جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا سینتیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر

سالنامہ

۱۹۶۶ء

بمبئی

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	زرِ ششماہی	ممالکِ غیر سے	قیمتِ سالنامہ
سات روپے	چار روپے	۱۴ شلنگ	ایک روپیہ

مکتبہ قصرِ الادب

بمبئی ۴ بی سی

ہیں۔ اس سال میں ہماری جو بات ہوئی تھی اس کا اب ان دو مہینوں کے اندر بہر صورت منوا لینا ہے۔ اس لئے ہمارے کام کی رفتار تیز تر ہونی چاہئے۔ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر خدا جانے آئندہ کوئی ایسا وقت نہ آئے گا جب اردو کے حقوق آئینی طور پر تسلیم ہونے کی امید کی جا سکے۔ ہمیں ایک طرف اردو کے لئے ساری مراعات حاصل کرنی ہیں اور دوسری طرف اس کی بقا و ترقی کے لئے عوامی سطح پر وہ کام کرنا ہے جو اب تک کیا نہیں گیا ہے اور جس کے سلسلے میں واضح تجاویز آپ نے اپنے زیر نظر اداریے میں پیش کی ہیں۔

عظیم اقبال _____ گنج ہائے بیا بیا (بہار)

گن گنوں کی رنگینیوں سے مزین نومبر کا "شاعر" منظر نواز ہوا۔ آپ کی ہمت اور لگن کی داد دینی پڑتی ہے۔ "شاعر" کو سنوارے چلے جا رہے ہیں۔ اردو تحریک کی بے مائیگی پر اس زبان کے سربراہوں کی رہبری کر رہے ہیں۔ اردو زبان شاعری خدمتوں کو کبھی فراموش نہ کر پائیگی۔

اردو کی بقا و ترقی کے لئے آپ نے جس منصوبہ کا تذکرہ کیا ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ زبان کا درجہ ایمان اور مذہب سے بھی اونچا ہوتا ہے۔ لیکن اردو والوں کی سرد مہری سمجھ میں نہیں آتی۔ سنجیدہ ادب کو وہ سراہ سکتے۔ اردو کا کوئی اخبار یا رسالہ نہیں خریدتے۔ اگر کبھی کبھار خریدتے بھی ہیں تو ایسے رسالے جن میں سستی عشقیہ باتی، رومانی اور فلمی باتیں ہوتی ہیں۔

سرمایہ کی فراہمی کی جانب جو ہلکا اشارہ آپ نے کیا ہے، وہ ممکن ہو سکتا ہے لیکن دوسروں کی مدد کے بھروسہ پر آپ کب تک بیٹھے رہیں گے۔ یہ سہارا پا ہی کے سر کیوں نہ ہو۔ دوسرے آپ کے نقش قدم پر چلنے کے لئے خود بخود تیار ہو جائیں گے۔

زیر نظر شمارہ میں اچھے مضامین ہیں خصوصاً علی عباس امید کا مضمون ترقی پسندی اور دعا طلب ہے۔ احسان دانش، وفا ملک پوری، ماہر القادری اور متین سروش کی تخلیقات روح پرور ہیں۔ آپ کی نظم "تانیا ٹوپی" انداز بیان، تسلسل خیال اور لطافت احساس کی رنگ آمیزی کا بہترین نمونہ ہے۔ میرے افسانہ "کل کے بچے" میں کتابت کی غلطیوں نے بہت سے خوبصورت اور پر معنی الفاظ اور جملوں کا تاثر ختم کر دیا۔

عروج احمد عروج _____ نزد مکرم ٹاکیز۔ جالنہ

تازہ "شاعر" میں آپ کی نظم "تانیا ٹوپی" پسند آئی۔ آپ نے بڑے موثر انداز میں واقعات غدر کا خلاصہ اتنے مختصر اشعار میں کیا ہے کہ بے ساختہ منہ سے داد نکل جاتا ہے۔ بڑی پیاری نظم ہے۔ احسان دانش، متین سروش کی غزلیں اور ماہر القادری، قمیر الجعفری، عطا محمد شعلہ کی نظمیں بھی اچھی ہیں۔

سردار جعفری کا مضمون "نئی شاعری کے فلسفہ راز" خاصہ کی چیز ہے۔ لیکن ایک بات کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ جعفری صاحب نے مضمون کی ابتدا میں لکھا ہے کہ میرا مقصد نئی شاعری پر اظہار خیال کرنا نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے نئی شاعری پر بحث سے بچنے کی کوشش کیوں کی ہے۔ جعفری صاحب کو تو کھل کر نئی شاعری پر اظہار خیال کرنا چاہیئے۔

راجہ مہدی علی خاں اور ساحر لدھیانوی پر لکھے گئے مضامین اچھے ہیں۔ عظیم اقبال کا افسانہ پسند آیا۔

وہاب دانش _____ لوئر بازار، نظر علی لین۔ رانچی

ماہ رواں کا "شاعر" نظر سے گذرا۔ بیحد پسند آیا۔ اداریہ میں اردو کی بقا کے سلسلے میں آپ نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی اہمیت اور عملی قدروں سے ناچیز سو فی صدی متفق ہے۔ کسی بھی تحریک کے لئے خلوص اور نیک نیتی اگر روح ہے تو ذکر خون۔ جو رگوں میں موج بن کر جذبۂ عمل کو تازہ رکھتا ہے۔ آپ نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے، انہیں فروغ دینے اور ذہین طبقہ تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ آئندہ شماروں میں بھی دانشوروں اور ارکان پسند ہنروں کی رائیں عملی اقدامات سے متعلق تحریروں اور افادی تفہیمات کا سلسلہ جاری رہے۔ تاکہ قدم ملا کر چلنے والوں کا اشتراک بھرپور طریقے سے مل سکے۔

سرمایہ کے سلسلے میں عملی اقدام کا پروگرام فوراً ہی بن جانا چاہئے۔ اور سارے اردو پسند خطوں کو مختلف حلقوں میں بانٹ کر کام شروع کر دینا چاہئے۔ امید کہ اس محور سے کام کا سہرا "شاعر" کے سر ہی باندھا جائے گا۔ کیوں کہ ہندوستان بھر میں جتنے بھی رسالے نکل رہے ہیں ان میں سے ایک نے بھی ابھی تک اتنے ٹھوس اور مستحکم قدم کی طرف توجہ مبذول نہیں کرائی ہے۔

اس بار سردار جعفری نے جس چٹکلے انداز میں نئی شاعری کی حمایت کی ہے اور نئی شاعری کے چہرے پر پڑے ہوئے "اون کے الجھے ہوئے نقاب"

غذائی خود کفالت کے لئے

چوطرفہ جدوجہد

اسے کامیاب بنائیے

مہاراشٹر چیلنج کا سامنا کرتا ہے

- زیادہ اُپجاؤ اور مخلوط بیجوں کا استعمال
- غذائی فصل کے علاقوں میں سینچائی کے پانی کا آزادا اور گنّے والے علاقوں میں کمی۔
- گیہوں اور دھان کی دوہری فصلوں میں اضافہ
- فصل کے دوران کاشتکاروں کو مناسب قیمتوں

ڈائرکٹر آف پبلسٹی گورنمنٹ آف مہاراشٹ

یہ ڈرامہ کی پہلی ادبی مثال ہے جو اسٹیج کی خصوصیات واضح ہوں۔ رہیں اپنی جگہ پر رہیں ہے اور وہ ڈرامہ نہیں کہلایا جا سکتا۔

(۲) میں پروفیسر ادیب کے اس نظریہ سے متفق نہیں ہوں کہ واجد علی شاہ نے اندر سبھا پیش کر کے اردو ڈرامے کی بنیاد ڈالی اور امانت نے اس کی نقل کر کے اپنا اندر سبھا لکھی۔

تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں اور خود پروفیسر ادیب اس بات پر متفق ہیں کہ (الف) واجد علی شاہ اختر سے پہلے شاہی ڈرامے کا روایات نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں ملتی ہیں۔

(ب) اس سے پہلے بھی نواب سعادت علی خاں کے دور میں رہس کھیلے جاتے تھے۔ (ج) محمد قلی قطب شاہ سے لے کر ناسخ تک اور ان کے بعد بھی سیکڑوں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں راجا اندر اور ان کے اکھاڑے کا تذکرہ ہے۔

(د) دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم میں پوری اندر سبھا پیش کر دی ہے۔ ہر اردو داں اندر سبھا کو امانت کی تصنیف سمجھتا ہے لیکن پروفیسر ادیب فرماتے ہیں۔

(الف) اندر سبھا کا نام امانت کا اپنا رکھا ہوا نہیں ہے

(ب) اندر سبھا امانت کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے

(ج) اندر سبھا کے کردار امانت کے تخلیق کئے ہوئے نہیں ہیں

(د) اندر سبھا کا قصہ ان کا اپنا نہیں ہے۔

(ہ) اندر سبھا کو لوگوں نے معمولی کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں دی

ہر شخص ان دلائل سے اتفاق کرتا ہے کیونکہ ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ اندر سبھا کے قصے زمانہ نا معلوم سے زبان زد خلائق ہیں اور عام طور پر رہس کی صورت میں کھیلے جاتے رہے ہیں۔ امرا اپنی حویلیوں میں اور غربا کھلے میدانوں میں رہس کھیلتے تھے۔ واجد علی شاہ نے بھی حسب حیثیت اندر سبھا اسٹیج کی۔ واجد علی شاہ نے امرا اور رؤسا و عظام کے لئے اندر سبھا لکھی اور امانت نے غربا کے لئے۔ یہ اتفاق ہے کہ امانت کی اندر سبھا چھپ کر زندہ رہ گئی۔

(۳) "راجہ گوپی چند اور جلندھر" اردو کا پہلا ڈراما ہے اور خورشید "اردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈراما۔

اکرام جاوید ——— جوبلی پوسٹ آفس حیدر آباد ۲

تازہ "شاعر" مضامین نظم و نثر اور طباعت و گٹ اپ کے اعتبار سے پندآیا۔ "شاعر" کے حسن کا یہ نکھار میرے لئے باعث مسرت ہے۔ حصۂ شاعری میں آپ کی نظم شاندار اور پرشکوہ ہے۔ اس میں قلب و نظر کو متاثر کرنے کی پوری پوری تاب و توانائی ہے۔ وفا ملک پوری کی نظم اور حقیر سروش کی غزل بھی میں نے بڑے شوق سے پڑھی اور مسرور ہوا۔ کہانیاں بھی اچھی خاصی ہیں بحیثیت مجموعی "شاعر" کا یہ شمارہ اردو ادب کی رفتار ترقی کا آئینہ دار ہے۔ "کرشن چندر نمبر" خاصی اہم ادبی پیش کش ہوگی۔ اس کا مجھے یقین ہے۔

انجمن آرا انجم ——— امیر نشان، علیگڈھ

"شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ علی عباس صاحب امید کا مضمون "ترقی پسندی" صحت مند نظریہ کا حامل ہے اور ساتھ ہی تجزیہ بخش بھی۔ آج کل "ترقی پسندی" اور "جدیدیت" پر بڑی گرم بحثیں چل رہی ہیں۔ اگر چند صحت بخش مقالوں اور تقریروں کے ذریعہ ترقی پسندی اور جدیدیت کا مفہوم، مطلب اور مقصد واضح ہو جائے تو بہت سے بے راہرو صحیح منزل پا لیں گے۔ اس شمارے کے تقریباً سب مضامین اور کہانیاں قابل ستائش ہیں۔ حصۂ نظم میں اگر غزل کے رنگ کو اور نکھارا جائے تو "شاعر" کی دلکشی فزوں تر ہو جائے۔ آپ کی نظم "تانیتا لوپی" بڑی اثر انگیز اور سلاست و روانی کا بہترین نمونہ ہے۔

اپکی جلد جوان ہے تو آپ جوان ہیں.....

اپنی جلد کی جوانی بھری تازگی اور چمک کے لئے

افغان کولڈ کریم کی مدد لیجئے

اپنی جلد کو جوان اور چمکدار رکھئے، اس کو
داغ، بھدے پن اور جھریوں سے بچائیے

افغان سینو

اور کولڈ کریم

خوبصورتی کا مکمل علاج

تیار کردہ

ای۔ایس۔پاٹن والا

بمبئی ۷

محفل اپنی .....!

[illegible] کا آخری شمارہ

[illegible] سخت تنگی اور انتشار کے ساتھ ختم ہو رہا ہے۔ اس سال پورا ملک زبردست پریشانیوں کا شکار رہا ہے۔ ادب و صحافت کے لئے بھی یہ سال اچھا ثابت نہیں ہوا۔ بلا شبہ سامان کی گرانی نے بڑی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔

بہر حال ثابت قدمی ہی اس دور کا تقاضا ہے۔ "شاعر" نے بھی اس کا بخوبی دیا۔ مشکلات کے باوجود ہمارا قدم آگے ہی کی طرف بڑھا ہے۔ "شاعر" میں نمایاں صوری و معنوی تبدیلیاں آئی ہیں اور سب سے زیادہ مسرت کی بات تو یہ ہے کہ اس سال پورے بارہ شمارے پیش کئے گئے۔ ہر مہینہ کے آخر ہی میں سہی لیکن "شاعر" ہر مہینے نکلتا ضرور رہا ہے۔ آٹھ روپے کے تخلیلی سالانہ چندہ میں نو سو سے زیادہ صفحات پیش کئے گئے۔ اس پر بھی دوران سال میں بعض کرم فرماؤں نے "شاعر" کے وی۔ پی واپس کر دیئے۔ ایسے حضرات کو افسوس کا ہدیہ دیا ہی خواہ ہر گز نہیں کہا جا سکتا۔ ایک وی۔ پی کی واپسی سے "شاعر" پر تقریباً بارہ آنے کا بار پڑتا ہے۔

دسمبر ۱۹۴۶ء کا یہ نازہ شمارہ، پچھلے شماروں ہی کی طرح متنوع ہے اس بار علمی ادبی اور تنقیدی مضامین کی تعداد زیادہ ہے۔ ہمیں اسکا افسوس ہے کہ اس شمارہ میں افسانے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایک بہت ہی طویل مگر کام کے مضمون "تقلیدی اور تخلیقی شاعری" نے دو تین افسانوں کا حق چھین لیا۔ پہلے ہی کچھ اعلان شدہ نظمیں اور غزلیں رکی ہوئی تھیں۔ اس بار بعض کتابت شدہ منظومات کو بھی روکنا پڑا ہے۔ "رد و قبول" اور "نقد و نظر" کے دونوں اہم ابواب کے لئے بھی جگہ نہ نکل سکی۔

کئی بار عرض کیا جا چکا ہے کہ "شاعر" کے لئے بے اندازہ نظم و نثر۔ تخلیقات آتی ہیں۔ ۱۹۴۵ء کی تقریباً چھ سو تخلیقات واپس کرنا پڑی تھیں ۱۹۴۶ء میں اس سے بھی زیادہ دباؤ رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ مواد کھپانے کے باوجود آئی ہوئی تخلیقات کا دو سواں حصہ بھی شائع نہیں ہو پاتا۔ قلم کار بڑا تقاضے ہیں۔ کاش وہ "شاعر" کی تنگ دامانی کا احساس کریں۔ ہو سکتا ہے کہ جنوری ۱۹۴۷ء کے "شاعر" کے صفحات بڑھانے پڑیں۔ اس لئے کہ اس کے لئے جو نظم و نثر تخلیقات منتخب کی گئی ہیں وہ بہت زیادہ ہیں۔ سوال کاغذ کی [illegible] کا بھی تو مرحلہ ہے۔ ۱۹۴۷ء "شاعر" کے [illegible] کاغذ کا نصف قیمت سے بھی کم میں پیش کیا جائے گا۔

صرف بارہ روپے

"شاعر" کے ہمدرد، دوست، خریدار، مقامی کارکن، غرض جتنے بھی پڑھنے والے ہیں کیا اُن میں سے ہر شخص اپنے حلقۂ تعلق سے کسی ایک صاحب ذوق سے بارہ روپے وصول نہیں کر سکتا؟ ایک نیا خریدار بنا لینا تو کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔

آئندہ شمارہ

مضامین	اُردو میں تحقیق	مالک رام
	تشنہ کی غزل پسندی	ڈاکٹر جعفر رضا
	مضمون۔ مقالہ۔ انشائیہ	عبدالطیف اعظمی
	ہندی نئی نظم کا موضوعاتی پھیلاؤ	شیام کنول
کہانی	دل اور دیوار	عمر عادل زئی
	میری دنیا میرے لوگ	کلدیپ رعنا
ریویو تبصرے	"جشن شاعر"	ندا فاضلی
بحث	نئی شاعری کیوں؟	وقار پردیسی
		رشید الدین
		حسین عباس

ندا فاضلی کے خط کا جواب، پروفیسر اے سی۔ بھل

اور کئی دوسری اہم نثری تخلیقات

منظومات: ثاقب کانپوری۔ تین سروش۔ علیم اختر۔ مظفر نگری۔ مظفر حنفی۔ اویس احمد دوراں۔ ظفر اقبال۔ اسرار اکبر آبادی۔ نشاط الرحمٰن خاں نشا۔ بدیع الزماں خاور۔ کیفی اورنگ آبادی۔ جلیل عرشی۔ ممتاز راشد۔ سید ظہیر جعفری۔ ناز قادری۔ ذکاء الدین شایاں۔ عفیفہ کیفی۔ امیر حمزہ۔ آر۔ طاہر دانیال۔ برہم ناتھ درت قاصر۔ راہی قریشی۔ اعزاز افضل۔ سروج اختر سروج۔ افسانہ بجاپوری۔ فاروق شفق۔ ظفر غوری۔ سہراب دانش۔ مناف صدیقی۔ علیم اللہ حالی۔ فروغ تمکنت۔ مستانہ شکیب۔ شمیم ہاشمی وغیرہ۔

جرعات۔ نقد و نظر، ادبی و تہذیبی خبریں اور فنکاروں کی تصاویر

۱۵ سال پہلے ۱۹۵۰ء "شاعر" نے

مشاعرہ نمبر

پیش کیا تھا اور اس کے بعد اس نمبر کا تقلید بھی ممکن نہ ہو سکی۔ معرض وجود میں آیا تھا۔

اس میں اندھیروں سے بزم گیتی کو ایک نئی روشنی ملے گی

اور اس معرکہ پر سیماب اکبر آبادی۔ آرزو لکھنوی، جوش ملیح آبادی۔ نشور لکھنوی، وحشت کلکتوی، نوح ناروی، عالی جعفری، جوش ملسیانی۔ مجنوں صدیقی لکھنوی، تلوک چند محروم، سریش لکھنوی، نمکین اکبر آبادی۔ ساغر نظامی، رویش صدیقی، ماہر القادری، منظر صدیقی، نریش کمار شاد، جگن ناتھ آزاد، پرتو لکھنوی، شفیق جونپوری، شمیم کرہانی، عرش ملسیانی، منور لکھنوی جیسے چوٹی کے شعراء کے علاوہ سو سے زیادہ دوسرے معروف شعراء کی غزلیں شریک ہیں۔

۶۴ - شعراء کی تصاویر

سید احتشام حسین۔ اختر ہلوری اور سہیل بخاری کے مضامین اس نایاب نمبر کی قیمت ۱۹۵۰ء میں ایک روپے چار آنے تھی اور اب چار روپیہ علاوہ محصول ڈاک ہے۔

منیجر "شاعر" پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۸ - بی سی

ارباب ذوق کے لئے

"شاعر" کے سالنامے اور خاص نمبر

"شاعر" نے اب تک بے شمار "سالنامے" اور "خاص نمبر" پیش کئے ہیں جو اپنے حسن و سیاق کے اعتبار سے بیحد مقبول ہوئے۔ ان میں ادب و شعر تنقید و تحقیق اور افسانہ و ڈرامہ کا نہایت قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ سیکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان کی صرف چند کاپیاں باقی رہ گئی ہیں

سالنامہ	۱۹۵۱ء	دو روپے	
افسانہ نمبر	۱۹۵۶ء	دو روپے	
جمہوریت نمبر	۱۹۶۲ء	ڈیڑھ روپیہ	
افسانہ نمبر	۱۹۶۲ء	ایک روپیہ دس آنے	
سالنامہ	۱۹۶۳ء	ڈیڑھ روپیہ	
خاص نمبر	۱۹۶۳ء	ایک روپیہ چار آنے	
سالنامہ	۱۹۶۴ء	ایک روپیہ	
ڈرامہ نمبر	۱۹۶۴ء	ایک روپیہ بارہ آنے	
سالنامہ	۱۹۶۵ء	ایک روپیہ بارہ آنے	
خاص نمبر	۱۹۶۷ء	ایک روپیہ	

منیجر "شاعر" پوسٹ بکس ۴۵۲۶ - بمبئی ۸ - بی سی

خلیل الرحمٰن اعظمی کا تازہ ترین مجموعۂ کلام

"نیا عہد نامہ"

عنقریب شائع ہو رہا ہے

ناشر:- انڈین بک ہاؤس۔ محمد علی روڈ۔ علی گڑھ

مدت خریداری ختم ہونے کی اطلاع:- اس سیاہ حلقہ میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سال خریداری ماہ دسمبر ختم ہو گیا ہے چونکہ تین ماہ (اپریل۔ مئی۔ جون) کے شمارے شائع نہ ہو سکے اس لئے آپ کی قیمت واضح کر کے سات روپے سالانہ چندہ کے بجائے آپ کی خدمت میں آئندہ ماہ فروری ۱۹۶۸ء میں سالنامہ شاعر شائع کیا جائے گا (علاوہ محصول ڈاک) صرف پانچ روپے آٹھ آنے کا بھی جا سکتا ہے یا آپ یہ تخفیف شدہ رقم ۵/۵۰ Rs. ذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے۔ اس تخفیف شدہ چندے ہی میں اب آئندہ دو سال "شاعر" بدستور آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہے گا۔ یہ اطلاع آپ کی بھرپور توجہ چاہتی ہے۔

منیجر

اردو کی مشہور اور ممتاز نقاد ڈاکٹر سید جعفر

کے

بارہ ۱۲ تنقیدی مضامین کا مجموعہ

فن کی جانچ

قیمت:- چار روپے

ملنے کا پتہ:-

نیشنل بک ڈپو۔ مچھلی کمان، حیدرآباد، آندھرا پردیش

ترتیب

اردو ادب کا تعلیم کا مسئلہ — اداریہ — اعجاز صدیقی ۹
مرثیہ غم و رثا — نظم — اعجاز صدیقی ۱۰
منظر نگاری کا مفہوم — مقالہ — ڈاکٹر سلام سندیلوی ۱۱
غزل — فراق گورکھپوری ۱۵
غزل — میکش اکبرآبادی ۱۶
ایک رات — افسانہ — قرۃ العین حیدر ۱۷
بیداریٔ ہند — نظم — خلیل الرحمٰن اعظمی ۲۲
سیاہ کے یہاں مشقی تجربے — مقالہ — پروفیسر زرینہ ثانی ۲۴
سازِ آہنگ — نظم — متین سروش ۳۰
فنِ ڈرامہ اور انارکلی — مقالہ — لطف الرحمٰن ۳۱
خدا جانے — نظم — سلام مچھلی شہری ۳۱
غزل — شاذ تمکنت ۳۲
پورٹریٹ نمبر دو — افسانہ — رام لعل ۳۳
روشنی کی لہر — نظم — رفعت سروش ۳۹
سرگوشیاں — نظم — رحمان جبابی ۳۹
آغا صاحب — طنز و مزاح — کنہیا لال کپور ۵۱
افسانۂ آدم — نظم — حرمت الاکرام ۵۵
آپٹو نیمر کا تصویری نظمیں — مقالہ — ندا فاضلی ۵۶
غزل — بشر نواز ۶۰

غزل — کرشن موہن ۶۰
دھمکی — افسانہ — ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط ۶۱
مشورہ — نظم — محمود سمیر ۶۷
موم کا بدن — افسانہ — اکرام جبابی ۶۹
غزل — محسن زیدی ۷۴
غزل — نامی انصاری ۷۴
سمندر — افسانہ — آمنہ ابوالحسن ۷۵
حیف — نظم — راج نرائن رازؔ ۷۶
غزل — پیرزادہ اقبال احمد ۷۷
علم ہے ظلمت — طنز و مزاح — یوسف ناظم ۷۸
اُردو — نظم — بدر پراچہ ۸۱
گلدستۂ نسیم — مقالہ — نسیم انہونوی ۸۲
آشوبِ آگہی — نظم — ڈاکٹر نظر حیدری ۸۴
نرمیدر بھیا — افسانہ — مانک ٹالہ ۸۷
مومن — ڈرامہ — اظہر افسر ۹۱

مکتوبات — مختلف قلم کار ۹۴
محفل اپنی ۔۔۔ ! — ادارہ ۹۸

کرشن چندر نمبر میں
خود

کرشن چندر

کے اپنے قلم سے
ایک تازہ اور غیر مطبوعہ شاہکار نئے

ناول

کے علاوہ

تین تازہ کہانیاں
ایک ڈرامہ
ایک مزاحیہ
میرے ادبی نظریات
میرے تنقید نگار
میرے ادبی زندگی کا آغاز و انجام

کرشن چندر کے شب و روز
(تصاویر کے ذریعہ)
اور

عکس تحریر

کرشن چندر کے
اہم خطوط

ادارہ "شاعر" فخر و مسرت کے ساتھ
اردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار

کرشن چندر

پر نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر پیش کر رہا ہے
کرشن چندر کی منفرد شخصیت اور اس کے ہمہ گیر فن پر نہ صرف ہندوستان کی
کئی زبانوں کے مشہور قلمکاروں بلکہ دنیا کے کئی بڑے مصنفین اور مفکرین
کے مضامین و تاثرات

کرشن چندر نمبر

میں

پیش کیے جائیں گے

کرشن چندر

کی
ادبی زندگی کی لافانی تاریخ
اس کی عظمت کی کہانی، اس کی تصانیف کا جائزہ،
اس کے زندہ اسلوب فکر اور شاہکار افسانوں، ناولوں اور ڈراموں پر
تنقیدی نظر
درجنوں تصاویر
تفصیلات اور تاریخ کا انتظار کیجئے

ارباب قلم اپنے مضامین کرشن چندر جلد از جلد ارسال فرمائیں

جرعات:-

اُردو ادب کی تعلیم کا مسئلہ

اُردو ادب اپنے قدیم دور سے جدید دور میں آکر بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ادب کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے اور آج کے دور میں جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف انسانی رجحان تیزی کے ساتھ دوڑ رہا ہے، زندگی میں توازن اور اعلیٰ انسانی قدروں کی بقا کے لئے ادب کی اعلیٰ تعلیم اور اُس کا فروغ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ ادب انسان کو مہذب اور اُس کی جمالیاتی حس کو اُجاگر کرتا ہے۔ زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ ادب کے مسائل بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔

اُردو زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کوتاہیوں اور خامیوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے شعبۂ اُردو کی طرف سے ایک چار روزہ سمینار ۳۰ دسمبر سے ۲ جنوری تک منعقد کیا جس کا افتتاح ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین نے فرمایا اور صدارت نواب علی یاور جنگ اُس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے کی۔ اس سمینار کے نو اجلاس ہوئے۔ ہر جلسہ کو پروفیسر آل احمد سرور نے چلایا اور سنبھالا۔ پروفیسر آل احمد سرور کی خیر مقدمی تقریر بڑی جامع اور بامقصد تھی سمینار میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور اُن کے کالجوں سے آئے ہوئے پروفیسروں اور لیکچراروں نے شرکت کی جن میں کئی ماہرین زبان و ادب، مشاہیر اساتذہ اور بلند پایہ ادیب تھے خواتین لیکچرار بھی تھیں۔ راقم الحروف کو بھی اتفاقی طور پر سمینار کے دو تین جلسوں میں شریک ہونے کی مسرت حاصل ہوئی اور اس کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ سمینار میں کئی اہم موضوعات پر مقالات پڑھے گئے۔ بحثیں ہوئیں نصاب تعلیم کے سلسلے میں غور کیا گیا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اُردو زبان و ادب کی تعلیم کی کوتاہیوں اور خامیوں پر کھل کر اظہار خیال ہوا۔ اور یہ بات مان لی گئی کہ ہمارے یونیورسٹی کالجوں میں اُردو زبان و ادب کی صحیح تعلیم نہیں دی جاتی اور اسکی ذمہ دار وہ اساتذہ ہیں جو ان کالجوں میں تعلیم دیتے ہیں۔ اس سلسلے کی بہت سی مثالیں دی گئیں جو دلچسپ بھی تھیں اور عبرت آموز بھی۔ مثلاً ایک پروفیسر صاحب جو کبیر سے تعلق رکھتے ہیں اور ریڈر بھی ہیں انھوں نے اپنے طلبہ کو بتایا کہ حالی نے صرف دو مسدس لکھے ہیں۔ ہر چند ان مثالوں میں نام نہیں لئے گئے تھے۔ پھر بھی سمجھنے والوں نے سمجھ ہی لیا۔ لیکن ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین نے اپنے پُر مغز افتتاحی خطبے میں جب یہ فرمایا کہ دیگر مضامین کے متعلق میں زیادہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن بمبئی کے متعلق میں جانتا ہوں کہ وہاں کے بعض کالجوں میں اُردو زبان و ادب کی بہت غلط تعلیم دی جاتی ہے تو بمبئی سے ایک دبیز پردہ جذباتی وابستگی کی بنا پر راقم الحروف کو ایک ذہنی جھٹکا سا لگا۔ سیدین صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ اپنی جگہ صداقت پر مبنی تھا جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تعجب کی بات یہ بھی تھی کہ اس سمینار میں بمبئی کے کالجوں کی نمائندگی بالکل نہ تھی۔ راقم الحروف بھی ذاتی طور پر یہ بات جانتا تھا کہ بمبئی کے بعض کالجوں میں اُردو کی صحیح تعلیم نہیں دی جاتی۔ تعلیم کا سوال تو الگ رہا خود بعض اساتذہ زبان و ادب سے مطلق دسترس نہیں رکھتے مگر وہ بی اے اور ایم اے کی کلاسوں کو اُردو پڑھاتے ہیں۔ ایک خاتون لیکچرر جن کی مادری زبان اُردو نہیں اور جو اُردو پڑھانے میں وہ مصنف (م۔ص۔ن۔ن۔ف) کو "مُصنف" (م۔ص۔ن۔ف) کہتی ہیں بمبئی میں چند اچھے کہنہ مشق اساتذۂ اُردو ادب بھی ہیں لیکن عام طور پر یہ بات نہیں ہے بمبئی اور دوسرے شہروں کے کالجوں کی ناقص تعلیم ہی کا یہ سبب ہے کہ ان سے طلبہ محض اُردو میں امتحان تو پاس کر لیتے ہیں لیکن یہ ادیب، مصنف اور بلند پایہ شاعر پیدا نہیں کر سکتے۔ سیدین صاحب اور وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی دونوں نے یہ بات فرمائی کہ "موجودہ تعلیم سے فیض اُٹھانے والوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔" وہی تو اساتذہ تھے جن کے فیض تلامذہ نے اعتشام حسین۔ آل احمد سرور۔ مجنوں گورکھپوری۔ سجاد ظہیر۔ سردار جعفری جذبی۔ فراق گورکھپوری، اختر اورینوی۔ عبدالقادر سروری جیسے سیکڑوں مشاہیر پیدا کئے۔ ان کے بعد آنیوالی نسل میں بھی کچھ نام نظر آجاتے ہیں۔ لیکن اب یہ نسل تیار کالجوں میں تعلیم پا رہی ہے وہ نقص تعلیم کی بنا پر بہت پیچھے ہے۔ اگر اُردو زبان و ادب کی تعلیم پر آج اساتذہ نے توجہ نہ دی تو خدشہ ہے کہ ادیبوں، مصنفوں اور بلند پایہ شاعروں کی پیدائش کا سلسلہ رک جائے۔ اس سلسلے میں کالجوں کے موجودہ اساتذہ کو بھی بڑے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ خود اُردو زبان و ادب میں ڈوب کر، جدید علمی تقاضوں کو سمجھ کر اور دوسری زبانوں کی ترقی کو پیش نظر رکھ کر اپنے طلبہ کو تعلیم دینی چاہئے۔

خوشی کی بات ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے جس سمینار کا آغاز کیا ہے، وہ ہر سال ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہوتا رہنا چاہئے اور اساتذۂ ادب و اُردو کی کوششوں اور اُن کے کاموں کا جائزہ لینے کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ اُردو زبان و ادب کی صحیح تعلیم کے مسئلے سے اِس زبان کی بقا کا سوال بھی وابستہ ہے، یہ صرف تعلیم ہی کا مسئلہ نہیں۔

مارچ ۱۹۷۳ء

اعجاز صدیقی

مژدۂ غم رُبا

تاشقند کانفرنس کا طربیہ اور المیہ

مژدہ بادِ اہلِ چمن رُک گئی وہ بادِ سموم
جس نے سوچا تھا کہ شاخوں کو جھلس کر رکھ دے
جس نے چاہا تھا کہ شاخوں کو جھلس کر رکھ دے
زرِ گل آتشِ سیال بنے، گل جائے

دل میں پیوست جو خنجر تھے، وہ باہر نکلے
چھوڑ دی سینہ فگاری کی ادا تیروں نے
کم ہوئی رُوح میں چبھتے ہوئے کانٹوں کی خلش
پائے غم چھوڑ دیا کانپتی زنجیروں نے

رُک گئیں خون کی بہتی ہوئی پاگل ندیاں
خندقیں اب نہ بھری جائیں گی پھر لاشوں سے
داغ اب کھا نہ سکے گا کوئی مظلوم کے
زخم اب بطن نہ رکھیں گے تڑپ لاشوں سے

بادہ چھلکاؤ کہ قضا ہو گیا میخانے کا در
جام ٹکراؤ، کہ رُوٹھے ہوئے میخوار ملے
بھول بیٹھے تھے جو آئینِ وفا، رسمِ خلوص
نئے کے نذرانۂ دل، پھر وہی دلدار ملے

دیکھ دیکھو کہ ماتھے کی لٹیں ہٹا کے رہیں
اتصالِ مہ و خورشید ہُوا، رقص کرو
جو بڑھا راہِ تدبّر میں، وہ پہلا ہی قدم
امن اور صُلح کی تمہید ہُوا، رقص کرو

کسے معلوم تھا، اس رقص کی جھنکاروں کو
ڈوبنا ہوگا غم و رنج کی آوازوں میں
جن کو ہاتھوں نے اُٹھایا تھا بصد بیتابی
بَدَد کی چیخ اُبھر آئے گی اُن سازوں میں

کسے معلوم تھا، پردیس میں دینے کے لئے
قیمتِ صُلح و صفا، قیمتِ جاں ٹھہرے گی
کسے معلوم تھا، بے ساختہ رُک کر اک سانس
ساری دُنیا کے لئے ایک فغاں ٹھہرے گی

منزلِ شوق جب آئی تو ہوا رہبر گم
دے کے جادوں کو لہو قافلہ سالار گیا!
ہائے، تھا زندگی دامن کا سَودا بھی عجیب
ایک شے جیت لی اور دوسری شے ہار گیا!

ایک شب کی بھی تو پروانے کو مُہلت نہ ملی
کہ ذرا شمع سے تشریحِ وفا کر لیتا
کم سے کم اتنی ہی مل جاتی اُسے فرصتِ مرگ
سینہ چاکانِ حوادث کی دوا کر لیتا

عبرت انجامیٔ انساں پہ نگاہیں ڈالو!
زیست پر غور کرو، زیست حباب آسا ہے
چند سانسیں جو ملی ہیں وہ شکوں سے کٹ جائیں
امن کی قدر کرو، جنگ میں رکھا کیا ہے

ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ گورکھپور یونیورسٹی

مقالہ:۔

منظر نگاری کا مفہوم

جس طرح کسی چیز کی تعریف کرنا اور اُس کو الفاظ کے حدود میں لانا مشکل ہے، اسی طرح منظر نگاری کی تعریف واضح الفاظ میں کرنا ایک کام ہے مختلف ادیبوں اور نقادوں نے منظر نگاری کی تعریف اپنے نقطۂ نظر سے کی ہے اور اُس کے مفہوم کو ادا کیا ہے مگر اُن کے بات کہیں نہیں ہیں بلکہ اُن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یوں تو منظر نگاری اُس شاعری کو کہہ سکتے ہیں جس میں کسی بھی منظر کی عکاسی کی ہو مگر خاص طور سے منظر نگاری کا اطلاق اُس شاعری پر ہوتا ہے جس میں مناظر قدرت کا بیان ہو۔

انگریزی ادیبوں اور نقادوں نے بھی منظر نگاری کے مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہڈسن منظر نگاری کے لیے TREATMENT OF کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ای البرٹ بھی اس قسم کی شاعری کو TREATMENT OF NATURE سے تعبیر کرتا ہے[1]۔ وہ نیچر کا اطلاق اُن مناظر پر کرتا ہے جو زمین، ہوا اور سمندر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ شاعری جو ارضی، فضائی، اور بحری مناظر سے تعلق رکھتی ہے، نیچرل شاعری کہی جا سکتی ہے۔ اسی بنا پر ہم منظر نگاری کو نیچرل شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔

اُردو میں نیچرل کا مفہوم دورِ حاضر میں زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ مگر سرسید کے دور میں نیچرل شاعری کا یہ مفہوم نہ تھا۔ سرسید نیچرل شاعری کا ایک جداگانہ مفہوم رکھتے تھے۔ انھوں نے ۹ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو مولوی محمد حسین آزاد کو ایک خط لکھا۔ اس میں انھوں نے لاہور کی مجلسِ مشاعرہ کا بھی ذکر کیا۔ اس خط سے نیچرل شاعری کے بارے میں اُن کے نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔

"میری نہایت قدیم تمنا اسی مجلس مشاعرہ سے برآئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی "خوابِ امن" پہنچی۔ بہت دل خوش ہوا۔ درحقیقت شاعری اور زور گنجوری کی داد دی ہے۔ اب اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دیگا۔ لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضرور ہے کہ انگریزی شاعری کے خیالات کے کرارُ دو زبان میں ادا کیے جائیں۔ یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی کر تو دے۔ ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں۔ ہم بیان کیا کر سکتے ہیں"[2]

یہاں سرسید نے نیچرل شاعری کا یہ مطلب لیا ہے کہ وہ شاعری جو خیالی نہ ہو۔ بلکہ فطری ہو اور جو تصنع اور آورد سے پاک ہو۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ انگریزی شاعری کو نیچرل سمجھتے ہیں۔

---

1. An Introduction to the study of literature by Hudson. P. 424
2. A history of English Literature by Albert. P. 290

نقل خط از سرسید بنام ڈاکٹر عبید اللہ مسعود مدظلہ

نوٹ:۔ اس خط کے آخر میں ۱۹ اکتوبر ۱۸۷۴ء تاریخ چھپی ہوئی ہے جو کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ۱۸۷۴ء کے بجائے ۱۸۷۳ء ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اپنی کتاب (صفحہ ۲۰۶) میں ۱۸۷۴ء ہی لکھا ہے۔

جسے بزبانِ انگریزی سبجکٹیو Subjective کہتے ہیں۔ اوّل قسم کی شاعری جس کا نام .....

راقم خارجی رکھتا ہے، ایسے بیانات پر مشتمل ہے جن سے عالم فی الخارج کے معاملات پیش نظر ہوجاتے ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں اکثر بیانات رزم، بزم، جلوس، تزک، احتشام، لباسِ فاخرہ، باغ، قصور، چمن، گلزار، سبزہ زار، لالہ زار، چشمے، ہوا، برق، باراں سیل، برف، شفق، بحر، شام، روز، شب، شمس، قمر، ستارے، ثوابت، قطب و بروج و دیگر عناصر خارجی اشیاء کے متعلق ہوتے ہیں[1]

مولوی سید امداد امام کے بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خارجی شاعری میں مادی مناظر اور فطری مناظر دونوں آجاتے ہیں۔ یعنی خارجی شاعری میں بازار، جلوس، رزم اور بزم کی بھی منظر نگاری کی جاسکتی ہے اور باغ، چمن، شفق اور چاند وغیرہ کی بھی تصویریں کھینچی جاسکتی ہیں۔ اس طرح خارجی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں منظر نگاری بھی شامل ہے۔ مگر سہولت اور وضاحت کے لئے ہم خارجی شاعری کو دو حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک مادّی اشیاء کا بیان جس کا نام وصف نگاری رکھا جاسکتا ہے۔ دوسرے غیر مادی یا فطری اشیاء کا بیان جس کو منظر نگاری کہا جاسکتا ہے۔

یہاں اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ انگریزی ادب کے مطالعہ نے منظر نگاری یا نیچرل شاعری کے مفہوم کو زیادہ واضح کردیا ہے اردو کے نئے نقادوں نے نیچرل شاعری کی روح کو گرفت میں لینے اور اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اقبال کے کلام کے سلسلے میں نیچرل شاعری کے مفہوم پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"اس صنف میں اقبال کا کلام لاجواب ہے۔ اور اُن کی وہ نظمیں جو نیچرل چیزوں اور قدرتی مناظر پر ہیں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ مثلاً جگنو، چاند، صبح کا ستارہ، ایک پرندہ اور جگنو، ابر، وغیرہ، اعلیٰ تخیل، صحتِ بیان اور شیرینیٔ زبان کے واسطے بے مثل جواب ہیں"[2]

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اقبال کی نیچرل نظموں میں جگنو، صبح کا ستارہ، ایک پرندہ اور ابر وغیرہ کو شامل کیا ہے۔ یہ تمام موضوعات نیچر یا فطرت سے متعلق ہیں۔ اس لئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان موضوعات کا تعلق نیچرل شاعری سے ہے۔ جس کا نام ہم منظر نگاری بھی رکھ سکتے ہیں۔

شیخ اکرام بھی نیچرل شاعری کا اطلاق مناظرِ قدرت کی شاعری پر کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ غالب کی شاعری کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

"مرزا کی شاعری پر ایک اور اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ وہ نیچرل نہیں جب حالی نے نیچرل شاعری کی اصطلاح شعر و شاعری میں پہلی مرتبہ استعمال کی تھی تو اُس نے اُس سے وہ شاعری مُراد لی تھی جو خیالی نہ ہو بلکہ نیچر یا فطرت کے مطابق ہو۔ اگر غالب کے کلام کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ اعتراض صحیح نہیں معلوم ہوتا ..... مگر بعض مقرضین نیچرل شاعری سے بالعموم مناظرِ قدرت کی شاعری مُراد لیتے ہیں۔"[3]

اس بحث و مباحثہ سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ مرئیات کے بیان کو خارجی شاعری کہا جاسکتا ہے۔ اس خارجی شاعری کے دو حصّے ہوسکتے ہیں۔ ایک مادی اشیاء کا بیان جس کو وصف نگاری سے موسوم کیا جاسکتا ہے دوسرا غیر مادی یا فطری اشیاء کا بیان جس کو منظر نگاری کہا جاسکتا ہے۔

یہاں اس امر کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ منظر نگاری کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ منظر نگاری کا اطلاق صرف اُسی شاعری پر نہیں کیا جاسکتا ہے جس میں مناظرِ قدرت کا بیان ہو۔ یعنی ہم منظر نگاری صرف DISCRIPTION OF NATURE کو نہیں کہیں گے بلکہ منظر نگاری اس ساری شاعری کو کہیں گے جس میں فطرت کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں کیا گیا ہو۔ یعنی منظر نگاری کا مطلب TREATMENT OF NATURE ہے۔ چنانچہ مناظرِ قدرت کے بیان کے علاوہ فطرت کے ذی روح ہونے کا تصوّر، فطرت کی انسان سے ہمدردی، فطرت کی انسان سے بے اعتنائی، فطرت کی انسان کی خوشی میں شرکت، فطرت میں انسان کے لئے جذبۂ احترام، فطرت کی انسان کی موجودگی سے رونق، فطرت

---

[1] کاشف الحقائق جلد اول مولوی سید امداد امام اثر صفحہ ۱۷۲ [2] تاریخ زبان اردو۔ رام بابو سکسینہ صفحہ ۲۰۱

[3] تعلیم نمونہ۔ شیخ محمد اکرام صفحہ ۱۵۵

باقی ص پر دیکھئے

فراق گورکھپوری

غزل

کچھ غریبوں کا بھلا کیجئے گا — یا فقط جور و جفا کیجئے گا
آپ اپنے تو ہیں اے حضرتِ دل — لیکن اک روز دغا کیجئے گا
اک زمانے سے ہوں مایوسِ کرم — کچھ مرے حق میں دعا کیجئے گا
میں تو بس اہلِ رضا ہوں کب تک — مجھ سے ناراض رہا کیجئے گا
دلِ بیتاب کو ممکن ہو تو آپ — اپنی اک برقِ ادا کیجئے گا
اپنے وعدے کی طرح مجھ کو بھی — کیا یونہی ٹال دیا کیجئے گا
میں خود اپنی ہی قسم ہو جاؤں — مجھ کو اس طرح فنا کیجئے گا
رُوٹھئے حضرتِ دل اُس سے ضرور — پھر تو تا عمر منا کیجئے گا
بعد میرے مرا افسانۂ غم — مدّتوں آپ سُنا کیجئے گا
دل کو گلزارِ رُخِ رنگیں کا — دامنِ موجِ صبا کیجئے گا
بے تعلق کوئی اتنا بھی نہ ہو — مجھ کو کیا اپنی بلا کیجئے گا
رُخِ روشن پہ یہ گیسو کی لٹک — کُفر کو قبلہ نما کیجئے گا
دل کہ سرشارِ مئے غفلت ہے — اس کو ہشیار ذرا کیجئے گا
انتہا جور و ستم کی مجھ پر — تجھ سے گا بخدا کیجئے گا
چھوٹ کر اُس سے جو ملے اور سے آپ — تب تو آپ اور ادا کیجئے گا
حضرتِ عشق مجھے ہے معلوم — آپ ہر بُت کو خدا کیجئے گا
عشق کو مورد ہر جُرم و قصور — کیجئے گا تو بجا کیجئے گا
دوستوں سے بھی نہیں ملتی آنکھ — کیا مجھے اپنی حیا کیجئے گا
حضرتِ عشق فنا بھی ہو کر — دَرد بن بن کے اُٹھا کیجئے گا
دوستو حال مرا، میرے بعد — اک کہانی سی کہا کیجئے گا
مائلِ لطف و کرم ہے کوئی — نہ خطا کر کے خطا کیجئے گا
خود سری حُسن کی فطرت ہی سہی — کبھی میرا بھی کہا کیجئے گا
وعدۂ دوست پہ یہ بے چینی — وہ نہ آئے گا تو کیا کیجئے گا
ہے پہنچنا جو وہاں تک خود کو — اک فقیرانہ صدا کیجئے گا

کون اپنا ہے زمانے میں فراق
یہ تو سنسار ہے کیا کیجئے گا

میکش اکبر آبادی

غزل

○

زمین و آسماں کوئی نہیں ہے
چلے آؤ یہاں کوئی نہیں ہے

○

سُنا کرتے ہیں ہم یوں سب کی جیسے
ہماری داستاں کوئی نہیں ہے

○

جہاں میں ہوں وہاں تو بھی ہے اے دوست
جہاں تو ہے وہاں کوئی نہیں ہے

○

ہے میرِ کارواں ہر اک یہاں پر
کہ میرِ کارواں کوئی نہیں ہے

○

کہیں بیٹھے تو دل برداشتہ سے
فقیروں کا مکاں کوئی نہیں ہے

○

وہ آئیں گے۔ وہ آتے ہیں۔ وہ آئے
نہیں ہے کوئی۔ ہاں کوئی نہیں ہے

○

جبینِ شوق ہے کعبہ ہو یا دیر
تمہارا آستاں کوئی نہیں ہے

○

بدل جاتا ہے ہر لمحے وہ میکش
مقامِ عاشقاں کوئی نہیں ہے

○

افسانہ:-

قرۃ العین حیدر

ایک رات

میں، فیروز اور نشیت گھر سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے کہ بازار کے موڑ پر ایک ریسٹوران کے سامنے پہنچ کر مجھے شدید چکر آیا۔ میں لڑکھڑا کر فٹ پاتھ پر گر گئی۔ فیروز اور نشیت نے سراسیمہ ہو کر مجھے اٹھانے کی کوشش کی۔ زندگی میں آج تک ایسا نہ ہوا تھا۔ سخت کوفت اور ندگی کے ساتھ میں چند سکنڈ کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ دریچے میں رکھی ہوئی کھانے کی چیزوں کو بڑی آرزو سے دیکھا۔ اور ساتھ ہی گھڑی پر ڈالی۔ نشیت جلدی سے ریسٹوران کے اندر چلے گئے۔

پچھلے دو روز سے میں اپنے کمرے میں دروازے بند کئے پوسٹر کلرز کاغذوں اور اسکیچوں کے انبار میں گھری ہندوستانی طلبا کی امداد ں کے میلے کے لئے پنچ تنتر کی پچیس تصاویر بنانے میں معروف رہی تھی۔ چونکہ گروپ کی چھوٹی موٹی آرٹسٹ میں ہی تھی۔ اس لئے نمائش سے فی چار دن قبل یہ کام بڑی دھوم دھام سے مجھے سونپا گیا تھا۔ جسے میں نے حسب معمول بڑی خود اعتمادی سے فوراً قبول کر لیا تھا۔ "اجی میں ں میں پنچ تنتر کی، کہو تو سارا مہابھارت، سموچی الف لیلہ اسٹریٹ (ILLUSTRATE) کر کے ایک طرف ڈال دوں۔" یہ کہہ کر میں شان نیازی کے ساتھ فوراً کام میں جٹ گئی۔ میلے کی نمائش میں ولنود، مزمدار، آرا، ابراہام اور شاید نیوٹن سوزا بھی اپنی تصاویر رکھ رہے تھے۔ مگر ضرورت مند طلبا کے امدادی فنڈ کے لئے کام کرنے کی دھن کچھ ایسی تھی کہ سب ہی میلے کو کامیاب بنانے میں مصروف تھے۔ اور مجھے بھی یہ قطعی احساس نہ ہوا تھا کہ جب میری تصاویر ولنود مزمدار اور آرا کے شاہکاروں کے پہلو بہ پہلو رکھی جائیں گی تو کس قدر ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ مگر ایک عمر ایسی ہوتی ہے جب اس قسم کی حقیقت پسندی اور جھجک پاس نہیں پھٹکتی۔ اور اگر کسی نے مارے اخلاق کے میرے کارنامے کی تعریف کر دی تو کمسر نفسی سے سر جھکا کے کہا "اجی اپنا تو بس یہی ہے۔"

تو اسی طرح مارے معروفیت کے صرف چار اور توس پر گذارا کر کے لگاتار کام کرتے رہنے کے بعد جب فیروز اور نشیت کے ساتھ ں باہر نکلی تو مجھوں نے آدھ گھنٹہ قبل فون کیا تھا کہ للت دادا کے یہاں ہنگامی میٹنگ ہے اور چند منٹ قبل وہ دونوں میرے ہمراہ للت دادا کے ں چلنے کے لئے آئے تھے، تو چند قدم چل کر ہی بھوک کی وجہ سے میری آنکھوں تلے اندھیرا سا پھیل گیا۔

بگ بن کی سوئیاں تیزی سے آگے سرک رہی تھیں۔ میں کپڑے جھاڑ کر فٹ پاتھ سے اٹھی ہی تھی کہ نشیت سینڈوچز کا ڈبہ ہاتھ ں لئے ریستوران سے نکلے اور ہم لوگ بھاگم بھاگ للت دادا کے گھر پہنچے۔

للت دادا جو بیرسٹری پڑھ رہے تھے لندن مجلس کے ایک سرگرم رکن تھے اور حالانکہ ہندوستان اور پاکستان دو مختلف اور متخالف ں جن چکے تھے مگر پاکستان کے ترقی پسند طلبا بھی لندن مجلس کی سرگرمیوں میں شامل رہتے تھے اور مجلس کا کوئی کلچرل پروگرام یا ئی سنگیت محفل خصوصاً مشرقی پاکستان کے لڑکوں اور لڑکیوں کی شمولیت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔ سیاست نے جو بھائی بندیاں ں ائی تھیں وہی دیواریں گرتی بھی جا رہی تھیں۔ اُس وقت للت دادا کے فلیٹ میں ہمارے بہت سے ساتھی جمع ہو چکے تھے۔ اندھیرے ملانگ کے اُس پار جولیس اور ایتھل روزن برگ کی سزائے موت کی اپیل مسترد کر دی گئی تھی دنیا کو یقین تھا کہ وہ دونوں

بے گناہ ہیں۔ مگر امریکن پریذیڈنٹ نے پنڈت ہنرو۔ چرچل اور دوسرے دانشوروں اور عالمی بیتاؤں کی رحم کی درخواست بھی سنی اَن سُنی کر دی تھی۔ چند گھنٹوں بعد صبح کے چار بجے نیویارک کی سنگ سنگ جیل میں ان میاں بیوی کو بجلی کی کرسی پر بٹھایا جانے والا تھا۔ اور اب اس وقت طلبا کی ہاتھ لندن کے شہریوں کے جلوس کے ساتھ ڈاؤننگ اسٹریٹ جانے کے لئے تیار تھیں۔ تاکہ چرچل سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ آئزن ہاور سے فوری اپیل کریں کہ یہ سزا منسوخ کروائیں۔ جب ہم للت دا کے کمرے میں داخل ہوئے تو پاکستان کا ایک جوشیلا اسٹوڈنٹ لیڈر ایک میز پر چڑھ کر شعلہ بار تقریر کر رہا تھا۔ "ساتھیو۔ ہم آج دنیا کو دکھا دیں گے کہ برطانوی چالبازیوں کے باوجود پاکستان اور ہندوستان متحد ہو کر اپنے مشترکہ دشمنوں پر فتح ثابت کر سکتے ہیں کہ"۔ دوسری طرف ڈھاکہ اور کلکتہ کے چند لڑکوں اور لڑکیوں نے نذرِ اسلام کا ایک جوشیلا گیت شروع کر دیا اور ہم سب تیز تیز قدم رکھتے ٹریفلگر اسکوایئر روانہ ہو گئے جہاں انگریز مردوں اور عورتوں کا ایک زبردست اور منظم جلوس نمبر ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ جلوس خاموشی کے ساتھ ویسٹ منسٹر کی طرف بڑھنے لگا۔ لندن پولیس کا بڑا بھاری جتھہ جلوس کے ہمراہ چل رہا تھا۔ ہم لوگ راستے پر ذرا آگے بڑھے تھے جب اطلاع ملی کہ چرچل اپنے کنزرویٹو ہاؤس چلے گئے ہیں۔ اب جلوس نے ادکسفرڈ سرکس کا رخ کیا۔ انگریز قطار اندر قطار چوراہے کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے مگر ہندوستانیوں اور پاکستانیوں نے عین چوراہے کے وسط میں دھرنا دیدیا۔ گو سارجنٹ پولیس نے ہمیں اٹھانے کی ناکام کوشش کی بڑا خطرناک وقت تھا کیونکہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہم لوگ آنافاناً ہی کچلے جا سکتے تھے۔ مگر ان انوکھے ستیہ گرہیوں نے اطمینان کے ساتھ "جن گن من" شروع کر دیا۔ یہ گاندھی کے دیس والے ہیں۔ انہیں کون اٹھا سکتا ہے۔ کسی ہندو انگریز نے للکار کر ایک کانسٹیبل سے کہا۔ ادکسفرڈ سرکس میں آدھ گھنٹے تک دھرنا دینے کے بعد ہم لوگ ہائیڈ پارک روانہ ہوئے۔ جلوس جب پکیڈلی سرکس پہنچا تو راہ گیروں میں سے کچھ تماشائیوں میں سے چند نے چلا کر کہا "ارے سرخے۔ برن کرائسس کے موقع پر کیا تمہاری نانی مر گئی تھی؟" (انگریزی محاورے کا مفہوم تقریباً یہی تھا)۔ "اس وقت احتجاج کیوں نہیں کیا؟" (حالانکہ اس جلوس میں "سرخے" بہت کم تھے۔ ہزاروں کا یہ پرسکون احتجاجی ہجوم لندن کے عام شہریوں پر مشتمل تھا۔ اچانک پولیس کی سرچ لائٹ سے آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اخبار والوں نے فلیش تصویریں لینی شروع کیں ایک فلیش بلب عین میرے چہرے پر آ کر چمکا۔

"تم ایک طرف کو چھپ جاؤ۔" میرے قریب کھڑے ایک سناسا نے کہا (میں ان دنوں ایک ٹوری (Tory) اخبار میں کام کر رہی تھی)۔ یہ شناسا لاہور سے آئے ہوئے تھے۔ اور یونیورسٹی میں فزکس کی ریسرچ کر رہے تھے۔ اور بہت سنجیدہ اور متین انسان تھے۔

"واہ کیوں چھپ جاؤں۔ واہ۔ واہ۔" میں نے غصے سے جواب دیا۔

"ملازمت جائے گی ایک دن۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ اور آگے بڑھ گئے۔

ہم پکیڈلی سرکس سے نکلے ہی تھے کہ للت دا نے مائیکروفون ہاتھ میں لے کر اطلاع دی کہ آخری اپیل بھی مسترد کر دی گئی۔ دونوں کو صبح پانچ بجے سے جلوس پر ہولناک سناٹا طاری ہو گیا۔ جس میں چند عورتوں کی دبی دبی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ مجھ سے ذرا دور ایک بوڑھا انگریز جھک کر اپنی بیوی کو دلاسا دے رہا تھا۔ اور وہ رو رو کر دہرا رہی تھی "مگر تام۔ ان کے دو بچے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے۔"

اتنے میں ایک انگریز نے مائیکروفون پر کہا "آیئے۔ ہم سب ہائیڈ پارک میں رات بھر بیٹھ کر دعا کریں۔"

جلوس اسی خاموشی کے ساتھ ہائیڈ پارک کی سمت بڑھنے لگا۔

میرے ہمراہ چلتا ہوا ایک بوڑھا انگریز پروٹسٹنٹ پادری آہستہ آہستہ انجیل مقدس کے عہد نامۂ قدیم کا تینتیسواں (۳۳) زبور داؤدی پڑھ رہا تھا۔ "خداوند خدا میرا اگڈریا ہے۔ مجھے کوئی ڈر نہیں۔ وہ مجھے ہری چراگاہوں میں آرام کراتا ہے۔ وہ مجھے خاموش پانیوں کے کنارے لے جاتا ہے۔ اور۔ گو میں موت کے سائے کی وادی میں سے گذر رہا ہوں، مجھے کسی خطرے اور بدی کا خوف نہیں۔"

راستہ طے کرتے ہوئے بیچ بیچ سے انگریز مرد اور عورتیں کیتھولک زائرین کی مانند چند قدم چلنے کے بعد دو زانوں جھک کر دعا مانگتے اور پھر چلنا شروع کر دیتے۔ ایک انگریز عورت رومن کیتھولک عورت تسبیح انگلیوں سے لپٹے ہاتھ جوڑے متواتر زیر لب دعائیں پڑھ رہی تھی۔

ایک بیوی کی بانہ نے آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔
جلوس مرجھاتے روانہ ہوا۔ شہر کی جگمگ برقی روشنیاں ہلکے سے کہرے میں جھلملا رہی تھیں۔ اب رات کے دس بج چکے تھے۔
"اپیل مسترد ہو گئی۔" ایک ساتھی نے میرے قریب آکر کہا۔
پنڈت جی۔ "میں نے اطمینان سے جواب دیا۔
دنیا میں روشنی کا مینار ابھی موجود ہے۔ پنڈت جی کی آخری درخواست کو رد نہیں کیا جائے گا۔
ہندو۔ ہندو۔ ہندو۔ ہجوم میں بھنبھناہٹ کی پھیلی اور اطمینان اور امید کی لہر سی سارے میں دوڑ گئی۔

لیکن پنڈت جی آج ہی لندن سے یورپ روانہ ہو چکے تھے۔ دو روز قبل انہوں نے اوسٹرلی کے ایک پرفضا باغ میں ہمارے ایک مجمع کو خطاب کیا تھا۔ بڑی شگفتہ سنہری دھوپ سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ چاروں طرف پھول ہی پھول تھے۔
نوجوانوں کے مجمع میں پنڈت جی خود بھی جوان اور بیحد مسرور نظر آتے تھے۔
وہ بکنگھم پیلس سے بلاوا آیا تھا۔ ملکہ کا ذکر کرتے ہوئے (جس کی تاجپوشی حال ہی میں ہوئی تھی) انہوں نے ایام کے متعلق ایک اردو شعر پڑھا، اور مسکرا کر کہنے لگے۔
"تم لوگوں کی طرح جب میں نے بھی اپنی جوانی کے چند سال کیمبرج اور لندن کی گلیوں میں بتائے۔"
"پنڈت جی۔" ہم لوگ چلائے۔ "اپنی جوانی کے کچھ قصے سنائیے۔"
ہم سب اور خود پنڈت جی بھی ساتھ کس قدر خوش تھے اور ہم سب کے ساتھ کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ سعیدہ نے کہا

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

"ارے بھئی۔ ایسی بددعا تو مت دو۔ اتنی لمبی عمر تو مصیبت ہو جائے گی۔" انہوں نے ہنس کر جواب دیا۔
پھر انہوں نے سنجیدگی سے تقریر شروع کی۔ مجمع کو لاؤڈ سپیکر خاصا تھا۔ ہم لوگوں نے کسی سیاسی نکتے پر ان سے جرح شروع کی تو انہوں نے کہا۔ "آپ لوگ بات مجھے بیوقوف طرح طرح کے فقرے اٹھاتے ہیں۔"
"پنڈت جی فقرے لگائے جاتے ہیں۔ اٹھائے نہیں جاتے۔" ایک لڑکے نے مجمع میں سے پکار کر کہا۔ پنڈت جی نے اس پر شفقت سے نظر کی اور مسکرا دیئے۔ تقریر کے دوران میں انہوں نے کہا۔
"ایک دفعہ میں نے یورپ کے کسی لوفر سے پوچھا۔"
"ایک دفعہ۔" ملیگڈھر یونیورسٹی سے آئی ہوئی ایک لڑکی نے مجھ سے چپکے کہا۔ "پنڈت جی کس قدر کملی زبان بولتے ہیں۔ گنگا اور جمنا پانیوں میں دھلی ہوئی زبان۔"
"ابھی بڑی شاد و نرم ہے پنڈت جی میں۔ جب دیکھو تب یورپ کا ذکر۔" ایک لڑکے نے ہنس کر آہستہ سے مجھ سے کہا۔ ہم لوگ واقعی کس قدر مسرور تھے اس وقت ہمارا باپ ہمارے سر پر موجود ہے۔ دنیا کے حالات کتنے ہی بگڑ جائیں باپ کا سایہ سروں پر تھا۔
دوسرے روز لندن مجلس کا "طائفہ" لندن کے ایک بڑے ہال میں (غالباً کاکسٹن ہال مجھے اچھی طرح یاد نہیں)
پنڈت جی کے سواگت میں گانے بجانے کے لئے مستعد کھڑا تھا۔ پنڈت جی وہاں کسی برطانوی کمیٹی کی طرف سے مدعو کئے گئے تھے جلسے صدارت لارڈ پیتھک لارنس کر رہے تھے اور ضعیفی کی وجہ سے بیحد جھکے ہوئے بیٹھے تھے۔ پنڈت جی نے تقریر کے دوران میں کہا۔
"ہندوستان جاگ اٹھا ہے۔" لارڈ پیتھک لارنس کا سر اور جھک گیا۔
"سارا ایشیا جاگ اٹھا ہے۔" لارڈ پیتھک لارنس کا سر اور زیادہ جھک گیا۔
"سارا فرقہ جاگ اٹھا ہے۔" لارڈ پیتھک لارنس میز کے پیچھے بیٹھے بیٹھے نظروں سے تقریباً اوجھل ہو گئے۔

میرے قریب کھڑے ہوئے ایک لڑکے نے چپکے سے کہا۔ پنڈت جی کے الفاظ کا لارڈ ہیتھ لارنس نے کس قدر ڈرامائی طریقے سے ساتھ دیا ہے۔ پنڈت جی کی تقریر جاری رہی۔

"ملہوتہ، وہی گھسی پٹی جیوپولیٹکس (Geopolitics) اچھے خاصے بورژوازی کے ایجنٹ ہیں) میرے پیچھے کھڑے ہوئے ایک لڑکے نے آہستہ سے اظہار خیال کیا۔ یہ لڑکا رندھیر سے پیرتیدکے۔" جہاں گیر ہے چیانگ کائی۔ وہیں جائے گا ہرو بھائی" کے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ اظہار خیال کرنے کے بعد وہ بورژوازی کے اس ایجنٹ کی تقریر سے محظوظ ہوکر سنتا رہا۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد جب پنڈت جی کنگز لے مارٹن ویزل کے نرغے سے نکلے تو حسب معمول ہم لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور کسی طرح ان کو گاڑی تک پہنچنے نہ دیا۔ "ارے بھئی" وہ ہنس ہنس کر کہتے رہے۔ مجھے جانے دو دیر ہو جائے گی۔ حالانکہ صاف ظاہر تھا کہ ان کا خود دل چاہ رہا تھا کہ ہم لوگوں کے ساتھ چند منٹ اور ٹھہریں۔ لیکن ساری دنیا اس وقت بین الاقوامی سیاست کے کسی اہم فیصلے کے متعلق اُن کے مشورے اور رائے کی بیتابی سے منتظر تھی اور انہیں فوراً ہی اس اہم کانفرنس کے لئے جانا تھا۔

دوسرے روز وہ لندن سے جا رہے تھے۔

دنیا کو ہر ائسیس سے بچانے والے کا نام سنکر اُس وقت مجمع نے اطمینان کا سانس لیا۔ روزن برگز بھی بچ جائیں گے۔ ان کی موت میں صرف پانچ گھنٹے رہ گئے ہیں۔ مگر یقیناً بچ جائیں گے۔

"چلو جمال کو فون کر کے پوچھیں کہ پنڈت جی کو یورپ میں کہاں Contact کیا جائے۔" میں نے ریش سے کہا۔ میں ریش اور فیروز فوراً ایک عمارت میں پہنچے انڈیا ہاؤس کے پبلک ریلیشنز آفیسر کو فون کیا۔ معلوم ہوا جمال بھی جینوا میں ہیں اور پنڈت جی کا ہوائی جہاز جینوا سے روانہ ہو چکا ہے۔ چپ چاپ سے ہائیڈ پارک واپس چلے گئے۔

مجمع کا لحاس پر بکھر کر دجل شروع کر چکا تھا۔ رات بھیگ چلی تھی ساری دنیا سکون کے ساتھ سونے والی تھی۔ میں لکھنؤ سے آئی ہوئی معاشیات کی [illegible] فیروز، جو لندن میں یونیورسٹی میں رتن ناتھ سرشار پر ریسرچ کر رہی تھی اور ایک انگریز لڑکی ایلین جو سعیدہ کی ہم جماعت تھی ایک لیمپ کے پاس گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہمیں دیکھ کر لاہور سے آئے ہوئے فزکس اسکالر بھی ہمارے پاس آ بیٹھے۔ سب خاموش تھے۔ یک لخت مجلس والوں کے گروہ نے گانا شروع کر دیا۔

بنا بھر سے ایک ہوئے نوجوان، ایک آدرش نہاں لئے خطرہ ہو بلیدان کا پھر بھی ہم لائیں گے سکھ چین

[illegible] ڈھاکے اور کلکتے کی لڑکیاں اور لڑکے اس گیت کو اٹھا رہے تھے۔

"مجھے بجلی کا جھٹکا لگے گا تو کیا ہوگا۔" ایلین نے آہستہ سے جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

"ہم امریکہ میں رہیں اور ہم جاپان میں۔ ہم ہندوستان میں ہیں اور پاکستان میں ہم موت پر ہنسنے والے سب ایک ہیں۔ ایک ہیں۔" مجلس والے گا رہے تھے۔

پھر بھی ہم لائیں گے سکھ چین!" فزکس اسکالر نے دہرایا۔ "سکھ چین!" ——— سب الفاظ کی چمک پھیریاں ہیں۔ سیاست کے اٹل حقائق پر شاعروں کے تخیلات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔" فزکس اسکالر نے آہستہ سے کہا۔ پھر وہ اداسی سے سعیدہ کی طرف مڑے۔ "آپ نہیں گا رہی ہیں سعیدہ بیگم؟" انہوں نے دریافت کیا۔

"جی نہیں" سعیدہ نے گھٹنوں میں سر دئے دئے جواب دیا۔

میری، فیروز اور سعیدہ وغیرہ کی ایک قبیح عادت تھی کہ اکثر لندن کی سڑکوں پر چلتے چلتے، ٹیوب میں، یا بسوں کی دوسری منزل پر بیٹھ کر ہم لوگ خوب گاتے تھے۔ "سورج ڈوب گیا" اور "منزل کی طرف دو گام بڑھو اور سامنے منزل آ جائے گی" اور "کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر، کبھی غنچہ و گل و خار پر۔ میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر" اور "پیا ملن کو جانا" تھی میں رہے وہ جی سیمیں تن ساجنا"

جب ٹیوب یا بس میں بیٹھے ہوئے سنجیدہ انگریز ہمیں غور سے دیکھتے تو سعیدہ دکن کے کرخنداروں والے لہجے میں کہتی۔ اور چڑاؤ سالوں کو۔ اور کوئی نہ کوئی قوالی شروع کر دیتی۔ ویسے میں اور سعیدہ خود کو نیو تھیٹرز کے پرانے گیتوں کا ایکسپرٹ مانتے تھے۔ ہم نے شروع ہی سے فرض کیا تھا کہ ایک عمر ایسی ہوتی ہے جس میں اسی قسم کی باتیں زندگی کا حاصل معلوم ہوتی ہیں۔

تو اس وقت دفعتہً ایک درخت کے نیچے تقریر کرتے ہوئے للت دا، پاریوں راہیوں، اور عورتوں کی دعاؤں کی بجائے ہم گنگناہٹ اور اس عظیم الشان ہجوم کی لرزہ خیز خاموشی کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے میں نے کوئی مزید لہو بات سوچنے کی کوشش کی۔ "ارے صاحب" میں نے فرنسس اسکالر سے کہا۔

"آپ کبھی سعیدہ سے سڑک پر چلتے ہوئے گانا سنیئے۔"

"سڑک پر؟۔ یعنی آپ لوگ سڑکوں پر گاتی ہیں؟" انہوں نے بھونچکے ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"سیٹی بھی بجاتی ہوں گی؟"

"جی نہیں۔ مگر سنیئے تو۔ ایک مرتبہ کیا ہوا کہ یہ سعیدہ جو ہے یہ لیک لیک کر گا رہی تھی دنیا ہمارے پیار کی ہمدم جواں رہے۔" میں بھی ہم رہوں سارے میں اسکی بجائے دنیا تو سچی مچی جوانی آئی ہوئی تھیں کمرے میں آگئیں۔ تو سعیدہ نے ترنت گانا یوں ختم کیا۔ میں بھی وہیں رہوں میری مچی جہاں رہیں

ہا ہا ہا" دات نان سنس آئی ایم تاکنگ۔ میں نے دل میں کہا اور سر جھکا کر گھاس کا ایک تنکا توڑا۔

خوشگوار۔ مناظر، زندگی کے سہانے دقفوں پر انے گیتوں اور مانوس چہروں کا ایک جلوس میرے ذہن میں منڈلا رہا ہے۔ مسرت کی تلاش مسرت کی تکمیل۔ ذہنی عذاب۔ دکھ۔ بے انصافیاں۔

مری مراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں میں اپنی تسبیح پہ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

سرد گھاس فولاد کی کرسی کی طرح یخ ہے۔ ابھی اس میں گرنٹ نہیں آیا۔ چاند کے نیچے مجیٹھ دھند میں لپٹا ساکت بیٹھا ہے۔ اونچے درختوں کی سیاہ صلیبیں سارے میں گڑی ہیں۔ سعیدہ اب آہستہ آہستہ گنگنا رہی ہے۔ وہ کیا جانے پریت جو ہرنے سے گھبرائے۔

سرینائی جھیل پر بطخیں پروں میں سر چھپا کر کب کی سو چکیں۔ کہرہ اب میری ناک اور حلق میں گھس رہا ہے۔ صبح کے ڈھائی بج چکے ہیں۔ نیویارک سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔ میں سردی سے کانپ رہی ہوں۔

"صبح تک یہیں بیٹھیں تو مر جاؤ گی نمونیہ لے۔ گھر جاؤ۔" ڈیوز نے کہا۔

"اچھا" میں نے جواب دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پارک کی گھاس پر بیٹھے ہزارہا چپ چاپ انسانوں پر ایک نظر ڈالی اور سنسان بھیس پتھر کے شہر میں سے گذرتی (یہ بھیس پتھر کا شہر۔؟ جس کے ہزارہا باسی سرد آسمان کے نیچے میٹھے دو ایسے اجنبیوں کی آنے والی موت کا سوگ منا رہے تھے جن کو انہوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا؟) میں اپنے گھر پہنچی۔ اور کمرے کا دروازہ کھول کر پلنگ پر جا گری۔

صبح چھ بجے ٹرینہ کی گھنٹی بجی میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا ایلین اندر آئی اور آتشدان کے سامنے بیٹھ کر آہستہ آہستہ اپنے اوورکوٹ پر چپکی ہوئی گھاس کی پتیاں ہٹانے لگی۔ میرے سامنے فرش پر کل کی بنائی ہوئی پنچ تنتر کی کہانی کی وہ تصویر فرش پر پڑی تھی جس میں ایک ہرے بھرے باغ میں ایک خوبصورت جھونپڑے کی دہلیز پر ایک جوان عورت بچہ گود میں لیے بیٹھی تھی۔ دوسرا لڑکا سامنے کھیل رہا تھا۔ عورت کا شوہر اپنے کنبے کو دیکھ کر خوشی سے مسکرا رہا تھا۔ ابھی اس درخت کی پتیاں بنانا باقی ہیں۔ جیسی راستے کے اسٹائل میں۔ میں نے آنکھیں ملکر کوفت کے ساتھ سوچا پھر میں نے ایلین پر نظر ڈالی۔

"کیا ہوا ایلین۔؟" میں نے پوچھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا۔ ایلین نے خاموشی سے چائے کی کیتلی چولہے پر رکھی اور باورچی خانے میں چلی گئی۔

"اگر ہم۔ اگر ہم پنڈت جی کو کسی طرح پکڑ پاتے۔ تو شاید۔ بلکہ یقیناً۔" میں نے کہنا چاہا مگر آواز میرے حلق میں اٹک گئی۔ ایلین نے باورچی خانے

خلیل الرحمٰن اعظمی

بیداریٔ ہند

اِس گنبدِ نیلگوں کے نیچے
ہر روز خلا کی وسعتوں میں
رتھ پر اپنے سوار ہو کر
سورج آتا ہے اور زمیں کے
چہرے کے نقوش ہیں اُبھرتے

کرنوں میں نہا کے ہیں نکھرتے
اصنامِ حسیں، جنھیں اجنتا
صدیوں سے ہے گود میں چھپائے
پڑتی ہے یہی شعاعِ رنگیں
سانچی کے عظیم معبدوں پر
رُکتی ہے کنارکا کے اُوپر
لیتے ہیں جہاں پہ سانس اب بھی
بن بن کے بُتانِ ماہ پیکر
ریتیلی زمیں پہ سرد پتھر
ہے دیکھتی چشمِ مرمریں سے
گرتے ہوئے اشکِ شبنمیں کو
ٹکراتی ہیں گاہ یہ ضیائیں
مینا روں سے اس مناکشی کے
اُڑتی ہوئی بدلیاں جہاں پر
پھیلائے ہوئے پروں کو اپنے
ڈوبی ہوئی کہر میں پڑی ہیں

مٹنے کی نہیں یہ شان و شوکت
بے مثل یہ پاک سرزمیں ہے
اِس سازِ سکوت میں فسوں ہے
بیداریٔ رُوح یہ سکوں ہے
اُڑتا ہے ہوا میں آج دیکھو
آزادیٔ ہند کا پھریرا
پھر ابرِ کرم اُٹھا ہے ہر سُو
بھر جائیں گے کوہ و دشت و دریا
پیاسا نہ رہے گا آج کوئی
جی بھر کے پیے گی آج جنتا
منزل کی طرف چلو رفیقو!
ہر ذرّہ ہے یہ پیام دیتا

ہاں آگے بڑھے چلو عزیزو!
جس سمت نوائے زندگی ہو
جس سمت کہ امن و شانتی ہو
یکجہتی و آشتی ہو جس جا
ہر اک کو نصیب سرخوشی ہو
جنت کا رہے نہ ہم کو ارماں
دھرتی اتنی بدل گئی ہو
قصہ نہ ہو رام راج کوئی
آنکھ اپنی اب اس کو دیکھتی ہو
آشا کے کھلے ہوں پھول ہر سُو
ہر سمت بسنت آ گئی ہو
ہر رنج کو ہم بھلا چکے ہوں
دُکھ کی تصویر مٹ چلی ہو

آؤ سُنو گیت اب خوشی کے
دامودر اور مہاندی کے
رقصاں ہے صدائے برق و فولاد
ویرانے بھی ہو رہے ہیں آباد
پنجاب ہو یا کہ آندھرا ہو
دُرگاپور ہو کہ ہو بھلائی
ہر سمت مشین گا رہی ہے
آیا اب عہدِ آہنی ہے
دوشیزۂ کوہسار بھی اب
دلہن کی طرح سے سج رہی ہے

ما تھے پہ چمک رہا ہے جھومر
سیج پُج کی کوئی یہ لکشمی ہے
لب پر نہیں کوئی آہ و فریاد
اب غم کی بساط اُٹھ رہی ہے

قدموں میں ہے اپنے فتح و نصرت
ہر لحظہ ہے جشن عہدِ نو کا
لہراتی ہیں نیلسری کی تانیں
آنکھوں میں بسا ہے پھر کنھیا
اغیار کا حال اب زبوں ہے
جو اپنا عدو ہے سرنگوں ہے
جاگو، جاگو، مرے رفیقو!
سورج نکلا ہے اُس کی کرنیں
اپنی رُوحوں میں آج بھر لو
ہاتھوں میں اب اپنے جام اُٹھاؤ
اِس جام میں حُریت کی مے ہے
جی بھر کے اُچھالو اور پی لو
یہ کیسی ہوائیں چل رہی ہیں
اب دُور نہیں وہ لمحۂ عیش
ویرانوں کے بھاگ پھر کھلیں گے
ٹپ ٹپ ٹپکیں گی رس کی بُوندیں
برکھا امرت کی خوب ہوگی

(ایک اُڑیا نظم کا آزاد ترجمہ)

مقالہ:-

زرینہ ثانی

سیماب کے ہیئتی تجربے

ہیئت اور اسالیب کے تجربوں کی روایت بھی اُردو نظم کی روایتوں کے ساتھ ہی شروع ہوئی ہے۔ ابتدا میں حالی آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی کے یہاں اُردو شاعری میں ہیئت کی تبدیلی کی ایک غیر شعوری کوشش ملتی ہے۔ اسی لئے یہ کوششیں باقاعدہ رجحان نہ بن سکیں بلکہ کوششیں ناکام ہی رہیں۔ وہی ردیف اور قافیے کی پابندی، وہی بندسے کے عروضی اصول، وہی کہنہ اور روایتی طرز ادا، جنھیں ہم نے قدیموں کا پُرانا ورثہ سمجھ کر سینے سے لگا رکھا تھا خوش آہنگ اور بھلے معلوم ہوتے رہے۔ لیکن تا کے؟ انسانی ذوق کسی ایک چیز سے ہمیشہ مطمئن نہیں رہ سکتا۔ زمانے میں تغیر ہی کو ثبات ہے۔ رفتہ رفتہ روایت کے یہ بُت ٹوٹنے لگے اور ہمارے ذہن مغربی اثرات کو قبول کرنے کے قابل ہوتے گئے۔ اسالیب اور ہیئت میں بھی مغربی ہیئت کا تصور اثر انداز ہوتا گیا اور آہستہ آہستہ اسالیب اُردو بدلتے گئے۔ کہیں سانٹ SONET کی شکل میں۔ کبھی عروضی ارکان کی ترتیب بدل کر۔ کبھی شعروں کی شکل میں خفیف سا تغیر پیدا کر کے۔ ہیئت کی تبدیلی کے لئے بحروں میں نت نئے تجربے کئے گئے جو کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس قسم کے تجربے، جوش، سیماب، اختر شیرانی۔ عظمت اللہ خاں۔ حامد اللہ افسر، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی وغیرہ کے یہاں ملتے ہیں۔ یہ تجربے اکثر و بیشتر کامیاب۔ رہے ہیں۔ تجربات کی یہ دُنیا محدود نہیں تھی۔ بلکہ دورِ جدید میں بھی ن۔م راشد۔ فیض۔ میراجی۔ سلام مچھلی شہری وغیرہ کے تجربات سے اُردو نظم کی نئی نئی ہیئتوں میں اضافہ ہوتا رہا۔

سیماب کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ سیماب نے ہیئتی تجربے بہ نسبت دُوسرے شعراء کے کہیں زیادہ کئے۔ اور اُردو شاعری میں تجربے کی روایت کو کافی آگے بڑھا کر اس میں گراں قدر اضافے کئے۔

عبدالقادر سروری لکھتے ہیں "اسالیب[1] کے اختراع اور تنوع کی مثالیں جو جدید دور کا حصہ ہیں جیسی سیماب کے پاس نظر آتی ہیں دُوسرے شعراء کے پاس کم نظر آئیں گی۔" سیماب نے نہ صرف نئی روایتوں کو جنم دیا بلکہ پُرانی روایتوں میں بھی کہیں تغیر اور تشکیل کی اور کہیں تخریبی روش اختیار کی۔ اصطلاحیں وہی استعمال کی گئیں جو اُردو شاعری کی روایت میں رچ بس گئی تھیں۔ مگر مفاہیم میں یک گونہ تبدیلی نظر آتی ہے۔ اُن کے ہیئتی تجربوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ مواد MATTER اور ہیئت FORM میں ہم آہنگی ملتی ہے جہاں شدت اور جوش کی کیفیت کا اظہار ہے، وہاں بحروں کے ارکان اور بندش سے جو ہیئت اختیار کی گئی ہے وہ بے حد رواں دواں ہے

زندہ دلانِ وطن ہیں دل و جانِ وطن
لاکھ پہ بھاری ہے آج ایک جوانِ وطن

---

[1] جدید اُردو شاعری۔

اہلِ وطن سے بڑھی خفتہ و شانِ وطن
یہ ہیں دماغِ وطن کا یہ ہیں زبانِ وطن

زندہ باد

اضطراب زندہ باد! انقلاب زندہ باد!

اس چھوٹی سی بحر کی نظم میں خیالات اور جذبات کی جو شدت دکھائی گئی ہے اُس سے قاری کا دماغ بے ساختہ متاثر ہوتا ہے۔ یا شعروں کے بعد "زندہ باد" کا ٹکڑا مفہوم کی وضاحت میں مدد دیتا ہے۔ اس کے بعد اضطراب زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد ایک خیالی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ہیئت کے نت نئے تجربے سے مفہوم کو واضح تر اور موثر بنا دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے تجربے بیش بہا ہیں۔ "جنگی ترانے" میں اسالیب کے تجربے میں دوسری انوکھی جدت ہے۔

دلاورانِ تیز دم بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ محترم بڑھے چلو، بڑھے چلو
تم اقتدارِ قوم ہو امینِ کارِ قوم ہو
نگاہ دارِ قوم ہو تمہیں وقارِ قوم ہو

وقارِ قوم کی قسم

بڑھے چلو بڑھے چلو دلاورانِ ...!

پہلے مصرع کے "دلاورانِ تیز دم" کو آخر میں بطور مخاطب لاکر بڑی جدت پیدا کی گئی ہے۔

"ہم ہندوستانی ہیں" میں قافیے سے روانی پیدا کی گئی ہے۔ بحر میں تصرف اور اُس کے ارکان میں جو تبدیلی نظر آتی ہے کہ مکمل بحر کی بجائے اُس کے کچھ ارکان کو آخر میں استعمال کیا گیا ہے ؎

زنگی ہیں نہ ایرانی نہ رومی و کیانی ہیں — کہ ہم ہندوستانی ہیں
ہمارا دیس ہے ہند اور ہم اُس کی نشانی ہیں — کہ ہم ہندوستانی ہیں

"کہ ہم ہندوستانی ہیں" ٹیپ کے مصرعہ کی طرح ہر دوسرے شعر میں بار بار آتا ہے اور اس کی گونج کافی دیر تک فضا میں محسوس ہوتی ہے۔

کہیں مکمل بحر کو لے کر کچھ تصرف کے ذریعے نئے نئے پیکر تراشے ہیں۔ جیسے "جرسِ کارواں" میں۔

"یومِ آزادی خمسہ ہے۔ لیکن اس میں تھوڑا سا اضافہ ہے۔ یعنی آخر میں ایک مصرعہ "کہاں ہے یومِ آزادی" بڑھا دیا گیا ہے جس سے صوتی ترنم میں اضافہ ہو کر یہ اور اثر آفریں بن گیا ہے۔ اس قسم کی نظمیں "اے جوانانِ وطن اے اسیرانِ وطن"۔ "جاگ اے ہندوستان ..." "کاروان کی پکار" "منزل قریب ہے" وغیرہ ہیں۔

"کوسِ رحیل" میں بڑی بحروں کے ساتھ مصرعوں کی ترکیبوں میں تبدیلی ہے اور ترنم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک نیا تجربہ کیا گیا ہے۔ دونوں مصرعوں کا وزن یکساں ہے اور اس میں ایک چھوٹے سے حصہ کا اضافہ ہے۔ نظم بطور مستزاد شروع کی گئی ہے ؎

رہبرِ کی ضرورت نہیں سامانِ سفر باندھ — اُٹھ اور کمر باندھ
اب منزلیں اپنی نہ اِدھر اور اُدھر باندھ — اُٹھ اور کمر باندھ

اس کے بعد یہ جدت ہے کہ چھوٹی بحر میں استعمال کی گئی ہیں اور چار مصرعے ہم قافیہ ہیں۔ اس کے بعد ایک مصرع بڑی بحر میں جو پہلے کا ہم قافیہ ہے۔

کمزور ہے رفتار ہیں راستے پُرخار

کوئی نہیں غم خوار رہبر ہے نہ سالار
اندیشۂ بے کار نہ اے شعبدہ گر باندھ
اور اس کے بعد ——— اُٹھ اور کمر باندھ

کہکر بات مکمل کر دی گئی ہے۔ یہاں موسیقی کا زیر و بم پیدا ہوتا ہے اور لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اسالیب کی تبدیلی سے پتہ چلتا ہے کہ شاعری صرف عروضی قواعد کی پابند ہو کر بلند نہیں ہو سکتی بلکہ ذہنی اور ذوقی لحاظ سے بھی بلند ہو سکتی ہے۔ شاعر کی موسیقی اُسے مختلف النوع رُوپ عطا کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیماب کا ذوقِ موسیقی بڑا ہی تربیت یافتہ اور نکھرا ہوا تھا جس نے اُن کے یہاں نئے نئے ہیئتی تجربوں کو جنم دیا۔ ساتھ ہی ساتھ ترنم اور غنائیت بھی پیدا ہوتی گئی ہے۔ "اختلاف" میں ایک نیا انداز ہے۔ ترکیب الفاظ اور بحر مفہوم سے ہم آہنگ ہو کر دماغ پر عجب سی کیفیت طاری کر دیتی ہے:۔

اختلاف ۔ اے اختلاف

ہر سخن پرور ہے اپنی بات پر اٹکا ہوا
ہر طرف طوفانِ خودداری کا ہے پھیلا ہوا
آج ہر ذہن اک غلط فہمی میں ہے اُلجھا ہوا
ہے مگر کس کو غلط فہمی کا اپنی اعتراف
اختلاف

اختلاف ۔ اے اختلاف

نوحۂ وطن ۔ بلائے انتخاب ۔ خواتین سے خطاب وغیرہ میں بھی ہیئت کے نرالے ڈھنگ سے کامیاب تجربے کئے گئے ہیں۔ سیماب نے تھوڑے تھوڑے فرق اور تقرف سے نئی ہیئت کی تخلیق کی ہے۔ جیسے "میں عید کیا مناؤں" میں تین مصرعے ہم قافیہ ہیں، چوتھے کا قافیہ علیحدہ ہے۔ پھر مصرعے میں تصرف کر کے اُس تصرف شدہ کو بھی چوتھے کا ہم قافیہ بنا دیا گیا ہے۔ جیسے:۔

تخریب کی گھٹائیں گھنگھور چھا رہی ہیں
سنکی ہوئی ہوائیں طوفاں اٹھا رہی ہیں
ناخواستہ بلائیں دنیا پہ آ رہی ہیں
ایسی سبا ہی میں کیا لطفِ عید اُٹھاؤں
میں عید کیا مناؤں!

"منزل قریب تر ہے" اور "اے اسیرانِ وطن" میں تھوڑا سا فرق ہے۔ چار مصرعے ہم قافیہ۔ پانچواں علیحدہ اور اُس کا تصرف شدہ مصرعہ اس کا ہم قافیہ ہے۔ "ہادیت" میں جو اسلوبی اور ہیئتی طرز ہے وہ دوسری نظموں سے جُدا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں سے اسالیب کی تبدیلیاں ہیں۔ حفیظ جالندھری کے یہاں بھی ملتی ہیں اور یہ بڑی حد تک اُن کی انفرادیت بن گئی ہیں۔ مگر سیماب کے یہاں ہمیں ایسے تجربے کثرت سے ملتے ہیں۔ چھوٹی بحروں کی نظم میں بڑا تسلسل، ترنم اور روانی ہے۔ الفاظ کی بندش اور ترکیبیں، زیر و بم کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ بڑا خوبصورت سماں بندھ جاتا ہے۔ جیسے "شاعر" "تم کاوش دہر ہی ہوتے"، "سرگزشت"، "شاعر کی تربت"، وغیرہ۔ لیکن یہ صرف چھوٹی بحروں کو کیں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ بڑی بحروں کی شمولیت سے تنوع پیدا کیا گیا ہے۔ چار چھوٹی بحروں کے مصرعے ہیں۔ پھر ایک مختصر بڑی بحر میں سہ

شاعر ہے جہانِ فطرت — اسرار دانِ فطرت
رمز آشنائے فطرت — گوش و زبانِ فطرت

تخیل کے بیان کو سانچے میں ڈھالتا ہے
الفاظ کے بدلتے ہوئے معنی نکالتا ہے

"سرگزشت" میں انھیں چھوٹی بحروں کا استعمال مختلف انداز سے کیا گیا ہے۔ ابتدا میں دو شعر ہیں اس کے بعد چھوٹی بحروں کے چار مصرعے قافیہ بدلے ایک شعر ہم قافیہ۔

"شاعر کی تربت" پوری نظم چھوٹی بحر میں مسلسل اور رواں دواں ہے۔ یہ طرز بھی حفیظ جالندھری کے یہاں ملتا ہے۔ سیماب کی نظم کا بند دیکھئے ؎

خنجگ بیاباں ظلمت بداماں
شاعر کا مدفن اُس میں فروزاں
پژمردہ اک پھول اک شمع لرزاں
خاموش منزل ماحول ویراں
ٹوٹا سا کتبہ لیکن غزل خواں
پُر ہول منظر
لیکن نوا گر
اللہ اکبر اللہ اکبر

آخر میں قافیے کے کھٹکے سے موسیقی اور روانی میں شدت پیدا کی گئی ہے۔ اس طرح ان ہیئتی تجربوں میں بحروں کی تبدیلی، ٹکڑیوں کا تنوع اور قافیوں کے التزام میں ایک سلیقہ ملتا ہے۔ ایک جدت پائی جاتی ہے۔

"شاہ جہاں کی آخری ہچکی" میں اور سراجہ تجربہ کیا گیا ہے جو بے حد کامیاب ہے۔ اس میں قافیوں کا التزام اور بحروں کی تبدیلی تو تقریباً سبھی بحر کر چار مصرعوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اسی کو مختصر کر کے ہم قافیہ بنایا گیا ہے۔ مگر پڑھتے وقت احساس ہوتا ہے کہ نیا ہے۔ یہی شاعر کے فن کا کمال ہے۔ ؎

شاہِ جہاں ہے بیزارِ دنیا بالیں سے دنیا لپٹی ہوئی ہے
دل کو ہے فکرِ ترکِ تمنّا دل سے تمنّا لپٹی ہوئی ہے
خیل و حشم کی، تاج و علم کی، دنیا ادب سے ہے پیشِ خدمت
دیہیم و افسر، اقلیم و لشکر، صد ہا خزانے معمورِ دولت
تاریخِ ماضی ہنگامہ در بر
پیشِ نظر ہے آئینہ بن کر
شاہِ جہاں ہے بیزارِ دنیا دل کو ہے فکرِ ترکِ تمنّا
بالیں سے دُنیا لپٹی ہوئی ہے
دل سے تمنّا لپٹی ہوئی ہے

"آہنگِ وقت" بھی اپنی طرز کا انوکھا اور نیا تجربہ ہے ملاحظہ ہو ؎

لا خرد حوصلۂ عزم کو بردے کار ہوشیار
میں نہیں کہتا تبر و تیشۂ و خنجر اٹھا سر اُٹھا

سیماب کی پوری نظمیہ شاعری کا مطالعہ کرنے والا اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ سیماب نے ہیئت کے بے انتہا کامیاب تجربے کئے۔ اچھوتی طرز کی بحریں نکال ان میں طبع آزمائی کی۔ ان کے تجربے انوکھے اور جدید ہیں اور یہ کہنا کہ انھوں نے اجنبی راہوں میں جس فن کار نے

سب سے پہلے فارغ خس کے تمام امکانات کے مقابلے میں سینہ سپر کیا۔ وہ حفیظ جالندھری تھا۔ "حقیقت پر مبنی نہیں ــــ کیونکہ سیماب کے ہیئتی تجربے دوسرے شعراء سے کہیں زیادہ ملتے ہیں۔ اس رجحان کو آگے بڑھانے میں سیماب کا اہم مقام ہے اور اس سلسلے میں ا کا فخر انہی کو حاصل ہے۔ سیماب جس وقت ہیئتی تجربوں میں معروف تھے وہ حفیظ جالندھری کے بچپن کا دور تھا اور جو زمانہ حفیظ جالند کے ہیئتی تجربوں کا مانا جاتا ہے اُس زمانے میں سیماب کے شاگرد رشید ساغر نظامی اُردو نظم کی ہیئت میں ایسی جدّتیں کر رہے تھے جو لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس کے ثبوت میں ساغر نظامی کا مجموعۂ کلام "بادۂ مشرق" پیش کیا جا سکتا ہے۔ "بادۂ مشرق" کی یہ اس دور کی ہیں جب ساغر اپنے استادِ محترم کے زیر تربیت تھے اور اُن کی ادارت میں آگرہ سے ماہنامہ "پیمانہ" نکلا کرتا تھا۔ جو ساغر ز صلاحیتوں اور جدّتوں کا بہترین مظہر تھا۔ اُس زمانہ (۱۹۲۳ء تا ۱۹۳۲ء) میں کوئی دوسرا رسالہ اتنا ترقی پسند نہ تھا۔ ساغر نے اُس وقت ایسی نظمیں کہی تھیں جو اچھے اچھے ماہرینِ موسیقی اُس ترنم سے نہیں پڑھ سکتے تھے جس میں ساغر نظامی پڑھا کرتے تھے۔ مشاعروں میں سوا حفیظ جالندھری اور ساغر نظامی کے کوئی شاعر اُس نوع کی نظمیں اُس آہنگ اور ترنم کے ساتھ نہیں پڑھا کرتا تھا۔ یہ دونوں جوان دونوں کی آوازوں میں بلا کی کشش تھی۔ دونوں کے پاس نظمِ اُردو میں جدید ہیئتی تجربے تھے۔ محفلوں میں یوں معلوم ہوتا تھا کہ نغموں کا بہہ رہا ہے۔ اختر شیرانی بھی کافی بعد میں آئے۔ جوشؔ اور عظمت اللہ خاں بھی سیماب سے عمر میں کافی چھوٹے تھے، اگر ہم ٹھوکنے یہ تاریخی کڑیوں کو ملائیں اور سُنی سنائی باتوں کا اعتبار نہ کریں تو سوائے سیماب کے اُس پُرانے دَور میں کوئی دوسرا شاعر ایسا نظر نہیں آ نے اتنے زیادہ ہیئتی تجربے کئے ہوں۔ اور پھر نئے دَور میں آنے والے اپنے جدید ذہن تلامذہ جیسے ساغر نظامی، آزاد چاندپوری۔ مخمور ضیا فتح آبادی۔ منظر صدیقی۔ سید فیضی، مختار صدیقی۔ الطاف مشہدی وغیرہ سے کرائے ہوں۔

میں نے اوپر پُرانے دَور کا ذکر کیا ہے اور یہ پُرانا دور میں ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۶ء سے لیتی ہوں۔ اُس دَور میں کہیں بھی ہمیں جوشؔ عظمت اللہ خاں کے نام نہیں ملتے۔ ہم نظم نگاروں میں چکبستؔ کا نام ضرور لے سکتے ہیں۔ ایک اعلیٰ درجے کے قومی شاعر کی حیثیت ــ چکبست کے یہاں بہت کچھ مل جاتا ہے۔ مگر اُن کے یہاں بھی نئے موضوعات کے باوجود اسالیب پُرانے ہی نظر آتے ہیں۔ لے دے کر صر اقبالؔ اور سیمابؔ رہ جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ کی چند نظموں سے بھی ہیئتی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن مشہوری طور پر اسالیب کے سا میں جو بات سیماب کے یہاں نظر آتی ہے وہ اُس دَور کے کسی دوسرے نظم نگار شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اُس دَور میں سیماب نا ترقی اور مذہبی موضوعات پر نظمیں کہا کرتے تھے۔ اُن کی زیادہ نظمیں "نظام المشائخ" "صوفی" اور "افادہ" وغیرہ میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ اب سے تقریباً پچاس سال پہلے یہ رسائل کثیر تعداد دیگر سیماب سے نظمیں حاصل کیا کرتے تھے۔ سیماب کے سب سے پہلے مجموعۂ نظم "نے ستان" جو ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا، جس میں کچھ فلسفیانہ، کچھ متصوفانہ اور کچھ تو اور مذہبی قسم کی نظمیں ہیں۔ اُس کی دو نظمیں بطور خاص پیش کرنا چاہتی ہوں۔ جب میں نے ان نظموں کو پڑھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور جیسے جیسے میں نے اُن کی نظموں کا مطالعہ کیا، مجھے اُن کے تجربات کی رنگا رنگی کا علم و احساس ہوتا گیا۔ سیماب کے ان تجربات پر ایک مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اُن کے سلاموں اور غزلی نظموں کے مجموعوں میں بھی کئی ایسی نظمیں مل جاتی ہیں۔ بچوں کے لئے انھوں نے جو نظمیں کہی ہیں اُن میں سے بھی اکثر میں نہایت خوشگوار ہیئتی تجربے ملتے ہیں۔

"نے ستان" میں شائع شدہ ایک نظم "عیدِ قربان" ملاحظہ فرمائیے۔ یہ نظم ۱۹۱۶ء کی ہے اور رسالہ "نظام المشائخ" دہلی میں شا ہوئی تھی۔ اب سے پچاس سال پہلے ؎

مری یہ حسرتِ نازیں، ہلالِ عید پوری کر
کہ میں تنگ آ گیا ہوں اپنی اُمیدوں کے ہیجاں سے
خدارا کے تجھے روشن
نگاہیں تجھ پہ ہوں قرباں

غمخوار دمونس بن
یرا ہو مرا ارماں
شکا کے لیل ضوفگن کرنوں کے داماں سے۔

یدا اردو شاعری میں بلینک ورس BLANK VERSE اور فری ورس FRE VERSE کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ فیض، احمد فیض۔ مخدوم محی الدین اور دوسرے ترقی پسند شعراء نے ان اصناف نظم کو کافی ترقی دی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ۱۹۱۶ء سے پہلے کے کسی دوسرے شاعر کا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا اور مغرب کے ان اسالیب نظم کو کسی نے چھوا تک نہ تھا۔ سیماب نے بلا جھجک اس کو اردو میں منتقل کر لیا۔ نظم "صدائے قربان" خاصی طویل ہے۔ آپ اس کا فنی تجزیہ کریں گے تو یقیناً آپ کو حیرت ہوگی کہ اتنی کامیاب نظم شاعر نے ابے سے پچاس سال پہلے کہی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ سیماب کے اسی اختراع نے آنے والی نسلوں کے نظم جدید کی کروٹیں بدلوائیں۔ اس دور کی ایک دوسری نظم "دعوتِ روح" کا ذکر اور بھی زیادہ باعثِ دلچسپی ہوگا۔ یہ نظم بھی "نظام الشائع" ہی کی شائع شدہ ہے۔ سنہ اشاعت موجود ہے اور اس پر خود سیماب کا نوٹ ہے۔ نظم کے دو بند معہ نوٹ کے یہاں نقل کر رہی ہوں یہ بھی ایک طویل نظم ہے۔

دعوتِ سادح
(پچھلے پہر کے سناٹے میں)

سوتی ہے دنیا ہر سُو　　سوتی ہے پھولوں کی بُو
ہو کر نفس سے بے قابو　　کب تک بدلے گا پہلو
اے دل بول اُٹھ اللہ ہُو!

سب ہیں ساکت مورِ چکور　　ساکن ہے چڑیوں کا زور
بلبل بھول گئی ہے شور　　گم ہیں آنکھوں میں آنسو
اے دل بول اُٹھ اللہ ہُو!

سیماب:۔ "اس نظم کی تقطیع "فعلن فعلن فعلن فع" سے ہوتی ہے اور اس میں زحافات کرکے لانے کے لئے لفظ "اُٹھ" کا بولنے کے بعد اضافہ کیا ہے۔ لیکن جو حضرات اس نظم کو بحرِ موسیقی پہنانا چاہتے ہیں اور مصرعوں کی لمبائیوں میں جکڑ کر ہر طرف سنانا چاہتا ہو۔ اس نظم سے فضائے خاموشی میں بیداری پیدا کرنے کے آرزومند نہیں رہ "اُٹھ" کی قید سے بری ہو سکتے ہیں اور اس کی ترکیب یہ ہے کہ "بول" کے ب۔ ر۔ کو ذرا توجہ کے ساتھ ادا کریں۔ تقطیع بغیر "اُٹھ" کے بھی پوری ہو جائے گی اور "اے دل بول اللہ ہُو" کی پُر کیف موسیقی میں عالمِ بیخودی" کا پورا منظر سامنے آجائے گا۔ میں نے صرف اس لئے بڑھا دیا ہے کہ بادی النظر میں ایک زحاف کم معلوم ہونے سے نکتہ چین معترض نہ ہوں ورنہ میں خود اس مصرعہ کو اسی بحر کے فعلن فعلن توجہ کے ساتھ اس طرح جھوم جھوم کر گا رہا ہوں

اے دل بول اللہ ہُو

اب کہ اس نوٹ سے کئی باتیں ہمارے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ [illegible] عالمِ خلوت میں اپنے سوز و ساز کی دنیا کو جگانے کے لئے خود گا گا کر پڑھا کرتا ہے۔ [illegible] تجربے کے دامنِ نشانات مل جاتے ہیں۔ ان میں فنی یا ہیئتی کا [illegible] نے حفیظ جالندھری۔ عطاء اللہ خاں اور ساغر نظامی وغیرہ کو آگے بڑھا

[illegible] آتے ہیں
[illegible] خلق دیکھا ہوتا
[illegible] کی طرح کسی [illegible]
[illegible] جذبہ پیدا کرتا ہے صدر [illegible]

[illegible] ہیرو کے کردار کو مرکزیت کا حامل

متین سروش

ساز و آہنگ

عشرتِ و غم کی جو ہر خام خیالی جائے
سخت مشکل میں بھی رُخ کی نہ بحالی جائے
گرچہ دُنیا میں کوئی عشرتِ جاوید نہیں
لذتِ سعیِ مسلسل سے نہ خالی جائے
جتنے شعلے ہیں غمِ عشق کے پیتے جائیں
پیاس سہتے ہوئے ارماں کی نہ ٹالی جائے
بات تو جب ہے کہ یہ نظمِ تمنا بدلے
وصل و ہجراں کی ہر اک رسم اُٹھالی جائے
آج درکار ہیں بجلی کے شرارے ہم کو
اب کہیں اور غمِ دل کا سوالی جائے
حسرتِ تابِ سخن دل میں نہ رہنے پائے
بات جو کہنے کی ہے سب کو سنالی جائے
ساز و آہنگ بھی محفل میں ضروری ہیں مگر
نغمہ و شعر میں ہر بات نہ ڈھالی جائے
جورِ ایام کے افسانے بہت عام سہی
صورتِ کیف و سکوں بھی تو نکالی جائے

ایک سی قید میں ہیں شام و سحر کے جلوے
اک نئی بزمِ تصوّر کی سجالی جائے
عظمتِ شوق کے انوار نہیں ہیں مسدود
چشمِ کمزور سہاروں سے ہٹالی جائے
حُسنِ تعبیر سے ہر خوابِ وفا روشن ہے
تیرے نسّاشِ طرازِ جلالی و جمالی جائے
ہوئی تھی۔ اب ہے پچاس، گلزار کھلی لالہ و گل جاگ اُٹھے
مری یہ حسرتِ زرّیں، نئی تصویر بنالی جائے
کہ میں تنگ آگیا ہوں اپنی اُمیدوں سبو سب کا ہے انداز نیا
خدا رکھے تجھے روشن
ی کی ڈالی جائے
نگاہیں تجھ پہ ہوں قرباں

جوہری دَور میں یہ تیرہ خیالی کب تک
اشہبِ فکر کی رفتار بڑھالی جائے
راستہ صاف ہے منزل پہ رسائی کے لئے
قیدِ اوہام سے تخئیل چھڑالی جائے
ہمتیں ڈھونڈ رہی ہیں نئی راہیں ہر دم
ہر قدم پر نئی اک شمع جلالی جائے
تیرہ و تار فضاؤں کو ضرورت ہو اگر
روشنی عارضِ خوباں سے چُرالی جائے
زلفِ بے رنگِ زمانہ کو ہو درکار اگر
نکہتِ گیسوئے شب رنگ اُڑالی جائے
بختِ انساں کو ضرورت ہے نئی رفعت کی
عظمتِ عرش کی تقدیر منگالی جائے
توڑ دیں حلقۂ زنجیر بہ صد کیف و سرور
دھوم اک لاشۂ زنداں پہ مچالی جائے
حشر در حشر یہ ہنگامۂ عالم کیا ہے
جان جلتی ہوئی صدیوں کی بچالی جائے
حرکت و جہد و عمل کی نئی تاریخ بنے
داستاں اک نئی دنیا کو سنالی جائے
رشتۂ آلام میں پھولوں کے لگا دیں انبار
ہر کلی باغِ محبت کی کھلالی جائے
یوں سلیقہ سے کریں حسنِ کرم کا اظہار
محفلِ دہر کی تقدیر جگالی جائے
رنگ یوں گلشنِ آفاق کے خاکوں میں بھریں
امن کے خواب کی تصویر بنالی جائے
کوئی گوشہ نہ رہے حشمِ مسرت سے الگ
روشنی ہر در و دیوار پہ ڈالی جائے
کیفِ جاوید مسرت کا نہ کھونے پائے
یوں چھڑے ساز کہ خاموش نہ ہونے پائے

مقالہ

لطف الرحمٰن

فنِ ڈرامہ اور انارکلی

مہ کی تکنیک میں مشرق و مغرب میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔ صرف تفصیلات میں فرق ہے۔ مغرب کے ڈرامہ نگاروں نے ڈرامہ کا جو معیار قائم کیا ہے اسے کر معیار تک پہنچتی ہے۔

یدیا اردو ڈرامہ نگاری پر مغربی اثرات بہت زیادہ ہیں۔ درپن، جاترا، لیلاؤں، قیصر باغ اور امانت کی اندر سبھا پر ان اثرات ہیں۔ ہمارا کلاسیکی ادب جو سنسکرت کا ہے۔ اس کا اثر اردو ڈرامہ نگار کا پرتو نہ ہو سکا۔ تفصیلات کے لئے ب پر نظر ڈالنا ہوگی۔

یدیا اردو ڈرامہ پر دو ادوار گزر رہے ہیں: ایک اسٹیج کا دور اور دوسرا دور جب ڈرامے صرف ادبی رہ گئے۔ امتیاز حسین عابد حسین وغیرہ ادبی ڈرامہ نگار ہیں جو اسٹیج کے لئے لکھتے تھے اور شیکسپیئر کا چربہ اتارتے تھے۔ البتہ اندر سبھا میں تمام اثرات ہے۔

سکو نے ڈرامے کے متعلق تین باتیں بتائی ہیں۔ اور تمام بڑے ڈرامہ نگاروں نے ان کا خیال رکھا ہے۔ ڈرامے میں تین وحدتیں ہیں۔ اس کو DRAMATIC UNITIES کہتے ہیں۔

وحدتِ عمل UNITY OF ACTION

وحدتِ زمان UNITY OF TIME

وحدتِ مکان UNITY OF PLACE

بانک یہ تینوں وحدتیں ڈرامہ میں موجود نہ ہوں ڈرامہ فنی اعتبار سے کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔

وحدتِ عمل UNITY OF ACTION ڈرامہ میں ایک مرکزی عمل ہوتا ہے۔

ا اس مرکزی عمل کو اجاگر، روشن اور واضح کرنے کے لئے آتے ہیں۔ سنسکرت ڈراموں کے ناقدین بھی اس بات پر متفق ملہ میں ایک رس ہونا چاہئے۔ یعنی ایک مرکزی عمل، ورنہ ڈرامہ غائب ہو جائے گا۔ ڈرامے میں بڑی وحدانیت ہوتی ہے۔ دار کے مقابلے میں کوئی اور کردار نہیں ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے کردار ہیرو کے کردار کو روشن اور تاثیر انگیز کرنے کے لئے آتے ہیں۔ دلن" کا کردار۔ ہیرو کے کردار کو مزید متحرک، زندہ اور باعمل بنانے کے لئے آتا ہے۔ "ولن" اور ہیرو کا تعلق وہی ہوتا ہے جو آدم اور شیطان کا ہوتا ہے۔

نانہ کا کردار بالعموم ——— (۱) ہیرو کے کردار میں عمل و حرکت اور سعی و کاوش کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ (۲) ڈرامہ CONFLI یعنی الجھن پیدا کرتا ہے۔

ن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ڈرامہ میں یکرنگی کی ضرورت ہے۔ خصوصاً ہیرو کے کردار کو مرکزیت کا حامل

ہونا چاہئے۔

ڈرامے کی مثال نظامِ شمسی کی سی ہے۔ جس میں ایک وحدانی نظام ہوتا ہے جو حد سے زیادہ منظم اور مرتکز ہوتا ہے۔ ان ساری باتوں وحدتِ عمل کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی دو کردار مل کر ایک کردار بنتے ہیں۔ جیسے MACBETH اور MACBETH میں LADY MACBETH مل کر ایک کردار بنے ہیں۔

۲۔ وحدتِ مکان UNITY OF PLACE یونانی ڈراموں میں وحدتِ مکان پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مگر بعد میں شیکسپیئر اور دوسرے ڈراما نگاروں کے یہاں مثلاً برناڈ شا کے یہاں بھی اس کا خاص التزام نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ سنسکرت ڈرامہ نگاروں نے بھی وحدتِ زمان و مکان کی پابندی نہیں کی۔ مثلاً "شکنتلا" میں اس کی پابندی نہیں ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈرامے میں وحدتِ عمل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ وحدتِ زمان و مکان کی شرط نہیں۔ یہ ڈرامہ نگار کی [illegible] اور فن پر منحصر ہے۔

مختصر یہ کہ ڈرامہ کی خصوصیات میں بنیادی خصوصیت وحدتِ عمل ہے۔ ڈرامہ کی صنف کی ابتدا ہی اس وجہ سے ہوئی کہ زندگی کی گرما گرمی، برق رفتاری، شدت، حیرت ناکی اور بوالعجبی کو پیش کیا جا سکے۔ اسی لئے ناول اور داستانوں میں جب بھی اچانک پن نمودار ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں اس میں ڈرامائیت پیدا ہو گئی ہے۔ ڈرامہ میں سراپا تیزی اور شدت ہوتی ہے۔ ڈراما میں ابتدا سے انتہا تک حرکت، عمل، شدت، تصادم اور اچانک پن کا احساس ضروری ہے۔ یہ ڈراما کی بنیادی ضرورتیں ہیں۔ بہرکیف! ڈرامہ میں "ACTION" عمل" فن کار اور اداکار دونوں پیدا کرتے ہیں۔

کامیاب ڈرامہ نگاری ہمیشہ اسٹیج سے وابستہ ہوتی ہے اور اداکاری سے مل کر وحدت پیدا کرتی ہے۔ اگر اسٹیج سرگرم، چھبلی اور متحرک نظر آئے تو ڈرامہ میں پھیکا پن اور سستی پیدا ہو جاتی ہے۔ ACTION عمل تو حاصلِ ڈراما ہے لیکن اس کو مزید جاندار اور متحرک اداکار کرتے ہیں جسمانی حرکت کے پیچ و خم اور نشیب و فراز سے عمل بڑھ جاتا ہے۔

ACTION دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک خارجی، دوسرا داخلی۔ ڈرامہ کی ابتدا میں خارجی عمل پر بہت زور دیا جاتا ہے لیکن داخلی عمل کو شدت کے ساتھ اُجاگر کرنا مشکل ترین کام ہے۔ داخلی طور پر نفسِ انسانی میں جو تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ اُس کو جسمانی حرکات و سکنات کے ذریعے اسٹیج پر پیدا کرنا آسان نہیں۔ لیکن کامیاب اور بڑے ڈرامہ نگار اس کو کامیابی سے پیش کرتے ہیں۔

اسٹیج کو باروق، چوبچالی، دلچسپ اور با عمل بنانے میں جاندار اداکاری کا بڑا دخل ہے۔ اداکار اپنی حرکات اور اپنے اشاروں کے ساتھ ساتھ ادا کرتا ہے۔ تب جا کر ڈرامہ مکمل ہوتا ہے۔ اسٹیج کے لوازم کے اعتبار سے ڈرامہ کے مواد اور اداکاری کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہونا ضروری ہے۔

مکالمہ:۔ ڈرامہ کا ذریعۂ اظہار مکالمہ ہے۔ ڈرامے میں مکالمے کی اہمیت اور مکالمے میں ایک ایک لفظ کی اہمیت ناول اور افسانے سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ڈرامہ نگار کو لفظوں کے ذریعے داخلی جذبات و احساسات اور باطنی واردات و کیفیات کی پیش کش کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے مکالموں میں لفظوں کا انتخاب اور جملوں اور فقروں کا لب و لہجہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ لفظوں کی بندش، نشست و برخاست، اندازِ اظہار، اور لب و لہجہ سے بہت کچھ ظاہر ہو جاتا ہے۔ بالخصوص داخلی کیفیات کے اظہار کے ذرائع یہی ہیں۔

خود کلامی:۔ SOLILOQUY دل پر گزرنے والے جذبات و مسائل اور طوفانِ تلاطم کو پیش کرنے کے لئے خود کلامی سہارا لیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں اداکاری کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ SHAKESPEARE نے بھی خود کلامی کے مظاہر پیش کئے ہیں۔ خود کلامی کے اُتار چڑھاؤ سے باطن میں اُٹھنے والی جذباتی موجوں کا پتہ چلتا ہے۔ کہیں کہیں یہ خصوصیت بھی ڈرامے کی مقبولیت میں بہت اہم حصہ لیتی ہے

منظر کی تنظیم:۔ ڈرامے میں منظر کی اندرونی تنظیم اور مناظر کی آپس میں تنظیم یعنی سین کی نمائش بندی بھی بہت اہمیت رکھتی ہے کبھی کبھی نغمہ و موسیقی کے ذریعے سے اور کبھی کبھی جزئیات کے ذریعے سے LADY MACBETH جیسا شوہر کو قتل کرنے کے لئے اُکساتی ہے اور اس

ل کا مرتکب ہوجاتا ہے تو LADY MAC BETH کے ضمیر کی آواز اُس کو پریشان کرتی ہے۔ اُس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ اسٹیج
ا بیدہ دھنا میں وہ اپنے ہاتھ میں جلتا ہوا چراغ لئے خموشی سے گزر جاتی ہے۔ اُس کے اس ردِعمل سے اُس کے دل کی تشویش اضح ہو جاتی
ایک علامت ہے۔ چراغ اُس کی رُوح اور اُس کا ضمیر ہے جو روشن ہے اور اُس کے عمل کی پشیمانی اُس کی خموشی ہے۔ اسی HAMLET کی
جان۔ اُس کی جھجک، اُس کی خود کلامی، اس کا ٹھہراؤ اور TO BE OR NOT TO BE کی کشمکش بھی اہم ہے۔ غرض یہ کہ لب و لہجہ کے اُتار چڑھاؤ
یات نگاری کے ذریعے اور علامت کے ذریعے داخلی عمل کو ڈرامہ نگار عالمِ خارج میں لاتا ہے۔ اُس کے لئے منظر کی ترتیب و تنظیم
ری ہوتی ہے۔

ے کی تعمیر:۔ وحدت اور عمل ڈرامے کے لئے ضروری ہے۔ اس غرض کے لئے ڈرامہ کی تعمیر بھی وحدانی ہوتی ہے۔ ڈرامہ میں ابتدا سے
دونوں قسم کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی خارجی اور داخلی۔ ڈرامے میں حیرت ہونی چاہئے لیکن نہایت ہی شدت اور تکمیل کے ساتھ۔
ن کے لئے جو تکنیک برتی جاتی ہے۔ اُس کو ڈرامہ کی تعمیر کہتے ہیں۔ اس میں اعمال کی شدت کا اظہار بہتر سے بہتر ذریعے سے
ے۔ عمل اور وحدتِ عمل ACTION AND UNITY OF ACTION سے اثر تیکھا اور دیرپا ہوتا ہے۔

رامہ کی تعمیر کے تین حصے ہوتے ہیں:۔

۱۔ ابتدا

۲۔ عروج

۳۔ انجام

ان میں سب سے اہم وسطی حصہ ہوتا ہے اس کو PEAK OF THE DRAMA کہتے ہیں۔ یہ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی کے مانند
ہے۔ وسطی حصہ کلید محراب ہوتا ہے۔ اس کو CLIMEX کہتے ہیں۔ اس کے بعد انجام کی منزل آتی ہے۔ ابتدا سے لے کر وسط
ن PREPARATION OF CLIMEX یعنی تعمیری مرحلہ کہتے ہیں اور پھر عروج سے لے کر انجام تک کو ANTI CLIMEX
عشر وج کہتے ہیں۔

ادم:۔ ڈرامہ میں تصادم کی اہمیت بھی بہت ہوتی ہے DRAMATIC CONFLICT یعنی ڈرامائی تصادم کے بغیر ڈرا
ب نہیں ہوسکتا۔ بالعموم دو میلانات، خیالات، تہذیب و تمدن، شخصیتوں، انسان اور تقدیر، فرد اور سماج، نیکی اور بدی کے
ان تصادم ہوتا ہے۔ اور یہی حصہ ڈرامہ کی جان ہوتی ہے۔ ڈرامہ میں شدت کو اور تابانی اور اثر انگیز کرنے کے لئے تصادم پیدا
تا ہے۔ یہ ابتدا میں نازک خرام ہوتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ عروج کے مقام پر تصادم اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے
یہاں سے آہستہ آہستہ اُتار کی طرف مائل ہوتا ہے اور اصل منزل یہی ہے CLIMEX کے بعد کے دور کو بہت ہی فنکارانہ چابکدستی
نیچے آتا رہا جاتا ہے تاکہ تصادم کا عنصر کو خری لمحہ تک رہے۔ آخری نقطہ پر تصادم ختم ہوجاتا ہے اور ڈرامہ کا اختتام ہوجاتا ہے۔

تصادم کے ساتھ ساتھ کش مکش کا ہونا ضروری ہے۔ اسی کش مکش کو DRAMATIC TENSION کہتے ہیں جب تک
م قائم رہے گا کش مکش جاری رہے گی اور SUSPENSE باقی رہے گا۔ اس طرح تین عناصر ڈرامہ کی دلچسپی
رار رکھتے ہیں۔

۱۔ ڈرامائی تصادم DRAMATIC CONFLICT

۲۔ ڈرامائی کش مکش DRAMATIC TENSION

۳۔ ڈرامائی سسپنس (تجسس) DRAMATIC SUSPENSE

ANTI CLIME یعنی تقابلِ عروج کے دور میں تصادم، کش مکش اور نتیجہ کا انتظار باقی رہے۔ اس کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت
ہے۔ اس کے لئے توازن: اعتدال، روک تھام اور فنی کاوش سے کام لیا جاتا ہے۔ اگر کوئی فن کار ان جان گداز مراحل سے نکل گیا

وہ کامیاب ہوجاتا ہے۔

ڈرامہ ساخت و ترکیب کے لحاظ سے بنیادی طور پر ایک ہی ہوتا ہے۔ خواہ وہ المیہ ہو یا طربیہ۔ کردار نگاری۔ واقعات کی پیش کش، ٹمنا بندی، نیز مکالمہ نویسی کے اعتبار سے تکنیک میں ڈرامہ کی بنیادی ضرورت اُس کے ہر شعبہ پر حاوی ہوگی۔ ڈرامہ وحدت عمل اور شدت عمل کو پیش کرنے والا فن ہے۔ ڈرامہ میں زندگی کا کوئی ایک تجربہ، جذبہ، کیفیت یا رس اپنی گہری شدت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ وحدت عمل اور عمل میں سرگرمی ڈرامے کے بنیادی تقاضے ہیں۔ کردار نگاری کے سلسلے میں بھی یہی تقاضے قائم رہیں گے۔ کردار زیادہ نہ ہوں تو اچھا ہے۔ ڈرامہ کی دھرانی کیفیت، کرداروں میں اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ مرکزی کردار نمایاں ہوتا ہے۔ ڈرامہ میں ایک مرکزی کردار ہوتا ہے۔ جس کو ہیرو کہتے ہیں۔ اُس کے مقابلے کے کردار کو "ولن" کہتے ہیں۔ "ولن" بھی ہیرو کی خصوصیات کو واضح کرنے اور ڈرامے کی شدت کو بڑھانے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ ہیرو سے ٹکراتا ہے اور ڈرامے کی شدت میں اضافہ کرتا ہے اور مرکزی کردار کو بھرتا ہے۔ ڈرامے کی مرکزیت یہ ہے کہ سارے ثانوی کردار، مرکزی کردار کے گرد رقص کریں۔ کرداروں میں درج ذیل خصوصیات ہونی چاہئیں۔

۱۔ کردار کی اپنی انفرادیت ہونی چاہئے۔ یہ محض ڈرامہ نگار کی صدائے بازگشت نہ بن جائے۔ اہم کردار کے لئے ضروری ہے کہ اُن کی داخلی کیفیات کو خارجی خصوصیات کے ساتھ پیش کیا جائے۔ داخلی کردار نگاری فن کار کی سب سے بڑی جانچ ہوتی ہے۔ کرداروں کی نفسی زندگی، جذبی زندگی، احساساتِ اندرونی و باطنی پیچیدگیاں، داخلی عمل اور ردِّ عمل، اُن کا سوچ بچار سب کچھ مخصوص ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا جاسکے۔ کرداروں کا اصل وجود داخلی ہوتا ہے۔ اِس لئے کردار نگاری کا اہم مسئلہ داخلی ہوتا ہے۔

۲۔ کرداروں کو انفرادی ہونا چاہئے۔ جن میں انوکھاپن، دلکشی اور جاذبیت کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ دلکشی فنِ قصہ کے لئے ضروری ہے۔ خواہ وہ ناول ہو یا افسانہ یا ڈرامہ۔ مگر ڈرامہ میں اُس کی اہمیت دُوسری اصناف سے زیادہ ہے۔ اِس لئے دلچسپ اور منفرد کردار لائے جائیں۔

۳۔ کرداروں کا ارتقا ہونا چاہئے۔ مسلسل اور پیہم۔ اِس لئے کہ زندہ چیزیں بڑھتی ہیں۔ حالات و واقعات۔ ماحول کی تبدیلیاں، نفسیاتی ردِّ عمل کے تحت مرکزی خصوصیات کے باوجود اِن میں ارتقا ہونا چاہئے۔ GROWTH IN CHARACTER بہت ضروری ہے۔ کردار کو جامد نہیں ہونا چاہئے بلکہ متحرک اور باعمل۔ کردار کس طرح ماحول اور سماج کے مقابلے میں اپنا ردِّ عمل پیش کرتا ہے۔ جملہ کردار نگاری کا بہت بڑا جیب ہے۔

واقعہ طرازی: ۔ ڈرامہ میں واقعات پیش کئے جاتے ہیں لیکن بیانیہ انداز میں نہیں بلکہ رُونما ہوتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں۔ اِس لئے ہم اِس کو واقعہ نگاری نہیں واقعہ طرازی کہیں گے۔ اِس میں مناظر کی تنظیم ہوتی ہے۔ اور ہدایت دی جاتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے واقعہ کے ذریعے اہم واقعات رُونما کئے جائیں۔

دوسرے کرداروں کی حرکت و عمل کے ذریعے جو اسٹیج پر رُونما ہوتے ہیں۔ واقعات کی پیش کش کی جاتی ہے۔ مثلاً سازش، جنگ معاہدے وغیرہ کی شکل میں واقعات لائے جاتے ہیں۔

واقعات کی نمائش ایک اور طریقے سے ہوتی ہے۔ یعنی مکالمہ کے درمیان کسی کردار کے ذریعے کسی ہونے والے واقعہ کی اطلاع دی جاتی ہے۔ اِس کو INDIRECT INFORMATION کہتے ہیں۔

یہ تین طریقے ہیں۔ جن کے متوازن انداز سے واقعہ طرازی کی جاتی ہے اور یہ بھی بنیادی ضرورت ہے اور اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اِس لئے کہ:

DRAMA IS THE STORY BY ACTION, NOT BY REPORTAGE NOT BY NARRATION.

ڈرامہ میں ایسے واقعات کی کثرت ہونی چاہئے۔ جو تصادم اور کشمکش کو آگے بڑھائے۔ تاکہ ڈرامے کی مرکزیت کو مجروح نہ کرے۔ ایسے واقعات کا انتخاب کیا جائے جس سے وحدت قائم رہے۔ اُس کو ڈرامائی عناصر کہتے ہیں۔

واقعات کے لئے جیسی اہم ضرورت یہ ہے کہ ان میں ربط اور تسلسل برقرار رہے۔ واقعات ڈرامے کی مرکزیت اور کرداروں کی خصوصیت کے حامل ہوں۔ یہ ناول اور افسانوں کے لئے بھی ضروری ہے۔ واقعات کا ہر کردار پر اور کردار کا ڈرامے پر پڑنا چاہئے۔ اگر فنکار دونوں کی ضروریات ہم آہنگی کو پیش نہ کر سکا تو ناکامیاب ہے۔ واقعات یا تو کرداروں سے پیدا ہوں یا کرداروں کو متاثر کریں۔ واقعات کا کرداروں سے بے تعلق ہونا ڈرامے کا سب سے بڑی خرابی ہے۔

فضابندی:- فضابندی ناول، افسانہ اور ڈرامہ سب کے لئے ضروری ہے۔ کردار اور واقعات کسی نہ کسی فضا میں ابھرتے ہیں۔ فضا کے اثرات سے زندگی کی واقعیت اور حقیقت نمایاں ہوتی ہے۔ اور زندگی کی جدوجہد کا لطف پیدا ہوتا ہے۔ ناول میں فضابندی بیانیہ انداز پر پیش کی جاتی ہے۔ ڈرامہ میں دو طرح سے اس کی پیش کش ہوتی ہے۔

(۱) ڈرامہ میں فضابندی پس منظر اور پردے سے ہوتی ہے۔ ڈرامہ اسٹیج سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ پردے اور پردے کا انتخاب اور رنگ آہنگ کا معاملہ فضابندی کا معاملہ ہے۔ پردے کے نقش و نگار اور رنگ و آہنگ کا تعلق آنے والے واقعات سے ہوتا ہے۔

(۲) رقص و نغمہ سے بھی فضابندی کی جاتی ہے۔ رقص کے معنی ڈرامے میں بہت وسیع ہیں۔ قاتل کا ہاتھ میں خنجر لے کر کسی کو قتل کرنے کے لئے آگے بڑھنا بھی رقص ہے ACTION (عمل) اور ACTION کی تفصیلات کو رقص کہتے ہیں۔ اس سے بھی فضابندی ہوتی ہے۔ نغمہ، سامان اور اسباب، جو اسٹیج پر لائے جاتے ہیں۔ ان سے بھی فضابندی پیدا ہوتی ہے۔ گویا اسٹیج کی چیزوں کا تعلق بھی فضا آفرینی سے ہے۔ یہ خارجی فضابندی ہوئی۔ جدید دور میں ان کو بہت ہی تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے۔ شیکسپیئر (SHAKESPARE) کے دور میں اتنی تفصیل سے یہ چیزیں پیش نہیں کی جاتی تھیں۔

فضابندی کا تعلق داخلیت سے بھی ہے۔ یہ اداکاری کے ذریعے پیش کی جاتی ہے یا خود کلامی اور رمز و علامت کے ذریعے۔ بہرحال! داخلی فضابندی بھی پُراثر اور دلکش ہوتی ہے۔

فضا کے ساتھ ماحول بھی وابستہ ہے۔ دراصل اندرونی کیفیات کو خارجی مناظر اور ان کے اثرات و کوائف کے تمام جزئیات کے ساتھ پیش کرنا فضابندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ بڑا وسیع لفظ ہے۔ مختصراً اس سے مراد یہ ہے کہ ماحول اور منظر کا ردِعمل کرداروں پر ظاہر کیا جائے۔ اب اس معیار پر ہم اداکاری کا جائزہ لیں گے۔

کچھ دنوں قبل تک کی تحقیق کی رُو سے اُردو کا پہلا ڈرامہ امانت لکھنوی کی تخلیق "اندر سبھا" کو قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن اب تحقیق کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "اندر سبھا" اُردو کی پہلی تمثیل نہیں بلکہ امانت لکھنوی کے پہلے بھی ڈرامہ نگاری کی تین چار منزلیں گزر چکی ہیں۔

۱۔ عہد بہ عہد تمثیل کے ڈرامے جو مغلیہ دور میں بھی کھیلے گئے۔ مغلیہ دور میں آگرہ میں بھی ایک گروہ میں ڈراما کھیلا گیا تھا۔

۲۔ دوسرا دور رہ بمبئی اسٹیج کا ہے جو ۱۸۵۷ء سے پہلے تک بمبئی میں ڈرامے پیش کرتا رہا۔ پہلے اور دوسرے دور کے درمیان خیالی ڈرامے بھی کھیلے گئے۔

۳۔ تیسرا دور رقیصر باغ میں کھیلے گئے "رہس" کا ہے۔ اسی زمانے میں عوامی رنگ میں بھی ڈرامے گاؤں میں کھیلے جاتے تھے۔

اس کے بعد اندر سبھا، کا دور آتا ہے۔ اس کا مصنف شاہی رہس اور عوامی ڈراموں سے متاثر تھا۔ لیکن ہندوستانی ڈراموں کو براہ راست سنسکرت ڈراموں کا فیض نہ مل سکا۔ کالی داس کے ڈراموں کا کوئی اثر اُردو ڈرامہ نگاری پر نہ پڑا۔ پھر بھی امانت لکھنوی کے دور میں اُردو ڈرامہ ہندوستانی مزاج سے بلاشبہ بہت زیادہ متاثر ہے۔ اُس وقت ڈرامے بالعموم منظوم لکھے جاتے تھے۔ امانت لکھنوی کا ڈرامہ بھی منظوم ہے اور اپنی ساخت اور ترکیب کے لحاظ سے ایک طرف ہندو صنعتیں اور دوسری طرف فارسی تمثیلوں سے ماخوذ ہے۔

عصرِ جدید میں ڈرامے نثر میں لکھے جانے لگے۔ بمبئی کی تھیٹریکل کمپنیوں نے بہت سارے ڈرامے اُردو کو دیئے۔ بالخصوص آغا حشر کی کمپنی نے

اس قدر کو اُردو ڈرامہ کا عہد زرّیں کہا جا سکتا ہے۔

امید کی جاتی تھی کہ حشر کے دَور میں ڈرامہ اپنی حیثیت، اور اپنا مقام حاصل کرے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ فلموں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی بنا پر ڈرامہ پیچھے پڑ گیا اور ایک حد تک اسٹیج سے الگ ہو گیا۔ اس لئے اس کی اہمیت باقی نہ رہی۔ حشر کے بعد چند اہم نام اُردو ڈرامہ نگاری میں آتے ہیں۔ جن میں عبدالمجید دریا بادی نے (زود پشیماں) اور پنڈت وتاتریہ کیفی نے "مرادی دادا" اور "مراٹھا ویر" ڈرامے لکھے، لیکن یہ طویل بھی ہیں اور ان میں تعداد کی بھی ہے۔ گرچہ اسٹیج سے الگ ہونے کی بنا پر ڈرامائی تضاد میں حرکت کی کمی کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ یہ ہمارے ادبی ڈراموں کی باقاعدہ ابتدا تھی۔

اس کے بعد "جاوید حسین" نے "پردۂ غفلت" لکھا۔ اس دَور میں مغربی اثرات اُردو ڈرامہ نگاری پر کافی پڑے اور بہتیرے سماجی اصلاحی ڈرامے لکھے گئے۔ اشتیاق حسین قریشی نے "نفرت کا بیج" "نیلا لفافہ" "گناہ کی دیوار" "نقش آخر" وغیرہ ڈرامے لکھے۔ مگر سب اسٹیج سے الگ ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب کے ڈرامے "کھیتی" اور "غازہ جنگی" بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان "تاج" کی اہمیت اس لئے ہے کہ "تاج" کا تعلق اسٹیج سے تھا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ منظر و تنظیم کا احساس، نغمہ، رقص اور پردے کی تبدیلی خیال رکھتے ہوئے بھی پارسی کی وسعت اور پھیلاؤ کو وہ "انارکلی" میں نہ روک سکے۔ اس کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ پلاٹ کے لحاظ سے اس کو اسٹیج کرنا بہت مشکل ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کو اسٹیج کرنا گویا بھارت کو اسٹیج کرنا ہے۔ غالباً تاج نے یہ ڈرامہ اسٹیج کے لئے نہیں لکھا تھا۔

"تختِ جمشید" تاج کا بہت بہتر ڈرامہ ہے۔ اثرات کے اعتبار سے بھی اور فنی تقاضوں کے لحاظ سے بھی۔ تاج اپنے دَور کے لکھنے والے تمام لوگوں میں زیادہ کامیاب، بہتر اور دانشور ڈرامہ نگار ہے۔ تاج بھی تھیٹر یل کمپنی سے تعلق رکھنے کے باوجود پوری تربیت حاصل نہ کر سکے۔ پھر بھی حشر کے بعد تاج اُردو کے سب سے بہتر ڈرامہ نگار ہیں۔

"انارکلی" کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے اقدار فن کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا جو درج ذیل ہیں:-

(۱) کردار نگاری:- قصہ کی کوئی صنف ہو۔ کردار نگاری ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ اور قصہ کی جاندار سیرت نگاری کی کامیابی پر منحصر ہے۔ "انارکلی" انتخاب کردار، انفرادیت کردار، کرداروں کی خارجی و داخلی پیش کش، اور تقاضائے کردار اور کردار و واقعات کے ربط و ہم آہنگی کے اعتبار سے کامیاب ڈرامہ ہے۔ اس میں چند اہم کردار بڑی حسن کارانہ تاثیر کے ساتھ پیش ہوتے ہیں۔ انارکلی اکبر اور جہانگیر کے کردار تو مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر ساتھ ساتھ بختیار اور قرنیا کا کردار بھی ثانوی کرداروں میں بہت اہم ہے ان کی تشکیل میں فن کار نے بڑی چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ زندہ، منفرد اور ممتاز ہیں۔ ان میں سے کوئی دلکش اعتدال نظیر، اور ذہن و قلب پر اپنے دیرپا اثرات مرتب کرتے ہیں۔

چونکہ انارکلی ایک المیہ ہے۔ اس لئے مرکزی کرداروں کے علاوہ ثانوی کرداروں پر بھی المناکی طاری ہے۔ انارکلی غم انجامی کی انتہائی مثال ہے۔ لیکن اکبر کا غم بھی ناکامیوں کی شکست کا غم ہے۔ خوابوں کے مٹ جانے کا غم ہے۔ جہانگیر کا غم محبت کی شکست محبوب کی موت اور ساتھ ساتھ اس کا احساس کہ وہ شہزادۂ ہندوستان ہونے پر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ کا پروردہ ہے۔ قرنیا اور قرنیا کی ماں کا غم فنی، لازوال اور ابدی ہے۔

ڈرامے کی کردار نگاری یہ تقاضا کرتی ہے کہ کرداروں میں ڈرامائیت ہو، یعنی ڈرامے میں تصادم اور کشمکش کی فضا ہو۔ ساری ہے۔ تاج نے ابتدا سے لے کر انتہا تک اس ڈرامائی تقاضے کو بخوبی پیش کیا ہے اور ڈرامائی تصادم کی شدت کہیں کم نہیں ہونے دیا ہے۔ ٹکراؤ اور تصادم کئی جہتوں سے ہے۔ داخلی و خارجی، ذہنی و جذباتی۔ اکبر اور انارکلی ٹکراتے ہیں یہ ہمالیہ اور گل یاسمین کا ٹکراؤ ہے۔ لیکن فن کار نے وہ ناز کر۔ حقائق پیش کئے ہیں کہ ہمالیہ گل یاسمین کے سامنے تھرتھرا جاتا ہے اور ڈرامے کی الم انجامی شدید تر ہو جاتی ہے لیکن آخر میں ہمالیہ گل یاسمین کو روندنے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر بڑے گہرے اور

ں زخم کھانے کے بعد۔ لیکن تاج نے بڑی لطافت آمیز فن کاری اور لطیف ہنرمندی سے ٹکراؤ کا یہ پہلو پیش کیا ہے
ے بے وزن، بے عمل اور بے وقار لڑکی اپنی تقدیر میں محبت کے لئے اپنے جذبات کی شدت کی بنا پر شہنشاہِ ہند کے سامنے جرأت
ی ہو جاتی ہے۔ عشق جسے بے پایاں عزم عطا کرتا ہے۔ پھر بھی اس کی فطری و نسائی کمزوری اس کی رگِ جان کے تار کو جھنجھنا دیتی ہے۔
ہ لرزتی کانپتی رہتی ہے۔ دوسری طرف شہنشاہ ہند بھی لرزتا اور کانپتا رہتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے مقادم کو تیسرا لقادم
ید تر کر دیتا ہے۔ اور وہ شہزادہ سلیم ہے۔ جو اکبر کی تمناؤں کا واحد سہارا ہے۔ جو ولی عہد سلطنت ہے اور جو اس کی یا سمین کا شیدائی ہے
سلیم کے اندر جو جھجک ہے وہ ماں کے خیال سے، اکبر کے خیال سے نہیں۔ کبھی کبھی محبت اور فرض کے درمیان کش مکش ہوتی ہے جو
واضح ہے اور سلیم محبت کے لئے فیصلہ کرتا ہے۔ کبھی کبھی حالات ایسے ہوتے ہیں کہ شہزادہ سلیم بے بس ہو جاتا ہے اور آخر میں اُسے
گا بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ تقدیر کا فیصلہ ہے۔ یہ بے بسی اور ناکامی ابنِ آدم کی بے بسی اور ناکامی ہے۔ یہ تصادم ایک مثلث ہے۔ اِن
ساتھ دو تین افراد اور بھی شامل ہو جاتے ہیں جو دانستہ یا نادانستہ تصادم کو تیز، شدید اور خطرناک بناتے ہیں۔ کچھ افراد شکین، انارکی اور
نجاشت کے ساتھ تصادم کو کلائمکس تک پہنچانے میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔

ان میں دلآرام کا کردار بڑا اہم ہے۔ وہ بڑی جنسیت عورت ہے۔ لیکن اگر یہ نہ ہوتی تو ڈرامہ نہ ہوتا۔ یہ وہ فتنہ ہے جو ہر جائی طرح
لگا کر دور سے تماشا دیکھتا ہے۔ فتنہ انگیز، موذی۔ شیطان۔ لیکن تاج نے اس "دلی" کے اندر بھی انسانی کمزوری کی روشنی۔ کہیں کہیں
دلآرام کے کردار میں بھی کبھی کبھی رحم و کرم کا جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے اور قارئین و ناظرین کے دلوں میں بھی کبھی کبھی اس کے لئے ہمدردی
ہونے لگتی ہے۔ دراصل وہ بھی محبت کی ماری ہے اور اسی محبت کے غم میں اپنے مقابل پر حملہ آور ہوتی ہے لیکن اس کے دل میں بھی
انسانیت کی لہریں اٹھتی ہیں۔ یہ بھی کردار نگاری کا بڑا کمال ہے کہ سفید صرف سفید نہ ہو اور سیاہ صرف سیاہ نہ ہو۔ ملزم سلیم ہے
دلآرام، نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن حالات و واقعات کی زنجیر سے کوئی آزاد نہیں۔ دونوں اپنی اپنی زنجیروں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔
اکبر کا ظاہر بڑا سخت، تند اور ظالم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مصنف نے اس کی مجبوریوں کو بڑی فن کاری سے پیش کیا ہے۔
ے طرف عظیم اور با حشمت سلطنت ہے اور دوسری طرف ایک خوبصورت پھول، ایک مدبر کے لئے کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ
ں کو مسل ڈالے۔ آخر پیغمبرانِ کرام بھی تو جہاد کے لئے ہزاروں ہزار حمزہ کو جان دینے پر ضامند کر دیتے ہیں۔ روحانی اقتدار طبقے کے لوگ ہی
ے گھڑ لیتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ایک فرد کی خوشی قوم اور ملک و ملت کے لئے کچھ نہیں۔ اس لحاظ سے ہم اکبر کو صرف سیاہ نہیں کر سکتے۔ اکبر ظالم ضرور
ہے لیکن اکبر ایک انسان ہے جس کو فن کار نے ایک انسانی حیثیت سے پیش کیا ہے جو بہترین کردار نگاری کی بہترین مثال ہے۔

اکبر کی بھی پریشانیاں تھیں۔ ملک و ملت کے لئے۔ اکبر کا کردار بہت عمدہ ہے۔ آزاد نے بھی اکبر لکھا تھا۔ جس کو ناصر نے
ملایا۔ لیکن اس میں اکبر کا کردار بہت ہی بے جان اور سست ہے۔ لیکن تاج نے اکبر کی کردار نگاری میں بہت ہی فنی شعور سے
لیا ہے۔ اکبر بادشاہ ہے۔ اکبر باپ ہے۔ اور ان دونوں کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ اور یہ دونوں اُس اکبر سے لڑتے ہیں۔ جو اکبر
کے دل میں ہے۔ ایک انسان! وہ اکبر کو بے انتہا چاہتا تھا۔ وہ ہندوستان کو بے انتہا چاہتا تھا۔ اور دونوں کی قیمت
کنیزِ حرم۔۔ اکبر کے لئے اس سے بڑا سانحہ اور کیا ہو سکتا تھا؟

اکبر کا دبدبہ، حشم، مرتبہ، شان و شکوہ، جاہ و جلال، عظمت و بلندی اور سریر و دربار یک ناچتی تھرکتی ہوئی لڑکی شہزادہ
یم سے آنکھیں ملائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر ایک ظالم نہیں۔ اس کے اندر انسانی مقناکی ہے۔ جتنی ہر انسان کے اندر اور
صفاکی نظری ہے۔ اس کی زندگی کا ایک نصب العین ہے۔ وہ دلکر بین ہے۔ وہ اس جرأت کو برداشت نہ کر سکا۔ حقیر
نسانی فوجوں اور خاصیوں کو تاج نے بڑی خوبصورتی اور بڑے جمالیاتی انداز میں پیش کیا ہے۔ بالخصوص اکبر کا کردار تو امتیاز
ج کی صلاحیتِ کردار نگاری کی ایک نمایاں مثال ہے۔

شہزادہ کا کردار بہت ننھا اور خوبصورت ہے۔ اس کا کردار اس طرح ہے کہ جیسے جہاد سے ایک چھوٹا سا عقاب ٹکرا گیا ہے۔

یا ایک ننھی سی گڑیا ایک بڑی مشین میں گھس گئی ہے اور اب مشین چل نہیں سکتی۔ یہی حال ثریا کا ہوا۔ وہ ایک چھوٹی سی چڑیا ہے جسے پالتو بلی کا درجہ مل گیا ہے اور وہ بھی شہزادہ سلیم کی۔ تاج نے ثریا کی بھی بڑی اچھی کردار نگاری کی ہے۔ ڈرامہ ختم ہونے کے بعد ثریا اور انارکلی کا تضاد اور بڑھ جاتا ہے۔ ایک، ہے (انارکلی) جو محبت کی آگ میں جل جاتی ہے۔ اور ایک ثریا محبت کی نفسیات کی آگ میں۔ ثریا کا کردار بھی المناک ہے۔ لیکن بہت ہی معصوم اور حیرت خیزی کا شکار۔

غرض کردار نگاری کی ڈرامائی ضروریات۔ خصوصیات کی روشنی میں "انارکلی" ایک کامیاب ڈرامہ ہے۔

بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ اس میں ہیرو کے کردار کی مرکزیت قائم نہیں رہی۔ بعض لوگوں کا یہ اعتراض ہے کہ آخر یہ کس کی ٹریجڈی ہے۔ اکبر کی یا سلیم کی۔ یا انارکلی کی؟ ہیرو کون ہے اور ولن کون؟ مرکزی کردار کون ہے۔ اکبر، سلیم یا انارکلی؟ ڈرامہ نگار کا خیال ہے کہ انارکلی مرکزی کردار ہے۔ اسی لئے اس کا نام انارکلی رکھا گیا ہے MACBETH اور LADY MACBETH کی طرح اس میں بھی دو کردار ایسے ہیں جو ایک ہیں۔ یعنی انارکلی اور سلیم۔ ڈرامہ نگار کے مطابق جو مخالف کردار ہے وہ اکبر ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ ولن اکبر ہے یا دانارکلی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عصر حاضر میں جو میلان درجحان ڈرامہ نگاری کا رہا ہے اس کی رو سے شیکسپیئرین اصطلاحوں کو دہرانا لاحاصل ہے۔ مرکزی بات یہ ہے کہ اس میں ڈرامائی عناصر ہیں کہ نہیں۔ "ولن" ایک مخالف کردار ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ وہ سرتاپا ولن ہو۔ "ولن" کے فنکارانہ معنی یہ ہیں کہ ایک مرکزی کردار کے مقابلے میں ڈرامائی تضاد کو تیز تر کرنے کے لئے دوسرا کردار آئے۔ اکبر روایتی "ولن" نہیں اور نہ روایتی "ولن" ہونے کی ضرورت ہے۔ گانس وردی اور برنارڈ شا کے یہاں جو "ولن" ہیں۔ ان کے یہاں نیکی اور شرافت کے جذبات بھی موجود ہیں۔ ولن کا جو CLASSI-CONCEPTION تھا وہ پرانی بات ہوگئی۔

اکبر ایک مقابل کردار ہے۔ انارکلی کے کردار کو اور بھی ابھرنا چاہئے تھا اس لئے کہ وہ مرکزی کردار ہے لیکن مقابل کا کردار یعنی اکبر مرکزی کردار یعنی انارکلی سے بھاری پڑتا ہے۔

تاریخی صداقت اور فن کا نامہ مداقت میں بڑا فرق ہے۔ فن کار تاریخ سے مواد لے سکتا ہے اور اس کے کسی حصے کو رد بھی کر سکتا ہے اور اس میں اضافہ بھی۔ لیکن فن کار کا فرض ہے کہ اس PROBABILITY (امکان) کو ثابت کر سکیں۔ پھر بھی فن کار کو تاریخ سے اتنا نہیں کھیلنا چاہئے، کہ انقباض پیدا ہو جائے۔

تاج نے غور لکھا ہے کہ قصہ غلط ہے اور قصہ کی جذباتی کیفیت نے دراصل ان میں ڈرامہ لکھنے کی تحریک پیدا کی ہے۔ فن میں جھوٹ فن بن جاتا ہے۔ قصہ جھوٹ سے شروع ہوتا ہے۔

تاج نے انارکلی کا حق ادا نہیں کیا۔ انارکلی کے کردار کو جتنا مشخص، منفرد، ٹھوس اور احساساتی ہونا چاہئے وہ نہ ہو سکا۔ انارکلی فن کار کے یہاں بھی کمزور رہی اور اکبر کے یہاں بھی مغلوب، یعنی وہ "تاج و تخت" دونوں سے محروم رہی۔ اکبر ناظرین کے ذہن پر چھایا ہے۔ اس کے کردار کو اتنا مضبوط نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ اس ڈرامے کی خامی ہے اور ایک بڑا نقص اور عیب۔

دراصل فن کار کے اپنے جذبات و احساسات کے پس منظر کا اثر بھی اس کی تخلیق پر پڑتا ہے۔ اس زمانے میں تاج عجاب سے بڑے والہانہ جذبہ و شعور سے محبت کر رہے تھے۔ ان کی رومانیت کا اثر ڈرامہ پر پڑا۔

واقعات طرازی: ۔ ڈرامہ میں واقعات کی پیش کش عملی انداز میں ہوتی ہے۔ بیانیہ انداز میں نہیں۔ اس میں واقعات کردار کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں۔ ڈرامہ میں واقعات کئی عنوانوں میں پیش کئے جاتے ہیں

(۱) وہ واقعات جو اعمال کی شکل میں سرزد ہوتے ہیں۔ یعنی کردار ان واقعات کو پیدا کرتے ہیں اور اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں

(۲) دوسرے وہ واقعات جو رونما ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ لیکن مکالمے کے ذریعہ ان واقعات کی طرف اشارہ کئے جاتے ہیں روشنی ڈالتے ہیں۔ اور حوالہ دیتے ہیں۔ ایک کردار دوسرے کو مکالمے کے انداز میں واقعات کی اطلاع دیتا ہے۔

ہے۔ خود کلامی میں بھی کبھی کبھی واقعات سامنے آتے ہیں۔ ایک کردار اپنے طور پر سوچتا ہے اور پچھلے واقعات جو اُس کے ساتھ گزر چکے ہیں اُس کو بھی ظاہر کرتا چلا جاتا ہے۔

ایسے واقعات کا انتخاب جس میں تصادم ہو، دلچسپی ہو اور جس میں ڈرامائیت ہو۔ ڈرامہ نگار کی کامیابی ہے۔ کرداروں کے ساتھ واقعات کا گہرا رنگ ہوتا ہے۔ کرداروں کا اثر واقعات پر اور واقعات کا کرداروں پر اور پھر دونوں کے درمیان تسلسل، تنظیم، ہم آہنگی اور باہمی ربط بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

تاج کے ڈرامہ انارکلی میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ اس میں واقعات کی مدت لمبی ہے اور ڈرامے کا RANGE بہت ہی وسیع ناول جیسا معلوم ہوتا ہے۔ اسٹیج کے وقت انارکلی میں چار گھنٹے سے بھی زیادہ وقت لگتا ہے۔ اور یہ ڈرامہ نگار کی غلطی ہے۔ ڈرامے سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے میں اسٹیج ہو جانا چاہیے۔ اس ڈرامے کو پانچ گھنٹے سے کم میں پیش کرنا ممکن نہیں۔ اس میں کردار نہیں لیکن واقعات زیادہ ہیں۔ مگر انتخاب واقعہ میں تاج کامیاب ہیں۔ جو واقعات انھوں نے پیش کئے ہیں وہ دلکشی و اہمیت ہونے کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت ہیں۔ اُن میں کوئی واقعہ بھرتی کا نہیں۔

ڈرامہ میں المیہ کی شدت کو کم کرنے کے لئے تسکین دہ واقعات لائے جاتے ہیں۔ اس کا ایک اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ تصادم اور پیدا کر کے المیہ کو اُجاگر کرنے، غم کی شدت جب گوارا نہ ہو تو مسرت کی باتیں پیش کی جاتی ہیں۔ درمیان میں مزاحیہ کردار لاتے ہیں۔ اور DRAMATIC RELIEF کہتے ہیں۔ آغا حشر نے بعض ڈراموں میں اس کو غیر فن کارانہ طور پر پیش کیا ہے۔ مثلاً "یہودی کی لڑکی" میں "میستا اور گھسیٹا" کا کردار غیر فن کارانہ ہے۔ اس کو اگر نکال دیا جائے تو اس سے ڈرامہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

پلاٹ یا سین کے وقفے میں لباس تبدیل کرنے کے لئے یا اسٹیج کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جو واقعات لائے جاتے ہیں۔ ان کو DRAMATIC INTR-V.D. کہتے ہیں۔

اچھا DRAMATIC INTERLUDE وہی ہے جو ڈرامہ میں عضویاتی طور پر منسلک ہو۔ یہ ڈراما کا ORGANIC PAR عضویاتی حصہ ہوتا ہے۔ شیکسپیر کے یہاں DRAMATIC INTRLUDE بہت ہی عضویاتی ہیں۔ تاج کے یہاں یہ حیثیت حشر کی طرح غیر فن کارانہ نہیں بلکہ عضویاتی طور پر ڈرامے سے وابستہ ہوتی ہے۔ ان میں مزاحیہ عناصر بھی ملتے ہیں۔ تہذیب جھلکیاں بھی اور یہ ٹریجڈی المیہ کی شدت کو کم کرتی ہیں اور تقابل بھی پیدا کرتی ہیں۔ کئی رومانی مناظر ہیں جو ایک دوسرے سے طور پر مربوط ہیں۔ اس اعتبار سے بھی تاج ایک کامیاب واقعہ طراز ہیں۔

واقعات کی اہمیت کردار آفرینی میں معاون ہے۔ غرض واقعات کردار آفرینی میں۔ اکبر کی شخصیت اور کردار اس عہد کی تہذیب اور ہندوستانی معاشرت و تمدن میں ایک معمار کی حیثیت رکھتا ہے۔ جن کو اشارات، رموز و کنایات اور کبھی خود کلامی سے بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ اکبر کی تعمیر کو ہم اکبر کی تخلیق میں دیکھتے ہیں۔ اکبر سلیم کو اکبر بنانا چاہتا ہے۔

غرض تاج نے واقعات کی خوبصورت ترتیب اور اشارات سے اتنے لطیف کام کئے ہیں کہ حشر سے اس معاملے میں آگے گئے ہیں۔

"انارکلی" کا سب سے بڑا عیب اس کی رومانی فضا کی شدت ہے۔ حشر کو DRAMATIC SENSE زیادہ تھا لیکن فنکارانہ تسلسل میں تاج حشر سے آگے ہیں۔ اس میں واقعات کا تصادم بہت ہی کامیاب ہے۔ بلکہ تصادم ہی سے سین شروع ہوتا ہے۔ یہی نہیں اس میں جگہ جگہ پر مختلف تصادم سامنے آتے ہیں۔ حرم سرا میں رہنے والی کنیزوں کی چشمکیں، اکبر کی تعمیری طبیعت اور سلیم کی رومانیت کی ٹکر، ماں کی محبت و لطافت اور باپ کی قوت و توانائی کی ٹکر، دل آرام اور انارکلی کا ٹکراؤ، نثار کی مسلطنت سے وفاداری، دوستی اور سلطنت سے ٹکراؤ، جہانگیر کی ٹکر اور انارکلی کا اکبر سے ٹکراؤ، محبت و نفاست بلندی و عظمت کی ٹکر، غرض یہ کہ ڈرامے میں ابتدا سے انتہا تک ایک ایک تار میں تکراؤ ہوتا ہے جس سے اس کی ڈرامائی فضا

ہے اور دلچسپی اور SUSPENSE کا احساس ہر جگہ جاگزیں نظر آتا ہے۔
واقعات کی پیش کش میں تاج نے ہر جگہ ڈرامائی لوازم قائم رکھے ہیں۔ تصادم کی لطیف ترین گھڑی رقص گاہ ہے۔ جہاں اکبر انارکلی کی آنکھوں کے اشاروں کو دیکھ لیتا ہے۔ انارکلی، سلیم اور اکبر تینوں کے عکس آئینے پر ٹکراتے ہیں۔ غالباً آئینہ بھی ایک علامت ہے زندگی کا ؎

سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

یہی انارکلی اور سلیم کی محبت نے اس پر عمل نہ کیا اور یہ شیش محل پگھل جاتا ہے۔

اکبر کی خود کلامی باعتبار تصادم، شدت جذبات اور المیہ بہت کامیاب ہے۔ اکبر کی شخصیت وہاں ملفوف نہیں بلکہ بالکل خود کلامی میں اکبر کے المیہ کی شدت بہت زیادہ ہے۔ خود کلامی کی پیش کش اور واقعات کے دھارے میں ایسا معلوم ہوتا ہو یا جاتا ہے۔

۔ ڈرامہ میں چونکہ واقعات و حالات کے اثرات براہ راست رُونما ہوتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں اس لئے اس میں مکالمہ ایک معتبر وقیمت رکھتی ہے اور ڈرامہ کی کامیابی، ناکامیابی کی ضامن بھی یہی ہوتی ہے۔ الفاظ کا انتخاب، لب ولہجہ کا اتار چڑھاؤ داخلی وخارجی کیفیات وحالات کی تشریح کرتا ہے اس لئے مکالمے کو زوردار، مختصر اور بامعنی ہونا چاہیئے۔ تاج نے مکالمہ کے فرائض بحسن وخوبی انجام دئے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ گئے ہیں کی رومانیت کے شکار ہو گئے ہیں۔ پھر بھی مجموعی طور پر انھوں نے مکالمہ نگاری میں بڑی صناعانہ ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔

بر کے مکالمے ایک پُروقار شہنشاہ کے دبدبے، رعب اور وجاہت وحشم کے اعتبار سے بڑے کامیاب اور برمحل ہیں۔ الفاظ کی اور اس کا صوتی رعب ودبدبہ ایک بادشاہ کی فطری اُفتاد کے مطابق ہے۔ اُس کے مکالمے سے اکبر کا داخلی وخارجی کردار سامنے آتا ہے۔ دراصل اچھی مکالمہ نگاری کردار نگاری کے حسن وجمال میں اضافہ کرتی ہے۔ سلیم کے مکالمے ایک لاابالی پرواہ شہزادے کی فطرت کے غماز ہیں۔ اس کے مکالمے میں شعریت کا عنصر دراصل سلیم کی رومانی نفسیات کے متقاضی ہے۔ البتہ مکالمے میں طوالت زیادہ ہے اور الفاظ کی زیادتی اور اس کا ظاہری حُسن معنی ومطلب کے لئے حجاب بن جاتا ہے۔ پھر بھی سلیم کے مکالمے رومانی مکالمہ کے نمونے ہیں۔

ڈرامہ میں سب سے اہم مکالمہ دل آرام کا ہے۔ اس کے یہاں اختصار بھی ہے زور وجوش بھی اور معانی ومطالب کے اعتبار سے بہت دلنشیں ہے۔ پھر یہ کہ الفاظ بامحل اور برمحل لائے گئے ہیں۔ لب ولہجہ سے اُس کی داخلی فطرت کا اندازہ ہو جاتا ہے پر تاج سے فطرت بھی ہو گئی ہے۔ مثلاً انھوں نے "خواجہ سراؤں" "بیگمات اور کنیزوں کی گفتگو کے انداز اور لب ولہجہ میں کوئی رکھا۔ یہ اچھی فنکاری کی دلیل ہیں۔ خطابت کے اعتبار سے الفاظ کا استعمال تحسین آمیز ہوتا ہے۔

بن مجموعی طور پر تاج کے مکالمے ڈرامے کی بنیادی ضرورتوں کو از ابتدا تا انتہا قائم رکھنے میں بہت ہی مدد ومعاون ہیں اور اس کی ڈرامائیت اور دلچسپیت کی نفاست میں دلکشی، رعنائی اور جاذبیت پیدا کرتے ہیں

شعر یہ کہ فنی اعتبار سے "انارکلی" اُردو ڈرامہ نگاری کا ایک شاہکار ہے۔ اور بلاشبہ تاج آغا حشر کے بعد اُردو کے سب سے کامیاب اور عظیم ڈرامہ نگار ہیں۔

●

بقیہ افسانہ ایک رات صفحہ ۳۱

نکل کر نے دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

لوگ ۔ تم لوگ خوش قسمت ہو کہ تمہارے پاس ہنر موجود ہے ۔ مگر ہمارا ——— اس مغرب کا

۔ ۴؎

سلام مچھلی شہری

خدا جانے

number
D 95

کب ٹھہرے گا یہ دورِ ایام خدا جانے
کب رقص میں آئے گا پھر جام خدا جانے

کیا لائیں گے رنگ اپنے اوہام خدا جانے
یہ صبحِ درخشاں ہے یا شام خدا جانے

تجدیدِ محبت کے افسانۂ رنگیں کا
آغاز تو بہتر ہے انجام خدا جانے

آثار تو کہتے ہیں اب دور نہیں منزل
ہو جائیں نہ راہوں میں ناکام خدا جانے

اربابِ سیاست کے احکام تو جاری ہیں
کیا ہوگا محبت کا پیغام خدا جانے

معصوم تماشائی فرزانوں سے عاجز ہیں
کب آئے گا محفل میں خیام خدا جانے

رندوں نے سلام اپنا معبد تو سجایا ہے
اب شیخ و برہمن کا پیغام، خدا جانے

شاذ تمکنت

غزل

جفا آسودۂ وفرقت شناسا کر دیا تُو نے
خبر بھی ہے تجھے اے بے خبر کیا کر دیا تُو نے

شروعِ عشق کے قصّے بھلا بیٹھے تھے ہم دل سے
مآلِ عشق پر اُن سب کو تازا کر دیا تُو نے

تری اُمید پر کیا کیا ادھورے کام چھوڑے تھے
ہجومِ فکرِ حسرت میں تہنا کر دیا تُو نے

وہ کیا رِیلا تھا کیوں کر ہاتھ چھوٹے، کس کو سمجھاؤں
بھرے میلے میں دُنیا کے اکیلا کر دیا تُو نے

مری کھوئی ہوئی باتیں ترے غم کی مناجاتیں
مرے پندار کو عجزِ سراپا کر دیا تُو نے

مری آواز آئی یا تری زنجیرِ درگونجی
مری خاموشیوں کو بھی تقاضا کر دیا تُو نے

کہاں جاؤں مجھے پہچاننے والا نہیں کوئی
ہر آئینہ کے آگے جیسے رُسوا کر دیا تُو نے

میں تیرے واسطے دُنیا کو ٹھکراتا رہا برسوں
جسے ٹھکرا دیا تھا کیوں اُسی کا کر دیا تُو نے

پرائے آج اپنے ہو گئے تیری نگاہوں میں
مجھے اپنا سمجھ کر کیوں پرایا کر دیا تُو نے

چُراتا پھر رہا ہوں اپنی آنکھیں غمگساروں سے
کچھ ایسا لگ رہا ہے مجھ کو جھوٹا کر دیا تُو نے

لکیر اک کھینچ دی میں نے مقدّر کے نوشتہ پر
جلی حرفِ محبّت کو شکستہ کر دیا تُو نے

سحر کا خوف، دن کا ولولہ، شب کی گراں جانی
کہ یوں مر مر کے جینا میرا حصّہ کر دیا تُو نے

کہاں اب حشر تک کوئی توقع تیرے پانے کی
خدا جانے یہ کیسا حشر برپا کر دیا تُو نے

کڑے کوسوں بھی تیری یاد کا دامن نہیں چھوٹا
کہ خُوشبوئے وفا کو دشت پیما کر دیا تُو نے

خراش اک چیخ کی جس طرح سناٹے کے چہرے پر
کچھ ایسا ہی مرا حالِ تمنا کر دیا تُو نے

مرے اشعار کو خاموشی و سنجیدگی دے دی
مرے نغموں کو پچھلے کا وصنہ لکا کر دیا تُو نے

ترا دامن گلستاں ہو کہ مدفن شاذ کے حق میں
بہر صورت مجھے اشکِ چکیدہ کر دیا تُو نے

رام لعل

پورٹریٹ نمبر دو

بارش ابھی تک جاری تھی۔ مسافروں کی بھیڑ کے کارن بس اسٹینڈ کی پکی زمین دیکھتے دیکھتے کچڑ اور دلدل سے ڈھک گئی تھی۔ ٹین کی چوڑی چھت والی چھاں سیمنٹ کا فرش تھا کیچڑ لوگوں کے جوتوں کے ساتھ لگ لگ کر اندر چلا آیا تھا۔ بسوں کے اندر بھی وہی کیچڑ پھیلا ہوا تھا۔ سبھی جانتا تھا ہم سارے ہی انسان کیچڑ میں رہتے ہیں۔ کسی کو اپنے جوتوں اور کپڑوں کے خراب ہونے کا احساس نہیں ہے۔ بیچ کے حصے کو تھوڑی اسپیس بنا رہا تھا وہاں بھی میرے قریب ایک شخص نے اپنے پیروں سے کیچڑ کے نشان چھوڑ دیئے تھے۔

صبح سے دوپہر تک صرف دو بسیں چھترپور سے آئی تھیں ایک تو اور ہی چلی گئی تھی۔ دوسری جسے خوبپوری جانا تھا۔ پانی سے سڑک کٹ جانے کی وجہ سے وہیں رکی ہوئی تھی۔ اب سارے ہی مسافر یہاں وہاں بچوں یا اپنے سامان کے اوپر مایوس صورتیں لئے ایک دوسرے کو بے مقصد گھور رہے تھے یا اپنے کو کیچڑ بنا رہا تھا۔

ایک عورت سوئیٹر بن رہی تھی۔ گود میں روتا ہوا شیر خوار بچہ بھی لئے ہوئے تھی۔ اسے چپ کرانے کے لئے بار بار چمکارتی اس کے منہ میں دودھ کی بھی اس طرف کی نپل منہ مارتے مارتے ذرا دیر کے لئے سو جاتا۔ دودھ پینا چھوڑ دیتا اور عورت کی چھاتی ننگی لٹکتی رہتی اور وہ سوئیٹر بننے چلی جاتی۔

ایک بوڑھا پوٹلی کو گھٹنوں پر پھیلائے اپنی سوکھی روٹی بڑے مزے سے چبا چبا کر کھا رہا تھا۔ ہر لقمے کے ساتھ ہی مرچ کو بھی ذرا سا دانتوں سے کاٹ لیتا۔ لقمہ چبانے اور نگلنے میں اسے کم سے کم تین چار منٹ لگ جاتے۔

چار مسافر ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے ساتھ چپکے سے کھڑے تھے۔ انہیں ٹکٹ ملتے تھے نہ ہی بسوں کے آنے جانے سے متعلق کوئی اطلاع ہی دی جا رہی تھی۔ وہ اندر بیٹھے ہوئے بابوؤں کے چہرے ہی تاکے جا رہے تھے۔

چھوٹے سے بکسٹال پر کچھ اڑے کے فلمی پریوں کی تصویروں سے من بہلا رہے تھے۔ بکسٹال کا مالک خود کوئی جاسوسی ناول پڑھنے میں منہمک تھا۔ ایک بنچ پر دو پولیس والے ایک آدمی کو ہتھکڑی لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کا ملزم نیچے زمین پر بیٹھا بڑے اطمینان سے بیڑی پی رہا تھا اور کھانس کھانس کر حاکموں پر تھوک رہا تھا۔

پھل والا اپنے مجبوبے میں امرود اور کیلے رکھے اونگھ رہا تھا۔ اس کے پاس کتنی دیر سے کوئی گاہک نہیں گیا تھا۔

کیچڑ بناتے بناتے اچانک میری نگاہ ایک چالیس پینتالیس برس کے آدمی پر جا ٹکی جو اپنے ٹرنک پر بیٹھا سگار پھونک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جس کا اخبار تھا جسے اب وہ پڑھ نہیں رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اخبار کو وہ کئی بار الٹ پلٹ کر پڑھ چکا تھا۔ اب اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اب وہ اپنے سگار کے دھوئیں کو ہی گھور رہا تھا۔ اس کے لئے وقت کاٹے کٹ نہیں رہا تھا۔ بلکہ وقت ہی اب اسے کاٹ رہا تھا۔ اس کے بھنچے ہوئے جبڑوں پر گہری جھریاں پڑ چکی تھیں۔ شیو بڑھ چکا تھا۔ وہاں تازگی کی کوئی جھلک موجود نہیں تھی۔

میں اسے پہچانتا تھا۔ اسے کم سے کم دس سال کے بعد دیکھا تھا۔ وہ بہت بدل چکا تھا۔ اس کا چہرہ، اس کے بال، جسم، سارا ہی شخصیت ہی

وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا اس لئے میں اُس کا اسکیچ بنانے میں لگا رہا۔ ساتھ ساتھ لتیکا کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اس کی بیوی تھی۔

دلّی میں پٹودی ہاؤس کے پیچھے ایک سہ منزلہ مکان میں ہم کبھی کبھی اکٹھے ہوتے تھے۔ کچھ ہی مہینے میں اُوپر کے فلیٹ پر تھا یہ لوگ نیچے تھے نچلی منزل چھ فلیٹوں میں کئی عورتیں تھیں۔ طرح طرح کی۔ اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر ان سب کے اسکیچ بنائے تھے میں نے۔ لتیکا ان سب میں منفرد عورت تھی۔ اپنے لمبے بالوں، اور متناسب جسم کی وجہ سے ہی نہیں۔ کیرالا کے ساحلی علاقوں کی ایک دلفریب مسکراہٹ بھی اُس کے پاس تھی۔ جو بات اپنی لگتی تھی۔ رُوح تک پہونچنے والی اور عجیب عجیب سپنے دکھانے والی سمندر کی طرح گہری نیلی اور اداس اداس آنکھیں بھی تھیں اس کے پاس۔ میں نے مل کالے رنگ کی ایسی دلکش عورت اور کہیں نہیں دیکھی۔

پہلے میں نے لتیکا کو چھپ چھپ کے دیکھا۔ سامنے ہوتے ہی دل کو گھبراہٹ سی جکڑ لیتی تھی۔ ایک عجیب سا احساس کمتری طاری ہو جاتا تھا میں بیٹھ کر ہی اس کے اسکیچ بناتا رہا۔ دن کا بیشتر حصہ وہ بالکونی میں گذارتی تھی۔ جب وہ مہدی حسن کے ساتھ بیٹھ کی چائے پیتی تھی۔ بیٹھ کا پیر پر پیر رکھے مہدی حسن کو دفتر جاتے وقت جھنجلے پر بالکل جھک کر ٹاٹا کہتی تھی۔ کبھی کبھی بال سکھانے کے لئے دھوپ میں کرسی ڈال کر لیٹ جاتی تھی۔ اڑوس پڑوس کی عورتوں کو چائے پلانے کے لئے بھی یہیں بٹھا لیتی تھی۔

میں نے اس کے بیشمار اسکیچ بنائے تھے۔ ان دنوں میں ہندی اور انگریزی کے دو ڈیلرز کے ساتھ وابستہ تھا۔ وہاں لتیکا کے کئی فوٹو چھپے تھے۔ لیکن کوئی بھی لتیکا کے بارے میں نہ جان سکا۔ ایک دن میں نے لتیکا کا پورٹریٹ بنانے کا ارادہ کر لیا۔ اس دن مجھے سخت بخار آ رہا تھا۔ لیکن میں اپنے کمرے سے نکل کر اس کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اپنے ساتھ اس کے سارے ہی اسکیچ اٹھا کر لے گیا تھا۔

اس نے ایک عجیب سکراہٹ کے ساتھ میرا سواگت کیا۔ اپنے اسکیچ دیکھے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس انکشاف سے وہ بے حد مسرور ہوئی کہ کوئی اسے ایک مدّت سے چھپ چھپ کر دیکھتا رہا ہے۔ میں نے اس کا پورٹریٹ بنانے کی اجازت چاہی تو وہ گھبرا گئی۔ ڈر گئی۔ پھر اس نے میری طرف سیدھی نظر سے دیکھا۔ جس میں انکار بھی نہیں تھا۔ وہ سب سے چھپ کر میرے سامنے آ کر بیٹھنے کا خطرہ مول لے سکتی تھی۔

میں ایک عجیب سی مسرت سے کانپتا ہوا دو تین تین سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتا ہوا اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ میرا کمرہ بہت گندا رہتا تھا۔ ہر طرف گرد، کاغذات، کینوس، رنگوں کی ٹیوبیں، پنسلیں، برش، سگریٹ کی خالی ڈبیاں، کھانے کی جھوٹی پلیٹیں، بیئر اور شراب کی بوتلیں، گلاس کتابیں، رسالے۔ جیسے کسی کباڑی کا اسٹور ہو!

لتیکا کے آنے تک میں کچھ بھی نہ ٹھیک کر سکا۔ وہ اچانک ہی وہاں آ کر کھڑی ہو گئی۔ بکھری ہوئی چیزوں کے ٹھیک درمیان۔ وہ ہر چیز کو غور سے اور دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ جو نے کے ساتھ میں رہتا تھا۔

وہ مجھ سے ذرا لمبی تھی۔ مجھے سر اٹھا کر ہی اس کی آنکھوں میں دیکھنا پڑتا تھا۔ میں نے اُس کے سامنے خود کو کسی قدر چھوٹا محسوس کیا۔ اُسے جلدی سے بیٹھنے کے لئے کرسی دے دی۔ وہ بیٹھ گئی تو اسے ذرا فاصلے پر جا کر دیکھنے لگا۔ اس کا جائزہ لینے لگا۔ اُسے کس زاویے سے بٹھاؤں۔ وہ کس طرف دیکھے۔ میری طرف یا کھڑکی سے باہر۔

اس وقت اس کے بال کھلے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ "بالوں کو سمیٹ لیجئے۔" تو وہ بالوں کو جلدی جلدی ایک گٹھری کی طرح لپیٹ کر مسکرا دی۔

میں نے سوچا بال اس کے آگے پڑے ہوں تو وہ زیادہ جاذب نظر ہو گی۔ اُس سے کہا۔ "بال کھول کر آگے ڈال لیجئے تو۔"

اس نے ویسا ہی کیا۔ صرف مسکراتی رہی۔ جیسا میں چاہتا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر اس کے بال سمیٹے تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس سے قبل کسی عورت کے بال سمیٹتے وقت میری یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی۔ وہ میری طرف بڑی بڑی اداس آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ بولی۔ "آپ کو تو تجربہ ہے۔"

اُسے کوئی جواب دینے کے بجائے میں ایزل پر کینوس چڑھانے چلا گیا۔ وہ تب بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں سے بچنے کے لئے میں نے کھڑکی کی طرف دیکھنے کے لئے گھوم کر میز پر جھکے جھکے سر کو گھما کر مسکرا دی۔

ئی روز تک آتی رہی۔ دن میں جب بھی اکیلی ہوتی اور فرصت پا جاتی اور مجھے گھر پر دیکھ لیتی تو جھٹ اُوپر چلی آتی۔ اُس کا پورٹریٹ بنانے ے اپنی ساری محنت اور صلاحیت صرف کر دی۔ اس پورٹریٹ کو میں نے انتہائی شدّتِ احساس کے ساتھ بنایا۔ اُسی شدت ں کے ساتھ جس میں اپنے اپنے وقت کے ماہر بھی مبتلا رہے ہوں گے۔ ٹشیان، ذوی وِنچی، مائیکل اینجلو، ربرو، جیل وغیرہ۔ اپنا بنایا ٹریٹ مونالزا کا سا پورٹریٹ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس پورٹریٹ کے لئے تاریخی حالات بھی موافق تھے۔ اپنے زمانے کے رویّے اور ں بھی۔ لیکن پھر بھی لیٹیکا کے پورٹریٹ کو میں اپنے زمانے کی مونالزا کا ہی پورٹریٹ سمجھتا تھا۔ اسے بناتے وقت میری نس نس میں اک آگ سی ہی تھی۔ میں سر اٹھا کر لیٹیکا کی طرف دیکھتا اور اس کی اداس مسرور آنکھیں اپنے اوپر گڑی ہوئی پاتا تو میرے اندر کی آگ اور بھی تیز ہو اٹھتی، یاں کانپنے لگتیں۔ اس سے پہلے کوئی عورت میرے جذبات پر اس طرح قابو نہیں پا سکی تھی۔ لیٹیکا میرے لئے ایک خلبہ بن گئی تھی۔ آرٹ تخلیق اور تکمیل کا غلبہ۔ میں کہہ سکتا ہوں وہ میرے سامنے آنے سے پہلے بھی میرے ذہن کے کسی گوشے میں یقیناً رہ رہی تھی۔ جب پورٹریٹ بنا رہا تھا اس وقت بھی وہ میرے خوابوں میں رہتی تھی۔ لیکن اس کی شکل و صورت اس قدر صاف اور واضح دکھائی دیتی ں اس کے جسم کے سارے ذرّات تک گن سکتا تھا۔ اس کی ساری دلربائی کینوس پر منتقل ہوتی چلی آئی تھی۔ جو بے حد خوشگوار ور بے حد پُراسرار بھی۔ سراب اور حقیقت کا ایک امتزاج بھی خواب اور حقیقت کی کوئی عجیب سی آمیزش بہت عمل میں آسکتی ہے تو ہت اس تصویر میں پوری طرح موجود تھی۔

جب تصویر مکمل ہو گئی اور میں برش کی نوک سے اس پر رنگ کا آخری نشان بھی لگا چکا تو اچانک میں نے محسوس کیا وہ میرے کاندھے سے سسک رہی ہے۔ اس کے رونے کا سبب میں نہ سمجھ سکا میں اپنے جذبات میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ میرے لئے پورٹریٹ کے مزید کھڑے رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ پچھلے تین روز سے میں شراب اور ہیروئن کے سہارے کام کر رہا تھا۔ میں بہت کمزور ہو گیا تھا شاید زنہ ں میں نے خود کو گرنے سے بچایا۔ اسے بھی سہارا دیا اور ہم ایزل کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔

اس پورٹریٹ نے لیٹیکا کے اپنے احساسِ حُسن کو بڑی تقویت پہونچائی تھی۔ اس کی دلکشی کی تعریف کئی لوگوں نے کی تھی لیکن اس تی کی عظمت کا اعتراف پہلی بار میں نے کیا تھا۔ اس اعتراف کے بعد وہ جان تک دے دینے کے لئے تیار نظر آئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی وریکی جب نمائش ہو اور لوگوں کی نظر خود لیٹیکا پر بھی پڑے تو وہ کسی صدمے کا شکار ہو جائیں۔ اس نے یہ بات اپنے دل میں بٹھا لی تھی یر کے مقابلے میں اس کی اپنی حقیقت کچھ نہیں ہے۔

وہ میری گود میں سر رکھ کر سسکتی رہی۔ اسے میں نے گلے سے لگایا۔ شدّتِ جذبات سے اُسے بار بار چوما اور اُسے یقین دلانے کی کوشش کی "یہ تصویر ا نہیں ہے جتنی تم سمجھتی ہو۔ تمہاری خوبصورتی اس کے سامنے ماند نہیں پڑ سکتی۔ تمہارے اندر جو ماڈل ہے اسے تو بھی ڈسکور کرنا ہے، اسے یوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مجھے بھی وہ سب زاویے معلوم کرنے ہیں جو اب تک کی بنائی تصویروں پر سبقت لے جائیں۔"

اُسے میری باتوں پر یقین نہ آیا۔ اگرچہ میری درخواست پر کئی بار پھر میرے سامنے گھنٹوں بیٹھی۔ میں نے اس کے کئی نیوڈ بنائے۔ اس نے اپنا سب کچھ میرے کر دیا تھا۔ وہ اپنا سب کچھ اب میرا ہی سمجھتی تھی۔ اس پر میرا بھی اتنا ہی حق مانتی تھی جتنا اس کے شوہر کا تھا۔ جیسے اس کے اور میرے تعلقات کا کوئی علم تا۔ نہ ہی ان لمحات و راتوں کا جو میری شہرت کا باعث بن رہے تھے۔ ہم دونوں کسی خوف یا احساسِ گناہ کا شکار بھی نہیں ہوئے۔ جیسے کچھ ایک معمول کے مطابق چلتا رہا۔ جیسے زندگی کا اپنا معمول ہوتا ہے جیسے حالات اپنے طور پر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ دل و دماغ تو مطمئن والی یکسانیت کے ساتھ۔ بنا کسی روکاوٹ کے، بنا کسی خلجل کے۔!

چاس سے زیادہ نیوڈ بنانے پر بھی میں کسی ایک سے بھی مطمئن نہ ہو سکا۔ وہ مجھ پر ہنستی تھی مجھے شکست مان لینے کے لئے کہتی۔ کیونکہ اس کا ال پکچر اس تصویر سے بہتر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ جسے میں انتہائی شاہکار کہتا تھا۔ اس کے زرد مضطرب چہرے کو میں اسی کامیابی سے پینٹ نہ کر سکا ا کے چہرے کی وہ کیفیت، اب بھی گرفت سے باہر ہو چکی تھی۔ اس کی غیر معمولی قوتِ اس کی جلد میں سے ایک ہی بار نچوڑ کر میں نے پیش کر دیا تھا ا نے مل کر جو جذبہ ایک بار ابھار لیا تھا اسے پھر سے ابھار نہ سکا۔ لگتا تھا خود اس کے لئے بھی اپنی وہی اتھاہ مسکراہٹ نیوڈوں پر

پیدا کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ جب تک وہ میرے جسم میں داخل نہیں ہوتی تھی میری انگلیاں ایک عجیب سی تھرتھراہٹ لئے ہوئے کام کرتی رہتی تھیں۔

ایک روز میں کسی خاص رنگ کی تلاش میں تھا۔ وہ ٹیوب میرے ہاتھ میں آنے کے بجائے پھسل کر ایک گرسی کے نیچے جا پڑی۔ میں نے لمحہ بھر کرسی کو مسل کر رکھ دیا۔ کرسی کی رکاوٹ مجھ سے برداشت ہی نہ ہو سکی تھی۔ لیکن اب مجھے اس طاقت اور جوش کا یقین نہیں ہوتا تھا۔ صرف اس بات کا یقین ہوتا تھا کہ جسموں کے اتصال سے خیالات کا اتصال کہیں اہم ہے۔ کہیں زیادہ بڑا ہے۔ کہیں زیادہ مؤثر اور حقیقی ہے۔

کوئی اور اتنی اچھی تصویر نہ بنا سکنے پر میں مایوس ہو گیا۔ میں نے اس مکان کو چھوڑ دیا۔ اپنی شاہکار تصویر ایک آرٹ گیلری کے حوالے کر دی۔ میرے شوخ کی پرورش ہوتی رہی تھی میں نے دلی بھی چھوڑ دی۔ میرے اچانک چلے جانے سے لیتکا بہت حیران ہوئی ہو گی۔ اسے میرا یہ رویہ بہت عجیب لگا ہو گا۔ میں واقعی ایک عجیب سی ذہنی کیفیت میں مبتلا تھا۔ میں نے ریل سے ساؤتھ تک کا سفر پلان کیا۔ جگہ جگہ گاڑیاں اور کمپارٹمنٹ بدل بدل کر بھوکا رہ کر، میلا کچیلا رہ کر اور ایک دن پکڑا بھی گیا۔ چھ مہینوں کے لئے جیل میں بند کر دیا گیا۔ جب رہا کیا گیا تو پھر آوارہ گردی اختیار کر لی۔ اسی طرح بلا سفر کرتا رہا۔ کبھی گاڑی سے کبھی پیدل بھی۔ کبھی کبھی کسی راہ رو کی مہربانی سے کار یا ٹرک سے بھی گیا۔

میں ہندوستان سے باہر چلا گیا۔ کئی ملکوں میں رہا۔ ملایا، سنگاپور، جاپان، روم، فرانس، امریکہ۔ وہاں بہت سے لوگ دیکھے۔ بہت سے لوگ ملے۔ بہت سے آرٹسٹ اور بہت سی عورتیں۔ جو لیتکا سے زیادہ گوری تھیں۔ زیادہ نرم اور شوخ تھیں اور حد درجہ اوباش تھیں۔ اور ذہین تھیں اور آزاد تھیں۔ آدمی اور عورت کے تعلقات کے بارے میں کافی نڈر اور حقیقت پسند بھی تھیں لیکن ان میں لیتکا کا بدل ایک بھی نہیں تھی۔ میں نے لیتکا کو ہمیشہ یاد رکھا۔ اسے بھلانے کی کوشش بھی بے حد کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

اب پھر میں اپنے دلیش میں تھا۔ ایک بس اسٹینڈ پر اچانک مہدی حسن کو دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ لیکن میں اپنی حیرت اور خوشی کو چھپا کر اس کا پیچھا کرتا رہا۔ جب اس نے اپنی محویت سے نکل کر سر گھمایا تو میں نے بھی ہاتھ روک لیا۔ فائل بند کر کے اور اپنا ایئر بیگ کاندھے سے لٹکا کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

مجھے دیکھ کر وہ بھی حیران ہو اٹھا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کر بولا "اچھا تم وہی آرٹسٹ ہو، وہی ناجودی میں ہمارے اوپر رہتے تھے وہی نا!"

میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس نے پوچھا "آج کل کہاں رہتے ہو؟ ادھر کیسے گھوم رہے ہو؟"

میں نے اسے بتایا "آج کل بمبئی کی ایک ٹیکسٹائل مل کے لئے ٹیکسٹائل ڈیزائن بناتا ہوں۔ پبلسٹی کے لئے۔ اب کمبخت راڈ جا رہا تھا بار بار ٹھوکر کی وجہ سے بس نہیں مل رہی ہے۔"

"میں بھی وہیں جا رہا ہوں آؤ بیٹھو۔"

اس نے اپنے ٹرنک پر سرک کر تھوڑی سی جگہ میرے لئے بھی پیدا کی۔ لیکن میں نے کہا "چلئے کہیں بیٹھ کر کافی یا چائے پئیں۔ یہاں تو وقت گذارنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ بس نہ جانے کب تک آئے!"

"بس آئے گی تو فوراً ہی۔ تباتے ہیں چھ گھنٹے لیٹ ہے۔"

وہ میرے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔ اس کا سامان بکنگ آفس میں رکھوا دیا گیا۔ جب ہم باہر آئے تو وہ بولا "میرے پاس وہسکی ہے کہو تو وہی پئیں۔"

میں نے انکار نہ کیا۔ وہسکی لے کر ہم تانگے میں جا بیٹھے۔ بس اسٹینڈ اور مرکٹ ہاؤس تک کئی ہوٹل تھے۔ جو بے حد غلیظ تھے۔ کپڑے لتہ پتہ فروش والے اور گاہکوں کے شور سے گونجتے ہوئے۔ ہم وہیں ایک جگہ بیٹھ گئے۔

"میں بھی اب دلی میں نہیں رہتا۔ جب سے میری بیوی کا انتقال ہوا ہے۔"

میں حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ یقین نہ آیا۔ اس نے لیتکا کے بارے میں یہ کہا ہے۔ لیکن میں نے اپنی ساری حیرانی ایک ہی لمحے میں ایک

نٹ میں حلق کے نیچے ناردی۔ لیکن تب بھی میرے دل کو جیسے کسی نے مضبوط مٹھی میں کس رکھا تھا۔

"تمہیں یاد ہے نا میری بیوی؟ اسی مکان میں میرے ساتھ ہی تھی۔ آتے جاتے کبھی نہ کبھی اُسے ضرور دیکھا ہوگا۔"

میں نے ایک گھونٹ اور لگا۔ کہا کچھ نہیں۔

"جس کی موت نے مجھے بے حد اُداس بنا رکھا ہے۔ تم جانتے ہو میں دوئی کا رہنے والا ہوں۔ ناسک میں پیدا ہوا لیکن میں نے شادی ایک کرسچن عورت جو ساؤتھ انڈیا کی رہنے والی تھی۔ دراصل مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن پہلی نظر میں نہیں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "میں پہلی نظر کی محبت کا قائل نہیں ہوں۔ پہلی نظر تو بس چونکا دیتی ہے۔ ایک خیال دے دیتی ہے۔ خواب دیکھنے کی دعوت لیکن جب جسم کی کشش اپنی طرف کھینچتی ہے تبھی آدمی کے دل میں محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔"

میں کچھ عرصے کے لئے کوچین گیا تھا۔ یہ لڑکی مجھے وہیں ملی تھی۔ کسٹم آفس میں ٹائپسٹ تھی۔ شمال کے لوگوں کے لئے اس کے اندر بڑی خراش تھی۔ اس نے میرے سامنے ہم لوگوں کی بہت تعریف کی۔ جتنے دن میں وہاں رہا وہ مجھے ملتی رہی۔ اپنے گھر لے گئی۔ اپنے ماں باپ سے ملوایا۔ میں نے سوچا کہ چلنے کا جو اپنی ظاہر کی تو وہ فوراً راضی ہو گئی۔ والدین نے بھی اجازت دیدی وہ اجازت دیتے تو بھی وہ میرے ساتھ چلی آتی۔ ہم ایک دوسرے سے عشق کرنے لگے تھے۔ اُس نے یہ بتاتے وقت اس کے چہرے پر بہت ہی پُر جلال اور غلیظ مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ شراب نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن وہ اور زیادہ افسردہ ہو گیا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اس کے اس طرح رو پڑنے کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ مجھے معلوم نہیں تھا وہ اپنی عورت سے اس درجہ لگاؤ رکھتا ہے۔ میں نے فائل سے اس کا کیس نکالا۔ اور اسے مکمل کرنے لگا۔

روتے روتے وہ خود ہی چپ ہو گیا۔ اب اس کی آواز پہلے سے زیادہ بھاری اور ڈراؤنی لگی۔ "میں جب اپنے عشق کی بات کرتا ہوں تو مجھے کتنے ہی ہور لوگوں کے عشقیہ قصے یاد آجاتے ہیں۔ ہمارا عشق کسی کے عشق سے کم درجے کا نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کے لئے ترستے تھے۔ جب ملتے تھے تو دوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹ جاتے۔ بعض لوگ میرے قد پر ہنستے ہیں۔ لیکن اس نے میری اونچائی کو ہمیشہ پسندیدگی سے دیکھا ہمیشہ اس کی وہ خود بھی تو لمبی تھی۔ عام ہندوستانی عورتوں سے اونچا اور دلکش۔ اس کا رنگ ذرا کالا نہ ہوتا تو اس کا شمار دنیا کی حسین ترین عورتوں میں ہوتا تھا۔ لیکن میرے لئے تو حسین ترین ہی تھی۔ مجھے معلوم تھا لوگ اس کی طرف پلٹ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اس کے ساتھ تانگ کرنے کیلئے ترستے تھے بعض اُس پر شعر بھی کہتے تھے۔ کچھ لوگوں نے اس کے قریب ہونے کے لئے ہی مجھ سے دوستی پیدا کرنا چاہی تھی۔ لیکن وہ بہت نیک اور ذہین تھی۔"

اس کی آواز اور بھی بھاری ہو گئی۔ اس کا گلا بھر آیا۔ وہ کئی بار کھنکارا۔ چند گھونٹ اور پیئے۔ پھر باہر دیکھنے لگا۔

میں گھٹنوں پر کاغذ پھیلائے پنسل چلاتا رہا۔ اس کی باتیں بھالے کی نوک کی طرح میرے دل میں چبھ رہی تھیں۔ وہ آدمی مجھے بہت ہی اچھا معلوم ہوا بہت بھلا اس سے الگ ہو جانے کو جی نہ چاہا۔

اُس کا چہرہ اپنی پوری مماثلت کے ساتھ ابھر رہا تھا۔ اپنی شخصیت کے پیچیدہ اور طلائم تاثر کے ساتھ۔ اُس نے اپنے لئے ایک پورا سین بنا کر کہا۔ "میں اپنی بیوی کی پاکیزگی کی تعریف کر رہا تھا نا! پاکیزگی کے بارے میں میرا تصور وہی ہے جو عام آدمی کا ہے۔ پاکیزگی کے بارے میں یہ تصور بھی ایک سا ہے۔ پاکیزگی دراصل مرد کی فوقیت اور اس کے دباؤ کی علامت ہے ورنہ آدمی اور عورت کی بنیادی خواہشات اور ضروریات میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ میں نے لنیکا کو کبھی کسی سے ملنے سے نہیں روکا تھا۔ کبھی اس پر پابندی نہیں لگائی تھی۔ کبھی اُس پر کڑی نگاہ نہیں رکھی تھی۔ اگر وہ کسی سے ملتے ہوتے، آپ دونوں کی دوستی ہو گئی ہوتی تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا وہ مجھ سے بے اندازہ محبت کرتی ہے۔ بہت بے صبری سے میرا انتظار کیا کرتی ہے لیکن اسے میرا اس ہمیشہ ستاتا رہنا کہ وہ میری خدمت پوری طرح نہیں کر رہی ہے اس بات کی وجہ سے شکایت کیوں نہیں کرتا؟ کبھی غصہ کیوں نہیں ہوتا؟"

وہ مجھے مخاطب کر رہا تھا لیکن جلدی ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھ ڈالے۔ شراب کا ایک گھونٹ

پکار سنگھ سنگھانیا اور اپنے ارد گرد دھوئیں کا ایک بادل سا تان لیا۔ جب بولنے کے قابل ہوا تو کہا۔ ایک دن اچانک میں نے اس کے مزاج میں ایک عجیب سی تبدیلی دیکھی۔ اس نے اپنی سب تصویریں دیواروں سے اتار اتار کر توڑ ڈالیں پھاڑ دیں۔ یہ سب کئی فوٹو گرافروں کی کھینچی ہوئی تھیں۔ کہنے لگا۔ مجھے کوئی تصویر اچھی نہیں لگتی۔ میں انہیں دیکھنا تک نہیں چاہتی۔

"میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اپنی تصویروں کو وہ پہلے تو بہت پسند کرتی تھی۔ اب اچانک اُسے اُن سے دشمنی کیوں ہو گئی۔

"میں نے اس کی تصویریں اتروانے کا وعدہ کیا۔ کئی اچھے فوٹو بنانے والوں کے نام لئے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ میں نے دو ایک آرٹسٹوں کو بھی مدعو کیا تاکہ وہ اس کا پورٹریٹ بنا لیں۔ انہیں بہت سا روپیہ دیا لیکن لیتیکا نے ان کی بنائی ہوئی تصویریں بھی ناپسند کیں۔"

"ایک دن کسی نمائش میں میں نے ایک عورت کا پورٹریٹ دیکھا ہو بہو لیتیکا کا لگتا تھا۔ میں تو دیکھتے ہی دنگ رہ گیا۔ اسے خرید کر گھر لے گیا۔ مجھے یقین تھا اسے دیکھ کر لیتیکا بھی حیران رہ جائے گی۔ خوش بھی ہو اُٹھے گی۔ لیکن اسے دیکھتے ہی پتہ ہے اس نے کیا کہا؟"

میرے سامنے ایک سوالیہ نشان سا کھڑا کر کے خاموش ہو گیا۔ اس کے لب کپکپانے لگے۔ اس کے چہرے پر انتہائی کرب نمودار ہو گیا۔ میں بھی گھبرا اٹھا۔ میرا بھی کانپنے لگا۔ لیکن اس نے کچھ طاقت جمع کر کے کہا۔ "لیتیکا اس تصویر کو دیکھتے ہی چیخ اٹھی۔ کہیں یہ تصویر میری نہیں ہے۔ میری نہیں ہے! اور اس نے تصویر نیچے گرا دی۔ اور خود بھی گر گئی۔ اور ختم بھی ہو گئی! ہمیشہ کے لئے!

میں بھونچکا سا ہو کر اُسے دیکھتا رہا۔ وہ جلدی جلدی گلاس میں سے بچی ہوئی پی رہا تھا۔ شراب ختم کر کے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ بولا "میں چلتا ہوں۔ بس آخری ہو گئی۔"

وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ میں نے ایک نظر اپنے سامنے رکھے ہوئے پورٹریٹ پر ڈالی۔ پورٹریٹ مکمل ہو چکا تھا۔ لیتیکا کے پورٹریٹ کی طرح سوز تھا۔ حقیقی بھی تھا جو کچھ وہ کہتا رہا تھا وہ سب بھی اُس میں موجود تھا۔

فوری آرام کے لیے

جوشینا

جوشینا کے اجزا جسم میں داخل ہوتے ہی تیزی سے سائنس کی نالیوں کو صاف کرتے ہیں۔ زکام کے اثرات کو دور کرتے ہیں۔ حرارت اور اعضا شکنی کو روکتے ہیں۔ اور تسکین پہنچاتے ہیں۔

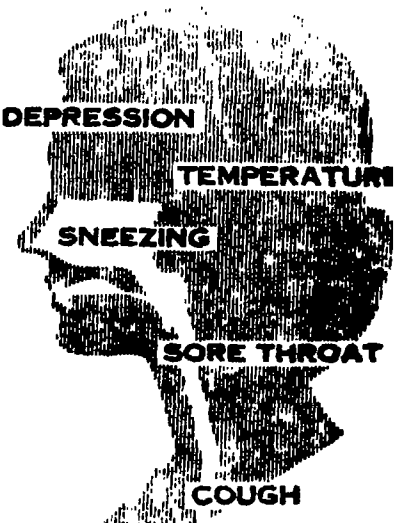

بمقدار

دہلی • کانپور • پٹنہ

GALVANINE

رفعت سروش

روشنی کی نہر

میں ازل سے نُور کا پیغامبر
میں ابد کا چشمۂ آبِ بقا
میں ہمیشہ موت سے لڑتا رہا
کل مری نظریں تھیں حادی نُور کی
آج اندھیرا ہے فضاؤں پر محیط
یہ اندھیرا موت کا ہمرنگ بیشک ہے مگر
اِس اندھیرے میں نہاں کچھ نُور کے دھارے بھی ہیں
زندگی کے سوز کے سیّال انگارے بھی ہیں

میں پُرانا بادہ کش
اِس سے پہلے بھی مجھے پینے پڑے آتش فشاں
اِس سے پہلے بھی مجھے پینی پڑی ہیں بجلیاں
موت نے کب پائی ہے مجھ سے اماں
آج پھر میں قطرہ قطرہ پی رہا ہوں زندگی کے زہر کو
اہرمن کے قہر کو
کل اُگل دوں گا میں لیکن روشنی کی نہر کو

رحمان جامی

سرگوشیاں

یہ اندھیروں کی سرگوشیاں
اُن اُجالوں کے بارے میں
جو میرے حصّے میں آئے ہوئے ہیں
بہت تیز تر ہیں

اور اب میں بھی چپکے سے سرگوشیوں کو
(ذرا اِن اندھیروں سے ہٹ کر)
کھڑا سُن رہا ہوں
مگر مطمئن ہوں
مجھے اِن کی سازش سے خطرہ نہیں ہے
کہ میں تیرہ راہوں سے واقف ہوں
جن میں کئی قافلے کھو گئے ہیں
مگر میں بہرحال اِن تیرہ راہوں میں
کھو کر بھی اک روشنی پا گیا ہوں
بھٹک کر خود اپنا ہی رہبر بنا ہوں
کئی منزلوں کے نشاں جانتا ہوں
مری جستجو، میرا حاصل ہے
میں راہبر ہوں

اور اب یہ اندھیروں کی سرگوشیاں
اُن اُجالوں کے بارے میں
جو میرے حصّے میں آئے ہوئے ہیں
جنھیں میں نے اپنے تجسّس سے حاصل کیا ہے
بہت تیز تھیں
لیکن اب سرد سے سرد تر پڑ چکی ہیں

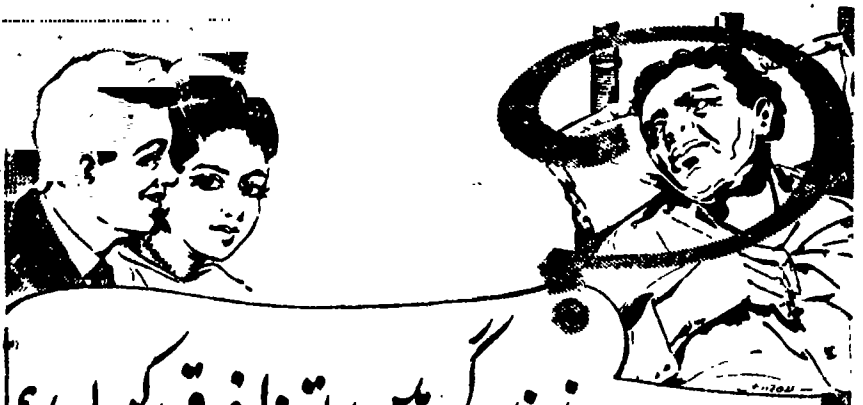

زندگی میں اتنا فرق کیوں؟

آپ ایک طرف اپنی چارپائی پر بے چینی اور مایوسی سے کروٹیں بدل رہے ہیں
دوسری طرف آپ کا ساتھی خوش و خرم آرام سے زندگی بسر کر رہا ہے۔
آپ بھی اسی طرح کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان مرحوم کے قائم کردہ دواخانہ کے

طبی بورڈ کو مفصل حال تحریر کر کے مفت مشورہ طلب کریں۔

نوٹ

آپ کے سبھی خطوط راز میں رکھے جائیں گے

صحیح اور خالص ادویہ کا واحد ضامن
دہلی ایڈمنسٹریشن کے زیر انتظام ایک قومی ادارہ

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۲۲ بلیماران دہلی ۶

ہر جگہ ایجنٹ درکار ہیں۔ تفصیلات طلب کریں

ایجنٹ برائے بمبئی:- میسرز۔ بابا دی دواخانہ ۳۹۳ - پائیدھونی - بمبئی ۳

طنز و مزاح

کنہیا لال کپور

آغا صاحب

Phone : 24
Principal
D. M. College,
MOGA. (Punjab)

D/ 17.12. 1965

علامہ اعجاز صدیقی و مولانا مہندر ناتھ صاحب!

بے شاعر!

آپ کے متعدد نوازش نامے۔ محبت نامے۔ شکایت نامے ملے۔ ان کے علاوہ "شاعر" بھی ملتا رہا۔ لیکن مجھ کم بخت کو ہی وقت نہ ملا۔ کہ آپ کے کسی خط کا جواب دے سکوں۔ گنہگار ہوں۔ شرمسار ہوں۔ یعنی "زندانِ لعنت" میں گرفتار ہوں۔ معذرت چاہتا ہوں۔ سب گناہ آپ کی محبت کے زور پر کیے ہیں۔ یہ بھی جانتا ہوں اگر آپ مجھے بخش دیجیے تو پھر کشتی اور گردن زدنی کسے پھر اینگلے۔

مجھ گنہگار کو جو بخش دیا
تو جہنم کو کیا دیا تو نے!

ایک خاکہ بعنوان "آغا صاحب" "شاعر" کے لیے بھوا رہا ہوں۔ شاید آپ کو پسند آئے۔ اس میں رنگ خود بھر لیجئے گا یعنی اسکی لوک پبلک سنوار لیجئے گا۔ آپ کی نظمیں اور مہندر ناتھ کی کہانیاں اکثر پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ مہینوں پڑھکر آپ دونوں پر رشک اور اپنے آپ پر غصہ آتا ہے۔ کہیں کیا کیا جائے ایں سعادت بزور بازو نیست خدا آپ کو اور شاعر کو زندہ رکھے۔ کرشن چندر صاحب کو میرا سلام پہنچا دیجئے گا۔ اور ایک پیام بھی۔ کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

دوبارہ معذرت کے ساتھ۔ آپ دونوں کا دور افتادہ مداح
کنہیا لال کپور۔ مرحوم و مغفور!!

یُوں تو آغا صاحب نے محنت سے سُن رکھا تھا جس کا نام اُسی کو صلاحیت۔ لیکن اُن کا خیال تھا کہ بہت سی باتوں کی طرح یہ کہاوت بھی ایک ڈھکوسلا ہے چنانچہ جب روزنامہ "پامال" کے شیخ اکبر علی نے انھیں ادارت کے فرائض انجام دینے کے لئے کہا، حالانکہ انھیں اخبار نویسی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ انھوں نے فوراً یہ پیش کش منظور کرلی اور پروفیسری سے استعفا دے دیا۔

اخبار کا جائزہ لینے کے بعد انھیں محسوس ہوا اس کا نام کچھ عجیب سا ہے۔ انھوں نے ایک نہ شُد دو شُد کی مثل پر لاشعوری طور پر عمل کرتے ہوئے اخبار کا نام "پامال" رکھ دیا۔ نیا نام اُن کے علاوہ اُن کے اسسٹنٹ ایڈیٹروں کو بہت پسند آیا۔ لیکن خدا جانے پریس برانچ والوں کو اس نام سے کیا چڑ تھی۔ انھوں نے آغا صاحب کے نام ایک نوٹس جاری کر دیا۔ آپ نے نیا ڈکلریشن داخل کئے بغیر اخبار کا نام بدل دیا ہے۔ اس لئے زیر دفعہ فلاں آپ پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ آغا صاحب بہت سٹپٹائے کہ سر مُنڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ افسروں کی منت سماجت کی کہ ہمیں معمولی خوگزشت کے لئے معاف کر دیا جائے۔ بڑی مشکل سے وہ اس شرط پر راضی ہوئے۔ جب تک نیا ڈکلریشن منظور نہیں ہوتا۔ اخبار بند رہے گا۔

اخبار کے جاری ہونے پر آغا صاحب کو سب سے زیادہ مشکل نظر آیا۔ وہ ہر روز اداریہ تحریر لکھنے کا تھا۔ آغا صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جو کبھی کبھار ایک اچھا مضمون ضرور لکھ لیتے ہیں لیکن یہاں تو ہر روز ایک نہ ایک موضوع پر طبع آزمائی کرنا تھا۔ اس مصیبت سے بچنے کے لئے انھوں نے اپنے پہلے اداریے میں اعلان کیا۔ ہمیں خشک اور غیر دلچسپ اداریوں سے سخت نفرت ہے۔ ہم اس وقت تک کسی موضوع پر قلم نہیں اٹھائیں گے جب تک وہ واقعی دلچسپ نہ ہو۔ آئندہ ہر اداریے کے بجائے مشہور شعراء کے لطائف شائع کیا کریں گے۔ اس کی ابتدا انھوں نے غالب اور ذوق کے لطائف سے کی اور وعدہ کیا کہ اگلی اشاعت میں قارئین کا ہنیانت طبع انشاء اور مصحفی کے لطائف سے کی جائیگی۔ جو لطائف غالب اور ذوق سے منسوب کئے گئے۔ اُن میں سے تین یہ تھے:۔

۱۔ ایک دفعہ ذوق نے غالب کو اپنا مشہور مصرع سنایا۔ کہ ان جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر۔ غالب نے برجستہ کہا۔
"ہم نے یہ مانا کہ دہلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟"

۲۔ ایک دن ذوق نے غالب سے فرمائش کی۔ میرے اس مصرعے پر گرہ لگائیے ع ہر عزخفر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ۔
غالب نے فوراً گرہ لگائی ع نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

۳۔ غالب غزل سنا رہے تھے۔ جب انھوں نے یہ مصرع پڑھا ع غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
تو زوروں کی داد ملی۔ ذوق سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے پکار کر کہا ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

پانچ سات دن یہ سلسلہ خوب چلا۔ اس کے بعد شیخ اکبر علی کو خطوط موصول ہونے لگے۔ یہ کیا مذاق ہے۔ اداریے کے بجائے خود ساختہ اور بے ہودہ لطائف کیوں شائع کئے جا رہے ہیں۔ شیخ صاحب نے آغا صاحب کو فہمائش کی کہ آئندہ لطائف کے بجائے اداریہ شائع کیا جائے۔

اس سے اگلے دن۔ آغا صاحب نے بڑے طمطراق سے اپنے سکریٹری کو امن اور جنگ کے موضوع پر اداریہ لکھوانا شروع کیا۔ سکریٹری کو چار کشٹ لگانے کے بعد انھوں نے کہا "لکھو۔ اس وقت سارا عالم جنگ سے بے زار اور امن کا خواہاں ہے۔ عالمی امن قائم ہو سکتا ہے بشرطیکہ... بشرطیکہ..."

سکریٹری نے پوچھا "بشرطیکہ..."

آغا صاحب نے دماغ پر زور ڈال کر جواب دیا۔ "بشرطیکہ یعنی بشرطیکہ...."

آپ کا مطلب ہے بشرطیکہ تمام ممالک ایک دوسرے کے ساتھ شریف ہمسایوں کی طرح رہیں۔"

"ہاں، ہاں یہ بالکل یہی مطلب ہے۔"

سکریٹری نے یہ فقرہ لکھنے کے بعد پوچھا۔ "اس کے آگے؟"

"اس کے آگے لکھو اور وہ.... اور وہ...."

"جی لکھ لیا"

"ہاں اور وہ.... اور وہ"

"آپ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے علاقے کو ہتھیانے کی کوشش نہ کریں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے یہی لکھ دو۔"

"اس کے بعد"؟

"اس کے بعد لکھو۔ اور وہ .... اور یہ سب تو ہیں... یعنی دنیا کے مختلف ممالک ..."

سکریٹری نے قلم روکتے ہوئے کہا "ایٹم بم بنانے اور چلانے سے احتراز کریں۔"

آغا صاحب اُس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولے۔ "اماں یار تم سکریٹری نہیں اچھے خاصے ایڈیٹر ہو چلو اب باقی کا حصہ اپنے گھر جا کے لکھ لو۔ جب ایڈیٹوریل مکمل ہو جائے تو کاتب کو بھجوا دو۔ ہم تمہارے لئے چائے بھجوانے کا بندوبست کرتے ہیں۔"

چار دن آغا صاحب اس طریقے پر عمل کرتے رہے یعنی ایڈیٹوریل کا پہلا فقرہ لکھواتے۔ باقی کلرک سے لکھواتے۔ پانچویں دن شیخ صاحب نے اُنہیں بلوا بھیجا اور کہا کہ متعدد قارئین نے شکایت کی ہے کہ "پاتال" کے ایڈیٹوریل کسی گمشدگی کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ آغا صاحب نے شیخ صاحب کو یقین دلایا کہ انشاء اللہ آئندہ قارئین کو یہ شکایت نہیں ہوگی۔ دفتر میں آکر انھوں نے اپنے سکریٹری کو خوب ڈانٹا۔ "نالائق یہ سب لکھنا تمہاری شرارت معلوم ہوتی ہے۔ تمہیں بوجھ کر فضول ایڈیٹوریل لکھتے ہو۔" اُس نے اپنی صفائی میں کہا۔ "حضور! سچ تو یہ ہے میرے پاس جو آٹھویں جماعت کا طالب علم ہے۔ اُردو معلّٰی میں کی ایک کتاب ہے۔ بہت سے فقرے میں اُس میں سے نقل کرتا ہوں۔"

"یہ نہایت غیر مناسب حرکت ہے۔ ہمارا نہیں تو کاپی رائٹ کا کچھ خیال کیا ہوتا۔"

"حضور! آئندہ ایڈیٹوریل آپ خود لکھا کیجئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہر روز لکھنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ کیا تم کوئی اور تدبیر نہیں سوچ سکتے"

"ایک تدبیر ہو بھی ہے اگر آپ کو پسند ہو تو"

"ہاں ہاں کہو"

"میرے پاس روزانہ "صبحدم" کی جلدیں بندھے ہوئے پانچ سال ہوئے ہیں مکمل فائل ہے۔ اگر آپ اُس میں سے چیدہ چیدہ ایڈیٹوریل نقل کروا دیں تو"

"لیکن اگر کسی کو پتہ چل گیا"

"پتہ کیسے چلے گا، قارئین کا حافظہ اتنا تیز نہیں ہوتا۔"

"لیکن آج کے ایڈیٹوریل کا کیا بنے گا؟"

"آج آپ کسی معاملہ کے کل یا پرسوں کے ایڈیٹوریل کو دو تین جگہ سے نقل کر دیجئے۔"

"لیکن یہ تو سرقہ ہوگا"

"بالکل نہیں، آخر میں آپ ایک نوٹ دیدیجئے کہ ہمیں معاصر کے مندرجہ بالا خیالات سے سو فی صد اتفاق ہے۔"

ایک ہفتے کے بعد آغا صاحب کو "صبحدم" مرحوم سے ایڈیٹوریل سے ایک شکایتی خط موصول ہوا کہ وہ ہر روز اُن کے اداریے اپنے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ بند نہ کیا گیا اور تحریری معافی نہ مانگی گئی تو معاملہ عدالت میں لے جایا جائے گا۔ کوئی اور چارۂ کار نہ دیکھتے ہوئے آغا صاحب نے ان الفاظ میں معذرت شائع کر دی "کاتب کی غلطی سے ہمارے اخبار میں "صبحدم" کے اداریے چھپتے رہے ہیں۔ ہمیں اس غلطی کا سخت افسوس ہے۔"

اس سانحہ کے بعد آغا صاحب نے یہی مناسب سمجھا کہ ایڈیٹوریل کا مسئلہ حل کرنے کے لئے حاجی بنی بخش اسسٹنٹ ایڈیٹر "بصرا" کی خدمات حاصل کی جائیں۔ سوچا کر کرنے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ صرف ڈیڑھ روپیہ یومیہ پر "پاتال" کے لئے ایڈیٹوریل لکھنا منظور کر لیا۔

ایک دن آغا صاحب کے دونوں اسسٹنٹ ایڈیٹر چھٹی پر چلے گئے۔ اُس دن اُنھیں خبریں مرتب کرنے کا کام بھی کرنا پڑا۔ بڑی مشکل سے اُنھوں نے پہلا صفحہ مرتب کیا اس کے بعد ایسا تھکا ماندا سا محسوس ہوا اور وہ صوفے پر دراز ہو گئے۔ جب اُن کی آنکھ کھلی تو کاتب نے مزید مواد کا مطالبہ کیا۔ اُنھوں نے جھلا کر کہا۔ "کیا ابھی تک اخبار مکمل نہیں ہوا؟" کاتب نے جواب دیا۔ "ابھی تو تین صفحے باقی ہیں۔"

"تین صفحے، تو انھیں کیسے پُر کیا جائے گا؟"

"یہ تو جناب بہتر جانتے ہیں۔"

"اچھا یوں کرو کہ ان تینوں صفحوں پر "اسٹاپ پریس" لکھ کر انھیں خالی چھوڑ دو۔"

"جناب "اسٹاپ پریس" کے لئے اتنی جگہ نہیں چھوڑی جاتی۔"

"خواہ مخواہ کی تکرار مت کرو۔"

کاتب نے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ جب دوسرے دن پرچہ شیخ صاحب کے ہاتھ میں پہنچا تو اُنھوں نے آغا صاحب کو فوراً اپنے کمرے میں حاضر ہونے کو کہا۔ آغا صاحب کو دیکھتے ہی وہ گرج کر بولے "یہ کیا حرکت ہے؟ اسٹاپ پریس کے لئے تین صفحے! کام چوری کی حد ہو گئی" آغا صاحب نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ آج کل بین الاقوامی صورتِ حال بڑی تشویش ناک ہے۔ کسی وقت بھی کسی ملک کے وزیرِ اعظم کے بیان کی قطع کی جا سکتی ہے۔ چونکہ ایسے بیانات عموماً طویل ہوتے ہیں۔ اس لئے احتیاطاً تین صفحے خالی رہنے دیے تھے۔" شیخ صاحب کی تسلی نہ ہوئی۔ اُنھوں نے میز پر مُکّا مارتے ہوئے کہا۔ "ہم ایسے فضول بہانے سُننے کے لئے تیار نہیں۔ آپ کو برخاست کیا جاتا ہے۔"

آغا صاحب نے بڑی نرمی سے کہا۔ "شیخ صاحب"۔ سرِ تسلیم خم ہے۔ جو مزاجِ یار میں آئے۔" لیکن جان کی امان پاؤں تو عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہمنے ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جس کا شکوہ اس شعر میں کیا گیا ہے ؎

میں بھی کوئی چیز تھا لیکن نہ بیچا تا مجھے
بندہ پرور! قدر ہی تم نے نہیں جانی مری

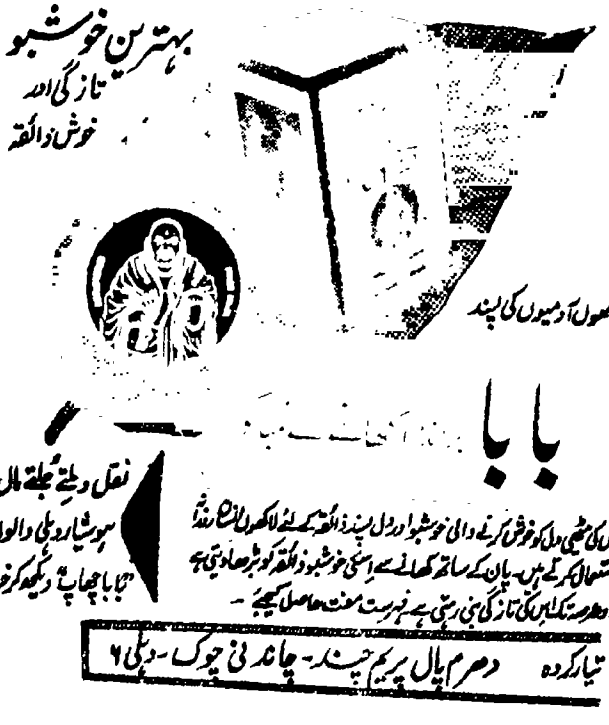
بہترین خوشبو
تازگی اور
خوش ذائقہ
لاکھوں آدمیوں کی پسند
بابا
نقل دلتے جلتے مال سے
ہوشیار دہلی والوں کا
"بابا چھاپ" دیکھ کر خریدیے
اس کی میٹھی دل کو خوش کرنے والی خوشبو اور دل پسند ذائقہ کے لئے لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ پان کے ساتھ کھانے سے اسکی خوشبو ذائقہ کو بڑھا دیتی ہے اور مدت تک اس کی تازگی بنی رہتی ہے۔ فہرست مفت حاصل کیجیے۔
تیار کردہ دھرم پال پریم چند۔ چاندنی چوک۔ دہلی ۶

سیّد حرمت الاکرام

افسانۂ آدم

شکوۂ بیرنگیٔ عالم لئے جاتا ہوں میں
دل پہ اور اک زخمِ بے مرہم لئے جاتا ہوں میں

حادثوں کی برق پرور آندھیوں کے سامنے
زیست کا شیرازۂ برہم لئے جاتا ہوں میں

شوخیٔ حالات کا ہے کچھ تقاضا ہی عجیب
تلخیٔ احساسِ کیف و کم لئے جاتا ہوں میں

سعیٔ پیہم بھی رہی محرومِ کیفِ زندگی
لذّتِ ناکامیٔ پیہم لئے جاتا ہوں میں

کھو کے تیری بزم میں سرمایۂ صبر و سکوں
آخر آخر اپنی چشمِ نم لئے جاتا ہوں میں

تیرے نغموں کی کھنک بنتی کہاں تک خُلدِ گوش
اپنے سازِ دل کا زیر و بم لئے جاتا ہوں میں

طعنہ زن ہیں مجھ پہ میری منزلوں کی وُسعتیں
اجنبی راہوں کے پیچ و خم لئے جاتا ہوں میں

سونپ کر تیرے لبوں کو خندۂ گُل کی بہار
اپنی خاطر گریۂ شبنم لئے جاتا ہوں میں

یاد آنے کی تمنّا، یاد کرنے کا جُنوں
اک نیا کیف اک نیا عالم لئے جاتا ہوں میں

تیرے دامن کو بنا کر اپنے اشکوں کا امیں
اپنے غم کا اک نیا محرم لئے جاتا ہوں میں

روئے گی اس "سادہ لوحی" کو مسیحائی تری
شہد کا جویا تھا لیکن سم لئے جاتا ہوں میں

روح میں اپنی سمو کر تیرا دردِ لازوال
دولتِ پائندگیٔ غم لئے جاتا ہوں میں

ہو ہی جائے گی ادا شرحِ دبیاں کی رسم بھی
کیا ہے، گر اک قصّۂ مبہم لئے جاتا ہوں میں

کچھ نہ پا کر بھی ترا ممنون ہونا تھا مجھے
دین ہے تیری کہ تیرا غم لئے جاتا ہوں میں

حُسن کے خاموش وعدو! تم کو رہنا ہے گواہ
دو دلوں کا رشتۂ محکم لئے جاتا ہوں میں

حرمتؔ اِس فردوس سے خونِ تمنّا کے عوض
سُرخیٔ افسانۂ آدم لئے جاتا ہوں میں

ندا فاضلی

اپولونیر کی تصویری نظمیں

فرانسیسی شعر فطری طور پر نہایت تیز اور حساس واقع ہوا ہے۔ لمحہ بدلتی دنیا کا یہ حساس اور ذہنی کجرو تی کیفیتوں کی شعوری پہچان فرانسیسی ادب اور آرٹ کی نمایاں خصوصیات رہی ہیں۔ جمالیاتی تحریکات سے متاثر ہونے میں فرانس نے عہد جدید میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ زندگی وقت، اور شعور کے متوازن امتزاج ہی سے ادبی مزاج عبارت ہے۔ ماحول کا ہر اُتار چڑھاؤ زندہ ادب میں پارے کی لکیر کی طرح اپنی رفتار متعین کرتا رہتا ہے۔ ادب بھی چلتی پھرتی زندگی کی مانند اُگتا ہے، پھیلتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔ زندگی اور ادب کے درمیان وقت کی خلیج کو پاٹنے میں فرانس کے جدید ادیبوں نے سارے یورپ کو نئی تحریکوں کی سوجھ بوجھ دی ہے

اپولونیر کا جنم ایک غیر قانونی بچے کی صورت میں ۲۶ اگست ۱۸۸۰ء میں روم میں ہوا۔ اس کی ماں ایک آزاد طبیعت پولش خاتون تھی۔ اپولونیر کے مزاج کا کھلنڈرا پن، طبیعت کی آزاد روی اور روایت شکنی شاید اس کو اپنی ماں ہی سے ورثے میں ملی ہو۔ اپولونیر کی شاعری کے ساتھ اس کا رہن سہن بھی فرانس کے ادبی حلقوں میں توجہ کا مرکز رہا ہے۔ مجاز مرحوم کی طرح وہ بھی محفل میں مسکراہٹ اور کمرے میں آنسو بن کر زندگی بسر کرتا رہا۔

نرالے ڈھنگ کی پوشاک، بے تکلف بیوہارہ، لطیفہ گوئی کی عادت خوبصورت اور نایاب اشیاء کو جمع کرنے کی دُھن وغیرہ اُس کی شخصیت کو عجیب و غریب طریقے سے پبلک کے سامنے پیش کرتی ہے۔ نفسیاتی زبان میں اسے ہم MASK-WEARING نقاب پوشی بھی کہہ سکتے ہیں ٹوٹے ہوئے چہروں پر نقابیں اوڑھنے کی روش متوسط طبقے کی ہپنسی سے گھڑی جا رہی ہے۔

اپولونیر بہت کم عرصہ زندہ رہا لیکن اتنی کم مدت میں جس کا زیادہ حصہ پہلی عالمی جنگ میں ہیبت ناک مورچوں پر گذرا، اس کے ذہن کی اختر صلاحیت اور تخلیقی انفرادیت فرانس کے ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔ ALCOOLS اور CALLIGRAMS (اپولونیر کے مجموعے) بھی ملارمے، بادلیر اور رمبان کی شاعری کی طرح فرانس کی ادبی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔ اچھی شاعری ہر عہد میں تجربا تی رہی ہے۔ تجربہ رائج الوقت بے جان روایتوں سے بے اطمینانی کا اظہار رہتا ہے نئے خطوط کی نشاندہی۔ بدلتی ہوئی سمتوں کی جانکاری ہی سے ممکن ہے تجربہ چونکاتا بھی ہے اور ذہن کو بیدار بھی بخشتا ہے۔ روایات عادت کی طرح غیر شعوری طور پر ہمارے اندر گھل مل جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم کسی شخص کو ایک خاص وضع قطع میں دیکھنے کے عادی ہو جائیں اور لباس کی ذرا سی ردّ و بدل ہماری آنکھوں میں کھٹکنے لگے۔ وہ آدمی کچھ عجیب عجیب سا دکھائی دینے لگے۔ ظاہر ہے۔ اجنبیت اس آدمی میں نہیں بلکہ ہماری آنکھوں کی ہوتی ہے۔

اپولونیر برہنہ و عریانی کے رُوپ کا شاعر ہے۔ وہ اپنے ڈھنگ تیور، رُوپ اور بہروپ سے شہری بناوٹ اور میکانکی تہذیب کے کھوکھلے پن پر طنز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی شاعری میں اسکول کے لڑکے کی سی شوخی اور رومانی تحیّر گھلا ملا ہے۔ دنیا کو وہ نڈر آنکھوں سے دیکھنے کا عادی ہے۔ وہ رمبان کا صحیح معنوں میں جانشین تھا وہ بھی جیون فلسفی پر اٹوٹ یقین رکھتا تھا لیکن وہ صرف خارجی اشیاء کی فہرست کا شاعر نہیں تھا۔ اس کا ذہن کسی طلسمی شیشے کی طرح مختلف اشیاء کو نئی نئی شکلیں عطا کرنے میں ماہر تھا۔ خیالات اس کے ذہن میں آکر تصویر کا رُوپ دھار لیتے تھے۔ اپنی ایک نظم

'ZONE' میں اُس نے خود ایک جگہ فنِ مصوّری سے اپنے پیدائشی لگاؤ کا اعتراف کیا ہے۔

یہاں اپولونیر کی پوری شاعری کو موضوعِ بحث نہیں بنانا ہے۔ مجھے تو صرف CALLIGRAMES کی اُن نظموں پر بات چیت کرنا ہے جو اپنے بناؤ، رُوپ اور ہیئت کے لحاظ سے اپنی نوعیت کی نئی اور انوکھی نظمیں ہیں۔

CALLIGRAMES کی بیشتر نظمیں اپولونیر نے میدانِ جنگ سے پوسٹ کارڈ پر لکھ کر اپنے دوستوں کو بھیجی تھیں۔ یہ نظمیں تصویری فارم میں لکھی گئی ہیں۔ برستے پانی کی دھاریں، دل اور تاج، دُھواں چھوڑتا سگار، سٹیک ٹائی، فوّارے سے چھوٹتا پانی، رات کا آسمان وغیرہ اچھی نظموں کے علاوہ خوبصورت آرٹ کے نمونے بھی ہیں۔ ان نظموں کی خارجی ہیئت سے جیسا کہ کچھ نقادوں کی رائے ہے، صرف چند دوستوں کی تفریحِ طبع مقصود تھی۔ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ان نظموں کے پیچھے بھی وہی احساس کارفرما نظر آتا ہے جس سے انیسویں صدی کا انگریز حلیفیت پرست شاعر شیلے دوچار ہو چکا تھا۔ شیلے کا جملہ LANGUAGE FAILS ME تخیلی اُڑان کے سامنے الفاظ کی کم مائگی کا ثبوت ہے۔ لیکن شیلے کے یہاں اس کم مائگی کے تدارک کی کوئی واضح کوشش نظر نہیں آتی۔ مجبوری کے سامنے سپر ڈال دینا بھی ٹھیک نہیں۔ زندگی معاشرے میں لوک گیتوں کی ساخت اور ان میں ایک خاص قسم کی لَے اور فطری ڈھلاؤ، جذبات و احساسات کے مقابلے میں زبان کی اسی کمزوری کے غیر شعوری احساس کو ظاہر کرتا ہے۔

ادب میں زبان دو فریقوں کے درمیان جذباتی ارتباط قائم کرتی ہے۔ ہر فنکار اپنے غم و خوشی میں دوسروں کو بھی اُسی شدّت و تاثر کے ساتھ شریک کرنا چاہتا ہے جس طرح وہ خود اُس سے گزر چکا ہوتا ہے اور شاید یہی فنکارانہ خلوص اور انفرادی نوکیلے پن کی پہچان بھی ہے۔ الفاظ سے ہمارا رشتہ صرف خارجی ہی نہیں نفسیاتی بھی ہوتا ہے۔ بار بار سُننے اور بولنے سے بھی ان کی انتقالِ تاثر کی قوت میں ضعف پیدا ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔ شاعر کا ذہن جتنا شعور مند اور حسّاس ہوگا اُسے اُتنا ہی اس نفسیاتی ردِّ عمل کا احساس ہوگا۔ ہر ادیب تجربات اور مشاہدات کی سطح پر دوسروں سے الگ ہوتا ہے۔ وہ مانگی ہوئی قباؤں سے اپنے بدن کو نہیں ڈھانکتا بلکہ اپنے بدن کی ساخت کے مطابق اپنا لباس بھی تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ کسی کی کوشش کو صرف یہ کہہ کر نظر انداز کر دینا کہ "ایسا تو کبھی نہیں ہوا" یا "ایسا اچھا نہیں" مناسب بات تو نہیں کہی جا سکتی۔

اپولونیر کی نظموں کا چونکتا ہوا رُوپ مسکانکی عہد میں انگڑائی لیتی نفسیاتی سوجھ بُوجھ کا پتا دیتا ہے۔ اور یوں بھی باؤلیر کے الفاظ میں حُسن کو جاذبِ نظر ہونے کے لئے اُس کے اندر اجنبیت کا ہونا عین ضروری ہے۔ اپولونیر کو زبان کے کھُردرے پن اور احساسات نازکی دونوں کا احساس تھا۔ اپولونیر کا آرٹ جذبات و احساسات کو اُن کے اپنے فطری رُوپ میں نمایاں کرنے اور اُنھیں قاری کے تخیلی تحرک تک منتقل کرنے کی کوشش ہے۔ وہ ہنرِ اولیے جذبے کی تاثراتی کیفیت کو زندہ حالت میں محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ ان نظموں میں شاعر کی انفرادیت پر انگلی رکھنے کے لئے فنِ مصوّری سے اُس کی گہری واقفیت کو جاننا ضروری ہے۔ جس طرح SYMBOLISTS علامتی شاعر، موسیقی کے تاثرات نمایاں ہیں اور جس میں الفاظ سے وہی تاثراتی لہریں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو اِس فن کا خاصّہ ہے۔ اسی طرح اپولونیر نے پینٹنگ سے تکنیکی بناؤ اور غیر مرئی جذبات کو منتقل کرنے کا فن سیکھا ہے۔ اپولونیر خارجی مظاہر کا عاشق تھا۔ اُس نے خارجی رنگا رنگی کا تماشا دیکھنے کے لئے مصوّر کی آنکھ سے کام لیا۔ اپولونیر کی مصوّری سے وابستگی اُس کے ذاتی رشتوں اور ذہنی رجحانات سے پیدا ہوئی ہے۔ پکاسو اور پکابیا سے اُس کی گہری دوستی تھی۔ ۱۹۱۱ء کی نمائش میں اپولونیر نے پکاسو، بریک، میٹزے اور فیرنے کے آرٹ پر ایک مفید تحقیقی مقالہ لکھ کر عوام کو اُن کی تجرباتی اُپج اور تکنیکی باریکیوں سے متارف کرایا تھا۔ اس تنقید سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتنے شعوری لگاؤ کے ساتھ اس فن سے جُڑا ہوا تھا۔ مصوّروں سے اس کے تعلق اور کیوبزم CUBISM پینٹنگ کی تحریک جس میں صورتی کلا کی خصوصیات کو تصویروں میں اُبھارنے کی کوشش کی جاتی ہے) سے اسکے لگاؤ نے اپولونیر کو الفاظ میں وہی تجربہ کرنے پر آمادہ کیا جو اس کے ہمعصر مصوّر چترکلا میں کر رہے تھے۔

اپولونیر صوفی تھا نہ سائنسداں۔ وہ زندگی کے تخیلی حُسن، آرزو دیکھی صوتی پرچھائیوں اور متضاد حقیقتوں کا شاعر تھا۔ اُس کی رائے میں اُس کے عہد کے شاعر ضرورت سے زیادہ دماغی، مصنوعی اور روایتی قوانین و ضوابط کے ماننے والے تھے۔

پکچوریشن (کوما، فل اسٹوپ، سوالیہ نشان وغیرہ) سے انحراف اور نظموں کا چونکا دینے والا سراپا روپ اسی ٹھہراؤ کے ردِ عمل کی صورت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ان تصویری نظموں میں برسات، دل، تاج اور آئینہ، تابوت اور قبر، رات کا آسمان، پائپ سے گرتا ہوا دھواں، بڑی صفائی اور سدھے ہوئے ہاتھوں سے بنائی گئی ہیں۔ ان تصویروں سے نظموں کا مرکزی خیال اپنی پوری شدت اور تاثراتی کیفیت کے ساتھ ذہن کی سطح پر آگ کی لپٹوں کی طرح پھیل جاتا ہے۔

کچھ نظموں کی تصویریں دیکھئے:-

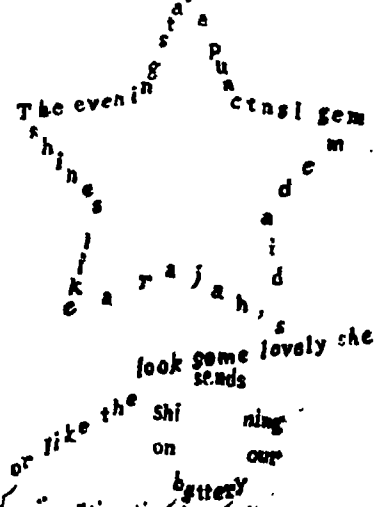

ترجمہ:- شام کا ستارہ ایک موتی کے مانند اپنے مقررہ وقت پر کسی راجہ کے خوبصورت تاج سا جھل جھل کر رہا ہے۔ یا کوئی حسین روشنیرہ ہماری فوجی چوکی پر ایک اُچٹتی سی نظر پھینک رہی ہے۔

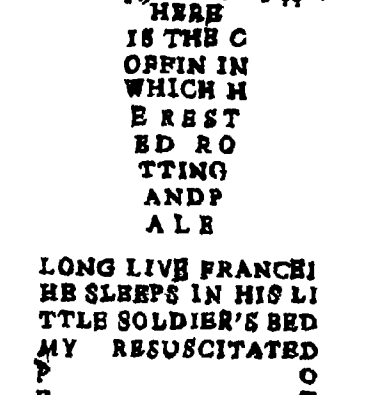

ترجمہ:- یہ ہے وہ تابوت - جس میں اُسے رکھا گیا ہے - وہ گل سڑ رہا ہے۔ فرانس کی جے ہو - اپنے چھوٹے سے سپاہی نہ مرقد میں بیک وقت دنیا و مافیہا سے آزاد ابدی نیند سو رہا ہے۔

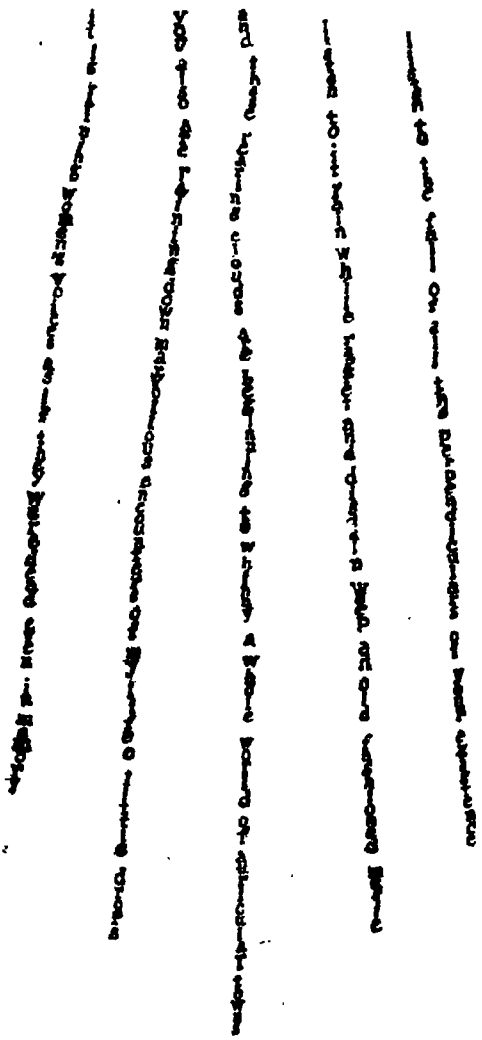

ترجمہ:- میرے کانوں میں اُن عورتوں کی آوازیں برس رہی ہیں جو بیوہ واشت سے بھی عور ہو چکی ہیں۔ بارش کے ننھے قطرو! تمہارے اندر میری زندگی کی خوبصورت وارداتیں جھلک رہی ہیں۔ اُمڈتے بادلوں نے میری سماعت کی اُونچی بستیوں کو گنگنا دیا ہے۔ برستی ہوئی برسات سن۔ اس سے پہلے کہ ناکامی و مایوسی روایتی سنگیت کی دھاروں میں برسنے لگے، اپنے وجود کے نیچے گرتی متوازی لکیروں کی آواز سن۔

اپولونیر کی ان نظموں کا رُوپ جنگ کے ہیبت ناک مورچے پر ایک ہنر نظر حساس شاعر کی نفسیات کی بہ یک وقت عکاسی کرتا ہے۔ ان نظموں کا تصویری رُوپ جذبات کے دھیمے پن کو ایک مشعل کی طرح اُجاگر کیے ہوئے ہے۔ ان نظموں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں یہ بات دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ یورپ کی شاعری ہمارے ملک کی طرح اسٹیج سے کبھی نہیں جُڑی۔ وہاں شاعر اور قارئین کے درمیان صرف کاغذ کام کرتا ہے جبکہ ہمارے یہاں شعر کی کمی کو اسٹیجی ہاؤ بھاؤ، آواز کے اُتار چڑھاؤ اور بدن کے بناؤ سنگار سے پُورا کیا جاتا رہا ہے۔ اپولونیر کی یہ نظمیں خاص حالات میں انکشافِ ذات کا واضح اظہار ہیں جس کے آئینے میں شاعر اپنے پُورے قد اور باحرکت ذہن کے ساتھ ہمیں گھُورتا ہوا نظر آتا ہے۔

"برسات" میں رینگتی ہوئی پانچ متوازی لکیریں، تابوت اور کتبے میں ایک مرقد کی تصویر اور رات کے آکاش میں ستارے کا اسکیچ پڑھنے والوں کے ذہن میں جنگ کا ڈراؤنا ماحول اور اس میں سانس لیتے انسان کے کرب کو اپنی پُوری شدّت و تاثر کے ساتھ چھوتی ہیں۔ یہ ہی نظمیں اگر سیدھی طرح اور عام طریقے سے لکھی جائیں تو مرکزی خیال چاہے وہی رہے مگر تاثراتی کیفیت اور جذبے کی شدّت جس سے اچھی شاعری عبارت ہے اور جو قاری اور شاعر میں جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہیں نظر نہیں آئے گی۔

انسانی حواس میں 'باصرہ'، ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک کنکری کی طرح ہے جس کے بغیر ذہنی اور تخلیقی دنیا میں روشنی کبھی کبھی سی رہتی ہے۔ پیدائشی اندھوں کی نفسیات مختلف ہو سکتی ہے۔ امریکہ میں آرٹ کی نئی تحریک Optic art کی تیکنک باصرہ کی اسی اہمیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ان نظموں کی تصویری ہیئت داخلی احساس کے لئے ایک موثر خارجی کینوس کا کام کرتی ہے جس پر شاعر کی سوچ خوب سے خوب تر ہو کر دھیمے دھیمے انداز میں پھیلتی رہتی ہے اور پڑھنے والے کے ذہن کو دیر تک متحرک رکھتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ مایاکوفسکی اور کچھ دوسرے جدید شعراء نے اپنی نظموں میں کہیں کہیں لفظوں کو اپنے روایتی رُوپ کے برعکس توڑ کر الگ الگ حروف میں لکھنا مناسب سمجھا۔ مایاکوفسکی نے اپنی نظم Battle میں Fine کو توڑ کر Bat اور Tle دو حصّوں میں بانٹ کر

سب سے زیادہ قابل اعتماد
بالوں کو سیاہ کرنے والا
وسمول
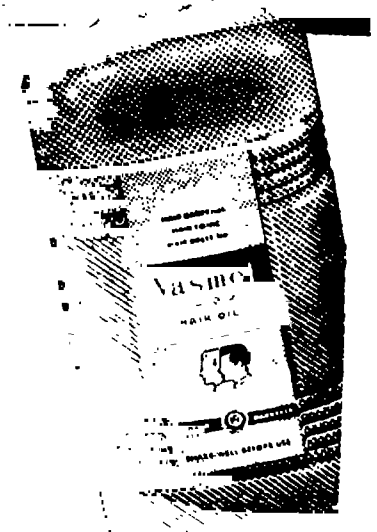

سفید بالوں کو سیاہ کرتا ہے
بالوں کو سنوارنے کا بہترین ذریعہ ہے
ایملسی فائڈ ہیر آئل اور پومیٹم کی
شکل میں ہر اسٹور سے
دستیاب ہو سکتا ہے

دنیا بھر میں لاکھوں استعمال کرتے ہیں
ہائیجینک لیبرٹری انڈسٹریز پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲ بمبئی ۱

بشر نواز

غزل

○

آہٹ پہ کان، در پہ نظر اِس طرح نہ تھی
ایک ایک پَل کی ہم کو خبر اِس طرح نہ تھی

تھا دل میں درد پہلے بھی، لیکن نہ اِس قدر
ویراں تو تھی حیات مگر اِس طرح نہ تھی

جب تک سبا نے چھیڑا نہ تھا، نکہتِ گُلاب
کوچہ بہ کوچہ محوِ سفر اِس طرح نہ تھی

ہر ایک موڑ مقتلِ ارمان و آرزو
پہلے تو تیری راہگزر اِس طرح نہ تھی

ہوتی تھی پہلے برسوں میں نم آستیں کبھی
ارزاں متاعِ دیدۂ تر اِس طرح نہ تھی

○

کرشن موہن

غزل

○

ہم فکر و کشاکش میں بھولے
سگرٹ کے دُھوئیں کے مرغولے

بے کیف حقیقت ہیں اے دل
گاہے خوابوں کی خوشبو لے

رنگیں فرصت کی رفعت کو
اپنی سنگیں محنت چھو لے

جو سعی و عمل سے بے پروا
خوابوں کے جھولے میں جھولے

وہ لوگ بہت دل شاد رہے
دُنیا کے سب جھگڑے بھولے

بغض و نفرت کو جنم دیا
ہم کیسے پگھلے، کیسے پھولے

○

افسانہ

ست پرکاش سنگر

دھمکی

رمیش اور میں کالج میں ساتھی ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ متضاد طبیعتوں کے مالک ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوب نباہ کر رہے ہیں۔ جھگڑا کئے بنا ہم اکٹھے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے درمیان ایک خاموش انڈرسٹینڈنگ ہو چکا ہے۔ ایک دوسرے کی عادات سے نفرت کرنے کے باوجود ہم اس جذبے کو باہمی رنجش میں منتقل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور عادات بھی کسی قدر فحاشانہ ہیں۔ میں مطالعۂ کتب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، رمیش مطالعہ کے بغیر ہی رہ سکتا ہے۔ میں سینما گھر کے نزدیک تک نہیں پھٹکتا، رمیش وہاں زندگی بتا سکتا ہے۔ میں چھ گھنٹے سے زیادہ سو نہیں سکتا، رمیش چھ گھنٹے سے زیادہ جاگنے کا مخالف ہے۔ اگر میں سگریٹ پینا چاہوں تو وہ مخالفت کرے گا، اور اگر میں شراب نوشی کے خلاف لیکچر دوں، رمیش وخت رز کا فرد لطف اٹھائے گا۔ گوشت خوری کا وہ محض اس لئے مُرید ہے کہ میں اُس سے پرہیز کرتا ہوں۔ وہ اُنھیں سبزیوں کو پسند کرتا ہے جنھیں میں میز پر لانے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں لمبی سیر کرتا ہوں رمیش کرسے کے اندر گھوم لیتا ہے۔ میں بس کی سواری کرتا ہوں اور وہ رکشا میں چکر لگاتا ہے۔

یہی بات ہمارے دوستوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ میرے دوست دھرم پال ہیں، تو اُن کے دھرم ناش۔ میرے امر متسر رام ہیں تو ان کے لاہوری پرشاد ہیں۔ میاں عاجز خار کی دوستی کا دم بھرتا ہوں۔ رمیش مرزا اکبر خاں سے یارانہ رکھتا ہے۔ میرے ساتھی خادم کل ہیں۔ ان کے مخدوم بخش۔ میں صنفِ نازک کی محبت سے کنی کاٹتا ہوں، وہ ان کی محبت کے بغیر زندگی کو زندگی ہی تصور نہیں کرتے۔

اگر میرا دوست چھ فٹ چار انچ لمبا ہے تو رمیش کا ساتھی چار فٹ چھ انچ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ اگر امر متسر یا رام کا وزن کپڑوں اور جوتوں سمیت تیس سیر سے کچھ وزنی نہیں کرتا۔ تو لاہوری پرشاد کا کپڑوں اور جوتوں کے بغیر تین من سے کم نہیں ہوگا۔

اتنے زبردست تضاد کے باوجود ہم دونوں گذشتہ بیس سال سے اکٹھے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پسند نہ کرتے ہوئے بھی ساتھ نبھا رہے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ وہ خاموش انڈرسٹینڈنگ ہے جس کے مطابق ہم ایک دوسرے کے حقوق کے حدود اربعہ میں دخل انداز نہیں ہوتے۔ اسی انڈرسٹینڈنگ کی شرط نمبر پانچ کے مطابق گھریلو معاملات کا انتظام اُن کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ قرار پایا کہ میں نہ تو اُن کی کسی بات میں مخل ہوں گا، بلکہ اُن کے ہر مشورہ پر عمل کروں گا۔

میں اُن کے مشورے کو اکثر خاموشی سے اختیار کر لیتا، وہ مجھے تاکید کرتے کہ نوکروں کے معاملے میں مجھے ایکدم خاموش رہنا ہوگا۔ انھیں شک تھا کہ میری خشک مزاجی نوکروں کو بھاگ جانے پر مجبور کرتی ہے بے بنیاد ہونے کے باوجود مجھے اس الزام کو قبول کرنا ہوتا۔ جھگڑے سے بچنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔

ایک دن شام کو دفتر سے لوٹا۔ کر آرام کرسی پر بیٹھ کر باس پڑی ہوئی تپائی کو انگلیوں سے بجانے لگے۔ اُن کا یہ عمل آنے والی مصیبت کا پیش خیمہ ہوتا۔

"بھائی صاحب! آپ نے پھر نوکر کو نکال دیا۔" لہجے میں سنجیدگی بھرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"میں نے؟"

"آپ کے سوا یہاں کوئی دوسرا نہیں جس سے مخاطب ہو سکوں۔"

"نوکر کو نکالنے اور رکھنے کے آپ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں اور مجھے آج تک دخل انداز ہونے کا موقع ہی نصیب نہیں ہوا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن اس نوکر کو آپ کی وجہ سے جانا پڑا۔" وہ الفاظ میں تلخی بھرتے ہوئے بولے۔

"آپ سے نوکر نے کہا؟"

"نہیں۔"

"نوکر کے کسی دوست نے کہا؟"

"نہیں۔"

"الہام ہوا؟"

"یوں ہی سمجھ لیجئے۔"

"پاگل پن کا دورہ کیوں: سمجھ لوں؟"

"بھائی صاحب! میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"آپ کبھی ایسے موڈ میں ہو سکتے ہیں، ایسا سمجھ کر میں آپ کے مذاق کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن آپ اس طرح مجھ پر شک کرتے ہیں، اس کی وجہ سمجھ نہیں سکا۔"

"اس کے چلے جانے کا دوسرا سبب میں نہیں سمجھ سکتا۔"

"لیکن اسے ڈانٹنا تو درکنار، میں نے اس سے بات تک نہیں کی۔"

"تو یہی سبب ہے۔" تو وہ کھانستے ہوئے اور پیشانی پر انگلیاں بجاتے ہوئے بولے۔ "اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ان کے غصے کا پارہ چڑھ گیا ہے۔ اسے یہی شکایت رہی ہوگی کہ میری عدم موجودگی میں آپ نے اس سے بات نہیں کی۔ اس کا دل نہیں لگا اور وہ اداس ہو کر بھاگ نکلا۔"

"لیکن ہمارے سمجھوتے میں نوکر کا دل بہلانے کی شرط کہاں تھی؟" میں نے ازراہ پروٹسٹ کہا۔

"سبھی شرائط قلم بند کیسے کی جا سکتی ہیں؟"

"زبانی اشارتاً بتا دی ہوتی۔"

"کامن سینس بھی کسی شے کا نام ہے۔" وہ طنز کا نشتر چبھوتے ہوئے بولے۔

حملے کی شدت سے گھبرا کر ایسے موقع پر میں ہنومان چالیسا کا پاٹھ جپنا شروع کر دیتا ہوں، اس کے زیر اثر دفاع مضبوط ہو جاتا ہے اور میں رمیش سے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتا ہوں۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے دوسری جگہ زیادہ تنخواہ مل گئی ہو۔" میں نے ہمت باندھ کر کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔؟ بالکل ہو سکتا ہے۔" رمیش کو مجھ سے متفق ہونا پڑا۔

"اس میں آپ مجھے کس طرح قصوروار ٹھہرا سکتے ہیں؟"

"ہر طرح سے۔" اس نے جواب دیا۔

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کرنے کی بات آپ کو کیوں نہیں سوجھی؟"

"آپ کو بھی کہاں سوجھی؟" مجھے کہنا پڑا۔ "آخر میں کیوں ڈروں؟"

"آفس کی فائلوں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے جو ان باتوں کے متعلق سوچ سکوں؟"

"اور آپ یہ بھی نہیں چاہتے کہ میں اس معاملے میں دخل اندازی کروں۔ دوسرے آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ میں بیکار رہتا ہوں۔؟"

"اجی سوچا اس چھوکرے چھوکریوں کو لیکچر دینا کس کام میں شمار کیا جاتا ہے؟" وہ لہجے میں تلخی اور حقارت کی آمیزش کرتے ہوئے بولے۔

ہمیشہ کی طرح جیت رمیش کی ہوئی۔ مکان اسی کے نام تھا۔ میرے لئے دوسرے مکان کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ایک کے چلے جانے کے بعد رمیش دوسرے نوکر کو پکڑ لائے گا۔ اور سچ مچ اگلے دن نیا نوکر آ گیا۔ تین فٹ چار انچ قد کا مالک اور اس کے مطابق سولہ سال، گیارہ ماہ، انتیس دن کی عمر والا گڑھوالی بدری کسی قدر چسٹ لڑکا تھا۔ اسے لیکچر دینے اور بازار بھیجنے کے بعد، رمیش اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری چھوٹی آنکھوں پر غلبہ ڈالنے کے انداز سے دھیرے دھیرے اور الفاظ کو تولتے ہوئے بولا۔

"بھائی صاحب! بدری گزشتہ پانچ ماہ میں چھٹا نوکر ہے۔"

"جہاں تک مجھے یاد ہے۔ پچھلے چھ ماہ میں پانچواں نوکر ہے۔"

"میں ہر کسی وقت مذاق کا عادی نہیں۔"

"کسی وقت بھی نہیں۔" میں نے فوراً کہا۔ ویسے اپنے خاص موڈ میں جب اور جتنا چاہیں مذاق کر سکتے ہیں۔ پھر مذاق سننے اور

بھنے کے لئے وقت سے بڑھ کر عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"آپ تیر اندازی کر رہے ہیں اور میں ایک اہم بات کہہ رہا ہوں۔"

"فرمائیے!"

"اگر بدری ہاتھ سے نکل گیا تو ....."

"کیلاش مل جائے گا۔" میں نے فقرا پورا کرتے ہوئے کہا۔

"کہنا آسان ہے۔"

"آپ غلط نہیں فرماتے۔"

"اور میں چاہتا ہوں، آپ ٹھیک انداز سے تُنیں بھی۔" رمیش مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "اس نوکر کو آپ چھوڑیں گے نہیں، اسے گالی نہیں دیں گے، خفگی کا اظہار نہیں کریں گے بلکہ اُس سے اچھا سلوک کریں گے۔"

"منظور"

"قصوروار ہونے کی صورت میں اُسے کچھ نہیں کہیں گے۔"

"یہ بھی منظور۔"

"اس کی تنخواہ تیس روپے ہوگی۔ بیس آپ دیں گے۔ اور باقی کے پیسے ہم آدھے آدھے چکائیں گے۔"

"یہ بالکل نہیں ہو سکتا۔"

"یہی ہوگا۔ اگر آپ دوسرا مکان لیں گے تو پگڑی کے پیسے چکانے میں جائداد سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

"تو میں ہی اُسے تیس روپے دوں گا۔" یہ میں نے تجویز کیا۔

"یہ بھی نہیں ہو سکتا۔" اُس نے رد کرتے ہوئے کہا۔

"وجہ؟"

"اس سے آپ کا سوفی صدی اُس پر کنٹرول ہو جائے گا۔"

خاموش رہنے کے سوا میں اور کر ہی کیا سکتا تھا۔؟

اگلے دن بدری نے ناشتہ تیار کیا اور اُسے میز پر سجایا۔ آج کل شاید کوئی یقین نہ کرے۔ لیکن اُن دنوں عام طور پر لوگ دیسی گھی استعمال کرتے تھے اور کچھ باہمت لوگ چھپا کر بناسپتی گھی گھر پر لاتے تھے۔ بدری نے دودھ میں آٹا گوندھ کر دیسی گھی چپڑ کر پراٹھے اور آملیٹ میز پر رکھے۔ ناشتے سے نپٹنے کے بعد میں رسوئی گھر میں گیا تو اُسے ناشتہ کرنے میں مصروف پایا۔ اُس کا مینو بھی لعینہ وہی تھا۔ محض پراٹھوں کی تعداد دُگنی تھی۔

اگلے دن اتوار تھا۔ نئے ملازم کے آنے پر اپنی فیاضی کا ثبوت دینے کے لئے رمیش اپنی گرل فرینڈز کو ڈنر دعوت کرتا تھا۔ ایک ذمہ دار پیشہ ور کی حیثیت سے وہ مجھے مینو بھی بتلا دیتا۔ بازار جا کر سبزیاں اور پھل خریدنا میری ذمہ داری تھا۔ مہینے کے اختتام پر میں اُسے حساب دیکھنے اور اپنے حصے کے پیسے چکانے کے لئے کہتا۔ وہ ناراض ہو کر مجھے لتاڑتا۔ بیوی کہہ کر پکارتا۔ دو تین دن تک ناراضی کا اظہار کرنے کے لئے مجھ سے بات چیت نہ کرتا۔ طعنے دیتا۔ ہاتھ جوڑ کر کہتا۔

"مہاراج! آپ کے پیسے چکائے بغیر میں کیسے بچ سکتا ہوں۔ یہاں نہیں دوں گا تو اگلے جنم میں حساب چکانا ہوگا۔"

اور مجھے کو بات یہ تھی کہ وہ اب تک بچا ہوا تھا اور اگلے جنم سے بالکل بے خبر رہتا۔ لیکن اُس جنم میں کامل یقین رکھنے کے سبب میں اُس کی دلیل کو تسلیم کر لیتا اور خاموش ہو جاتا اور جب اُس کا من چاہتا وہ کچھ پیسے چکا دیتا، اُس کے بعد دُگنے بھر لے لیتا۔ وہ جانتا تھا کہ مکان اُس کے نام ہے اور وہاں سے نکل کر میں برلب سڑک ہی رہ سکوں گا۔ اور میں اِس بات سے بخوبی واقف تھا کہ مستقل سکونت کے لئے سڑک کوئی آدرش جگہ نہیں۔ اِس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں اُس کے ہزاروں کے بوجھ کو خاموشی سے برداشت کر لیتا۔ اور اُس کے ہر نخرے کو خوشگوار فرض سمجھ کر سہن کرتا۔ اخبارات اور رسائل کے بل چکانا بھی میرا ہی کام تھا۔

نوکر کو تنخواہ میں دیتا۔ اُس سے کام وہ لیتا۔ ہر نوکر اُس کی مٹھی چاپی اور سر کی مالش کرتا۔ اُس کی گرل فرینڈز کے پاس خط لے کر جاتا اور اُن کے جواب لاتا۔

اتوار کو مہمان آئے۔ میز پر سجے ہوئے کھانے کو دیکھ کر خوش ہو اُٹھے۔ ہاتھ دھوئے بنا کھانے کی طرف لپکے۔ پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ جیسے کسی حکم کے زیر اثر جیبوں سے رومال نکال کر آنکھوں کو پونچھنے لگے۔ پھر ناک سے نیچے بہتے ہوئے مادے کو سنبھالنے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن اِس نوالے نے حلق سے نیچے اُترتے ہی پورنگ کا کام کیا کہ پانی کا سرچشمہ پھوٹ نکلا اور آنکھ اور ناک کی راہ باہر آنے کے لئے بے تاب ہو اُٹھا۔ اِس مواد پر قابو پانے کے لئے رُومال کو ناکافی سمجھ کر مہمانوں کا قافلہ شور مچاتے ہوئے باتھ روم روانہ ہوا۔ اور آنکھوں کو دھونے، ناک صاف کرنے اور کلی کرنے کے بعد باہر آیا۔ بدری اِس بات کا قیاس تک نہ کر سکتا تھا کہ یہ لوگ کھانے سے اتنی جلد

فارغ ہو جائیں گے اور تانگوں میں سوار ہو کر مال روڈ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچ سکتا کہ یہ لوگ گھر کا کھانا چھوڑ کر ہوٹل پر جا کر اپنی بھوک کو مشانت کریں گے۔ وہاں پہنچ کر رمیش نے چینی ہوٹل کے بیروں کو کھانا سرو کرنے، مہمانوں کو کھانے اور مجھ سے پیسے چکانے کو کہا۔

بات کو مجھ سے مخاطب ہو کر رمیش کہنے لگا۔

"بھائی صاحب! آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ مجھے اس طرح ذلیل و خوار کریں گے۔"

"اور کس طرح امید کرتے تھے؟"

"آپ پھر اس قدر سنجیدہ بات کو مذاق میں ٹالنا چاہتے ہیں۔"

"اس لئے کہ آپ ہمیشہ مجھ پر الزام تھوپنا چاہتے ہیں۔ بھلا آج میرا کیا قصور تھا؟"

"آپ نے کھانا چکھ لیا ہوتا۔"

"آپ نے خود کیوں نہیں زحمت فرمائی؟"

"میں تو اُن لوگوں کے ساتھ مصروف تھا۔" وہ قدرے نرم پڑ کر بولے۔ "کم از کم آپ کچن میں جا کر دیکھ لیتے۔" "کیا؟"

"کہ وہ نمک، مرچ اور کھانڈ کا برابر کا استعمال کر رہا ہے۔"

"ہاں مجھ سے اتنی بھول مرزد ہوئی۔" میں نے غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "اُسے یہ سمجھانا بھول گیا کہ اس نیم ترقی یافتہ سماج میں دال بسری میں چینی نہیں ملائی جاتی۔ سالہ سال کی عمر پا لینے کے بعد بھی بچہ ہی ہے۔ نمک زیادہ ڈال دیا۔ اُس کا اثر کم کرنے کے لئے مرچ ڈالنی پڑی اور دونوں کا اثر مٹانے کے لئے چینی۔"

"بس چینی کچھ زیادہ ڈال دی۔ بچہ ہے نا۔ آپ درگزر فرماتے ہیں۔" رمیش نے جواب دیا۔

"آپ تو کہتے ہیں مجھ دار ہے۔"

"ایماندار بھی"

"ایماندار کیسے؟"

"ایماندار یوں کہ وہ ایماندار نکلا بازار سے نقد داموں پر جو سودا لاتا، باقی پیسے فوراً لوٹا دیتا۔ ایک پیسے کے بھی سودا لے آتا۔ اور پیسے نہ مانگتا۔ سمجھ دار نکلا، گول کر کے کو سجانے کے لئے سامان لے آتا۔ ایک دن خوبصورت پھولوں والی کوبی کچھ کر رمیش اچھلا۔

"سالا بڑا بدمعاش ہے۔ کتنا عمدہ پھولوں والا لایا ہے۔ آپ نے منگوایا ہوگا۔"

"بالکل نہیں۔"

"یہی تو کمال ہے سارے پیسے اپنی! ادھر آؤ؟"

وہ کچن میں سے آیا۔

"تو نے پھولدان کہاں سے لیا؟"

"بازار سے۔ اور کہاں سے۔"؟

"پیسے کہاں سے لئے؟"

"روپیہ بیچ کر۔"

"شاباش!" رمیش اُس کی پیٹھ ٹھونک کر بولا "بات ہوئی نہ۔ سب اخبار بیچ ڈالے؟"

"کاپیاں بھی۔"

"کاپیاں کہاں سے لیں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کی الماری میں سے۔"

میں اچھل کر الماری کی جانب بھاگا۔ بیچ بیچ وہاں کاپیاں نہ تھیں۔

"بے وقوف کہیں کا! تو! بھاگ جا یہاں سے۔ ابھی نکل جا" میں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ "سُنتا نہیں؟"

"کیا بات ہوئی؟" رمیش نے پوچھا۔

"کیا بات نہیں ہوئی؟ اس گدھے نے میری چار سال کی محنت چار روپے میں بیچ ڈالی۔ میرا ریسرچ کا سارا میٹر ختم کر ڈالا۔"

"پھر اکٹھا کر لینا۔" رمیش بولا۔

"بالکل ان پڑھوں جیسی بات کر ڈالی۔" میں نے غصے کی حالت میں کہا۔ "تم سمجھتے ہو۔ مواد اکٹھا کرنا آسان ہے؟ مجھے ایسے نوکر کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن صلح نامہ۔۔۔۔؟"

"نہ صلح نامہ کی۔۔۔۔"

"آپ شانتی سے کام لیجئے۔ سبھی ٹھیک ہو جائے گا۔" رمیش مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگا۔ "ارے بدری! جا صاحب سے دس روپے لے کر دکاندار سے کاپیاں واپس لے آ۔ دو گھنٹے فالتو پڑھنے میں اُسے کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ لو دو روپے تم اپنی محنت کے رکھ لینا۔"

"نہ۔"

فرمانبردار نوکر نے جواب دیا۔

اگلے دن بدری کو دوسری اسکیم سوجھی۔ اُس نے کپڑے دھونے کا پروگرام تیار کیا۔ سہارے چلے جانے کے بعد اُس نے بڑے ہانڈے میں پانی اُبالا۔ اُس میں صابن اور سوڈا ڈالا۔ اور اُس میں کپڑے ڈالے۔ دھیان اِس بات کا رکھا کہ اُن میں ایک بھی سوتی کپڑا نہ ہو۔ سرج کے سوٹ، پینٹ، سویٹر اور کوٹ سبھی کو اِس کھولتے صابن کے پانی میں اشنان کرائے گئے۔ پانی پھر بھی بچ گیا۔ اُس میں نکٹائیاں ڈالی گئیں۔ لیکن وہ پھر بھی ختم نہ ہوا، کپڑے اُسے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ٹرنکوں میں بند تھے۔ اُس نے تالوں کو للچائی نظر سے دیکھا اور ان پر اینٹوں کے وار کیے۔ لیکن اُن دنوں ظالم تالے بھی اصلی اور اس لئے مضبوط ہوتے تھے۔ نہ ٹوٹ سکے۔ تب اُس کے زرخیز دماغ میں ایک بات آئی۔ کیوں نہ رضائیوں کو بھی گرم پانی میں اشنان کرایا جائے؟ آخر ان کی بھی عاقبت سُدھر جائے گی۔ لیکن نتیجہ اس کے برعکس ہوا۔ اُنھوں نے اِس طرح دم توڑا کہ جسم کے ساتھ رُوح بھی کھولتے پانی میں جل گئی۔ رُوح کے بغیر عاقبت بننے اور بگڑنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

شام کو لوٹ کر آنگن میں رسّیوں پر گرم سوٹوں، مفلروں، ٹائیوں اور رضائیوں کو رسّیوں پر لٹکتے دیکھ کر ہم حیران نہ ہوتے تو کیا کرتے؟ اگر انھیں اِس حالت میں دیکھ کر، ہمیں تو کیا، اُن کے سخت ترین دشمنوں کو بھی رحم آ جاتا۔ پژمردہ چہرے، مُرجھائے ہوئے جسم، خشکل سے بے شکل، رمیش کو اِس بات کا پختہ یقین تھا کہ بدری نے یہ بنیا تجربہ محض میرے ہی کپڑوں سے کیا ہے۔ اِس لئے لائٹ ہاؤس میں اُسے مخاطب کر کے بولے۔

"ارے یہ کیا کر دیا ہے؟ گرم کپڑوں کی نمائش لگا دی ہے!"

"بابو جی! آج فرصت تھی۔ میں نے سوچا انھیں دھو ہی ڈالوں۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔ سو رہا، انا ہووے تاں ——" وہ دونوں ہاتھوں سے تالیاں پیٹتے ہوئے بولا۔ "کوئی گرم کپڑے بھی گھر پر دھوتا ہے!"

"نہیں بابو جی! سب کو اُبالا ہے۔"

"ارے کپڑوں کو یا جینا؟ وہ میری طرف کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے تاکہ میں اُن کی تصحیح کر کے کہہ سکوں۔ "مجھے"؟

میں ناموش رہا۔

"تو بھی عجیب لوگ ہے۔ کیسے کیسے کام کرتا ہے۔"

"بابو جی۔ غلطی معاف۔" بدری نیچی نگاہ کیے بولا۔ "لوگوں والے کپڑے نہ دھو سکا۔ تالے مضبوط تھے، ٹوٹے نہیں۔"

"کون سے ٹرنک؟" وہ گھبرا کر چونک اُٹھا۔ "میرے کپڑے تو سبھی باہر تھے۔ ٹرنکوں میں تو بھائی صاحب کے کپڑے بند تھے۔ تو بھی میرے کپڑے دھو ڈالے۔ تجربہ بھی پر کرڈالا؟ ان کا ایک بھی کپڑا نہیں دھویا؟"

اور وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کرسی میں دھنس گئے۔

اب میں اُن کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُنھیں اپنی تباہی کا اِس قدر ملال نہیں تھا۔ جتنا اِس بات کا کہ میں صاف بچ نکلا تھا۔

اگلے اتوار کو ہمارا کھانا باہر تھا۔ ہمارا پروگرام رات کو گیارہ بجے لوٹنے کا تھا۔ لیکن میزبان کو ضروری تار کرنے اور گاڑی میں باہر چلے جانے کے سبب ہم وقت سے کافی پیشتر لوٹ آئے۔ گھر آ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہ کر سکے۔ ڈائننگ روم میں کھانے کی میز پر بچوں کے بجائے بیئرز بوتلوں کو رار دگرد کھڑے "بونے" کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ میں نے اور رمیش نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لیکن ہمیں کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ وہ لوگ ڈونگوں میں سے میٹ اور سبزیاں لے رہے تھے۔ بھی بدری کی آواز چمچوں کی آواز پر غالب آ گئی۔ وہ اُن سے مخاطب ہو رہا تھا۔

"بھائیو! مجھے خوشی ہے کہ آپ لوگوں نے میری دعوت نامہ قبول فرما کر یہاں آنے کی تکلیف کی۔ یہ دعوت میرے صاحب رمیش بابو کی ہونے والی شادی کے بارے میں ہے۔ اس بات کا مجھے پتہ نہ چلتا۔ اگر وہ اپنی ہونے والی بیوی سے میرے ذریعے خط و کتابت نہ کرتے اور مجھے اِس خط و کتابت کو پڑھنے کا موقع نہ دیتے کل دونوں کی کافی دیر تک خفیہ ملاقات ہوئی اور میں نے چھپ کر ساری بات سُن لی۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے رمیش کو آگے بڑھنے سے روکا

"تم اُس وقت کہاں تھے؟" ایک آواز آئی

"میں اور اصل صاحب کے پلنگ کے نیچے سو رہا تھا۔ کھُسر پھُسر سُن کر میری آنکھ کھُل گئی۔"

میں نے دوسری بار رمیش کو آگے بڑھنے سے روکا۔

بدری کی بات کا تالیوں سے سواگت کیا گیا۔

"میں اس بدمعاش کو جوتے مار کر گھر سے باہر نکال دوں گا۔"

"میں اسے انعام دوں گا۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"انعام! میں اسے ایک منٹ بھی گھر میں نہ رہنے دوں گا۔"

"میں اسے گھر سے باہر نہیں جانے دوں گا۔"

"لیکن عہد نامہ!" رمیش میری طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ عہد نامے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

شاید ہمارے الفاظ مہمانوں کے کان تک پہنچ گئے تھے۔ ایک سیٹی کی آواز فضا میں گونجی اور ایک پل کے اندر کمرہ خالی ہو گیا۔ ایکدم سبھی ایسے غائب ہو گئے جیسے زمین کے اندر دھنس گئے ہوں۔ میز پر کھانے کی اشیاء بھی نہ تھیں نہ اُس پر طشتریاں تھیں نہ ڈونگے۔ مہمان اپنا اپنا سامان لے کر اس طرح غائب ہوئے جیسے گدھوں کے سر سے سینگ۔

"بدری!" رمیش نے چلا کر آواز دی۔

کوئی جواب نہ ملا۔

"بدری!" اُس کی آواز پھر سے فضا میں گونج اٹھی۔

لیکن وہاں ہم دونوں کے سوا کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا۔ اور ہم دونوں کے بیچ بدری کو لے کر ایک بحث چل نکلی۔ رمیش اسے نکالنے کی فکر میں تھا اور میں تنخواہ میں اضافہ کرنے کی۔ پیٹ کے سبب بیماری (پیچش) میں مبتلا ہونے سے کہیں زیادہ تیزی آ گئی تھی۔ تبھی کسی نے آ کر خبر دی کہ بدری ایک ایمبولینس میں بیہوش ہو کر ہسپتال میں پڑا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ لوٹا۔

اور وہ بیچ بیچ لوٹا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک پہلوان قسم کا آدمی تھا۔ شاید وہ شہر کے گھریلو ملازمین کی انجمن کا سیکریٹری صدر تھا۔ رمیش نے اُس دن کی دعوت کا تذکرہ کیا تو بدری نے حیرت کا اظہار کیا۔ وہ تو ایک سنجیدہ ایکسیڈنٹ میں مبتلا تھا۔ سنجیدہ مزاج پہلوان گواہی اور ثبوت پیش کر رہا تھا۔ اُن کی دلیلوں میں زخم دیکھ کر میں بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ میں نے ہنس کر بند کرنے کے لئے رائے شماری کا مشورہ دیا۔ آخر جمہوریت کی برکات کا ہم نہیں تو اور کون فائدہ اٹھائے گا؟ رمیش کے سوا سبھی نے میری بات سے اتفاق کیا اور کثرت رائے سے یہ قرار پایا کہ بدری کی بات میں کافی وزن ہے۔ رمیش اپنی بات پر اڑا رہا۔ [illegible] نے ہنس کر میں نے کہا۔

"بدری! آج سے تمہاری تنخواہ میں پانچ روپے اضافے سو

اعلان میں رمیش بابو کی طرف سے کر رہا ہوں۔"

"بالکل غلط! میں اسے نکالنے کا حکم صادر فرماتا ہوں۔"

"بابو جی! ایسا کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔" بدری نے جواب دیا۔

"کیوں؟" رمیش نے پوچھا۔

"اس کا جواب ہماری انجمن کے سیکریٹری صدر جناب پہنچ دیں گے۔" اس نے پہلوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس نے زندگی میں پہلی بار ہر خوشی توڑتے ہوئے پہلوان بولا کہ اسے نکالنے سے ہم آپ کے خلاف جلوس نکالیں گے۔ نعرے لگائیں گے۔ شہر بھر میں آپ کو بدنام کریں گے آپ کا پتلا بنا کر جلائیں گے اور اگر ضرورت پڑی تو آپ کو۔۔۔"

"بس، بس، بس۔" رمیش بول اٹھا۔

اس کا مضبوط جسم کانپ رہا تھا۔ اُس کا تو امادل چھاتی کی دیوار سے ٹکرا کر آواز پیدا کر رہا تھا۔

"ایک ملازم کے ساتھ برا سلوک ہونے پر ہم لوگ مالک کا جلوس ہی نہیں نکالتے اس کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں۔"

"اور اگر ملازم کو انعام ملے تو؟" میں نے پوچھا

"تو مالک کی شہرت کا ڈنکا پیٹتے ہیں۔"

"آپ جا کر اپنی یونین کو ایسا کرنے کی تاکید کیجئے۔" میں نے پہلوان کو مشورہ دیا۔

"آپ مناسب فرما رہے ہیں۔" اُس نے جواب دیا۔ اور رخصت ہو گیا۔

"صاحب! آپ کے لئے چائے تیار کرتا ہوں۔" بدری نے شکرانے کے طور پر کہا۔

"ہم دونوں کے لئے۔" میں نے کہا۔

بدری کو شاید یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ نہ ہی رمیش کو۔

بقیہ ایلوپیری کی تصویری نظمیں ص ۵۹

اوپر نیچے کی ترتیب سے لکھا ہے۔ پہلی نظم میں ایلوپیری کا چہرہ ہے۔ پتلی پتلی لکیریں بڑے کے چھوٹے ہوتے ہوئے چہرے کی مانند آہستہ آہستہ نقاب کشائی کرتی ہیں جس سے حسن و رعنائی کے ساتھ ساتھ شوق کی بیتابی بڑھ جاتی ہے۔ جو خود اپنے اندر ایک اضافی شان کا مالک ہوتی ہے۔ ایلوپیری کی کئی تصویری نظمیں ہیں۔ میں نے اپنے مضمون میں بخوف طوالت صرف تین نظمیں لی ہیں۔ اُردو شاعری میں بیت سے تجربے ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایلوپیری کے یہ تجربات اُردو دنیا کے لئے باعث دلچسپی ہوں گے۔

محمود حمیدی

مشورہ

نئے لوگوں کی یہ بستی جہاں تم مدتوں پہلے
نئے شہر تمنا کے لئے کتنی مرادوں سے

سفیرِ عہدِ نو بن کر بڑی چاہت سے آئے تھے
نئے احساس کی سوغات اپنے ساتھ لائے تھے

○

جو راہیں ہر قدم پر چاہتی تھیں روک لیں تم کو
بھلا کر دل سے سب دیرینہ یادیں عمرِ رفتہ کی

چلے آئے تھے تم اُن سے گزر کر بے نیازانہ
نئے عنواں سے چھیڑا تھا نئے خوابوں کا افسانہ

○

مگر اب مدتیں گزریں کہ تم چپ چپ سے رہتے ہو
بدلتے وقت کو اپنا سمجھ کر تم بہت خوش تھے

کسی نے اس نئی محفل میں پہچانا نہیں تم کو
بدلتے وقت نے اپنا مگر جانا نہیں تم کو

○

خلوصِ دل کا نذرانہ کہاں لے کر چلے آئے
پرانے لوگ اپنی عادتوں میں اور ہی کچھ تھے

یہاں جنسِ پذیرائی کی قیمت اور ہی کچھ ہے
نئے لوگوں کا اندازِ طبیعت اور ہی کچھ ہے

○

شناسا مدتوں کے اس طرح آپس میں ملتے ہیں
چٹانوں سے سوا سنگین چہرے روبرو پائے

کہ جیسے غور سے اک اجنبی کو اجنبی دیکھے
مشینوں سے زیادہ بے مروت آدمی دیکھے

○

جب اپنی کس مپرسی زندگی محسوس کرتی ہے
بسا اوقات تنہائی کے وہ لمحے بھی آتے ہیں

کوئی اندر ہی اندر گھٹ کے جیسے مرنے لگتا ہے
کہ آپ اپنے ہی احساسات سے جی ڈرنے لگتا ہے

○

بدل لو فیصلے اپنے جو گھر سے لے کر نکلے تھے
شکستِ انجمِ امیدوں پہ اپنی نوحہ خواں کیوں ہو؟

بھلا دو تم نے جو وعدے کئے تھے زندگانی سے
کہ یہ زندہ نہ ہوں گی اب تمہاری نوحہ خوانی سے

○

چلو اپنے ہی ویرانے کی جانب لوٹ چلتے ہیں
تمہارے درد کا محرم، تمہیں پہچاننے والا

وہاں شاید یہ چاکِ دامنِ احساس سِل جائے
پرانے دوستوں میں کوئی شاید اب بھی مل جائے

○

طبی دواخانہ یونانی (اندور) پرائیویٹ لمیٹڈ

کی مایہ ناز ایجاد

جسم کے تمام فاسد مادوں کو تقویت دے کر بکثرت خون صالح پیدا کرتا ہے۔ بدرجۂ اعلیٰ مقوی اعصاب ہے

دلدوصاغ

خصوصاً قوائے جسمانی کو طاقت دیتا ہے

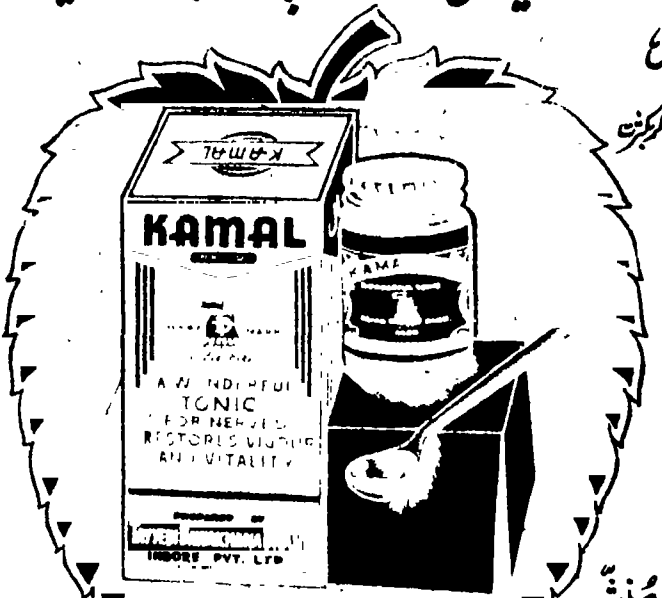

کمال

منشی طبی

اور زہریلی دواؤں سے بالکل پاک ہے

مکمل کورس ۲۴ روز کے لئے

۲۲ روپیے

۱۲ روز کے لئے

۱۱ روپیے

چند شہرۂ آفاق خصوصی ادویات

ٹی۔ڈی ٹوتھ پاؤڈر

امراض دنداں کے لئے مشہور و مستند منجن۔ پایوریا کی بہترین دوا اور ہر روزانہ استعمال کیلئے بہترین منجن

بڑی شیشی	۱/۵۰
چھوٹی شیشی صرف	-/۵۰

عرقِ ماء اللحم

کھوئی ہوئی طاقت کی بحالی کے لئے نفیس مرکب

موسم سرما کی جان

پوری بوتل قسم اعلیٰ	۱۳/۷۵
آدھی بوتل	۷/۱۲

لبوب کبیر

طب یونانی کا مشہور مرکب بہترین صحیح اجزاء سے تیار کردہ

قسم اعلیٰ دس گرام ۵۰ پیسے

بڑھاپا پلز

فالج، لقوہ، کھانسی اور بچوں کے امراض کے لئے اکسیری گولیاں

شیشی کلاں	۳/۲۵
" خورد	۱/۶۲

شاہی

کمی خون، ضعف اعصاب، ضعف ہضم، موسمی بخار، کمزوری اور ہر قسم کی کمزوری کے لئے بہترین تقویہ

مکمل کورس	۹/ روپیے
۱۲ روز کے لئے	۳/۲۵ "

طبی دواخانہ یونانی (اندور) پرائیویٹ لمیٹڈ

۵۱- بوہرہ بازار اندور سٹی (ایم۔پی)

بدایچ

چوک بازار آگرہ

مہاراجا روڈ اندور

فون:- ۶۳۳۴

طبی دواخانہ یونانی

فون:- ۳۲۴۸۸۳

۷۷ محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳

افسانہ:-

اکرام جاوید

موم کا بدن

اُسے اپنے باپ سے بے حد محبت تھی۔ وہ اُس کے بغیر ایک پل بھی چین سے نہیں رہ سکتا تھا۔ چودہ سالہ زندگی میں اُس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، ایک سائے کی طرح اپنے باپ کے ساتھ رہا تھا۔ اور اُس کا باپ بھی اُسے اپنی اولاد میں سب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ سُرخ اینٹ اور چُونے کی دیواروں سے مصور ایک وسیع اور خوبصورت مکان میں وہ اپنے باپ کے ساتھ اکیلا نہیں رہتا تھا۔ اس کی بوڑھی دادی تھی۔ ماں تھی اور پانچ چھوٹے بھائی بہن تھے۔ اور گھر سے باہر ایک خاندان تھا۔ چچا، ماموں، خالہ، خالو، پھپھی اور پھوپھا، اپھپھی زاد اور پھوپھی زاد بھائی بہن۔ اتنے بڑے خاندان کے علاوہ بے شمار دوست احباب۔ اس کے خاندان میں سب ہی لوگ بڑے اور نامور تھے۔ سین وہ صرف اپنے باپ کی شخصیت سے مرعوب اور متاثر تھا۔ وہ اکیلا کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ اور اس کا باپ کبھی بھی اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاتا تھا۔ ذرا بڑا ہوا تو اسے اسکول میں داخل کروایا گیا۔ اور اسکول میں اسے مدتوں وحشت ہوتی رہی تھی وہ صبح اپنے باپ کے ساتھ اسکول آتا اور شام میں اُسی کے ساتھ گھر لوٹتا تھا۔!

اُس کے خاندان میں سب ہی بڑے لوگ تھے۔ اور اس کا باپ بھی بڑا آدمی تھا۔ لیکن دولت جمع کرنا اُس کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ مذہبی آدمی تھا۔ پھر بھی نہایت وسیع القلب اور روشن خیال تھا۔ وہ گہرے سانولے رنگ کا معصوم صورت اور نیک دل آدمی تھا۔ اس کا چہرہ گھنی تھا۔ آنکھیں گہری سیاہ اور چمکدار تھیں۔ ناک اونچی اور ستواں تھی۔ ہونٹ پتلے پتلے تھے۔ اور دہانہ نہ تو بہت زیادہ پھیلا تھا اور نہ انتہائی تنگ۔ دہانہ کی ساخت ہی ایسی تھی کہ اس کے پتلے پتلے ہونٹ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے۔ ایک نہایت پیاری، پُرخلوص اور شفقت بھری مسکراہٹ چہرے پر مختصر سی ڈاڑھی تھی۔ اور آنکھوں پر ہمیشہ سنہری کمانیوں والی عینک چڑھی رہتی تھی عینک کے اندر سے جھانکنے والی سیاہ چمکدار بادامی آنکھوں میں ہمیشہ ایک نرم نرم سی روشنی فروزاں رہتی۔ مدہم لو میں جلنے والے دو چراغ جو پیار و محبت کی روشنی دیتے تھے۔ اس کے چہرے پر زہد، بُردباری، علم و انکسار کے ساتھ ساتھ گہرے تفکر کے نقوش بھی ابھرے رہتے تھے۔ وہ ایک غیر معمولی ذہین آدمی تھا۔ اس کی ذہانت، فطانت، علمیت اور شائستہ فکر کے سب ہی لوگ قائل اور معترف تھے۔ وہ حیرت اور شوق سے اپنے باپ کی باتیں سنا کرتا تھا۔ مذہب، فلسفہ جدید اور قدیم دینی اور دنیاوی علوم و فنون پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ اُسے اپنے باپ کی معلومات اور علم پر فخر تھا۔!

اس کے باپ نے زندگی بھر کوئی جائیداد پیدا نہیں کی تھی۔ لیکن بزرگوں کی پیدا کی ہوئی جائیداد کچھ اتنی تھی کہ زندگی بھر کبھی اُسے روپیہ پیسے کیلئے پریشان ہونا نہیں پڑا پھر وہ اپنی ذات پر نہایت کفایت شعاری سے خرچ کرتا تھا۔ اور دوسروں پر بیدریغ اور بے حساب خرچ کرتا تھا۔ وہ اپنے وقت کا حاتم تھا اور دوسروں کے لئے زندہ تھا۔

"زندگی تجربہ ہوش و حواس ہے۔" ایک واقعہ ہے جب ہمیں انسان کی آزمائش کی جاتی ہے اور اُسے بقدر ظرف مقام دیا جاتا ہے۔ دنیا کی زندگی دو روزہ ہے اور اس زندگی لازوال دنیا میں کوئی خیر واقعی کما کر پائی جا سکتی ہے تو وہ ہے نیکی اور تجربہ۔ انسان ایک سچائی ہے باقی سب جھوٹ ہے" وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ "دل کا سکون اور روح کی مسرت ہی دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ہیں"

اس کا باپ ہر قسم کے لوگوں سے ملتا تھا۔ اس کے دوستوں میں علمائے دین بھی تھے اور رندان خانہ خراب بھی۔ سخت قسم کے کٹھ ملا

پسند بھی تھے اور آوارہ مزاج اپیقوری بھی۔ وہ لوگ بھی تھے جو نجات کے لیے جسم اور روح پر ستم ڈھاتے تھے۔ اور وہ بھی تھے جو جسمانی آسودگی اور لذت ہی کو حاصلِ زیست سمجھتے تھے۔ شہر بھر کے شاعر، ادیب، مصور اور موسیقار اس کے دوست تھے۔ اور شہر بھر کے دیندار دل اور زاہد وں کی محفلوں میں بھی اس کا نام احترام سے لیا جاتا تھا۔ اس کے باپ کی عمر اسی برس سے کم ہی تھی۔ مگر وہ بوڑھوں میں بوڑھا اور بچوں میں با آسانی بچہ بن سکتا تھا۔ اس میں غرور و تکبر نام کو نہ تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کا بھی دشمن نہ تھا۔ اسے کوئی شاذ و نادر ہی ملتی تھی جو اس کے باپ کی خود غرضی، سنگدلی یا غرور و تکبر کو ثابت کر سکے۔ زندگی بھر اس نے کسی کا دل نہیں دکھایا تھا۔ "ان ن کا دل جام جم سے بھی زیادہ قیمتی شے ہے کہ ایک بار ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا۔ پھر کوئی اسے جوڑ نہیں سکتا۔ جب یہ حالت ہے پھر تو کوئی کسی کے دل کو کیوں توڑے۔" وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ مذہبی لوگوں میں پائی جانے والی جھلاہٹ، تنگ مزاجی اور تعصب کا اس میں نام و نشان تک نہ تھا۔ آستا نیک، آستا من پسند، وسیع المشرب اور خود آگاہ خدا پرست آدمی تھا وہ کہ سارا شہر اس کے گن گاتا تھا۔ اور وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے عظیم اور پیارے آدمی کو بھی موت آسکتی ہے۔

لیکن ایک دن اسے موت آگئی۔!

وہ ابھی بائی اسکول ہی میں تھا کہ بمبئی کی ایک سرد اندھیری رات میں اس کے باپ کی زندگی کی روشنی گم ہو گئی۔ اس کا باپ جو صبح زندہ تھا، ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اور اسے حسبِ معمول گھر سے اسکول بھیجا کرتا تھا۔ وہ ذرا سی دیر میں ایک سرد لاش بن چکا تھا۔ وہ غم سے پاگل ہو گیا۔ رات بھر باپ کی لاش سے لگا روتا رہا۔ اور صبح جب لوگوں نے میت کو نہلا دھلا کر سفید کفن میں لپیٹ دیا تو اس نے بھری آنکھوں سے حیرت اور غم سے اس نے دیکھا کہ اس کے باپ کے مردہ چہرے پر حیرات کی رات میں نیلگوں ہوئی تھا اور جس کے ہونہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا، ایک عجیب سی ملکوتی مسکراہٹ کھل اٹھی تھی۔ ایک مکمل اور پر سکون اور ناقابلِ بیان حد تک پر اسرار مسکراہٹ جو زندگی میں کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اور آخری دیدار کرنے والوں کی زبان پر بے ساختہ خدا کی حمد و تعریف کے جملے آگئے تھے۔ سب ہی نے اس ابدی مسکراہٹ کو مرحوم کی نجات اور اس کے متقی ہونے کی نشانی قرار دیا تھا۔ پھر جنازہ اٹھا۔ اور جلوس جنازہ میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔ انسانی سروں کے سمندر میں اس کے باپ کا جنازہ اسے اس کشتی کی طرح دکھائی دیا جو آدھی لاش لے جانے کے لئے نیلے سوگوار سمندر کی لہروں پر نمودار ہوئی تھی۔ فضا سوگوار تھی۔ اور کلمہ کی گونج سے بوجھل تھی۔ آسمان اداس تھا اور زمین نوحہ کناں۔ اور پھر شہر کی بڑی مسجد میں نماز جنازہ سینکڑوں لوگوں نے غم اور سوگواری کے عالم میں پڑھی۔ اور شہر کے ایک آباد محلے کے قلب میں سرخ اینٹوں کی چار دیواری سے گھرے قبرستان میں اس کے پیارے اور عظیم باپ کی لاش کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ غم واندوہ کی شدت سے اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ اسے وہ سب کچھ ایک خواب کی طرح دکھائی دے رہا تھا ایک انتہائی غمناک اور روح فرسا خواب۔ اور جب اس کے باپ کو سنگ لحد میں سلا دیا گیا تو کفن کے سرہانے کے بند کھول دیئے گئے۔ اور چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں نے بے اختیار پکار کر کہا۔ "سبحان اللہ" اور یہاں بھی اس نے آنسوؤں کی چلمن سے دیکھا۔ گہری سنگ لحد میں اس کے باپ کا نورانی چہرہ خود بخود قبلہ رو ہو گیا تھا۔ بند آنکھیں، پر سکون اور مطمئن چہرہ جو قبلہ کی طرف لیٹ گیا تھا اور یہ اس بات کی نشانی تھی کہ مرنے والے کا خاتمہ بخیر ہوا۔ اور وہ جنت میں جانے والا ہے۔ اور اس کا دل چیخ اٹھا۔ "ابا آپ اکیلے جا رہے ہیں۔ پھر کبھی نہ آنے کے لئے۔ مجھے بھی ساتھ کیوں نہیں لے چلتے۔ مجھے اکیلا کیوں چھوڑ رہے ہیں۔" لوگوں نے اسے سنبھال کر وہاں سے ہٹانا چاہا تو وہ کشمکش کرتے ہوئے بولا۔

"چھوڑ دو مجھے۔ ظلم نہ کرو۔ میں اپنے ابا کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ آخری بار، آہ آخری بار۔" اس کے بڑے چچا نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "بچے، سے بھائی جان مرحوم کو بے حد انس تھا۔ وہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اسے دیکھ لینے دو۔ اب وہ زندگی بھر اپنے پیارے اور شفیق باپ کی صورت نہیں دیکھ سکے گا۔"

اور وہ دیر تک اپنے باپ کے مردہ چہرے پر نگاہیں جمائے بکھرا رہا۔ کتنا سکون کتنی بے خوفی۔ کس قدر اعتماد اور اعتبار ہے اس نورانی چہرے پر۔ مرنے کے بعد بھی اسی طرح سہانا، مسکراتا ہوا مطمئن چہرہ جسے دیکھ کر کبھی ڈر نہ لگتا تھا اور نہ ہی وحشت ہوتی تھی۔ عبیر و گلاب کے فرش پر لیٹا وہ محبت بھرا جسم، جو جلد ہی نگاہوں سے اوجھل ہونے والا تھا۔

ابھی وہ جی بھر کر اپنے باپ کا چہرہ دیکھ بھی نہ سکا تھا کہ لوگوں نے پتھر کی سلیں لحد پر چنانی شروع کر دیں۔ ایک سل دوسری سل۔ پہلے انتی ڈھک گئی پھر دھڑ، ایک سل اور۔ اور اب سینہ بھی ڈھک گیا۔ اور ایک سل کالے پتھر کی ایک چوڑی سی سل۔ آخری سل جس نے لحد میں اس کے باپ

کو اس طرح بند کر دیا جیسے حجری کا دروازہ حجری کو بند کر دیتا ہے۔ اور پھر گور کن پھاوڑوں سے لحد پر مٹی ڈالنے لگے۔ وہ ساری رسومات کو کھڑا دیکھتا رہا دم آتش بدل، شکستہ اور پریشان حال۔ اور کچھ کا دیر بعد مٹی کا ایک ڈھیر قبر کی صورت میں اس کے سامنے تھا جس کے نیچے اس کا انتہائی شفیق اور پیارا ایک مٹی پر سکون نیند سو رہا تھا۔ فاتحہ خوانی کے بعد سب لوگ واپس چلنے لگے اور اس کے ماموں نے زبردستی اسے وہاں سے چلنے پر مجبور کیا۔

"صبر کرو بابا۔ دیکھو ابھی تمہاری امی ہیں، بھائی بہن ہیں، دادی اماں ہیں، نانا جان ہیں، نانی اماں ہیں۔ اور ہم لوگ ہیں، تم ہم سے یوں بے حال ہو۔ اس طرح تم روؤ گے اور اپنی حالت تباہ کر دو گے تو تمہارے ابا کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔"

"تو کیا ابا ہمیں دیکھ رہے ہیں؟"

"بالکل۔" اس کے ماموں نے کہا۔ "مگر ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔"

"پھر کون دیکھ سکتا ہے انہیں؟"

"کوئی نہیں۔" اس کے ماموں پریشان ہو گئے۔ "صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے انہیں دیکھ سکتے ہیں۔"

"کیا مرنے کے بعد بھی انہیں دیکھنا ممکن نہیں۔؟" وہ کھوکھلی آواز میں بولا۔

"اب وہ صرف قیامت کے روز دکھائی دیں گے بابا۔" اس کے ماموں کی آواز لرز کر رہ گئی۔

اور اس نے پوری شدت سے سوچا کہ کاش قیامت ابھی اسی وقت آ جائے تاکہ وہ اپنے پیارے ابا کو دوبارہ دیکھ سکے۔ ان سے مل سکے۔ ان سے ہمکلام ہو سکے۔ ان کی قربت کے طاقت بخش احساس سے قوی بن سکے۔!

لیکن قیامت نہیں آئی۔ اور وہ رات بھر بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ رات بھر آنسو بہاتا رہا۔ اس کی سسکیوں سے کوئی خواب لرز رہا تھا۔ اس کے آنسو سے بھیگ رہا تھا۔ اور اس کی سوگوار ماں اور بوڑھی دادی اس کے بستر پر بیٹھی اس کی دلجوئی کر رہی تھیں۔

دبلی پتلی کمزور اور زرد رو دادی اماں کے مجبور یوں آلود مغموم چہرے پر نگاہیں جمائے وہ بار بار پوچھتا تھا۔

"دادی اماں۔ ابا اب کیا کر رہے ہوں گے۔؟"

اور دادی اماں دل پر جبر کر کے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیتی تھیں۔

"بیٹا۔ اب منکر نکیر کے سوال و جواب کے بعد جا چکے ہوں گے۔ تمہارے ابا تو جنتی تھے۔ اب قبر ان کے لئے روشن اور کشادہ کر دی گئی ہو گی۔ اور قبر میں جنت کی کھڑکی کھول دی گئی ہو گی۔"

"ابا جنت کو دیکھ رہے ہوں گے۔"؟ وہ بے تابی سے پوچھتا۔ "ابھی وہ قبر ہی میں ہوں گے نا دادی اماں۔ جنت کو وہ ابھی نہیں گئے ہوں گے نا"

"وہ قیامت تک قبر ہی میں رہیں گے۔ خدا کی عبادت اور ہم تمام کے لئے دعا کرتے ہوئے، سکون کی نیند سوتے ہوئے وہ قیامت تک قبر ہی میں رہیں گے۔ اور جب صور اسرافیل پھونکا جائے گا تب ہی وہ قبر سے نکلیں گے اور خدائے بزرگ و برتر کے آگے حاضر ہوں گے۔ اسی دن وہ ہم سے ملیں گے۔ اسی دن خدائے واحد و مطلق فیصلہ اور حساب کرے گا۔

تو ابا قبر ہی میں ہیں۔ وہ دل ہی دل میں کہہ اٹھا۔ اور قیامت تک وہیں رہیں گے۔ کہیں نہیں جائیں گے۔ ابا قبر میں زندہ ہیں۔ ہمیں دیکھ سکتے ہیں ہماری آواز سن سکتے ہیں۔ اس طرح ابا کہیں گم نہیں ہوئے ہیں۔ کھو نہیں گئے ہیں۔ وہ قبر میں موجود ہیں اور موجود رہیں گے۔ ساتھ ہی اس نے ایک انتہائی بچکانہ سوال کیا۔

"دادی اماں۔ ابا کو قبر میں کیوں دفن کیا گیا۔ ہمارا گھر تو اتنا بڑا تھا۔ کسی کمرے میں انہیں رکھ دیتے تو کیا ہوتا۔؟"

دادی اماں خوف اور غم سے زرد پڑ گئیں، اور درد بھری آواز میں بولیں۔ "بیٹا بڑا گھر تو قیامت تک نہیں رہ سکتا تھا۔ بھلا اس میں ان کو کیسے رکھا جا سکتا تھا۔ وہ جو قیامت تک رہنے والے ہیں۔" وہ رک کر بولیں۔ "سچی بات تو یہ ہے بیٹے کہ ہمارے یہ مکان بنے فنا ہو جانے والے اور غیر حقیقی ہیں۔ اصلی اور حقیقی مکان تو قبر ہی ہے جہاں سب کو ایک دن جانا ہے اور قیامت تک رہنا ہے۔ غفلت میں ہو یا راحت میں قیامت تک قبر ہی میں رہنا ہے۔

اور اُسی وقت سے اس کے ذہن میں اپنے باپ کی قبر کو پختہ اور پائیدار بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ اور چہلم کے دن جب مٹی کی کچی قبر پختہ چبوترے اور سیمنٹ کی ایک خوبصورت سی پختہ قبر میں تبدیل ہو گئی۔ اور سفید پھولوں کی چادر چڑھانے کے بعد تعویذ مزار پر گلاب کے تازہ سرخ پھول رکھ کر فاتحہ کے لئے لوگوں نے ہاتھ بلند کئے تو بے ابر نیلگوں آسمان پر گرمیوں کا پورا چاند ابھر آیا تھا۔ اور سفید نورانی قبر پر اجلی چاندنی کے پھول برسانے لگا تھا۔ قبر کے سرہانے سے خوشبودار دھواں بلند ہو رہا تھا۔ پھول اور خوشبو ہی ارواح کی غذا ہیں۔ مرنے والوں کی واحد غذا جس سے انہیں سکون ملتا اور آسودگی نصیب ہوتی ہے۔ بوڑھی دادی اماں کی کہی ہوئی یہ بات اس کے ذہن پر ہم کردہ کی تھی۔ وہ ہر روز سورج نکلنے سے پہلے باپ کی قبر پر پہنچ جاتا۔ اور نو شگفتہ پھولوں کو قبر پر چڑھاتا۔ خوشبودار اگربتیوں کو سلگاتا۔ اور گیارہ بار درود پڑھ کر فاتحہ پڑھتا۔ اُس نے مسجد کے پیش امام سے سُنا تھا کہ گیارہ بار درود پڑھنے سے اہل قبور کو قبر پر آنے والے کی اطلاع ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

صبح سویرے وہ اپنے باپ کی قبر پر پہنچ جاتا۔ درود و فاتحہ کے بعد گھنٹوں قبر سے باتیں کرتا۔ اپنے باپ کو گھر اور باہر کی باتیں سناتا۔ اور جب سورج بلند ہو جاتا تو بوجھل قدموں سے واپس چلا آتا۔ اور شام میں اسکول سے واپسی کے فوری بعد پھر باپ کی قبر پر پہنچ جاتا۔ اپنے باپ کو اپنا سبق سُناتا۔ درسی کتب پڑھتا۔ قبر سے باتیں کرتا رہتا۔ قبر کے اندر اپنے باپ کی موجودگی کا احساس اسے سکون بخشتا تھا۔ وہ اب اس قدر غمگین اور دل شکستہ نہیں رہا تھا۔ آنکھوں سے دور ہو کر بھی اس کا باپ دُور نہیں ہوا تھا۔ وہ جب بھی قبر پر پہنچتا چشم تصوّر اسے اس کے باپ کا چہرہ دکھا دیتی۔ وہ مسکراتا ہوا چہرہ، وہ محبت بھرے ہاتھ، وہ بازو، وہ سینہ، وہ جسم۔ وہ روح۔ وہ لازوال محبت اور وہ شفقت۔ وہ اپنے باپ کو اس طرح محسوس تو کر سکتا تھا۔ اس کی آواز کو سن سکتا تھا۔ اس کی بے پناہ قربت میں پناہ لے سکتا تھا۔!

ایک سال گذر گیا۔ مگر اس کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ صبح اور شام باپ کی قبر پر باقاعدگی سے گھنٹوں اس سے باتیں کرتا۔ ایک دن اس نے اپنے باپ کی قبر کو مخاطب کر کے کہا "ابا جان! میں درجۂ اوّل سے کامیاب ہوا ہوں۔"

چند دنوں بعد اس نے اپنے باپ کو بتایا کہ اسے کالج میں داخل لیا گیا ہے۔ اور چند ماہ بعد اس نے شام میں باپ کی قبر پر آنا ترک کر دیا۔ اس میں اس کے ارادے کو مطلق دخل نہ تھا کالج کی زندگی اور سرِ وقت کی وجہ سے وہ مجبور ہو گیا تھا۔ اور چند ماہ بعد ایک صبح اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں اپنے باپ کی قبر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ابا۔ اب میں ہر روز یہاں نہ آسکوں گا مجھے روز کالج جانے میں دیر ہو جاتی ہے۔ اچھے ابا۔ میں اب ہر جمعہ ضرور آیا کروں گا۔ آپ کوئی خیال نہ کریں۔ میرے لئے دعائے خیر فرمائیں۔"!

زندگی کے تقاضوں نے گو اسے پوری طرح اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے باپ کے خیال سے غافل نہ ہو سکا تھا۔ اس کا پیارا شفیق باپ اس کے خیالوں میں زندہ تھا۔ اور ہر جمعہ کے روز جب وہ اس کی قبر پر پہنچتا تو اس کے جسمانی وجود کو بھی محسوس کرتا تھا۔ اس کے کچے ذہن میں برسوں پہلے جو خاکہ بنا تھا اب اس میں رنگ بھر چکا تھا۔ اس کا عقیدہ پختہ ہو گیا تھا کہ قبر میں اس کا باپ موجود ہے۔ جو اس کو دیکھ سکتا ہے۔ اس کی آواز سن سکتا ہے۔ اس کی خوشی اور کامیابی کے لئے خدا سے دعا کر سکتا ہے۔!

وہ گرمیوں کی ایک رات تھی۔ اور اتوار کی رات تھی۔ وہ خلافِ معمول اور خلافِ وقت اپنے باپ کی قبر پر پہنچ گیا تھا۔ اور انتہائی درد بھری آواز میں کہہ رہا تھا۔

"ابا۔ دادی اماں کا ابھی ابھی انتقال ہوا ہے۔ وہ۔ وہ بھی آپ کے پاس پہنچ گئی ہوں گی۔ کیا آپ کو یہ سب معلوم ہے؟"

باپ کی موت کے بعد دوسرا گھاؤ تھا جو اس کے دل پر لگا تھا۔ بوڑھی دادی سے اسے اُنس تھا۔ باپ کی موت کے بعد وہ دادی کی رفاقت میں سکون محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ مر گئی۔ ویسے بے حد غم تھا۔!

رات ہی میں اس کے چچا نے طے کیا کہ دادی اماں کو اس کے باپ کے سرہانے سپردِ خاک کیا جائے۔

"بھائی جان مرحوم بڑے خوش نصیب تھے جنہیں ماں کی پائنتی مل رہی ہے۔"

"ماں کے قدموں میں جنت ہے"۔ پرانی یادیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ اور اس طرح دادی اماں ہی ابا کے سرہانے دفن ہوں گی ابا کو خود بخود جنت مل جائے گی۔ وہ جنت اور دوزخ کے بارے میں سوچتا ہوا قبرستان کی طرف چل پڑا جہاں اس نے باپ کی قبر کے سرہانے اس کی دادی اماں کی

آخری آرام گاہ اور ان ہی کے الفاظ میں اُن کا اصلی اور حقیقی مکان تیار ہو رہا تھا۔!

قبرستان میں جب وہ پہنچا تو سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔ اور دھوپ خاصی تیز ہو گئی تھی دو سیاہ فام گورکن سیاہ کملی پوشیوں کو الشوث کی طرح کسے سر بسجود رہے تھے ان میں سے ایک دراز قد سیاہ فام آدمی تھا جس کی تھوڑی پر مختصر سی کھچڑی داڑھی تھی اس کی ادھیڑ عمری کی غماز تھی۔ دوسرا آدمی نوجوان تھا۔ گو سیاہ فام وہ بھی تھا مگر اس کی صورت پر اس کے ساتھی کی طرح وحشت نہیں برستی تھی۔ دونوں گورکن کرتک پر منہ تھے۔ اور ان کے چہرے، سینے اور پیٹھ پر گرمی سے پسینے کی بوندیں اُبھر آئی تھیں جن پر مٹی جم رہی تھی دادی اماں کی قبر اس کے باپ کی قبر کے بالکل سرہانے کھدی رہی تھی۔ اچھا خاصا گڑھا کھد چکا تھا۔ وہ حیرت، غم اور شوق سے کھدائی کا کام دیکھنے لگا۔ ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ "ابا کے سرہانے کدال اور پھاوڑے کا ــــ" شور و غل ہو رہا ہے۔ کیا اس سے ان کے آرام یا عبادت میں خلل نہیں پڑ رہا ہوگا۔؟ ساتھ ہی دوسرا خیال آیا، کیا ابا اس وقت اس کی موجودگی سے آگاہ ہیں۔؟ پھر ایک خیال اور۔ کیا ابا کو معلوم ہے کہ ان کے سرہانے کون دفن ہونے آ رہا ہے۔؟ پھر یکے بعد دیگرے خیالات آتے گئے۔

اچانک ایک ہلکا سا دھماکا ہوا۔ اور دونوں گورکن بیک آواز خوف سے چیخ پڑے۔ وہ چونک گیا دادی اماں کی قبر کی پائنتی کھودتے ہوئے گورکنوں نے اس کے باپ کی قبر کے سرہانے کو کھود دیا تھا۔ اور تازہ کھدی ہوئی قبر میں سے پرانی قبر کا دہانہ کسی سرنگ کے دہانے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ جس پر تازہ گری ہوئی مٹی کا غبار جھا گیا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ تن بدن میں سنسنیوں کا ایک جال سا قفقہ و قفقہ سے ڈوبنے ابھرنے لگا تھا۔ آج برسوں بعد اس بند تجوری کا پٹ کھلا تھا جس میں اس کی روح کا خزانہ بند تھا۔ اس کے دل میں ایک بار اور اپنے باپ کا چہرہ دیکھنے کی خواہش پوری شدت سے ابھر آئی۔ اس کا باپ جو اس قبر میں اس کی نگاہوں کے آگے اُتارا اور سُلایا گیا تھا۔ اس کا نیک، عظیم اور خدا پرست باپ جس کے متقی ہونے کی شہادت خود اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ وہ جو قبر میں قیامت تک رہنے والا تھا۔ جنت کے نظاروں اور خدا کی عبادت میں محو، پُرسکون اور پر آرام کی زندگی بسر کرتا ہوا۔ وہ جس کے ساتھ وہ برسوں سے محوِ تکلم رہ چکا ہے۔ وہ جو اس قبر میں تھا۔ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ .....!!!

وہ دھڑکتے دل سے تازہ کھدی ہوئی لحد میں کھلے ہوئے دہانے کی طرف دیکھنے لگا جس پر سے گرد و غبار اب صاف ہو چکا تھا۔ اس کا دل کسی نامعلوم خوف سے ڈوبنے لگا۔ اس نے جھک کر اس تاریک سرنگ میں جھانک کر دیکھا۔ سفید کفن، کافور، عطر، عبیر اور گلاب کی خوشبو کا نام و نشان تک نہ تھا۔ قبر میں کچھ بھی نہ تھا۔ ہڈیاں تک دکھائی نہ دیتی تھیں۔ اس پر سکتہ کا سا عالم طاری ہو گیا۔ اس ایک لمحہ میں اس کے خیالوں کا شیش محل دھماکے کی بلندیوں سے فرش پر آ رہا تھا۔ قبر بالکل خالی تھی۔ اندر کچھ تھا تو وہ مٹی تھی اور تاریکی۔ وہ پریشان ہو کر اوپر آ گیا، اور گورکن جو اپنی خطا پر نادم اور لرزہ براندام تھے جلدی جلدی قبر کے کھلے ہوئے دہانے کو بند کرنے لگے۔

قبر میں ہڈیاں تک گل گئیں۔ آبا تو قیامت تک یہیں رہنے والے تھے۔ لیکن یہاں کچھ بھی نہیں۔ زمین اس کے باپ کو کھا چکی تھی۔ تو یہی زندگی ہی ہے۔ قبر کی طرح خالی، تنہا، ویران اور کھوکھلی ــ اور بے حقیقت ــ؟

اس کے نیم پختہ ذہن پر کچے خیالوں کے بنائے ہوئے سارے گھروندے مسمار ہو چکے تھے۔ اور روح کی گہرائیوں میں درد بھرا اور بھیانک سناٹا چھا گیا۔ زخمی دل اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا جب وہ قبرستان سے باہر نکلا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کے باپ کا در حقیقت آج انتقال ہوا ہے۔ اور وہ اب اسے سپردِ خاک کر کے جا رہا ہے ــ!

بقیہ منظر نگاری کا مفہوم صـ ۱۴ کا

انسانی نفسیہ سے متاثر ہونا، فطرت پر انسانی ہیئت کا اثر اور فطرت کے ذریعہ متصوفانہ، فلسفیانہ، اخلاقی اور نفسیاتی مسائل کا تجزیہ وغیرہ بھی منظر نگاری کے زمرے میں شمار ہے۔ ممکن ہے کہ منظر نگاری کی اس وسعت سے کچھ ناقدین متفق نہ ہوں۔ اور اُن کے ذہن میں منظر نگاری کا نہایت محدود تصور رہا ہو۔ مگر انگریزی ادب میں منظر نگاری کے اس مفہوم کو اپنایا گیا ہے اور فطرت کے مختلف پہلوؤں کو منظر نگاری کے قلب میں سمو دیا ہے۔

محسن زیدی

غزل

شعلہ ہوں مگر برف کی چادر سے ڈھکا ہوں
نغمہ ہوں مگر ساز کے پردے میں چھپا ہوں

کہسار تجھے پاکر بھی یہ محسوس ہوا ہے
جیسے کہ کسی اور کو میں ڈھونڈ رہا ہوں

اے اہلِ ستم! نقشِ سرِ آب نہ سمجھو
مجھ کو نہ مٹا پاؤ گے میں نقشِ وفا ہوں

شاید ہو کوئی شمع کسی سمت سے روشن
حیران سا میں کب سے اندھیرے میں کھڑا ہوں

وہ عہد جو ہر دور میں اک خواب رہا ہے
اس عہد کے آثارِ سحر دیکھ رہا ہوں

صہبا سے بھروں جام کہ اب خونِ جگر سے
کچھ تلخیٔ حالات کا حل سوچ رہا ہوں

محسوس یہ ہوتا ہے کوئی اور ہو جیسے
میں اپنی ہی تصویر سے اب کتنا جدا ہوں

اک شب بھی نہ اس طرح جلی ہوگی کوئی شمع
اک عمر میں جس سوزِ مسلسل میں جلا ہوں

محسن ہے مجھے ناز کہ اس شہرِ نوا میں
اپنا ہی میں آہنگ ہوں اپنی ہی صدا ہوں

نامی انصاری

غزل

عشق میں تھی گرچہ پہلے کیف سامانی بہت
دھیرے دھیرے بڑھ گئی دل کی پریشانی بہت

دیکھ کر اہلِ جہاں کی مصلحت اندیشیاں
یاد آتی ہے مجھے صحرا کی ویرانی بہت

سادگی میں بھی ہیں پنہاں شوخیوں کی بجلیاں
آئینہ در آئینہ ہے گفر سامانی بہت

دیکھئے کیا رنگ لاتا ہے جہانِ رنگ و بو
خونِ دل کی عہدِ حاضر میں ہے ارزانی بہت

کون کر سکتا ہے اب چاکِ جگر کا حوصلہ
ہم سے دیوانوں کو ہے بس چاک دامانی بہت

بادۂ رنگیں تری سرمستیوں کی خیر ہو
مدتوں کرتے رہے ہم بھی گل افشانی بہت

نقش ہائے خونِ بسمل کا بھی ہے کوئی جواب
شہرتیں پاتا رہا ہے خامۂ مانی بہت

بادۂ انگور سے جاتی نہیں تشنہ لبی
اس لئے ارزاں ہوا ہے خونِ انسانی بہت

چھیڑیئے محفل میں نامی اب کوئی سازِ دگر
کر چکے حسن و محبت کی ثنا خوانی بہت

افسانہ:۔ آمنہ ابوالحسن

سمندر

جس وقت تائی ماں کا انتقال ہوا مجھے یکایک احساس ہوا کہ ایک عظیم قیمتی معلومات سے بھرپور کتاب پڑھنے سے رہ گئی۔ یقیناً مجھے اس کتاب سے اکتساب کے لئے کچھ اور ہوش مند ہونا چاہیئے تھا۔ اس احساس کے بعد میں نے بے حد ضبط کیا لیکن چند آنسو میری آنکھوں سے تائی ماں کے چہرے پر ٹپک ہی گئے۔ لوگوں نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا لیکن تائی ماں کی بند آنکھیں میری تنظر کے دائرے میں مسکرا پڑیں جیسے انھوں نے چپکے چپکے خاموشی ہی خاموشی میں مجھ سے بہت کچھ کہہ دیا ہو۔

تائی ماں عجیب و غریب ہستی کی مالک تھیں۔ ایک ایسا انسان جو بظاہر معمولی سا محسوس ہوتا لیکن غور سے دیکھنے پر ایسا تیکھا اور منقش کہ پرکھنے والا حیران رہ جائے۔

تائی ماں کو اجالے سے بغض للہی تھا۔ شاید وہ اندھیرے کو ایک بڑی محفوظ پناہ گاہ سمجھتی تھیں۔ خاص طور پر چاندنی روشنی سے انھیں بڑی نفرت تھی۔ ہمیشہ بھرپور چاندنی راتوں میں کھڑکیوں اور دروازوں پر دبیز پردے ڈلوا دیا کرتیں۔ تائی ماں کو اونچی ہنسی کی آواز سے بھی سخت چڑ تھی اگرچہ انھوں نے ہنسنے والوں کو کبھی نہیں ٹوکا لیکن معلوم یہی ہوتا تھا جیسے کہہ رہی ہوں۔ جتنا ہنسو گے اتنا ہی روؤ گے۔

تائی ماں کو دنیا سے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ پھولوں سے، رنگوں سے، بچوں سے وہ بے حد دور رہتی تھیں۔ آنے جانے والوں سے بھی انھیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ان کا ایک پرانا چشمہ تھا۔ ایک قلم اور ایک موٹی بھدی کاپی۔ جانے وہ اس میں کیا لکھا کرتیں ورنہ بقیہ وقت آرام کرسی پر چھوٹے لیٹے رہنے میں صرف کر دیتیں۔ ان کی آنکھیں ہمیشہ بند رہتیں۔ لوگ سمجھتے وہ کسی وظیفے میں مصروف رہتی ہیں۔ لیکن ناچیز کے خیال میں تائی ماں کو دعاؤں یا وظیفوں کی برکتوں پر بھی کبھی اعتماد نہیں رہا۔ انھیں دیکھ کر کبھی کبھی مجھے رحم کا احساس ضرور ہوتا۔ لیکن اگلے ہی لمحے مجھے اپنے اس حماقت آمیز خیال پر ہنسی آجاتی۔ اتنی بڑی کوٹھی۔ ایسے چاہنے والے تایا ابا۔ جاہ و حشمت۔ عزت۔ مرتبہ۔ عشرتوں کی ریل پیل، بھلا ان میں کوئی زخم پنپ بھی سکتا ہے۔ یہ غریبانہ تخیلیں کرنے والے حال جان کر علاج شروع کر دیں۔؟؟

لیکن ان کے انتقال کے بعد میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ ہی گئی کہ بعض وقت ماہرین فن بھی تو دھوکہ کھا جاتے ہیں اور یہ دھوکہ شاید لوح محفوظ میں مشیت کے حکم سے درج ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر لاکھ انسان سر پٹکے علاج ہو ہی نہیں پاتا۔

اگر تائی ماں کی کوئی اولاد ہوتی تو شاید ان کی ہستی کا عقدہ کسی نہ کسی حد تک ضرور ہی کھل جاتا لیکن سب لوگوں کی طرح میں نے بھی سنا تھا، تایا ابا کو اولاد سے ازلی دشمنی رہی۔ وہ اولاد سے اسی طرح بھاگتے رہے۔ جیسے نیولے سے سانپ۔ دو ایک مرتبہ امید ہوئی بھی تو خاندان بھر کے ہاں ہاں کرتے معاملہ برابر کرکے دم لیا۔ لیکن تائی کو ہمیشہ ہتھیلی کا چھالا سمجھا اور ان کے عیش و آرام اور ان کی مسرتوں میں کبھی مخل نہ ہوئے۔ یہ بھی سنا کہ تایا ابا کے اس غیر انسانی رویئے پر بھی تائی کی آنکھ سے کبھی آنسو نہیں گرا۔ لوگوں نے انھیں ہمیشہ مگن دیکھا۔ اور دعا دی۔ "بنت گھر بسا رہے"

تائی "ماں" ہو تھیں، لیکن دنیا بھر کی اولادیں ہمیشہ ان کی سلیقے و قرینہ سے فرمانبردار رہیں۔ انھیں اس طرح مانا کہ ان کی اپنی کوکھ کی اولاد بھی نہ مانتی۔ چھوٹے بڑے دور و نزدیک سے ان کی ہر بات کا خیال رکھا کرتے۔ وہ کسی سے اپنا کام کروانا منظور نہ کرتیں تب بھی لوگ ان کے آگے پیچھے جاتے

اور ان کا کام کر لینے پر فخر سے سر بلند کئے گھومتے نظر آتے۔

میں قصۂ اس شام سے شروع کروں گا جب میں نے ان کا مور کا پر لگا ہوا خوبصورت قلم ان کی مجلّد کاپی کے ایک صفحے پر گھسیٹ دیا تھا۔ محض قلم کی انوکھی خوشنمائی سے مرعوب ہو کر۔ بیچارے اندھیرے میں نہ مجھے اپنا لکھا کچھ سمجھ میں آیا تھا نہ ہی تائی ماں کا لکھا ہوا۔ تاہم اس میں درج تحریر کا گہرا نقش میرے ذہن میں ان موتیوں سے مشابہ رہا جو ایک لڑی میں بڑی ترتیب و تزئین سے پرو دیئے گئے ہوں۔ پھر ان کی آہٹ سن کر میں وہاں سے بھاگ آیا تھا۔ لیکن ہمیشہ مجھے حسرت رہی کہ اس تحریر کو سورج کی کھلی روشنی میں غور و اطمینان سے دیکھوں۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے ان کے سرد مُردہ جسم، پرسکون چہرے اور بند آنکھوں کو غور سے دیکھا تو مجھے یہ دفعتہً محسوس ہوا میں لاعلمی کے گہرے کنویں میں مغرور بے علم لٹکا ہوا ہوں اور ایک بڑی قیمتی الماری کتاب جس کی قیمت کا کوئی تعین کبھی نہیں کیا جا سکتا، میرے مطالعے میں آنے سے پہلے بند کر دی گئی۔

اس روز میں دیر تک روتا رہا۔

یوں تو سب ہی رو رہے تھے۔ لیکن میرے رونے پر اکثر لوگ متعجب تھے۔ لوگوں نے بہت کم مجھے تائی ماں کے رہن سہن کے حصّے کی طرف جاتے دیکھا تھا جب کہ قریب قریب گھر کا ہر فرد کچھ نہ کچھ حاصل کر لینے کے لئے وہاں ضرور چکّر لگاتا رہتا۔

یہ خواہش تائی ماں خواب ہی میں آ کر مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائیں لیکن یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی اور نہ ایا آیا ایکدم بھولوں سے نظر آنے لگے۔ وہ ہر صبح باقاعدگی سے سب کے آگے اپنا خواب بیان کرتے جو الف سے واسلام تک تائی ماں کی آمد اور حکایات سے بھرپور ہوتا۔ اور سب بڑے دھیان سے سنا کرتے۔ مگر مجھے محسوس ہوتا۔ تایا ابا مکر کر رہے ہیں۔ یہ ان کا لاشعور ہے، جو ہر شب ان کی بند آنکھوں کے آگے من چاہے کرشمے دکھا کر ہر صبح اجالے میں مدغم ہو جاتا ہے۔ اندھیرا تایا ابا کی بڑی کمزوری تھا۔ انھوں نے ہمیشہ اُجالے سے پیار کیا تھا اور اجالے ہی میں اندھیرے کی بابت سوچا تھا۔ ورنہ سرِشام ہی وہ بتی جلا کر آنکھیں بند کر لیتے اور کبھی رات کی تاریکیوں کو بڑھتے اور پھیلتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ ہاں سحر کا بہلا روشن کرن کے ساتھ وہ بستر چھوڑ دیتے اور گجر دم جاگنے والی چڑیوں کی طرح چہچہانے لگتے۔

ان کے دو دست احباب محدود تھے۔ انھیں دنیا کی ذرّہ برابر فکر نہ تھی۔ ہمیشہ اپنی دنیا تائی کے وجود میں تلاش کی اور ہمیشہ مطمئن رہے۔ تائی کی زندگی میں پہلی مرتبہ اتفاقاً اور تائی کے مرنے کے بعد دوسری بار میں نے مجلّد کاپی دیکھی۔ تایا ابا اس کے اوراق احتیاط سے چُن رہے تھے۔ تایا کا چشمہ ان کی ناک کی نوک پر پھسل کر آیا تھا۔ اور جانے آگ کی قربت سے یا وفورِ جذبات سے چند سیّال دھبے ان کی آنکھوں کے اردگرد پھیل گئے تھے۔ میں نے چشمہ تایا کی آنکھوں پر برابر کیا اور بولا۔ "میں جلا دوں تایا ابا۔؟"

تایا ابا کو شاید اپنی ہی اولاد سے چڑ تھی، ویسے وہ سب بہن بھائیوں کے ہم بچّوں کو بے حد چاہتے تھے۔ میری بات سن کر پہلے تو چونکے۔ پھر بے حد تھکے ہوئے انداز میں بولے۔ "نہیں"۔ اور بڑی پھرتی سے انھوں نے بقیہ اوراق کو آگ دکھا دی۔ میں سوچتا رہا کیا تایا ابا نے واقعی ان اوراق پر درج تحریریں نہیں پڑھی ہوں گی؟

کیا واقعی وہ ایسے بلند، باہمّت اور سچّے انسان ہونگے۔؟ مجھے پتہ نہ چل سکا لیکن جب تھوڑے ہی لمحوں میں صدمے کی تاب نہ لا کر وہ بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے تو میں واقعی بلک بلک کر رو پڑا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرا کوئی نہیں رہا۔ اتنی بڑی دنیا میں اتنے انسانوں کے بیچ میرے بے حد رونے پر اماں نے مجھے دو چانٹے لگائے ابا نے مجھے تسلی دی لیکن میرا دل بوجھل تھا۔ ایک ایسے بوجھ سے بھرا ہوا، جس کا ہلکا ہو جانا ممکن ہی نہ تھا۔

چالیس دن تک تایا تائی کا سامان محفوظ رہا۔ اکتالیسویں دن ان کے بہن بھائیوں میں سامان کا بٹوارہ ہوا۔ میں از حد مشتاق ایک کونے میں دُبکا رہا۔ تائی کی ہم راز اُس مجلّد کاپی کے جا جانے کے باوجود مجھے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جو تائی کی پُراسرار زندگی کا خاطر خواہ تجزیہ ثابت ہو۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا کمرہ خالی ہوتا گیا۔ بے رونقی بڑھتی گئی۔ تایا تائی کے عدمِ وجود کو کھنگال کر جب سب لوگ اٹھ گئے اور کمرہ صفائی کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا تو تنا چپکے چپکے احتیاط سے کمرے کا کونا کونا چھانتا پھرا۔ بالآخر جہاں تائی کا بستر تھا وہاں مجھے

(بقیہ صفحہ ۸۰ پر دیکھئے)

راج نرائن راز

حیف

میں نے جو طوطا پالا تھا
میری باتیں دہراتا تھا!
سُن کر دوست سبھی خوش ہوتے
میں بھی بے حد مجوش ہوتا تھا
اور کمالِ فن پر اپنے
اکثر ناز کیا کرتا تھا

جانے اک دن بات ہوئی کیا
میں کھویا سا، سوچ میں ڈوبا
سوچا۔ کام پرندوں کا ہے
کھُلی فضا میں اُڑنا پھرنا
اور سُریلے نغمے گانا!
بھور بھئے گھر واپس جانا

لیکن جو میرا طوطا ہے
پنجرے کے اندر رہتا ہے
میری باتیں دُہراتا ہے

کھُلی فضا میں اُڑنا پھرنا
ڈال ڈال پر بور کترنا
بھور بھئے گھر واپس جانا
اُس کو بھی تو بھاتا ہوگا

پنجرے کا دروازہ کھولا
طوطا سہما سا بیٹھا تھا
گویا خود کو بھول گیا تھا

میری باتیں دوہراتا تھا!

طوطا، طوطا بھی نہ رہا تھا!
طوطا، انساں بن نہ سکا تھا!

پیرزادہ اقبال بیجاپوری

غزل

برہم ہے اُن کی زُلفِ دوتا خیر مانگئے
اب شہر میں ہے رقصِ قضا خیر مانگئے

اُڑنے لگی ہے گردِ بلا خیر مانگئے
میلی نہ ہو سکوں کی قبا، خیر مانگئے

ملنے لگے ہیں شر کے خداؤں کو حوصلے
خاموشیِ خیر کا ہے خدا، خیر مانگئے

اُٹھنے کو ہیں کچھ اور بگولے میانِ دشت
چلنے کو ہے کچھ اور ہوا خیر مانگئے

اک بھیڑ سی ہے بابِ اجابت کے آس پاس
گھبرائی جا رہی ہے دعا، خیر مانگئے

اقبال پھونک پھونک کے رکھئے گا اب قدم
رہزن ہوئے ہیں راہنما، خیر مانگئے

طنز و مزاح :-

یوسف ناظم

علم سے فلم تک

علم سے فلم تک پہنچتے ہیں آدمی کو بڑا عرصہ لگا اور اتنا عرصہ لگنا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ آدمی فلم تک سیدھے راستے سے پہنچا بھی نہیں۔ آدمی نے یوں بھی کب سیدھا راستہ اختیار کیا ہے۔ جس راستے سے وہ فلم کی طرف آیا وہ بڑا کٹھن اور پیچیدہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ کسی راہبر کو پہچانتا بھی نہ تھا اس لئے وہ ہر راہ رو کے ساتھ تھوڑی دور چلتا اور پھر کئی دن اور کئی مہینے بھٹکتا۔ چلنے میں آدمی کو زیادہ تکلیف نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو خلد سے چلا کر دنیا میں آیا تھا۔ لیکن بھٹکنے کے معاملے میں البتہ اُسے بڑی محنت کرنی پڑی۔ شروع شروع میں تو اُس سے متعلق بھٹکتا یا ہی نہیں گیا۔ وہ جب بھی بھٹکنے بیٹھا جلد ہی تھک جاتا۔ لیکن آگے چل کر نفسیاتی طور پر اُسے بھٹکنے کی ایسی مشق ہوگئی۔ جیسے چھوٹے بچوں کو ڈبہ کے دودھ کی ہو جاتی ہے۔ اس مشق کے بعد آدمی کو بھٹکنے میں اتنا مزہ آنے لگا کہ وہ راستہ چلے بغیر بھی بھٹکنے لگا۔ اُس کی اس بدذاقی کی وجہ سے بھی کافی وقت صرف ہوگیا ورنہ آدمی کب کا فلم کی منزل پر پہنچ گیا ہوتا۔ علم سے چھٹکارا تو اسے مدت ہوگئی تھی۔ اور اگر اُس کا سفر نا۔ مل ہوتا تو آدمی بہت پہلے فلم کو پہنچ جاتا۔ لیکن اس معاملے میں آدمی کے فطری قابل کے علاوہ چند اور شخصیتیں بھی تھیں جو مسلسل پڑھنے کے بعد ہی آسان ہوئیں مثلاً یہ کہ اُس زمانے میں فنِ فلمیات نے بھی زیادہ ترقی نہیں کی تھی اور شہروں میں فلائی اوور پل نہیں بنے تھے۔ راستہ چلتے ہوئے آدمی کو ٹریفک کے کئی مراحل سے سابقہ پڑتا تھا۔

فلم تک پہنچنے میں آدمی نے کچھ زیادہ چستی بھی نہیں دکھلائی تھی کیونکہ اُس کے ایرانی والدین نے بتایا تھا کہ جو کام دیر سے ہوتا ہے، اچھا ہوتا ہے اس کے علاوہ آدمی کو یہ بھی معلوم تھا کہ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اُسے یقین تھا کہ وہ کسی راستے سے جائے اور چاہے ٹیڑھی چال چلے یا سیدھی چلے وہ فلم تک پہنچ جائے گا۔ بلکہ اُسے اس کا بھی یقین تھا کہ اگر وہ فلم کی طرف چلا کر نہ گیا تو خود فلم اُس تک پہنچ جائے گی کیونکہ علم سے چھٹکارا پانے کے بعد اُس کی منزل ایک ہی تھی۔ فلم۔ FLY OVER BRIDGE

کہا جاتا ہے کہ فیضی اور ابوالفضل کے عہد تک آدمی علم میں باضابطہ اور بے حد مبتلا رہا۔ فیضی اور ابوالفضل کی مشترکہ وفات کے بعد بھی اکّے دُکّے واقعات میں آدمی کا علم سے تعلق ثابت ہوتا ہے لیکن یہ واقعات ایسے ہی ہیں جیسے ہزاروں شادیوں میں ایک آدھ کامیاب شادی کا ناگہانی واقعہ۔ علم سے آدمی کے تعلق کے ان واقعات میں، فسادات کا روزمرہ بن نہیں ملتا۔ علمائے ہوئے آدمیوں کو بھی دنیا زیادہ دن برداشت نہیں کرسکی تھی۔ ارسطو، سقراط، بقراط، لقمان، ارشمیدس اور اسی ذات کے دوسرے سیکڑوں انسانوں کی موجودگی کا خیازہ، دُنیا بہت پہلے بھگت چکی تھی رہتا ہیں ایسے خود غلط لوگوں کا گزر ممکن نہیں۔ علم سے انسان کا رشتہ ٹوٹنا ضروری تھا۔

علم سے جب انسان کی ضروریات کی تکمیل ممکن نہ رہی تو قوم نے سوچا کہ اب علم کو چھوڑ کر فلم کے میدان میں قسمت آزمائی کرنی چاہیئے اصل میں کسی قوم کو معلوم ہے جب قوم کسی کام کے بارے میں سوچ لیتی ہے تو پھر دوبارہ نہیں سوچا کرتی۔ دوبارہ وہ لوگ سوچتے ہیں جنھیں اچھی سوچ پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ قوم کبھی دوبارہ نہیں سوچتی۔ اُس کی پہلی سوچ ہی آخری سوچ ہوا کرتی ہے۔ قوم نے جب فلم کے بارے میں سوچا اس وقت

قوم کو لارڈ کارنوالس کی سرپرستی حاصل تھی۔ لارڈ کارنوالس کی کلچرل یعنی سماجی معروفیات بہت زیادہ تھیں۔ انھوں نے کارنوال اور اس بہت اچھے لگے تھے اور اُن کی رائے میں اہمیت کے لحاظ سے ہوا اور غذا کے بعد کارنوال ہی کا نمبر آتا تھا۔ بعض موقعوں پر لارڈ کارنوالس کو ہوا اور غذا پر بھی ترجیح دینے میں تکلف محسوس نہیں فرماتے تھے۔ غالباً لارڈ کارنوالس ہی نے قوم کی پیٹھ ٹھونکی اور قوم کو فلم کی طرف راغب ہونے کا قیمتی مشورہ دیا اور ہمارے ہاں فلم شاید بہت پہلے بن جاتی اور ہمارے اسلاف کو بھی ایک آدھ فلم دیکھنے کا موقع مل جاتا مگر ہمارے اسلاف بہت زیادہ شریف تھے۔ وہ بغیر فلم دیکھے مر گئے۔ وہ غالباً دُور اندیش بھی تھے۔ "عالم آرا" دیکھے فیضانِ کا دفعات بنا، کر شمہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ عالم آرا نے سچ پوچھئے تو قوم کی زندگی کا رنگ بدل دیا۔ ورنہ پوری قوم عالم آرا سے پہلے بڑی طرح سوئی ہی تھی۔ اس وقت کا مؤرخ لکھتا ہے کہ وہ گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی۔ اور گھوڑے بیچ کر سونا نہایت گہری اور طویل نیند کی علامت ہے۔ اب ایسی گہری نیند صرف خواب آور گولیوں کی مدد سے نصیب ہو سکتی ہے۔ عالم آرا سے پہلے قوم بڑی ہی گہری نیند میں تھی۔ شاری فضا پر مُردنی چھائی ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے سب کو سانپ سُونگھ گیا ہو۔ اگر سانپ سونگھ لے تو آدمی کا اتنا ہی نقصان ہے جتنا کہ سانپ کے کاٹنے سے ہوتا ہے۔ قوم اسی خمارہ کے عالم میں تھی کہ عالم آرا کا وجود عمل میں آیا۔ یک بیک فضا بدل گئی اور لوگ عالم آرا کو دیکھ کر بول اُٹھے۔

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی"
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر — رشکِ سطحِ چراغِ مینائی

عالم آرا کو آپ بارش کا پہلا قطرہ سمجھ لیجئے، اس کے بعد تو وہ دھواں دھار بارش ہوئی کہ لوگ سیاست دانوں کے بھاشن بھول گئے۔ پہلے پہل فلم ہمارے یہاں صرف پڑھے لکھے لوگوں کے لئے تیار ہوئی۔ وہ فلم خاموش فلم تھی۔ اداکاروں کے ہونٹ ہلتے تھے۔ دوسرے اعضائے جسمانی بھی ایک حد تک دوسری حرکت میں حرکت کرتے تھے۔ لیکن آواز نہیں آتی تھی۔ کس نے کس سے کیا کہا۔ پردۂ فلم پر تحریر کی شکل میں نمودار ہوتا تھا۔ یعنی پہلے ہیرو اور ہیروئن کے ساتھ نہایت غصّے کے عالم میں گفتگو کرتا دکھایا جاتا اور پھر فوراً پردۂ فلم پر نظر آتا "تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ ایک جھانپڑ رسید کروں تو دُور جا گرے" پڑھے لکھے لوگ یہ جملہ پڑھ کر خوش ہوتے اور اپنے بازو بیٹھنے والے اَن پڑھ لوگوں کو بآواز بلند یہ ڈائیلاگ سُناتے۔ اتنے میں پردۂ فلم پر دوسرا منظر آجاتا۔ جس میں ہیروئن کہتی نظر آتی "اپنے آپ کو بہت حسین سمجھتا ہے۔ ایک ہاتھ رکھ دوں تو جگہ بگڑ جائے۔" خاموش فلموں کو لوگ بڑی محنت سے دیکھا کرتے۔ خاموش فلم دیکھنے، مکالمے پڑھنے اور دوسرے ان پڑھ سنیما بینوں کو ڈائیلاگ سُنانے کے جرم میں اکھنیوں ٹکٹ بھی خریدنے پڑتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا۔ لیکن جب فلم انڈسٹری والوں کو احساس ہوا کہ فلم دیکھنے والوں میں بڑی تعداد ان پڑھ لوگوں کی ہوتی ہے اور فلم انڈسٹری کی ساری آمدنی اَن پڑھ طبقہ ہی کی جیب سے ہوتی ہے تو فلم انڈسٹری والوں نے بولنے والی فلمیں بنانے کی سازش کی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ فلم دیکھیں۔ انھوں نے سوچا کہ تھوڑی زیادہ تعداد میں ان پڑھ لوگ فلم دیکھیں گے اتنا ہی قوم کو فائدہ پہنچے گا۔ ٹاکی فلم بننے کی دیر تھی کہ قوم کی بند آنکھیں یوں کھل گئیں جیسے بند مٹھی کا بھرم کھل جاتا ہے۔ جہاں بھی ٹاکی فلم دکھائی جاتی وہاں سرِ شام گھروں کو تالے لگ جاتے، بازار اور کارو بار بند ہو جاتے اور لوگ فلم دیکھنے یوں بھاگتے جیسے کسی کا گھر لُٹنے جا رہا ہو۔

ٹاکی فلم بننے سے پہلے کوئی ہیرو، باغ میں ہیروئن کے پیچھے دوڑتے ہوئے گانا نہیں گا سکتا تھا۔ نہ کبھی کوئی ہیرو یا ہیروئن کی سہیلی مرتے وقت دردِ بھرا راگ چھیڑ سکتی تھی۔ عشق اور موت کے مشاغل میں بروقت گانا گانے سے عشق کا عمل اور موت آسان ہو جایا کرتی ہے۔ ٹاکی فلم سے پہلے یہ سہولت میسّر نہ تھی۔ ایکٹروں کو البتہ دوسری تکالیف نہیں تھیں مثلاً اُن کی آواز کاسٹ نہیں ہوا کرتا تھا۔ پھٹے ہوئے بانس یا ریلوے انجن کی آواز رکھنے والے ایکٹر بھی خاموش فلموں میں حصّہ لے سکتے تھے۔ ان ایکٹروں کو صرف ہونٹوں کا ٹیسٹ دینا پڑتا تھا اور یہ دیکھا جاتا تھا کہ بغیر آواز نکلے اُن کے ہونٹ ہل سکتے ہیں یا نہیں۔ اداکاراؤں کے ہونٹوں کا ٹیسٹ دوسرے طریقوں سے لیا جاتا تھا۔

فلمیں دیکھنے اور دیکھ کر صبر کرنے کے معاملے میں قوم نے بڑے ایثار اور بے حد حُبّ الوطنی کا ثبوت دیا۔ قوم کی اِس

فرخ دی اور رسیپ الشتری کو دیکھ کر ملک کے کئی سیٹھوں اور بنیوں نے عبرت حاصل کی۔ عوام کے ایثار کا انھوں نے بھی دندان شکن جواب دیا۔ انھوں نے اپنے آبا و اجداد کے پرانے کاروبار سے توبہ کر لی اور فلم سازی کا بیوپار شروع کیا۔ اگر لوگ عوام کے ساتھ ایسا سلوک پر آمادہ نہ ہوتے تو جوان لڑکوں اور کم عمر لڑکیوں کو گھر سے بھاگنے کا موقع نہ ملتا۔ فلمیں نہ بنتیں تو کتنے ہی گھروں کو گھر ہی کے چراغ سے آگ لگ جاتی۔

علم سے فلم تک پہنچ جانے کے بعد آدمی نے علم کی طرف واپس جانے کا خیال ترک کر دیا۔ یہ کوئی جج تھوڑے ہی تھا کہ کرو اور واپس بھجاؤ۔ فلم تو مستقل عبادت ہے۔ اب آدمی دو قسم کی فلمیں بناتا ہے۔ ایک ہٹ HIT فلمیں اور دوسری فلاپ FLOP فلمیں۔ ہٹ فلمیں وہ جنھیں دیکھ کر دل پر چوٹ پڑتی ہے۔ اور فلاپ فلمیں وہ جو باہر کے ملکوں کو بھیجی جاتی ہیں۔ یہ ساری فلمیں سنسر بورڈ پاس کرتا ہے۔ سنسر بورڈ سے فلم جب پاس ہو کر باہر آتی ہے تو شور اٹھتا ہے۔

میں کا کروں رام مجھے بڈھا مل گیا

سنسر بورڈ کے خوف سے اب فلموں میں تیراکی کے مناظر زیادہ رائج ہو گئے ہیں۔ کیونکہ تیراکی کے سین میں لباس کم اور عورت نیاز ہوا کرتی ہے۔ فلموں میں عورتوں کی زیادتی کی وجہ سے کہانی کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہٹ فلموں کے اور بھی کئی راز ہیں جو فلاپ فلم بنانے والوں کو معلوم نہیں ہیں۔ ہٹ فلمیں بنانے والے کو کوئی دوسرا کام نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن فلاپ فلم بنانے والے جب چاہیں ڈاکومینٹری DOCUMENTRY فلم بھی بنا سکتے ہیں۔ اس فلم کو فلاپ فلم کا معروف ثانی کہہ سکتے ہیں۔

(بقیہ گلدستۂ نسیم (دہلی) صـ۸۵)

میں چاند آڑا ترچھا ہو کر نکلتا ہے۔ سیدھا تو چل ہی نہیں سکتا ہے۔ ورنہ کترانے کی کیا ضرورت تھی۔ یوں پڑھیے ؎

شب وہ آغوشِ تصور سے گئے ہیں اس طرح — نالۂ دل جس طرح جاتے ہیں تھرّاتے ہوئے

(۲۴) فکر ——— جناب بابو دین دیال صاحب شاگرد تصور۔ تعیین ہے ؎

ہم نہ ہوں گے پھر کسی دن گریہ کا انداز ہیں — ہائے وہ گردن جھکانا تیرا شرماتے ہوئے

شیدا ———

تیغ بن کر چل گیا ہے حلق پر عشاق کے — ہائے وہ گردن جھکانا تیرا شرماتے ہوئے

(بقیہ افسانہ سمندر صـ۷۶)

ہوئے فرش پر مجھے کچھ شکوک نشانات نظر آئے۔ اور ذرا کاوش پر دو پتھر اپنی جگہ سے نکلے آئے۔ ایک ڈبہ مجھے ملا۔ میں نے ہوشیاری سے پتھر جمائے اور ڈبہ اپنے کمرے میں لے آیا۔ پھر دروازہ بند کر کے میں نے تالا توڑا۔ میری آنکھیں جگمگا گئیں۔

چند مزید اوراق۔ دو ہی موتیوں کی لڑیاں جیسی صاف ستھری خوبصورت قریب مختصر لیکن اتنے ہی میں ایک داستان۔

داستان تو میں آپ کے سامنے نہیں دہراؤں گا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر وہ تائی کی ذات کا المیہ نہ ہوتی تو تائی یقیناً حفظ شدہ نہ ہوتیں بلکہ ایک خوش باش ہستی ہوتیں۔ تائی کا اجالے سے، انوکھوں سے، دنیا کی رونقوں اور قہقہوں سے پیار ہوں کا توں برقرار تھا۔ زخموں سے، پھولوں سے۔ خوشبوؤں سے تائی ہمیشہ ہمکنار رہتیں۔ ان کی گود بھی لہلہاتی فصل سے بھرپور رہتی مگر تائی کی خاموشی نے صبر و ضبط کا ایک ایسا باب میرے آگے کھول دیا جس کے الفاظ زہر اور معنی بے حد اتھاہ تھے۔ میں نے اس وقت تک سمندر نہیں دیکھا تھا لیکن پھر سمندر دیکھنا میرا محبوب عادت بن گئی۔ ہزاروں لہریں گہرائی سے ایک دوسرے کی جانب ایک دوسرے کے تعاقب میں مسلسل لپکتی ہوئیں لیکن سطح پر بس ہلکورے دیکھنے والا آمیز بن جائے۔ تھپیڑوں اور تھپیڑوں کے باوجود ایسا تھہراؤ اور پُرسکون اچھلتی ہوئی آنکھیں سرور پا جائیں۔

لوگ کہتے ہیں میں پاگل ہوں۔ دنیا جہاں کو بھول کر سمندر سے۔ سمندر سے پیار کرتا ہوں لیکن میں نے تو ہمیشہ اس گہرائی کو پالینے کی کوشش کی ہے۔ جو ہزاروں طوفانوں کو اپنے اندر سمو کر بھی اتنی عظیم اور شانت ہوتی ہے کہ نظر نہ رکھنے والے کو صرف اپنا ہی چہرہ نظر آئے!

بدیع الزماں خاور

اُردو

اِس کی بیداری کے قصّوں میں دکن کی بات ہے
اِس کے خوابوں کا فسانہ، مالوے کی رات ہے
اِس کے بچپن کی کہانی، خطّۂ گجرات ہے

تاج کے سرشار دیوانوں نے سینچا ہے اِسے
قلعۂ دہلی کے پروانوں نے سینچا ہے اِسے
خون سے ہندو مسلمانوں نے سینچا ہے اِسے

اِس میں کوکن کی حسیں امرائیوں کا ذکر ہے
وادیٔ پنجاب کی رعنائیوں کا ذکر ہے
جنّتِ کشمیر کی انگڑائیوں کا ذکر ہے

اِس زباں میں موجۂ گنگ و جمن کی بات ہے
اِس زباں میں قلبِ شیخ و برہمن کی بات ہے
اِس زباں میں جاں فزا دل قوم و وطن کی بات ہے

یہ زباں ہے صبح کا پیغام سازِ نُور پر
یا ہے کوئی نغمۂ شیریں لبِ جمہور پر
عکس اِس کے نُور کا پڑتا ہے میرے طور پر[1]

نیم باز آنکھوں کا جادو، یہ زبانِ میر ہے
خامۂ غالب کی اِس میں شوخیٔ تحریر ہے
جو دلوں پر نقش ہے، وہ پیکرِ تصویر ہے

پرورش پائی ہے اِس نے راج اور دربار میں
اُس نے اپنے نقش چھوڑے، ہر قدم دیوار میں
اِس کے نغمے گونجتے ہیں، کوچہ و بازار میں

اِس کی نظموں میں اَچھوتے فکر و فن کا رُوپ ہے
اِس کی بحروں میں غزل کے بانکپن کا رُوپ ہے
اِس زباں میں اِمتزاجِ شعر و سخن کا رُوپ ہے

یہ زباں تاریخ کے شانوں پہ ہے زُلفِ دراز
یہ زباں ہر ایک عالم میں رہی ہے عہد ساز
اِس زباں پر ہے ہماری طبعِ آزادی کو ناز

عرش سے برسی ہوئی اِس میں مئے الہام ہے
ہے بنارس کی سحر اِس میں اودھ کی شام ہے
حُسنِ فطرت سے جو ہے لبریز، یہ وہ جام ہے

اِس کے افسانے میں پنہاں سحر ہے بنگال کا
اِس کے ناول میں ہے موسم، خاکِ نینی تال کا
اِس کا ہر فن کار، پنچھی ہے وطن کی ڈال کا

خوشنما تہذیب کے پھولوں کا یہ گلزار ہے
سرزمینِ ہند کا، میری زباں شنگار ہے
اِس کے چودہ[2] زیوروں میں ایک چنداں ہار ہے

عظمتِ اقوامِ ہند کو مٹا سکتے نہیں
گل کے جو دشمن ہیں، خوشبو کو مٹا سکتے نہیں
خود یہ مٹ جائیں گے اُردو کو مٹا سکتے نہیں

---

[1] ہملٹ

[2] وہ اقوام جو روس کی طرف سے "ایک خواب الدد" پر سردار جعفری کو دیا گیا۔

تحقیقی مقالہ

تمنا مظفرپوری

گلدستۂ نسیم

اواخر انیسویں صدی میں گلدستہ شائع ہونے کا عام رواج ہوگیا تھا۔ گلدستہ میں ایک ہی مصرع طرح پر مختلف شعرا کی کہی ہوئی غزلیں شامل ہوتی تھیں۔ یہ مصرع طرح اخبار یا رسالے میں شائع ہوا کرتا تھا اور اس مصرع پر طرح آزمائی کرکے مرتب گلدستہ کے پاس روانہ کردیتے۔ بمبئی سے ایک گلدستہ جناب عبدالحمید فرخ دہلوی مدیر "بمبئی پنچ بہادر" و "سلطان الاخبار" کی نگرانی میں "ارمغان فرخ" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ لیکن "ارمغانِ فرخ" سے پہلے دہلی نے گلدستہ "نسیم" شائع ہو چکا تھا۔ گلدستہ نسیم کے پہلے شمارے کی ماہ اشاعت صحیح نہیں کہی جاسکتی لیکن یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وسط سال ۱۸۹۶ء میں جناب قربان علی خان صاحب بسمل کی نگرانی میں شائع ہوا تھا۔ مصرع طرح تھا ع

ہائے وہ گردن جھکانا تیرا شرماتے ہوئے

اور شاید یہ مصرع طرح دہلی پنچ میں شائع ہوا تھا اور اُسی اخبار کے ذریعے شعرا کو دعوتِ سخن دی گئی تھی۔

گلدستہ نسیم میری نظر سے نہیں گزرا البتہ مفت روزہ مزاحیہ اخبار "بمبئی پنچ بہادر" بمبئی ۱۸۹۶ء میں گلدستہ نسیم پر ریویو شائع ہوا تھا۔ اُسی پنچ اخبار کی مدد سے یہ مضمون لکھ رہا ہوں تاکہ گلدستہ میں شریک شعرا کے متعلق عام واقفیت ہوجائے۔

یہ ریویو جناب چندی پرشاد صاحب شیدا دہلوی کا ہے اور "بمبئی پنچ بہادر" میں قسط وار ۱۰، ۱۲ اور ۱۵ نومبر کے تین شماروں میں شائع ہوا تھا۔ ریویو میں زیادہ تر ویسے ہی اشعار شامل ہیں جن میں خامی ہے یا شاعر کے کہنے کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ شیدا صاحب نے پہلے ان کے شعر کا مطلب لکھا اور پھر وہ اصل شاعر کہنا کیا چاہتا ہے اسے ظاہر کرتے ہوئے اُن کے اشعار پر اصلاح بھی کی ہے۔ میں ریویو سے شعرا کا نام اور کلام نوٹ کر رہا ہوں۔

(۱) آثر ——— یہ ریویو کے پہلے شاعر ہیں ان کا پورا نام سید ظفر حسین تھا اور آثر تخلص۔ یہ شاعر دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کی غزل کا مطلع ہے۔ ؎

تیرا عالم بس مٹا دیتا ہے یاد آتے ہوئے　　مسکرا دینا پھر اکر منھ وہ شرماتے ہوئے

اس شعر پر شیدا صاحب لکھتے ہیں ——— "اے صل وجل کیا مطلع لکھا ہے جس سے مطلع خورشید کی بھی رنگ زرد ہوگئی ہے" مطلب تو خیر خاصا تھا لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ کس کو مٹا دیتا ہے اور حضرت پھر اکر منھ یا پھر کر منھ۔ اجی یوں فرمائیے ؎

مجھ کو اے ظالم مٹا دیتا ہے یاد آتے ہوئے　　پھر کر منھ مسکرانا تیرا شرماتے ہوئے

(۲) آحقر ——— آثر صاحب کے تین شعر کے بعد جناب منشی احمد خان صاحب آحقر کا نمبر آتا ہے۔ لیکن اُن کے تین شعر میں سے کسی پر بھی اصلاح یا تنقید نہیں ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔ مقطع ہے ؎

جھوٹ ہے آحقر زباں دانی کا دعویٰ تو ہے　　ایک مدت چاہیے اُردو زباں آتے ہوئے

ف بمبئی پنچ بہادر سے متعلق راقم الحروف کا مضمون ماہنامہ "شاعر" کے سالنامہ ۱۹۷۵ء میں دیکھئے۔ ۱۲ بمبئی پنچ بہادر کے مطالعہ میں مجھ سے بعض الفاظ ایسے ملے جن کے استعمال میں آج کل جنس کا فرق ہے۔ ت م

(۳) احسان ——— جناب عبدالرحیم خاں صاحب تلمیذ شاعر دہلوی۔ احسان صاحب کے تین شعر میں سے ایک شعر ہے ؎

درد و غم دل سے ہٹا اور داغ چمکے واہ واہ ۔۔۔ دیکھ لیتے ہیں کبھی تارے نکل آتے ہوئے

اس شعر پر شیدا صاحب لکھتے ہیں۔ جی ہاں۔

حالت خفتہ است و تو خفتہ ۔۔۔ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

آدھا قیتر آدھا بٹیر۔ یہ شعر لکھا ہے یا گنے کا نٹے ہیں۔ یوں کہئے ؎

داغ دل چمکیں اگر ہٹ جائے درد و غم کہیں ۔۔۔ دیکھ لیں ہم بھی کبھی تارے نکل آتے ہوئے

(۴) آخگر ——— اب چوتھے شاعر ہیں جناب منشی سوہن لال صاحب آخگر شاگرد شاعر دہلوی۔ اُن کا شعر ہے ؎

یہ ہمارا ہی کلیجہ ہے ہمارا ہی جگر ۔۔۔ اُف نہیں کرتے ہیں ظالم برچھیاں کھاتے ہوئے

شیدا:۔ جناب منشی برچھیاں کھانے کا ثبوت اگر کوئی مشعل آفتاب لیکر ڈھونڈے تو خدا جانے کہیں نہیں ملے گا۔ یوں پڑھو ؎

روکتا ہے ترچھی نظروں کو ہمارا ہی جگر ۔۔۔ اُف نہیں کرتا ہے ظالم برچھیاں کھاتے ہوئے

(۵) اعجاز ——— نام سید اعجاز حسین خاں صاحب تخلص اعجاز تلمیذ خطیر۔ شعر ہے ؎

پھر رہے ہیں حشر میں بھی وہ غضب ڈھاتے ہوئے ۔۔۔ ترچھی نظروں سے چلے جاتے ہیں دھمکاتے ہوئے

شیدا:۔ "مطلع تو خوب لکھا ہے لیکن ایک آنچ کی کسر رہ گئی یوں فرمائیے ؎

پھر رہے ہیں حشر میں بھی وہ غضب ڈھاتے ہوئے ۔۔۔ ترچھی نظروں سے چلے ہیں سب کو دھمکاتے ہوئے

(۶) لبمل ——— شیدا صاحب کی نظر میں چھٹے شاعر ہیں گلدستہ نسیم کے مہتمم و مدیر جناب ثروت علی خاں صاحب لبمل۔ شعر ہے ؎

کل جنہیں ہستی تھی ہر دم تاج زرّیں کی ہوس ۔۔۔ آج وہ سر پھر رہے ہیں ٹھوکریں کھاتے ہوئے

شیدا ——— "کچھ عمدگی نہ رہی۔ تاج زرّیں کی ہوس نے۔۔۔ بلکہ پورا شعر کو عام کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ ورنہ بہت ہی عبرت خیز شعر ہے۔ دیکھئے ہم کہاں تک پہنچا دیتے ہیں ؎

کل وہی سر جو کہ تھے زینت دہ تاج نگیں ۔۔۔ آج وہ یوں پھر رہے ہیں ٹھوکریں کھاتے ہوئے

ریویو کی پہلی قسط چھ شاعروں پر مشتمل ہے اور میں نے اُن کا ایک ایک شعر اس لئے نوٹ کر دیا ہے کہ ان میں سے بہت سے شعراء کے متعلق لوگوں کو علم نہیں لہٰذا نمونے کے کلام کے ساتھ واقفیت حاصل ہو اور یہ ریویو اور اصلاح کی نقاد سے میرا مقصد یہ ہے کہ ایک اچھے خیال کو جلا بازی یا بے توجہی سے کتنا نقصان پہنچتا ہے۔ علاوہ ازیں اُس زمانے کی تنقید و تبصرہ سے روشناس کرانا بھی مقصود ہے۔

اب ریویو کی دوسری قسط جس میں آٹھ شعراء شامل ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

(۷) جلال ——— دوسری قسط کے پہلے شاعر ہیں سید حسن علی لکھنوی، تخلص جلال لکھنوی۔ ان کا شعر ہے ؎

کنگھی، چوٹی، ہستی، کاجل، زیبِ زینت، ناز کی ۔۔۔ کس نے کس نے اُن کو ورنہ کا میرے گھر آتے ہوئے

"انتظار" شعراء جناب حسن علی صاحب جلال لکھنوی کے شعر پر جناب شیدا لکھتے ہیں۔

"شعر خاصا ہے لیکن دوسرا مصرع ذرا سست ہے یوں بدل دیجئے ؎

کنگھی، چوٹی، ہستی، کاجل، زیبِ زینت، ناز کی ۔۔۔ ہائے کس کس نے انھیں روکا یہاں آتے ہوئے

(۸) حسرت ——— مرزا عنایت بیگ صاحب رئیس سونی پت، تخلص حسرت۔ آپ کا شعر ہے ؎

یاد آتا ہے شبِ وصلت سوالِ وصل پر ۔۔۔ ہائے وہ گردن جھکانا تیرا شرمانا ہوئے

شیدا :۔ "حضرت تضمین تو اچھی تھی لیکن شبِ وصلت متروک ہے۔ اس کے بجائے "عشرت" لکھ دیجئے"

(۹) خطیر ——— اب جناب مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب خطیر کا شعر پڑھئے اور اس پر جناب شیدا کا ریویو۔ شعر ہے ؎

بیٹھتے ہو تم اگر پہلو میں گھبراتے ہوئے ۔۔۔ لے بھی لو دو اک بوسۂ لب ہم کو شرماتے ہوئے

——— "واہ واہ مطلع تو خوب لکھا ہے لیکن ذرا مطلب تو دیکھئے جب کہ پہلو ہی میں وہ گھبراتے ہوئے بیٹھتے ہیں تو بوسۂ لب کے نام سے کوسوں بھاگیں گے۔ اس گھبرانے پر بوسۂ لب کی فرمائش اور طرّہ ہے۔ یوں پڑھئے۔ ؎

بیٹھتے ہیں میرے پہلو میں تو گھبراتے ہوئے ۔۔۔ کچھ جھجکتے سے سنبھلتے سے وہ شرماتے ہوئے

(۱۰) رسوا ——— جناب بابو کشن داس تخلص رسوا، شاگرد شاعر دہلوی۔ شعر ہے ؎

وہ عیادت کے لئے آئیں نہ آئیں غم نہیں ۔۔۔ موت کو بھی موت آتی ہے یہاں آتے ہوئے

شیدا :۔ "شعر تو اچھا ہے لیکن مصرع ثانی میں حضرت خاقانیِ ہند شیخ ابراہیم ذوق کی گرہ کا لگ گئی ہے۔"

(۱۱) رشید ——— جناب سید محمد مصطفےٰ مرزا عرف پیارے صاحب لکھنوی۔ شعر ہے ؎

فتنۂ محشر مدد دیتا ہے جب چلتے ہیں آپ ۔۔۔ ہم بھی آتے ہیں جلو میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے

شیدا :۔ "کیوں حضرت ایک مصرع میں واحد، ایک میں جمع یہ اختلاف کیسا۔ یوں کہئے ؎

فتنۂ محشر مدد دیتے ہیں جب چلتے ہیں آپ ۔۔۔ ہم بھی آتے ہیں جلو میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے

(۱۲) سرفراز ——— جناب قاضی نور بہاء الدین صاحب۔ شعر ہے ؎

چلدیئے وہ چھوڑ کر مجھکو یہ فرماتے ہوئے ۔۔۔ پھر کبھی آئیں گے تیرے گھر کہیں جاتے ہوئے

شیدا :۔ "مصرع اولیٰ ذرا جیت نہیں بیٹھا۔ یوں فرمایئے ؎

دے گئے مجھکو تسلی وہ یہ فرماتے ہوئے ۔۔۔ پھر کبھی آئیں گے تیرے گھر کہیں جاتے ہوئے

(۱۳) شاعر ——— اب حضرت شیدا کی نظر شاگردوں کی لمبی فہرست رکھنے والے شاعر جناب آغا شاعر دہلوی پر ہے۔ جناب شاعر دہلوی کے کئی اشعار پر ریویو ہے۔ بمبئی پنچ بہار کی پوری دو کالم حضرت شاعر دہلوی کے کلام اور جناب شیدا کے تبصرے سے پُر ہیں شاعر کا شعر ہے ؎

کس زمانے میں پھرا کرتے ہو اِترا تے ہوئے ۔۔۔ یاں بھی ہو جاؤ کبھی آتے ہوئے جاتے ہوئے

شیدا :۔ "اے سبحان اللہ۔۔ کیا مطلع ارشاد فرمایا ہے اور اس پر زباندانی کا دعویٰ، یوں کہئے ؎

یوں تو پھرتے ہو زمانے بھر میں اِترا تے ہوئے ۔۔۔ یاں بھی ہو جاؤ کبھی آتے ہوئے جاتے ہوئے

جناب شاعر کا دوسرا شعر ہے ؎

تکتے ہی مجھ کو تم اُلٹے کِدھر پھرنے لگے ۔۔۔ چاند کیوں شرما گیا ہے بام پر آتے ہوئے

شیدا :۔ "معلوم نہ ہوا کہ آپ میں کیا بات دیکھی جو چاند بام پر آنے آتے اُلٹا لوٹ گیا۔ شرما گیا۔۔ حضرت یوں کہئے ؎

جلوہ کس کے عارضِ تاباں کا آیا ہے نظر ۔۔۔ چاند کیوں شرما گیا ہے بام پر آتے ہوئے

(۱۴) شاکر ——— نام قاضی عبدالشکور تخلص شاکر۔ شعر ہے ؎

ایک دن تعریف کی تھی چال کی اُس دن سے پھر ۔۔۔ دیکھتے ہی مجھکو وہ چلتے ہیں بل کھاتے ہوئے

شیدا :۔ "شعر تو درست ہے لیکن اولیٰ مصرع کی بندش ذرا ثقیل ہے یوں فرمایئے ؎

چال کی تعریف میرے منہ سے سن کر ہمدمو ۔۔۔ دیکھتے ہی مجھکو وہ چلتے ہیں بل کھاتے ہوئے

دوسری قسط کے آٹھ شاعروں کے بعد تیسری قسط کے شعرا پر ریویو ملاحظہ ہو ؎

(۱۵) طرار ——— جناب وارد غدر مرزا سرفراز حسین صاحب مالک سرفراز پریس دہلی۔ شعر ہے ؎

ہم دربار تیرے اعدا، خوف خویش و قسر با اُن کو ہیں کتنے مرتع یاں تلک آتے ہوئے

شید ا ۔ "جناب میں لفظ تلک بوجہ ثقیل ہونے کے دہلی والوں نے چھوڑ دیا ہے اُس کی جگہ تک جو اس کا ہم معنی ہے استعمال کرتے ہیں" دوسرا مصرع اس طرح بدل دیجئے ع

کتنے مانع ہو گئے اُن کو یہاں آتے ہوئے

(۱۶) طالب ——— جناب گلزاری لال صاحب طالب (نائب انسپکٹر انبالہ چھاؤنی) شعر ہے ؎

ذکر جب آیا مرا بولے وہ ہنس کر ناز سے سیکڑوں پھرتے ہیں ایسے ٹھوکریں کھاتے ہوئے

شید ا ۔ "کس بنی پر سدہ"

(۱۷) قاتل ——— نام سید یعقوب حسین۔ تخلص قاتل۔ شاگرد جناب شاعر دہلوی۔ مقطع ہے ؎

دم مرا لینے کو ہم دم قاتل تماشا بن گیا تم بھی آکر دیکھ جاؤ غش پہ غش آتے ہوئے

شید ا ۔ "بہت اعلیٰ درجہ کا شعر ہے اگر مصرع اولیٰ یوں کر دیا جائے تو اور بھی چمک اٹھے ؎

اس قدر ہے ناتواں قاتل تماشا بن گیا تم بھی آکر دیکھ جاؤ غش بہ غش آتے ہوئے

(۱۸) کلیان ——— نام منشی کلیان سنگھ تخلص کلیان شعر ہے ؎

شاعری اب تک بھی کچھ نہیں آئی مجھے مدتیں گزری ہیں تعلیم سخن پاتے ہوئے

(۱۹) مائل ——— جناب منشی جنیسر داس صاحب مائل شاگرد شاعر دہلوی۔ شعر ہے ؎

شوخیاں چمکیں مزاج یار میں آتے ہوئے دیکھ لو تصویر سے تصویر بن جاتے ہوئے

شید ا ۔ "منشی صاحب آپ کا مطلب تو یہی ہے تاکہ مزاج یار میں آتے ہوئے شوخیاں چمکیں یہ تصویر سے تصویر بن جاتے ہوئے یوں دیکھو۔ مجھ میں نہیں آتا کہ کیا گیا ہے۔ دونوں مصرعوں کے الگ الگ معنی موجود ہیں مگر دونوں ملا کر دیکھیں تو کچھ بھی جچتے نہیں۔ ربط نداردد۔ یوں کہو ؎

دیکھ کر عکس آئینہ میں محو حیرت ہو گئے دیکھ لی تصویر سے تصویر بن جاتے ہوئے

دوسرا یوں ؎

آفتاب حشر کا اُن پر گماں ہونے لگا شوخیاں چمکیں مزاج یار میں آتے ہوئے

(۲۰) مرزا ——— جناب بابو مرزا محمد ہادی صاحب بی اے لکھنوی۔ مقطع ہے ؎

ہم کو مرزا سے نہ تھا پہلے یہ حسن ظن کبھی منہ لپیٹے کل اُسے دیکھا کہیں جاتے ہوئے

(۲۱) منتظر ——— جناب سید کاظم حسین صاحب منتظر لکھنوی۔ شعر ہے ؎

کچھ ہو دل میں یہ ہی سنتا ہوں زبانی تیری دیکھئے کیا رنگ لائے آنکھ تک آتے ہوئے

شید ا ۔ مصرع اولیٰ یوں بدل دیجئے۔ ع ——— کچھ ہو دل میں یہ ہی سنتا ہوں ترے تیروں سے میں

(۲۲) نجمی ——— نام محمد مصطفےٰ خاں تخلص نجمی شاگرد شاعر دہلوی شعر ہے ؎

اس کو تڑپا یا اسے گھائل کیا وہ مصطفےٰ گیا دیکھتے آتے ہیں کیا کیا آفتیں ڈھاتے ہوئے

(۲۳) وحید ——— جناب سید حسن علی صاحب (رئیس ضلع پیلی بھیت) مقطع ہے ؎

شب وہ آغوش تصور سے گئے ہیں اس طرح ابر سے جس طرح نکلے چاند کترا تے ہوئے

شید ا ۔ "رات کو وہ آغوش تصور سے اس طرح گئے ہیں جیسے چاند ابر سے کتراتا ہوا نکل جاتا ہے۔ واقعی بیچ بیچ میں ابر

(بقیہ صفحہ پر دیکھئے)

ظفر حمیدی

آشوبِ آگہی

اے مرے دوست تری یاد کے رنگیں لمحے
جب مرے ذہن کے پردے پہ اُبھر جاتے ہیں
یا اچانک تری تصویر کا دُھندلا خاکہ
گر کبھی میرے تخیّل میں جھلک جاتا ہے
ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی غم کا سایہ
دل کی تاریک گپھاؤں میں اُجالا کر دے
دل کی دیوار پہ ماضی کے سنہرے نقشے
لے کے انگڑائی اُنھیں جیسے اجنتا کے نقوش
اک محقق کی نگاہوں کو مُسخّر کر لیں
اور حیرت میں وہ خود نقش بہ دیوار بنے

اے مرے دوست تری پاک محبّت کی قسم
زندگی آج عجب موڑ پہ آ پہنچی ہے
حوصلہ ہے نہ وفا کا، نہ جفا کے شکوے
بے بسی غم ہی نہیں، وصل کا ارماں بھی نہیں
ولولے سرد ہیں جذبات کا طوفاں بھی نہیں

ٹمٹماتے ہیں کہیں دُور امنگوں کے دیئے
کان دھرتا نہیں پازیب کی آہٹ پہ کوئی
دستِ نازک بھی کوئی آج حنا گیر نہیں
دائرہ تنگ ہے احساس کی برنائی کا
دامنِ تار نہیں، چاکِ گریباں بھی نہیں
مُنجمد زخمِ تمنّا کا لہو ہے کب سے
دشت میں خار ترستے ہیں کوئی قیس ملے
اب نہ شیریں ہے نہ فرہاد کی وہ کوہ کنی
کوئی سُنتا ہی نہیں موجِ صبا کے نغمے
بربطِ وقت کا آہنگ دل آویز نہیں
گردشِ جام میں خیّام کا وہ رنگ نہیں
اب نہ سرشاریِ حافظ ہے نہ فکرِ غالب
تاب کس کو ہے کہ اب چھیڑ سکے دیپک راگ
میگھ دُوت آج کہاں پریم کا سندیس لئے
آج بس عقل کی باتیں ہیں خرد کے چرچے

افسانہ:-

مانک ٹالہ

نریندر بھیا

نریندر بھیا کی وکالت کی پڑھائی کا آخری سال تھا۔ امتحان قریب آیا تو وہ ہمارے والد صاحب کے پاس تشریف لائے۔ ادھر ادھر کی باتوں اور دسکا پالش کے بعد والد صاحب سے گویا ہوئے۔

"چاچا جی! ہر روز گاؤں سے شہر آنے جانے میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔ آخری سال ہے یہی وقت اگر پڑھائی میں صرف ہو تو اچھے نمبروں سے پاس ہو سکتا ہوں۔"

والد صاحب حسب عادت رد ہوں کہہ کر مراقبے میں چلے گئے۔

"اگر آپ اپنی شہر والی حویلی کا ایک کمرہ تین چار مہینے کے لئے مجھے رہنے کے لئے دے دیں تو میں بے فکر ہو کر پڑھائی میں جٹ جاؤں گا۔"

نریندر بھیا کو جب کبھی اپنا مطلب نکالنا ہوتا تو ان کی زبان سے شہد ٹپکنے لگتا۔

والد صاحب نے حامی بھر دی۔

والد صاحب ضلع کچہری میں وکالت کرتے تھے شہر میں ایک آفس لے رکھا تھا۔ سستا زمانہ تھا۔ بڑے بڑے دو کمروں کا آفس تھا۔ ایک برآمدہ بھی تھا۔ آفس کے کام کے لئے ایک ہی کمرہ کام میں آتا تھا۔ دوسرے کمرے میں وکالت کی پرانی کتابیں، آل انڈیا رپورٹر کی پرانی جلدیں، ایک بڑی میز اور چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

نریندر بھیا نے اس کمرے کی صفائی کروائی۔ کتابوں کی گرد جھاڑی۔ اور انہیں قرینے سے لگایا۔ ٹوٹی ہوئی کرسیوں کو برآمدے کی زینت بنایا اور کمرے میں ایک چارپائی ڈلوالی۔ ایک ٹوٹے پھوٹے ٹیبل لیمپ کو ٹھیک ٹھاک کے اپنے کام کے قابل بنایا۔ اور پڑھائی میں جٹ گئے۔

چند روز کے بعد والد صاحب وکالت کے امور سے فراغت پاکر دفتر سے گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ نریندر بھیا چہرے پر معصومیت سجائے ہوئے عرض مند ہوئے۔ "چاچا جی! ہیں۔ ہیں۔ ہوٹل والا دودھ کھانا نہیں کھلاتا۔ آپ کی ضمانت مانگتا ہے۔ ماہوار حساب سے یوں بھی کھانا سستا پڑتا ہے۔"

والد صاحب نے دودھ والے کو ضمانت دے دی تو کہنے لگے کہ لگے ہاتھوں حلوائی کو بھی ضمانت دے دیجئے۔ صبح کو ناشتہ پانی اور رات کو دودھ جلیبی کی ضرورت پڑتی ہے۔ مہینے کے مہینے حساب چکا دیا کروں گا۔"

لگے ہاتھوں حلوائی کو بھی ضمانت دے دی گئی۔

تین چار ماہ پلک جھپکنے میں گزر گئے۔ نریندر بھیا امتحان دے کر واپس گاؤں لوٹ گئے۔ ان کے واپس جانے کے بعد والد صاحب نے دیکھا کہ نریندر بھیا جس کمرے میں براجمان تھے۔ اس کمرے میں پڑا ہوا بڑا میز اور بہت سی کتابیں غائب تھیں۔

والد صاحب بہت جلال میں آئے۔ نریندر بھیا سامنے ہوتے تو لگے بچوڑ دینے۔ نریندر بھیا کو بلانے کے لئے والد صاحب نے کئی مرتبہ خط دوڑائے لیکن وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹرخا جاتے۔ اس دوران میں والد صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

ایک روز اچانک سرِ راہ ملاقات ہوگئی۔ نریندر بھیا نظر بچا کر کھسکنا ہی چاہتے تھے کہ والد صاحب نے پکار لیا۔

"چاچا جی" کہہ کر نریندر بھیا تصویر دار بچے کی طرح آنکھیں جھکا کر باادب! ملاحظہ ہو کر کھڑے ہوگئے۔ والد صاحب نے میز اور کتابوں کے متعلق پوچھا تو کھسیا کر کہنے لگے۔

"چاچا جی۔ ہیں۔ ہیں ــــ وہ تو میں ــ ہوں۔ ہوں ــ لے آیا تھا۔ جی میں نے سوچا ــ ہوں۔ ہوں ــ آپ کے پاس نالتو پڑی ہے ــ ہی ہی ــ میں وکالت شروع کروں گا تو ضرورت پڑے گی۔ بس وکالت چلتے ہی لوٹا دوں گا۔ چاچا جی! ہی ہی ہی ــ چار چھ مہینے کی تو بات ہے۔ آپ فکر نہ کریں میں فیر تھوڑا ہی ہوں ــ"

والد صاحب میز اور کتابوں کو روکر بیٹھے تھے کہ ڈھابے والا اور حلوائی اپنے اپنے بل لے کر حاضر ہوگئے۔ پتہ چلا کہ زبانی جمع خرچ کے علاوہ نریندر بھیا نے ایک پائی بھی انکے پلے نہیں ڈالی تھی۔

والد صاحب نے نریندر بھیا کو گھر گھار کر پکڑا۔ حلوائی اور ڈھابے والے کے بلوں کی بات کی تو وکالت چلنے پر پائی پائی چکا دینے کا وعدہ کیا۔ والد صاحب نے غصّے میں آکر بہت سی جھاڑیں پلائیں۔ لیکن نریندر بھیا انھیں شیر مادر سمجھ کر پی گئے۔ مگر گانٹھ ڈھیلی نہیں کی۔

یہ نریندر بھیا کی وکالت سے پہلے کی تمہید تھی۔ امتحان کا نتیجہ نکلتے ہی انھوں نے بڑے دھولے سے وکالت شروع کر دی۔ باتوں کے دھنی تھے موکلوں کو گھر گھار کر ایسا اوٹے پر جاتے کہ وہ پرکٹے پنچھی کی طرح ہر وقت ان کی گرفت میں رہنے، جواب سے جواب کیسں بھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ موکلوں کو ایسے سبز باغ دکھاتے کہ انھیں یقین ہو جاتا کہ پہلی ہی پیشی میں ان کا حریف چاروں شانے چت ہو جائے گا۔ چنانچہ نریندر بھیا مقدمے کے اخراجات اور اپنی پوری فیس پیشگی وصول کر لیتے۔

اس کے جو نریندر بھیا آگے آگے اور موکل اُن پیچھے پیچھے ہوتے۔ نئی وکالت تھی لیکن اخراجات شاہانہ تھے۔ فیس کے ساتھ مقدمہ دائر کرنے کے لئے ہوئے اخراجات بھی خرد برد کر دیتے۔ جو کل مقدمہ دائر کرنے کو کہتے تو روز کوئی نیا بہانہ گھڑ دیتے۔ پھلے موکلوں کی جوتیاں گھستے گھستے نئے موکل پھنس ہی جاتے۔ چنانچہ نئے موکلوں سے وصول کئے ہوئے پیسوں سے پرانے موکلوں کے مقدمے دائر کرتے۔ اور پھر نئے موکل جوتیاں چٹخاتے پھرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موکل ان سے دور بھاگنے لگے۔ چرب زبانی کا جادو ختم ہوگیا اور نریندر بھیا زبردست ٹرمکیاں مارنے لگے۔ اور شاہانہ اخراجات دوستوں، رشتہ داروں سے ادھار لے کر پورے کرنے لگے۔ دو چار ماہ بعد کوئی اپنے پیسے کی واپسی کا مطالبہ کر بیٹھتا تو اس سے اور ادھار مانگ بیٹھتے۔ چنانچہ اپنے روپیہ کا مطالبہ کرنے والے اب ان سے چھپے چھپے پھرتے کہ کہیں مزید کا مطالبہ نہ کر بیٹھیں۔

آخر ایک روز ایک بیرسٹر صاحب نے انہیں اپنا اسسٹنٹ بنا لیا۔ بیرسٹر صاحب کا کام بہت بڑھا ہوا تھا اور انہیں ایک لائق نائب کی ضرورت تھی جو ان کے چھوٹے موٹے کام سنبھال سکے۔ چنانچہ نریندر بھیا تنخواہ کے ساتھ فیس میں سے بھی حصہ وصول کرتے رہے۔ کافی عرصہ تک ان کی گاڑی چلتی رہی۔ پھر ایک روز نریندر بھیا بیرسٹر صاحب کی خوبصورت جوان لڑکی کے ساتھ روپوش ہوگئے۔

بیرسٹر صاحب کی بیگم کو بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ بیرسٹر صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ انہیں بیگم سے محبت تھی دراصل بیگم سے بیرسٹر صاحب کی لو میرج ہوئی تھی اور بیگم ان کی سب سے بڑی کمزوری تھیں۔ خود ہندو تھے بیگم مسلمان تھیں۔ دونوں اونچے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی شادی پر ہائے ہو نہیں ہوئی تھی۔ نہ کسی نے کسی کو مذہب تبدیل کرنے کے لئے مجبور کیا۔ والد کے متعلق انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک بچہ مسلمان بنے گا تو دوسرا ہندو۔ علیٰ ہذا القیاس۔

وہ لڑکی جو نریندر بھیا کے ساتھ بھاگی تھی بیگم صاحب کے حصہ کی اولاد تھی۔ چنانچہ بیگم صاحب برابر بھی شدت سے دورے پڑنے لگے تھے۔ جنہیں دیکھ دیکھ کر بیرسٹر صاحب کی پتلی گم ہونے لگی تھی۔ چنانچہ بیرسٹر صاحب نے پولیس کی مدد سے فرار ہونے والوں کو چار چھ گھنٹوں کے اندر اندر ہی پکڑ لیا۔

بیرسٹر صاحب چاہتے تو نریندر بھیا کو دو چار سال کے لیے سرکاری مہمان خانے کا مزا چکھوا سکتے تھے۔ کیوں کہ لڑکی ابھی نابالغ تھی لیکن بدنامی کے ڈر سے انھوں نے معاملہ رفع دفع کروا دیا۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ نریندر بھیا شادی شدہ تھے۔ اور بھگوان کی دیا سے اُن کی شریمتی کی گود میں سال ڈیڑھ سال کا چاند سا بیٹا بھی کھیل رہا تھا۔

ان کی شادی بھی عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی۔ شادی سے پہلے انہیں پتہ لگ گیا تھا کہ اُن کی ہونے والی بیوی دمہ کی مریض ہے اور دمہ دم کے ساتھ جاتا ہے۔ لیکن دریا دلی نوگوں نے اُن کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ خاندان کافی امیر ہے۔ جہیز میں کافی رقم ہاتھ لگے گی۔ دمہ کی مریضہ عورت کا کیا بھروسہ کب دم نکل جائے۔ بات نریندر بھیا کے دل کو لگی۔ اور اس طرح شادی ہوگئی۔ اور پھر نریندر بھیا بیوی کے دم گھٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ اس کے اعلاج معالجہ سے لاپروائی تو برتتے ہی تھے۔ ساتھ میں بدسلوکی اور مار پیٹ کی رفتار بھی تیز کر دی۔ لیکن ان کی بیوی تھی کہ پتہ کی بیماری اور نکھرتی جاتی تھی۔ گویا اس کے دمے کا علاج مار پیٹ کے ذریعے ہو رہا ہو۔

آخر جب نریندر بھیا نے دیکھا کہ اُن کی بیوی کو لوگ کا پنڈ نہیں چھوڑ رہا ہے۔ تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اور انہوں نے بیرسٹر صاحب کی دختر نیک پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ صاحب زادی ان کے جھانسے میں آگئیں اور ان کے ساتھ بھاگ نکلیں۔

بیرسٹر صاحب سے فراغت پاکر نریندر بھیا نے پھر سے اپنی وکالت کا اڈا جمایا۔ بیرسٹر صاحب کے تحت کام کر کے انہوں نے اپنی واقفیت کا دائرہ کافی وسیع کر لیا تھا۔ علیٰ بھی بیرسٹر صاحب کے مقابلے میں کم لیتے۔ چنانچہ کام پھر چل نکلا۔ نئی نئی اغوا برائے بیس قسم کے مقدمات میں اور دور دور تک ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ عدالت میں ایسی دھواں دھار جرح کرتے کہ مخالف فریق کے گواہوں کے چھکے چھوٹ جاتے۔

ایک مرتبہ ایک خوبصورت نوجوان عورت اپنے بھتیجے کے ساتھ ان کے دفتر میں آئی۔ اپنے خاوند سے خلع حاصل کرنا تھا۔ خاوند سے علیحدہ ہو کر اپنے میکے ہی میں رہ رہی تھی۔ بڑی تیز قسم کی عورت تھی۔ ضرورت سے زیادہ حسین اور جہاں خاوند دل و جان سے چاہتا تھا۔ لیکن اس کے حسن اور جوانی کے ساتھ ہر وقت اسے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتا۔ اور وقت بے وقت روٹی کی طرح دھو دھو کر رکھ دیتا۔ ایسی قسم کی عورت ہوتی تو زندگی کی گاڑی چلتی رہتی۔ لیکن زمانے کا ہاتھ چلتا تو اور اس کی نذر بن جاتی۔ بعض بدقسمت سرے چڑھتے کہ ساس نند کا ان ہوتا۔ آئے روز زور زور کی چخ دھاڑ سے تنگ آکر اسے گھر سے دھکا دے دیا اور وہ میکے چلی آئی۔

مقدمے کی ابتدائی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ ایک دو پیشیاں بھی پڑ چکی تھیں۔ مقدمہ کچھ الجھا ہوا تھا۔ جج سہر جاتا اور وغیرہ کے جھگڑے بھی تھے۔ وکیل صاحب ایسے کئی مقدمے لڑ چکے تھے۔ اس لیے نریندر بھیا اکثر ان سے مشورہ لینے آتے تھے۔

اسی دوران میں نریندر بھیا نے اس پر یا اُس نے نریندر بھیا پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے تھے۔ گھر سے اپنے بھتیجے کو ساتھ لے کر مقدمہ کے سلسلے میں وکیل صاحب سے مشورہ کرنے آتیں۔ اُن کے دفتر میں پہنچ کر بھتیجے کو کچھ نہ کچھ لانے کے بہانے کہیں روانہ کر دیا جاتا۔ ساتھ ہی اس کی نگاہ بھی گم کر دی جاتی۔ آخر کار دروازہ بند کر کے دونوں تخلیہ میں پرسکون ماحول میں مقدمہ کی آئندہ پیشیوں کے سلسلہ میں صلاح و مشورہ کرتے۔

مقدمہ نے اور زور پکڑا تو وکیل صاحب کے روز گھر پر مشورہ کے لیے تشریف لانے لگے۔ نریندر بھیا نے بیوی سے مرغ مسلم بنوائے۔ شامی کباب الگ تلوا کر تیار کروائے۔ اس روز دونوں میں دو دو دفعہ بھوجن ہوا۔ بھتیجے کے دروازے بند کر کے مقدمہ کے سلسلہ میں دیئے جانے والے بیانات کی ریہرسل کروائی جاتی۔ ریہرسل کے بعد دونوں مل کر کھانا کھاتے۔ مرغ کی ٹانگیں چوڑی جاتیں۔ ہنسی مذاق اور قہقہے بلند ہوتے۔ ادھر نریندر بھیا کی بیوی جلتی بھنتی اور ٹسوے بہاتی رہتی۔

نریندر بھیا کی بیوی نے مرتبہ والد صاحب کے پاس فریاد لے کر گئی کہ وہ نریندر بھیا کو سمجھائیں کہ وہ راہ راست پر آجائیں۔ لیکن والد صاحب سمجھے کہ اپنے اصولوں کی آڑ لے کر ان کے ذاتی معاملات میں دخل انداز ہونے سے صاف انکار کر دیتے۔

نریندر بھیا کے معاشقے کی داستان کا گھر گھر چرچا تھا۔ تماش بین قسم کے لوگ اپنی طرف سے مرچ مسالحہ لگا لگا کر چٹخارے لے لے کر نریندر بھیا کے عشق کے قصے بیان کرتے اور اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے تبصرے فرماتے۔ اس طرح ان لوگوں کے فرصت کے لمحے چٹخارے لیتے لیتے گزرنے لگے۔

بہرحال اس بات سے سب متفق تھے کہ مقدمہ کا فیصلہ ہوتے ہی زریدر بھیا ان صاحبہ سے باقاعدہ شادی کرلیں گے یا گھر میں ڈال لیں گے۔

لیکن ایک روز زریدر بھیا بڑے دھڑے سے والد صاحب کے پاس آئے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ شبہ سے ڈھنگ کی بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ اس روز وہ صاحبہ ان کے ہاں تشریف لائی ہوئی تھیں۔ بزدکرے میں مقدمے کی روئداد سنانے کے بعد انہوں نے ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ اور چھیڑوں کے درمیان مرغ تخم اڑائے تھے۔

اس کے بعد انہوں نے شالامار باغ میں پہلے پہر کے عورتوں کے میلے میں جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ یہ میلہ ہر مہینے کے پہلے پیر یعنی گرہن کو لگتا تھا۔ اس روز بھی پہلا پیر تھا۔ کوئی تہوار بھی تھا اس لئے عدالتوں میں چھٹی تھی۔

زریدر بھیا نے تانگے کا انتظام کیا اور اگن کے بھتیجے کے ہمراہ باغ کے لئے روانہ کردیا۔

تانگا شالامار باغ کے باہر پہنچا۔ ان کے میاں اپنے دو تین پہلوان قسم کے دوستوں کے ساتھ باہر کھڑے تھے۔ بھتیجہ صاحب کو تانگے سے نیچے اتارا اور اپنے دوستوں کی مدد سے اپنی بیوی کو اغوا کرکے لے گئے۔

زریدر بھیا کو اطلاع ملی تو بھاگم بھاگ والد صاحب کے پاس آئے۔ قصہ یہ تھا کہ تانگے والا زریدر بھیا کا واقف کار تھا۔ زریدر بھیا چاہتے تھے کہ تانگے والے کی مدد سے اغوا کرنے والوں کو پکڑ کر حوالات میں بند کرکے وہ صاحبہ ان کو سونپ دی جائیں۔ والد صاحب زریدر بھیا کی بات سن کر فرمانے لگے "دکانداری کے امور کے بارے میں مشورہ دینا تو میرا فرض تھا۔ تمہارے عشق و عاشقی کے پھٹے میں میں اپنی ٹانگ کیوں اڑاؤں؟ تمہارے ذاتی جھگڑوں کے لئے نہ تو میرے پاس وقت ہے اور نہ میں اپنے دوستوں سے مدد حاصل کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

پھر خلاف توقع مسکرا کر فرمانے لگے۔ حق بہ حقدار رسید۔

ہنستا کھیلتا مُنّا — ماں کے پیار کی

نونہال۔ بچوں کو صحت مند زندگی کے لیے تیار کرتا ہے اور
مرض سے بچنے کی قوت بڑھاتا ہے۔

نونہال کے استعمال سے بچے ہمیشہ توانا اور خوش و خرم

نونہال گرائپ سیرپ: ننھے بچوں کی جلاب کشائی کے

نونہال بے بی ٹانک: بچوں کی بڑھوتری کے

دہلی ، کانپور ، پٹنہ

ڈراما:- اظہر افسر

مومن

افراد:-
مومن
صاحب جی
شفیقہ
ایک موسیقار

(قدیم طرز کا ایک خوبصورت دالان، اُجلا چاندنی کا فرش، جس پر بیچوں بیچ ایک نہایت قیمتی قالین بچھا ہے۔ وسط میں گاؤ تکیہ سے لگے مومن (کشیدہ قامت سرخ و سفید رنگ، روشن آنکھیں، گھنی ہوئی بھنویں، لمبی مستوان ناک، پتلے پتلے ہونٹوں پر پان کا کھا جا ہوا، ہلکی ہلکی مونچھیں، خوبصورت داڑھی، سر پر گھونگریالے بال، کاکل کچھ کچھ کندھوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ بدن پر خرشتی ململ کا کرتا اور اگرکھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ جس سے تعویذ لٹک رہا ہے۔ ایک کریمی رنگ کے دوپٹے کو کمر کے گرد لپیٹ لیا ہے جس کے دونوں کونے سامنے پڑے ہیں۔ انگرکھے کی آستین بلیٹ کر چڑھا لی ہے۔ سر پر گلشن کی دوپلی ٹوپی پہنے) بیٹھے ہیں۔ سامنے کچھ کاغذات بکھرے ہوئے ہیں۔ ایک چھوٹا سا پاندان رکھا ہے۔ داہنی طرف چلمن لگی ہے۔ وسط میں پیچھے ایک خوش وضع محراب ہے جس پر سفید کپڑا تانا گیا ہے۔

پردہ اٹھتا ہے تو مومن سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ محراب میں ایک نوجوان عورت کا سایہ نظر آتا ہے۔ عورت سر جھکائے کھڑی ہے۔ مرد عورت کا ہاتھ تھامنے، اسے چومنے کی کوشش کر رہا ہے۔ موسیقار پس منظر نہایت سُریلی آواز میں گا رہا ہے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومن۔ (اُٹھ کر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگتے ہیں)

موسیقار۔ وہ نئے گلے وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومن۔ (پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھتے ہیں)

موسیقار۔ جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(موسیقار کی آواز کے ساتھ ساتھ محراب والا سایہ بھی غائب ہو جاتا ہے۔ داہنی جانب کی چلمن ہلنے لگتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی محبوبہ صاحب جی، زرد رنگ کا لمبی آستینوں کا کرتہ، کاہی صدری، سُرخ گلبدن کا پائجامہ، دھانی دوپٹہ اوڑھے جھجکی ہے)

مومن۔ (کچھ دیر تک چلمن کی طرف دیکھتے ہیں پھر مسکرا کر)
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

صاحب جی۔ (اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور چلمن سے کچھ پیچھے ہٹ جاتی ہے)

مومن۔ صاحب۔

صاحب جی۔ (جواب میں صرف چلمن ہلتی ہے)

مومن۔ تم نے وہ نہیں سُنا۔

اے پردہ نشیں چلمن اٹھا دے کہ ذبح جائے
کرتا ہوں میں سوزِ غم پنہاں کی شکایت

صاحب جی۔ (چلمن کے پیچھے ہی سے بڑے اُداس لہجے میں)

ہم خاک میں بھی مل گئے لیکن نہ ملے وہ
دل ہی میں رہی رہی بخشش جاں کی شکایت

مومن۔ صاحب باہر نہیں آؤ گی، ہمارے رشتہ دار تمھیں مجھ سے جدا کرنے پر تلے ہوئے ہیں، کیسی کیسی آفتیں ڈھا رہے ہیں۔ آسمان نے جو یہ گھڑی مل بیٹھنے کو بخشی ہے کیوں ہم الگ الگ گزاریں، صاحب۔

صاحب جی۔ (چلمن اٹھا کر آہستہ آہستہ باہر آتی ہے، مومن نہایت نزاکت سے اُس کا ہاتھ تھام کر قالین پر اُسے بٹھاتے ہیں)

مومن۔ (ایک کاغذ سامنے رکھتے ہوئے)۔ لو اسے پڑھو۔

صاحب جی۔ (دوسری طرف منھ پھیر لیتی ہے)

مومن۔ ناراض ہو؟

صاحب جی۔ یہ بتاؤ اُس نامے کا کیا ہوا؟

مومن۔ نامے کا؟ کوئی پیام بھجوایا تھا میری صاحب نے؟

صاحب جی۔ میں کیوں پیام بھجواتی، آپ اپنی کہیے،

مومن۔ بھئی کہنا کریاں نہ بجھواؤ، کس نامے کا ذکر کرتی ہو،

صاحب جی۔ کپورتھلہ والے، وہ نامہ جو مہاراجہ کپورتھلہ نے آپ کو بھیجا تھا،

مومن۔ (قہقہہ لگاتے ہیں) بھئی ایسے وقت کس کافر کو اُس نامے کا خیال آسکتا ہے،

صاحب جی۔ آخر لکھا کیا تھا؟

مومن۔ لکھتے کیا، ماہوار ساڑھے تین سو روپے مقرر کئے تھے، پیام کے ساتھ آنے جانے کا خرچ بھی بھیجا تھا۔

صاحب جی۔ اور آپ نے زاد راہ اور ماہوار دونوں کو ٹھکرا کر۔۔۔

مومن۔ صاف جواب دے دیا کہ میں مصاحبی اور پابندی سے حاضر ہوں، ایک ہی "صاحب" کافی ہے۔

صاحب جی۔ (مسکراتی ہے)

مومن۔ بھلا سوچو تو جس دربار کا تنبو خاں بھانڈ، ایک معمولی گویا ساڑھے تین سو روپے ماہوار کمائے۔ میں بھی اسی دربار سے رہی تنخواہ پاؤں۔

صاحب جی۔ خودداری کوئی آپ سے سیکھے۔ مسٹر ٹامسن صاحب لفٹننٹ گورنر پنجاب نے آپ کو جب اپنے ساتھ لے جانا چاہا تو آپ نے کیا کہا۔

مومن۔ صاحب دلی ہمارے لیے ابھی اس قدر سستی نہیں ہوئی کہ اُس کو تین روپے ماہوار کے عوض بیچ دیتا۔ ہائے۔

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

صاحب جی۔ جن حضرت کے آپ شعر پڑھتے ہیں وہ اور سودا، سوز، انشا، انیس، دبیر، ناسخ، آتش، علیحدہ، جرأت حضرت ذوق بھی تو آپ کے سامنے ہیں، کتنے نام آپ کو گنواؤں، سبھوں کے لئے دربار کی پابندی لازمی رہی ہے۔

مومن۔ حضرت میرزا مظہر جانجاناں، آبرو، عیش، شاہ حاتم حضرت خواجہ میر درد، انھیں کیوں بھول گئی ہو۔ نہیں صاحب نہیں، میں مدح کو گداگری اور ہجو کو دنی الطبعی گردانتا ہوں۔ زندگی میں راجہ اجیت سنگھ والی پٹیالہ اور نواب دوبیر خاں والی ٹونک کے نام جو قصیدے لکھ دئے ہیں وہی بہت ہیں۔ میں اب اور کسی کا ممنونِ احسان ہونا نہیں چاہتا۔

غیر کرتے ہیں سبوئے مے گلگوں عطا
ساغرِ چشم میں ہم دل کا لہو بھرتے ہیں

خیر ہٹاؤ اس ذکر کو، کوئی اور بات کرو، تمھارے اس شعر کا کیا بنا۔ کیا مصرعہ تھا وہ۔؟ ہاں

گنہ کیا صنم کے نظارے میں زاہد
دوسرا مصرعہ ملایا نہیں، یا شعر ابھی تک لنگڑا ہے۔

صاحب جی۔ (منھ پھیر لیتی ہے) (مومن اُٹھ کر سامنے بیٹھتے ہیں، (صاحب دوسری طرف منھ پھیر لیتی ہے)

مومن۔ (پھر اپنی جگہ واپس آکر) جی؟ (آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) جی؟

صاحب جی۔ (مسکراتی ہے) جائیے نہیں ملا۔

مومن۔ ذرا پڑھو تو۔۔۔

صاحب جی۔ رقیبوں کا جلنا کہاں دیکھتا تو

سماں یہ مرے گھر میں آیا تو دیکھا
گنہ کیا صنم کے نظارے میں زاہد

....

مومن۔ ہاں۔ گنہ کیا صنم کے نظارے میں زاہد
(پھر صاحب جی کی طرف اور پھر نیچے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے)
خدا نے یہ جلوہ دکھایا تو دیکھا

صاحب جی۔ خوب شعر ہو گیا۔ واہ۔ (پھر چھت کی طرف دیکھ کر)
کچھ کچھ درست ضد سے تری ہو چلے ہیں وہ
یک چند اور کجروی اے آسماں نہ چھوڑ

مومن۔ (فوراً) جس کو چے میں گزارا صبا کا نہ ہو سکے
اے عندلیب اس کے لئے گلستاں نہ چھوڑ

صاحب جی۔ (ہنستی ہے) عرصے سے (رک جاتی ہے)

مومن۔ ہاں ہاں عرصے سے؟

صاحب جی۔ عرصے سے چاہتی ہوں کہ آپ کی وہ غزل سنوں اور آپ ہی سے،

مومن۔ کون سی غزل؟

صاحب جی۔ کس کی خراب آنے کی ہے کس لئے ہے یہ بے تابی
کس لئے ہم ہیں بر ہم پھرتے آتے ہیں اور جاتے ہیں۔

سنائیے گا؟

مومن۔ ہاں ہاں!

صاحب جی۔ لیکن۔ ترنم سے۔

مومن۔ (مسکرا کر صاحب جی کو دیکھتے ہیں اور پھر ترنم سے پڑھتے ہیں)
کس کی خراب آنے کی ہے کس لئے ہے یہ بے تابی
کس لئے ہم ہیں بر ہم پھرتے آتے ہیں اور جاتے ہیں
شکوہ کیسا بیداد کرے گا، کیجئے اس سے دیکھو تو
دیکھے ہے ظالم غیر جب ہم زخمِ جگر دکھلاتے ہیں
ہوش گئے یاں دل سے پہلے ہوئے سمجھ تو سمجھیں رات
یہ تو سمجھے حضرتِ ناصح آپ کسے سمجھاتے ہیں
کیا کہیں تم سے اے ہمدرد پوچھو مت مرغانِ چمن
کیونکر یاں ایامِ خزاں اور بہر کے دن کٹ جاتے ہیں
کنجِ قفس میں بیٹھے کیا ہے روتے ہیں تنہائی پر
یاد سیرِ موسمِ گل سے کیا ہے جی بہلاتے ہیں

(کسی کے آنے کی آہٹ ہوتی ہے)

صاحب جی۔ شاید کوئی آ رہا ہے (اچانک مومن کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

(قدموں کی چاپ قریب سنائی دیتی ہے)

(صاحب جی جلدی جلدی چلتی چمن کے پیچھے جا کر غائب ہو جاتی ہے) (بائیں طرف سے شفیقہ رنگین انگرکھا۔ ایک بگا پاجامہ اور مخملی جوتی پہنے داخل ہوتے ہیں)

شفیقہ۔ تسلیمات بجالاتا ہوں۔

مومن۔ (چلن ہی کی طرف دیکھتے ہوئے) مصطفےٰ خاں بڑے برے وقت آئے۔

شفیقہ۔ کیا فرمایا حضرت نے؟ کچھ گستاخی ہوئی ہو تو درگزر کیجئے گا۔

مومن۔ کس لطف کی صحبت تھی صاحب جی سے۔ تم نے آکر سب درہم برہم کر دی۔

شفیقہ۔ کون صاحب جی یعنی امۃ الفاطمہ بیگم؟

مومن۔ ہاں امۃ الفاطمہ بیگم صاحب جی۔

شفیقہ۔ وہ یہاں تھیں (مومن کی گردن پر اپنا ہاتھ رکھتا ہے) نصیب دشمناں کہیں ناسازِ تو نہیں۔ ہاں بدن تو ٹھنک رہا ہے۔ آپ آرام کیجئے۔

مومن۔ کیسی باتیں کر رہے ہو شفیقہ۔

شفیقہ۔ میں بالکل سچ عرض کر رہا ہوں۔ جو شخص ناممکنات کا ذکر کرے اس کے لئے اور کیا کہا جائے۔

مومن۔ ناممکنات۔ تم سمجھتے ہو صاحب جی یہاں نہیں آ سکتی۔؟

شفیقہ۔ خود آپ بھی تو اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ صاحب جی تو اس کے رشتہ داروں نے محض آپ سے جدا کرنے کے لئے زبردستی لکھنؤ بھجوا دیا۔ چھ مہینے ہو چکے ہیں وہ لکھنؤ میں ہیں۔ اور آپ کہتے ہیں صاحب جی یہاں تھیں۔ میں اور تو کچھ نہیں کہوں گا۔ بس آپ آرام فرمائیے۔ میں ابھی حکیم منور علی کو بلا کر لاتا ہوں۔ (شفیقہ گھبرایا ہوا چلا جاتا ہے)

مومن۔ (حیران چلن کی طرف دیکھ رہے ہیں، ایسی منظر موسیقار رو دکی کے میں یہ شعر پڑھتا ہے)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(کچھ دیر کے لئے عقب میں محراب والا سایہ ابھرتا ہے اور پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

خطوط

یوسف ناظم ——— اسسٹنٹ ایکزکیوٹو فوڈ جی کارپوریشن بلڈنگ وصوبی تالاب بمبئی ۱

"شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ حسب معمول دلچسپ اور دقیع ہے۔ آپ کی نظم "کرب خود کلامی" نے تو دھوم مچادی۔ مکتوبات کا سلسلہ مقبول ہوتا جارہا ہے۔ لیکن کیا اچھا ہو کہ یہ صفحات تنقید اور تلخی کی باتوں سے مبرا رہیں۔ بیچارے رفعت صاحب "اسکوپ" کے بارے میں ذرا سی بات کہہ کر پھنس گئے۔

"خلیل بدایونی کی رومانی شاعری" پر تبصرہ بہت پسند آیا۔ یہ کتاب میری نظر سے بھی گزری ہے اور مجھے بھی ایسا معلوم ہوا کہ فن کتابت اور فن طباعت کے مظاہرے کے لئے چھاپی گئی ہے۔ تبصرہ نگار نے تو "بیچ سودا" کا حوالہ دیا لیکن مجھے تو کیشہ کاری کے نمونے شبہ ہوا تھا۔

محمد عظیم ——— نادر بخش اینڈ کو فیروز آباد (ضلع آگرہ)

آپ کے اس خیال سے مجھے اتفاق ہے کہ "شاعر" کے مکتوبات دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ خود میں بھی رسالہ کھولتے ہی مکاتیب ڈالتا ہوں۔ نہ صرف "شاعر" بلکہ دوسرے رسائل میں شائع شدہ مکتوبات پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا ہے کہ بیشتر مکاتیب رسالہ کا بالاستیعاب مطالعہ کئے بغیر ہی لکھے جاتے ہیں۔ بعض اس لئے لکھے جاتے ہیں کہ اپنے احباب کی مدح سرائی مقصود ہوتی ہے۔ بعض مکتوب نگار اپنا چھپا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اپنا نام چھپوانے کی سہل ترین ترکیب یہ ہوتی ہے کہ یا تو ایڈیٹر کی کسی تخلیق کی تعریف کی جائے یا اس کے کسی کارنامے پر اظہار رائے کیا جائے اور یہ رائے عام طور پر تحسین پر مبنی ہوتی ہے۔ بیشتر رائیں عام طور پر بغیر پڑھے ہی ظاہر کی جاتی ہیں اور ہر صاحب رائے کو مافیہ اسی میں نظر آتی ہے کہ وہ مشاہیر کی تخلیقات کی تعریف کرے۔ نئے اور غیر معروف حضرات کی کتنی ہی قدر اوّل کی چھپتی ہیں لیکن مکتوبات میں شاذ و نادر ہی اُن کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اکثر مکتوب نگار پرکھنے کی صلاحیت کم رکھتے ہیں لیکن سبھی کو اپنی ذاتی رائے ظاہر کرنے سے ہماری کم نظری منظر عام پر آئے گی یا مستند ادبا ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے، اچھی صحیح رائے نہ سہی تو کم از کم بڑی کم ظرفی کی بات ہے۔ ہماری رائے صحیح ہو یا غلط۔ ہمارے لئے یہ شرف کیا کم ہے کہ ہم نے یہ رائے خود پڑھ کر قائم کی ہے۔

میں جو لذت ہے وہ دوسروں کے تاج محل میں کہاں۔! مجھے مسرت ہوگی اگر آپ میرے خط شائع فرمادیں۔

a poor thing but my own

طرفہ قریشی ——— آغا حشین کا باڑہ۔ عقب نعل صاحب ناگپور ۱

آپ نے نومبر ۶۹ء کے "شاعر" کے اداریہ میں چند ایسی باتیں پیش کیں جن کی طرف ہمارا شعبۂ حکومت کو حقیقتاً پورے طور پر توجہ دینا بالخصوص اُن ادبا اور شعرا کو جن کی تخلیقات اور خدمات کے صلے میں وہ مراعات ملنی چاہئیں جن کے وہ مستحق ہیں۔

بمبئی خاص کے ساتھ ہمارا شعبہ کے چھتیس اضلاع ہیں۔ ان میں دو چار اضلاع کو چھوڑ کر اگر تحقیق کی جائے تو ہر ضلع میں ایک یا شاعر ایسے نکلیں گے جن کی پوری زندگی اُردو زبان و ادب کی خدمت میں صرف ہوئی ہے۔ مستحقین کی باقاعدہ ایک فہرست مرتب ہونی چاہئے اور حسب مراتب انھیں اُن کے حقوق ملنے چاہئیں۔ بمبئی خاص بھی ایسے مستحقین کی ایک خاصی تعداد موجود ہے جن کی زندگی کا ہر لمحہ زبان و ادب کی خدمت میں صرف ہوا اور ہو رہا ہے۔ ایسے شعرا اور ادبا کی فہرست حکومت ہمارا شعبہ تک پہنچائی جائے۔ صوبے کی مختلف اُردو انجمنوں کا انتخاب بھیجا جائے۔ اور یہ سب کام انجمن ترقی اُردو بمبئی کی وساطت سے ہونا چاہئے۔

دوسری صوبائی حکومتوں کی طرح حکومت مہاراشٹر کا یہ اقدام نہ صرف فن کاروں کی معاشی الجھنوں کو دور کرے گا بلکہ اس کی اس

خصوصیات میں ایک مفید اور اچھا اضافہ بھی ہوگا۔ اگر "شاعر" کے ذریعے یہ تجویز حکومت تک پہنچ جائے اور اس کا کوئی معقول حل نکل آئے تو میں سمجھتا ہوں کہ "شاعر" کے ادبی و لسانی کارناموں میں یہ سب سے بڑا اور اہم کارنامہ ہوگا۔

"داستانِ چمنستان" کے تحت آپ کے "ادارتی نوٹ" کے ذریعے جو خصوصیات سامنے آئیں وہ قارئین کی معلومات میں بہترین اضافے کی موجب ہیں۔ مولانا سیماب کی اُن کتابوں کا شائع ہو جانا بھی ضروری ہے۔ آپ نے مولانا مرحوم کی غیر مطبوعہ کتابوں کی جو فہرست پیش کی ہے اُس میں کتاب "میرے شاگرد" کا اندراج نہیں ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں مولانا اس نام سے ایک کتاب ترتیب دے رہے تھے۔

اشرف فاروقی ——— ۱۴، ۷، ۴۴۔ جوگنا بازار اورنگ آباد (مہاراشٹر)

"شاعر" کی آمد سے قبل ۲۸ نومبر کو میں نے حضرت سکندر علی وجد صدر انجمن ترقی اُردو مہاراشٹر سے تفصیلی گفتگو کی تھی کہ دیگر ریاستوں کی طرح مہاراشٹر سے بھی اُردو میں سرکاری پرچہ نکلنا چاہئے۔ صاحب موصوف نے بتایا کہ انجمن کے ایجنڈے میں یہ بات شامل ہے۔ انجمن اس سلسلے میں نمائندگی کرے تو یقیناً اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے اور سب ہی انجمنوں کی اس مطالبے کو تائید حاصل رہے گی۔ "شاعر" دیکھا تو یہ بات بھی "جرعات" میں شامل تھی۔ فی الواقعی آپ ہر ایک کے دل کی بات کہنے میں پیش پیش ہیں۔

مظہر امام ——— پروگرام ایگزیکٹیو آل انڈیا ریڈیو۔ گوہاٹی (آسام)

اُردو سے متعلق آپ کے "اداریے" بڑے جان دار اور زور دار ہوتے ہیں۔ اگر سچائی فتح یاب ہوتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُردو اپنا جائز مقام حاصل کرنے سے محروم رہے۔ آپ نے اخباروں میں بزمِ اُردو ناگا لینڈ کی رپورٹ پڑھی ہوگی۔ یہ بزم ناگا لینڈ کے وزارتِ خلافہ کو ہمیا میں چند اُردو دوستوں کی کوشش سے قائم ہوئی ہے جس کے صدر شری سنس راج رتن ہیں جو اُردو کے جانے پہچانے ادیب اور حکومت ناگا لینڈ کے ڈائریکٹر آف انفارمیشن اینڈ پبلسٹی ہیں۔ بزم کے سکریٹری ابراہیم الدین انصاری ہیں جو مقامی سائنس کالج میں لیکچرار ہیں۔ اس بزم کے روحِ رواں کیپٹن کرشن نیتر ہیں جو آل انڈیا ریڈیو کوہیما میں پروگرام ایگزیکٹیو ہیں۔ اس بزم کے کئی اہم مقاصد ہیں۔ مثلاً اُردو زبان و ادب کی نشر و اشاعت۔ اُردو لائبریری کا قیام۔ ناگا لینڈ کی لوک کہانیوں پر اُردو میں تنقید وغیرہ۔

حکومت ناگا لینڈ نے یکم دسمبر کو اپنی ریاست کے قیام کی دوسری سالگرہ کی تقریب میں مجھے شرکت کے لئے مدعو کیا تھا۔ یہ بھی موقع تھا کہ اس ریاست کی جانب سے کسی اُردو شاعر کو سرکاری تقریب میں نظم پڑھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ہر چند نظم کا انگریزی ترجمہ وزراء اور دیگر عمائدینِ حکومت کے درمیان پہلے ہی تقسیم کر دیا گیا تھا لیکن اُردو جاننے والے اور سمجھنے والے بھی کافی بڑی تعداد میں تھے اور انھوں نے نظم بڑی توجہ اور مسرت کے ساتھ سُنی۔ سند اصل اس تقریب میں میری شرکت بزمِ اُردو ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس بزم نے میرے اعزاز میں ایک خصوصی جلسہ بھی کیا تھا۔ جس کی صدارت وہاں کے وزیر تعلیم شری کیشتان نے فرمائی۔ انھوں نے بزمِ اُردو سے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

نومبر کے شمارہ میں جناب مکرم قریشی اور منظفر حنفی نے میری غزل (مطبوعہ شاعر اکتوبر ۷۵ء) کے مطلع کے بارے میں اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ میں دونوں احباب کا ممنون ہوں۔ مطلع میں واقعی "ایطا" ہے۔ میں نے اپنی غزلوں میں اس طرح کے عیب سے ہمیشہ اجتناب برتا ہے۔ اس لئے مذکورہ غزل کا مطلع بھی تبدیل کر دوں گا۔ یہ "غلط روانی" میں نہیں بلکہ "بے خیالی" میں سرزد ہوئی ہے۔

عروج احمد عروج ——— نزد مکرم ٹاکیز جالنہ (مہاراشٹر)

"شاعر" کے دسمبر والے شمارے کے حصۂ مکتوبات میں محمد عظیم فیروز آبادی کے اس مشورہ کی میں پُرزور تائید کروں گا کہ آپ کے علامہ سیماب پر یقیناً قلم اُٹھانا چاہئے۔ ویسے بھی یہ کام آپ کے اوّلین فرائض میں شامل ہے۔ نومبر ۷۵ء کے شمارے میں علامہ پر آپ کا نوٹ نظر سے گزرا تھا۔ علامہ کی غیر مطبوعہ تصانیف کی اب بھی کافی تعداد موجود ہے۔ ان کی اشاعت کی جانب بھی توجہ دیجئے۔

میری ذاتی لائبریری میں ایک تصنیف "پتوار" تلاش کرنے پر دستیاب ہوئی ہے۔ آپ کی تحریر کے مطابق علامہ سیماب نے

یہ ڈرامہ مسمی رام دیوانہ کو لکھ کر دیا تھا۔ اگر آپ کہیں تو آپ کے پتے پر بھجوا دوں۔؟

دسمبر ۶۵ء کے شمارے کی منظومات میں شاذ تمکنت۔ رونق نعیم اور نسیم پرواز کی نظمیں پسند آئیں۔ غزلیات میں سرشار سیلانی متین سروش۔ اقبال بیجاپوری اور افتخار احمد فخر دھولیوی کی غزلیں بہت اچھی ہیں۔ حصۂ نثر بھی اس بار بہت جاندار ہے۔

بدیع الزماں خاور ——— نئے نیملی ماں۔ دابولی ضلع رتناگیری۔

دسمبر کا "شاعر" مل گیا ہے۔ اب تک صرف نظمیں اور غزلیں پڑھ سکا ہوں۔ دوران کی نظم نے مجھے کافی متاثر کیا۔

۲۰ دسمبر (۶۵ء) کے اکثر مراٹھی اخباروں میں ایک خبر جلی طور پر شائع ہوئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ "مراٹھی ساہتیہ سمیلن" نے ایک تجویز پاس کی ہے جس کا مقصد حکومت سے یہ مطالبہ کرنا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے صرف مراٹھی پروگرام نشر کئے جائیں جس طرح کلکتہ اور مدراس ریڈیو کے تمام نشری پروگرام بالترتیب بنگالی اور تامل میں ہوا کرتے ہیں۔ مہاراشٹر کے تمام ریڈیو اسٹیشن مراٹھی کے ساتھ پورے انصاف سے کام لے رہے ہیں۔ اس کے باوجود معلوم نہیں "ساہتیہ سمیلن" کو مذکورہ تجویز پاس کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ پھر اس تجویز کے ذریعہ جو مطالبہ کیا جا رہا ہے، وہ دوسری زبانوں کے حق میں سخت نقصان دہ ہے۔ اگر خدانا خواستہ اس مطالبے کو حکومت نے مان لیا (جس کی کم از کم مجھے امید نہیں) تو نتائج یقیناً بہتر نہ ہوں گے۔ علاقائی زبان کی حیثیت سے مراٹھی کی اہمیت مسلم ہے۔ مگر مراٹھی والوں کو کوئی ایسا غلط انداز اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ جس سے مہاراشٹر میں عام طور پر بولی اور سمجھی جانے والی "اردو" ہندی، گجراتی جیسی دوسری زبانوں کی حق تلفی ہو۔ دوسری زبان والوں کو کوشش کرنی چاہئے کہ "ساہتیہ سمیلن" اپنی تجویز پر نظر ثانی کرے اور اسے صحیح انداز سے پیش کرے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی "شاعر" میں اس سلسلے میں کچھ لکھیں گے۔

شفق تنویر ——— منگل واڑہ۔ بھوپال

"شاعر" کا دسمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ آپ کا "جرعات" میں مسلسل اردو کے بارے میں جس بے باکی سے لکھ رہے ہیں۔ وہ یقیناً قابل تعظیم ہے۔ اس خود غرضی کے دور میں ایسی بے باکی کا مظاہرہ آپ کا اردو سے حقیقی محبت کا پتہ دیتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس بے باکی سے آپ کو نقصان پہنچ رہا ہو۔ پھر بھی سے "فروغ فرقِ سرداراں" کو نظر نہ لگے۔

آپ نے "جرعات" میں کتنی اچھی بات لکھی ہے کہ "اردو والوں کو انعامات نہیں چاہئیں۔ اردو والوں کو سرکاری امداد و اعانت نہ دیجئے۔ صرف اس کی تعلیم کا نظام ابتدا سے ثانوی مدارج تک کر دیجئے۔" یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم اردو کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی تعلیم کا انتظام باقاعدہ طور پر ابتدا سے ثانوی مدارج تک کرنا پڑے گا۔ ورنہ ہمارے بعد کی نسل اردو سے کافی حد تک ناواقف ہو گی۔

"تشکیل جدید اردو کی رومانی شاعری پر تبصرہ" پڑھ کر ڈاکٹر تشکیل الرحمٰن پر بہت ترس آیا۔ "جدید شاعری میں ہیئت کا مسئلہ" میں امتیاز صاحب نے لکھا ہے کہ "یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سجاد ظہیر کا تجربہ ہر طرح سے کامیاب رہا ہے اور مستقبل قریب میں لوگ اسی کو فن مان لیں گے۔ اگر یہ اسلوب رائج ہو گیا تو اردو شاعری میں مزید تجربوں کی زحمت نہیں اٹھانی ہوگی۔"

یہ ٹھیک ہے کہ سجاد ظہیر کا تجربہ کامیاب رہا ہے۔ یہ بھی بجا کہ لوگ اس کو "فن" بنا لیں گے۔ پھر بھی اردو شاعری میں تجربات ہوتے رہیں گے اور ہونے بھی چاہئیں۔ جدوجہد ہی کا نام زندگی ہے۔ جہاں جدوجہد ختم ہوئی۔ زوال شروع ہوا۔ خود سجاد ظہیر بھی یہ پسند نہیں کریں گے کہ اردو شاعری میں ان کے بعد تجربات نہ ہوں۔

غزلیات میں اعزاز افضل اور عشرت قادری کی غزلیں پسند آئیں۔ سرشار سیلانی کی غزل پڑھ کر علامہ سیماب مرحوم کا یہ شعر بہت یاد آیا۔

عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی چار دن ——— دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

علیم اختر مظفر نگری کی غزل کا مطلع ؎

اس طرح چپ ہوں کوئی بات ہوئی ہو جیسے کسی جنگل میں کہیں رات ہوئی ہو جیسے

کے مصرع ثانی میں "کہیں" حشو ہے۔

نسیم مظفر پوری ——— ریزرو بنک آف انڈیا۔ پوسٹ بیگ ۱۲۶ پٹنہ ۱ (بہار)

دسمبر کا شمارہ باعث نواز ہوا۔ بیک نظر یہ شمارہ خاص نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس میں شامل فنکار لکشر نئے ہیں۔ مگر مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ شمارہ بھی حسب سابق اہم اور بہت اہم ہے۔ مقالات کی جدت اور تنوع، نظموں کی رنگا رنگی، غزلوں کی دلکشی، افسانوں کی حیات آفرینی، بس یوں سمجھئے کہ دل و دماغ عش عش کر اٹھتے ہیں۔ نیتر خلجی کمال گورکھپوری اور روشن آرا نیتر کے افسانے بہت پسند آئے۔ روشن آرا نیتر کے کچھ اور افسانے بھی دیکھے تھے۔ مگر ان میں وہ بات نہیں تھی جو یاد رکھی جا سکے۔ مگر موجودہ افسانہ پڑھ کر ایسا احساس ہوتا ہے، جیسے انھوں نے اپنی راہ بنالی ہے۔ میں ان کو مبارکباد کا خط خود ہی لکھتا مگر شاید وہ پاکستان جا چکی ہیں[1]۔

نومبر کے شمارہ میں زہر کون پیے، خوبصورت، قابل غور اور وجد آفریں نظم تھی۔ اگر کسی صاحب کو وہ نظم سے زیادہ نثر معلوم ہو تو اس سے خود ان کی سہل پسندی ظاہر ہوتی ہے۔

مظفر حنفی ——— میوانی پورہ۔ بھوپال گیٹ۔ سیہور (بھوپال) ایم۔ پی)

"شاعر کی اشاعت دسمبر ۶۵ء میں حضرت ناکامی نے میرے اس شعر ؎

بعد از وقت پشیمان کہاں ہوتے ہو پھول جب توڑ لیا ہے تو مسلنا ہوگا۔

میں "کہاں" کا لفظ بے محل بتایا ہے۔ اس جگہ یہ لفظ طنزیہ لہجے میں "کیوں" کا مفہوم ادا کرتا ہے اور میرے خیال میں برمحل ہے۔ مثال کے لئے دو تین مجلے دیکھئے۔

(۱) آپ بھی کہاں کی بات لے بیٹھے۔ گڑے مردے اکھاڑنے سے فائدہ"، (۲) "آپ یہاں کہاں؟ یہ عید کا چاند اور صدیوں بعد نکل آیا"، (۳) "اس جھانسے میں ہم کہاں آنے والے ہیں، کسی اور کو پھانسئے"۔

مندرجۂ بالا اقتباسات میں لفظ "کہاں" بالترتیب کب، کیسے اور نہیں کا مفہوم طنز کے ساتھ ادا کر رہا ہے۔ امید کہ ناکامی صاحب مطمئن ہو گئے ہوں گے۔

عبدالرحیم نشتر ——— گجری بازار۔ کامٹی (ناگپور)

دسمبر کا "شاعر" دیکھا۔ اس بار بھی رسالہ بہت خوب ہے۔ "بہار رفتہ ہے" اور "تاثر" دونوں غزلیں بہت پسند آئیں۔ یوں تو تمام غزلیں اچھی ہیں لیکن متین سروش کی غزل بہت ہی اچھی ہے۔ افسانوں میں "روپ" اور "احساس جیا جاگا" پسند آئے۔ مقالات کا حصہ بہت ہلکا پھلکا لگا۔ تبصرہ میں "شکیل بدایونی کی رومانی شاعری" پر بے لاگ تبصرہ، تبصرہ نگار کے مخلص اور دیانتدار ہونے کا ثبوت ہے۔ سائچاندپوری نے حضرت سیماب اکبرآبادی پر جو مضمون لکھا تھا اس پر آپ نے جو نوٹ دیا تھا۔ اس سلسلے میں کئی خطوط دیکھے۔ اگر حضرت سیماب سے متعلق مضامین شاعر میں نہ شائع ہوں تو بہتر ہے۔ مضامین نگار اگر دیگر رسائل میں بھی بھیجیں تو کوئی وجہ نہیں کہ شائع نہ ہوں۔ سیماب کی شخصیت اس قابل ہے کہ انھیں ان کا صحیح مقام دیا جائے اور صحیح قدر کی جائے۔

ضیا حسنی ——— کاشانۂ سنجری، چھوٹی بازار۔ فتحپور (یوپی)

"شاعر" کا نیا شمارہ باعث نواز ہوا۔ آپ نے "جہات" کے آخری پیراگراف میں جو بات کہی ہے صحیح ہے۔ اگر اس پر عمل ہو تو یقیناً خوشگوار نتائج مرتب ہوں گے۔ مقالات کا باب کافی سجا ہوا اور دلکش ہے۔ انظر ولی پسند آیا۔ اور قاضی عبدالودود صاحب کے جواب سے کتنی مفید اور نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ یقیناً یہ ایک اہم انظر ولی ہے۔ صابر دت کا شخصی تاثر بھی اچھا ہے۔ نظموں میں شاذ تمکنت، اویس احمد دوراں، رونق نعیم، نصیر سرپرانوی اور اخلاق فتحپوری پسند آئے۔ متین سروش، علیم اختر مظفر نگری، اعزاز افضل، شاذ اور فخر دھرسیوی کی غزلیں بھی اچھی ہیں۔

---

[1] روشن آرا نیتر بھاگلپور (ہندوستان) ہی میں ہیں۔ ادارہ

ادارہ

محفلِ اپنی ...!

سالنامہ

"شاعر" اپنی سینتیسویں سالگرہ پر یہ پُرمغز سالنامہ پیش کر رہا ہے۔ تقریباً دس سال سے پابندی کے ساتھ ہر سال "شاعر" کا ایک سالنامہ اور ایک خاص نمبر شائع کرتا آرہا ہے۔ "شاعر" نے سالنامہوں اور خاص نمبروں کی روایت کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ اُردو کے کسی رسالے نے اس پابندی کے ساتھ سالنامے اور خاص نمبر پیش نہیں کئے۔ اب تک کے شائع شدہ تمام سالنامہوں میں ۱۹۶۶ء کا یہ سالنامہ سب سے کم حجم ہے لیکن اپنے علمی و ادبی خزانہ و وقار کے اعتبار سے بہت اہم اور بہت بڑا ہے۔ اس میں تو نمود و نمائش کا پہلو ہے جو ضخیم سالنامہوں میں بھی عام طور پر نہیں ہوتا۔ نیا سلسلہ اور حسنِ کتابت و طباعت بھی قابلِ دید ہے۔ چند ماہ سے "شاعر" کی کتابت مولوی رفیق عابد ناہری سنبھال رہے ہیں جو خود اہلِ علم ہے ہیں اور فن خطاطی میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ بہرحال سالنامہ کے حجم کی کمی محسوس نہ ہوگی۔ یہ کمی موجودہ حالات کا تقاضا ہے اور اخباری کاغذ کی پابندیوں کا نتیجہ۔ دوسری طرف اشتہارات کے نئے قوانین بھی "شاعر" کے لئے باعثِ نقصان ہیں۔ تیسری طرف وہ عام بے حسی ہے جو توسیعِ اشاعت کے مقصد کو آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ چوتھی وجہ آئندہ چند ماہ میں شائع ہونے والا ضخیم ترین "کرشن چندر" نمبر ہے۔

ہاں سالنامہ میں وہ سب کچھ ہے، جو ذوق کی آسودگی کو درکار ہوتا ہے۔ اس میں طنز و مزاح۔ تنقید و تحقیق، افسانہ، ڈرامہ اور نظم و غزل کے کئی شاہکار ہیں۔ مندرجات پر الگ الگ نقد و تبصرہ ممکن نہیں۔ حجم کی کمی اور دیر سے موصول ہونے کی وجہ سے بہت سے منتخب مضامین نظر و نشر کئے پڑے ہیں اور یہ سب آئندہ شمارے میں شائع ہوں گے۔ اُمید کہ سالنامہ ۱۹۶۶ء کافی پسند کیا جائے گا۔ عدمِ گنجائش کی وجہ سے "ادبی خبریں" اور "نقد و نظر" کے جواب نہیں دئے جا رہے ہیں۔

توسیعِ اشاعت کی بات

گزشتہ ماہ دسمبر کے شمارے میں سب ہی قارئینِ "شاعر" سے توسیعِ اشاعت کے سلسلے میں ایک "جلی قلم" درخواست کی گئی تھی جس کا نتیجہ ان سطور کے قلمبند کرنے تک حد درجہ مایوس کن ہے جن مخلصین نے اس سلسلے میں توجہ دی ہے۔ ادارۂ "شاعر" اُن کا ممنون ہے۔ اُن کے نام ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ "شاعر" کے ہر اہلِ قارئین سے پھر درخواست ہے کہ وہ سب "شاعر" کی توسیعِ اشاعت میں حصہ لے کر "شاعر" کی ترقی و بقا میں مدد پہنچائیں۔

۱۔ جناب بدیع الزماں خاور۔ داپولی (رتناگری)	۳۴	خریدار
۲۔ جناب محی الدین احمد ایم۔ اے۔ رانچی	۹	"
۳۔ جناب نسیم گوالیاری۔ احمد آباد	۷	"
۴۔ جناب یٰسین انصاری۔ آکولہ	۶	"
۵۔ جناب تاج تونکی۔ احمد آباد	۵	"
۶۔ جناب پیرزادہ اقبال ہاشمی ایم۔ اے۔ بھاولپور	۴	"
۷۔ جناب ضیا فتحی فتحپور۔ (یوپی)	۴	"
۸۔ جناب عبدالستار مائل۔ ٹمکور	۲	"
۹۔ جناب ل۔ م۔ شاہد جمشید پور	۱	"
۱۰ جناب پروفیسر فخر دھولیوی ایم اے۔ جلگاؤں	۱	"
۱۱۔ جناب سرشار رسیلانی۔ بمبئی	۱	"
۱۲۔ جناب اویس احمد دوراں۔ کلکتہ	۱	"
۱۳۔ جناب عزی عدل آباد۔ جلگاؤں	۱	"

سب سے زیادہ خریدار بدیع الزماں خاور نے دئے ہیں۔ کل تعداد ۷۴

آہ تلوک چند محروم

۱۷ جنوری کو اُردو زبان کے نہایت مشہور و مقبول بزرگ شاعر تلوک چند محروم کا اسّی سال کی عمر میں دہلی میں انتقال ہوگیا۔ وہ دہلی کے ولنگڈن ہاسپٹل میں صاحبِ فراش تھے۔ اُردو کے بزرگ نظم نگاروں کی وہ آخری کڑی تھے۔ اکبر الہ آبادی، چکبست، سیماب اور ظفر علی خاں کے ساتھ اُن کا ذکر ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنی یادگار سے گیتا مالی، رباعیاتِ محروم، کاروانِ وطن، بہارِ طفلی، نیرنگِ سیاسی اور شعلۂ نوا چھوڑی ہیں۔ انھیں اُن کی تصانیف پر انعام بھی ملا اور اعزاز بھی۔ حب الوطنی اُن کا خاص موضوع تھا۔ انھوں نے بچوں کے لئے بھی بہت زیادہ نظمیں کہی ہیں۔ وہ ایک نہایت سیدھے سادے ملنسار اور خلیق انسان تھے۔ صحافت میں بھی دخیل رہے اور ہر جگہ ایک اچھے معلم کی حیثیت سے مختلف درس گاہوں میں کام کیا۔ اُن کی بڑی یادگار اُن کے صاحبزادے جگن ناتھ آزاد ہیں۔ مخدوم صاحب کی موت اُردو ادب کے لئے صدمۂ عظیم ہے۔ ادارۂ "شاعر" آزاد صاحب اور مرحوم کے دیگر پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

۳
جاری شدہ ۱۹۳۸ء

بانی: علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا سینتیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر

شمارہ ۲
فروری
سنہ ۱۹۶۶ء

بمبئی

ادارہ
اعجاز صدیقی
مہندر ناتھ

سالانہ	زرِ شناسائی	ممالکِ غیر میں	فی پرچہ
۱۲ روپے	چار روپے	۱۶ شلنگ	۱۰ آنے (۶۲ پیسے)

مکتبہ قصرِ الادب
پوسٹ بکس ۲۰۷۰ بمبئی ۸ بی سی

زندگی میں اتنا فرق کیوں؟

آپ ایک طرف اپنی چارپائی پر بے چینی اور مایوسی سے کروٹیں بدل رہے ہیں۔
دوسری طرف آپ کا ساتھی خوشی و خرم آرام سے زندگی بسر کر رہا ہے۔
آپ بھی اسی طرح کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان مرحوم کے قائم کردہ دواخانہ کے

طبی بورڈ کو مفصل حال تحریر کر کے مفت مشورہ طلب کریں۔

نوٹ

آپ کے سبھی خط راز میں رکھے جائیں گے

صحیح اور خالص ادویہ کا واحد ضامن

دہلی ایڈمنسٹریشن کے زیر انتظام ایک قومی ادارہ

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس ۱۰۲۲ بلیماران دہلی ۶

ہر جگہ ایجنٹ درکار ہیں۔ تفصیلات طلب کریں۔

ایجنٹ برائے بمبئی:۔ میسرز دریابادی دواخانہ ۳۹۳۔ پائیدھونی۔ بمبئی ۳

شاعر بمبئی

ترتیب

اُردو زبان کا خلائی سفر — اداریہ — اعجاز صدیقی ۷
راگوں کا جغرافیائی پس منظر (مقالہ) سید حبیب الرحمٰن غزنوی ۸
تمہارے ہاتھ — (نظم) — ادریس احمد آزاد آں ۱۵
غزل — شہاب جعفری ۱۶
غزل — ابو محمد سحر ۱۶
بیتی — (افسانہ) مترجمہ۔ فیض الحسن ۱۷
آواز کی صلیب — نظم — امیر عارفی ۲۰
غزل — مظفر حنفی ۲۱
غزل — مظفر شبلی ۲۱
اہم اعظم — (مقالہ) — زکاء الدین شایاں ۲۲
نوحہ — نظم — تمر اقبال ۲۷
غزل — اختر نظمی ۲۹
غزل — دور آفریدی ۲۹
کھڑکی — (افسانہ) — رضیہ منظور الامین ۳۰
نور کا دھارا (دوہے) — نظم — کنول پرشاد کنول ۳۳
غزل — ممتاز راشد ۳۴
غزل — کیف احمد صدیقی ۳۴
سنگِ لیلیٰ — (طنزیہ مزاح) — جون ایلیا گوہر ۳۶
امن کا ترانہ — نظم — زبیر رضوی ۳۸

☆

پھول بنے انگارے — (افسانہ) — شبنم کیتیوم ۳۹
غزل — سحر رام پوری ۴۳
غزل — راہی قریشی ۴۳
آندھرا پردیش میں اُردو مرثیہ (مقالہ) — رشید الدین ۴۴
پرواز — نظم — اسرار اکبر آبادی ۴۸
کون اپنا اور کون پرایا — (افسانہ) — کلیم راہی ۴۹
الزام (مزاحیہ) — نظم — راہی ۵۳
عبداللہ ناصر کی ظرافت — (مقالہ) — احمد جمال پاشا ۵۴
غزل — رحمت الاختر ۵۷
غزل — علیم اللہ حالی ۵۷
غزل — پرشیندر دکھی ۵۷
غزل — اقبال ظاہر الکھوٹی ۵۷

مکتوبات

اظہر افسر — سلام سندیلوی — پریم سینی
آفاق رشید — مسعود تمنا آبادی — بدیع الزمان خاور
اقبال ہاشمی — امیر عارفی — محمد لطف الرحمٰن
یوسف ناظم — رام لعل — ضیا حسنی
— محمد عبید اللہ شریف —

محفل اپنی — ادارہ ۶۲
نقد و نظر — (تبصرے) — ادارہ ۶۳
رفتار — (ادبی خبریں) — ادارہ ۶۵

☆

ادارہ "شاعر"، فخر و مسرت" کے ساتھ
اردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار

کرشن چندر

پر نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر پیش کر رہا ہے

کرشن چندر کی منفرد شخصیت اور اس کے ہمہ گیر فن پر نہ صرف ہندوستان کی کئی زبانوں کے مشہور قلم کاروں بلکہ دنیا کے کئی شعبے مصنفین اور مفکرین کے مضامین و تاثرات

کرشن نمبر

میں

پیش کیے جائیں گے

کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ،
اُس کی عظمت کی کہانی، اُس کی تصانیف کا جائزہ
اُس کے زندہ اسلوب فکر اور شاہکار افسانوں
ناولوں اور ڈراموں پر
تنقیدی نظر

درجنوں تصاویر

تفصیلات اور تاریخ کا انتظار کیجئے

کرشن چندر نمبر میں
خود

کرشن چندر

کے اپنے قلم سے
ایک تازہ غیر مطبوعہ اور شاہکار نئے

ناول

کے علاوہ

تین کہانیاں
ایک ڈرامہ
ایک مزاحیہ
میرے ادبی نظریات
میرے تنقید نگار
میری ادبی زندگی کا آغاز و انجام

کرشن چندر کے شب و روز
(تصاویر کے ذریعہ)
اور
عکس تحریر
کرشن چندر کے
اہم خطوط

ارباب قلم اپنے مضامین کرشن چندر نمبر جلد از جلد ارسال فرمائیں۔

جرعات :-

اُردو زبان کا خلائی سفر

یادش بخیر، جب ہندوستان میں جدید زبانوں کا غلبہ ہوا تو یہاں کی قدیم و عظیم زبان سنسکرت کو زوال آمادہ ہونا پڑا۔ وہ سنسکرت زبان جس میں نہایت قیمتی، تہذیبی، تاریخی، ادبی اور مذہبی سرمایہ تھا۔ جو دیوتاؤں، رشیوں، منیوں، پنڈتوں اور دانشوروں کی زبان سمجھی جاتی تھی، جس میں متبرک مذہبی کتابیں تھیں، جس کے ایسے عظیم کتب خانے تھے جن میں تحقیق کرنے اور جگہ سے مستفید ہونے کے لئے بیرونی دُنیا کے لوگ آیا کرتے تھے۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ نہ وہ سنسکرت زبان رہی اور نہ اُس کا چلن ہی باقی رہا۔ اِس کے محرکات و عوامل بہت سے ہیں جن میں اقتدار کا بدلنا۔ سیاسی مصالح کا بروئے کار آنا اور عوامی رشتہ سے اِس زبان کا کٹ جانا بھی ہے۔ پھر سیکڑوں سال تک ہندوستان میں سنسکرت زبان کا احیا ممکن نہ ہو سکا۔ لیکن اِس زبان کی عظمت باقی رہی، اِس کی بڑی بڑی کتابیں لائبریریوں میں محفوظ رہیں اور اُن سے کام لے کر ماہرین استفادہ کیا جاتا رہا۔

جب کسی زبان کا اقتدار ختم ہوتا ہے یا ختم کیا جاتا ہے تو اُس کے لئے ایسی ہی صورتیں پیدا کر دی جاتی ہیں کہ اُس کا رشتہ عوام سے اُستوار ہونے کے بجائے خواص تک محدود ہوتا چلا جائے۔ اُس زبان کو تحقیق کی زبان بنا دیا جائے۔ ایسے ادارے قائم کر دئے جائیں جن میں حوالہ جاتی کتابیں یعنی REFERENCE BOOKS تیار ہوں۔ اِن اداروں کو بڑی بڑی رقمیں دی جائیں تاکہ قدردانی کا بھی احساس ہو اور ایسے ذہنوں کو خرید لیا جائے جو عوامی سطح پر کام کر سکتے تھے۔

اُردو زبان بعینہٖ اُسی منزل سے گزر رہی ہے جس سے کبھی سنسکرت زبان گزر رہی تھی۔ راقم الحروف کو چند حالیہ سفروں میں اِس کا صحیح اور بھرپور اندازہ ہوا کہ بعض علاقوں میں اُردو زبان کی صرف پرچھائیاں رہ گئی ہیں۔ اُس کا چلن نہایت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ زبان تو زبان، افسوسناک بات یہ ہے کہ اِس زبان سے وابستہ گنگا جمنی تہذیب جو ہندوستان کے لئے سرمایۂ افتخار سمجھی جاتی تھی، وہ بھی یا تو ختم ہو چکی ہے یا ختم ہوتی جا رہی ہے۔ بہت بڑی بڑی رقمیں اُردو میں نایاب کتابوں کی تحقیق و تدوین کے لئے بعض اداروں کو دی جا رہی ہیں اور اُن اداروں میں نہایت اعلیٰ پیمانے پر کام ہو رہا ہے۔ کام کرنے والے شاندار زندگیاں گزار رہے ہیں اور اُردو کی عوامی تحریکوں سے اِس درجہ کٹ اور ہٹ گئے ہیں کہ اُس کے عمومی چلن کی بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ چونکہ وہ اپنے اِداروں کی مضبوط چہاردیواری کے نیچے محفوظ ہیں، سرکاری سطح پر اُن کی پُرسش ہے، اِس لئے باہر کے طوفانِ باد و باراں کا اُنھیں احساس تک نہیں۔ اُردو کے عوامی کاموں کے لئے ہمارے پاس سرمایہ ہے نہیں، جس سے پودے لگائے جائیں، کوئی فصل جال بچھایا جائے۔ اُردو کے جو چھوٹے چھوٹے ذاتی مدرسے یا شبینہ اسکول کھولے جاتے ہیں اُن تک کا خرچ پورا نہیں ہو سکتا اور بالآخر وہ بند ہو جاتے ہیں۔ مگر دوسری طرف کثیر سرمایہ سے تیار کی ہوئی ضخیم اور قیمتی حوالہ جاتی کتب ہمارے سامنے آجاتی ہیں!!

یہاں اِس ذکر سے مقصود نہ کوئی اعتراض ہے اور نہ کسی طنز کی غرض سے یہ باتیں عرض کی جا رہی ہیں، اِس کے پیچھے جو جذبہ، احساس اور ایک نفسیاتی و منطقی بات ہے، اُسے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ یقیناً اُردو زبان کا یہ پہلو کہ وہ سب کی زبان رہے، سب تک پہنچے، نئی نسلیں اُس سے محروم نہ ہوں، اُس کے عوامی رشتے اُستوار رہیں سب سے زیادہ اہم پہلو ہے۔ انسان کا عروج اِس میں نہیں ہے کہ چند نفوس تک پہنچ جائیں۔ اُس کا عروج زینہ ترقیوں سے وابستہ ہے۔ اُردو کے عروج و زوال کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اِس وقت بڑی ضرورت یہ ہے کہ اُس کی عوامی جڑوں کو اور زیادہ کھوکھلا نہ ہونے دیا جائے۔

"شاعر" کے اِسی شمارے میں صوبۂ آندھرا پردیش میں اُردو کی حالت و کیفیت پر ایک مضمون شائع ہو رہا ہے۔ دوسرے صوبوں میں اُردو زبان کے لئے ایسے جذبات پیدا کرنے کی طرف ہماری توجہ ہونی چاہیے۔

۱۸ فروری ۱۹۶۲ء

شاعر بمبئی

مقالہ:۔ سیّد حبیب الرحمٰن غزنوی

راگوں کا جغرافیائی پس منظر

ابتداءً یہ عرض کردوں کہ جہاں تک فن اور موسیقی کی تکنیک کا تعلق ہے، میں اس سلسلہ میں قطعی معصوم اور مبرّا واقع ہوا ہوں۔ یہ موسیقی کسی وقت بھی میرا موضوع سخن نہیں رہی۔ نہ ہی میں اس کے پیچ و خم اور زیر و بم کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ البتہ اس فن کی تاریخ اور راگوں کے جغرافیائی پس منظر میں جو حقائق معلوم ہو سکے ہیں اُنھیں کو یہاں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

فنونِ لطیفہ میں موسیقی کی اہمیت مسلّم ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف بھی کرنا ہوگا کہ فنونِ لطیفہ کے اس اہم شعبہ پر فنی اور تاریخی نقطۂ نظر سے بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں مذہب، سائنس، زبان، تہذیب، ثقافت، اقتصادیات اور تاریخ و سیاست پر کافی لٹریچر دستیاب ہو جاتا ہے، وہاں موسیقی سے متعلق عام فہم لٹریچر نسبتاً کم ملتا ہے۔ جو کچھ کتابیں ملتی ہیں وہ یا تو سطحی ہوتی ہیں یا پھر اس قدر مادق اور مغلق ہوتی ہیں کہ اہلِ فن ہی انھیں سمجھ لیں تو سمجھیں۔ عام لوگوں کے بس کا روگ تو نہیں ہے کہ وہ انھیں سمجھ پائیں۔ اس بارے میں میری اپنی رائے یہ ہے کہ ہمارے موجودہ اور گذشتہ محققین اور اہلِ قلم حضرات نے اس فن کو یا تو سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دی یا اسے سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔

فن شریف کی بدنامی

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب موسیقی۔ رقص، سرود و نغمہ کو ملک کے شرفاء ایک "مخصوص طبقہ" کا فن سمجھتے تھے۔ انھیں ہرگز یہ گوارا نہیں تھا کہ خود ان کی اپنی اولاد ناچنا، گانا اور بجانا سیکھے۔ ان کے نزدیک موسیقی صرف تفریحِ طبع کا ایک ذریعہ تھی اس سے زیادہ انھوں نے اس فن کو چنداں اہمیت نہیں دی۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے ہمارے بزرگوں کی یہ رائے چنداں غلط بھی نہیں کہی جا سکتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ پچھلے ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں ہندوستان کا یہ مایۂ ناز فن طوائفوں، قوّالوں، پیشہ ور گویّوں اور میراثیوں ہی کا فن اور ذریعۂ معاش بن کر رہ گیا تھا۔ ملک میں کچھ گھرانے اور سلسلے ایسے ضرور تھے جو اس فن کو بہ حیثیت فن اپنائے ہوئے تھے اور نہایت خودداری اور وضعداری کے ساتھ باوقار حالات کا مقابلہ کر رہے تھے، البتہ اس فن سے روزی کمانے والے فوّالوں، ڈفلیوں، میراثیوں اور طوائفوں کی اکثریت نے شرفاء اور اہلِ قلم کو اس فن سے عملاً دور رکھا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جن بے شمار علمی شعبوں میں تحقیق و تفحص کی جو جاندار تحریکیں پچھلے ڈیڑھ سو سال کے عبوری دور میں چلتی رہیں اور جن کے نتیجہ کے طور پر ہر فن نے اچھے اچھے محقق اور اہلِ قلم پیدا کر لئے وہاں موسیقی کے پیچ و خم کو سمجھانے والا، اس کی تکنیک اور تاریخ سے بحث کرنے والا ایک بھی مسلّم اور مایۂ ناز اہلِ قلم پیدا ہو سکا بلکہ موسیقی کا فن ایک خفیہ اور انڈر گراؤنڈ تحریک کی طرح صرف سینہ بسینہ ہی منتقل ہوتا رہا۔

تہذیب کی قدریں جب بدلتی ہیں

حالات کے ساتھ ساتھ تہذیب کی قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ آپ نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہوگا جب ہمارے ملک کی تعلیم یافتہ اور اونچے گھرانے کی خواتین ساڑی کے ساتھ ایسے فراک یا اچکن کوٹ پہنا کرتی تھیں جن سے اُن کے پورے ہاتھ۔ شانوں سے کلائیوں تک اور کمر ایڑیٹ

ڈھکے رہتے تھے کیونکہ اُس زمانہ میں ان اعضاء اور حصۂ جسم کی نمائش معیوب سمجھی جاتی تھی مگر اُس کے بعد ہی مسلسل ایک انقلاب رونما ہوا کہ آستینوں کو ناپا جوتی گئیں ۔۔۔ اور پھر تیسرے دور میں تو ساڑھی کی عریانی فیشن میں شمار ہونے لگی۔ سینہ کے علاوہ پیٹ اور کمر کا کچھ حصہ بھی کھلا رہنے لگا۔ مگر آگے چلکر پھر اس لباس میں ایک تغیر رونما ہوا۔ آستینیں جو بالکل کالعدم ہو چکی تھیں از سر نو برآمد ہوئیں اور کہنیوں تک لمبی ہو گئیں اسی طرح پیٹ اور کمر بھی ڈھک گئے۔ لیکن آج کا تازہ بتازہ منظر پھر وہی فیشن پیش کر رہا ہے جس میں پیٹ اور کمر عریاں ہونے لگی ہیں گجرات میں تو آدیواسی گھرانے کی خواتین بطور فیشن اس لباس کو زیادہ پسند کرنے لگی ہیں جو گجراتی زبان میں "ڈاڑی" (غالباً یہ دراوڑی) کا لباس ہے۔ یہ لباس گھگھری اور ساڑی کے علاوہ صرف ایک مختصر چولی پر مشتمل ہوتا ہے اور چولی بھی ایسی جس کا دامن سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے۔ اور پھر آج کل کا نیڈی لباس ۔۔۔؟

بہر حال تہذیب کی مختلف ادوار میں مختلف مناظر پیش کرتی ہیں۔ اور تقریباً یہی حالات تھے جن سے موسیقی کو بھی گذرنا پڑا ہے دور میں جو شرفا گانے بجانے اور ناچ کو معیوب سمجھکر تنگ رہے تھے آج وہی اپنی اولاد کے لئے ماہر فن ٹیوٹر رکھ کر اپنے گھروں کی جاروبداری ہی میں رقص و سرود و نغمہ کی تعلیم دلوا رہے ہیں اور جگہ جگہ میوزک کالج، سنگیت اسکول اور موسیقی کلب کھل گئے ہیں وہ اس پر مستزاد ہیں۔

موسیقی کا مذہبی درجہ

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تاریخ کے کسی دور میں انھوں نے موسیقی کو مذہبی درجہ نہیں دیا۔ البتہ صوفیائے کرام کے مختلف سلسلوں میں ہمیشہ چشتیہ سلسلہ کے بزرگ اس فن کی سرپرستی کرتے آئے ہیں۔ مگر وہ بھی مخصوص شرائط اور لوازم کے ساتھ۔ پانچویں صدی ہجری کے مشہور مجدد اور فلسفی امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور آفاق کتاب احیاء العلوم میں موسیقی کی ایک حد تک حمایت کی ہے۔ نیز حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ جیسے مشہور صوفی اور خدا پرست انسان کا موسیقی سے گہرا تعلق اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ یہ فن شریف ہر حال میں خلاف مذہب قرار نہیں پاتا۔ البتہ ہندوؤں میں اس فن کو مذہبی درجہ دیا گیا ہے۔ ہندو محققین کا قول ہے کہ :۔ قدیم ہندو لٹریچر موسیقی کا منبع رگ وید کو قرار دیتا ہے اور پھر سام وید کے ایک منتر کا نام گاندھروا وید بھی ہے۔ موسیقی کے گاندھروا راگ اور راس منتر وید کے نام میں جو موسوری اور معنوی مناسبت پائی جاتی ہے وہ اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ وید میں موسیقی کا وجود پایا جاتا ہے۔

گجرات کے مشہور مؤرخ اور محقق پروفیسر رتن منی راؤ جوڑے دم ۱۹۵۶ء نے اپنے ایک مقالہ میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔ پرانوں کے زمانہ میں شیو جی (شنکر) کو سنگیت کا آدیشٹ دیوتا مانا گیا ہے۔ پرانوں کی روایات یہ بتاتی ہیں کہ رقص، تانڈو نرتیہ کی ایجاد کا سہرا شیو جی کے سر ہے۔"

گیتا میں سنگیت کا ذکر

شری مد بھگوت گیتا کے ایک اشلوک میں सतत कार्य लोमा کے الفاظ ملتے ہیں، جن کا مفہوم ہے "ہمیشہ میرا کیرتن کرنے والا" اس مفہوم کا مادہ سنسکرت کے لفظ کیرتن سے پیدا ہونے والی موسیقی ہی معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر سنسکرت کے لفظ کیرتن کے دوسرے معنی لے لیے جائیں تو وہ سانسر بین کے ہوتے ہیں، گویا اس اعتبار سے مفہوم یوں بنے گا :۔ ساز کے ساتھ میرا کیرتن کرنے والا۔ بہر حال گیتا میں آدیشور کے ذریعہ سنگیت کی اہمیت واضح کی گئی ہے اور عام طور پر ہمارے ملک میں کیرتن کے لئے مختلف ساز اور راگ استعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح ہندو مذہب اور تاریخ کے پس منظر میں موسیقی کا ایک خصوصی مقام متعین کیا جا سکتا ہے اور پھر ہوتا ہوما اور اگنیشٹوما کے تہواروں میں جنوبی ہند کے میتھارا اور خوبصورت مندروں میں نیز دیوداسی کے نرتیہ اور مقدس ہندو عمارتوں کے کھنڈرات بھی اس کا بین ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ ہندو مذہب کی عبادات میں موسیقی جزو لاینفک کی طرح ہمیشہ سے پائی گئی ہے۔

سنگیت کی قدیم تصانیف

پانچویں صدی عیسوی سے قبل کی کوئی ایسی تصنیف ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکی ہے جو موسیقی پر فنی اعتبار سے روشنی ڈالتی ہو۔ البتہ پانچویں صدی کے وسط میں بھرت پال کے بعد بھرمی پال نامی ایک موسیقی راجہ کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ اس راجہ نے سنگیت سدھاکر نامی ایک فنی کتاب

تصنیف کی تھی۔ آج اس کتاب کا اصل متن تو کہیں نظر نہیں آتا مگر اس کے نامکمل ترجمہ کا ایک نسخہ تنجور میں دستیاب ہوا ہے۔ تاہم اس نقطہ سے ہم یہ قیاس ضرور کر سکتے ہیں کہ بارھویں صدی سے قبل ہی موسیقی پر کچھ کتابیں ضرور لکھی گئی ہوں گی۔ اس لئے قیاس و تجسس کی ضرورت اس تصنیف کے بعد تیرھویں صدی میں کشمیر کے سارنگ دیو کا حال ملتا ہے جس نے دیوگری کے جادھو راجہ کی زیر نگرانی سنگیت رتناکر ایک بہترین کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب فنی اعتبار سے کافی معتبر سمجھی گئی ہے۔

سنگیت کے معنی

سنگیت رتناکر میں سنگیت کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے: गीतं वाद्यं तथा नृत्तं त्रयं संगीत मुच्यते। مفہوم کی مزید وضاحت کرتے ہوئے سارنگ دیو نے لکھا ہے: गीतस्य महात्म्यं के प्रवदन्ति मुनीश्वराः। गीतं काम मोक्ष प्राप्ति एकस्य साधनम्।

ان عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ گیت، سرود اور رقص یہ سب کا مجموعہ سنگیت ہے۔ گیت سے مراد صرف گانا۔ اور رقص کا مقصد دل حاصل کرنا اور خوش کرنا ہے۔ اس عبارت کی مذہبی جزئیات سے قطع نظر ہم اگر سنگیت کے مفہوم ہی کو لیں تو پتہ چلتا ہے کہ عہد قدیم اور عہد متوسط میں رقص، نغمہ اور سرود۔ تینوں سنگیت کے مفہوم میں آتے تھے۔ موسیقی اصطلاح میں اسے یوں سمجھئے کہ موسیقی ایک جنس ہے اور رقص، نغمہ اور سرود اس کی انواع ہیں۔

سنگیت سے گجرات کی قدیم نسبت

سنگیت رتناکر میں عہد قدیم کی موسیقی کی تاریخ کے ایک طویل اشلوک میں بیان کی گئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے:-

برہما نے تانڈو (مشکل ترین رقص) بھرت منی کو سکھایا۔ بھرت منی کے گاندھروں اور اپسراؤں (پریوں) کی معیت میں شیو جی کو یہ کھیل کر دکھایا جس کے نتیجہ کے طور پر شیو جی نے تانڈو کے ایجاد کردہ تانڈو نرتی (شیو طبال کا رقص) بھرت منی کو دکھایا۔ انہاں نے پارتی کو یہ سیکھ کر نے کے لئے کہا۔ پارتی نے ناسو کی ایک ادشا کو یہ ناچ سکھایا اور اوشا سے دندھا کی گوپیوں نے یہ ناچ سیکھا اور پھر ان گوپیوں سے سوراشٹر (کاٹھیاواڑ) کی عورتیں لاسیہ سیکھیں اور اس طرح یہ ناچ لوک کے مختلف حصوں میں رائج ہوا۔:

اس تشریح سے ایک بات تو یہ واضح ہوتی ہے کہ تانڈو نرتی جو اظہار قہر و جلال کا ایک خوفناک ناچ ہے۔ مردوں کے حصہ میں آیا اور لاسیہ نسبتاً نرم و نازک ہے اس لئے عورتوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ مشہور ہندستانی رقاص اودے شنکر کے ہاں یہ دونوں قسم کے رقص ملتے ہیں۔ اس سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی کہ اوشا سورہ (مشہور دیو جالندھر کی بیٹی اور بانو دھا کی بیوی اوشا نے دوارکا میں دوارکا ناتھ سوراشٹر کے ذریعہ ہی کا مشہور تیرتھ استھان ہے اور شری کرشن کی جنم بھومی بھی) سوراشٹر کی عورتوں کو لاسیہ نرتی کی تعلیم دی۔ اس طرح گجرات سے سنگیت کی قدیم نسبت کا سب سے پہلا ثبوت اگر دستیاب ہو سکتا ہے تو وہ سنگیت رتناکر کا مندرجہ بالا اشلوک ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے وقت

پروفیسر رتن جی راؤ جوشی نے بھی موسیقی سے متعلق ایک قدیم کتاب تلاش کی تھی جو بقول ان کے سنگیت رتناکر سے ڈیڑھ سو سال بعد لکھی گئی تھی۔ دراصل یہ کتاب سنگیت رتناکر کی شرح یا حاشیہ کا درجہ رکھتی ہے۔ جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی اس وقت مغل ہند پر کافی حد تک حکمرانوں کا چکا تھا اور چودھویں صدی میں علاؤالدین خلجی نے جنوب کی طرف پیشقدمی کر کے گجرات پر اپنا تسلط جماتے ہوئے دیوگری تک کا علاقہ زیر نگیں کر لیا تھا۔ نے بن راگ اور راگنیوں کا ذکر اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ چودھویں صدی کے جنگجو ماحول میں ان راگ راگنیوں کی قدیم روایات کو محفوظ کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ چنانچہ چودھویں اور پندرھویں صدی میں ایسے لوگ صرف انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے جو قدیم راگوں اور راگنیوں کو ان اصولوں اور قواعد کے مطابق گا سکتے ہوں۔ البتہ جنوبی ہند میں حالات مختلف تھے۔ وہاں سنگیت میں قدیم روایات اس وقت بھی محفوظ تھیں اس حالات اگر اشارہ نہ بھی کرتے تو صرف شمالی ہند پر اشارہ نہ بھی کرتے۔

اس تاریخی بحث سے یہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا کہ مسلمانوں کی آمد سے ہندستانی سنگیت کی کمر توڑ دی تھی! بلکہ دکھانا یہ مقصود ہے کہ کس طرح وہ

تاریخ کے مختلف ادوار میں علوم و فنون پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن یہ ایک بین حقیقت ہے کہ شمالی ہند کے سماجی انقلابات اور صبر آزما دور میں امیر خسرو کا وجود پایا جاتا ہے جن کی ذات اور نظریات ہندوستانی موسیقی کی ترقی اور پیشرفت کے سلسلہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور صرف امیر خسرو ہی نہیں بلکہ آپ کے گروہ تک کے متعدد سادہ سا یگانہ سنگیت کاروں اور ماہرین موسیقی کا ایک ایسا حلقہ بن گیا تھا جو تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ ان لوگوں نے ہندوستانی موسیقی کے عروج اور ارتقاء میں کافی عہد و جہد کی ہے اور اس کے حفظ و بقاء کے بھی کافی انتظامات کئے تھے۔

موسیقی کے اثرات

امام غزالی نے احیاء العلوم میں سماع کے باب میں موسیقی کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔ "جو لوگ موسیقی کو لہو و لعب سے تعبیر کرتے ہیں ہمیں ان سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اتنا تو ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ لہو و لعب (موسیقی) انسان کے تفکرات، ہیجانی کیفیات اور ردہ اذیتوں کو مٹانے میں کافی حد تک موثر ہے۔"

اگر اس جگہ ہم لہو و لعب کا مترجمہ کھیل کود کر دیں اور رقص کو اسی کھیل کود کے ضمن میں لے آئیں تو امام غزالی کے اس نفسیاتی نکتہ کی تائید حسب ذیل اشلوک سے ہوتی ہے۔ दुःखार्तिश्रमक्लेश विनोदनिबन्धनम् یعنی رقص ایک ایسی شے ہے جو دکھ، صدمات اور تھکاوٹ اذیتوں کو مٹانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

راگ اور راگنیاں

کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہؒ احمد آباد میں صوت الناقوس، کی ایک فارسی رسالہ حال ہی میں نظر سے گذرا ہے۔ اس رسالہ کے مصنف نے دن رات کے مختلف اوقات کی مناسبت سے کل چھ بنیادی راگ تسلیم کئے ہیں۔ (۱) بھیروی (۲) ہنڈول (۳) مالکونس (۴) دیپک (۵) شری راگ (۶) میگھ راگ۔ اور پھر ان چھ بنیادی راگوں کی چھ چھ رعیں (ضمنی راگنیاں) پیش کی ہیں جن میں بھیروی۔ للت۔ بلاول۔ کانڑا۔ ملتانی۔ بھاسا کا سورہ پوربی۔ دھناسری۔ بھوپالی۔ گوڑی۔ دیپک۔ براری۔ توڑی۔ اساوری۔ ملہار۔ سورٹھ۔ ترپتی۔ سارنگ۔ مدھ۔ سرپردہ گوجری وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ اور پھر ان ضمنی راگنیوں سے بھی نت نئی راگنیاں مختلف فنکاروں نے ترتیب دی ہیں جو آج بھی مروج اور متداول ہیں۔

یہاں ہم مختلف راگ و راگنیوں کے ناموں کی جغرافیائی مناسبت سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ خصوصاً بھیروی، بلاول، گوجری، گندھار۔ اور سورٹھ کے متعلق بہت کچھ کہنا ہے۔ البتہ موسیقی کے دو مشہور اسکول ہندوستان مت اور کرناٹک مت میں ضمنی راگنیوں کے بارے میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے پہلے اسے ذہن نشین کر لیجئے۔ ہندوستان مت کے بموجب بلاول نامی راگنی ہنڈول راگ کے ماتحت آتی ہے۔ اور کرناٹک مت کے بموجب دیوگندھار۔ شری راگ کے ماتحت آتا ہے۔

راگوں کا جغرافیائی پس منظر

پروفیسر جوشی کا خیال ہے کہ۔ بھیروی راگ نے گجرات کی سرزمین پر ہی جنم لیا ہے۔ اگرچہ اس دعوے کے ثبوت میں ہوست پارے پاس کچھ دلائل نہیں ہیں۔ تاہم تاریخ کے اوراق گجرات کے عہد قدیم کے حالات بیان کرتے ہیں ان کے پیش نظر ذکر کردہ بالا دعویٰ قرین قیاس بن جاتا ہے۔ اس خیال کی تائید تاریخ کے ان واقعات سے ہوتی ہے جو بھیروپوجا کے مناظر چارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب گجرات، سوراشٹر اور مغربی مالوہ میں بھیروپوجا کا عام رواج تھا۔ یہ اس دور کا ذکر ہے جب یہاں پاشوپت بھیروائے فرقہ کو پورا عروج حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ اگرچہ یہ فرقہ پیدا ہو چکا تھا۔

پرمار اس پاٹن کے مشہور عالم سومناتھ مندر کی عہد قدیم میں کچھ اور ہی نوعیت تھی۔ اس تیرتھ کو مہابھارت میں اگنی تیرتھ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اور پرانوں کی زبان میں بھیرو کا نام کالا گنی رودر (काला अग्नि रुद्र) معلوم ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے آگے چلکر اگنی اور شیو کے اس رشتہ کے ہمیشہ قائم رہنے کے لئے بھیرو رنگ اور بھیرو کی پوجا کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا گیا تھا۔ پروفیسر جوشی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ:۔ پرانوں تو بالکل واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ پربھاس پاٹن میں سومناتھ سے قبل بھیرو ہی کالاگنی رودر کے نام سے پوجا ہوتی تھی۔"

ہندو مذہب کے بموجب شیو جی کے مختلف روپ ہوتے ہیں۔ جن میں ایک خوفناک روپ بھیرو کا بھی ہوتا ہے جبکہ اسی بھیرو روپ کی پوجا آگے چل کر سومناتھ کی پوجا میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس تجزیہ سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ گجرات کے سولنکی راجاؤں کے زمانے سے قبل جب یہاں بھیروپوجا

روں پر بھی بھیرو راگ گایا جاتا ہوگا اور یا جاتا ہوگا وہی راگ بھیرو کی مناسبت سے بھیرو راگ مشہور ہوا ہوگا۔
ہندوستان کے مشہور سنگیت آچاریہ بھات کھنڈے کا قول ہے کہ ٹنک میں جو راگ بھیروی کے نام سے مشہور ہے اسی راگ کو جنوبی ہند کے ماہر موسیقی تو ڑی کہتے ہیں۔ دراصل یہ ایک دلچسپ بحث ہے مگر طے شدہ مسئلہ نہیں ہے ہمارے نزدیک بھیروی یا بھیرو راگ کی بنیاد دین پر بھیرو یا بھیروی راگ ہم نے گجراتی راگ کی حیثیت دی ہے۔ اگر اس سلسلہ میں مزید تحقیقات کی جائے تو بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔

جغرافیائی راگ

ہندوستانی موسیقی میں راگ۔ راگنیوں کے جو جغرافیائی نام پائے جاتے ہیں ان میں سے چند ناموں کی وجہ تسمیہ حسب ذیل ہے۔

سندھورا یا سندھوی:۔ اس راگنی کو سندھورا اور سندھوڑا بھی کہتے ہیں۔ سندھو دراصل اس سرزمین کا قدیمی نام ہے جو دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ چنانچہ پنجاب کو عہد قدیم میں سندھوی کہتے تھے۔ اسی علاقہ میں شمالی سندھ کا کافی حصہ شامل ہے۔ سندھورا راگ اسی سرزمین کی پیداوار ہے اور اس کا نام بھی اسی علاقہ کی مناسبت سے سندھورا راگ پڑ گیا ہے۔

ملتانی:۔ یہ نام پنجاب کے جنوبی حصہ اور سندھ کے شمالی حصہ کی پیداوار ہے۔ البتہ اس نام کی مناسبت ملتان شہر سے ہے یا عہد قدیم کے صوبہ ملتان سے، یہ بات ہنوز تحقیق نہیں ہو سکی۔ پنڈت بھات کھنڈے نے صوبہ ملتان کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔

گندھار:۔ قرینہ تو یہ کہتا ہے کہ اس راگ کی ایجاد کا سہرا افغانستان کے مشہور تاریخی شہر قندھار کے سر باندھا جائے۔ جس عہد میں ہندوستان کو آریہ ورت کہا جاتا تھا اس زمانہ میں قندھار ہندوستان ہی کا ایک صوبہ تھا۔ بلکہ مغلوں کے عہد حکومت تک قندھار ہندوستان سے منسلک رہا۔ مسلمانوں کے تسلط سے قبل ہندوستان اور افغانستان میں تقریباً ایک ہی قسم کی تہذیب پائی جاتی تھی۔ بدھ اور بامیان کے آثار عتیق اس حقیقت کا ثبوت آج بھی پیش کر رہے ہیں۔ بہرحال گندھار راگ کی نسبت اسی قندھار سے ہے۔

جونپوری:۔ اس راگ کو مسلمانوں کے زمانہ میں عروج حاصل ہوا ہے۔ بعض لوگ جونپوری ہی کو تو ڑی قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ تو ڑی بنات خود کہاں کی ایجاد ہے؟ اس کے متعلق کوئی صحیح رائے اب تک نہیں قائم کی جا سکی۔ بہت ممکن ہے یہ راگ غیر ملکی ہو۔ موسیقی کی بعض کتابوں میں ترشک تو ڑی کا نام پایا جاتا ہے۔ تیرہویں صدی میں ترک مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی یہ راگ بھی ہندوستان آیا ہو تو چنداں تعجب کی بات نہیں ہے۔

ٹنک:۔ ٹنک راگ۔ کان مشہور ٹھاکر راجپوتوں کی ایجاد معلوم ہوتا ہے۔ سارنگ دیو نے سنگیت رتناکر میں اسے ٹنک لکھا ہے بہار۔ بنگال اور گوڈ یہ تینوں صوبجاتی نام ہیں۔ بنگال کا قدیمی نام گاڈھی ہے البتہ ان دونوں راگوں میں اختلاف پایا جاتا ہے تو تعجب کی بات نہیں ہے، اس لئے کہ بعض راگنیاں ایسی بھی ہیں جنھیں دوسرے ملتے جلتے راگوں کی آمیزش نے ایک نئی صورت دے دی ہے۔ بہرحال یہاں ہم اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے، نہ ہی ہمیں اس میں خیداں مہارت حاصل ہے۔

مالکونس:۔ یہ راگ مالوہ کی پیداوار ہے۔ چونکہ مالوہ عہد قدیم میں گجرات ہی سے منسلک تھا لہذا ثقافتی اعتبار سے اس راگ کو گجرات سے نسبت دینا بے محل نہیں ہوگا۔ تاہم زیادہ مناسب تو یہ ہے کہ اسے ایک مستقل اور علاحدہ راگ ہی تسلیم کیا جائے۔

کونسلی:۔ یہ مشہور کانڑا راگ ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں۔

اساوری:۔ اس راگ کا صوبجاتی پس منظر معلوم نہیں ہو سکا تاہم سنگیت رتناکر نے اس کا ذکر کیا ہے۔ لہذا یہ تو طے شدہ بات ہے کہ اساوری تیرہویں صدی سے قبل کا راگ ہے۔

ترنگ:۔ یہ بھی ایک صوبجاتی راگ ہے، سنگیت رتناکر نے اسے آندھرا پردیش کا راگ قرار دیا ہے۔

مندرجہ بالا چند راگوں کے ناموں سے ان کی جغرافیائی نسبت معلوم ہو جاتی ہے اسی طرح راگوں کے اور نام بھی اسی قسم کی جغرافیائی مناسبت رکھتے ہوں تو اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کسی کو کیا عذر ہو سکتا ہے۔

گجرات کے راگ:۔ جغرافیائی ناموں کی اس مختصر سی تشریح کے بعد اب ہم ان راگوں اور راگنیوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں

جو گجرات کے اس طویل و عریض علاقہ سے نسبت رکھتے ہیں۔ جو تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے یکسانیت رکھتا ہے۔ بھیرو یا بھیروی کا اجمالی تذکرہ اور گجرات سے ان کی قدیمی نسبت تو ظاہر ہو چکی ہے۔ اسی طرح مالشی یا مالشی راگ کو بھی کافی دنگار گجرات ہی کی پیداوار بتاتے ہیں۔ سنگیت رتناکر نے بھی مالوی مالشی کا ذکر کیا ہے تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس راگ کو گجرات کی پیداوار ثابت کرنے کے لئے سوائے چند مبہم باتوں کے کوئی واضح دلیل اب تک نہیں مل سکی۔

اب سوال رہ جاتا ہے سورٹھ دیش کی راگنیوں کا۔ کیدار گوجری اور ایمری وغیرہ کا تو یہ تمام راگ، راگنیاں گجرات کی پیداوار ہیں۔ یہ بات کسی قدر وضاحت طلب ہے جہاں تک سورٹھ کا تعلق ہے اسے ہم سوراشٹر کے مشہور علاقہ سورٹھ (سابق ریاست جونا گڑھ) کا راگ کہہ سکتے ہیں۔ سنگیت رتناکر نے دیش راگ کو "سوراشٹر دیش کیتبھا" بھی کہا ہے لیکن اس لفظ کا کوئی مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم دیس یا دیسی ایک قدیم نام ضرور ہے۔ کچھ لوگ کیدار کو گجراتی راگ بتاتے ہیں لیکن اس کے پس پشت کوئی جغرافیائی توجیہہ ہمیں نہیں مل سکی۔ پنڈت بھات کھنڈے نے سر جھا کر کے چند اشلوک پیش کئے ہیں جن میں اساورکی راگ کو آشاوری میلجوا کہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ میلجوا۔ مالوہ کا قدیمی تلفظ ہے۔

گوجری راگ کا گجرات سے تعلق اظہر من الشمس ہے۔ البتہ گوجری راگ سے مطلب گجرات علاقے کا راگ ہے یا گوجروں کا یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ گوجری کے ساتھ ہی ایمری اور سوراشٹری کے نام بھی ملتے ہیں۔ ایمر علاقہ موجودہ ریاست گجرات ہی میں موجود ہے اگرچہ اس کی جغرافیائی حیثیت آج باقی نہیں ہے۔ قدیم فنکاروں نے گوجری کے ساتھ اگر گوجری کا نام بھی لیا ہے جو کافی معنی خیز ہے۔

گوجری کا تذکرہ ایک اشلوک میں ملتا ہے جس میں ہاتھی دانت کی موٹی موٹی چوڑیاں پہننے اور ساڑی باندھنے دانت کو کچا نہیں لگانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مسکت کچھا، لفظ سے گجرات اور مہاراشٹر کی عورتوں میں تفریق ہو جاتی ہے کیونکہ مرہٹہ خواتین ساڑی کا کچھا لگاتی ہیں اور گجرات میں کچھا لگانے کا رواج نہیں ہے۔ ہاتھی دانت کی موٹی موٹی چوڑیاں پہننے کا گجرات کی رباری اور بھروار قوموں میں آج بھی رواج موجود ہے البتہ شہروں میں ہاتھی دانت کی موٹی موٹی وزنی چوڑیوں کی جگہ ہلکی اور دیدہ زیب کچھ سے سرخ رنگ کی ہاتھی دانت کی چوڑیاں مروج ہیں اور یہ دونوں چیزیں ـــ بغیر کچھا لگی ساڑی اور ہاتھی دانت کی چوڑیاں ـــ گجراتنوں کے لئے مخصوص ہے۔

بلاول راگ

پروفیسر جوشی نے بلاول لفظ کا تجزیہ پہلے ایک مقالہ میں نہایت عمدگی سے کیا ہے چونکہ سارنگ دیو نے سنگیت رتناکر میں بلاول کا ذکر کیا ہے اس لئے یہ راگ عہد قدیم کی یادگار تو قرار پاتا ہے لیکن اس کی وجہ تسمیہ بحث طلب ہے۔ سنگیت رتناکر نے بلاول کو دیلاول لکھا ہے جب کہ دوسری کئی کتابوں میں دیلاول بھی آیا ہے یہاں تک اس معمولی اختلاف کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیز سنسکرت اور پراکرت زبانوں کے مختلف تلفظ کا نتیجہ ہے۔ دیلاول دراصل سنسکرت نام "ویلا کال" ہے جبکہ پراکرت میں اس تلفظ کا دیلا وَل یا دیلاول ہوا ہے۔ عہد قدیم میں پرہاس پاٹن کے گرد و نواح کے ساحلی علاقہ کو دیلا کال ہی کہا جاتا تھا جیسا کہ قدیم سنسکرت کتبوں سے واضح ہوتا ہے۔ اسی ساحلی رقبہ پر آج ویراول نامی مشہور شہر اور بندرگاہ واقع ہے۔ ویراول سے پاٹن صرف دو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دونوں شہر ایک دوسرے سے ملحق ہیں اسی ویراول کا ہندی یا اردو تلفظ پلاول کی ہے۔ جیسے ویرم گام۔ ویرمگام اور ولنو وغیرہ کو اردو یا ہندی بولنے والے ہرم گام۔ بڑھوان اور ولنو کہتے ہیں اور خود ویراول۔ پاٹن، ماٹرول اور جونا گڑھ کے مسلمان آج بھی اسے بلاول ہی کہتے ہیں۔ اور چونکہ بلاول عہد قدیم میں تہذیبی، تمدنی، علمی اور مذہبی لحاظ سے ایک مخصوص مقام رکھتا تھا اور سوم پورانا ہی ماہر فن تعمیر کی وجہ سے اس کی بڑی شہرت تھی اس لئے آرٹ اور فنون لطیفہ نے اس دور میں یہاں جو ترقی کی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ بہرحال بلاول راگ اسی عہد قدیم کی یادگار ہے۔

بھات کھنڈے نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "شمالی ہند کی موجودہ موسیقی کی اصل بنیاد یہی بلاول راگ ہے"۔ چنانچہ بلاول کی تاریخی حیثیت صاف بتا رہی ہے کہ اس راگ نے سرزمین گجرات پر جنم لیا اور یہیں پروان چڑھ کر اس نے آگے قدم بڑھایا۔

کھماچ راگ

بلاول کی طرح مشہور اور متداول راگوں میں کھماچ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اس راگ کا قدیمی نام کھمباوتی ہے اور یہ گجرات کے مشہور زمانہ

تاریخی شہر بندرگاہ کھمبایت (Cambay) سے تعلق رکھتا ہے مستعار رہتا کریں اس لئے ذکر موجود ہے۔ سار ڈنگ دیو نے اسے راگ قرار دیا ہے۔ میں مت کی بعض کتابوں میں اسے کھمباتی راگ کہا گیا ہے جہاں کھنڈے نے اس نام پر کافی بحث کی ہے۔ ا کہ کھمباتی راگ کثرت استعمال اور تلفظ کے تنوع کے باعث کھمباچی بنا اور پھر جب اس شکل میں بھی تغیر رونما ہوا تو کھماچ بن گیا کھماوتی اور کھماچ کسی قدر فرق کی وجہ سے دو علیحدہ راگ شمار ہوتے ہیں لیکن اصل دونوں کی ایک ہی ہے اور یہ راگ گجرات شہر کھمبایت ہی میں ایجاد ہوا ہے۔

سوویر، ترونا اور لالی

یہ تینوں راگ مستقل حیثیت میں آج موجود نہیں ہیں اور کن کن راگوں میں یہ مدغم ہو گئے ہیں ان کا پتہ لگانا کم از کم ہم لوگوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔ البتہ یہ تینوں قدیم راگ گجرات ہی کے دامن سے وابستہ پائے گئے ہیں۔ سوویر مغربی ہند کے نام ہے جو کچھ اور جنوبی سندھ کے درمیان واقع تھا اور ثقافتی اعتبار سے گجرات ہی کا ایک حصہ تھا۔ سنہ عیسوی کے اوائل میں جکتا ہیں ان میں بعض جگہ "سندھ سوویر" الیا نام ملتا ہے۔

ترونا بھی ایک جغرافیائی راگ ہی ہے۔ عہد متوسط میں ترون ریاست جودھ پور کے مغربی حصہ کو کہا جاتا تھا۔ یہ نام راج ر کے مطابق دسویں صدی عیسوی سے قبل کا ہے اور تہذیبی اعتبار سے قدیمی گجرات ہی سے اس کا تعلق ہے۔

لالی نامی راگ تو گجرات کے لاٹ علاقہ کی پیداوار ہے یہ بات تو اس کے نام ہی سے ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ تمام تخمینہ حقائق کی روشنی میں کسی قدر مبہم معلوم ہوتی ہیں۔ اگر کوئی صاحب ان مسائل کی تحقیق کریں تو نفس مسئلہ پر نہایت دلچسپ ڈالی جا سکتی ہے۔ موسیقی جامد فن نہیں ہے اور نہ ہی اس پر ہمیں دسترس حاصل ہے چنانچہ اس کی فنی بازیگریوں سے ہمیں کی ہے ہماری دلچسپی صرف راگ راگنیوں کے نسلی تغیرناموں سے ہے اور اس مضمون میں ہم نے ان ناموں کے جغرافیائی پس منظر ہے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان میں بھی زیادہ تر قیاس ہی کا سہارا لیا گیا ہے، کوئی معقول اور ٹھوس دلیل ہمارے پاس ہ ہمارا قیاس کسی حد تک درست ہی کہا جائے گا جب تک کہ تاریخی شواہد اسے غلط ثابت نہ کر سکے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ قیاس لو ہرگز نہیں ہے ــــ بہرحال محققین کے لئے یہ ایک عمدہ موضوع ہے، خصوصاً پی ایچ ڈی کے لئے اس پر ایک بہترین تھیسس لکھا جا سکتا ہے۔

آہ ــــ والدۂ ماجدہ

۱۲ فروری ۱۹۶۶ء کو دوشنبہ کے دن میری والدۂ ماجدہ، بیگم علامہ سیماب اکبرآبادیؒ سات دن کی مسلسل بے ہوشی کے بعد، بیاسی سال کی عمر میں بمقام کراچی (پاکستان) انتقال

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

سوگوار

اعجاز صدیقی

ادریس احمد ادریس

تمہارے ہاتھ

(اعلانِ تاشقند کی روشنی میں)

تمہاری سعیِ دانش سے نئی اُمید جاگی ہے
دلِ مغموم میں جو آج سے پہلے نہ جاگی تھی
ہر اک نبضِ یقیں اس تار میں ڈوبی ہوئی سی تھی

مگر تم ہو تو کیا غم ہے یہ بادِ طوفانِ بربادی
گلستاں بچ ہی جائے گا، تمنا بر بھی آئے گی
غزالِ شام خود اپنے لہو میں ڈوب جائے گی

نہ جانے کیا کہا تم نے کہ دور و روٹھے ہوئے راہی
بھلا کر تلخیِ ماضی گلے ملتے نظر آئے
کدورت کے دھندلکے میں ستارے سے ابھر آئے

مئے اخلاص کا ساغر لئے جب تم قریب ہو گئے
فضائے تاشقند اُس وقت رنگیں ہو گئی ہو گی
مگر دشمن کی محفل میں صفِ ماتم بچھی ہو گی

تمہارے ہاتھ کتنے مہرباں ہیں کتنے مخلص ہیں
سما جاتے ہیں لمحوں میں محبت کی کرن بن کر
جگا دیتے ہیں ذہنوں کو صداقت کی کرن بن کر

تمہارے ہاتھ دل کو جو ہمیشہ نظر دیکھ ساتھی ہیں
زمانے بھر کو خوابِ عشرتِ منزل دکھاتے ہیں
مہ و انجم کی صورت راستوں میں جگمگاتے ہیں

تمہارے ہاتھ امید و یقیں ہیں، عزم ساحل ہیں
حریفِ شب ہیں یہ شمعِ امن ہیں، مشعلِ درخشاں ہیں
شفا و رحم، ہمدردِ جہاں، غمخوارِ انساں ہیں

تمہارے ہاتھ پیمانِ رفاقت، حرفِ دلداری
یہی زخموں کا مرہم، شیشہ دلوں کے مسیحا بھی
یہی راہ نجات و راحتِ امروز و فردا بھی

تمہارے ہاتھ میں اپنی کہ وہ تحریکِ بیداری
کہ جس کی تیز رو ہر گلشنِ عالم میں خلتی ہے
فضا رہ رہ کے جس کی لہر سے کروٹ بدلتی ہے

تمہارے ہاتھ اُس اعلان کے معمار ہیں جس نے
تمہاری عمر میں سے امن کا پیغام بھیجا ہے
بہت آہستہ لیکن دوستی کا ساز چھیڑا ہے

مبارک ہو صفیرِ دوستی اچھا ہی ہونا تھا آخر
ہوس کاروں کے نرغے سے نکل جانے کا وقت آیا
شعورِ زیست کے سانچے میں ڈھل جانے کا وقت آیا

شہاب جعفری

غزل

شام رکھتی ہے بہت درد سے بیتاب مجھے
لے کے چھپ جا کہیں اے آرزوئے خواب مجھے

اب میں اک موجِ شبِ تار ہوں ساحل ساحل
راہ میں چھوڑ گیا ہے مرا مہتاب مجھے

اب تک اک شمع سیہ پوش ہوں صحرا صحرا
تجھ سے چھٹ کر نہ ملی رہگذرِ خواب مجھے

ساحلِ آب و سراب ایک ہے منزل منزل
تشنگی کرتی ہے سیراب نہ غرقاب مجھے

دشت در دشت مرے سر سے گذرتا سورج
لے کے ڈوبا ہے یہی نورِ فلک تاب مجھے

اپنی دھرتی پہ نہ میں ہوں نہ مرا سایہ ہے
نظر آتا نہیں کچھ دیدۂ بے خواب مجھے

میں بھی صحرا ہوں مجھے سنگ سمجھنے والو
اپنی آواز سے کرتے چلو سیراب مجھے

میں بھی دریا ہوں ہر اک سمت رواں ہوں کب سے
میرا ساحل بھی نہیں منزلِ پایاب مجھے

اب مجھے ڈھونڈ نہ آغوشِ گریزاں ہر سو
لے اڑی خاک بہا لے گیا سیلاب مجھے

شام پوچھے تو نہ کہنا کہ ہیں دنیا میں نہیں
لے کے پھر آئے گا اس گھر میں مرا خواب مجھے

ابو محمد سحر

غزل

مٹ گئے ذوقِ سفر کے جتنے ارماں دل میں تھے
ہم نہ جانے زندگی کی کون سی منزل میں تھے

اک ہجومِ دردِ پنہاں انجمن در انجمن
کتنے تنہا تھے کہ یوں تنہا بھری محفل میں تھے

زندگی بن جائے جن سے اک جہنم زارِ غم
ایسے شعلے بھی اسی دنیائے آب و گل میں تھے

توڑ کر عہدِ وفا جائیں تو اب جائیں کہاں
ہم تھے اس الجھن میں لیکن آپ کس مشکل میں تھے

رات یادِ یار بھی کیا رنگ لائی اے ندیم
مہرِ آتش بار کے تیور مہ کامل میں تھے

تھا جو حسنِ نظر تو دردِ دل کا کیا قصور
حسن لیلیٰ کے سوا بھی حسن کچھ محمل میں تھے

ہے سحر عرضِ ہنر بس سعیِ تکمیلِ ہنر
امتیاز ایسے نہ کچھ اب ناقص و کامل میں تھے

افسانہ:-

شامر بیٹی

سکمبیر

مترجمہ: قیس احسن

مٹی

سیتا نے دیکھا کہ اس کی دائیں پنڈلی ننگی تھی۔ اور اس پر ایک چھپکلی چڑھ آئی تھی۔ اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اوپر کی طرف آ رہی تھی۔ سیتا نے چاہا کہ یکایک اٹھ کر اسے جھٹک دے مگر کسی خوف اور نفرت سے اس کا بدن بے جان ہو رہا تھا اور اس میں اٹھنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔

اچانک سیتا کے خواب ٹوٹ گئے اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے اوپر چھت کی طرف دیکھا جہاں وہ اکثر مٹیلے رنگ کی ایک بڑی گھناؤنی چھپکلی دیکھا کرتی تھی۔ اس وقت وہ چھپکلی چھت سے چپکی ہوئی اس کی طرف منہ اٹھائے دیکھ رہی تھی۔

سیتا نے اپنا تیسری بار خواب میں چھپکلی کو اپنی ٹانگ پر چڑھتے ہوئے پایا تھا۔ پتہ نہیں سوئی کہاں سے آجاتی تھی اور ٹانگ پر اس طرح اوپر چڑھنے لگتی تھی کہ سارا بدن جیسے مٹی کا بن جاتا تھا۔

سیتا نے چھپکلی کی طرف سے آنکھیں ہٹا کر کمرے میں نظر دوڑائی۔ دیواروں کو دیکھتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی اجنبی کمرے میں ہو۔ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد اسے اپنا ہی کمرہ محسوس ہوا۔ ہاں! اپنا.... لیکن کچھ پرایا سا بھی۔

اس وقت اس کی آنکھوں میں نیند تھی۔ مگر اب وہ سو نہیں سکتی تھی۔ سونا چاہتی بھی نہیں تھی اس نے آنکھیں ملیں جن میں کچھ ہلکی جلن تھی خارش نظروں سے وہ کمرے میں دیکھنے لگی۔ اسے آج کا دن دوسرے دنوں کی بہ نسبت عجیب سا لگا جو صبح ہی ایک تلخی لئے ہوئے چڑھا تھا۔ درحقیقت وہ تلخی رات ہی چڑھ چکی تھی۔ اس کا شوہر کافی رات گئے نشے کی حالت میں گھر لوٹا تھا۔ آتے ہی کپڑے اتار کر بستر پر پڑ گیا تھا۔ پھر اس نے سیتا کو کھینچ کر اپنی بانہوں میں لے لیا تھا۔ سیتا کا انگ انگ سلگ اٹھا۔

اس کی بانہوں سے الگ ہونے کی کوشش کے باوجود بھی وہ الگ نہ ہو سکی تھی۔ تب ہی اس کے شوہر کو ایسی تیز ہوئی کہ سیتا کا بدن اور بستر لت پت ہو گیا۔ یہ کمرے کی گھٹن تھی یا دل کی گھٹن؟ سیتا کی طبیعت گھبرانے لگی۔ اس گھٹن میں دیواروں کے گہرے ہرے رنگ کی تیکھی مہک بھی شامل تھی۔ دیواروں کو رنگے صرف دو ہی مہینے ہوئے تھے۔ مگر دیکھنے میں وہ اب بھی گیلی لگتی تھیں۔ ان میں سے پہلے ہی روز کی طرح تازہ اور تیکھی مہک آ رہی تھی۔ دیواروں کا وہ رنگ اور اس کی مہک ایسی تھی کہ اتنے دن ہو جانے کے باوجود بھی سیتا اس کی عادی نہیں ہو سکی تھی۔ شروع شروع میں اس نے اپنے شوہر سے اس کی شکایت کی تھی تو وہ ہنسا تھا۔ "تم کیا جانو اس رنگ کی قدر کرنا۔" اس نے کہا تھا۔ "یہ آئل کلر ہے۔ عام رنگوں سے کہیں مہنگا مگر میں نے اسے کافی سستے میں کرا لیا ہے۔ دیکھتی نہیں ہو، کمرہ کیسا لگتا ہے؟ چمکنے لگا ہے۔ اب شہر میں رہنا سیکھو اور گاؤں کے دن بھول جاؤ۔" گوبر میں پانی ڈالا اور دیواروں کو لیپ دیا۔ سچ پوچھو تو تمہارے اندر اب تک گوبر کی بدبو سمائی ہوئی ہے۔ تبھی اس رنگ کی مہک تمہیں نہیں بھاتی ہے مگر دھیرے دھیرے اس کی عادت پڑ جائے گی۔"

اس کے بعد سیتا کبھی اس رنگ کے بارے میں شکایت نہیں کر پائی۔ اور نہ ہی اس کی عادی ہو سکی۔ سیتا اب تک کو کی مہک کی بھی عادی نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے شوہر کو سگریٹ پینے کی عادت تھی۔ تمباکو کی مہک سے سیتا کا دل گھبرانے لگتا تھا۔ خاص کر شوہر کی سانسوں میں بسی تمباکو کی مہک تو وہ اُف

ہی برداشت نہ کر پاتی تھی۔ اُس کے آغوش میں سیتا کا بدن سکڑ کر رہ جاتا اور اسے سانس لینے میں بڑی مشکل ہوتی تھی۔ ماں کے اندھیرے میں شوہر کی فرقت کی گھڑیوں سے ڈرگتا اور بھی کلاکان اس سے بچنے کی کوشش کرتی۔ اب تو وہ کسی حد تک اسے برداشت کرنے کی عادی بھی ہو گئی تھی۔ اُس نے اسے ویسے ہی مسلط کر دیا تھا جیسے زندگی کی بہت سی دوسری کڑوی چیزوں کو مان لیا تھا۔ کچھ چیزوں کو ناپسند ہونے پر بھی اپنانا پڑتا ہے۔

سیتا کی نظر جزائری اور پر چھت کی طرف اُٹھ گئی اور اس نے چھپکلی کو دیکھنا چاہا۔ مگر چھپکلی کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ چھپکلیوں ہی کی طرح کچھ جانور کتے گھر کے اندر گھسے ہوتے تھے۔ سیتا نے سوچا۔ مینڈک، کیچوے، اور سانپ چھپنے سے گھن آتی ہے۔ اس نے سانپ صرف ایک بار دیکھا تھا وہ بھی سرا ہوا۔ اُس وقت بھی کلاکان کے بعد اس نے سپنوں میں کئی بار سانپ دیکھا تھا وہ ہمیشہ اس کے بستر پر چڑھا آتا تھا۔ وہ ایک ہی سانپ ہوتا تھا مگر وہ گاؤں والا سانپ نہیں تھا۔ اس وقت وہ دس گیارہ سال کی تھی وہ بھی کیسے دن تھے گاؤں کی زندگی کے دن۔ وہ دن اڑتے ہوئے معلوم ہوتے تھے ایسے جیسے ..... جیسے .....

سیتا کو کوئی مثال نہ سوجھی اور وہ ان دنوں کا تصور کرنے لگی۔ تب اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ شادی کے بعد وہ بھی جیسے شہر میں رہنے لگے گی۔ مگر آج وہ اس شہر کی ایک اتنی بڑی عمارت میں رہ رہی تھی جس میں دو سو سے زیادہ خاندان رہتے تھے۔ اتنے خاندان تو اُس کے پورے گاؤں میں بھی نہیں تھے۔

رگھو کے بہنے پر جب سیتا کو معلوم ہوا تھا کہ اس کا ہونے والا شوہر بارہویں جماعت تک پڑھا ہوا ہے اور بمبئی شہر میں نوکری کرتا ہے تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ گاؤں کی لڑکیاں اس سے جلنے لگی تھیں اور ان لوگوں نے اس کے مقدر کو سراہا تھا۔ اس وقت تک گاؤں کی کوئی بھی لڑکی کبھی اسکول نہیں گئی تھی۔ اس کے علاوہ ہر لڑکی گاؤں میں ہی بیاہی گئی تھی۔ ویسے سیتا ان لڑکیوں سے زیادہ پڑھی لکھی تھی، سلائی کڑھائی کے کام میں وہ سب سے زیادہ ہوشیار تھی۔

بمبئی شہر اس کے تصور میں کوئی پریوں کا دیس تھا کتنی خوش تھی وہ کبھی آتے وقت اور اس ریلوے میں پہنچ کر اس نے جب اپنے اس کمرے میں قدم رکھا تھا تو اسے ایک عجیب سی اداسی اور گھٹن محسوس ہوئی تھی۔ اُس وقت اس کمرے کی دیواریں میلی تھیں۔ فرش پر چاروں طرف سامان بکھرا پڑا تھا۔ کمرے میں بجلی تو تھی ایک بلب بھی لگا ہوا تھا مگر پنکھا نہیں تھا۔ اس فضا میں سیتا کو شوہر کے ساتھ ہونے پر بھی پہلے پن کا احساس ہوا تھا۔

کئی دنوں تک وہ اجنبیت نہیں مٹی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں روسوئی، ایک کونے میں چھوٹی سی الماری اور دو ٹرنک تھے۔ یہ عمارت ایسے ہی دو سو کمروں کی بنی ہوئی تھی۔ عمارت میں چار منزلیں تھیں اور اس کے دو طرف سے دو سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں ان سیڑھیوں پر ہمیشہ ہلکا سا اندھیرا چھایا رہتا۔

اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے جب بھی سیتا کا خیال بھٹکتا، اپنے گاؤں پہنچ جاتا جس میں اس نے زندگی کے سولہ سال گذارے تھے۔ وہ چھوٹے سے گاؤں کی زندگی تھی مگر کتنی وسعت تھی اس میں جنگلوں کے لہراتے کھیتوں کا پھیلاؤ، ہوا، دھوپ اور کھلی فضا، آتی، بدلتے موسم، سردی، گرمی، خزاں اور بہار۔ گرجتے بادلوں والی برسات، سچ کتنے رنگ تھے اور کتنا مزہ تھا۔

سیتا سوچتی، مگر یہاں تو اس کمرے میں بس ایک ہی رنگ ہے۔ زندگی جیسے چاروں طرف سے بند ہو گئی ہو۔ کمرے کے دروازے پر ہمیشہ ایک بھورے رنگ کا پردہ لٹکتا رہتا تھا۔ اس پردے کو ہٹا یا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اس سے گذرنے والے اندر جھانکے بغیر نہ رہتے۔ سامنے والے گھر میں دو بوڑھی چھپکلی آنکھیں تھیں جو ہر وقت اُس طرف تکتی رہتی تھیں۔ اس عمارت کے آگے میں ایک اور عمارت تھی۔ دونوں عمارتوں کے درمیان جو دو تین فٹ کی جگہ تھی وہ دونوں طرف کے گھروں سے پھینکے گئے کوڑے کرکٹ اور کھانے پینے کی بچی کھچی چیزوں سے بھری رہتی۔ اس میں سے ہر وقت ایسی بدبو آتی رہتی کہ طبیعت متلانے لگتی تھی۔

دیواروں سے گھری گھٹی فضا میں زندگی بھی گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ وہ پنکھ پھیلا کر اڑنا چاہے تو کیسے اڑ سکتی ہے؟ چھوٹی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آتی ہے۔

دیواروں پر سفید رنگ کرائے جانے سے پہلے ایک بار سیتا نے شوہر سے درخواست کی تھی، ہم اس کمرے کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ رہنے چلے جائیں

جہاں مکان ان کھڑی تھوڑی دور پر بنے ہوئے ہوں۔ گھر کے سامنے چھوٹا سا آنگن ہو جس میں ایک چھوٹی سی کیاری ہو کر چھوٹوں اور شرکاریوں کے پودے لگا سکوں۔ جہاں آنگن میں کھڑے ہو کر چڑھتے ہوئے سورج کو دیکھا جا سکے۔ رات کے وقت تاروں بھرے آسمان کا نظارہ کیا جا سکے۔ ایک کھڑکی

مگر اس کے شوہر نے اس کی آرزوؤں کو ٹھکرا دیا۔ "تم کبھی سمجھ گی نہیں" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ "بھلا اس کمرے کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے جس کا صرف گیارہ روپے کرایہ ہے اور جو اسٹیشن کے اتنا قریب ہے۔ یہاں سے میرا دفتر بھی زیادہ دوری پر نہیں ہے۔ پھر اس علاقے میں مکانوں کی گنجائش کی وجہ بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک سال پہلے اس کمرے کی تین ہزار پگڑی ملتی تھی۔ آج چار ہزار۔ سال بھر بعد پانچ ہزار ملے گی۔ اس سے ایک سال بعد چھ یا سات ہزار۔ لیکن اس کے مقابلے میں اگر سستی سے باہر مکان لیا جائے تو اس کا پگڑی نہیں دینا پڑے گا۔ کرایہ کم ہوگا۔ پھر وہ اسٹیشن سے ڈیڑھ دو میل دور بھی ہوگا۔ دفتر پہنچنے کے لئے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کا روز کا سفر کرو اور ہر مہینے کا دس بارہ روپیہ کرایہ الگ ادا کرو۔ ... نہیں نہیں! یہ کمرہ کسی حالت میں چھوڑا نہیں جا سکتا۔ ہاں! اگر اس کی دیواروں میں سیلی ہیں اور اس میں دم گھٹتا ہے تو رنگ و روغن کرایا جا سکتا ہے۔ بالکل نیا جیسا بن جائے گا۔"

اور دو مہینے پہلے اس نے دیواروں پر گہرے رنگ کا آئل کلر کرایا تھا۔ اور کہا تھا۔ "رنگ پر تو اسی روپے ہی خرچ ہوئے ہیں لیکن اب اس کمرے کی پانچ سو روپے اور زیادہ پگڑی مل سکتی ہے۔"

سیتا پھر چپ رہنے لگی تھی۔ اسے لگا تھا کہ کمرے کی چاروں دیواروں کے اندر چار دیواریاں اور کھڑی ہو گئی ہیں۔ اب تو یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

سیتا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ آدھی لیٹی رہنے سے اس کی کمر میں درد ہونے لگا تھا۔ کمرہ اسے چاروں طرف سے بند معلوم ہوا۔ اس نے چاہا کہ دروازے کا پردہ ہٹا دے، مگر سامنے کے گھر کی دو بوڑھی آنکھوں کا خیال آیا۔ کتنی بھوکی نظریں دھنسی ہوئی آنکھیں! جیسے عورت کبھی یکلخت نہ ہو۔ آخر یہ کھوسٹ اس کمرے کی چار ہزار روپے پگڑی لے کر چلا کیوں نہیں جاتا؟ اچھا ہوگا اگر یہ اپنے گاؤں چلا جائے اور بڑے آرام سے اپنی بقیہ زندگی کے دن کاٹے۔ مگر میری اپنی زندگی کیسے بنے گی؟ سیتا نے سوچا۔ دس مہینے پہلے وہ یہاں آئی تھی۔ اب لگتا ہے جیسے دس سال ہو گئے ہوں۔ مگر جب دس سال ہو جائیں گے تو کیا ہوگا؟ کیا دس سال بیت بھی سکیں گے۔

سیتا دیر تک دس سالوں کا اندازہ لگاتی رہی۔ دس سال شاید کٹ بھی جائیں اگر شوہر کے ساتھ اس کی شادی شدہ زندگی کی شکل نہ ہو۔ دونوں کے درمیان ایک ایسی خلیج تھی جیسے اس عمارت اور سامنے والی عمارت کے بیچ۔ اور اس خلیج میں سمائی ہوئی ہوا کو کبھی مہک، شراب کی بو اور چھپکلی کے چھپنے کا سا احساس۔

کمرے کے ایک کونے میں آہٹ ہوئی تو سیتا نے ادھر دیکھا۔ شاید کوئی چوہا ہو۔ اس نے سوچا۔ کچھ دیر کے بعد وہ آواز بند ہو جائے گی۔ تب سیتا کی نظر الماری کے اوپری خانے پر ٹک گئی۔ جس میں کچھ کھلونے پڑے تھے۔ ان کھلونوں کو اتنے تھوڑا عرصہ قبل اگر کے طور پر اس نے خریدا تھا۔ ان میں ایک چینی پیتل کا گڈا۔ چاندی کے چھوٹے چھوٹے برتن، پیتل کا اونٹ، سیپیوں کی بنی ہوئی چار چڑیاں، چینی کے دو بگیر اور لکڑی کی ایک مورنی وغیرہ تھے مورنی کے ساتھ ایک مور بھی تھا جو ایک دن نیچے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ سیتا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھی کھلونے ہوں۔ مجبور و بیبس اگر وہ الماری کا پٹ کھول دے تو یہ بھاگ جائیں گے۔ مگر تو ایسے آرام سے بیٹھا ہوا ہے جیسے اسی کا گھر ہو اور تو اگر ان بھاگتے ہوئے کھلونوں کی طرف دیکھے جا رہا ہے۔ گڈا بڑا خوش لگ رہا ہے۔ مورنی بھی .... لیکن یہاں وہ الماری کے کاپٹ میں سے باہر جھانک رہی ہے۔ کچھ کہتے ہی اڑ جائے گی۔ کتنی اصلی لگ رہی ہے۔

یکایک سیتا کو احساس ہوا کہ جیسے مورنی زندہ ہو گئی ہو اور سچ مچ اڑنا چاہتی ہو۔ وہ اسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ مورنی آگے جاتی ہوئی معلوم پڑی۔ کس شان سے چل رہی ہے۔ سیتا کے اندر تقریباً دوڑ گئی۔ مورنی کی چال! اسے اپنے گاؤں میں، گھر کی چھت پر چلتی ہوئی مورنی دکھائی دی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہنستے گاتے جھنڈ، کھیل، کھلیان، گاؤں میں کولشیر کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ان چند مقامات میں سے تھا جہاں مور بکثرت پائے جاتے تھے۔ اس خاندان کے لوگ بتاتے تھے کہ ان کے پرکھوں نے مور کو کبھی نہیں مارا۔ اس کے گاؤں میں کبھی بھی کوئی جلسہ ہوتا تو اس میں اپنی نگہ

(بقیہ صفحہ ۳۵ پر دیکھئے)

امیر عارفی (علیگ)

آواز کی صلیب

ایک آواز جو قرن ہا قرن سے
ہر زمانے میں گونجی ہے اور آج بھی
گونجتی ہے مگر !
جس جگہ بھی یہ آواز گونجی
اسے تیر و نشتر ملے
جھوٹ اور مکر کے تازیانے ملے
سب نے باغی کہا اپنے ماحول کا
اس کو ایمان شکن جان کر
جہل نے قتل کے فتوے صادر کئے
اہلِ دانش تو تاریکیٔ جہل کو
اپنے سینے سے چمٹائے بیٹھے رہے
بند آنکھیں کئے
انگلیاں اپنے کانوں میں ڈالے ہوئے
اپنے اپنے عقائد کے،
اندھے کنوؤں میں مقیّد رہے !

ایک آواز جو قرن ہا قرن سے
گونجتی آئی تھی
گونجتی ہی رہی
اور عقائد کے اندھے کنوؤں میں اُترتی گئی
زہر کا پیالہ اُس کو پلایا گیا
پھر صلیبوں پہ اُس کو چڑھایا گیا

اس کو مصلوب کرنا کوئی سہل تھا ؟
وہ صدا
صبح کے نور میں ڈھل گئی
اور اندھے عقیدوں کے گہرے کنوؤں میں سحر بن گئی
سیکڑوں لوگ شوقِ طلب میں بڑھے
سیکڑوں سر عقیدت سے آگے جھکے
اندھے، بہرے خداؤں کے شہرِ طلسمات میں
گم شدہ دل کے تاریک در وا ہوئے !

آج اُس وقت کے غار سے
ایک آواز کی گونج پھر آئی ہے !
یہ صدا بھی پرانی صدا کی طرح
ظلمتِ جہل کو چیر کر
تجربہ، آگہی
عقل کی جگمگاتی ہوئی روشنی
آبروئے وطن
جرأتِ گفتگو
رزق کی پاسباں
زندگی کی زباں
اور جمہور کے واسطے نغمۂ جانفزا بن گئی
یہ اخوت، مساوات اور امن کا راستہ بن گئی

غزل

مظفر حنفی

○

سیکڑوں طوفان کشتی میں دکھا سکتا ہوں میں
ناخدا پر کس طرح ایمان لا سکتا ہوں میں

کیا ضروری ہے کہ برقِ تُند خو زحمت کرے
آپ ہی اپنے نشیمن کو جلا سکتا ہوں میں

مجھ پہ بے پایاں کرم ہے دردِ لامحدود کا
وسعتِ کونین میں کیسے سما سکتا ہوں میں

نشترِ غم کی ذرا دل پر عنایت چاہیے
یہ شگوفے صرف کانٹوں میں کھلا سکتا ہوں میں

لاکھ پابندی سہی تحریر پر گفتار پر
دورِ ستم! بزمِ تمنا تو سجا سکتا ہوں میں

موڑ آتے لازمی ہیں زندگی کی راہ میں
بھولنے والے کہیں بھی یاد آ سکتا ہوں میں

دوستی کی بات بے حد عامیانہ ہو گئی
دشمنی کو بھی سلیقے سے نبھا سکتا ہوں میں

اے مظفر! بات کرنے کا سلیقہ چاہیے
آنکھ پھر برقِ تجلی سے ملا سکتا ہوں میں

غزل

علقمہ شبلی

○

چاک در چاک ہے پھولوں کی قبا، سُنتے ہیں
پنجہ کش اب بھی ہے گلشن کی ہوا، سُنتے ہیں

تم نے چھیڑا بھی نہیں سازِ تبسم اپنا
تیز ہے دل کے دھڑکنے کی صدا، سُنتے ہیں

جانے کب آہ گذرِ شوق کی ہو گی گل پوش
گھر کے آئی تو ہے گھنگھور گھٹا، سُنتے ہیں

آپ کے وعدۂ فردا کا یقیں ہے، لیکن
روح فرسا ہے بہت وعدۂ وفا، سُنتے ہیں

شمعِ دل ہی کو جلاؤ کہ شبِ تار کٹے
سر بہ زانو ہے چراغوں کی ضیا، سُنتے ہیں

کیا علاجِ دلِ بیمار کی صورت نہ رہی
آج ہے چارہ گری وقفِ دعا، سُنتے ہیں

نغمۂ مرغِ چمن ہو کہ خروشِ طوفاں
ہم تو ہر ساز پہ اپنی ہی صدا سُنتے ہیں

ذکاء الدین شایاں

مقالہ۔

اسمِ اعظم ـــــ (ایک تبصرہ)

صنعتی انقلاب، سائنسی ایجادات اور مشینوں کے فروغ نے انیسویں صدی کے شروع ہی سے، تمام دنیا میں اور خاص طور پر مغربی ممالک میں ایسی میکانکی فضا پیدا کر دی تھی جس میں جذبات اور روحانیت کو نظر انداز کر کے مادیت پر بے جا زور دیا جانے لگا تھا۔ اس کے نتیجہ میں ادب بھی کسی حد تک متاثر ہوا۔ مغربی مفکرین کے سیاسی اور سماجی نظریات شعر و ادب پر بھی بے جان اور مشنری ڈھانچے میں تبدیل کر دیتے اگر بروقت یورپ کے کچھ باشعور ادیب، آرنلڈ، ٹینی سن، براؤننگ، کارلائل اور رسکن وغیرہ اس کے خلاف آواز نہ اٹھاتے۔ یہ ادیب عہد وکٹوریہ کی پیداوار تھے مگر اس دور کی صنعتی، معاشی اور سائنسی ترقی پر آنکھ بند کر کے ایمان لانے کو تیار نہیں تھے۔ کیوں کہ انہیں احساس تھا کہ یہ مشینی ارتقاء انسان کے فطری جذبات، روحانی اور اخلاقی اقدار کے حق میں سمِ قاتل ثابت ہوگا اور انسان کو دائرہ انسانیت سے خارج کر دے گا۔ چنانچہ یہ شعراء اور ادیب عہد وکٹوریہ کے انتشار (VICTORIAN UNREST) کو محسوس کر کے ایسے ادب کی تخلیق میں کوشاں رہے جو انسان کی داخلی اقدار کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ اس قسم کا انتشار اور ذہنی بے اطمینانی یورپ ہی میں نہیں تھی بلکہ دوسرے ممالک بھی اس سے متاثر تھے ہر جگہ مذہب اور سائنس، روحانیت اور مادیت، شعر و ادب اور صحافت میں کشمکش تھی۔

شاعری احساسات کی زبان ہے نہ کہ نظریات کا بیان۔ لیکن اردو شاعری کی یہ بدقسمتی تھی کہ ۱۹۳۶ء کے بعد جب ترقی پسند اثرات کو قبول کرنے اور حقیقت نگاری کو اپنانے کے قابل ہوئی تو اس نے فطری احساسات کو پس پشت ڈال کر مستعار نظریات ہی کو ٹھیک سمجھا اور اسی کو ترقی کی معراج سمجھا۔ ہمارے شعراء نے دوسری زبانوں کی اندھی تقلید میں میکانکی طور پر وہ اصول وضع کئے جو ہندوستانی شاعری کے مزاج کے خلاف تھے۔ یعنی موضوع اور ہیئت میں وہ مماثلت نہیں تھا جس کے امتزاج سے کوئی اچھی تخلیق وجود میں آتی ہے۔ ان لوگوں نے بغیر سوچے سمجھے، بغیر سمجھے کے اور اپنی افتادِ طبع کا خیال نہ کرتے ہوئے دوسرے ممالک کے رائج شدہ نظریات کو اپنی شاعری میں برتنا شروع کر دیا۔ خواہ یہ روس کے اشتراکی نظریات ہوں یا عرب عجم کے اسلامی تصورات۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری میں شور، ہنگامہ، انقلاب، نعرہ بازی اور پروپیگنڈے کے عناصر زیادہ پیدا ہو گئے۔ دوسری طرف حقیقت نگاری اس کو سمجھا جانے لگا کہ بند کمروں میں بھانک کر لوگوں کی نجی زندگی کی عکاسی کی جائے جس میں جنسی تجربات نمایاں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت دنوں تک اردو ادب میں خشکی، بے رنگی اور عریاں نگاری کا دور دورہ رہا۔ لیکن پندرہ بیس سال کی ٹھوکروں کے بعد ہمارے ادیب اور شاعر سنبھل چکے ہیں۔ اور اب وہ ایک صحت مند راہ کی جانب گامزن ہیں۔ شہریار کے مجموعہ ہائے ایم اعظم پر (جو نئی شاعری کا حامل ہے اور جس کا مصنف بھی نئے دور کا ایک حساس فرد ہے) قلم اٹھانے سے پہلے میں نے مندرجۂ بالا تاریخی پس منظر ضروری سمجھا ہے کیونکہ اس کو ذہن میں رکھے بغیر شہریار کی شاعری کے ساتھ ہم انصاف نہیں کر سکتے۔

شہریار کو میں تقریباً چھ سال سے جانتا ہوں۔ ان سے گفتگو ہوئی ہے، اکثر و بیشتر ان سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ شروع

پر تبادلۂ خیال ہوا ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں سُنی ہیں اور اپنی سنائی ہیں۔ اپنا کلام سناتے وقت میں نے شہریار کو دوسرے شاعروں کی طرح آواز بناتے یا بے جا داد کا طلب کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ داد دیجیے اور اثر پیدا کرنے والے لہجے میں اپنی نظم اس طرح پڑھتے ہیں جیسے پڑھ نہ رہے ہوں بلکہ نظم کو تخلیق کر رہے ہوں۔ اور نظم کے اختتام پر وہ سامعین کو اس انداز سے دیکھتے ہیں جیسے کسی نے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔ اُن کی غزلوں اور نظموں کے الفاظ مشاعرے کے بعد حواس ذہن میں نئی نئی تصویریں اور نئے نئے مفہوم لے کر ابھرتے رہتے ہیں۔ دوسروں کا کلام سنتے وقت بھی وہ متانت اور سنجیدگی کے دائرہ میں داد دیتے ہیں۔ اچھے شعر پر جھومتے بھی ہیں۔ ہلکی آواز سے واہ واہ بھی کرتے ہیں اور اکثر خاموش بھی رہتے ہیں۔ ان کی چال ڈھال، گفتگو، رکھ رکھاؤ سب میں ایک سلیقہ ہے جو ان کے اُجلے کردار کی دلالت کرتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ان کے الجھے ہوئے بال ضرور پریشان کر دیتے ہیں مجھے خوشی ہے کہ اس نئے دور کے دوسرے شعراء کی طرح اور ان کے بالوں کی مانند ان کی شاعری میں الجھاؤ نہیں ہے۔ وہ صاف، ستھری اور رواں ہے۔ "اسم اعظم" کے مطالعہ کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ جس شخص کا یہ کلام ہے اس کو شہریار ہی کے حلیہ کا ہونا چاہیئے۔ مجھے شہریار کی آنکھوں میں گہرائی، خلوص کے عکس اور بولتی ہوئی خاموشی نے زیادہ متوجہ کیا ہے۔

شہریار کی نظمیں روح، جذبہ اور اسلوب کے اعتبار سے شاعری کے جو زمین ڈوبی ہوئی ہیں۔ نئی نسل کے شعراء کے مقابلہ میں ان کا یہ کارنامہ کچھ کم نہیں ہے۔ ان نظموں میں احساسات کی زبان ہی استعمال کی گئی ہے۔ ایسا نہیں کہ شاعر نے باہر کا کوئی نظریہ اپنے اوپر منطبق کر کے پروپیگنڈے کے انداز میں شاعری کی ہو۔ اُن کے یہاں نہ مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش ہے، نہ عوام کا غصہ، نہ کارخانوں اور ملوں کا دھواں، نہ مشینوں کی گڑگڑاہٹ، نہ چین، روس، ہندوستان اور امریکہ کی حمایت یا مخالفت میں ہنگامی نظمیں۔ یہاں مجھے ورڈسورتھ کا وہ قول یاد آرہا ہے جو اس نے اپنے شعری نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا "شاعر کو کسی موجودہ ہنگامی واقعہ، منظر، یا کیفیت سے متاثر ہو کر ایک دم قلم لے کر نہیں بیٹھنا چاہیئے بلکہ اُس واقعہ، منظر یا کیفیت کو ایک خاص مدت تک ذہن و تصور میں پروان چڑھا کر تخلیق کی طرف رجوع ہونا چاہیئے تاکہ اُس میں زیادہ گہرائی اور ابدیت پیدا ہو سکے۔" شہریار ورڈسورتھ کے اس قول پر پوری طرح عمل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہاں اس غلط فہمی کا شکار ہونا مناسب نہیں ہے کہ شہریار زمانے کی بدلتی ہوئی نبض کو نہیں پہچانتے یا زندگی کے موجودہ حقائق سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ وہ زندگی اور اُس کے ہر شعبہ کی سرگرمیوں اور پیچیدگیوں کو ایک خاص شاعرانہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہ انسان کی مجبوری کو محسوس کرتے ہیں، اُس کی ناکامی پر کڑھتے ہیں۔ مادّی ترقی اور مالی سہولتوں کے باوجود انسان کا دل اتنا دکھا ہوا کیوں ہے، اس کو سوچتے ہیں۔ شہریار دوڑتی بھاگتی، چلتی پھرتی شہری زندگی کے کسیلے دامن سے مواد حاصل کر کے نظموں کے چھوٹے چھوٹے شیشے تراشتے ہیں یا آئینہ خانے تعمیر کرتے ہیں۔ ان میں کبھی اپنی تصویر دیکھتے ہیں اور کبھی دوسروں کی تصویر دکھاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ فطرت کی سادہ اور معصوم جھولی سے بھی کچھ نوادرات چُرا لیتے ہیں اور اُن کی مدد سے اپنی نظموں میں نیا رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی نظمیں شہر کے ہنگاموں سے بھری ہوئی زندگی اور سنگین حقائق سے اخذ شدہ مفہوم افشا کرتی ہیں جن کو ایک دانا تک شاعر نے اپنے دل اور جذبہ کی آگ میں تپا کر نظم کیا ہے۔ ان میں فطرت کا حسین چہرہ بھی جگہ جگہ اپنی تابناکی دکھاتا ہے۔ شہریار کے دل میں انسانیت کا ایسا بھرپور درد موجود ہے۔ اس میں ایسی کسک اور تڑپ ہے جس نے ان کے قلم میں زور اور انداز بیان میں رچاؤ پیدا کر دیا ہے۔ ان نظموں میں ایک شعری سلیقہ ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے موضوع اور اس کی مناسبت سے ہیئت کا انتخاب ہر جگہ بڑی خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔ ان میں کہیں جوڑ نظر نہیں آتا۔ بظاہر ان نظموں میں خارجی عوامل اور محرکات کی کارفرمائی بہت کم ہے لیکن ان نظموں کی تہہ میں اس زیریں لہر (UNDER CURRENT) تک پہنچ سکتے ہیں جو زندگی، زمانہ اور ماحول کی تمام تحریکات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور جس کا ابال کہیں کہیں سطح پر بھی آگیا ہے۔ ویسے زیادہ تر اس لہر کو شاعر نے اپنے اندرونی ہیجان میں چھپا لیا ہے۔

بلاغت اور جامعیت ان نظموں کا خاص پہلو ہے۔ شہریار کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم نظم کرنے کے قائل ہیں۔ وہ قاری کو الفاظ کے بے جا طومار اور گورکھ دھندے سے بچا کر اصل موضوع سے وابستہ رکھتے ہیں۔ اور اپنے تاثر کو چند سطروں میں ختم کرنے یا سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شہریار کو خوف ہو کہ کہیں ان کا یہ قیمتی، انوکھا اور زندگی کے جذبے سے بھرپور تاثر الفاظ کی بازی گری میں فنا نہ ہو جائے یا سرکش گھوڑے کی طرح اپنا رُخ کسی اور سمت نہ کر لے اس لئے وہ اُسے چند لفظوں میں قید کر کے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں۔ نظموں کے اختتام کی سطریں نقطۂ عروج تک پہنچتی ہوئی ایسی ٹھنڈی سانس لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جس میں شاعر کے تخلیقی عمل کی تھکاوٹ اور الجھنوں کے بعد اطمینان جگمگاتا نظر آتا ہے۔

آج کل نفسیاتی تنقید پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ فنکار کی زندگی، ماحول اور مزاج کا اثر اس کی نگارشات میں کہاں تک ہے۔ اس کا سراغ لگایا جا رہا ہے۔ اور شعور و لاشعور کے ہنا خانوں کا جائزہ ضروری ہو گیا ہے۔ "اسم اعظم" کا مطالعہ بھی اس نقطۂ نظر سے مفید ہو سکتا ہے۔ ناقدین فن اور خاص طور پر تخیل نفسی کے ماہرین شہریار کی شاعری میں بار بار آنے والے ایسے الفاظ سے کچھ نتائج اخذ کر سکتے ہیں جن میں شاعر کی افتادِ طبع کا پرتو ہے۔ مثلاً 'خواب'۔ 'نیند'۔ 'دھندلکا'۔ 'سائے'۔ 'سکوت'۔ 'خوابوں کا بھکاری'۔ 'پرچھائیاں'۔ 'نیند کا جادو'۔ 'ادھورا سپنا'۔ 'شجرِ سایہ دار'۔ 'نیند کا سیلاب'۔ 'نیند کی سبز پری'۔ 'خواب کی پرچھائیاں'۔ 'سائے کی موت'۔ 'نیند کی دیوار'۔ 'دن کا عذاب'۔ 'دن کی تیز دھوپ' وغیرہ۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے الفاظ اور نظموں کے پس منظر میں ہمیں ایک دردمند اور غم خوردہ شخص کی تصویر ملتی ہے جس کے خواب اور آرزوئیں زندگی کے تلخ حقائق سے دست و گریباں ہیں، یہ کشمکش اور تصادم اس کی حیات کا جز بن چکا ہے۔ وہ کبھی شہر کے ہنگاموں سے اُکتا کر اپنی تنہائیوں کے دھندلکوں میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ کبھی خواب، تنہائی اور خاموشی سے گھبرا کر ہنگاموں سے بھری ہوئی زندگی کی آرزو کرتا ہے۔ زندگی (جو اس کے لئے زہر بن چکی ہے) سے ڈرتا بھی ہے لیکن اسے گلے بھی لگائے رکھنا چاہتا ہے۔ اپنے دن بھر کے دکھوں کو نیند کے سیلاب میں بہا کر کبھی مطمئن سا ہو جاتا ہے اور کبھی ہزار کوشش کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے دور رہتی ہے۔ اُسے اپنا ہی غم عزیز نہیں بلکہ زمانے کے غم کا بھی خیال ہے۔ ان نظموں میں جگہ جگہ ایک ایسا چہرہ بھی جھلک دکھاتا ہے جو کبھی شاعر کے زخموں اور اس کی بے چینیوں کا راز دار رہ چکا ہے۔ جس کو ایک مدت تک شاعر نے خلوصِ دل سے پوجا ہے لیکن جو اب اس کی پہنچ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ وہ چہرہ جو غمگین اور افسردہ آنکھوں اور جسے خود اپنی مجبوریوں نے قید کر رکھا ہے۔

"قبرستان"۔ "وقت"۔ "عرفان"۔ "ماضی"۔ "ہم سفر"۔ "گیانیوں کا اپہار"۔ "شجرِ سایہ دار"۔ اور "عرفان کی آخری" وغیرہ اس مجموعہ کی ایسی نظمیں ہیں جن میں شہریار کے فلسفیانہ ذہن اور زندگی کے کسی واقعہ، پہلو یا منظر پر ایک خاص زاویے سے شدید غور و فکر کا انداز ملتا ہے۔ مجھے ان چھوٹی چھوٹی نظموں کے پیالوں میں دریاؤں کی وسعت کا احساس ہوا ہے اور وسیم بیگ کی وہ مختصر نظمیں یاد آئی ہیں جن میں شاعر نے فلسفیانہ نکات کو نظم کیا ہے۔

"واپسی"۔ "نیا دن نیا عذاب"۔ "اجنبی"۔ "پریم انت"۔ "فریب در فریب"۔ "آئینہ دیکھ کے"۔ "جرم" اور "نیند کا جادو" کامیاب مختصر نظمیں ہیں۔ ان میں شاعر کے دل اور دماغ کی وہی شدید کشمکش کارفرما ہے۔ جس تلاش کرنے کے لئے وہ بار بار طرح طرح کی فلسفیانہ تاویلیں کر کے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے ان نظموں میں حقیقت کھلا ہوا اظہار بھی ہے۔ رومان کی چاشنی بھی اور فطرت کے حسین مظاہرات کا عکس بھی۔

میں نے بہت کوشش کی اپنے تبصرہ میں ثبوت یا حوالے کے طور پر کچھ اقتباس پیش کروں، لیکن ناکام رہا۔ اس لئے کہ یہ نظمیں اتنی مربوط ہیں کہ بغیر پوری نظم کا حوالہ دئے اصل موضوع یا مفہوم کا تعین مشکل ہے۔ پھر بھی چند مختصر ترین

دوسری نظموں کے کچھ حصے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

سرو شاخوں پہ اوس کے قطرے
ہیں ابھی محوِ خواب اور سورج
رتھ پہ اپنے سوار آتا ہے

(نیا دن نیا خواب)

اور یہ پیڑ تو خود
آگ اگلتے ہوئے سورج کا گلہ کرتے ہیں
ان سے سایہ کی توقع ہے فضول
یہ تو ہر ایک مسافر کو یونہی رد کرتے ہیں

(شجرِ سایہ دار)

جہاں ساری تہذیبیں شرمائی سہمی
سر برہنہ کھڑی ہیں
جہاں ہم سے خلوت گزیدہ گنہگار بندوں کی
اک انجمن ہے
زمیں کا وہ حصہ حقیقت ہے ارض و سما کی
خودی کی خدا کی!

(قبرستان)

اک گھنیرے شجر کے سایہ میں
دو گھڑی بیٹھ کر یہ بھول گئے
قرضہ ہائے جنوں چکانے ہیں
ہم کو سورج کے ناز اٹھانے ہیں

(آشوبِ آگہی)

کوئی رنگ اور زادیوں کی زباں جانتا ہے
کوئی تال سم کی فغاں جانتا ہے
مگر کوئی اس سے سوا جانتا ہے
مگر کوئی خود کو خدا جانتا ہے

(عرفان کی آخری منزل)

غرض اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ بہتر یہی ہے اسم اعظم کا مطالعہ کر کے ان نظموں سے لطف اٹھایا جائے۔ کہیں کہیں ایک یہ بات مجھے ضرور کھٹکی ہے کہ شہریار نے ہندی کے ایسے غیر مانوس الفاظ کے استعمال کو جائز سمجھا ہے جو اردو کے مزاج سے صحیح طرح میل نہیں کھاتے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ ہندی کے نرم و نازک اور شیریں الفاظ کو اردو میں برتنا اچھا ہے اور زبان کے لیے مفید بھی۔ لیکن ان کی نظم "گیانیوں کے اپہار" میں "گیان" اور "اپہار" جیسے الفاظ کے مترادفات اردو میں لائے جا سکتے تھے۔ یا نظم "آرزو کے آخری شجر میں" "اپائے" کا لفظ نظم کے "اردو مزاج" پر کچھ گراں معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

ایسے وقت میں دل کو ہمیشہ سوجھا ایک اُپائے ،
کاش کوئی بے خواب دریچہ چپکے سے کھل جائے

"اسم اعظم" میں غزلوں کا حصّہ کم ہے۔ نظموں کی طرح یہ غزلیں بھی مختصر اور ایک ہی تاثر لئے ہوئے ہیں۔ شاعر نے خواہ مخواہ مختلف النوع مضامین کو نظم کرنے سے گریز کیا ہے۔ ان میں تغزل، روانی، سادگی اور شگفتگی کے علاوہ شاعر کی داخلیت کی آنچ بھی ہے۔ اور اپنا غم، دنیا کا غم، اور زندگی کی اٹل حقیقتوں کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ ان غزلوں میں صرف ذاتی محرومیوں اور ناکامیوں ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ زمانے سے ٹکرانے کا عزم بھی ہے۔ حسب ذیل اشعار ہمیں سرمستی، کیفیت اور تازگی کے علاوہ کچھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

ذکر کسی کا چھڑ گیا، پھر چھائی اُداسی محفل پر
آج کی رات کٹ گئی گزرے گی شاید پھر اِس دل پر

تھا غضب جاگنا تمنّا کا - رقص کرتی رہی زمیں شب بھر
لاکھ خورشید سربام اگر ہیں تو رہیں - ہم کوئی موم نہیں ہیں کہ پگھل جائیں گے
خون میں جوش نہیں آیا زمانہ گزرا - دوستو آؤ کوئی بات نکالی جائے
کیا کوئی نئی بات نظر آتی ہے ہم میں - آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے
خشک پتّوں کے ڈھیر میں نفس کو - ٹھوکریں ڈھونڈتی رہیں شب بھر
کیا حادثہ ہوا ہے جہاں میں کہ آج پھر - چہرہ ہر ایک شخص کا اُترا ہوا سا ہے
پیاس مکروہ ہونے لگی ہے مری - اے سرابو! مرا راستہ چھوڑ دو

"اسم اعظم" نئی شاعری کا وہ نیا مجموعہ ہے جو مختصر نظم گو کے کامیاب اور واضح امکانات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ شہریار نے مختصر نظم کی بنیاد ڈالی لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ دس پندرہ سال کے اندر اُبھرتے ہوئے نئے شاعروں کے حلقہ میں اُن کی شاعری نمایاں ہے۔ ہم اس شاعری پر کوئی لیبل نہیں لگا سکتے۔ یہ صرف شاعر کی داخلیت، وجدان اور احساس کی نمائندگی کرنے والی۔ نظم میں خارجی مظاہرات پر زیادہ زور دینے والے حضرات شہریار کی داخلیت پر ناک بھوں چڑھا سکتے ہیں۔ لیکن انھیں یہ ماننا پڑے گا چیخ پکار، ہنگاموں اور طوفانوں میں گھر کر بھی اُس شعر و ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے جو صداقت سے الگ جانا پہچانا جا سکتا ہے اور جس میں زندگی کی تہذیب، اقدار، اخلاق، انسان دوستی، عالم گیر محبت اور دردمندی کے ابدی عناصر مل سکتے ہیں۔

علی سردار جعفری کی ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۴ء تک کی سب سے زیادہ نظموں اور غزلوں کا نیا مجموعہ

نظم و غزل کی اعلیٰ قدروں میں ایک حسین اور دلفریب اضافہ

ایک خواب اور

قیمت ——— چھ روپے

ملنے کا پتہ:- مکتبہ شعر الادب۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶۴ بمبئی ۲۸ بی سی

ثمر اقبال

نوحہ

اے وطن میں ترا شاعرِ خوش بیاں تیری ندیوں کا دل، پربتوں کی زباں
اے وطن میں تری وادیوں کی صدا، اے وطن میں ترے آبشاروں کی جاں
اے وطن میں ترے حُسن کا مدح خواں، تجھ سے ہر دَور میں پیار کرتا رہا
تیری تصویر میں رنگ بھرتا رہا
تجھ پہ نظموں کے موتی لٹاتا رہا، شعر کہتا رہا، گیت گاتا رہا
تیری دھرتی کو گلزار کرتا رہا، تیری مٹی کو کندن بناتا رہا
تیرے دلکش مناظر کی رعنائیاں، میرے فنوں میں ڈھل کر امر ہو گئیں
رونقیں خوب سے خوب تر ہو گئیں

تیرے جھرنوں کی خوابیدہ موسیقیاں میرے افکار سے یک بیک چونک اُٹھیں
میں کہ خوش رنگ کلیاں کھلاتا رہا، تیرے باغوں میں خونِ شفق فام سے
مشعلیں ذہن و دل میں جلاتا رہا، تیرے دلکش، مقدّس سے جواں نام سے
تیرے سورج سے برسی ہوئی دھوپ کو، دودھیا چاندنی میں سمجھتا رہا
نکہتِ گل کی کہتا رہا داستاں، گوکہ کانٹوں سے دامن اُلجھتا رہا
رنگ گیسوئے دلدار سے سلسلہ، میں نے جوڑا تری ہر شبِ تار کا
صبح کو عکس سمجھا رُخِ یار کا

خوں پلاتا رہا میں ترے عشق میں اپنے پیاسے قلم کو دلِ زار کا
تیری جانب اُٹھی جب کسی کی نظر، اُس کو جھکنے پہ مجبور میں نے کیا
جب کسی کی کماں سے لپکتا ہوا ناوکِ زہر آمیز آگے بڑھا
اُس کو رُکنے پہ مجبور میں نے کیا
جب بھی شعلے بھڑکنے لگے جنگ کے، امن و اخلاص کی میں گھٹا بن گیا
بوئے گل، غنچۂ نیم وا بن گیا
نکہتِ زلف، رنگِ حنا بن گیا
پارۂ ابر، موجِ صبا بن گیا
ہر کڑے دَور، ہر آتشیں عہد میں، میں ترا ہم نفس، ہم نوا بن گیا
پنگھٹوں اور کھیتوں کی روشن فضا، میرے گیتوں سے خود کو سجاتی رہی

تیری ہر رُت سے چاندی برستی رہی، تیری ہر فصل سونا لٹاتی رہی
تیرے دریاؤں کے نیلگوں پانیوں، تیرے شفاف چشموں کی آواز میں
یہ مری شاعری سرسراتی رہی
تیرے سرسبز ٹیلوں پہ میری زباں، روز نغموں کی شبنم لٹاتی رہی
تاج کا حسن، ایلورا کی دلکشی، میری نظموں سے تشہیر پاتی رہی
تیرے قلعوں، ترے معبدوں پر مری ہر نظر چادرِ گل چڑھاتی رہی
رقصِ گنگا کی ہر لہر کرتی رہی، گیت جمنا کی ہر موج گاتی رہی
میں مورخ نہیں، پھر بھی ہر دور میں تیری منظوم تاریخ لکھتا رہا
سُرخیٔ خوں سے شام و سحر، روز و شب تیری معصوم تاریخ لکھتا رہا
تیری تہذیب، تیرے تمدن کی میں مُلک در مُلک تبلیغ کرتا رہا
تیرے سورج کی کرنوں کا تحفہ لئے، کتنی تاریکیوں سے گزرتا رہا
تیری تصویر میں رنگ بھرتا رہا

اے وطن میں ترا شاعرِ خوش بیاں، تیری گلیوں میں ہوں آج نوحہ کناں
دل میں اک قطرۂ خوں بھی باقی نہیں، خشک ہے میرے ذہن و قلم کی زباں
رُوح سے کوئی نغمہ اُبلتا نہیں، چار سُو ہے گھٹن اور خاموشیاں
سیلِ ظلمات میرے تعاقب میں ہے اور آگے ہے شعلوں کا اک کارواں
دل میں ہے درد کا ایک آتش فشاں، اور لگتا ہے جیسے وہ پھٹنے کو ہے
ایک سیلاب جو چھوٹ کر بہنے کو ہے، ایک ناگن جو ڈس کر پلٹنے کو ہے
میں کہ جن کے لئے گیت لکھتا رہا، آج وہ من کشاں ہیں وہ پرچھائیاں
انجمن جن کی خاطر سجاتا رہا، سونپ کر چل دیئے مجھکو تنہائیاں
جانے پہچانے چہرے تو ہیں اَن گنت، کوئی اِن میں مگر مجھ سے واقف نہیں
میرے گیتوں کے مجموعے کل کی طرح، آج بھی ہیں دُکانوں میں رکھے ہوئے
اُن کی جانب کوئی ہاتھ بڑھتا نہیں، میں نے لکھا ہے کیا، کوئی پڑھتا نہیں
جیسے قبریں ہوں وہ میرے افکار کی، مقبرے ہوں مرے سرد جذبات کے
خون سے میں رقم جن کو کرتا رہا، قدردان ہیں کہاں اُن خیالات کے
وہ جنہیں میں نے سمجھا پرستارِ فن، آج میرا قلم توڑ کر چل دیئے
وہ جنہیں میں نے مانا تھا رُوحِ سخن، آج تنہا مجھے چھوڑ کر چل دیئے

اے وطن میں ترا شاعرِ خوش بیاں، تیری گلیوں میں ہوں آج نوحہ کناں

غزل

اختر نظمی

○

تم اک نغمۂ ہوش رُبا ہو
میرے دھڑکتے دل کی صدا ہو
نُور ہو میری تنہائی کا
تم میری راتوں کی ضیا ہو
حُسن ہو خوابوں کی وادی کا
رنگ ہو تم، تصویر ہو، کیا ہو؟
جسم کھنکتے ساز کی لَے ہے
نغمہ ہو تم یا نغمہ نما ہو
اُن کی بات نکل آئی ہے
قصّہ گُل ہو، ذکرِ صبا ہو
میری طرح دریا تک آ کر
کون ہے جو پیاسا لَوٹا ہو
ایسے ہٹا ہے چاند سے بادل
جیسے درِ میخانہ کھُلا ہو
لوگ مجھے نظمی کہتے ہیں
شاید تم نے نام سُنا ہو

غزل

دَورؔ آفریدی

○

پیمانوں سے جو چھلکی ہے، اُس کی قیمت باقی ہے
یعنی یارو! خونِ تمنّا، دردِ محبّت باقی ہے
باغ و بیاباں ہی تک تم محدود رہے ہو دیوانو!
ہم سے پُوچھو کیا نہیں دیکھا، کون سی حسرت باقی ہے
ہم تم ہیں ناکام تو کیا ہے، حُسن و متاعِ عالم کو
نورسی آنکھیں، چاند سے چہرے، پھُول سی رنگت باقی ہے
کیا کھویا ہے؟ کیا پایا ہے؟ اِس کا ہمیں افسوس نہیں
مجھ سے مِل کے بچھڑ جانے کی پھر اک حسرت باقی ہے
تیرے ستم پر دل بیٹھے تو کس سے تری فریاد کریں
روزِ ازل سے اب تک تجھ سے سب کو شکایت باقی ہے
جب تک ہم ہیں چاکِ گریباں، وحشت کے چرچے ہیں
جب تک تم ہو اِس دنیا میں ناز و نزاکت باقی ہے
کوئی کب کس رنگ میں نکلے اِس دنیا کے خرابے میں
ہم تو بہت بدنام ہوئے ہیں تیری شہرت باقی ہے

افسانہ:۔ رفیعہ منظور الامین

کھڑکی

"ابا تم نے یہ سڑا سا گھر کیوں لے لیا۔؟" امینہ نے اپنے باپ سے احتجاج کیا۔

"کیوں بیٹا۔" لطیف نے اپنی لاڈلی بیٹی سے فکرمند ہو کر کہا۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ تجھے یہ گھر پسند آئے گا۔ اس میں تو یہ خانہ باغ بھی ہے جو اُس گھر میں نہیں تھا۔"

"ہے تو ابا۔ مگر کمرے میں جو کھڑکی ہے نا۔ اُس میں سے روز مُردے نظر آتے ہیں تو مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ارے پگلی۔" لطیف نے ٹھٹھا مار کر کہا۔ "تو ادھر دیکھتی ہی کیوں ہے۔ قبرستان میں مُردے نہیں تو کیا زندے آئیں گے۔ اُدھر نہ دیکھا کر۔"

جب سے امینہ کی ماں مری تھی لطیف نے اُسے ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر پالا تھا۔ چھ سال کی امینہ اب پندرہ سال کی ہونے کو آئی تھی۔ زمانے کی تند ہواؤں سے امینہ کو ہمیشہ اُس نے چٹان بن کر بچایا تھا۔ اس کے ہاتھوں نے زندہ چلاتے چلاتے زندگی کے نو سال جھیل ڈالے تھے۔ وہ ڈرتی تھا اور اس کا اصول تھا کہ وہ کہیں جا کر مزدوری نہ کرتا خواہ کوئی کتنا ہی لالچ دے۔ اتفاق سے اس کے اصول ٹوٹنے کی نوبت کبھی نہیں آئی کیونکہ گھر بیٹھے اُسے اتنا کام مل ہی جاتا تھا کہ وہ ہاتھ روک کر اپنا اور اپنی لڑکی امینہ کا پیٹ بھر لے۔ اور تھوڑا تھوڑا پیسہ بیٹی کے لئے پرایا گھر خریدنے کیلئے جمع بھی کرتا رہے۔ اس پیسے کا خیال امینہ کو ہوش سنبھالنے پر بھی معلوم نہ ہوا۔ کیونکہ لطیف کا خیال تھا کہ پیسے کی حرارت اکثر کرداروں کو پگھلا دیتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ آنچ امینہ کے آنچل کو بھی چھو لے۔ وہ امینہ کی نظر بچا کر یہ پیسے نوٹوں کی شکل میں ایک لکڑی کے بکس میں جمع کرتا جس کی چابی اس کی کمر سے بندھی رہتی۔ البتہ جب کبھی وہ اسے کسی میلے میں برقعہ پہنا کر لے جاتا تو اسے آزادی ملتی کہ اپنی مرضی کی کوئی بھی چیز خرید سکے۔ لیکن امینہ کی مجال نہیں تھی کہ نقاب کا کونا بھی سرکا سکے۔

کہتے ہیں جہاں ہیرا کا تھا ہو تو ہمہ دلیں پھرتے ہیں۔ گو کہ امینہ کے ہوش سنبھالنے پر لطیف نے اس کا اسکول چھڑا دیا تھا حتیٰ کہ اس کا دلیز میں بیٹھنا بند کر دیا۔ پھر بھی ایک روز ہیرے کے درخت پر کسی نے باہر سے پتھر پھینک مارا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ اس کی چوٹ امینہ کے دل پر لگتی لطیف کے سخت ہاتھوں نے اُسے دبوچ لیا۔ اور تین دن کے اندر اندر اس نے لٹھوں کا وہ محلہ ہی چھوڑ دیا۔

اس نئے گھر کے پچھواڑے ہی قبرستان تھا جس میں ہر وقت مُردوں کی آمد اور زندوں کی رفت جاری رہتی۔ لطیف بے خانہ باغ سمجھتا تھا اس میں اتنی جگہ بھی نہ تھی کہ چارپائی کی لمبی بکری پردہ کام کر سکے۔ اسی لئے وہ دروازے کے سامنے بیٹھ کر کام کرتا اور اندر پچھواڑے کی کھڑکی سے امینہ زندوں اور مُردوں کا یہ ٹریفک دیکھا کرتی۔

امینہ نیک اور شریف ماں کی نیک اور شریف بیٹی تھی۔ لطیف کی شفقت بھری پرانہ نگاہوں نے جان لیا تھا کہ امینہ میں ایک بہترین بیوی بننے کے گُن موجود ہیں۔ اور اب وہ اس تلاش ہی میں تھا کہ کسی طرح اس کے لئے سو روپوں کا مال جہیز تو وہ اپنے اس دھندے سے بہم پہنچا سکے۔ وہاں ہی خیالات میں گم اپنا کام کر رہا تھا کہ دروازے کے کھٹکھٹانے پر امینہ نے آواز لگائی۔

"آپ بند کرو کام ـــــ دیکھتے نہیں کہ شام ہو گئی ہے ـــ تھک جاؤ گے ـ آج تم نے بہت کر لیا ـ اگر روٹی کھا لو ـ"

"کیا بنایا ہے میری بیٹی نے ـــ ہے" لطیف نے پوچھا ـ

"تم ہی نے تو آج گوشت لا دیا تھا ـ وہی بنایا ہے ـ"

"جب سے تو نے پکانا شروع کیا ہے امینہ ـ" لطیف اپنا سامان سمیٹتا ہوا بولا ـ "مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ہمیشہ سے تیرے ہی ہاتھ کا کھانا کھاتا آیا ہوں ـ تیرے ہاتھ میں بھی تیری ماں ہی کے ہاتھ کا سا مزہ ہے ـ"

"اب حلوہ ہی اُدھار ہے گا ـ" منہ اسپر جائے گا ـ" امینہ خوش ہو کر بولی ـ

لطیف جب کھانا کھانے کیلئے گھر میں گیا تو اُس کی نظر کھڑکی پر پڑی ـ اب پھر کوئی زمین کے سینے میں ہمیشہ کے لئے آنا جا رہا تھا ـ اس نے مٹی کے تیل کا خالی کنستر اٹھا کر کھڑکی میں رکھ دیا اور کھانا کھانے کے لئے بیٹھ گیا ـ

"آج مجھے رات میں بڑے بڑے خواب نظر آتے ہیں ـ جیسے کفن پہنے ہوئے مردے میرے پیچھے بھاگ رہے ہوں ـ کبھی ایسا لگتا ہے جیسے مجھے زمین کے لوگ قبر میں دھکیل رہے ہوں ـ تب میں ایک دم چلانے لگتی ہوں ـ تھیلیں مارنے لگتی ہوں ـ تو سب مجھے چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں ـ"

ایسے خواب تو بیٹا ہاضمے کی خرابی کی وجہ سے نظر آتے ہیں ـ دیکھا اب میں نے یہ کنستر کھڑکی میں رکھ دیا ہے نا ـ اب تو پھر کبھی نظر نہیں آئے گا ـ تو دیکھنے کی کوشش بھی نہ کرنا ـ

لیکن اس کے باہر جاتے ہی امینہ کھڑکی کی طرف لپکی کیونکہ قبرستان سے پھر پُراسرار اور دردناک گلوکار کی آوازیں سرسرانے لگی تھیں ـ مسکیوں کی گھگھاہٹ تھی ـ امینہ کی حالت ایک ایسے مریض کی سی ہو گئی تھی جو روز اپنے گھاؤ کو کرید کرید کر دیکھتا ہے کہ اب وہ کتنا مندمل ہو گیا ـ اور تجسس اور بے پناہ تکلیف کو اور بھی زیادہ بڑھا لیتا ہے ـ وہ بھی جان سے جاتی تھی کہ ادھر نہ دیکھے ـ پھر بھی کوئی وحشیانہ جذبہ اُسے مجبور کر دیتا اور وہ ڈستے ڈستے ہی کھڑکی سے جھانکنے لگتی ـ اور جو کچھ بھی نظر آتا اس پر اسے گھنٹوں زائل نہ ہوتا ـ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے ڈر کے مارے اب اس کی جان ہی نکل جائے گی ـ روز روز کے اس نظارے نے اسے نڈر بنا دیا تھا جیسے ڈر بھی ایک عادت ہو ـ اس کی سہیلی اس کی ماں، اس کا ہم سب کچھ اس کا باپ ہی تھا ـ لیکن اس کے پاس محنت مشقت کے بعد اتنا وقت کہاں بچتا کہ امینہ کا دل بہلاتا ـ وہ اکیلے پن میں بس اسٹول کے ان چند دانوں کا حساب جوڑتی رہتی یا پھر سوچتی رہتی کہ جب سے وہ بیاہی گئی تھی تب سے وہ کتنی بار کھودی گئیں ـ

سردیاں شروع ہو چکی تھیں ـ ایک روز امینہ کو بخار سا ہو گیا ـ لطیف نے کھٹ سے گھر کو باہر سے تالا مارا اور دوڑا دوڑا ڈاکٹر سے دوا لے آیا ـ سردی کا بخار تھا تین چار دن میں ٹھیک تو ہو گیا لیکن امینہ اور بھی کمزور ہو گئی ـ

دو دن سے تیز ہوائیں سنسنا رہی تھیں ـ برسوں بھگو دینے والا سناٹا رات کا دے رہے تھے ـ لطیف کو بھی سردی نے بخار کا تحفہ دے دیا تھا ـ اس نے پہلے تو امینہ سے چھپایا تھا ـ کل لیکن رات ہوتے ہوتے اس کی تکلیف کوہ میں بدل گئی ـ امینہ نے اپنا کمبل اُسے اچھی طرح اُڑھا دیا ـ رات میں تیزی سے سائیں گھل رہی تھی ـ اور سارا ہی ملحقہ خالی ہوا میں آمادہ روحوں کی طرح تھپکے مار رہی تھیں ـ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی چیخ چیخ کر پکار رہا ہو کہ فضا دھیرے دھیرے بھر جائے گی ـ قندیلیں بار بار سہم سہم اٹھتی ـ لطیف نے امینہ کی بچی ہوئی دوا کی ایک خوراک اور گولی کھا لی ـ "سردی ہی کا تو بخار ہے ـ" اُس نے سوچا ـ

"بیٹی ذرا سر دبا دے ـ بہت درد ہو رہا ہے ـ بالکل ـ" امینہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سرہانے بیٹھی اُس کا سر دباتی رہی ـ

"دیکھ میں کتنا تنگ کرتا ہوں تجھے ـ" اس نے اپنے ہاتھوں سے بیٹی کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا ـ

امینہ کمزور جسم میں، ڈھلوان بہت کے تھکے ہوئے بات نے قیامت مچا رکھی تھی ـ اس پر اُس کی کمزوری نے اور بھی نا دیدہ کام کیا ـ لطیف پر ہذیانی کیفیت طاری تھی ـ امینہ نے ایک مرتبہ پہلے بھی بالکل یہی حالت اپنی ماں کی دیکھی تھی جبکہ اس نے دنیا کو خیرباد کہا تھا ـ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اسے سب کچھ یاد تھا ـ اچانک ایک نڈر بھوت کنستر کو دھکیلتا ہوا اندر گھس آیا اور قندیل بھک سے بجھ کر اور پھر مکمل اندھیرا چھا گیا ـ امینہ نے محسوس کیا جیسے اس کی سانسیں بھی ٹوٹ کر ساتھ چھوڑ گئیں ـ

اُس کا باپ بڑبڑا رہا تھا: امینہ، امینہ دیکھ تیری ماں مجھے طعنے دے رہی ہے۔ لوگ مجھے گھسیٹے لے جا رہے ہیں۔ مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو مجھے۔

"ابّا، ہائے ابّا تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

"بیٹا لطیف نے گویا کچھ ہوش میں آکر کہا۔ خدا کی مرضی یہی ہے امینہ۔ دیکھ میرے بعد اپنی عزت کی حفاظت کرنا۔ وہ الماری کی صندوقچی ۔۔۔ لیکن وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ اور اس کے ہونٹ یوں ہی بڑبڑا کر خاموش ہو گئے۔

"ابّا ۔۔۔ ابّا ۔۔۔ بولتے کیوں نہیں ۔۔۔" امینہ نے باپ کو کانپتے ہاتھوں سے اندھیرے میں ٹٹولا ۔۔۔ ایک منٹ یوں ہی گذر گیا۔ تب اُسے اندازہ ہوا کہ یہ باہر کا اندھیرا تو اس کی زندگی میں بھی در آیا ہے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے قبرستان کے سارے مُردے قبروں سے اُٹھ کر اسی کھڑکی کے راستے اندر گھس آئے ہوں ۔۔۔ اور تالیاں بجا بجا کر اس کے اطراف ناچ رہے ہوں۔ اور ان سب میں اس کا باپ بھی شامل ہے۔ خوف نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ پتہ نہیں کتنی دیر ایسے ہی گذر گئی۔ امینہ یوں ہی لطیف کے سرہانے بیٹھی رہی۔ اس کے خیالات نے پھر سلیٹوں کی طرح رینگنا شروع کیا۔ اسے اچانک شرم سی آئی کہ اس کے رحم اور صدمے پر ڈر غالب آگیا ہے۔ وہ باپ جس نے چٹان بن کر ہمیشہ اس کی حفاظت کی اب اس کی نظروں میں محض ایک عورت بن کر رہ گیا ہے۔ جو اس پر دانت تیز کر رہا ہو۔ ماں کی موت کے بعد کے سارے ہی واقعات ایک ایک کر کے اسکے دماغ میں ابھرتے رہے لیکن اسکی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا نہ اسکے لب تھرتھرائے۔ دھوں کا ناچ رنگ دیکھا تھا اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک ایک کر کے ساری روحیں اسی کھڑکی کے راستے باہر کھسکتی جا رہی ہیں۔ کسی غیر مرئی طاقت نے اس کی ہستی ہی بدل دی تھی۔ اسے کسی چیز سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ جنتی ہوائیں، زمی، اندھیرا اور موت کا ڈر جیسے معمول بن چکے تھے اور زندگی اجنبی ہو گئی تھی۔ اتنی رات اور اس طوفان میں کون اُسے ملے گا۔ کسے وہ ڈھونڈھے وہ صبح کا انتظار کرے گی۔ بے روح جسم کے سرہانے بیٹھے بیٹھے اس نے دوپٹہ سے اپنا سر ڈھانکا۔ آنکھیں بند کیں اور اپنے باپ کی آخرت کیلئے قرآنی آیات کا ورد کرنے لگی۔ اس پر غنودگی کی طاری ہونے لگی۔ اور اسکا سر پلنگ کی پٹی سے ٹک گیا۔

صبح تو ہونی ہی تھی ۔۔۔ اچانک امینہ نے بوکھلا کر آنکھ کھولی۔ اُس پر ایک چہرہ جھکا تھا ۔۔۔ اُس کے باپ کا چہرہ ۔۔۔ امینہ کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اچانک وہ آنکھیں پتھرا گئیں جنہوں نے بڑی مشکل سے خود کو اندھیروں کا عادی بنایا تھا۔ اُن آنکھوں سے زندگی کی پہچان ہمیشہ کیلئے ختم ہو گئی۔ لطیف کے کانپتے ہاتھوں سے دودھ کا کٹورا گر گیا۔

●●

بقیہ افسانہ "مٹی" ۔۔۔ صفحہ 19 سے آگے

نظمیں سناتا۔ اُس کی ایک نظم تھی "تیری مورنی جیسی چال"۔ یہ نظم سیتا کو زبانی یاد تھی۔ وہ کسی بھی نظم کو تین چار بار پڑھ لیتی تو اُسے زبانی یاد ہو جاتی۔ بہت بعد میں سیتا کو معلوم ہوا کہ یہ نظم اُسی کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ اُسے پہلے تو یقین ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر یکایک اُس پر جیسے کوئی راز کھل گیا اور اُس کے اندر کپکپی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ کپکپی آج بھی مری نہیں تھی۔

ایک بار سیتا نے اپنے اندر اس کیفیت کو محسوس کیا۔ اور کمرے کی اُمس بھری گھٹن میں ایک لمحہ کیلئے اسے سردی سی محسوس ہوئی۔ تب اُس نے خود کو اپنے گاؤں میں گھر کی چھت پر بیٹھے ہوئے پایا۔ صبح کا وقت تھا اور سردیوں کی دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ سامنے کچھ دوری پر ایک مورنی دانے چگ رہی تھی اور اٹھلا اٹھلا کر چل رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں سیتا کا خیال ٹوٹا اور تب اُسے احساس ہوا کہ وہ اپنے ہی کمرے میں بیٹھی الماری کی مورنی کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ چلتے چلتے رک گئی تھی اور پہلے ہی کی طرح اُڑنے کے لئے تیار تھی۔ وہ اُس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اپنی بے زبان نظروں سے اُسے الماری کا پٹ کھولنے کے لئے کہہ رہی ہو۔

سیتا اُٹھی اور الماری کے پاس جا کر اُس نے دھیرے سے اُس کا ایک پٹ کھولا ۔۔۔ پھر دوسرا بھی کھولا ۔۔۔ کچھ دیر وہاں کھڑی رہی۔ پھر چارپائی پر آکر بیٹھ گئی۔ اور ایک ٹک مورنی کو دیکھنے لگی۔ وہ اُڑنا چاہتی تھی اور الماری کھلی تھی ۔۔۔ مگر وہ وہاں کی وہاں کھڑی رہی ۔۔۔ آخر ہے تو مٹی کی بنی ہوئی۔ "سیتا نے سوچا۔ "اصلی ہوتی تو اُڑ جاتی۔" اور تب ہی سیتا کو احساس ہوا کہ چارپائی پر بیٹھی ہوئی وہ خود بھی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ صرف مٹی کی ۔۔۔

(ہندی سے ترجمہ)

●●

کنول پرشاد کنول

نور کا دھارا

(انیس)

ایک تجلّی ایک ستارا
صدیوں سے آندھی پانی میں
جلنے والا ایک شرارا
دیدۂ و دل کو قلب و نظر کو
شوق و جنوں کی راہگزر کو
مدّت سے ہر شام و سحر کو
نرم لوؤں سے دھونے والا
جنگل، بستی، ویرانوں میں
اندھی عقل کے ایوانوں میں
حسن کے مہکے کاشانوں میں
بیج کرن کے بونے والا
جھلمل جھلمل نور کا دھارا

جس نے کھل کر شہرِ ادب کی
ہر محفل، ہر بزم کو لوٹا
جس کے رنگ کا اک پرتو ہے
فکر و فن کا ہر گل بوٹا
کوئی پنچھی، کوئی طائر
وہ شہباز ہو یا شاہیں ہو
کوئی نہ اُس کے سحر سے نکلا
کوئی نہ جس کے دام سے چھوٹا

مستی جو ہر دل میں ڈولے
جادو جو سر چڑھ کر بولے
کائنات کے رازِ دروں جو۔
نوکِ قلم سے پل میں کھولے
خوب ہوا جو یہ جادوگر
یہ اقلیمِ سخن کا سورج
مطلعِ شوق پہ ایک صدی۔
پہلے ہی بڑی شان سے اُبھرا۔
اِس لئے اُس کا نور مسلسل
آج بھی اِس دنیا میں رواں ہے
آج بھی اُس کا حسن جواں ہے

اور جو کہیں یہ بھولے سے ہی
دَور میں میرے پیدا ہوتا
اُگنے سے پہلے ہی ڈھل جاتا
اپنی آگ ہی میں جل جاتا

مستعد ڈاک خانوں کی مستعد ڈاک کی مستعد طرز

سندھ ڈاک ہے تو آدمی ۔ پر کام میں وہ کسی مشین سے کم نہیں ۔ ایک گھنٹے میں ۶۰۰ چٹھیاں چھانٹتا ہے ۔ چٹھیاں چھانٹنے کی یہ رفتار بھی حیران کن ہے ۔ اور یہ کمال کہ کوئی چٹھی کسی غلط خانہ میں نہیں جاتی ۔ مشین محض ایک دن میں ۵۰۰ ، ۴ چٹھیاں چھانٹ لیتا ہے ۔ یہ ہے ذہین انسان کا کام ہے ۔ اسے وہ دل لگا کر اور بڑی ہوشیاری سے کرتا ہے ۔

محکمہ ڈاک و تار میں سندھ جیسے ۱۵۰۰۰ آدمی ہیں جو ہر سال ڈاک سے ۴۰۰ کروڑ چیزوں کو ان کی جگہ تک پہونچانے کے لئے بڑی ہوشیاری اور لگن سے کام کرتے ہیں ۔

محکمہ ڈاک و تار

ممتاز راشد

غزل

○

قُرب پا کر بھی خُدا دُور ہی سمجھا تجھکو
خوفِ رُسوائی نے جی بھر کے نہ دیکھا تجھکو
میری نظروں میں تمنّائے تیری نگاہوں میں سُکوت
دشتِ حالات نے کس موڑ پہ پایا تجھکو
محفلِ جام و طرب ہو کہ الم کے لمحے
ہم نے ہر رنگ میں ہر حال میں چاہا تجھکو
تیرے چہرے پہ سجی تھی مری نظروں کی نقاب
خلقتِ شہر نے دیکھا کہ نہ دیکھا تجھکو
جب کوئی قُرب ملا دل نے تجھے ڈھونڈا ہے
جب کوئی ساتھ ہوا ہم نے پکارا تجھکو
زندگی پھر کبھی اُس راہ سے آگے نہ بڑھی
اجنبی شہر کی جس راہ پہ کھویا تجھکو

کیف احمد صدّیقی

غزل

○

میرے فقیرِ دل کی جسے بددُعا ملے
شہرِ طرب میں رہ کے بھی وہ غمزدہ ملے
اوراقِ یادداشت پلٹ کر تو دیکھئے
شاید کسی ورق پہ مرا تذکرہ ملے
وہ درد ہو کہ اشک، مسرت ہو یا الم
مجھکو تو راہِ عشق میں سب بے وفا ملے
یوں تیرے غم نے مجھکو گرفتار کر لیا
جیسے بغیر جُرم کسی کو سزا ملے
دل میں اگر چراغِ تجسّس ہو ضو فگن
تاریک مُتکدہ میں بھی تجھکو خدا ملے
اے ناقدانِ وقت ذرا غور سے پڑھ
شاید کلامِ کیف میں کچھ فلسفہ ملے

طنز و مزاح :- جیون لال گوہر

سگِ لیلیٰ

کوئی مانے یا نہ مانے، یہ ایک حقیقت ہے کہ تہذیبِ جدید کے اس دورِ نزیں میں ہمارا معیارِ زندگی خاصی حد تک بلند ہو گیا ہے ـــــ آج کسان و دہقان بھی، قدیم نوابانِ اودھ کی طرح عجب چاہیں، ہر شہر و مضرب و مغنی کو مجرے کے لئے طلب کر سکتے ہیں، جب چاہیں ٹرانزسٹر یا بیٹری ریڈیو سیٹ کے ذریعہ محفلِ شعر و نغمہ، بزمِ رقص و سرود برپا کر سکتے ہیں ـــــ دودھ بیچنے والے گوالے، موٹر سائیکل پر دودھ لادے، جب نکلتے ہیں تو تہذیبِ انسانی کا عہدِ شیر خواری پانی پانی ہو جاتا ہے ـــــ عامۃ الناس "مادرن ڈریسرز" سے ٹیڈ لین کے کٹش شرٹ اور ڈیکرن کی پینٹ اُدھار خرید کر اسٹیٹس کو قرض کے فرض کو نظر انداز کرتا فیشن میں داخل سمجھتے ہیں۔ اناج کی مہنگائی اور ضروریاتِ زندگی کی نایابی کے باوجود لوگ لختِ دل کھا کر اور اشکِ خون پی کر کسی سنیما میں "پھولوں کی سیج" پر جا بیٹھتے ہیں یا "GAY LORD" [1] میں غمِ دوراں و غمِ جاناں کو غرقِ بادہ و جام کرتے نظر آتے ہیں ـــــ بعض کم نظر مدعی مساوات کا رونا روتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عہدِ جمہوریت میں سماجی نابرابری اور بڑھ گئی ہے، اب ان حضرات کو کون سمجھائے کہ سماجی مساوات تو اس نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے کہ آج مشاعروں میں نغمۂ بلبل اور میمنڈک کا ٹرٹراہٹ' کا سول ایک ہے۔ مشاعرے اور معاشرے میں شاعر اور بھانڈ کی قدر و قیمت آج یکساں ہے۔ سماج سے طبقاتی نابرابری کا فاصلہ مٹا دینے کے لئے آج خواتین چوڑی دار پائجامہ، ساڑی، ٹراؤزر، سلیکس پہن کر اور مردانہ وضع کے بال ترشوا کر جنسی فرق و امتیاز کے خلاف جہاد کر رہی ہیں ـــــ پھر اس دورِ مساوات میں صرف انسان ہی مساوات کی نعمت سے فیضیاب نہیں بلکہ آج کے متمدن سماج میں تو جانوروں کو بھی انسانوں کے برابر کا رتبہ حاصل ہے۔ مثلاً کتے کو جو درجہ آج کے مہذب معاشرے نے عطا کیا ہے وہ مجنوں کو لیلیٰ، صاحب کہنے کو بھی میسر نہ رہا ہوگا ـــــ

آج کل جب آپ کسی "صاحب بہادر" قسم کے "مہذب فیملی مین" دوست سے ملنے کے لئے ان کے بنگلے پر جاتے ہیں تو جیسے ہی آپ پورٹیکو (PORTICO) سے بڑھ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہونے لگتے ہیں، فوراً ایک "رشکِ شمشاد و صنوبر" ALSATION "آلسیشن" صوفے کے نیچے دھنسیں آغوش سے اچھل کر اپنے پنجے آپ کے سینے پر رکھ دیتا ہے اور آپ ذرا سہم کر سوچنے لگتے ہیں کہ یہ حسنِ استقبال" کی کوئی "گرم جوشانہ ادا" ہے یا "اظہارِ رقابت" کا کوئی "سگِ غمزہ" ؟! ـــــ

کتے کے دیگر افراد سے زیادہ "یہ سگ زادہ" اپنی خود اعتمادی کے اظہار اور "عشوہ گری" کے لئے آپ

---

[1] ایک فلم کا نام

یہ محسوس کرانے پر تُلا نظر آتا ہے کہ وہ بھی اِس معزز خاندان کا "معزز رکن" ہے اور چونکہ مجھ دیگر افرادِ خاندان کی طرح "ناشتہ وہ بھی" BUTTER + CHEESE "سے کرتا ہے اِس لئے وہ بھی خود بڑی چیز ہے۔ مگر مجھ کو اِس احساسِ برتری" کے سائے میں آپ کو سہما دیکھ کر، کوٹھی کی مالکن "ٹائیگر! ٹائیگر!!" پکارتی ہوئی منظر پر اُبھرتی ہیں اور اپنے سینے سے گتے کا بوجھ ہٹتا دیکھ کر آپ کے حواس بجا ہوتے ہیں، رُکی ہوئی سانس پھر چلنے لگتی ہے ——— ساتھ ہی آپ کے "مہذب" دوست کی نصف بہتر کی نرم و شیریں آواز فضا میں ایک لفظی فہمائشی تحلیل کرتے ہوئے آپ سے یوں مخاطب ہوتی ہے "معاف کیجئے گا، گوہر صاحب، گتے غریب، کچھ شاہ و جوہری تو ہیں نہیں جو قدرِ گوہر پہچان سکیں، لیکن بُرا نہ مانئے گا کیونکہ غرطرزن کی نااہلیت سے قدرِ گوہر کو کم نہیں کرتی" ——— گتے کی اِس قدر ناشناسی یا "ناز فرمائی" کے لئے میں خود طلبگارِ عفو ہوں" ——— آیئے نا، تشریف رکھئے، میں چائے لے کر ابھی آئی، کیا کروں، کم بخت خادمہ گھر چلی گئی ہے۔ آپ بیٹھئے تو، چائے کا پانی کھول ہی رہا ہے" ——— اُن محترمہ کو کیا معلوم کہ وہاں تو چائے کا پانی کھول رہا ہے مگر یہاں خون کھول رہا ہے اُن کے "مہذب" "دربانِ گرگ نما" کی "اداؤں" پر! ——— خیر آپ کے تشریف رکھتے ہی چائے کی ٹرے بھی تشریف لے آتی ہے اور صاحبِ خانہ بھی ——— چائے کی میز پر محترمہ سے باتیں ہو رہی ہیں کہ اُن کے لاڈلے "ٹائیگر صاحب قبلہ" میز پر چڑھ کر عین وسط میں براجمان ہو جاتے ہیں اور بار بار، آپ کی جانب سر اُٹھا کر، دُم ہلا کر، اپنی "صدر نشینی" کے لئے "خراجِ تحسین و احترام" طلب فرما رہے ہیں ———

جونہی آپ چائے کی پیالی اٹھا کر لبوں تک لے جانا چاہتے ہیں، محترمہ کے یہ سگِ عزیز (سگے عزیز) اپنی تیکھی "مقنواں ناک" آپ کی پیالی کی طرف بڑھاتے ہیں اور گھبراہٹ میں یہ "ساغرِ مے" آپ کے ہاتھ سے چھوٹ کر "دودھوں نہاؤ" کی دُعا دینے لگتا ہے اور آپ یہ بھی نہیں کہہ پاتے کہ ع "ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں"

اِدھر آپ کے "جیب و آستیں" پر ہلکے کتھئی رنگ کے MONOTONE "تجریدی آرٹ" کے نقش و نگار اُبھرتے ہیں اور اُدھر محترمہ کے لعلِ شکریں پر ایک میٹھی معذرت گزار مسکراہٹ ——— وہ اپنے سگِ عزیز کو آغوشِ محبت میں گھسیٹ کر، اپنے لبِ نازک سے اُس پر مُہرِ محبت ثبت کرتے ہوئے فرماتی ہیں، "او ٹائیگر! ہاؤ نائی یو آر!!" ———

اردو کا وہ حسرت نصیب شاعر جو لبِ جاں بخش کے بوسوں کا ارمان دِل میں لئے یہ کہتا ہوا خاک میں مل گیا کہ ؎

پسِ مُردن بنائے جائیں گے ساغر مری گِل کے
لبِ جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مِل کے

اگر آج کسی طرح زندہ ہو جائے تو یہ منظر دیکھتے ہی ع۔ آتشِ رشک و حسد سے خاک ہو جائے وہیں،

اُس غریب کو تو خدا جانے، خاک میں مل کر بھی لبِ جاں بخش کے بوسے ملے یا نہیں، لیکن آج کی اِس تہذیب کے صدقے ایک سگ زادے کا دامن، "بے عرض و طلب" اِس "متاعِ گراں بہا" سے مالا مال ہو رہا ہے۔ اب بھی اگر کوئی نہ مانے کہ یہ دورِ حیات دورِ مساوات ہے تو اہلِ نظر کو کہنا پڑے گا کہ ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ۔ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

زبیر رضوی

امن کا ترانہ

امن انسانیت کا ترانہ
اے مرے ایشیا گنگنانا

امن ماتھے پہ جھومر کا ہنسنا
امن کانوں میں بندوں کا بجنا
امن ہاتھوں میں مہندی کا رچنا
چوڑیوں کا کلائی میں بجنا

امن انسانیت کا ترانہ

امن بچوں کی معصوم باتیں
امن تاروں بھری چاندراتیں
امن شوخی، نگاہوں کی گھاتیں
دل کی جیتیں، کبھی دل کی ماتیں
امن انسانیت کا ترانہ

امن بادل، گھٹا، بادوباراں
فصلِ گل، موسمِ شہریاراں
امن موسیقیٔ آبشاراں
پھول، شبنم، شفق، جوئباراں
امن انسانیت کا ترانہ

امن پاؤں میں پائل کی چھم چھم
شعر، نغمہ، غزل، گیت، سرگم
کیف و مستی، رفاقت کا عالم
وصل، جسموں کی تحلیلِ باہم
امن انسانیت کا ترانہ

امن غالب کی نازک خیالی
امن اقبال کی فکرِ عالی
امن ٹیگور کی لازوالی
امن نذرُل کی صوتِ بلالی
امن انسانیت کا ترانہ

امن ہاتھوں میں تیشے مچلنا
امن پتھر کا مورت میں ڈھلنا
امن فولاد و آہن پگھلنا
کارخانوں، مشینوں کا چلنا
امن انسانیت کا ترانہ

امن ہاتھوں کا ہاتھوں سے ملنا
چاکِ دل، چاکِ دامن کا سلنا
پیار، چاہت کے پھولوں کا کھلنا
والہانہ رفیقوں کا ملنا
امن انسانیت کا ترانہ
اے مرے ایشیا گنگنانا

افسانہ:

شبنم قیوم (سری نگر)

پھول بنے انگارے

اور پھر ایک چیخ کے ساتھ یہ آواز گونجی کہ دھرتی کا پہلا انسان عرش پر آگیا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ زیادہ سے کم از کم ایک مصنوعی سیارہ خلا کی طرف داغ دیتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دریا کے کنارے ایک انسان کھڑا تھا۔ مگر دریا میں زیادہ زور و شور نہیں تھا۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ۔ اس روز پہلا ہاتھ اپنے ہاتھوں کا بھونپو بنا کر اخبار کی تازہ خبر پڑھنے نکلا تھا۔ ایک خبر تہلکہ آفرین۔ آواز گونجنے سے پہلے دریا کے کنارے کھڑا انسان اپنی شکل و عقل اور اپنی صنعت سے بیزار تھا۔ اور انسان عرش پر جانے والے جب خلا میں گردش کرنے لگا۔ تب . . . . . .

پھر ایک چیخ کے ساتھ یہ آواز گونجی کہ عرش کا پہلا انسان دھرتی میں ڈوب گیا۔

ان دنوں اکثر لوگ اسے یہ قیاس بھی کیا تھا۔ ایک غریب مگر نیک انسان دریا کے کنارے کھڑا نہ جانے کیا کر رہا تھا۔ وہ سطح آب پر اپنی صورت کو بنتے اور منتشر ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جب اسے اس بات کا مکمل یقین ہوا کہ میں کامیابی کی ساری حدود پار کر کے فرش سے عرش پر آگیا ہوں تو وہ اپنا توازن کھو کر لڑکھڑایا اور دھڑام سے دریا میں کود گیا۔

بوڑھی ماں عام لوگوں کی طرح شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں، امیروں اور رئیسوں کو بھی آج اپنے ہاں دیکھ کر حیرت میں اس طرح ڈوب رہی تھی۔ جس طرح اس کا بیٹا گمنامی میں دریا میں ڈوب گیا تھا۔ سارے شہر میں نہ صرف سلطان کے پانی میں ڈوبنے کا انکشاف ہو رہا تھا بلکہ اس کے ہم ایک لاکھ روپے کی لاٹری لگنے کا چرچا بھی ہو رہا تھا ——— آج سلطان کو سبھی جانتے تھے۔ سب اس کے یار دوست تھے سب سیٹھ ساہوکار اس کے ساتھی تھے۔ آج کے بجائے اگر سلطان کبھی کسی گاڑی کے نیچے آکر مر بھی گیا ہوتا تو شاید ہی اس کے مرنے کا اتنا چرچا ہوتا ———

موت کی دنیا سے لوٹ کر جب سلطان ایک لاکھ روپے کا تصور کرتا تو اسے شادی مرگ ہونے لگتی۔ لوگ حیران و ششدر آرہے تھے اور اسکو جان پہچان ایک لاکھ روپے پانے کی مبارک باد دے کر جاتے تھے۔ اردگرد پڑوسی رشک و حسد کو ایک طرف رکھ کر اسے نظر بد سے بچنے کے لئے تدبیر دینے کی تلقین کرتے تھے اور بہت ساری باتیں بتا کر واپس جاتے تھے۔

بوڑھی ماں جب اکیلے میں ان سب باتوں پر جو وہ دوسروں کی زبانی سنتی غور کرتی تو اس کے پلّے کچھ بھی نہ پڑتا۔ اور غور و فکر کے آخری مرحلے تک پہنچ کر وہ ہر بار اپنے آپ سے کہنے لگتی ———

یہ لوگ کیا کہتے ہیں ——— ؟ میرا بیٹا شادی مرگ میں مبتلا ہو گیا تھا ——— ؟ وہ دریا کے کنارے کون سی غیر مرئی شے دیکھ کر دریا میں ڈوب گیا تھا ——— ؟ اور جب اسے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا تو وہ پریشانی کے ساتھ حیران بھی ہوتی ———

بوڑھی ماں کے نزدیک روپے پیسے کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ چاہے روپیہ ایک ہو، ایک سو، ایک ہزار یا ایک لاکھ۔ اس لئے نہیں کہ وہ روپے کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس لئے بھی نہیں کہ وہ سرمایہ داری کے خلاف تھی۔ دراصل وہ ایسی بدنصیب بوڑھی تھی جس نے بچپن سے لے کر اب تک اپنے ہاتھوں روپے پیسے خرچ کئے اور نہ کبھی اس کے پاس روپے پیسے رہے۔ وہ اتنا بھی نہیں جانتی تھی کہ روپے سے سب کچھ بنتا ہے۔ روپے ہی سے

شان و شوکت ہوتی ہے وہ بالکل سادہ لوح تھی۔ اس کی نظر میں رہنے کو جیسا بھی ایک ٹھکانہ ہو، پیٹ پالنے کے لئے روکھا سوکھا ہو اور تن ڈھانکنے کیلئے جیسا بھی پہننے کو ملے اپنی زندگی میں نہ اس نے اس کے سوا کچھ دیکھا اور نہ ہی وہ دیکھنے کی خواہش کی۔ اُسے جو ہوئے کافی وقت ہو چکا تھا اس کا اثاثہ اس کی ایک بیٹی اور بیٹا تھا اور یہی اولاد اس کی ساری دھن دولت اور خوشی تھی۔ اگر اُسے کسی چیز کی تمنا تھی تو بس یہ تھی کہ میری یہ اولاد پھلے اور پھولے۔ گھر میں ایک بہو اور ایک داماد ہو اور زندگی کی وہی ایک گردش ہو۔

تاریخ کہتی ہے جب ہندوستان میں پہلی اونچی عمارت بنی اُس وقت لوگوں کے خیالات اُس سے بھی اونچے ہو گئے تھے پھر بھی لوگ دور دور سے اُس اونچی عمارت کو دیکھنے آتے تھے۔ کہتے ہیں اُس وقت ایک شخص نے اس اونچی عمارت کی طرف دیکھ کر فخر سے کہا تھا جب میں اس عمارت پر چڑھ جاؤں گا تو آنکھیں کھول کر مفت میں ہندوستان کا نظارہ کروں گا بیگرد سرا شخص سامنے آکر فوراً بولا تھا۔ جب میں اس اونچی عمارت پر چڑھوں گا تو آنکھیں بند کر کے اُوپر سے نیچے گر سکتے ہوئے خودکشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی وقت قطب مینار نے اس تضاد کو دیکھ کر اپنی حیثیت سے اونچا ہونے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

زمانہ کہتا ہے سلطان اپنی خاندانی روایات کے مطابق سیدھا سادا تھا۔ محنت مزدوری کر کے بہن اور بوڑھی ماں کو پالتا تھا وہ غریب ضرور تھا غریک اور رحمدل تھا۔ وہ جیسی بھی زندگی گزارتا تھا مگر اپنے حال میں مطمئن تھا وہ زمانے کے گورکھ دھندوں، سیاسی ہتھکنڈوں اور مذہبی سازشوں سے بالکل علیحدہ اپنی زندگی گذارتا تھا اس کی بہن بھی بڑی شرمیلی تھی۔ جوانی دہلیز جانے کے باوجود کبھی اس میں لغزش نہیں ہوئی تھی۔ اس کے دل میں صفائی اور پاکیزگی بھری تھی۔ دونوں بھائی بہن کو ماں سے ازحد محبت و عقیدت تھی۔

سلطان سے جب پوچھا جاتا تم اس ایک لاکھ روپے کا کیا کرو گے تو وہ مخصوص جواب دیتا ۔۔۔ میں یہ ساری دولت مسجدوں اور آستانوں کی نذر کر دوں گا۔ لاچاروں اور تنگ دستوں میں خیرات کروں گا۔ بیکسوں کی امداد کروں گا۔ اس کے اس جواب سے سب خوش ہو جاتے تھے۔ اور لگے ہاتھوں سرمایہ داروں کو گالیاں دینے لگتے تھے۔ جو سرمایہ سے سرمایہ جمع کرتے ہوئے غریبوں کا گلا گھونٹتے ہیں۔ غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ جو دولت مند ہوتے ہوئے بھی دولت کے لئے دن و رات ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ اپنی تجوریاں بھرنے کے لئے انکی شرافت اور انسانیت کو دیمک چاٹ لیتی ہے مگر ایک غریب جب اچانک دولت مند بن جاتا ہے تو وہ شرافت، سچائی اور انسانیت میں چار چاند لگا دیتا ہے۔

سلطان نے بیساری رحم ماں کے جوڑے کر کے گویا ایک بہت بڑے فرض سے چھٹکارا پا کر یقیناً جنت حاصل کر لی تھی۔ وہ لیکھ لاکھ روپے پانے کے بعد وہ ماہر بہت کم نکلتا تھا اس کے دل میں عجیب و غریب خیالات اور بہت سارے مسائل پیدا ہونے لگے۔ اسے اپنے آپ میں غیر معمولی تبدیلی بھی دکھائی دی۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات جنم لینے لگے تھے۔ اکیلے میں جب کبھی وہ اپنے ساتھ کسی دولت مند کی زندگی کا موازنہ کرنے لگتا تو اسے اپنے ان خیالات پر گھن آنے لگتی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی اپنے پرانا البادہ چھوڑ کر وہاں جانا چاہتا تھا جہاں زندگی کی حسرتیں نہیں بلکہ حسرتیں ہوتی ہیں۔

وہ دن میں کئی بار مان روپیوں کو دیکھ لیتا تھا اور گھنٹوں ان کو تکتا رہتا تھا۔ روپے کے بنڈلوں کو تکتے تکتے وہ اپنے ساتھ اپنی موجودہ پوزیشن و بھول کر وہاں دیکھ لیتا تھا جس کا ایک عام انسان خیال ہی کر سکتا ہے۔ سوچ کی اس دنیا سے لوٹ آکر جب آپ ہی آپ اس کے منہ سے ہاش نکلتے نکلتے رہ جاتا تھا اس میں ایک حرکت سی پیدا ہوتی اور فوراً کوئی اس کے اندر سے کہتا۔ اے نادان دولت کی ذکفری میں الفاظ کا ہاش کہاں ہوتا ہے۔ اس دولت کے ملنے کے بعد جب سلطان بازار کی طرف جاتا تو اس کے منہ کے بجائے خیالات میں پانی بھرنے لگتا۔ اور وہ دل ہی دل میں کہتا اپنی دولت سے سب کچھ لیتا ۔۔۔۔۔ اور بوڑھی ماں سوچنے لگتی تھی۔ کیا ایک لاکھ روپے لیتے ہوتے ہیں جس سے ہمارے لئے اچھے کپڑے اتنا سارا سامان آ سکتا ہے۔ جب کبھی بوڑھی ماں اور بہن سے سلطان کہتا۔ اب ہم یہاں نہیں رہیں گے بلکہ کسی اور جگہ جا کر رہنے کے لئے ایک کوٹھی لیں گے تو اس کی بہن خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی۔ اور بوڑھی ماں ۔۔۔۔ وہ سوچنے لگتی۔ کیا دولت مند بن جانے کے بعد سب اپنے پڑوسیوں سے علیحدہ ہو کر رہتے ہیں یا وہ اپنا گھر بار کو چھوڑ دیتے ہیں۔

سلطان کو رفتہ رفتہ اس گندی بستی سے نفرت ہونے لگی جس میں اس کی ہی نہیں بلکہ اس کے والدین کی زندگی پروان چڑھ کر آخری منزل طے کر چکی تھی۔ اب تنگدست، لاچار اور غریب لوگ اس کو بہت بُرے لگتے تھے۔ کیونکہ اس کا اٹھنا بیٹھنا بڑے بڑے امیروں کے ساتھ ہونے لگا تھا سلطان

ئی ان سب باتوں کو اور بدلتے ہوئے خیالات کو دیکھ کر بوڑھی ماں سوچنے لگتی تھی۔

میرا بیٹا کیوں اپنا آبائی گھر چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ وہ مسجد دل اور آستانوں میں نذر و نیاز دینے کے بجائے اتنی ساری فیرنی چڑھوانے کیوں جاتا ہے۔ وہ غریبوں کی مدد کرنے کو آج بیوقوفی کیوں جانتا ہے۔ آخر یہ ایک لاکھ ریپے کیا ہوتا ہے ـــــ سلطان خود بھی اپنی بدلتی ہوئی حالت کو دیکھ کر اپنی نیت کو سمجھنے لگتا تھا لیکن کسی کو تیقن کچھ نہیں میں ملبوس دیکھ کر کسی کو اپنی شاہانہ کوٹھی میں رہ کر یا کاروں میں گھومتے پھرتے دیکھ کر یا ایسی ہی اور باتوں سے اس کے دل میں حسد پیدا ہونے لگتا تھا۔ اب آپ میں اس غیر معمولی تبدیلی کو دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اب ان لوگوں کے ساتھ مقابلہ کرنے پر اتر آتا ہوتا۔ جیسا باد زندگی بسر کر رہے ہیں آخر وہ بھی ایک برائی ہی سہی مگر کوٹھی خرید کر رہا اور کوٹھی حاصل کر لینے کے بعد اسے ایک کار کی بھی ضرورت محسوس ہوتی۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے شہر میں ایک ہراس سی پھیل گئی۔ سنتے ہی سنتے لوگوں میں زبردست سنسنی پھیل گئی۔ اخباروں میں یہ کہ اس خبر کی تشہیر کر رہے تھے ـــــ قلب مینار کے سامنے لوگوں کا ایک جم غفیر جمع ہو رہا تھا۔

اور سلطان کا ذکر پولیس کے سامنے بیان دے رہا تھا۔

جناب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے جو کچھ بھی معلوم ہے میں صاف صاف بتا دوں گا۔ مگر یہ سب کچھ بتا دینے سے پہلے ـــــ اگر آپ مجھے موقع دیں گے تو میں سلطان۔ اس کی بہن اور بوڑھی ماں کی زندگی کا حال مختصراً پیش کروں گا۔ کیونکہ میرے اس بیان کی روشنی میں آپ کو میرے غریبے سے اس واقعہ کے بارے میں بہت مدد ملے گی۔ جناب ـــــ میں سلطان کو بہ حیثیت کافی دیر سے جانتا ہوں بلکہ مجھے اس کے قریب رہنے کا بھی موقع ملا ہے۔ جب تک وہ غریب تھا وہ ایماندار اور شرافت کا مجسمہ تھا۔ اس کی بہن بھی بڑی سلیقہ شعار، پاکیزہ اور سنسکار والی تھی۔ ان کے بارے میں تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ دیوی تھی۔ آپ اسے جانتے نہیں ہیں۔ وہ بالکل سادہ لوح تھی۔ اس کا سارا اثاثہ اسکے بیوہ پھول تھے۔ اور وہ دونوں بوڑھی ماں کی پوجا کرتے تھے۔ پھر جناب :۔ آپ جانتے ہیں سلطان غریب سے امیر کیا بن گیا وہ تو فرش سے عرش پر پہنچ گیا۔ اور عرش پر پہنچنے کے بعد قدرتی طور پر اس کے خیالات بلند ہوتے۔ رفتہ رفتہ اسے غریب لوگوں سے نفرت ہونے لگی یہاں تک کہ وہ اپنے رشتہ داروں، ہمسایوں، پڑوسیوں اور علاقے کے لوگوں کو چھوڑ کر اس بستی میں رہنے کو چلا گیا جہاں بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار اور ٹھیکہ دار رہتے ہیں۔

اپنی کوٹھی میں آکر جب سلطان نے یہاں کے بڑے بڑے لوگوں کو دعوت دی جو اس نئی بستی میں رہتے تھے تو اس کی نئے لوگوں سے جان پہچان ہوئی۔ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہوا۔ ان لوگوں سے آہستہ آہستہ زندگی گزارنے اور کاروبار چلانے کے طریقے سیکھے۔ کوئی اگر اس کی کوٹھی کی باؤنڈری طریقے سے سجانے کی نئی نئی صلاح دیتا۔ کوئی اس کو روپے سے روپے پیدا کرنے کے طریقے بتاتا۔ غرض ہر کوئی اس کے ساتھ دوستی گانٹھ لیتا تھا۔ اس نئی دنیا میں آکر سلطان اور اس کی بہن نے محسوس کر لیا کہ اب تک وہ زندگی کچھ اور گزارتے تھے وہ ایک غریب تھا۔ اصل میں زندگی یہ ہے۔ کیونکہ اس نئی زندگی میں جس طرح سلطان کو نت نئی الجھنوں سے واسطہ پڑنے لگا تھا اسی طرح اس کی بہن کو بھی نت نئے دوست ملنے لگے تھے۔

جناب! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل سچ کہہ رہا ہوں سلطان اب فلم ایکٹرسوں کی طرف دیکھ کر گہرے بدلتا تھا اور اس کی بہن چست لباس پہننے کے ساتھ میک اپ بھی خوب کرنے لگی تھی۔

جناب! نئی سوسائٹی کے ساتھ گھل مل کر دونوں بہن بھائی اب ہوٹلوں کے اور کلبوں میں بھی جانے لگے تھے۔ اس طرح سلطان کسی نئی لڑکی کے ساتھ اور اس کی بہن کسی نئے دوست کے ساتھ جب رات رات بھر غائب رہنے لگے تو بوڑھی ماں سخت پریشان ہوئی۔ اس نے کتنی بار میرے سامنے اپنی بیٹی یا بیٹے کو اس بے حیائی یا بے غیرتی سے باز رہنے کے لئے کہا مگر جناب ـــــ سلطان اس کا مذاق اڑا کر کہتا ـــــ

"تم تو دیہاتی لوگ ہی بوڑھی ہو، اسی لئے خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ یہ ایسی ہی سوسائٹی ہے۔ یہاں ایسی باتوں کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ زندگی اسی کا نام ہے اس سے پہلے جو زندگی ہم یہاں جھونپڑی میں گزارتے تھے میں اس پر لعنت بھیج کر تمہیں یہاں اس اسٹیج پر لے آیا ہوں۔ تم کھاؤ، پیو اور عیش کرو۔ تم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھو مگر زبان مت ہلاؤ۔ . . . . . میری اچھی ماں!

سلطان کے اس رویے سے پریشان ہو کر بوڑھی ماں جب کبھی اپنا دکھڑا بیٹی کو سناتی تو وہ بھی ہنس کر کہہ دیتی۔

"تم تو پرانے زمانے کی عورت ہو، اس زمانے میں تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ تم بھی اگر میری طرح جوان ہوتیں تو ضرور اس زندگی کا لطف اٹھاتیں"

جناب ان باتوں کے سنتے سے بوڑھی ماں کے سوکھے خون میں ایسی گرمی پیدا ہوجاتی کہ وہ اس کوٹھی کو اکھاڑ نے کے بعد اس سوسائٹی کو بھی آگ لگا دینا چاہتی تھی مگر اس میں اتنی سکت نہ تھی۔

اب میں آپ کا وقت زیادہ نہیں لوں گا۔ اس لئے میں اپنا اصلی بیان پر آتا ہوں۔ ــــــ جناب! میں کہہ رہا تھا کہ رات جب یہ حادثہ ہوا میں کوٹھی پر موجود تھا سلطان کی بہن چند دنوں کو ملی سے فیرحاضر رہنے کے بعد واپس آئی تھی۔ شام کو اس نے مجھے بلوا کر کہا کہ میں آنے کو ہی تھا۔ واپسی پر میں نے بوڑھی ماں کو اطلاع دی کہ آپ کی بیٹی شاید بیمار ہیں۔ تو بوڑھی ماں ہزار ناراضگی ظاہر کرنے کے باوجود بھی اٹھ کر آئی اور بیٹی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ لیکن جب اسے اندر سے دروازہ نہ کھولے جانے کا جواب ملا تو اسے کچھ شک ہوا اور وہ دوسرے کمرے میں آکر گھنٹوں روتی رہی۔ اپنی پرانی اور نئی زندگی کا موازنہ کرکے خون کے آنسو بہاتی رہی۔

جناب! رات کے بھی کوئی بارہ بجے۔ سوئے ہوئے کو وہ اٹھ کھڑی ہوئی لیکن ایک دم چکرا کر گر گئی۔ میں کافی کوشش کرکے اسے ہوش میں لے آیا۔ مگر جب وہ اپنے ہوش میں آئی تو جناب ــــــ اس نے دیوانہ وار اٹھ کر اس سیف کو توڑ دیا جس کو مجھ جیسے تین آدمی بھی نہیں توڑ سکتے تھے۔ اور اس سیف میں سے اس نے سارے نئے کپڑے روپے نکال کر ڈھیر لگا دیا۔ اور پھر اس ساری دولت پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی کیونکہ اس کی نظر میں یہی دولت قصوروار تھی۔ جس نے اسے آج یہ سب کچھ دکھایا تھا۔ جب وہ نوٹوں کو آگ لگا رہی تھی تو اسی وقت سلطان باہر آیا جب اس نے روپے کے بڑے بڑے بنڈل جلتے ہوئے دیکھے تو جناب ــــــ! سلطان اس وقت نشے میں تھا۔ اپنی اس دولت کو جلتے ہوئے دیکھ کر دیوانہ ہوگیا۔ وہ اپنی بوڑھی ماں کو ننگی ننگی گالیاں دینے لگا۔ لیکن جب اس طرح بھی اس کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے بوڑھی ماں کو بازو اور ٹانگوں سے پکڑ کر اسی آگ پر رکھ دیا۔ جب تک کہ اس کے کپڑوں میں بھی آگ نہ لگ گئی۔

جناب! میں نے اپنی آنکھوں سے بوڑھی ماں کو اس آگ میں جلتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اسے بچانے کی کوشش بھی کی مگر۔۔۔۔۔ جناب! سلطان یہاں سے سویرے سویرے چلا گیا۔ وہ آپ کو قطب صاحب کی اونچائی پر مل سکتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں وہ وہاں پر آنکھیں کھول کر اپنے پیش کا نظارہ کر رہا ہے یا آنکھیں بند کرکے خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آپ وہاں جاکر دیکھ لیجئے۔

بہترین خوشبو
تازگی اور
خوش ذائقہ

لاکھوں آدمیوں کی پسند

بابا

اس کا میٹھی دل کو خوش کرنے والی خوشبو اور دل پسند ذائقہ کے لئے لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ پان کے ساتھ کھانے سے اس کی خوشبو ذائقہ کو بڑھا دیتی ہے اور عرصہ تک اس کی تازگی بنی رہتی ہے۔ فہرست مفت حاصل کیجئے

تیار کردہ دھرم پال پریم چند۔ چاندنی چوک۔ دہلی۔ ۶

نقلی و ملتے جلتے مال سے
ہوشیار۔ دہلی والوں کا
"بابا چھاپ"
دیکھ کر خریدیئے

غزل

سحر رامپوری

○

خونِ دل خونِ جگر جانے دو
اپنا گلشن ہے، سنور جانے دو
ہر ستم حد سے گزر جانے دو
زندگی اور نکھر جانے دو
غمِ دنیا، غمِ عقبیٰ، غمِ دوست
کوئی وقفہ تو گزر جانے دو
لٹ چکے ہیں لب و رخسار بہت
رونقِ شام و سحر جانے دو
چند تنکے سہی، یاد آئیں گے
قصۂ برق و شرر جانے دو
شبنم و گل سے بھی باتیں ہوں گی
سرخیٔ دیدۂ تر جانے دو
اور ہی کچھ ہے بھٹکنے کا مزا
جس طرف جائے نظر، جانے دو
یہ جو بیمار سی لگتی ہے حیات
وقت کی نبض ٹھہر جانے دو
منع کرتا ہوں میں کب ہنسنے کو
ظالمو زخم تو بھر جانے دو
تم کہو گے؟ تو سحر کس دل سے
میر کا سوز و اثر جانے دو

غزل

راہی قریشی

○

مضطرب ہیں سب ہی جورِ گردشِ تقدیر سے
اب تو پہلوئے سکوں بدلے کسی تدبیر سے
ظلمتِ شب میہماں ہے اور تھوڑی دیر کی
دوستو مایوس کیوں ہو صبح کی تنویر سے
ہائے جتنا خوبصورت خواب دیکھا تھا کبھی
آج اُتنا ہی ہُوا غم خواب کی تعبیر سے
لوگ تو ہیں محبت کر کے بھی ہیں سُرخرو
اور ہم رسوا ہوئے اخلاص کی توقیر سے
جسم ہو سکتے ہیں زنداں میں سلاسل کے اسیر
حوصلے باندھے نہیں جاتے مگر زنجیر سے
آپ کا اعجاز گویائی سرآنکھوں پر مگر
تلخیٔ غم کیا مٹے شیریٔ تقریر سے
یہ نیا انداز دیکھے تو کوئی انصاف کا
اب سزا ملتی ہے پہلے جرأتِ تقصیر سے
دل شکن ہے حادثوں کا سلسلہ راہی مگر
یہ بھی ممکن ہے کہ مل جائے سکوں تقدیر سے

مقالہ:-

رشید الدین

آندھرا پردیش میں اُردو مُوقّف

اگست ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی تو عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ ہندوستان میں اُردو کے لئے عملاً کوئی مقام باقی نہیں رہا اس کے بعد نومبر ۱۹۵۶ء میں جب زبان کی بنیادوں پر ہندوستان کی تنظیم جدید عمل میں آئی تو اُردو کو ایک دھچکا پہنچنے کی وجہ سے رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ چنانچہ اُردو داں حضرات نے پراسن اور متحدہ طور پر اس کے لئے جدوجہد شروع کی اور یہ مطالبہ کیا کہ اُردو کو یو۔پی، پنجاب اور دہلی کی، جہاں یہ زبان بڑے پیمانے پر بولی جاتی ہے، سرکاری زبان بنایا جائے۔ آج بھی اُردو دوستوں کا یہ مطالبہ برقرار ہے اور وقتاً فوقتاً وہ اپنی بساط کے مطابق اس کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح تقسیم کے فوری بعد اُردو کے تعلق سے جس قسم کا اندیشہ ظاہر کیا جا رہا تھا وہ بڑی حد تک صحیح ثابت ہوا۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ مرکزی حکومت کے بعض ارباب مقتدر اور بعض ریاستی حکومتوں کے سربراہ اس کے لئے خصوصی حل سے کوشاں بھی رہے کہ اُردو کو ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ مراعات ملیں۔ اس سلسلے میں پنڈت جواہر لال نہرو اور بنجبانی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جنھوں نے زندگی بھر اُردو کی وکالت کی اور یہ ان ہی کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ اردو کشمیر کی سرکاری زبان قرار دی گئی۔

ریاستی حکومتوں میں اردو کے تعلق سے سب سے فراخ دل حکومت آندھرا پردیش نکلی۔ سابق وزیر اعلیٰ آندھرا پردیش شری سنجیوا ریڈی نے جو ان دنوں مرکز میں فولاد و معدنیات کے وزیر ہیں، بڑے کھلے دل سے سابق ریاست حیدرآباد کی زبان اردو کو تسلیم کیا۔ اور نہ صرف زبانی طور پر اس زبان کے ترقی یافتہ ہونے کا اقرار کیا بلکہ عملی طور پر بھی اسے تلگو کے بعد ریاست کی دوسری سرکاری زبان قرار دیا۔ شری سنجیوا ریڈی نے یہ تاریخی اعلان کہ اُردو زبان تلگو کے بعد ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہوگی۔ تشکیل آندھرا پردیش کے چھ ماہ بعد اُردو دانشوروں کے ایک جلسہ میں کیا تھا جو نظام کالج حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا۔

اس کے بعد سے آندھرا پردیش کی سیاست اور نظم و نسق میں کئی قلابازیاں آئیں۔ کئی وزراء بدل گئے کئی اعلیٰ عہدہ دار علیحدہ یا علاحدہ ہو گئے۔ قیادتیں بھی تبدیل ہوئیں۔ شری سنجیوا ریڈی کے بعد شری ڈی۔ سنجیا اور پھر بعد میں شری برہمانند ریڈی وزیر اعلیٰ ہوئے مگر اُردو کے تعلق سے حکومت کی پالیسی میں کوئی فرق نہیں آیا اور صرف قول ہی کے نہیں بلکہ فعل کے اعتبار سے بھی اردو آندھرا پردیش کی دوسری سرکاری زبان رہی۔ خصوصاً موجودہ وزیر اعلیٰ شری برہمانند ریڈی تو اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی فراخ دل اور وسیع النظر نکلے۔ حال ہی میں جب تلگو کو سرکاری زبان بنانے کے تعلق سے قانون سازی پر زور دیا جانے لگا اور بعض اُردو دوستوں اور انجمنوں کی جانب سے اس تشکیک کا اظہار کیا گیا کہ آیا قانون میں اُردو کا تذکرہ بھی ہوگا یا نہیں شری برہمانند ریڈی نے ایک سے زائد بار اس بات کا صاف اور واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ مسودۂ قانون میں اردو کا بھی تذکرہ کیا جائے گا۔ چنانچہ اس قانون کا مسودہ تیار کر لیا گیا ہے جو اسمبلی کی میقاتِ مارچ میں پیش کیا جائے گا۔

ریاستی حکومت کے اس عمیق اور رہنماؤں کے اس فراخ دلانہ بیانات سے قطع نظر جب ہم سنجیدگی سے اس بات کا

جائزہ لیتے ہیں کہ اُردو کو واقعی ریاست کے نظم ونسق میں کتنا دخل ہے اور اردو اقلیت کو یہاں کتنی مراعات اور سہولتیں دی گئی ہیں تو یہ حقیقت ہم پر واضح ہوجاتی ہے کہ کم از کم یہاں قول وفعل کا تضاد نہیں پایا جاتا بلکہ عمل اور بیانات میں تکمیل ہم آہنگی پائی جاتی ہے راقم الحروف کوئی چھ سال سے حکومتِ آندھرا پردیش سے وابستہ ہے اور محکمۂ ترجمہ میں اُردو کا مترجم ہے۔ اس طرح میں برادری کے دیگر لوگوں کی بہ نسبت اس بات سے زیادہ باخبر ہوں کہ اس ریاست میں اُردو کا کتنا عمل دخل ہے اور اردو داں کو کتنی مراعات اور سہولتیں حاصل ہیں۔

آیئے سب سے پہلے تعلیمی میدان کا جائزہ لیں۔

ریاست آندھرا پردیش میں اردو ذریعہ تعلیم کے جتنے مدارس ہیں یا جتنے طلبا اپنی مادری زبان اُردو میں تعلیم حاصل کرتے ہیں میں نہیں سمجھتا اتنے مدارس یا طلبا کی اتنی تعداد اس وقت ہندوستان کی کسی اور ریاست میں ہوگی۔ یہاں تلنگانہ کے علاوہ دیگر لسانی اقلیتوں کو اس بات کی آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں دلائیں۔ جس مدرسہ میں بھی طلبا کی تعداد تیس ہو وہاں اردو پڑھانے کا بھی انتظام ہے۔ اگر کسی جماعت میں صرف دس لڑکے پڑھنے کے خواہاں طلبا ہوں تو وہاں اردو تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اگر کسی مدرسہ میں اُردو کے طلبا کی ناخواندہ تعداد موجود نہ ہو تو انھیں ایسے مدارس میں منتقل کردیا جاتا ہے جہاں اردو ذریعہ تعلیم کا انتظام ہو۔ تحتانوی کے علاوہ وسطانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر بھی اردو ذریعہ تعلیم کا انتظام موجود ہے مگر ایسی صورت میں علاقائی زبان کے طور پر تلگو کی تعلیم لازمی ہے مگر عثمانیہ میٹرک اور آندھرا میٹرک کے لئے تلگو بھی لازمی نہیں۔ اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے لئے طلبا کی تعداد فی جماعت (۴۰) ہے۔

اُردو ذریعہ تعلیم کے اساتذہ کے لئے علاوہ ٹریننگ کا بھی انتظام ہے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے تعلق سے ریاست میں جو پوزیشن یکم نومبر ۱۹۵۶ء کے بعد تھی وہی آج تک قائم ہے اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی گئی۔

جامعاتی سطح پر بھی اُردو ذریعہ تعلیم کا انتظام ہے اور ایسے اداروں اور کالجوں کو حکومتِ آندھرا پردیش اور جامعۂ عثمانیہ تسلیم کرتی ہے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کے کالجوں میں اُردو اختیاری مضمون اور زبان دوم کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کالج اور اردو آرٹس کالج حیدرآباد میں ایسے تعلیمی ادارے ہیں جہاں جامعاتی تعلیم اردو میں دی جاتی ہے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس اور کالجوں کو بھی حکومت اسی طرح امداد دیتی ہے جس طرح کی امداد تلگو اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے مدارس اور کالجوں کو دی جاتی ہے پولیس ایکشن (۱۹۴۸) اور تنظیم جدید (۱۹۵۶) کے بعد کالجوں اور جامعہ عثمانیہ میں اردو مضامین اختیاری کے طلبا کی تعداد گھٹ گئی تھی مگر پچھلے چند برسوں سے پھر اس تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے اور ہر سال یہ اضافہ جاری ہے۔ چنانچہ ایم۔ اے اردو میں چھ آٹھ سال قبل بمشکل چھ آٹھ طلبا ہوتے تھے آج تیس تیس اور چالیس چالیس طلبا ہیں۔

یہ تو تھی تعلیم کی پوزیشن ——— اب ذرا عدل والصاف کی طرف آیئے۔

ریاست آندھرا پردیش میں آج بھی بیشتر عدالتوں کی زبان اُردو ہے۔ ہائی کورٹ کے علاوہ بہت سی ماتحت عدالتوں میں بھی اُردو کا چلن ہے اور اسے تسلیم کیا جاتا ہے تلنگانہ کے نو اضلاع کے علاوہ علاقہ آندھرا کے تین اضلاع کرنول کڈپہ اور انت پور میں بھی اردو کو تلگو اور انگریزی کے ساتھ ساتھ عدالتی زبان تسلیم کیا گیا ہے اور ان اضلاع کی تمام عدالتوں میں اردو درخواستیں قبول کی جاتی ہیں۔ مجرمین، گواہان اور وکلا کو اردو میں بحث کی اجازت ہے۔ اکثر عدالتوں میں اردو مترجمین مامور ہیں۔

اب عام نظم ونسق کی طرف آیئے۔

ریاست آندھرا پردیش کے نظم ونسق میں اُردو کا پوری طرح رواج ہے۔ موجودہ احکام اور چلن کے مطابق یہاں انگریزی اور تلگو کے ساتھ ساتھ عوام سے اُردو میں بھی درخواستیں قبول کی جاتی ہیں اور ان پر کارروائی کرکے اُس کی اطلاع متعلقہ فریق

کو اردو ہی میں دی جاتی ہے البتہ بہت لمبی کارروائیوں میں فیصلے انگریزی میں کئے جاتے ہیں مگر اس کے ساتھ اردو ترجمہ بھی منسلک ہوتا ہے۔ جس علاقہ میں بھی ۱۵ تا ۲۰ فیصد آبادی اردو بولتی ہے وہاں تمام اہم سرکاری اعلانات وغیرہ انگریزی اور تلگو کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شائع کئے جاتے ہیں۔ عوام کی جانب سے استعمال کئے جانے والے فارم وغیرہ بھی اردو میں چھپوائے جاتے ہیں۔ تمام اہم قوانین، قواعد اور ضوابط انگریزی اور تلگو کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شائع کئے جاتے ہیں۔

مستقر حیدر آباد پر اس غرض سے ایک محکمۂ ترجمہ قائم ہے جہاں تلگو کے ساتھ ساتھ اردو، مرہٹی، کنڑی اور عامل کے مترجمین موجود ہیں۔ جہاں تک تلگو مترجمین کا تعلق ہے وہ تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ اس کے بعد اردو مترجمین کا نمبر ہے۔ محکمۂ ترجمہ حیدر آباد میں چھ اردو مترجمین ہیں (جن میں راقم الحروف بھی شامل ہے) ان چھ مترجمین پر ایک گزیٹیڈ عہدہ دار ہے جس کا کام صیغۂ اردو کی نگرانی اور تراجم پر نظر ثانی کرنا ہے۔ گزیٹیڈ عہدہ دار کے علاوہ اردو کا ایک سپرنٹنڈنگ افسر بھی ہے اور اردو کا ٹائپ رائٹر بھی موجود ہے۔ محکمۂ ترجمہ کے صیغۂ اردو میں تمام مسودات قانون اور حکومتی اعلانات کے اردو ترجمہ کے علاوہ عوام کی جانب سے پیش کی جانے والی اردو درخواستوں، حکومت کی سابق اردو کارروائیوں، عدالتی فیصلوں اور سابق ملازمین کے کارنامہ جات ملازمت (سروس ریکارڈس) کے انگریزی ترجمے شامل ہیں۔ محکمۂ ہذا میں تلگو اور اردو کے مترجمین کے علاوہ ایک ایک مترجم مرہٹی، کنڑی اور تامل کا بھی ہے۔

محکمۂ ترجمہ کے علاوہ محکمۂ اطلاعات میں بھی صیغۂ اردو موجود ہے جس کا ایک گزیٹیڈ عہدہ دار بھی ہے۔ یہاں بھی دو مترجمین اور ریڈرس موجود ہیں۔ یہاں سے شہر کے اردو اخبارات کو سرکاری خبریں روانہ کی جاتی ہیں اور اردو اخبارات میں شائع شدہ عوامی شکایات کا انگریزی ترجمہ متعلقہ محکمہ اور عہدہ دار کو بھجوایا جاتا ہے۔ یہاں سے حکومت آندھرا پردیش کا سرکاری رسالہ "آندھرا پردیش" بھی شائع ہوتا ہے جو انگریزی، تلگو اور ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شائع ہوتا ہے۔ یہ محکمہ حکومت اور عوام کے درمیان رابطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح اس کے صیغۂ اردو کا کام حکومت اور اردو داں افراد کے درمیان ربط قائم رکھنا ہے۔

علم و ادب کے معاملے میں بھی حکومت آندھرا پردیش اردو داں حضرات کی سرپرستی و اعانت کرتی ہے۔ کئی اردو کتب خانوں، اداروں اور انجمنوں کو سرکاری امداد دی جاتی ہے۔ ساہتیہ اکیڈیمی آندھرا پردیش تلگو کے ساتھ ساتھ اردو شاعروں اور ادیبوں کی کتابیں بھی شائع کرتی ہے اور انھیں انعام بھی ملتا ہے۔ بہت سے ضعیف العمر شاعروں اور ادیبوں کے وظائف بھی مقرر ہیں۔ اردو اخبارات اور رسائل کو حکومت کے اشتہارات بھی بلا کسی تفریق کے جاری کئے جاتے ہیں۔ یہاں کے اردو اخبارات کو بھی حکومت اہم سمجھتی ہے اور اردو اخبارات کے ذریعہ چلائی جانے والی کسی تحریک پر فوری توجہ دیتی ہے۔

حکومت آندھرا پردیش کی ملازمت میں داخل ہونے کے لئے زبان کی کوئی رکاوٹ نہیں۔ مقررہ قابلیت رکھنے والے کوئی بھی امیدوار لئے جا سکتے ہیں۔ البتہ تقرر کے بعد دو یا تین سالوں میں مقررہ تلگو ٹسٹ کامیاب کرنا ضروری ہے۔ تقرر کے وقت جن کی عمر ۴۵ سال سے متجاوز ہو چکی ہے، تلگو ٹسٹ سے مستثنیٰ ہیں۔ آندھرا پردیش پبلک سروس کمیشن کے مسابقتی امتحانات میں مضمون اختیاری اردو بھی لیا جا سکتا ہے۔ بعض مسابقتی امتحانوں میں مضمون نویسی اور ترجمہ بھی شامل ہوتا ہے جس کے دو مضامین کی صورتوں میں بھی اردو کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

تقریباً اردو داں ملازمین کو بھی حکومت نے پوری پوری مراعات دی ہیں۔ بعض ملازمین کو ایسے صیغوں پر متعین کر دیا گیا ہے جہاں وہ تھوڑی بہت انگریزی جان کر کام چلا سکتے ہیں۔ بعض ملازمین کی صورت میں اس جائداد کے دوش بدوش انگریزی

جانے والے اشخاص کے لئے عارضی جائیدادیں قائم کی گئی ہیں اور اسی طرح اردو داں ملازمین برائے نام دفتر آتے جاتے ہیں اور اصل کام نئے تقرر شدہ انگریزی جاننے والے ملازمین کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ سہولت کوئی حکومت کسی زبان والوں کو کیا دے سکتی ہے؟

یہ ساری باتیں بُرائی نہیں ہیں بلکہ ٹھوس حقائق پر مبنی ہیں۔ ریاست میں لسانی اقلیتوں کو دئے گئے تحفظات کا ضابطہ خود وزیر اعلیٰ نے قبول کی ہے جن کی مدد اس سلسلے میں مستعد اعلیٰ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ محکمۂ نظم و نسق عامہ کے نائب مستعد لسانی اقلیتوں کے تحفظات سے متعلق امور کے عہدہ دار مجاز ہیں جو ریاست مستعد اعلیٰ کی ہدایات کے تحت ان فرائض کو انجام دیتے ہیں۔ ضلع کی سطح پر کلکٹران ضلع اس کام کے مکمل نگراں ہیں۔ اوپر بیان کردہ تحفظات کے تعلق سے اگر کہیں عمل نہ ہو رہا ہو تو وزیر اعلیٰ، مستعد اعلیٰ یا نائب مستعد محکمۂ نظم و نسق عامہ کو اس سلسلے میں توجہ دلائی جا سکتی ہے۔

اوپر بیان کی گئی باتیں کسی سنائی یا خوش عقیدگی پر مبنی نہیں بلکہ محکمۂ نظم و نسق عامہ حکومت آندھرا پردیش کے جی۔ او نمبر ۱۲۲۴ سے ماخوذ ہیں جو ۱۲ نومبر ۱۹۶۴ء کو جاری کیا گیا اور انگریزی کے علاوہ جس کا ترجمہ اردو، کنڑ اور مرہٹی میں بھی کیا جا کر جریدۂ آندھرا پردیش غیر معمولی میں اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے حکومت نے اس جی۔ او کو لسانی اقلیتوں کی واقفیت کے لئے الگ سے کتابچہ کی صورت میں بھی شائع کیا ہے۔

بہرحال آندھرا پردیش میں اُردو کا موقف بہت اچھا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان کی دیگر ریاستیں، خصوصاً آندھرا پردیش کی پڑوسی ریاست مہاراشٹر اس کی تقلید کرے۔ دیگر ریاستوں کے لئے آندھرا پردیش کے اس تجربہ سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ دو زبانوں کے رائج ہونے سے نظم و نسق میں کوئی بدنظمی نہیں پیدا ہوتی بلکہ اسی طرح اپنی ریاست کی سب سے بڑی اقلیت کو مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ ریاستی حکومت اردو کے تعلق سے فراخ دلانہ پالیسی اختیار کرے تو مرکزی حکومت بھی ایسی ریاستوں میں اردو کی ترقی کے لئے کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ حیدرآباد سے اب آل انڈیا ریڈیو اُردو میں بھی علاقائی خبریں نشر کر رہا ہے۔

۱۵ سال پہلے ۱۹۵۰ء میں "شاعر" نے

مشاعرہ نمبر

پیش کیا تھا اور اُس کے بعد اس نمبر کی تقلید بھی ممکن نہ ہو سکی

معمہ کی طرح تھا

"ان ہی اندھیروں سے بزم گیتی کو ایک دن روشنی ملیگی"

اور اس معمہ پر سیماب اکبرآبادی۔ آرزو لکھنوی۔ جوش ملیح آبادی۔ اثر لکھنوی۔ وحشت کلکتوی، نوح ناروی، ماچی جامی، جوش ملسیانی، حمید صدیقی لکھنوی۔ تلوک چند محروم۔ سراج لکھنوی۔ بیخود اکبرآبادی۔ ساغر نظامی۔ رزق صدیقی۔ ماہر القادری منظر صدیقی۔ وارث کرمانی۔ شاد عظیم آبادی۔ بہزاد لکھنوی۔ شفیق جونپوری۔ شمیم کرہانی۔ عرش ملسیانی۔ منظر لکھنوی جیسے چوٹی کے شعراء کے علاوہ ستر سے زیادہ دوسرے معروف شعراء کی طرحیں شریک ہیں۔ ۲۰۰ شعراء کی تصاویر اس نایاب نمبر کی قیمت ۱۹۵۰ء میں ایک روپیہ چار آنے تھی اور اب چار روپیہ علاوہ محصول ڈاک ہے

منیجر "شاعر" پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۴۰۰ بی سی

ارباب ذوق کے لئے

"شاعر" کے سالنامے اور خاص نمبر

"شاعر" نے اب تک بے شمار "سالنامے" اور خاص نمبر پیش کئے ہیں جو اپنے حسن و معیار کے اعتبار سے بیحد مقبول ہوئے۔ ان میں ادب و شعر، تنقید و تحقیق اور افسانہ و ڈرامہ کا نہایت قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ سیکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان کی تھوڑی چند کاپیاں باقی رہ گئی ہیں۔

سالنامہ ۱۹۵۱ء دو روپے
جمہوریت نمبر ۱۹۶۱ء ڈیڑھ روپے
سالنامہ ۱۹۶۳ء ڈیڑھ روپیہ
سالنامہ ۱۹۶۵ء ایک روپیہ
سالنامہ ۱۹۶۶ء ایک روپیہ بارہ آنے

افسانہ نمبر ۱۹۵۲ء دو روپے
افسانہ نمبر ۱۹۶۳ء ایک روپیہ دس آنے
خاص نمبر ۱۹۶۳ء ایک روپیہ چار آنے
ڈرامہ نمبر ۱۹۶۴ء ایک روپیہ بارہ آنے
خاص نمبر ۱۹۶۶ء ایک روپیہ

منیجر "شاعر" پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۴۰۰ بی سی

اسرار اکبرآبادی

پرواز

جھکی جھکی سی ہیں اونچائیاں فضا گم صم
دھوئیں میں ڈوبا ہوا ہے زمیں کا گرم آلاؤ
گھلے گھلے ہیں اندھیروں کے منجمد سائے
خود اپنے آپ میں الجھا ہے راستوں کا گھماؤ

حیات و موت کی ساری حدیں تمام ہوئیں
کہ اس مقام سے آگے کوئی بھی راہ نہیں
تصورات کا ٹھہراؤ یہ خلا ہی خلا
اکیلی اونگھتی خاموشیوں کی تھاہ نہیں

ہٹی مٹی سی لکیریں یہ زرد زرد نشاں
کبھی عرب کا پیمبر ادھر سے گذرا تھا
خلا کو پار کیا حسنِ دو جہاں کے لئے
وہ آسمانوں کی گہرائیوں میں اترا تھا

یہ میرے سامنے اونچی سی روئی کی دیوار
گھلی گھلی سی شعاعوں کے سرنگوں پرچم
ابھر رہی ہیں یہاں آکے وقت کی لہریں
پلٹ رہے ہیں شب و روز لے کے کچھ موسم

اندھیروں اور اجالوں کا سرمئی ماحول
ہوا میں تیرتی روحوں کی جنبشوں پہ سکون
ازل کی پیاس ہے پرچھائیوں کے ہونٹوں پر
خیالِ حسن سے ہوتی ہے دائروں میں دکھن

عجیب درد بھرا کشمکش کا عالم ہے
مگر چراغ جلانا ہے روشنی کے لئے
زمیں کے واسطے اونچائیوں پہ آیا ہوں
مجھے پلٹ کے بھی جانا ہے زندگی کے لئے

یقین و عزم کے سائے میں گرمیٔ پرواز
تمام عالم و حرکت کی ایک ہے آواز

کلیم راہی

افسانہ:۔

کون اپنا کون پرایا

شام کا سرمئی رنگ رات کی سیاہی میں پوری طرح غرق ہو چکا تھا۔

وہ بڑی سرعت سے تار آفس میں داخل ہوا اس کے چہرے پہ تفکرات کی گہری لکیریں تھیں۔ شیو کافی بڑھا ہوا تھا۔ لباس بھی زیب تن نہ تھا۔ سرخ سرخ آنکھوں میں ایک ایسی گہری چمک تھی جو انسان کی آنکھوں میں اس وقت آجاتی ہے جب وہ امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔

تار آفس میں سناٹا سا تھا۔

صرف ایک ادھیڑ عمر کا کلرک لوہے کا جنگلہ والا سیٹی بچ پر بیٹھا ہوا تھا جو شاید کسی شہر کی منڈی کا بھاؤ جاننا چاہتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ہلکی سی بڑبڑاہٹ کے ساتھ کچھ حساب لگا رہا تھا۔ حساب کے دوران وہ بار بار غلطی کر جاتا تھا اور پھر ہر غلطی کے بعد اس کی پیشانی پر جھلاہٹ کی ہلکی سی لکیریں ابھر آیا کرتی تھیں۔

تار آفس کے لمبے لمبے ٹیلی گراف مشینوں کی ٹک ٹک جاری تھی اور بوڑھا ونڈو کلرک، جس کے چہرے پہ تجربات کی انگنت جھریاں تھیں اور بالوں میں کثیر تعداد میں چاندی کے تار جھلک رہے تھے سیاہ کافی دار عینک لگائے بڑے انہماک سے کچھ لکھ رہا تھا۔

اور نے پوسٹ ٹرنک کال کرنی ہے ۔۔۔" وہ الجھے الجھے لہجہ میں ونڈو پر جھکتے ہوئے بولا۔

"نمبر بتلائیے" بوڑھے ونڈو کلرک نے نظروں کو اوپر اٹھایا۔

"۲۵۵۲۰"

"ہاں یاد آیا کل بھی تم نے اسی نمبر پر دو بار ٹرنک کال کیا تھا۔" بوڑھے ونڈو کلرک کی بوڑھی و تھکی ہوئی مچھلی سی آنکھیں عینک کے سفید شیشوں سے جھانکنے لگیں۔

"جی ہاں"۔

"اور ادھر سے کسی نے کال ریسیو بھی نہیں کی تھی ۔۔۔؟" وہ ترچھی نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تیزی کے ساتھ بولا

"جی ہاں"۔

"وہ لوگ تمہارے کون ہوتے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ جن سے تم بات چیت کرنا چاہتے ہو ۔۔۔؟" بوڑھے ونڈو کلرک کے چہرے پہ جھریوں کے درمیان خلوص کا رنگ سمٹ آیا۔

"چچا زاد بھائی ہیں"۔

"اوہ ۔۔۔ شاید تم کچھ روپے منگوا رہے ہو ۔۔۔" اس نے معنی خیز نظروں سے اس کی حالت کا جائزہ لیا۔

"جی ۔۔۔ کچھ ایسی ہی بات ہے ۔۔۔" اس نے گھٹے گھٹے لہجہ میں جواب دیا۔

اس گفتگو کے بعد بوڑھا ونڈو کلرک خاموش ہو گیا۔ مگر اس کی بوڑھی آنکھیں جو کچھ کچھ دھندلا گئی تھیں عینک کے سفید شیشوں کے پیچھے پھیلتی اور سکڑتی جا رہی تھیں۔ وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔

"روپیہ ۔۔۔؟ روپیہ بہت بڑی شئے ہے بابو ۔۔۔ بہت بڑی شئے ہے۔ لوگ روپیہ کی خاطر کیا کچھ نہیں کرتے ۔۔۔ اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں، اپنے اصولوں کو سر بازار نیلام کر دیتے ہیں۔ اپنے آدرشوں کا بے رحمی سے گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ روپیہ تو بھگوان بن گیا ہے بھائی ۔۔۔ البتہ کی پدوی پا گیا ہے ۔۔۔ کون ہے جو اس البتہ کو اپنے مندر سے دور کرنا چاہتا ہو ۔۔۔؟"

وہ عجیب عجیب نظروں سے بوڑھے ونڈو کلرک کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔

چند منٹوں بعد بوڑھے وندو کلرک نے اُس سے پانچ روپیہ کا نوٹ لیا۔ اس کی کال بک کی اور فون کا نمبر ڈائل کر کے ایکس چینج کو اس کا مطلوبہ نمبر دے دیا۔

"کتنی دیر لگے گی۔ لائن تو کلیر ہے نا ۔۔۔؟" اس کے لہجہ سے بے چینی مترشح تھی۔

"لائن تو کلیر ہے ۔۔۔ پھر بھی بیس پچیس منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔" وندو کلرک نے متین لہجہ میں جواب دیا۔

"میں انتظار کر سکتا ہوں۔" وہ دھیمے لہجہ میں بولا اور وہیں بنچ پر بیٹھ گیا۔

اس کا ذہن جاگ رہا تھا، سُرخ آنکھوں میں کئی رنگ ابھرتے اور ڈوبتے چلے جا رہے تھے اور ماضی کی کتاب دھیرے دھیرے وقت کے ہاتھوں کھلتی چلی جا رہی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا ۔۔۔

"اختر فراز میرا اچھا دوست ہے۔ بڑا آدمی ہے۔ روپے پیسے کی ریل پیل ہے اُس کے لئے پانچ سو روپے کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ میری مدد ضرور کرے گا۔ آخر میرے اور اس کے درمیان سالہا سال کے اچھے مراسم ہیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ میرے اس کے مابین خون کا بھی رشتہ تو ہے نا۔ لیکن وہ میرے خطوط کا جواب کیوں نہیں دے رہا ہے۔ میں اب تک کوئی چھ ایکسپریس خط اس کے نام پوسٹ کر چکا ہوں۔ اسے لکھتا رہا ہوں کہ والدہ کی طبیعت بہت خراب ہے اس لئے وہ مجھے پانچ سو روپے کا منی آرڈر کر دے۔ مگر پتہ نہیں کیوں وہ خاموش ہے۔ ہاں ایسا بھی نہیں ہے کہ میں نے وہ پانچ سو روپے کا طلبیہ اور مانگے ہوں۔ میں نے تو روپے قرض کے طور پر طلب کئے ہیں۔ پتہ نہیں کس وجہ سے ۔۔۔ نہ تو وہ میرے خطوط کے جوابات ہی دے رہا ہے اور نہ ہی کال ریسیو کر رہا ہے جبکہ کل کسی نے فون ہونے کی گھنٹی بجائی تھی میں نے نقرئی قہقہوں کی ہلکی ہلکی آوازیں بھی سنی تھیں۔ شاید کوئی اقربیہ تھی؟ تو پھر اسے کال ریسیو کرنے میں کیا مار پڑتی ۔۔۔؟ وہ انکار بھی تو کر سکتا تھا ۔۔۔ یا اپنی مجبوریاں بھی تو بتا سکتا تھا۔ مگر خدا جانے کس لئے اُس نے کال ریسیو نہیں کی ۔۔۔؟

اگر آج اس نے کال ریسیو نہیں کی تو میں اسے کبھی بھی معاف نہیں کروں گا۔ میں اس بات کو فراموش کر دوں گا۔ وہ میرا اچھا دوست ہے۔ اس سے بڑھ کر میری توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں اپنے دل میں اس کے لئے بے پناہ پیار رکھتا ہوں اور وہ مجھ سے صرف اس لئے دور بھاگ رہا ہے کہ میں نے اُس سے پانچ سو روپے قرض مانگے ہیں۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ رائے پور سے باہر ہو۔ کل ہی ایک اخبار میں میں نے اس کی مسکراتی ہوئی تصویر دیکھی ہے۔ وہ ایک ہیرے کے ایوارڈ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور پھر آج ہی صبح جب الاند حسین سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے رات کل برلا سینما ہال میں دیکھا تھا۔ تو کیا؟ کیا اختر فراز بھی ان ہی لوگوں کی صف میں آ کھڑا ہوا ہے جن کی نگاہوں میں روپیہ مذاق کی حیثیت رکھتا ہے۔؟ تو کیا اب میری امیدوں اور آرزوؤں کا خون ہو جائے گا؟ کیا اعتماد کی روشنیاں گل ہو جائیں گی اور ہر طرف گہری اور طویل تاریکی پھیل جائے گی؟ کیا وہ بنیادیں جنہیں میں نے پتھر کی چٹان سمجھ رکھا ہے ریت کے گھروندوں کی طرح ڈھیر ہو جائیں گی اور مستقبل کے سارے روشن خواب پت جھڑ کے درد پتوں کی طرح بکھر جائیں گے۔ اور کیا ۔۔۔ والدہ ؟ ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ وہ نہیں ۔۔۔ وہ نہیں ۔۔۔ نہیں نہیں ۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا ۔۔۔ کبھی نہیں ہو سکتا ۔۔۔ کبھی نہیں ۔۔۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا ۔۔۔" وہ بڑبڑانے لگا۔

بازو بیٹھا ہوا موٹی توند والا بیٹھا ہوا بوڑھا کلرک وندو کلرک دونوں چونک کر اس کے چہرے کو تکنے لگے۔

مگر وہ تو اپنی دنیا میں گم تھا۔

سیٹھ نے تھوڑی دیر بعد اُس پر سے نظریں ہٹا لیں اور زیر لب بڑبڑایا ۔۔۔

"شاید کوئی اسکرو ڈھیلا ہو گیا ہے ۔۔۔" اور پھر اپنے حساب میں کھو گیا۔

مگر بوڑھا وندو کلرک ایسی نظروں سے اُس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جیسے اگر اس کا بس چلے تو وہ ابھی کیش بکس میں سے پانچ سو روپیہ نکال کر اُس کے حوالے کر دے تاکہ اُس کا چہرہ مسکراہٹوں سے بھر جائے۔ مسرتوں اور خوشیوں سے سرخ ہو جائے۔ اور اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں زندگی کی رمق جاگ اٹھے۔ مگر ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟ بوڑھا وندو کلرک چاہتے ہوئے بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا حکم نہیں مانا جا سکتا تھا۔ کیش بکس میں پڑے ہوئے نوٹ اس کے نہیں تھے؟ اس کی ملکیت تو صرف اس کے پرانے بوسیدہ کوٹ کی اوپری

یا تھی جس میں دس روپے کا ایک پرانا سکہ پڑا ہوا تھا اور
کی پرانی اور بوسیدہ جیب کے بھی تو کئی حصہ دار تھے۔ وہ تنہا
مالک تھوڑے ہی تھا۔ تین جوان کنواری بیٹیاں تھیں جن کے ہاتھ
دن کی فکر روز بروز اس کے چہرے کی جھریوں میں اضافہ کر رہی تھی
میں چاندی کے تار بڑھتے چلے جا رہے تھے اور آنکھوں کی جوت
کو گھٹتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کس کس کی مدد کرے گا۔ کس کس
بلا سکے گا۔ پتہ نہیں ہر روز کتنے لوگ اس تار آفس میں
ہوں گے جن کی مدد وہ کرنا چاہتا ہوگا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا ہوگا۔
یے سوچ کر وہ کچھ [illegible]

"ٹرن..... ٹرن..... ٹرن... فون کی گھنٹی
پڑی

"ہیلو... اچھا۔ اچھا۔" بوڑھا وہ ٹھوکر مار کر ماؤتھ پیس
ہلا اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔

"اے پور ۲۵۵۲"

"لائیے" اس نے چونک کر بوکھلاہٹ سے بھرے ہوئے انداز
بڑی سرعت کے ساتھ کھڑکی کی سلاخوں میں سے ہاتھ ڈال کر ریسیور
دیا۔ جبکہ وہ بڑے اطمینان سے بازو میں بنے کیبن میں کھڑے
رابطہ کر سکتا تھا۔

"ہیلو۔" وہ ماؤتھ پیس میں چیخا۔

"ٹرن ٹرن..... دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں تھا۔

"ہیلو۔" وہ دوبارہ چیخا۔

"ٹرن ٹرن..... مگر ابھی خاموشی تھی۔

"ہیلو۔" اس نے تیسری بار کہا۔

"ہولڈ آن پلیز۔" ریسیور اٹھا کر کسی نے بازو رکھ دیا ہے۔
ایک چیخ آپریٹر کی آواز ابھری۔

"اوہ۔" اس کے حلق سے ایک سرد آہ نکلی

"آپ ٹھہریئے میں پانچ منٹ بعد پھر کنیکشن دیتا ہوں۔"
بڑبڑایا۔

"شکریہ۔" کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اور پھر سوچ کی تاریک گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ بوڑھا وہ ٹھوکر
معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے ایک لمحہ کے لئے
کا جیسے اس کی بوڑھی دھندلائی آنکھیں بڑبڑانے لگی ہوں۔

"روپیہ۔" وہ بڑبڑایا۔ "روپیہ بہت بڑی شے ہے بابو۔۔
بہت بڑی شے ہے۔۔۔ لوگ روپے کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتے۔
اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں۔ اپنے اصولوں کو سرِ بازار نیلام کر دیتے ہیں
اپنے بلند آدرشوں کا سرِ عام گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ روپیہ تو بھگوان
بن گیا ہے بھائی۔ اس نشے کی لت پڑ گئی ہے۔ کون ہے؟
وہ اس نشے کو اپنے اندر سے دور کرنا چاہتا ہو۔"

آسمان بڑی تیزی سے گہرا رہا تھا۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ اور
اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ [illegible] ہوگا۔ ڈاکٹر کا بل دو سو
روپیہ تک پہنچ گیا ہے۔ وہ اب کسی بھی صورت میں آپریشن کے لئے رضامند
نہیں ہوگا۔ آپریشن تو دور کی بات ہے شاید اب وہ دوا بھی دینے پر راضی
نہ ہو۔ اس نے کل ہی ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا تھا کہ وہ کل تک روپوں کا
بندوبست کر لے ورنہ دوا نہیں ملے گی۔ پرائیویٹ دواخانہ ہے کوئی
خیراتی ہسپتال تھوڑے ہی ہے۔ ہم یہاں مفت میں پانی نہیں دیتے۔ دوا
دیتے ہیں۔ دوا اور دوا کی قیمت ہوتی ہے۔؟

"لیجئے۔" کوئی کال ریسیو کر رہا ہے۔ بوڑھا وہ ٹھوکر
کوئی تین چار منٹ بعد اس سے مخاطب ہوا۔

اور وہ چونک کر ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

"لائیے۔" اس نے پہلے سے زیادہ سرعت سے ریسیور اچک لیا
"ہیلو۔ میں جاوید بول رہا ہوں۔ کیا اختر بھائی ہیں؟"
"اختر نواز صاحب اور ان کے تمام گھر والے کل ہی کشمیر چلے گئے
ہیں۔" دوسری طرف سے آواز ابھری۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں نرس کا بیچ ہوں۔"

"او۔ کب تک آ جائیں گے؟"

"بھلا میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

"اوہ۔ ٹھیک ہے۔ شکریہ۔"

"شکریہ۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

جاوید نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کا چہرہ اب پہلے کی طرح
مرجھا گیا تھا۔ آنکھوں میں جو چمک تھوڑی دیر پہلے تھی اور ختم ہو چکی
تھی اور اس کی جگہ ایک گہری حسرت اور مایوسی جھلک رہی تھی۔
اس نے کال کاٹ دی۔ بجی ہوئی ریسیور کانوں سے لگائی اور پھر قدموں

نادر آفس کے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

"ہیلو۔ مسٹر جاوید۔۔۔" ایک جانی پہچانی سی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"اور اُس نے اپنی نگاہوں کو اوپر اٹھا لیا۔

"یار۔۔۔ اتنے تو کھوئے کھوئے رہا کرو۔ کالج لائف ختم کرنے کے بعد تم ایسے گم ہو گئے جیسے دودھ میں شکر۔ مدتوں کبھی ہمیں بھی ملنا ملانا۔۔۔" اس کے سامنے بشیر علی کھڑا ہوا تھا۔

گول گول چہرہ، کشادہ پیشانی، چھوٹے چھوٹے بال، اور آنکھوں پر سنہری کمانی کی عینک۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

جاوید کو یاد آنے لگا کہ اُس نے ایک بار بشیر علی کو بہت برا بھلا کہا تھا۔ اور اس پیشانی میں اس کی اسٹک کی مار سے لگنے والے گہرا نشان اب بھی بشیر علی کی کشادہ پیشانی پر چمک رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو۔۔۔؟"

"آں۔۔۔۔ ہاں۔۔۔ جاوید چونک پڑا۔

"شاید کچھ پریشان ہو۔۔۔؟ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ ذرا بھائی صاحب کو ٹرنک کال کرنے آیا تھا۔" جاوید اپنے الجھے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"کیوں خیریت۔۔۔؟" بشیر علی کے لہجے سے بے تکلفی ٹپک رہی تھی

"یہی کچھ روپیوں کی ضرورت تھی۔۔۔"

"مل گئے۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔"

"کیا کہا۔۔۔؟"

"وہ رائے پور میں نہیں ہیں۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ تو پھر آؤ میرے ساتھ۔۔۔" وہ اُسے لیکر کار تک آگیا جاوید کی آنکھوں میں گہرا تحیر تھا۔

"کتنے روپیوں کی ضرورت ہے۔۔۔؟"

"آں۔۔۔۔" جاوید کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آئی تھی۔

"ہاں ہاں۔۔۔ کہو کتنے روپیوں کی ضرورت ہے۔۔۔؟" اس میں گہرا خلوص تھا۔

"پانچسو۔۔۔" جاوید نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیں۔۔۔ یہ لو۔۔۔" بشیر علی نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے نوٹ نکال کر تین سو کے پانچ نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔

مگر جاوید جامد و ساکت کھڑا ایسی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا جیسے اپنی سماعت اور بینائی پر یقین نہ آرہا ہو۔

"اب لو بھی یار۔۔۔" بشیر علی نے بے تکلفانہ انداز میں نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیئے۔۔۔ "اور ہاں، ذرا ٹھہرو میں ابھی ایک نار کر کے آتا ہوں پھر ہم ساتھ ہی چلیں گے۔ بشیر علی نے اسی لہجہ میں کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر آفس کی طرف بڑھ گیا۔●●

●شوکت تھانوی نمبر ●افسانہ نمبر
●ہندی کہانی نمبر ●عباس حسینی نمبر
کے بعد

ماہنامہ کتاب لکھنؤ

کا ۔ سالنامہ ۱۹۶۶ء شائع ہو گیا۔
جس میں ملک کے مشاہیر اہل قلم نے حصہ لیا ہے
صفحات ۱۶۰ قیمت ڈیڑھ روپیہ
۔زرِ سالانہ چھ روپیہ بھیج کر یہ نمبر مفت وصول کیجئے
مینیجر ماہنامہ کتاب۔ چوک لکھنؤ ۳

بیان بابت ملکیت و جملہ تفصیلات "شاعر" بمبئی
(فارم نمبر ۴ ۔ رول ۸)

۱۔ مقام اشاعت۔ بمبئی ۲۔ وقفۂ اشاعت۔ ماہانہ
۳۔ پرنٹر۔۔۔ اعجاز صدیقی
۴۔ پبلشر۔۔۔ " "
۵۔ قومیت۔ ہندستانی
۶۔ ایڈیٹرز۔۔۔ اعجاز صدیقی۔ ہندستانی
۷۔ قومیت۔۔۔ ہندستانی
۸۔ پتہ۔۔۔ ۱۲ دینا ناتھ بلڈنگ۔ تیسری منزل، فاکلینڈ روڈ بمبئی ۴
۹۔ ملکیت۔۔۔ اعجاز صدیقی

میں اعجاز صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجۂ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔
۲۸ فروری ۱۹۶۶ء (دستخط) اعجاز صدیقی

داہی

الزام

قبیلۂ شعراء کو ہے یہ شکایت عام
مشاعرے میں جو آتے ہیں سامعینِ کرام

بجائے اس کے کہ دیں برمحل سخن کی داد
بجائے اس کے کہ سُنتے رہیں بغور، کلام

کبھی تو ہیں بُتِ اخفش کی طرح چُپ بیٹھے
کبھی تو ہوئے دینے کو دادِ بے ہنگام

کبھی تمسخر و تضحیک کی چلا کے غُلیل
ہیں کرتے درہم و برہم مشاعرے کا نظام

مرا مشاہدہ اس باب میں کچھ اور بھی ہے
نہیں ہے جس میں ذرا بھی مبالغے کا قوام

مشاعرہ میں وہ اک سطحِ مُرتفع کہ جہاں
قریب صدر فروکش ہیں شاعرانِ عظام

وہ خاص صف کہ جہاں کی فضا ادب آموز
وہ خاص صف کہ جو ہے مرکزِ نگاہِ عوام

سماں وہاں کا کلب گھر سے کم نہیں ہوتا
سخنوروں کے لئے ہے وہ خوش گپی کا مقام

پُرانے دوست ملے ہیں جو بعد مدت کے
تو ہو رہا ہے بہ اخلاصِ دل، سلام و کلام

کسی کے لب پہ یہ شکوہ کہ جھیڑ مقطع جو بست
ذرا بھی پھر نہ وہ گاڑی میں کر سکا آرام

لتا کی دُھن میں کوئی گنگنا رہا ہے غزل
کہ خوش گلوئی میں ہے آج کل اُسی کا نام

غُنودگی کے ہے عالم میں کوئی مست بخواب
کوئی ہے گھات میں حاصل کرے شراب کا جام

جُگالیاں کوئی کرتا ہے پان کھا کھا کے
کوئی چبانے میں مصروف ہے بینا بادام

بنا رہا ہے فضا میں دھوئیں کا کوئی محل
بنا رہا ہے کوئی شاعرِ شکستہ کام

کسی کو حفظِ مراتب کی فکر لاحق ہے
پکارا جائے فلاں سے نہ پہلے میرا نام

ہر اک کے دل میں یہ خواہش کہ سب سُنیں اُس کو
مگر وہ دوسرے شاعر کا خود سُنے نہ کلام

کھڑا ہو کوئی بھی مائک پہ رنگ ہے یکساں
ذرا تو شعر سُنائیں کہ حُرمت الاکرام

نظر ملی تو ذرا مسکرائے دیکھ لیا
پھر اس کے بعد نہ شاعر ہے ذہن میں نہ کلام

ادب کے محتسبوں کو یہ غور کرنا ہے
کہ سامعین کہاں تک ہیں مُوردِ الزام

احمد جمال پاشا

عبداللہ ناصر کی ظرافت

"اودھ پنچ" (دور ثانی) کے شعرا میں عبداللہ ناصر ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ "سرپنچ"، "اپنچ"، "لفچوں"، "دلی پنچ"، "پنجاب پنچ"، "لاہور پنچ"، "علی گڈھ پنچ"، "الکشاف"، "شیرازہ" اور دوسرے ظریفانہ اخبارات میں ان کا طنزیہ اور مزاحیہ کلام بڑی دھوم دھام سے شائع ہوتا تھا۔

"اودھ پنچ" سے "انقلاب بمبئی" تک مزاحیہ شاعری میں عبداللہ ناصر کے یہاں ہمیں وہی صحت مند رجحانات ملتے ہیں جن کو اکبر الہ آبادی اور ظریف لکھنوی کی دین کہنا مناسب ہوگا۔

ان کے "اودھ پنچ" کے معاصرین میں ظریف لکھنوی، شہباز بلند پرواز، ہندی ندیم، المست شاہ پوری، نشتر جسنہ نگر، حقا، کرمل، سرکوب فتح پوری، سرشار کمنڈوی، قمر جیادی، دولہا گیادی، زار ہندی، ریاض جبولی، ہوش جبولی، اصغر شاہ پوری، اخا اور فیض قدیر بھگوی اور بعد کے دور میں اکبر لاہوری، خضر تمیمی، شوکت تھانوی، سید محمد صغیر حسن مسافر، لق لق، مجید لاہوری طرفہ جیلپوری، اسعد ملتانی، رئیس امروہوی، شہباز لدھیانوی، مائل دہلوی، شوق بہرائچی، شاد عارفی، داہی اور شاہد صدیقی وغیرہ کی جھلک ایک اہمیت رہے گی۔

عبداللہ ناصر ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کو شب کو انتقال ہوا۔ اس طرح انھوں نے ۶۳ برس کی عمر پائی۔ تقریباً ۴۰ سال کی عمر سے مزاحیہ شاعری شروع کردی تھی کیونکہ ۱۹۲۲ء کے مزاحیہ اخبارات میں ان کا کلام ملتا ہے اور تقریباً ۱۹۶۲ء تک ملک کے ظریفانہ رسائل میں ان کا مزاحیہ کلام یا اس کی نقلیں ملنے لگتی ہیں۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ عام طور پر ان کی ایک ہی قسم کی چیزیں ایک وقت متعدد معاصر اخبار و رسائل میں ملتی ہیں۔

معلمی کے پیشے کے ساتھ انھوں نے خاموشی کے ساتھ اپنے اس شوق کی بھی ہمیشہ آبیاری کی۔ اودھ پنچ کے "قطعات" اور "نظمیں" سے "انقلاب" کے تازیانے تک ان کا یہ رنگ ہمیشہ قائم رہا۔

عبداللہ ناصر نے تقریباً ۴۰ سال تک ہمیں ظرافت کی آبیاری کی اور اس میں الوان و اقسام کے گل بوٹے کھلائے۔

عبداللہ ناصر کی ظریفانہ شاعری محض وقت گزاری نہیں تھی۔ اس میں ہمیشہ انھوں نے اصلاح کا پہلو اپنے پیش نظر رکھا۔ اودھ پنچ کے مکتب والے ہمیشہ سماجی اصلاح اور واضح مقصدیت پیش نظر رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے عبداللہ ناصر اودھ پنچ کے شعرا میں اکبر اور ظریف سے زیادہ قریب ہیں۔

ان کے موضوعات میں ہمیں نصف صدی کے تغیر پذیر سماجی رجحانات کی رنگا رنگی اور گہری مقصدیت کی چھاپ ملے گی۔ اس کی جھلک بھی دیکھئے۔

پیٹ امام

اصلاح کا خیال نہ تنظیم کی ہے فکر — گو اس کے ہاتھ مقتدیوں کی لگام ہے

دن رات حلوے مانڈے کی جو سوچتا رہے　　وہ پیش امام کاہے کو ہے پیٹ امام ہے

روزہ

کان، ناک، ہاتھ، پاؤں اور منہ کا　　ہے یہ ممکن ہوں سدا روزہ
اس پرستان بمبئی میں مگر　　غیر ممکن ہے آنکھ کا روزہ

شیرافگنی

کل تلک شیرافگنی میں جس کو حاصل تھا کمال　　آج نکلا گھر میں ایک چوہا تو وہ گھبرا گیا
اس میں یہ جرأت کہاں آنکھیں ملائے شیر سے　　آئینے میں اپنی ہی آنکھوں سے جو شرما گیا

نئی تعلیم کی افادیت کے بارے میں ان کے یہاں بھی شک و شبہ ملتا ہے۔ تعلیم کے سرکاری اور دفتری ہونے کا ان کو بھی احساس رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ موجودہ تعلیم سب کچھ بنا دیتی ہے مگر بس، آدمی نہیں بنا پاتی۔

کالج

نکلتا ہے کلرکوں کا یہاں سے ایک بڑا لشکر　　نکلتے ہیں یہیں سے ڈاکٹر، انجینئر، لیڈر
یہیں سے ایکٹر اور ایکٹریسیں بھی نکلتی ہیں　　نکلتا ہے مگر کالج سے کوئی آدمی بنکر؟

عبداللہ بھرے یہاں جدید موضوعات کی فراوانی ہے۔ مکانوں کی قلت، پردہ اور بے پردگی، فیشن ازم اور عشق بازی، بے جا آزادی، غرض ہر فیشو پر بھی ان کے یہاں بہت کچھ مل جائے گا۔

سڑک چھاپ مجنوں

انھیں بھیج دو جیل، کوڑے لگاؤ　　جو چاہو سزا دو، نہیں کوئی شکوہ
سڑک چھاپ مجنوں، مگر کم نہ ہوں گے　　کہ آزاد ہیں ایکٹریس چھاپ لیلیٰ

فارن منسٹر

وہ ہوم منسٹر تھیں تو گھر میں تھی اک رونق　　لڑتی تھیں کبھی مجھ سے سنتیں کبھی سناتیں
فارن منسٹر ہیں جس دن سے مری بیگم　　تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں

آپ اپنی لڑکیوں کو مردانگی سکھائیں　　فٹ بال اور ہاکی کرکٹ انھیں کھلائیں
پتلون پہنوائیں اور بال بھی کٹائیں　　شوشو جتن سے ان کی نسوانیت مٹائیں
لیکن میں آپ سے یہ اک بات پوچھتا ہوں　　کل باپ وہ بنیں گی، یا وہ بنیں گی مائیں

نوجوانوں کی منطق

رہے گا حسن پر کنٹرول جب تک　　نگہ کی چور بازاری رہے گی
نقاب و پردہ کی رسموں کے ہوتے　　رہے گی تاک جھانک اپنی رہے گی

نئی تہذیب کے کچھ اور نمونے بھی دیکھئے اور ان کے مطالعے اور مشاہدے کی داد دیجئے۔

فرمائش

بے تکلف دوست سے ملنے گیا میں اس کے گھر　　اس سے میں نے ٹھنڈا پانی مانگا پینے کے لئے
آدمی آنے دو شکر میں نے یہ اس سے کہا　　آج تم ہی بن رہا ہو آدمی میرے لئے

شاعر بمبئی

واسطہ

خدا کے نام پر پھینکا نہ کوئی ۔۔۔ نہ مانگا ایک بھی نام نبی پر
کیا اعلان جب مزدوں کا میں نے ۔۔۔ ہزاروں آ گئے اس ڈگڈگی پر

پلے بیک سنگر

وہ گانے جن کو سنکر تم کو اکثر وجد آیا ہے ۔۔۔ جنھیں گانا نہیں آتا انھوں نے ان کو گایا ہے
یہ ہیں پلے بیک سنگر کی کرشمہ سازیاں ناصر ۔۔۔ کہ جس نے چیل اور کوؤں کو بھی بلبل بنایا ہے

بناسپتی نوجوانی

اس پر تعجب آپ کو ہونا نہ چاہیئے ۔۔۔ فی گھنٹہ ایک میل اگر نوجوان چلے
پوڈر کا دودھ، ڈالڈا گھی کے ہیں یہ ریفن ۔۔۔ تانگا بھی گر چلے تو بہت ناتواں چلے

اور عبداللہ ناصر کا یہ مشہور شعر تو شاید آپ نے بھی سنا ہو ؎

زبردستوں سے جب پڑتا ہے پالا زیردستوں کا ۔۔۔ خطائیں ماننی پڑتی ہیں اپنی بے خطا ہو کر

آدھی صدی کے اس سرمایہ کے کھنگالنے پر بہت سے گوہر آبدار برآمد ہو سکتے ہیں، جن میں اخباری دنیا سے متعلق رہنے کی وجہ سے صفائی ہے اور کثرت مشق کے سبب ایک قسم کا نکھار اور خوشگواری ملتی ہے۔

اردو کی مزاحیہ شاعری میں عبداللہ ناصر کے اس مزاحیہ کلام کی ہمیشہ ایک اہمیت رہے گی۔

ان کے مزاحیہ قطعات میں جن وقتی اور ہنگامی کیفیات کا احاطہ کیا گیا ہے ان کا ہماری سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

اردو پنچ کے ایک اہم شاعر کی حیثیت سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اور ان کی مزاحیہ شاعری اور باغ و بہار تحریفات کی تازگی سدا بہار رہے گی۔

فوری آرام کے لیے

جوشینا

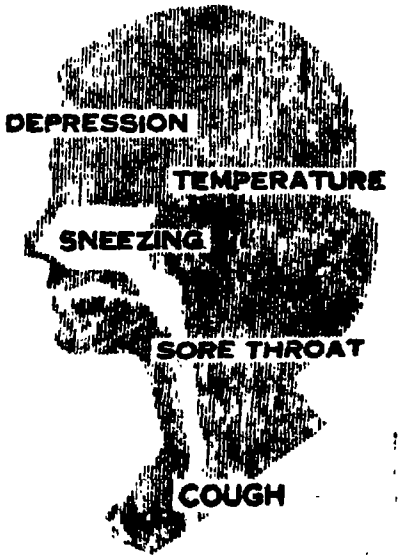

جوشینا کے اجزا جسم میں داخل ہوتے ہی تیزی سے سانس کی نالیوں کو صاف کرتے ہیں۔ زکام کے اثرات کو دور کرتے ہیں۔ حرارت اور اعضا شکنی کو روکتے ہیں۔ اور تسکین پہنچاتے ہیں۔

بمدرد

دہلی ۔ کانپور ۔ پٹنہ

غزلیں

مدحت الاختر

اپنے دونوں ہاتھ ہیں خالی، کون ہمیں پہچانے گا
دنیا دھن دولت کی سوالی، کون ہمیں پہچانے گا

لب پہ تبسم ہلکا ہلکا، چہرے پر خوابوں کی چمک
آنکھیں پیاسی روح سوالی، کون ہمیں پہچانے گا

ساری دنیا فرزانوں کی فرزِ کہن کی عاشق ہے
ہم نے نئی اک طرز نکالی، کون ہمیں پہچانے گا

پھول کہاں کے رنگ کیسے گلشن کا احوال نہ پوچھ
خار ملے ہیں ڈالی ڈالی، کون ہمیں پہچانے گا

ملنے کو تو دوست پرانے مدحت ہر ہر گام ملے
سب نے لیکن آنکھ چرالی، کون ہمیں پہچانے گا

علیم اللہ حالی

یہ رات، یہ چاند، یہ ہوائیں
بہتر ہیں کہ تیرے بن نہ آئیں

مدت سے جو گم ہے وہ غمِ یار
اب آئے تو ہم گلے لگائیں

پیدا ہوا دل میں آج پھر سوز
یادوں کی دہک اٹھیں چتائیں

گزری ہے دمِ فراق جو کچھ
سن پائے کوئی تو ہم سنائیں

اب تاب غمِ وفا نہیں ہے
کیا اُن کی جفا کو منھ دکھائیں

ہریشچندر دکھی جبالنوی

مشکلوں سے خود ہی ٹکراتے ہیں ہم
یوں بھی اپنے دل کو بہلاتے ہیں ہم

دامنِ دل میں لئے زخموں کے پھول
بے تری محفل میں پھر آتے ہیں ہم

ہر نفس ہوتی ہی رہتی ہے خطا
دیکھئے کیا کیا سزا پاتے ہیں ہم

کیا کہیں کیا ہیں رموزِ بے خودی
اک سرورِ جاوداں پاتے ہیں ہم

وادیٔ شعر و سخن میں اے دکھی
چند گل بوٹے کھلا جاتے ہیں ہم

اقبال ظاہر اکلکوٹی

ہر طرف شورِ وفا ہو جیسے
آسماں ٹوٹ پڑا ہو جیسے

دل دھڑکتا ہے کچھ ایسا سرِ شام
تو بس اب آ ہی رہا ہو جیسے

عارضِ حسن پہ عکسِ مہتاب
پھول پانی میں کھلا ہو جیسے

اشک یوں پیتے ہیں اہلِ ساحل
بوند پانی نہ ملا ہو جیسے

ظلم، بیداد، تغافل، طعنے
اُن کو ہر چیز روا ہو جیسے

تاثرات

اظہر افسر ——— آل انڈیا ریڈیو۔ حیدر آباد

سالنامہ بھی طلا اور رنگا رنگ بھی۔ سالنامہ مختصر ہے مگر خوب ہے۔ ایک چیز بھی تو بھرتی کی نہیں ——

اس بار آپ نے یہ اچھا کیا کہ حصۂ نظم حصۂ نثر سے الگ نہیں کیا۔ غزل نظم کی طرح ترتیب دادہ ہے۔ نظموں میں "مژدۂ غم ربا" "بیداریٔ ہند" "روشنی کی لہر" "الفاظ و کلام" "اردو" اور "مشورہ" موضوع کے اعتبار سے کامیاب نظمیں ہیں۔ خاص طور پر آپ کی نظم "مژدۂ غم ربا" بے حد پسند آئی۔ (غم ربا کی ترکیب بھی خوب ہے) دو طرح کے ایسے مشکل جذبات کی ترجمانی جیسی آپ نے اپنی نظم میں کی ہے، ان دنوں شاید ہی کسی اور نے کی ہو۔ پوری نظم مرصع ہے۔ یہ دو شعر تو میں نے بار بار پڑھے ہیں اور احباب کو سنائے ہیں۔

ایک شب کی بھی تو پروانے کو مہلت نہ ملی — کہ ذرا شمع سے تشریحِ وفا کر لیتا
کم سے کم اتنی ہی مل جاتی اسے رخصتِ مرگ — سینہ چاکانِ حوادث کی دوا کر لیتا

غزلوں کا انتخاب بھی کافی اچھا ہے۔

مقالات میں "منظر نگاری کا مفہوم" "سیماب کے ہیئتی تجربے" "گلدستۂ نسیم" بہت عمدہ ہیں۔ مقالہ "فنِ ڈرامہ نگاری اور انارکلی کے سلسلے میں کچھ جزئیات سے مجھے اختلاف ہے۔ انشاء اللہ اس متعلق سے میں کچھ لکھنے کی کوشش کروں گا۔ افسانوں میں "ایک رات" "پورنیما کی رات" "موم کا بدن" اور "دیوی" خوب ہیں۔ کنہیا لال کپور کا فکاہ "آنا صاحب" اور یوسف ناظم کا طنزیہ علم سے نظم تک بہت پسند آیا۔ غزل کچھ پھیکے پھیکے ہیں آپ نے جو اعلان کیا تھا کہ جنوری ۱۹۴۶ء میں ایک مجلہ ثانی ضخامت میں شائع کیا جائے گا۔ اسے سو فیصد سچ کر دکھایا۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی ——— شعبۂ اردو۔ گورکھپور یونیورسٹی۔ گورکھپور (یو۔پی)

آج "شاعر" کا سالنامہ موصول ہوا۔ آپ نے اس نمبر میں ملک کے مشہور و معروف ادیبوں کو یکجا کر دیا ہے۔ اس لئے اس نمبر کا معیار کافی بلند ہو گیا ہے۔ شاعر کا سالنامہ اعلیٰ معیار کا ہونا بھی چاہیئے۔

آپ کی نظم "مژدۂ غم ربا" بہت کامیاب ہے۔ اس میں فکر کی بلندی کے ساتھ فن کی پختگی بھی موجود ہے اسی لئے یہ نظم پر اثر ہے۔ اردو شاعری کو آپ کے قلم کی ضرورت ہے

کرشن چندر پر مضمون تقریباً تیار ہے۔ میں جلد ہی آپ کی خدمت میں اس کو روانہ کر دوں گا۔

پریتم سینی ——— نہرو کالج ——— بھجر (پنجاب)

"کرشن چندر نمبر" کے لئے ایک مقالہ بھیجوں گا جس کا عنوان "کرشن چندر اور اشتراکی حقیقت نگاری" ہوگا۔ آپ کا سالنامہ پڑھا۔ میری رائے میں ہندستان بھر کے شعر و ادب کا واحد اُونچا معیار کا رسالہ ہے۔ ایسے حالات کی کسی سختی کا شکار ہونے سے بچاتے رہیں۔ ویسے شاید علامہ سیماب اکبرآبادی کی یاد گار ہے۔ اسے ہمیشہ چھپتے رہنا چاہیئے۔ میں بھی اس کے چند معیار بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

آغا رشید مرزا ——— ۱۲ کانگریس ایجی ٹیشن روڈ کلکتہ ۱۶

جب کبھی شاعر پر نظر پڑتی ہے تو سوچتا ہوں کہ یہ اعجاز ہی تو ہے کہ شاعر زندہ ہے اور وہ بھی اس دور میں! ——— شاعر مانوس علم و ادب کا ظہور اب تک زندہ رہنا ہے اور زندہ رکھتا ہے۔

سالنامہ کا شمارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ "جرأت" میں کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں مگر یہ زبان آپ نے جو کچھ لکھا ہے، یقیناً وہ آپ ہی کی آواز ہے ——— آپ کو اس کے سنانے کا مبارک باد دیتا ہوں ———

شاعر کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے توسیع اشاعت کی کوشش اگر ضروری ہے اور یہی اس کی صحیح خدمت بھی ہوگی۔ میں حتی الامکان اس خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ امید ہے کہ کافی تعداد خریداروں کی فراہم کر سکوں گا۔

بر سبیل تذکرہ ——— حضرت سیماب مرحوم نے زمانہ ہوا، اپنی ایک نظم آل انڈیا ریڈیو دہلی کے مشاعرے میں پڑھی تھی۔ اس کا صرف ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ہے۔ دنیا کے ہر نئے ہنگامہ پر اس شعر کو ضرور دہراتا ہوں۔ اگر آپ کے پاس پوری نظم ہو تو کسی اشاعت میں ضرور شائع کریں۔

بلال کبریائی گھانے والا ہے زمانے پر ——— کوئی دن اور بندوں کو خدا سے کھیل لینے دو

مسعود محمد تاباں، ایم۔ اے ——— متوسط مرکز ادب ——— بدھوارہ۔ بھوپال

سالنامہ اس بار بھی صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے بے حد حسین ہے۔ آپ کی نظم "مژدۂ غم رہا" ایک آزمودہ انسان کے ان جذبات کی پوری پوری ترجمانی کرتی ہے جو تاشقند اعلان اور اس کے فوراً بعد شاستری جی کی موت سے اس کے ذہن و دماغ پر مرتسم ہوئے ہوں گے۔ یہی اس نظم کی آفاقیت اور ہمہ گیری کی دلیل ہے۔ نظم کا عنوان بھی بیحد پسند آیا۔ اس بار مضامین کا پلہ بہت بھاری ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر سلام سندیلوی، پروفیسر زرینہ ثانی، ندا فاضلی اور تمنا مظفر پوری کے مقالے مضمون نگاروں کے وسیع مطالعے کی غمازی کر رہے ہیں۔ زرینہ ثانی نے بڑی خوبی سے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ علامہ سیماب نے تجربے کی روایت کو آگے بڑھانے میں کتنا ناں حصہ لیا ہے۔ افسانوں میں قرۃ العین حیدر کی کہانی "ایک رات" ہر اعتبار سے ایک اچھی کہانی ہے۔ دیگر افسانوں میں اکرام جاوید کا "موم کا بدن" اور آمنہ ابوالحسن کا افسانہ "سمندر" بہت پسند آیا۔ پچھلے دنوں کنھیا لال کپور کے مضامین پڑھ کر جو مایوسی ہوئی تھی، آغا صاحب نے اس کی پوری پوری تلافی کر دی بلکہ تھوڑی سی ایڈوانس بھی۔

منظومات میں خلیل الرحمٰن اعظمی، متین سرمدشی، سلام فیلی شہری، شاذ تمکنت، رفعت سروش، بشر نواز، محمود سعیدی، حسن زیدی اور ڈاکٹر مظفر حنفی کی تخلیقات بہت پسند آئیں۔ ڈرامہ، مومن، اظہر افسر نے لڑکپن اخو العبرتی سے مرتب کیا ہے۔ پڑھ کر لطف آگیا۔

بدیع الزماں خاور ——— نیلی مال ——— دالپولی (رتناگیری)

سالنامہ سلیقہ سے مرتب کر بیحد مسرت ہوئی۔ آپ نے اس میں اتنا مواد سمو دیا ہے کہ حجم کی کمی محسوس نہیں ہونے پاتی۔ نیا سرورق بھی جاذب نظر ہے۔ تاشقند کانفرنس سے متعلق آپ کی نظم اثر انگیز ہے۔ قرۃ العین حیدر کا افسانہ "ایک رات" شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ امید ہے کہ بہت سے ڈائجسٹ اسے نقل کریں گے۔ لطف الرحمٰن نے فن ڈرامہ کے اصولوں کی روشنی میں "انارکلی" کا تجزیہ بڑی محنت کے ساتھ کیا ہے۔ زرینہ ثانی اور ڈاکٹر سلام سندیلوی کے مقالات بھی قابل تعریف ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نظم کا ترجمہ کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ علاقائی زبانوں کی اچھی تخلیقات کو اردو میں ڈھالنے کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ اگر آپ شاعر میں دوسری زبانوں کے تراجم کا ایک مستقل باب شروع کریں تو اس مقصد کو فیر معمولی تقویت پہنچائی جا سکتی ہے۔

شاعر کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں آپ کی درخواست کا نتیجہ حقیقت میں بہت مایوس کن ہے۔ شاعر کے ہر پڑھنے والے کو کم از کم ایک نیا خریدار تو دینا ہی چاہئے۔ اور یہ کام بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اردو والے اپنے آپ کو زبان و ادب کی صحیح خدمت پر آمادہ کریں۔ کرشن چندر جیسے بڑی اشاعت تک شاعر کے دو دو سال کے خریدار بنا دیتے ہیں اردو والوں کا اولین فرض سمجھتا ہوں۔ اب بھی وقت ہے کہ ہر شخص اس سلسلے میں اپنے حصے کا کام خلوص سے انجام دے۔

پروفیسر پیرزادہ اقبال ہاشمی ——— ہاشم پیر درگاہ ——— بیجاپور

سالنامہ نظر نواز ہوا۔ واقعی یہ اپنے علمی و ادبی تمدن و وقار کے اعتبار سے بہت اہم اور بہت عظیم ہے۔ مقالات کا باب بہت ہی وقیع ہے۔ یوں تو تمام مقالات اچھے ہیں لیکن ڈاکٹر سلام سندیلوی، پروفیسر زرینہ ثانی اور ندا فاضلی کے مقالے بہت پسند آئے۔ افسانوں میں پورٹریٹ نمبر دو "موم کا بدن" اور "سمندر" قابل تعریف ہیں۔ منظومات میں "مژدۂ غم رہا"، "راز و آہنگ"، "مزاحیے" اور "مشورہ" بیحد دلکش ہیں۔ ترقی کی مزاحیہ شعر

ے میں خود اپنی ہی قسم ہو جاؤں ——— مجھ کو اس طرح قسم کھانا کیجئے گا

غالب کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے۔ ؎

ہستی ہماری اپنی قسم پر دلیل ہے ——— ہم کو مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

موصوف کی غزل کا یہ شعر ؎

دوستوں سے بھی نہیں ملتی آنکھ　　کیا مجھے اپنا کہا کیجئے گا

بہت پسند آیا ہے۔ سکیش اکبرآبادی، شاذ تمکنت اور تقبر نواز کی غزلیں بھی اچھی ہیں۔

امیر عارفی ——— ۴۔ مارلین روڈ۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

آجکا سالنامہ اور دسمبر کا شمارہ ملا۔ شکریہ، دسمبر کے شمارے کے "مراسلات" کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ آج ہماری زبان جس موڑ پر آگئی ہے وہ ہم سب کے لئے قابل فکر ہے۔ "اردو" زبان کی حیثیت سے تو معتدل ہے لیکن رسم الخط کے لحاظ سے دم توڑ رہی ہے۔ میں یہاں علیگ لڑکوں کو جانتا ہوں جو ٹھیٹ روانی سے اردو بولتے ہیں لیکن جب لکھنے کا سوال آتا ہے تو بغلیں جھانکنے کا کام آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو تعلیم یو۔ پی سے ختم ہو گئی ہے اور مرض یہاں تک بڑھ رہا ہے کہ ایسے وقت میں آپکے "مراسلات" سرتوں کو جگانے کا کام کرتے ہیں۔ حیدرآباد کی طرح اگر تمام اردو انجمنیں مل کر کوئی مستقل انتظام نہ کر سکتیں تو کم از کم اردو زندہ رہ جائے۔ سالنامہ رسالوں کے "مراسلات" بھی اپنی جگہ دعوت فکر دیتے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور کی "نکتہ چینی" میں پرانی طنزیت کا پہلو سینا رہتا ہے۔ میں آپ خود ہی شریک تھے اور جو جو مسائل آئے واقعی ان پر سنجیدگی سے غور کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح تعلیم کے دوسرے شعبوں پر ہر سال سات ٹھوس طریقہ پر بحث مباحثے ہوتے ہیں، اس مرتبہ اردو تعلیم اور نصاب پر علیگڈھ یونیورسٹی کا سیمینار مشعل راہ کا کام دے گا۔ اس سیمینار پر آپ کا تبصرہ بھی بڑھانے والوں کو غور و فکر کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

دسمبر کے شمارہ میں میر نظمی کا افسانہ "روپ" کافی جاندار ہے اور غزلوں میں متین سروش اور حلیم اختر کی غزلیں پسند آئیں۔ تاشقند معاہدہ کی ہوا اسپرٹ رہی ہے۔ اس کی روح آپ کی نظم "مژدۂ غم ربا" میں رچ بس گئی ہے۔

رک گئیں خون کی بہتی ہوئی پاگل ندیاں　　خندقیں اب نہ بھری جائیں گی پھر لاشوں سے
داغ اب کھانہ سکے گا کوئی مظلوم کے　　زخم اب ربط نہ رکھیں گے نمک پاشوں سے

اور یہ بند تو ہزاروں دلوں کی دھڑکن بن گیا ہے

بادہ چھلکا دو کہ دا ہو گیا میخانہ کا در　　جام ٹکراؤ کہ روٹھے ہوئے میخوار ملے
پھول بیٹھے تھے جو آئین وفا، رسم خلوص　　لے کے نذرانۂ دل، پھر وہی دلدار ملے

اور پھر یہ طربیہ نظم جس طرح المیہ پر ختم ہوتی ہے، وہ آپ کا دل ہی جانتا ہے ؎

غزلوں میں حضرت سکیش اکبرآبادی کی غزل اپنے اندر ایک خاص جذبہ اور حسن رکھتی ہے۔

سنا کرتے ہیں ہم یوں سب کی جیسے　　ہماری داستاں کوئی نہیں ہے

فراق صاحب نے اردو شعر و ادب کو جو کچھ دیا ہے، وہ اس کا حصہ ہے۔ لیکن آج کل ان کی غزلوں سے غنائیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اگر وہ طویل طویل غزلیں کہنا کم کر دیں تو ایک بار پھر غزل جی اٹھے۔ نظموں میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظم بہت ہی خوبصورت ہے اور یہ کسی بھی حیثیت سے ترجمہ نہیں معلوم ہوتی۔

افسانوں میں دو افسانے اپنے لکھنے والوں کا نام خود بتاتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا افسانہ "ایک رات"، لندن میں رہنے والے اُن جیالوں کی یاد دلاتا ہے جو پچھلے تک کی تقسیم کے باوجود دو متقسم ہیں اور آج پھر انھیں پنڈت نہرو کی کمی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ دوسرا افسانہ "افسانہ نگار اکرام حامد یہ کا ہے۔ "موم کا بدن" پڑھتے ہوئے میری آنکھیں بھیگ گئیں اور مجھے اپنا عزیز دوست نصیر اختر صدیقی یاد آگیا جو آج کل لندن میں ہے۔ یہ بالکل اسی کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اکرام حامد یہ نے بہت اچھی نفسیاتی کردار نگاری کی ہے۔ آمنہ ابوالحسن کا افسانہ "سمندر" بھی اچھا ہے۔ اتفاق سے دونوں کی تھیم ایک ہی ہے۔ رام لعل اپنے رنگ کے ماہر ہیں، کنہیا لال کپور کا "آغا صاحب" پھیکا ہے۔ یہ تو مرحوم و مغفور کپور ہے۔ ہم تو "سنگ و خشت" والا کپور پھر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ رقبہ نواز کی غزل بھی اچھی ہے۔ غرض سالنامہ کی ایک ایک خوبی کو کہاں تک گنوائوں۔

شاعر بمبئی

محمد لطف الرحمٰن ——— معرفت ہفتہ روزہ "قومی تنظیم" سبزی باغ پٹنہ (بہار)

"شاعر" کا تازہ شمارہ طلسم اعتبار سے پسندیدہ رہا۔ عزۃ العین حیدر کے فن کا میں دلدادہ ہوں لیکن "شاعر" میں اُن کی کہانی فنی اٹھان نگاری کے تقاضوں کی تکمیل نہیں کرتی۔ لگتے کہانی سمجھتے ہوئے کچھ نامکمل ہوتا ہے۔ جیسے اُن کا منفرد اسلوب بیان بھی دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ متین برکھش کی نظم فکر انگیز اور دل کش ہے۔ نور سعیدی کی نظم بھی بڑی کامیاب اور پُر اثر ہے۔ بشر نواز اور محسن زیدی کی غزلیں پسند آئیں۔

"آجکل" میں آپ کی نظم دیکھی تھی۔ وہ نظم فنی اور جمالیاتی اعتبار سے اردو کی چند نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ "شاعر" کی نظم موضوع اور فن دونوں ہی بڑی کامیاب اور پُر تاثیر ہے۔ بالخصوص آپ نے چھوٹے بند میں جس طرح گریز کیا ہے اور موسم کی اداسی کو جس طرح اسیرِ فن کیا ہے وہ بہت ہی قابلِ تحسین ہے۔ یہ سوچ بڑا خطرناک لفافہ لیکن آپ بڑی کامیابی اور سلامت روی کے ساتھ گذر گئے۔ اس سے آپ کی پختہ کلامی اور ہنرمندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک ایک مصرعے میں معانی و مطالب کی ایک دُنیا آباد ہے۔ یہ بڑی کامیاب، بھرپور اور اثر انگیز نظم ہے۔

"شاعر" کا ہر نمبر ہر اعتبار سے دیدہ زیب اور گرانقدر ہے۔

یوسف ناظم ——— ایسسٹینٹ لیبر کمشنر، فرام جی کاؤس جی بلڈنگ، دھوبی تالاب بمبئی ۱

"شاعر" کا سالنامہ خلافِ معمول مختصر ہے، ورنہ آپ تو بڑے ضخیم سالنامے شائع کرتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، مضامین، نظموں اور غزلوں کے اعتبار سے یہ بھی بڑا وزن دار رہا ہے۔ اتنے سخت اداریے لکھ کر دل نہ توڑ لیا کیجئے۔ عزۃ العین حیدر کا افسانوی مضمون اور رام لعل کا افسانہ بڑی عمدہ چیزیں ہیں۔ افسانے تو واقعی اس مرتبہ آپ نے بہت ہی اچھے جمع کر لئے۔

رام لعل ——— ۳۹۔ آر۔ ہلٹی اسٹوری، چار باغ۔ لکھنؤ

میں بمبئی نہ آسکا۔ آپ بھی تو گذشتہ دو ماہ سفر میں رہے۔ سالنامہ مل گیا تھا۔ ان حالات میں آپ اور اردو والوں کی گرفتاریں دیکھتے ہوئے، اس سالنامہ کو اچھا ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ضخیم نہ ہوتے ہوئے بھی اچھا اور اعلیٰ پایہ کا ادب پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ پاکستانی رسالوں کی درآمد بند ہو جانے پر بھی یہاں کے رسالوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ یہ بات غور طلب ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے اردو پڑھنے والے قارئین اگرچہ مزیت یافتہ طبقہ کی طرح باہر کی چیز کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اردو کو نقصان پہنچانے کے لئے یہ رویہ بھی ذمہ دار ہو سکتا ہے۔

ضیا حسنی ——— چھوٹی بازار، فتح پور (یو۔پی)

سالنامہ نظر نواز ہوا۔ سواد اور معیار کے اعتبار سے شاعر کی دیرینہ روایات کے عین مطابق ہے۔ آپ نے پھر کافی موثر، متنوع، اور معیاری تخلیقات کے ذریعہ زیرِ نظر سالنامہ کو سجایا ہے۔ دو مقالے "منظر نگاری کا مفہوم" اور "سیماب کے ہیئتی تجربے" پڑھ سکا ہوں۔ دونوں قیمتی ہیں۔ عزۃ العین حیدر کی فرنگی ماحول کی ایک رات کافی دلچسپ ہے۔ رام لعل اور اکرام جاوید کی کہانیاں بھی پسند آئیں۔ بعض حصے بھی کافی خوبصورت اور معیاری ہے۔ آپ کی نظم مژدہ غم ربا پڑھی۔ آپ نے تاشقند کانفرنس کے مرحوم اور المیہ کو کافی موثر انداز میں نظم کیا ہے۔

محمد عبید اللہ شریف ——— احاطہ عزیدوں جاہ۔ شاہ گنج، حیدرآباد ۲ (یو۔پی)

شاعر اکتوبر ۱۹۷۵ء کے اداریہ نوٹ میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ علامہ سیماب مرحوم کی تصانیف کی تعداد لگ بھگ دو سو ہے۔ اور علامہ کا بیان کہ یہ ۲۰۰ تصانیف ہیں۔ آپ نے ایک فہرست بھی دی ہے۔ یہ تو ہوا علامہ سیماب مرحوم کا کام۔

موضوع کے متعلق دوسروں نے بھی کچھ نہ کچھ کام ضرور کیا ہوگا۔ مختلف رسائل میں موضوع کے متعلق مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ملک کی مختلف جامعات میں ایم۔اے، اور پی۔ایچ۔ڈی کے لئے مقالات پیش ہوئے ہوں گے۔ اگر اس کی بھی ایک فہرست مرتب فرما کر شاعر میں شائع فرما دیں تو مناسب ہوگا۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی مختلف جامعات میں ایم۔اے کے امتحان کے لئے کسی مخصوص مصنف کا مطالعہ منوط ہوتا ہے چنانچہ جامعہ عثمانیہ میں گذشتہ دو تعلیمی سال کیلئے علی الترتیب اقبال اور سودا کا مطالعہ لازمی قرار دیا گیا تھا۔ اس ضمن میں جناب ڈاکٹر مسعود حسین خانصاحب صدر شعبۂ اردو آئندہ تعلیمی سال کیلئے علامہ سیماب مرحوم کا نام پیش فرما کر شاملِ نصاب کئے جانے کی کوشش فرمائیں تو مناسب ہوگا۔

نقد و نظر

(تبصرہ کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

چائے کے باغ

از ——— قرۃ العین حیدر

میں نے کتابیں بھیجنے والے سلیز مین سے کہا۔ ذرا چائے کے باغ دیتا۔"

"اجی بڑا گھٹیا ناول ہے۔ کیوں روپے ضائع کر رہے ہیں آپ"۔ سلیز مین نے چڑ کر جواب دیا۔

جواب سنکر میں سٹ پٹا گیا۔ قریب ہی ایک اور صاحب تشریف فرما کہنے لگے۔ "جی ہاں۔ ایک صفحہ بھی کی خاتون افسانہ نگار کا بیہودہ ناول نگار تو ختم ہو گیں۔"

میں منہ لٹکا کر دوکان سے باہر آگیا۔

چند دن کے بعد یہی ناول شاعر کے دفتر میں تبصرہ کیلئے آیا۔ میں نے ناول پڑھنا شروع کیا۔ اور پھر پڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ ختم کر دیا اور بے ساختہ میرے منہ سے یہ جملہ نکلا۔

"اگر یہ ناول گھٹیا ہے تو بڑھیا ناول کسے کہتے ہیں؟"

اگر دو تین صفحات سے اس ناول کا جائزہ لیا جائے تو زیادتی ہوگی۔ کیونکہ یہ ناول بچوں کے لئے نہیں ہے۔ البتہ پڑھنے والوں کیلئے ہے۔ عمر کے لحاظ سے نہیں بلکہ جو ذہنی طور پر بالغ ہوں۔

عنوان سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ اس میں چائے کے باغات میں کام کرنے والوں کی زندگی کی عکاسی ہوگی۔ مگر یہاں تو لب و لہجہ اور حسن و عشق کا قصہ ہے۔ جس کا انداز بیان حقیقت کے زیادہ قریب اور رومانی کم ہے۔ اس ناول میں چند عورتوں اور مردوں کے کردار پیش کئے گئے ہیں۔ ایسی عورتوں کے کردار جو ایک دو مردوں کو چھوڑ کر دوسرے مردوں سے عشق کرتی ہیں اور ایسے مردوں کے کردار جو اپنی پہلی بیویوں کو چھوڑ کر دوسری اور تیسری سے عشق فرماتے ہیں۔ ان کرداروں میں واقعی جان ہے، کشش ہے۔ یہ کردار محض کاغذ کے مادھو نہیں ہیں۔ بلکہ اپنے مقصد کی خاطر کسی طرح اپنی زندگی برباد کر کے آباد کرتے ہیں، اور پھر برباد کرتے ہیں۔ کرداروں میں حسن و عشق کی داستان ختم ہو جاتی ہے۔ اس چھوٹے سے ناول میں مختلف لوگوں کے

باشندے حسن و عشق کی داستان میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ اس کا بھرپور تاثر پڑھنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ سر پکڑ کر بیٹھ جائیں گے۔ آخر میں قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ خدا نے ایسی دنیا کیوں بنائی۔ آخر یہ سب کچھ کیوں اور کس لئے؟

قرۃ العین حیدر نے بڑے فنکارانہ انداز میں چند کرداروں کو اس ناول میں تخلیق کیا ہے۔ اس چھوٹے سے ناول میں زندگی کا ایک بہت بڑا سمندر موجزن ہے۔ میری رائے میں یہ چھوٹا سا ناول "آگ کے دریا" پر بھاری ہے۔ کاش اس ناول کی چھپائی، لکھائی اور سرورق خوبصورت ہوتا اور اسے ٹیکسٹ بک کی طرح نہ پیش کیا جاتا۔

قیمت ڈیڑھ روپے پچاس پیسے ——— ناشر حلقۂ ادب بمبئی ۱۔ رسیتا محل، بومن جی پٹیٹ روڈ۔ بمبئی ۲۶ (۳ مہینہ لاگت)

پیاسی بیل

از ——— مانک ٹالہ

مانک ٹالہ کے افسانے ہندوستان کے ہر رسالوں میں چھپ کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ "پیاسی بیل" مانک ٹالہ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ مانک ٹالہ کو کتابیں لکھنے کا شوق نہیں بلکہ اچھے اور معیاری افسانے لکھنے کی لگن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہے ——— یہ سنگ و خشت کا پجاری افسانہ نگار کیسے بن گیا؟ یہ بات بھی معجزے سے کم نہیں!

مصوری میں کمال، ریاضت، احتیاط اور محنت کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اور اگر آپ مانک ٹالہ کے افسانوں کا جائزہ لیں، تو آپ محسوس کریں گے کہ ان ہی چیزوں نے ان کے افسانوں کو جلا بخشی ہے۔ یوں مانک ٹالہ کی نثر بڑی کھردری اور سخت ہے۔ بلکہ عام لوہے کی طرح ٹھوس اور سنگلاخ ہے لیکن اس ظاہری آہنی پیکر کے اندر پھولوں جیسی نرمی، اور Silk Glass جیسا اجلا پن ہے۔ اور اس طرح ہر افسانہ، ایک چٹان سے تراشا ہوا بے حد دلکش اور دلفریب مجسمہ نظر آتا ہے۔ ہر فقرہ بنا تلاشا ہوا، اپنی جگہ پر ہیرے کی طرح جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے اور مانک ٹالہ

ہ اور دلربا مہمل الفاظ کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ناول کے ہ حد نثری اور مکالمت ہے۔

ان کا پہلا افسانہ "ست یگ" کا انسان ایک گونگے اور بہرے کی ہ ہے۔ نظا ہر وہ بات کر سکتا ہے، دیکھ سکتا ہے، لیکن اپنے طرز عمل سے ہر خالی گہوارہ جھلاتا ہے۔

"پیاسی بیل" میں ایک چھوٹی سامازک خیال قلم بند کیا گیا ہے اور ایک اکبر اور جاہل بدمست سے مالک اعلیٰ نے ہیں کے افتتاح کرتا شاہے۔ کہ آخر میں ہادوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سانک مالا کو کسی ازم سے لگاؤ نہیں انھوں نے ترقی پسندی کے خاص ہی کا اظہار نہیں کیا۔ اور رجعت پسندی سے نفرت بھی نہیں کی۔ زندگی کے شعبوں میں قدم رکھ کر جہاں بھی انھیں زندگی کی جھلکیاں نظر آئیں افسانوں میں سمو دیا۔ اس لئے اُن کے افسانوں میں تنوع ہے کیفیت پائی جاتی۔ ان کا افسانہ اگر قصوں کی کمی نہیں، طنز و مزاح سے بھرپور ۔ بند ہیں۔ روپے جمع کرنے والوں پر ایک گہری چوٹ ہے۔ یہ دو صفحوں نانہ اپنی جگہ بے حد کامیاب ہے۔

سانک مالا ادبی رسیں میں پھیلانگ مار کر یہ مدارسل میں شریک نہیں ا چاہتے بلکہ اپنی فنی مہارت اور ادبی لگن سے اپنی جگہ بنانے کے قائل ۔ مانک مالا نے اپنے آبا و اجداد کی طرح موتیوں کے سوداگر تو نہیں ہو سکتا ر ان کے آبا و اجداد نے چھوٹے موتیوں کا بیوپار کیا ہو، لیکن مانک مالا ادبی دنیا میں دور دور سے موتیوں کا امپلا کیا ہے۔ اس لئے ادبی ہریوں کا فرض ہے۔ کہ وہ ان بچے اور چمکدار موتیوں کی قدر کریں۔

قیمت ۔ چار روپے ۔ ملنے کا پتہ

جیوتی پبلشرز ۲۹/۲۳۴ اوم نواس، وڈالا ۔ بمبئی ۳۱

(مہندر ناتھ)

وہ لوٹے گی

از ——— ڈاکٹر ست پرکاش سنگر

ڈاکٹر ست پرکاش سنگر اردو اور ہندی کے مشہور و معروف نے والوں میں سے ہیں۔ ان کا زیر تبصرہ ناول ازدواجی زندگی کے گرد گھومتا ہے۔ مرد اور عورت کی جنسی، جذباتی اور نفسیاتی زندگی اپنے اندر بے پناہ تش رکھتی ہے۔ ڈاکٹر ست پرکاش سنگر نے ہیں تھیم کو ناول میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول میں واقعات بہت کم ہیں۔ کردار وں کا قلبی اور ذہنی تجزیہ زیادہ ہے۔

کہانی کی ابتدا عشق سے شروع ہو کر شادی پر ختم ہوتی ہے جہاں سے اصل کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ کس طرح دو انسان قریب رہ کر بھی ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں کیونکہ میاں اور بیوی کے مزاج ایک دوسرے سے نہیں ملتے، اس لئے دونوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو جاتی ہے اور یہی دیوار دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔

مغرب نے میاں بیوی کے جھگڑوں کو طلاق کے ذریعہ سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ مشرق نے عورت کو بقائے باہمی کا طریقہ سکھایا ہے یا مرد کو دیوتا بنا کر پوجنے پر مجبور کیا ہے۔ بہرحال ناول کی تھیم کو اجاگر کرنے کیلئے محرکات اور واقعات کی ضرورت ہوتی ہے سنگر داخلی کیفیتوں کو تو بڑی کامیابی سے اجاگر کرتے ہیں۔ لیکن پلاٹ کے تانے بانے کو بُننا آسان بات نہیں۔ اُس میں کافی مہارت کی ضرورت ہے پلاٹ کے علاوہ کرداروں کو تناسب اظہار بنا دیا جائے کہ ان کے باہمی ٹکراؤ سے ایک شاندار کلائمکس بن سکے مزاجوں کا آپس میں نہ ملنا شاید ایک کہانی تو جنم دے سکے لیکن ناول کے لئے یہ ہلکا پھلکا سا مواد کافی نہیں ہوتا ایک کامیاب ناول کے لئے واقعات، کردار، تھیم، داخلی تجزیہ اور فارجی اثرات اس طرح ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں۔ کہ پڑھنے والا یہ ماننے پر مجبور ہو جائے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ جبھی جا کر ناول میں گہرائی اور گیرائی آتی ہے۔ ناول میں جہاں جہاں سنگر نے مکالموں کا استعمال کیا ہے وہ بے حد برجستہ اور شگفتہ ہیں۔ کتاب کا ٹائیٹل اور بکھائی چھپائی اچھی خاصی ہے۔

قیمت:۔ تین روپے ۔ ناشر و چھپوانے والے

چنڈی گڑھ (پنجاب) (مہندر ناتھ)

مدتِ خریداری ختم ہونے کی اطلاع

اس سیاہ حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سال خریداری فروری کے اس شمارہ کیساتھ ختم ہو گیا ہے چونکہ کم سے کم سال تین شمارے آپ کو کم سے کم سلے اُن کی قیمت روپے کر کے سات روپیہ سالانہ چندہ کے بجائے آپکی خدمت میں آئندہ ماہ مارچ ۱۹۶۱ء کا شمارہ ملاوہ محصول ڈاک صرف پانچ روپیہ ہ آنہ ارسال کیا جائے گا یا آپ تخفیف شدہ رقم منی آرڈر کے ذریعہ روانہ فرما دیں۔ اگر خریداری منظور نہ ہو تو ایک خط کے ذریعہ اطلاع دیدیں۔ ۔ مینیجر

اداریہ :

محفل اپنی ....!

سالنامہ پسند کیا گیا :-

گزشتہ مہینے سب سے کم مخالفت کا حق "سالنامہ" پیش کیا گیا تھا اسے اس کے مواد اور ترتیب کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ شاعر کا بنا سرورق بھی کافی پسند کیا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ سالنامہ مقابلہ بہت ہی کم وقت میں تیار ہوا تھا۔ اس کی کتابت کے آغاز سے اشاعت کی منزل تک مدیر شاعر کو زیادہ تر بمبئی سے باہر رہنا پڑا۔ اسی لئے اس کی اشاعت میں کچھ تاخیر واقع ہوئی۔ بہرحال ارباب ذوق و نگاہ کی پسندیدگی کا شکریہ اور ان غیر ذمہ دار حضرات کا سخت شکوہ۔ جنھوں نے سالنامہ چھپنے کے بعد واپس کر کے شاعر کو دیدہ و دانستہ سخت نقصان پہنچایا۔

یہ تازہ شمارہ

فروری ۱۹۴۶ء کا یہ تازہ شمارہ بھی قدرے تاخیر سے نکل رہا ہے۔ مارچ کا شمارہ ان شاء اللہ بطور شائع ہو سکے گا۔ اس شمارہ میں ترتیب کی وہی رنگا رنگی قائم رکھی گئی ہے۔ جس کا عام طور پر مطالبہ کیا گیا ہے۔ جہاں تک مواد کا تعلق ہے، تو یہ بھی کافی مقدار میں ہے۔ اس میں چار مقالے، ایک طنزیہ و مزاحیہ، چار افسانے، سات نظمیں اور چودہ غزلیں ہیں۔ شاید ہی کسی رسالے کے لئے اتنی زیادہ نظمیں اور غزلیں آتی ہوں جتنی شاعر کے لئے آتی ہیں اور شاید ہی اتنی کم نظمیں اور غزلیں کسی رسالہ میں شائع ہوتی ہوں جتنی کم شاعر میں ہوتی ہیں۔ اس بار مقالوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے۔ ہم نے شاعر کو محض نظموں اور غزلوں کا گلدستہ کبھی نہیں بنایا۔ زیادہ سے زیادہ معلومات افزا مضامین پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو ہر پہلے سیکڑوں نظمیں اور غزلیں آتی ہیں۔ ظاہر ہے ان میں چند ہی معیاری ہو سکتی ہیں۔ اور چند ہی کی اشاعت بھی ممکن ہے۔ عام طور پر شاعر سے شکوہ کناں رہتے ہیں اور ان خفا ہونے والوں سے سوائے معذرت کے ہم اور کیا عرض کر سکتے ہیں ہم نے تو بارہا یہ درخواست کی ہے کہ نو مشق اور ایسے شعراء جو ابھی اپنے فکر و فن کی کوئی مدت اور بلندی نہیں رکھتے، شاعر کو اپنے کلام سے معاف رکھیں۔ اس کے باوجود نظموں اور غزلوں کی ریل پیل رہتی ہے۔ پھر یہ مطالبہ بھی کہ ان سیکڑوں نظموں، غزلوں اور افسانوں پر اپنا رائے ظاہر فرمایا کریں۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے۔ نو مشق قلم کار اپنی شاعرت کو نکھار رہے ہیں وہ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کر لیا۔

پڑھنے والے یہ چاہتے ہیں کہ مدیر انتہائی معیاری تخلیقات شائع ہوں اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ شاعر کا معیار کسی صورت میں انہیں گرانا نہیں اور نہ کہنہ مشق و مشاہیر اور شعراء کی تخلیقات کے ہوتے ہوئے تیسرے درجے کی معمولی چیزیں شائع کی جا سکتی ہیں۔ نئے لکھنے والوں کو شاعر نے ہمیشہ خوش آمدید کہا ہے لیکن ان ہی کو جن کے یہاں کچھ جان ہو۔ ادب و شعر چیستاں نہیں کہ آنکھ سیدھا کاٹا اور ہانڈی میں ڈال دیا۔ شاعری محض موزوں طبعی اور افسانہ نگاری محض الف سیدھے لکھ لینے کا نام نہیں۔ شاعر میں شائع شدہ تخلیقات کا سخت احتساب ہوتا ہے۔

توسیع اشاعت

شاعر کی توسیع اشاعت کی طرف سے ابتک مایوسی ہی ہوتی چلی آرہی ہے۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ شاعر کے تمام قارئین اور ناظرین میں شاعر نوازی کا احساس جاگے اور وہ شاعر کو ایک بہت بڑی کاشانت رکھنے والی جریدہ بنا دیں، مگر افسوس کہ عام طور پر اس طرف توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ کسی دوست یا غیر سے سات روپے لینا اور گمنام شاعر کا خریدار بنا دینا کوئی بہت مشکل بات نہیں۔ اس کے لئے صرف احساس قوت ہے۔ ایک سو تیس سال سے مسلسل نکلنے والے اداریہ کی طرف سے غفلت ناشدنی زبان داں کا بڑا المیہ ہے۔

بہرحال، ان چند شاعر نواز حضرات کے نام دوسری قسط کے طور پر شکریہ کے ساتھ شائع کئے جا رہے ہیں جنھوں نے نئے خریدار دستیاب فرما کر ہمارے شکریہ میں خریدار دینے والے دوستوں کی تیسری شاندار قسط شائع کرا سکیں۔

۱۔	جناب بدیع الزماں فاورقی	واہ پونی	۱۲ خریدار
۲۔	جناب نسیم تاج لوٹھی	احمد آباد	۵ "
۳۔	جناب تیم گوالیاری	احمد آباد	۴ "
۴۔	جناب اظہر افسر	حیدر آباد	۱ "
۵۔	جناب یوسف ناظم	بمبئی	۱ "
۶۔	جناب ل۔ م۔ شاہد	جمشید پور	۱ "
۷۔	جناب ڈاکٹر ظفر حمیدی	مظفر پور	۱ "
۸۔	جناب اے۔ ایم جعفری صاحب	انتا پور	۱ "
۹	جناب خرد شاہ پوری	کلکتہ	۱ "
۱۰۔	جناب شمیم ہاشمی صاحب	روہتاس	۱ "

علمی۔ ادبی اور تہذیبی خبریں

یو پیا اسٹوڈنٹ سرکل کی طرف سے یوم غالب

بمبئی میں اردو و فارسی اور عربی کے ان طلباء کا جو کالجوں میں تعلیم پا رہے ہیں، یا پا چکے ہیں۔ "یو پیا" کے نام سے ایک سرکل قائم ہے جو کالجوں کے اساتذہ کی توجہ سے کئی سال سے نہایت مفید علمی کام انجام دے رہا ہے۔ ۱۵ فروری ۱۹۶۷ء کو یو پیا کی طرف سے بمبئی کی مشہور تفریح گاہ چوپاٹی پر واقع برلا کرپڑ اکیڈمی ہال میں نہایت شاندار طریقہ سے "یوم غالب" منایا گیا۔ ہال کے بیرونی دروازے پر غالب کے ساتھ، غالب میوزیم کا انتظام کیا گیا تھا جس میں غالب کی تصانیف کے مختلف نسخوں، غالب پر لکھی گئی کتابوں اور رسالوں کے غالب نمبروں کو کمال خوش ذوقی سے سجایا گیا تھا۔ ہال خوش پوش سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ ادیب، پروفیسر، شاعر، صحافی، اخبار، اور رسالہ نویس سب ہی تھے۔ برلا اکیڈمی کے خوبصورت آڈیٹوریم پر یہ پروگرام "غالب بہ نفس نفیس" سے شروع کیا گیا۔ درمیان میں اور اس کے بعد غالب کی بڑی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ اس منظر پر ان پر پھولوں کی پتیاں برس رہی تھیں اور غالب کے مختلف اشعار اردو کی صدا بکر گونج رہے تھے۔ پھر طالبات نے کورس کی صورت میں غالب کی ایک غزل پیش کی۔ مختلف لوگوں نے غالب کا کلام سازوں کے ساتھ سنایا۔ ان میں پروفیسر عبدالحق نے غالب کی ایک فارسی غزل بڑے اچھے انداز میں پیش کی۔ غالب ہی کی زندگی سے متعلق دو اسکٹ "ڈرامے" ایک ظ انصاری کا "مجنوں ہوتا تو کیا ہوتا" اور دوسرا کنھیا لال کپور کا "غالب جدید شعرا کی محفل میں" پیش کئے گئے۔ بعد ازاں غالب پر بعض اور سوالات کا پروگرام ہوا۔

ڈاکٹر عابد حسین بمبئی میں

اردو کے بزرگ اور مشہور و ممتاز ادیب ڈاکٹر عابد حسین فروری کے پہلے ہفتہ میں بمبئی تشریف لائے اور ایک ہفتہ قیام فرمایا۔ یہ صوت کا یہ سفر آل انڈیا ریڈیو بمبئی، حیدرآباد اور بھوپال کے اردو پروگراموں کا جائزہ لینے اور اس سلسلے میں سفارشات پیش کرنے کے سلسلے میں تھا۔ آپ مرکز میں اردو کے چیف ایڈوائزر ہیں۔

بمبئی میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ صاحب کے اعزاز میں ایک شاندار عصرانہ دیا۔ اسی میں راجندر سنگھ بیدی کو ان کے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" اور سردار جعفری کو "ایک خواب اور" پر انعامات ملنے کے سلسلے میں مبارکباد پیش کی گئی۔ عصرانہ میں بمبئی کے ادیب، شاعر، صحافی، پبلشرز، پروفیسر اور دیگر حضرات شریک تھے۔ جلسہ میں ڈاکٹر عابد حسین کی تازہ تصنیف "ہندستانی مسلمان" زیر نظر تھی۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب سے بعض سوالات کے جوابات دیئے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں دو نشستیں اور بھی ہوئیں۔ ایک نشست شہاب الدین دسنوی صاحب پرنسپل صابو صدیق ہال کی طرف سے اور دوسری انجمن ترقی اردو مہاراشٹر کی طرف سے۔ انجمن کی نشست میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ریڈیو سے متعلق ایک یادداشت پیش کی گئی۔

راجندر سنگھ بیدی کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام

ساہتیہ اکیڈمی نے ۱۹۶۷ء کا اردو کا انعام مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" پر دیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی اردو کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہیں۔ جدید افسانوی ادب میں اپنا ایک انفرادی مقام رکھتے ہیں۔

ادارۂ "شاعر" بیدی صاحب کو اس اعزاز پر خلوص دل کے ساتھ مبارکباد پیش کرتا ہے۔

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام نظام اردو خطبات

نظام اردو خطبات کا آغاز اس سال ۲۵ جنوری ۱۹۶۷ء کو ہوا ہے۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند اس افتتاح اور جناب ڈاکٹر ہمایوں کبیر وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی ان خطبوں کی صدارت فرمائیں گے۔

ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین ۱۹۶۶ء کے مقرر منتخب ہوئے ہیں۔ ان کے خطبات کا موضوع "فکر انسانی کا ارتقاء" ہے۔

کرتار سنگھ دگل کو ساہتیہ اکیڈیمی کا انعام

پنجابی زبان کے مشہور ادیب کرتار سنگھ دگل کو ان کے پنجابی زبان کے افسانوی مجموعے "اک چھٹ" پر ساہتیہ اکیڈیمی کی طرف سے ۱۹۶۵ء کا انعام پانچ ہزار روپیہ دیا گیا۔ دگل صاحب پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ ادارۂ شاعر دگل صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

فراق گورکھپوری رو بصحت ہیں

الہ آباد ۱۹ فروری:۔ اردو کے مایۂ ناز شاعر فراق گورکھپوری سرنی ہاسپٹل میں اطمینان بخش طور پر رو بصحت ہیں۔ فراق صاحب ہرنیا کے مرض میں مبتلا ہیں جس کا آپریشن کیا گیا۔ ان کے نگراں ڈاکٹر نے بتایا کہ آپریشن کامیاب ہوا ہے۔

نثار اٹاوی کو ریاستی انعام

اٹاوہ ۱۱ فروری:۔ اردو کے مشہور شاعر جناب نثار اٹاوی کو ان کی قومی، ادبی، سماجی اور تعلیمی خدمات کے سلسلے میں اس سال حکومت اتر پردیش نے پانچ سو روپیہ کا ریاستی انعام دینا تجویز کیا ہے۔ نثار اٹاوی اسلامیہ کالج اٹاوہ میں لکچرر ہیں۔

علامہ رسیاب اکبرآبادی کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے درجہ اول میں ایم اے کیا۔ دو سال تک رسالہ ساقی آگرہ کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ کئی سال ہوئے ان کا مجموعۂ کلام "ماہ و انجم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی کئی کتابیں زیر طبع ہیں۔ ہندی زبان میں بھی انھوں نے تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے۔

امیر عارفی کو مجاز گولڈ میڈل

علی گڑھ یونیورسٹی کی مجاز میموریل کمیٹی کی طرف سے نوجوان شاعر امیر عارفی کو یہ تین نظموں "برسات" ۱۹۶۵ء، "مجاز" اور "میڈل" کا گولڈ میڈل کے موقع پر دیا جائے گا۔

آہ — جہاں بانو نقوی

بیگم منور کی کو مشہور ادیبہ جہاں بانو نقوی کا حیدرآباد میں انتقال ہو گیا۔ وہ اردو زبان و ادب پر پوری پوری دسترس رکھتی تھیں۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ افسوس کہ کینسر جیسے موذی مرض نے قبل از وقت ایک پاکیزہ مذاق ادیبہ کو ہم سے چھین لیا۔ ادبی حلقوں میں جہاں بانو نقوی کی کمی ہمیشہ محسوس ہوگی۔

مختصر، مختصر

● مشہور ادیب اور دانشور ڈاکٹر ملک راج آنند کو بیگم منور کی ۱۹۶۶ء سے دو سال کی مدت کیلئے لندن کلا اکیڈیمی کا صدر منتخب کیا گیا ہے۔

● اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر اور قومی کارکن مخدوم محی الدین کے اعزاز میں صوبۂ آندھرا پردیش کی دولت اتحاد ہی امور کی طرف سے ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی گئی۔ اس موقع پر مخدوم محی الدین کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک شال اور پھول مالا پیش کی گئی۔ شری ایم۔ آر۔ پائی وزیر تنہ ہی امور نے اس تقریب کی صدارت فرمائی۔

● ڈاکٹر ذوالحسن ہاشمی صدر شعبۂ اردو فارسی دکھنی یونیورسٹی کو شعبۂ اردو اور فارسی میں نئی قائم ہونے والی پروفیسر شپ کیلئے ایگزیکٹو کونسل نے منتخب کر لیا ہے۔

● اردو کے مشہور شاعر اقبال سہیل مرحوم کی یاد میں جونپور میں سہیل اکیڈیمی قائم کی گئی ہے۔ یہ اکیڈیمی مرحوم کے تنقیدی مضامین اور ان کی شاعرانہ تخلیقات کا جائزہ لے گی۔

● ۲۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو پروفیسر سنٹرل ہال الہ آباد میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کو ان کی خود نوشت سوانح عمری "میری دنیا" کی پہلی جلد پیش کرنے کیلئے ان کے دوستوں اور شاگردوں کی طرف سے ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں اردو داں ہندی کے ممتاز ادیبوں اور عمائدین شہر نے شرکت کی۔

● نئی نسل کے نمائندہ شاعر کمار پاشی کا مجموعۂ کلام "پرانے موسموں کی آواز" شائع ہو گیا ہے۔

● الیگڑھ ۳ فروری:۔ اردو کے مشہور شاعر و نقاد ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کا دوسرا مجموعۂ کلام "نیا عہد نامہ" شائع ہو گیا ہے یہ مجموعہ ۱۲۸ صفحات کا ہے اور قیمت ساڑھے چار روپے ہے

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء
بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا سینیئر سہ ماہی علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شمارہ ۳ مارچ
سنہ ۱۹۶۶ء

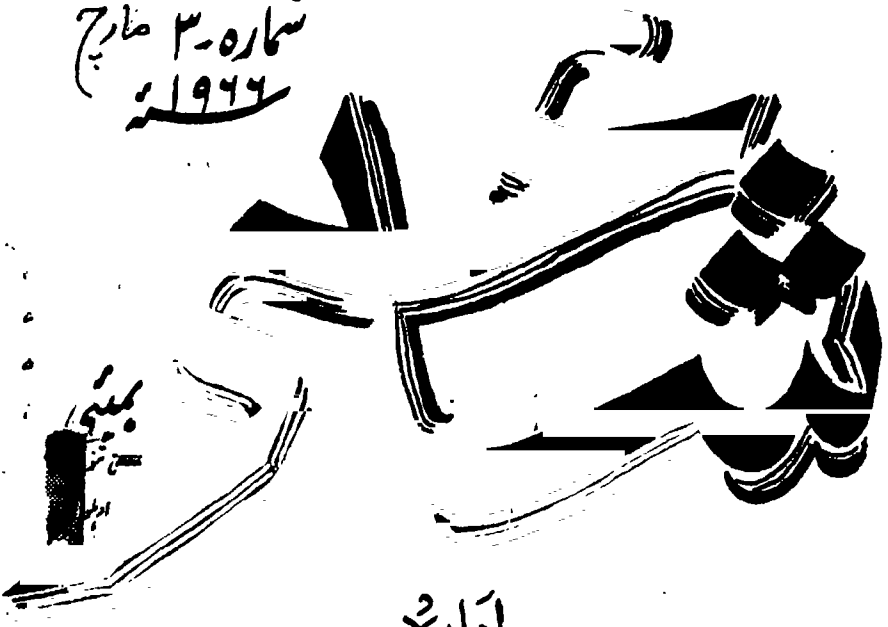

ادارہ
اعجاز صدیقی
مہندر ناتھ

فی پرچہ	ممالک غیر سے	زر شش ماہی	زر سالانہ
۱۰ آنے (۶۲ پیسے)	۱۶ شلنگ	چار روپے	سات روپے

مکتبہ قصر الادب
پوسٹ بکس ۴۵۲۶ بمبئی ۴۰۰ بی سی

اَب ہی میٹرک میں سوچیں اکائیوں

میٹروں میں خریدیں
گزوں میں نہیں

اگر آپ میٹرک پیمانوں میں لین دین نہیں کرتے اور ہمیشہ انہیں دوسری اکائیوں، کز، انچ وغیرہ میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، تو یہ نہ بھولیں کہ آپ خواہ مخواہ جمع تفریق کی بھول بھلیوں میں پھنستے ہیں۔ اُلجھن میں پڑتے ہیں۔ اَب مُلک بھر میں میٹرک باٹ اور پیمانے استعمال ہوتے ہیں اور یہی قانونی ہیں۔ اب ہر دُکاندار کے لئے سرکاری مُہر لگے میٹرک باٹ اور پیمانے رکھنا ضروری ہیں۔ اِن باٹوں اور پیمانوں کی جانچ کسی وقت کی جا سکتی ہے۔

میٹرک نِظام اپنائیے اپنی اور مُلک کی مدد کیجئے

اَب صِرف میٹرک باٹ اور پیمانے قانونی ہیں

کرتار سنگھ دگل
پنجابی زبان
پنجابی زبان کے اعزاز
کی طرف سے ۱۹۷۵ء
پنجابی اور اردو
دگل صاحب کو۔

فراق گو
سرنی، ناسپور
صاحب ہر نیا کے مرض
نے بتایا کہ آپریشن کا

نثار اطہ
ایم۔
ان
ہتر
ا
ایڈ
رسٹ
ما
مہدہ

شاعر
کانو

ترتیب

...ڑیا ریڈیو کی نئی لسانی پالیسی	(اداریہ)	اعجاز صدیقی	۷
...ر شباب	(مقالہ)	مناظر عاشق ہرگانوی	۱۰
...زل		منور لکھنوی	۱۵
...ندی مفقود	(افسانہ)	اکرام جاوید	۱۶
...تجدید عہد الفت	(نظم)	اعجاز صدیقی	۲۱
...رام چند فرحت	(مقالہ)	نقی احمد ارشاد	۲۳
...زل		علیم اختر مظفر نگری	۲۶
...زل		ظہر نہ قریشی	۲۷
...تنا	(نظم)	یوسف ناظم	۲۸
...قطعات		کرشن موہن	۲۸
...یہ صلہ دل بندے !	(افسانہ)	رفعت صدیقی	۲۹
...ونگ لو	(نظم)	ڈاکٹر سلام سندیلوی	۳۱
...زل		حامد علی کاشمیری	۳۴
...زل		کھنیل آذر	۳۴
...ایک معمار قوم کی شخصیت	(مقالہ)	کوثر چاندپوری	۳۵
...مطلع	(نظم)	صہبا رحیم	۴۲
...پرانے انسان کی کتھا	(مقالہ)	شہاب جعفری	۴۳
...ایک تصویر	(نظم)	کمار پاشی	۴۶
...ٹوٹے پتے	(نظم)	کمار پاشی	۴۶

شاعر

کچھ اپنے فن کے بارے میں	(مقالہ)	کمار پاشی	۴۷
غزل		معصور سبزواری	۵۰
غزل		شاہد کشمیر	۵۰
اُردو افسانے کا ارتقا	(انشائیہ)	آثر فاروقی۔ ڈاکٹر اعجاز حسین	۵۱
ارتقا	(نظم)	ذکا والدین شایاں	۵۴
تاشقند کے پھول	(نظم)	وقار صدیقی	۵۴
لازوال تبسم	(روسی کہانی)	صہبا اکرام	۵۵
جدائی کے بعد	(نظم)	نقی علی خاں ثاقب	۵۷
ہرجائی	(نظم)	مشفق تنویر	۵۷
چاند کی کہانی	(طنزیہ)	آفاریشہ مرزا دہلوی	۵۹
چھتری ـــــ ۱۸	(انشائیہ)	نور سہکار	۶۱
غزل		عبدالرب صبا	۶۳
غزل		قیصر صدیقی	۶۳

مکتوبات

انجم اراانجم	بدیع الانوار جاوید	معراج الکبرآبادی
مظہر حسین صدیقی	شہبا جعفری	محمود ہاشمی
حامد علی شیدی	عبدالعزیز خالد	تمنا مظفرپوری
محفل اپنی		ادارہ ۶۸
نقد نظر	(تبصرے)	ادارہ ۶۹
رفتار	(ادبی خبریں)	ادارہ ۷۲

جلد ـــ ۳۰

شمارہ ـــ ۳

شائع ہو چکا

ادارہ "شاعر" فخر و مسرت کے ساتھ

اُردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار

کرشن چندر

پر نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر پیش کر رہا ہے

کرشن چندر کی مختصر شخصیت اور اُس کے ہمہ گیر فن پر ہندوستان کی کئی زبانوں کے مشہور قلم کاروں بلکہ دنیا کے کئی بڑے مصنفین اور مفکرین کے مضامین و تاثرات

کرشن چندر نمبر

میں

پیش کئے جائیں گے!

کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ، اُس کی عظمت کی کہانی، اُس کی تصانیف کا جائزہ اُس کے زندہ اسلوبِ فکر اور شاہکار افسانوں ناولوں اور ڈراموں پر تنقیدی نظر

درجنوں تصاویر

تفصیلات اور تاریخ کا انتظار کیجئے

کرشن چندر نمبر میں

خود

کرشن چندر

کے اپنے قلم سے

ایک تازہ غیر مطبوعہ اور شاہکار

نئے

ناول

کے علاوہ

تین تازہ کہانیاں

ایک ڈرامہ

ایک مزاحیہ

میرے ادبی نظریات

میرے تنقید نگار

میری ادبی زندگی کا آغاز و انجام

کرشن چندر کے شب و روز

(تصاویر کے ذریعہ)

اور

عکسِ تحریر

کرشن چندر کے

اہم خطوط

ارباب قلم اپنے مضامین کرشن چندر نمبر جلد از جلد ارسال فرمائیں

ترجمہ:-

آل انڈیا ریڈیو کی نئی لسانی پالیسی

ہمارے ملک میں زبانوں کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لسانی بنیادوں ہی پر یہاں صوبوں کی تقسیم ہوئی ہے اور اسی لئے علاقائی زبانوں کو زیادہ ابھرنے اور پنپنے کا موقع ملا ہے۔ ہر علاقائی زبان اپنے تحفظ اور ترقی کے لئے کوشاں ہے۔ یہ جذبہ تکراؤ کی حد تک تیز ہو چکا ہے۔ ملک کی بڑی زبانیں ایک دوسرے کو اپنا حریف سمجھنے لگی ہیں، حلیف نہیں۔ حتیٰ کہ ہندی زبان جسے ہم نے "راشٹر بھاشا" کا درجہ دیا ہے اور جسے اب تک پورے ملک کی رابطہ زبان بن جانا چاہئے تھا، نہیں بن سکی ہے اور نہ مستقبل میں ایسی کوئی امید پائی جاتی ہے۔ ہر ملک میں رابطہ کی ایک بڑی زبان ہوا کرتی ہے اور عام زبان کی حیثیت (اختیار کر لیتی ہے۔ ہندی زبان کو اسی حیثیت سے سرکاری زبان قرار دیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے اسے ہندی کے بجائے قطعی طور پر "سنسکرت" بنا دیا گیا اور اس حد تک ناقابل فہم کہ غیر ہندی علاقے اسے قبول نہ کر سکے۔ اگر ہندی زبان کو گاندھی جی کے تصورات کے مطابق بنائی جاتی، اسے وسعت دینے کے لئے ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں کے خزانوں سے عام فہم الفاظ لئے جاتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ یہ سرکاری زبان پورے ملک کے دلوں کی زبان نہ بن جاتی۔ لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔ ہندی زبان میں سنسکرت کے ثقیل بوجھل اور نامانوس الفاظ شامل کر لئے گئے۔ ایک نہایت مشکل علمی زبان کو عوام پر لاد دیا گیا۔ نہ سمجھ میں آنے والی اصطلاحات وضع کی گئیں۔ علمی، ادبی اور کتابی ہندی تو الگ ہی، ریڈیو جیسے عوامی اور صنعتی ادارے کی زبان کو بھی اتنا مشکل بنا دیا گیا کہ ہندی نہ جاننے والے کیا، اس کے جاننے والوں کی سمجھ میں بھی بہ مشکل آتی ہے۔ سب سے اہم چیز ریڈیو کی خبریں ہیں ــــ، ہندو پاک کی چند روزہ جنگ کے دوران جب خبریں نشر ہوتی تھیں تو دکان دوکان، ہوٹل ہوٹل اور گلی گلی خبریں سننے کے لئے ہندوستانی عوام سیکڑوں کی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن ان میں پانچ فی صد بھی ایسے نہ ہوتے تھے جو ان خبروں کو سمجھ لیتے۔ چنانچہ ایک دوسرے سے پوچھتا تھا کہ کیا کہا؟ اگر آج ہندوستان کے تمام صوبوں کے عوام سے پوچھا جائے کہ وہ موجودہ ہندی زبان کو سمجھتے ہیں تو اکثریت نفی میں جواب دے گی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے دور تک پھر بھی کچھ غنیمت تھا کہ ریڈیو کی زبان کسی حد تک سمجھ میں آجاتی تھی، لیکن ان کی موت کے فوراً بعد ہی جس طرح زبان کو بدلا گیا اور دو سال ہی میں اسے ہندی کے بجائے سنسکرت بنا دیا گیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اُسی دن ہندوستانی عوام کو ریڈیو کی لسانی پالیسی کی سختی کا اندازہ ہو گیا تھا جس دن پنڈت نہرو کے دس جنازہ کا آنکھوں دیکھا حال ریڈیو سے بتایا جا رہا تھا۔ اس میں شاید ہی کوئی ایسا جملہ تھا جو آسانی سے سمجھ میں آیا ہو۔ پنڈت نہرو کو ہمیشہ اس کی شکایت رہی کہ وہ موجودہ ہندی کو نہیں سمجھ سکتے۔

کوئی بھی عوامی زبان گفت و شنید کر نہ بولی جاتی ہے اور نہ سمجھی جاتی ہے۔ اسے اس کا عوامی چلن مقبولیت اور محبوبیت عطا کرتا ہے۔ ریڈیو کی خبروں اور اس کے اہم پروگراموں کے لئے تو ایسی ہندی زبان ہونی چاہئے تھی جسے عدا اس والے بھی سمجھ لیتے، کیرالا، آسام، بنگال، اڑیسہ، گجرات، پنجاب اور کشمیر والے بھی۔ یہ تسلیم کہ اتر پردیش، ہماچل پردیش، راجستھان، مدھیہ پردیش اور بہار میں ہندی زبان سمجھنے والوں کی اکثریت ہے۔ لیکن ان صوبوں میں بھی لاکھوں لوگ ایسے مل جائیں گے جو پوری طرح ریڈیو کی سنسکرت آمیز زبان نہیں سمجھتے۔ ہندوستان بھر کے کالجوں اور ہائی اسکولوں میں ہندی لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے ہندی زبان پڑھنے والے یہ طلبا بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ان پڑھ لوگوں کا تو ذکر ہی کیا۔ دور کیوں جائیے، کوی سمیلنوں ہی کو لے لیجئے، انگلے کی شاعری کے مقابلے میں نیرج کی عام فہم شاعری کو ہندی جاننے والے سامعین زیادہ سراہتے ہیں۔

ریڈیو سے روزانہ کئی وقت نشر ہونے والی خبروں سے سرسری طور پر اخذ کئے گئے کچھ الفاظ یہاں پیش کئے جا رہے ہیں۔ الفاظ کی بات تو الگ رہی، خبروں میں جملوں کی ساخت بھی روزمرہ کے بالکل خلاف ہوتی ہے۔ الفاظ اپنے افعال کے ساتھ تال میل نہیں کھاتے۔

سرکھشا کی درشٹی	شرن نیتر	گھوشنا کا اوسیویشن	ویو ستا
نرمان	اشوا سن دیا	اُت پادن ہوا	آپ لبدھ

شنتنترتا دیوس	نرد بھارت	گرہن راج	پھر سک
نرد دیتا کے آروپ	اپنا ہیومنت بنالیا ہے	گھوشنا پتر	پروت ساہن
سرکشت ہیں	پکشن	پری ڈام	اشپشٹ سماچار
سنشودھنوں	انترگت	فی کیت	غنیت کیا ہے
گھوشت کر دیا	سمن تروں	پرستاوت	بھن بھین
ماننیتا پردان کردی	نرواچت	سپرک	

خبریں ایسی چیز ہیں جن میں ہر روز حالات و واقعات نئے نئے آتے ہیں اور اسی اعتبار سے خبروں کو الفاظ کا روپ دینے والے ریڈیو کے لوگ نئے نئے الفاظ استعمال کرتے ہیں، خواہ وہ موزوں ہوں یا نہ ہوں۔ زبان کے حسن، اس کے عوامی مزاج اور چلن کا مطلق خیال نہیں رکھا جاتا۔ قوم و ملک کا یہ کتنا بڑا نقصان ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں عوام ان خبروں کو نہیں سمجھ سکتے جنھیں سننے کے لئے وہ روزانہ بے چین رہتے ہیں۔ خبروں میں تو ایسے الفاظ ہونے چاہئیں جو زبان سے بہ آسانی ادا ہو سکیں یہ مختصر ہوں تاکہ کم وقت لیں اور ان کے استعمال سے جملہ بگڑے نہیں۔ ریڈیو سے عام طور پر جو الفاظ بولے جاتے ہیں وہ لہجے اور دیر میں زبان سے ادا ہوتے ہیں، اسی لئے خبریں کم سمجھنے میں آتی ہیں۔ خبریں نشر کرنے والے سرکاری ملازمین کبھی کبھی ان الفاظ کی ادائیگی میں گڑبڑا جاتے ہیں۔ ان کے لہجہ میں ایک بناوٹ پائی جاتی ہے۔ تکلف اور تصنع کا احساس ہوتا ہے۔ روانی اور شیرینی نہیں ہو سکتی۔

ایسے ہزاروں آسان الفاظ موجود ہیں جو ہندی زبان کا اصل سرمایہ ہیں۔ ان ہی سے ریڈیو کی خبروں اور دوسرے پروگراموں کو مرتب کرنا چاہئے۔ لفظ "رات"، نہ عربی ہے، نہ فارسی، نہ انگریزی۔ لیکن اس عام بول چال کے لفظ کو چھوڑ کر ریڈیو کے اناؤنسر صاحب بہت بن بن کر کہتے ہیں "اس سمے راتری کے ٹھیک سوا آٹھ بجے ہیں"۔ ہم یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ کئی سو سال سے اس ملک میں ہندی جاننے اور نہ جاننے والے دن اور رات بولتے آئے ہیں۔ رات کو راتری بنا دینے میں کیا حسن ہے؟ یہ ہندی زبان کے ساتھ کتنا بڑا ظلم ہے۔ کہ اسے عوامی ہندی الفاظ سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ہندی زبان کا وہ رس اور لوچ جو کبیر اور تلسی کے یہاں ہے۔ بچن کی کویتا میں پایا جاتا ہے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کی زبان بن کر نہایت کرخت ہو جاتا ہے۔ یہ ہندی زبان کے حسن کو سراسر نقصان پہنچانا ہے۔ اس کی مقبولیت کو ختم کرنا اور غیر ہندی داں صوبوں کو پریشان کرنا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ریڈیو کے حکام اور دوسرے ذمہ دار سرکاری لوگ اس زبان کو ہندی زبان کا نام نہ دیتے ہوئے یوں کہا کریں کہ "اب سنسکرت بھاشا میں سماچار پرسارت ہوں گے"۔ کچھ لوگ اگر یہ سوال کریں تو بے جا نہ ہوگا کہ "ہندی زبان" اگر اسی کا نام ہے جس میں خبریں نشر کی جاتی ہیں تو "سنسکرت" کسے کہیں گے؟ ریڈیو پر اب تک جو لسانی پالیسی برتی گئی ہے کیا وہ جمہوری اصولوں کے مطابق ہے۔؟

خوشی کی بات ہے کہ محکمۂ نشریات و اطلاعات کے وزیر شری راج بہادر نے لوک سبھا کے ممبروں کو یقین دلایا کہ ہندی زبان کے خبرنامہ کو آسان بنایا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ عام فہم الفاظ کا ایک وسیع خزانہ موجود ہے جسے بہ آسانی لیا جا سکتا ہے۔ زبان کی روح اور اس کے کردار کو خیال رکھنے کے سلسلے میں وزیر موصوف نے نہایت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ ہمیں امید ہے کہ وزیر نشریات و اطلاعات اپنے ان خیالات کو عملی جامہ پہنائیں گے اور سابقہ وزراء کی طرح کٹر قسم کے سنسکرت نوازوں کی باتوں میں نہیں آئیں گے۔ آل انڈیا ریڈیو کی زبان زیادہ سے زیادہ خوبصورت، آسان اور عام فہم ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہندی زبان سے عام طور پر ہر صوبے کے کروڑوں عوام محبت کرنے لگیں گے۔

۱۲ مارچ ۵۶ء

شکریۂ تعزیت

میری والدۂ ماجدہ بیگم علامہ سیمابؔ اکبرآبادیؒ کی وفات پر ہندستان اور پاکستان کے جن عزیزوں، دوستوں، بُزرگوں اور معنوی بھائیوں نے اظہارِ ہمدردی فرمایا، تعزیتی جلسے منعقد کئے، خطوط اور تار بھیجے۔ میں اور میرے تینوں برادرانِ عزیز (مقیم کراچی) اُن کے شکر گزار ہیں۔ چونکہ مادرِ ادب کے سانحۂ وفات پر کئی سو خطوط آئے ہیں، اس لئے فرداً فرداً سب کا شکریہ ادا کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ میرے درد و غم کو میرے مخلصین نے جس شدت سے محسوس کیا اور اُس میں جس طرح حصّہ گیر ہوئے، اُس کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ میں "شاعر" کے ذریعہ اُن تمام ہمدردوں تک اپنے جذباتِ تشکر پہنچا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

حادثات اور سانحات کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ لیکن اُن کی نوعیتیں مختلف ہوا کرتی ہیں، اور اُسی اعتبار سے وہ اپنا تاثر چھوڑتے ہیں۔ کبھی کبھی حادثات و واقعات کی کڑیاں حیرت ناک طور پر کچھ اِس طرح جُڑ جاتی ہیں کہ انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ عجیب بات ہے کہ "شاعر" کا اجرا فروری ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا۔ اُس کی اشاعت کے اکیسویں سال میں ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو والدِ محترم علامہ سیمابؔ اکبرآبادی نے انتقال فرمایا۔ اُن کی وفات کے اکیسویں دن ۲۰ فروری ۱۹۵۱ء کو مجھے ترکِ وطن پر مجبور ہونا پڑا۔ اور میں ۲۱ فروری کو بمبئی پہنچا ——— اور اب ۲۱ فروری (۱۹۶۶ء) ہی کو والدۂ محترمہ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا —— !!

(اعجاز صدّیقی)

تحقیق :-

مناظر عاشق ہرگانوی

نثرِ سیماب

(خوبصورت بلا عُرف آئینہ)

"ناول" انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لفظی معنی عجیب اور انوکھی چیز کے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں افسانوں کی ایک خاص صنف ہے۔ جس کی بنیاد واقعات اور فطرت پر ہوتی ہے۔ ذاتِ انسانی اس کا خاص موضوع ہوتا ہے۔ انسان کے افعال، خیالات، اغلاط اور خام کاریوں سے اس کا تعلق ہے۔ روزانہ زندگی کے واقعات، ان کی فطرت، اُس کی تلوّن مزاجی، خوف، احساسات، جوش، جذبات غرض یہ سب ناول کے موضوع ہیں۔

اُردو زبان و ادب میں لفظ "ناول" اب نیا نہیں ہے۔ سینکڑوں ناول نویس پیدا ہوئے اور ہزاروں ناول لکھے گئے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

اُردو زبان و ادب کے محسنین میں شیخ عاشق حسین سیماب اکبرآبادی مرحوم بھی ہیں۔ اُردو کا ہر پڑھا لکھا جانتا ہے کہ شاعری میں مولانا سیماب کا نظری ذوق اور ہدی میراث ہے اور اُن کا شمار اُردو شاعری کے عظیم اساتذہ میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ علامہ سیماب مرحوم ایک مُسلّم الثبوت شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ انھوں نے نثر کی ہر صنف پر لکھا ہے اور خوب اور بہت لکھا ہے۔ ——— ان میں ناول بھی ہیں۔

میرے پیشِ نظر علامہ مرحوم کا ایک ناول "خوبصورت بلا عُرف آئینہ" ہے۔ ساڑھے سات سو صفحے اور نو (۹) ابواب پر مشتمل اس ناول کو ۱۹۱۰ء میں منّی لال بال کشن داس تاجران کتب جوہری بازار آگرہ نے بال کشن پریس آگرہ سے شائع کیا تھا جس کی قیمت ۸ر آنہ ہے۔ یہ ناول حسن و عشق کی جیتی جاگتی تصویر ہے، رشک و رقابت کا فوٹو ہے۔ وصل و ہجر کا البم ہے۔ زبان و محاورات کا مخزن ہے۔ دلکش مضامین کا مجموعہ اور اردو نثر کا آئینہ ہے۔ جس میں قوتِ خیال، مصورِ فطرت اور ہنرمند کے فرق کو بتایا گیا ہے۔ اور ان کے پیچیدہ اور اعلیٰ ترین مسائل پر دلچسپ موشگافیاں کی گئی ہے۔ ——— زبان نہایت صاف، سادہ رواں اور شیریں ہے۔ تحریر میں بے تکلفی اور بے ساختہ پن ہے۔ تشبیہ و استعارہ سے بھی دلکشی پیدا کی گئی ہے۔ متانت اور سنجیدگی کا عنصر رشتہ ہاتھ سے کہیں نہیں چھوٹتا ہے۔ پلاٹ اور کردار نگاری میں بھی یہ ناول کامیاب ہے۔ لیکن اس میں خامیاں بھی ہیں، اور ہونی بھی چاہئیں۔ کیونکہ ۱۹۱۰ء میں یہ ناول طبع ہو کر منظرِ عام پر آچکا تھا اور اس وقت ناول نگاری اتنی عام اور مقبول نہیں ہوئی تھی جتنی آج ہے۔ بارہ بیس برس قبل تھی۔ اگر دیکھا جائے تو نذیر احمد (۱۸۳۶ء - ۱۹۱۲ء) رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶ء - ۱۹۰۲ء) منشی سجاد حسین (۱۸۵۶ء - ۱۹۱۵ء) عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ء - ۱۹۲۶ء) اور مرزا ہادی رسوا (۱۸۵۸ء - ۱۹۳۱ء) کے ناولوں میں بھی بہت ساری خامیاں موجود ہیں۔

لہ اگر علامہ سیماب کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست دیکھنا ہو تو ملاحظہ فرمایئے ماہنامہ شاعر بمبئی کا شمارہ نومبر ۱۹۶۶ء ——— صفحہ ۱۵ تا ۱۹ ——— (م۔ع۔ہ)

۲-۳ اعجاز صدیقی مدیر شاعر بمبئی نے مرحوم کس بنا پر خوبصورت بلا عُرف آئینہ کو ناول کے بجائے ڈراما بتاتے ہوئے اُس کا نام "واہ رے پیچ یا خوبصورت بلا" اور مطبوعہ الوالعلائی پریس آگرہ لکھا ہے؟ ملاحظہ ہو شاعر نومبر ۶۵ء صفحہ ۱۶ (م۔ع۔ہ)

خوبصورت بکاؤ عرف آئینہ، کی ہیروئن ایک کمسن چودہ[14] سالہ لڑکی محسنہ، ایک متوسط الحال، قلیل تنخواہ پانے والے، ریلوے ڈیپارٹمنٹ میں ملازم شہاور خاں کی اکلوتی اور حسین و طرحدار بیٹی ہے۔ جسے آئینہ دیکھنے کا مرض لاحق ہے۔ عام طور پر جوان لڑکیاں کنگھی چوٹی کا زیادہ شوق رکھتی ہیں، اکثر آئینہ زیادہ دیکھا کرتی ہیں۔ مگر یہ گھنٹہ بھر کی جگہ دو گھنٹے۔ لیکن محسنہ رات دن، اٹھتے بیٹھتے، چوبیس گھنٹے آئینہ دیکھتی رہتی ہے۔ اسے دکھانے کا خیال ہے نہ پینے کا ہوش۔ رات دن اپنے کمرے میں بند رہ کر اپنی صحت کو گھن لگا رہی ہے۔ اس کے اس مرض سے شہاور خاں، اس کی بیوی اور اس ناول کا ہیرو حسن بھی عاجز اور پریشان ہیں۔

حسن ایک نوجوان لائق لڑکا ہے۔ عمر سترہ[17] سال ہے۔ میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا ہے، محسنہ کا ماموں زاد بھائی ہے اور رنگ روپ میں محسنہ کا ہمشکل۔ یہاں تک کہ اگر حسن کو زنانہ لباس پہنا دیا جائے تو دیکھنے والے دھوکہ کھا جائیں کہ یہ محسنہ ہے۔

محسن محسنہ کا دیوانہ ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ محسنہ اس کی زوجیت میں آجائے، اور اس پر دونوں کے والدین بالاتفاق رضامند بھی ہیں۔ صرف محسنہ کی بیماری کی وجہ سے بات ٹھنڈی ہے۔

محسنہ کے آئینہ دیکھنے کے مرض کا ہر طرح سے علاج کیا گیا، عمل، مسمریزم، جنتر منتر، تعویذ گنڈے، نذر، نیاز، طبی معالجہ جو کچھ کسی نے بتایا کیا گیا۔ بیوی کے کہنے پر شہاور خاں بنارس کے ایک عالم فاضل مولوی ہدایت اللہ کے پاس بھی گئے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ گھر میں جتنے آئینے ہیں ان کو اٹھوا دیا جائے۔ اس کام کے لئے حسن کو محسنہ کے کمرے میں بھیجا گیا۔ محسن اسے سمجھاتا ہے کہ اگر تمہیں اپنی جوانی پر رحم نہیں آتا تو مجھ پر رحم کرو کیونکہ تمہاری پریشانی سے میرے ارمانوں کا مجموعہ پریشان ہو جائے گا۔ اور میری تمنائیں ناکام ہو جائیں گی۔ مگر اس کا حاصل ــــ آخر لوگوں کے مشورہ پر شہاور خاں نے ایک اشتہار شائع کر کے اسے راستے پر چسپاں کرایا کہ ــــ

"میری ایک چودہ[14] سالہ لڑکی جس کا نام محسنہ ہے۔ عرصہ چھ[6] ماہ سے ایک ایسی حالت میں ہے جسکو شاعر جنون اور حکیم خلل دماغ سے تعبیر کرتے ہیں مگر دراصل اس کے پیچھے ایک خوبصورت بلا پڑ گئی ہے۔ جس کا نام عوام میں "آئینہ" مشہور ہے یعنی وہ دن رات آئینہ دیکھا کرتی ہے اور یہ شغل روز بروز ترقی پذیر ہوتا جاتا ہے۔ عمل، مسمریزم، جنتر منتر، علاج، تعویذ گنڈے، ٹوٹکے، نذر، نیاز جو کچھ کسی نے بتایا کیا۔ مگر اس کی حالت درست نہ ہوئی۔ چونکہ مجھے وہ لڑکی بھی پیاری ہے اور اس کی جان بھی۔ لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ وہ اسی خیال کی نذر ہو جائے ــــ اور بذریعہ اشتہار ہذا عام طور پر اعلان کرتا ہوں کہ جو شخص بشرطیکہ وہ مسلمان ہو میری محسنہ کو اس خوبصورت بلا سے نجات دلا دے گا، اس کی حالت جیسی بھی ہو جیسی ہی ہو جائے گی تو میں اس احسان کے صلہ میں محسنہ کی شادی اس کے ساتھ کر دوں گا۔" راقم شہاور خاں۔

اشتہار دیکھ کر لکھنؤ سے ایک برقعہ پوش عورت آتی ہے جس نے دعا کیا کہ وہ محسنہ کو ٹھیک کر دے گی۔ اس برقعہ پوش عورت کی خواہش کے مطابق اسے محسنہ کے کمرے میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے حکام کیا وہ یہ تھا کہ چراغ کو ہاتھ دے کر آئینہ پر کوئی رقیق چیز ڈال دی کہ جس سے وہ بالکل اندھا ہو گیا۔ اور برقعہ الگ پھینک کر خود بجائے آئینہ کے جا کھڑی ہوئی۔ محسنہ کے خیالات میں ایک تغیر پیدا ہوا۔ جھنجھلاہٹ اور غصہ کے حالت میں اس کی زبان سے "نکلا اور وہ دیا سلائی ڈھونڈنے لگی۔ جب بکس مل گیا تو اس نے چراغ جلایا۔ اور جب چراغ کی روشنی کمرہ میں اچھی طرح پھیل گئی تو اس نے دیکھا کہ بالکل وہی تصویر جو اسے آئینہ میں نظر آتی تھی آئینہ کی جگہ کھڑی ہوئی ہے۔ وہ بے اختیار ہو کر دوڑی اور اس ہیولے سے لپٹ گئی جو آج تک اسے صرف بصورت عکس نظر آتا تھا۔ چونکہ ایسے موقع پر ان کی اکثر شادی مرگ ہو جاتا ہے۔ بایں خیال اس برقعہ پوش نے اس سلین کو زیادہ دیر تک محسنہ کی آنکھوں کے سامنے بیکار رہنے نہ دیا کہ گفتگو شروع کر دی[5]

غرض وہ عورت اسی کمرے میں محسنہ کے ساتھ رہ کر آہستہ آہستہ اسے اپنا ہم خیال بنا لیتی ہے، آئینہ توڑوا کر پھینکوا دیتی ہے اور محسنہ

---

[4] صفحہ ۱۴ ۔ م ۔ ع ۔ ۵۔

[5] صفحہ ۴۲ ۔ م، ع ۔ ۵۔

[6] صفحہ ۴۸ م، ع، ۵

رُو بہ صحت ہونے لگتی ہے۔

اور جب محسنہ بالکل ٹھیک ہوگئی تو جمعہ کے دن سب جمع ہوئے اور اُس برقعہ پوش نے شہاؔر خاں سے مخاطب ہو کر کہا ــــ مجھے اس قدر کہنا ہے کہ وہ خوبصورت بلا جو آپ کی لڑکی کے سر پر سوار تھی، محض قوتِ خیال سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ ورنہ حقیقتاً کوئی اسرار و دقائق اور ایسی کسی عامل کامل کا جادو منتر نہ چل سکا۔ اگر آپ یونہی قدیم توہمات میں مُبتلا رہتے تو اپنی ہونہار صاحبزادی کو اس بلائے بے درماں سے نجات نہیں دلا سکتے تھے۔ مگر خدا کی قدرت ہے کہ آپ کے دماغ میں اجتہاد کا مادہ پیدا ہوا۔ جس کی داد میں کیا آج تمام زمانہ دے گا اور دے رہا ہے۔ قوتِ خیال سے ہزارہا مرض پیدا ہو جاتے ہیں اور اسی سے لاکھوں بیماریاں دُور ہو جاتی ہیں۔ اگر انسان اسے مناسب طریقہ پر عمل میں لائے تو سینکڑوں فائدے اس سے اُٹھائے۔ یورپ کے صنّاع جن کی اختراع طرازی پر آپ لوگ ہزار جان سے نثار ہیں، اسی قوتِ خیال کے ذریعہ ترقیاں حاصل کر رہے ہیں اور نئی نئی ایجادیں آئے دن کرتے جاتے ہیں۔ جزائر عظم الیشیا کے تمام حصص اُن عالی دماغ انسانوں سے اب تک خالی ہیں جو "قوتِ خیال" کو کام میں لا کر شاہراہِ ترقی پر کامیاب ہوں۔ خیال کرتے ہیں، جوش پیدا ہوتا ہے، مگر اس جوش اور خیال کو تقویت حاصل نہیں ہوتی۔ اور اُن کے منصوبے ادھورے اور ارادے ناکام رہ جاتے ہیں۔ اگر وہ اپنے خیالات کو قوت دیں تو وہ بھی اہلِ یورپ کی طرح نئی نئی تجدید کے موجد مانے جائیں۔ اور اپنے ملک میں امتیازی درجہ حاصل کر لیں۔ رہا یہ سوال کہ خیالات کو قوت کیونکر دی جائے۔ اس کا سبق تمہیں محسنہ کی سوانح سے ملے گا۔ دیکھئے آئینہ کون نہیں دیکھتا۔ مگر کسی کو آج تک اُس پر عاشق ہوتے نہیں سُنا۔ بات یہ ہے کہ محسنہ نے آئینہ دیکھا۔ اُسے اپنے عکس میں کوئی خاص بات معلوم ہوئی۔ مکرر پھر دیکھا۔ وہی دلکشی پہلے سے ترقی پر ہو گئی اور اس نے پھر آئینہ دیکھنے پر مجبور کیا۔ حتیٰ کہ آئینہ دیکھنا اُس کی عادتِ ثانی ہو گیا اور نوبت بایں جا رسید کہ اُس کے خیالات تقویت حاصل کر گئے اور آپ لوگوں نے محزون اور وحشت کا حکم لگا دیا۔

کیا آپ عام طور پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ آئینہ دیکھنا محزون ہے۔ ہرگز نہیں۔ پھر بے چاری محسنہ نے کون سا قصور کیا جو اُسے مخزونی اور وحشی کا خطاب عطا کیا گیا ــــ

حضرات یہ سب قوتِ خیال کے کرشمے ہیں۔ اسی طرح انسان اگر اپنے نیک خیالات کو ثبات دینا چاہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ دنیا بھر کا بہ معاش کیوں نہ ہی نیک بخت اور نیک معاش ہو جائے گا۔ اگر ایک کارگر اپنی بازار میں اپنے خیالات کو ترقی دے گا اور اُن کو قوت حاصل ہو گی تو وہی بنا ورٹا ایک دن خاص پہلو لئے ہوئے نکلے گی۔

اگر کسی قوم میں سے کوئی شخص اپنی قوم کی بہبودی کے ذرائع پر اپنے خیالات کے مرکز کو وسیع کرتا رہے گا تو ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ قوم میں مجتہد کہے جانے کا مستحق ہو جائیگا اور اُس کے اجتہاد پر لوگ فخر کریں گے۔ [1]

لوگ حیران تھے کہ ایک معمولی عورت اور ایسا لکھ ــــ مگر ان کی حیرانی اور خوشی کی اُس وقت انتہا نہ رہی جبکہ شہاؔر خاں اور اُن کی اہلیہ نا اُمید تھیں کہ محسنہ کسی فقیر کے ہاتھوں بیاہی جائے گی اور محسن سے شادی کرنے کی دیرینہ آرزو پوری نہ ہو گی کیونکہ برقعہ پوش کے اصرار اور گذارش پر شہاؔر خاں نے رضامند کر لیا تھا کہ اُس کے سلمہ برقعہ پوش چاہے گی خواہ وہ قوم سے کوئی ہو، ذات اُس کی کچھ بھی ہو، وہ اعتراض نہ کریں گے ــــ جب برقعہ پوش نے یہ فرمائش کی کہ "اب التماس یہ ہے کہ اپنی محسنہ کو مجھے دے دیجئے" یعنی میری زوجیت میں دے دیجئے۔ [2] تو لوگوں کے تعجب پر عورت نے برقعہ اور زنانہ کپڑے فوراً اتار دیئے۔ اور لوگ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ وہ کوئی دوسرا نہیں بلکہ محسن تھا۔

دل کا اطمینان جاتا رہے اور کلائمکس چونکا دینے والا ہو۔ شروع کرنے کے بعد قاری عجیب عجیب خیالات اور واہموں میں مُبتلا ہو جاتا ہے اور فطری طور پر، کیونکہ انسان کے اندر رحم کا جذبہ قدرت کی طرف سے عطیہ ہے۔ محسنہ اور محسن سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور عجیب عجیب کہانی آگے بڑھتی ہے تجسس بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن جب نقاب اٹھتا ہے تو قاری کے چہرے پر آپ سے آپ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ یہ تاثر راقم خود

---

[1] صفحہ ۵۵-۵۴ ۔ م۔ ع۔ ہ

[2] صفحہ ۵۶ ۔ م۔ ع۔ ہ

اپنا بیان کر رہا ہے۔ وہ خوبصورت بلا عنوان آئینہ، کو پڑھتے وقت راقم عجیب عجیب خیالات اور جذبات میں مبتلا رہا اور کوشش کے باوجود بھی دورانِ مطالعہ یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ محسنہ اور محسنہ کا ملاپ کیونکر ہو سکتا ہے۔ پھر جیسے جیسے ناول قریب الختم ہوتا گیا، راقم کے ذہن پر مایوسی کی گرد جمتی گئی اور دونوں کرداروں کے لئے ہمدردی کا جذبہ بڑھتا گیا لیکن جب برقع پوش کی اصلیت ظاہر ہوئی تو بے ساختہ چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی ــــ

ناول "خوبصورت بلا عرف آئینہ" کے صفحہ ایک پر "انعام مجانب اہلِ مطبع" کی سرخی کے تحت یہ اعلان درج ہے :-

"ہم ناول ہذا کے مصنف کی اس گراں مایہ تصنیف اور اثر جانفشانی کی داد دیتے ہیں جو اس ناول کے تیار کرنے میں اُن کو دوڑنی پڑی ہوگی۔ کیونکہ اس ناول میں یہ لطف ہے کہ جس قدر اشعار اس میں تحریر ہیں وہ سب آئینہ پر ہیں جو حسب موقع چسپاں کئے گئے ہیں اور گلزار داغ اور آفتاب داغ سے اس طرح اخذ کئے گئے ہیں کہ آئینہ کے متعلق کوئی بھی شعر مرقومہ بالا تصانیف میں باقی نہیں رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے ہم نے یہ انعام مقرر کیا ہے کہ جو صاحب گلزار داغ اور آفتاب داغ سے آئینہ کے متعلق کوئی ایسا شعر نکال کر دکھا دیں جو اس ناول میں درج نہ ہو تو ناول ہذا ایک عدد اُن کو بطور انعام مفت دی جائے گی۔

مینیجر بالکشن پرنٹنگ پریس جوہری بازار آگرہ۔"

صفحہ ۲ پر "ڈیڈیکیشن" کی سرخی کے تحت علامہ سیماب نے اس ناول کا انتساب کیا ہے۔ "..... میں اس آئینہ کو بنظرِ قدردانی و بغرض حوصلہ افزائی نہایت ادب اور امید کے ساتھ عالی جناب مستطاب نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس وتالوی دام فیوضہ و زاد اقبالہ کے نام نامی اور اسم گرامی پر معنون کرکے ....."

صفحہ ۳ پر علامہ سیماب کے قلم سے "تمہید" درج ہے۔

عارضِ روشن کے پرتو سے عجب کیا ایک دن
گرچمک کر آئینہ اقبالِ اسکندر بنے

اے آئینہ کے دیکھنے والو تم نے ناول تو بہت سے دیکھے ہوں گے مگر یہ ناول اپنی طرز کا انتہائی انوکھا ناول ہے۔ سب سے پہلے اس میں لطف زبان ملاحظہ فرمایئے، پھر واقعات کی داد دیجئے ــ اس کے بعد جو خصوصیت قابلِ داد و دید ہے، وہ یہ ہے کہ اس ناول میں کوئی شعر ایسا نہیں جس میں لفظ "آئینہ" نہ آیا ہو۔ ماسوا اس کے جمیع الملک حضرت داغ دہلوی مرحوم کی دو اوین گلزار داغ اور آفتاب داغ میں جتنے اشعار متعلق آئینہ آئے ہیں یا یوں کہئے کہ دونوں دیوانوں کے جن اشعار میں لفظ آئینہ آیا ہے وہ تمام و کمال حرفاً حرفاً اس ناول میں درج ہیں۔ اس خصوصیت کے ساتھ ان اشعار کو باموقع خوبصورتی کے ساتھ لانے میں جو جدوجہد مجھے کرنا پڑی ہے وہ میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔ اگر پبلک نے اس کی داد دی تو زہے قسمت ورنہ زبان گلہ نہ شکایت"

آگرہ ۲۲ نومبر ۱۹۰۹ء

ابوالفخر سیماب صدیقی
وارث اکبر آبادی عفی عنہ

اس ناول میں کُل ۷۷ اشعار ہیں۔ ان میں ایک شعر میں علامہ سیماب مرحوم کا تخلص ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں داغ مرحوم کے اشعار ہی نہیں ہیں بلکہ علامہ سیماب نے اپنے اشعار بھی شامل کئے ہیں ــــ وہ شعر یہ ہے ؎

میں ہی اے سیماب آئینہ کو دیتا ہوں جلا
میرے ہی دم سے یہ سب جلوہ گری شیشہ میں ہے

اس ناول میں مسمریزم، قوتِ خیال اور ہپناٹزم پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اُن کے فرق کو بتایا گیا ہے۔ یہ حصہ کافی معلوماتی ہے۔ فی زمانہ علم مسمریزم کو کچھ ایسی ترقی حاصل ہوئی ہے کہ فیصدی پچاس علم دوست اصحاب اس فن کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ اگر یہ نہ کہا جائے تو دوسرے الفاظ میں کی جائے تو اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ فن معلومہ قوتِ خیال کا ایک کامیاب نتیجہ ہے۔ قوتِ خیال

بڑی قوت ہے جس کے بل بوتے پر سینکڑوں اہم سے اہم کام بسہولت تمام انجام پاجاتے ہیں۔ عقیدت یا عقیدہ جس کا نام ہے وہ اسی قوتِ خیال کی فروعات میں سے ہے۔ نذر، نیاز، گنڈا، تعویذ، بھوت، پلید اور دُنیا بھر کے جھگڑے سب اسی قوتِ خیال پر مبنی ہیں۔ سب کی بنیاد بھی قوتِ خیال ہے۔ قوتِ خیال سے جو کام نکلتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں نکل سکتا۔ قوتِ خیال بلا خیالِ مذہب و قوم ہندو مسلمان، گبر و مجوس وغیرہ سب میں موجود ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جو فائدہ اہلِ اسلام وظائف سے اٹھاتے ہیں وہ ہی فائدہ ایک برہمن اشلوک پڑھ کر حاصل کرلیتا ہے کہ جو فائدہ متبرکات ایک مسلمان شخص مزاروں اور معبدوں پر جانے سے لے آتا ہے وہ ہی برکتیں ایک ہندو مندروں سے لوٹ لاتا ہے۔ خواجہ صاحبؒ کی نیاز و فاتحہ سے اگر فیضی پچاس مرادیں پوری ہوتی ہیں تو شیخ سدّو کا کیرا کرنے سے بھی فیضی بیس مرادیں پوری ہوجاتی ہیں ——— ..... آتش پرست آگ کو معبود سمجھ کر اُس سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں اور ملتی ہیں۔ آفتاب پرست سورج کو بزرگ ترین خدا سمجھ کر اُس سے عرض حال کی تقویتِ معدوم چیزوں کی بھی خاطر خواہ پوری ہوتی ہیں۔ یہ سب قوتِ خیال کے ادنیٰ ترین شعبے ہیں۔ خیال کی تقویتِ معدوم چیزوں کو موجود کرکے دکھا سکتی ہے۔ اندھیری رات میں جبکہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہو اور دور دور تک کوئی آواز نہ سنائی دیتی ہو، کسی لق و دق میدان یا کسی دشوار گذار گھاٹی کے دامنوں پر نظر کیجئے، معلوم ہوگا کہ کوئی ڈراؤنی چیز یہاں موجود ہے۔ اب اپنے خیالات کو یوں جمایئے کہ یہ کوئی بلا ہے۔ جمتے جمتے وہی خیال درحقیقت معدوم بے اصل ہے مگر رفتہ رفتہ تقویت حاصل کرتا جارہا ہے) اُس ہیولا کو مجسم بنکر آپ کے سامنے کھڑا کردے گا۔ اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ واقعی کوئی بھوت بلا ہے۔ اُس کی آنکھیں، کان، ناک، دانت، بال اور دیگر ڈراؤنے اعضاء آپ کی قوتِ خیال پر موقوف ہیں۔ سب ظاہر ہوجائیں گے اور آپ پر خوف طاری ہوجائے گا۔ غرض قوتِ خیال ایک عجیب مظہر العجائب قوت ہے اور مسمریزم کو بھی اسی قوت سے ہپناٹزم کی طاقت حاصل ہے۔ بعض عامل جو مسمریزم کے طریقوں سے کسی قدر واقف ہیں اپنے معمولی اصحاب سے فرمایا کرتے ہیں کہ ہمارے تابع ہمزاد ہے۔ یہ بات بالکل لغو ہے۔ ہمزاد کا تابع کرنا بڑی بیڑھی کھیر ہے .... نئے ہمزاد کے معنی ہیں۔ ہمراہ جناہوا یعنی ہمزاد ہر انسان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور جب تک اُس کی عمر ۱۲ سال کی نہیں ہوجاتی ہر وقت الٹھے بیٹھتے، سوتے جاگتے اُس کے ساتھ رہتا ہے اور پھر چونکہ پردہ ہر مذہب و قوم میں ایک ضروری رسم ہے، کنارہ کش ہوجاتا ہے۔ ہمزاد شکل و شمائل، عادات و خصائل میں اپنے ہمزاد انسان سے بالکل مشابہ ہوتا ہے اور علم و کمال میں ہر طرح بہرہ مند۔ اگر انسان جاہل ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اُس کا ہمزاد بھی جاہل ہو۔ مگر جو انسان فاضل ہے تو ہمزاد عالم ہوگا۔ ہمزادوں میں قومیں بھی نوعِ انسان کی طرح قائم ہیں۔ جو ہمزاد مسلمان ہیں وہ شیخ، سید، مغل، پٹھان کی قیود سے آزاد نہیں۔ جو ہندو ہیں وہ برہمن، چھتری، شودر ویش وغیرہ اقوام نام سے نامزد ہیں۔ عیسائیوں کے ہمزاد عیسائی، مجوسیوں کے مجوسی، نصرانیوں کے نصرانی، ہندوؤں کے ہندو، مسلمانوں کے مسلمان۔ غرضکہ جس قوم اور مذہب میں جو انسان مبعوث ہے اُسی مشرب اور ملت میں اُس کا ہمزاد بھی مخلوق ہے۔ آپ نے سنا ہے کہ فلاں عورت اور فلاں مرد کے سر فلانی کو لن اور فلاں چمٹ آتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ وہی ہمزاد۔ ورنہ کوئی بلا ہے، نہ چڑیل ... مگر ہاں اس بات کے ماننے میں کسی قسم کا تامل نہیں ہوسکتا کہ مسمریزم اور قوتِ خیال لازم و ملزوم ہیں۔ قوتِ خیال کے متعلق اکثر حاذق حکما اور لائق ڈاکٹر بھی بہت کچھ تحریر کرچکے ہیں اور اسلئے کہا جاتا ہے کہ قوتِ خیال از روئے سائنس یا باعتبار حکمت بھی مؤثر ثابت ہوئی ہے ... حکیم فیشا فوئٹ نے قوتِ خیال پر ایک بسیط اور مدلل بحث کی ہے، جس کا مجمل خلاصہ یہ ہے کہ "قوتِ خیال اور قوتِ دماغ دونوں قوتیں جسم انسان میں بادشاہ ہیں اور باقی تمام طاقتیں اُن کی محتاج" اگر یہ دونوں طاقتیں انسان کو ودیعت نہ ہوئیں تو انسان انسان نہ کہلاتا کیونکہ حیوان اس سے محروم ہیں اور مجنوں لیلیٰ کی وضعداری گئی تو مجنوں کے ہاتھ سے خون جاری ہوگیا۔ اگر یہ سچ ہے تو وہی قوتِ خیال کا کرشمہ ہے۔ کہ کہن نے مرگِ شیریں کی جھوٹی خبر سنکر سر پر کلہاڑی ماری۔ شیریں مرگ کی سچی سرگذشت سے موثر ہوکر اسکی قبر پر جان نثار کرگئی۔ اگر یہ دونوں حادثے تاریخی دُنیا میں جھوٹے نہیں ہیں تو یہ بھی قوتِ خیال کے ادنیٰ نمونے ہیں ۹

انشاء اللہ نشر سیماب کی دوسری کڑی "حیاتِ داغ" ہوگا۔ علامہ سیماب مرحوم کی کتاب "حیاتِ داغ" کا نام حضرت اعجاز صدیقی نہ معلوم کس بنا پر "چراغِ داغ" لکھا ہے ۱۰

---

۹ صفحہ ۲۲ تا ۲۵ ۔ م ۔ ع ۔ ۵

۱۰ ملاحظہ ہو ماہنامہ "شاعر" نومبر ۶۵ء صفحہ ۱۷ ۔ م ۔ ع ۔ ۵

شاعر بمبئی

منوّر لکھنوی

غزل

ہمت ہار کے بیٹھ نہ جائے پستِ دلِ ناکام بہت ہے
کیسے بار اُٹھے گا اِس کا سخت غمِ ایّام بہت ہے

کُلفت ہے آغاز سے مجھ کو، اندوہِ انجام بہت ہے
صبح سے میں مایوس بہت ہوں تیرہ مری شام بہت ہے

شمعِ سحر کی صورت بجھتے بجھتے لَو دے اُٹھتا ہے
اپنی پختہ کاری پر بھی شوق کا جذبہ خام بہت ہے

کیا الزام کسی کو دینا، ہم نے تو جس کو بھی دیکھا
خود اپنی ہی کم ظرفی سے مقصد میں ناکام بہت ہے

چھٹتا ہے کب دیکھئے پیچھا، انساں کا اِس دَورِ بُرا سے
شام و سحر کے پھیر میں پڑ کر بیزارِ ایّام بہت ہے

دل کے آسودہ کرنے کو کیا یہ زیادہ حد ہی پینا
رُخ میں سُبو کی سمت کرو کیا بھلا اک جام بہت ہے

کچھ تو لینا چاہیئے آخر، جائزہ دونوں کے اجزا کا
گرمیِ شوق میں بیحد سرد ترا پیغام بہت ہے

ہر دم دھڑکا یہ رہتا ہے، بوجھ سے دب کر بیٹھ نہ جاؤں
اک مدّت سے میرے سر پر بارِ غم و آلام بہت ہے

بگڑے کام کے بن جانے کی کوئی شکل نکل ہی آئے
رکھ لے حوصلہ عزّت اِسکی خوارِ دلِ ناکام بہت ہے

دے نہ زیادہ طولِ امل تُو اپنے شوقِ پامالی کو
رُوندنے والے تیرے لئے تو سبزہ زیرِ گام بہت ہے

کہدے بادِ صبا سے کوئی فرش بچھائے کیوں پھولوں کا
کانٹوں کے بستر پر مجھ کو راحتِ آرام بہت ہے

عشق کے بادو پھیلے پھیلے ہاتھ ہوس کے سمٹے سمٹے
عشق کی اِس میں کیا گنجائش تنگ ہیں کتنے دام بہت ہے

پھر بھی اکثر کم بینوں کو تجھ سے بیگانہ ہی پایا
مان لیا ہم نے یہ منوّر ملک میں تیرا نام بہت ہے

...یر میں مکتبہ جامعہ کا سترہواں جشن

...ہ میں مکتبہ جامعہ کی ترقی کے دس سال پورے ہوئے تھے۔ اس میں تمام زبانوں کے کتابوں کے بڑے بڑے ...کتب خانہ لیٹریچر خانہ بچوں کے لیے بہت سی چیزیں شوق کی ...ک نمونہ کی کتابیں تیار کی گئیں۔ اس نمونہ میں ہر صوبہ اور ...ہر کو جگہ دی گئی تھی۔ بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ مکتبہ جامعہ نے ...یہ شروع کیا۔

...ہ کے بعد سے ہر سال اس میں مختلف زبانوں کی طرف ...ہ کا پروگرام رکھا جاتا ہے۔ امسال کے پروگرام کا اہتمام انجمن ترقی اردو ...ف سے کیا گیا تھا۔ جس میں ساجدہ شکیلہ بیدار نے اپنا ...ہ خوبصورت اور دلچسپ انداز میں پیش کیا۔ سردار جعفری، سکندر علی وجد ...ر صاحبہ، کیفی اعظمی، ندا فاضلی، یوسف ناظم اور چند دوسرے ...ر نے اپنا کلام سنایا۔ اردو غزلیں موسیقی کے ساتھ پیش کی گئیں۔ اردو ...ہ کے پروگرام میں ہر زبان کے پروگرام سے زیادہ لوگ شریک ...ہ کا "ہال" کی تمام نشستیں بھری ہوئی تھیں اور بے شمار ...ن کھڑے ہوئے تھے۔

اُردو مراٹھی ڈکشنری شائع ہو گئی

...ہ ۲۴ نومبر۔ ادب اور ثقافت کی ترویج و ترقی اور ...ف ادب میں آپسی اور قریبی زبانوں کے تراجم شائع کرنے کے لیے ...ومت مہاراشٹر نے ایک بورڈ قائم کیا تھا۔ بورڈ کے چیرمین جو کے ...ر مشہور مراٹھی نے ایک پریس کانفرنس میں بورڈ کی کارگزاری کا ...ہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کی طرف سے ایک اردو مراٹھی اور مراٹھی اردو ...ری شائع کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کئی دیگر اردو مراٹھی کتابیں ...ر شائع کی گئی ہیں۔

بیگم ماہر القادری کا انتقال

...ہ ۲۴ نومبر۔ اردو کے مشہور شاعر مولانا ماہر القادری کی بیگم کا طویل علالت کے ...ہ انتقال ہو گیا۔ مرحومہ آٹھ سال سے مسلسل بیمار تھیں اور ...ہ کے بیٹوں اور بیٹیوں کے ہاں باری باری سے رہتی تھیں۔

...ہ ایک اخبار صدق جدید نے یکم مئی ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ سے جاری کیا۔ ۱۹۵۲ء میں یہ اخبار ...ہ سے شائع ہونے لگا۔ ۱۹۵۳ء میں یہ اخبار لکھنؤ سے شائع ہونے لگا۔

نقوش

سال میں چار بار

ادب اور تہذیب کا بین الاقوامی ترجمان

زیر ادارت

سردار جعفری

اس میں لکھنے والے وہ ترقی پسند ادیب ہیں، جنھوں نے نئی راہوں سے نئی منزلوں کی طرف سفر کیا ہے۔ ان پر جدید اُردو ادب کو بجا طور سے ناز ہے اور ان کی تخلیقات دنیا کے بہترین ادب سے آنکھیں ملا سکتی ہیں۔

اس میں لکھنے والے وہ بزرگ ادیب ہیں، جو اپنے نام کے ساتھ کسی صفت کا اضافہ پسند نہیں کرتے لیکن انسانیت کی اعلیٰ قدروں، زندگی کے حسن اور تہذیب کی لطافت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں اُردو ادب کی آبرو ہیں۔

اس میں لکھنے والے وہ جدید ترین ادیب ہیں، جو تذبذب، تشکیک اور بے دلی کی نیم تاریک، نیم روشن فضاؤں سے گزر رہے ہیں۔ اگر وہ پرانی اقدار سے مایوس ہیں تو یقیناً ان کے دل میں نئی اقدار کی روشنی موجود ہے اور ایک نہ ایک دن وہ اس روشنی کو تلاش کر لیں گے۔ اُردو ادب کا مستقبل ان کے ہاتھ سے تابناک ہے۔

سالانہ چندہ ——— بیس روپے

بیرونِ ہند ——— تیس شلنگ

۲۰۔ کھیتان بھون۔ جے۔ ٹاٹا روڈ

بمبئی ۱

ہوتے ہیں۔ تو وہ بڑی عبرت ناک زندگی بسر کر رہا تھا۔

گورے رنگ کا لمبے لمبے سڈول جسم اور معصوم صورت والا مہندر مجھ میں ان سب سے چھوٹا تھا، اور یونیورسٹی میں ملازم تھا۔ اسسٹنٹ لائبریرین ہونے کے کارن اُس کا سارا دن کتابوں میں گذر جاتا تھا۔ اور راتیں جاگنے اور خیالوں کی وادیٔ سنگ میں اصنام تراشنے میں تمام ہوتی تھیں۔!

حسینی نے اپنے ان تینوں دوستوں کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا تھا۔ رات کا کھانا کھانے تک انھوں نے خلا و پرانی فتح کے موضوع سے لے کر انا نگاہ اور دیگر فرد و ذات زندگی اور عوام کے اخلاقی زوال اور روحانی انحطاط تک سب ہی موضوعات پر باتیں کی تھیں۔ فنون لطیفہ اور بالخصوص ادب سے عوام کی بڑھتی ہوئی بے حسی اور تغافل پر افسردہ بھی ہوئے تھے۔ اور ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی ذہنی افتادگی اور پست خیالی پر شکوہ سنج بھی۔ مشینوں کی حکومت اور دلوں کی موت سے بات بڑھ کر پھر اُسی پرانے موضوع تک پہنچ گئی۔ وہی موضوع جس پر وہ برسوں سے باتیں کرتے، سوچتے اور بحث کرتے رہے تھے۔ صدیوں پرانے اور پریشان کن سوالات۔ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں۔ کہاں جائیں گے۔ زندگی کا آغاز کیا تھا اور انجام کیا ہوگا۔۔۔؟ کیا زندگی فانی شئے ہے؟ اگر نہیں تو بکھرنے کا مطلب کیا ہے؟ آج مدتوں بعد انھیں فرصت ملی تھی کہ ان ازلی سوالوں پر جی کھول کر باتیں کر سکیں۔ وہ آج سے پہلے بھی اس موضوع پر گفتگو کر چکے تھے۔ پتھر کی بے حس دیواروں سے سر ٹکرا کر وہ زخمی اور لہولہان ہو چکے تھے۔ لیکن ہوش و حواس کے قید خانوں کی ان سنگین دیواروں میں کوئی دروازہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک گنبدِ بے در کے قیدی تھے۔ اور آزادی کے لئے ترس رہے تھے!

"میں کون ہوں؟"

"تم حسینی ہو۔"

"اور میں؟"

"اشفاق!"

"اور یہ؟"

"یہ فوری ہے۔"

"اور وہ کون ہے؟"

"وہ مہندر ہے!"

لیکن "میں" "تم" "یہ" اور "وہ" "کون ہے؟"

"سب ایک ہیں۔ واحد اور مطلق ایک جسے بیان کرنا مشکل، دیکھنا ناممکن، اور سننا دشوار ہے۔ جو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے کہ موجود ہے!"

"آخر یہ ہونا کیا شئے ہے؟"

"کوئی شئے نہیں ہے۔ ہونا نہیں ہونا ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی بھی در اصل نہیں ہے۔"

"لیکن میں تو ہوں۔ میں جو سوچتا ہوں کہ ہوں۔"!

"تم نہیں ہو۔ اس لئے کہ در اصل تم سوچ ہی نہیں رہے ہو۔"

"مگر۔۔۔ میں سوچ تو رہا ہوں۔"؟

"سوچ کہاں رہے ہو، بس غریب کھا رہے ہو۔"!

"لیکن مجھے یقین ہے۔۔۔؟"

"یقین فریبِ مسلسل کا نتیجہ ہے۔۔۔ اور بس!"

"تو پھر ۔۔۔ پھر میں کچھ بھی نہیں ہوں ۔۔۔ تم کچھ بھی نہیں ہو ۔ وہ کچھ بھی نہیں ہے ۔ دکھائی دینے والی اور دکھائی نہ دینے والی دنیا کچھ بھی نہیں ہے ۔ آسمان فریبِ نظر ہے ۔ اور زمین خیالوں کا دھوکہ ہے ۔۔۔ زندگی ہے اور نہ ہی موت ہے ۔"؟

"فریبِ نظر ۔ فریبِ خیال ۔۔۔ سوچ کے تراشیدہ صنم ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ دنیا ہے صرف اس لئے کہ ہم سوچتے ہیں ۔"!

"اس کا مطلب ہے کہ سوچ کا وجود ہے ۔ خیال کی اپنی ایک ہستی ہے ۔۔۔ ۔"؟

"تم پھر بہک رہے ہو غوری ۔۔۔ چائے پیو ۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے !"

"اور ہاں مہندر ۔۔۔ تم سگریٹ تو نہیں پیو گے ۔ یہ شراب ہی پی لو ۔۔۔"

"شکریہ ۔۔۔ میرے یار بے حد شکریہ ۔"

"اور اشفاق تم تو سگریٹ بہت پیتے ہو ۔"؟

"ہاں صرف سگریٹ ہی پیتا ہوں ۔"

"ہاں تو اشفاق ۔" ۔۔۔ حسینی نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو چھت پر لگے تیزی سے گھومتے برقی پنکھے پر جمائے ہوئے کہا ۔ "زندگی اور موت دونوں اصل میں ایک ہیں ۔ زندگی میں موت ہے اور موت میں زندگی ۔"

"میں تو آگیا میرے دوست ۔ ان باسی صدیوں پرانی بار بار دہرائی ہوئی باتوں سے ۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم نے اب تک جتنی بھی باتیں کی ہیں ان میں سے ایک بھی بات نئی نہیں ہے ۔"!

"ڈیر اشفاق ۔" حسینی نے چونک کر کہا ۔ "دنیا میں کون سی بات نئی ہے میرے بھائی ۔"؟

"ہائے کتنی پرانی ، بوسیدہ اور فرسودہ ہے یہ دنیا جس میں ہم یعنی نئے دور کے انسان رہتے ہیں ۔۔۔" مہندر کی آواز پر شراب کا غلبہ ہو رہا تھا ۔

"دنیا صدیوں ، صد ہزار صدیوں پرانا قید خانہ ہے ۔"

"پھر وہی گھسی پٹی باتیں ، رگیدے ہوئے فرسودہ خیالات ، بقولِ فلاں والے جملے ۔

"میرے دوست کوئی بالکل نئی بات نہ سہی ، کوئی ایسی بات تو ہو جس میں تازگی پائی جائے ۔" اشفاق بیزاری سے بولا ۔

"زندگی تم جسے فرسودگی اور تازگی کا حسن اور بدصورتی کے امتزاج کا ۔۔۔" غوری بڑبڑانے لگا ۔ "اشفاق پیارے ۔ لوحِ ہستی پر انسانی وجود ایک نقطہ ہے ، اور اس نقطہ کو مرکز مان کر ایک پرکار سے دائرہ کھینچ دیا گیا ہے ۔ خیال کا دائرہ ۔ سکڑتا اور پھیلتا ہوا دائرہ ۔ ہائے کتنے بیکراں ہزاروں دائرے ہیں ۔ کتنی قوسیں ۔ ان گنت انسان ۔ ان گنت ننھے منے اور وسیع متحرک ، پھیلتے ، مچلتے ، اور سکڑتے ہوئے دائرے ۔ اور ان کے درمیان انسان ایک بے بس اور مقید نقطہ ۔ ارادہ تخلیق کا ہر کار چل رہا ہے ۔ خیال کے دائرے ۔ رقص میں ہیں ۔ ہوش و حواس کے زندان میں یہ کیسا شور و غل بپا ہے ۔ دائرے پھیل رہے ہیں ، دیواریں اونچی ہوتی جا رہی ہیں ، زنجیریں کھنک رہی ہیں ۔۔۔"

"واہ ۔ واہ ۔ ہائے ۔۔۔" مہندر پر شراب قابو پا چکی تھی ۔ وہ نشیلی آواز میں کہنے لگا ۔ "دیواریں اونچی ہوتی جا رہی ہیں ۔ بے در و دیوار کی اور گنبد جیسی چھت قید خانے کی ۔۔۔ دیواروں میں کوئی دروازہ نہیں ، کوئی کھڑکی نہیں ، اندر حبس ہے ۔ ہوا کا ایک جھونکا بھی نہیں ۔۔۔"

"پھر بھی ۔۔۔" حسینی نے شراب کا آخری گھونٹ لگاتے ہوئے غور لہجے میں کہا ۔ "پھر بھی دیواروں میں ان گنت آنکھیں ہیں جو جھانک رہی ہیں ۔ بے شمار کان ہیں جو سن رہے ہیں ۔ اندر اندھیرا ہے اور باہر روشنی ۔۔۔"

"اور ہم اندھیرے میں ہیں ۔" غوری نے فقرہ دہرایا ۔

"اور روشنی کی باتیں کر رہے ہیں ۔" اشفاق جھلا گیا ۔ "پرانی ، فرسودہ باتیں ۔ اف ۔۔۔ میرا تو دم گھٹنے لگا ہے ۔" کہتے ہوئے اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا ۔ اور منہ سے دھوئیں کے مرغولے نکالنے لگا ۔

کچھ دیر کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی ۔ پھر مہندر کی نشیلی آواز ابھری ۔

"اشفاق بھائی ۔ زندگی کے بارے میں دوسروں کے تجربات اور خیالات کو دہرانا اب ختم ہو گیا ..... اجی ..... تو میرا ذاتی تجربہ ہے ۔ سنئے ۔"

اشفاق کے علاوہ فوری اور حسینی کے چہروں پر بھی اشتیاق کا ہلکا سا رنگ ابھر آیا۔

گزشتہ سردیوں کی ایک رات میں اپنے کمرے میں بند تھا۔" مہندر اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگا۔ "کمرہ بالکل بند تھا۔ کھڑکیاں اور دروازے سب بند تھے۔ اور کمرے میں انگیٹھی دہک رہی تھی۔ میں نے دیکھتے ہوئے انگاروں پر لوبان کی ایک ڈلی ڈال دی۔ ایک چھوٹی سی ڈلی۔ اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوبان کی ننھی منی سی ڈلی جل کر اور دھواں بن کر سارے کمرے میں چھا گئی۔ مجھے لوبان کی خوشبو بہت پسند ہے۔"

"پھر؟" اشفاق نے بے چینی سے کہا۔

"پھر کیا؟" مہندر ہنس کر بولا۔ "میرا یہ معمولی سا تجربہ تھا ..... انسان کا وجود لوبان کی ننھی منی سی ڈلی ہے جو سلگے تو لطف ہے اور پھیلے تو زمانہ ۔ اور موت سیاہ آگ کی دہکتی ہوئی انگیٹھی ہے ۔"

"اور زمانہ کیا ہے؟ اور بکا ایک قطرہ ۔" حسینی کو گہرا نشہ ہو گیا تھا۔ "میرے دوست زندگی جینے کی شے ہے، سوچنے اور سمجھنے کی نہیں!"

"پھر وہی پرانی بحث ۔" اشفاق نے بیزاری سے کہا۔ وہ اس وقت صرف خوش ہونا چاہتا تھا۔ سوچ سوچ کر غمگین اور اداس ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اور کمرے کی فضا خوشی کے لئے قاتل فضا تھی۔ اس نے اپنا سگریٹ کیس اٹھا لیا۔ اور کچھ کہے سنے بغیر کمرہ سے باہر نکل کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر کھلی چھت پر پہنچ گیا جو چاروں طرف سے لوہے کی ریلنگ سے محصور تھی۔ اوپر آسمان صاف نیلگوں تھا۔ اور اکا دکا گنتی ستاروں کے درمیان آدھا چاند کسی حسینہ کی چشم نم ناک کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ نیچے بجلی کے کھمبے دور دور دو قطاروں میں ایستادہ تھے۔ جن پر لگے ہوئے مرکیوری ٹیوب کی اجلی روشنی سے سیمنٹ کی ہموار نیلگوں سڑک روشن تھی۔ پارس بلڈنگ کی چھت پر سے وہ زمین اور آسمان پر دور دور تک دیکھ سکتا تھا۔ عمارتوں، درختوں اور روشنیوں کا ایک سمندر تھا جو اس کے آگے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ رات کا حسن جیسے اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ ہر طرف سوز و گداز، نور و لطافت کی دھندلاہٹ کی ہوئی تھی۔ اشفاق کے ذہن سے تھکن اور افسردگی کا وہ احساس اڑ گیا جو نیچے حسینی کے کمرے کی فضا کا نتیجہ تھا۔ شہر کی مصروف اور مشینی زندگی کی برق رفتاری اس وقت سست پڑ گئی تھی۔ پارس بلڈنگ اور اس کے سامنے والی سڑک پر رات اور نیند کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ روشنیوں کو بھی جیسے نیند آ رہی تھی۔ نیچے حسینی کے کمرے سے حسینی، فوری اور مہندر کی آوازیں وقفہ وقفہ سے ابھر رہی تھیں۔ وہ اب بھی اسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔

اشفاق کھلی فضا اور تنگ ہو کے لطیف جھونکوں میں بڑی راحت محسوس کر رہا تھا۔ خیالوں میں کھوئے کھوئے سے انداز میں اس نے طویل کرتہ کی جیب سے سگریٹ کیس نکالا اور تازہ سگریٹ کو ختم ہونے والے سگریٹ سے سلگا کر ابھی اس نے ایک ہی کش لیا تھا کہ تازہ سگریٹ اس کی انگلیوں کی گرفت سے چھوٹ کر چھت سے نیچے سیمنٹ کی نیلگوں سڑک پر جا گرا۔ اور اشفاق کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اس نے سگریٹ کے اوپر سے نیچے سڑک پر گرنے کی آواز تک محسوس کی تھی۔ اس کے ذہن میں بے چینی اور تلخی کا ناگوار احساس ابھر آیا۔ نئی سگریٹ کے اچانک گر جانے کا احساس وہ مرکز تھا جس کے اطراف بے سکونی، انتشار اور کرب کے صد ہزار دائرے کھنچتے جا رہے تھے۔ ابھی تو اس نے سگریٹ جلائی تھی، ابھی تو اس نے پہلا ہی کش لیا تھا۔ اور سگریٹ گر گیا۔ اس سگریٹ کے دوسرے کشوں سے ملنے والی لذت اور سکون سے وہ محروم ہو گیا۔ اس نے جلدی سے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ مگر پہلے ہی کش میں اسے بے کیفی اور بدمزگی کا احساس ہوا، جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جیسے وہ سگریٹ نہیں گھاس پی رہا ہو۔ اس نے پے در پے کئی کش لگائے لیکن اس کا اضطراب اور خلش جوں کا توں برقرار رہی۔ وہ بیزاری اور کرب کے جانگسل احساس سے ریلنگ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اور دلچسپی سے نظروں سے سڑک پر دیکھنے لگا، جہاں وہ گرا ہوا سگریٹ اب بھی موجود تھا۔

اس کی نگاہیں اس سگریٹ پر جمی ہوئی تھیں جو سرکیورٹی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں نیلگوں سڑک پر ایک موٹی سی چھوٹی سی سفید لکیر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اتنے میں سیاہ رنگ کا ایک آوارہ کتا نہ جانے کہاں سے نکل کر سڑک پر اس جگہ آیا جہاں وہ سگریٹ پڑا ہوا تھا۔

اور کچھ دیر سڑک کو سونگھ کر ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ اور پھر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کا مطلب تھا وہ سگریٹ ابھی جل رہا ہے۔ وہ سگریٹ جسے انگلیوں میں جل کر تمام ہونا تھا، اب سڑک پر جل رہا ہے۔ وہ لذت بخش آسودگی جو اس سگریٹ میں پنہاں تھی وہ اب کسی اور سگریٹ میں نہیں مل سکتی۔ اس نے پے در پے کئی سگریٹ جلا ڈالے۔ مگر بیقراری کم نہ ہوئی۔ اور اس گرے ہوئے سگریٹ کا خیال ایک کانٹے کی طرح احساس میں پیوست کھٹکتا رہا۔ اس نے بوجھل دل سے آسمان کی طرف دیکھا۔ آدھا چاند کسی ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑے کی طرح خون آلود غموں سے ہمدرد ستارے زخم بن گئے۔ آسمان اس کی بے سکونی پر جیسے قہقہہ زن تھا۔ اور زمین پر اب کوئی بھی شے حسین اور دل کش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔!

آخر وہ اضطراب کے انتہائی نقطہ پر پہنچ کر چھت سے نیچے اترا۔ جیلی کے ڈرائنگ روم میں اب بھی پرانی بحث جاری تھی۔ وہ بوجھل قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ اور زینوں کو طے کر کے سڑک پر پہنچ گیا۔ وہ سگریٹ جو اوپر سے نیچے گرا تھا، جسے گرنے سے پہلے ہی راستے میں بجھ جانا تھا اور اب بھی جل رہا تھا، ایک لمحہ کیلئے وہ ٹھٹکا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ سڑک پر دور دور تک کوئی نہ تھا۔ پاس بلڈنگ بھی نیند کی آغوش میں تھی۔ پھر اس نے جھپٹ کر سڑک پر سے وہ سگریٹ اٹھا لیا۔ اور وہیں کھڑے کھڑے لائٹر سے اس کو دوبارہ سلگایا لیکن پہلے ہی کش میں اس کا منہ بدمزہ ہو گیا۔ وہ سگریٹ اب دوبارہ سلگ کر بدمزہ اور بے کیف ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کئی کش کھینچ ڈالے، اور کوئی بھی کش اس کے ذائقہ کو بدل نہ سکا۔ اسے اس گرے ہوئے سگریٹ سے بھی لطف و آسودگی نہیں مل رہی تھی۔ اس نے جھلا کر سگریٹ کو سڑک پر پھینک دیا۔ اور اپنے جوتے کے تلے اسے مسل دیا۔ اور کھڑے کھڑے حسرت و غم سے روندھے ہوئے پامال سگریٹ کو دیر تک گھورتا رہا۔ مبہم اس کے احساس میں ایک موج سی ابھری۔ اور ایک نئے خیال کی روشنی سے اس کا ذہن جگمگا اٹھا۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا جیلی کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جہاں اب بھی پرانی بحث چل رہی تھی۔ وہ پرجوش آواز میں چیخ کر بولا۔ "او عقلمندو۔ بحث ختم کرو۔ اور سنو۔" اس نے پراعتماد لہجے میں اپنے اس تازہ تجربے کو بیان کرتے ہوئے کہا۔ "زندگی بھی اس سگریٹ کی طرح ہے جو میرے ہاتھوں سے گر گیا تھا، اور جس کے آخری کش سے ملنے والی لذت اور آسودگی سے میں محروم ہو گیا۔ اس لئے دوستو۔ ہر کش کو آخری کش سمجھ کر سگریٹ پینا سیکھو۔ یہی زندگی ہے۔ اور بس۔"

"میرے دوست۔" پھریرے بدن کے فلسفی شاعر جیلی نے قہقہہ بلند کیا۔ "تم نے اپنے تجربے سے پھر بھی کوئی نئی بات نہیں دریافت کی؟" وہ طنز سے بولا۔ "اور پھر زندگی، زندگی ہے۔ سگریٹ نہیں۔!"

"کتنی پراسرار، گہری اور ناقابل فہم ہے یہ زندگی۔" یہ زندگی سے ہمدردی حسرت سے کہا۔

"اور ہم جانے پہچانے اور سمجھے بغیر ہی جینے پر مجبور ہیں۔"

"ہم سب دائرہ ہوش و حواس کے اندر قید ہیں نصائی۔" عوری نے بے بسی سے کہا۔ "اور دائرہ سے باہر نکل کر جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ بات اس زمانے میں تو بہت مشکل ہے۔"

اس کے باوجود اشفاق مطمئن تھا۔ اس لمحہ اس کے ذہن میں کوئی الجھن نہیں تھی۔ اس کے دل میں کوئی غم نہیں تھا۔ ایک چھوٹے سے تجربے نے ایک بڑا اور مسلسل پھیلنے والا دائرہ اور کھینچ دیا تھا۔ اور وہ مدت میں بھی آزادی کی لذت محسوس کرنے لگا تھا۔

مدت خریداری ختم ہونیکی اطلاع

اس سیاہ حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سال خریداری مارچ کے اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو گیا ہے چونکہ گذشتہ سال تین شمارے آپکو کم ملے تھے اسلئے اگلی تمام دفتر کے سات روپیہ سالانہ چندہ کے بجائے آپکی خدمت میں آئندہ ماہ اپریل ۱۹۵۱ء کا شمارہ ملا کر چھ شمارے بھیجے جائیں گے۔ اگر خریداری منظور نہ ہو تو اپریل کا شمارہ ملتے ہی واپس فرما دیں۔ اگر خریداری منظور ہو تو زرچندہ فوراً منی آرڈر کے ذریعہ روانہ فرما دیں۔ اگر خریداری منظور نہ ہو تو زرچندہ فوراً منی آرڈر کے ذریعہ واپس فرما دیں۔ شکریہ

از: اعجاز صدیقی

تجدیدِ عہدِ الفت

پاکستانی دوستوں اور فن کاروں کے نام

(سلسلۂ مراسلت شروع ہونے کے بعد)

تمہارے ہاتھ کی یہ دل نواز تحریریں
تمہارے خامۂ رنگیں کی یہ سطورِ جمیل
بہت دنوں میں ہوئیں پھر نشاطِ فکر و نظر
طویل سلسلۂ اضطراب ختم ہوا
فسانۂ شبِ ہجراں کا آخری ٹکڑا
جمالِ مطلعِ صبحِ وصال بن کے رہا
لرز رہی تھی بہت بادِ تند و تیز سے جو
خوشا نصیب وہ یادوں کی شمع بجھ نہ سکی
زہے نصیب نہ ٹوٹی وہ ارتباط کی رسم

وہ ایک دورِ جنوں، وحشتوں کا وہ عالم
گذر گیا، گذراں موسمِ خزاں کی طرح
ہزار شکر وہ طوفاں اتر گیا جس میں
تباہیاں تھیں سفینوں کی، ناخداؤں کی
ہزار شکر، وہ بجلی نہ بڑھ سکی آگے
جلانے آئی تھی جو، رودِلوں کے خرمن کو

وہ ایک رات، کہ جب ہر طرف اندھیرا تھا
تمہاری یاد کے روشن چراغ میں نے کئے

تمہارا نام لیا میکشوں کی محفل میں
تمہارا ذکر کیا حلقۂ نگاراں میں
تمہاری بھول کو سو سو طرح کے نام دئے
تصوّرات میں اکثر تمہیں پیام دئے
پیامِ امن و اُخوّت، پیامِ صلح و صفا
یہی پیام ہے سب دلبرانِ عالم کو
کہ دلبری کے تقاضے یہاں کچھ اور ہی ہیں

عظیم تم بھی ہو، ہم بھی عظیم، غم بھی عظیم
امینِ عظمتِ ماضی و حال ہیں ہم لوگ
مرا وجود تو میرے وطن کی خاک سے ہے
مگر وہ خاک، کہ تم جس سے پیار کرتے ہو
ہے اُس میں دفن وہ میرا عظیم سرمایہ
تمہارے ملک کا عزّ و وقار ہے جس سے
ادب سے کہتے ہو سیمابؔ تم جسے، پیارو!
بنا چکے ہو ابھی خود، تم اپنے ہاتھوں سے
اُسی زمیں پہ مری خاکؔ کی تُربتِ تازہ

شہ مرحوم علامہ سیماب اکبرآبادی جو قائد آباد (کراچی) میں مدفون ہیں۔

شہ ری عالیہ ماجدہ نے ۱۰ فروری ۱۹۶۶ء کو کراچی میں انتقال فرمایا۔

وہ ماں، کہ آخری دیدار جس کا ہو نہ سکا
وہ ماں، کہ جس نے یہ وعدہ لیا تھا رو رو کر
میں دوں گا اُس کے جنازے کو آخری کاندھا
میں لوں گا اُس کے لبوں کا وہ آخری بوسہ
جو یادگار رہے گا مری تمنا کا
مگر یہ جبر، یہ محرومیاں تمنا کی!
تڑپ کے رہ گئیں مجبوریاں تمنا کی!
بجائے خیریتِ دلبراں، ملی وہ خبر
کہ جس نے صبر و سکونِ حیات لوٹ لیا!
تم اپنے ہاتھ رکھو میرے دل کے زخموں پر
یتیم ہند کو، اے اہلِ پاک پُرساد و
یہ تُربتیں، جو یہاں بھی ہیں، وہاں بھی ہیں!
یہ قبریں، جو یہاں بھی ہیں، درو وہاں بھی ہیں!
اسی کا نام ہے وہ دردِ مشترک، کہ جسے
ہزار کوئی بھلائے، بھلا نہیں سکتا

زمین بانٹ لی ہم نے، مگر یہ دل نہ بنٹے
رہیں گی ایک، ہمیشہ یہ سرحدیں دل کی
کبھی ہوئے ہی نہیں گوشت سے جدا ناخن
ازل سے تا بہ ابد جسم و رُوح کے رشتے
مہد سے تا بہ لحد سلسلے تعلق کے!

وہ تاشقند ہو، دلّی ہو، یا کہ پنڈی ہو

کہیں نہیں ہے دلوں کے اُجاڑنے کا سوال
کوئی نہیں، کہ جو تاراجیوں کو دعوت دے
کسی کو شوق نہیں ہے، بہے عوام کا خون
کسے پسند، کہ بچے یتیم ہو جائیں
کسے پسند، کہ سینے دو نیم ہو جائیں

وہ امن و صلح کی قیمت جو اہلِ ہند نے دی
کسی نے قوم کی تاریخ میں نہ دی اب تک
گنوا کے ہم نے سرِ شوق ایک جانِ عظیم[1]
لٹا کے جادۂ الفت میں اک متاعِ عزیز
تجلیوں کی ادا شامِ تاشقند کو دی
نکھار صبح کراچی کو جس نے بخش دیا
جو رنگ بھر گئی لاہور کی فضاؤں میں

کوئی تو داد مجھے میرے صبر و ضبط کی دو
کہ میرے پاؤں ہیں تیغوں کی تیز دھاروں پر
رگوں سے خون ٹپکنے لگا ہے غسم بن کر
کھڑا ہوا ہوں المناک رہگزاروں پر!
کوئی تو "شذرۂ منظوم" میرے نام لکھو
کوئی سلام تو بھیجو، کوئی پیام تو دو
جو میری قوم، مرے ملک اور وطن کے لئے
یقین وعدۂ تجدیدِ عہدِ الفت ہو!

---

[1] وزیر اعظم لال بہادر شاستری

مقالہ:- نقی احمد ارشاد

رام چند فرحت

یہ مصنف ہے فارسی مثنوی "گنج شائگاں معروف بہ حاتم نامہ" کا۔ عزیز الدین بلخی مرحوم تاریخ سخنورانِ بہار جلد اوّل صفحہ ۵۰ میں تحریر کرتے ہیں "پہلی جلد کا نام گنج شائگاں اور دوسری جلد موسوم بہ "گنج بعد آرد" ہے۔ عزیز الدین بلخی مرحوم نے اپنے لکھنے کے مطابق دونوں جلدوں کے قلمی نسخے مولانا شوق نیموی مرحوم کے پاس دیکھے تھے، جو منشی شیخ سعادت علی مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔

اس کتاب کا اصلی نسخہ محترم ڈاکٹر ہاشم صاحب مدظلہٗ کے پاس موجود ہے جو مصنف کے دستِ خاص کا ہے۔ اصلی نسخہ کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ گنج شائگاں اور گنج بعد آرد درحقیقت دو الگ الگ جلدیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی جلد ہے جس کا نام گنج شائگاں مشہور بہ حاتم نامہ ہے۔ اس میں درحقیقت حاتم کا مکمل قصہ فارسی مثنوی میں کہا گیا ہے۔

لالہ رام چند فرحت کون تھا؟:- اس کا سالِ ولادت معلوم ہو سکا نہ سالِ رحلت۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ محلہ عالم گنج (پٹنہ سٹی) کا رہنے والا تھا اور فارسی کا نہایت پُر گو شاعر تھا۔ اس کا زمانہ وہی تھا، جب کامگار خاں (زمیندار گیا) شاہزادہ عالی گوہر (شاہ عالم ثانی) کی خدمت پر کمربستہ تھا۔ محمد قلی خاں (صوبہ دار الہ آباد) (شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کا حقیقی چچازاد بھائی) کے عظیم آباد کی لڑائی سے واپس چلے جانے کے بعد کامگار خاں شاہزادہ عالی گوہر کی خدمت میں اس لئے پہنچا کہ اُس کا راجہ مُنڈ سنگھ زمیندار شکاری سے ذاتی جھگڑا تھا۔ چنانچہ راجہ سندر سنگھ کی ترغیب سے راجہ رام نرائن موزوں (نائب ناظم بہار و شاگردِ شیخ علی حزیں) نے کامگار خاں کو گرفتار کرنا چاہا۔ کامگار خاں:- یہاں اس شخص کا مختصر حال سیر المتاخرین کے حوالے سے درج کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ نرہٹ سائی ضلع گیا کا زمیندار تھا۔ اس کا راجہ سندر سنگھ شکاری سے جھگڑا ہوا۔ راجہ رام نرائن موزوں نے اسے گرفتار کیا۔ بعد رہائی اُس نے شاہ عالم سے کھڑولی میں ملاقات کی ـــــ اور شاہی اخراجات کا کفیل ہوا۔ شاہ عالم کو ساتھ لے کر اُس نے لشکر رام نرائن کا مقابلہ کیا۔ رام نرائن کو شکست ہوئی۔ مگر یہ عظیم آباد میں داخل نہ ہو سکا بلکہ کرنل کلاپو کے مقابلے پر روانہ ہوا۔ بادشاہ کے ساتھ بہار شریف پہنچا۔ وہاں سے بادشاہ سے الگ ہو کر مرشد آباد پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد میر قاسم کے زمانے میں اُس سے اور میر قاسم سے ان بن ہو گئی اور گیا مان پور کو روانہ ہو گیا۔ اُس نے سید ہدایت علی خاں بلد صاحب سیر المتاخرین سے ملاقات کی اور بادشاہ کی شکایت کی کہ وہ مُنڈ سنگھ زمیندار شکاری سے ملا ہوا ہے۔ گیا مان پور کی لڑائی میں اُس نے میجر کارنک سے شکست کھائی۔ بادشاہ انگریزوں سے مرعوب تھا اور ملنا چاہتا تھا۔ کامگار خاں کو یہ بات نہایت شاق گزری۔ وہ بادشاہ سے علیحدہ ہو گیا۔ میر قاسم کی حکومت میں وہ نرہٹ سائی کو چھوڑ کر رام گڈھ چلا گیا۔ جب میر قاسم بھی انگریزوں سے ان بن ہو گئی تو اُس نے میر قاسم کی ملازمت اختیار کر لی۔ وہ ہوا نالے (سنتھال پرگنہ)

لہ نرہٹ سائی موجودہ گیا ضلع کے نواده سب ڈویژن میں ہے۔ ۱۲-۱۱۸۱ھ میں جب فرانسیسی سیاح فرانسس بکنن اُس جگہ گیا تھا تو اُس نے کامگار خاں کے بنائے ہوئے قلعہ کو دیکھا تھا جو اب حال میں تھا (سفرنامہ فرانسس بکنن انگریزی صفحہ ۷۶)

کی اطاعت میں مرزا بخف خان کے ساتھ تھا۔ گرگین خاں ارمنی سپہ سالار میر قاسم سے اس کی ان بن ہوگئی۔ یہ بیربھوم کی طرف سے مرشد آباد پر حملہ کرنے کو بھیجا گیا، مگر میر قاسم کی ناکامیابی کے بعد اپنے وطن واپس چلا آیا۔

الغرض ایسے پُرآشوب زمانہ میں رام چند فرحت ادبی خدمت انجام دے رہا تھا۔

معاصرین فرحت :۔ زمانہ پُرآشوب تھا، مگر اس سے گئے گزرے دور میں چند ہستیاں نہایت اہم گزریں مثلاً شیخ علی حزیں جنھوں نے بنارس میں اقامت اختیار کرلی تھی (۲) راجہ رام نرائن موزوں نائب ناظم عظیم آباد (۳) راجہ شتاب رائے منتظم جاگیر صمصام الدولہ دہلی سید غلام حسین خاں وفا مؤلف سیر المتاخرین (۵) مرزا فاخر مکین جنھوں نے بعد دہلی لکھنؤ میں اقامت اختیار کرلی تھی۔ ان کے شاگردوں میں عبدالرحمٰن راقب اور اُن کے بھائی محمد علی خاں حامی مؤلف تاریخ مظفری و محمدی و بحر مواج عظیم آباد میں رہتے تھے (۷) شعرائے اُردو میں میر تقی میر، میرزا سودا، میر حسن اُس زمانے میں گزرے اور میر حسن کے استادوں میں میر ضیاء الدین ضاحک عظیم آباد میں رہ گئے۔ دیگر مشاہیر میں علی ابراہیم خاں مؤلف گلزار ابراہیمی اور اُن کے بھائی علی قاسم خاں۔ اسی زمانہ میں غالب علی خاں شاگرد میرزا فاخر مکین، دربار شاہ عالم ثانی سے وابستہ تھے۔

اصل کتاب :۔ یہ درحقیقت مثنوی ہے۔ اس کے شروع میں ایک قصیدہ ہے "در توحید" ؎

سپاس ایزد جاں بخش دادرِ برحق کہ طرح ساختہ چوں دُرِ گشنیدِ ارزق

۲۲۔ اشعار کے بعد مقطع ہے۔

مہینائے کرم ہائے خویشتن بخشا بحالِ فرحت محزوں گدائے خام و فسرق

سرجان شور :۔ دوسرا قصیدہ بھی فارسی میں ہے "قصیدہ در مدح بندگان جناب معلّی الالقاب مستر جان شور بہادر دام دولتہ کہ از آخر حروف مصارع اوّل نام نامی ہر کدام آید واز حروفِ ہر مصاریع بیتے بہ طریق توشیح حاصل می کرد واز حروفِ مصاریع ثانی سالِ تاریخ مستفاد می شود"

سرجان شور کے زمانہ میں نواب آصف الدولہ نواب وزیر اودھ نے رحلت کی تھی اور اُسی زمانہ میں وزیر علی خاں کی معزولی عمل میں آئی تھی۔ سرجان شور ہندوستان کا چوتھا گورنر جنرل تھا۔ کہتا ہے ؎

ہزار شکر کہ از سازگاریِ ایام فتادہ است در مدحا بچنگِ انام
مسرت است فزوں خلق را ز حدِ قیاس گرفت کارِ جہاں بر مرادِ زیبِ نظام

۲۳۔ اشعار کا قصیدہ ہے جو تمام تر صنائع سے معمور ہے، جس کی تشریح خود مصنف نے اخیر میں کردی ہے۔ اس کے بعد لکھتا ہے کہ ۱۲۰۱ھ میں یہ قصیدہ سرجان شور کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔

رقعہ بنام کامگار خاں :۔ کامگار خاں کا حال درج کیا گیا۔ یہ منظوم رقعہ کامگار خاں کے پاس بھیجا گیا تھا ؎

صبا رقیمۂ فرحت بیار زمند بجاں بخانِ مشفقِ من کامگار خاں برساں

مکتوب این است

کرم فرمائے حالِ دوست داراں ادب آموز نادانستہ کاراں
معطر ساز مغز مہربانی گلِ تازہ گلستانِ معانی

اس منظوم رقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ رام چند فرحت کے تعلقات کامگار خاں سے بڑے گہرے تھے۔ وہ کامگار خاں سے ملاقات کا خواہاں تھا ؎

ک مہینا۔ خدا کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ شداد عظیم آبادی کا فارسی کا ایک شعر ہے ؎
ہمہ شب زطیلی کروبیاں رسد ایں صدائے مہینی (یعنی ہر شب فرشتوں کی جماعت سے یہ پیام ذرا بجان آتا ہے)

پس از شوقِ لقائے فرحت اندوز — کہ چوں لطفِ فراواں است ہر روز
خوشا روزے کہ با یاراں نشینم — زمانہ را بکامِ خویش بینم

۱۵۔ اشعار میں۔ اِس کے بعد ترجیع بند ہے " بہ مدح جناب مستطاب حضرت جمال الدین برادرِ حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیری قدس اللہ اسرارہم کہ در موضع کوریلا متعلقہ پرگنہ نوبت پور واقع است (نوبت پور اب اناؤ ریلوے اسٹیشن کا ایک قصبہ ہے) ؎

اے در درِ فلک ہمیشہ نام است — ہر جا ست محیطِ فیضِ عام است
بگذشت سرم ز چرخِ اعلیٰ — جائے من ازاں کہ شد کوریلا

صنائع :۔ طویل ترجیع بند ہیں۔ شعرائے فارسی نے عام طور سے ترجیع بند نظم کئے ہیں۔ اِس کے بعد ایک بالکل نئی چیز ہے۔ یعنی سانپ کی شکل میں رُباعی نظم کی ہے۔ اِس کے متعلق مصنّف کی تحریر ہے۔

"رباعی صنعتِ مار" در ریں صنعت نصف حروفِ رُباعی دو بارہ خواندہ می شود، بہ سبب گردشِ دائرہ" کہتا ہے کہ یہ رُباعی صنعتِ مار میں ہے۔ اِس صنعت میں آدھے حروف رُباعی کے دوبارہ گردشِ دائرہ کے سبب سے پڑھنے چاہئیں۔ اِس میں تمام حروفِ تہجّی سے کام لیا گیا ہے یعنی از الف تا یائے فارسی ایک رُباعی مُرتّب ہوتی ہے

دوسری رُباعی صنعت مقعد میں بصورت کرۂ ارضی نظم کی ہے۔ اِس کے پہلے اِس قسم کی رباعیاں فارسی خواہ اُردو میں میری نظروں سے نہیں گزری ہیں۔ جو رُباعی حلقۂ مار میں نظم کی ہے، حسبِ ذیل ہے ؎

ہر کس دارد خیالِ زُلفِ برہم — یا بے تو دلش خستۂ دہر دم در ہم
با خوئے عجستہ در دِ پیشش با شد — کے زہرہ کہ خواہاں بسجود آید رم

اِس کے بعد چند غزلیں ہیں۔ پہلی غزل ہے ؎

ہست ہمیشہ پُر شکن، سنبلِ زُلفِ مشکبو — پیچ بہ پیچ، خم بہ خم، حلقہ بہ حلقہ، مُو بہ مُو
دلبرِ خم تو می دہد از ہمہ عفوِ عاشقاں — تازہ بہ تازہ، نو بہ نو، لحظہ بہ لحظہ، سُو بہ سُو

اِس کے بعد مثنوی شروع ہوتی ہے۔ ابتدا میں چند اشعار شیخ سعدی کی مدح میں ہیں اور پھر آغازِ قصّہ ہے۔ یہ مُلکِ یمن کا قصّہ ہے۔ اِس میں بادشاہِ غرّاساں، حُسن بانو اور درویش وغیرہ کا حال نظم کیا ہے۔ طویل مثنوی ہے اور مولانا رومیؒ کی بحر میں ہے۔

بعد اختتامِ مثنوی مصنّف نے اپنا حال نظم کیا ہے اور شہر عظیم آباد کا حال لکھا ہے مگر یہ کل باتیں اِس قدر مختصر ہیں کہ اُن سے صرف مصنّف کا نام، تخلّص، سنِ تصنیفِ کتاب اور شاہ اوزاں کی درگاہ کے متعلق اور کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب ۱۱۸۸ھ میں تمام ہوئی اور ۱۱۹۸ھ میں مصنّف نے خود اپنے ہاتھوں سے صاف کی۔ اپنے حال اور شہر عظیم آباد کے حال میں کہتا ہے ؎

شکر کیں مجموعۂ رنگیں کلام — یافت باصد زیبِ حسنِ اختتام

چند اشعار کے بعد ؎

موئے بندِ زُلفِ ایں مشکیں پرند — بندۂ ناقص طبیعت را کمند
در سخن فرحت تخلّص ساختہ — اشہبِ فکرت بمیداں تاختہ
می کند بزمِ سخن را بوستاں — بشنو اندر کشورِ ہندوستاں
ہم عدیلِ جنتم کر یاد ہست — نام آں شہرِ عظیم آباد ہست

۱؎ حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری۔ سالِ ولادت ۶۶۱ھ سلسلۂ فردوسیہ کے بزرگ زیدہ بزرگوں میں تھے۔ سالِ وفات ۷۸۲ھ۔ فیروز تغلق کا زمانہ تھا۔ آپ کی بہت سی تصانیف و تالیفات یادگار ہیں۔ ارشاد۔

۱۱۸۸ فصلی کے عظیم آباد کی حالت سے

کنگرہ ہائے عمارت ہائے آں — می زند خندہ بر پیشانی آسماں
عالماں رایت زعلم افراشتہ — وہم ایشاں عرش فرش انگاشتہ
تو لیانش از شراب ناز مست — ہر یکے در دلبری گستاخ دست
موجزن سوئے شمالت آب گنگ — چشمۂ کوثر خجل زاں آب و رنگ
لالہ اندامانِ رنگیں پیرہن — ہمچو حور عریاں بخار و خط زن
ہر یکے پاشند از کف مشتِ آب — بر لباسِ خویشتن ہمچو گلاب
رودِ جلاّ در جنوبِ آں رواں — نخلِ تاڑ و انبہ گرداگرد آں
ہشت آنجا درگہِ عرش اشتباہ — شاہِ ارزاں مظہرِ لوزیر اللہ

خاتمۂ نظم پر دو تاریخیں ہیں ؎

سالِ اتمامش چو دل از عقل خواست — کرد دو انگشت غم دیگر دو راست

۱۱۸۸ فصلی

چوں ز انگشتش رقم مرقوم گشت — یک ہزار و یک صد و ہشتاد و ہشت

۱۱۸۸ فصلی

جہاں گنگا ندی میں اشنان کا سین کھینچا ہے کہیں بھی مبتدل شعر نہیں نظم کیا ہے۔

مجموعہ کے آخر میں ایک غزل ہے جس کی ردیف ہے "گوری شنکر"۔ اس غزل کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گوری شنکر سہائے کی فرمائش سے حاتم نامہ نظم کیا گیا تھا ؎

شد ختم بہ اقتضائے گوری شنکر — حاتم نامہ برائے گوری شنکر

آخری عبارت ہے "تمام شد کتاب گنج شائقاں مشہور بہ حاتم نامہ تصنیف بندۂ رام چند فرحت تخلص بخطِ مصنف بتاریخ ششم رجب المرجب ۳۳ جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی موافق ۱۱۹۸ فصلی مصادق ۱۲۰۵ ہجری"

الغرض اس گئے گزرے دور میں یہ فارسی کا نہایت باکمال شاعر عظیم آباد میں گزرا۔ اس زمانہ کے عظیم آباد کے ہندو فارسی گو شعراء میں راجہ رام نرائن موزوں، مہاراجہ کلیان سنگھ، کنور حشمت سنگھ عرف ڈھولو راجہ بنیرہ شتاب رائے قابلِ ذکر ہیں۔

علی سردار جعفری کی ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۴ء تک کی تو سو سے زیادہ نظموں اور غزلوں کا نیا مجموعہ

ایک خواب اور

قیمت :- چھ روپے

نظم و غزل کی اعلیٰ قدروں میں ایک حسین و دلفریب اضافہ

ملنے کا پتہ :- مکتبۂ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶۴ بمبئی ۸ بی سی

علیم اختر مظفر نگری

غزل

رکھا ہوا ہے آئینۂ شوق رُو برو
پھر ہو رہی ہے اُن سے تصور میں گفتگو
پھر برق آفریں ہے ہجومِ جمالِ ناز
پھر مرکزِ خیال ہے اک شوخ، شعلہ رُو
پھر بن گئی ہے حسنِ مجسم نگاہِ شوق
پھر ڈھل گئی ہے نُور کے سانچے میں آرزو
اب ہر نظر ہے جلوہ گہِ شوق کامراں
اب دل بنا ہوا ہے شبستانِ آرزو
اب ہم ہیں اور شکر و وفا و کرم کی بات
اب وہ ہیں اور لطف و محبت کی گفتگو
اب ہر نفس ہے عطر فشاں مشامِ جاں
بکھرے ہیں میرے دوش پہ گیسوئے مشکبو
دل میں سمو رہے ہو نگاہوں میں ہے خمار
اللہ رے کیفِ بادۂ بے جام و بے سبو
جیسے کوئی سُنائے مجھی کو مری غزل
نغمے کھنک رہے ہیں فضاؤں میں چار سُو
اخترؔ خیالِ دوست میں کھویا ہوا ہوں اس طرح
خود مجھ کو ڈھونڈتا ہے مرا ذوقِ جستجو

طرفہ قریشی

غزل

نہیں دیتی ہمیشہ ساتھ ذہنوں کی اداکاری
کبھی انسان کو غافل بھی کر دیتی ہے ہشیاری
ترے قربان جاؤں اے نگاہِ رحمتِ باری
کہ مے اک نقطۂ موہوم اب میری سیہ کاری
کسی کی سربلندی کو وہ خاطر میں نہیں لاتا
ترے در سے جسے ملتی ہے معراجِ نگوں ساری

سرِ محشر ہتھیلی پر سرِ اپنا لیے کے آیا ہوں
یہ تم نے کیا کہا تھا زندگی کا بوجھ ہے بھاری
وہاں آسانیوں کی راہ پیدا ہی نہیں ہوتی
جکڑ لیتا ہے ذہنوں کو جہاں احساسِ دشواری
نہ دے ترغیبِ عیشِ زندگی اے راحتِ دنیا
کہ ہے پروردۂ خوابِ پریشاں میری بیداری
بڑا دشوار ہے دونوں کو اک میزان پر رکھنا
ہوئی ہے عاقبت ہلکی تو دنیا ہو گئی بھاری
خود آگاہی سے پہلے خود فراموشی کو لازم کر
بغیر بے خودی کیفِ خودی ہوتا نہیں طاری
خدا کی دین، فطرت کا عطیہ ہے یہ اے طرفہ
ہمیں رشک اُن پہ ہے جن کی غزل ہوتی ہے معیاری

قطعات :-

یوسف ناظم

تمنا

○

وہ جذبِ دل ہو عطا جس کے فیض سے یارب
میں آہِ گرم بھی کھینچوں تو زخم بھر جائیں
دعا اجل کی جو مانگوں تو زندگی پاؤں
خزاں کو یاد کروں تو چمن سنور جائیں
جو چپ رہوں تو ملے دادِ خامشی مجھ کو
صدا جو ظلم کو دوں تو گرم بکھر جائیں
کروں میں توبہ تو چھلکے شراب کوثر کی
اٹھاؤں جام تو یہ روز و شب نکھر جائیں
ستم کی آگ بھی ہو میرے واسطے شبنم
مثالِ بادِ صبا حادثے گزر جائیں
بڑھوں جو آگے، زمانہ بھی میرے ساتھ بڑھے
جو روک لوں میں قدم، قافلے ٹھہر جائیں
وہ جذبِ دل ہو عطا جس کے فیض سے یارب
میں آہِ گرم بھی کھینچوں تو زخم بھر جائیں

کرشن موہن

○

خوشبو

ہے یاد تری من میں
اور یاد میں ہے یہ من
آنگن میں بسی خوشبو
خوشبو میں بسا آنگن

عشق و ہوس

جب تلک بج رہا ہے سازِ نفس
آدمی ہے اسیرِ عشق و ہوس
سوزِ ایثارِ عشق کی دولت
کاروبارِ ہوس ہے کیفِ مس

نیرج

مجھ کو کتنا سکھ دیتا ہے
سرما کے سورج کا نیرج
دکھ میں بھی مسکاتا ہے من
جیسے گدلے جل میں نیرج

فرقت

روٹھ گئی ہیں شوخ آشائیں
ٹوٹ گئے ہیں خواب سلونے
وقت کے ضدی بچے تو نے
توڑ دیے کتنے ہی کھلونے

افسانہ:۔ رفعت صدیقی

یہ سادہ دل بندے

جیسے جیسے دن چڑھتا جا رہا تھا جمّن کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی تھی۔ آج صبح سے کسی کام میں بھی اُس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اُس نے خود کو ہزار طرح سے بہلانے کی کوشش کی تھی۔ مگر تھوڑی تھوڑی دیر سے اس کا ذہن انجانی سی گھُل گھلیّوں میں بھٹک کر رہ جاتا اور وہ فیصلہ نہ کر پاتا کہ آخر اُسے کیا کرنا ہے؟

صبح فجر کی نماز پڑھنے کے بعد جب وہ مسجد سے باہر نکل رہا تھا تو سب لوگوں کو اُسے اتنا جلدی مسجد سے نکلتا دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ وہ اُس وقت تک مسجد سے باہر نہیں نکلتا تھا جب تک سورہ یٰسین نہ پڑھ لے۔ اُس کے اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا تھا۔ حتیٰ کہ اُس دن بھی نہیں جبکہ اُس کی لڑکی کی شادی ہو رہی تھی ــــ اُس روز گاؤں کے لوگ بڑے ہی جوش و خروش سے جمّن کا اقبال بلند کر رہے تھے۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک بھی اس کی خوشی میں شریک تھے۔ صبح سورج نکلنے کے وقت اُنھیں بارتیوں کا استقبال کرنا تھا۔ گاؤں کی نیک نامی کی بات تھی۔ پھر دولھا کوئی ایسا ویسا تو تھا نہیں۔ اچھا خاصا دس جماعتوں تک پڑھا ہوا۔ دارث پور کے ایک اچھے خاندان کا چشم و چراغ۔

لیکن اُس روز بھی جمّن نے اپنا معمول نہیں چھوڑا تھا۔ راحت جاں نے کہا بھی۔ "ابھی جمّن! تھوڑی دیر کی اتنی بھی کیا فضیلت۔ ایک دن چھوڑ دینے سے کیا اللہ میاں ناراض ہو جائیں گے۔؟"

لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

شیخ جمّن کبھی تحصیل میں چپراسی تھا اور اُس کی سادہ لوحی اور نیک دلی کے چرچے ساری تحصیل میں عام تھے۔ تحصیلدار صاحب کو اس پر بڑا اعتماد تھا۔ اور وہ اُسے بہت عزیز رکھتے تھے۔

تحصیل کی ہنگامہ خیز زندگی میں جہاں رشوت کی نہریں بہا کرتی تھیں اور نیچے سے اُوپر تک لوگ اِن نہروں میں ہاتھ دھونا اپنا فرض سمجھتے تھے، جمّن اپنی ایمانداری سے ذرہ برابر بھی ہٹ نہیں سکا تھا۔ اس کے ساتھی مذاق کرتے۔ ارے میاں جمّن! تم نے ایک عمر گنوا دی، مگر رہے بُدھو کے بُدھو ــــ ابھی ہوش میں آ جانے کا موقع ہے۔ بڑھاپے کیلئے کچھ سامان کر لو۔"

"ابے چپ ــــ" جمّن اُنھیں ڈانٹتا۔ "ٹر ٹر کئے جا رہا ہے بیٹا حرام کی کمائی کب تک کھاؤ گے۔؟ ایک نہ ایک دن تو گردن پھنسے گی۔ پھر سرکاروں کی دھول پھانکو گے۔ جانتے ہو خدا کیا کہتا ہے رشوت کے بارے میں؟" یک لخت اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی اور سانحہ دوڑ جاتی۔ اور اُس کی آنکھیں دُور خلا میں گھورنے لگتیں۔ "وہ فرماتا ہے۔"

"بس کرو بابا بس کرو۔" ایک چپراسی اُس کی بات اچانک کاٹ دیتا۔ "تم تو وعظ کرنے ہی بیٹھ جاتے ہو۔ شوق سے مت کھاؤ تم رشوت مگر ہمارا جینا کیوں حرام کرتے ہو۔" پھر اور سب ہنسنے لگتے۔

گاؤں کے بھی لوگ اُس کی خوبیوں کے بڑے معترف تھے۔ اور اپنے گھریلو معاملات میں اُس سے صلاح کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ گاؤں کا کوئی بیاہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں جمّن شریک نہ ہوتا ہو۔ جب بھی زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل اس چھوٹے سے گاؤں میں کوئی بیاہ ہوتا ــــ

اور نکاح کے بعد قاضی صاحب جلدی سے اپنے بڑے سے رومال میں بادام اور کھانڈ کا ڈھیر باندھے تشریف لے جاتے تو جمن دولہا کو نکاح کی اہمیت سمجھاتا۔ اس کے حقوق و فرائض کا تذکرہ کرتا۔ اور بتاتا کہ ایک سے دو ہونے کا کیا مطلب ہوتا ہے

جب بھی کسی کے یہاں اولاد ہوتی اسی کو بلایا جاتا۔ بچے کے کان میں اذان دینے کیلئے ۔ اور جب یہی بچے بڑے ہو جاتے تو جمن انھیں صبح میں قرآن پڑھایا کرتا تھا۔ اور پڑھانے کے دوران انھیں بتلاتا کہ وہ کب پیدا ہوئے تھے۔ ان کے ماں باپ اس وقت کیسے تھے۔ اور پھر یہ بھی کہ ان کے کانوں میں سب سے پہلے اسی نے اذان دی تھی۔ اور بچے حیرت سے منہ کھولے یہ سب سنتے رہتے۔

جمن کی اذان کی دور دور تک دھوم تھی۔ صبح فجر کے وقت جب اس کی بلند و مترنم ہوئی پرسوز آواز۔ رات کے دھندلکے کو چیرتی ہوئی گاؤں میں گونجتی تو گہنگاروں کے دل بھی کانپ اٹھتے۔ اس وقت مسجد میں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اذان دینے کے بعد وہ اپنے سر پر گھڑا اٹھائے قریب کے کنویں سے پانی بھر لاتا اور مسجد کے بڑے سے تسلے کو بھر دیتا تاکہ نمازیوں کو وضو کے لئے کنویں پر نہ جانا پڑے۔ اس کے بعد وہ اپنی لاٹھی اٹھاتا اور گاؤں کی گلیوں کا راستہ لیتا۔ ہر گھر پر رکتا اور دھیرے سے آواز دیتا۔ "نماز نیند سے بہتر ہے"

جمن کی بیوی کا اس کی جوانی ہی میں انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی اکلوتی لڑکی ہی اس کی زندگی کا سہارا تھی۔ اس لڑکی کو وہ جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس نے اس کا قرآن ختم کروایا۔ اور پھر اس کے لئے رشتے کی تلاش کرنے لگا۔ بمبئی سے رشتہ بھی ایک شریف خاندان ہی میں طے ہو گیا۔ جمن کو جیسے گھر بیٹھے دولت مل گئی۔ پہروں وہ گاؤں والوں کے سامنے اپنے داماد کے گھر آنے کا تذکرہ کیا کرتا۔ اس کا داماد بھی اس کا بڑا خیال کرتا تھا۔ بیٹی داماد نے اسے بہت مجبور کیا تھا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر ان کے ساتھ شہر میں رہے۔ مگر وہ راضی نہیں ہوا تھا۔ بیٹی اپنی ہو تو ہو بیٹی کا گھر اپنا نہیں ہوتا۔ وہ اکثر گاؤں والوں سے کہا کرتا تھا۔

ہفتے میں وہ ایک بار بیٹی کے گھر بڑے اہتمام سے پہنچ جاتا اور ساتھ میں کچھ پھل ہوتے۔ کچھ گھی ہوتا اور گاؤں کا بنا ہوا تھوڑا سا اناج بھی کیونکہ اس کے داماد کو اناج بہت پسند تھا۔ یہ سب کچھ لے کر جب وہ لمبا سفر طے کر پہنچتا تو خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ اور اس کا نواسا اور لڑکی اس کی گود میں چڑھ جاتا۔ اور اس کے ہاتھ سے تھیلی جھپٹ لیتا۔ تب جمن کو ایسا محسوس ہوتا جیسے دنیا ہی میں اسے جنت مل گئی ہو۔ اپنے چھوٹوں کا خلوص دل کے کتنے گوشوں کو منور کر دیتا ہے۔

لیکن آج جیسے اس کے دل میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ اس کی قوت فیصلہ جیسے مفلوج ہو کر رہ گئی تھی اور دماغ کسی کند چھری کی طرح زنگ آلود ہو چلا تھا۔ آخر اس کیفیت کی وجہ کیا تھی؟"

گاؤں کی مسجد جس میں گاؤں کے سبھی مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے بہت قدیم تھی ۔ شاید قلی قطب شاہ کے زمانے کی۔ دیواروں میں جگہ جگہ شگاف پڑ چلے تھے۔ کہیں کہیں کسی بوڑھے کے دانتوں کی طرح چونا جھڑتا جا رہا تھا۔ اور کئی بار تو نماز کے دوران نمازیوں کے سر پر ڈھیلے بھی گر پڑے تھے۔ مسجد کا اوپری حصہ بھی تمام کا تمام کائی کی چادر اوڑھے تھا اور میناروں کے اوپری سرے موسموں کے پے در پے حملے برداشت نہ کر کے ٹوٹ چکے تھے۔ سیاہی تقریباً پوری مسجد پر غالب تھی فرش پر جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ جن میں برسات کے دنوں میں اوپر سے پانی ٹپک ٹپک کر جمع ہو جاتا اور جائے نماز میں بیٹھتے، نمازیوں کے گھٹنے دکھنے لگتے۔

مسجد کی اس حالت سے جمن کو بڑا دکھ تھا۔ اس کا بس چلتا تو مرمت اپنے ہی خرچ سے ساری مسجد کو آئینہ بنا دیتا جب بھی وہ گاؤں کے کسی مسلمان سے ملتا تو گفتگو کے دوران مسجد کی خستہ حالی کا ذکر ضرور لے آتا۔ لوگ سنتے اور کھسک جاتے کہاں دو وقت پیٹ بھرنا ہی لعبار ہے ۔ پہلے گھر میں چراغ تو پھر مسجد میں۔

لیکن اس دن فجر کے بعد جمن نے کچھ اس انداز سے مسجد کی کسمپرسی کا ذکر چھیڑا کہ لوگوں کے دل پگھل گئے ۔ یہ شاید اس کے لہجہ کا والہانہ خلوص تھا جو سننے والوں کے جذبۂ ایمان پرستی پر میقل کر گیا۔ ان کی آن میں لوگوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ حتی الامکان مسجد کی ترمیم کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور دیں گے ۔ اور واقعی ایک ہفتے کے اندر اندر دو سو روپیوں کی خطیر رقم جمع ہو ہی گئی۔

جمن ایسے خوش تھا جیسے اسے جنت کی کنجی مل گئی ہو۔ یہ سوچ سوچ کر اس کا دل قابو سے باہر ہوا جاتا تھا کہ مرمت کا یہ مبارک کام اس

اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اسے دراصل پوری طرح اب محسوس ہوا کہ گاؤں کے لوگ اُس پر کتنا اعتماد کرتے ہیں۔ لیکن اسی اثنا میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے اُس کا سکون چھین لیا۔

ہوا یہ کہ ایک دن جب وہ حسبِ معمول اخبار کو اپنی لڑکی کے ہاں پہنچا تو اُس نے دیکھا اُس کی بیٹی اور داماد بڑے پریشان ہیں۔

"کیوں خیریت تو ہے؟" اس نے پسینہ پیشانی سے پونچھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"قاسم کہاں ہے؟" قاسم اُس کے نواسے کا نام تھا۔

"سو گیا ہے۔" اُس کی بیٹی نے جواب دیا۔

"تم لوگ پریشان کیوں ہو؟" اس نے بوسیدہ پنکھا جھلاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ــــ ذرا۔" اُس کے داماد نے منہ کھولا۔ "ذرا اُلجھن آپڑی تھی۔"

"کیسی اُلجھن؟"

اُس کے داماد نے ایک لمحے کیلئے اُس کی بیٹی کی طرف دیکھا، جیسے پوچھ رہا ہو کہوں یا نہ کہوں۔ پھر کھنکھار کر بولا۔ "ہمارے محکمے کی طرف سے کچھ روز پہلے یہ آرڈر جاری ہوا ہے کہ ہر پندرہ حساب کے اہل کار کو دو سو روپوں کی ضمانت ایک ہفتے کے اندر داخل کرنی ہوگی ورنہ انھیں نکال دیا جائے گا ــــ" وہ رُک گیا ــــ پھر بولا ــ وقت اتنا کم ہے کہ شاید ہمارا کہیں سے انتظام ہو سکے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟"

واقعی! بڑی اُلجھن ہے۔" محسن بولا اور سوچنے لگا ــــ کیا کیا جا سکتا ہے؟ اُس کے داماد نے شادی کے بعد سے اب تک اُس سے کوئی فرمائش اور کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ پھر اُس کا کوئی تحریری رشتہ دار بھی تو نہیں تھا کہ ایسے وقت اُس کی مدد کو آگے آتا۔ کیا وہ کچھ نہیں بتا سکتا اپنے داماد اور اپنی بیٹی کے لئے ــــ؟ یہ اُن کی خوشحالی کا سوال تھا۔ نوکریاں آج کل آسانی سے نہیں مل جایا کرتیں۔ بڑے جوتے گھسنے پڑتے ہیں ــ زمین اور آسمان ایک کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر نوکری لگتی ہے ــ اب یہ نوکری چھوٹ جائے تو پتہ نہیں کیسی کیسی مشکلیں برداشت کرنی پڑیں گی انھیں۔

کیا کسی طرح وہ اُن کی مدد نہیں کر سکتا؟ شاید گاؤں والوں میں سے کوئی دے سکے؟ نہیں ــ اُس کے دل نے فوراً تردید کی۔ وہاں کی فاقہ مست لوگ ــ انھیں اپنا پیٹ بھرنا ہی کٹھن تھا۔

پھر کیا ہوگا؟ کیا وہ انھیں فاقوں کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتا ہے ــ؟ کیا وہ اُن کی چھوٹی سی خوشگوار دنیا کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا؟ کیا کچھ بھی نہیں؟

"ابّی! ایک صورت ہو سکتی ہے ــ" وہ بول اُٹھا۔

"کیا؟" بیٹی اور داماد دونوں ہی ایک ساتھ پوچھ بیٹھے۔

"میرے پاس مسجد کی مرمت کیلئے کچھ گاؤں والوں کے روپے جمع ہیں۔ یہی کوئی دو سو روپے ــ" وہ رُک گیا جیسے کسی نے دل کسی شے سے کہا۔ "تم کیا کر رہے ہو؟" اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ "میں تمھیں وہ دے سکتا ہوں۔ لیکن تمھیں جلد ہی واپس کرنے ہوں گے۔ مسجد کی امانت ہے ــ لوگ کسی وقت بھی روپیہ مانگ سکتے ہیں۔"

"بس ماموں مجھے صرف ایک ہفتے کی مہلت دیجئے ــ" اُس کے داماد کے لہجے میں خوشی تھی۔ "میں کہیں نہ کہیں سے انتظام کر ہی لوں گا آپ کے روپوں کی واپسی کا ــ"

پھر محسن نے دو سو روپے دھڑکتے ہوئے دل سے اپنے داماد کے حوالے کر دئے تھے اُس نے یقیناً امانت میں خیانت نہیں کی تھی۔ کسی کے کام آنا ثواب ہے اور پھر اس کا داماد تو جلد ہی رقم واپس کر دے گا۔

لیکن دن آگے بڑھتے گئے اور رقم واپس نہیں آئی۔ ہفتہ ختم ہوا۔ دوسرا۔ تیسرا۔ چوتھا۔ پھر دوسرا مہینہ بھی شروع ہو گیا۔ اس عرصہ میں مرمت کے سلسلے میں کچھ مجاور بزرگ بھی تشریف لائے لیکن کسی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ رقم اُس کے پاس نہیں ہے۔

اور آج جبکہ اسے رقم دیئے ہوئے پورے دو مہینے گذر چکے تھے اور اس کا داماد ابھی تک رقم واپس نہیں کر سکا تھا ——— فجر کے بعد کچھ لوگوں نے دوسرے تیسرے، ان سے کام شروع کر دینے کے بارے میں گفتگو شروع کی تھی جس میں اس نے بڑی بیدلی سے حصّہ لیا ——— لیکن تب سے وہ بیحد پریشان ہو گیا تھا۔

بیٹے بیٹھے اس نے بے چینی سے سیلو بدلا اور بازو پر پڑے ہوئے شملے کو سر پر باندھنے لگا ——— اچانک باہر کسی نے اسے آواز دی۔ جلدی جلدی شملہ باندھ کر وہ باہر نکلا ———

"نانا" اس کے سامنے شرف الدین پٹواری کا لڑکا کھڑا تھا ——— ابا نے کہا ہے کہ شام میں سیمنٹ کے گتے دار صاحب آئیں گے ——— پانچ رقم لے کر گھر پر آجائیں" ——— وہ چلا گیا ——— جمّن کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا سارا وجود برف کے مجسمے میں بدل گیا ہو۔ ایک قدم بھی اٹھانا اسے ناممکن سا لگ رہا تھا ——— اس نے بمشکل دروازے کا سہارا لیا اور مردہ قدموں سے چلتا ہوا اندر آگیا ——— اب وہ کیا کرے؟ رقم کہاں سے آئے؟ لوگوں کو کیا جواب دے؟ کیا اس کی برس ہا برس کی ریاضت مٹی میں مل جائے گی؟ کیا گاؤں والوں کو اس بات پر حیرت اور غصّہ نہیں ہوگا کہ اس نے امانت میں خیانت کی ——— ہاں! وقت پر امانت کا واپس نہ کرنا خیانت ہی کہلاتا ہے۔ اور وہ بھی ایسی امانت میں خیانت! اس کی پیشانی پر لاتعداد پسینے کے قطرے اُبھر آئے۔ کیا وہ لوگوں کو اپنے اوپر نام دھرتے برداشت کر سکے گا؟ وہ جس کی پاکیزگی، ایمانداری اور خدا پرستی کی مثالیں دی جاتی ہیں جو راہ چلتے پر سبقت حاصل ہو جائے گا؟ کیا اس کی اس سفید داڑھی پر ایک سنگین الزام کی سیاہی تھپ جائے گی؟ وہ کانپ اٹھا اور اچانک اس کے کانوں میں سیکڑوں آوازیں چیخنے لگیں۔ "یہ دھوکہ باز ہے!" "یہ بے ایمان ہے!" "یہ خدا کی آڑ لے کر مخلوق کو دھوکہ دیتا ہے۔" "اس نے ہمارے اعتماد کا خون کر دیا۔ اس کے منہ پر تھوک دو ——— تھوک دو!!"

"نہیں" وہ دل ہی دل میں چیخ اٹھا ——— تب اس کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ اور جیسے کسی نے اسے بجلی سے چھو دیا ہاں ——— بس اب ایک ہی صورت ہے بس ایک ہی ——— اس کے سوا کوئی نہیں ——— کوئی نہیں ———

اس نے جھٹ جھونپڑی کی کھپریل کی طرف دیکھا۔ پھر وہ کچھ ڈھونڈنے لگا۔ جلد ہی اس کے ہاتھ میں ایک رسّی آگئی ——— اس نے اس میں پھندا ڈالی اور چھت پر لگی شہتیر کی طرف اسے پھینکا۔ پھندا لگ گیا۔ اس نے دوسری طرف بھی پھندا بنایا اور اسے اونچا کر دیا ——— اس کا دل یوں زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے سینے کی دیوار پھلانگ کر باہر آجائے گا۔ اور جسم کے لاتعداد مسامات سے پسینے کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔

ایک چھوٹا سا پڑا ہوا اسٹول پھندے کے نیچے رکھ کر جمّن اس پر چڑھ گیا اور پھندا گلے میں ڈالنے ہی کو تھا کہ جیسے کسی نے دل سے آواز دی "ٹھہرو!" ——— وہ گھبرا گیا ——— "تم خودکشی کر رہے ہو بزدل کہیں کے! حرام موت مرو گے؟ یہ اتنے برسوں کی عبادت اسی لئے تھی کہ جہنم کا ایندھن بن جاؤ ——— کیا یہی ہے تمہاری ساری زندگی کا حاصل!!" وہ رُک گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف چھایا ہوا تھا ——— نہیں نہیں ——— ہرگز نہیں!! وہ ہرگز خودکشی نہیں کرے گا ——— ہرگز نہیں ——— کبھی نہیں ——— وہ کانپتا رہا۔ اچانک وہ اسٹول سے پھسل پڑا ——— نیچے گرتے ہی اس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی۔ پھندے کے لپیٹے ہوئے فرش میں بہت دنوں سے ایک لوہے کا ٹکڑا ابھرا ہوا تھا جس نے گلا لگنے کے بارے میں وہ سوچتا رہا تھا۔ ویسے ہی ہتھیار کر دیا پھر اس کی کنپٹی میں اس بری طرح چبھا کہ ——— خون کا ایک فوارہ سا نکلا ——— دوسری بار جب اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا تو اس کے گلے کو پکڑا ہوا محمود کے سامنے کچھ اور لوگ بھی اندر آگئے ——— خون سے لتھڑا ہوا جمّن کا چہرہ خون میں لت پت تھا۔ داڑھی خون سے رنگ گئی تھی ——— وہ بدحواس اس کی طرف لپکے ———

صبح ——— خدا کا ——— شکر ہے ——— جمّن کی جھونپڑی کے سامنے والے کچھ الفاظ اگلے ——— "لا ——— الہ ——— " وہ شاید قلمہ پڑھنے ہی والا تھا کہ اس کی گردن ڈھلک گئی ——— وہ مر چکا تھا۔

صبح میں جب گاؤں والے اپنے دلوں پر ایک بھاری غم کا بوجھ لئے جمّن کی بیٹی اور داماد کو اطلاع دینے کے بارے میں بات کر رہے تھے کہ انہیں اندھیرے میں کوئی آتا ہوا نظر آیا۔ نزدیک آنے پر انہوں نے حیرت سے دیکھا۔ وہ جمّن کا داماد تھا۔ (باقی صفحہ پر دیکھئے)

ڈاکٹر اسلام سندیلوی

ویپنگ ولو

(ویپنگ ولو ایک پہاڑی درخت کا نام ہے جس کی پتیوں کی شکل آنسوؤں کی دھار سے ملتی جلتی ہے۔ اس نظم کی بنیاد اسی مشاہدے پر ہے)

کس لئے روتا ہے "ویپنگ ولو" کا یہ شجر
پتیاں اس کی ہیں کیوں اشک کے قطروں کی طرح

کیوں بہاتا ہے یہ اشکوں کے مسلسل دھارے
جوڑ تا رہتا ہے یہ کس لئے ٹوٹے تارے

اس کے اشکوں کا کرے کوئی بھلا کیسے شمار
اس سے کیا پوچھے کوئی موتی پرونے کا سبب

جب ہیں رخسار پہ شبنم کی ہزاروں لڑیاں
اسے ملتی نہیں جب فرصتِ فریاد و فغاں

نرم نور کی آغوش میں یہ "رانی کیمت"
ہر طرف محوِ تبسم یہ مہکتے ہوئے پھول

رامش و رنگ میں غلطیدہ یہ وادی کی بہار
لیکن اس کے رخِ محزوں پہ ہے اشکوں کی قطار

اس کے رونے کا بہرحال سبب ہے کوئی
غمِ انساں میں جلا کرتا ہے سینہ اس کا

درحقیقت یہ شجر ہوتا ہے حساس بہت
غالباً اس لئے لگتی ہے اسے پیاس بہت

تشنگی قلب کی کس طرح بجھائے آخر
صفِ مژگاں پہ سجاتا ہے یہ ہر دم آنسو

اپنے ہی اشک یہ دن رات پیا کرتا ہے
روز و شب سسکیاں بھر بھر کے جیا کرتا ہے

روئے گیتی کے خط و خال سے یہ واقف ہے
اس کی نظروں سے نہیں راز کوئی پوشیدہ

ڈوبی ڈوبی ہوئی آنکھوں میں ہیں حالاتِ جہاں
ہر طرف جنگ و جدل، آہ و بکا، شور و فغاں

اس کی آنکھوں میں ٹھہرتے ہی نہیں ہیں آنسو
منجمد خون کے قطرے ہیں رخِ گیتی پر

غمِ انساں میں ہوا جاتا ہے کتنا بے تاب
کرۂ ارض ہے انساں کے لہو میں غرقاب

کوہ ہے تن سے تراشیدہ سروں کا انبار
ہر طرف نکبت و دریا، بغض و حسد، شر و فساد

دشت ہے خون میں ڈوبا ہوا رنگین ورق
بھولتا جاتا ہے انسان محبت کا سبق

آج دنیا میں نہیں رنگِ حنا کی قیمت
کوئی مے خوار نہیں جام و سبو کا پیاسا

اس حقیقت سے ہے آگاہ یہ معصوم شجر
آج انساں ہے انساں کے لہو کا پیاسا

یہ پیہم نالہ رہے گا دہر میں تب تک آنسو
قتل و غارت کی دکاں بند نہ ہوگی جب تک

جاری رکھے گا یہ تسبیح کے دانوں کا شمار
نسلِ آدم کی فغاں بند نہ ہوگی جب تک

حامدی کاشمیری

غزل

پھولوں کو دہکتے جھونکوں سے دامانِ بہاراں جلتا ہے
احساس کے جلتے لمحوں میں یہ سارا گلستاں جلتا ہے

اب کیسے اٹھیں یہ خستہ قدم، اے حسرتِ منزل کیا ہوگا
کانٹے ہیں کہ دستِ انگارے، راتوں کا بیاباں جلتا ہے

نیند آئے تو کیونکر آئے گی تسکین کے ساماں کیا ہونگے
اک زخم سا انگارے کی طرح دل میں شبِ ہجراں جلتا ہے

ہم سوختہ دل دیوانے ہیں، کیا غم کھائیں کیوں فکر کریں
کس رنگ محل کو آگ لگی کس کا یہ شبستاں جلتا ہے

اے ٹھنڈی ہوا، اے لہر صبا، اے شبنم کی پھواروں کا آنچل
نرگس کی سلگتی آنکھوں میں خوابوں کا گلستاں جلتا ہے

اے سوزِ دروں اب بیدردی دیوانوں کا حاصلِ آزادی
زنجیریں پگھلتی ہیں شب کی تاریکی کا زنداں جلتا ہے

مہتاب کی کرنوں کی ٹھنڈک ہر ذرے کو دل کو چھوتی ہے
تخلیق کے شعلوں میں گھر کر اک تیر لنگر لخواں جلتا ہے

کفیل آذر

غزل

نہ آتشِ لب و عارض نہ انتظار کی دھوپ
جلا رہی ہے ہمیں صرف روزگار کی دھوپ

ہمارے گھر کا اندھیرا مہیب ہے، لیکن
نہ دیکھ پائیں گے ہم شہرِ سوگوار کی دھوپ

کبھی کبھی بڑی شدت سے یاد آتی ہے
وہ ترے جسم کی رنگت، وہ رہگذار کی دھوپ

ہم اپنے عہد کے منصور بھی ہیں عیسیٰ بھی
ہمارے واسطے لاؤ صلیب و دار کی دھوپ

ہماری فکر کے آنگن میں اب نہ پھیلے گی
کسی کے ہجر کی ٹھنڈک، کسی کے پیار کی دھوپ

ہمارا دامنِ صد چاک دیکھنے والو
تمہیں بھی راس نہ آئی اگر بہار کی دھوپ؟

یہ اور بات کہ سائے سمٹ گئے ورنہ
بہت کڑی تو نہیں تھی ترے دیار کی دھوپ

مقالہ :-

کوثر چاندپوری

ایک عصر آفریں شخصیت

متوسط قد و قامت، ہلکے مگر پھرتیلے جسم اور متناسب اعضاء کی ایک دلکش شخصیت، شیروانی اور سفید پائجامہ میں ملبوس ننگے سر، سورج نکلنے سے پہلے دہلی کی کسی کشادہ سڑک پر تیز گامی کیساتھ چلتی یقیناً کبھی آپ نے بھی دیکھی ہوگی، جس کے لمبے اور سُتے ہوئے چہرے کے خدوخال میں عزم و ہمت کی کرنیں مچلتی نظر آتی ہیں اور لبوں پر ایک متین سی مسکراہٹ ہوتی ہے، کشادہ پیشانی پر ستارۂ اقبال کی روشنی ہوتی ہے اور آنکھوں میں ذہانت، بلند خیالی اور عالی ہمتی کی ہلکی ہلکی جگمگاہٹ۔ سر کے مشکی بال ہمیشہ ایک ہی انداز سے پیچھے کی طرف اُلٹے رہتے ہیں اور پورا جسم سرگرمی اور چستی کا ایسا پیکر ہوتا ہے، جسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ برسوں یونیفارم کے قالب میں جکڑا رہا ہے۔ اسی لئے عمل اور جدوجہد کی تصویر بن گیا ہے۔ بظاہر یہ ایک شخصیت ہے، لیکن حقیقت میں ایک تحریک، ایک انجمن، اور ایک ادارہ ہے، ممکن ہے آپ نے کبھی اُسے نہ دیکھا ہو، مگر نا ممکن ہے کہ اُس کا نام آپ کے ذہن و شعور پر چھایا ہوا نہ ہو، حکیم عبدالحمید ایک ایسا نام ہے، جو ایک عظیم، ہمہ گیر اور انسان دوست تحریک کے سمبل (Symbol) کی حیثیت سے نہ صرف ایشیا میں بلکہ یورپ میں بھی اچھی طرح جانا پہچانا جاتا ہے، اس تحریک میں ہمدرد دواخانہ سے لے کر جامعہ طبیہ، طبی کانفرنس اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (Indian Institute of Islamic Studies) تک شامل ہے۔ اثر شخصیتیں تحریکوں اور اداروں کی طاقت سے روشناس ہوتی ہیں، لیکن کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے تحریکات اور ادارے نہ صرف پہچانے جاتے ہیں، بلکہ اُن کی پوری تاریخ اُنھیں کے گرد گھومتی محسوس ہوتی ہے۔ حکیم عبدالحمید ایسی ہی عصر آفریں اور تاریخ ساز شخصیت کا نام ہے۔ اس نے نئے اور پرانے ذہن کی آمیزش سے ایک حسین سنگم بنایا ہے۔ قدیم روایات کو عصری شعور سے توانائی بخشی ہے۔

حکیم عبدالحمید صاحب ایک خاص اندازِ نظر کے مالک ہیں، اُن کی ذات میں مغرب اور مشرق دونوں کی سچائی پوری ہم آہنگی کے ساتھ سما گئی ہے۔ دماغ میں سائنس اور نئے علوم کی چمک ہے، اور دل میں پورا مشرق اپنی رُوح، تہذیب اور تاریخ کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ اُن کا نقطۂ نگاہ بیکراں وسعتوں کا حامل ہے۔ اس میں انسانیت کا حُسن ہے، انسان دوستی کا جذبہ ہے اور ایک ایسی فلک بوس رفعت ہے، جو قوم و مذہب کا امتیاز کئے بغیر محض "انسان" کو اپنا محبوب اور مطمحِ نظر قرار دیتی ہے۔ اس کے لئے مسرت اور شادمانی کی جستجو کرتی ہے، وہ سب سے پہلے انسان اس کے بعد کچھ اور ہیں، اُن سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان ہوئی تھی۔ اس وقت ان کا جسم اتنا ہلکا اور دماغ اتنا بھاری نہ تھا، جتنا اب ہے، جنوری کا مہینہ تھا، دہلی کی فضا سردی کی شدت سے کانپتی محسوس ہو رہی تھی، اور پورا ماحول قائم چاندپوری کی مثنوی "شدتِ سرما" کی ترجمانی کر رہا تھا، ہمدرد دواخانہ انگیٹھیوں کا سماج بنا ہوا تھا، ہر کارکن کی کرسی کے قریب لوہے کی ایک انگیٹھی رکھی تھی اور اس میں لکڑی کے کوئلے دہک رہے تھے سب سے پہلے مجھے قاضی مسرت علی صاحب منیجر سے ملایا گیا، جو سر سے پاؤں تک مشرقی بلکہ اسلامی کلچر کا نمونہ تھے، میں

اپنی پریکٹس کے آغاز ہی سے ہمدرد دواخانے کے نام اُس کی شہرت اور عظمت سے متاثر تھا لیکن اُن ہاتھوں سے واقف نہ تھا، جو اس کی تعمیر و ترقی کے لئے ہر آن متحرک و مصروفِ عمل تھے۔ اس وقت میں نے پہلی بار ان کا لمس محسوس کیا۔

قاضی صاحب نے پوچھا

میاں حمید سے ملیں گے آپ؟

اس نام کو ادا کرتے وقت صحیح معنی میں اُن کا تعلق زبان کے بوسے لے رہا تھا، چہرے پر عقیدت اور خلوص کے نقوش ابھر آئے تھے۔ اس زمانہ میں ہمدرد دواخانہ اتنا بڑا نہ تھا جتنا اب ہے، بس دہلی کا ایک دواخانہ تھا۔ فیکٹری یا کارخانے کی وسعت اس میں نہ تھی۔ میں گلیاری سے گزرتا قاضی صاحب کی قیادت میں حکیم صاحب کے کمرے میں پہنچا، جہاں متانت، خاموشی، وقار اور ڈسپلن کی ایک عجیب فضا تھی۔ حکیم صاحب کرسی پر بیٹھے تھے اور ہر بات سے مترشح تھا کہ یہ کرسی بڑی سی میز بھی، جس پر قلمدان، پیپر ویٹ، پن کشن اور دوسری چیزیں نہایت قرینے اور خوبصورتی سے سجی ہوئی تھیں، حکیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے لبوں پر بالکل ویسی ہی مسکراہٹ تھی، جیسی اب نظر آتی ہے، ہزاروں طوفان اور انقلاب آئے، سینکڑوں آندھیاں چلیں، لاکھوں زلزلے آئے انسانیت نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ گئی، ملک کا جغرافیہ بدل گیا۔ لیکن حکیم صاحب کی مسکراہٹ کا انداز وہی ہے۔ اس میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہ ایک ابدی اور دائمی اخلاقی قدر کی طرح اپنی جگہ قائم ہے، حکیم صاحب کا انداز گفتگو نہایت میٹھا اور لہجہ اتنا دھیما تھا کہ بعض باتیں میں سُن بھی نہ سکا۔ یہ ملاقات عقیدت اور خلوص کی ایک مستقل بنیاد ثابت ہوئی اور آج جب ماہ و سال کی بہت سی گردشوں کے بعد ۱۹۶۲ء شروع ہو چکا ہے اور جنوری ہی کی برفیلی ہوائیں چل رہی ہیں اور بلا مبالغہ میں سینکڑوں مرتبہ حکیم صاحب سے مل چکا ہوں مگر ان کے اوصاف کی ابتدا اور انتہا معلوم نہیں ہو سکی، نہ کردار کی بلندی تک نگاہ پہنچ سکی، اُن کا دماغ جتنا بلند ہے، قلب اتنا ہی وسیع ہے، اُن کی شخصیت جن پاکیزہ عناصر سے بنی ہے۔ ان میں خفتہ کم ہمتی، دون ہمتی یا انتقامی جذبہ کا ایک ذرہ تک شامل نہیں، کسی بڑی شخصیت کی تعمیر میں ان چیزوں کی گنجائش ہی نہیں ہوا کرتی۔ وہ خلوص، ہمدردی، شرافت اخلاق اور عالی ظرفی سے بنا کرتی ہے۔ حکیم صاحب بے حد مخلص، وضعدار، ایثار پیشہ اور اصول پرست ہیں۔ لیکن اُن کا اصول پتھر کی چٹان نہیں، اُس میں آہن و فولاد کی صلابت بھی ہے اور شاخ گل کی سی لچک بھی۔ جو لنکن نے خیال سے بڑے اور اہم اُصول کی بہترین علامت ہے۔ Important principals may and must be flexible.(Lincoln) اُن کا اُصول انسانیت سے کبھی نہیں ٹکراتا، وہ انسانیت کی فلاح کے لئے اُصول بناتے ہیں اور اسی مقصد سے اس پر عمل کرتے ہیں، وہ ہر وقت سوچنے اور ہر لمحہ مصروف رہنے کے عادی ہیں۔ وہ ایسے جینیس (Genius) ہیں۔ جن کی فہم و فراست پر فلسفیانہ غور و فکر اور تلاش و تجسس ہمیشہ بھاری رہتی ہے اور خوب سے خوب تر کے تجسس کا جذبہ کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ بیحد مصروف رہنے کے باوجود وہ جھنجھلاتے نہیں۔ ایک مرتبہ وہ ڈاک دیکھ رہے تھے یہ اُن کا بہت دلچسپ مشغلہ ہے۔ ایک صاحب آئے اور لگاتار سوالات کرتے چلے گئے۔ ہر سوال پر گمان ہوتا تھا کہ اب حکیم صاحب جواب نہیں دیں گے اور جھنجھلا جائیں گے، مگر وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ نہایت شگفتہ انداز میں جواب دیتے رہے، شکست سوالات کرنے والے کو ہوئی۔ اس کے پاس پوچھنے کو کوئی بات نہ رہی تو مطمئن ہو کر چلا گیا۔

حکیم صاحب ڈاک بہت تیزی سے دیکھتے ہیں، خطوط اور اخبارات کا انبار اُن کے سامنے ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ اخبار الگ رکھتے جاتے ہیں۔ لفافے اور کارڈ پڑھنے کے بعد دوسری طرف رکھتے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا۔ ڈاک بہت سرسری طور پر آپ نے دیکھی۔

جی ہاں، مگر میں ہر خط کے متعلق بتا دوں گا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ اُن کی ذہنی اور فکری طاقتیں قابلِ رشک حد تک اچھی ہیں۔ حافظہ بالکل محدثین کا سا ہے، ہر بات یاد رہتی ہے۔ تندرستی اور صحتمندی کے لحاظ سے ان کا شمار ان لوگوں میں ہو سکتا

ہے جن کو ایور گرین Ever Green کہنا چاہیے۔
میں نے انھیں کبھی بیمار یا مضمحل نہیں دیکھا ممکن ہے مزاجی تغیرات کا قوت کار کردگی پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو، یہ محض ان کی غذا یا رزنہ محتاط اور باقاعدہ زندگی اور پرہیز کا اثر ہے۔ وہ صبح کو کئی میل ٹہلتے ہیں ہر موسم میں ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے ہیں۔ حکیم بی این شرما صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا طبی کانفرنس وڈیکل سپرنٹنڈنٹ ہارڈنگ ریسرچ کلینک کا بیان ہے کہ "چند سال قبل موسم سرما میں حکیم صاحب اور وہ سرینگر میں تھے حکیم صاحب وہاں بھی صبح کو ٹھنڈے پانی ہی سے نہاتے تھے۔ وہ نہایت سادہ غذا کھاتے ہیں آل انڈیا طبی کانفرنس برہان پور سے واپسی کے وقت حکیم صاحب نے بھوپال میں میرے یہاں قیام فرمایا مولانا سچاد صاحب اور اقبال صاحب ساتھ تھے صبح کو حکیم صاحب نے دسمبر کی شدید سردی کے باوجود ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور دوپہر کو دودھ میں صرف دو انڈے گھول کر پیئے، دسترخوان پر کبھی مرغ مسلم کی ڈش حکیم صاحب کی اس بے نیازی کا شکوہ بھی کرتی رہی، حکیم صاحب قواعد حفظان صحت کا ایک مکمل عملی نمونہ ہیں پھلوں میں انھیں سنترے سے دلچسپی ہے سنترہ سردی کے موسم میں بھی وہ استعمال کرتے ہیں۔ میں ہمدرد دواخانہ کا مستقل مہمان ہوں یہی وجہ ہے کہ دہلی ایسے بڑے شہر کے ہوٹلوں کی فضا سے ہمیشہ دور رہتا ہوں کہ بہت دن پہلے جب حکیم صاحب نے دوپہر کا کھانا ترک نہیں کیا تھا۔ مجھے دونوں وقت ان کے ساتھ کھانے کا موقعہ ملتا تھا۔ فرش پر دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا جاتا اور کھانے والے جن میں مرحوم سعید صاحب اور حکیم محمد یحییٰ صاحب مرحوم بھی ہوتے تھے سب لوگ دسترخوان کے چاروں طرف بیٹھ جاتے، روٹیاں دسترخوان میں لپٹ کر سب کی سب حکیم صاحب کے سامنے رکھ دی جاتیں اور وہ گرم گرم چپاتیاں سب کو دیتے جاتے دوسرے ڈونگے ڈھکے رکھے رہتے ہلکے سے ہلکے ہر چیز ضرورت کے مطابق کھاتے رہتے بیچ کے وقت دسترخوان پر پھلوں کی موجودگی بھی ضروری تھی سنترے، سیب موسمی، اور کیلے کافی تعداد میں آتے، رات کے کھانے میں سبزیوں کی تعداد کا اضافہ ہو جاتا۔ اور پھلوں کی جگہ متعدد قسم کی مٹھائیاں آتیں، اس وقت حکیم صاحب ایک انگریز کی طرح بلبل ہزار داستان بن جاتے، وہ باتیں کرتے، ہنستے اور مذاق سنجی کے موڈ میں ہوتے، تقسیم کے بعد دسترخوان پر مولانا سچاد صاحب کا ساتھ ہونے لگا۔ ان کی مولویانہ اور عالمانہ خصوصیات سے قطع نظر مجھے ان کا وہ عادل جہانگیری بہت زیادہ پسند ہے جو وہ کھانے کے ساتھ کرنے کے عادی ہیں اور ساتھ ہی داد بھی دیتے جاتے ہیں حکیم صاحب کے متعلق کسی طرح یہ پتہ نہیں چل سکا کہ انھیں کون سا کھانا پسند ہے، بڑی ریسرچ کے بعد پھلوں میں ان کا دو سدا پسندیدہ پھل دریافت ہو سکا یعنی سنترہ، اب حکیم صاحب دوپہر کا کھانا چھوڑ چکے ہیں۔ دہلی کے دوران قیام میں صرف رات کے کھانے پر ہی اجتماع ہوتا ہے جو ہمیشہ دلچسپ ثابت ہوتا ہے، ایک مرتبہ مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی مرحوم کا ساتھ ہوا، نہایت ہنس مکھ، سرخ و سفید اور تندرست انسان تھے، دیر تک ان کے ریشمی لحاف پر گفتگو رہی، ایک دم حکیم صاحب نے مجھ سے سوال کیا۔

آپ کی رائے میں مولانا کی عمر کیا ہوگی؟

میں نے مطایبہ سمجھ کر جواب دیا

میں تو جب سے پیدا ہوا ہوں مولانا کی تخلیقات پڑھ رہا ہوں اس لحاظ سے، مولانا کسی طرح نوے برس سے کم کے نہیں ہو سکتے۔ مولانا کے تیور بگڑ گئے، تبسمی نظر سے مجھے دیکھا لیکن ان کی نگاہوں کی تلخی، قہقہوں کی مٹھاس میں گھل کر رہ گئی۔ دہلی کے اکثر ارباب علم سے حکیم صاحب کے کھانے پر ملاقات ہو جاتی ہے، غالب، آزاد، اصلاحی اور شیفتہ کی موجودہ دہلی میں حکیم صاحب کی ذات علم اور ادب سے شیفتگی رکھنے والوں کے لئے مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔

کھانے کی چیزوں کے سلسلے میں حکیم صاحب کے اشارات نہایت بلیغ ہوتے ہیں، ایک مرتبہ فرمایا

مولانا آپ نے کوثر صاحب کو آئس کریم نہیں کھلائی؟

اور مولانا نے نہایت ذوق و شوق کیساتھ نئی دلی کے مشہور ہوٹل ریجنٹ کے بیجر کو فون کیا، وہاں سے تھرماس میں بہترین قسم کا آئس کریم (Three in one) آیا۔ ارباب دہلی کی مہمان نوازی ہمیشہ ضرب المثل رہی ہے، حکیم

صاحب تواضع اور مہمان نوازی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ہندوستان کی نامور علمی اور ادبی شخصیتیں آپ ہی کے یہاں مہمان ہوتی ہیں، علامہ نیاز فتحپوری کا قیام بھی دواخانہ میں رہتا تھا، اور میں تقسیم کے بہت پہلے سے دواخانہ ہی کا مہمان رہتا ہوں اندر ہی اندر قیام گاہیں بدلتی رہتی ہیں، کیونکہ آئے دن دواخانہ میں کوئی نہ کوئی جدید عمارت بن جاتی ہے، مگر مرکز یہی رہتا ہے،

ایک بار میں کچھ کتابوں کے ساتھ دہلی گیا حکیم صاحب نے اپنے پرانے حجرہ میں میرے لئے مکان خالی کرادیا، جہاں ضرورت کی ہر چیز مہیا تھی کھانا اور ناشتہ ٹھیک وقت پر پہونچ جاتا تھا، اس کے بعد جب میں دہلی جاتا اور دواخانہ کے مہمان خانہ میں ٹھہرتا تو منشی ابن حسن صاحب جاندپوری کی ڈیوٹی لگ جاتی کہ میرے ناشتے وغیرہ کا انتظام کریں ابن حسن مرحوم قائم جاندپوری کے پرپوتے تھے اور ۱۹۴۷ء کے فسادات میں قتل ہوگئے۔

حکیم سعید صاحب کی شادی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ تو دریا گنج والی کوٹھی میں قیام ہوا جو اب جین ایک خوبصورت اور پرفضا باغ میں واقع تھی زمانہ سردی ہی کا تھا صبح کی خوشگوار، نقرئی دھوپ میں بیٹھکر دریائے جمنا کی پرچین موجیں مرزا بیدل کے اشعار گنگناتی محسوس ہوتیں اس وقت میں سمجھا کہ مرزا بیدل نے پہلے متھرا میں اور پھر دہلی میں رودِ جمن کے کنارے کیوں گھر بنانا پسند کیا تھا، دراصل گنگا اور جمنا دونوں ہندوستان کے جمالیاتی تصور کا ایک ایسا آئینہ ہیں جسمیں فطرت اپنی پوری خوبصورتی اور جمال سامانی کے ساتھ صاف نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ دہلی میں ساحل جمنا پر مرزا بیدل ابدی نیند سو رہے ہیں اور بنارس میں خسرو آسودۂ خواب ہیں۔

سعید صاحب کی شادی کے انتظامات نہایت شاندار تھے دہلی میں ہندو اور مسلمان معززین کثرت سے مدعو تھے اور قاضی مشرف علیہ صاحب مسیح الملک حکیم اجمل خاں کو بھی لے آئے تھے جن کی نازک مزاجی مشہور تھی، قاضی صاحب انھیں لانے کی مہم کا جس انداز سے ذکر فرمایا اس کا ہلکا سا عکس اس شعر میں موجود ہے

لائے اُس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

عام طور پر شرکاء کے چہروں پر مسرت کے آثار تھے۔ وہ حکیم صاحب کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھکر مسرور ہو رہے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ انھیں دارالسلطنت دہلی کے دونوں طبقوں میں وہی مقبولیت حاصل ہے جو کسی زمانہ میں حکیم اجمل خاں مرحوم کا طرۂ امتیاز تھی۔ علامہ دتاتریا کیفی اور مولانا عبدالحق مرحوم سے اسی اجتماع میں میری ملاقات ہوئی تھی۔

ایک اور روح افزا منظر بھی دیکھنے میں آیا تھا، لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً نواب سراج الدین احمد خاں سائل یادگار داغ دہلوی کے تشریف لانے کی اطلاع ہوئی اُس زمانہ میں وہ معذور ہو چکے تھے رکشا میں بیٹھکر آئے تھے، سر پر زرین ٹوپی تھی، رنگ بہت کھلا ہوا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس میں ہلکی سرخی بھی جھلک رہی تھی، لوگوں نے رکشا کو گھیر لیا حکیم صاحب نے بھی قریب پہنچکر سلام کیا، سائل صاحب نے ایک ہاتھ اُن کی گردن میں حمائل کر دیا اور نہایت خوش الحانی کے ساتھ تہنیت کا قطعہ پڑھا۔

یہ سب تقسیم سے پہلے کے واقعات ہیں، ۱۹۴۷ء میں دس بارہ ہمراہیوں کے ساتھ دہلی جانے کا اتفاق ہوا، میں تسیم کوثر کی شادی میں چاندپور جا رہا تھا اُن کے متعدد احباب بھی تھے، ایک رات ٹھہرنا تھا، قیام کے انتظامات دواخانہ میں ہوئے اس روز گوشت کی ہڑبل تھی آٹھ دس مرغ منگائے گئے اور بڑے اہتمام سے کھانا کھلایا گیا۔

ہمدرد دواخانہ کی تاریخ ارتقاء کا ہر باب حکیم عبدالحمید صاحب کی فکر جوان اور پیرانہ سالی کی اصابت فکر و رائے کے عنوان سے شروع ہوتا ہے انھوں نے بہت چھوٹی عمر میں دواخانہ کا اہتمام سنبھالا تھا، اور رابعہ بصریہ ثانی یعنی اپنی والدہ مرحومہ کی رہنمائی میں آغاز کار کیا تھا، موجودہ منزل تک پہنچنے میں انھیں بہت سی مراحل سے گذرنا پڑا ہے، ایسے موڑ۔ پیچ و خم اور نشیب و فراز

بھی آئے ہیں جب منزل کے نشانات تقریباً محو ہو گئے اور حدِ نظر تک سراب کے دھندلکوں کے سوا کوئی چیز نہ رہی، رہبری کے لئے کوئی نقش یا نشان باقی نہ رہا لیکن حکیم صاحب نے اپنی ہمت اور عزم کی بیکراں صلاحیتوں ہی کو رہنما بنایا اور آپ ہی خضر راہ بن کر منزل کی جانب گامزن رہے اگر ان مشکلات میں وہ حوصلہ اور استقلال کھو بیٹھتے تو دواخانہ کا وہ آبگینہ جو انھیں وراثت میں ملا تھا چور چور ہو جاتا اور سونے کی ایک کان بن کر آزاد ہندوستانیوں کی قومی ملکیت میں نہ آتا۔ حکیم صاحب نے برسرِ کار آتے ہی دیانت، سچائی اور ایمانداری کی ہدایات جاری کیں۔ انھیں اوصاف کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنایا، طبِ قدیم کی تمام بنیادی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے ایک نئے جادے پر نئی منزل کی جانب پیش قدمی شروع کی اور اپنے دماغ کی تمام کھڑکیاں سائنس اور نئے علوم کے لئے کھول دیں۔ کیمسٹری اور دوا سازی کے اعلیٰ انتظامات کئے، نئے آلات، اور خود کار مشینوں کو استعمال کیا، آہستہ آہستہ یہ بندوبست بھی کیا کہ تیاری کے دوران دواؤں کو ہاتھ نہ لگنے پائے ریسرچ کا شعبہ قائم کر کے دیسی ادویہ کی اہمیت اور افادیت کو افسانوی دھندلکوں سے نکال کر ٹھوس حقیقت میں تبدیل کر دیا۔ پیکنگ کے معیار کو بلند کر کے یورپی ادویہ کے برابر کر دیا۔ یہ ترقی صرف فن یا دواخانہ کی نہیں، بلکہ اس آزاد ہندوستان کا بھی جو ابتدا سے علوم و فنون کا مرکز رہا ہے اور جس کے فنی معجزوں نے بغداد کی اسلامی حکومت سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔ حکیم صاحب نے جس مردانہ حوصلے سے یہ سب کچھ کیا اور جس مجاہدانہ جوش سے وہ دواخانہ کے گہنائے ہوئے آفتاب کو ترقی کے نصف النہار تک لائے ہیں، اسے توفیقِ الٰہی کے علاوہ اور کسی نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ ہمدرد دواخانہ جو شہر کے ایک گنجان محلہ میں واقع ہے، بظاہر ایک چھوٹی سی چیز نظر آتا ہے یہ حقیقت کہ یہ نقطہ پھیلتے پھیلتے بہت بڑا دائرہ بن گیا ہے انھیں کو معلوم ہوتی ہے جو اندر ہی اندر دور تک پھیلے ہوئے اس سلسلۂ عمارات کو غور سے دیکھتے ہیں جو دواخانہ کے مختلف شعبوں کو اپنی آغوش میں لئے ہیں کہیں مشینوں میں دوائیں پکائی جا رہی ہیں۔ کہیں آپ ہی آپ شربت بوتلوں میں بھرا جا رہا ہے، کہیں پیکنگ کا کارخانہ قائم ہے اور کہیں بوتلوں اور شیشیوں کے اجتماع سے ایک ایسی کارگہِ شیشہ گری تیار ہو گئی ہے جس کی وسعت کو دیکھ کر آدمی دریائے حیرت میں غرق ہو جاتا ہے۔

ملک اور بیرونِ ملک کے سائنسداں مفکر اور دانشور دواخانہ کے سائنٹیفک انتظامات کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، انھیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان انسانی فلاح و بہبود کے راستوں پر بھی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ حکیم صاحب کی مصروفیتیں نہایت گوناگوں اور اہم قسم کی ہیں، ان کے وقت کا ہر لمحہ ان مشغولیتوں میں بند ھا ہوا ہے بہت سویرے بیدار ہو کر وہ اخبارات دیکھتے ہیں، خاص موضوعات سے متعلق اخبارات اور رسائل سے تراشے لیتے ہیں، پھر اپنے عملے سے الگ الگ فائلوں میں چسپاں کرتے ہیں اس طرح بیشمار ادبی علمی اور مجلسی عنوانات پر ایک جداگانہ کتاب کا مواد جمع ہو جاتا ہے جسے سامنے رکھ کر نہایت معلوماتی تصنیف پیش کی جا سکتی ہے میں نے ان قیمتی فائلوں کو دیکھا ہے ایک فائل صرف طبابت پر تھا جس میں نہایت بیش قیمت معلومات جمع کی گئی تھیں جن اخبارات اور رسائل سے تراشے حاصل کئے جاتے ہیں۔ وہ زیادہ تر عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کے ہوتے ہیں ٹھیک 9 بجے حکیم صاحب مطب میں آ جاتے ہیں جو ہندوستان الحمد کے لئے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے مریضوں کا اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، ہندوستان کے ہر صوبہ سے آئے ہوئے بیمار موجود ہوتے ہیں ایک ایک مریض ان کے سامنے پیش ہوتا ہے اور وہ اس کا نہایت گہرا طبی معائنہ کرتے ہیں، تشخیص میں جدید ذرائع سے بھی کام لیا جاتا ہے ایکسرے، فلوروسکوپ، خون اسٹول اور یورین وغیرہ کی رپورٹیں دیکھی جاتی ہیں۔ ایک بجے کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے پھر حکیم صاحب دواخانہ کے دوسرے شعبوں کی نگرانی کے فرائض انجام دیتے ہیں اس کے بعد تصنیف و تالیف کے مشاغل یا ایکسپیریمنٹ میں منہمک ہو جاتے ہیں، اور کوئی اس انہماک میں مخل ہو سکتا نہ دروازہ بند ہو جاتا ہے یا اس پر چیرا سی کھڑا نہ

۔۔ اُن کی یہ علمی مصروفیت کسی طرح ایک فلسفی کی محویت اور خود فراموشی سے کم نہیں ہوتی اتفاق سے ایک مرتبہ میں نے اسوقت اُن سے ملنے کی اجازت چاہی اور میرا کارڈ حکیم صاحب تک پہونچا دیا گیا۔ انھوں نے مجھے بلا بھی لیا میں پہونچا تو وہ کسی فائل کی تلاش میں اس قدر محو تھے کہ دیر تک میرے آنے کی خبر نہ ہوئی۔ میں نے دانستہ ان کے استغراق میں دراندازی نہیں کی اور خاموش کھڑا ان کی فلسفیانہ تحقیق و تجسّو کے اس منظر کو دیکھتا رہا۔ کئی منٹ تک یہی عالم رہا آخر میرے اوپر نظر پڑی اور چونک سے گئے، حکیم صاحب گیارہ بجے رات تک اسی طرح کاموں میں گھرے رہتے ہیں۔ ان کے سونے کو سہرا نہیں ہے، نرم و گرم گدّے بھی نہیں بلکہ وہ تخت پر ایک معمولی گدا بچھا کر سوتے ہیں، مطالعہ سے حکیم صاحب کو بیحد شغف ہے۔ ان کی لائبریری نہ صرف دہلی بلکہ ایشیا بھر کی بہترین لائبریری ہے وہ نفسیات سے بہت ذوق رکھتے ہیں اور اپنی نفسیاتی مہارت سے علاج معالجہ میں اکثر کام لیتے ہیں، ایثار و قربانی کا جذبہ ان کے خمیر میں شامل ہے، دواخانہ کو وقف کر کے انھوں نے قومی جائداد میں منتقل کر دیا، اور پانچ لاکھ سے زائد کی ذاتی جائداد انڈین نیشنل ٹرسٹ آف اسلامک اسٹڈیز کو دیدی ہے۔ دواخانہ کے ہزاروں ملازمین سے اُن کا سلوک ایک مربّی اور سرپرست کا سا ہے اُن کے لئے وہ ہر ایثار کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ پنشن بڑی باقاعدگی سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ تاریخی ترقی دی جاتی ہے، ملازمین کی علمی اور ذہنی ترقی نیز جسمانی صحت پر پوری توجہ کی جاتی ہے تفریحی مشاغل کے لئے بھی رقم مخصوص کی جاتی ہے۔ انصاف مساوات، اور ملازمت کے استقلال کی ضمانت دی جاتی ہے دواخانہ کے والستگان حکیم صاحب سے سچی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور ان کے اعلیٰ انسانی اوصاف کی تقلید کرتے ہیں، اسی لئے ان کے اندر کوئی معاصرانہ چشمک یا تخریبی رجحان موجود نہیں وہ ٹیم اسپرٹ (Team Spirit) کے ساتھ کام کرتے ہیں اور برادرانہ انداز سے مل جل کر دواخانہ کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔

حکیم صاحب ادب کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اس کی جھلک دواخانہ کی تمام مطبوعات میں نظر آتی ہے۔ کوئی ٹک لیٹ، فہرست یا اشتہار ایسا نہیں ہوتا جسمیں فنی حقائق کو ادبی رنگ سے ادبی زبان میں نہ پیش کیا جاتا ہو۔ حکیم صاحب کے ادبی ذوق ہی کا نتیجہ ہے کہ دواخانہ میں متعدد صاحب طرز ادیب اور شاعر موجود ہیں جو سند و ستان گیر شہرت رکھتے ہیں حکیم صاحب تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں، ان کی متعدد تصانیف چھپ چکی ہیں جو مواد اور موضوع کی اہمیت نیز اسلوب بیان کی انفرادیت کے اعتبار سے نہایت ممتاز ہیں۔ آل انڈیا طبی کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے ان کے جو خطبات صدارت شائع ہوئے ہیں ان میں جہاں ایک ہوشمند ذہین اور ترقی پسند طبیب کی نظر کارفرما ہے، وہاں مختلف ہنگامی مسائل کا احاطہ کرنے اور انھیں پیش کرنے کے انداز میں ایک اچھے فن کار اور دانشور کی فنی چابکدستی بھی جھلکتی ہے۔ مقالات کو عوام کے سامنے پڑھتے وقت وہ خطیب اور مقرر کا لب و لہجہ اپنا لیتے ہیں جس کی دلکشی سامعین کو مسحور کر دیتی ہے موقت رسائل کی ترتیب اور ادارت کا وہ بہت ہی اچھا سلیقہ رکھتے ہیں ایک زمانہ میں ہمدرد صحت کی تدوین اوّل سے آخر تک خود ہی کیا کرتے تھے پھر یہ ذمہ داری سعید صاحب کے سپرد کر دی گئی۔ دواخانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب کی دماغی مصروفیت بہت بڑھ گئی۔ پھر بھی ہمدرد صحت کی ترتیب کا زیادہ بار انھوں نے خود ہی سنبھالا ہمدرد اخبار بھی انھیں کی رہنمائی میں نکل رہا ہے۔

حکیم عبدالحمید صاحب انسان کی تربیت اور ذہنی نشوونما میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، وہ ایک اچھے آرٹسٹ کے مانند دماغ کے سادہ صفحات پر نقش و نگار بنانے کی قدرت صلاحیت رکھتے ہیں اُن کا طالب علمی زندگی کے کسی امتحان میں ناکام نہیں ہوتا۔ وہ ایسے جوہر قابل موجود ہیں جو حکیم صاحب کے فیض تربیت سے کامیاب ترین انسانوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔

ایک خود ان کے چھوٹے بھائی حکیم حافظ محمد سعید صاحب انھیں کے ہم رتبہ ہیں۔ شہرت، قابلیت اور ذہانت کی اُن

ـ اسی بلندی پر فائز ہیں جو حکیم صاحب کے حصہ میں آچکی ہے۔ سعید صاحب کراچی میں اسی مرتبہ کا دواخانہ اسی نام سے چلا رہے ہیں اور تمام اوصاف میں حکیم عبدالمجید صاحب کا عکس جمیل ہیں۔ خود حکیم صاحب کو اپنے اس شاہکار پر ناز ہے، انھوں نے زبان سے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا، لیکن جب میاں سعید کا نام زبان سے ادا ہوتا ہے تو آنکھوں میں فخر و مسرت کی چمک نمایاں ہو جاتی ہے۔ سعید صاحب بھی اپنے بڑے بھائی سے عقیدت آمیز محبت رکھتے ہیں مارچ ۱۹۴۸ء میں مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا تھا قیام حمیدیہ دواخانے ہی میں تھا اگر ان دونوں بھائیوں میں دراصل بڑا کون ہے۔ سن و سال کی بڑائی اور عقل و شعور کی بڑائی ایک اہم بحث ہے۔ دواخانہ میں ایک جانب حکیموں کا قوام ملوں سے گذر کر چاندی کے مانند چمکتے ہوئے قلمی دار برتنوں میں بھرتا جا رہا تھا اور آپ ہی آپ اس کی گھٹائی ہو رہی تھی۔ دوسری طرف روح افزا کی بوتلیں ٹرالی پر رقص کر رہی تھیں ان پر کیپسل چسپاں کئے جا رہے تھے ایک حصہ میں ایک خود کار مشین ترازو کا کام انجام دے رہی تھی وہ اونس کا صحیح پورے تولہ کو منہ میں دبا لیتی اور گرد و انکالنے کے بعد پھلکا الگ پھینک دیتی یہ سب مشینیں جرمن سائنس دانوں کی دانشوری کا نتیجہ تھیں اور انھیں کے منصوبے سے فٹ کی گئی تھیں میں نے بہت دیر سوچ کر کہا۔

ان سب چیزوں کا کریڈٹ ہمارے حکیم صاحب کو پہنچتا ہے کہ انھوں نے آپ کی اتنی اچھی تربیت کی۔ سعید صاحب نے بڑی سعادت مندی کیساتھ اعتراف کیا۔

بیشک! ـــ یہ سب بھائی جان ہی کی تقسیم کا ثمرہ ہے۔

دوسرے خوش نصیب ماسٹر عبدالمجید صاحب ہیں افسوس کہ اب ماسٹر عبدالمجید صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں ۱۹۶۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا) جو اولاً صاحبزادہ عبدالمجید کے اتالیق مقرر ہوئے تھے اور حکیم صاحب کی نگرانی میں ان کی عملی صلاحیتوں کا بہترین نشو و نما ہوا چنانچہ حکیم محمد یحییٰ صاحب مرحوم کے کراچی چلے جانے پر وہی ان کی جگہ پر بیٹھ رہے اور ایڈمنسٹریشن کی حیثیت سے اتنے بڑے کارخانے کے نگراں ہیں جس کی فروخت ایک کروڑ سے متجاوز ہے اور جو صرف ہمدرد پر ایک لاکھ سے زیادہ کی رقم صرف کر رہا ہے۔

حکیم صاحب ہر جگہ کے لئے ایک موزوں آدمی کا انتخاب کرتے ہیں ان کی نگاہ انتخاب سے بہت کم غلطی ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ حکیم صاحب نے ایک ملازم رکھا جس نے ان کی گھڑی چرا لی، چوری کا الزام ثابت ہو گیا، مولانا مجاور صاحب کا بیان ہے کہ حکیم صاحب کو اسی دن خفا ہوتے دیکھا گیا۔ برسوں اس نے کہیں تھی کہ گھڑی چوری ہو گئی تھی۔ اور اس سے کوئی مالی نقصان ہوا تھا۔ اس خفگی کا رخ چوری کرنے والے کی طرف بھی نہیں تھا۔ غصہ حکیم صاحب کو اپنے ہی اوپر آیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ دواخانہ میں جس کی بنیاد ہی تقویٰ اور دیانت پر ہے ایسے آدمی کو ملازم ہی کیوں رکھا گیا، اور سارا یہ انتخاب غلط کیوں ہوا ـــــ اور کیوں نگاہ انتخاب کا حرمت کو خطرہ لاحق ہوا، اور میں سوچتا ہوں کہ یہ انتخاب بھی صحیح ہو جاتا، تو حکیم صاحب کی شخصیت پر لکھا ہوا میرا مضمون فنی اعتبار سے بالکل ناقص رہ جاتا۔ ان کی شخصیت پر محاسن کا غازہ قدرت نے اس طرح لگایا ہے کہ عیب کا سطح ہر طرف سے ڈھک گئی ہے، بلکہ معدوم ہو گئی ہے۔

اب مجھے دو باتیں اور کہنا ہیں، ایک تو یہ کہ حکیم صاحب ہر قصور معاف کر سکتے ہیں، لیکن بے عملی کے جرم کو کبھی نہیں بخشتے۔ دوسرے یہ کہ شدید اور لگاتار مصروفیت کی تھکن اتارنے کے لئے وہ ہفتہ سے چھوٹ منانے کے عادی ہیں پہلے ہر اتوار کو مہرولی قطب صاحب یا کسی اور خوش سواد مقام کی سیر ہوا کرتی تھی، شام کا کھانا بھی وہیں کھایا جاتا تھا میں بھی چند بار بغرض پروگرام میں ساتھ رہا ہوں بعض اوقات دہلی سے دور کسی جگہ چلے جاتے ہیں، میلوں پیدل چلتے ہیں اور شکار بھی کھیلتے ہیں، مگر بندوق پر وہ قدرت نہیں جو فن اور قلم پر ہے۔

یہ مضمون جنوری ۶۴ء میں طاہر صدیقی صاحب ایڈیٹر ہمدرد دواخانہ دہلی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا وہ اس وقت کوئی کتاب مرتب کر رہے تھے کتاب اس وقت تک شائع نہیں ہو سکی۔ میں نے بامسرار وعدوں سے یہ مضمون واپس لے لیا۔

کوثر چاندپوری

صہبا وحید

ھملیٹ

(بورس پاسترناک کی ایک نظم کا عکسِ لطیف)

وہ شورِ رزمِ گل
وہی ہنگامہ تھم گیا آخر!
ہر ایک سمت ہیں بوجھل سکوت کے سائے
کبھی تھا جن سے فروغِ تماشہ گاہِ حیات
وہی خروشِ تمنا ہے بازگشتِ صدا!

تماشہ گاہ میں آہستگی سے چلتا ہوا
(دُبا دا چونک اٹھیں پھر سکوت کے پیکر)
تماشہ گاہ کے اسٹیج پر میں آتا ہوں!
ادراک کو اڑی جو کھٹ پہ ساکت و صامت
خلا میں دُور بھٹکتی ہوئی صداؤں سے
جدید عہد کے بارے میں سوچتا ہوں میں
کبھی یہ فکر کہ کل جانے اس جگہ کیا ہو!
کبھی یہ سوچ کہ انجام میرا کیا ہوگا؟
اُمید و بیم کی حالت میں ہے تجسّس بھی
وہ بازگشتہ پکاریں کہ دُور رہتی ہیں!

یہ تیرگیٔ شبِ تار آج میری طرف
بغور دیکھ رہی ہے ہزار آنکھوں سے
وہ ریزہ ریزہ مناظر بھی تک رہے ہیں مجھے
تماشہ گاہ کے موٹے دبیز شیشوں سے
مرے پدر —!
مرے ابّا! جو ایسا ممکن ہو!
نوشتِ لوحِ مقدّر کبھی بدل جائے
جو پیش آنی ہے اُفتاد، اگر وہ ٹل جائے
تو پھر تو اس غمِ ہستی کے تلخ ساغر کو
مرے وجود طلب سے گزر ہی جانے دے

یہ تارِ پُود طلب کا بکھر ہی جانے دے

تری مشیّتِ جابر کا پاس ہے مجھ کو!
سرِ نیاز جھکائے، رضا و رغبت سے
ترے دیئے ہوئے کردار کو نبھاؤں گا
مگر اے باپ! اے ابّا! تو اس سے واقف ہے!
کہ ہر وقت کی نیرنگیوں سے ہوتی ہے
تماشہ گاہ کے اسٹیج پر نئی تمثیل
ہر ایک شے سے ٹپکتی ہے اجنبیت سی
ہر اک لباسِ کہن بھی تو ہو گئی تبدیل!
نہ وہ کہانی ہے باقی نہ وہ رہے کردار
وہ بازگشت صدائیں بھی ہو گئیں تحلیل

تو صرف اس کے لئے مجھ کو یہ سعادت دے
کہ سوزِ دل سے جلالوں نئے چراغوں کو
خدنگِ آشنا پھر کر لوں دل کے داغوں کو

بایں ہمہ کہ مکمّل ہے اس کا ہر ہر ایکٹ
اور اختتام سے ممکن نہیں ہے راہِ فرار
یہاں ہوں اب بھی
میں بے آسرا، تنِ تنہا
ہر ایک شے کو لے ڈوبا فریبیوں کا نفاق
مدارِ علّت و معلول ہے ترا ایسا
دیارِ ہیبت سے بس یونہی اب گزرنا ہے
پر اس قدر نہیں آساں کہ جس قدر آساں[1]
کسی بساطِ چمن زار سے گزرنا ہے

---

[1] یہ آخری دو مصرعے ایک روسی کہاوت کا مفہوم ادا کرتے ہیں (ص ۔ ا)

شہاب جعفری

پرانے انسان کی کتھا

پرانے موسموں کی آواز — کمار پاشی

میرے ہمعصروں میں کمار پاشی میرے چند پسندیدہ شاعروں میں ہیں۔ ان شاعروں میں نئی شاعری کے دو نئے علمبردار شاعروں کے مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ ایک میرے دوست کا مجموعہ "اسمِ اعظم" اور دوسرا کمار پاشی کا مجموعہ "پرانے موسموں کی آواز"۔ جب نئی نسل یا نئی شاعری کی بات آتی ہے تو خواہ مخواہ اُس تقابل کا اعادہ کرنے کو جی چاہتا ہے جو گذشتہ نسل اور گذشتہ شاعری سے ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں عہدوں کی شاعری میں بنیادی اقدار کا فرق ہے اور پڑھنے والا اس فرق کو سمجھے بغیر نئی شاعری سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

سردار جعفری نے اپنی ایک تقریر اور ایک شائع شدہ انٹرویو میں بھی 'نئی نسل اور پرانی نسل کے امتیاز کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اُنھوں نے اِس کا تعین شاعر کی عمر اور اُس کے زمانۂ شہرت سے کیا اور فراق گورکھپوری اور اختر الایمان کی مثالیں دی ہیں کہ یہ شاعر جن میں ایک جان سے عمر میں بڑا اور دوسرا اُن کا ہمعصر ہے، بہت بعد میں مشہور ہوئے۔ اختر الایمان اُن کے ہمعصر ہیں۔ لیکن اُن کو نئی نسل میں گنا گیا۔ سردار جعفری دو نسلوں کے امتیاز کو ختم کرنے میں یہ بھول گئے کہ نئی اور پرانی شاعری کا تعلق شاعر کی عمر سے نہیں، شاعری کی بنیادی اقدار، تصورِ حیات میں اختلاف اور دو رجحانوں کے فرق سے ہے فراق یا اختر الایمان اس لئے جدید نسل سے تعلق رکھتے ہیں کہ وہ جدید ذہن سے قریب ہیں۔ اُن کی وہ آوازیں جو ترقی پسند تحریک کے زمانۂ عروج اور اس کے خروش و خطابت کے عہد میں دبی دبی سی تھیں۔ آج اپنے اظہار کا مناسب زمانہ پاکر نمایاں ہو گئیں۔ ان آوازوں کو گوشِ سماعت ہمارے عہد نے عطا کیا۔

نئی شاعری کے لئے، جن حالات نے فضا تیار کی، اس کا تفصیلی ذکر میں اپنے ایک مضمون "جدید ادب" میں کر چکا ہوں ظاہر ہے اس مختصر سے تعارف میں اُن کا اعادہ نہ تو ممکن ہے نہ اس کا موقعہ ہے۔ صرف چند اشارے کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

زمانۂ قدیم سے اب تک دُنیا کے فن و ادب دیومالائی عقائد، مذہبی تصورِ حیات اور سیاسی مقاصد کے تابع رہے ہیں۔ گذشتہ چند صدیوں سے اس پر سائنسی علم و عمل کے اثرات پڑنے شروع ہوئے جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ انسانی معاشرے کی شکل بدلی، انسانی رشتوں، اخلاقی قدروں، سماج اور فرد کے نظامِ ہمرشتگی کے معیاروں میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ دیہات شہر بنے، کھیت کارخانے بنے، چھوٹے چھوٹے کنبوں میں زندگی گذارنے والے سیدھے سادے انسان اتنی تعداد میں بڑھے کہ ساری زمین کو چھا لیا۔ ذرائع رسل و رسائل نے زمین کی طنابیں کھینچ دیں، زمین اتنی چھوٹی ہو گئی کہ آدمی کو دوسرا قدم رکھنے کے لئے جگہ کی قلت محسوس ہونے لگی اور اُس کی فکر نے اُسے سوچنے پر مجبور کیا کہ ؎

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

علم اور دریافت کی برکتوں نے ماضی کے انسان کی طلسماتی دُنیا کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ اس کا تخیّل مادّی اور محسوس پیکروں میں ڈھل گیا۔ دراصل اُن دیکھی چیزوں کی آرزو میں زیادہ لطف ہے۔ پہلے تو انسان نے خواہش اور جدوجہد کی کہ اُس کی آرزوئیں برآئیں، لیکن آرزوؤں کی مورتیں جب زندہ اور ٹھوس حقیقتوں کے رُوپ میں سامنے آگئیں تو انسان نے محسوس کیا، جیسے اُس کی آرزو پوری نہ ہوئی ہو، بلکہ اُس سے اُس کی متاع چھن گئی ہو۔ اُس کے ذہن میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ سائنس، صنعت اور سیاست کے علوم نے جمہور کی دُنیا کے لئے خارجی خلاؤں کی دریافت کی، اور ہر اُس قیاس اور احساس نے فرد کی دُنیا کے لئے داخلی خلاؤں کی دریافت کی۔ اِن داخلی خلاؤں کو پُر کرنے کے لئے بے بس فرد ہر طرف ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ وہ کبھی مستقبل کے آدرش کی طرف بڑھتا ہے، کبھی حال کے لمحے کو پکڑتا ہے، کبھی پُرانی قدروں، ماضی کے طلسمات اور قدیم انسان کے معصوم اور بے داغ ذہن کو یاد کر کے آسودہ ہونا چاہتا ہے۔ جدید دُنیا۔ جس پر فلسفہ، مذہب اور دیومالا کے بجائے سائنس، صنعت اور سیاست کا غلبہ ہے۔ جو دراصل کبھی انسان کے آدرشوں اور خوابوں کی دُنیا تھی۔ جب اُس کی جدوجہد کے نتیجے میں حقیقی وجود میں آگئی تو اُس کو اچانک محسوس ہوا کہ اُس کے سارے خواب، سارے آدرش چھن گئے۔ سائنس کے مقابلہ میں فن اور مذہب بے معنی ہو گئے۔ زمین کا طلسم، چاند کا جادو، فطرت کی تمام رعنائیاں، تسخیرِ فطرت کے نتیجے میں بکھر گئیں، آدمی کے خواب ٹوٹ گئے اور وہ عظیم کائناتوں کا علم حاصل ہونے سے اپنے کو بونا محسوس کرنے لگا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج کی شاعری عدم تسکین اور احساسِ کمتری کی شاعری ہے، جس کی کچھ اپنی صالح اقدار بھی ہیں۔ یہاں پھر ایک تصادم، ایک کشمکش، ایک ٹکراؤ نے جنم لیا۔ یہی تصادم، کشمکش اور ٹکراؤ جدید فنی تصورِ حیات کا ضامن ہے۔ جدید شاعری، جدید سائنسی دُنیا کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے، جدید معاشرے کے خلاف ایک احتجاج ہے اور یہ ردِ عمل اور احتجاج دراصل اُس قدیم انسان کا ہے، جو ازل سے آج تک زندہ ہے۔ یہ انسان اپنی ذہنی خلا کو پُر کرنے کے لئے نئے اقدار، نئے تصورِ حیات اور نئے انسانی رشتوں کی تلاش میں ہے۔ ابھی تک اُس کے ہاتھ بہت کم چیزیں آئی ہیں، ابھی یہ شاعری صرف تلاش کی شاعری ہے۔ حصول کی آسودگی اور طمانیت کی شاعری نہیں۔

جدید اُردو شاعری میں ہر اچھے فن کار نے اقدار کی تلاش میں اپنی مسافت کے لئے اپنا اپنا ایک راستہ چُنا ہے۔ کچھ مدت گزر جانے کے بعد ہی چاروں کھونٹ سے واپس آنے والے درویش کسی الاؤ کے گرد اکٹھا ہو کر بیٹھیں گے اور اپنے اپنے سفر کی متاع پیش کریں گے۔ تبھی ان تمام تجربوں اور نئے جہانوں کے خزف ریزوں کو اکٹھا کر کے زندگی کی نئی مورت ترتیب دی جا سکتی ہے۔ کمار پاشی بھی چند گوہرِ آبدار کی تلاش میں نکلے ہیں، اُن کے سفر کی سمت بیشتر ماضی ہے کہ وہی اُن کے مزاج سے مطابق ہے۔ وہ جدید انسان کی رُوح کے سلسلے کو ماضی کی رُوح سے ملاتے ہیں اور جسم یا ریشۂ جسم کو ایک رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اُن کا انسان بہت قدیم ہے، جو صدیوں پہلے پیدا ہو چکا تھا، یہ انسان خانہ بدوش ہے، جو کبھی تتلی پنچی کی طرح دنیا کا نقشہ بناتا ہے، جو ہوا کے تیز جھونکے میں اُڑ جاتا ہے اور اُس کا گڑیا گھر بھی مسمار ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ اس پھیلی ہوئی کائنات میں سخت گھٹن محسوس کرتا ہے، جس کے چاروں طرف سمندر ہے اور شہروں کا شور ہے۔ یہ انسان رشتۂ جسم کی وجہ سے سمٹ محدود ہو گیا ہے، چھوٹا ہو گیا ہے۔ اس کی رُوح آفاق کی حدوں کو چھونا چاہتی ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا یہ جسم ایک راکھ کا ڈھیر بن جائے گا، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اُس کی آواز امر ہے اور اُس کی جستجو جاری رہے گی۔ کمار پاشی کی نظموں میں یہ فضا غالب ہے۔ اسی فضا کے ذیل میں اُن کے یہاں جگہ جگہ موت سے ایک قسم کی وابستگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بشر کے انجام پر دیکھ رنجھ آتے ہیں، لیکن موت، اضمحلال اور تنوطیت کا نشان ہونے کے باوجود پڑھنے والے کے ذہن پر ایک

ہی تاثر چھوڑتی ہے۔ وہ تاثر یہی ہے کہ انسان ازلی ہے، انسان ابدی ہے، وہ بہت نیا ہو کر بھی بہت پرانا ہے۔ اس انسان کا دُکھ صرف یہ ہے کہ اُس نے تسخیر کائنات کر کے اپنی بہت بڑی دولت کھو دی ہے۔ اُس کا اُس کو پچھتاوا ہے۔ وہ اس کی تلافی میں اپنی کھوئی ہوئی کائنات، بکھرے ہوئے ماضی، روٹھے ہوئے ماہ و سال کو پھر سے حاصل کرنے کے لئے مچل کر کھڑا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو جگہ جگہ دیوتاؤں کا آلیہ یاد آتا ہے۔ کمار پاشی کی نظموں میں سب سے زیادہ حاوی علامت "ہوا" ہے۔ ہوا ان کے یہاں "وقت" کا درجہ لے لیتی ہے۔ ہوا کا تیز جھونکا ہر چیز کو مٹا دیتا ہے۔ ہوا کی حرکت ان کا بہت محبوب موضوع ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اُن کی نظموں میں ایک اضمحلال کی سی فضا کے باوجود ایک متحرک، جاندار قوت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وہ عنصر ہے، جو اُن کی نظموں کو انجماد اور سنگین سکوت سے بچا لیتا ہے۔ کمار پاشی کے یہاں بعض بڑے اچھوتے طرزِ بیان ہیں۔ ذہن کی بعض بڑی نازک کیفیتوں کو اُنھوں نے بڑے ہی متاثر کن انداز میں پیش کیا ہے۔ اُن کے یہاں مجموعی احساسات تو صرف چند ہی ہیں اور اُنھیں کے گرد اُن کی ساری نظمیں گھومتی ہیں لیکن ان احساسات سے پیدا ہونے والی فضا، اُس کے گوشے، اُس کے خدوخال کی جزئیات کا بیان جگہ جگہ بہت خوبصورت اسلوب میں ہوا ہے۔ فکشن کی یہی تازگی اُن کو بہتر اور خوب تر شاعری کی طرف لے جائے گی اور تیراجی کو خبر باد کہے گی۔ اُن کے ذہنی افق، مانوس و نامانوس احساسات اور فکرِ کائنات کو ابھی اور وسیع ہونا ہے۔ جیسے جیسے ان میں وسعت پیدا ہوگی۔ اُن کی اسلوبیات اور لفظیات میں بھی رچاؤ اور تیکھاپن پیدا ہو جائے گا۔

بہترین خوشبو
تازگی اور
خوش ذائقہ
لاکھوں آدمیوں کی پسند
بابا
نقل سے ہوشیار دہلی والوں کا
"بابا چھاپ"
دیکھکر خریدیئے
اس کی مٹھی اس کو خوش کرنے والی خوشبو اور دل پسند ذائقہ کے لئے لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ پان کے ساتھ کھانے سے اس کی خوشبو ذائقہ کو بڑھا دیتی ہے اور عرصہ تک اس کی تازگی بنی رہتی ہے۔ فہرست مفت حاصل کیجیے۔
تیار کردہ:- دھرم پال پریم چند۔ چاندنی چوک دہلی - ۶ -

دو نظمیں:-

کمار پاشی

سوکھے پتے

○

دور دور تک پیڑ کھڑے ہیں
جن کی شاخوں پر پتوں کے زرد رنگینے جڑے ہوئے ہیں
گل کا موسم بیت چکا ہے
آؤ۔ خزاں کے شانوں پر سر رکھ کر روئیں
یہی اب اپنا درد سنے گی
یہی اب اپنا دکھ بانٹے گی

پتوں کو احساس نہیں ہے
اک دن ایسا بھی آئے گا
سورج خونی آنکھ سے جب ان کو گھورے گا
وہ شاخوں سے پھسل پھسل کر
سنبھل سنبھل کر
آوندے منھ دھرتی پہ گریں گے
لو دیکھو وہ سورج نکلا
نرم سجیلی شاخوں سے ہم
پھسل پھسل کر
گرے زمیں پر

○

ایک تصویر

○

آسماں چپ چاپ تکتا ہے زمیں کو
اور سیلیٹ ناک بادل
سر پہ چیلوں کی طرح منڈلا رہے ہیں

چاند بھی اب چلتے چلتے
یوں ٹھٹھک کر رہ گیا ہے
جیسے کھائی میں لڑھکنے سے بچا ہو

جل رہا ہے آگ میں دھرتی کا سینہ
بجھ رہا ہے چرخ پر اک اک ستارہ
ہانپتا ہے شہر سارا

○

مقالہ

کمار پاشی

کچھ اپنے فن کے بارے میں

اپنے فن سے متعلق کچھ کہنا یا لکھنا یا درحقیقت اپنے ضمیر کی عدالت میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے کے برابر ہے۔ میرے لئے اس مرحلے سے دوچار ہونا اور سُرخرو گذرنا اگرچہ خاصہ دشوار ہے لیکن نئے زمانے اور نئی شاعری کے رسم و رواج نے آج کے لکھنے والے کے لئے اس عدالت کی پیشی کچھ لازمی سی بنادی ہے۔

جس زمانے میں ترقی پسند شاعری اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی اور ترقی پسند شعرا اپنے گناہوں کا طوق گلے میں ڈالے کونوں، کھدروں میں چھپنے کی کوشش کر رہے تھے، اُنہی دنوں میری شاعری کا آغاز ہوا۔ میرے سامنے ایک مہد دم توڑ رہا تھا۔ اور نئے دور کے خدوخال ابھی اُجاگر نہیں ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی میرے احساس میں نئے زمانوں اور نئی منزلوں کے موسم ابتدائی انگڑائیوں میں ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اُس زمانے کی اُمنگوں اور ولولوں کو میں نے اپنی نظم دیوداسی میں اس طرح پیش کیا تھا۔

آکاش پہ بادل چھایا ہے
بوندوں نے ساز بجایا ہے
کیا ایسے بھیگے موسم میں ساون کا گیت نہ گاؤ گی
کیا جام پکڑ کے ہاتھوں میں
محفل میں جھوم نہ جاؤ گی

اس نظم میں، میں نے جس دیوداسی سے خطاب کیا تھا، وہ اُس دور کی ایسی مجہول شاعری تھی جو بے حسی کا "برفیلا پری ماں بن کر خود کو پوتر تا کا کوئی انگور بتلانا چاہتی تھی۔"

احساس کے موسم دھنک رنگ بھی ہوتے ہیں اور فن کار کو زمانوں اور صدیوں کے سفر پر بھی آکساتے ہیں۔ ان موسموں کے تندس کر اور اس کی کیفیت کو اپنے احساس میں سمیٹ کر میں نے فن کی جن دنیاؤں کی تلاش کا سفر شروع کیا تھا، میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں نے اس کی کوئی منزل سر کر لی ہے۔ لیکن اس کربناک سفر پر چل نکلنے سے مجھے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ میں نے تاثرات سے کر محسوسات اور خوابوں کی وسعتوں میں پناہ لینے کی کوشش کی۔

اس اعتبار سے میری شاعری میرے عہد کا آئینہ نہیں ہے۔ بلکہ اس عہد کے انسان، اس کی تنہائی، اس کی بے بسی، اور اجنبیت سے آگے خوابوں اور خیالوں کا سفر ہے۔ میں اپنا کوئی خیال یا فلسفہ اپنے پڑھنے والوں پر تھوپنا نہیں چاہتا، لیکن پھر بھی اپنے اور اُن کے درمیان کے فاصلوں کو کم کرنے کے لئے کچھ بہت تھوڑے اشارے ضروری سمجھتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ میں نے شاعری کو دردِ ہجر و وصال اور عاشقانہ اٹھکیلیوں کا ذریعہ نہیں سمجھا، بلکہ اپنی ذات کی تسکین اور طمانیت کا وسیلہ بنایا ہے، اور انسانی زندگی

کو ایک اکائی کی شکل میں محسوس کیا ہے۔
نئے سماج اور نئی سوسائٹی نے انسان کو مختلف خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ میں نے اس تقسیم سے اپنی داخلی شخصیت کو بچا کر اُسے ایک ایسے IDEAL کی صورت میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، جس میں آدمی محض ایک مہذب آدمی ہی نہیں بلکہ تہذیب کا خالق بھی ہے اور اس اعتبار سے سماج اور سوسائٹی سے اس کا رشتہ ایک ازلی اور ابدی رشتے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس رشتے کا احساس وہ "نوالاشعور" ہے، جسے میں نے اپنی بیشتر نظموں میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً اس، رشتۂ جسم، خانہ بدوش، جنم دن، اور سفر وغیرہ۔ ان نظموں میں تہذیب نے اس خالق کے خدوخال اُبھارنے کی سعی کی گئی ہے، جو وقت کے قافلوں سے بہت دُور، اپنی حسرتوں کے صحراؤں میں پارہ پارہ کیا تھا۔

اور یونہی اپنی پتھریلی آنکھوں سے ہم
بے خبر بے صدا
دیر تک، جانے کیا
پھیلے آکاش کی نیلی نیلی فضاؤں میں ڈھونڈا کئے
اور بلکتے ہوئے قافلے وقت کے
دُور تک ہم کو حسرت سے تکتے رہے۔

سفر

دراصل میں اس کردار کا وژن (VISION) میری نظموں میں ایک ایسے دیومالائی انسان کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جس کا زندگی سے بہت ہی پرانا بلکہ ازلی رشتہ ہے، لیکن ہمارے دَور میں اس کردار کو ایک المیہ سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے اور وہ المیہ ہے: اُس کا بے صدا ہو جانا، یعنی اُس کی آواز پر مشینوں، موٹروں اور "بس کے بھپوؤں" کی بے ہنگم آوازوں کو چھا جانا۔ اس کیفیت کو میں نے سفر کے بعد میں اس طرح پیش کیا ہے:

ہزاروں برس کی مسافت کو میں آج طے کر چکا ہوں
تو یہ سوچتا ہوں
کہاں چھوڑ آیا ہوں آواز اپنی

میرے مجموعے "پرانے موسموں کی آواز" میں شامل بیشتر نظموں میں آپ کو ایک ایسے آدمی کا کردار نظر آئے گا، جو زندگی سے اپنا ابدی رشتہ قائم کئے ہوئے ہے اور نیچر کو اپنے وجود اور اپنے EXISTANCE کے جواز کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یہ کردار کہیں "میں" کے طور پر سامنے آتا ہے اور کہیں "دیوتاؤں کا المیہ" کی صورت میں محض اُس کی کتھائیں اور عظمت کے نشان نظر آتے ہیں۔ اور کہیں کہیں اس کے اعمال دیوتاؤں کے اعمال سے مشابہ نظر آتے ہیں، جس کی وجہ سے غالباً میرے پڑھنے والے میری شاعری میں اساطیر، دیومالا یا رُوح کو پہچاننے اور تلاش کرنے کا جتن کرتے ہیں۔ لیکن میں اس سلسلے میں، صرف اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ یہ کردار میرے احساس کا وژن ہے۔ خود شاعر کی ذات اور اُس کے کردار میں وہی فاصلہ ہے، جو ایلیٹ کے IMPERSONALITY کے تصور میں۔

دراصل رُوح کو میں انسان کی داخلی اور خارجی زندگی کے درمیان ایک ربط کا وسیلہ سمجھتا ہوں، اس لئے ایک ابدی کردار کی تخلیق میں جہاں کہیں میرا رویہ رُوحانی یا مذہبی قسم کا نظر آتا ہے وہ درحقیقت اسی اشتراک کا حامل ہے۔ ورنہ میرا مقصد نہ برہمن ہے، نہ آپ نشدوں سے اور نہ ہی بھگتی سے۔ اپنے اس کردار کے مقصد پر پہنچنے کا تو کے رویے کے مطابق خدا کو مُردہ نہیں

سمجھا، بلکہ زوال خوردہ تسلیم کیا ہے۔
جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں: اساطیری ادب میں فن کار خود کو واقعات سے الگ تھلگ رکھتا ہے۔ اس کے برعکس تعبیراتی ادب میں فن کار خود بھی ایک خیالی کردار کے طور پر اپنی تخلیق میں شامل رہتا ہے۔ لیکن میری شاعری کا یہ کردار واقعات، افکار یا "میں" سے بھی الگ اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتا ہے اور عمل کے ساتھ ساتھ سوچنے، سمجھنے اور محسوس کرنے اور محسوس کرانے میں پیش پیش نظر آتا ہے۔
نئے زمانے کا کرب، میری خارجی زندگی کا کرب ہے اور میری شاعری میری داخلی زندگی اور داخلی محسوسات کا اظہار ہے۔ اس لئے میں نے مشینی دور، تنہائی، خوف، اجنبیت، قتل، قتل گاہ، خودکشی، ہجوم، ہجوم کی تنہائی اور ایسے ہی نئے اور نفیس اپیل موضوعات سے ہٹ کر اپنے داخلی احساسات کو شعر کے قالب میں ڈھالنا چاہا ہے۔
ایک پُرسکون دور میں اب سے بہت پہلے اساطیر، یا دیو مالا کی تخلیق ہوئی تھی اور کسی تلسی نے اپنے خوابوں کو خیالات اور نظریات کو رامائن کا روپ دیا تھا۔ میں نے اپنے احساس کے اس طمانیت بخش موسم میں وہ نئی دیو مالا تخلیق کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے: جس کا بیان میرے مجموعے کی ایک نظم خنودگی کے عالم میں موجود ہے۔
خواب و خیال سے میرا یہ تعلق اور روِژن پرستی ممکن ہے نئی شاعری کے نقادوں کو نراخبط معلوم ہو۔ لیکن اس کے جواز میں مجھے بادلیئر کی ایک سطر یاد آتی ہے:

I have cultivated my hysteria with delight and horror.

میرے مجموعے کی آخری نظم گذشتہ دنوں کا قصہ ہے۔ بظاہر یہ نظم بہت واضح ہے، لیکن میرے بعض دوستوں نے اکثر اس نظم کے متعلق مجھ سے سوال کئے ہیں۔ ویسے بھی اس نظم کو میں اس مجموعے میں شامل تمام نظموں کا انتہائیہ سمجھتا ہوں۔
دراصل مختلف تہذیبوں کے عروج و زوال اور پھر انقلابی اور ارتقائی رجحانات اس نظم کا پس منظر ہیں۔ انسان جو قدیں بناتا ہے، آنے والی نسلیں اُن ہی پر اپنے انقلابی رویے کے "ترشول" سے حملہ آور ہوتی ہیں اور اس کشمکش میں ہمیشہ ادبی قدروں کا زوال اور المیہ سامنے آتا رہا ہے۔ آج ہم جن نعروں کو اپنے سینوں پر تمغوں کی طرح سجائے ہوئے پرانی قدروں اور تہذیبوں پر حملہ آور ہیں بالکل اسی طرح آنے والے دور میں ارتقا کے شہزادے ہماری قدروں کا بھی قتل عام کریں گے۔ تہذیب اور اس کے ارتقائی کہانی کا یہ سلسلہ آج بھی ہمارا المیہ ہے اور کل بھی ہوگا۔ تہذیب کے یہی مختلف دور اور اُس کی کتھائیں اس نظم کا محرک ہیں۔ اور یہ نظم تہذیب کے اُس خالق کا انتہائیہ بھی ہے، جسے میں نے اپنی بیشتر نظموں میں پیش کیا ہے۔
آخر میں مجھے اس بات کا اعتراف بھی کرنا ہے کہ اپنے دور کی گونا گوں شاعری، امیجز، سمبلزیا Absurdities پر بچوں کی طرح مچل جانے والی نئی شاعری اور میری شاعری میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ میری شاعری، میری شاعری ہے اور اس سے زیادہ یہ کہ یہ میرا وژن ہے اور اس میں میں نے اپنی زندگی کے تمام رنگ، تمام موسم اور تمام ادبیت سمونے کی کوشش کی ہے۔
اس مختصر سے مضمون میں اگرچہ وہ سب باتیں تو نہیں کہہ سکا ہوں جو میں اپنے اور اپنی شاعری کے بارے میں کہنا چاہتا تھا لیکن شاعر کا احساس کہیں کہیں ایک راز بھی ہوتا ہے۔ اس راز کا انکشاف میرے بعض جذبوں کی موت بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے آخر میں ہنری جیمز کے لفظوں میں یہی کہنا چاہوں گا کہ:
"ہم نے اندھیروں میں اپنے سفر کی راہیں تلاش کی ہیں۔ ہم صرف وہی کر سکتے ہیں جو ہمارے اختیار میں ہے اور ہم وہی کچھ پیش کر سکتے ہیں، جو ہمارے احساس کا سرمایہ ہے۔ ہماری تکنیک ہی ہماری جستجو ہے اور یہی جستجو ہمارا مقصد ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے فن کا باقی ماندہ سرمایہ، فن کی ایسی دیوانگی ہے، جس کا اظہار ممکن نہیں۔"

مصوّر سبزواری

غزل

○

آشفتگی پھر آج منا لے گئی مجھے
وہ بوئے رہگذار بُلا لے گئی مجھے

سمجھا تھا یہ کہ میں ترے قدموں کی دھول ہوں
دُنیا سمجھ کے پھول اُٹھا لے گئی مجھے

چارہ گروں کو میری ہوا تک نہ لگ سکی
چپکے سے کوئی شامِ بلا لے گئی مجھے

تجھ کو پکارنا تھا نہ دشتِ طلب میں دوست
دُور اور تجھ سے تیری صدا لے گئی مجھے

اب انجمن میں بیٹھا ہوں گم سُم، کہوں بھی کیا
دُزدیدہ اک اداسی، چُرا لے گئی مجھے

رکھتا بھی کون تشنہ سوالوں کی آبرو
بس میری خامشی ہی بچا لے گئی مجھے

اِس میں کسی طلب کا مصوّر نہ تھا سوال
میخانے ایک لغزشِ پا لے گئی مجھے

○

شاہد جبیں

غزل

○

بھول بیٹھے ہیں ترے شہر میں گھر کو اپنے
ہر در و بام سے ٹکراتے ہیں سر کو اپنے

بھولے راہی کو تو مل جائے گا رستہ لیکن
وہ مسافر جو بھلا بیٹھے سفر کو اپنے!

اُن کو کیا ہوگی خبر رُخ ہے ہواؤں کا کدھر
بند کر لیتے ہیں جو روزن و در کو اپنے

مطمئن یوں تو نہ ہو پاتا کبھی ذوقِ جمال
کچھ بدلنا پڑا اندازِ نظر کو اپنے

کبھی ذرّے بھی ملا لیتے ہیں تاروں سے نظر
ایک ٹھوکر ہی سہی خاک بسر کو اپنے

ہم سلامت ہیں تو اک روز بہار آئے گی
حوصلہ دیتی ہے ہر شاخ شجر کو اپنے

○

انٹرویو:۔ اثر فاروقی

اُردو افسانے کا ارتقا

ڈاکٹر اعجاز حسین سے ایک گفتگو

اثر فاروقی:۔ ڈاکٹر صاحب، میں چاہتا ہوں کہ آج کی اس نشست میں صرف نثر کے متعلق بات ہو۔ شعر و شاعری کے بارے تو ہمیشہ ہی ہوتے رہتے ہیں۔ اور آپ چونکہ نثر کے آدمی ہیں اس لئے یہ بات اور بھی زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین:۔ اثر صاحب، سچ یہ ہے۔ میں بھی شعر و شاعری سے تنگ آ چکا ہوں۔ جب دیکھئے شعر سنئے، شعر پڑھئے داد دیجئے، مجھے، واقعی سبھی لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ میں شعریت ہی کو سمجھتا ہوں۔ الہ آباد میں میں نے Lay Circle کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے، جہاں شعر پر تو بحث و مباحثہ ہو سکتا ہے (یہ شعر سنانا نہیں ہو سکتا۔ یہ کلب تقریباً پچیس سال سے اپنا کام کر رہی ہے۔

اثر فاروقی:۔ ڈاکٹر صاحب، نئے لکھنے والوں کو، میرا خیال ہے کہ بعد کے لکھنے والوں سے ہے، یہ شکایت ہے کہ ہمارے نقادوں میں زیادہ تر بزرگ حضرات شامل ہیں، اپنے ذوق سے کما حقہٗ ہم آہنگ نہیں ہو سکتے ہیں اور ان کی تنقید موجودہ ادبی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی ہے۔ آپ خود بھی بڑی حد تک اس رائے سے متفق ہوں۔

ڈاکٹر اعجاز حسین:۔ اثر صاحب، ہو سکتا ہے کہ کچھ حد تک یہ بات صحیح ہو۔ نقاد کا کام تخلیق کے دو چار برس بعد کا ہے۔ اگر تخلیق فوراً ہی واقعی مسلم طور پر آ رہی ہو، تو ظاہر ہے کہ نقاد کو اپنا فرض سنبھالنا ہوگا۔ مگر آپ اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ کبھی چیزوں پر وہ بیک وقت نظر کر سکے۔

اثر فاروقی:۔ ڈاکٹر صاحب، میرا مطلب تو یہ ہوا کہ نقاد صرف اپنے علم اور اطلاع کی بنیاد پر ہی اکتفا کرتا ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ ساتھ ہی ساتھ تاثر اور کھوج کا کام بھی جاری رہے کیونکہ اس بات کے پورے امکانات ہیں کہ ہر فنکار اپنی ہر تخلیق کی [illegible] نقادوں تک پہنچانے سے قاصر رہے۔ ویسے یہ بات بھی درست معلوم ہوتی ہے کہ فنکار [illegible] تخلیق رہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین:۔ تلاش اور کھوج کا جہاں تک تعلق ہے، نقاد کم پیش اس کام کو انجام دیتا ہے، مگر کچھ بھی چھوڑ جاتا ہے۔ امکانات باقی رہ جاتے ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ اگر نقاد کے سامنے تخلیق کے تو چھ سال یا دس برس کی ذمہ داری کے ساتھ آئے، اپنا فرض ادا کر دیتا ہے۔

اثر فاروقی:۔ ڈاکٹر صاحب، بہرحال ایک بات تو جو میں نے آپ سے پوچھی تھی، وہ رہ گئی۔ بعد کو میں پہلے کہہ چکا ہوں میرا مقصد ہے، اس کی گفتگو افسانہ نگاروں کے مسائل، ان کی فکر اور ان کے رجحانات، سماجی و تنقیدی شعور اور ان کے فن و خیال سے متعلق ہو۔

ڈاکٹر اعجاز حسین:۔ اثر صاحب، ہمارے ادب میں افسانہ ایک نئی صنف ہے اور بہت تیزی اور سرعت کے ساتھ ترقی کی ہے۔ اس کی مثال ہمیں ملتی ہے شعر و شاعری میں، وہ زیادہ تر غزل کا تخیل، قافیہ پیمائی کے چکر میں پڑے رہے۔ قافیہ کا قافیہ ردیف ہو سکتا یا آخری تک وزن پر [illegible] کو نہیں باندھا جا سکتا جس کی وجہ سے مواد کی اہمیت گھٹ کر رہ گئی اور ہمارے فنکار محدود خیالات کی تکرار کرتے رہے۔ مگر یہاں ایک طرز ادا [illegible] کا تعلق ہے، اس صنف نے کم وقت میں بے پناہ ترقی کی۔ پریم چند نے اردو افسانے کی ترقی میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ وہ سے جدا ہے، ان کی وجہ سے اردو افسانہ اس مقام پر پہنچا جہاں اتنے عظمت و وقار کے ساتھ پہنچا گیا۔

اردو افسانے کی بات پریم چند کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

اثر فاروقی: ڈاکٹر صاحب، پریم چند نے یقیناً اردو افسانے کی بنیاد رکھی اور اس پودے کو پروان چڑھانے میں مقدور بھر کوشش بھی کی، لیکن پریم چند کو منزل قرار دے دیا جائے تو اردو افسانے کی ترقی اور بقا کا سوال معرض بحث میں پڑ جاتا ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ پریم چند کے بعد کے آنے والوں نے افسانے کے کام کو پوری لگن، خلوص اور معیار کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین: ٹھیک ہے۔ اگر یہ بات ہے تو قابل اتفاق ہے۔ کسی بھی شخصیت کو ادب میں منزل قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کی وجہ سے ادبی ارتقا کے رک جانے کا خدشہ ہے۔ مگر جو کام پریم چند کا تھا انھوں نے حسن و خوبی انجام دیا اور جس کے بغیر اردو افسانے کے خواب کی تعبیر کی تکمیل کا تصور شاید ادھورا ہی رہ جاتا۔ پریم چند کی کردار نگاری، اُن کا اسلوب، اُن کے موضوعات، افسانے کی ہیئت، مواد اور اختصار وغیرہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو پریم چند کو اردو ادب میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ اور آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ پریم چند کی طرز تحریر کی اُن کے بعد کے لکھنے والوں پر گہری چھاپ ہے۔

اثر فاروقی: ڈاکٹر صاحب، کسی بھی ادب میں یہ بات مسلمہ ہے کہ ہر بڑی شخصیت کے بعد متاثرین کی ایک فوج ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین: میں مانتا ہوں کہ متاثرین کی ایک فوج ہوتی ہے لیکن اُن میں سے کسی کو بھی لیڈر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اثر فاروقی: ڈاکٹر صاحب، پریم چند کے بعد ترقی پسند تحریک کے جنم اور ارتقا اور اس کے ردِ عمل وغیرہ کے متعلق اتنی باتیں ہو چکی ہیں کہ اب مزید اس سلسلے میں کسی قسم کی کوئی بات مناسب نہیں معلوم ہوتی۔

ڈاکٹر اعجاز حسین: مگر اختر صاحب، جب ترقی پسند تحریک کا ذکر نکلا ہے تو میں ایک بات کہنا چاہوں گا۔ ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد، اس کے عوامی رجحانات اور کئی دوسری باتوں کا اعتراف کیا جانا ضروری ہے لیکن ترقی پسند تحریک میں چند لوگ ایسے بھی رہے ہیں جن کا نقطۂ نظر ہمیشہ انتہا پسندانہ رہا ہے۔ میں ترقی پسند تحریک کی چند باتوں کو قابل گرفت سمجھتا ہوں مثلاً منٹو کے متعلق یہ الزام عائد کیا جاتا رہا کہ اُس کے پاس مقصد نہیں ہے اور اُس کی تحریریں اظہارِ لذت پرستی کا نمونہ ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ چار چیزیں پڑھ کر آگئی ہوں، لیکن منٹو کے ساتھ یہ زیادتی ہے کہ اُس پر لذت پرستی کا الزام لگایا جائے۔ کوئی بھی ادب اگر بے مقصد ہو تو واقعی فضول ہے لیکن منٹو کے پاس ایک واضح مقصد اور نصب العین تھا۔ وہ سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورت جو اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہے کے مسائل کو سامنے لاتا ہے۔ بڑی بیباکی اور مہارت کے ساتھ انھیں پیش کرتا ہے۔ اس کے اسباب و علل پر روشنی ڈالتا ہے تو یہ ایک بڑا کام ہے جسے اردو ادب میں منٹو نے منفرد انداز میں کیا۔ جب چین میں عوامی حکومت قائم ہوئی اور آزادی ملی تو اقتدار نے پیکنگ سے طوائف بندگی ختم کرنے کے لئے نہ صرف شہر کی سب طوائفوں کو باعزت طریقہ پر فوجیوں کے ساتھ بیاہ دیا بلکہ اس بات کی ذمہ داری بھی لی کہ اُن فوجیوں کے سماجی موقف میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ ہونے پائے۔ اگر ہمارے یہاں یہ بات نہ ہو سکی اور امیر غریب کو صاحب اقتدار لوگ نہ ختم کر سکے اور ایک فنکار نے اگر اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور برائی کی جڑ پر وار کیا تو واقعی یہ ایک بڑی بات ہے۔ چنانچہ اس زیادتی کو جو سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے برداشت نہیں کیا جا سکتا کہ منٹو کا مقصد تحریر قارئین کو محض لذت پرستی میں مبتلا کر کے گمراہ کرنا تھا۔

اثر فاروقی: ڈاکٹر صاحب، میں ایک بات صاف کرنا چاہتا ہوں کہ نئے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ نہ صرف منٹو کے پاس ایک عظیم مقصد تھا بلکہ جن موضوعات کو انھوں نے اپنایا وہ اردو افسانہ کا گراں قدر سرمایہ ہے اور یہی منٹو کو اس لحاظ سے عظیم فنکار مانتے ہیں۔ چنانچہ منٹو کے ساتھ زیادتی کئے جانے کی غلط فہمی کا اب کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔

ڈاکٹر اعجاز حسین: اختر صاحب، اگر یہ بات ہے تو واقعی قابل قدر ہے۔ منٹو کی شخصیت بلاشبہ اپنے فکر و فن، نظریے، اپنے گہرے احساس اور عزیز کی وجہ سے نہ صرف سب سے الگ ہے بلکہ اُن کی تحریریں اردو افسانے کی زینت ہیں۔

اثر فاروقی: ڈاکٹر صاحب جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں میں زیادہ تر نئے افسانہ نگاروں کے احساسات، جذبات، اور اُن کے ردِ عمل کے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے اگر یہ معلوم کیا جائے کہ آیا آپ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ نئے لکھنے والوں کا سماجی شعور اپنے

پیش رو فنکاروں سے زیادہ واضح اور زیادہ اثر انگیز ہے؟

ڈاکٹر اعجاز حسین:۔ اثر صاحب، بلاشبہ نئے لوگوں کا سماجی شعور بہت زیادہ ہے، ان کے غور و فکر میں بھی بڑی گہرائی اور سچائی معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئے افسانوں میں موادو موضوع کے ذریعہ ہمارے آس پاس کے مسائل کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔ جس طرح آزادی سے پہلے سبھی فنکاروں نے برائیوں کی جڑ یعنی غلامی پر مسلسل وار کئے اور اس کے خاتمے کے لئے مختلف طریقوں سے طرح طرح کے ردِ عمل کا اظہار کیا، اسی طرح آج بھی سماجی ناہمواری و نابرابری کے خاتمے کے لئے ہمارے فنکار اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اثر فاروقی:۔ ڈاکٹر صاحب، کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ نئے لکھنے والے اپنے افسانوں میں رشوت، نظم و نسق کی جانبداریوں، بنیادی حقوق کی حق تلفیوں اور عام زندگی کے ہر اس پہلو کو جوں کا توں پیش کرتے ہیں جس کا تعلق آج کے معاشرے میں سماجی ناانصافی یا عدم مساوات سے ہو۔

ڈاکٹر اعجاز حسین:۔ اثر صاحب، میں عرض کر چکا ہوں کہ میں ان باتوں کا معترف ہوں، یقیناً یہ ساری باتیں آج کے افسانے کا موضوع ہیں لیکن میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح آزادی سے پیشتر سبھی فنکاروں نے مشترکہ طور پر برائی کی جڑ پر کاری ضرب لگائی اسی طرح آج بھی ان تمام خرابیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے مشترکہ کوشش کی ضرورت ہے کیونکہ آج بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔

اثر فاروقی:۔ ڈاکٹر صاحب، کیا آپ ان نئے لوگوں میں چند نام ایسے بتا سکتے ہیں جن کی تخلیقات آپ کی پسندیدگی کا باعث ہوں۔

ڈاکٹر اعجاز حسین:۔ جی ہاں، کیوں نہیں۔ قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، بلقیس مہدی، قدروں نے جہاں بہت سی باتیں دی ہیں وہیں ہمیں اچھی خاتون فنکاروں کو بھی دیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ عورت کو اس کا حق نہیں دیا جاتا تھا، میں ہندستانی سماج کی بات نہیں کرتا، یہ بات دنیا میں ہر جگہ ہوتی تھی کہ عورت کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام کرنے نہیں دیا جاتا تھا۔ رضیہ سلطانہ نے نظم و نسق کو چلانے کی بے پناہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا، لیکن ہم لوگ اُسے برداشت نہ کر سکے اور طرح طرح کی بہتان تراشی کے بعد اُسے قتل کر ڈالا۔ آج یہ بات مؤرخین کی تحقیق کے بعد صاف ہو چکی ہے کہ رضیہ سلطانہ کا کسی غلام سے کوئی تعلق نہیں تھا، جب کہ اس پر الزام لگایا گیا تھا۔ عورت کو اپنی صلاحیت کو بروئے کار لانے کی پوری اجازت ہونی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ وہ تلوار تو نہیں چلا سکتی لیکن قلم چلا سکتی ہے۔

اثر فاروقی:۔ ڈاکٹر صاحب، ہو سکتا ہے متقدمین نے محسوس کیا ہو کہ جو خوبی خراب عورت قلم چلا کر کر سکتی ہے وہ تلوار سے بھی نہیں ہو سکتا۔ اسلئے بھی اُسے قلم چلانے کی اجازت نہ دی گئی ہو، مگر ڈاکٹر صاحب یہاں بڑا اہم اور بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا تخلیقی صلاحیتوں کو روکا جا سکتا ہے اور کیا تخلیقی قوت کے اظہار و فروغ پر پابندی لگائی جا سکتی ہے خواہ وہ فنکار عورت ہی کیوں نہ ہو۔

ڈاکٹر اعجاز حسین:۔ اثر صاحب، ہاں کبھی کبھی ایسا ہوا ہے۔

اثر فاروقی:۔ ڈاکٹر صاحب، بات خاتون افسانہ نگاروں سے نکل کر دور تک پہنچ گئی اور چونکہ آپ نے صرف خاتون افسانہ نگاروں کے نام گنائے ہیں اسلئے مردوں کی ناراضگی کا احتمال ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین:۔ اثر صاحب، اب میں عمر کے اس مقام پر ہوں جہاں، مجھے عورتوں میں دلچسپی ہے نہ مردوں میں، میرا مطلب اس طرح کے بھی لکھنے والوں سے ہے۔ نام محض علامت ہیں۔

اثر فاروقی:۔ ڈاکٹر صاحب، ایک بات اور ہے، کیا یہ کسی بھی فنکار کے لئے معیوب نہیں کہ جب وہ اپنی تحریروں کی وجہ سے عروج پا چکا ہو اور اس بلند مقام پر پہنچنے کے بعد اس کی تحریریں اس کے اپنے انحطاط کی وجہ بن جائیں۔ میرا مطلب کرشن چندر کی تازہ فنکارشات سے ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین:۔ اثر صاحب، جی ہاں، یہ بڑی کمزوری ہے۔ دراصل ہر فنکار کے پاس جتنا کچھ ہوتا ہے اس کے اظہار کے بعد وہ اپنے کو دُہرانے لگتا ہے اور ہر فنکار محض اسلئے لکھتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ ناول اُسے لکھنا ہے۔ یہ رویہ اس کے اپنے انحطاط کا باعث ہے۔

اثر فاروقی:۔ ڈاکٹر صاحب، گلشن کے افق تم پر اس کا اعادہ نامناسب نہ ہوگا کہ آج کے نوجوان فنکار اپنی تخلیقی قوتوں، گہرے مشاہدوں، لیتی سماجی شعور، اچھے تنقیدی رجحان کی بدولت قارئین کے علاوہ نقادوں کو بھی متاثر کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز حسین:۔ اثر صاحب، یہ بات سچ ہے۔ خود تنقیدی احساس ہر فنکار کے لئے ضروری ہے۔ وہ آپ اپنا جتنا سخت ناقد ہوگا اتنی ہی اس کی تخلیقات

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر دیکھئے)

ذکاء الدین شایاں

"ارتقاء"

○

جنوں کے ناخن سے
زندگی کے سیاہ زخموں کو اور کھرچو
لہو نچوڑو
گلوں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے
زندگی کا ——
کمند پھینکو فلک پہ
ماہ و نجوم و یزدان و اہرمن کو اسیر کر لو
نذیری فطرت کی گھاٹیوں میں
نئے اجالوں کا رنگ بھر دو!

مگر کبھی، صرف ایک لمحہ کو
یہ بھی سوچو
کہ ان اجالوں کی تیز کرنوں میں
روشنی کی بلندیوں میں
یہ قلبِ انساں اداس کیوں ہے
سیاہ کیوں ہے!

○

وقار صدیقی

"تاشقند کے پھول"

○

یہ حسنِ امن کے، یہ عشقِ سربلند کے پھول
دیارِ ہند میں یہ ارضِ تاشقند کے پھول
قبول کرتی ہے مریم کی جانفزا لَے
قبول کرتے ہیں مندر کے دیوتا ان
سلام کہتے ہیں مسجد کے رہنما ان
دلوں کے پھول، محبت کے پھول، پیار کے پھول
کھلے یہ پھول تو پھر برق کا چلن نہ رہا
وفا کی راہ میں اب کوئی راہزن نہ رہا
جنوں کی خیر، کوئی آج بت شکن نہ رہا
یہ پھول وقت کے باغ و بہار ہیں
نظر کا چین، دلوں کا قرار ہیں

○

میخائیل شلوخوف

روسی کہانی

مترجمہ۔ صبا اکرام

لازوال تبسم

ٹروفم اپنے کمرے سے نکلا اور دروازہ بند کرتا ہوا اصطبل کی طرف بڑھ گیا۔ اصطبل میں داخل ہوتے ہی اُس کی نظر نوزائیدہ گھوڑی کے بچے پر پڑی جو گھوڑی کی چھاتی سے منہ لگائے تھنڈ میں کھڑا ٹھمک رہا تھا۔ ٹروفم بچھیڑے کو دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر تمباکو کا پائپ نکالا اور ایک سگریٹ بنا کر ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولا۔

"اوہ، تو تم نے بچھیڑے کو جنم دے ہی دیا؟" اُس کی آواز میں کرب چھپا تھا۔

گھوڑی بچے کی تھیلی میں اپنے نتھنوں کو ڈالے منہ چلانے میں مگن تھی۔ اور ٹروفم دروازے سے لگ کر کھڑا بچھیڑے کو دیکھے جا رہا تھا۔

"میں اس بچھیڑے کا کروں گا کیا؟"

بچھیڑا اپنے دُبلے پتلے مخملی پیروں کے سہارے کھڑا کوئی کھلونا معلوم ہو رہا تھا۔ ٹروفم اپنی اُنگلی سے بچھیڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"کیا میں اسے گولی مار دوں؟"

گھوڑی نے یکبارگی منہ گھما کر سُرخ سُرخ آنکھوں سے اپنے مالک کو گھورا.....

کمانڈر اپنے ہاتھ میں چائے کا پیالہ لئے بیٹھا تھا۔ اُس نے پیالے کو اس طرح تھام رکھا تھا جیسے دشمن پر حملہ کرنے سے قبل وہ اپنی رائفل کے کندے کو تھامے ہو۔

"اس بچھیڑے کو گولی مار دینا ہی بہتر ہے۔ ورنہ اسے ساتھ ساتھ پھرنے سے لوگ ہمیں فارغ بدوش سمجھیں گے۔" ٹروفم نے کہا۔

"یہی تو میں بھی کب سے کہہ رہا ہوں — فارغ بدوش نظر آنا تو اور بات ہے لیکن اگر سی۔او۔آگیا تو اور بھی زیادہ شرمندگی اُٹھانی پڑے گی۔ تمہیں سوچ اگر وہ ریکمنٹ کا معائنہ کرنے آیا اور پریڈ کے دوران بچھیڑے نے کہیں اُچھل کُود شروع کر دی تو ساری سُرخ فوج میں ہماری ہنسی اُڑ جائے گی۔"

دوسری صبح جب ٹروفم اپنے کمرے سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر کمانڈر نے پوچھا۔

"کیا بچھیڑے کو گولی مارنے جا رہے ہو؟"

ٹروفم نے جواب میں صرف "ہاں" کہا اور اصطبل کی طرف بڑھ گیا۔

کمانڈر سر جھکائے بیٹھا فائر کی آواز کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک منٹ ..... دو منٹ..... کئی منٹ گزر گئے لیکن فائر کی آواز سنائی نہ دی۔

کچھ دیر بعد ٹروفم آتا ہوا دکھائی دیا۔

"کیا ہوا؟"

"شاید میری رائفل خراب ہو گئی ہے۔"

"دیکھوں، کیا خرابی ہے؟"

ٹروفم نے بے دلی سے رائفل کمانڈر کی طرف بڑھا دی اور کمانڈر اُسے کھول کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس میں تو کارتوس ہی نہیں ہے!"

"نانکن!"

"میں سچ کہہ رہا ہوں اس میں ایک بھی کارتوس نہیں ہے۔"

"ہا... ہا... بات یہ ہے کہ میں نے غور ہی کارتوس نکال کر اصطبل میں پھینک دیا۔"

"خیر، اسے فی الحال زندہ ہی رہنے دو۔ کچھ دنوں بعد دیکھا جائے گا۔" رائفل کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

ایک ماہ گزر گیا اور اس درمیان ٹرونم کی یونٹ اور کوسیکا فوج لڑائی چھڑ گئی۔ جنگ شام ڈھلے شروع ہوئی۔

اپنے پلاٹون میں ٹرونم سب سے پیچھے تھا۔ اس نے چابک مار کر گھوڑی کے منہ سے خون نکال دیا۔ لیکن گھوڑی نے رفتار تیز نہ کی۔ اکثر وہ چلتے چلتے رُک جاتی اور جب اُس کا بچھیرا اُس کے قریب پہنچ جاتا تو آگے بڑھتی۔

مارے غصّے کے ٹرونم نے گھوڑی کی پُشت سے چھلانگ لگا دی اور اپنی رائفل کاندھے سے اُتار کر ہاتھوں میں تھام لی۔

دائیاں فوج دستہ سفید پہاڑوں سے بھڑ گیا اور ڈھلوان پر دونوں فوجیں ایک دُوسرے کو پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش کرنے لگیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آندی میں گھر کر کے پیچھے جھول رہے ہیں۔ لڑائی چلتی رہی اور ڈھلوان میں گھونسوں کی ہنہناہٹ گونجتی رہی۔

ٹرونم نے لڑتے ہوئے فوجیوں کو ایک نظر دیکھا اور پھر اپنی رائفل سیدھی کر کے بچھیرے پر گولی چلا دی۔ لیکن پتہ نہیں گھبراہٹ کی وجہ سے اُس کے ہاتھ کانپ گئے یا کوئی اور وجہ تھی کہ نشانہ چُوک گیا۔ اور بچھیرا ہنہناتا ہوا چوکڑی بھر کر دُور جا کھڑا ہوا۔

وہ رات ٹرونم کی یونٹ نے لق و دق صحرا میں گزاری اور احتیاطاً تمام رات فوجیوں نے سگریٹ پینے سے گریز کیا۔ گھوڑوں کی زینیں بھی نہیں کھولی گئیں۔ آدھی رات کے وقت ایک گشتی دستے نے واپس آ کر اطلاع دی کہ انھیں جنوبی سمت میں دشمن کی فوج جمع ہو رہی ہے۔

طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر قبل کمانڈر ٹرونم کے پاس آیا اور کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہنے کے بعد بولا۔

"سنو ٹرونم، تم اس بچھیرے کو جلدی ٹھکانے لگا دو۔ اکثر وہ جنگ کے دوران فوجیوں کو ڈسٹرب (ہراساں) کرتا ہے۔"

"میں نے کوشش تو کئی بار کی کہ اسے مار ڈالوں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، اسے دیکھتے ہی ہاتھ کانپنے لگتے ہیں اور نشانہ چُوک جاتا ہے۔ وہ مجھے اتنا پیارا لگتا ہے کہ مارنے کو جی نہیں چاہتا۔ اکثر میں یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ کہیں وہ حملے کے وقت فوج کے درمیان آ کر نہ گھس جائے۔"

کمانڈر اُس کی باتیں سُن کر مُسکرانے لگا۔ لیکن ٹرونم اُس کی مُسکراہٹ کو دیکھ نہیں سکا۔ کچھ دیر تک وہ اوور کوٹ میں سر چھپائے بیٹھا رہا اور پھر بیٹھا بیٹھا سو گیا۔

دوسرے دن دوپہر کے وقت فوج نے ندی پار کرنا شروع کی۔ کمانڈر نے سب سے پہلے ندی میں چھلانگ لگائی اور اس کے بعد ایک ایک کر کے جوان اور اتنے ہی گھوڑے پانی میں کُودنے پڑے۔ گھوڑوں کی زینیں کھول کر تین چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر لاد دی گئی تھیں۔ اور انھیں کشتیوں میں سے ایک پر ٹرونم سوار تھا۔ اُس نے اپنی گھوڑی کمانڈر کے حوالے کر دی تھی۔

ٹرونم نے چپو ایک طرف رکھ دیا اور ندی میں تیرتے ہوئے جوانوں اور گھوڑوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اُن کا پُورا جسم پانی میں تھا اور سر سطح پر۔ اُس کی گھوڑی کا بچہ بھی اُسے کچھ ہی دُور پر نظر آیا۔ وہ تیرتے تیرتے کبھی اپنا مُنہ پانی کے باہر نکال دیتا اور کبھی پانی میں گُم ہو جاتا۔ شاید وہ تھک چکا تھا۔ ٹرونم کے کانوں میں یک بیک اُس کی دردناک آواز گونجی۔ "ہی۔ ای۔ ای۔"

بچھیرے کی یہ کرب میں ڈوبی ہوئی آواز ٹرونم کے دل میں کسی خنجر کی طرح پیوست ہو گئی۔ پانچ سال کی مسلسل جنگی زندگی میں اُس کا دل کبھی اس طرح نہیں کانپا تھا۔ لیکن آج ایک ڈوبتے ہوئے بچھیرے کی دردناک آواز سُن کر اُس کا چہرہ راکھ کی طرح سفید ہو گیا۔

ندی کے تیز دھارے بچھیرے کو بہا کر کافی دُور لے گئے تھے اور اب وہ بھنور میں گھر کر چکر لگا رہا تھا۔ ٹرونم نے کشتی بھنور کی جانب موڑ دی۔

دُشمن کی مشین گن ندی کے سینے پر گولیاں برسا رہی تھی۔ پچھمی قبیس میں بلبوس ایک فوجی چلا چلا کر کچھ کہہ رہا تھا اور اُس کی رائفل شعلے اُگل رہی تھی۔

بچھیرے کی آواز آہستہ آہستہ سست ہوتی جا رہی تھی۔ ٹرونم نے اپنے جُوتے اُتار کر کشتی میں کُود گیا اور پانی میں کُود گیا۔ پچھمی قبیس والے افسر نے اُسے تیرتے ہی دائیں طرف ساحل سے چیخ کر کہا۔ "ہولڈ فائر۔"

ٹرونم کو بچھیرے تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگ گئے۔ اُس نے بچھیرے کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور دائیں جانب ساحل تک لے آیا۔ بچھیرا ٹھنڈے تھرتھر کانپ رہا تھا اور اُس کے مُنہ سے سبز رنگ کا پانی بہہ رہا تھا۔

ٹرونم اپنے کانپتے ہوئے پیروں پر کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر وہ قدم آگے بڑھا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔ اُسے ایسا لگا کہ سینے میں کسی نے گرم خنجر پیوست کر دیا ہے۔ اُس نے فائر کی آواز سُنی تھی۔

دائیں طرف ساحل پر پچھمی قبیس والے افسر نے اپنی رائفل سے خالی کارتوس نکال کر پھینک دیا۔

بچھیرے کے نزدیک ہی ٹرونم نے حس و حرکت پڑا تھا۔ اُس کا جسم اینٹھ چکا تھا۔ لیکن اُس کے نیلے ہونٹ جھول نے پانچ سال سے کسی بچے کا بوسہ نہیں لیا تھا، مُسکرا رہے تھے۔

نقی علی خاں ثاقب

جُدائی کے بعد

وفا کی پیار کی حُسنِ سخن کی آنچ آئی
گلی کلی سے تمہارے بدن کی آنچ آئی

میں سوچتا ہوں شبِ تار کی فصیلوں میں
تمہارے شہر میں سورج اُبھر گیا ہوگا
تمہاری خلوتِ معصوم کی فضاؤں میں
تمہارے حُسن کا سونا بکھر گیا ہوگا

غموں کے پاس کچھ اِس طرح سے رُکی ہے صبا
کہ جیسے نامۂ اُمّید لے کے آئی ہے
ہوا اُداس اندھیروں کا زہر ہے لیکن
نظر سے دُور کرن کوئی جگمگائی ہے

شبِ فراق کو خوابوں کے ہار پہنا کر
قدم قدم پہ نئے گیت بُن لئے میں نے
ہر ایک لفظ کو اپنے لہو سے چمکا کر
خیالِ دلبر کے مہتاب چُن لئے میں نے

تمام عمر ہی آرزو کی وادی میں
تمہارے نقشِ قدم کی طرح بھٹکتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کا چمن مہکتا ہے
تصوّرات کے چہرے ابھی دمکتے ہیں

فسونِ عہدِ ستم ٹوٹ جائے گا اک دن
امانتِ خلشِ انتظار رہنے دو
شبِ الم کو شبِ وصل سے بدلنا ہے
جوانیوں کو یونہی بے قرار رہنے دو

شفق تنویر (بھوپال)

ہرجائی

تیرے چہرے کے ساتھ ساتھ مجھے
چاند بھی تو عزیز ہے اے دوست
سینۂ شب پہ جو لہکتا انداز
صبح کی کھوج میں نکلتا ہے
ایک قندیل بن کے جلتا ہے
تیری زُلفوں کے ساتھ ساتھ مجھے
ان گھٹاؤں سے بھی محبت ہے
جن کی رفتار زندگی کا پیام
جن کی آواز زندگی کا رباب
لے کے پانی سمندروں سے جو
خشک دھرتی کو کرتی ہیں سیراب
تیری باہوں کے ساتھ ساتھ مجھے
دستِ مزدور سے بھی اُلفت ہے
تیشۂ عزم سے جو کھودے ہے
موت کی وادیوں میں جوئے حیات
درد و غم کے اُداس سائے سے
تاکہ مِل جائے آدمی کو نجات
چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ مجھے
کارخانوں کا شور بھی ہے عزیز
آج میری نہیں کروروں کی
جس سے وابستہ زندگانی ہے
اِس گرجتے ہوئے زمانے میں
ارتقا کی جو اک نشانی ہے
خوشبوئے پیرہن کے ساتھ مجھے
سوندھی سوندھی یہ بوئے گِل بھی عزیز
کہ جو برسات کے ترنّم سے
تن میں ہمّت سے پھوٹ پڑتی ہے
درحقیقت جو اک علامت ہے
کھیتیوں پر بہار آنے کی
میری محبوب میں ہوں ہرجائی
ہر حقیقت کا دل سے شیدائی

شائع کردہ

پورا پتہ
لکھنے سے
خط جلدی
پہونچتا ہے

ادھورا پتہ
لکھنے سے
خط دیر سے
پہونچتا ہے

بھارتی ڈاک و تار

لطیف مزاح :-

آغا رشید مرزا دہلوی

چاند کی کہانی

"آؤ میں تمہیں سناؤں چاند کی کہانی ــــ"

اور ہم اُس کے چاروں طرف بیٹھ گئے ــ

چاندنی کی لہر ہر ہلکی تموج کے پیلے ملگجے سے دوپٹے کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس روشنی میں اُس کا چہرہ ایک پراسرار داستان گو کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ چند لمحے سکوت کے بعد اُس نے کہنا شروع کیا۔

ــــ داستان گو، افسانہ نگار، اور شاعر یہ نام ہے کہ وہ زمین پر رہ کر آسمان کی بات کرتا ہے۔ حقیقت سے گریز کرتا ہے اور تخیل کے سہارے اپنے لیکچروں کے خوبصورت جال بُنتا ہے اُس میں خود پھنستا ہے اور دوسروں کو پھنساتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر حقیقت کسی نہ کسی خواب کا نتیجہ ہے۔ ہر آدمی پہلے خواب ہی دیکھتا ہے۔ بچے خواب، جھوٹے خواب اور ادھورے خواب۔ ہر خواب ایک حقیقت ہے اور ہر حقیقت ایک خواب۔ بالکل زندگی کی طرح جو ابھی نظر آتی ہے اور ابھی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

اتنے کہنے کے بعد وہ ایک لمحہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر اُس کی خواب آلود آنکھیں خلا میں گھورتی رہیں اور پھر اُس نے کہانی اس طرح شروع کی جیسے ابھی کسی خواب سے بیدار ہو گیا ہو ــــ

ــــ یہ اُس چاند کی کہانی ہے۔ جہاں تک پہنچنے کے لئے سائنس سر پٹک رہا ہے۔ میں سائنس داں نہیں ہوں لیکن چاند تک پہنچنے کیلئے میں ہر خطرہ مول لینے، یہاں تک کہ مرنے کو بھی تیار تھا۔ میرا خیال تھا کہ زندہ رہ کر زندہ درگور ہونے کے بجائے مرنے کے بعد زندۂ جاوید ہونا بہتر ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے چاند اور اُس کی دنیا سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن کیا کرتا کہ اس دنیا میں رہتا بھی تو مشکل ہو رہا تھا۔ دراصل جنگ کی تباہی اتنی نہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں لباس کی طرح ہر چیز تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ دل، ظرف، نظر، تنگ، اور شاید اسی لئے عرصۂ حیات بھی تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اب اگر تنگ آمد بجنگ آمد کے مقولہ پر عمل کرتا تو بھلا کس کس سے زور آزمائی کرتا۔ اس زمانے میں تو کم ظرفی بلند بالا اور ظرفیوں کا گلہ گھونٹ رہا ہے۔ آخر مرتا کیا نہ کرتا۔ یہی سوچا کہ چاند کی دنیا میں جاؤں اور اپنی دنیا سے الگ بسا دوں۔ شاید وہاں سکون اور چین پاؤں۔

سنا تھا کہ لوگ جہازی اور خلائی بن کر ولایت پہنچ جاتے ہیں اور صبح شام کی نکسیر سے گلو خلاصی پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس سرزمین کو چھوتے ہی رنگ کچھ ایسی ولایت مل جاتی ہے اور کرامت حاصل ہو جاتی ہے کہ یہاں جانے میں کھل جا سم سم کی طرح قسمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ سوچا کہ میں بھی کسی نہ کسی طرح اُس سرزمین پر پہنچ کر کسی صورت راکٹ میں پہنچ جاؤں۔ اور جب راکٹ چاند کے گرد چکر لگائے تو اللہ کا نام لے کر کود پڑوں۔ اگر چاند میں جا گرا تو لوٹ کر دوبارہ ورنہ اس دھماکے سے چھٹکارا تو بہرحال مل ہی جائے گا۔

خوش اتفاقی اخبار میں اشتہار نظر پڑا۔ کسی تاجر کو بمبئی تک سائقہ لے جانے کیلئے ایک پرانی ہیوک سکریٹری کی ضرورت تھی۔ یوں تو میں کسی اشتہاری ملازمت کا قائل نہیں، کیونکہ یہ آسامیاں عموماً اشتہار سے پہلے ہی پُر ہو جاتی ہیں یا پھر کسی لانبے چوڑے سکریٹری کے لئے مخصوص

ہوتی ہیں۔ بہرحال مجھے تو کچھ کرنا ہی تھا۔ وہ اشتہار تصویر یار کی طرح سامنے رکھے سوچتا رہا۔ اور پھر فکر میں غوطے کھاتا رہا۔ جب تہ میں پہنچا تو دیکھا کہ بڑے بڑے عالم متفکر، فلسفہ، علم و فضل جھاڑنے کے بجائے جوتیاں گانٹھنے میں مصروف ہیں۔ اس کے بعد کچھ فکرمند نظر آئے۔ جن میں زیادہ تعداد اسکالر، ٹیچر، پروفیسر اور رائٹر قسم کے لوگوں کی تھی جو دن کو فارسی و سنسکرت تدریس کرتے اور رات کو بارٹر ٹائم تیل بیچ رہے تھے۔ اس کے بعد ایک بڑی ٹولی بے فکروں کی نظر آئی جس میں زیادہ تعداد اسمگلروں، چوروں، لٹیروں، چور بازاری کے استادوں جلسازوں اور اٹھائی گیروں کی تھی جو جہالت، بے فکری کی زندگی گزار رہے تھے۔ اُن میں سے ایک استاد نے ازراہِ ہمدردی ملازمت حاصل کرنے کا گُر بتایا اور کہا۔ اگر ملازمت کرنا ہے تو ایسی سفارش تلاش کرو جس سے ملازمت دینے والے کی گوں دبتی ہو یا گوں پڑتی ہو۔ کیونکہ آج کل کی دنیا، دوستی، محبت، اور ہمدردی کو اینڈ ٹیک (GIVE AND TAKE) کے اصول پر چل رہی ہے۔

افسوس ہے کہ مجھے ایسی تیر بہدف سفارش تو نہ مل سکی لیکن ایک بہر ملاقات قسم کا تعارف دستیاب ہو گیا۔ کسی زمانے میں یہ صاحب شہر کچلی کے مالک تاجر صاحب کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ اگرچہ اب مرحوم ہو چکے تھے لیکن جب زندہ تھے یعنی صاحبِ اقتدار تھے جوب ریوڑیاں بانٹتے پھرتے تھے اب خود ریوڑی کے پیر میں آ گئے تھے لیکن اس ہیر پھیر میں ریوڑیوں کے ڈھیر لگا لئے تھے۔ کیونکہ ڈھیری زندگی جو سامنے پڑی تھی۔ بہرصورت بڑی اُمید لے کر میں تاجر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سفارش کی بدولت وہ بڑے تپاک سے ملے۔ دولت فائدہ دیانت کیا تو میں نے کہا۔ دولت ہے زیادہ ہے۔ آوارہ و ناکارہ ہوں۔ اگر آپ کی نظرِ عنایت ہو جائے تو بیڑا پار ہو جائے۔ اس کے بعد میں نے اپنی ایمانداری کی تمام داستانیں سنا ڈالیں۔ وہ سب کچھ خاموشی سے سنتے رہے۔ اس کے بعد ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ خدا سب کے ایمان کو محفوظ رکھے۔ میں بھی اپنا ایمان سیف میں محفوظ رکھتا ہوں۔ خاص خاص موقع پر بقدرِ ضرورت استعمال کرتا ہوں۔ قیمتی چیز ہے اس لئے سنبھال کر رکھتا ہوں۔ اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے بغیر ایمان کے کام نکالتا ہوں۔ ملازم بھی ایسے ہی رکھتا ہوں۔ لیکن آپ سے یہ کیس سنجرے نے کہا کہ مجھے ایماندار آدمی کی ضرورت ہے۔ دراصل مجھے ایک ڈکشنری ایمان کی ضرورت ہے۔ جو ہوش و خرد پر بجلیاں گرا سکے جس طرح کہانی لکھتے وقت آپ کو زینتِ داستان کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح کاروبار میں ہم کو بھی زیبِ دکاں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ کام آپ کے بس کا نہیں۔

اس کے بعد انھوں نے بجلی کی گھنٹی دبائی۔ دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا کہ باہر انتظار لیو کے لئے بہت سی بجلیاں چمک رہی ہیں۔ بہت بے آبرو ہو کر وہاں سے نکلا نہیں بلکہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اور الٹی سڑک پر آ کر دم لیا۔ اور پایا تھا کہ ایک فرشتہ صورت شریف آدمی سے ٹکر ہو گئی۔ ان کی صورت دیکھ کر معاً مجھے فرشتوں کا خیال آیا اور میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس معاملے میں فرشتوں سے مدد لوں کہ وہ مجھے اپنے بال و پر مستعار دیدیں۔ یا مجھے اڑا کر براہِ راست چاند میں پہنچا دیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے پہلے نیکی کے فرشتوں کی جستجو کی۔ لیکن معلوم ہوا کہ موجودہ دور میں کہیں ان کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لئے اللہ میاں نے ان کو واپس بلا لیا ہے۔ البتہ ایک آدھ کہیں کوئی باقی ہو گا تو وہ اللہ میاں کے کسی بندے کے کام کاج میں پھنسا ہو گا۔ اب مجھے تو کسی طرح کام نکالنا ہی تھا مجبوراً بدی کے فرشتوں کی جستجو شروع کی۔ لیکن معلوم ہوا کہ اس زمانے میں ان کی اتنی مانگ ہے اور وہ اپنے کام میں اتنے مصروف ہیں کہ بات کرنے کی بھی فرصت نہیں۔ اب مجبوراً ایک ہی راستہ بچا تھا کہ اللہ میاں کے فرشتوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ اُن میں سے حضرتِ عزرائیل سے کہا تو خطرے سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ وہ اگر ایک مرتبہ لے بھی جاتے تو پھر اس دنیا میں واپس آنے کا نام ہی نہ لیتے۔ اس لئے پھر حضرت اسرافیل کی خدمت میں عرض کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن وہ پہلے ہی سے بھرے بیٹھے تھے۔ کیونکہ حضرت ان نے صور پھونکنے سے پہلے ہی یعنی قیامت سے قبل قیامت اٹھا رکھی تھی۔ آخر کار حضرت میکائل کی طرف رخ کیا تو دیکھا کہ وہ بھی کچھ جھنجھلائے ہوئے سے ہیں۔ انسان نظامِ کائنات میں مسلسل ٹانگ اڑائے جا رہا ہے اور اُن کے حسابِ کتاب کو درہم برہم کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ گرمی میں سردی، اور سردی میں گرمی برسات میں خشک سالی یا پھر مَل مَل طغیانی۔

اب باقی رہے حضرت جبرئیل، تو ازراہِ ادب ان سے کچھ عرض کرنے کی ہمت نہ تھی۔ دوسرے اب میں اتنا تنگ آ گیا تھا کہ اس سلسلے میں مزید جانفشانی کی ہمت بھی نہ تھی۔ بقول غالب

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

مراٹھی انشائیہ :-

ترجمہ - نُور پرکار

از - نا - سی - پھڑکے

چھتری

میں اپنی گیلری میں کھڑا اُس ننھے بچے کو دیکھ رہا تھا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ پھر بھی وہ اپنی چھتری کو بندوق کی طرح اپنے کاندھے پر رکھے بھیگتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ بہت ہی آہستہ ہنستے ہوئے۔ مدھم سروں کو لبوں میں دباتے ہوئے۔ بہت سارے نوجوان اور بوڑھے یہ تیز تر قدموں سے اپنے گھروں کو واپس ہو رہے تھے۔ چونکہ بارش کا زور تھا۔ مگر یہ ننھا بالک ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے جیسے برسات کی بوندوں سے کہہ رہا ہو۔ بس اتنا ہی برسنا جانتی ہے۔! اِدھر جو، خوب برسو اور اتنا برسو کہ میں سرتاپا بھیگ جاؤں مگر میری چھتری صحیح و سالم اسی حالت میں میرے کاندھوں پر پڑی رہے۔ چھتری کی ضرورت تو ہے، مگر اُس کا استعمال ضروری نہیں ــــ

ذرا اپنی گزرفتہ کو آواز دیجئے۔ کیا اُس بچے کی طرح آپ بھی اپنے بچپنے میں بھیگنے نہیں گئے تھے اور جب کسی شخص نے آواز دیتے ہوئے کہا تھا "بچے چھتری کھول لو۔" تو آپ نے یہ کہہ کر نہیں ٹالا تھا کہ "چھتری کا گھوڑا ٹوٹ گیا ہے۔" اتنا ہی نہیں، اس جھوٹ کا گناہ آپ کے سر نہ تھوپا جائے۔ اسی لئے آپ نے پتھر سے اُس کا گھوڑا توڑ دیا تھا۔ اور اگر آپ نے یہ نہیں کیا تو میں یہ کہوں گا کہ آپ جھوٹے نہیں تھے۔ آپ پر بچپنا سرے سے آیا ہی نہیں۔ آپ ایک دم بڑے ہو گئے۔ جوان ہو گئے۔ بچپنے میں دھوپ، بارش اور چھتری کا کیا واسطہ؟ چھتری کی ضرورت تو ہوتی ہے۔ مگر بارش اور دھوپ سے بچنے کے لئے نہیں۔ اس کا استعمال ہمارے دل کے سہلاوے کے لئے کیا جاتا ہے۔

اگر اپنے پاس چھتری ہے تو کرکٹ بخوبی کھیلی جا سکتی ہے۔ لکڑی کے بنائے ہوئے بیٹ کے بجائے اس چھتری سے گیند کو اچھالنے میں جو لطف حاصل ہوتا ہے۔ پڑوس کے دادا نے گیند اچھالی اور آپ نے چھتری کو بیٹ کا روپ دے کر اس زور سے مارا کہ چوکا لگ گیا۔ اس چوکے میں جو لطف ہے وہ دانی میں فرسٹ کلاس بیٹ سے "ہیرے ہوٹن اسٹیڈیم" میں کھیلنے پر حاصل نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی بدتمیز نے آپ کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو چھتری کا نصف اس کی ٹانگوں میں پھنسا دیا۔ بس وہ لمحہ بھر میں زمین پر ہوگا۔ اکھاڑے کے بھی داؤ اس چھتری کے آگے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ اس چھوٹے سے بچے نے جب چیمبرلین کی اس تصویر کو دیکھا، جس میں وہ چھتری کو اپنے ہاتھوں میں تھامے برمن مار رہا تھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ سٹیلر کو چھتری کے زور سے اپنے قابو میں کرنے جا رہا ہے۔ اس سے اسے ایک گونہ سکون حاصل ہوا۔

گرمی کی تعطیلوں میں آموں کے باغات سے آم چرانے کیلئے چھتری کارگر ثابت ہوتی ہے۔ اس کا اگلا حصہ ڈالی میں پھنسایا جائے اور پھل توڑ لیا جائے۔ رکھوالے کی نظروں اور ہاتھوں سے بچاؤ کے لئے ایک چھتری اور دو پاؤں کافی ہیں۔ جس کے پاس ایک چھتری ہو اور اس کے پاؤں دوڑنے میں ماہر ہوں۔ سمجھو کہ باغوں کے سبھی آم کے درخت اُس کے ہیں۔ شاید اسی لئے چھوٹے بچوں کو چھتری زیادہ پسند ہے۔

اور بڑے بھی اس کا استعمال ہمیشہ کی طرح ہی کرتے ہیں، ایسا دعوے سے نہیں کہا جا سکتا۔ شاید آپ حامی بھر لیں۔ البتہ میں اس ضمن میں ذرا سی مختلف ہی مناسب سمجھتا ہوں۔ کیا آپ نے کبھی سامنے سے آنے والی جان پہچان صورت کو ٹالنے کیلئے چھتری کا استعمال نہیں کیا؟ پوچھ لیجئے عورتوں سے۔ کیا وہ دھوپ اور بارش سے زیادہ نظروں سے بچنے کے لئے چھتری کا استعمال نہیں کرتیں؟ پاس پڑوس کی چیزوں کی پرکھ کے لئے چھتری ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ ابھی خاصی نئی ہے۔ جس کے پیچھے بڑی آسانی سے شکار کھیلا جا سکتا ہے۔ بھلا شبہ مجھے کالا جیشہ استعمال کرنے والوں پر بھی تھا۔ البتہ

جب میرے پڑوسی بابو رائے نے ڈاکٹر کی صلاح اور رائے کے باوجود بھی کالی عینکیں آنکھوں پر چڑھالیں تب میرے شک نے یقین کی جگہ لے لی۔ آدمی ان کالی عینکوں کے پیچھے سے ہر چیز بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ سینما گھر کی سب سے اونچی جگہ B ox کہلاتی ہے۔ جہاں سے ہم ہر چہرہ دیکھ سکتے ہیں مگر ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ مراٹھی کے مترجم نے B ox کو چشمہ کا نام دیا ہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم باکس کو کون سا نام دو گے تو میں صاف صاف کہہ دوں گا ــــــ "چھتری!"

اس چھتری سے ایک پُرسکون جگہ کا تخیل دیا جا سکتا ہے۔ البتہ وہ اپنے سماج میں نہیں، پائی۔ باقی۔ چونکہ کبھی اس پُرسکون جگہ کو عام کرنے کی رائے سے متفق نہیں ہوں گے۔ اگر آپ چوپاٹی کی سیر پر چھتری کے نیچے کچھ دیر کے لئے بیٹھ جائیں تو کوئی نہ کوئی چھتری کو پرے ہٹا کر آپ کی طرف دیکھتا ہوا جائے گا اور کچھ دیر دیکھنے اور پرکھنے کے بعد جانا کچھ کہہ اٹھے گا۔ اگر اس نے خاموشی مناسب نہ سمجھی تو ندا ہی بھر جاتا ہے اس کے ارادے جو ٹھے کلمات کیا ہو لائے۔ وہ بات میں چھٹی کے دنوں میں اور اکثر اتوار کے دنوں میں جب سورج کی کرنیں بادلوں کو چھوتی ہیں، کئی جوڑے ساحل پر ریت میں چھتری گاڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے محوِ گفتگو نظر آئیں گے۔ ان کی چھتریاں بھی کھلی ہوتی ہیں مگر ان کی نظریں دوسری چھتری کی طرف نہیں جائیں گی۔ عمر خیام آج یورپ کے کسی ملک میں پیدا ہوئے ہوتے، تو وہ اپنی محبوبہ سے کہیں گے کہ ساحل پر پھیلی ہوئی ان چھتریوں اور ان کے نیچے بیٹھے ہوئے عاشقوں کی طرح میں بھی ایسی ہی کسی چھتری تلے تمہارے ساتھ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانا چاہتا ہوں۔"

کہتے ہیں کئی لوگوں کو قسم قسم کی چھتریاں خرید کر جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ مگر ایسا آدمی ابھی تک میری نظروں سے نہیں گذرا۔ البتہ چھتری بھولنے کا مرض بہتوں کو لاحق ہوتا ہے۔ ایسے بہت سارے لوگ میری نظروں سے گذرے ہیں۔ یہ بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اپنی چھتری کس جگہ بھول آئیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ دکان میں، ٹرام میں یا پھر بس میں، جہاں بھی جائیں گے چھتری وہیں چھوڑ کر چلے آئیں گے۔ میرا اندازہ دیکھے جتنا خرچ انہوں نے اپنا بیاہ رچانے میں کیا ہوگا۔ اس سے زیادہ انہوں نے چھتریاں خریدنے کے لئے کیا ہوگا۔ اور آخر کار تنگ آکر سکنڈ ہینڈ چھتری خریدنے کا ارادہ کر لیا ہوگا۔ چونکہ ایک دوسرے کا ساتھ پندرہ دن سے زیادہ تک نہیں نبھ سکتا۔ پھر کنواری چھتری کی کیا عزت ہے؟ اس لئے انہوں نے سکنڈ ہینڈ چھتریوں پر قناعت کر لی ہوگی۔ کبھی کبھار اس سکنڈ ہینڈ چھتری کے ایک کونے میں اپنا لکھا ہوا نام دیکھ کر چہرے کا رنگ چھتری کے رنگ سے بھی گہرا آبنوسی زائد کالا ہو گیا ہوگا۔

کچھ عجیب عجیب سے میرائے ہیں۔ جو یوں ہی سے گردش کر رہے ہیں۔ سکنڈ ہینڈ چھتری کی دکان کی چھتریاں اگر اپنی داستان حیات دہرانے لگ جائیں گی تو نہ جانے کیسی کیسی آوازیں کان کے پردوں سے ٹکرانے لگیں گی۔ ایک کہے گی ایک نوجوان طالب علم مجھے بہت عزیز رکھتا تھا مگر ایک روز وہ مجھے بھول گیا۔ اور میں ایک بدمعاش کے ہاتھوں میں پھنس گئی۔ دوسری کہے گی میرا مالک بڑا کردار اسا ہو کا رہا تھا۔ آخر کار اس کا ایک بوجھ کے بعد دوسرے آدمی کا ہاتھ تھامنے پر اس کا جی بھر گیا ہوگا۔ تیسری کہے گی بارش میں گئی ہوگی اور رام نام ستیہ کی صدا عبارت سنا سکے گی۔ چوتھی کسی مجبور عورت کے گھر کے تاریک کونے میں کھڑی رہ کر یہ دیکھ رہی ہوگی کہ یہاں کیسے کیسے لوگ آتے ہیں اور کیسی کیسی بولیاں بولتے ہیں۔

ان تمام باتوں کو یکجا کیا جائے تو ایک اچھا ناول لکھا جا سکتا ہے۔ ایک سانحہ کئی جیتے جاگتے کردار لوگوں کے سامنے آ سکتے ہیں۔

چھتری مرنے جینے کے قابل نہ سہی مگر قابل تمثیل ضرور ہے۔ کوئی ایک ایسا دور بھی ہوا ہے جب چھتری بادشاہ کی نشانی تھا اور اس کا بادشاہ چھتر پتی کہلاتا تھا۔ مگر آج کل کے اس نئے دور میں روپے دو روپوں میں کوئی "چھتر پتی" بن سکتا ہے۔ آج لوگ شاہی دعوتوں کو، ہم اپنی زندگی کے دن بتا رہے ہیں۔ اس کا ثبوت اگر کوئی شخص مجھ سے طلب کرے اور مجھ سے یہ پوچھے کہ یہ حکومت ہماری ہے، ہمارے لئے ہے اور ہماری وجہ سے ہے، اس کا کیا ثبوت ہے؟ تو میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ثبوت کے طور پر اپنے ہوکیا پیش کر

کا ــــــ چھتری!

عبدالرب صدا سیونوی

غزل

یادوں کا سینہ چھلنی ہے، چھالے دیکھے بھالے کون
چارہ گر سب ہار چکے ہیں غم کی پھانس نکالے کون

دل کے ظلمت خانے میں اک آہ غنیمت ہے یارو
شمعِ اُلفت بجھ جائے تو پھیلائے اُجالے کون؟

جب چاہے یہ رُسوا کر دے جو چاہے الزام یہ دے
یہ دُنیا ہے، اِس دُنیا کے مُنھ پر تالے ڈالے کون؟

اُلفت کی تحریکیں تو ہیں منصوبوں کی دنیا میں
لیکن ایک سوال ہے یہ بھی، دردِ جگر میں پالے کون؟

اپنی آگ میں جلنے والو، درد پرایا کیا جانو
میرے غم سے کیا مطلب؟ تم ہی پر ہنسنے والے کون؟

ساحل پر اک بھیڑ لگی ہے طوفانوں کی گھاتوں میں
ایک سے ایک یہ پوچھ رہا ہے پہلے کشتی ڈالے کون؟

صحرا بھی کنگال نہیں ہے، موتی کا بھی کال نہیں
لون صدا صحرا کو چھانے، اور دریا کو کھنگالے کون؟

قیصر صدیقی سمستی پوری

غزل

کتنے عجیب، کتنے نرالے ہوئے ہیں لوگ
تہذیبِ نَو کی گود کے پالے ہوئے ہیں لوگ

انساں کی دید کو مری آنکھیں ترس گئیں
چہرے پہ اک نقاب سی ڈالے ہوئے ہیں لوگ

ماضی نے جُز فریبِ وفا کچھ نہیں دیا
ماضی کی لاش پھر بھی سنبھالے ہوئے ہیں لوگ

خونِ جگر دیا ہے ہمیں نے بہار کو
پھر بھی ہمیں چمن سے نکالے ہوئے ہیں لوگ

جس کی چمک پہ لُٹتی ہیں بھُوکی جوانیاں
اُس "مہرِ نَو" کے پُوجنے والے ہوئے ہیں لوگ

سرکش جہاں ہوئے ہیں اندھیروں کے لاڈلے
پیدا وہیں سے کے اُجالے ہوئے ہیں لوگ

قیصر ملے تو کیسے ملے منزلِ نشاط
جب خود ہی پائے شوق کے چھالے ہوئے ہیں لوگ

ایک ہفتے میں چند لمحے بھی اطمینان کے ایسے نصیب نہیں ہوئے ہیں۔ نہ راتوں کو نیند آتی ہے اور نہ دن میں قرار ہے۔
کاش آپ ادھر ہی طاہر جمال آسکتے۔ (۱۰ فروری ۱۹۵۸ء صبح ۹)

فضیل جعفری ——— شعبۂ انگریزی۔ گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ سائنس۔ اورنگ آباد

"شاعر" کا سالنامہ دیکھا، جو کم ضخامت کے باوجود اچھا ہے۔ آپ نے جانے پہچانے لکھنے والوں کو اچھی خاصی تعداد میں یکجا کر دیا ہے۔ امید ہے کہ اسے پڑھنے والوں کے حلقے میں پسند کیا جائے گا۔

سالنامہ میں شامل شدہ کچھ چیزیں پسند آئیں اور کچھ ناپسند۔ چاہتا تھا کہ بعض مضامین کی خامیوں کی طرف اشارہ کروں، مگر مصیبت یہ ہے اور شاید آپ بھی اس سے واقف ہوں کہ آج کل اردو کے شاعر اور ادیب کچھ اس درجہ احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ نرم سے نرم الفاظ میں کی ہوئی تنقید بھی ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ اور وہ مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں، اس لئے خاموش رہنے ہی میں جان کی خیر نظر آتی ہے۔

(مگر پھر ادب کی خیر کے لئے کیا ہوگا؟! ——ادارہ)

محمود ہاشمی ——— ۱۲۱۱۔ بلیماران دہلی ۶

آپ کے خط اور تازہ تجارتی زبان سے مختصر والدہ صاحبہ کے انتقالِ پُرملال کی خبر معلوم ہوئی۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس موقع پر آپ پر کیا بیتی ہوگی۔ آپ نے اپنے پچھلے سال کے کراچی کے مختصر قیام کے زمانے کی جو مختصر گفتگو تحریر فرمائی ہے، اُس سے اس حادثے کے کتنے دل ہلا دینے والے پہلو سامنے آتے ہیں۔ کاش اپنا دھڑکتا ہوا دل آپ کو دکھا سکتا۔ آپ کا خط پڑھ کر بے اختیار آنسو آ گئے۔

تقسیم وطن کے صدمے سے ہم سب کو ہی دوچار ہونا پڑا لیکن آپ نے جس قدر صدمے اور نقصانات اٹھائے ہیں، اور اس پر بھی جس طرح سرگرم عمل ہیں، اس سے ہم بدنصیب سبق نہیں لے سکے لیکن آپ کی ہمت و جرأت پر رشک کرتے ہیں۔ آپ کی شخصیت اُن تمام مسائل کی آماجگاہ ہے، جن کا تعلق ہندوستان کی مخلوط ثقافتی، لسانی اور ادبی موضوعات سے ہے۔ آپ ہر مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ اسی لئے پچھلے دنوں آپ کی نظموں میں ہندوستان کی دھرتی، ماں کی طرح سے محبت اور کرب سے چیختی ہوئی نظر آئی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ شاعر میں جدید تر نیرنگیوں اور جدید موضوعات پر زیادہ سے زیادہ مضامین وغیرہ شائع ہوتے رہیں تاکہ جدید تر ادب کے حلقوں تک بھی زیادہ سے زیادہ رسائی ہو سکے۔ سالنامہ میں مجھے خاص طور سے مضامین پسند آئے تھے۔ ایسے مضامین سے لوگوں کو اپنا جائزہ مرتب کرنے میں معلومات کی شوخی سے اگر سنسنی اور تجسس کی چاشنی نہ ہو اور کچھ تر و تازہ زندگی محسوس نہ ہو تو ہمیں شاعر کا حصہ نہ بنانا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ اس شوخی اور تازگی کی وجہ سے ہی بیشتر نئے ادیب ہاکنز نما رسائل میں لکھنا پسند کرتے ہیں۔ ہندی زبان کے رسائل نے تو اس "شوخی" کو اپنا مزاج بنا لیا ہے اور خاصے مقبول ہو رہے ہیں۔

پروفیسر حامدی کاشمیری ——— بھوری کدل۔ سرینگر (کشمیر)

شاعر کا سالنامہ ستمبر ملا۔ شکریہ! سرسری نظر دیکھ کر ہی طبیعت خوش ہو گئی۔ اس بار بھی آپ نے یہ نمبر روایتی حسن و معیار کے مطابق نکالا ہے اس میں منتخب چیزوں کو شامل کیا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں ایک لمبی مدت سے شاعر کی محفل سے دور رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیلئے اپنے تحقیقی مقالے کو مکمل کر اللہ کا شکر ہے کہ میں یہ مقالہ مکمل کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ جنوری کے مہینے میں، میں لکھنؤ اور دلی جاؤں گا تاکہ اپنے ٹائپ کرا دوں۔ تین دن باقی ہیں، مجھ سے ہو سکا۔ مجبوراً ہو کر اب اسے بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ مارچ کے پہلے ہفتے میں یونیورسٹی میں پیش کر رہا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اردو نظم پر اثرات کے موضوع پر مقالہ لکھا ہے۔

عبدالعزیز خالد ——— "الحسینؑ" ۲۴ بی۔ پی۔ ای، سی، ایچ۔ ایس۔ کراچی ۱۲ (پاکستان)

سالنامہ ملا، اور فروری کا شمارہ بھی۔ یاد فرمائی کا تہِ دل سے شکریہ

والدۂ مرحومہ کے غم میں اس دورِ افتادہ کو برابر کا شریک خیال فرمائیں۔ خدائے توانا مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ

۱؎ مرحومہ کی صبر سے بڑی نواسی جو ہندوستان میں ہیں ۲؎ اس کی نام کو انتقال ہوا۔ ۳؎ اس کی صبح نامہ کے ذریعہ اطلاع ملی اور یہ خط پورے دن

استقامت۔ مظفر صاحب بھی سناتا تھا بیمار ہیں۔ آج کل معلوم نہیں کیسے ہیں۔ آپ کیسے کتنی مشکلیں اور پریشانیاں ہیں اور یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ ان سے مردانہ وار نبرد آزما ہوتے ہیں اور مظفر و کامراں ہوتے ہیں۔

نسیم مظفرپوری ——— ریزرو بنک آف انڈیا، پوسٹ بیگ نمبر ۲، پٹنہ۔ ۱ (بہار)

"شاعر" کا تازہ شمارہ (فروری ۱۹۷۱ء) مظفرپور میں ہی دیکھا ہوں۔ آپ کے اداریے کے متعلق اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اُن کی حیثیت بھرپور مدلل ہے۔ مقالات متنوع ہیں۔ اویس احمد دوراں اور قمر اقبال کی نظمیں بہت اچھی ہیں۔ بحر رامپوری کی غزل مجھے سب سے زیادہ پسند آئی۔ خاص طور سے یہ اشعار ؎

خونِ دل خونِ جگر جانے دو　　اپنا گلشن ہے سنور جانے دو
اور ہی کچھ ہے بھٹکنے کا مزا　　جس طرف جائے نظر جانے دو

افسانوں میں فیض حسن کا ترجمہ اچھا ہے۔ رفیعہ منظور الامین کا افسانہ "کھڑکی" بھی ایک اچھا افسانہ ہو سکتا تھا، اگر وہ اس کے اختتام پر عجلت سے کام نہ لیتیں۔ "پھول بنے انگارے" عنیمت ہے۔ "کون اپنا کون پرایا" کا موضوع کوئی نیا نہیں۔ فنی پختگی سے عاری اس افسانے کا انجام شروع سے پہلے معلوم ہو جاتا ہے۔

فیض الحسن ——— معرفت ایس۔ اے۔ چودھری، سپرنٹنڈنگ انجینئر، ورلڈ بینک پروجیکٹ، لوہرپنہ، پہاڑ

حصہ نثر میں سید حبیب الرحمٰن غزنوی کا مقالہ رگوں کا جغرافیائی پس منظر خوب ہے۔ آندھرا پردیش میں اردو موقف پڑھ کر تو طبیعت خوش ہو گئی۔ کاش! حیدرآباد کی طرح بہار کے اور صوبوں میں بھی اردو علاقائی زبان تسلیم کر لی جاتی۔ جہاں اردو کا جائز حق ہے۔ رفیعہ منظور الامین کی کہانی بھی پسند آئی۔

——— بقیہ:۔ **چاند کی کہانی** ۔ صفحہ ۶۰ سے آگے ———

اب صرف دعا ہی باقی رہ گئی تھی۔ چنانچہ میں یادِ الٰہی میں مصروف ہو گیا۔ نہ معلوم اللہ میاں کو رحم آیا یا کسی فرشتہ کا دل پسیجا۔ ایک دم نیند نے آنکھیں بند کر دیں۔ میں نے آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ پھر آواز آئی "آنکھیں کھول دے"۔ آنکھیں کھولیں تو خود کو چاند کی دنیا میں پایا۔ لیکن دیکھا کہ اس دنیا میں بھی کچھ انتشار ہے۔ ہر ذی روح بھاگا چلا جا رہا ہے۔ میں نے ایک ایک سے پوچھا۔ لیکن کسی نے توجہ نہ دی۔ اور سیدھے منزلات تک رسائی۔ آخر میں نے ایک بزرگ سے کہا کہ جناب میں اس سرزمین سے آیا ہوں جہاں "انسان رہتا ہے جو اشرف المخلوقات ہے اور جس کی انسانیت شہرہ رکھتی ہے۔ اُن بزرگ نے مجھے سرتاپا اس طرح دیکھا جیسے میں انسان نہیں کوئی خطرناک شے ہوں۔ اور جب میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں ایک معمولی ادیب ہوں۔ بالکل بے ضرر ہے خطرہ اور خود انسان سے بھاگ کر یہاں آیا ہوں تو وہ قدرے مطمئن ہو کر بولے۔ تم کیسے انسان ہو۔ تمہاری انسانیت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہی بیٹھے دیکھتے رہے ہو۔ بعض حسد، حرص و ہوس، ظلم، جنگ، بے انصافی، چور بازاری، فساد، خونریزی، جنگ و جدل اور رنگ و نسل کے جھگڑے ابھی تک تیری دنیا میں جا بجا نظر آ رہے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ابتدائے آفرینش سے تیری دنیا ایسی ہی ہوتا آ رہا ہے۔ اے ابنِ آدم! انسان ہی تیرا کلمہ انسانیت ہے اور یہی تیری عظمت ہے جسکے لئے تو ہماری دنیا میں قدم رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ تو یہاں پہنچے اور تیری دنیا ہم تک پہنچے ہم چاند کی دنیا چھوڑ کر چلے جائینگے۔ اے انسان! زمین اور آسمان کے درمیان کا علاقہ پار کرنے سے پہلے تو اپنے میں کہ انسانوں کے بیچ کا خلا پُر کرنے کی کوشش کر اپنی گمراہ تہذیب کھون لگی اور کھوکھلی انسانیت کے سیکڑوں، ہزاروں خلاؤں کو پُر کرنے کی کوشش کر۔ اتنی دولت اور وقت جو تو یوں ضائع کر رہا ہے اگر اپنا ہاتھ ہی دنیا بنانے میں صرف کرے تو یقین کر تیری دنیا بھی چاند کی طرح روشن ہو جائیگی۔ یہ سنکر میرا سر شرم سے جھک گیا۔ اور کچھ بولنے میں سر اٹھایا تو بھیڑ میں کوئی نہ تھا۔ چاند کی دنیا خالی ہو چکی تھی۔

سائنسداں کہتے ہیں کہ چاند میں آبادی نہیں ہے۔ لیکن اس کی حقیقت آج تک کسی کو نہیں معلوم۔

چاند کی ویرانی دیکھ کر میرا دل بھی گھبرایا اور بقول غالب مجھے بھی ؎

دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا۔

اداریہ:— محفل اپنی ....!

یہ تازہ "شاعر"

کئی اعتبارات سے "شاعر" کا یہ تازہ شمارہ پچھلے شمارہ سے زیادہ جاذبِ فکر و نظر ہے۔ پچھلا شمارہ کتابت و طباعت کے اعتبار سے کچھ گوارا نہیں تھا۔ علاوہ ازیں وہ ۱۰۰ صفحات کا تھا اور یہ پورے ۱۴۴ صفحات کا ہے۔ کئی سال سے شاعر کے ۴۸ صفحات مستقل کر دیئے گئے تھے۔ اس کے باوجود منتخب مضامین کے لئے یہ حجم ہمیشہ کم معلوم ہوتا تھا اور ارادہ تھا کہ "شاعر" کو تھوڑی سی قیمت کے اضافہ کے ساتھ اکہتر صفحات پر نکالا جائے لیکن ریکارڈ پر ہر ہر کا بھاؤ آسمان پر پہنچ گیا۔ اخبار کا کاغذ پرچہ ۱۰ روپیہ ۱۵ سیر آگیا۔ اب سات روپیہ سالانہ چندے اور دس آنے فی کاپی میں ۱۴۴ صفحات کا پرچہ نہیں دیا جا سکتا۔ جس میں عام رسائل سے زیادہ مواد ہو۔ اور جس کی کتابت و طباعت بھی اچھی ہو۔ گذشتہ شمارہ والا صفحات کا پیش کیا گیا تھا لیکن اس نے مطمئن نہیں کیا۔ بہرحال یہ بہت اہم سوال ہے کہ آیا "شاعر" کا حجم کم کیا جائے۔ یا اس کی قیمت میں اضافہ کیا جائے۔

چونکہ یہ شمارہ پورے ۱۴۴ صفحات کا ہے، اس لئے اس میں بہت کافی مضامین نظم و نثر سما گئے ہیں۔ اس بار مندرجات کی ہر چیز اچھی ہے "شعر و سخن" میں ایک گم شدہ کتاب کا جائزہ ہے۔ "ایک عہد آفریں تحریک" ساختیت اور ہیئت پر ایک علم و ادب سے بھرا ہوا مضمون ہے۔ "ہماری زبان" کی زندگی ہے۔ "رام چندر فرحت" تحقیقی مضمون ہے اور اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ ہندوؤں میں کس پائے کے فارسی دان کے شاعر تھے۔

جدید ترسیل کے اہم شعرا کو ایک تسلسل کے ساتھ "شاعر" میں پیش کرنے کے متعلق بہت دن سے سوچا جا رہا تھا۔ اس بار ایک ایسے ہی شاعر نے خود اپنے فکر و فن پر روشنی ڈالی ہے۔ "پرکاش انسان کی کتھا" اور "کچھ اپنے فن کے بارے میں" اسی ذیل کے مضامین ہیں۔

"اردو افسانے کا ارتقاء" ڈاکٹر اعجاز حسین سے ایک اہم انٹرویو ہے۔ اس میں کرشن چندر کے متعلق بھی ایک روایتی انداز کا سوال و جواب ہے۔ یہ بڑا عجیب مطالبہ ہے کہ کسی فنکار کا دماغ یکساں پیمانوں میں ڈھالے۔ کرشن چندر پر اس قسم کی باتیں اب غیر ضروری بنتی جا رہی ہیں۔ اس کے بس پشت بہت سے اسباب ہیں۔ یہ موقع ان کے اظہار کا نہیں ہے۔ کرشن چندر کا فن بہرحال ترقی تازہ عصری اور متنوع ہے۔

اس بار ایک مراٹھی زبان کا افسانہ "چھتری" اور مشہور روسی افسانہ نگار میخائیل شولوخوف کی کہانی کا ترجمہ لازوال ہم تم بھی قارئین کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ طنز و مزاح کے ذیل میں "چاند کی کہانی" لطف دے گی اور طبع زاد افسانوں میں "قیدی نقطہ" اور "یہ سادہ دل بندے" قارئین کو بہت متاثر کریں گے۔

اس شمارہ کی نظموں، غزلوں، اور قطعات میں لہجہ کی توانائی اور فکر و فن کی بلندی ملے گی۔ ان میں سے بعض میں بلا کا موضوعاتی رچاؤ اور ریاض ہے۔

شاعر کا آئندہ شمارہ بھی کئی اہم تخلیقات لے کر آ رہا ہے۔ "شاعر" کے خوش ذوق قارئین انتظار فرمائیں۔

توسیع اشاعت کی مہم

کسی مہم کو سر کرنے کے لئے بڑی توجہ اور سرگرمی کی ضرورت ہے۔ "شاعر" کی توسیع اشاعت کی مہم میں ہنوز وہ گرمی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ بہرحال جو احباب دوست اور "شاعر" نواز اس میں حصہ لے رہے ہیں وہ زمرۂ "ادارۂ شاعر" بلکہ پوری اردو دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

۱	جناب بدیع الزماں خاور	(دابولی)	۴	خریدار
۲	جناب آغا رشید مرزا دہلوی	(کلکتہ)	۴	"
۳	جناب نسیم گوالیاری	(احمد آباد)	۶	"
۴	جناب متین سروش	(پونہ)	۲	"
۵	جناب شیخ مجتہدی	(احمد آباد)	۱	"
۶	جناب جیون لعل گوہر	(مہو)	۱	"
۷	جناب قیصر شمیم	(کلکتہ)	۱	۰
۸	جناب یعقوب راہی	(مہاڑ)	۱	۰
۹	اشرف مسعودی صاحب	(بنگلور)	۲	"

"شاعر" ہندستان کا وہ ادبی ماہنامہ ہے جسے ہم دوسری زبانوں کے رسائل کے مقابلے میں پیش کر سکیں۔ شرط یہی ہے کہ اردو کے شیدائی اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں۔

شاعر بمبئی

شعر و نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں ناضروری ہیں)

چند ادبی مسائل

از ——— پروفیسر شاہ مقبول احمد ایم اے

شاہ مقبول احمد، شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج کلکتہ سے متعلق ہیں اور اردو زبان و ادب کے مسائل پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ کتاب کے نام سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ادبی مسائل کے متعلق کچھ عملی یا نظری مباحث ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس میں شاہ صاحب کے گیارہ چھوٹے بڑے مضامین ہیں مضامین کا تعلق رکھتے ہیں۔ اردو یا ہندستانی مہارکی عام زبان، اردو اور ہندی ہماری بولی۔ بہار کے چند ٹھیٹھ دیہاتی ٹوٹکے ان کے موضوعات ہیں۔ پہلا مضمون اردو یا ہندستانی تاریخی مطالعے اور عوام کے اعتبار سے مفید ہے لیکن بچہ الجھا ہوا ہے۔ اس میں تاریخی ترتیب چونکہ گڈمڈ ہو گئی ہے اور بعض امور کا بار بار اعادہ ہوا ہے، اس لئے مضمون الجھ کر رہ گیا ہے۔

ان پانچ قابل مطالعہ لسانی مضامین میں سب سے اچھا مضمون بہار کے چند ٹھیٹھ دیہاتی محاورے ہے۔ یہ مضمون خاصا طویل اور معلوماتی ہے۔ شاد صاحب نے محاورہ اور کی جو ایک بڑی تعداد دی ہے اور جنھیں بہاری محاورے یا ضرب الامثال بتایا ہے ان میں سے بہت سے ہندستان کے دوسرے صوبوں کے شہروں اور قصبوں میں بھی رائج ہیں۔ بعض بالکل اور بعض تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ۔ اس موضوع پر اگر کام کیا جائے اور تمام صوبوں کے محاوروں کا تقابلی مطالعہ ہو تو بڑے اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

کتاب کے بقیہ مضامین کلکتہ کے ادیب و شاعر سلیم عظیم آبادی ناموفق آبرو۔ بہاری ماحول اور اردو ادب۔ جمیل مظہری کے بعض اشعار۔ میر تقی میر کی شاعری کے بعض پہلو بھی ضمنت ہیں۔

کتاب کی ضخامت ۱۴۴ صفحات ہے۔ یہ اخباری کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ قیمت دو روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ "مکتبہ صنم" سبزی باغ پٹنہ ۴

(۱) یادگار جگر
(۲) نگارشات جگر

از ——— محمد اسلام

محمد اسلام صاحب نے حیات جگر اور ان کی شاعری پر کافی کام کیا ہے اس سے پہلے ان کی ایک اور کتاب جگر کے ملفوظات شائع ہوئی تھی جگر پر

انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

(۱) "یادگار جگر" میں جگر مراد آبادی مرحوم کے وہ اشعار جمع کئے گئے ہیں جو شعلۂ طور، "آتش گل" یا "داغ جگر" میں شامل نہیں ہیں۔ یا تو ان اشعار کو خود جگر صاحب نے حذف کر دیا تھا یا وہ رسائل یا اخبارات میں لکھے گئے تھے۔ ایسے اشعار کے علاوہ بعض دو نظمیں اور غزلیں بھی ہیں جو جگر صاحب کے احباب اور معتقدین کی بیاضوں میں تھیں۔ کچھ کلام خطوط اور پرانے رسائل میں ملا۔ محمد اسلام صاحب نے بڑی تلاش و تحقیق سے یہ سب کچھ جمع کیا ہے۔ اس سے قطع نظر اس میں معیاری اور غیر معیاری کا تفرقہ اشعار غلوں اور غزلوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ یہی نہیں ہے کہ اس کتاب میں مرحوم جگر کا گم شدہ کلام جمع کر دیا گیا ہے بلکہ ان کے مجموعوں سے تقابل کر کے حواشی میں تبدیلیوں اور دوسرا متون کے متعلق مفید حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ آخر میں پھر کتابیات کے عنوان سے کتابوں، خطوط، بیاضوں اور رسائل کی تفصیل ہے۔

۱۲۶ صفحات۔ قیمت دو روپے

(۲) نگارشات جگر۔ اس کتاب میں محمد اسلام صاحب نے جگر مراد آبادی کی وہ نثری تحریریں جمع کی ہیں جو شعر و شاعری کے متعلق ہیں۔ یا تو یہ مختصر دیباچے اور مقدمے ہیں۔ یا فانی، بدایونی، اصغر گونڈوی اور دوسرے نوجوان شعراء کی شاعری پر اظہار خیال۔ ظاہر ہے جگر صاحب نثر نگار نہیں تھے نثری تحریریں انھوں نے دوسروں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر لکھی تھیں۔ اس لئے یہ تبرکات کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کا ایک جگہ جمع ہو جانا۔ جگر مراد آبادی کے نظریات شعری کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

۱۱۲ صفحات۔ قیمت دو روپیہ۔ دونوں کتابیں۔ دانش محل۔ امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ نے شائع کی ہیں۔

بہادر شاہ ظفر

از ——— منجو قمر عبداللہ

یہ ایک مکمل ڈرامہ ہے۔ جسے آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کے کل ہند مقابلۂ اردو ڈرامہ میں بہترین ڈرامہ قرار دیتے ہوئے اکیڈمی کی طرف سے انعام دیا گیا۔

مصنف ڈرامہ نگار منجو قمر عبداللہ کا مختصر یہ ڈرامہ تاریخی پس منظر میں

شائع ہوتا تو بھی موضوع اور انداز پیشکش کے اعتبار سے اچھا سمجھا جاتا۔
لیکن ڈرامہ سے پہلے ڈرامہ نگار نے جو صفحات اردو ناٹک پر تحریر کیے ہیں ان میں اس ڈرامہ کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے سے اردو ناٹک کی مکمل تاریخ نہایت دلچسپ انداز میں سامنے آتی ہے۔ ویسے اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ جو ڈرامہ نگار کہ اس صنف میں کتنا درک حاصل ہے۔ اچھا ڈرامہ نگار ہونا ایک الگ بات ہے لیکن ناٹک کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں پر گہری نظر رکھنا۔ اس کے تاریخی تسلسل اور عروج و زوال سے واقف ہونا فن اور فنکاری کی نزاکتوں کو سمجھنا اور برتنا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ قمر رئیس صاحب نے اپنے مضمون "اردو ناٹک" میں اپنے چالیس سالہ تجربات، مشاہدات اور اپنی علمی وابستگی کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے، ایک شخص جس نے اتنی گہری وابستگی رکھتا ہو تو اس کی تحقیق اچھی ہی ہوگی۔ قمر رئیس صاحب نے اپنے اس مضمون میں نہ صرف اردو ناٹک کا مفصل حال ہی لکھا ہے بلکہ ان کے پلاٹ، ڈائلاگوں کے نام۔ ڈرامہ نگاروں اور ڈائریکٹروں کے نام، ان کے اسالیب اور ان کی خصوصیات اور ان کے فنی کمالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ ہندوستانی موسیقی اور رقص کا بھی ناپختہ نقطۂ نگاہ سے ذکر کیا ہے۔

اردو ڈرامے کے محسن اعظم آغا حشر کاشمیری کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے جو انداز اور تفصیل سے کیا ہے حشر کی صنف ڈرامہ میں علمی اور نظری بصیرت کا جس طرح مظاہرہ کیا ہے وہ حد درجہ لائق ستائش ہے۔

جہاں تک ڈرامہ کا تعلق ہے وہ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی المناک زندگی کی مکمل اور موثر تصویر ہے۔ دہلی کے انقلاب سے لے کر رنگون کی قید اور ظفر کی آخری نزع کی ہچکی تک کے واقعات کو ڈرامہ میں خوبی کے ساتھ سمویا ہے۔ انھوں نے تاریخی صداقتوں کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے تمام حقیقی کردار اس میں موجود ہیں اور ان کرداروں نے اپنی زبان سے جو کہنے والے ادا کئے ہیں وہ ایک حد تک اس دور کے مطابق ہیں۔ ڈرامہ میں بہادر شاہ ظفر کے تمام متعلقین و متوسلین موجود ہیں جنھوں نے غدر کے فتنہ میں حصہ لیا تھا اس میں اعزاز تمثیل کی فہرست کے بعد ایک ایسا گوشوارہ بھی ڈرامہ نگار نے دیدیا ہے جس سے نہ صرف علمیہ اور اساس معلوم ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ بہادر شاہ ظفر ہوں یا محمد بخت خاں سپہ سالار، حکیم احسن اللہ خاں وزیر اعظم، فیروز شاہ، مولانا فضل حق خیر آبادی، غالب، شیخ محمد ابراہیم ذوق، مومن، آزردہ، داغ، حکیم احمد شاہ، ہاڈسن یا کرنل ڈیورس جو ان سب پر حاوی تھا۔

مکالمے موثر اور شستہ اور برجستہ ہیں۔ ڈرامہ میں شروع سے آخر تک ربط اور عمل کے اعتبار سے خود بہادر شاہ ظفر کے اشعار کبھی کسی کی زبان سے اور کبھی بس منظر سے آتی ہوئی آواز میں سنائے گئے ہیں۔

ڈرامہ میں بہادر شاہ ظفر کی موت کے بعد اس المیہ کو ہندستان کی آزادی کی جنگ ۱۹۴۷ء سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اور یہاں ڈرامہ نگار سے کوتاہی ہوئی ہے۔ ظفر کے مدفن کی بات تو اچھی سوچی گئی اور بہادر شاہ ظفر کے مزار پر سوجا شاہزادہ دیکھا کو دکھایا گیا جو وہاں جنگ آزادی کو جیتنے کی قسم کھاتے ہیں لیکن داد کلیجہ کو زمانہ قریب سے ملانے کے لئے محسن کشی کی ضرورت تھی تو یہ کردار کھڑے ہونے کی طرح نہ ابھر پایا۔ ڈرامہ میں جو شدت تاثر پیدا ہونی تھی، وہ نہ ہو سکا۔

مجموعی طور پر ڈرامہ کافی اچھا ہے اور خود اپنے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ ڈرامہ میں جس سادہ و سامان اور لباس کی ضرورت ہو سکتی ہے، ڈرامہ نگار نے اس کی فہرست بھی دیدی ہے۔ غرض یہ ایک اچھا مکمل ڈرامہ ہے جو اسٹیج پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

کتابت، طباعت صاف ستھری اور سرورق بہت اچھا ہے ۱۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپیہ چھپن پیسے۔

ملنے کا پتہ:۔ نگار پبلیکیشنز۔ ملتانی پورہ۔ بیگم بازار۔ حیدرآباد ۱

مشاغلِ شوق

از ——— شاغل قادری

یہ شاغل قادری صاحب کا مجموعہ کلام ہے۔ اس مجموعہ کے نام سے ظاہر ہے کہ شاغل صاحب کو شاعری سے ایک گہرا اور شائق شاعر ہونا پایا ہے ان کی غزل اور مطالعہ کلام سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت دن سے شعر کہہ رہے ہیں۔ کلام صاف اور ستھرا ہے۔ مجموعہ کے شروع میں نعتیں ہیں اور آخر میں غزلیں۔ درمیان میں حمد، نعت و منقبت کا مختصر حصہ ہے۔ ڈاکٹر سید احمد حسن صاحب نے اپنے تعارف میں جو منتخب اشعار پیش کئے ہیں ان میں سے غزل کے چند شعر بطور نمونہ یہاں دیئے جا رہے ہیں۔

کلی کلی کا تبسم چمن چمن کی بہار ، ترے جمال کی ہر رنگ میں جھلک دیکھی
قادری ہائے کی محبت میں یہ عالم ہے کہ اب ، مجھکو دیوانہ سمجھتے ہیں زمانے والے
لطف گلشن کا اسیری میں کہاں گرچہ قفس ، لاکھ کوشش سے بہار آئے نہیں جانے والے
قفس ہے، گلوں سے کہہ کر صیاد ، چمن کا لطف اسیری میں آ نہیں سکتا

مجموعہ کا آخر میں متعلقات تاثرات ہیں اور ۱۲ صفحات کے بعد ۱۲۰ صفحات پر ۱۹۱ کتابت طباعت اچھی۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

ملنے کا پتہ:۔ دارالادب۔ باٹا پور، ریتی دیہا گجور۔ (بہار)

سب سے زیادہ قابلِ اعتماد
بالوں کو سیاہ کرنے والا
وسمول

سفید بالوں کو سیاہ کرتا ہے
بالوں کو سنوارنے کا بہترین ذریعہ ہے
ایملسی فائڈ ہیر آئل اور پومیٹم کی
شکل میں ہر اسٹور سے
دستیاب ہو سکتا ہے

دنیا بھر میں لاکھوں استعمال کرتے ہیں
ہائیجنک ریسرچ لیبارٹیز پوسٹ بکس ۱۹۲ بمبئی ۱

— بقیہ افسانہ "یہ سادہ دل بندے" صفحہ ۴۴ سے آگے

"ماموں کہاں ہیں؟" وہ سلام کے بعد بولا۔

"ماموں!" سب نے جیسے ایک ساتھ کہا۔ پھر سناٹا سا چھا گیا۔

کچھ دیر کے بعد ایک نے تھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ انتقال کر گئے۔"

"انتقال کر گئے؟" محسن کے داماد پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اور اس کے ساتھ سے وہ پتلی گر پڑی جس میں دو سو روپے وہ اپنے کسی دوست سے قرض لے کر محسن کو واپس کرنے کیلئے آیا تھا۔

••

— بقیہ "اُردو افسانے کا ارتقاء" صفحہ ۴۳ سے آگے۔

کھری ہوں گی اور آج کے لکھنے والوں میں سماجی و تنقیدی شعور بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بہرحال مختصراً اردو افسانے کے ارتقاء کے متعلق اتنی بات کہی جا سکتی ہے کہ ہم چند سے اب تک اس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اردو کے چند افسانے عالمی ادب کے دوش بدوش رکھے جا سکتے ہیں۔

نوٹ: ڈاکٹر سید امتیاز حسین شعبۂ اردو مرہٹواڑہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ توسیعی لکچروں کے سلسلے میں اورنگ آباد آئے ہوئے تھے اس موقع پر ان سے دو نشستوں میں اردو افسانے اور اردو زبان کے تازہ مسائل پر گفتگو ہوئی تھی۔ افسانے کی بات شریکِ اشاعت ہے۔

کارواں ہمارا
کوثر چاندپوری کے دو رپورتاژ جو
طرزِ تحریر اور تکنیک کے لحاظ سے بیحد اہم
اور دلچسپ ہیں۔ یہ واقعات کو ایک
خاموش مگر متحرک فلم کی طرح پیش کرتے ہیں۔
کتابت و طباعت اعلیٰ۔ گرد و پوش دلکش اور آرٹسٹک
(قیمت تین روپے تیس پیسے)
پتہ: حلقۂ فکر و شعور ۳۴۶ بلیماران، دہلی ۶

شاعر بمبئی

علمی۔ ادبی اور تہذیبی خبریں

...لصہ کالج (دہلی یونیورسٹی) میں راجندر سنگھ بیدی کا استقبال

اردو کے مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کو اُن کے ناولٹ ...ب چادر میلی سی" پر ساہتیہ اکیڈیمی کا ۱۹۶۵ء کا اردو انعام ملنے پر ...ا دہلی یونیورسٹی کی بزم ادب نے اُن کے اعزاز و استقبال میں بڑے پیمانے ...ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس موقعہ پر اُن کے ہمعصر اردو کے دوسرے مشہور افسانہ ...کرشن چندر، ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر اور شاعر غلام ربانی ...ن بھی موجود تھے۔ جلسے کی صدارت سجاد ظہیر صاحب نے کی جلسے کا افتتاح ...تے ہوئے صدر شعبۂ اردو جناب شہاب جعفری نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ ...ساہتیہ اکیڈیمی انعام کی نوعیت اور اہمیت کا ذکر کیا۔ اور اردو ادب میں

چپلون میں اردو پروگرام۔!

چپلون (رتناگیری) میں گذشتہ ۲۵ فروری کے بعد، ڈاکٹر وتارکان کالج کے شعبۂ اردو و فارسی کی طرف سے پروفیسر این ایس گورکر (صدر شعبۂ اردو سینٹ زیویرس کالج بمبئی) کی صدارت میں ایک ادبی پروگرام کا اہتمام کیا گیا تھا۔

پروفیسر گورکر صاحب نے اردو اور قومی یکجہتی کے موضوع پر تقریر افروز تقریر فرمائی۔ اور اردو فارسی کی اہمیت کو واضح کیا۔ اس پروگرام میں شرف کمالی اور حیرت کونی جیسے مشہور مرثیہ گو شاعروں کے علاوہ بدیع الزماں خاور بھی شریک تھے۔ اور انھوں نے اپنی وطنی نظموں کے

...ہار تہذیبی خبریں

بیدی کے مقام اور اُن کے فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد بزم ادب کے صدر رو الرحمن، نائب صدر سلطان پروین قریشی، سکریٹری محمد خورشید عالم اور بزم ادب کے نگراں جناب شہاب جعفری نے مہمان خصوصی کو ہار پہنائے۔ رسم ...پوشی کے بعد صدر سلطان پروین نے مدعیانہ اس پیش کیا جس میں کہا ...یا کہ "آپ کو انعام دیکر ساہتیہ اکیڈیمی نے دراصل خود اپنے ذوق انتخاب ...ی داد دی ہے جس کے ہم برسوں سے منتظر تھے۔ تقریباً دو سال قبل اسی بزم ادب نے اظہار عقیدت کے طور پر آپ کی پچاسویں سالگرہ کا جشن منایا تھا..... ہمیں آپ پر ناز ہے۔ آپ کو اردو پر ناز ہے اور اردو کو سرزمین پنجاب پر ناز ہے کہ جس زرخیز مٹی نے اردو کے چھتنار درخت کی صدیوں سے نشو و نما کی ہے۔"

اپنا سپاس پیش ہونے کے بعد کرشن چندر نے بیدی کے فن پر ایک ہمعصر ادیب کی حیثیت سے بصیرت افروز تقریر کی۔ اس کے بعد بیدی نے اپنے ناولٹ اور اپنے فن کے بارے میں خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں سجاد ظہیر صاحب نے بیدی کی افسانہ نگاری پر تقریر کی۔ جلسے کے اختتام پر جناب شہاب جعفری اور جناب غلام ربانی تاباں نے بیدی صاحب کی فرمائش پر اپنا کلام سنایا۔ جلسے کی کامیابی کے لئے سکریٹری بزم ادب نے پنجابی شعبے کے اساتذہ کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا۔ طلبہ نے بزم ادب کے اس تاریخی جلسے کا ایک فوٹو گروپ بھی کرایا۔ (عالیہ بیگم آفس سکریٹری بزم ادب)

علاوہ گریش، امیل، اور کلکرنی کی مراٹھی کہانیوں کے منظوم ترجمے سنائے جو بے حد پسند کئے گئے۔

"آگ اور پانی"

ہندو چین جنگ سے متاثر ہو کر عالمی امن کے موضوع پر طارق جمیلی کا مشہور ڈرامہ "آگ اور پانی" پوربندر کالج کی بزم اردو کے سالانہ جلسہ کے موقع پر مصنف کی ہدایت کاری میں اسٹیج کیا گیا۔ یہ ادبی ڈرامہ عن قریب ہی کتابی صورت میں منظر عام پر آرہا ہے۔ پروفیسر اختر قادری صدر شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی نے صدارتی تقریر میں "آگ اور پانی" کو جنگ اور امن کے موضوع پر ایک نہایت کامیاب تجزیہ قرار دیتے ہوئے پروفیسر طارق جمیلی کو اس عظیم تخلیق کیلئے مبارکباد بھی دی۔ اس شہر میں اس ڈرامہ کا دوبارہ اسٹیج کیا جانا اس کی مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔

کل ہند اردو کانفرنس وجے واڑہ میں ہوگی

حیدرآباد، مارچ:۔ رنگل ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ماہ مئی میں وجے واڑہ میں کل ہند اردو کانفرنس منعقد کی جائیگی اس موقع پر اردو مساعدین بھی ہوں گے۔ اردو کانفرنس میں مرکزی اور ریاستی وزراء ارکان پارلیمان و اسمبلی شرکت کرینگے۔ رنگل ایسوسی ایشن نے یہ بھی قرارداد منظور کی ہے کہ ریاستی حکومت اپریل کی آندھرا پردیش میں اردو کو ایک سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔

اُردو ٹریننگ کالج ویجاپور دارنگ آباد پھر کھول دیا گیا

انجمن ترقی اُردو مہاراشٹر کی کوششوں کا نتیجہ

پچھلے سال اُردو ٹریننگ کالج ویجاپور طالب علموں کی کمی کی وجہ سے بند کر دیا گیا تھا۔ اس نامناسب حکم کے خلاف انجمن ترقی اُردو مہاراشٹر نے کمشنر لنگر سنگ منا ڈیٹو حکومت ہند سے احتجاج کیا تھا۔ چنانچہ شری معرا ایسیسٹنٹ کمشنر لنگر سنگ منا ڈیٹو اورنگ آباد تشریف لائے اور جناب سکندر علی وجد صدر انجمن ترقی اُردو مہاراشٹر اور شری آپٹے ڈپٹی ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن مرہٹواڑہ سے اس مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا۔ شری آپٹے نے یقین دلایا کہ اگر اس سال بیس امیدوار بھی آجائیں گے تو اُردو ٹریننگ کالج پھر سے کھول دیا جائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ حکومت مہاراشٹر اُردو کی تعلیم کا انتظام کرنے میں کافی دلچسپی لے رہی ہے۔ اس سلسلے میں صدر انجمن ترقی اُردو ۶ فروری ۱۹۷۶ء کو شری چوہدری وزیر تعلیم حکومت مہاراشٹر سے ملے۔ وزیر موصوف نے اس فیصلہ کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا کہ اُمیدواروں کی تعداد کے پیش نظر یہ اطلاع اخبارات میں شائع کر دی جائے۔ اُردو ٹریننگ کالج ویجاپور کا تعلیمی سال جون سے شروع ہوتا ہے اس لئے امیدوار یہ چاہتے کہ وہ ۳۱ مارچ ۱۹۷۶ء تک اپنی اپنی درخواستیں ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن مرہٹواڑہ، اورنگ آباد کو بھیج دیں۔ اور اسی کی ایک کاپی سید سکندر علی وجد صدر انجمن ترقی اُردو مہاراشٹر بن چکی روڈ اورنگ آباد کو روانہ کر دیں۔

مولانا امتیاز علی عرشی کی خدمت میں کتابچہ

مجلس تذکیر عرشی دہلی کی طرف سے میسرز کے کنوینر مالک رام صاحب نے اُردو کے مشہور و ممتاز محقق مولانا امتیاز علی عرشی (رامپوری) کی اکسٹھویں سالگرہ پر ۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء کو شام کے ساڑھے چار بجے ایک خاص جلسہ سپرد ہال دہلی میں کیا گیا۔ اس میں نائب صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے مولانا عرشی کو ایک کتابچہ پیش کیا۔

دہلی میں اُردو کی ترقی و ترویج کیلئے ایک لاکھ روپے منظور

دہلی ۴ فروری:۔ جن سنگھ کی زبردست مخالفت کے باوجود آج کارپوریشن کے بجٹ اجلاس میں اُردو کے فروغ کے لئے ایک لاکھ روپے کی ایک تجویز زبردست اکثریت سے منظور کر لی گئی۔ یہ تجویز جو بحث میں ترمیم کے طور پر پیش کی گئی تھی چودھری عبدالستار نے پیش کی اور اُس کی تائید شکیم محمد شریف خاں صاحب نے کی۔

بیگم سیماب کی رحلت پر بھوپال میں تعزیتی جلسہ

بھوپال ۴ فروری (ذریعہ ڈاک سے)، کل شب کو مکان واقع بھوپال میں، بیگم صاحبہ مرحومہ سیماب اکبرآبادی کی رحلت پر ایک تعزیتی جلسہ جناب عشرت قادری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مقامی دانشوروں نے شرکت کی جناب مسعود قمر تاباں نے ایک تعزیتی قرارداد پیش کرتے ہوئے اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا اور علامہ سیماب مرحوم کے تمام فرزندان خصوصاً حضرت اعجاز صدیقی جناب منظر صدیقی اور جناب ظہر صدیقی سے اپنی گہری ہمدردی ظاہر کی۔ آخر میں تمام حاضرین نے بیگم سیماب کیلئے دعائے مغفرت کی۔

شرکاء میں حضرات مظفر حنفی، ڈاکٹر حمید شاہین، مقصود دعوانی، عبدالرؤف قریشی سکریٹری جمعیۃ العطار، آصف شاہجہری، سید اختر علی اختر، شفیق تنویر، قاسم نیازی، مہندر اوستی، سلطان حیدری، فضل تابش، نعیم کوثر اور شاد سلطان پوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ (نامہ نگار)

کُل ہند اُردو سمپوزیم اودے پور

اُردو دوستوں کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ شہر اودے پور میں سلسلہ اکیڈمی کی راجستھان کی زیر سرپرستی اور انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیر اہتمام ۲۷، ۲۸، ۲۹ مارچ ۱۹۷۶ء کو ایک کُل ہند اُردو سمپوزیم بعنوان "لوک کلا منڈل اودے پور میں منعقد ہو رہا ہے۔ جس کی صدارت جناب ماہر صدیقی (مدیر ترنم عرب بمبئی) فرمائیں گے اور جس میں ملک کے ممتاز ادبا اور شعراء کی شرکت متوقع ہے۔

۸ مارچ کی شب میں ایک کُل ہند مشاعرہ بھی ہوگا۔

خلیل تنویر (نامہ نگار)

شعبۂ اُردو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں

راجندر سنگھ بیدی کا استقبال

علی گڑھ ۲۰ مارچ:۔ شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خصوصی دعوت پر اُردو کے ممتاز افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی علی گڑھ تشریف لائے۔ ساڑھے تین بجے سہ پہر میں انجمن اُردوئے معلی کی طرف سے ایک جلسہ نیشنل آف آرٹس کے لاؤنج میں منعقد کیا گیا۔ جس میں علی گڑھ یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ، ادیبوں، دانشوروں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ صدر جلسہ پروفیسر آلِ احمد سرور نے اپنی تقریر میں بیدی صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ساہتیہ اکیڈمی کا انعام ملنے پر مبارک باد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ اس

انعام کے ملنے سے بیدی کی فنی عظمت میں تو اضافہ نہیں ہوا لیکن اس بات کی خوشی ہے کہ یہ اعزاز ایک ایسے فنکار کو ملا ہے جو اس کا حقیقی معنوں میں مستحق ہے۔ بیدی جادے ان فنکاروں میں ہیں جن سے مل کر زندگی پر ایمان تازہ ہوتا ہے، انھوں نے انسانی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا ہے اور اس کی گہرائیوں تک پہنچے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے افسانہ نگاری میں فارمولے یا فیشن کو اسقبال نہیں کیا۔ وہ نارمل اور فطری زندگی کے افسانہ نگار ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں جو حقیقت پسندانہ رویہ ملتا ہے اس کی مثال دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی کا مقبول عام افسانہ نگاروں میں کبھی نہیں رہے۔ ان کے افسانوں سے لطف اندوز ہونے کیلئے ایک خاص طرح کی سنجیدگی اور ذہنی تربیت کی ضرورت ہے۔ میں یہ کہنے میں کچھ حق بجانب نہیں سمجھتا کہ منٹو اور عصمت نے، گو وہ اعلیٰ پایہ کے فنکار ہیں، اردو افسانے پر بعض منفی اثرات چھوڑے ہیں۔ ان کے اثر سے افسانے میں کچھ بے راہ روی کا عنصر بڑھا ہے جس طرح ابوالکلام آزاد کی تقلید میں ایک غیر فطری اسلوب کو رواج ملا۔ جدید افسانہ میں موضوع اور ہیئت کی حد تک فنی پختگی ہے لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ اپنی پٹڑی سے کچھ اتر گیا ہے۔ بیدی کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے اردو افسانہ کی گاڑی کو پھر اس کی پٹڑی پر کھڑا کیا ہے۔ "اپنے دکھ مجھے دے دو" اس کی ایک اور مثال ہے۔ یہ افسانہ فن کا ایک معجزہ ہے۔ اسی طرح "نقسیم" "نداور" "فرد" اور "ضمانت" سے متاثر ہو کر ہمارے یہاں جو افسانے لکھے گئے ہیں ان میں بھی یہ بات دیکھی جا سکتی ہے کہ افسانہ نگاروں نے اپنا توازن کھو دیا ہے۔ اور ان کا رویہ فطری نہیں ہے۔ بیدی کی کہانی "لاجونتی" اس سلسلے میں ایک استثنائی حیثیت رکھتی ہے۔ بیدی کے جس ناولٹ پر انھیں ساہتیہ اکیڈیمی کا انعام ملا ہے یعنی "ایک چادر میلی سی" وہ بیدی کی فنکاری اور زندگی کے گہرے مشاہدے اور انسانی ہمدردی و حقیقت شناسی کی بنا پر ہمارے افسانوی ادب کا ایک شاہکار ہے اور بلاشبہ ایک زندہ رہنے والا فن پارہ۔ بیدی کی راؤ آرزو کے افسانوی ادب کا ایک فیرخانی کردار ہے۔

سرور صاحب کی استقبالیہ تقریر کے بعد راجندر سنگھ بیدی نے حاضرین سے خطاب کیا۔ انھوں نے کہا جب تک سرور صاحب تقریر کرتے رہے میں یہی سوچتا رہا کہ میں اپنی تقریر کس طرح شروع کروں گا۔ افسانہ لکھتے وقت بھی مجھے یہی دقت پیش آتی ہے۔ اس کا پہلا فقرہ میرے نزدیک بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اور جب تک میں اسے پا نہیں لیتا میرا افسانہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اپنے ناولٹ ایک چادر میلی سی کے بارے میں بیدی صاحب نے کہا کہ اس میں میں نے وہ زندگی پیش کی ہے جسے میں نے بہت زیادہ قریب سے دیکھا ہے۔ یہ کہانی میرے اپنے گاؤں کی ہے اور اس کے بہت سے کردار حقیقی ہیں۔ میرے دوست ملک راج آنند نے مجھ سے ایک بار کہا کہ فن اسی وقت بلند پایہ ہو سکتا ہے جب فنکار اپنی ذات اور ماحول کے اندرون میں جھانکتا ہے اور اس کے رشتوں کی گرہ کھولتا ہے میں نے ان کے اس مشورہ پر اکثر عمل کیا ہے میں نے دوسری زبانوں۔ عظیم فنکاروں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ انھیں پڑھ کر مجھے ہمیشہ احساس رہا کہ ان فنکاروں کی گرفت زندگی پر جتنی مضبوط ہے وہ بات ہمارے نہیں ملتی۔ ہمارے ناول غیر ضروری تفصیلات اور بے معنی جزئیات کا پلندہ ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ایک اکائی نہیں بن پاتے۔ ناول نگار اگر ناول اندر فلسفیانہ بحثیں چھیڑ دے یا علمی مسائل پر تجسس لکھنے بیٹھ جائے فنی عیب ہے۔ خواہ یہ عیب ٹالسٹائی، اور روسی ناولوں کے یہاں ہی نہ ہو۔ مغرب کے ناول نگاروں نے آہستہ آہستہ اس عنصر کو کم کیا ہے اپنے ناولوں میں اب لمبی لمبی تقریریں نہیں کرتے۔ چند دلچسپ کے نہیں لکھتے، نہ شاعرانہ اور انشاپردازانہ لفاظی کرتے ہیں۔ البتہ مصوری، موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ کی نزاکتیں بہت سلیقے سے پیدا کرتے ہیں۔ جس سے ناول کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایمینگ وے کے بعض ناولوں کی مثال دیتے ہوئے اس کی فنکاری، رمزیت اور مسائل حیات پر اس کی گرفت کو بیدی نے سراہا اور کہا کہ میں چاہتا تھا کہ اردو میں اس طرح کا ناول لکھوں جو ایک وحدت بن سکے اور زندگی سے اس کا رشتہ حقیقی اور گہرا ہو۔ ایک چادر میلی سی میں میں نے یہ کوشش کی ہے۔ اب ایک اور ناول لکھ رہا ہوں، جو مجھے امید ہے، کہ ایک سال کے اندر مکمل ہو جائے گا۔ اس کا نام "رنگ" ہے۔

اپنے ناولٹ ایک چادر میلی سی کے بعض اقتباسات بیدی صاحب نے پڑھ کر سنائے۔ اور خاص خاص نکات کی نشان دہی کی۔

آخر میں سرور صاحب اور زوقی صاحب نے فلم سے متعلق بعض سوالات کئے۔ ایک خاتون نے ایک چادر میلی سی کے ایک حصے سے متعلق اپنا اظہار کیا کہ کرداروں کا رد عمل صحیح نہیں ہے۔ بیدی صاحب نے وضاحت کی۔ سرور صاحب نے بیدی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور یہ جلسہ برخواست ہوا۔

پرنٹر پبلشر اور مالک افتخار صدیقی نے نیو رسل فائن آرٹ پریس نوروجی اسٹریٹ بمبئی میں چھپوا کر شائع کیا

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ مہیاب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا سینتیس سالہ علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

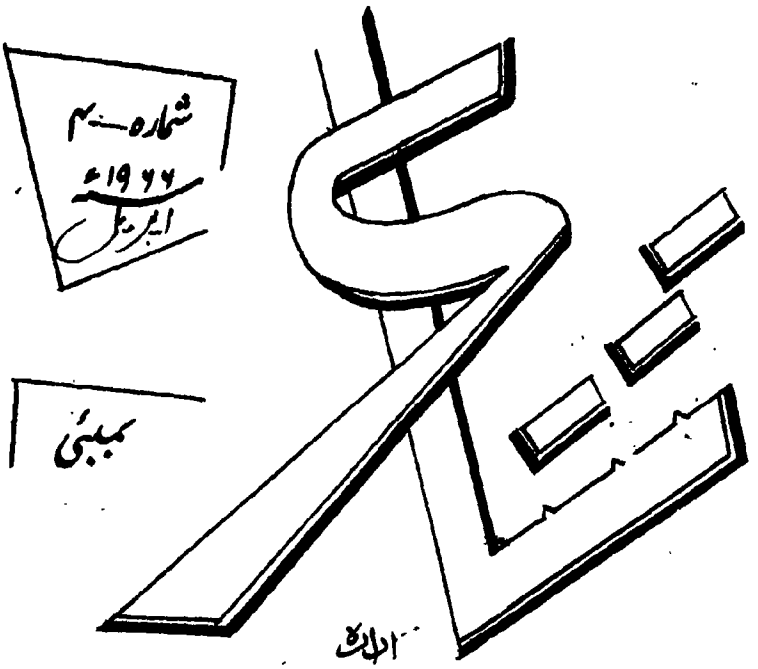

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

زرِ سالانہ
سات روپے

زرِ ششماہی
چار روپے

ممالکِ غیر سے
۱۶- شلنگ

فی پرچہ
۱۰ آنے (۶۲ پ)

ملتبہ دفتر الادب

پوسٹ بکس ۴۵۲۶ - بمبئی ۴۰۰ بی سی

شراب نوشی کی لعنت

تباہی کا پیش خیمہ ہے

آدمی اور گھر دونوں کے لئے

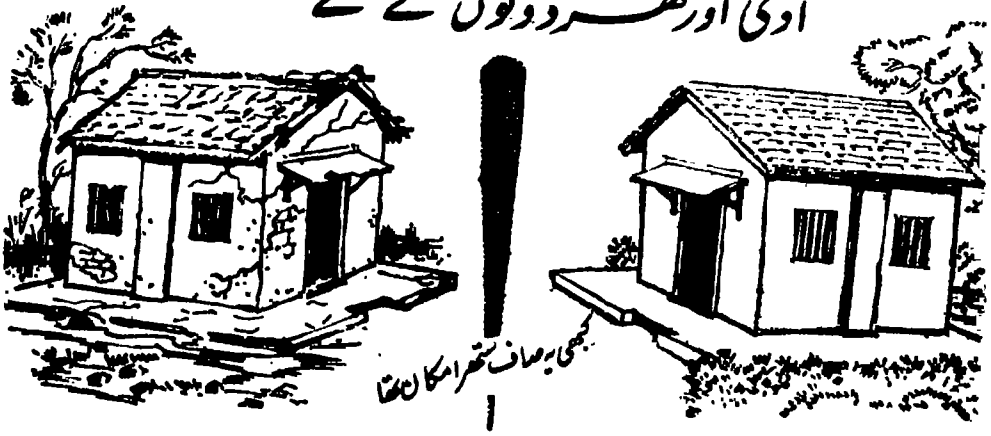

کبھی یہ صاف ستھرا مکان تھا

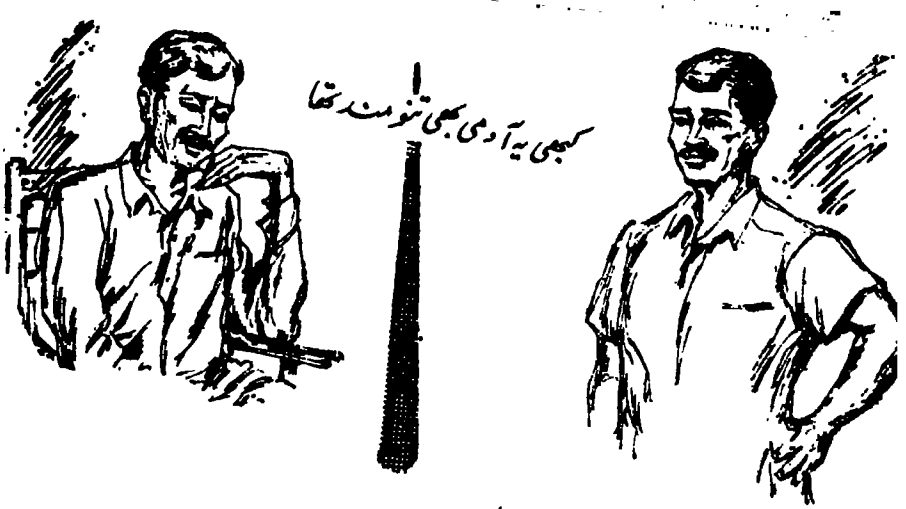

کبھی یہ آدمی بھی تنومند تھا

ملک کے عوام کی طاقت اور وسائل
کا قومی تعمیر کے لئے استعمال
وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے!

ڈائریکٹر پبلسٹی، حکومت مہاراشٹرا۔ بمبئے

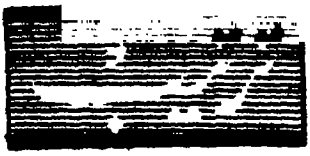

عام انتخابات اور اردو	(اداریہ)	اعجاز صدیقی	۷
سرسٹھ عام کہانیوں کا ساحر	(مقالہ)	ڈاکٹر شبیہ عنبر	۸
غزل		نازش پرتاپگڈھی	۱۳
دو صدا کی تصویر	(افسانہ)	ظفر اوگانوی	۱۴
چھ کردہ نقطے	(نظم)	اعجاز صدیقی	۲۰
غزل		متین سروش	۲۱
غزل		محسن زیدی	۲۱
شوکت تھانوی کی مزاح نگاری کے چند عوامل و عناصر	(مقالہ)	مفتون کوٹوی	۲۲
وارفتہ	(نظم)	صدیق نظر	۲۶
فراق کے موڈ پر	(نظم)	رحمن جامی	۲۶
غزل		نصیر پرواز	۲۷
غزل		کشیری لال ذاکر	۲۷
دودھ کی چائے	(افسانہ)	(آنسہ) اقبال نظام	۲۸
اردو ادب میں مشترکہ تہذیب و تمدن	(خطبہ)	اعجاز صدیقی	۳۲
غزل		عنوان چشتی	۳۸
غزل		اکرم نعیمی	۳۸

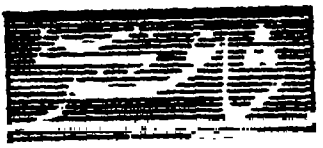

چاند کی واپسی	(ڈرامہ)	سلام مچھلی شہری	۳۹
مسافر	(نظم)	فروغ تمکنت	۴۲
شاعر	(نظم)	شاہد عزیز	۴۲
تیغر بدایونی مرحوم	(مقالہ)	جہانگیر جوہر	۴۳
غزل		حنیف ساغر	۴۶
غزل		صباوالا بجم	۴۶
غزل		عبدالصمد تپش	۴۶
پیاسا سمندر	(افسانہ)	مظفر حسین جاوید	۴۷
بمبئی سے اردو پورٹ تک	(رپورتاژ)	نداں فاضلی	۵۲

مکتوبات

متین سروش — شمس کانپوری طہرانی — نادم انصاری
قیصر تمکندر — آنند فاروقی — احمد حسین دانش
منظور الحسن کاوش — بدیع الزماں خاور — نقی احمد ارشاد

محفل اپنی .....!		ادارہ	۶۲
نقد و نظر	(تبصرے)	ادارہ	۶۳
رفتار	(علمی و ادبی خبریں)	ادارہ	۶۵

آپ کی آنکھیں راز سے آگاہ ہیں!

ہاں! آپ کے چہرے کی دلکشی کے راز کو وہ بخوبی جانتی ہیں۔ وہ ٹھنڈی افغان سنو سے پوری طرح مانوس ہیں ـــــ آپ کی پسندیدہ بیوٹی ایڈ۔ آپ کی آنکھیں آپ کے صحیح انتخاب کی معترف ہیں ـــــ

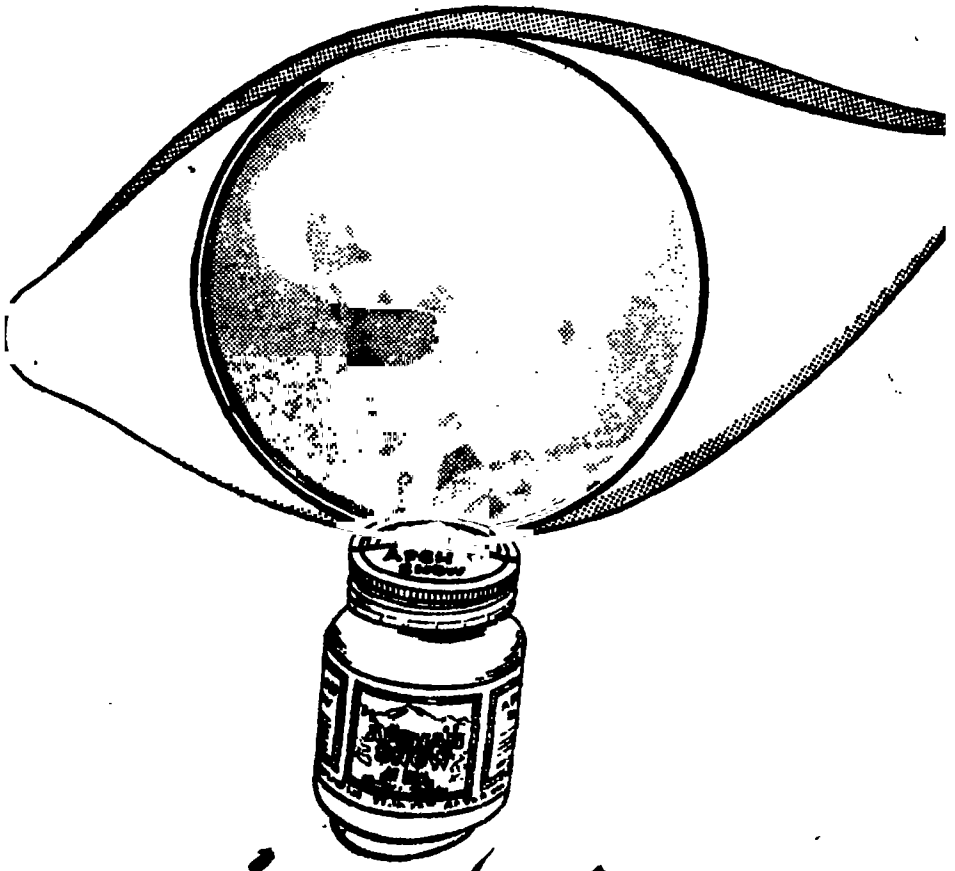

افغان سنو

آپ کے چہرے میں خوشگوار تبدیلی لاتی ہے۔ ملاحت سے بھرپور افغان سنو آپ کے چہرے کے داغوں کو صاف کرتی ہے۔ جھریوں اور کیلوں کی کمیں ختم ہوجاتی ہیں۔ افغان سنو کا شکریہ۔ کہ اس کے استعمال سے آپ کا چہرہ دن بھر تر و تازہ اور جاذب نظر رہتا ہے۔

افغان سنو آپ کی پسندیدہ بیوٹی ایڈ۔

ـــــ ای۔ ایس۔ پاٹن والا۔ بمبئی۔

جرأت

عام انتخابات اور اردو

آئندہ سال پورے ملک میں عام انتخابات ہوں گے۔ پانچ سال کے بعد پھر ہندستانی عوام کی قسمتوں کا سودا ہوگا۔ ہوس اقتدار ننگی ہو کر گلی کوچوں میں ناچے گی۔ دولت لٹائی جائے گی، دولت بٹورنے کیلئے۔ عوام سے جھوٹے وعدے کئے جائیں گے۔ سخت سیاسی رسہ کشی ہوگی۔ بدامنی اور فرقہ پرستی قائم رکھنے کیلئے ایک لامذہب ریاست میں مذہب اور فرقوں کے نام پر ووٹ مانگے جائیں گے۔ جہاں نیک دل مخلص اور خدمت گذار لوگ سامنے آئیں گے، وہیں محض کرسیوں کی زینت بننے والے خود غرض بھی آگے بڑھیں گے۔ خیال ہے کہ آئندہ ہونے والا جنرل الیکشن، پچھلے ہونے والے تمام الیکشنوں سے زیادہ "خوفناک" ہوگا۔

کچھ بھی ہو، ہندستان کو اپنے جمہوری نظام پر ناز ہے۔ ہماری سب سے بڑی جمہوریت کا کاروبار عوام کی رائیوں سے منتخب کئے ہوئے نمائندوں ہی سے چلتا ہے۔ وہ اچھے ہوں یا برے، بہرحال عوام کے نمائندے ہوتے ہیں۔ خواہ کسی دروازے سے کیبنٹ، پارلیمنٹ اور اسمبلی میں کیوں نہ آئے ہوں۔ عوام بھی بڑی حد تک اس کے ذمہ دار ہیں کہ ان کے نمائندگان کیسے ہیں۔

گذشتہ پانچ سال میں ملک کو طرح طرح کی پریشانیوں سے گذرنا پڑا ہے اور اب تو یہ پریشانیاں انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔ بھوک، افلاس، گرانی اور بدامنی عام ہے۔ ہمارا ملک جتنا بڑا ہے اتنے ہی بڑے اس کے مسائل بھی ہیں، اور ان مسائل کو عوام و خواص مل کر ہی حل کر سکتے ہیں۔ ہر چند ملک اب تک خوش حال نہیں ہو لیا ہے، لیکن دنیا کی ترقیاتی دوڑ کا ساتھ دینے کے لئے کوشاں ضرور ہے۔ ہم اپنے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ مگر بدقسمتی سے عوام کی زندگی کا دکھ درد اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ ملک کے ترقیاتی پروگراموں کے متعلق زیادہ نہیں سوچ سکتے۔ عوام کی زندگی تھوڑی بہت پرسکون ہو تو وہ اس طرف توجہ دیں۔ آج راشن کی دوکانوں کے سامنے لائن لگائے ہوئے ہیں تو کل کانسلیٹ کے لیے کیو (Q) میں کھڑے تپ رہے ہیں۔ پرسوں ہڑتال میں شریک۔ دنگے، فساد، اضطراب اور انتشار۔!!

ہمیں یقین ہے کہ ایک دن اسی اضطراب و انتشار سے فلاح و سکون کی راہیں نکلیں گی۔ ہندستان کا روشن مستقبل اب بہت دور نہیں ہے۔ اب ہندستانی عوام زیادہ دن ان حالات کا شکار نہیں رہ سکتے۔ انقلاب حال لازمی اور ضروری ہے۔

کئی کروڑ اردو جاننے والے بھی سیاسی، سماجی اور اقتصادی الجھنوں سے دوچار ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ایک بڑی لسانی الجھن وہ بھی ہے۔ اردو زبان کے سلسلے میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے اب تک کے دیئے ہوئے تمام یقینات نقش بر آب ثابت ہوئے ہیں۔ کسی احتجاج اور کسی گذارش کا ہنوز کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ شاستری جی کے زمانہ میں پھر کچھ امیدیں پیدا ہوئی تھیں۔ وہ بھی ٹوٹ گئیں اور اب سناٹا ہی سناٹا ہے۔ اردو زبان محض اپنے کس بل کی بنا پر لسانی محاذ پر ڈٹی ہوئی ہے۔ ملک میں ہر طرف رنگ جمائے ہوئے ہے لیکن وہ آئینی مراعات جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے اسے ملنی چاہئیں، ان سے محروم ہے اور یہ تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے۔

اپنی بات منوانے اور اپنا حق لینے کے لئے اردو والوں کے سامنے پھر ایک موقع ہے اور وہ ہے آئندہ عام انتخاب۔ ضرورت ہے کہ اردو کے تمام ادارے ابھی سے بیدار ہو جائیں۔ مل جل کر سوچیں کہ آئندہ انتخابات میں انھیں کیا رخ اختیار کرنا ہے۔ کن عملی اقدامات کی ضرورت ہے جو اردو کے مقاصد کو تقویت پہونچائیں۔ اگر آنے والے الیکشن میں ہم اردو والوں نے اپنے ووٹ ضائع کر دیئے تو یہ کچھ اچھا نہ ہوگا۔ کیوں نہ ہم ایک مرکزی اردو الیکشن کمیٹی یا اسی طرح کی کوئی تنظیم وقتی طور پر بنالیں اور تمام امور پر غور کر لیں۔

شاعر کے آئندہ شمارہ میں اس سلسلے میں ہم کچھ تجاویز پیش کریں گے۔ صاحبان فکر و نظر سے ہماری درخواست ہے کہ وہ بھی اپنے مشوروں سے نوازیں۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر

سمرسٹ مائم ــــ کہانیوں کا ساحر

سمرسٹ مائم ایک ایسا فنکار تھا جس نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک دنیا کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو جیتے جاگتے انسانوں کی، زندگی کے نشے سے لبریز کہانیاں سنائیں۔ نقادوں نے اس کے گیت کم گائے، بعض وقت اسے فتولی، کلبی اور سطحی بھی کہا گیا۔ لیکن اس کے باوجود دنیا کے بڑے بڑے ملکوں میں مشرق سے لے کر مغرب تک اس کا سکہ چلتا رہا۔ سمرسٹ مائم بہت عظیم فنکار نہیں تھا، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو مقبولیت، ہر دلعزیزی اور دلوں میں گھر کر لینے کی صلاحیت اس کے فن میں تھی وہ بہت کم لکھنے والوں کے حصے میں آتی ہے۔ سمرسٹ مائم اس دور کا بہت اچھا قصہ گو تھا۔ اس نے کرداس نے انسانی فطرت کے چہرے سے نقاب اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے یہاں روح کی پرواز کا ذکر نہیں، لیکن اس نے مادی زندگی کی ڈوروں کا لقاء ضرور کیا تھا، وہ ایک ایسا بنا جس حیات تھا جس نے زندگی کے مرمز کو سمجھنے کی پرخلوص کوشش کی تھی۔ انسانی فطرت کی بوقلمونی، اس کے تضاد، اور اس کی چھوٹی چھوٹی الجھنوں کو جس طرح مائم نے اپنے ناولوں اور کہانیوں میں پیش کیا ہے وہ بعض دلچسپ اور جاندار نظریں نہیں بصیرت افروز بھی ہیں۔ مائم نے بہت سے مقامات کی سیاحت کی تھی، بہت سے شہر اور گاؤں دیکھے تھے، مشرق اور مغرب میں انسان کو زندگی کے میلے میں کھویا ہوا پایا تھا۔ حیات کی نت نئی اداؤں کو دیکھا تھا۔ پھر انکا لیں کے جزیروں میں فطرت کے بکھرے ہوئے جلوے دیکھے تھے۔ انگلستان اور یورپ کے ماحول میں فرد کو کشمکش حیات سے متصادم پایا تھا، لیکن مائم نے انسانی جذبات کو سمندر پار کی دنیا میں محصور کر کے نہیں دیکھا۔ اس کی نظریں ان دور دراز لکیروں کے پیچھے خود انسان پر بھی ہوئی ہیں۔ اور اسی کی خوشی اور غم، شکست و فتح، مائم کے فن کا موضوع بن جاتی ہے۔ اسی لئے مائم کے فن میں ہمیں ایک عالمی مزاج ملتا ہے۔ ناول زبان اور تکنیک کے اعتبار سے کتنا ہی معیاری کیوں نہ ہو جب تک اس میں لہلہاتی زندگی کی الجھی ہوئی زندگی کا بہاؤ اور وقت کے قدموں کی چاپ سنائی نہ دے، ہمہ گیر مقبولیت اور دلوں میں گھر کر لینے والی موسیقی نہیں پیدا ہو سکتی۔ سمرسٹ مائم نے ناول اور کہانیوں کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے اور ہر صنف ادب میں اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔

سمرسٹ مائم ۲۵ جنوری ۱۸۷۴ء کو پیرس میں ایک برطانوی سفارت خانہ کے ملازم والدین کے گھر میں پیدا ہوا۔ وہ ابھی آٹھ سال ہی کا تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اور دو سال بعد والد نے اسے مکمل طور پر تنہا کر دیا۔ باپ خوش حال تھا اس لئے مائم کو ورثے میں اتنی رقم مل گئی کہ وہ اپنی تعلیم بآسانی جاری رکھ سکے۔ چچا کے گھر میں اس نے تعلیم کی منزلیں طے کرنی شروع کیں۔ مائم کا چچا سخت گیر اور خود ساختہ اصولوں پر کاربند شخص تھا۔ اس لئے مائم کا اس سے نباہ نہ ہو سکا۔ "OF HUMAN BONDAGE" میں اس نے ان تلخ تجربات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ صحت کی خرابی میں اس کی صحت اکثر ٹھیک نہیں رہتی تھی اس زمانے میں تبدیل آب و ہوا کیلئے اس نے فرانس اور جرمنی کا سفر کیا۔ ۱۸۹۲ء میں وہ میڈیکل اسکول میں داخل ہو گیا۔ ۱۸۹۷ء میں مائم نے ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کر لی۔ اسی زمانے میں اس کا پہلا ناول "LIZA OF LAMBETH" شائع ہوا۔ اور کتاب کی غیر معمولی مقبولیت نے مائم کو تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ کیا۔ مائم نے ایک اچھی ملازمت کی پیشکش بھی مسترد کر دی اور ادب کے میدان میں قدم جما لئے۔ ۱۸۹۹ء میں مائم کے مختصر افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں مائم کا اولین ڈرامہ "A MAN OF HONOUR" اسٹیج سوسائٹی کی طرف سے کھیلا گیا۔ اسی سال مائم نے [illegible] "LADY FREDERICK" اسٹیج کیا گیا تو غیر معمولی توقعات پر

ڈراما مقبول خاص و عام ہوا۔ اور مائم کے معاشی مسائل حل ہو گئے۔ مائم نے ڈراما نگاری ہی پر اکتفا نہیں کی وہ زندگی کی ایک جھلک دکھانے والی صنف سے زیادہ اُس صنف سے مطمئن تھا جس کے ایجاز و اختصار میں بہت سے اشارے سما جاتے ہیں۔ اس لئے مائم نے مختصر افسانوں اور کہانیوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ناول اس لئے اُس کی توجہ کا مرکز بنا کہ وسیع کینوس (CANVAS) میں خیالات کے پھیلاؤ اور زندگی کی بھرپور ترجمانی اچھا موقعہ ملتا ہے۔ مائم کے ڈراموں اور ناولوں کی تعداد اسّی سے زیادہ ہی ہے۔ اُس نے ۱۹۵۸ء میں تصنیف و تالیف کا کام ختم کر دیا تھا کیونکہ اس عرصے میں اُس نے ادب کا دامن اُن موتیوں سے بھر دیا تھا جو اس کی زندگی اور تجربات کا بہترین سرمایہ تھے۔

۱۹۳۵ء میں ملکہ الزبیتھ نے مائم کو اعزازی مدارج بنا لیا۔ آکسفورڈ اور بعض دوسری یونیورسٹیوں نے اُس کے ادبی اعتراف کے طور پر اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں بھی دیں۔ اس کے علاوہ وہ لائبریری آف کانگریس واشنگٹن کا فیلو بھی تھا اور اُسے امریکہ کی فن و ادب کی خوش سوسائٹی کا اعزازی رکن بھی بنایا گیا جو کوئی معمولی اعزاز نہیں ہے۔ مائم نے اپنی خود نوشت سوانح SUMMING UP بھی لکھی ہے جس سے اُس کی شخصیت اور خیالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے

سمرسٹ مائم کا پہلا ناول "LIZA OF LAMBETH" ہے۔ اس میں مائم نے عنفوانِ شباب کے سیدھے سادے اور لطیف جذبات کی بڑی دل کش مصوری کی ہے جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہا جا چکا ہے، یہ ناول سمرسٹ مائم نے اُس وقت تخلیق کیا جب وہ ایک طبی طالب علم تھا۔ انسانی فطرت کے اسرار پر سے آہستہ آہستہ پردہ سرکتا جا رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ LIZA OF LAMBETH میں ہمیں انسانی خواہشات کے سرچشمے کا کھوج لگانے کی تمنا مضطرب نظر آتی ہے۔ "لیزا" زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر ایک الھڑ دوشیزہ ہے جو سن کی موج میں ایک ایسے شخص کو دل دے بیٹھتی ہے جو دراصل اُس کی محبت کے قابل نہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ جذبات کی لہروں پر بہتا ہوا "لیزا" کے قریب آگیا تھا۔ پھر "لیزا" کی ایک چھوٹی سی بھول، ایک ان جانی لغزش نے اُس کی زندگی میں دور دور تک اندھیرے پھیلا دیئے۔ اخلاق کے معلّم اور محتسب اس قسم کے قصوں کے اسی طرح کے انجام کے متوقع ہوتے ہیں LIZA OF LAMBETH میں مائم ایک الیسا فنکار محسوس ہوتا ہے اخلاقی قوانین کی زیادہ پروا نہیں لیکن قصّے کا انجام خود اس بات کا شاہد ہے کہ وہ پروہ مائم نے یہ بتایا ہے کہ زندگی کے ناپسندیدہ تجربات کا نتیجہ بھی تلخ اور ناپسندیدہ ہوتا ہے لیکن خیر اور شر کے بارے میں اُس نے کوئی قطعی جواب نہیں دیا۔

انسانی فطرت اتنی پیچیدہ، پُراسرار اور اتنے رنگا رنگ عناصر کا مجموعہ ہے کہ اُس کی تہوں کو کھولنا اور اُس کا تجزیہ کرنا آسان نہیں۔ وہ اکثر مذہبی، اخلاقی اور سماجی قوانین کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنی انفرادیت کا اظہار بھی کرتی ہے۔ مائم نے اپنی تخلیقات میں اس پر اکثر جگہ اظہارِ خیال کیا ہے اور اس وجہ سے اکثر اُس کو بیباک، عریاں اور کلبی کہا گیا ہے۔ مائم نے خود ایک جگہ ان نقادوں کو برجستہ جواب دیا ہے۔ اُس کا ایک کردار کہتا ہے:

"اگر صداقت سے آنکھیں چار کرنا اور اس کی تلخی پر مسکرانا، انسانی فطرت کو اسی طرح سمجھنا جیسی وہ دکھائی دے، اُس کی حماقتوں پر مسکرانا، اور اگر وہ قابلِ رحم ہوں تو اُن سے ہمدردی ہونا کلبیت ہے تو میں مزدور کلبی ہوں۔"

مائم کی ناول نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کرداروں کے اعمال کو خیر و شر، نیکی اور بدی یا سود و زیاں کے پیمانے سے ناپنے کا قائل نہیں۔ وہ کبھی کبھی انسان کے عمل اور ردِ عمل کی توجیہ ضرور کرتا ہے۔ مگر اُن پر لیبل چسپاں کر کے وہ فنکار کے منصب کو معرضِ خطر میں ڈالنا نہیں چاہتا مائم کی ایک مشہور تصنیف Nan and six Pence جو بہت سے اعتبارات سے انگریزی کا ایک قابلِ قدر ناول ہے۔ اس میں مشہور فرانسیسی مصوّر پال گاگیں Paul Gauguin کی زندگی کا پرتو موجود ہے۔ اس ناول میں مائم نے آرٹ، عورت، محبت، اخلاق اور سوسائٹی کے بارے میں بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو یقیناً چونکا دینے والے ہیں۔ اسٹرک لینڈ کا کردار کوئی انوکھا کردار نہیں۔ وہ بے حس، لاپروا، نرم جذبات سے عاری ایک خود پسند انسان ہے۔ وہ ایک بے وفا شوہر اور بیوفا باپ ہے۔ اور اس بیدردی اور بے وفائی پر وہ پچھتاتا نہیں۔ اُس کا ضمیر ملامت نہیں کرتا اور اس کے دل میں اپنے گھر بار اور بیوی بچوں کو خیرباد کہتے ہوئے کوئی کسک پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے فن کے ساتھ انصاف کرنے South Seas چلا جاتا ہے۔ اسٹرک لینڈ اپنے فیصلوں پر پشیمان نہیں ہوتا۔ اُس کی بیوی Ata انتہائی وفادار عورت ہے۔ لیکن اُس سے بھی اسٹرک لینڈ کو کوئی ہمدردی نہیں۔ اسٹرک لینڈ بہت سی

نی کمزوریوں کا شکار ہونے کے باوجود حقیقی معنی میں فنکار ہے۔ وہ فن کیلئے حالات سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اور اُن پر فتح پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کے استقلال، پامردی اور ثابت قدمی کی ہر حال داد دینی پڑتی ہے۔ اُس کی زندگی اور موت دونوں دلچسپ ہیں۔ وہ مرنے سے کچھ دن قبل اپنی قبر پر بیٹھی کی تصویر کھینچتا ہے۔ یہ آرٹ کا ایک نایاب نمونہ تھا لیکن اسٹرک لینڈ کی قبر پر بڑی آتش زدگی کی جاتی ہے کیونکہ وہ ایک خطرناک بیماری میں مبتلا ہے۔ اس موقع پر ہمیں محض مصوری کے ایک بے مثل شاہکار کی تباہی کا رونا نہیں ہوتا۔ ایک ذہین فنکار کے حسرت ناک انجام پر ہماری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ سمرسٹ مائم کے ناولوں میں Moon and six Pence کا بھی جسے کو لازوال اہمیت حاصل ہے۔ یہاں مائم کی فنکارانہ صلاحیتیں پورے شباب پر نظر آتی ہیں SITUATION کو اتنا موثر، دلسوز اور مکمل بنا کے پیش کرنا معمولی ادیب کا کام نہیں۔

۱۹۱۲ء میں مائم نے "Human Bondage" لکھنی شروع کی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خود مائم کی تصویر حیات ہے۔ طبی طالب علم۔ لیپ کیرالڈ اصل مائم ہی ہے۔ کیری لنگڑا ہے اور مائم سمجھا۔ فلیپ کیرا کا کردار ذہنی غلامی سے آزادی فکر تک پہنچنے کی مختلف منزلوں کی ترجمانی کرتا ہے کیرالڈ ۱۹۱۵ء پر فریفتہ ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایسی بے پناہ اور اعتماد عشق کے لائق نہیں۔ اس کی طرف کھنچتا ہی جاتا ہے۔ یہ حساس شخصیت جو صداقت کی روشنی کی تلاش میں ہے اندھیروں میں گھر جاتی ہے۔ اس ناول کو مائم کا شاہکار سمجھا گیا ہے۔ اس ناول کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ مائم اس میں زندگی کے نت نئے تجربات اور اس کے گوناں پہلوؤں، اس کے پست و بلند اور اس کی رنگینوں کا بڑا گہرا شناسائی نظر آتا ہے۔ قصے کی بستی، کرداروں کی متحرک اور گویا تصویریں، اس کی صاف ستھری نثر جس میں کہیں جھول نہیں اور ناول کی تنگ پر مائم کا عبور، ہمارے ذہن پر اس کی عظمت کی مہر ثبت کر دیتا ہے۔ مائم کی بڑائی اور اس کی ادبی حیثیت اسی میں اس نے عام انسان کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ انسان جو پیار کر کے دھوکا دیتا ہے، جو شرافت کی لاج رکھ لینے کے لئے جان کی بازی بھی لگا دیتا ہے، جو خون خرابہ بھی کرتا ہے۔ ہیروں کی شکست و ریخت بھی ہوتا ہے اور اچھی کامرانی پر نازاں بھی ہوتا ہے۔ ایثار و صداقت کی خاطر اندیشۂ سود و زیاں سے بے نیاز ہو جاتا ہے ہی انسان مائم کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ مائم نے دلوں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے وہ سمجھتا ہے کہ ہر نقاب کے پیچھے حسین چہرہ نہیں ہوتا۔ مائم ہر دل انسان میں بھی فرشتوں کی کوئی صفت دیکھ لیتا ہے اور بہترین آدمی کے دل میں چھپے ہوئے شیطان کا کھوج لگاتا ہے۔ مائم کہتا ہے:۔

"ایک آدمی ہر وقت اچھا اور برا ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ایسے بدمعاشوں سے بھی واقف ہوں جو انتہائی اعلیٰ درجے کے ایثار کے قابل ہیں۔ بدترین چور جو انتہائی اچھی فطرت رکھتے ہیں اور طوائف جن کی زندگی کا مقصد بے لوث محبت کرنا ہے۔ میرا مشاہدہ مجھے اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ بہت سے اچھے اور برے میں زیادہ فرق نہیں ہے جیسا کہ معلم اخلاق ہمیں سمجھاتے ہیں۔"

اپنے ایک مختصر افسانے "Rain" میں مائم نے اسی خیال کو اپنا مرکزی تصور بنایا ہے۔ "رین" ایک ایسی کہانی ہے جس کو نہ صرف مائم کی دیگر تخلیقات بلکہ انگریزی کے افسانوی ادب میں بھی ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے (اس کو فلمایا بھی گیا ہے) یہ Somerset Sea کے ایک جزیرے کی کہانی ہے جس میں اتفاقاً ایک مشنری ریورنڈ ڈیوڈسن، ایک ڈاکٹر اور ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اخلاقی قدروں پر زیادہ ایمان نہیں رکھتی۔ اس عورت کے روپ کو دیکھ کر ڈیوڈسن کو بڑا افسوس ہوتا ہے۔ وہ اس کو نیکی کے راستے پر کھینچ لانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس الزام پر ہوتا ہے کہ ڈیوڈسن اس کو راہ راست پر لانے کے بجائے خود گناہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اسی پچھتاوے میں خودکشی کر کے اپنا زندگی ختم کر لیتا ہے۔ Sadie کے منہ سے بے اختیار ڈیوڈسن کی لاش کو دیکھ کر یہ الفاظ نکلتے ہیں:۔ تم سب ایسے ہی ہو! سب کے سب سؤر!

"Rain tree Vacific" میں مائم نے راہبوں کی زندگی پیش کی ہے۔ وہ اکثر جگہ جان کی انتہا پسندی کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ نیڈرلینڈ میں پین کے مناظر، راہبہ عورتوں کی زندگی اور ان کے مسائل پر زور دیا گیا ہے۔ فرانس میں یہ کتاب مائم کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا نقطہ فنی اعتبار سے بڑا ہی دلچسپ اور موثر ہے۔ مائم اس ناول میں کچھ روحانیت پرستوں کے کڑے اصولوں کی گرفت ڈھیلی کرنے کی کوشش کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس میں مائم کا مخصوص طنز بھی ہے۔ وہ برطانوی نوآبادیات کے انگریز افسروں کی حماقتوں پر مسکرا دیتا ہے۔ اس ناول میں ایک طرف چین کی راہبہ عورتیں ہیں، جنہوں نے روح کی نشوونما کیلئے جسم کے تمام تقاضوں سے منہ موڑ لیا ہے تو دوسری طرف وہ ہیروئین ہے جو جذبات کی تسکین کیلئے کردار کی پاکیزگی کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے۔ مائم راہب عورتوں کے بارے میں لکھتا ہے:۔

یہ دونوں جمع حاصل کرنا چاہتا ہیں وہ ایک فریب تصور ہے، اور اس جملے میں مائم کی شخصیت اور اس کے تصورات کی ترجمانی موجود ہے۔

"Out station" میں ایک مختصر افسانہ ہے جس میں مائم نے یہ بتایا ہے کہ زندگی میں ہمیشہ حق و صداقت کی فتح نہیں ہوتی کبھی کبھی شر کی خیر پر غالب آجاتا ہے۔ اس میں دو متضاد افسروں کا ذکر ہے ایک برطانوی نوآبادی میں ملازم ہیں۔ بڑا افسر مغرور، کم آمیز، ظالم اور اصول پرست۔ چھوٹا افسر نیک دل، ملنسار، خدا پرور، اور مساوات کا قائل ہے۔ وہ انسان سے محبت کرتا ہے۔ افسر اور ماتحت، غریب اور امیر یا کالے گورے کے امتیازات سے قطعاً ناواقف ہے۔ خیالات اور تصورات کے اس اختلاف نے دونوں افسروں میں نفرت پیدا کر دی۔ اور پھر مسابقت کے جذبے کے تحت ان دونوں میں ٹکراؤ ہوا۔ آخر میں بڑے افسر کا بھیجا ہوا نوکر چھوٹے افسر کو اپنے آقا کے راستے سے ہمیشہ کے لئے ہٹا دیتا ہے اور اس طرح ظلم، جبر، غرور و خود پسندی کو محبت و محبت، انسان دوستی، رحمدلی اور نیک نفسی پر فتح حاصل ہوتا ہے۔ مائم نے کہانی یہ کہہ کر ختم کی ہے کہ دنیا میں ہر وقت حق کی فتح نہیں ہوتی، ناحق بھی کامیاب و ظفر مند ہوتا ہے۔

مائم کی Cakes and Ale ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مائم نے اس میں ہارڈی کا مذاق اڑایا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے خود مائم نے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیکس اینڈ ایل میں ایک نوجوان ایک شادی شدہ عورت کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ڈرلفیلڈ کا کردار اس میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس سے زیادہ اہم خود اس کی پہلی بیوی روزی Rosie ہے۔ روزی بظاہر کوئی نیک چلن عورت نہیں۔ وہ زندگی پر کبھی سنجیدگی سے غور کرنا نہیں چاہتی۔ وہ انسانی حیات کو سود و زیاں سے اوپر اٹھ کر ایسا کھیل سمجھتی ہے جس میں کھلاڑی کو ہر حال کھیلنا ہی چاہیئے۔ خود اپنی تکمیل کیلئے بھی اور دوسروں کے تفریح کیلئے بھی۔ ڈرلفیلڈ کی بیوی اس کی سالقہ بیوی کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اور اس کی بد چلنی اور بد اخلاقی پر چوٹ کرتی ہے تو مائم جواب دیتا ہے:۔

"روزی ایک سیدھی سادی عورت تھی۔ اس کی خواہشیں اور اس کی فطرت سادہ تھی۔ وہ لوگوں کو خوش کر کے خوش ہوتی تھی ——— محبت کرنا اس کی فطرت میں داخل تھا۔ یہ بدکاری تھی یا حماقت تھی۔ یہ اس کی فطرت تھی۔ وہ اپنے آپ کو اسی طرح پیش کرتی تھی جس طرح سورج گرمی پہنچاتا ہے اور پھول مہک دیتا ہے۔ اس سے اس کی سیرت متاثر ہوتی تھی۔"

یہاں مائم کی مشہور تصنیف "Summing up" کا ایک جملہ یاد آتا ہے جس میں اس نے کہا ہے:۔

"زندگی کا حسن اسی میں ہے کہ ہر ایک اپنی فطرت اور مزورت کے مطابق کام کرے۔"

Rayer's Edge بھی مائم کے ناولوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں مائم نے مشرق اور مغرب کے متضاد اور تفاوت رکھنے والے مذہبی رجحانات کی آویزش کا بڑی خوبی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ ایک سنجیدہ اور انسانیت کی بنیادی خصوصیات پر غور کرنے والا ذہن اس سے کس طرح متاثر ہو سکتا ہے یہ ایک ایسے "معمولی انسان" کی کہانی ہے جو "غیر معمولی" حالات میں گھرا ہوا ہے۔

سمرسٹ مائم نے برما، سیام، ملایا، سنگاپور، سماترا اور جاوا وغیرہ کے ماحول اور وہاں کے فطری مناظر کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ مائم اپنی تخلیقات میں انسانی فطرت کے بیان کے علاوہ مظاہر قدرت کا بڑا اچھا مصور بھی معلوم ہوتا ہے۔ وہ جس ماحول میں کہانی کے پس منظر کو اتارتا ہے اس کی تصویر قاری کی نظروں کے سامنے متحرک ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ مائم کے شوق سیاحت نے اس کے مشاہدے کو وسیع تر کر دیا تھا۔ اور اس کی جزئیات نگاری میں جان ڈال دی تھی۔ اس سلسلے میں خاص طور پر The Fall of Edward Barnard قابل ذکر ہے۔ یہ جنوبی بحرالکاہل کے ایک چھوٹے سے خوبصورت جزیرے کی کہانی ہے جہاں ایک امریکی نوجوان اتفاق سے چلا آتا ہے۔ جزیرے کی رومان پرور فضاؤں میں وہ کچھ عرصے کیلئے کھو جاتا ہے اور یہاں ایک حسین لڑکی اس کی زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔ مائم نے اس جزیرے اور اس کے باشندوں کی جو تصویریں پیش کی ہیں وہ ذہن پر ایک انمٹ نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ اس مختصر افسانے کا قصہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ اور مصنف کی بعض اہم خود خال کو بے نقاب کرتا ہے۔ مائم کے مختصر افسانوں میں

Out Station, The Yellow Streak, The letter, The fall of Edward Barnard, Red, Rain, Ashenden اور Cosmopolitans, Altogether, کی کہانیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مائم کے ادبی اکتسابات میں اگر طنز کا عنصر بھی موجود ہے Cakes and Ale میں اس نے اپنے بعض ہم عصر ادیبوں کی تحریروں کی خامیوں، ان کی خود پسندی اور سطحیت کا مذاق اڑایا ہے۔ Painted Veil میں ایک جگہ برطانوی نوآبادیات کے افسروں کو اپنے مخصوص طنز کا اس طرح نشانہ بنایا ہے، انھیں تیز اور ہوشیار آدمیوں کی ضرورت نہیں۔ ہوشیار آدمی خیالات رکھتے ہیں اور اس سے فساد پیدا ہوتا ہے۔

سمرسٹ مائم نے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ اس کے ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ مائم نے ڈرامے کی فنی ارتقا میں اپنا کوئی رول ادا نہیں کیا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ڈرامے خواص اور عوام دونوں کا دل لبھاتے رہے۔ مائم کے یہاں برنارڈ شا کی سی فنی بلندی، وسعت نظر اور تجزیاتی انداز نہیں۔ اس کے ڈرامے زیادہ تر طربیہ ہیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو جوڑ کر اس نے ان سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ بہت زیادہ بصیرت افروز نہیں، لیکن ان میں انسانی کمزوریوں اور خوبیوں کو جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش ہے۔ مائم کی نثر میں جو طنز ملتا ہے اس کا نام "Summing up" اور "The Gentleman in the parlour" ہے مائم کی طرح تحریر کی سحر آفرینی، جاذبیت اور بے پناہ روانی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مائم کے سفرناموں میں مناظر، مقامات اور اشخاص کے بڑے خوبصورت مرقعے موجود ہیں۔

مائم اپنے ناولوں، مختصر افسانوں میں تجربے کے بجائے روایت کی طرف مائل معلوم ہوتا ہے۔ جس زمانے میں مائم کا ادبی شعور بیدار ہوا تھا، انگریزی افسانہ نگاری، ہیجوت سے متاثر تھی۔ مائم ہیجوت کے فن کا اعتراف کرتا ہے، لیکن وہ ہوپاساں سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ ہوپاساں کے مختصر افسانے میں تلوار کی سی تیزی، آبگینے کی سی نزاکت اور شبنم کا سا گداز ہوتا ہے۔ اس کی حقیقت پسندی زندگی کے گریزاں لمحات کو فن پارہ بنا کر پیش کرنے کی صلاحیت، زندگی کی وسعتوں کو سمیٹ لینے کا رجحان اور اس کے ڈرامائی انداز سے مائم متاثر ضرور ہے۔ ہیجوت کے یہاں زندگی کے پراسرار دھندلکوں، اس کی پہنائیوں اور زندگی کے سرچشمے کا کھوج لگانے کی جو آرزو ملتی ہوئی نظر آتی ہے اس کو مائم پسندیدہ نگاہوں سے مسعود دیکھتا ہے۔ لیکن مائم واقعات کیفیات اور جذبات کی مصوری پر قصے کی دلچسپی اور حسن کو مینٹ چڑھا دینے کا قائل نہیں معلوم ہوتا۔

مائم کے یہاں ایک طرح کی معروضیت ملتی ہے۔ مذہبی قدروں میں وہ ذہنی تشکیک کے سامان نہیں پاتا۔ وہ روحانیت کا قائل نہیں اچھے اخلاق کا حامی ہے۔ اس نے سنہ وسیت کی فنی اداس کی نعش کو مذہبی رسومات انجام دیئے بغیر نذر آتش کر دیا جاتا۔ مائم نے کوئی خاص فلسفہ حیات پیش نہیں کیا وہ اکثر چیزوں کو کھوکھلا، شکر طاقتور اور ہمہ گیر پاتا ہے۔ جن قدروں کو ہم سدا بہار اور ابدی تصور کرتے ہیں وہ ان کو زندگی کا ایک عارضی پہلو سمجھتا ہے لیکن اس کا انداز جارحانہ نہیں ہے۔ اس کی تخلیقات میں انسان کا بھرپور مرقع ملتا ہے۔ اس کی تصانیف میں انسان اپنی فطرت کے رنگا رنگ پہلوؤں اور اپنی ساری تیز نگیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ مائم کو نوبل انعام کا مستحق نہیں سمجھا گیا اس کی تصانیف میں بعض نقادوں کو کمی نقص نظر آتا ہے لیکن ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مائم ان چند ادیبوں میں سے تھا جسے دنیا کی آبادی کے ایک قابل لحاظ حصے نے بہت پڑھا اور بہت سراہا۔ ●●

بقیہ افسانہ "پیاسا سمندر" صفحہ

سے بہت کچھ کہہ گئی ——— کہ عورت کی نفرت میں کتنی گہری تاریکی ہے اور محبت میں کتنی بے بسی ——— اور یہ کہ زندگی میں اور موت میں رات کا اندھیرا ——— میری گردن جیسے کٹے ہوئے بازو کی طرح لٹک گئی۔

مجھے آج بھی یاد ہے اس کی وہ چیخ جس میں میری زندگی ڈوب کر رہ گئی تھی ——— مجھے معلوم نہیں میں کب تک خیالات میں کھویا، اس کی الٹی چیخوں میں ڈوبا رہا۔ جب میں خیالات سے چونکا اور اس کے کمرے تک پہنچا تو میں نے دیکھا وہ بستر پر تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہی تھی اور زمین پر تیزاب کی شیشی خالی پڑی تھی ——— صبح ہوتے ہوتے وہ مر چکی تھی۔

"اُف! یہ کتنی بڑی لڑکی ہے ——— !!" میں نے کہا

وہ کہنے لگا ——— "لڑکی یہ نہیں کہ رحمتی موت کے اندھیرے میں ڈوب کر رہ گئی اور یہ کہانی ختم ہو گئی۔ یہ کہانی تو اب شروع ہوئی ہے ——— جنگ رک گئی ہے اور کل ایک ہفتے کی چھٹی لے کر اپنا وہ خواب پورا کرنے کیلئے آ رہا ہے جس کی ایک ہلکی سی جھلک وہ بہت پہلے دیکھ چکا تھا۔"

کچھ دیر وہ خاموش رہا۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ باہر بہت تیز بارش ہو رہی تھی اور اس کی لہریں دور کہیں طلاؤ

شاعر بمبئی

نازش پرتابگڈھی

غزل

خاموشیوں کو نُدرتِ گفتار کہہ گئے
کیا لوگ تھے جو دار کو دلدار کہہ گئے

ہاں اے حیاتِ سخت و گراں ہم پہ ناز کر
ہم تھے جو ہر ستم کو ترا پیار کہہ گئے

طوق و رسن کو نام دیا زلفِ دوست کا
زنداں کو سایۂ نگہِ یار کہہ گئے

اپنی ہی طرح وہ بھی رہینِ ستم تھے، جو
شام و سحر کو کاکلِ و رُخسار کہہ گئے

اب اور کیا رکھا ہے ترے وحشیوں کے پاس
اک حرفِ شوق تھا جو سرِ دار کہہ گئے

سمجھے تھے ذمّہ دارِ وقارِ چمن جنھیں
نرگس کو وہ بھی دیدۂ بیمار کہہ گئے

اے زندگی وہی قدرِ رعنائے حُسن تھا
تیرے اداشناس جسے دار کہہ گئے

ذہنِ بشر بھی دیتا ہے سو طرح کے فریب
خوابوں کو ہم بلندیٔ افکار کہہ گئے

ملتے مرے غموں سے تو چیخ اُٹھتے وہ بزرگ
جو خامشی کو عظمتِ کردار کہہ گئے

جن کی سمجھ میں آ نہ سکا معنیٔ سکوت
وہ حالِ دل کو تشنۂ اظہار کہہ گئے

نازش وہ خود بھی آخری دم تک جیا کئے
جو لوگ زندگی کو اک آزار کہہ گئے

ظفر اوگانوی

دُھندلی تصویر

بعض لوگ رازوں کے سہارے آگے بڑھا کرتے ہیں۔

لیکن پروفیسر نعمانی کے ساتھ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ ایک کھلی کتاب تھے، جو چاہے جہاں سے پڑھ لے۔ انھوں نے اپنی کوئی بات کسی سے چھپا کر نہیں رکھی تھی۔ شاید وہ ایسا کرنے کے اہل بھی نہیں تھے۔ وہ ہر ایک بات دوسرے سے کہہ لینے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ اور اس طرح انھیں ایک سکون سا ملتا تھا ویسے کہنے سے پہلے وہ ہر ایک بات کی اہمیت کا اندازہ ضرور لگا لیتے اور خود کو اس نتیجے پر پہنچاتے کہ یہ بات کس سے کہنی چاہیئے، اور کس سے نہیں۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ان کی وہ اہم بات جس کے متعلق انھوں نے سوچا تھا کہ یہ کسی سے نہیں کہنی چاہیئے خود اُن ہی کی زبان سے اُن کے تمام دوستوں تک پہنچ گئی۔ جیسے ایک بار انھوں نے کامرس کالج کی لکچرشپ کیلئے انٹرویو دیا۔ اُسی دن شام میں اُن سے کسی نے کہا کہ وہ لے لئے گئے ہیں۔ اُن کے خیال میں جس ذریعہ سے یہ خبر ملی تھی وہ معتبر تھا۔ اس کے بعد انھیں اور کیا چاہیئے۔ دوڑے ہوئے اشرف کے پاس گئے اور بے تکلفی سے کہا۔

"تجھے مبارک باد نہیں دوں گا۔"

"کچھ بتاؤ گے بھی۔ میں تمھیں مبارک باد دوں گا اور مٹھائی بھی کھلاؤں گا۔"

"کامرس کالج میں میرا لکچرر ہو گیا ہے۔"

جب آدمی کو غلط توقع کوئی بڑی خوشی حاصل ہو جائے تو وہ بچوں کی طرح اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہے اور چڑیوں کی طرح چہچہانے لگتا ہے۔ یہی حال اُس وقت نعمانی کا بھی ہو رہا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے انہیں جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ وہ اشرف کے کچھ قریب آئے اور سرگوشی کے انداز میں بولنے لگے۔

"مگر دوست! ابھی اس کو راز ہی رہنے دینا۔ کسی سے ہرگز ہرگز مت کہنا۔"

اشرف کو نعمانی کی ملازمت کی خبر سے بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ اور خوشی کے پُرخلوص مظاہرے کیلئے اس وقت جب الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے سکے تو وہ قریب کے ہوٹل میں نعمانی کو لے گیا تھا۔ وہاں بیٹھ کر اشرف نے اُن کو کچھ مشورے دیئے تھے۔ مستقبل کی تعمیر کیلئے کچھ مفید باتیں بتائی تھیں۔ اور آخر میں اُس نے نعمانی سے یہ بھی کہا تھا کہ دیکھو اس کا تذکرہ کسی اور سے تم بھی نہ کرنا۔ جس روز سے وہ اُن کو لے کر اُس روز سمجھ لو کہ ملازمت مل گئی۔ مگر دوسرے ہی دن اشرف سے کئی ملنے والوں نے کہا کہ انھیں بھی نعمانی کے تقرر کی خبر مل چکی ہے۔ اشرف کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ خبر اتنی جلدی اُن سبھوں کو کس طرح مل گئی جبکہ یہ بات نعمانی نے صرف اسی کو بتائی تھی۔ اور دوسروں سے نہ کہنے کی بات طے پائی تھی۔ تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ نعمانی خود بھی رات میں ہر ایک کے یہاں گئے اور فرداً فرداً سبھوں کو اپنی تقرری کی خبر دی۔ اور چلتے چلتے ہر ایک سے انھوں نے وعدہ لے لیا کہ یہ خبر وہ اپنی ذات تک محدود رکھیں ——— لیکن ہوا یہ کہ تقرری کسی دوسرے کی ہو گئی اور نعمانی کفِ افسوس ملتے رہ گئے۔ افسوس اس بات کا نہیں تھا کہ انھیں جگہ نہیں مل سکی بلکہ مردِ مہذب اس کا تھا کہ وہ غلط قسم کے ایک ملاقاتی کی بات کو سچ سمجھ بیٹھے تھے۔ اس کے نتیجے میں انھیں جس طرح کی ذہنی تکلیف برداشت کرنی پڑی۔ اُس کے پیشِ نظر نعمانی کا یہ فیصلہ غیر متوقع ہرگز نہیں تھا کہ آئندہ وقت سے پہلے کوئی بات کسی سے نہیں کہی جائے گی ——— لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آپہنچا کہ وہ لکچرار ہو گئے اور نعمانی پروفیسر نعمانی کہلانے لگے۔

کالج میں مقبولیت کیلئے اُنکے پاس ظاہری پُرکشش شخصیت بھی تھی اور تعلیمی صلاحیت بھی۔ اسی لئے دیکھتے دیکھتے وہ ہر دل میں گھر کر گئے۔

جب کبھی وہ چھٹی پر ہوتے تو اساتذہ کرام میں اُن کی کمی محسوس کی جاتی۔ اور جب اساتذہ کرام میں موجود ہوتے تو اُس میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے۔ قہقہے اُبل پڑتے۔ چوڑیاں چھنک جاتیں۔ کنواری آوازوں کا ترنم گھونٹ پڑتا۔

شیلی کی شاعری پر میں نے نئے دو صفحے لکھے ہیں۔ انھیں دیکھ لیجئے گا سر!"

سال چہارم کی طاہرہ خانم اٹھی اور آواز میں شہد گھول کر بولی۔

"سر! میری اٹنڈنس چھوٹ گئی ہے۔ ذرا بنا دیجئے نا۔ پلیز سر!"

اور پھر تیسری لڑکی آگئی۔

"سر کیشن کی یہ لائنیں میرے پلّے بالکل ہی نہیں پڑیں۔ ذرا سمجھا دیجئے نا سر!"

وہ اُن لڑکیوں سے کچھ اس انداز میں باتیں کرتے جیسے دسمبر کے آخری دنوں کی بارش میں وہ بھیگ رہے ہوں۔ یا کلیجہ چوں کے تپتے سورج کے نیچے انھیں کھڑا کر دیا گیا ہو۔ کسی بھی لڑکی کو جواب دینے سے پہلے اُن کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جمع ہو جاتے۔ آنکھیں جھک جاتیں۔ کہنا کچھ چاہتے اور زبان سے اتفاقاً کچھ نکلتے۔ اس عالم میں دیکھ کر اُن کے بعض ساتھی پروفیسروں کو کچھ افسوس ہوتا۔ کچھ رشک کرتے اور کچھ نغمانی کی سادہ لوحی پر قہقہے تک چھوٹ کر جاتے۔ مگر اس سے نغمانی کے کردار میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ ان چیزوں کا جو ردِ عمل ہوا اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں اب اور زیادہ خوفزدہ نظر آنے لگے ہیں۔ پہلے وہ لڑکیوں کا کم سے کم سامنا تو کر لیتے تھے۔ مگر اب جیسے ہی انھیں اس بات کا احساس ہو جاتا کہ کوئی طالبہ اُن سے کچھ پوچھنے آرہی ہے، تو وہ اسٹاف روم کے دوسرے دروازے سے نکل جاتے۔ خاص طور پر طاہرہ سے وہ کوسوں دور بھاگتے حالانکہ طاہرہ سے باتیں کرنے کے لئے ہر ایک پروفیسر کوئی نہ کوئی موقع تلاش کیا کرتا تھا۔ جیسے سیاسیات کے پروفیسر نادر رستمؔ کبھی طاہرہ کو گذرتے ہوئے دیکھ لیتے تو اُسے بہت ہی شفقت سے بلاتے اور اپنے سامنے کھڑا کر کے اُسے مشورے دیتے

"مس طاہرہ! یہ دیکھئے آپ تھیوری کیلئے اے، بی کیمبرج کی کتاب نوٹ کر لیجئے۔ اس کتاب کے بعد آپ کو دوسری کتابوں کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ ویسے اگر آپ چاہیں تو سیلیکٹڈ اور ہیرالڈ سے بھی فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ اور ہاں کانسٹی ٹیوشن کیلئے آپ نوٹ کر لیں....."

یا پھر اردو کے پروفیسر خیامؔ کو اگر خوش قسمتی سے موقع مل جاتا تو وہ کچھ اس طرح جال پھینکتے۔

"دیکھئے طاہرہ خانم! بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ موجودہ اُردو غزل کے بارے میں آپ ابھی کچھ نہیں جانتی ہیں۔ یہ اس لئے کہنا پڑ رہا ہے کہ گذشتہ نوٹریل میں آپ سے میں نے میرؔ کی غزلوں کے متعلق سوال کیا تھا اور آپ نے مجاز اور ساحر کی غزلوں پر تنقید کی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ سب کے سب ترقی پسند شاعر ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک کا اپنا مزاج ہے۔ اپنی آواز ہے۔ اپنا آہنگ ہے۔ اور اپنا علیحدہ لب و لہجہ ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ اُردو میں بھی سب سے اچھی رہیں۔ اس کیلئے آپ کو ترقی پسند ادب کا مطالعہ کرنا چاہیئے....."

لیکن پروفیسروں کے یہ مشورے طاہرہ کو کبھی متاثر نہ کر سکے۔ اس لئے کہ وہ جانتی تھی کہ ان مشوروں میں صداقت ہو تو ہو مگر خلوص نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر ایسی بات بھی نہیں تھی کہ وہ سیاسیات پر توجہ نہیں دیتی ہو یا اُردو ادب سے اُس کی دلچسپی معمولی ہو۔ وہ ہر ایک شعبہ کے مصنف کی کتاب پڑھنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ پھر یہ کہ اُردو ادب سے اُس کا گہرا تعلق تھا۔ اس کے باوجود وہ کبھی کبھی کلاس میں سوالات کا جان بوجھ کر کچھ اس طرح جواب دیتی کہ خواہ مخواہ پروفیسر کو اس سے بھدردی پیدا ہو جاتی اور وہ متعلقہ فن پر کتابوں کی ایک طویل فہرست لکھوانا ضروری سمجھتا۔ اس طرح کی بھدردی کا دوسرا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ چند لمحوں کیلئے طاہرہ کی قربت مل جائے۔ لیکن وہ جس پروفیسر سے قریب ہونا چاہتی تھی وہ صرف پروفیسر نغمانی تھے۔ مجبور نے اُس کو روک کر کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ اور کبھی کوئی مشورہ نہیں دیا تھا حالانکہ وہ یہ چاہتی تھی کہ پروفیسر نغمانی کوئی مشورہ دیں تاکہ وہ آئندہ کی ادبیات اور اُس کی تنقید و تاریخ سے بھی گہرا رابطہ پیدا کر سکے۔ اس لئے اُس نے سوچا تھا کہ نغمانی سے اپنے گھر پر روزانہ تھوڑا وقت دینے پر اگر راضی ہو جائیں تو بات بن جائیگی۔ مگر بات نہیں بنی۔ اس لئے کہ جب نغمانی نے یہ سنا تو وہ بالکل اس طرح گھبرا گئے جیسے اسٹاف روم کی چھت اچانک پھٹ گئی ہو اور اُس کی شہتیریاں ایک ایک کر کے اُن پر گرنے لگی ہوں۔ جب وہ سنبھلے تو انھوں نے طاہرہ کو اپنے ساتھ لیا اور انگریزی کے سب سے سن رسیدہ پروفیسر رابرٹسن کے پاس جا کر سفارش کی کہ وہ طاہرہ کو وقت دے دیا کریں۔ پروفیسر رابرٹسن بات نہیں ٹال سکے اور پڑھانے

کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن اُس وقت طاہرہ کے چہرے پر جو بیزار اثرات نمایاں ہوئے تھے ان کو نغمانی نے کوئی اہمیت نہیں دی اور سیدھا اسٹان
بُدم میں وہ اس احساس کے ساتھ لوٹ آئے کہ اب اس کمرے کی چھت پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئی ہے اور اس کے اچانک گرنے کا اب
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ دسمبر کی ایک ٹھٹھری سہمی رات میں پروفیسر نغمانی اپنے سب سے بے تکلف دوست اشرف کے گھر اُس وقت پہنچے جب وہ لحاف کے
اندر خود کو سمیٹ چکا تھا لیکن ایسے میں بھی جب اُس نے نغمانی کی آواز سُنی تو وہ لحاف پھینک بھاگا کہ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ جہاں نغمانی سنجیدگی
کے ساتھ بیٹھے ہوئے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ اشرف کو دیکھ کر انھوں نے پہلے تکلیف دہی کیلئے معذرت چاہی پھر براہ راست مقصد کی طرف آ گئے۔

"وہ طاہرہ ہے نا۔۔۔۔"

اشرف بہت کچھ طاہرہ کے بارے میں سُن چکا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کامرس کالج کی سب سے حسین اور نک چڑھی لڑکی ہے۔ نیز یہ کہ سیٹھ
نغمانی کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اُس کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کالج کے کسی بھی پروفیسر کو کم ہی لفٹ دیتی ہے۔ ایسے میں وہ نغمانی کے منہ سے اُس کا نام سنکر چونک
پڑا۔ اُس کے ذہن میں تعجب اور شک کے ملے جلے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ لیکن پہلے وہ نغمانی سے خود ہی پوری بات جاننا چاہتا تھا اس لئے
وہ بالکل خاموش رہا۔

"وہ روزانہ کسی نہ کسی بہانے میرے فلیٹ میں چلی آتی ہے اور گھنٹوں اکیلی بیٹھی رہتی ہے۔ میں نے ایک بار اسے سمجھایا کہ وہ یہاں نہ آیا کرے۔ اس
تنہا فلیٹ میں ایک جوان لڑکی کو نہیں آنا چاہیئے۔ لیکن اُس پر ان باتوں کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ وہ حسب معمول آتی رہی۔ آخر کار میں نے اُسے ڈانٹ
ڈپٹ اور سختی کے ساتھ پیش آنے پر مجبور ہو گیا۔"

اشرف سنجیدگی کے ساتھ نغمانی کو سُن رہا تھا لیکن وہ اتنا کہنے کے بعد کچھ اس طرح خاموش ہو گئے جیسے اُن کے پاس کہنے کیلئے اب الفاظ باقی نہ
بچے ہوں۔ وہ کی آنکھوں میں بے بسی اور بے کسی کے سفید ڈورے ادھر اُدھر دوڑنے کے بجائے ایک جگہ اکٹھا کر رک گئے تھے۔ دوسری طرف اشرف
کو انتظار تھا کہ نغمانی ابھی کچھ اور کہیں لیکن جب نغمانی دوسرے منٹ بھی کچھ نہیں کہا تو اشرف بڑے ہی تامل انداز میں پوچھ بیٹھا۔

"تو کیا پھر وہ چلی گئی اور اُس کے بعد نہیں آئی؟"

اور اب نغمانی کو جیسے آگے بڑھنے کیلئے ایک مضبوط سہارا مل گیا تھا۔

اشرف! اُس کے بعد وہ ایک نازک سی کلی کی طرح مرجھا گئی اور اُس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے۔"

اشرف دوسرے ثانیے میں بھی باتیں ایک ساتھ اگلوا لینا چاہ رہا تھا۔

"پھر۔۔۔ آگے کیا ہوا۔"

مگر اُس نے بات یہ کہہ کر اور بھی پیچیدہ کر دی۔

"میں خود تم سے پوچھنے آیا ہوں کہ ایسے میں تم کیا کرتے؟"

اشرف ایک لمحے کیلئے گڑبڑا گیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں ملیں اور ٹیبل لیمپ کے اندر سے جھانکتے ہوئے دودھیا بلب کو تکنے لگا۔ پھر جیسے
یہ سوچ کر کہ بہر حال اس سوال کا جواب تو اُسے دینا ہی ہے۔ اُس نے اپنی نظریں نغمانی کے چہرے میں پیوست کر دیں اور کچھ اس انداز میں بولنے لگا۔
کہ جیسے وہ آواز اُس کے منہ سے نہیں نکل رہی ہو بلکہ دودھیا بلب کی شعاؤں سے پیدا ہو رہی ہو۔

"میں ۔۔۔ میں اُس وقت اس کو اپنا رومال دیدیتا۔ اُس کو گلے سے لگا لیتا۔ اُس کے تمام دکھ سمیٹ لیتا۔ اُس کو بھیگے ہوئے رخساروں
نکال کر عدت میں پہنچا دیتا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ تم نے بھی یہی سب کچھ کیا ہوگا۔"

نغمانی نے بہت ہی متانت کے ساتھ یہ بات کہی۔

"میں سب کچھ کر سکتا تھا مگر میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔"

اشرف جھنجھلا گیا۔

تو پھر آپ اُس کے قدموں میں اپنا سر رکھ کر گڑگڑانے کیوں لگے۔ آپ نے اُس سے کہا ہوگا کہ مجھے معاف کر دو طاہرہ۔"

نعمانی کی آنکھیں جذبات سے بالکل خالی دکھائی دے رہی تھیں۔

"میں نے یہ بھی نہیں کیا۔"

اِس بار اشرف کے لہجے میں بلا کی نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"احمق کہیں کے! تو پھر آپ نے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ کیا واقعی آپ نے اُسے نکال دیا۔"

"ہاں اشرف۔ میں نے اُسے نکال دیا اور وہ اب کبھی میرے فلیٹ میں آنے کی جرأت نہیں کر سکے گی۔" وہ رُک رُک کر اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔

"دیکھو تم مجھ سے ہمیشہ قریب رہے ہو قربت کے اِسی رشتے سے تم جو چاہو مجھے کہہ سکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم نے ابھی ابھی مجھے احمق کہا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ حماقت نہیں تھی، انسانیت تھی ——— دراصل میں طاہرہ کو دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اِسی لئے میں نے اس کو کھلے لفظوں میں یہ بتا دیا کہ دو سال سے ایک اور لڑکی میرا انتظار کر رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ میں نے اُس کی تمنا نہیں کی ہے، میں نے اُسے نہیں چاہا ہے، لیکن اُس نے تو میری آرزو کی ہے اور میرے خواب دیکھے ہیں۔ میں اُس کی آرزوؤں کا مذاق نہیں اُڑا سکتا۔ میں اُس کا دل کسی قیمت پر نہیں توڑ سکتا۔ بتاؤ اشرف! کیا میں نے طاہرہ کو یہ سب بتا کر غلطی کی ہے۔ فرض کر لو کہ اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا تم ایسی لڑکی کی تمناؤں کا خون کر دیتے اور کیا تم اس کے خوابوں کے محل مسمار کر دیتے۔"

اشرف کی آنکھیں اب تک نعمانی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ اُس وقت کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ نعمانی کی حماقت پر رویا جائے یا اُس کے کردار کی عظمت کا اقرار کر کے اُسے گلے سے لگا لیا جائے۔ لیکن اِس سے پہلے کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچتا پروفیسر نعمانی جا چکے تھے۔

کہانی یہیں پر ختم ہو چکی ہوتی مگر دوسرے روز شام میں نعمانی کے علاوہ بقیہ تمام بے تکلف احباب جب کیفے ڈی سوزا میں جمع ہوئے تو ہر ایک نے یہ کہا کہ نعمانی ہر ایک کے یہاں گئے تھے اور اُنھوں نے سبھوں کے سامنے طاہرہ کا واقعہ دہرایا تھا اور دہراتے جاتے ہر ایک سے یہ پوچھا تھا کہ اُنھوں نے اُس کے ساتھ اِس طرح کا برتاؤ کر کے کیا غلط کیا۔ تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد چونکہ سبھی اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ طاہرہ جیسی خوبصورت اور دولتمند لڑکی کی محبت کا مذاق اُڑا کر جہاں اُنھوں نے ایک بڑی حماقت کی ہے وہاں ایک بڑے خطرے کو بھی دعوت دی ہے۔ اِسی لئے یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کی گئی کہ نعمانی سے اُس دوسری لڑکی کی تفصیلات پوچھی جائیں کہ وہ کیا ہے اور کون ہے؟ اس کے بعد جلد سے جلد ان دونوں کی شادی کرا دی جائے۔ اس طرح طاہرہ اگر انتقام لینا بھی چاہے گی تو اُسے اِس میں زیادہ کامیابی نہیں ہو سکے گی لیکن اس تجویز کو برتنے میں ایک رکاوٹ یہ آن پڑی کہ نعمانی سے کس طرح پوچھا جائے کہ اُس لڑکی کا نام اور اُس کے والدین کا پتہ کیا ہے۔ اصل میں یہ بھی جانتے تھے کہ نعمانی سے اگر پوچھا جائے تو وہ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اگر نہ پوچھا جائے تو وہ اہم تر اپنی باتوں کو بھی سبھوں سے کہہ دیتے ہیں۔ پھر بھی سبھی دوست کیفے سے یہ طے کر کے اُٹھے کہ نعمانی سے دوستی کا واسطہ دے کر یہ بات پوچھی جائے گی اور جس طرح بھی ممکن ہو اُنھیں اُس لڑکی کی تفصیلات بتانے پر مجبور کیا جائے گا۔

مگر بات وہی ہوئی جس کا ڈر تھا۔ یعنی نعمانی نے اس موضوع پر ایک مستقل سکوت اختیار کر لیا۔ ان کو لاکھ قسمیں دی گئیں، دوستی کا واسطہ دیا گیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور یہ کہ جب اُنھوں نے دیکھا کہ دوستوں سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں رہا ہے تو وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر بمبئی جانے کا پروگرام بنا بیٹھے۔ دوستوں نے نعمانی کے اس رویئے کا کوئی اچھا اثر نہیں لیا اور اُن کے مسئلے سے دلچسپی لینے کا ارادہ بھی دل سے نکال دیا۔ لیکن اشرف کو نعمانی سے چونکہ پُرخلوص ہمدردی تھی۔ وہ اُن کی معصومیت کو سمجھتا تھا، اِس لئے اُس کا خیال تھا کہ نعمانی کو اِس خطرے میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ اُن کو ہر حال میں صحیح راستے پر ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ سوچ کر وہ نعمانی کے پاس جانے کو تیار ہو گیا کہ وہ اُن کو سمجھائے گا اور آخر وقت تک سمجھائے گا کہ اُنھوں نے ایک غلط اور پُرخطر راستے کا انتخاب کیا ہے۔ اُنھیں وہ راستہ چھوڑ دینا چاہیئے اور جب اس کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہو جائیں گی تو وہ اُن سے صاف طریقے پر کہہ دے گا کہ اب اُنھیں چھٹی لے کر بمبئی جانے کی ضرورت نہیں ہے اِسلئے کہ اب اُن کے ذاتی مسئلے میں کوئی تنگ کرنے نہیں آئیگا۔ مگر اتفاق یہ پیش آیا کہ اشرف کے جانے سے پہلے ہی نعمانی اپنی تمام سنجیدگیوں کے ساتھ خود ہی اشرف کے یہاں پہنچ گئے

دو منٹ تک ایک دوسرے کو بس تکتے رہ گئے جیسے راستے میں دو اجنبی ایک دوسرے کے سامنے اچانک آ گئے ہوں۔ اشرف کے ذہن میں کچھ دیر پہلے یہ بات نہ تھی کہ اسطرح نعمانی چائے کے بہانے آ جائیں گے اس لئے تعجب آمیز سکوت کے ساتھ وہ ان کو سر سے پیر تک دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ نعمانی کو بیٹھنے کے لئے بھی نہ کہہ پایا لیکن نعمانی خود ہی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور بیٹھتے ہی وہ سب کچھ بتا گئے جس کو پوچھنے کے لئے ان کے احباب بے حد پریشان تھے، اور جس کی وجہ سے ان کے دل بلاوجہ بوجھل ہو گئے تھے تفصیلات بتانے کے بعد انھوں نے اپنے کردار کی بھی وضاحت کر دی۔

"اشرف! مجھ سے کسی کا دل کسی قیمت پر نہیں توڑا جا سکتا اس لئے میں کسی سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتا ہوں۔ اس کو تم میری کمزوری سمجھ لو یا میری شرافت۔ بہر حال یہ میری فطرت ہے۔"

اشرف نے آخری بار نعمانی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کے سامنے ایک طرف بلندی ہے اور دوسری طرف گہری کھائی۔ ایک طرف ایک ایسی لڑکی ہے جس کے پاس حسن ہے، تعلیم ہے اور دولت نہیں، دوسری طرف ایک کلرک کی لڑکی ہے جس کے پاس نہ تعلیم ہے، نہ دولت ہے اور نہ صورت۔

"میں بھی اس حقیقت کو سمجھتا ہوں۔ میں بھی بلندی پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ مگر میرے نزدیک بلندی کا دوسرا مفہوم ہے اور میں بلندی پر پہنچنے کے لئے وہ زادِ راہ استعمال نہیں کرنا چاہتا جو تمہارے لئے اہم ہیں۔ میرے خیال میں دولت کی فراوانی، تعلیم کا نشہ اور حسن کی جگمگاہٹ سے اہم ترین چیز آج بھی موجود ہے جس پر یقین کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ وہ بیش قیمت چیز پُرخلوص دل ہے اور یہ دولت طاہرہ کے پاس نہیں مل سکتی ہے۔"

اس گفتگو کے بعد اشرف کو کم سے کم اتنا تو اندازہ ہو گیا کہ نعمانی کے دل کے کسی گوشے میں طاہرہ کیلئے جگہ نہیں بنائی جا سکتی ہے۔ اس لئے اب اس نے نعمانی کو اس پر تیار کرنا چاہا کہ وہ جلد سے جلد شادی کر لے تاکہ طاہرہ کی توجہ اس کی طرف سے ہٹ جائے اور یہ ہنگامہ ختم ہو۔ نعمانی جانتے ہوئے صرف اتنا کہہ کر وہ آگے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔

دوسرے روز اشرف کو دفتر کے ایک کام کے سلسلے میں اچانک بمبئی جانا پڑ گیا۔ تقریباً پندرہ دن کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی غیر حاضری میں بھی چیزیں اپنی جگہ پر تھیں اور حالات بدستور۔ تاہم وہ دوستوں سے مل کر اور فیصر نعمانی کی خیریت اور ان کا سکنڈل کے سلسلے کی تفصیلات جاننے کیلئے بیتاب تھا۔ اور یہی بے تابی اس کو شام میں کینے ڈی سوزا کی طرف لے گئی۔ کینے کے آخری ٹیبل کے گرد اشرف کے تقریباً سبھی دوست موجود تھے اور ان کے بجھے ہوئے چہرے بتا رہے تھے کہ کوئی اہم ترین مسئلہ ان کے سامنے ہے۔ ویسے اشرف کو دیکھ کر سبھوں نے مگر مچھ کا ظاہر کیا۔ خندہ پیشانی کے ساتھ ہر ایک نے اس کو اپنی اپنی ٹیبل کی کرسی پر بٹھانا چاہا، لیکن اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے سبھوں کے چہرے پڑھ لئے اور اندازہ لگا لیا کہ آج کوئی خاص بات ضرور ہے۔ اپنے قیاس کی صحت کا اس کو اس وقت یقین آیا جب اس نے نعمانی کے متعلق پوچھا اور کسی نے اس کو قطعی اہمیت نہیں دی۔ آخر جب اشرف نے اصرار کیا تو ایک طرف سے کسی نے یہ کہا۔

"چھوڑو بھی ۔۔۔ اب اس نعمانی کا ہم کوئی ذکر بھی سننا نہیں چاہتے جو کبھی ہمارا دوست تھا اور جس کے کردار کی عظمت کبھی ہمارے لئے مقدس تھی۔"

اشرف کا دل بے چین ہو گیا۔

"آخر ہوا کیا۔"

"تم نہیں سن سکو گے۔ اشرف! ۔۔۔ اس نے معصومیت کے پردے میں جس بری طرح ہم سبھوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی ہے۔ اس کی تفصیل نہیں سن سکو گے۔ تمہارا دل پھٹ جائے گا۔"

اشرف کی فوراً درخواست جاری رہنے لگی۔

"تمہیں بتانا ہی ہوگا کہ آخر نعمانی نے کون سا جرم کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔"

"تو پھر سنو کہ انھوں نے تمہارے جانے کے چند ہی دن کے بعد اسی طاہرہ سے شادی کر لی" ان کو بھی انھوں نے اپنے نکاح سے نکال دیا تھا۔ کے لئے تعجب خیز بھی تھی اور اہم بھی۔ ہم نے سمجھا کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا ہے، لیکن صبح ایک ہفتے کے بعد ہی ہمیں یہ خبر ملی کہ نعمانی نے اس لڑکی سے بلا اطلاع شادی کر لی جو کبھی نعمانی کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ اس دوسری شادی کی خبر ہم نے بالکل اسی طرح سنی جیسے کسی نے نعمانی کی موت کی خبر ہمیں ٹیبل پر کافی کی خالی پیالیاں کچھ اس انداز میں بھی ہوئی تھیں جیسے ابھی ابھی، دفعتاً میں معلق ہو جائیں گی اور ان کی جگہ موت کا مقفل

جائے گا۔ اور ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے سبھی لوگ سناٹے میں کھڑے ہوں گے۔ لیکن اس خوفناک سکوت کے طلسم کو اشرف نے کچھ اس انداز میں توڑا کہ سبھی چہرے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"لیکن طاہرہ کس طرح تیار ہو گئی اور اس کے والدین نے کیسے گوارا کر لیا کہ ان کی اکلوتی لڑکی سوکن کا ابدی عذاب برداشت کرتی رہے۔ اور کیا اس کو کرنے یہ جانتے ہوئے بھی کہ نغمانی کی شادی ہو چکی ہے اس سے اپنی لڑکی کی شادی کی اجازت دے دی۔ پھر نغمانی نے خود ایسا کیوں کیا؟ اُف! اتنے۔ ارے سوالوں کے انبار ہے میرے سامنے ہیں۔!"

وہ اپنے بالوں کو مٹھی میں پکڑ کر جھٹکے دے رہا تھا اور اس کے چہرے پر ہلکی کرب کی زردی چھائی چلی جا رہی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اس کو بتایا گیا۔

"یہ تمام سوالات ہمارے ذہن میں بھی ابھرے تھے لیکن نغمانی صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گیا تھا کہ میں چونکہ فطری طور پر کسی کا دل نہیں توڑ سکتا اس لئے میں نے دونوں سے شادی کی۔ اور اس کے لئے میں نے دونوں کی رضامندی حاصل کر لی تھی۔"

اشرف کی آواز کچھ اس طور پر ابھری جیسے وہ خود سے پوچھ رہا ہو۔

"کیا واقعی اس نے دونوں لڑکیوں سے بیک وقت شادی کر کے ان دونوں کا دل رکھ لیا یا دونوں ہی کا دل توڑ دیا؟"

اور پھر جیسے اس کے سامنے کسی نے نغمانی کی دھندلی سی تصویر لا کر رکھ دی۔ اور وہ اس میں نغمانی کے کچھ واضح نقوش تلاش کرنے لگا لیکن اسے جب مایوسی ہوئی تو کیفے سے ایک خاموش سنجیدگی کے ساتھ اٹھا اور نغمانی کے سسرالی مکان کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ وہ اس سے مل کر اس کے کردار کے متعلق اپنا کوئی صحیح رائے قائم کر سکے۔

سیٹھ کاچ کے پورٹیکو میں سفید ماڈل کی ایک خوبصورت کار کھڑی ہوئی تھی اور ڈرائیور سفید یونیفارم میں کار کے اس پچھلے حصے کی طرف کھڑا تھا جہاں رجسٹریشن کے نمبروں کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اشرف کو پورٹیکو تک آنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی لیکن اس کے بعد کی راہ ڈرائیور نے یہ کہہ کر مسدود کر دی کہ صاحب ابھی ابھی آ رہے ہیں، بس دو منٹ کے انتظار کی زحمت اور گوارا کرنی ہوگی۔ اسی دو منٹ میں ڈرائیور نے اشرف کا نام اور پتہ۔ صاحب یعنی پروفیسر نغمانی سے متعلق کی تفصیل اور نہ جانے کون کون سے سوالات پوچھنے شروع کر دیئے اور یہ سلسلہ کچھ دراز ہوتا لیکن اس سے پہلے ہی پروفیسر نغمانی دو جوان اور محو مذاق لڑکیوں کے درمیان چہل پہل کے انداز سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ نغمانی نے کار کے پاس اشرف کو دیکھا۔ کچھ جھجکے پھر لپکے اور اشرف کو گلے سے لپٹاتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولے۔

"دوست ہم کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے تمہارے بغیر اپنی شادی کر لی۔ تم میری شادی میں شریک نہیں ہوئے اس کا مجھے دکھ ہمیشہ رہے گا۔"

اور پھر انہوں نے ان دونوں لڑکیوں کو آواز دی۔

"ارے بھئی تم دونوں اپنے اشرف سے ملو۔ اور یہ ہیں مسز طاہرہ نغمانی۔۔"

طاہرہ نغمانی چہرے پر مسکراہٹ لئے آگے بڑھیں اور مصافحہ کیلئے اپنا داہنا ہاتھ اشرف کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک بل کھا گئیں۔

"میں نے نغمانی صاحب سے آپ کی تعریف اتنی سنی کہ آپ سے ملنے کو بے اختیار جی چاہنے لگا۔"

"آپ ہیں مسز ناہید نغمانی۔۔"

ناہید کے قدم رک رک کر اٹھ رہے تھے۔ چہرے پر گندمی رنگ کے علاوہ کے بغیر سنہری کرنوں کے عکس کا پرتو نظر آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ سادگی کا رنگ، بالوں کا اسٹائل، زیب تن کی ہوئی ساڑی کی تعداد سب کچھ مسز سعید کی طرح کا تھا۔ ناہید نے بھی آگے بڑھ کر اشرف سے ہاتھ ملایا۔

"میں بھی آپ کو دیکھنے کی مشتاق تھی اور واقعی آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ لیکن سر درد ــــ اس لئے کہ خوشی کی قطعیت کا احساس تو آپ سے طویل گفتگو کے بعد ہی ہو سکے گا۔"

اس پر تین قہقہوں کی ملی جلی آواز فضا میں تحلیل ہو گئی۔ لیکن اشرف ان تینوں کا منہ تکتا رہا کہ ان تینوں کے قہقہوں میں اتنی یکسانیت اور ہم آہنگی کی آخر وجہ کیا ہے۔ ــــــ کیا واقعی ان تینوں میں سے کسی ایک کا بھی دل نہیں ٹوٹا ــــــ؟

اعجاز صدیقی

چھ کروڑ نقطے!

وہ قافلہ، جو عرب سے چلا عجم کی طرف
اور اس کے بعد جو نقطوں میں ہو گیا تقسیم

تمام ریگ کے ذرّوں کو جگمگاتے ہوئے
حرم سے بھی جسے نسبت ہے اور دیر سے بھی

نظر اٹھائے کھجوروں کے جھنڈ سے آگے
بڑا عجیب ہے لیکن سفر یہ نقطوں کا

قدم قدم پہ جلاتا ہوا خرد کے چراغ
انہیں قرار بھی ہے اور بے قرار بھی ہیں

تپیدہ خاک پہ نقشِ خودی بنائے ہوئے
سوالِ کثرت و قلت کے باوجود اب بھی

روش روش پہ کھلاتا ہوا یقیں کے کنول
جئے ہوئے ہیں ستاروں کی انجمن کی طرح

تمام فلسفۂ کائنات کا محرم
چمک رہے ہیں شراروں کے پیرہن کی طرح

علومِ ظاہری و باطنی کو سینوں میں
نہیں ہے کوئی "خطِ مستقیم" اب ایسا

لئے ہوئے عمقِ بحرِ بے کراں کی طرح
کہ جس پہ ڈھونڈ سکیں ان تمام نقطوں کو

حضورِ ربِّ دو عالم، بصد خلوص و نیاز
وہ ایک خطِ جلی جس پہ دس کروڑ ہیں یہ،

دلوں کے ساتھ جھکائے ہوئے جبینوں کو
یہ ایک خطِ خفی، چھ کروڑ ہیں جس پر

سروں پر اپنے اٹھائے ہوئے "کتابِ عظیم"
اسی طرح ہیں بہت سے خطوط اور نقطے

جلو میں اپنے تقدس لئے فرشتوں کا
جو مل کے ایک نیا زاویہ بناتے ہیں

حرم سے دیر و کلیسا میں آ کے پھیل گیا
جدا جدا بھی کئی راستے دکھاتے ہیں

اذانِ صبحِ مساوات بن کے گونج اٹھا

جو چل پڑا تو قدم کامرانیوں نے لئے
وہ قافلہ، جو عرب سے چلا عجم کی طرف

رکا، تو روک لیا بڑھ کے نبضِ ہستی کو
ٹھہر گیا ہے جو دامانِ سندھ میں جا کر

بنا تجلیِ اقصائے عالمِ موجود
جو کٹ گیا ہے خود اپنے قدیم نقطوں سے

بکھر کے صفحۂ دورِ جہاں پہ "نقطوں" میں
رواں دواں ہے جو امواجِ خوش ادا کی طرح

اسی سے آج مجھے اک سوال کرنا ہے؟
سوال یہ ہے کہ ان "چند لاکھ نقطوں" کو

محیطِ ارض و سما ہو گئے یہی نقطے
جو ایک "وادیٔ خوش رنگ" میں ہیں محوِ خرام

فلک پہ جیسے ستاروں کے ان گنت جھرمٹ
کسی طرح جو "خطِ مستقیم" پر بھی نہیں

زمیں کو کثرتِ نور و ضیا سے گھیر لیا
نہیں ہیں "زاویۂ قائمہ" جو فرد اکے

رہا نہ خطۂ دشت و جبل کوئی باقی
الگ الگ کوئی جن کا نہیں وجود و عدم

جہاں پہنچ نہ گئے ہوں بکھر کے یہ نقطے!
سطورِ عصر میں ترجیح کس لئے دی جائے؟

صریح و صاف رواں چھ کروڑ نقطوں پہ

وہ قافلہ کہ عرب سے چلا عجم کی طرف

متین سروش

غزل

اے گنبدِ مینائی اے گنبدِ مینائی
دیکھی تھی کبھی پہلے اشکوں کی یہ رسوائی!
اے دورِ زماں کیسی یہ منزلِ نو آئی
خونِ دلِ انساں سے تابش نے جلا پائی
اسرارِ محبت سے آگاہ اگر ہوتا
ہوتی نہ زمانے میں انساں کی یہ رسوائی
کیوں تشنہ لبی اپنی یوں شعلہ بجاں کرتی
تسکینِ مئے و مینا سے ہوتی جو مسیحائی
پھر ابرِ کرم اُٹھے رحمت کی گھٹا چھائے
سہمے ہوئے ہونٹوں پر کیسی یہ دعا آئی؟
کیوں دل کا لہو جلتا اشکوں کے شراروں میں
ہوتا جو بہاروں میں سامانِ شکیبائی
وہ رنگِ زمانہ بھی دیکھا مری نظروں نے
ہنستی رہی دانائی، روتی رہی دانائی
ہے امن کی دعوت بھی اور شعلہ فشانی بھی
کیا خوب ہے قاتل کی گلبانگ مسیحائی
وہ طرزِ نوا ایسی مطرب نے بھلائی ہے
جب سازِ طرب چھیڑا آوازِ فغاں آئی
آوازِ جرس گھوئی گردِ رہِ منزل میں
ہے شعلہ بجاں راہی اور دشت کی پہنائی
پھر شورِ سلاسل سے اک دھوم ہوئی غم میں
پھر شہرِ تمنا میں آئیں ترے سودائی
سرشار ہوں دیوانے پھر جوشِ محبت سے
پھر کوچۂ قاتل میں بجنے لگے شہنائی
شعلے ہیں سروش اپنی دنیائے تصور میں
ہمراہ مرے پی لے جو ہو کوئی سودائی

محسن زیدی

غزل

اُن آنکھوں کا عنوان کنول، سوچ رہا ہوں
لب کے لئے تشبیہہ، غزل سوچ رہا ہوں
میخانے کے دستور کہن سال میں ساقی
کب ہوگی کوئی ردّ و بدل سوچ رہا ہوں
تنہائیِ شب اور بہکتی ہوئی یادیں
بھولے ہوئے اشعارِ غزل سوچ رہا ہوں
یہ پیچ و خم گیسوئے دوراں ہیں کہ اے دوست
یہ بھی ہیں تری زلف کے بل سوچ رہا ہوں
اُکتا گئی ہنگامۂ محفل سے طبیعت
ویرانہ ہے محفل کا بدل سوچ رہا ہوں
کس آس پہ اُمید کی دیوار اُٹھاؤں
سنسار ہے اک ریت محل سوچ رہا ہوں
صد رنگی آفاق کی اس قوسِ قزح میں
ہے عشق کا اک حسنِ عمل سوچ رہا ہوں
کہتے ہیں کہ ہر غم کا مداوا ہے غمِ دل
کیا ہے غمِ دل کا کوئی حل سوچ رہا ہوں
تخریب ہے کیا ہر نئی تعمیر کی بنیاد
تعمیر کے اسباب و علل سوچ رہا ہوں
گو آج بھی جینے کی سزا سخت ہے محسن
کیا صورتِ حالات ہو کل سوچ رہا ہوں

مفتوں کوٹوی

شوکت تھانوی کی مزاح نگاری کے چند عوامل و عناصر

مرحوم کے مزاحیہ فیچر موضوع اور اسلوب دونوں لحاظ سے طرفگی و شگفتگی کے حامل نظر آتے ہیں۔ وہ وقتی حالات پر بھی بڑی خوبی سے اپنے انداز میں رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ اور تخیلی و آفاقی عنوانات پر بھی۔ "گرانی زدہ" پر انھوں نے بڑے دلچسپ پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ بعنوان "موقع پر کیا خوب رہے" کے سلسلے میں بھی ایسے ایسے پہلو نکالے ہیں کہ بے اختیار ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ "سگریٹ کی کہانی" کو انھوں نے "سگریٹ" کے عنوان سے بڑے دلچسپ انداز میں ظاہر کیا ہے۔ "شوہر برائے فروخت"، "تجریدی آرٹ" ان کے بڑے پر لطف مضامین ہیں۔ تعمیر طلب ان کی ادبی معلومات پر مبنی ہے۔ "پہلے آپ" میں پرانی تہذیب پر ہلکا پھلکا طنز ہے۔ قاضی جی ایسے کردار ہیں جو پرانے انداز فکر اور قدیم معاشرہ اور تہذیب کے پروردہ ہیں۔ اور خاندانی وضع و شان کے دلدادہ۔ لیکن خوشیا پروری، زخیرہ اندوزی، دور رخ گرفتاری جیسی قومی و ذاتی برائیوں سے لوث ہیں۔ برخلاف ان کی بیوی، ان کی بہن زبیدہ اور ان کا پڑوسی جمیل اپنے ملک کے سچے وفادار ہیں۔ اور ملک کے تعمیری و ترقی انگیز امور کا ہمیشہ خیر مقدم کرتے ہیں۔ مذہبی اعتبار سے بھی سرشار ہیں۔

قاضی جی کو روزہ نہ رکھنے کی صورت میں پان کھا کر باہر نکلنے سے روکا جاتا ہے۔ قاضی جی روزہ نہ رکھنے کی جواز میں بڑی دلچسپ باتیں کہتے ہیں۔ بہر حال شکست مکالمات مفہم کئے جا رہے ہیں۔ قاضی جی ہار جاتے ہیں۔ باقی دیگر امور زیبدہ جمیل اور قاضی جی کی بیوی یہ تینوں حکومت کے اس اقدام کو محسن قرار دیتے ہیں۔ "لکی پکڑ" میں ان کی بہن اور بیوی بلاس گوہ آلو ملنی۔ ملکی ترقی اور قومی بہبودی کے خیال سے جائز اور ضروری سمجھتے ہیں۔ قاضی جی ایک طرف ہیں۔ ان کی بیوی اور ان کی بہن زبیدہ دوسری طرف۔ "بادل چھپ نہ جانا" بہت اچھا ہے۔ بڑی پھلجھڑیاں اڑائی جاتی ہیں۔ عجیب استعارات و تشبیہات کا بیان ہوتا ہے۔ خوب خوب قہقہے لگائے جاتے ہیں۔

"ارادہ کیا ہے کیا مجھے سر سے پیر تک کھدر بھنڈار بنا جائے گا۔ میرے لئے ناممکن ہے اس قسم کا لباس پہننا۔ نہ میرے باپ دادا پھر کبھی کبھی ضرورت پڑا تھا۔ میں اس کا عادی ہوں۔ میں تو ایک ہی جوڑا پہن کر دو اجلاس ہو جاؤں گا..... اس کو پہنتے ہی گاؤ تکیہ نظر آئے گا۔ بخدا بالکل گاؤ تکیہ ہے۔ بلکہ میرے یہاں تو اس کپڑے کے غلاف بھی گاؤ تکیوں پر نہیں چڑھائے جاتے....."

شوکت تھانوی بڑی قادر الکلامی اور وسیع البیانی سے کہتے ہیں۔ الفاظ کا رکھ رکھاؤ بڑا مناسب حال ہوتا ہے جس میں لفظی صنائع بھی ہوتی ہیں اور ادبی لطافتیں بھی۔

دانت صاف کرنے کیلئے انگریز ہم کو ایسا دندان شکن طریقہ سکھا گئے ہیں کہ دانت بالکل ہی بیکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو طبیعت ایسی صاف ہوتی ہے کہ یہ طریقہ خون تھکوا دیتا ہے۔ ہم لوگ اپنے خاص منجن استعمال کرتے تھے اور دہرے کے منے چبایا کرتے تھے۔ مگر لاڈل روٹی کا گرداکھانے والوں نے ہم کو ایسا ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ کا عادی کیا ہے کہ انگریز تو چلے گئے لیکن یہ ٹوتھ برش کسی طرح نہیں جاتا۔ ایک ٹوتھ برش کیا مختصر ہے۔ ہم نہ جانے کس کس قسم کے برش میں اپنے کو مبتلا پاتے ہیں۔ کپڑے صاف کرنے کا برش، بال سنوارنے کا برش، داڑھی بنانے کا برش، جوتا چمکانے کا برش، جیبی برش، میزی برش، فرنیچر برش، ناک میں دم کر دیا ہے ان برشوں نے۔ اور ساری زندگی ان برشوں کے محاصرہ میں آکر رہ گئی ہے....."

شوکت مرحوم منظر کشی کے ساتھ طرز مزاح کے ہلکے ہلکے چھینٹے بھی مارتے چلے جاتے ہیں۔ کہیں موقع پر بار بار والوں کا سماں اور ان کا انداز فروختگی ملاحظہ ہو۔ اگر یہ تجربے کامیاب ثابت ہوئے اور مارکیٹ میں انسان کے اسپیئر پارٹس (Spare Parts) آگئے تو وہ دن دور نہیں کہ گلی کوچوں میں ریڑھی والے آواز لگاتے پھریں گے کہ ــــــ ٹوٹے ہوئے دل والو ــــــ معدہ، جگر، پھیپھڑا، آنکھوں کے جوڑے لے لو ــــــ

دل جیسے ہیں اپنا، یہ کوئی جینے والا ــــ دماغ، دماغ۔ آواب دماغ۔ کارآمد دماغ، معاملہ دماغ، چشم منوں ساز، نگاہ خاطر انداز ــــ آنچہ شیم ــــ یہاں ملے گا جو آنے، یہاں کا مال گلابی جو آنے، یہ چشم شرابی جو آنے، یہ تیر مژگاں جو آنے، یہ چاہ زنخداں جو آنے ــــ"

روزمرہ کے الفاظ شوکت محترم اس بہترین انداز میں استعمال کرتے ہیں کہ بیساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ ــــ خدا کا شکر ہے ماہ لیڈی میں نواب بفضلہ خیریت ہے اور غیریت دوسرے شہروں کی بھی بنک طلب ہے ــــ پولیس کو تو تل تو ریٹ درج کرنا چاہیئے تھی۔ ورنہ لوٹ ڈالو کے پر تو کچھ درج کر ہی دیا جاتا۔ ایک آدھ ہاتھ ہی سہی ــــ

یہی نہیں وہ محاورے بھی بڑے برمحل استعمال کرتے ہیں اور مرغوب اللامثال بھی ــــــــــــــــ

"تمام دنیا میں یہ کہاوت مشہور ہے کہ قاضی جی کے چوہے بھی سیانے ــــ اور ہمارے یہاں کی اس چوہیا کا یہ حال ہے کہ جاکے آپ مزا آئیں کہ میں مضمون نگار ہا ہوں۔ برسوں کی بنی ہوئی بات پر پانی پھیر دیا۔ ــــ ،، اپنوں کو فائدہ کو تو نہیں پہنچاتا ہاں دہی مثل ہے کہ گھٹنے ہمیشہ پیٹ کی طرف جھکتے ہیں ــــ اور ہاں ایک مثل اور یاد آئی۔ اوّل خویش، بعدہٗ درویش۔"

شعروں کے استعمال سے بھی وہ بڑا ظریفانہ ماحول بنا دیتے ہیں۔ ــــ آخر خدا خدا کر کے وہ دن بھی آگیا جب انسان کے سپیشر پلدس (Spatha) دستیاب ہو سکنے کے امکان نظر آنے لگے۔ اور شاعر کی یہ پیشین گوئی سچ ہوتی نظر آنے لگی کہ ؎ آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں لوٹ کر ــــ ہم تو صاحب اس کے قائل ہیں کہ ؎ ردِ عمل کو شرم ہے پسپائی پیش "رہ گئی" بدعملی" وہ بھی کسی مخصوص لباس کی محتاج نہیں ہوتی۔ بدکردار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ بدکرداری کی وردی پہنے، نہایت شستہ تعلیق اور مہذب لباس کے اندر بھی ایک گندہ ملعون وجود بس سکتا ہے۔

؎ صورت تو نظر کی تھی مگر جیب کاٹ لی ایسے بھی ہم کو راہ میں کچھ ہم سفر ملے

ان کا ادبی ذوق اور شعری مذاق نثر میں تشبیہات و استعارات کی بہاریں دکھاتا ہے۔ لطف یہ کہ طنز و مزاح میں خواہ مخواہ نہیں آتا۔ بلکہ استعارے اور تشبیہیں ہوتی ہی ایسی ہیں جو موضوع سے قریب بھی ہوں، نئی بھی ہوں، اور دل کش اور دل پذیر بھی۔ ایک دو مثال ملاحظہ ہو۔

"ہمارے یہاں بھی بہت سے لوگ محض فیشن کے طور پر لباس بہن کر سرو قد" بنے پھرتے ہیں ورنہ فی الواقع پر نہایت شریف خصائل ہوتے ہیں۔"

"خدا کیلئے تم کپڑے بدل لو ورنہ وہ بھی کہیں گی کہ یہ قاضی جی کے یہاں کی خود نہیں ہیں، یا لاہور کی آگ لگی ہوئی عمارتیں۔"

بعض لوگ اس طرح سے پتلون پہنتے ہیں کہ شرعی پاجامہ بھی اس پتلون کو جھک کر سلام کرتا ہے۔ بعض لوگ پتلون پہن کر اپنے کو اشارہ وڑاتے ہیں کہ پتلون کو لنگوٹا بنا کر چھوڑتے ہیں (اشارہ اس مصرع کی طرف ہے ؎ اشارہ وڑا یا لنگوٹی کر دیا پتلون کو)

شوکت مرحوم طنزیات میں بڑے کامیاب ہیں۔ ان کے طنز نشتر پڑے چبھتے ہوئے ہوتے ہیں مسلمانوں کی تعلیم معاشرت پر ایک طنز ملاحظہ ہو۔ قاضی جی اپنی بہن کے لئے کہہ رہے ہیں۔

"بھلا بتایئے۔ خدا ری اور تف قسم کے الفاظ وہ صاحب زادی بول گئی ہیں جن کی والدہ نے کریم ختم کی تھی تو سارے خاندان میں مٹھائی بٹی تھی اور ہر گھر میں جہاں تک کہ لڑکی کو تو تعلیم دلانا ہی نہیں ہوتا وہ تو بس کرنا نام پیدا کرنے خود آپ اپنی ذہانت سے کام کی کہ صرف پڑھنا سکھایا ہے نہ تو لکھنا سکھایا اور کچھ پڑھانے کا ارادہ ہے۔ ــــ ،، ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں۔

"بھلا بتایئے ایک تو آپ بچا لی۔ دوسرے جاہل مطلق۔ مین سے آجیری در دانہ لکھتے ہیں، اور فرماتے ہیں مجھ سے کہ قاضی جی۔۔۔۔ اب یہ اپنے لیٹر بی کے چوچلے کچھ کم کیجئے۔"

شوکت مرحوم نے گھریلو پر "دلائی" اور "حقیقی" "اہل صفا" "دلائی لامہ اشخاص" کی پھبتی کسی ہے۔ قاضی جی کی زبان سے محبوط الحواس کی تشریح کرتے ہیں۔ قاضی جی اپنی بیوی کو سمجھا رہے ہیں ــــ یہ بات ایک محبوط الحواس ــــ سمجھیں یعنی اس کو یوں سمجھ کہ جیسے میں ہوں۔ بلکہ میں نہیں جیسے جمیل میاں ہیں۔ ان کے حواس بجا نہ رہیں۔ اس کو عرف عام میں ٹکنگ عربی میں گویا محبوط الحواس کہا جائے گا۔ تو میرا مطلب یہ ہے کہ یہ بات ایک پاگل میں ہوتی ہے کہ وہ محبوط الحواس ہو جائے۔"

اسی طرح الفاظ کو غلط استعمال کر کے شوکت مرحوم بڑی ظریفانہ فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ ــــ صاحب میں تو شیشہ حیرت بلکہ آئینہ حیرت یا فضل حیرت جن کے روبرو اہل حیل حیلہ تیل میرے سامنے اس قسم کی تقریر بنا بات چیت کرتا ہیں۔ ــــ بہذا ختم ہے نفاست اس لڑکی پر یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ نفاست پر۔ ــــ ابے صاحب وہ تو میں چوکے کہہ رہا تھا۔ گویا اس نے مجھ سے ایسا کہا ہو جو چوکے کے مترادف آس پاس ہے۔ ــــ اگر میں وکالت پڑھ لیتا کہیں تو آپ کا ہم جلیل میاں! اس وقت ہائی کورٹ ہوتا۔ یعنی ہائیکورٹ کا کوئی جج وغیرہ ــــ خیر یار زندہ صحبت باقی۔ نہیں نہیں بلکہ میں کہنا چاہتا ہوں کہ گذشتہ را صلوٰۃ "

یہ لفظوں کا غلط استعمال اور بعد میں ان کا فوراً صحیح استعمال راجس سے شوکت مرحوم ظرافت آمیز ماحول مرتب کرتے ہیں۔ اسی طرح چند اور فقرات سے بھی وہ ظریفانہ مزید فضا بنا دیتے ہیں ــــ "بھلی انتہا کر دی یعنی یہ حد ضد کر دی ــــ" بلب؟ یہ کیا چیز ہوتی ہے؟ یعنی وہ روشنی کا لمبا گولا مقعر ــــ "اب ہم کمرہ میں چلی جاؤ۔ مجھے تمہاں سے کچھ پرائیویٹ یعنی راز کی باتیں کرنا ہیں۔"

یہ تضریب و مزاحیہ فضا بھی لفظوں کے مناسب و برمحل رکھ رکھاؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ ــــ اب اگر ان کے اس "ریڈی میڈ" اخانے پر ہنسی آجائے تو خوبداری کا امکان ــــ بحث کی حد تک تو ظریفانہ ادبی ایجنٹ کا تقیدی اعلامیہ بن جائے گا۔

خود اپنے گھر میں یہ حال ہے کہ اپنی بیوی سے مخاطب ہیں۔ مجھ سے کوئی غیر کیا تعصب کرے گا۔ میں تو اپنوں کا مارا ہوا ہوں جن کو اپنی صورت کی شیشیت سے اجو بوں پر اس ہزار سکڑ رہا ہے وقت قبول کیا تھا۔ اب تو کسی کی آئی ہوئی مجھ کو آجاتی۔ بہت جی چکے۔"

لفظوں کے غلط استعمال ہی سے شوکت مرحوم ظرافت انگیز فضا پیدا نہیں کرتے۔ محاوروں کے غلط استعمال سے بھی وہ ہنساتے ہیں۔ "مجھ دھوبی سے تو جناب کا بس نہیں چلتا اس گدھے کا کان اینٹھتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ میں چھٹن خاں کے ساتھ شطرنج نہ کھیلا کروں تو کیا جناب کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا کروں!"

مرزا شاکر کو غلط استعمال کروانے کے بھی وہ ظرافت نگاری کا فن ادا کرتے ہیں۔ قاضی جی اپنی بہن زبیدہ سے اپنی بیوی کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ "کوثر بیوی اس کو پسند کرتی ہے کہ اس کے شوہر کو جیل بھیجنے کے مشورے کئے جائیں۔ میرا خیال ہے کہ اس حد تک تو تمہاری اصلاحی جان بھی میرے لئے نہ چاہتی ہوں گی۔ ان کی پالیسی تو یہ ہے کہ کھلائیں گی سونے کا نوالہ اور دیکھیں گی شیر کی نگاہ۔ اللہ بخشے والدی جان مرحومہ بھی کہا کرتی تھیں کہ بچوں کے ساتھ بزرگوں کا یہ طریقہ ہونا چاہیئے ــــ مگر اس ــــ یہ تو غلط استعمال ہو گیا۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان نقل کے دشمنوں نے وہ کہاوت بھی نہیں سنی کہ کتے کو دیکھ کر چاند بھونکتا ہے تو بھونکا کرے ــــ"

شوکت مرحوم کی یہ قادر الکلامی بے نظیر تو اور کیا ہے کہ وہ صحیح الفاظ، صحیح استعمال، صحیح محاورات اور صحیح اشعار کے برمحل استعمال سے بھی مزاحیہ فضا پیدا کر لیتے ہیں اور ان کے غلط استعمال سے بھی۔ بات میں سے بات نکالنا، لفظوں کے رکھ رکھاؤ سے شگفتگی پیدا کرنا، لفظی و معنوی رعائتیں برت کر مزاحیہ ماحول بنا لینا ان کے معمولات میں سے ہے۔ مصرعوں اور شعروں کا غلط استعمال بھی بڑا نشانہ انداز رکھتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک معنوی طور پر ان کا غلط استعمال دوسری لفظی طور پر۔ دونوں کی بحیثیت مزاح نگار ان کا استعمال۔ دونوں کی مثالیں ملاحظہ کیجئے

لیجئے وہاں طرح ہو گئی۔ خوش طبعی اور بذلہ سنجی بلکہ مجھ سے تو پھبتی پھبتی ــــ جیسے ہمارے مصری بھائی ہیں کہتا ہے تم کو چھبتی چھبتی کا ــــ وہی مثل کہ ــــ مرغ چھبتی ہیں سے نہ جائے اسد ــــ اس گھر میں آگ لگ گئی گھر ہی کا اللہ یعنی وہ گھر کے چراغ سے ــــ گل کر دیجئے مرے خاندان کا چراغ کہ کیجئے جو کچھ بھی چاہے

سر تسلیم خم ہے جو مزاج شریف ــــ نہ نہ، سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔ ــــ تو صاحب! اچھی زبردستی ہے وہی مثل کہ ــــ نہ ٹٹے پنے کی مشتری ہے۔ نہیں نہیں، وہ کیا ہے کم بخت، ہاں وہ تو یہ ہے کہ ــــ نہ ٹٹے کی اوجاڑ ہے نہ فریاد کی ہے۔ بوں پر بھروسا موشی دلوا، ہیں یاد کرتے ہیں یہ کچھ گڑبڑ ہے اس شعر میں۔ مگر خیر

مصرعوں کا یہ غلط چیونڈا اک اور مگر بڑا ہر ٹھنڈ ہے۔ قاضی جی کھجا رہے ہیں۔ اخیر میں وہ خدا حافظ کہتے ہیں اور شعر تیار ہوتا ہے۔

مالونہ مانو جہاں جہاں اختیار ہے ــــ بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر قسمت نے گر ملا دیا

مصرعے اور اشعار کہیں تو درست کر لئے جاتے ہیں، کہیں ویسے ہی چھوڑ دیئے جاتے ہیں لیکن قارئین کیلئے ان میں سمجھنے کیلئے مکمل اشارہ ہوتے ہیں۔ قاضی جی بالفور غشی کی حالت میں بڑبڑا رہے ہیں۔ کیا خوب، اگ تاخ یعنی بزرگوں کو کہتا ہے بچہ۔ وہی مثل ہے کہ ــــ بگڑی تی بگڑی تی بگڑی تی گئے مدھی چرا

لاحول ولا قوت، میں کیا بکتا جا رہا ہوں اور کوئی روکتا ہی نہیں مجھ کو۔ چاہے میں غلط شعر پڑھ جاؤں۔

ارے صاحب توجہ کیجئے معلوم کر آپ ہی کی طرح کے نازک مزاج آپ کے یہاں بھی ہوتے ہیں کہ بیس گی اور دل شکنی ہو گئی۔ وہی مثل پیش نہیں بلکہ وہی شعر نسیم بہار کا مجھونکا ــــ ادھر نہ آئے۔ اوں ہوں ــــ کچھ گڑبڑ ہو گیا مصرعہ ــــ نسیم بہار ــ ادھر نہ آئے مجھونکا ــــ ادھر نہ آئے نسیم بہار کا ــــ واللہ مجھونکا ادھر نہ آئے ــــ ایں ایک ہو گیا مصرعہ۔ بھئی بیل کیا بات کہہ دی ہے شاعر کہتا ہے ظالم ــــ

مجھونکا ادھر نہ آئے نسیم بہار کا ۔۔۔ ازک بہت ہے پھول مرا غ مزار کا ۔

اوپر کی مثالوں میں ایک جگہ مصرع بغیر درست کیا ہوا چھوڑ دیا گیا۔ دوسری مثال میں شعر درست کرنے کی کوشش کا سفر کیا گیا۔ اور شعر درست لیا۔ ایک دوسری جگہ، فانی ہی مصرع درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں اندر وہ غلط ہو جاتا ہے، وہ بھی شعر کی الجھن ہو گئیں سب تدبیریں الجھی تقدیر ہیں ہے فانی کی بخار میں مبتلا ہیں ــــ بخار اتنا تیز نہیں جتنا یہ واویلا مچا رہے ہیں۔ اسی عالم میں اپنی بیوی سے کہتے ہیں ؎ تمہیں آنکھیاں سوجھی ہیں ہم بیا۔ لیٹے ہا ــــ بخار زدگی کی اسی حالت میں فانی ہی شعر پڑھتے ہیں ــــ

ارے سیر کی خوب، ہائے پھرے ــــ ارے پھول پھینکے۔ ارے بھی شاد رہے۔ ارے ہاں وہ تیر ہیں، آہ کشش فزا آباد رہے۔

شوکت عظیم کا مضمون مذاق ہو موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے جدت و ندرت کا حامل ہے۔ اردو کی فکری مزاحیہ صلاحیت، اولی استعداد اور مظہر تقاضا مزاج بالکل نہ ہی کرتا ہے معلوم ہوتا ہے وہاں ان کا قلم بس رواں چل پڑا۔ عمل کاریاں کرتا چلا گیا۔ وہ کسی گھر بند نہ تھے۔ کثیر التصانیف انسان ہیں۔ عادل ی لکھے ہیں تو بڑی شگفتگی اور دلچسپی سے مزاحیہ فیچر بھی لکھے ہیں، تو بڑی ظرافت و برجستگی سے، مقالے ہوں کہ مضامین ہر نثری نگارش میں ان کے منفرد رنگ اور ناظر بڑی آب و تاب دکھاتے ہیں۔ زندگی مشغل قرطاس و قلم ہی میں گذری۔ وہ اپنی تحریروں سے ہر عمر میں ہنساتے رہے۔ ان کے مزاحیہ سرمایہ میں دلچسپی، خندہ گی ملتی ہے۔ کسی قسم کی مایوسی کا احساس ہوتا ہے۔ آمد ہی آمد معلوم ہوتی ہے۔ آورد کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اور یہ ایک ایسی خصوصی صفت تھی جو انھیں کے ساتھ رخصت ہو گئی کہ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت کی بہاریں نصیب کرے ــــ صبا اہل کمال اٹھ گئے انسانہ رہ گیا ●●

اس کی میٹھی دل کو خوش کرنے والی خوشبو اور دل پسند ذائقہ کیلئے لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ پان کیساتھ کھانے سے اس کی خوشبو ذائقہ کو بڑھا دیتی ہے اور عرصہ تک اپنی تازگی بنی رہتی ہے۔ فہرست مفت حاصل کیجئے۔

تیار کردہ:۔ دھرم پال پریم چند ۔ چاندنی چوک۔ دہلی-۶

صدیق نظر

واردات

ایک مبہم سی اُمید پہ قائم ہے حیات
یہ تمناؤں کی باہوں میں لچکتے ہوئے خواب
یہ خیالات کی خوشبو، یہ تصوّر کی مہک
دامنِ ناز کی رنگت ہے نگاہوں کا فسوں
میرے احساس میں مہکا ہے مرا سوزِ دروں
وادیٔ شوق میں ہر روز کھلا کرتے ہیں
آرزوؤں کے حسیں پھول محبت کے گلاب
دیدۂ ناز سے ہر لمحہ چھلکتی ہے شراب

یہ تخیل کے تراشے ہوئے پیکر، یہ بدن
پیار کے پھول تمنّا کی مہک کے ساگر
خواب کے گاؤں، وفاؤں کے یہ بازارِ نگر
سب حقیقت کی کڑی دھوپ میں جل جاتے ہیں
خود بخود برف کی مانند پگھل جاتے ہیں

خاک جب ہوتے ہیں خوابوں کے تراشیدہ صنم
بھول جاتے ہیں لبِ ناز بھی دعوؤں کا چلن
وادیٔ دید بدل جاتی ہے ویرانے میں
آگ لگ جاتی ہے نظروں کے صنم خانے میں

سوچتا ہوں کہ تمناؤں کو رسوا نہ کروں
زندگی سے حسیں خوابوں کا تقاضہ نہ کروں
چند لمحوں کی مسرت پہ بھروسہ کر کے
زندگی بھر کی پشیمانی کا سودا نہ کروں

رحمٰن جامی

فردا کے موڑ پر

میرا ماضی مرے حال کی راہ میں
لٹ گیا ہے کسی قافلے کی طرح
حال بھی میرا فردا کے اِس موڑ پر
آج ہے پاؤں کے آبلے کی طرح

لڑکھڑاتے قدم زندگی کے لئے
کتنے بے چین ہیں کتنے بے تاب ہیں
ایک فریاد ہے دل کی ہر آرزو
آنکھ اُمید کی کب سے بے خواب ہیں

اور اب آ کے فردا کے اس موڑ پر
حال بن کر تماشائی خاموش ہے
جیسے طوفان اُٹھنے کی ہے یہ خبر
کس قدر میری تنہائی خاموش ہے!

نصیر پرواز

غزل

مجھے قبول نہیں زخمِ دل کی بخیہ گری
سکوتِ شام سے بہتر ہے نالۂ سحری
دل و نگاہ کے مابین اک خلش ٹھہری
نصیبِ غم کو ہے کیا ماسوائے دردسری
ہر ایک سمت اندھیروں کی گرد چھائی ہے
تری نگاہِ فسوں ساز کی یہ کم اثری
اُسی سلیقے سے کرتا ہوں دردکا اظہار
عطا ہوا ہے جہاں تک شعورِ نالہ گری
دیارِ درد کی تاریکیوں میں گم ہو کر
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں وسعتِ نظری
ہزار تشنہ سہی زندگی کی اُمیدیں
ترے لبوں پہ تو قائم ہے آرزو کی تری
رواں ہے پھر بھی رہِ غم میں کاروانِ خیال
نہ کوئی جادۂ منزل نہ نورِ راہبری
نہیں ہے مجھ کو غرورِ شعورِ فن پرواز
بجز خیالِ ہتی دامنی و بے ہنری

کشمیری لال ذاکر

غزل

یہ راہ جب بھی چلی، بدگماں چلی ہے مجھے
بھٹک رہا ہوں کہ منزل کہاں ملی ہے مجھے
ترے جمال کی پرچھائیاں بھی ساتھ رہیں
ترے خیال سے فرصت کہاں ملی ہے مجھے
مرے خلوص کے پھولوں نے چوم چوم لیا
تری نگاہ کی شبنم جہاں ملی ہے مجھے
غبار اتنا کہ پہچان بھی نہیں سکتا
بچھڑ کے زندگی تو پھر کہاں ملی ہے مجھے
وفا کی بات کروں کس طرح زمانے سے
نظر ملی ہے نہ تابِ زباں ملی ہے مجھے

(انشہ) اقبال نظام

دُودھ کی چائے

آج دن بھر ہی سے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی بوندیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں کہ اچانک دھوپ نکل آئی۔ بالکل ہلکی ہلکی دھوپ جیسے پچھلے دنوں جب چمپا کا بیاہ ہونے والا تھا۔ تو وہ گوٹے کے کپڑے پہنے ہوئے کھڑی تھی۔ میں جھونپڑی سے باہر نکل آیا جس کے سامنے والے حصے میں جو سڑک کے کنارے تھا گرم گرم چائے اُبل رہی تھی۔ ایک طرف پان بنانے کا سامان پڑا تھا۔ جُونے میں تھوڑا سا کھانا پڑا ہوا تھا جسے میں نے نکالا تاکہ میں کا اسٹاک بھی اسی میں ہوتا تھا۔ میری یہ چھوٹی سی دوکان خوب چل رہی تھی۔ آتے جاتے ٹرک والے، موٹر والے، ہر قسم کے مسافر یہاں رُک جاتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی کار یا اسکوٹر یا موٹر سائیکل بھی رُک جاتی تھی۔ میں ان لوگوں کی ضرورت کی چیزیں مہیا کر دیا کرتا تھا۔ اور وہ لوگ پھر اپنے سفر پر چل کھڑے ہوتے تھے۔ جب بھی کوئی موٹر یا ٹرک میری دکان پر رُک کر جانے کی تیاری کرتا میں اُسے دور تک جاتا ہوا دیکھتا رہتا۔ جب تک وہ ایک نقطہ نہ بن جاتا تب بھی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھتا ہی رہتا۔ کیونکہ سڑک بالکل سیدھی تھی اور اس پر کہیں میلوں تک کوئی موڑ یا بیچ کا خم نہ تھا۔ اکثر جب اسکول کے بچے شور مچاتے ہوئے سڑک پر سے گذرتے تو مجھے بے حد ناگوار گذرتا۔ کیونکہ وہ بہت شرارت کرتے ہوئے گذرتے تھے۔ اکثر لڑتے بھی تھے اور کبھی کوئی بسکٹ لینے میری دوکان پر مرمر رکتا تھا۔ میں کسی بھی ایسے بچے کو بہت جلد رخصت کر دیتا تھا حالانکہ میں جانتا تھا کہ ان میں کون سا بچہ کس کا ہے۔ لیکن میں نے کبھی اُن کے ماں باپ سے اُن کی شکایت نہیں کی۔ اسکول کا ماسٹر چھٹی کے بعد اسکول لگنے سے پہلے اور بیچ کی چھٹی میں میری دکان میں ایک کپ چائے پی جاتا رہتا تھا۔ وہ روز اپنی ٹوٹی سی سائیکل پر شہر سے آتا تھا۔ کبھی کبھی بیچ پر لیٹ کر فلمی تانیں اڑایا کرتا یا پھر لڑکوں کو بلا کر ہاتھ پیر دبواتا۔ آج بھی جب بچے شور مچاتے ہوئے گذرے اور ماسٹر اسکول آکر بیچ پر لیٹ گیا تو میں نے اس کے سامنے چائے اور پان ایک ہی ساتھ رکھ دیے اور ذرا ٹھہر کر جھونپڑی سے باہر آگیا۔ یہ میری جھونپڑی کا پچھلا حصہ ہے اور یہی شیا مو کا کھیت ہے۔ میں جانتا تھا اس وقت ہلکی دھوپ نکل آئی ہے۔ اور بوندیں بڑی ہیں مرمر آسمان پر دھنک لہرائے گی اور میرا خیال صحیح تھا۔ میں نے دیکھا سات رنگوں والی دھنک آسمان پر اُبھر آئی ہے۔ کھجور کے دونوں پیڑ کے ٹیڑھے اوپر وہ جھکا رہی ہے اور اس کے عورے اوپر ایک اور ہلکی سی دھنک نکل آئی ہے۔ مجھے کوئی موسم پسند نہیں ہے۔ مگر صرف یہ رنگین دھنک جو میرے ماضی کو ساتھ لے ابھرتی ہے۔ اور میرا دل چاہتا ہے زندگی کے چالیس زینے پیچھے اُتر جاؤں اور اللہ میں ہوتا سالہ لڑکے کھیتوں کو بھاگتا ہوا کنوئیں پر پہنچ جاؤں۔ جہاں ایک رنگ والی دھنک بہت دھیرے دھیرے کنوئیں سے ڈول کھینچ رہی ہو اور ہر بار ڈول بھر رسی کو کھینچنے کیلئے بڑھتا ہو اپنی چوڑیوں کی کھنک سمیت جھک جاتا ہو۔ اور میں بہت چپکے سے پیچھے پہنچ کر کنوئیں والا آنچل سر پر سے کھینچ دوں۔ فضا میں خون زدہ سی اوئی کی آواز گونج اُٹھے، اور بھر بھر کر ڈول رسی سمیت کنوئیں میں جا پڑے۔ رسی تیز تیز گھرسی سے نکل گئی، بھرا ہوا ڈول ایک دھکے سے کنوئیں کی تہہ میں پہنچ گیا۔ میں چونک پڑا۔ باہر کوئی موٹر رکی تھی۔ میں جلدی سے پلٹ آیا۔ اسکول ماسٹر جا چکا تھا۔ جیب رک گئی تھی اور وہ نیچے اُتر رہا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گیا۔ بک کر اُس کے قریب پہنچا۔ جیب میں مٹی ہوئی لڑکی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور میں اس سے چائے کا آرڈر لے کر پلٹ پڑا کیونکہ مجھے بہت جلد انھیں چائے پلا کر رخصت کر دینا ہوگا۔ تب تک وہ دونوں بیٹھے ہوئے ہنس ہنس کر باتیں کرتے

رہیں گے۔ اچھا ہوا آج دودھ کا انتظام ہو گیا اور نہ اتنی صبح صبح چائے میں کتنی شرمندگی ہوتی۔ میں انہیں ہمیشہ دودھ کی چائے پلا کر دیتا ہوں۔ آج میں بہت خوش ہوں، آج دو بڑے اچھے موسم میں آئے ہیں۔ آج لڑکا خلافِ معمول سفید قمیض اور کالی پتلون پہنے ہوئے ہے ورنہ میں نے ہمیشہ اس کو بہت خوبصورت سوٹوں میں دیکھا ہے۔ آج لڑکی بھی کالا غرارہ پہنے ہوئے ہے۔ سفید کرتہ اور کالا دوپٹہ اوڑھے وہ بہت خوبصورت لگ رہی ہے۔ دونوں مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ ذرا دیر سے جائے بناؤں تاکہ انہیں دیر تک دیکھتا رہوں۔ لڑکا اس سے نیچے اترنے کو کہہ رہا ہے، مگر وہ شرما شرما کر انکار کر رہی ہے۔ مگر میں جانتا ہوں وہ بھی اتر آئیگی نوسیمور کی چھلیوں کے پیڑ کے نیچے کھڑی ہو جائیگی تب لڑکا اس کے قریب کھڑا ہو جائیگا اور دونوں بے مقصد ہنس پڑیں گے پھر بھی کوئی پلیجر بس گذرنے لگے گی اور ان کی ہنسی کو بریک لگ جائیگا۔ لڑکی پیڑ کی طرف منہ پھیر کر کھڑی ہو جائیگی لیکن نظر میں ہوں گی جائے انڈیل رہا ہوں۔ مجھے دیکھتے ہی عادی سے لڑکے کی طرف مڑ جائیگی لتے میں بس گذر چکی ہوگی اور وہ پھر ہنسنا شروع کر دیں گے۔

آج بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ دونوں کے نام پوچھوں۔ دونوں کہاں رہتے ہیں یہ پوچھوں۔ چرواں سے کہوں میری جھونپڑی کے اندر بیٹھ جائیں۔ لیکن میں ان سے یہ کچھ بھی نہ پوچھ سکا اور میں نے ان کو چائے لے جا کر دی۔ وہیں کھڑے کھڑے انھوں نے کپ منہ سے لگا لیا پانی گرم تھی۔ لڑکی کے ہونٹ جل گئے اور وہ ہنس پڑی اور چائے کے گرم ہونے کی شکایت کرنے لگی۔ لڑکا اب بھی ہنس رہا تھا۔ یہ دونوں ساتھ کیوں ہنستے ہیں؟ پچھلے چھ مہینوں سے میں ان کو ہنستا دیکھ رہا ہوں۔ ان چھ مہینوں میں یہ میرے پاس کتنی بار آچکے ہیں۔ اوہ ٹھیک یاد آیا۔ شاید شہر سے باہر اور میری اس کٹیا سے بہت دور، شاید دس بارہ میل دور ان کا مکان بن رہا ہوگا۔ ورنہ صرف چائے پینے یہ اتنی دور سے کیوں آتے؟ اب کی بار جب آئیں گے تو ان سے میں ضرور پوچھوں گا کہ ان کا مکان کہاں بن رہا ہے۔ لیکن میں ایسا کبھی نہ کر سکا۔ نہ ان کا نام پوچھ سکا نہ گاؤں۔

اب کی بار دو ہفتے بعد آئے تھے۔ میں نے دور سے ہی چائے کا آرڈر دیا۔ چائے بنائی اور ان کو لے جا کر دی۔ شاید ان کی گاڑی میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ لڑکا انجن پر جھکا کچھ کر رہا تھا۔ لڑکی پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے دونوں کپ تھام لئے اور اندر سیٹ پر رکھ دیئے اور لڑکے کا انتظار کرنے لگی۔ جب گاڑی ٹھیک ہو گئی تو دونوں ٹہلتے ہوئے پیڑ کے نیچے آگئے اور چائے پینے لگے۔ شاید ہونے والے ایکشن کی باتیں کر رہے تھے۔ اور میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ لڑکے نے پان لیا اور دونوں واپس لوٹ گئے۔

کھیتوں میں ہوا کے کٹ رہے تھے۔ جوار بھری پوری لدی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں گابھے کو نیل کی کوک سنائی دے جاتی تھی۔ آموں پر بور آنے کو تیار تھا۔ راستے کے سب پیڑوں میں آگ سی لگ رہی تھی۔ مخملی پھول زمین پر بچھے ہوئے تھے۔ کہ اچانک ان کی گاڑی آگئی۔ لڑکی کی گود میں بہت سارے ٹیسو کے پھول تھے۔ جب تک میں انہیں چائے دینے کیلئے چائے بنانے میں مصروف رہا، لڑکی نے مزید پھول سمیٹ لئے اور گاڑی میں رکھ لئے۔

پھر ایک دن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ ایک خوبصورت سی کار سے اتر رہا تھا۔ حیرت مجھے کار پر نہ تھی۔ حیرت تو مجھے کسی اور بات پر تھی۔ وہ بات ہی ایسی تھی کہ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لیکن پھر بھی میں ایک غریب جھونپڑا ہوٹل والا اور وہ ایک مالدار آدمی جو کاروں اور موٹروں کے ساتھ ساتھ لڑکیاں بھی بدل سکتا ہے۔ کار میں سے اجلے رنگ والی لڑکی اتر رہی تھی۔ اس نے بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھے اور چاروں طرف ایک حیرت بھری حقارت کی نگاہ ڈالی۔ میں جب چائے لیکر گیا تو اس نے کراہیت محسوس کی۔ اور میرے بدن کے گندے کپڑوں پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ دور سے پھر ایک طمع پیالی اور طشتری کو غور سے دیکھا لیکن لڑکے کی تقلید میں مجبوراً ہر مار کرنے لگی۔ پھر دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ میں چور نگاہوں سے دونوں کو دیکھتا رہا اور پہلی بار مجھے لڑکے سے شدید نفرت ہوئی بے اختیار مجھے وہ پہلی لڑکی یاد آگئی۔ جس کی ہر ادا، ہر انداز یاد آیا۔ اس نے کبھی اس ماحول سے منہ نہ بنایا تھا۔ وہ بے تحاشا ہنستی تھی۔ نہ جانے اس کی ہنسی کہاں سسک رہی ہوگی۔ میں سوچنے لگا۔ اف بڑی غلطی کی، اس سے میں اس کا پتہ پوچھ لیتا۔ اس کے پاس جاتا اور اس کو تسلی دیتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے تصور ہی سے میں کانپ اٹھا اور میری آنکھیں خود بخود بھیگ گئیں۔ دن تیزی سے اڑتے چلے جا رہے تھے۔ مہنگائی بڑھتی جا رہی تھی

بسکٹ اور دودھ بھی مہنگا ہو گیا تھا۔ میں نے بھی چائے کے دام بڑھا دئے تھے۔ میں اب اُس لڑکے کو اُس کی موٹروں سمیت بھول جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب بھی میں نے بھری دوپہر میں آنکھیں بند کیں، وہ لڑکی میرے سامنے آکھڑی ہوئی اور میں اُس کے لئے چائے بنانے لگا۔ لیکن یہ سب وہم تھا۔ میں اُس کو یاد کر کے تڑپ جاتا تھا۔

ایک ایسی ہی دوپہر تھی۔ گرمیوں کی لمبی دوپہر۔ کھیتوں میں کچھ باقی نہ تھا۔ سڑکوں پر دھول اُڑ رہی تھی۔ گرمی شدت سے پڑ رہی تھی۔ کہ باہر کوئی گاڑی رُکی۔ میں لیٹا رہا۔ میں جانتا تھا اِس وقت شمو اکا ٹرک ہوگا وہ خود اکر بنچ پر لیٹ جائیگا، اور سو جائیگا۔ اس کے بعد اٹھے گا منہ ہاتھ دھوئیگا، چائے پی کر پان کھائیگا، تب گالیاں دیتا ہوا ٹرک اسٹارٹ کرے گا اور چلا جائیگا۔ شمو الاکھ برا سہی، لیکن اُس میں ایک بات اچھی تھی کہ ہر پھیرے میں مجھے ہلانے کیلئے لکڑیاں دے جایا کرتا تھا۔

ارے یہ کیا؟ یہ تو وہی بالو ہے۔ وہی لڑکا۔ میں گھبرا کر جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ میں نے کہا، صاحب چائے بناؤں، لیکن پیچھے سے ایک تحقیر آمیز ہنسی گونج اٹھی۔ "اِس گرمی میں چائے، میں تو صرف پانی پیونگی۔" میں پھر اس نئی دبلی پتلی لڑکی کے عائزے میں کھو گیا۔ جو لڑکے کو صرف پانی پلا کر لے گئی۔ جب کار دُور چلی گئی تو میں نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ دل ہی دل میں لڑکے کو بہت ساری گالیاں اور بد دعائیں دیں۔ پھر بے اختیار نہ جانے کیوں وہ پہلی لڑکی یاد آگئی۔ اور میں اُس کو یاد کر کے رو سا دیا۔ میں اُس لڑکی کی تلاش میں کالمبس بن جانا چاہتا تھا۔ اُسے اپنی جھونپڑی میں لا کر رکھنا چاہتا تھا۔ اُس کے آنسو پونچھنا چاہتا تھا۔ اور کھلی فضا میں آزاد چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ آہ! آج میری بیٹی ہوتی تو بالکل اُسی کے برابر ہوتی۔

اِدھر کئی دنوں سے اسکول کی نئی عمارت بن رہی تھی۔ اور اُس کے قریب ہی پی۔ ڈبلیو۔ ڈی، اور آفس کی عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ اِس لئے سڑک پر کافی چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ اور شاید دو موسم بھی بیت گئے تھے۔ میں نے دُور سے اُس کی کار کا ہارن سنا اور غصّے سے تلملا اٹھا۔ "یہ کمبخت پھر آرہا ہے۔" ہاں ہاں وہی ہے۔ وہ دیکھو روک دی اُس نے گاڑی۔ وہ کالی کار کے پاس رو کی ہے اُس نے۔ آہ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ ایک عورت ایک بچہ"۔۔۔ خوبصورت عورت، خوبصورت بچہ"۔ لیکن یہ عورت اُف، میں سے کوئی بھی نہیں۔ یہ تو بالکل نئی ہے۔ "اُف، اس لڑکے کو چائے میں ہرگز نہیں دوں گا۔ میری دُکان اِس کیلئے نہیں ہے۔ اُس نے کتنی ہی لڑکیوں سے دیکھتے ہی دیکھتے مراسم بڑھائے اور اب شادی کی اور سے کی ہے۔ وہ دونوں ہنس رہے ہیں۔ ہاں، بھولی بھالی عورت کو اس کے پچھلے کرتوت کیا معلوم۔ "آنے دو۔"

وہ ہنستے ہوئے آرہے ہیں۔

میں اِس عورت سے آج سب کچھ کہہ دوں گا۔

وہ قریب آگئے۔۔۔ اور قریب۔ بالکل میرے قریب۔۔۔ معصوم بچے" نے بڑھ کر بسکٹ اٹھالیا۔ اور میں نے خود اسے دوسرا بسکٹ دے دیا۔ اس نے توتلی زبان سے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اُس کے بھول سے گال پر پیار کر لیا۔ اور بچے" کی مسکراہٹ میں سب کچھ بھول گیا۔ جلدی سے چائے بنائی اور دونوں کو دی۔ ایک کپ میں بچے کو خود پلانے بیٹھ گیا۔ دونوں ذرا دُور جا کر کھڑے ہو گئے۔ اِن کی بھی ہنسی میرے پاس آرہی ہے۔ بچے نے چائے ختم کر لی۔ اُس نے پیسے دیئے اور تینوں کار میں بیٹھ گئے۔ کار مڑی اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔۔۔

جہاں کار اوجھل ہوئی تھی، وہاں سے پہلی لڑکی اُبھر آئی۔ میں اُس کے استقبال کیلئے اٹھ کر بھاگا۔ مگر وہ مجھ سے بھی تیز بھاگ گئی۔ ایک بار پھر میں اُس کیلئے دل میں درد محسوس کرنے لگا۔

دیوالی آنے والی تھی۔ ادھر تین چار دن سے مہاوٹ برس رہی تھی۔ کھیت بھی ہرے تھے۔ میرے امرود کے پیڑ میں بڑے بڑے امرود لٹک رہے تھے۔ میں نے چھنیا چمار سے کہہ کر جھونپڑی کو نئے سرے سے چھوایا تھا۔ اس کی بیوی نے دو دن تک اکر دیواروں کو نئے سرے سے لیپا، اور پوتا۔ زمین بھی برابر کر کے، اس نے لیپ دی۔ میں نے سوچا لاؤ سب ٹھیک ٹھاک کر لوں۔ پھر دیوالی آیا ہی چاہتی ہے۔ میں نے الماری صاف کی۔ کانچ، گیلے کپڑے سے پونچھے۔ ایک نئی بید چٹائی۔ ایک میز خرید لی۔ چائے بنانے کیلئے نئے برتن نکال لئے۔۔۔

اور نہا دھو کر جب اپنے آپ کو نیا محسوس کرنے لگا تو دھنک کی یاد نے گھیر لیا۔ وہ ہوتی تو دیکھتی۔ میری چھوٹی سی دکان کتنی چل رہی ہے۔ میں کتنا خوش حال ہوں۔ اگر وہ ہوتی تو، میں اب تک اس کیلئے ریڈیو مزور خرید لیتا۔ لیکن اب کیا کروں خرید کر۔ میری اندر کی صدری میں چار سو روپے پڑے ہیں۔ میری زندگی بھر کی کمائی۔ دھنک ان چار سو روپیوں کو دیکھ کر خوش ہو جاتی۔ ارے۔ لو وہ دیدی آگئے۔ آیئے دیدی چائے بناؤں۔

ان کے ساتھ نیا ماسٹر بھی ہے۔ وہ اس ماحول سے بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتا، یہاں بہت خوش حال رہے گا۔ پڑھنے والے بچے اس کے ہاتھ پیر دابیں گے۔ جنسل کی ہر چیز لاکر دیں گے۔ گھی، گڑ مفت ملے گا۔ صرف میں! چائے مفت نہ دوں گا لیکن تھوڑے دن میں یہ خود ہی مانوس ہو جائیگا۔

کل دیوالی ہے۔ شام کو رمیا کمہار پورے ایک سو دیئے دے جائیگا۔ اسی سے تیل بھی منگوالوں گا۔ پھر کل میری یہ چھوٹی سی دکان جگمگا اٹھے گی۔ ضرور لکشمی میری دکان میں آئے گی اور اس دن سچ مچ لکشمی آگئی۔

میں بے اختیار پاگل کی طرح اس کے سواگت کو بھاگا۔ اس دن میں خوشی کے مارے مرتے مرتے بچا۔ میں نے دور سے ایک جیپ آتی ہوئی دیکھی۔ جب ذرا قریب آئی تو اسی لڑکے کی تھی۔ میں چپکا بیٹھا رہا، لیکن یہ کیا۔ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہی پہلی لڑکی جیپ سے اتر رہی تھی۔ ایک خوبصورت لیکن بہت تھکی ساڑی باندھے ہوئے ہی ہنستی ہوئی اتری۔ لیکن اس کی ہنسی میں اب بھی کھنک تھی۔ اس دبی دبی سی ہنسی میں بھی وہ بہت پیاری نظر آرہی تھی۔ میں بے اختیار دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں بچ پڑا۔ بیٹا بڑے دنوں میں آئیں۔ چلو اندر بیٹھو۔ وہ ہکا بکا میری صورت دیکھ رہی تھی۔

لڑکے نے کہا۔ "سن کیا رہی ہو چلو نا۔"

وہ درخت کی طرف بڑھی۔ میں نے راستہ روک لیا۔ "دیکھو میرا گھر تمہارے لئے کتنا صاف ستھرا ہے۔ چلو، آج اندر چلکر بیٹھو۔" وہ ہنستی ہوئی اندر آگئی۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ اس کی مانگ کا سیندور دیکھ کر میں ہواؤں میں اڑنے لگا۔ میرے منہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی نکل گیا۔ "تمہاری بیوی؟ تو پھر وہ لڑکیاں اور وہ عورت اور بچہ یہ سب کیا تھا۔؟"

لڑکے نے ایک قہقہہ لگایا اور بتایا کہ وہ دو لڑکیاں تو اس کی بہنیں تھیں، بچہ اور عورت بھابی اور بھتیجا تھا۔

میں نے مزید مسرت سے اسے گلے لگا لیا۔ مجھ گھر بیٹھے لکشمی نے ایک بڑی دولت بھیج دی تھی۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ اب ہر اتوار کو وہ دونوں بغیر بھولے ہوئے اپنے بوڑھے باپ سے ملنے آتے ہیں۔ اور میں بیٹھا ہوا سوچتا ہوں اسے بیٹا کہوں یا اسے بیٹی۔

آج اتوار ہے، ٹیسو کے پھول بہت کھل گئے ہیں۔ میں اپنے بچوں کیلئے چن لوں۔ وہ دونوں آتے ہی ہوں گے جلدی سے چائے بنالوں۔ دودھ کی، صرف دودھ کی چائے ——

●●

مدت خریداری ختم ہونیکی اطلاع

اس سیاہ حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری اپریل کے اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ آپکی خدمت میں سنہ ۱۹۶۱ء کا "شاعر" ذریعۂ وی۔ پی بھیجا جائیگا یا آپ سالانہ چندہ کی رقم ذریعۂ منی آرڈر روانہ کر دیجئے۔ اگر تجدید خریداری منظور نہ ہو تو واپسی ایک خط کے ذریعہ دفتر کو اطلاع دیدیجئے تاکہ وی۔ پی۔ نہ بھیجا جائے۔ —— مینیجر ——

جدید دور کے احساسات کی آواز!

اردو شاعری میں فکر و ہیئت کی نئی راہ!!

فکر کو احساس، احساس کو آواز، آواز کو لفظ بنانیوالے نئی نسل کے پُر وقار شاعر

شہاب جعفری

کا مجموعۂ کلام

سورج کا شہر

زیر اشاعت و طباعت کی منزل میں ہے

اعجاز صدیقی

اُردو ادب میں مشترکہ تہذیب و تمدّن

خطبۂ صدارت کُل ہند اُردو سمپوزیم اودے پور (راجستھان)

(منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹ مارچ سنہ ۱۹۶۶ء)

محترم خواتین اور حضرات ،

میں اراکینِ انجمن ترقی اُردو اودے پور اور راجستھان ساہتیہ اکیڈیمی کا شکر گذار ہوں کہ مجھے "کل ہند اُردو سمپوزیم" کی صدارت کی عزت بخشی - میری اپنی مصروف زندگی ایسی ذمہ داریوں سے مجھے اکثر دُور ہی رکھتی ہے - دراصل آج کے سمپوزیم کے موضوع کی اہمیت میرے لئے وجہ کشش ہوئی اور میں یہاں حاضر ہونے پر مجبور رہا -

سب سے پہلے جو بات میرے محسوسات سے ٹکرائی وہ یہ تھی کہ "سمپوزیم" کے لئے موضوع "اُردو ادب میں مشترکہ تہذیب و تمدن" ہی کیوں دیا گیا؟ کسی بھی مباحثہ کے لئے موضوع کا تعین کسی خاص ضرورت کے تحت ہوتا ہے - اس کا ایک مقصد تو یہ ہو سکتا ہے کہ اُردو ادب میں مشترکہ تہذیب و تمدّن کی چھان بین کی جائے یا اس طرف مزید توجہ دی جائے تاکہ "قومی یکجہتی" کو بڑھاوا ملے - دوسرا خیال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں جبکہ اُردو زبان کے ساتھ سخت ناانصافی کی جا رہی ہے، اُس کی تہذیبی اور تمدّنی حیثیتوں کو واضح کیا جائے - میں آخر الذکر کو ایک طرح کا احساسِ کمتری سمجھتا ہوں - اُردو زبان و ادب اب وہاں نہیں ہے ، جہاں اُسے کسی مصروفی انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہو - ہاں اگر کچھ لوگ مشکوک ہیں یا ثبوت چاہتے ہیں تو وہ خود کیوں نہ تحقیق کی زحمت کریں - اُردو کے قدیم و جدید ادب کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں - زبان اور ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو چھپا ہوا ہو - روزِ روشن کی طرح ہر بات آئینہ ہے - تاریخیں بھری پڑی ہیں - لیکن اگر اس موضوع کو زیرِ بحث لانے کا منشا صرف تجدید و تفہیم ہے تو اس پر ضرور بحث کرنا چاہئے - چونکہ اس موضوع میں کوئی اختلافی پہلو نہیں ہے، اس لئے بحث کا ایک ہی رُخ ہو سکتا ہے - ادب میں مشترکہ تہذیب کی بات تو بہت بعد کی ہے - پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اُردو زبان کن مشترکہ اسباب کی ساختہ پرداختہ ہے - اس کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین میں کتنی گہری ہیں، اس کا سرچشمہ کیا ہے، کن پراکرتوں سے مل کر یہ بنی ہے اور عہد بہ عہد اس میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں -

اُردو زبان کے بننے اور ترقی کرنے کی تاریخ بہت طویل ہے - لسانی تحقیق کے مطابق ہندآریٰ اور اُردو دونوں جدید زبانیں ہیں "کھڑی بولی" جو شورسینی پراکرت کی اہم شاخ ہے، اُسی سے یہ پیدا ہوئیں - کوآں اور دراوڑ زبانیں چھ سات ہزار سال پرانی زبانیں تھیں اور جب ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح ایران و افغانستان کے راستوں سے "آریانسل" ہندوستان میں داخل ہوئی تو اُن قدیم اور غیر مہذب زبانوں پر "ہند آریائی پراکرتوں" کا زبردست اثر پڑا - "آریائی نسل" کے غلبے سے کوآں اور دراوڑ قبیلے اور اُن کی زبانیں سمٹ کر جنوب کی طرف چلی گئیں - تامل، تلگو، ملیالم اور کنڑ زبانیں بہت سی تبدیلیوں کے ساتھ اُن قدیم زبانوں کی یادگار ہیں - لیکن اُس سنسکرت بھاشا سے جو آریٔ اپنے ساتھ لائے تھے، یہ زبانیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں - سنسکرت زبان کے ساتھ ایک مذہبی وابستگی بھی تھی اور یہاں تک کہ یہ زبان دیوتاؤں کی زبان کہلائی -

جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اور جب تک باقی رہے گی، انسان کو اپنی سماجی ضرورتوں کے لئے سانچے بنانے اور بدلنے پڑے اور آئندہ بھی بدلنے پڑیں گے۔ ایک متحرک اور زندہ سماج مادی ضرورتوں اور خوش حالیوں کے لئے روایتوں کی زیادہ پاسداری نہیں کیا کرتا۔ ہندوستان کی قدیم زبانوں کے ساتھ اس کے قدیم قبائلی باشندوں کی بہت سی روایتیں وابستہ تھیں۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ مختلف نسلیں اور قومیں ہندوستان میں آنا شروع ہوئیں اور ایران و توران، پامیر و تبت اور ایشیائے کوچک کی تہذیبیں سمٹ کر ہندوستان کا ایک نیا مزاج بنانے لگیں۔ زبانوں کے امتزاج نے سماجی رشتوں اور ضرورتوں کی تکمیل میں دشواریاں پیدا کیں۔ چونکہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی خواہش تیز تھی، اس لئے اظہار کا ایک نیا راستہ نکلنا شروع ہوا اور بغیر کسی جبر و اکراہ کے ایک نئی زبان کے وجود میں آنے کے امکانات پیدا ہونے لگے جو کئی سو سال تک غالب رہنے کے باوجود سنسکرت زبان کو بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی یا ہندوی زبان ننگے اور گھنگھیرو چلنے لگی تھی۔ غریبوں، بے تعلقوں اور غلاموں ہی کے زمانہ میں ایک نئی سی کھچڑی زبان نے جنم لیا تھا۔ اس زبان کو جنم دینے والے وہ معصوم لوگ تھے جنھیں نہ ہندو کا نام دیا جا سکتا ہے اور نہ مسلمان کا۔ بس وہ انسان تھے۔ یا یوں کہئے کہ دیش بھگت۔ اپنے دیش کے انسانوں کے لئے آسانیاں پیدا کرنا اُن کا دھرم اور ایمان تھا۔ سندھ سے لے کر پنجاب، دہلی۔ دوآبہ گنگ و جمن، دکن۔ گجرات۔ بنگال۔ بہار تک سورسینی پراکرت سے نکلی ہوئی کھڑی بولی لہجے کے ذرا فرق کے ساتھ کہیں راجستھانی کہلائی، کہیں میتھلی اور اودھی، کہیں بھوجپوری اور مگہی، کہیں برج بھاشا اور ہریانی۔ پھر کئی سو سال کے بعد جب مغل حکمراں یہاں آئے تو عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کا اثر بھی اس ہندوی یا ہندوستانی زبان پر پڑ کر رہا اور آگے چل کر اسی کو "اردو" کہنے لگے۔ یہ وہ زبان تھی جسے مذہب، رنگ و نسل اور فرقوں کے اختلاف کے باوجود سب نے چاہا اور سب اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔ یہ کہنا تاریخی اعتبار سے درست نہیں کہ گیارہویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک جو نئی زبان ترقی کی منزلوں سے گذری، اس نے عربی اور فارسی زبانوں کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا۔ آپ کو یہ سن کر شاید تعجب ہو کہ ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں مثلاً مراٹھی، گجراتی۔ تلگو۔ جنگلہ وغیرہ میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے بے شمار الفاظ پائے جاتے ہیں اور جنھیں آج یہ زبانیں اپنی ہی زبان کے الفاظ سمجھتی ہیں، ان کو باہر نکال کر پھینک دینے کا کوئی جذبہ ان کے بولنے والوں میں نہیں پایا جاتا۔ میرے گجراتی زبان کے ایک عزیز نے مجھے لکھا ہے کہ اگر گجراتی زبان سے عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ الگ کر لئے جائیں تو یہ زبان ہی ختم ہو جاتی ہے۔ صرف اردو زبان کو محض اس لئے کہ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں، بدیسی زبان بتانے والے دوستوں سے میں گذارش کروں گا کہ وہ ملک کی دوسری زبانوں کا جائزہ لیں تو انھیں اس بات کی سچائی کا اندازہ ہو جائے گا۔ اردو زبان میں صرف عربی فارسی یا ترکی ہی کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ ہندی اور انگریزی زبانوں کے بھی ہزاروں الفاظ ہیں۔ اردو میں ہندی الفاظ کی تعداد عربی اور فارسی الفاظ سے چار گنا زیادہ ہے۔ جہاں تک اردو گرامر (قواعد) کا تعلق ہے، وہ ہندی گرامر سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اس کے تمام افعال و ضمائر دیسی ہیں۔ مزاج اور لہجہ دیسی ہے، روح دیسی ہے، جسم دیسی ہے۔ سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی تو دوسروں کی لائی ہوئی زبانیں تھیں، لیکن وہ آسان ہندی اور وہ اردو جسے ہم سب بولتے، لکھتے اور پڑھتے ہیں، خالص ہندوستان ہی کی ہے۔ دن۔ رات۔ چاند۔ سورج۔ برسات۔ جھنڈا۔ کھیت۔ دکھ۔ روگ۔ کسان۔ آنکھ۔ ناک۔ کان۔ ہاتھ۔ سکھ۔ چین۔ سماوٹ۔ گھلاوٹ۔ بناوٹ۔ ہار۔ جیت۔ ٹھنڈا۔ اوس۔ بادل۔ گھٹا۔ بجلی۔ نیند سویرا۔ آج بھگڑا اور اسی طرح کے ہزاروں الفاظ ہندوستانی نہیں تو اور کہاں کے ہیں۔ دنیا کی اور کس زبان میں یہ پائے جاتے ہیں؟ اردو والے بحیثیت یہ جدید ہندوستانی الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ موقع محل کے اعتبار سے دوسری بیرونی زبانوں کے الفاظ بھی۔ اردو نے کبھی اور کسی دور میں اپنے دامن کو تنگ نہیں کیا۔ جس زبان کا جو لفظ کام کا لگا اسے اپنا لیا اور یہی وجہ ہے کہ یہ زبان صدیوں سے ہندوستان کی عوامی زبان ہے۔ اردو زبان کے مشترکہ زیور کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنا طولِ کلام ہوگا۔

حضرات۔

تہذیبی قدریں ہمیشہ ارتقا پذیر رہتی ہیں۔ تہذیب کسی جامد شے کا نام نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مصر و یونان و روما کی عظیم

تہذیبیں کبھی زوال آمادہ نہ ہوتیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اُن پرانی بڑی تہذیبوں کے نشانات تو ملتے ہیں مگر وہ جیتے جاگتے باقی نہیں ہیں۔ تہذیبوں کے عروج و زوال کی کہانی نہ صرف بہت پرانی بلکہ بڑی عبرتناک ہے۔ خود ہندوستان میں پچھلے آٹھ ہزار سال کے طویل زمانہ میں بے شمار تہذیبوں نے جنم لیا اور وہ سب ختم ہو گئیں۔ اب بھی کبھی کبھی بہت پرانے ڈھانچے اور اُن کے سرد میں کی تہوں سے اتفاقیہ طور پر نکل آتے ہیں اور اُن میں سے کوئی زبانِ حال سے کہتا ہے ؎

"یہیں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا"

بالکل اسی طرح مہنجو داڑو، ہڑپا اور ایسی ہی دوسری قدیم تہذیبوں کے نشانات ہمارے لیے دلچسپی اور عبرت کا باعث ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں تہذیبی تبدیلیوں کی داستان بہت طویل ہے۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ جیسے جیسے کسی ملک کے باشندوں کی جبلتیں ایک دوسرے سے ملتی جاتی ہیں ویسے ہی ویسے تہذیب و تمدن میں نمایاں تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں اور اُن پر نکھار آتا جاتا ہے۔ تہذیب و تمدن کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے۔ زراعت، صنعت و حرفت، تجارت، سائنس، آرٹ، مذہب، ثقافت، سب تہذیبی دائروں میں آتے ہیں۔ مختلف اطوار و خصائل، زبانیں اور بولیاں، عقیدے اور رسم و رواج رکھنے والے لوگ جب بہت سی باتوں پر سمجھوتہ اور اشتراک کر لیتے ہیں تو ایک مشترکہ تہذیب پیدا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر نہ صرف ایک زبان بنائی بلکہ ایک نئی شاندار تہذیب کو بھی جنم دیا۔ یہ تہذیب عصری تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی ہندوستان کے لئے موجبِ افتخار ہے۔

ادب کا تعلق فنونِ لطیفہ سے ہے۔ بت سازی، فنِ تعمیر، رقص، موسیقی اور مصوری فنونِ لطیفہ کے مظہر ہیں۔ یہ تمام فنون انسان کی جمالیاتی حس سے تعلق رکھتے ہیں اور جمالیاتی حسیں اپنے دور کی عکاسی ہوا کرتی ہیں۔ ہندوستان عہدِ عتیق سے حسن و جمال کا مرکز ہی نہیں بلکہ منبع رہا ہے۔ اس کا فطری حسن بیرونی مہموں کے لئے ہمیشہ وجہِ کشش بنا اور اس حد تک کہ اس ملک میں قدم رکھنے کے بعد وہ قومیں یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ انھوں نے یہیں جینا مرنا اور اپنا دیار سے اجنتا ایلورا اور تاج محل "پھر دیا جانا پسند کیا۔ یہ گوتم، کرشن، رادھا اور گوپیوں کی سرزمین۔ یہ کالیداس کی "شکنتلا" کا دیس۔ یہ نور جہاں اور زیب النسا کی محبت کا دیار۔ وہ اس کے انگ انگ سے ٹپکتی ہوئی نہ صرف وہ اُجلے دریا۔ وہ گنگناتے ہوئے آبشار۔ سر اٹھائے ہوئے پربت اور بل کھاتی ندیاں۔ وہ گاؤں کی حسین پگڈنڈیاں اور لہلہاتے کھیت۔ وہ ماتھوں کے قشقے اور ہاتھوں میں رچی مہندیاں، وہ لہراتی ہوئی چوٹیاں اور غزالوں کو شرماتی ہوئی آنکھیں۔ !

فطرت کی اتنی جمال سامانیاں اور دولت کی اتنی فراوانی کسی ملک میں نہ تھی۔ کتنی خوش قسمت تھیں وہ قومیں جنھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ اس کی خاک پر سجدے کئے اور اس کے ذروں کو پوجا۔ یہاں کی قدیم تہذیبوں کے ساتھ جب آریائی تہذیب نے رشتہ جوڑا اور پھر کئی سو سال کے بعد مسلمانوں نے بھی اپنی تہذیبی قدروں کو ہندوستان کے تہذیب و تمدن سے وابستہ کر دیا تو ہر طرف ایک نئی بہار انگڑائیاں لینے لگی۔

ظاہر ہے، جو زبان جس ملک میں آنکھ کھولے، بڑھے اور پلے، وہ کسی بیرونی تہذیب سے اپنا رشتہ کس طرح استوار کر سکتی ہے؟ اردو۔ ہندوستان کی سب ہی قوموں اور زبانوں کا ایک مشترک روپ ہے۔ اسی لئے اس کے ادب میں سیکڑوں سال سے ہندوستانی تہذیب و ثقافت اپنے جلوے دکھا رہی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کا کوئی مظہر ایسا نہیں جو اردو ادب میں نہ ہو۔ اس کی کہاوتوں، محاوروں اور لوک گیتوں میں ہندوستان کا دل دھڑک رہا ہے۔ ایسے ہزاروں شعر پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں خالص ہندوستانی روایات اور مقامی رنگ ہیں۔ صرف دو شعر بطور نمونہ سن لیجئے ؎

"الکھ جگانا" ۔ یعنی اللہ یا بھگوان کے نام پر مانگنا۔ حاتی کا شعر ہے ؎

در پہ الکھ آ کے جگاتے ہیں جب
سُن کے گھروں سے نکل آتے ہیں سب

"دھان پان ہونا"۔ دیسی محاورہ ہے۔ نظیر کہتے ہیں ؎

گلوری بھی جو اٹھائی، لچک گیا پہنچا
ہمارا یار نزاکت میں دھان پان ہوا

گلوری، پہنچا، دھان، پان سب ہندوستانی چیزیں ہیں۔
میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ہندی زبان کے ادب سے کہیں زیادہ اردو ادب میں "ہندوستانیت" ہے۔ اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اردو زبان نے "مذہب" سے اپنا رشتہ کبھی نہیں جوڑا۔

میں چاہتا تھا کہ اپنے اس خطبے میں ہندو اور مسلمان کی اصطلاحیں استعمال نہ کروں۔ لیکن ان کا استعمال اس لئے ناگزیر ہو گیا کہ دونوں قوموں کی کچھ الگ الگ خصوصیات بھی ہیں۔ ان کے الگ الگ ہتھیار ہیں۔ ایک مندر میں بھگوان کو تلاش کرتا ہے اور دوسرا مسجد میں خدا کو۔ اردو ادب میں کہیں کہیں جہاں مسلمانوں کی کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں، وہیں ہندوؤں کے عقائد کے تذکرے بھی مل جاتے ہیں۔ اگر ایک طرف مسلمانوں نے (ہندوؤں کے ساتھ ساتھ) اردو ادب میں نام پیدا کیا تو دوسری طرف بھاشا کے ادب میں بھی شہرت حاصل کی۔ مسلمان بادشاہوں نے سنسکرت اور ہندی زبانوں کی زبردست سرپرستی کی۔ ان زبانوں میں تصنیف و تالیف کے مواقع فراہم کئے۔ فیروز شاہ تغلق نے "جوالا مکھی" کے کتب خانے کی بعض نادر کتابوں کے تراجم فارسی میں کرائے۔ خافی خاں نے فارسی زبان میں آسامی لکھی۔ مرزا خان بن فخر الدین محمد نے سنسکرت اور ہندی فن بلاغت اور عروض و قافیہ پر بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے بیٹے اعظم شاہ کے لئے ایک کتاب لکھی۔ بنگلہ زبان میں مسلمانوں نے بھاگوت اور مہابھارت کے ترجمے کئے۔ مسلمانوں نے اور بھی کتنے کام کئے، اگر میں اس کی تفصیل پیش کروں تو صفحے کے صفحے بھر جائیں۔

سلطنت غزنویہ کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان، پھر امیر خسرو۔ ملک محمد جائسی، قطبن، شہزادہ دانیال، عبدالرحیم خانخاناں۔ عزی آسی، ملا نوری، شیخ غلام مصطفیٰ انسان، عبدالجلیل بلگرامی اور کئی دوسرے مسلمان عالموں نے جن کے نام یہاں چھوڑ رہا ہوں، ہندی زبان کے عالموں ہی کی طرح بھاشا زبان میں انشا پردازی اور شاعری کے جوہر دکھائے۔ دوسری طرف مغلوں کے دور میں مغل حکمرانوں کی سرپرستی اور ان کی دلچسپی کی بنا پر خود ہندوؤں میں بھاشا زبان کے بہترین نثر نگار اور شاعر پیدا ہوئے۔ جیسے کیشو داس، تلسی داس، سورداس، بہاری لال، تریا تھی۔ بندھو دیوی اور سینا پتی۔ مغلوں ہی کے زمانہ میں سکھوں کا گرنتھ لکھا گیا۔ چونکہ اردو اور ہندی دوسری مالدار بیرونی زبانوں سے قریب آگئی تھیں، قدامت کے بادل چھٹ رہے تھے، اس لئے ہندی زبان بھی جدید تشبیہات و استعارات، صنائع اور بدائع سے آشنا ہوئی۔ اس وقت نہ کوئی بھید بھاؤ تھا اور نہ زبانوں میں کسی قسم کا ٹکراؤ۔ ایک فطری رجحان اور بہاؤ تھا جس کی سمت یہ دونوں جدید زبانیں بڑھ رہی تھیں۔ ہندوستانی عوام انہیں سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے اشارے دلوں کی زبان بن گئے تھے۔

فن موسیقی کی طرف نظر ڈالئے تو زیادہ تر بڑے موسیقار مسلمان ہی ملیں گے۔ صفیوں نے ہندوؤں کو اس فن سے آشنا کیا اور خود یہ زبردست نام پیدا کیا۔ انھوں نے راگ اور راگنیاں ایجاد کیں۔ ایسے انسٹرومنٹ بنائے اور استعمال میں لائے۔ جن میں ہندوؤں کی دیومالائی روایتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ ہندو تہذیب میں موسیقی کو عبادت کا درجہ حاصل ہے لیکن مسلمانوں کے یہاں بہت سے حدود و قیود ہیں۔ یہاں اگر میں مسلمان صوفیا کی تعلیمات، ان کے ارشادات اور اس تہذیب کا ذکر کروں جس نے ہندو اور مسلمانوں کے دلوں اور ان کی روحوں کو متاثر کیا تو یہ خطبہ اور بھی طویل ہو جائے گا۔ ایک تہذیبی انقلاب کی طرف بڑھا۔ اہم قدم فن موسیقی ہی کا، فن مصوری میں بھی خالص ہندوستانی روایات کے حامل بہت سے نامور مصور ہوئے ہیں اور انھوں نے اپنے ہندو بھائیوں کو اس فن میں بھی زبردست مدد دی۔ غرض ہندو اور مسلمان کی تخلیق کے تجربے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور وہ رنگ ہندوستانی تھا۔

یہ کس درجہ فخر اور قابل ترین بات ہے کہ اردو زبان کے ڈرامہ نگاروں نے ہندوؤں کے عقائد اور ان کے بزرگوں کے حالات کا گہرا مطالعہ کر کے ہندی ڈراما میں بہتریں ڈرامے لکھے۔ واجد علی شاہ کے دور میں امانت کا ڈرامہ "اندر سبھا" تو بے حد مقبول

ہوا ہی تھا۔ اُس کے بعد شیکسپیر کی تہذیب و تمدن کی دُھن نے اُردو ڈرامہ نگاروں سے کشن سداما۔ کرشن اوتار۔ رام بن باس۔ کرشن لیلا۔ ستیا بان۔ مہابھارت، رام لیلا۔ بلوا منگل۔ ہریشچندر۔ بھگت پرہلاد۔ سورداس۔ بھگت کبیر۔ راجہ بھرتہری۔ بلاس ستی ساوتری۔ وشنو لیلا۔ ستی النسوئیا۔ نل دمن۔ ہیر رانجھا۔ گوتم بدھ۔ کرشن کنہیا جیسے ہندستانی ڈرامے لکھوائے۔ ان ڈراموں کی زبان اتنی میٹھی اور رسیلی ہندی ہے کہ سُننے والے پھڑک جاتے تھے۔ ہر ڈرامہ کا آغاز حمد، یعنی خدا یا بھگوان کی تعریف سے ہوتا تھا اور یہ کورس کی شکل میں اس طرح کے الفاظ سے شروع ہوتا تھا۔

تو کرتار ——— سرجن ہار

یا

تو بھگوان ، تو بھگوان

اُردو نثر کے قدیم قصّے اور اُس کے بعد لکھے جانے والے جدید افسانے، ہندوستان کے مشترک تہذیب و تمدّن سے بھرے ہوئے ہیں۔ بہت پُرانی باتوں کو جانے دیجئے۔ جدید دَور میں اُردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار منشی پریم چندر کا نام اس ذیل میں فخر کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اُردو شاعری کا تعلق ہے، تو اس میں اُردو ادب کی دوسری اصناف سے کہیں زیادہ ملکی عنصر پایا جاتا ہے۔ ایسا کونسا ملکی موضوع ہے جو اُردو شاعری میں نہ ہو۔ خواہ یہ خالص سنسکرت پرانی ہو یا اُردو زبان کے ایک مکمل اور قریب دبان بن جانے کے بعد کی۔ دو چار اور دس پانچ نہیں، بلکہ ایسے سیکڑوں ہندو اور مسلمان اُردو شاعروں کے نام ہندوستان بھر کے فخر کے ساتھ پیش کر سکتا ہے، جن کی شاعری میں ہندوستانیت رچی بسی ہوئی ہے۔ اُردو کی قدیم غزل میں جو زبان کی ہے وہ ملک کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی۔ ان میں خالص ہندوستانی جذبات و واردات پائے جاتے ہیں۔ قدیم دکنی شاعر داؤد کہتا ہے ؎

رات دن ہے ، پکار میں داؤد جیوں پپیہا پیا پیا تجھ بن

ہندوستان کے پھلوں اور پھولوں، موسموں اور دریاؤں، میلوں اور تہواروں سے اُردو شاعری خالی نہیں ہے۔ اُردو شاعری نے اگر علامتوں کو اپنے یہاں جگہ دی ہے تو پپیہا، کوئل اور بھونرے کو بھی علامت (SYMBLE) بنایا ہے۔ یہ تو صرف ایک اشارہ ہے، ورنہ خالص ہندوستانی علامتوں سے اُردو شاعری بھری پڑی ہے۔ ہندوستانی تشبیہات و تلمیحات کی بھی اُردو شاعری میں کمی نہیں۔ "شوالہ پنڈت" سے ماخوذ چند شعر سُنئے ؎

مصحفی ہر اشک کو مری مژگاں سے یہ علاقہ ہے کہ جوں ستار کی کھونٹی سے تار باندھ دیا

انشا دل میں سما رہا ہے یوں داغِ عشق اپنے جس طرح کوئی پھولا ہووے کنول میں بیٹھا

سودا نہیں ہے کوئی گھر ایسا، جہاں اس کو نہ دیکھا ہو کنھیا سے نہیں کچھ کم، صنم تیرا وہ ہرجائی

دھونی رمانا اور آسن مار کر بیٹھنا بھی ہندوستان ہی کے جوگیوں کا طریقہ ہے اور اس سے میر تقی میر اس طرح کام لیتے ہیں ؎

کب تک دھونی رمائے جوگیوں کی سی رہوں بیٹھے بیٹھے دَر پہ میرے، تیرا آسن جم گیا

دریا میں نہانا۔ گرہن دان دینا۔ ماتھے پر صندل لگانا۔ بسنتی کپڑے پہننا۔ گلگوں اُڑانا، ہندوؤں کے مذہب و رسم و رواج سے تعلق رکھتا ہے اور ان سے ہمارے شعراء نے غزل میں کام لیا ہے۔ (شوالہ ہند حصّہ دوم)

صاحب "شوالہ ہند" کی تائید میں سیکڑوں اشعار اس طرح کے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اب ذرا اُردو نظم کی طرف آیئے۔ تو یہ واقعہ ہے کہ اُردو نظم میں قومی، ملکی اور ہندوستان کے مشترک تہذیبی و تمدّن کا جو گراں بہا سرمایہ ہے، وہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں مل سکتا۔ اُردو نظم کا ایک بڑا حصّہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے شاعروں کا اچھا اقتباس ہے بلکہ اس کا بیشتر حصّہ موضوع ہندوستان کی پیشانی پر جڑا ہوا ہے اور اس کے حسن کو

کرشن کنہیا ۔ رکھے کا بچہ ۔ پیراکی ۔ ہولی ۔ دیوالی ۔ بسنت ، کس پر نظیر کی نظمیں نہیں ہیں ۔ !

میاں نظیر کے علاوہ اور بھی اَن گنت اُردو شاعروں نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب ، اُس کے تمدّن اور روایات کو اپنا شاعر
میں برتا ہے ۔ بڑے حُسن ، تاثر اور عقیدے پسندی کے ساتھ ۔ اُردو شاعری میں راگ ۔ ملہار ۔ برسات ۔ دیپک ۔ بجوبد ۔ کو
گنگا ۔ جمنا ۔ کاشی ۔ بنارس ۔ گوکل ۔ بندرابن ۔ ہالہ ۔ اجنتا ۔ ایلورا ۔ سانچی ۔ سومناتھ ۔ بسنت ۔ راکھی ۔ گو
اشٹمی ۔ مہاتما بدھ ۔ سری کرشن ۔ رام چندر جی ۔ سیتا جی ۔ گرونانک ۔ کبیر ۔ تلک ۔ گوکھلے ۔ سی ۔ آر داس ۔ گاندھی
جگور ۔ ہیرو ، کس پر نظمیں نہیں ہیں ! سری کرشن پر سیماب اکبرآبادی کی نظموں کا ایک مکمل مجموعہ "کرشن گیتا" (مطبوعہ الہ
پریس ، آگرہ) آپ میں سے بہت لوگوں نے دیکھا ہوگا ۔ "مرثیہ" ایک خالص مذہبی چیز ہے ، جس میں شہدائے کربلا کے معر
کا ذکر ہوتا ہے ۔ لیکن مرثیہ نگار شعراء نے مرثیوں تک میں ہندوستانی روایات کو برتا ہے ۔ اس سے زیادہ اُردو ادب کی رواداری
اور کیا ہو سکتی ہے ۔ ؟

مشترکہ تہذیب و تمدّن کا مقصد یہی ہے نا ، کہ وہ ادب جس میں ہندوستان بول رہا ہو ۔ اُس کی ندیاں گنگنا رہی ہوں ، اُس کے
باغ خوشبوئیں بکھیر رہے ہوں ۔ اُس کے پربت سر اُٹھائے ہوئے ہوں ۔ اُس کے موسم مسکرا رہے ہوں ۔ اُس کی حسین اور تابندہ
عمارتیں ، اس کے نغمہ ریز آبشار ۔ اُس کے اُجلے دیہات ، اُن کے گھاٹ ۔ اُس کی دیہاتیں ۔ اُس کے پنگھٹ ، میلے ٹھیلے ، کھیتیاں ۔ بازار ۔ گاؤں
اور شہر ، اُس کے اوتار ، اور اوتا ہنا ، سب جلوہ گر ہوں ۔ تو میں عرض کروں گا کہ یہ سب کچھ اُردو ادب میں بھرپور انداز میں موجود ہے ۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ، ہر مُلک کی تہذیب اپنے عصر کے ساتھ تغیّر پذیر ہوتی رہتی ہے ۔ آج ہندوستان میں وہ تہذیب
نہیں ہے جو اب سے پانچ ہزار یا پانچ سو سال پہلے تھی ۔ اُردو ادب نے بہرحال ، ہر تہذیبی ، تمدّنی اور ثقافتی تغیّر کا ہمیشہ پورا پورا ساتھ
دیا ہے اور اس میں اُس کے واضح نشانات پائے جاتے ہیں ۔ تہذیبی اور تمدّنی روایات میں اشتراک کے علاوہ ، اُردو زبان و ادب نے
قومی و ملکی ہمواہی اور سیاسی تاریخ کے ساتھ جو شاندار سفر کیا ہے وہ ہندوستان کی تاریخ کا بہت روشن باب ہے اور ایک الگ موضوع
کی حیثیت رکھتا ہے ۔

آج کی دنیا کا ہر انسان اپنے وسائل و مسائل کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بعید قریب ہو چکا ہے ۔ سائنس اور ٹکنالوجی
کی ترقیوں نے انسان کی رسائی کو چاند اور ستاروں تک ممکن بنا دیا ہے ۔ ایجادات و اختراعات کا بازار گرم ہے ۔ پوری دُنیا ہی
جدید تہذیب پھیل چکی ہے ۔ آج کوئی مُلک وحدتِ تہذیب کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ تہذیبی برتاؤ حد درجہ وسیع ہو چکے ہیں ۔ مغرب
مشرق کو متاثر کر رہا ہے اور مشرق مغرب کو ۔ ایشیائی اور یورپی ممالک ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی زبردست تگ و دو
میں مصروف ہیں ۔ کہیں بھی ایک تہذیب ، ایک تمدّن اور ایک زبان کے خواب نہیں دیکھے جا رہے ہیں ۔ ہاں تہذیبی اور تمدّنی اشتراک
اور سماجی اشتراکِ عمل کی زیادہ سے زیادہ کوششیں ہو رہی ہیں ۔ جہاں تک زبانوں کا تعلق ہے تو لغوی ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا قول
"کوئی زبان پیچھے کی طرف نہیں جاتی ۔ بلکہ جتنا آگے کی طرف بڑھے گی ۔ اُتنا ہی جلد ترقی کرے گی"

اُردو زبان تو ہمیشہ رواں دواں ، ترقی پسند اور وسیع داماں رہی ہے ۔ چھوٹی سی عمر میں اُس کی بے پناہ ترقیوں کا یہی سبب ہے اور
یہی اُس کے عالمی و دوامی ہونے کی دلیل ہے ۔ چونکہ اب بھی ہندوستان کی یہی وہ تنہا زبان ہے جو ہر شہر ، ہر گاؤں ، ہر کوچہ و
بازار میں بولی ، لکھی اور پڑھی جاتی ہے ۔ اسے ہندو ، مسلمان ۔ پنجابی ، سندھی ، بنگالی ۔ مراٹھے ۔ گجراتی ۔ مدراسی ۔ آسامی
غرض سب سمجھ لیتے ہیں ، اس لئے اس کا ادب بھی تر و تازہ اور ہماری مشترک اقدارِ حیات کا بھرپور نمائندہ ہے ۔ اشتراک و
تعاون اُردو زبان و ادب کا خاصّہ ہے ۔ اس کا انداز فطری ، اس کا رُوپ اصلی اور اس کا آہنگ دلوں کو موہ لینے والا ہے ۔
یہی موہنی زبان اور اس کا دلکش ادب ہندوستان کا بڑا قیمتی نمشترکہ سرمایہ ہے ۔ اگر ہم نے اسے کھو دیا تو یہ ایک
زبردست قومی نقصان ہوگا ۔

عنوان چشتی

غزل

ذرّے کو مہر، قطرے کو طوفاں کئے ہوئے
ہے عشق زندگی کو نمایاں کئے ہوئے

جشنِ شبِ فراق کوئی آ کے دیکھ لے
بیٹھا ہوں آنسوؤں سے چراغاں کئے ہوئے

اِک جانِ آرزو کی توجہ کے باوجود
دل ہے خود اپنی موت کا ساماں کئے ہوئے

دل کی جراحتوں کے کھلا کر نئے گلاب
بیٹھا ہوں زندگی کو گلستاں کئے ہوئے

رکھتا ہوں سو معاملے اُن سے بہ فیضِ دل
اپنی نظر سے بھی اُنھیں پنہاں کئے ہوئے

عنوان کوئی آ ہی گیا بزمِ ناز میں
جلووں کا انگ انگ نمایاں کئے ہوئے

لے ۱۰ر فروری ۶۶ء کو یومِ غالب دہلی میں پڑھی گئی۔

اکرم دھولیوی

غزل

جام سے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
میکشو ہوش میں آتے ہوئے جی ڈرتا ہے

چین لٹتا ہو تو بے حوصلگی ہی اچھی
نگہِ شوق اُٹھاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

بعد اک عمر کے تسکین کا پیغام نہ دو
دل کی دُنیا میں اب آتے ہوئے جی ڈرتا ہے

کتنے صیاد ہیں گلزار میں گلچیں کتنے
باغبانوں کو بتاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

یہ بھی جاتا نہ رہے گردشِ ایام بخیر
غم کو سینے سے لگاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

گھر میں تھا جو دل، اب وہ نگے یا نہ نگے
قید سے چھوٹ کے جاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

دہر میں داد تباہی بھی ملے گی کہ نہیں
زندگی تجھ کو مٹاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

دل کوئی چیز نہیں اہلِ ہوس کے آگے
مہر و اخلاص جتاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

ظلمتِ یاس بھلی تیرہ نصیبی کی قسم
شمعِ اُمید جلاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

شکوۂ جور و جفا شکوۂ بے جا تو نہیں
اِک ذرا بات بڑھاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

وہ خیالات جو ہیں مظہرِ حسرت اکرمؔ
اُن کو اشعار میں لاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

ڈرامہ :- سلام مچھلی شہری

چاند کی واپسی

(منظر: ایک سمندری شہر کے غریبوں کی ایک بستی ــــ آخری شب ابھی ابھی ڈھلی ہے)

مرد (میاں) تم اچانک کہاں چلی گئی تھیں۔ کہاں سے آرہی ہو، تم کانپ کیوں رہی ہو ــــ تم .....

عورت (بیوی) کچھ نہیں ــــ بس ۔ بات یہ ہے کہ، .....

مرد (میاں) کیا بات ہے، اتنی پریشان کیوں ہو۔

عورت (بیوی) میں ــــ میں اسے چھوڑ آئی ہوں۔ میں نہیں چاہتی تھی۔

مرد (میاں) کسے چھوڑ آئیں۔ تم کیا نہیں چاہتی تھیں۔ کھل کر بتاؤ۔ کیا بات ہے۔ تم تو ابھی موت سے بچ کر آئی ہو۔

عورت (بیوی) میں اسے چھوڑ آئی ہوں۔ ٹاپوؤں کے ایک بڑے مگرمچھ خوبصورت سے ڈبے میں۔ (بیوی کی بے تحاشہ ہنسی کر) گھور کیوں رہے ہو، کہہ تو دیا میں اسے چھوڑ آئی ہوں ــــ وہاں ــــ ساحل پر ــــ ایک خاموش گوشے میں ــــ!

(پس منظر میں کئی آوازیں ایک ساتھ ابھرتی ہیں)

ایک لڑکی (اپنے محبوب سے) :- وہ دیکھو، ٹاپو کا اتنا بڑا مگر اتنا خوبصورت ڈبہ ــــ!

نوجوان (ہنس کر) ــ مگر وہ بالکل خالی ہوگا۔

لڑکی :- دیکھیں تو ذرا۔

نوجوان :- چھوڑو بھی، سمندری ساحلوں پر ایسی پڑی ہوئی چیزیں کبھی کبھی بہت خطرناک بھی ثابت ہو جاتی ہیں۔

سپاہی (پاس سے) کیا معاملہ ہے۔

نوجوان :- چلو اپنا کام کرو۔

سپاہی :- میں تو اپنا کام کر چکا۔

نوجوان :- کیا مطلب ؟

سپاہی :- تم دونوں میرے ساتھ تھانے چلو۔

نوجوان :- کیوں ؟

سپاہی :- اس لئے کہ ــــ

لڑکی :- سپاہی جی! آپ خواہ مخواہ ہم پر شک کر رہے ہیں۔ ہم تو ٹاپوؤں کے اس بڑے ڈبے کی بابت بات کر رہے تھے۔

سپاہی :- یہ ٹھیک ہے مگر اب آپ نہیں جا سکتیں۔

(ایک لڑکے سے) ــــ ارے لڑکے، دیکھ کر آ۔ اس ڈبے میں کیا ہے ؟

لڑکا :- حضور! مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ کچھ دن پہلے ایسا ہی ایک ڈبہ نظر آیا تھا مگر کیا بتاؤں کہ اس میں کیا تھا۔

نوجوان :- کوئی سانپ تو ہوگا نہیں۔ میں خود ہی دیکھتا ہوں۔

سپاہی :- نہیں۔ آپ نہیں جا سکتے۔

ایک پادری :- آپ لوگ ساحل کی پُرسکون فضا کو خراب کر رہے ہیں۔ صبح ہو گئی صبح کے مبارک لمحوں میں بھی سکون نہیں ملتا۔

لڑکی :- پادری جی! یہ سپاہی ہیں خواہ مخواہ پریشان کر رہا ہے۔ ہم تو صرف اس ڈبے کو دیکھ کر رک گئے تھے اور سوچ رہے تھے نہ جانے اس میں کیا ہے ــــ ؟

پادری (سپاہی سے) تم انہیں بے وجہ پریشان کر رہے ہو

سپاہی :- یہ قانونی معاملہ ہے پادری صاحب

وکیل :- قانونی معاملہ ہے تو بندہ حاضر ہے

پادری :- آپ کی تعریف ؟

وکیل :- میں ایک وکیل ہوں (پھر سپاہی سے) مسٹر پولیس مین آپ خود تفتیش میں دیر کر رہے ہیں۔ آپ کا پہلا کام اس ڈبے کو اپنے قبضے میں کرنا ہے۔

سپاہی :- میرا پہلا کام ان دونوں کو اپنی نگرانی میں رکھنا ہے۔

لڑکا :۔ اچھا میں ہی اٹھائے لاتا ہوں اُس ڈبے کو ــــ
(چند قدم آگے بڑھ کر ڈبہ اٹھانے لگتا ہے)
(ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز)
لڑکا :۔ ارے، بچہ! (کئی آوازیں اُبھرتی ہیں)
پہلی آواز :۔ زندہ ہے ــ
دوسری آواز :۔ ہے رام، یہ کلجگ ہے کلجگ
تیسری آواز :۔ توبہ توبہ، اب قیامت بالکل قریب ہے
(بچے کی آواز خاموش ہو جاتی ہے)
پادری :۔ دنیا میں گناہ اتنا بڑھتا جا رہا ہے کہ آسمان پر خدا کا بیٹا بھی مغموم و پریشان ہے ــ
لڑکی :۔ ہے رام، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اُس ڈبے میں ایک زندہ بچہ ہوگا۔
نوجوان :۔ میں نے کہا تھا نا کہ کبھی کبھی ایسے پڑے ہوئے ڈبے خطرناک بھی ثابت ہو جاتے ہیں۔
سپاہی :۔ اب باتیں بنانے سے کام نہ چلے گا۔
نوجوان :۔ کیا مطلب؟
سپاہی :۔ میرا کیا مطلب ہے۔ یہ ابھی تم پر ظاہر ہو جائیگا۔
وکیل :۔ معاملہ واقعی قانونی ہے اور اس کا تصفیہ بھی قانونی ڈھنگ سے ہونا چاہیئے ــ
پادری :۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ جرم کسی اور کا ہے تو یہ سوچنا پڑے گا، کن حالات سے مجبور ہو کر یہ گناہ کیا گیا ہے۔
وکیل :۔ ایسے گناہ بلکہ جرم کے ارتکاب کی صرف ایک ہی وجہ ہوتی ہے۔ ناجائز تعلق اور پھر اُس کے بدصورت انجام کو چھپانے کی کوشش ــ
لڑکی :۔ نہیں، صرف یہی وجہ تو نہیں ہوتی۔
وکیل :۔ آپ مشکوک ہونے کے باوجود، کافی بشاش نظر آتی ہیں۔
لڑکی :۔ جی ہاں، اس لئے کہ میں بے قصور ہوں، اور مجھے اپنے وکیل کے قانون پر پورا بھروسہ ہے۔
پادری :۔ ہاں، فخر سے! آپ کہہ رہی تھیں ایسے گناہ بلکہ جرم کے ارتکاب کی ایک ہی وجہ نہیں ہوتی۔
لڑکی :۔ جی ہاں! میں ٹھیک ہی کہہ رہی تھی ــ ہمیں اس کے اسباب اور نتیجے پر بھی منظر کر بھی سوچنا چاہیئے۔
نوجوان :۔ اور اس کی ایک وجہ آزاد، پُرسکون اور رنگین زندگی کی تمنا بھی ہو سکتی ہے
وکیل :۔ واہ آپ بھی کافی بڈر معلوم ہوتے ہیں
نوجوان :۔ میرے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے
(بچہ پھر روتا ہے)
لڑکا :۔ آپ لوگ اُسے کھول کر تو دیکھیے۔
پادری :۔ ہاں، اگر بچے کو کچھ ہو گیا تو تلوح کی نظر میں یہ سب سے بڑا پاپ ہوگا۔
وکیل :۔ اور سب سے بڑا جرم بھی۔
(کئی آوازیں اُبھرتی ہیں)
پہلی آواز :۔ لڑکا ہے یا لڑکی۔
دوسری آواز :۔ پتہ نہیں پاپی کا کس مذہب سے تعلق ہے۔
تیسری آواز :۔ ایسے ہاتھ لگانا چاہیئے یا نہیں
پہلی آواز :۔ چھی چھی، اسے چھونا بھی پاپ ہے۔
دوسری آواز :۔ پتہ نہیں کس کا بچہ ہے؟
(پھر وہی پہلا منظر اُبھرتا ہے)
مرد :۔ (یعنی میاں سب کچھ جان کر) لیکن تم نے اتنی کمزور اور بدتر حالت میں، اتنی جلد، یہ سب کیسے کیا۔ کیوں کیا ــــ!
عورت (بیوی) میری کچھ کہنے یا سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔ میں کچھ نہیں بتا سکتی ــ
مرد :۔ (محبت اور گھبراہٹ کے ملے جلے لہجے میں) خود پر قابو پاؤ۔ میں نے کہا تھا نا کہ ڈاکٹر کے لے کر ابھی آتا ہوں۔
عورت :۔ تم ڈاکٹر کو نہیں لا سکتے تھے۔
مرد :۔ لیکن خدا کی اُس نعمت کو پھینک دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔
عورت :۔ خدا کی نعمت ہمارے لئے ایک مسئلہ بھی بن سکتا تھا۔
مرد :۔ اور اسی لئے تم نے اتنا بڑا گناہ بلکہ بڑا جرم کر دیا۔
عورت :۔ پتہ نہیں، میں نے کیا کیا، میری سوچنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔
مرد :۔ تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ قصور میرا ہے۔
عورت :۔ نہیں تم بے قصور ہو۔
مرد :۔ تم نے میرے حالات سے بہت سخت انتقام لیا ہے
عورت (انگلیوں کے کچوکے دیتے ہوئے) ــــ اپنی وہ گفتگو یاد

کو جب میں نے ایک خوبصورت کپڑوں کے جوڑے کا طرف اشارہ کرتے ہوئے تم سے کچھ کہا تھا اور سب کچھ کہتے ہوئے بھی تم نے کس طرح مجھ پر ایک ایسا سایہ پھینک ڈالا تھا۔ یاد کرو جب میں نے تمہیں سونے کے بدلے میں کھوئی پائی تو تم اچانک کیوں ہنس پڑے تھے۔ یاد کرو جب میں پچھلے ماہ آتے ہوئے اچانک پھسل کر گر پڑی تھی تو تم نے ــــــ

مرد:۔ چپ رہو۔ خدا کیلئے چپ رہو، یہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ وہ کہاں ہے۔ مجھے چلو وہاں جلدی کرو، اگر اُسے کچھ ہو گیا تو ــــــ

عورت:۔ میں اب کہیں نہیں جا سکتی۔ میں کہیں نہ جاؤں گی۔ مجھے پریشان مت کرو۔

مرد:۔ تمہارا دماغ واقعی کام نہیں کر رہا ہے۔ میں خود جاتا ہوں میں اُسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ جہاں بھی ہوگا میں اُسے ڈھونڈ لاؤں گا۔ وہ میرا ہے، میرا ــــــ میرا بچہ... (دھڑتا ہوا باہر چلا جاتا ہے۔

(ساحل کا منظر پھر اُبھرتا ہے)

پادری:۔ ــــــ بہت وقت ضائع کر رہے ہیں۔ بچے کو کھلی ہوا میں رکھنا چاہیئے۔ اگر اُسے کچھ ہو گیا تو یہ بہت بڑا گناہ ہوگا۔

(بچہ روتا ہے)

لڑکی:۔ ــــــ (آگے بڑھ کر) میں کھولتی ہوں۔ آہا ہا، بڑا خوبصورت بچہ ہے۔ لڑکا ہے، لڑکا!!

نوجوان:۔ تم تو اتنی خوش ہو گئیں ــــــ

لڑکی:۔ میرے سینے میں ایک عورت کا دل ہے۔

سپاہی:۔ باتیں بند کرو۔ کیا حاصل ــــــ لے لو اسے گود میں اور چلو میرے ساتھ تھانے ــــــ

لڑکی:۔ سپاہی جی! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔

نوجوان:۔ انہیں کچھ نہ کہو۔ یہ اپنے فرض سے مجبور ہیں۔

سپاہی:۔ فضول باتوں سے کیا فائدہ ــــــ

لڑکی:۔ سپاہی جی! آپ کا بھی کوئی بچہ ہوگا۔ دیکھئے نا، کتنا خوبصورت ہے۔

سپاہی:۔ مجھے باتوں میں اُلجھانے کی کوشش نہ کرو۔ (اُسی وقت ایک آدمی ہانپتا ہوا آتا ہے، بچہ پھر رونے لگتا ہے)

مرد:۔ (ہلاتے ہوئے) میرا بچہ ــــــ میرا لعل ــــــ خدا کا کوئی بتاؤ، میرا بچہ کہاں ہے۔؟ (پاس آجاتا ہے)

سپاہی:۔ کیا شور کر رہے ہو۔ کون ہو تم؟

پادری:۔ شکر ہے آسمان سے کالے بادل چھٹ گئے۔ خدا کا بیٹا اس وقت کتنا خوش ہوگا (پھر آنے والے سے)

پادری:۔ لو بیٹے! یہ ہے تمہارا بچہ!

(بچے کی آواز رک جاتی ہے)

وکیل:۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ اسی کا بچہ ہے۔

لڑکی:۔ سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ بچے نے رونا بند کر دیا ہے۔

سپاہی:۔ اس ناٹک کے باوجود تم قانون سے نہیں بچ سکتیں۔ اب تم تینوں میرے ساتھ چلو۔

(اُسی وقت ایک عورت دوڑتی ہوئی آتی ہے)

عورت:۔ ٹھہریئے، کسی کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ــــــ میں ہوں اس کی بیوی ــــــ اور ــــــ اور اس بچے کی ماں! گناہ میں نے کیا ہے۔ سزا مجھے ملنی چاہیئے۔

پادری:۔ آسمان پر خدا کا بیٹا خوشی سے مسکرا رہا ہے۔

لڑکی:۔ مبارک ہو میں، بہت خوبصورت بچہ ہے۔

نوجوان:۔ خدا آپ کو یہ چاند سا بیٹا مبارک کرے۔

سپاہی:۔ (عورت سے) معاف کرنا بہن! کیس ایسا ہے کہ آپ کو تھانے تو چلنا ہی پڑے گا۔

عورت:۔ نہیں ہمارا جانا واپس مل گیا۔ اب جہاں چاہو لے چلے ــــــ! (مجمع بکھر جاتا ہے۔ پس منظر میں بچے کے ہنسنے کی آواز)

بقیہ ــــــ قیصر بدیزوی مرحوم (صفحہ ۲۰ سے آگے)

قیصر صاحب مرحوم ملازمت برار میں بہ حیثیت قدر دان مزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے بلکہ اپنی شعری خدمات کے صلے میں وہ سرکار مہاراشٹرا سے وظیفہ پاتے تھے۔

حق مغفرت کرے۔ عجب آزاد مرد تھا۔

فروغ تمکنت

مسافر

کس نے گیسو بکھیر کر اپنے
راہ کی دھوپ شبنمی کر دی
کس نے آواز دی خیالوں کو
لوٹ آؤ کہ یہ سفر ہے دراز
میرا دامن پکڑنے آئی ہیں
کس کی یادیں بہار کے مانند
کون اصرار کر رہا ہے یوں
کس کی آغوش نے پکارا ہے
کس کی زلفوں کے سُرمئی بادل
مری تشنہ لبی پہ روئے ہیں
کس کے آنچل کی چھاؤں کہتی ہے
لوٹ آؤ میں انتظار میں ہوں
کس کو صندل حنائی پوروں سے
مرے تلووں کے خار چُننے کی
کوئی آواز ہو کوئی نغمہ
مجھ کو فرصت نہیں ہے سُننے کی
خلوتِ ناز سے نہ دے آواز
اے مری روح! اے مری شہناز
مجھ کو شاید نہیں ہے یہ معلوم
میری منزل ہے مجھ سے کتنی دُور
اپنی منزل سے کتنا دُور ہوں میں

شاہد عزیز (اودے پور)

شاعر

جب بھی آیا ہے کوئی وقت کے ہونٹوں پہ سوال
ایک شاعر کے قلم ہی نے دیا اُس کا جواب
جب بھی بڑھتا ہے کوئی ظلم کی آندھی لے کر
ایک شاعر کا قلم کرتا ہے اُس پر یُورش
جب بھی ہوتا ہے زمانے میں اندھیروں کا گذر
ایک شاعر کا لہو جلتا ہے مشعل بن کر

ایک شاعر کہ دکھاتا ہے کئی خواب نئے
ایک شاعر کہ جلاتا ہے محبت کے چراغ

پھر بھی دُنیا کو کہاں اس کی وفاؤں کا خیال
اس کو ہر دور میں دُنیا نے کئی زخم دئے
پھر بھی شکوہ نہ شکایت ہے زمانے سے اسے
اپنے زخموں کو لئے سینے میں سو جاتا ہے
ایک دن موت کی تاریکی میں کھو جاتا ہے

قیصر بدیزوی (مرحوم)

ایسی باتیں معمولی نہیں جاتیں جن کا احساسات و جذبات پر گہرا اثر پڑا ہو۔ انسان جس کو چاہتا ہے اور جس کی موت کے متعلق سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اگر اس کی موت کی خبر اچانک مل جائے تو مشکل ہی سے یقین کیا جاسکتا ہے۔ مجھے پہلی بار اپنے ایک ملنے والے سے، جب یہ خبر ملی کہ "قیصر صاحب کا انتقال ہو گیا" تو مجھے یقین نہ آیا۔ اخبارات میں اُن کی موت کی خبر دیکھ کر حیرت ہوئی۔ میں نے اپنے ایک دوست کو لکھا "کیا قیصر صاحب کے انتقال کی خبر سچی ہے؟" جواب میں خبر کی تصدیق ہوئی تو میں چند لمحوں کے لئے سکتہ میں آگیا کہ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے! مگر حقیقت، حقیقت ہی ہوا کرتی ہے اور موت بھی ایک حقیقت ہی ہے۔

میں نے قیصر صاحب کو پہلے پہل ۱۹۵۲ء میں دیکھا تھا۔ کھلتا ہوا بادامی رنگ، کشادہ پیشانی، موٹی موٹی مسکراتی آنکھیں، اونچی کھڑی ناک، پان سے لبریز پتلے لب، منہ دانتوں سے بے نیاز، داڑھی مونچھ صاف، سر پر اونچی دیوار کی چناح کیپ، چوڑا چکلا سینہ، نہ زیادہ موٹے نہ زیادہ دبلے، تقریباً پونے چھ کا قد، لباس میں جناح کیپ کے ساتھ شیروانی، پرکوٹ، لمبا چست پائجامہ، ہاتھ میں چھڑی لئے مسکراتے ہوئے گذرتے نظر آئے تھے۔ اُس وقت میں اُن سے متعارف نہ تھا۔ بس یہ سن رکھا تھا کہ برار کے اچھے کہنہ مشق اور مانے ہوئے شاعر ہیں۔ باقاعدہ تعارف ۱۹۵۳ء میں ہوا جب وہ ایک مشاعرہ کی صدارت کے لئے رشید کیپی صاحب کے یہاں تشریف لائے۔ تعارف کے بعد بھی انھوں نے نگر محویت یا مسرت کا اظہار نہ کیا اور یوں ہی رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ اُس وقت میں اُن سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا اور چند منٹ بعد ہی اٹھ آیا۔

چند مہینے بعد ۱۹۵۴ء میں قاضی سید غیاث الدین مرحوم وزیر پرسول سپلائی حکومت مہاراشٹر کی صدارت میں ایک آل انڈیا مشاعرہ اکولہ میں منعقد ہوا جس میں جناب مجروح سلطانپوری کے علاوہ ہندوستان کے دیگر مشاہیر شعراء بھی شریک تھے۔ اس مشاعرے میں جناب کیفی کے ساتھ میں بھی آیا تھا۔ قیام قیصر صاحب ہی کے یہاں تھا۔ مشاعرے کے بعد قیصر صاحب کے یہاں ایک گھریلو نشست بھی ہوئی جس میں رشید کیفی، حمید ناگپوری، پروفیسر شارق پنڈی، ذکا صدیقی، فیشہدکاپوری، اور عبداللہ عرشی کے علاوہ دوسرے شعراء بھی شریک تھے۔ مجھے اُس مجلس نشست میں غزل پڑھنی پڑی۔ اور جب میں غزل کے اس شعر پر پہنچا ؎

وفا نبھی (نبھی)، جفائیں بھی سر چکے لیکن ۔۔۔ نہ ہو سکے کبھی واقف مزاجِ یار سے ہم

تو قیصر صاحب چونکے اور مجھے کوئی دوسری غزل سنانے کو کہا۔ میں نے دوسری غزل سنائی تو بہت خوش ہوئے اور خوب داد[1] دی۔ یہیں سے میرے اور اُن کے تعلقات شروع ہوئے۔ اکولہ میں ہمیشہ انہی کے یہاں قیام رہتا اور یہ قیام کبھی ہفتوں اور کبھی کبھی مہینوں طول کھینچ جاتا۔ قیام کے دوران ہمیشہ شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی۔ رفتہ رفتہ میں اُن کی شاعرانہ عظمت کا قائل ہوتا گیا اور اُن سے شاعرانہ عقیدت پیدا ہو گئی۔

علاقہ برار میں یوں تو کئی شاعر پیدا ہوئے لیکن گمنامی کے پردے نے انھیں شہرت کے بازار میں نہ آنے دیا اور دنیائے ادب اُن کے ناموں تک سے ناآشنا رہی۔

قیصر صاحب کے مجموعۂ کلام "طوفان و ساحل" کی اشاعت سے پہلے بھی اس علاقے کے بعض شاعروں کے انتخابات شائع ہوئے لیکن اہل ذوق

[1] اس سے شاعرانہ خودستائی مقصد نہیں ہے بلکہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

اور ارباب نظر کی کمی کے باعث وہ اتنی بھی مقبولیت حاصل نہ کر سکے، اگر غریب شاعر کی عرق ریزی کی تھوڑی بہت داد ہی ملجاتی۔ اس کے برعکس دیگر علاقوں کے شعراء کے کلام نے جو مقبولیت حاصل کی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بہرحال قیصر صاحب کے کلام نے چند ماہ کے عرصے ہی میں خاصی مقبولیت حاصل کرلی۔ یہ چیز جہاں اس بات کی دلیل ہے کہ اس علاقے کے ارباب نظر اپنے ادنیٰ شاعروں کو واقعی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس بات کا ثبوت بھی کہ قیصر صاحب کا کلام حقیقتاً ایسا ہی معیار اور دلکشی ہے کہ ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کرلے۔

قیصر صاحب کے کلام کی اس مقبولیت کا راز میری دانست میں یہ ہے کہ انھوں نے آپ بیتی اور جگ بیتی کا بڑا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ تخیلی ڈھانچا بیشک ان کا اپنا ہے لیکن ان کی تخلیقات سارے سماج اور ماحول کی سچی تصاویر ہیں۔ ان کی باتیں ہمارے دل میں اس لئے گھر کرتی ہیں کہ ان میں ہمارے محسوسات اور مشاہدات کی صحیح عکاسی پائی جاتی ہے۔ جب وہ ہماری زندگی کے کسی فرسودہ پہلو کا ذکر کرتے ہیں اور کھل کر سچی بات کہہ جاتے ہیں تو ہمیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ہمارے ہی دل کی آواز ہے۔

حصولِ اقتدار کا خبط، انسان کے ضمیر فروشی اور حق پرستی کو بے حسی، خوشامد پسندی، اور اقتدار پرستی کے ہاتھوں بیچ دینا ہے۔ اور انسان اتنا بزدل ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک اہلِ اقتدار کے خلاف ہر جائز اور حق بات کا اظہار ناجائز اور جھوٹ کے مترادف ہوتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے قیصر صاحب کی حقیقت نگاری پر بعض اقتدار پرست ناک بھوں چڑھاتے تھے۔

ہر انسان اپنے دل میں کچھ آرزوئیں رکھتا ہے، یہ اور بات ہے کہ ہر شخص کا طریقۂ اظہار جداگانہ ہو، شاعر اپنے شعروں کے ذریعے اس کا اظہار کرتا ہے اور قیصر صاحب نے بھی اپنے شعروں کے ذریعے بیباکانہ طور پر اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا ہے۔

اٹھو اٹھ کر نظامِ محفلِ ہستی بدل ڈالو — بڑھو بڑھکر بدی کی قوتوں کا سر کچل ڈالو
سمیٹو مرکزِ انسانیت پر نظمِ برہم کو — سکھاؤ احترامِ زندگی اولادِ آدم کو

مٹا کر امتیازِ نیک و بد سب ایک ہو جائیں
خدا بھی ایک ہے، بندے بھی اس کے ایک ہو جائیں

انھوں نے نظم ہی کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ غزلوں کے ذریعہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیے

غضب خدا کا یہ مجبوریاں محبت کی — دعا کو ہاتھ اٹھائے تو لب ہلا نہ سکے
ہم آئے تھے کہ ذرا رنگِ برہم دیکھ تو لیں — مگر یہ بھول گئے دل مچل ہی جائیگا
پروردۂ چمن ہوں، چمن پر ہے میرا حق — یہ بوٹ ہی نہیں ہے کہ کانٹوں کو ہار ہوں
فسانۂ دلِ پرشوق پوچھنے والو! — یہ داستاں بھی کسی کو سنائی جاتی ہے
یاد آکر وہ کرم فرما گئے — آج پھر آنکھوں میں آنسو آگئے
قیصر ہجومِ شوق میں اکثر گماں ہوا — جیسے گذر گئے وہ ہمارے قریب سے
نگاہِ گرم سے دیکھو نہ اے چمن والو! — میں کل یہاں سے اٹھالوں گا آشیاں اپنا

اب قیصر صاحب ہم میں نہیں۔ انھوں نے "اپنا آشیاں اٹھالیا"، مگر ان کے مندرجۂ ذیل دو مقطعے بار بار زبان پر آرہے ہیں۔

ہنس ہنس کے کہہ رہا تھا دلِ خوں شدہ کا حال — ہم دو گھڑی تھے قیصرِ غم آشنا کے ساتھ
اٹھ گیا خاموش قیصر تیری بزم نانسے — لے خبر محفل کی اب ہنگامۂ محفل چلا

جناب رشید کمیلی نے قیصر صاحب کے مجموعۂ کلام "طوفان و ساحل" پر جو تنقید و تجزیہ کیا ہے، وہ "طوفان و ساحل" کے ابتدائی صفحات میں "تعارف" کے عنوان سے شامل ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ

"موضوع کے اعتبار سے قیصر صاحب کا کلام جس چیز کا حامل ہے اُسے ہم صرف دو لفظ عصر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کی بڑی صحیح عکاسی کی ہے۔ جو کچھ ہم اس دور میں محسوس کر رہے ہیں، جن مسائل پر ہر سوچ بوجھ رکھنے والے

انسان کیلئے فورِ فکر آج کل ناگزیر ہے، بس اُن ہی باتوں کو انکوائری نے اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے وہ بڑے حقیقت پسند واقع ہوئے ہیں۔ زندگی کے حقائق سے آنکھ چرا خواہ وہ کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں انسان کی فطرت سے بعید ہے۔ اور اسی لئے تو وہ کبھی تصورِ پرستی کا شکار ہو سکے نہ کلیت اُن کے مزاج میں راہ پا سکی اور میں سمجھتا ہوں، یہی وجہ ہے کہ فنتاسیت ان کے کلام میں نام کو نظر نہیں آتی۔ زندگی کے متعلق اُن کا نظریہ بڑا صالح اور صحت مند ہے اور اسی بناء پر اُن کے ہاں خالی خولی رومان اور خیالی عشق کے ڈھکوسلے جو مریضانہ ذہنیت کو جنم دیتے ہیں، مطلق نہیں۔ غم کوشی، یاس پسندی، اداسی، افسردگی، اضمحلال، خفگی، جھلاہٹ، اس قسم کی کسی چیز سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ بس ایک امید افزا انشاطیہ عنصر ہے جو چند مستثنیات کو چھوڑ کر، کلام کے ہر پہلو پر چھایا یا نظر آتا ہے۔"

قیصر صاحب نے شاعری کی جس صنف میں بھی طبع آزمائی کی اس میں ان کی انفرادیت نمایاں ہوئی۔ اُن کی غزل گوئی کے متعلق کیفی صاحب لکھتے ہیں کہ

"جب ہم قیصر صاحب کی غزلیں دیکھتے ہیں تو اُن میں بھی اُن کی بیباک انفرادیت کی جھلکیاں ہمیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں اور یہ بات کسی شاعر کے بڑے ہونے کی ایک مستحکم دلیل ہے۔ اُن کی فطرت کا تیکھا پن، اُن کے مزاج کی دارستگی اور اُن کی طبیعت کا بانکپن اُن کی شخصیت کے ایسے جوہر ہیں جو غنی چنگی کی جلا پاکر غزل کی تقلیدی فضا کی تاریکی میں بھی بڑی آب و تاب دکھاتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ روایت اور انفرادیت کا اُن کے ہاں متناسب اور متوازن امتزاج پایا جاتا ہے۔ اسے ہم جنون اور شعور کی صحیح آمیزش بھی کہہ سکتے ہیں۔"

ہندوستان کے مشاہیر شعراء اور مقتدر ادیبوں نے اُن کے کلام کو سراہا۔ ماہنامہ "نگار" "شاعر" "آجکل" "فاراں" "ہماری زبان" "خیال" کے علاوہ دیگر موقر جریدوں میں "طوفان و ساحل" پر تبصرے ہوئے۔ ان کے علاوہ روزناموں، ہندی اور انگریزی کے اخباروں میں یہ شائع ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ حضرت اثر لکھنوی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی تک نے انہیں تحسین و ستائش کے کلمات سے نوازا۔ حضرت رنج پوری نے مئی ۱۹۵۹ء کے "نگار" میں ان کے شاعرانہ مرتبے کے متعلق لکھا ہے کہ

"قیصر صاحب پرانے شاعر ہیں، کہنہ مشقی اور شعر و دونوں حیثیتوں سے ہر ادبی رسائل کی دنیا میں بھی وہ غیر معروف نہیں ہیں، لیکن مل وہ ہیں کیا اور کس مرتبہ کے شاعر، اس کا علم اس مجموعۂ کلام کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

وہ نظم و غزل دونوں خوب لکھتے ہیں۔ نظموں کی خوبی یہ ہے کہ وہ تغزل سے خالی نہیں اور غزلوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ محض تقلید و تتبع سے بالا وہ نئی کے سوگوار ہیں، مستقبل کے واعظ و مبلغ بلکہ وہ حال کے شاعر ہیں اور جو اُن پر گذرتی ہے اس کو وہ بڑی لطافت و ندرت سے ظاہر کر دیتے ہیں۔"

ناگپور ٹائمز "Nag pur Times" میں غفور انیس صاحب نے "طوفان و ساحل" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "قیصر صاحب کے کلام میں کوئی پیغام نہیں ملتا۔"

میرا اپنا خیال ہے کہ اچھا ادب کسی خاص نظریے یا پیغام کے پروپگنڈے کا محتاج نہیں ہوا کرتا بلکہ بقول روزوزورتھ تمام علوم میں سے شاعری کو "روح لطیف" کا درجہ حاصل ہے۔ بعض شاعروں نے یقیناً شاعری سے پیغام کا کام لیا (اور اب بھی لیا جا رہا ہے) لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر شاعر کسی "پیغام" یا نظریہ کا حامل ہو۔

قیصر صاحب صرف ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک جہاں کش انسان بھی تھے اگر کوئی انہیں کام کے دوران دیکھتا تو بے ساختہ کہہ اٹھتا کہ

"مدا ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نہ بود ہا"

وہ ہمیشہ ہنستے ہنساتے رہے، سخت تکالیف میں بھی انہوں نے کسی کو اپنی تکلیف کا احساس نہ ہونے دیا۔ غرضیکہ اُن کی شخصیت کا ہر پہلو بڑا دلچسپ تھا اگر اُن کی شخصیت کے پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔

قیصر صاحب ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے، ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "رباب ہستی" کے نام سے ۱۹۴۰ء میں بمبئی سے شائع بھی ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے افسانے کے بنیادی کردار، میں ایسی خصوصیات رکھی ہیں کہ ہر پڑھنے والا چاہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے علاوہ اُن کی بہت سی شعری و افسانوی تصانیف غیر مطبوعہ ہیں اور انہیں منظر عام پر لانا ارباب ذوق و اہل نظر پر منحصر ہے۔ (بقیہ صفحہ ۴۱ پر دیکھئے۔)

غزلیں

حنیف ساغر

بھٹکے نہ کہیں تیزیٔ رفتار کو روکو
تم کل کے لئے آج کے فنکار کو روکو
دیوانے جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے ہیں
ہو بس میں اگر سایۂ دیوار کو روکو
کچھ خواب ابھی دیکھے ہیں ابھی شہرِ طرب کے
کچھ دیر ابھی صبح کے آثار کو روکو
اے ناقدو تزئینِ در و بام سے پہلے
تہذیب کی گرتی ہوئی دیوار کو روکو
دیوانے کبھی طوق و سلاسل سے رُکے ہیں
ممکن ہو اگر جرأتِ اظہار کو روکو
الزام نہ آجائے تہی ظرفی کا ساغر
دل پر ہی سہی وقت کے ہر وار کو روکو

ضیاء الانجم پرتاب گڈھی

اک ادائے ازلی ہو جیسے
حُسن معصوم کلی ہو جیسے
ہونٹ مُرجھائے ہوئے ہیں اُن کے
بادِ مسموم چلی ہو جیسے
ساری کونین ہوئی ہے بیدار
حُسن نے آنکھ مَلی ہو جیسے
سایۂ زُلف رُخِ روشن پر
سُرمئی شام ڈھلی ہو جیسے
عشق تارے کی طرح ہے لرزاں
کسی مہوش کی لگی ہو جیسے
آج چھیڑی وہ غزل اُس نے ضیاؔ
فن کے قالب میں ڈھلی ہو جیسے

عبدالصمد تپش

سنبھل سنبھل کے رہِ عشق میں قدم نہ بڑھاؤ
جُنوں جُنوں ہے خرد کی اسے نہ چال سکھاؤ
اندھیری شب ہے نہ سوچو کہ کون گزرے گا
گزر ہی جائے گا کوئی بھی راستہ تو دکھاؤ
ہزار گونہ حسیں ہیں یہ مہوشانِ زمیں
فلک کے چاند ستارو بہت نہ تم اترا ؤ
ہر ایک وہم پہ ہونے لگا یقیں کا گماں
سراب وقت کو سمجھو، فریبِ وقت نہ کھاؤ
تمہارے ذوقِ سفر کا یہ امتحاں ہے تپشؔ
کھلیں گے پھول بھی راہوں میں تم قدم تو بڑھاؤ

شاعر بمبئی

مظفر حسین جاوید

پیاسا سمندر

وہ ایک چاند رات تھی جو اس دھرتی اور آکاش کے بیچ میں گردن جھکائے کھڑی بھیگ رہی تھی ـــــ اور اللہ آسمان کسی بوڑھے جوتشی کی طرح اُس کی موت کی پیش گوئی کر رہا تھا۔

مجھے آج بھی یاد ہے وہ رات ـــــ اور اُس کی موت۔ جیسے میرے سارے ہتھیاروں کو چوپٹ کرنے گئی تھی۔ اور بدلے میں مجھے چند آنسو اور چند سسکیاں دے گئی تھی۔ وہ رات ـــــ جو آج بھی میری زندگی کے کھنڈر میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہی ہے۔ ـــــ

"رجنی ـــــ !"

"رجنی ـــــ !!"

جب بھی میں نے تنہائی میں اُس کے بارے میں سوچا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے اُس کی موت کی رات ایک گندی گالی بنکر میری دنیا پر چھا گئی ہے ـــــ اور اُس کی وہ نظر جس میں ایک التجا تھی ـــــ بے کسی تھی ـــــ ایک پکار بن کر مجھے زندگی سے موت کی وادی میں لے آئی ہے۔

آج جب رات کی تاریکی میں میرے اُن تنہا لمحوں کا کوئی سہارا نہیں ہوتا ـــــ اور پھر جب یہ زندگی کا تنہا لمحہ آہستہ آہستہ میرے سارے وجود پر چھا جاتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب میری زندگی میں وہ صبح کبھی نہ آئے گی جو اپنے ساتھ سورج لائیگی۔ اور دل کا سورج کبھی نہ چمکے گا۔ پھر میں گھبرا کر اپنے دل کے تنہا آنگن سے پوچھنے لگتا ہوں۔

اور پھر میری نظروں کے سامنے زندگی کا وہ نگوں ایک گول مٹکائی کی طرح پھیل جاتا ہے جب ایک ڈھلتی ہوئی رات میں ـــــ میں، رجنی اور میں۔ بمبئی سے برسوں کی جان پہچان تو تھی لیکن وہ ہی تین ملاقاتوں میں اُس نے اپنے بے پناہ خلوص کا کچھ ایسا ثبوت پیش کیا کہ مجھے اُس سے مل کر ایسا محسوس ہوا جیسے اُس سے برسوں کی جان پہچان ہو۔ میں اُن لوگوں میں سے تھا جو پہلی ہی ملاقات میں ہاتھ ملا کر دوسروں کو اپنے تکلف بنا لیتے ہیں۔ اُس کے ماضی کے بارے میں میں زیادہ تو معلوم نہ کر سکا لیکن اتنا جان سکا کہ وہ اس دنیا میں تنہا ہے اور تنہا ہی رہنے کیلئے پیدا ہوا ہے ـــــ اس لئے وہ اپنی اس تنہائی سے اُکتا کر فرح میں داخل ہو گیا تھا۔

وہ ہی تین ملاقاتوں میں اُسے مجھ سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ وہ دو، دو، تین تین مہینے کی لمبی رخصت لے کر مجھ سے ملنے آجاتا ـــــ اور پھر جاتے وقت اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔

یہ کہانی بھی آنسو اور بول کی ہے جب وہ تحفے لے کر مجھ سے ملنے آیا ہوا تھا۔

مجھے یاد ہے، ایک رات جب تیز بارش ہو رہی تھی اور میں بہت گہری نیند سو رہا تھا۔ پچھلے پہر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے سنا دروازے پر کوئی زور زور سے دستک دے رہا ہے

"کون ـــــ ؟" میری آواز بھرائی ہوئی تھی

"آ ـــــ میں" بمبل کی ہنستی ہوئی آواز تھی۔

میں نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا، رات کے دو بج رہے تھے۔ اپنے کمرے سے نکل کر تیز قدموں سے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے جب میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا، وہ رجنی کے ساتھ کھڑا بھیگ رہا ہے۔

میں ایک لمحہ کیلئے سوچتا رہ گیا اور رجنی کو دیکھتا رہا ــــ یہ کس گاؤں، کس گلی، اور کس گھر کی آبرو ہے ــــ اور زندگی کی کس آبرو کو بچانے کی حسرت میں بمل کی انگلی پکڑ کر میرے گھر کے دروازے تک آگئی ہے ــ یہ خیال ایک سوال بنکر میرے ذہن پر چھا گیا۔

"رجنی ــــ" بمل نے اس کا نام بتایا۔

"رجنی ــــ" میں نے سوچا، اور وہ لمحہ جیسے ایک کانٹا بنکر میرے سینے میں چبھنے لگا اور میری پچھلی زندگی میری نظروں کے سامنے ایک کتبہ کی طرح نشان بنکر رہ گئی۔ ایک ایسا سوال جس میں کوئی رجنی نہ تھی۔ کسی رجنی کے میٹھے بول نہ تھے دور دور تک کسی آنچل کا سایہ نہ تھا۔ زندگی کے اس سرے سے اس سرے تک کسی رجنی کا پیار نہ تھا۔

بمل اس کے بارے میں کہتا رہا ــــ لیکن میں کچھ سن سکا۔ اگر کچھ سن سکا تو صرف اتنا کہ اب رجنی یہیں رہے گی ــــ میں بمل سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اتنا بھی نہ پوچھ سکا کہ یہ کون ہے؟ اور اسے کہاں سے اٹھا لایا ہے۔ اور وہ بھلا کب تک رہے گی؟ میرے ہونٹ کھل نہ سکے۔ میں پتھر کا ایک بے جان بت بنکر رہ گیا۔ ایک ایسا بت ــــ جس کے ہونٹوں پر اقرار تھا نہ انکار ــــ

دروازہ بند کر کے جب ہم اوپر آئے تو رجنی کو میں نے غور سے دیکھا۔ وہ بھیگے کپڑوں میں جسم چرائے خاموش تھی۔ اس کے بھیگے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر اس کے چہرے پر گر رہے تھے۔ اور بارش سے بھیگا ہوا اس کا چہرہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے برسات کی بھیگی ہوئی ایک پاکیزہ صبح۔ صاف ستھری اور نکھری ہوئی، جو دھوپ کی تمازت سے دمک اٹھی ہو۔

وہ باتیں جو بنا کہے بغیر مجھے دیکھے جا رہی تھی ــــ جیسے کہہ رہی ہو ــــ میں اسی گھر کی آبرو ہوں اور میں تمہارے کہنے پر وقت کی تپتی ہوئی دھوپ میں اپنی زندگی کو جھلسا کر آئی ہوں ــــ صرف تمہارے لئے! بڑھو، ایک قدم اور مجھے اپنے ان تنہا لمحوں میں جذب کر لو!

اس رات بہت دنوں کے بعد میرے گھر کے آنگن میں چاندنی آئی تھی۔ اس سے پہلے جب چاندنی آئی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا۔ جیسے یہ چاندنی نہیں بلکہ میرے دل کے دامن سے لپٹی ہوئی ہے۔ وہ خوشی جو اس چاندنی کو پا کر محسوس ہو رہی تھی مجھے اب تک نہ مل سکی۔

اور اسے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا میری اب تک کی زندگی جس میں کسی رجنی کی بیوفائیں دفن نہ تھیں ــــ وہ زندگی جس میں اب تک میں نے دل کا لہو نچوڑ کر کوئی آنچل نہ رنگا تھا ــــ آج وہ رجنی ایک سچا وعدہ بنکر میری زندگی کی پہلی امید کی شہنائی بنکر آئی ہے ــ جو مستقبل میں میری بے بس کروٹوں کا سہارا بنے گی۔ اور میری بے رنگ زندگی کا گہوارہ ــــ

اور پھر دوسرے لمحہ میں سوچنے لگتا آخر ایسا کیوں ــــ؟ اس سے میرا رشتہ ہی کیا ہے ــــ اس نے تو بہت پہلے ــــ مجھ تک پہونچنے سے پہلے بمل کو اپنا مان مقام دیا تھا۔ لیکن میں اپنے دل کو کیسے سمجھاتا ــــ میں اپنی زندگی کے ان سونے سپنیس ۳۵ برسوں کو کیسے بھول سکتا تھا۔ جس میں کوئی رجنی نہ آئی تھی ــــ جس میں کسی رجنی کا ناقابل اعتبار وعدہ نہ تھا ــــ اگر کچھ تھا تو صرف میری تنہائی۔ ایک ناقابل فراموش تنہائی۔ جس کی یاد ایک کراہ بنکر میرے سینے میں تڑپنے لگتی۔ میں اپنے ان تنہا لمحوں کو کیسے بھلا دیتا۔

جب رات کی تاریکی اجالے سے بدل گئی تو بمل میرے کمرے میں آیا۔ رجنی میرے ساتھ والے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔ اور بمل مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"میں اسی ہفتے اس سے شادی کر لوں گا۔"

"شادی ــــ؟" جیسے میری زندگی کا حسین خواب بکھر کر رہ گیا ــــ اور وہ ایک لمحہ زہر بنکر میرے سارے جسم میں سرایت کر گیا۔

"کون ہے وہ؟" میں نے پہلی بار اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔

"وہ ــــ وہ مجھے زندگی کے اس میلے میں ملی جو کسی کو پا لینے کی حسرت میں اپنے وجود کو مٹائے جا رہی تھی۔ اور مجھے جس کی برسوں سے تلاش تھی۔ آج جب وہ ملی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری اس سے برسوں کی جان پہچان ہے۔ اور میرا اس سے بہت پرانا اور گہرا رشتہ ہے۔ اس وقت سے جب اس دھرتی پر انسان نے پہلی بار کسی کو چاہا تھا۔ اور پہلی بار محبت کا گیت گایا تھا۔ میری زندگی کا وہ خواب جو ایک ادھورا افسانہ بنکر رہ گیا تھا

شاید اس کے آنے سے مکمل ہو جائے۔"

میرے ایک چھوٹے سوال پر وہ بہت کچھ کہہ گیا۔ اپنے بارے میں اور رجنی کے بارے میں۔ اور میں خاموشی سے اس کے چہرے کو پڑھتا رہا تھا۔ جہاں اس کے چھوٹے چھوٹے تاثرات مل کر ایک نئی زندگی کا پیغام دے رہے تھے۔

"نہیں ——— ایسا نہیں ہو سکتا۔" لیکن میرا دل میرے ہونٹوں تک نہ آ سکا۔

اور میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے پر اس کے دل کی بات پڑھنی چاہی ——— لیکن میں کچھ نہ پڑھ سکا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اپنے پیر کے ناخنوں کو زمین سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے اسے میرے جواب کا انتظار ہو۔

مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔

"تم سوچ رہے ہو گے میں کس گھر کی فلاکت اٹھا کر لے آیا ہوں۔ لیکن یہ کسی دوسرے کے گھر کی گندگی تو نہیں، یہ ہمارے اور تمہارے ہی گھر کی گندگی ہے، اور اپنی گندگی کو کون چھپا سکا ہے؟ آج مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک خشک کنواں ہوں، ایک ایسا خشک کنواں جس میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے ——— لیکن رجنی کے آجانے سے ایسا محسوس ہوتا ہے اب وہ اپنے زندگی کے سارے آنسوؤں سے لبریز کر دے گی ——— مجھے زندہ رہنے کیلئے کچھ نہیں چاہیئے۔ چند سسکیاں، چند آنسوؤں کے سہارے میں زندہ رہ لوں گا ———"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا، اور میں لاکھ کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکا، یکایک وہ اٹھ کھڑا ہوا، اور میرے سامنے سے چلا گیا۔

لیکن زندگی کا یہ بے رنگ افسانہ ایک خواب بنکر رہ گیا۔ جنگ چھڑ گئی تھی اور عمل کو پنجاب کے ایک محاذ پر بلا لیا گیا۔ شام کو جب میں گھر پہنچا تو دیکھا محن میں ایک پولیس گاڑی کھڑی تھی اور عمل اپنے فوجی لباس میں دو سپاہیوں کے ساتھ جانے کو تیار کھڑا تھا۔ اور اسے شاید میرا ہی انتظار تھا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے اپنی جیب سے ایک مڑا ہوا سٹیل گرام نکال کر مجھے دکھایا۔ میں نے پڑھا۔ اسے فوراً اپنی ڈیوٹی پر آ جانے کو کہا گیا تھا۔ اور پھر ہم اور رجنی اس موٹر میں بیٹھ گئے۔ اسے اسٹیشن تک چھوڑنے کیلئے۔ رجنی اس کی بغل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا اس وقت اس کی آنکھوں سے بے پناہ پیار ٹپک رہا تھا۔ سارے راستے ہم خاموش رہے، کوئی کچھ بھی نہ بول سکا۔ سب کے چہروں پر ایک سوال تھا اور صرف ایک ہی سوال۔

اسٹیشن پر بھی میں اس سے کچھ نہ بول سکا۔ اور نہ وہ ہی کچھ بولا۔ ہم سب خاموش تھے۔ عمل، میں اور رجنی ——— سب خاموش تھے۔ اس طرح جیسے نئے واقعات کا سب کو انتظار ہو۔

جب گاڑی آئی تو وہ خاموشی سے سوار ہو گیا۔ میں نے دیکھا اس وقت وہ بہت اداس نظر آ رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک ایسی جگہ جا رہا تھا جہاں زندگی اور موت دونوں قدم سے قدم ملا کر چلتی ہیں۔ وہ تو رجنی کیلئے اداس تھا۔ اسے اتنا ہی موقعہ مل سکا کہ وہ رجنی کی مانگ میں سیندور بھر کر اپنی زندگی کی اس ادھوری خواہش کو پورا کر سکتا۔

اور پھر جب گاڑی کے چھوٹنے کا وقت آیا تو اس نے ایک ہلکے سے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ اور رجنی کی طرف ایک نظر دیکھ کر کہنے لگا ——— "آج میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی امانت تمہیں سونپے جا رہا ہوں ——— تم مجھے چھوٹے بھائی کی طرح چاہتے ہو نا اسی چاہت پر بھروسہ کر کے میں رجنی کو تمہارے حوالے کئے جا رہا ہوں۔ رجنی کا خیال رکھو گے ——— اسے زندگی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے نہ دینا۔ میں لوٹ کر آؤں گا اور ضرور آؤں گا مجھے پہلے اپنے اس فرض سے سبکدوش ہو لینے دو۔ آج مادرِ وطن مجھے پکار رہا ہے، کہہ رہی ہے ——— 'میری لاج بچا لو ———' میں نے تم پر بھروسہ کیا ہے اس بھروسہ کا احترام کرنا۔ آج میری طرف صرف ایک جوان رجنی کی نگاہیں نہیں اٹھی ہوئی ہیں۔ آج ہزاروں اور لاکھوں جنیوں اور کنیکنیوں کی نگاہیں میرے چہرے پر سوال بنکر چھا گئی ہیں ——— وہ نگاہیں جیسے مجھ سے کہہ رہی ہیں۔ ... ہمارے سیندور کی لاج رکھو۔ ہمارے سہاگ کی حفاظت کرو۔ آج تمہیں دھرتی ماں کی لاج رکھنی ہے جس نے تمہیں جنم دیا، جس نے تمہیں زندگی دی ———"

اور عمل جیسے نازک وقت میں بھی اپنی زندگی کی ساری تمناؤں کو پی کر اپنے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ لئے ہوئے تھا۔ لیکن وہ اپنی اس مسکراہٹ میں زندگی کے چھپے ہوئے اس زہر کو نہ پی سکا جو اس کی اس مسکراہٹ میں ایک تلخ حقیقت بنکر شامل ہو گیا تھا ———

رجنی اُس کے کندھے پر سر رکھے اپنی ہلکی سسکیوں سے اُس کی اُس تلخی کو کم کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی ۔۔۔ اور بمل اُسے تسلی دے رہا تھا ۔۔۔

"دُنیا میں رجنی ۔۔۔ دیش پر چھائی ہوئی جنگ کی یہ گھٹا ایک نہ ایک دن ضرور چھٹے گی اور پھر سُن کا سورج چمکے گا۔ لیکن اس کیلئے ہمیں قربانی دینی ہے گی۔ آج میرے سامنے ہزاروں اور لاکھوں رجنیوں، رُکمنیوں اور رمجھاؤں کی حفاظت کا سوال ہے ۔۔۔ رجنی! مجھے اس آخری وقت میں تمہاری مسکراہٹ کی ضرورت ہے ۔۔۔ جس کے سہارے، اور جس کی روشنی میں میں تمہاری حفاظت کر سکوں، مجھے دیکھ کر مسکراہٹ دو رجنی! جو جنگ کی تاریک راتوں میں مجھے روشنی دے سکے ۔"

اور دوسرے لمحہ گاڑی چل پڑی تھی ۔ میں اور رجنی اُسے اپنی نظروں سے الوداعی پیغام دے رہے تھے اور وہ دروازہ پر کھڑا ہمیں دُور تک رومال لہرا کر جواب دیتا جا رہا تھا۔ ایک نئی زندگی کا پیغام ۔۔۔ جو آج نہیں تو کل ضرور آئیگی، ایک نئی زندگی سب کیلئے ۔ اس دھرتی پر بسنے والے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کیلئے ۔۔۔!

بمل چلا گیا تھا ۔۔۔ اور رجنی کو میرے حوالے کر گیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اپنے اوپر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی تیزی سے یہ کہانی ایک نیا موڑ کیسے اختیار کر گئی ۔ میں کس منہ سے کہہ سکتا تھا کہ مجھے رجنی سے محبت ہے ۔

لیکن میں بمل کے اعتماد کو زخمی بھی کیسے کر سکتا تھا۔ میں اُس کی یاد کا کیسے خون کر سکتا تھا۔ رجنی پر میرا حق ہی کیا تھا۔ اُس پر حق تو صرف بمل کا حق تھا۔ جس نے اُسے تلاش کیا۔ اور اپنی منزل پائی ۔۔۔ لیکن میں ابتک کیوں اپنی زندگی کے بنواس میں اکیلا گھوم رہا تھا۔ میری زندگی میں کیوں نہ کوئی رجنی آئی ۔

یہ ایک سوال تھا جو میری زندگی کے اِن تنہا لمحوں سے اُبھرتا اور وقت کے اندھیرے میں ڈوب جاتا اور اُسی لمحے مجھے اپنی زندگی ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح نظر آنے لگتی ۔۔۔

رات کی تاریکی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور میں اپنی ہی دُکھوں بھری کہانی میں ڈوبا ہوا اپنی زندگی کو دیکھی بنا رہا تھا۔

"رجنی ۔۔۔"

یکایک کسی نے ہولے سے دستک دی۔

میں نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے وہ کھڑی تھی ۔۔۔ میری زندگی ۔۔۔ رجنی ۔۔۔

وہ مجھ سے چوروں کی طرح میرے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

رجنی نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا اور میں گھبرا کر اپنی چارپائی تک واپس چلا آیا۔ نہ جانے کتنی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا ۔۔۔ اور اُس وقت جو کہ جب رجنی بالکل میرے سامنے کھڑی تھی، میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا، وہ بالکل سر سے پیر تک دہکتا ہوا شعلہ بنکر آئی تھی جس کی ایک چنگاری مجھے جلا کر خاک کر دینے کیلئے کافی تھی ۔۔۔ سرخ ساری میں پٹا ہوا اُس کا جسم میرے جذبات میں آگ لگا رہا تھا ۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا جسم کانپ رہا ہے ۔

"کس لئے آئی ہو یہاں ۔۔۔ ؟" میں ابھی تک کانپ رہا تھا۔

وہ ایک لمحہ کیلئے چونکی اور پھر مسکراتی ہوئی بالکل میرے قریب آکر چارپائی پر بیٹھ گئی ۔

"تم سے کچھ کہنے ۔۔۔" وہ اُسی طرح مسکرا رہی تھی۔

یکایک جیسے میرے سارے بدن میں آگ لگ گئی اور ایک لمحہ کیلئے میں سر سے پیر تک کسی نامعلوم احساس سے کانپ کر رہ گیا۔ میں نہ جانے کیوں نہ جانے کیوں ڈرتا سا پیچھے ہٹ گیا۔

"کیا کہنا چاہتی ہو ۔۔۔ ؟" میری آواز کانپ رہی تھی۔

"یہی کہ مجھے بمل سے نہیں، تم سے محبت ہے ۔۔۔" یکایک اُس کی گردن جھک گئی ۔

"رجنی ——— !!"

ایک لمحہ کیلئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی ڈھلوان سے لڑھک کر نیچے گرتا چلا جا رہا ہوں۔ اپنی زندگی کی گہری کھائیوں میں ——— یہ محبت کی کون سی آگ تھی، جو ایک الاؤ کی طرح میری زندگی کے ارد گرد پھیل گئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اور پھر وہ یکایک میرے شانے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے میرے کندھے پہ اپنا سر رکھ دیا۔ نہ جانے کس جذبے کے تحت میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا ——— میں نے اس کی طرف دیکھا اور اس نے نگاہ جھکا لی۔ شرم و حیا کی ایک سرخ لکیر سمٹ کر اس کے چہرے پر چھا گئی۔

اور دوسرے لمحہ میرے دل کے گوشے سے ایک بھائی پہچانی آواز ابھری۔ یہ آواز بمل کی تھی جو کہہ رہا تھا ——— آنند! تم مجھے چھوٹے بھائی کی طرح چاہتے ہو نا، اسی چاہت پر بھروسہ کر کے میں رجنی کو تمہارے حوالے کئے جا رہا ہوں۔ رجنی کا خیال رکھنا۔

اسی لمحہ ایک سرد لہر مجھے سر سے پیر تک کپکپا گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے جسم کا سارا خون ابل کر میرے دل کی دیوار کو توڑ گیا۔ میں یکایک گھبرا کر اس سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔

"رجنی ——— تم جاؤ، سویرا ہو ——— دیکھو رات کتنی گہری ہوتی جا رہی ہے!"

"نہیں ———"

"رجنی تم بھول کر رہی ہو۔ میری زندگی ایک بجھتا ہوا شعلہ ہے، ایک خشک جھیل ہے۔ میں تمہیں وہ سب کچھ نہ دے سکوں گا ——— جو تمہیں مجھ سے امید ہے۔ تم میرے پاس ایک عظیم امانت ہو ——— میں بمل کو کیا جواب دوں گا ——— تم اس کی آخری امید ہو، اس کی زندگی کا آخری سہارا ہو۔ میں اس سہارے کو کیسے چھین سکتا ہوں۔ بمل جنگ پر تمہاری اور تمہاری جیسی ہر لڑکی اور لاکھوں جوان اور نوجوان تمہاری لاج بچانے کیلئے اپنی جان ہتھیلی پر لئے دن کے اجالے، رات کی تاریکی میں ایک نامعلوم منزل کی طرف بڑھ رہا ہے ——— جب وہ لوٹ کر آئے گا تو میں اسے کیا جواب دوں گا ———"

میں ایک بار پھر اپنے ماضی کی طرف لوٹ گیا تھا۔ اور اس وقت نہ جانے کہاں سے میری آواز میں بے بسی آ گئی تھی۔

"نہیں آنند ——— میں اس کی ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجھے تم سے محبت ہے صرف تم سے ——— ! تم نہیں ہو ——— تو میں بھی کسی گہرے سمندر میں ڈوب کر مر جاؤں گی۔"

یکایک وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

اور میں ایک عجیب الجھن میں پڑ گیا ——— میں کیسے سمجھاؤں اسے کہ بمل سے میرا کیا رشتہ ہے۔ میں بمل کے اس آخری ——— اس سے کیسے چھین سکتا ہوں ——— زندگی کی یہ تلخ حقیقت وہ کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ میں اپنی زندگی میں آنے والی رجنی کا ——— میرا انتظار تو امر ہے ——— لیکن زندگی کا یہ زہر نہیں پی سکتا ——— ایک دوست کو فریب اعتماد نہیں دے سکتا ——— !

"رجنی ———" میں نے اسے جھنجھوڑا

"ہوں ———"

"جاؤ ——— اور سویرا ہو۔ تمہارا خیال ایک تلخ خواب ہے جس کی حقیقت کی تہہ تک تم نہیں پہونچ سکتیں۔ میں بمل کو ——— ایک دوست کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس نے مجھے جو امانت سپرد کی ہے میں اسے مقدس امانت سمجھتا ہوں!"

اور دوسرے لمحہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"آنند ——— !!" اس نے حیرت سے اپنا سر اٹھایا اور میری طرف دیکھنے لگی، جیسے میری آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو ——— اپنی زندگی کیلئے ان آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہی ہو۔

وہ جا رہا تھی پر اس نے مجھ پر ایک عجیب نظر ڈالی ہوئی چلی گئی۔ وہ نظر ایک سنگ میل بن کر ٹھہر گئی۔ اسی ایک لمحہ میں وہ اپنی نظروں

(بقیہ افسانہ صفحہ ۲ پر دیکھئے)

(رپورتاژ)

ندا فاضلی

بمبئی سے اُودے پور تک

دادر اسٹیشن سے جنتا ایکسپریس آٹھ بیتالیس پر چھوٹتی ہے میں اعتیاطاً ساڑھے آٹھ بجے ہی پہونچ گیا تھا۔ لیکن وہاں معلوم ہوا ٹرین ایک پیکٹ لیمونڈر، تین پان، دو چائے اور ایک پورا انڈین ایکسپریس (اخبار) لیٹ ہے۔ کسی شاعر نے اپنی محبوبہ کے انتظار کے بارے میں لکھا ہے، ہم نے ہر پہلو سے دنیا دیکھی۔ اور مجھے پہلی بار یہاں آکر اس مصرعے کی سچائی کا احساس ہوا۔

ہندو پاک کشمکش، ناستقند معاہدہ اور اس کے خوشگوار اثرات، اناج کی قلت، سلام مچھلی شہری کی مشکراہٹ کا جواب، گوالیار کی کسی تنگ گلی میں جگر کی شاعری کی طرح دبی دبی مسکراہٹیں، سمندر پار بسی ماں کی خطوط کی کچھ گیلی گیلی باتیں، کتنی یادیں، کتنی لغزشیں، کتنی تلخ حقیقتیں!! دو گھنٹے اور پورے ستائیس سال کا پھیلاؤ۔

انتظار یار تیرا شکریہ ہم نے ہر پہلو سے دنیا دیکھ لی

محترم اعجاز صدیقی بمبئی سنٹرل سے بیٹھے تھے۔ ٹوٹا ئر کے گیٹ پر کھڑے وہ مجھے ڈھونڈ رہے تھے اور پلیٹ فارم کی ست رنگی بھیڑ بھاڑ میں، میں اُردو بھاشا میں ٹوٹا ئر کے پاس بیٹھ کی پوچھ تاچھ کر رہا تھا۔ "ارے واہ! آپ جا نہیں رہے ٹوٹا ئر ہمیشہ آگے لگتا ہے۔ ایک باریک گمبھیر آواز نے مجھے چھوا۔ مجھے لگا اعجاز صاحب اس وقت ہونٹوں سے نہیں بلکہ اپنے چہرے پر لگی عینک کے شیشوں سے بولے ہوں۔ اور میں بھی صرف آنکھوں ہی سے اپنی ناواقفیت کا اعتراف کرتے ہوئے اندر پہونچ گیا۔

اعجاز صاحب کے ہر کام میں ایک سلیقہ اور تنظیم ہوتی ہے۔ ریل کے ڈبے میں بھی وہ بستر، تکیہ، چادر، سوٹ کیس، بیگ، ٹوکری..... ہر چیز کو ٹھیک سے سجائے ہوئے تھے..... میرے لئے بیگ محفوظ تھا..... میں نے چاہا بیگ کھول کر کوئی کتاب نکالوں اور کسی نئے کلاکار کے ساتھ اس کے دکھ سکھ کی سیر کروں، لیکن اسی وقت اعجاز صاحب نے ریل کی چھک چھک میں اپنی آواز کو اُبھارتے ہوئے کہا۔ گاڑی ٹھیک دو گھنٹے لیٹ ہے۔ رتلام میں اگر گاڑی نہیں ملی تو بڑی تکلیف ہوگی۔ اس وقت وہ صرف ہونٹوں سے نہیں۔ اپنی آنکھوں، ماتھے کی شکنوں، ہاتھ کے اشاروں، کندھوں کے جھکاؤ، اور چہرے کے بناؤ۔ غرض کہ پورے جسم سے بول رہے تھے۔ میرا کیا تھا۔ بقول فراق ۔ "نیند بھی، خواب بھی، کہانی بھی" لیکن ان کے ساتھ مجھے بھی فکر مند ہونا پڑا۔ اور دیر تک اسی موضوع پر بات چیت ہوتی رہی، حالانکہ اس بحث مباحثہ سے گاڑی کی رفتار میں کوئی تبدیلی اور رتلام سے ملنے والی ٹرین کے وقت میں کسی قسم کا ردّ و بدل پیدا ہونا ممکن نہ تھا..... گاڑی اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔ وقت اپنی گتی سے گذر رہا تھا۔

دور کا راستہ دو طرح سے کٹتا ہے، ہمسفر اچھے ہوں۔ یا لیٹ کر کتاب پڑھنے کیلئے مگ دستیاب ہو۔ اس بار قسمت سے ہمسفر بھی اچھے ملے۔ اور مگ بھی فراق کی غزل کی مانند کافی لمبی چوڑی، جاہے لیٹو، جاہے بیٹھو، جاہے جائے نماز بچھا کر تہجد گذاری کرو۔ اعجاز صاحب اسٹی پاتی مار کر بیٹھ چکے تھے۔ مگر میں اپنی عمر کے مطابق اپنے بیٹھنے کا رخ ابھی تک متعین نہیں کر پایا تھا۔ کس طرف ہو کے بیٹھوں، کدھر رخ کروں، کہاں پاؤں پھیلاؤں،

جلوؤں کے اژدہام نے حیراں بنا دیا"

ایک گول مٹول خوبصورت سا بچہ اپنی ماں کی گود سے لپک کر سیٹ سے نیچے اتر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بچہ

ورڈسٹ ورتھ کا نقاد سا فلسفی نہیں، رابندر ناتھ ٹیگور کا اور دھی، شریر اور چنچل بالک تھا۔ جب باپ کے کمرے میں گھس کر رام کے کاغذوں پر سیاہی لگا دے، ماں کا آنکھ بچتے ہی دھول میں لوٹنے لگے اور اکیلا ہو تو ریت میں پاؤں ڈال کر چھوٹے چھوٹے اسکیمو جیسے گھروندے بنانے لگے۔ بچہ بہت بڑا عابد و زاہد ہوتا ہے۔ کیسی ہی محفل ہو، مذہبوں کا اجتماع ہو، گنواروں کا جمگھٹا، بچہ سب کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ تھوڑی دیر کی میں تربیت کی بیٹیوں کے سب، جوان، ادھیڑ، بوڑھے، اپنے اپنے انداز میں اس بچے کو لبھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کیا رئمنٹ میں دو دو برس کے بہت سارے منی داس بچے کا نام، بھرے ہوں۔ اور ذات، اجاشا، دھرم، اور اونچ نیچ کے سارے فرق، منی بمبئی کی کلکاریوں اور بے فکر قہقہوں میں گھل مل گئے ہوں۔ اعجاز صاحب ستلاتی زبان میں کان کے بجائے اس کے رخساروں میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ میرے پاس بیٹھی لڑکی نے اپنی پوری زبان کچھ اس طرح نکالی کہ منی کے سرخ ہونٹوں پر ایک ننھی سی کلی اگ آئی۔ میں نے بالوں کے گھنے ریشم میں اپنی انگلیاں ڈال دیں۔

اس کے باپ کی زبانی معلوم ہوا بچہ (منی) جیتن آنند کی فلم "آخری خط" کا مشہور اداکار ہے اور شاید دنیائے فلم کا سب سے کم عمر ہیرو بھی۔ منی کسی پریس کانفرنس کے سلسلے میں دہلی جا رہا تھا۔ رسالہ شمع کی خبر کے مطابق ڈائریکٹر اس فلم کو بہت تیزی سے بنا رہے ہیں کیونکہ اگر زیادہ وقت لگا تو منی اس رول کیلئے جس میں وہ کام کر رہا ہے۔ فٹ نہیں بیٹھے گا۔

جیسے جیسے گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی، اعجاز صاحب کی آواز چشمے کے شیشوں اور مسکرانے کے انداز سے اطمینان جھلکنے لگا۔ ان کی فکر جائز بھی تھی۔ اٹھیں، مدراس کی شام کو اردو سمپوزیم (اودے پور) میں خطبۂ صدارت پڑھنا تھا، جو ابھی تک کاغذ کے ٹکڑوں میں بکھرا پڑا تھا۔ اسے ترتیب سے جمانے کا بھی سوال تھا۔

شاید گجرات کی سرحد شروع ہو گئی تھی۔ ہمارے آس پاس ہی کچھ اجلے اجلے سنہری چہرے، بھولی بھولی روشن آنکھیں، چھوٹے چھوٹے قدوں کے سڈول جسم، سونا جڑھے دانت، اٹکھیلے پن کی چھینٹ کی ساڑیاں، اور کسی ہوئی چوٹیاں نظر آنے لگی تھیں۔ ہوا میں ہلکی ہلکی نمی سی پیدا ہو گئی تھی۔ میرے قریب بیٹھی ہوئی لڑکی کھڑکی بند کرنے کی کوشش میں دوہرا سرخ سی ہو گئی۔ تتلی کلائیاں، شوہر کے گریبان میں بٹن ٹانکنے والی انگلیاں، کروشیا چلانے والے بھورے اور تھکتے چاند کو بھلانے والے بازو، لمبے اور ریشمی سے کھیلنا کیا جانیں، !! میں نے آگے بڑھ کے کھڑکی کے کانچ کو نیچے کر دیا۔ اور پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھنے کیلئے کہ کسی اجنبی لڑکی کے ساتھ کوئی احسان کیا جائے تو اس کے چہرے پر کیا تاثرات ہوتے ہیں۔ لیکن وہ شاید بہت تھکی ہوئی تھی۔ میرے دیکھنے تک وہ پاؤں پھیلا کر آنکھیں بند کر چکی تھی۔ ساغر نظامی کا کہنا خوبصورت مصرعہ ہے "حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے۔"

بڑودہ اسٹیشن پر اعجاز صاحب کے دو عزیز دوست پائے اور ناشتہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اعجاز صاحب نے ان سے متعارف کرایا۔ ایک ابراہیم انجم اور دوسرے جمال مہدوی تھے۔ کئی اسٹیشنوں کی بدذائقہ چائے پینے کے بعد اس چائے نے بڑا مزہ دیا۔ چائے ہی تھرمس میں اور تھی۔ ڈبے کے بیشتر لوگ پلیٹ فارم پر اتر گئے تھے۔ یا ڈائننگ روم میں جا چکے تھے۔ میری سیٹ والی لڑکی گم صم بیٹھی تھی۔ "چائے پیجئے گا۔" اس انداز پر وہ کچھ گھبرائی، لجائی اور پھر مسکرانے لگی۔ جی نہیں! شکریہ۔ اتنی دیر میں اس کا شوہر بھی آچکا تھا۔ میرے اصرار کو دیکھتے ہوئے، اس نے خود ہی ہاتھ سے کپ لے کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکیاں کھاتے پیتے وقت اور عمر بتاتے وقت کیوں پس و پیش کرتی ہیں، یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔

رتلام کا اسٹیشن ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹہ دور تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ مارچ کے آخری دنوں میں دسمبر کی سی سردی اور میرے ساتھ بمبئی کے موسمی کپڑے، ململ کے کرتے یا پالیسٹر کی شرٹس۔ اعجاز صاحب کو گرم شیروانی نہ لانے کا افسوس اور مجھے اوٹی سوٹ کا دکھ۔ لیکن شیروانی کے افسوس اور اوٹی سوٹ کے دکھ، دونوں کو رتلام کی گرم گرم چائے میں گھول کر پینا پڑا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تاخیر سے پہنچنے کے باوجود اودے پور جانے والی ٹرین اپنے مہمانوں کو لے جانے کیلئے منتظر تھی۔ فرسٹ کلاس پیار ٹمنٹ میں پڑے بستر بدل کر کے اپنی اپنی سیٹ پر ہم دراز ہو گئے۔ رتلام سے اودے پور کا فقط گیارہ بارہ گھنٹے کا سفر ہے۔ بڑی بے فکر اور میٹھی نیند آئی۔ مگر اعجاز صاحب تمام رات نہ سو سکے۔

کتنا ہی آرام کیوں نہ ہو انھیں نرمیں میں نیند نہیں آتی۔

صبح کا سورج جنگل میں بہت خوبصورت لگتا ہے۔ اگر سر پر رکھے کسی انگھرے کی طرح دھیمے دھیمے اگتا ہوا سورج صدیوں سے بہائے کسی تپتے دشت نے بچے کے ننگے جسم سا شوریدہ رنگ مچھی ہوئی پیتل کی تھال کی مانند جھلملاتا سورج، لال گھونگھٹ کی اوٹ سے دمکتے چہرے سا لجھے گداز بانہوں میں سمٹے جوبن سا سورج، جاڑے کا آسمان اور جنگل کا سورج۔ فطرت کے دو حسین راز ہیں جو آج کی مصروف دنیا میں بہت کم لوگوں پر عیاں ہوتے ہیں۔ کیمپ ریفریشمنٹ کے دروازے کے پاس ایک بالشت بھر آبی دھوپ دھیمے دھیمے اپنے پیر پھیلا رہی تھی۔ گذرتے کھیتوں اور راستوں پر اونچے اونچے قد، لال پگڑیاں، کسی ہوئی پٹیوں سے اوپر کی چوٹیاں، پھیلے گھاگھرے اور رنگ برنگی چنریاں نظر آرہی تھیں۔ بھائیوں تک بھری ہوئی گاڑی کی چوٹیاں ——— اداس بالوں میں پروئی ہوئی جھاڑی کی باریک لڑیوں جیسے چھوٹے اسٹیشنوں پر ان کی کہانیو کی طرح ذہن کو چھو رہی تھیں۔ برن کے جیوٹ سپلوتوں اور دوفا پرست پربکاؤں کی دھرتی۔ مجھے ایک راجستھانی لوک گیت کا ٹکڑا یاد آگیا۔ کوئی پردیسی اپنی بستی کی عورت سے اکتا کر روزی کی تلاش میں پردیس نکل جانا چاہتا ہے۔ مگر مجبور کو یہ جدائی ایک آنکھ نہیں سہاتی۔ اسے سپرد کرجھوں میں چھ راسال بتانا منظور لیکن اپنے ساجن سے نہ بچھڑنا خواہ ہونا خواہ نہیں ؎

سیر بھر گیہوں برس دن کھائیے پیا کو نہ جانے دیجے ہو...

ویٹر چائے لے آیا تھا۔ چائے کی کیتلی سے دھوپ چڑھی صبح جاپ کی جھینی نقاب سے جھانک رہی تھی۔ اودے پور اب صرف ایک اسٹیشن دور تھا۔ خلیل تنویر اپنے تین نوجوان دوستوں کے ساتھ اشتیاق دید میں علی الصبح ہی اسٹیشن پر ہم سے ملنے اور خوش آمدید کہنے چلے آئے تھے۔ نوجوان ذہن، نئی نئی سوجھ، بہت سے سوال، الجھے ہوئے اشارے، بکھرے ہوئے خیال۔

"نئی شاعری نئے آدمی کی کہانی ہے۔" نئی شاعری کو پرانی اقدار کی کسوٹی پر پرکھنا ممکن نہیں، ہندستان کے رتی پسند گروپ میں سوائے سردار جعفری کے اب کوئی دوسرا نام نظر نہیں آتا۔ باقر مہدی، ندا فاضلی، اور عادل منصوری کے لہجے کا کھردرا پن آج کے نئے لوگ بودھ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ "میرا جی، بند کو ٹھری کے شاعر تھے، راہی معصوم رضا دوسرے نام سے بھی نثر لکھتے ہیں۔" خلیل تنویر کہے چلے جارہے تھے۔ اعجاز صاحب خاموشی سے سن رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اودے پور کے نوجوان اور ان کی یہ تیز سوجھ —!!

"اس سمپوزیم میں ہم نے کچھ نئے لوگوں کو بھی خاص طور سے مدعو کیا ہے لیکن ..... خلیل تنویر کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ وہ لیکن کے آگے کیا کہنا چاہتے تھے؟ کیٹس نے ایک جگہ کہا ہے Heard melodies are sweet but those unheard are sweeter. شاعری کی طرح بشمیر، جام اور رزلف کے رومانی امتزاج کے ساتھ ہمارے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ عابد حسین ادیب، نور محمد اڈوکیٹ، انجمن ترقی اردو کے دوسرے کارکنان کے ساتھ پلیٹ فارم پر ہمارے منتظر تھے۔

ٹھہرنے کا انتظام ٹورسٹ بنگلہ میں کیا گیا تھا۔ پہاڑی پر بنی ایک خوبصورت عمارت ہے۔ دور سے دیکھو تو ایسا محسوس ہو جیسے بہت ساری اسکول کی لڑکیاں گھیرا باندھ کر کھڑی ہو گئی ہیں، یا کوئی چنچل رقاصہ ہے جو ناچتے ناچتے ایک خاص پوز میں یکلخت ٹھہر گئی ہو اور جانے کب پھر تو لے پھر سے فضاؤں میں تیرنے لگے۔

راجستھان کے مختلف مقامات سے آئے ہوئے مہمان شعرا اور ادیب اسی عمارت کے الگ الگ کمروں میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہماری آمد کی خبر آناً فاناً ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی کہ دل عاشق کی طرح چاروں طرف سے کھچا کھچ بھر گیا۔ حامد رشید خاں، ظفر عوزی، فضل الحسنین، عارف بیکانیری، سلطان احمد، خلیل تنویر بہت سے دوسرے کارکنان اور ان سب کے بیچ میں شمع محفل اعجاز صاحب۔ باتیں ہی باتیں، آوازیں ہی آوازیں۔

پنڈت نہرو کے لفظ، آرام حرام ہے، پر اور کہیں عمل ہو نہ ہو لیکن ایسے ادبی اجتماعات میں اس پر عمل ضرور کیا جاتا ہے۔ اس کی تصدیق میں کرتا ہوں۔

اودے پور سمپوزیم کا افتتاحی جلسہ، عمارت کو پانچ بجے شام لوک کلا منڈل کی خوبصورت اور کشادہ عمارت میں شروع ہوا اور اودے پور

کا اوپن ایئر تھیٹر ہو ہے۔ کاشی کے گھاٹوں کی طرح دور تک پھیلی ہوئی گیان جیسی اونچی نیچی نشستیں۔ روشنی میں لقمۂ نور بنی ہوئی تھیں۔ افتتاح وزیر مالیات راجستھان شری کول نے بڑی شگفتہ اردو میں اپنی مختصر مگر جامع تقریر سے کیا۔ اردو کول صاحب کی مادری زبان ہے۔ آپ نے کہا "ہمارا اردو زبان کی سادگی اور لوچ ہمارے دیس کی قومی یک جہتی کی بھرپور علامت ہے۔" کول صاحب نہایت وجیہہ آدمی ہیں۔ اُن کے لہجے میں کشمیری شائستگی اور راجستھانی طرّی دونوں کا امتزاج ہے۔ وہ آج کھلے طور سے اردو کے رکھشک کی حیثیت سے اُس کی وکالت کر رہے تھے۔ اُن کے کئی جملے تالیوں کے شور میں گونجنے لگا۔

ڈوگھا ایڈوکیٹ نے مائک پر صدر جلسہ اعجاز صدیقی سے خطبۂ صدارت پڑھنے کی گذارش کی۔ اعجاز صاحب اپنے گلے سے پھول مالا اتارتے ہوئے مائک کے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ دبستانِ سیماب کا سدا بہار پھول جو اب خود اپنے اندر ایک چمن ہے، اپنی خوشبو اور رنگا رنگی سے سامعین پر جادو سا کئے ہوئے ہے۔ بوڑھے، ادھیڑ، جوان سب ہمہ تن گوش ہیں۔ ایک آواز اور ہزاروں کان اور پھر دیش کے کونے کونے میں اس کا پرچار۔ اعجاز صاحب بڑی روانی اور آواز کے ڈرامائی اُتار چڑھاؤ کے ساتھ تاریخی حوالوں اور علمی اور لسانی تحقیق کی روشنی میں "اردو ادب میں مشترکہ تہذیبی تمدن" کا جائزہ لے رہے ہیں۔ کاغذوں پر پنسلیں چلائے جا رہے ہیں۔ کیمروں کے بٹن دبائے جا رہے ہیں اور اعجاز صاحب اپنے خطبے کا آخری جملہ بہت جذباتی انداز میں پڑھ رہے ہیں۔ "یہ میری ہندی زبان اور اس کا ادب ہندوستان کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ اگر ہم نے اسے کھو دیا تو یہ ایک زبردست قومی نقصان ہوگا۔" تالیوں کے شور میں کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی۔ شاید کوئی مائک پر مہمانوں کا شکریہ اور اگلے دو دنوں کا پروگرام پیش کر رہا ہے۔ کسی نے پیچھے سے کہا فرقت کاکوروی بھی تشریف لے آئے ہیں۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا فرقت تو اُردو شاعری میں بڑی تکلیف دہ چیز ہے۔ میرے پاس بیٹھے عابد حسین ادیب اور مگل سکسینہ (راجستھان ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری) باوجود ضبط کے کھلکھلا پڑے۔۔۔۔

فرقت صاحب میرے پیچھے ہی بنا کسی تکلف کے جوتوں کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ منہ میں پانوں کی پندرہ بیس گلوریاں، چہرہ پر کئی سالوں کی لگاتار جگا رتوں کی تھکن، اور سر پر بچھے چھوٹے بال جن سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ابھی دو تین دن پہلے ہی مہندی لگائی گئی ہے۔۔۔۔

جیسے جیسے رات بڑھتی جا رہی ہے ہوا میں ٹھنڈک گھلتی جا رہی ہے۔ ہر دیس کی رات شراب کی طرح پراسرار اور نشیلی ہوتی ہے۔ مگل سکسینہ ہندی نظم پر بڑی سنجیدگی سے اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں، اور میں بھی ہوں ہوں سے، ہاں، ہوں، کرتا چل رہا ہوں، لیکن نظر ہے کہ کبھی بجلی کے تاروں میں اٹکی ہوئی پرانی پتنگوں کے کاغذ پڑھ جاتی ہے۔ کبھی سڑک پر پڑی کسی اکیلی سگریٹ کی خالی ڈبیہ سے کھیلنے لگتی ہے اور کبھی کسی بند کھڑکی کی جھریوں سے چھنتی ہوئی روشنی سے کوئی کہانی بننے لگتی ہے۔ وہ نئی نظم کے موضوعات پر بول رہے تھے اور میں نئی نظم کے موضوعات کی کھوج کر رہا تھا۔

دوسرا دن کافی مصروف گذرا۔ دو مقالات کی نشستیں اور پھر رات کو آل انڈیا مشاعرہ۔ فرقت کاکوروی بہائے دھوئے، کسی فاتحہ کی طرح معصوم اور اجلے نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے اپنا مضمون پڑھا اور ہمہ محفل کو قہقہوں سے لوٹ پوٹ کر دیا۔ ایک تو موضوع ہی خود ایک دلدار قہقہہ تھا، اس پر اُن کے پڑھنے کا ڈرامائی انداز ۔۔۔ ابوالکلام آزاد اپنی بھتیجی اندرا گاندھی کو عالم بالا سے خط لکھ رہے ہیں۔ انھیں بڑا تعجب ہے کہ آکاش کے لوگ بھی "آکاش وانی" کی بھاشا سمجھنے سے قاصر ہیں۔ دھرتی کے لوگ اسے کیسے سمجھ لیتے ہیں۔ بات میں بات نکالنا اور لفظوں اور جملوں کے گھماؤ پھراؤ سے مزاح پیدا کرنا فرقت صاحب کا دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

شہاب جعفری سیدھے اسٹیشن سے یہیں چلے آئے۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا، کچھ لوگوں کے چہرے دھلے ہوں یا میلے، ہر حالت میں اچھے لگتے ہیں۔ صبح کی پہلی نشست میں مقالات سے زیادہ وقت اعتراضات نے لے لیا تھا۔ شام کی نشست میں، اس سے پہلے کہ کوئی صاحب چاند میں داغ اور سورج میں تپش ڈھونڈنے کھڑے ہوں، فرقت صاحب مائک پر آ دھمکے۔ "دیکھئے صاحب، اس نشست میں تین مقالے پڑھے گئے ہیں۔ ایک میرا مقالہ ہے جس میں تو کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش ممکن ہی نہیں، دوسرا مضمون ندا فاضلی کا ہے۔ انھوں نے پہلی نشست میں سب سے زیادہ بحث کی تھی۔ اس لئے اپنے مقالے میں وہ بہت (CONSCIOUS) چوکنا ہیں۔ یہاں بھی دال گلتی نہیں دِکھتی۔ اور جناب، جہاں آپ نے دو کوری کر دیا تو میرے کہنے سے آپ تیسرے کو بھی معاف کر دیجئے!" آخر میں اعجاز صدیقی نے بہ حیثیت صدر تمام

اپنی مجموعی رائے کا اظہار کیا۔ کچھ بحث طلب پوائنٹس کی وضاحت کی۔

شام کے سرمئی سائے پھیل رہے تھے۔ نیم کی گھنی ڈالوں پر دور دور کے پنچھی لوٹ رہے تھے۔ اور اودے پور کے پرخلوص میزبان ہمیں ہری چنچل پانیوں کی نگری کے قدرتی مناظر دکھانے کیلئے لے جا رہے تھے۔

ڈھلتی دھوپ، چاروں طرف جھیلوں کا پھیلاؤ، اور ہلکی رفتار سے بڑھتی چپو۔ شام کے وقت پانی کی آواز اور لہروں کی خوشبو ہیں عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے کتنے قریب ہو جاتے ہیں۔ نہ دنیا نہ پردیس، نہ غیر شاعر نہ مشاعرہ۔ ہر طرف پیار ہی پیار۔

کس قدر نرم ہو گئیں نظریں　　کوئی دشمن نظر نہیں آتا

رات کو جب ٹوک کا لا منڈل پہنچے تو وہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آٹھ دس ہزار سامعین۔ جدھر نظر جاتی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ دیواروں پر، دروازوں پر، اسٹیج کے پیچھے آدمی، سڑک پر آدمی۔ مشاعرے کی صدارت بھی اعجاز صاحب ہی نے کی اور نظامت کے فرائض مزاحیہ نے انجام دیئے۔ ابھی مشاعرہ کا آغاز ہی تھا کہ نریش کمار شاد "سر کہیں، پاؤں کہیں، ہاتھ کہیں بال کہیں" کے عالم میں اسٹیج پر آ گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پبلک شاد کے قطعات میں چھپی رومانی کسک کو سراہ رہی ہے یا ان کی بہکی بہکی حرکات و سکنات سے لطف لے رہی ہے۔ شاد خوبصورت قطعات سنا رہے ہیں لیکن بیچ بیچ میں بے ربط اور بے معنی جملے بھی بہت کرتے جا رہے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہ نشے کی حالت میں بھی اسٹیج ٹیکٹ نہیں بھولتے۔ میرے سامنے بیٹھے کسی صاحب داں نے مسکراتے ہوئے میری طرف ایک پرچہ بڑھایا۔ اس پر ایک فارمولا لکھا تھا۔ نریش کمار شاد = (اختر شیرانی + عدم)۔ انفرادیت ہا میرے خیال سے سائنٹیفک تنقید کا ارتقائی روپ کچھ اسی طرح کا ہوگا۔ لیکن اودے پور میں البجرے (Albatross) کا یہ شاعرانہ سوال ــــ !! حیرت ہی حیرت :ــــ

ہواؤں کی تھکی اور شعروں کی گرمی بڑھ رہی تھی۔ اودے پور کے یہ ہزاروں سامعین کتنے باذوق ہیں۔ ہمہ تن گوش، شاعر آسمے ہیں، جاسے ہیں۔ باسوقع ہو تنگ اور برمحل داد۔ اناؤنسر کے ہر جملہ پر (بقول شخصے) پھڑکے جا رہے ہیں۔

شفا گوالیاری نے بھی پبلک کے مذاق کے قطعات سے مشاعرہ کو گرمایا۔ وہ شاید نہیں جانتے تھے کہ ان کی سنجیدہ غزل کیلئے بھی ماحول سازگار ہے۔ اور ایسا ہی ہوا کہ شعراء کے سنجیدہ کلام پر سامعین نے بھرپور داد دی۔

شہاب جعفری مائک پر کہہ رہے ہیں ــــ یہ ہے جو سب کا تعارف کرا رہے تھے میں ان کا نام لے رہا ہوں۔ اور جانے کیا کیا کہتے چلے جا رہے ہیں۔ برنارڈ شا نے کسی جگہ کہا ہے۔ کسی کی مذمت پر تعریف کرنا قتل کرنے کے برابر ہے۔ مشاعرہ پورے شباب پر ہے۔ میں تین نظمیں پڑھ کے واپس آ رہا ہوں۔ سامعین کے اصرار کی توجہ لائی جا سکتا ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ میں مائک پر کسی دوسرے شاعر کا نام پکاروں۔ اعجاز صاحب اور شہاب جعفری زبردستی مجھے نظمیں سنانے کیلئے واپس کر دیتے ہیں۔ 'خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے .....

فرقت کاکوروی اپنا نام سنتے ہی کھڑے نہیں ہوتے۔ وہ اپنے ہارے میں کہے گئے ایک ایک لفظ کو مسکراتے ہوئے سنتے رہتے ہیں۔ بے چارہ اناؤنسر بولتے بولتے تھک جاتا ہے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ فرقت صاحب نے بڑے جاندار سماجی موضوع پر نظم شروع کی ہے۔ برتھ کنٹرول ایسے موضوع کو کس فنکارانہ سنجیدگی اور شائستہ مزاح کے ساتھ نبھایا ہے۔ سامعین زبان کی صفائی، سماجی طنز، اور شوخ بیانی کی داد دیتے نہیں تھکتے ہے قابو ہوئے جا رہے ہیں۔ ان سے دوبارہ پڑھنے کی فرمائش ہو رہی ہے۔

شہاب جعفری کو مشاعرے میں میں نے پہلی بار سنا۔ وہ غزل کہتے ہی نہیں غزل کو غزل کی طرح پڑھتے بھی ہیں۔ مومن خاں نے کیا خوب کہا ہے۔

وہ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو ــــ غزل کے بعد شہاب اپنی نظم "سورج کا شہر" شروع کر رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ پبلک اب صرف اچھا ترنم ہی نہیں اچھی شاعری بھی سننے کا مذاق رکھتی ہے۔

روحی دہلوی اودے پور کی مقبول شاعرہ ہیں۔ وہ پہلے بھی کئی بار اودے پور اور گرد و نواح کے مشاعرے پڑھ چکی ہیں۔ سنجیدہ ترنم اور اچھی غزل، بڑی کامیابی سے پڑھ رہی ہیں۔

اب تک نریش کمار شاد، شہاب جعفری، عامر رشید، ساغر اجمیری، ساحل لونکی، سالک عزیزی، ممتاز سنکیب، فضل التین، منگل سکسینہ

ظفر غوری، شفا گوالیاری اور میں اپنا کلام سنا چکا ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں۔ اعجاز صدیقی (صدر مشاعرہ) کے بارے میں کیا لکھوں۔ ان کی صحافتی و ادبی خدمات سے کون واقف نہیں۔ پچھلے چند سالوں سے اعجاز صاحب کی غزلوں میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آرہی ہے۔ ان کی سوچ کے زاویوں اور انداز بیاں میں ایک انفرادی نوکیلا پن پیدا ہوا ہے۔ جو کہی غم سے اجتماعی کرب تک کا پھیلاؤ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اعجاز صاحب کی غزل کا ہر شعر لوگ غور سے سن رہے ہیں اور داد دے رہے ہیں۔

مشاعرہ بہت دیر تک چلتا۔ لیکن اعجاز صدیقی کے بعد دوبارہ زیادہ وقت نزاکت کا رشادی نے لے لیا۔ سامعین بھی دوسرے شعراء کو سننا چاہتے تھے ان کو زحمت دینے کے بجائے منتظمین نے مشاعرہ کو مجبوراً ختم کر دینا اور ہزاروں سامعین کو تشنہ چھوڑ دینا ہی مناسب سمجھا۔

فرقت صاحب کو صبح پانچ بجے چلے جانا تھا۔ مشاعرے کے بعد جاگیں تمام رات جاگا کیں تمام رات۔" والی صورت بن گئی تھی۔ اعجاز صاحب چونکہ بہت تھکے ہوئے تھے، اپنے پلنگ پر کروٹ لیتے ہی فوراً سو گئے۔ میں، شہاب، عابد حسین ادیب ہمتین، اور خلیل تنویر کافی اس انتظار میں تھے کہ فرقت صاحب جو لطیفہ سنا رہے ہیں وہ ختم ہو تو محفل برخاست کی جائے۔ مگر لطیفہ تھا کہ شیطان کی آنت سات میں بات، جملہ میں جملہ، میں دیوار سے ٹیکے ہی غائب ہو گیا۔ کافی دیر بعد جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ سامعین کی اکثریت شکست خوردہ فوج کی طرح گردنیں ڈالے پڑی ہے اور اکیلے فرقت صاحب تیغ گفتار لئے بے چارے شہاب جعفری پر لگاتار حملے کئے جا رہے ہیں۔ ؎

ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا　　پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا

صبح دیر سے آنکھ کھلنی چاہیئے تھی لیکن فوراً ناشتہ کر کے تیار ہو جانا پڑا۔ سمپوزیم کی آخری نشست نو بجے شروع ہونے والی ہے۔ یہ نشستیں ایک ہرے بھرے کاؤنڈ میں رنگین شامیانے کے نیچے ہوئی ہیں۔ ہمتین، شہاب، اور ساغر اجمیری کے مقالوں کے بعد اعجاز صاحب نے تینوں دنوں کے پروگرام کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا اختتامی تقریر کی۔ آج اعجاز صاحب بہت جذباتی نظر آرہے تھے۔ پرانے آگرہ میں بسنت کے میلوں اور ہولی کے تہواروں میں ہندو مسلم یکانگت کی یاد دلاتے ہوئے وہ بھرائے گلے سے باہمی میل جول اور بھائی چارے کی تلقین کر رہے تھے۔ ہندستان مختلف پھولوں کا ایک گلدستہ ہے، اس کے اختلافات میں بھی ایک تہذیبی ہم آہنگی ہونی چاہیئے۔

آج کے چیف گیسٹ راجستھان ساہتیہ اکادمی کے صدر شری ہری بھاؤ اپادھیائے، جو جے پور سے تشریف لائے ہیں۔ چھریرا بدن، سلوٹوں بھری پیشانی، چمکتی ہوئی بھوری آنکھیں، کھلتا رنگ، سر سے پاؤں تک برج علاقہ کی پگڑی میں ملبوس، میٹھے میٹھے بول، صاف صاف باتیں، نہ ہندی سے دوستی، نہ اردو سے دشمنی۔ ہر اچھی چیز کے پجاری۔ راجستھان میں اردو کی ترقی و بہبود میں ساہتیہ اکادمی کے رول کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔ یہ اکادمی صرف ہندی کیلئے ہی نہیں، یہ اردو کیلئے بھی ہمیشہ کام کرتی رہی ہے [illegible] اعجاز صدیقی کی تجویز پر انھوں نے بھی سمپوزیم میں پڑھے گئے تمام مقالوں کو ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

سمپوزیم کی آخری نشست کافی دیر میں ختم ہوئی۔ تھکاوٹ کے چہروں پر گہرے تاثرات تھے۔ راجستھان میں اردو سمپوزیم کا اس طرح کامیاب ہونا۔ اچھے اچھے مقالے پڑھے جانا۔ اردو اور ہندی حلقوں کا اس طرح گہری دلچسپی لینا بہت بڑی بات تھی۔ دوپہر کے آخری کھانے کے بعد برابر والی لائبریری کا جائزہ لیتے ہوئے جائے قیام پر پہنچے۔ چار بج چکے تھے۔ رتلام کی ٹرین چھ بجے روانہ ہوتی ہے۔ خلیل تنویر بضد تھے کہ سہیلیہ کی باڑی (اودے پور کا ایک خوبصورت مقام) کی سیر کر لی جائے۔ موسم بھی کچھ نشیلا سا تھا۔ تھکن کے باوجود بڑا لطف آیا۔ ایک وسیع ترین باغ، گلابی کے بڑے بڑے پھولوں سے لدا ہوا۔ پانچ گنبد اور ہر گنبد کے اطراف بڑے بڑے فوارے اور ادھر ادھر شام کی کرنوں کی طرح چہل قدمی کرتی ہوئی راجستھانی لڑکیاں۔ کوری مراحی کے پانی کی طرح مٹی کی بھینی بھینی سوندھی سوندھی خوشبو میں ایک رومانی رچاؤ پیدا کئے ہوئے تھی۔

ایک مرد اور عورت دروازے پر دو گیروے مٹکے لئے بیٹھی تھی۔ دھلے ہوئے اجلے مٹکے اور ان پر لپٹا ہوا لال کپڑا۔ میرا پیاس آنکھوں سے اتر کر ہونٹوں تک آگئی۔ اس نے شیشے کے گلاس میں پانی بھرا۔ مگر میں پہلے ہی دھرتی پر منہ سے اوک لگائے بیٹھ چکا تھا۔ میٹھا میٹھا سوندھا جل، اور ادھر ادھر اڑتے ہلکے ہلکے چھینٹے۔ ناگارجن کی کویتاؤں کی طرح سادہ۔ کومل اور فطری، حسن۔

چھ بجنے میں ابھی تھوڑا وقت باقی تھا۔ کمرے سے سامان اٹھا کر اسی جیپ میں تیز تیز اسٹیشن کیلئے روانہ ہو گئے۔ ہمارے رومال

(بقیہ صفحہ ۶۶ پر ملاحظہ ہو)

شاعر بمبئی

مکتبہ

متین سروش ——— آل انڈیا ریڈیو۔ پونہ

"شاعر" کا تازہ شمارہ ہر لحاظ سے معیاری اور افادی ہے، نظم و نثر دونوں حصے متوازن معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی نظم "تجدید عہد الفت" بے حد بھائی۔ یہ نظم نہایت خوبصورت، اثر آفریں، درد انگیز اور تصویر زا ہے۔ جیسا کہ اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں، آپ ان چند مخصوص شاعروں میں سے ہیں جو آپ بیتی کے موضوع پر نہایت اعلیٰ درجہ کی نظمیں مسلسل لکھتے رہے ہیں۔ ادھر آپ نے "حب الوطنی" کے موضوع پر اور ہندو پاک آویزش کے سلسلہ میں نظمیں لکھی ہیں اردو ادب کے قومی اثاثہ میں بیش بہا اضافہ ہیں۔

یوسف ناظم کی نظم "متاع" ان کے دل کی معصومیت اور اس مشینی دور میں ان کی پیاسی روح کی تڑپ کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کی نظم "پینگ" ایک خوبصورت اور حکیمانہ درد سے مملو نظم ہے۔ وہ پھولوں اور درختوں اور مظاہر قدرت پر مسلسل اعلیٰ درجہ کی نظمیں لکھتے رہے ہیں اور اس میدان میں انھوں نے اپنی ایک جداگانہ امتیاز کی حیثیت بنالی ہے۔ منور لکھنوی کی غزل "ان کی استادانہ فنکاری کی مظہر ہے۔ مدحی لکھنوی کی غزل شعلہ و شبنم کا حسین امتزاج ہے۔ کفیل آذر، مصور سبزواری اور نصیر صدیقی کی غزلیں بھی کافی اچھی ہیں۔

حکیم عبدالحمید صاحب پر کوثر چاندپوری کا مقالہ "ایک عہد آفریں شخصیت" سیرت نگاری کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ کوثر صاحب کی نثر بھی دلکش ہوتی ہے۔ نثر میں شاعری۔ لیکن اس مقالہ کو انھوں نے ایک مرصع نظم بنادیا ہے۔

ناظر عاشق ہرگانوی کا مقالہ "نثر سماج" بھی دلچسپ اور پرکشش ہے اور اردو نثر کے کئی حسین، جلوہ فروش گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے۔

"اردو افسانے کا ارتقاء" کے عنوان سے ڈاکٹر اعجاز حسین سے اشرفادی کی بات چیت کو میں نے بہت دلچسپی سے پڑھا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے جس انداز میں جواب دیئے ہیں وہ ان کے روایتی طرز فکر کا آئینہ دار ہیں۔ اور کئی جگہ انھوں نے تنقید نگاروں اور نقادوں کی ذہنی طریق سے گریز ہی میں راہ نجات دیکھی ہے۔ نقاد کا یہ فرض ہے کہ وہ لکھنے سے پیشتر اپنے مطالعہ اور نظر دونوں کو وسعت دے۔ اور قلم اٹھانے سے پہلے یہ کوشش کرے کہ وہ اپنے موضوع سے متعلق تازہ ترتخلیقات سے آگہی حاصل کرے۔ لیکن ڈاکٹر محمد حسین کے علاوہ کم لوگ اس فرض کو پورا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سب سے گمراہ کن بات تو ——— ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے اردو افسانہ و نثر اور اردو نظم کے لئے نقاد کے تقابل کے سلسلہ میں کہی ہے۔

"ہمارے ادب میں فن افسانہ نگاری نے جتنی تیزی اور سرعت کے ساتھ ترقی کی ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ شعر و شاعری میں تو زیادہ تر فنکار قافیہ پیمائی کے چکر میں پڑے رہے۔ ..... جس کی وجہ سے مواد کی اہمیت گھٹ کر رہ گئی۔ اور ہمارے فن کار محدود خیالات کی تکرار کرتے رہے۔ مگر جہاں تک نثر اور اردو افسانہ کا تعلق ہے، اس صنف نے کم وقت میں بے پناہ ترقی کی۔"

اس اقتباس میں سب سے پہلے یہ بات قابل غور ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے نثر اور افسانہ کو اس طرح ساتھ لیا ہے کہ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے اردو افسانہ نے زیادہ نثر نے مجموعی حیثیت میں بے پناہ ترقی کی ہے۔ یہ ایک بنیادی غلطی ہے۔ اردو افسانہ اور ناول نے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کی ہو۔ ہمارا نیا نثر ..... دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کے باوجود اس اردو نثر نے جسے علمی کہا جائے ہرگز بے پناہ ترقی نہیں کی ہے۔ اور اب تو اس کی ملی نثر پر جمود کی طاری ہے۔ اب رہی یہ بات کی اردو نثر اور افسانہ دونوں نے ایک خاص دور میں اردو نظم سے زیادہ اور بے پناہ ترقی کی ہے حیران کن ہے۔ ہمیں پریم چند کے افسانہ کو انھوں نے معیار بنایا ہے ——— کم و بیش یہی زمانہ اقبال، چکبست، سرور جہان آبادی، تاجور، چند مرحوم، سیماب اکبرآبادی، اقبال سہیل، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، اختر شیرانی، اور حفیظ جالندھری کا ہے۔ ان شعرا نے اردو شاعری کو ان دفعتوں، وسعتوں اور گہرائیوں سے آشنا کیا جن کا جواب ہندستانی زبانوں میں نہ کیا، بدیسی زبانوں میں بھی نہیں۔ پریم چند کی افسانہ نگاری اور اس دور کی پوری افسانوی نثر کے مقابلے میں ان شعرا کی تخلیقات زیادہ دلکش، رنگین، بصیرت افروز، قیمتی اور

دیتے ہیں۔ ان کے بعد بھی اردو نظم کی ترقی کا سلسلہ جاری رہا، فراق، منیف، مجاز، احسان دانش، رویش صدیقی، مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، ن۔م۔ راشد، ساغر نظامی، سلام مچھلی شہری، سردار جعفری، اختر الایمان، احمد ندیم قاسمی، اجمل صدیقی، جاں نثار اختر، قاضی سلیم شاذ تمکنت، وحید اختر، اور راقم الحروف کے علاوہ درجنوں ایسے بہت سے دوسرے شعراء کی تخلیقات اردو شاعری کا دامن نئے موضوعات اور نئی بہاروں سے آراستہ کر رہی ہیں۔ نہ اردو نثر اور افسانہ کی ترقی رکی ہے اور نہ وہ اردو نظم سے آگے بڑھا ہے۔

اکرام جاوید اپنے افسانوں میں بڑا پیچیدہ کردار پیش کر رہے ہیں جو زندگی پر اور عوامل پر دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ ان کا افسانہ "قیدی نقطہ" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ان کی یہ تخلیق ان کی پرانی تخلیقات سے زیادہ لطیف اور بلند تر ہے۔ لیکن اس کا اختصار۔۔۔ یہ افسانہ ضرورت سے کچھ زیادہ مختصر ہو گیا۔ شمسی کاظمی طہرانی ——— مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ بدمستی سزد گر مُنتہم سازد مرا ساقی ہنوز از بادۂ دوشینہ ام پیمانہ لبریز دارد

آپ کا موقر رسالہ "شاعر" نومبر ۱۹۷۵ء آج الفاق سے مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں نظر نواز ہوا۔ چونکہ فقیر کو اپنی ذاتی مصروفیات کی بنا پر اتنا وقت نہیں ملتا کہ شائع ہونے والے رسالے اور اخبارات کا مسلسل مطالعہ کر سکے۔ اس لئے اس رسالے میں جناب میکش اکبر آبادی کا مکتوب پڑھ کر جواب دینے میں تاخیر ہو گئی۔ میکش صاحب نے اس مکتوب میں آج کل کے خانہ برانداز سارق شاعروں کے ساتھ فقیر کا بھی ذکر کیا ہے، اور نہایت محتاط لہجہ میں تحریر فرمایا ہے کہ میں نے ان کی غزل مطبوعہ "آجکل" نظم نمبر اپریل ۱۹۵۰ء کے تین مصرعے قبول کر لئے ہیں۔ مذاق اڑانے اس قبول فرمانے سے میکش صاحب نے کیا مراد لیا ہے۔ سرقہ یا توارد۔۔۔

فقیر نے آج تک میکش صاحب کا کوئی شعر نہ پڑھا ہے نہ سنا ہے۔ اس لئے کسی قسم کے سرقے کی تو گنجائش ہی نہیں۔

اگر انھوں نے درحقیقت دیانتداری اور خلوص کے ساتھ شعر گوئی میں اپنا وقت صرف کیا ہے تو بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ اتنی طویل نظم لکھنے والا شاعر جس نے ہر بند میں الگ الگ ردیف و قوافی اختیار کئے ہوں، کس طرح ان کے تین مصرعے قبول کر سکتا ہے، کیونکہ اس پوری نظم کے رنگ و آہنگ سے ان کی غزل کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔۔۔ البتہ نظم کے بیچ کے بند میں فقیر نے "تو نے کیا" ردیف اختیار کی ہے اور قوافی رکھے ہیں بہار، کنار، رنگذار وغیرہ۔ ان کی غزل کی ردیف بھی الفاق سے "میں نے کیا" ہے اور قوافی بھی الفاق سے وہی ہے بہار۔ کنار۔ رنگذار وغیرہ۔ تو ایسی صورت میں آخری دو تین مصرعوں میں الفاظ اور مضمون کا ٹکرا جانا ناگزیر ہے۔

بہار کا تقابل کرتے وقت بالعموم قوتِ متخیلہ خزاں کو ہی پیش کرتی ہے۔ لہٰذا ان کے اور میرے مصرعے میں خزاں کا لفظ مشترک ہونا تعجب کی بات نہیں اور "بہار تو نے کیا" تو ظاہر ہے کہ آئیگا ہی۔ ان کا مصرعہ ہے "خزاں کو موجِ نسیمِ بہار میں نے کیا۔" اور فقیر کا مصرعہ ہے "خزاں کو رد کشتِ فصلِ بہار تو نے کیا۔" مصرعِ اولیٰ فقیر کا اور ان کا بالکل الگ ہے۔

دوبارہ پھر فقیر نے بہار کا قافیہ بے اختیارانہ انداز میں لکھا تو مصرع ہو گیا "بہار آئی جو ذکرِ بہار تو نے کیا" اور ان کا مصرع ہے "بہار آئی جو ذکرِ بہار میں نے کیا۔" اس کا بھی مصرعِ اولیٰ فقیر کا اور ان کا علیحدہ علیحدہ ہے۔

اسی طرح تیسرا مصرع ہے "جنوں کو شمعِ سرِ رہگذار تو نے کیا۔" اس میں بھی "جنوں کو شمعِ رہگذار کرنا" ان کے مصرع اور فقیر کے مصرع میں مشترک ہے۔ فقیر کے یہاں غزلوں میں مجنوں کو شمعِ رہگذار کرنا" اکثر پایا جاتا ہے۔ کیونکہ فقیر کا مخصوص اور محبوب انداز بیان ہے۔ مثلاً اسی قسم کا ایک شعر فقیر نے اس وقت بھی کہا تھا جب فقیر مہاراشٹر کالج پونہ میں ایف۔ ایس۔ سی کا طالب علم تھا۔ فقیر کی پوری غزل مہاراشٹر کالج میگزین میں دیکھئے جو ۱۹۵۲ء میں چھپا تھا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

خرد کی تیرہ مزاجی سے چھپ گئی منزل جنوں کو شمعِ سرِ رہگذار کرنے دو

بات جناب میکش صاحب کی شان کے شایان نہ تھی کہ وہ اس اتفاقی اور قدرتی اشتراک کو "قبول فرمانا" قرار دے کر سارقین سے لئے مکتوب میں فقیر کا ذکر کریں۔ غالباً انھوں نے علامہ سعد الدین تفتازانی علیہ الرحمۃ کا یہ قول المول شرح مطول میں نہیں پڑھا۔

حکم سرقہ دقیق کردہ میشود کہ اخذ ثانی از اول یقینی باشد والا احکام سرقہ مترتب نمی تواند شد واز قبیل توارد خواہد بود۔ و در صورتی کہ اخذ ثانی از اول معلوم نباشد۔ باید گفت کہ فلاں شاعر چنیں گفتہ است و دیگری سبقت بردہ چنیں یافتہ ۔۔۔ و باین حسن تعبیر مغتنم و امید فضیلت صدق راہ محفوظ دارد و خود را از دعوی علم بغیب و نسبت نقص بغیر انتہی ۔ ملاحظہ ہو الطول شرح مطول جلد ۲ صفحہ ۱۰۴ (مطبوعہ)

علامہ علیہ الرحمۃ کے اس فیصلے کے آخری الفاظ بار بار پڑھئے اور دیکھئے کیسا سچا مشورہ دیا ہے اور انسانیت و اسلام کے نقطہ نگاہ سے کتنی اچھی راہ تجویز فرمائی ہے۔ فقیر کے نزدیک اس قسم کے غیر شعوری مشترکات و متشابہات سے کوئی بدید قدیم شاعر نہیں بچ سکتا بھی وجہ ہے کہ حضرت مولانا غلام علی آزاد بلگرامی المتوفی ۱۲۰۰ھ صاحب تذکرہ مآثر الکرام نے فرمایا ہے۔ "مقتضای حسن ظن آنکہ اشتراک مضامین را محمل برتوارد کنند و تاکہ محمل حسنی داشتہ باشند چرا در پے محمل دیگر روند ..... و اگر کسی بنظر تفتیش ملاحظہ کند کم شاعری ایما از تولد و مضامین خالی یا بدیعاطۂ جمیع معلومات خاصۂ حضرت علم الٰہی است تعالیٰ شانہ خامۂ معنی نگار تیری بتاریکی می افگند بچہ دانستہ صید دارستہ است یا بال و پر بستہ ۔ (مآثر الکرام دفتر ثانی صفحہ ۶۹)

امید ہے کہ ہر منصف مزاج شخص فقیر کو اس امر میں معذور اور دور شاہجہانی کے ملک الشعراء خلاق المعانی ابو طالب کلیم ہمدانی علیہ الرحمۃ کی طرح اس اعلان میں حق بجانب سمجھے گا۔

منم کلیم طور بلندی ہمت ۔۔۔ کہ استفادۂ معنی ز جبرئیل کنم
بجوان غیب الٰہی چو دسترس دارم ۔۔۔ نظر بکاسۂ دریوزۂ گدا نکنم
ولی علاج توارد نمی توانم کرد ۔۔۔ مگر زبان بہ سخن گفتن آشنا نکنم

اس قسم کے توارد کی مثال میں شعراء فارسی کے مندرجۂ ذیل اشعار پیش کرتا ہوں۔ ان اشعار میں قارئین کرام دیکھیں گے کہ مضمون، الفاظ، ردیف و قوافی اور معنی کے لحاظ سے کس قدر اشتراک و مماثلت ہے۔ ان میں ہر شاعر اپنی جگہ استاد فن ہے اور کسی کیلئے گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے دوسرے شاعر کا شعر یا مصرع متقل کیا ہو۔

۱ بسلیم۔ مشاطہ را بجمال تو دیوانہ میکند ۔۔۔ کآئینہ را بخیال پریخانہ میکند
صائب۔ دل را نگاہ گرم تو دیوانہ میکند ۔۔۔ آئینہ را رخ تو پریخانہ میکند
غنی کشمیری۔ ہر کس کہ دید روی تو دیوانہ میشود ۔۔۔ آئینہ از رخ تو پریخانہ میشود

۲ سلیم:۔ ز آشفتگی طرۂ مقصود خبر داد ۔۔۔ ہر فال کہ از شانۂ شمشاد گرفتیم
صائب:۔ خواہد فتاد دامن زلفش بدست من ۔۔۔ این فال را ز شانۂ شمشاد دیدہ ایم

۳ سنائی ۔ قضا کہ بر لب او خط عنبریں دارد ۔۔۔ برای کشتن من زہر در نگیں دارد
صائب:۔ امید جان شیریں داشتم از لعل سیرابش ۔۔۔ ندانستم کہ از خط زہر در زیر نگیں دارد

۴ فیاض:۔ بباغ بسکہ ز شرم رخت گل آب شود ۔۔۔ غلاف غنچہ گل شیشۂ گلاب شود
وحید:۔ نگاشتے کہ رخ دوست بے نقاب شود ۔۔۔ ز شرم غنچہ گل شیشۂ گلاب شود

۵ مشرقی:۔ برگ حنا یکیم و بامید رنگ و بو ۔۔۔ در دست دیگری است بہار و خزان ما
خالص ۔ مارا خبر ز شادی و غم نیست چون حنا ۔۔۔ در دست دیگری است خزان و بہار ما

عہد حاضر کے مشہور نقاد پروفیسر قادری کا قول ہے۔ "بعض خیالات، بعض مضامین، بعض اسالیب بیان، بعض ترکیبیں ایسی عام اور فطری ہوتی ہیں کہ اکثر آدمیوں کے ذہن میں بغیر کسی خاص غور و فکر کے آجاتی ہیں۔ ان کے استعمال پر سرقہ (یا القول میکش صاحب "منحول فرمانا") کا الزام دینا ظلم ہے۔

ناصر انصاری ——— ۹۷/۱۷ پریڈ۔ کانپور

"شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ یاد فرمائی کے لئے ممنون ہوں۔ اس مرتبہ آپ کا اداریہ آل انڈیا ریڈیو کے انتساب عمل و عقد کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ریڈیو کا ۸ بجے کا ہندی خبرنامہ سننے کے بعد جب میں نے "شاعر" پڑھنے کیلئے اٹھایا تو سب سے پہلے اداریہ ہی پر نظر ٹھہری۔ اس خبرنامے میں جس کا میں نے ذکر کیا ہے سنسکرت کے الفاظ کی ایسی زبردست بھرمار تھی اور جملوں کی ساخت ایسی عجیب غریب کہ مشکل ہی سے چند فقروں کا مفہوم میں نے سمجھا ہوگا۔ اس سلسلے میں حامیانِ ہندی کی طرف سے ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ جب اردو کے لئے علاحدہ خبرنامے نشر کئے جاتے ہیں تو ہندی خبروں کی زبان کتنی ہی مغلق کیوں نہ ہو اردو والوں کو اس پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔ بلاشبہ اردو والوں کو کوئی حق نہیں ہے مگر ہندستان کی کروڑوں جنتا کو تو یہ حق حاصل ہے کہ وہ پوچھیں کہ ایسی زبان کیوں استعمال کی جاتی ہے جس کے سمجھنے کیلئے سنسکرت کا وِدوان ہونا ضروری ہے۔ آخر ہندستان کے دیہاتوں اور شہروں میں بسنے والے خبروں کے متلاشی کس طرح اپنے ذوق کی پیاس بجھائیں؟ کیا وہ انگریزی کا بلیٹن سنیں؟ آخر کلکتہ، بمبئی، دہلی، ناگپور، الہ آباد، پٹنہ، لکھنؤ اور بنارس جیسے شہروں میں عام طور سے بازاروں اور سڑکوں پر جو زبان بولی جاتی ہے (اور جسے دیہات سے آنیوالے بھی بخوبی سمجھتے ہیں) ریڈیو والے اس کو کیوں نہیں اپناتے؟ ٹھیٹ ہندی (یا شدھ ہندی) اور فارسی آمیز اردو کا زیادہ سے زیادہ استعمال مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کی اس پالیسی کے قطعی برخلاف ہے جس کے ذریعہ وہ ان دونوں زبانوں کو قریب سے قریب تر لانا چاہتے تھے۔ ریڈیو والے تو اردو ہندی کی خلیج کو اور وسیع کرتے جا رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مستقبل کا مورخ ہماری ان نامعقولیوں اور کوتاہیوں کو کس طرح معاف کر سکے گا۔

میں یہاں ایک بات کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جنگ کے زمانے میں دودھ بھارتی کے کانپور اسٹیشن سے ہندی اور اردو خبروں کے بلیٹن یکساں طور پر نشر ہوتے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ہندی خبروں کا بلیٹن تو بدستور نشر ہو رہا ہے مگر حسب معمول اردو خبروں کا بلیٹن ختم کر دیا گیا ہے اور ٹھیک اسی وقت یعنی رات کے ۹ بجے "ہوا محل" کا پروگرام فٹ کر دیا گیا تاکہ "ہوا محل" سننے والے اردو خبروں سے محروم رہیں یا اگر اردو میں خبریں سننا چاہیں تو "ہوا محل" کے شوق سے باز آئیں۔ ریڈیو والے "ہوا محل" کا پروگرام ۹ بجے سے ۹½ بجے تک رکھ کر ۹½ سے ۹¾ بجے تک اردو خبریں بہ آسانی نشر کر سکتے تھے، جیسا کہ یہ لوگ ستمبر ۴۵ء سے دسمبر تک کرتے رہے ہیں۔ ان سب دقائق پر نظر رکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کی لسانی پالیسی بجا، عام اور روا ہو رہی ہے جس کی طرف جوزا توجہ دی جانی چاہیئے۔ امید ہے کہ نشریات کے موجودہ وزیر شری راج بہادر ان موضوعات پر غور کریں گے اور آل انڈیا ریڈیو کو ایک مثبت پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کریں گے۔

قیصر قلندر ——— آل انڈیا ریڈیو۔ اندور (ایم۔ پی)

"شاعر" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ بعض تخلیقات پسند آئیں۔ نظم "تجدید عہد الفت" ایک Image کی عکاسی کرتی ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کی نظم "ویپنگ ولو" (Weeping Willow) کے تاثراتی جملے میں انکشافات بڑے دلچسپ ہیں، اور تحقیق سے کم درجہ نہیں رکھتے۔ اگر انہوں نے واقعی یہ درخت دیکھا ہو تو ہمارے لئے اُن کا مشاہدہ "اطلاع" سے کم درجہ نہیں رکھتا۔ (Weeping Willow) کشمیر میں فراط سے ہوتا ہے۔ اس کی پتیاں آنسوؤں کی دھار سے مشابہ نہیں ہوتیں۔ البتہ ٹہنیوں کے سروں پر بہے دانے جیسے ہوتے ہیں۔ جو گچھے کی صورت میں لٹکے ہوتے ہیں۔ ان کو بہلی نظر میں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ جیسے انگور کے چھوٹے چھوٹے دانے ہوں، اور وہ بھی ابتدائی سٹیج میں۔ پتیوں کی صورت بید کے دوسرے درختوں سے اس اعتبار سے مختلف ہوتی ہے کہ بید مجنوں (Weeping Willow) کی پتیاں ڈیڑھ انچ دو انچ لمبی لنک دار ہوتی ہیں۔ اور دوسرے بید کے درختوں میں ایک انچ سے تقریباً ڈیڑھ انچ ہوتی ہیں بیچ کا حصہ زرا چوڑا ہوتا ہے۔ کشمیر میں (Weeping Willow) ہی کو بید مجنوں کہتے ہیں۔ بید مجنوں کی پتلی اور لمبی ٹہنیاں جھکی جھکی سی رہتی ہیں اور عموماً پانی ہی کو چھوتی ہیں۔ ہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ بید مجنوں ندی نالوں کے کناروں پر اگاتے ہیں۔ چونکہ بید کے درخت اکثر و بیشتر کرکٹ کے بلّے بنانے کے کام آتے ہیں اور کشمیر میں افراط سے ملتے ہیں اسی لئے بید کے بلّے بنانے کے چھوٹے بڑے کارخانے بھی وہاں ہیں۔ "تحریک و ترغیب" نے ڈاکٹر صاحب سے جو نظم لکھوائی ہے موضوع اور مفہوم کے اعتبار سے بہت اچھی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کا مشاہدہ فی الواقع کسی اور درخت کا ہو۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انگریزی

لفظوں (Wordings) سے نظم کہنے کی ترغیب دی ہو۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو نظم اچھی ہے۔

اختر قادری ——— جوناگڑھ ——— اورنگ آباد

تازہ "شاعر" ملا۔ میری اور ڈاکٹر سید احمد خلیق کی بات چیت کے سلسلے میں آپ نے جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس ضمن میں، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ علی الاعلان طور پر میرے اپنے جذبات و احساسات کو واضح کر دوں۔ کیونکہ ان باتوں کا ادب کی چند بنیادی اور ضروری حقیقتوں سے گہرا تعلق ہے۔ آپ نے اپنی محفل میں ارشاد فرمایا ہے کہ "اس میں (بات چیت میں) کرشن چندر کے متعلق بھی ایک روایتی انداز کا سوال جواب ہے" یہ بڑا عجیب مطالبہ ہے کہ کسی فنکار کا دماغ یکساں چیزیں ڈھالے۔ کرشن چندر پر اس قسم کی باتیں اب فیشن بنتی جا رہی ہیں۔ اس کے پس پشت بہت سے اسباب ہیں۔ یہ موقع ان کے اظہار کا نہیں ہے۔ کرشن چندر کا فن بہرحال روز تازہ، معصری اور متنوع ہے۔ "یقیناً ادب کی کوئی مثال نہیں ہوتی" اس لئے کسی بھی فنکار سے یکساں چیزیں، ایک جسامت اور وزن کی، ڈھالنے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ادب میں انحطاط کا پہلو اور کسی بھی فنکار کی زوال آمادہ تحریریں نہ صرف فنکار کیلئے بلکہ ادب کیلئے بھی کمزوری کی بات ہے۔ کسی فنکار کی کسی کمزوری پر گرفت کرنے کا کم از کم میرے نزدیک ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی مجموعی عظمت اور حیثیت سے انکار کر دیا جائے۔ غزل کی آج کی شاعری سب ہی کو زیادہ اپیل نہیں کر رہی ہے۔ اگر کوئی اس پر معترض ہوتا ہے تو اس میں کوئی روایت یا فیشن کی بات ہوتی ہے یا خالص دیانتدارانہ تنقید کی۔ ہمارے پاس یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ کئی چیزوں کو جو اپنی اپنی الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں ایک ساتھ گڈمڈ کر دیا جاتا ہے۔ میں تو اس بات سے بخوبی واقف ہوں کہ کرشن چندر اگر کمزور تحریریں لکھ رہے ہیں تو اس کی بھی چند ناگزیر وجوہات ہیں۔ ہمارا اردو کا سماج و معاشرہ اسقدر گیا گزرا اور ناقص ہے کہ وہ اپنے ادیب و فنکار کی پرورش کے آسان یا سہولتوں کے ذریعہ مہیا نہیں کرتا۔ مجبوراً ایسے فنکار کو جس کی زندگی کا محور روٹی کے اطراف ہی گھومتا ہو عسرت کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے۔ زیادہ لکھنے کی وجہ سے بعض فنکار اپنے سابقہ اسلوب اور طرز کو برقرار نہیں رکھ پاتے ہیں۔ اگر اس طرح کی کمزوری یعنی ناقص قسم کی تحریروں پر گرفت کی جاتی ہے تو اس میں روایت کی کیا بات ہے، اور فیشن کہاں ہے؟ ایک ادیب ہے کہ خود اعتراف کر رہا ہے کہ میں نہیں لکھ رہا ہوں اور ہم ہیں کہ مسلسل لکھ رہے ہیں کہ نہیں جناب آپ کی ہر شئے، ہر تخلیق شاہکار ہے، تازہ ہے، عصری و متنوع ہے۔ کیا ایک عظیم اور بلند مرتبت ادیب کو اس طرح کے مرتبے پر فائز رکھنا عین حق ادب ہے؟ کیا کھری کھری، سچی سچی بات نہیں ہو سکتی۔ ارتقاء کا ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ بچہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے تو اس کا لباس بھی بڑھتا جاتا ہے۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ ایک اچھے خاصے توانا اور عظیم فرد سے کہا جائے کہ نہیں تم بچوں کے لباس میں ہی اچھے لگتے ہو جو اپنے انفرادی لباس میں معلوم ہوتے ہو۔ راجندر سنگھ بیدی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، احمد ندیم قاسمی، اور بھی کئی لوگ ہیں ان کی تحریروں میں اس قدر کمزوری اور نقص کیوں نہیں پیدا ہوا؟ ظاہر ہے کہ ادیب جب ایک مقام بنا لیتا ہے تو اس کو برقرار رکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اگر پچھلی کہانی اچھی نہیں تو کم از کم اسی معیار کی کہانی اسے لکھنی ہی چاہیئے جس میں اس کے انفرادی نقوش ابھر کے آتے ہیں۔ جن کی بدولت وہ الگ پہچانا جاتا ہے۔ اس کا ہرگز مطلب نہیں کہ ہر شئے کو شاہکار ہونا چاہیئے، یکساں ہونا چاہیئے۔ ایک آدمی پچھے جا رہا ہے اور ہم ہیں کہ اس کی پیٹ تھپک رہے ہیں: بہت خوب، واہ واہ کیا رفتار ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے کتنی بنیادی بات کہی ہے کہ جو محض لکھنے کیلئے لکھ رہے ہیں، ان کیلئے یہ روش انحطاط کا باعث ہے۔ فضیل جعفری صاحب کا خط آپ سے دریافت کرتا ہے کہ کیا تنقیدی خطوط پر ایڈیٹر کا رائے دینا ہوگا کہ بہرحال انتخاب تو وہی پیش کرتے ہیں۔ بات چیت میں قائمی کا تاثر یہ لکھا جانا چاہیئے ان سطور کو امید کہ آپ شائع فرمائیں گے۔

سید لقمہ احمد ارشاد ——— ڈپٹی مجسٹریٹ۔ مظفر پور (بہار)

"شاعر" کا مارچ کا شمارہ ملا۔ اس سے پہلے انگریزی اخبار سے یہ معلوم ہوا تھا کہ جناب تلوک چند محروم (آنجہانی) کی علالت کے زمانہ میں آپ ہی تشریف لے گئے تھے۔ اس شمارہ سے آپ کی والدہ صاحبہ کے انتقال کی خبر ملی۔ خدا مرحومہ کے درجات عالی کرے۔ اس سلسلے میں آپ نے جو نظم فرمائی ہے، بڑی جانگداز ہے اور اردو ادب کی بڑی شاہکار چیز ہے۔

"زمین بانٹ لی ہم نے، مگر یہ دل نہ بٹے"

بدیع الزماں خاور ——— ۴۰۔ نئے فیملی ہال۔ والپولی، ضلع رتناگری

(بقیہ صفحہ ۶۶ پر دیکھئے)

ادارہ

محفل اپنی....!

"شاعر" کا زیرِ نظر شمارہ

ہمیں خوشی ہے کہ شاعر کی پُرکاری اور اس کے گلشنِ دیدہ زیب کی کامیابی کا سراہا جا رہا ہے۔ "شاعر" کی ترتیب و تدوین پر بہت توجہ کی جاتی ہے اور اس میں اچھے سے اچھا اور زیادہ سے زیادہ مواد پیش کیا جاتا ہے۔ اپنے تازہ شمارہ میں اگر ایک طرف سمرسٹ ماہم کے فن، اس کی شخصیت اور عظمت پر ایک تازہ اور اچھا مضمون ہے، تو دوسری طرف "موکت خانوی کی مزاح نگاری کے عناصر و عوامل" پر ایک مدلل مقالہ ہے۔ "اردو ادب میں مشترکہ تہذیب و تمدن سے اردو زبان و ادب کے اس قیمتی سرمایہ کی یاد تازہ ہوگی جو ہمارے ملک کیلئے سرمایۂ افتخار ہے اور جسے فراموش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی شمارہ میں دو درجہ کے قابلِ ذکر مرحوم شاعر قمر بدیوی کی شخصیت پر مضمون ہے۔ "بمبئی سے بودے پور تک" ایک دلچسپ اور خوبصورت رپورتاژ ہے۔ ہی اس شمارہ کی رنگارنگی ہے کہ اس میں رپورتاژ بھی ہے اور ڈرامہ بھی۔ سلام مچھلی شہری کا ڈرامہ "چاند کی واپسی" ہلکا پھلکا جذباتی اور تاثراتی ہے۔ افسانوں میں "دھندلی تصویر" "دودھ کی چائے" اور "پیاسا سمندر" تینوں اپنے اپنے مزاج، تاثر اور مقصد کے اعتبار سے کافی اچھے افسانے ہیں۔

ہر چند نظمیں اور غزلیں کم ہیں لیکن منتخب ہیں۔ یوں تو نظمیں اور غزلیں بہت آتی ہیں، مگر انھیں پڑھکر بہت افسوس ہوتا ہے۔ ان میں شاعر کی سوچ میں دس پانچ بھی نہیں ہوتیں۔

نظم "چھ کرور نقطے" کے متعلق اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ محض شاعر کی فکر نہیں بلکہ خود ان چھ کرور نقطوں کے دل کی وہ آواز ہے جو مدت سے گھٹ رہی تھی اور جسے پیرایۂ اظہار نہیں مل رہا تھا۔ کوئی ملک، کوئی قوم اور کوئی فرقہ اس سے کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو صرف اس کرب اور حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرے جو اس نظم میں ہے۔

ذرا سی بات کو اوں سوں طرح افسانہ بنا دیا کرتے ہیں، اس کا اندازہ مکتوب نگار سے ہوگا۔ بارہا عرض کیا گیا ہے کہ مکتوب نگار اختصار سے کام لیا کریں۔ چونکہ طویل مکتوبات نے کافی جگہ لے لی ہے اسلئے اس بار بھی پندرہ میں خط شائع ہونے سے رہ گئے ہیں، اور ان مکتوب نگاروں سے ہم معذرت خواہ ہیں۔

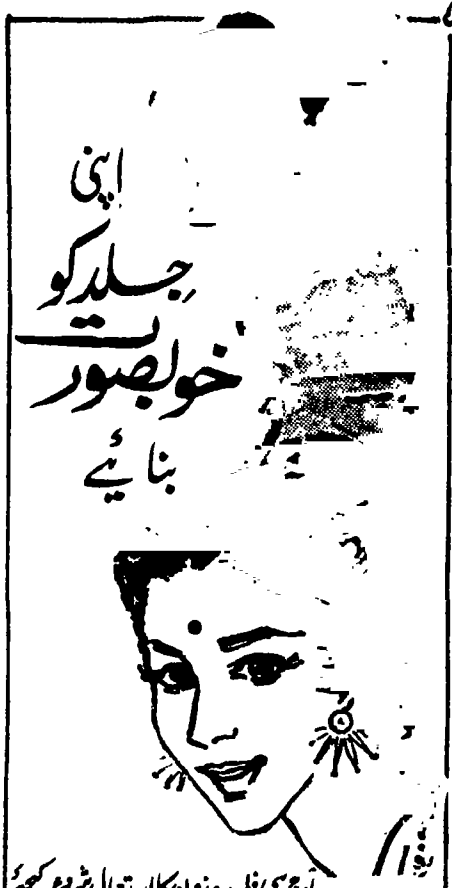

آج ہی فلورو زون کا استعمال شروع کیجئے چند ہفتوں میں آپ کی جلد خوبصورت سے خوبصورت تر ہو جائے گی۔ فلورو زون جلد کو خوبصورت بناتا ہے۔ کیل، مہاسے اور بھورے بال دور کر کے لازوال حسن عطا کرتا ہے۔ فلورو زون جسم میں جذب ہو کر اپنے کیمیائی اثرات سے چھپے ہوئے حسن کو ابھارتا ہے۔ خوبصورتی، دلکشی اور جاذبیت پیدا کرتا ہے۔

فلورو زون لوشن چار روپے پچھتر نئے پیسے
فی بوتل
فلورو زون کنٹر ریڈ اکریم پانچ روپے ۸۵ نئے پیسے
ہر جگہ دستیاب ہوتا ہے
یا براہ راست اس پتہ سے منگائیے

بائیونک لیبوریٹریز لمیٹڈ پوسٹ باکس نمبر ۱۱۹۲ بمبئی ۱

شاعر بمبئی

نقد و نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کربل کتھا

از ——— فضل علی فضلی

مرتبہ ——— مالک رام۔ مختار الدین احمد

"کربل کتھا" اردو کی نایاب نثری کتاب تھی۔ جس کا کوئی نسخہ ہندوستان کے کسی کتب خانہ میں نہ تھا مولوی کریم الدین نے اس کا ذکر اپنے تذکرے طبقات الشعرائے ہند میں کیا تھا اور مصنف کے حوالے سے دوسرے مصنفین اپنی کتابوں میں اس کا تذکرہ کرتے رہے مولوی کریم الدین کے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ تھا جو انھوں نے اپنے دوست ڈاکٹر اسپرنگر، پرنسپل دلی کالج کو دیدیا تھا اور جسے وہ اپنے ساتھ جرمنی لے گئے تھے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اپنے یورپ کے سفر میں بڑی تلاش و جستجو کے بعد یہ مخطوطہ لوٹن گن یونیورسٹی (جرمنی) کے کتب خانے میں دریافت کیا اور یہ وہی نسخہ نکلا جو مولوی کریم الدین نے ڈاکٹر اسپرنگر کو دیا تھا۔ وہاں سے "کربل کتھا" کا عکس لے کر مشہور محقق و ادیب مالک رام اور خود مختار الدین احمد نے نہایت دیدہ ریزی سے اسے مرتب کیا ہے۔

یہ محض "کربل کتھا" کا عکس نہیں ہے بلکہ اس نایاب قلمی کتاب پر ایک مکمل تحقیق ہے۔ "کربل کتھا" ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب "روضۃ الشہدا" سے ماخوذ ہو کر لکھی گئی تھی۔ "روضۃ الشہدا" ایران، ہندوستان، ترکی وغیرہ میں بیحد مقبول تھی اور محرم الحرام کی مجالس اہل ایران میں عام طور پر پڑھی جاتی تھی۔ ترکی زبان میں اس کے ترجمے ہوئے۔ قدیم دکنی زبان کے شاعروں نے بھی اس کے دکنی میں ترجمے کئے۔ اس میں دس مجلسیں ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں فارسی کا چلن کم ہو رہا تھا اور اردو زبان شروع ہو چکی تھی، اس لئے عام لوگوں کے استفادے اور محرم کی مجالس میں پڑھے جانے کے لئے فضلی نے اردو میں اسے لکھا۔ شمالی ہند میں نثر کی یہ پہلی باقاعدہ کتاب کہی جاتی ہے دونوں کی تطبیق سے مرتبین نے یہ ثابت کیا ہے کہ "کربل کتھا" "روضۃ الشہدا" کا مکمل عکس نہیں ہے۔ اس میں دس مجلسیں ہیں اور "کربل کتھا" میں بارہ۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ فضلی نے تحریف و اضافہ سے کام لیا ہے۔ نثر کے علاوہ "روضۃ الشہدا" کے اشعار کا ترجمہ بھی اردو میں کیا ہے۔ اور فضلی نے ان اشعار کو پُر تاثیر بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہر چند ان میں بہت سے سقم اور کمزوریاں اور غلطیاں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ناقل سے ان میں غلطی ہوئی ہو۔

مرتبین نے بڑی حد تک نثر و نظم کو سمجھنے اور تصحیح کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے "فٹ نوٹ" بڑے قیمتی ہیں۔

جہاں تک کتاب کے مقدمے کا تعلق ہے، یہ فاضلانہ اور محققانہ ہے۔ آخر میں فرہنگ۔ فہرست ماخذ و حواشی فہرست اعلام، فہرست امم و قبائل۔ فہرست غزوات و ایام، فہرست بلاد و اماکن، فہرست آیات قرآنی، فہرست احادیث نبوی، فہرست اقوال و حکم، فہرست الفاظ قدیم وغیرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرتبین نے اس پر کتنی محنت کی ہے۔ کربل کتھا کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کے ایک ایک لفظ کو کتنی توجہ سے پڑھا اور پرکھا ہے۔ تحقیقی کام جس سلیقے اور انداز سے ہونا چاہئے وہ اس کتاب سے آشکارا ہے۔

۲۴۸ صفحات۔ کتابت و طباعت معیاری، قیمت ساڑھے سات روپیہ۔

ناشر۔ ادارۂ تحقیقات اردو۔ پٹنہ۔

شام و شفق

از:— ——— ڈاکٹر سلام سندیلوی

ڈاکٹر سلام سندیلوی اردو کے معروف ادیب، نقاد اور شاعر ہیں۔ وہ ایک عرصے سے نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شعری تخلیقات بھی کر رہے ہیں۔ انھیں ہر صنف سخن پر قدرت حاصل ہے۔ سادگی، سلاست اور روانی انکے کلام کا خاصہ ہے۔ کئی سال پہلے ان کے کلام کے دو مجموعے "ساغر و مینا" اور "نکہت و نور" شائع ہوئے تھے۔ انھیں ان کے کلام پر اکثر اساتذۂ سخن نے داد دی ہے۔ چونکہ انھوں نے انگریزی زبان کے شعر و ادب کا مطالعہ بھی کافی کیا ہے۔ اس لئے نیچرل شاعری کی طرف ان کا زیادہ رجحان ہے۔ عام طور پر وہ قدرتی مناظر سے تاثر حاصل کرتے ہیں اور اس پس منظر میں اپنے موضوعات پھیلاتے ہیں۔ یہیں سے ان کے یہاں ایک عمیق اداسی اور وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور چونکہ وہ ایک بہت دردمند دل رکھتے ہیں اس لئے ان کا داخلی کیفیات بھی ان کے کلام کو اثر آفریں بنا دیتی ہیں۔ لیکن اس اثر آفرینی کا نقص یہ ہے کہ یہ تیز اور شدید نہیں ہو پاتی۔ یہ شعلہ بننے کے بجائے بجھی بجھی سی آنچ ہے۔

"شام و شفق" ان کی رباعیات کا مجموعہ ہے اور پچھلے سال اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں جو کمزوریاں رہ

(باقیہ صفحہ ۱۰۰ پر دیکھئے)

جشنِ اثر لکھنوی

اردو کے بزرگ شاعر اور ادیب نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی طویل علمی و ادبی خدمات کے اعتراف اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ۹ اپریل ۱۹۶۸ء کو کشمیری محلہ میں "جشنِ اثر" ہوا۔ جشن کا افتتاح اتر پردیش کے وزیر انصاف سید علی ظہیر نے فرمایا اور صدارت پنڈت آنند نرائن ملا نے کی۔ حضرتِ اثر لکھنوی بہت دن سے صاحبِ فراش ہیں۔

رسالہ ادیب کا دوبارہ اجرا

جامعۂ اردو علیگڈھ کا ترجمان جو بند ہو گیا تھا۔ جناب ابن فرید کی زیرِ ادارت دوبارہ جاری ہو گیا ہے۔ ادیب دو ماہی رسالہ ہے۔ فی کاپی ایک روپیہ قیمت ہے۔

فضلی کی "کربل کتھا" کو ایکہزار روپیہ کا انعام

لکھنؤ ۱۸ مارچ:۔ آل انڈیا میر اکاڈمی نے اردو نثر کی پہلی کتاب

جشنِ حزیں قریشی احمد آبادی

گجرات کے کہنہ مشق شاعر حزیں قریشی احمد آبادی کے احباب اور معتقدین نے احمد آباد میں اُن کا جشن منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ جشن اپریل کو منایا جائیگا۔ اس میں ایک کل ہند مشاعرہ بھی ہوگا جس کی صدارت جناب پنڈت آنند نرائن ملا فرمائیں گے۔ (نامہ نگار)

مولانا عبدالماجد دریابادی کو پانچہزار کا انعام

لکھنؤ ۳۰ اپریل:۔ حکومت اتر پردیش نے اردو کے مشہور انشا پرداز، مصنف اور صدق جدید کے ایڈیٹر مولانا عبدالماجد دریابادی کو اُن کی طویل علمی و ادبی خدمات کے صلے میں پانچ ہزار روپیہ کا گراں قدر انعام دیا ہے۔

ڈاکٹر ست پرکاش سنگر کی سالگرہ

چندی گڑھ ۲۸ اپریل:۔ اردو اور ہندی کے معروف

علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

فضلی کی کربل کتھا کو جسے مالک رام اور ڈاکٹر مختار الدین احمد نے ایڈٹ کر کے شائع کیا تھا۔ ایک ہزار روپیہ بطور انعام دیا ہے۔ اس کے علاوہ میر اکیڈمی نے ڈاکٹر سید جعفر (حیدرآباد) کو اُن کی تصنیف "من تو شدم" پر تین سو روپیہ اور عمر انصاری (لکھنؤ) کے مجموعۂ کلام "سازِ بیخودی" پر دو سو روپے کے خصوصی انعامات بھی دیے۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کو ٹیگور انعام

حکومت مغربی بنگال کے منتخب شدہ ججوں کی سفارش پر عمل کرتے ہوئے ۱۹۶۶-۱۹۶۵ء کیلئے رابندر ناتھ ٹیگور یادگار انعامات کا اعلان کیا ہے۔ بنگلہ تصانیف پر انعامات کے علاوہ، شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی اردو تصنیف "بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات" پر بھی پانچ ہزار روپیہ کی رقم بطور انعام دی گئی۔

پروفیسر پیرزادہ اقبال ہاشمی کی شادی

بیجاپور ڈاک سے) پروفیسر پیرزادہ اقبال ہاشمی کی شادی ۲۶ اپریل کو اہتمام کے ساتھ ہوئی۔ شادی میں معززین شہر، صوفیا، شعرا اور ادبا کی اور اہلکاروں کی ساتھ نے شرکت کی۔ اس تقریب کے لیے میرا ایک شعر پڑھا گیا۔

مصنف اور تاریخ کے مشہور استاد ڈاکٹر ست پرکاش سنگر کی ۹۴ویں سالگرہ کے موقعہ پر ساہتیہ سنگم چندی گڑھ کا ایک خصوصی اجلاس ڈاکٹر گن پتی چندر گپت کے مکان پر منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ہرم پال ملی نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ شہر کے برگزیدہ اہل قلم اور سامعین بھاری تعداد میں موجود تھے۔ جناب صدر نے فرمایا کہ ڈاکٹر سنگر بیس سال سے خاموشی کے ساتھ ٹھوس ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اردو ہندی میں اُن کی بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ساہتیہ سنگم نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ ڈاکٹر ست پرکاش سنگر کی پچاسویں سالگرہ شاندار طریقہ سے منائی جائے گی۔

انجمن اساتذۂ اردو کی کل ہند کانفرنس

انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند نے اردو کی تعلیم اور اساتذۂ اردو کے مسائل پر غور کرنے کیلئے ۸-۹ مئی ۱۹۶۸ء کو اپنی کل ہند کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے۔

کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کی صدارت جناب کرنل بشیر حسین زیدی ممبر پارلیمنٹ نے مستقل فرمائی ہے۔

بقیہ .... نقد و نظر صفحہ ۶۴

گئی تھیں۔ وہ اس ایڈیشن میں دور کر دی گئی ہیں۔ اکیس رباعیاں بھی اسلام سندیلوی نے حذف کر دی ہیں جو اُن کے بعض احباب نے پسند نہیں کی تھیں یا جن میں کچھ کمی یا کمزوری تھی۔

اردو میں عام طور پر لکھی گئی رباعیوں سے یہ کچھ مختلف ہیں۔ ان کے پہلے دو یا تین مصرعوں میں مضمون نکالا ہے اور چوتھے میں کوئی نکتہ یا غیر نکتہ تلمیح ؎

وہ چاند کو تکتا ہوا اک حسرت سے روتی ہوئی شبنم وہ غم فرقت سے
منہ موڑے ہوئے بھونرے کو دیکھ کلی یا کیکئی رو بیٹھی ہو کسی کثرت سے

تمام رباعیاں اسی رنگ کی ہیں کافی رواں اور اچھی۔ بال بعض رباعیوں کے آخری مصرعے اب بھی توجہ طلب ہیں۔ ہر رباعی کے نیچے "تلمیح" کی تفصیل درج ہے۔

لکھائی، چھپائی، سرورق عمدہ۔ ۱۳۶ صفحات۔ قیمت۔ دو روپے
ملنے کا پتہ:۔ نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔ (یو۔پی)

بقیہ ... رپورتاژ لمبی سے اودے پور تک صفحہ ۵۰

دوڑتی ہوئی آنکھیں اور بھاگتے ہوئے لوہے کے تیز پہیے اور ان کے اردگرد بنی ہوئی کئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں۔ نئے نئے رشتوں کی کہانیاں، پرانی یادوں کی کہانیاں، جن کا نہ کوئی انت ہے نہ شروعات۔ اوم پرکاش کے ایک سندر ہندی گیت کی لائنیں ہیں۔

کا تر باتوں کو چھوڑیں، چھور دو بالوں کے۔ ملتے ہیں بول ہو اپنا غیر ہو
سب چلے گئے سونا پن ہے۔ تھراتی پیڑی "تناتا" اسٹیشن ہے۔

بقیہ ـــــ مکتوبات (صفحہ ۶۲ سے آگے)

مجھے افسوس ہے کہ ادھر شاعر کے سلسلے میں میرے کام کی رفتار کچھ سست ہو گئی ہے۔ دراصل بیگم گذشتہ ہفتے سے سخت بیمار ہیں اور میرے اوقات کا بیشتر حصہ تیمارداری میں گزر رہا ہے۔

مارچ کے تازہ شمارہ میں آپ کی نظم "تجدید عہد الفت" نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس کے اشعار فکر و فن کی انتہائی بلندیوں کو چھوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کا بھوپالی اس شعری تخلیق میں بالکل منفرد صورت اختیار کر گیا ہے۔ ادب کے ناقدین آپ کی اس نظم کا شمار سالِ رواں کی اہم اور شاہکار نظموں میں کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

گرمی میں بھی زندگی کو مسرور و خوش گوار بنائیے

اس مقصد کے لئے

شربت رُوح افزا

بہترین مشروب ہے

شربت رُوح افزا انسان کے لیے اُنیس قدرتی اجزا کا
ایک نہایت قیمتی مرکب ہے

شربت رُوح افزا ہر روز پیجئے اور مسرت بھرے لمحات کا لطف اٹھائیے
شربت رُوح افزا نہایت لذیذ اور تازگی بخش شربت ہے

دہلی • کانپور • پٹنہ

O.M. NOA 270-UR.

پبلشر اور مالک اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ پریس ۳۳ لوہار چال بمبئی میں چھپوا کر دفتر بمبئی سے شائع

JAMIA MILLIA ISLAMIA

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اُردو کا سینتیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شمارہ — ۵ مئی

سنہ ۱۹۶۶ء

تاج

بمبئی

احمد رہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	زرِ ششماہی	ممالکِ غیر سے	فی پرچہ
سات روپے	چار روپے	۱۶ شلنگ	۱۰ آنے (۱۲ پیسے)

مکتبہ قصر الادب

پوسٹ بکس ۴۵۲۶ بمبئی ۸ بی سی

آپ کو پوسٹ آفس سیونگز بنک میں کھاتا کیوں کھولنا چاہیئے؟

- ۴ فی صد ٹیکس سے بری سُود ہر برس یکم اپریل کو جمع ہوجاتا ہے۔
- آپ واحد کھاتے میں ۲۵۰۰ روپے اور مشترکہ کھاتے میں ۵۰۰۰ روپے جمع کرسکتے ہیں۔
- آپ جتنی رقم اور جتنا عرصہ چاہیں نکلوا سکتے ہیں۔
- یکمشت ۱۰۰ روپے سے کھولا جاسکتا ہے۔
- نابالغ بھی اپنا کھاتا کھول سکتا ہے۔
- ان پڑھ پڑھے لکھے بینک کے ذریعہ اپنا کھاتا چلا سکتا ہے۔
- ان کھاتوں پر سُود ملتا ہے جو مورڈیو گلاں کے ذریعہ بلا وقت بلا ضمانت رکھے جاتے ہیں۔
- نامزدگی کی سہولت ملتی ہے۔
- ۵۰۰۰ روپے تک کے کھیوں کا سپیشل وراثت کے سرٹیفکیٹوں کے بغیر کیا جاتا ہے۔
- اپنے ۱۰۰۰ روپے تک کے نقد پیسے کا تحفہ بھیج سکتے ہیں۔

اپنی پاس بک اپنے ڈاک گھر میں جمع کردیں تاکہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۶ء کو ختم ہونے برس کا سُود آپ کے کھاتے میں چڑھا دیا جائے۔

قومی بچت آرگنائزیشن

DA 44/65

نقیب

اُردو اور انتخابات	(اداریہ)	اعجاز صدیقی	۷
سورج کا شہر	(نظم)	شہاب جعفری	۸
کچھ "آبِ پا" کے بارے میں	(مقالہ)	رفعت نواز	۹
غزل		مظفر حنفی	۱۳
جلتی آنکھیں	(افسانہ)	رضیہ شبنم منیری	۱۴
محرومی	(نظم)	شمس فریدی	۱۷
بیزاری	(نظم)	فیروز	۱۷
۱۹۶۵ کی قابلِ قدر ادبی تخلیقات	(تنقید و تبصرہ)	ڈاکٹر گیان چند	۱۸
غزل		قیصر شمیم	۲۱
غزل		کرشن موہن	۲۱
نیر شہاب "حیاتِ داغ"	(مقالہ)	مناظر عاشق ہرگانوی	۲۲
اے مقدس وطن	(نظم)	بدیع الزماں خاور	۲۷
یہ نذرِ دیتا	(نظم)	آدم نصرت	۲۷
وادیاں گلاب کی	(افسانہ)	شہاب داروی	۲۸
غزل		ممتاز راشد	۳۱
غزل		وہاب دانش	۳۱

شاعر

جگر سے آخری ملاقات	(یادداشت)	آغا شید میرزا وہلوی	۳۲
روٹی اور لیڈر	(افسانہ)	رشید انور	۳۶
چھوٹے بڑے لوگ	(ڈراما)	رسول احمد	۳۹
غزل		عبدالرحیم نشتر	۴۶
غزل		سحر انصاری	۴۶
غزل		اقبال طاہر	۴۶
نین گفتگو	(طنزیہ)	جیون لعل گوہر	۴۷
مجاز۔ اپنے ہی آئینہ میں منظر ہیں	(خاکہ)	حمید الشطاری	۴۹

مکتوبات

شیام کنول ـــــ سید حرمت الاکرام ـــــ نازش پرتاپگڈھی
بدیع الزماں خاور ـــــ متقا کاظمی ـــــ قمر اوگالوی
علی عباس حامدی امید ـــــ وفا پرویز ـــــ ظہیر صدیقی
علیم اختر مظفر نگری ـــــ زیر شانی ـــــ نسیم مظفر پوری

ادھر ادھر

محفل اپنی ...!		ادارہ	۶۰
نقد و نظر	(تبصرے)	ادارہ	۶۱
رفتار	(علمی و ادبی خبریں)	ادارہ	۶۵

ادارہ "شاعر" فخر و مسرت کے ساتھ

اُردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار

کرشن چندر

پر نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر پیش کر رہا ہے

کرشن چندر کی منفرد شخصیت اور اُس کے ہمہ گیر فن پر نہ صرف ہندوستان کی کئی زبانوں کے مشہور قلم کاروں بلکہ دُنیا کے کئی بڑے مصنفین اور مفکرین کے مضامین و تاثرات

کرشن نمبر

میں

پیش کئے جائیں گے

کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ، اُس کی عظمت کی کہانی، اُس کی تصانیف کا جائزہ، اُس کے زندہ اسلوبِ فکر اور شاہکار افسانوں، ناولوں اور ڈراموں پر تنقیدی نظر

درجنوں تصاویر

تفصیلات اور تاریخ کا انتظار کیجئے

کرشن چندر نمبر میں

خود

کرشن چندر

کے اپنے قلم سے

ایک تازہ غیر مطبوعہ اور شاہکار

نئے

ناول

کے علاوہ

تین تازہ کہانیاں

ایک ڈرامہ

ایک مزاحیہ

میرے ادبی نظریات

میرے تنقید نگار

میری ادبی زندگی کا آغاز و انجام

کرشن چندر کے شب و روز

(تصاویر کے ذریعے)

اور

عکسِ تحریر

کرشن چندر کے

اہم خطوط

ارباب قلم اپنے مضامین کرشن چندر نمبر جلد از جلد ارسال فرمائیں

جرعات

اُردو اور انتخابات

اسمبلی اور پارلیمنٹ کی تو غیر بڑی اہمیت ہے۔ ان کی نشستیں حاصل کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جاتا ہے۔ معمولی سے میونسپل انتخابات کو لے لیجئے، اس کے لئے بھی نمائندگان مختلف دھڑوں کا ایک شیش محل تعمیر کرتے ہیں۔ اور کامیابی کے بعد یہ محل کسی جادو کی محل کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ ملک میں پارلیمنٹ اور اسمبلی کے لئے پچھلے جتنے بھی انتخابات ہوئے ان میں بیشتر نمائندگان نے اردو والوں کا سہارا لیا۔ اردو کو اس کے حقوق دلانے کے زبردست وعدے کئے۔ ایسی ان گنت مثالوں کے بجائے صرف ایک مثال اتر پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ شری گپتا جی کی کافی ہوگی جو صوف نے یو۔ پی کا وزیر اعلیٰ ہونے سے پہلے اردو کے سلسلے میں بہت سے وعدے فرمائے تھے اور کامیابی کے بعد ان تمام وعدوں کو فراموش کر دیا۔

۱۹۶۷ء کے عام انتخابات مختلف بنیادوں پر لڑے جائینگے۔ ان میں سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی اور مذہبی بنیادوں کے علاوہ لسانی بنیاد بھی ہوگی۔ کچھ ہندی زبان کا سہارا لیں گے۔ کچھ اردو اور دوسری علاقائی زبانوں کا۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے، ہمیں یقین ہے کہ اردو والوں کے ووٹ حاصل کرنے کے باوجود ہمارے کامیاب نمائندے اردو زبان کیلئے کچھ نہیں کریں گے۔ ایسی صورت میں اردو والوں کو کیا کرنا ہے یہ ایک اہم سوال ہے۔ مشکل ترین ہندی زبان کو پھیلانے اور بڑھانے کا رجحان آل انڈیا ریڈیو کی خبروں سے ظاہر ہے، یا اس زبان کی ترقی کے لئے جو کثیر سرمایہ منظور کیا گیا ہے اس سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف ہماری زبانوں پر اپنی بگڑی بگڑی طاقتور ہوتی جا رہی ہیں بعض ریاستوں میں تو کل تو پرانی کی اپنی علاقائی زبانوں ہی میں سرکاری اور غیر سرکاری کاموں کو انجام دینے کیلئے احکامات صادر ہو چکے ہیں۔

اردو زبان بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اور ان کی کروڑ لوگوں سے اردو ہی کے نام پر ووٹ مانگے جائیں گے۔ لیکن پچھلے تلخ تجربات کی روشنی میں یہ محض وقتی بات ہوگی اور اس کے بعد کچھ بھی نہ ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں اردو والوں کو کیا کرنا چاہیئے ــــ؟

یہ تو ظاہر ہے کہ اردو والے جن جن نمائندوں کا ساتھ دیں گے انھیں تو فائدہ پہنچے گا لیکن سوچنا یہ ہے کہ اس میں خود اردو کا کیا نفع یا نقصان ہے۔ کون سا ایسا مؤثر پہلو ہو سکتا ہے جس سے آئندہ انتخاب میں اردو کو اس کے حقوق کی بازیافت میں مدد ملے۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ بطور احتجاج کسی علاقے میں بھی اردو والے کسی سیاسی جماعت کو اپنا ووٹ نہ دیں۔ لیکن جمہوری نقطۂ نظر سے یہ بات بھی کچھ زیادہ مناسب نہ ہوگی، اور اس احتجاجی اقدام سے بھی اردو کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچے گا۔

دوسری نوعیت یہ ہو سکتی ہے کہ اردو کے آزاد نمائندوں کو کھڑا کیا جائے اور انھیں کامیاب بنانے کیلئے زبردست کوشش کی جائے۔ ان میں سے اگر چند نمائندے بھی کامیاب ہو گئے تو وہ اسمبلی اور پارلیمنٹ میں اردو کے حقوق کیلئے جد و جہد کریں گے۔ ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ایک طرف تو اردو کے مانے ہوئے ادیب ہیں اور دوسری طرف ان میں سیاسی اور سماجی شعور بھی ہے۔ ان کے علاوہ انجمن ترقی اردو سے لیکر ریاستی اور مقامی سطحوں تک میں ایسے قابل لوگ موجود ہیں، جنھیں اگر آئندہ انتخابات میں اردو حلقوں کی طرف سے آزاد نمائندہ بنا کر بھیجا جائے تو وہ ملک و قوم کیلئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ آئندہ عام انتخابات سے پہلے مرکزی انجمن ترقی اردو اور اردو کے عام اداروں اس خصوص میں اچھی طرح غور کر لیں اور ایک ایسا بھرپور قدم اٹھائیں جو اردو زبان کیلئے مفید ثابت ہو۔ اگر ہم نے کوئی عملی اقدام نہ کیا اور خاموش بیٹھے رہے تو اردو کو اس سے بھی زیادہ نقصان پہنچ جائے گا جتنا اب تک پہنچ چکا ہے۔ آئندہ انتخابات کے سلسلے میں اردو والوں کی ایک تنظیم اور ان کی آواز ہونی چاہیئے۔ ذاتی مصلحتوں اور مفادات سے قطع نظر۔

شہاب جعفری

سورج کا شہر

"نہیں! یہ سورج کے شہر کا آدمی نہیں ہے
کہ یہ تو مرنے کے بعد فٹ پاتھ پر پڑا ہے
یہ لاش ہم سب کی طرح سورج کے ساتھ گردش میں کیوں نہیں ہے
پڑھو تو اس ڈائری میں کیا ہے"

پھٹے پھٹے اک ورق پہ کچھ یوں لکھا ہوا تھا :

میں اپنی دنیائے فکر و فن کے آج بن باس میں پڑا ہوں
ضرورتوں میں گھرا ہوا ہوں
یہاں تو دوا اور دوا کا حاصل ہمیشہ ہی چار ہاتھ آیا
کہ پانچ ناممکنات میں ہے
عظیم فن کار کا قلم ہو کہ کارخانے کی تخلیقِ سخن کی آورد نہیں ہے
مقدس آگ اُن کے دل کی یوں پیٹ کے جہنم میں جل رہی ہے
کہ زندگی کی جو قوتیں ہیں، وہ صرف زندہ ہی رہنے میں صرف ہوتی ہیں
مشین کی طرح ذہن بھی کام کر رہے ہیں
رگوں میں جیتے لہو کے بدلے رقیق لوہا بھرا ہوا ہے
مشین کی طرح پاؤں چلتے ہیں
آدمی کا جلال گردش میں سرنگوں ہے
ارادہ و اختیار اک اضطرابِ سکیگس ہے جس سے بچ کر
کوئی نہیں دو گھڑی کسی سے جو بے غرض رک کے بات کر لے
(کسے خبر - ؟ آدمی کے دو میٹھے بول کو میں ترس رہا ہوں!)"

یہاں پہ تحریر آنسوؤں سے مٹی ہوئی تھی — اور اس سے آگے :

"یہ شہر، سورج کا شہر ہے، اس کے روز و شب کا پتہ نہیں کچھ
نہ آج تک وقت اور تاریخ کا مجھے علم ہو سکا ہے
کہ میرے احساس میں کوئی آج ہے نہ کل!
اور یہ رات ہے یا سیاہ سورج!؟
غروب ہو کر بھی آسمان و زمیں سے پیہم گذر رہا ہے!!
بس اس جہاں میں - سیاہ روشن - ہمیشہ دن ہے
ہمیشہ سورج ہی اپنے سر پر کھڑا ہوا ہے
یہ کائنات اک تھکتہ گاڑی ہے، ایک پہیے پہ چل رہی ہے
(زمیں کا چاند، کیا خبر کس اندھیرے پاتال میں گرا ہے!)
ہر ایک شے بھاگتی ہوئی ایک دوسرے کی تلاش میں گم
بس اک تصادم!
ہر ایک شخص ایک دوڑتی لاش ہے کہ اک دوسری دہشت زدہ لاش گویا
سب اپنا سورج سے منہ چھپائے تلاش میں وقت کی حواساں
کسی کو اتنی بھی شام ملتی نہیں کہ تھوڑا اداس ہو لیں۔"

یہاں پہ جملے عجیب سے تھے۔ لہو کے دھبوں سے مٹ گئے تھے!

رفعت نواز

کچھ "آبلہ پا" کے بارے میں

سال گذشتہ عذرا نقوی کے ناول "آنگن" پر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ "آنگن" اردو ناول کے مستقبل سے مایوس ہونے والوں کے لئے ایک مژدۂ جانفزا ہے۔ عذرا نقوی نے ناول کی دنیا کی اندھیری رات میں ایک چراغ روشن کیا ہے جس کی روشنی میں کیا اور لکھنے والے آگے بڑھیں گے۔ اور چراغ سے چراغ روشن ہوں گے۔ ایک سال میں دو ناول تو ایسے منظر پر آئے جو میرے گذشتہ سال کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔ ایک تو قرۃ العین حیدر کا ناول "چائے کے باغ" اور رضیہ فصیح احمد کا "آبلہ پا"۔ اور یہ بات اس سے بھی انکار نہیں کہ بعض اچھے لکھنے والوں کے انتہائی کمزور ناول بھی اس سال پڑھنے میں آئے ہیں۔ جیسے شوکت صدیقی کا ناول "خون و خشت" جو سرے سے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ "یہ خدا کی بستی" والے شوکت صدیقی کا ناول ہے۔

رضیہ فصیح احمد کی کہانیاں ۱۹۴۷ء سے ملک کے جانے پہچانے معیاری رسائل میں چھپ رہی ہیں اور پسندیدگی کی جا رہی ہیں۔ اور ادب پڑھنے والا طبقہ ان کے نام اور کام سے ناواقف نہیں ہے۔ "آبلہ پا" رضیہ فصیح احمد کا پہلا ناول ہے۔ انھوں نے ڈرامے اور مزاحیہ بھی لکھے ہیں، اور تو اور ان کی غزلیں بھی چھپی ہیں۔ میں ان کی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ رضیہ فصیح احمد موجودہ افسانہ نگاروں میں جو دس پندرہ اچھے افسانہ نگار ہیں، بلاشبہ شامل کی جا سکتی ہیں۔

"آبلہ پا" کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ رضیہ فصیح احمد کی ناول کے فن پر بڑی مضبوط گرفت ہے اور دلچسپ اور اچھا ناول لکھنے کے گُر سے وہ واقف ہیں۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ اس گُر سے قلیل مدت میں واقف ہو گئیں۔ ورنہ ہمارے یہاں ایسے ناول نگار بھی ہیں جو دس بیس پچاس طویل طویل قصے تو لکھ کر ناول کے نام سے چھپوا دیئے، مگر خیر سے کوئی سچا ناول لکھ کر نہیں دیا۔ اچھا اور سچا ناول لکھنے کا گُر تو اردو میں گنتی کے مصنفوں ہی کو آتا ہے۔ ویسے دھاندلی کر کے اپنے آپ کو ناول نگار منوانا ہو تو میں بھی اپنے خیالات کی پوٹ کو چھپوا کر ناول نگار بن سکتا ہوں۔ اور عوام الناس میں بھی بہت سارے اس دھاندلی کے اہل ہو جائیں گے ہی۔ مگر زبردستی کے منوانے سے ادب میں کچھ ہوتا ہوتا ہے، ہاں زبردستی کا منوانا، دھاندلی اور الٹ پھیر کے لئے سیاست بڑا موزوں میدان ہے۔

چونکہ اردو میں اچھے اور سچے ناول چند ہی ہیں، اس لئے ناول پڑھتے وقت یہی خیال ذہن میں سمایا رہتا ہے کہ چلو پڑھ کر دیکھ لیں اس چھٹے میں کیا ہے اور بہت سارے ناول اس معیار پر پورے اترتے ہیں کہ وقت گذاری کیلئے کوئی قصہ پڑھ لیا وقت بھی گذر گیا اور قصہ بھی پڑھ لیا۔

"آبلہ پا" پڑھنا شروع کیا تو کچھ پڑھ کر کچھ ایسا ہی موڈ بنا تھا۔ ویسے میں اس سے توبہ نہیں تھا کہ رضیہ صاحبہ اچھے افسانے لکھتی ہیں اور ان کے اس ناول کی تعریف بھی ہوئی ہے۔ اس ناول پر اضافی ایک اور ادبی انعام (آدم جی انعام) بھی ملا ہے جو کم از کم اردو ادب میں اپنی مالی حیثیت ایک اہم درجہ رکھتا ہے۔ مگر ہم اس بات سے بھی واقف ہیں کہ یہ بڑا ادبی انعام ایسے ناولوں پر بھی دیا گیا ہے جن کی ادبی حیثیت مشکوک ہے اور ہم اس سے بھی آگاہ ہیں کہ بعض معروف لکھنے والوں نے محض اس ادبی انعام کے لالچ میں ناول لکھے ہیں۔ چنانچہ ممتاز مفتی کے "اکھ لوتے" اور اردو کے طویل ترین ناول "علی پور کا ایلی" کا یہی قصہ ہے۔

میرے پیش نظر آبلہ پا کا ہندستانی ایڈیشن ہے جس میں کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں جن کی وجہ سے اکثر مقامات پر مفہوم کو سمجھنا دشوار ہو گیا ہے اور کئی جگہ صحیح جملے غلط لکھے گئے ہیں۔ اور الفاظ خاموش زبان سے ناشر کی کم علمی اور بے توجہی کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں۔ بہرحال...

"آبلہ پا" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ابتداء سے انتہا تک انتہائی دلچسپ ہے اور پڑھنے والے کی توجہ ناول سے ہٹنے نہیں پاتی اس ایک بڑائی میں کئی ضمنی خوبیاں بھی شامل ہیں جو کسی نہ کسی طور پر اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ مصنفہ نہ صرف فنِ ناول نگاری سے واقف ہے بلکہ اس نے اپنے پیشرو ناول نگاروں کی تصانیف کو بغور پڑھ کر ان کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ ناول کا فقرہ یوں ہے۔

صبا اپنے والد کے ساتھ کوئٹہ کے "چمنستان ہوٹل" میں مقیم ہے۔ اسی ہوٹل میں اسد بھی ٹھہرا ہوا ہے۔ اسد کے ساتھ خوبصورت تین سال بوبی بھی ہے۔ اسد محکمہ ریلوے میں کسی اچھی سی خدمت پر مامور ہے۔ صبا سنجیدہ، خاموش طبع، اردو ادب کی دلدادہ ہے۔ اسے ہوٹل کے ہنگامی کلب کی رقص و نغمہ اور دیگر عام سی دلچسپیوں سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ اس لئے اکثر وہ اپنے کمرے میں یا باغیچہ میں بیٹھی کتابیں پڑھا کرتی ہے یا بنا کڑھائی کیا کرتی ہے۔ یا اسد کے بوبی سے باتیں کیا کرتی ہے۔ پھر وہ ہوٹل میں مقیم لوگوں کے بچوں کو اردو پڑھاتی ہے۔ بوبی کے توسط ہی سے اسد صبا سے ملتا ہے۔ ادھر ادھر کبھی کبھار یا اسد اور صبا ملتے ہیں اور ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ صبا اسد سے کافی متاثر بھی ہو جاتی ہے مگر بوبی اسد کے رشتے سے مشکوک بھی رہتی ہے۔ ایک دن اسد اس کے شک کو یہ کہہ کر دور کر دیتا ہے کہ بوبی امریکہ کا ایک لاوارث لڑکا ہے جس کے والد ایک حادثے میں انتقال کر چکے ہیں اور اسد بوبی کا صرف بالن ہار ہے۔ صبا کے والد محمد یار آدمی ہیں اپنی لاڈلی بیٹی اور اسد کے میل جول پر وہ خوش نہیں ہوتے جب اسد ان سے صبا کے ساتھ شادی کے متعلق کہتا ہے تو وہ صبا کو بلا کر پوچھ لیتے ہیں کہ کیا وہ بھی اسد کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ صبا کچھ دن سوچ کر شادی کیلئے تیار ہو جاتی ہے۔ شادی لاہور میں ہوتی ہے۔ اسد کے رشتے دار بھی شادی میں شریک ہوتے ہیں شادی کے فوراً بعد ہی میاں بیوی ہنی مون منانے ارک کی طرف نکل جاتے ہیں۔ راستے میں اسد صبا سے اس کی پچھلی زندگی کے متعلق پوچھتا ہے تو صبا بتاتی ہے کہ وہ یو۔پی کی رہنے والی ہے اور تقسیم ملک کے وقت ہجرت کر کے آئی ہے۔ اس کے بھائی بہن اور والدہ اور دوسرے رشتہ دار ہندو کی نذر ہو گئے البتہ وہ ایمبولنس کر چکی ہے۔ اور اس کا منشا معاشرہ کی اصلاح کرنا ہے۔ ہنی مون کے زمانے ہی میں بوبی کے متعلق باتیں ہوتی ہیں اور اسد کی باتوں سے یوں لگتا ہے کہ وہ بوبی کے معاملے میں صبا کی دلچسپی کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اور نوواجی زندگی میں پہلی بار صبا کے اعتماد کو ٹھیس لگتی ہے۔ ارک کے قیام کے دوران ہی میں صبا کو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اسد عیاش بھی ہے۔ اس کے تعلقات ارک ریسٹ ہاؤس کی رہنے والی ایک مقامی عورت سے بھی ہیں۔ صبا کے خواب اور عزائم سب ٹوٹنے لگتے ہیں۔ وہ اچانک بیمار پڑ جاتی ہے۔ اسد اسے لاہور اپنی سہیلی عذرا کے یہاں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ راستے میں ٹرین میں اسد کے پرانے شناسا افسانہ نگار انجد مل جاتے ہیں۔ ان کی بیوی شمسہ بھی افسانہ نگار ہے۔ رات میں جب صبا اور شمسہ سو چکے ہوتے ہیں اسد، انجد کو اپنے امریکہ کے قیام کے زمانے کے واقعات سناتا ہے۔ پتہ چلتا ہے وہاں کیٹی نامی کوئی امریکن لڑکی اسد کی داشتہ رہ چکی تھی اور جس کی آخری نشانی بوبی ہے۔ (عذرا صبا کی عزیز ترین سہیلی ہے، اس کا شوہر کسی اچھی سی خدمت پر مامور ہے، عذرا کے ساتھ اس کی بڑی بہن اور اس کے شوہر نامدار بھی رہتے ہیں۔ عذرا کے شوہر اپنی بڑی سالی پر لٹو ہیں اور عذرا اس واقعہ سے بے خبر بھی نہیں ہے۔ مگر اس نے کبھی اپنے شوہر کو یا اپنی بہن کو اس بات کا احساس نہ ہونے دیا کہ وہ اس کے کھٹکوں سے واقف ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ شوہر خود راہ راست پر آ گئے اور بہنا دلہ دوسری جگہ کرا لیا۔ اور میاں بیوی بال بچے خوش خوش رہنے لگے۔ لاہور میں اپنی سسرال بھی جاتی ہے اور اس حقیقت سے آگاہ بھی ہوتی ہے کہ گھر کی حالت مالی اعتبار سے نہایت درجہ کمزور ہے۔ اسد میاں تو شاہانہ زندگی گذارتے ہیں۔ اور یہاں گھر کے بڑے اخراجات کا بار بڑا بھائی اٹھاتا ہے۔ اور اسد میاں اپنی ماں، بہنوں اور بھائیوں پر حقارت کی نظر ڈالتے ہیں۔ ساس بہو کی شکایت کرتی ہے تو بہو کو کچھ بھی پاس ہوتا ہے دے ڈالتی ہے، اور شوہر کے کرتہ کا ایک نیا جوڑا دیکھ کر رو آتی ہے۔ اور جب وہ تندرست ہو کر کوئٹہ پہنچتی ہے تو اسد کو دوسری ہی رنگ میں رنگا دیکھتی ہے۔ زینہ (صبا کی سہیلی) اسد کے ساتھ اکثر دیکھی جاتی ہے۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ نہ کچھ کر رہی ہوتی ہیں۔ اسد کی اصل شخصیت اور کردار سے صبا واقف ہو جاتی ہے۔ میاں بیوی میں خاموش تلخی شروع ہو جاتی ہے۔ اسد صبا سے بیزار رہتا ہے اور بار بار اسے چھوڑ کر جاتا ہے ایک دن کلب میں دونوں میں کچھ ان بن ہو جاتی ہے صبا اپنی انا کے ٹکڑے کو

پر اسے میں ایک فقیر سردی میں اکڑا بڑا رہتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ بانگ رہا تھا۔ صبا اسے اپنی عمدہ والی قیمتی شال دے دیتا ہے۔ تیسرے دن اخبار میں اطلاع آتی ہے کہ وہی فقیر چوری کے الزام میں دھر لیا گیا ہے اس کے جسم پر قیمتی شال ملتی جو اس کی حیثیت سے بہت قیمتی ہے۔ صبا فقیر کی گرفتاری کی وجہ خود کو سمجھتی ہے اور اس کی رہائی کے لئے کوشاں رہتی ہے اس سلسلے میں وکیل عامر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ عامر، صبا کے کردار سے کافی متاثر ہوتا ہے۔ پھر اسد سے ان کی گھریلو رنجشوں کا پتہ چلتا ہے تو کسی طرح صبا کو اسد کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ صبا کی بیماری عود کر آتی ہے اور وہ بہت کمزور ہو جاتی ہے۔ اسد اسے سمجھا بجھا کر اس کے والد کے پاس بھیج دیتا ہے اور خود دو مہینوں پر نکل جاتا ہے۔ پھر اسد زرینہ سے شادی کر لیتا ہے اور صبا کو طلاق دے دیتا ہے۔ زرینہ بچوں کی موجودگی میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔ اسد کو امریکہ کے کسی گرجا گھر کے پادری کے خط کے ساتھ کیتھی کا آخری اعتراف "Last confession" ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچی اسد کا بیٹا نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کے کسی دوست کے گناہ کا پھل ہے۔ اسی اثنا میں اچانک عامر اور زرینہ کی منگنی ہو جاتی ہے۔ اسد اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے وہ بچی کو قتل کر دیتا ہے اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ عامر زرینہ کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ صبا کے والد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ کراچی آجاتی ہے۔ عامر بھی کراچی آجاتا ہے۔ صبا کے یہاں اسد سے لڑکی پیدا ہوتی ہے، وہ پھر سے الف، الیس، سی میں داخلہ لے لیتی ہے۔ کراچی میں عامر صبا سے ملتا رہتا ہے اور دبی زبان میں دائمی رفاقت کی پیشکش بھی کرتا ہے۔ صبا اس کی بات ٹال جاتی ہے۔ عامر اپنی بہن ثمینہ کے ذریعہ شادی کا پیغام بھیجواتا ہے تو صبا کہتی ہے، میں زندگی کی پرخار راہوں پر چلتے چلتے تھک گئی ہوں میرے پیروں میں آبلے پڑ گئے ہیں تھکن دور ہو اور آبلہ پائے پا لیجئے ہو جائیں تو آگے بڑھنے کا فیصلہ کروں گی۔" یہ ہے "آبلہ پا" کا خلاصہ جو چار سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ "آبلہ پا" دراصل صبا کی کہانی ہے۔ پورا ناول صبا کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ اور صبا کے توسط ہی سے ناول کے دیگر کردار متعارف ہوتے ہیں۔ صبا کی کردار نگاری رضیہ فصیح احمد نے بڑی محنت اور توجہ سے کی ہے۔ صبا کے کردار کو پڑھتے ہوئے قرۃ العین حیدر کے ایک کردار چمپا (آگ کا دریا) کی تصویر آنکھوں کے آگے کھنچ جاتی ہے۔ صبا خاموش طبع، سنجیدہ، مطالعہ کی شوقین، بحر رو، غیور اور خدا ترس ہے۔ وہ مصیبتوں سے بڑی خاموشی سے لڑتی ہے۔ اسد اس سے برا سلوک کرتا ہے تو وہ کسی سے تذکرہ تک نہیں کرتی۔ حتیٰ کہ اپنی طلاق کی بابت اپنے بیمار والد تک کو کچھ نہیں بتاتی۔ صبا کے سوچنے کا ڈھنگ اور نظریۂ حیات عام لڑکیوں سے الگ سا ہے۔ وہ ظاہری چمک دمک اور ہنگاموں کی قائل نہیں ہے وہ کوئی قابل ذکر قومی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ اردو زبان کی وہ دلدادہ ہے اور چاہتی ہے کہ اردو کی ترویج میں وہ بھی حصہ لے۔ وہ مشرقی تہذیب کی ایک بہترین نمائندہ ہے۔ مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی مذمت بھی صبا کے کردار کا ایک خاص وصف ہے، چنانچہ اس عہد روی کا مظاہرہ فقیر کو شال دینے اور اس کی رہائی کے لئے کوشش کرنے، اور دوسری جگہ حاملہ دھوبن کی ممکنہ مدد کرنے سے ہوتا ہے۔ جب فقیر اور دھوبن ظلم کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں تو اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ ملک میں ڈاکٹروں کی بڑی ضرورت ہے۔ وہ پھر سے الف، ایس، سی میں داخلہ لے کر ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کرتی ہے۔ صبا اسد سے محبت کرتی ہے، شادی رچاتی ہے، انتہائی ناچاقی کے زمانے میں بھی مفاہمت کی کوشش کرتی رہتی ہے، اور حالات کا خاموشی سے مقابلہ کرتے کرتے وہ بیمار ہو جاتی ہے اور پھر طلاق کی شکل میں اسے آخری شکست ملتی ہے، وہ کچھ دل برداشتہ تو ہو جاتی ہے مگر زندگی سے مایوس ہو کر فرار کی راہ اختیار نہیں کرتی بلکہ نئے عزم سے زندگی کی تشکیل کرتی ہے اور یہیں صبا کا کردار پورے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ صبا پر قرۃ العین حیدر کی چمپا کی گہری چھاپ ہے۔ مگر ناول کے آخری حصے میں چمپا سے صبا ایک قدم آگے بڑھ جاتی ہے۔ صبا تصوراتی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا میں چلتی پھرتی حالات کا مقابلہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ صبا کے کردار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ وقت کے ساتھ تیز کاسے آگے بڑھتی ہے، جیسی کہ زندگی بڑھتی ہے اور ستاری کے ساتھ صبا الفاظ کے ساتھ صاف گفتگو کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور یہ رضیہ فصیح احمد کی کردار نگاری کی معراج ہے۔

اسد متوسط طبقے کے ایک عام سے نوجوان کی طرح ہے وہ اپنے ماحول اور ماضی سے رشتہ توڑ کر اڑنا چاہتا ہے مگر اس کے کردار میں بڑا تضاد پایا جاتا ہے جو اس کے نوزائیدہ ہونے کی چغلی کھاتا ہے۔ عیاشی، ماضی سے فرار، حال سے اُنسیت اور مستقبل سے ناامیدی اسد کے کردار کی خاص خصوصیات ہیں۔ مجھے اسد کے کردار میں عزیز احمد کے ناولوں کے مردانہ کرداروں کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہی عیاشی، پینا پلانا اور

اخلاق کمزوریاں اور نئے جھوں کی تلاش ۔ مگر یہی اسد اپنے لڑکپن کی بوبی کے تعلق سے بالکل بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ بوبی سے بے انتہا محبت کرتا ہے اور اس محبت میں وہ کسی کی شرکت بھی گوارا نہیں کر سکتا، بوبی کو ذرا بھی تکلیف ہو تو وہ بے چین ہو جاتا ہے۔ اسد اپنی شکست برداشت نہیں کر سکتا سب اسے پے بہ پے شکستوں کا احساس ہوتا ہے تو وہ حواس کھو بیٹھتا ہے اور اس دیوانگی میں وہ بوبی کو قتل کر دیتا ہے اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اسد کا انجام بڑا فطری نظر آتا ہے سو ہی اسد جو زندگی بھر دوسروں کو دھوکا دیتا رہا، اپنی شخصیت کو پردوں میں چھپاتا رہا، آخر میں خود اپنے آپ کو اپنے عمل کے ذریعے بے نقاب کر دیتا ہے۔

صبا کی سہیلی عذرا کا کردار بڑا بھرپور اور زندہ ہے۔ وہ حالات کا مقابلہ بڑی جرأت سے کرتی ہے اور کسی مرحلہ پر بھی وہ حالات کے آگے سر نہیں جھکاتی تو وہ اپنے آپ پر بھروسہ رکھتی ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا شوہر آج نہیں تو کل ضرور راہ راست پر آجائے گا۔ وہ بہن کو رقیب کے روپ میں دیکھتی ہے مگر غصہ سے حواس باختہ نہیں ہو جاتی، وہ اپنے شوہر سے ناراض ضرور رہتی ہے مگر شوہر کو اپنی ناراضگی کا احساس تک ہونے نہیں دیتی۔ وہ اپنے دکھ میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتی اور نہ وہ اپنے دکھ کا ڈھنڈورا پیٹا کرتی ہے۔ عذرا "آبلہ پا" کے دیگر نسوانی کرداروں کے مقابلے میں زیادہ حقیقت پسندانہ اور جاندار نظر آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عذرا قاری کو جلد متوجہ کر لیتی ہے۔

ماہر پڑھا لکھا نوجوان ہے اور محبت کرنے والا دل رکھتا ہے۔ وہ صبا سے بے حد متاثر ہے اور اس کا غم بانٹنا چاہتا ہے۔ وہ جھوٹی شان، نام و نمود اور لاؤ لیپٹ کا قائل نہیں ہے اور صبا کو اپنا ہم خیال دیکھ کر وہ اس کی رفاقت کا متمنی ہو تا ہے۔ ماہر کی چاہت میں جسم پرستی اور دولت کی طلب نہیں ہے۔ اسی لئے وہ زینہ سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ اس کا عشق سچا ہے اور ایک سچے عاشق کی طرح وہ محبوب کے وصال کی امید میں ہجر کے کڑے دن گزارتا ہے مگر روتے دھوتے نہیں بلکہ شعوری طور پر با عمل رہ کر۔

ان کرداروں کے علاوہ زرینہ، صبا کے والد، انجد، عمر، شاہدہ باجی اور بوبی کے کردار ناول کے چوکھٹے میں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں بخصوصیت سے انجد اور عمر کے کردار بڑے دلچسپ ہیں اور وہ ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان کی علیحدگی سے ناول ایک نیا رخ اختیار کر لیتا ہے۔

"آبلہ پا" تکنیک کے اعتبار سے بڑا دلچسپ ہے۔ کہیں یہ بیانیہ انداز ہے تو کہیں ناول کا کوئی کردار خود کو متعارف کرکے کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ ناول کی تکنیک بڑی حد تک عزیز احمد کے ناول "شبنم" کی تکنیک سے مشابہت رکھتی ہے۔ ناول میں ایک دھیما دھیما کہانی کا فطری بہاؤ ہے اور پلاٹ آہستہ آہستہ تمام جزئیات کے ساتھ کلائمکس کی طرف بڑھتا ہے، اور کلائمکس کے قریب پہنچکر کہانی تیز رو پر آجاتی ہے، برق رفتاری سے واقعات رونما ہوتے ہیں اور کہانی کی بکھری کڑیاں تیزی سے جڑنے لگتی ہیں اور کلائمکس پر کہانی پورے طور پر مکمل ہو جاتی ہے اور قاری پر گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔

رضیہ فصیح احمد نے ناول میں واقعات کو بڑے سلیقے سے ترتیب دیا ہے اور ناول پڑھکر یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی میں واقعات اسی ترتیب سے رونما ہوئے ہوں گے جس طرح کہ وہ ناول میں ترتیب دیئے گئے ہیں صرف ایک جگہ مصنوعی یا خلاف واقعہ بات کا شبہ ہوتا ہے: دیپو کا جیل سے بھاگ کر صبا کے کمرے میں آجانا اور پھر بھوک سے اس کی موت واقع ہو جانا حیرت ہے کہ رضیہ فصیح احمد نے اس واقع کی مصنوعیت کو محسوس نہیں کیا۔

تاثر آفرینی کے اعتبار سے بھی رضیہ فصیح احمد کامیاب ہیں بخصوصیت شاہدہ اور ہونا کی دھوپن کی اموات کو انتہائی موثر تکنیکی انداز میں قلمبند کیا گیا ہے اور قاری پر بھی یہ اموات گہرا تاثر چھوڑتی ہیں۔

ناول کی ایک اور قابل ذکر خوبی اشاریت ہے۔ رضیہ فصیح احمد تقسیم ملک کے بعد مسلمانوں کے زوال کو چند جملوں میں کرکے آگے بڑھ جاتی ہیں۔ ورنہ اس موضوع پر تو مصنفین نے پورے پورے ناول لکھ دئے ہیں۔ ویسے رضیہ فصیح احمد کا موضوع یہ نہیں تھا مگر وہ کم از کم دس بارہ صفحات تو ضرور اس اجمال کی تفصیل میں لکھ سکتی تھیں۔ اگر وہ ایسا کرتیں تو فنی طور پر ناول میں ایک خامی رہ جاتی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رضیہ فصیح احمد ناول کے فن سے کتنی واقفیت رکھتی ہیں۔

مظفر حنفی

غزل

(محترم اعجاز صدیقی کے نام بمبئی کی غزل سے متاثر ہو کر یہ غزل کہی گئی ہے)

پھولوں کے، عندلیب کے، میرے، کلی کے زخم
رِسنے لگے ہیں موسمِ گُل میں سبھی کے زخم

"غیروں سے مستعار" اُجالوں کو کیا کریں
آنکھوں میں پڑ نہ جائیں کہیں روشنی کے زخم

اربابِ کم نظر سے کہو "احتیاط" ہے
یوں دیکھنے کی چیز نہیں زندگی کے زخم

خود اپنے حال پر ہی توجہ نہ کر سکے
ہم نے کسی کے داغ گنائے کسی کے زخم

فرصت کہاں کہ غور کروں بیٹھ کر کہیں
راہِ حیات کے ہیں کہ تیری گلی کے زخم

رُودادِ غم سُنا کے پریشان ہوں بہت
بے حد کسک رہے ہیں تمہاری ہنسی کے زخم

پوچھیں گے آپ "کیوں یہ شبستاں جلا دیئے"
ہم آپ کو دکھائیں اگر تیرگی کے زخم

یعنی مجھے حساب چکانا ہے عمر بھر
یہ دشمنی کے زخم ہیں، یہ دوستی کے زخم

کوشاں رہے ہیں ہم کہ نہ اوروں کو دیکھ لے
آئینۂ غزل میں ہماری صدی کے زخم

ہاتھوں میں ہے ادب کے "نمکدانِ بے رُخی"
صفحات پر پڑے ہیں مری آگہی کے زخم

وہ وقت آ لگا ہے مظفر کہ الحذر
اتنے کبھی حقیر نہ تھے آدمی کے زخم

شاعر بمبئی

رفیعہ شبنم منچری (بمبئی)

افسانہ :-

جلتی آنکھیں

وقار کی آنکھیں کھلی ہی رہ گئیں۔ اس نے برا سا منہ بنایا، جیسے ابکائی آگئی ہو۔ دروازے کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی دو جلتی آنکھیں اس کا استقبال کر رہی تھیں۔ آٹھ سال کے طویل عرصے کے بعد جب وکی نے اپنی جانی پہچانی سرزمین پر قدم رکھا اور گلی کے مسکراتے ہوئے ذرّوں نے خوش آمدید کہہ کر اس کا استقبال کیا تو اس کا دل نہ جانے کتنی آرزوؤں اور امیدوں سے جگمگا اٹھا۔ آج سے آٹھ سال پہلے کے گوناگوں واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے سمٹ آئے۔ اور وہ نہ جانے کس خیال سے آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ اور پھر جب اس نے دروازے پر دستک دی تو یہی سوچ رہا تھا کہ ہمیشہ کی طرح چچی جان بڑبڑاتے ہوئے اٹھیں گی اور دروازہ کھولتے ہی اس کی بلائیں لینا شروع کر دیں گی۔ لیکن ——— چند ہی لمحوں بعد جب دروازہ کھلا تو اس نے برا سا منہ بنا لیا۔ سارا موڈ آف ہو کر رہ گیا۔ وہی دو مخموس جلتی آنکھیں اس کا استقبال کر رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ اندر داخل ہو گیا۔

"ہائے اللہ وکی بھیا!" جلتی آنکھوں کے نیچے ہلتے ہوئے دو ہونٹوں نے تعجب کا اظہار کیا۔

"کون وکی؟" چچی جان کی آواز آئی اور ان کے قدموں کی چاپ باورچی خانہ سے دالان کی طرف تیزی سے بڑھی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں وکی کی بلائیں لینے لگیں۔ اور پھر کسی کو آواز دی۔

"شبّو! ارے او شبّو! سنتی ہو، دیکھو اپنا وکی آیا ہے۔" زینہ پر زور دار دھڑ دھڑ ہوئی جیسے کوئی تیزی سے اترا ہو۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ اور کچھ دیر کے بعد وکی کی نگاہیں اور پرائیں۔ شبانہ اپنے پورے جسم کو دوپٹے میں لپیٹے وکی کے سامنے نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اور وکی کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ گورا رنگ، بڑی بڑی موٹی موٹی آنکھیں، مسکراتے ہوئے لب اور اوڑھی ہوئی سنہری زلفیں، یہ تھا اس کے آٹھ سال کے تصورات کا حسین مجسمہ، لانبی، خمدار پلکیں آہستہ سے اٹھیں، فراخ پیشانی تک پہنچیں اور نازک سی آواز آئی، "آداب عرض ہے"

"آداب عرض" وکی نے مختصر سا جواب دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی آواز دور، بہت دور سے آئی ہو، اور پھر خاموشی چھا گئی۔ ایک طویل خاموشی۔ یکایک بے ہنگم قہقہے نے دونوں کا طلسم توڑ دیا۔ شبّو چونکی اور شرما کر بھاگ گئی۔ وکی نے گھبرا کر سر اوپر اٹھایا۔ پھر جلتی آنکھیں دروازے کی اوٹ سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد دوسری دو آنکھیں بھی اس کا ساتھ دینے لگیں۔ اور جب پورا چہرہ دروازے سے جھانکنے لگا تو وکی کو یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ وہ رُوبی ہے۔ "کیوں اور رُوبی کی بچی" ——— کیا میں آداب بھی نہ کروں گی۔" وکی نے بیٹے ہی بیٹے ہانک لگائی۔ اور پھر دیوانہ ایک دھماکے کے ساتھ کھل گیا۔ دروازے کے ساتھ ہی دونوں دھم سے وکی کے قدموں کے قریب گر گئیں۔ وکی نے جھک کر اپنے قدموں میں گرے ہوئے چہرے کو تھامنا چاہا، تو اس کا ہاتھ رکا کا رکا ہی رہ گیا۔ وہی جلتی آنکھیں اس کے قدموں میں سلگ رہی تھیں۔ اف! ایک لمحے کیلئے

وہ سر سے پیر تک کانپ گیا۔

دو جلتی آنکھیں ـــ جیسے کسی قبرستان میں سرخ مرمریں دیئے جل رہے ہوں۔ یا دو آسمان کی تاریک فضاؤں میں دو مدھم ستارے ٹمٹما رہے ہوں۔ وکی نے لرز کر آنکھیں اٹھائیں تو اس وقت تک گرنے والے سنبھل چکے تھے۔ لیکن وکی کی روح کی گہرائیوں تک ایک عجیب ہیبت ناک اور پُراسرار خوف رچا بس گیا تھا۔

ہمیشہ ہی سے وہ ان آنکھوں سے ڈرتا اور نفرت کرتا رہا تھا۔ بچپن ہی سے، جب اس کے والد اور چچا جان اسی حویلی میں ساتھ رہتے تھے اور جب وہ شبانہ، روبی، اسلم اور شاذی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ شاذی۔ اخروٹ و دھشت کی ایک عجیب سی لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ سانولی سلونی، اور دبلی پتلی سی وہ لڑکی، جس سے اسے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔ سامنے آتی تو اس طرح گھورتے ہوئے جیسے اس کا کوئی مر مر گیا ہو۔ اور ایسی منحوس کہ کبھی کوئی خوشی کی خبر موصول ہی نہ ہو سکے۔ وکی کو تو اس کے ساتھ کھیلنا بھی گوارا نہ تھا۔ کیسی عجیب ہے یہ لڑکی بھی۔! وکی اکثر سوچا کرتا تھا اور آج بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اس نے اکثر یہ سوچا تھا کہ جب اس کی شبّو دلہن بن کر اس کے گھر آئے گی اور جب وہ پھولوں میں لدا پھندا داماد بن کر چچا جان کی حویلی میں قدم رکھے گا تو داماد کی حیثیت سے وہ صرف اتنا حق مانگے گا کہ جب وہ سسرال میں قدم رکھے تو ان جلتی ہوئی منحوس آنکھوں کو اس کے سامنے سے دور بہت دور کر دیا جائے۔ صوفے کے ہتھے پر ہاتھوں کے سہارے اپنے سر کو ٹکائے وہ یہی سوچ رہا تھا اور اسی خیال میں وہ ایک لمحہ کھوئے اونگھ گیا۔ کچھ دیر بعد تپائی پر سے رسالہ گرنے کی ایک ہلکی سی آواز سے چونک کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ تو شبّو کو اپنے قریب پایا۔ سرخ دوپٹے میں لپٹی لپٹائی سر کو ڈھانپے، رسالہ اٹھانے کی غرض سے جھکی ہوئی شبّو کی پیٹھ وکی کی جانب تھی۔ وکی کو ایک شرارت سوجھی، اس نے دوپٹے کے آنچل کو سر سے کھینچ لیا۔ "ہائے اللہ!!" ایک ہلکی سی چیخ کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ وکی سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ دوپٹہ سر سے گرتے ہی وہ مڑی۔ اور وکی نے برا سا منہ بنا لیا۔ وہی دو جلتی ہوئی آنکھیں ـــ اسے تعجب اور نفرت سے گھور رہی تھیں۔

"معاف کرنا شاذی" میں سمجھا، میں سمجھا کہ شبّو ہو گی۔" وکی نے بمشکل اپنا جملہ پورا کیا اور گھبرا کر کمرے سے نکل گیا۔ لیکن اب بھی اس کی نگاہوں کے سامنے وہ جلتی ہوئی ویران آنکھیں تھیں۔ اور اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

وہ اٹھا کہ شبّو کے کمرے کی جانب مڑا۔ اور اس کی میز پر بکھری ہوئی کاپیوں میں اس نے ڈرائنگ پنسل سے یوں ہی آڑے ترچھے خطوط گھسیٹنے لگا۔ میز کے کونے پر رکھی ہوئی شبّو کی تصویر مسکرا رہی تھی اور وہ کاغذ پر شبّو کا اسکیچ بنانے میں مصروف تھا۔ اور جب اسکیچ مکمل کرنے کے بعد اس نے نظریں اٹھائیں تو جھنجھلا کر رہ گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے کاغذ کی دوسری جانب سے وہ جلتی ہوئی آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ دو بھڑکتے، سلگتے انگارے!! اس نے جھنجھلا کر تصویر پھاڑ دی۔ پرزے ہوا میں اچھال دیئے اور شبّو کے تبسم پر نظریں جمائے حسین تصورات میں کھو گیا۔ بہت دیر تک وہ یوں ہی شبّو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھا رہا اور پھر ایک مٹھی سرمئی سی ہنسی کی کھنک نے اس کے کانوں میں امرت گھول دیا۔ پھر ایک جانی پہچانی سی خوشبو اسے اپنے قریب محسوس ہوئی۔ وہ چونک کر پلٹا۔ اس کی کرسی کی پشت کا سہارا لے شبّو مسکرا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ہنس دی۔ موتیوں کی صاف و شفاف لڑی بن کر ٹوٹ گئی۔ وکی نے ایک عجیب سے جذبے کے تحت شبّو کی لانبی گھنی پلکوں والی آنکھیوں کے سروں کو آہستہ سے دبا کر چھوڑ دیا۔

"انٹرویو کیا ہوا؟" ـــ کچھ دیر بعد شبّو نے پوچھا۔ اور وکی نے ایک قہقہہ ہوا میں اچھال دیا۔

"ہونا کیا ـــ وہی ہوا جو پچھلے چار انٹرویوز میں ہوا؟" ـــ "یعنی؟" شبّو کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ رخساروں کی سرخی کم ہو گئی "یعنی یہ کہ ـــ" وکی نے ہنستے ہوئے اپنی آنکھیں شبّو کی آنکھوں کی نیلی جھیل میں ڈبو دیں۔ "یعنی یہ کہ انھوں نے اپنا کام کیا اور میں نے اپنا۔" "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔" شبّو کی آواز دب کر رہ گئی۔ "مطلب یہ کہ ـــ" وکی نے پہلو بدلا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "انھیں اونچے درجے کی سٹارٹر شپ کی ضرورت تھی۔ میں نے لوئر گریڈ کی کوالیفکیشن پیش کی۔ انھوں نے سفارش قبول کر لی۔ کوالیفکیشن ٹھکرا دی، نتیجہ یہ ہوا کہ تاجر نے اس حویلی کی راہ لی اور ایک عمر ڈگلاس گریجویٹ نے ایک اعلیٰ درجے کی کرسی سنبھالی۔" وہ ہنسا۔ مگر شبّو خاموش ہو گئی۔

اُس کے چہرے پر پسینا ہی پسینا ہو گیا اور وہ مرعوب قدموں سے چلتے ہوئے باہر نکل گئی۔ وکی نے دروازے میں کھڑے کھڑے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ لیکن اچانک اس کے قہقہے کو جیسے بریک لگ گیا۔ آخری زینہ کے قریب، دروازے سے کچھ فاصلے پر وہی دو جلتی آنکھیں اُس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ جھنجھلا کر اندر چلا آیا۔ اور صوفہ پر ڈھیر ہو گیا۔

پتہ نہیں کتنی دیر بعد جب کسی نے شانوں کو جھنجھوڑ کر اُسے جگانے کی کوشش کی تو وہ چونک اُٹھا۔ اور آنکھیں جگانے والے کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ سالو لا سامان اور سپاٹ چہرہ، جس میں کوئی حسن نہ تھا، سیاہ زلفیں اور دو جلتی ہوئی آنکھیں۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ "کیا بدتمیزی ہے۔" اُس نے پڑھے پڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "معاف کیجئے۔ ابو جان نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔" جلتی آنکھیں اُٹھیں اور وہ ویران سے چراغوں کی لویں تھرتھرانے لگیں۔ وکی نے اُن آنکھوں کو اتنے قریب سے پہلی بار دیکھا تھا۔ ایک عجیب سی سنسناہٹ اُس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ وہ چپ چاپ اُٹھ بیٹھا۔ تقریباً چار بج رہے تھے۔ عصر کی چائے کا وقت ہو چکا تھا۔ اور چچا جان میز پر خلافِ معمول اُس کے منتظر تھے۔

اور چائے کا تلخ گھونٹ اُس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ جیسے زہر ہو۔ کپ اُس کے ہاتھوں سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ "کوئی بات نہیں۔" اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ "میں اُسی میں خوش ہوں، جس میں شبّو اور آپ سب خوش ہیں۔" اس نے بمشکل اپنے لبوں کو جنبش دی۔ اور بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

ساری کائنات اُسے گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ چاروں طرف جیسے تاریکی ہی تاریکی چھا گئی۔ وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں میں سر کو چھپائے بہت دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا۔ آنسو اُس کی ہتھیلیوں پر ٹپکتے رہے۔ اور شام کا دھندلکا بڑھتا گیا۔ اچانک کسی نے اس کے کمرے کا بلب آن کر دیا۔ اُس نے چونک کر سر اٹھایا۔ تو دروازے کے قریب وہی دو جلتی آنکھیں نظر آئیں۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ دو دیئے اس کی اپنی حسرتوں کے مزار پر جل رہے ہوں۔ آج ان دیوٹیوں کی روشنی سے زیادہ مدھم نظر آئی۔ پھیکی پھیکی بے رونق اور خوفناک ——— اور پھر وہ دُور جا کر غائب ہو گئے۔ اس نے سوچا ایک بار جا کر شبّو سے خود ہی بات کرے۔ آخر اس میں کون سی کمی تھی جو شبّو نے اُسے ٹھکرا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ شبّو کے کمرے کی طرف بڑھا تھا، لیکن کمرے میں داخل ہونے کے بعد اُس کی بچی کھچی آرزوؤں پر بھی اوس پڑ گئی۔ وہاں شبّو نہ تھی۔ وہ سب معمول اس کمرے کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ غیر ارادی طور پر اُس نے ڈرا گھسیٹ لیا۔ اور سامنے ہی لگا ہوا کاغذ میں الجھی ہوئی شبّو کی تصویر پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ "وکی!۔ مجھے معاف کر دو، میں تمہاری آرزوؤں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ زندگی میں محض ہنسی، دل لگی اور حسین آرزوؤں کے متعلق سوچنے آ جانے ہی کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ حقائقِ زندگی کا سلسلہ جب شروع ہوتا ہے تو ساری آرزوئیں، سارے خواب اور ساری تمنائیں محض ایک خیالی نقطہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ اور حالات کی تلخی زندگی میں زہر گھول کر رکھ دیتی ہے۔ اس سے قبل کہ حالات کی یہ تلخی میری زندگی کو زہرناک بنا دے میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے۔ آج کی دُنیا میں کوئی تمہاری کفالت کا بیڑا نہیں اٹھانے والا نہیں۔ تم اپنی کوالیفکیشن کا جائزہ لو گے اور یہاں حقائقِ زندگی تمہیں کاغذ کا ٹوٹا بنا کر رکھ دیں گے۔ یوں بھی میں اونہہ کو تم سے بہتر سمجھتی ہوں جو صرف ایک گریجویٹ ہے لیکن آج ایک اعلیٰ پوسٹ پر فائز ہے۔"

اور وکی کی آنکھیں خود بخود جل اٹھیں۔ اس کی پلکوں پر کچھ ستارے جگمگائے اور لڑھک گئے۔ ایک آہ اس کے سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔ بڑی پھرتی سے وہ اپنے کمرے میں آیا۔ جلدی جلدی اس نے اپنے کپڑے سوٹ کیس میں ٹھونسے، جیسے تیسے خود کو سنبھالا اور زینہ طے کر کے چچا جان کے پاس پہنچا جب وہ باورچی خانہ سے باہر نکلا تو اُس کے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس تھا اور دوسرا ہاتھ اپنے بالوں پر پھیرتا ہوا وہ بوجھل قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چچا جان بھی باورچی خانہ سے نکلے تھے۔ شاید انہیں اپنی شکست کا احساس ہو گیا تھا۔ اچانک شبّو پر اس کی نظر گئی۔ زرتار ساری میں لپٹی لپٹائی یہ سرخ کلی اُسے کچھ زیادہ ہی جاذبِ نظر دکھائی دی۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے لگا۔ اُس نے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ دروازے پر ایک زوردار "دھڑاک" کی آواز آئی۔ وہ چونک کر پلٹا۔ بلّے کی طرح دروازہ کی اوٹ سے دو جلتی ہوئی آنکھیں اُسے دیکھ رہی تھیں۔ ٹمٹماتے ہوئے دو ویران دیئے، مدھم سے جگمگاتے ہوئے دو ننھے منّے جگنو!! ایک لمحہ کے لئے وہ ان آنکھوں

(بقیہ صفحہ ۳۸ پر دیکھئے)

شمس فرخ آبادی

محرومی

میں نے اِس عالمِ تلخ و زہراب کو،
اپنے افکار کی روشنی، نغمگی، دل کشی بخش دی
زندگی مضمحل تھی مگر، میرے افکار سے صورتِ جبیں مسکرانے لگی
گنگنانے لگی،
یہ زمیں، ایک حسیں، دل نشیں گلستاں بن گئی
میں بھی افکار کی وسعتوں میں نہ جانے کہاں کھو گیا
ذہن و دل پر مرے کیف سا چھا گیا،
نیند سی آ گئی
اور جب نیند سے،
میری آنکھیں کھلیں،
میں نے دیکھا مرا گلشنِ رنگ و بُو، عالمِ خوب رُو
ایک ویران سا غم کدہ بن گیا !!!

فیروز نما

بیزاری

(شکسپیئر کی "میڈرنگل" کا ترجمہ)

اِن ہونٹوں کو لے جاؤ پرے
لے جاؤ پرے اِن ہونٹوں کو
جن ہونٹوں کی کھائی تھی قسم
یہ آنکھیں ہٹا لو آگے سے
یہ آنکھیں جو ہیں رشکِ سحر
جو صبح کو بھی گمراہ کریں
پر واپس کر دو وہ بُوسے
ہاں وہ بُوسے واپس کر دو
وہ بُوسے جو ہیں مُہرِ وفا
وہ بُوسے جو بے کار گئے
بے کار رہ گئے، بے کار گئے

شاعر بمبئی

ڈاکٹر گیان چند

۱۹۶۵ء کی قابلِ قدر ادبی تخلیقات شعری ادب میں

۱۹۶۵ء کے پُرآشوب سال میں اُردو کے نگار خانے میں متعدد ارژنگِ سخن سجائے گئے۔ اِن کے نقش گروں میں فیضؔ، سردارؔ جعفری، خلیل الرحمٰن اعظمی، اختر انصاری دہلوی، نثار بارہ بنکوی، شفیق جونپوری، منشی نوبتدائے نظر، منیب الرحمٰن، شہریار، اور اختر اورینوی کے علاوہ عزیز ناوک نے تیرے صیدِ نیم جاں ڈھونڈ لانے میں، ولی کلیم الدین احمد بھی ہیں۔ فرصتِ تنگ حوصلہ کے چند لمحے مجھے میسّر ہیں اُن میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کروں گا۔ یعنی آپ کے سامنے قابلِ ذکر شعری مجموعوں کا تعارف پیش کرتا ہوں۔ گو یہ تعارف ایک تنگ خط انداز ہی سہی۔

اپنی دیدہ زیبی کے سبب ہندستانی بک ٹرسٹ بمبئی کی کبیر بانی سب سے پہلے دامنِ دل کھینچ لیتی ہے۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر ملک راج آنند اور سردار جعفری ہیں۔ اس میں کبیر کی ۲۰۰ منتخب نظمیں اُردو اور ہندی دونوں خطوط میں چھاپی گئی ہیں۔ سردار جعفری نے ایک عالمانہ دیباچہ تحریر کیا ہے۔ آخر میں چند حضرات نے حواشی درج کئے ہیں۔ ہندستانی بک ٹرسٹ کا مقصد اُردو اور ہندی بولنے اور پڑھنے والوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا اور طباعت کے معیار کو بلند کرنا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب دونوں مقصدوں میں بدرجۂ اتم کامیاب ہوئی ہے۔ کاغذ اور طباعت کا معیار ایسا ہے کہ کبیر بانی کو مرقعِ چغتائی کے پہلو میں جگہ دینا ہوگی۔

ہندستانی بک ٹرسٹ نے ایک اور اسکیم کے تحت بارہ جلدوں میں جدید اردو ادب کا انتخاب پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بتفصیل یہ ہے۔ رباعیاں، غزلیں، نظمیں، افسانے، دو دو جلدوں میں، ناولٹ دو جلدوں میں، طنز و مزاح، تنقید دو دو جلدوں میں۔ یادیں یعنی آپ بیتی اور سفرنامے اور بارھویں جلد میں نئے ادب کے معمار۔ ٹرسٹ اپنی روایت کے مطابق اگر اس جلد کو اردو کے علاوہ ہندی میں بھی شائع کردے (وہ علاوہ جلدوں میں بھی) تو اردو اور ہندی دونوں کے حق میں مفید ہو۔ انتخابی سلسلے کی پہلی کتاب رباعیاں ۱۹۶۵ء میں سامنے آئی جو حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن دونوں کے اعتبار سے دعوتِ نظر ہے۔ عجلسِ ادارت مزاق، خدیجہ عظیم اور معنی عباسی پر مشتمل ہے۔ سردار جعفری نے رباعی کی تنگنائے پر ایک دیباچہ لکھا ہے۔ مجموعے میں آسی غازی پوری، جگت موہن لال رواں، محروم، یگانہ، فانی، فراق، اور جوش شامل ہیں۔ حیرت ہے کہ رباعی کو انجد حیدر رباعی کو اس بزم میں کیوں دھکیل دی گئی۔ جگت موہن لال رواں کی ایک رباعی محلِ نظر ہے اس میں مطلع تو ہیں مگر رباعی کی بحر میں ہے۔

اپنے ساقی سے کل یہ پوچھا میں نے — کتنے مے خوار تشنہ لب آتے ہیں
بولا کہ مقدرات ہیں بادہ و ظرف — آنے کی اگر کہو تو سب آتے ہیں

اس سال کا یادگار مجموعہ سردار جعفری کا ایک خواب اور ہے جس میں نظموں کے علاوہ کچھ غزلیں بھی ہیں۔ حسبِ معمول نظموں میں گرمیٔ عمل کی رَو، محنت کا پگھلتا لاوا اور ترقی کا جیالتا منار دوڑ رہا ہے۔ ملاحظہ ہو ہاتھوں کا ترانہ ؎

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں

اِن ہاتھوں کو تسلیم کرو
تاریخ کے اور تمدنوں کے بہتوں کی روانی اِن سے ہے
دنیا کا فسانہ اِن سے ہے انساں کی کہانی اِن سے ہے
تہذیب کی اور تمدّن کی ہر لمحہ رجوانی اِن سے ہے
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

اُن کی غزلیں بھی روایتی نہیں۔ اِن میں بھی زندگی کے تجربے اور مشاہدے تڑپ رہے ہیں ؎

ابھی تو اور دروں کے دریچہ پوش تھی اب اپنے سایۂ دیوار و در کی خیر مناؤ

ساتھ ہی، سردار نے اُس آفاقی جذبے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جو بقول میرؔ: زمین آسمان میں بھرا ہے جس کی آگ انسان کو خاکی سے نوری کر دیتی ہے۔ اِس طرح سردار کی غزل اور نظم میں زیادہ مغائرت نہیں رہتی۔

۱۹۶۵ء کے شعری ادب میں ایک بہت خوشگوار اضافہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں ۳۷ غزلیں اور ۲۸ نظمیں ہیں جو اعظمی اور اس کے دور کی ذہنی سرگذشت ہیں۔ نئی غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے کاش میں نہ ساز حقیقت کو چھیڑتا وہ دل نواز اک خلش جستجو گئی
ابھی تک یاد آتے ہیں کچھ ایسے اجنبی چہرے جنھیں دیکھے تو کوئی دیکھکر تکتا ہی رہ جائے

اعظمی کی بہت سی نظمیں علامتی ہیں۔ اُن کے ایک ہم سبق نے اُنھیں نصیحت کر دی تھی کہ "جب تک اپنا مجموعۂ کلام چھپوا نا لو ان نظموں کے ساتھ ان کی شرح بھی شائع کر دینا"۔ اِس بار کہ کی طنز نے اُنھیں بے راہ روی سے بچا لیا۔ چنانچہ جہاں اُن کی نظمیں ان کے ماضی کے دھندلکوں، احساسات کے لمحوں اور تنہائی کے دیرانوں سے دوچار کر دیتی ہیں وہاں اِس حد تک مبہم نہیں کہ نظم اور عنوان کی چول ہی نہ بٹھائی جا سکے۔

ملگڈھ کے افق سے ابھرنے والا ایک اور تابندہ ستارہ شہریار کا مجموعۂ کلام اسم اعظم ہے۔ شہریار کی نظمیں صحیح معنی میں خلوت زدہ ان کے ذہن اور سینوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ سوچنے والا پراگندہ روزی پراگندہ دل نوجوان جو ترقی پر عقیدہ رکھتا ہے راہِ عمل میں گامزن ہونا چاہتا ہے لیکن سنگلاخ راستے کے ساتھ اتحاد کھڑا دیکھ کر اندیشہ ہائے دور دراز میں کھو جاتا ہے۔ ایک تین مصرعوں کی نظم ملاحظہ ہو ؎

سرو شاخوں پہ اوس کے قطرے
ہیں ابھی محوِ خواب، اور سورج
رتھ پہ اپنے سوار آتا ہے

اور غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں، ایک میں احساسِ تاریکی، دوسرے میں نور کی برتری ؎

یہ کیا جگہ ہے دوستو یہ کون سا دیار ہے حدِ نگاہ تک جہاں غبار ہی غبار ہے
ہجر کی شب ہو یا وصال کی شب شب کو نسبت نہیں سحر سے کوئی

سالِ گذشتہ اردو شعر کو علی گڈھ کی دین معمول سے کچھ زیادہ ہی رہی۔ منیب الرحمٰن کا مجموعۂ کلام بازدید انجمن ترقی اردو ہند نے ٹائپ میں شائع کیا ہے۔ منیب الرحمٰن بھی عبید و قمر کے مفکر معتبر شاعر ہیں۔ مجموعے کی پہلی نظم خواب کا آخری مصرع ہے ع میں اکیلا تھا اکیلا ہی رہا۔ ایک اور نظم "ایک رات" کی ابتدا؛

زندگی اک خلائے لامحدود دور تک اک عمیق تنہائی
آہ ہم کس قدر فسردہ تھے

اقبال کے رنگ میں منیب الرحمٰن نے ایک منثور ساقی نامہ لکھا ہے۔ ذیل کے اشعار کس کی طرف چشمک زن ہیں۔

وہ پیرِ فسوں ساز مرد خبیر نظر بندیوں میں تھا جو بے نظیر

بتایا کیا اُن کو ماضی کے رمز سنا تا رہا قصّہ ہائے حجاز
ہوا رہ گیا اضطراب تو نہیں ٹھہرتا پتا یہ چلا نوشتے میں زہر تھا

یہ پیر فسوں ساز کہیں اقبال ہی نہ ہو۔

کتاب کا پبلیکیشنز رام پور نے معیاری لوب ارزاں قیمت کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اُس میں حنیف احمد حنیف کا تحریر حرف" جولائی ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ یہ حنیف کے اس وقت تک کے کلام کا کلیات ہے لیعنی اس میں اُن کے آخری مجموعے "دست تہہ سنگ" کے بعد کی بھی دو چار نظمیں ہیں۔ حنیف آزاد نظم کی آبرو ہیں۔ اُن کے یہاں خیال شاعری کی بے راہ روی نہیں ملتی لیکن پہلی نظم "آج کے نام اور آج کے غم کے نام" میں بعض مصرعوں کی جگہ تبدیل ہو جانا کھٹکتا ہے۔ پوری نظم بحر متدارک میں ہے لیکن پہلے مصرعے اور تیسرے دوسرے مصرعوں کی بحر کچھ اور ہے۔

کارکنوں کی افسردہ جانوں کے نام

وہ معصوم جو بھولپن میں
وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن
بیواؤں کے نام

آزاد نظم میں بحر کے ارکان کی کمی بیشی جائز ہے لیکن بحر کا بدل جانا بے اصولی ہے۔

کیسے معلوم نقاد کسی وقت کلیم الدین احمد بھی شعر فرمانے لگیں گے۔ ان کے مجموعے کا نام ۲۴ نظمیں" جس قدر غیر شاعرانہ ہے رنگ اور سپاٹ ہے کچھ ایسا ہی ان کی نظموں کا حال ہے۔ مجموعے کی بیشتر نظمیں معرّیٰ ہیں کچھ آزاد نظمیں بھی ہیں۔ لیکن زیادہ تر ذہنی ورزش معلوم ہوتی ہیں۔ نظر کرین کھاتے مصرعے، کمزور قافیے خام خیالات، کسی نظم میں اتنی شعریت نہیں کہ ایک بار پڑھنے کے بعد وہ دوبارہ قاری کے دل احساس کو کھٹکھٹائے۔ کلیم الدین احمد کی تنقید کا معیار کل نظمی توصیف میں پوست کندہ ہو جاتا ہے۔ ان کی نظموں کا استقبال بھی کچھ اتنہ سے زیادہ امید افزا نہیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں تو ک چند محروم کے مجموعۂ خرمیان شعلہ نوا اور جگن ناتھ آزاد کے مختصر مجموعے ماتم تہرو کے دوسرے ایڈیشن شائع ہوئے۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اور ڈاکٹر محمود حسین خاں نے شمالی ہند کے پہلے مستند اردو شاعر محمد افضل فضلی متوفی ۱۳۵۵ھ کی بکٹ کہانی شائع کی اس کتاب پر ۱۹۶۵ء درج ہے لیکن یہ دراصل ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ یعنی یہ تینوں کتابیں چار سال کے وقفے سے باہر ہیں۔ ان کے برعکس خمار بارہ بنکوی کی آتش تر پر سن طالبات نومبر ۱۹۶۶ء میں آ جانا تھا لیکن یہ ۱۹۶۸ء میں منظر عام پر آئی۔ محض غزلوں کا مجموعہ ہے۔ تین شعر ؎

مجھے قبول دو عالم کی ظلمتیں یارب اجالا ہو کبھی ان کی انجمن سے دور
مجھ گئی آنکھوں کی پیاس بڑھ گئیں دنیائیں حسن فنا ہو گیا سامنے آنے کے بعد
غلط کہ رنگ نہ لایا لہو شہیدوں کا بہار آئی تو لیکن مرے چمن سے دور

نیول اور چراغ حسرت موہانی کے شاگرد حقیقی جو نپوری مرحوم کا ضخیم انتخاب کلام ہے جو زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے، ہر شعر سے ان کی قدرت کلام اور پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک نظم پیشہ مولوی کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

اور الیکشن کا زمانہ ہو تو پھر کیا پوچھنا میکشوں میں مژدۂ تسنیم و کوثر دیکھئے
اللہ اللہ مستی تقویٰ فقیہہ قوم کی۔ جھومتا ہے بے پئے بالائے منبر دیکھئے
اے معاذ اللہ تجارت واعظانِ شہر کی بیچتے پھرتے ہیں دستارِ پیمبر دیکھئے

حالی نے مسدس مدوجزر اسلام لکھا تھا۔ بلدیو راج سوداؔ نے اسی بحر میں مسدس چند نامہ لکھ کر شائع کیا۔ پاکستانی حملے پر انجمن ترقی اردو لکھنؤ نے رزمیہ نظموں کا مجموعہ شمشیر و سناں مرتب کیا جس میں آنند نرائن ملّا، سردار جعفری، اوز ماہری، عرش ملسیانی، آزاد، سلام، شاذ تمکنت رفعت سروش، ناز قادری، پرتاب گڑھی، خمار بارہ بنکوی، وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ میرے پیش نظر تین اور مجموعے عمر انصاری کا "سانیٹ خونیں"، رام رتن بھٹناگر کا "نشتر نظر" اور منوہر لال طالب کا "برگ سبز" ہیں۔ ان کے علاوہ ذیل کے مجموعے بھی اگلے برس کی دین ہیں لیکن میرے نظر

(باقی صفحہ ۳۹ پر دیکھئے)

قیصر شمیم

غزل

میخانے کی یہ اچھی تنظیم ہوئی
ساغر ساغر تشنہ لبی تقسیم ہوئی

قلتِ مہبا کا یہ اثر تھا رندوں پر
رسمِ تنک بخشی کی بڑی تعظیم ہوئی

سرکش ہونا اہلِ وفا نے سیکھ لیا
تجھ سے جب توہینِ سرِ تسلیم ہوئی

اوّل اوّل دل کی خلش تھی گوشہ نشیں
آخر آخر شورشِ ہفت اقلیم ہوئی

مشرق و مغرب ایک ہی دل کی گونجیں تھے
بوالہوسی میں یہ دنیا تقسیم ہوئی

آخر قیصر دیدہ و دل بیباک ہوئے
اور نصابِ شوق میں کچھ ترمیم ہوئی

کوشن موہن

غزل

رنگِ روئے روشن سے، زہرِ باطن کو مت ڈھانپ
کتنا بھی رنگیں ہو سانپ، دیکھ کے دل اٹھتا ہے کانپ

تو ہے اب کتنی معصوم، میں ہوں اب کتنا مسموم
پہلے تیری زلفیں تھیں، اب میرے جذبات ہیں سانپ

کون اپنی کمزوری کو، ظاہر ہونے دیتا ہے
غم کی معصومی سے ہم، اپنی ہوس لیتے ہیں ڈھانپ

زیست کا ہے کیسا یہ سفر، جانے کب آئے منزل
پھول گئیں سانسیں اپنی، ہم تو گئے اس دوڑ میں ہانپ

آج اچانک ملنے پر، مسکائی ہے سوچ تری
آنکھ کو آنکھ نہ پہچانے، دل کو دل جانا ہے بھانپ

جنم جنم کا رشتہ ہے بھول تو ہے اک وقتی شے
جب بھی ملیں گے ہم دونوں، دل کو دل جائے گا بھانپ

مناظر عاشق ہرگانوی

نثرِ سیمابؔ — "حیاتِ داغؔ"

اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو علامہ سیمابؔ کو ادب کے ہر شعبہ سے شغف تھا۔ اور اُن کی ہمہ گیر طبیعت کسی بھی ادبی موضوع پر بند نہ تھی۔ اردو زبان اور ادب کی خدمات کے لحاظ سے سیمابؔ کا جو مرتبہ ہے اُس میں کچھ کلام نہیں۔ آپ کی نثر، بے تکلفی ہے۔ اندازِ بیان صاف اور سادہ، بُرجستہ اور پختہ ہے۔ تحریر میں حد درجہ شگفتگی ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی سے عبارت کو پُرلطف بنانے میں آپ کو خاص ملکہ ہے۔ اور بقول راز چاندپوری "مولانا ــــ نے ذہن رسا اور ہمہ گیر طبیعت پائی تھی۔ وہ ہر موضوع پر نظم و نثر بدقت تکلف اظہار خیال کر سکتے تھے۔ اور اکثر و بیشتر قدرے غور و تامل کے بعد قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ زود گوئی اور زود نویسی میں وہ اپنے وقت میں منفرد تھے۔ انھوں نے اتنا سرمایۂ نظم و نثر اپنی یادگار چھوڑا ہے کہ بیک وقت اُس کا احاطہ کرنا دشوار ہے[1]۔"

سیمابؔ کے سرمایۂ نثر میں "حیاتِ داغؔ"[2] کی اہمیت میری نظر میں بہت زیادہ ہے۔ اس صفحے (ضخامت ۵۴ صفحات ہے مگر بعد کے چار صفحات پر اشتہارات ہیں۔) کی اس کتاب کو "معلومات کا مخزن" کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ دبیر الدولہ مدبر فصیح الملک، نبیلِ ہند محبوب جنگ ناظم یار جنگ ستاد السلطان، جہان استاد[3] نواب مرزا خاں صاحب داغؔ دہلوی کے حالات کو ایک شاگرد ہونے کی حیثیت سے سیمابؔ نے جس خلوص سے پیش کیا ہے اور بعض جگہ جس طرح تنقید کی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہونے کے ساتھ اپنی جگہ مسلّم ہے۔ نیز اس میں بیان کردہ واقعات جو دوسرے مذکروں سے مختلف ہیں، معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ اُن کی صحت میں اب شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ دیباچہ میں علامہ سیمابؔ فرماتے ہیں۔

"یہ ایک ایسے باکمال اور آفتابِ شاعری کی سوانح عمری ہے جس کے فیض کی کرنیں سارے ہندستان میں پھیلی ہوئی ہیں اور جو بحیثیت ایک شاعر کے دنیا میں قیامت تک کے لئے اپنے کمالات اور سخنوری کے اوراکات کی ایک روحانی یادگار قائم کر گیا ہے۔

آج اہلِ نظر کی ہندستان میں کمی نہیں، اس لئے کسی کے عیب و ہنر پر اگر تعصب یا مصلحت کا پردہ ڈالا جائے تو وہ چھپ نہیں سکتا۔ جن تنقید اس ملک میں زندہ ہو گیا ہے اور اب ظلمتِ شب کو "چاندنی" بتا دینے والے عیب پوش حضرات خاموش ہو گئے ہیں۔

دنیا میں ہزاروں باکمال ہر زمانے میں پیدا ہوئے ہیں لیکن سب کا رنگ جُدا گانہ رہا اور ایک سے دوسرے نے ٹکر نہ کھائی۔ اسی قبیل سے مرزا صاحب بھی ہیں کہ گو انھیں باکمال معاصرین کے زمانے سے ہمدوشی ہوئی لیکن وہ سب سے الگ چمکے۔ اور سب کے بعد تک چمکتے رہے۔

---

[1] ماہنامہ "شاعر" نومبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۹۔

[2] اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" نے نہ معلوم کس بنا پر "حیاتِ داغؔ" کو "چراغِ داغؔ" لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو "شاعر" نومبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۷۔

[3] "حیاتِ داغؔ" ٹائیٹل (سرورق)

آج ہندوستان میں مرزا صاحب کی سیکڑوں سوانح عمریاں موجود ہیں۔ اور ہر مصنف نے بخیال خود اُن کی لائف اور اُن کی شاعری پر تنقید کی ہے۔ ہم بھی مرزا صاحب کے ایک ادنیٰ شاگرد ہونے کی حیثیت سے اُن کی مقدس زندگی پر آج کچھ لکھنے بیٹھے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اپنا طرز بیان دوسرے مورخین و مؤلفین سے جُدا رکھ کر سچے اور اصلی حالات سے ناظرین کو محظوظ کریں۔ جو بات اس لائف میں نئی ہوگی وہ ہمارے ناظرین سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی ؎

پھول اگرچہ سیکڑوں گلشن و مرغزار میں کھلے ۔۔۔ سب کا ہے رنگ الگ الگ سب کی ہے بُو الگ الگ

مرزا صاحب کے شاگردوں یا طرفداروں پر یہ ایک عام اعتراض ہے کہ وہ لوگ جب اُن کی کسی غزل یا کسی حالت پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو مساوات اور صداقت کے پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ اعتراض مرحوم کے شاگردوں پر بالکل بیجا ہے اور اس کا ثبوت آپ کو اس مختصر سوانح عمری کے چند صفحات اچھی طرح دے سکیں گے۔

ابھی مرزا صاحب کے دیکھنے والے، انھیں برتنے والے اور اُن سے فیضیاب ہونے والے ہندوستان میں ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں موجود ہیں۔ اس لئے اُن کے حالات زندگی میں کسی قسم کا خشو یا نقص پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور ان لوگوں کی مُتفقہ آوازوں پر ایسی لائف کو جس میں بجز حشو و زوائد کے اور کچھ نہ ہو، اپنی تنقیدی نگاہوں سے معیوب و متروک قرار دے سکتے ہیں ؎

مرزا صاحب کی شاعری پر جن لوگوں نے خواہ مخواہ دانت نکالے اور اعتراضات کی بوچھار کی وہ عموماً لکھنؤ کے شاعر تھے جن کا ذکر ہم موقعہ سے اس لائف میں کریں گے اور یہ ان کا ایک معاصرانہ یا معاندانہ شیوہ تھا کہ جب تک وہ زبان اعتراض نہ کھولتے انھیں بجائے خود فروغ پانا مشکل تھا۔

جبکہ مرزا صاحب مرحوم و مغفور حیدرآباد دکن میں سلطنت سخن کے بادشاہ بنے بیٹھے تھے۔ میں بھی ایک خادم اور غاشیہ بردار کی حیثیت سے اُسی دربار کا ایک گوشہ نشین تھا۔ سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۰۵ء تک استاد مرحوم کی محبت بھری نگاہیں مجھے "آگرہ" اور "کانپور" میں نوازتی رہیں اور میں نے جو فیض اس مرحوم ذات کے تعلق سے اٹھائے وہ کچھ میرا ہی دل خوب جانتا ہے۔ اس اثنا میں جو باتیں، حالات اور نکات سخن مجھے براہ راست معلوم ہوئے وہ سب میں آج صفحۂ کاغذ پر ظرافت ناظرین کیلئے چُنے دیتا ہوں۔ اُمید ہے کہ ناظرین ان خیالات و حالات سے مستفید ہوں گے اور اُن کی معلومات میں لائف کسی نہ کسی پہلو سے ضرور اضافہ خیز ثابت ہوگی۔

میں اپنی کسی تالیف، تصنیف یا تحریر کو مغلق اور متکلف الفاظ کے پرشکوہ اجتماع سے بارِ نظر نہیں بناتا۔ اور یہ میرا ایک قدیم اصول ہے۔ اس لائف میں بھی جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اس اصول کو نظر انداز نہ ہونے دوں گا۔ اس لئے کہ موٹے اور کھردرے الفاظ سے مجرّا اس کے کوئی فائدہ نہیں نکلتا کہ ناظرین کی سماعت اور ادراک دھوکا کھائے اور اُن کی سمجھ میں کوئی بات آسکے تو بمشکل آئے۔ اگر ناظرین اسے میری بے بضاعتی اور کم مائگی پر محمول فرمائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

لوٹنڈلہ ضلع آگرہ ۔۔۔ سیماب صدیقی الوارثی اکبرآبادی

داغ کی شاعری پر لکھنؤ کے شاعروں نے دانت نکالے ہیں اور اعتراضات کی بوچھاڑ کی ہے۔ اس کی تفصیل علامہ سیماب نے اس طرح لکھی ہے "دہلی اور لکھنؤ میں کچھ ازلی مخالفت تھی، اس لئے اکثر شعرا لکھنؤ سے مرزا صاحب کی چلتی رہی اور رئیس رامپور کے فیضیاب رہے ہمیشہ اپنے دہلوی مصاحب اور دہلوی شاعری کی بات رکھی۔ جناب امیر مرحوم اور جلال مغفور نے کبھی مرزا صاحب کی مخالفت نہ کی اور یہی وجہ ہے کہ مرتے دم تک مرزا صاحب کے دل میں اُن دونوں کی محبت باقی رہی۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

۲۳

"اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ ملتے امیر احمد و سید جلال سے"[1]

"مرزا صاحب کے عہدِ زرّیں کی عظمت کا یہ ایک معجزہ تھا کہ لکھنؤ والوں نے بھی اُن کے سامنے سر نہ اٹھایا۔ لکھنؤ میں جلال زندہ تھے، امیر موجود تھے، لیکن کبھی استاد السلطان کے منہ نہ آئے۔ مرزا غالب نے جناب ذوق کے سہرے کا جواب لکھوایا۔ اُن پر زبانِ اعتراض کھولی۔ مگر ذوق کے شاگرد و حریفِ العصر پر کسی کی زبان اعتراض اُس کے جیتے جی دراز نہ ہوئی۔"[2]

"کلام میں اگر شوخی اور برجستگی ہو تو وہ صاحبِ کلام کی خوش گفتاری پر محمول کیا جاتا ہے۔ محض خشک اور بے نمک کلام نہ تو سامع پر کوئی خوشگوار اثر ڈال سکتا ہے نہ شاعر کی طبیعت ہی اس سے خوش ہوتی ہے۔ جن اشعار پر معترضین نے اعتراض کئے ہیں، وہ اسی نظر سے ہیں، لیکن مرزا داغ کے چاروں دیوانوں میں نظرِ متجسس کو ڈال کر دیکھا جائے تو مندرجۂ ذیل اشعار کے علاوہ کوئی اور شعر اس انداز کا نہ ملے گا۔

جوشِ پر اور قیامت کی جوانی آئی ہاتھ میرا جو ترے سینے پہ اکثر بھرتا
حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں
مزہ ہو وصل کی شب اس طرح ہوں پیار کی باتیں ہمارا ہاتھ سینے پر تمہارا ہاتھ گردن میں
اے شیخ جو بتائے مئے عشق کو حرام ایسے کے دو لگائے بھگو کر شراب میں
بس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

ان اشعار کے علاوہ یقیناً کوئی اور شعر اس مذاق کا مرزا صاحب کے دیوان میں نہیں ہے، لیکن جو لوگ مذاقِ سلیم رکھتے ہیں اور شوخی پسند ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے تخیل سے کوئی منچلا شاعر خالی نہیں رہ سکتا۔"[3]

"پنجاب اس سے زیادہ رنگین اور بہتر تخیل کی مثال میں منشی امیر احمد مینائی، ریاض لکھنوی، یا گویا کھیوری، مضطر خیر آبادی، اور طاہر فرخ آبادی مرحوم کے اشعار پیش کرتے ہوئے علامہ سیماب فرماتے ہیں "غرضکہ اس قسم کے اشعار ہر اچھے شاعر کے کلام میں ملیں گے۔ لکھنؤ والے مرزا داغ کو خواہ مخواہ بدنام کرنا چاہیں تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ اگر انہیں لکھنوی انداز کو کوئی کلاسیکی ثبوت دینا ہے تو وہ اپنے ہاں کے شاعروں کے دواوین میں تلاش کریں۔ جان صاحب دیکھیں، واسوخت امانت اُٹھ کر پڑھیں، زہرِ عشق مثنوی گلزارِ نسیم، بدرِ منیر ــــــ وغیرہ پر بالاستیعاب نظر ڈالیں تو انکھیں معلوم ہو جائے گا کہ سوقیانہ مضامین کے مالک اہلِ لکھنؤ زیادہ ہیں یا اہلِ دہلی؟"[4]

کلکتہ والی جہاب اور مرزا داغ کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ سیماب مرحوم لکھتے ہیں کہ "دلم پور میں بے نظیر باغ کا میلہ ہوا کرتا تھا۔ مرزا صاحب بھی اکثر اس میلے میں شریک ہوئے۔ اور ماہ منیر نامی کسی خاتون سے جو شاعرہ تھی اور کلکتہ رہا کرتی تھی آپ کو اُنس ہو گیا۔ اسی تقریب سے آپ ایک مرتبہ حصولِ دعوت کلکتے تشریف لے گئے تھے۔ اس سفر اور اس واقعہ کو مرزا صاحب نے اپنی مثنوی "فریادِ داغ" میں واضح لکھا ہے۔ مثنوی پر تو تم آگے چل کر ریویو کریں گے مگر یہاں اتنا دکھانا چاہتے ہیں کہ مرزا صاحب کا اُنس کسی نفسانی خواہش کے ماتحت نہ تھا۔ بلکہ وہ ماہ منیر کی سخن فہمی و سخن سنجی پر عاشق ہو گئے تھے۔ اُس کا تخلص جہاب تھا اور سنتے ہیں کہ خوب شعر کہتی تھی ــــ ایک مرتبہ مرزا صاحب نے اُسے لکھا کہ تم ہمیں اپنی تصویر بھیج دو۔ اُس نے ایک "بسٹ تصویر" جو آدھے حصۂ جسم کی ہوتی ہے مرزا صاحب کو رام پور بھیج دی۔ مرزا صاحب کی شوخ اور جمالی طبیعت کو بھلا قرار کہاں تھا۔ فوراً یہ رباعیاں موزوں کر کے اس کے جواب میں کلکتہ بھیج دی گئیں۔

تم تو فلکِ حسن پہ ہو ماہِ منیر سائے کی طرح ساتھ ہے داغِ دلگیر

---

[1] صفحہ ۹-۱۰۔ [2] صفحہ ۲۰۔
[3] صفحہ ۳۴-۳۵
[4] صفحہ ۳۷۔

خالِ لبِ گلفام ہے شاہد اس کا ۔۔۔ بے داغ نہ کیوں ہو تمہاری تصویر

نصف حصۂ جسم کی تصویر دیکھ کر اس پر کتنا شاعرانہ ریویو کیا جاتا ہے کہ ۔

اس شکل کا دنیا میں نہیں کوئی نظیر ۔۔۔ صورت ہے طبیعت کی طرح شوخ و شریر

اللہ رے حجاب ۔ بدگمانی تیری ۔۔۔ بھیجی ہے مجھے نصف بدن کی تصویر

یہ حقیقت ہے کہ داغ کی شہرت خاص و عام میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں شعراء کی کثیر تعداد آپ کے تلمذ سے مستفید ہوئی۔ کل شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے۔ علامہ سیماب کے لکھنے کے مطابق شاگردوں کی غزلوں کی بر اصلاح کیلئے حیدرآباد میں "دفتر فصیح الملک" کھولا گیا تھا۔ جہاں سے اصلاح کے بعد شاگردوں کو غزلیں بھیجنے کا باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا۔ سیماب لکھتے ہیں "یہ وہ زمانہ تھا کہ مرزا صاحب کا طوطی نہ صرف دکن میں بلکہ سارے ہندوستان میں بول رہا تھا۔ اور لوگ اس نام کی عزت کرتے تھے۔ مرزا صاحب نے اپنے تلامذہ کی کثرت کا لحاظ کر کے ایک دفتر "دفتر فصیح الملک" کے نام سے حیدرآباد میں کھول دیا تھا۔ جہاں باقاعدہ غزلوں کے پہونچنے اور بعد اصلاح واپس ہونے کا انتظام معقول طور پر کیا گیا تھا۔"[9]

"حیاتِ داغ" کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سائل دہلوی کی ادارت میں ایک منظوم رسالہ "معیار الانشاد" نکلتا تھا۔ داغ کا زیادہ تر کلام اسی رسالہ میں شائع ہوا۔ علامہ سیماب لکھتے ہیں "معیار الانشاد" ایک منظوم طرحی رسالہ حضرت سائل دہلوی[10] کے اہتمام سے شائع ہوتا تھا جس میں مرزا صاحب بالالتزام اپنی غزلیں بغرض اشاعت دیتے تھے اور دوسرے طرحی رسالوں کو آپ کے رشحاتِ قلم سے بہت کم بہرہ حاصل ہوتا تھا۔"[11]

داغ کو سمجھنے اور ان پر لکھنے کیلئے اگر "حیاتِ داغ" کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کے ذریعے داغ سے متعلق صحیح واقعات کا علم ہوگا۔ نیز داغ سے متعلق بے بنیاد روایات اور بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے گا۔ دراصل سید آلِ احمد[12] نذر دوسرے تذکروں سے "حیاتِ داغ" کا موازنہ پیش کیا جاتا۔ اگر وقت نے اجازت دی تو انشاء اللہ علامہ سیماب کی کتاب "حیاتِ داغ" اور دیگر مصنفین کی کتابوں میں سوانح داغ کا موازنہ پیش کیا جائیگا۔ م۔ ع۔ ہ۔ "داغ ایک مسلّم الثبوت شاعر تھے۔ مگر علامہ سیماب نے ان کی نثر کی بھی مثالیں پیش کی ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔" ایک مرتبہ یار لوگوں نے مرزا صاحب کی زندگی میں ان کے مرنے کی خبر اڑا دی۔ لاہور اور صوبہ متحدہ کے اخباروں میں آپ کا ماتم ہوتے۔ جب آپ نے یہ سنا تو بہت غصہ آیا اور چند اخبارات کو یہ مضمون اپنے ہاتھ سے لکھ بھیجا۔

"حاسدوں نے میری خبر مرگ اڑا دی ہے اور حال یہ ہے کہ بیماری جاتی رہی اور میں باقی رہ گیا۔ دشمن داغ کا دل جلاتے ہیں۔ اللہ میں داغ دل نصیب ہو۔"[13]

"ایک مرتبہ میری غزلیں دو مہینے تک بعد اصلاح واپس نہ آئیں تو میں نے تنگ آکر ایک شکایت نامہ ذرا سخت لہجہ میں لکھ دیا۔ جس کے جواب میں مرزا صاحب نے مندرجۂ ذیل خط مجھے لکھا۔

"بھائی حضور شکار میں مصروف ہیں۔ گرمی بلا کی پڑ رہی ہے۔ جب شیر سے فرصت ہوتی ہے تو نظر سوجھتا ہے۔ تم خفا ہوئے، خیر ہر چہ از دست میرسد نیکوست۔ تمہارا، داغ دہلوی۔"[14]

---

[9] :۔ صفحہ ۱۰۔۱۱

[10] :۔ صفحہ ۱۷۔

[11] :۔ ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں المتخلص بہ سائل مرزا داغ کے نہایت ہونہار پر گو اور بسیار گو شاگردوں میں تھے۔ آپ خود استاد تھے۔

[12] :۔ صفحہ ۱۷۔

[13] :۔ صفحہ ۲۴۔ [14] :۔ صفحہ ۲۴

"ایک مرتبہ میں نے چند لکھنؤ اور دہلی کے محاورات کے متعلق کچھ دریافت کیا تو اُس کے جواب میں لکھا "ہاں تمہارا خیال صحیح ہے، لیکن ہمارے یہاں حضور" پیر و مرشد اور بادشاہ کو کہتے ہیں معشوق کو نہیں کہتے۔ لکھنؤ والے کچھ بھی کہیں۔ ہم تو اپنی وضع نہیں چھوڑ سکتے۔ تمہاری غزل کے کیا کہنے۔ لیکن کیا میری محنت کی داد نہ دو گے۔ سائل دہلی گئے ہوئے ہیں۔ وہ آجائیں تو پرچے بھجوا دوں۔ داغ دہلوی، داغ کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سیمابؔ لکھتے ہیں "دیوان گلزار داغ میں وہ تمام پرانی غزلیں درج ہیں جو دہلی کی کہی ہوئی ہیں۔ اور کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جو رامپور میں اکر کہی گئی تھیں۔ اس دیوان کی غزلوں میں وہ الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں جنہیں مرزا صاحب نے آگے صفائی زبان کے لحاظ سے متروک فرمایا۔ اس میں ۳۹ غزلیں، سات رباعیاں، ۶ خمسے، ایک مسدس شہر آشوب، دو قصیدے اور دو قطعے ہیں۔"[۱۵]

"آفتاب داغ میں ۱۱۹ غزلیں اور ۸ رباعیاں ہیں۔ اور یہ دیوان نسبتاً گلزار داغ سے زیادہ سلیس اور صاف ہے لیکن اس میں بھی جو غزلیں ہیں وہ پرانے یا متوسط زمانے کی کہی ہوئی ہیں۔"[۱۶]

"مہتاب داغ۔ قیام دکن کے زمانے میں شائع ہوا ہے۔ اس میں گلزار داغ کی برابر غزلیں ہیں۔ اور قصیدے مخمس وغیرہ سب موجود ہیں۔ یہ تیسرا دیوان دونوں پہلے دیوانوں سے زیادہ اچھا ہے اور اس کی غزلیں فصاحت اور صفائی کا ایک نہایت پاکیزہ اور اپ ٹو ڈیٹ نمونہ پیش کرتی ہیں۔"[۱۷]

"مثنوی فریاد داغ وہی مثنوی ہے جس میں مہ لقا میر کی داستان حسن و عشق کے قصے اور کلکتے کا سفر لکھا گیا ہے۔ یہ مثنوی اپنے انداز بیان میں تمام مروجہ مثنویوں سے زیادہ سہل العزیز اور مرتب ہے۔ باعتبار سلاست بیان اور انداز تحریر یہ مثنوی میر حسن یا گلزار نسیم اس کے پاسنگ بھی نہیں ہے (یہاں الفاظ سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ م۔ غ۔ ہ) لیکن چونکہ اب مثنویوں کا رواج ہندوستان سے اٹھ گیا ہے، اس لئے اس کے ایڈیشن شائع نہیں ہوتے۔ کتاب کا حجم ۵۲ صفحہ ہے۔"[۱۸]

"ان کتابوں کے علاوہ یادگار داغ کے نام سے ایک مجموعہ کلام شائع ہوا ہے جو ان کی وفات کے بعد جمع کیا گیا ہے اور جس میں وہ نئی غزلیں اور قطعات وغیرہ درج ہیں جو مذکورہ بالا تین دیوانوں میں درج ہونے سے رہ گئی تھیں۔"[۱۹]

کتاب "حیات داغ" مالمالشاعت رسالہ "صوفی" پنڈی بہاؤالدین ضلع گجرات پنجاب کیلئے اسلامیہ سٹیم پریس میں درد انارکلی لاہور میں چھپا حافظ مظفر الدین چھپی ہے۔ کتاب کے آخر میں چار صفحے پر مشتمل کارخانہ صوفی کی طرف سے "یادِ رفتگاں" میر درد دہلوی، وجدانی نشتر، ذوالنون مصری، آئینہ خود شناسی، میلاد النبی، شمس جریدہ، حیات سعدی، سیرۃ لقمان، جذبات الاوح، جذبات المسلم، خدیجۃ الکبریٰ، سیرۃ الحسینؑ، سیرۃ بلالؓ، مشاہیر ہند اور آب حیات کا اشتہار درج ہے۔ مندرجہ بالا کتب میں "خدیجۃ الکبریٰ" اور "سیرۃ الحسینؑ" علامہ سیماب کی کتابیں ہیں۔ اشتہار اس طرح ہے۔

خدیجۃ الکبریٰ رضؓ

یعنی سرتاج نامی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ نتیجہ طبع مولانا عاشق حسین صاحب سیماب عارفی اکبرآبادی۔ جن کی تالیفات زیادہ تعریف کی محتاج نہیں۔ آپ کے مزار پُر انوار کا فوٹو کتاب کے شروع میں لگا ہوا ہے۔ دلائی کپڑے کی خوشنما جلد ہے۔ قیمت مجلد (عہ ر) بلا جلد (عہ)

سیرۃ الحسینؑ

یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کے حالات زندگی شہادت و واقعات کربلا کی مفصل و مبسوط تاریخ ہے جس میں آپکے مزار مقدس کے علاوہ دیگر شہدائے کربلا کے مزار کے فوٹو دلفا دیدہ بھی بیش کئے گئے ہیں۔ دو رنگوں سے چھپا ہوا امیروں دلائی جلد نے کتاب کی ظاہری صورت کو بھی دلفریب بنا دیا ہے۔ مولانا عاشق حسین صاحب سیماب وارثی اکبرآبادی کا زور قلم ذکر کربلا کا بیان اور مولانا کی زبان "دلائی کا غذ پر چھپی ہے۔ جلد پر کتاب اور مصنف کا نام گوتھ پہلی حروف میں انگریزی جلد ولی کی طرح کندہ ہے۔ قیمت بادجود ان خوبیوں کے مجلد (عہ ا/۲) بلا جلد (عہ ا/۲)"

کیا ہی اچھا ہو اگر فی زمانہ "حیات داغ" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو جائے۔

۱۵؎ صفحہ ۲۴ ۱۶؎ صفحہ ۲۱ ۱۷؎ صفحہ ۲۱ ۱۸؎ صفحہ ۲۱، ۲۲ ۱۹؎ صفحہ ۲۲۔ ۲۰؎ صفحہ ۲۳

۲۱؎ :۔ خدیجۃ الکبریٰ رضؓ کے مزار کا فوٹو کتاب کے شروع میں لگا ہوا ہے۔

بدیع الزماں خاور

اے مقدس وطن

پاک اے میری ارضِ ہمالہ! ہے تُو
میں پجاری ہوں، میرا شوالہ ہے تُو
اے مقدس وطن، میرے ہندوستاں!
میرے ہندوستاں!!

تیری آغوش میں چہچہاتا ہوں میں
تیرے دامن میں خوشیاں مناتا ہوں میں
تیری تقدیس کے گیت گاتا ہوں میں
تیرا بلبل ہوں میں، تُو مرا گلستاں
میرے ہندوستاں!!

میرے بے چین دل کا سہارا ہے تُو
ایک تازہ سحر کا اشارا ہے تُو
امن کا اس جہاں میں ستارا ہے تُو
گھیر سکتی نہیں تجھ کو تاریکیاں
میرے ہندوستاں

لال قلعے کی مشعل فروزاں رہے
تیرا سہ رنگ پرچم درخشاں رہے
حشر تک اے وطن تُو تمدن افشاں رہے
تیرا نغمہ زمانے میں ہو جاوداں
میرے ہندوستاں

زندہ باد اے وطن، زندہ باد اے وطن
تجھ کو دیکھوں میں آباد و شاد اے وطن
میرے دل میں رہے تیری یاد اے وطن
مر کے بھی کم نہ ہوں میری بے تابیاں
میرے ہندوستاں

میرے جنت نشاں
اے مرے گلستاں!!
میں پجاری ہوں، میرا شوالہ ہے تُو
پاک اے میری ارضِ ہمالہ ہے تُو

آدم نصوحت

یہ زرد پتّا

یہ زرد پتّا
جدا ہوا ہے جو شاخِ گل سے
پڑا ہوا ہے جو اب زمیں پر
زمیں پہ کب تک پڑا رہے گا

یہ زرد پتّا
زمیں کی آغوش میں پگھلتا رہے گا کب تک؟!
زمین — جو سب کی مہرباں ہے،
جو ماں کا دل ہے،
جو ماں کی ممتا کا ایک پھیلاؤ،
ایک منظر ہے چشمِ بینائے رازداں میں

یہ زرد پتّا!
یہ بطنِ خاکی سے جب نکل کر فضائے عالم میں سانس لے گا
نئی اُمنگوں، نئی ترنگوں کے ساتھ جب یہ قدم بڑھائے گا سوئے منزل
قدم بڑھائے گا جب یہ آگے
تو ساتھ دیں گی رہِ طلب کی حسین صبحیں
کھلیں گی کچھ اور شاہ راہیں،
شعاعیں آگے بڑھیں گی سورج کی،
اور وہ جب اس کو جوشِ مستی میں چوم لیں گی

تو زرد پتّا —
بدل کے اپنا لباسِ کہنہ،
لباسِ نو میں
لباسِ سُرخ اور سبز پہنے
لچکتی شاخوں پہ مسکراتا
لباسِ سیمیں میں جگمگاتا
وہ جب کبھی جلوہ بار ہوگا
وہ صبح — صبحِ بہار ہوگی

افسانہ۔

شہاب دائروی

وادیاں گلاب کی

مگدھ کی پرانی راجدھانی سے کچھ فاصلے پر گدھ کوٹ کی مقدس زمین پر جہاں کبھی مہاتما بدھ کے پاک قدموں کے نقش تھے۔ آج وہاں محکمہ سیاحت کا ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس تعمیر ہے جس کے سامنے سرخ اور سفید گلاب کی لمبی لمبی کیاریاں ہیں۔ دائیں بائیں پہاڑیوں کے دامن ہیں۔ اور خاموشیاں، گہری طویل خاموشیاں، جو اکثر فضلو کی بے ہنگم ہنسی سے درہم برہم ہو جاتی ہیں۔ فضلو اس ریسٹ ہاؤس کا دربان ہے۔ بہت باتونی، بلا کا ہنس مکھ، اور بہت ہی خدمت گذار ــــ

میں ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں مدھم روشنی کے زیر سایہ آرام کرسی پر نیم دراز تھا کہ پائل کی ہلکی سی گونج کے ساتھ کوئی میرے سامنے سے بڑی آہستگی سے گذر کر روم نمبر سات میں داخل ہو گئی اور میری نگاہیں ابھی روم نمبر سات ہی پر جمی ہوئی تھیں کہ فضلو نے مجھے چونکا دیا۔

"کافی باؤجی ــــ" وہ مسکرایا۔ ظالم نے غضب کا تیز دماغ پایا تھا۔ اگر وہ کچھ بھی پڑھا لکھا ہوتا تو یقیناً کسی بڑے عہدے پر ہوتا۔

"روم نمبر سات میں کون ہیں فضلو ؟ ــــ" میں نے کافی کی چسکی لی۔

"دھرم پال جی ــــ" فضلو میرے سامنے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور اینٹھتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر ڈالتے ہوئے بے اختیار ہنس پڑا۔ بڑا بے موقعہ ہے وہ۔ کتنی خوبصورتی سے ہنس کر اس نے میری دکھتی رگ کو چھو دیا تھا۔ لیکن میں نے بھی بڑی چالاکی اور انجانے پن سے خود اس سے پوچھا۔

"تم ہنسے کیوں ؟ ــــ"

"جی، جی ــــ" وہ گھبرا گیا۔ "اکیلے رہتے رہتے یوں ہی ہنسنے کی عادت سی ہو گئی ہے اور کوئی بات نہیں ــــ"

"روم نمبر سات میں دھرم پال جی اکیلے رہتے ہیں ؟" میں نے پوچھا

"جی ہاں ــــ"

"لیکن میں نے ابھی اس کمرے میں ایک عورت کو جاتے ہوئے دیکھا تھا، وہ کون ہے ؟ ــــ"

"وہ قدیم گھاٹ کی مورتیوں کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کیلئے بہت دور سے آئی ہے۔ سب سے ملتی ہے۔ بہت اچھی ہے۔" فضلو نے کہا ــــ "دھرم پال جی بھی پرانی چیزوں کے شیدائی ہیں۔ اسی وجہ سے دونوں پرانی چیزوں کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔"

"تم چیزوں کے بارے میں کچھ جانتے ہو یا نہیں ؟ ــــ" میں نے پوچھا۔

"میں جاہل کیا جانوں ــــ" وہ مسکرایا ــــ "میں گندہ چیزوں کے بارے میں بھی بہت کم جان پاتا ہوں۔"

اور فضلو ابھی میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ روم نمبر سات کے دروازہ کا پردہ سرکا اور دھرم پال کے قدموں کی چاپ کے ساتھ پائل کی ہلکی آواز ابھرتی ہوئی قریب آ گئی۔

"دو کرسیاں ہمارے لئے بھی یہاں لے آؤ فضلو ــــ" دھرم پال نے رکتے ہوئے مجھ پر نگاہ ڈالی۔

"آپ کو اعتراض تو نہیں ۔"

"نہیں، نہیں ۔" اتفاق میں اللہ کر کھڑا ہو گیا ۔ مدھم روشنی میں اب پوری طرح دھرم پال کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اپنا سر کا نصف حصہ وہ گنوا چکا تھا۔ چہرے کی جلد کا کھردرا پن نمایاں تھا۔

"میں دھرم پال ہوں ۔" وہ اپنا تعارف کرانے لگا ۔ "بنگلیش کی آزادی سے پہلے ایک کالج میں تاریخ کا پروفیسر تھا۔ پھر آزادی کی جنگ میں شامل ہو کر کئی بار جیل گیا اور آزادی پانے کے بعد دیش کی خدمت کر رہا ہوں ۔"

"نہیں جناب، دھرم پال جی آپ سے حقیقت بیان کرتے ہوئے شرما رہے ہیں ۔" روزی ہلکی سی ہنسی ۔ "سچ تو یہ ہے کہ اب دھرم پال جی اپنی خدمت کا دطن سے معاوضہ وصول کر رہے ہیں

"نہیں بھائی ایسی کوئی بات نہیں ۔ ایک معمولی ٹرسٹ کا چیرمین ہوں ۔" دھرم پال نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ۔ "روزی کی بات بیچ میں آئے ۔ یہ تو قدیم موریتوں کے ساتھ ساتھ موڈرن انسان پر بھی ریسرچ کر رہی ہیں ۔"

اور دھرم پال کی بات پر ہم تینوں ہنس پڑے ۔ میری نگاہیں روزی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں ۔ اس کے چہرے کے نقوش بہت تیکھے تھے ۔ اور اس نے اپنے بالوں کو بڑی خوبصورتی سے سنوارا تھا ۔ جس سے بھینی بھینی خوشبو اڑ کر فضا میں پھیل رہی تھی ۔ اپنے دونوں کہنیوں کو اپنی انگلیوں کے سہارے ایک خاص انداز سے اپنے شانے پر ڈالتے ہوئے وہ مجھ سے مخاطب ہوئی ۔

"آپ اپنے متعلق ہمیں کچھ بتانا نہیں چاہتے ہیں کیا ۔۔۔ ؟"

"میں ایک معمولی پبلشر ہوں، کتابیں چھاپ کر اپنا پیٹ پالتا ہوں ۔ اور دہلی کے گلی کوچوں میں ملا آبی ۔ کے نام سے مشہور ہوں ۔"

"نام تو اکثر سنا تھا آج قدرت نے نیاز کا موقع بھی بخش دیا ۔"

اور روزی نے خاص لکھنوی انداز میں جھک کے سلام کیا ۔ ٹھیک اسی وقت خضلو نے ہمارے درمیان چھوٹا سا ٹیبل لا کر ڈال دیا اور پل بھر میں دوڑ کر بڑے میں کافی اور کاجو لے آیا ۔ کاجو بھری کانچ کی چھوٹی سی ڈش میری طرف سرکاتے ہوئے روزی نے کہا ۔

"یہاں کب تک قیام کا ارادہ ہے ؟"

"یہی دو چار دنوں تک ۔۔۔" میں نے کہا

"اتنا مختصر کیوں ۔۔۔ ؟" دھرم پال نے پوچھا

"کیوں کہ آپ کی طرح کسی ٹرسٹ کے چیرمین نہیں ہیں ۔" روزی نے کہا ۔ "سچ مانئے ملا آبی، جن لوگوں نے اپنے گھروں میں چھپ کر بھی اپنی ڈوبتی ہوئی آواز سے آزادی کیلئے ہلکا سا بھی نعرہ لگایا تھا اب ان کیلئے آزادی چیں بہ چیں لکھتا ہے ۔" اور روزی کھلکھلا کر بڑی بے ساختگی سے ہنس پڑی ۔ میری نگاہوں نے دھرم پال کے چہرے کا جائزہ لیا تو وہ ہر قسم کے تاثر سے خالی تھا ۔ بڑی سنجیدگی سے وہ مجھ سے مخاطب تھا ۔

"میں تو جنتا کا سیوک ہوں ملا آبی ۔۔۔ اور دیش کی پچانوے فیصد جنتا سب، عاقل نہیں، ہر سمجھ کے انسان ہیں ۔ اور اپنی عقل کے موجب باتیں کرتے ہیں ۔ میں ان کی باتوں کا کبھی برا نہیں مانتا ہوں ۔۔۔"

"پرندوں میں گدھ اور انسانوں میں یہ دیش بھگت قسم کے انسان بڑے گھاگ ہوتے ہیں ۔" روزی نے کہا ۔

"بچوں کے پھڑ لو، پر جس طرح گدھ اپنے پروں کو جلدی سے سمیٹ کر خاموش بیٹھا رہتا ہے وہی حال ٹھیک ہمارے دیش بھگتوں کا ہے ۔"

"باتوں میں الجھ کر تو آپ نے کافی پی ہی نہیں ملا آبی ۔۔۔" دھرم پال نے باتوں کا رخ موڑنے کی کوشش کی ۔

"میں کافی پہلے ہی پی چکا ہوں ۔۔۔" میں نے کہا ۔

"ایک اور سہی ۔۔۔" روزی مسکرائی ۔ اس کی مسکراہٹ میں بڑی جاذبیت تھی ۔ بڑی کشش تھی ۔ وہ کشش میری آنکھوں میں اترتی چلی گئی ۔ میں نے روزی کے ہاتھ سے کافی کی پیالی لے لی ۔

"کل کا آپ نے اپنا کیا پروگرام بنایا ہے ۔۔۔ ؟" روزی نے پوچھا ۔

"اپنا تو کوئی پروگرام نہیں۔"

"میں تو گیا کی میں جاؤں گی۔" روزی نے کہا۔ "مورتیوں سے دلچسپی ہو تو میرے ساتھ چلیئے۔"

ایسی حماقت نہ کیجئے گا ملّا جی ورنہ ہاتھ پاؤں کا کوئی حصہ ہمالیہ پر رہ جائیگا اور آپ یہاں واپس آکر خدا کو پکاریں گے۔" دھرم پال نے کہا۔ "آپ میرے ساتھ چلیئے، گرم پانی کے چشمے میں پیر سن کے سن ہاتھ کا لطف لیا جائے۔"

"سن لیا ملّا جی، یہ ہیں ہمارے دیش بھگت جو پہلے سیدھے ڈھنگ سے اشنان کرتے تھے اب سن ہاتھ اور مون ہاتھ کے علاوہ ہو گئے ہیں۔" روزی ہنس پڑی۔ "سچ کہتی ہوں ملّا جی یہ محاورہ ان دیش بھگتوں پر سو فیصد صادق آتا ہے کہ کوّا چلا ہنس کی چال اور اپنی بھی چال بھول گیا۔"

اچھا ہی کوا اپنا کوئی بری بات نہیں۔" دھرم پال نے روزی کو غور سے دیکھا۔

"پر وہ اچھا ہو جب تو۔" روزی نے کہا۔ "ہر ملک کی حدود اس کا رقبہ، رہن سہن، جدا جدا ہوتا ہے۔ اس کی اپنی روایت ہوتی ہے، اپنا تمدن ہوتا ہے، ہندستان کو اگر ہم پیرس بنانے لگیں تو ہماری اپنی تہذیب کہاں رہے گی؟"

"قطعی درست۔" میں نے روزی کو سہارا دیا۔

"بالکل غلط۔" دھرم پال نے کہا۔ "ہزاروں سال سے کنوئیں کی طرح ہم ایک ہی طرح کا جال بنتے اور توڑتے رہے ہیں۔ جب تک ہم غلام تھے، ہمارے ذرائع محدود تھے وہ کسی حد تک صحیح تھا، لیکن اب جبکہ ہم آزاد ہیں، ہمیں بھی آزاد قوموں کی طرح یہ حق حاصل ہے کہ ہم اپنا ہر قدم آگے بڑھائیں ——"

"اور سنگم کے لئے ہم رادھا کو آواز دیں۔" روزی کی بھویں کمان ہو گئیں۔ "جس رحم کی پاکیزگی کی ہم بچوں کو کہانیاں سناتے تھے اس نام کی عظمت کو ترقی یافتہ دماغوں نے کتنی اونچی منزل دی ہے۔"

ملّا صیں تو سو سال قبل ہندستان میں جنم لینا چاہیئے تھا۔" دھرم پال ہنسا۔

"تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے وہ موجودہ وقت سے بہت اچھا تھا۔" روزی نے کہا۔ "ہر ایک کا نام اغلاط کا سلیٹ ہوتا تھا۔ ورنہ اس دور کے انسان پوجا کے لائق تھے۔"

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات بھیگنے لگی تھی۔ دھرم پال اور روزی میرا اشارہ سمجھ کر اٹھ گئے۔ میں بھی اپنے کمرے میں چلا آیا کچھ وقت گذر کر جب میں بستر پر دراز ہوا تو سگریٹ کی خواہش ہوئی۔ مگر ماچس بستر پر نہ تھی۔ خیال آیا کہ میں نے برآمدے میں ٹیبل پر چھوڑ دی تھی۔ اپنے کمرے سے نکل کر جب میں روزی کے کمرے کے پاس سے گذرنے لگا تو اندر سے فضلو کی آواز آرہی تھی۔

"تم مہ کرا دیتی ہو اور میں نئی زندگی پا لیتا ہوں۔ لیکن تم یہ دھرم پال کو کب تک پالتی رہو گی۔؟"

"کیا کروں فضلو۔" روزی کہہ رہی تھی۔ "میں شہر شہر قانون کے ڈر سے بھاگتی اور گھومتی رہی ہوں۔ دھرم پال سے میرا کچھ چھپا نہیں۔ اس سے دشمنی مول لوں تو جیل جاؤں۔"

"تب تو اب کے جو حاصل کریگی، نصف اس کے حوالے کر دیگی۔؟"

"تم ساتھ دو تو بچا لوں گی۔"

"وہ کس طرح ——؟"

"بس دھرم پال کو یہ یقین دلا دینا کہ ملّا جی تلاش تھا۔

یکایک میرا سر گھوم گیا۔ روزی کا دوسرا رخ میں نے دیکھ لیا تھا۔ بڑا ہی گھناؤنا اور مکروہ رخ تھا۔ میں تیزی سے تاپ اٹھا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ رات کسی طرح بستر پر گذر گئی۔ اور صبح سویرے ہی میں فضلو کے نام ایک پرزہ لکھ کر کوٹی ہاتھ ٹیلی فون ڈیریکٹری باہر سے نکل گیا۔ گلابوں کے نوشگفتہ پھولوں کی خوشبو اڑ رہی تھی لیکن میرا دماغ مہاتما بدھ کے نقش پا پر قائم لیٹ باؤس میں بیٹھے ہوئے تعفن سے پھٹ رہا تھا۔ گلاب کی پنکھڑیوں کے سینے میں تعفن کا زخم رستا ہوا دکھائی دیا۔ جس زخم نے دجلہ کے کتنے جنگلوں میں زہر بھر آہو گا اور جب تک فضلو جیسا درد مان رہے گا بھرتا رہے گا ——

ممتاز راشد

غزل

اُمید کی رنگیں راہوں میں کیا بتلائیں کیا پایا ہے
ہر موڑ پہ نظریں اُٹھی ہیں، ہر موڑ پہ دھوکہ کھایا ہے

اب ہجر کے سُونے لمحوں میں ہر رات سحر تک جاگیں گے
خوناب سُلگتی آنکھوں نے خوابوں سے بھلا کیا پایا ہے

اخلاص کے موتی، جنس وفا شعروں کی تڑپ، اشکوں کی جلن
وہ چاہیں تو ہم تک آ جائیں اپنا تو یہی سرمایہ ہے

اُٹھ آئے ہیں اُن کے در سے مگر مایوسی کا عالم کیا کہیے
تقدیر کے نازک شیشے کو ہر پتھر سے ٹکرایا ہے

جیون کی اکیلی راہوں میں جب غم کے اندھیرے بڑھتے ہیں
نظروں نے ایک دیئے میں خورشید چمکتا پایا ہے

اب پوچھو ہو جس کو ماہ وشو وہ راشد کب کا مر بھی چکا
گلیوں میں جو بھٹکا کرتا ہے یہ اُس فن کار کا سایہ ہے

وہاب دانش

غزل

رنگ چہرے کا کہیں آج اُتر جائے نا
ہے بہت تیز ہوا، زُلف بکھر جائے نا

آج کے دن پہ اندھیرے کا کرم ہے، لیکن
کل کوئی صبح کہیں اور نکھر جائے نا

خشک پتّوں پہ ذرا پاؤں سنبھل کر رکھنا
دیکھنا شور ہواؤں میں بکھر جائے نا

پاس کھڑکی کے نہ سونا کہ کہیں پچھلے پہر
یہ ہوا لے کے کوئی میری خبر جائے نا

رات اپنی ہے اِسے سو کے نہ کھونا دانش
چھُپ کے پیڑوں کے اُدھر چاند گزر جائے نا

آغا رشید مرزا

جگر سے آخری ملاقات

یہ حسنِ اتفاق ہے، یا میری خوش قسمتی کہ مجھے اکثر نامور شخصیتوں اور مقتدر ہستیوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ بعض ملاقاتیں اتنی دلچسپ اور پُرخلوص ہوتی ہیں کہ دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ اور اُن کی یاد کبھی ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ جب بھی کبھی ماضی کے اوراقِ الٹتا ہوں یہ نقش نمایاں نظر آتے ہے۔ اور اُن کی معیت میں بیتے ہوئے ماضی کے اُن لمحات کی یادیں تازہ ہو جاتی ہے جیسے آج ہی کی بات ہو۔

یوں تو میں نے حضرت جگر کو بارہا دہلی میں دیکھا۔ مشاعروں اور خاص خاص محفلوں میں اُن کا کلام سُنا۔ مگر اُن سے ملاقات کا اتفاق بھی ہوا۔ لیکن اتنے قریب سے اُن کی ہمہ گیر اور پُرخلوص شخصیت کے مطالعہ کا موقع نہ ملا تھا۔ سب سے پہلی بار میں نے اُن کو بکتا دہلوی کے ہاں دیکھا، بکتا صاحب کا قیام مترول باغ میں تھا۔ اور وہ ہر ماہ ایک خاص محفل اپنے گھر پر منعقد کیا کرتے تھے۔ میں اُس وقت اسکول کا طالب علم تھا۔ والدِ مرحوم کے ہمراہ اُس محفل میں شرکت کا اتفاق ہوتا تھا۔ اُس محفل میں حضرت بیخود دہلوی اور نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی بھی شریک تھے۔ حسبِ دستور سب سے پہلے مبتدی حضرات کا تانتا لگا رہا۔ اُن میں سے ایک حضرت کا مزاحیہ کلام کافی مقبول ہوا۔ اُس کا صرف ایک مصرع میرے ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے۔ ع

ناک کی پونی یہ کہتی ہے میں جوئے شیر ہوں

اس کے بعد چند مقبول شعرا اور پھر حضرت جگر تشریف لائے۔ اپنے خاص ترنم میں اپنی مشہور غزل شروع کی ؎

اے حسنِ یار شرم یہ کیا انقلاب ہے ۔۔۔ تجھ سے زیادہ در و ترا کامیاب ہے

اور جب اُنھوں نے یہ شعر پڑھا۔ ؎

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک ۔۔۔ ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

تو اس پر حضرت بیخود دہلوی از خود رفتہ ہو گئے۔ واہ، واہ مکرر سہ کرر سے محفل گونج اٹھی۔ غالباً آدھے گھنٹے تک اسی ایک شعر کا اعادہ ہوتا رہا۔ مشاعرہ کا اختتام پر حضرت جگر نے، حضرت بیخود اور حضرت سائل کی جوتیاں اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر دہلیز پر رکھیں۔ یہ دو بزرگ اگرچہ اُن کے اُستاد نہ تھے لیکن استاد وقت ضرور تھے اور اس لحاظ سے حضرت جگر اُس کفش برداری پر ناز اں نظر آرہے تھے۔ حضرت جگر کی انکساری اور اساتذہ کے احترام کا خیال آتا ہے تو سوچتا ہوں ۔۔۔ استادوں کی جوتیاں سیدھی کرنا بھی ایک ریاضت ہے۔ اور اس کے بعد ہی انسان کو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ فی زمانہ یہ جذبہ کہاں ۔۔۔ اس وقت تو ہجوم دیگرے نیست کا جذبہ نمایاں ہے اور شاید اسی لئے ہم کوئی کارہائے نمایاں نہیں کر پاتے۔

اس کے بعد میں نے اُن کو دوسری جنگِ عظیم کے دوران دیکھا۔ جنگِ عظیم کا یہ زمانہ ایک عام فہم خوشحالی کا زمانہ تھا چیزیں مہنگی تھیں لیکن پیسہ سستا تھا۔ ملازمت مل جاتی تھی لیکن ملازم نہیں ملتا تھا۔ زمانے کے انقلاب کے ساتھ ساتھ ادب و ادب میں بھی انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ نظم و نثر میں سیاسی نظریات و رجحانات رونما ہو چکے تھے۔ رسالوں، کتابوں، اخبار، ریڈیو، محفلوں، ادب برائے ادب یا

اور پرانے زندگی ۔ نیا ادب، پرانا ادب، ترقی پسند ادب، اور ادیبوں کے ہنگامے جوبن پر تھے۔ انہیں دنوں عریک کالج ہال میں مشاعرہ تھا شہنشاہ تغزل کا نام جب بھی آتا اور جہاں بھی آتا نئے پرانے سب ہی سر تسلیم کر دیتے۔ مشاعرہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو رہا تھا۔ مرت اتنا اعلان ہوا: اب جگر تشریف کے بیٹھو مری باری آئی۔" ادھر سامعین کے دلوں میں آتش شوق بھڑک رہی تھی۔ ادھر حضرت جگر خود آتش سیال میں ڈوبے جھوم جھوم کر پڑھ رہے تھے ۔۔۔

چشمی نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے ۔۔۔ اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

جس انداز سے وہ پڑھ رہے تھے معلوم ہوتا تھا واقعی اس خاکدانِ کی ٹھوکر میں سارا زمانہ ہے۔ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کسی ایک پہلو قرار نہ لے۔ آئی مائیکروفون کا اناؤنسر ہالہ میں مائک لئے ان کے ساتھ ساتھ گردش کر رہا تھا۔

کچھ عرصہ بعد جنگ ختم ہو گئی۔ سیاسی ہنگاموں کا دور شروع ہوا اور یہ دور ۱۹۴۷ء کے عظیم ہنگامہ پر ختم ہوا۔ اس قیامت میں معلوم نہیں کون کہاں گیا بعد الاں ان سے میری ملاقات میں کانپور میں ذکر کر رہا ہوں۔ مارچ ۵۵ء میں ہوئی۔ اتفاق معلوم ہوا کہ جگر صاحب کراچی کے مشاعرہ میں شرکت کر کے واپس آ رہے ہوں گے کلکتہ آ رہے ہیں۔ اس وقت میں ولیم۔ ڈم ائرپورٹ پر رہا تھا۔ بر سبیل تذکرہ میرے سالے صاحب ایک صاحب شرما جی سے ملے جو کسٹم آفیسر تھے اور سوئے اتفاق اس روز ان کی ڈیوٹی بھی ائرپورٹ ہی پر تھی۔ شرما جی پنجاب کے رہنے والے تھے۔ سخن فہم اور صاحب ذوق تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے معتقد تھے۔ ہر وقت ان ہی کا کلام پڑھتے اور گنگناتے رہتے تھے۔ اس اعتقاد اور سرشاری کی انتہا یہ تھی کہ ائرپورٹ سے شہر تک جب بھی کسی بس میں سفر کرتے "آنکھیں بند کئے با آواز بلند ظفر کا کلام پڑھتے چلے جاتے۔ انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی لطف اندوز ہو رہا ہے یا بور ہو رہا ہے۔ میں نے شرما جی سے جگر صاحب کی آمد کا ذکر کیا۔ شرما جی کو بھی ملاقات کا اشتیاق تھا۔ وہ سب کام چھوڑ کر جہاز کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ جگر صاحب تشریف لائے۔ میں نے شرما جی سے تعارف کرایا۔ کچھ دیر ان سے بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد کسٹم میں سامان چیک کرانے کی خاطر جگر صاحب نے چابیاں اپنے کمر بند سے کھولیں۔ لیکن سامان کھولنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ میں انہیں لے کر ائرپورٹ ریسٹورنٹ میں آیا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ کسٹم کا پیادہ دوڑا آیا اور جگر صاحب کی چابیاں دیتے ہوئے بولا "شرما جی نے بھجوائی ہیں آپ کسٹم میں بھول آئے تھے۔" جگر صاحب نے چابیاں پھر اپنے کمر بند میں باندھ لیں مسکراتے ہوئے بولے "آجکل تو یادداشت کا یہی عالم ہے۔ جب کبھی کہیں باہر سے گھر پہنچتا ہوں تو بیگم یہ نہیں پوچھتیں کہ کیا کما کر لائے ہو بلکہ یہ پوچھتی ہیں کہ کیا گنوا کر آئے ہو۔" اس لطیفہ پر مجھے بھی ہنسی آگئی اور وہ خود بھی مسکراتے رہے۔ میں نے دریافت کیا "جگر صاحب کیا پیجئے گا۔" اس پر ان کی مسکراہٹ میں اور اضافہ ہو گیا" اور فرمانے لگے۔ پینا تو چھوڑ چکا ہوں۔ بفضلہ حج بھی کر آیا ہوں۔ کوئی کولڈ ڈرنک ہی ٹھیک ہے۔ میں نے عرض کیا۔ میرا مطلب بھی کولڈ ڈرنک یا چائے ہی سے تھا۔ ورنہ مجھے معلوم ہے کہ آپ عرصہ ہوا تائب ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد وہ کولڈ ڈرنک پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ میں نے ایک فیر مطبوعہ غزل تحریر کرنے کی فرمائش کی۔ اس وقت کوئی کاغذ پاس نہ تھا۔ میرے ہاتھ میں کسٹم ڈکلریشن کا ایک سادہ فارم تھا جو حضرت ایک طرف سے چھپا ہوا تھا۔ وہی فارم میرے ہاتھ سے لیکر اس کی پشت پر اپنے خوبصورت نستعلیق خط میں ایک غزل اور ایک شعر تحریر کیا۔ اس کے نیچے جگر۔ گونڈہ۔ ضلع بہرائچ۔ پی "تحریر فرمایا۔ ممکن ہے یہ غزل اور شعر بعد میں کہیں شائع ہوا ہو۔ لیکن اس وقت انہوں نے مجھے فیر مطبوعہ کہہ کر ہی دیا تھا۔ جسے میں نذر قارئین شاعر کر رہا ہوں۔

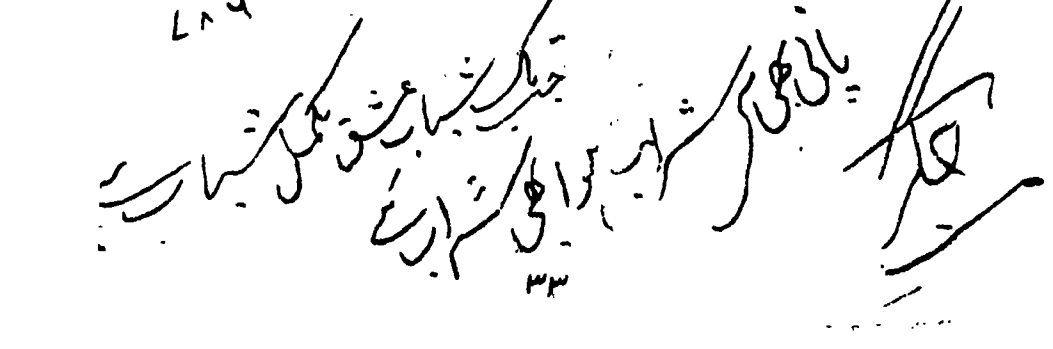

۱۸۶

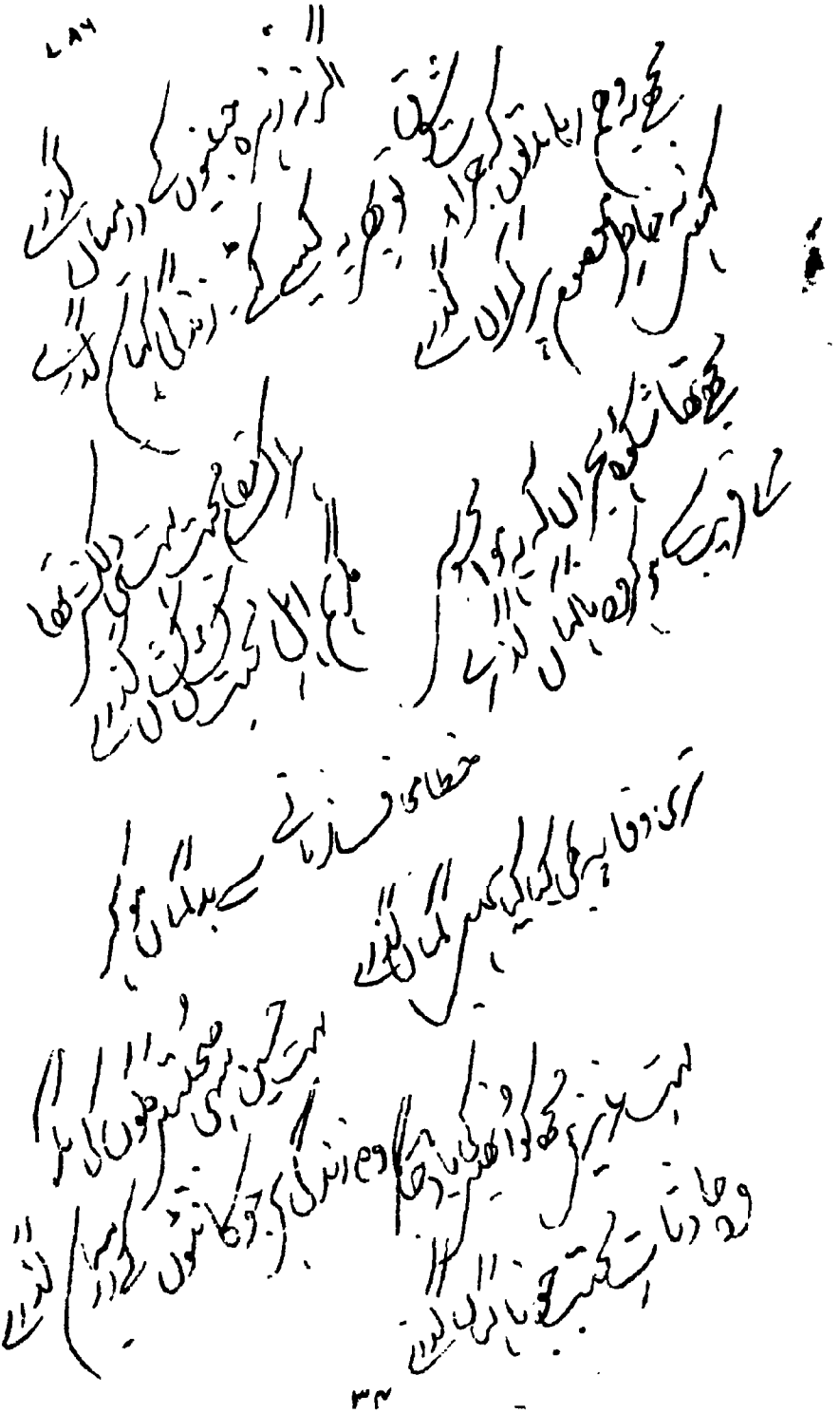

شاعر بمبئی

جگر مراد آبادی گونڈہ (یو۔پی)

اُنھوں نے غزل لکھ کر ختم ہی کی تھی کہ ائرلائن کی کوچ آگئی چلتے ہوئے میں نے گھر پر ایک نشست خاص کا ارادہ ظاہر کیا۔ جسے انھوں نے فوراً قبول کرلیا۔ اُن کا قیام کیننگ اسٹریٹ میں ایک تاجر کے یہاں تھا۔ اپنی قیام گاہ کا پتہ دیا اور تین بجے وہیں پر ملنے کا وعدہ فرما کر رخصت ہوگئے۔ مجھے پہنچنے میں ذرا دیر ہوئی۔ دیکھتے ہی فرمانے لگے: "آپ ہی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہا تھا۔" سونٹ گرمی اور دھوپ کی وجہ سے میں پسینہ میں تر ہو رہا تھا۔ میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ بھئی اتنی سخت دھوپ میں چشمہ بھی نہیں۔ یہ کہہ کر اپنا دھوپ کا چشمہ اُٹھا کر سامنے رکھ دیا اور کہا۔ "یہ میری طرف سے ہے۔ اگر یہ پسند نہ ہو تو ابھی چلتے ہوئے نیچے سے نیا چشمہ لے لیتے ہیں۔" اس خلوص اور محبت کو دیکھ کر میری زبان گنگ ہوگئی۔ میں نے اپنا چشمہ جیب میں سے نکال کر سامنے رکھ دیا، اور صرف اتنا کہا۔ "میرے لئے آپ کی محبت اور خلوص کیا کم ہے۔" نشست کے بارے میں مجھے معذرت کرنی پڑی کیونکہ وقت کی کمی کی وجہ سے انتظام ممکن نہ تھا۔ اس پر انھوں نے کہا "دو میں نے آپ کی خاطر سارے پروگرام منسوخ کر دیئے تھے اور کئی لوگوں سے انکار کرنا پڑا۔ چلئے یہ بھی اچھا ہی ہوا اب اطمینان سے بیٹھ کر کچھ دیر بات تو کر سکینگے۔"

اس کے بعد باتوں کا سلسلہ شروع ہوا جو رات کو آٹھ بجے کے قریب ختم ہوا۔ دوران گفتگو میں انھوں نے مجھے بتایا کہ کراچی میں اُن کو ایک ہزار روپیہ ماہوار بطور وظیفہ اور رہنے کے لئے ایک کوٹھی کی پیشکش ہوئی تھی۔ لیکن اُن کو اپنا وطن عزیز ہے۔ اس لئے انکار کر دیا۔ اس عرصہ میں شعر و ادب اور ہر موضوع پر گفتگو ہوئی لیکن زیادہ تر گفتگو کا موضوع "صوفی ازم" ہی رہا جو اس رنگ اور جذبہ میں ہمہ تن غرق نظر آرہے تھے۔

بہ میں قناعت ترہ از کجاست تا بہ کجا

دوسرے روز صبح انھیں انڈین ایرلائن سے لکھنؤ ہوتے ہوئے گونڈہ جانا تھا۔ میں انھیں رخصت کرنے کیلئے ایرلائن کے آفس پہنچا۔ دیکھتے ہی کہنے لگے۔ "آپ نے اتنی زحمت میرے لئے کیوں اُٹھائی۔" میں نے عرض کیا کہ شہنشاہ تغزل آئیں اور میں دیدہ و دل فرش راہ نہ کروں۔ یہ سنکر فرط جذبات اور خلوص سے بغلگیر ہوگئے۔ اتنے میں بس کے روانہ ہونے کا اعلان ہوگیا۔ اور وہ بس میں بیٹھ کر چند لمحوں میں میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ افسوس معلوم نہ تھا کہ یہ آفتاب تغزل اب ہمیشہ کے لئے روپوش ہونے والا ہے۔ کچھ عرصہ بعد خبر ملی کہ وہ سخت بیمار ہیں اور اس کے بعد معلوم ہوا کہ رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی جانے والا خود غرق رحمت ہو گیا

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی (اقبال)

خط لکھتے وقت

خریدار حضرات اپنے نمبر خریداری کا اور ایجنٹ

اپنی ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ورنہ تعمیل نہ ہو سکے گی۔

کہانی

رشید انور

روٹی اور لیڈر

جس ڈپٹی منسٹر صاحب کے اعزاز میں ڈنر دیا گیا تھا اُن کے آنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ کلب میں جمع میونسپل کونسلرس مختلف پارٹیوں کے لیڈر، بڑی بڑی ملوں کے مالک اور دوسرے مختلف تجارتی قسم کے لوگوں کی ایک بھیڑ تھی۔ اور سارے لوگ انتظار کی اِن گھڑیوں کو کاٹنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کے لئے ایک دوسرے کی بیویوں سے باتیں کر رہے تھے۔ میونسپل کلب کی چمک دمک اور سارے ہال میں پھیلے ہوئے سگریٹ اور سگار کے دھوئیں سے مجھے اُلجھن سی ہونے لگی۔ اس لئے میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا کلب سے باہر آگیا۔ کلب کے سامنے ایک قطار میں کھڑی ہوئی گاڑیاں سے پہیے برگد کے گھنے درختوں کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے وہ سب بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنی دُور سے صرف پرچھائیاں سی دکھائی پڑ رہی تھیں۔ یا پھر کوئی بڑی پیتے لگتا تو ایک چنگاری سی چمکنے لگتی۔ میں چلتا ہوا اُن تک آگیا۔ وہاں وہ سب تھے اور اپنے بوسیدہ اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے کپڑوں میں اپنے آپ کو سردی سے بچانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے چپ چاپ میونسپل کلب کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ جمّا دادا اُن سب کے بیچ اپنا کمزور اور بوڑھا جسم لئے کانپ رہا تھا۔ میں اُن کے بالکل قریب جا کر کھڑا ہوا۔ اور میں نے جمّا کے اطمینان سے اُسے اپنی طرف بلایا۔

"جمّا دادا ــــ میں گھوم رہا ہوں کہاں سے جب بھی تمہیں فرصت مل جائے سیدھے چلے آنا۔ میں کھانے پر تمہارا انتظار کروں گا۔"

"بابو جی ــــ آپ ــــ آپ کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں میرے لئے ــــ اس کی کوئی ضرورت نہیں ــــ" اُس کی آواز بڑی رقم اور کپکپاتی ہوئی تھی ــــ

"آج تو تم بہت بڑے آدمی بن گئے ہو۔ سارے شہر والوں کی زبان پر تمہارا نام ہے۔ لوگ تمہیں ہاتھوں ہاتھ لے رہے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کیلئے تم نے جو کچھ کیا وہ بہت بڑی بات ہے۔ میں بھی دوست ہوں تمہارا۔ اس لئے چاہتا ہوں آج میرے ہی ساتھ رات کا کھانا کھالو ــــ میں نے کھانے کیلئے کہہ دیا ہے۔"

"لیکن بابو ــــ لیکن ــــ" وہ ہکلانے سا لگا۔

"لیکن ویکن کچھ بھی نہیں ــــ تمہیں آنا ہی ہوگا۔ میں انتظار کروں گا ــــ اور اُس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں جب سے اس عجیب سے محلّے میں آیا تھا اُس گھڑی سے آج تک محلّے کا صرف ایک ہی آدمی تھا جس سے میں ملتا تھا اور کبھی کبھار باتیں کر لیا کرتا تھا۔ کبھی گھر کی اور کبھی باہر کی ــــ کبھی سیاسی اور کبھی مذہبی ــــ کبھی دکھ درد کی اور کبھی خوشی کی۔ نہ جانے کتنی ہی بار جمّا دادا سے میں نے باتیں کی تھیں اور اُن سے ملکر ہمیشہ ہی مجھے اِس محلّے میں تنہائی کے اذیت ناک احساس سے کچھ دیر کے لئے چھٹکارا مل گیا تھا ــــ اس محلّے سے اور روز بروز ترقی کرتے ہوئے شہر میں سر چھپانے کیلئے سہارا ملنا کٹھن ہوتا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس محلّے میں دن گذار رہا تھا۔ درد و غربت کی آگ میں بُری طرح سُلگتے ہوئے اس محلّے میں بڑے عجیب عجیب لوگ رہتے تھے۔ جن میں سے بیشتر لوگوں کی آمدنی کے ذرائع شریف نہ تھے۔ ایسے محلّے میں جمّا دادا کی موجودگی اُن کی طرف نظر رکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ صبح سویرے میں اُدھر گھوم کر واپس ہو رہا ہوتا اور اِدھر تنہائی میں اُن سے ملاقات ہو جاتی۔ جمّا دادا اُس وقت صبح کی نماز کے بعد محلّے کے سرے والی مسجد سے

نکلنے کے بعد اگر بتی سلگا کر لوٹ رہے ہوتے۔ اور پھر علیک سلیک کے بعد ایک ساتھ چلتے ہوئے ہم ادھر اُدھر کی چھوڑ دیتے اور پھر چند گھڑیوں کی ہمراہی کے بعد اپنی اپنی راہوں پر چل پڑتے۔ جمّا دادا تانگہ چلاتے تھے اور سارے شہر میں ایک ایک سواری کے پیچھے اُدھا اُدھا گھنٹہ گھومتے تھے تاکہ تانگا کیسے بھی لگے اصان کی ہمیشہ بیار رہتی اور آٹھ بچوں کی گذر کسی بھی طرح ہو۔ حمید اُن کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اور جمّا دادا نے اُسے بڑے ارمانوں اور بڑی امیدوں سے پڑھایا تھا۔ حمید اچھے جیسے پڑھ کر آگے بڑھتا گیا جمّا دادا کی کمر ور آنکھوں کی روشنی واپس آتی گئی۔ انھوں نے اپنے آپ کو پھر جوان ہوتا محسوس کیا اور جس دن حمید ایک آفس میں بابو ہو گیا تو جمّا دادا نے جیسے سالہا سال کے بعد اطمینان کی سانس لی اور اپنا تانگا نہ لگایا جیسے وہ اب تک کی ساری ذمہ داریوں سے حمید کے حق میں سبکدوش ہو گئے ہوں۔ انھیں ایسے لگا جیسے خوشیوں کی ایک جوت ان کی نظروں کے بالکل سامنے جل رہی ہو اور وہ جب چاہیں ہاتھ بڑھا کر اُس جوت کو اپنے ہاتھوں میں تھام سکتے ہیں۔ اور اپنے تاریک گھر کے ایک ایک گوشے میں سُکھ کے کئی چراغ جلا سکتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی انھوں نے اس جوت کی طرف ہاتھ بڑھایا، اُن کا ہاتھ معلق رہ گیا۔ وہ سکتے کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے سے لگائے اُس جوت کو دیکھتے ہی رہے جس نے اُن کے ارمان، اُن کی آرزوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس توانائی کو جلا کر خاک کر دیا تھا جس کی آس میں وہ صبح سے لے کر شام تک اپنے کھانے پینے کی پروا کئے بغیر گلی گلی کوچہ کوچہ اپنے تانگے کو لئے پھرتے تھے۔ حمید اتنے دُور کہیں کسی اور شہر میں اپنا ٹرانسفر کروا لیا۔ صاف ستھرے اور اُجلے کپڑے پہننے والا حمید۔ ٹیبل اور کرسی پر بیٹھ کر کام کرنے اور روانی سے انگریزی میں بات کرنے والا حمید اس حقیقت کو برداشت نہ کر سکا کہ وہ ایک تانگہ چلانے والے کا بیٹا ہے۔ اُس نے اپنے بھائی بہنوں سے، اپنی ماں سے اور برف کی طرح سفید بالوں والے جمّا دادا سے ناطہ توڑ لیا، اور پھر جمّا دادا اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی بوڑھے نظر آنے لگے۔ اُن کے چہرے پر جھریوں کا جال سا بچھ گیا اور ان کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔ انھوں نے بہت کوشش کی محبت محنت کی، محلے کی درگاہ پر اَن گنت اگربتیاں جلائیں لیکن سُکھ کی ایک چنگاری بھی اُن کے گھر میں نہ جلی۔ انھوں نے جتنی تگ و دو کی گھر میں اتنی ہی تاریکیاں بڑھتی گئیں ــــ اور اُس دن اُن کا دل چاہا ایسی زندگی سے بہتر ہے کہ اپنے گھر کے آنگن میں ایک بڑی سی قبر کھود دیں اور اپنے ہاتھوں سے اپنی بیوی، اپنی جوان بیٹی اور اُن چھوٹے چھوٹے بچوں کو اُس میں دفن کر دیں جن کے دکھوں کا اب کوئی حل نہ مل سکتا تھا۔ کیونکہ اُس دن سارے شہر میں بسیں ہڑتال کر دی گئیں۔ ہر سڑک، ہر محلے اور ہر بازار سے آدھے آدھے گھنٹے سے بسیں چلنے لگیں۔ بھاگتی ہوئی بسوں کی طرح وقت بھی اُن کے ارمانوں کے چہروں پر دھول اڑاتا ہفتوں اور مہینوں کی طرح بھاگا اور بھاگتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ اُن کے حالات بھی بدلتے گئے۔ کوئی آخر دس پیسے میں سفر کرنے کی بجائے اِن تانگے والوں کو تیس اور چالیس پیسے کیوں دے۔ وہ اڈوں پر اپنے اپنے تانگوں کو لئے کھڑے رہتے اور بس گرد اڑاتی اور شور مچاتی اُن کی روزی کو کچلتی اُن کے سامنے سے گزرتی رہتی اور وہ سب گالیاں بکتے اور بڑبڑاتے رہتے لیکن جمّا دادا جب چاپ کھڑے خلاؤں میں تاکا کرتے اور سوچتے کہ کوئی اگر اُن سے پوچھے کہ دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ہر گزرنے والی گھڑیوں کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ مرتے جاتے ہیں۔ یوں جیسے کسی بڑے برتن سے قطرہ قطرہ پانی ٹپکے ــــ تو جمّا دادا اُسے اپنے گھر کی چوکھٹ پر لے جا کر کھڑا کر دیتے۔ پھر اُن سیکڑوں مایوس تانگے والوں نے چونک کر جمّا دادا کی طرف دیکھا جنھوں نے صبر برت، رکھنے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ لوگ سمجھاتے رہے، انھیں قسمیں دے کے بڑھاپے کا احساس دلاتے رہے لیکن جمّا دادا نے ایک رسّی، وہ یوں آہستہ آہستہ مرنے کو بڑی نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جمّا دادا کا جب بہت مشرع ہوا تو شہر میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ تانگہ یونین والوں اور مزدور لیڈروں نے بہت بندھائی، میونسپلٹی والوں اور دوسرے عہدہ داروں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈرایا دھمکایا لیکن اُن کے ہاتھ کی تسبیح چلتی رہی چہرے کا رنگ زرد ہوتا گیا اور وہ آہستہ آہستہ موت کے قریب ہونے لگے۔ بات زور پکڑی تو اخباروں نے لمبی چوڑی سرخیاں بنائیں اور کسی نے جمّا دادا کی اور ایک دن ایک ڈپٹی منسٹر صاحب آپہنچے۔ اُس دن جمّا دادا کے برت کا آٹھواں دن تھا۔ پھر سارا ہی دن میونسپلٹی کے بند دفتر میں میٹنگ ہوتی رہی اور بالآخر ڈپٹی منسٹر صاحب نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ کچھ راستوں پر بسیں بند کر دی گئیں اور کچھ راستوں پر جہاں سڑکیں چوڑی تھیں بند کر دی گئیں۔ تانگے والوں نے خوشی کا ناچ شروع کر دیا۔ ایک ہنگامہ سا تھا۔ ایک جلوس تھا جو جمّا دادا کو اپنے کندھوں پر لئے گھوم رہا تھا۔ پھولوں کے ہار لئے مبارکبادی کی صدائیں اور فلیش کی روشنی تھی کہ جمّا دادا کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ پھر اُنھیں رات ڈپٹی منسٹر کو تانگہ یونین کی طرف سے ڈنر دیا گیا۔ اس میں سارے ہی لیڈروں نے اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ شرکت کی۔ وہ لیڈر بھی جو تانگہ یونین کے مخالف

تھے اور وہ لیڈر بھی جو موافق تھے۔ وہ لیڈر بھی جو کام کے لیڈر تھے اور وہ لیڈر بھی جو صرف نام کے لیڈر تھے۔ وہ لیڈر بھی جنہوں نے جماداد کو آج تک نہ دیکھا تھا لیکن آج وہ یوں باتیں کر رہے تھے جیسے اُن کی ساری زندگی جماداد کے تانگے میں بیٹھے بیٹھے ہی کٹ گئی ہو ——— اور وہ سب لیڈر میونسپل کلب میں ڈنر پارٹی کا انتظار کر رہے تھے اور میں انھیں دیکھ کر آیا تھا۔

گھر پر میرے ملازم نے میری ہدایت کے مطابق غسل خانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ میں نہ گندا تھا نہ جماداد آ گئے۔ ان کی تانگہ جلد آنے کی بجائے قدرے لیٹ تھی۔ اس لیے مجھے تعجب ہوا لیکن میں نے کھانے کی طرف توجہ دی۔ جماداد کی ایک بھتیجی اور اچھی سی صورت ہو میں کر رہا تھا اس سے زیادہ خوبیوں مجھے دلی مسرت ہو رہی تھی۔ تمام چیزیں اچھی طرح دسترخوان پر لگا دینے کے بعد جب میں اپنے ملازم کو مزید کسی خدمت کی ہدایت دے کر چلا تو ایک لمحہ کیلئے میری نگاہ میں کچھ بھی نہ آیا۔ کیوں کہ جماداد وہاں نہیں تھے جہاں میں چھوڑ گیا تھا۔ میں نے کمرے میں تعجب سے چاروں طرف دیکھا اور پھر جھپٹ کر باہر دروازے سے لمبی اندھیری تاریک گلی میں نظر ڈالی۔ تقریباً گلی کے آخری سرے پر وہ تیز تیز قدموں سے چلے جا رہے تھے۔ میں نے انھیں آواز دی لیکن وہ رُکے نہیں۔ میں نے پھر آواز دی اور اُن کی طرف دوڑا۔ اُن تک پہنچتے پہنچتے میری سانس پھولنے لگی۔ میں نے پیچھے سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"جماداد ——— یہ کیا حرکت ہے۔ ؟ ——— کہاں جا رہے ہو تم ——؟؟ ———"

"بابو جی ——— بابو جی میں ——" جماداد کی آواز کو ان کے آنسوؤں کی دیواروں نے آگے بڑھنے نہ دیا ——— میں نے اپنے لہجے کو نرم کرتے ہوئے پوچھا ———

"تم اس طرح کیوں چلے جا رہے تھے جماداد۔ کوئی غلطی ہو گئی ہے کیا مجھ سے ——؟؟ ———"

"نہیں نہیں ——— ایسا نہیں بابو جی ——— ایسا نہیں ..... میں ..... میں ——" اس کے آگے انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور وہ ہاتھ میرے سامنے کر دیا جو دامن تلے تھا۔ مجھ پر بجلی سی گری۔ کبوتر کے پاؤں میں وہ دو ریشمی پٹیاں تھیں جو میں نے دسترخوان پر ان کے سامنے رکھی تھیں۔

"آٹھ دن ہو گئے بابو ..... اُن کے منہ میں دانا تک نہ گیا ——— وہ مر جائیں گے ——— وہ سب مر جائیں گے ——" ——— اور میری کسی بات کا انتظار کئے بغیر وہ اس راستے کی طرف مڑ گئے جو ان کی گھر کی طرف جاتا تھا۔ اور میں اسی تاریک سی گلی میں پاؤں نہیں کتنی دیر یوں کھڑا رہا جیسے میں انسان نہیں کوئی پتھر کا بت ہوں اور میرے کانوں میں جماداد کے گھر سے اٹھتی ہوئی وہ سسکیاں تازیانوں کی طرح پڑنے لگیں جو میونسپل کلب میں گونجتے قہقہوں سے بہت ——

——— بقیہ افسانہ ..... "جلتی آنکھیں" صفحہ ۱۶ ———

لو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ جلتی ہوئی ویران آنکھیں۔ اچانک جلتی ہوئی آنکھیں جھپکیں اور ٹپ ٹپ کئی آنسو گر گئے۔ لاشعور اچھلتے ہوئے ستارے جھنجھلاتے بڑبڑاتے ہوئے انگارے۔!! اور وہ جلتی ہوئی آنکھیں اب بھی حسرت و یاس سے اسے گھور رہی تھیں۔ اچانک وہ کئی گہری پلکیں مسکرا اٹھیں۔ وہ پلٹا اور دروازے کی جانب بڑھا۔ ویران آنکھیں غائب ہو چکی تھیں مگر وہ کئی کے دل میں اب بھی وہ دو دیئے جل رہے تھے۔ نہ جانے کس خیال سے وہ مسکرا دیا۔ اس کے کانوں میں چچا جان کی آواز آ رہی تھی۔ "شبلو کی بات چھوڑ دو۔ اس ڈال کی کسی اور کلی کے بارے میں بھی تم سوچ سکتے ہو۔ میں تمہیں ہر حال میں قبول کرنے کو تیار ہوں ——"

——— بقیہ شعر و ادب ۱۹۶۵ء کی قابلِ قدر ادبی تخلیقات صفحہ ۲۰ ———

سے نہیں گذرے۔ الاماں نظر از نوبت رائے نظر، پیاسا دریا از اختر انصاری۔ انجمن آرزو از اختر اورینوی، گلبانگ از مخمور عثمان آبادی، رنگ حنا از فیض الحسن جعفری، میں اور گواز مظفر احمد انصاری، آبگینہ از سید محمد لوٹکی، سرچشمہ از چندن بھارتی، ترنگیں از رانا پرتاپ سنگھ گنوری، دل مرا کیسا از مرتبہ وحشوانا تھ۔ وطن کے راگ۔ مرتبہ مظفر شاہ

غرض کیفیت اور کمیت دونوں کے اعتبار سے ۱۹۶۵ء اردو شعر و ادب کے لئے اچھا سال ثابت ہوا، خواہ کسی پر من خاص پر عنایت گوئی کی ہو کرپا کی ہو۔

(پیشکریہ، آل انڈیا ریڈیو۔ بمبئی)

ڈرامہ

رسول احمد

چھوٹے بڑے لوگ

منظر:—

سوچا اس خانہ بدوشوں کی رہائش کی چال کے سامنے کے کھلے میدان میں پردہ کھلتا ہے۔

وقت:- جاڑے کے دنوں میں — شام کے قریب۔

اسٹیج کے بائیں جانب ایک کونے میں ٹاٹ کی دیواروں کی ایک کوٹھری بنی ہوئی ہے۔ جہاں رامو کاکا دن بھر اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ اس وقت بھی کاکا اپنا کام کر رہے ہیں۔ دو، تین نوجوان کاکا کے پاس آتے ہیں۔

(ایک نوجوان):- رام رام کاکا۔

کاکا:- رام رام۔ اے پھتیا تو سلام کرتو دہنیں تو تیرا بھیجا مار ڈالے گا

دوسرا نوجوان:- اب کام بند کرو کاکا۔ اوئے چلو۔ دیکھو سب کام اپ جائیگا

کاکا:- ناچ والے آگئے سب۔

تیسرا نوجوان:- وہ کدھر آیا ئے کاکا۔ اپنے اودھر سب ریڈی کر دیا ئے۔ وہ آئے گا تو ناچ چالو کر دے گا۔

(نندو چھوٹی ٹوکری کے پیچھے سے آتا ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا ہے۔ مگر یا وہ ایک عرصے سے بیمار ہے۔ وہ لکڑی کے سہارے چل رہا ہے۔ اس کی سانس پھول گئی ہے اور تھک جانے کی وجہ سے رُک گیا ہے اور گردن جھکائے دھیمے دھیمے کھانس رہا ہے)

کاکا:- پھتیا۔ جا نندو کو سنبھال (فتح جا کر نندو کو سہارا دیتا ہے۔ کاکا بھی نندو کے پاس آتا ہے) یہ کیا نندو۔ تجھے اپنا بھی کچھ خیال نہیں ہے۔ باہر تو کیوں آیا؟ تیرے لئے کھاٹ سے اُٹھنا تھیر (دیر) ہے تھیر

نندو:- بڑے بڑے تھک گیا ہوں کاکا۔ اور پھر ایسے شبھ اوسر کب کب آتے ہیں۔ آج دیس دیس کے چاند مجرا ہوگا۔ سنا تھا ہوگا۔ اوئے میں ایک کونے میں بیٹھا دیکھتا رہوں گا۔ آج سویرے سے سوچ رہا ہوں رامو بھیا۔ ہم جیسے معمولی لوگ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔۔۔ (فتح سے مخاطب ہوتا ہے) پھتیا۔ رے جا رہا ئی پر لیٹے لیٹے تیرے گیت سنتا ہوں بیٹے۔ تو بہت اچھا گاتا ہے۔ اور اس گیت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کھبر مجھے اٹیلی —

فتح:- کھبر مجھے اٹیلی بس بات ہی نا کل پڑی مجھے (بس اتنی خبر ہے کہ مجھے ماں نے پکارا ہے)

نندو:- یوں نہیں گا کے سنا ئیے۔ (اور فتح گیت گاتا ہے۔ نندو کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے) شاباش۔ شاباش۔

کاکا:- پھتیا۔ نندو کو سنبھال کے جا میں بھی آتا ہوں۔۔۔ (فتح نندو کو سہارا دے کر لے جاتا ہے)

(تینوں چلے جاتے ہیں۔ کاکا اپنی چھوٹی ٹوکری میں جا کر اپنا کام سمیٹتا ہے۔ اور چھوٹی ٹوکری کے عقب میں چلا جاتا ہے)

بائیں جانب سے سلمیٰ داخل ہوتی ہے۔ اور دائیں جانب سے اختر۔ دونوں بیچ میں آکر ایک دوسرے سے بڑی گرمجوشی سے ملتے ہیں۔

سلمیٰ:- ہلو اختر۔

اختر:- ہلو سلمیٰ۔ بڑی دیر کر دی آج۔ تمہارا آفس کب بند ہوتا ہے

سلمیٰ :۔ اور درد عام کر دیتی ہے اختر۔ کام اس قدر بڑھ گیا ہے کہ تھک جاتی ہوں

اختر :۔ یہ دن بھی گذر جائیں گے سلمیٰ۔ اگر جنگ نہ ہوئی ہوتی تو آج ہم دونوں ..... ارے تم تو شرما گئیں۔

سلمیٰ :۔ خدا کا شکر ہے جنگ بند ہو گئی۔ مجھے تو رہ رہ کے خیال آتا تھا۔ کہ یہ جنگ کیسے بند ہو گی۔ اور کئی مرتبہ میں اکیلے میں تمہیں یاد کر کے اتنا رو لی ہوں کہ بس۔ اگر اس وقت تم مجھے دیکھ لیتے تو ضرور میرا مذاق اڑاتے۔ اور کہتے کہ ایک فوجی کی ــــــ (ہنسنے لگتی ہے)

اختر :۔ کیا کہتا۔ ہوں۔ ایک فوجی کی بیوی کا دل مضبوط ہونا چاہیئے۔ کیوں؟

سلمیٰ :۔ لیکن اختر۔ میں اپنے دل کو کیسے پتھر بنا لوں۔ میرا بس چلے تو تمہیں ..... (ہنستی ہے) لیکن ابھی میں کیا کر سکتی ہوں۔ صرف تمہیں اپنی نظروں میں بند کر سکتی ہوں۔ دل کی دھڑکنوں میں چھپا سکتی ہوں۔

اختر :۔ سلمیٰ ... سلمیٰ۔ پھر ایک بار اپنے دل کو پتھر بنا لو۔ صرف میری خاطر۔ اگر میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوتا۔ تو یہ منحوس خبر سنائے بغیر ہی چلا جاتا۔ سلمیٰ۔ کل صبح میں جا رہا ہوں۔ ڈیوٹی پر ..... مجھے آج ہی تار ملا ہے۔

سلمیٰ :۔ اختر!

اختر :۔ جنگ پھر شروع ہو گئی ہے۔

سلمیٰ :۔ مت جاؤ اختر۔ اب مجھ سے یہ صدمہ برداشت نہ ہو گا۔ میں نے بہت دعاؤں کے بعد تمہیں پایا ہے۔

اختر :۔ اور اب تم مجھے کبھی نہ کھو دو گی۔ تمہاری ان معصوم اور حسین آنکھوں کی چمک مجھے موت کے غار سے بھی ــــ

سلمیٰ :۔ (اختر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے) اختر ... اس کا گلا رندھ جاتا ہے۔ اور وہ رو دیتی ہے۔)

اختر :۔ (اس کے آنسو پونچھتے ہوئے) سلمیٰ اس طرح مجھے جدا مت کرو۔ پلیز۔ لاؤ اپنا ہاتھ مجھے دو۔ میں تمہیں اپنے ایک دوست کی انگوٹھی پہنا دوں۔

سلمیٰ :۔ اختر یہ کیا کر رہے ہو تم۔ میری زندگی صرف تمہارے لئے ہے۔

اختر :۔ اسے پہن لو سلمیٰ۔ ڈسوزا کی روح کو شانتی ملے گی۔ اس نے

ہمارے پیار کے سکھ کی دعائیں دی ہیں۔ تم نہیں جانتیں سلمیٰ وہ میرے کتنے قریب تھا۔ تمہاری تصویر ہمیشہ اس کے پاس رہتی تھی۔ اور دیکھو یہ تصویر ہے اس کی مہربانی کی۔ کیتی کتنی معصوم ہے یہ۔ لیکن جنگ نہ کسی کی معصومیت دیکھتی ہے، نہ خوبصورتی۔ اور نہ رشتے ناتے۔ یہ میری بہن تھی سلمیٰ۔ وہ ڈسوزا کو ہر خط میں لکھتی تھی کہ میرے فوجی بھائی کو سلام ..... (ایک ٹھنڈی سانس لے کر) لیکن دشمنوں کے بموں نے اس رشتے کو بھی ختم کر دیا۔ یہ انگوٹھی ان دونوں کی معصوم محبت کی نشانی ہے۔ آج وہ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں۔

سلمیٰ :۔ اور ..... ڈسوزا ... بھائی۔

اختر :۔ وہ ایک راڈار سینٹر پر حملہ کرنے گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ اس نے جب سے کیتی کی موت کی خبر سنی تھی وہ کہا کرتا تھا کہ میں دنیا میں کیتی کے بغیر میں ایک پل زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے وہ موت کے منہ میں کودتے جاتے وقت اس نے یہ انگوٹھی دیتے ہوئے کہا تھا۔ "اختر۔ یہ رنگ سلمیٰ کو پہنا دینا۔ میں کبھی اپنی بہن کو نہ دیکھ سکوں گا۔"

سلمیٰ :۔ (انگوٹھی کو بوسہ دیتی ہے۔ اور رو دیتی ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر کہہ نہیں سکتی۔ اور تیز قدموں سے چلی جاتی ہے)

اختر :۔ سلمیٰ ... سلمیٰ ... (لیکن سلمیٰ چلی جاتی ہے اور اختر بھی تھکے تھکے قدموں سے چلا جاتا ہے)

(حکم سنگھ اور ڈاکٹر داخل ہوتے ہیں)

ڈاکٹر :۔ ایک بات بولوں سردار جی۔ تم اپنا دماغ کو ایک دم ہسپتال بھیج دو۔ ہائی گا ڈبولتا ہے۔ ایک دم سیریس کیس ہے۔ اگر ہسپتال نہ بھیجا تو کیا ہے گا مالوم ہے۔ تمہارا ہائنس بھی ایک دم ویران ہو جائیگا۔ جارا ما پیک۔ ہی، ہی، ہی۔

حکم سنگھ :۔ میں جانتا ہوں ڈاکٹر اسے کیا ہوا ہے۔

ڈاکٹر :۔ تم جانتا ئے۔ ہی، ہی، ہی۔ تم کب سے ڈاکٹر بن گیا۔

حکم سنگھ :۔ جب سے لڑائی چل رہی ہے۔

ڈاکٹر :۔ ہی، ہی، ہی۔ تم بھی ایک دم سردار جا ہے۔ جنگ شروع ہوتا ئے سردار جی تو بھائی لوگ پوچھی بنتا ئے۔ ڈاکٹر کیسے بنتا ئے۔ ہی ہی ہی۔

حکم سنگھ :۔ تم تو کیا ڈاکٹر۔ دنیا میں کوئی آدمی نہیں سمجھ سکتا صرف وہی

سمجھ سکتا ہے۔ جس کا ایک ہی بیٹا ہو اور وہ بھی اور چے پر۔ چوبیس گھنٹے سے جس کی کوئی چیخ نہ آئی ہو۔ سالا فکر مند ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نہ روک سکتی ہے نہ سہ سکتی ہے۔ اگر مرے گی نہیں تو کیا ہوگا۔ میں جانتا ہوں تمہارے علاج سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر:۔ اپن اتنا ناڑی نہیں سردار جی۔

حکم سنگھ:۔ نہ تم ناڑی ہو نہ میں۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں صرف ایک دل کی تسلی کے لئے تمہیں بلاتا ہوں (ڈاکٹر کا بیگ دے دیتا ہے)

ڈاکٹر:۔ اچھا سردار جی۔ اپن پھر کل آئیں گا۔ ہاں۔

حکم سنگھ:۔ کل میں خود ہی دوا لینے آجاؤں گا۔

ڈاکٹر:۔ کیوں؟ بیمار کو روز دیکھنا منگتا ہے۔

حکم سنگھ:۔ سو تو ٹھیک ہے ڈاکٹر۔ لیکن... اب کیا بتاؤں۔

ڈاکٹر:۔ ارے تم تو ایک دم سردار جی ہے۔ تم فکر مائے کو کرتا ہے۔ بہت سا لوگ اپن کو بیوقوف بولتا ہے۔ پر ہم اتنا بیوقوف نہیں ہے۔ اپن کل آئیں گا اور جرور (ضرور) آئیں گا پیسہ ویسہ کا چنتا مت کرو سردار جی۔ اب اپن کو ہکم ہوا ایسا صرف تمہارا دوائی کا دکھ نہیں ہے تمہارا بھی نہیں ہے۔ ہم سب کا دکھ ہے۔ سمجھے۔

حکم سنگھ:۔ کرپا ہے آپ کی۔ ۔۔۔ (دباؤ ہو ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر اسے روکتے ہوئے) تم بھی ایک دم سردار جی ہے۔ (ہنستے ہوئے چلا جاتا ہے)

کاکا:۔ حکم۔

حکم سنگھ:۔ تسلے کاکا۔

کاکا:۔ ارے بھائی کلونت کی کیا حالت ہے۔

(عقب سے ایک عورت کی آواز آتی ہے)

بالو:۔ اور دس گیارہ سال کا لڑکا جو کاکا کاکا پکارتا ہے۔ چلا جاتا ہے)

حکم سنگھ:۔ سانس چل رہی ہے کاکا۔ کل جب اس نے سنا کہ لڑائی بند ہو گئی ہے۔ اس وقت سے اس کی حالت کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن۔

کاکا:۔ دل چھوٹا مت کر حکم۔ بھگوان سب اچھا کریں گے۔ لیکن اسے مت بتانا کہ لڑائی کی لعنت ختم ہو گئی ہے۔ اس کا دکھ بہت بڑا ہے۔ ہم انہیں سمجھ سکتے۔

حکم سنگھ:۔ وہ ایک ہی کمر پڑھی ہے کاکا۔ میرا رتن تک بنے گا۔

کاکا:۔ آئے گا، آئے گا جرور آئے گا۔۔۔ دیکھتے ہوئے اپنی جھونپڑی کی طرف چلا جاتا ہے۔ حکم سنگھ بھی چلا جاتا ہے)

بالو:۔ دنتا بالو دوڑتا ہوا آتا ہے۔ دادا۔ دادا۔ بابا بابا آئی

دادا:۔ کیوں بیٹا۔۔۔ اسے یہیں بلالے۔۔۔ (آواز دیتا ہے) کنتی ارے یہیں آجا بیٹی۔۔۔۔ (کنتی آتی ہے)

کنتی:۔ بالو۔۔۔۔ وہ۔۔۔ بالو۔۔۔

دادا:۔ بول بیٹا بول۔

کنتی:۔ بالو۔۔۔ رجو کا باپ ابھی تک نہیں آیا۔

دادا:۔ ارے بیٹی ابھی اس کے آنے کا وقت کہاں ہوا ہے۔ ابھی تو سرپھ (صرف) سات بجے ہیں۔

کنتی:۔ نہیں بالو۔۔۔ سب لوگ کہتے ہیں رجو کے باپ کی لڑائی پر گیا ہے۔

دادا:۔ (ہنستے ہوئے) لڑائی پے؟ ارے تجھے کس نے کہہ دیا بیٹی۔ اس کا وہاں کیا کام۔ لڑائی پہ تو بھیجا جاتا ہے۔

(گلاب خاں داخل ہوتا ہے)

گلاب:۔ تسلے کاکا

دادا:۔ ارے تو گلاب بھی آگیا۔ بھئی وہ تیرا دوست کہاں ہے؟

گلاب:۔ کاکا۔۔۔۔ (وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ اور کنتی کی طرف اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ اس کی موجودگی میں کچھ کہنا نہیں چاہتا)

دادا:۔ کنتی تو گھر جا بیٹی۔

کنتی:۔ نہیں بالو۔ میں نہیں جاؤں گی۔

گلاب:۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے بھائی۔۔۔۔ کاکا راستہ ٹرک نے کرنیل صاحب کے موٹر پر کچل دیا ہے۔

(دادا ایک دم گھبرا جاتا ہے گویا اسے گلاب کا تار چکا ہو۔ کچھ دیر تک تو اس کی آواز بھی نہیں نکلتی)

کنتی:۔ (کاکا کو جھنجھوڑتے ہوئے) سنا بالو۔ سنا تم نے۔

دادا:۔ رو مت بیٹی۔ اپنے وکت رونا برا شگون ہے بیٹی۔

کنتی:۔ تو میں کیا کروں بالو؟

دادا:۔ پرارتنا کر بیٹی۔۔۔۔ بھلا آدمی مجھ سے ٹکر لو گیا ہتا

میں اُسے کبھی نہ روکتا۔

گلاب:۔ میں نے کاکا رامو کو بہت سمجھایا تھا۔ تو گھر میں سب سے مل کر جا۔ لیکن وہ نہ مانا۔ اور سب سے پہلے تیار ہو گیا۔

کاکا:۔ (گویا خود ہی باتیں کر رہا ہو) ہاں۔ تو نے ایک پاپ کا سراوپی کر دیا ہے۔ اس دھرتی کا ہم پر بہت قرض تھا۔ رامو تو نے بہت اچھا کیا۔

گلاب:۔ کاکا، رامو کو کچھ کہلوانا ہے۔ میں کل صبح جا رہا ہوں۔

کاکا:۔ ہاں اُسے کہنا تیرا باپ بہت خوش ہوا (اور اپنی آنکھیں پونچھتا ہے)

کنتی تو باپو پہلے میرا اکلا گھونٹ دو۔ میرے دودھ کے دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ باپو گلاب سے کہو وہ آپ مجھے گھر بھیج دے۔

کاکا وہاں رامو اکیلا نہیں ہے بیٹی۔ بہت سے لوگ ہیں۔ اور سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی تو ہو گا۔ یہ دیکھ گلاب کی بھی پتنی ہے۔ اُس کے بچے بھی ہیں۔ پھر یہ کیوں جاتا ہے۔ تو نہیں جانتی بیٹی پہلے کی ناریوں کو۔ وہ اپنے مردوں کو ہنستے ہوئے یدھ پر بھیجتی تھیں۔ ادھر آ بیٹے۔ ادھر آ۔ (گلاب نزدیک آتا ہے) رامو تو ہمیں ملے ہی چلا گیا۔ تو تو مجھ سے مل کر جا۔ اس راستے پر جانے والا دشمن بھی میرا بیٹا ہے۔ ایک باپ کو اپنے بیٹے سے گلے مل لینے دے۔ (دونوں گلے ملتے ہیں) بھگوان تم سب کی رکشا کرے۔ (کاکا کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ وہ گلاب سے جدا ہوتا ہے۔ اور کنتی کو لے کر چلا جاتا ہے)

(شرما جی اور رام موہن داخل ہوتے ہیں۔ شرما جی اور رام موہن دونوں نے کھادی پہن رکھی ہے لیکن رام موہن کا لباس مضحکہ خیز ہے)

رام موہن:۔ (چلاتا ہے) ایے ایے۔ ایے کرشی لاؤ کرشی۔۔۔ دیکھیے گدھے ہیں یہ لوگ۔ (اور خود ہی بھاگتے ہوئے دائیں جانب کی ونگ سے باہر چلے جاتے ہیں۔ اور خود ہی کرشی اٹھائے داخل ہوتے ہیں) تم لوگوں میں ایک پائی کی بھی عقل نہیں ہے۔ چلو یہ منہ کیا دیکھتے ہو۔ صاحب کا سوٹ کیس لاؤ۔۔۔ (دونوں شخص جو رام موہن کے ساتھ ہی آئے پر آگئے ہیں) ۔۔۔ چلو۔۔ چلو۔۔۔ کیا سمجھے ہو۔ ایسے بڑے آدمیوں کو بھی نہیں پہچانتے۔ (کرسی بیچ میں رکھ کر) آیئے شرما جی آیئے۔

(شرما جی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ معلوم ہے۔ ہمارے صاحب کون ہیں۔ راجیہ سرکار کے چیلسٹی ڈاکٹر ہیں اور۔۔۔

فرنانڈیز:۔ (دل کم سر۔ آپ آیا اپن بوت دراجی ہوا۔

گوپال:۔ بڑی کرپا کی آپ نے۔

شرما جی:۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ دھرم اور کرتویہ میں کرپا جیسا کوئی استھان نہیں ہے۔ ماتر بھومی کی رکشا ہم سب بھارتیوں کا دھرم ہونا چاہیئے۔

رام موہن:۔ ہا۔ ہا۔ کتنے سندر وچار ہیں۔ اور آپ کے ان ہی وچاروں پر ہیں نے اپنا ناٹک لکھا ہے۔

شرما جی:۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ جب ہمارے جوان سپاہیوں پر جان کی بازی لگا رہے ہوں۔ ہمارا ہر کمار یدھ کا ایک انش (جز) ہوتا ہے۔ جب آج مجھے معلوم ہوا کہ سیٹھ اگر دھاری لال کی چال کے لوگوں کی اور سے سیٹھ جی پانچ ہزار روپے یدھ میں دے رہے ہیں تو میں اپنے تمام کام چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ اچھا سیٹھ جی کب آ رہے ہیں یہاں۔

گوپال:۔ آتے ہی ہوں گے مالک۔ (عقب سے سیٹھ جی کی آواز سنائی دیتی ہے۔۔۔ "ننھو۔۔۔ رامو۔۔۔ ابے او گوپال)

مالک آگئے سرکار۔۔۔ چلو چلو۔۔۔ دیکھیں۔۔۔ (گوپال اور فرنانڈیز بائیں جانب سے نکل جاتے ہیں۔)

شرما جی:۔ رام موہن جی یہ تمہارا پروگرام کب تک چلے گا۔

رام موہن:۔ دو، تین گھنٹے ہو جائیں گے شرما جی۔

شرما جی:۔ دو، تین گھنٹے! اس سے پہلے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔

رام موہن:۔ ہنستے ہوئے) اگر آپ میرے ناٹک میں ہوتے تو دیکھتے ہی دیکھتے آپ کی Exit کروا دیتا (ہنسنے کی ناکام کوشش کرتا ہے)

شرما جی:۔ رام موہن ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں سیٹھ جی سے مل کر خود ہی چلا جاؤں گا؟

رام موہن:۔ ہو تو سکتا ہے۔ لیکن آپ کے بغیر اس ناٹک کا مہتسو کون کرے گا۔ میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں۔ شرما جی، اگر آپ

نیابتی طرفداری نہ کی تو یہ الفاری کا مزدہ میرے ڈرامے کو کینسل کر دیں گے۔

شرما جی:۔ کیوں؟

رام موہن:۔ آپ تو جانتے ہیں الفاری کی ذہنیت۔ وہ میرے ہر کام میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ اگر آپ نہ ہوتے تو مجھے Prod motion کی نہ ملتا۔ اب وہ کہتے ہیں صادق سے اچھا کوئی لکھنے والا ہی نہیں ہے گجرات میں۔ میں پوچھتا ہوں اس جنگ میں بڈھا کا پہاڑ اچھی طرح کون کر سکتا ہے۔ میں یا وہ؟

شرما جی:۔ تم چنتا مت کرو رام موہن۔ تمام سرکاری ٹوکیشن ملیں گے ... اچھا اب یہ بتاؤ ——

اجنبی:۔ (گجراتی زبان میں) سیٹھ جی آنے والے نہیں ہیں۔

شرما جی:۔ کیا؟ — (ایک دم کھڑے ہو جاتے ہیں) سیٹھ جی نہیں آئیں گے۔ کیوں؟ .... اب؟

رام موہن:۔ اگر آپ کل مل لیں تو ——

شرما جی:۔ تو جھک مارنے یہاں آیا۔ کل گیارہ بجے سیٹھ جی کے دفتر میں انٹرویو ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سو روپے کی نوکری ملی جائے گی۔ اتنی بات سمجھے ——

رام موہن:۔ اب بات کچھ کچھ میں آ رہی ہے۔ یعنی اگر آج ہی سیٹھ جی سے ملاقات ہو جائے تو آپ کے بیٹے کو پانچ سو روپے کی نوکری مل سکتی ہے۔ اور سیٹھ جی سے یہاں ملنے کا پلان فیل ہو گیا۔ فرض کرو اگر یہ ڈرامے کی کوئی سچوایشن ہوتی تو میں کیا کرتا (سوچتے ہوئے) پہلی بات تو یہ کہ سیٹھ جی کو بیمار رہتا۔ کیونکہ اکثر بڑے آدمیوں کو ایسے موقع پر کھانسی ہو جاتی ہے، زکام ہو جاتا ہے۔ پھر (چٹکی بجاتے ہوئے) بس ٹھیک ہے۔ آپ ایسی وقت چلے جائیے سیٹھ جی کے گھر۔ اور جاتے ہی ان سے کہئے کہ میں نے آپ کے بیمار ہونے کی خبر سنی اور سارا کام چھوڑ چھاڑ کر ملنے چلا آیا۔ دیکھئے سیٹھ جی ایک دم خوش ہو جائیں گے۔

شرما جی:۔ " Very good

رام موہن:۔ اور ہاں۔ ہو سکے تو میرے کو بھی ساتھ لے جائیے۔ اور اسے سمجھا دیجئے کہ وہ سیٹھ جی کو بار بار چاچا جی کہے۔

(دونوں جانے لگتے ہیں۔ کہ اسی لمحہ ایک نوجوان کا سیٹھ جی کے گھوڑا ناچ کی چار پانچ نوجوان لڑکیاں ہیں ڈرامے کی کمی کو اسٹکلاں دور کر سکتا ہے .....

(دونوں باہر چلے جاتے ہیں)

(منیم جی) گوپال اور فرنانڈیز کے ساتھ داخل ہوتے ہیں)

منیم جی:۔ تم لوگوں نے اچھا انعام دیا ہے مجھے۔ ارے میں سیٹھ جی کے آگے سر نہیں اٹھا سکتا۔ تم نے کس سے پوچھ کر اس ہیرے کو پرگھو بنا دیا۔

فرنانڈیز:۔ ہیرا یا ہائے منیم جی۔ ہیرالال جی بولو۔ ہیرالال جی۔ وہ اب Mayor ہائے DEputy جا لیئے۔

منیم جی:۔ اہ۔ ہا۔ اب وہ ڈپٹی بنے کہ فٹنی۔ سیٹھ جی کے آگے اور میرے آگے ہیرا ہی رہے گا۔ تم لوگوں کی تو اکل گھاس چرنے گئی ہے۔ سیٹھ جی کے بیسوں سے وہ اکشن دیتا۔ سیٹھ جی نے اسے ڈپٹی بنایا۔ تو اس دن کے لئے کہ وہ پرگھو بنے اور سیٹھ جی ایک کونے میں بیٹھیں۔

گوپال:۔ (ہاتھ جوڑتے ہوئے) ہم سے بڑی بھول ہوئی منیم جی۔ ہمیں معاف کرو۔ ہم کہو تو ہم سیٹھ جی کے سامنے ہاتھ جوڑ کے ماپی مانگیں

منیم جی:۔ سیٹھ جی نے ماپی کے بھوکے ہیں اور نہ یہاں آنے کے۔ میں تو تمہارے بھلے کے لئے کہتا ہوں سمجھے۔ سیٹھ جی سے سیکڑوں کام پڑیں گے تمہیں۔ وہ ہیرا تو تمہیں گننے بھی نہیں آئے گا۔

گوپال:۔ اب کیا ہو گا؟

منیم جی:۔ ہو گا وہی جو ہمیشہ (ہمیشہ) ہوتا ہے۔ بھولیں کرو تم اور بھگتیں گے ہم۔ اچھا وہ چندے کی رقم کس کے پاس ہے۔

فرنانڈیز:۔ سب پیسا زور بھائی کے پاس ہے۔ وہ اپنا گورکھا بھائی چندا دینے کو نا بولتا ہے۔

منیم جی:۔ ہے بھگوان۔ ناک میں دم کر دیا ہے اس لائسنس (دستخط) نے۔ کہاں ہے وہ؟ دیکھتا ہوں کیسے نہیں دیتا۔

(منیم جی غصے سے نکل جاتے ہیں۔ گوپال اور فرنانڈیز بھی ساتھ چلے جاتے ہیں۔ رائٹر جاب

سے رام موہن اور بائیں جانب سے کشم داخل ہوتا ہے۔
(کشم نے میک اپ کیا ہوا ہے۔)

رام موہن:۔ ہا۔ ہا۔

کشم:۔ انکل، یہ بھی کوئی طریقہ ہے ولسی سیوا کا۔

رام موہن:۔ کیا ہوا لے لی، تم کب آئیں؟

کشم:۔ آدھ گھنٹے سے میک اپ کر کے بیٹھی ہوں I am ... Tired now

رام موہن:۔ لتے جلدی تھک گئیں۔ لوگ تمام زندگی میک اپ میں گزار دیتے ہیں اور نہیں تھکتے، ہی ہی ہی

کشم:۔ (رام موہن کا منہ چڑاتی ہے) تم نے خواہ مخواہ معیت میں پھنسا دیا۔ میں اکیلی بور ہو گئی ہوں انکل

رام موہن:۔ کیلاش وغیرہ نہیں آئے۔

کشم:۔ I am only for Goodness to come

رام موہن:۔ یہ کیا کہہ رہی ہے بی۔ وہ لوگ ابھی تک نہیں آئے؟ تو ناٹک کب ہو گا؟ اگر ناٹک نہ ہوا تو میں ایک ایک کی۔ میں سب کے خلاف ویش وید گی کا مقدمہ لڑوں گا۔ اور سیدھے دلوں گا جیل میں۔ سمجھتے کیا ہیں۔ اگر بڑے کلاکار ہیں تو اپنے گھر کے ہیں بھی تلیفون کرتا ہوں۔ (اور غصے میں پاؤں پٹختا ہوا چلا جاتا ہے۔ گنیش اور کلا داخل ہوتے ہیں)

کلا:۔ تم بھی بچوں کی طرح ضد کرتے ہو گنیش۔ تم نہیں جانتے ہیں رام موہن کے کسی ڈرامے میں کام کرنا نہیں چاہتی۔

گنیش:۔ یہ میں جانتا ہوں کلا۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس الو کے پٹھے کو ایک بھی جملہ لکھنا نہیں آتا۔ ڈرامہ کیا لکھے گا؟

کلا:۔ پھر تم لوگ اسے اس قدر IMPORTANCE کیوں دیتے ہو؟

گنیش:۔ تم نہیں جانتیں کلا۔

کلا:۔ میں سب جانتی ہوں۔ وہ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا ہے، دو چار سرکاری شو دلا دے گا اور ــــ

رام موہن:۔ (داخل ہوتا ہے) ارے تم بھی کیسے آدمی ہو گنیش۔

کشم:۔ (رام موہن سے) انکل اب انہیں بلو نا۔ یہ سب کیوں دیر سے آئے۔ انکل پولیس کو ٹیلیفون کیا یا نہیں؟

گنیش: پولیس کو؟

رام موہن:۔ ارے ہیں ... وہ ... وہ ... میں تو بھول گیا۔ ٹیلیفون کرنے گیا تھا۔

کشم:۔ تم مجبور ہو بولتے ہو انکل۔ ابھی تم ان سب کو ویش وید وی کہہ رہے تھے۔

گنیش:۔ ہیں؟

کشم:۔ جی ہاں۔ تم سب دیر سے جو آئے ہو۔

گنیش:۔ شٹ اپ۔ شرم نہیں آتی بکواس کرتے ہوئے۔

رام موہن:۔ ارے بھئی گنیش خواہ مخواہ بے بی کا موڈ خراب ہو جائے گا اور وہ ناٹک میں کام نہیں کر سکے گی۔ جانتے ہو ابھی ابھی بے بی کے ڈیڈی ہمارے ناٹک کو پسند کر گئے ہیں۔ اب تمام سرکاری شو ہمیں ملیں گے۔

کلا:۔ میں جانتی ہوں گنیش۔ آخری بار جو میں تم سے کہہ رہی تھی۔

گنیش:۔ کلا۔ اس ڈرامے میں تم ہی کام کرو گی۔

رام موہن:۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے گنیش۔ میں شرما جی کو وچن دے چکا ہوں۔

گنیش:۔ میں کلا کو وچن دے چکا ہوں۔

رام موہن:۔ لیکن کہاں کشم بے بی اور کہاں کلا دیوی۔

کلا:۔ یو شٹ اپ۔ اگر اب ایک لفظ کہا تو زبان کھینچ لوں گی۔

رام موہن:۔ یو شٹ اپ۔

کلا:۔ سنا گنیش۔ اب میں یہاں ایک پل بھی نہیں ٹھہر سکتی۔ اور اگر تم نے بھی اس ڈرامے میں کام کیا تو میں کبھی تم سے بات بھی نہیں کروں گی۔ (کلا چلی جاتی ہے۔ گنیش، کلا، کلا، کہتے ہوئے پیچھے چلا جاتا ہے۔ اور رام موہن کرسی پر گر پڑتا ہے۔ منیم جی داخل ہوتے ہیں)

منیم جی:۔ اتنا بڑا تالا لگا کر چلا گیا ہے۔ اتنا غصہ آتا ہے کرتا لا توڑ کر سب سامان باہر پھینکوا دوں۔

گردھاری:۔ (ڈرامائی انداز میں داخل ہوتا ہے) کیوں منیم جی کلا یہ نہیں لیتے کیا۔؟

منیم جی:۔ اوہو۔ ابے تو کون سے سوچ پاس دے دیتا ہے۔

گردھاری:۔ سوچ پاس تو کیا منیم جی، دنیا کی ساری دولت بھی تمہارے سیٹھ جی کا پیٹ نہیں بھر سکتی۔

منیم جی:۔ ابے تو کب انسان بنے گا گردھاری۔ یاد رکھ اگر آج تو نے چندے کے پچیس روپے نہیں دیئے تو اچھا نہیں ہو گا۔

گردھاری:۔ میں چندے میں ایک پائی بھی نہیں دے سکتا۔

مینم جی:۔ تو میں سیٹھ جی کو کیا جواب دوں گا۔

گردھاری:۔ اُن سے کہنا تمھارے لاکھوں روپے کس کام آئیں گے۔

ایک شخص:۔ ٹھیک کہتے ہو گردھاری بھائی۔

مینم جی:۔ یہ کون ہے ٹھیک کا بچہ۔ شرم نہیں آتی تمھیں۔ یہ پیسے سیٹھ جی کے جیب میں یا میری جیب میں جانے والے نہیں ہیں۔ تم سب کی بھلائی ــــ

گردھاری:۔ بات کاٹ دیتا ہے۔ مینم جی اتھارا سماج اور تمھارے دیس کے ٹھیکیدار ہمیں ایسے ہی وقت پر ہم غریبوں کو یاد کرتے ہیں۔

ہیرالال:۔ (جو بھیڑ میں نمودار ہوتے ہیں) کون ہے یہ ــــ؟

(رستا ٹھہرا جاتا ہے)

گردھاری:۔ میں؟ میں بھی ایک ہندوستانی ہوں ہیرالال جی۔ دیس کی آزادی کی حفاظت صرف تمھارا ہی حق نہیں ہے۔ میرا بھی دھرم ہے لیکن مجھ جیسے غریب لوگ پورے اٹھارہ سال سے آزادی اور ترقی کے نام پر بھوک، بے روزگاری اور بدحالی کا زہر پیتے رہے ہیں اور تمھاری لوٹ کھسوٹ نے ہمیں تم سیاست کا نام دیتے ہو آج بھارت کو جنگ کے شعلوں میں ڈھکیل دیا ہے۔ آج تمھارے منصوبوں پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ تباہی اور بربادی منہ پھاڑے تمھیں نگلنے کے لئے آگے بڑھ رہی ہے تو تم لوگ غریبوں کی جان و مال کی بھیک مانگ کر ٹینک کو بچانے نکلے ہو۔

ہیرالال:۔ یہ غدار ہے۔ دیس دروہی ہے۔ کمیونسٹ ہے۔

گردھاری:۔ اگر سچ بولنا غداری ہے۔ دیس دروہ ہے۔ تو میں غدار ہوں، دیس دروہی ہوں۔

ہیرالال:۔ میرا منہ کیا دیکھتے ہو تم لوگ۔ پکڑ لو اسے۔ پکڑ لو۔

(کوئی آگے نہیں بڑھتا)۔۔۔ مینم جی۔ پولیس کو بلاؤ۔

(دو تین آدمی ایک زخمی لڑکے کو اٹھائے داخل ہوتے ہیں۔ لڑکے کی پیشانی سے خون بہہ رہا ہے)

گردھاری:۔ (زخمی لڑکے کو دیکھ کر) منّو یہ کیا ہوا منّو کو۔

منّو:۔ کچھ نہیں باپو۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔

اجنبی:۔ اسے دو چار لڑکے پیٹ رہے تھے۔ میں نے بیچ بچاؤ کیا۔

گردھاری:۔ پٹے کیوں؟ مگر کیوں؟

منّو:۔ گھر چلو مت باپو۔ مجھے بہت زیادہ چوٹ نہیں لگی۔۔۔ (کراہتے ہوئے) ۔ تمھیں نے کہا تھا۔۔۔ جنگ کے زمانے میں صرف وہی اچھا آدمی سمجھا جاتا ہے، جو اچھا سپاہی ہوتا ہے۔ ملک کا وفادار ہوتا ہے۔

گردھاری:۔ ہاں۔ ہاں۔ منّو لیکن

منّو:۔ باپو سب پیسے دو تین گنا زیادہ بھاؤ چڑھا کر اپنا اناج بیچتے ہیں۔ اور میں نے۔۔۔۔ میں بھاؤ زیادہ نہیں لیتا باپو۔۔۔ میرے سب اناج بک گئے باپو اور۔۔۔۔ اور اُن کے اخبار پڑے رہے۔۔۔ پھر۔۔۔ پھر۔۔۔

(اس کی گردن ڈھل جاتی ہے)

گردھاری:۔ (چلاکر) منّو۔۔۔ منّو میرے بیٹے۔۔۔ تیرا باپ دیس دروہی ہے۔ تجھے ایسا سبق کبھی نہیں سیکھنا چاہئے تھا کہ تو اپنی جان دے دے۔۔۔۔ (ہیرالال کی طرف مڑ کر) ہیرالال۔ اس مُردہ جسم کے لئے بھی ایک پھانسی کا تختہ بنواؤ۔ یہ بھی دیس دروہی ہے۔۔۔ لو۔۔۔ پولیس داخل ہوتی ہے۔ اور سائرن کی آواز آتی ہے۔ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ لوگوں کی چیخ پکار کے ساتھ پردہ گرجاتا ہے) ●●

بقیہ صفحہ ۵۱ ۔ ● محاذ۔ اپنے ہی پس منظر میں۔

یونیورسٹی کا منظور نظر۔۔۔۔ فنکار۔۔۔۔ محاذ۔۔۔۔ پتھروں پر سسک کر۔۔۔۔ تڑپ کر۔۔۔۔ مرگیا۔۔۔۔ سردی میں ٹھٹھر کر مرگیا۔ ایک باب ختم ہوگیا۔۔۔۔ مگر ایک پُرسوز آواز برابر چلی آرہی ہے ــ

اے غمِ دل کیا کروں۔۔۔ اے وحشتِ دل کیا کروں۔ ●●

● مدّتِ خریداری ختم ہونے کی اطلاع

اس سیاہ حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری مئی کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو گیا ہے آپ کی خدمت میں جون ۱۹۶۲ء کا "شاعر" وی پی روانہ کر دیا جائے گا۔ یا آپ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر روانہ کر دیجئے۔ اگر تجدید خریداری منظور نہ ہو تو واپسی ایک خط کے ذریعہ دفتر کو اطلاع دیدیجئے تاکہ وی پی نہ بھیجا جائے۔ منیجر

غزلیں

(عبدالرحیم نشتر)

اِک پری وش کی قبا بن کے چلے
آج ہم اپنی دُعا بن کے چلے
سائگروں پر چھا گئے بن کر ہوا
ریگ زاروں میں گھٹا بن کے چلے
رات کو پھیلے اندھیروں کی طرح
دن کو سورج کے ضیا بن کے چلے
بزمِ جاناں سے چلے جس وقت ہم
یوں لگا جیسے خدا بن کے چلے
آرزو یہ ہے کہ میں شنجرِ بنوں
اور تو بادِ صبا بن کے چلے
اُن کا کیا ہے، وہ تو جانِ شہر ہیں
گھر سے نکلے دِل رُبا بن کے چلے

(سحرؔ اعظمی)

محتسب! رندِ خوش اطوار سے کیوں اُلجھا ہے
ہوش کی آہنی دیوار سے کیوں اُلجھا ہے
پاسِ غیرت تھا تو صیاد سے اُلجھا ہوتا
باغباں مُرغِ گرفتار سے کیوں اُلجھا ہے
قیدِ گرداب سے کشتی کی رہائی معلوم
ناخدا وقت کی رفتار سے کیوں اُلجھا ہے
زندگی جس کی ہے افسوں زدۂ خواب و خیال
وہ مری فطرتِ بیدار سے کیوں اُلجھا ہے
واعظا! خود ہے یہ تہذیب زوال آمادہ
آفتاب سرِ دیوار سے کیوں اُلجھا ہے
اِک نظر کیفیتِ رنگِ افق پر بھی سحرؔ
تیرگیٔ سحر آثار سے کیوں اُلجھا ہے

(اقبال طاہر اکلوٹی)

نفس نفس ہے فسردہ نظر نظر ہے نڈھال
عروجِ درد کی منزل میں ہے سکوں کا زوال
خدا ترس ہیں مرے اہلِ مے کدہ کتنے
اُٹھا ہے پھر مری حق تلفیٔ وفا کا سوال
تمھیں نے چھین لیا ان کا حافظہ ورنہ
بھلا سکیں گے تجھے کیسے میرے خواب و خیال
چمن میں خار ہیں اپنے نہ برگ و بار نہ گُل
سُنائیں بھی تو کسے ہم دلِ تباہ کا حال
ہٹا سکی نہ کبھی فرطِ شوق کے باوصف
نسیمِ زلفِ جنوں رُخ سے شب کے گرد و ملال
جلا رہا ہوں سرِ شام ہی سے اے طاہر
شبِ فراق کے رحم و کرم پہ شمعِ وصال

طنز و مزاح

جیون لعل گوھا

فنِ گفتگو

کہتے ہیں کہ سقراط نے فنِ گفتگو میں ایک عورت سے تربیت حاصل کی تھی جس کا نام غالباً اسپاشیا (Aspasia) تھا۔ اس روایت کی صداقت پر شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ جنسِ لطیف اس فنِ لطیف میں، عام طور پر، مہارتِ تامہ رکھتی ہے۔ جہاں تک مردوں کا تعلق ہے، بعض "علامہ و علامہ" قسم کے مرد ہی کسی خاص موضوع پر کچھ دیر تک گفتگو کر سکتے ہیں۔ لیکن عورتیں بلا امتیاز، بغیر کسی موضوع کے گھنٹوں بولتی ہیں، بلکہ یہوں بلا تقریر خطرناک ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا ادبا و شعرا کو چاہیئے کہ اگر وہ اچھے خطیب و مقرر بھی بننا چاہتے ہوں تو فنِ خطابت ایسی بیویوں سے حاصل کریں جو عورت ایک عدد بیوی سے شرفِ تلمذ حاصل کریں۔ تلمیذ الرحمٰن کے ساتھ ساتھ "تلمیذ الازواج" ہونے میں کیا حرج ہے۔ ایں

آپ میں سے اکثر حضرات کو یہ حال نوازِ تجربہ ہوا ہوگا کہ کبھی کبھی آپ کی "نصف بہتر" اور اُن کی ہم ذوق و ہمنوا سہیلیاں بیٹھک کمرے میں محفل آرائی کرتے کرتے، آپ کے ڈرائنگ روم کو خالی پا کر اُسے اپنا "کمرۂ عدالت" بنا لیتی ہیں اور شہر بھر کے واقعات و حادثات، یعنی تمام اسپیشل اور گھریلو جھگڑوں پر تنقید و تبصرہ کرتے کرتے ایک تازہ گرم قسم کا مباحثہ شروع کر دیتی ہیں ــــ پھر جہاں تک خانگی تنازعات کا تعلق ہے، یہ خود ساختہ جیوری ہمیشہ "جنسِ کثیف" یعنی شوہروں ہی کو مجرم قرار دیتی ہے۔ "ہاں گاہے گاہے یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک آدھ محترمہ شوہر کا موید بننے کیلئے کسی کم نصیب شوہر کی "اکلوتی دلہن" کی بخت اور "عزیز از جان صورت" کو بھی متہم کر بیٹھتی ہیں لیکن اسی ایک سانس میں دلہن بیگم کے بخت نارسا پر اظہارِ تاسف و ہمدردی کی نمائش کے ساتھ ساتھ اہلِ غریب کا مذاق اڑاتے ہوئے قہقہے بھی لگاتی ہیں۔ ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟!"

دوسری خاتون اشیائے خورد و نوش کے نرخوں کی سیر بھی لگا کر مارکٹ سے واپس آ کر گلشن کی مہنگائی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں ــــ "اجی! کہوں کھانے کی بات میں اللہ میاں حضرت آدم و بی حوا کو جنت سے نکال کر دنیا اب تک مطمئن نہ ہوئے اور اب اولادِ آدم کو کہیں سے محروم کرنے پر تلے نظر آتے ہیں۔ وہ تو کہیئے غریب شیطان نے امیر امریکہ والوں کو اکسا رکھا کہ وہ یا کہ ہندستان کو ڈرا دھمکا کر نہ رکھے تو ہم اور نہ اس ارضِ جنت نشاں کے دوزخ بن جانے میں کون سی کسر باقی رہ گئی ہے۔ جنت کی نہر لبنِ و جبرِ انجد کے ہاتھ سے گئی سو گئی ہی تھی اب بھائی یہ کا دودھ بھی پیڑ یا کا دودھ" ہو گیا ہے۔ صنعتِ تکھن سازی کے بجائے اب "مکھن بازی" کی صنعت زیادہ ترقی کر رہی ہے۔ سبزی کا ذکر کرنا اب سبزہ کو دکھانے کے مترادف ہے۔ دال گئی تو اب "طالبانِ دید" کی دال نہیں گلنے دیتی۔ مجھ کو آج آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا ہے۔ اور شکر تو ایسی چیز ہے جو عین چل گئی ہے۔ دل کا چین لوٹ کر۔ یا یوں کہو کہ "میٹھا زہر" بن گئی ہے۔ جو صرف ڈاکٹر کے نسخے پر پرمٹ کے ذریعہ ہی خریدی جا سکتی ہے زندگی "پرمٹ" پر مٹ رہی ہے۔ اب کوئی کیا کھائے سوائے قسموں کے؟! اور کیا پیئے سوائے خونِ جگر کے! اب "گھنٹوں" گھنٹوں "کیو" میں کھڑے کھڑے اور پھر لیٹ لیٹ کر ملتا ہے۔ اور تو اور ــــ ع قلتِ غلہ خوں کو چھپانے کے لئے بھوجا غازہ اور لپ اسٹک یہاں بنا شروع ہوئے ہیں اُن کے دام سنگھی تو ع ــــ اجی اب اشکِ خوں پنا دلِ ناکام روتا ہے ــــ ادنیٰ اللہ کیا زمانہ آیا ہے ــــــ

ایک اور گمنام صاحب جن کے کسی بزرگ رشتہ دار کے "سورگ باش" ہونے کی تازہ خبر ابھی ملی ہے، مرحوم کا ذکرِ جمیل چھیڑ رہی ہیں اور

آنسو نہ آنے کے باوجود رومال آنکھوں پر پھیرتی جاتی ہیں ـــــ دل ہی دل میں کچھ جائداد ملنے کی توقع پر شکر ادا کر رہی ہیں لیکن بظاہر سسکیاں بھر رہی ہیں۔ اور اُن کی ہر روز کی ادائیں اس کامیاب اداکاری کا منہ تک رہی ہیں۔ ع پیارِ شیریں است باید ساخت۔

ایک اور محترمہ یوں گفتگو فرما ہیں۔ "نوج یہ کمبخت مرد دے تو بس بھوزے ہیں بھوزے، گل تازہ کے شیدائی"۔ بیوی کے چہرے مہرے پر جب تک آب و رنگ باقی ہے اُن کی نگاہ میں وہ "شیریں" ہے اور زندگی چونکے شیر۔ لیکن جہاں اُس کے نخلِ حیات میں کوئی "شیریں" پھل نمودار ہوا وہ اُن کے لئے بوجھ بن گئی اور لگے کسی "لیلیٰ" کی تلاش میں صحرانوردی کرنے۔ بگوڑے اپنے آپ کو تو ہمیشہ یوسف ہی سمجھتے ہیں۔ جیسے ہر زلیخا کی نظر اُنھیں کی پرستار ہوتی۔ "تمھیں کہو کہ یہ انداز دلبری کیا ہے"؟! اس پر طرّہ یہ کہ بے وفا کہیں گے ہمیشہ ہم عورتوں ہی کو۔ کاش مرزا غالب ان "عاشقین" کے لئے یوں فرما جاتے تو اُن کی غالبیت میں بھلا کیا فرق پڑ جاتا ؎

وہی تعلیم دیں وفاؤں کی
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

آپ کے کمرے میں منعقد اس "بزمِ شعر و سخن" میں بھی شریکِ بزم "دادِ فصاحت" دے رہے ہیں اور آپ اپنے ملحقہ کمرے میں بیٹھے بے تابانہ صدرِ محفل کے مقطعے کا انتظار کر رہے ہیں کہ کب یہ "نشست" برخاست ہو اور آپ اپنا اکلوتا گرم سوٹ جو آپ کے کمرے میں رکھی کپڑوں کی الماری میں لٹکا ہوا ہے وہاں سے لاکر پہن سکیں تاکہ بروقت دفتر میں منہ دکھا سکیں۔ لیکن خود تمیں آپس کی بات چیت سے شک جائیں یہ "احتمالِ عقلی" ہے کیونکہ جنسِ نازک کی زبان کے رگ و ریشے فطرت نے بہت لچکدار بنائے ہیں۔ یہی لچک تو مردوں کے اعصاب میں کھنچاؤ اور تناؤ پیدا کرتی ہے اور حضرت علامہ اقبال کے تجربے کے مطابق وہ اِن کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہیں۔

آہ بیچارے مرد!!

●●

بہترین خوشبو
تازگی اور
خوش ذائقہ

لاکھوں آدمیوں کی پسند

بابا

اس کی میٹھی اور دل کو خوش کرنیوالی خوشبو اور دل پسند ذائقہ کیلئے لاکھوں انسان روز استعمال کرتے ہیں۔ بابا کیساتھ کھانے سے اس کی خوشبو ذائقہ کو بڑھا دیتی ہے اور عرصہ تک اس کی تازگی بنی رہتی ہے۔ فہرست مفت حاصل کیجئے

نقل و ملتے جلتے نام سے
ہوشیار دہلی والوں کا
بابا چھاپ دیکھکر خریدیئے

تیار کردہ:- دھرم پال پریم چند ـــــ چاندنی چوک۔ دہلی ۶

لے : بے وفا۔

حمید اللہ خاں (اندور)

مجاز — اپنے ہی پس منظر میں

مجاز بہت بلند ہے... اس کی شاعری ارتقا کا مہیب ہے۔ جب ہم اس کا نام لیتے ہیں تو نہ جانے کیوں ہمارے دلوں میں ایک چبھن.... ایک کھٹک..... ایک کسک اٹھتی ہے.... ایک ٹیس سی محسوس ہوتی ہے۔ اور ہم مجاز کی روح کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں..... اس کو چھونے کے لئے۔ لیکن یہ کیا.... فنکار اور اوپر اٹھتا جا رہا ہے۔ اور بلند ہوتا جا رہا ہے..... جب زمانے کا غم... اور تلخی ایام فنکار کے پیچھے لگ جاتے ہیں تب وہ یک بیک کہہ اٹھتا ہے۔

"اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں"

اف! وہ کتنا سوز ہے..... غم کی کتنی تپش ہے، اس کی آواز میں.... مجمع اس تپش کو برداشت کر رہا ہے، اس دلسوزی کو محسوس کر رہا ہے۔ اور شاعر کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے۔ یکایک مجمع میں سے ایک آواز ابھرتی ہے۔ "کون ہے یہ"

دم بھر کیلئے شاعر رکتا ہے، پھر مسکرا کر جواب دیتا ہے

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنس الفت کا طلب گار ہوں میں

مجمع میں کچھ لوگ شعر سنکر شنڈے رہ جاتے ہیں۔ کچھ واہ واہ قہقہے لگانے لگتے ہیں ایک عجیب سا ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ فنکار آگے بڑھ جاتا ہے اور مجمع پیچھے پیچھے ہو لیتا ہے۔

ایک درد بھری آواز آتی ہے۔ مجاز..... مجاز.... ٹھہر جاؤ مجاز..... رک جاؤ.....

فنکار بڑے استقلال اور بڑی درد بھری آواز میں جواب دیتا ہے۔

راستہ میں رک کے دم لوں میری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں میری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں

"اے غم دل کیا کروں..... اے وحشت دل کیا کروں"

فنکار پھر آگے بڑھ جاتا ہے، لیکن وہ برابر بڑبڑا رہا ہے۔

.... جاند تاروں کو لوٹا لوں.... اس کنارے تو چلا لوں
... سارے کے سارے نوچ لوں.... ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں.... پتھر توڑ دوں... میں ہی بڑھ کر توڑ دوں.....
ساماں پھونک دوں..... شبستاں پھونک دوں...
قصر سلطاں پھونک دوں.....

ہجوم برابر اس کے پیچھے چلا جا رہا ہے.... مجمع سے ایک آواز ابھرتی ہے۔ "مجاز آندھیروں میں کہاں لیجا رہے ہو؟"

فنکار کے قدم برابر آگے بڑھ رہے ہیں اور وہ جواب بھی دے رہا ہے۔

دشت ظلمات میں بھٹکنے دے
میری راہوں کو کہکشاں نہ بنا

دوسری آواز آتی ہے۔ "چلو مجاز ہم تمہیں چاند تاروں کی محفل میں لے چلیں"

فنکار شاید ہر چیز سے بیزار ہے۔ وہ فوراً کہتا ہے۔

ماہ و انجم سے مجھ کو کیا نسبت
مجھ کو ان کا مزاج داں نہ بنا

یکایک آواز آتی ہے "مجاز تم ہمارے سردار ہو ہمارا کارواں لیجا رہے ہو"

فنکار کہتا ہے۔

جس کو اپنی خبر نہیں رہتی ۔۔۔
اُس کو سالارِ کارواں نہ بنا

آوازیں چیخ رہی ہیں۔ اور آؤ، جہاز اور آؤ۔ ہم تمہیں اپنا جہاز بنا لیں۔ شاعر رکتا ہے، مجمع پر ایک نظر ڈالتا ہے، اکثر اُس کی آنکھوں کی چمک کی تاب نہ لاکر نظریں جھکا لیتے ہیں۔ کچھ مشکل بندے اُسے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اور فنکار چلّا اٹھتا ہے۔

راز تیرا چھپا نہیں سکتا
تو مجھے اپنا رازداں نہ بنا

فنکار کے قدم بلندی کی جانب بڑھتے ہیں اور اُس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہوتی ہے۔ دلی کی گلیاں یاد آرہی ہیں۔ شاعر تڑپ اٹھتا ہے۔

پھر تری بزم جمیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤں گا میں اور بہ انداز دگر آؤں گا میں
سر سے پا تک ایک خوں رنگ خنجر بن کے آؤں گا
لالہ زار رنگ و بو میں آگ بن کر آؤں گا

مجمع سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں، شاید لوگوں کو فنکار سے اُنسیت ہو چلی ہے، ایک آواز اُبھرتی ہے۔ "فنکار قدامت پسند لوگوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔"

شاعر بڑی بے باکی سے جواب دیتا ہے۔

قدامت حد یں کھینچتی ہی رہے گی
قدامت کی بنیاد ڈھائے چلا جا

آوازیں ایک ساتھ اُبھرتی ہیں۔ "فنکار"

"ہوں" فنکار مخمور آنکھوں کو اُٹھا کر مجمع کی جانب دیکھتا ہے۔

آوازیں۔ "بہت سرکش ہو گئے ہو۔"

ہا۔۔۔ ہا ہا۔۔۔ ایک طویل قہقہہ کے بعد فنکار کہتا ہے۔

"جو پرچم اٹھا ہی لیا سرکشی کا
اسے آسماں تک اڑائے چلا جا"

پھر فنکار اپنی منزل کی جانب آگے بڑھنے لگتا ہے اور ہجوم اُس کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ اب کے ہجوم میں سے ایک نسوانی آواز اُبھرتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ "فنکار تم میرے محافظ بن جاؤ۔"

"کون ہو تم؟" فنکار ایک لمحہ رُک کر پوچھتا ہے۔

"عورت ہوں مصیبت کی ماری عورت ۔۔۔۔۔!"

"ہاں مجھے معلوم ہے ۔۔۔۔ کاش ۔۔۔

تری بیڑی بنا ہیں تیری عصمت کی محافظ ہیں
تو اس لشکر کی تیزی آزمایتی تو اچھا تھا

"میں آدمی سے نہیں ڈرتی فنکار"

"ڈرنا بھی نہیں چاہیئے، اے سراپا ناز ۔۔۔ لیکن ۔۔۔

سنائیں کھینچ لی ہوں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامان حراحت اب اکٹھا کیا تو اچھا تھا

عورت کا چہرہ گلاب کے تازہ پھول کی طرح کھل اٹھتا ہے اور فنکار آگے بڑھ جاتا ہے ۔۔۔ یکایک فنکار رُک جاتا ہے۔ مڑ کر مجمع کی جانب دیکھتا ہے ۔۔۔ ایک دم اُسکی نظر ایک نوجوان شخص پر پڑتی ہے ۔۔۔ داڑھی بڑھی ہوئی ہے ۔۔۔ سر کے بال بے ترتیب ۔۔۔ چہرہ سے افسردگی ٹپک رہی ہے ۔۔۔ فنکار ایک انداز دلبرانہ کے ساتھ نوجوان کی جانب اُنگلی اٹھاتا ہے۔ پھر خود کو بھی ایک نظر دیکھتا ہے اور کہہ اُٹھتا ہے۔

"جوانی اور یوں گھر جائے طوفانِ تحولات میں
خدا رکھے ابھی تو بیخودی کا دور ہے ساقی"

فنکار پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔ دفعتاً کوئی کہہ اُٹھتا ہے "اقبال گو شاعر ہے غزل گو۔" ایک دم فنکار کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے۔ آنکھوں میں چمک اور لو اُسی کی سی جلی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور وہ کہتا ہے۔

قسم نطق کی شعلہ افشانیوں کی ۔۔۔
کہ شاعر تو ہوں، اب غزلخواں نہیں میں

مجمع میں سے ایک بے باک شخص پوچھ بیٹھتا ہے "مجاز"

"کیا ہے"

"الہ آباد بھی گئے تھے"

"تو پھر"

"وہاں بھی کچھ کہا ہوگا"

"بہت کچھ کہا ہے"

"تو سناؤ نا!"

سنو:
یہاں کے شہر یاروں کو خبر دو
کہ مردِ انقلابی آگیا ہے

اب فنکار کو بھی مجمع سے الفت ہو چلی ہے۔ وہ ایک سبزہ زار پر بیٹھ جاتا ہے۔ مجمع بھی اُس کے اِرد گرد بیٹھ جاتا ہے۔ سب فنکار کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔

ایک آواز آتی ہے: "مجاز کتھاری منزل کہاں ہے؟"

فنکار جواب دیتا ہے ؎

بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل
ہزار بار جہاں سے گذر چکا ہوں میں

ایک بزرگانہ آواز آتی ہے ۔ "مجاز بہت پیتے ہو، خدا سے بھی ڈرو"

شاعر مسکرا کر جواب دیتا ہے۔

تیرے گناہگار گنہگار ہی سہی
تیرے کرم کی آس لگائے ہوئے تو ہیں

"فنکار تمھاری حقیقت ہی کیا ہے؟"

میری حقیقت "ہوں"

آج بھی ہے مجاز خاک نشیں
اور نظر عرش پر ہے کیا کہیئے

"مجاز"

"کہو"

آج کل حسن و عشق میں طعنہ زنی ہو رہی ہے
حسن اور عشق کو دے طعنۂ بیداد مجاز
تم کو تو صرف اسی بات پہ مر جانا تھا

"مجاز وہ ملنے آئے ہیں"

فنکار ہنس کر جواب دیتا ہے ؎

یہ آنا کوئی آنا ہے کہ بس رسماً چلے آئے
یہ ملنا خاک ملنا ہے کہ دل سے دل نہیں ملتا

"مجاز لوگ تمھیں برباد کہتے ہیں ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا؟"

"افسوس" فنکار ایک سرد آہ بھر کر کہتا ہے ؎

مری بربادیوں کا ہم نشینو
تمھیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

اور واقعی مجاز کو اپنی بربادی کا کبھی غم نہیں ہوا۔

مجاز مر گیا ..... مجاز مر گیا ..... ہاں وہی مجاز مر گیا جو اپنے موسم کا ایک کھلتا ہوا پھول تھا ..... علیگڑھ

(بقیہ صفحہ ۴۳ پر دیکھئے) ۵۱

سب سے زیادہ قابلِ اعتماد
بالوں کو سیاہ کرنے والا

وسمول

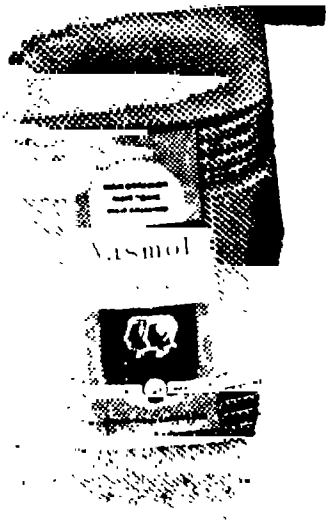

سفید بالوں کو سیاہ کرتا ہے
بالوں کو سنوارنے کا بہترین ذریعہ ہے

ایملسی فائڈ ہیر آئل اور پومیڈ کی شکل میں ہر اسٹور سے دستیاب ہو سکتا ہے

دنیا بھر میں لاکھوں استعمال کرتے ہیں۔

ایسٹ لیبرٹریز انسٹی ٹیوٹ پوسٹ بکس ۱۱۹۱ بمبئی ۱

خطوط

شیام کنول ——— ۶۱۷ — ۲ — ۱۷، مہدی پورہ۔ حیدر آباد (دکن۔ انڈیا)

ادھر سالنامے کے بعد "شاعر" کچھ اور نکھار پا گیا ہے۔ زیر نظر تازہ شمارہ بھی کافی وقیع ہے آپ کا خطبہ معرکہ کی چیز ہے۔ ندا فاضلی نے گھر بیٹھے ادبی سیر کرادی۔ سیدہ جعفر اور معتبر کو نئی کے مقالات۔ !! یہ بات باعث مسرت ہے کہ "شاعر" کے افسانوں کا معیار کچھ اور بلند ہو گیا ہے۔ سالنامہ کے تقریباً تمام افسانے معیاری تھے۔ لیکن اکرام جاوید کا افسانہ "موم کا بدن" ایک عرصہ تک یاد رہے گا۔ اسی طرح اُن کا گذشتہ شمارے کا افسانہ "قیدی" نقطہ بھی ناقابل فراموش ہے۔ ادھر ایک طویل عرصہ کے بعد اکرام جاوید کے تین چار افسانے نظر سے گذرے ہیں اور یہ احساس ہوا کہ وہ ایک نیا رنگ لے کر ٹھہر رہے ہیں۔ تازہ شمارہ میں "پیاسا سمندر" زیادہ متاثر کرتا ہے۔ "دودھ کی چائے" بھی خوب ہے"۔ دھندلی تصویر کچھ زیادہ ہی دھندلی نظر آتی ہے۔

پچھلے خطوط میں فضیل جعفری نے اپنے مکتوب میں کہا تھا کہ "بعض مضامین کی خامیوں کی طرف اشارہ کرتا مگر مصیبت یہ ہے اور شاید آپ بھی اس سے واقف ہوں کہ آج کل اردو کے شاعر اور ادیب کچھ اس درجہ احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ نرم سے نرم الفاظ میں کی ہوئی تنقید اُن کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ اور وہ مرنے مارنے پر اُتر آتے ہیں۔ "کتنے تیکھے اور حقیقت پر مبنی بات کہی تھی فضیل صاحب نے۔ اس کا ثبوت تازہ "شاعر" میں اثر فاروقی کا خط دے رہا ہے۔ اثر فاروقی کا خط حقائق سے زیادہ جذبات پر مبنی ہے۔ جذبات کی رو میں وہ کئی بے ربط باتیں کہہ گئے ہیں۔ حالانکہ نہ اس قدر جذباتی ہونے کی ضرورت تھی اور نہ زیر افروختہ۔ کرشن چندر کی بعض تخلیقات سے اختلاف اور انھیں معیاری نہ کہنے کی گنجائش ضرور نکل آتی ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ اُن کا ذہن مائل بہ انحطاط ہے۔ آج بھی اُن کی ایسی کہانیاں پیش کی جا سکتی ہیں جن کا جواب نہیں ملتا۔ "جامن کا پیڑ" (اس کہانی کی بعض جزئیات سے مجھے اختلاف ہے۔ پھر بھی) اسے ایک عظیم طنزیہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ "لندن کی سات شامیں"۔ "میرے گاؤں کی کلو پیڑا" ایسے کئی اور نام گنائے جا سکتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کا حوالہ دیتے ہوئے موصوف نے سوال کیا ہے کہ "اُن کی کہانیوں میں کوئی کمزوری کیوں نہیں ہے؟" یہ تقابل عجیب ہے۔ پھر بھی میں فضیل صاحب سے گذارش کروں گا کہ وہ بیدی کی "بل" "لمبی لڑکی" اور "لاجونتی" پڑھیں اور پھر بتائیں۔ اس بات کی وضاحت نامناسب نہ ہوگی کہ بیدی نے "لاجونتی" کی "بل" اور "بل" کے بعد "لمبی لڑکی" لکھی تھی۔

اخر صاحب کے مطابق، فضیل جعفری کے مکتوب میں ایسا کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ تنقید سے مدیر کے ناراض ہونے کا احتمال ہے۔ کیونکہ بالآخر انتخاب ہوتا ہے۔ جبکہ خود مدیر "شاعر" نے تنقید سے گریز کے اُن کے خیال پر اپنے نوٹ میں یہ سوال لیا ہے کہ "اپنے ادب کی خیر کیلئے کیا ہوگا۔؟" بڑی حیرت کی بات ہے کہ اثر فاروقی نے اپنے اس مختصر سے جملے میں کئی متضاد باتیں کہی ہیں۔ امید ہے موصوف میرے ان چند جملوں پر ناراض ہونے کے بجائے ان پر غور کرنے کی زحمت گوارا کریں گے۔

سید حرمت الاکرام ——— رام باغ، مرزا پور

"شاعر" نظر نواز ہوا۔ آپ کی نظم "چھ کرور لفظے" فکر انگیز اور خود طلب ہے۔ لیکن ان مسائل پر سوچ بچار کرنے کی کسے مہلت ہے۔ اور اہل اقتدار کے نزدیک غالباً اس کی ضرورت بھی نہیں۔ بیشتر مضامین ابھی پڑھ نہیں سکا ہوں۔ البتہ "اداریہ" کے سلسلے میں آئندہ شمارہ کا منتظر ہوں۔

نازش پرتاپگڈھی ——— بیگم وارڈ، پرتاپ گڑھ (یو۔پی)

[illegible] کا "شاعر" پہلی مرتبہ موجودگی میں یہاں پہنچا تھا۔ میں پہنچا تو صرف وصول یابی کی اطلاع ہی مل سکی۔ معلوم ہوا ایک صاحب آئے تھا

لے گئے۔ دیکھئے کب تک واپس کرتے ہیں۔ البتہ اپریل کا شمارہ برسوں طلب ہے۔ جس میں آپ کی نظم "چھ کرور نقطے" شریک اشاعت ہے۔ ایک میں ہی نہیں آپ کے کلام میں جو گہری بصیرت، سیاسی سوجھ بوجھ اور ان سے بھی زیادہ جو سوز دردوں تیزی کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کا اعتراف کرنے کیلئے ہر صاحب ذوق اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ گٹ بندی اور ہٹ دھرمی سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو گذشتہ دو تین برس میں ایک دو نہیں بلکہ متعدد شاہکار نظمیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں۔ جو اردو ادب کے خزانے میں قابل قدر اضافہ ہیں۔ کاش نقاد شخصیت اور گروہ کی حدوں سے باہر نکل کر کسی بھی شاعر اور اس کے کلام کا جائزہ صرف ادب کے نقطۂ نظر سے لے سکتے۔

بدیع الزماں خاور ——— ۴ ، اے فیملی مال، والپولی (دستاگیری)

اردو والوں کو اس بات کا پختہ ارادہ کر لینا ہے کہ وہ آئندہ انتخابات میں اپنے "ووٹ" صرف اردو کے لئے استعمال کریں۔ کسی ایسے امیدوار کو وہ اپنا ووٹ ہرگز نہ دیں گے جو اردو کا حامی نہ ہو اور آئینی مراعات دلانے میں ذمہ دارانہ طور پر جد وجہد کرنے کا جذبہ نہ رکھتا ہو۔ ہمارے ہر رائے دہندہ کو ابھی سے خبردار ہو جانا چاہیئے اور یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ اسے آنے والے الیکشن میں ایک "اردو دوست" کی حیثیت سے حوصلہ گیر ہونا ہے۔

عام انتخابات کے سلسلے میں بہت سے امور غور طلب ہیں۔ میرے خیال میں زیادہ بہتر صورت یہی ہے کہ ایک مرکزی اردو الیکشن کمیٹی بنائی جائے۔ اور اس کمیٹی کی ہدایات کے مطابق ہر جگہ کام کیا جائے۔ یہ کمیٹی ایک واضح اور تفصیلی پروگرام مرتب کرے اور اردو کے رہنما اس کے مطابق عوام تک پہونچکر ضروری اقدامات کریں، تو موثر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اردو کے سلسلے میں ہمارا ہر ایک ووٹ بیحد قیمتی اور اہم ہے اسے نہ اردو کے سوا کسی اور مقصد کیلئے استعمال کرنا چاہیئے اور نہ ضائع ہونے دینا چاہیئے۔

تازہ شاعر کے ذریعے آپ کی ایک اور شاہکار نظم (چھ کرور نقطے) منظر عام پر آئی ہے۔ آپ کا خطبۂ صدارت (جو اسی شمارے میں شامل ہے) اردو زبان و ادب کے تاریخی جائزے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ندا فاضلی نے کل ہند اردو سمپوزیم اردو کے پورے کارپور تاژ بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس بار انہوں نے غزلیں اور نظمیں بھی عنایت فرمائی ہیں۔ سلام کا ذرا لمبا لیکن اچھا انداز میں ہونے کے باوجود پسند آیا۔

منظر کاظمی ——— ۹۸ ، اے بلاک، دھنتکیڈیہہ۔ جمشید پور

"اپریل کے شاعر" میں آپ کی نظم "چھ کرور نقطے" اور خطبۂ صدارت، نازش کی غزل، ایک افسانہ "دھندلی تصویر" اور ندا فاضلی کا رپورتاژ کام کی چیزیں ہیں۔ ان کے علاوہ بقیہ ساری چیزیں نہ صرف یہ کہ ہلکی ہیں بلکہ بیکار ہیں۔ (غزلیات کے کچھ حصے البتہ اچھے ہیں) تاہم جیسے عظیم فنکار پر لکھنے کیلئے اس کی تخلیقات کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کرنے کی ضرورت تھی۔ بیسویں صدی کے اس فنکار نے جب بھی قلم اٹھایا ہے تو دنیا کے ہر حصے میں رہنے والوں نے اپنے دامن کی دھجیاں بکھری پائی ہیں۔ تفصیل سے نہ سہی کم از کم گھٹے ہوئے انداز میں جائزہ لیا جانا چاہیئے تھا۔

حرکت عقلانی پر مضمون پڑھنے کے بعد ایسا لگا جیسے اسکول کا کوئی طالب علم "اسکول ورک" کر رہا ہو۔ "اسکول ورک" کوئی بری بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی کوئی تک نہیں کہ شاعر کے متعلق صفحات برباد کر دیئے جائیں۔

"چاند کی واپسی" کو صرف اس لئے پڑھنا پڑا کہ ہو سکتا ہے سلام مچھلی شہری نے اس بار کوئی چٹکلے کی بات کی ہو۔ لیکن افسوس کہ اس کی حالت زار پر ماتم کرنے کیلئے ایک اور جواز مل گیا۔

آپ نے بڑے معرکہ کی نظم کہی ہے۔ اگر میرا یہ خط کسی اور رسالے کے پاس جاتا تو میں اس پر تفصیل سے لکھتا۔ انسانوی سطح کی لاج ظفر اوگانوی کے دم سے رہ گئی ہے۔ ان دنوں افسانہ نگاری کا بھی عجیب حال ہے۔ ایک طرف "بیسویں صدی" کے لوگ افسانوں کو ڈرامائی روم کی گفتگو سے آگے نہیں بڑھنے دیتے تو دوسری طرف کوئی اور پندرہ پرکاش ہیں جن کی ساڑھے سات صفحات پر مشتمل دو کہانیوں کو نبھانے کے لئے محمود ہاشمی کا تو صفحوں کا مضمون بھی ساتھ ہی شائع کیا جاتا ہے۔ اللہ حافظ ہے ہم لوگوں کا اور ہمارے ادب کا۔ نازش کا مطلع دل میں اتر کر رہ گیا ہے

خاموشیوں کو نذرِ گفتار کہہ گئے　　کیا لوگ تھے جو دار کو دلدار کہہ گئے

متین سروش اور محسن نیدیی کی غزلیں بھی توجہ سے پڑھی جانے کے لائق ہیں۔ آپ کی نظم کے آخری بند کے دوسرے مصرعے کی ساسی گڑبڑ ہے (غالباً فنِ کتابت کا کمال ہے) مجموعی طور پر اپریل کا شمارہ معیاری نہیں ہے۔ صاحبِ گوئی کیلئے معذرت خواہ ہیں۔

ظفر اوگانوی ایم اے ـــــ نشیمن، رمنہ روڈ۔ پٹنہ ۶

ہیج۔ شاعر علاء اور آج کا سب کچھ پڑھا۔ "چھ کرور نقطے" وقت کی ایک ضرورت، دلوں کی ایک آواز اور دھڑکنوں کی ایک پکار ہے کامیاب ترجیہ ہے۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور ہر بار ایک نئی کیفیت اور نیا تاثر نصیب ہوتا ہے۔ ایسی نظمیں کہنا لوگ نے میں؟ اگر کہتے ہیں تو شاعری نہیں رہتی۔ اگر شاعری ہوتی ہے تو تاثر برقرار نہیں رہتا۔ آپ کی اس نظم میں سب کچھ ہے۔

دوسری طرف آپ کا خطبہ بھی دقیع اور مفید ہے۔ خاص طور پر اس کا تاریخی اور لسانی حصہ طلبا کیلئے پُرمغز مواد فراہم کرتا ہے۔

علی عباس حامدی امید ایم اے (علیگ) ـــــ کیمرج کالج۔ مہربال (ایم۔ پی)

اپریل کا "شاعر" ملا۔ آپ کا اداریہ بے انتہا پسند آیا۔ ندا فاضلی کے روپ رتا نے بھی ایک تاثر چھوڑا۔ ناوش پر تابگڈھی اور نعیم عرفانی میں پسند آئیں۔ "چھ کرور نقطے" نکو من کی ملبدلیوں کو چھوتی ہوئی بے پناہ خوبصورت نظم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادھر آپ کی نظموں کا لہجہ بالکل منفرد صورت اختیار کر گیا ہے۔ امید کہ آئندہ بھی شاعر میں ایسی ہی نظمیں ملتی رہیں گی۔

وفا پرویز ـــــ بنائے راجہ لین۔ ہند پیڑی۔ رانچی

"شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے سرسید کی بہت اچھا حیثیتوں کو اس کی شخصیت کا آئینہ بنا کر پیش کیا ہے۔ سلام مچھلی شہری کی نظم "جاگنا کل بھی ہے" ہندوستانی نظموں کے روایتی مناظر کا حامل ہے۔ ناوش، متین سروش، حنیف ساغر اور ضیاء پرتاب گڈھی کی غزلیں اچھی ہیں۔ ندا فاضلی کا پورتاژ "لبھی سے اودے پور تک" کافی دلچسپ ہے۔

اگر ایک طرف کل ہند سمپوزیم اودے پور ساہتیہ اکیڈمی میں آپ کا خطبۂ صدارت "اردو ادب میں اشتراکِ تہذیب و تمدن" خالص اردو نے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی موثر بانہ گذارش ہے۔ تو دوسری طرف "اداریہ" میں وقتی طور پر مرکزی اردو اکیڈمی کی تنظیم نو کی اور ریاستی ت کو دہلی کی زبان کی الجھنوں کی طرف مخاطب کرنے کا احتجاجی اشارہ۔

واقعی یہ (GENERAL ELECTION) عام انتخاب اردو والوں کے حق مانگنے کا بہت ہی مناسب موقع ہے۔ ہمیں اپنے عملی اقدامات ت جلد از جلد تیز کر دینی چاہیئے۔

آپ کی نظم "چھ کرور نقطے" صحیح ان ناطق کے تارِ احساس کو چھیڑتا ہوا مضراب ہے۔ لیکن اس مصرعے سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

"ٹھہر گیا ہے جو دامن سنہ میں آکر"

میرا خیال ہے موزونیت کے لحاظ سے دامن کی جگہ "دامان" ہونا چاہیئے۔ انشاء اللہ آپ سے اپنی کولانچی کے آل انڈیا شاعرے ملاقات ہو گی۔

ظہیر صدیقی ایم اے ـــــ رحمت منزل، پارک لین پٹنہ

"شاعر" کے تازہ شمارہ میں آپ کی نظم "چھ کرور نقطے" دلچسپی کے ساتھ پڑھی۔ یہ ایک کامیاب علامتی نظم ہے۔ موضوعاتی نظموں میں ہیاں اکثر شعر بھرتی ماری جاتی ہیں۔ لیکن مذکورہ نظم ایک طرف موضوع سے انصاف کرتی ہے تو دوسری طرف فنی قدروں کا بھرپور احترام تے ہے۔ شاعری در اصل سلیقہ کا نام ہے۔ ظفر اوگانوی کی کہانی "دھندلی تصویر" انوکھی اور دلچسپ ہے۔ لیکن اپنی فنی جزئیات کے لحاظ سے واب ہونے کے باوجود ایک لاینحل مسکلہ قارئین کے ذہنوں میں پیدا کر دیتی ہے۔ آیا ایک مرد، دو عورتوں کے ساتھ بیک وقت ازدواجی زندگی سر نہیں سے بسر کر سکتا ہے۔ بہرحال یہ ایک دیگر مسئلہ ہے اور اس سے کہانی کی فنی کامیابی پر حرف نہیں آتا ہے۔

لے جی ہاں کتابت کی غلطی ہے۔ "دامان" کر لیا جائے۔ (ادارہ)

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اب "شاعر" کے اجراء میں استقلال اور پابندی آگئی ہے۔

(مولانا) علیم اختر مظفر نگری ——— ۲۴۶۳، رنگ محل خورد، عبدالحمید خاں روہلہ

"شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ کی نظم "چھ کردر کفظے" آپ کی آفاقی فکر کا اعجاز ہے۔ جس طرح "کرامت" یا "معجزہ" کو بیان کرنا ان کے ذہنی تاثرات کو بیان نہیں کر سکتا۔ بالکل یہی حال نظم پڑھ کر میرا ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ نظم کی خوبیاں بیان کرنے کیلئے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ بس دعا کرتا ہوں کہ ——— اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ——— !

پروفیسر زرینہ ثانی، ایم اے ——— ۳۶۱، شنکر نگر۔ ناگپور

"شاعر" کے نئے شمارے میں آپ کی نظم "چھ کردر لفظے" بڑی موثر اور وقت کی ایک اہم آواز بن کر جلوہ گر ہوئی ہے۔ نظم کا کنایہ معنی کی ایک دنیا سموئے ہوئے ہے اور غور و فکر کی دعوت بھی ——

نسیم مظفر پوری ——— رزرو بنک آف انڈیا۔ پٹنہ ۱

"شاعر" کا اپریل کا شمارہ سابقہ کئی شماروں پر بھاری ہے۔ کیونکہ اس میں ادب کی تقریباً ہر صنف پر مضامین ہیں اور وہ بھی بھرپور انداز میں پورے ۶۶ صفحات کے اس شمارے میں مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ندا فاضلی کے پورتاژ نے۔ بڑے پیارے انداز میں انھوں نے اسے قلمبند کیا ہے۔ آپ کا خطبہ آپ کے خلوص دل اور شدت محسوسات کا مظہر ہے ——!

ظفر اوگانوی کا افسانہ زبان و بیان اور تکنک کے اعتبار سے اچھا ہے۔ مگر پورا افسانہ ختم کرنے کے بعد ایک تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ اس نے کیرو سے کتنے کٹھن حالات میں بریک وقت دو لڑکیوں سے شادی کیسے کی؟ "اس کیلئے دونوں کی رضامندی حاصل کرنا کافی تھا۔ مگر وہ یہ ہی سے سوال ختم نہیں ہو جاتا۔ بقیہ دو افسانے بھی اچھے ہیں۔ معاف کیجئے گا، مجھے سلام مچھلی شہری کا ڈرامہ پسند نہیں آیا۔ ادھر دو تین برسوں میں انھوں نے ایک اچھی تو کام کی چیز نہیں لکھی ——!

کیا ہی اچھا ہو اگر آپ قلمکاروں کے خطوط کے ساتھ پتے دینے کی بجائے، ان کی تخلیقات کے ساتھ دیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی ——— موضع ہرگانواں، پوسٹ بربگہہ۔ ضلع مونگیر (بہار)

ابھی چند گھنٹے پیشتر "شاعر" کا تازہ شمارہ زیر مطالعہ آیا ہے۔ عقیل علی عقیلی کی کتاب "کرپل کتھا" یا "مجلس" مرتبہ مالک رام مختار الدین احمد پڑھا۔ آپ نے لکھا ہے کہ "مولوی کریم الدین نے اس کا ذکر اپنے تذکرے "طبقات الشعرائے ہند" میں کیا تھا اور انھیں کے حوالے سے دوسرے مصنفین اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کرتے رہے۔ مولوی کریم الدین کے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ تھا جو انھوں نے اپنے دوست ڈاکٹر اشپرنگر، پرنسپل دہلی کالج کو دے دیا تھا اور جسے وہ اپنے ساتھ جرمنی لے گئے تھے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اپنے یورپ کے سفر میں بڑی تلاش و جستجو کے بعد یہ مخطوطہ لنڈن (انگلستان) کے کتب خانے میں دریافت کیا۔ اور یہ وہی نسخہ نکلا جو مولوی کریم الدین نے ڈاکٹر اشپرنگر کو دیا تھا۔ وہاں سے کرپل کتھا کا عکس لے کر مشہور محقق و ادیب مالک رام اور خود مختار الدین احمد نے نہایت دیدہ ریزی سے اسے مرتب کیا ہے۔"

لیکن طبقات الشعرائے ہند (مولوی کریم الدین) تاریخ نثار دد (مولانا آسی نظامی رہروی) کی عبارت پڑھ کر اور کرپل کتھا میں دی گئی عبارت کو پڑھ کر شک گذرتا ہے کہ مولوی کریم الدین نے جس نسخہ سے طبقات میں اقتباس پیش کیا ہے اور جو نسخہ ڈاکٹر اشپرنگر کو دیا تھا اور جسے مالک رام اور مختار الدین احمد نے مل کر مرتب کیا ہے، دونوں نسخے مختلف تھے۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمایئے راقم کا مضمون "فضلی کی کرپل کتھا یا وہ مجلس" مطبوعہ ماہنامہ صبح نو" پٹنہ۔ جنوری فروری ۱۹۷۶ء)

مرتبین مالک رام اور مختار الدین احمد نے کتاب کے گرد و پیش سے لیکر مقدمہ اور حواشی تک میں ایک سے زائد بار اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ یہ متن اس نسخے پر مبنی ہے جو مولوی کریم الدین کے پاس تھا جس کا ایک طویل اقتباس انھوں نے طبقات الشعرائے ہند میں نقل کیا تھا۔ جو بعد میں اشپرنگر کی نذر کر دیا گیا تھا اور یہ کہ اب یہ نسخہ پہلی بار (اکتوبر ۱۹۶۵ء میں) طبع ہو کے علمی دنیا کے سامنے آرہا ہے۔ لیکن بقول ڈاکٹر محمود الٰہی "ڈاکٹر اشپرنگر اور مولوی کریم الدین کے خوشگوار تعلقات اپنی جگہ پر لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اختلافات نسخ

ے بادصف نسخۂ اشپرنگر کو نسخۂ کریم الدین کہہ دیا جائے ــــ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ کریم الدین کا نسخہ اشپرنگر والے نسخے سے مختلف تھا کریم الدین کے بیانات کی اہمیت آج بھی باقی ہے۔" ملاحظہ فرمائیے ہفتہ وار "ہماری زبان۔ علی گڑھ ۵ ستمبر ۱۹۶۵ء صفحہ ۴)

ڈاکٹر محمود الٰہی کا شک بجا ہے۔ اس کے اس شک کو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی تحریر سے اور تقویت ملتی ہے کہ فاروقی صاحب یورپ کے خانوں سے ۱۹۵۰ء میں دیگر مخطوطات کے عکس کے ساتھ نصفی کے کربل کتھا کا عکس بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور (غالباً ۱۹۶۰ء میں) دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے یہ کتاب شائع ہوئی تھی، اور پنڈت جاہر لال نہرو کے نام معنون کی گئی تھی اور پنڈت جی نے اس انتساب کو شرف قبول بخشا تھا ملاحظہ فرمائیے ماہنامہ "سماجستان" ڈائجسٹ دہلی دسمبر ۱۹۶۵ء صفحہ)

آگے چل کر آپ نے اپنے تبصرہ میں لکھا ہے کہ "شمالی ہند میں نثر کی یہ پہلی باتاعدہ کتاب کہی جا سکتی ہے" مالک رام، اختار الدین احمد، خلیل الرحمٰن علی محمد الٰہی اور دیگر حضرات کربل کتھا یا وہ مجلس کو شمالی ہند میں اردو نثر کی پہلی کتاب کہتے ہیں۔ لیکن پروفیسر حامد حسن قادری کی تلاش و تحقیق نے ایک اور سال کا پتہ لگایا ہے جو وہ مجلس سے سوا چار سو برس پہلے ۱۳۰۸ء میں تصنیف ہوا۔ اس کے مصنف خواجہ سید جہانگیر اشرف سمنانی ہیں۔ رسالہ اخلاق و تصوف سے متعلق ہے۔ اس کی تمام تر اہمیت لسانی ہے۔ بقول کی وہ مجلس سرچشمہ فارسی رنگ انشا میں ڈوبی ہوئی ہے۔ عبارت مقفیٰ و مسجع ہے اور عربی و فارسی الفاظ کثیر ہیں" (اردو ادب کی تاریخ۔ از نسیم قریشی طبع اول ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۱۹۱)

"شاعر کے اس تازہ شمارہ میں ڈاکٹر سید جعفر، جہانگیر جوہر اور مقبول کوٹری کے مقالے، آپ کا خطبہ، سلام مچھلی شہری کا ڈرامہ، آغا روپ تاڑ مظفر اوگانوی کا افسانہ آپ کی اور رحمٰن حاجی صدیق نظر کی نظمیں، متین سرد ش، محسن زیدی، نازش پرتابگڈھی، اکرم کھولوی اور عنوان چشتی کی غزلوں کے چند اشعار خاص طور پر پسند آئے ــــ

حیدر رضوی ــــ لال پھاٹک، مظفر نگر (بہار)

"شاعر کا حالیہ شمارہ ہر لحاظ سے معیاری اور افادی ہے۔ "جرعات" میں "عام انتخاب اور اردو" کے تحت جو تحریک آپ نے پیش فرمائی ہے قابل ستائش ہے۔ کیونکہ اردو جاننے والوں کیلئے یہی ایک بہترین موقع ہے حکومت کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرنے اور ان کو منوانے کا ایسا سنہرا موقع اگر بالفرض نکل گیا تو پھر اردو کے سلسلے میں اردو والوں کو مایوسیوں ہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اردو والوں کو چاہیے کہ عام انتخابات میں اسی وقت حصہ لیں جب اردو کے سلسلے میں ان کے مطالبات پورے ہوں ورنہ اس عام انتخاب کا مکمل بائیکاٹ کریں۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے امید ہے کہ نتیجہ حسب دل خواہ ہوگا۔ صرف ایک ووٹ کیلئے سرکی ٹوپی پیروں پر رکھنے والے اتنے ووٹوں کو اپنے ہاتھ سے جاتے کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ مجبور ہو کر انھیں بھی کچھ نہ کچھ اردو کیلئے کرنا ہی پڑے گا۔ مگر اس کیلئے جد و جہد اور عمل کی ضرورت ہے جس کے لئے اردو عوام کو تیار ہو جانا چاہیئے۔ اس سلسلے میں آپ کی کچھ "قابل دید" کاوشوں کا بھی مستظر ہوں۔

آپ کی نظم "چھ کروڑ لقطے" پوری ایک تاریخ ہے اور ان چھ کروڑ لقطوں میں سے ہر ایک لقطہ کے دل کی آواز ہے جس کو آپ نے بڑے خوبصورت انداز سے نظم کی شکل دی ہے۔ یہ نظم اردو ادب کیلئے شاہکار رہے۔ خطبۂ اردو ادب میں مشترکہ تہذیب عنصر بھی بہت اہم ہے۔ اسی پر ہمیں آج کل سخت ضرورت ہے۔ مخالفان اردو جو اردو کی مخالفت میں اردو پر طرح طرح کے الزام لگائے بیٹھے ہیں۔ اس کی تردید اور ان کا منہ بند کرنے کیلئے ایسی ہی چیزوں کی ضرورت تھی جو آپ نے بڑے اچھے انداز میں لکھا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ غزلوں میں نازش پرتابگڈھی، محسن زیدی خاص طور پر پسند آئے۔ انداز بیان (آسی، اقبال، نظام) کا الگ الگ ہونا بہت خوب ہے۔

نسیم صدیقی چنوری ــــ کرپہ

"عام انتخابات اور اردو" کے عنوان سے جو اداریہ آپ نے سپرد قلم فرمایا ہے اور اس میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے رویے و رویوں کی جو نشان دہی کی گئی ہے، جدید ہندوستان کی جو بھرپور عکاسی کی گئی ہے، وہ اک طرف ٹھوس اور زندہ جاوید حقیقت ہے تو دوسری طرف آپ کے شب و روز کے "اردو فکر" اور آپ کی بے باک اور بے لاگ تنقید و حق گوئی کی مظہر و آئینہ دار بھی ہے۔ خدا کرے یہ اداریہ ایسا اثر انگیز ثابت ہو کہ اردو کے جسم نزار میں نئی روح نیا اور تازہ خون لائے بلکہ دائمی مسیحائی کا ضامن بھی ہو۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی ——— شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

ماہ اپریل کا شاعر موصول ہوا۔ آپ نے اس شمارے میں بہت اعلیٰ معیار کا مواد یکجا کر دیا ہے۔ نثری حصے میں ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بحیثیت مجموعی مائل پر بہت تفصیلی اور تنقیدی مضمون لکھا ہے۔ جس کے ذریعہ اس کے فکر و فن پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ "اردو ادب میں اشتراکی تہذیب و تنقید" بھی ایک محسوس اور معلوماتی مضمون ہے۔ خصوصاً آج کے دور میں جبکہ اردو کے خلاف ایک محاذ قائم ہے، اس مضمون کی افادیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ شعری حصہ بھی اچھا خاصا ہے۔ "چھ کور لقطے" نظم رمزیہ اسلوب کی ایک حسین مثال ہے۔ محسن زیدی اور عنوان چشتی کی غزلیں بھی اچھی ہیں۔

میری نظر حصۂ مکتوبات پر بھی پڑی ہے۔ میں تمام سروش صاحب کا شکر گذار ہوں جنھوں نے میری نظم "ویپنگ ولو" کو پسند فرمایا ہے۔ ان کی پرخلوص داد سے میری بہت ہمت افزائی ہوئی ہے۔

قیصر قلندر صاحب کا خط بھی میرے پیش نظر ہے۔ انھوں نے "ویپنگ ولو" درخت کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے، میں اس کی تردید کی جرأت نہیں کر سکتا کیونکہ انھوں نے اس درخت کو کشمیر میں بذاتِ خود دیکھا ہے۔ مگر میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ "ویپنگ ولو" کو میں نے بھی بذاتِ خود رانی کھیت میں دیکھا ہے۔ چند سال قبل مجھے رانی کھیت جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں رانی کھیت کے احباب کے ساتھ جب میں تفریح کے لئے نکلا تو ایک مقام پر مجھے ایک بڑا درخت نظر آیا جس کی پتیاں انگوروں کے قطروں سے ملتی جلتی تھیں۔ یہ پتیاں شاخوں سے ایک تسلسل کے ساتھ آویزاں تھیں۔ اور اسی تسلسل کی بنا پر شاخ انگوری کی دھار معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اپنے احباب سے اس درخت کا نام پوچھا۔ انھوں نے اس کا نام "ویپنگ ولو" بتایا۔ میں نے اس درخت کا فوٹو بھی لیا اور اسی وقت میرے ذہن میں اس نظم کی داغ بیل پڑ گئی مگر اس کو مکمل کرنے کا اب موقع ملا۔

یہاں اس بات کو بھی سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ ولو کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ اور کافی مختلف ہوتا ہے۔ ولو کے درخت کچھ انچوں سے لے کر ۱۰۰ فیٹ تک بلند ہوتے ہیں۔ مثلاً Black willow کی اونچائی ۱۰۰ فیٹ ہوتی ہے۔ تنا اور مادہ کے لحاظ سے بھی ولو کی شکل و شباہت اور عادت میں فرق ہوتا ہے۔ ولو کے اقسام کا یہ حال ہے کہ N. J. Anderson نے ۱۰ سال کی مسلسل تحقیق کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کی تقریباً ۱۰۰ قسمیں ہوتی ہیں۔ C. S. S. Sargent نے بھی ۱۷۰ سے لے کر ۱۸۰ تک ولو کی قسمیں بتائی ہیں۔ جب اس درخت کی اتنی قسمیں ہوتی ہیں تو اس کا بھی امکان ہے کہ ولو کا ایک درخت ایسا بھی ہو جس کی پتیاں انگوروں سے مشابہ ہوں

ولو کے تمام درختوں کو دو نمبروں میں رکھا گیا ہے۔ پہلی قسم کے درخت وہ ہیں جن کی معاشی اہمیت Economic Importance ہے۔ دوسری قسم کے درخت وہ ہیں جو آرائشی اہمیت (Ornamental Importance) رکھتے ہیں۔ معاشی اہمیت رکھنے والے درخت WHITE, BLACK WILLOW اور S. Caprea ہیں۔ OSIERS اور S. CAPREA WILLOW سے باسکٹ بنتی ہیں۔ اس کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کے مؤلف نے لکھا ہے کہ (S. Alba) WHITE WILLOW سے کرکٹ کے بلے بنتے ہیں۔

(Encyclopaedia Britannica vol. 23. P. 627)

اس موقع پر ذہن میں ایک اور بات آتی ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ قیصر قلندر صاحب جس درخت کو Weeping willow سمجھ رہے ہوں وہ White willow ہو۔ کیونکہ White willow سے کرکٹ کے بلے بنتے ہیں اور Weeping willow سے کرکٹ کے بلے نہیں بنتے ہیں۔ آرائشی اہمیت رکھنے والے درخت زیادہ تر سجاوت کیلئے لگائے جاتے ہیں۔ چیمبرس انسائیکلوپیڈیا کے مؤلف نے آرائشی درختوں میں Weeping willow اور Golden willow کو رکھا ہے۔ (Chambers Encyclopaedia vol. P. 596) اس کا مطلب یہ ہے کہ Weeping willow آرائش کیلئے لگایا جاتا ہے۔ اس سے گمان اغلب یہ ہے کہ اس سے کرکٹ کے بلے نہیں بنتے ہوں گے۔ ویپنگ ولو کے سلسلے میں انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں ایک اہم جملہ ملتا ہے۔ اس کا مؤلف لکھتا ہے

"The drooping habit of the weeping willow renders it very attractive

(Encyclopaedia Britannica vol. 23. P. 628)

(بقیہ صفحہ ۶۲ پر دیکھئے)

اداریہ :-

محفل اپنی ...!

یہ تازہ شمارہ اور اس کی تخلیقات

"شاعر" کا یہ تازہ شمارہ پچھلے شماروں سے کچھ مختلف ہے۔ اس میں یا تو مختصر فن پارے ہیں۔ کبھی کبھی مختصر مضامین طویل مضامین سے زیادہ لطف دیتے ہیں۔ اپنی رنگارنگی کے اعتبار سے یہ تخلیقات پسند کئے جانے کے قابل ہیں۔ وحیدہ نصیح احمد کے ناول "آبلہ پا" کا جائزہ۔ "۱۹۶۵ء کی اردو تخلیقات" پر تبصرہ۔ "نئی شیراز" میں "حیات داغ" "مطالعہ" "مگر سے آخری ملاقات" کی یادداشت۔ "فن گفتگو" پر تبصرہ۔ اور "آواز" کا ایک نئے ڈھنگ سے اس کے اپنے ہی پس منظر میں پڑھکر تاثرات کافی لطف اندوز ہونگے۔

"جلتی آنکھیں" "وادیاں گلاب کی" "ردی" اور "لیڈر" تین مختصر مگر اچھی کہانیاں ہیں۔ ان کے علاوہ ڈراما "چھوٹے بڑے لوگ" جو کسی قدر طویل ہے اپنی مقصدیت اور تکنیک کے اعتبار سے خوب ہے۔

ہندستان کے مستند و مشاہیر شعرا نہ جانے کہاں گم ہو گئے ہیں۔ کس خوابناک عالم میں ہیں۔ ؟! ان کی بے توجہی کے باوجود ہر شاعت میں بہتر سے بہتر ملغظیں اور غزلیں پیش کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ امید کہ مشاہیر ادبا اور شعرا "شاعر" کو اپنے تعاون سے نوازیں گے۔ ہر ملک کے بڑے ادیب اپنی زبان اور اپنے ادب کی عظمت کا سبب ہوتے ہیں۔ ادھر چند سال سے ہمارے بہترین ادیب اور شاعر اپنے ملک کے ادبی رسائل کو قبول سے گئے ہیں۔ یوں بھی ہندوستان میں ادبی رسائل زندہ رہنے کے برابر ہیں اور جو ہیں وہ بڑے قلمکاروں کی بے توجہی کی وجہ سے مرنے جا رہے ہیں۔ ہمارے مشاہیر اہل قلم اپنی زندگی محسن اور معیار عطا کر سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو آج کی اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک بڑا الزام جگہ پا جائیگا۔

"شاعر" میں "ادبی خبریں" دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس بار "نقد و نظر" اور خبروں کیلئے زیادہ گنجائش نکالی گئی ہے۔ امید کہ چند اشاعتوں میں تمام موصولہ مطبوعات پر تبصرے ہو جائیں گے۔

مکتوبات :-

"شاعر" پر اظہار خیال کے سلسلے میں آئے ہوئے خطوط میں سے ہر بار بہت سے خطوط شائع ہو جانے سے رہ جاتے ہیں۔ بعض رسمی خطوط تو اداریہ خود ہی روک لیتا ہے۔ لیکن لمبا اوقات جگہ کی قلت، خطوط کی طوالت اور کثرت بھی مانع ہوتی ہے۔ پچھلی اشاعت کے سلسلے میں جتنے خطوط آئے ہیں کہ اگر ان سب کو شائع کیا جائے تو دس بارہ صفحات بھی کم ہو جائیں۔ ان میں سے اہم خطوط کے لئے ۴ صفحات نکالے گئے ہیں۔

اس بار خطوں میں ذرا کھل کر باتیں ہوئی ہیں۔ یہ بڑے پر لطف ہیں۔ کڑے تیوروں کے باوجود ان میں ایک ادبی خلوص ہے چونکہ ہم ادبی تہذیب کی وراثت کو سینوں سے لگائے ہوئے ہیں اس لئے باتیں اسی انداز میں کی جانی چاہئیں۔ گہری تنقیدی نگاہ تحلیل کی عظمت کو اعتبار دیتی ہے۔ جو دل "خوب" کی آواز پر اچھلیں، اور مسرور ہوں۔ وہ "زشت" کی صدا پر ڈوب کیوں جائیں؟۔

"خوب و زشت" دونوں پر گوارائی کا مذہب اپنا چاہیئے یہی آئین ادب ہے، اور یہی جستجوئے فن۔

کیا سوچ رہے ہیں ؟

"شاعر" بالالتزام جن ارباب ذوق کی نظر سے گذرتا ہے، وہ توسیع اشاعت کے سلسلے میں ہماری معروضات بھی دیکھتے ہوں گے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں اور اس اجتماعی مقصد کی طرف ہم انھیں کس طرح متوجہ کریں۔ ؟

صرف دس پانچ دردمندان اردو ہی نے اب تک ہماری آواز پر توجہ دی ہے اور وہی دو تین مہینے سے نئے خریدار عنایت کر رہے ہیں۔ کسی چھوٹی سے چھوٹی زبان کے جاننے والے بھی اپنے کسی ادبی رسالے کی آواز کو اس طرح نظر انداز نہیں کرتے۔ !! ہماری نگاہیں "شاعر" کے تمام قارئین کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ ذیل میں ان "شاعر" دوستوں کے نام بصد شکریہ پیش کئے جا رہے ہیں جنھوں نے گذشتہ ۲ ماہ میں اپنے شاعر کیلئے کا آیا

(۱) جناب رشید مرزا دہلوی (کلکتہ) ۴ خریدار
(۲) جناب بدیع الزماں خاور (لاہور) ۵ "
(۳) جناب پروفیسر پیرزادہ اقبال ہاشمی (بہاولپور) ۱ خریدار
(۴) جناب نسیم کوثاری۔ احمد آباد ۱ خریدار
(۵) جناب بشیر احمد صوفی۔ سوپور (کشمیر) ۱ "
(۶) جناب عبدالمنان عدنانی (مہو) ۱ "
(۷) جناب جہانگیر جوہر (مرزا پور) ۲ "

نقد و نظر

(تبصرہ کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اردو شاعری کا مزاج ... از ... ڈاکٹر وزیر آغا

نئی نظم اور نئے فکشن کی طرح نئی تنقید کا بھی وجود ہے۔ ہر عہد اپنی پہچان خود کرتا ہے۔ ماضی حال کو حال میں مستقبل کو حال میں بدلتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ روز اول سے آج تک جاری ہے۔ زندہ زبان زندگی کے ساتھ پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ بیتی ہوئی رات کو تو نئی روشنی میں اکثر سڑلا جاتا رہا ہے۔ لیکن گذرے ہوئے اندھیروں سے نئے دن کو تلاش کرنا فیر فطری عمل ہوگا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" جدید تنقیدی اقدار پر اردو شاعری کو از سر نو سمجھنے سمجھانے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ میر آغا نے فنی تخلیقات کو جانچنے کے لئے جس نفسیاتی سوجھ بوجھ کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ اس کتاب میں اپنے بھرپور ارتقائی روپ اور کچھ اور نکھے تیوروں کے ساتھ نمایاں ہے۔ ڈاکٹر صاحب دور جدید کے ان چند لیے گنے ناقدین میں سے ہیں جن کی رائیں نظریاتی تعصب اور سیاسی و تاریخی پس منظر کی میکانکی یکسانیت سے پاک ہیں۔ ان میں فرد اور سوسائٹی کے ہر لمحہ بدلتے رشتے کے نفسیاتی و تہذیبی شعور سے ادبی تخلیقات کی ذمہ دار گرہوں کو کھولا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں اردو شاعری کی تین جاندار اصناف گیت، نظم اور غزل کے مزاجی امتیازات کو تہذیبی و ثقافتی کینوس پر اُبھارا گیا ہے۔ ان کے نزدیک ان اصناف میں صرف فارم ہی کا نہیں بلکہ باطنی و معنوی اختلاف بھی کارفرما ہے۔ اس کو علامتی انداز میں انھوں نے یوں ظاہر کیا ہے۔ "گیت میں بچہ ماں کے بطن میں تھا، غزل میں بچہ ماں کی انگلی تھامے ہوئے ہے، لیکن نظم میں ماں بچے کے اندر چھپی ہوئی ہے۔"

آغا صاحب نے اصولِ استدلال میں ایک نئے اور کامیاب تجربے کا اضافہ کیا ہے۔ جس سے نقاد ہمیں متاثر ہوتے ہیں۔ اردو شاعری کے مزاج سے پہلے ان کی ایک اور تنقیدی کتاب "نظم جدید کی کروٹیں" بھی آچکی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ادب شاعری کے سرسری مطالعہ سے نہیں بلکہ زندگی کے گہرے شعور، عالمی ادب کے عمیق گیان، اور صنعتی عہد کی تیز رفتاری کی سوجھ سے ظہور میں آئی ہیں۔ آج کے عہد میں نئے آدمی کا نفسیاتی تجزیہ اور عہد گذشتہ کا تنقیدی valuation جس خوبی اور علمی تہہ داری سے آغا صاحب نے کیا ہے۔ اس سے کسی کو نظریاتی اختلاف بھلے ہی ہو لیکن اس میں جس دانشورانہ محنت اور نفسیاتی مہم گیری سے کام لیا گیا ہے اس کی داد نہ دینا ادبی ناانصافی ہوگی۔ آخر میں کتابیات کے عنوان سے جن حوالوں کا ذکر ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وزیر آغا نے یہ کتاب کافی مطالعہ کرنے کے بعد لکھی ہے۔ بڑا سائز، جم ۳۲۰ صفحات۔ قیمت چھ روپے ملنے کا پتہ: جدید ناشرین۔ چوک اردو بازار۔ لاہور (پاکستان)

(ن۔ ف)

نورِ فردا ... از ... صدیق احمد صدیق

بڑے چھوٹے ناموں اور شہرتوں کے گھمسان میں جب جانی پہچانی آوازیں بھی نہیں پہچانی جاتیں تو ان آوازوں کا ذکر ہی کیا جو دور تک پہنچنے کی صلاحیت تو رکھتی ہیں لیکن ان کیلئے راستے صاف نہیں۔ صدیق احمد صدیق نے مدتوں کی ریاضت سے اپنی آواز کو اپنے دور کا تو بنا لیا لیکن اسے مسلسل پھیلا نہ سکے۔ شاعری میں اظہار سے ابلاغ تک کی منزل بڑی کانٹوں بھری ہوتی ہے۔ ان کانٹوں سے گذرنا آسان بات نہیں۔ صدیق اپنی خاصی طویل شاعرانہ عمر میں سنبھلی ہوئی شاعری تو کرتے رہے لیکن اسے بہت عام کرنے کا شاید انھیں گر نہ آیا۔ وہ مالیگاؤں (ضلع ناسک) کے محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ طبقہ جس کے ہاتھوں میں ملک کی صنعتی ترقی کی باگ ڈور ہے۔ مالیگاؤں جس کے محنت کش ہاتھ اگر ایک طرف چادر صنعتی نظام کی زلفیں سنوار رہے ہیں تو دوسری طرف گیسوئے اردو کے پیچ و خم بھی نکال رہے ہیں۔ یہی بہت ہے کہ مشینوں کی گڑگڑاہٹ، سماجی ناہمواریوں، اور قدیم و جدید کی کشمکش کے باوجود صدیق نے اپنی فکر کو بہت قدیم اور بہت جدید کے "درمیان" سنبھالا لیا۔ "نورِ فردا" غزلوں کا مجموعہ ہے، جس میں ایک طرح کی فکری پختگی، ذوق کا رچاؤ اور شوق کی نارسائی ہے۔ غزلوں کے اکثر اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ناکامیوں اور محرومیوں

نے جنم دیا ہے۔ یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ اپنے دور کے محسوسات کا پیدا وار ہیں ۔ ؎

کیا بات ہے، ہر ایک یہاں تیرہ ذہن ہے
بستے ہیں کیسے لوگ اجالوں کے شہر میں
نا آشنائے منزلِ مقصود ہیں تو کیا
پیچھے نہیں رہیں گے کسی ہم سفر سے ہم
اے نازنینِ دہر ذرا لیخائے کائنات
ہم اہلِ عشق یوسفِ زنداں شکن بھی ہیں
ڈرا کے ظلمتِ شب سے ظلم نصیبوں کو
دلا رہے ہیں سحر کی تجلیوں کا یقیں
اک نظر اپنے اشاروں کی طرف بھی اے دوست
میرے بگڑے ہوئے ماحول کی تصویر نہ دیکھ

عتیق کی شاعری میں یقین و اُمید کی جھلکیاں ہیں لیکن یہ ابھی پختہ اور موضوعی نہیں ہیں۔ عتیق کا زندگی پرستانہ انداز نظر اگر اور ابھر گیا، فکر کے بعض مستعار اور روایتی سانچے ٹوٹ گئے تو ان کا دوسرا مجموعہ کلام اس سے کہیں زیادہ اعتبارِ فکر و فن لئے ہوئے ہوگا۔

کتاب میں عتیق کی شاعری سے متعلق حضرت اثر لکھنوی کی رائے، زاہد صدیقی کا "دیباچہ" ظ۔ انصاری کی "چند باتیں" اور عبدالحمید سرور کا "عتیق کی آواز" شامل ہے۔ افسوس کہ مجموعہ کی نثر و نظم میں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں اور غالباً یہ نتیجہ ہے ٹائپ شدہ صفحات کے صحیح طور پر پروف نہ دیکھنے کا۔ ساتھ میں کوئی محو نامہ بھی نہیں لگایا گیا ہے۔ ویسے یہ مجموعہ اردو ٹائپ میں نہایت دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ ایک متوسط طبقے کے نا آسودہ شاعر کا اپنی کتاب کے لئے جتنا اہتمام قابلِ ستائش ہے۔ حجم ۸۸ صفحات۔ سیاہ خوبصورت جلد پر نہایت روشنائی سنہری ڈالی۔ قیمت تین روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ "بزمِ ادب" ناندیڑ۔ مالیگاؤں (ضلع ناسک)

"فن کی جانچ"
از ڈاکٹر سید جعفر

"فن کی جانچ" ڈاکٹر سید جعفر کے بارہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو مختلف ادبی شخصیات اور موضوعات پر ان کی سنجیدہ مطالعہ پذیر جوانبدار ادب فہمی اور سخن شناسی کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی رائے "سوچی سمجھی اور اثر انگیز تاثر" ہوتی ہیں۔ ان مضامین میں مواد

کو کسی بنے بنائے فارمولے میں فٹ کرکے دیکھنے کے بجائے، صحت مند ادبی تاثر اور ادراک کی روشنی میں سمجھنے سمجھانے کا رجحان نظر آتا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں تنقیدی رائے میں زیادہ کسی ادیب سے ان کی انفرادی عقیدت مندی جھلکنے لگتی ہے جو نظریاتی تنقید کی طرح ادب کے ارتقاء کیلئے مضر تو بالکل نہیں ہیں مگر قارئین کو وقتی طور پر غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر "مگر" مطربِ خوشنوا" پیش کیا جاسکتا ہے۔ مگر کے بارے میں ان کی رائے ۔۔۔ "حسن و عشق کے تجربات پر سوداؔ سے غزل کے متعلقات ہے ہیں۔ لیکن ان تجربات میں تنوع پیدا کرنے ..... انھیں زندگی کی تاثیر حقیقت بنا دینے.. ان میں لطافت اور معنویت کا اضافہ کرنے .... کا جو انداز مگر کے یہاں ہے اس کی مثال اردو شاعری میں مشکل سے نظر آتی ہے۔" کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ اور پھر اس کے ثبوت میں جو شعر دیئے گئے ہیں اس ذیل کا دوسرا شعر یہ ہے۔

سفاک چوٹیں بھی ہیں قاتل نظر بھی ہے
کیا چیز ہو گئے ہو تمہیں کچھ خبر بھی ہے

سرسیّد کے سماجی تصور پر داستانوں کے ثقافتی منظر اور اردو نظم میں ہیئت کے تجربے کافی مدلل گہرے اور اچھے مضامین ہیں۔ ان میں تحقیقی انہماک کی جھلکیاں بھی ہیں۔ جو ایک اضافی سنجیدگی اور وقار کو پیدا کئے ہوئے ہیں: "اردو نظم میں ہیئت کے تجربے" میں ایک جگہ انگلستان اور امریکہ میں آزاد نظم نگاری کا سنہ (شاید کتابت کی غلطی سے) ۱۸۹۱ء لکھا ہے جو درست نہیں۔ بلینک ورس، تو ملٹن کی عروسِ گمشدہ (Lost Paradise) اور اس سے پہلے شیکسپیئر کے یہاں استعمال ہو چکی تھی۔ وہٹ مین (1892-1819) نے آزاد نظم نگاری کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا تھا۔

مجموعی اعتبار سے یہ مضامین اردو تنقید میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ضرور کرتے ہیں اور بقول اعتشام حسین "ان میں بیشتر مضامین کو دلچسپ اور خیال انگیز پایا۔"

حجم ۲۰۸ صفحات۔ قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ:۔
نیشنل بکڈپو۔ مچھلی کمان۔ حیدرآباد (دکن)

قطارِ شیشہ
از خلش بڑودوی

گجرات سے کئی اچھے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ احمد آباد کے

بزرگ ترین شاعر کلیم احمد آبادی کا "متاعِ کلیم"۔ نئے شاعر محمد علوی کا "خالی مکان"۔ جمال قریشی کا "خیال کربلا"۔ عادل منصوری، عقیل کلیمی رحمت امروہوی، زوار حسین اعجو، تبسم سبار کپوری، خالد سی عقیل احمد آبادی اور کئی دوسرے شعراء اپنا ایک مقام رکھتے ہیں جو ترین قریشی اور تاج لوشکی کے کلام کے مجموعے زیرِ طبع ہیں۔ گجرات کے ان ہی قابلِ ذکر شعراء میں اپنی طرز اور فکر کا ایک شاعر خلش بڑودوی بھی ہے۔ جسے عام طور پر ادبی حلقے جانتے ہیں۔

"قطارِ شیشہ" خلش بڑودوی کی غزلوں کا حسین مجموعہ ہے جس طرح خلش کی شاعری سادہ پُرکار ہے اسی طرح اس کا یہ مجموعہ بھی نہایت خوبصورت کتابت و طباعت کا اعلیٰ کاغذ اور دیدہ زیب جلد کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ گجرات سے اتنی اچھی کتاب کا شائع ہونا قابلِ رشک ہے اردو زبان کا حال بے حال سہی لیکن اِدھر اس کی کتابیں عام طور پر بھی دیدہ زیب شائع ہونے لگی ہیں۔ "قطارِ شیشہ" میں ۸۴ غزلیں، ۶ نظمیں، متفرق اشعار اور رباعیات و قطعات ہیں۔

خلش بُنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے اور غزل بھی وہ غزل جس نے روایتوں کی آغوش میں پرورش پاکر درایتوں سے اپنا رشتہ جوڑا ہے "جو نیا کچھ جدید کیوں نہ ہو جائے" ادب و شعر کی قدیم "خوبصورتیوں" کی جلوہ گری اس میں عزور رہے گی۔ آج ہم داغ اور مجروح کے "چٹخارے" کو کچھ بھی سمجھیں لیکن جو لوگ اس چٹخارے میں "شعورِ عقیقت" کو سمونے کی کوشش کرتے ہیں اُن کا کلام یقیناً پسندیدگی کی سند حاصل کرتا ہے۔ شاعری میں انتہا کا تلخ اور کھردرا پن بھی آج بہت اہم کہا جاتا ہے۔ مگر جو نکہ انسان کی جمالیاتی حس ابھی مری نہیں ہے اور نہ شاید کبھی مرے۔ اس لئے غزل کے رچے ہوئے انداز کا نامطبوع ہونا مشکل ہی ہے۔

سردار جعفری نے "قطارِ شیشہ" کے پیش لفظ "میں ایک جگہ لکھا ہے

"جدید تر شاعری کے ہنگامے میں جہاں لوگ،
لنگڑے معروں اور سکھلاتے ہوئے آہنگ کی بھرمار ہے
خلش صاحب کی شاعری ایک ٹھہرا ہوا پُرسکون اور
دل موہ لینے والی آواز ہے۔ جو آہستہ آہستہ روح کے
تاروں کو چھیڑتی ہے۔ اور یہ بڑی بات ہے۔"

جس آواز کی طرف سردار جعفری نے اشارہ کیا ہے وہ خلش کی ہر غزل میں موجود ہے لیکن ہر شعر میں نہیں اور یہ انتخابِ کلام کی سطح کا سبب ہے کہ جہاں "قطارِ شیشہ" میں فکر و فن سے پوری طرح مزین اشعار بہت کافی ہیں، وہیں بعض ہلکے پھلکے شعر بھی رہنے دیئے گئے ہیں مثلاً

تو کسی بھولی دل کی کشتی — تیز بہت جذبات کے دھارے
روشن چہرے والا کنکر — دل میں رکھتے ہیں انصاری
محبت کا کرم اللہ اکبر — جسے چاہے بنا دے فیر فانی

یہ اشعار نہ بُرے ہیں اور نہ جذبات و لوازماتِ شعری کی کمی میں کمی ہے۔ لیکن وہ بات نہیں جو ذیل کے اشعار میں ہے۔

اے خامشی گذر بھی حدِ احتیاط سے
مدت ہوئی ہے نامہ بری کا لئے ہوئے
اسی نگاہ سے مانگیں چلو شعورِ جنوں
سوالِ عظمتِ دار و رسن ہے کیا کہئے!
اور بھی چند مقاماتِ طلب آگے ہیں
دار سے منزلِ دلدار تک آتے آتے
اپنی الجھی ہوئی نیندوں کی یہ سجھا ہوں
مطمئن کوئی بھی آج اپنے گلستاں میں نہیں

خلش کے ایسے ہی اشعار سے متاثر ہو کر "قطارِ شیشہ" کے دیباچہ میں عزیز قیسی نے لکھا ہے

"قطارِ شیشہ" میں ایسے بہت سے اشعار مل جائیں گے جن میں علوئے فکر نے فن کے حسین امتزاج سے بے پناہ تاثر پیدا کر دیا ہے۔ یہ صرف تاثر بلکہ چونکا دینے والا انداز اختیار کر لیا ہے۔"

خلش کی غزلوں میں خوش فکری کے ساتھ ساتھ ہلکا ہلکا درد بھی ہے۔ اس نے غمِ ذات اور غمِ کائنات کو شدت سے محسوس کیا ہے اور ان محسوسات نے اس کے شعروں کو اور بھی جاندار بنا دیا ہے۔

ہم ترستے ہی رہے پھر بھی اجالوں کیلئے
چاند اترے سیکڑوں اور سیکڑوں ڈھلے
اس کو کیا کہیئے کہ ساقی نے تو پی ہی نہ ہو
ہم تو ہر پیالے سے ذکرِ تشنگی کرتے رہے
عہدِ رفتہ کے زخم کیا بھرتے
دورِ حاضر کے غم نہیں بدلے

بلاشبہ "قطارِ شیشہ" اچھی رچی ہوئی شاعری کا قابلِ قدر مجموعہ ہے اس میں مولانا حبیب الرحمٰن عزیزی کا تعارف، اظہار حمد قیسی کا دیباچہ

سردار جعفری کا خیر مقدم، اور مجروح سلطانپوری کی تقریظ شامل ہے۔
ضخامت ۴۴ صفحات۔ قیمت تین روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ بزم توفیق۔ طائی اسٹریٹ۔ بڑودہ۔ (گجرات)

رنگِ حنا

از ——— قیصر الجعفری

اپنے مجموعۂ کلام کیلئے رنگِ حنا کے نام کا انتخاب قیصر الجعفری کے رومانوی مزاج اور ان کی سیاسی رجعت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان کی شعری کاوشوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۳۸ء کے شعری ورثے کو شعوری طور سے ہضم کرنے کے بجائے اسے فارمولوں کی صورت میں اپنایا ہے۔ ہر بچہ اپنے اندر اپنے باپ کو لے کر جنم لیتا ہے۔ مگر وہ بوجھ کی مانند نہیں جسم میں دوڑتے خون، نسلی خصائص، پیلی نسوں اور مزاجی بناوٹ میں گھلا ملا ہوتا ہے۔ جس پر حالات اور بدلتے تقاضے عصری شائستگی اور توازن (Poise) پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسے آپ، میں کی کھوج بھی کر سکتے ہیں۔ جو زندگی کے دوسرے مظہروں کی طرح زندہ آرٹ کی لازمی شرط ہے۔ اسی کی تلاش کرنا پڑتی ہے۔ اپنی آواز کو پانا اور اس کو سچا اپنا ہر باشعور ادیب کا فرض ہے۔ ایسا نہیں کہ اس مجموعے میں کہیں قیصر کی آواز نہیں سنائی دیتی ہو۔ قیصر نظمیں بھی کہتے ہیں اور غزلیں بھی۔ ان کا لہجہ لچکیلا، رچا ہوا اور سنورا ہوا ہے۔ وہ بات کو سجا کے کہنے کے عادی ہیں۔ جس سے کبھی کبھی خوبصورتی اور تعقید بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ فارمولوں کے گھیرے سے نکل کر اپنے آنگن میں، اسکول میں پڑھتے بچے کے ذمہ دار باپ، ریل کی پٹری پر پڑی جوان لاش کے بھائی، ملازمت خرچ نہ دیے جانے کی شکایت کرنیوالی مجبور جوانی کے شوہر کی طرح سوچتے ہیں تو ان کی آواز میں تاثراتی تڑپ، صداقت اور جذباتی سچائی ابھر آتی ہے۔ نظم "صلیب" میں گھر سے آئے ہوئے خط کو پڑھ کر جب وہ کہتے ہیں ؎

کبھی یہ ذکر کہ بارش میں گھر ٹپکتا ہے
تمام رات مجھے جاگنے کو کہتی ہے
کبھی یہ ذکر شاید کی فیس باقی ہے
کئی دنوں سے وہ اسکول بھی نہیں جاتا

یا:۔

تو ہم بھی ان ہی کی طرح اپنی متوسط مجبوریوں کے تحت کچھ اس طرح سوچنے لگتے ہیں

مری حیات ہے ان لوپ لائنوں کی طرح
کبھی کبھار جہاں کوئی ریل آتی ہے۔ قیصر

"رنگِ حنا" کا شاعر عقل سے دل کی جانب اور دل سے عقل کی اس راہ پر گامزن ہے جس پر اردو شاعری کا کارواں تیس سال سے سفر کر رہا ہے۔"

شاعر کے مستقبل کی پہچان نئی راہیں کھوجنے سے ہوتی ہے کہ بنے بنائے راستے پر چلنے سے۔ یہ بات کہنے میں کوئی ہرج نہیں کہ اگر قیصر نے "میں" کی تلاش اور نئی فنی استعداد جس کی اس مجموعے میں کمی ہے، کے ساتھ جاری رکھی تو ان کی شاعری میں اور زیادہ گہرائی و واقعیت اور تاثر پیدا ہونے کا امکان ہے۔ الفاظ کے برتنے میں انھیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔

قیصر نے اپنا یہ شعری مجموعہ کافی اہتمام سے پیش کیا ہے۔ پیش لفظ سید شہاب الدین دسنوی کا اور دیباچہ سردار جعفری کا ہے۔

حجم ۱۱۲ صفحات۔ قیمت تین روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ دور حیات پبلیکیشنز۔ پرنس بلڈنگ۔ ابراہیم رحمتہ اللہ روڈ (ویسٹ) بمبئی ۱

بقیہ ... مکتوبات .. صفحہ ۵۷

یہاں DROOPING کا لفظ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ ویپنگ ولو کا درخت کچھ افسردہ اور مضمحل نظر آتا ہے۔ بہرحال یہ بات مزید غور طلب ہے کہ آخر اس درخت کا نام ویپنگ ولو کیوں پڑا؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس درخت میں رونے کی کوئی کیفیت ضرور پائی جاتی ہے۔ اسی لئے اس کا نام WEEPING WILLOW پڑا ہے۔ جس طرح سے ولو کے ایک درخت کو SILKY WILLOW اسی وجہ سے کہتے ہیں کیونکہ اس کی پتیاں ریشمی طرح ہوتی ہیں۔ ولو کا ایک درخت YELLOW WILLOW کہلاتا ہے کیونکہ اس کی ٹہنیاں پیلی ہوتی ہیں۔ اسی طرح سے ولو کے ایک درخت کا نام WEEPING WILLOW محض اسی لئے پڑ گیا ہے۔ کیونکہ اس کی پتیاں اخروٹ سے مشابہ ہوتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ RED WILLOW، SHINING WILLOW، BLACK WILLOW، WHITE WILLOW، PURPLE WILLOW وغیرہ ولو کے درخت اپنی ظاہری خصوصیات کی بنا پر اسی قسم کا نام رکھتے ہیں۔

بہرحال مجھے کشمیر کے ویپنگ ولو کا کوئی ذاتی علم نہیں ہے۔ میں نے تو رانی کھیت میں جس ویپنگ ولو کو دیکھا ہے، وہی درخت میری نظم کا موضوع ہے۔ اس کے باوجود چونکہ قیصر قدسی صاحب نے اس درخت کے سلسلے میں شک کا ایک دھندلا پیدا کر دی ہے، اسلئے میں اس کے بارے میں مزید تحقیق کروں گا۔ میں قیصر قدسی صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے مجھے اس نکتے کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

اردو اور دیگر متعلقہ زبانوں اور ان کے ادب کی ترقی کے لئے کام کر رہی ہے۔ اکیڈمی کی طرف سے ہندی اور اردو میں دو رسالے بھی شائع ہوتے ہیں۔ "گلستان" اور "مدھومتی"

حال ہی میں اس کے ممبران کا انتخاب ہوا ہے۔ حضرت صبا۔ بے پوری جناب پریم شنکر سریواستو اور جناب عارف نقشبندی بیکانیری اس کے ممبر چنے گئے ہیں۔

مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان کی فہرست شائع ہوگئی

کراچی۔ کل پاکستان انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ خاص میں اردو، فارسی اور عربی کے دو ہزار سے زائد نادر مخطوطات ہیں۔ ان مخطوطات کی توضیحی فہرست مرتب کی جا رہی ہے۔ پہلی جلد شائع ہو گئی ہے جس میں ۵۰ مخطوطات پر توضیحی حواشی ہیں۔ ہر مخطوطے کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ متعلقہ مخطوطے کے دیگر نسخے کہاں کہاں موجود ہیں۔ آخر میں کتب خانے کے تمام اردو مخطوطات کی مکمل اجمالی فہرست بھی دی گئی ہے۔ اس فہرست کو انجمن صدیق امر روہی اور سید صفدر علی عابد مصنفی نے مرتب کیا ہے۔

نثار اٹاوی کے اعزاز میں جلسہ

جناب نثار اٹاوی کو یو۔ پی سرکار کی جانب سے اعزاز و انعام عطا ہونے کی خوشی میں اسلامیہ کالج اٹاوہ کی مجلس انتظامیہ اور ممبران اسٹاف نے مورخہ ۱۷ مئی کو موصوف کا پر تپاک استقبال کیا۔ کالج کے خوبصورت ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں شہر کے تمام معززین اصحاب کے علاوہ علی گڈھ سے جناب عبدالرحمٰن خاں صاحب شیروانی صدر اسلامیہ ایجوکیشنل سوسائٹی و جناب نواب رحمت اللہ خاں شیروانی رئیس بھیکم پور نے بھی شرکت کی۔ جلسہ کی صدارت بابو ہوتی لال صاحب اگروال ڈپٹی اسپیکر یو۔ پی اسمبلی نے فرمائی۔ نثار صاحب کو تہنیت نامہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد نائب صدر جمہوریہ ہند عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، شری کملاپتی پرکاش وزیر تعلیم یو۔ پی، ڈاکٹر سمپورنانند وائس چانسلر یو۔ پی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب الہ آباد یونیورسٹی۔ پروفیسر محمد بشیر خاں صاحب ہیڈ شعبہ اردو لیونیورسٹی علی گڈھ، پروفیسر گھوری سہائے فراق گورکھپوری، جناب احمد صدیقی "مدیر شاعر" جناب نمار باره بنکوی، جناب احمد شاہد واحدی، جناب سلام مچھلی شہری، جناب جگناتھ آزاد، اور جناب بگھوان گزار دہلوی وغیرہ کے تہنیتی پیغامات سنائے گئے۔ جناب ہوامی سروپ پانڈے، جناب لاڈلی لال صاحب لائق اور جناب فیض صاحب نے نظم کی صورت میں اور شری وشوناتھ بھٹیلے ایڈیٹر بھارت گورو، شری پریم شنکر گپتا گورنمنٹ ایڈوکیٹ، شری دیوی دیال ردے سالیسٹر، مین میونسپل بورڈ جناب ظفر علی خاں، جناب شیخ نفیس الحسن، ایم۔ پی اور جناب صدر نے بصورت نثر اپنے دلی جذبات اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ بعدہٗ نثار صاحب نے خود ایک مؤثر تقریر سے اپنے بزرگوں اور بہی خواہوں کا شکریہ ادا کیا۔ جلسہ کے بعد کالج کے لان پر ایٹ ہوم دیا گیا۔ رات کو محفل سخن منعقد ہوئی جس میں شہر کے ادبا اور شعرا نے نثار صاحب کی خدمات کو سراہا۔ یہ محفل خیر و خوبی رات کے ۱۲ بجے ختم ہوئی ... محمد اختر (منتخب۔ پرنسپل اسلامیہ کالج اٹاوہ)

دبستانِ سیماب پر تحقیق

میں پٹنہ یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم کے تلامذہ پر "دبستانِ سیماب" کے عنوان سے کام کر رہا ہوں۔ اساتذۂ متاخرین میں علامہ سیماب کے سب سے زیادہ تلامذہ ہوئے۔ جن میں عصرِ حاضر کے بہت سے مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ "دبستانِ سیماب" کا موضوع چونکہ بہت وسیع ہے اس لئے بغیر اردو دوستوں اور خود علامہ سیماب کے تلامذہ کی مدد کے یہ کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہندوستان اور پاکستان کے تمام تلامذۂ سیماب اور اردو دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ اس سلسلے میں تعاون فرمائیں۔

(۱) ہند و پاک کے موجودہ تلامذۂ سیماب اپنے مختصر حالاتِ زندگی مع تاریخِ تلمذ ——— غزلوں کے بیس منتخب اشعار۔ دو بہترین نظمیں اپنی تصانیف کی فہرست اور اپنے ادبی مقام سے متعلق حوالوں اور دوستوں کی رائیوں سے مطلع فرمائیں۔

(۲) اپنے چار اصلاح شدہ شعر بھیجیں۔

(۳) ہر مرحوم تلامذۂ سیماب کے متعلق جن حضرات کو علم ہو وہ انکا تذکرہ اور کلام عنایت فرمائیں۔ (۴) اپنا تازہ ترین تصویری فوٹو بھیجیں۔

(پروفیسر افتخار احمد فخر گورکھپوری شعبۂ اردو و فارسی ایل۔ ایس۔ کالج۔ جلگاؤں۔ (مشرقی خاندیش)

اظہر افسر کے ڈراموں کا مجموعہ شائع ہو گیا

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد (آندھرا پردیش) کی طرف سے مشہور ادیب اور ڈرامہ نگار مرزا اظہر افسر کے سات منتخب ریڈیائی اور اسٹیج ڈراموں کا مجموعہ "مسافتوں" شائع ہوا ہے۔ جس کا تعارف مشہور ادیب میر حسن نے لکھا ہے۔

ازبکی زبان میں بیدی کی کہانیاں

تاشقند ۸ مارچ: حال ہی میں "لاجونتی" کے نام سے ازبکی زبان میں راجندر سنگھ بیدی کی منتخب کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے جو پانچ کہانیوں اور ناولٹ "ایک چادر میلی سی" پر مشتمل ہے۔ ان کہانیوں کا ترتیب اور الف کے ترجمہ کا کام محمد جانف خان بیروی، زینت اللہ تف اور شیخ نیشا بالف نے کیا ہے۔ یہ مجموعہ تیس ہزار کی تعداد میں شائع ہوا ہے اور عام طور پر مقبول ہو رہا ہے۔

حکومت اتر پردیش کے اردو کتابوں کے انعامات

مارچ ۱۹۷۵ء کے اختتامی سال میں حکومت اتر پردیش نے اردو کے جو انعامات دیئے ان کی تفصیل یہ ہے

تصنیف	انعام کی رقم	مصنف
دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر	۱۵۰۰	ڈاکٹر محمد حسن
نقوشِ اقبال	۱۲۰۰	میکش اکبرآبادی
مکسِ گل	۸۰۰	شمیم کرہانی
میر انیس بحیثیت زندہ شاعر	۵۰۰	اکبر حیدرآبادی
سرشار ایک مطالعہ	۵۰۰	پریم پال
دید و دریافت	۵۰۰	نثار احمد فاروقی
تاریخ شیراز ہند جونپور	۵۰۰	سید اقبال احمد
شامتِ اعمال	۵۰۰	دلآور فگار

آصف علی مرحوم کی یاد میں اردو کے ظائف

ایک لاکھ روپے جمع کرنے کیلئے یادگاری کمیٹی کی اپیل

دہلی کے ممتاز شہریوں نے مرحوم آصف علی کی یادگار قائم کرنے کے لئے امداد کی اپیل کی ہے۔ آصف علی کی یاد میں اردو کے پوسٹ گریجویٹ طلباء کیلئے تین وظیفہ جاری کئے جائیں گے۔ اپیل پر کرنے والوں کے نام یہ ہیں۔

جگل کشور کھنہ۔ ہردے ناتھ کنزرو۔ مہدی نواز جنگ۔ نورالدین (میئر دہلی) پی۔ این سپرو (ایم۔پی) لالہ شام ناتھ تارا پور (ایم۔پی) اور بی۔ ایچ زیدی (ایم۔پی)

یہ تین وظائف -/۷۵ روپیہ ماہوار کے ہوں گے۔ اور آصف علی مرحوم کی ثقافتی اہمیت کی بہترین یادگار ہوں گے۔

بمبئی میں مشاعرہ

اسی مقصد کیلئے ۱۲ مارچ کو بمبئی میں ایک پبلک مشاعرہ جو وی رشنکر دآئی۔ سی۔ (ایس) کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں نواب آصف علی صاحب نے شرکت کی۔ اس مشاعرہ کمیٹی کے خصوصی رکن سرو جفر تھے، جن کے حسنِ انتظام سے اس مشاعرہ کے ذریعہ آصف علی مرحوم کی یاد میں دیئے جانے والے وظائف کیلئے کچھ فنڈ جمع کیا گیا

نریش کمار شاد کو انعام

حکومت پنجاب کی طرف سے اردو، ہندی اور پنجابی زبان کی بہترین کتابوں پر ہر سال جو انعامات دیئے جاتے ہیں اس میں اس سال اردو کی دو کتابوں کو پانچ پانچ سو روپے کے انعامات دیئے گئے۔ ایک نریش کمار شاد کی کتاب "میرا کلام" ہے اور دوسرا کنڈن کی کتاب "گلزار" پر۔

حیدرآباد کی ممتاز شاعرہ بانو طاہرہ سعید کو اعزاز

ریاستی حکومت آندھرا پردیش کی طرف سے محکمۂ وزارت تہذیبی امور نے ممتاز شاعرہ و ادیبہ بانو طاہرہ سعید کو "مخدوم ادب" کا اعزاز و سند تفویض کیا۔ دیر کلچرل افیرس جناب اپادھائے طاہرہ صاحبہ کو کیسہ زر اور شال پیش کیا۔ کالا بھون ساہتیہ اکیڈیمی کی خوبصورت عمارت میں یہ شاندار تقریب ہوئی۔ نواب مہدی نواز جنگ سابق گورنر گجرات نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے طاہرہ سعید کی شعری اور ادبی صلاحیتوں کی ستائش کی۔ بانو طاہرہ سعید کے دو شعری مجموعے "ہدیۂ طاہرہ" اور "برگِ سبز" شائع ہو چکے ہیں۔

راجستھان ساہتیہ اکیڈیمی کے نئے ممبران

اودے پور۔ راجستھان ساہتیہ اکیڈیمی کی سال سے جنرل

اردو زبان و ریڈیو اطلاعات و نشریات کی نظر میں

ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو بھوپال کے ارشاد پر وزیر اطلاعات و نشریات شری رانا جہادر سنگھ بھوپال ریڈیو اسٹیشن پر تشریف لائے ہوئے۔ ان کی خدمت میں ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں بھوپال ریڈیو پر اردو کے شعبۂ اردو کے قیام، دوسری زبان کی طرح مستقل طور پر اردو پروگرام اور خبریں نشر کئے جانے کا انتظام، بھوپال کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں اردو کی نمائندگی ۔۔۔ مدھیہ پردیش سے سرکاری اردو اخبارات کے اجراء اور مقامی اخبارات و رسائل کو سرکاری اشتہارات دیئے جانے کا مطالبہ پیش کیا گیا۔

شری رانا جہادر نے تمام مطالبات پر ہمدردی سے غور کرنے اور عملی اقدامات کئے جانے کا یقین دلایا۔ ساتھ ہی ساتھ فرمایا: "اردو کے سلسلے میں مایوسی ایسی نہیں ہے۔ بلکہ عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اردو کسی ایک فرقے اور مذہب کی زبان نہیں ہے۔ اس سے ہم سب کو پیار ہے اور ہم سب کو اس کی ترقی کیلئے کوشش کرنی چاہیئے۔

بھوپال کے اردو اخباروں کو انعامات

بھوپال ۲۸ مئی: معلوم ہوا ہے کہ بھوپال میونسپل کونسل نے اردو اور ہندی کے بیس اخباروں کو پانچ پانچ سو روپیوں کے انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اردو کے جن ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو یہ انعامات دیئے جائیں گے۔ ان کے نام یہ ہیں:۔

محوی صدیقی لکھنوی، وکیل بھوپال، محمود الحسینی اکبر سعید خاں۔ شفا گوالیاری، مقصود دھرانی۔ ایم عرفان، قمر جمالی۔ مقصود عرفان۔۔۔ اور عشرت قادری۔

کلکتہ ایک رباب

سید عزمت اللہ کاظم (مصنف اجالوں کے گیت) کی خوبصورت نظم۔ "کلکتہ ایک رباب" جلد ہی کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے۔ یہ نظم جس میں کلکتہ کے حاضر، ماضی اور تہذیبی حالات کی انتہائی نفیس کاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، شہروں سے متعلق نظموں کی فہرست میں ایک بیش بہا اضافہ اور تحفہ ہے۔ مقدمہ ڈاکٹر اختر اورینوی اور دیباچہ پروفیسر کرامت علی کرامت نے تحریر فرمایا ہے۔

"غالب شناسی" کے افتتاح پر ادیبوں کا جلسہ

بمبئی یونیورسٹی کلب ہاؤس میں ۱۰ اپریل کو شام کے چار بجے اردو کے نمائندہ ادیبوں کا ایک سنجیدہ جلسہ ہوا۔ جس میں ڈاکٹر انصاری کی تازہ کتاب "غالب شناسی" کا افتتاح انگریزی کے جرنلسٹ اور ادیب، مہاراشٹر حکومت کے وزیر ڈاکٹر رفیق زکریا نے کیا اور مراٹھی گورنمنٹ کے وزیر صدارت کرتے ہوئے مصنف کو داد دی کہ جس زمانے میں حالی نے غالب پر کتاب لکھی تھی، وہ اس زمانے کے علمی و ادبی شعور کی نمائندگی کرتی تھی۔ آج کے ذہن اور شعور کے لحاظ سے "غالب شناسی" یہ فرض انجام دیتی ہے جو غالبیات کے تمام ادب سے مختلف لب و لہجہ رکھتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف نجم الدین اور جناب ناظر آزاد نے بھی تقریریں کیں۔ باقر مہدی نے مصنف کے وسیع اور شگفتہ مسائل کی بڑی داد دی۔

اس جلسے کی خصوصیت یہ تھی کہ ادبی اور انتظامی اور تعلیمی مسئلوں پر بحث کے مسائل اٹھے۔ ڈاکٹر نجم الدین نے اردو ادیبوں سے شکایت کی کہ وہ اپنے ادب میں عربی لفظوں کی صورت بدل دیتے ہیں اور بعض ایسی اصطلاحیں ایجاد کرتے ہیں جو نہ اصل میں عربی ہیں اور نہ اردو۔ یا ہندستانی۔

ظ۔ انصاری نے بتایا کہ غالب ایک بڑا شاعر ہی نہیں بلکہ عقلیت کی برتری اور (OBJECTIVITY) کا نمائندہ ہے جو ہمارے عہد کی خصوصیت ہے۔ "غالب شناسی" ان پانچ کتابوں کی پہلی کڑی ہے جو یکے بعد دیگرے وہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جلسہ میں غالب کی غزل "مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے" گائی گئی اور اداکار پنچتن نے چہرے اور ہاتھوں کے اشارے (PANTOMIME) میں پیش کی۔

خالد شفائی کا شعری مجموعہ "سنگ و سمن" شائع ہو گیا

اردو کے جانے پہچانے شاعر اور اپنی نظموں میں رومان و انقلاب کو سمونے والے خالد شفائی کا شعری مجموعہ "سنگ و سمن" شائع ہو گیا ہے۔ مہندی محبوب حیدر آباد دکن۔ پی) کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس کے ۱۲۰ صفحات ہیں اور قیمت فی جلد تین روپے ہے۔ یہ مجموعہ ماہنامہ قلمکار۔ مہندی محبوب حیدر آباد دکن یا مرہن لال ایس پرمار نوز ایجنٹ۔ مین روڈ رورکیلا ۱ سے مل سکتا ہے۔

ادارہ شاعر مرحوم کے صاحبزادگان اور دوسرے اعزا سے اظہار رنج و افسوس کرتا ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی پر تحقیق

میں دہلی یونیورسٹی سے مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کی تصانیف پر ریسرچ کر رہا ہوں کسی صاحب کے پاس اُن کے خطوط یا متعلقہ مواد محفوظ ہو تو درج ذیل پتہ پر اطلاع دینے کی عنایت فرمائیں۔

صبیحی پرمی۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

مہدی جعفری پوری انتقال

کراچی (ذریعہ ڈاک)، مئی ۱۹۶۶ء کو ۱۹ بجے صبح سید خورشید علی مہدی جعفری پوری کراچی (پاکستان) میں انتقال ہو گیا۔ مہدی جعفری پوری، مولانا علامہ سیماب اکبر آبادی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ علمی اور تحقیقی کاموں سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔ تاریخ گوئی میں تو انہیں ید طولیٰ حاصل تھا اور فن تاریخ گوئی پر وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت کافی لکھا۔ وہ ایک اچھے اور کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔

راج کمل چودھری سخت علیل ہیں

پٹنہ۔ (ڈاک سے) ہندی کے مشہور نقاد۔ کہانی کار اور شاعر راج کمل چودھری سخت علیل ہیں۔ اور پٹنہ کے اسپتال میں زیر علاج ہیں۔ ان کی آنتیں سڑ گئی ہیں۔ گردہ خراب ہو گیا ہے۔ وہ اور ان کے افراد خاندان سخت اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ امید کہ حکومت ہند اور بہار ریاستی حکومت اُن کی طرف بھرپور اور خاص توجہ دے گی۔ (نامہ نگار)

گرمی میں بھی زندگی کو مسرور و خوش گوار بنائیے

اس مقصد کے لئے

شربت رُوح افزا

بہترین مشروب ہے

شربت رُوح افزا انسان کے لیے اُنیس ۱۹ قدرتی اجزا کا ایک نہایت قیمتی مرکب ہے

شربت رُوح افزا ہر روز پیجئے اور مسرت بھرے لمحات کا لطف اٹھائیے

شربت رُوح افزا نہایت لذیذ اور تازگی بخش شربت ہے

دہلی • کانپور • پٹنہ

Regd. No. H/A-37/59 UP.

پرنٹر پبلشر اور مالک الحاج عبدالحق نے یونیورسل فائن آرٹ پریس ۲۳ لوہار چال بمبئی ۳ سے طبع کرا کر دفتر ماہنامہ شاعر بمبئی ۴ سے شائع کیا۔

بانی عامر سبیعاب الہ آبادی مرحوم

اردو کا سینتیس سالہ علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شمارہ ——— ۶
سنہ ۱۹۶۶ء جون

- 9 JUL 1966

ہما

بمبئی

ادارہ
اعجاز صدیقی
مہندر ناتھ

زرِ سالانہ
سات روپے

زرِ ششماہی
چار روپے

ممالک غیر سے
۱۶ شلنگ

فی پرچہ
۱۰ آنے (۶۲ پیسے)

مکتبہ قصر الادب
پوسٹ بکس ۵۲۶ بمبئی ۳ بی سی

ادارۂ "شاعر" فخر و مسرت کے ساتھ
اُردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار

کرشن چندر

پر نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر پیش کر رہا ہے
کرشن چندر کی منفرد شخصیت اور اُس کے ہمہ گیر فن پر نہ صرف ہندوستان کی
کئی زبانوں کے مشہور قلمکاروں بلکہ دُنیا کے کئی بڑے مصنفین اور مفکرین
کے مضامین و تاثرات

کرشن چندر نمبر

میں
پیش کئے جائیں گے

کرشن چندر

کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ

اُس کی عظمت کی کہانی اُس کی تصانیف کا جائزہ

اُس کے زندہ اسلوبِ فکر اور شاہکار افسانوں، ناولوں اور
ڈراموں پر تنقیدی نظر

درجنوں تصاویر
تفصیلات اور تاریخ کا انتظار کیجئے

کرشن چندر نمبر میں خود

کرشن چندر

کے اپنے قلم سے

- تازہ اور غیر مطبوعہ شاہکار

ناول

کے علاوہ

- تازہ کہانیاں
- ڈرامہ
- مزاحیہ
- ادبی نظریات
- تنقید نگار
- ادبی زندگی کا آغاز و انجام

کرشن چندر کے شب و روز
(تصاویر کے ذریعہ)
اور

عکسِ تحریر

کرشن چندر کے

اہم خطوط

ربابِ قلم اپنے مضامین کرشن چندر پر جلد از جلد روانہ فرمائیں

ترتیب

ہندی اور انگریزی میں اردو کا کیس (اداریہ)		اعجاز صدیقی	۶
آہ ۔ مولانا نیاز فتحپوری	(یادداشت)	اعجاز صدیقی	۷
غزل		علیم اختر مظفر نگری	۱۱
سیماب اکبرآبادی کے فنی نظریات	(مقالہ)	ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۲
غزل		اعجاز صدیقی	۱۷
ایک شام	(افسانہ)	شکیب	۱۸
موڈ	(نظم)	اسود اکبرآبادی	۲۵
بچن ۔ (ہندی کا خیام)	(مقالہ)	محمود واجد	۲۶
غزل		شفیق کوٹی	۳۰
غزل		طرنم قریشی	۳۰
سنگیتا	(مراٹھی کہانی)	ترجمہ ۔ نوربرکار	۳۱
غزل		نشتر نواز	۳۵
غزل		شاہد صدیقی	۳۵
اردو رقعہ کا تدریجی ارتقا	(مقالہ)	یعقوب ابی	۳۶
اے سبک رفتارانِ ساحل	(نظم)	ظہیر صدیقی	۴۰
عاشق صبر طلب	(طنز و مزاح)	یوسف ناکم	۴۱
غزل		اقبال بجاپوری	۴۲
غزل		ظفر غوری	۴۳

شاعر بمبئی

ایک جھونپڑی کی کہانی	(افسانہ)	شام کنول	۴۴
خواب	(نظم)	رؤف خلش	۴۹
گذارش	(نظم)	منظور احمد نہتا پوری	۴۹
عزالانصاری سے ایک ملاقات	(انٹرویو)	ضیا حسنی	۵۰
غزل		کیف احمد صدیقی	۵۲
غزل		پیرزادہ علیخان نرگس	۵۲
غزل		مدحت اختر	۵۲
خط	(انگریزی کہانی)	انجمن آرا انجم	۵۳
معاہدہ	(نظم)	مہدی تاریکوٹی	۵۳
مراج	(سانیٹ)	حنیف کیفی	۵۶

مکتوبات کے

رفیعہ شبنم — اقبال بجاپوری — بدیع الزماں خاور
نعیم صدیقی — عتیق احمد عتیق — اعجاز صدیقی
شفیقہ فرحت — مسعود قمر تاباں — پدیزام سیف اللہ
عروج احمد عروج — ساغر مہدی — شوکت محمود

ادب و ثقافت کے

محفل اپنی .....!		ادارہ	۶۱
نقد و نظر	(تبصرے)	ن ۔ ف	۶۲
رفتار	(ادبی خبریں)	ادارہ	۶۵

جرأت :-

شاعر بمبئی

ہندی اور انگریزی میں اُردو کا کیس

اس عنوان سے ۸ مئی ۱۹۶۶ء کے اخبار "ہماری زبان" میں ایک اداریہ لکھا گیا ہے اور اس میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اُردو زبان کے حقوق اور اُس کے مسائل کے متعلق اُردو میں تو بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ہندی اور انگریزی میں اس کے لئے مناسب اقدامات نہیں کئے گئے۔ یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ ہندی اور انگریزی کے اخباروں میں دلائل و براہین کے ساتھ اُردو کے مقدمہ کو پیش کیا جائے۔ نہ صرف ہندی اور انگریزی بلکہ دوسری علاقائی زبانوں کے اخبارات و رسائل کے ایڈیٹروں کو خطوط لکھے جائیں۔ اُنھیں مضامین بھیجے جائیں۔ اُن میں اُردو جلسوں کی رُوداد یں چھپوائی جائیں۔ آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) ہندی اور انگریزی میں چھوٹے چھوٹے رسالے چھپوا رہی ہے، ان رسالوں میں اُردو زبان کے مسائل ہوں گے۔

مدیر ہماری زبان نے یقیناً ایک ضروری امر کی طرف اُردو والوں کو متوجہ کیا ہے۔ لیکن سوچنا یہ ہے کہ کتنے لوگ اُردو کے مسائل سے واقف ہیں۔ کتنے ہندی اور انگریزی زبانوں میں لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور جو صلاحیت رکھتے ہیں اُنھیں کوئی دلچسپی بھی ہے یا نہیں۔ بفرضِ محال چند لوگوں نے چاہا بھی تو کیا اس سے مسئلہ کا حل نکل سکے گا۔ کیا دوسری زبان والے اُردو کے مقدمے، اُس کی دیرینہ خدمات اور اُس کی عظمت و ضرورت سے واقف ہو جائیں گے؟

کئی سال پہلے انجمن کے جنرل سکریٹری جناب ایل احمد سرور بمبئی آئے تھے تو ایک پریس کانفرنس میں کسی دوسری زبان کے نمائندے نے یہ سوال کیا تھا کہ "ہمیں نہیں معلوم اُردو کے کیا مسائل ہیں کیا آپ اپنے دوسری زبانوں میں اُردو کے مسائل اور اُس کی اہمیت کو بھی پیش کیا ہے۔" سرور صاحب نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ یہ بات انجمن کے پروگرام میں ہے اور جلد ایسے کتابچے مختلف زبانوں میں شائع کریں گے۔ لیکن وہ کتابچے اب تک شائع نہ ہو سکے۔ اب پھر یہ احساس جاگا ہے۔

ہم اُردو والوں کے سوچنے کا ڈھنگ کچھ عجیب ہی سا ہے اور جو کچھ بُرا بھلا سوچتے بھی ہیں تو بدقسمتی سے اُس پر عمل نہیں ہوتا۔ گزشتہ آٹھ دس سال میں "ہماری زبان" میں بے شمار اہم مسائل کے سلسلے میں لکھا گیا، بحثیں چھڑیں، کمیٹیاں بنائی گئیں۔ کیا اُن میں سے کوئی ایک کام بھی انجام ہوا؟

ہندوستانی میں اُردو کی بے پناہ ترقی ہو سکتی ہے اُس کے تمام حقوق اُسے مل سکتے ہیں۔ کروڑوں اُردو سے ناآشنا لوگ اُس سے آشنا ہو سکتے ہیں۔ اُردو کے لئے اب بھی وہ امکانات موجود ہیں جو ایک ہم مرحوم پر پہنچا دیں۔ مگر اب کیا کیجئے کہ ہمارے ہاتھ مایوسی اور بے دلی کا ایک سیدھا سا نسخہ لگ گیا ہے "رونا اور سونا"۔ ہم اُردو والوں کا شیوہ بن گیا ہے ہمارا حال سالہا سال سے یہی رہا ہے۔ ہماری فکر اُسی انداز کی ہے کہ تریاق کے آتے آتے سانپ کاٹا ہوا مر جائے!!

انجمن ترقی اُردو (ہند) کے اراکین سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ اپنے اندازِ فکر کو بدلیں۔ ہزاروں اور گونگوں کو آواز دینے سے بہتر یہ ہے کہ اُردو کے سب سے بڑے ذمہ دار ادارہ کی حیثیت سے ہر معاملہ میں "خود اقدامی" سے کام لیا جائے۔ انجمن کا کوئی بھی اور مثبت قدم اگر بھرپور پڑ جائے تو اُس کے پیچھے لاکھوں قدم ہو سکتے ہیں۔ مسلم کی مضبوط اور صحیح نیت سے ہی پر مقتدر لوگوں کی نیت کا انحصار ہوتا ہے۔

انجمن نے اُردو کے مقدمہ کو دوسری زبان والوں تک پہنچانے کے لئے جن کتابچوں کی اشاعت کا پروگرام بنایا ہے، وہ کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ انجمن کتنے اور کب تک یہ کتابچے چھاپے گی۔ کسے کسے بھیجے گی۔ کون توجہ سے پڑھے گا۔

اس سلسلے میں عمل کی صحیح راہ یہ ہو سکتی ہے کہ انجمن کی طرف سے فی الحال صرف انگریزی اور ہندی میں ایک پندرہ روزہ "بلیٹن" شائع ہو جو کہ نام INDIAN LANGUAGES BULLETIN (انڈین لینگویجز بلیٹن) ہو۔ ہندی کے لئے بھی ایسا ہی نام تجویز کر لیا جائے۔ اتنا خوبصورت چھپے اور اہم بنا دیا جائے کہ انگریزی اور ہندی والے ذوق و شوق سے پڑھیں۔ ہندوستان کے ہر بڑے اور چھوٹے کے بک اسٹالوں پر یہ "بلیٹن" فروخت ہوں۔ انگریزی اور ہندی کے تمام اخبارات و رسائل کو تبادلے میں بھیجے جائیں۔ ان میں ہندوستانی زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی جائے۔ اُردو کی اہمیت اور اس کے مسائل کو حقیقت پسندانہ اور روادارانہ انداز میں پیش کیا جائے۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ یہ "بلیٹن" انجمن کے لئے ایک بڑی آمدنی کا بھی ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اس کی اشاعت پچیس پچاس ہزار تک بہ آسانی پہنچائی جا سکتی ہے اور بہت کافی اشتہارات بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

۸ جون ۶۶ء

اجمل صدیقی

آہ ـــــ مولانا نیاز فتحپوری

۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کو صبح کراچی (پاکستان) میں مولانا نیاز فتحپوری انتقال فرما گئے۔
پورے ۸۲ سال کی بیقراریوں کو آخر قرار آگیا۔
مسلسل ساٹھ سال تک انشائے لطیف سے لے کر ادب، تنقید، افسانہ، ترجمہ اور مذہب و تاریخ کو اپنی مضبوط گرفت میں لینے والا قلم رُک گیا۔ ایک روایت کو نیند آگئی اور ایک اسلوب کا خاتمہ ہوگیا۔

بہت چھوٹی سی عمر میں میرے ادبی شعور نے اپنے بال و پر نکالے تھے۔ نثر و نظم میں کسی کے اسلوب سے متاثر ہونے یا نہ ہونے کی بات الگ ہے۔ مجھے یہاں صرف اِس بات کا ذکر کرنا ہے کہ میں نے کام کرنے کے لئے سلیقے، انہماک اور جدوجہد کو اپنا آدرش بنایا، اُس میں والدِ مرحوم علامہ سیماب، بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور مولانا نیاز فتحپوری کی شخصیتوں کو بڑا دخل ہے۔ جب ادب و صحافت کی عملی دنیا میں قدم رکھا تو مولانا نیاز کے ماہنامہ "نگار" پر ایک نکھار آچکا تھا۔ میرے یہاں پنجاب، دہلی، لکھنؤ اور دوسرے شہروں سے اور بھی رسائل آتے تھے۔ لیکن "نگار" کی سیدھی سادی ترتیب کے باوجود اُس کے وہ مضامین جو مولانا نیاز کے ذہین قلم ہوتے تھے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا کرتے تھے۔ یوں بھی "نیاز اور آگرہ" کی نسبت سے "نگار" میرے ہی وطن سے نکلنے والا ایک ادبی صحیفہ تھا۔ جو شاہ دلگیر کے "نقاد" کے بعد آگرہ سے شائع ہونے والا دوسرا معیاری ادبی جریدہ تھا۔ "نگار" فروری ۱۹۲۶ء سے دسمبر ۱۹۲۶ء تک آگرہ سے نکلنے کے بعد بھوپال منتقل ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی تین چار سال تک اُس کی طباعت آگرہ ہی میں ہوتی رہی۔ یہ داستان ذرا طویل ہے۔ "نگار" صرف ایک ہی سال کا تھا کہ میرے یہاں سے بھی ایک جدید تر ماہنامے کا اجراء ہوگیا، جس کا نام "پیمانہ" تھا۔ اور جو "نگار" سے زیادہ جدت و شگفتگی لئے ہوئے تھا۔ "نگار" اور "پیمانہ" کے بہت سے قلم کار مشترک تھے۔

یوں تو اُس زمانہ میں عام طور پر شاعری ہی کا ہر طرف چرچا تھا۔ لیکن والدِ مرحوم علامہ سیماب کے قائم کردہ قصرالادب (۱۹۳۳ء) میں نثر نگاری کو بڑی اہمیت تھی۔ مجھے یہ لکھنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ مولانا نیاز کے ذوقِ انشاء پردازی کو بڑھانے اور سراہنے والے اُن کے آگرہ کے وہ دوست تھے جو خود جدید اور خوبصورت نثر نگاری کا آغاز کر چکے تھے۔ یہ شاہ دلگیر، لطیف الدین احمد (ل۔ احمد) مینائے قباس ہاشمی، سید محمود مخمور اکبرآبادی، امام اکبرآبادی، مقدس اکبرآبادی وغیرہ تھے۔ "نگار" بھی ان ہی دوستوں کے جدید ذہن کی پیداوار تھا۔ ل۔ احمد اور مخمور اکبرآبادی کی نثر آج بھی ہمارے ادب میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے۔ ل۔ احمد نے خصوصیت کے ساتھ انشائے لطیف کی تحریک کو مقبول بنایا۔ ہر چند مولانا نیاز خود مہدی افادی اور سجاد حیدر یلدرم کے اسلوبِ نگارش سے متاثر تھے۔ لیکن اِس تاثیر کو تیز کرنے میں زندہ دلانِ اکبرآباد ہی کا ہاتھ تھا۔ یہ میرے سنِ شعور تک پہنچنے سے بہت پہلے کی بات ہے۔ لیکن مولانا نیاز سے میری اپنی ادبی وابستگی کا زمانہ ۱۹۳۳ء کہا جا سکتا ہے۔ فروری ۱۹۳۳ء میں میرے یہاں سے رسالہ "شاعر" کا اجراء ہو چکا تھا۔ اُس سے پہلے "پیمانہ"۔ ہفتہ وار اخبار "تاج" اور رسالہ "ثریا" بھی نکل چکے تھے۔ "شاعر" کے بعد رسالہ "کنول" اور ہفت روزہ "ایشیا" کے اجراء نے ہماری علمی، ادبی اور صحافتی وابستگیوں کو اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اُس وقت پورے ہندوستان میں دو ہی ادارے ایسے سمجھے جاتے تھے جو نئی نسلوں کے ذہنوں کی تربیت کر رہے تھے۔ نثر میں مولانا نیاز کا ادارہ اور شاعری میں علامہ سیماب کا اسکول۔

قصہ مختصر، ان پرانی داستانوں میں جو تعمیر و تخلیق کی چنگاریاں چھپی ہوئی ہیں مولانا نیاز کی موت نے انھیں ایک بار پھر روشن کر دیا۔ میں اس دور کے اساتذۂ سخن و ادب میں مولانا نیاز کا بے حد احترام کرتا تھا اور مولانا نیاز کی تحریروں کے علمی، ادبی، لسانی، فنی اور معلوماتی پہلو میرے لئے وجہِ کشش ہوتے تھے، کئی سال تک میں بالاستیعاب اُن کے مضامین کا مطالعہ کرتا رہا۔ اُس وقت تک اُن کی کئی کتابیں چھپ گئی تھیں، جو صدیق بک ڈپو سے میرے یہاں تبادلہ میں آیا کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ یوں محسوس ہوا کہ وہ ہم سے خوش نہیں ہیں۔ قصر الادب کی ادبی و شعری کاوشوں کو وہ کسی اور رنگ میں دیکھتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اُن کے اس تاثر میں تو کمی ہو گئی لیکن بانیٔ قصر الادب کے خلاف انھوں نے ایک مستقل محاذ بنا لیا۔ پھر بھی اُن میں میری دلچسپی بدستور تھی۔ "نگار" کی بعض تحریروں سے مجھے اختلاف پیدا ہوا، میں نے مولانا کو متوجہ کیا۔ اُن کی عظیم ادبی شخصیت، انتھک خدمات اور اُن کے ادب و احترام کے باوجود مجھے اُن کی "ہنگامہ پسندی" اور "مصلحت اندیشی" سے تکلیف ہوتی تھی۔ چڑھتا ہوا خون تھا، استاذۂ شعر و ادب سے زبردست قربتیں اور محبتیں تھیں۔ "قصر الادب" ایک بہت بڑا ادبی ادارہ بن چکا تھا۔ والدِ مرحوم علامہ سیماب کی سنجیدگی اور ادب و شعر میں اُن کے لائے ہوئے انقلاب و اجتہاد نے چھوٹی سی عمر میں میرے ذہن کو بڑا بنا دیا تھا اور میں سب سے بے تکلف باتیں کرنے لگا تھا۔ مولانا نیاز سے بھی بعض امور میں کھل کر خط و کتابت ہوئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ مولانا کی شخصیت اُس وقت بھی مُسلّمات سے تھی، اب بھی اور آئندہ بھی رہے گی۔ اُن کے کارہائے نمایاں بھلائے نہیں جا سکتے لیکن جب اُن کی بہت سی تحریروں کا واقعات کے پسِ منظر میں جائزہ لیا جاتا ہے تو ایک طرح کا دکھ ہوتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کی یہ بات ۔

"وہ سنسنی خیز باتوں کی تجارتی قیمت کو ایک معاملہ سنج کی حیثیت سے مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔"

کتنی تلخ معلوم ہوتی ہے، لیکن کیا کیجئے کہ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

مذہبی معتقدات ہوں یا علمی و فنی نکات، تنقید ہو یا تبصرہ۔ نرد ہو یا چوسر۔ مولانا نے جس موضوع کو بھی ہاتھ لگایا، اپنے مخصوص طرزِ تحریر کی تمام تر رعنائیوں کے باوجود کہیں نہ کہیں "سنسنی خیزی" ضرور پیدا کی۔ انھیں قدرت تھی کہ "نگار" کے پورے پورے "خاص نمبر" اپنی ہی تحریروں سے مرتب و مزین کر دیئے۔ اسلوب میں ایسی جان کہ قاری کھنچتا چلا جائے، علم و وقوف کا یہ حال کہ مختلف زبانوں کی کتابوں کا بخیہ اس طرح پیش فرمائیں کہ وہ خود اُن کا معلوم ہو۔ یوں لگتا تھا کہ معلومات کا ایک بحرِ ذخار موجیں مار رہا ہے۔ اُن کی بعض باتیں سب ہی کو بڑی عجیب سی لگتی تھیں۔ کبھی جوش ملیح آبادی پر، کبھی اختر حمید آبادی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ کبھی برنبائے تعلقات حسرت موہانی کو اُردو کا سب سے بڑا غزل گو ثابت کر رہے ہیں۔ کبھی ایسی باتیں لکھ رہے ہیں جن سے کفر و الحاد کی بُو آئے۔ اُردو زبان کو نقصان پہنچانے کی زبردست کوشش کی گئیں، لیکن نیاز صاحب نے کبھی "نگار" کے "ملاحظات" میں اُردو کے لئے کچھ نہیں لکھا۔ ہندوستانی سیاست کو چھوڑ کر وہ اپنے "ملاحظات" میں پاکستانی سیاست سے بحث فرمایا کرتے تھے۔ سیماب، جوش، جگر، فانی۔ یگانہ اور اپنے دور کے دوسرے مسلم الثبوت اساتذۂ شعر و ادب کے یہاں انھیں خامیاں ہی خامیاں نظر آئیں۔ ایک زمانہ میں فراق کو اچھالنا شروع کیا تو "نگار" کا کوئی شمارہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں فراق کا ذکر نہ ہو اور بعض وجوہ کی بنا پر جب اس سلسلے کو ختم کیا تو پھر فراق جیسے بڑے شاعر کا نام لینا بھی پسند نہ کیا۔ اقبال نمبر، غالب نمبر، جگر نمبر کی اشاعتوں کا مقصد اُردو حلقوں میں ایک طرح کا ہیجان اور سنسنی پیدا کرنا ہی تھا۔ تخریب اور تخلیق و تحریر کے اس سنسنی خیز عمل سے بہت سے لوگ لطف اندوز ہوتے تھے اور بہت سے بدمزہ۔ لیکن یہ مرحوم کے قلم کا جادو تھا کہ ان کی تحریروں کو لوگ پڑھتے ضرور تھے۔ اُن کے ہوشمند مضامین پر میں نے لوگوں کو سر دُھنتے ہوئے دیکھا ہے۔ مکتوبات کا ایک نہایت دلچسپ اور سنگین سلسلہ انھوں نے نگار میں شروع کیا۔ استفسارات کے باب میں وہ زیادہ تر ایسے موضوعات کو لیتے تھے۔ جو پڑھنے والوں میں دلچسپی پیدا کریں۔ مجنوں گورکھپوری نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"نیاز ایک زبردست قوتِ آخذہ کے مالک ہیں۔ وہ بڑے سلیقے کے ساتھ دوسری جگہ سے مواد لے سکتے ہیں۔ اور اپنے انفرادی اسلوب سے

اُس کو اپنا بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔"

اِس سلسلے میں بابا بھنیش چیس پروفیسر عبدالغنی سبحوانی نے تو بھوپال کے ایک اخبار کے صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے اور اخذ و ترجمہ کے سلسلے میں سنگین الزامات عائد کیے۔ میں نے بہتیرا کہا دیکھا کہ مولانا نیاز نے خود پرکیے گئے اعتراضات کا "نگار" میں جواب دیا ہو۔ وہ اپنے اصولوں میں بہت سخت تھے۔ انھیں تو اپنے کام سے کام تھا۔ ہر وقت لکھنا، پڑھنا، نئی نسل کو متاثر کرنا اور اردو میں ایسا مواد پیش کرنا جو ہمیں معلوم ہو اُن کا محبوب مشغلہ تھا جس پر وہ آخری سانس تک کاربند رہے جہاں وہ ایک اصول پرست ادیب تھے، وہیں کاروباری معاملات میں بھی بہت سخت تھے۔

مذہب سے اُن کا تعلق برائے نام ہی تھا۔ وہ ایک کھلا جالیاتی شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے اُردو شعر کو اِس جمالیاتی شعور سے آشنا کیا۔ آسکر وائلڈ، والٹر پیٹر اور ٹیگور کی انشائے لطیف کو اردو میں عام کیا۔ ٹیگور کی گیتانجلی" کا تو ایسا خوبصورت ترجمہ پیش کیا کہ پڑھنے والے عش عش کر اُٹھے۔ انھوں نے اپنی یادگار ۳۵-۳۶ چھوٹی بڑی تصانیف چھوڑی ہیں۔ اِن میں انشائے لطیف سے لیکر افسانہ، ناول، تنقید، تنقید جمالیات، جمالیات پر مقالہ میں، مذہب، تاریخ، فلسفہ سبھی کچھ ہے۔ اُن کے "رنگین اور سنگین" خطوط کے بھی شاید دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ مولانا نیاز سے بعض نظریاتی اور معتقداتی اختلافات کے باوجود اُن کی تصانیف کافی پڑھی جاتی ہیں۔ "نگار" کا بڑا خرچ اُن کی تصانیف کی آمدنی ہی سے پورا ہوتا تھا۔ حکومت ہند نے اُنھیں "پدم بھوشن" کا خطاب دیا اور غالباً اُنھیں وظیفہ بھی ملتا تھا۔

مولانا نیاز پٹھان تھے۔ ابتدائی زندگی محکمۂ پولیس کی ملازمت میں گزری۔ مزاج میں سختی تو تھی ہی علم و ادب میں غیر معمولی صلاحیتیں پیدا ہو جانے کی وجہ سے اُن میں ایک بردست "انا" بھی پیدا ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود کو ماورائے علم و ادب سمجھتے ہیں۔ ادب کی بڑی سے بڑی شخصیت کو وہ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انھوں نے اپنے کسی بڑے ہمعصر ادیب یا شاعر کی عظمت کا اعتراف کبھی دل سے نہیں کیا۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے اُدبا اور شعراء اس دنیا سے اُٹھ گئے، لیکن کبھی انھوں نے کسی کے لئے بطور تعزیت دو جملے اپنے رسالہ "نگار" میں نہیں لکھے۔ کوئی مرنے والا اُن کے نزدیک قابل ذکر نہ تھا۔

جو کچھ بھی ہو، وہ اپنے اسلوب، فکر و نظر اور علم و فضل کے اعتبار سے شخصیت رکھتے تھے۔ اُردو زبان و ادب پر اُن کی فکر و نظر کا پرتو ہمارا اُن کے ساتھ لکھنے والے ارباب علم کا ایک بڑا حلقہ تھا۔ بقول کرشن چاندر پوری۔

"وہ حیات انسانی کی ایک عملی تاریخ اور اُس کے تجربات کا مکمل اظہار تھے۔"

اگر مولانا نیاز خود اتنے بڑے اور شخصیت دار ادیب و دانشور نہ ہوتے ہوئے صرف "نگار" کے ایڈیٹر ہی ہوتے تو بھی یاد رکھے جانے کے قابل تھے۔ کس ادبی رسالہ نے اتنی طویل عمر اور ایسا معیار پایا ہے؟؟؟

گزشتہ ۴۰ سال میں مولانا نیاز سے بیشمار مرتبہ سرسری ملاقاتیں ہوئیں۔ البتہ خط و کتابت بابا ہوئی۔ خطوں کے جواب میں اُن کی صفحہ نگاری مشہور تھی۔ اُن کا جواب کبھی کبھی ایک چیستاں بن جایا کرتا تھا۔ بعض ادبی مسائل میں اُن سے کافی نرم گرم باتیں ہوئیں۔ تقسیم ملک کے بعد اوائل ۱۹۵۰ء میں پہلی بار بھوپال آگیا۔ پھر لکھنؤ جانا نہ ہو سکا۔ مولانا بھی کبھی تشریف نہیں لے جاتے تھے۔ خط و کتابت بھی بہت کم ہو گئی۔ پاکستان جانے سے پہلے اُن کا مشاعرہ ذوق ایک بار پھر شدت کے ساتھ اُبھر آیا تھا چنانچہ "نگار" میں اُنھوں نے "طرحی مشاعرہ" شروع کیا۔ اچھے شعراء نے اپنی غزلیں بھیجیں لیکن اُن کی نگاہ انتخاب نے بہت سوں کے کئے تو ہین و تحقیر کے پہلو پیدا کر دیئے۔ اُنھوں نے شعراء کے بہترین اشعار کو نظر انداز کر دیا۔ کسی کا ایک شعر لیا، کسی کے دو اور تین شعر لئے۔ دراصل وہ خود اس حیلے سے اپنی فکر تازہ پیش کرنا چاہتے تھے اور بتانا چاہتے تھے کہ ؎

"دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور غزلیں"

چنانچہ اپنے تجویز کردہ مصرع طرح پر اُنھوں نے سو غزلہ اور چہار غزلہ پیش کئے۔ بعض لوگوں نے مجھ سے شکایت کی۔ میں نے ایک زریعہ سے مولانا تک یہ بات پہنچائی اور عرض کیا کہ اِس طرح کا مشاعرہ "نگار" اور اُن کے ادبی وقار کے منافی ہے۔ لیکن مولانا نے توجہ نہیں فرمائی۔ ادبی حلقے میں یہ تاثر تھا کہ مشاعرہ نے "قلمی طرحی مشاعرہ" کی ابتدا کر کے کئی سال تک اُسے ارتقا کی انتہائی منزل پر لا کر چھوڑ دیا تھا۔ اگست ۱۹۵۰ء میں مشاعرے اپنا جوبن پر تھے "مشاعرہ نمبر" نکالا تھا وہ اُردو ادب کی تاریخ میں یادگار رہے۔ اُس میں بیشمار مشاہیر شعراء کی طرحی غزلیں مع اُن کی تصاویر کے تھیں۔ اِس مشاعرہ میں جن غزلوں میں سے علامہ آرزو لکھنوی، علامہ سباب اکبرآبادی، مولانا ماہر القادری اور جہاں تک یاد آتا ہے ایک دو سرے مشاہیر کی غزلوں کے کچھ اشعار میں رد و بدل کر کے مولانا نیاز نے "نگار" میں اعتراضات فرمائے تھے اور مجھے اُن کے ادب و احترام کے باوجود "مشاعرہ" میں ایک نوٹ لکھنا پڑا تھا۔ مولانا سے کافی تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ والد مرحوم علامہ سباب تو خیر اُس وقت کراچی میں فارغ کا شکار ہو گئے تھے۔ اُسی زمانہ میں علامہ آرزو لکھنوی کراچی تشریف لے گئے تھے۔ میں بھی دس بارہ دن کے لئے والد صاحب کو دیکھنے کراچی گیا تھا۔ یہ جنوری ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ احباب نے خانہ دنیا باغی یا کسی دوسرے ہال میں (نام صحیح یاد نہیں) میرے استقبال کا انتظام کیا تھا۔ میرے انتہائی محترم بزرگ علامہ آرزو کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ حضرت آرزو بڑی شفقت فرماتے تھے۔ چنانچہ اُس جلسے اور عطرئے میں تشریف لے آئے۔ میں نے موصوف کو اپنے ہی صوفے پر نہایت ادب و احترام سے بٹھایا۔ بیٹھنے کے بعد اُن کا پہلا تلخ جملہ مولانا نیاز فتحپوری ہی کے متعلق تھا۔ حضرت آرزو حد درجہ برہم تھے۔ اتنے کہ میں نے اِس سے پہلے کبھی اُن کی زبان سے اتنے سخت اور عامیانہ الفاظ نہیں سنے تھے۔ اُنھیں مولانا نیاز کے اعتراضات کا رنج نہ تھا۔ رنج

تھا تو اُن تعریف و تعرّف کا جو صحیح اشعار میں مولانا نیاز نے کیا تھا۔ میں وہ گفتگو یہاں دُہرانا مناسب نہیں سمجھتا۔ مولانا نیاز اب ہم میں نہیں ہیں۔ اُن کی ہنگامہ آرائیاں اُن کے ساتھ ختم ہو گئیں۔ وہ اپنی بہت سی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود ہمیشہ گلشن ادب کے محسن و محرّک سمجھے جائیں گے۔

"شاعر" کے "شاعرِ نمبر" کے سلسلے میں جو تلخی اُبھری تھی وہ دَب گئی۔ اُن کے "نگار" کا کاروان چلتا رہا اور میرے "شاعر" کا قافلہ بھی تیز گام رہا۔ یکایک معلوم ہوا کہ مولانا پاکستان ہجرت کر گئے۔ دل بیٹھ سا گیا، کسی ادارے کے جانے کا اتنا دُکھ نہیں ہوا تھا، جتنا مولانا نیاز کے جانے کا ہوا۔ اِس لئے کہ وہ جس ادارہ کو چالیس پچاس سال سے لئے بیٹھے تھے، وہ ہندوستان میں اُردو کے لئے بڑا سہارا تھا۔ وہ خود اِس ملک میں اُردو کا ایک "بقاعدہ" تھے۔ لیکن شاید اُن کی تیز نظروں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اُن کے قد کو چھوٹا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ جیسا کہ اب عملاً طور پر اُردو حلقوں میں ہو رہا ہے۔ اُنھیں اپنی اولاد ہی کی طرح اپنے نگار کی بھی فکر تھی۔ آج وہ دَور آگیا ہے کہ ہندوستان کے اُردو ادبی رسائل سسک رہے ہیں۔ پاسنگ شاید اُردو اور شعر اُن سے قلمی تعاون تک نہیں کرتے۔ کچھ بڑے ادیب و شاعر پاکستان کے رسائل میں لکھنا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ ضرور دیکھیں کہ وہ بھی اپنے ہی پرچے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے ادبی رسائل کی طرف بھی تو نظر اُٹھا کر دیکھیں۔ اب تو یہ ہو رہا ہے کہ ہم مختلف خانوں میں بند ہو کر رہ گئے ہیں اور رہیں بنے "خوش فہمی" کر رہے ہیں۔ نہ کسی کی خدمات کا اعتراف اور نہ اُردو کے اجتماعی مفاد کا احساس!!

پاکستان بننے کے ۱۷ سال بعد ۱۷ دسمبر ۱۹۶۴ء میں مجھے بھی اپنی بیمار اور ضعیف ماں۔ اور صاحبِ فراش بڑے بھائی حضرت منظر صدیقی اکبرآبادی کو دیکھنے نیز مزارِ آبا پر جانے کے لئے کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ جانا چاہتا تھا کہ اپنے اُس ایک ماہ کے مختصر سے قیام میں سب ہی سے پرانوں سے ملوں مولانا نیاز سے بھی خوشی خوشی ملنے کی تمنا تھی۔ کراچی میں ہر وقت کی مصروفیات تھیں۔ دعوتیں، پارٹیاں، نشستیں، ملاقاتیں۔ ملانے سے ملنے کی خواہش بھاری رہی اور میں وقت نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ بھی سوچتا تھا کہ نیاز کس طرح ملیں گے۔ اُس دَوران میرے برادرِ محترم حضرت صبا متھراوی نے اپنے مکتوبِ اُردو کی طرف سے ایک شاندار عصرانے اور شعری نشست کا اہتمام کر لیا جب میں وہاں پہنچا تو میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی کہ حضرت مولانا نیاز فتحپوری صدرِ اجلاس تھے۔ میں بنا بیت ادب بیٹھ گیا۔ اُنھوں نے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ عمر، وقت اور حالات نے مولانا کی مزاجی کیفیت کو بدلا دیا ہے۔ اُس نشست میں کراچی کے اور بھی متقدمین و متاخرین شعرا شریک تھے۔ مولانا نے دورانِ گفتگو میں فرمایا "میں تو بعض وجوہ کی بنا پر ہندوستان سے چلا آیا، لیکن آپ ہندوستان میں جس ہمت و استقلال سے اُردو کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اُس سے میں بہت متاثر ہوں۔ وہاں میری ضرورت ختم ہو گئی تھی۔ اب آپ جیسے مجاہدوں کی ضرورت ہے۔" مولانا کے اِس طرح کے اظہارِ خیال سے مجھے کچھ اطمینان ہوا اور یہ اندازہ بھی کہ وہ میری تقریر کے خاموشی کے ساتھ بغور مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ اُن کے دل میں کھلی تلخیاں نہ تھیں۔ تھوڑی دیر میں وہ شعری نشست شروع ہو گئی۔ مولانا نیاز ہی نے اُس کی صدارت فرمائی۔ آخر میں جب میں اپنے اشعار پیش کر چکا تو مولانا نے مرحوم نے سامعین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے اعجاز میاں کی آمد پر چند شعر کہے ہیں۔ پہلے وہ سنا دوں اِس کے بعد غزل سناؤں گا۔ وہ یادگار اشعار حوزِ دل میں درج کر رہا ہوں، میرے ہندوستان آنے کے بعد حضرت صبا متھراوی نے مجھے بھیج دیئے تھے۔ غالباً کراچی کے بعض اخبارات میں بھی اُس شعری نشست کی رپورٹ کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔ مولانا جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے۔ ماضی و حال کا ایک طویل ادبی سلسلۂ خواب میری آنکھوں میں ناچ رہا تھا۔ میں اپنی سخت دلی کے باوجود کسی کسی موقع پر بزرگ شیخ پگھل جایا کرتا ہوں۔ مولانا نے جب آخری شعر پڑھا تو میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ بزرگوں کی آنکھیں دیکھنے کو کہاں ملتی ہیں۔ یہ بزرگ آنکھیں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مُند گئیں۔ ہاں تو وہ اشعار تھے ؎

بہت خوشی ہوئی پیشِ کے آئے ہیں اعجاز — خدا کا شکر ہے پھر میں نے اُن کو دیکھ لیا
مرے عزیز مرے ایک دوست کے فرزند — ادیب و نامور و شاعرِ رسا عرفاً
خدا کرے وہ جہاں خوب اور شاد رہیں — یہی ہے میری تمنا، یہی ہے میری دعا
سُنا ہے یہ بھی کہ وہ جلد جانے والے ہیں — یہ بات ہے بہت افسوسناک و رنج افزا
مگر یہ جائے وداعِ غزل نہیں ہے صبا — اِسی کے ساتھ مجھے یہ بھی اُن سے ہے کہنا

وداعِ وصل بُرا مگر نہ لگئے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا (نیاز فتحپوری)

سامعین نے بھی دل کھول کر مولانا کو اُن کے قطعے کی داد دی۔ نشست ختم ہوئی۔ مولانا نے عصرانے میں شرکت فرمائی۔ میرے سے وہی سنجیدگی اور وقار آشکار۔ گفتگو میں وہی علمی انداز۔ صحت بھی اچھی خاصی تھی۔ کیسے معلوم تھا کہ داغِ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی، یہ شمع باقی، اتنی جلد خاموش ہو جائے گی — رہے نام اللہ کا!!

علیم اختر مظفر نگری

غزل

جفا و جور و ستم آزمائے ہیں کیا کیا
یہ آئینے ترے غم نے دکھائے ہیں کیا کیا

یہ کس کی یاد نے چھیڑا ہے دل کے تاروں کو
ربابِ شوق پہ نغمے سنائے ہیں کیا کیا

کبھی جو روٹھ گئی ہے نگاہِ شوق ان سے
پیام ان کے مرے نام آئے ہیں کیا کیا

جبینِ ناز کو کچھ بل بھی عرضِ غم نے دیئے
وہ دل ہی دل میں مگر مسکرائے ہیں کیا کیا

وہ ایک شمع فروزانِ شوق بجھ نہ سکی
وفا کی راہ میں طوفان آئے ہیں کیا کیا

جنونِ شوق نے منزل کو جا لیا تنہا
خرد نے رہزن و رہبر بنائے ہیں کیا کیا

سنک اٹھی ہے تمنا کی مست مست پون
ترے خیال نے آنچل اڑائے ہیں کیا کیا

مری نگاہ پہ الزامِ دید ہے، لیکن
جمالِ نار پہ بھی حرف آئے ہیں کیا کیا

مرا خلوصِ محبت تو تھک کے بیٹھ گیا
ترے فریب جادو جگائے ہیں کیا کیا

وہ اک نظر کہ جسے التفاتِ ناز کہیں
اس اک نظر نے فسانے بنائے ہیں کیا کیا

ادائے ناز سے اکثر گلا بیاں بھر کر
نگاہِ مست سے ساغر پلائے ہیں کیا کیا

خود اپنے عکس پہ ان کا گمان گزرا ہے
فریبِ چشمِ تماشا نے کھائے ہیں کیا کیا

حضورِ حسن میں اک نذرِ شوق دینے کو
مری نگاہ نے موتی لٹائے ہیں کیا کیا

بہارِ لالہ و گل، جانِ رنگ و بو بن کر
نظر میں حسن کے جلوے سمائے ہیں کیا کیا

چھڑا جو ذکرِ وفا ان کی بزم میں اختر
سنا ہے آپ انھیں یاد آئے ہیں کیا کیا

ڈاکٹر اسلم فرخی

سیماب اکبرآبادی کے فنی نظریات

مولانا سیماب اکبرآبادی ہمارے عہد کے جلیل القدر شاعر اور انشا پرداز تھے۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی قوتِ شعری سے نوازا تھا اور انھوں نے اپنی اس خداداد صلاحیت سے اردو شاعری کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ بھی کیا۔ مولانا سیماب اس اعتبار سے بھی اردو شاعری میں اہمیت کے حامل ہیں کہ انھوں نے فن شعر کے متعلق ایک خاص نظریے کی ترویج و اشاعت کی اور اپنی شاعری میں بھی ہمیشہ اسے ملحوظِ خاطر رکھا۔ فن شعر و شاعری کے متعلق مولانا کے خیالات بڑے واضح اور حقیقت پسندانہ ہیں۔ انھوں نے جا بجا بڑے دلنشیں انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور مولانا کی شاعری اور فن کو سمجھنے کے لئے ان کا تفصیلی مطالعہ ناگزیر ہے۔

مولانا سیماب کی شاعری کا آغاز روایتی ماحول اور رسمی غزل سرائی سے ہوا۔ یہ داغ و امیر کا عہد تھا اور پورے ملک کی فضا میں انھیں کے نغمے گونج رہے تھے۔ مولانا سیماب نے بھی داغ کا تلمذ اختیار کیا۔ اس عہد کا کوئی شاعر داغ و امیر کے اثرات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا۔ مولانا سیماب کے ابتدائی کلام میں داغ کا اثر بھی نمایاں ہے۔ اور طرزِ لکھنؤ کے اتباع میں "ہلکا سا اک کفن ہو شہیدِ بہار کا" اور "مجھے پسند نہ کیوں آئے صحنِ صافِ قفس"، جیسی غزلیں بھی مولانا کے مجموعۂ کلام میں ملتی ہیں۔ تقابلی مطالعے کے سلسلے میں مولانا کا یہ مطلع ؎

جو پھول گر پڑا ہے کہیں ان کے ہار کا　　غازہ بنا ہے چہرۂ صبحِ بہار کا

آمیر مینائی کے اس شعر۔

پھولوں سے فرشِ خاک پہ تارے بکھر گئے　　دھاکا کہیں جو ٹوٹ گیا ان کے ہار کا

کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ ہر بڑے شاعر کی طرح داغ بھی اپنے رنگ کے موجد اور خاتم تھے۔ مولانا سیماب نے داغ سے اثر یقیناً قبول کیا، لیکن ان کی تقلید کو اپنا شعار نہیں بنایا اور نہ وہ زیادہ مدت تک قدیم رنگِ تغزل سے وابستہ رہ سکے۔ غور و فکر، مشاہدے، مطالعے اور تجربے نے مولانا سیماب کو ایک جدید رنگِ تغزل کی طرف مائل کیا۔ جس کی تفسیر انھوں نے یوں بیان کی ہے۔

"صحیح تغزل کی روح واردات و جذبات ہیں۔ جو کیفیت حقیقتاً ہم پر طاری ہو اور جو واقعات ہمارے مشاہدے اور مطالعے میں آئیں وہی ہماری غزل کا اصلی موضوع ہیں۔ یہ لازمی نہیں کہ اگر ایک شاعر کسی کے فراق میں مضطرب الحال نہیں ہے تو وہ فراقیہ اشعار ضرور ہی لکھے اور ایک دولت مند فارغ الافکار شاعر بھی ایک گدائے کاسہ لیس کی طرح فقر و فاقہ کے مضامین لکھ کر لوگوں کو اپنی تضحیک کا موقع دے۔ اس قسم کی شاعری یا غزل گوئی نقالی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ تاثیر صرف اس شعر میں پیدا ہو سکتی ہے جو شاعر کے دلی جذبات کا آئینہ اور اس کی کیفیاتِ حقیقی کا ترجمان ہو۔ جب تک کہنے والا اپنے کلام کا اثر خود اپنے دل و

دماغ پر محسوس نہ کرے، اُس وقت تک وہ دوسروں کی سماعت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ہمیں محسوس شاعری کی ضرورت ہے۔ مفروضہ خیالات کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ طرز پُراثر، پیرایہ متین، اسلوب نیا، طریقہ اچھوتا، زبان نہ ملّا یانہ، نہ بازاری، روزمرّہ درست، محاورات برمحل، ترکیب چست، الفاظ بے ساختہ اور مجلے شستہ ہوں۔ کہ نہ حرف رہے نہ زبان اُلجھے۔ نیز تقلیدی مضامین اور عام موضوعات سے احتراز ہونا چاہیے۔"

مولانا کا یہ سارا بیان بہت اہم ہے۔ حالی نے طفلی کے حوالے سے اصلیت، سادگی اور جوش کو لوازم شعر قرار دیا تھا۔ لیکن جس عنصر کو حالی نے جوش سے تعبیر کیا تھا اُسے دراصل احساس سمجھنا چاہیئے، اصلیت، سادگی اور جوش یقیناً شعر کے لئے نہایت اہم ہیں۔ اِن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ مولانا سیماب نے بھی حالی کے انھیں خیالات سے چراغ شوق روشن کیا ہے۔ مگر انھوں نے اِس پر اضافہ بھی کیا ہے۔ حالی نے معنویت کو مدِنظر رکھا ہے لیکن شعر کے ظاہری خط و خال کے متعلق اُنھوں نے کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا۔ مولانا سیماب نے شعر کی معنوی اور صوری دونوں کیفیتوں کو مدّنظر رکھا ہے اور اسی وجہ سے اُنھوں نے شعر کی زبان پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ گویا اُن کے یہاں حُسنِ معنویت کے ساتھ ساتھ حُسنِ ظاہر بھی واضح ہے۔ زبان کو بلاشُبہ شاعری میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کوئی اچھا شاعر زبان کی طرف سے اغماز نہیں برت سکتا اور نہ اُس کی اہمیت سے منکر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا سیماب نے زبان، اسلوب، طرزِ ادا، سب کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اگر اُن کے یہاں زبان و بیان کی اِس اہمیت کے متعلق ایک واضح تصوّر موجود نہ ہوتا تو پھر مولانا کے خیالات کو حالی کی صدائے بازگشت سے زیادہ حیثیت نہ دی جاتی۔ لیکن اُنھوں نے نہ صرف حالی کے خیالات کو اپنایا ہے بلکہ اُن پر اضافہ بھی کیا ہے۔ مولانا کا یہ جُملہ کہ "ہمیں محسوس شاعری کی ضرورت ہے۔" رسمی اور تقلیدی انداز کے خلاف راست اقدام کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاویلیں تو ہر دور میں ہوتی آئی ہیں۔ ویسے بھی تاویلوں میں ہمیں خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اُردو شاعری کا بڑا سرمایہ رسمی اور تقلیدی شاعری پر مبنی ہے اِسے ہماری کوتاہی کہئے یا محرومی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اپنی کوتاہی اور محرومی کا اعتراف ضروری نہیں سمجھتے۔ مولانا نے ہر جگہ رسمی اور تقلیدی انداز کو اُردو شاعری کے لئے سمِ قاتل قرار دیا ہے۔ اُنھوں نے جہاں کہیں بھی اُردو شاعری کے متعلق اظہارِ خیال فرمایا ہے، وہاں اُس انداز سے پیدا ہونے والے مضر اثرات کی نشان دہی بھی کی ہے اور ایک جگہ تو اُنھوں نے بڑے صاف الفاظ میں کہا ہے۔

"عام اُردو شاعری کے موجودہ انحطاط کا ایک بڑا سبب کورانہ تقلید بھی ہے۔ شعراء کی اجتہادی قوت مرورِ ایام سے سلب ہو چکی ہے اور وہ ایک دائرۂ محدود سے نکلنا اور ترک و اختیار کی مقررہ قیود سے باہر آنا کفرِ شاعری سمجھتے ہیں۔"

اِسی ضمن میں مولانا آگے چل کر کہتے ہیں۔

"جب اُردو شاعری کا یہ حال ہو تو خاموش بیٹھنا گناہِ عظیم ہے۔ اِس خرمنِ فرسودہ میں آگ لگا دینے کی ضرورت ہے۔ اِس انبارِ قدامت آلود سے بزمِ سخن کو پاک کر دینا مناسب ہے۔ بقولِ اقبال "جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو۔"

اُردو شاعری کے تقلیدی انداز کے خلاف سب سے پہلے محمد حسین آزاد نے آواز بلند کی تھی۔ حالی نے اِس سلسلے میں انتہائی قابلِ قدر کام انجام دیا۔ مولانا سیماب بھی اِس سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ مولانا کی شاعری کے متعلق تو بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اُن کے فنی نظریات اور نقد و تنقید کا جائزہ لینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ فن کے بارے میں فن کار کے خیالات ہمیشہ نہایت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ [illegible] کے فن ہی کو سمجھنے میں مدد نہیں دیتے بلکہ

ان کی وجہ سے فن کا عمومی اور خصوصی جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ نئے اصول بھی منضبط کیے جا سکتے ہیں اور نئے افکار و شوابط بھی سامنے آ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

ایک اور جگہ مولانا سیماب نے تغزل کے متعلق اپنا نقطۂ نظر اس طرح بیان کیا ہے۔

"تغزل اُس رنگ اور اسلوبِ بیان کو کہتے ہیں جو غزل میں استعمال کیا جاتا ہے۔ تغزل کا تعلق انسان کی لطیف ترین رُوحانیت اور نفسانیت سے ہے۔ عشق و عشق، یاس و اُمید، وصل و فراق، انتظار و کامیابی اور اسی قسم کی مختلف حالتوں کو گہرے تاثر کے ساتھ مصوّر کرنے کا نام تغزل ہے۔ غزل کی تعریف میں بامعشوق سخن گفتن اور تغزل کی تعریف میں معاملہ بندی کہہ کر خاموش ہو جانا غزل اور تغزل دونوں کی توہین ہے۔ تغزل کو قطعی طور پر نفسانیت سے پاک اور رُوحانیت سے لبریز ہونا چاہیے۔ تغزل کے مختلف اسکول ہیں۔ لیکن حقیقی تغزل وہی ہے جس کی بنیاد دین جذباتِ لطیفہ پر قائم کی گئی ہوں اور جس میں ابتذال و رکاکت کا شائبہ تک نہ ہو۔"

اس بیان سے مولانا کا نقطۂ نظر بڑی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ تغزل کو نفسانیت سے پاک ہونا چاہیے یا نہیں یہ اپنی جگہ پر ایک علیحدہ بحث ہے اور شاید اسے دُرست مان لینے کی صورت میں ہمیں اپنی شاعری کے ایک بڑے حصّے سے محروم ہو جانا پڑے، لیکن مولانا کے خلوص میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ تغزل کو صرف معاملہ بندی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مولانا کا یہ خیال دُرست ہے کہ مختلف حالتوں کو گہرے تاثر کے ساتھ مصوّر کرنے کا نام تغزل ہے۔ یہ تعریف بڑی حد تک جامع اور مانع کہی جا سکتی ہے۔ حالتوں کی وضاحت میں اختلاف ممکن ہے۔ ان میں نفسانیت اور رُوحانیت دونوں کا امتزاج بھی ہو سکتا ہے اور دونوں علیحدہ علیحدہ بھی ہو سکتی ہیں۔ شرط گہرے تاثر کی ہے۔ خود مولانا نے اپنی غزل میں اپنے بیان کردہ تغزل کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ ابتدائی دور کے کلام سے قطع نظر اُن کی غزل اُن کے معیارِ تغزل پر پُوری اُترتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مولانا سیماب کی غزل کا مجموعی تاثر رُوحانیت اور نفسانیت کا لطیف امتزاج ہے، جس میں نفسانیت کا شائبہ بھی نہیں۔ مولانا کی غزل لطیف جذبات سے فروغ پاتی ہے۔ اس میں سوز، درد اور حرارت تو ہے، ابتذال اور پستی نہیں۔ بلکہ اُن کے پُورے کلام میں مُبتذل اور پست شعر شاید ہی کہیں ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا سیماب نے جو کچھ کہا ہے اُس پر خود عمل بھی کیا ہے اور یہ کہ وہ نظریۂ شعر پر حقیقی معنوں میں ایمان رکھتے تھے۔ اسی سلسلے میں مولانا آگے چل کر کہتے ہیں۔

"میں غزل میں پاکیزہ تغزل کا مخالف نہیں، لیکن شاعری کو تغزل کی محض تنگ محدود رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ اُردو شاعری میں غزل اس وقت ایک مدقوق مریضہ کی حیثیت رکھتی ہے اور خطرہ ہے کہ اسے اگر صحیح صورت میں زندہ رکھنے کی کوشش نہ کی گئی تو وہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی۔"

مولانا کا یہ بیان ۱۹۳۰ء کا ہے۔ میں نے سن کی وضاحت یوں ضروری سمجھی کہ اُس وقت تک علامہ اقبال کی غزلیات کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ غزل کو مدقوق مریضہ کہنا مولانا کی قوتِ اظہار کا جرأت مندانہ ثبوت قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن مولانا جیسے کٹر غزل گو اور غزل کی فضا میں پرورش پانے والے شاعر کی یہ حقیقت پسندی قابلِ داد ہے کہ اُنھوں نے حقیقت کے اظہار میں اپنی محبوب صنفِ سخن کا پاس نہیں کیا۔ غزل ہماری تہذیب کا حصّہ اور ہماری شاعری کی آبرو ہے، لیکن حُسن اور آبرو برقرار رکھنے کے لئے خونِ جگر کی ضرورت پڑتی ہے "نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر" اور "معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود" مولانا کا غزل کو مدقوق مریضہ قرار دینا اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ غزل کو نئے خونِ جگر اور دلِ گداختہ کی ضرورت تھی۔ اُسی کی جانب مولانا نے اشارہ کیا ہے اور تا بمقدور اُنھوں نے اپنے خون سے اُس کی آبیاری بھی کی۔ غزل آج بھی زندہ ہے۔ مدقوق مریضہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ

صحت مند اور توانا صنفِ سخن کی حیثیت سے کہ اُسے مولانا جیسے بزرگوں کے خونِ جگر نے نئی زندگی بخش دی ہے۔ حیاتِ تازہ کی افکارِ تازہ سے نمود اور یہ افکارِ تازہ وہی غزل کی نئی زندگی کے ضامن ہیں۔

فنِ شعر کے متعلق مولانا کا نظریہ ہمیشہ حقیقت پسندانہ رہا ۔۔ غزل اور تغزل ہو یا رسمی اور تقلیدی انداز، ان سب کے بارے میں انھوں نے ہمیشہ سوچے سمجھے اور مستحکم شعر کہے۔ مولانا نئی دستوں کے جویا اور غیر ضروری فنی قیود سے بیزار تھے۔ فنی قیود سے بیزاری کو عام طور پر بے راہ روی اور کم علمی کا نام دیا جاتا ہے۔ ستم ظریفی سہی لیکن صورتِ حال اکثر یہی رہی ہے۔ مولانا غیر معمولی قوتِ شعری کے حامل ہونے کے باوجود غیر ضروری پابندیوں کو جذبات و واردات کے بیان کے لئے رکاوٹ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ "ایطا" پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔

"عربی شعراء ایطا سے بچتے تھے۔ فارسی شعراء بچتے رہے اور اُردو شعرائے متقدمین و متاخرین بھی اسی احتیاط کے اسیر نظر آتے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ ایطا سے مطلع کی کیفیات اور معنویت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ردیف کے بعد قافیہ بامعنی باقی رہے یا بے معنی۔ آخر اس قید سے اور شاعری سے کیا تعلق؟ مگر نہیں۔ اگر آپ ایسا کوئی مطلع کسی ماہرِ فن شاعر کے سامنے پڑھیں گے تو وہ آپ کی قابلیت سے مرعوب نہ ہو جائے گا اور شعر پر نہیں تو دل میں ضرور سمجھے گا کہ قدرِ قادر الکلامی معلوم شد۔ شاعری کا تعلق حقیقت میں روحانیت سے ہے اس لئے اُسے زیادہ سے زیادہ وجدانی ہونا چاہیئے۔ اگر وجدانی نہ ہو تو کم سے کم ایسی غیر ضروری قیود اور پابندیوں سے تو اُسے مرور آزاد ہو جانا چاہیئے۔ جو اُس کے پیکرِ لطیف پر آہنی زنجیروں سے زیادہ گراں معلوم ہوتی ہیں۔"

یہاں کسی فنی بحث کا موقع نہیں اور نہ یہ بحث ضروری ہے صرف یہ کہنا مناسب ہے کہ مولانا نے جس خیال کا اظہار کیا ہے اُس سے اُن کی سلامت روی اور سلیم الطبعی کا احساس ہوتا ہے۔ اِس مثال سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ مولانا سرے سے فنی قیود کے قائل ہی نہ تھے۔ اُنھوں نے ساری زندگی فنی قیود کی پوری پوری پابندی کی لیکن ذاتی طور پر وہ نفسِ مضمون کو پیکر پر قربان کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اُن کا مسلک "من نداہم فاعلاتن فاعلات" نہ تھا بلکہ انھوں نے ماہرِ فن کی حیثیت سے فنی قیود پر نظر ڈالی تھی اور بڑے غور و فکر کے بعد نتیجے پر پہنچے تھے، اسی سلسلے میں وہ آگے چل کر کہتے ہیں۔

"اگر سوسائٹی کا دباؤ تیور بدل کر آنکھیں نہ دکھاتا اور اُردو شعراء کے مذہب کی اساس روشن خیالی پر ہوتی تو میں آج سب سے پہلے یہ اعلان کرتا کہ ایطا کا ترک اختیار کیا جائے اور اس غیر ضروری قید و بند کو شاعری سے اُٹھا دیا جائے۔ مگر مجھے اپنے ایک دوست کا یہ قول ہمیشہ یاد رہے گا کہ انسان کا ضمیر اُس کے ماحول میں رہتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا ماحول ابھی تاریک ہے اور قدامت اپنی تمام سخت گیریوں کے ساتھ ہنوز کارفرما ہے۔"

مولانا کا یہ خیال بالکل صحیح تھا۔ آج بھی ماحول میں تاریکی کا کچھ نہ کچھ اثر باقی ہے اور شاید اسی وجہ سے ابھی تک اُن کی رائے پر پورا پورا عمل نہ ہو سکا۔

زبان کے متعلق بھی مولانا کا نظریہ ہمیشہ حقیقت پسندانہ رہا۔ اُنھوں نے زبان کو ہمیشہ اظہارِ خیالات کا ایک ذریعہ سمجھا اور اُسے اپنی شاعری کی بنیاد نہ بنایا۔ زبان کے بارے میں اُن کے خیالات ضمنی طور پر پہلے بھی بیان ہو چکے ہیں۔ ایک اور جگہ زبان کے متعلق اُنھوں نے لکھا ہے۔

"ٹکسالی زبان کے حامیوں کا ایک گروہ ہے جو چاہتا تو یہ ہے کہ زبان کی وسعت پر حرف نہ آئے مگر فی الحقیقت اُس کی ترقی کی راہیں بند کرنے کا خواہش مند ہے۔ نئے الفاظ، نئے معنی، نئے اسالیبِ بیان

سے حد سے زیادہ ڈرنا ایک زندہ زبان کے لئے اس سے کچھ کم ہی مہلک ہے جتنا کہ ان خطرات کی قطعی روک تھام نہ کرنا۔"

میرا خیال ہے کہ مولانا کی اس تلخ نوائی پر اہلِ زبان حضرات نے ضرور لے دے کی ہوگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا کا مشورہ بہت صائب ہے۔ دُنیا کی کوئی زبان خالص نہیں اور نہ کوئی زندہ زبان خالص رہ سکتی ہے۔ نئے الفاظ، نئے معانی اور نئے اسالیب بیان کے بغیر کوئی زبان زندہ نہیں رہ سکتی۔ نئے الفاظ کو لبیک نہ کہنا زبان کی ترقی کو روکنا ہے۔ دُنیا کے ہر بڑے شاعر اور ادیب نے اپنی زبان کو اظہارِ خیال کا ایک نیا سانچہ اور نئے اسالیب عطا کئے ہیں۔ نئے الفاظ کو اپنایا ہے اور پرانے الفاظ کو نئے معنے پہنائے ہیں۔ یہ ایک فطری معاشرتی عمل ہے۔ اسی وجہ سے مولانا نے اس کے بارے میں بڑی واضح اور اچھی تنکی رائے دی ہے۔

مولانا سیماب کا تنقیدی نقطۂ نظر مابعد الطبیعات اور افادیت دونوں سے ہم آہنگ ہے۔ کیونکہ وہ شعر میں روحانیت اور نفسانیت دونوں کا امتزاج پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ روحانی امتزاز اور اثر پذیری دونوں پر انھوں نے اپنے شعری نظریات کی بنیاد رکھی ہے اور اپنی شاعری میں بھی انھیں ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ حالی کے متعلق انھوں نے ایک جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ

"مولانا حالی عمر بھر شعر کہتے رہے، ایک با خبر استاد کے شاگرد تھے، کلام میں پختگی تھی مگر ایک متغزل کی حیثیت سے انھیں کبھی ہو بتولیتِ عام میسر نہ ہوئی۔ آج حالی مرحوم صرف اپنے مقدمۂ شعر و شاعری اور ایک مسدس کی وجہ سے شعرائے ہند میں متعارف و مقبول ہیں۔ اس کے علاوہ کیا اُن کے تمام سرمایۂ فکر کی ایک کڑی ایسی بھی ہے جو لوگوں کی زبان پر یا دماغ میں محفوظ کہی جا سکتی ہو۔"

یہ رائے حالی جیسے غزل گو کے بارے میں درست نہیں جس شاعر نے

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں ۔۔۔ اب جھانکتے ہیں سایۂ زلفِ بتاں سے ہم

اور

اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت

جیسی غزلیں کہی ہوں اُس کے تغزل کے بارے میں اختلافِ رائے ممکن نہیں، بلکہ ایک نقاد نے حالی کے ترکِ تغزل کو ادبی ارتداد سے تعبیر کیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اُردو غزل میں حالی کا رنگ و آہنگ انھیں ایک متغزل کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اس قسم کے خیالات مولانا کے یہاں خال ہی خال نظر آتے ہیں۔

مولانا سیماب نے صرف تنقید کے نظریاتی پہلو ہی کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ عملی تنقید کے بھی اچھے نمونے پیش کئے ہیں، معاصر شعراء کے متعلق کچھ لکھنا جان بوجھ کر خطرے کو دعوت دینا ہے۔ مولانا اس خارزار سے بھی گزرے اور اُن کا دامن بھی سلامت رہا۔ انھوں نے اپنے معاصرین کے کمالات کا اعتراف ہمیشہ کھلے دل سے کیا۔ یہ اُن کے سچے فن کار ہونے کا بدیہی ثبوت ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مولانا کی نظری اور عملی تنقید کو جو جا بجا بکھری ہوئی ہے یکجا کیا جائے اور اُن کے معتقداتِ شعری اور تنقیدی نقطۂ نظر پر سیر حاصل بحث کی جائے۔ یہ اُردو ادب کی خدمت بھی ہوگی اور مولانا کی ادب پروری کا صحیح اعتراف بھی اسی کے ذریعے ممکن ہے۔

اعجاز صدیقی

غزل

خوشبو کے رسول بن گئے ہیں
وہ زخم، جو پھول بن گئے ہیں

کیا کیجے، بے اصولیوں کے!
پہلے سے اصول بن گئے ہیں!

آیا اُن تک سلام منزل
جو راہ کی دھول بن گئے ہیں

چاہا جب بھی دلوں نے ہنسنا
کچھ اور ملول[1] بن گئے ہیں

اُن کو طوفان میں ڈبو دو
جو مدِّ فضول بن گئے ہیں

بیٹھی نہ بٹھائے سے جو اب تک!
ایسی ہم چول[2] بن گئے ہیں!

یہ سادہ دلانِ عصرِ حاضر
سوکھا ہوا پھول بن گئے ہیں

آیاتِ وفا کی جب چھڑی بات
ہم شانِ نزول بن گئے ہیں

شیخانِ حرم ہوں، یا برہمن
سب اوّل جلول بن گئے ہیں

لاؤ ایمان ہم پہ لو گو،
ہم غم کے رسول بن گئے ہیں

ارماں پینے کے ہوں، کہ ہوں جینے کے
اک شوقِ فضول بن گئے ہیں

ایسے بھی ہیں کچھ حسین وعدے
جو یاد کی بھول بن گئے ہیں

بہکو نہ بہت، بہکنے والو!
مستی کے اصول بن گئے ہیں

سوکھے ساکھے، تپاں، نکیلے
اِنسان، ببول بن گئے ہیں!

رکھ دی جن پر زبان ہم نے
کانٹے وہی، پھول بن گئے ہیں

اعجاز کے نا قبول تیور
معراجِ قبول بن گئے ہیں

---

[1] "ملول ہونا" کے مقابلے میں "ملول بننا"، شاید خلافِ محاورہ معلوم ہو۔ اعجاز

[2] معمولی سی معمولی اور کھردری سے کھردری چیز شاعری کا کنایہ بن سکتی ہے اور اس سے بڑے سے بڑے مقصد کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ اعجاز

افسانہ

شکیب

ایک شام

جب مخدوم اور روی شہر جانے کیلئے اپنے ہوسٹل سے باہر نکلے تو یونیورسٹی کیمپس کے ماحول پر ایک پُرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اطراف کے ہوسٹلوں سے بھی کوئی باہر نکلتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ اکثر لڑکے اتوار گزارنے کیلئے ہفتہ کے آدھے دن ہی سے شہر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے یہاں نکل جایا کرتے تھے۔ اس وقت یونیورسٹی کی پے گراؤنڈ پر بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ورنہ ہر روز کسی نہ کسی ٹیم کے دو چار کھلاڑی اپنے اپنے کھیل کی مشق میں مصروف دکھائی دیتے۔ بعض بیچرلر لڑکے اپنے ہوسٹلوں سے نکل کر کیمپس سے دور کھیتوں میں تفریح کے لئے نکل جاتے۔

یونیورسٹی کیمپس کا ماحول یونیورسٹی کی کلاسوں سے زیادہ دلچسپ و خوشگوار ہوتا ہے۔ یونیورسٹیوں کے طالب علم اپنی کورس کی کتابوں سے کہیں زیادہ کیمپس کے ماحول اور لائبریری سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ مخدوم کا تو پہلے یہ خیال تھا کہ شریف زادہ ہونے رکھنے والے لوگوں اور عادی مجرموں کو جیلوں میں بند رکھنے کے بجائے اگر کیمپس کے ماحول میں رکھا جائے تو ایسے لوگ بہت جلد اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ کیوں کہ پچھلے چار پانچ برس کے تجربہ سے یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ بہت سے شریر اور چور طالب علم بہایت سنجیدہ اور پُروقار غور و فکر کے عادی ہو چکے تھے۔ مگر پچھلے ایک دو برسوں میں اچانک کچھ ایسے طالب علموں کی بھرمار سی ہو گئی تھی کہ یونیورسٹی کا ماحول اچھا خاصا شور و فساد کا گڑھ بن گیا تھا۔ ان طالب علموں کو خاموشی سے زیادہ ہنگامہ پڑھائی سے زیادہ لباس، لائبریری سے زیادہ سینما اور میل ملاپ سے کہیں زیادہ علیحدگی پسندی عزیز تھی۔ اکثر لڑکے علمی مباحث سے زیادہ فلمی گیتوں میں الجھے رہتے.....

مخدوم نے اب اپنی پہلی رائے بدل دی تھی، اور وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ یونیورسٹیوں کو اب یکلخت جیل خانوں میں تبدیل کر دینا چاہئے۔

جب وہ کینٹین سے ہو کر گذرنے والے راستے پر پہونچے تو انھیں کینٹین سے دو بیروں کے لڑنے کی آواز سنائی دی وہ دونوں بیرے ایک دوسرے کو باری باری گالیوں سے نواز رہے تھے۔ جب سے کینٹین کا مالک بدل گیا تھا۔ اکثر بیروں میں لڑائی معمولی ہوتا رہتا تھا۔ ان دنوں کھانا بھی کچھ ٹھیک نہیں بن رہا تھا۔ چائے تو بالکل ہی خراب ہو گئی تھی۔ سستے قسم کے سگریٹ بھی عام سپلائی سے مہینے مل رہے تھے۔ سابقہ مالک کو ہٹا لینے میں کچھ شریر لڑکوں کا ہاتھ تھا۔ جب کچھ لڑکوں کی اداکاری زیادہ ہو گئی اور اس نے تماشہ شروع کیا تو چپکے سے ان لڑکوں نے پچاس ساٹھ اور لڑکوں کے دستخط لے کر جھوٹ موٹ کی ایک شکایتی رپورٹ سپرنٹنڈنٹ کو جمع دی تھی۔ اس پر مختلف الزامات لگائے گئے تھے کہ کینٹین کا مالک چوری کے کینٹین میں خراب بچتا ہے اور رات میں یہاں بازاری عورتیں بھی لائی جاتی ہیں۔ اگر مالک کو نہیں بدلا گیا تو ساری یونیورسٹی میں ہڑتال کر دی جائے گی۔ یہ شکایتی درخواست ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی توسط سے دی گئی تھی۔ حالانکہ اس درخواست میں لگائے گئے سنگین الزامات سے وہ بھی متفق نہ تھا۔ مگر سکریٹ کے لئے بھی وہ معقول رائے سے کم نہ تھا کیونکہ کینٹین کے مالک نے مہنگائی کی وجہ سے اس کی کمیشن میں کمی کر دی تھی۔

نیا مالک نہایت خوش اخلاق اور ملنسار آدمی تھا اس کی خوش اخلاقی عام طور پر مالدار اور فضول خرچ طالب علموں کے لئے ہوتی تھی۔ کچھ دنوں سے تورات دیر گئے تک کیمپس میں موٹروں کی سرسراہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ اور کینٹین کے پھیلے کمروں میں رات بھر روشنی جلتی رہتی۔ کبھی کبھار گفتگو قہقہوں سے کیمپس کی پرسکون فضا کو پراسرار اور ہیجان انگیز ہو جاتی تھی۔ اکثر کھانے کے ٹیبل پر رکھے ہوئے گلاسوں میں الکحل کی بو آتی۔ جب کچھ لڑکے دوسرا گلاس منگوا کر پانی پیتے تو ایسے موقعوں پر مقامی متمول گھرانے کے لڑکے جن سے نجات پانے کیلئے ان کے والدین نے انھیں ہوسٹلوں میں چھوڑ رکھا تھا۔ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیتے۔ یونیورسٹی کے یہ اندرونی حالات ناقابل اصلاح حد تک خراب ہو گئے تھے۔

دن بھر کا تھکا ماندا سورج مغرب کی پیشانی پر چمک رہا تھا۔ اس کی تمازت میں اب وہ شدت باقی نہیں رہی تھی جو پیہم کو بھی پریزہ پریزہ کر دیتی ہے۔ بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی الہڑ معصوم دوشیزہ اس بے جان کائنات کو اپنی باہوں میں لئے اپنے نرم و گداز جسم کی حرارت بخش رہی ہو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے فضا کو نم کر رہے تھے۔ دور افق پر چہل کرنوں نے دن بھر کا پھولوں سے سجا یا ہوا گلابی رنگ و دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ بوٹانیکل گارڈن کے پیڑ برگ و گل و نکہت کچھ اس طرح کھڑے تھے کہ معلوم ہوتا تھا وہ اپنے ہاتھ پھیلائے مالک ارض و سما سے اپنا اترا ہوا لباس مانگ رہے ہوں۔ دن بھر کے تھکے ماندے پرندے بھی اپنے گھونسلے پروں کو پھیلائے، درختوں کی طرف رین بسیرے کے لئے لوٹ رہے تھے۔

بوٹانیکل گارڈن سے گزرنے کے بعد شہر جانے والے قریب ترین کچے راستے پر جب مڑنے لگے تو مخدوم اور روی نے بے اختیار یونیورسٹی کے عمارتوں پر نظر ڈالی۔ لڑکے غیر شعوری طور پر اس مقام سے گزرتے وقت پلٹ کر یونیورسٹی پر ایک نظر ضرور ڈال لیتے تھے۔ دراصل یہاں سے یونیورسٹی کی عمارتیں، اس کا نشیب و فراز، خاموش درختوں سے ہو کر گذرنے والا پرسکون راستہ اور یونیورسٹی کے لان میں پھیلی ہوئی ہریالی بڑی ہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت فضاء میں پھیلا ہوا سرخ رنگ یونیورسٹی کی عمارتوں میں جذب ہو گیا تھا۔

یہاں سے شہر تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں سے پھر انھیں بیچ شہر میں جانے کے لئے بس پکڑنی تھی۔ اب تک تو وہ خاموش چلے آ رہے تھے لیکن جوں ہی وہ ڈھلان کی طرف چلنے لگے۔ روی نے اس طویل خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ "کچھ تو کہو یار راستہ بور ہو رہا ہے۔" مخدوم گنگنانے لگا۔ مخدوم کا گنگنانا روی کی توقع کے خلاف تھا۔ کہنے لگا۔ "نام کے وقت گنگنانا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ایسے وقت میں تو دھیمے لہجہ میں کسی موضوع پر گفتگو ہونی چاہیئے۔ اور"..... مخدوم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "اور پھر موضوع گفتگو کسی معاشقے یا سیاست سے بہت کر ہونا چاہیئے۔"!

مگر روی کی کمزوری تو یہی تھی کہ وہ معاشقے اور سیاست سے ہٹ کر کوئی بات ہی نہ کر سکتا تھا۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں تو یہی کہنے والا تھا کہ آج منور ما بہت اور سیدھے سادے لباس میں کتنی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔" مخدوم سگریٹ جلاتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "اسی وجہ سے وہ ایک امیر باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود سیدھے سادے کپڑے پہنتی ہے حالانکہ چیف جسٹس کی لڑکی معینہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور حسین ہے۔" سادگی آج کی ضرورت نہیں بلکہ سب سے بڑا فیشن ہے۔ منور ما تو صرف اس لئے سادے کپڑے پہنتی ہے کہ وہ ان ہی کپڑوں میں قابل کشش ہے۔ اور اسے اس کا پورا پورا احساس بھی ہے۔ ورنہ وہ پندرہ روپیوں کی ساڑھی پر تیس سو روپوں کی گھڑی کبھی نہ باندھتی۔ البتہ وہ متین ہے مغرور نہیں۔ بیباک ہے بے حیا نہیں۔ اس حد تک تو معینہ مجھے بھی پسند ہے اور تیرے لئے مخدوم نے بھی روی کی طرف شکر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور تیرے لئے شاید اس کی کوئی چیز بھی قابل کشش ہے۔"

روی کو شرمندگی کے احساس کے ساتھ کہنے لگا۔ "خدا میں کوئی برا خیال نہیں رکھتا۔" مخدوم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "خیر جو کچھ بھی ہو کسی کے متعلق اس کے غیر موجودگی میں ایسی باتیں ٹھیک نہیں معلوم ہوتیں۔ اور خاص کر لڑکیوں کے معاملے میں تو

مخدوم کی غائب دماغی اور سوال کی نوعیت کا شدید احساس ہوا۔ اس نے سگریٹ جلائی اور پھر ذہن کو یکجا کرنے لگا۔

روی :۔ آج کی اہم خبر کیا تھی۔

مخدوم :۔ عورت حقیقت پسند ہوتی ہے۔ وہ دن بھی کچھ دور نہیں جب وہ اسٹیج سے میلے پردے اوٹھا کر پھینک جائے گی۔

روی۔ مخدوم کے اس جواب سے متفق تھا۔ مگر عورت کے تعلق سے اس کی اپنی رائے کچھ اور تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ عورت کا حسن اس کی ظاہر داری میں ہے اور ظاہر داری کو اس کی حقیقت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ چاہتا تھا کہ مخدوم سے اس موضوع پر بالواسطہ بحث کرے مگر اسے دوسرا سوال کرنا تھا اور شرط جیتنی تھی۔

روی :۔ اگر زمین الٹا گھومنا شروع کر دے تو کیا دنیا کا جغرافیہ بدل جائے گا؟

مخدوم نے فوراً کہا۔ "نہیں"

"نہیں" جواب مخدوم نے غیر شعوری طور پر نہیں دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح چھوٹ کے سوالوں میں سے ایک سوال باقی رہ جائے گا۔ مگر وہ گذشتہ برسوں میں اس بات پر غور کرتا رہا تھا کہ زمین کے الٹے گھومنے سے کیا جغرافیہ بدل سکتا ہے؟ وہ اس تعلق سے مسلسل غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ زمین کے الٹا گھومنے سے دنیا کا جغرافیہ نہیں بدل سکتا۔! اگر زمین الٹا گھومنا شروع کر دے تو دنیا کو صرف ۱۲ گھنٹوں کے لئے تبدیت ہوگی کیونکہ کرۂ ارض پر اس دن زمین کے تاریک حصہ میں چوبیس گھنٹوں کی رات اور روشنی والے حصہ میں چوبیس گھنٹوں کا دن ہوگا۔ اور پھر کوئی فرق نہیں ہوگا۔ صرف مغرب مشرق ہو جائے گا اور مشرق مغرب۔

مخدوم اپنے اس نظریہ کو تفصیلی طور پر پیش کرنا چاہتا تھا مگر روی کو تو اپنی شرط سے مطلب تھا۔ وہ اس پر کیا غور کرتا۔ اس نے ذرا مخدوم کو یاد دلایا کہ اب چھوٹ کا صرف ایک ہی سوال باقی رہ گیا ہے۔

مخدوم نے مسکرا کر کہا۔ ہاں۔ ہاں۔ کوئی بات نہیں تو سوال کرتا جا۔

روی۔ ان لوگوں کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے، جنہوں نے سب سے پہلے روح دریافت کی اور مادہ کو تقسیم کیا۔

مخدوم، روی کے اس سوال سے محظوظ تو ہوا، مگر اس کا خیال تھا کہ روی اتنا ذہین نہیں ہو سکتا، یہ سوال صاف طور پر مستعار معلوم ہو رہا تھا۔ ممکن ہے پروفیسر شرما نے آج سائیکولوجی کی کلاس میں یہی سوال کیا ہو۔

مخدوم کو تو غیر مطلوبہ جواب دینا تھا۔ اس نے سوال سے بھی زیادہ دلچسپ اور تحقیق طلب جواب دیا۔

مخدوم :۔ سقراط کا کالیہ اس کی زہر نوشی میں نہیں ہے۔ بلکہ تمام کی ان آخری اہم ترین گھڑیوں میں پوشیدہ ہے جو اس نے اپنے ایک درجن شاگردوں کے ساتھ گذاریں۔ اور اس کے دوسرے شاگردوں نے ان گھڑیوں کو قلم بند نہ کر کے، لوگوں کو ان کی قیاس آرائیوں کیلئے چھوڑ رکھا ہے۔

روی کو سقراط کے بارے میں اتنی معلومات نہ تھی۔ وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ سقراط نے اپنے نظریہ کی حمایت میں زہر پی کر اپنے نظریہ کو ہمیشہ کی زندگی بخش دی۔ اور سقراط کو سچا سمجھنا غلطی ہے۔ اگر سقراط کے مخالفین بھی اس کے تعلق سے کوئی کتاب لکھتے۔ تو اس کی شخصیت صاف ہو جاتی۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے زمانے کے مروجہ اصولوں سے بغاوت کی تھی اور سماج میں انتشار پھیلایا تھا۔ ہر وہ شخص اپنے سماج کا غلام ہوتا ہے۔ اس طرح ہمیں سقراط سے ہمدردی یا اس وقت کے سماج سے نفرت نہیں ہونا چاہئے۔ روی نے قطع نظر کرتے ہوئے سوال کیا۔ "امن ایک خواہش اور جنگ ایک ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

مخدوم یہ جانتا تھا کہ اس سوال کا جواب اگر دیا جائے تو یقیناً مختصر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تمام قوموں کی ہزار ہا برس کی تاریخ کی ورق گردانی کرنی پڑے گی۔ اور پھر سوال اپنی جگہ سوال ہی بنا رہے گا۔

اس کے بجائے مخدوم نے کہا۔ ایکٹروں کی تقلید، بہروپی خصوصیات پیدا کرتی ہے۔ اور بہروپ فکر و عمل میں انتشار و تضاد

پیدا کرتا ہے۔ اور آج کی مہذب دنیا اسی کا شکار ہو گئی ہے۔

روی نے آج محسوس کیا کہ مخدوم کیوں کبھی کسی ایٹم کے بارے میں گفتگو کرنے سے احتراز کرتا ہے۔ اور اپنے دور سے وہ متنفر کیوں نظر آتا ہے۔ روی سمجھ گیا کہ مخدوم پر فلسفیانہ موڈ طاری ہو گیا ہے اب یقیناً وہ شوپنہار کے قریب ہے۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ مخدوم کو کچھ دیر اسی طرح مصروف رکھا جائے۔

اس نے کہا۔ "کہتے ہیں موسیقی روح کے ہیجان کو ختم کر دیتی ہے؟"

مخدوم نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ روی دلچسپ سوالات کر کے اسے مصروف رکھنا چاہتا ہے۔

اس نے کہا۔ "کبھی کسی سپاہی نے وطن کی محبت کا گیت نہیں گایا۔ یہ تو ان شاعروں کا مشغلہ ہے جنہوں نے کبھی موت کا ننگا چہرا نہیں دیکھا۔"

روی۔ "موجودہ دنیا کو امن کی ضرورت ہے۔ یہ امن کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟"

مخدوم اس سوال کا متعلق جواب دینا ضروری سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح چھوٹ کے تمام سوالات ختم ہو جائیں گے مگر اس نے بڑے اطمینان سے سمجھانے کے انداز میں جواب دیا۔

"موجودہ دنیا کو امن اسی وقت نصیب ہو سکتا ہے جب تک کہ روس امریکہ کی اور ہر دنیا کو اناج اور دوائیں سپلائی کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔ اور امریکہ اپنی زائد پیداوار بڑھا پانے کے ذرائع معلوم کرے۔ اور برطانیہ کو اس کے معیارِ زندگی کی سلامتی کی ضمانت نہ دے دی جائے۔ اور ایشیائی قوموں کو محنت کا عادی نہ بنا لیا جائے۔ اور اس وقت تک جب تک دنیا کے ذہین لوگوں کو موقع پرستی سے نہ روکا جائے گا۔ انسانوں کے اس مہیب دفد کو امن کی ضرورت لاحق رہے گی جیسے ہر ملک کے دور دراز گوشوں میں آج بھی لوگ امن و سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور وہ اپنے آپ کو اپنے ہمسایوں سے زیادہ خوشحال اور ترقی یافتہ سمجھتے ہیں۔

روی نے خوش ہو کر کہا۔ "بالکل صحیح ہے، مگر مخدوم اب تیرے سوالات ختم ہو گئے۔"

مخدوم نے اپنی بجھی ہوئی سگریٹ کو دوبارہ جلاتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ ہماری شرط تو یہاں سے شروع ہو گی۔ اب تجھے کون ہارتا ہے۔"

وہ چلتے چلتے اب اتنے فاصلے پر رہ گئے تھے کہ انہیں بس اسٹینڈ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ روی نے اب ارادہ کر لیا کہ وہ نہایت سیدھے سادے اور مختصر سوالات کرے گا اور مخدوم سے بھی مختصر جوابوں کی توقع رکھتا تھا۔

روی نے کہا۔ "سرخ گلاب کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟"

مخدوم نے مسکرا کر کہا۔ "پرامن ترقی اصلاحات کی تحریک کا فلسفہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ نرم اور زرخیز زمینوں پر قوی اور طاقتوروں کے لئے تخم کو تسلیم کر لو۔ اور کمزور کو بنجر اور سخت زمین عطا کر کے لگان وصول کرو۔ چاہے وہ دو ہی پیسے کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اگے چل کر ان دو پیسوں کو کروڑ سو روپوں میں آسانی سے بدلا جا سکتا ہے۔"

روی نے جواب پر کوئی توجہ نہ دی وہ صرف مخدوم کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ تاکہ فوراً دوسرا سوال کرے۔

روی۔ "آواز کی رفتار تیز ہے، یا روشنی کی؟"

مخدوم کا موڈ ہنوز اسی طرح قائم تھا۔ اس نے پھر اسی اطمینان سے جواب دیا۔ "کینیڈی کو اس لئے قتل نہیں کیا گیا کہ اس وقت ایشیا اور یورپ کے بہت سے سربراہوں کو قتل کئے جانے کے اندیشے بڑھ گئے تھے۔ بلکہ امریکی قوم خود ہلاک ہونا چاہتی تھی۔"

روی۔ "کیا اس سال تیرا ارادہ پھر فیل ہونے کا ہے؟"

مخدوم۔ "زندگی تو برتنے کی چیز ہے۔ اگر کچھ پانا چاہتے ہو تو وہم اور خوف سے ہٹ کر ہمیشہ زندہ رہنے کے تعلق سے سوچو۔

مخدوم نے یہ جملہ کچھ اس انداز سے ادا کیا کہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بہت دن سے اس کے اظہار کیلئے موقع کا متلاشی رہا ہو۔

روی: کبھی تو نے کسی لڑکی کو نہیں چاہا ہوگا۔

مخدوم کے لئے یہ سوال نہایت معمولی سا تھا۔ مگر اس سے آج کل روی کی ذہنی مصروفیت کا پتہ چل رہا تھا۔

مخدوم نے اپنے چہرے پر بغیر کسی تاثر کا اظہار کرتے ہوئے یوں جواب دیا۔ "ہندستان کے کسان کی صدیوں کی زندگی ایک جگہ میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ اس نے کہا۔ ہمارا کسان آج بھی گھر کے آنگن میں کھڑا یہ سوچ رہا ہے کہ اس کے گھر کے دو بیماروں میں سے پہلے بیل کا علاج کرائے۔ بیل کا یا بیٹے کا۔؟

روی سمجھ گیا کہ اب مخدوم کو اس طرح کے سوالات کرکے ہرا دینا مشکل ہوگا۔ اس نے سوچا تو پھر کوئی ایسا سوال کیا جائے جو مخدوم کی کمزوری ہو سکے۔ روی نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مستقبل کا ہندستان کیسا ہوگا؟"

مخدوم کسی قدر بھلا کر کہنے لگا۔ اگرچہ میں یہ شرط ہار رہا ہوں۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مستقبل کا ہندستان عوام ہی کی بھوک پیاس۔ اور ان ہی کے گوشت و خون پر کھڑا ہوگا جبکہ اس کے خمیر میں بہت سے [illegible] کی ہڈیاں خود غرض لیڈروں کی کھوپڑیاں، بلیک مارکیٹ کرنے والوں کے استخوان اور حکومت کے بہت سے چھوٹے بڑے عہدہ داروں کا سفید خون اور فرقہ پرستوں کے سڑے ہوئے جسم و دماغ شامل ہونے چاہئیں۔ روی اپنی جیت کی خوشی میں مسکرا کر کہنے لگا۔ "ویسے تو تم نے شرط ہاری ہے۔ مگر میں تیرے اس آخری جواب سے پوری طرح متفق ہوں۔

بس اسٹینڈ ابھی چند قدموں کے فاصلے پر تھا کہ بس آگئی۔ اور یہ دونوں دوڑتے ہوئے بس میں سوار ہو گئے۔ بس کچھ دور ہی چلی تھی کہ ایک مسلح پولیس والا نے بس کو روک دیا۔ اور انسپکٹر نے کنڈکٹر سے کہہ دیا کہ تمام پسنجروں کو نیچے اتار دو۔ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے۔

بس کنڈکٹر نے لوگوں سے اتر جانے کیلئے کہا۔ لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ بس میں سے کوئی اترنے کیلئے تیار نہ تھا۔ سب لوگ جاننا چاہتے تھے کہ بس کیوں نہیں جائیگی۔ کیا بات ہے؟

بس کنڈکٹر نے کہا۔ انسپکٹر صاحب نے یہ بتایا نہیں۔ بس اب یہ بس نہیں جائیگی۔ چلو جلدی جلدی اترو۔

پچھلی سیٹ سے ایک شخص مارے غصہ کے یہ کہتے ہوئے اتر گیا۔ "اس میں تعجب اور حیرت کی کیا بات ہے۔ شہر میں کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوا ہوگا۔ یا پھر فرقہ پرستوں اور حکومت میں ٹھن گئی ہوگی۔ لوگ فرقہ وارانہ فساد کا نام سنکر دھڑا دھڑ اترنے لگے۔ بس میں بھی وہ ایک دوسرے کو مارنا نہ شروع کر دیں۔

روی اور مخدوم بھی اتر گئے۔ اور ساتھ ساتھ لوگوں کے چہرے بھی اتر گئے تھے۔ ایک تو ان کی ہفتے بھر کی تنخواہ ماری گئی اور پھر فرقہ وارانہ فساد کا نام سنکر ان کے ذہن دماغ ماؤف اور جسم مضمحل ہو گئے تھے۔ وہ بس سے اتر کر خاموش ہو کر سڑک کی طرف اٹھی راستہ پر چل پڑے۔ فضا کی ہلکی سیاہی گہری ہو کر تاریک ہو گئی تھی۔ ریڈیو اسٹیشن کی بتیاں بھی بجھا دی گئی تھیں۔ ہر طرف سکوت اور سناٹے کے سوا کچھ محسوس نہ ہوتا تھا۔

ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ موت کا ہاتھ فطرت کی نبض سے کھیل رہا ہے۔ جیسے ہی دور سے آتشزنی فرقہ کی آگ دکھائی دینے لگی۔ مخدوم اور روی نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ آہستہ آہستہ شہر میں کی دہشت انگیز آواز پوری فضا پر چھا گئی۔ اور وہ دونوں شہر کی زلزلہ خیز رفتار سے زمین میں پھیلنے والے ارتعاش کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

●●

اسرار اکبرآبادی

موڑ

آپ اپنی جستجو میں کھو گئی ہیں منزلیں
زندگی کو راستوں پر کچھ نظر آتا نہیں
آسماں کی جنبشوں سے چھن رہی ہیں الجھنیں
کس طرف جانا ہے مجھ کو کوئی بتلاتا نہیں

دور تک گہرائیوں میں رک گئے ہیں قافلے
مغربی اونچائیوں پر پستیوں کا ہے دھواں
کچھ پرندے جم گئے ہیں وقت کے پھیلاؤ پر
ہم بجز خاموش چہروں پر ہیں حیرت کے نشاں

خوشنما خوابوں کے خاکے مل رہے ہیں خاک میں
حال و مستقبل پہ ہوتا ہے اندھیروں کا گماں
بھولے بھٹکے دائروں میں آس ہے الجھی ہوئی
ناامیدی کے خلا میں کشمکش کا ہے سماں

وسعتوں کی سنسناہٹ سے فضا میں ارتعاش
روح مضطر پھر رہی ہے راستہ بھولی ہوئی
کروٹوں پر کروٹیں ہی لے رہے ہیں فاصلے
عظمتوں کے ارتقا کی سانس ہے پھولی ہوئی

آج کے ٹوٹے ہوئے سینے میں کل کا درد ہے
زندگی کو ڈس رہی ہے گرم لوہے کی لکیر
پتھروں کے ڈھیر پر پرچھائیاں ہیں سرنگوں
ٹھوکریں کھا چلے آتے ہیں صدیوں کے سفیر

ڈگمگاتی الجھنیں یہ گردشوں کے سلسلے
وادیوں کے پیچ و خم میں تیرگی کا موڑ ہے
قافلے والو سنبھل کر مشعلیں روشن کرو
عظمتِ پرواز کے آغاز کا یہ توڑ ہے

ظلمتوں میں زندگی کی آبرو لٹنے نہ پائے
ہاں نئے بڑھتے اجالو راستہ چھٹنے نہ پائے

محمود واجد

بچن ـــــ ہندی کا خیام

"کھاؤ پیو اور خوش رہو" یہ قول ایک کہاوت کی طرح مشہور ہو گیا ہے۔ ادب کی تاریخ میں ایسا تصور رکھنے والے کم نہیں۔ عرب شاعر ابو نواس کا کلام شراب میں ڈوبا ہوا ہے۔ فارسی کے عمر خیام کی رباعیاں مئے گلگوں سے غسل کر کے نکلی ہیں۔ انگریزی کے رابرٹ ہرنگ کے سانیٹ نشے میں سرمست ہیں۔ اردو کے رباعی داغ کو بھی شیشے میں اتارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مگر ان سب میں اور سب سے بڑھ کر خیام کا نظریہ ہے۔ کل کی فکر فضول ہے۔ آج کو اپنا ڈھب اور ڈھنگ کا حق ادا کرو۔ یہاں تک کہ وہ اس مستی میں خدا کو بھی نہیں بخشتا۔ ؎

ابریق مئے مرا شکستی ربّا ـــ بر من در عیش را بہ بستی ربّا
بر خاک مذلتی مئے گلگون مرا خاکم بدہن کہ سخت مستی ربّا

(اے خدا تو نے میری شراب کی صراحی توڑ دی۔ مجھ پر عیش کا دروازہ بند کر دیا۔ میری سرخ شراب کو خاک پر گرا دیا۔ خاکم بدہن تو بھی مست ہے اے رب) وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ ؎

چوں فوت شوم ببادہ شوئید مرا تلقین ز شراب و جام گوئید مرا
خواہید کہ روز حشر یابید مرا از خاک در میکدہ جوئید مرا

(جب میں مروں تو شراب سے مجھے غسل دو۔ اور (بوقت مرگ) جام و شراب ہی سے تلقین کرو۔ اگر چاہتے ہو کہ قیامت کے دن مجھے پاؤ تو در میکدہ کی مٹی میں مجھے تلاش کرو۔)

ہندی شاعر بچن بھی کم و بیش یہی تخیل رکھتا ہے ؎

میرے اودھروں پر ہو انتم بستو نہ تمسی دل پیالا میری جیبھیا پر ہو انتم بستو نہ گنگا جل ہالا
میرے شو کے پیچھے چلنے والو یاد اسے رکھنا "رام نام ہے ستیہ" نہ کہنا، کہنا "مدھوشالا"

(میرے ہونٹوں پر آخری وقت تمسی کی پتی نہ ہو بلکہ جام ہو اور میری زبان پر آخری شے گنگا جل نہ ہو بلکہ شراب ہو۔ اے میرے جنازہ کے پیچھے چلنے والو یاد رکھو کہ رام نام ستیہ ہے نہ کہنا بلکہ کہنا کہ میخانہ کا نام سچا ہے)

ذہنی طور سے تو دنیا کی مختلف زبانوں کے کئی بڑے شاعر ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ غالب نے کہا تھا۔ ؎

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

اور یہ بیخودی محض غم سے نجات پانے کی راہ ہے۔ بچن بھی اسی دوراہے سے گذرے اور بے اختیار پکار اٹھے۔ ؎

یاد نہ آئے دکھ میں جیون اس سے پی لیتا ہالا جگ چنتاؤں سے رہنے کو مکت اٹھا لیتا پیالا۔
شوق سادھ کے اور سواد کے میں تو پیا جگ کرتا ہے پر میں دھرودگی ہوں جبکی ایک دوا ہے مدھوشالا

(میں شراب اس لئے پیتا ہوں کہ دکھ بھری زندگی یاد نہ آئے۔ دنیا کی فکر سے نجات پانے کو جام اٹھاتا ہوں۔ لوگ شوق، لگاؤ اور مزے کے لئے

پیتے ہیں۔ لیکن میں وہ بیمار ہوں جس کی دوا ہی شراب ہے)

حضرتِ جگر نے بھی کچھ ایسی ہی بات بڑے پیارے انداز میں کہی ہے۔

اس واسطے پیتا ہوں کہ جل جائے جوانی واللہ کسی شوق کے مارے نہیں پیتا

لیکن ان ساری باتوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر جگہ شراب کا مقصود حقیقی شراب ہے۔ بعض حالات میں یہ بعض علامتی شئے ہے۔ شراب مے عرفاں بھی ہے۔ فارسی اور اردو کے بیشتر اساتذہ نے اسے ان معنوں میں لیا ہے۔ ہاں بعض نے اسے مجازی معنی پہنائے ہیں۔ یہ بات بڑے فنکاروں کے ساتھ عجیب رہی ہے کہ کبھی زندگی کی پرچھائیں تک اپنے فن پر پڑنے نہیں دیتے۔ (میرا مطلب بے راہ روی سے ہے)۔ یہ کردار کا جوہر ہے۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عملی زندگی میں کسی نے شراب کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور شراب پر بے شمار سپلیوں سے استغاثہ کیے ہوں۔ اردو میں ریاض اس کا تابندہ مثال ہیں جن کے یہاں خمریات پر شاید سب سے زیادہ (ہزاروں اشعار) ہیں۔

مجھ سے مینا ہی کہتا ہے بہ آوازِ بلند میرے ہوتے ہوئے اندیشۂ فردا کیا ہے

خیامؔ کہتا ہے۔

مئے خور کہ چنیں عمر کہ غم درپئے اوست آں بہ کہ بخواب یا بہ مستی بگذرد

(شراب پی تاکہ زندگی میں جو غم ہے وہ اس میں ڈوب جائے۔ ہر فکر کو مستی میں سمو کر ٹال دے!)

غم بھلانے کو شراب پینے کا جواز تقریباً سبھی شاعروں نے ڈھونڈا ہے۔ لیکن ہر ایک کا زاویۂ فکر جدا ہے۔ کوئی شراب کو شراب سمجھ کر پیتا ہے۔ کوئی خونِ دل پیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شراب پی لی۔ اپنا اپنا ظرف ہے۔ بچنؔ ان معنوں میں ہندی کے ریاض ہیں کہ انھوں نے خود شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اپنے مجموعۂ کلام "مدھوشالا" میں وہ کہتے ہیں۔

"مدھوشالا کے بہت سے پاٹھک (قاری) اور شبھ چنتک (بہی خواہ) ایک سمے (وقت) سمجھا کرتے تھے کچھ شاید اب بھی سمجھتے ہوں کہ اس حالیکہ مصنف ان دنوں مدیرِ اد (شراب) کے نشے میں چور رہتا ہے۔ واسطو کتلا حقیقت) یہ ہے کہ مدیرا نام دھاری دَرب (شراب نامی جنس) سے میرا پرچیہ (تعارف) اکبر شہ (لفظاً) برائے نام ہے نشے سے انکار نہیں کروں گا۔ زندگی ہی ایک نشہ ہے۔ کویتا (شاعری) بھی ایک نشہ ہے اور بھی بہت سے نشے ہیں۔ اپنے پر یمیوں کا بھرم دُور کرنے کے لئے ایک سمے (وقت) میں نے ایک رُباعی لکھی تھی۔

سوگیم نہیں پیتا اوروں کو پیتو بلا دیتا ہالا سوگیم نہیں چھوتا اوروں کو پر پکڑا دیتا پیالا

پر اُپدیش کشل بہتیروں سے میں نے یہ سیکھا ہے سوگیم نہیں جاتا اوروں کو پہنچا دیتا مدھوشالا

(میں خود نہیں پیتا لیکن اوروں کو شراب پلا دیتا ہوں، خود نہیں چھوتا لیکن دوسروں کو جام پکڑا دیتا ہوں۔ لیکن یہ نصیحت میں نے بہت سارے ماہروں سے سیکھی ہے کہ خود نہیں جاتے لیکن دوسروں کو مئے خانہ تک پہنچا دیتے ہیں۔)

پھر بھی برابر پرشن (سوال) ہوتے رہے۔ آپ پیتے نہیں تو آپ کو شراب پر لکھنے کی پریرنا (تحریک) کہاں سے ملتی ہے؟ پرشن بھولا تھا بھلا ایمان دار ایک دن وچار (خیال) آیا کہ کاشتھوں کے کل (خاندان) سے جتنا (پیدا ہوا) ہوں جو پینے کیلئے پرسدھ (مشہور) ہے۔ سوچنے لگا کہ بزرگوں بلا آباؤ اجداد کا کیا ہوا مدھو پان (مئے نوشی) مجھ پر سنسکار (روایت) نہ چھوڑ گیا ہوگا۔ ایک رباعی لکھی ــــ

میں کاشتھوں کو دیکھ، میرے پُرکھوں نے تا ڈھالا میرے تن کے لہو میں ہے کچھ تہ پرتی تشت ہالا

پشتینی آدیکار مجھے ہے مدیالے کے آنگن پر میرے دادوں پردادوں کے ہاتھ کی مدھوشالا

(میں کاشتھوں کی اولاد، میرے آباؤ اجداد نے اتنا ڈھالا کہ میرے جسم کے خون میں کچھ تہ در تہ صدی شراب ہے۔ میراحق میخانے کے آنگن پر اسلئے ہے کہ میرے دادوں پردادوں کے ہاتھ میخانہ لگا تھا!)

لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ امور ڈھالے کے کاشتھ ہیں جن کے یہاں کنوندتی (وراثت) ہے کہ اگر کوئی شراب پی لے تو کوڑھی ہو جائے گا یہ بھی نیتی (قدرت) کا ایک وینگیہ (طنز) ہے کہ جنھوں نے مدیرا (شراب) نہ پینے کی اتنی کڑی پرتگیا (عہد) کی تھی ان کے وشنو (اولاد) نے

مدیرا کی اتنی وکالت کی۔!"

رباعی کا فن ایک مخصوص بحر و وزن رکھتا ہے، آہنگ و نغمہ رکھتا ہے سب کچھ رکھتا ہے۔ یہ فارسی الاصل ہے۔ ہندی میں اس کا تتبع بہت کم ہوا ہے۔ سب سے اہم کوشش بچن نے کی اور اسے لیجنڈ رباعی تو نہیں لیکن اسکے قریب لے آئے۔ ایک بڑا التزام انھوں نے یہ رکھا ہے کہ ہر چوتھے مصرعے میں "مدھوشالا" (میخانہ) کی تکرار ہے۔ دکن و میخانہ کے لحاظ سے فراق نے جو روپ گھی رباعیاں لکھ کر اردو کو ہندی کے قریب کیا یا یوں کہئے کہ ہندی کو اردو کے قریب لے گئے۔ ہندی شاعری میں اردو (اور فارسی بھی) کے خلاف صنف کا اظہار جنس لطیف کی طرف سے ہوتا ہے اور یہی بنیادی فرق ہے ہندی اور اردو شاعری کا۔ جہاں اردو میں مردانہ وقار اور آہنگ ہے وہاں ہندی میں نسوانی حیا اور والہانہ پن ہے۔ جہاں جہاں ہندی نے اردو اور اردو نے ہندی کے اثرات قبول کئے ہیں وہاں وہاں مزاج کی ہم آہنگی ملتی ہے۔ پھر بھی بنیادی و صنف ہندی اور ثقافتی قدروں کا حامل ہوتا ہے۔ اردو (دوسرے معنوں میں فارسی جس کے تہذیبی اور ثقافتی اثرات اردو میں سب سے زیادہ ہیں) اپنا مخصوص مزاج رکھتی ہے اور ہندی اپنا۔ حالانکہ دونوں ہمسائیں ہیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ بچن کی رباعیاں عمر خیام کی رباعیوں سے اثر انداز ہوئی ہیں۔ فرق صرف قدروں اور تہذیبوں کا ہے۔ ... ہندستان اور ایران کا اصول مدّ اگانہ مزاج رکھتا ہے لہٰذا قوتِ حیات کے اجزاء الگ الگ ہیں۔ بچن نے خود کہا ہے۔

"میں نے عمر خیام کے ہر دردِ دل) اٹھاؤ نا پر سوتوں (جذبات کے پھولوں) کو اپنی بھاشا (زبان) کے تار میں پرو کر چڑھایا (پیش کیا) ہے۔" عمر خیام کی رباعیاں بظاہر کتنی ہی سرشاری و سرمستی میں ڈوبی ہوں مگر واقعتاً فکری اور فنی اعتبار سے اتنی بلند ہیں کہ ان تک ہر کس و ناکس کی رسائی ممکن نہیں۔ ان میں جذب بھی ہے اور خلوص بھی۔ یہی ان کی مقبولیت کا راز ہے۔ بچن بھی ہندی ادب میں کم مشہور نہیں۔ ان کی ایک تصنیف "مدھوشالا" کے ہی چودہ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور پچھلے تیس برسوں سے آج تک اسی طرح مقبول عام ہیں خلوص یہاں بھی ہے مگر خیام کی طرح اپنے مخصوص فلسفہ حیات نہیں۔ لہٰذا فکری گہرائی اتنی زیادہ نہیں۔ پروفیسر نرنجن جو بچن کے بہت قریب رہے ہیں اور دل و جان سے انھیں عزیز کی طرح چاہا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مدھوشالا" متعدد بھی دسے متعلق) کویتائیں (شاعری) ان کی خلاصی کے کارن (سبب) اتی شرلسکر (اعلیٰ) پرتیت (محسوس) ہوئیں۔ "بچن کی "پگ دھونی" سے موازنہ کرتے ہوئے آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔ "ایک کا چر پریمی (پرانا عاشق) ہوں تو ایک کا چر پرچت (پرانا واقف کار) ایک کا چر وِیوا تی (پرانا غور کرنے والا) ہوں تو ایک کا چر گیانی (پرانا عالم)۔"

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک کا اثر اگر ذہن پر پڑتا ہے تو دوسرے کا دل پر۔ ایک سے محض واقفیت ہے تو دوسرے سے قلبی لگاؤ ہے۔ اور یہ دوسرا "پگ دھونی" ہے نہ کہ "مدھوشالا"۔ دراصل جو دل میں ہل چل مچا دے وہ پروفیسر نرنجن کے نزدیک اصل شاعری ہے۔ اسی میں انسان ڈوب کر رہ جائے۔ ان باتوں سے قطع نظر اگر دیکھئے تو آپ محسوس کریں گے کہ بچن کی رباعیاں خیام کی رباعیوں کی طرح جام میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بچن نے خود ہی لکھا ہے۔

"میخ مدیرا (شراب) لایا ہوں جسے پی کر بھوش (مستقبل) کے بھئے (خوف) بھاگ جاتے ہیں اور بھوت کال (ماضی) کے دار ون دکھ (سنگین غم) دور ہو جاتے ہیں۔ جسے پان کر دین کر (مان اپمان (عزت و ذلت) کا وِسمرن (ہوش) نہیں رہ جاتا۔ اور گوڑ (عزیز) کا گوڑ (لیت (لپشیدہ) ہو جاتا ہے۔ جسے ڈھال کر مانو (انسان) اپنے نجی (ذاتی زندگی) کی وِیتھا (الم) پیڑا (تکلیف) اور کٹھنائی (مشکل) کو کچھ نہیں سمجھتا۔ اور جسے چکھ کر منش (آدمی) شرم (محنت) سنگھرش (مصیبت) سنتاپ (اذیت) سبھی کو بھول جاتا ہے۔ آہ! جیون کی مدیرا (زندگی کی شراب) جو ہمیں وِوش (مجبور) ہو کر پینی پڑتی ہے کتنی کڑوی ہے! یہ مدیرا (شراب) اس مدیرا کے نشے کو اتار دے گی۔!"

ان الفاظ سے بچن کی رباعیوں کا پس منظر واضح ہو جاتا ہے۔ زندگی بڑی سخت ہے، اس کے مصائب بھلانے ہیں۔ ان سے بچنے کی ایک راہ ہے۔ وہ یہ کہ انسان انھیں بھول جائے۔ شراب کے نشے میں ڈوب جائے۔ شراب اور شراب خانہ یہاں پر پھر علامت بن جاتے ہیں

بچن کی مدھوشالہ میں اشارہ ہے عبادت اور خلوص سے بھری ہوئی جگہ کے لئے اور مدیرا محبت اور خلوص ہے جسے پی کر انسان کے نیچ بھید بھاؤ کا تفرقہ نہیں رہ جاتا۔ مدیرا رحم، پیار و برہمن کا بھید بھاؤ ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں ہر کسی کو پناہ ملتی ہے۔ جس جگہ ہر کوئی اپنا غم بھول جاتا ہے۔ انسان، انسان کامل بن جاتا ہے۔ کہتے ہیں ــــ

مسلمان اور ہندو ہیں دو، ایک مگر اُن کا پیالا　　ایک مگر اُن کا مدیرالے ایک مگر ان کی ہالا
دونوں رہتے ایک، نہ جب تک مسجد مندر میں جاتے　　بیر بڑھاتی مسجد مندر میل کراتی مدھوشالا

(مسلمان اور ہندو دونوں مگر اُن کا جام ایک ہے، ایک ہی پیمانہ ہے۔ ایک ہی شراب ہے۔ دونوں ایک اس لئے نہیں رہتے کہ مسجد اور مندر ہی جو ایک نہیں ہونے دیتے۔ جھگڑا بڑھاتے ہیں لیکن پھر میخانہ ان میں میل کراتا ہے)۔ اسی طرح مدیرالے (شراب) مدھوشالا (میخانہ) پیالا (جام) اور ساقی کی علامات سے بڑا کام لے کر بچن نے اپنی رباعیوں میں بڑا تنوع پیدا کیا ہے۔ خیام ان معنوں میں ان سے آگے بڑھ جاتے ہیں جن میں وہ سمجھتے ہیں کہ زندگی قضا و قدر کے ہاتھوں ہے۔ دو روزہ عمر عیش کر کیوں نہ گزاری جائے۔ لہذا وہ غم کو بھی شراب کی طرح پی جانا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مستی و سرشاری میں وہ بہت دور چلے جاتے ہیں۔

خیام گر بہ گفتہ ایں غم چیست　　در خور دن غم فائدۂ بیش و کم چیست
آں را کہ گذشتہ نہ کنی فکر و غمش　　فردا نہ برائے گفتہ آمد غم چیست

(اے خیام اگر کہا ہوں پر بیکار کڑھتا ہے۔ حق کے کرم کو اظہار کا بھی تو موقع ہے۔ جو گناہ نہیں کرتا اس کی مغفرت کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے گناہ کے لئے سب مغفرت ہے تو غم کس بات کا!)

بچن کہتے ہیں ــــ

پاپ اگر پینا، سمجھ وشی تو تینوں ساقی بالا　　نیتہ پلانے والا پیالا، پی جانیوالا ہالا ــــ
ساقیا انہیں بھی لے چل میرے میخانے یہی بتلاتا ہے　　قید جہاں میں ہوں کی جائے قید وہیں مدھوشالا!!

(مئے نوشی اگر گناہ ہے تو تینوں ہی گناہ گار ہیں۔ ساقی، مل، انعام، روزانہ پلانے والا جام اور پی جانے والی شراب۔ انصاف یہی کہتا ہے کہ انہیں بھی میرے ساتھ لے چل۔ جہاں میں قید ہوں وہیں پر میخانہ بھی قید ہو!) انہیں احساس ہے کہ شراب اور ساقی کے لوازمات در اصل زندگی ہیں اگر اس زندگی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو زندگی کس کام کی۔ میرے لئے تو یہی سب کچھ ہے۔ زندگی سے اگر خلوص و محبت نکال دیجئے تو پھر کیا رہ جاتا ہے۔

غم کے باب میں خیام کہتے ہیں ــــ

تا کے ز غم زمانہ محزوں باشی　　با چشم پر آب و دل پر خوں باشی
مے نوش دمے عیش کوش دخوشدل باش　　زاں پیش کزیں دائرہ بیروں باشی

(کب تک زمانے کے غم میں پریشان ہوگا۔ کب تک چشم نم اور دل پر خوں لے کر رہے گا۔ مستی و شراب میں ہر غم کو ڈبو دے اور خوش رہ۔ کل کی کیا خبر کہ کیا ہوگا!)

خوش اوقات ہونے کی یہاں تک بات ہے خیام کا اس میں جواب نہیں لیکن خوش باسی کے ساتھ ہمسفری کا احساس بچن کو ہے۔ وہ میخانے کو ایسی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جن میں کوئی تفریق نہیں۔ ماؤ تو کا جھگڑا باقی نہیں رہ جاتا۔ اسب برابر ہو جاتے ہیں۔ خیام مرد خوش اوقات کا نمائندہ ہے اور بچن مرد کامل (اپنے خیال میں) کا نمائندہ ہے۔ جو ملا امتیاز اس و آں سب کچھ ایکتا کے لئے نچھاور کر دیتا ہے۔ طوائف بچن کے یہاں بھی کم نہیں ہے۔ شراب اور ساقی کا ذکر ہی لطیف شئے ہے اور پھر اس کا والہانہ اظہار۔ بچن کو اس اظہار پر قابو ہے۔ بچن کی آواز سیکڑوں میں پہچانی جا سکتی ہے۔ ان کا منفرد لہجہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندی شاعروں کو انہوں نے ایک نئی جہت عطا کی۔ یہ بچن کا کارنامہ ہے اور اس میں وہ ایک مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی دوسری بڑی اہم

بقیہ صفحہ ۳۹ پر دیکھئے

شفیقہ فرحت

غزل

محبت پھول بھی ہے خار بھی ہے
جمالِ طور بھی ہے، دار بھی ہے
تمہارا منتظر میں ہی نہیں ہوں
چمن میں نرگسِ بیمار بھی ہے
نفس ہی اک نہیں رستے میں حائل
حجابِ رُوح کی دیوار بھی ہے
اِسے تم قہقہا سمجھو نہ میرا
شکستِ دل کی یہ جھنکار بھی ہے
سکونِ رُوح بھی ہے اشکِ غم بھی
محبت لُطف بھی آزار بھی ہے
زباں ہے مرہمِ زخمِ جگر بھی
زباں چلتی ہوئی تلوار بھی ہے
فنا ہونے پہ ہے مجبور انساں
جو تیرا عکس بھی شہکار بھی ہے

طرزؔ نفیسی

غزل

لہو دل کا لئے پلکوں پہ اشکِ لرزہ تاب آیا
مری آنکھوں کی بینائی چرانے آفتاب آیا
حرم سے میکدے میں کون بہرِ احتساب آیا
بڑھا مینا کا دل، جام و صراحی پر شباب آیا
وہ کیوں چھپتے گل و لالہ، ہمہ انجم کے پردوں میں
ہماری بے حجابی دیکھ کر اُن کو حجاب آیا
تجھے اے شوقِ دیدار اب صبح تک بیدار رہنا ہے
خیالِ یار پر تکیہ کئے آنکھوں میں خواب آیا
کہاں تھا پہلے دنیا کے خط و عارض کا یہ عالم
جبیں چومی تمہاری جب کہیں رنگِ شباب آیا
زمیں بدلی، زمیں پر بسنے والے تو نہیں بدلے!
یہ دنیا بے محل ہی چیخ اُٹھی انقلاب آیا
یہ تپتی دوپہر اور یہ درختوں کے گھنے سائے!
یہ کس کے گیسوؤں کی چھاؤں لیکر آفتاب آیا
مجھے ہو ناز طرزؔ کیوں نہ اپنی باریابی پر
گیا با آب و تاب اُس بزم میں، با آب و تاب آیا

مراٹھی کہانی　　مترجمہ ــ نور پرکار　　از:۔ آشا بھاجیکر

سنگیتا

جاتی ہو اس کے بعد کیا ہوا۔؟

اُس چھجے سے پرندے نے اپنے پر تول لئے۔ اور راج محل کے کٹہرے کے باہر ہونے لگا شروع کیا حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کئی راتوں کے متواتر جاگے ہوئے اُس اُداس اور پریشان راجا کی آنکھوں پر نیند کے سائے اتر آئے اور وہ نیند کی آغوش میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔"

سنگیتا کی پیشانی پر اُلجھے ہوئے بالوں سے کھیلتے ہوئے میں اُسے کہانی سنا رہی تھی۔ دوپہر اور رات سونے سے قبل اُسے کہانی سُنانی ضروری ہے۔ جب تک اُسے کہانی نہ سنائی جائے سونے کا نام نہیں لیتی۔ اِس لئے دوپہر میں کسی بھی ضروری کام کو پرے رکھ کر کہانی کی ابتدا کرنی پڑتی تھی۔ پہلی کہانی تو پوری ہو جاتی مگر دُوسری کہانی جب تک اپنے اختتام کو پہنچتی۔ سنگیتا سو چکی ہوتی۔ لیکن آج پہلی کہانی بھی ابھی پوری نہیں ہو پائی تھی کہ نیند کی پری نے اُسے آدبوچا۔ میں نے اُسے چھوٹی سی کھاٹ پر لٹا کر چھپر دانی گرا دی۔ ہمارے گھر میں کاؤں کے باہر ہونے کی وجہ سے دن میں مکھیاں اور راتوں میں مچھر اپنا اپنا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ اس لئے چھپر دانی کا دن میں بھی استعمال نہایت ضروری ہے۔ میں نے سوچا کھلی نہ میں بھی کچھ دیر کے لئے اپنی آنکھیں موندے پڑی رہوں۔ میں نے اپنا رُخ دیوان خانے کی طرف کر دیا۔ دیوان خانے کے دروازے میں پھنسا ہوا ایک لفافہ اندر کی جانب جھانک رہا تھا۔ پتہ نہیں ڈاکئے نے آج کال بیل کیوں نہیں بجائی۔ مگر اگلے لمحے مجھے یاد آیا کہ بڑے استوں پر کام جاری ہونے کی وجہ سے بجلی بند کر دی گئی تھی۔ یہ کہا جائے تو سیشن کا خط آج آجانا چاہیئے تھا مگر تحریر اجنبی سی تھی اِس لئے میں نے لفافے کو جاروں طرف سے دیکھا اور جب مجھے اِس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ خط اُن ساتوں میں سے کسی کا نہیں ہے تو میں نے لفافہ چاک کیا۔ لفافے میں ایک چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا اور اُس ٹکڑے پر صرف پانچ سطریں۔ لیکن اتنی مختصر سی تحریر پڑھتے وقت مجھے محسوس ہوا جیسے دھیرے دھیرے کوئی میری روح قبض کر رہا ہو!...

..... "نہیں نہیں، بالکل نہیں۔ سنگیتا میری ہے، صرف میری۔ اور اِس پر کسی کا کوئی اندھیکار نہیں۔" میں نے اپنے آپ سے کہا اور اُس طرف دوڑ پڑی جہاں سنگیتا سکھ کی نیند سو رہی تھی۔ میں نے اُسے اپنے ہاتھوں میں لے کر اس قدر اپنے سینے سے بھینچا کہ سوئی ہوئی سنگیتا جاگ اٹھی۔ میں نے دھیرے دھیرے پھر اُسے نیند کی آغوش میں ڈھکیل دیا۔ وہ سو گئی مگر میں نہ سو سکی۔ میں جاگ گئی تھی، میرے خیالات جاگ گئے تھے...

اِس کہانی کو شروع ہوئے آج تین سال ہو رہے ہیں۔ میں بڑی خاموشی سے اُس امریکہ سے آئے ہوئے ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور مجھے اِس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ یہ ڈاکٹر جو ہونی انہونی سی بات ضرور کریں گے۔ گو کہ ایک ایک کر کے ساری اُمیدیں ختم ہو چکی تھیں۔ اِس کے باوجود من کے اندھیارے میں اُمید کا چھپا ہوا جگنو اُس وقت بھی ٹمٹما رہا تھا۔ ڈاکٹر نے یکایک اپنا لہجہ بدلا۔ اور مجھ سے پوچھا۔ کیا بچپن میں تم کسی حادثے کا شکار ہو گئی تھیں؟

"جی ہاں"

ڈاکٹر نے بڑی گمبھیرتا سے کہا۔ "آپ کی آنکھوں کو سخت ایذا پہنچی ہے اِس لئے اب بچے کا جنم لینا ناممکنات میں سے ہے۔"

میں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور پرنام کیا۔ انھوں نے مجھے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "زندگی میں ہر سکھ سبھوں کو میسر نہیں ہوتا۔

اناڑی آدمی میں کوئی بچے سنبھالے پڑے ہوئے ہیں جنہیں ماں کی ممتا چاہیئے۔ اگر آپ ایسے ہی کسی یتیم بچے کو اپنا بچہ کر پروان چڑھائیں تو۔۔۔۔۔؟

سنجیدہ نے بھی مجھ سے یہی سوال کئی بار پوچھا تھا مگر میں یہ سوچ کر چپ ہو گئی تھی کہ جس کے والدین کا پتہ نہیں ہوتا اسے کیسے گود لیا جائے۔ جس کے ماں یا باپ زندہ ہوں وہ اپنا بچہ دوسروں کے سپرد کیسے کریں گے؟

"اور اگر حالات ایسا کرنے پر مجبور کریں تو؟" ڈاکٹر نے جواب طلب کیا۔

تو میں کہوں گی۔ "یقیناً وہ اپنے بچے کی ماں نہیں ہے۔"

ایسی ایک بھی عورت آپ کو نہیں مل سکے گی جو اپنے بچے کو نہ چاہتی ہو۔ صرف مجبوریاں اپنا سر جھکانے پر مجبور کرتی ہیں۔

تو آپ کی نظر میں کوئی ایسا بچہ ہے؟ میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

آپ ہی کی عمر ہو گی اس لڑکی کی، مگر اس کا منگیتر ہوائی جہاز کے حادثے کا شکار ہو گیا۔ شادی سے قبل ہی وہ ماں بننے والی ہے۔ اور اس ہونے والے بچے کا باپ اس دنیا میں نہیں۔ اس لئے اس راز کو پردے میں رکھنا اخلاقی فرض ہے۔ ورنہ وہ قابلِ قبول نہ ہو گی۔ آج اس کا منگیتر زندہ ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ ایک بات اور جسے میں محسوس کر رہا ہوں وہ یہ کہ تم دونوں میں کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں ہی کے چہرے پر کشش، ایک ہی قسم کے خدوخال!

کہیں ایسا دھوکہ میں اسے یہاں چڑھا لاؤں اور کل کو پھر سے ماں کی ممتا جاگ اٹھے اور وہ اپنا بچہ واپس لے جانے کیلئے یہاں دھنستی ہوئی چلی آئے۔

"میں یقین دلاتا ہوں ایسا نہیں ہو گا۔ قطعی نہیں۔"

میں نے گھر آ کے ہی کشش سے کہا اور ستیش نے سنا ہی بھروسہ۔ ہم دونوں نے بچے کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

جوں جوں دن قریب آتے جاتے میری بے چینی اور بڑھتی جاتی۔ جاڑے کے دن تھے۔ اس لئے میں نے آنے والے اس ننھے بچے کے گرم کپڑے تیار کر لئے۔ کشی کی گھر میں ستیش بڑی نرم کے ساتھ تھے۔ پانچ دس نوکر چاکر ادھر ادھر دوڑانے پر لگا رکھی۔ کئی قسم کے تو صرف گھر میں چھوٹے چھوٹے "دوڑنے اور اچھلنے قدموں کی ستیش کے غم جاتے وقت ناچا کھینچنے والے تھے" ننھے ہاتھوں کی۔ اب وہ کمی بھی پوری ہو جائے گی۔ لڑکا مجھے پسند تھی۔ اس لئے میں نے پہلے ہی سے اس کے لئے سنگیتا نام منتخب کر لیا تھا۔

ٹھیک دو مہینوں کے بعد ڈاکٹر کا بلاوا آگیا۔ میرا سینہ دل، دماغ، ہاتھ اور پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس کے بلانے پر دوڑتی ہوئی میں نے پوچھا۔ کیا ہوا ڈاکٹر؟

"لڑکی!"

مگر تم اتنے خاموش کیوں ہو؟ کہیں اس کی ماں نے اپنا ارادہ تو نہیں بدل دیا؟

"نہیں، اس کی ماں ابھی تک بیہوش ہے۔ زخم کافی گہرا ہے اور ابھی ہوش۔ بچہ کمزور ہے۔ اس کا وزن کم ہے۔ اس کا خیال رکھنا نہایت ہی ضروری ہے۔"

"کچھ نہیں تو کم از کم پچھلے دو مہینے سے میں اسے اپنی کوکھ میں پرورش کر رہی ہوں۔ اسے ہر قسم کا پیار دے رہی ہوں۔" میں نے اپنے دل میں کہا۔ پھر ایک کہہ اٹھی۔ "کیسی بھی ہو ڈاکٹر اب لڑکی میری ہے۔"

میں نے پورے دس دن اسپتال میں گذارے اور کبھی اس بچی کی ماں سے ملنے کی خواہش تک ظاہر نہیں کی۔ چونکہ یہی ڈاکٹر کی ہدایت تھی۔ ڈاکٹر نے بتا دیا تھا۔ اس سے پہلے ہی کہ بچے ہوتے ہی مل لیں۔ چونکہ وہ بے حد کمزور تھی۔ اس لئے اب کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہیں۔"

میں اسپتال سے بچی کو لے کر گھر آئی اور اس کا نام سنگیتا رکھا۔

پہلے چھ ماہ سنگیتا کی دیکھ بھال میں مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا۔ ہر بار نظریں آسمان کی طرف اٹھ جاتیں اور دبے دبے سروں میں پوچھا کرتیں۔ "کہیں میرے بھاگ میں دھوکا تو نہیں لکھا ہے؟"

مگر نہیں، چھ مہینے کا بچہ بیمار پڑ گیا مالا بار سنگیتا سنبھل چکی تھی۔ میری دنیا کی کوئی شکایت نہیں رہا۔ پھر وہ مسلسل بیمار رہنے لگا میرے انگ انگ میں اس کی دعائیں رچ بس گئیں کیسے دن تھے وہ بھی۔ میں نے برسات گھر پر بیٹھے بیٹھے سلوائے۔ کیا کیا رکھتا اس کے لئے۔ کیسے کیسے منصوبے بنائے تھے اور آج اچانک اس خط نے میرے گھر پر بجلی گرا دی۔

"سنگیتا کی ماں اسے لے جانے کیلئے تڑپ رہی ہے۔"

لکھتے میں گھڑی بول اٹھی چار بج گئے۔ اسی کو چار بجے بیٹھے بیٹھے اپنے من کے دیواروں میں ڈوبے ہوئے کتنا وقت گذر چکا ہے۔ اب سنگیتا کی ماں آتی ہی ہوگی۔ مگر اب مجھ میں اتنی طاقت کہاں ہے۔؟

اسی وقت کال بیل بج اٹھی۔ میں نے اپنی کھوئی ہوئی قوت کو یکجا کیا اور دروازہ کھول کر دیکھا تو دروازے پر ادونا کھڑی تھی سنگیتا کی ماں! وہی گورا رنگ اور اداس چہرہ! اگر نہ جانتے آج کیوں دیکھا اس کی اداس آنکھیں نظر آتیں لیکن میں صرف کھنڈر دیکھ رہا تھا۔

میں نے راستہ دیا وہ اندر آگئی اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں ہی خاموش تھے صرف سگریٹ کے ٹکڑوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے سکوت توڑا۔ "میرا خط ملا ہوگا۔"

میں اثباتی جواب دینا نہیں چاہتی تھی اس کے باوجود بھی پتہ نہیں کیسے میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

"تو پھر تمہیں لگتا ہوگا کہ مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا جائے۔" اس کے بعد پھر ایک بار اس نے میرا چہرہ دیکھا اور کہا۔ "ماں کی اس یاچنا میں کوئی بات پر دیا نہیں چاہتی تھی مگر تجھ سے کہا گیا۔ بچے بے حد کمزور تھا اس لئے پیدا ہوتے ہی چل بسا۔ میں مرنہیں سکتی تھی اس لئے زندہ تھی۔ دن بیتا ہا کیا تھا میرا! لیکن وقت ہی سب چیزوں کا علاج ہے۔ میں نے زندگی کے اس باب کو ختم کر کے ان پرانی یادوں کو بھلانے کیلئے کام کرنا شروع کیا۔ یہ پچھلے مہینے کی بات ہے مرنے سے پہلے اس رانڈ نے مجھے مری ماں نے آگاہ کر دیا کہ میری بچی زندہ ہے۔ اور تمہارے پاس ہے۔ مگر کوئی غم تھا اور نہ کوئی خوشی۔"

یکایک وہ رک گئی اور پوچھ بیٹھی۔ کیسی لگتی ہے وہ میری طرح یا اس کی طرح؟

میں جانتی ہوں تم نے اپنا خون دے کر اسے پروان چڑھایا ہے۔ ڈاکٹر نے تمہارا پتہ بھی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اس سے وعدہ کر کے آئی ہوں کہ صرف ایک نظر دیکھ کر واپس آجاؤں گی۔ مگر بات پکی نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور سچ ہے کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے یہاں آئی ہوں۔"

اسی وقت سنگیتا دوڑتی ہوئی آئی اور ماں سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔

ادونا نے انہیں پھیلائیں مگر سنگیتا اس اجنبی عورت کو دیکھ کر اور بھی میرے قریب آگئی۔

سنگیتا نے اپنی ماں کو نہیں پہچانا، اس لئے ادونا دکھی ہو گئی اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

رات بھر سنگیتا میرے سینے سے لگی سوتی رہی اور میں جاگتا کر سوچتا رہا۔ خیالات کی ایک رو کہتی کہ سنگیتا اس کی ہے، اس لئے اس کے پاس چلی جانی چاہیئے۔ مگر جیسے دھیرے دھیرے کوئی زنجیر میں جکڑ لیتا۔ اور پوچھتا وہ چلی گئی تو پھر تمہارے پاس کیا رہے گا؟ کیسے کیسے دکھ جھیلے ہیں تم نے اس کے لئے ایک لمحہ بھی کیا اسے اپنا اولاد سے کم سمجھا؟

رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ادونا نے اس بات کا اندازہ لگا لیا۔ اس لئے اس نے کہا۔ "میں جانتی ہوں بہن تمہیں کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ مگر میں مجبور ہوں۔"

ہم بھی مجبور ہیں۔ اس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ تم سنگیتا کو لے جا سکتی ہو۔" میں نے اپنے سینے پر پتھر رکھتے ہوئے کہا۔

اسی شام ادونا سنگیتا کو لے جانے والی تھی، مگر ایک سنگیتا کو بخار آگیا۔ حسب معمول میں رات بھر اس کے سرہانے بیٹھا دوائیں پلاتا رہا۔ تک کی پٹیاں لگاتا رہا۔ ادونا دفتر سے چھٹی لے کر آئی تھی اس لئے وہ زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتی تھی۔

آخر کار ادونا کے جانے کا دن آ ہی گیا۔ میں سنگیتا کے کپڑے بیگ میں بھرتی رہی اور ادونا کو ہدایات دیتی رہی۔ اسے دودھ سونے سے قبل کہانی سننے کی عادت ہے۔ کھی اسے بالکل پسند نہیں۔ نکلیں چیزوں کی وہ زیادہ عادی نہیں۔ ہوا کے بدلتے ہی اسے گرم کپڑے

پہنائے جائیں۔ دوا کی ساری شیشیاں رکھ دی گئیں۔ ان پر ہدایات درج ہیں، اس کے مطابق دوا جاری رکھی جائے۔ میں جانتی تھی سنگیتا میرے بنا جانے کے لئے تیار نہ ہوگی۔ اس لئے میں نے نارونا کو رات کی گاڑی سے جانے کے لئے کہا۔ اس وقت تک سنگیتا سو جائے گی پھر اسے لے جانے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

میں صرف اتنا ہی کہہ سکی، "سنگیتا کا خیال رکھنا۔" مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے گاڑی تک چھوڑ آتی۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور رو رو کر جی ہلکا کرتی رہی۔ ایک بے بس اور مجبور ماں کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہے؟

رات آدھی سے زیادہ بیت گئی۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا اور پورے گھر پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور سنگیتا کے کمرے کی طرف دوڑ پڑی۔ جو سُنسان پڑا تھا۔ سامنے کھانے میز تے باندھ کر اور ناکو دے دیئے۔ اس لئے درد و دیوار سے اور بھی اداسی چھلک رہی تھی۔ میں نے سنگیتا کی کھاٹ کے کٹہرے کو پکڑ لیا۔ اور زار و قطار روتی رہی۔ جب رو رو کر جی نہیں بہلا تو پھر اٹھ کر پورے گھر کا سنّاٹا کھانے کو دوڑا۔ جس پر سنگیتا سکون کی نیند سویا کرتی تھی۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سنگیتا اپنی جگہ موجود تھی اور مجھ کی نیند سو رہی تھی۔ لیکن ایک میں نے اپنا سامان اور ناکے کمرے کی طرف کر دیا۔ شاید اس نے آج جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہو۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ سنگیتا کا بیگ جو کپڑوں اور کھلونوں سے بھرا ہوا تھا اپنی جگہ موجود تھا۔ میں دوڑتی ہوئی سنگیتا کے کمرے کی جانب مڑی۔ تکیے کے قریب ہی ایک چھوٹا سا پرزہ ملا۔ جس پر لکھا تھا۔ پیاری ممی!

تمہارا دل مجھ سے نہیں بہلا جانا۔ یہ بات یقیناً سچ ہے کہ میں نے اسے جنم دیا۔ پر تم نے بھی اپنا خون دے کر اسے نئی زندگی عطا کی۔ میں نے اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیا ہے کہ تم سنگیتا کے بنا کبھی زندہ نہیں رہ سکتیں۔ تم اسے اپنی ہی سمجھ کر اس کی پرورش کرنا۔ میں کبھی کبھار اسے دیکھنے آیا کروں گی۔ تمہاری ـــــ ارونا

میں نے سنگیتا کو اپنی باہوں میں سمیٹا اور اپنے کمرے کی جانب چل پڑی۔ جیسے زندگی کی ایک نئی کہانی پھر شروع ہو رہی ہو۔۔۔ !

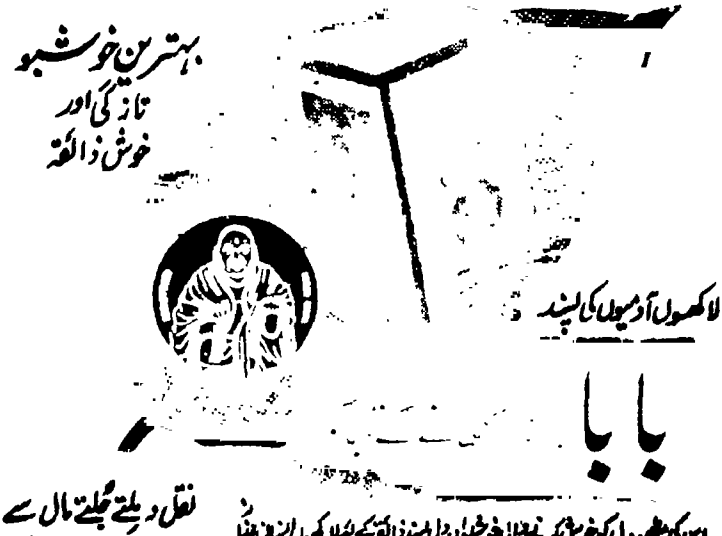
بہترین خوشبو
تازگی اور
خوش ذائقہ
لاکھوں آدمیوں کی پسند
بابا
اس کی دھیمی دل کو خوش کر دینے والی خوشبو اور دل پسند ذائقہ کے لاکھوں انسان دیوانے ہیں۔ پان کے ساتھ کھانے سے اس کی خوشبو ذائقہ کو دوبالا کر دیتی ہے اور دیر تک اس کی تازگی بنی رہتی ہے۔ فہرست مفت حاصل کیجیے۔
نقل و ملتے جلتے مال سے
ہوشیار دہلی والوں کا
"بابا چھاپ" دیکھ کر خریدیے
تیار کردہ:- دھرم پال پریم چند۔ چاندنی چوک دہلی ۶

شاعر بمبئی
NATIONAL PRESS
MEHFIL KHANA

بشر نواز — شاہد صدیقی (لکھنوی)

غزل

9 JUL 1982

اِس شہر کی گلیوں میں چرچے ہیں مرے دل کے
افسانہ و افسانہ قصّے ہیں مرے دل کے

کس مرد کے چہرے سے اُلٹوں میں نقاب آخر
ہر مرد سے انجانے رِشتے ہیں مرے دل کے

اک قیدِ مسلسل ہے اُس شوخ کی چاہت بھی
اب خیر مری آہوں پر پہرے ہیں مرے دل کے

بھٹکے ہوئے خوابوں کو ڈھونڈوں تو کہاں ڈھونڈوں
رستے تو کئی دن سے سُونے ہیں مرے دل کے

کیفیتیں کچھ کچھ تو شعروں سے ہوئیں ظاہر
کچھ رنگ جبیں سے بھی جھلکے ہیں مرے دل کے

معجز بیاں ہیں نُطقِ گہربار کی طرح
ہم وہ کہ چُپ ہیں سایۂ دیوار کی طرح

نادانیوں نے دل کی ہمیں در بدر کیا
ہم بھی گراں تھے ورنہ ترے پیار کی طرح

ٹھہرا نہ گُل فروش جہانِ خراب میں
موسم کوئی بھی موسمِ دیدار کی طرح

برباد یوں سے کھیل کے اے خودسری تجھے
ہم کر چلے عظیم غمِ یار کی طرح

سوچیں ہیں بار بار، پہ بولیں ہیں گاہ گاہ
ہم کم سخن ہیں نُدرتِ افکار کی طرح

شاہد مہک رہی ہے خیالوں کی انجمن
اب تک کسی کی زُلفِ طرحدار کی طرح

یعقوب راہی

اُردو مرثیہ کا تدریجی ارتقاء

مرنے والا مرتا ہے تو اُس کے عزیزوں اور دوستوں پر غم واندوہ کے بادل چھا جاتے ہیں۔ زندگی کیسی ہی کیوں نہ ہو ہر شخص عزیز ہوتی ہے۔ عمر کی زندگی گذارنے کے باوجود بھی کوئی بخوشی موت قبول نہیں کرے گا۔ دُنیا کی محبت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ انسان کسی صورت اسے چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ اُس کی دولت، اُس کے عزیز اور اُس کی اُمیدیں اُسے کھینچتی رہتی ہیں۔ دوست اپنے رفیق کو، بیوی اپنے شوہر کو، بہن اپنے بھائی کو اور ماں باپ اپنے لختِ جگر کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ یہ چاہتے ہیں کہ جب تک اُن کا دم میں دم ہے وہ بھی ساتھ رہے۔ لیکن قضا کسی کی نہیں سنتی۔ عزرائیل آتے ہیں اور اپنا فرضِ منصبی بلا لحاظ ملک و ملت ادا کر جاتے ہیں۔ پسماندگان کے لئے اپنے عزیز کی جدائی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ یہ غم اور یہ الم ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ کوئی دھاڑیں مار کر روتا ہے، کوئی بال نوچتا ہے کوئی اُس غم کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ الغرض رنج و غم کا اظہار بہت سے طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ مرنے والے کی خوبیاں گنائی جاتی ہیں۔ اُس کے کارناموں کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ غرض اُس کی زندگی بھر کی خوبیوں اور اچھائیوں کو گنا گنا کر ماتم کیا جاتا ہے۔ اس میں تصنع اور بناوٹ کو دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ رونے والا صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ کسی کو سُنانے اور جتانے کی خاطر وہ داد نہیں کرتا۔

یہی غم واندوہ اور رنج والم شاعری کی زبان میں مرثیہ کہلاتا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں عربوں کے یہاں مرثیہ کے نقوش ملتے ہیں۔ اسلام سے قبل بھی عربوں کے یہاں مرثیہ نگاری موجود تھی۔ اپنے عزیزوں کے مرنے پر شاعر مرثیے لکھتے تھے۔ جس میں رونے رُلانے کی باتیں ہوتی تھیں۔ لیکن اسلام سے پہلے یہ صنف اتنی ترقی یافتہ نہ تھی۔ "واقعۂ کربلا" اس صنف شاعری میں نمودِ صبح ہے۔ امام مظلوم کی شہادت کا سیاسی پہلو خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو لیکن اتنا ضرور صحیح ہے کہ یزید نے رسولِ خدا کے نواسے پر جو ظلم و ستم کیا یہ ظلم اور ستم اتنا شدید تھا کہ آسمان تھرا گیا، زمین کانپ اٹھی اور مسلمانوں نے خون کے آنسو بہائے۔ یہ ایک قومی سانحہ تھا۔ سارے عالم کے مسلمانوں کے دلوں میں یزیدی طاقت کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ عربی شعراء نے پُر سوز مرثیے لکھے۔ جن کی تاثیر کا حال یہ تھا کہ لوگ سُنکر بیقرار ہو جاتے۔ اور دھاڑیں مار مار کر آہ و زاری کرتے۔ غرض واقعۂ کربلا نے مرثیہ کے لئے لافانی مواد فراہم کیا۔ عرب شاعر حقیقت پسند تھے۔ چنانچہ اُنکے مرثیوں میں بھی مبالغہ نہیں تھا۔ لیکن جب یہ صنفِ شاعری ایران میں آئی تو ایرانی ماحول میں رنگ گئی۔ شاعری کی اور اصناف کی طرح اس میں بھی تصنع اور بناوٹ داخل ہوئی۔ مبالغہ پسند ایرانی شاعر مرثیہ نگاری میں حقیقت کو نباہ نہ سکے۔ بچائی سے معرا مرثیے ہارون الرشید کے عہدِ خلافت میں اپنا مقام کھو چکے تھے۔ چنانچہ ہارون نے مرثیوں کا پڑھنا رکوا دیا۔ کیونکہ اس سے عوام کے جذبات برانگیختہ ہونے کا خطرہ تھا۔ ایران پر تاتاریوں کا حملہ ایک آسمانی مصیبت تھا۔ لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ علم و ادب کی شمعیں گل کی گئیں۔ اور اسلامی تہذیب و تمدن کا سرمایۂ عظیم خاک میں مل گیا۔ یہ خونچکاں منظر فارس کے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ اُن کی زندگی میں گریز کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے

ب تصوف نے ترقی کی اور عطار اور مولوی جیسے بزرگ پیدا ہوئے۔ دنیا کی بے ثباتی کے مناظر [illegible] کو مقبولیت اپنے
ادیا تھا۔ چنانچہ اس دور میں قصیدہ کی جگہ مرثیہ نے لے لی۔ اور فارسی شاعری میں اچھے اچھے مرثیے [illegible]

اسی زمانہ میں ہندستان میں اکبر برسرِ حکومت تھا۔ اس کے دربار کی شاعرانہ تقاضائے آخر میں امام حسینؑ کی [illegible]
شعار لکھ دیا کرتے تھے۔ بیجاپور اور گول کنڈہ میں شیعیت کا زور تھا۔ ان درباروں میں ایران سے آئے ہوئے شاعروں کی بھرمار
تھی۔ چنانچہ اردو زبان میں مرثیہ نگاری کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ اس زمانے کے مرثیہ نگاروں میں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، شاہی، غواصی، لطیف
اللہ قطب شاہ اور بیجاپور کے علی عادل شاہ، ہاشمی، مرزا وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان درباروں کی سرپرستی اور ادبی سرگرمیوں
نے صرف مرثیہ گوئی کا آغاز ہی نہیں بلکہ متعدد ایسے شاعر بھی پیدا ہوئے جو صرف مرثیہ ہی کہتے تھے۔ یعنی شاہی، مرزا، کاظم وغیرہ۔ آخر دور
کے مرثیہ کہنے والوں کا عہد تقریباً سو سال کا ہے جس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تقریباً سب مرثیہ گو غزل کی ہیئت
میں مرثیہ کہتے تھے۔ جو ابتدائی زمانے کے مرثیوں کے علاوہ زیادہ تر مسلسل ہیں۔ جذبات و خیالات کا اظہار بھی سیدھے طریقے سے کیا گیا
ہے۔ زبان گرچہ قدیم ہے لیکن تسلسل اور واقعہ نگاری کی جھلک آگئی ہے۔ یہ مرثیے محرم کی مجلسوں میں پڑھنے کیلئے مذہبی جذبات کے
تحت لکھے گئے تھے۔ ان کا مقصد رونے رُلانے کے سوا کچھ نہیں۔ خوش آواز شاعر بڑے سوز و درد سے مرثیے پڑھا کرتے تھے۔ اس
دور کے مرثیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں واقعاتِ کربلا کا ذکر مجموعی حیثیت سے ملتا ہے۔ الگ الگ شخصیات کو لے کر ان کی تصویریں
پیش کرنے کا طریقہ دوسرے دور کی اختراع ہے۔

مرثیہ نگاری کا دوسرا دور بارھویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ اور رنگ زیب کے زیرِ نگیں آچکے تھے۔
علی عادل شاہی اور قطب شاہی درباروں کے ختم ہوجانے کے بعد بھی اردو شعر و شاعری لوگوں میں ویسی ہی مقبول رہی۔ البتہ یہ ضرور ہوا
کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے بجائے اب شاعروں کا جمگھٹ اورنگ آباد میں ہوگیا جو دکن میں سلطنتِ مغلیہ کا صدر مقام تھا۔ دکن کی یہ سیاسی
تبدیلی اردو مرثیے کے پہلے اور دوسرے دور کی حدِ فاصل قرار دی جاسکتی ہے۔ دوسرے دور کے مرثیے کی زبان نکھر گئی اور اظہار پر بھی
لوگوں کو قدرت آگئی۔ جس کی وجہ سے کلام میں صفائی اور ہمواری آگئی۔ مناسب بحروں کا انتخاب، الفاظ کی زیادہ پرتاثیر ترتیب، شاعرانہ تاویلات
و استعاروں کے حسن کو ساتھ مرثیے کی [illegible] میں طبع آزمائی، اس عہد کے مرثیوں کی ظاہری خصوصیات ہیں۔ پہلے دور کے مرثیوں میں واقعاتِ کربلا کا ذکر مجموعی حیثیت سے
ملتا ہے۔ لیکن بعد کے لکھنے والوں نے حضرت قاسمؑ، حضرت حُرؑ اور حضرت علی اصغرؑ کے متعلق اقتضائے حال کے مطابق مضامین پیدا
کئے۔ تخیل کی مدد سے مکالمے، گفتگو اور رسوم کے رنگ بھر کر ان مرثیوں کو ہم سے قریب لائے۔ جناب شہربانو کا اپنے کمسن حوان علی اکبرؑ
اور معصوم علی اصغرؑ کو یاد کرکے رونا، حضرت زین العابدینؑ کی بیماری اور ضعف اور سخت سکینہؑ وغیرہ سے مرثیہ کے لئے نئی راہیں نکلیں۔ جن
سے ردوِ اثر میں اضافہ ہوا۔ مضامین میں مرزا کے بعد دوسری جدّت سیدان کے یہاں ملتی ہے۔ جنھوں نے ایک مرثیہ میں کربلا میں شادی کا
سامان ترتیب دیا۔ حسنِ بیان اور بحر کے مناسب انتخاب نے اس مرثیہ میں بڑی تاثیر پیدا کی۔ اس دور کے مشہور مرثیہ نگاروں میں
ذوقی، احمد، اشرف، امامی، اور ہاشم علی برہانپوری کے نام نمایاں ہیں۔ ہاشم علی کی شخصیت دکنی مرثیہ گویوں میں ممتاز ہے۔ انھوں
نے اپنا مجموعۂ مراثی ردیف وار مرتب کرکے اس کا نام دیوانِ حسینی رکھا۔ دیوانِ حسینی میں ۳۸ مرثیے اور سلام ہیں۔ اس دور کے
مرثیوں میں مکالموں نے راہ پائی۔ اور مکالموں کی وجہ سے نہ صرف اصل منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ بلکہ کرداروں کے خاکے بھی ساتھ ساتھ بنتے
ہیں۔ دوسرے دور میں جب شہیدوں کے حال کے الگ الگ مرثیے لکھے گئے تو ان میں جذبات کی ترجمانی، رزمیت، جنگ، شجاعت اور
بہادری کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس طرح ان تمام عناصر کی جھلکیاں آگئیں جو لکھنؤ پہنچ کر اردو مرثیے کے اجزائے ترکیبی قرار پائے۔ ان مرثیوں
کے کردار اور جذبات نگاری میں ہندستانی ماحول و فطرت کا خاص خیال رکھا گیا۔

دکن کے مرثیہ گویوں سے شمالی ہندی واقفیت رکھتا تھا۔ میر و سودا کا زمانہ اردو شاعری کا عہدِ زرّیں ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں
شعر و شاعری کا چرچہ گلی گلی میں تھا۔ ہر محلہ میں شاعر رہتے تھے۔ شاگردوں کے گروہ استادوں سے اصلاح لیتے تھے۔ اس زمانے کی شاعری

کا عام رجحان تو غزل کی طرف تھا لیکن مرثیہ گوئی کا رواج بھی بہت تھا۔ لوگ حصولِ ثواب کے خیال سے مرثیے لکھتے اور بڑی بڑی مجلسیں منعقد کرتے تھے اسی ثواب کے خیال سے لوگ مرثیوں کی خاموں پر گشت نمائی کرنا خلافِ ادب سمجھتے تھے۔ خوب پر مذہبی احترام اور وقعت پردہ ڈالے ہوئے تھی۔ اکثر شاعروں نے تو مرثیہ گوئی کو اپنا ذریعۂ معاش بنا لیا تھا۔ یہ میدان نااہل شاعروں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا چنانچہ بگڑا شاعر مرثیہ گو کا حکم لگا دیا گیا — اس زمانے کے مرثیہ گویوں میں سودا، میر، مسکین، حزیں، غمگین، محمد تقی تعلیم مہرباں، عاجز، محزوں، حیدر علی حسرت، احمد، صوفی، سکندر وغیرہ مشہور ہیں۔ ان مرثیہ گویوں نے بہت سے ہندی الفاظ اپنے مرثیوں میں استعمال کئے جو دیگر اصناف میں استعمال نہیں کئے گئے تھے۔

مرثیوں کا مقصد اب بھی رونا رلانا تھا مرثیے اب بھی بہت سیدھے سادے لکھے جاتے تھے۔ میر صاحب کے زمانہ میں مرثیہ گوئی میں کوئی خاص ترقی نہ ہوئی۔ چونکہ جاگیر داری کا زور تھا، اس لئے مرثیے میں بھی سلام اور مجرے داخل ہوئے۔ یہ صنف جب لکھنؤ پہنچی ہے تو بگڑا ہوا ماحول پاتی ہے۔ خوش نگاری زوروں پر تھی۔ رنگینیت رچی بس چکا تھا۔ لیکن اب بھی کچھ خدا ترس ایسے تھے جنھیں اپنی عاقبت کی فکر تھی۔ آصف الدولہ کے زمانے میں امام باڑے وغیرہ بن رہے تھے۔ اس زمانہ میں میر حسن کے صاحبزادے میر خلیق مرثیہ کی شمع جلائے ہوئے تھے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے میدان میں جو بہ دلیلیاں آئیں وہ میر خلیق کے زمانہ میں آئیں۔ مرثیہ کیلئے مسدس کا طریقہ ایک آئین کی صورت اختیار کر گیا۔ اس دور میں میر ضمیر بھی میر خلیق کی طرح غزل سے دست بردار ہو کر مرثیہ گوئی کیلئے وقف ہو گئے۔ اس وقت تک مرثیہ تیس سے چالیس بند تک کا ہوتا تھا۔ میر ضمیر نے مرثیہ لکھا۔

کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے

اس میں شاہزادہ علی اکبرؓ کی شہادت کا بیان ہے پہلے ایک تمہید سے مرثیہ کا چہرہ باندھا، پھر سراپا لکھا، پھر میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچا۔ اور بیانِ شہادت پر خاتمہ کر دیا۔ چونکہ یہ پہلی ایجاد تھی اس لئے تعریف کی آوازیں دور دور تک پہنچیں۔ تمام شہر میں شہرہ ہو گیا۔ اور اطراف و اکناف سے دعوتیں آنے لگیں۔ یہ صنفِ مرثیہ گوئی میں ایک انقلاب تھا کہ پہلی روش متروک ہو گئی۔ اور سب اسی نئی طرز کی پیروی کرنے لگے۔ اسی دور میں میدان دلگیر اور میدان فصیح بھی نامور مرثیہ گو تھے۔ مرزا فصیح حج و زیارت کو گئے اور پھر وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ میدان دلگیر کی زبان میں لکنت تھی چنانچہ میر ضمیر اور میر خلیق کیلئے میدان خالی رہا کہ وہ اپنی طبع کی جولانیاں دکھائیں۔ میر خلیق کے یہاں بیان نہایت درد انگیز ہوتا تھا۔ میر خلیق اور میر ضمیر ایک ہی مجلس میں اپنا کلام نہیں سناتے تھے۔

اس کے بعد مرثیہ گوئی کا سنہرا دور آتا ہے۔ یہ انیس و دبیر کا دور ہے۔ ان اساتذہ نے مرثیہ گوئی کو ترقی کے نصف النہار تک پہنچا دیا میر ضمیر اور میر خلیق کی طرح اس دور میں بھی مرزا دبیر اور میر انیس میں مقابلے ہوتے رہے۔ دبیر نے اپنے استاد میر ضمیر کے نام کو چار چاند لگا دیئے اور میر انیس بھی اپنے باپ میر خلیق کی مسند پر بیٹھ گئے۔ دونوں کے کمال نے سخن شناسوں کے ہجوم کو دو حصوں میں بانٹ لیا۔ آدھے دبیر کے ہو لئے اور آدھے انیس کے۔ میر انیس صفائی کلام، لطفِ زبان، محاورہ کی چاشنی، خوبیٔ بندش، حسنِ اسلوب، مناسبتِ مقام، طرزِ ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے۔ اور مرزا دبیر شوکتِ الفاظ، مضامین کی آمد، اس میں جا بجا غم انگیز اشارے، درد انگیز کنائے۔ المناک اور دلگداز انداز جو مرثیہ کی غرضِ اصلی ہے، ان وصفوں میں بادشاہ تھے۔

اس دور میں لکھنؤ کے بے فکرے لوگوں میں کمال رکھتے تھے اور تماشے کے عاشق۔ چنانچہ دونوں استادوں کے باہمی مقابلوں نے مرثیہ گوئی کی فکر کو شوقِ ایجاد اور مشقِ پرواز میں عرش سے اونچا اچھال دیا۔ ان اساتذہ نے مرثیہ گوئی کو اتنی بلندی پر پہنچا دیا کہ اس سے زیادہ بلندی پر پرواز غیر ممکن معلوم ہوتی ہے۔ ان اساتذہ نے مرثیہ گوئی کو دوسرے اصنافِ شاعری کے مقابل کھڑا کر دیا بلکہ ان میں سے بہت سے اس کے آگے ماند پڑ گئے۔ مرثیہ گوئی میں اس دور نے رنگینی پیدا کر دی۔ اور تشبیہ، استعارہ اور لفظی صناعی سے زبان کو مزین کیا۔ انیس و دبیر کے جلائے ہوئے چراغ آئندہ آنے والے کاروانوں کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ زمانہ بدلتا جائے گا، ادب میں ترقی ہو گی، ممکن ہے صنفِ مرثیہ بھی اپنی منزل ڈھونڈ نکالے لیکن یہ یقینی امر ہے کہ انیس و دبیر کے چراغ کو بجھا کر مستقبل کا مرثیہ گو اپنی منزل نہیں پا سکے گا۔

یہ چراغ جلتے رہیں گے۔ اور ان چراغوں کی روشنی میں مستقبل کا مرثیہ گو اپنی منزل کا نشان پا لے گا۔

۱۸۵۷ء کے بعد سیاسی، سماجی، اور اخلاقی بیداری ہوئی۔ سرسید اور ان کے رفقا کار نے اپنی قوم کو بیدار کرنے کی ازحد کوشش کی۔ مولانا حالی بھی اس مالا کے ایک چمکیلے موتی ہیں۔ حالی نے اردو شاعری کا رخ بدلا اور مسدس مدوجزر اسلام لکھی۔ مسدس حالی مسلم قوم کا مرثیہ ہے۔ اس میں حالی نے اپنی قوم کی تاریخ لکھی مسلمانوں کے زوال پر آنسو بہائے اور ان کے شاندار ماضی سے حاضر کا مقابلہ کیا۔ حالی کا ہر شعر درد و تاثیر سے بھرا ہوا ہے۔ پڑھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی قوم کی بدحالی پر آنسوؤں کا سیلاب امڈ آتا ہے۔ اسی طرح حالی نے شخصی مرثیے بھی لکھے۔

سرسید اور غالب پر لکھے ہوئے مرثیے آج بھی لوگ پڑھتے ہیں۔ اور غالب و سرسید جیسی باکمال شخصیات کی یادوں سے اپنے دلوں کو منور کر لیتے ہیں۔ اسی طرح علامہ شبلی نے بھی اپنے بھائی محمد اسحٰق کی وفات پر ایک مرثیہ کہا۔ یہ مرثیہ نہ صرف مولانا شبلی کی شاہکار ہی ہے بلکہ اردو کے چند بہترین مرثیوں میں سے ایک ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف اثر اور درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ ناممکن ہے کہ کوئی اسے پڑھے اور متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔ اور مولانا شبلی کے درد و غم میں برابر کا شریک نہ ہو۔ مولانا شبلی کے اس مرثیہ میں میر انیس کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔

شاد عظیم آبادی نے بھی مرثیہ نگاری کے میدان میں جوہر دکھائے ہیں۔ شاد کے مرثیوں میں اثر انگیزی کافی حد تک پائی جاتی ہے۔ خاص طور پر شاد عظیم آبادی کے قومی مرثیے توجہ کے مستحق ہیں۔ لیکن ان کے مرثیوں کے مطالعہ سے یہ بات نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنے مرثیوں میں میر انیس کا تتبع کیا ہے۔ اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں فصاحت، مضمون آفرینی اور بلند پروازی پائی جاتی ہے۔ کردار نگاری اور منظر کشی وغیرہ خصوصیات بھی شاد کے مرثیوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

اردو مرثیہ کے سرمایہ میں آج کے دور (بیسویں صدی) میں تقریباً ہر خوش فکر شاعر نے قومی اور شخصی مرثیے لکھ کر گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ اس سلسلے میں تلوک چند محروم کی تخلیقات کافی اہم ہیں۔ محروم نے شخصی مرثیے بہت لکھے ہیں۔ ان کے تمام مرثیے اثر و درد میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کو پڑھ کر ہر شخص متاثر ہو جاتا ہے۔

اردو مرثیہ کے تدریجی ارتقاء میں اعجاز صدیقی کے "کرب خود کلامی" کا ذکر نہ کرنا بہت بڑی ادبی کوتاہی ہوگی۔ "کرب خود کلامی" ہندی اور اردو کا تنازعہ کی پیداوار ہے۔ یہ اپنے وقت کا قومی اور فنی مرثیہ ہے اور اس کا ہر مصرع درد و غم میں ڈوبا ہوا ہے۔

بقیہ صفحہ ۲۹ . . . . "بچن" ——— ہندی کا خیام"

زبان اردو جو فارسی سے اتنی قریب ہے وہ بچن کے ایسا شاعر بھی ان معنوں میں پیدا نہ کر سکی جس میں اپنی مکمل انفرادیت کے ساتھ اپنی مخصوص آواز کا کوئی شاعر ہمارے سامنے پیش کیا جا سکے۔ یہ ہندی کی خوش نصیبی ہے۔!

لیکن بچن کے ساتھ یہ بڑی ٹریجڈی ہے کہ ہندی والے انھیں اردو کا اور اردو والے انھیں ہندی کا شاعر سمجھتے ہیں۔ ہندی والے ناراض ہیں کہ ان کی (بچن کی) شاعری کی بنیاد اردو کلچر پر ہے۔ اور اردو والے ان کے یہاں کوئی نئی بات نہیں پاتے۔ چونکہ خیام کے اثرات اردو میں یوں بھی کم نہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔

بچن کی شاعری میں بیشتر پرانے خیالات کی باز گشت سہی، وہ ہندی ادب کو متنوع جذبات کی قوس و قزح سے روشناس مزید کراتے ہیں۔ اردو والوں کے لئے وہ قابل احترام اس لئے ہیں کہ زبان و بیان کا ایسا گنگا جمنی رنگ پیدا کرتے ہیں کہ دل جھوم اٹھتا ہے اور جدید ادب میں زبان و بیان کا مسئلہ کم اہم نہیں۔ اس حیثیت سے وہ اردو والوں کے لئے قابل تقلید بھی ہیں۔

ظہیر صدیقی

اے سبک ساران ساحل

بے کراں بحر کی پہنائی نگل لے نہ انھیں
موجۂ آب کی تلوار انھیں کاٹ نہ دے
ان کی ہستی خزیں
سیلِ امواجِ بلاخیز کی زد میں کہیں آجائے
اس لئے
موجِ گرداب کے گھبرائے ہوئے بزدل کیڑے
ریگ زارِ لبِ ساحل پہ بناتے ہیں نقوش
چند لمحوں کے لئے
اُلجھے اُلجھے سے پریشان خیالی کے نقوش
ریگ زارِ لبِ ساحل پہ ٹھہر جاتے ہیں
پھر اچھلتی ہوئی بڑھتی ہے کوئی موج آگے
اور دھو لے جاتے ہیں موہوم نقوش
اور پھر خوف سے سہمے ہوئے ان کیڑوں کو
بحرِ بے پایاں کی آغوش نگل لیتی ہے

اب نہ ساحل پہ ہیں نقاش نہ باقی ہیں نقوش
حلقۂ موج میں اُلجھے ہوئے مُردہ کیڑے
تیرتے پھرتے ہیں بے جان سے تنکوں کی طرح

گرمیٔ خونِ عمل، خونِ یقیں سے عاری
لحم و روغن سے مرکب کوئی ڈھانچہ جیسے
ایک ویران محل
زندگی نام نہیں ہے اس کا

یوں بھی یہ جسم کا ڈھانچہ ہے نفس کا مرہون
آمد و شد ہی نفس کی ہے گواہاتِ حیات
ہاں مگر زیست کی ضامن تو نہیں
کیونکہ یہ موت کی مقراض بھی ہے

منجمد خونِ عمل، خونِ یقیں ہو لیکن
سانس رُکتی تو نہیں
موت اک لمحہ ٹھہرتی تو نہیں
لحم و روغن کو کبھی
خضر کی عمر میسر تو نہیں!

بندِ شریانوں میں کچھ قطرہ خوں بکھرے ہیں
ذرہ ہائے یخ سرشتہ ہیں محرومِ رواں و عمل
گرمیٔ عزم و یقیں دے ان کو
برف پگھلے گی تو اک سیلِ رواں
کتنی امواجِ حوادث میں بدل جائے گا
زندگی پھر ان ہی موجوں کے تھپیڑوں میں جگہ پائے گی
موت برحق ہے نہیں اس سے مفر
ہاں مگر
موت آئی اگر اس کشمکشِ طوفاں میں
زندگی سے تو حسیں تر ہوگی۔

(طنز و مزاح)

یوسف ناظم

عاشقی صبر طلب.....!

جو لوگ عشق وغیرہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کے لئے ہمارا پہلا مشورہ تو یہ ہوگا کہ وہ اس فعل کو کچھ عرصے کے لئے ملتوی کردیں۔ بقول شیرازی کی ریسرچ کے مطابق، دمشق میں بھی جب قحط پڑا تھا تو عوام نے عشق کرنا بند کردیا تھا۔ صرف چند مالدار گھرانوں کی حد تک عشق محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ عشق کے لئے خوشحالی پہلے بھی ضروری تھی اور آج بھی ضروری ہے۔ بلکہ ہمارا خیال ہے عشق کے لئے پہلے بنسبت آج کہیں زیادہ سہولتیں حاصل تھیں۔ لوگ قدامت پسند ضرور تھے لیکن آسودہ حال تھے۔ ایک ہی وقت میں کئی کئی عشق کرسکتے اور انھیں خوش اسلوبی کے ساتھ نباہنے کی استطاعت ان میں تھی۔ آج عشق کے مواقع تو بہت ہیں لیکن استطاعت کے نام صفر۔ اس کے علاوہ لوگ کچھ سست اور کاہل بھی ہوگئے ہیں۔ محنت کرنے کا جذبہ ان میں رہا ہی نہیں۔ پہلے زمانہ کے عاشق راتوں میں اٹھ اٹھ کر آہیں کھینچا کرتے تھے۔ آدھی شبی کا لفظ یوں ہی نہیں بنا لیا گیا تھا۔ دن کے اوقات میں وہ بڑی محنت کرتے اور عشق کے امتحان میں کامیاب ہونے کے لئے جان تک لڑا دیتے تھے۔ عشق کا ایک امتحان کامیاب کرتا اور دوسرے امتحان کی فکر میں مبتلا ہو جاتے۔ ان عاشقوں کی صحتیں بھی اچھی تھیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ بچپن سے اچھا کھائے پیئے ہوتے تھے۔ اگر گریبان میں آپ کا منہ سما سکتا ہے تو اس میں منہ ڈال کر دیکھئے اور کہئے کہ کیا آپ کی صحت اجازت دیتی ہے کہ آپ عشق کرسکیں۔ آج کے سارے نوجوان بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔ اور بلڈ پریشر والا کیا عشق کرے گا۔ اچھی صحت کے علاوہ پہلے کے عاشق پہننے کے لئے درجنوں جوڑے اپنے پاس رکھتے تھے۔ روزانہ کم سے کم ایک قمیض کا گریبان تو وہ چاک ہی کر ڈالتے تھے۔ بعض اوقات تو عشق اتنا شدید ہو جاتا تھا کہ قمیض کسی کام کی نہیں رہتی تھی۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

آج کل تو کپڑا اتنا مہنگا ہوگیا ہے کہ ہم نہیں سمجھتے کوئی سمجھدار آدمی عشق کے نام پر ایک آدھ قمیض بھی قربان کرسکے۔

کس درجہ تنگ ہوں ترے ہاتھوں سے اے جنوں — لاؤں کہاں سے روز گریباں نئے نئے

سراج اورنگ آبادی کچھ زیادہ دولت مند نہیں تھے۔ عاشقی کے لئے ان کے پاس مناسب لباس نہ تھا لیکن چونکہ ان کا عشق کرنا بہت ضروری تھا انھوں نے اپنے لئے لباس برہنگی کا انتخاب کرلیا۔

شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اک لباس برہنگی — نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی

عاشقی کے لئے وسیع مطالعہ بھی بہت ضروری ہوگیا ہے۔ عشق میں کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہ کرنا چاہیئے ان باتوں کو جانے بغیر عاشقی کر بیٹھنا ایسا ہی ہے جیسے بغیر ریسٹورنٹ میں کھانا کھانا۔ عشق صرف خوشحالی کا نہیں اصول اور آداب کا بھی تابع ہے۔ عشق کے دوران میں آہیں بھرنا، گریہ وزاری کرنا، نالہ و فریاد و فغاں سے کام لینا، محبوب کا رخ کرنا، بلا وجہ آبادی کی طرف لوٹنا، سنگ در جانانہ پر اپنا خالی سر پٹکنا، خط لکھنا، خط لکھ کر پھاڑ دینا۔ رقیب سے پٹنا، بیمار ہونا، نزع کی تکلیف برداشت کرنا، عاشق کے لئے یہ سب ضروری افعال ہیں۔ اور ان سب کاموں میں آداب کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے مثلاً آہ کی بات ہی کو لے لیجئے۔ اکثر لوگ آہوں کے معاملہ میں دھوکا کھا جاتے ہیں۔

ہوں کے معاملہ میں غلطی کرنا تو جیسے سب کا پیشہ ہو گیا ہے۔ اپنی اس بداعمالی کی وجہ سے آدمی نہ صرف اپنی ذات کو خواہ وہ اپنی ذات کیوں نہ ہو بلکہ اپنی آل و اولاد کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ گرم آہ کے موقعہ پر ٹھنڈی آہ استعمال کرنا یا ٹھنڈے کے موقعہ پر گرم آہ کی وجہ سے آہ و سوزاں کو معرض میں لانا ایک عام غلطی ہے جو علماء ہوں یا فضلاء، عقلاء ہوں یا کلماء سبھی سے سرزد ہوا کرتی ہے یہ ہو گئی ہے کہ خود اس بات پر بھی افسوس کے اظہار کے لئے لوگ جو آہ کھینچتے ہیں وہ اکثر گرم ہوا کرتی ہے۔ حالانکہ اردو اور فارسی مستند کتابوں میں افسوس اور تاسف کے موقعہ پر آہ سرد تجویز کی گئی ہے۔ واقف کار لوگ دوسرے کی بیوی کی طرف دیکھ کر بیشتر آہ سرد کھینچا کرتے ہیں۔ اس آہ میں عشق کا عنصر کم اور حسرت کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ سرد آہ کھینچنا زیادہ مشکل کام نہیں۔ ٹھنڈی آہوں سے آس پاس کے لوگوں کو تکلیف نہیں پہنچتی۔ آہ کھینچنے والے کے دل کو البتہ تقویت پہنچتی ہے مثلاً بس آئی اور گذر گئی، آپ وہیں کھڑے رہ گئے۔ بس میں چڑھ جانے کے بعد کنڈکٹر نے آپ کو اتار دیا تو آپ بجائے گالی دینے کے، ٹھنڈی آہ کھینچ سکتے ہیں۔ اس جذبے سے آپ کے اعصاب کا تناؤ دور نہیں ہو گا لیکن ایک آہ سرد آپ کی کوفت کو دور کر دے گی۔ اسی لئے آپ نے دیکھا ہو گا کہ بسوں، ٹراموں اور ٹرینوں میں ہر شخص آہ سرد جو کھینچتا رہتا ہے ـــــ آہ سرد کھینچنے کیلئے ہمیں قدرت نے بکثرت مواقع فراہم کئے ہیں۔ سرد آہیں کھینچنے میں ہمارے بزرگوں نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔ ان کی اولاد بھی ہر موقعہ پر ٹھنڈی آہ کھینچتی ہے اور آسمان کی طرف دیکھ لیا کرتی ہے کہ آہ ادھر جا رہی ہے یا نہیں۔ آہیں بھرنے کیلئے ہمیں روز کوئی نہ کوئی وجہ مزید مل جاتی ہے بلکہ اب تو فیشن یہ ہو گیا ہے کہ اگر کوئی وجہ نہیں ملتی اس بات پر بھی ہم آہ سرد کھینچتے ہیں کہ یہ کیا غضب ہو گیا۔

سب سے گھٹیا قسم کی آہ، سادی آہ ہوتی ہے۔ یہ نہ گرم ہوتی ہے نہ ٹھنڈی۔ یہ آہ کھینچی نہیں صرف کی جاتی ہے۔ سادی آہ کرنے سے ذہنی بدنامی ہوا کرتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے ایک فیصلہ میں لکھا ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام ۔۔۔ وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

عاشقوں کو سادی اور ٹھنڈی دونوں قسم کی آہوں سے پرہیز کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ عاشقی کی شان آہ سوزاں میں ہے۔ پہلے زمانہ میں موسم سرما میں عشاق گرم آہوں سے آتش دان کا کام لیا کرتے تھے۔ کون انگیٹھی سلگائے لحاف تاپے، ایک آہ گرم کھینچی اور سردی پاؤں تک آ گئی ہو گئی۔ عاشقوں کے جسم خود کھانا رکھنے کے کام کیسں ہوا کرتے تھے بلکہ یوں سمجھئے عاشق کسی بکری کے تنور کی طرح گرم رہا کرتا تھا۔ اب یہ گرمی، آج کے نوجوان کہاں سے لائیں گے۔ یہیں بہ آواز بلند رونا بھی نہیں آئے گا۔ رونا آیا بھی تو ہمسائے بری طرح جھڑکیں گے۔ میر کے زمانہ میں تو مکان بڑے وسیع ہوا کرتے تھے اور ایک مکان سے دوسرے مکان کا فاصلہ بھی زیادہ ہوا کرتا تھا لیکن میر کے ہمسائے سو نہیں سکتے تھے کیونکہ بحیثیت عاشق، میر کیلئے بآواز بلند رونا ضروری تھا۔

ہمارے شور سے میر سو رہا ہے گا ۔۔۔ تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

آج تو مکانات کا وہ قلت ہے اور ان کا طرز تعمیر بھی اتنا ناقص ہے کہ بیوی کے کان میں بھی کوئی بات کہو تو پڑوسی سن لے۔ بآواز بلند رونا تو ایک طرف رہا۔ عاشق روئے گا نہیں تو کیا دم سادھ کر سو رہے گا۔ چلئے رونے کی سہولت سے بھی محروم ہو گئے۔

عمدہ عشق کے لئے دھیان لگانا بھی لازمی ہے۔ طبلچی اور بھیونڈی کے ساتھ محبوب کی یاد اور تصور میں اتنا ڈوب جانا چاہئے کہ آدمی کو خود کی خبر نہ آئے۔ عاشق اپنے تصور کی اصل میں تربیت کرتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس منزل پر لے آتا ہے جہاں تصور میں اصل کا لطف آنے لگتا ہے۔ جلیل نے اس معاملہ میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔

ہائے اچھوتے تصور کے مزے ۔۔۔ گود میں ان کو لئے بیٹھے ہیں

ہمارے ایک دوست کو پہلے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ شعر محبوب کی شان میں کہا گیا ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ یہ شعر شاعر نے اپنے بچوں کی یاد میں کہا ہو گا۔ جمع کا صیغہ استعمال کر کے، شاعر نے واقعی غلط فہمی پیدا کر دی۔ آج کے عشاق خود گود میں بٹھائے جانے کے لائق ہوتے ہیں۔ کمزور اور منحنی۔ ٹیڈی عاشقوں نے عشق کا ستیاناس مار دیا ہے۔ اختر شیرانی بھی اب کھانے وغیرہ سے

(بقیہ صفحہ ۴۷ پر دیکھئے)

اقبال بیجاپوری

غزل

جب سے بیدار ہو گئی دُنیا
شہرِ آزار ہو گئی دُنیا
خوف رہتا ہے جس کے گرنے کا
ایسی دیوار ہو گئی دُنیا
دُھول اُڑاتی ہے یاس و حسرت کی
دشتِ پُرخار ہو گئی دُنیا
جب بھی نامِ خلوص ہم نے لیا
ہم سے بیزار ہو گئی دُنیا
یا بجولاں ہے خیر کی دلوی
شر کی سرکار ہو گئی دُنیا
ہر قدم مشکلات ہیں، یارو!
راہِ دُشوار ہو گئی دُنیا
ابنِ مریم کی یاد آتی ہے
اتنی بیمار ہو گئی دُنیا
ایک بھی تو نہیں دُکانِ خوشی
غم کا بازار ہو گئی دُنیا
بھول بیٹھی ہے جبرِ قدرت کو
اتنی مختار ہو گئی دُنیا
ہم پڑے ہیں ابھی وہیں کے وہیں!
تیز رفتار ہو گئی دُنیا!
خاک چھنوا رہی ہے اے اقبالؔ
کوچۂ یار ہو گئی دُنیا

ظفر غوری۔ کوڑہ (راج)

غزل

تری نظر کی کرن شب کدوں کا ساز بنی
ہمارے خوں کی شفق، صبحِ نو کا راز بنی
وہ اک نگاہ جو شرما کے رقصِ جام ہوئی
وہی نظر جو اُٹھی عرش کا فراز بنی
ہم اہلِ درد کو دُنیا کی ہر ادائے ستم!
خیالِ دوست کے پرتو سے دِلنواز بنی
جنوں نے کر دیا باہم ہزار عالم کو
خرد دِلوں کے لئے حدِ امتیاز بنی
یہ زندگی کہ گنہگارِ غم ازل سے تھی
حریمِ مے سے جو گزری تو پاکباز بنی
کسی کی یاد کبھی چاندنی کے بستر پر
کسی حسیں کا مہکتا سا جسمِ ناز بنی
ہمارا ذکر ہے ماتم کسی گلستاں کا
تمھاری بات خرابے میں گل طراز بنی
ظفرؔ وہ بات جو لوح و قلم سے فاش ہوئی
دلوں کا سوز بنی، روح کا گداز بنی

افسانہ

شیام کنول

ایک جھونپڑی کی کہانی

اس ویران اور بے نور موڑ سے آگے اس اجاڑ ٹیلے پر ایک اکیلا بوڑھا تاڑ نہ جانے کب سے کمر جھکائے کھڑا ہے۔ جب میرا مالک میری تخلیق میں مصروف تھا تو بڑے زور کی ہوا چلی تھی اور بوڑھے تاڑ کی عمیدہ کمر اس طرح ہلتی تھی گویا اس کی چوٹی پر لرزتے پانچ پتوں میں سے دو ٹوٹ کر دھرتی پر آ رہے تھے۔ بوڑھا تاڑ دو پتوں سے محروم ہو گیا۔ لیکن اس کی محرومی نے میرے مالک کو خوش کر دیا۔ دو پتے میری تکمیل کا باعث بنے۔ چھت جو ادھوری رہ گئی تھی اس کے لئے اب میرے مالک کو فکر زندہ گئی۔ اور میں تکمیل پا گئی۔ اس طرح میری تخلیق و تکمیل میں بوڑھے تاڑ نے بھی حصہ لیا۔ شاید اس لئے کہ وہ بھی ویرانے اور تنہائی سے اکتا گیا تھا۔ لیکن میرا وجود بھی اس خموشی کو توڑ نہ سکا۔ چار، پانچ فٹ اونچا اور اتنا ہی چوڑا میرا وجود کبھی دیئے کی لو کی تھرتھراہٹ نہ دیکھ سکا۔ کبھی چراغ کی روشنی اسے منور نہ کر سکی۔ کبھی یہاں سائے نہیں رینگے۔ قہقہوں کی گونج نہیں ابھری اور کبھی مسکراہٹوں کی روشنی میرے دامن پر کھیل نہ سکی۔ ایسا نہیں ہے کہ یہاں ــــــ میری آغوش میں انسان نہیں بستے۔ ہر شب رات کے سناٹے میں، میں دو ذی روحوں کو اپنی آغوش میں جگہ دیتی ہوں۔ ایک میرا مالک اور دوسری اس کی چہیتی بیوی۔

میری مالکن شام ڈھلنے سے کچھ پہلے چلی آتی ہے۔ اس کے کچھ دیر بعد مالک۔ وہ جب آتا ہے تو چند لمحوں کے لئے سوئے ہوئے ویرانے جاگ اٹھتے ہیں۔ ایک پُر سوز لیکن محبت آمیز آواز سناٹے میں گونجتی ہے۔ "کرنا"۔ اور کرن میری مالکن اپنے شریک زندگی کی تھکی ہاری امیدوں کو سہارا دینے آگے بڑھتی ہے۔ اور میرا مالک۔ وہ بیک اپنے سر سے اٹا ہوا مرچ اور لکڑی کی گٹھڑی اتار کر دھرتی پر رکھ دیتا ہے۔ پھر کچھ دیر کے لئے دھرتی کی ٹھنڈی اور سخت چھاتی اسے اپنے سینے سے لگا لیتی ہے اور بوڑھے تاڑ کے نیچے آگ کی لپٹیں اٹھنے لگتی ہیں۔ کچھ دیر تک شعلے بھڑک کے بیٹھ جاتے ہیں اور ان شعلوں کے قریب بیٹھی میری مالکن کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں لرزنے لگتی ہیں اور میرا مالک اپنی بھوک، تھکن، افلاس اور زندگی کی ناکامیوں کو فراموش کر کے اپنی ہمسفر کے چہرے پر عیاں بھوک، آنکھوں سے جھانکتے خلوص اور ماتھے پر لرزتی پسینے کی ننھی بوندوں کو تکنے لگتا ہے، اور تکتے تکتے سوچنے لگتا ہے، کاش میں کے ماتھے پر لرزتی پسینے کی بوندیں موتی بن جاتیں اور سوچتے سوچتے وہ مفلوک الحالت کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ پھر میری مالکن کی آواز اسے واپس بلاتی ہے تو وہ چونک پڑتا ہے۔ مالکن ایک پھٹے پرانے کپڑے پر گرم روٹی رکھ دیتی ہے جس پر کچھ مرچیں، پیاز اور نمک کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ جب میرا مالک یہ روٹی نمک، پیاز، مرچ اور پانی کی مدد سے حلق سے اتارتا ہوتا ہے۔ تو میری مالکن اداس آتی اور وہ پرانا پھٹا ہوا بوریا جو عرصہ سے اُن کا ساتھی ہے بچھا دیتی ہے پھر باہر نکل کر مالک کے قریب بیٹھ جاتی ہے۔ عموماً دونوں خاموش رہتے ہیں، کیونکہ اُن کے پاس باتیں کرنے کیلئے کوئی موضوع نہیں ہے مستقبل کا کوئی منصوبہ ہے نہ ماضی کی کوئی داستان۔ کبھی کبھی کوئی جملہ کسی کے لبوں سے پھسل پڑتا ہے اور پھر خموشی چھا جاتی ہے۔ میرا مالک اپنے حصے کی روٹی کھا چکنے کے بعد لیٹ جاتا ہے۔ مالکن اپنے حصے کی بچی ہوئی روٹی کھانے بیٹھتی ہے۔ جب وہ بھی کھا چکتی ہے تو دونوں میری آغوش میں سما جاتے ہیں اور دھندلے نے پر رات کی سیاہ چادر تنتی رہتی ہے۔

ماضی کا ایک واقعہ سناؤں! مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے جب میری مالکن نے ایک خواہش ظاہر کی تھی۔ اپنی پہلی لیکن ایسی خواہش جس

کا اظہار شاید ہی کوئی عورت کرتی ہو۔ کیسی لرزش تھی اُس کے اظہار کے وقت! یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وہ دونوں اس ویرانے میں نئے نئے آئے تھے، اور ۔ ۔ ۔ ۔ اُن کے چہروں پر ابھی مسرت جواں تھی۔ اُمنگوں کی جوالا، اُمیدوں اور ارمانوں کا چھلکتا خزانہ زینتِ دل تھا۔ مالکن کا چہرہ جنگلی گلاب کا سا تھا تو مالک کا چہرہ سرخ اور سیم جیسا تھا۔ اُن دنوں میلا رنگ روپ بھی کچھ اور ہی تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے سیلوے کا جوڑا، گھنگھرو اور سنگھار مار کر نئی نویلی دلہن کو گھونگھٹ اُلٹ کر بٹھا دیا ہو۔ ہاں یہ اُن ہی دنوں کی بات ہے۔ اُس دن مالکن جلد لوٹ آئی تھی۔ آکر اس نے میری صفائی شروع کر دی۔ کپڑے جھٹک کر ایک طرف رکھے۔ بستر جھاڑ پونچھ کر ٹھیک کیا۔ لوریا جو ابھی نہا تھا، دھوپ کھانے کیلئے باہر ڈال کر اس پر ایک پتھر رکھ دیا پھر چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہو کر آنگن میں جا بیٹھی۔ بہت دیر تک وہ اطراف میں پھیلے ویرانوں اور جھاڑ جھنکاڑ کو تکتی رہی۔ شام ڈھلے جب مالک لوٹ کر آیا تو وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔ "کرنا! "مالک کی آواز پر وہ چونکی۔ "آج تو جلدی آ گئی" "کام نہیں ملا" مالکن نے اداس لہجے میں کہا۔ "کوئی بات نہیں۔" مالک نے سر سے پوٹلی اتارتے ہوئے کہا اور مالکن چپ چاپ وہ گٹھری سنبھال کر چولہا جلانے بیٹھ گئی۔ پھر وہ کھانے سے فارغ ہو کر میرے گھر سے چلے اندھیرے میں ڈوب گئے۔ سناٹا۔ خموشی ۔ ۔ ۔ چند پل اس طرح بیتے جیسے صدیاں گذر گئی ہوں۔ یوں سے میرے گھیرے میں ایسی ہی تاریکی کا راج ہے۔ یہاں امریدوئیں جنم لینے سے پہلے دم توڑ دیتی ہیں۔ محبت مجبوریوں تلے دب کر رہ جاتی ہے اور زندگی سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہے۔ زمانے نے کئی کروٹیں لیں لیکن لاکھ گھڑیوں میں تنے اندھیروں کا جال نہ ٹوٹ سکا۔ ان ننگے تاریک گھروں میں صدیوں سے انسان روشنی کی تمنا لے کر جنم لیتا آ رہا ہے، روشنی کے پیچھے دوڑتے دوڑتے دم توڑ رہا ہے لیکن ایک کرن ۔ ۔ ۔ ۔ روشنی کی ایک کرن بھی ان تاریکیوں تک نہ پہنچ سکی۔ آخر کب تک ۔ ۔ ۔ کب تک یہ تاریکی پھیلی رہے گی؟ کب تک ان اندھیروں میں جنم لینے والی زندگی کا دم گھٹتا رہے گا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ چند پل ۔ ۔ ۔ ۔ چند پل بیتے۔ ایک خیال آیا اور گذر گیا۔ معاً اس تاریک سناٹے میں جذبات سے لبریز، کرن کی سرگوشی گونجی "آواز! "دیپو" "ہوں" "تجھے یہ اندھیرا، یہ ویرانہ، یہ سناٹا بہت پسند ہے کیا؟" "نہیں" "مجھے پسند نہیں" "کوئی بھی انسان پسند نہیں کرتا انہیں۔" اسی لئے میں چاہتی تھی کہ ۔ ۔ ۔ ۔ کرن نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ "کیا چاہتی ہے؟" دیپک کی آواز میں جوالا کا رس تھا۔ "میں چاہتی تھی کہ ہم آنگن میں ۔ ۔ ۔ ۔ کرن نے بات پھر ادھوری چھوڑ دی۔ "کہہ ڈالو کرن کیوں گئی۔" دیپک نے ہمت بڑھائی۔ لیکن کرن کچھ بھی نہ بولی۔ چند لمحوں کی خموشی کے بعد دیپک ہی نے گویائی کی جسارت کی۔ لیکن اس آواز میں پہلے کا سا رس نہ تھا۔ اداسی کی گہری دھند میں ڈوبی اس آواز میں کچھ جلنے کی بو آ رہی تھی۔ شاید ۔ ۔ ۔ شاید یہ ایک انسان کی روح کے جھلسنے کی بو تھی۔ یا اُس کے ارمانوں، اُمنگوں اور تمناؤں کے جھلسنے کی یا ۔ ۔ ۔ ۔ یا اس کی زندگی کے جھلسنے کی یا ۔ ۔ ۔ ۔ پتہ نہیں کسی اور چیز کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس بو سے دم گھٹنے لگا۔ مجھے اس وقت وہ آواز بالکل اچھی نہ لگی۔ حالانکہ یہ آواز ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بو میرے لئے نئی نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس بو سے نا آشنا نہ تھی۔ پھر بھی مجھے اُس وقت وہ آواز، وہ بو اچھی نہ لگی۔ میرا مالک کہہ رہا تھا۔ "میں جانتا ہوں کرنا کیا چاہتی ہے؟ بھرپیٹ کھانے کو روٹی اور ساگ، تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا، گھر میں جلتا ہوا ایک دیپ، اور ۔ ۔ ۔ ۔ اور آنگن میں مسکراہٹوں کے پھول بکھیرنے، اپنی معصوم کلکاریوں سے سناٹوں کا سینہ چاک کرنے کے لئے خوبصورت جیسے معصوم بچے" ۔ ۔ ۔ ۔ اتنی تمنا کا تو ہر شخص کو اختیار ہے۔ ہے نا کرنا؟ تو بھی یہی سب چاہتی ہے نا؟" "نہیں دیپو میں تو ۔ ۔ ۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے آنگن میں سناٹا نہ رہے۔ میری ۔ ۔ ۔ میری گود ۔ ۔ ۔ ۔" اور کرن کی آواز جذبات کے طوفان میں ڈوب گئی۔ ایسی آسودہ بھری جذبات بھری آواز اپنی مالکن کی نہ کبھی پہلے میں نے سنی اور نہ بعد میں۔ شاید میرا مالک بھی اس جذبات بھری آواز میں ڈوب گیا تھا۔ بہت دیر تک ڈوبا رہا۔ اُس کی آواز ابھری نہ سکی۔ وہ نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ جنالوں کی دنیا میں کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ لیکن جب اُس کی آواز ابھری تو اس میں وہی بو تھی ۔ وہی تلخی ۔ "کرنا تیری آرزو ہر عورت کی آرزو ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہر انسان کی تمنا ہے ۔ ۔ ۔ کیا میرے دل میں ایسی خواہش نہیں؟ لیکن کرنا! ہماری جیسی جھونپڑیوں میں پیدا ہونے والے بچے جنم لینے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں، کیونکہ جہاں وہ جنم لیتے ہیں وہاں پہلے ہی سے نہ پیٹ بھر کھانا ہوتا ہے نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔ ننگی بھوکی ماں کی چھاتیوں میں دودھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی اولاد کو ۔ ۔ ۔ قوم کے مستقبل کو حیات بخشے اور ۔ ۔ ۔ اور موسم کے کھردرے ہاتھوں میں ان کے جسم گل جاتے

ہیں۔ ... لیکن کرنا! تیری آرزو ضرور پوری ہوگی۔ ہم اپنے مہمان کے لئے اپنے مستقبل کیلئے موت کا منہ بھی پھیر دیں گے۔ ہوا کا رُخ بدل دیں گے۔ تیری زندگی اور نئے مستقبل کیلئے۔ ہم زیادہ سے زیادہ محنت کریں گے۔" "پگا دیپو! کرن کی آواز سے مسرت چھوٹی پڑ رہی تھی۔ "ہاں کرنا" سمیک کی آواز میں بھرپور عزم تھا۔ "تو .... ایک بات بتاؤں .. بکرن کی آواز لرزنے لگی۔ یکا یک، "پراشتیاق آواز۔ "میں ... میں" ... "سچ کرنا!" ... کاش ... کاش اس ایک لمحہ کیلئے میرے گھیرے کے اندھیرے معدوم ہو جاتے ... روشنی کی ایک کرن کہیں سے چوری چھپے ہی مل جاتی۔ صرف ایک کرن! کاش میں ان چہروں پر پھوٹتی مسرت کی ایک جھلک ہی دیکھ پاتی ...!

ایک موسم گیا۔ اور دوسرا آیا۔ بھری برساتوں میں میرا جو دل لرزنے لگا۔ ایسا لگتا کہ جھم جھم برستا پانی مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ کر کہیں دور لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن ... وہ مجھے سمیٹ نہ سکا۔ میرے قدموں کو بھگو کر وہ لوٹ لوٹ جاتا۔ اور اس کے نقش رہ جاتے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گندے ہوئے دلوں کے ساتھ سخت مشقت کے نشان میرے مالک کے چہرے پر ثبت ہوتے جا رہے تھے۔ جھم جھم برستے پانی کے بوجھ سے میرے جسم کا ایک ایک انگ ٹوٹنے لگا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ناقابل برداشت محنت سے میری مالکن کا، اس کا سارا جسم جیسے گل رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہڈیوں کے ڈھانچے میں بدلتی جا رہی تھی ٹھیک ایسے ہی جیسے ..... میں لکڑیوں اور بالنوں کے ڈھانچے میں بدل رہی تھی۔ اور دن گذرتے جا رہے تھے۔ رُت بدلتی جا رہی تھی۔ رم جھم برستا پانی دھند کہیں دور کی آغوش میں چھپ گیا۔ اور ... مالکن کام کی تلاش میں جانا چھوڑ کر دن دن بھر آنگن میں پڑی رہتی تھی یا میرے گھر میں۔ اس کا دکھتا ہوا چہرہ پیلا پڑنے لگا تھا۔ بوڑھے نادر کے نیم شکستہ پنجر سے چپکے لرزتے ہوئے پتے کی طرح میرے مالک کے چہرے پر فکر کی گہری لکیریں جیسے مستقل ہو گئیں۔ آنکھیں سوچ میں ڈوبی رہتیں۔ اور وہ سوچتا رہتا۔ نہ جانے کیا ...!

ایک دن ... شام ڈھلے ... بہت دیر گئے وہ آیا تو چہرہ اترا ہوا تھا۔ بہت زیادہ قدم جیسے لڑکھڑا رہے تھے۔ مالکن جو خود سہارے کی محتاج تھی اٹھ کر سہارا دینے کی کوشش کرتے ہوئے پریشان آواز میں بول پڑی۔ "کیا بات ہے دیپو؟" "کچھ نہیں" "تو پھر ..." "لگ گیا ہوں اور ... نوکر بھیا کا خط بھی آیا ہے۔" "راجو کا؟" "ہاں۔ اس بار پیسے نہ بھیج سکا نا! لکھا ہے کھانے کے پیسے دینے ہیں۔ فیس کے پیسے دینے ہیں۔ اگر جلد پیسے نہ آئے تو ہوسٹل والا کھانا بند کر دے گا۔" "پھر پیسے کیوں نہیں بھیجے؟" "کہاں سے بھیجتا۔ تیری مزدوری کم ہو گئی اور ... اب بچے ہونے میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ علاج میں پیسے کہاں سے لے آئینگے؟" "دیپو جیسے بجھ گیا۔ کرن جیسے معدوم ہو گئی۔ سناٹے گھر سے ہو گئے اور تاریکی کی چادر دبیز ہو گئی۔ آدھی رات بیت گئی۔ تاریکی اور سناٹے میں اچانک مالکن کی کراہ ابھری۔ اور پھر یہ کراہیں چیخوں میں بدلتی گئیں۔ چیخیں جب تیز ہو گئیں تو مالک نے میرے گھیرے سے باہر نکال دیا۔ پھر اسے اپنے کندھے پر لادے ایک طرف چل پڑا۔ کتنی عجیب لگ رہی تھی میری مالکن تاروں کی چھاؤں میں! دھڑ مالک کے کندھے پر لٹکا ہوا اور سر نیچے کی طرف جھولتا ہوا ...!!

شاید سات آٹھ دن بیت گئے تھے۔ مالکن کو واپس لوٹے اتنے دنوں نہ آنگن میں آگ جلی۔ نہ روٹی کی سوندھی بو فضا میں پھیلی اور نہ ہی مالک کے چہرے پر مسرت کا کوئی کرن نظر آئی۔ سناٹا۔ گہرا غم انگیز اور تکلیف دہ سناٹا۔ اور وقت آہستہ آہستہ گذرتا رہا۔ اس طرح جیسے اس کے تلوے زخمی ہو گئے ہیں۔ کانٹوں سے بھر گئے ہوں۔ اور ایک دن ... مالک کے کندھے کا سہارا لئے، آنکھوں میں آنسو بھرے، لرزتی کانپتی مالکن لوٹ آئی۔ اور پھر ... جب وہ میرے گھیرے میں داخل ہوئی۔ جب اپنے پرانے چبوترے پر گر پڑی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرے سونے گھیرے کو دیکھ کر، اپنی سونی گود دیکھ کر، اپنی سونی کوکھ کو دیکھ کر، آنگن میں جا گئے سناٹے کو دیکھ کر اور اپنے گرد رقص کرتے ہوئے پر ہول ویرانوں کو دیکھ کر۔ وہ روتی رہی اور دن ڈوبتا گیا۔ وہ سسکتی رہی اور رات دم توڑنے لگی۔ اور صبح جب صبح طلوع ہوا تو مالکن تھک چکی تھی۔ چور چور ہو چکی تھی ... جیسے اس کی آرزو پاش پاش ہو چکی ہو۔ اور اب ... نہ مالکن کے ہونٹ لرزتے ہیں نہ مالک کی کوئی سرگوشی ابھرتی ہے۔

جھلسا دینے والی گرمی رخصت ہو چکی ہے اور رم جھم برساتی موسم شروع ہو گیا ہے۔ گرمی کی چلنے والی تند ہوائیں میرے ڈھانچے سے چپکی ہوئی خشک اور ٹوٹی مڑی پتیوں کا بیشتر حصہ اڑا کر لے جا چکی ہیں۔ اب میں بالکل اس طرح کھڑی ہوں جیسے کوئی کلہاڑن اپنے ناموس کو ڈھانپنے کیلئے جا بجا پھٹے چیتھڑے لپیٹے ہو۔ سوچتی ہوں اس بار جو مینہ برسنے لگے گا تو کیا ہوگا؟ کیا میرا وجود برقرار رہے گا؟ اور ...

لکن اس رم جھم میں گیلی دھرتی پر کیسے سو سکے گی؟ اب تو وہ بیدار بھی رہنے لگی ہے۔ کوئی کمی دن کام پر نہیں جاتی۔ دن دن بھر پڑی آسمان تی رہتی ہے جیسے نیلے آکاش کی وسعتوں میں اپنے ارمان تلاش کر رہی ہو۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ بالکل ایسے جیسے میں۔۔۔

رات بھر بارش ہوتی رہی ہے اور خوب زور و شور سے۔ اور پھر پو پھٹنے سے پہلے گرجتے برستے بادل کافی کی طرح پھٹ گئے ہیں سپیدی پھیلنے لگی ہے۔ میرے گھیرے میں مالکن جب چارپائی پر حس و حرکت پڑی ہے اور مالک ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا ہے۔ ایسا لتا ہے اس نے اگر پلک جھپکائی تو پھر کبھی میری مالکن کو اپنی کرتا کو دیکھ نہ پائے گا۔ وہ دیکھتا رہا اور وقت کی لوکی ہوئی لاٹھی سے بچتے رہے۔ اور۔۔۔ بہت دیر بعد۔۔۔ وہ چونک پڑا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے بدن سے لپٹا ایک اکلوتا، پھٹا پرانا کمبل اتار مالکن کے جسم کو ڈھانکنے لگا۔ ہاں۔ اب وہ صرف ایک جسم ہے۔ اس جسم کو ڈھانکتے ہوئے اس کی خشک اور ویران آنکھوں میں جانے ں سے دو موتی آئے اور ٹوٹ پڑے۔ پھر وہ آنکھیں پھیر کر باہر نکل گیا۔ وہ جب لوٹ کر آیا تو اس کے ساتھ چار آدمی اور تھے بالکل اسی ح۔ اُن کے تنوں پر بھی برائے نام ہی کپڑا اٹکا تھا۔ وہ سب مل کر لکڑیاں اکٹھی کرنے لگے۔ گیلی سوکھی لکڑیاں۔ ایسی لکڑیاں جو رات بارش کے پانی کے ھ بہا آئی تھیں۔ یا وہ جو جھاڑیوں کی شکل میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اور پھر۔۔۔ دور حدِ نظر پر بنے شمشان میں ایک چتا تیار ہونے لگی۔

وہ لوگ۔۔۔ چار آدمی۔ میری مالکن کو اٹھا کر لے جا چکے ہیں۔ اب میرا مالک تنکا تنکا کر کے مجھے علیحدہ کر رہا ہے۔ اب میرا کوئی ہ نہیں ہے۔ کوئی ڈھانچہ نہیں۔ تنکا تنکا کر کے پھر جوڑ کر میرا مالک اب مجھے مالکن کی چتا کی طرف لئے جا رہا ہے۔ اب میں اپنی مالکن کے جسم پر ور کی طرح پھیلا دی گئی ہوں اور۔۔۔ نیچے گیلی لکڑیوں میں آگ لگا دی گئی ہے۔ وہ اب سلگنے لگی ہیں۔ ہیں۔۔۔ دھواں جیسے یدار جیسے۔۔۔ میری مالکن کی زندگی سے دھواں اٹھا کرتا تھا۔۔۔ ٹھیک ویسا ہی دھواں ان لکڑیوں سے اٹھ رہا ہے۔ کچھ دیر یوں دھواں اٹھتا رہے گا پھر شعلے بن کر مالکن کے جسم کو، میرے وجود کے تنکے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ ہم خاک ہو جائیں گے۔ ر۔۔۔ یہ کہانی ختم ہو جائیگی۔ چند لمحوں میں۔ لیکن۔ ایسی ہزاروں لاکھوں کہانیاں یہاں بکھری پڑی ہیں۔ جب تک یہ تنگ و تاریک نیچڑ بستیاں ہیں، جب تک دیپک اور کرن جیسے لوگ ان جھونپڑیوں میں بسیرا کرنے پر مجبور رہیں ایسی کہانیاں ہر روز جنم لیتی رہیں گی، ختم تی رہیں گی اور پھر جنم لیتی رہیں گی۔

بقیہ صفحہ ۴۲ "عاشقِ صبر طلب"

ارغ ہو کر تصور کرنے کے لئے لیٹتے وقت تو رات بھر تصور ں میں مبتلا رہتے۔ وہ قسم قسم کے نقشے دیکھا کرتے تھے۔

رات بھر اُن کا تصور دل کو تڑپاتا رہا
ایک نقشہ سامنے آتا رہا جاتا رہا

شق میں تصور کے علاوہ عملاً دونوں ہاتھوں سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر وصل کی دعائیں مانگی جائیں یا پھر ایک ہاتھ سے اپنا قعا لیے اور ایک ہاتھ سے محبوب کا دامن۔ داغ نے جیسے دونوں ہاتھوں کا کام لیا۔

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے ـــــ دل کو تھاما اُن کا دامن تھام کے

ماشق صرف ایک ہی ہاتھ استعمال کرے تو دل اور دامن دونوں میں سے ایک نقصان اٹھانا پڑے گا۔

ں میں بار بار مشق بھی مشق ہونی چاہیئے۔ ۔۔۔ بار بار مرنے سے کتنا گھبراتے ہیں ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ کر دکھانی ۔۔۔ ۔۔۔ پہلے ہی سے کہا تھا

کیں کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

مدّتِ خریداری ختم ہونے کی اطلاع

اس پرچہ ملنے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری جون کے اسی شمارہ کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ آپ کی خدمت میں حسبِ قاعدہ ۱۰۰ شمارے ویلیو ایبل کر بھیجا جائے گا یا آپ سالانہ چندہ کی رقم ذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیجئے اگر بددستور خریداری منظور نہ ہو تو براہِ کرم ایک خط کے ذریعہ دفتر کو اطلاع دیجئے ورنہ وی پی نہ بھیجا جائے۔

منیجر

خط لکھتے وقت

خریدار حضرات اپنے نمبر خریداری کا اور ایجنٹ

اپنی ایجنسی کے نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں ورنہ تعمیل نہ ہو سکے گی۔

رؤف خلش

خرابہ

یہ گھائلوں کا حسیں خرابہ
جہاں ہزاروں سُلگتے لمحوں کی آنچ میں
خوشبوؤں کے اجسام جل گئے ہیں
جہاں ابھی کونپلوں کی چہکار
سوئی سوئی رُتوں کی گمبھیرتا میں گم ہے
اُلجھتے تاروں میں کھو گئے ہیں
جواں نظر کے جواں بُلاوے
مچلتی پہنائیوں سے خالی ہیں سارے پنگھٹ

یہ گرم آہوں کی طرح تپتی ہوا کے جھونکے
یہ ملگجاتی سی دھوپ، جیسے اُچٹتی نیندیں
کہاں اُفق پر لہک سکیں گے۔
نشیلے بادل
نہ میگھ ملہار کی تھاپ جھم
نہ پائلوں کی لرزتی چھم چھم

گگوں کے مارو!
یونہی چلیں گے یہ گرم جھونکے
یہ دھوپ پھیلی رہے گی تنہا
نہ آئے جب تک یہاں کوئی خوشبوؤں کا گھائل
جو دھوپ میں بھی
لہو سے اپنے کنول کھلا دے
کنول کی ان نرم ٹھنڈکوں سے
جو اس خرابے میں چھاؤں کر دے
اور اس کے دامن کو اپنے ہی آنسوؤں سے بھر دے

منظور احمد تنہا تماپوری

گزارش

بھیگی آنکھوں سے سوچتی کیا ہو؟
چشمِ حیراں سے دیکھتی کیا ہو؟
آسماں کچھ نہیں خلا کے سوا،
آسمانوں میں ڈھونڈتی کیا ہو؟

خواب پلتے ہیں صرف دھرتی پر
خواب جلتے ہیں صرف دھرتی پر
کتنی صدیوں سے ابنِ آدم نے
خواب دیکھے ہیں صرف دھرتی پر

اپنے خوابوں کی کوئی بھی تعبیر
ماہ و انجم کی زرد کرنوں میں
ڈھونڈنا بھی تو ایک سپنا ہے
آدمی پھر بھی گم ہے سپنوں میں

کیسے کہہ دوں زمیں اپنی ہے
چاند اپنا، ستارے اپنے ہیں
ہم ہی انساں خدا کے نائب ہیں۔
دونوں عالم ہمارے اپنے ہیں؟

آسمان و زمیں کے ربِ جلیل
ہم سے اعزاز دو جہاں لے لے
ہیں جو آنکھوں میں کچھ خموش سوال
صرف اُن کا جواب تو دے دے!!

انٹرویو

ضیا حسنی

عمر انصاری سے ایک مُلاقات

وہ لمحات ناقابل فراموش ہیں جب میں نے نامور اور خوش فکر شاعر عمر انصاری کو قریب سے دیکھا۔ ان کی پُرخلوص شخصیت اُن کی شاعری کی طرح دل کش دکھائی دی۔ جس سے میری ذہنی وابستگی کافی دنوں سے تھی۔ پہلے وہ غریب خانے پر شعر و ادب کے موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ اس فیز ادبی گفتگو کے درمیان ایک ایسا انسان اُبھر کر سامنے آیا تھا جس کے خلوص کی گرمی میں اب بھی محسوس کر رہا ہوں۔ گفتگو طویل ہوتی گئی، اسی دوران میں جناب پیلی بھیتی (کنور بیتاب شاعر) تشریف لے آئے اور ہم دونوں کو چائے پلانے کیلئے اپنے مکان لے گئے۔ وہاں چائے پیتے ہوئے میں نے عمر صاحب سے گفتگو شروع کی۔

ض:۔ آپ کی ولادت کب اور کہاں ہوئی؟

ع:۔ لکھنؤ میرا مولد و مسکن ہے۔ میں ۳۰ ستمبر ۱۹۱۲ء کو وہاں پیدا ہوا۔ اور وہیں کی خاک کے ذرّوں میں اپنی زندگی کی تلاش جاری ہے۔

ض:۔ تعلیم کہاں تک حاصل کی؟

ع:۔ میں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔

ض:۔ گہوارۂ شعر و ادب کی دعبداں خیز اور رنگین فضاؤں نے آپ کو پروان چڑھایا اور بقول پروفیسر احتشام حسین ... دبستان لکھنؤ کی ادبی روایات اور بیان کی ندرتیں آپ کو لکھنؤ کی ادبی فضا سے ملیں۔ عمر صاحب! مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی دل کش شام اور وہ آپ کی شاعری کا عنوان بنی ہوگی۔

ع:۔ صفی، عزیز، نگار، اثر، اور وحید کے لکھنؤ نے یقیناً مجھے بہت کچھ دیا لیکن میں فطری طور پر موسیقی سے کافی دلچسپی رکھتا تھا اور گانا سننے کے بعد جو کیفیت طاری ہوتی تھی، وہی مجھے شعر کہنے پر اکساتی تھی۔

ض:۔ زحمت کر کے اپنے ماضی کی طرف مُڑ کر دیکھیے اور کوئی ایسا واقعہ سنائیے جو خاص طور پر آپ کی شاعری پر اثر انداز ہوا ہو۔

ع:۔ ضیا صاحب! مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں۔ جسے میں شعر گوئی کا موضوع کہہ سکوں۔ میں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ جہد آزادی کا دور تھا۔ جب وقت بعض ایک خاموش تماشائی نہ تھا اور حالات نہایت تیزی سے بدل رہے تھے۔ ذہنوں نے نئے خیالات نئے اسالیب اپنانے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ حالی اور آزاد کی دکھائی ہوئی شاہراہوں پر شعلیں جلنا شروع ہو چکی تھیں۔ اقبال اور ٹیگور کے ترانے فضا میں گونج رہے تھے۔ مجاہدین آزادی نے مجھے بھی متاثر کیا اور وہی میری نظموں کے ہیرو بنے۔

ض:۔ شاعری کے میدان میں کس قابل قدر ہستی نے آپ کی رہنمائی کی تھی

ع:۔ میں نے تین اساتذہ سے استفادہ کیا جن کے اسمائے گرامی ہیں۔ (۱) مولانا ابو الرشد رشید لکھنوی (۲) لسان الہند عزیز لکھنوی، (۳) مصوّر درد مولانا عبدالباری آسی

ض:۔ اس وقت آپ کن شعراء سے زیادہ متاثر تھے۔

ع:۔ مجھے میر، غالب اور مومن کا بیک وقت مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور میں اُن کی عظمت کا قائل ہوں حسرت، سیماب، جگر اور جوش کو بہت قریب سے دیکھا۔ ان شعراء کو میں پسند کرتا ہوں۔

ض:۔ اب آپ کن شعراء کو پسند کرتے ہیں۔

ع: فیض اور فراق کو

ض: کن اصنافِ سخن میں آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔

ع: کبھی میں غزل میرے دل کی آواز ہے۔ نظم میری فکر کی جولاں گاہ اور رباعی میری ذہنی آوارگی کا میدان۔ آپ کے کتنے مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

ع: دو "تبرسی کاردواں" اور "سازِ بے خودی" شائع ہو چکے ہیں۔ غزلیات کا مجموعہ "صنم کدہ" بہت جلد شائع ہونے والا ہے۔

ض: رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں "بہترین شعر وہ ہے جو ضرب المثل بن جائے"۔ آپ کے نزدیک اچھے شعر کی تعریف کیا ہو سکتی ہے؟

ع: میں اس شعر کو سب سے بہتر سمجھتا ہوں جو اپنے عہد کا ترجمان ہو۔ ویسے شعر کی ہزاروں تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔

ض: آپ نے کافی خوبصورت اور مکمل نظمیں کہی ہیں، ہمارا وطن، جنتِ کشمیر، رانی کھیت کی ایک شام، رہبرِ اعظم لعل بہادر شاستری۔ براہِ کرم بتائیے کہ آپ نظم کس طرح کہتے ہیں۔

ع: نظم کہنے کے لئے کسی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے کوئی نظم بغیر تحریک کے کہی ہو۔ خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی۔ میری نظمیں میری زندگی کے مختلف ادوار کی یادگار ہیں اور میرے احساسات، مشاہدات اور تجربات کی آئینہ دار۔

ض: نظم کو کیا چیز مؤثر بناتی ہے۔

ع: میرے نزدیک نظم کے دو عنصر کے ساتھ شاعر کی صحیح وابستگی ہو تو وہ اسے جاذبِ نظر اور مؤثر بنا سکتا ہے۔

ض: سماجی اور سیاسی تبدیلیوں نے اکیلے نظم کو نہیں غزل کو بھی متاثر کیا۔ نئی غزل اپنے آہنگ اور طرزِ اظہار کے اعتبار سے مجھے کافی اچھی لگتی ہے۔ فیض، احمد ندیم قاسمی، اختر انصاری اور مخدوم محی الدین کی غزلیں خود ہی میری توجہ مبذول کرلیتی ہیں۔ اور میں انھیں بہ شوق پڑھتا ہوں۔ زحمت کر کے بتائیے کہ آپ غزل کے موجودہ معیار سے پوری طرح مطمئن ہیں یا نہیں۔

ع: آپ کی پسندیدگی کا کیا سوال ہے۔ خود جدید ادب کا رجحان غزل کی جانب ہے۔ میرے نزدیک غزل ہر دور میں ایک نئے موڑ میں داخل ہوتی چلی آرہی ہے۔

ض: براہِ کرم جدید ادب کے متعلق کچھ فرمائیے۔ کیا کسی خاص دورِ شعر و ادب کو جدید کہا جا سکتا ہے۔

ع: ہر دور میں کچھ نئی قدریں ادب میں آتی ہیں جنھیں جدید ادب کے نام سے معنون کیا جا سکتا ہے۔ کسی خاص دورِ شعر و ادب کو جدید نہیں کہا جا سکتا۔ میرے نزدیک غالب اور اقبال اپنے زمانوں کے ترقی پسند شاعر تھے۔

ض: اب کچھ آزاد نظمیں مجھے کافی پسند آئیں اور اکثر میں نے ویسی جاذبیت اور اثر انگیزی نہیں دیکھی جیسی میں چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ع: ہمیشہ ادب میں تجربے ہوتے ہیں اور ان میں سے چند ہی پروئے کار آتے ہیں اور کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔

ض: شاعری کے علاوہ آپ کن دوسری اصنافِ ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور انھیں پڑھنا پسند فرماتے ہیں۔

ع: تنقیدی اور افسانوی ادب کو میں بشوق پڑھتا ہوں۔

ض: کیا اردو تنقید سے آپ مطمئن ہیں؟

ع: تنقیدی کام خوب ہو رہا ہے اور مستقبل خوشگوار دکھائی دے رہا ہے

ض: نثر نگاری سے آپ کی توجہ کبھی مبذول ہوئی تھی اور کیا آپ کسی جریدے سے متعلق رہ چکے ہیں۔

ع: ایک دفعہ ارادہ کیا تھا کہ جب میں نے صحافت کی طرف بھی رجحان کیا تھا۔ ماہنامہ "صباحت" ہفت روزہ "علم اشتار" پندرہ روزہ "ترقی" اور روزنامہ "البند" کی ادارت کے فرائض ادا کر چکا ہوں۔ میں نے بہت سی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان میں سے خوابہائے رنگین "میری پسند" کہ فی نہاد جو نیز بنگ خیال" میں مارچ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ (بقیہ صفحہ ۶۲ پر دیکھئے)

غزلیں

کیف احمد صدیقی

دلِ خاموش جب نغمہ سرا معلوم ہوتا ہے
مجھے دھوکا تری آواز کا معلوم ہوتا ہے

ترے دل کی نزاکت سے بہاریں بھی نہیں واقف
یہ وہ گل ہے جو پامالِ صبا معلوم ہوتا ہے

مجھے تو آخری شب کا یہ حسرت ناک سناٹا
کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا معلوم ہوتا ہے

ہوائے غم سے جب افکار کے شعلے بھڑکتے ہیں
مرا احساس اک جلتی چتا معلوم ہوتا ہے

صاحبزادہ میر فراغت علی خاں فریس

اپنے ہر زخمِ تمنا کو تمنا کہیئے
وقت قاتل ہے مگر اُس کو مسیحا کہیئے

چاند نکلے نہ سحر ہو، نہ شبِ غم گزرے
یوں کوئی روٹھ کے جائے تو اُسے کیا کہیئے

چند یادیں بھی ہیں، سائے بھی ہیں، افسانے بھی
کس طرح اے دلِ تنہا تجھے تنہا کہیئے

پھول پامال، خفا گیت، سحر افسردہ
کوئی ایسا بھی نہیں اب جسے تجھ سا کہیئے

دل پہ لکھا ہے جسے تلخیٔ دوراں نے فریس
زندگانی کو وہ اک حرفِ تمنا کہیئے

مدحت الاختر

گل کی جگہ خار لٹائے گئے
جشن بہاروں کے منائے گئے

اُن کے دلوں میں تھا اندھیرا بہت
دیپ مرے خوں سے جلائے گئے

منزلِ پُرکیف نگاہوں میں تھی
دار و رسن سامنے لائے گئے

دُھوپ ترے ہجر کی پھیلی رہی
دُور تلک رو کے سائے گئے

غیر کا کیا ذکر کہ مدحت یہاں
ہم ہی بسا غیر سے پائے گئے

(انگریزی سے ترجمہ)

انجمن آرا جسیم

خط

مالا کو خوش ہونا ہی چاہیئے تھا کیونکہ دو سال بعد اُس کی بیٹی گھر آ رہی تھی۔ دو سال کے اِس عرصہ میں مالا کی زندگی حبس اور غربت اور پریشانی میں گذری تھی جسے وہ جانتی تھی۔

دن کسی طرح آفس میں گذرتے۔ دفتر کا ہی کام جس سے مالا کو راہ فرار اختیار کرنا چاہتی تھی اب اُس کے لئے ذہنی سکون کا باعث ہوا تھا۔ مگر رات میں اُسے تنہائی کی بدنما میں گھسیٹ لاتیں اور راتیں بیم خوابی کے عالم میں بیت جاتیں۔

تنہائی کا شدید احساس اُس کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا۔ یہ احساس اُس وقت اور زیادہ ہو گیا تھا جب چترا سلیش میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ اُسے لگا تھا کہ اب اُس کی بیٹی چترا اُس سے دُور ہو جائے گی جو گذشتہ سالوں میں اُس کی بہترین دوست ثابت ہوئی تھی۔

شروع کے چند برسوں میں اُس کی زندگی کا انحصار چترا پر اتنا نہ تھا کیونکہ اُس کی ماں زندہ تھی۔ مگر جب سے ماں کا انتقال ہوا تھا چترا اُس کی زندگی بن گئی تھی۔

اور اب تو چترا ہی اُس کا سب کچھ تھی۔ جب اُسے وقت سے چھٹی ملتی تو وہ تمام وقت اپنی بیٹی کے ساتھ گذارتی۔ اُس کے ساتھ کھیلتی۔ اُسے کہانی کی کہانیاں سناتی۔ اُسے گھمانے لے جاتی اور اُس کی پرورش میں ہر طرح کا خیال رکھتی۔ وہ بیک وقت اُس کی ماں بھی تھی اور باپ بھی۔

ماں کے چھوٹے چھوٹے تعاقات میں سے ایک تعاقہ اُس کے دل کی گہرائیوں کو چھوتا ہوا چلا گیا۔ وہ زیر لب مسکرائی۔ رات بھر جاگ کر اُس نے اپنی بیٹی کی سالگرہ پر لیموں جیسے پیلے رنگ کی فراک سی تھی۔ کیونکہ یہ اُس کی بیٹی کی پسند تھی۔ اور جس پر چترا نے انتہائے مسرت میں مالا کے گلے میں اپنی باہیں حمائل کر دی تھیں اور کہا تھا اگر یہ فراک درزی سیتا تو میں کبھی نہ پہنتی بلکہ نفرت کرتی۔

اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں اپنی بیٹی سے اتنا زیادہ پیار پا کر وہ مطمئن سی ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چترا اُس کا سب کچھ بن کر رہ گئی تھی۔ عام طور سے بچے اپنی ماؤں کے بجائے دوستوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں مگر چترا کی دوست تو اُس کی اپنی ماں تھی۔

اور اب تو چترا گھر واپس آ رہی تھی۔ مالا نے ہاتھ میں دبے ہوئے خط پر ایک نظر ڈالی۔ اُس کا جواب سوچنے لگی۔ مگر اُس نے خط کی سلوٹ اور اُس کے ڈریسنگ ٹیبل پر چترا اور سلیش کے فوٹو کے قریب رکھ دیا۔ جو اُن کی شادی کے وقت کا البم کھینچا گیا تھا۔

اُس نے فوٹو اٹھایا اور کافی دیر تک دیکھتی رہی۔ ایک دلکش لڑکی کا مسکراتا چہرہ جو بے کراں برکتوں کا حامل تھا۔ اُس کے پہلو میں ایک سنجیدہ نوجوان کا چہرہ اپنے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

مالا جب پہلی بار سلیش سے ملی تو اُسی وقت اُس کو جان گئی تھی۔ اُس کے لہجہ ہی سے اُس نے اُس کی شرافت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ چترا اُس کے ساتھ اچھی طرح رہ سکے گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی دوستی بڑھتی جا رہی تھی۔ سلیش کو جب دہلی میں ایک اچھا ملازمت مل گئی تو مالا کو اچانا سا سکون ملا تھا۔

چترا اور سلیش کی خط و کتابت جاری تھی۔ ہر خط میں چترا کے لئے بے پناہ محبت ہوتی۔ جب سلیش چند ماہ بعد چھ ہفتے کی تعطیل میں آیا

تو نہ جانے کس عجیب کے کشت چترا کی عجیب حالت تھی۔

مالا کو وہ دن یاد تھا جب وہ چترا کو دیکھنے اور مالا سے کچھ کہنے آیا تھا۔

سلیش تمہیں دیکھ کر تعجب ہو رہا ہے نا اچانک یہاں کیسے آ گئے۔ پھر وہ خوشی سے کہہ اٹھی۔ تم کیسے رہے؟ دہلی کیسی لگی؟ جلد جلد اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤ۔

سلیش بڑے ادب سے باتیں کر رہا تھا۔ مگر بے چینی کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے سامنے میں بیٹھی ہوئی چترا پر بار بار نظر ڈالتا۔ چترا نے اس کے اضطراب کا اندازہ لگاتے ہوئے کہہ ہی دیا۔

دمی سلیش آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

وہ وقت آ چکا تھا جسے ٹالتا رہا تھا حالانکہ مالا نے ہمیشہ اس وقت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خاموش سی ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کہے اور کیا نہ کہے۔

مجھے اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ میں پوری طرح چترا کا خیال رکھوں گا اور اسے خوش رکھنے کی ہر امکانی کوشش کروں گا۔

مالا نے مشکل سے کہا۔ مجھے بڑی خوشی ہے سلیش، خود پر زور ڈالتے ہوئے بولی: مجھے یقین ہے تم چترا کو خوش رکھو گے تم دونوں کو میری مبارک باد۔

چترا اپنی ماں کی گردن میں بازو حمائل کرتے ہوئے فرط مسرت سے چیخ اٹھی ممی تم کتنی عجیب اور اچھی ہو۔

اپنی بیٹی کی بے پناہ خوشی محسوس کر کے مالا کا دل ٹوٹ گیا۔ رنج و مسرت کے آنسوؤں سے بھیگے چہرہ کو اس نے دوسری طرف موڑ لیا آنے والے وقت کا اس کے جذبات سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ محسوس تو یہ تھا کہ ہر کام انجام دینا تھا۔ شادی کا سارا انتظام اس نے خود کیا۔ تمام سامان خریدا اور وہ لحاظ دولہن کو رخصت کیا۔

اس کا دل ٹوٹ کے چور چور ہو گیا۔ وہ اپنے بستر پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اپنی عزیز ترین بیٹی کی جدائی پر اس کا دل کراہ اٹھا کچھ عرصہ سے وہ اپنی بیٹی ہی کو اپنی زندگی سمجھ بیٹھی تھی۔ مگر اب وہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا تھا اور زندگی کا صرف نام باقی رہ گیا تھا۔

اب وہ صرف اپنی بیٹی کے خط پر ہی زندہ رہ رہی تھی۔ دفتر سے واپسی پر ہر روز وہ اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول کر سب سے پہلے لفافہ پر نظر ڈالتی۔ ہفتہ میں اس کا ایک خط آتا تھا۔ مالا دوسرے ہفتہ تک اس خط کو دیکھتی اور پڑھتی رہتی تھی۔

گذشتہ دو برس میں چترا دو دفعہ آئی تھی زیادہ تر وقت پرانی باتوں میں گذرتا۔ چترا اپنی نئی زندگی کے بارے میں زیادہ نہ بتاتی۔ اور مالا بھی کبھی اس سے پوچھنے کی کوشش نہ کرتی۔

دوسرے دن مالا، چترا کے خط کا جواب دینے بیٹھ گئی۔ اس نے قلم ہاتھ میں لیا۔ اور سامنے پڑے ہوئے کاغذ کو دیکھنے لگی۔ اسی کا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا لکھے۔ اس نے ہمدردی اور انتہائی محبت سے چترا کو لکھنا چاہا کہ یہ اس کا اپنا گھر ہے۔

مگر کچھ سوچ کر اس نے قلم رکھ دیا اور پھر خط اٹھایا۔ دسویں بار وہ خط پڑھ رہی تھی۔

پیاری ممی۔

مجھے احساس ہے کہ یہ بات آپ کیلئے انتہائی تکلیف دہ ہوگی جس کو کچھ عرصے سے آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا۔ مزید یہ تمہید کی بات ہے کہ آپ کی لڑکی اپنی ازدواجی زندگی میں ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اور اب یہ بات انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ سلیش اور میں ایک دوسرے کے لئے نہیں بنے ہیں۔ ہماری شادی ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ ہم دونوں ہر ایک بات پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔

میں ان باتوں سے عاجز آ گئی ہوں۔ اور اب گھر آ رہی ہوں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے۔ اپنا بنائی ہوئی چیز پر پورا عمل کروں گی۔ اور شادی کو ایک دھوکہ کے کچھ نہ سمجھوں گی سلیش کبھی کبھی منانے کی کوشش کرتا ہے مگر مجھے جو کرنا تھا کر چکی۔ میں بہت جلد آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جواب جلد

آپ کی بیٹی ——— چترا

مالا نے قلم اٹھایا اور بڑے غور سے سوچنے لگی۔ یہ تو بہت آسان ہوگا کہ میں چترا کو لکھ دوں کہ وہ آجائے۔ اور وہ یقیناً آجائے گی پھر وہ دونوں خوشی سے زندگی کے دن گذاریں گی۔ اوہ۔ کتنی خوشی! جیسے اسے سکون مل گیا ہو۔

مگر وہ یہ نہ لکھ سکی۔ اس کے سامنے اپنی ماں کا اداس چہرہ گھوم گیا۔ وہ ماں جس کو وہ ہمیشہ کیلئے دفن کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہی تھی۔ چترا کی طرح اس نے بھی جیون ساتھی کا انتخاب خود کیا تھا۔ ایک خوبصورت نوجوان سرلیش۔ اپنے رفیق حیات کا خیال آتے ہی ایک ہلکی سی اس کے ہونٹوں کو چھو گئی۔ سرلیش جواب اس کا نہیں تھا۔

اسے اپنی شادی کے آغاز کے وہ دن یاد آگئے جب شب و روز خوشیوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ مگر کچھ عرصہ بعد تلخیوں نے جگہ لے لی۔ جس طرح وہ اپنی بات پر قائم رہتا تھا اسی طرح مالا بھی ہٹ دھرمی سے کام لیتی تھی۔ دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے سامنے جھکنا نہیں چاہتا تھا۔ سرلیش وقت کی پابندی نہیں کرتا تھا اور مالا اپنی دانائی کا ثبوت دیتی۔

وہ ایک دوسرے کی بات نہ سہہ سکے۔ انھوں نے کبھی شادی کے بندھنوں کے متعلق دل کی گہرائیوں سے نہ سوچا۔ اور بغیر کوشش کئے ہوئے وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو گئے۔

مالا اپنی بیوہ ماں کے پاس چلی گئی جس نے دل سے اس کا شیر مقدم کیا۔ توقع کے خلاف اس نے اپنی ماں سے بے انتہا محبت اور ہمدردی پائی۔ اس کو گھر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ طوفان بھرے سمندر سے ساحل پر آگئی ہو۔

زندگی کے ناقابل برداشت بوجھ سے اب وہ آزاد ہو گئی تھی۔ وہ جو چاہتی کرتی۔ جو فیصلہ کرتی اس پر عمل کر ڈالتی۔ وہ آزاد اور خود مختار تھی۔ ذہن کے دریچوں سے ایک دم سرلیش کی تصویر ابھر آئی مگر اس نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ بہت مغرور تھی۔ اور سرلیش کو دکھانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے بغیر بھی سب کچھ کر سکتی ہے۔

مالا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا بھی مگر بہت بعد میں۔ سرلیش نے دوسری شادی کر لی تھی۔ بدقسمتی سے مالا یہ بھی نہیں کر سکتی۔ چترا کے ہوتے ہوئے وہ دوسری شادی کر بھی کیسے سکتی تھی۔ اس کے علاوہ چترا کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے والی صرف وہ تنہا تھی۔

اس نے ماضی کی یادوں کو پرے پھینک دیا۔ اور قلم اٹھا کر لکھنا شروع کیا۔

پیاری چترا ——

مجھے یہ لکھ کر بہت افسوس ہو رہا ہے کہ حالات تمہارا ساتھ نہیں دے رہے ہیں جو کچھ تم کر سکتی ہو اسے چھوڑ دو مت۔ اگر تم ایسا نہیں سوچتی ہو تو میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ یہ جھگڑے تمہاری زندگی کو بے لطف بنا دیں گے۔ تم اور سلیش دونوں سمجھدار ہو اور اپنا اچھا برا سوچ سکتے ہو۔

تم نے لکھا ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کیلئے نہیں بنائے گئے ہو۔ یہ غلط ہے۔ مرد عورت ایک دوسرے کیلئے بنے ہیں۔ بات صرف نباہنے کی ہوتی ہے۔ ہاں کبھی ایک دوسرے کو سمجھ لیا جاتا ہے اور کبھی سمجھنے میں کافی عرصہ لگتا ہے۔ ان ہزاروں لڑکے اور لڑکیوں کے بارے میں سوچو جن کی شادی ان کے والدین کرتے ہیں۔ کیا وہ ایک دوسرے کے ساتھ نبھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ تمام شادیوں میں کچھ نہ کچھ نشیب و فراز آتے ہی ہیں۔ ذرا صبر سے کام لو پیاری چترا۔ پھر یہ بات خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔

میرے لکھے ہوئے پر افسوس نہ کرنا۔ لیکن میں یہ نہیں سوچ سکتی کہ تم گھر آؤ۔ سلیش کے ساتھ رہو۔ اور خود کو بدلنے کی کوشش کرو۔ اس کی خوبیوں کو سراہو اور کمی کو نظر انداز کرو۔ کیونکہ ہم سب میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور ہوتی ہے۔

تم تنہائی کے احساس سے ناواقف ہو۔ مگر میں بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ کیونکہ میں نے تمہارے ہی جیسے حالات میں زندگی کی مسرتوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ خدارا میری غلطی مت دہراؤ۔

نیک خواہشات کے ساتھ

تمہاری پیاری ممی۔

••

مہدی پرتابگڈھی

مُعاہدہ

تُو کہ ناواقفِ آدابِ جُنوں ہے اب تک
اور مجھکو بھی نہیں عقل و خرد کا کوئی پاس
عشوۂ حُسن پہ نازاں ہے تری فکرِ جمیل
اور خودداریِ احساس ہے میری بھی اساس

تجھ سے ہر قصرِ محبّت نے اُجالا پایا
تاج کو میں نے بھی بخشی ہے یہ عظمت دی ہے
راستہ زیست کا گُل بیز کیا ہے تُو نے
میں نے بھی تیشۂ فرہاد کو عزّت دی ہے

کیف و مستی کا طرب خانہ ہے تجھ سے آباد
عارضِ زُلف کا افسانہ سُنایا میں نے
زندگی تجھ سے عبارت، مری فطرت ایثار
حوصلہ زیست کا اے حُسن بڑھایا میں نے

آ کہ ہم مِل کے نئے دَور کا آغاز کریں
رُوپ اور رنگ میں ڈھل جائیں تمنّاؤں کے خواب
تشنہ لب کلیوں کو شبنم کی نمی مِل جائے
اور کھِل جائیں ہر اک دل میں مسرّت کے گلاب

حنیف کیفی بریلوی

معراج

(سائنٹ لبرز پیٹر آرک)

پھر ہُوا شور کچھ اِس طرح اُفق کے اُس پار
آج پھر برسرِ پیکار ہے قدرت سے بشر
چیر تا آگیا انسان خلاؤں کا جگر
مُنتشر سا ہے نظامِ فلکِ کج رفتار!
پھر فضاؤں میں نظر آئے جُنوں کے آثار
چاند کی سمت ہوا پھر کوئی سرگرمِ سفر
اور یہ سوچ رہا ہوں میں سرِ راہگُذار
کتنے طوفان اُٹھا سکتی ہے اک مُشت غبار!

میں کہ اِس دَورِ تمدّن کا اک ادنیٰ انسان
ذرّۂ خاک کی معراج مجھے ہے معلوم
ہیں کمالاتِ بشر کی مری نظروں میں حدود
تنگ ہے دامنِ دل فکر و نظر بے پایاں
دشتِ ظلمات میں ہیں نقشِ تجلّی معدوم
عدم آباد کی حد میں ہے شبستانِ وجود

مکتوبات

رقیمہ شبنم منجری۔ بی۔ اے۔ بی ٹی ـــــــ بی۔ آئی۔ ٹی۔ بلاکس بمبئی ۳۴

اس ماہ کے شمارے میں آپ کا اداریہ خاص طلب ہے۔ واقعی اب اردو بولنے والے طبقہ کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ حال ہی میں "اردو محافظ دستہ" سے کچھ توقعات بندھی ہیں۔ مگر پھر ڈر لگتا ہے کہ کہیں اس کو بھی مجبوریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے جو گذشتہ کئی سالوں سے انجمن ترقی اردو کو کرنا پڑ رہا ہے۔ اس سلسلہ میں آنریبل ملا کی وہ تقریر یاد گار رہے گی جو انھوں نے انجمن اسلام کے وسیع حال میں فرمائی تھی۔ بہرحال اردو اور انتخابات" ایک اہم مسئلہ ہے اور اس کا کوئی خاطر خواہ حل تلاش کرنا نہایت ضروری ہے۔

نظم کے حصے میں شہاب جعفری، مظفر حنفی، منیر الجعفری، ممتاز راشد اور سحر اعظمی کی غزلیں قابل تعریف ہیں خصوصاً مظفر صاحب کی غزل کے یہ دو شعر بہت پسند آئے۔

"خیروں سے نقارۂ اجالوں کو کیا کریں ـــــ آنکھوں میں پڑ نہ جائیں کہیں روشنی کے زخم
کوشاں رہے ہیں ہم کہ نیا دور دیکھ لے ـــــ آئینۂ غزل میں ہماری صدی کے زخم

اب اس پر بھی بعض ستم ظریف غزل کو محض خانۂ گل و بلبل تک محدود کر دیں تو اس میں غزل کا کوئی قصور نہیں، قصور انکی کوتہ بینی کا ہے۔

جہاں تک حصۂ نثر کا تعلق ہے مناظر عاشق صاحب نے اپنے مقالے میں "حیات داغ" کے اقتباسات زیادہ دیئے ہیں اور "نثر سحاب" کے متعلق بہت کم لکھے ہیں۔ "روٹی اور لیڈر" رشید الظفر کا انداز طنز کے خوبصورت لبادہ میں ایک تلخ حقیقت کو چھپائے ہوئے ہے اور کافی اچھا ہے۔ "فن گفتگو" میں جیوں العل گوہر نے عورتوں کی محفلوں کا نقشہ بڑے خوبصورت طنز یہ اور مزاحیہ انداز میں کھینچا ہے مگر کیا ہی مزہ آتا جب وہ اسی طرح مردوں کی بھی دو چار محفلوں کا نقشہ کھینچ دیتے جہاں سگریٹ کے دو چار مرغولوں میں بڑی بڑی حکومتوں کے تختے تک الٹ دئے جاتے ہیں۔ عورتیں لاکھ "فن گفتگو" میں ماہر سہی، مگر دنیا کے بڑے بڑے مقرر ین اور خطیب "صنف نازک" ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ "مجاز ـــ اپنے ہی پس منظر میں" کچھ پھیکا نظر آیا۔ ایسے اور خوبصورت بنایا جا سکتا تھا۔ نقد و نظر میں "رنگ حنا" پر تبصرہ کرتے ہوئے منیر الجعفری کے متعلق سواد جعفری کے اس جملہ پر کہ "رنگ حنا" کا شاعر اسی راہ پر گامزن ہے جس پر اردو شاعری کا کاروان تیس سال سے سفر کر رہا ہے" نقاد نے لکھا ہے۔ "شاعر کے مستقبل کی پہچان نئی راہیں کھوجنے سے ہوتی ہے۔ نہ کہ بنے بنائے راستے پر چلنے سے۔ اگر "رنگ حنا" کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ منیر الجعفری نے صرف بنے بنائے راستے پر چلنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے بلکہ نئی راہیں بھی کھوجی ہیں۔ ان کی نظمیں "صلیب" "سوال" "لولاد" "کھنڈر" "انکی کہانی" اور "اندھے بھکاری" ان نئے راستوں کا پتہ دیتی ہیں۔

آپ نے اپنے نوٹ میں "ادب اور مقصدیت" پر جو چند جملے تحریر فرمائے ہیں اور اس سلسلہ میں جو مشورے دیئے ہیں انھیں بخوشی قبول کر لینے کو جی چاہتا ہے۔

(پروفیسر) پیر زادہ اقبال بیجاپوری ـــــ ہاشم پیر درگاہ۔ بیجاپور

شاعر کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ واقعی پچھلے شماروں سے کچھ مختلف ہے۔ نثری حصے میں بشر نواز کا مقالہ قابل تعریف ہے۔ انھوں نے "آلہ پاء" کا بڑے سچے تلے انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ مقالہ نو سینی ہونے کے باوجود تنقیدی پہلو بھی لئے ہوئے ہے۔ مناظر عاشق صاحب کا مضمون پڑھ کر حیات داغ دیکھنے کا اشتیاق بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ڈاکٹر ہی ان چند کا مضمون چونکہ ریڈیو کے لئے لکھا گیا ہے اس لئے اس کے اختصار کی شکایت کرنا نامناسب ہے۔

مظفر حنفی کی غزل کی تعریف کرنے کے لئے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ مطلع کے علاوہ مندرجۂ ذیل دو شعر بہت

پسند آئے۔

ارباب کم نظر سے کہو "احتیاط" سے ۔۔۔ یوں دیکھنے کی چیز نہیں زندگی کے زخم
پوچھیں گے آپ کیوں یہ نشیمن جلا دئے ۔۔۔ ہم آپ کو دکھائیں اگر تیرگی کے زخم

عبدالرحیم نشتر، سحر اعظمی اور اقبال ظاہر الکلکوٹی کی غزلیں بھی اچھی ہیں۔

"ترجمات" میں اس بار بھی بہت سی کام کی چیزیں ہیں۔ اردو والوں کا فرض ہے کہ وہ اسے طور سے پڑھیں اور کچھ کرنے کی کوشش کریں۔ دوسری ریاستوں کی طرح صوبۂ میسور میں بھی اردو کی حالت بہت خستہ ہے۔ اردو کے لئے یہاں کے ارباب نشاط کا رویہ بہت ہی مایوس کن ہے۔ قیدوں کی بات چھوڑ دیجئے۔ اردو کی روٹی کھانے والے اردو سے دور ہیں۔ اس سلسلے میں آپ مزید کچھ لکھئے۔

بدیع الزماں خاور ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴ اے فیلی مال۔ ڈالپلی (ضلع رتناگری)

آپ نے آئندہ عام انتخابات میں، ہر علاقے سے اردو کے آزاد نمائندوں کو کھڑا کرنے کی جو تجویز پیش کی ہے اس سے اردو والوں کی تائید حاصل ہونی چاہیئے۔ اس سے زیادہ مؤثر اور مفید طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ مرکزی انجمن ترقی اردو، ریاستی شاخوں کے اشتراک و تعاون سے اس سلسلے میں جلد از جلد لائحہ عمل مرتب کرے تاکہ کام کے آغاز میں تاخیر نہ ہو۔ اردو کے لئے تمام عملی اقدامات انجمن کے ذریعے کئے جائیں۔ یہ بات اہم اور ناگزیر ہے!!

"شاعر" کا تازہ شمارہ حسب معمول بڑے لکھنے والوں کی کمی کے باوجود حسین اور معیاری ہے۔ اور اس کے لئے آپ کی دیدہ ور تی قابل داد ہے۔

"سورج کا شہر" شہاب جعفری کی بہترین شعری تخلیق ہے۔ یہ نظم اسلوب کے اعتبار سے اچھوتی ہے۔ مظفر حنفی نے آپ کی زمین میں بڑی اچھی غزل کہی ہے۔ رفعت نواز، اور مناظر عاشق کے مقالات موضوعات کے لحاظ سے جامع اور پُر مغز ہیں۔ شمس فریدی اور اکرم نقاش کی نظمیں گہرے تاثرات کی حامل ہیں۔ فیروز نے شیکسپیئر کی "میڈ ریگل" کا کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ نیر شتم، شہاب دائروی اور رشید انور کے افسانوں کے علاوہ "جگر سے آخری ملاقات" اور "فن گفتگو" بھی پر لطف نثری تخلیقات ہیں۔ کرشن موہن کی غزل نے مجھے آج کل عام طور پر رسالوں میں چھپنے والی ان کی دوسری غزلوں ہی کی طرح مایوس کیا۔ رسول احمد کا ڈرامہ اس شمارے کی جان ہے۔

نعیم صدیقی چنوری ۔۔۔۔۔۔۔۔ محلہ وارث میاں صاحب۔ کرپہ

جیسا کہ آپ نے مئی کے "شاعر" کے اداریہ میں تحریر فرمایا ہے، اب وقت آیا ہے کہ انجمن ترقی اردو (کل ہند) اور اردو کے دیگر اداروں مشترکہ طور پر ایک ہندستان گیر پیمانہ مرتب کریں اور انتخابات کے وقت اس پلان کے تحت اردو کے مقاصد حاصل کرنے کے ذرائع و وسائل کو اپنانے کی سعی بلیغ فرمائیں۔

اب کی بار مقالوں میں "کچھ آملہ بابا کے بارے میں" "نثر سیاب" "جگر سے آخری ملاقات" "فن گفتگو" اور "ہمارے اپنے ہی پس منظر میں"۔ افسانوں میں "روٹی اور لیڈی" "وادیاں گلاب کی" "نظموں میں "سورج کا شہر" "اے مقدس وطن" اور غزلوں میں مظفر حنفی، قیصر تمکین، اور ممتاز راشد کی غزلیں خاصے کی چیز ہیں مکتوبات میں [illegible] سے متعلق قیصر قلندر کے مکتوبات کے جواب میں ڈاکٹر سلام مچھلی شہری نے جو تفصیل پیش کی ہے واقعی وہ نہ صرف ریسرچ کا مرتبہ رکھتی ہے بلکہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی متانت، سنجیدگی اور صبر کی بھی مظہر ہے اگر میں یہ کہوں کہ اردو کے اہل قلم اور نقادوں کو اسی قسم کی متانت، سنجیدگی اور صبر سے کام لینا چاہیئے تو بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب [illegible] محسن ہے بلکہ قابل تقلید بھی۔

کسی وقت "شاعر" میں ایسا باب بھی کھلا ہوا تھا جس میں اساتذۂ سخن کی اصلاحیں، مشہور شعراء کی غزلوں پر نقادوں کی تنقید

اور بھوپال تینوں حضرات کے جوابات شائع کئے جاتے تھے۔ اگر یہ باب پھر سے جاری کر دیا جائے تو کیا ہے۔ میں شاعر کے مکتوب نگار کے ساتھ اس سلسلے میں جانا چاہتا ہوں۔

میں بھوپال اور ٹونک کو نسل کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں کہ اس نے اردو کے دانشوروں کو اعزازات دینے کا جو قدم اٹھایا ہے کہ عجب ہے کہ ہندوستان کے دیگر علاقوں اور شہروں کی کونسلوں نے ابھی وہ قابلِ تقلید ہو۔ میں اردو کے عظیم۔ با اقتدار و صاحب اثر افراد سے التماس کرتا ہوں کہ وہ اپنے اپنے علاقوں اور شہروں کی کونسلوں کی اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ ترغیب دلائیں کہ وہ بھوپال اور ٹونک کونسل کی طرح اپنے علاقے کے اردو دانشوروں کی مالی امداد کریں۔ تاکہ اردو کے دانشور دنیا کے ایک حد تک مقامی حوصلہ افزائی حاصل ہو۔ اور یہ عجب کہ یہ مقامی حوصلہ افزائی نئی تخلیقات کا باعث بنے۔

عتیق احمد عتیق ——— دیاپورہ۔ مالیگاؤں۔ ضلع ناسک

خط پڑھ کر ہم تو سہم گئے۔ آپ کے رکن کمیٹی محترم شفیع اور اثر بیاؤلی اعزاز مذکور کے دیرینہ ہم منصب ہونے والے افتتاحی پروگرام میں شرکت کے لئے پُرزور اپیل کرنے میرے پاس آئے۔ بزم امجد "گزشتہ ایک ماہ قبل قائم ہوئی ہے اور آپ کے نام سے منسوب ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بزم ہذا کے منتظر ہونے والے افتتاحی پروگرام میں آپ بھی شرکت فرما کر اپنی شیریں بیانی کا موقع بخشیں۔ اور اپنے زرین نگار افکار مشوروں سے نوازیں۔ ہم نے آپ اپنے گنہگاروں معروفیات کے باوصف صرف ایک روز کی قربانی دے کر ہمیں ممنون فرمائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ آپ کرشن چندر نمبر کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داریوں سے جب تک فراغت نہ پالیں گے، باہر کہیں سفر کا ارادہ بھی نہ کریں گے لیکن بچوں بڑوں کے ادیبوں جو آپ کے نام سے اردو زبان و ادب کی مستقل اور قابل قدر خدمات انجام دینا چاہتے ہیں ان کے دل نہ توڑ جائیں گے۔ لہٰذا جس طرح ممکن ہو از راہِ احسان نوازی تھوڑا سا وقت نکال کر صرف ایک روز کے لئے یہاں ہو جائیے۔ ان لوگوں کی بھی حوصلہ افزائی ہو جائیگی اور آپ بھی اس سفر سے بہت خوش ہوں گے جواب کے لئے پوسٹ کارڈ منسلکہ ملفوف ہے۔ اپنی خیریت کے ساتھ ساتھ اپنی آمد کی بشارت سے نوازئیے تو ممنون ہوں۔

جواب:—

مکرمی تسلیم

کل عزیزی عتیق صاحب کا خط ملا اور اسی کے ساتھ آپ کا پتہ لکھا ہوا کارڈ۔

میرے ہم مگان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ مجھ پر یہ سیستم یا کرم کیا جائے گا۔ بہر حال آپ سب کی محبت کا شکریہ۔ اگر میں یہ شکایت کروں تو بیجا ہوگا کہ میرے نام سے بزم بنانے سے پہلے آپ کو مجھ سے دریافت کر لینا چاہئے تھا۔ لطف یہ کہ عتیق صاحب نے بھی آپ کو یہ بات یاد نہ دلائی اور نہ اس اقدام سے روکا۔ وہ تو میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں۔

میں نہایت سچائی اور خلوص کے ساتھ یہ بات عرض کر دوں کہ میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ میرے نام سے کوئی بزم وغیرہ بنائی جائے۔ وہ بھی میری زندگی میں۔ مرنے کے بعد بھی میرے کارِ سفر میں شاید ہی کوئی ایسی چیز مل سکے جسے اتنا بڑا اعزاز دیا جائے۔ میں اپنی خدمات کی بے مائگی کو خود اچھی طرح جانتا ہوں۔ اب تک جو کچھ کیا ہے اور آئندہ جو کچھ کر رہا ہے اس کے لئے بھی دعا گو ہوں کہ اللہ صلہ و ستائش کی تمنا سے ہمیشہ بے نیاز رکھے۔ لطف اسی میں ہے اور یہی جہد و عمل کی روح ہے۔

میں آپ سب سے یہ درخواست کروں گا کہ اس بزم کو کسی اور قابل قدر ہستی کے نام سے منسوب کر دیجئے۔ جو آپ کے مالیگاؤں میں مسلم صاحب نظر صاحب، مشوق صاحب، ادیب صاحب وغیرہ اساتذۂ فن میں سے ہیں اور اس لائق کہ ان کی خدمات کی یادگاریں قائم کی جائیں۔

ہندو پاک کی مرحوم شخصیتوں میں بھی بہت بڑے بڑے نام ہمارے سامنے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق۔ آرزو، صفی، فانی، یگانہ، سیماب، حسرت، اصغر۔ ٹونک چند محروم۔ ادبا و شعرائے موجد میں بھی جلیل القدر لوگ ہیں۔ اثر لکھنوی، جوش ملیح آبادی، وحید احمد صدیقی، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، آلِ احمد سرور، مالک رام کو تو جانے پوری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس

ثانی عبدالودود حیدرآباد، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر گیان چند وغیرہ ڈاکٹر شعر و ادب کے نام گنوائیں آپ کرا۔ ان میں سے ہر ایک کی خدمات نہایت مفید اور اہم ہیں۔ حال ہی میں مولانا نیاز فتحپوری نے انتقال فرمایا ہے۔ بہت مناسب ہوگا کہ آپ اپنی بزم کو "بزم نیاز" کا نام دے دیں۔ مولانا نیاز کے اردو ادب پر بہت احسانات ہیں ـــــ ان راہ کے اہم اراکین کا ایک جلسہ بلا کر بزم کا نام و زائل بدل لیجئے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو میرے لئے تحفہ و جشن کا بہت ہوگا اور مجھے بزم سے اپنی تعلق کا اعلان کرنا پڑے گا۔

رہا میرے مالیگاؤں حاضر ہونے کا سوال تو واقعہ یہ ہے کہ دو تین ماہ سے میری صحت بہت خراب ہے۔ خون کے دباؤ کی زیادتی میں مبتلا ہوں۔ علاوہ ازیں ہمارا ایک ایسا طوفان ہے کہ دو تک کنارا نظر نہیں آرہا ہے۔ اگر کسی دوسرے نام کی بزم کے ماتحت کسی جلسے میں بھی آپ مجھے اس وقت بلائیں تو میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ امید کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ اگر آپ نے میرے کسی مرحوم ہونے والے موضوع کے نام سے اپنی بزم کو منسوب کر دیا اور کسی دوسرے موقع پر بلایا تو ضرور حاضر ہوں گا اور اپنا خراج محبت پیش کروں گا۔

اس خط نے مجھے بہت اندیشہ مند بنا دیا ہے۔ میں عتیق صاحب کا خط اور آپ کو روانہ ہوا کہ جواب دانہ "شاعر" میں شائع کئے دے رہا ہوں۔ اس لئے کہ میری زندگی میں کبھی کسی طرف سے مجھ پر ایسا ستم نہ ہوا۔ اور میرا مسلک سب کے سامنے آجائے۔ یہ عرض کر دینا بھی نہ ہوگا کہ اس دیوانے شعر و ادب میں اتفاق کو ٹوٹے اور پروپیگنڈا کرنے والے کو میں بہت ناپسند کرتا ہوں۔ دیوانہ اپنے دامن کی دھجیاں اس لئے ہوتی ہیں کہ اس کے گریبان شائستہ جمع ہوں۔ اسے تو اپنے کام سے کام ہے۔ وہ تو نفس تخریق و تعمیر کے لئے رہبر ہوتی ہے۔ ادب اور ادیب کی سطح اونچی خوبصورت ہونی چاہیئے۔ ایسے کتا فتوں سے کیا تعلق!! ہمارے مسلمان نے داد و تحسین سے بے نیاز ہو کر ہی کارہائے نمایاں انجام دئے۔ اسی لئے وہ آج زندہ ہیں اور ہم انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔ مخلص اعجاز صدیقی

شفیقہ فرحت۔ ایم اے ـــــ مہارانی لکشمی بائی گورنمنٹ گرلز کالج۔ بھوپال

آپ کے دو خط مل چکے ہیں، اب تو اظہار ندامت پر بھی ندامت ہونے لگی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ لوگ Independence اور بھوکے مرنے میں لڑ پڑے۔!

کرشن چندر لاجواب اسی اعزاز کے مستحق ہیں جو آپ انھیں "شاعر" کی زبان سے دے رہے ہیں۔ ہندوستان کے کونے کونے سے آپ کی اس کوشش کو سراہا جا رہا ہوگا۔ (کچھ پریشانی میں بھی دخل ہے!!) لیکن یہ کام کچھ عاشقی سے کم صبر طلب نہیں۔ مٹتے مٹتے آپ اپنی قسم کو پہلے ہی ہو رہے ہیں اب نہ جانے کس عالم میں ہوں گے۔

بہر حال حسب روایت میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں ـــ (کرشن چندر کے اس پارسل پر ٹیکس خرچ معاف ہے ـــ!!)

میں اگلے ہفتے تک کرشن چندر کے کسی ناول پر تبصرہ یا ان کی شخصیت کا تاثر بھیج دوں گی۔ ذرا ڈر گئے ـــ! لکھنے کے سلسلے میں ابھی ایک الہام ہوا ہے۔ پچھلے دنوں حیدرآباد میں جو طنز و مزاح کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کے دوسرے دن ایک ادبی نشست ہوئی۔ جسے کرشن چندر کے ساتھ ایک نام کا نام دیا گیا تھا۔ اس میں انھوں نے اپنی تین کہانیاں سنائیں۔ اسی نام کے بس منظر میں، میں ان کے فن پر کچھ لکھ دوں گی۔ کہنے کی حکم ہے؟ ـــ

مسعود تمر تاباں ایم اے ـــــ مرکز ادب، بدھوارہ۔ بھوپال

تازہ "شاعر" میں شہاب جعفری اور شمس فریدی کی نظمیں پسند آئیں۔ اس بار نثری حصہ کچھ کمزور ہے: "نثر سیماب" کے سلسلے میں "حیات داغ" پر مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون ایک قابل قدر کوشش ضرور ہے لیکن مضمون نگار کا "حیات داغ" کا گہرا مطالعہ اور نثر سیماب پر اچھی گرفت کی کمی کھٹکتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علامہ سیماب مرحوم کی نثری تحقیقات پر ناقدانہ تحقیق کی جائے تاکہ مرحوم کے فن کا یہ پہلو اجاگر ہو کر اردو نثر کے سرمایے میں اضافہ کا باعث بن سکے۔ "جگر سے آخری ملاقات" آغا صاحب نے بڑی خوبصورتی سے پیش کی ہے۔ مشاہیر کے بارے میں ایسے مضامین لکھے جاتے رہیں تو اچھا ہے۔ اس مرتبہ افسانوی حصہ بھی نسبتاً ہلکا ہے۔ افسانہ "جلتی آنکھیں" کا پلاٹ تو اچھا ہے لیکن اسے اتنی ہی خوبصورتی سے پیش نہ کیا جا سکا۔ اور افسانے کے کردار بھی واضح طور پر پیش نہیں کئے جا سکے۔

مظفر حنفی کی غزل بہت پسند آئی۔ حال ہی میں مختلف رسائل میں موصوف کی مختلف رنگ کی غزلیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس فن پر کتنی قدرت حاصل ہے۔ یہ غزل جو آپ کے نام منسوب کی گئی ہے اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ آپ کے اور مظفر حنفی کے دلوں میں کوئی نہ کوئی کلید مشترک موجود ہے۔ خدا ان زخموں سے سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔

پروفیسر ایم۔ سیف اللہ ——— ۲۰۰۱-۲-۸ جیلی ہاؤس۔ حیدرآباد

"شاعر" برابر ملتا ہے۔ اور بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ اپنی کمپنی کی بعض سہیلیوں کو بھی پڑھ کر سناتی ہوں۔ خصوصاً اشعار۔ "خاص نمبر" بہترین انتخاب ہے۔ اسے اٹھا کر بار بار پڑھتی ہوں۔ خاص طور پر جمیل مظہری کی نظمیں "یہ کیا ہوا تم کو۔" اور "ذرہ ذرہ خدا سے ڈرو۔" ناقابل فراموش ہیں۔ مقالہ میں صرف چند بند دئے گئے ہیں۔ اگر آپ مکمل نظمیں شائع کریں تو لطف آجائے۔

تازہ شمارہ میں معجز سے آخری ملاقات پڑھ کر اور خود ان کے ہاتھ کی تحریر کی ہوئی غزل دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی۔ اس موضوع پر ضخیم کرانے کا ارادہ ہے جس پر Photo stat ہے۔

عروج احمد عروج ——— نزد مکرم ٹاکیز۔ مالنہ

مئی ۲۰۰۱ء کا "شاعر" نظر نواز ہوا۔ آپ نے اداریہ (اردو واحد انتخابات) میں جو تجاویز پیش کی ہیں ان پر اردو دوستوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے کہ ان تجاویز کو روبہ عمل لانے میں وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ اس بار مضامین میں رفعت نواز کا مقالہ "کچھ آبلہ پا کے بارے میں" پڑھ کر محسوس ہوا کہ یہ مقالہ بھی رفعت کے دیگر مقالات میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے بڑی تفصیل سے ناول نگار رفیع فتیح احمد کے فن پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا یہ مقالہ ایک حد تک تبصرہ کے تعریف میں بھی آتا ہے۔ افسانوں میں رشید انور کا "مقدر" معقدی افسانہ بے حد جاندار ہے۔ مظفر حنفی اور ممتاز آفرید کی غزلیں بھی اچھی ہیں۔ اس بار "مکتوبات" میں بقول آپ کے ذرا کھل کر باتیں ہوئی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم تنقید کو کس حد تک برداشت کر سکتے ہیں۔

آپ نے محفل آرائی میں یہ بات خوب کہی کہ مستند و مشاہیر شعراء نہ جانے کہاں گم ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی جو قلم کار آپ سے تعاون کرتے ہیں، ان کی تخلیقات سے بھی "شاعر" کچھ فیر معیاری تو نہیں ہو جاتا۔ اور پھر آپ کا انتخاب معیار کا ایک شاندار ثبوت ہوتا ہے۔

سید شمیم احمد ——— پی۔ ایس۔ بی۔ ایم ۱۱۱ کدما جمشید پور

تازہ شمارہ کے حصہ مضامین میں رفعت نواز کا "کچھ آبلہ پا کے بارے میں" غنیمت ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کا "۱۹۶۵ء کی قابل قدر ادبی تخلیقات" اس لئے قابل درگزر ہے کہ یہ ریڈیو کے لئے لکھا گیا ہے۔ پھر بھی ان کی چند باتیں قابل گرفت ہیں بخصوص جناب کلیم الدین احمد کی "بیالیس نظموں" کے بارے میں ان کا یہ کہنا ——

"..... بحر کریں کھاتے مصرعے، کمزور قافیے، عام خیالات، کسی نظم میں اتنی دلکشی نہیں کہ ایک بار پڑھنے کے بعد دوبارہ قاری کے دل احساس کو کھٹکھٹائے ....." (بہ الفاظ دیگر بکواس) نادرست ہی نہیں بلکہ انتہائی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اسے صرف ان کا ذاتی خیال کہہ کر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بات خلوت سے نکل کر جلوت تک پہنچ چکی ہے۔ اگر ان کی رائے کو درست بھی مان لیا جائے تو یہ بھی دریافت کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اگر بیالیس نظموں کے بارے میں آپ کا یہی خیال تھا تو پھر ۱۹۶۵ء کی بہترین ادبی تخلیقات میں ان کا ذکر کیسا معنی؟ آپ کلیم الدین احمد کی بیالیس نظموں کو ۱۹۶۵ء کی بہترین ادبی تخلیقات پر قلم اٹھاتے وقت نظر انداز کر دیتے۔ لیکن نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے ممدوح کے روبرو کلیم الدین احمد کی علمی شخصیت، تنقیدی صلاحیت اور شعری الفرادیت سے متاثر ہی نہیں۔ مرعوب بھی ہیں۔ مگر کیا کیجئے گا تنگ دلی اور عصبیت کا جو ہر حال اپنے اظہار پر مجبور ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کا یہ رویہ ان کی ادبی بصیرت اور بزرگی کے شایان شان نہیں ہے۔ خدا شاہد ہے کہ میں ان کی دل سے عزت کرتا ہوں مگر ——— میں بہر حال ان کو کبھی کہہ نہ سکا قدر ——"

اداریہ

محفل اپنی ....!

پہلی ششماہی

۱۹۶۶ء کی پہلی ششماہی کا اختتام جون کے اس شمارہ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جنوری سے جون تک پورے چھ پرچے پیش کئے گئے۔ جولائی سے دسمبر ۱۹۶۶ء تک کی دوسری ششماہی کے بقیہ چھ شمارے بھی اسی طرح پابندی کے ساتھ پیش کئے جائیں گے۔ ہر مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں "شاعر" کو شائع کرنے کی امکانی کوششیں جاری ہیں۔

یہ تازہ شمارہ

جون ۱۹۶۶ء کا یہ تازہ شمارہ پچھلے شماروں ہی کی طرح متنوع ہے۔ "انٹرویو" طنز و مزاح، تراجم، مقالے، افسانے سب کچھ ہے۔ اس شمارہ کی کئی تخلیقات بھرپور ہیں۔ سیماب بدکے فنی نظریات، اور "اردو مرثیہ کا تدریجی ارتقاء" اس کا ثبوت ہیں۔ نئے شعراء کو اردو میں پیش کرنے کا سلسلہ "شاعر" نے شروع کر دیا ہے۔ بخیتن پر مضمون پسند کیا جائے گا۔ "عاشقی صبر طلب" طنز و مزاح کا خوبصورت شہ پارہ ہے۔ افسانوں میں دو طبع زاد اور دو ترجمہ شدہ ہیں۔ "ایک شام" غیر معمولی اچھے افسانوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ تحلیل نفسی پر اس افسانہ کی بنیاد ہے۔ "ایک جھونپڑی کی کہانی" بڑی دردناک ہے۔ "سنگینا" اور "خط" دوسری زبانوں کی معیاری کہانیاں ہیں۔

اس بار نظمیں اور غزلیں نہ صرف زیادہ ہیں بلکہ کافی معیاری بھی۔ "شاعر" ادبی رسائل کی ٹھٹھری ہوئی ادبی روایتوں کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ارتقا کی طرف

"شاعر" کی ترتیب اور اس کے حسن و معیار میں اضافوں کے لئے بہت دن سے سوچا جا رہا ہے جولائی اور اگست کے دونوں شمارے اس اعتبار سے اہم ہوں گے۔ ہم کوشاں ہیں کہ "شاعر" میں ایسی نئی تبدیلیاں لائیں جو اسے ایک مستند ادبی جریدہ بنا دیں۔ امید کہ شاعر اہل قلم" ان تبدیلیوں کے سلسلے میں ہم سے تعاون فرمائیں گے۔

ایجنٹوں سے

خوش قسمتی سے "شاعر" کو بہایت پرخلوص اور ادب دوست ایجنٹوں کا تعاون حاصل ہے۔ "شاعر" کے ان تمام ایجنٹوں سے گزارش ہے کہ وہ اخباری کاغذ کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر پہلے سے اضافی کاپیوں کی اطلاع دے دیا کریں۔ تاکہ ان کی ضرورت کے مطابق پرچہ چھپوایا جا سکے۔ انھیں کسی قسم کی شکایت نہ ہو۔

صرف دو

"شاعر" نوازوں اور ادب دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ دوسری ششماہی کے پہلے شمارے جولائی ۱۹۶۶ء سے صرف دو دو نئے خریدار عنایت فرما دیں۔ ان کا یہ تعاون "شاعر" کے نئے پروگرام اور گرانی کے اس بحران میں زبردست امداد کا کام کرے گا۔

"شاعر" کی قیمت میں معمولی سا اضافہ

ملک میں بڑھتی ہوئی زبردست گرانی کی وجہ سے سب ہی رسائل و اخبارات نے بہت پہلے اپنی قیمتوں میں اضافہ کر دیا تھا لیکن "شاعر" اب تک اسی پرانی قیمت میں دیا جا رہا تھا۔ ہم اضافہ کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ ملکی روپیہ کی قیمت میں یکایک کمی نے درآمدی کاغذ کی قیمت میں مزید سوا تین سو روپیہ فی ٹن کا اضافہ کر دیا۔ اور اسی مہینے سے اخبار بیچنے والے ڈیلروں نے بڑھی ہوئی قیمت وصول کرنا شروع کر دی ہے۔ یہ ملک کے چھوٹے اخبارات و رسائل کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اگر حکومت نے فریاد سن لی اور اس کا کوئی حل نکل بھی آیا، تو بھی دوسری گراں سامانیوں کی وجہ سے کوئی رسالہ پرانی قیمت پر اب نہیں دیا جا سکتا۔

ہم "شاعر" کی قیمت میں اس کے بڑھے ہوئے اخراجات کے اعتبار سے تو کوئی اضافہ نہیں کر رہے ہیں۔ البتہ صرف تھوڑا سا نقصان پورا کرنے کے لئے قیمت میں برائے نام اضافہ کیا جا رہا ہے۔ یعنی سالانہ چندے میں صرف ایک روپیہ کا اور فی کاپی میں صرف دو آنے کا۔

چنانچہ جولائی ۱۹۶۶ء سے "شاعر" کی سالانہ قیمت آٹھ روپے اور فی کاپی بارہ آنے (۷۵ پیسے) ہوگی۔

امید کہ "شاعر" کے مستقل خریدار اور ایجنسیوں سے خریدنے والے حضرات اس نہایت معمولی اضافہ کو قبول کر لیں گے۔

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

گفتنی ——— از مخمور سعیدی

مخمور سعیدی اردو دنیا میں ایک جانا پہچانا اور امید افزا نام ہے۔ آزادی کے بعد جب سے نام آور کر سامنے آئے، کچھ تو بن کھلے ہی مرجھا گئے، کچھ بڑی بڑی بلڈنگوں کی گنجیوں میں سمٹ کر رہ گئے اور کچھ ٹاٹے دال کے ڈبوں میں بند ہوتے چلے گئے۔ ہم آگئی صبح اور چڑھتی عمر میں بھلا کون شاعر نہیں ہوتا۔ لیکن پختی دھوپ اور ٹھہرتی عمر میں شاعری تلاش کرنے کے لئے ادبی لگن کے ساتھ ساتھ تیر کے نقطوں میں زندگی کو ناپنا پڑتی ہے، مخمور سعیدی کا شمار ان چند خوش قسمت ناموں میں ہے، جو بدلتے وقت ناہموار حالات اور سماجی ذہنی رویوں کے بوجھ تلے بھی پرورش لوح و قلم کرتے رہے.... اور آج کمال بتدریج اور ارتقاء کے ساتھ کر رہے ہیں۔

مخمور سعیدی حساس طبیعت اور روشن ذہن کے شاعر ہیں۔ ان کا شعری آرٹ سنی سنائی باتوں رائج الوقت عقائد اور موروثی روایات سے کم متاثر ہوا ہے، یہ چلتی پھرتی زندگی کے ساتھ زیادہ چلا ہے۔

ان کی نظموں اور غزلوں میں انفرادی تجربہ اور حیاتی تجربہ فنکارانہ روپ میں نظر آتا ہے۔ یہ شاعری بنا لیبل کی ہے، اور یہی اس کی بڑی خوبی ہے۔ زندگی کو ہے کی سلاخ کی طرح سیدھی اور سخت نہیں بلکہ نرم اور لچکیلی ہوتی ہے ——— "گفتنی" کا شاعر بکھرے ہوئے لمحوں میں سانس لیتے مؤدس کی زندگی جیتا ہے اس کا ہر قدم ایک نیا تجربہ، ہر صبح ایک نیا زاویہ اور ہر شام، ایک نئی پہچان ہوتی ہے۔ وہ ایک کائی میں جیسا سوچتا، دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسے فنکارانہ آب و تاب بخش دیتا ہے۔ مخمور کے ہاں ٹوٹک کا ذہنی رچاؤ بھی ہے اور دہلی کا "گفتنی" پھیلاؤ بھی، وہ جہاں حسن نظارہ میں ؎

یاں بکھرائے رخ گلفام پر تو کھڑی ہے سامنے کے بام پر
یا مجسم ہو گئی ہے چاندنی قدِ آدم ہو گئی ہے چاندنی

حسن نظارہ بڑھانے کیلئے مجھ کو دیوانہ بنانے کے لئے
یا یہ ایک پیہم ایک حسرت ہیں
جانی پہچانی نگاہوں کا تصادم اور پھر
ایک بے نام تبسم کی کرن ہونٹوں پر
ایک انجان مسرت کی چمک آنکھوں میں

رومانی سرشاریوں میں کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں وہاں کسک اور دوسری نظموں میں زندگی کو تجزیاتی باریک بینی سے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سیمگوں چاند کے آئینے میں
جلوہ گر ہے ترا ہنستا ہوا روشن چہرا
تو کسی انجمن ناز کی زینت ہو گی
میں یہاں غم کے جہنم میں پڑا ہوں تنہا
سوچتا ہوں کہ کوئی کلمہ کہوں

ماضی کا اقتباس بھی دیکھئے۔

دستور ہے یہاں کا پیچھے نظارہ کرنا
ایسا نہ ہو دگرنہ اقلیم عمر لوٹ کر
حاکم تجھے سزا دے۔ پیکر کا بت بنا دے

مخمور سعیدی کے انداز بیان میں کلاسیکی سنجیدگی اور عہد جدید کا نفسیاتی لچکیلا پن دونوں پائے جاتے ہیں، غزلوں میں روایتی دلکشن کہیں کہیں کھٹکتا ہے۔ جس سے خیال کی تازگی مرجھائی سی، لگتی ہے مگر ان میں اچھے اور خوبصورت شعروں کی خاصی تعداد ملجاتی ہے یہ بھی کچھ کم نہیں، ان کی غزلیں بالکل روایتی نہیں معلوم ہوتیں، ان میں ایک طرح کی ندرت ہے اگر یہ بڑھ جائے تو مخمور سعیدی غزل اور نظم دونوں کا ایک متوازن شاعر کہلائے گے۔

نہ پوچھ آہ کچھ ان بانہوں کی ویرانی
کھلی نہ جن پہ کبھی زلف مشکبو تیری
زندگی کا کٹھن سفر..... تنہا

جیسے گزرے کوئی جنم سے
اپنے انجام کا آغاز ہوئی جاتی ہے
زندگی دور کی آواز ہوئی جاتی ہے

"گفتنی" خوبصورت گیٹ اپ اور اچھے کاغذ پر چھپی ہے۔ دیا چند گوپال متل نے لکھا ہے، قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ تحریک ۹۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج، دہلی ۶

تحقیقی مطالعے

انا ..... عطا کاکوی

تحقیقی مطالعے اردو کے مشہور محقق نقاد عطا کاکوی کے انیس مقالات کا مجموعہ ہے۔ تحقیق بڑی جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس میدان سے گزرنے کے لئے ذہن کے ساتھ پسینے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ جذباتی وابستگی اور غیر ضروری عقیدتمندی، زندگی کے اور شعبوں کی مانند ادب پر بھی مضر اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ ماضی کی صحیح پہچان حال کے صحت مند استحکام کی تلاش ہوتی ہے۔

عطا کاکوی نے ان مضامین میں تاریخی دلائل اور تنقیدی بیباکی کے ساتھ کئی نقابوں کو اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ "ذوق کے کلام پر آزاد کی اصلاحیں" اور دوسرے مضامین اس ڈھنگ کی خوبصورت کوششیں ہیں۔ عطا صاحب نے بڑی موجو بوجھ سے آب حیات کے مصنف کی تاریخی استناد پرستی کا تجزیہ کیا ہے، ذوق کے اور بچپل اشعار پر آزاد کی لفظی و معنوی اصلاحات کا تقابلی جائزہ "ذوقیات" میں ایک نئے اور اہم تجربے کے مترادف ہے۔ اس کتاب کے دوسرے مضمون میر کے معروضہ اشعار، میں اردو کے ان چند مشہور شعروں کی نسبت کو متقادانہ نظر سے تولا گیا ہے جو نقادوں کی سہل پسندی کی بنا پر کہیں سے کہیں منسوب کر دیئے جاتے ہیں۔

مثلاً یہ مشہور شعر

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

امیر کے الف دبنے کی وجہ سے میر ہی منسوب کیا جاتا ہے جبکہ مذکورہ کا قصر بحوالہ تذکرۂ شیفتہ ایک شاعر امیر شاگرد قائم کا ہے اسی طرح ذیل کے اشعار

دلی کے کچھ کلاہ لڑکوں نے
کام مشتاق کا تمام کیا،

کوئی عاشق نظر نہیں آتا
ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

فاروقی صاحب میر کے سمجھے ہوئے ہیں، حالانکہ یہ شرف قائم کے نام ہیں جس پر میر نے تضمین کی ہے۔ تحقیقی مطالعے میں انیس تحقیقاتی نوعیت کے مختلف طرز و انداز کے مطالعات شامل ہیں۔ انہیں سے بیشتر مضامین پاک کے معیاری رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، ان میں سے ہر مقالہ اپنے موضوع پر ایک نئی تحقیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ تحقیقی تنقید کے لئے جس OBJECTIVITY اور عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے، اس کتاب میں ہر جگہ نمایاں ہے، عطا صاحب نے ان مقالوں میں صاف سلیس زبان اور سیدھا سادا انداز اختیار کیا ہے۔ قیمت تین روپے سناشو اعظیم الشان بک ڈپو، سلطان گنج ۔ پٹنہ ۔ ۶

تلاش نور

انا ..... درشن سنگھ دخل

ہر مقدس صحیفہ تلاش نور کا دستاویز اصل ہے۔ کوئی جوت کی جلی کرن کو جل چڑھاتا ہے، کوئی سرمئی دھندلکوں میں سیاہ اندھیرے کی صدا دیتا ہے۔ کوئی سلگتے آتش دان کے سامنے سر عقیدت خم کرتا ہے۔ اور کوئی گرجے میں صلیب پر ٹنگی عظیم سچائی کو بوسہ دیتا ہے۔ مختلف زبانیں، ان گنت علامتیں ایک حقیقت ۔۔۔ زندگی میں نور کی تلاش۔

جسم اور روح کا توازن زندہ سماج کی تہذیبی شناخت ہے۔ ہندو پاک میں ۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات، امریکہ میں رنگ و نسل کے نام پر ظلم و تشدد، نئے دیت کا نگوں پر سامراجی ہٹ دھرمی، چین کی نئی چنگیزیت، انسانی حیات کے اس رشتے کے عدم توازن کی کچھ ہیبت ناک مثالیں ہیں۔ آج انسان کو خلائی اڑان اور سائنسی نت نئی ایجادوں سے زیادہ صوفی کے چہرہ پر چھائی ہوئی تاریکی میں روشنی کا تجربہ کرنا ہے۔ سائنسی ترقیات سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے لئے ہمیں ذہنوں میں لپٹی ہوئی دائمی و بنیادی روحانی اقدار کو نعروں میں ملانا اور پھیلانا ہے۔

وہ کیا نکھارے گا ہر ذرہ کو وہ کیا سنوارے گا کانٹوں کو
چلے ہیں جو آسمان کی جانب، زمیں کی لیکن خبر نہیں ہے

درشن سنگھ دخل کی شاعری کو صوفی ازم سے لگاؤ ہے، ان کے خیالات میں وہی کھلاپن، فضائی اپنائیت، تہذیبی لوچ، اجلی

وحدانیت، شانتی اور خلوص ہے جو تصوف کی بنیادی خصوصیات رہی ہیں، وہ بھی دل کو خدا کا مقام اور عشق کو خدا سمجھتے ہیں۔

تلاشِ نور میں گورو نانک، حضرت محمدؐ، سری کرشن مہاراج، رام چندر جی، چھاتا بدھ، معین الدین چشتیؒ اور بہت سے دوسرے عظیم روحانی رہنماؤں کی تعلیمات پر خوبصورت نظمیں شاعر کی صوفی منشی اور سیکولر ذہنیت کی طرف واضح اشارہ کرتی ہیں۔ اس شاعری میں پنڈتوں اور ملاؤں کا سا کٹرپن نہیں بلکہ فقیروں کی سی کھلی ذہنیت، رواداری اور اشتراکی ہم آہنگی کی ملائمت نظر آتی ہے۔ حضرت زرتشت" میں وہ کہتے ہیں۔

کسی دیار کی بندش نہ سرزمیں کی قید
پیامِ عارف دانا ہے، کھل جا کھل جا کیتے

یہی وہ کھلی ذہنیت ہے جو حرم و دیر کی خارجی علامات سے اوپر اٹھ کر رب کی تلاش میں پرواز کرنا نظر آتی ہے، درشن کا شعر ہے۔

منزل دیر و حرم سے مجھے مطلب کیا ہے
میری منزل تو وہیں ہے تو جہاں ہو اے دوست

"صنمِ خانش" میں وہ کس خوبصورتی سے اپنا نقطۂ نظر بیان کر رہے ہیں۔

آسمانوں پہ نہ مذہب کو بٹھاؤ کہ یہ روح
آسمانوں ہی سے اترتی ہے زمیں کی خاطر
اِسی دھرتی کے تڑپتے ہوئے انساں کیلئے
سارے بچھڑے ہوئے انساں کو ملانے کیلئے

درشن سنگھ ایک سلجھے ہوئے ذہن کے اچھے شاعر ہیں۔ ان کی آواز میں خلوص اور انسان دوستی کا تھرتھراہٹ ایک خاص رچاؤ پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اسلوبی سجاوٹ اور بات ہے لیکن شعر میں تاثراتی شدت کو جگانا بغیر شعوری و غیر شعوری وابستگیوں کے ناممکن ہے۔ "تلاشِ نور" میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ ہر جگہ شاعر کا احساسِ جمال اور اس کی سچائی اور دھرتی پوجا کا عکس صاف نظر آتا ہے۔

قیمت تین روپے۔ ناشر

حلقۂ ارباب فکر۔ دہلی۔ پتہ روحانی ستسنگ
سبزی منڈی دہلی"

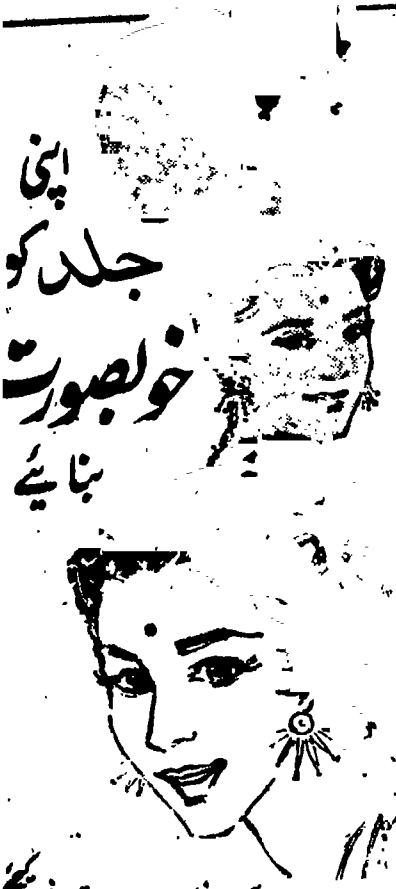

آج ہی فلورو زون کا استعمال شروع کیجئے
چند ہفتوں میں آپ کی جلد خوبصورت سے خوبصورت تر ہو جائے گی
فلورو زون جسم کو خوبصورت بناتا ہے۔ کیل، مہاسے اور جھریاں دور کر کے لاجواب حسن عطا کرتا ہے۔
فلورو زون جسم میں جذب ہو کر اپنے کیمیائی اثرات سے چھپے ہوئے حسن کو ابھارتا ہے۔ خوبصورتی، دلکشی اور جاذبیت پیدا کرتا ہے

فلورو زون لوشن چار روپے پچھتر نئے پیسے فی بوتل
فلورو زون کلنزنگ کریم پانچ روپے ۵۰ نئے پیسے
ہر جگہ دستیاب ہوتا ہے
یا براہ راست اس پتہ سے منگائیے
ہاربنگ ریسرچ لیبارٹریز پوسٹ بکس ۱۹۲ بمبئی ۱

اُردو کا حق مطالبہ کانگریس کو ووٹ دینے

فیروزآباد کے حامیانِ اُردو کا فیصلہ

فیروزآباد (ضلع آگرہ) یکم جون:۔ پرسوں شب میں ایک جلسہ ڈاکٹر رشید جہاں کی صدارت میں حاجی پورہ میں منعقد ہوا۔ قاضی یعقوب علی صاحب وغیرہ حلیفوں نے تقریر کرتے ہوئے اُردو تحریک کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اُردو کے حقوق کی پامالی اور اُردو کی بنا کی موجودہ ذمہ داری پر صوبہ اتر پردیش کی اسمبلی کا کانگریس پر حملہ ہوتی ہے۔

انجمن کلچرل سوسائٹی کی طرف سے اس جلسہ میں القاء قرارداد سے دو قراردادیں منظور کی گئیں۔ ایک کے ذریعہ علامہ نیاز فتحپوری ایڈیٹر "نگار" پاکستان کے انتقال پر ملال پر دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ان کی وفات کو دنیائے ادب اُردو کا ناقابلِ تلافی نقصان عظیم قرار دیا۔ دوسری قرارداد میں کانگریس سے پرزور اپیل کی گئی کہ

رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے رحلت فرمائی۔ آپ کی عمر تین ماہ تھی۔ مرحوم خواجہ عزت لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں نہایت منکسر مزاج، متواضع، سلیم الطبع اور خاموش کام کرنے والے عالم علم و ادب کی عزت میں بسر فرمائی۔ آپ کی ادارت میں ایک عرصہ تک شائع ہوتا رہا ہے۔ آپ کے مقطعات و رباعیات "مساغر و مینا" دنیائے شعر و ادب میں بلند مقام تصنیف ہے۔ تاریخ گوئی میں وہ مہارت تامہ حاصل تھی کہ جس کی مثال اس دور میں نہیں مل سکتی۔ تاریخی مقطعات کا مجموعہ "نوائے سروش" اس پر شاہد ہے۔ مرحوم اساتذۂ قدیم کا صحیح نمونہ تھے۔

(حکیم سید یوسف اسلوادہ)

مولانا آزاد کے خطوط مطلوب ہیں

بہت دن ہوئے میں نے درخواست کی تھی کہ جن احباب کے

رفتار — علمی — ادبی — تہذیبی — خبریں

وہ اُردو کے مطالبات پر ہندی کا رد والی کریں اور یو۔ پی۔ بہار وغیرہ میں اسمبلی کو سرکاری زبان کا درجہ دے۔ ورنہ اُردو دوست عوام آئندہ الیکشنوں میں پوری طاقت سے کانگریس کے خلاف حامیانِ اُردو کو نیابت کرنے کی مہم شروع کرنے پر مجبور ہوں گے۔

عابد حسین ادیب کو صدمہ

اُدے پور (ڈاک سے) راجستھان ساہتیہ اکیڈمی کے رکن اور اس کے اُردو رسالہ "تراث" کے مینیجنگ ایڈیٹر عابد حسین ادیب کے والدِ محترم جناب حسن علی صاحب بدایونی کا انتقال فرما گئے۔ مرحوم کی عمر ۸۰ سال تھی۔ وہ اپنی قوم کے نہایت بزرگ اور معزز لوگوں میں تھے ادارہ "شاعر" ادیب صاحب کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔

حضرت بیخود دہلوی کا انتقال

متعلقہ علم و ادب میں یہ خبر نہایت رنج و ملال کے ساتھ سنی جائے گی کہ صوبہ بہار کے کاملِ فن اور معمر [illegible] حفظ الرحمٰن اسمٰعیل صاحب وہ ۱۹۶۰ء کو [illegible]

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے خطوط میں سے کچھ تعداد میرے پاس بھیج دیں۔ تاکہ اعلیٰ "مکاتیب مولانا آزاد" میں کیا جا سکے۔ جو زیرِ ترتیب ہے۔ اس درخواست پر بہت سے صاحبوں نے لبیک کہا اور خطوط بھیج دئے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ ابھی تک کئی صاحبوں نے معاملے کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا اسی لئے خطوط نہیں بھیجے۔ میں دوبارہ درخواست کرتا ہوں کہ جتنا جلد ہو سکے بھیج دیجئے۔ اس طرح وہ ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو جائیں اور لوگوں کے پاس پڑے رہنے سے ان کا تلف ہو جانا یقینی ہے۔ خطوط کا کام ختم ہو جانے پر واپس بھیج دیئے جائیں گے۔

مالک رام۔ ساہتیہ اکیڈمی راجندر بھون

نیپال میں مشاعرہ

نئی دہلی، ۱۰ جون:۔ آئندہ ہفتہ نیپال کی راجدھانی کھٹمنڈو میں ایک مشاعرہ ہو رہا ہے جس میں ہندستان کی طرف سے اُردو کے نمائندہ شاعر شرکت فرمائیں گے۔ اس مشاعرہ میں کوئی اور ملکوں کے شاعر بھی شریک ہوں گے۔

ملازمت کیلئے تیلگو کیساتھ اُردو جاننا ضروری

حکومت آندھرا پردیش نے احکامات جاری کئے ہیں جن کی رُو سے تلنگانہ علاقے کے تو اضلاع اور آندھرا علاقے کے تین اضلاع میں حصولِ ملازمت کے لئے تیلگو کے ساتھ اردو دان جاننا ضروری ہوگا۔

آندھرا پردیش میں کل بیس اضلاع ہیں۔ حکومت آندھرا پردیش کے ان احکامات سے اردو کی تعلیم اور اسے سیکھنے کے رجحانات پیدا ہو گئے ہیں۔

اُردو افسانہ نگاروں کے تذکرہ کے سلسلہ میں ظفر اوگانوی کی بمبئی میں آمد

اُردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ظفر اوگانوی اردو افسانہ نگاروں کے زیرِ ترتیب تذکرے "اردو افسانہ سنہ ۳۰ تا سنہ ۷۰ء" کے لئے بمبئی آئے اپنے ایک ماہ کے قیام کے دوران انجمن نے بمبئی کے صفِ اوّل کے ادیبوں سے ملاقات کی۔ مقامی اخبارات نے ظفر صاحب کے تذکرہ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور انھیں ہر ممکنہ تعاون دیا۔ ظفر صاحب اپنے قیام بمبئی کے دوران نجیب اشرف ندوی، اختر حسین رائے پوری، مہندر ناتھ، انور عظیم، رشید امجد، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، واجدہ تبسم اور سلمیٰ صدیقی سے ملے۔ ظفر صاحب کا مذکورہ تذکرہ ترتیب کے آخری مراحل پر ہے۔

شہر میسور میں یادگار مشاعرہ

حسبِ اعلان ادارۂ بیت الادب کا نیا دوازدہ میسور کی جانب سے مورخہ ۱۲ جون کی شب ٹھیک دس بجے جناب محمود آباد ایڈیٹر ساقی بنگلور کی صدارت میں مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ عزیز الملک جناب عزیز بیگ صاحب سابق ایڈیٹر سیاست نے مشاعرہ کا افتتاح فرماتے ہوئے دوازدہ کا تعارف کرایا۔ صدر مشاعرہ نے مشاعروں کی اہمیت اور اردو زبان کی ترقی حال پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ افتتاحی تقریر کے بعد مشاعرہ باقاعدہ آغاز ہوا۔ غالباً میسور میں پہلی مرتبہ مشاعرے میں اردو کے شیدائیوں نے اتنی کثیر تعداد میں شرکت کی ہوگی۔

جناب بنگلور دہلوی صاحب کسی ذاتی کام سے میسور تشریف لائے تھے مسلمین کی درخواست پر انھوں نے مشاعرہ کی صدارت قبول فرمائی۔ جناب اقبال متین صاحب نے مشاعرہ کو اور زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے اناؤنسر کے فرائض انجام دیئے اور ہر شاعر کا منظوم تعارف کرایا جس سے مشاعرہ بے حد دلچسپ بن گیا۔

مشاعرہ جناب کامیابی کے ساتھ تقریباً دو بجے ختم ہوا۔ عوام کے خیال میں ایک یادگار مشاعرہ ہوا۔ تقریباً شہر میسور میں اکاون برس کے بعد اس شان سے ہوا ہے۔ اور شروع سے آخر تک مجمع کے ساتھ سنا گیا ہے۔

صدر جذیل شعرائے کرام نے مشاعرہ میں حصہ لیا۔

حضرات:۔ محمود آباد۔ بنگلور دہلوی، محمود سعید ممبر ساقی شاہی، محمد حنیف کلیم، شاہد، خلیل سیالی بدکوالاری، دبدبہ ٹونک سالک، روشن شاقی ہمایوں، سرور ش، بیباک، اقبال متین، کاوش ارمان آلدھوری، معلم صبیحی، امین، منصور، ڈاکٹر انور، واجد بیگ میکش، قمر اور محامد۔

بقیہ صفحہ ۵۰ "عمر انصاری ایک ملاقات"

ض:۔ اس کی THEME کیا تھی۔

ع:۔ اس دنیا کے مقابلے میں ایک نئی دنیا کی تلاش جو ہمارے مہدی نام پر انہوں سے پاک اور ہمارے شاعرانہ وجدان کے اعتبار سے پوری اترتی ہو۔

ض:۔ اس وقت آپ کن افسانہ نگاروں سے زیادہ متاثر تھے اور اب آپ کن کو پسند فرماتے ہیں؟

ع:۔ اس وقت مجھ کو پریم چند نے متاثر کیا تھا اور اب کرشن چندر اور بیدی کو پسند کرتا ہوں۔

ض:۔ آپ نے کئی ایسے اہم نام نہیں لئے جن کی افسانہ نگاری کے سلسلے میں طویل خدمات ہیں اور وہ بھلائے نہیں جا سکتے۔

ع:۔ میں نے اپنے پسندیدہ کہانی کاروں کا نام بتا دیا تھا۔ ویسے اور بھی کہانی کار ہیں جن کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں اور ان کی عظمت مانی ہوئی ہے۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔ میں مشاعرہ سے پہلے میسور انجمن ترقی اردو کے صدر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔

جاری شدہ ۱۹۳۸ء

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اُردو کا سنتیس سالہ علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	معاونین سے	تاعمر خریدار ہی	ممالکِ غیر سے	فی پرچہ
آٹھ روپے	پچیس روپے	۱۲۵ روپے	۲۵ شلنگ	۱۲ آنے (۵، پیسے)

مراسلہ زرکا پتہ

ماہنامہ "شاعر"، قصرالادب بمبئی ۸ بی سی

دہلی آفس

۱۲۱۱ - بلیماران - دہلی ۶

فروخت کا پتہ

مکتبۂ قصرالادب

پوسٹ بکس ۴۵۲۶، بمبئی ۸ بی سی

کلکتہ آفس

۱۲ کانگریس ایگزیبیشن روڈ، کلکتہ ۱۷

نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ

(اوّل اجرا)

سرمایہ لگانے کا

محفوظ، مُفید طریقہ

روپیہ لگانے کی شرطیں

۱۰ روپے ۱۰۰ روپے ۱۰۰۰ روپے

۱۸ روپے ۱۸۰ روپے ۸۰۰ روپے

ڈاک گھروں سے حاصل کئے جا سکتے ہیں

ایک نئی سیریز

نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ

(اوّل اجرا)

بنک سیریز

اس کے بھی وہی سرٹیفکیٹ فائدے ہیں

اسٹیٹ بنک آف انڈیا

اور اُس کے معاون بنکوں کے قریبی

DA 46/136

قومی بچت آرگنائزیشن

ترتیب

نارسائی سی نارسائی ہے!	(اداریہ)	اعجاز صدیقی	۷
اُردو میں اور توں کا ادب	(مقالہ)	سید طاہر صدیقی	۸
غزل		حرمت الاکرام	۱۱
آخری دھماکہ	(افسانہ)	اقبال صدیقی	۱۲
بیتاگ کے بعد	(نظم)	شہاب جعفری	۱۷
گجرات میں اردو	(خطبہ صدارت)	اعجاز صدیقی	۱۸
غزل		نازش پرتاپگڈھی	۲۳
چندنی کتابیں	(ویڈیائی تبصرہ)	ڈاکٹر گیان چند	۲۴
خلوص مدیرا	(نظم)	رام نرائن ناز	۲۷
جاپان کے نگہت	(افسانہ)	منظر کاظمی	۲۸
غزل		ارشد صدیقی	۳۲
ماضی	(نظم)	احمد وصی	۳۲
ایک ادیب کی ڈائری	(سرسری نام)	ندا فاضلی	۳۳
تاج محل	(نظم)	ساحل مزیگری	۳۵
غزل		حسن کمال	۳۵
مُفت کے مشورے	(طنز و مزاح)	سرور جمال	۳۶
ضمیر سے خیر تک	(نظم)	ظفر حمیدی	۳۹
دردبھری چیخ	(افسانہ)	مشتاق علی شاہد	۴۰
رات	(نظم)	تیغر صدیقی	۴۳
غزل		عتیق احمد عتیق	۴۳
غزل		نیاز فتحپوری	۴۴
ستم	(چند یادیں)	ضیا حسنی	۴۴
غزل	(نظم)	بدیع الزماں خاور	۴۷
نظم نظر کی بات		شاہین الہ آبادی	۴۸
مجھے پہچانتے ہو؟	(افسانہ)	عظیم اقبال	۴۸
نظم کی زبان	(نظم)	شاذ پرویز	۵۱
غزل	(ردیف اخر)	آل احمد سرور	۵۲
غزل		تاجی قریشی	۵۵
انسان اور روٹی		امیر چند بہار	۵۵
	(افسانہ)	ہاویں کبیر ترجمہ - متین قادری	۵۷
غزل		شاہد کبیر	۵۹
غزل		نعیم صدیقی	۵۹
غزل		قیس رامپوری	۵۹
اگر مجھ سے فرقتین دن کے لئے آنکھیں مل جائیں	(ترجمہ)	مس ہیلن کیلر	۶۰
تاریکیائے الم انگیز	(قطعۂ تاریخ)	عزیز قدوسی	۶۲

مکتوبات

ل۔ احمد — علی عباس عابد — عبید — رفعت نواز
نثار پرویز — انجمن آرا انجم — انوار انصاری
اظہر اضہر — تمنا مظفرپوری — ضیاء حسنی

محفل اپنی		ادارہ	۶۸
نقد و نظر	(تبصرے)	ادارہ	۶۹
رفتار	(ادبی و تہذیبی خبریں)	ادارہ	۷۲

تصویر صفحہ ۶ پر

مولانا نیاز فتحپوری

شاعر بمبئی

جولائی ۱۹۶۶ء

جلد ——— ۳۷

شمارہ ——— ۷

ادارۂ "شاعر" فخر و مسرت کے ساتھ
اُردو کے مشہور آفاقی افسانہ نگار

کرشن چندر

پر نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر پیش کر رہا ہے
کرشن چندر کی ممتاز شخصیت اور اُس کے ہمہ گیر فن پر نہ صرف ہندوستان کی کئی
زبانوں کے مشہور قلم کاروں بلکہ دُنیا کے بڑے بڑے مصنفین اور مفکرین
کے مضامین و تاثرات

کرشن چندر نمبر

میں
پیش کئے جائیں گے

کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ، اُس کی عظمت
کی کہانی، اُس کی تصانیف کا جائزہ
اُس کے زندہ اُسلوبِ فکر اور شاہکار
افسانوں، ناولوں اور
ڈراموں پر تنقیدی
نظر

درجنوں تصاویر
تفصیلات اور تاریخ کا انتظار کیجئے

کرشن چندر بمبئی میں
خود
کرشن چندر
کے اپنے قلم سے
ایک تازہ، غیر مطبوعہ اور شاہکار
ناول

کے
علاوہ
تین تازہ کہانیاں
ایک ڈرامہ
ایک مزاحیہ
میرے ادبی نظریات
میرے تنقید نگار
میری ادبی زندگی کا آغاز و انجام

کرشن چندر کے شب و روز
(تصاویر کے ذریعے)
اور
عکسِ تحریر
کرشن چندر کے
اہم خطوط

ارباب قلم اپنے مضامین کرشن چندر پر جلد از جلد ارسال فرمائیں

نارسائی سی نارسائی ہے۔!

بدقسمتی سے ملک میں مختلف آتش فشاں مسلک ہے ہیں۔ بھوک کا آتش فشاں، بے روزگاری کا آتش فشاں، مہنگائی کا آتش فشاں، حادثات اور بیماریوں کا آتش فشاں، حادثات کا آتش فشاں، چور بازاری اور بد اخلاقی کا آتش فشاں، سیاسی اختلافات کا آتش فشاں اور ان سب پر لسانی تعصب کا آتش فشاں۔ بے حسی اور کور چشمی کا تو ذکر ہی کیا؟ لیکن یہ واقعہ ہے کہ کروڑوں حساس دل و دماغ اور بینا آنکھیں ان حالات سے سخت متاثر ہیں۔ انھیں ہر طرف دھواں ہی دھواں اور چنگاریاں ہوا ہوا نظر آرہا ہے۔ کسی کل اُنھیں چین نہیں بیٹھنے دیتا ہے۔ عجیب بدحواسی اور انارکی کا عالم ہے۔

لسانی جھگڑے نہ ہوئے ختم ہوتے ہیں اور نہ کل ان کے ختم ہونے کی کوئی اُمید ہے۔ ہندی زبان کو قابل فہم بنا کر مختلف زبانوں کے صوبوں کو اس پر چڑھایا اور ڈرایا جا رہا ہے۔ صوبوں نے اپنی اپنی زبانوں میں سرکاری کام کرانے شروع کر دیے ہیں۔ سوا لوگ سخت مصیبت میں ہیں جو اگر ہندی، انگریزی اور اُردو تو جانتے ہیں لیکن صوبائی زبان اعلیٰ سطح پر نہیں جانتے۔ اب یہ لسانی بحران یونیورسٹیوں میں بھی گھس گیا ہے۔ حال ہی میں ناگپور یونیورسٹی نے اُردو زبان کے گلے پر چھری چلائی ہے۔ احتجاج ہو رہا ہے۔ قرار دادیں پاس کی جا رہی ہیں۔ مگر حاصل!!

حاصل وہی ہوگا جو صوبہ بہار، مدھیہ پردیش، دہلی، اُتر پردیش اور پنجاب وغیرہ میں ہوا۔ "کون سنتا ہے بے بسوں کی پکار" جھوٹے وعدے۔ غلط قسم کی دلاسہ ہی۔ نہ پارلیمنٹ کے میمورنڈم کا احتجاج کام آیا۔ نہ انجمن ترقی اُردو کے وفود کی ملاقاتوں کا نتیجہ نکلا۔ نہ جیتے جاگتے قرار دادوں نے کام دیا۔ آل پارٹیز اُردو کنونشن کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ پہلے تو محض کٹر ہندی پرستوں اور انتہا پسندوں ہی کا ذہن جو آج بھی اُردو کے وجود اور اس کی خدمت کے منکر ہیں اب یہ بات بھی صاف اور نمایاں ہو چکی ہے کہ مرکز سے لیکر بعض صوبائی حکومتوں تک کا مطمح نظر یہی ہے کہ اُردو کے جائز حقوق کو پامال کیا جائے۔

بہرحال اُردو والوں میں اب حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ایسا جذبہ اُبھر رہا ہے جو قربانیوں پر دلالت کرتا ہے۔ مگر یہ جذبہ تیز ہوتا چلا گیا تو ایک نہ ایک دن اُردو کے جائز مطالبات کے آگے مخالفین اُردو کو جھکنا ہی پڑیگا۔ ضرورت بہت چوکنا رہنے اور تنظیم و اتحاد کی ہے۔ بدقسمتی سے اُردو کی صفوں کا انتشار ابھی تک دُور نہیں ہوا ہے اور ایک اعتبار سے یہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ بمبئی اور بہار کی حالیہ "بھوک ہڑتالوں" اور اُن کے سلسلے میں عام طور پر اُردو والوں کا عدم اعتماد و اتفاق، بہار سے اجتماعی انتشار کی واضح نشانی ہے۔ اگر ان بھوک ہڑتال کرنے والوں کو اُردو کے عام حلقوں کی تائید حاصل ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کا اثر نہ ہوتا۔ بمبئی کانگریس کے سیشن کے موقع پر بھوک ہڑتال کرنے والوں اور جلوس نکالنے والوں کی طرف سے صدر کانگریس شری مراج کو ایک عرضداشت پیش کی گئی تو انھوں نے توجہ کا وعدہ فرمایا۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور صدر کانگریس دونوں سے چند ادیب بھی ملے۔ دہلی میں بھی یہی ہوا تھا۔ بہار میں بھی یہی ہوا۔ صوبہ بہار کے وزیر اعلیٰ نے بھی توجہ دینے کا وعدہ کیا، لیکن جس کا نام وعدہ ہے اور جو آزادی کے بعد سے اب تک کیا جا رہا ہے۔ وہ ایسی چڑیا ہے جسے ہم عنقا کہتے ہیں۔

"شاعر" کے اداریوں میں مدتوں سے یہ عرض کیا جا رہا ہے کہ ہماری اُردو تحریک بہت کمزور ہے اور اس کا سبب ظاہر یہ ہے کہ وہ طاقت ور وقت پر کام نہیں آتے جن سے عوام اور خواص اور خود حکومتیں متاثر ہوں۔ مداری کے پٹارے میں جب تک کوئی ایسا شخص ہاتھ نہ لگے جو جانتا ہو جیسے سانپوں کے زہر کا اُتار آتا ہو، اُس وقت تک کامیابی قابو میں نہیں آتے۔ لکھنؤ کے چند گم نام نوجوانوں نے بھوک ہڑتال کرلی تو کیا ہوا۔ کہ مستند اطلاعیں ہیں کہ اُس میں حیات اللہ انصاری۔ پنڈت سُندر لال۔ آل احمد سرور۔ آنند نرائن ملا جیسی گورکھپوری وغیرہ شامل نہ تھے۔ اگر آج فراق گورکھپوری اور پنڈت سُندر لال بھوک ہڑتال شروع کر دیں تو لاکھوں اُردو عوام اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ صوبائی حکومتیں لرز نے لگیں اور کل کوئی نتیجہ خیز بات سامنے آجائے۔ یہ وقت نظریاتی بحثوں اور علیحدگی پسندی کا نہیں ہے۔ اتحاد و تنظیم کا ہے۔ اسی لئے میں نے یہ نظم پیش کی تھی۔

۱۱ر جولائی ۷۲ء

عورت کو جلن کے پیچھے ہی رکھا جائے

سعیدہ طاہر صدیقی

اُردو میں عورتوں کا ادب

ہر دور کا ادب اُس وقت کی معاشی زندگی اور اُس کی پیچیدگیوں کا مظہر ہوتا ہے عام طور پر ادیب وقت اور زمانے کے ساتھ چلتا ہے اور اپنے فن سے سماج کے شعور میں گہرائی اور وسعت پیدا کرتا ہے۔

اسی لئے ہر ادیب کا ادب اوّل تو اُس کے اپنے شعور کے مطابق ہوتا ہے دوسرے انسان کی مادّی زندگی کے عروج و زوال کا آئینہ دار۔ اُردو زبان میں عورتوں کا ادب بھی کم و بیش انہی اصُول سے متابز رہا۔ عورتوں سے متعلق جو بھی ادب تخلیق میں آیا۔ اس کے بھی مختلف تاریخی دور ہیں۔ اور اسی تاریخی دور کے پس منظر میں ادب کی تخلیق ہوئی۔

ابتدائی افسانے اور قصّے، بہادری اور جانبازی اور دلیری کے کارناموں کے عکس ہوتے تھے ادب کا اثر افسانوں پر تھا

[illegible]

ارباب قلم

"مراۃ العروس" اور "بنات النعش" جیسے مشہور ناول لکھے۔

"مراۃ العروس" — تعلیم نسواں پر سب سے پہلی تصنیف تھی جس میں ایک چھوٹی عورت کا کیرکٹر پیش کیا گیا ہے۔ اور واقعات سے ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح ایک چھوٹی عورت اپنے خاندان کی تباہی کا باعث ہوئی۔ کتاب "بنات النعش" مستورات کی واقفیت عامّہ کے لئے سلیس اُردو میں لکھی گئی۔ اس کے علاوہ پند و نصائح کی کتاب مثلاً "مواعظ حسنہ" بھی تخلیق کی۔ یہ دور نثری قصّے کی کلاسیکی معراج کا دور ہے۔

محمد حسین آزاد نے کیفیت کا کرن پھول جیسے پند و نصائح کی کتاب لکھی، حالی نے اپنے خاص رنگ میں ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کے لئے اصلاحی نظمیں کہیں اور انھیں قومی اور معاشرتی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ "حقوق نسواں" مولوی سید ممتاز علی نے لکھی۔ لیکن خانہ داری کے ناول، اس بلندی سے برابر گرتے گئے جس پر نذیر احمد نے انہیں پہنچایا تھا، اس قسم کے ناول نگار دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک تو وہ گروہ جو خانہ داری کی زندگی کا مقابلہ آوارگی کی زندگی سے کرکے گھر کی زندگی کی برتری کو سراہتا ہے جیسے "مخزن کلثوم" اس ناول میں بیوی روایتی ہندوستانی خاتون کی مانند سب ظلم سہتی ہے اور اپنے شوہر کو پھر بھی معاف کر دیتی ہے۔

دوسرا گروہ جو خواتین کیلئے خانہ داری سے متعلق ادب کی تخلیق کر رہا تھا اس کا اصل THEME عورتوں کی عام زندگی اور مظلومیت تھا اشتیاق حسین قریشی کی تھیزیوں عورت کی مظلومی کی داستان شرر نے بھی کچھ ایسے ناول لکھے جو اصلاحی مقصد لئے ہوئے تھے اور خاص خواتین کیلئے لکھے گئے تھے۔ نادی سرفراز حسین نے "ثروت و فہیم" خواتین کے لئے لکھی۔

مرد لکھنے والوں کے ساتھ خواتین بھی مقصدی ادب کی تخلیق کر رہی تھیں اور خاص طور سے خواتین کے لئے لکھنے میں کوشاں تھیں "شمیم و نسواں" فاطمہ اختر بیگم کی تخلیق تھی۔ اس کتاب کا مقصد عورت کو نسائیت، خانہ داری، معاشرت تربیت اطفال کی صفات کا مجموعہ بنا دینا تھا۔ بیگم مرزا احمد علی کی "ماہ درخشاں" خواتین کے ہی ادب میں شمار کی جاتی ہے۔

ادب میں ہر دور میں ایک گروہ ایسے لکھنے والوں کا ملتا ہے جس نے عورت کے حقوق اُسے واپس دلانے کی کوشش کی ہے شاعروں نے بھی غرض سے کہیں کہیں عورت کے صحیح مرتبہ کی نشاندہی کی۔

افسانہ نگاروں نے اِس استحقاق کو زیادہ مستحکم بنانے کے لئے عورتوں کو اپنے افسانے کا کردار بنایا۔ ان میں اِیسی سیرت کی جتنی اچھائیاں تھیں، پیدا کیں عورت کو ایثار، محبت اور اطاعت کا مثالی پیکر بنایا، ان ناولوں میں شوہر خواہ اس پر کتنا ہی ظلم کرے "عورت ہی فطرت کا یہ تقاضا تھا کہ وہ اس کے پیر دھو دھو کر پیئے۔ اور اپنی نیند اور اپنے عیش و آرام کو صرف اپنے سرتاج کی زندگی کے آرام پر بھینٹ چڑھا دے، اور اس کے تمام کہا پنا سکھ چین، خدمت کو عبادت جانے۔ عورت کے لئے اس قسم کے ادب میں ممتاز حیثیت رکھنے والے راشد الخیری، سلطان حیدر جوش اور پریم چند ہیں۔ راشد الخیری نے تقریباً ساٹھ کتابیں خواتین کے لئے لکھیں۔ انہیں نصف سے زیادہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۱ء تک لکھی گئیں۔ ان کی چند کتابوں کے نام ہیں، مستورات۔ نالۂ زار۔ وداع خاتون۔ گرداب حیات۔ منازل السائرہ وغیرہ۔

اس دور میں ترجموں نے عورت کو بہ حیثیت موضوع بہت رواج دیا۔ شرر، راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی ایک مقصد لے کر آگے بڑھ رہے تھے، خواجہ حسن نظامی کی اس سلسلے کی ایک کتاب "بیوی کی تربیت" ہے۔

خواتین کے مذاق اور مطلب کے مضامین لکھنے کی قدرت اور ان کی اصلاح و ترقی کا دل میں درد رکھنے والوں کی فہرست میں سیماب اکبر آبادی، تلوک چند محروم، سید راحت حسین، مرزا فرحت اللہ بیگ، آغا شاعر قزلباش، ڈاکٹر سید احمد بریلوی، عزیز لکھنوی، میر باقر علی داستان گو، مرزا عظیم بیگ چغتائی وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

صحافت کی دنیا میں عورتوں کے لئے جو رسائل اور جریدے جاری ہوئے ان میں عصمت، سہیلی، زیب النساء، خاتون بمبئی، مستورات، مسلمہ، مصباح، ہمجولی، حریم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض اب تک نکل رہے ہیں کئی اور پرچے بھی شائع ہوئے۔ مثلاً عصمت برہان پور، عفت، لڈو کا دیس، خاتون بیگم، پیام آئینہ، پردہ نشیں، خادمہ، استانی، حور، خاتون مشرق وغیرہ۔

یہ بعض دور کا ذکر ہے جب ہندستان پر ایک غیر ملکی حکومت کا غلبہ تھا اس لئے اپنی پرانی روایات اور تہذیب کو قائم رکھنے کی جدوجہد میں انسانی مقصد تک سے پیش نظر تھا۔ لیکن عورت نے جلد ہی ادیبوں کے ذہن میں دوسرا روپ دھارا، وہ زیادہ دلکش اور پُر عظمت ہو گئی۔ یہ تصویریں پریم چند نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیں۔ انھوں نے ایسے نسوانی کردار پیش کئے جن میں مشرق کی سادہ دلکشی ہے، وہ محبت کی دیویاں ہیں گو دوسری ہندوستانی عورتوں کی طرح وہ بھی اپنے شوہر کو پوجتا جانتی ہیں لیکن پریم چند اپنی کہانی کے نسوانی کرداروں کو عمل اور مرد کے لئے زور بازو بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے "عورت مرد کی راہ میں رکاوٹ بنے"۔ اُن کے ناول "میدانِ عمل" "پردۂ مجاز" "چوگانِ ہستی" "نرملا" اسی طرز فکر سے متاثر ہیں:

اس کے ساتھ ساتھ پریم چند اپنے ناولوں اور کہانیوں میں عورتوں پر مردوں کی زیادتی کے خلاف احتجاج بھی کرتے ہیں۔

اب ادب میں ایک تیسرا گروہ پیدا ہوتا ہے جو نہ عورت کی پہلی تصویر کو پسند کرتا ہے اور نہ دوسری کو۔ ہیں تیسرے گروہ کے فنکاروں نے عورت کی شعریت اور نسوانیت کی ملی جلی تصویر پیش کی جس پر رومانیت کا رنگ زیادہ چڑھا ہوا تھا۔

اس فکر کے تحت عورت کا ظاہری حسن ہی شعریت تھا، وہ اپنے ادب میں اسی ظاہری حسن کے نمونے پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہو عورت کے بارے میں ایک شاعرانہ تصور

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں	گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں
دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں	سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر رُک جائیں
آتش حسن سے تقویٰ کو جلانے والی	بجلیاں تبسم سے گرانے والی

لیکن ترقی پسند ادب میں عورت دبی اور کچلی ہوئی نہیں ہے یہاں کچھ اور ہی رنگ ہے اس ادب میں گوشت پوست کی جیتی جاگتی عورت ہے۔ جو اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ ہے، وہ ادب میں ماں بہن، بیوی اور محبوبہ بن کر جلوہ گر ہوئی۔

اکبر الہ آبادی نے اگر خواتین کو لیجئے لیے اشعار کہے جن میں اُن کو مغربی تعلیم حاصل نہ کرنے کی تلقین ہے تو اختر شیرانی نے نسائی نظم پیش کی، گویا ترقی پسند ادب جس میں عورت نے جنم لیا اس کا سہرا اختر ہی کے سر ہے۔ پیسر بھی نہ بچا بلکہ اقبال نے بھی عورت کو محل کے پیچھے ہی رکھنا مناسب

سمجھا۔ ترقی پسند شاعروں اور افسانہ نگاروں نے عورت کو نئی منزل دکھائی اور اس کی آزادی کا مطالبہ کیا۔

ترقی پسند ادب میں مزدوروں کے بعد عورت کو دنیا کی سب سے مظلوم مخلوق قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ عورت اُن کے خیال میں دُہرے ظلم کا شکار ہو رہی ہے یعنی پہلا معاشی اور دوسرا جنسی جو کہ برتری کے جھوٹے تصور کی بُنیاد پر اُن پر ڈھائے گئے۔

غرضیکہ وہ عورت جو ترقی پسند ادب کے ابتدائی زمانے میں عشق کے دریچے سے ادب میں داخل ہوئی تھی اُسے شاعر نے اپنے آنچل کا پرچم بنا لینے کی تلقین کی۔

اِسرار الحق مجاز نے آزادیٔ نسواں پر بہت زور دیا ہے "اُن کی نظم" نوجوان خاتون سے" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزمالیتی تو اچھا تھا
اگر خلوت میں تو نے سر اُٹھایا بھی تو کیا حاصل
بھری محفل میں آکر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

احسان دانش اپنی نظم "غمکاری دوست" میں بستی کے خوشحال دوں کو عورتوں کیلئے جنگل کے درندوں کی نسبت زیادہ بُرا سمجھتے ہیں۔

اُدیب رضا دہلوی اشک نے نچلے متوسط طبقے کی خواتین کے لئے بہت کچھ لکھا اُن کے افسانے "کونپل" "قفس" "چٹان" اور "چیتن کی اماں" اسی مقصد کے گرد گھومتے ہیں۔ یعنی وہ معاشی آزادی کے خواہاں ہیں۔

ترقی پسند ادب میں منٹو نے مرد اساس سماج میں عورت کے جنسی EXPLOITATION کو اپنی اکثر کہانیوں کا موضوع بنایا۔

کرشن چندر عورت پر کوئی ظلم برداشت نہیں کرتے۔ وہ ایسے سماج پر بھرپور وار کرتے ہیں وہ نہ صرف عورت کی عصمت کی حفاظت چاہتے ہیں۔ بلکہ اُس کی آزادی کے بھی خواہاں ہیں۔

کرشن چندر مزدور سے زیادہ مزدور عورت کے افسانہ نگار ہیں کیونکہ اُن کے خیال میں مزدور عورت کی بدقسمتی دُہری ہے اوّل تو طبقاتی رویے جنسی اُن کا خاص موضوع سرمایہ دارانہ سماج کی ہوس پرستی ہے اِس موضوع پر اُنھوں نے جتنے افسانے لکھے ہیں جیسے "بنت" اور "جنم" "سفید پھول" "ٹوٹے تارے" "انوکھا چور" "شکست" وغیرہ۔

ہندوستانی عورت کی مظلومیت کو کرشن چندر کی انسانی رومانیت نے رنگا رنگ اسالیب میں بیان کیا۔ عصمت چغتائی نے کہیں کہیں عورتوں کی نفسیات کا مطالعہ اچھی طرح کیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ "اُردھ ناری" ایک ہندوستانی بیوی کی سچی محبت اور ہمدردی کی تصویر ہے۔

علی عباس حسینی نے اپنے افسانوں میں اکثر اصلاحی رجحان رکھا ہے۔ بقول سردار جعفری اب یہ نئی عورت ادب میں مضبوطی سے قدم رکھ رہی ہے ابتدا میں صرف عشق اور عورت کی آزادی کے تصور نے ترقی پسند ادیبوں کو متحرک کیا تھا۔ اب وہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ عشق کی صحت مندی اور عورت کی آزادی کی بُنیادیں معاشی اور سماجی ہیں اور جب تک عورت کو معاشی آزادی نہیں ملتی وہ وسیع سماجی آزادی میں اپنا حصّہ نہ حاصل کر سکے گی۔

سیّد حرمت الاکرام

غزل

حُسنِ ظاہر سے بہلتی ہے نظر
ورنہ پھُولوں میں بھی ملتے ہیں شرر

لَوٹ کر کون و مکاں سے اکثر
اپنے پیکر سے اُلجھتی ہے نظر

زندگی! وقت سے آگے بڑھ کر
پیچ و خم سے کبھی اپنے بھی گزر

میں نے خود کھوئی ہے اپنی منزل
کس سے پُوچھوں مجھے جانا ہے کدھر؟

سفرِ غم میں یہ مہلت کس کو؟
دیکھتا کون کسی کو مُڑ کر؟

اِس طرح خواب کی تعبیر نہ ڈھونڈ
دیکھ! لمحوں کے بدلتے تیور

انقلاب اور کوئی کیا ہوگا
نازِ اندھیروں کے اُٹھاتی ہے سحر

قافلے ڈھونڈ رہے ہیں کس کو؟
جا کے ٹھہری ہے ستاروں پہ نظر

دشتِ وحشت میں بھی اُڑنے لگی گرد
کون ہو کس کے لئے خاک بسر؟

ہم خدا کہہ کے جسے پُوج سکیں
اے چٹانو! کوئی ایسا پتھر؟

ایک اک کر کے بجھے سارے چراغ
روشنی دیتے ہیں جلتے ہوئے گھر

میرا غم اتنا تُنک ظرف نہیں
مجھ کو دکھلاؤ نہ شبنم کے گہر

تازہ کرتے چلو احساسِ حیات
بھر لو زہراب سے حرمت ساغر

اقبال صدیقی

آخری دھماکہ

آج سویرے ہی سے میں پینٹ کرنے بیٹھی ہوں۔ آج مجھ پر موڈ طاری ہے۔ صبح سے اب تک میں چائے کی دس پیالیاں پی چکی ہوں۔ میرے ذہن میں تخیلات کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ میرے اندر ایک تلاطم برپا ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ ایزل پر لگے ہوئے خالی کینوس پر اپنے خیالات کو رنگوں میں اتار دوں۔ آسمان میں سیاہ بادلوں کا کینوس تنا ہوا ہے اور اس پر سفید بگلوں کی قطاریں آڑی ترچھی بھاری ہیں۔ اور میں اس منظر کو اپنے کینوس پر اتارنے بیٹھی ہوں۔ کتنی مدت بعد ہوری ہے۔ بادلوں کی یہ سیاہی جنگ اور موت کی سیاہی جیسی ہی تو ہے۔ اور سفید بگلوں کی پرواز میں زندگی کی بے قرار پرواز ہی تو مضمر ہے۔ جہاں تاریک تخیلات کا بسیرا ہے۔ وہاں ذہن انسانی امن و مسرت کی طرف مائل پرواز بھی تو ہے۔ ایک نئی منزل کی طرف جہاں سیاہ بادل برس کے کھل جائیں گے اور سفید بادلوں کی اوٹ سے قوس قزح کے رنگ جھانکنے لگیں گے۔ کتنا تضاد، کتنی کشمکش ہے! تہذیب کے اس عہد میں انسان کے زندہ رہنے کی تگ و دو کتنا ڈرامائی رنگ لیے ہے اپنے اندر۔

اور میں انسان کی اس دیرینہ آرزو کو رنگوں میں سمیٹ کر پیش کرنا چاہتی ہوں۔ دوسرے کمرے میں وانگ صبح کا اخبار پڑھ کر فارغ ہو چکا ہے اور اب چوکو دنیا سمیٹنے پڑھا رہا ہے۔ اپنے اجداد کی سرزمین میں تیسرے دھماکے کی خبر پڑھ کر وانگ آج مسرت سے لبریز ہو رہا ہے۔ اس کا بس چلے تو آج ہی اڑ کے وہاں پہنچ جائے۔ صبح چائے پیتے وقت کس فراخ انبساط سے اس نے اخبار میرے سامنے پھیلا دیا تھا اور کتنے مسحور لہجے میں اس نے کہا تھا۔

"دیکھو دیکھو سوں کتنا کامیاب دھماکہ ہوا ہے۔ ہمارے عظیم اجداد کی سرزمین میں۔ ہمالہ کے اس طرف ہم ایک عظیم قوم کی اولاد ہیں سوں۔ ہم کسی سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ کسی سے بھی پیچھے نہیں رہ سکتے۔ آخر ہماری رگوں میں وہی خون موجزن ہے نا جس نے دنیا کی قدیم ترین تہذیب بنائی تھی۔"

اور سگار کا ایک گہرا دھواں منتشر کر کے وہ اپنے اور اولاد کی نئی دنیا کے تصور میں کھو گیا۔ حالانکہ وہ چین کبھی نہیں گیا۔ اس نے ابھی نہیں کہ چین کی مٹی کیسی ہے، وہاں کے پانی کا مزہ کیسا ہے، وہاں کی بولی بولی کیسی ہے پرل بک کے ناولوں سے اس نے چین کے لوگوں اور ان کی زندگی کا ایک خاکہ اپنے ذہن میں تیار کر رکھا تھا۔ چین ایک بہت بڑا ملک ہے۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ لیکن وہاں افلاس ہے، قحط ہے، افیون اور گری ہوئی صحت ہے۔ اس کے علاوہ اپنے دادا سے وہ زمینداروں کی شان و شوکت کے قصے بھی سن چکا ہے۔ اور ان کے ہاتھوں چینی کسانوں پر ڈھائے گئے مظالم کی داستان بھی۔ اور جب وہ پیکنگ کی نئی کتابیں پڑھنے لگا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ چین کتنا بدل گیا ہے۔ وہاں کی زندگی اب کتنی مختلف ہو چکی ہے۔ وہاں کے لوگ کتنے خوشحال ہو گئے ہیں۔ یہ تصویر پرل بک کی دکھائی ہوئی تصویر سے کتنی مختلف ہے۔ وہاں اب چھوٹے چھوٹے پیروں والی عورتیں نہیں ہیں۔ وہاں اب افیون کے نشے میں ٹوٹ گھسٹتے ہوئے مرد نہیں ہیں۔ وہاں اب بے سہارا بچوں کے ہاتھ نہیں ہیں۔ یہ سب باتیں نے پیکنگ کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ اور اپنے ذہن کے کینوس میں اس نے اس غیر طبقاتی سماج، اس خوابی زندگی کی ایک بڑی ہی رنگین تصویر اتار رکھی تھی۔ حالانکہ وہ چین کبھی نہیں گیا۔ اس نے اس دیش کو کبھی نہیں دیکھا۔ دیکھتا بھی کیسے؟ اس کی تو پیدائش ہندستان میں ہوئی تھی۔ جیسے خود

ہری۔ آج سے سو سال پیشتر اس کے دادا یہاں چینی ریشم کی گانٹھ لے کر آئے تھے۔ وہ کلکتے میں گھوم گھوم کر چینا سلک بیچتے تھے۔ انہیں اس ملک کا باسمتی چاول بہت مرغوب تھا اور گنگا کے پانی نے تو ان کی انیون زدہ صحت کی کایا پلٹ ہی کر دی۔ وہ اس دیش کے رسیا ہو گئے۔ اور انھوں نے وہیں اقامت اختیار کر لی۔ ان کے بعد وانگ کے باپ نے سنٹرل ایونیو میں جوتوں کی ایک غدہ دکان کھول لی۔ وہیں میرے باپ کی دندان سازی کی دکان تھی۔ وہ ایک ماہر دندان ساز تھے۔ انھیں سے وانگ نے دندان سازی سیکھی۔ اور پھر وانگ سے کبھی سبقت لے گیا۔ وانگ کے ہاتھ میں بڑی صفائی ہے۔ داسوں پر اس کا ہاتھ گیا نہیں کہ وہ یوں نکل آتے ہیں جیسے نیند کی آغوش میں ڈھلکتے ہوئے بچے کے منہ سے ماں کی پستان نکل آتی ہو اور پھر وہ اسی انداز سے اصل سے بھی زیادہ خوبصورت دانت جوڑ دیتا ہے۔ اور لوگ اس کے معجزہ کے قائل ہو جاتے ہیں۔ ایک بار اس نے میرے ہلتے ہوئے دو دانتوں کو نکال کر انار کے دو دانے جوڑ دئے اور جب میں نے اپنے مصنوعی دانتوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے مسکرا کر دیکھا تو جانے کیوں وہ وہیں کا وہیں مجھ پر فریفتہ ہو گیا۔

اور پھر ہم دونوں کی شادی ہو گئی۔

دور سے کرے سے چوچی کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"پاپا، جاں خاندان کی حکومت کہاں تک پھیلی ہوئی تھی؟"

اور چوچی ڈکار کر کہتا ہے۔

"ساری دنیا میں"

"پھر جاں خاندان کے لوگ بہت بڑے بادشاہ تھے؟"

چوچی کہتا ہے۔

"بہت بڑے بیٹے۔ ہم بہت بڑے لوگوں کی اولاد ہیں بیٹے۔"

وانگ نے فخریہ لہجے میں کہا۔

آبا پرستی ہم چینیوں کی روایت رہی ہے۔ ہم اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ، ان کی تہذیب، ان کی معاشرت کے بھاری ہوتے ہیں۔

میں ان کی باتوں سے کان سٹانا نہیں چاہتی ہوں۔ مگر ان کے الفاظ میرے کانوں میں پڑتے ہیں تو میں چونک سی جاتی ہوں۔ میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔

"میں تمہیں ایک عظیم سائنسداں بنانا چاہتا ہوں بیٹے پھر تم نوکلیائی بم بناؤ گے۔"

"یہ کیا ہوتے ہیں بابا۔"

"یہ بڑے کارگر ہتھیار ہوتے ہیں بیٹے۔ ان سے ہم ساری دنیا کو نیست و نابود کر سکتے ہیں۔"

"پھر ہم کہاں رہیں گے پاپا؟"

میرے کانوں میں مسرت کے پیمانوں کے اٹھتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے۔ کتنی بنیادی بات کہی ہے اس نے۔ کیا انسان اتنا سفاک ہو چکا ہے کہ آج اس کے سامنے یہ آخری سوال منہ کھولے کھڑا ہے؟

"بہت۔" وانگ کی آواز آتی ہے۔

"ہم تو صرف اس دنیا کو مٹانا چاہتے ہیں۔ بیٹے جہاں سرمایہ داری ہے، استحصال ہے، بھوک ہے، افلاس ہے۔"

چوچا خاموش رہتا ہے۔ وہ شاید وانگ کی مارکسی دلیل سمجھنے سے قاصر ہے۔ وانگ جاری رہتا ہے۔

"ہم دنیا میں ایک عظیم انقلاب لانا چاہتے ہیں بیٹے۔ ایک آخری انقلاب جس کے بعد یہ پرانی دنیا اور اس کا گلا سڑا نظام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا، اور اس کی جگہ ایک نئی دنیا پیدا ہو گی جس میں کوئی طبقہ نہ ہو گا، جس میں انسان انسان کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہ ہو گی۔ جس میں دائمی فارغ البالی ہو گی۔"

چوچا خاموش ہو گیا، ظاہر ہے اسے پاپا کی باتیں کچھ عجیب و غریب معلوم ہو رہی ہوں گی۔ خفیف توقف کے بعد وانگ اور چوچی گفتگو پھر شروع ہوئی۔

"بولو میں سائنسداں بنوں گا۔"

"میں سائنسداں بنوں گا۔"

"میں نیوکلیائی بم بناؤں گا۔"

"میں بڑے بڑے بم بناؤں گا۔"

"میں انقلابی بنوں گا۔"

"میں انقلابی بنوں گا۔"

"شاباش، آج کا سبق ختم۔"

میرا دل ڈوب گیا۔ برش میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ ایزل کے رنگ گڈمڈ ہو گئے۔ لکیروں کی قطار اڑتی ہوئی کہیں دور نکل گئی تھی۔ صرف سیاہ بادل کی چھتری اب بھی کھلی ہوئی تھی، جیسے ایٹم بم کے دھماکے سے سیاہ بادلوں کا چھاتہ آسمان کی طرف اڑنے لگتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وانگ نے تاریخ کو ایک

پشت پیچھے ڈھکیل دیا تھا۔ میری نظر میں خالی کینوس پر بھی باتیں اور میں رفتہ رفتہ ایک گہری سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ کیسے دیوانے ہیں یہ لوگ جو اپنی اور اللہ کو ذہنی دنیاں باتوں کا سہارا دے کر خود کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ذہنی دنیاں تاریکیوں میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ انسانی الفرت کی بنیادیں کے بطن میں تو نہیں پلتی۔ جنگ و جدل کا تصور ماں کی لوریوں میں تو نہیں ملتا۔

دانگ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ پر مجھے اس کا احساس تب ہوا جب سگار کی تلخ بو میری سانسوں میں داخل ہونے لگی۔ مجھے سنجیدہ دیکھ کر دانگ ہنس پڑا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

اور تلخ سے اس نے سگار کا دھواں اگل دیا۔

"سوچ رہی ہوں تاریخ قلم سے لکھی جاتی ہے یا تلوار سے۔"

"اوہ۔" دانگ ذرا تیلا اٹھا۔

"اور سوچ رہی ہوں زندگی رنگوں سے رنگی جاتی ہے یا آگ اور خون سے۔"

"تاریخ تلوار سے بنائی اور قلم سے لکھی جاتی ہے سوں۔"

دانگ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور پھر اس نے سگار کا ایک طویل کش لیا۔

"انسان المقدر رہا ہے پرانا ہو چکا ہے دانگ۔ آج حالات یکسر بدل چکے ہیں اور موجودہ حالات میں یہ بات کتنی مہمل معلوم ہوتی ہے کہ تم بم کے دھماکوں سے تہذیب کی شمع روشن کرنے کی سوچ رہے ہو لاشوں کے ڈھیر سے بھلا ایک نئی دنیا کس طرح آباد ہو سکتی ہے؟"

"ایک آخری اور فیصلہ کن جنگ۔ لڑی جائیگی سوں۔ جنگوں کو ختم کرنے کیلئے عوام کی یہ جنگ۔ ناگزیر ہے۔ یہ تاریخی اور ارتقاء کا ایک ناگزیر پہلو ہے۔"

"لیکن اس مہلک جنگ کا نتیجہ معلوم ہے؟ اس کے بعد یہ دنیا ایک عظیم الشان قبرستان میں مستقل ہو جائیگی۔"

"گھبراؤ نہیں سوں۔ ہم دنیا کے قبرستان کو صاف کر کے نئی تہذیب کا سنیما محل بنا لیں گے اور ایک بار پھر ساری دنیا کو علم و حکمت کی نعمتیں تقسیم کرنے کا افتخار ہمیں کو حاصل ہوگا۔ ہمارا شاندار ماضی ہماری پائیدار بنیادوں پر نئی تہذیب ایک بار پھر ابھرائی جائیگی۔"

دانگ جذبات سے لبریز ہو رہا تھا۔ وہ بڑے فخریہ لہجہ میں بول رہا تھا۔ اس کا رگوں میں اس کے اک دیکھے اجداد کا خون جوش مار رہا تھا۔ اسی کے مطالعے نے اس کے ذہن کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھال دیا تھا اور اس کی شخصیت میں کچھ ایسی باتیں رچ گئی تھیں کہ اسے اپنے مخصوص کتابوں کی باتوں کے علاوہ دوسری کوئی بات سمجھ ہی نہیں آتی۔ اس کی ہر بحث کی جان ان باتوں پر ٹوٹتی تھی مثلاً طبقاتی کشمکش، لیبر، سماج کا انہدام، عوامی انقلاب، جمہوری اقدار اور وہ ایسی باتوں سے بالکل چراغ پا ہو جاتا۔ مثلاً ہم لبرٹی، اسلحہ بندی، تاریخ کا امن اور انتقاء۔ اس کے مشتعل ہونے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ باتیں اس کی پیکنگ کی کتابوں میں کہیں نہیں لکھی تھیں۔ میں نے ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"جس انقلاب کی باتیں تم سوچتے ہو دانگ اس کا تصور نہایت ہی قدیم ہے جبکہ انسان کے ہاتھوں میں اتنے تباہ کن اسلحہ جات نہ تھے۔ آج تو انقلاب کے عالمی تصور کے مقابلے میں مقامی تصور زیادہ بامعنی معلوم ہوتا ہے۔ آج تو ہر ملک میں اس کے کلچر اور اس کی روایتوں کے پس منظر سے ابھرا ہوا انقلاب ہی لایا جا سکتا ہے۔ اور اس کی تحریک انسانی ذہنوں ہی میں چلائی جا سکتی ہے۔ آج انقلاب کی جنگ انسانی ذہنوں میں لڑی جا رہی ہے۔ اور میدانوں کی جنگ تو تاریخی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کا دھماکہ آخری دھماکہ تھا دانگ۔ اور یہ جو خطرناک نیوکلیائی بم بنائے جا رہے ہیں، جانتے ہو ان کا حشر کیا ہوگا؟ ایک دن یہ بھی سمندروں کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سرد کر دیا جائے گا۔"

دانگ نے میری باتوں کو کسی قدر تحمل سے سنا۔ ظاہر ہے اسے میری باتوں میں اصلاح پسندی کی بو آ رہی تھی۔

خاموشی سے میں نے برش اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا اور پھر اپنے کینوس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اتنے میں چو آ گیا۔ مجھے پینٹ کرتے دیکھ کر وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔

"واہ زاد ممی۔" اس نے کہا۔ کتنی خوبصورت تصویر میں اتار رہی ہو۔ مجھے بھی سکھا دو۔"

"ممی۔ رنگ کیسے بناتے ہیں؟"

"آدمی نے۔"

"کتنے اچھے، کتنے خوشنما ہیں یہ۔ نیلے، پیلے، لال۔"

"یہ دنیا اور یہ زندگی بھی بہت خوبصورت ہے بیٹے۔"

ہاں ممی، صبح ہوتی ہے تو آسمان چمک اٹھتا ہے، دھنکی نکلتا ہے تو آسمان کتنا حسین نظر آتا ہے۔"

میں چونکا۔ ممی ہوئی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوں۔

"اور ممی، اچنگ ہے میری دوست، وہ کاغذ کے بہت خوبصورت پھول بناتی ہے۔"

"اچھا،"

"ہاں ممی، لال لال، پیلے پیلے، ہرے ہرے، نیلے نیلے، بہت سارے، اتنا بڑا، میں بھی پھول بناؤں گا ممی، چمکیلے شوخ رنگ والے۔"

شاباش میرے لال، تم اتن کی اولاد ہو جنھوں نے کاغذ بنایا۔ جس پر کتابیں لکھی جاتی ہیں، جن سے تہذیب کی آوازیں سنی جاتی ہیں، جن کے بغیر انسان نہ معلوم کب تک سٹون ایج میں بھٹکتا رہتا۔"

مجھے مجھے حیرت زدہ گھورنے لگا۔ وہ میری باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ وانگ سے مخاطب ہوا۔

"وڈیڈی میں آپ کے لئے پھولوں کا ایک حسین گلدستہ بناؤں گا۔"

"اور اپنا سبق یاد ہے؟" وانگ نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر کہا۔

"ہاں وڈیڈی، میں بڑے بڑے بم بناؤں گا۔"

وانگ خوشی سے ابل پڑا۔ اس نے بڑھ کر مجھے کو اٹھا لیا اور خوشی سے ناچتا ہوا بولا۔

"میرا بیٹا انقلابی ہوگا۔"

ایک سوال میرے ذہن میں رینگ اٹھا اور میں بول پڑی۔

وانگ ہر تہذیبی عہد کی کوئی نہ کوئی لازوال یادگار باقی رہتی ہے۔ مثلاً چین کی دیوار، مصر کے اہرام، اجنتا کی گپھائیں، ہماری بیسویں صدی کی تہذیبی یادگار کیا ہوگی جانتے ہو؟"

وانگ خاموش رہا۔

ہماری بیسویں صدی کی کھدائی سے ماہرین کھوپڑیاں نکالیں گے، ٹوٹے ہوئے ہاتھ پیر نکالیں گے، ٹوٹا ہوا تاج محل نکالیں گے میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟ یہ ہے تمھاری جنگ کی لاحاصلیت کی تصویر! کتنی شاندار کتنی ذی حیات ہے یہ!"

وانگ بولا۔ اس نے ڈانٹ کر کہنا شروع کیا۔

"یہ سب کواس ہے سوں قیطعی کواس۔ تم بورژوائی ذہنیت رکھتی ہو اور اصلاح پسندوں کی طرح سوچتی ہو۔ جنگ اور اسلحہ کی تعمیر کے لئے ایک آمرانہ جنگ ناگزیر ہے۔ تم نے ڈائی کلٹس نہیں پڑھا ہے۔ تم یہ نہیں سمجھ سکتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری اولاد اس عالمی جنگ کی لیڈر ہو تاکہ انقلاب کا سہرا اس کے سر بندھے۔ میں اپنے بیٹے کو لیڈر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے ایک انقلابی ماحول کی ضرورت ہے۔ تم ایسے شاعرانہ اور رجعت پرانہ باتیں کیوں سناتی ہو؟"

اور کچھ خاموش رہ کر اس نے مزید کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں یہ ماحول اس کیلئے سازگار نہیں۔ میں اسے اس ماحول سے دور لے جانا چاہتا ہوں۔ میرے بچے کی پرورش اس ماحول میں نہیں ہو سکتی۔"

وہ متواتر تمباکو پینے لگا۔ سارے کمرے میں سگار کی تلخ بو پھیل گئی مجھے اس سے بڑی کراہیت ہوتی ہے۔ مجھے تو متلی آنے لگتی ہے۔ اور میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میرا موڈ خراب ہو گیا۔ حالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ باہر بارش ہونے لگی تھی۔ کھڑکی کے قریب جا کر میں برستے ہوئے بادلوں کو دیکھنے لگی۔ وانگ بڑے جوش میں کہہ رہا تھا۔

"ہمیں ایسے رہنما پیدا کرنے ہیں سوں جیسے حان خاندان کے لوگ تھے۔ جانتی ہو کتنے عظیم لوگ تھے وہ؟ سارا ایشیا ان کا تھا۔ آدھا یورپ۔ آج ہمیں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے سوں"

میں سنتی رہی۔ وانگ پھر کہنے لگا اور پھر میرے قریب آکر نہایت سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا۔

"سوں ہم لوگ پیکنگ جا رہے ہیں۔"

میں دھک سے رہ گئی۔ مجھے کچھ یقین نہیں آرہا تھا جیسے وانگ نے کوئی غلط بات کہی ہو۔ کہیں میں نے غلط تو نہیں سنا تھا لیکن وانگ نے میری غلط فہمی دور کر دی۔

"ہمیں خوش ہونا چاہیئے سوں۔ ہم تو اپنے عظیم اجداد کی سرزمین کو واپس جا رہے ہیں جہاں سے انقلاب کے جھنڈے لہرا کر ہم ساری دنیا میں پھیل جائیں گے۔ کلکتہ سے ہم کینٹن جائیں گے اور پھر کینٹن سے پیکنگ۔"

میں سکتے میں آگئی۔ تاریخ خود کو کیسے دہراتی ہے! گھڑی کی مخالف سمت میں! کبھی جہاز کینٹن سے کلکتہ آتا تھا۔ اور اس میں چینی ریشم کی گانٹھیں آتی تھیں۔ ماہر دندان ساز آتے تھے۔ فوجرہ گیا کے لئے۔ اور بہت پڑھے لکھے تھوڑے سے طالب علم آتے تھے۔ مگر یہ وانگ کیا کہنا چاہتا ہے آج؟

داخل جا چکا تھا۔ کمرے میں سگار کا دھواں اپنی غنی کے ساتھ پھیلا ہوا تھا اور دھوئیں کا ہر غبار میری آنکھوں میں سوالیہ نشان بن کر ناچ رہا تھا

"وانگ پیکنگ جا رہا ہے"

"جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا؟

"جس کی ہوا اس نے کبھی نہیں سونگھی؟

"جس کا پانی اس نے کبھی نہیں چکھا؟

"وانگ پیکنگ جا رہا ہے!

"وانگ"

"ہوں"

"میں پیکنگ نہیں جا رہی"

"کیا بکتی ہو؟"

"چوتھو مت، میں پیکنگ نہیں جا رہی۔ میرے بھائی بھی نہیں جا رہے۔ میرے چچا بھی نہیں۔ خود تمھارے بڑے بھائی بھی نہیں جا رہے جو تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ میں پیکنگ نہیں جا رہی وانگ۔ اگر تم چلے گئے تو میں بودھ گیا چلی جاؤں گی اور وہیں ... اور وہیں اپنے دوسرے بچے کو جنم دوں گی۔ جو تم میرے شکم میں چھوڑے جا رہے ہو۔ مجھے قلق ہے کہ تم میرے لختِ جگر کو مجھ سے چھین لے جاؤ گے۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے، ہائے میں اپنے لال کو پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ میں اسے پھر کبھی نہ چوم سکوں گی میں تم سے آخری بھیک مانگنا چاہتی ہوں۔ دو گے؟ اپنی آنکھوں میں طبیل کی چنگاریاں بھر لو لیکن میری جھولی میں میری گود کا پھول ڈال دو۔ جی چاہے تو تم پیکنگ چلے جاؤ لیکن میرے چھوٹے کو نہ لے جاؤ۔

میں اسے ایک ماہر فنکار بنانا چاہتی ہوں۔ جو حسن و رعنائی کے لازوال شاہکار تخلیق کرے گا۔ تم نفرت سے منہ کیوں بناتے ہو؟ اس لئے نا کہ تم اسے کچھ اور بنانا چاہتے ہو۔ میں تمھیں یاد دلانا چاہتی ہوں کہ نپولین نے بھی ایک میرن ڈوک، ایک مردِ افضل پیدا کیا تھا، لیکن اس مردِ افضل نے کیا کیا؟ اپنی برتری کے نشے الاپ الاپ کر سارے یورپ میں جنگیں بھڑا دیں۔ اس نے میں اپنے لال کو قبرستان کا شہنشاہ نہیں بنانا چاہتی ہوں۔ اف کتنا خوفناک ہے یہ تصور کہ میرا چھوٹا ایک دن انسانی کھوپڑیوں کے ہار پہن کر تالیاں بجا بجا کر ناچے گا اور یہ کہتا پھرے گا۔

میں جبلی مادیت کے احکام بجا لایا ہوں میں نے طبقات کی کشمکش ختم کر دی ہے۔ میں ایک نئی دنیا کا خالق اعظم ہوں، جس میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔

میں جانتی ہوں تم میرے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو جھٹک دو گے میں جانتی ہوں تم میری نہیں سنو گے۔ میں جانتی ہوں تم میرے کلیجے کے ٹکڑے کو مجھ سے چھین کر لے جاؤ گے۔ میں تمھیں روک بھی نہیں سکتی اپنی بے بسی پر چند آنسو بہا سکتی ہوں۔ میں ماں ہوں وانگ، میرا دل ہے، پتھر نہیں۔ میں عورت ہوں عورت۔ تخلیق کا سرچشمہ۔ ——— میں تخریب کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ جاتے ہو تو جاؤ۔ مگر میری آخری بات سنتے جاؤ۔ تمھارا اپنا انسان گورکن ہو سکتا ہے، زندگی کا فنا کار نہیں۔ جاتے ہو تو جاؤ لیکن میری باتیں یاد رکھنا۔ میں تو دھو گیا میں رہ کر اپنے دوسرے بچے کو جنم دوں گی اور اس کے ہاتھ میں برش تھماؤں گی جس سے وہ تاریخ کے کینوس پر حسین شاہکار بنائے گا اور بودھ کے مقدس سائے میں بیٹھ کر ہم وہ لازوال منظر دیکھیں گے

جیئو اور جینے دو۔

اور تب ہی زندگی ہزار ہا پھولوں کی بہار ستان ہو سکتی ہے ■

نظم و غزل کی اعلیٰ قدروں میں ایک دلفریب اضافہ

سردار جعفری

سو سے زیادہ نظموں اور غزلوں کا مجموعہ

ایک خواب اور

قیمت ——— چھ روپے

مکتبہ وقار الادب، پوسٹ بکس ۴۵۳۱ بمبئی بی سی

غزل کا رچاؤ اور فکر کا بانکپن

عتیق احمد عتیق

کے نئے مجموعۂ غزل ——— نورِ فردا

میں دیکھئے

اردو ٹائپ میں خوبصورت طباعت روشن اور ورق

قیمت ——— ۳ روپے

مکتبہ وقار الادب، پوسٹ بکس ۴۵۳۱ بمبئی بی سی

"یہ درد جو زندگی کی صورت
صدیوں سے یونہی رواں دواں ہے
صدیوں سے جو روشنی کی صورت
دھرتی پہ جمال رائگاں ہے
اِس درد کی انتہا کہاں ہے؟
یہ درد جو زندگی سبا ہے!"

شہاب جعفری

تیاگ کے بعد

بے کار سا یہ سوال — لیکن
اک فکر میں کائنات ڈوبی
ہر شے نے ہر ایک شے سے پوچھا
ہر اک کا جواب تھا خموشی
ہر جسم نے رُوح کو پکارا
ہر رُوح پکار سُن کے چُپ تھی
دریاؤں کے شور جانگسل کو
ساحل کی سماعتیں ہی کم تھیں
پتھر کے سکوتِ مضمحل کو
صحراؤں کی وُسعتیں ہی کم تھیں
اک دل کی صدائے منفعل کو
افلاک کی رفعتیں ہی کم تھیں
البتہ صدا و سمت و آفاق
سب درد ہی درد ہو گئے تھے
ہر درد میں ایک "نیں" چھپا تھا
"نیں" — جس کی کچھ انتہا نہیں ہے

اعجاز صدیقی

۱

گجرات میں اردو

(خطبۂ صدارت)

(مشاعرہ "جشنِ حریت" ۔ احمد آباد (گجرات) منعقدہ ۲۹ مئی ۱۹۶۶ء)

خواتین و حضرات!

"جشنِ حریت" کے اس مشاعرہ کی جو ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے، میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اس کا شکریہ ادا کروں یا شکایت۔ اتنا تو ہے کہ اس وقت میں مجھے اس کیلئے مجبور کیا گیا۔ سوچنے اور سمجھنے کے لئے کوئی موقع ہی نہیں بلکہ دیرینہ تعلقات کی ان تمام نزاکتوں کو درمیان میں لایا گیا جنہیں اگر نظر انداز کرتا ہوں تو یہاں تک کہ مجھ کو کٹر اصول پرست کہنے والے اصولوں سے بھی ہٹنا پڑا۔ لوگ مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ میں مشاعروں کی صدارت سے بچتا کیوں ہوں۔ کیا فرماؤں اور جواب پر مسکرا کر مجھے یہ بات ٹال دینی پڑتی ہے۔ اس موقع پر اگر میں اس امر کی صراحت کردوں تو بے محل نہ ہوگا۔ اس کا ایک فہمی سبب تو میری صحت کی خرابی ہے کہ میں کسی اجتماع میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا۔ اور صدر کو تو جم کر بیٹھنا چاہیئے۔ چاہے پنڈال خالی ہو جائے اور مشاعرہ میں دو ایک شاعروں کے ساتھ تنہا کرسیاں رہ جائیں، مگر غریب صدر کو جو بہرحال صدر ہی رہتا ہے، بناہی رہنا پڑتا ہے، اور اکثر اچانک اس ذمہ داری کو نباہنا ہوتا ہے، دوسرا مشاعرہ میں سامعین کی طرف سے نرم و گرم گفتگو کے جو تحفے آتے ہیں ان کا ذمہ دار صدر شعراء میں تلخیاں بھریں تو ان کا ذمہ دار صدر۔ نقد ہوتا خیر کی فوقیت سے اگر کچھ شعراء خفا ہو جائیں تو اس کی ذمہ داری بھی صدر پر۔ منتظمین کی کوتاہیوں سے بدمزگی پیدا ہو تو صدر۔ ذمہ دار پولیس کی اجازت سے زیادہ دیر تک مشاعرہ کی محفل گرم رہے تو صدر۔ بعض شعراء کو معارف نہ ملیں تو وہ صدر کے دامن سے الجھیں۔ کوئی شاعر ہوٹی ہوٹی کرنے لگے، اور مشاعرہ گاہ تماشہ گاہ بن جائے تو بھی صدر کی شامت۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ صدر کے اختیارات سامعین چھین لیتے ہیں۔ صدارتی مسئولیتوں کے متعلق کہاں تک عرض کروں۔ مختصر یہ کہ مشاعرہ کا صدا اچھا خاصا "بخور" عبرت ہوتا ہے ـــــ تو حضرات! کون ان خطرات کو مول لے، جن لوگوں کی صدارتوں میں ہمارے دو ایک مشاعرے بخوبی انجام تک پہنچ جائیں، وہ گھر پہنچ کر خدا کا شکر ادا کرتے ہوں گے، یہ صورتِ حال زیادہ تر مشاعروں کی صدارت میں پیش آتی ہے۔ علمی و ادبی اجتماعات کی صدارت اس سے مختلف ہوتی ہے اور ان میں لے دے کسی کو پیچھا چھوٹ نہیں ہوتی ـــــ

میرے صدارت سے گریز کا دوسرا پہلو خالص علمی ہے، ادب و شعر کی تاریخ میں یہ بات مانی جا چکی ہے کہ مشاعروں میں باقاعدہ خطبہ خوانی کی روایت میرے گھر سے چلی اور آہستہ آہستہ ایک سحر سا ہو گیا۔ اختیار کر کے عام ہو گئی۔ مشاعروں کے ساتھ تحریری یا تقریری خطبۂ صدارت لازم و ملزوم ہو گیا۔ چونکہ آجکل کے عام طور پر منعقد ہونے والے مشاعروں کی علمی و ادبی حیثیت اور نجابت اور قدر و قیمت پسندی غالب آچکی ہے اس لئے اکثر و بیشتر ایسے مشاعروں کو علمی و ادبی جلسہ ہی کافی سمجھے جاتے ہیں۔

سامعین شعر سننے کے شوق میں کچھ اور سننا پسند نہیں کرتے۔ اگر میں بھی اسی رسم کا شکار ہو جاؤں تو اس سے میری خانگی و ذہنی دلچسپیاں مجروح ہوتی ہیں۔ اس لئے میں اسی میں عافیت سمجھتا ہوں کہ مشاعروں کی صدارت سے دور رہوں۔ ہر بڑے مشاعرہ کی صدارت کسی نہ کسی بڑے ادیب، شاعر یا سیاستدان یا ماہر تعلیم کو دی جاتی ہے۔ اگر مشاعروں کے سامعین صرف پندرہ بیس منٹ صدر کا تحریری یا تقریری خطبۂ صدارت توجہ اور سکون سے سن لیا کریں تو اس سے بہت فائدہ ہو۔ شاعروں کے یہ "خطبات" ہمارے علمی و ادبی ا

[illegible] کے خصوصیات واضح ہوں۔ رہیں اپنی جگہ پر رہیں ہے اور ہم ڈرامہ نہیں کہلا سکتا۔
اس میں پروفیسر موصوف کے اس نظریہ سے متفق نہیں ہوں کہ واجد علی شاہ نے اندر سبھا پیش کر کے اردو ڈرامے کی بنیاد ڈالی اور امانت نے اس کی نقل کر کے اپنا اندر سبھا لکھی۔

تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں اور خود پروفیسر موصوف اس بات پر متفق ہیں کہ (الف) واجد علی شاہ امانت سے پہلے شاہی ڈرامے کی روایات نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں ملتی ہیں۔

(ب) اس سے پہلے بھی نواب سعادت علی خاں کے دور میں رہس کھیلے جاتے تھے۔ (ج) محمد قلی قطب شاہ سے لے کر ناسخ تک اور ان کے بعد بھی سیکڑوں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں راجا اندر اور ان کے اکھاڑے کا تذکرہ ہے۔

(د) دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم میں پوری اندر سبھا پیش کر دی ہے۔ ہر اردو داں اندر سبھا کو امانت کی تصنیف سمجھتا ہے لیکن پروفیسر موصوف فرماتے ہیں۔

(الف) اندر سبھا کا نام امانت کا اپنا رکھا ہوا نہیں ہے
(ب) اندر سبھا امانت کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے
(ج) اندر سبھا کے کردار امانت کے تخلیق کئے ہوئے نہیں ہیں
(د) اندر سبھا کا قصہ ان کا اپنا نہیں ہے۔
(ہ) اندر سبھا کو لوگوں نے معمولی کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں دی

ہر شخص ان دلائل سے اتفاق کرتا ہے کیونکہ ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ اندر سبھا کے قصے زمانہ نامعلوم سے زبان زد خلائق ہیں اور عام طور پر رہس کی صورت میں کھیلے جاتے رہے ہیں۔ امرا اپنی حویلیوں میں اور غربا کھلے میدانوں میں رہس کھیلتے تھے۔ واجد علی شاہ نے بھی حسب حیثیت اندر سبھا اسٹیج کی۔ واجد علی شاہ نے امرا اور رؤسا عظام کے لئے اندر سبھا لکھی اور امانت نے غربا کے لئے۔ یہ اتفاق ہے کہ امانت کی اندر سبھا چھپ کر زندہ رہ گئی۔

(۳) زاہر گوپی چند اور جلند ہر "اردو کا پہلا ڈراما ہے اور خورشید" اردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈراما۔

اکرام جاوید ——— جوبلی پوسٹ آفس حیدر آباد ۲

تازہ "شاعر" مضامین نظم و نثر اور طباعت و گٹ اپ کے اعتبار سے پسند آیا۔ "شاعر" کے حسن کا یہ نکھار میرے لئے باعث مسرت ہے۔ حصۂ شاعری میں آپ کی نظم شاندار اور پر شکوہ ہے۔ اس میں طلب و نظر کو متاثر کرنے کی پوری پوری تاب و توانائی ہے۔ وفا ملک پوری کی نظم اور عین سروکھی کی غزل بھی میں نے بڑے شوق سے پڑھی اور سرور ہوا۔ کہانیاں بھی اچھی خاصی ہیں۔ بحیثیت مجموعی "شاعر" کا یہ شمارہ اردو ادب کی نظر و نثر کا آئینہ دار ہے۔ "کرشن چندر نمبر" خاصی اہم ادبی پیش کش ہوگی۔ اس کا مجھے یقین ہے۔

انجمن آرا انجم ——— امیر نشان، علیگڑھ

"شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ علی عباس حسینی صاحب امید کا مضمون "ترقی پسندی" صحت مند نظریہ کا حامل ہے اور ساتھ ہی تنقید بخش بھی۔ آج کل "ترقی پسندی" اور "جدیدیت" پر بڑی گرم بحثیں چل رہی ہیں۔ اگر چند صحت بخش مقالوں اور تقریروں کے ذریعہ ترقی پسندی اور جدیدیت مفہوم، مطلب اور مقصد واضح ہو جائے تو بہت سے بے راہرو صحیح منزل پا لیں گے۔ اس شمارے کے تقریباً سب مضامین اور کہانیاں قابل ستائش ہیں۔ حصۂ نظم میں اگر غزل کے رنگ کو اور نکھارا جائے تو "شاعر" کی دلکشی فزوں تر ہو جائے۔ آپ کی نظم "تانیتا ٹوپی" بڑی اثر انگیز اور سلاست و روانی کا بہترین نمونہ ہے۔

یہاں گجراتی زبان کے جاننے والے بیشمار دوستوں میں سے شاید بہت کم اس سے واقف ہیں کہ اُن کی زبان میں دوسری زبانوں کے کتنے الفاظ ہیں۔ اِن لغات کی ایک مکمل فہرست بنانا تو بہت بڑا کام ہے۔ میں سرسری طور پر صرف چند الفاظ پیش کرتا ہوں۔ ذیل کے منتخب کردہ عربی و فارسی الفاظ جس طرح اردو زبان کا اپنا سرمایہ سمجھے جاتے ہیں، بالکل اُسی طرح گجراتی زبان میں بھی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک گجراتی دوست کے بقول اگر یہ الفاظ گجراتی زبان سے نکال لیئے جائیں تو گجراتی زبان ہی ختم ہو جائے۔ اس کا حسن جاتا رہے۔

۱۔ دل
۲۔ محفل
۳۔ مست
۴۔ رنگ
۵۔ استر
اِن کے لئے گجراتی میں دوسرا لفظ نہیں ہے

۶۔ جنت = سُورگ بھی کہتے ہیں
۷۔ برخواست = وِسرجن بھی کہتے ہیں

۸۔ برکت
۹۔ برف
۱۰۔ دیوان
گجراتی میں کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے

۱۱۔ چمن
۱۲۔ گلشن
اپوَن بھی کہتے ہیں

۱۳۔ برابر = گجراتی میں دوسرا لفظ نہیں ہے
۱۴۔ حقیر = بگڑ کر۔ ہابر
۱۵۔ کمال = مُونث بولا جاتا ہے۔ اور کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے۔
۱۶۔ قدر = بگڑ کر قدر بروزن سَفر
۱۷۔ قتل = بگڑ کر قتل بروزن سَنبھل

۱۸۔ قد
۱۹۔ قافلہ
۲۰۔ قبضہ
۲۱۔ قبول
۲۲۔ کبوتر
گجراتی میں اِن کے لئے دوسرا لفظ نہیں ہے

۲۳۔ کمر = بگڑ کر کمر بروزن نشتر
۲۴۔ نصرت = بگڑ کر نُصرت
۲۵۔ کتاب = بگڑ کر کتاب

۲۶۔ کمین
۲۷۔ خصلت
گجراتی میں اِن کیلئے دوسرا لفظ نہیں ہے

۲۸۔ خمیر
۲۹۔ گرم
۳۰۔ غرض
گجراتی میں ان کے لئے دوسرا لفظ نہیں ہے

۳۱۔ دبدبہ = بگڑ کر دبدبو
۳۲۔ محبت = پریم بھی بولتے ہیں

۳۳۔ ظاہر
۳۴۔ غزل
۳۵۔ یاد
۳۶۔ شکار
۳۷۔ ساقی
گجراتی میں ان کے لئے دوسرا لفظ نہیں ہے

۳۸۔ درد = بروزن محمد بولتے ہیں
۳۹۔ نصیب = بھاگیہ بھی بولا جاتا ہے
۴۰۔ زہر = بگڑ کر جھیر، بروزن پھیر
۴۱۔ اثر = مُونث بولتے ہیں دوسرا لفظ نہیں
۴۲۔ جوان = یوان اور جوان دونوں رائج ہیں
۴۳۔ زندگی = زندگی اور بگڑ کر جندگی دونوں طرح بولتے ہیں
۴۴۔ مجبور = مجبور اور لاچار دونوں بولے جاتے ہیں

۴۵۔ جام
۴۶۔ نشتر
۴۷۔ سلامت
۴۸۔ مصیبت
۴۹۔ نشانی
ان کے لئے گجراتی میں دوسرا لفظ نہیں ہے۔ ادھانی بھی بولتے ہیں۔ مگر کم رائج ہے۔

۵۰۔ خوشی = دوسرا لفظ نہیں ہے۔ آنند بولتے ہیں مگر کم

۵۱۔ باغ = باگ اور بنیچہ دونوں بولتے ہیں

۵۲۔ آباد
۵۳۔ ہوش
۵۴۔ خبر
۵۵۔ شہید
گجراتی میں ان کے لئے دوسرا لفظ نہیں ہے

۵۶۔ زخم = بگڑ کر جکھم بروزن رقم
۵۷۔ منظور = بگڑ کر منجور
۵۸۔ نظر = بگڑ کر۔ نجر
۵۹۔ دیوار = بگڑ کر۔ دیوال

۶۰۔ ملاقات
۶۱۔ منزل
۶۲۔ سفر
۶۳۔ محنت
۶۴۔ نادان
اِن سب کے لئے گجراتی میں کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے۔

۶۵۔ رضا = بگڑ کر رجا
۶۶۔ مسافر = اتارو بھی بولتے ہیں مگر کم

۶۷۔ حد
۶۸۔ حریف
۶۹۔ گناہ
۷۰۔ دُنیا
۷۱۔ معافی
۷۲۔ عالم
۷۳۔ آبرو
اِن کیلئے گجراتی زبان میں کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے

۷۴۔ جواب = اُتر بھی بولتے ہیں

۷۵۔ جاہ و جلال
۷۶۔ شیطان
۷۷۔ دوا
اِن کے لئے گجراتی زبان میں دوسرا لفظ نہیں ہے

۷۸ - دلیل } کوئی دوسرا لفظ ۸۰ - جلدی - کوئی دوسرا لفظ نہیں ۸۱ : نمونہ : بگڑ کر نمونو
۷۹ - علاج } نہیں ہے ہے ۸۲ : نصیحت : بگڑ کر نسیحت

۸۳ - مزا : بگڑ کر : مجھا ۸۴ - مذاق : گجراتی میں مونث بولتے ہیں

گجراتی اور اردو زبان کی قربت و محبت کا بنیادی سبب یہی ہے کہ دونوں زبانوں میں سیکڑوں الفاظ مشترک ہیں، خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ لسانی اشتراک دونوں زبانوں کی شاعری کو بھی ایک دوسرے سے قریب لانے کا سبب بنا۔ گجراتی زبان میں غزل، رباعی۔ قطعہ، بالکل اسی طرح ہے جس طرح اردو زبان میں۔ دونوں زبانوں کے شعرا اپنے افکار و خیالات میں بھی مماثلت رکھتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ دونوں زبانوں میں کوئی تنازعہ ہے اور نہ ان کے ادیب و شاعر ایک دوسرے سے دور ہیں۔ نئے ترقی یافتہ گجرات کے لئے یہ بڑی قابل فخر بات ہے۔ گجرات کی حکومت بھی اندھرا پردیش اور مہاراشٹر کی حکومتوں ہی کی طرح اردو زبان کو پھلنے پھولنے کے مواقع دے رہی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ یہ لسانی یکجہتی (LANGUAGES INTERGRATION) اور بڑھے۔ گجراتی اور اردو دونوں زبانیں اس سمت میں ترقی کی انتہائی منزلوں تک پہنچیں، ہم اردو والے ہندوستان کی ہر زبان کا احترام کرتے ہیں اور پورے ہندوستان میں ہر جگہ بولی، سمجھی، لکھی، اور پڑھی جانے والی اردو زبان کو اپنے ملک کی سالمیت کے لئے بہت بڑا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

حضرات!

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں یہ خطبہ مشاعرہ میں پڑھ رہا ہوں اور مشاعرہ بھی جشن حزیں کا۔ لیکن گجرات کی اردو شاعری کے متعلق میں نے کچھ بھی نہیں کہا اور زبانوں کی بات چھیڑ دی۔ تو میں اختصار کی طرف آتے ہوئے عرض کروں گا کہ ذاتی طور پر شاعری کے ذکر سے زیادہ مجھے زبانوں کے میل جول کی باتوں میں دلچسپی ہے اس لئے بھی کہ چند سال سے ملک میں بھاشاؤں کے جو جھگڑے کھڑے کر دیئے گئے ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ اگر یہ جھگڑے ختم نہ ہوئے تو ملک کی سالمیت کو زبردست نقصان پہنچ جائے گا۔ ہم اس سے بھی زیادہ پریشانیوں میں گھر جائیں گے، جتنے آج گھرے ہوئے ہیں۔

گجرات میں شعر و سخن کی بات۔ آپ ولی گجراتی (میرے خیال میں دکنی) سے چلائیں یا اس سے پہلے یا بعد کے دور سے ہر دور میں یہاں صاحب کمال شعرا ہوئے ہیں۔ گجرات کے شاہ مسکین کا "حبنامہ" محمد امین کی "یوسف زلیخا"، شاہ خوب محمد چشتی کی "خوب ترنگ" اور پیر محمد شاہ کا مجموعہ کلام اور یہاں کے شعری ادب کے دوسرے ذخیرے کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ اردو کی سب سے پہلی شاعرہ یہیں ہوئی۔ افسوس کہ گجرات کے قدیم اردو شعرا کے کارنامے ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ ابھی تک میری نظر سے کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جس میں گجرات کے تمام شعرا کا تذکرہ مع انکے عہد کی تحریر ہو۔ یہ کام ارباب گجرات کی توجہ چاہتا ہے۔ گجرات میں ایسے اہل قلم موجود ہیں جو تحقیق و تدوین کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ گجرات میں اردو شاعری اور نثر نگاری کی ابتدا سے اس دور تک کی ادبی و شعری تاریخ میں ضرور مرتب ہونی چاہیئے۔ اس اہم کام کے لئے حکومت گجرات سے مدد لی جا سکتی ہے شرط یہی ہے کہ آپ نے دل سے اس کی چنگاریاں پھونکیں، آپ اس ضرورت کو شدت سے محسوس کریں اور گجرات کی اس شاندار ادبی تاریخ کو کھنگالیں۔

ادھر میں نے گجرات کے صرف پچھلے ۳۲ سال کے شعری ادب کا مطالعہ ضرور کیا ہے، مطالعہ ہی نہیں بلکہ بہت سے شعرا کو قریب سے دیکھا بھی احمد آباد، بڑودہ، سورت، بھڑوچ، پاٹن، پور، ماٹھ، ڈول وغیرہ بہت سے شعرا کو اپنے ماہنامہ "شاعر" کے ذریعہ متعارف کرایا ہے۔ اس سے تیس پینتیس سال پہلے کے "شاعر" کے فائل آپ اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو حیرت و مسرت ہوگی کہ رسالہ "شاعر" نے کتنا بڑا کام انجام دیا ہے۔ اس وقت جبکہ گجرات کے شعرا، کو نہ ادبی دنیا جانتی تھی اور نہ ان کے کلام کو ہمارے رسائل شائع کرتے تھے میں نے ان شعرا، کے کچھ نہ کچھ شعری کارنامے اپنے رسالے "شاعر" کے صفحات میں جگہ دی۔ شاعر کے اجراء ۱۹۳۶ء کے بعد گجرات میں جو شعرا بنے اور آگے بڑھے انہیں بنانے اور آگے بڑھانے میں میری خدمات کو بڑا دخل رہا ہے ان میں سے کئی خود میری دریافت ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ میری اس خدمت کو عام طور پر گجرات کے اہل علم کا اعتراف ہے۔

میں مجلت میں شاعر کے فائل کھنگال نہ سکا۔ صرف ۱۹۳۶ء کا ایک فائل دیکھ سکا۔ اسی میں سے محض احمد آباد کے دو شاعروں کے شعر نوٹ کر کے لایا ہوں، اور وہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

مایوس نہ ہو ذوقِ نظر سے دلِ مضطر — اک کیف فقط جلوہ گہِ ناز نہیں ہے
اے شوقِ رہائی نہ ہو مائل بہ رہائی — اب مجھ کو یقین پر و پرواز نہیں ہے

اے اہلِ قفس جوشِ جنوں ہو جو ادھر کو — نکہتِ گلِ پیکِ تہِ زنجیر بہار آئی ہے
غنچہ دلِ نہ کھلا بادِ مسرت سے کبھی — اب بھی کس طرح یقین ہو کہ بہار آئی ہے

ہر صبح جلوہ گہ ہے یہاں انقلاب تو — لے آئی مجھ کو گردشِ چرخِ کہن کہاں
ہر اشک خوں کو دعوئے منصور ہو تو کیا — ہر دعوے کے واسطے دار و رسن کہاں

اے پرسشِ خموشیِ پیہم بس اب نہ چھیڑ — تصویر ہوں مجھے تابِ سخن کہاں

احمد حسین قتیل احمد آبادی ۱۹۳۶ء

دل ڈوب سا چلا ہے ابھی سے ہیں مضمحل — غربت میں آ گیا یہ خیالِ وطن کہاں
اے دل نہ جا بجا نالہ و فریاد میں مچل — لیکن وہ میرے واسطے دار و رسن کہاں

کیا بات تھی کہ بزمِ نماند سے کبھی اٹھا — وہ دل اٹھا تو محفل سے مجھے لے کے اٹھا
آفریں صد آفریں کہیے کہ پابندِ وفا — صورتِ نقشِ قدم بیٹھا تو پھر مشکل اٹھا

جانے کس رندِ ازل کی آمد آمد ہے حزیں
کس کے استقبال کو ساقی نے ساغر اٹھا

(حزیں قریشی احمد آبادی ۱۹۳۶ء)

خیال ہے کہ میرے پیش کردہ اشعار اب سے تیس سال پہلے کے ہیں اور اُس وقت کے سنجیدہ معیارِ غزل پر پورے اترتے ہیں۔ ایک بات آپ کو یہ بھی سنا دوں کہ جب احمد آباد کے ان شعراء کا کلام میرے رسالہ شاعر میں شائع ہوتا تھا تو بہت سے لوگوں کو یہ گمان گزرا الادب کا گلا ہے، لیکن ایسا نہ تھا۔ گمان محض اُن اشعار کے معیار کے پیشِ نظر تھا جو اِن میں پایا جاتا ہے۔ گجرات کے بزرگ ترین شاعر حضرت احمد آبادی کے مجموعہ کلام "متاعِ کلیم"۔ محمد علوی کے مجموعہ نظم "خالی مکان" خلش بڑودوی کے مجموعہ "غزل" "قطارِ شیشہ" جمال قریشی کی "لہر لہر" نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ گجرات کے شعراء اپنا ایک معیار اور مقام رکھتے ہیں۔ یہ وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں۔ آپ دیکھتے جائیے — ہیں گجرات کے دو شعراء کے مجموعوں کے ڈھیر لگ جائینگے۔

مجھے یقین ہے کہ گجرات کے دو شعراء کا تعارف کیا تو چلے گا انتخابِ شعر کے تقاضوں کو پورا کرے گا۔ زندگی کی وہ دو مٹھیاں بھر کر کے اور کا خاصہ ان کے یہاں اُبھریں گی۔ اور یہ اپنی اہمیت منوا کر رہیں گے۔ شاعری محض موزونیِ طبع کا نام نہیں ہے۔ شعر زندگی کی تفسیر ہوتا ہے شاعری نہایت کا درد و کرب چھپا ہوا ہوتا ہے۔ شاعری وہی ہے جو مسائلِ حیات کا احاطہ کرے۔ فطرت کی جمال سامانیوں کو اپنے اندر سمیٹے۔ ذہنی ثابت کو خارجی پیمانوں میں ڈھال دے۔ وہی شاعری بڑی شاعری ہوتی ہے جو داخلی اور خارجی دونوں کیفیات میں خوبصورت فنی ہم آہنگی پیدا کرے۔ گجرات کے تمام اچھے شعراء میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ وہ خود کو ہندوستان میں پھیلے ہوئے وسیع حلقۂ شعر و ادب کا ایک اور نمائندہ سمجھیں۔ ان کے لئے جگہیں خالی ہیں، وہ آگے بڑھیں، فکر کی نئی نہروں کی کھوج کریں اور یہ بتا دیں کہ صوبۂ گجرات تخلیقی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔

آج کا یہ جشن احمد آباد (گجرات) کے کہنہ مشق و ممتاز شاعر جناب حزیں قریشی کی طویل شعری خدمات کے اعتراف میں منایا جا رہا ہے۔ صاحب کا پورا شاعرانہ سفر میرے سامنے ہے۔ انکی شاعری کی ابتداء سے اُسکے ارتقا کی منزل تک کا شناسا رہا ہوں۔ انھوں نے نہ صرف شعری کو بلند کیا بلکہ اپنے حلقہ کے بعض دوسرے نوجوان شعراء کو بھی متاثر کیا۔ مجھے حزیں صاحب کی جو ادا سب سے زیادہ پسند آئی وہ

بقیہ صفحہ ۱۴ پر دیکھئے

غزل

کُو بہ کُو پھرتے ہیں اِس دَور میں ہم آوارہ
تھے تو پہلے بھی مگر آج سے کم آوارہ

جانے کب ہم سے ہوا جرمِ تبسّم سرزد
آج تک پھرتے ہیں با دیدۂ نم آوارہ

ہم سفر ہو تو گئی ہے مگر اے گردشِ وقت
یہ نہ پُوچھا کہ کِدھر جاتے ہیں ہم آوارہ

اے جُنوں خیر ہو تیری کہ پھر اک مُدّت سے
نہ ہوا کوئی بھی پروردۂ غم آوارہ

یہ الگ بات کہ دُنیا اُسے در در لے جائے
فِطرتاً ہو نہیں سکتا ترا غم آوارہ

لذّتِ درد کے جھونکوں نے ٹھہرنے نہ دیا
مطلعِ غم پہ رہا ابرِ کرم آوارہ

زندگی تیری مُروّت میں ٹکے ہیں کچھ دیر
ورنہ ہم لوگ نہیں وقت سے کم آوارہ

شبنم و گُل، مہ و انجم کی نقابیں ڈالے
روزِ اوّل ہی سے ہے گریۂ غم آوارہ

بخشش دیں دولتِ اِخلاص جو مِل جائے کوئی
دربدر پھرتے ہیں ہم اہلِ کرم آوارہ

حادثہ ہے کہ ترے نام پہ اے حُسنِ حیات
ہو گئے کتنے ہی اربابِ قلم آوارہ

نازش اِس دَور نے الفاظ کے معنی بدلے
گھر پہ رہتے ہوئے کہلاتے ہیں ہم آوارہ

ڈاکٹر گیان چند

چند نئی کتابیں۔ نثری ادب میں

آج کی مختصر صحبت میں جن نئی کتابوں کا تعارف مقصود ہے اُن کے نام یہ ہیں۔ (۱) میری دُنیا از ڈاکٹر سید اعجاز حسین ۲۔ نذیر عرشی مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد ۳۔ کشمیر کے دو ادیب دو بھائی از پروفیسر عبدالقادر سروری۔ ۴۔ مطالعۂ سودا از ڈاکٹر محمد حسن اور ۵۔ تذکرۂ گلشنِ سخن، مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی۔

میری دُنیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے ریٹائرڈ صدر شعبۂ اردو اساتذہ ڈاکٹر اعجاز حسین کی آپ بیتی ہے۔ جو تقریباً پانچسو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اعجاز صاحب الٰہ آباد یونیورسٹی کے چند سال قبل علم رہے۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء سے ۱۹۶۱ء تک شعبۂ اردو میں پروفیسر رہے۔ اس طویل عرصہ میں آپ نے ہزاروں شاگردوں کے ذہنوں کو علم کے نور سے منور کیا۔ آپ مجلسی آدمی ہیں۔ ہنسی مذاق کی شوخ باتیں کرتے ہیں۔ آپ کی سوانح نہ ان سب پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے نہ آسانی کتاب کے تین سو صفحے جا سکتے ہیں۔

پہلا حصہ آپ کی سوانح پر مشتمل ہے۔ آپ بیتی لکھنے میں بڑے کٹھن مقامات آتے ہیں۔ اعجاز صاحب ان گھاٹیوں کو بڑی پامردی سے پار کر گئے ہیں۔ ان میں اتنی جرأت ہے کہ اپنی کتابِ زندگی کے ہر صفحے کو زمانے کی سفاک نظروں کے سامنے لا سکیں۔ الٹرنیس کے امتحان میں بار بار فیل ہونا ہو، کلکتہ میں فاقہ کرنا ہو یا الٰہ آباد میں بازارِ حسن کی زیارت کوئی تفصیل چھپا نہیں رکھی۔ زمانے نے انھیں کیا کیا پٹخنے نہ دیئے۔ کتنے دوستوں کا قرض اُن کے سر آپڑا۔ چنانچہ کسی کے فریب نے انھیں ساری عمر زیرِ بار رکھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے پر پراویڈنٹ فنڈ کا ایک خاصا حصہ کھینچ لے کر اس پیر تسمہ پا سے نجات ملی۔

کتاب کا دوسرا حصہ الٰہ آباد یونیورسٹی اور وہاں کے رفقاء کے بارے میں ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اشتعہ بیانی میری میں مسلم یونیورسٹی سے اپنی والہانہ عقیدت کا سمندر سمو دیا ہے۔ اس سے کچھ ہی کم اعجاز صاحب کی زندگی میں الٰہ آباد یونیورسٹی کو دخل ہے۔ اعجاز صاحب کی آپ بیتی شعبۂ اردو اور الٰہ آباد یونیورسٹی کے اس دور کی سرگزشت ہے لیکن مسلم یونیورسٹی اور الٰہ آباد یونیورسٹی میں ایک بڑا فرق ہے۔ مسلم یونیورسٹی ایک تحریک، ایک تہذیب ہے۔ اُس کا اپنا ذہن اور اپنی روایت ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی محض علمی درسگاہ ہے۔ اس لئے یہاں کے طلباء میں یونیورسٹی کے لئے "من تو شدم تو من شدی" والی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ اُن کے دل و دماغ پر سوار نہیں ہو سکتی۔ اُن کے خون میں جذب نہیں ہو سکتی۔

آپ بیتی کا تیسرا اور سب سے بڑا حصہ شاگردوں کا تذکرہ ہے۔ اہم اور غیر اہم قابلِ ذکر و ناقابلِ ذکر اتنے زیادہ شاگردوں کا ذکر ہے کہ آپ بیتی شاگردوں کا تذکرہ بن گئی ہے۔ اس حصہ میں بھی مصنف کا قلم شوخیوں سے باز نہیں رہتا لیکن خوبی یہ ہے کہ کسی شاگرد کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس سے آبگینوں کو ٹھیس لگ جائے۔

زندگی کی مختلف منزلوں میں اعجاز صاحب متعدد لوگوں کے قریب آئے۔ اُن میں ایک طرف وقار الملک تھے تو دوسری طرف دلیپ کمار ایکٹر۔ اُن سب کی دلچسپ تفصیل اس کتاب کے کونے کونے میں سمائی ہوئی ہے۔ یہ آپ بیتی نہیں، واقعی ایک دُنیا ہے جس کی جھلکیاں اعجاز صاحب نے اس دلکشی کے ساتھ دکھائی ہیں کہ اسکی پوری سیر کئے بغیر واپسی ممکن نہیں۔ اس کتاب میں اعجاز صاحب کے مزاح لطیف اور دلچسپ مشاہدات کی

ایسی فراوانی ہے کہ اس کا صرف یہی پہلو کتاب کی حیاتِ جاوداں کا ضامن ہو سکتا ہے۔

نذیر عشرتی، اردو کے مشہور محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی ۱۱ویں سالگرہ پر پیش کی گئی۔ شروع میں ڈاکٹر زور کا مختصر سا پیش لفظ ہے اس کے بعد ۱۲ اردو اور ۱۰ انگریزی مقالے ہیں۔ اردو میں چار مضامین عرشی صاحب کی شخصیت متعلق ہیں اور بقیہ سب مختلف علمی موضوعات پر ہیں۔ لکھنے والوں میں مالک رام۔ قاضی عبدالودود۔ محمد زبیر صدیقی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور مسعود حسن خورشی جیسے صاحبانِ علم و فضل ہیں۔ انگریزی حصے میں آکسفورڈ کیمبرج، اڈنبرا۔ BRUSSELS اور بوڈاپسٹ کی یونیورسٹیوں کے مستشرقین شامل ہیں۔ اردو میں زندہ اور بیدار لوگوں کے خاص نمبر نکالنے کی تو جو چل پڑی ہے لیکن بزرگ علماء کو یادگاری کتاب پیش کرنے کی رسم کبھی ادا نہیں ہوئی۔ پہلی کوشش کی کیمبرج یونیورسٹی نے جو یادگاری مجموعہ مرتب کیا تھا وہ میری نظر سے گزر چکا ہے۔ مضامین کے وزن کے اعتبار سے نذیر عشرتی اس کے ہم پلہ ہے۔ لیکن حسنِ ظاہر کے معاملے میں اس سے کہیں آگے بڑھ جاتی ہے۔ کاغذ نہایت دبیز اور عمدہ، طباعت نستعلیق ہو کہ نسخ کہ انگریزی املی سے اعلیٰ۔ غرض جس اہتمام سے یہ کتاب تیار ہوئی ہے وہ اردو کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ اس نقش اول میں نقش آخر کی شان ہے اور یہ سب ایک فردِ واحد جناب مالک رام کا کارنامہ ہے جنھوں نے دوڑے، دوڑے قصبے اس بار کو اپنے ذمہ لیا۔ اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ کتاب کی کیفیت اور کمیت کو دیکھتے ہوئے اس کی قیمت چالیس روپے زیادہ نہیں۔ نذیر عشرتی عرشی صاحب ہی کی نہیں۔ مالک رام صاحب کی بھی دستار میں ایک طرہ فخر ہے۔

کشمیر کے دو ادیب، در بھائی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی سری نگر کی تازہ ترین تصنیف ہے، یہ تعارف ہے پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور ان کے چھوٹے بھائی پنڈت سالگ رام کول سالگ کا جو انیسویں صدی کی آخری چوتھائی اور بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں عمائدینِ کشمیر میں تھے۔ انھوں نے کئی مہاراجاؤں کا زمانہ دیکھا، ان کی زرنگار پگڑی پر اشوب تھیں کبھی یہ مہاراجہ کے دربار میں ہیں تو کبھی ریاست بدر ہو کر مہاراجہ بادیوان کے خلاف اخبار نکال رہے ہیں۔ غرض ان کی زندگی کا تانا بانا والیٔ ملک کے عتاب و خوشنودی کی دھوپ چھاؤں سے بنا ہے۔ یہ کشمیری پنڈتوں اور سناتن دھرموں کے لیڈر بھی تھے۔ اور صحافی بھی انھوں نے کئی اخبار نکالے۔ کئی تعلیمی اداروں سے متعلق رہے۔ کشمیر کی لیجسلیٹو کونسل کے موجودہ صدر پنڈت شونرائن قوتہ دار سالگرام سالک کے نواسے ہیں۔

سروری صاحب نے پہلی بار تفصیل سے ان حضرات کی سوانح لکھی ہے اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خستہ کی تصانیف میں کشمیر کی تاریخ، "گلدستۂ کشمیر" اور مثنوی "گوپال نامہ" قابلِ ذکر ہیں۔ سالک کی تصانیف ان سے زیادہ ہیں، یہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں کشمیری زبان کی قواعد "مثنوی سستی پتوں" اور "مثنوی سندر بدن" اہم ہیں یہ سب کتابیں غیر مطبوعہ ہیں اور بعض مصوروں میں غیر موجود بھی، جو ہیں ان کی بھی اشاعت کی امید نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ادیب کی حیثیت سے ان حضرات کا یہ مقام نہیں ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام بار پا سکے۔ ہاں ادب کے علاقائی جائزے میں ان کا بھی ذکر کیا جائیگا۔

مطالعۂ سودا:۔ ۱۶۰ صفحات پر محیط ڈاکٹر محمد حسن کی تصنیف ہے۔ جسے ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ دلی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو آجکل سودائی ہو گیا ہے، مطالعۂ سودا کے بعد فوراً ڈاکٹر خلیق انجم نے سودا پر ایک ضخیم کتاب شائع کی ہے، معلوم ہوا ہے کہ دونوں حضرات "کلیاتِ سودا" مرتب کر رہے ہیں۔ مطالعۂ سودا تنقیدی کتاب نہیں، اس میں سودا کے حالاتِ زندگی ۴۴ صفحات میں ہیں، اس کے بعد کی فصل میں پس منظر ہے۔ اور اس کے بعد کلامِ سودا پر تنقید، کتاب کا یہی پہلو ہے جس کی وجہ سے کوئی مفکر اسے نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ڈاکٹر محمد حسن اردو کے ان نقادوں میں سے ہیں جو جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اسے سرسبز کر دیتے ہیں، مطالعۂ سودا بھی اسی طرح بقاعت کتاب ہے تمیتِ بہیر نعم کا تحفہ ہے:

سودا کے کلام میں چونکہ اس کے قصیدے گل سرسبد ہیں، ان کے رنگ و بو کے آگے اس کے دوسرے نقش و نگار ماند ہو کر رہ جاتے ہیں ڈاکٹر محمد حسن نے قصیدوں کے علاوہ سودا کی غزلوں اور مرثیوں پر خصوصی توجہ کی ہے، غزلوں میں سودا کے چند مرغوب مطالب دریافت کئے ہیں، اور مرثیوں کے سماجی پہلو کا جائزہ لیا ہے، لیکن فاضل مصنف کا یہ قول شاید مبالغہ ہے۔

"سودا نہ ہوتے تو انیس کے مراثی کیلئے راہ ہموار نہ ہوتی۔"

انیس سے پہلے بہرحال ضمیر اور دبیر مرثیہ کو موجودہ شکل دے چکے تھے۔ سودا کے معاصر سکندہ کا جو مرثیہ ملتا ہے وہ مراثی سودا کی نسبت انیس کے رنگ سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

مصنف نے صفحہ ۱۸ پر شیخ چاند کی تقلید میں جس قصیدے کو سودا کے شاگرد حکیم امنع الدین سے منسوب کیا ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی کی تحقیق ہے کہ وہ بندرابن راقم کا ہے، تاعظہ ہوا، رد ادب جولائی ۵۰ء میں اس کا مضمون "سودا کا ایک قصیدہ"۔

تذکرہ گلشن سخن۔ سالم ہندوستان کی انجمن ترقی اردو نے قدیم اردو کی معتمد خمیر مطبوعہ تصانیف کو شائع کر کے اردو کی عمر میں صدیوں کا اضافہ کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نئے ہندوستان کی انجمن ترقی اردو نے قسم کھالی ہے کہ اردو کے ایک بھی مخطوطے کو منظر عام پر نہ لائے گی، مرزا علی خاں مبتلا لکھنوی کے "تذکرہ گلشن سخن" کی اشاعت سے خدا خدا کر کے یہ کفر ٹوٹا ہے۔ تذکرہ پرانا ہے یعنی ۱۹۲۴ء کی تصنیف ہے۔ اسے اردو کے عظیم محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی نے مرتب کیا ہے اس کا پہلا تعارف مسعود صاحب نے رسالہ "ھمایوں" بابت دسمبر ۱۹۳۳ء میں پیش کیا تھا۔ کام کی دشواری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ اس تذکرہ کے صرف دو ناقص نسخے ہیں، ایک رضا لائبریری رامپور میں، دوسرا جناب مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں۔ ظاہر ہے جس کتاب کے نسخے بہت کم ہوں اس کو درستی سے پڑھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ تذکرے کی ابتدا میں مرتب نے ۲۸ صفحات کا دیباچہ لکھا ہے جس میں مبتلا اور اس کے تذکرے کے بارے میں جو کچھ معلومات فراہم ہو سکیں جمع کر دی گئی ہیں، اور ان کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

"گلشن سخن" میں حالات بہت کم ہیں، انتخاب کلام زیادہ ہے، مصنف نے بڑے شعراء کی معاصرانہ چشمکوں پر خصوصی توجہ کی ہے تذکرے میں غالب کا احوال دیکھ کر میں بڑا حیران ہوا۔ نام بھی نواب اسد اللہ خاں دیا ہے۔ تذکرہ ۱۹۲۴ء کی تصنیف ہے۔ اور غالب دہلی اس وقت تک عالم وجود میں بھی نہ آئے تھے۔

مزید پڑھنے سے معلوم ہوا کہ اسد اللہ خاں غالب مرشد آبادی ہیں یقین کے حالات میں اس کے باپ کے ہاتھوں قتل ہونے کا بھی ذکر ہے، تذکرہ گلزار ابراہیم میں لفظاً لفظ اسی کو نقل کر دیا گیا ہے۔ (بہ شکریہ ریڈیو جموں و کشمیر)

(بقیہ خطبہ صدارت۔ صفحہ ۲۲)

وہ ان کا شعری خصوص ہے، اور ظاہر ہے، جہاں کسی فن سے خلوص ہوگا وہاں کبھی نہ کبھی وقت فیض آ ہی جاتی ہے جب لوگ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، صد شکر، خوبی صاحب کو وہ منزل مل گئی اور انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی شعری خدمات کا صلہ پالیا۔ امید ہے کہ ارباب گجرات اپنے فنکاروں کے کمالات کا اعتراف اسی طرح کرتے رہیں گے۔

مجھے علم نہیں کہ گجرات میں "ساہتیہ اکیڈیمی" قائم ہے یا نہیں — اگر نہیں ہے تو گجراتی اور اردو زبان کے قلم کاروں کو مل کر حکومت گجرات کے تعاون سے "ساہتیہ اکیڈیمی" بنانی چاہیئے اور اگر اکیڈیمی قائم ہے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس میں اردو کا حق کتنا ہے۔ حکومت گجرات کو دوسرے صوبوں کی طرح اپنے صوبے کے اردو کے ممتاز اہل قلم کی تصانیف اور ان کی شخصیتوں کو پوری طرح نوازنا چاہیئے۔

آخر میں میرا یہ اخلاقی فرض چکیاں لے رہا ہے کہ میں محسن حزیں کمیٹی" کا شکریہ ادا کروں۔ یہ حسن کمیٹی کے پرخلوص اراکین کا معجزہ ہی ہے کہ انھوں نے اپنے اصرار سے آج احمد آباد ہی میں مجھ سے یہ صدارتی تقریر لکھوالی اور اس جھلسا دینے والی گرمی میں تمام دن "بزم قمر لیشن" کی بالائی منزل میں "خس خانہ" نہ سہی تو کم از کم "برف آب" اور تمام دوسری آسائشوں کے ساتھ مجھے قید رکھا۔

خلوص و وفا

راج نرائن رازؔ

پیپل کی ڈالی پہ بیٹھی کوئل
گیت سہانے گا رہی تھی
جھوم، جھوم، لہرا رہا تھا من

میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا
پیار سے اس کو پاس بلایا
پھدکی - پھدکی، پھر سے اڑ کر
اونچی ڈال پہ جا بیٹھی وہ

اتنے میں اک ننھا بالک
ہاتھ میں جال لئے ننھا سا
آ نکلا اس سمت، ادھر سے

کوئل کی آواز پہ ٹھٹکا!
ننھا سا وہ ننھا منا لڑکا
جھوم اٹھا سن کر تان کو اس کی
جانے پھر کس سوچ میں ڈوبا
جانے سوچ کے کیا مسکایا!

پھر ننھا سا جال لگا کر!
چپکے سے دانہ پھیلا کر!
ایک طرف کو وہ ہو بیٹھا

کوئل پھدکی، چہکی، ناچی
اور بڑی مسرور ہوئی وہ
سمجھی گیتوں کے رسیا نے
فرمائی ہے یوں قدر اس کی

کوئل پھدکی، پھر سے اڑ کر
دانے کے اوپر آ بیٹھی

سوکھ گیا گیتوں کا چشمہ!

جال میں اک جنبش سی ہوئی پھر
کوئل کس کے قابو میں تھی
کون ہوا گیتوں کا رسیا

منظر کاظمی

جامن کے گیت

پچھلی رات ہوا کچھ دھیمی چلی تھی۔

دوسری صبح جب گاؤں کے تمام بچے ہر روز کی طرح باغ میں پہنچے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ اس لئے کہ رات میں ہوا دیا وہ تیز نہیں چلی تھی اور جامنیں زیادہ تعداد میں گری ہوئی نہیں مل سکیں۔ سب نے اپنی نظریں اوپر کی طرف اٹھائیں اور دیر تک حسرت بھری نگاہوں سے جامن کی لدی ہوئی شاخوں کو دیکھتے رہے۔ ان میں کوئی عمر کے لحاظ سے اس لائق نہیں ہو سکتا تھا کہ درخت پر چڑھ کر کسی شاخ کو ایک زناٹا دے کے نیچے زمین پر گرا دے۔ ایک دم سیاہ اور گلابی رنگ میں تبدیل ہو جائے۔ سب نے اوپر دوسرے کو بڑی خاموشی سے دیکھنا شروع کیا تو جمیل اور عابد آگے بڑھ گئے۔

سارے بچے اس گر سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اب آگے کیا ہونے والا ہے۔ انھوں نے فوراً جمیل اور عابد کی تقلید کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی کمر پر جما لیا اور اپنی اپنی گردنیں اوپر کی طرف اٹھائیں۔

جمیل اور عابد نے شروع کیا۔

"مینا کا بچہ سلور یارے، دو گو جامن گرا دے"

سب لڑکوں نے مل کر اسے دہرایا۔

"کچا گرے یا پکا گرے، دو گو جامن گرا دے۔"

لڑکوں نے پھر آواز میں آواز ملائی

جمیل اور عابد گیت کا ایک بول گاتے اور تمام بچے اپنے ٹوٹے ہوئے ترنم کے ساتھ اسے دہراتے۔ تھوڑی ہی دیر بعد جب گان کی آواز پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہو گئی تو اوپر درخت پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کا جھنڈ چہچہا کر پھڑپھڑا کر اڑ گیا۔ اور ایسے میں جو کئی شاخیں جھول گئیں تو ڈھیروں جامنیں چٹاپٹ آگریں۔

پھر بھگدڑ مچ گئی۔ لوٹ ہی تو مچ گئی۔

تمام لڑکے دوڑ دوڑ کر جامنیں چننے لگے۔ ہاتھوں سے اٹھا اٹھا کر منہ میں ڈالتے اور منہ بھر جاتا تو اپنی جیبوں میں بھر بھر کے ٹھونستے جاتے اور اس طرف ایک بڑی سی اور بالکل سیاہ جامن جو سب سے الگ تھلگ پڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی جمیل لپکا۔ لیکن عابد کی نگاہ بھی اس پر جا چکی تھی۔ وہ بھی تیر کی طرح جھپٹا۔ دوسرے ہی لمحہ عابد نے اپنی ہتھیلی جما جما دی۔ اور عابد کی ہتھیلی پر جمیل نے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"پہلے میں نے دیکھا تھا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو پہلے میں نے دیکھا تھا۔"

"لیکن وہاں پہلے کون پہنچا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ جامن میرے ہاتھ کے نیچے ہے۔"

"لیکن بات ہے۔"

"ہاں۔"

"تو۔۔۔ یہ لو۔" کہہ کر جمیل نے اپنا ہاتھ ذرا اوپر اٹھایا اور اپنے عابد کے ہاتھ پر دے مارا۔ ادھر جامن کا تو کچھ پتہ نہیں چلا اور دونوں نے دو ہتھڑ جما دئے۔ اور جمیل نے جب اپنا ہاتھ کھینچا تو اس پر خون دیکھ کر ایک زبردست ہاتھ مارا تو عابد کے ہونٹ دانت تلے دب گئے۔

اور پھر دونوں روتے ہوئے جب اپنے اپنے گھر پہنچے تو کس ایسا لگا جیسے کسی نے راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کو ذرا سا ہوا دے دی ہو۔

"اخوہ۔۔۔۔ منگ آگیا ہوں رحمت کی اولاد سے۔ اگر یہ پوتی کا معاملہ نہ ہوتا تو میں ابھی بتا دیتا۔" شرافت حسین نے کوٹ سے میں پکی ہوئی چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا، جمیل ہاں کا لڑکا تھا۔

عابد کا باپ بھی غصہ سے آگ بگولا ہو رہا تھا۔

"قسم خدا کی یہ میری شرافت ہے کہ میں اس وقت برداشت سے کام لے رہا ہوں، ورنہ اس شرافت کے نوٹے کو ایک ہاتھ میں ناگتی کا پل دکھا دیتا۔"

بات یہیں تک آئی گئی ہو گئی ہوتی تو کوئی بات تھی لیکن یہ بات گھر سے نکل کر باہر گلی میں آئی اور پھر گلی گلی گھومتی ہوئی پورے گاؤں میں پھیل گئی۔

سکونت لوٹانے پانی کے گھڑے کو اپنی کمر سے اتارتے ہوئے عابد کی ماں کو دلاسہ دیا۔

"کیا کرو گی دلہن۔ صبر سے کام لو۔ اور گھر کی یہی حالت ہے۔ اب ہم ہی کو دیکھ لو۔ ایک برس سے اس کے یہاں پانی بھرتے ہیں مگر ایک روپیہ مہینہ دیتے بھی اس کا کلیجہ پھٹتا ہے۔ کا جانے اور کلموہی ہمارا دم کیسے نکلے گا۔ پورا گھر بے خراب ہے دلہن۔ جمیلو اما باپ بھی کوئی ڈھنگ کا نہ ہے۔ اب بچارا دیکھو کہ ہمرے مرحوم سے کیسی یاری تھی۔ دونوں جب تک رات میں ایک۔ ساتھ حقہ نہ پیتے دونوں میں سے کسی کو نیند نہ آتی مگر مرحوم کے گذرتے ہی کیسے آنکھ بدل گئی۔ اب اس کے یہاں پانی بھرنا پڑتا ہے اور ایک روپیہ ماہواری بھی دینے میں کلیجہ پھٹتا ہے۔ اور جمیلو کو تو ایسا آسمانی کا تارہ بنائے ہے کہ بس۔ اسکول میں کیا پڑھتا ہے کہ لاٹ صاحب ہو گیا۔ اپنا عابد بابو بھی تو اسکول میں پڑھتا ہے۔ اور سے کو لن بات میں کم ہے۔"

اور یہی سکونت لوٹا جب جمیل کے گھر گئیں تو شرافت میاں حقہ کا کھاٹ پر چت لیٹے ہوئے حقے کا کش لے رہے تھے ان کے نزدیک پہنچ کر بولیں۔

"کا ہوا ہے شرافت بابو۔ اپنے جمیل بچوا کو، اہل صبح دیکھا ہے کہ بغیچے کی طرف سے روتے ہوئے چلے آئے رہے ہیں۔"

"ارے وہی رحمت میاں کے چھوکرے نے اس کو مارا تھا۔ ایک بالشت کا ہے اور دنیا کو نچائے پھرتا ہے۔"

"توبہ۔۔۔۔ توبہ۔۔۔۔" سکونت لوٹا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے لوپلے کانوں کو پھٹپھٹایا۔

"اور گھر کی ہوا بے بگڑی ہوئی ہے۔ اور رای چھوکرا تو استاد معاش ہے کہ باپ رے باپ ہمرے مرحوم ہمیشہ کہتے رہے کہ رشید اور رحمت میاں کے لڑکے سے بچائے رکھو۔ گزرتے وقت بھی وہ یہی بولے تھے۔"

"میں اس کو مزا اچھا دوں گا۔ اس نے سمجھا کیا ہے۔"

شرافت میاں حقہ سے کا چھٹنے لگے تو سکونت لوٹا نے خالی گھڑا اٹھایا اور کنوئیں سے پانی لانے چلی گئیں۔

رحمت میاں اور شرافت میاں دونوں کا گھرانا کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ اور ان کے دعوؤں کے مطابق وہ دونوں لنگوٹیا یار بھی تھے۔ دونوں نے ساتھ ہی ہوش سنبھالا تھا۔ ایک ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا اور ایک ساتھ بنڈی پر بیٹھ کر جاتے۔ اور ایک ہی ساتھ مدرسے میں داخل کیے گئے تھے۔ اور کم و بیش دونوں نے ایک ہی ساتھ مدرسہ چھوڑا تھا اور اپنی خاندانی سنبھالنے لگے حتیٰ کہ کملا دھر بی کی لڑکی سے عشق بھی دونوں نے ساتھ ہی کیا تھا۔ اور کچھ ہی ماہ بعد عشق کا بخار بھی دونوں کا ساتھ ہی اتارا گیا تھا۔

مدرسہ کی تعلیم نے ان دونوں کو اس لائق بنا دیا تھا کہ وہ اپنے اپنے کھیتوں کا حساب برہمی آسانی کے ساتھ پڑھ لیا کرتے۔ اور مالگذاری وصول کرنے والا پٹواری جب ان سے رسوت مانگتا تو یہ بڑا حساب کرتے اور یوں پٹواری انہیں زیادہ چکر نہیں دے پاتا اور اس طرح گاؤں کے پڑھے لکھے لوگوں میں ان دونوں کا بھی شمار کیا جاتا۔

دونوں کے درمیان کسی بات پر معمولی سا اختلاف بھی نہ ہوتا۔ لیکن جب ان کی شادی ہوئی اور بچے ہوئے اور یہ بچے جب بڑے ہو کر کسی نہ کسی بات پر اکثر و بیشتر معمولی سی تلخی ضرور پیدا ہو جایا کرتی۔ یہ سلسلہ ادھر پانچ چھ برس سے چلا آ رہا تھا۔ تلخی ہمیشہ بچوں کی آپس کی لڑائی سے شروع ہوتی اور کھیتوں کی منڈیر پر ہو کر یہ اور بڑھ جاتی۔ لیکن معاملہ بہر حال اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ اور پھر دونوں ایک ساتھ ہنستے بولتے نظر آتے۔

مگر شرافت میاں کا کہنا تھا کہ وہ اب مزید برداشت نہیں کر سکتے اور رحمت میاں بھی اپنے اندر برداشت کرنے کی صلاحیت کے ختم ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔

اتنا ہونے کے باوجود بھی یہ بات شاید ختم جاتی۔

لیکن رام دھنی لوہار کے بیٹے نے اپنے کھیت میں ایک بکری کو گھس کر فصل برباد کرتے ہوئے دیکھا تو اپنے ہاتھ کا ڈنڈا گھما کر دے مارا۔ اور جب اس نے یہ دیکھا کہ وہ بکری صرف تین ٹانگوں پر سماتی ہوئی بھاگ رہی ہے تو مارے خوف کے تھاک کھڑا رہا۔

اور یہ بکری شرافت میاں کی تھی۔

جمیل کی ماں نے اپنے سینہ پر دو ہتڑ مار کر فلاں ناشروع کیا۔

"ہو نہ ہو۔۔۔۔ اس کی ٹانگ اسی گھر والے نے توڑ دی ہے۔

غضب خدا کا۔ اب اس پر اثر آیا وہ۔ اللہ چاہے گا تو اس کی جان پر بھی اثر رہے گی۔

شرافت میاں اپنی کھاٹ پر لیٹے ہوئے یہ سوچ رہے تھے کہ وہ کون سا طریقہ اپنایا جائے کہ رحمت کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ اسی دوران اُن کے ملازم نے آکر پوچھا۔

"مالک اپنے بھی بانس کاٹ لیوا۔ باری گھیرے کے ہے۔"

"لے کاٹ لو گے بعد میں۔" شرافت میاں پہلے ہی سے بھرائے ہوئے تھے۔

"رحمت بابو کاٹ رہن ہیں۔ اُنہی سے بول لی کے ساتھ ہم ہو کاٹ لیئی۔"

کیا کہا؟ جیسے شرافت میاں کو اندھیرے میں روشنی کی ایک لکیر دکھائی دی۔

"رحمت بانس کاٹ رہا ہے۔؟"

"ہاں مالک۔"

"ہوں۔" وہ بستر سے اُٹھے۔ "پھر چل میرے ساتھ۔" انھوں نے ملازم کو ساتھ لیا اور اُس طرف چل دئے جہاں بانس کا گڑھا تھا۔

یہ بانس کا گڑھا وہاں کب سے تھا۔ نہ تو رحمت میاں کو یاد تھا اور نہ شرافت میاں کو۔ انھیں صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ اُن دونوں کے باپ کی دوستی کی نشانی تھی۔ جنھوں نے اپنے ہاتھوں سے وہاں یہ بانس اِس لئے لگایا تھا کہ آگے چل کر اُن کے لڑکے اور گاؤں کے دوسرے لوگ اُن کی دوستی کو یاد رکھیں۔ اور یہ طے پایا تھا کہ دونوں کو جب بھی جتنے بانسوں کی ضرورت ہوگی بغیر کسی جھجک کے وہ کاٹ لیا کریں گے۔

اب تک یہی ہوتا چلا آیا تھا۔

رحمت میاں نے پچھلے سال اپنا گھر بنوایا تھا تو سیکڑوں بانس کٹ گئے۔ مگر شرافت میاں کی پیشانی پر بل نہیں پڑے۔ اور شرافت میاں نے جب اپنی بیٹھک بنوائی تو کم و بیش اتنے ہی بانس پھر کاٹے گئے۔ مگر رحمت میاں کو کبھی یہ نہیں لگا کہ بانس کا گڑھا ہے بھی یا ختم ہو گیا۔

لیکن آج شرافت میاں زور سے گرجے۔

"قسم ہے ایک بانس بھی کٹے گا تو گردن کاٹ دوں گا۔"

"زبان سنبھال کر بات کیجئے بھائی صاحب۔ یہ آپ کے باپ کی ملکیت نہیں ہے۔"

"یہی تو بتانے آیا ہوں کہ یہ میرے باپ کی میراث ہے اور میرے بغیر ایک انچ بھی بانس نہیں کٹے گا۔"

"اور میں یہ بانس آپ کی اجازت کے بغیر اِس لئے کاٹ رہا ہوں کہ آپ یہ جان لیں کہ آپ کا اس پر کوئی حق نہیں۔"

"میرا کوئی حق نہیں۔"

"نہیں۔"

"تو پھر کاٹ کر دکھیو۔"

"یہ لو۔ کاٹتا ہوں۔" رحمت میاں نے چمک کر کلہاڑا بھرپور وار بانس کی جڑ پر مارا تو شرافت میاں نے اچھل کر اپنے ہاتھ سے وار اچک لیا۔

وہ تو شکر ہوا کہ اِس ہنگامہ کی آواز سُن کر آس پاس کے کھیتوں میں کام کرنے والے کسان وہاں جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے دونوں کے ہاتھ ڈال کر ایک دوسرے سے الگ کیا اور پھر انھیں کھینچ کے گھروں تک چھوڑ آئے۔

اور یہ بات جب بستی کے گھر گھر تک پہنچ گئی کہ بانس کے گڑھے رحمت میاں اور شرافت میاں کے درمیان سرحد پھاند تے ہوئے گئے تو بستی کے لوگوں نے اپنے اپنے تعلقات کے مطابق اُن کے خیر خیریت لینے کے لئے پہنچنا شروع کر دیا۔

اور شام ہوتے ہوتے دونوں کی بیٹھک پر چند ڈال چوکڑی اور یہ چوکڑی رات کے بارہ بجے تک جمی رہی۔

اُدھر رحمت میاں کو لوگوں نے یقین دلایا۔

یہ بانس دراصل آپ کے باپ نے لگایا تھا۔ لیکن شرافت کے باپ سے اُن کی دوستی تھی اِسی لئے انھوں نے کبھی روک ٹوک نہیں کی۔ مگر اِس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ زمین بہر حال آپ کی ہے۔ اور یہ شرافت کی بے ایمانی ہے کہ وہ اُس کو اپنی ملکیت بتاتے ہیں۔ آپ اِس کا فیصلہ کرائیے۔ ہم تو کہتے ہیں ضلع کچہری سے فیصلہ کرائیے۔ وہ کیا سمجھتے ہیں ہم لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔"

اور اُدھر شرافت میاں کو اُن کے لوگ کہہ رہے تھے۔

"وہ تو ہے ہی بے ایمان ہے۔ اُس کے باپ نے زندگی بھر لوگوں کی زمین ہڑپ ہڑپ کر اتنا جمع کیا۔ میرے والد مرحوم ہوتے تو وہ سارا فیصلہ کر دیتے۔ یہ بانس کا گڑھا آپ کا ہے۔ اِس لئے کہ زمین آپ کی ہے۔ آپ کسی بات کی فکر نہ کریں۔ ضرورت پڑی تو ہم لوگ گواہی دیں گے۔ ہم لوگ گواہی دیں گے۔

سب سے زیادہ قابلِ اعتماد
بالوں کو سیاہ کرنے والا
وسمول

سفید بالوں کو سیاہ کرتا ہے
بالوں کو سنوارنے کا بہترین ذریعہ ہے

ایملسی فائڈ ہیر آئل اور پومیڈ کی
شکل میں ہر اسٹور سے
دستیاب ہو سکتا ہے
(دنیا بھر میں لاکھوں استعمال کرتے ہیں)
ہائیجنک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سٹ پوسٹ بکس ۱۱۹۲ بمبئی ۱

مدت میاں ہم لوگوں کی بات سنیں مانیں گے۔ ضرور مانیں گے۔ عدالت فیصلہ کر دے گی۔"

یہ چٹپٹی چوکڑی جب ختم ہو گئی تو ادھر رحمت میاں اور ادھر شرافت میاں دونوں اپنے اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئے اور ایک دوسرے کے خلاف سوچ سوچ کر نئی نئی گھونٹ پیتے رہے۔ تمام رات باتوں نے جاگ کر گزاری۔ لیکن صبح ہونے سے پہلے وہ دونوں اپنے اپنے دل پر ایک فیصلہ پر پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک الگ بات تھی کہ دونوں نے ایک ہی فیصلہ کیا تھا۔

صبح ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی انہوں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا، پھر بیوی کھیتوں کے پرانے کاغذات ڈھونڈنے میں انہیں کافی وقت لگ گیا اور گاؤں سے باہر کچی سڑک پر جہاں سے شہر جانے والی سواریاں گزرتی تھیں پہنچتے پہنچتے دن کے دس بج گئے۔

دونوں شہر جا رہے تھے۔ ضلع کچہری میں مقدمہ دائر کرنے کیلئے۔

ایک دوسرے سے کچھ فاصلہ پر وہ دونوں اکڑے ہوئے کھڑے تھے اور اپنے اپنے طرفداروں سے بہت دنوں کے بعد ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور ان کے طرفدار بغل میں کاغذات کا پلندہ دبائے کافی عرصہ کے بعد شہر دیکھنے کی خوشی میں کوئی بات نہیں سمجھ رہے تھے اور صرف ہوں ہاں کرتے جا رہے تھے۔

ایک بس جا چکی تھی۔ کوئی تانگہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوسری بس کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ وہ دونوں کچی سڑک کے کنارے اگی ہوئی گھاس پر تولیہ بچھا کر بیٹھ گئے۔ اور ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ آم اور جامن کے پیڑوں سے بھرا ہوا سامنے والا باغ گونج اٹھا۔

"مینا کا بچہ صلہ مارے، دودھ جامن گرا دے۔"

رحمت میاں اور شرافت میاں دونوں نے ادھر گھوم کر دیکھا۔ باغ کے تمام بچے اپنا اپنا بستہ پر ہاتھ رکھے اپنی اپنی گردن اوپر کی طرف اٹھائے ہوئے تھے۔ اور ان سب کے آگے جمیل اور عابد ایک ساتھ اپنے توتلے بھرے ترنم کے ساتھ گائے جا رہے تھے۔

"مینا کا بچہ صلہ مارے، دودھ جامن گرا دے"

اور تمام بچے اچھے اچھے بچوں کی طرح دہرا رہے تھے۔

"کچا گرے تو مر لہ مارے، دودھ گرے تو کھا گدھے۔"

رحمت میاں نے شرافت میاں کو دیکھا اور شرافت میاں نے رحمت میاں کو۔ چند لمحوں تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اپنی اپنی گردن جھکائے نہ جانے کیا سوچتے ہوئے وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

■■

ارشد صدیقی

غزل

دل اب ہلاکِ جلوۂ دیر و حرم کہاں
تم جب سے مِل گئے ہو زمانے کے غم کہاں
تم میرے ساتھ ساتھ چلو، ورنہ کیا خبر
لے جائیں زندگی کے مجھے پیچ و خم کہاں
دل خون ہو چکا ہے مگر سوچتے ہیں یہ
اُٹھ کر اب اُن کی بزم سے جائیں بھی ہم کہاں
میرے جُنوں پہ ڈال رہے ہیں وہ خود نقاب
اُن کی نظر کا جا کے کھُلا ہے بھرم کہاں
یہ بزمِ زندگی ہے شبستانِ دل نہیں
آواز دے رہا ہے مجھے تیرا غم کہاں
ہاں ہم ہی خود نگر تھے، پر اب دیکھنا یہ ہے
اُس زُلفِ پُر شکن کے نکلتے ہیں خم کہاں
یہ سوچ کر تو اور بھی تھمتے نہیں ہیں اشک
پھر دامنِ جمال کہاں چشمِ نم کہاں
ارشد جو ظلم کر کے مداوا بھی کر سکیں
اِس دورِ مصلحت میں وہ اہلِ ستم کہاں

احمد صمیر

ماضی

جب کبھی رختِ سفر باندھ کے گھر سے نکلا
اِس ارادے سے کہ آفاق پہ پرواز کروں
اور، میں بڑھ کے جہیں چوم لوں مہ پاروں کی
اور، اِس وسعتِ کونین کو اِن بانہوں کے
نرم گھیروں میں جکڑ ڈالوں،
اسے قیدی کر لوں
تب، وہی موڑ سے چھوڑ کے جانا چاہا
سامنے آتا ہے، کہتا ہے "کدھر جاتے ہو؟"
میرے دامن کو جکڑتے ہوئے مضبوطی سے
پوچھتا ہے کہ "چلوں میں بھی، جدھر جاتے ہو؟"

سمرسٹ ماہم
مترجمہ: فاضلی

ایک ادیب کی ڈائری کا ایک ورق

میں دس سال اور موت کے قریب آگیا ہوں۔ میں آج بھی اس بارے میں بالکل اسی طرح محسوس کر رہا ہوں جیسا کہ دس سال پہلے.... بیشک کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں سب کچھ کر چکا ہوں، بہت سارے لوگوں کو جان چکا ہوں، بہت سی کتابیں پڑھ چکا ہوں، بیشمار تصویریں دیکھ چکا ہوں، کئی بار موسیقی سے لطف اندوز ہو چکا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ خدا کا وجود ہے بھی کہ نہیں، وہ تمام دلیلیں جو اس کے وجود کے ثبوت میں پیش کی جاتی رہی ہیں، ان میں سے کسی میں جان نظر نہیں آتی۔ اپی کورس (EPICURUS) کی طرح ہم بھی تک اپنی عقیدت کی بنیاد کسی فوری تاثر پر رکھتے ہیں۔ لیکن میں کبھی اس تاثراتی لمحے سے نہیں گزر پایا۔ اور نہ ہی کوئی منطقی دلائل سے تمام خیر و خوبی والے خدا کے ساتھ شیطنت کی موجودگی کو ثابت کر پایا ہے۔

کبھی کبھی میں ہندو فلسفے کے اس پراسرار غیبی وجود کے تصور کی طرف راغب ہو جاتا ہوں جو صرف اس تو، کیا ان اور سہا آنند ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ اور میں چاہتا بھی ہوں کہ اور دوسرے خداؤں کے مقابلے میں مجھ عہد یہ عہد انسانی ذہن سے ختم کیے رہتے ہیں، اسی خدا پر یقین کرنے لگوں۔ لیکن یہ بھی محض خوبصورت خیالات کے سوا کچھ نہیں۔ تمام عالم رنگ و بو کو کسی جلوہ یکتائی معشوق سے منسوب کر دینا اور بات ہے مگر اس کے ثبوت میں منطقی دلائل ہم پہنچانا مشکل ہے۔ جب میں دنیا کی بے پناہ وسعتوں کا تصور کرتا ہوں، لاتعداد ستارے، اور خلائی پہنائیاں جن میں بیشمار صدیاں سمٹی پڑی ہیں، تو میں ایک عجیب سی دہشت محسوس کرنے لگتا ہوں۔ لیکن میرا تخیل اس کائنات کے کسی خالق کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ میں دنیا کو ایک ایسا مجسمہ سمجھنے کیلئے تیار ہوں جس کا اصل ابھی تک انسانی فہم و ادراک کی دسترس سے بالا ہے جہاں تک انسانی زندگی کا تعلق ہے مجھے اس نقطۂ نظر سے اختلاف نہیں کہ طبیعاتی مادہی سے تخم زندگی کی نمود ہوتی ہے اور جس کی نفسی حرکت میں ہی ارتقائی تگ و دو کا راز پوشیدہ ہے۔ لیکن اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کا راز کیا ہے؟ یہ ابھی تک میرے ذہن میں صاف نہیں!

میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس کشمکش کے موضوع پر جو کچھ فلسفیوں، ماہر روحانیات اور صوفیوں نے کہا ہے وہ میرے لئے تسلی بخش نہیں.... ماورا اگر خدا کا وجود یقینی ہے اور اس کا سمجھنا جیسا کہ کہا جاتا ہے مخلوقات عالم سے بھی ہے۔ تو اس میں ایک مجسمہ انسان کی مانند ذاتی شعور بھی ضرور ہونی چاہیئے کہ وہ عام انسانی کمزوریوں کو حلیمانہ نظروں سے دیکھ سکے۔

اور روح کا مسئلہ کیا ہے۔ ہندو اس کو آتمن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کے عقائد کے مطابق یہ ازل سے تا ابد قائم و دائم ہے، ہے اور رہے گی۔ اس نقطۂ نظر کو مان لینا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس دوسرے تصور کے جس کی رو سے روح کا جنم بھی فرد کیساتھ ہی ہوتا ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ انسانی روح حقیقت مطلق سے ہی جدا کی ہوئی اکائی ہے، اور جس کا مقصد عشرت قطرہ کی مانند دریا میں فنا ہو جانا ہے، یہ ایک دلچسپ تخلیق ہے۔ اس کی کسی اور دوسری نوعیت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم۔ اس کے ساتھ ہی آواگون کا تصور بھی جڑا ہوا ہے، جو انسانی نیک نیتی اور سچائی کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے، یہاں بدی مانی کی غلط کاریوں کی فطری پاداش سمجھی جاتی ہے لیکن یہ عقیدہ بھی خامی کا مسئلہ ہے اور بدھی کے تعقل کو سمجھانے سے قاصر ہے۔

حقیقت میں رُوح کیا ہے؟ افلاطون سے آج تک ہزاروں لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس سوال کا جواب دیتے رہے ہیں، اور شیرازہ میں صرف افلاطونی تصور کی حاشیہ آرائی تک ہی محدود رہے ہیں، ہم اکثر اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں اور یہ ان لیے میں کبھی کوئی نقصان نہیں کہ ہم کچھ نہ کچھ تو اس کے معنی نکالتے ہی ہیں، عیسائیت میں اسے سات مرتبہ عطا کر کے اس کی دائمیت پر مُہر لگائی جاتی ہے، تب بھلے ہی اس پر یقین نہ ہو، لیکن رُوح ایک توجہ طلب مسئلہ ضرور ہے۔ میں خود سے جب رُوح کے معنی پوچھتا ہوں تو سوائے 'شعورِ ذات' کے دوسرا مفہوم میرے ذہن میں نہیں آتا۔ 'شعورِ ذات'۔۔۔ میرے اندر کا 'میں'۔۔۔ وہ شخصیت، جو میں خود ہوں، اور۔۔۔ اور جو ان تمام حادثات، واقعات، واردات، اور سانحات جن سے میں دو چار ہوا ہوں یا جو تاثروں سے تر بتر بیت پاتی ہے۔

شاید کچھ اصحاب کو اعتراض ہو کہ خارجی حالات، رُوحانی نظام پر کیسے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ مگر اپنے تئیں میں اسے زیادہ قرینِ قیاس سمجھتا ہوں۔ اگر میں لکھنؤ کا نہ ہوتا، یا میرا قد تین چار انچ اور لمبا ہوتا، اور میرے بچپن کی بدھیتی جو بچپن میں سونے کی پلیٹ لگانے سے دُور ہو سکتی تھی، اور جس کی وجہ سے میرا چہرہ زیادہ جاذب نظر ہو جاتا، میرے ملنے جلنے والوں کے بڑھ عمل میں ضرور تبدیلی واقع ہوتی، اور میرا ہونا، مزاجِ موسم بھی کچھ مختلف ہوتا۔ تو کیسی رُوح کیا میں میں ذات کے ذرے آگے کی جنبش سے تبدیلی پیدا ہو جاتے۔ ہم سب جانتے ہیں، اگر اتفاقی حادثات ہماری زندگی پر اثر انداز نہ ہوں تو ہمارے رُوحانی مزاج کی نوعیت کچھ سے کچھ ہو جائے۔ رات دن کے ہیر پھیر، کسی سے ملنا، کہیں ٹھہرنا، کھانا پینا اور نہ کھانا پینا۔۔۔۔۔ یہ سب ہماری رُوحانی تنظیم میں بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں۔ رُوح ہماری خصوصیات، رشتے۔ اور بے ترتیبیوں کا علامتی اظہار ہے یا کوئی مقتدر آسمانی طاقت۔ مگر ہمارا کردار اس کی خارجی تفسیر ضرور ہے۔ شاید اس سے کوئی انکار نہ کر پائے کہ ہماری تکالیف ذہنی یا جسمانی بیماری کے کردار پر اپنا اثر ڈالے بنا نہیں رہتیں۔

میں کچھ ایسے اشخاص سے واقف ہوں جو اپنی غربت اور گمنامی کے دنوں میں نہایت حاسد، سخت اور گرے ہوئے تھے، مگر اچھے دنوں میں وہی خوش اخلاق اور حلیم نظر آنے لگے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ تھوڑا سا بینک بیلنس اور شہرت کی چمک دمک ہمیں رُوحانی ہمہ گیری بخش سکتی ہے۔

میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ رُوح جس کا ڈھلاؤ عام ذہنی و جسمانی اتفاقات کے سانچوں میں ترتیب پاتا ہے، انسانی جسم سے جدا کا حیثیت رکھتی ہے، جب ہم کسی مرے ہوئے آدمی کو دیکھتے ہیں تو زیادہ ہمیں بے حس و حرکت نظر نہیں آتا۔

مجھ سے اکثر پوچھا گیا ہے "کیا میں پھر سے اپنی پوری زندگی جینا چاہتا ہوں؟ بے شک! میں نے بہت سکھی زندگی جی ہے۔ شاید بہت سوں سے بہتر!! لیکن دوبارہ اسی سلسلے کو شروع کرنے کی دیر میری سمجھ میں نہیں آتی یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے یکبارگی پڑھی ہوئی جاسوسی کہانی کو دوبارہ پڑھنے کو کہا جائے۔ اگر دوبارہ جنم لینے کا عقیدہ جس پر دُنیا کی تین چوتھائی آبادی اٹوٹ یقین رکھتی ہے۔۔۔ صحیح ہے۔۔۔۔ اور یہ کہ ایک اضافتی عمل ہو تو میں یہ تجربہ کرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ میں ان تجربات سے متعارف ہو سکوں جن سے میں اپنے حالات اور ذہنی و جسمانی بناوٹ کے سبب محروم رہا ہوں کے بارے میں میں جاننا چاہتا تھا مگر جو غیر اختیاری حالات کے تحت ممکن نہ ہو سکا۔ لیکن نہیں!! مجھے یہ پسند نہیں۔۔۔ میں بہت کچھ کر چکا مجھے نہ مائیت پر وشواس ہے نہ اس کی خواہش ۔۔۔۔۔ میں مرنے کے لئے بالکل تیار ہوں۔۔۔۔ اور مجھے یقین ہے کہ میری جسمانی موت کے ساتھ ہی میری رُوح بھی اپنی تمام کمزوریوں اور اچھائیوں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔

اپی کیورس نے ایک بار HENOECEUS کو لکھا تھا

"اس اصول کو ماننے کے عادی ہو جاؤ کہ موت ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی، ہر اچھائی، بُرائی کا تعلق احساس سے ہوتا ہے، موت اسی حیاتی عمل کے خاتمے کا نام ہے۔ موت کا صحیح شعور ہمارے ذہن سے دوام کی تخیلی خواہش کو نکال کر ہماری چند روزہ زندگی کو قابل اور قابلِ شکار بنا دیتا ہے، اس آدمی کے لئے کوئی اُلجھن باقی نہیں رہتی، اگر وہ شعوری طور سے زندہ رہنے کو کوئی خوفناک امر نہ سمجھے۔ ان الفاظ کے ساتھ آج کے دن میں نوٹ بک کو ختم کرتا ہوں۔

ساحل ویگیری

تاج محل

اک غزل!
حُسنِ تخلیق کی مستیوں نے کہی
اک کنول
صبحدم جھیل میں کھِل گیا
دودھ کہتے ہوئے دل کی ویرانیاں
خامشی وقت کی، حشر سامانیاں
گیت کے رُوپ میں، پیار کی دُھوپ میں
رقص کرنے لگیں، یوں تسنور نے لگیں
جس طرح آئینے کے قریں کوئی حرماں نصیب
دفعتاً اپنے محبوب کی
گرم سانسوں کی حدّت کو پانے لگے
فرطِ احساس سے لب چبانے لگے
تھر تھرانے لگے

اور پھر سوچ کی گہری پرچھائیاں
آگ کی گود میں سرد تنہائیاں
عشق کی آنکھ سے خون بن کر گریں
اپنے دامن میں خنکی سمیٹے ہوئے
وقت کے گرم رخسار پر
چارہ سازی کے انداز میں
یک بیک تھم گئیں
سرد جھونکوں سے حالات کے جم گئیں
اک کنول کھِل گیا، اک غزل ہو گئی
اک غزل مرمریں تاج پہنے ہوئے
اک کنول رَو میں جمنا کی بہتا ہوا
داستانِ الم اُن کی کہتا ہوا
جن کے اشکوں کی جلتی ہوئی بوند سے
رنگ شاداب ہے، عشق سیراب ہے

حسن کمال

غزل

کس رہ پہ شبِ غم نے ہمیں گھیر لیا ہے
کیا چیز جلائیں کہ نہ دل ہے نہ دیا ہے
جتنی بھی ہوئیں دل کی تمنا کو شکستیں
اتنا تجھے پانے کا مجنوں اور بڑھا ہے
جس یاد کو ڈھالا تھا بہت پیار سے غم میں
آجاؤ کہ سینے میں وہ غم ٹوٹ چلا ہے
ہنستے تو ہیں اک پل کو، چکاتے ہیں کئی دن
وہ قرض جو ہستی نے ترے غم سے لیا ہے
سجدوں سے وہ تسخیر ہو ممکن ہے یہ کیوں کر
وہ قامتِ زیبا کہ نہ بُت ہے، نہ خدا ہے
جس بات سے آجاتا ہے جینے کا سلیقہ
اُس بات کو سوچا تو بہت جی بھی کھا ہے
کھونے کو ہے کیا چیز حسنؔ اپنی گرہ میں
لے دے کے ہے اک رُو سو وہ درد بھی کیا ہے!

مسرور جمال

(طنز و مزاح)

مُفت کے مشورے

یہ کوئی انگلینڈ یا امریکا تو ہے نہیں جہاں جیب خالی کیے بغیر مشورے حاصل کرنے کیلئے ڈھیروں خرچ کرنا ہوتا ہو۔ کسی سے ملنے یا باتیں کرنے کیلئے ہفتوں پہلے اپوائنٹ منٹ کرنا پڑتا ہو۔ یہ تو جناب ہندستان ہے ہندستان جہاں رشتہ داروں سے زیادہ ملاقاتی اور ملاقاتیوں سے زیادہ احباب ہوتے ہیں اور جہاں یہ مقولہ بُری طرح فیل ہوجاتا ہے کہ:۔

"واقف کار زیادہ سے زیادہ بناؤ، لیکن دوست صرف چند رکھو"

اللہ تعالیٰ سب کے مقابلہ میں جو چیز ہندستان میں بکثرت پائی جاتی ہے وہ ہے مُفت کا مشورہ۔ مفت، بالکل مُفت، ایک دم مفت اور قطعی مُفت مشورے دینے والے ہر قسم اور ہر عمر کے حضرات اور خواتین سے ہمارا آئے دن پالا پڑتا رہتا ہے۔ کوئی صورت نہیں کہ ہم ہر ایک کے حقیقی اور فاضل مشوروں سے جان چھڑا سکیں۔

پوچھ لیجئے تو یہ مشورہ دینے میں بڑے ہی فراخدل ہوتے ہیں آپ ان سے خوش ہوں یا ناخوش لیکن یہ عام طور پر آپ سے ناخوش رہا کرتے ہیں کہ آپ اُن کے قیمتی مشوروں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاتے اور نہ اُن کی صلاحیتوں سے مستفیض ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

مشورے دینے والے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو وقت بے وقت ہر جگہ اور ہر موقع پر اپنی قیمتی رائے دینے کو تیار رہتے ہیں۔ دراصل یہ بڑے دور اندیش ہوتے ہیں لیکن مشورے ان کے بالکل مُفت ہوتے ہیں۔ ان کے مُفت کے مشورے اکثر جان لیوا ثابت ہوتے ہیں جن پر عمل کرنے کے بعد زندگی بھر کی قیمت چکانی پڑتی ہے یہی ہوتا ہے کہ اُن کے مشورے پر چلنے کی چبھن زندگی بھر دل پر کچوکے لگاتی رہتی ہے۔ مثلاً ایک فاضل مشورہ دینے والے نے فرمایا۔

"ارے یہ کیا گرم گرم پانی پیتی رہتی ہے، برف ہو رہی ہے کچھ میں پڑنا بھی کیا کہ اس سیدھے سے ایک ریفری جریٹر لے لو۔"

اُن کے نزدیک تو بیت ہی سستا نسخہ تھا۔ بتا کر چلتے بنے۔ اُن سے یہ بھی تو نہ ہوا کہ اسی سانس میں ریفری جریٹر خریدنے کے مالی پہلو پر غور کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ "آئس باکس" خریدنے کی رائے دیتے۔

اب ذرا ریفری جریٹر کے دلکش تصور کو ذہن میں لائیے جب بھی چلچلاتی دھوپ اور لُو میں پسینہ پسینہ ہونے کے بعد آپ کا دل ٹھنڈے پانی یا آئس کریم کو چاہے گا تو ان کا مشورہ آپ کو یاد آئے گا اور زندگی بھر ریفری جریٹر کی یاد یا کمی آپ کو ستاتی رہے گی۔

مشورہ دینے والوں کی دوسری تکلیف دہ قسم وہ ہے جو وقتی طور پر کسی تکلیف سے متاثر ہونے کے بعد آپ کو کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ مثلاً آپ کا کوئی اچھا بھلا ملاقاتی آپ کی شاندار پانچ منزلہ عمارت کی ساری سیڑھیاں طے کرکے جب ہانپتا کانپتا اوپر پہونچے تو مکان کی تعریف سے کہیں آپ کو بتائے کہ اتنے بڑے مکان میں آپ نے لفٹ نہیں لگوائی ہے اور جب آپ سوالیہ نشان بن جائیں تو بڑی سادگی اور بھولے پن سے وہ مشورہ دیں۔

"آپ اس میں لفٹ کیوں نہیں لگوا لیتے۔"

آپ کے مہربان تو مشورہ دے کر چلتے بنیں گے لیکن زندگی بھر زینے اُترنے چڑھنے کے ساتھ ہر بار ان کا مفت کا مشورہ آپ کا تعاقب کرتا رہے گا، اور ہوسکتا ہے آپ کو یہ سننا پڑے کہ مفلسی کے سبب ایک لفٹ تک نہ لگوا سکے۔

ان مشورہ دینے والوں کے آئے دن کے مشوروں سے تو میرے کان پک گئے ہیں۔

اتفاق سے ایک بار اتفاق میں فیل ہو گئے اب جو پُرسا دینے والوں کا تانتا بندھا اور ہر ایک میں خصوصاً سکرجالائے کہ اگر غلطی سے پاس ہو جاتے تو آنے والوں کو مٹھائی کھلانے کیلئے خود حلوائی بننا پڑتا۔ جو تازہ وہ فیل ہوئے پاس ہونے والوں سے کم از کم اس اعتبار سے زیادہ دیتا۔ جن بدنصیبوں نے اس امتحان محنت سے پڑھ کر اگلا امتحان پاس ہونے پر زور دیا تھا، ان میں سے زیادہ تر کی سات پشتوں میں بھی کسی نے کتاب کی شکل نہیں دیکھی تھی اور ان کی قابلیت کا عالم تھا کہ خود گھر کے روزمرہ کے سودا سلف اور دھوبی کے کپڑوں تک کا حساب نہ رکھ سکتے تھے بلکہ بعض انگوٹھا لگانے والے تک یہاں بھی مشورہ دے رہے تھے۔

ایک دن ہم اپنا مراقبہ جو سینے بیٹھے تو پڑوس کی بابا منڈلی پڑی۔ پہلے تو انھوں نے کپڑے کا بغور معائنہ کر کے اس میں نقص نکالا جاما جی ہاتھ سے جل گیا۔ اس کے بعد کرسچیونٹ اور سلائی کے بارے میں اپنا رائے دیتی رہیں۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ وہ سلائی کے بارے میں قطعی ناواقف ہیں، بس ان کے ذہن میں دو چار علمی طرارے تھے۔ جن کے بل پر وہ اپنی بے پناہ قابلیت کا رعب ہم پر جھاڑ رہی تھیں۔

مگر سب سے زیادہ غصہ تو ان پر آتا ہے جو کھانے پینے کی چیزوں میں اپنا مشورہ ملا کر کھانے پینے کا ناس کرتے ہیں مثلاً ہمیں آلو مٹر اور ٹماٹر پسند ہیں تو وہ لوکی، توری اور بھنڈی کے افادی پہلو پر غور کرنے کا مشورہ دیں گے۔ اگر ہمیں دال پسند ہے تو وہ صلاح دیں گے کہ روٹی کھایا کیجئے۔ اس قسم کے مشورے لاکھ ان کا منہ کالا کر کے ان کان مار آئیں، مگر اس سے بھاری جنرل نالج میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کس ترکاری میں وٹامن (ب) ہے اور کس میں "ن" غرضیکہ ث ج ح سبھی طرح کے وٹامنوں سے پوری پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔ اور گیہوں (پشرطیکہ کنٹرول میں آنے کی وجہ سے سڑ نہ چکے ہوں) چاول سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے حالانکہ گیہوں کے بارے میں ہم اتنا علم ضرور رکھتے ہیں کہ گیہوں کھانے کے بعد ہی حضرت آدم اس دنیا میں پھوٹنے کے مرتکب ہوئے تھے اور ان کا گیہوں کھانے کا مشورہ خدا جانے ہمیں کس جہنم میں لے جائے۔

ہمارے بعض ملاقاتی تو مشورہ دینے میں اس قدر عالم واقع ہوئے ہیں کہ ہمیں طرح طرح کے مشورے دینے کا فکر ہی دن رات دبلے اور بیمار رہتے ہیں۔ اور وہ گھر کے ہر معاملے کو اپنا معاملہ سمجھتے ہیں۔ گرگرمیاں گزارنے کیلئے ہم کشمیر جانے کا بالکل ٹکٹ وغیرہ لیں تو وہ اصرار کریں گے کہ بھئی کشمیر میں کیا رکھا ہے۔ نینی تال یا خلہ جاؤ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے پہاڑ اور پہاڑی تو کیا کوئی ٹیلہ تک نہیں دیکھا۔ لیکن جمہوریت میں آزادیٔ رائے اور محکمۂ مذہب مخالف کا ہونا ضروری ہے اس لئے وہ عادت سے مجبور ہو کر اختلاف برائے اختلاف کی خاطر کشمیر پر شملہ کو ترجیح دے رہے ہیں۔

کچھ بھلے مانس محض اپنی بات اوپر رکھنے یا نبھانے کی خاطر مشورے دیا کرتے ہیں۔ اگر آپ نے نئی سلائی مشین خریدی ہے تو یہ فوراً آپ کی ٹانگ کھینچیں گے کہ میرٹ کیوں نہیں خریدی۔ وہ تو اس سے زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ مگر آپ سینگر سے بھی ہار مان لائے ہیں تو وہ آپ کی جان کو آجائیں گے کہ آپ اسے واپس کر کے "اوشنا" سے بھی لے آئیں۔

اس قسم کے مشورے دینے والوں کی اس وقت سب سے زیادہ بن آتی ہے جب ان کی وجہ سے ان کا کوئی دوست یا عزیز بیمار پڑ جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کے قول کے فول آپ کے بابت فرمانے پر گویا شروع ہو جائیں گے۔ انہیں اس سے بحث نہیں کہ آپ کو محض موسمی بخار یا معمولی نزلہ ہوا ہے۔ وہ کسی بھی صورت میں اسے "تپ دق" سے کم کا مرض ہرگز نہ دیں گے۔ ان کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ اگر آپ زندگی سے ہاتھ نہ دھو سکیں تو کم از کم صحت سے تو دھو ہی لیں۔ اس کا تجربہ ہمیں پچھلی برسات میں اس وقت ہوا جب ہم موسمی بخار میں مبتلا ہو کر بستر علالت پر دراز تھے۔ جس کے چاروں طرف عیادت کرنے والوں کا مجمع سے تمام بلکہ رات گئے تک میلہ سا لگا رہتا تھا۔

ایک بڑی بی آئیں تو آتے ہی انھوں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ بغض کے دھوکے میں کلائی پکڑ کر نبض ٹٹولتی رہیں، سینہ ٹھونک بجا کر دیکھا، ہماری جملہ بدپرہیزیوں کا جائزہ لینے کے لئے کمرے کے چاروں طرف گہری نظروں سے معائنہ کیا۔ لیکن جب کمرے میں یا ہمارے آس پاس ایسی کوئی چیز نہ دیکھ کر نہ ملا تو پھر ہماری سلامت آنکھ بولیں ——

آخر کیسے آگیا بخار؟ کیا کیا کھایا تھا؟ ٹھنڈے میں غسل کیا تھا کیا؟ کیلا کھایا تھا یا امرود اور سیب وغیرہ کوئی ٹھنڈی چیز اس برسات

کھائی تھی یا شبنم میں سو گئی تھیں ؟"

اُن کی جرح جاری تھی اور ہم دل ہی دل میں حیران کہ نہانا تو ... کیلئے ضروری ہے اور پھول صحت بخش چیز ہوتے ہیں۔ ان کا بھلا ... سے کیا تعلق، پھر بھی ابتدائی جرم کے طور پر سر ہلانا پڑا اور انھوں ... جوابی گولہ باری کرتے ہوئے کونین مکسچر سے بھی تلخ لکچر پلانا شروع ... دیا۔

"جب خدا کا قہر تھا تو بھی اور کردی گرمیوں میں نہانے کے بعد تھوڑے ... پل کھائے بغیر رہنا تو کیا گرمی دانے نکلتے۔" دوسرے صاحب کی ... حکمت جو پھڑکی تو پوچھ ہی تو بیٹھے۔

"کس کا علاج ہو رہا ہے ؟"

"ڈاکٹر احمد کا !"

"اور یہ بھی کوئی ڈاکٹروں میں ڈاکٹر ہے۔ حکیم اسد اللہ خاں کو ... کھل نہ دکھایا۔ حکیم نہیں، اسے مسیحا جانو مُردہ زندہ کر دیتا ہے"

صبح سے اب تک ریشر ہومیوپیتھک، ایلوپیتھک، آیورویدک ... بائیوکیمک، نیچر کیور، طب اور ماہر پروفیسر سے لیکر تکیہ والے شاہ صاحب ... تک کی سو معالجوں کو بگھتا چکے تھے اور نہ کھاتا اگر ہم ان میں سے کسی ... کا علاج بھی کرنا چاہتے تو ان کے انتخاب میں کم سے کم ایک ہفتہ ضرور ... لگ جاتا جبکہ بخار زیادہ سے زیادہ دو تین دن میں رفو چکر ہو جاتا۔

ایک صاحب ٹمپریچر، نبض اور اجابت وغیرہ کی تفصیل معلوم ... کرنے کے بعد بڑے مطمئن ہونے کے انداز میں بولے "کوئی بات نہیں۔ شام تک ... اتر جائے گا۔ مجھ پر برس پڑیں۔ ان کا پارہ ایکدم چڑھ گیا۔ "مجھے ... کہ ہمارا بخار اُن کے چڑھ گیا جو اس صورت میں۔

"بس بس یہی سب باتیں بچے پن کی ہیں۔ ... اور بیماری ... کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔ تم کہتی ہو کہ بخار صرف ۹۹ ڈگری ہے اور میں ... کہتی ہوں کہ سانپ کا بچہ بھی بڑا ہو تا ہے اس سے بچنے کے لئے لوٹ کا ... ضروری ہے۔"

دوسری نے مشورہ دیا۔"

"کچھ نہیں پہلے اکسرے کراؤ اکسرے !"

غرضیکہ رات کو جب سونے کی کوشش کی تو نیند اس لئے غائب ... تھی کہ ہم بخار سے ... تھے یا یہ کہ "موت کا ایک دن معین ہے۔" ... بلکہ اس لئے کہ معمولی بیماری کے خوفناک پہلوؤں نے ہمیں اپنی لپیٹ میں ... لے لیا۔ رات بھر اٹھ اٹھ کر کبھی تھرمامیٹر کا معائنہ کرتے، کبھی ٹمپریچر چیک ... کبھی بلغم کی کمی و بیشی اور نوعیت پر غور کرتے۔ رات تو کٹ ہی گئی مگر ... ہم اس کشمکش میں مبتلا رہے کہ ہمیں ضرور کچھ خطرناک بیماریاں لاحق ہو ... چکی ہیں اور ہمارا یہ شک اس وقت تک دور نہ ہوا جب تک ہم اپنی ... ایک سہیلی کے پاس نہ چلے گئے اور معالجت کے مشورے دینے والوں ... سے محفوظ ہوتے ہی نہ صرف ہم اچھے بھلے ہو گئے بلکہ ہمیشہ کے لئے ... بخار پڑنے سے توبہ کر لی۔

موسمی بخار سے تو ہم بچا چھڑا چکے ہیں لیکن بے موسم کے مشوروں ... سے اٹھتے بیٹھتے ہوتے، جاگتے، چلتے پھرتے معالجت کے مشوروں ... سے نجات پانا ابھی باقی ہے۔ ■■

شاذ تمکنت کی نظموں اور غزلوں کا پہلا مجموعہ

تراشیدہ !

"شاذ تمکنت ہندوستان کے جواں سال و جوان فکر شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں اور غزلیں مشہور رسالوں میں شائع ہو کر ملک کے اہل نظر کو متوجہ کر چکی ہیں۔ ان کی شاعری کا خاص جوہر خلوص، طبیعت، جدت فکر ہے۔ ان کے بیان میں تازگی اور لہجے میں گھلاوٹ ہے۔ ان کے شعر لمسیات اور حسیات کی کیفیتوں سے مملو ہیں۔ رنگ و صوت کا یہ خوشگوار امتزاج انہیں اپنے ہمعصروں میں ممتاز و منفرد کرتا ہے۔ ان کی لفظیات کی مہک دور سے پہچانی جا سکتی ہے۔ ابھی ان کی عمر بہت کم ہے لیکن ان کی شاعری کے آثار ہونہار ہیں۔ مجھے یقین ہے آگے چل کر جو ادبی سرمایہ وہ ہمیں دینگے وہ ناقابل فراموش ہوگا۔ ان کا اب تک کا کلام بھی نہایت بیش قیمت ہے۔"

(فراق گورکھپوری)

جولائی ۱۹۶۶ء کے آخر تک منظر عام پر آرہا ہے۔ تفصیلات کیلئے ذیل سے ربط قائم کیجئے۔

نیشنل بکڈپو ۔ چار کمان ۔ حیدرآباد

ظفر حمیدی

خمیر سے ضمیر تک

(۱)

اے رفیقو، غمگسارو، دوستو
تم کسی جرّاح سے اتنا کہو
ہاتھ میرا کاٹ ڈالے، ورنہ یہ
کینسر کا زہر سارے جسم میں
پھیل جائے گا بسرعت ایک دن
اور مرض ہو جائے گا یہ لاعلاج
حرج کیا ہے ہاتھ اگر جاتا رہے
آج تک جو کچھ بھی ہاتھوں نے لکھا
بہرہ ور کب اس سے کوئی ہو سکا
کاغذی تخلیق کا تو وہ بنا
داستاں، در داستاں، در داستاں!

(۲)

ہمدمو، لاؤ ابھی جرّاح کو
پاؤں میرا قطع کرنے کے لئے
کینسر کا زہر ورنہ جسم میں
کچھ دنوں میں منتشر ہو جائے گا
فرق کیا پڑتا ہے اگر کٹ جائے پاؤں
چلتے چلتے تھک چکا ہے یوں بھی یہ
ایسی راہوں میں جہاں منزل نہیں
ثبت کچھ نقشِ قدم بکھرے ہوئے
یا غبارِ رہگذر اڑتا ہوا
آسماں، در آسماں، در آسماں!

(۳)

ساتھیو، جرّاح کو دو مشورہ
وہ تراشے جلد یہ میری زباں
کینسر کا زہر ورنہ پھیل کر
میرے ہر اک عضو میں بس جائے گا
کیا ہوا کٹ جائے گر میری زباں
تعلق کے عناصر تو ہیں
لحن دائودی خدا بھی
طور پر موسیٰ کو عشق آ ہی گیا
طائرِ سدرہ کی الہامی ندا
گنبدِ افلاک میں گونجی ہوئی
تھی مری آواز ہی کی بازگشت
چیستاں، در چیستاں، در چیستاں!

(۴)

محسنو، جرّاح سے کہہ دو ذرا
میری آنکھوں کو نکالے آ کے وہ
کینسر کا زہر ورنہ پھیل کر
مار ڈالے گا مجھے اب جلد ہی
میری آنکھوں کی بصارت بے فضول
جب بصیرت کا معمہ حل نہیں
دُور بیں سے دیکھنے کے بعد بھی
خوردبیں میں دیکھنے کے باوجود
ہے حقیقت آنکھ سے اوجھل کہیں
لامکاں، در لامکاں، در لامکاں!

(۵)

صاحبو جرّاح سے جا کر کہو
چھیل کر وہ پھینک دے میرا دماغ
کینسر کا زہر شاید پھیل کر
جان میری لے ہی لے گا ایک دن
کیا ہوا کھا جائے گر یہ دماغ
کارزارِ خیر و شر ہے جو ہنوز
جس پہ سایہ ہے ابھی اوہام کا
ٹمٹماتی ہے جہاں شمعِ خرد
خواب کا طوفان اٹھتا ہے جہاں
یاد کی پرچھائیاں جس میں مکیں
جن کی تہ میں منجمد سہما ہوا
پر بریدہ طائرِ تحت الشعور
آشیاں، در آشیاں، در آشیاں!

(۶)

مولیسو، جرّاح سے لیکن کہو
میرے دل کے درد کو چھیڑے نہ وہ
کینسر کا زہر اس دل میں نہیں
ظلمتِ سکرات اس دل میں نہیں
موج زن ہے اس میں خونِ آبِ حیات
بج رہا ہے اس میں سازِ ممکنات
ضو فگن ہے اس میں قندیلِ ضمیر
رُوکشِ پروردگارِ کائنات
کہکشاں، در کہکشاں در کہکشاں!

مشتاق علی شاہد

درد بھری چیخ

"تم پردیسی ہو۔"

"تو کیا ہوا؟"

"پردیسیوں سے پیار کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔"

"میں ویسا نہیں!"

"سب یہی کہتے ہوں گے!"

"تو پھر تم مجھ سے اب نہیں بولو گی؟"

"میں نے یہ کب کہا؟!"

تورالائی کا پہاڑی نالہ جو بیچ پر چھوٹے تو چھوٹی سی ندی کہلانے کا مستحق ہے کہیں کہیں پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر پانی کے چھینٹے اڑاتا ہوا بھی رفتار سے بہہ رہا تھا۔ برسات کے موسم میں اس طغیانی دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ برسات کے علاوہ عام دنوں میں اس کی رفتار سست ہی رہتی ہے۔ نالے کا پاٹ کچھ زیادہ چوڑا نہ تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ دوسرے کنارے کی چیزیں صاف دکھائی نہ دیں اس لئے سلطان محمد نے اپنا سبز رنگ کا چارخانے کا کپڑا جو سلطانی مرد اور عورتیں یکساں طور پر استعمال کرتے ہیں، دھو کر پھیلا دیا تھا۔ ایک، دو یا بھی کچھا اس محمد کی کمر کے گرد لپٹا ہوا تھا اور اب وہ اپنے کالے کلوٹے بچے کو نہلانے میں مصروف تھی۔ ہم دونوں، میں اور رومالی ہر شام ہرن پور روڈ کے اس پل کے نیچے آ بیٹھتے تھے جس کے نیچے سے ہو کر یہ نالہ گذرتا تھا۔

"تم بزدل ہو!"

"ہوں!"

"تم مکر گئے ہو!"

"نہیں — اب نہیں!"

"کیوں؟"

"اب — تم جو ساتھ ہو!"

(رومالی کی آنکھوں میں یقین کی شمعیں جل اٹھیں)

سلطان محمد نے بچے کو نہلا کر دوبارہ ریت پر کیلنے کو چھوڑ دیا تھا۔

اب وہ خود نہا رہی تھی۔ پانی اس کی کمر تک تھا اور وہ اپنے لمبے لمبے بال رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی۔ گرمی کا موسم جون کا مہینہ آگ برسا کر اب ڈوب چلا تھا لیکن مغرب میں اب بھی سرخ دھبے باقی تھے۔ بلیک سلطانی کی گھٹاؤں سے لدا ہوا ایک بھاری بھرکم ٹرک پل کے اوپر سے گڑگڑاتا ہوا گذر گیا۔

"تم نے نرس کی ٹریننگ کہاں لی تھی؟"

"ولی میں — کیوں؟"

"یوں ہی پوچھ لیا تھا — کوئی خاص وجہ نہیں!"

"مجھ کو ان باتوں کو یہ بتاؤ تم نے آخر کیا سوچا۔؟"

وقفہ — . . . .

"بولو نا، کیا سوچا ہے تم نے۔؟"

"کس کے بارے میں۔؟"

"میرے لئے — اپنے لئے — اور . . . . .

(وہ چپ ہو گئی — اس کا سر جھک گیا۔)

شام کا دھندلکا کچھ بڑھ چلا تھا۔ پتہ نہیں کیوں، تورالائی کا نالہ آج کچھ مضطرب سا نظر آتا ہوا لگ رہا تھا۔ جیسے دھم کے اندھیرے

سائیں پُرتراہا ہو ـــــ اور سائے کسی کی نارائنگی اور خفگی سے بے نیاز پھیلتے ہی جاتے تھے۔ رومالی نے اپنی زلفیں کھول کر اپنے شانوں پر بکھیر لیں ـــ سنتال عورت پیلی پیلی سی مٹی کو صابن کی طرح اپنے سر اور بالوں میں رگڑ رہی تھی۔

"تم نے جواب نہیں دیا ـ"

"تین چار ماہ ٹھہر جاؤ۔ پھر میں ایک لمبی چھٹی لونگا اور تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ اپنی ماں کے پاس۔ پھر دیکھنا وہ کتنا خوش ہوگی۔ تو وہ تمہیں نرس کی نوکری بھی نہیں کرنے دے گی۔ بھلا اس کا بیٹا ڈاکٹر ہو اس کی بہو کو نوکری کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے!"

(میں نے دیکھا رومالی رو رہی تھی!)

نالے کے اس پار سنتال عورت اپنے بال خشک کر لینے کے بعد اب اپنے بچے کو نہلا کر واپس جا رہی تھی۔ ابھی اندھیارا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ میں نے مشن اسپتال کی اسٹیشن ویگن کو جو مریضوں کیلئے ایمبولنس اور مردے لے جیپ کا کام کرتی تھی، پل کے ایک کنارے کھڑا کر دیا تھا۔ پاس پڑوس کے سارے گاؤں والے جو سب کے سب سنتالی تھے، میری بڑی عزت کرتے تھے۔ اور رومالی کو تو دیوی سمجھتے تھے۔ رومالی سے میرے میل جول اور تعلقات پر انگلیوں نے کبھی ایسی کوئی بات ظاہر نہیں کی تھی جس سے یہ شبہ ہوتا کہ ہم دونوں کے تعلقات یا میل جول پر انھیں کوئی اعتراض ہو۔ ایک بار جب انکوں نے "لدھنا پوجا" کا تہوار منایا تو میری اور رومالی کی خوب دعوت کی تھی۔ اور کئی حد مرغ جسے یہ لوگ مسیم کہتے ہیں تحفتاً پیش کئے تھے۔

"تم رونے کیوں لگیں ـ؟"

(رومالی خاموش ہو گئی ـــ اس نے اپنا گھونسلہ نیچے ڈالے)

"اچھا سنو ـــ ایک گیت گاؤ، وہی گیت ـــ ـــ ـــ

جب تم نے مجھے پہلی بار بلا کر سنایا تھا!"

"اس گیت میں محبت کی دعوت دی گئی ہے!"

"تو کیا ہوا ـــ تم وہی گیت گاؤ!"

"نہیں ـــ اب میں کوئی دعوت دینا نہیں چاہتی!"

(رومالی کی آواز میں بے پناہ کرب تھا!)

پڑیا کا ایک غول نالے کے اوپر سے شور مچاتا ہوا گذر گیا۔ اندھیارا اب اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ اپنی اپنی جگہ ہم دونوں ہی شاید کچھ سوچ رہے تھے۔ جانے کیا۔؟ ـــ

پھر جانے کیوں اور کیسے رومالی خود ہی گانے لگی۔ وہ گیت نہیں جو اس نے مجھے پہلی دفعہ سنایا تھا۔ بلکہ ایک دوسرا گیت۔ جانے آج کہاں سے اتنا سوز اس کی آواز میں سمٹ آیا تھا۔ وہ گا رہی تھی ـــ اور میرا ذہن جیسے کچھ سوچنے کی ساری صلاحیتیں کھو تا جا رہا تھا۔ وہ گا رہی تھی ـــ اور میں بت بنا اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ گا رہی تھی ـــ اور ہواؤں میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ وہ گا رہی تھی۔ نوڈائی نالے کے بہتے ہوئے پانی کے تال پر ـــ آج تان پورا کے بغیر اس کی آواز ایک نیا جادو جگا رہی تھی ـــ جب وہ تان پورا پر گاتی تھی تو اس کی آواز کے قدم شاید تان پورا کے تاروں میں اُلجھ جاتے تھے۔ آج تان پورا کے بغیر اس کی آواز آزاد تھی۔ ایک دم آزاد ـــ چڑیوں کے اس غول کی طرح جو ابھی ابھی شور مچاتا ہوا گذر گیا تھا ـــ

"تم نے گانا کیوں بند کر دیا۔؟"

"گانا ختم ہو گیا ـ"

"اور گاؤ!"

"تھک گئی ہوں!"

"چلو پھر واپس چلیں!"

"تم مجھ سے شادی کب کرو گے؟"

(اچانک جیسے مجھے کسی نے آئی۔ اے۔ ایس کے ہونے والے اسٹڈی روم میں ڈھکیل دیا)

"ایسی جلدی بھی کیا ہے؟" (میں سنبھل چکا تھا)

(رومالی پھر اداس ہو گئی!)

آپریشن روم کا دروازہ بند کیا جا چکا تھا۔ آپریشن ٹیبل پر ایک حاملہ سنتال عورت لیٹی ہوئی تھی۔ پورے کمرے میں ایتھر کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ رومالی آپریشن کرنے کے لوازمات پر کھولتے ہوئے پانی میں دھو رہی تھی۔ سنتال پرگنہ کے اس چھوٹے سے گاؤں میں یہ چھوٹا سا اسپتال نعمت تھا۔ اور جب سے اس گاؤں میں بجلی آگئی تھی مجھے بھی بڑی سہولت ہو گئی تھی۔ میں نے آپریشن روم میں بجلی کے طاقتور بلب، ہسپتال کے دیگر کمروں میں پنکھے اور ہیٹر کا خاص انتظام کروا لیا تھا۔

"بڑی والی قینچی ـ"

"یہ لو ـ"

"چھوٹی چمٹی"

"تمھارے ہاتھ ہی میں تو ہے!"

"اوہ۔ ہاں!" (آپریشن جاری تھا۔)

"آپریشن کر لینے کے بعد کیا آپ بس میں کچھ دیر کے لئے رک سکتے ہو؟ مجھے تم سے کچھ بہت ضروری باتیں کرنی ہیں!"

(روتمالی نے میرے کان کے پاس دھیرے سے کہا)

"نرس ۔۔۔ تم دھوبی پر ہو!" (میرے اندر کا فرض شناس ڈاکٹر چیخ پڑا۔)

"جی! ۔۔۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ یہ چھری لیجئے!"

(روتمالی کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے!)

توڑائی کا نالہ اپنی اگلی دھیمی رفتار سے بہہ رہا تھا۔ نالے کے اس پار آج کوئی نہیں تھا۔ سورج کب کا غروب ہو چکا تھا۔ ہوائیں آج خونریز چل رہی تھیں۔ روتمالی بار بار اپنی زلفوں کو اپنے چہرے پر بکھرنے سے روک رہی تھی۔ لیکن زلفوں نے بھی شاید ہواؤں سے سازش کر لی تھی۔ آپریشن روم میں روتمالی کو ڈانٹنے کے بعد سے اب تک ہم دونوں زیادہ تر خاموش رہے تھے۔ لیکن آج کی خاموشی نے عجیب گمبھیر رعب دھار لیا تھا ۔۔۔ میں ہمیشہ ایسی خاموشی سے گھبراتا ہوں۔ آج بھی میرا دل گھبرا رہا تھا۔

"کیا تم اس ماہ یا اگلے ماہ تک مجھے اپنے گھر نہیں لے جاؤ گے؟"

"پہلے تمھاری تو منظوری ہو لے!"

"لیکن تم نے تو ابھی تک اس کے لئے درخواست بھی نہیں دی ہے؟"

"تو دے دوں گا ۔۔۔؟"

"کب ۔۔۔؟"

"آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" (وہیں جھلا گیا)

"جلدی ہے! ۔۔۔ تمھیں نہ ہو گی، پر مجھے تو ہے!!"

میں حیرت سے روتمالی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور وہ میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے تھامے ہوئے عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

توڑائی کے نالے کے قریب آج عجیب سی اداسی اور گھٹن کا احساس ہو رہا ہے! سورج ابھی کچھ دیر پہلے غروب ہو چکا ہے لیکن ریت ابھی گرم ہے۔ توڑائی کا یہ پہاڑی نالہ آج بھی دھیمی رفتار سے بہہ رہا ہے! نالے کے اس پار شاید کوئی مویشی مر گیا ہے جس کی سڑی ہوئی لاش کی بو کبھی کبھی ہوا کے ساتھ آ جاتی ہے تو جی متلانے لگتا ہے۔ پر جانے کیوں میرا جی یہاں سے اٹھنے کو نہیں چاہتا۔ ۔۔۔ آج تو میرے قریب روتمالی بھی نہیں۔ اور نہ اس کی مدھر بھری رسیلی آواز ۔۔۔ جس کا نشہ میرے وجود پر چھا جاتا تھا۔ وہ تو پچھلے سال ہی اسی پہاڑی نالے میں ڈوب کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہو چکی ہے۔ وہ برسات کا موسم تھا۔ اور اس نالے میں غضب کا بہاؤ تھا۔ برسات کا پانی اتنا بڑھ گیا تھا کہ پل کے پائے بھی ڈوب گئے تھے۔ کہتے ہیں جب برسات کا پانی اس نالے سے ہو کر بہتا تھا تو اس نالے کی چیخ دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ روتمالی نے اس میں کود کر جان دی ہو گی تو اس کی درد بھری چیخ کیوں نے سنی ہو گی ۔۔۔؟!

●●

کلکتہ: اک رباب

کلکتہ: اک رباب جیسی نظموں کی ہمارے یہاں کمی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اردو کیلئے سیدہ حرمت الاکرام کی یہ نظم مشعلِ راہ ثابت ہو گی۔ اور رہنمائی کا فرض انجام دے گی۔

ڈاکٹر اختر اورینوی

سیدہ حرمت الاکرام کی طویل نظم "کلکتہ: اک رباب" جس میں کلکتہ کے سماجی، تہذیبی اور تاریخی حالات کی عکاسی انتہائی حسن کاری کے ساتھ کی گئی ہے کتابی شکل میں شائع ہو گئی۔ یہ نظم اردو کے شعری ادب بالخصوص شہروں سے متعلق نظموں کی فہرست میں ایک بیش بہا مفید اور تیکھا اضافہ ہے۔

نفیس کتابت "اعلیٰ طباعت، دبیز گرد پوش، مجلد معہ سرنگا گرد پوش، شاعر کی تصویر بھی شاملِ کتاب ہے۔

قیمت :۔ ایک روپیہ پچاس پیسے

ملنے کے پتے: سیدہ حرمت الاکرام ۔ رام باغ ۔ مرزا پور (یوپی انڈیا) دفتر ماہنامہ "شبخون" ۳۱۴، رانی منڈی الٰہ آباد (یوپی انڈیا)

فیضؔ صدیقی سمستی پوری

رات

میں ہوں تاریکیوں کا گہوارہ

اپنے دامن میں ہوں چھپائے ہوئے
کتنے خلوت کدوں کے "رازِ نہاں"
اپنے سینے میں ہوں دبائے ہوئے
کتنے زخمی دلوں کی آہ و فغاں

کتنی محبوب کی جوانیوں کی پکار
کتنی دوشیزہ آرزؤں کے غم
کتنے لٹتے ہوئے سہاگوں کا سوز
کتنی مجبور حسرتوں کے چراغ

کتنے بہکے ہوئے تقوشِ قدم
کتنے جلتے ہوئے لبوں کی شراب
کرب سہتی ہوئی نگاہوں کا
درد پلتی ہوئی اُمیدوں کا

کتنی ماؤں کی آنکھ کے آنسو
بھائیوں کے ضمیر کی آواز
کتنے باپوں کی چیختی رُوحیں
کتنی معصوم دھڑکنوں کا راز
اپنے دامن میں ہوں چھپائے ہوئے

میں ہوں تاریکیوں کا گہوارہ

عتیق احمد عتیقؔ

غزل

لازم مجھی پہ سارے زمانے کا پیار بھی
میرے لئے ہی سلسلۂ لطف و دار بھی
جب سے تمہارے غم کو گلے سے لگا لیا
دل پر گراں نہیں ہے غمِ روزگار بھی
اتنی حسین کب تھی زمانے کی کائنات
ہے اس میں اپنے حسنِ نظر کا وقار بھی
نیرنگیٔ لطافتِ گلزار ہی نہیں
ہے خارِ رخ سے آتشِ گل کا نکھار بھی
اس دورِ ارتقا میں کچھ ایسے بھی لوگ ہیں
جن پر پڑی نہ فکر و نظر کی پھوار بھی
زیرِ قدم ہوں سارے زمانے کی راحتیں
دل سے کرو تو رشتۂ غم اُستوار بھی
ہاں ہاں بفیضِ امن ہی بزمِ حیات میں
پھیلی رہی ہے تیرگیٔ انتشار بھی
چھیڑا جو میں نے بربطِ احساس تو عتیقؔ
نغموں کی لَے سے ٹوٹ گئے دل کے تار بھی

تھا کہ وہ ذوقِ سلیم کے حامل بھی ہیں۔ نیاز صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"میں ابرار ہاشمی سے ملنا چاہتا ہوں"

"یہیں اُن کو بلوا لیا جائے گا۔" موں صاحب نے جواب دیا۔

"میں اپنی وضع کے مطابق اُن کے یہاں خود جاؤں گا۔"

نیاز صاحب ابرار ہاشمی کے یہاں چلے گئے تھے، اور میں اُس ملاقات کا عجیب و غریب تاثر اپنے ذہن میں لئے ہوئے گھر چلا آیا یہ بات موضوع سے ذرا ہٹ کر ہے لیکن اِس کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ میں دستوں، جماعت کا امتحان دے چکا تھا اور چھٹیوں میں نے ان کی کتابیں نگارستان اور حالستان بھی پڑھ لی تھیں۔ اور اس عرصہ میں نگار کے جو پرچے نہیں پڑھ سکا تھا۔ انہیں بھی پڑھ رہا تھا میرے ایک بزرگ عزیز مطالعۂ نیاز سے مجھے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اور مجھے نگار کو محویت سے پڑھتے دیکھ کر سختی سے منع بھی کرتے تھے نہ نیاز صاحب کے خاصے نکتہ چیں تھے۔ انہیں لامذہب کہتے تھے۔ لیکن یہ انہیں بھی نگار کا بے چینی سے انتظار کرتے اور اسے بشوق پڑھتے دیکھا ہے۔ ایک دن وہ نگار کے تازہ شمارے کے پڑھنے میں مستغرق تھے، مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہہ دیا۔

"قبلہ! اس گمراہ کن جریدے کو آپ خود پڑھتے ہیں اور مجھے منع کرتے ہیں۔"

"میاں تم میں ابھی پختگی نہیں آئی، میں تمہیں اس خوبصورت فتنے سے دور رکھنا چاہتا ہوں، اس لئے منع کرتا ہوں۔ نیاز لکھتا خوب ہے، اس پیرانہ سالی میں بھی وہ مجھے متوجہ کر لیتا ہے۔"

نگار کی بات چلی تو ایک بات اور یاد آ گئی۔ نیاز صاحب کو نگار بہت عزیز تھا، وہ اعلیٰ معیار کے حامل اس پرچے کو اب تک بلا ناغہ نکالتے رہے اور اب کہ ادارت فرمان فتحپوری کے ہاتھوں میں آ گئی ہے تو بھی اس کی زندگی کی امید باقی ہے، وہ جب تک جیتے رہے اپنے جریدے کے بلند معیار کو قائم رکھا، اس سلسلہ میں وہ صرف کام دیکھتے تھے، نہ کسی کی سفارش سنتے اور نہ ہی کسی کے دباؤ میں آتے تھے۔ میرے ایک نیک دل اور مخلص دوست کے کئی، مقلے "نگار" میں چھپ چکے تھے اور وہ مضامین معیاری بھی تھے۔ میں نے اُن مضامین کو پڑھا بہت بشوق پڑھا تھا۔ اور جب میں اُن فاضل مقالہ نویس سے ملا تو اُن کی اس کامیابی پر تہنیت پیش کی، وہ صاف گو اور سچے ادیب ہیں کہنے لگے "نیاز صاحب کے التفات کو دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ نگار کی توسیع اشاعت میں اُن کا ہاتھ بٹاؤں، اس سلسلہ میں مجھے کامیابی بھی ہوئی۔ اور میں نے نگار کے دس خریدار بنا کے بھیجے لیکن نیاز صاحب اس بات سے خوش ہونے کے بجائے کبیدہ خاطر ہوئے اور اب اُن کا پہلے سا التفات باقی نہیں رہا۔

"نیاز صاحب کی اُن ادیب کی طرف سے بے نیازی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ اور میں اُن کی شعری اور نثری تخلیقات نگار میں دیکھنے لگا۔ پارۂ ادب ہو یا اشعار، انسان میں زندگی ہے تو وہ رجوع کر لیتے ہیں۔

اب میں جو واقعہ لکھنے جا رہا ہوں، اُسے میں نے نیاز صاحب کے ایک قریبی دوست سے سنا تھا اور کافی متاثر ہوا تھا اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کو اپنے کام سے کتنی دلچسپی تھی۔ نیاز صاحب کو اپنی محبوب بیٹی شوکت کے عین عالمِ شباب میں دُنیا سے اٹھ جانے سے کافی تکلیف پہنچی تھی۔ اور اس اندوہناک حادثے سے متاثر ہو کر اُنھوں نے ایک مؤثر مضمون بھی سپردِ قلم کیا تھا۔ جس کی یادگار میں نگار کے اذہان سے محو نہیں ہوئی ہوگی۔ یہ المناک واقعہ کافی دنوں تک نیاز صاحب کے دل و دماغ پر چھایا رہا، لیکن جیسے ہی انہیں خیال آیا کہ اب یہ سانحہ اُن کی ادبی مصروفیات میں رکاوٹ بن رہا ہے تو وہ اسے بھول جانے کی کوشش کرنے لگے۔ اور اپنے مشغلۂ نوشت و خواند میں اسی ذوق و شوق سے لگ گئے۔ اُن کے یہاں جو ہستر انی آتی تھی اُسے نیاز صاحب کی اس تبدیلی کا علم نہیں تھا، اُس نے آتے ہی ہمدردانہ طور پر مرنے والی کا تذکرہ شروع کیا تو نیاز صاحب نے اُسے ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔

"کب تک چلے گی یہ بات ختم کرو اس تذکرے کو۔"

نومبر ۵۶ء میں ماموں صاحب کان پور منتقل ہو گئے تھے۔ وہاں نیاز صاحب کئی بار تشریف لے گئے، وہ کسی نہ کسی کام سے آتے تھے انہیں

(بقیہ صفحہ ۵۴ پر دیکھئے)

بدیع الزماں خاور

ستم

مری تمنّا ہے مُدّتوں سے
کہ موسمِ گُل کے چند لمحے
گزاروں لاہور کے چمن میں

مری تمنّا ہے مُدّتوں سے
کہ محفلِ میر کے ترانے
سُناؤں وارث کی انجمن میں

مری تمنّا ہے مُدّتوں سے
کہ اک مسافر کی حیثیت سے
میں جاؤں اقبال کے وطن میں

مگر یہ میری حسیں تمنّا
جو میرے سینے میں پل رہی ہے
جو میرے دل میں مچل رہی ہے

نہیں ہے محفوظ، اُس ستم سے
جو سرحدیں مجھ پہ ڈھا رہی ہیں

شاہین الٰہ آبادی

غزل

ایسے بھی ہوئی رات بسر وقت سے پہلے
خم جیسے ہو مُفلس کی کمر وقت سے پہلے

اُس صبح کے بھولے کا بھی کچھ نام تو رکھ دو
آجاتا ہے جو لوٹ کے گھر وقت سے پہلے

کرنی ہے ہمیں مصلحتاً آج فروزاں
قندیلِ سرِ راہگزر وقت سے پہلے

کیا بات ہے، کیوں اہلِ نظر اب نہیں دیتے
دادِ نگہِ آئینہ گر وقت سے پہلے

وہ خواب جو ہیں ضامنِ بیداریٔ انساں
ڈر ہے نہ کہیں جائیں بکھر وقت سے پہلے

اے رختِ سفر باندھنے والو یہ ضروری
لو جائزۂ عزمِ سفر وقت سے پہلے

ملّاح ہوں کیسے بھی منائیں گے نہ لوگ
اے بادِ سحر، جشنِ سحر وقت سے پہلے

جز مرگ بھی شاہینؔ ہے علاجِ غمِ ہستی
کھل جائیں جو اسرارِ نظر وقت سے پہلے

عظیم اقبال

نظر نظر کی بات

اول میاں فخرالدین مولوی بن گئے۔

اُن کی دیرینہ تمنا تھی کہ پڑھ لکھ کر قوم کی کچھ خدمت کر سکیں۔ عالم، فاضل کی سند ملتے ہی محمود نگر مڈل اسکول میں انھیں ملازمت مل گئی۔ پھر تو ایسا ہوا کہ اُن کی پڑھائی کی تعریف میں محمود نگر مڈل اسکول کی دیواریں تک گنگنانے لگیں۔ لڑکوں نے اُن کی تعریف کی۔ مدرسوں نے آنکھیں سرایا۔ اور صدر مدرس نے اُن کی پیٹھ ٹھونکی۔ مولوی فخرالدین پھولے نہیں سماتے تھے۔ انھوں نے اور بھی محنت کی۔ محنت اور ایمانداری کو تعریف کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر سوچے محنت کے محنت کو زنگ لگ جاتی ہے اور ایمانداری کے پیکر میں گھن لگ جاتا ہے۔

مولوی فخرالدین علامہ اقبال کے رسیا تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ زندگی میں اگر انھوں نے کچھ سیکھا ہے تو وہ اقبال کا فلسفہ ہے۔ صوم و صلوٰۃ بات ہے پڑھائی لکھائی کا سلسلہ ہو، یا دنیاوی معاملات مولوی صاحب اقبال کا حوالہ ضرور دیتے۔ اُن کی زندگی بڑی پاک زندگی تھی۔ پڑھنا اور پڑھانا جن کا اوڑھنا بچھونا زندگی تھے۔ بہم کے وقت شاگردوں میں گھرے بیٹھے اور فرصت کے وقت کتابیں ہی اُن کا اور پڑھتا کچھ تھا۔ نہ کسی کا لینا نہ کسی کا دینا۔ ادھر اُدھر کی شکایت اور نہ ہی منت کا رونا۔ ملکی غیر ملکی سیاست اور نہ ہی دنیا جہاں کی بحرانی حالات کا تذکرہ۔ کسی بات سے انھیں دلچسپی نہ تھی۔ گھر کے اکیلے فوتے۔ جو رُوٹھ جاتا نے دے کر بس اکیلے دم تھے۔ لیکن کیلئے باپ دادا کے وقت کا ایک بوڑھا نوکر اُن کے ساتھ برسوں سے رہتا آیا تھا۔ مولوی صاحب اُسے بابا کہتے تھے۔

بابا کہتا تھا مولوی صاحب اُس کی گود میں کھیلے ہیں۔ جب بھی بابا کو موقع ملتا، مولوی صاحب کے بچپن کے کچھ دلچسپ واقعات سُنا کر وہ خوش ہوتا۔ بوڑھا ہونے کی وجہ سے اور سب باتیں تو اُس کے ذہن سے آہستہ آہستہ نکل ہی چکی تھیں لیکن ایک بات وہ مرتے دم تک نہیں بھول سکتا تھا۔ میاں فخرالدین جب ڈیڑھ سال کے تھے، بابا اُنھیں سینے سے لگا کر سویا تھا۔ اچانک جب گرم گرم سی کوئی سیال سی شے اس کے چہرے پر گری تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میاں فخرالدین بڑے خوش تھے۔ اُن کا جانگیہ بھیگا ہوا تھا۔ اور وہ ..... مولوی صاحب کو بچپن کی یہ بات سنکر بہت شرم آتی۔ انھیں شبہ ہونے لگتا کہ یاد حقیقت انھوں نے کبھی ایسی بدتمیزی کی تھی۔ بابا کو اور بہت ساری باتیں یاد تھیں کبھی کبھی جب وہ اگلے وقتوں کی یادوں سے مسحور ہوتا تو بڑا ہنستا۔ پھر اس کی آنکھیں بھر آتیں۔ فسادات کا سارا نقشہ اُس کی آنکھوں تلے اب بھی ناچ اُٹھتا۔

مولوی فخرالدین اُس وقت تھنی کی مہمان تھے۔ انھیں اپنے ماں باپ یا گھر کے کسی فرد کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ بابا کی نگاہیں ماضی کی اندھیریوں میں جہاں تک کچھ ڈھنڈلے دھندلے نقوش پا سکتی تھیں، اُن کا تعلق فخرالدین اور اُن کے گھر بار سے تھا۔ اُسے اپنے آقا میاں فخرالدین کی کرشمہ آرائیاں اب بھی بہت یاد آتی تھیں۔ میاں فخرالدین کی کلکتہ میں بہت بڑی دکان تھی۔ ہزاروں کا کاروبار تھا۔ کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ زندگی بڑے مزے میں گذرتی تھی۔ میاں فخرالدین نے جو کچھ مال و دولت پیدا کیا سب اپنی قوتِ بازو سے۔ کلکتہ کے فٹ پاتھ پر بہرحال لے گئے۔ مجھ ایسے ہزاروں ایک بڑے اسٹور کے مالک بن گئے تھے۔ کئی کئی نوکر چاکر رکھے گئے۔ دکان کیلئے اور گھر کے لئے بھی۔ میاں فخرالدین نے پھر تو اپنی خالہ کی ایک غریب صابرہ خاتون کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ دن کو دولت کی ریل پیل میں رات کو بستر پر سوتے اور گرمی رات کو تھک کر چور ہو کر جب اپنے مسترل پر پہنچتے تو ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی۔ عورت

کی باتیں سرد کے لیے کتنی سکون بردہ ہوتی ہیں۔!!

شادی کے بڑے نہال کے بعد معاؤں تعزیتوں اور گرد و کا اثر ہوا تھا۔ اور صابرہ خاتون کی گود میں فخرالدین نے آنکھ کھولی تھی۔ میاں فخرالدین کتنے خوش تھے۔ سوچتے تھے دنیا جہاں کی خوشی اُن کے دامن میں سمٹ کر آگئی ہے۔ فخرالدین کے مستقبل کیلئے انھوں نے کتنے منصوبے بنا ڈالے۔ ڈاکٹر فخرالدین۔ انجینیر فخرالدین۔ سیٹھ فخرالدین، نہیں نہیں۔ مسٹر فخرالدین۔ گورنر فخرالدین۔ کمشنر فخرالدین۔ نہیں یہ سب نہیں ــــ پروفیسر فخرالدین، بیرسٹر فخرالدین اور جانے کیا کچھ ــــ

بابا کہتا تھا فخرالدین اس وقت دو برس کے ہوں گے۔ کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ فخر منزل اور فخرالدین جنرل اسٹور کو بلوائیوں نے کباڑ خانے میں تبدیل کر دیا۔ فخرالدین اور صابرہ خاتون کو کس بیدردی سے ذبح کیا گیا تھا ــــ بابا کو جب کبھی وہ منظر یاد آتا وہ کانپ کانپ جاتا۔ بڑی مشکل سے فخرالدین کو گلے سے چمٹائے ہوئے وہ خونخوار درندوں کے چنگل سے بچا تھا۔

میاں فخرالدین عالم، فاضل بنکر اب مولوی فخرالدین بن گئے تھے فخر احمد اُن کے رشتہ کے چچا ہوتے تھے۔ یہ اُن کی مہربانیاں تھیں کہ کلکتہ کی فخر منزل اور فخرالدین جنرل اسٹور کو خستہ حالی ہی میں بیچ دیا گیا۔ فخر احمد زمانہ ساز آدمی تھے۔ دنیادار کم تھے اور خدا پرست زیادہ۔ فخرالدین کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ قصبے کے مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد فخرالدین کو ندوۃ العلوم میں داخل کرا دیا گیا۔ اور امتیازی شان سے امتحانات پاس کرنے کے بعد مولوی فخرالدین اب محمود نگر مڈل اسکول کے مدرس تھے۔

بابا اب بوڑھا ہو چلا تھا۔ لیکن اُس کی کمر میں ذرا سا خم بھی نہ تھا۔ اُسے پچھتر روپے سیر بھی کھانے پر ملتا۔ مولوی فخرالدین کا سارا کام کاج بابا ہی کرتا۔ مولوی صاحب کی اہلیت اور شخصیت کا پرچہ محمود نگر قصبے کے گھر گھر میں تھا۔ سب لوگ یہی کہتے ایسا قابل اور سید حا سادا لڑکا اب مشکل ہی سے ملے گا۔ فی زمانہ اور نئے زمانہ میں ہوش سنبھالنے کے باوجود مولوی فخرالدین اپنے علاوہ ہمیشہ دوسروں کیلئے سوچا کرتے۔ کبھی بھی بیٹھ کر اپنی بڑائی نہیں کرتے تھے۔ اُن سے کسی کو شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے یہاں تک ہو سکتا ہے ہر کسی کی خدمت کیلئے کمربستہ رہتے۔ اپنی قلیل آمدنی میں مکتوں نے بہتوں کا بھلا کیا۔

تنگ حال بازگوں کی آنکھوں نے ہمیشہ مدد کی۔ اپنے کسی کو کتاب

خرید دی۔ کل کسی کی فیس معاف کر دی۔ کبھی کسی کیلئے کپڑے سلوا دیئے۔ کبھی ... مولوی صاحب بڑے دل گردے کے آدمی تھے۔ انھوں نے ہمیشہ کم جیب پاجامہ اور کرتے میں کام چلایا۔ جاڑے کے دنوں میں بس ایک صدری آجاتی کہ بدن میں لپٹا ہوا ایک بنڈی کرتے کے اوپر چھا لیتے۔ گھر کی ضرورت بڑھ جاتی تو کھادی کا جاڑا بھی لے لیتے۔ ان کی ساری کائنات شاعری دوسروں کی بھلائی کے مقصد سے ہوتی۔ جو کچھ میسر وہ بچا سکتے تھے، اس کا مصرف دوسرے لوگ ہی کیا کرتے۔ دوسروں کی تکلیف سے انھیں دلی تکلیف ہوتی۔ اور دوسروں کو فائدہ پہنچا کر وہ بیحد خوش ہوتے۔ ان کی زندگی مثالی تھی۔ ان کا ایک مادر ش تھا کہ کبھی تو اب مولوی فخرالدین کم سے کم اس صدی کے آدمی تو نہیں۔ بڑا علم کر دار تھا اُن کا ــــ

مولوی صاحب کے جتنے شاگرد رہے تھے سب اُن پر جان چھڑکتے تھے۔ محمود نگر مڈل اسکول سے فارغ ہونے کے بعد بھی بابا ہمیشہ انھیں یاد رکھتے۔ اُن کے طور طریقے اُن کی زندگی کو ہمیشہ متاثر کرتے رہتے۔

مولوی صاحب کے ایک شاگرد عبداللہ صاحب رام پور سے تبدیل ہو کر محمود نگر آئے تو اُن کی ترقی ہو چکی تھی۔ وارنٹ سے پولس انسپکٹر بنے تھے۔ ہی عبداللہ کے چہرہ پر کچھ اور نکھار آگیا تھا۔ مولوی فخرالدین کو اُس دن کچھ عجیب سی خوشی کا اندازہ ہوا۔ ایک انسان جب ترقی کرتا ہے تو پوری نسل آگے بڑھتی ہے۔ یہی قوم ترقی کرتی ہے۔ مولوی صاحب بڑے نازاں ہوئے۔ فخر سے اُن کا سینہ پھول گیا۔

پہلے تو کئی دن تک مولوی صاحب نے انسپکٹر عبداللہ سے ملنے نہیں آئے گا۔ پھر وہ سوچے پولیس والے بڑے مشغول ہوتے ہیں۔ نہ جانے کیا پتہ پولیس انسپکٹر عبداللہ اور مولوی فخرالدین میں کتنا فرق ہو گیا ہے۔ ایک کو دوسرے کی کیا ضرورت ہے پھر دونوں کیوں ملنے لگے۔ مگر مولوی صاحب اپنے شاگرد رشید سے ملنے کیلئے بہت بیچین تھے۔ ایک دن اسکول سے چھٹی ملنے کے بعد انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ عبداللہ سے ضرور ملیں گے۔

دسمبر کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی شام کو مولوی صاحب نے اپنا کرتا پاجامہ زیب تن کیا۔ روئی کی بڑی سی رضائی اور کھادی کا جاڑا اوڑھ کر تھانہ کی طرف چل پڑے۔ انسپکٹر عبداللہ نے مولوی صاحب کو پہچاننے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ مشکل تو مولوی صاحب کو ہوئی۔ بیس برس کے عرصہ میں انسان کی شکل و شباہت کتنی بدل جاتی ہے۔

انسپکٹر عبداللہ نے مولوی فخرالدین کی جائے بیٹھک سے تواضع کی

دو اپنے چار دوست لڑکے لڑکیوں سے تعلیم کہلوایا۔ مولوی صاحب نے سب کو دعا دی۔ چلنے چلاتے مشاعرہ ختم ہو گیا۔ مغرب کی نماز انھوں نے انسپکٹر عبداللہ ہی کے یہاں ادا کی۔ رات کا آنچل بھیگتا جا رہا تھا اور اچھ پسند ہو چکی تھی۔

"مولوی صاحب کبھی کبھی ایا کیجیے۔ یہ سب آپ ہی کے بچے ہیں۔ انھیں ہی لکھائیے پڑھائیے۔" انسپکٹر عبداللہ نے کہا۔ پھر انھیں کچھ یاد آیا سردی کی شدت اور مولوی فخرالدین کے جسم پر برائے نام کپڑے۔ انسپکٹر عبداللہ خود اپنی طرف کھنچے چلے گئے۔ اس نے اپنے نوکر کو آواز دی۔

"بھولا، ارے بھولا۔ مالکن سے بولو کہ پچھلے برس میرے سبز رنگ کے جو کوٹ کے کالر کو چوہے نے کتر دیا تھا، اسے بکس سے نکال دیں۔"

بھولا کوٹ لے آیا۔

انسپکٹر عبداللہ نے اسے مولوی فخرالدین کو دیتے ہوئے کہا۔

"مولوی صاحب ایسے میں نے صرف تین سال استعمال کیا ہے۔ ذرا سا اس کا کالر مرمت کرا لیجیے گا تو کم سے کم سات آٹھ برس تک آپ کے کام آئے گا۔"

مولوی فخرالدین نے شاید زندگی میں اتنی شرمندگی اور بیچارگی محسوس نہیں کی تھی۔ ان کا ذہن کھول اٹھا۔ آخر اس عبداللہ کے بچے نے سمجھا کیا ہے۔ اپنا نوکر بھک منگا، بھکاری، محتاج، ــــ یہ ترن کا کوٹ مجھے دیتا ہے کیوں، کیوں ــ؟ مولوی فخرالدین ایسے تو نئی کوٹ بنوا سکتا تھا۔ یہ اترن کا کوٹ ــ یہ عبداللہ تو میرا بڑا ہی گستاخ شاگرد نکلا ــ بدتمیز کہیں کا۔

مشکل سے وہ خود پر قابو پا سکے۔

"مجھے کوٹ سے وحشت ہوتی ہے سردی سے مدافعت کیلئے بوجھ ہی کافی ہے۔" وہ اتنا ہی کہہ سکے۔

پھر وہ پلٹے اور جلد جلد قدم بڑھاتے ہوئے محمود نگر مڈل اسکول کی طرف بڑھنے لگے۔

انسپکٹر عبداللہ نے کوٹ اپنے کاندھے پر رکھا اور سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا

What a fool ــ چند کہیں کے

All Educated, All mannered

ہونہہ! کیا کہنے ان تعلیموں کے۔ بچے پڑھے ہیں یہ ہمارے مولوی!

"گاہے کو سردی میں آپ کھڑے ہیں انسپکٹر صاحب، راسو چکیدہ

نے انسپکٹر عبداللہ کو خیال کے تانے بانے سے باہر نکالا۔

"اوہ تم رامو۔ تمھیں سردی نہیں لگتی کیا ــ"

"گریبوں کے لئے سردی گرمی سب برابر ہے، سرکار ــ یہ چادر کافی ہے حضور ــ"

"نہیں نہیں۔ سردی بڑی زوردار ہے۔ تمھیں رات بھر جاگنا بھی تو پڑتا ہے۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔ لو یہ کوٹ پہن لو۔"

"دھنیہ سرکار، بھگوان آپ کو اور ترقی دے۔ آپ بڑا صاحب سے بھی بڑا صاحب بن جائیں۔ انسپکٹر صاحب کی جے۔"

انسپکٹر عبداللہ کے چہرہ پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رینگ گئی، وہ جلد قدموں سے وہ اپنے کوارٹر کی سیڑھی چڑھنے لگے۔ اب ان کا ذہن ہلکا ہو چکا تھا۔

●●

اقدامؔ کا نیا اظہار

چاندنی اساڑھ کی

راج نرائن رازؔ

پہلا شعری مجموعہ

عنقریب آپ کے ہاتھوں میں ہوگا

مدتِ خریداری ختم ہونے کی اطلاع

اس سیاہ حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری جولائی کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو گیا ہے آپ کی خدمت میں اگست ۱۹۶۰ء کا شمارہ وی۔ پی بھیجا جائے گا آپ سالانہ چندہ کی رقم مبلغ آٹھ روپے فی الفور منی آرڈر روانہ کر دیجئے۔ اگر تجدید خریداری منظور نہ ہو تو براہِ کرم ایک خط سے دفتر کو اطلاع دیتے تاکہ وی پی نہ بھیجا جائے۔ منیجر

نشاط پرویز

"مجھے پہچانتے ہو؟"

مجھے پہچانتے ہو؟ کون ہوں کیا نام ہے میرا
محبت میرا مذہب، زندگی پیغام ہے میرا

میں پھولوں کی ہنسی ہوں، نرم کلیوں کا تبسم ہوں
بہاروں کا فسانہ، چاند تاروں کا ترنم ہوں

میں کوئل کی صداؤں اور پپیہے کے ترانوں میں
مرا ہی ذکر ہے حسن و وفا کی داستانوں میں

کنھیا کی مدھر مرلی سے میرا پیار چھلکا ہے
میری آواز جب گونجی ہے دل رادھا کا دھڑکا ہے

میں رادھا کا تقدس اور سیتا کی نشانی ہوں
میں لچھمن کی محبت رام کی زندہ کہانی ہوں۔

میں مریم کی مقدس آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو
میں عیسیٰ کی ہوائے دامن تقدیس کی خوشبو

میں گوتم کے مہکتے خواب کی تعبیر ہوں جیسے
عرب کے کملی والے کی حسیں تنویر ہوں جیسے

بھجن میرا کبیر و سورداس و چشتی و خسرو کا دوہا ہوں
نانک کا نغمہ ہوں گرنتھ و بائبل میں، وید میں قرآں کے پاروں میں

میں مندر اور مسجد میں، کلیسا، گوردواروں میں
سنہری دھوپ ہیں اور شام کی ٹھنڈی فضاؤں میں

سمندر کے کنارے، بھور کی شیتل ہواؤں میں
مری آواز کی لہروں پہ یہ کشتی چلاتے ہیں

یہ محنت کش مچھیرے بھی تو میرے گیت گاتے ہیں
مری آواز ٹکراتی ہے نیلے آسمانوں سے

پلٹ جاتے ہیں نغمے کشتیوں کے بادبانوں سے
میں دیوالی کے دیپوں اور ہولی کی بہاروں میں

میں راتوں کی سجاوٹ اور صبحوں کے نظاروں میں
چھنکتی پائلوں میں، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ میں

مہکتی، جگمگاتی راکھیوں کی مسکراہٹ میں
میں سو جاتا ہوں اکثر ریت کے سندر گھروندوں میں

میں ہولی گڑیوں کے کھیلوں اور بچوں کے کھلونوں میں
چمکتی مانگ کا سیندور ہوں، شبھ کامنائیں ہوں

میں بہنوں کا غرور و ناز اور ماں کی دعائیں ہوں
مری آواز نغمہ بن کے آتی ہے مشینوں سے

مری تصویر روشن ہے عرق آگیں جبینوں سے
گھنے کنجوں سے اور کٹتی ہوئی فصلوں کے گیتوں سے

چمکتی تتلیوں، کھیتوں سے کھلیانوں تک، باغوں سے
ادب کی، علم کی، تہذیب کی شمعیں جلائی ہیں

یہ میں نے محفلیں تاج و اجنتا کی سجائی ہیں
فراق و خیض اور مخدوم و ساحر کا فسانہ ہوں

مجاز و جعفری، اعجاز و اختر کا ترانہ ہوں
فضا میں گونجتا ٹیگور کا شاداب نغمہ ہوں

سمن، بچن، نرالا اور سرن کی میں کویتا ہوں
تلک اور گھوکھلے کی جانفشانی کی کہانی ہوں

میں نہرو کی امانت اور باپو کی نشانی ہوں

مجھے یہ وقت کے شعلے بھلا کیسے جلائیں گے
یہ اپنی آگ میں اک روز خود ہی ڈوب جائیں گے

زبان اور ادب کے مسائل

آلِ احمد سرور

نظم کی زبان

زبان کا تصور سماج کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ فرد کی اپنی کوئی زبان نہیں ہوتی، وہ سماج سے ایک زبان سیکھتا ہے۔ تحریر کی اہمیت کے باوجود زبان کی بنیاد بول چال میں ہے۔ زبان سیکھ لی جائے تو یہ ایک عادت بن جاتی ہے۔ زبان میں طبقوں کا فرق بھی ملتا ہے، اس میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ بقول مارٹیو پالی کے جس میں زبان کی تبدیلی نہیں ہوتی، وہ مُردہ ہو جاتی ہے۔ یہ تبدیلی اصوات میں بھی ہوتی ہے۔ الفاظ میں بھی، قواعد میں بھی اور معنی کے رشتوں میں بھی۔

ہم زبان کے اس تصور کو ذہن میں رکھیں تو ادبی زبان کو اتنا مقدس نہیں سمجھا جائے گا۔ نہ اس کی بعض خوبیوں کی خاطر بول چال کی زبان سے اس کی بہت زیادہ دوری گوارا کی جا سکے گی۔ ظاہر ہے کہ ادبی زبان معیاری زبان ہے، یا الفاظ کی بہترین ترتیب کا دوسرا نام ہے۔ یہاں الفاظ سائنسی زبان کی طرح صرف معلومات کی گنجی نہیں، نہ بول چال کی زبان کی طرح محض کام چلاؤ۔ یہ الفاظ

کا اظہار تخلیقی ہے، یہ بھرپور تاثر دیتے ہیں، یہ ذہن کے دریچے کھولتے ہیں، فضا میں بے نام پُل بناتے ہیں اور زمان و مکاں کو سمیر کر لیتے ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ ان میں وہی بات آ جاتی ہے۔ جو اُن صاف شدہ چاندیوں میں ہوتی ہے جن کا حیات بخش جوہر کھینچ لیا گیا ہو۔ اگر ادبی زبان بول چال کی زبان سے دُور ہو جاتی ہے تو وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ دکھائی دے۔ اس کی مثال ان کاغذی پھولوں کی سی ہے جو آنکھوں کو تو بھلے معلوم ہوتے ہیں، مگر خوشبو نہیں دیتے۔ زبان کے گرد اگرد شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔

ایلیٹ نے شاعری کی تین آوازوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلی شاعر کی وہ آواز ہے جب وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ دوسری جب وہ ایک مجمع کو خطاب کرتا ہے۔ اور تیسری جب وہ کسی فرضی یا اصلی کردار کی زبان میں بولتا ہے۔ شاعر جب اپنے آپ باتیں کر رہا ہوتا ہے تو اگرچہ اس وقت بھی وہ یہی سماجی آلہ استعمال کرتا ہے مگر ایک طرح سے اس وقت وہ دنیا سے کچھ بے تعلق سا ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک غزل کی زبان اسی پہلی آواز کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہماری غزل چونکہ صرف دل کی واردات نہیں رہی، اس لئے اس کی زبان بھی صرف شاعر کے خود کلامی تک محدود نہیں رہی، بلکہ اس میں دوسری دونوں آوازوں کی لے بھی شامل ہو گئی ہے۔ یا اچھا ہی ہوا مگر غزل در اصل پہلی آواز کی ترجمانی ہے۔ اس لئے دوسری اور تیسری آوازوں کی پوری پوری نمائندگی نہیں کر سکتی۔ نظم کی زبان غزل کی زبان سے اس لئے مختلف ہونی چاہیئے کہ نظم کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس میں نثر کی تعمیری صلاحیت سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ اس میں اشارے کے بجائے صراحت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس میں شاعر کی دوسری اور تیسری آوازوں کی بھی گنجائش ہے اور پہلی آواز میں بھی اس طرح سنائی دے سکتی ہے کہ مختلف آوازیں مل کر ایک سنگیت بن جائیں جو مسرت اور بصیرت کا خزانہ ہو۔

ایلیٹ ہی نے ایک جگہ کہا ہے کہ جس شاعر میں بلا کی ہوتی ہے، وہ براہِ راست زندگی کی طرف جاتا ہے، جو سُلجھے تقلیدی اور خوشہ چینی قسم کا ہوتا ہے، وہ ادب کی طرف۔ [illegible] کو اس طرح سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے

> ہماری زبان میں اس کی پوری صلاحیت موجود ہے کہ ہماری پوری تہذیبی بساط کی آئینہ داری کر سکے۔
>
> ہمارے اس کے لئے ہمارے شاعر کو شاعری کی خلاقانہ فضیلت اور تخلیقی عظمت میں یقین اور اعتماد پیدا کرنا ہوگا۔

کہ پہلی قسم کا شاعر وندہ زبان استعمال کرتا ہے اور دوسری قسم کا کتابی۔ اردو شاعری کی زبان زیادہ تر کتابی ہے اور اس کتابی زبان کا بڑا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔

کتابی زبان کو ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ ورڈس ورتھ نے اٹھارہویں صدی کی انگریزی شاعری کی زبان کو مصنوعی کہا اس کے رچاؤ اور پختگی میں زندگی کی کمی پائی۔ نثر اور نظم کے مروجہ امتیاز کو کم کر کے شاعری کی زبان کو بول چال کی زبان سے قریب لانا چاہا۔ خود اپنی نظموں میں اس نے اس کے تجربے بھی کئے جن میں سے کچھ کامیاب ہیں۔ کچھ ناکام۔ کولرج نے اس کے باغیانہ جوش کی اصلاح کی مگر اس میں شک نہیں کہ ورڈس ورتھ نے دکھتی رگ پر انگلی رکھی تھی۔ اور اس کے اثر سے انگریزی شاعری کو نیا جذبہ نئی توانائی نئی زندگی نیا لہجہ اور نیا اسلوب ملا۔

غزل کی زبان کا اثر ایک اور وجہ سے بھی ہوا ہے۔ اردو کے عام شاعر کا احساس چند بندھے ٹکے موضوعات ہی کا اظہار کر سکتا ہے۔ رومانی عشق، مبہم سی انسان دوستی، رواجی اخلاق، محدود فطری علم، عشق کی عقل پر فوقیت طبقاتی احساس، شہری مزاج، مخصوص مذہبی رنگ۔ یہاں میں صرف اُن مضمونوں میں گفتگو نہیں کر رہا ہوں جن معنوں میں آزاد نے اردو شاعری کی زبان پر تنقید کی تھی، اور نہ صرف اُن معنوں میں جن میں قراقش نے اردو میں قدیم ہندوستانی عناصر کی کمی کا ماتم کیا ہے۔ بلکہ میں تہذیبی فضا کے محدود ہونے کی بات کر رہا ہوں جو جاگیردارانہ ذہن کی زیادہ غماز ہے، جسے سماجی تبدیلیوں کا پورا پورا احساس نہیں ہے۔ اور جو تبدیلی پر کم زیادہ کرتا ہے اُن کا خیر مقدم کم۔ جو ٹھہراؤ کا زیادہ قائل ہے تغیر کا کم۔ اور جو فانی کو بھی صرف فانی قریب ہی تک محدود سمجھتا ہے اور اس سے دور جانے کو تیار نہیں۔ اس لئے میرے نزدیک نظم کی زبان غزل کی زبان کے رچاؤ سے اس کی اشاریت، اس کے تہذیبی علامات، اس کی سماجی اور اخلاقی قدروں سے بلند ہو سکے، تو یہ اچھی بات ہوگی نثر کی افادیت اور حسن سے انکار نہیں، مگر بھاؤ ٹرے کے دور میں ہاتھ میں صرف نشتر لئے زندگی کے معرکے کو سر نہیں کیا جا سکتا۔ نشتر کی ضرورت بھی ہے ہمیشہ بھی مگر صرف نشتر پر زیادہ فخر کرنے سے کام نہیں چلے گا۔

نظم کی زبان کی بنیاد بے شک بول چال کی زبان پر ہونی چاہیئے۔ مگر چونکہ نظم ادب کی ایک شاخ ہے اس لئے بول چال کی زبان کی بے پروائی اور نظمی اسکے نشیب و فراز اور اس کی جنسی معاملات میں بے جھجک بات چیت کو ایک ترتیب یا معیار کی چھلنی سے اس طرح گذرنا ہوگا کہ اس کا عام فہم جاندار اور جذبے سے بھرپور حصہ سب کا سب آجائے اور اس کی مخصوص اصطلاحیں، ناچیزی، اس کا سوقیانہ پن، اس کی چلتاؤ شکست نکل جائے۔ یہ چھلنی اتنی باریک نہیں ہونی چاہیئے کہ اس میں صرف میدہ ہی چھن سکے، بلکہ اس کے سوراخ اتنے بڑے ضرور ہونے چاہئیں کہ اُن سے چوکر کا خاصا حصہ بھی آٹے کے ساتھ نکل آئے اور اس طرح غذائیت کا اہتمام ہو سکے۔ اس زبان کو فارسی، عربی یا سنسکرت کی قواعد سے بھی تمام تر آزاد ہونا پڑے گا۔

شاعروں کو اپنی بات، کہنے اور منوانے کے لئے اشاروں، کنایوں، جھلکیوں، حیرت ناک جلووں کے بجائے مسلسل اظہار، تقریر، اظہار، آغاز و انجام، گویا فارم کے ایک گہرے تصور کو اپنانا پڑیگا۔ اور اس لئے نظم کو ایک چھوٹی مثنوی یا مسدس یا چند یوں ہی سے مربوط بندوں سے آگے بڑھا کر بے قافیہ یا آزاد نظم کو ترقی دینا پڑے گی۔

یہاں ردیف اور قافیہ کو ترک کر دینے کا سوال نہیں ہے، نہ پابند شاعری کو ادب بدر کرنے کی تجویز میں تو سلمت اللہ خاں کی طرح یہ بھی کہنے کو ہرگز تیار نہیں کہ غزل کی گردن بے تکان مار دینا چاہیئے۔ یہاں صرف زبان اور فن کے تصور میں توسیع کا سوال ہے۔ اگر ہمارے اصناف سخن سے قافیے، ردیف اور بحروں کی یہ آمریت کم ہو جائے۔ جس کے شکنجے میں الفاظ کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ اور ہمارے کی ہڈیوں کی مالا بنتے رہتے ہیں، تو ہمیں تندہی صہبا کا اس لئے کم نہ کرنا پڑے گا کہ مبادا کہیں آبگینہ پگھل جائے، نہ خیالات پر اتنے بند باندھنے پڑیں گے، نہ اس کو ٹکڑوں میں پیش کر کے قناعت کرنی پڑیگی، نہ وزن کی مجبوریوں کی وجہ سے کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ بلکہ اسے اپنی پوری تاثیر اور تیزی سے دکھانے کا موقع ملیگا۔ اے قافیہ اور آزاد نظم کی کوشش اور کامیاب ہوتی اگر اس کی بنیاد بول چال کی زبان پر قائم ہوتی مگر نہ صرف اس کی بنیاد بول چال کی زبان پر نہیں رکھی گئی بلکہ اسکے موضوعات بھی اکثر ایسے چنے گئے جو عام زندگی کے موضوعات نہیں تھے، یہ کچھ مریضانہ اور کج ذہنوں کی بے راہ روی کو چھپانے کے لئے ایک دلپسند پردہ بن گئے۔

میں یہ نہیں مانتا کہ اردو شاعری کی زبان بدیسی ہے لیکن یہ ضرور مانتا ہوں کہ اردو شاعری کی زبان مجموعی طور پر ہمارے دیس کے ایک مخصوص طبقہ، یعنی شہری ہندو کے متوسط طبقے کے فکر و ذہن کی نمائندگی کرتی ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ جس طرح جدید انگریزی

شاعری ادنیٰ ہوتے ہوئے بھی عام فہم ہے اسی طرح سے ہماری شاعری نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ہماری زبان میں اس کی پوری صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہماری تہذیبی لبا طا کی آئینہ داری کر سکے۔ ہاں اس کے لئے ہمارے شاعروں کو شاعری کی طاقت، فضیلت اور عظمت میں یقین اور اعتماد پیدا کرنا ہوگا۔ ہمیں الفاظ کی صحت اور غلطی کے معیار کو بدلنا ہوگا مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمارے معیار یکسر بدل جائیں ہاں ان میں خاصی لچک ہوگی _____ ہمیں فارسی تراکیب کی بیساکھی کا اتنا سہارا لینے کی ضرورت نہ ہوگی _____ کیونکہ بیساکھیاں ایک حد تک اپنے پیروؤں میں طاقت کی کمی کا بھی ثبوت ہیں۔ ہمیں بحروں، قافیے، ردیف، مروجہ اصناف سخن کی شکنجہ بندی وغیرہ سے بھی خاصا آزاد ہونا پڑے گا۔ ہمیں نظم کو اس قابل بنانا پڑے گا کہ وہ ایک طرف دھرتی پر ہل چلاتے ہوئے کسان کے ذہن کی ترجمانی کر سکے، اور دوسری طرف ان خلا کے سیاحوں کے ذہن کی عکاسی بھی، جو زمین کے حسن کو کشش ثقل سے آزاد ہو کر دیکھ رہے ہیں۔ اس کے لئے ہمارا موجودہ علم اور زبان کا محدود سرمایہ کافی نہ ہوگا بلکہ بول چال کی زبان کی بنیاد کے ساتھ جدید علمی زبان سے بھی کہیں کہیں مدد لینی پڑے گی خصوصاً ہندی بحروں کی آزادی اور موسیقی کے علم دونوں سے اور زیادہ فائدہ اٹھانا پڑے گا۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جدید نظم اگر جدید ذہن کی عکاسی کرنے لگے تو یہ اور بھی مشکل ہو جائے گی، وہ غلطی پر ہیں، یہ مشکل ہمیں پسند نہ کرنے والوں کے لئے ہے، اس ذہن کے لئے نہیں جو ایک طرف اپنے تہذیبی سرمایہ سے واقف ہے دوسری طرف جدید علمی دنیا کے کارناموں سے بھی۔ جدید شاعری مشکل اور مخصوص ہوتی ہے تو وہ ایک مخصوص طبقے کی ذہنی تفریح یا اس کی الجھنوں اور نفسیاتی گرہوں کی طلسم بندی بن کر رہ جاتی ہے، یہ وہ غزل ہے جو شاعر سادہ سے گہرا کر اس کا حلقہ توڑ دیتا ہے اور اپنی ذات کو کائنات سمجھنے لگتا ہے۔ اردو شاعری کو نئے سرے سے کائنات کے اس حلقے میں داخل ہونا ہے جس میں سات سیل گہرا سمندر اور لاکھوں کروڑوں میل دور ستارے شامل ہیں اور جس میں انسان آج ہلاکت کی اور نجات ابدی کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ اسے زبان سے ایک نیا عشق پیدا کرنا ہے، تاکہ وہ اس کی ہر ادا کو سمجھ سکے اسے اپنی سرزمین پر اپنی جگہ بنانی ہے اور اسی اپنی سرزمین کے ہر رنگ و آہنگ سے لو لگانا ہے اسے قدما کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ہے، اسے میر کے ذہن کی تقلید نہیں کرنا ہے بلکہ میر کو بھی جذب کرنا ہے اسے حساسیت، مذہب، جس کی روح تک پہنچنا ہے۔ اور انسانیت پر وہ اعتقاد اور اپنے سخن پر وہ اعتماد پیدا کرنا ہے جو غالب کو بھی ہے اور نجات بھی۔ غالب اور اقبال سے ہم بہت کچھ لے چکے۔ میر، نظیر، حالی سے ابھی بہت کچھ لے سکتے ہیں۔ اور ہندی شاعری کے اس حصے سے بھی جو کہ اسلام سے ہماری تہذیب اور تاریخ کے کتنے ہی جگمگاتے گوشے پوشیدہ ہیں۔ اس ضرورت کا احساس تو ہے مگر یہ ابھی عام نہیں ہوا۔ اس لئے ہمیں اپنے اپنے گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر اب میدان میں نکلنا چاہیئے۔ کھلی ہوا میں کچھ چراغ بجھ جاتے ہیں _____ مگر کچھ اور نئے جلتے بھی ہیں ہماری زبان اتنی جاندار ہے کہ وہ اب تک جس طرح تہذیب بدلی کی ترجمانی کرتی رہی ہے اسی طرح تہذیب کے ہر رقص کی بھی ترجمانی کر سکے گی۔ اس رقص کی طرف میلان شروع ہو گیا ہے، اب ہمارا فرض یہ ہے کہ اسے اور آگے بڑھائیں، حتیٰ کہ یہ ہمارا نمائندہ انداز بن جائے

(ہماری زبان)

(بقیہ نیاز فتحپوری - چند یادیں صفحہ ۴۶)

کاں کچھ میں آرام دہ جگہ بھی ٹھہرنے کے لئے مل سکتی تھی لیکن وہ ہمیشہ ماموں صاحب کے یہاں قیام کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ تنگ زندگی سے گزر کر اوپر جانے میں تکلیف اٹھاتے ہیں، لیکن وہیں جا کر دونوں وقت کھانا کھاتے تھے۔ وہ بوڑھوں سے زیادہ جوانوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اور ان پر شفقت فرماتے تھے وہ میرے ماموں زاد بھائی ظفر میر شبلی سے کافی خوش رہتے تھے۔ وہ جب تک لندن نہیں چلا گیا اسے برابر شرف مخاطبت حاصل رہا، اس کے نام انہوں نے اکثر اپنے مخصوص انداز میں خط لکھے ہیں جو قابل ذکر ہیں۔ پھر وہ اچانک پاکستان چلے گئے، ان کا یہ قدم بھوشن کا خطاب لیکر خاموشی سے پاکستان چلے جانا ایک اچھی بات نہیں تھی۔ جسے ہر شخص نے محسوس کیا اور خود نیاز صاحب کو بھی اعتراف کرنا پڑا۔ حکومت ہند نے میری جتنی قدر افزائی کی اس کا اقتضاء یہی تھا کہ میں وہیں جان دیتا۔" بہر حال نیاز صاحب فعل مکانی کر کے ایک تلخ یاد بھی چھوڑ گئے ... لیکن ان کی طویل ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

غزل

امیر چند بہار

پردۂ شعر میں ہم سوزِ نہاں کہتے ہیں
بات جو بھی ہو بصد حسنِ بیاں کہتے ہیں

خیر نغموں کا تو کیا ذکر، کہ اب اہلِ چمن
میری خاموشیِ لب کو بھی فغاں کہتے ہیں

تشنگی عام ہوئی جاتی ہے جس کے باعث
لوگ آخر اُسے کیوں پیرِ مغاں کہتے ہیں

اپنے حالات بھی ہیں قابلِ اظہار مگر
ہم جو کہتے ہیں تو روداد جہاں کہتے ہیں

اہلِ گلشن کو کسی سے نہیں شکوہ، لیکن
اُن سے نالاں ہیں، خزاں کو جو خزاں کہتے ہیں

وقف پیکار ہے حالات سے انسان مگر
عہدِ حاضر میں اسے امن و اماں کہتے ہیں

وہ جو ملتے ہیں تو کیا کچھ نہیں کہتے، لیکن
جس کا ارمان ہے، وہ بات کہاں کہتے ہیں

آدمی ڈوب گیا اپنے لہو میں رہ کر
اور ہم قصۂ رخسارِ بتاں کہتے ہیں

غزل

پلٹیں گے رُخ اپنا کب، یہ ماہ و سال آخر
کب تک ہمیں رہنا ہے یوں غم سے نڈھال آخر

کیا حد سے گزر جانا، اے مستِ کمال آخر
ہر چیز کو دنیا میں لازم ہے زوال آخر

وہ سطوتِ قیصر ہو یا حشمتِ اسکندر
مل جاتا ہے مٹی میں سب جاہ و جلال آخر

میں تجھکو بتاتا ہوں کیا عشق میں ہوتا ہے
ارمان و طلب اوّل، اندوہ و ملال آخر

محرومیِ ناکامی، دل سوزیِ دوراں کا ہی
ہوتا ہے محبت کا اکثر یہ مآل آخر

موہوم سا اک جذبہ دل میں جو رہا پنہاں
آتا ہے مرے لب پر بن کر وہ سوال آخر

زیبِ ورقِ دل ہے یہ قول بہار اپنا
تکمیلِ ریاضِ اوّل، تحصیلِ کمال آخر

بہترین خوشبو
تازگی اور
خوش ذائقہ

لاکھوں آدمیوں کی پسند

بابا

اس کی میٹھی اور دل کو خوش کرنیوالی خوشبو اور دل پسند ذائقہ کیلئے لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ پان کیساتھ کھانے سے اسکی خوشبو ذائقہ کو دوبالا کر دیتی ہے اور عرصہ تک اسکی تازگی بنی رہتی ہے۔ فہرست ملفت حاصل کیجئے

نقل و ملتے جلتے نام سے ہوشیار، دہلی والوں کا "بابا چھاپ" دیکھکر خریدیئے

تیار کردہ:- دھرم پال پریم چند —— چاندنی چوک دہلی ۶

ہمدرد
کے
برسوں کے
تجربات کے
نتائج

ہمدرد مرہم
ہر طرح کی جلدی تکلیف، جیسے پھوڑے پھنسی اور چاقو وغیرہ کے زخم میں کام آتا ہے
اسے ہمیشہ گھر میں رکھیے

قلزم
ہر ناگہانی تکلیف، جیسے اچانک درد، چوٹ لگنے، دست وغیرہ کا فوری علاج۔
"قلزم" ہمیشہ پاس رکھیے

ہمدرد بام
سر کے درد، نزلہ زکام سینہ کی جکڑن اور روزمرہ کی بہت سی تکلیفوں میں کارآمد ہے
ہمیشہ ساتھ رکھیے

ہمدرد منجن
دانت اور مسوڑھوں کو صاف اور بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہمیشہ پابندی سے
ہمدرد منجن استعمال کیجیے

صدوری
صدوری کھانسی اور پھیپھڑوں میں بلغم جمع ہو جانے کی تکلیف کو دور کرتی ہے
کھانسی کے لیے شفا بخش ہے

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی - کانپور - پٹنہ

تصویر:۔ ہمایوں کبیر
ترجمہ:۔ متین قادری

انسان اور روٹی

چیتل پدما اپنی سُبک رفتاری بھول گئی اور سورج کی مشعلہ بار لگاموں کی تاب نہ لاکر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی؟ جیسے تیل کے ختم ہونے پر چراغ کی جوت گم ہو جاتی ہے۔ یا پھر جیسے کوئی ظالم باپ اپنے روتے ہوئے بچے کو غضبناک سرخ آنکھوں سے دیکھے اور بچہ سہم کر چپ ہو جائے، رونا بند کر دے اور آنسو پی جائے۔

پدما کے خشک کنارے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جس کی گرد سے اٹی ہوئی گلیوں میں کالے گورے، بھورے ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے ہیں۔ یہ بچے کھیل رہے ہیں، اُس سے کچھ ہی فاصلے پر پرانے نیم کے اصغر میاں درخت بن رہے ہیں۔ اُن کی اکلوتی خواہش ہے کہ وہ جلد سے جلد تیار ہو جائے تو اپنے شہر جا کر بچ آئیں اور کسی نہ کسی طرح بھوک سے نڈھال بچوں کے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کریں۔ جو تھوڑی دیر کھیلتے ہیں اور زیادہ دیر پر لیشان کرتے ہیں اور اس میں اُن معصوموں کا کوئی قصور بھی نہیں ہے۔ قصور تو اُس بھوک کا ہے، روٹی کی اُس خواہش کا ہے جو جانے کن راہوں سے گذر کر معدہ میں آ دھمکتی ہے اور سارے جسم کو آتش فشاں کی طرح دہکا دیتی ہے۔

پدما کے مشرقی ساحل پر آباد اس گاؤں میں کسی کی بھی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔ سب کے سب ہی کسان ہیں۔ زمین کے بیٹے جو سالہا سال سے کھیتی باڑی کرتے ہیں، جو اپنا پیٹ کم پالتے ہیں اور شہر کے بیوپاریوں، ساہوکاروں کی تجوریاں زیادہ بھرتے ہیں۔ کس قدر بھولے ہیں یہ لوگ کتنے معصوم۔ لیکن خدا کو پھر بھی اُن کے بھولے پن پر رحم نہیں آتا۔ وہ اکثر ان لوگوں کو دکھ دیا کرتا ہے۔ بھوک اور فاقے دیا کرتا ہے۔ کبھی کبھی اِن لوگوں کو غم دینا مقصود ہوتا ہے تو وہ بارش کے بادلوں کو روک دیتا ہے۔ یہ اساڑھ کا مہینہ ہے، لیکن ابھی تک آسمان سے ایک بوند بھی نہیں برسی۔ کھیتوں کے ہونٹوں پر پپڑی سی جم گئی تھی۔ کسانوں کے حلق سوکھنے لگے تھے۔ بیلوں کی توانائی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ جہاں ہریالی تھی وہ سبزہ تھا، پھول پتے اور رس بھرے پھل تھے۔ اب وہاں دھول اڑتی تھی۔ اصغر میاں جب ان سبزہ زاروں میں گرد کے بگولے اٹھتے ہوئے دیکھتے تو ایک لمحے کے لئے اُن کے دل کی دھڑکن بند سی ہو جاتی۔ لیکن وہ خود کو تسلیاں دے لیتے تھے وہ امید بھرے دل سے سوچنے لگتے تھے، بارش ضرور ہو گی۔ کالے کالے بادل ضرور چھائیں گے۔ پورے گاؤں میں اصغر میاں ہی ایسے آدمی تھے جو کسی حد تک معقول، صابر، نیک اور رحم دل تھے اور اُن کی اسی قناعت پسندی اور رحمدلی کی وجہ سے گاؤں کے بوڑھے جوان اور بچے سب ہی لوگ اُن کا احترام کرتے تھے۔

خشک سالی کا پہلا سال تو کسی نہ کسی طرح گذر ہی گیا۔ اصغر میاں کی یہ خوش نصیبی ہی تو تھی کہ اُن کا کھیت پدما کے ساحل سے لگا ہوا تھا۔ لیکن اب پدما بھی خشک ہو چکی تھی۔ اصغر میاں نے متفکر نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ جہاں کالے کالے بادل تو کجا سفید روئی کے گالے بھی نہ تھے۔ جو کبھی کبھی آسمان پر نظر آیا کرتے تھے۔ اس وقت تو ہر سُو جہاں تک نگاہوں کی پہونچ تھی، نیلا ہی نیلا آسمان تھا۔ نہ جانے یہ آسمان کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ پانی کیوں نہیں برساتا۔؟ اصغر میاں نے دل ہی دل میں سوچا۔ مگر اُن کی یہ آواز آسمان کی لاتعداد وسعتوں میں گم ہو کر رہ گئی۔ اصغر میاں نے اپنی لاٹھی اُٹھائی اور کھیت کو پُرنم نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن وہاں کالے کالے مٹی کے ڈھیلوں اور بھورے خشک سیدانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اُن کی آنکھیں بے اختیار رو دینا چاہتی تھیں۔ مگر آنکھوں میں آنسو کہاں تھے؟ وہ تو ان کالے کالے کھیتوں نے اپنے اندر جذب کر لئے تھے

صغرمیاں کی مالی حالت تو کچھ غنیمت تھی بہ نسبت گاؤں کے دوسرے لوگوں کے۔ کل ہی کی بات ہے جب صغرمیاں رانو کے گھر کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ تو کیا انہوں نے اس کے بچوں کے رونے کی آواز سنی، ایک بچہ زور زور کر کہہ رہا تھا..... مجھے بھوک لگی ہے، روٹی دو..... ماں مجھے روٹی دو۔" لیکن ماں نے روٹی دینے کے بجائے ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ اس سے یہ دردناک منظر دیکھا نہ گیا۔ انہوں نے گھوم کر تھوڑی سی جوار رانو کے گھر بھجوادی اور ساتھ ہی اس جوار کو پیس کر دو لپاٹی پکالیا جب دو لپاسامنے آیا تو بچے اس پر اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے برسوں سے بھوکے ہیں۔ جیسے بھوک اور فاقے کی راہوں پر چلتے چلتے صدیاں گذر گئی ہوں۔ لیکن اس طرح کب تک چلتا؟ جب دوسرے سال بھی گھٹائیں نہ برسیں تو غریب اور لاچار کسانوں کو ایسا لگا جیسے پہلے ان کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسائے گئے ہوں اور اب انہیں خونخوار بھنک پاٹھی کی مار ہی ہو۔ کبھی تو وہ قدرت کے خلاف غم اور غصے سے بھڑک اٹھتے تھے اور کبھی اپنی لاچاری و ناداری پر اشک بہانے لگتے تھے۔ محدود تعداد جوار سے دن بھر بیٹھنے کے بعد چند بچے اور لڑکیاں چن لاتی تھیں لیکن جب اناج نہ ہو تو آگ جلا کر بھی کیا کرے، انگارے بھی کھائے؟ اگر انسان کا بس چلے تو انگارے بھی چبا جائے۔

اصغرمیاں کے کھیتوں میں چند آم، املی اور نیم کے درخت تھے لیکن موسم کی تمازت اور پانی کی کمی کی وجہ سے ان کے درختوں کے پتے زرد ہو گئے تھے۔ بعض درختوں کے پتے جھڑ گئے تھے اور اب بھوت پڑ پاتی رہ گئے تھے۔ سوکھے پیڑ مغلی چاروں طرف سے محاصرہ کر چکی تھی۔ پہلے گھوں کے انور بکے، پھر برتن بکے اور..... پھر انسان بھی بکنے لگے۔ حسن بھی بکنے لگا عزت بھی بکنے لگی اور وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ کم سے کم بیسویں صدی کے اس سائنسی دور میں نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ کم سے کم گاؤں بھر میں سب ہی کی ایک جیسی حالت تھی لوگ دھرم کرم کو بھول کر بھوک مٹانے کے لئے جانوروں پر ٹوٹ پڑے وہ لوگ جو گوشت کو چھونا گناہ عظیم تصور کیا کرتے تھے۔ اب کچا گوشت چبانے لگے۔ گاؤں والے مایوسی، ناکامی اور مفلسی سے بھری سیلی سیلی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے۔ اب امید تھی تو صرف اصغرمیاں سے کہ وہ کچھ کر سکیں گے۔ گاؤں والوں کا خیال تھا کہ ان کی حالت بہت اچھی ہے۔ آخر ایک دن گاؤں کے چند لوگ اصغرمیاں کے مکان کے پاس پہنچے مدقوق چہرے، ناتواں جسم، تار تار لباس، گرد سے اٹے ہوئے پاؤں،

کسی نے کچھ نہ کہا لیکن اصغرمیاں نے سب کی نگاہیں پڑھ لیں۔ انہوں نے انہیں اندر آنے کو کہا۔ جب سب اندر آگئے تو انہوں نے مکان کا ایک ایک گوشہ کھنگالا۔ کسی نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے سر جھکا کر سب چل دیئے۔ اصغرمیاں نے دور بہت دور کھیت کے سنگ درخت کو دیکھا، جو تنوں سے بے نیاز کھڑے تھے۔

(آزاد ترجمہ انگریزی سے) ○○

آئندہ شمارہ اگست ۶۶ء

چند لکھنے والے

کوثر جاوید پوری	ڈاکٹر سلام سندیلوی	مہندر ناتھ	سلام مچھلی شہری
یوسف ناظم	احمد جمال پاشا	اظہر انصر	محمود قمر تاباں
متین سروش	اکرام جاوید	شاذ تمکنت	آفاق رشید مرزا
مناظر عاشق ہرگانوی	مذاق مظفری	محسن زیدی	ادیس احمد دوراں

اور بہت سے دوسرے قلم کار

بقیہ صفحہ ۶۱ ۔ اگر مجھے صرف تین دن کیلئے "زندہ رہنا ہے" پھول سونگھنے والی ہو، پھولوں کی مہک اور خوشبو کے تاثر کو یوں محسوس کیجئے جیسے کل یہ تاثر آپ سے چھن جائے گا۔ اور اسی طرح ہر لقمہ جو آپ کھائیں اور ہر وہ پھل جو آپ چکھیں یہ سوچ کر کھائیے اور چکھئے کہ شاید کل ہی یہ قوت ذائقہ آپ کا ساتھ چھوڑنے والی ہو۔

اپنے تمام حواس کا پورا پورا استعمال کیجئے۔ آنکھوں کو لطف اٹھائیے اور قدرت اور انسان کی عظمت کو محسوس کیجئے۔ آپ کا یہ خیال ہے کہ جتنے حواس آپ کے پاس ہیں ان میں سب سے زیادہ آپکی زندگی کو دلکش اور پرکیف بنانے والا حواس قوت سماعت یعنی آپ کی آنکھ ہی ثابت ہو گی۔

اچھی غزل روح کے تاروں کو چھیڑتی ہے
اور شیشہ و پیمانہ سے چھلتی ہوئی سرمستی پیدا کرتی ہے۔
خلش بڑودوی ــــ کا مجموعۂ غزل **قطار شیشہ**
یہی کیفیات پیدا کرتا ہے
بہترین کتابت و طباعت۔ اعلیٰ خوبصورت جلد۔ قیمت تین روپے
مکتبہ قصر الادب۔ پوسٹ بکس ۵۲۶۴ بمبئی ۱ بی سی

غزلیں

شاہد کبیر

ہم کہاں جبّہ و دستار سے پہچانتے ہیں
آدمی کو کسی معیار سے پہچانتے ہیں
کیا تعجب جو انھیں میرا ٹھکانہ نہ ملا
لوگ گھر کو در و دیوار سے پہچانتے ہیں
مرکزِ علم و تجارت ہو کہ گہوارۂ فن
شہر کو کوچہ و بازار سے پہچانتے ہیں
کسی کوچے میں ملے یا کسی میخانے میں
زندگی ہم تجھے کس پیار سے پہچانتے ہیں
مجھ کو شاہد وہی اک شوخ نہ پہچان سکا
لوگ جس کو مرے اشعار سے پہچانتے ہیں

نعیم صدیقی چنوری

مسیح سے نہ کسی چارہ گر سے ملتا ہے
سکونِ قلب تمھاری نظر سے ملتا ہے
حیات کیا ہے گھڑی دو گھڑی کا وقفہ ہے
سبق حیات کا رقصِ شرر سے ملتا ہے
خدا دراز نسیمِ سحر کی عمر کرے
پتا تمھارا نسیمِ سحر سے ملتا ہے
تمھاری بزم میں چرچے ہیں خیر کے لیکن
تمھاری بزم کا دستور شر سے ملتا ہے
نعیم واقعہ یہ ہے کہ امن دنیا کو
انھیں کے سایۂ دیوار و در سے ملتا ہے

قیسِ رامپوری

کبھی جفا ہے، کبھی پیکرِ وفا ہے کوئی
مری حیات بھی شاید تری ادا ہے کوئی
ترا ہر ایک ستم ابتدا سہی، لیکن
اِس ابتدا کی بھی اے دوست انتہا ہے کوئی
تری تلاش، تری جستجو میں یہ تو ہوا!
پیمبری کے فسانے سنا رہا ہے کوئی
نہ ہو سکے تو نہ ہو تم سے دردِ دل کا درماں
خوشی تو یہ ہے کہ ہاں درد آشنا ہے کوئی
تمھارے عشق میں دیر و حرم سے بچ بچ کر
فرازِ دار سے آگے نکل گیا ہے کوئی
دیارِ دہلی میں آ کر پتہ چلا اے قیس
غریبِ شہر کو ہنس کر نہ دیکھتا ہے کوئی

مس ہیلن کیلر

اگر مجھے صرف تین دن کیلئے آنکھیں مل جائیں

مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہوتی اگر ہر انسان سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد صرف چند دن کیلئے اندھا اور بہرا ہو جایا کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اتفاد تاریکی کے بعد اُسے روشنی کا صحیح ادراک ہو سکتا اور گہرے سناٹے کے بعد اُسے آوازوں کے ارتعاش اور زیر و بم کا صحیح لطف حاصل ہو سکتا۔

میں اکثر اپنے ملنے والوں کی قوتِ مشاہدہ کی جانچ کرتی رہتی ہوں حال ہی میں میں نے اپنی ایک سہیلی سے پوچھا۔

"تم نے جنگل سے گذرتے وقت کیا کیا دیکھا؟"

اور میری سہیلی نے مسکرا کر کہا

"کوئی خاص چیز نہیں"

میں سوچتی ہوں بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان ایک گھنٹہ تک کسی جنگل میں گھومے اور کوئی قابلِ ذکر چیز نہ دیکھے! ۔ میں۔ جو کہ مکمل اندھی ہوں صرف چھُو کر ہی سے کئی پر لطف چیزوں کا احساس کر لیتی ہوں۔ درختوں کی نازک نازک پتیاں اور اُن کا حسین موسم بہار میں کھلنے والی کلیوں کا جذبۂ نمو جب قدرت انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی ہو۔

کبھی کبھی میں کسی سنتھے سے پودے کی شاخوں سے اپنے ہاتھوں کو مس کرتی ہوں اور میرے اندر زندگی کے پھلنے پھولنے کا اور آگے بڑھنے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ بعض اوقات اُن چیزوں کو جنہیں میں چھُو کر اس حد تک محسوس کرتی ہوں دیکھنے کا کیسا بے پناہ طرح دل پر حاوی ہو جاتا ہے۔ جو چیزیں صرف لمس سے ایسی مسرت بخشتی ہیں، اگر کہیں میں انھیں دیکھ لوں تو ــــ میں نے تصور ہی تصور میں بارہا سوچا ہے کہ اگر مجھے صرف تین دن کیلئے آنکھیں جائیں تو میں وہ تین دن کیا کچھ دیکھنے میں گذاروں۔

میں ان تین دنوں کو تین حصّوں میں تقسیم کروں: میں انسانوں کو دیکھنے میں گذاروں۔ وہ انسان جو میرے ارد بستے ہیں اور جن کی محبت میں رہ کر زندگی کتنی پیاری اور کتنی معلوم ہوتی ہے۔ میرے تصور ہی میں نہیں آسکتا کہ جب آنکھو بلکاروں میں بیٹھ کر کسی دوست کی روح میں جھانکا جائے تو محسوس ہوتا ہے۔ تین دن اگر میں صرف تین دن کے لئے حاصل کر سکتی۔

میرا پہلا دن بہت مصروف دن ہوتا میں اپنے تمام عزیزوں اور رشتہ داروں کے چہروں کو غور سے دیکھتی۔ اُن خدوخال میں جھانکنے کی کوشش کرتی۔ اور اُن کے چھپے ہوئے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرتی۔ میں کسی ننھے معصوم پر اپنی نگاہیں مرتکز کر دیتی یہ دیکھنے کے لئے کہ معصومیت بچپن اور زندگی کے اوّلین مراحل نے اُسے کتنا حسین بنا دیا ہے۔ میں اُن کتابوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کتنی خوش ہوتی جن کی تعریف الجھا تک صرف دوسرے مجھے پڑھ کر سناتے رہے ہیں۔ اور مجھوں مجھے انسانیت کے دکھ درد سے آشنا کیا ہے۔

اُس سہ پہر میں بھرے بھرے کھیتوں اور باغوں میں نکل جا اور جی بھر کر قدرت کے اتھاہ حسن کا نظارہ کرتی اور بیتابی سے غروب آفتاب کے پرعظمت منظر کا انتظار کرتی۔ شاید اُس پہلی رات مجھے بے تابی کی وجہ سے نیند بھی نہ آتی۔

دوسرے دن طلوعِ سحر کے ساتھ میں اُٹھ بیٹھتی اور اپنی

آنکھوں سے اندھیرے کو اُجالے میں مدغم ہوتے دیکھتی اور رات کی سیاہی سے دن کی سپیدی کے ملاپ کا مشاہدہ کرتی۔ اور پھر آہستہ آہستہ مشرق سے سورج کو بلند ہوتے دیکھتی۔ وہ کتنا دلکش منظر ہوتا ہے جب سورج کی پہلی کرنیں زمین کا بوسہ لے کر ہر شے میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہیں۔

دوسرا دن میں دنیا اور کائنات کے اسرار جاننے میں گذارتی۔ دنیا جو گذر گئی ہے اور دنیا جو موجود ہے۔ اس لئے میں سیدھی کسی عجائب گھر کا رُخ کرتی۔ عجائب گھر میں مجھے صدیوں پرانے انسانوں کے ڈھانچے، اُن کے مکانات، اُن کے کھانے پینے کے برتن دکھائی دیتے اور میں انسان کی عظمت کا اندازہ لگاتی۔

میری دوسری منزل فنونِ لطیفہ کا عجائب گھر ہوتا۔ ابھی تک میں صرف ہاتھوں کے لمس سے تصویروں کا حسن اور مجسموں کا فن محسوس کر پاتی ہوں۔ اب مجھے کھل کر انھیں دیکھنے کی مہلت ملتی۔ میں فراعین مصر کو دیکھتی۔ اہرام کی بلندیوں کو محسوس کرتی۔

ہومر کی ایلیڈ مجھے بہت پسند ہے۔ خود ہومر سے مجھے بہت لگاؤ ہے۔ اس لئے کہ وہ خود اندھا تھا اور جانتا تھا کہ نابینا ہونے کے معنی کیا ہیں۔ میرے سامنے مصوّروں کے شاہکار ہوتے اور میں انھیں دیکھ کر اپنی روح میں عجیب بالیدگی محسوس کرتی۔ اس لئے کہ بڑے فن کاروں کا کہنا ہے کہ آرٹ کو سمجھنے کیلئے نگاہوں کی تربیت اور تہذیب بہت ضروری ہے۔

دوسرے دن کی شام میں کسی تھیٹر یا فلم دیکھنے میں گذارتی۔ کتنا لطف آتا جب میں خود اپنی آنکھوں سے ہیملٹ کو چلتا پھرتا دیکھتی۔ ہاں موسیقی کو میں ابھی تک کچھ زیادہ نہیں سمجھ پاتی ہوں۔ صرف ہاتھوں سے چھو کر سازوں کے ارتعاش کے احساس میں مجھے کچھ لطف آتا ہے۔ یا موسیقی کی لہریں جب زمین سے گذرتی ہیں تو میں ایک خاص قسم کی کیفیت محسوس کرتی ہوں۔

تیسرے دن میں پھر طلوعِ صبح کا استقبال کرتی اور ایک بار پھر مجھے نئی خوشی اور نیا لطف حاصل ہوتا۔ اس تیسرے دن میں پھر زندگی کے ہنگاموں کے درمیان رہنا پسند کرتی۔

میں شہر کے کسی پُر رونق بازار کے چوراہے پر کھڑی ہو کر آتے جاتے ہزارہا انسانوں کو غور سے دیکھتی۔ ہر طرف زندگی رقصاں و جولاں نظر آتی۔ چہروں کی مسکراہٹیں مجھے ایک نیا سرور بخشتیں۔ عزم و ارادہ سے تنی ہوئی گردنیں مجھ میں خود اعتمادی پیدا کرتیں۔ اور مجھے فخر محسوس ہوتا۔ افسردہ چہروں کو دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھتا۔ شاید عورتوں کے رنگ برنگ ریشمیں لباسوں کو دیکھ کر میری نگاہیں کبھی جھکتیں اور کون جانے خود میں بھی انتخاب کرنے کے بعد کوئی رنگین اور شوخ رنگ کا لباس پہنتی۔ اس کے بعد میں شہر کے مختلف حصّوں میں جاتی۔ وہاں بھی جہاں بنگلے ہیں، کاریں ہیں، خوبصورت لان ہیں، صاف ستھرے کھیلتے ہوئے بچے ہیں اور وہاں بھی جہاں جھونپڑے ہیں۔ گندگی ہے، افلاس ہے، حسرت و غم کی یہ دنیائیں میرے مشاہدہ کے وسیع اور مجھے انسانی زندگی سے اور قریب کر دیتیں۔

اب میرے تیسرے دن کا اختتام قریب ہوتا۔ شاید میں عجائب گھر کی کسی عمارت میں داخل ہو جاتی اور کوئی کامیڈی فلم دیکھتی اور سچی کی زندگی کی بھی ایک ایسی ہی فلم ہے۔

پھر نصف رات کو جب اندھیرے کی رات مجھ پر مسلط ہو جاتی۔ اور میں اُجالوں سے اندھیروں کی گود میں آگرتی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہی رہتی کہ میں وہ بہت کچھ جو دیکھنا چاہتی تھی نہ دیکھ سکی۔ اور اس کا شدید احساس مجھے اُس وقت ہوتا جب میرے چاروں طرف پھر اندھیرے کی دنیا ہوتی۔

شاید یہ تین دن کا پروگرام جو میں نے اپنے لئے سوچا ہے آپ کے لئے موزوں نہ ہو۔ اگر آپ تین دن کیلئے اندھے ہو جائیں۔ بہرحال یہ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کو ایسا حادثہ پیش آجائے یعنی آپ صرف تین دن کیلئے اندھے رہنے کے بعد اپنی بینائی حاصل کریں تو ضرور اس کائنات کی سمت میں آپ کی دلچسپی کہیں زیادہ بڑھ جائیگی۔ آپ کی نگاہیں ایک ایک ذرّہ کو چومیں گی۔ زندگی سے آپ کی محبت بڑھ جائے گی اور آپ کے ذہنی افق پر ایک نئی صبح طلوع ہوگی۔

میں ہوں کہ اندھی ہوں آپ جیسے آنکھوں والوں سے یہی کہنا چاہتی ہوں کہ خدارا اپنی آنکھوں سے کائنات کی ایک ایک چیز کو دیکھئے۔ جیسے خدانہ کرے کل ہی آپ اندھے ہونے والے ہوں۔ اور یہی بات دوسرے حواس خمسہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ، سازوں کی نغمگی، آبشار کا ترنم، جھینگروں کی ترنم روانی، ہواؤں کی سنسناہٹ کو اس طرح غور سے سنئے جیسے آپ کل ہی بہرے ہونے والے ہوں۔ ہر شے کو اس طرح والہانہ طور پر چھو کر لمس لطیف حاصل کیجئے جیسے یہ لمس کی قوت کل ہی آپ سے

(بقیہ صفحہ ۵۸ پر دیکھئے)

تاثر انگیز

بروفات حسرت آیات مولانا نیاز

نقادِ عظیم اُردو

آج بے شک رہنمائے معتبر جاتا رہا
یہ تسلق ہے جانِ اربابِ ہنر جاتا رہا

آہ! یارو! کس قدر مغموم ہے اُردو ادب
رو رہا ہے دل ادیبِ نامور جاتا رہا

آہ! سچے دل سے تھا جو آج شیدائے غزل
ہائے صادق گیسو آرائے ہنر جاتا رہا

دیکھئے تو رو رہا ہے خون کے آنسو "نگار"
باکمالِ فن مدیرِ نامور جاتا رہا

ہے کہاں نقادِ فن، ہائے وہ بنّاضِ سخن
ہے الم! اُردو کا وہ بھی چارہ گر جاتا رہا

آہ! تھا لاریب جو عقدہ کشائے مشکلات
رو رہے ہیں آج ہم! وہ دیدہ ور جاتا رہا

واد ریتا! کون ہے جو آج ہے گوہر شناس
صد الم! اب ماہرِ لعل و گہر جاتا رہا

یہ بھی سچ ہے ایسا اہل سکتا نہیں منزل شناس
حیف و حسرت! آج حق بیں راہبر جاتا رہا

اہلِ باطن، مردِ میداں جو کہ تھا یاروں کا یار
کیا بتائیں ہائے اب وہ رُوٹھ کر جاتا رہا

آہ! وہ کہ دُور میں دلدادۂ تحقیق تھا
آہ! صادق! ہائے! مخلص حق نگر جاتا رہا

جس کی ہستی پر تھے نازاں آج ہم اہلِ ادب
آہ! وہ بھی اہلِ دل، صاحب نظر جاتا رہا

آہ! بے شک نازشِ فن بھی وہی اک تھا عزیز
حیف! صد افسوس! مردِ معتبر جاتا رہا

ہائے ہائے ہوش والے روئیں قسمت کو عزیز
آج صد افسوس مردِ باخبر جاتا رہا

مکتوبات

ل۔ احمد ——— ۷ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱

"شاعر" کا پرچہ موصول ہوا۔

نیاز صاحب پر آپکا مضمون پڑھا اور مکرر پڑھا۔ آپ نے بہت تھوڑے لفظوں میں بہت کچھ کہہ دیا۔ اور نیاز صاحب کی شخصیت پر ایک جامع تبصرہ کر دیا ——— مرحبا!

خدا کرے آپ کی صحت ترقی پذیر ہو۔

علی عباس عابدی امید ایم اے ——— کیمبرج کالج۔ بھوپال (ایم پی)

پرسوں جون کا "شاعر" ملا۔ پرچہ کافی پسند آیا۔ اداریہ تو خیر اپنی ایک الگ اہمیت یا دوسرے لفظوں میں انفرادیت رکھتا ہی ہے۔ نیاز مرحوم سے متعلق آپ کے مکمل جامع اور پُر مغز مختصر مضمون نے بہت متاثر کیا۔ جملہ کا استعمال میں نے اس لئے کیا ہے کہ مولانا کے انتقال کے بعد سے ہندوستان اور پاکستان سے بہت سارے طویل طویل مضامین شائع ہوئے، لیکن تقریباً سبھی ان کی شخصیت کے کسی خاص پہلو کو مدِ نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ لیکن آپ نے تو گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ چار سطروں میں تاریخ سمو دی۔ خاص چیز جو مجھے پسند آئی وہ آپ کے لطیف اشارے تھے جو آپ کے ان اشاروں نے وہ کام کر دیا ہے جو اوروں کے صفحات نہ کر سکے۔ مولانا کی شخصیت کا بھرپور عکس اس مضمون میں ملتا ہے۔

علیم اختر اور آپ کی غزلوں کے علاوہ بشر نواز، ملا وحیدہ نسیم کی غزلیں بھی پسند آئیں۔ افسانوں میں "ایک جھونپڑی کی کہانی" اور "سنگینا" پسند آئے ——— یعقوب راہی کا مضمون بھی اچھا ہے۔ "موڑ" "گردش" اور "معراج" اچھی ہیں۔

ایک چیز جو میری سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ کہ آپ ہر شمارے میں "مشاہیر اہلِ قلم" سے درخواست کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کم از کم یہاں تک میں سمجھا ہوں اب تک تو کوئی مثبت نتیجہ نہیں ہوا۔ کیا یہ ضروری ہے کہ وہی لوگ صاحبِ فن سمجھے جائیں جو عمر میں سے زیادہ مشہور ہیں۔ "شاعر" اب تک اپنے معیار کے مطابق نکل رہا ہے حالانکہ لفظ کے آپ کے مشاہیر متوجہ نہیں ہیں۔ چونکہ ادھر کچھ لکھا کرتا ہوں اس لئے یہ چند سطور لکھنا میں نے ضروری سمجھا۔ اگر نئے لکھنے والے معیاری تخلیقات پیش کرتے ہیں تو انھیں قبول کرنے میں پس و پیش نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ انہیں میں سے کل مشاہیر بھی ہو جائیں گے۔ بہرحال اگر آئندہ آپ مشاہیر سے نام نہاد اہلِ قلم سے درخواست نہ کریں تو بہتر ہو کیونکہ شاعر کے معیار میں کوئی کمی اب تک نہیں آئی ہے۔ اور اگر آئندہ آپ نے یوں ہی انتخاب کیا تو معیار اور بھی بلند ہو گا پست نہیں۔

رفعت نواز ——— ظلہ گھاٹی۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر)

"شاعر" کا تازہ شمارہ ملا شکریہ! اس بار حصۂ نثر جاندار ہے۔ "سیماب اکبرآبادی کے فنی نظریات" پر ڈاکٹر اسلم فرخی نے کام کا مضمون لکھا ہے۔ علامہ سیماب پر تحقیقی کام کرنے والوں کیلئے یہ اشاریہ مضمون بڑا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ کنہیا لال کپور کی "مدھو شالا" پر ممتاز احمد خاں کا اچھا مضمون ہے۔ یعقوب راہی کا مضمون "اردو مرثیہ کا تدریجی ارتقاء" بڑا تشنہ ہے۔ حیرت ہے کہ انھوں نے مرثیہ کے ارتقاء پر اتنا مختصر اور نامکمل مضمون لکھا اور مطمئن ہو گئے۔ اس مضمون میں کئی اہم مرثیوں کا ذکر تک نہیں ہے۔ مثلاً غالب (عارف والا مرثیہ) اقبال (طارق اور فاتح پر مرثیے) آنند نرائن ملا (کاندھی جی کی شہادت)

جوش (پنت نہرو کا مرثیہ) ۔ اس کے علاوہ اس مضمون میں اور بھی کئی اہم نوٹ گزشتہ ہیں جن کا ذکر اس خط میں ممکن نہیں ہے۔ ایک الگ سے مضمون کی ضرورت ہے۔

شکیب، بنام کنول اور آشا بھاجیکر کے افسانے مجھے پسند آئے۔ یوسف ناظم کا مزاحیہ دلچسپ ہے۔

پروفیسر اقبال بیجا پوری نے نصیر کے مضمون "ابلہ پا" پر اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ میں ان کا مشکور ہوں۔ مگر وہ مضمون بشر نواز صاحب کا لکھا ہوا نہیں تھا۔ وہ صاحب نے اپنے خط میں لکھا ہے) براہ کرم آئندہ شمارے میں اس کی تصحیح کر دیجئے۔

نثار پرویز۔ لیکچرر ـــــــ ایم۔ اے۔ ایم۔ بی ٹیلر۔ نیو راکسی ٹاکیز۔ کمپور روڈ۔ لشکر (گوالیار)

جوش کے شمارے میں آپ کا اداریہ بہت غور طلب ہے۔ "لارڈ لینگو جسٹن" کے بارے میں آپ کی رائے بہت معقول و مدلل ہے۔ کاش اس رائے کو عملی جامہ پہنا دیا جائے۔ عظیم ادیب، نقاد اور افسانہ نگار حضرت نیاز فتحپوری کے انتقال سے اردو دنیا کو سخت دھکا پہونچا ہے۔ آپ نے اپنی یادداشت بہت مؤثر انداز میں تحریر کی ہے۔ پڑھنے کے بعد ایک عجیب تاثر دل و دماغ پر دیر تک چھایا رہا۔ ماضی کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو بیکس خوبصورت ہوتا ہے۔ ہم بہت سے نظریاتی اختلافات کے باوجود بھی کچھ ہستیوں کو فراموش نہیں کر سکتے۔ بہرحال مولانا نیاز اب ہم میں نہیں۔ انھوں نے اردو ادب کی نشو و نما میں جو ناپاں حصہ لیا، وہ یادگار رہے گا۔ اب جیسا کہ خود انھوں نے آپ سے دوران ملاقات میں اعتراف کیا تھا کہ "آپ ہندوستان میں جس ہمت و استقلال سے اردو کیلئے کام کر رہے ہیں اس سے میں بہت متاثر ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ ہندوستان میں جس لگن سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں، وہ سب کے بس کی بات نہیں۔

مولانا نیاز کا آخری شعر جس پر آپ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں

"وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد ہزار بار برو صد ہزار بار بیا"

انتہائی درد انگیز ہے۔ وداع و وصل کی اس الگ الگ منزل سے گزرنے والا ہی محسوس کر سکتا کہ ان چند الفاظ میں کتنا درد اور کتنی حسرتیں پوشیدہ ہیں۔ بہرحال مقالوں میں ڈاکٹر اسلم فرخی اور محمود واحد کا مقالہ قابل تعریف ہے۔ یوسف ناظم نے "عاشقی صبر طلب" ..... کافی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ ضیا جسنی کا انٹرویو بھی پسند آیا۔ میری ناچیز رائے میں اگر آپ کبھی کبھی ایسے انٹرویو شائع کرتے رہیں تو ہمیں ادبی شخصیتوں کے بارے کافی مختلف نظریاتی معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔ شکیب نے اپنے افسانے "ایک شام" میں آج کی غیر مطمئن اور غیر واضح زندگی کی گھٹن کو بہت کامیابی سے پیش کیا ہے۔ مراٹھی کہانی "سنگیتا" اپنے پلاٹ اور کردار نگاری کے اعتبار سے ایک نہایت مؤثر کہانی ہے جو دل کی گہرائیوں کو چھو لیتی ہے۔

حصۂ غزل میں آپ کی غزل نیز علیم اختر، مظفر نگری، طفر قریشی، بشر نواز، شاہد صدیقی، اور اقبال بیجاپوری کی غزلیں بھی بہت پسند آئیں۔ ہر غزل میں چند اشعار تو بہت ہی اچھے ہیں۔ نظموں میں اسرار اکبر آبادی کی نظم عزم نو کی نقیب سی محسوس ہوتی ہے۔ ظہیر صدیقی کی نظم ۔ نئے سبک سلاں ساحل بھی قابل تعریف ہے۔ رؤف خلش، منظور احمد اور مہدی پرتاب گڈھی کی نظمیں عام ہیں۔ مگر ان میں ایک قسم کی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ حنیف کیفی کا سائیکٹ ایک خوبصورت اور پرشکوہ تخلیق ہے۔ مجموعی طور سے آپ کا یہ شمارہ مختلف رنگوں کی ایک حسین و جمیل آمیزش ہے

انجمن آرا انجم ـــــــ امیر نشان۔ علیگڈھ

"شاعر" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ آپ نے میری کہانی شائع کر کے پھر شکر گزار ہونے کا موقع دیا ہے۔ "شاعر" کا حصۂ نظم و نثر خوب ہے۔ آپ کی غزل کا یہ شعر کافی پسند آیا۔ ؎

رکھ دی جو پر زبان ہم نے کانٹے وہی پھول بن گئے ہیں

مگر اس شعر کے متعلق میرا خیال ہے ؎

ارماں پینے کے ہوں، کہ ہوں جینے کے اک شوقِ فضول بن گئے ہیں

میرے خیال میں پہلا مصرعہ خارج از بحر ہے۔ اس غزل کی بحر یہ ہے۔ مفعول، مفاعلن، فعولن۔ یا مفعولن۔ فاعلن۔ فعولن۔ مگر مفعولات ان دونوں میں سے کسی میں نہیں آتا۔

انوار انصاری، ایم کام ـــــ کاٹاٹولی چوک۔ اولڈ ہزاری باغ روڈ۔ رانچی (بہار)

جون کا شاعر لفظ نواز ہوا۔ یہ جان کر دل کو ایک گونہ تسکین ہوئی کہ آپ نے بھی زمانے کے ساتھ چلنے کی ٹھان لی۔ مجھے سخت تعجب تھا کہ اب تک "شاعر" کی قیمت میں کیونکر اضافہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس بڑھتے ہوئے دورِ گرانی میں جب جینا مشکل ہو رہا ہے "شاعر" کیلئے زندہ رہنا ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ میں آپ کی رائے سے سو فیصدی متفق ہوں۔ "شاعر" کی قیمت میں اضافہ از حد ضروری تھا۔ دو جزو یا دو کا اجزا کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرو گے۔

ویسے تو آپ کے ہر اداریے "میں نئی باتوں کی طرف اشارہ ہوتا ہی ہے، مگر اس بار آپ نے ہندی اور انگریزی میں اردو کا کیس پیش کرنے کیلئے ایک اچھا مشورہ دیا ہے۔ مولانا نیاز فتحپوری کی موت سے ادب میں ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ نیاز صاحب کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوئیں اگرچہ آپ نے بھی اشارے اشارے میں بہت کچھ لکھ دیا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی اور یعقوب راہی کے مقالے پسند آئے۔ شکیب کا افسانہ بیحد اچھا معلوم ہوا۔ علیم اختر اور آپ کی غزلوں کا کیا کہنا۔ یوسف ناظم سے اور لکھوائیے۔

اظہر افسر ـــــ آل انڈیا ریڈیو۔ حیدر آباد (آندھرا پردیش)

تازہ "شاعر" ملا اور بڑے دنوں کے بعد آپ کا عنایت نامہ بھی۔ کتاب پر مبارکباد کا دلی شکریہ۔ آپ کے یہ شعر گنگنا رہا ہوں اور دفتری میں بیٹھا آپ کو خط لکھ رہا ہوں

ایسے بھی ہیں کچھ حسین دعدے جو یاد کی بھول بن گئے ہیں
کیا کیجئے بے اصولیوں کے پہلے سے اصول بن گئے ہیں
اعجاز کے نا قبول تیور معراجِ قبول بن گئے ہیں

چھوٹی بحر میں خوب غزل کہی ہے آپ نے۔ "بھول" کا استعمال بھی انوکھا ہے۔ مولانا نیاز فتحپوری کے انتقال کے بعد اور ہر بیشتر اخباروں اور رسالوں نے تعزیتی نوٹ شائع کئے ہیں۔ لیکن آپ نے مولانا نیاز کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے وہ بے حد متاثر کن ہے اور یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

اس بار مقالات "سیماب اکبرآبادی کے فنی نظریات" "بچن" اور "اردو مرثیہ کا تدریجی ارتقاء" خوب ہیں۔ آپ کی نظم "کرب خود کلامی" کے تعلق سے تو یعقوب راہی نے میرے دل کی بات کہہ دی۔

مکتوبات کے تحت "الیگاؤں" کے عتیق صاحب کو جو آپ نے جواب دیا ہے، اس سے آپ کے کردار کی عظمت کا پتہ چلتا ہے، ورنہ آج کل تو..... گلی گلی کاسۂ صدارت اور اپنے نام کی کسی بزم کی ممبرشپ لئے گھومتے ہیں!!

تمنا مظفر پوری ـــــ معرفت میسرز ظفر اسٹورس۔ گورارو بازار۔ ڈاکخانہ گورارو۔ ضلع گیا

اس ایک ماہ میں کبھی کبھی گورارو آیا تو سینچر کو اور اسی روز چلا گیا۔ سینچر کو یہاں دوکانیں بند رہتی ہیں۔ اس لئے شاعر نہ مل سکا۔ اب جب ٹور ختم کر کے آیا تو "شاعر" مئی اور جون کے دونوں شمارے ملے۔ جرأت سے ادبی رفتار تک جلد جلد ختم کر ڈالنا چاہا۔ اور قریب قریب ایسا کر بھی ڈالا۔

شاید کبھی ترقی اردو والوں نے بھی اردو کے لئے آج تک اتنا نہیں لکھا جتنا آپ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ اگلی حال میں آپ نے سنا ہوگا کہ پٹنہ میں وزیر اعلیٰ کی کوٹھی پر جناب معصوم شرفی نے اردو کو بہار میں ٹانوی زبان کی جگہ دی جائے، کے تحت "بھوک ہڑتال" کی تھی۔ مذہبی نقطۂ نظر سے

ٹھیک ہے اصل خط ہی لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے یہی حق کیلئے جنگ کا ایک طریقہ ہے۔ آپ جیسے مجاہد اور شرفی جیسے بہادر جب موجود ہوں تو اردو اپنا حق لے کر رہے گی۔

"شاعر" مئی کے شمارے میں رسول احمد کا ڈرامہ بہت پسند آیا۔ ڈرامہ اور طنزیہ و مزاحیہ ہر شمارے کیلئے ضرور حاصل کیجئے۔ اس شمارے کی ہر اہمیت رکھتی ہے۔ کیا مقالے کیا افسانے اور کیا نظمیں۔ فیروز کی نظم "بیزاری" بہترین ترجمہ ہے۔ اگر یہ وہی فیروز ہیں جو پوسٹ گریجویٹ بہار یونیورسٹی کے طالب علم ہیں تو کوئی حیرت یا تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ وہ خود بھی اچھی نظم کہتے ہیں۔

جون کے شمارے میں شکیب کا افسانہ "ایک شام" پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ بڑے دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔ یوسف ناظم صاحب تو طنز و مزاح نگار ہیں۔ پتہ نہیں اس عنوان سے آج کے حاشق کچھ لکھ سکتے ہیں یا نہیں۔ نظموں میں ظہیر صدیقی کی نظم "اے مسیحا سارا ہی ساحل منحوس" نظم کا دوسرا اور آخری حصہ میں نے بار بار پڑھا۔ آپ کے یہ اشعار

لاؤ ایمان ہم پہ لوگو! ہم غم کے رسول بن گئے ہیں
رکھ دی جن پر زبان ہم نے کانٹے وہی پھول بن گئے ہیں

اور طرفہ قریشی کا یہ شعر۔

زمیں بدلی زمیں پر بسنے والے تو نہیں بدلے یہ دنیا بے عمل ہی رہی حج اکبر انقلاب آیا

میرے پسندیدہ اشعار ہیں۔

ضیاء حسنی ——— کاشانۂ سبزی، چھوٹی بازار۔ فتحپور (یو۔پی)

تازہ "شاعر" میں آپ کی غزل دیکھی۔ کافی جاندار، موثر اور دردانگیز ہے۔ علامہ نیاز مرحوم کی وفات پر آپ کا تعزیتی نوٹ بھی پڑھا۔ جس میں آپ نے مخصوص تعزیت کے ساتھ ایسی باتیں بھی لکھی ہیں جو حقیقی ہونے کے باوجود تلخ دکھائی دے رہے ہیں۔ بہرحال مذکورہ مضمون کا مطالعہ بھی دلچسپ رہا۔ باقی شاعر کی سب ہی غزلیں کافی اچھی ہیں۔

اویس احمد دوراں ——— سی۔ ڈی۔ ایل۔ بی۔ ڈی۔ ایم۔ جی بلڈنگ ۱۲ کے پی، ڈی ۲۳ کلکتہ

"شاعر" دو ماہ کے بعد اب کے ملا ہے۔ جسے اب تک پڑھ نہ سکا۔ پرسوں ہی ملا ہے۔ آپ کی غزل دیکھی پسند آئی۔ ایک مضمون مرثیہ پر کام کا ہے ایک بار پڑھا ہے۔ دوبارہ پڑھنا ہے۔ آپ کی شاعری اب بہت ہی بالغ و پختہ سنجیدگی ہو گئی ہے نیا ہی رنگ ہے جو شعر کو تاثیر سے بھر دیتا ہے۔ میں اس رنگ کا مداح ہوں، بلکہ خود بھی اسی کی پیروی کرتا ہوں۔

سید احمد شمیم ——— پی۔ ایس۔ بی۔ ایم ۱۵۵۔ پوسٹ کدما۔ جمشید پور ۲

میری نظموں کو آپ نے جس جان گوئی اور خلوص سے شائع کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ بچ جانے، اس سے دل بہت متاثر ہوا۔ آپ کے گرانقدر مشوروں کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔ میں خود بھی شاعری میں چیستاں کا قائل نہیں ہوں۔ ہاں علامتی شاعری کا مداح ضرور ہوں۔ لیکن صرف اس حد تک کہ بات اشاروں میں تو ہو مگر چیستاں نہ ہو۔ نظم میں ایک کھڑکی ضرور کھلی ہونی چاہیئے۔ جس سے قاری نظم کے پس منظر میں جھانک سکے۔ اور نظم کو سمجھ سکے۔ اور میرا خیال ہے کہ میری ان دو یا تین نظموں میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ واضح ہے۔ بلکہ اس حد تک واضح جدید اردو شاعری کا طرۂ امتیاز بھی انہیں ہے۔ ورنہ ..... جس قسم کی نظمیں لکھ رہے ہیں اور بڑے بڑے مدیروں کے ہاتھوں ہاتھ لے جا رہے ہیں ان سے اردو کا ہر سنجیدہ طالب علم واقف ہے۔ نہ معلوم میری نظمیں آپ کو چیستاں کیوں نظر آئیں؟ ہاں وہی عنوان کی بات تو عرض یہ ہے کہ عنوان کے مہمل ہونے سے نظم کے مقصد و معنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہاں قاری کے لئے کچھ دعوت فکر کا سامان ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ میری نظمیں بلا عنوان بھی بہت صاف ہیں۔ ہاں میں نہیں کہہ سکتا کہ فنی لحاظ سے وہ کیسی ہیں اور آپ کے

سامنے یوں بھی میں اس کی جرأت نہیں کرسکتا ہوں۔ لیکن میری یہ کوشش ہمیشہ رہتی ہے کہ شاعر کیلئے اپنے طور پر اچھی سے اچھی تخلیق ارسال کروں۔ کبھی دھوکا کھاؤں تو دیا جاسکتا ہے مگر آپ کی نگاہِ فن شناس سے نکتہ رس سے بچ نکلنا ممکن نہیں ہے۔

آپ اُن نظموں کو شائع کریں یا نہ کریں مگر میری گذارش ہے کہ ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں اور اپنے "پتہ نجھڑ" اور "زندگی" کے عنوان کے تحت اُن کے بارے میں اپنا بے پناہ معروضیتوں کی رو سے آپ نے میری نظموں کو ایک نظر دیکھ کر بتا دیا۔

بہرحال حسبِ حکم ایک نظم اور مزید پانچ اشعار کی ایک غزل (غزل میں ۹ اشعار تھے) ارسال کر رہا ہوں۔ اگر یہ چیزیں آپ کو پسند آئیں گی تو سمجھ کہ محنت وصول ہوئی۔

پروفیسر اے۔ ایم۔ بہار ـــــــ شعبۂ انگریزی۔ گورنمنٹ کالج۔ دھرم سالہ (پنجاب)

میری غزل سے متعلق آپ کی بے لاگ اور گرانقدر رائے کا پورا پورا احترام کرتا ہوں۔ بیشک یہ غزل میں نے بہت جلدی میں کہی تھی۔ دراصل میں غزل کا شاعر ہونے کا مدعی نہیں ہوں۔ میری ناقص رائے میں غزل ایک لطیف صنفِ سخن ہے جو حسن و عشق، ہجر و وصال اور رنج و غم کے علاوہ زندگی کے دوسرے گہرے مسائل اور سنجیدہ خیالات کے بار کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ قافیہ اور ردیف کی پابندی شاعر کے صحیح جذبات کی ترجمانی میں بیشتر مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح غزل زندگی کی صحیح معنوں میں تفسیر بننے سے قاصر ہے۔ بہرکیف یہ میرا ذاتی نظریہ ہے۔ شعرِ سخن کے لئے تو غزل کہنا ضروری ہوجاتا ہے۔

مسعود قمر تاباں ایم۔ اے ـــــــ مرکزِ ادب۔ بدھوارہ، بھوپال (ایم۔ پی)

تازہ شمارہ میں "شاعر" کے معیار اور ترتیبی حسن میں اضافے کا اعلان بڑی مسرت سے پڑھا۔ سینتیس سال سے تمام بدلتے ہوئے علمی و ادبی رجحانات ساتھ دینے والا شاعر ہمیشہ ارتقا کی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔ بہت دن سے ادبی حلقوں میں یہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ آپ کے اعلان سے شاعر شیدائیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

مکتوبات کے باب میں سید شمیم احمد (جمشید پور) نے اپنے خط میں ڈاکٹر گیان چند کے بارے میں جو نازیبا الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ ادبی اختلاف ممکن ہے لیکن اس کے اظہار کا بھی ایک طریقہ ہوا کرتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند اور جناب کلیم الدین احمد دونوں ایک ہی صدی کے بزرگ ہیں۔ انہوں نے "اہم نظمیں" پر جو اظہارِ خیال فرمایا ہے وہ حقیقت و واقعیت لئے ہوئے ہے اور اس سلسلے میں بیشتر اربابِ نظر ڈاکٹر گیان کے ہم خیال ہیں۔ اس کے ثبوت میں شمیم صاحب سے درخواست ہے کہ وہ ماہ جون ۱۹۶۷ء کا ماہنامہ "ساقی" کراچی (پاکستان) دیکھیں۔ جس کے صفحہ ۴۳ پر "اہم نظمیں" پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ میں وہ مختصر تبصرہ قارئینِ "شاعر" کے لئے ذیل میں درج کر رہا ہوں۔

"پروفیسر کلیم الدین احمد ہمارے ادب کے چوٹی کے نقاد ہیں۔ اُن کی تحریریں ایسے تیز و نشتر ہوتے ہیں جن کے گھاؤ مشکل ہی سے بھرتے ہیں۔ اُن کی سب سے پہلی تنقیدی کتاب اردو شاعری پر ربع صدی پہلے شائع ہوئی تھی جس میں انھوں نے تقریباً سب ہی شاعروں کو اوندھا کر رکھ دیا تھا۔ اور انکشاف کیا کہ بس شاعر ہیں تو عظیم الدین احمد کے والد (حکیم نصیر الدین احمد) جن کی اس ادبیات پر بڑی (بالواسطہ) پیش رفت میں قاضی عبدالودود نے حال ہی میں کلیم صاحب کی ۱۲ نظموں کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ ضرورت تھی کہ کتاب کا آغاز ایک لمبے چوڑے مقدمہ سے ہوتا اور ان ۱۲ نظموں کی اہمیت اور افادیت کو واضح کیا جاتا۔ مگر یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ حد یہ کہ کسی نظم کا کوئی عنوان بھی نہیں ہے۔ اب تک کو یوں ہی بیچ میں سے کھول کر جو دیکھا تو نظم ۳۵ کے پہلے مصرعے سامنے آئے:۔

آکاش سے آتی ہے یہ صدا
اُٹھ باندھ کمر لے زادِ سفر
چل دیکھ خدا کیا کرتا ہے

مذکورہ بالا میں یہ بھولا لبراہ [illegible]

حرفِ حرف

(تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

نارسیدہ

از ــــــــــــ دارث کرمانی

وہ کوئی پتھر ہو، بُت ہو، یا کوئی اَن دیکھی طاقت۔ زندگی ہر عہد میں کسی نہ کسی یقین کی اُنگلی تھامے وقت کی ناہمواریوں کو ناپتی رہی ہے۔ انسان کے اندر کے خلا نے دھرتی پر انسان کے ساتھ ہی جنم لیا ہے۔ انسانی تہذیب کی مختلف سمتیں اسی خلا میں گر کر بھرنے کی ناکام یا کامیاب کوششوں کی تاریخی علامتیں ہیں۔ انسان کا ادھورا پن کوئی آج ہی کا المیہ نہیں..... یہ تو روزِ ازل سے انسان کا مقدر رہا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ موجودہ عہد میں اس احساس میں زیادہ شدت پیدا ہو گئی ہے۔

ہر دور اپنا ILLUSION، خود پیدا کرتا ہے۔ سائنسی و صنعتی انقلابات نے انسان سے رہا سہا یہ بھرم بھی چھین لیا۔ انسان نے پہلی بار اپنی آنکھوں سے اپنا گرد و صاد دیکھ لیا ہے اور یہی اس عہد کا کرب ہے۔ نا تمامیہ۔ خود فریبی سے خود آگاہی تک کی ایک منظوم روداد ہے۔ جو لہجے کی تمکنت اور مخملیت کے باوجود آج کے عہد کے اجتماعی کرب کو انفرادی آہنگ بخشنے میں خاصی کامیاب ہے۔ دارث کرمانی کے زیرِ تبصرہ مجموعے کی ابتداء عہدِ جوانی کی مبارک باد سے شروع ہوتی ہے۔ ان نظموں میں فضا کم عمر رومانیت کی سی ہے۔ اس میں کوہِ قاف کی پریوں کا عالم، ادائے غمزہ، تبسمیں، عذراں، خیالوں کے زرفشاں پیکر، اُلفت کے زمانے کی یاد دہانیاں اور بوسیدہ خطوں کے پرزوں کی دولت قیصر و کسریٰ سے زیادہ بہیت دیزۂ زمین کو چہارم آسمان بنائے ہوئے ہے۔ یہاں شاعر جنونِ شوق کی تکمیل کے لئے فضائے حسن میں کھلا ہوا چاہتا ہے۔ اس قسم کی نظمیں لہجے کی تبدیلی کے ساتھ اختر شیرانی کی سی معصوم ذہانت کا شکار نظر آتی ہیں۔ ان میں خوبصورت لفظوں اور تصویروں سے تو سجا سجا تو بن جاتی ہے، مگر جس کے رنگوں کو دیکھنے کے لئے مرادوں کے دن، جاگی ہوئی آنکھیں اور تمنا کی راتیں سوئی ہوئی عمر چاہئے۔ یہ سندر کومل رنگ دھوپ کھائی آنکھوں کے لئے کہاں۔

دارث صاحب کی ان ابتدائی نظموں میں الفت کا تراوٹ، دعوت، شباب، تاج محل وغیرہ حسین تخلیقات ہیں۔ ان میں معصوم سرگوشیاں بھی ہیں اور پاک بیباکیاں بھی۔ ان میں جسمانی تقاضے بھی ہیں اور خلائی سرشاریاں بھی۔ مگر ہر جگہ ایک فنکارانہ رچاؤ اور تہذیب کے ساتھ۔

یہ جلتی ہوئی سانس یہ بہکے ہوئے جذبات
آزلیت کو معصوم گناہوں سے ہمیں
پھر مٹھیا کے اک سایہ کسی شاخ کے نیچے
ہمیں پھر کوئی تازہ غزل مجھ کو سنائیں

تیرا رو روکے تغافل کی شکایت کرنا
میرا ہنس ہنس کے وہ تسکین دلانا تجھ کو

اس مجموعے کی دوسری نظمیں اور غزلیں شاعر کی خود آگہی کے جادو لیتے ہیں۔ نئے عہد کی برقی رفتاری میں سانس لیتی ہوئی لمحوں کا المیہ۔ سماج اور فرد کے نئے رشتے کی نئی نوعیت کا المیہ۔ آبادی میں تنہائی کا المیہ، شخصیت کے بکھراؤ اور انتشار کا المیہ۔ دارث صاحب فنی تخلیق کے لئے نظریاتی وابستگی کے بجائے گداختگی دل پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وہ لوچ اور نرمی ہر جگہ نظر آتی ہے جو پڑھنے والوں کو بے تکلف دوست کی طرح بہت جلد اپنا رازدار بنا لیتی ہے۔ خاموش آگ، اُگلا کا پھول، خراب آباد، تخلیق، خمار تھی۔ اکتوبر کا مہینہ اور دوسری نظمیں اور غزلیں اپنے انداز بیان کی ندرت اور سوچ کی تیزی کے لحاظ سے اس مجموعے کی اچھی نظمیں ہیں۔

نظم شرارتی ان میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اس میں شاعر نے نہایت موزوں انداز میں عہدِ حاضر کے ذہنی CONFUSION کو تہہ دار اشاروں سے چھونے کی کوشش کی ہے۔

دارث صاحب فکر کے تیکھے پن، انفرادی ردِ عمل، عصری شعور اور

سوالیاتی تبدیلوں کے اعتبار سے ذہن کے قریب نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے اندر کی گہماگہمی میں نہیں جھانک رہے ہیں۔ وہ باہر کی کھلی فضاؤں سے بھی اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں، انہیں انفرادی کرب کا بھی احساس ہے اور سماجی پیچیدگیوں کا مناسب شعور بھی۔

رُخ ہوا کا ذرا جو بدلے گا
میہ درخت آگ بن کے پھیل جائے گا
ان درختوں سے اپنے رکھ امید
جاگ اے بندروں کی نسل جدید

سرد ہوتے ہوئے بجھوں کی راکھ
تہہ بہ تہہ جم گئی ہے ڈھانچوں پر
اینٹھ کر رہ گئی ہیں آوازیں
تھرتھراتے ہوئے ہی ہونٹوں پر

ناشر بمصنف، بتہ، بکچرار شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(ن۔ف)

اِنشائیہ

انشائیہ _____ ڈاکٹر آدم شیخ

"انشائیہ" ڈاکٹر آدم شیخ کی ایڈیٹ کی ہوئی ایک اردو ایسیز (ESSAYS) کی مختصر سی کتاب ہے، اس میں سولہ مضامین شامل ہیں، جن کے انتخاب میں ادبی پرکھ سے زیادہ تاریخی ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے، انتساب میں فیض کا یہ جملہ درج ہے۔

"کوشش کیسی بھی حقیر کیوں نہ ہو زندگی یا فن سے فرار اور شرمساری پر فائق ہے" عرض ناشر میں ناشر نے لکھا ہے

..... "یہ زبان ایک اونچے معیار کی طرف رواں دواں تھی کہ بھوک اور سماج کی تحریکوں نے اس پر غلبہ پالیا، اور نہ صرف یہ کہ اس زبان کی ترقی رُک گئی بلکہ یہ مفلوج ہو کر رہ گئی"۔ خدا جانے ان کی نظر میں زبان کی ترقی کا کیا معیار ہے؟ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ بھوک اور سماجی تحریکوں کے بغیر کسی عہد کے ادب کا تصور ہی ممکن نہیں۔

کتاب کے شروع میں شیخ صاحب نے انشائیہ کے تاریخی پس منظر اور اس کے صنفی مزاج سے ایک طویل بحث کی ہے۔ یہ خطہ خاں نکوفن کے "نئے اور پرانے چراغ" کے نام سے تین ابواب پر منقسم ہے۔

اس میں انھوں نے خود اپنی تنقیدی رائے کے بجائے ناقدین کے اقتباسات سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ اس طریقۂ کار سے موضوع کو پھیلانے میں تو آسانی ہوتی ہے مگر تشریح کی عدم تسلسل کی وجہ سے ذہن جلووں کے ہیر پھیر میں کچھ الجھ سا جاتا ہے۔ کچھ جملے دیکھئے۔

"انشائیہ نگار کے پیش نظر کوئی مقصد نہیں ہوتا..... نثر کی دوسری شاخوں کے لکھنے والے کے تصورات میں تجربات میں جمالیاتی تاثر کم اور عملی وافادی پہلو زیادہ نمایاں رہتا ہے۔

مقصدیت تخلیقی حسن کو مجروح کر دیتی ہے۔

دنیا میں ہر شے کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ ادب میں مقصدیت سے انکار ممکن نہیں، ہاں اس کے اظہار کے طریقوں پر اختلاف ہو سکتا ہے، تبدیلی کی کہانیاں اور فیض کی نظمیں ہمارے عہد کی دلیلیں ہیں۔

"انشائیہ" کو ایڈٹ کر کے شیخ صاحب نے ایک اہم ضرورت کا اظہار کیا ہے۔ اردو میں اس صنف پر بہت کم کام ہونے کے برابر ہوا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کے ذریعہ نئی نسلوں کو متوجہ کیا ہے ممکن ہے ڈاکٹر آدم شیخ کی یہ کوشش اردو میں کسی اور بہتر کتاب کا پیش خیمہ بنے ہو۔ خدا کرے یہ کوشش سراہے جانے کے قابل ہے۔ اس کتاب سے یونیورسٹیوں کے طلبا کو بطور خاص فائدہ پہنچے گا۔

ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کے اشتہار کے مطابق ان کی دو کتابیں اور زیر طبع ہیں۔ امید ہے کہ ان میں چھپائی اور کتابت کا ضرور خیال رکھا جائے گا۔

قیمت:۔ دو روپے پچاس پیسے۔ ناشر:۔ اُشرس امپوریم پرائیویٹ لمیٹڈ۔ خورشید بلڈنگ سر فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی ۱

(ن۔ف)

خط لکھتے وقت

۱۔ خریدار حضرات اپنے نمبر خریداری کا حوالہ دیں
۲۔ ایجنٹ اپنا ایجنسی نمبر ضرور لکھیں
۳۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی خط یا لفافہ بھیجا جائے۔

منیجر

رفتار — علمی — ادبی — اور تہذیبی خبریں

نذر الاسلام اکیڈیمی کا افتتاح

کلکتہ ۵ رجون:۔ (ی ٹی آئی) بنگال کے انقلابی شاعر قاضی نذر الاسلام کی شاعری اور ان کے خیالات کی نشر و اشاعت کی غرض سے آج یہاں نذر الاسلام اکیڈیمی کا افتتاح ہوا۔ یہ نیتاجی سبھاش چندر بوس کے آبائی مکان نیتاجی بھون میں قائم کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں مشہور اہل قلم کی ایک کمیٹی بھی قائم کر دی گئی ہے

قاہرہ میں ہندو پاک مشاعرہ

سردار جعفری اور فیض احمد فیض کی شرکت

قاہرہ ۴ رجون:۔ گذشتہ روز یہاں ہندوستانی طلبہ نے ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ اس مشاعرہ میں ہندوستان اور پاکستان کے بعض شعراء نے شرکت کی۔ ہندوستان کی طرف سے مشہور ترقی پسند شاعر سردار جعفری اور پاکستان کی طرف سے فیض احمد فیض نے نمائندگی کی۔ ان دونوں شعراء کو سامعین نے بلیو ریفاص سنا۔ ہندوستانی سفارتخانے کے ثقافتی اتاشی مسٹر رائن نے بھی مشاعرہ میں حصہ لیا۔ جناب رائن اردو، عربی اور فارسی کے اسکالر ہیں۔ مشاعرہ میں ہندوستانی طلبہ اور مصری شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

قیدیوں کیلئے تلگو، اردو اور ہندی کے امتحانات

حیدرآباد ۳ رجون:۔ سنٹرل جیل چنچل گوڑہ میں قیدیوں کو جیل کے مکتب اسکول ہی میں اردو، ہندی اور تلگو کی تعلیم دی جارہی ہے۔ حال ہی میں زیر تعلیم قیدیوں کا امتحان بھی لیا گیا جس کے نتائج بڑے شاندار ہے۔ آندھرا پردیش پرشید کے تلگو امتحانات میں حصہ لینے والے ۲۴ امیدواروں میں سے ۱۸ امیدواروں نے کامیابی حاصل کی۔ مسٹر نگیر ریڈی ساری ریاست میں اول قرار دئے گئے۔

انجمن صداقت پسند مصنفین کی تشکیل

مشہور ناول و افسانہ نگار عابد رشید کے مکان رسول منزل، مولوی گنج میں ایک نشست زیر صدارت ڈاکٹر مظاہر علی سندیلوی (لکچرر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی) منعقد ہوئی جس میں انجمن صداقت پسند مصنفین کی تشکیل ہوئی۔

انجمن کا مقصد انسان دوستی، امن پروری اور قومی ایکتا ہے۔ دستور کی ترتیب اور کام کی رفتار بڑھانے کیلئے مجلس عاملہ کا قیام عمل میں آیا جو عادل رشید۔ ڈاکٹر مظاہر علی سندیلوی، ڈاکٹر سلام سندیلوی (لکچرر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی) امین سلونوی، عزالانصاری، حیات وارثی، مائل ملیح آبادی، ضیا عظیم آبادی پر مشتمل ہے۔ انجمن کی شاخیں تمام ملک میں قائم کی جائیں گی۔

مخدوم محی الدین زخمی ہو گئے

حیدرآباد ۹ رجولائی:۔ شمالی ویتنام پر امریکی بمباری کے خلاف مظاہرے کے دوران پولیس کے لاٹھی چارج سے جو لوگ زخمی ہوئے ان میں مشہور شاعر اور سیاسی لیڈر مخدوم محی الدین بھی شامل ہیں

۱۲ رجولائی سے اردو کیلئے جامع مسجد دہلی کے سامنے

ڈاکٹر عباس ملک کی بھوک ہڑتال

بمبئی۔ ڈاکٹر عباس ملک نے اخبارات کو ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ اردو زبان جو کہ مشترکہ سرمایہ اور قومی یکجہتی کی ضمانت تصور ہے، اس کے حصول کیلئے قربانی دینے کی ضرورت نظر آنے لگی ہے انھوں نے پختہ عزم کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ وہ جامع مسجد دہلی کے سامنے ۱۲ رجولائی سے بھوک ہڑتال کریں گے۔ اگر وہ اس سے بچ نکلے تو اس بھوک ہڑتال کو پارلیمنٹ کے سامنے بھوک ہڑتال تاموت کی صورت میں تبدیل کر دیں گے۔

ڈاکٹر صاحب نے محبان اردو کے نام اپیل کرتے ہوئے التجا کی کہ وہ اپنی صفوں میں دراڑ نہ پڑنے دیں اور آپس میں متحد رہیں۔

کرشن چندر کے فن پر بہترین خطوط لکھنے کیلئے

طلبا، اور طالبات کو انعامات

ماہنامہ "شاعر" بمبئی کا نہایت ضخیم اور خوبصورت کرشن چندر نمبر شائع ہو رہا ہے۔ ادارۂ شاعر مسرت کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہے کہ کالجوں اور ہائی اسکولوں کے جو طلبا اور طالبات اردو کے مشہور و ممتاز افسانہ نگار کرشن چندر کے فن اور شخصیت پر خطوط کے ذریعہ اظہار خیال کریں گے، ان میں سے بہترین خطوط پر پندرہ انعامات دیئے جائیں گے۔

انعامات کی تفصیل اور قواعد:۔

(۱) سب سے اچھے خط پر پہلا انعام پچاس روپے نقد اور ایک کاپی کرشن چندر نمبر۔

(۲) دوسرا انعام تیس روپے نقد اور ایک کاپی کرشن چندر نمبر۔

(۳) تیسرا انعام بیس روپے نقد اور ایک کاپی کرشن چندر نمبر۔

(۴) دس بہترین خطوط پر دس انعامات۔ ایک ایک کاپی کرشن چندر نمبر۔ مع کرشن چندر کے دستخطوں کے۔

(۵) خطوط بھیجنے کی آخری تاریخ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۶ء ہے۔

(۶) خط فل اسکیپ سائز پر پندرہ سطروں سے زیادہ کا نہ ہو۔ اردو ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں سے کسی میں لکھا جا سکتا ہے۔

(۷) خط کے ساتھ پرنسپل ہیڈ ماسٹر یا شعبۂ اردو کے انچارج کی تصدیق ضروری ہے۔

(۸) طلبا اور طالبات اپنے اپنے کالجوں اور اسکولوں کے نام اور پتے صاف تحریر کریں۔

(۹) خط کے ساتھ چند روپئے پیسے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

(۱۰) بہترین خطوط کا انتخاب ذمہ دار ادیبوں کی ایک کمیٹی کرے گی۔ جن کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا۔

(۱۱) انعامات حاصل کرنے والے طلبا اور طالبات کے خطوط مع ان کی تصاویر کے کرشن چندر نمبر میں شائع کئے جائیں گے۔ خطوط اس پتہ پر بھیجے جائیں اور لفافے کی پشت پر خط برائے کرشن چندر نمبر لکھ دیا جائے۔

ایڈیٹر ماہنامہ شاعر، مکتبہ قمر الادب، پوسٹ بکس ۴۵۲۶ ممبئی ۴ (بی ایس)

جوہر ٹونکی کا انتقال

ٹونک (راجستھان) کے مشہور ناظم گویا صاحبزادہ محمد مصطفیٰ خاں جوہر مرحوم ۱۳۸۶ھ کو کوٹہ سے ۱۸ میل دور ایک گاؤں میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔

جوہر مرحوم نظم اور نثر دونوں کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے مضامین نظم و نثر کثیر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ رزم و بزم کے نام سے ان کا ایک دیوان بھی شائع ہوا تھا۔ نادر و نایاب کتابیں جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ اور مرحوم نے ان کا ایک اچھا ذخیرہ جمع کر لیا تھا

کہانیوں کا مقابلہ ۔۔۔ ۲۱ روپیہ کا انعام

بی بی سی لندن کا اعلان

بی بی سی نے مختصر افسانوں کے ایک مقابلہ کا اعلان کیا ہے جو برطانیہ سے باہر رہنے والے افسانہ نویس حصہ لے سکیں گے۔ پہلا انعام ۔۔۔ پونڈ (۲۱۰ روپے) کا ہے۔ جن دیگر افسانہ نویسوں کی کہانی براڈ کاسٹ ہونے کیلئے منتخب ہوں گی ان میں سے ہر ایک کو بیس پونڈ دیئے جائیں گے۔ کہانی غیر شائع شدہ انگریزی زبان میں اور ۱۰۰۰ سے ۲۰۰۰ الفاظ پر مشتمل ہو۔ کہانی انسانی تجربہ کے کسی گوشہ پر ایسے ڈھنگ سے روشنی ڈالتی ہو کہ اسے دنیا میں ہر جگہ سمجھا جا سکے۔ کہانیاں مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجی جائیں۔

شارٹ اسٹوری کمپیٹیشن بی بی سی ہوم سروس بش ہاؤس لندن ڈبلیو سی ۲

امراؤ جان ادا، ادبی عدالت میں

کراچی کی ادبی عدالتِ عالیہ میں ایک سنسنی خیز مقدمہ پیش ہونے والا ہے۔ جس میں لکھنؤ کی ڈیوڑھی دار طوائف امراؤ جان ادا مشہور ادیب مرزا ہادی رسوا کے خلاف استغاثہ دائر کرے گی۔ مقدمہ کا تعلق دلاور خاں ڈکیت عام جان کے چہیتے اور سید جان "بوا صاحبہ" نواب سلطان علی خاں، نواب کی داشتہ سوگندھی، نواب اور جوگن کے لڑکے گوہر مرزا بیٹھ پتا جوہری، عین الحال دلیون جی وغیرہ کے علاوہ ناول کے بعض موضوع اور دوسرے کرداروں سے ہے۔ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ نے کراچی کے ممتاز ادیبوں، وکیلوں اور دانشوروں سے درخواست کی ہے کہ اپنی نوعیت

کی اس پہلی ادبی عدالت میں فریقین کی جانب سے وکالت کریں گے۔ تین جج بحثوں کی سماعت کے ساتھ مقدمہ کا فیصلہ صادر کریں گے۔ سید دلدار علی شاہ۔ سابق جسٹس اخلاق حسین، ابراہیم جلیس، ڈاکٹر اسلم فرخی، سید سبط حسن اور شان الحق حقی اس پروگرام میں حصہ لیں گے۔

آلِ احمد سرور اور مالک رام کابل میں

امریکہ میں ایک ادارہ ہے، فلبرائٹ بک پروگرام۔ اس کی شاخیں ایران، افغانستان اور پاکستان میں ہیں۔ یہ ادارہ فارسی اور اردو میں علمی و ادبی کتابوں کی طباعت خصوصاً ترجموں کی اشاعت میں مدد دیتا ہے۔ ایران اور افغانستان میں اس کی شاخوں نے مطبوعات کا ایک خاصا بڑا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ کابل میں وہاں کی وزارت معارف اور یونیورسٹی کے تعاون سے ایک سمینار ۲۰ جون سے ۲۵ جون تک منعقد ہوا۔

اس سمینار میں ہندستان کو بھی نمائندگی کی دعوت دی گئی تھی۔ چنانچہ حکومت ہند سے پروفیسر آلِ احمد سرور، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) اور مشہور نقاد و ادیب، مالک رام کو بھیجا گیا۔ ہندستان کے ان دونوں [illegible]

سلطان سجانی کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہو گیا

مایگاؤں (یہ جو اللہ۔ اردو کے نئے ابھرتے ہوئے افسانہ نگار سلطان سجانی کے افسانوں کا مجموعہ "بنی زکائیں" شائع ہو گیا ہے۔ اس میں اُن کے ۹ افسانے شامل ہیں۔ "بنی زکائیں" کا دیباچہ سردار جعفری نے لکھا ہے۔ اور اسے مکتبۂ اردو محمد [illegible] نے شائع کیا ہے۔

کاپٹی (ناگپور) سے ہفت روزہ "تاج" کا اجراء

کاپٹی (ڈاک سے) یہاں "تاج پرنٹرس اینڈ پبلشرز کوآپریٹو سوسائٹی لمیٹڈ" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم ہوا ہے۔ اسی ادارہ سے ایک ہفت روزہ اخبار "تاج" کا بھی اجراء کیا جا رہا ہے۔ یہ ورد ہو اور مہاراشٹر شمال کا واحد ہفت روزہ ہوگا۔ اس کے مدیر ظہیر افروز اور نائب مدیر شمیم منتظم ہونگے

التماس

میں حضرت شاد عارفی (مرحوم) پر ایک کتاب "شاد عارفی — فن اور شخصیت" ترتیب دے رہا ہوں۔ مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ شاد عارفی صاحب کے فن اور شخصیت پر مضامین بھیجنے کا کرم کریں۔ ادب دوست حضرات موصوف پر مختلف رسائل میں شائع شدہ مضامین کے تراشے روانہ فرمائیں تو عنایت ہوگی۔ جن اصحاب کے پاس شاد صاحب کے خطوط ہوں وہ مندرجۂ ذیل پتے پر ارسال کریں۔ نقل حاصل کرنے کے بعد بحفاظت واپس بھیج دیے جائیں گے۔

کتاب اگست کے اواخر میں منظر عام پر آئے گی۔ اس لئے ضروری ہے لہٰذا یہ لطف جلد کیا جائے۔

مظفر حنفی — میوزیم پارہ۔ بھوپال گیٹ، بھوپال (ایم پی)

ناگپور یونیورسٹی کے خلاف صدائے احتجاج

علاقہ ودربھ جمعیۃ العلماء نے ایک [illegible] بیان کے ذریعہ ودربھ کے تمام تعلیمی و سماجی اداروں، جمعیۃ العلماء، انجمن [illegible] اور ہر دلعزیز کونسلر موسائی و دیگر جماعتوں سے پیلی بھیت ہے کہ وہ ناگپور یونیورسٹی کی کمیٹک کونسل کے اس فیصلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں جس کی رو سے [illegible] کے امتحان کے لئے اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے اپنے طریقہ کو ختم کر دیا ہے۔

بقیہ: مکتوبات .... صفحہ ۸۹ سے آگے

اردو والوں کا تو یہ فرض ہے کہ وہ حقداروں کا حق اُن کی زندگی میں دیدیں۔ یہ ایک بڑا سانحہ ہے کہ شاعر و ادیب اپنی زندگی دے کر ادب کو زندگی بخشتا ہے اور وہ خود اپنی زندگی ہی میں زندگی سے محروم رہیں۔ مرنے کے بعد چند سال تک مرثیوں اور جلسے جلوسوں کے [illegible] کافی فائدہ پہنچتا ہے۔ سعادت حسن منٹو اور مجاز اس سانحہ کی مثال [illegible] ہیں۔ ادب و شاعر کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے [illegible] ہوتے ہوئے اگر ہم [illegible] تو اب لوگوں کی رائے لے لیں۔

"شاعر" کی قیمت میں اب صرف ایک روپیہ سالانہ کا اضافہ کیا ہے اس کی وجہ [illegible] ہے۔ مہنگائی سے اس کی کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ اتنا کم قیمت میں لٹریچر ہم پہنچانا اور وہ بھی بمبئی شہر سے، آسان نہیں۔ میرے خیال میں اب نہیں تو کم از کم سال نو سے شاعر کی سالانہ قیمت دس روپے اور ایک پرچہ کی قیمت ایک روپیہ کر دیں۔ یہ قیمت کچھ زیادہ نہیں بلکہ شاعر کم معیار کے پرچوں کی قیمت عرصے سے یہی چلی آ رہی ہے۔

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ میماب اکبرآبادی مرحوم

اُردو کا سینتیسواں سالانہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

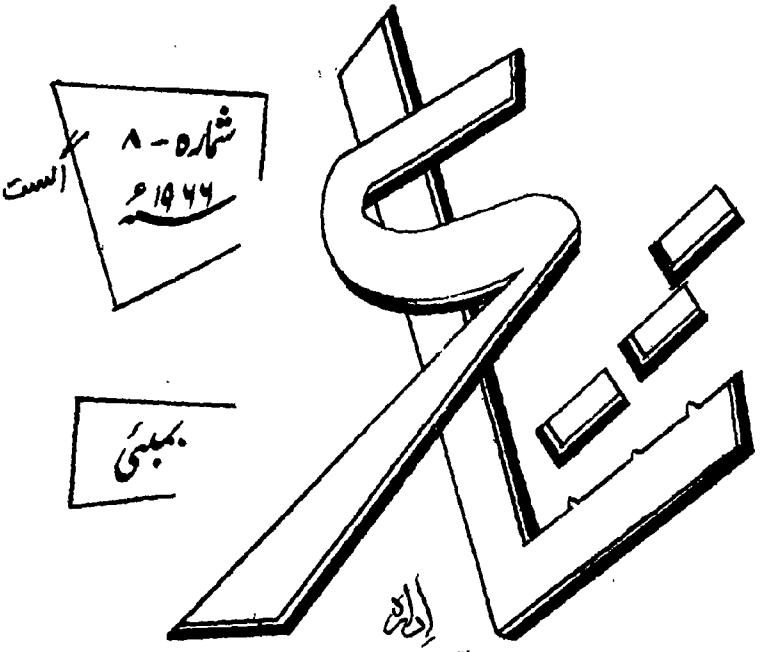

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	معاونین سے	تاعمر خریداری	ممالک غیر سے	فی پرچہ
آٹھ روپے	پچیس روپے	۱۲۵ روپے	۲۵ شلنگ	۱۲ آنے (۷۵ پیسے)

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ شاعر، فقیر الادب - بمبئی ۸ بی سی

خط و کتابت کا پتہ

مکتبۂ قصرِ الادب

پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶ - بمبئی ۸ بی سی

دہلی آفس
۱۲۱۱ - بلیماران - دہلی ۶

کلکتہ آفس
۱۲ کانگریس بلڈنگ - ریپن روڈ - کلکتہ ۱۷

دی بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک لمیٹڈ

۸۷۔ محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳

منظور شدہ سرمایہ	۲۰،۰۰،۰۰۰	روپے
جاری کردہ اور وصول شدہ سرمایہ	۱۹،۴۰،۸۰۰	″
محفوظات اور دیگر فنڈ	۹،۱۵،۷۰۰	″
ڈیپازٹس	۴،۲۴،۴۴،۹۰۰	″
نقد رقم اور سرکاری تمسکات میں مسلکہ سرمایہ	۲،۶۱،۲۱،۹۰۰	″
ایڈوانسز	۱،۸۴،۰۵،۰۰۰	″
کاروباری سرمایہ	۴،۸۴،۶۳،۰۰۰	″
سالانہ کاروبار زائد از	۷۲،۰۰،۰۰،۰۰۰	″

آخری منافع جو ادا کیا گیا (بونس سے مستثنیٰ اور خاص بونس کے ساتھ) ۹ فی صد

سرکاری آڈٹ کی درجہ بندی "اے"

ہماری خصوصی خدمات

ہوم سیونگ سیف ← ہوم سیونگ سیف اکاؤنٹ میں اپنی روزمرہ کی بچت کر کے، نکالنے کے لئے کتابی شکل میں جمع کیا جاتا ہے۔ اس پر پلے ۴ فی صد سود دیا جاتا ہے۔

نائٹ سیف ← یہ ایک انوکھی خدمت ہے جو ہیڈ آفس میں انجام دی جاتی ہے۔ بنک کے ممبران اور معاملین بنک کے اوقات کے بعد بھی اپنی دن بھر کی کمائی بنک کے "نائٹ سیف" میں رکھ سکتے ہیں اور اس طرح رات کے وقت چوری کے خطرے سے بے فکر ہو سکتے ہیں۔

ہائر پرچیز کے انتظامات ← نہایت رعائتی نرخ پر بنک سے قرض لے کر سلائی کی مشین، کپڑے دھونے کی مشین، ریفریجریٹر، گھریلو اسپین ڈرائر، بجلی کے پنکھے، دریچے کے ٹائپ کی ایرکنڈیشنڈ مشین حاصل کی جا سکتی ہے۔

بینکنگ سے متعلق ہر طرح کے امور انجام دئے جاتے ہیں

شاخیں (بمبئی)

(۱) ۱۰۔ اے۔ بی اور ۷۔ اے۔ بی۔ نل بازار بمبئی ۳

(۲) ۲۹۴ صدر اسٹریٹ۔ بمبئی ۳

(۳) صابو صدیق مسافر خانہ پلیٹفارم روڈ۔ بمبئی ۹

احمد آباد

(۴) فوارہ گاندھی روڈ
(احمد آباد۔ گجرات)

زرین جی۔ رنگون والا
(مینجنگ ڈائرکٹر)

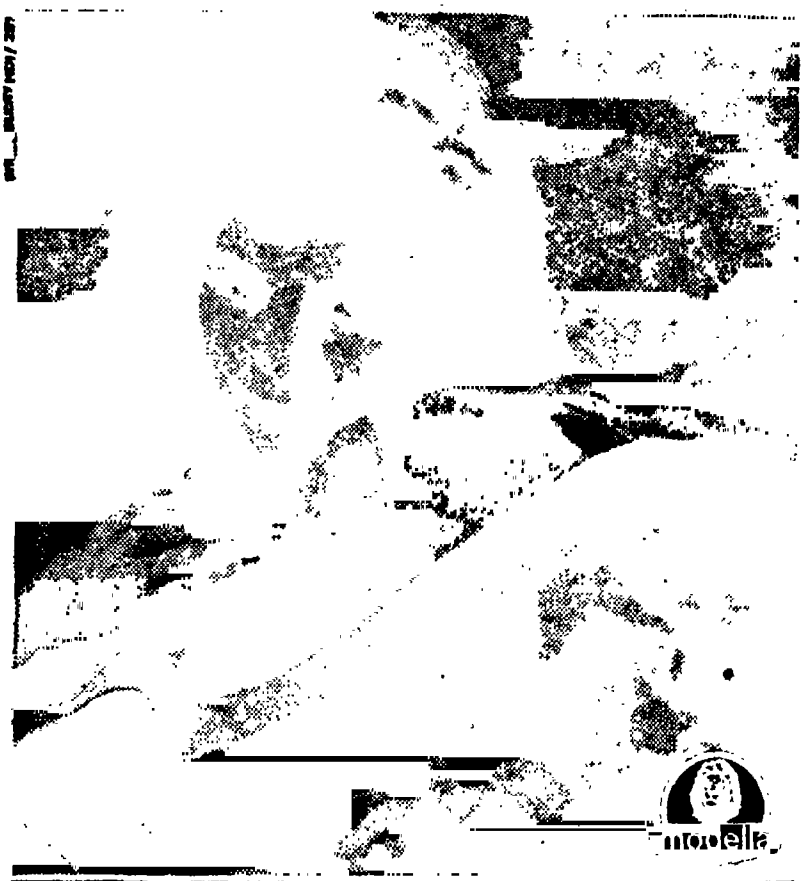

م م م م م ..... !	موسم سرما کا لطف اُٹھائیے۔ موڈیلا کمبلوں میں آرام کیجیے۔ اُن کے پشمینہ کی گرمی سے فرحت حاصل کیجیے اُن کے دلکش رنگوں سے مسرور ہوئیے۔	بہترین قسم کے کمبلوں کے لیے۔ جنے ہوئے اور گرم یا رجہ جات۔ خریدنے سے پہلے اطمینان کر لیجیے **موڈیلا** موڈیلا پرائیویٹ لمیٹڈ ۴۔ سی ڈلکن انشورنس بلڈنگ ویر نریمان روڈ۔ بمبئی ۱

اعجاز صدیقی کی طویل شاہکار نظم

خوابوں کا مسیحا

(ایک ساتھ تین زبانوں میں شائع ہوگئی)

خوابوں کا مسیحا ہی مشہور نظم ہے جو ہندوستان کے نجات دہندہ پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال کے بعد کہی گئی تھی یہ نظم ریڈیو سے نشر ہونے کے علاوہ مختلف شہری مجموعوں حکومت ہند کی کتابوں اور اخبارات اور رسائل میں بھی شائع ہو کر مقبول ہوئی تھی

نیا روپ

اسی نظم کو اعجاز صدیقی نے ایک بالکل نیا روپ دیا ہے۔ اس میں مزید بارہ طویل و مختصر نئے بندوں کا اضافہ اور نظر ثانی کر کے نظم کو شاہکار کا درجہ دے دیا ہے۔ ایک پورا نیا بند پنڈت نہرو کی "راکھ" پر شامل کیا ہے۔ نظم کے تمام نئے بند غیر مطبوعہ اور ناشنیدہ ہیں۔ اب یہ پہلی نظم سے بالکل مختلف ہے

اس طویل ELEGY میں جواہر لال نہرو کی ہمہ گیر شخصیت اور اُن کے تصورات و معتقدات کا گہرا نفسیاتی مطالعہ تمام شاعرانہ لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس کے ایک ایک مصرعے سے ایشیا کے اس عظیم رہنما کی پوری زندگی جھلکتی اور چمکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ نظم پنڈت نہرو کی عظمت کی ایک خوبصورت علامت بن گئی ہے

خوابوں کا مسیحا

● امن عالم کے لئے ایک پیغام بھی ہے اور لمحۂ فکریہ بھی ●

یہ پہلا شعری مجموعہ تھا جو ایک ساتھ اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں نہایت اہتمام سے شائع ہوا ہے نظم کا انگریزی ترجمہ مترنم، رواں خوبصورت، اردو سے قریب اور بجائے خود ایک مکمل نظم ہے۔ ہندی روپ بھی قابل داد ہے۔

دیباچہ ——— کرشن چندر

انگریزی ترجمہ:۔ ماہر کلیانی ہندی روپ:۔ ندا فاضلی

طباعت و لیتھو کی نفیس طباعت۔ اعلیٰ کاغذ۔ خوبصورت جلد

دو رنگے گرد پوش پر پنڈت نہرو کا خوابناک اسکیچ

قیمت دو روپئے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ

مکتبۂ قصر الادب۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶۴ بمبئی نمبر ۸ بی سی

ادارۂ "شاعر" فخر و مسرت کے ساتھ

اُردو کے مشہور آفاقی افسانہ نگار

کرشن چندر

پر نہایت ضخیم، شاندار اور رمنگالی نمبر پیش کر رہا ہے

کرشن چندر کی منفرد شخصیت ادب اُس کے ہمہ گیر فن پر نہ صرف ہندوستان کی کئی زبانوں کے مشہور قلم کاروں بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مصنفین اور مفکرین کے مضامین و تاثرات

کرشن چندر نمبر

میں پیش کئے جائیں گے

کرشن چندر

کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ، اُس کی عظمت کی کہانی، اس کی تصانیف کا جائزہ، اُس کے زندہ اُسلوب فکر اور شاہکار افسانوں ناولوں اور ڈراموں پر

تنقیدی نظر

درجنوں تصاویر

تفصیلات اور تاریخ کا انتظار کیجئے

ارباب قلم اپنے مضامین کرشن چندر پر جلد از جلد ارسال فرمائیں

ترتیب

نام بنام	(اداریہ)	اعجاز صدیقی	۸
گھونگھٹ	(خمسے)	فراق گورکھپوری	۹
نئی شاعری۔ نیا زاویہ	(مقالہ)	مسعود قمر تاباں	۱۰
اعلان	(نظم)	میکش سرمستی	۱۴
محبت کے سوا	(افسانہ)	کوثر چاندپوری	۱۵
غزل		محسن زیدی	۱۹
غزل		ضیا فتح آبادی	۱۹
ایک خط	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۲۰
فکر تونسوی کی طنز و ظرافت	(مقالہ)	مناظر عاشق ہرگانوی	۲۲
خواب زار	(نظم)	شاذ تمکنت	۲۵
چاہیاں	(افسانہ)	مہندر ناتھ	۲۷
سندھیا دربار کی ہولی	(یادداشت)	ندا فاضلی	۳۲
غزل		مظہر امام	۳۵
غزل		زبیر رضوی	۳۵
خواب ڈھونڈوں کہاں	(افسانہ)	اکرام جاوید	۳۶
حسرتِ بسترِ گل	نظم	اویس احمد دوراں	۴۲
سردی منزل	(طنز و مزاح)	احمد جمال پاشا	۴۲

شاعر بمبئی

اگست ۱۹۶۶ء

مسیحا	(افسانہ)	آغا خورشید مرزا دہلوی	۴۴
غزل		فضیل جعفری	۴۹
غزل		کرشن موہن	۴۹
آدھ گھنٹہ پروفیسر کلیم الدین احمد کے ساتھ	(یادداشت)	ڈاکٹر سلام سندیلوی	۵۰
بادل	(نظم)	ذکا صدیقی	۵۳
ایامی	(ڈرامہ)	اظہر افسر	۵۴
تیز آہٹ	(نظم)	ظہیر ناشاد	۶۲
غزل		اقبال طاہر	۶۲
رم جھم	(سائنسی افسانہ)	نسیم احمد	۶۳
اردو کا پہلا دستیاب سندھی ڈراما (روحِ انجن)		ڈاکٹر عبدالعلیم نامی	۶۵

مکتوبات

نازش پرتاپگڈھی — اظہر افسر — زبیر رضوی
مظہر امام — اکرام جاوید — ظہیر صدیقی
ندا فاضلی — عنوان چشتی — بدیع الزماں خاور
عبدالقوی دسنوی — محسن زیدی — راز سنتوکھری
ڈاکٹر گیان چند — محمد عظیم — علی عباس امید

نقد و نظر	(تبصرے)	(ا۔ع۔ص)	۷۵
محفل اپنی...!		ادارہ	۷۹
سرفراز	(ادبی و تہذیبی خبریں)	ادارہ	۸۱

جُرعاتے :

نام بنام

جولائی کے اداریے میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ اُردو تحریک کی ناکامی کے جہاں بہت سے دُوسرے اسباب ہیں، وہیں ایک سبب یہ بھی ہے کہ اُردو کی مشہور و ممتاز شخصیتیں عملی طور پر سامنے نہیں آتیں۔ اور اگر آتی ہیں تو اجتماعی طور پر نہیں۔ اٹھارہ سال کی طویل مدت میں اُردو تحریک نے سیکڑوں رُخ بدلے صرف اتنی سی بات کیلئے کہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اُردو کو اُسکے جائز حقوق دیدیں۔ ہر جگہ اُردو کی باقاعدہ تعلیم ہو۔ بلاشبہ ہزاروں قراردادوں جلسوں، تحریروں اور تقریروں نیز مختلف حلقوں سے اُردو والے گُذر چکے ہیں۔ اگر اُردو تحریک کی اٹھارہ سالہ تاریخ مرتب کی جائے اور اس کے لئے ہم نے جو کچھ کیا اُس کے ذکر سے ہزاروں صفحات بھر سکتے ہیں۔ مگر نتیجہ ۔۔۔؟

اُردو تحریک کی مسلسل ناکامی کا ایک سبب سمجھ میں آیا اور اُسی کی طرف گزشتہ شمارے کے اداریے میں اشارہ کیا گیا تھا۔ بات ذرا اُلجھی ہوئی تھی اور نام بنام، اس لئے دلوں کو بر نہ لگی۔ یُو۔ پی کے اخبارات میں یہ اچھا خاصہ موضوعِ بحث بن گئی ہے۔ اس شمارہ کے مکتوبات میں بھی ایک خط اس بحث کو آگے بڑھانے کی دعوت دیتا ہے۔ بحث کو چاہے بڑھایئے یا گھٹایئے، وہ بحث ہی رہے گی۔ کوئی مثبت نتیجہ تو نکلنے سے رہا۔ مگھوہی نہیں، ہندوستان کے ہر شہر اور قصبے کے ہر اُس گمنام اور نام آور، جوان اور بوڑھے کو راقم الحروف کا خراجِ خلوص و محبت، جو اُردو کے لئے میدانِ عمل میں آئے، سر سے کفن باندھے اور اپنے ہاتھوں میں اُردو کا مقدس پرچم لیکر گولیوں کی بارہ کے سامنے سینہ سپر ہو جائے۔ اُردو کے ہر اُس فدائی کو سلام عقیدت جو مقتل کی طرف خراماں خراماں بڑھے۔ مگر وہ تنہا نہ ہو۔ اُس کے پیچھے فدا ہونے والوں کی ایک بھیڑ ہو۔ شہید انِ اُردو کی لاشیں اُٹھانے والوں کا ایک جمِ غفیر ہو۔ بلا تخصیصِ رتبہ و منصب جبتک محمود و ایاز ساتھ ساتھ نہ ہونگے، چلائے جائیے اپنی اُردو تحریک۔ رہا نتیجہ تو عاجل تو کچھ ہوگا نہیں، چاہے ایمان انگیز مضامین لکھئے چاہے شعلہ بار تقریریں کیجئے۔

نازک اندامانِ اُردو ——

تمہارے رُخ کو اگر اُس کے وقت پر موڑا جائے یا خود نہ مڑا جائے تو سوائے تباہی کے اور کیا ہو سکتا ہے کیا سیاسی اور جمہوری اُصولوں کو بھی ہم نہیں سمجھ سکتے بہت معمولی ہاتھ نہ جھکنے والے ہاتھ جب ایک ساتھ اُٹھ جاتے ہیں تو دستوری غلطیوں کو بھی جھک جانا پڑتا ہے، مگر ہر وقت، بعد از وقت نہیں۔ چُپ چُپ کے "اُردو" کے لئے آہ و زاری، غلطیوں کے محلوں میں محفوظ بیٹھے ہوئے اُردو والوں پر سنگ باری تو کام آ نہیں سکتی۔ اگر کوئی چیز کام آ سکتی ہے تو وہ احساس کی چنگاری ہے جو سب کے سینوں سے پھوٹے اور شعلہ بن جائے کبھی نہ بجھنے والا شعلہ! تو پہلے یہ شعلہ بھڑکایئے سب کے سینوں میں۔ تاریخ نہ ہمارا قلم الحروف کو معاف کریگی اور نہ غلیشہ کے محلوں میں بیٹھنے والوں کو ۔۔۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں اُردو کے مٹنے کی تاریخ کم از کم نصف صدی بعد لکھی جائے گی، اُس وقت ہم ہی مجرم ہی ہوں گے ہماری کوتاہیاں ہوں گی، خود غرضیاں اور تن آسانیاں ہوں گی۔ شاید تاریخ لکھنے والے ہاتھ بھی وہی ہوں، جو قتل کرنے والے ہیں۔

سوال اس وقت کا ہے۔ اس سے پہلے مواقعات کا ہے جنہیں ہم نے کھو دیا ۔۔۔ حیات اللہ انصاری اور بیگم انیس قدوائی نے پارلیمنٹ میں شدّ و مد کے ساتھ اُردو کا سوال اُٹھا دیا۔ صدر جمہوریۂ ہند نے بھی غالباً پہلی بار اُردو کی عظمت و اہمیت اور اُس کی ضرورت و بقاء کے لئے اپنی بیباکانہ رائے کا اظہار کر دیا۔ یُو۔ پی کی وزیر اعلیٰ سُچیتا کرپلانی نے ازراہِ کرم یہ فرما دیا کہ اگر کسی جگہ دس بچے بھی اُردو تعلیم کیلئے ہوں تو وہاں اُردو تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ یہ تو بالکل تازہ باتیں ہیں ۔۔۔ مگر ان کے نفوذ و عمل کے لئے کیا "بھوک ہڑتالی نوجوان" ہی کام آئیں گے؟ کیا اس وقت پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، پنڈت مُنشی نرائن، آلی احمد سُرور، آنند نرائن ملا، فراق گورکھپوری، حیات اللہ انصاری، مفتی عتیق الرحمٰن، سردار جعفری، ڈاکٹر عابد حسین، بیگم انیس قدوائی، خواجہ غلام السیدین، اختر حسین رائے پوری، خورشید الاسلام، جذبی، احمد ندیم قاسمی، اختر ۔۔۔۔ اور اسی طرح کی اُن شخصیتوں کو جو اُردو کے لئے آواز میں بلند اور کام کر رہے ہیں۔ سجاگنے دوڑنے کی ضرورت نہیں؟

۱۵ اگست ۱۹۶۰ء

فراق گورکھپوری

گھونگھٹ

اِدھر میں نے کچھ اپنے اشعار اور بہت سے فارسی اور اُردو شعراء کے اشعار پر خمسے کہہ ڈالے ہیں۔ اِن تضمینوں کا نام میں نے "گھونگھٹ" رکھا ہے۔ یعنی اصل شعر ایک خوبصورت چہرہ ہے اور اُوپر سے لگائے ہوئے میرے تین مصرعے اِس چہرے پر گھونگھٹ کا کام دے رہے ہیں۔ بیمار بھی ہوں اور بہت بے فرصت ہوں۔ پانچ تضمینیں بھیج رہا ہوں۔

اِس دیارِ بے کسی میں زندگی کی بُو نہ باس
خود نقابِ رُخ ہے روئے آتشیں کی آب و تاب

کچھ نہیں کہتی خموشی کیا گماں ہو کیا قیاس
یوں تو سچ ہے آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

کوئی آگے ہے نہ پیچھے دُور ہے کوئی نہ پاس
پردے آنکھوں کے جلا دے شعلہ سامانِ شباب

پھول خشک افسردہ سبزہ شمع چپ بالیں اداس
آفتاب از پرتوِ خویش است دائم در حجاب

دل بھر آیا عالمِ گورِ غریباں دیکھ کر
آشکارا کردۂ خود را و پنہانی ہنوز

تسلیم لکھنوی

ناصر علی

کل تک اپنا بھی نشیمن تھا میانِ گلشن
کس نشے کی فضاؤں میں تاثیر نظر آئی

مِل کے گاتے تھے تو لَو دیتے تھے مِنقار و دہن
کس خوابِ اسیری کی تعبیر نظر آئی

شعلۂ نغمہ سرِ لالۂ و گُل عکس فگن
کس چاکِ گریباں کی تصویر نظر آئی

خبرِ من برسانید بہ مُرغانِ چمن
کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میر نظر آئی

کہ ہم آوازِ شما در قفسے افتادہ است
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

شیخ سعدی

میر

اِس شہر کے سب خطّے بُت خانۂ آذر تھے
سب پیکرِ رعنائی رشکِ مہ و خاور تھے

ایمان کو غش آئے یہ وہ بُت کافر تھے
دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے

جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

میر

مسعود قمر تاباں

نئی شاعری — نیا زاویہ

تجربات ادب میں زندگی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر زبان اور ہر ملک کے ادب میں تجربات ہوتے آئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اردو ادب کا بھی مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اردو میں ہمیشہ ہی سے تجربات ہوتے آئے ہیں اور آج بھی جاری ہیں۔ دورِ حاضر ایک طرح سے اگر تجربات کا دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آج ادب کا میدان زندگی کے ہر میدان میں جس تیزی کے ساتھ تجربات ہو رہے ہیں ماضی میں دور دور تک اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ بہرحال تجربات کے اس دور میں دنیا کی دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو ادب کا دامن بھی تجربات سے خالی نہیں ہے، جو ہر زبان کی ہمہ گیری اور وسیع دامانی کی دلیل ہے۔ ہر نئی نسل اپنے ساتھ کچھ تجربات لے کر آتی اور اسے اپنے پیچھے کی نسلوں کی طرح مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نئی اور پرانی نسل کی معرکہ آرائیاں، کوئی نئی بات نہیں۔ یہ ہمیشہ سے ہوتی آئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ دورِ حاضر کی نئی نسل گذشتہ نئی نسلوں سے زیادہ سرکش تو ضرور ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی زیادہ طاقتور نہیں بن سکی ہے اس کی وجہ شاید خلوص اور اجتماعیت کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ اس نے اپنی قوت کو ٹکڑوں میں بانٹ رکھا ہے حالانکہ نئی نسل کی فوج میں تجربہ کار سپہ سالاروں سے لے کر نگرزٹوں تک ایک قابلِ لحاظ تعداد موجود ہے۔ لیکن تنظیم و ڈسپلن کی کمی کی وجہ سے اس فوج میں فی الحال انتشار اور بدامنی کا دور دورہ ہے۔ اور ساتھ ہی اچھے کمانڈروں کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ فوج ابھی تک شاندار کامیابیاں حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نئی نسل کی بیزاری سے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو آنے والا کل نئی نسل کے لئے درخشاں مستقبل کی نوید لے کر آئے گا۔ آج کے پراگندہ حالات سے ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس وقت ہم انتہائی خلوص، لگن اور ایمانداری کے ساتھ گیسوئے اردو کو نئے نئے اسالیب (اسٹائلس) سے سنوارنے میں منہمک ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ آج کے لوگ (ذہنی طور سے) گیسوئے اردو کو جدید فیشن کے مطابق سنوارے جانے کی مخالفت میں اپنی ساری قوت صرف کر دیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ کل یہی لوگ ہمارے ساتھ مل کر دوشیزۂ اردو کے بالوں کو سنوارنے کی کوشش کریں گے لیکن یہ ان کی بدقسمتی ہوگی کہ اس وقت تک کچھ اور جدید اسٹائل ایجاد ہو چکے ہوں گے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ ہمیشہ سے جدید و قدیم کا ٹکراؤ چلا آ رہا ہے اور ہر دور میں نئی نسل کی جدت پسند مجتہدین کی رہی ہے، حالانکہ ہر نئی نسل کی ابتداء میں مخالفت کی جاتی رہی ہے لیکن آخر کار ہر پرانی نسل کو ان مجتہدین کے آگے سر جھکانا ہی پڑا ہے۔

ہر نئی نسل اپنے زمانے میں ترقی پسند ہی ہے۔ غالب، حالی، آزاد، اور اقبال اپنے دور کے عظیم ترقی پسندوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ غالب نے جب زمانے کی روش سے ہٹ کر اردو غزل میں کچھ نئے تجربات کئے تو اس پر کون سا ساتھ حاضر نہ ہوا۔ اس کے لئے تو یہاں تک کہہ دیا گیا کہ "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" لیکن بعد کی نسلوں نے غالب کی عظمت کو سمجھا اور عوام کو اس سے روشناس کرایا۔ اسی طرح حالی کی کیا کیا مخالفتیں نہیں کی گئیں اور بیچارے اقبال کے لئے تو زاہد تنگ نظر نے کفر کا فتویٰ بھی صادر فرما دیا تھا۔ سے گریز نہیں کیا۔ اسی طرح ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ترقی پسند تحریک ایک طوفان کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ طوفان اتنا تیز رفتار تھا کہ بڑی بے دردی کے ساتھ ہر قدیم، پوسیدہ اور کمزور چیز کو اپنے زور میں بہا لے گیا۔ اس تحریک کے ساتھ بھی ہمیشہ کی طرح ایک جم غفیر ہو لیا۔ لیکن دیر سے آخر کار یہ بھرتی بھی چھٹی اور ہزاروں نہیں تو سیکڑوں اور سیکڑوں نہیں تو کچھ اصول "ٹھگ ادب کے شہزادوں" میں سے آج اتنے بھی باقی نہیں ہیں کہ جنہیں انگلیوں پر گنا جا سکے۔ حالانکہ اس تحریک

نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا لیکن ایک مخصوص لفظ انگن کی پابندی کی وجہ سے اس تحریک کا میدان محدود ہو کر رہ گیا اور یہ بڑی جلدی زوال پذیر ہو گئی۔ اس تحریک نے جہاں مظفر حنفی، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی جیسے افسانہ نگار دیئے وہیں سردار جعفری، مجروح، ساحر، جاں نثار اختر، مخدوم اور کیفی جیسے شاعر بھی۔ لیکن منٹو اگرچہ طبعی موت مرے تو عصمت چغتائی نے خاموشی کی موت اختیار کر لی۔ اور کرشن چندر کے یہاں بھی وہ پہلی سی آب و تاب باقی نہیں رہی۔ اسی طرح مجروح، ساحر، جاں نثار اور کیفی نے فلمی زہر نوش کر کے وقت سے پہلے خود کو مخدوش بنا لیا۔ اس کے برخلاف سردار جعفری اور مخدوم آج بھی زندہ ہیں اور ان کے اندر ابھی بہت زندہ رہنے کی بھرپور توانائی نظر آتی ہے۔

اب آیئے جدید ترین نسل پر ——— تاریخ کے اوراق الٹتے چلے جایئے لیکن آپ کو کہیں یہ آثار اور پرآگندگی نہیں ملے گی جو اس نسل کی امتیازی خصوصیت بنی ہوئی ہے۔ لیفٹیننٹ کمانڈر کی یہ فوج اگر ایک طرف چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے تو دوسری طرف اس میں بہت سے ایسے غیر تربیت یافتہ سپاہی گھس آئے ہیں جو اپنے خول سے باہر آنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور خود ساختہ خول میں بیٹھے ہوئے "اچھا مارا پیارے نیست" کا ورد کرتے رہتے ہیں۔ آج نئی شاعری پر جتنے بھی اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ سب نہیں تو ان کا زیادہ حصہ ایسے ہی "درانداز" پر چسپاں ہوتا ہے لیکن ان اعتراضات کی وجہ سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان سے نئی نسل کے شاعروں کو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ برسات کا موسم ہی کتنا ہوتا ہے پھر جاڑے کا عالم خواب (HIBERNATION) شروع ہو جائے گا۔

نئی نسل کے شاعروں کو ہم دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اگر ایک طرف تجربات کے نام پر کوا اس کرنے والوں کا ایک جم غفیر نظر آتا ہے تو دوسری طرف ایک گروہ ایسا بھی ہے جو تن من دھن سے انتہائی ایمانداری کے ساتھ اپنے تجربات کو سنوارنے میں مشغول ہے حالانکہ ابھی اس گروہ میں بھی یک رنگی پیدا نہیں ہو سکی ہے اور کسی نہ کسی حد تک انتشار بھی پایا جاتا ہے۔ پھر بھی تو کا امید ہے کہ یہ گروہ اردو ادب کے دامن میں کچھ بیش بہا موتی کا اضافہ کرنے میں کامیاب ہو گا۔ اس گروہ میں بہت سے لوگوں کو شمار کیا جا سکتا ہے لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ پھر اس قسم کی بحثیں اپنے محور سے ہٹ کر صرف نام تک محدود ہو جایا کرتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخص سیکڑوں صفحات پر بکھرے ہوئے ادب کا ایک ایک لفظ پڑھنے میں کامیاب ہو ہی جائے جیسا کہ اشہب زماں نقد کرسانس لینے کو تیار نہیں معلوم ہوتا۔ اور پھر "اور بھی دکھ ہیں زمانے میں ....." ؟ بہرحال اس وقت میرے ذہن میں جو نام گونج رہے ہیں ان میں محمد علوی، شہاب جعفری، اختر الایماں، شہریار، مدافاضلی، خلیل الرحمٰن، عمیق حنفی، قاضی سلیم، بلراج کومل، کمار پاشی اور باقر مہدی وغیرہ شامل ہیں۔ مذکورہ نئے شاعروں میں یکرنگی کی کمی دلالتوں کے انتشار کی طرح کھٹکتی ہے۔ محمد علوی، شہاب جعفری، اختر الایماں، خلیل الرحمٰن، مدافاضلی اور شہریار کی تخلیقات عموماً دوسرے شعراء کے مقابلے میں زیادہ صاف و شفاف دلکش اور زیادہ اپیل کرنے والی ہوتی ہیں۔ ان کی زیادہ تر تخلیقات میں فکر کی گہرائی اور سماج کے مختلف طبقات کے مسائل کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ جبکہ عمیق حنفی، کمار پاشی، قاضی سلیم اور باقر مہدی وغیرہ کی زیادہ تر تخلیقات گنجلک اور مبہم ہوتی ہیں جنہیں بعض اوقات تو سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر بھی ان لوگوں کے یہاں کچھ تخلیقات ایسی ضرور مل جاتی ہیں جنہیں نئی شاعری کے بارے میں کچھ لکھتے وقت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شہاب جعفری کی نظم "سورج کا شہر" ان کی دیگر نظموں کی طرح ہر لحاظ سے ایک خوبصورت نظم ہے جس میں فکر و فن کی گہرائی اپنی تمام تر لطافتوں کے ساتھ موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی ایک نیا آہنگ ملتا ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اپنی دھرتی پہ نہ میں ہوں نہ مرا سایہ ہے　　نظر آتا نہیں کچھ دیدۂ بے خواب مجھے

محمد علوی کے یہاں علامات نسبتاً واضح اور کچھ میں آنے والی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی تخلیقات زیادہ اپیلنگ بن جاتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی نظم "مشورہ" ملاحظہ ہو۔

مری جاں اس قدر اندھے کنویں میں　　بھلا یوں جھانکنے سے کیا ملے گا
کوئی پتھر اٹھاؤ اور پھینکو　　اگر پانی ہوا تو چیخ اٹھے گا

مدافاضلی کے فن میں ایک ایسی انفرادیت ہے جو دوسروں کے یہاں کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ عام طور سے مدافاضلی کی وہ نظمیں زیادہ اپیل کرتی ہیں جن میں سماج کے مختلف طبقوں کے تضادات و ازادی کی نفسیات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ایک لڑکی کے خواب، فیندر اور بھگوڑے خواب جیسی نظمیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مدافاضلی نفسیات اور خصوصاً جنسی لطیف کی نفسیات میں کتنا گہرا دخل رکھتے ہیں۔ یہ نظمیں گنجلک اور مبہم علامات سے پاک ہونے کے ساتھ مدافاضلی کے فن کا بہترین نمونہ

کہا جا سکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ نداؔ فاضلی کی خاص علاماتی نظمیں بھی اپنے ہم عصروں سے زیادہ شفاف اور زیادہ واضح ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک نظم "دو کھڑکیاں" ملاحظہ ہو۔

آمنے سامنے دو کھڑکیاں
ملتی سگریٹ کی لہراتی آواز میں
سُوئی ڈورے کے رنگین الفاظ میں
مشورہ کر رہی ہیں کئی روز سے
شاید اب بوڑھے دروازے سر جوڑ کر
وقت کی بات کو وقت پر مان لیں
نیچ کی ٹوٹی پھوٹی گلی چھوڑ کر
کھڑکیوں کے اشاروں کو پہچان لیں

عمیق حنفی کی "سندباد" افسوس ہے کہ "سندباد" کو "ایک طویل نظم" ماننے کیلئے میں خود کو ابھی تک تیار نہیں کر سکا۔ کچھ ٹکڑے یا میری رائے میں کچھ نظمیں بہت خوبصورت ہیں جن میں صنفی ترقی کے ساتھ بڑھتے ہوئے مسائل کی بڑی خوبی کے ساتھ عکاسی کی گئی ہے اور جن کا شمار اس سال کی بہترین نظموں میں کیا جانا چاہیئے۔ بہرحال "سندباد" "ایک طویل نظم" یا "کئی نظموں" کی بحث سے زیادہ اہم ہے۔ "سندباد" کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

آج "نوساختہ" کھنڈروں میں گھرے
کائکوں بند ڈبوں کے بد دل مکیں
ہر طرف ہر قدم ہیں اسی سوچ میں
یہ زمیں وزن بھی اُن کا سہہ پائے گی!
یا قدم دو قدم بعد ڈھہ جائے گی!
یا لہو اور اشکوں میں بہہ جائے گی!

شہریار کی غزلیں اُن کی نظموں سے زیادہ اپیل کرتی ہیں۔ اُن کی شاعری نئی نسل کی نفسیات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ ایک مختصر سی نظم اور غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

سرد شاخوں پہ اوس کے قطرے
ہیں ابھی محوِ خواب اور سورج
رتھ پہ اپنے سوار آتا ہے

لا کہ خورشید سرِ بام اگر ہیں تو رہیں ہم کوئی موم نہیں ہیں کہ پگھل جائینگے

کمار پاشی کے یہاں الجھاؤ اور ابہام نے اُن کی شاعری کے زیادہ حصّے کو گنجلک اور مبہم بنا دیا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ عادل منصوری کی طرح بالکل ہی گنجلک، مبہم اور سطحی انداز کی نہیں ہیں۔ کمار کے یہاں بعض بعض اچھی نظمیں اور اشعار مل جاتے ہیں۔ کمار پاشی کی نظم "ایک تصویر" دیکھئے۔

آسماں چپ چاپ تکتا ہے زمیں کو
اور ہیبت ناک بادل
سر پہ چیلوں کی طرح منڈلا رہے ہیں
چاند بھی اب چلتے چلتے

یوں ٹھٹک کر رہ گیا ہے
جیسے کھائی میں لڑھکنے سے بچا ہو
جل رہا ہے آگ میں دھرتی کا سینہ
بجھ رہا ہے چرخ پہ اک اک ستارہ
ہانپتا ہے شہر سارا

اس مختصر سے مضمون میں زیادہ پوری نئی شاعری کا احاطہ ہی کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ہر شاعر کے یہاں سے مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے مجھے نئی نسل کے قلمکاروں سے انتہائی پر خلوص گذارش کرنا ہے کہ وہ ایک تجرباتی دور سے گذر رہے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر تجربہ کامیاب ہی ہو اور نہ ہی اس کی ضد کرنا دانشمندی کی علامت ہے۔ اُن کے تجربات کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ اُن کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بلکہ آئندہ نسلیں ہی اس کا صحیح VALUATION کر سکیں گی۔ وہ جو تجربات کر رہے ہیں اگر اُن میں خلوص اور ایمانداری شامل ہے تو یقین رکھنا چاہیئے کہ یہ تجربات ضرور کامیاب ہوں گے۔ لیکن اگر اُن تجربات میں خلوص اور ایمانداری کی جگہ جعلی شہرت کی خاطر عوام کو چونکانے کی شعوری کوشش یا روایات سے سراسر انحراف اور اپنے سے قبل کی نسلوں کی تحقیر کرنا ہے (جیسا کہ کچھ "دور اندازوں" نے اپنا شیوہ بنا لیا ہے) تو یاد رکھنا چاہیئے کہ پھر زندہ ہی رہیں گے اور نہ اُن کے تجربات۔ عوام سے بے بہرہ ہو کر کوئی ادب ترقی نہیں کر سکتا۔ نئی نسل کیلئے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہونا چاہیئے کہ ہم جو ادب تخلیق کر رہے ہیں اس کا عوام سے بھی کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ ہر ادب کی ترقی اور بلندی کا انحصار اُس کے جاننے والے اور قارئین کا حلقہ ہوا کرتا ہے۔ اگر نئی نسل کے ادیب قارئین کا حلقہ پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو نتیجہ معلوم! ہر زبان اور ادب کا اپنا ایک مخصوص مزاج اور ماحول ہوا کرتا ہے۔ دوسری زبانوں کے ادب سے کوئی چیز مستعار لیتے وقت اس بات کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ ہماری زبان کی طبع نازک پر گراں تو نہیں گذرے گا۔ اور پھر شاعری تو کیف و سرور کا دوسرا نام ہے۔ اگر اس میں سے یہی عنصر ختم کر دیا جائے تو پھر وہ شاعری، شاعری کہلانے کی حقدار تو کبھی نہ بن سکے گی۔

■■

آہ ـــــ راجہ مہدی علیخاں

موت کا سفاک ہاتھ کسی کو نہیں چھوڑتا۔ راجہ ہو یا پرجا، غمگین ہو یا ہنسوڑ۔ زندگی کا کیا ہے، بس پانی کا ایک بلبلا ہے۔ کون جانے کب یہ ٹوٹ جائے۔ کب زندگی کا بہتا ہوا دھارا رُک جائے۔ ؎ "بے ثباتی سی بے ثباتی ہے"

کل تک ہماری محفلوں میں راجہ مہدی علیخاں زعفران زار بنے ہوئے تھے۔ آج اُن کا ہماری بزم جسم جواں کے لئے تکلیف دہ اور دوسروں کیلئے باعث دلچسپی ہوا کرتا تھا، منوں مٹی کے نیچے دبا ہوا ہے۔ سب کو ہنسا ہنسا کر رُلا کر دینے والے نے یہ بھی دکھایا کہ وہ رُلا بھی سکتا ہے۔

۲۶ جولائی ۱۹۶۶ء کو شب کے تین بجے نیشنل سینیٹوریم باندرہ (بمبئی) میں راجہ مہدی علیخاں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اُن کی عمر صرف پچاس سال تھی۔ تقریباً ایک مہینے سے بیمار تھے۔ وہ ضلع انبالہ پنجاب میں پیدا ہوئے تھے اور ایک ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کی والدہ محترمہ بھی لکھتی تھیں۔ اُن کے حقیقی چچا ظفر علیخاں اردو زبان کے مشہور شاعر اور صحافی (روزنامہ زمیندار کے مدیر) تھے۔ شعر و ادب اُن کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے۔ گریجویشن کے بعد وہ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے تھے۔ پھر ۱۹۴۷ء میں فلمی دنیا میں آئے۔ برسوں کی کاوش کے بعد اب اُن کا زمانہ عروج آیا تھا۔ وہ ایک بہت اچھے گیت نگار بن گئے تھے۔ ادھر کئی فلموں میں اُنھوں نے بہترین گیت لکھے۔

اُن کا میدان میلان طنز و مزاح تھا۔ اور وہ بیحد مشہور تھے۔ ہندو پاک کے بیشمار رسائل و اخبارات میں اُن کی مزاحیہ نظمیں اور اُن کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ اُن کے طنز و مزاح کی سطح کبھی اونچی ہوتی تھی لیکن وہ بہرحال پسند کئے جاتے تھے۔ انھیں قلم پر پوری پوری قدرت حاصل تھی خوش مذاقی اور خوش باشی اُن کی فطرت میں تھی۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی۔ ابھی وہ اور بہت کچھ دیتے۔ اُن کی اچانک وفات سے ہندو پاک کے اردو حلقوں کو زبردست دھچکا پہنچا۔ حق مغفرت کرے۔ اردو ادب کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ راجہ مہدی علیخاں کی موت سے۔ ادارۂ شاعر مرحوم کے پسماندگان سے دلی ہمدردی رکھتا ہے۔ اُمید کہ راجہ مہدی علیخاں کی تمام تخلیقات اُن کی یادگار کے طور پر منظر عام پر لائی جائیں گی۔

ـــ ادارہ ـــ

متین سروش

اعلان

رنگِ آزادیِ جمہور نہ جانے دیں گے
ساحرِ ظلم کو جادو نہ جگانے دیں گے

ہم ہیں اک جلوۂ بیداریٔ انسان و حیات
وقت کو شرم سے گردن نہ جھکانے دیں گے

ہم ہوا خواہِ بہاراں ہیں نگہدارِ چمن
آشیاں لوٹ کے گلچیں کو نہ جانے دیں گے

نازپروردۂ الفت ہیں، اداداں کرم
نفرت و جور کا سکّہ نہ چلانے دیں گے

جس کا ہر گل ہے شہیدوں کے لہو سے رنگیں
بجلیوں کو وہ گلستاں نہ جلانے دیں گے

جس کے انوار سے روشن ہے دیارِ ہستی
اُس سحر پر کبھی ظلمت کو نہ چھانے دیں گے

خونِ ارماں جسے دے دے کے نکھارا ہم نے
رنگ اُس گلشنِ جاں کا نہ اُڑانے دیں گے

تحفۂ برق و شرر ساتھ جو اپنے لائے
ابر وہ باغِ تمنّا پہ نہ چھانے دیں گے

اہرمن زادے کریں لاکھ بہانے ایجاد
خرمنِ امن پہ بجلی نہ گرانے دیں گے

شر نوازانِ ستم لاکھ گرائیں پردے
جلوۂ روئے حقیقت نہ چھپانے دیں گے

حوصلہ ہار کے منزل پہ نہ بیٹھیں گے کبھی
یوں ہنسی جوشِ طلب کی نہ اُڑانے دیں گے

زلزلے آئیں کہ گردوں سے شرارے برسیں
جوشِ پیمانِ وفا کو نہ مٹانے دیں گے

ہم فداکیش بھی، جاں باز بھی، بیدار بھی ہیں
فتنۂ تازہ عدو کو نہ اُٹھانے دیں گے

جان سے پیارے شہیدانِ وطن کی سوگند
بچ کے میدان سے دشمن کو نہ جانے دیں گے

مادرِ ہند تری پاکیٔ داماں کے نثار
تیری عزّت پہ کوئی حرف نہ آنے دیں گے

پرچمِ ہند تری عظمت و رفعت کو سلام
سر کسی دشمنِ جاں کو نہ اُٹھانے دیں گے

شمعِ آزادیٔ افکار کی روشن ہے سروش
یہ حسیں شمع عدو کو نہ بجھانے دیں گے

کوثر چاندپوری
(کہانی)

محبت کے سوا

وہ لفٹ میں کھڑا ان عورتوں کو دیکھ رہا تھا جو پہلی دوسری اور چوتھی منزل پر جانے والی تھیں۔ لفٹ نیچے آتے ہی اس نے دروازہ کھول دیا تھا مگر ایک لڑکا اندر آنے سے ڈر رہا تھا۔ اس کی ماں کھینچ کر لانے کی کوشش کرتی، وہ پیچھا چھڑاتا دور جا کھڑا ہوتا۔ اس تماشہ میں اسے بڑا مزہ آرہا تھا۔ ماں ہانپ رہی تھی۔ بچہ رو رہا تھا، دوسری عورتیں ہنس رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ نہایت دلچسپی سے یہ ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ سارے ہی کردار اپنی اپنی جگہ کامیاب تھے۔ یہ زندگی کی ایک چھوٹی سی کشمکش تھی جس سے پتہ چل رہا تھا کہ جدوجہد کا جذبہ بچپن ہی سے سر ابھارنے لگتا ہے۔ ابھی عمر میں بچے بڑوں کا سہارا چھوڑ کر اپنی راہ الگ بنانے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ ذرا دیر بعد دو عورتوں نے اسے زبردستی لفٹ میں چڑھا دیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے لفٹ کا بٹن دبا دیا پھر ایک اور بٹن کو انگوٹھے سے دبا کر چھت میں لگا ہوا پنکھا چلا دیا۔ لفٹ تیزی سے اوپر جانے لگی۔ لڑکا جھینپی مار رہا تھا، جیسے لفٹ میں بٹھا کر اسے مہاندیں سے مہا بنا رہا ہو۔ اور وہ مٹھی کی باس سونگھ کر اس سے چھٹ جانے کی آرزو کر رہا ہو۔ بچپن سے اس کا ہم بنا تھا، اور جس میں آخر وہ گھل مل جانے والا تھا۔ لڑکا روتا رہا، بچت میں لگا ہوا پنکھا گھومتا رہا۔ پہلی منزل کے بعد دوسری آگئی، پھر تیسری اور چوتھی۔ لفٹ میں کھڑی عورتیں دروازہ کھلتے ہی فرش پر رینگنے لگیں۔ چار نوجوان جو دیر سے گھنٹی بجا رہے تھے نیچے جانے کیلئے لفٹ میں آگئے۔ اس نے اسی مشینی انداز سے بٹن دبا دیا۔ پنکھا ایک خاص قسم کی گرگراہٹ کے ساتھ رقص بتابی میں مصروف ہو گیا۔ لفٹ چوتھی منزل سے نیچے کھسکنے لگی۔ تھرڈ فلور پر کئی آدمی کو بنائے کھڑے تھے۔ ان میں سے پانچ کیلئے گنجائش نکل آسکے، باقی جگہ نہ ہونے کی وجہ سے وہیں رہ گئے۔ لیکیو، الا کے دانوں کی طرح بکھر گیا۔ اس نے اشارے سے جلد آنے کا وعدہ کیا اور لفٹ تیسری منزل سے یوں گذر گئی جیسے کسی چھوٹے سے اسٹیشن سے طوفان میل گذر جاتا ہے۔ چند ہی پلوں میں لفٹ نیچے آگئی۔ وہاں سب معمول لوگ اوپر جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی اندر کے آدمی اس طرح لفٹ سے نکل بھاگے جیسے جنگلی کبوتر دانہ کی تلاش میں گھونسلا چھوڑ کر اڑ جاتے ہیں۔ اس کی جگہ دوسرے لوگ ان پالتو کبوتروں کی مانند آگھسے جو بسیرا لینے کی غرض سے آشیانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ آنے والوں میں کچھ بابو بھی تھے۔ ان کی بغلوں میں انگریزی، اردو، ہندی، گجراتی کے اخبارات دبے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک بولا۔

دو چار سال میں چاند پر بھی ایسی ہی فرمیں کھل جائیں گی اور ہم آفس کرنے لفٹ میں بیٹھ کر جایا کریں گے۔

دوسرا بابو خوب ہنسا۔ اس کے موٹے اور سیاہ ہونٹوں کے پیچھے بڑے بڑے مصنوعی دانت چمکنے لگے۔ ہنسی پر قابو پا کر وہ کہنے لگا۔

سب سیٹھوں کی باتیں ہیں ہنس راج جی۔ اس نے بابو لوگوں کی گپ زیادہ غور سے نہیں سنی۔ بٹن دبانے کے بعد وہ سوچنے لگا۔ لفٹ بھی عجیب چیز ہے۔ کبھی اوپر چڑھتی ہے، کبھی نیچے کھسکتی ہے۔ سال بھر سے اسی طرح بالکل پابندی سے حرکت کر رہی ہے۔ اس ایک سال میں خود اس کا اپنا جیون بھی ایک ہی طرح سے چلتا رہا ہے۔ جتنا اوپر چڑھتا ہے اتنا ہی نیچے سرکتا آتا ہے۔ پہلے کے بعد دوسرے دھیرے دھیرے بندر تک اوپر چڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور پیسے ختم ہوتے ہی تیس تک لگاتار نیچے کو کھسکتا رہتا ہے۔ وہ اس راکٹ کے مانند ہے جو اپنے اندر کتنے پابند کو بٹھا کر پہلے چاند کی سمت اڑتا ہے پھر جلدی جلدی زمین کی جانب آنے لگتا ہے۔ راکٹ کے اس طرح آنے جانے میں ایک نوع مقصد ہوتا ہے۔ مگر اس کی زندگی کا آنا جانا بظاہر بیکار سی چیز ہے۔ ذرا ہی اس کے قابو کی بات ہوتی تو کھڑکی سے ایک زور دار لات مار کر اس کے پہلے خیال کو تنکے کی طرح بہا لے جاتی۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ حرکت اور جنس کیسے مقصد کیلئے مکرر ہو سکتی ہے۔ اس کی بدولت مجھے مہینے میں ڈیڑھ سو روپے ملتے ہیں۔ ان سے میں مکان کا کرایہ دیتا ہوں۔ ہوٹل والے

کو کھانے کا قابل بچاتا ہوں۔ کپڑے بناتا ہوں۔ اور ضرورت کی نہ جانے کتنی چیزیں خریدتا ہوں۔ بلیڈ، شیونگ کریم، بیٹل، کنگھا اور نہ جانے کیا کیا۔ میرا جی انہیں کے گرد گھومتا ہے جو لفٹ کو اس طرح اوپر نیچے لے جانے ہی سے حاصل ہوتی ہیں اور ایک دن بلا رانی بھی مجھے مل جائے گی۔ جس کے لئے میری راتیں نہ جانے کب سے بلک رہی ہیں۔ بلا کا خیال آتے ہی اس کے دل میں ایک خاص قسم کا گداز پیدا ہو گیا۔ وہ یوں پگھل گیا جیسے دھیمی آنچ پر موم پانی ہو جاتا ہے۔ وہ قریب بکھرے ہوئے آدمیوں کے سانس کی گرمی میں بہت سی باتیں سننا بھی محسوس کرنے لگا۔ ایک سانس میں اسے بھوک کی چڑچڑاہٹ کا احساس ہوا۔ دوسرے نفس میں غلامانہ بدحواسی کا کرب تھا جیسے وہ اس شہر میں مدھر سے مکان کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو اور جس دروازے پر پہونچتا ہو وہاں چار ہزار کا ہندسہ لکھا ہوا دیکھتا ہو۔ تیسری کا انداز کا الجھاوا پا کر اس کی سانس میں شعلے سے لپکنے لگے ہوں۔ ایک نوجوان کی سانس نے اس کے شعور سے ٹکرا کر کہا۔ میں بیکار ہوں۔ مجھے نوکری چاہیئے۔ میں لفٹ بھی چلا لیتا ہوں۔ میں نے بھی بنجاری طرح میٹرک پاس کیا ہے اور تمہارے مالک کے پاس نوکری کی درخواست لے کر جا رہا ہوں۔ فوراً اسے وہ وارننگ یاد آگئی جو گذشتہ ہفتہ میں مرزا نے اسے دی تھی۔ اگر آئندہ کو سختی سے وقت کی پابندی نہ کی تو لفٹ کر دیئے جاؤ گے۔ یہ سنکر خود اسی کے سانس میں انگارے سے بھر گئے۔ اسی وقت ایک بڈھے کی آواز بول اٹھی۔ میرا اسٹینگ کارڈ نہیں بن سکا۔ میرا پاس محبہ سے موٹر مانگتا ہے۔ اور دن بھر ادھر ادھر بھگاتا ہے۔

یہ بنڈل ڈاک میں ڈال آؤ۔

یہ لیٹر ایم ٹیکسن آفس میں لے جاؤ۔

ترکاری کا تھیلا لے کر بنگلہ پر پہلے جاؤ، وہاں مالکن حکم دیتی ہے مکرے میں ڈسٹنگ کر دو، باہر آتا ہوں تو شوفر بتاتا ہے میز پر سونے کا رنگ نہیں ہے۔

جتنی سانسیں چل رہی تھیں اتنی ہی باتیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ کوئی سانس ایسی نہ تھی جس میں کوئی آواز نہ ہو۔ پھر بھی بابو لوگ کہتے ہیں، گھر تو نہیں دنیا بدل جائے گی۔ اگر چاند تک پہونچ گیا ہے۔ اس نے وہاں کی تصویریں کھینچ لی ہیں۔ تھوڑے دنوں میں دنیا بھر کے یہ بولتے ہوئے سانس چاند میں پھر دوڑنے لگے۔ وہاں یہ کچھ نہ کہہ سکیں گے کوئی بات ہی کہنے کو نہ ہوگی۔ اس نے اتنی بہت سی باتیں سوچ کر پشت پر لگے ہوئے شیشہ میں اپنا منہ دیکھا۔ پیچھے کی ہوا سے بال بکھر گئے۔ چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ لگتے یوں لگا جیسے آئینہ اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔ وہ کہہ رہا ہو۔ تم بلا کو نہیں پا سکو گے۔ دھرتی پر رہنے والوں کو آسمان خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔

ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے سوچا بیوی گھر میں آجائیگی تو چہرے پر بھی رونق آجائے گی اور آئینہ اسے شرمندہ نہیں کر سکے گا۔ بلا رانی کو جب وہ یہاں آئی تھی وہ گذشتہ چھ مہینے سے اس کے خیالات میں بسی ہوئی تھی۔ ہر وقت شوخ اور رنگین تتلی کے مانند تصورات میں اڑتی پھر رہی تھی۔ اب تک اس نے بلا سے بات تک نہ کی تھی۔ نگاہ بھر کر دیکھا بھی نہ تھا۔ ہر بار دیکھنے کے بعد اپنی نگاہوں سے یہ شکایت ہی رہ جاتی تھی کہ جی بھر کر دیکھ کیوں نہ لیا۔ بلا سے اسی عزم کا ارادہ تھا۔ جس میں وہ لفٹ مین کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ بلا کو اس سے زیادہ تنخواہ مل رہی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے اور جب وہ اس سے شادی کی درخواست کرے گا تو بلا منظور کر لے گی۔ وہ کہے گی تم لفٹ مین ضرور ہو۔ تمہاری تنخواہ بہت کم ہے۔ لیکن میں تمہارا گھر آباد کروں گی۔ ضروری نہیں کہ شوہر بیوی سے زیادہ تنخواہ پاتا ہو۔ اونچ نیچ ہر شعبۂ حیات سے ملتا رہتا ہے۔ زمین کے باشندے چاند پر کلونیاں بسا رہے ہیں اور ان میں بیٹھ کر لوگ آسانی سے تیسری چوتھی منزل تک چلے جائیں گے۔ میں تمہاری بیوی بن سکتی ہوں۔ تمہارے یہ بکھرے ہوئے بال مجھے پسند ہیں۔ اور یہ آئینہ ہو تو ہر لمحہ دل میں بسا رہتا ہے۔ میری صرف ایک شرط ہوگی تم دوستوں سے ملنے پر کوئی پابندی نہ لگا سکو گے۔ بلا روز ہی صبح نو بجے چوتھی منزل پر جاتی اور شام کو گراؤنڈ فلور پر اتر آتی۔ اس کا یہ سفر لفٹ ہی کے ذریعہ طے ہوتا۔ وہ لفٹ کا دروازہ کھولے انتظار کرتا رہتا۔ پہلے ایک بوڑھا بابو آتا، پھر دوسرے کلرک آتے، چپراسی اور اردلی بھی آتے۔ وہ سب کو لفٹ میں بٹھا کر دوسری، تیسری اور چوتھی منزل پر چھوڑ آتا۔ جب نیچے آتا، بلا رانی لفٹ کی منتظر ہوتی۔ اس کی ساری سے سینٹ کی بھینی بھینی مہک آتی رہتی۔ برستی لگے ہوئے خوبصورت ہونٹ اس طرح ایک دوسرے سے ملے رہتے جیسے گلاب کی پنکھڑیاں نیچے اوپر رکھی ہوں۔ ان پر مسکراہٹ کی کوئی لہر نظر نہ آتی۔ آنکھوں میں ایک گہری سی چمک ہوتی جب بلا اندر آجاتی، وہ دروازہ بند کر کے بٹن دبا دیتا۔ بلا کا چہرہ آئینہ میں مسکراتا محسوس ہوتا۔ اس کے سانس کی گرمی سے آواز آتی۔ تم ایک انسان سائنٹی کی ضرورت ہے۔ روبائے کیا ہے میں اسے ڈھونڈ رہی ہوں۔ اندھیرے میں اب تک کوئی جگنو چمکتا دکھائی نہیں دیا۔ ——— تم بہت اچھے حیوان سائنٹی بن سکتے ہو۔ بولو بن سکتے ہو؟

ضرور بن سکتے ہو۔

وہ مڑ کر آئینہ کی طرف دیکھتا۔ آئینہ اس کا طرح مذاق اڑاتے ہوئے کہتا۔

یہ منہ اور مسور کی دال۔

اس کی امیدوں کا محل سمار ہو جاتا۔ وہ سوچتا سچ مچ بلا اور آدمی میں بہت فرق ہے۔ ہڈے اور سور ج چاند اور زمین کا سا فرق۔ وہ کیونکر میری بیوی بن سکتی ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا آئینہ توڑ ڈالے۔ اسے لفٹ سے خیال کر پھینک دے۔ ایک دن بلا آدھا دن پر سے کالی سارے بابو اوپر جا چکے تھے۔ بلا نے دن پر دو گھنٹہ تاخیر سے آنے کی اطلاع دیدی تھی۔ وہ بے چینی سے لفٹ کے دروازے پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ۱۱ بجے بلا آئی۔ اس کے جسم پر بہت قیمتی ساڑھی تھی۔ لبوں پر سرخی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ وہ لفٹ کی دیوار سے ٹیک کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بلا کی طرف دیکھا اور پھر آئینہ میں اپنے نقوش کا اس کے خدوخال سے مقابلہ کیا، وہ طے کر چکا تھا کہ آج بلا سے ضرور باتیں کرے گا۔ وہ کہے گا، کیا آپ جیون کی لمبی پگڈنڈی پر میرے ساتھ چل سکیں گی۔؟

میں لفٹ مین ہوں۔

لیکن ــــ لیکن

پھر زینہ سے اترنے لگتا اس کی گرگراہٹ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔

لفٹ بٹن دباتے ہی اوپر کی طرف چلی پہلی منزل پر پہونچنے سے پہلے ہی وہ بیچ میں رک گئی۔

"بجلی فیل ہو گئی۔"

لفٹ بگڑ گئی۔

بلا کی آنکھیں پھیل گئیں، اس پر دل کا دورہ پڑتے پڑتے رہ گیا۔ خوف سے کانپتے ہوئے بولی۔

اب کیا ہوگا؟

بجلی والا فاروقی آئے گا اور لفٹ ٹھیک کر دے گا ابھی میں خود ہی کوشش کرتا ہوں۔

بلا کی ساری سے سینٹ کی مہک پھوٹ رہی تھی اور ہونٹوں سے سرخی کی کریں نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے سوچا یہ بہت اچھا موقع ہے اسے بلا سے اسی وقت اپنی خواہش کا اظہار کر دینا چاہیئے۔ فوراً ہی اسے خیال آیا نہ جانے کتنے کسٹمر گراؤنڈ فلور پر کھڑے ہو لگے فرم کا سارا کام رک گیا ہوگا۔ باس کی سیلی اوپر نہ پہنچ سکیں گی۔ باہر لوگ پاس سے تڑپ جائیں گے۔ دوسرا فوری سامان بھی ادھر سے ادھر نہ جا سکے گا۔ پورے فرم میں کھلبلی مچ جائے گی، اس وقت بلا سے کچھ کہنا بڑی خودغرضی ہے۔ جب سامنے بہت سے مسائل سامنے آجائیں تو اپنے جذبات کا دبا لینا ہی اچھا ہے۔ جنسی بہت اہم سہی مگر دوسری حقیقتوں سے کیونکر ٹکرا سکتی ہے۔ ایک دم بلا کی ساری سے سینٹ کی خوشبو غائب ہو گئی۔ اس کے لبوں کی سرخی پھیکی پڑ گئی۔ اور خود اس کا اپنا سانس چلا اٹھا۔

اور بھی غم ہیں زمانہ میں .....

اس نے سوچا اوپر چڑھ کر کسی کو آواز نہ دی تو لفٹ یوں ہی پھنسی رہے گی۔ ایسی ناکام کوشش سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ جو لفٹ کو پہلی اور دوسری منزل کے درمیان پھنسا دے۔ ہو ہا زور کی وقت کامیاب ہے جب چاند کے گرد حلقہ کاٹنے لگے۔ وہ لوہے کے دروازے میں پاؤں ڈال کر اوپر چڑھ گیا اور زور سے بولا۔ ــــ

مسز چوپڑا جی جلدی سے انا ؤنس کر دو کہ لفٹ پھنس گئی ہے۔ فاروقی جہاں بھی ہو لفٹ نمبر ۲ پر پہونچ جائے۔

ذرا دیر بعد فاروقی نے اوپر سے کہا۔

مارٹن میں آگیا ہوں۔ کوا ڈا بھی طرح بند کر لو۔ بجلی کے تار ٹھیک ہو گئے۔ کرنٹ دوڑنے لگا۔ مارٹن نے بٹن دبایا۔ لفٹ تیزی سے اوپر جانے لگی۔ بلا چیخی۔

دندر فائی مسٹر مارٹن۔ مارٹن نے اوپر پہونچکر سوچا۔ عورت کے منہ سے یہ الفاظ کتنے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ میں لفٹ اوپر نہ لاتا تو یہ الفاظ سننے کو نہ ملتے۔ اگر شادی والی بات کہدیتا تو نہ جانے وہ کیا جواب دیتی۔

شاید گالی دے ڈالتی! ــــ چانٹا مار دیتی! ــــ نہ جانے کیا کرتی!

atlas
اٹلس
رولنگ شٹرس

اٹلس رولنگ شٹرس ماہر اور تجربہ کار کاریگر بناتے ہیں۔
اٹلس رولنگ شٹرس یعنی بہترین قسم کی صناعی اور عمدہ اسٹیل
اٹلس رولنگ شٹرس ہر طرح کی حفاظت کے ضامن۔

(ایک سال کی گارنٹی)

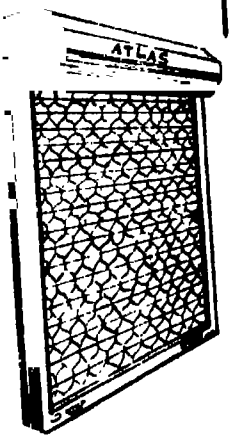

اٹلس رولنگ شٹرس درج ذیل اقسام میں تیار ہوتے ہیں۔

- اٹلس رولنگ شٹرس پل اینڈ پش ٹائپ
- اٹلس گیئر آپریٹیڈ رولنگ شٹرس، وکٹ گیٹ کے ساتھ۔
- اٹلس رولنگ شٹرس سلائڈنگ گائڈ کے ساتھ۔
- اٹلس شٹرس۔ کم۔ گرل
- اٹلس رولنگ گرلس مڈبار ٹائپ۔
- اٹلس ورٹیکل رولنگ شٹر۔

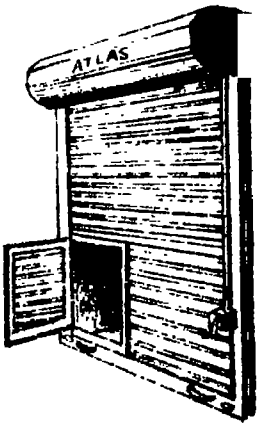

اٹلس رولنگ شٹرس تجارتی، سرکاری، نیم سرکاری، میونسپل اداروں، کوآپریٹو سوسائٹیوں، سرکاری اور ذاتی ٹھیکیداروں، غرض چھوٹے اور بڑے بہت سے اداروں کی اپنی بہترین بناوٹ اور عمدہ اسٹیل کی بنا پر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

بنانے والے:-

رینگل آئرن اینڈ اسٹیل ورکس

۳۸۔ کیبے کالونی۔ اندور ۱ (ایم۔پی)

محسن زیدی

غزل

سوالِ تشنہ لبی کا جواب چاہتے ہیں
ہم اپنے جام ہی میں شراب چاہتے ہیں

سحر کو دیکھ لیا تیرگیٔ شب نہ مٹی
ہم اِس اُفق میں نیا آفتاب چاہتے ہیں

گراں ہیں اِتنے حقائق کہ سانس گھٹتی ہے
حقیقتوں کے عوض ہم سراب چاہتے ہیں

کسے دماغ ہے اخترؔ شماریوں کا مگر
ہم اپنے داغِ جگر کا حساب چاہتے ہیں

نہ جانے کون سی منزل پہ عقل بہکا دے
جُنوں کو ہم قدم و ہم رکاب چاہتے ہیں

اِسی لئے تو لہو کر رہے ہیں دل کو ہم
کہ آنسوؤں میں بھی رنگِ شراب چاہتے ہیں

بہل سکیں گے کسی خواب سے وہ کیا محسنؔ
جو خواب دیکھ کے تعبیرِ خواب چاہتے ہیں

ضیا فتح ابادی

غزل

لہر سی دل میں اُٹھی موجۂ طوفاں ہو کر
رگِ جاں ڈوب گئی سازِ غزل خواں ہو کر

روز و شب کچھ بھی دھڑکنے کے سوا کام نہیں
یہ صلہ خُوب ملا دل کو نمایاں ہو کر

مجھ سے کیا پوچھتے ہو دیکھتے کیوں تجھکو نہیں
کیا ملا دشت میں مجنوں کو پریشاں ہو کر

کر چکا ترکِ تعلق تو کبھی کا لیکن
ذہن میں یاد اُبھرتی ہے غزل خواں ہو کر

دل شکستہ ہوں، کہیں ٹوٹ نہ جائے ڈر ہے
یہ مرا عہدِ وفا بھی ترا پیماں ہو کر

اجنبی اپنے وطن میں کوئی دُشمن بھی نہ ہو
آئینہ دیکھ رہا ہے مجھے حیراں ہو کر

جام ٹوٹے ہوئے، اُترا ہوا مے کا چہرہ
شامِ غم آئی ہے کیا صبحِ درخشاں ہو کر

اے ضیاؔ جبرِ محبت کا کنارا معلوم
دل میں آیا غمِ انساں غمِ جاناں ہو کر

یوسف ناظم

(طنز و مزاح)

ایک خط

بانڈرہ بمبئی ۵۰ یکم جولائی ۱۹۶۸ء

پیارے جھبّو!

جیتے رہو۔

میں نے تمہیں پچھلے نومبر میں ایک خط لکھا تھا۔ یہ خط ستر ہوتے ہے ابد یقیناً تمہیں ملا ہوگا۔ پھر تم نے ... کیوں نہیں دیا۔ ہوش میں ہو یا نہیں؟ ... تجھ کو میں یہ خبر اگر تمہاری جنوبیں ... سکتا۔ پی فارم "تو میں یوں حاصل ... تا ہوں۔ ہوش ہو تو اس بار کھولو ... ہر ماں پابندی سے ایک خط لکھ دیا کرو۔ ... تم ٹیکس کے سالانہ تختے کی طرح۔ ... ان خط میں باتیں سچ لکھنا۔ جتنا ... جھوٹ لکھنا ہے وہ اسی تختے میں لکھنا

تمہیں خط لکھنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ میں یہاں پریشان ہوئی ہوں۔ ... کسی اور وجہ سے نہیں۔ صرف شاعری سے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہماری شاعری پندرہ بیس سال کے عرصے میں ایسا ہولناک رخ اختیار کرلے گی۔ تمہیں پتہ ہے کہ علامتی شاعری میں ہوتا کیا ہے۔ جہاں کئی والدین نے اپنے بچوں کو اردو ... سمجھا تھا وہ یا ہے۔ صرف اس خوف ... نہ بتا پر کہ آئندہ پیدا کرنے والے جدید

شاعری پڑھیں گے۔ علامتی شاعری میں میں جہاں تک دیکھ پایا ہوں صرف علامتیں ہوتی ہیں۔ شاعری نہیں ہوتی۔ علامتی شاعری کرنے والے کا کچھ نہیں جاتا۔ البتہ سننے اور پڑھنے والے کی سلامتی خطرے میں پڑتی ہے۔ ایک اہم ٹیکس آفیسر نے کسی محفل میں علامتی شاعری سن لی تھی تو انھیں بے حد غصہ آگیا تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب وہ دنیا کا مشکل سے مشکل معمہ حل کر لیتے ہیں تو جدید شاعری کیوں نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اور تو کچھ کر نہیں پائے صرف دوسرے دن انھوں نے علامتی شاعر کے نام انکم ٹیکس ادا کرنے کا نوٹس جاری کر دیا تھا۔ اور اس پریشانی میں بیچارے شاعر کی شاعری کئی دن بند رہی۔

میں نے شاید تمہیں پہلے بھی لکھا تھا کہ علامتی شاعری اسی وقت کی جاسکتی ہے جب آدمی کے پاس کئی علامتیں جمع ہو جائیں۔ اس قسم کی شاعری کرتے وقت۔ شاعر کا کپڑے پہننا، نہانا مرنا وغیرہ نہیں ہوا کرتا۔

شاعر اگر کپڑے پہنے ہوئے ہو تو علامتی شاعری رُک رُک کر آتی ہے۔ علامتی شاعری سے افاقہ ہونے کے بعد شاعر نارمل آدمیوں کی طرح گھر سے باہر نکل سکتا ہے۔ اور بڑے سے بڑا آدمی بھی پہلی نظر میں پہچان نہیں سکتا کہ یہ شخص بندکرہ میں معمولی شاعری کرتا ہے۔ تو ہزار دفعہ کہو کہ کہا جاتا ہوں۔ خود شاعر کے چہرے پر کوئی خاص علامتیں نہیں پائی جاتیں۔ چہرے مہرے سے تو اکثر شاعر کافی معصوم اور خطرناک حد تک بھولا نظر آتا ہے۔ اس کے گن تو بعد میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جھبّو میں تم سے کیا بیان کروں کہ اس معاملے کی کیا حالت ہو گئی ہے۔

تمہیں نشتر خانپوری یاد ہوں گے۔ وہی جو فراز، فراق اور فیض کے پرستار رہتے۔ اب انھوں نے بھی جدید شاعری شروع کر دی ہے۔ اور سچ کہا فرمانے پچھلی شاعری اداسی اور غمگینی کی وجہ سے ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ نشتر کئی دنوں تک غائب رہے۔ جب ملے تو میں نے پوچھا تھا کہ وہ کہاں تھے۔ جھبّو تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ انھوں نے مجھ سے کہا میں علامتوں کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اکثر لوگ یہ بھی فرماتے ہیں کہ علامتیں ڈھونڈنی نہیں پڑتی ایجاد کرنی پڑتی ہیں۔ میں نے کہا بھئی میں ایک ایجاد ایسی ہے جس کی کوئی ماں نہیں۔ یہاں علامتی شاعری کا مرحلہ مندرجہ کو نظر نہیں آتا۔ نشتر بولے تم کبھی ترقی نہیں کر سکو گے۔ نشتر کا یہ بھی خیال ہے کہ علامتی شاعری وہ اچھی کر سکتے ہیں جو مجرد ہوں یا کم سے کم کنوارے ہوں۔ نشتر نے اپنی دوسری بیوی کو بھی طلاق دے دی ہے۔ اپنی مختصر سی ملاقات میں نشتر نے مجھے کئی علامتیں بتلائیں۔ بولے۔ گلی کا لفظ تمہیں کیا لگتا ہے۔ میں کہا نہیں۔ میری صورت دیکھ کر وہ بولے اسے یاد یہ بتلاؤ کہ اس لفظ سے تمہارے ذہن میں کیسی تصویر ابھرتی ہے۔ میں نے کہا اس لفظ سے میرے ذہن میں گلی کی تصویر ابھرتی ہے۔ بولے، تم ہو نرے گدھے ہو۔ کیا اس لفظ سے تمہارے ذہن میں آدمی کا تصور نہیں پیدا ہوتا۔ میں خوفزدہ ہو گیا اور میں نے کہا ہاں یقیناً گلی کے لفظ سے آدمی کی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے۔ بہت خوش ہوئے بولے۔ گلی کا کھمبا اور ناریل کا درخت کیسی علامتیں ہیں۔ میں نے کہا۔ یہ علامتیں کہاں ہیں چیزیں ہیں، نشتر نے سمجھایا۔

ں میرے دوست ۔ یہ نئی علامتیں ہیں جو معشوق کا قد ظاہر کر سکتی ہیں۔ اس کی تفصیل انھوں نے یہ بتلائی کہ ہماری شاعری میں شمشاد قد معشوق کا مکمل و مثل ہے لیکن ہمارے اسلاف شاعروں نے شمشاد کا درخت دیکھا تھا اور نہ ہماری اولادیں شمشاد کے درخت کا دیدار کر سکیں گی۔ اس لئے ہماری نئی نسل شمشاد کے لفظ سے معشوق قد کا اندازہ نہیں کر سکے گی۔ اس نسل کی سہولت کے لئے نشتر نے کہا ہیں بجلی کا کھمبا اور ناریل کا درخت ہی استعمال کرنا ہوگا۔ میں بالکل قائل ہو گیا۔ اور گرمی سے تے گرتے بچا۔

محبوبیار سے نشتر فرزانپوری اس عرصہ میں واقعی نہ جانے کہاں پہنچ گیا۔ ارے بھئی اس نے ترقی کی اتنی ساری منزلیں پر نہیں کیسے طے کر لیں۔ اس کا ذہن ل صاف ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی سمجھایا کہ پانی کا نلکا، دروازہ کا کنڈا، شیشے کا ڈھکن اور جوتے کا تلا بھی نہایت دیدہ زیب اور سامعہ نواز علامتیں ہیں، ں شاعری کا رس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے صابن کی ٹکیہ محبوب کی پڑیا، بچے کی رال اور گھوڑے کی نعل جیسی علامتوں پر تو ہمارا نشتر جھوم اٹھتا ہے۔ وہ کہتا ۔ ان علامتوں سے آدمی کے دل میں زندگی کی اُمنگ اور جینے کی ترنگ پیدا ہوتی ہے۔ بولنے والی علامتوں میں مینڈک، قاز، اور چوہیا کے بہت اچھا لگتی ہیں

باتوں باتوں میں جب میں نے اس سے کہا کہ کیا یہ شاعری عوام کیلئے قابل قبول ہوگی۔ نشتر نے کہا عوام کبھی سیدھی طرح راستہ پر نہیں آتے۔ عوام کو تو بار بار ٹکے دینے پڑتے ہیں۔ بھولے ہم جدید شاعر تو اب شاعری ہی بحر میں نہیں ہر میں کیا کریں گے۔ میں نے پوچھا یہ ہر کیا چیز ہوتی۔ نشتر بولے۔ ہر دوی جو تم نے صنعت ذو بحرین میں پڑھا تھا۔ یعنی بزرگ اعظم وغیرہ۔ پھر انھوں نے بتلایا، انھوں نے چند نظمیں ہر خفیف میں کہی ہیں، اور چند ہر ثقیل میں۔ لیکن ابھی اُن کا ارادہ ان نظموں کو پرچوں اور رسالوں ں ڈالنے کا نہیں ہے کیونکہ وہ چند اور ہر یں مثلاً ہر مذبذب، ہر اسہام وغیرہ ایجاد کرنا چاہتے ہیں۔ اور سنو محبوبہ انھوں نے مجھے یہ بھی بتلا دی ہے کہ وہ عنقریب لتک میں ایک جدید قسم کی گیت لکھنے والے ہیں کیونکہ ایک نوجوان پروڈیوسر اپنی نئی فلم میں جدید شاعری کو جگہ دینے والا ہے۔ نشتر اعلان کرنے والے ہیں کہ نئی عری بہت جلد بحروں سے اپنا رشتہ توڑ لے گی۔

نشتر فرزانپوری سے مجھے ملے تقریباً پندرہ دن ہو گئے ہیں لیکن میں ابھی تک سنبھل نہیں پایا ہوں۔ ڈاکٹر انجم کی رائے ہے کہ مجھے پہاڑ پر جانا ہوگا۔ وہاں بھی اگر ٹھیک نہیں ہو پایا تو یقیناً پہاڑی پر سے نیچے چھلانگ لگا دوں گا۔

تم فوراً تلگی کا ایک خط لکھ دیجیو۔ جواب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ انھیں ہم سے ہمدردی کب ہے۔ سُنیں گی تو کہیں گی اچھا ہوا میں نے کتنا کہا ساتھ چلو لیکن ے نہیں۔ اب رہیں وہیں اور گھنگھیلیں علامتی شاعری ــــــ سچ ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ اسی وجہ سے ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھیں۔ مجھے ذرا بھی معلوم ہو تا تو سر بل چلا چلنا۔ والی کو پیار۔ کہیں وہ بجلی کا کھمبا تو نہیں ہو گئی۔ فقط

تمہارا۔ شیرو

آئندہ شمارہ ستمبر ۶۶ء

چند خاص خاص مضامین ــــــ

سیماب اکبر آبادی۔ ایک شاعر ایک انجمن	شید سعید احمد ایم اے	اندھیرا اور اندھیرا	(کہانی) نور شاہ
دلی کی مراثنیں اور اُن کے گانے	آغا رشید مرزا دہلوی	حافظ کا اثر شعرائے اردو پر	سید تقی احمد ارشاد
کنول ہی پھول	(ڈراما)	اظہر انصر	انوار منیر۔ ایم اے
آگ	(مراٹھی ڈراما)	مترجمہ۔ نور پرکار	(کہانی) کلیم راہی

یہ اور دوسرے گراں قدر مضامین

منظومات ــــــ

میکش اکبر آبادی	قیسم اختر مظفر نگری	طرفہ قریشی	ندا فاضلی	جمیل کلیمی	اختر نظمی
بدیع الزماں خاور	حامدی کاشمیری	ظہیر صدیقی	خلش بڑودوی	اسرار اکبر آبادی	جمال ہاشمی
کفیل آذر	کیف احمد صدیقی	افتخار احمد فخر	اخلاق فتحپوری	تقی حیدر	شفقی شومر

فکر تونسوی کی طنز و ظرافت

تہذیب یافتہ کچھ ہی لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ کو متمدن یا Civilise بننے میں تاخیر ہوتی ہے اور اسی سبب سے مہذب اشخاص ہر زمانہ میں عام لوگوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ لیکن تمدن میں ظرافت کا عنصر اسی وقت آتا ہے جب وہ ایک جمود کے عالم میں ہوتا ہے۔ لکھنؤ کی درباری تہذیب نے ایک ظرافت کی بنیاد ڈالی، مگر اس میں اعلیٰ درجہ کے ظرافت کا فقدان تھا۔ ظرافت کی اعلیٰ حس جسے Sense of Humour کہا جاتا ہے۔ تہذیب کی معراج کی نشان ہے۔ میری ڈتھ کہتا ہے کہ کسی ملک کے متمدن ہونے کی سب سے عمدہ کسوٹی یہ ہے کہ آیا وہاں ظرافت (لطیفہ اور کامیڈی چلتے پھرتے ہیں یا نہیں؟ سچے طربیہ کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہنسائے مگر ہنسی کے ساتھ فکر کو بھی بیدار کرے۔"

ظرافت کے پیلے سے ان کی فطرت دلی جذبات کی نمائش ماذ لیہ: ضرورتاً ہے اور بات ہی بات میں ہنستے ہنسے طنز کرتا ہے اور ہمیشہ طفلانہ: ذہنیت کو مل ملا کر الجھانے اور سلجھانے کا ایک نیا کھیل کھیلتا ہے۔ فرائڈ نے ظرافت کو بے تکی باتوں میں تک کی بات Sense in non-Sense کہا ہے۔ لیکن برناڈ شا کا کہنا ہے کہ "سچی بات سب سے زیادہ ظریفانہ ہوتی ہے" اور آسکر وائلڈ کہتا ہے کہ "اگر کسی سے سچی بات کہلوانا ہو تو اسے ایک نقاب دے دو۔ ظرافت ایسی ہی ایک نقاب ہے۔"

معمولی ظرافت محض الفاظ کے طلسم سے پیدا کی جاتی ہے لیکن اعلیٰ درجہ کی ظرافت کے لئے خیال اچھوتا اور نادر ہونا ضروری ہے۔

فرد، جماعت، قوم یا ملک کی مکروہیوں، اس کی خامیوں اور اس کی لغزشوں پر کڑی نظر ڈالنا ہی نکتہ چینی بلکہ زبردست تنقید کرنا اور انھیں معمولی خیز انداز میں منظر عام پر لانا طنز ہے۔ جن عیوب کو لوگ ہنر سمجھتے ہیں اور اس پر انھیں بے جا ناز و افتخار ہے، ان کی تنقید کرنا وہ بھی ایسے انداز میں کہ ان کا کریہہ یا قابل مذمت اور قابل نفرین پہلو روشن ہو جائے۔ گویا طنز کا مقصد تنقید اور اصلاح ہوتا ہے۔ اور ظرافت کی غرض تفریح و مزاح ہے کیونکہ خالص طنز کے اندر تلخی ہوتی ہے۔ تیزی ہے اور تشدد ہوتا ہے۔ جسے عام لوگ برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن فکر تونسوی ایک اعلیٰ فنکار کی طرح، ایک بیدار مغز۔ ماہر نفسیات اور معلم اخلاق کی طرح اس ظرافت کی چاشنی ملا دیتے ہیں۔ یہی وہ خوبی ہے جس کی وجہ سے طنز و ظرافت کی دنیا میں انھیں ایک مقام دیا گیا ہے اور ان کا نام اس درجہ روشن تابناک نظر آتا ہے۔ فکر کا سب سے بڑا وصف یہی ہے کہ وہ طنز و ظرافت کو ایسے حیرت انگیز طریقہ سے شیرینی شکر کی طرح ملا دیتے ہیں کہ طنز کی تلخی تو کم ہو جاتی ہے لیکن اس کی اثر خیزی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

فکر کو قدرت نے ظریفانہ طبیعت، ناقدانہ اور طنزیہ نظر عطا کی ہے۔ ایک حساس اور دردمند دل دیا ہے جو ان کا دل، ذہن اور دماغ ملک، قوم اور انسانیت کی لغزشوں محسوس کرتا رہا ہے۔ اگرچہ ان کی تحریر میں ہم ان کے تلخ جگر سے نکلتے ہوئے خون کے قطرے نمایاں طور پر دیکھتے ہیں۔ لیکن ظریفانہ مزاج نے ان ہی قطرہ ہائے خون جگر کو للذا دیا ہے۔ بچے کتنے ہی [illegible] سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

کچھ متفنن لوگ کہہ رہے ہیں کہ کرنسی کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے مگر میرا خیال ہے کہ بچوں کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے یا شاید یوں ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی وجہ سے بڑھ رہے ہیں یا دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ مثلاً ادھر گورنمنٹ اپنی [illegible] کرنسی نوٹ چھاپ کر مارکیٹ میں بھیجتی ہے اور ادھر والدین بھی اپنی فلک [illegible] ہیں۔ گورنمنٹ کو اس بچے پر بڑا غصہ آتا ہے کہ یہ کم بخت اب کمانے کھانے سے [illegible] استعمال میں لگ کر ایک اور نوٹ چھاپ دیتی ہے ادھر

جب ایک نوٹ چھپ جانے کی خبر پہنچتی ہے تو ایک اور بچہ چھلانگ کر کہتا ہے "آداب عرض ہے۔" اندیوں کرنسی اور بچوں کی پیدائش جاری ہے اور ان دونوں کے درمیان بے چارے والدین "سینڈوچ" بنے جا رہے ہیں۔

اس رپس سے گھبرا کر کچھ اور عقلمند لوگ اٹھتے ہیں۔ "نعلی پلاننگ کرو، نعلی پلاننگ کرو، ورنہ مر جاؤ گے۔" چنانچہ عامۃ الناس ایمان داری سے یہ سوچنے لگتے ہیں کہ بچوں کی تعداد کو "پلان" کرنا چاہیئے اور زیادہ تعداد میں بچے پیدا کر کے ملک کے بھاری بوجھ میں شگاف نہیں کرنا چاہیئے۔"

فکر کے انداز بیان میں، ان کی ظرافت میں، طنز میں، سوجھ بوجھ میں، ان کے انداز گفتار اور طریقۂ اظہار میں دلفریبی ہے۔ جاذبیت اور گہرائی ہے۔ کتوں کی اقسام "میں تخیل کی بلندی، مشاہدے کی گہرائی، طنز کے کوڑے اور ظرافت کی پھلجھڑی دیکھیے۔ کتوں کی کتنی اقسام ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ مزمن خوفناک قسم کا معشوق سا لگتا ہوتا ہے جو میم صاحب کے ساتھ کار میں بیٹھا کرتا ہے اور کار کی کھڑکی میں سے اپنی لمبی لمبی زبان نکال کر راہ چلتے انسانوں کا جیسے منہ چڑاتا رہتا ہے اور دکھتا رہتا ہے ——— ہا ہا ہی ——— آداب عرض ہے تم ذرا کلب تک جا رہے ہیں، وہاں ری کھیلیں گے۔ پنگ پانگ سے شوق فرمائیں گے۔ جی ہاں۔ ہا ہا ہی ——— آداب عرض ہے۔"

کتوں کی دوسری بڑی قسم شکاری کتوں کی ہوتی ہے۔ یہ مارشل نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور عام طور پر جارحانہ کارروائیاں کرنے کے لئے سنسار میں پیدا ہوتے ہیں۔ جب انھیں جھپٹنے، چیرنے پھاڑنے کے لئے کوئی دشمن میسر نہیں آتا، تو یہ پاگل ہو جاتے ہیں "تو سیکھے کتے" کہلاتے ہیں۔ انسان نے پہلے پہل انھیں جنگلی خونخوار جانوروں پر جھپٹنے لپکنے کیلئے استعمال کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد جب انسان کو کیا سوجھی کہ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ اپنے انسانوں پر جھپٹنے کیلئے بھی استعمال کرنے لگا۔ چنانچہ پرانے جاگیردار انھیں اپنے ہمزموں پر چھوڑ دیتے تھے۔ کئی سیٹھ لوگوں نے انھیں بے ایمانی کی کمائی سے بھری ہوئی تجوریوں پر بٹھا دیا۔ بڑی بڑی کوٹھیوں بنگلوں میں آپ کو عام طور پر "بلی ڈوگ" دکھائی دیں گے جنھیں یہ تربیت دی جاتی ہے کہ ہر آنے والے کی پتلون پر ڈائرکٹ ایکشن کرو۔

مجھے یاد ہے کہ ہمارے گاؤں کے نمبردار کے پاس ایسا ہی ایک شکاری کتا تھا جس نے نمبردار کے داماد کو حویلی میں داخل نہیں ہونے دیا تھا اور برات ناکام لوٹ گئی تھی۔ کتا نمبردار کا وفادار تھا۔ ہر جائی نہیں تھا۔

کتوں کی سب سے بڑی قسم جسے میں ارتقائی کہتا ہوں عوامی کتوں کی ہوتی ہے۔ اس قسم میں عیارت عادت کی ذاتیں ہوتی ہیں۔ کئی بالکل پردلتاری کا ہوتے ہیں، کئی عمر بھر بزدل رہتے ہیں، کئی اہنسا وادی ہوتے ہیں۔ کئی کسر نفسانہ ذہنیت رکھتے ہیں کہ روکھی سوکھی کھا کر ٹھنڈا پانی پی لیتے ہیں اور یوں ساری زندگی کاٹ دیتے ہیں۔ کئی نہایت عقلمند ہوتے ہیں۔ یعنی دوسرے کتے کا مالی زبردستی چھین کر بھاگ جاتے ہیں۔ کئی بڑے ڈپلومیٹ ہوتے ہیں۔ نہایت شریف اور مسکین بن کر آپ کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ اور اچانک موقع محل دیکھ کر حملہ کر دیتے ہیں۔ کئی بالکل قدامت پرست ہوتے ہیں۔ آپ انھیں لاکھ نئے نئے رستے سجھائیں وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اور پھر وہیں آموجود ہوتے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ چھوٹی چھوٹی دشمنیوں، چھوٹی چھوٹی دوستیوں اور چھوٹی چھوٹی بے بنیادیوں میں اپنی چند روزہ زندگی گذار دیتے ہیں۔ کمزور کتے پر حملہ کرنا، طاقتور کتے سے ڈر کر پیچھے ہٹ جانا، برابر کی چوٹ والے کتے سے محتاط محاذ بنانا۔ غرض عجوزہ طور پر کتوں کی عوامی نسل انفرادیت سے محروم ہوتی ہے۔ بس اس پر ذوق کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ ؎

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

فکر کا مشاہدہ اور تخیل ایک ایسی کشت ہے جسے ہم طنز و ظرافت کا زعفران زار کہہ سکتے ہیں جس میں ہر طرح کی خوشبو دکھی محسوس ہوتی ہے۔ ہر طرح کے پھول نظر و نسِ نظر کا کام دیتے ہیں لیکن جس کے اندر چبھے ہوئے کانٹے دل میں آہستہ آہستہ چبھتے جاتے ہیں۔ "آپ کا نام" کا یہ اقتباس نہ کئی نام ایسے ہوتے ہیں جو اسم بامسمی ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے مرکزی وزیروں میں بڑی گاڑھی لال نندا ہیں، اگرچہ نہایت کامیاب دیہی ہیں، مگر گلزاری لال نندا کی بات ان پر بالکل فٹ نہیں آتی۔ ان کے منہ سے کبھی گل جھڑتے ہی نہیں، پھول جھڑتے ہیں، انھیں دیکھ کر کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ گلزار میں بادِ نسیم چل رہی ہے اور کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ یہی حالت مشری سمپورنانند جی کی ہے۔ کہ ان میں کرشن مراری والی کوئی بات نہیں ہے۔ مثلاً اگر ان کے منہ پر مصری رکھ دی جائے تو ساری مکھیاں ڈر کے مارے بھاگ جائیں گی۔ اور پھر ہمارے لال بہادر شاستری جی اچانک ہی دنیا سے اٹھ گئے۔ لوگ کہتے ہیں دشاستری تو وہ واقعی ہیں کیونکہ کئی شاستر پڑھ چکے ہیں مگر یہ شاستر تو انھوں نے بعد میں پڑھے ہیں) انھیں دیکھ کر کسی منتھ سے بالموا کا تصور تو کیا جا سکتا ہے مگر یہ خیال نہیں آتا کہ شاستر سنجی نیپال کے جنگلوں میں جا کر شیر کا شکار کرنے لگے۔ شری جگجیون رام کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ سارے جگ کے جیون آدھار ہیں لیکن ان میں نقص یہ ہے کہ وہ ریل بھاڑہ بڑھاتے جا رہے ہیں اور سارا جگ پریشان ہے

کہ عیسوی کی ریل پر کیسے چڑھیں۔ اس اعتبار سے اُن کا نام "جھاڑہ پھونکا وارام" ہونا چاہئے تھا۔"

اور ٹیلیفون کی تم ظریفیاں" کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیے۔

"ہمارے ایک دوست ہیں، مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی۔ آج کل بمبئی میں فلم ڈائرکٹری ہیں ہیں۔ کسی زمانہ میں بیدی صاحب محکمۂ ڈاک و تار میں پوسٹ ماسٹر لگے ہوئے تھے۔ وہ خود سنایا کرتے ہیں کہ ایک بار اُن کی میز پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے چونگا اٹھا کر کان پر رکھا اور پوچھا "ہیلو! میں راجندر سنگھ بیدی بول رہا ہوں۔ فرمائیے آپ کون صاحب ہیں؟"

اُدھر سے جواب آیا: "میں پوسٹ ماسٹر جنرل بول رہا ہوں۔"

بیدی صاحب کہتے ہیں تب میں یہ سنتے ہی میرے ہاتھ۔ پاؤں پھول گئے۔ ڈاک کے محکمہ سے بڑا افسر کافون تھا۔ اُس کے سامنے ہاتھوں والے آداب لازمی تھے، چنانچہ میں نے فوراً چونگا رکھ دیا اور پگڑی کی شکنیں درست کرنے لگا۔ اپنی نکٹائی ٹھیک کی، گلا صاف کیا اور پھر ٹیلیفون پر ہی ہاتھ سے سلام کیا اور پھر کہا: "سر! گڈ مارننگ۔ فرمائیے، حکم کیجئے ....."

غذائی اضافہ کی کنجی
مخلوط بیجوں کا استعمال
دوسری فصلیں
کاشتکاروں کے لئے مناسب قیمتیں
غذائی خود کفالت
منصوبہ کی کامیابی کی راہ
ڈائرکٹوریٹ آف پبلسٹی، گورنمنٹ آف مہاراشٹر، بمبئی

گویا ٹیلیفون اچھے بھلے معقول پڑھے لکھے آدمی کو بھی ایک بار تو بوکھلا ہی دیتا ہے۔

فکر کی طرز، نظر کی جہت میں ذہانت اور مشاہدہ بھی چیزیں ہیں۔ فن کے پاس علمی سرمایہ کافی نظر آتا ہے۔ دلچسپی تو وہ بیسیار نویس ہیں مشرق و مغرب کے علمی اور ادبی خزانوں سے انھوں نے بہت سی چیزیں حاصل کی ہیں۔ اس لئے اُن کی تحریر میں طنز اور مغربی طنز اور ظرافت نگاری کا ایک رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے۔ اُن کا اسلوب بیان پختہ ہے۔ اُن کے جملے صاف ستھرے اور شگفتہ ہوتے ہیں۔ بعض جگہ وہ لمبے چوڑے جملوں میں بڑے ہلکے پھلکے طنز کے کوڑے چلاتے ہیں۔ ظرافت پیدا کی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ طنز واقعات اور ماحول سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور اس کی بدولت اُن کو حسن و موزونیت پیدا کرنے کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تھا بقول شخصے طنز نگار ہوتی ہے۔

○

شاذ تمکنت

خواب زار

چاند جگمگاتا ہے
تھال جیسے کندن کا
ہر کرن کے سینے میں
پھوٹتی ہیں جھنکاریں
یہ پھوار سی خنکی
یہ کٹار سی دھاریں

○

رات سے گریزاں تھا
رات پھر چلی آئی
بھولی بسری باتیں کیوں
کہہ رہی ہے تنہائی

○

تو اگر مری ہوتی
رنگ ہی دگر ہوتا
اس خرابۂ دل کا
خلوتوں کا محفل کا
اب جو حسرتیں ٹھہریں
کل وہ آرزوئیں تھیں
اب جو آہ کہلائی
وہ دعا تھی ہونٹوں پر
کل جو شبنم اتری تھی
اب وہ بن گئی پتھر
اب جو اشک بہتے ہیں
کل وہ سب ستارے تھے
ریت جیسے چشمہ تھی
تنکے سب سہارے تھے
اب جو درد سہتا ہوں
شب گزیدہ ارماں ہے
دور تک ہے سناٹا
دور تک بیاباں ہے
اب جو میری صورت ہے
آئینہ کی حیرت ہے

○

میرے بخت میں آئی
سانس کی گنہگاری
نان و آب کی تہمت
دل کی کاسہ برداری
ہوشمندیوں کا غم
غفلتوں کی بیداری
اک ترے نہ ہونے سے
آپ اپنا دشمن ہوں
اپنے ہی نقابیں میں
پاشکستہ رہزن ہوں
شب گلے بھی سے تھے
کس سے کیا گلہ کیجے
مانگنا بھی کو تھا
کیوں کوئی دعا کیجے

○

تو اگر مری ہوتی
رنگ ہی دگر ہوتا
رنج و شادمانی کا
میری زندگانی کا
روز و شب کی رنگت کا
عیش کا، اذیت کا
طور ایک دنیا کا
خیر کا، شناسا کا

دوستوں کی باتوں کا
دشمنوں کی گھاتوں کا
قہقہوں کی گونجوں کا
جشن کے کی دھوموں کا
صبح و شام ہونے کا
میٹھی نیند سونے کا

○

ڈالیوں کے جھکنے کا
برگِ گل پہ شبنم کے
قطرہ قطرہ رکنے کا
رقص رات بھر ہوتا
رنگ ہی دگر ہوتا
تو اگر مری ہوتی

○

طائروں کے اڑنے کا
ٹھنڈی ٹھنڈی جھیلوں کے
کونے کونے مڑنے کا
راستہ جدھر ہوتا
رنگ ہی دگر ہوتا
تو اگر مری ہوتی

شام مہکی مہکی سی
اگر نئی ، ملاگیری
چاند کا شہابی پن
چاندنی کا چندن پن
کیفِ خود فراموشی
نیم شب کی خاموشی
سرد بستر مری ہوتی
تو اگر مری ہوتی
رنگ ہی دگر ہوتا

○

طبع کی روانی میں
اس بھری جوانی میں
کتنے کام ادھورے ہیں
کوئی کام کر لیتا
آئینے مقابل تھے
میں بھی کچھ سنور لیتا
پتھروں کے سینے میں
مورتیں مچلتی ہیں
آئینوں میں نادیدہ
صورتیں مچلتی ہیں
ہر سفالِ نم خوردہ
کوزہ گر کی دھن میں ہے
آب و گل کا شیرازہ
مال و زر کی دھن میں ہے
برگِ گل کے صفحوں پر
ہیں نمو کی تحریریں
انتظارِ فردا میں
مہر و مہ کی تقدیریں

○

کاروانِ روز و شب
یوں نہ بے خبر ہوتا
میں بھی ساتھ ہو لیتا
یوں نہ دربدر ہوتا
قدرِ زندگی ہوتی
موت کا بھی ڈر ہوتا
ہائے اک رفاقت کا
جشنِ عمر بھر ہوتا
تو اگر مری ہوتی
رنگ ہی دگر ہوتا

○

شاعر بمبئی

نہندر ناتھ

(کہانی)

چابیاں

ظفر چپراسی کی شخصیت کی دھاک تو اسی دن بیٹھ گئی جس دن میں نے پہلی بار فیکٹری میں قدم رکھا۔ اس نے دیکھتے ہی بڑے مؤدبانہ انداز میں یوں آداب کیا۔ کہ دفتر کے لوگ مجھے دیکھنے کی بجائے ظفر کی طرف دیکھنے لگے۔ اور سلام کے بعد اس نے دفتر کے اندر جا کر میرا مسئلہ یوں بیان کیا جیسے بادشاہ سلامت کی سواری جا رہی تھی۔ اور وہ کہہ رہا ہو "باادب، باملاحظہ ہوشیار۔"

مجھے چاپلوس آدمیوں سے سخت نفرت ہے۔ خاص کر میرے والد محترم نے مجھے اس فیکٹری کو چلانے سے پہلے تنبیہہ کی تھی، کہ چاپلوس نوکروں سے محتاط رہنا۔ —— اس لئے میں نے پہلی ملاقات میں۔ دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔ کہ ظفر چپراسی کو برخاست کر دوں گا۔ میں اسی انتظار میں تھا۔ جونہی ظفر نے کوئی غلطی کی میں نے اسے برطرف کیا۔ جوں جوں دن گذرنے لگے، ظفر چپراسی کی شخصیت کی چبھن کھٹکنے لگیں۔ بجائے اس کے کہ میں اسے یہ بتانے کی کوشش کرتا، میاں تم ایک چپراسی ہو اپنی جگہ پر رہو۔ اس نے میرے اردگرد ایسا گھیرا ڈالا کہ ظفر چپراسی کے بغیر میرا وجود بے معنی سا ہو کے رہ گیا۔

یوں تو ظفر میرے کمرے کے باہر ہی بیٹھا رہتا۔ لیکن اندر بیٹھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا، جو شخص باہر بیٹھا ہوا ہے، وہی اس دفتر اور فیکٹری کا مالک ہے۔ آج کل میں بالکل کٹھ پتلی کی طرح اس کی گرفت میں تھا، وہ جیسے چاہتا مجھے نچاتا۔

مجھے کٹھ پتلی بنانے میں اسے کافی محنت کرنی پڑی۔ میرے دفتر میں داخل ہونے سے پہلے وہ اپنی جگہ پر موجود رہتا۔ گیٹ سے داخل ہوتے ہی وہ مجھے دیکھ لیتا، اور اس گز کے فاصلے سے ایسے باوقار اور بارعب سلام سے میرا استقبال کرتا کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جاتا۔ جونہی میں اپنے دفتر کی طرف مڑتا، تو پک کر آفس کا دروازہ کھولتا، اندھا کر میں دیکھتا کہ ہر چیز قرینے اور سلیقے سے رکھی ہوتی۔ قلم، دوات، پیڈ، فائلیں، ہر چیز اپنی جگہ پر بچی کھچی سجاوٹ نظر آتی۔ میز تو شیشے کی طرح چمکتی۔

اس صفائی کے علاوہ اس نے کمال صفائی سے اس بات کا پتہ لگا لیا کہ صاحب کا پسندیدہ ڈرنک کون سا ہے۔ چپکے سے دروازہ کھول کر اندر آتا اور کہتا "صاحب لسی"

ظفر کو معلوم ہو گیا تھا۔ صاحب کمرے میں داخل ہوتے ہی لسی کا آرڈر دیتے ہیں۔

بس پہلے دن میں نے لسی کا آرڈر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے آرڈر دینے کا موقعہ نہ آیا۔ اب تو ہر چیز بغیر مانگے مل جاتی۔ یعنی گولڈ فلیک کا پیکٹ، ماچس اور تمباکو والا پان۔

میری دیکھ بھال کے علاوہ اس نے میرے ملنے والوں پر ایسا رعب جمایا کہ اس کی اجازت کے بغیر مجھ سے کوئی ملنے کی ہمت نہ کرتا۔

کوئی ملنے آتا تو وہ راستہ روک کر کہتا۔ "اس وقت صاحب ایک اہم فائل دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو آدھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا۔" حالانکہ ظاہر ہے ملاقاتی کو اگر یہ کام ہوگا تو ٹھہرے گا ورنہ چلا جائے گا۔ ظفر چپراسی کے اس رویے سے میرے کئی دوست میرے دشمن بن گئے۔ کیونکہ بہت سے دوست تو محض گپیں مارنے آتے تھے۔ سگریٹ پینے، پان کھانے، کچھ ادھر ادھر کی باتیں اور چلتے بنے۔ اب اس قسم کے دوستوں کا میرے دفتر میں آنا مشکل تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں، اب سارے دفتر میں میرا رعب داب بیٹھ گیا تھا۔ سب لوگ کہتے، "اجی مانئے صاحب کی کیا بات ہے، اتنی پابندی اور سلیقے سے کام کرتے ہیں کہ معمول باتوں میں ایک سکنڈ ضائع نہیں کرتے۔ وقت پر دفتر آتے ہیں، اور وقت پر جاتے ہیں۔ میں معمولی آدمیوں سے تو ملتے ہی نہیں۔ دفتر میں گپیں ہانکنے، جوئی جوں میرا وقار دفتر میں بڑھتا تھا، ظفر چپراسی کی گرفت مجھ پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

آپ ضرور پوچھ سکتے ہیں، اگر ظفر چپراسی نے اپنی محنت خلوص اور دیانتداری سے سکہ جما لیا تھا، تو اس میں بیچارے کا کیا قصور۔ جناب میرے آنے سے پہلے ظفر چپراسی کی ماہوار تنخواہ صرف ساڑھے دو پیسے تھی، اور اب اس کی تنخواہ پچھتر روپے ہے۔ یعنی ایک۔ اس کے اندر اندر اس نے پندرہ روپوں کا اضافہ کرا لیا تھا۔ یہ

اس کی بہت بڑی فتح تھی۔

مرد اپنی تنخواہ بڑھوا لیتا، تو شاید مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا، اب تو اس نے دفتر کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی تھی۔ یعنی کس کلرک کی تنخواہ بڑھوا دیں۔ ایک دو کے خلاف شکایتیں کر کے انھیں نکلوا دیا۔ اب تو پورے دفتر میں ظفر چپڑاسی کا طوطی بول رہا تھا۔ اور سب لوگ سفارش کرانے کے لئے ظفر کے ارد گرد گھومتے نظر آتے۔

یہ بات مجھے بالکل اچھی نہ لگی۔ ہاں اگر میں زیادہ ذہین نہ ہوتا، یا ظفر مجھ سے زیادہ تجربہ کار اور پڑھا لکھا ہوتا، یا ظفر میرا آقا ہوتا تو غلبہ میں ایسی باتوں پر غور نہ کرتا۔ ایک معمولی سے چپڑاسی کی یہ ہمت کہ وہ ایک فیکٹری کے مالک پر اس طرح چھا جائے۔ اور اسے دو کوڑی کا نہ کر رکھ دے۔ یہ واقعی حیرت انگیز بات تھی۔ اور میرے لئے پریشانی کا باعث بھی۔

ایک بار تو اس نے کمال ہی کر دیا۔ دفتر میں آیا کہنے لگا، "حضور۔"

"کیا بات ہے؟"

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہو تو عرض کروں۔"

"کہو۔"

"جی وہ ــــ" یہ کہہ کر وہ رک گیا۔

"کہو تو، ہوا کیا؟"

"جی میری بہن کی شادی ہے۔ اب دیکھئے نا، میری بہن کا میرے سوا اور کون ہے۔ دراصل میری بھی کیا حیثیت ہے۔ جو کچھ ہیں، آپ ہی ہیں۔ آپ کی وجہ سے میں نے اپنی بہن کی شادی طے کر لی۔ کتنا بڑا سہارا ہے آپ کا۔ خدا کی قسم جب چلتا ہوں، تو سینہ تان کر چلتا ہوں، خدا آپ کا سایہ میرے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے۔"

"روپے چاہئیں۔ ظفر۔"

"جی ہاں۔ کتنے روپے بھیج دوں۔ کاغذوں میں شادی ہو گی۔ اماں دیں ہیں۔ ایک سو روپے بھیج دینا، کیا خیال ہے حضور کا۔"

"ایک سو سے کیا ہو گا۔ ظفر۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، ماں جی۔ پھر دو سو بھجوائے دیتا ہوں۔"

"ارے ظفر، تمھاری بہن کی شادی ہے، تین سو بھجوا دو۔"

"زیادہ تو نہیں ہو گئے۔ صاحب۔"

"تمھاری تو ایک ہی بہن ہے۔ اگر پانچ سو روپے زیادہ خرچ ہو گئے تو کیا ہوا، ظفر۔"

آپ کے منہ میں گھی شکر۔ خدا کی قسم۔ آپ جیسا مالک کہاں ملے گا۔"

"یہ لو تین سو روپوں کی چیک اور اماں جی سے مل کر روپے لے لو۔"

"جو حکم سرکار۔"

چٹ لے کر وہ چلا گیا۔

تین دن کے بعد پھر وہ میرے کمرے میں آیا۔ "حضور گستاخی معاف ہو تو عرض کروں۔"

"ہاں۔ ہاں کہو۔"

گھر سے اماں کا خط آیا ہے۔ بس آپ کے گن گاتی ہیں، وہ۔ اور یہ بھی لکھ دیا کہ دو سو روپوں کی اور ضرورت ہے۔ میں اگر دو سو روپے کہاں بھجوں سرکار۔ غریب آدمی ہوں۔ محض ایک چپڑاسی، پھر بھی دو سو روپے تنخواہ۔ اتنا اعتبار ہے، مالک کو ہوں۔ مالک کون بچائے گا صاحب۔ میں اماں کو کیا جواب دوں آپ ہی جواب دیجئے گا۔"

بکتے رہے اور بھیجنا چاہتے ہو ظفر؟"

جتنے آپ جوا دیں۔ خیر دو سو بھیج دیجئے گا۔ منی آرڈر فارم اپنے مبارک ہاتھ سے بھر دیجئے۔ ابھی حاضر کرتا ہوں۔"

پہلے منشی سے دو سو روپے تو لے آؤ۔"

"حضور ــ ایک معمولی چٹ لکھ جائیے۔"

دراصل اسے کام لینے کا ڈھنگ آتا تھا۔ میری کمزوریوں کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ میری دکھتی رگ پر وہ ذرا انگلی رکھ دیتا، اور مجھے اس کی بات ماننا ہی پڑتی۔

ایک دن منہ لٹکا کر میرے کمرے میں آ گیا۔

"حضور گستاخی معاف۔ اگر جان کی امان ہو تو عرض کروں۔"

"کچھ کہنے سے معاف کہو۔ ادھر اُدھر کی مت ہانکنا۔"

"جو وہ آپ کا ہی رام۔" یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔

"ہاں۔ اسے کیا ہوا۔" میں نے ہفتے میں آکر کہا۔

"اچھا حضور۔ کس بتاؤں گا۔ آج نہیں۔" وہ جانے کیلئے مڑا۔

"ارے بات تو بتا کر جا۔"

پہلے میں بات کی تہہ تک پہنچ جاؤں گا سرکار۔ پھر آپ سے عرض کروں گا۔"

اگلے دن ظفر کہنے لگا۔ "صاحب وہ بات تو بالکل سچ ہے۔"

"ایسے کون سی بات؟"

"جو ہری جزائچی جی کی۔"

"لیکن کون سی، بتاؤ تو سہی۔"

"بتلاتے ہوئے شرم آتی ہے، حضور۔"

"شرم کس بات کی۔"

"رام ہی رام بد دیانت ہے سرکار۔"

"اُس نے کیا بد دیانتی کی ہے۔" میں نے چلا کر کہا۔

"حضور فیکٹری سے لوہے کی چادریں چوری کر کے بازار میں بیچ دی ہیں۔ اور جو رقم حاصل کی اسے خود ہضم کر لیا۔"

"ہری رام پر الزام لگانے سے پہلے ایک بار سوچ لو ظفر۔ یہ سودا مہنگا پڑے گا۔"

"سرکار اگر بات غلط نکلے تو میرا گردن اڑا دیجئے گا۔"

"گردن تو نہیں اڑاؤں گا لیکن تمہیں برخاست ضرور کر دوں گا۔ منظور ہے یہ شرط۔"

"بولا تنے حضور۔"

آج میں بیحد خوش تھا۔ ظفر خود بخود اپنے جال میں پھنس گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہری رام اس قسم کی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا۔ شروع دن سے میں نے اس معاملے کی تفتیش کرائی۔ آخر کار مجھے شکست کھا سامنا کرنا پڑا۔ ظفر نے جو الزام لگایا تھا وہ بالکل درست تھا۔ اگلے دن ظفر کی بجائے ہری رام کو برخاست کرنا پڑا۔

دراصل اس معاملہ کا واقعہ کے بعد ساری فیکٹری میں ظفر کا ڈنکا بج گیا۔ اب یوں معلوم ہوتا تھا کہ ظفر واقعی فیکٹری کا مالک تھا۔ دل ہی دل میں ظفر کے خلاف نفرت کا لاوا اُبل رہا تھا۔ مگر میں کوئی غلطی نہیں کرتا۔ میں غصے سے جل بھن رہا تھا۔ جب میں آتا تو ظفر کی صورت دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی۔ میں ظفر کی صورت دیکھنا بھی پسند نہ کرتا۔ اسی دوران میں میرے ایک دوست رہے ہوئے آفس میں داخل ہوئے، اور آتے ہی مجھ پر برس پڑے۔

"اجی، عجیب خبیث نوکر ہے آپ کا۔"

"کیا ہوا مالک رام جی۔"

"اور کیا ہو سکتا ہے، پنڈت جی، ایک ہفتے سے ملنے کی کوشش کر رہا ہوں سے غلط دو ٹکے کا نوکر کو کوئی ذکوئی بہانہ بنا دیتا ہے۔ صاحب ابھی فائل دیکھ ہیں صاحب، ابھی ملوا تا ہوں آپ کو، صاحب ابھی کانفرنس روم میں گئے صاحب۔ ابھی فون کر رہے ہیں۔ ذرا ٹھہر جائیے۔ پرماتما کی قسم۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا ہے جیسے میں اپنے دوست سے نہیں مل رہا ہوں، بلکہ کانگریس کے صدر سے کی اجازت چاہ رہا ہوں۔ پنڈت جی آپ بڑے ہوں گے اپنے گھر میں۔ میں تو آپ ماڈسے کے لئے آیا تھا۔ ایک بہت بڑا آرڈر لایا تھا۔ لوہے کی چادروں کا،

خیر، اب چلتا ہوں۔"

"ارے بیٹھئے تو، مالک رام جی۔"

"پہلے اپنے نوکر کو تمیز سکھائیے۔"

"ظفر۔"

"جی، چلایا"

ظفر دوڑتا ہوا اندر آیا۔

"تم نے صاحب کو اندر کیوں نہیں آنے دیا۔ بڑے بدتمیز ہو گئے ہو۔"

"جی جی۔ سن غلطی ہو گئی سرکار۔"

تو اس غلطی کا خمیازہ بھگتو، اسی وقت دفتر سے حساب بے باق کر کے چلے جاؤ۔ میں تمہارے ایسے نوکر کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ آج سے تمہیں برخاست کیا جاتا ہے سمجھے۔"

ظفر چپڑاسی یہ سب کچھ سنتا رہا۔ میرا خیال تھا وہ گڑگڑائے گا، روئے گا، معافی مانگے گا لیکن وہ بالکل خاموش رہا، اور چپکے سے کمرے سے نکل گیا۔

شام کو جب گھر پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ آنگن میں چند بچے کھیل رہے تھے جن کی شکل صورت سے میں واقف تھا۔ چائنک میری نگاہ چار پائی پر پڑی میری حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، جب میں نے یہ دیکھا کہ ظفر چپڑاسی میرے والد محترم کے پاؤں داب رہا تھا۔

بیٹے زندہ آنا۔" پتا جی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا

"کیا بات ہے پتا جی"

"بیٹا، بیٹھو۔"

پھر والد صاحب نے ظفر کو جانے کیلئے اشارہ کیا۔ ظفر چلا گیا۔

"ظفر کو تم نے دفتر سے نکال دیا ہے۔"

"ہاں پتا جی۔"

"کیوں"

"میں دفتر کے کام کاج میں کسی قسم کی دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔"

"ایک معمولی سے نوکر کو برخاست کر کے کون سا بڑا کام کیا ہے تم نے۔ بیچارا غریب ہے، بال بچوں والا ہے۔ اس وقت کہاں جائے۔"

جہنم میں جائے۔ سیٹھ سے جا ملے، چلا جائے۔ کیا میں نے ساری عمر کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، پتا جی۔"

بیٹے، زندہ ہو شمند کی، دانائی اور ذکاوت کی پہچان زندگی میں نہیں ملے گا۔ دفتر جانے سے پہلے ظفر ہر روز یہاں آتا، سودا سلف لا کر دیتا، جو کام کہتی تھی کرتا تھا۔ سنڈے سنڈے تمہارے بچوں کو سیر کرانے لے جاتا تھا۔ تمہیں اس

بات کا اندازہ ہی نہیں کر اس کے بغیر یہ گھر نہیں چل سکتا۔ بیچارے سے ایک معمولی سی غلطی ہو گئی۔ اللہ نے اسے ہمیشہ کے لئے چلتا کر دیا۔ اس کی غلطی کا صلہ تم زندگی بھر نہیں دے سکتے۔ یہ سراسر بے انصافی ہے۔ لمحے لمحے واپس لینا ہو گا۔"

جو کچھ والد صاحب نے کہا تھا یہ سب باتیں میرے لئے نئی تھیں۔ ظفر کی شخصیت کا یہ سرا سرے سے میرے ہاتھ نہ آیا تھا۔ اس نے مجھے گود میں اٹھانے سے پہلے، میرے والد محترم کو اپنی گود میں لے لیا تھا۔ میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ حالات میرے موافق نہ تھے۔ ملک کونے میں بیوی کھڑی تھی۔ اس سے ذرا دور میرے دو بچے مجھے گھور گھور کر اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جرم کیا تھا۔

"میں اب ظفر کو نوکر نہیں رکھوں گا پتا جی، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"میرا آخری فیصلہ بھی سن لو۔ اگر تم ظفر کو بحال نہیں کرو گے، تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ میں ابھی جاتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگے۔

"پتا جی۔"

میں نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پتا جی کی بات دوہرائے میں نے ہتھیار ڈال دئے۔ اور کہا "اچھا پتا جی، میں ظفر کو بحال کرتا ہوں۔"

"صرف بحال ہی نہیں کرو گے، اسے ترقی بھی دینا پڑے گی۔"

"دوں گا پتا جی۔ کمبخت ہر جگہ مجھے ہی شکست دیتا ہے۔ ظفر کا بچہ۔" یہ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

ظفر پھر ہمارا بھائی بن گیا۔ اپنی نوکری پر۔ دو سال اسی طرح گذر گئے۔ پھر اچانک ۱۹۷۱ء کا بھیانک دور آیا۔ قتل و غارت گری کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔ اس خونی دور میں ظفر ایک آہنی دیوار بنکر ہماری حفاظت کرتا رہا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اب یہاں رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے تو میں نے ٹیکسی کو تالا لگا دیا۔ سامنے ظفر چپڑاسی کھڑا تھا۔

"صاحب جا رہے ہیں۔" ظفر کی آواز میں بیچارگی اور اداسی تھی۔

"ہاں ظفر۔"

میں نے ظفر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

ظفر اس سے پہلے جو میرے دل و دماغ کی چابیاں تمہارے پاس تھیں، آج اس ٹیکسی کی چابیاں ظفر نے میرے ہاتھ میں رکھ دیں۔ اور اصل میں تو یہ اس ٹیکسی کے مالک ہونے کا [illegible] کی طرف اپنا

اپنی جلد کو خوبصورت بنائیے

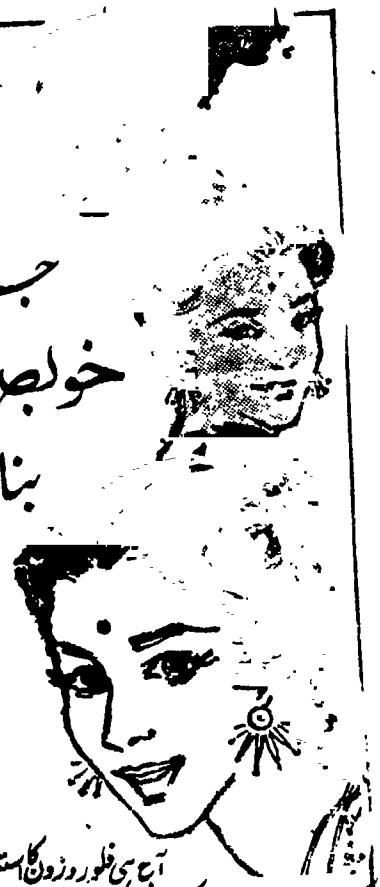

آج ہی فلورون کا استعمال شروع کیجئے۔ چند ہفتوں میں آپکی جلد خوبصورت سے خوبصورت تر ہو جائیگی فلورون نرون جلد کو خوبصورت بناتا ہے۔ کیل، مہاسے اور جھریاں دور کرکے لازوال حسن عطا کرتا ہے۔

فلورون نرون جسم میں جذب ہو کر اپنے کیمیائی اثرات سے چھپے ہوئے حسن کو ابھارتا ہے۔ خوبصورتی، دلکشی اور جاذبیت پیدا کرتا ہے۔

فلورون لوشن چار روپے پچھتر پیسے
فی بوتل
فلورون نرون کنسٹریٹڈ کریم پانچ روپے ۸۵ پیسے
ہر جگہ دستیاب ہوتا ہے
یا براہ راست اس پتہ سے منگائیے

ہائیجنک لیبارٹریز انڈسٹریل اسٹیٹ پوسٹ بکس ۱۱۹۲ بمبئی ۱

طبیّہ دواخانہ یونانی (اندور) پرائیویٹ لمیٹڈ

کی مایۂ ناز ایجاد

جسم کے تمام غدودوں کو تقویت دے کر بکثرت خون صالح پیدا کرتا ہے۔ بدرجۂ اعلیٰ مقوّیِ اعصاب ہے

دل و دماغ

اور خصوصاً قوائے جسمانی کو طاقت دیتا ہے

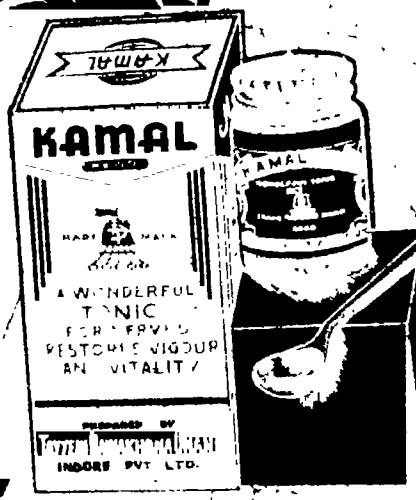

کمال

منشی

اور

زہریلی دواؤں

سے

بالکل پاک ہے

طبیّی

چند

شہرۂ آفاق

خصوصی ادویات

مکمّل کورس ۲۴ روز کے لئے ۲۲ روپیے

۱۲ روز کے لئے ۱۱ روپیے

مفت

ٹی۔ڈی ٹوتھ پاؤڈر

امراض دہان کیلئے مشہور و مستند

سجن۔ پائیوریا کی بہترین دوا اور عام روزانہ استعمال کیلئے بہترین منجن

بڑی شیشی ۱/۵۰

چھوٹی شیشی -/۵۰

عرق ماء اللحم

کھوئی طاقت کی بحالی کے لئے

نفیس مرکب

موسم سرما کی جان

پورن بوٹی خاص اعلیٰ ۱۳/۷۵

آدھی بوتل ۷/۱۲

ملنے کا پتہ

طبیّہ دواخانہ (اندور) پرائیویٹ لمیٹڈ

۵۱۔ بوہرہ بازار اندور سٹی (ایم۔پی)

برانچیز

چوک بازار۔ اجین

اور

مہارانی روڈ اندور

فون ۱۔ ۶۳۳۴

طبیّہ دواخانہ یونانی

فون ۔۔ ۳۲۴۸۸۳

۷۰ محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳

شاہی

کی خون، ضعف اعصاب، عضاء رئیسہ، مردوں اور عورتوں اور بچوں کیلئے بہترین ٹانک

مکمّل کورس -/۹ روپیے

۱۲ روز کے لئے -/۳۲۵

بواسیری پلز

تازہ، بقوہ، کھانسی اور سینہ کے امراض کے لئے اکسیر، گلوکوز کی

شیشی کلاں ۳/۲۵

" خورد ۱/۶۲

امبر ب کیپسول

طبّ یونانی کا مشہور مرکب ہر شیشی صحیح

اجزاء پیر تیار کردہ

قسم اعلیٰ دس گرام ۵۰ پیسے

ندا فاضلی

سندھیا دربار کی ہولی

گنگا ندی کے کنارے کی آنچل بالکل کی طرح اکہرے بدن بھیا نگر پانیوں کے چھینٹے اڑاتا ہر پھٹیلا بستی بجا رہا ہے۔ اگتے سورج کی پہلی کرن مندر سے لٹکے مہا گھنٹی کی کوئی کو پنڈتوں کی ہتھیلیوں پر کھیلتی شاشوں کا پرساد کھا کر... ہری گھاس پر ٹہلتی ٹہنیاں چٹخا رہی ہے کھڑکیوں کے پردے سرکتے ہیں۔ دھلائوں کی چولہوں کی سنہری چرچراہٹوں سے گلیاں گونج اٹھیں چوراہے پر رات بھر جاگا ہوا چوکیدار آنکھیں ملتا لاٹھی سنبھالے پیپل پر ٹنگی چاند کی تہہ کر رہا ہے۔ گھاٹ پر ہاتھوں پر بندھی ہوئی گائیں بڑے دلار سے بچھڑوں پر زبان پھیر رہی ہیں۔

"جیو اجی چوک" کے بیچوں بیچ کھڑا کوئی مٹھی بھر غبار کے دانے ہاتھ میں لیکر ہوا میں اچھالتا ہے اور چاروں طرف ڈیرے سے کبوتر بکھر جاتے ہیں۔ وکٹوریہ مارکیٹ کی محرابوں میں دوکانوں کی چھتوں پر، جہاں تہاں راہو کے مجسمے کے سنگ مرمر کے گنبد پر... آ... آ... آ... کی آوازیں دھیمے دھیمے سروں میں پھیل رہی ہیں۔ اور جنگلی کبوتروں کے پرے اپنی چونچوں میں دھوپ کے ننھے ننھے ٹکڑے لئے دھرتی پر اتر رہے ہیں..... شہر دھیرے دھیرے جاگ رہا ہے۔ منڈیروں پر بیٹھے چالاک مینائیں، چکیوں کے مدھر گیت، جھانجوں کی چھن چھن اور دودھ کی لطیف سرسراہٹوں میں گھلی ہوئی آ رہی ہیں۔ بستروں پر انیدے بچے کسمساتے ہیں۔ رات بھر کی نیند سے چہرے تازہ کلی کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔ کلکاریاں گونجتی ہیں۔ لجا ہٹیں جاگتی ہیں اور ہنستی آنکھیں کھلتے ہی سارا بھر پرانی پچکاریوں کی ڈھنڈائی ہو رہی ہے۔ پچکاریاں چھلنے جا رہے ہیں۔ دوشنداں کشکولے جا رہے ہیں۔ صندوق الٹ پلٹ کئے جا رہے ہیں۔ کوئی دوا کی خالی شیشی میں رنگ بھر رہا ہے۔ کوئی عطر جیبوں میں گلال بھرے بھاگا جا رہا ہے۔ کوئی ٹین کی پچکاری لئے چوکھٹ پھلانگ رہا ہے۔

سڑک کے کنارے چاروں طرف بھیڑ ہی بھیڑ نظر آ رہی ہے۔ ہاتھوں میں گلال اور رنگ بھری پچکاریاں لئے جنتا بے چینی سے مہاراج کا انتظار کر رہی ہے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی پبلک اپنے بھرپور پیار، مستی اور عقیدت کے ساتھ راجہ سے ہولی کھیلنے جمع ہوئی ہے۔ مکانوں کی چھتوں، دالانوں، جھروکوں اور گیلریوں پر ہزار طرح کی ناری بیاپاریاں بنی ٹھنی کھڑی ہیں۔ داغ کی غزلوں کا سارا ماحول جگر کے لہجے کی سرشاری..... چہلیں ہو رہی ہیں۔ آنچل ڈھلک رہے ہیں، کوئی جھجکے سے گردن اٹکائے دوسری ہوئی جا رہی ہے، کوئی پردے کا کونا سرکائے "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کا عالم پیدا کئے ہوئے ہے۔ کوئی پیچھے دب گئی ہے تو پنجوں کے بل کھڑی کھڑکی سے جھانک رہی ہے۔ ہر ایک کی کھنکتی ہوئی ہنسی، اوئی..... مگر سب کی نظریں سڑک پر جمی ہوئی ہیں۔ لوگ شاید دیر ہو جانے کے ڈر سے وقت سے پہلے ہی آ گئے ہیں۔ سڑکوں پر بچھے کیسے پولیس والے اس امڈتے طوفان کے آگے کناروں کی طرح ڈٹے ہیں۔

ادھر گوالیار راج کے فوجی ہیڈ کوارٹر پر تیاریاں ہو رہی ہیں، رنگ کی بڑی بڑی ناندیں اور ٹب بھرے رکھے ہیں۔ فوجی بینڈ پر بھیرویں کی کومل لہریں شام کی ندی کی طرح ہلکے ہلکے بہہ رہی ہیں سپاہی اپنے سپہ سالار کے منتظر ہیں۔

مغل محل میں تو ابھی دربار لگا بھی نہیں، دلکشا میدان موتی کی طرح چمک رہا ہے۔ قنائیں لگی

ہیں۔ فرش اور گاؤ تکیوں سے پورا میدان سجا ہے۔ پیڑوں کا ایک ایک پتہ دھلا ہوا ہے کیا مال جو کہیں دھواں نظر آئے، برف سے سفید انگرکھے چوڑی دار پائجامے، کالے جوتے اور کلف لگے رنگین صافے ہر طرف اپنی بہار دکھا رہے ہیں، کہیں کہیں کالی فرکی ٹوپیاں بھی جیروں پر خوب پھب رہی ہیں۔ بڑے بڑے درباری چھوٹے بڑے جاگیردار، اسٹیٹ کے جانے پہچانے وزیر، سرکاری افسران دلکشا میدان میں گاؤ تکیوں سے لگے بیٹھے ہیں۔ ہر چہرے پر خوشی کی چمک، ہر ہونٹ پر مسکراہٹ.... پٹھان، سید، مرہٹے، ٹھاکر سب مختلف رنگوں کے پھولوں کی طرح ایک ہار میں گندھے ہیں۔ چاندی سونے کی بڑی بڑی گنگا جمنی کشتیوں میں عبیر، گلال اور مقیش رکھا ہوا ہے، چاندی کی چمکتی ناندوں میں خوبصورت رنگ ہلکورے کھا رہا ہے۔ بھینی بھینی سگندھ سے بسی ہوائیں۔ ہر طرف رنگ، ہی رنگ، پھول ہی پھول، آس پاس سرخ پگڑیاں اور سنہرے پٹکے باندھے محل کے اہل کار چوکس کھڑے ہیں۔ بھاگتی آکاش ماں کی ممتا سا صاف، اجلا اور پھیلا ہوا نظر آرہا ہے۔ پیلے پیلے کرتے پہنے سندر بیبے رنگولی کی کھڑکیوں سے باہر جھانک رہے ہیں۔ مور اپنے پر سمیٹے اگتے سورج کی طرف تاک رہا ہے۔ آم کی ڈال پر فاختہ کا جوڑا چونچ میں چونچ ڈالے چپ چاپ بیٹھا ہے۔

سب بے چینی سے مہاراج کا انتظار کر رہے ہیں.... اور وہ سامنے.... دو بڑی بڑی آنکھیں جھلکیں۔ ہونٹوں سے ایک بھیلی مسکراہٹ پھوٹی اور دور دور تک چاندی سی بکھر گئی۔ سفید شیروانی، کسا ہوا چوڑی دار پائجامہ اور طرے دار دوکونی پگڑی پہنے مہاراج جیواجی راؤ مسند کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ درباری باری باری مجرے پیش کر رہے ہیں۔ تمام اہل کار سر جھکائے کھڑے ہیں اور راجہ اپنی اونچی مسند پر بیٹھے مسکراتے ہوئے چاندی کے مٹھ میں رکھی پچکاری کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔

لمبی لمبی کلا کاروں کی سی انگلیوں میں ہیروں کے نگ والی انگوٹھیاں جھلمل کر رہی ہیں، بڑی بڑی فنکار آنکھیں جیسے گھٹاؤں بھرا آسمان، کتنی رسیلی، کتنی نرم، کتنا رس کتنا جادو۔ جدھر اٹھ جاتی ہیں بڑی بڑی شریر مکاہیں تک جھکنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ مندر سیا گھرانے کی آنکھیں اور موتی خاص طور سے مشہور ہیں۔ مہاراج جیواجی راؤ کا بدن گٹھیلا، قد درمیانہ، رنگ گیہواں اور چہرا چوڑا، کشیدہ اور خوبصورت تھا۔ ان پر یوں تو ہر پوشاک ہی خوب سجتی تھی مگر شیروانی، تنگ پائجامہ اور بڑی باڑھ والی کالی فرکی ٹوپی میں تو نظر لگ جانے کا ڈر ہوتا تھا۔

اللہ رے جامہ زیب تری جامہ زیبیاں
جو رنگ تو نے پہنا وہی رنگ کھل گیا!

استاد حافظ علی خاں سرود پر کوئی مدھم دھن چھیڑے ہوئے ہیں، سنگیت کے مختلف راگ موسموں اور وقت کی مزاجی مناسبت سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ کسی موزوں وقت پر کوئی موزوں دھن بجلی کی طرح روح کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہے، جیسے ایک دانہ ہوئی سب لوگ جیسے کسی گہری میٹھی نیند سے چونک پڑے ہوں۔ مہاراج کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی، حافظ علی خاں بجتے بجتے کو ایک تمثالی کلائمکس پر لاکر جان بوجھ کر تار توڑ دیتے ہیں یا وہ خود سنگیت کی بھنکاروں میں اتنے کھو جاتے ہیں کہ نغمے کی شدت کے بوجھ سے ساز خود ٹوٹ جاتا ہے.... یہ راز آج تک کسی کو معلوم نہیں.... زیب النساء اور شیریں (محل کی مشہور گائکائیں) مضطر خیرآبادی کی لکھی ہوئی ایک پیاری سی ہوئی کو اپنی آوازوں کے آبشار چڑھاؤ سے مجسم کیے ہوئے ہیں۔ "اڑتے بادل نے رنگوں میں بھرا ہوا کون کی طرح کوئی چمکیلا چیرا بدن، کاندھوں پر اڑتے ہوئے ریشم لے" پھر پیشانی پر جھلمل کرتے سے آنکھوں میں اگتے ہوئے چاند سورج، پھوٹتی ہوئی خوشبو میں سانسوں میں بجتے ہوئے گھنگھرو اور شانے کنول کی طرح لہراتا جھومتا ہوا بدن.... "مجھ گیا رنگوں سے سارا بدن"

کلائے جادو اور گلے کے رس سے دیوں کی لو میں کھلتی جا رہی ہیں، آج ہولی کا دربار ہے۔ آج راجہ کا ہیں "دیا" پیار اور مستی انج ہے، مہاراج ہنستے ہوئے چاندی کی پچکاری میں رنگ بھر بھر کر درباریوں پر پھینک رہے ہیں۔ گلال اور گلاب دو پچکاریوں کا ہر طرف چھڑکاؤ ہو رہا ہے۔ راجہ خود بھی بھیگا ہوا ہے اور دوسروں کو بھی رنگ میں شرابور کر رہا ہے۔

نیچے مہاراج نے کسی سردار کے کھانے پر ہاتھ مارا، صافے اور پگڑیاں اچھلنے لگیں، میراثی لوگ لمبے لمبے ہاتھوں سے گرے ہوئے

سائے اور پرچھائیاں کوٹھے لگے..... یہ ہی تھیتی سانولے اور بچکڑیاں کل لڑکیوں کے دوپٹوں، بیویوں کی ساڑیوں، بچوں کے کرتوں اور ہنوا کے بھات کی صورت میں تبدیل ہو جائیں گی..... سرکار کی جے..... مہاراج کا بول بالا ہو... کی آوازیں گونجنے لگیں۔

کتنا پیارا کتنی خوشی کتنی سرشاری..... پرورش کے نئے نئے طریقے، امداد کے نت نئے ڈھنگ..... ہر ایک کے دکھ کی لاج، ہر ایک کی خوشی میں ساتھ۔

مادھو مہاراج نے ایک بار بھنڈ کے مشہور ڈاکو پنچم سنگھ کو صرف چٹکی بھر گلال کے بدلے میں آزاد کر دیا تھا اور فوج سمیت واپس آ گئے تھے، جرموں پر سزا دینے کی بجائے جاگیر اور انعام سے عزت بخشی تھی۔

آج بھی وہی شبھ ہتھوار ہے، ٹھاکر کنور گلاب سنگھ مادھو مہاراج کے لال اپنے موتی والے کے درشن کیلئے جمع ہوئے ہیں، دلوں میں آشائیں، لبوں پر دعائیں۔

سونے چاندی کے زیوروں سے لدے ہوئے ہاتھی کے ہودے پر مہاراج گلال اور رنگ میں پوری طرح بھیگے ہوئے ہیں، ہونٹوں کی مسکراہٹ چنار کے پتوں سے چھنتی ہوئی کرن سی چمک رہی ہے۔ ہر جھروکے میں چاند ہی چاند..... ہر گیلری میں پھول ہی پھول، ہواؤں میں مست رنگین پچکاریاں اڑ رہی ہیں، سرکاری نقارہ ایک مدھر دھن سے مستی کا خیر مقدم کر رہا ہے۔

چھتوں، منڈیروں، کھڑکیوں سے رنگوں کی پھواریں برس رہی ہیں..... جیوا جی مہاراج کی جے..... سندھیا مہاراج کی جے سے پورا شہر گونج اٹھا ہے..... ہاتھی جھوم جھوم کر آگے بڑھ رہا ہے..... مہاراج کے دونوں ہاتھ کمل کی کلی کی مانند جڑے ہوئے ہیں۔

گشت کی جھانکی کی سب سے اونچی منزل پر ایک بوڑھا کھڑا ہو کر زور سے چلاتا ہے..... موتی والے کی جے..... مہاراج کی نظر ایک ساتھ اوپر اٹھتی ہے، ہاتھ جڑتے ہیں اور ایک دیا کی چمک چہرے پر جاگ اٹھتی ہے..... اور سب دیکھتے ہیں کہ وہ پاس بیٹھے اپنی 'ڈی' سی سے کچھ کہہ رہے ہیں۔

شاید اس بوڑھے کو لڑکی کی شادی کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوگی، یا رہنے کے لئے مکان کی خواہش ہوگی... یا اپنے کسی بچے کے لئے روزگار کی تلاش۔

ہاتھی انہیں جے جے کاروں کے پیار بھرے شور میں کسی دلہن کی طرح جھومتا جھامتا..... جگہ جگہ اسی طرح رکتا..... نئی نئی کہانیاں بنتا..... صرافے بازار سے گزرتا..... خود بھی رنگ میں ڈوبا..... دوسروں کو بھی بھگوتا..... گورکھی کے پھاٹک کی طرف بڑھتا جا رہا ہے ——— اور وہ بوڑھا پورے یقین اور اطمینان کے ساتھ آنے والے کل کا انتظار کرنے لگتا ہے..... اس کی آنکھیں عقیدت یقین اور پیار کے ملے جلے احساس سے جھلملا رہی ہیں..... اس کی کمر کے خم میں آپ ہی آپ کچھ سیدھا پن سا پیدا ہوتا جا رہا ہے۔

(ہندی سے ترجمہ)

(بقیہ "رم جھم" صفحہ ——— ۶۴)

بارشوں کی یہ برساتیں دنیائے نباتات کیلئے جس قدر حیات بخش ہیں اسی قدر مضر حیوانات کیلئے بھی ہیں۔ میرے گھر کی قریبی پہاڑی پر ایک لومڑی سیر کرتی تھی برسات کے دنوں اس کے بچے جو چکے تھے اور ایک صبح ایک ننھا سا لومڑی کا بچہ اپنے جسم کو سمجھا نہ سکا کہ کون برسات سے بھیگ نہ جائے۔ میں نے اسے اس برساتی نالے کی طرف جاتے دیکھا جس میں ہر برسات میں بپھرا ہوا پانی بہتا ہے۔ اطراف و اکناف کے تمام نالے ہر طرف بہہ رہے تھے اور گھنٹوں میں ابھر کر نمودار ہونے والے چشموں اور جھرنوں کی آوازیں اپنے کی کوشش میں ناکام رہتی تھیں اپنے پنجوں کیلئے چند جگہ کو ڈھونڈ لینے کے بعد وہ اپنی کمر کی طرف چلی گئی۔ کئی گھنٹے دیکھتے گزر گئے۔ بالآخر میں نے ایک بھرپور قہقہہ بلند کیا کہ میرا ان برساتوں کے ساتھ عجیب مسرتوں سے بھرا ہوا ساتھ ہے۔ اور اس وقت بھی جبکہ میں اور میرے بچے کھڑکیوں سے لگے بیٹھے تھے، کھیتوں کو بہہ جانے والے پانی سے محفوظ رہتے دیکھ رہے تھے ہماری نظر ایک لومڑی کے گھر کی طرف اٹھی جو اپنے بچوں کو باہر رکھے نہایت آسودگی سے کھیل رہی تھی۔ باہر گھٹا ٹوپ جم برس رہی تھی اور ہمارے بچے اس کی بیچینی کو دیکھنے لگے بار بار باہر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمیں حیرت ہونے لگی میرے بچوں کی طرح یہ بھی ہماروں کے ان ازلی دلدادہ، سحر آگیں نغمات کو سننے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہیں۔

شاعر بمبئی

مظہر امام

غزل

ایک مدّت سے مرے گھر میں کوئی آیا نہیں
ان شناساؤں میں کوئی آشنا چہرہ نہیں
گلی ہی گلی، سڑکیں ہی سڑکیں، عشق ہے بے امتحاں
آج رستے میں کوئی دریا نہیں، صحرا نہیں
آسماں بھی سر پہ ہے، تارے بھی، مہر و ماہ بھی
اپنے پیروں کے تلے لیکن کوئی دُنیا نہیں
خود غرض ہیں انجمن آرائیاں، تنہائیاں
آدمی کا آدمی سے اب کوئی رشتہ نہیں
آج کے کوّے اُڑاتے ہیں ہمالہ کا مذاق
ہاتھ میں پتھر بہت ہیں، سر کوئی اُونچا نہیں
آگیا ہے اب سوا نیزے پہ تازہ آفتاب
آنکھ والوں نے قیامت کا سماں دیکھا نہیں
جس میں لکھے درج ہوں ہمارا نساں کے لئے
وہ صحیفہ آسماں سے آج تک اُترا نہیں
میرے حصّے میں فقط بربادیاں، ویرانیاں
یہ جہاں سب کا جہاں، میرا نہیں، میرا نہیں

زبیر رضوی

غزل

شوقِ عریاں ہے بہت جن کے شبستانوں میں
وہ ملے ہم کو حجابوں کے صنم خانوں میں
وضعِ ارباب جنوں کھنچ کے ملے ہے ہم سے
پھول ٹانکے ہیں نئے ہم نے گریبانوں میں
کھڑکیاں کھولو کہ در آئے کوئی موجِ ہوا
راکھ کا ڈھیر ہیں کچھ لوگ طرب خانوں میں
شہرِ خورشید کے لوگوں کو خبر دو کوئی
دن کے غم ڈوب گئے رات کے پیمانوں میں
جب کوئی ساعتِ شاداب ملی جام بکف
جان سی پڑ گئی بجھتے ہوئے ارمانوں میں
اے صبا لے کے چلی آ کسی بادل کی پھوار
خاک اُڑتی ہے بہت دل کے بیابانوں میں
اے غزالانِ وطن ناز کرو ہم پہ کہ ہم
آخری گلپت ہیں خوباں کے ثنا خوانوں میں

شاعر ممبئی

اکرام جاوید
کھاف

خواب ڈھونڈوں کہاں

بہت دن ہوئے میں نے ایک خواب دیکھا تھا
بے برسیلا آسمان نیلے فلک بوس پہاڑوں کا سلسلہ، قدرتی رنگ پھیلا ہوا پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب فضائے سبزہ جھاڑیاں پودے پھول ایک کائناتِ رنگ و بو فضائے نیلگوں کی لامحدود گہرائیوں میں دیوتاؤں کے دیوتا کا رتھ چل رہا تھا جیسے جوپیٹر کے سفید دیو ہیکر گھوڑے کھینچ رہے تھے اور میں اس قدیم ترین یونانی رتھ پر سوار تھا۔ جوپیٹر کے سرکش اور طاقتور گھوڑے جنھوں نے خود جوپیٹر کے نہتی مگر بہادر لختِ جگر کو فنا کی گہری اندھیری کھائی میں گرا دیا تھا۔ وہ ایک خاکی فانی انسان کے اشاروں پر چل رہے تھے آسمانی رتھ پر سوار میں فضائے نیلگوں کی لامحدود بلندیوں سے پرے بھی دیکھ سکتا تھا۔ وہ کائنات جو تھی مگر لامحدود، بیکراں، لامثال اور لامحدود تھی بس منظر میں ایک خواب آور موسیقی ابھری ہوئی تھی ایک نغمہ تھا جو میری حیران اور مسرور روح کی گہرائیوں کو چھو رہا تھا۔

آزادی، اختیار اور لذتِ تسخیر کے ناقابلِ بیان عالم میں اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

اور پھر میں خاک زاد تھا، غبارِ خاک کا ایک ذرہ تھا جسے خاک نے بلندیوں سے پستیوں کی طرف کھینچ لیا تھا۔ فضائے نیلگوں کی لامحدود بلندیوں سے یونانی دیوتاؤں کے دیوتا کی رتھ سے گرا ہوا ایک فانی انسان دریا سے نکلا ہوا ایک قطرہ جو اب دریا اپنے وجود کی انفرادیت کیلئے کشمکش کر رہا تھا۔ قطرہ جو بے بسی کی انتہا پر پہنچ کر سینۂ صدف کو ڈھونڈ رہا تھا کہ موتی بن جائے۔ دریا سے الگ رہے اور دریا اُسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ کشمکش آج برسوں سے جاری ہے۔ اس کشمکش نے مجھے بیشمار خواب دکھائے۔ وہ خواب جن کی تعبیر مجھے اب تک نہ مل سکی۔!

میرے خواب کی تعبیر جاڑوں اور برسات کی چند سیاہ، منحوس اور دہشتناک راتیں ہیں جن کی یاد ایک ناسور کی طرح میرے دل میں رہ گئی ہے۔

وہ سرما کی ایک اندھیری رات تھی جس کی تاریکی میں میرے باپ کی زندگی کی روشنی کھو گئی، رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں موت دبے پاؤں آئی۔ اور نو گھنٹے کے اندر ایک جیتا جاگتا محبت بھرا وجود ایک سرد بے جان قالب میں بدل گیا۔ مٹی کی مورت بے قیمت ہو گئی اُسے مٹی میں ملا دیا گیا۔

اور میرے معصوم ذہن کے سارے خواب مٹی میں مل گئے۔ وقت کمہار کے چاک کی طرح گردش میں رہا۔ خواب مٹی میں ملتے اور مٹی سے ابھرتے رہے۔ مورتیاں ڈھلتی، ٹوٹتی اور بے قیمت ہوتی رہیں، کمہار کے چاک پر تخلیق کا تماشہ ہوتا رہا۔ خاک، خاک میں ملتی رہی۔

وہ میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ زندگی میں غم نام کی کوئی شے نہیں تھی، مجھے کسی بات کی فکر نہ تھی — میں ایک پھول تھا اور شاخِ ہستی پر ابھی ابھی کھلا تھا کہ خزاں کی مسموم ہوائیں چلنے لگیں، میرا شفیق باپ جو ایک حقیقت تھا، پل جھپکتے ہی وہ ایک خواب بن گیا، اور مجھے خوابوں سے محبت ہو گئی۔ خواب دیکھنا میری عادت بن گئی۔!

میرا بچپن مر گیا۔ محسوس کئے بنا میں نے اپنی لاش کو دفن کر دیا۔ میں اب جوان تھا۔ میرا اگر مگر اب خزاں کی طرح خوبصورت شاداب جوبلی نہ تھا۔ گھر میں سونے چاندی کی نہریں اب سوکھ چکی تھیں۔ فکرِ معاش کی دودھاری تلوار میرے سر پر لٹک رہی تھی، اور میں اپنی بوڑھی دادی، بیوہ ماں، اور نو سن

مشاعرہ

چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ مستقبل کے بارے میں سوچ کر اُداس ہو رہا تھا، مجھے دنیا میں بہت بڑا آدمی بننا تھا، پڑھ لکھ کر کارنامے انجام دینے تھے، اپنے خاندان کا نام روشن کرنا تھا۔ لیکن میں اعلیٰ تعلیم نہ پا سکا۔ کوئی بڑا آدمی نہ بن سکا۔ بدحواسی اور بوکھلاہٹ کے عالم میں دو کی چھوٹی سی ملازمت اور حقیر تنخواہ ہی کو میں نے زندگی کا مقصد سمجھ لیا۔ غیر شاعرانہ، یکساں اور غیر معمولی خشک کام نے میری روح کی نغمگی کا کام تمام کر دیا، زندگی کا نمونوں کا بن، زہر کا پیالہ اور دل کا ناسور بن گئی۔ گھٹن اور حبس کے شدید احساس سے میرا دم گھٹنے لگا — ایسے میں ہوا کا ایک جھونکا چلا، زلف درخ کا ایک حسین خواب میری بے خواب آنکھوں تک آ پہنچا — میں نے سائے کو اپنی بے قرار بانہوں کی گرفت میں لینے کی سعی کی۔ سایہ غائب ہو گیا، ایک حسینہ نے مجھے محبت کا پہلا سبق پڑھایا، دو قدم ساتھ دے کر چھوڑ گئی اور خواب بن گئی —

ہوا کے جھونکے وقفے وقفے سے جیسے رہے زلف درخ کے سائے ڈوبتے ابھرتے رہے مدھ بھری آنکھوں کے ساغر اور گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نازک لبوں کی لپکتی اور مسکراہٹ کے اُجالے میرے ذہن میں رنگین خوابوں کی دھندلی چھا گئی — کئی کامیاب اور ناکام عشق کئے۔ اور تھک ہار کر ایک سیدھی سادی معمولی صورت شکل کی بے خبر اور بھولی لڑکی سے شادی کر لی، ڈیڑھ سو روپے ماہوار کمانے والا کلرک اسکے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ شادی ہوئی تو بچے بھی ہو گئے۔ بیوی میرا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ وہ میری پرستش کرتی تھی مجھے اپنا مجازی خدا سمجھتی تھی، مجھے اس کی پرستش کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خدا بننا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو رفاقت کے لئے ترس رہا تھا، رگ جاں سے بھی زیادہ قریب محسوس کرنا چاہتا تھا کسی کو۔ مگر کوئی بھی میرے اس قدر قریب نہ آ سکا، کوئی شریک رفاقت کو پوری نہ کر سکا۔ میں ایک بند کتاب ہی رہا۔ کوئی مجھے نہ سمجھ سکا، تاریخ کے بنائے بتوں کو پوجنے والے محسوس تک نہ کر سکے کہ تاریخ کے ان بتوں کا حال میں ہوں۔ میں جو ان کے درمیان ان ہی کی طرح زندہ ہوں، ماضی پرست زمانہ مجھے پہچان نہ سکا۔

وقت کے ہر بڑے آدمی کی طرح مجھے بھی دنیا میں اچھی زندگی کے لئے ترسنا پڑا۔ دانے پانی کے جھگڑوں میں اپنی عمر کے قیمتی ماہ و سال برباد کرنا پڑے، قدم قدم پر لٹنا اور قتل ہونا پڑا۔ آسمانی رتھ اور اس کے چار سرکش گھوڑوں پر قابو پانے کی تعبیر کتنی بھیانک تھی، مجھے میرے خوابوں کی جنت نہ مل سکی۔ میری آنکھوں میں گرم دہکتی ہوئی سلاخیں پھیر دی گئیں۔ قصور تھا تو یہی کہ میں نے خواب دیکھے تھے، تسخیر کائنات کے خواب، موت اور فنا پر قابو پانے کے خواب، ماضی اور مستقبل کے خواب جن کے درمیان حال کا سیلابی خوں آشام دریا بہہ رہا ہے۔

برسات کی وہ اندھیری رات جب موت "سفاسڈ" کی صورت میں میری پیاری بہن قمر پر ٹوٹ پڑی۔ میری بہن جو میری ہمشکل تھی اور میں اپنے مرحوم باپ کا ہم شکل ہوں۔ تو اس طرح میرے باپ کی ایک اور شکل مٹ گئی۔ اور میری ایک اور صورت فنا ہو گئی۔ میں اسے بچا نہ سکا، میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ زندہ زمین اور نہ ہی مردہ — پھر قمر کیسے بچ سکتی تھی۔ اُسے سخت بخار کے عالم میں دواخانہ لے جانے والا، اور سرکاری دواخانے میں کمپمری کے عالم میں کھڑا اُسے دم توڑتے دیکھنے والا، میں ہی تو تھا اور میں ہی تھا جو اس کی لاش لے کر گھر آیا تھا، وہ کالی ڈراؤنی رات جب جاننے پہچاننے والوں میں میری تنگدستی اور مجبوری کی تشہیر ہوئی تھی قمر کے پاس کپڑوں کا صرف ایک جوڑا تھا جسے پہن کر وہ اسکول بھی جاتی تھی اور گھر میں بھی رہتی تھی۔ لیکن جب وہ مر گئی اور دواخانے سے اس کی لاش گھر آئی تو لوگوں نے کہا کہ میت کے کپڑے بدل دو — اور میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ قمر کے مستقبل کے بارے میں کیا کیا نہ سوچا تھا۔ کتنے سہانے خواب دیکھتے تھے کہ اُسے اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا، قیمتی ملبوسات اور زیورات سے سجا کر دلہن بنا کر دھوم دھام سے اُسے رخصت کروں گا، اب وہ ہمیشہ کے لئے میرے گھر سے جا رہی تھی اور میرے لئے اسکے آخری سفر کا خرچ بھی ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اُسے اس کی قبر تک پہنچایا گیا۔ وہ بھی حقیقت سے افسانہ بن گئی — ایک خواب کی طرح غیر مرئی اور غیر حقیقی!

وقت کا سیلابی دریا پوری قوت سے بہہ رہا ہے۔ حقیقتوں کو خواب اور خوابوں کو حقیقت بناتا ہوا — اور میری جوانی نذر سیلاب ہو گئی — میرا جوان جسم مر گیا، اور اس مردہ جسم سے ایک بوڑھے نے جنم لیا ہے —!

برسات اور سردیوں کی درمیانی رات بہت اندھیری اور دہشتناک ہے، زمانہ اب بدلا ہے فکر معاش کی نوکر دی سے اب آزاد ہوں۔ اب میں بہت بڑا آدمی ہوں، اعلیٰ درجہ کی زندگی گزارتا ہوں، میرے پوتے اور نواسے یقین نہیں کرتے کہ ان کا دادا اور نانا ایک زمانہ میں

دنیا میں اس وقت بھی ہوا ہے اور مفلسی کی بدولت آسودگی اور خوشی سے محروم رہا ہے، میں اپنے ماضی کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ ماضی مجھ سے بری طرح چمٹا ہوا ہے کون اپنے ماضی کو بھول سکتا ہے کون اپنی جان سمتا کو فراموش کر سکتا ہے۔

وہ بھی ایک رات تھی۔ مارچ کی گرم اندھیری رات، جب میرے خواب یاسمین کی شکل میں میرے سامنے آئے ایک بھولی بھالی معصوم پُرخلوص لڑکی جس کی بڑی بڑی چمکدار آنکھوں اور دلربا مسکراہٹ نے مجھے یکبارگی اور چاک گریباں کر دیا محبت کا تیز و تند جھونکا ایسا میرے جذباتی وجود کی بنیادیں ہلا گئیں۔ میں جو پھولوں کی چاہ میں قدم قدم پر قتل ہوتا رہا تھا، ایک باد اور معتدل میں پہونچ گیا میری جو اپنے نقطۂ عروج پر تھی میں ایک سیدھی سادی باوفا اور اطاعت گزار بیوی کا شوہر تھا اور تین پیارے بچوں کا باپ تھا۔ مجھے اپنی بیوی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ مجھے اپنے بچوں سے بے پناہ محبت تھی، لیکن یاسمین نے میرے ہوش و حواس اڑا دیئے، میں اپنی بیوی بچوں کو بھول گیا۔ اپنی عمر، اپنے حالات کا مجھے کچھ خیال نہیں رہا۔ اور یاسمین کی جوان محبت کے طوفانوں میں کھو گیا۔ میں اپنا ماضی اور ماضی کا قصہ غم سب کچھ بھول بیٹھا، اتنی شدت اس قدر جوش و خروش اور اس طرح دیوانہ وار میں نے زندگی میں کسی کو نہیں چاہا تھا، یاسمین۔ مجھے میرے دل کی محبت کا احساس دلایا، وہ محبت جس کا مجھے خود علم نہ تھا، اور جذبوں کی تہہ در تہہ گہرائیوں میں کہیں پوشیدہ تھی، محبت کی عظمت، گہرائی، گیرائی اور طاقت و توانائی کا عرفان میرے لئے مشعل راہ بنا، میری زندگی ہی بدل گئی، ایک نشہ سا مجھ پر طاری ہو گیا۔

میں نے یقین کر لیا کہ یاسمین میری ناآسودہ زندگی کے خوابوں کی تعبیر ہے اب اس کے بعد میری زندگی میں کوئی خلاء نہیں رہے گی میں نے بے خطر آگ کے سمندر میں چھلانگ لگا دی، دنیا دیدہ حیران نہ ہی اور ناممکن اور انہونی باتیں ہو کر رہیں، یاسمین کو پانے کے بعد سوچا تھا کہ اب کوئی خواب نہیں دیکھوں گا۔ اب کسی خواب کی تلاش نہیں کروں گا۔ میں نے یاسمین کو دل میں اٹھا کر رکھ لیا اور در دل بند کر لیا۔ آنکھوں کے کیواڑ بند کر لئے۔

وقت کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی بدل گیا، یاسمین ملی تو محسوس ہوا جیسے مجھے اس کا صرف جسم ملا ہے اور اس کا دل اس کے پہلو میں نہیں ہے آہستہ آہستہ ایک دیوار سی ہم دونوں کے درمیان حائل ہو گئی ــــ اور یاسمین جو حقیقت تھی، پھر خواب بن گئی ــ!

وقت کس قدر تیز رفتار سے گزر رہا ہے، وہ وقت بھی گزر گیا، وہ وقت جو آنے والا ہے۔ میں درمیان میں معلق کھڑا ہوں، حیران، لرزاں، پریشاں، یادوں کی گہری دھند میں ڈوبا ہوا ــــ یادیں ماضی اور حال کی یادیں گزشتہ تجربات، حادثات اور گزرے ہوئے لوگوں کے چہروں کے چاند ستارے، ستاروں کی طرح چمکدار آنکھیں اور پھول کی طرح تر و تازہ خوبصورت ہونٹ اب بھی مجھے اس آہو چشم کی یاد آتی ہے۔ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں میری سماعت اور بصارت میں فرق آ چکا ہے پھر بھی میں دیکھ اور سن رہا ہوں۔ میری نگاہوں کے آگے کتنے جسموں کے مکان ہیں جو ویران ہو گئے کھنڈر بن گئے اور صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔ موت اور زندگی کی کشمکش، کمہار کے چاک کی گردش، قفس میں گرفتار پنچھی، قفس سے نکالے ہوئے پنچھی۔ بادشاہ مر گیا۔ اور اس کی عملداری لوٹ لی گئی۔ سلطنت میں آگ لگا دی گئی۔ شہر جسم شعلہ پوش ہوا۔

میرے کانوں میں کتنی زنجیریں کھنک رہی ہیں کتنے سروں کے دیوار زنداں سے ٹکرانے کی صدائیں بلند ہیں کتنی صد ہزار روحیں ہیں جو بے گھر ہو گئیں ــ کتنی پاپی پاپنی صورتیں ہیں جو خاک میں مل گئیں اور خاک میں ملنے والی ہیں جسموں کی سلطنت سے محروم شاہوں اور شہنشاہوں کی آہوں کا دھواں فضا میں بلند ہے کتنی تشنہ کام جوانیاں کتنے معصوم اور مظلوم خواب دیکھنے والی جن کی صورتیں، جن کے جسم، جن کی رفتار اور آواز میرے سامنے ہے، جھڑتے ہوئے پھول کی سسکیوں کی صورت میں، اجل و خزاں کی شکل میں۔ چاند ستاروں اور آوارہ بادلوں کے روپ میں۔ موت کے جھونکوں کے بھیس میں ــ!

وہ جو کبھی خواب دیکھتے تھے اب خود خواب بن چکے ہیں اور میں جو اب تک خواب دیکھتا رہا ہوں، میں بھی خواب بن جاؤں گا، اپنے جسم کے کل سے ہمیشہ کے لئے نکل جاؤں گا، سخت قید سے محروم ہو کر اسی طرح اندھیری راتوں، تاروں اور جگنوؤں کی [illegible] بند آنکھوں کے کواڑ کھلیں گے اور روشنیوں کی [illegible]

خوشبو بن کر زمین اور آسمان کے درمیان پھیل جاؤں گا' اور لوگ مجھے دیکھ نہ سکیں گے' محسوس نہ کر سکیں گے' میری آواز تک نہ سن سکیں گے' کون کسی کو دیکھ اور سمجھ سکتا ہے' کھلونا ٹوٹتا ہے تو پھینک دیا جاتا ہے' اور پھر اس زمانے میں جب کہ میں دکھائی دیتا ہوں' محسوس کیا جا سکتا ہوں' سنا اور سمجھا جا سکتا ہوں کون مجھے دیکھ اور سمجھ رہا ہے ۔؟ اور جب میں موم کے بُت کی طرح پگھل جاؤں گا تو کون مجھے خاک کے ذرات میں تلاش کرنے کی زحمت گوارہ کریگا ۔ کون زمین پر قدم رکھتے ہوئے سوچے گا کہ زیر قدم کسی کا دل پڑا ہے کسی کی آنکھیں بجھی ہیں' کسی کا سارا پیکر بکھرا ہوا ہے جسے روندتے ہوئے وہ چلنے پر مجبور ہے ۔ کون آنکھ مجھے آوارہ بادلوں آسمان کی نیلی گہرائیوں' ہوا کے جھونکوں' دن کے اُجالے' چاند تاروں کی روشنی اور پھولوں کی خوشبو میں دیکھ اور محسوس کر سکے گا نغمہ کی صورت سے کون آشنا ہے' خوشبو کا چہرہ کس نے دیکھا ہے' بہتے ہوئے دریا کے پانی میں کون کسی قطرے کو ڈھونڈ اور پا سکتا ہے ۔ ؟ لامکاں ہوتے ہی لامحدود بن جاتا' ہوش و حواس کے دائرے سے نکلتے ہی وسعت میں آسمان بن جانا' موت یہی ہے اور یہی زندگی ہے' قطرہ چاہے قطرہ رہے یا گہر آبدار انجام وہی دریا میں مل جانا ہے' دریا جاوداں اور ابدی حقیقت ہے اور حقیقتوں کا خواب ہے زندگی ۔!

جانے والو !

میرے پیارو ۔ میرے بزرگو..... میرے دوستو اور دلربا ؤ کیا جانے سے پہلے تم نے بھی یہی کچھ سوچا تھا جو میں سوچ رہا ہوں ۔ میری یہ سوچ نئی اور انوکھی تو نہیں ہے ۔!

"میں کون ہوں ۔ کہاں سے آیا اور کدھر جاؤں گا ۔

"ہم کون تھے ۔؟ ہم کہاں تھے ؟ ہم کہاں آ گئے ہیں ۔؟

یہ کیسی آوازیں ہیں جو زمین و آسمان کے درمیان گونج رہی ہیں ۔

یہ کون قطرے ہیں جو دریا میں ملتے ہوئے سسک رہے ہیں ؟ غبار خاک کے اندر سے دم بہ دم صدائیں بلند ہیں' تاروں بھرے سیاہ آسمان پر ہاؤ ہو کا عالم چھایا ہوا ہے' موجیں اُٹھ رہی ہیں' قطروں کو دریا اپنی طرف کھینچ رہا ہے' دریا سے قطرے جدا ہو رہے ہیں اور جدا ہو کر پھر ملنے کی سعی کر رہے ہیں' ایک کشمکش سی جاری ہے ۔ اور میں سوچتا ہوں کہ یہ کشمکش کیسی عجیب کشمکش ہے ۔ کیا یہ کشمکش ہی زندگی ہے ؟ کیا اس کشمکش پر قابو پانا ممکن ہے ؟ کیا جسم کے فنا ہونے کے باوجود انسان زندہ رہ سکتا ہے' بے روح اور بے جسم ۔

میرا دل اس احساس سے دہلنے لگتا ہے کہ جب مرنے کے بعد میرے ساتھ میرا "میں" بھی مر جائے گا' میرا سوچنے والا وجود ختم ہو جائے گا' تو پھر موت کے بعد کی زندگی کیا زندگی ہو گی' ہوش و حواس ہی نہ رہیں تو پھر ابدی زندگی سے کیا حاصل ہو گا ؟ ابدی مسرت اور دائمی آسودگی کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے ؟ چشم تماشائی کے بغیر تماشہ کیا تماشہ ہو گا ۔؟

موت آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی ہے' جانے وہ مجھ سے کتنی دور ہے ۔ کس قدر قریب پہنچ چکی ہے' موت تو یقینی ہے' موت کے بعد کیا ہو گا ؟ میرے خوابوں کا کیا ہو گا جن کا سلسلہ میرے جسم کی عملداری کی سرحد سے آگے بھی دراز ہے' وہ خواب جو اب بھی میری آنکھوں میں ہیں' آنی آسودگی کے باوجود ابھی کس قدر تشنگی باقی ہے کون دل سچی مسرت کو پا سکا ہے یہاں ۔ عمر کی ہر منزل پر تجربات ہوش و حواس نے لذت تشنگی اور بھی بڑھا دی ۔ ہر بار جام لبوں تک پہنچ کر ہاتھ سے چھوٹ گیا ۔ کامیاب اور ناکام صد ہزار آرزوئیں شعلوں کی طرح میرے دل کا طواف کرتے ہیں دل جو آتشکدہ ہے صدیوں پرانی آگ اب بھی روشن ہے سوچتا ہوں کیا دل کا یہ آتشکدہ کبھی سرد بھی پڑ سکتا ہے' موت کی برف کیا اس آگ کو بجھا سکتی ہے ؟

سوچتے سوچتے سرما کی اندھیری رات ختم ہو گئی ۔ موت اور زندگی کے درمیان ایک اور رات کا فاصلہ کم ہو گیا ۔ بیاباں آسودگی کناروں پر نور کی لکیر سی اُبھرنے لگی ہے نسیم سحر چلنے لگی ہے نسیم سحر کے مست متوالے جھونکو ۔ ذرا آہستہ چلو ۔ قدم بچا کے چلو ۔ یہاں اپنے خوابوں کی دنیا سجائے بیٹھا ہوں' محبت کے تاج محل بنائے بیٹھا ہوں' یہاں میرا دل ہے آہستہ چلو ۔

وقت گزر رہا ہے، کہکشاں چاک گردش میں ہے، زندگی کا دریا بہہ رہا ہے، گجر دم نسیم سحر پھول کھلا رہی ہے، خوشبو اڑا رہی ہے۔ نسیم سحر۔ نوشگفتہ پھول۔ پھولوں کی خوشبو۔ ایسی نئی نویلی مست مست کن خوشبو۔ میرا دل مچلنا چاہتا ہے۔ سوچتے سوچتے میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ سانس تک لینا دوبھر ہو گیا ہے۔ کون آ رہا ہے، یہ کہر سی کیوں سنائی دے رہی ہے۔ آنکھوں کے آگے نورانی دھندلی کیوں چھانے لگی ہے۔ ایک پیکر۔ ایک خیال، ایک ہیولا سا ابھر رہا ہے، کانوں میں جانی پہچانی آواز کا ترنم گھلنے لگا ہے، میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ہے۔ وہ جو خواب تھی کہہ رہی ہے..... میرے خوابوں کو قوت گویائی مل گئی ہے، میرے دل کی محبت ایک نئے روپ میں سامنے آئی ہے۔

زندگی جینے کی شے ہے، خوشبو سونگھنے اور محسوس کرنے کی شے۔ اور محبت جینے کا گر سکھاتی ہے، حقیقت کے چہرے سے نقاب ہٹاتی ہے۔ اور خواب دکھاتی ہے زندگی کے۔ زندگی جو ذرات، اشیاء اور اجسام میں منقسم ایک واحد اور مطلق اکائی ہے، خوشبو پھولوں میں ہٹ کر بھی واحد وجود رکھتی ہے، قطرہ دریا بھی ہے۔ قطرے کا وجود اصل میں دریا کا وجود ہے قطرے کی انفرادیت، دریا کی انفرادیت ہے اور محبت قطرہ اور دریا کے درمیان رشتہ ہے۔

سحر ہو رہی ہے، ایک لمبی اندھیری رات ختم ہو رہی ہے۔ وقت کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لمحات برق رفتاری سے گزرتے جا رہے ہیں، میں اب بھی خواب دیکھ رہا ہوں، قطرہ کی طرح نہیں بلکہ دریا کی طرح۔ کل عالم انسانی کی حیثیت میں میں خواب دیکھ رہا ہوں اندھیرے میں اجالے کے خواب، یہ خواب جو محبت کی وادیوں سے میری طرف آتے رہے ہیں۔

میری یاسمین ــــ میری محبت ــــ تم جہاں کھڑی ہو وہاں اجالے کی سرحد ختم ہوتی ہے، آگے پراسرار گہرا مہیب اندھیرا ہے اور تم موت کے اندھیروں میں بھی میرے ساتھ ہو، میں تمہارے ہاتھ کے لمس کو محسوس کر رہا ہوں، یہ ہاتھ جو زمانہ ہوا کبھی میرے ہاتھوں میں آئے تھے۔ اب بھی یہ ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہیں۔ اب مجھے کوئی غم نہیں ہے، زندگی کے رائیگاں جانے کا احساس ہے اور نہ تشنگی اور نا آسودگی کا غم۔ تمہارے معصوم حسن کی قسم ــــ میرے دل میں محبت کا چراغ اب بھی روشن ہے، اب بھی روشن ہے۔

بہت دن ہوئے میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اور اب سر افلاک برفیلی چوٹیوں پر میں یونانی دیوتاؤں کے دیوتا کے آسمانی رتھ پر سوار ہوں۔ اور وہ چاروں دریا سفید اور سرکش گھوڑے میرے قابو میں آ چکے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۵۱ ۔ آدھ گھنٹہ پروفیسر کلیم الدین کے ساتھ)

ڈرائنگ روم میں پروفیسر کلیم الدین احمد کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور میرے بعد پروفیسر سید حسن صاحب تشریف فرما تھے، پروفیسر کلیم الدین احمد نے بیٹھنے کے بعد ہی میرے حالات دریافت کئے۔ گورکھپور یونیورسٹی کے بارے میں معلومات حاصل کیں، پھر شعبۂ اردو کے بارے میں پوچھا۔ کتنے اساتذہ ہیں، کتنے طلبا ہیں، تعلیم کا معیار کیا ہے؟ اسی قسم کے دیگر سوالات کئے۔ اس کے بعد ان کی خدمت میں اپنی ایک تنقید "ادب کا تنقیدی مطالعہ" پیش کی جس کو انھوں نے بخوشی قبول فرمایا اور شکریہ ادا کیا۔ میں دوران گفتگو میں بار بار گھبرا رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ طویل گفتگو ان پر بار خاطر ثابت ہو رہی ہو۔ اسی لئے میں نے پروفیسر سید حسن سے کہا کہ اب چلنا چاہیئے۔ مگر پروفیسر کلیم الدین احمد نے فرمایا، اتنی جلدی کیا ہے؟ یہ جملہ بہت ہمت افزا تھا۔ اس لئے میں رک گیا اور پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس مرتبہ اردو کے مختلف ادیبوں کا ذکر آیا، خاص طور سے پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر سید احتشام حسین اور پروفیسر محمود گورکھپوری کے بارے میں سرسری طور پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ اس گفتگو کے ختم ہونے کے بعد میں پھر چلنے کے لئے تیار ہوا، میں ڈر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پروفیسر موصوف اٹھ جائیں اسی لئے میں نے پروفیسر سید حسن سے چلنے کو کہا مگر اس بار بھی پروفیسر کلیم الدین احمد نے روک لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کافی آئی، چائے کا سیٹ نہایت خوبصورت اور کافی نہایت نفیس جو غالب کے بادہ سے زیادہ "جاں فزا تھی" اتنے میں ۹ بج گئے یاد میں نے رخصت ہونے کے لئے آمادگی ظاہر کی، میری تائید پروفیسر سید حسن نے بھی کی، اس بار پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب نے بھی چلنے کی اجازت دے دی، ہم لوگ مسکراتے ہوئے پروفیسر موصوف کی کوٹھی سے باہر نکلے، میرے نزدیک پروفیسر کلیم الدین احمد سے یہ آدھ گھنٹے کی ملاقات بہت اہمیت رکھتی ہے جس کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔

شاعر بمبئی
ادیس احمد دوراں

حسرتِ بسترِ گُل

بتا اے مرے دل!
مرے مضطرب دل بتا
زندگی سبزۂ و شبنم و گُل کی دُھن میں
بیاباں کے کانٹوں پہ کب تک چلے گی؟
لہو بہہ رہا ہے!!
مرے خون شُدہ دل بتا
زندگی مجھ سے اب اور کیا چاہتی ہے
وہ محفل جہاں آبگینوں کی مے ہے گلابی
جہاں کی فضا پیار کی اک دھنک ہے
جہاں خم بہ خم گیسوؤں کی مہک ہے
ابھی منزلوں دُور ہے
اے مرے غمزدہ دل بتا کیا کروں میں؟
بہت تھک گیا ہوں
مگر پھر بھی وہ بے شمار آرزوئیں
وہ ہر بزم میں سربلندی کی خواہش
لگن سروری کی
وہ مر مر کے اُونچے شبستاں کے ارماں
وہ اک بسترِ گُل پہ سونے کی حسرت
وہ بادِ مخالف سے لڑنے کی لذت
وہ جوشِ طلب وہ نشاطِ تمنّا
جو بے انتہا ہیں
دُکھی زندگی کو
بیاباں بیاباں پھرا ہی رہے ہیں

متاعِ تو کل لُٹی جا رہی ہے
سُکوں چھن گیا، نیند اُچٹ سی گئی
رُوح گھبرا رہی ہے
مگر زندگی ہے کہ اپنے لہو میں
نہائی ہوئی راہ طے کر رہی ہے
سفر بیکراں ہے
بتا اے مرے دل
میں تکمیلِ خواہش کی دُھن میں
کہاں تک یونہی پا بجولاں رہوں گا

بیاباں کے کانٹے بہت تیز ہیں
رُوح میں چبھ رہے ہیں
لہو بہہ رہا ہے!!

احمد جمال پاشا
(دلھنر و مزاح)

سروری منزل

ہمارا شہر، عزا، گھر اور ہم شیطان کی طرح مشہور ہیں۔ بھلا ایسا کون ہوگا جو لکھنؤ کے نام سے ناواقف ہو۔ اور جس نے یہ لکھنؤ نہ دیکھا ہو گا اس کو ضرور امین آباد کی سیر کرنا ہی ہوگی۔ ہی امین آباد میں اگر کسی راہ چلتے سے بھی آپ ہمارا گھر پوچھئے تو کھٹ سے بتا دے گا۔

"وہ ہی سروری منزل۔!"

تو جناب "سروری منزل" کی شہرت کی وجہ یہ نہیں کہ اس میں ہم رہتے ہیں یا اس میں آئے دن ادبی جلسے ہوا کرتے ہیں بلکہ اس کی اپنی بھی ایک شخصیت ہے جس کا ہونا ہوا ثبوت امیر کا لکھا ہوا یہ شعر ہے ؎

ناگھر میرا ناگھر تیرا
چڑیا رین بسیرا

اس تاریخی شعر کی وجہ سے جو بھی اس کے سامنے سے ایک بار گذر جائے "سروری منزل" کے لئے ضرور ہوا ہے کہ:

"اچھا تو یہ ہے سروری منزل۔!"

پھر جب بھی کوئی پوچھتا ہے تو وہ کھٹ سے بتا دیتا ہے کہ:۔

"ہاں ہاں! ہم کچھ گلے آپ چڑیا جو بسیرا کے بارے میں پوچھ رہے ہیں"

اسی وجہ سے جب حکومت نے مسافروں اور فٹ پاتھ کے باسیوں کی سہولت کے خیال سے شہر میں جگہ جگہ "رین بسیرے" بنا دیئے۔ تو ایک مصیبت ہم پر یہ نازل ہوئی کہ ادھر شام ہوئی اور دس پانچ مسافر رات بسر کرنے کے لئے ہمارے پردھر نا دینا شروع کر دیتے۔ اب ہم کو نا کہ انھیں سمجھایا جاتا کہ

"صاحب شوق سے پدھارئیے۔!"

مگر ان کی سمجھ میں کسی طرح نہ آتا کہ "جو گھر نہ میرا ہو اور نہ تیرا وہ چڑیا رین بسیرے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔"

تو جناب اسی چڑیا رین بسیرے میں ہم رہتے ہیں۔ اس کے سامنے کا رُخ امین آباد میں شامل ہے اور پچھواڑے کا پکے احاطے (احاطہ خانم فقیر محمد خاں) میں۔ احاطہ خانم کو جوش صاحب کے دادا فقیر محمد خاں گویا نے آباد کیا تھا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ انھوں نے اس کو بطور اصطبل استعمال کیا تھا۔ اس زمانے میں یہاں ان کے رسالے کے گھوڑے باندھے جاتے تھے، اور اس زمانے میں اس میں ہم رہتے ہیں۔ اور اب تو ماشاء اللہ ہم ہی ہم ہیں۔ لیکن ہمارے پیش میں اس میں شرکت قاضی، عبد الباری آسی، صفی لکھنوی، ناطق لکھنوی، اور مجاز وغیرہ رہتے تھے۔ مجاز تو اسی گھر میں پیدا ہوئے تھے اور یہ گھر اس زمانے میں "سروری منزل" کے بجائے "حکیم جی کا گھر" کہلاتا تھا۔ ان کے بعد اس میں پولیس جو کی آئی اور پھر ہمارے جیسے گناہ گار۔ یہ لوگ تو اب اللہ میاں کے یہاں رہتے ہیں، مگر ہم ابھی تک صرف اس وجہ سے یہاں رہتے ہیں کہ ابھی تک ہمارا مکٹ نہیں کٹا ہے۔ کیونکہ فی الحال ہمارا ارادہ ہے کہ ؎

"آگے بڑھیں گے دم لیکر"

چڑیا رین بسیرا کی سب سے بڑی خوبی اور خامی یہ ہے کہ یہ قلب شہر میں واقع ہے۔ خوش قسمتی سے کفن دفن کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا کام ہو جس کیلئے ہمیں کہیں دور جانا پڑے۔ مگر بدقسمتی سے بیچ شہر میں رہنے کی تمام خوبیاں اس وجہ سے خاک میں مل گئی ہیں کہ دور دراز کے محریر اور خصوصاً کے یہاں بھی اگر کوئی چار پڑھائے کسی کا سکول یا یونیورسٹی میں داخلے کا مسئلہ ہو، شادی بیاہ کی خریداری کرنا ہو، شہر گھومنا ہو، کرایہ پر رہنے کے لئے مکان تلاش کرنا ہو، بڑا دھرنا ہو۔ وہ آنکھ بند کر کے "ناگھر میرا ناگھر تیرا" گاتا ہوا چڑیا رین بسیرا میں آن دھمکتا ہے۔ خیر یہاں تک تو غنیمت ہے۔ آدمی، آدمی کے کام آتا ہے۔ گھر آئے ہوئے کو لوٹا یا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ اگر کوئی صاحب ہاؤ اور خدا کیلئے بھی نکلیں اور اصلیں ذیابیطس ہو تو ڈاکٹر کے یہاں بھیڑ جاڑ زیادہ ہو اور اپنی باری کے انتظار میں انھیں دو تین گھنٹے گزارنا پڑیں، کسی صاحب کو اپنی سائیکل کا پنکچر بنوانا ہو، کوئی مہربان راشن کی ٹیکیاں کی آمد سے بھی پہلے لائن میں جھک مارتے ہوں۔ بطور ماسٹر پلان ہمارے یہاں دھمک سے نازل ہو

کر ہماری سات پشتوں پر احسان کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے قیمتی وقت کو برباد کر جاتے ہیں۔ ہم اس درمیان یہ بھی نہیں سوچ پاتے کہ ہمارے گھر میں ہر ہفتہ کیسے کیسے۔ کیونکہ ایک جاتا ہے تو چار آتے ہیں۔ لہٰذا آنے جانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

رین بسیرے اور چوپال کے علاوہ ہمارے گھر کی ایک اور حیثیت بھی ہے جس کو ہوٹل کی زبان میں "فری بورڈنگ اینڈ لاجنگ" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جن جان پہچان والوں کے لخت جگر کا ہاسٹل میں داخلہ ہونے میں دیر ہو جاتی ہے وہ یہیں بسیرا لیتے ہیں۔ مفت طعام و قیام کا یہ سلسلہ پورے سمسٹر جاری رہتا ہے۔ جہاں اسپتال میں ہے وہاں کے عزیزوں کی خواتین اسپتال میں داخلہ نہ ملنے کی صورت میں "سروری منزل" سے "چوغا خانے" کا کام لینے سے بھی نہیں چوکتیں۔ معزز مہمانوں اور باتحاوہ عزیزوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ لیکن ان بن بلائے مہمانوں کا ضرور شکوہ کروں گا جو سفارشیں کرانے، مقدمے لڑانے، پونی ورسٹی میں ریسرچ کرنے یا اپنی ریسرچ کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے اور سائنڈ بزنس کی غرض سے آتے ہیں۔ مگر ظاہر یہ کرتے ہیں کہ بس آپ کی محبت میں آ گئے۔ اور جب آ گئے تو پھر گئے۔ لہٰذا ان کا جھگڑا الگ لگا رہتا ہے۔

ہمارے گھر کا ایک اہم پہلو اس کا اپنے پڑوس میں واقع ہونا بھی ہے۔ یعنی دوسرے عام مکانوں کی طرح یہ بھی تین طرف مکانوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ نہ پوچھئے کہ اس میں کون لوگ رہتے ہیں۔ بلکہ یہ معلوم کیجئے کہ کیسے لوگ رہتے ہیں۔ تو صاحب پڑوسی تو پڑوسی ہوتا ہے، خواہ اس کا گھر آپ کے گھر سے ملا ہوا ہو یا آپ کے محلے سے۔ اس کے بعد اسے اس کا پورا پورا حق پہونچتا ہے کہ وہ گھر گرہستی کی کسی بھی چیز کو کسی بھی وقت مانگنی مانگ کر ہمیشہ کے لئے اس کا دالیں کرنا بھول جائے۔ جن پڑوسیوں کی دیوار ہمارے بیچ ہے ان میں سے اکثر کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ وہ بآواز بلند سوچتے ہیں۔ لہٰذا ان کی ہم آہنگ آوازیں برابر ہمارے کانوں سے ٹکراتی رہتی ہیں اسی لئے ہم بآسانی اپنے ہمسایے سے ملتے ہی پوچھ بھی لیتے ہیں۔

"کہو بھئی چنے کی دال کھا کے آ رہے ہو؟"

اور وہ ہمارا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اس وقت اسے بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ دال کھانے کے وقت اس کے بارے میں اپنی بیوی سے دیر تک بآواز بلند تبادلۂ خیال کرتا رہا تھا۔

ہمارے پڑوسیوں کو حیرت ہے کہ ہم کبھی سینما نہیں دیکھتے۔ لیکن انھیں یہ علم نہیں کہ ان کے پڑوسی ہونے کے بعد سینما دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، صبح شام اور دن رات ان پڑوسیوں کے ڈائیلاگ، گانے اور مفت کی موسیقی سننے کے ساتھ ساتھ ان کی گھریلو مار دھاڑ والی زندگیوں کی پوری پوری فلمیں اور آنے والی فلموں کے ٹریلر تک سننے کو مل جاتے ہیں۔ جس کے بعد الگ سے سینما دیکھنا بدمذاقی نہیں تو پھر کیا ہے۔

لیکن پڑوسیوں اور باہر والوں میں ہم اپنے تہذیبی فرق نہیں کر پاتے کہ پڑوسی تو گھر کے باہر سے تنگ کرتے ہیں جبکہ باہر والے گھر کے اندر ہمارا ناطقہ بند کئے رہتے ہیں۔ دونوں کے نتیجے میں ہم اپنے ہی گھر کے کمروں میں ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں اور گھر میں رہتے ہوئے بھی ہماری حیثیت اکثر تو امنع سے زیادہ نہیں۔ جس کا کام محض ہر آنے والے کا خندہ پیشانی سے استقبال، ناظر خواہ تو امنع اور ہر جانے والے کو پھر اسی خوش خلقی سے الوداع کہنا پڑتا ہے۔ خواہ وہ ہماری گھر گرہستی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر جا رہا ہو۔ کیونکہ میزبان جو ٹھہرے، اور وہ بھی تقریباً سرکاری قسم کے لہٰذا ع

ہماری بلا سے بجا رہے یا بجوم

●●

مدتِ خریداری ختم ہونے کی اطلاع

اس سیاہ حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری اگست کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ آپ کی خدمت میں بصد شکریہ ہمارا شاعر ذریعہ وی پی بھیجا جائیگا۔ یا آپ سالانہ چندہ کی رقم مبلغ آٹھ روپے ذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیجئے۔ اگر تجدید خریداری منظور نہ ہو تو واپسی ایک خط سے دفتر کو اطلاع دیدیجئے تاکہ وی پی نہ بھیجا جائے۔ (مینیجر)

آغا رشید مرزا دہلوی
(کہانی)

مسیحا

ممکن ہے وہ خلوصِ دل ہی سے کوئی بات کہتا ہو لیکن مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ طنز کر رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ دل ہی دل مجھے چاہتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میرے دل میں کوئی اور بسا ہوا ہے۔ مجھے گمان ہوتا ہے کہ روشی سے میری محبت پردہ اندر ہی اندر چمک رہا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے اُس کی ہر بات ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ اور پھر اُس کی بات چیت میں کوئی شگفتگی کوئی خوش مذاقی بھی تو نہیں ہے جب دیکھو دنیا نہ لانے کے دُکھ درد کی باتیں، جیسے سارے جہاں کا درد اُسی کے جگر میں تھا ہے۔ اور اس کے ساتھ وہ اپنی خدمتِ خلق کی داستانیں بھی یوں سناتا ہے گویا وہی ایک مسیحا اس زمانے میں پیدا ہوا ہے۔

وہ ایم اے کر چکا ہے اور اب انگریزی ادب میں پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ فادر گومز نے گرجا میں سروس کے بعد ڈیڈی سے تعارف کراتے ہوئے کہا تھا "یہ ہیں مسٹر جوزف بنگلور سے یہاں تعلیم مکمل کرنے آئے ہیں، بہت محنتی اور ہونہار ہیں بڑی مصیبت اٹھانے کے بعد ایم اے کر پائے ہیں اور اب پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے آپ ہر طرح ان کی مدد کریں گے"

اُس روز کے بعد سے ڈیڈی اُس پر خاص توجہ دے رہے ہیں، ویسے بھی تو وہ ہر طرح اس کی مدد کرتے ہیں اور دلچسپی لیتے ہیں۔ کیونکہ کرسچین لڑکے کم ہی اعلیٰ تعلیم تک پہنچ پاتے ہیں۔ وہ جب بھی آتا ہے اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ میری طرف کبھی نہیں دیکھتا، کبھی آنا سامنا ہو بھی جاتا ہے تو وہ مسکرا کر "ہلو آشی" کہتا ہے، اور پھر اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں غمازی کرتی رہتی ہیں کہ وہ مجھے دیکھتے ہی رہنا چاہتی ہیں۔ وہ خوددار ہے، منہ سے کچھ کہنا نہیں چاہتا، یا شاید وہ جانتا ہے کہ میں اس کی نہیں ہو سکتی، وہ روشی کلاس فیلو رہ چکا ہے، اس نے مجھے بارہا روشی کے ساتھ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دیکھا ہے میں سوچتی ہوں معلوم نہیں کیوں یہ جانتے ہوئے کبھی وہ میرے خواب دیکھ رہا ہے، لیکن خواب دیکھنے میں کسی کا کیا اجارہ ہے۔ دیکھنے دو۔ وہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے ڈیڈی اتنے موقوف نہیں، انھوں نے مجھے بڑے لاڈ پیار سے پالا ہے کبھی میری آزادی میں مخل نہیں ہوئے مجھے سب ہی کچھ انھوں نے دیدیا کسی چیز کی کمی نہیں اور پھر ان کا اپنا بھی تو قد ہے، وہ میونسپلٹی میں ڈین ہیں، وہ دولت مند نہیں لیکن اپنے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے اُن کا شمار رئیسوں ہی میں ہوتا ہے بلکہ اپنے علم کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی اُن کی عزت ہے۔ جوزف اس قابل نہیں کہ مجھے یہ تمام آرام و آسائش دے سکے، اور پھر ڈیڈی میری مرضی کے خلاف کبھی کچھ نہیں کریں گے، یہ سب سوچ کر میں خود کو تسلی دے لیتی ہوں، اور مطمئن ہو جاتی ہوں۔ لیکن ایک انجانا سا خوف میرے دل میں رہتا ہے، جوزف روز بروز ڈیڈی کے قریب ہوتا جا رہا ہے، اُس نے تھیسس مکمل کر کے داخل کر دیا ہے، ڈیڈی کا کہنا ہے کہ اسے ڈگری مل جائے گی۔ اب اُس کا مستقبل روشن ہے، نہ ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ اپنا اسکول قائم کرنا چاہتا ہے، وہ ابھی سے اس کے منصوبے باندھ رہا ہے، اور ڈیڈی نے ہر طرح اس کی مدد کا وعدہ کیا ہے۔

کرسمس کی چھٹیاں ہیں، ڈیڈی ہمیشہ مجھے ساتھ لے کر وطن جاتے ہیں، اُن کے بہت سے رشتہ دار غریب ہیں۔ سال کے سال وہ اُن سب کو کچھ نہ کچھ دیتے ہیں، اور ان کے ساتھ کرسمس مناتے ہیں، میں اُن کے ساتھ نہیں جا رہی ہوں، میں ڈر رہی ہوں، کہیں وہ جوزف کے بارے میں مجھ سے

سوال ذکر بیٹھیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی بات ہو میں روشی سے بات کر لینا چاہتی ہوں اور ڈیڈی کی واپسی پر انہیں بتلا دینا چاہتی ہوں۔ ڈیڈی جا چکے ہیں۔ میں تنہا ہوں، روشی میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے، وہ کتنا کچھ ڈھے، کتنا ہنس مکھ، ماتا دولت مند ہونے پر بھی بیحد منکسر ہے۔ میں نے ٹیلیفون پر اسے سب کچھ بتا دیا ہے اس نے دوسرے روز صبح اپنی سہاڑی والی کوٹھی پر مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں کئی مرتبہ پکنک کیلئے اس کے ساتھ اس کوٹھی میں جا چکی ہوں۔ بڑی خوبصورت اور پرفضا جگہ ہے۔ مجھے بیحد پسند ہے۔

موسم سرما کی خوش گوار صبح ہے، میں نے آسمانی رنگ کی سلیکس اور ہلکے زرد رنگ کا سوئٹر پہنا ہے، اور اپنی عنابی رنگ کی چھوٹی موریس ڈرائیو کرتی ہوئی روشی سے ملنے جا رہی ہوں، مجھے یاد آ رہا ہے۔ ایک مرتبہ اسی لباس میں دیکھ کر اس نے کہا تھا "اُف آشی! اس لباس تم ایسی معلوم ہوتی ہو جیسے لاجوردی آسمان پر سرِ شام کوئی ستارہ نکل آیا ہو۔" اس کی کوٹھی دور سے بلندی پر درختوں پھولوں اور بیلوں سے ڈھکی ہوئی ایک خوشنما سبز چھوٹی سی پہاڑی کی طرح دکھائی دیتی ہے، میں جب وہاں پہنچی ہوں روشی موجود نہ تھا صرف مالی اپنے کام میں مصروف ہے نقرئی دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ لان پر ہموار سبز گھاس مخمل کی طرح بچھی معلوم ہو رہی ہے اس پر کہیں کہیں شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمکتے نظر آ رہے ہیں۔ دائیں بائیں کونے میں یوکلپٹس کے درختوں کا سایہ لان پر پڑ رہا ہے، مجھے ماضی کے وہ دلفریب لمحات یاد آ رہے ہیں جب اسی یوکلپٹس کے نیچے روشی نے وفا و محبت کی قسمیں کھائی تھیں، وعدے کئے تھے۔ آج اس کے پرانے وعدے مجھے یاد دلانے ہیں، لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا ہے، میں نے تھک کر مالی سے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا ہے میں نے باغ کی تعریف کرتے ہوئے اس سے کہا "بہت خوبصورت باغ لگایا ہے تم نے ——!"

مالی نے کچھ دیر کے بعد جواب دیا۔ "بی بی جی۔ نہ میں مالی ہوں اور نہ یہ باغ میں نے لگایا ہے۔" میں نے حیرت اور تعجب سے پوچھا۔ "تو پھر کس نے اتنا سجایا ہے اسکو۔"

وہ پھر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا اور کسی قدر افسوس کے ساتھ بولا۔ "آپ سے پہلے جو لڑکی بڑے بابو کے ساتھ آیا کرتی تھی —— پہلے کبھی کبھی آپ کی طرح آیا کرتی تھی، پھر تین چار مہینے یہاں رہی اسی نے یہ باغ لگایا ہے۔ انگریزی کتابیں پڑھ پڑھ کر اس نے مجھے بھی سکھایا اور خود بھی میرے ساتھ مل کر بڑی محنت اس کے سجانے میں کی۔ ورنہ میں کیا جانوں مجھے تو یہاں دربان کے کام کے لئے رکھا گیا ہے۔ اس لڑکی کے چلے جانے کا مجھے بھی دکھ ہے۔ اس نے پوچھنے پر بھی نہیں بتایا کہ وہ یہاں کیوں ٹھہری تھی۔ اور کیوں جا رہی ہے۔" میں ہمہ تن مالی کی باتوں میں کھو گئی۔ میں نے خوشدلانہ اور رازدارانہ لہجہ میں کہا "مالی سچ سچ بتاؤ اس لڑکی کا بڑے بابو سے کیا تعلق تھا۔"

مالی نے کسی قدر تلخی سے جواب دیا۔ کس بابو کا کس لڑکی سے کیا تعلق ہے یہ میں کیا جانوں اور کیا بتاؤں یہاں تو چھوٹے بابو بڑے بابو خود بڑے صاحب ان کے دوست بڑے بڑے افسر اور صاحب لوگ —— سب ہی تو نئی نئی لڑکیاں لیکر آتے ہیں، بی بی! یہ چڑیا گھر ہے چڑیا گھر۔ آپ ان لوگوں کی سنگت چھوڑ دیجئے ——" اور پھر وہ مرجھائے ہوئے پھولوں زرد پتیوں اور سوکھی ہوئی شاخوں کو قینچی سے کاٹنے چھانٹنے میں مصروف ہو گیا۔

میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں، جیسے میں ایک لق و دق صحرا میں کھڑی ہوں۔ طوفانی ہوائیں چل رہی ہیں اور کوئی چلا چلا کر کہہ رہا ہے چڑیا گھر —— چڑیا گھر —— مجھے خوف معلوم ہو رہا ہے، اور ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں بھی ایک چڑیا ہوں اور اس کوٹھی کے کسی کمرے میں بند باہر نکلنے کے لئے در و دیوار سے اپنا سر پھوڑ رہی ہوں۔

معلوم نہیں روشی کب آیا اس نے پیچھے سے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ہے۔ غم و غصہ سے میرا چہرہ سرخ ہے، وہ سمجھ رہا ہے کہ میں اس کے دیر سے آنے کی وجہ سے بگڑ رہی ہوں، وہ میری خوشامد کرنا چاہتا ہے، لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ اور اسی طرح غصہ میں دریافت کیا۔ "میں نے جو کچھ تم سے کہا تھا اسکے بارے میں تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ میں اور انتظار نہیں کر سکتی۔" روشی حیرت زدہ مجھے دیکھ رہا ہے اس نے کبھی مجھے اتنے غصہ میں نہیں دیکھا، وہ گھبرا کر ہکلاتے ہوئے بولا۔ آشی آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ میرے ساتھ کچھ مجبوریاں ہیں —— اور پھر کیا ہم ایک دوست کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے اور یہ بھی کیا ضروری ہے کہ

اُس کا جواب سُن کر میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اور کیا محبت کا نتیجہ آوارگی ہونا چاہیئے تُو۔ چیٹ ۔ آوارہ ۔ بدمعاش ۔ مجھے تمہارے سب کرتوت معلوم ہیں" اور پھر تڑاتڑ میں نے اُس کے مُنہ پر تھپڑ مارنا شروع کر دیئے۔ وہ خاموش کھڑا رہا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ میں گاڑی میں آ رہی ہوں۔ لیکن اُس نے مجھے واپس نہیں بُلایا۔ آواز تک بھی نہیں دی۔ شاید وہ مجھ سے چھٹکارہ پانا ہی چاہتا ہے۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں گاڑی پوری رفتار سے چھوڑ دوں ۔ وہ کہیں ٹکرا جائے اور اس کے ساتھ میرا دماغ میرا جسم پاش پاش ہو کر فضا میں بکھر جائے۔

گھر آ کر کوشش کے باوجود میں رو نہ سکی۔ سارا دن آپ ہی آپ سوچتے سوچتے اور باتیں کرتے گزر گیا۔ قصہ میرا ہی تھا۔ ڈیڈی، تھے۔ دوستی محبت میل جول کسی چیز کے لئے انسان کے اُونچے معیار کو نہیں اُونچے کردار کو دیکھنا چاہیئے۔ رات آدھی ہو چکی ہے آنکھ میں نیند کا پتہ نہیں ہے۔ گھاؤ کس طرح بھرے گا۔ غم کیسے غلط ہوگا۔ یکایک میری نظر ڈیڈی کی الماری پر پڑی ۔ ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں لپکا ۔ شراب ۔ سُنتی آئی ہوں شراب سے بڑے بڑے غم غلط ہو جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے ہی سہی میں اس کرب سے نجات پانا چاہتی ہوں میں نے الماری کھولی۔ ہر طرح کی انگریزی شراب سے لبریز رنگین بوتلیں سجی ہوئی ہیں۔ سب سے نیچے کے خانے میں بلوریں گلاس اوندھے رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے پہلے کبھی شراب نہیں پی۔ ڈیڈی بھی کبھی نہیں پیتے۔ وہ ہر رات میں انگریزوں کی نقل کو ناپسند کرتے ہیں۔ صرف کبھی کبھی مہمان داری اور پارٹیوں کے لئے یہ بوتلیں بہت دن سے جوں کی توں پڑی ہیں۔ میں نے کھلی ہوئی سب بوتلوں میں سے تھوڑی تھوڑی چکھی ہے۔ سب کا مزہ کم و بیش ایک سا ہی معلوم ہوتا ہے۔ تند و تیز اور تلخ۔ حلق جل رہا ہے۔ سینہ میں آگ سی لگی ہوئی ہے، شاید یہ آگ غم کی آگ بُجھا سکے۔ لیکن غم ۔ وہ تو وہیں کا وہیں ہے، معلوم نہیں کونسی بوتل گلاس میں انڈیل کر پانی ملایا ہے اور آہستہ آہستہ پی رہی ہوں سر میں چکر آنے لگے ہیں، متلی ہو رہی ہے۔ یہ سب آتش سیال جلد از جلد انڈیل رہی تھی، باہر نکل پڑی ہے۔ سخت سردی کے باوجود مجھے گرمی لگ رہی ہے، سب کھڑکیاں کھولی ہیں۔ سرد ہوائے جھونکے مجھے اچھے معلوم ہو رہے ہیں۔ اب میں نے پھر گلاس بھر لیا ہے، آہستہ آہستہ آدھی بوتل خالی ہو چکی ہے، میرے ہوش و حواس معطل ہو چکے ہیں۔ معلوم نہیں کب اور کس وقت میں بالکل بے سُدھ ہو گئی۔ صبح دیر تک سوتی رہی۔ جب آنکھ کھلی تو منہ کا مزہ کڑوا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ رہے ہیں اور آنکھیں سوجی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں میں اپنی حماقت پر افسوس کر رہی ہوں اور سوچ رہی ہوں شراب سے غم غلط ہوتا ہے یہ ایک دھوکہ ہے۔ جو انسان اپنے آپ کو دیتا ہے۔ ورنہ غم تو وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ البتہ ہوش و حواس کچھ دیر کے لئے معطل ضرور ہو جاتے ہیں۔ اب اگر انہیں یوں ہی معطل کرنا ہے تو یہ کام مارفیا اور خواب آور گولیوں سے بھی لیا جا سکتا ہے ایوں تماشہ بننے سے کیا حاصل، خیر یہ خیال میرا اپنا خیال ہے۔

سب سے پہلے رات کو جو بوتل خالی ہوئی تھی اُس میں پانی ملا کر الماری میں اپنی جگہ رکھ دیا تاکہ ڈیڈی کو معلوم نہ ہو اور پہچان نہ سکیں اس کے بعد میں نے غسل کیا اور برآمدے میں بیٹھی کافی پی رہی ہوں۔ جوزف آ گیا ہے، ہوا سنی کہہ کر وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ ڈیڈی گئے ہوئے ہیں تو دوڑ کر جانے لگا لیکن نے اسے روک لیا۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ کچھ دیر باتیں کرے اُس نے پھر وہی زمانے کے دُکھ درد کی باتیں شروع کر دی ہیں لیکن معلوم نہیں کیوں، اب مجھے اس کی باتیں ناگوار معلوم نہیں ہو رہی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اُس سے باتیں ہی کئے جاؤں۔ اُس کے ساتھ ایک غریب چھوٹی سی لڑکی ہے۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے بوسیدہ اور گندے ہیں۔ بال مٹی سے اٹے ہوئے ہیں وہ برآمدے میں دروازے سے سر لگا کر بیٹھی ہوئی نعمت سے اونگھ رہی ہے۔ جوزف نے اس لڑکی کو اپنے قریب پیار سے بُلاتے ہوئے کہا۔

"آشی میں اس لڑکی کے لئے تمہاری مدد چاہتا ہوں، اس لڑکی پر ناجائز ہونے کی مُہر اور منحوس ہونے کا الزام ہے، در اصل ناجائز تو ان ہے ۔ اس لڑکی کے ماں باپ، یہ سماج یا سوسائٹی ۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دنیا میں کچھ لوگ صرف اس لئے خطاکار اور گناہ گار ٹھہرائے جاتے ہیں کہ وہ بے خطا اور بے گناہ ہوتے ہیں، میرے محلہ کا لوہار ہا جان نہ معلوم کہاں سے اس کو اٹھا لایا تھا

اور وہی اس کی پرورش کر رہا تھا لیکن اب وہ بھی چل بسا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ ذمہ داری لے لو ورنہ یہ سٹرکوں پر سے ہوتی ہوئی کوٹھ پر پہونچ جائے گی اور پھر اس پر جائز یا ناجائز کی مہر لگ جائے گی۔" میں نے لڑکی کو رکھ لیا ہے اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ دنیا میں دوسروں کا دکھ درد بھی ہوتا ہے اور اس کا بانٹنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

جوزف چلا گیا ہے۔ اور ابے سے گئے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں، میں نے اپنے آپکو مطالعہ میں غرق کر دیا ہے، اچھی کتابیں سب سے بہترین دوست ہوتی ہیں، ان سے نقصان نہیں پہنچتا کچھ فائدہ ہی حاصل ہوتا ہے، میرے چاروں طرف کتابوں کا انبار ہے، لیکن اب آنکھ بھی میرا دل اُچاٹ ہو رہا ہے، ڈیڈی ریٹائر ہو چکے ہیں، ان کی صحت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے، جوزف بھی دو سال سے نہیں آیا، وہ اپنا اسکول چلانے میں مصروف ہے۔ میں سن چکی ہوں، جس سکول میں اسّی فیصد غریبوں کے لڑکے بغیر فیس کے پڑھتے ہوں وہ کیسے چل سکتا ہے۔ آج کل تو تعلیمی درسگاہیں بھی کاروبار کا ایک ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ بڑی بڑی درسگاہوں میں داخلے پر بلیک مارکٹ اور رشوت ستانی کا دور دورہ ہے لیکن جوزف پر تو خدمتِ خلق کا دورہ پڑا ہوا ہے وہ اگر چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن اُسے کون سمجھائے زندگی کی گاڑی صرف جذبات سے نہیں چلتی۔

اچانک جوزف ڈیڈی کا روپیہ واپس کرنے آیا ہے جو اُس نے اسکول شروع کرنے کے سلسلہ میں لیا تھا۔ میں اُس وقت گھر میں نہیں تھی، جب آئی تو ڈیڈی نے کہا "کتنی دیر سے غریب کہتا را انتظار کر رہا ہے" اور یہ کہہ کر وہ بہانے سے کمرہ سے باہر چلے گئے، میں نے جوزف سے معافی مانگتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے تمہیں اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔"

آج پہلی مرتبہ جوزف نے اپنے جذبات بھرے ہوئے لہجہ میں کہا "آشی میں تو کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں، اور نہ معلوم کب تک انتظار کراؤ گی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے، میں نے اس کی طرف دیکھا وہ کتنا کمزور ہو گیا تھا، اُس کے سر کے بالوں میں سفیدی آگئی تھی، دن رات محنت کی وجہ سے وہ عمر رسیدہ نظر آ رہا تھا۔ میں بھی اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی، میرے آنسو نکل پڑے، اور میں نے اس سے کہا "یہ میں جانتی ہوں، لیکن پہلے کبھی تم نے اس کا اظہار اس طرح کیوں نہ کیا، شاید میں اس زہر سے بچ جاتی جو میری زندگی میں گھل گیا ہے۔" جوزف نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "اتنی مہلت ہی نہیں تھی مجھے جن لوگوں کا اپنی زندگی خود بنانی پڑتی ہے انہیں رومیو بننے کی فرصت ہی کہاں ملتی ہے، زندگی بنانے ہی میں آدھی زندگی ختم ہو جاتی ہے پھر بھی ضروری نہیں کہ زندگی بن جائے، اور انسان جو چاہتا ہے وہ اُسے مل جائے۔

میں جوزف کو دھوکہ دینا نہیں چاہتی، لیکن مجھ میں یہ ہمت بھی نہیں کہ اعتراف گناہ کر سکوں اور یہ کہہ سکوں کہ میں اُسکے قابل نہیں، میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے معاف کر دیگا اور پھر بھی مجھے قبول کر لیگا لیکن میں ڈرتی ہوں کہ میں اسے بالکل ہی نہ کھو دوں، اور پھر میرا ضمیر اور میری خودی جو ایک بار مجروح ہو چکے ہیں اور اب کسی کے سامنے سرنگوں نہیں ہونا چاہتے۔ میں نے جوزف سے کہا "بات دراصل یہ ہے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں خود کو ڈیڈی کی خدمت کے لئے وقف کر دوں گی اُن کی صحت اس لائق نہیں کہ وہ اکیلے رہ سکیں۔"

"آشی کیا ہم دونوں مل کر ڈیڈی کی خدمت نہیں کر سکتے۔"

جوزف نے مجھے لاجواب کر دیا ہے اور میں خاموش ہو گئی ہوں، جوزف سمجھ گیا کہ میں سوچنے کے لئے وقت چاہتی ہوں، اور وہ یہ کہتے ہوئے اُٹھ کر چلا گیا۔ "آشی سوچ لو، میں تمہارا انتظار کروں گا، لیکن اتنی دیر نہ کرنا کہ زندگی میں تھوڑی سی کشش بھی میرے لئے ختم ہو جائے۔

اس واقعہ کو ایک سال ہو گیا ہے، میرے پرانے زخم بھر چکے ہیں، زندگی میں نئی اُمنگ پیدا ہو گئی ہے، اس عرصہ میں میں نے اپنے آپکو تیار کر لیا ہے، میں جوزف سے سب کچھ کہہ دوں گی، اور یہ بھی بتا دوں گی کہ میں خود بھی اُسکو اپنانے کے لئے تڑپتی رہی ہوں، اُس روز کے بعد سے وہ نہیں آیا ہے، میرے دل میں وہم پیدا ہو رہا ہے، شاید اُس نے میرا خیال چھوڑ دیا ہے یا کسی اور کو چن لیا ہے اور اپنا ساتھی بنا لیا ہے، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے، جس نے اتنی عمر صبر و ضبط کا دامن نہ چھوڑا ہو اور خاموشی سے اتنا طویل انتظار کرتا رہا ہو، کیا وہ ایک

سا اور اسطار یا ئرسنا۔ مجھے دست ہو رہی ہے۔ میں اب ایک لمحہ بھی نہیں رُک سکتی۔ کچھ بھی ہو مجھے اُس سے فوراً ملنا چاہیئے صُبح سویرے میں جوزف کے سکول میں پہنچ گئی ہوں، وہ وہیں ایک حصّہ میں رہتا ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا اُس نے بڑا شہ اسکُول بنایا ہے، میرے گُمان میں بھی نہ تھا، سکول کا دروازہ بند ہے، میں اُسے کھلوانے کے لئے کاسے اُتر کر آہنی دروازے کے کھڑکی نُما دروازہ کے بائیں طرف سنگ مرمر کا کُتبہ آویزاں ہے اور اُس پر خوبصورت سیاہ حروف میں لکھا ہے۔

جوزف ہائی اسکول:۔

اِس اسکول کی بنیاد ریورنڈ فادر جوزف نے رکھی ہے۔ اُنھوں نے اسے اپنی ذاتی محنت اور آمدنی سے قائم کیا، اور اب اسے چرچ سے وابستہ کر کے غریبوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اور اُنھوں نے اپنی تمام زندگی خداوند یسوع مسیح کے نام پر انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے۔" ——— ✱

دربان نے دروازہ کھول دیا ہے۔ لیکن میں اندر نہیں جا سکی، میرے لئے یہ دروازہ بند ہو چکا ہے۔ دربان نے مجھ سے کچھ کہا ہے، لیکن میں سُن نہیں سکی ہوں، دروازہ پر غریب، مصیبت زدہ دُکھی اور بیمار جمع ہو گئے ہیں۔ دربان اُنہیں سمجھا رہا ہے، جوزف اعتکاف میں ہیں، وہ کل شام تک کسی سے نہیں مل سکتے ———

میں سوچ رہی ہوں وہ مسیحا جو دوسروں کو شفا بخش سکتا ہے خود اپنے درد کی دوا نہیں کر سکتا۔ میں جانتی ہوں اُس کی رُوح زندگی بھر سُولی کی سی اذیت میں مُبتلا رہیگی اور میری رُوح اِس کرب کے احساس سے ہمیشہ تڑپتی رہیگی۔

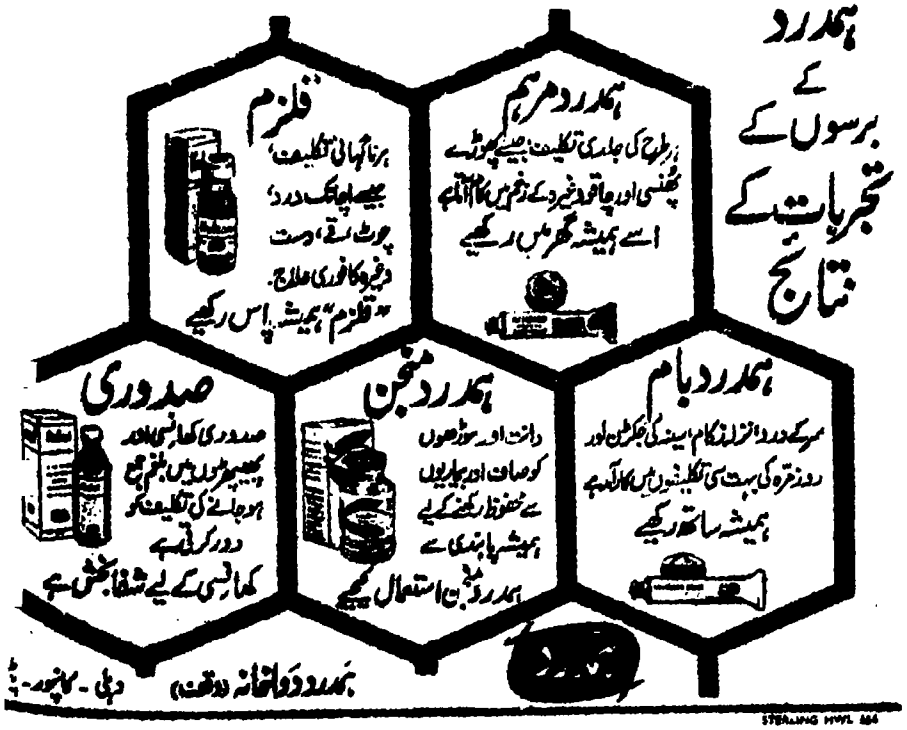

شاعر بمبئی
فضیل جعفری

غزل

خون پلکوں پہ سرِ شام جمے گا کیسے
درد کا شہر جو اُجڑا تو بسے گا کیسے

روز و شب یادوں کے آسیب ستائیں گے، کوئی
شہر میں اُن سے خفا ہو کے رہے گا کیسے

دِل جلا لیتے تھے ہم لوگ اندھیروں میں مگر
دِل بھی اِن تیز ہواؤں میں جلے گا کیسے

کس مصیبت سے یہاں تک ترے ساتھ آئے تھے
راستہ تجھ سے الگ ہو کے کٹے گا کیسے

آخر اُس کو بھی ہے کچھ جعفری دُنیا کا خیال
دیر تک رات گئے ساتھ رہے گا کیسے

کرشن موہن

غزل

صبحیں ہیں زرد زرد تو شامیں اُداس اداس
رکھی ہوئی ہے یاس پہ احساس کی اساس

ماحول بن گیا مری فکرِ لطیف کا
مایوسیوں نے جال بُنا ہے جو آس پاس

بڑھتی گئی اُمنگ تجھے پا کے رنگ میں
تیرے مِلن نے اور بڑھائی مِلن کی پیاس

بیکل رہے ہیں یاس میں بھی، آس میں بھی ہم
کوئی بھی رنگ آ نہ سکا عاشقی کو راس

ہم تلخیٔ حیات گوارا نہ کر سکے
اے کاش راس آئے ہمیں موت کی مٹھاس

اک جانگسل فریب اک آسیبِ مستقل
یہ آستیں کا سانپ ہے یا برتری کی آس

یوں ہی سمجھ رہا ہے زمانہ مجھے زعیم
میرے مزاج میں ہے کہاں افسری کی باس

ڈاکٹر سلام سندیلوی

آدھ گھنٹہ پروفیسر کلیم الدین احمد کے ساتھ

پروفیسر کلیم الدین احمد کی تصنیف "اردو شاعری پر ایک نظر" حصہ اول و حصہ دوم اور "اردو تنقید پر ایک نظر" جب شائع ہو کر منظر عام پر آئیں تو علم و ادب کی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ اُن کے نظریات کی تائید میں مُدّت سے الفاظ نکلے مگر تردید میں ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ عام طور سے یہ خیال کیا گیا کہ وہ ایک سفاک اور بے رحم نقاد ہیں، جو دوسروں کی تخلیقات پر بے دردی سے نشتر چلا دیتے ہیں۔ اُن کی ہیبت سے علم و ادب کے زمین و آسمان میں ایک قسم کی لرزش پیدا ہو گئی۔

میں نے بھی پروفیسر کلیم الدین احمد کی اُن تصانیف کا مطالعہ کیا اور اُس کے بعد میرے دل پر بھی ایک قسم کی ہیبت طاری ہو گئی۔ اس وقت تک کلیم الدین احمد صاحب کو دیکھنے کا مجھے موقع نہیں ملا تھا اور نہ ہستی سے اُن کی تصویر پر بھی کبھی نظر سے نہیں گذری تھی۔ مگر دل و دماغ پر اُن کی سخت گیری کے تاثرات ثبت ہو چکے تھے۔ غالباً اسی کا نفسیاتی نتیجہ ہے کہ میں نے اگست ۱۹۵۳ء میں اُن کو خواب میں دیکھا۔ خواب میں مجھے نظر آیا کہ ایک شخص تقریباً دو بجے رات کے وقت ایک کمرہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا ہے۔ سامنے میز پر بہت سی کتابیں جمع ہیں۔ اُس میز پر ایک بڑا سا لیمپ رکھا ہوا ہے جس میں ہالی پادر کا بلب روشن ہے۔ اس شخص کے چہرے کا رنگ سیاہ ہے۔ چہرہ ساخت کے اعتبار سے کچھ لمبا ہے۔ لمبا سیاہ اور لمبے چہرے پر خوبصورت کٹ کی کالی داڑھی ہے جو ہیبت میں اضافہ کر رہی ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سُرخ سُرخ ہیں جو عینک کی قید و بند سے آزاد ہیں۔ ماتھے پر شکنیں اور چہرے پر خشونت کی لکیریں ہیں۔ یہ شخص غالباً پینٹ اور غالباً بُش شرٹ میں ملبوس ہے۔ اس کا قد بہت طویل اور مضبوط ہے۔ جس پر کسی گراں تجربہ فوجی افسر کا گمان ہوتا ہے۔ خواب میں مجھے محسوس ہوا کہ یہی پروفیسر کلیم الدین احمد ہیں۔

مہر جولائی ۱۹۶۳ء کو مجھے اپنے ذاتی (لٹ دار دی) کے مقدمہ کے سلسلے میں مواد اکٹھا کرنے کیلئے پٹنہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں تقریباً ایک ہفتہ قیام رہا۔ جب میں پٹنہ پہنچا تو میری یہ خواہش ہوئی کہ میں پروفیسر کلیم الدین احمد سے ملاقات کروں اور پھر اُن کی اصل شکل کا خود اپنی شکل سے مقابلہ کر کے اندازہ لگاؤں کہ دونوں شکلوں میں کہاں تک مماثلت ہے۔ مگر پروفیسر صاحب سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ میں نے پہلے ہی سے سُن رکھا تھا کہ وہ کسی سے ملاقات نہیں کرتے ہیں۔ اور اگر ملاقات کر لیتے ہیں تو بات نہیں کرتے ہیں۔ یعنی کلیم نام تو ہے مگر کلام سے گریز کرتے ہیں اس لئے میں اپنی جگہ پر بہت مایوس تھا۔

پٹنہ میں میرا قیام اپنے بھتیجے عزیزی شمس الرب کے یہاں تھا جو اُن دنوں محمد رضا کالج پٹنہ میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ وہ باقر گنج میں رہتے تھے۔ اُن کے پڑوس ہی میں حکیم فدا رضا صاحب کا مکان تھا اس لئے پٹنہ کے ادیبوں میں سب سے پہلے انھیں سے ملاقات ہوئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے اُن سے عرض کیا کہ وہ مجھے پروفیسر کلیم الدین احمد سے ملا دیں۔ انھوں نے دبی زبان میں وعدہ تو کر لیا مگر یہ غالباً اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے انھوں نے اس سلسلے میں کوئی پروگرام نہیں بنایا۔

دوسرے روز میں خدا بخش لائبریری پہنچا وہاں محترمی قاضی عبدالودود صاحب سے ملاقات ہوئی۔ قاضی صاحب موصوف سے اس سے قبل لکھنؤ میں پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کے یہاں ملاقات ہو چکی تھی۔ اس لئے اُن سے کسی تعارف کی ضرورت پیش نہ آئی۔ قاضی صاحب موصوف نے چلتے وقت اپنے دولت کدہ پر مجھے چائے پر مدعو کیا۔ میں تقریباً پانچ بجے سہ پہر کو اُن کی خدمت میں حاضر ہو گیا جہاں پر پروفیسر حسین صاحب پہلے ہی سے موجود تھے ——— اس وقت وہ عربی و فارسی کے پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز ایمیریٹس پروفیسر تھے اور ریٹائرمنٹ کے دائر کئے تھے۔ میں اُن سے اس سے قبل متعارف نہیں تھا۔ اس لئے قاضی صاحب نے میرا اُن سے تعارف کرایا۔ اسی موقع پر وقار ملک پوری صاحب اور

جوہر نظامی صاحب بھی موجود تھے۔ چائے پر مختلف موضوعات پر بحث آئے۔ دورانِ گفتگو پروفیسر کلیم الدین احمد کا بھی ذکر آگیا۔ اُن کے متعلق نظامی صاحب نے بھی فرمایا کہ وہ بہت کم سخن اور خاموش قسم کے آدمی ہیں اور ملنے جلنے سے بہت گریز کرتے ہیں۔ بعد مغرب ہم لوگ نظامی صاحب کے یہاں سے رخصت ہوئے۔ چلتے وقت پروفیسر سید حسن صاحب نے اپنے دولت کدہ پر مجھے صبح کے ناشتے پر مدعو کیا۔

میں وقتِ معینہ پر پروفیسر سید حسن صاحب کے دولت کدے پر پہنچ گیا۔ وہ نہایت اخلاق و محبت سے پیش آئے اور ناشتے کے انتظام میں نہایت تکلف سے کام لیا۔ اس ملاقات میں ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب آگئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے پروفیسر سید حسن صاحب میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ اور ہم لوگوں کی برسوں کی ملاقات ہے۔ اس ملاقات میں انھوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ مجھے پروفیسر کلیم الدین احمد سے ملا دیں گے۔ یعنی جس ہاتھ سب پر گرانی کی تھی اُس کو انھوں نے اٹھایا۔ اُسی روز پروفیسر سید حسن صاحب نے پروفیسر کلیم الدین احمد کی کوٹھی پر فون کیا تاکہ پروگرام طے ہو جائے۔ مگر فون کرنے پر پتہ چلا کہ پروفیسر موصوف پٹنہ سے باہر ہیں اور رانچی تشریف لے گئے ہیں۔ اب میری امید مایوسی میں بدل گئی اور میں نے سمجھ لیا کہ اب وہ مقصود بالذات نہیں آئے گا۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کے علاوہ میں ڈاکٹر اختر اورینوی اور پروفیسر جمیل مظہری سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ مگر پتہ چلا کہ یہ دونوں حضرات بھی پٹنہ میں موجود نہیں ہیں۔ ایک دو دن کے بعد ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب تشریف لے آئے اور میں ایک شام کو پروفیسر سید حسن صاحب کے ہمراہ ڈاکٹر اختر اورینوی کے بنگلہ پر حاضر ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف بہت اخلاق سے پیش آئے اور پرتکلف چائے سے نوازا۔ وہاں بھی پروفیسر کلیم الدین احمد کی خاموشی طبع کا ذکر چھڑ گیا۔ اب میں ان کی ملاقات سے مایوس تھا کیونکہ اب پٹنہ سے میری واپسی کے دن قریب آرہے تھے۔

پٹنہ کے دورانِ قیام میں ایک رات "مجلسِ ادب" کی نشست ہوئی جس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ اسی ادبی محفل میں پروفیسر عطا کاکوی صاحب، حمید عظیم آبادی، یوم مظفر صاحب، کلیم عاجز صاحب اور دیگر شعرا سے ملاقات ہوئی۔ اس محفل میں پروفیسر جمیل مظہری کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور میں ان سے بھی ملنے کیلئے بیتاب تھا۔ مگر اس وقت تک وہ تشریف نہیں لائے تھے۔ وہ غالباً اس وقت تشریف لائے جب میں پٹنہ چھوڑ چکا تھا۔ پٹنہ کی یہ ادبی محفل نہایت صاف ستھرا اور آراستہ و پیراستہ تھی جس میں شہر کے بڑے رؤسا اور چیدہ شعرا شریک تھے۔ یہ نشست بہت کامیاب رہی تھی۔

پٹنہ آئے ہوئے مجھے تقریباً ایک ہفتہ گذر گیا تھا اور اب میں واپسی کی تیاری کر رہا تھا اس لئے میں ۱۰ جولائی کی صبح کو میں پروفیسر سید حسن صاحب کی خدمت میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کل میں گورکھپور واپس جا رہا ہوں مگر پروفیسر کلیم الدین احمد سے ملاقات کی حسرت دل میں باقی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں فون کر کے ابھی معلوم کرتا ہوں کہ پروفیسر موصوف رانچی سے واپس آئے کہ نہیں چنانچہ انھوں نے فون کیا۔ فون کرنے پر معلوم ہوا کہ پروفیسر موصوف واپس آگئے ہیں۔ اب میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میری خشک رگوں میں خون دوڑنے لگا۔ اور دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ پروفیسر سید حسن نے فون پر پروفیسر کلیم الدین احمد سے کہا کہ ایک صاحب گورکھپور سے آئے ہیں۔ انھوں نے ایک بار آپ کو خواب میں دیکھا تھا اب وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، تاکہ یہ معلوم کریں کہ اصلی صورت اور خواب والی صورت میں کتنا فرق ہے۔ یہ سُنکر پروفیسر کلیم الدین احمد بہت زور سے ہنسے اور فرمایا کہ ان کو میرے یہاں مزور لے آئیے۔ انھوں نے ملاقات کے لئے ۱۱ جولائی کو ۹ بجے صبح کا وقت مقرر کر دیا۔

۱۱ جولائی کو جمعہ کا مبارک دن تھا۔ میں ۹ بجے کے قریب پروفیسر سید حسن صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں پروفیسر کلیم الدین احمد کی کوٹھی کی طرف چل دیئے۔ اور ٹھیک ۹ بجے وہاں پہنچ گئے۔ پروفیسر سید حسن صاحب نے اپنی آمد کی اطلاع کی۔ اس کے بعد ایک ملازم کے ہمراہ ہم لوگ اُن کے ڈرائنگ روم کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم لوگ ایک برآمدے سے گذرنے کے بعد ایک کمرے میں پہنچے۔ اس کمرے کے بعد ایک دوسرا کمرہ تھا۔ یہی پروفیسر کلیم الدین احمد کا ڈرائنگ روم تھا۔ یہ ڈرائنگ روم نہایت پرتکلف طریقے سے سجا ہوا تھا۔ جونہی ہم اندر والے کمرہ تھا میں نے اس میں کچھ تاریکی تھی۔ اسی بنا پر بلب روشن کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چند منٹ کے بعد پروفیسر کلیم الدین صاحب مسکراتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ میرا خواب کس قدر جھوٹا تھا۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کا رنگ سیاہ کے بجائے گندمی تھا۔ چہرہ لمبا ہونے کے بجائے قدرے گول، چہرے پر داڑھی نہ تھی بلکہ کلین شیو ڈسٹے۔ آنکھیں نہ بہت بڑی تھیں اور نہ بہت چھوٹی۔ ان آنکھوں میں سرخی نہ تھی۔ نہ پلکیں نہیں تھیں، بلکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ خاکی پینٹ اور خاکی کشتی شرٹ میں ملبوس نہ تھے بلکہ سفید پائجامہ اور سفید قمیض پہنے ہوئے تھے۔ قد نہ بہت طویل نہ تھا بلکہ اوسط درجہ کا تھا۔ پروفیسر کلیم الدین احمد ایک خوفناک قسم کے بجائے ایک نہایت سنجیدہ، متین، مشرقین اور مہذب انسان نظر آرہے تھے۔

(باقی صفحہ ۱۴۰ پر ملاحظہ فرمائیے)

پورا پتہ لکھنے سے خط جلدی پہونچتا ہے

ادھورا پتہ لکھنے سے خط دیر سے پہونچتا ہے

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے

بھارتی ڈاک و تار

DAVP/1281

ذکا صدیقی

بادل

اُن کی زُلفوں کا اُڑایا ہے نقشہ بادل
یہ دُھواں دھار اندھیرا، یہ گھنیرا بادل

مُو قلم کا کسی فنکار کے، ہے "لینڈ اسکیپ"
سُرمئی، فالسئی، سُرخ، سُنہرا بادل

"مونالیزا" کا تبسّم رُخِ مہتاب پہ ہے
اور "دَ۔ وِنشی" کے تصوّر کا ہے سایہ بادل

نُور چھن چھن کے ٹپکتا ہے نقابِ رُخ سے
چاند کی روشنی کیا روک سکے گا بادل

زاہدو! حُرمتِ مے کا یہ اشارہ سمجھو
جانبِ کعبہ سے اُٹھا ہے سنہرا بادل

ٹین کے چھجّے پہ بوندوں نے جو چھیڑی سرگم
جھوم کر لیتا ہے ملہار کا لہرا بادل

اپنی دانست میں بھولے ہوئے بیٹھے تھے اُسے
ہائے، کیوں ایسے میں گھر آیا خدا یا بادل

یاد آنے لگی بیتی ہوئی رُت ساون کی
شبِ تنہائی میں تڑپائے نہ اتنا بادل

جب وہ ہنستے تھے تو بجلی سی چمک جاتی تھی
ایسا منظر ہمیں اب تو ہی دکھا جا بادل

تیرِ باراں سے وہ تڑپے نہیں کیوں میری طرح
کہیں "کیوپڈ" کی طرح تو نہیں اندھا بادل

ہُوک سی اُٹھتی ہے صحرا کے سُلگتے دل سے
آج دریاؤں پہ پھر ٹوٹ کے برسا بادل

دیر سے ڈھونڈ رہا تھا وہ نہ جانے کس کو
جانے کیا سوچ کے رونے لگا تنہا بادل

تشنگی صرف لبوں ہی کی نہیں ہوتی ہے
جانے خود کتنے جگوں کا ہے پیاسا بادل

اے ذکا! اپنی ہی پلکوں پہ بسا لو اس کو
آسمانوں کے تو دل میں نہ سمایا بادل

اظہر افسر

ایامی

(ڈپٹی نذیر احمد کے اسی نام کے ایک ناول پر مبنی)

افراد:-

آزادی بیگم
مستجاب
مشتاق
خواجہ آزاد
چھلاوہ
ماما
نوکر اور رفیم

منظر ۱:- (قدیم طرز کے مکان کا ایک دالان ہے۔ وسط میں تخت بچھا ہے۔ جس پر اُجلا چاندنی کا فرش ہے۔ دیواروں پر طغرے لگے ہیں۔ تخت سے نیچے بستر بند، صندوق اور پانی کی صراحی کا چھینکا رکھا ہے۔ وقفے وقفے سے نوکر آکر یہ سامان لے جاتا ہے۔

تخت پر آزادی بیگم لمبی آستینوں کا گلابی کرتا اور ہرا پاجامہ پہنے سر جھکائے بیٹھی ہے۔ اپنے گلابی دوپٹہ کے ایک کونے کو اُنگلیوں سے بل دے رہی ہے۔ مستجاب (آزادی بیگم کا شوہر) پرانے طرز کا سفید ایک برکا پائجامہ اور اچکن پہنے پاس کھڑا ہے۔ پردہ اُٹھتا ہے تو مستجاب جھک کر آزادی بیگم کی صورت دیکھتا ہے)

مستجاب:- آزادی بیگم اداس ہو؟ تم یوں اداس ہوتی ہو تو رہنے دو میں نہیں جاتا۔

آزادی بیگم (جب ساری دنیا ایک زبان ہو کر تمہیں جاؤ جاؤ کہہ رہی ہے تو اکیلی میں سب کے خلاف کیوں کر کہوں کہ نہ جاؤ۔

مستجاب:- آزادی۔

آزادی:- خود ابا جان اور اماں جان، سب کو یہی شبہ ہے کہ میں نے کہہ کر تم سے وعظ کرنا چھڑوایا اور آمدنی کی راہ بند کرائی۔ وہ میں ہوں جس نے مولویت کے قدیمی پیشے کو چھڑا کر تمہیں بھوپال میں نوکری کرنے پر اُکسایا ہے۔ شکر ہے کہ نوکری میں کوئی فن نہیں ورنہ لوگ ماسے طعنوں کے میرا جینا مشکل کر دیتے۔

مستجاب:- جی نوکری کی گرمی میں نے دی ساری کوششیں میں نے کیں۔ خود مجھے اُس آمدنی سے چڑ ہے جو مولویت کے ذریعہ سے حاصل کی جائے۔

آزادی:- اماں جان کہتی ہیں جس طرح اور نوکریاں ہیں اسی طرح کی نوکری مولوی کی بھی ہے۔ اور کوئی کام نہ کیں لوگوں کو دین کی تعلیم و تلقین کی۔

مستجاب:- اب میں سچی بات کہوں گا تو یہ سب کے سب بگڑ جائیں گے۔ ساری دنیا جانتی ہے اور خود مولویوں کو بھی معلوم ہے کہ اس زمانے میں جو کچھ انھیں دیا جاتا ہے وہ صدقہ، خیرات اور للّٰہ دیا جاتا ہے۔ میں اس عار کو گوارا نہیں کر سکتا۔ وعظ و نصیحت کار ثواب سمجھ کر کیا جائے اس پر بڑھ کر شریف پیشہ کوئی اور نہیں لیکن اسے ذریعۂ معاش بنانا میرے بس سے نہ زندگی بھر نہیں ہو سکتا۔

آزادی:- ابا جان کہتے ہیں تم مولویت کو ذریعۂ معاش نہ بناتے مگر بد لیں بھی تو نہ جاتے۔

مستجاب:- سال بھر سے تو میں کچھ نہیں کر رہا۔ بیاہ ہو جانے کے بعد بھی ہم دونوں کے کفیل ابا جان ہیں۔ یہ خیال صبح، شام میرے ذہن

آرے کی طرح چلتا رہا ہے۔ ابا جان نے یہی بہت کیا کہ مجھے روٹی کمانے کا ہنر سکھا دیا۔ سبھی والدین یہی کرتے ہیں اور اب جو کام مجھے ریاستِ بھوپال میں ملا ہے میری مرضی کے عین مطابق ہے۔

آزادی: ۔ کیا کام کرنا ہوگا!

مستجاب: بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں مطبع محمدی میں جس کے مالک سے میری پرانی ملاقات ہے اپنی کچھ کتابیں چھپوانا چاہتے ہیں، وہاں تحشیہ اور تصحیح کے لئے ایک عربی داں آدمی کی ضرورت ہے۔ فی الوقت تو تنخواہ تھوڑی ہے مگر آگے ترقی کی توقع ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ تم کچھ دن صبر کے ساتھ انتظام خانہ داری کر لو۔

آزادی: ایسی کونسی لمبی چوڑی خانہ داری ہے جس کے انتظام میں دقت ہوگی۔ کام عمدہ ہے تمہاری طبیعت کے عین مطابق ہے پھر ایک بڑی سرکار کا ذریعہ ہے تو معاد، اللہ بیلی، خدا کو سونپا۔ میں نے میاں ہوی کے حقوق کتابوں میں پڑھے ہیں اور وعظ بھی سنا ہے میرا تو لے دے کے تم پر ایک ہی حق ہے، حق مہر اور بس۔ سو میں تو پکار کے کہتی ہوں کہ میں نے اپنا حق مہر خوشی اور رضا مندی سے تم کو معاف کیا۔ لیکن میں تمہارے حقوق کی ذمہ دار ہوں۔

مستجاب: بیگم۔

آزادی: میں نے اپنے حصے کا جو کام تھا وہ میں نے کر لیا۔ اب تمہاری نیتیں کی ہوں گی، کون سی عورت ہوگی جو نہیں کرتی، کبھی میں نے کوئی بے جا فرمائش کی اور تم اس کو پورا نہ کر سکے میں ذرا بھی ناخوش ہوئی۔ ہو سکتا ہے تم نے کوئی چیز مجھے لا کر دی اور میں شکر گزار نہ ہوئی۔ تمہاری خدمت کے بجا لانے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی، ایک وقت تمہارا حکم نہ مانا، تمہارا ادب نہ کیا، تو بال بال تمہاری گناہ گار رہوں، اس وقت میں ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ للہ مجھے معاف کر دو۔

مستجاب: بیگم کیا کر رہی ہو!

آزادی: (سر ہلاتی ہے) زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں، کیا معلوم اب کے بچھڑے ہم پھر ملیں گے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو تم بھوپال میں رہو اور میں یہاں مر جاؤں۔ اور تمہارے حقوق میری گردن پر رہیں۔ کہہ دو مجھے معاف کیا۔ ایسے نہیں زبان سے کہو کہ معاف کیا۔

مستجاب: دل سے معاف کیا۔

مستجاب: بیگم تمہارا جس قدر بیقرار ہونا ہو تو سوچتا ہوں۔ میں تمہیں ساتھ ہی لے چلوں، لیکن اجنبی شہر، ہر چند نواب صاحب سے خط و کتابت بہت ہے مگر کبھی ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا، انھوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ مجھے ان کی خدمت میں نیاز نہیں۔ لفافہ پہنچتے ہی مکان کا ٹھیک ٹھاک کر کے بلوا تا ہوں اور ...

آزادی: (گھڑی ہو جاتی ہے، اور) (سسکیاں لیتی ہے)

مستجاب: اور خدا گواہ ہے اگر خدانخواستہ تمہارے بلانے کی کوئی صورت نہ نکلی تو پندرہویں دن تم مجھے یہاں دیکھنا، کیسی نوکری، کہاں کی چاکری، اگر کوئی ساری ریاست بھی دے دے تو میں ٹھہرنے والا نہیں۔

آزادی: ۔ یہ میں جانتی ہوں۔ مگر تم یوں نہ اداس ہو۔ جانے کیا خیال آیا کہ میں بے قرار تکلم ہو گئی۔ لو اب میں نہیں روؤں گی۔ تم بھی ہنسی خوشی سدھارو۔ جس طرح بیٹھے دکھا کر جاتے ہو، خدا وہ دن کرے کہ اسی طرح ہنستے مسکراتے دکھاؤ۔

ماما: ۔ (داہنی جانب سے داخل ہوتے ہوئے) میاں سلام مان رکھ دیا گیا۔

مستجاب: لو بیگم۔ ہم چلتے ہیں۔ خدا حافظ ۔ (داہنی جانب آزادی کو دیکھتا ہوا جاتا ہے)

آزادی: (رونے لگتی ہے، خدا حافظ و ناصر۔ اللہ کی امان میں دیا۔

منظر ۲: ۔ مکان کا وہی حصہ ہے جو پہلے منظر میں ہے آزادی تخت پر بیٹھی سر جھکائے کچھ سی رہی ہے۔ تخت کے پچھلے حصے میں ایک گھڑی رکھی ہے۔

ماما: ۔ (بائیں جانب سے آتی ہے) بی بی کل کا خط میاں ہی کا تھا نا۔ کب آ رہے ہیں۔ سب خیریت تو ہے نا۔

آزادی: (ماما کی طرف دیکھ کر) ہاں بوا سب خیریت ہے (پھر سینے لگتی ہے) کل ناموں شام خط آیا ہے۔ کھلے ہے اجازت مل گئی ہے، سامانِ سفر درست کر لیا ہے۔ چاند رات تک ضرور آ جاؤں گا۔ مگر نہیں معلوم کیا بات ہے کہ بیٹھے بٹھائے دل کے خلاف اور چاند نیاں لے کر بھی میں کہ کھول کر دیکھ لوں کہ آپ

ہی آپ دل بہلا جاتا ہے گھڑی کھولنے کی نوبت ہی نہیں آئی دیکھو ولیسی کی ولیسی بندھی ہے۔

(دو سنگ سنائی دیتی ہے) تار آیا ہے۔

آزادی: تار۔ الٰہی خیر۔ دوڑ لو تو۔

(ماما بھاگتی ہوئی داہنی جانب چلی جاتی ہے) آزادی بھی تخت سے اتر کر داہنی جانب جاتی ہے، مگر پردہ پر یہ سامان کھڑی اسٹیج پر دکھائی دیتا ہے۔ پھر باہر کی طرف جھانک کر

آزادی: ہے تو ہمارے ہی نام کا۔ کس کا ہے جسنہ کسی انگریزی پڑھنے والے سے پوچھ تو لیں لکھا ہے تار میں؟

ماما: (باہر ہی سے) بی بی آپ ہی کے نام کا ہے اور حضور آل کے نواب صاحب نے بھیجا ہے۔ کہو تو پڑھوا لاؤں۔

آزادی: اری ہاں جانا، کھڑی کھڑی دیر کر رہی ہے۔ مجھے ہول آرہا ہے دھڑکن ہو رہی ہے تخت تک آتی ہے اور آسمان کی طرف دیکھتی ہوئی بیٹھ جاتی ہے۔ میرے دل میں تو جس دن سے وہ سیدھا رہے ہیں بری بری باتیں چلا آرہی ہیں، کیا میاں کی مفارقت میں بھی بیبیوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ خدا جانے ایسی کیا بیتی کہ خود تار تک نہ دے سکے۔ برسوں آنکھوں نے خط لکھا، آج کسی دوسرے سے تار دیا۔

ماما (روتی ہوئی ہاتھ میں کھلا تار لئے داہنی جانب سے داخل ہوتی ہے) بی بی، بی بی، میاں چل بسے۔ بی بی۔

آزادی: جسنہ، جسنہ۔ (دھڑام سے گر پڑتی ہے) (دو چانک گر پڑتی ہے۔

ماما: بی بی۔ (دوڑتی ہے۔ پھر تخت پر پڑی ہوئی آزادی کے گلے کو ہاتھ لگا کر) یہ تو بے ہوش ہو گئیں۔

منظر ۳: مکان کا وہی حصہ ہے جو پہلے اور دوسرے منظر میں ہے۔ تکیے کے سہارے تخت پر آزادی نیم غش سی لیٹی ہے۔ پاس ہی آزادی کا باپ خواجہ آزاد بیٹھا ہے۔ آزادی نے اپنی آنکھیں مندر رکھی ہیں۔

خواجہ آزاد بیٹا۔ آزادی بیگم۔ بیٹا آنکھیں کھولو۔ (آزادی باپ کی طرف دیکھتی ہے) بیٹا میں سب کچھ جانتا ہوں۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْن۔ اگر تم پر کوئی مصیبت نازل ہو تو یہ شاید ہی بندگی نہیں کہ ہم اپنا آپا بھول کر خدا کو بھی بھول جائیں یا اس سے ناراض ہوں۔ مصیبت میں تو ہمیں اس کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ اگر اتنا نہ ہو سکا تو اس کا بندہ بے صبرا، ناشکرا اور ضعیف الاعتقاد کہلائے۔

آزادی: ابا جی، یہ خدا کو ہی منظور تھا۔

خواجہ آزاد: بے شک۔ کبھی شکایت کا لفظ زبان پر نہ لانا۔ دل میں بھی شکایت کا آنا بھی کفر ہے تم سمجھتی ہو مجھے۔ تمہاری ماں کو یا رشتہ داروں کو اس حادثہ کا غم نہیں۔ سب کو ہے سب کا کلیجہ پھٹ رہا ہے مگر سوائے صبر و شکر کے میں تمہیں کوئی تلقین نہیں کر سکتا۔ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْن۔ یہ آیت تم دن رات پڑھتی رہتی ہو ہم سب کو ہی سفر درپیش ہے۔ اگر ایک پہلے منزل پر پہنچ گیا تو زحمتِ سفر سے اس نے پہلے نجات پائی ہم بھی آن کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔ سب کو کبھی نہ کبھی منزل پر پہنچنا ہے، خدا نے چاہا تو سب ایک دن اس سے جا ملیں گے۔

آزادی: (سسکیاں لیتی ہوئی) ابا جی۔

خواجہ آزاد: اور پھر بیٹی یہ ملنا ایسا ملنا ہوگا کہ اس کے بعد بچھڑنا نہیں ہے۔ مفارقت نہیں ہے جدائی نہیں ہے خدا کے دربار میں صابرین کی بڑی عزت و توقیر ہے۔ وہ کسی بڑے سے بڑے حادثہ پر گزند کی نہیں میری بچی، اٹھو۔ اب کبھی تیری سسکی و سسکی دے کبھی تیری آنکھیں نہ ڈبڈبائیں۔ کوئی آنسو پلکوں پر نہ چھلکنے پائے۔

آزادی: (اپنا سر خواجہ آزاد کی گود میں رکھ دیتی ہے) ابا جی۔

خواجہ آزاد: (سر سہلاتے ہوئے) میری بچی۔ میری بچی۔

منظر ۴: مکان کا وہی حصہ جو پچھلے منظر میں ہے۔ آزادی ایک چھوٹا سا تکیہ لئے تخت پر بیٹھی ہے۔ کچھ خط سامنے پڑے ہیں۔ آزادی ایک ہاتھ سے اپنا سر تھامے ہوئی ہے۔

ماما: (داہنی جانب سے داخل ہوتی ہے) بی بی کسی طبیعت ہے۔

آزادی: سر میں بڑے زور کا درد ہو رہا ہے جسنہ۔ جب تک طبیعت ٹھیک رہی قرآن پاک کی تلاوت کی، پھر ان کے خط سب جمع

کہہ کے رکھے تھے اُن کو پڑھا کہ یکایک دہشت سی ہونے لگی
اور سر دکھنے لگا۔

ماما:۔ بی بی غم کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

آزادی: ہاں ممّا میں نے استعفا رد کر کے بھی کیا کر لیا۔ اور اگر آئندہ ساری عمر اسی طرح رنج کئے جاؤں گی تو بھی کیا کر لوں گی۔ اماں کہتی ہیں ہائے اُس کے اولاد بھی نہ ہوئی۔ میں تو کہتی ہوں بھلا ہی ہوا، آج کو اگر اولاد ہوتی تو دُہری مصیبت ہوتی۔

ماما:۔ دُہری مصیبت بی بی۔

آزادی:۔ اور کیا اپنی ہوگی کو روتی یا اُس کی بیٹی کو۔ لڑکا ہو یا لڑکی بس کے سر پر باپ نہیں اُس کا کیا ٹھکانہ۔ اولاد ہوتی اور بُری نکلتی، خود میری زندگی برباد ہوتی سو ہوتی، خاندان کی عزت اور آبرو کا خطرہ تھا۔ خدا کا کوئی امر مصلحت سے خالی نہیں۔ میں تو اُس کی بڑی شکر گزار ہوں کہ اِس آفت سے بچی رہی۔

ماما: ہاں بی بی اس بات کا سب کو وثوق ہے کہ میاں نے کوئی نام و نشان نہ چھوڑا۔

آزادی:۔ اری حسنہ جب اپنی ہی جان جاتی رہی تو نام و نشان، وہ کرم کیا کرتا۔ پھر بھی دنیا کا ایک خیال ہے ورنہ میں اولاد کے پیچھے لوگ اپنے دین کی تباہی کی پروا نہیں کرتے۔ وہی اولاد اپنے وقت پر پہنچ کر ماں باپ کا اتنا احسان بھی نہیں مانتی جتنا ایک پڑوسی کا۔ تو بہ ہے جواب پہ دیں، گستاخیاں اور نافرمانیاں یہ کریں۔ ایذا یہ پہنچائیں اور غضب خدا کا نام و نشان کہلائیں۔

ماما:۔ ہاں بی بی زمانے کا رنگ بڑا بُرا ہے۔

آزادی:۔ اولاد کی طرف سے تو مل میرا ایسا کھٹا ہوا ہے کہ میں نے کبھی اولاد کا کتنا نہیں کی۔ اب بھی اولاد کے ہونے کا خیال یا کسی کو گود لینے کا خیال مطلق نہیں دل کے بہلنے کی ایک ہی صورت تھی۔

ماما کیسی صورت بی بی۔

آزادی:۔ کوئی لڑکیوں کا مکتب کھول لیتی۔ مگر سر میں اتنا بوتا کس کے گھر سے لاؤں، خدا جانے دماغ پر کیا بیتی ہے کہ ذرا کوئی زور سے بولتا ہے تو چیخا جانے لگتا ہے۔ ممکن نہیں کہ مکتب کے عمل کی سہار ہو سکے۔ جی سہلانے کو ہر کھیل ہو سکتی ہیں مگر یہی میرے قابل نہیں۔ بعض کے ہیں [illegible]

منظر ۵:۔ پرانے طرز کے مکان کی ایک بیٹھک
ایک نوجوان (مشتاق) ٹہل ٹہل کر کچھ
یہ شعر پڑھ رہا ہے۔

مشتاق:۔ ہم تو پڑھ لیتے ہیں مُنہ تیری طرف کر کے نماز
نہیں معلوم کہ کعبہ بھی اُدھر ہے کہ نہیں

فہیم:۔ (داہنی جانب سے داخل ہوتا ہے) میاں اب تو یہ شعر پڑھنا اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنا چھوڑ دو۔ کیا اُس کی بیوی کا بھی کچھ خیال ہے۔

مشتاق:۔ آؤ آؤ میاں فہیم بیٹھو۔ ہی وقت تو اُس کے خیال کا ہے۔

فہیم:۔ میاں اُس سے بہتر بہتر بُنیری حسینائیں شہر میں بھری پڑی ہیں۔ جھوٹے کہو تو سچے بیاہنے لگیں۔

مشتاق ہائے تم میرے دل کا حال کیا جانو، میں نے جس کو لبہ کیا ہے وہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ بہت حسین دیکھے مگر ایسا نہیں دیکھا۔ میں نے اُس کو اُس عمر سے دیکھا ہے جب اُس کو حسین کے معنے بھی سمجھنے کی تمیز نہ تھی۔

فہیم:۔ پہلے تو خیر آزادی بیگم کے والد خواجہ آزاد کی بیوی ہادی بیگم کے آگے کچھ چل سکتی۔ اور ضد میں ہادی بیگم نے اپنی لڑکی کی شادی مولوی مستجاب سے کر دی۔

مشتاق:۔ اب نہ ہادی بیگم انکار کر سکیں گی نہ مولوی خواجہ آزاد۔ لیکن سب سے اہم سوال تو خود آزادی بیگم کی مرضی کا ہے۔ وہ حماقت کیلئے راضی نہ ہوگی۔

فہیم:۔ آزادی بیگم کو ہمخیال بنانا کون سا مشکل کام ہے۔ کسی مشاطہ سے کام لے لو۔ (داہنی جانب دیکھ کر) بھلا وہ واقعی بھلا وہ ہے۔ اے بی بھلا وہ۔

بھلا وہ:۔ (باہر ہی سے) کون۔ کسے آواز دے رہے ہو میاں۔

فہیم:۔ (داہنی جانب جاتا ہے) ممّی میں تمہیں ہی بُلا رہا ہوں۔ یہاں آؤ۔ اندر آؤ۔

(۵۰ سالہ ایک عورت (بھلا وہ) پان کھائے مسّی لگائے چادر اوڑھے اندر داخل ہوتی ہے)

بھلا وہ:۔ (سر جُھکا کر) [illegible] کو سلام کرتی ہے) میاں میں۔ انہیں پہچانا نہیں۔

فہیم :۔ یہ میرے جگری دوست ہیں مشتاق۔

چھلاوہ :۔ یہ وہی میاں مشتاق ہیں جو مولوی فواد آزاد کی لڑکی سے ناامید ہو کر مہینوں عمرستانوں میں مارے مارے پھرا کئے۔ مدت تک غائب رہے اور شاید دیوانے بھی ہو گئے تھے۔

فہیم :۔ (ہنستا ہے) ہاں یہ وہی میاں مشتاق ہیں۔ بی چھلاوہ تم بھی بڑی خبر نیار رکھتی ہو۔ مولوی مستجاب کے انتقال کے بعد کیا بہتر نہ ہوگا کہ آزادی بیگم کا عقد ثانی ہو جائے اور وہ بھی میاں مشتاق سے۔

چھلاوہ :۔ یہ بھی کوئی کام میں کام ہے رکھئے تو ابھی آزادی بیگم کو یہاں لانا مشکل مگر ہاں یہ تو نکاح کی فکر میں ہیں۔ خاطر جمع رکھئے۔ خانہ داری کا سارا سامان درست کر لیجئے۔ سمجھ لیجئے آپ کی اس لونڈی نے اس کام کا بیڑا اٹھا لیا ہے۔

فہیم :۔ (جیب سے دو روپے نکال کر دیتا ہے) لو اسے پان تمباکو کے لئے رکھو۔

چھلاوہ : میاں اس کی کیا ضرورت تھی۔ (لے کر ہتھیلی میں رکھ لیتی ہے) بندی تو سب کچھ کام ختم کر کے لے گی۔

مشتاق : بی چھلاوہ سنا ہے آزادی بیگم کا مال کچھ عجیب ہے۔ کسی وقت وہ اپنے میاں کو نہیں بھولتی۔ ارے تم ہنس رہی ہو۔

چھلاوہ : یہ مرد سے بڑے ہی بھولے ہوتے ہیں اور دیکھ لو تم لوگوں کو تو دنیا کی ابھی ہوا ہی نہیں لگی ہے۔ اور میں تو کچھ نہیں کہتی۔ بی آزادی کا کسی وقت میاں کا دھیان آنا ہی اس بات کی بڑی شہادت ہے کہ وہ زیادہ دن یونہی بیٹھنے والی نہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت اُنس پذیر ہے۔ آزادی دوران پرہاتھ مار کر نکاح وقتہ کرے پر کرے۔

فہیم :۔ بات تو ٹھیک کہتی ہو۔

چھلاوہ : اپنے طاقاتیوں میں خیال کیجئے جن کی بیبیاں مر جاتی ہیں، ہیں کو بیوی کے ساتھ زیادہ اُنس ہوتا ہے وہی دوسرا نکاح ہی کرتا ہے۔ اس وقت تک نور و دار کچھ بگڑی نہیں ہے، ہاں لوگ جلدی مچا کر بات بگاڑ دیں تو میں کہہ نہیں سکتی نہیں، نہیں ہمیں کوئی جلدی نہیں۔

فہیم :۔ اچھا میاں میں چلی۔ کوئی مشکل کام ہو تو مجھ ناچیز کا امتحان لیا ہوتا خیر میں پھر آؤں گا سلام دونوں کو سلام کر کے چلی جاتی ہے)

منظر ۶ :۔ مکان کا وہی حصہ ہے جو منظر ایک، دو اور چار میں ہے۔ تخت پر لحاف اس کی آزادی لیٹی ہوئی ہے۔ دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ بائیں جانب سے ماما داخل ہوتی ہے اور داہنی جانب جاتی ہے۔

چھلاوہ : (باہر سے) اپنی بیگم صاحب سے کہو بھوپال سے کوئی ملنے آیا ہے۔

آزادی : (انگڑائی لے کر بیٹھ جاتی ہے) کون ہے حسنہ، اندر بلا لو انھیں۔

چھلاوہ : (اندر آتی ہوئی) بی بی تم تو مجھے نہ جانتی ہو گی میرا نام آزمودہ خانم ہے۔ میں ہوں تو لکھنؤ کی رہنے والی مگر مدت سے بھوپال میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ (ایک طرف تخت پر بیٹھ جاتی ہے۔) مولوی مستجاب مرحوم کو اللہ جنت نصیب کرے اُن کی ہم سے بڑی رسم و راہ تھی۔ میرے سامنے ہی اُن کا انتقال ہوا ہے۔

آزادی : (سر پر دوپٹہ لیتی ہے) آپ کے سامنے؟

چھلاوہ : ہاں ہاں آخر ہم لوگوں سے تمہارا تذکرہ رہتا تھا۔ بھوپال سے چلی تو یہ سوچ کر نکلی تھی کہ دلی جاؤں گی تو تم سے ضرور ملوں گی۔ آج خدا نے وہ آرزو بھی پوری کر دی۔

آزادی :۔ (ادھر ادھر دیکھ کر) جانے پاندان کدھر پڑا ہے۔ حسنہ ذرا دیکھو تو۔ (حسنہ جاتی ہے)

چھلاوہ : جیسا مولوی صاحب نے حال بیان کیا تھا اس میں اور اب کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں نے اکمل سے پہلا کہ یہ تم ہو۔ بیشک تم نے میاں کا غم جتنا کیا تھا وہ ہی دنیا میں کوئی اور کرتا۔ (آزادی سر جھکا لیتی ہے اور دوپٹہ سے آنسو پونچھتی ہے) لے بی بی رو نہیں میرا دل بھی اُمڈا چلا آتا ہے۔

آزادی :۔ آپ کہہ رہی تھیں مولوی صاحب نے آپ کے سامنے حالت دم۔ کچھ حال تو بیان کیجئے۔

چھلاوہ :۔ نہ بابا مجھ سے نہیں کہا جاتا۔ تم آنسو نہ بہانے کی قسم کھاؤ تو میں کچھ کہوں

آزادی : سچ میں قسم کھاتی ہوں۔

چھلاوہ : مولوی صاحب کا مرنا تو عجیب قسم کا مرنا تھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ معمول کے مطابق اصلاح بنوائی، غسل کیا، کپڑے بدلے،

کھانا کھایا جیسے ان کی عادت تھی ذرا کی ذرا لیٹے۔ پھر اٹھ کر وضو کیا۔ نماز کو گئے۔ نماز میں کھڑے کھڑے چکر سا آیا۔ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ لوگوں نے جانا غشی ہے۔ بہت دیر ہوئی تو کسی نے سمجھا سکتہ ہے، کوئی کہنے لگا دورہ ہے۔ سلطان الحکمت اور جرنیل ڈاکٹر بلائے گئے۔ دونوں نے دیکھا اور کہا کچھ باقی نہیں ہے۔

آزادی: حکیموں نے کچھ بیماری بھی بتائی۔

چھلاوہ: ضعف قلب بتاتے تھے۔ میں نے نواب سلطان الحکما سے پوچھا اور بڑی محبت کی تو انھوں نے کہا کہ یہ ایک خاص بیماری ہے۔ ریاح پیدا ہو کر دل کو گھیر لیتی ہے اور دل کو خدا نے ایسا نازک مزاج بنایا ہے کہ تم جانو وہ ذرا سی تکلیف کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور دل کی جتنی بیماریاں ہیں سب میں اسی طرح فوراً آدمی کا کام تمام ہو جاتا ہے۔

آزادی یہاں دلی میں کیسے آنا ہوا آپ کا۔

چھلاوہ میری یہاں کچھ قرابت بھی ہے مگر میں ایک ایسی ضرورت سے آئی ہوں کہ ہے تو وہ سرکاری کام مگر ایک اعتبار سے میرا اپنا کام بھی ہے۔

آزادی: اگر کوئی کام میرے کرنے کا ہو یا جس کو تم جانو کہ میں کہہ سن کر کروا دوں گی، تو شوق سے کہنا۔ کیونکہ اوّل تو میں یہاں کی رہنے والی ہوں، دوسرے جس ریاست سے آپ آئی ہیں، میں اس کی نمک خوار ہوں۔ آپ سے اور مولوی صاحب سے تو عزیزوں کی طرح راہ و رسم تھی۔ آج کو مولوی صاحب زندہ ہوتے تو نہ آپ دوسری جگہ اترنے کا ارادہ کرتیں نہ وہ آپ کو کسی اور جگہ اترنے دیتے۔

چھلاوہ خدا گواہ ہے میں تم کو اپنوں سے بڑھ کر سمجھتی ہوں اور دوسری جگہ اترنے کا تم ذرا بھی خیال نہ کرنا۔ جس کام کے لئے میں آئی ہوں اس کام کا سرانجام وہیں سے خوب ہو سکتا ہے۔

(حسنہ پاندان لا کر تخت پر آمد یا ادب سے رکھتی ہے)

آزادی: مجھے پان کھلائیے۔ میں نے تو دو مہینے سے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ کون سی چیز کس حال میں ہے۔ دیکھ لیجئے سب چیزیں ہیں یا نہیں۔ حسنہ تم باورچی خانے میں چلو میں آتی ہوں۔

چھلاوہ: (حسنہ نازک اندام بیگم کا نام سنا ہوگا۔ (پاندان کھول کر پان بنانے لگتی ہے)

آزادی: نہیں تو۔

چھلاوہ: اصل میں یہ لکھنؤ کے مرشد زادے جمیل قدر کی خواص تھیں۔ پھر میں بھوپال میں آکر سکندر بیگم کی مصاحب ہو گئیں۔ ان کے بطن سے تو کوئی اولاد نہیں، ایک لڑکی کو گود لے رکھا ہے اب وہ لڑکی خدا رکھے سیانی ہو گئی ہے اس کے لئے کسی اچھے لڑکے کی تلاش تھی۔

آزادی: یہ جو ریاست بھوپال ہے۔ ۔ ۔ ۔

چھلاوہ: میری پوری بات تو سنو۔ نازک اندام بیگم کا آنا جانا محلات شاہی میں تو لگا رہتا ہے خدا جانے کس طرح انھوں نے تمھارے میاں کو دیکھ لیا۔ اور دیکھتے کے ساتھ ہی لٹو ہو گئیں۔ حاشا مولوی صاحب مر گئے اور مجھ کو بھی مرنا ہے۔ بیگم صاحب تو مولوی صاحب کے نئے نکلے جاتی تھیں۔ لڑکی بھی ان کے سامنے ہوتی تھی مگر بانک ہو یہ تو بڑا حادثہ ہو گیا اس لئے سب چپ ہو گئے۔ اب پتہ چلا کہ دلی میں ایک لڑکا ہے۔

آزادی: دلی میں۔ یہاں

چھلاوہ ہاں۔ سرکار دربار کی باتیں بیگم صاحبہ پر تو ظاہر کرنا ہے نہیں۔ پہلے مجھے حکم ملا ہے کہ میں دیکھ لوں۔ لڑکا کیسا ہے؟ میرے آنے کی تقریب یہ ہے ورنہ کہاں میں اور کہاں دلی۔

آزادی: پھر تم نے اس لڑکے کو دیکھا۔ کیسا پایا؟

چھلاوہ: (پان کھا کر پاندان بند کر دیتی ہے) دیکھا۔ خوب اچھی طرح دیکھا۔ اس میں تو [illegible] عورت کو اس سے بہتر شوہر سارے شہر کو اس سے بہتر داماد نہیں اور [illegible] سے بہتر بیٹا۔ غرض یہ [illegible] ہر طرح [illegible] شخص ہے۔ لیکن اس آدمی کا [illegible] مشغول معلوم ہوتا ہے۔

آزادی: (اپنا [illegible] ہے) دلی میں ایسا کون لڑکا ہے؟

چھلاوہ ابھی [illegible] ہزاروں سے میرے کو [illegible] نکالے۔

آزادی: آخر [illegible] ہے۔ [illegible] دولت کو ٹھکراتا ہے [illegible] بڑا افسوس ہوا اگر میں مرد ہوتی [illegible] ہی تو [illegible] کے تمھارے ساتھ [illegible] مگر بیگم صاحبہ کیا مجھے خاطر میں لاتیں۔

چھلاوہ: حقیقت تو یہ ہے کہ تم کو اپنے حسن کی خبر نہیں ہے۔ تمھاری شکل کے آدمی کو انھوں کیا [illegible] ہو [illegible] نہیں۔ عمدہ با [illegible]

یہ ہے کہ بڑھاپے تک تمھاری بھی سچ مچ بنی رہے گی۔ ایسا بڑا صدمہ تم نے ابھی ابھی اٹھایا مگر دیکھو اندر کھول کر بان نکالتی ہے، پان میرے ہاتھ میں ہے۔ میں تو

آزادی: آگ لگے اس حسن کو، نکلا سے کالی بھلی ہوتی۔ لمبی بے ڈول ہوتی۔ کوئی بات شکن ہوتی، کچھ بھی ہوتی۔ مگر یہ ہوتی سہاگن۔

چھلاوہ: وہ کوئی بڑی بات ہے جو مشک کی مہک اور حسن کی چمک سات پردوں میں بھی چھپائے نہیں چھپتی۔ تم پردے میں ہو تم کو خبر نہیں۔ میں تو اسی لوڑھ میں رہتی ہوں۔ پندرہ بیس جگہ کا حال تو مجھے معلوم ہے کہ تم پر زہر کھائے بیٹھے ہیں۔

آزادی: یہ آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔

چھلاوہ: تم میری اس وقت کی بات یاد رکھنا تم بہتیرا چاہو گی مگر لوگ تمہیں اس طرح نہ بیٹھنے دیں گے۔

آزادی: کس کی مجال ہے جو آنکھ بھر کر میری طرف دیکھے، دیدے نکلوا لوں۔

چھلاوہ: ایک تو خواہ مخواہ مشتاق ہی ہیں جن کو تم خوب اچھی طرح جانتی ہو۔ میرے بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ پہلے دن سے تم پر مرتے ہیں اور اسی غرض سے انھوں نے تمھارے گھر کی مٹھیک میں آنا جانا شروع کیا تھا مگر مولوی مستجاب کی تقدیر و تم کماؤ پوت اوپر لے اڑے اور بے چارہ منھ دیکھتا رہ گیا۔ تمھارے بیاہ سے خانہ مشتاق کے دل پر کچھ ایسا صدمہ ہوا کہ مدتوں وہ جنگل جنگل سیڑی بنا پھرتا تھا۔ پھر ایسا بیمار ہوا کہ کوئی نہیں کہتا تھا کہ جان بر ہوگا۔ تمھارے سیاں کا مرنا سنکر کچھ ایسا مرتو جیا اٹھا۔

آزادی: آپ کیا کہہ رہی ہیں،

چھلاوہ: میں ایک ایک حرف سچ کہہ رہی ہوں، اور یہ وہی شخص ہے جس کیلئے میں بھوپال سے دلی آئی ہوں۔ یہ بات یہ ہے تمھاری بھلائی کی تمھاری توقع میں جیتا ہے۔ انکار کرو تو جانوں تاہم یہ بھی کوئی تعجب نہیں۔ میں تو اسے خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔ یوں محبت کے بھوکے چاہنے والے اور بھی ہیں۔ مہاراجہ شام آں کے پیام بھی تمھارے پاس پہنچے والے ہیں۔ اگرچہ ہوگا انھوں سے بھی رہو سو ہونا نہیں۔ عشق و مذہب کا فرق بھی یہی ہے کہ عشق فانی عیب نہیں۔

آزادی: میرے اللہ دنیا کیا کہے گی۔ دوسرے لفظوں سے لوگوں میں وہ وقعت ہوگی جو اب ہے۔ نہیں نہیں نہیں۔

چھلاوہ: اٹھنے لگتی ہے، اچھا میں تو چلتی ہوں۔ پھر کبھی آؤں گی۔ سدا خوش رہو۔ پھلو پھولو۔ جاتے جاتے اتنا کہہ دوں اگر یوگی کی تمنیاں تم نے تمام و کمال نہیں چکھیں، لیکن جس قدر چکھی ہیں ان سے اندازہ کر سکتی ہو گی کیسی سخت آفت ہے اور اس آفت میں کتنی خدا کی بندیاں مبتلا ہیں۔ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کیلئے دوسری کوئی تدبیر نہیں۔ بس تم نکاح کر کے رہو تم اپنی مصیبت دور کر دو گی بلکہ سیکڑوں، ہزاروں بیواؤں کی مصیبتیں دور کر دو گی۔ ایسی چھوٹی اتنے اشارے کی منتظر بیٹھی ہیں کہ تم جیسی - - - - -

آزادی: مجھ جیسی، مجھ جیسی کیا

چھلاوہ: ہاں تم جیسی خدا ترس، کوئی آگے بڑھے اور سب کے سب اس کے پیچھے ہو لیں۔ تم نے ضرور کتابوں میں پڑھا ہوگا اور وعظ میں سنا ہوگا کہ جو شخص بھولی ہوئی سنت کو یاد دلائے اس کو اپنے عمل کے سوائے روز قیامت تک ان سب عاملوں کا ثواب بھی ملے گا جو اس کی دیکھا دیکھی اس پر عمل کریں۔

آزادی: - مگر سنئے - کہاں کی، ایک بیوہ کی شادی۔

چھلاوہ: - کہہ جانے کی یہ تو ہار تمھاری تقدیر میں لکھا ہو۔ اور اسی غرض سے خدا نے تم کو بیوہ کیا ہو۔ (فجت سے آنکر چلنے لگتی ہے) بہت کرو اور تمھارے پیچھے آنے والی سیکڑوں مصیبت زدہ عورتوں کیلئے راہ نجات کھول دو۔ ہمت کرو۔ ہمت کرو۔

(چھلاوہ چلی جاتی ہے مگر اس کی آواز برابر سنائی دے رہی ہے)

چھلاوہ: (غیر آواز) اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی کوئی دوسری تدبیر نہیں۔ کوئی تدبیر نہیں، کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔

آزادی سنتے ہی فوراً، باقوت اپنا سر
خدا کے تخت سے اٹھنے کی کوشش کرتی
ہے کہ گر پڑتی ہے۔ آزادی کی چیخ کے
ساتھ ہی پردہ فوراً گر پڑتا ہے اور آزادی
کو سہارا دے کر تخت پر بٹھاتا ہے۔
(آزادی کراہنے لگتی ہے - - - -)

آزادی: آہ۔ میرے مالک۔

ماما یہ سب کچھ ہو گیا بی بی۔

آزادی: ابھی جو کچھ ہمارے کانوں نے سنا ہے کیا وہ سچ تھا

تھی کہ گر پڑی۔ اسی کو لمبے میں چوٹ آئی ہے جس میں کمزوری اُٹھتا رہتا ہے۔

ماما:۔ بی بی۔

آزادی: آہ حسنہ۔ یہ بڑا پرانا درد ہے۔ میں کوئی چوتھا برس کی تھی۔ ایک دن کسی ضرورت سے رات کے وقت کوٹھے سے اُترتی تھی کہ اندھیرے میں سیڑھی پر سوئی ہوئی بلی پر پاؤں پڑ گیا۔ وہ زور سے چیخی۔ اور میں اپنی جھونک سنبھال نہ سکی۔ لڑھکتی ہوئی سیدھی نیچے آئی۔

ماما: ہے ہے بی بی۔ میں حکیم صاحب کو بلاتی ہوں۔

آزادی:۔ تم کہیں مت جاؤ حسنہ۔ میرے پاس بیٹھو، ابا جان آئیں گے تو کسی کو بلا لیں گے۔ اُس وقت اس واہمے پر میں اس قدر چوٹ آئی تھی کہ میں بھی بیہوش ہو گئی تھی۔ ابا جان میم ڈاکٹر کو لائے۔ آہ۔ کچھ چھ مہینے علاج چلا اس کا۔ تب میں چلنے پھرنے کے لائق ہوئی۔ آخر میں میم نے کہا تھا کہ ایک اور نشتر دینا ہو گا مگر ابا نے، اماں نے اور میں نے اُس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اب وہی کسر رہ رہ کر ستاتی تھی۔ اب اسی جگہ پر چوٹ لگی ہے۔

ماما: بی بی۔ آپ کی حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی آپ پسینے پسینے ہو رہی ہیں۔

آزادی: اب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ بڑے زور کا درد ہو رہا ہے ــــ از معدہ بیگم خواہ کیسی عورت سہی۔ وہ ٹھیک کہتی ہے۔ بیوہ عورت کی نجات نکاحِ ثانی میں ہے۔ حسنہ میں سوچتی تھی دوسرا نکاح بُری بے جا اور بدمذاقیات ہو گی۔ مجھے لوگ دو خصمی کہیں گے۔ ہزار کی بیبیاں مجھے نظرِ حقارت سے دیکھیں گی۔ طعنے ماریں گی مسکرائیں گی۔ لیکن کہیں۔

(خواجہ آزاد داخل ہوتا ہے)

ماما:۔ (تخت سے اُتر جاتی ہے) بی بی آپ کے ابا جان آئے ہیں۔

خواجہ آزاد: (جلدی جلدی چلتا تخت تک پہنچتا اور آزادی کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے) ۔ بیٹی۔

آزادی:۔ ابا جی۔ گواہ رہیے۔ میری آنکھ کسی غیر محرم پر نہیں پڑتے پائی۔ زبان کو گناہ کی کوئی بات نہیں بولنے دی۔ پاؤں کسی بُرے راستے پر نہیں چلے۔ لیکن میں یہ مرد رکھوں گی کہ میرا دل ــــ آہ۔ ابا جی۔

خواجہ آزاد: میری بچی۔

آزادی: میرا دل نکاحِ ثانی کا حمایتی ہے۔ ابا جی مجھے معاف کر دینا

ماما: ابھی تخت سے گر پڑیں۔ بی بی کو سخت تکلیف ہے سرکار

(خواجہ آزاد اُٹھنے لگتا ہے۔

آزادی: ابا جی نہیں مت جائیے۔ بیوہ ہو کر میں نے بیوگی کی قدر جانی۔ دُنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی اور عذاب نہیں۔ ابا جی، آپ اپنے وعظ میں ہمیشہ قنات سے اُدھر بیٹھنے والی مجبور و بے کس عورتوں کو اور آپ کے حضور بیٹھنے والے مردوں کو سمجھائیے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے نکاحِ ثانی کے لئے نہیں فرمایا "وَانْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ"

خواجہ آزاد: بیٹی اللہ نے فرمایا ہے۔

آزادی: آہ ــــ ابا جی ــــ اللہ

خواجہ آزاد: بیٹی۔ میری بچی۔

(آزادی کراہتی ہوئی خواجہ آزاد کی گود میں سر رکھ کے دم توڑ دیتی ہے اور پس منظر سے نواں کی آواز اُبھرتی ہے۔) (پردہ گرتا ہے) ••

(بقیہ۔ اُردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈرامہ صفحہ ٦٧)

بہت سریلی اور رسیلی آواز میں گاتا تھا۔

اصل یہ ہے کہ منور شد نے اُردو ڈراما کی دنیا میں ایک نئی راہ پیدا کر دی۔ اس سے قبل بواہر خوجے اور میمن حضرات تھیٹر نہیں جاتے تھے لیکن "منور شید" دیکھ کر اسٹیج کے فریفتہ ہو گئے۔ جب کبھی منور شید اسٹیج ہوتا وہ ضرور اُسے دیکھنے کیلئے جاتے اور بالیوالا اور مدن کو جو کمپنی کے ہر دلعزیز اداکار تھے اور عورتوں کے پارٹ کرتے تھے اپنے ہمراہ لے جاتے اُن کو سیر کراتے، اُن کو دعوتیں دیتے اور تحفے تحائف پیش کرتے تھے۔

یہاں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اُردو کے اس اوّلین ڈرامے نے جو مکمل صورت میں ہم تک پہنچا ہے اُردو تھیٹر کی کایا پلٹ دی اور مسلم تماش بین کا اُس کی طرف میلان ہو گیا۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ منور شید اُردو کا بنیادی ڈراما ہے تو غلط نہ ہو گا

(نوائے ادب، بمبئی۔ جنوری ١٩٦٠ء)

ظہیر ناشاد

تیز آہٹ

زندگی محوِ سفر ہے نئے انداز کے ساتھ
ہیں لبِ شوق پہ منزل کے ترانے رقصاں
ہم سفیروں کے قدم اتنے ہم آہنگ نہیں
پھر بھی ان قدموں کی آہٹ جو بہت تیز ہے آج
دُور تک گونج رہی ہے اُسی پیغام کے ساتھ
لوگ سُنتے ہی جسے خواب سے جاگ اُٹھے تھے
قرن ہا قرن کی پستی سے نکل آئے تھے
آج بھی ہم اُسی پیغام کے آئینہ میں
حال و آئندہ کے جلووں کی جھلک پاتے ہیں
آج بھی ہم اُسی پیغام کی کرنیں لے کر
جگمگاتی ہوئی منزل کی طرف جاتے ہیں

اقبال طاہر

غزل

رات گئے روتی ہے شبنم پھولوں کے سرہانے کیوں
دُہراتی ہے بادِ بہاری درد بھرے افسانے کیوں
ہم تو دیوانے ہی ٹھہرے فرزانوں کی بستی سے
لوگ ہمیں سے پیار کا لوہا آتے ہیں منوانے کیوں
رات کبھی کی ہوگئی رخصت، صبح کبھی کی آ پہنچی
شمع کو لیکن اب تک گھیرے بیٹھے ہیں پروانے کیوں
مانا دیر و حرم ہیں یارو شیخ و برہمن کی میراث
لیکن ان کے تصرف میں ہیں بیچارے میخانے کیوں
ویسے سانچ کو آنچ نہیں پر ظاہر یہ دُنیا والے
چھوٹی چھوٹی باتوں کے بھی گھڑتے ہیں افسانے کیوں

منیر احمد
(سائنسی افسانہ)

رمِ جھم

وہ اپنے بہاریں آنچل سے نرمی مئی کا دامن رنگ برنگے پھولوں سے بھرتے ہیں بلکہ فطرت کے حیرت انگیز کارخانے کو حرکت دیتے اور پرزے کارآمد بناتے ہیں۔ تعجب خیز سمعہ لیتے ہیں۔

سرمائی ایک سرد شام تھی۔ بہاروں طرف شفق کے رنگین سائے دراز ہو رہے تھے میں پرلے کے قریب دقت کے اُس رنگین حسن میں کھویا ہوا تھا۔ تنے میں ایک پرندہ اپنے گھونسلہ کی طرف واپس ہوتے ہوئے اُس سیب کی درخت کے قریب دم بھر کے لئے رُکا اور چند گیہوں کے دانے چھوڑ گیا۔ میں اُس پرندہ کی راہ دیکھتا رہا لیکن وہ پرندہ ان دانوں کیلئے پھر کبھی واپس نہ ہوا۔ ہوا چلتی رہی، سرد سرد ہوائیں سنسناتی رہیں اور سورج کی گرمی۔

آخر کار اپریل کے ایک دن، گرم رم جھم بارش نے دھرتی کی پیاس بجھانے کیلئے برس دیئے۔ اطراف و اکناف کے تمام برساتی نالے رواں دواں ہو گئے۔ شام کے دھندلکوں میں میں نے گیہوں کے اُن دانوں پر ایک چڑیا کی نظر ڈالی اور فرطِ شوق سے میں مُسکرا دیا۔ تعجب پڑا۔ کیونکہ رم جھم بارش میں

اُن بیج کے دانوں کے سینوں سے اُبل پڑی تھیں۔ میں حیرتوں کے بحرِ ناپید اکنار میں ڈوب گیا۔ اپریل کے یہ بادل اپنے جلو میں تمام فطرت کیلئے ہمیشہ پیغامِ نمو اور پیغامِ زندگی لئے پھرتے ہیں۔ یہ ہر اُس غنچہ و پودہ پر بھی زندگی کو حرکت دے سکتے ہیں جہاں دوسرے اوقات بہار کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ میں گیہوں کو بنگلے میں لے آیا اور ایک انگیٹھی میں بہایت حفاظت سے انھیں بو دیا۔ یہ مجھے اس بات کی یاد دلاتے رہیں گے کہ کرۂ ارض کے مختلف حصّوں میں ایسے کروروں بیج بہاروں کی اوّلین برساتوں کے ساتھ ہی نئی زندگی، نئی اُمنگیں لئے جوشِ نمو سے بیتاب و بیدار ہو رہے ہیں۔ وہ جلد ہی کومل کومل کونپلیں بن کر اُگیں گے اور دھرتی کو لالہ زار بنائیں گے۔

اس پہلی برسات اور بیج کے اس کرشمے سے مسحور ہو کر دوسرے دن میں نے ایک ماہر نباتات سے سوال کیا۔ "اپریل کی اس اوّلین برسات میں وہ کون سی مخصوص شے پوشیدہ ہے جو فطرت کو ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک سنوار سنوار دیتی ہے؟"

اور جب وہ بات کرنے لگا تو مجھے احساس ہوا کہ میں قوتِ نمو سے متعلق اس شعبے کے بارے میں کس قدر حقیر معلومات رکھتا ہوں۔ دوسری تین بہاروں میں، میں مطالعہ اور غور و خوض میں مشغول رہا۔ اپریل کے منڈلاتے گرم گرم بادلوں تلے کیچڑ مٹی کے سرخ ڈھیروں تک!

برسات ہی سے تو جاپانی سورج کی گرم کرنوں سے سیراب شدہ پانی ہے۔ تقریباً شفاف! ایک مرتبہ جب میں اپنے لڑکے کے ساتھ ایک سایہ دار جگہ کھڑا ہوا تھا۔ برسات میں بھیگنے سے بچنے کے لئے ہمارے قریب ہی پناہ لئے ہوئے ایک ماہرِ فلکیات نے اپنا ہاتھ باہر بارش کی طرف بڑھایا۔ اور جب اُس نے ہاتھ کھینچا تو اُس کی ہتھیلی پر پانی کے شفاف قطرے چمک رہے تھے۔

"میں نے ستاروں کے ذرّات اور خلائی عمل کا مرکب اپنی مٹھی میں پکڑ رکھا ہے" اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ فضا خلا سے آئے ہوئے کروروں چھوٹے چھوٹے ذرّات سے معمور ہے۔ ہر دن تقریباً دو ٹن ذرّات ہماری فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ جب یہ ذرّات بخارات کے بادلوں سے گذرتے ہیں تو ایک خاص ردِ عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ بخارات انھیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، اور نتیجہ پانی کی بوندوں کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہ ننھے ان قطروں کے لئے "دل" کا کام دیتے ہیں۔" وہ مسکرایا اور ہتھیلی پر چمکتے ہوئے قطرات کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "لیکن ہم ان ذرّات کو خود بین کے بغیر نہیں دیکھ سکتے۔"

اور اُس دن سے برسات کے یہ قطرے مُنہ میں لیتے ہی مجھے ایک عجیب سی مسرت سے معمور کر دیتے ہیں جب یہ میری کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکراتے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ قطرے، یہ ذرّات، دھرتی تک میرے قدموں تک ایک خاص پیغام لے کر آئے ہیں کہ

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

اور اِن جہانوں سے پرے اور بھی کئی ستارے اور جہان ہیں۔

اپریل کے دنوں میں زمین پر اترتے ہوئے یہ قطرات چاروں طرف ذروں کا ایک کارواں در کارواں بکھیر دیتے ہیں جو بہت جلد پگھلنے والی کھاد میں بدل کر چوشِ نمو سے بھرپور پیاسوں کے لئے "امرت" بن جاتے ہیں۔ دھرتی میں جذب ہوتے ہوئے پانی کے یہ قطرات بیج کی سطح تک پہنچتے ہیں اور وہیں اپنا مستقر تعمیر کر لیتے ہیں۔ کیونکہ پانی ہمیشہ سطح پر رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ اندر سے پودوں کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ کچھ بیج ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہوا کی نمی کو چوس لینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہی بیج سخت پتھریلی زمین کو بھی سبزہ زار بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

اپریل کی یہ برسات بیج کے چھلکوں کو بھگوتی ہوئی اس کے اندر بھی جا پہنچتی ہے۔ اپریل میں برسات کے شروع ہوتے ہی عام طور سے میں چینی کے ایک بڑے برتن کو برساتی پانی سے بھر لیتا ہوں۔ پھر چنے کے چند بیج اس میں ڈال کر ایک میز پر رکھ دیتا ہوں تاکہ گھر کے تمام لوگ فطرت کے اس عجیب تین گر کو جاگتے دیکھیں جو برسات کی وجہ سے زمین کے اندھیروں میں کارگذار ہوتا ہے۔ میری بیٹی اُس پر مسلسل نظر رکھے رہی۔ پھر اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان دانوں کو پھولتے ہوئے۔ "کھلونے کے غباروں" کی طرح۔ بیج کے اندر یہ پانی "مرد تین" اور "قوتِ نمو" کو حرکت دیتا ہے اور اس طرح کائنات کے اس عجیب کرشمہ کو ظہور میں لے آتا ہے جس سے دھرتی کا سہارا یں حسن برقرار ہے۔

درخت برسات کے پانی کو کئی طریقوں سے جذب کرتے ہیں۔ جی ہاں سب سے جانا پہچانا طریقہ۔ جڑوں ہی کے ذریعے ہے۔ یہی سبب ہے کہ تمام درخت پتوں سے زیادہ جڑیں پیدا کرتے ہیں۔ بیگنیوں کا امرت ایک پودا ایک ہی موسم میں کئی میل لمبی جڑوں کو جنم دیتا ہے۔

میں نے موسن کے ایک پودے کی جڑوں کے قریب سے مٹی کھود کر کالی لوہ وہاں پر ایک شیشہ لگا دیا اور اس طرح اس پودے کی جڑوں کی نشوونما کو دیکھنے، سمجھنے اور غور کرنے کا کامیاب تجربہ کر سکا۔ اپریل کی ہر ایک برسات کے ساتھ ہی پھیلتی پھیلتی ہوئی جڑوں کے مطابق میں شیشہ پر پنسل سے نشانات بناتا گیا۔ ایک ایک انچ جڑ کے بڑھنے کیلئے کئی کئی دن لگے۔

ایک بار جب پانی جڑوں تک پہنچ جاتا ہے تو وہ ایک خاص کشش عمل کی وجہ سے تمام ڈالیوں اور پتوں تک پہنچتا ہے۔ لیکن پانی کے اس اوپر چڑھنے کی ایک اور اہم وجہ بھی ہے۔ اور وہ ہے گرمی۔ ایک ماہر نباتات نے اس عمل کو مجھ پر نہایت دلچسپ انداز سے واضح کیا۔ اُس نے ایک عام گھریلو پودے "گل ہزارہ" کو اکھاڑا، جڑوں سے مٹی صاف کرنے کے بعد انھیں لال سیاہی سے بھری ہوئی ایک بوتل میں رکھ دیا۔ سیاہی دھیرے دھیرے اوپر چڑھتی رہی، بالکل اسی طرح جیسے تھرمامیٹر میں پارہ بڑھتا ہے۔ "لیکن اب نہایت غور سے دیکھو۔" اُس ماہر نباتات نے کہا۔ اور اُس پودے اور سیاہی کی بوتل کو بجلی کے ایک بلب کے قریب لے آیا۔ گرمی کی وجہ سے جیسے جیسے پتوں کی نمو بخارات بن کر اڑتی گئی ویسے ہی ویسے اُس کی جگہ لینے کیلئے ایک لمحہ دو انچ کی سرعت سے لال سیاہی اوپر چڑھتی گئی! یہی وہ عمل ہے جو سوکھ کی وجہ سے تمام نباتات میں جنم لیتا ہے۔

بلند بالا درختوں میں پانی کے اوپر پہنچ جانے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ اپریل میں تمام درخت پتوں کے بغیر ننگ دھڑنگ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس دور میں پانی کے اوپر جانے کا عمل اس قدر تناؤ نہیں ہوتا کہ سوکھ یا اس سے زیادہ اوپر بھی پہنچ سکے۔ لیکن سطح زمین اور بلند درختوں کے تنوں کے درمیان ہوا کے دباؤ کا فرق ہمیشہ توازن جڑوں کے دباؤ سے مل کر اس قدر دباؤ پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی طاقت سے صرف ایک درخت ہی کو نہیں بلکہ ایک بڑے جنگل کو بھی سیراب کیا جا سکتا ہے تنے کے نچلے سرے پر پیدا ہونے والی اس طاقت سے پانی اوپر اور اوپر کھنچتا چلا جاتا ہے۔

جب ایک بار ہری بھری کونپلیں پھوٹ پڑتی ہیں تو برسات کا پانی درختوں میں ایک اور طریقے سے بھی داخل ہوتا ہے۔ یعنے پتوں کے ذریعے۔ پانی کی یہ خاصیت ہے کہ وہ سیال سے سخت تر مادہ کی طرف لپکتا ہے۔ اسی خاصیت کے باعث بارش کا پانی پتوں کے مسامات کے ذریعہ اندرونی سمت سیال کی طرف کھنچا جاتا ہے چونکہ ہوا کے نمک اور کھار اس پانی میں مل چکے ہوتے ہیں، اس لئے یہ پانی پتوں کو مضبوط اور لچک دار بنانے میں بہت بڑا رول ادا کرتا ہے۔ اس تجربہ کو میرے دوست نے یوں کامیابی سے ثابت کر دیا کہ اُس نے ایک پتہ لیا اور اس پر شکر کے دانے ڈال دئے شکر سخت تر شے پتے کی اندرونی نمی کو کھینچنے لگی چند ہی لمحوں بعد پتہ اکڑ سا گیا

(باقی صفحہ ۳۴ پر دیکھئے)

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

اُردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈراما

یہ ڈراما "خورشید" ہے جو ۱۸۷۱ء میں اسٹیج ہوا۔

پیشتر اس کے کہ اس موضوع پر براہِ راست آیا جائے، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ابتدائی خاکہ پیش کر دیا جائے۔ کیونکہ ابتدائے ڈرامہ کے متعلق نہ صرف عوام ہی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ بلکہ ہمارے ادیب مثلاً عبدالعلیم شرر، شوق، بدر الدین، عبدالماجد دریابادی، عبدالسلام ندوی جیسے مشہور مفکر و محقق بھی غلط فہمیوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔ بنظر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابھی تک اردو ڈرامہ کی تاریخ لکھی گئی ہے اور نہ اس کی تحقیق کی طرف توجہ دی گئی۔

اُردو ڈرامہ کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ امانت نے اندر سبھا سے اس کی آبیاری کی، سلطان عالم واجد علیشاہ کے حکم سے یہ لکھی گئی، اُن کے دربار اور اُن کی نگرانی میں اسٹیج ہوئی اور اس کی بنا صرف "اندر سبھا" بتلائی جاتی ہے جو امانت کی [illegible] یہ کہ وہ ہے۔ اگر تاریخ کی روشنی میں اس [illegible] تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نہ تو واجد علیشاہ کے دربار میں امانت کو کوئی حیثیت حاصل تھی اور نہ شاہ عالم نے اُن سے اندر سبھا لکھنے کی فرمائش کی۔ یہ "رہس" نہ کبھی اسٹیج ہوئی اور نہ اس میں سلطان عالم نے پارٹ کیا۔ سلطان واجد علی شاہ کی متعدد تصانیف ہیں لیکن اُن میں سے کسی میں اندر سبھا کا ذکر موجود نہیں ہے۔ ان کے علاوہ دستاویزات، فرامین اور نسخے ہیں، لیکن کسی ایک میں بھی اُن کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ اس کے باوجود کہ واجد علی شاہ اور اُن کے اہلِ دربار یہ نہیں جانتے تھے کہ تھیٹر کیا چیز ہے، پھر بھی لکھنے والوں نے وہ قیاس آرائیاں کی ہیں، اور خیالی قلعے تعمیر کئے ہیں کہ اُن کو منہدم کرتے ہوئے بڑے بڑے صاحبِ طرز انشا پرداز، ادیب اور محقق خوف کھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا عبدالسلام ندوی کو لیجئے جو "شعر الہند" کے مصنف ہیں اور تحقیق کا فنی سلیقہ رکھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں

> "باوجود زمانہ کی نامساعدتی کے اُردو شاعری نے اپنے ابتدائی عہد کے ذوق میں اُن آتشی محکوموں سے کم فائدہ نہیں اٹھایا جو دلی سے میرٹھ تک فارسی پریوں اور ایران کے دیووں سے تشبیہوں اور استعاروں کا کام لیا جاتا رہا اس کے بعد مثنویوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلی مثنوی "سحر البیان" تھی۔ اس میں شہزادی بدر منیر کی رقیب ایک پری دکھائی گئی۔ اس کے بعد "لذتِ عشق" ہے اس میں ایک پری کے عشق سے گرمیِ عشق پیدا کی گئی۔ پھر "گلزارِ نسیم" کا نمبر آتا ہے اس میں اصلی معشوقہ پری ہی ہے۔ اس کے بعد "طلسمِ الفت" ہے، اس میں بھی پری نظر آتی ہے۔" (ص ۱۸۵)

ندوی صاحب لکھتے ہیں:۔

> "یہ پریاں کتابوں کے ورقوں، انجمن بخشوں کے دماغوں میں پھر رہی تھیں کہ واجد علی شاہ کا دور آیا اور شاعری اپنے پورے حدود پر بہت کچھ ترقی کر آئی۔ واجد علی شاہ کو چند انگریز مصاحبوں کے خیال دلانے سے ڈراما کا شوق پیدا ہوا۔ سری کرشن جی کی حاشقانہ زندگی کے پرانے مہندی ناٹک یعنی رہس نے ڈراما کا ایک خاکہ اُن کی نظر میں پیش کر دیا۔ اور خود جانِ عالم "پیا" کے نام سے

"کنیا بن گئے۔ اب وہ قیصر باغ اور اُس کے آس پاس کے باغیچوں اور کنجوں میں عاشق مزاج معشوق بنتے، گوپیاں، پریاں اُن کے شوق میں ماری ماری پھرتیں۔ کبھی وہ دھوبی ساکے جوگی بنتے اور کبھی پریاں اُن کے ذوق میں زلفیں کھول کے اور سر پہ اُبڑوا رکھ کے جنگلوں میں خاک چھانتیں۔" (ص ۱۹۶)

مندوی صاحب مزید لکھتے ہیں۔

"اُسی زمانہ میں ایک نامور شاعر امانت نے اُردو کا پہلا ڈرامہ یعنی اندر سبھا تصنیف کیا۔ اور تصنیف کے ساتھ ہی وہ عام طور پر کھیلا جانے لگا۔ اُن کا (امانت) سب سے بڑا کمال اِس اُردو ڈراما میں یہ تھا کہ فارسی پریوں اور دیووں کو ہندو دیو مالا کے مذاق کے سانچے میں ڈھال دیا۔ اِس مذاق کی اصلی ایجاد کا سہرا خود واجد علی شاہ کے سر ہے جنہوں نے بادشاہ سے کنھیا بن کر گویا ہندو مسلمانوں کو ہم آغوش کر دیا۔ مگر امانت نے اندر سبھا میں اس امر کو نمایاں کر دکھایا کہ اب ہندوستان کی دیو پری بھی شان کے ہیں۔" (ص ۱۰۰)

اِن سطور کے مطالعہ کے بعد ایک مفکر لکھتا ہے کہ "جب تک اس قسم کے لچر، پوچ اور بے معنی بیانات اُردو ادب کی تاریخ میں زندہ رہیں گے اُردو تھیٹر کی صحیح تاریخ مرتب نہیں ہو سکے گی" آیئے اب ہم اپنی توجہ اصل موضوع کی طرف مبذول کریں جس زمانہ میں امانت لکھنؤ میں اندر سبھا لکھ رہے تھے اُسی وقت مشرق کی سب سے بڑی تماشہ گاہ میں اُردو ڈرامے اپنی پوری آن بان کے ساتھ دکھائے جا رہے تھے۔ یہ تماشہ گاہ "بمبئی تھیٹر" کے نام سے موسوم تھی اور "گرانٹ روڈ تھیٹر" بھی کہلاتی تھی۔ یہ "رانی کا تھیٹر" "شاہی تھیٹر" "جگناتھ سنکر سیٹھ کا تھیٹر" "نانا سیٹھ کا تھیٹر" "باوٹا والا تھیٹر" بھی کہلاتی تھیں۔ اِس میں تجربہ کار انگریز جو سو سال سے انگریزی ڈرامے اسٹیج کر رہے تھے اُردو ڈرامے کے محافظ اور ہدایت کار تھے۔ ان ڈراموں کے اعلانات، اشتہارات اور تبصرے اب بھی انگریزی اخبارات میں پڑھے جا سکتے ہیں جو گورنمنٹ آف مہاراشٹر کے محکمہ آرکائیوز میں محفوظ ہیں۔

"بمبئی تھیٹر" میں نہ صرف اُردو ڈراموں کا سلسلہ جاری رہا بلکہ اُس نے روز افزوں ترقی بھی کی۔ ڈاکٹر دھنجی بائی پٹیل اپنی تصنیف "گجراتی اسٹیج کی تاریخ" میں لکھتے ہیں۔

"۱۸۶۱ء میں بمبئی شہر میں اٹھارہ تھیٹر کل کمپنیاں تھیں، اُن میں بیشتر وہ تھیں جو اُردو ڈرامے دکھاتی تھیں۔

ان میں ایک کمپنی "پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی" تھی، جس کے مالک دادا بھائی نوروز جی پٹیل ایم اے تھے، دادی پٹیل نے یہ دیکھ کر کہ رستم و سہراب" مالی حیثیت سے مفید ثابت ہوا ہے، ایدل جی کھوری سے ایک گجراتی ڈراما بنام "سونا۔ نا۔ مول۔ نی۔ خورشید" لکھایا۔ اور سہراب جی فریدون جی مرزبان سے اس کا ترجمہ اُردو میں کرایا۔ یہ ڈرامہ نثر میں تھا اور دادی پٹیل نے اُس کی تیاری پر کافی محنت کی تھی۔ اس کے لئے نئی نئی سین سینریاں اور پوشاکیں تیار کرائی تھیں۔ کمپنی کے دو حسین نوجوان مغنیوں۔ خورشید جی مہروان جی بابیو الا اور لیسٹن جی فرام جی ہیڈ نے کو موسیقی کی تعلیم دلوائی تھی۔

۱۸۷۱ء میں جب یہ ڈراما "وکٹوریہ تھیٹر میں اسٹیج ہوا۔ تو کافی قبول عام حاصل ہوا۔ آج بھی یہ ڈرامہ ہمارا موضوع ہے۔

اس ڈرامے کے متعلق ایک پارسی مورخ مسٹر کھبا تا اپنی تصنیف "میرے پچاس سالہ ناٹکی تجربات" میں لکھتا ہے۔

"اب تک ہندوستان میں انگریزی، مرہٹی، بنگالی اور گجراتی زبانوں میں ناٹک دکھلائے جاتے تھے، وہ صرف پارسی، مرہٹے اور بنگالی دیکھتے تھے مسلمانوں کو ناٹک دیکھنے کا بالکل شوق نہ تھا، اس وقت وکٹوریہ ناٹک منڈلی کا ڈائرکٹر دادا بھائی سوراب جی پٹیل ایم اے تھا۔ اُس نے منتظمین کمپنی کو رائے دی کہ وہ اُردو زبان میں ڈرامے دکھلائیں، لیکن اُنھوں نے یہ سوچ کر کہ پارسی اداکار اُردو زبان کس طرح بولیں گے اِس تجویز کو مسترد کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک بڑا سوال یہ تھا کہ اُردو ڈرامے کون لکھے گا، لیکن دادا بھائی اِس سے بددل نہ ہوئے۔ اور جب وہ کمپنی کے مالک بنے تو اُنھوں نے ایدل جی کھوری سے سونا۔ نا۔ مول۔ نی خورشید" نامی ڈراما لکھوایا۔ جو ایک ہندو ڈرامے "کالا دنتی" سے ماخوذ تھا۔ مسلسل ردّ و بدل اور کمی و بیشی کے بعد جب یہ ڈراما

اسٹیج کے قابل ہوا تو پٹیل کو یہ فکر ہوئی کہ اُس کو اُردو کا جامہ کون پہنائے۔ بعد تلاش بسیار یہ کام بہرام جی فریدوں جی مرزبان کے سپرد ہوا جو اُردو زبان سے کسی قدر واقف تھے۔ مسٹر مرزبان "راست گفتار" کے مالک و مدیر تھے۔ مرزبان نے نہ صرف اس کا ترجمہ کیا بلکہ پلاٹ میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ تاکہ ہندو مرہٹے اور گجراتی اُسے بخوبی سمجھ سکیں۔"

اس کے متعلق بہرام جی فریدوں جی مرزبان بحیثیت مترجم اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"قصہ خوانوں کی جناب میں اپنی طرف سے ظاہر کرتا ہے کہ اوّل اس کھیل کو گجراتی میں تصنیف کیا تھا۔ اس پر سے اس کمترین نے تھوڑی آرائش اور تبدیلی کے ساتھ ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ اس شہر میں ناٹک یا کھیل بازی کا شوق و خواہش روز افزوں پڑتا ہے اور ہر قسم کے سیکڑوں لوگ شوق سے دیکھنے کو جمع ہوتے ہیں۔ یہاں ہر طرح کی قوم بستی ہے۔ مگر جو تماشہ کیا جاتا ہے موقوف پارسی گجراتی زبان میں۔ تو یہ زبان اکثر انگریزوں مسلمانوں و ہندوؤں کو سمجھنا و حل ہونا مشکل ہے اس لئے کئی ایک صاحبوں نے اس امر کی کوشش کی کہ اگر کوئی کھیل ہندوستانی زبان میں لکھا جائے تو یہاں کے باشندے ہر قوم کو موافق آوے کیونکہ ہندی زبان سارے ہند میں مروج ہے۔ یہ مصلحت بندہ کو بھی پسند آئی اور یہ کہ زبان ہندوستانی میں آج تک کوئی کھیل یا ناٹک لکھا گیا دیکھنے میں نہیں آیا بلکہ ہندوستانیوں میں اس کا وجود بھی نہیں ہے۔ تو اس کھیل کو اپنے حوصلہ کے موافق سلیس اور روز مرہ کی ہندی میں کہ پارسی و ہندوؤں کو آسان ہووے اور سمجھ میں آئے ترجمہ کیا ہے کیونکہ سخت فارسی و عربی آمیز عبارت سمجھنا اکثر اُنھوں کو مشکل ہے۔

"پس دانا دل پر واجب ہو کہ ہندوستانی اس کمترین کی زبان نہیں ہے بلکہ قواعد وغیرہ کی خوب تعلیم بھی نہیں ہے مگر بعض دوستوں کی خوشنودی کے لئے اس کمترین نے موافق طاقت اپنی کے زبان ہندی میں اس کے نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تو عبارت ہندی میں اور قواعد میں البتہ خامی اور خطا رہی ہوگی اور سمجھوں کو آسان ہووے ایسی سلیس عبارت لکھنے کے سبب سے عبارت بھی رنگین نہیں ہوئی ہے پس اس خطا معاف کرے۔ اس قصہ سننے اور پڑھنے والوں کی ذات عالی سے اُمید رکھتا ہوں کہ کوئی صاحب عبارت اور قاعدہ کی ناواقفیتی کا عیب گیر نہ ہووے بلکہ اس سے درگزرے"

"اس ناٹک میں اکثر جگہوں اُردو زبان میں مشہور قصوں جیسا کہ زہر عشق، بدر منیر، یوسف و زلیخا اور گل بکاؤلی وغیرہ میں موافق ــــ آئے ہوئے فقرے نکتے و شعر کی آمیزش کی ہے اور اُسکے سوائے تمام غزلوں اور گانے بھی اُستادوں کی کتابوں سے میں نے انتخاب کر لئے ہیں۔

اس دیباچہ کے بعد اصل ترجمہ شروع ہوتا ہے۔ قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ شاہ دہلی فتح شاہ ایک حسینہ خورشید نامی کو سربازار نیلام کرنے کا حکم دیتا اور اُس کی قیمت ایک فٹ لمبا، ایک فٹ چوڑا اور ایک فٹ گہرا سونے سے پُر خانہ مقرر کرتا ہے۔ ایک سوداگر مستی فیروز آتا اور منھ مانگی قیمت دیکر خورشید کو خرید لیتا ہے۔

اس ڈرامہ میں نیلام کنندہ کا پارٹ مہربان جی بالیہ الا ادا کرتا تھا اور فیروز سوداگر کا پارٹ اس کا بیٹا خورشید جی بالیوالا۔ چونکہ باپ اپنی عورت کو اپنے شادی شدہ بیٹے کے حوالے کر دیتا ہے اس لئے ستا شائی بہت چہ می گوئیاں کرتے ہیں۔

اس میں خورشید جی کا پارٹ اگرچہ چاچا نگیر پستن جی کھبا تا کے لئے تجویز ہوا تھا لیکن گانوں کی زیادتی کے باعث خورشید جی بالیوالا کو دیدیا گیا۔ دہلی کے بادشاہ فتح شاہ کا پارٹ ہرمز جی مودی نے کیا۔ ظفر خاں کوتوال کا دنجی بھائی کران والا نے۔ اس وقت کران والا کو بڑی شہرت حاصل تھی کیونکہ میزن کے پارٹ میں اُس نے کافی شہرت حاصل کی تھی۔ غازی خاں کا پارٹ دھنی سوجھوا دفیض آباد کے بادشاہ کا پارٹ کاؤس جی بانے کیا تھا۔

چونکہ دادی پٹیل نے اپنی ساری توجہ اس ڈرامے کی طرف مبذول کرادی تھی اس لئے صرف منتخب اداکاروں کو پارٹ دیئے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس ڈرامہ نے بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔ اداکاروں نے بہت سُتھری اُردو بولی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر خورشید جی بالیوالا اس ڈرامے میں "خورشید کا پارٹ" نہ کرتا تو وہ اتنی جلدی بام عروج پر نہ پہنچ پاتا۔ وہ مکمل و صورت سے شاہزادہ معلوم ہوتا تھا اور گانا بھی

ہمارا پُرخلوص وعدہ ...

آج یوم آزادی کے موقعہ پر ہم عہد کرتے ہیں۔ ریلوں پر بہتر خدمت اور صحیح سلامت سفر کی مزید سہولتوں کا عہد۔ اور تن من دھن سے ہم اس وعدہ کو پورا کریں گے۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔

... یہ ہے ہمارا وعدہ جس کو پورا کرنے کے لئے آپ کی مدد چاہئے

ریلویز تو ہم کی ملکیت ہیں۔ آپ کی اپنی ملکیت۔ جو کچھ ریلویز پر گزرتی ہے وہ آپ ہی پر گزرتی ہے۔ ان کو چلانے میں آپ بھی اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ ہم تو آپ کا تعاون اور خیر سگالی چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ گاڑیوں کے وقت پر چلنے اور صحیح سلامت آرام دہ سفر کے لئے بھی۔ براہِ مہربانی ہم سے تعاون کیجئے تاکہ ہم آپ سے تعاون کریں۔

جاری کردہ: سنٹرل اینڈ ویسٹرن ریلویز

مکتوبِ جاپان

نازش پرتاپگڈھی ——— بیگم وارڈ۔ پرتاپگڈھ (یوپی)

جولائی کا شاعر مل گیا، ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ کے اداریے میں اردو پرستوں کیلئے فکر و عمل کی دعوتیں موجود ہیں، مگر شومئ قسمت معلوم۔ کاش جہانِ اردو کی چند بھاری بھرکم شخصیتوں میں کسی صورت جذبۂ عمل بھی پیدا ہو سکتا۔

زیرِ نظر اداریے نے مجھے ایک خیال دیا ہے جسے میں آپ کے سامنے اور شاعر کے ذریعہ تمام اردو دوستوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ آپ کی پیش کردہ اس حقیقت کو جھٹلانا ممکن نہیں ہے "ہندوستان کے پیارے میں جب تک کوئی ایسا شخص بالقہ نہ ڈالے جو مر مٹنا جانتا ہو، اس وقت تک آزادی نہیں آتے"۔ ساتھ ہی ساتھ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خبر بھی کم اہم نہیں ہے کہ لکھنؤ کے چند گمنام نوجوان اردو کیلئے بھوک ہڑتال تک کر آچکے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہندوستان کے سابق تعلیمی وزیر مولانا آزاد نے حکومت سے اپنی بات منوانے والے جانے پہچانے راہبرانِ قوم نہیں بلکہ کچھ اسی قسم کے گمنام سے لوگ تھے۔ ہندوستان بھر میں زیادہ نہیں صرف ایک گاندھی جیسے بے نام و نشان اردو پرست اگر ایسے پیدا ہو جائیں جو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کی جرأت کر سکیں تو پھر یقین کیجئے طاقت ور ناموں کی امداد و اعانت کے بغیر بھی اردو کو اس کا حق آسانی کے ساتھ مل سکتا ہے۔ لیکن ہے کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگن عشق؟ اس سوال کے جواب میں جہانِ اردو سے خاموشی کے علاوہ کچھ اور توقع فضول ہے۔ پھر۔ یہ نذرانۂ جاں" والی بات شاید کچھ غیر آئینی سی ٹھہرتی ہے۔ اس صورت میں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ بھوک ہڑتال تک جانے والے لکھنؤ کے چند گمنام نوجوانوں کے جذبۂ عمل کو کسی مناسب طریقے سے استعمال کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک طریقہ میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ ان نوجوانوں سے کہا جائے کہ وہ دہلی جا کر جامع مسجد کے سامنے بھوک ہڑتال کریں کیونکہ وہیں پنڈت سندر لال مولانا آزاد اور مغربی حیات اللہ انصاری کی دولت کدوں کے سامنے سیتہ گرہ شروع کر دیں اور اس طرح ان حضرات کو میدانِ عمل میں قدم رکھنے پر مجبور کریں۔ لکھنؤ کے علاوہ دہلی، علیگڈھ، الہ آباد اور بمبئی وغیرہ مقامات پر بھی اردو سے بہبودی رکھنے والے ایسے نوجوانوں کو آسانی کے ساتھ تلاش کیا جا سکتا ہے جو اپنے اپنے یہاں نامور اردو شاعروں اور ادیبوں کے گھروں پر جا کر خوشامد درآمد یا ستیہ گرہ اور بھوک ہڑتال وغیرہ کے ذریعہ انھیں اردو کے لئے ٹھوس عملی قدم اٹھانے پر مجبور کر سکیں۔

بلاشبہ حضرت فراق گورکھپوری، پنڈت سندر لال اور حضرت مولانا وغیرہ ایسے مقتدر حضرات ہیں کہ اگر یہ بھوک ہڑتال شروع کر دیں تو یقیناً آپ کے مربانی حکومتیں لرز نے لگیں۔ مگر کیا دوسری صفوں میں بھی ایسے درجنوں افراد نہیں ہیں جن کا جذبۂ عمل بروئے کار آجائے تو اردو کے لئے بھی کچھ مل سکتا ہے۔ کیا خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، سردار جعفری اور سجاد ظہیر وغیرہ کی جانب سے کیا جانے والا اعلان جہادِ ان حضرات کی عالمگیر شہرتوں کا سہارا لے کر مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو جھک جانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ فیضوں کے جور و ستم کی داستان کیوں دہرائیں، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اردو شعر و ادب کا سہارا لے کر ناکھدا اور کروڑوں کا بینک بیلنس بنانے اور عالمگیر شہرت حاصل کرنے والے درجنوں شاعروں اور ادیبوں میں سے کسی ایک بھی شاعر اور ادیب کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ اپنے ذریعۂ آمدنی و عزت کے تحفظ کیلئے مردانہ وار میدانِ عمل میں آجاتا۔ آج انھیں حضرات کی بدولت میں اردو کو حرفِ غلط کی طرح مٹایا جا رہا ہے اور یہ سب کے سب بیٹھے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ آج اردو کو اس محذوم کی ضرورت نہیں جو تلہ گانہ کے بعد حیدر آباد میں گرم عمل ہو کر آندھرا مظاہرہ کرتے ہوئے پولیس کے لاٹھی چارج سے زخمی ہوئے بلکہ آج اردو کو صرف انھیں گمنام نوجوانوں کی ضرورت ہے جو ؎

ستونِ دار پر رکھے ہوئے سروں کے چراغ
چلے چلیں کہ جہاں تک سیاہ رات چلے

میرے خیال میں شاعر کے ذریعہ ہندوستان بھر کے انھیں گمنام انسانوں کو پکارئے جو بلند و بالا ذاتی شخصیتوں کو ستیہ گرہ اور بھوک ہڑتال کے ذریعہ میدانِ عمل میں لانے کی پرخلوص کوشش کر سکیں اور یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی اگر ان حضرات میں کوئی جنبش پیدا نہ ہو سکے تو پھر اردو کے عوام انھیں

کے خلاف تحریک چلائیں۔ اُن سے مطالبہ کریں، جائے کہ یہ اپنے آپ کو اردو کے شاعر اور ادیب کہلانا چھوڑ کر اپنی لاعلمی کا واضح اعلان کر دیں۔
میں اپنی جانب سے دنیائے اردو کے محفل عوام سے درخواست کر رہا ہوں کہ کسی بھی مشاعرے میں یا ادبی جلسے میں اگر کوئی بھی اداکار یا کم از کم اداکار حیثیت نظر آئے تو ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے مطالبہ کریں کہ یا تو وہ اردو کے تحفظ کے لئے عملی قدم اٹھانے کا عملی وعدہ کرے یا پھر وہ بھی مشاعرے اور مجلسے میں اعلان کر دے کہ اسے اردو اور اس کی زندگی سے کوئی تعلق اور دلچسپی نہیں ہے۔

ظہیر افسر _____ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد

جولائی کے "شاعر" میں آپ نے جو تبدیلیاں کی ہیں قابل تعریف ہیں۔ تصویروں کا اضافہ بھی اچھا ہے۔
اس بار اضافے زیادہ ہیں اور اچھے ہیں۔ نظموں اور غزلوں کا انتخاب بھی خوب ہے۔ اردو میں عورتوں کا ادب مختصر اور نہایت تشنہ ہے۔ اس سلسلے میں توجہ کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ کسی سے اردو میں عورتوں کے ادب پر بھی لکھوائیے۔ گجرات میں اردو "پکار" رکر کر کہہ رہا ہے کہ اس کے پیچھے کتنی سخت محنت کی گئی ہے۔ عزیز قریشی صاحب نے مولانا نیاز کی وفات پر خوب تاثر لکھی ہیں۔

زبیر رضوی _____ ۱۹۵۷ ترکمان گیٹ دہلی ۶

"شاعر" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ عنایت کیلئے شکریہ۔ "شاعر" کی ظاہری صورت میں اس بار جو تبدیلی ہوئی ہے۔ وہ مجھے اچھی لگی۔ یقین ہے کہ آئندہ شماروں میں آپ "شاعر" کو دلچسپ بنانے کی کوشش کریں گے۔ آپ کی اور "شاعر" کی ثابت قدمی ہندستانی رسائل اور مدیران کیلئے مشعلِ راہ بن چکی ہے۔

مظہر امام _____ پروگرام ایگزیکٹو۔ آل انڈیا ریڈیو۔ گوہاٹی (آسام)

آپ سے شکوہ تھا اس لئے گئی ماہ بعد خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں اور وہ بھی اس لئے کہ "شاعر" کے شایانِ شان ایک غزل ہو گئی ہے اور کچھ اشعر مندگی کی تلافی ہو سکی ہے۔
گذشتہ برسوں آپ کی دو نظمیں "تجدید عہدِ الفت" اور "چھ کروڑ لفظے" نظر سے گذریں۔ برصغیر کے عالمی المیہ نے آپ کو جس قدر متاثر کیا ہے، اس شدت کے ساتھ اردو کے کسی شاعر کو نہیں۔ آپ نے موضوع کو اپنے جذبے کی صداقت اور انداز بیان کی تاثر آفرینی سے ندرت بخش دی ہے۔ میں نے دونوں نظموں کا کئی بار مطالعہ کیا اور ہر بار نئے احساس کو نئی تحریک ملی۔
اودے پور کے علاوہ بھی گذشتہ برسوں آپ کہیں نہ کہیں گئے تھے۔ وہاں کی رپورٹ پڑھی تھی اور آپ کا پُر مغز خطبہ بھی۔

اکرام جاوید _____ ٹاؤن انسپکٹر (اوپر سٹاف) نسرین بیگم بازار پوسٹ آفس حیدرآباد ۱۲

"شاعر" کا تازہ شمارہ ترتیب، معیار معیار اور انداز پیشکش ہر لحاظ سے انقلابی قسم کی تبدیلیوں کا آئینہ دار ہے۔ کتابت و طباعت بھی خوبصورت انداز میں ہوئی ہے لکھنے والوں کی تصاویر کا سلسلہ پرچہ کی دلکشی کو اور بڑھا رہا ہے۔ آپ کے "اداریے" اور خطبۂ صدارت کی وجہ سے "شاعر" کا وزن کافی بڑھ گیا ہے۔ اعتماد سبھی اچھے ہیں۔ منیر حسنی کا مضمون بالخصوص خاص پسند آیا۔ بعض حصے میں اکثر نکتیں اور غزلیں قابلِ نظر کی آسودگی کا باعث نہیں۔ "شاعر" کا اس انداز میں پابندی سے نکلنا واقعی معجزے سے کم نہیں۔ !

ظہیر صدیقی ایم اے _____ رحمت منزل۔ پارک لین، پٹنہ ۲

جولائی کا "شاعر" ملا۔ بہتر تخلیقات کو معیاری اور اعلیٰ انسانی قدروں کا حامل پا کر بیحد خوشی ہوا۔ اور "شاعر" سے عقیدت بڑھی۔
"نئے پتے" کے گذشتہ دو تین شمارے اچھے انسانی نقطۂ نظر سے تقریباً خالی رہے۔ حالیہ شمارہ نے اس کمی کی تلافی کر دی ہے۔ آخر وہ جگہ "انسانیت کی پکار" ہے۔

دانگ کا تعلق گیری ذہنیت شوکس کی ان نیت پرستی سے اٹلی ہے۔ یہ معرکہ خیر و شر ازل سے جاری ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ شر کو شادابی حاصل نہیں۔ یہ قوالی کا ایک سیاہ گرداب ہے جو عظیم اور دلکش سورج کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کامیاب نہیں ہوتا اور لمحہ بھر کے لئے روشنی دھندلا پڑ سکتی ہے، بجھ نہیں سکتی۔

"جاں گیت" نیا اور اچھا عنوان ہے۔ اور عنوان سے اچھا ترانہ ہے۔ منظر کاظمی کا اسلوب مجھے پسند ہے۔ "ستم" بظاہر چھوٹی سی نظم ہے لیکن کروروں انسانوں کی حسرت و بیچارگی کا مرثیہ پیش کرتی ہے۔

نصیر پرواز ایم اے ——— عقب نئی کوتوالی بھوپال

تازہ شاعر متوجہ نواز ہوا۔ یہ نئی تبدیلیاں نئے افق سے جھانکتا ہوا نیا سویرا ہے۔ شاعر اس حرمہ میں کہاں سے کہاں پہنچا۔ یہ بات قابل رشک بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ آپ یہ بوجھ کتنے عزم و استقلال اور کتنی ہمت کے ساتھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ بات ہم نوجوانوں کیلئے شمع راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بھرائی تڑپ میں شاعر کی جدوجہد ان کے صفحات میں اضافہ معیار کی بلندی، ایک ارتقا، ایک ترقی پتہ دیتی ہے کہ اعجاز صدیقی اور دوسرے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک فنا کرنے کیلئے تیار ہے۔ بے حس تو ہم میں جو شاعری کرتا ہے اور ادب کی خدمت سمجھتے ہیں۔ یہ بات نہایت ہاتھوں کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں کہ مجھے آپ کی لگن کے سامنے شرمندگی ہوتی ہے اور اس لئے بھی کہ آج تک میں "شاعر" کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ دل چاہتا ہے کہ پوری شدت کے ساتھ آپ کے ہمراہ ہو جاؤں۔

ندا فاضلی ——— ٹرامبے روڈ۔ پیجر اپول، دین کولونی چیمبور بمبئی ۷۱

"شاعر" کا زیر نظر شمارہ اپنی نئی تبدیلیوں اور رنگ و روغ کے ساتھ کافی وزن دار اور معیاری لگا۔ مواد کے انتخاب اور اس کی رنگا رنگی میں حسب معمول آپ کی لگن تک کو شخصیت نمایاں ہے۔ اداریہ کے آخری دو تین جملے آپ کی سان گوئی اور دوست داری کی پہچان کراتے ہیں۔

"مکتوبات" میں پروفیسر لے۔ سی۔ بہار کا خط ایک بحث طلب موضوع کو کریدتا ہوا لگتا ہے۔ ان کی رائے میں غزل ایک لطیف صنف سخن ہے جو حسن و عشق، ہجر و وصال اور رنج و غم کے علاوہ زندگی کے دوسرے گہرے مسائل کے بار کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

دوسرے مسائل سے ان کی کیا مراد ہے؟ غزل کی کینوس شاعر کے ذہن کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ غالب، ذوق، اور مومن ایک ہی عہد کے شاعر ہیں۔ غالب کے ذہن نے غزل کو زندگی کی نئی وسعتوں سے متعارف کرا کے ہی اسے غزل ہی رہنے دیا۔ اس کی آواز میں دیکھی ہر تحریری پیدا ہوئی نہ کہ خود اپنی سوال زبان و بیان سے گہری واقفیت اور صنفی مزاج کی شعوری سوجھ بوجھ کا ہے، نہ کہ بے چاری غزل کے فارم کا۔

غزل میں بات، بات کہنے کے ڈھنگ سے بنتی ہے باتوں کے چناؤ سے نہیں۔ فنکار نہ خانوں میں بٹ کر جیتا ہے نہ موضوعات کو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حسن و عشق، ہجر و وصال اور رنج و غم تک غزل کو محدود کرنے کی بات آج سے دو ڈھائی سو سال پہلے کہی جاتی تو شاید لوگ متوجہ ہوتے مگر آج!!!

——— شاید بہار صاحب کی نظر سے پچھلے پچاس سال سے اچھے شاعروں کی کامیاب غزلیں نہیں گذریں۔

عنوان چشتی ایم اے ——— ریورل انسٹی ٹیوٹ۔ جامعہ ملیہ۔ نئی دہلی ۲۵

برسات شاعر" جولائی کا شمارہ) اور کل سنیچر کی شام کو آپ کا محبت نامہ ملا۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ میری غزل (مطبوعہ اپریل ۶۶ء) کا ایک شعر ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ حضرت میکش اکبر آبادی کے شعری مجموعے "سوز و نغمہ" میں موجود ہے۔

میرا شعر ہے ——— رکھتا ہوں سو معاملے ان سے بغیض دل — اپنی نظر سے بھی انھیں پنہاں کئے ہوئے

میکش صاحب کا شعر ہے ——— رکھتا ہوں سو معاملے تجھ سے بغیض دل — اپنی نظر سے بھی تجھے پنہاں کئے ہوئے

اس ضمن میں عرض ہے کہ میں ذاتی طور پر میکش صاحب کا مداح و معترف ہوں۔ ان کی شخصیت اور شاعری (حرف نغمہ) پر ایک مضمون کی صورت میں اپنے تاثرات کا اظہار ماہنامہ جامعہ کے ذریعہ کر چکا ہوں۔ چونکہ میں نے حرف نغمہ کو اس پر تقدیمی مضمون لکھنے کیلئے تو بہت پڑھا تھا اس لئے ایسا لگتا ہے کہ میکش صاحب

کا یہ شعر ذہن کے کسی گوشے میں رہ گیا اور غالب کی زمین میں فکر شعر کرتے ہوئے فوراً شعور طور پر کاغذ پر آگیا۔ مجھے اس امر کا بے حد افسوس ہے۔ بہر حال میں اس شعر کو اپنی غزل سے خارج کرتا ہوں۔ آپ کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس طرف متوجہ کیا۔ براہ کرم اس سطور کو "شاعر" میں شائع فرما دیجئے تاکہ ایک غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے۔

"شاعر" کا تازہ شمارہ دلکش اور رنگا رنگ ہے۔ فنکاروں کی تصویروں اور ترتیب کی تبدیلی نے اس کے ظاہری حسن میں اضافہ کیا ہے۔

حرمت الاکرام، ناز حسن پر تاگڈھوی، شہاب جعفری اور سید صدیقی حسن کمال کی تخلیقات پسند آئیں۔ پروفیسر آل احمد سرور کا مضمون اور آپ کا خطبۂ صدارت بہت خیال انگیز ہے۔ آپ نے مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے خطبۂ صدارت پڑھ کر اپنا گھر لانے کی روایت کو باقی رکھا یہ بہت معیاری بات ہے۔

موضوع نیساب اکبر آبادی (شخصیت اور کارنامے) سے غافل نہیں ہوں۔

بدیع الزماں خاور ۴۰، اے، فیملی مال - والپولی (رتناگری)

آپ نے شاعر میں جو صوری اور معنوی تبدیلیاں کی ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے شاعر میں ایک نکھار اور اچھوتی کشش پیدا ہو گئی ہے۔ خدا کرے "شاعر" کا یہ نیا رنگ روپ اور نکھرتا رہے۔!!

تازہ شمارے میں آپ کا خطبۂ صدارت "اردو زبان سے متعلق تحقیقی ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔!! اس اشاعت کی تخلیقات میں مجھے ناز حسن پر تاگڈھوی، شہاب جعفری، مناظر عاشق ہرگانوی اور ظفر عمیدی کے منظوم و منثور مضامین خاص طور سے پسند آئے ہیں۔ ان کے سوا دوسری نگارشات بھی کسی نہ کسی پہلو سے دل کو چھونے والی معلوم ہوئیں۔ حیرت اور مسرت کی بات تو یہ ہے کہ شاعر کے کسی شمارے میں بھرتی کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں ہے۔ جس کا گلہ کیا جا سکے۔

دہلی اور کلکتے میں شاعر کے دفتر کی شاخوں کا قیام اطمینان بخش ہے۔ امید ہے کہ اس اقدام سے شاعر کی اشاعت کا کام اور تیزی سے ہوگا۔ اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں قارئین خواہ مدد ملے گی۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی ـــــ شعبۂ اردو۔ سیفیہ ڈگری کالج بھوپال

آپ کا رسالہ شاعر تقریباً پانچ سال سے دجب سے میں یہاں آیا ہوں) کالج میں برابر آرہا ہے۔ مقامی ایجنٹ سے خرید لیا جاتا ہے۔ اس کا معیار بھی برابر جاری ہے۔ جب کبھی دیر سے آتا ہے تو بڑی بے چینی سے اس کا انتظار رہتا ہے۔ ہندستان میں جتنی اردو کے ماہنامے ہیں جو ایک مدت سے باقاعدہ شائع ہو رہے ہیں اور اپنے معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ شاعر ان میں سے ایک ہے جس کا مقصد تجارت نہیں بلکہ علم و ادب کی خدمت ہے۔ چنانچہ اس کا [illegible] ہے۔ مال دزشندہ ہے اور مستقبل تابناک۔ آج جن مشکلات سے اردو زبان و ادب کو گذرنا پڑ رہا ہے اس سے کون واقف نہیں۔ جس پودے کو آغاز سے سینچا درخت بن جانا چاہئے تھا۔ وہ ٹھونٹھ نما شروع ہو گیا ہے۔ اس کی جڑوں میں بے توجہی، تعصب اور نہ جانے کس کس قسم کے کیڑے لگ رہے ہیں جو آہستہ آہستہ اسے کھوکھلا کر رہے ہیں۔ یہ دکھ کا ذکر کیا اپنوں کے ستم کیا کم ہیں۔ آج نعرے بازی اور صرف تقریروں سے کام نہیں بنے گا خلوص کے ساتھ اس کے لئے کوشش اور قربانی کی ضرورت ہے۔ لوگ اردو کے ذریعہ روٹی تو بن جاتے ہیں لیکن اس آڑے وقت میں رہنمائی نہیں کرتے ہیں اسلئے کہ رہنما کیلئے آگہی چاہئے۔

آپ کے رسالے کا اداریہ خوب ہوتا ہے۔ "نادسائی سی نارسائی" ہے۔ کے عنوان سے آپ نے نارسائی اور بے بسی کے ساتھ حقائق کو نمایاں کیا ہے۔ یہ بجا فرمایا ہے کہ اردو کی تحریک کمزور ہے۔ حیات اللہ انصاری، پنڈت سندر لال، آل احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی، اور فراق گورکھپوری جیسے اساطین کے علاوہ اور بھی بہت سارے لوگ ہیں جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اردو کی جنبش لب سے بہت کا گمان صحیح ہو سکتی ہیں۔ شاید اسی لیے لوگ تھوڑی توجہ اس طرف بھی کریں وہ جنہیں اردو سے لگاؤ ہے اور جو اس کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ اور اپنی زندگی کو سنوارنا سکھایا کیا ان پر اس کا کوئی حق نہیں۔

ہمیں اس حقیقت سے بھی غافل نہ رہنا چاہئے کہ اردو کے سالانہ جلسے تو بھی بند کے بعض حصوں میں برابر ہو رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ اردو گھرانوں میں اب اردو کا چلن کم ہوتا جا رہا ہے جس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ اکثر والدین بچوں کو اردو پڑھانے سے گریز کرتے ہیں۔ میں نام کی لگاؤں خود اردو کے بہت سارے ادیب، رہنما، اساتذہ اپنا جائزہ لیں۔ آخر گھر اجڑ اور اردو پڑھنے سے جھجکیا ہٹ کیوں؟ اور عجب ایسے لوگ جن کی معاش کا تعلق اردو سے ہے

چیز ہے تو اس میں تو دوسروں سے شکایت کس طرح کی جائے؟ اردو کے طلبہ کی کمی کی وجہ یہ بھی ہے کہ بعض ریاستوں میں اردو اسکول نہیں ہیں۔ مثلاً مدھیہ پردیش میں بہت کم ہے وہاں تو اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول بہت کافی تعداد میں ہیں اسی ملک کے کچھ اور بھی حصے ہیں جہاں اسکولوں میں اردو ذریعۂ تعلیم ہے بہار میں بھی بہت سے اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ لیکن ایسی جگہیں کتنی ہیں، ملک کے کتنے فیصد حصے میں جہاں طلبہ اردو پڑھنا چاہتے ہوں کوئی اسکول ایسا نہیں ہے جہاں ان کی اس خواہش کو پورا کیا جا سکے۔ خود بھوپال کو لیجئے۔ یہ سرزمین اردو کیلئے بہت زرخیز رہی ہے۔ یہاں ادیبوں خصوصاً شاعروں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ یہاں ہر جگہ اردو تہذیب کا جلوہ گری بھی نظر آتی ہے۔ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا سب کچھ مسلم اردو کا طبوں میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں، خود میرے سینئر کالج میں گزشتہ سال بی اے میں تقریباً ساڑھے تین سو اردو کے طلبہ تھے، میرا جہاں تک خیال ہے کہ ہندوستان کے شاید ہی کسی کالج میں اردو کے طلبہ کی اس قدر تعداد ہو۔ یہ خیر کی بات ضرور ہے۔ لیکن اس سے زیادہ تحریر میں ڈالنے والی بات یہ ہے کہ اس شہر میں ایک بھی ایسا اسکول نہیں ہے جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہو۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ روز بروز اردو کا دائرہ اور اردو کا زور کم ہوتا جا رہا ہے۔ ایک وقت یہ بھی ہے کہ جیسے جیسے اردو کی جڑیں کمزور ہوتی جا رہی ہیں، اسکولوں کی اردو کتابوں میں غلطیاں بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہو رہا ہے کہ اگر خلوص کے ساتھ اردو ذریعۂ تعلیم کے لئے کوشش کی جائے تو نصاب کی کتابوں کی غلطیاں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ کالجوں میں اکثر اسی قسم کی دقتیں پیش آتی ہیں۔ اس قسم کی دشواریوں کی طرف ہم توجہ نہیں کر رہے ہیں اور اس کے نتائج سے بے خبر ہیں۔ ضرورت ہے کہ بڑے ادارے اس طرف توجہ دیں۔ انجمن ترقی اردو پر خاص طور سے اس کی ذمہ داری ہے۔ اسے چاہئے کہ نصاب کی کتابوں کی دستیابی میں زیادہ سے زیادہ مدد کرے بلکہ جائز طریقے سے بھی بڑا کام ہو رہا ہے۔ اس نے اردو کی بقاء کے لئے بہت اہم فریضہ انجام دیئے ہیں۔ اس کی اکثر کوششوں سے اسکولوں کے طلبہ کیلئے مختلف مضامین کی کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے جو کچھ کام کیا ہے وہ ظاہر و محسوس ہے۔ اس کی خدمات کا کون منکر ہو سکتا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں اگر کسی ادارے نے اردو کی اشاعت میں سب سے زیادہ کام کیا ہے تو وہ انجمن ترقی اردو ہی ہے۔

شاعر کے کرشن چندر نمبر کا اعلان سن رہا ہوں اور خوش ہو رہا ہوں کہ ایک اچھا نمبر مطالعہ کے لئے ملے گا۔ ظاہر ہے کہ شاعر اپنے بلند معیار کو اس نمبر کی اشاعت میں برقرار رکھے گا۔ اس نمبر کے علاوہ بھی کئی نمبروں کے لئے اعلان کیا گیا ہے۔ خدا آپ کو ہر نمبر کے نکالنے میں آسانیاں پیدا کرے اور کامیاب کرے لیکن میری دلی خواہش ہے کہ آپ ایک شاعر نمبر نکالیں جس میں "شاعر" میں شائع شدہ تمام تحریروں کے اشاریے ہوں۔ یہ کام تحقیق کرنے والوں کے لئے بیحد مفید ہوگا۔ امید ہے کہ آپ خیر و عافیت ہوں گے۔ بھوپال سے متعلق تاثرات کیلئے کچھ وقت مزید نکالیں۔

محسن زیدی ایم اے ——— دہلی

جولائی کے شمارے سے آپ نے جو "ہیئتی تبدیلیاں" شاعر میں کی ہیں وہ نہایت معاون نظر ہیں۔ آپ بڑے سلیقے سے لکھ رہے ہیں۔ ان حالات میں ایسی باتیں لکھنا معمولی عزم و ہمت کے آدمی کا کام نہیں۔ یہ تو اہل عشق و اہل جنوں کا کام ہے۔

رازنتوکھ سری ایم اے ——— معاون رسالہ پگڈنڈی ہال بازار امرتسر

ماہنامہ "شاعر" کے ذریعہ آپ اردو زبان و ادب اور صحافت کی جو گراں بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سے آپ نہ صرف معاصرین کو متاثر کرتے ہیں بلکہ مستقبل کا ادبی مورخ بھی آپ کی ان خدمات کو صدیوں تک خراج تحسین پیش کرے گا۔ فی الحقیقت "شاعر" اردو صحافت کے ادب میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ وقیع اور خصوصی شمارے شائع کرنا بھی "شاعر" کی ایک روایت ہے۔ دور حاضر کے شہرۂ آفاق اردو ادیب جناب کرشن چندر کے کارناموں پر مشتمل "شاعر" کا خصوصی شمارہ نکالنے کا خیال بہت مبارک ہے۔ ایک محقق اس خصوصی شمارے کے لئے اس مکتوبات کے ہمراہ ارسال کر رہا ہوں۔ جس میں اس عظیم FICTION WRITER کے ایک بیحد اہم ناول "غدار" پر تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

منظر کاظمی ——— ۴۸ اے بلاک۔ دھتکی ولیہ۔ جمشید پور ۱

آپ نے اردو کے سلسلہ میں بڑا اہم سوال اٹھایا ہے۔ بہار میں معصوم شرقی نے تھوک ہڑتال کی۔ لیکن کیا ہوا؟ یہ ہڑتال وزیر اعلیٰ کی کوٹھی کے سامنے ہوئی مگر افسوس یہ بھی نہ ہو سکا کہ آتے جاتے وقت معصوم شرقی سے اتنا ہی پوچھ لیتے کہ آخر تم یہاں کیوں پڑے ہو۔ کیا ہوا ہے تم کو؟ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر یہی ہڑتال

کسی حکیم فخرالدین احمد یا کسی خانقاہی عبدالرزاق وغیرہ کا اختر اور نیازی نے کی ہوتی تو شاید وہ زیادہ سے زیادہ اپنا سر پیٹ لیتے۔ ایک اختر اور نیازی کا چہرہ بھی پیلا پڑ جاتے تو عجب نہیں۔ اردو والے اپنی جان پر کھیل جانے کو اگر اتنی بات تو ضرور سمجھتے ہیں۔ پنڈت سندر لال کو اردو کے مسئلے میں روتے ہوئے بھی میں نے دیکھا ہے۔ لیکن اس کا حاصل؟ عملی طور پر اردو کیلئے کسی نے کیا کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اس کا حساب کرنے کا وقت آگیا ہے، ساتھ ہی لوگوں کو اپنی پوزیشن بھی صاف کرنی ہوگی۔ میں اپنے اس خط کے ذریعہ اعلان کرتا ہوں کہ "فراق گورکھپوری، مگن لال آناد، پنڈت سندر لال، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ملوینت سنگھ، مہندر ناتھ اور اپندر ناتھ اشک" اور وہ بڑے لوگ جن کے بارے میں ابھی تو میں کچھ جاننا نہیں چاہتا ان کا نام اس وقت ذہن میں نہیں ہے، سے نہایت ادب و احترام کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ اردو کے سلسلے میں وہ کیا کر سکتے ہیں؟ ۔ اگر ضرورت پڑی تو ٹھوک بجا کر تل کر سکتے ہیں؟ اور اگر ضرورت پڑی تو اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں؟ اور اگر ضرورت پڑی تو اپنی جان دے سکتے ہیں؟ دیکھئے یاد آتا ہے کہ پنڈت سندر لال نے بہار اردو کانفرنس کے موقع پر ڈیلیگیٹ کنسشن میں یہ نعرہ لگایا تھا کہ اردو کے لئے اگر گولی چلائی جائے تو پہلی گولی کو پنڈت سندر لال کے سینے سے پار ہونا پڑے گا۔ سرداد صبغی، سامراد صابونی، جمیل مظہری، احمد ندیم قاسمی، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، امتیاز حسین، ممتاز حسین، ممتاز پالیگن، خلیل الرحمن اعظمی اور اختر الایمان وغیرہم کا معاملہ ابھی رہنے دیجئے۔ ہے ہمتوں بعضے اس بات کا بھی ہو جائے گا اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔

شاعر "اس بار ایک نیا رنگ لے کر آیا ہے اور یہ آپ ہی کا جگر ہے کہ آپ مزید کچھ نئے رنگوں کی بشارت دیتے ہیں۔ خدا کرے اس رنگ میں جنگ نہ چلنے پائے۔ ہم سب لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔ ظفر عدیمی کی آواز روز بروز نرم دار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ان کی نظم "میر" کے آخری بند کو پڑھتے وقت ایسا لگا جیسے نہایت خفگی کا اظہار کرنے میں کبھی کوئی کہانی میں نے پڑھی ہو۔ کار خانے کے جاں سوز ہنگاموں سے تھکا ہارا گھر واپس آیا اور شاعر پڑھنے بیٹھا تو بقول حفیظ جالندھری "واقعی عدیمی ہو گئی"۔ یعنی "مفت کے مشورے" نے یہاں بھی پیچھا چھوڑا۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ محترم سرور نے بڑے پیارے انداز میں یہ چیز لکھی ہے۔ طنز ہے لیکن اتنا ہلکا کہ کوئی زخم نہیں لگتا۔ اخلاقی تنقید کا یہ معیار بڑا اعلیٰ ہے کہ سننے والا غصہ اور جھنجھلاہٹ اور جھینپ جانے کے بغیر کسی کو خبر کئے اپنی اصلاح بھی کر لے۔ ان سے میرا گذارش ہے کہ وہ اپنی تخلیقات سے شاعر کو برابر نوازا کریں۔ (اقبال صدیقی دعا کرے ایک سال سپیشل میرا بھی لکھا گیا ہو) ہمارے ان سامعین میں ہیں جو افسانہ گھسیٹ لینا ہی سب کچھ نہیں سمجھتے بلکہ ادبی تخلیق میں خونِ جگر کی شمولیت پر ایمان رکھتے ہیں، ان کا افسانہ "آخری دھماکہ" اس بات کا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر گیان چند ——— پروفیسر جموں و کشمیر یونیورسٹی، جموں

جون کے شمارے میں میری تقریر سے متعلق شمیم احمد صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ مجھے اس کے ضمن ایک اعتراض کے بارے میں عرض کرنا ہے کہ میں نے علیم الدین کی "موہوم تخلیقی شکوفائی" کا نام لیا تو صفحہ ہو کی قابل قدر تخلیقات میں ان کا ذکر کیوں کیا۔

ہوا یوں کہ ریڈیو سے مجھے تقریر کرنے کی پیش کش ہوئی تو اس میں انگریزی میں عنوان "۱۹۶۵ء کی قابل ذکر شعری تخلیقات" دیئے گئے۔ جب میں تقریر لکھنے بیٹھا تو عنوان میں قابل ذکر کی جگہ قابل قدر کا لفظ پایا۔ چنانچہ میں نے شاعر میں اپنی تقریر ترمیم شدہ عنوان کے ساتھ بھیج دی۔ میرے نزدیک "مہم الکلیں" قابل قدر نہیں لیکن قابل ذکر ضرور ہے۔

محمد عظیم فیروز آبادی ——— نادر بخش اینڈ کو فیروز آباد (ضلع آگرہ)

آپ کو معلوم ہے کہ رسائل کو خطوط لکھنا میری عادت نہیں، لیکن بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں جنہیں پڑھ کر خاموش رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جولائی ۱۹۶۷ء کے شمارے میں ضیا جعفری صاحب کا ایک ایسا ہی قسم کا مضمون شائع ہوا ہے۔ (دنیائے فحاشہ کی کہکشاں چند یادیں) اس میں آپ لکھتے ہیں کہ ان کے کسی دوست نے نیاز کی توسیع اشاعت کیلئے کوشش کی تھی اور اس کیلئے دس نئے خریدار بھی فراہم کر دیئے تھے، لیکن نیاز صاحب اس سے خوش ہونے کی بجائے کبیدہ خاطر ہوئے۔ ظاہر ہے یہ بالکل خلافِ عقل واقعہ ہے۔ اور نیاز ایسے صاحب ہوش و کوشش مدیر سے کبھی اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ نیاز صاحب بڑے ہوشمند تھے اور نفع نقصان پر ہمیشہ ان کی نظر رہتی تھی۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے نگار کی توسیع اشاعت کی ہر کوشش کو نیاز صاحب بہ نظر استحسان دیکھتے

(بقیہ صفحہ ۸۰ پر دیکھئے)

نقد و تبصرہ

تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

ایک خواب اور

از ——— سردار جعفری

"ایک خواب اور" کو ہندو روس دوستی کے انعام سے زیادہ ادبی حلقوں کی پسندیدگی کا انعام بھی مل گیا۔ لیکن اردو نظم کا یہ اہم مجموعہ اس وقت تک تبصرے کیلئے فرصت یک نگاہ کا منتظر رہا۔ اور اب جبکہ اسے نقد و تبصرہ کے لئے اٹھایا تو منظر اس کی پہلی ہی نظم "ایک خواب اور" پر جم کر رہ گئی۔

دیدۂ حیراں کھلے تو پھر تے ہیں سوال
اور محرم کی طرح اشک سے گریزاں ہے جواب

سردار جعفری کی یہ نظم نئی نہیں ہے۔ غالباً ان کے آخری مجموعۂ نظم "پتھر کی دیوار" کے بعد کی ہے لیکن آج بھی پوری نظم اور اس کا یہ شعر ایک زندہ حقیقت بنا ہوا ہے۔ آج تو پہلے سے بھی زیادہ سوالات ہمارے سامنے ہیں ——

"اور محرم کی طرح اشک سے گریزاں ہے جواب"

کسی کی سمجھ میں کچھ آ ہی نہیں رہا ہے، انسان کی رگ رگ سے لہو رسنے لگا ہے، حال یہ ہے کہ

آستینوں کو پکارے ہے کہاں تک آنسو
اب تو دامن کو بھی لپٹے ہیں لہو کے دھبے

اس خونیں اضطراب اور روحانی کرب کو جس میں پوری دنیا عموماً اور ہندوستان خصوصاً مبتلا ہے، ہر شخص اپنی اپنی بساط شدت سے محسوس کر رہا ہے، لیکن ——

"کس سے ممکن ہے تمناؤں کی زخمہ کاری"

پھر بھی اپنے دور کا سرکش فنکار جو "شکستِ خواب" کا قائل نہیں، اپنے لہولہان ہاتھوں میں امید و ارتقاء کا پرچم تھامے ہوئے اپنے جذبۂ بیتاب کی عالم پر کمند پھینکنا چاہتا ہے، اور کہتا ہے ؎

"ایک خواب اور بھی اے ہمتِ دشوار پسند"

اسی ہمتِ دشوار پسند نے اردو ادب میں روایت شکنی کی بنیاد ڈالی۔ ہمارے شعراء کے سماجی شعور کو ابھارا۔ حیات و کائنات میں پھیلے ہوئے سماجی رشتوں کو سمجھنے کا تجسس پیدا کیا۔ انسانی ارتقاء کا تاریخی اور سیاسی جائزہ لینے پر مجبور کیا۔ فنا اور بقا کے مادی تصور کو حقیقی انداز میں دیکھنے کی خواہش پیدا کی۔ وہ شعری کیفیات جو صرف استظاظ روح کے لئے تھیں، یا جن کا تعلق صرف داخلیت سے تھا، ان کا رشتہ خارجی زندگی اور اس کی حیات سے جوڑا۔ اقبال، سیماب اور جوش سے پہلے اردو نظم کا جو رنگ و آہنگ اور مزاج و مواد تھا، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تین عظیم نظم نگار شعوری طور پر اردو نظم میں ایک انقلاب لائے جس نے اس کی کایا پلٹ دی۔ ان کے بعد کی آنے والی نسل دنیا میں رونما ہونے والے سیاسی، سماجی اور معاشی انقلاب سے اور بھی زیادہ متاثر ہوئی۔ علم کی وسعتوں اور احساس کی شدتوں نے ادبی حیات کی تعبیر و تفسیر کو پہلے سے کہیں زیادہ معروضی بنا دیا۔ جبر و ظلم کی دیواریں بہت اونچی ہو چکی تھیں۔ اردو شاعری کو رومان سے انقلاب کی طرف آنا ہی چاہیئے تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ اردو شاعری پر زبردست الزام ہوتا۔ اردو نظم نگاری کو اس الزام سے بچانے والے شعراء میں سردار جعفری کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔

تبصرہ نگار ترقی پسند شاعری کے متعلق کچھ جانتا ہے یا نہیں، اس سے قطع نظر یہاں اس کا ذکر ایک پیش پا افتادہ بات سے زیادہ

نہ چکا اس کی کیا تاریخ و تعریف ہے اس کا میں منکر کیا ہے' اس پر گفتگو کرنا تضیعِ وقت سے زیادہ نہیں۔ یہ تو ایک ایسی کہانی ہے جو برسوں سے دہرائی جا رہی ہے اور سب کو یاد ہو چکی ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جہت لینڈ کبھی اور کسی دور میں قابلِ اعتنا نہیں سمجھے گئے اور اب تو رجعت و ترقی کی اصطلاحیں بے معنی سی ہو چکی ہیں۔ ان دونوں خانوں میں ایک تیسرا خانہ فٹ ہو گیا ہے اور وہ ہے "انسان پسندی"۔ فاشزم' شہنشاہیت' جمہوریت' اشتراکیت اور تمام دوسری سیاسی اصطلاحیں بیکار و بے سود سمجھی جانے لگی ہیں۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد سے بے یقینی کو یقین میں' نفرت کو محبت میں' ظلم کو انصاف میں' شر کو خیر میں' جمود اور افلاس کو خوشحالی اور جنگ کو امن میں بدلنے کا ایک عالمی احساس جاگا۔ ظاہر ہے اُن پرانی اصطلاحوں سے کون چمٹا رہ سکتا تھا۔ سیاسی کھاڑے بازی نہ قوموں اور ملکوں کے کام آ سکتی ہے اور نہ ادب کے۔ ایک وقت تھا کہ جب سیاسی نظریات شدت کے ساتھ شاعری میں گھس آئے تھے۔ مگر اب ہر چند برس سے انسانی محبت کے اٹوٹ رشتوں اور عزم و یقین کی مستحکم بنیادوں کو لعبِ البین بنا لیا گیا ہے۔ آج کا بڑا کام روٹھی ہوئی فطرت کو منانا' اس کے حسن کو برقرار رکھنا۔ سائنس کے غلط اقدامات کو روکنا اور مسکتی دم توڑتی ہوئی انسانیت کو سہارا دینا ہے۔

"ایک خواب اور" کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے — سردار جعفری نے اپنی نئی شاعرانہ منزل کو کس خلوص اور اعتماد سے متعین کیا ہے اور کیسی نمایاں تبدیلیاں وہ اپنے یہاں لائے ہیں۔ اس مجموعہ میں گزشتہ دس سال کی کہی ہوئی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں اور ان میں سے کئی اعلیٰ پایہ کی ہیں۔ "ہاتھوں کا ترانہ" میں انھوں نے ہاتھوں کی عظمت و طاقت کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

اعجاز ہے ان ہاتھوں کا' یہ سیم کو چھو لیں تو آنچل ہے
پتھر کو چھو لیں تو مورت' کاغذ کو چھو لیں تو کاجل ہے
مٹی کو چھو لیں تو سونا ہے' چاندی کو چھو لیں تو پائل ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
تاریخ کے اور مشینوں کے پہیوں کی روانی ان سے ہے
دنیا کا فسانہ ان سے ہے' انسان کی کہانی ان سے ہے
تہذیب کی اور تمدن کی ہر بوقلمونی ان سے ہے'
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

"انسانی کاوشوں پر بھرپور اعتماد" ان کی نظم "سرخ سویرے" سے عیاں ہے۔ "زندگی" بھی ایک اچھی نظم ہے' جس میں نہ صرف رندانی ہے بلکہ فکر و فن نے اس میں بڑا حسن پیدا کر دیا ہے: "فقرِ طلب' استغنا و قلندرانہ جذبِ حقیقت۔ جامِ محبت۔ لمحوں کے چراغ۔ میرا سفر' ایک بات۔ دو چراغ۔ اہلِ دول' تخلیق کا کرب' سلام۔ میرے خواب۔ ایک پگلی' شعلۂ شبنم۔ آرزو کے صنم خانے۔ تم نہیں آئے تھے جب مہکے ہوئے قریب ہو تم۔ سناٹا' خنجروں کی روشنی جب صبا آئے گی۔ قتیل آفتاب۔ برہنہ پا ہے بہار اور صندل و گلاب کی ماکہ' اس مجموعے کی بہترین نظمیں ہیں۔

شعر کو الہام و تفاعل مانا جائے یا اسے شعوری فکر سے تعبیر کیا جائے' دونوں میں بصیرت کو دخل ہے۔ بصیرت جتنی گہری ہوگی' شاعری اتنی ہی اچھی ہوگی۔ ۱۹۳۵ء کے بعد جو نظم نگار شعرا اردو زبان نے پیدا کئے' ان میں سے بہت سوں نے اردو شاعری میں اسلوبی اجتہاد کیا۔ ہیئت کے تجربے کئے لیکن ان میں غیر معمولی فکری بصیرت نہ تھی۔ آج اس صف کے ممتاز نظم نگار شعرا جو جوش کے در پے کے لیکن آگے بڑھے تھے' جن کی شاعری کی بنیاد محض "اشتراکیت" تھی' جنہیں رومان سے انقلاب تک "جذبہ" نہیں لایا تھا بلکہ ان کی شاعری مطالعہ اور تقلید کی پیداوار تھی۔ انہیں مادی اور روحانی کرب کا صحیح عرفان نہ تھا' وہ سیاسی اور اقتصادی تبدیلیوں کو سمجھ تو رہے تھے' لیکن ان کا ذہنی اُفق روشن نہ تھا۔ انہیں شاعروں کی داد زیادہ پسند تھی' ان میں سے کتنے ہی چند گام چلے اور تھک کر رہ گئے۔ آخر آخر جو دو ہی نام تھے جو حرفِ غلط بنے' ایک فیض احمد فیض کا اور دوسرا سردار جعفری کا۔

اوّل الذکر کی شاعری پہلے شاخِ گل اور زلف و رخسار کی خوبی اور کھیلی۔ اس کے بعد مستقلاً زنداں اور خون' صلیب اور دار کی علامتوں میں محصور ہو گئی۔

"رومان اور عنبر" سے سردار جعفری کا تخلیقی سفر شروع ہوا' جو نہ جو لے کے برابر رہا ہے۔ اگر کچھ تھا بھی تو اس رومانی انقلاب پسندی پر بہت جلد اصغری حقیقت پسندی غالب آ گئی۔ مگر اس کے ساتھ ایک لطیف جمالیاتی شعور کارفرما رہا' جو آج تک باقی ہے بڑا آرٹ بغیر جمالیاتی شعور کے پیدا نہیں ہوتا۔ یہی شعور اسلوب کو وقار' فکر کو پاکیزگی' لہجہ کو خوبصورتی اور تاثر کو بے پناہ بناتا ہے۔ یہی الفاظ کے دروبست اور تراکیب کو حسن عطا کرتا ہے۔ اسی سے شعر میں گداز

پیدا ہوتا ہے۔ سردار جعفری کے یہاں اُن کے ہلکے جمالیاتی شعور نے اِن تمام خوبیوں کو محسوس بنا دیا ہے۔

سردار جعفری کے کلام کے پچھلے مجموعوں "خون کی لکیر" اور "پتھر کی دیوار" کی بعض نظموں میں سیاسی تبدیلیوں، مادّی اور روحانی کرب، بدلتی ہوئی تمدنی و اخلاقی قدروں، جہل و رجعت، انسانیت کے عالمگیر رشتوں، انقلاب اور تعمیر، استعماری طاقتوں کی کشمکش کے احساس کو ایک اعلیٰ پیرایۂ اظہار ضرور ملا ہے۔ لیکن "ایک خواب اور" کی نظموں میں یہ رنگ کچھ اور ہی ہے۔ اس مجموعے میں اُن کا جمالیاتی شعور زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ اس میں تشبیہ اور استعاروں کے نازک محل بوقلمونی کی مرصع کاری، الفاظ اور آہنگ کی جادوگری بہت نمایاں ہے۔ "ایک خواب اور" کی نظموں میں پہلے مجموعوں کی سی محدودیت نہیں، ان میں جوش و ولولہ بہت تیز اور تصورِ حیات بیحد جاندار ہے۔ پہلی جیسی ہنگامی اور اضطراری کیفیت بھی نہیں ہے۔ شاعر کے تجربات و مشاہدات کی پختگی اور اُس کے فکری ذہنی اُفق کی وسعتوں کا صاف پتہ چلتا ہے۔ پختہ کاری و پختہ مشقی، شعور کی بلندی اور نظر کی گیرائی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر اس مجموعے میں "مرے عزیز دیرے رفیقو" اور "نذرِ عقیدت" دو نظمیں نہ ہوتیں تو پچھلے سردار جعفری کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔

سردار جعفری نے ہمیشہ غزل گوئی سے گریز کیا لیکن "ایک خواب اور" میں متعدد غزلیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ ان میں اسلوب کی انفرادیت کے ساتھ شادابی اور شگفتگی ہے۔ رمز و کنایہ کی بھی کمی نہیں، ان میں ایسے خوبصورت اشعار بھی ہیں۔

شکایتیں بھی بہت ہیں حکایتیں بھی بہت
مزا تو جب ہو کہ یاروں کے رُوبرو کہیے

جہاں جہاں بھی خزاں ہے وہیں وہیں ہے بہار
چمن چمن یہی افسانۂ نمو کہیے

لیکن ان غزلوں میں اُس فکر اور حسنِ بے کی کمی ہے جس سے غزل، غزل ہوتی ہے۔

بڑھنے دو دوریٔ اور ابھی وسعتِ شب کو
بڑھ جائے گی دو چار شکن زلفِ بتاں اور

آخر دو تیں کس کو کس کو، کون یہاں برباد نہیں ہے
کم ہو کیوں ابروئے قاتل کی کمانوں کا کھنچاؤ
جب سر پر ہر ستم "آپ" شکار آتے ہیں

حُسن کے جلوے عام ہیں لیکن ذوقِ نظارہ عام نہیں
عشق بہت مشکل ہے لیکن، عشق کے دعویدار بہت

پہلے تین شعروں میں خط کشیدہ ٹکڑوں کے محلِ نظر ہونے کے علاوہ چوتھا شعر جگر مرادآبادی کے کسی شعر کی یاد دلاتا ہے۔ اور بھی کچھ سرسری قسم کے اشعار غزلوں میں ہیں۔ سردار جعفری کی وہی غزلیں ایک حد تک کامیاب کہی جا سکتی ہیں جو مسلسل ہیں اور جن میں ایک طرح کا تسلسلِ فکر ہے۔ ہاں غزلوں کے اشعار کی انفرادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

بات در اصل سردار جعفری کی نظموں کی ہو رہی تھی۔ ۱۹۴۲ء میں مولانا نیاز مرحوم نے نگار کا جدید شاعری نمبر" نکالا تھا۔ بائیس سال پہلے ڈاکٹر سید صفدر حسین نے اُس میں ایک جگہ لکھا تھا

علی سردار جعفری اپنی نظر اور مطالعہ کے اعتبار سے فیض اور مجاز دونوں سے گہرے ہیں۔ اُن کی نظر میں رومانیت اور جنسی بھوک قطعاً نہیں"۔

سردار کی وسعتِ مطالعہ اور صاحبِ نظری بلاشبہ اُن کی اپنی صنف کے شعرا سے زیادہ ہے۔ اس پر مستزاد اُن کی "خود تنقیدی" ہے اور اسی نے اُن کے مقصد و فن کو ایسی بلندی عطا کی ہے جو دوسرے نظم نگار شعرا کے یہاں کم نظر آتی ہے۔ سردار کی شاعری کا علمی و فکری پہلو بہت تابناک ہے۔ اُن کے یہاں بے جا علامتوں کے گورکھ دھندے اور اُن کی یکسانیت نہیں ہے۔ نئی شاعرانہ جہتیں ہیں۔ وہ توانائی اور ارتقار ہے جو شاعری کو عظمت عطا کرتا ہے۔ انھوں نے ضرورتاً "کلاسیکی رجحان" سے گریز نہیں کیا۔ کوئی نظم دیکھ لیجئے گھوڑا پن کہیں نہیں ملیگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں، چونکہ حقیقت گھوڑی ہوتی ہے۔ اس لئے اُس کے اظہار میں گھوڑا پن آ جانا فطری ہے۔ پھر فنکار کا کیا ہوئی؟ آرٹ کے نقطۂ نظر سے قالب کو زم لطیف ہونا چاہیئے۔ تب روح کا گھوڑا پن نگاہوں میں سما سکتا ہے انسان کی جمالیاتی حس بھی کچھ چاہتی ہے۔ کائنات کی ہر شے میں ایک سلیقہ، تنظیم اور حسن ہے ادب اور آرٹ بھی اُن کے بغیر ادب اور آرٹ نہیں ہو سکتا۔

اگر ادوار کے اعتبار سے اردو نظم نگاری کا مطالعہ کیا جائے

ہر دور میں نہایت اچھے اور مشہور نظم نگار شعرا مل جاتے ہیں جن کی غلیں ہمارے ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ لیکن ایک طویل دور شاعری میں عظمت کی تاج صرف اقبال، سیماب اور جوش تین ہی نظم نگاروں پر ٹوٹی۔ بعد کے دور میں بھی کئی ممتاز نظم نگار نمودار ہوئے ہیں۔ ان میں سردار جعفری کا نام بھی شامل ہے۔ سوال صرف اتنا ہی ہے کہ کتنوں کے سر پر ہمیں اس عظمت کا تاج نظر آتا ہے جسے "آمد" کہتے ہیں؟ ایک ذہین شعر اور اردو نظم کی تاریخ کے طالب علم کا اس استفہامیہ کا جواب ڈھونڈنے میں زیادہ دشواری نہ ہوگی۔

ظاہر ہے کہ محدود فضاؤں کی پرواز محدود ہی رہتی ہے۔ کائنات تو فضاؤں سے تاروں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس وسیع دنیا کے خارجی عوامل کے ساتھ ساتھ بے شمار داخلی کیفیات بھی ہیں۔ آج کا اقتصادی نظام اور اشتراکی سماج کل کچھ اور ہو سکتا ہے۔ آج کا صنعتی ڈھانچہ کل کسی اور نوع کا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ کل کی دنیا میں استحصال، جبر اور ظلم نہ ہو۔ ایک نہایت بیتاب و حساس دور میں شاعری کو خارجی رشتوں سے الگ رکھنا تو خیر ممکن ہی نہیں۔

جس شاعری میں اپنا دور نہ جھلکے وہ شاعری ہی کیا؟ یہاں سوال محدودیت اور لامحدودیت کا ہے۔ مغربی نظم نگاروں کو کیوں ترجیح دی جاتی ہے؟ صرف ان کے موضوعات کے تنوع کی وجہ سے۔ ان کے فکری اور اسلوبی تجربے کے تاثر حاصل کرنے کے طریقوں کی بنا پر۔ پھول کی ایک پنکھڑی، بچے کا بہتا ہوا ایک آنسو، ایک شکستہ قبر، بارش کا ایک قطرہ، زلزلے کا ایک جھٹکا، اتوار کی ایک شام، بیمار فقیر کا کاسہ انہیں تحریک و INSPIRATION دے سکتا ہے۔ ان کے یہاں اُنات کا ہر منظر اور ہر واقعہ نظم کا روپ دھار لیتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی عمیق اور معمولی سی چیزیں بڑے بڑے مقاصد کو احاطہ کر لیتی ہیں۔ یہ نہیں کہ بس تو سیت و طمانیت، بھوک، افلاس، سیاست، ازم، عصریت، انقلاب یا مجرد حسن و عشق ہی نظم کا موضوع بنتے ہوں۔

ادھر یہ تذکرے بھی ہوئے کہ سردار جعفری نے ملک کے سیاست سے متعلق مسائل سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ سیاسی مفاہمت و اداری کی آوازیں بھی آرہی ہیں اور اس سے زیادہ خود سردار شاعری میں خوش آئند تبدیلیاں آئی ہیں۔ ان کے مجموعے —

"ایک خواب اور" در پیرایۂ شعر" اس کا ثبوت ہیں۔ مسرت کی بات ہے کہ ترقی پسند دور کا یہ ممتاز نظم نگار اس عظمت کا مکمل شناس بنتا جا رہا ہے جو "صدیوں" کو احاطہ کر لیتی ہے جہاں تک میرا مطالعہ پہنچے، اردو شاعری پھر کسی اقبال، سیماب اور جوش کے پیدا ہونے کی بشارت کی منتظر ہے۔

سردار جعفری زبان اور فن پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود "ایک خواب اور" کی بعض نظموں کے بعض مصرعوں میں کچھ جھول پائے جاتے ہیں۔ یگانہ، ہیجو نظر کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کہیں کہیں مجموعے کے خالی پن کا شدت سے احساس ہوتا ہے لیکن ایک شعر، دو شعر، تین شعر پر مکمل اور مرصع نظموں کی دلچسپ اس احساس کو کم کر دیتی ہے۔

سردار جعفری علم و ادب کی دنیا میں جہاں ایک شعر و فکر و نظر کے حامل ہیں، وہیں عملی طور پر اچھے ادب کی نشر و اشاعت کی طرف بھی متوجہ رہتے ہیں۔ وہ ایک فعال ادیب ہیں۔ انہیں اردو کی "ہشت پہل شخصیت" کہنا بجا نہ ہوگا۔ نام ادبی محفل بھی سردار کے یہاں نہیں ہے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ترقی پسندی کے روایتی TREND کو شعوری طور پر بدلنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظر آفاقی قدروں UNIVERSAL VALUES پر ہے، یہ بڑی مبارک بات ہے۔

"ایک خواب اور" طباعت و کتابت کے اعتبار سے بھی معیاری ہے۔ قیمت چھ روپے۔ ملنے کا پتہ

حلقۂ ادب ۱۰۱ سیتا محل۔ بومن جی پٹیٹ روڈ بمبئی ۲۶
(ا۔ ج۔ ص)

ادبا اور شعرا سے درخواست

جن ادیبوں اور شاعروں کے پاس ان کی اپنی تصویر کے چھوٹے بلاک ہوں، وہ ہمیں بھیج دیں، تاکہ جب بھی ان کی کوئی تخلیق "شاعر" میں شائع ہو تو وہ بلاک کام آجائے۔

ادارہ

محفل اپنی.....!

تبدیلیوں کا خیر مقدم:۔

جولائی کے شمارے سے "شاعر" میں جو نمایاں تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ اُن پر ہر طرف سے اظہارِ مسرت کیا گیا۔ مجموعی اعتبار سے قارئین نے بالعموم انھیں پسند کیا اور سب سے زیادہ جو چیز پسند کی گئی وہ مضامین کے ساتھ خاکوں کی اشاعت ہے۔ "شیخ چلّہ" کے باب کے اضافے کو بھی اہمیت دی گئی۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ کرنے ہی کرنے کی بہت سی چیزیں ہیں۔ شاعر کو ایک خوبصورت ادبی ماہنامہ بنانے کیلئے بیاقلات کئے گئے ہیں۔ ابھی عرض اضافہ ہے۔ حالات نے اگر مساعدت کی تو شاعر کو اور زیادہ بہتر بنایا جائے گا۔ بعض "شاعر" سے گہری دلچسپی رکھنے والے حضرات کی آراء و امانت کی ہے: شاعر کے وسیع امکانات اُسی صورت میں پورے ہو سکتے ہیں جب کہ مسلسل نئے خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اس سلسلے میں ہمیں قدرے مایوسی ہوئی ہے۔ ہماری دیرینہ خواہشیں ارمان ہی رہی ہیں۔

شمارہ اگست سنہ ۱۹۶۶ء:۔

اگست کا یہ تازہ شمارہ مضامین کے اعتبار سے خاصی بہتر ہوگیا ہے۔ پچھلی کچھ صفحات بڑھا کر ایسے ۱۰ صفحات کا کر دیا گیا ہے۔ لیکن قیمت نہیں بڑھائی گئی ہے۔ جہاں تک اس کے مشمولات کا تعلق ہے، یہ کافی اہم تخلیقات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ نئی شاعری۔ یا نئی لہر" بہت تو جہ طلب ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ نئی شاعری کا اچھے اچھے مضامین لکھوائیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور گہری فکر و نظر رکھنے والے نئے شاعری ہماری ادبی الجھنوں کو سلجھائیں گے۔ منکر نکیرؔ سنوی کی طنز نظم "مانی ہو تو ایسی" مقالہ نگار نے اُس کے بیت سے گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ "بندر صیاد اور لالچی" پڑھتے وقت قارئین خود بخود مسکرا جائیں گے۔ اور پاس کی خوبصورت گفتگو بھی زبان۔ لا' آدھ گھنٹہ پر وفیسر کلیم الدین احمد کے ساتھ گزارنے کی بھی لطف آئیگا۔ جو اب اور حقیقت کے تعاقب کے لئے یہ یادداشت بہت دلچسپ ہے۔ روح انشر کے لئے ایک بہت اہم مضمون اور دو کہانیاں ستاب شاہ ڈائجسٹ منتخب کی گئی ہے۔ اس بار دو طنزیہ اور ظریفانہ مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ ایک خط میں مولانا خاکی کو اس فریب کی کتابت کا ملال ہوا ہے۔ "سروری منزل" سے ہر سال لوگوں کی منزل اور آخری قدر کی حیثیت سے گذرنا ہے کچھ نہیں۔

کہانیوں میں کوثر جاوید کی "محبت کے سوا" مہندر ناتھ "ماچیاں" اکرم ہاشمی "غلام محمد" اور اختر شیرانی "ریحانہ" لکھ کر آئے ہیں۔ ان چاروں مشہور کہانی نگاروں نے اپنے تیر حیات و مشاہدات میں اپنے قلم دڑھوڑے ہیں۔ ساتھی افسانہ "Apple Showers by Jan Geary" سے ماخوذ ہے۔ "شاعر" کیلئے اس افسانے کے اور بھی مضامین لکھیں گے۔ "آپا جی" اظہر افسر کا ایک دلچسپ اور نفسیاتی ڈرامہ ہے۔ ریڈیو نذیر احمد کے ایک غیر معروف ناول "آپا جی" پر مبنی ہے۔ نذیر احمد کے ناول "توبۃ النصوح" اور "مراۃ العروس" و "توبت" مشہور ہیں لیکن اُن کے اس ناول کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ پورا ناول قرآن مجید کی آیتوں اور لمبے لمبے مواعظ حسنہ سے بھرا ہوا ہے۔ اظہر افسر نے اسی ناول کی روح کو اپنی کامیاب اور تاثر آفرینی کے ساتھ ڈرامے کا روپ دیا ہے۔

فراق گورکھپوری کے خط گوشے میں سے جھانک رہے ہیں۔ بقیہ مضامین حیدرآبادی، خانہ لکنت، مظہر امام، زبیر رضوی، اویس احمد دوراں، شکیل حیدری کوثر مظہری، واحد نظیر، ظہیر بنارسی اور اقبال طاہر کی تخلیقات غزلیں نظمیں فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

گذشتہ شمارہ میں محمود پیرزادہ کی اجتماعی فطرت شائع ہوا تھا اُس کے ساتویں شعر کے مصرعہ اولیٰ میں کتابت کی غلطی سے "گوہر شناس" چھپ گیا ہے۔ وہاں "جوہر شناس" بنا لیا جائے تاکہ مادۂ تاریخ غلط نہ ہو۔

مکتوبات:۔

گذشتہ شمارہ پر اظہار خیال کے سلسلے میں تقریباً ڈیڑھ سو خطوط موصول ہوئے اور لکھنے کی بات یہ کہ اُن میں طویل خطوط بہت زیادہ ہیں۔ علی الاترین احمد و اپنی اور شرف قادری بھوپالی کے خطوط اپنی خیالات کے اعتبار سے مکمل مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ افسوس کہ اُن کی اشاعت کیلئے گنجائش نہ نکل سکی۔ زیادہ سے زیادہ صفحات نکال کر جتنے بھی طویل مختصر خطوط ممکن ہو سکے، اگست کے اس شمارہ میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ مکتوب نگاروں سے استدعا اور خصوصی امور پر توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ محض رسمی خطوط نہ لکھے جائیں۔ مباحث کو حل و فکر کا انداز دیا جائے تاکہ اُس سے فائدہ ہو۔ "شاعر" کا باب مکتوبات بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

ایک بہت طویل خط محترم ڈاکٹر گیان چند کا اور دوسرا اُس سے کم طویل محترمہ شمیم احمد جمشید پور کا موصول ہوا۔ دونوں میں پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کے مجموعہ کلام "اوہام نکلیں" پر بحث کا خاصا ہنگامہ۔ لفاظ قافیہ۔ یہ دونوں خط طویل روک دیئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے جامعانہ درخواست پر اپنے خط کو "ایسے لے لیا اور اُس کی جگہ صرف چند سطور کا ایک خط جو ایک مضامین کا انداز کرتا ہے اشاعت کے لئے بھیجا۔

اسی طرح پنڈت ہوتی لال ہوتی کی بھی ہماری بات مانی ہوگی۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہوتی صاحب کے مقدر کی تعریف کے سلسلے میں کوئی غیر سنجیدہ انداز اختیار کیا جائے۔ ان کی شاعری کو گھروں کے پیالوں میں جانچنے کے بجائے طرحی تقریبوں کے ساتھ مشاعروں میں پرکھا جائے۔ امید ہے "شاعر" نے بھی ایسی ناگوار بحثوں کو راہ نہیں دی۔

مکتبہ قصر الادب کے اشاعتی پروگرام کا آغاز :-

یہ اطلاع موجب مسرت ہوگی کہ سالہا سال کے بعد مکتبہ قصر الادب نے مطبوعات کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اسی مہینہ میں مکتبہ کی طرف سے اختر صدیقی کی شاہکار نظم "خوابوں کا مسیحا" ایک ساتھ اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں نہایت حسن اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ مخلص احباب اور "شاعر" کے بلند ذوق قارئین شہر میں اگر مل کر ایک ساتھ خوابوں کا مسیحا کی کاپیوں کا طلب کریں تو محصول ڈاک کی کافی بچت ہو سکتی ہے اور تمام احباب تک یہ خوبصورت شعری کتاب پہنچ سکتی ہے۔ اردو والوں کے علاوہ اس سے ہندی اور انگریزی زبانوں کے جاننے والے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

"خوابوں کا مسیحا" کے بعد علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم کی غزلوں کا تیسرا مجموعہ "نوح محفوظ" دسمبر تک شائع کر دیا جائے گا۔ اور پھر اختر صدیقی کی غزلوں کا مجموعہ "سخن در سخن" بعض کاتبہ دنوں سے بیطرف نہایت بے چینی کے ساتھ انتظار کیا جا رہا ہے شائع ہوگا۔ امید کہ مکتبہ قصر الادب کے اشاعتی پروگرام کا کامیاب بنانے میں اردو کا باذوق حلقہ ہماری زیادہ سے زیادہ مدد کرے گا۔

کرشن چندر نمبر :-

آئندہ شمارہ میں "کرشن چندر نمبر" کے لئے لکھے ہوئے مضامین کی فہرست پیش کی جائیگی۔ کرشن چندر نمبر بھی ایک سال کے اندر شائع ہو جائے گا۔ جن مشہور و مقتدر ارباب قلم نے ہمارے اپنے مضامین ابھی تک نہیں بھیجے ہیں وہ فوری طور پر توجہ فرمائیں۔ کرشن چندر نمبر کی کتابت شروع ہونے والی ہے۔

کشمیری لال ذاکر کی
تین کہانیاں

اردو حلقوں کو اس اطلاع سے مسرت ہوگی کہ مشہور افسانہ نگار کشمیری لال ذاکر کی تین طویل کہانیوں کا ایک خوبصورت مجموعہ تین مورتی پبلیکیشنز کی طرف سے عنقریب شائع ہو کر منظر عام پر آجائے گا۔ یہ کہانیاں کشمیری لال ذاکر کی نمائندہ کہانیاں ہیں جو اردو کے افسانوی ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تھے۔ اس کی اشاعت بڑھانے کیلئے اپیلیں کرنا یا چندہ کرنا وہ اپنی شان کے منافی سمجھتے تھے۔

جولائی کے شمارے میں مضمون کے ساتھ صاحب مضمون کی تصویر دیکھ کر جی خوش ہوا۔ اور بے اختیار داد دینے کو جی چاہا۔

علی عباس امید ایم اے ——— کیمبرج کالج بھوپال

شاعر کا تازہ شمارہ دیکھا۔ بہت زیادہ پسند آیا۔ سوغات کے علاوہ تخلیقات نے بھی متاثر کیا۔ آپ کا اداریہ تو خاصہ کی چیز ہوتا ہی ہے۔ "بگولے" میں بھی نے بھی محظوظ کیا۔ فنیا کمی کا مضمون "نیاز فتحپوری" بھی خوب ہے۔ جرمت بارش اور امیر چند بہار کی غزلیں پسند آئیں۔ شہاب جعفری اور نثار پردیسی کی نظمیں بھی ہیں۔ افسانوں میں "آخری دھماکہ" پسند آیا۔ مجموعی اعتبار سے اس ماہ کا شمارہ اچھا پسند آیا۔ صفحات بڑھا کر آپ نے قارئین کی بھی حوصلہ افزائی کی ہے۔ امید ہے کہ اس اضافہ قیمت کا اضافہ شاعر کے پڑھنے والوں میں کمی نہیں کر سکے گا۔ اگست کے شمارے میں آپ کا اعلان دیکھ کر ابھی سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔

لوئر پرکاش ——— منڈ پیٹرول روڈ۔ بوریولی۔ بمبئی ۶۶

شاعر کی نئی ترتیب بہت ہی خوبصورت ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہر کسی کے دل میں گھر کر لے گی۔

تیاگ کے بعد، ماضی، رات اور ستم بھی اچھی ہیں۔ غزلوں میں مشیر جعفری کی غزل ایک اچھا تاثر پیدا کرتی ہے۔ آپ کا خطاب صدارت جہاں اور دور والوں کے لئے ایک پیغام ہے، وہیں یہ ہمارے مشاعروں اور مجلات کے شاعروں پر بھرپور تبصرے کا کام کرتا ہے۔ آخری دھماکہ اچھا افسانہ ہے۔

میرا تحریر شدہ ڈرامہ ملا ہی ہوگا۔ آپ کی گرانقدر رائے کا بڑی شدت سے منتظر ہوں۔

نسیم مظفر پوری ——— جنرل سکریٹری تنظیم نو۔ سبزی باغ۔ پٹنہ

شاعر کا شمارہ جولائی دیکھا۔ ترتیب و تدوین کا انداز بہت پسند آیا۔ جیسا کہ میں نے قبل بھی لکھا تھا۔ اگر تخلیقات کے اختتام پر متعلقہ فنکاروں کے پتے بھی دیئے جائیں تو بہتر ہوگا۔ تصویروں کا سلسلہ بھی پسند آیا۔

اس بار افسانے تقریباً سبھی اچھے ہیں۔ خاص طور پر اقبال صدیقی اور منظر کاظمی کا افسانہ مجھے بہت پسند آیا۔ ظفر حمیدی کی نظم پڑھ کر بے ساختہ منہ سے "واہ" نکل گئی۔

مکتوبات کے حصے میں انجمن آرا انجم صاحبہ نے آپ کی غزل کے ایک شعر کے مصرع اولیٰ کو بے وزن بتایا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ صحیح شعر یوں ہے۔

ارمان پینے کے ہوں کہ جینے کے
اک مشورہ مفت میں گئے ہیں

روزنامہ سیاست — علمی، ادبی، اور تہذیبی خبریں

اُردو کی ترقی و ترقی پر خاطر خواہ توجہ دی جائے

اُردو زبان ایک عظیم ادبی ورثہ ہے

صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی تقریر

نئی دہلی ۱۳ اگست :۔ صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے آج یہاں ثقافتی ادارہ کی جانب سے منعقدہ ہم نہالی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے ملک کے ادیبوں اور شاعروں پر زور دیا کہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ ملک میں قومی یکجہتی کو فروغ دینے کی کوشش کو برستور جاری رکھیں۔ انھوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ اُردو اور سندھی جیسی زبانوں کی ترقی و ترویج پر مناسب اور خاطر خواہ توجہ دینی چاہیئے۔ صدر نے کہا اُردو زبان نے ملک کی تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا ہے اور وہ ایک عظیم ادب رکھتی ہے۔ اُردو لیڈروں اور شاعروں نے قومی زندگی کو ایک نئے جوش اور جذبے سے ہمکنار کیا ہے۔

یہ بات افسوسناک ہے کہ اُردو اور سندھی جیسی زبانوں پر توجہ نہیں دی جارہی ہے۔

لکھنؤ میں یوم نو لکشور

لکھنؤ میں پڑھے لکھانے پریم منشی نولکشور منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں جس میں اُردو، فارسی اور عربی کے اس عظیم ادارے اور اس کے بانی کی گرانقدر نولکشور کی خدمات کا اعتراف کیا جائے گا۔ نولکشور پریس کا سنگ بنیاد ۱۸۵۸ء میں رکھا گیا تھا جہاں سے اردو، فارسی اور عربی زبانوں کے وہ بیش بہا علمی و ادبی سرمایہ جو برصغیر ہندوستان بلکہ بیرون ملک مثلاً مصر، شام، عراق، ایران اور افغانستان وغیرہ میں بیحد مقبول ہوئے۔

یوم نولکشور کے اجتماع کے لئے نائب صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کو دعوت دی جاچکی ہے۔ نیز جرمنی، روس اور دیگر ممالک کے اہل علم اور مستشرق حلقوں کو بھی دعوت شرکت دی گئی ہے۔ اسلامی ممالک کے نمائندوں سے رابطہ قائم کیا جارہا ہے۔

اس تقریب میں جنم مقالے، کتابوں کی نمائش اور کل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا جائے گا۔

پارلیمان میں اُردو کا پُرزور مطالبہ

اُردو کو اُس کا صحیح مقام دیا جائے

نئی دہلی ۱۲ جولائی۔ پارلیمان میں اُردو کی حمایت میں پُرزور آواز بلند کی گئی۔ اور حکومت سے ایک اپیل میں کہا گیا کہ اُردو کو اُس کا صحیح مقام دیا جائے۔ جو ہمارے ورثے کے ایک عظیم جزو کی حیثیت رکھتی ہے اور اس غلط تصور کو ختم کیا جائے کہ اُردو عوام سے فیصدی نہستا فی نہیں ہیں۔

وفاقی کانگریسی ممبروں سید عنایت اللہ انصاری اور بیگم انیس قدوائی کی نیابت میں عرضی لیتے ہوئے اُردو کو ملک میں اُس کا جائز مقام دلانے کے لئے پُرزور اپیل کی۔ کانگریس اور اپوزیشن دونوں ہی طرف کے ممبران نے ریاستی حکومتوں پر اس بات کیلئے نکتہ چینی کی کہ وہ لسانی اقلیتوں سے متعلق کمشنر کی سفارشات پر عمل نہیں کر رہی ہیں۔ انھوں نے وزیر داخلہ پر زور دیا کہ وہ ان سفارشات پر عمل کرائیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کو اعزاز

دہلی ۱۵ اگست :۔ صدر جمہوریۂ ہند نے آٹھ عالموں کو اعزازی سندیں پیش کی ہیں۔ ان میں سے چھ سنسکرت، ایک عربی اور ایک فارسی کا عالم ہے۔ عربی کی سند مولانا عبدالماجد دریابادی کو ملی ہے اور فارسی کی سند دوسرے اودیہ شہوری، دہلی کے پرنسپل قاضی سجاد حسین کو دی گئی ہے۔

کوثر چاندپوری کی "جہانِ غالب"

اُردو زبان کے مشہور ادیب و افسانہ نگار کوثر چاندپوری کی نئی کتاب "جہانِ غالب" جو غالب کے فن، شخصیت، اسلوب اور دوسرے متعلقات شاعری سے ناقدانہ انداز میں بحث کرتی ہے، شائع ہو گئی ہے۔

غالب کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں کو تیرہ عنوانات میں تقسیم کر کے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر ورق غالب کی ایک تاریخی تصویر سے مزین ہے۔ کتاب ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ انتساب آفسر سعید خاں کے نام کیا گیا ہے۔ دیباچہ کی

عبارت پروفیسر امتیاز حسین اور نظیر لدھیانوی نے لکھی ہے۔ مولانا نیاز فتحپوری مرحوم کی رائے کا بھی اس میں شامل ہے۔ پیش لفظ خود کوثر چاندپوری کا ہے۔

میاں غالب، مکتبہ کائنات لاہور (پاکستان) نے چھاپا ہے اور قیمت باون روپے پچاس پیسے ہے۔

بدیع الزماں خاور کو ریڈیو کے نغمے پر انعام

دہلی ۱۰ اگست:۔ آل انڈیا ریڈیو نے ہندوستان کی تمام زبانوں کے شاعروں سے ریڈیو کے لئے قومی نغمے لکھنے کی دعوت دی تھی۔ ستر ہ زبانوں میں ساڑھے بارہ ہزار گیت اس مقابلے کیلئے بھیجے گئے۔ ان میں پہلے درجے کے دو انعامات صرف ہندی اور گورکھی زبان کو دیئے گئے۔ اردو کے کسی گیت کو پہلا درجہ نہیں ملا۔

دوسرا انعام اردو کے مشہور نوجوان شاعر بدیع الزماں خاور بلگرامی اور رضا امروہوی کو دیا گیا۔ تیسرا انعام پروفیسر مسیح الزمان خاں مسیح نے حاصل کیا۔

سلام مچھلی شہری پھر ریڈیو سے سرہو گئے

دہلی ۱۰ جولائی: ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی گئی کہ اردو کے مشہور شاعر سلام مچھلی شہری کا تقرر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں پروڈیوسر واسکرپٹ رائٹر کے عہدے پر ہو گیا۔ سلام مچھلی شہری بیس سال سے آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہیں۔

لسانی کمشن کی رپورٹ

اس مرتبہ دو رپورٹیں ایک ساتھ پارلیمنٹ کے ایوانوں کے سامنے آئی ہیں۔ ان کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اب تک اتر پردیش کی حکومت کا رویہ اردو کے لئے انصاف پسندانہ نہیں ہے۔ ایک رپورٹ میں دکھایا گیا ہے کہ ان اسکولوں کی تعداد جہاں اردو پڑھائی جاتی تھی، کس طرح ایک سال کے اندر گھٹی ہے۔

ضلع	اسکول ۱۹۶۰ء	اسکول ۱۹۶۱ء	کمی
المورہ	۴	۳	۱
سہارنپور	۱۹	۱۸	۱
فتحپور	۲۸	۲۲	۶
غازی پور	۳۶	۳۰	۶
جالون	۱۰	۶	۴
مین پوری	۱۲	۶	۶
پیلی بھیت	۲۵	۲۰	۵
گورکھپور	۴۵	صفر	۴۵

اس رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے زیادہ صیانک سلوک گورکھپور میں کیا گیا ہے۔

عامدی کاشمیری کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی

اردو کے مشہور افسانہ نگار اور شاعر پروفیسر عامدی کاشمیری کو جموں و کشمیر یونیورسٹی نے ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے "عصر حاضر کی اردو نظم پر یورپی اثرات" کو منظور کر کے انہیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا کر دی ہے۔ پروفیسر عامدی کاشمیری نے پروفیسر عبدالقادر سروری کی زیر نگرانی کام کیا تھا۔

اردو ٹیلی پرنٹر

پشاور (پاکستان) سے پتہ چلا ہے کہ اسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان آئندہ چھ سے دس ماہ تک کے عرصہ میں تمام اخبارات کو اردو کے ٹیلی پرنٹر فراہم کر دے گی۔ اب پ پ کی انتظامیہ نے اردو کے ٹیلی پرنٹر حاصل کرنے کیلئے درخواستیں طلب کی ہیں۔ اردو رسم الخط میں ان کے ذریعہ خبریں فراہم کی جائیں گی۔

عربی فارسی اسلامک کلچر اور اردو کے پروفیسروں کی انجمن قائم

۳۰ جولائی ۱۹۶۱ء کو بمبئی یونیورسٹی کے عربی فارسی اسلامک کلچر اور اردو کے پروفیسروں کی انجمن وجود میں آئی۔ اس انجمن کے پروگرام میں مندرجہ ذیل امور شامل ہیں۔

۱۔ بمبئی یونیورسٹی کے کالجوں میں مندرجہ بالا مضامین کی ترویج و اشاعت

۲۔ ان مضامین کے طلباء کی مختلف طریقوں سے ہمت افزائی

۳۔ بمبئی یونیورسٹی کے مندرجہ بالا مضامین کے پروفیسروں کے درمیان مساوات، بھائی چارہ اور اتفاق و اتحاد پیدا کرنا۔

انجمن کے پہلے سال کیلئے مندرجہ ذیل عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔

صدر: پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی۔ جنرل سکریٹری: پروفیسر مشیر مالی جائنٹ سکریٹریز: ڈاکٹر ایم فتح، پروفیسر شوکت انصاری۔ خازن: پروفیسر ایم کے کھان ممبران: پروفیسر سرور ڈانڈیکر، ڈاکٹر عبدالحی سید اور پروفیسر غلام محمد

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا پینتیس سالہ علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر

بمبئی

شمارہ - ۹ - ۱۹۶۶ء ستمبر

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	معاونین سے	تاعمر خریداری	ممالکِ غیر سے	فی پرچہ
آٹھ روپے	پچیس روپے	۱۲۵ روپے	۲۵- شلنگ	۱۲ آنے (۷۵ پیسے)

ماہنامہ "شاعر" قصر الادب - بمبئی ۸ بی سی

مکتبہ قصر الادب

پوسٹ بکس ۴۵۲۶ - بمبئی ۸ بی سی

دہلی

۱۲۱۱ - تیماران - دہلی ۶

کلکتہ

۱۲ کانگریس ایکزیبیشن روڈ - کلکتہ ۱۴

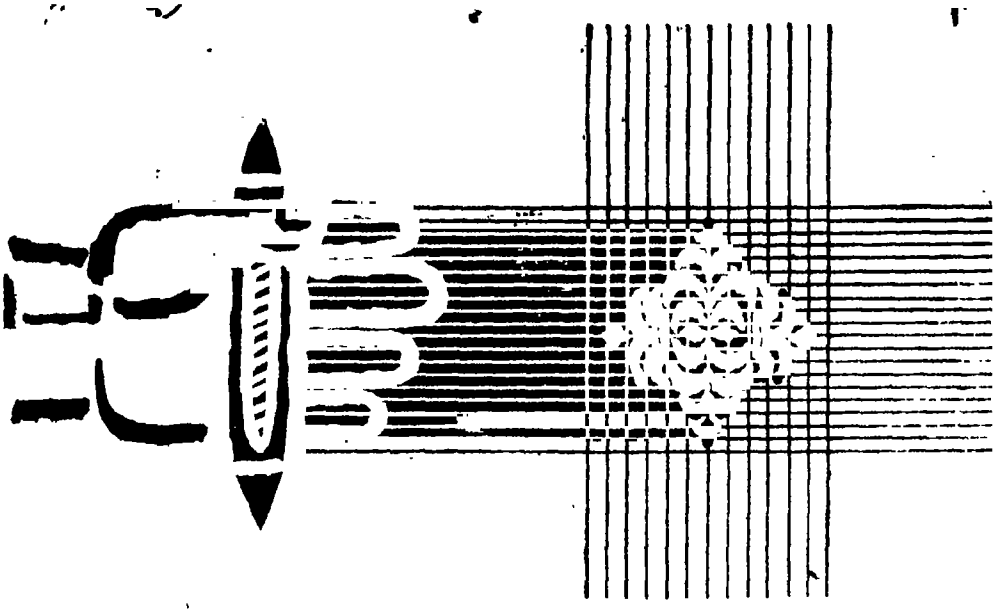

قابلِ تعریف

ہاتھ کھڈی کپڑے

"ملک میں تیار ہونے والے ہاتھ کھڈی کپڑوں سے زیادہ خوبصورت چیز میرے دیکھنے میں کم ہی آئی ہے۔ یہ ٹوٹے ہیں، بے مثال ہنرمندی اور فنکاری کے۔"

— جواہر لال نہرو

ہاتھ کھڈی کپڑے
ممتاز آرائشی پارچہ

آل انڈیا ہینڈلوم بورڈ

PA 66/720

اشاریہ

سب گڈمڈ (اداریہ) اعجاز صدیقی ۸
غزل میکش اکبرآبادی ۹
پردۂ غفلت پر ایک نظر (مقالہ) چندر دیپ ۱۰
آخری رات (نظم) کیفی اعظمی ۱۳
اندھیرا اور اندھیرا (افسانہ) نور شاہ ۱۴
شعورِ مرگ (نظم) ندا فاضلی ۱۷
غزل علیم اختر مظفرنگری ۱۷
حافظ کا اثر شعرائے اردو پر (مقالہ) سید نقی احمد ارشاد ۱۸
احسان (نظم) ظہیر صدیقی ۲۳
غزل طرفہ قریشی ۲۳
دلی کی مرثیہ خواں اور ان کے گانے (یادداشت) آغا رشید میرزا دہلوی ۲۴
غزل بدیع الزماں خاور ۲۴
کاغذ کا ٹکڑا (نظم) فروغ تمکنت ۲۹
بھول ہی بھول (ڈراما) اظہر افسر ۳۰
غزل افتخار احمد فخر دھولیوی ۳۵
غزل خلش بڑودوی ۳۵
راجہ مہدی علی خاں کلیم راہی ۳۶
ایک ستارہ (نظم) عبدالرحیم نشتر ۳۸
تلاش (نظم) ڈاکٹر حامد کاشمیری ۳۹
شاہکار (افسانہ) رفیعہ شبنم عنبری ۴۰
غزل کیف احمد صدیقی ۴۴
غزل اسرار اکبرآبادی ۴۴
لیلیٰ اور لیلیٰ کے خطوط (مقالہ) انوار منیر ۴۵
غزل جمیل کلیمی ۴۸
غزل قمر اقبال ۴۸
سوال (ہندی) نئے گیت کا؟ اوم پربھاکر ۴۹
ابکی ساون (گیت) اوم پربھاکر ۵۰
غزل لفیل آفند ۵۱
زمین کا مذہب (نظم) شفق تنویر ۵۱
آگ (مراٹھی ڈراما) ترجمہ۔ نور پرتاپ ۵۲
غزل اختر نفسی ۵۷
غزل جمال مہدی ۵۷
زبان گو۔ فن، زندگی کی روشنی میں (روحِ اخذ) محمد علی صدیقی ۵۸
سیماب اکبرآبادی۔ ایک شاعر ایک انجمن (″) سید سعید احمد ۶۱
نیاز فتحپوری (نظم) اخلاق فتحپوری ۶۳

مکتوبات

نامی انصاری — مظہر امام — مناظر عاشق ہرگانوی
قیصر قلندر — اظہر افسر — بدیع الزماں خاور
نور پرتاپ — عبدالجبار تاج — علی عباس امید
عبدالرحیم نشتر — اندو جیت دت — اقبال ماجدی
عبدالصمد

نقد و نظر (تبصرے) مختلف تبصرہ نگار ۶۸
محفل اپنی ....! ادارہ ۷۲
رفتار (ادبی و تہذیبی خبریں) ادارہ ۷۳

شاعر بمبئی
جلد ۳۷ — شمارہ ۹

ادارہ "شاعر" فخر و مسرت کے ساتھ

اردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار

کرشن چندر

پر نہایت ضخیم شاندار اور مثالی نمبر پیش کر رہا ہے

کرشن چندر کی منفرد شخصیت اور اس کے ہمہ گیر فن پر نہ صرف ہندوستان کی کئی زبانوں کے مشہور قلم کاروں بلکہ دنیا کے کئی بڑے مصنفین اور مفکرین کے مضامین و تاثرات

کرشن چندر نمبر

میں

پیش کئے جائیں گے

کرشن چندر نمبر میں

خود

کرشن چندر

کے اپنے قلم سے

ایک تازہ، غیر مطبوعہ اور شاہکار

ناول

کے علاوہ

تین تازہ کہانیاں

ایک ڈرامہ

ایک مزاحیہ

میرے ادبی نظریات

میرے تنقید نگار

میری ادبی زندگی کا آغاز و انجام

★

کرشن چندر کے

شب و روز

(تصاویر کے ذریعہ)

اور

عکسِ تحریر

کرشن چندر کے

اہم خطوط

کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ، اس کی عظمت کے کہانی، اس کی تصانیف کا جائزہ، اس کے زندہ اسلوبِ بیان اور شاہکار افسانوں ناولوں اور ڈراموں پر تنقیدی نظر

[redacted]

دلچسپ تصاویر

اربابِ قلم اپنے مضامین کرشن چندر پر جلد از جلد ارسال فرمائیں

موصولہ تخلیقات

کرشن چندر۔ میرا محبوب، میرا ہمدرد — مرزا ادیب
کرشن چندر بحیثیت افسانہ نگار — کوثر چاندپوری
کرشن چندر کے افسانوں کا اسلوب — ڈاکٹر سلام سندیلوی
تیسرا تخلیق — جوگندر پال
کپ چ ب ب اہ — رام لعل
کرشن چندر کی افسانہ نگاری — ڈاکٹر سید محمد حسنین
میرا بھائی۔ سب کا افسانہ نگار! — مہندر ناتھ
کرشن چندر کے حالاتِ زندگی — ڈاکٹر احمد حسن
کرشن کنھیا — یوسف ناظم
کرشن چندر اور کئی فرلانگ لمبی سڑک — آمنہ ابوالحسن
ہم کفر جانتے ہیں..... — پروفیسر شفیقہ فرحت
میرا ہمدم، میرا دوست — عادل رشید
کرشن چندر اپنے نظریات کی روشنی میں — ڈاکٹر عبدالمغنی رضا
کرشن چندر کا آرٹ اور تکنیک — ڈاکٹر احمد حسن
اُلٹا درخت — پروفیسر ظفر احمد نظامی
صبح ہوتی ہے — ایک ربورتاژ — پروفیسر شمیم احمد

کرشن چندر — قلمی چہرہ — خورشید گرامی
کرشن چندر — ایک شاعر — مسعود قمر تاباں
کرشن چندر۔ اپنے انٹرویو کی روشنی میں — گربچن سنگھ
کرشن چندر کے سماجی اور ادبی نظریات (ایک مکالمہ) — ڈاکٹر احمد حسن
کرشن چندر کے ساتھ ایک ملاقات (ہندی) — وشنو پربھاکر
کرشن چندر (ہندی) — وشنو پربھاکر
خط — (ہندی) — ممنت ناتھ گپت
کرشن چندر۔ کمرشل ازم اور انحطاط (ایک جواب) — آغا شیدا دہلوی
فکر اچھی، پرستش ناتمام! — نور سرکار
ہم زباں ہم داستاں — مناظر عاشق ہرگانوی
فن کی عظمت — نامی انصاری
دورِ جدید کا عظیم افسانہ نگار — مس صغرہ نسیم
چندر اور شکست کا ایک اہم کردار — پروفیسر اقبال بھاگلپوری
غدار۔ ایک تنقیدی جائزہ — راز سنتوکھ سری
گدھے کی ملاقات، کرشن چندر سے — اختر بستوی

انتظار ہے

آل احمد سرور۔ احتشام حسین۔ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ ممتاز حسین۔ ڈاکٹر اعجاز حسین۔ پروفیسر اختر اورینوی۔ عصمت چغتائی۔ خواجہ احمد عباس۔ راجندر سنگھ بیدی۔ قرۃ العین حیدر۔ سردار جعفری۔ سجاد ظہیر۔ حیات اللہ انصاری۔ سہیل عظیم آبادی۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ وقار عظیم۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ احمد ندیم قاسمی۔ علی عباس حسینی۔ ڈاکٹر اعجاز حسین۔ کنھیالال کپور۔ رام لعل۔ سجاد ظہیر۔ جیلانی بانو۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ ظ انصاری۔ اختر الایمان۔ مجروح سلطانپوری۔ ساحر لدھیانوی۔ کیفی اعظمی۔ ڈاکٹر ملک راج آنند۔ خلیل الرحمن اعظمی۔ راجندر سنگھ بیدی۔ او پندر ناتھ اشک۔ سلمیٰ صدیقی۔ کشمیری لال ذاکر۔ فرقت کاکوروی۔ انوار عنایت اللہ۔ شاہد احمد دہلوی۔ باجرہ مسرور۔ صہبا لکھنوی۔ محمد طفیل۔ شوکت صدیقی۔ پروفیسر حنیف فوق۔ پرکاش پنڈت۔ سیتو درما دھو راؤ پگڑی (مراٹھی) پی۔ کے اترے (مراٹھی)۔ رابھا چوشی (مراٹھی)۔ حمید دلوائی (مراٹھی)۔ احمد جمال پاشا۔ ظفر اوگانوی۔ شہاب جعفری۔ ریوتی سرن شرما۔ سرلا دیوی۔ کلام حیدری

خبر و نظر

شاعر بمبئی

سب گڈ مڈ

اِدھر کئی مہینوں سے اُردو حلقوں کی نظریں حالات کے اُس رُخ پر لگی ہوئی ہیں جو تیزی کے ساتھ بدلا ہے۔ پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ سے باہر اُردو کو اُس کا جائز حق دینے کیلئے جو پُرزور مُرشد مطالبات کئے گئے وہ بظاہر کافی مؤثر ثابت ہوئے۔ اور اس کا اندازہ صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن اور وزیر اعظم شری متی اندرا گاندھی۔ صدر کانگریس حضرات کے واضح اور حقیقت پسندانہ بیانات سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس سے پہلے کبھی اس درجہ صاف اور نتیجہ خیز رجحانات دیکھنے میں نہیں آئے۔ یوں لگا کہ جیسے واقعی اب کچھ ہوگا اور اُردو زبان کو اُس کا حق ضرور ملیگا۔ یہاں تک اطلاعات آئی ہیں کہ الیکشن سے پہلے کم از کم دو ریاستوں میں اُردو زبان کو ثانوی زبان کا درجہ دے دیا جائے گا۔ مرکزی وزیر فخر الدین علی احمد صاحب نے بھی اپنی اپیل میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اُردو کو چار ریاستوں میں سرکاری زبان مان لیا جائے۔

اُردو حلقے پُر اُمید تو پہلے بھی رہے ہیں اور حکومت کی مسلسل وعدہ خلافیوں کے باوجود اُمید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا لیکن اس بار تو اُمید کی اُمید میں یقین سے بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ ہر خبر دہ یہ جانتے ہیں کہ عام انتخابات سے پہلے سیاسی جماعتیں اور اُن کے نمائندے عام طور پر سبز باغ دکھایا کرتے ہیں۔ اس بار بھی عام انتخابات سے چند ماہ پہلے اُردو زبان کی پذیرائی کا ایک شور چاروں طرف سے اُٹھا ہے کچھ جانثارانِ اُردو نے اپنی بھوک ہڑتال اور احتجاج اور جدوجہد کا نتیجہ بتایا ہے میں کچھ رُحجان اپنی اپنی اُمیدوں کا حاصل سمجھ رہے ہیں اور اب بالکل اُس طرح مسلک خاموش ہوتے جارہے ہیں جس طرح سرکش بچے کچھ پیار مارنے کے بعد پُرسکون ہو جایا کرتی ہیں۔

دوسری طرف، تصویر کے تاریک اور روشن دونوں رُخ سامنے آچکے ہیں بات وہیں آکر ٹھہری ہے جہاں اُنیس سال سے موقع بہ موقع ٹھہرتی آرہی ہے۔ یعنی فرقہ پرستوں کا خوف۔ وہ فرقہ پرست جو ہمیشہ گنگی کا ناچ نچاتے رہے ہیں۔ جن کے خوف سے ملک و قوم کے بیشمار مسائل کے سلسلے میں مفاہمانہ اقدامات کا جذبہ ہمیشہ دبایا جاتا رہا ہے پنڈت نہرو جیسی محبوب اور بااختیار شخصیت کو بھی اکثر اس خوف اور اندیشہ کے تحت بہت سے معاملات میں پیچھے ہٹنا پڑا۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد جو سب سے بڑی لعنت ہمارے حصہ میں آئی، وہ فرقہ پرستی ہے۔ وہی فرقہ پرستی جس نے ملک کو تقسیم کرایا۔ وہی فرقہ پرستی جس نے لاکھوں انسانی جگر ٹکڑوں کو جنم دیا، وہی فرقہ پرستی جس نے قومی حکومت کو آج تک سکون سے کام نہیں کرنے دیا۔ آج ملک جس نازک دور سے گذر رہا ہے اُس کی تمام تر ذمہ داری فرقہ پرست جماعتوں پر ہے۔ اگر ہر ہندستانی محبت اور رواداری، خلوص اور سچائی، حقیقت پسندی اور دور اندیشی کو اپنا مسلک بنا لیتا تو ہمارا یہ عظیم ملک اس درجہ دشواریوں میں نہ گھرتا۔

اخباری اطلاعات کے مطابق جب یوپی اور بہار کے وزرائے اعلیٰ نے اپنے صوبوں میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کے متعلق وزیر اعظم وغیرہ سے گفتگو کی تو اس اندیشہ کا اظہار بھی کیا کہ اگر ایسا کیا گیا تو دونوں صوبوں میں ہندی زبان کے حامیوں کی جانب سے شدید مخالفت کی جائے گی فرقہ پرست جماعتوں کو کانگریس کے خلاف تحریک چلانے کا ایک اور موقع مل جائے گا۔ اس سے آنے والے انتخابات میں فرقہ پرست جماعتیں اکثریتی فرقے کے زیادہ ووٹ حاصل کر لینگی یہ فرقہ پرست جماعتیں چونکہ اُردو زبان کو "مسلمانوں" کی زبان کہتی ہیں، اس لئے کانگریسی حکومت کی نیت پر یہاں تک شبہ کیا جارہا ہے کہ وہ اردو زبان کو چند ریاستوں میں صرف اسی لئے سرکاری حیثیت دینا چاہتی ہے کہ اُسے مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ ووٹ ملیں۔ ؟

کس کو کس کے ووٹ ملینگے، کم ملیں گے یا زیادہ ملیں گے یہ تو اربابِ سیاست جانیں۔ جہاں تک اُردو کے حقوق کو مان لینے کی اس تھوڑی سی حالیہ آمادگی کا سوال ہے تو صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ اگر فرقہ پرستی کے بھوتوں کے خوف سے اس بار بھی مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اپنا ارادہ بدل دیا تو یہ بہت بڑی بدقسمتی ہوگی۔

اس مکمل تصویر کے سامنے آجانے کے بعد عام اُردو حلقوں اور اُردو کے سربراہوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیئے کہ وہ کونسی آخری ترین صورت ہو سکتی ہے۔ جس سے اُردو کے سلسلے میں فرقہ پرستوں یا ہندی دوستوں کے شکوک و شبہات دُور کئے جاسکیں؟

محمد الصدیقی

۱۵ ستمبر ۱۹۶۶ء

شاعر بمبئی
میکش اکبرآبادی

غزل

یہ میکدہ تو ہے ساقی گری کا نام تو ہے
نہیں ہے جام جو گردش میں۔ ذکرِ جام تو ہے

جو جی بچے تو کھلائیں گے گُل چمن والے
ابھی تو نام بدلتے ہیں یہ بھی کام تو ہے

شمیمِ گُل کو بتاتے ہیں خارِ فیض اپنا
کچھ اِس کا پھل نہ ملے پھر بھی اِس میں نام تو ہے

سُنے نہ کوئی مگر ہم فغاں کیے جائیں
نہ ہو کچھ اور قفس میں، یہ انتظام تو ہے

گواہ میرے گرفتار روزِ حشر ہوئے
یہاں بھی کچھ مرے قاتل کا اہتمام تو ہے

کسی کا نام میں لیتا نہیں ہوں اے میکشؔ
مگر جہاں میں شرافت کا قتلِ عام تو ہے

چندر دیپ

"پردۂ غفلت" پر۔ ایک نظر

مُعطیہ حکومت کے زوال کے بعد ہندوستان کی زندگی میں گھٹن گ گیا تھا ہندوستانیوں کا مزاج لاپرواہی اور بے نیازی کی حد تک تھا روایات کا سہارا بنا کر جھوٹی تسلیاں دینا ان کا شیوہ تھا جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد ہی ہمی قوتوں کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ جمود کے اس حسرو تشدد نے احساس کمتری کو اور زیادہ شدید کر دیا۔ عمل اور جدوجہد کے عناصر پہلے ہی سے ناپید ہو چکے تھے۔ اس تضاد نے اور زیادہ بے حس بنا دیا ایسی صورت میں مادی حقیقتوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد روحانی لذتوں میں سکون و طمانیت پانا، جھوٹی عزت شان کے سہارے زندہ رہنا، خود بھی طاقت و قوت ہونے پر ظلم و تشدد اختیار کرنا۔ روایات اور رسومات کے لئے جان کھپا دینا۔ خوشامد پرستی اور حق تلفی کرنا، قوت کے نشہ میں اصلیت کو بھول جانا، برے اور بھلے میں تمیز نہ کرنا۔ غرض خود ساختہ محدود سی دنیا میں زندہ رہنا اس وقت کی سب سے بھیانک اور خطرناک صورت تھی۔

عقلیت سے دور اور توہم پرستی سے سابقہ رکھنا اس دور کے لوگوں کا چلن ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر عابد حسین کا ڈرامہ "پردۂ غفلت" بھی ایک ایسے ہی ذمہ دار گھرانے کی کہانی ہے، جہاں زندگی سے دور روایت پرستی ہی کو زندگی کی معراج سمجھا جاتا ہے لیکن اسی گھرانے میں کچھ افراد ایسے بھی موجود ہیں جو وقت کے تقاضوں کو محسوس کر کے نئی زندگی کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں، یہ نئی جاگی ہوئی طبقے کے ایک نمائندے ہیں جو پرانے رسم اور رواج اور توہم پرستی کے خلاف بغاوت کرتے ہیں، تاکہ آئندہ آنے والی نسلوں کیلئے بہتری اور بہبودی کا پیغام بن سکے۔ بیسویں صدی میں مغربی ادب اور فلسفے نے ہندوستانیوں کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا مغربی ممالک کی ترقی ہم لوگوں کیلئے باعث رشک ہوئی۔ اور ان علوم پر پہنچنے کی آرزو بھی جاگیں۔ اس نئے طبقہ نے حالات کا جائزہ لیکر زندگی کو نئے انداز سے سنوارنے کی کوشش کی۔ "پردۂ غفلت" دو طبقات کی کشمکش کا ترجمان ہے، ایک طرف وہ طبقہ ہے جو زوال آمادہ تہذیب و تمدن کا حامل ہے اور دوسری طرف ابھرتی ہوئی نئی روشنی کے علمبردار ہیں جو زندگی کو نئی قدریں دینا چاہتے ہیں "پردۂ غفلت" میں یہی تصادم اور مخالفت مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مختلف اور متضاد نظریات نے بہت سے مسائل پیدا کئے ہیں اس قسم کا تصادم بیسویں صدی کی سب سے اہم خصوصیت ہے ڈاکٹر عابد حسین نے ان مسائل میں سے چند مسائل کو اپنے ڈرامے کے لئے منتخب کیا ہے۔ مذہبی روایات کی اندھا دھند تقلید، عورتوں کی حق تلفی اور پیسے اور طاقت کی ہوس اس ڈرامے کے اہم ترین عناصر ہیں۔

ڈرامے کا موضوع نہایت ہی اہم ہے، ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے زوال آمادہ تہذیب و تمدن کی پرانی قدروں سے نجات دلانے کیلئے نئے راستے دکھائے ہیں، انھوں نے ڈرامہ نگاری کے فرائض کو بخوبی انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ موضوع کی ہمہ گیری کے اعتبار سے اس ڈرامہ کی اہمیت سے کسی بھی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پرانی قدروں اور نئی قدروں کی یہ کشمکش ہماری آج کی زندگی کی ترجمان ہے۔ ڈرامہ نگار نے نہایت ہی سیدھے سادے انداز سے ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ ان کے نظریات و خیالات کی ترجمانی میں ایک خاص تناؤ ہے پلاٹ کی ترتیب و تنظیم پر ڈرامے کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے، ڈرامہ نگار نے اس کا ہر طرح خیال رکھا ہے، واقعات و حالات کو پیش کرنے میں تسلسل و ربط کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے اور تذبذب و کشمکش بھی موجود ہے، حالانکہ جتنی حیرت استعجاب کی ضرورت ہوتی ہے اتنی تو اس ڈرامہ میں نہیں ہے، مگر پھر بھی ایک اشتیاق ضرور پیدا ہوتا ہے۔

نقطۂ عروج بھی ڈرامہ کی اہم ضروریات میں سے ہے۔ ڈرامہ نگار نے کوشش کی ہے کہ یکسانیت کو پیدا نہ ہونے دیا جائے، مگر یہ کوشش اتنی کامیاب نہیں ہے۔ واقعات و حالات میں تسلسل و ربط تو باقی رہتا ہے مگر کبھی کبھی وہ بالکل سپاٹ ہو جاتے ہیں جس سے اکتاہٹ پیدا ہونے کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔ ڈرامہ نگار نے ڈرامہ کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے رومان پیدا کرنے کی بھی ضرورت محسوس کی ہے مگر جذبات کی شدت و درکنار جذبات تک کا اظہار نہیں ہو پاتا۔ خاموش محبت ہمارے تہذیب و تمدن کا ایک جزو ضرور ہے لیکن اس کا کسی نہ کسی طرح اظہار ہونا بھی ضروری ہے۔ صرف ایک تصویر اُس جذبے کو ظاہر نہیں کر سکتی۔ جن لوگوں کو نئی مدشی کا علمبردار بنا کر پیش کیا گیا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس بار کو اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔ سعیدہ، منظور اور محمد علی اپنی ہوائی روشنی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن ان میں جوش و ولولہ اور تابندگی نہیں ہے۔ شیخ جی پرانی اور نئی تہذیب کا سنگم ہیں۔ انہوں نے زندگی کے تلخ تجربات سے بہت کچھ سیکھا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ ان کا پیغام نئی نسلوں تک پہنچ جائے۔ ان کے خیالات و نظریات میں بہت جان ہے لیکن ان کی حالت ایک ٹوٹے ہوئے معمار کی سی ہے جس میں تعمیر کی سکت باقی نہ رہی ہو۔ ان کے ٹوٹنے سے جو لوگ فیضیاب ہوئے ہیں ان کی قوتیں بھی کچھ سلب سی نظر آتی ہیں۔ محمد علی کو علی کردار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے لیکن اس میں زندگی کے آثار کچھ زیادہ نظر نہیں آتے۔ جہاں کہیں بھی اس کی صلاحیتوں سے کام لینے کا موقع آیا ہے، وہ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ اس میں ایک حد تک نئے آدمی کی خوبیاں ہیں لیکن ان خوبیوں کو ابھرنے کا موقع نہیں ملا۔ اسی طرح سے دوسرے طبقے کے نمائندہ کرداروں کو ان کی پوری زندگی عطا نہیں کی گئی ہے۔ رقیہ بیگم، محمد حسین کے کرداروں میں پرانی تہذیب کی آئینہ داری موجود ہے۔ ان کا رکھ رکھاؤ، کھلا ہوا نقطۂ نظر اور قوت کارِ جوان ہے۔ علی طبرپران لوگوں کی زندگی محدود ہو گئی ہے۔ ان کے تحت الشعور میں شکست کی آرزو ہے۔ ان کچرے پڑے پن سے اس کا اظہار کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ ان کرداروں میں انسانی فطرت و نفسیات کی عکاسی بہت اچھی طرح کی گئی ہے۔ میر الطاف حسین اپنی سادگی اور مفلسی میں بدولت زندگی سے اپنی ہار تسلیم کر چکے ہیں۔ ان کی ایمان داری، دردمندانہ شفقت انہیں ترکِ دنیا پر مجبور کرتی ہے۔ زندگی کے حقائق کی تلخ نوائی کو عبادت و ریاضت میں پناہ تلاش کر لینے میں ان کی بے نیازی جوان کی سادہ لوحی کی وجہ سے ان کو عزیز ہے۔ خاندان کو تباہ و برباد کر دیتی ہے ایسے لوگوں کی زندگی کی عکاسی ہمیں دوسری جگہوں پر ملتی ہے۔ ڈرامہ نگار نے بنا بنایا ہی چابک دستی سے ان کا کردار پیش کیا ہے۔ محمد حسین کا کردار بھی ڈرامے میں ایک دلچسپ کردار ہے، حالانکہ ڈرامہ نگار اس کردار کو پورے طور سے ابھار نہیں سکا، تھوڑی صحت کے ساتھ اس کے مکالمے جو بہت ہی موزوں ثابت ہو سکتے تھے اس کی راہ میں حائل ہو گئے۔ اس کی احمقانہ باتیں قاری کے لئے بعض اوقات بڑی لطف ہوتیں اگر زبان میں ندرت و رفعت ہوتی۔ اس نے بنا وقت خواہ مخواہ تعلیم حاصل کرنے میں برباد کیا ہے۔ خیر سے وہ اسکول کا ہیڈ ماسٹر بھی ہے۔ لیکن جہاں تک پڑھنے پڑھانے کا سوال ہے وہ اس سے کوسوں دور ہے۔ ڈرامہ نگار نے اس کے کردار کے ان پہلوؤں کو خوب اجاگر کیا ہے۔ غلط انداز سے ان روایات کو جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، مذہب سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ توہم پرستی اور جھوٹے سہاروں کو مشکلات سے نجات حاصل کرنے کا باعث سمجھنا بھی اسی پسماندہ زندگی کی دین ہے۔ فوٹو کی انجام دہی میں کنواری اور دعاؤں کا سہارا لینا زندگی سے فرار کی علامتیں ہیں۔ جو تیور کے کردار میں ان خامیوں کو پیدا کر کے ڈرامہ نگار نے حقائق کی ناپختگی اور کم فہمی کو نہایت ہی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔

انگریزوں کے تسلط کے بعد ہندوستانیوں میں احساسِ کمتری زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ جاپانی ہندوستانیوں نے اپنے تہذیبی ورثے کو بھلا دیا تھا۔ وہاں خود داری بھی کردار سے سرے سے ختم ہو گئی تھی۔ حکومت کی ملازمت کو زندگی کی معراج تصور کیا جاتا تھا۔ ایک ادنیٰ سی ملازمت کو بہت بڑی نعمت خیال کر کے ہندوستانیوں نے اپنے طور پر زندگی کیلئے جد و جہد کرنا چھوڑ دی تھی۔ اگر کوئی فرد محمد منظور کے کسی نکمہ میں چھوٹی سی نوکری حاصل کر لیتا تھا تو دوسروں کی نگاہوں میں نہیں بلکہ خود اپنی نگاہوں میں اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی تھی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ حکومت اس کے بل بوتے پر چلتی ہے۔ حالات کا علم نہ ہوتے ہوئے بھی اس طرح ظاہر کرتا تھا جیسے سب کام اس کے مشورے سے ہوتے ہوں۔ محسن کے کردار میں ڈرامہ نگار نے بڑی چابکدستی سے ان تمام کمزوریوں کو اُبھارا ہے۔

"پیروۂ غفلت" میں نئے اُبھرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کی جھلک بھی پیش کی گئی ہے۔ سیتا رام گاؤں کا ایک معمولی ساہوکار ہے۔ لیکن اس کے انداز کسی طرح بھی ایک سفاک سرمایہ دار سے کم نہیں۔ خوشامد کر کے قرب حاصل کرنا اس کی عادتِ ثانیہ ہے۔ آئندہ زندگی کی خوشحالی کیلئے زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنا اس کی فطرت ہے، وہ ظاہر و طور پر اپنے آپ کو چھوٹے سے چھوٹا پیش کرتا ہے، مگر جب اس کا مطلب نکل جاتا ہے تو وہ آنکھیں دکھا سکتا ہے، لین دین کرنے والے سود خور بنیئے کے کردار کی عکاسی ڈرامہ نگار نے بہت ہی خوبصورتی سے کی ہے۔ گنگا سہائے کے پاس

ایک ایمان دار دُکاندار کی خصوصیات بُجوبی ملحوظ ہیں۔ وہ نہایت ہی ہوشیار اور چالاک ہے۔ معاملات کا صاف، دھوکا، اور ریاکاری سے کوسوں دُور ہے۔ وہ اپنے مالکوں کو فیض پہنچانے کے لئے اپنی جان کو ہتھیلی پر لئے پھرتا ہے۔ اس کا کردار اُس پُرانی روش کے لوگوں کا کردار ہے جو کسی خاندان سے وابستہ ہو کر زندگی بھر اُن کی بہتری اور بہبودی کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔

غرضیکہ ڈرامہ نگار نے سماج کے مختلف طبقات کے نمائندہ کرداروں کو پیش کر کے پُرانی روایتی قدروں کی کشمکش کو قلم بند کیا ہے۔ ڈرامہ کے بیشتر کرداروں میں عمل و حرکت کی خوبیاں موجود ہیں، مگر بسا اوقات اُن کی زندگی اُن سے دُور بھی ہو جاتی ہے، ڈرامہ کی زبان آسان و سلیس ہے۔ استعارات اور تشبیہات، محاکات، معنی، فطرت کی گہرائیاں، تجربات و مشاہدات پُورے تنوع اور فراوانی کے ساتھ پائے جاتے ہیں، مکالمے کرداروں کی مناسبت سے بہت خوب ہیں۔ کہیں کہیں اُن کی طوالت سے اُکتاہٹ بھی ہونے لگتی ہے، خصوصاً شیخ جی کے مکالمے جو ڈرامے کی جان ہیں، کہیں کہیں صرف تقریر ہو جاتے ہیں، رقیہ بیگم کے مکالمے اُن کے کردار کی صحیح اور سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ منظور اور سعیدہ کے کردار مکالموں کی کمی کی وجہ سے دب کر رہ گئے ہیں۔ احمد حسین اور سیتا رام کے مکالمے لاجواب ہیں، قارئین کی دلچسپی کیلئے بطور نمونہ چند مکالمے پیش کرتا ہوا اُڑا خاطر ہوں۔

پہلے ایکٹ سین نمبر ۲ سے ڈرامہ نگار نے رقیہ خاتون کا کردار ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ ۵۲ سال کی ہے۔ ہندوستانی عورت شوہر پرست تو ہوتی ہے کسی بھی حالت میں شوہر کی بُرائی نہیں سُن سکتی۔ رقیہ بھی ہندوستانی عورتوں میں سے ایک ہے، جب وہ شیخ جی سے ملنے جاتی ہے اور شیخ جی کھانسنے لگتے ہیں۔ تو وہ کہتی ہے۔

"بُڑھاپا سو بیماریوں کی بیماری ہے، اب تو آپ خدا۔ کے پانچ اُوپر ستّر برس کے ہیں، صفرا کے باپ کو بھی ساٹھ پُورے نہیں ہوئے۔ وہ بھی سدا کے روگی ہو گئے ہیں۔"

شیخ جی اس پر کہتے ہیں۔

"اجی الطاف میاں کی نہ کہیئے۔ وہ جوانی ہی میں کون سے تندرست تھے، بات یہ ہے کہ جب انسان ایک اندھیری کوٹھری میں رات دن نماز پر بیٹھا رہیگا تو صحت آپ ہی خراب ہوگی۔"

رُقیہ غصہ میں کہتی ہے۔

"آپکے نزدیک جو اللہ کا نیک بندہ نماز و ظیفے میں اپنے دن کاٹے وہ نکما ہے۔"

پھر شیخ جی الطاف حسین کی بُرائی کرتے ہیں تو رُقیہ کہتی ہے۔

"میں احمد حسین کی طرف سے تو کچھ نہیں کہتی، لوگ کہیں گے ہیں ہے طرف داری کرتی ہے لیکن صفرا کے باپ کو کوئی دُوسرا کچھ کہتا تو مُنہ جھلس دیتی، غضب خُدا کا، جس شخص نے دُنیا کو چھوڑا، چین اور آرام تج دیا، دن رات کی عبادت میں اپنی جان ہلکان کر دی، وہ لوگوں کے نزدیک کاہل ہے۔"

جب سعیدہ کی شادی کے بارے میں بات چیت ہوتی ہے تو رُقیہ کہتی ہے۔

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ اُس کی شادی تم محمد علی سے کرنا چاہتے ہو جو منھ پھٹ ہے گھنے ہیں وہ مُنھ سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ مجھے رتی رتی کی خبر ہے، چاہے دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے لیکن اُس کی شادی محمد علی سے نہیں ہونے دوں گی۔ دیکھوں میں مار خاں ہے جو میرے مقابلہ آئے گا۔"

شیخ جی فوراً بول اُٹھتے ہیں۔ "سعیدہ ــــ"

اور رقیہ خاتون یہ کہتے ہوئے چلی جاتی ہے۔

"دیکھوں گی یہ بالشت بھر کی لڑکی کیسے پُورے کُنبے سے لڑتی ہے۔"

قارئین کو اندازہ ہو گیا ہوگا، ڈرامہ نگار نے کس خوبصورتی سے عورت کے کردار کو اُبھارا ہے۔

اب ذرا ایک دو مکالمے سیتا رام اور رحیم بن کے سُنیئے۔

"سرکار آپ اور آدھ میاں، کچھ دو تھوڑی ہیں، ہم آپکے بھی تابعدار ہیں اُن کے بھی۔ اور آپ دونوں سے ہم بھکاؤ دوبدو کی بات چیت کریں گے؟ گھر کا کام جان کر کرتے ہیں۔"

(بقیہ صفحہ ۳۸ پر دیکھئے)

آخری رات

کیفی اعظمی

چاند ٹوٹا پگھل گئے تارے
قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے رات
پلکیں آنکھوں پہ جھکتی آتی ہیں
انکھڑیوں میں کھٹک رہی ہے رات
آج چھیڑو نہ کوئی افسانہ
آج کی رات ہم کو سونے دو

کھلتے جاتے ہیں سمٹے سکڑے جال
گھلتے جاتے ہیں خون میں بادل
اپنے گلنار پنکھ پھیلائے
آرہے ہیں اسی طرف جنگل
گل کرو شمع، رکھ دو پیمانہ
آج کی رات ہم کو سونے دو

شام سے پہلے مر چکا تھا شہر
کون دروازہ کھٹکھٹاتا ہے
اور اونچی کرو یہ دیواریں
شور آنگن میں آیا جاتا ہے
کہہ دو ہے آج بند مے خانہ
آج کی رات ہم کو سونے دو

جسم ہی جسم ہیں، کفن ہی کفن
بات سنتے نہ سر جھکاتے ہیں
امن کی خیر، کو توال کی خیر
مردے قبروں سے نکلے آتے ہیں
کوئی اپنا نہ کوئی بے گانہ
آج کی رات ہم کو سونے دو

کوئی کہتا تھا، ٹھیک کہتا تھا
سرکشی بن گئی ہے سب کا شعار
قتل پر جن کو اعتراض نہ تھا
دفن ہونے پہ کیوں نہیں تیار
ہوشمندی ہے آج سو جانا
آج کی رات ہم کو سونے دو

نور شاہ
کہانی

اندھیرا اور اندھیرا

ایک لہر۔!

بس ہوا کی ایک لہر کا انتظار ہے جس کی آمد سے فاختائی رنگ کا یہ پردہ سرسرانے لگے گا' اور بیتی عمر کے لمحے آنکھوں کے سامنے تھرتھرا اُٹھیں گے۔ چاہت کے سارے روپ سارے رنگ گھل مل جائیں گے۔ میں سوتیا کو دیکھ سکوں گا۔

خواب خیال سے بھری بھری آنکھیں'
مرمریں گالوں پر ہلکی شہابی رنگت'
گلابی ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ'
بچے کچے اور مضبوط جسم کی حرارت ـــ !!!

میں ابھی ابھی اس کمرے میں آیا ہوں۔ یہ کمرہ میرا جانا پہچانا نہیں ہے' یہاں میں پہلی بار آیا ہوں لیکن یہاں کی ہر چیز' ہر شے' ہر سجاوٹ اس کمرے سے بالکل ملتی جلتی ہے جہاں میں نے سوتیا کو پہلی بار دیکھا تھا' سب کچھ ویسا ہی ہے' کمرے کا رنگ' کھڑکیوں کے پردے' فرش کا قالین' اور اس کے نقش و نگار سب کچھ وہی ہے' سامنے یک شلف پر کتابیں بھی اسی انداز سے رکھی ہوئی ہیں' اور اس پر رکھا ہوا فریم ـــ ہاں صرف تصویر بدلی گئی ہے

یہ تصویر میری نہیں ـ یہ تصویر.....؟

"آپ کیسے کافی ـــ؟"

ایک سوچ ادھوری رہ گئی ـــ

"اور سوتیا ـــ" میں نے پوچھا۔

"وہ ابھی تیار ہو کر آ رہی ہیں ـــ"

"سوتیا کو میرے آنے کا علم ہے"۔

"جی ہاں۔ آپ کو دیکھ کر ہی تو کافی بھجوائی ہے' وہ سامنے کے کمرے میں ہیں۔ آپ بغیر دودھ کے کافی پیتے ہیں نا؟"

"تم کیسے جانتی ہو؟"

"مالکن کہہ رہی تھی۔"

ایک سوچ ماضی میں کھو گئی ـ کھو کر بکھر گئی ـ بیتی عمر کا ایک لمحہ جاگ پڑا ـ اور یہ لمحہ ـ یہ سوچ مجھے دلی کی اجنبی راہوں سے دور کشمیر کی جانی پہچانی گلیوں میں لے جاتی ہے' جہاں میں نے سوتیا کو اپنانے کا ایک خواب دیکھا تھا ـــ بڑی پرانی بات ہے' جب میں سوتیا سے ملا تھا' ایک تجرّد یا سی تھی وہ اُن دنوں ـــ بس گڈے گڑیوں کا کھیل رچاتی تھی ـــ ریت کے گھروندے بناتی تھی' اپنی تمنا کا اظہار نہ کر پاتی تھی۔ پھر میں آیا۔ میں نے ریت کے گھروندوں کو ڈھا دیا۔ وہ رو پڑی۔

میں نے پوچھا۔ "رو کیوں رہی ہو ـــ؟"

"کتنا خوبصورت گھروندا بنایا تھا' اور تم نے...."

میں نے کہا ـ "پگلی رو کیوں رہی ہو' میں تمہارے لئے گھر بناؤں گا ـــ"

وہ ہنس پڑی۔

لڑکپن کی کہانی بیت گئی۔ گڈے گڑیوں کے کھیل ختم ہو گئے گھروندے ڈھ گئے ـــ ایک نئی کہانی کا جنم ہوا۔ ایک نئی تمنا کا اظہار ہوا۔ زندگی ایک نئی آدم آمنہ بن گئی۔ اور اس میں ظاہر ہونے کے لئے بیتاب تمنا کا روپ ہم دونوں نے اپنا لیا' جیسے ہمارا لڑکپن' ہمارا پیار' انتظار کی گھڑیاں لئے مدتوں ایک دوسرے

کا منتظر تھا۔

میں نے کہا

"سوتیا آؤ اب انتظار کی ان پہاڑ سی لمبائیوں کو کم کر دیں۔"

"زندگی بجائے خود ایک سراپا انتظار ہے ــــ انتظار ایک شیریں لمحہ کا انتظار ــــ پھر لمبائیاں خود بخود کم ہو جاتی ہیں فاصلے سمٹ جاتے ہیں ــــ"

"اور پیار ــــ"

"پیار اسی بیٹھے ہوئے نقطے کا نام ہے ــــ"

لمبائیاں کم ہو گئیں۔ فاصلے سمٹ گئے ہاں ہاں بس ایک قدم ہی کی تو بات تھی پھر اجالا ہی اجالا دور دور تک پھیلا ہوا ــــ

میں نے کہا

"سوتیا کل ماں تمہارے گھر آ رہی ہے۔"

اس کی شہد بھری آنکھیں جھک گئیں ــــ

اس رات میں نے ایک خواب دیکھا تھا جیسے پری محل کے سارے کھنڈر آباد ہو گئے ہوں۔ پری محل کی پریاں گیت سنا رہی ہوں۔ اور سوتیا میری منتظر ہو ــــ

"تم کب آ گئے۔ کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی"

میں بھی کب سے تمہیں تلاش کر رہا تھا۔

"آؤ ــــ میں تمہیں اپنا محل دکھاؤں گی، تمہارے سر پر زرد پیلے پھولوں کا تاج رکھ کر سارے پری محل میں گھما پھرا دوں گی۔ پریوں کے گیت سناؤں گی۔ پیار بھرے گیت ــــــ قریب تو آؤ ــ دیکھو میں نے تمہارے لئے مغل شہزادی کا روپ اپنا لیا ہے پتھر کے طاقوں پر میں نے چراغ روشن کر رکھے ہیں۔

"نہیں سوتیا ــــ"

"کیوں؟"

"مجھے ایسے محلوں میں گھٹن سی ہوتی ہے، چلو چلیں۔"

"کہاں؟"

"پری محل سے دور ــــ ڈل جھیل کے اس پار ــــ اس بستی میں جہاں میرے جیسے لوگ رہتے ہیں وہاں ہم اپنا گھر بنائیں گے۔ ایک ایسا گھر جس کے خواب ہم نے لڑکپن سے دیکھے تھے ــــ"

"اور یہ محل ــــ"

"وہ دیکھو سوتیا ــ ہاں ڈل جھیل کے کنارے پھولوں سے سجی کھنوری ناؤ ہماری منتظر ہے۔ اسی ناؤ میں سوار ہو کر چلو چلیں اپنی دنیا میں، اپنی بستی میں، اپنے گھر میں ....."

میں سوتیا کا ہاتھ پکڑنے کے لئے اور قریب سرک آیا۔ دفعتاً طوفان اٹھا۔ سناٹی سیٹیاں بجاتا ہوا طوفان ــــ سارے چراغ بجھ گئے ــ گہرا اندھیرا چھا گیا۔

میں چلا اٹھا۔

"سوتیا تم کہاں ہو؟"

میری آنکھ کھل گئی ــ بس ایک خواب تھا ــ ٹوٹ گیا پری محل کے سارے کھنڈر ایسے ہی ویران پڑے تھے ــ کوئی پری نہ تھی ــ پریوں کے گیت نہ تھے۔

اور پھولوں سے سجی سنوری ناؤ۔

وہ بھی نہ تھی!!

لہر قی تھرکتی، بھنور اتی گئی ــ

نہ جانے کس نے کنکر پھینکے

پانی میں

پڑ گئے ان گنت دائرے

میں نے سوچا ــ کاش میں ہوتا سوار

اس ناؤ.....

لیکن میں ناؤ میں سوار نہ ہو سکا سوتیا بھی اس ناؤ میں سوار نہ تھی ــ کوئی اور آیا تھا پھولوں سے سجی سنوری کار میں اور سوتیا کو اسی میں بٹھا کر لے گیا۔

یہ منموہن تھا ــ

اور تصویر بدل گئی ــ جس فریم میں میری تصویر تھی وہ منموہن کی تصویر میں بدل گئی۔

فاصلے بڑھ گئے۔ دوریاں لمبی ہو گئیں، اور زندگی ایک سراپا انتظار بن گئی ــ ایک لمحے کا انتظار رہا

ماں نے کہا۔

"سوتیا کے والدین کو یہ رشتہ پسند نہیں۔ وہ بڑے لوگ ہیں۔ انہیں اپنی بیٹی کے لئے ایک کوٹھی، ایک کار اور بھی جانے کیا کیا چاہیئے ــ"

"لیکن سوتیا اور اس کا پیار ــ" میں نے سوچا۔

شاید اس کا پیار پاگل پن بن گیا تھا !!!

منموہن سوتیا کو پری محل کے کنگنوروں سے دور ڈل کے پانیوں اور ڈل کے اس پار کی بستی سے دور کشمیر کی جانی پہچانی گلیوں سے دور، دلی کی اجنبی راہوں میں لے گیا۔

ایک یگ ختم ہوا۔

ایک کہانی بیت گئی۔

بیتی عمر کا ایک لمحہ جاگا اور جاگ کر سو گیا۔ !!!

یہ تصویر میری نہیں ۔ یہ تصویر منموہن کی بھی نہیں۔ یہ تصویر ..... ؟!

بس ہوا کی ایک لہر کی آمد کا انتظار ہے۔

"آپ کے لئے اور کافی؟"

ایک بار سوچ پھر ادھوری ہو گئی۔

"نا بھئی اپنی مالکن سے کہدو میں..."

"صاحب بس وہ ابھی آ رہی ہیں۔"

"تم یہاں ؟"

"نوکر ہوں ۔"

"کب سے ؟"

"جب سے بڑے صاحب چلے گئے۔"

"اوہ ۔ یہ تصویر کس کی ہے جانتے ہو ؟"

"ہاں صاحب ۔"

"بستی ....."

یہ آواز سوتیا کی ہے، میں اس آواز کی مٹھاس سے واقف ہوں۔

"آیا مالکن"

بستی بھی چلا گیا، اور سوتیا ابھی تک نہیں آئی۔

دلی سے سوتیا نے کئی خط لکھے، وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتی تھی، جانے کیا کیا سنانا چاہتی تھی، ہر خط میں دلی آنے کی تاکید کرتی تھی، میں نے بھی کئی بار دلی جانے کے پروگرام بنائے۔ ہر بار منموہن کی صورت نظروں کے سامنے گھوم گئی۔

اور میں نے سوتیا کے کئی خط بن کھولے، بن پڑھے آگ کی نذر کر دئے ۔ !!

پھر ایک دن سنا، سوتیا منموہن سے طلاق لے رہی ہے !!

منموہن کسی دوسری جگہ جا کر رہنے لگا ہے، یہاں سارے کنبہ میں یہ خبر دھند کی طرح پھیل گئی۔

میں نے سوتیا کو ایک خط لکھا۔

میں نے لکھا ۔ سوتیا میں سن رہا ہوں کیا یہ سب صحیح ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم منموہن سے طلاق لے رہی ہو۔ کیونکہ تمہاری زندگی میں کوئی اور آیا ہے، تم اب کسی اور کو چاہنے لگی ہو۔ سوتیا کہدو یہ سب جھوٹ ہے۔"

سوتیا نے لکھا ۔ یہ سب صحیح ہے، مجھے منموہن سے بیحد ہمدردی ہے۔ صرف ہمدردی ۔ میں اسے پیار نہ دے سکی، میں نے بڑی کوشش کی تھی کہ اسے پیار دے سکوں، پر مجھ سے ایسا نہ ہو سکا۔ اور منموہن چلا گیا ۔ ہاں میری زندگی میں شیراز آ گیا ہے ۔ میں شیراز سے محبت نہیں کرتی ۔ میں اب کسی سے محبت نہیں کرتی، تم سے بھی نہیں، میں صرف اپنے آپ سے پیار کرتی ہوں۔ اپنی خوبصورتی سے پیار کرتی ہو، میں نے محبت کا مفہوم اب پا لیا ہے۔

"..... !!"

جب اپنے آپ سے، اپنے جسم اور اپنی خوبصورتی سے پیار کرنے کا جذبہ امڈ آتا ہے تو اندر کا انسان مر جاتا ہے، آدمی وحشی بن جاتا ہے، سوتیا کی اندر کی عورت بھی شاید مر چکی تھی، اور ایسے وقت میں نے سوچا، میرے دلی جانے کی ضرورت ہے۔

اور میں نے دلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔

سوتیا ابھی نہیں آئی۔

یہ تصویر مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی ہے، یہ تصویر شیراز کی ہے۔ !!!

ہوا کی جس لہر کا مجھے انتظار تھا، وہ آ چکی ہے، پردے میں سرسراہٹ ہو رہی ہے

"تم کب آئے ویریندر ۔ کیسا ہے تمہارا کشمیر۔"

"سوتیا ۔ یہ ۔ تم ہو"

"ہاں میں ہوں، تم گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو"

(بقیہ صفحہ ۳۲ پر دیکھئے)

شعورِ مرگ

اُسے نہیں معلوم
کہ اماں کیوں روتی ہیں
سر لٹکائے نہیں کیوں بیٹھی رہتی ہیں
سورج ڈھلتے ہی
کُتّا رونے لگتا ہے
گھڑی گھڑی دروازے کو تکنے لگتا ہے
گھر کا آنگن میلا میلا کیوں رہتا ہے
جگہ جگہ پر پانی پھیلا کیوں رہتا ہے
اُسے نہیں معلوم
کہ گڑیا کب آئی تھی
مٹی کی ہنڈکلیا کس نے دلوائی تھی
لیکن
جب کوئی پھیری والا آتا ہے
یا کوئی گھر والا اُس کو دھمکاتا ہے
جانے وہ کیا اِدھر اُدھر دیکھا کرتا ہے
جیسے کھوئی کھوئی شے ڈھونڈا کرتا ہے
اور اچانک
چلّا کر رونے لگتا ہے
اُسے نہیں معلوم

علیم اختر مظفر نگری

غزل

جب بھی وہ بہ صد لطف و کرم ساتھ چلے ہیں
سہمے ہوئے، اندازِ ستم ساتھ چلے ہیں
ہم اُن کی بھری بزم سے نکلے نہیں تنہا
خود بھی تو وہ دو چار قدم ساتھ چلے ہیں
سُنتے ہی صدائے جرسِ قافلۂ یاد
وہ اشک، وہ پروردۂ غم، ساتھ چلے ہیں
کیا جانے کیا سوچ کے اُٹھے ہیں دِوانے
سمجھاتے ہوئے دیر و حرم، ساتھ چلے ہیں
پہنچی ہے تری زُلفِ سیہ تاب کمر تک
جب کاکلِ شبرنگ کے خم، ساتھ چلے ہیں
بھٹکے نہ کوئی رہگزرِ شوق سے اختر
راہوں پہ مرے نقشِ قدم ساتھ چلے ہیں

سید تقی احمد ارشاد

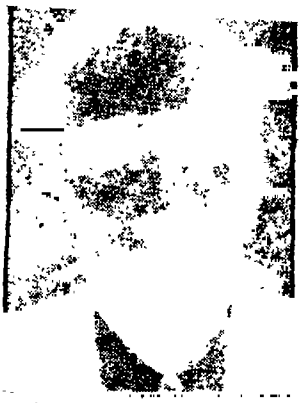

حافظ کا اثر شعرائے اُردو پر

نہ جانے کون سے عالم میں حافظ نے یہ اشعار لکھ کر سلطان غیاث الدین تغلق کے پاس بنگال بھیجے تھے۔ جب وہ بنگالہ کا صوبہ دار تھا یا بنگالہ میں موجود تھا۔ مگر یہ واقعہ یقیناً ۷۷۰ھ کے بعد کا ہے۔ کہتا ہے ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند — این قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود
حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دین — خامش مشو کہ کار تو از نالہ می رود

(سارے ہند کے طوطی خوش ہوں گے۔ اس فارسی غزل سے جو بنگالہ جا رہی ہے۔ اے حافظ سلطان غیاث الدین کی مجلس کے شوق سے خاموش مت رہ۔ اس لئے کہ تیرا کام نالۂ وزاری ہی سے جاری ہے)

اُس زمانے کے شعرائے ہند و علمائے ہند میں (۱) سعد منطقی (۲) مولانا علیم الدین (۳) عبید فارسی گو شاعر بہت مشہور تھے۔ عبید کے رہتے ہوئے حافظ کا شہرہ شیراز سے بنگالہ تک تھا۔ چونکہ غیاث الدین تغلق بادشاہِ دہلی صاحبِ علم و کمال تھا۔ اُس نے خواجہ کو مدعو کیا تھا۔

الغرض جب فارسی کے بعد، ہندوی، ریختہ اور اُردو میں اشعار کہے جانے لگے تو بھی کلامِ حافظ زبانوں پر چڑھا رہا۔ اس کی واضح مثالیں تمام اُردو گو شعراء کے یہاں ملتی ہیں۔

حافظ:- جاں دادمش بہ مژدۂ وخجلت ہمی برم — زیں نقد کم عیار کہ کردم نثار دوست

(بے خوش خبری میں اُس کو جان دے دی اور شرما رہا ہوں اس کم قیمت پونجی سے، جو میں نے دوست پر نچھاور کر دی)

غالب:- جاں دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پہلے حق کے معنی سچ اور دوسرے حق کے معنی ذمّہ۔

حافظ:- فرصت نگر کہ فتنہ چوں در عالم اوفتاد — عارف بجام می زد و از غم کراں گرفت

(فرصت کو دیکھ کر کہ جب فتنہ عالم میں ہوا۔ عارف نے پیالے میں شراب بھری اور غم سے کنارہ کر لیا)

غالب:- مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

حافظ:- معجز است این شعر یا سحرِ حلال — ہاتف آورد این سخن یا جبرئیل

(یہ شعر معجزہ ہے یا سحرِ حلال۔ یہ بات ہاتف لایا ہے یا جبرئیل لائے ہیں)

غالب:- آتے ہیں غیب سے یہ معانی خیال میں — غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

حافظ:- چو طفلان زاہدا تا کے فریبے — بہ سیبِ بوستان و شہد و شیرم

(اے زاہد! تو بچوں کی طرح مجھ کو کب تک فریب دے گا۔ بوستان کے سیب، شہد اور دودھ سے)

شہد اور شیر کے ذکر اور سیبِ بوستان سے اشارہ ہے کلامِ پاک کی سورۃ اَلْغَاشِیَۃ کی طرف اور دوسری سورت

کی طرف جس میں جنت کا ذکر ہے

غالب:- ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

میرے خیال میں غالب کے اس مصرعہ سے دیوانچہ میں نصف سے زیادہ کلام درحقیقت بیدل، صائب، عرفی اور حافظ کا ترجمہ ہے۔

غالب کے علاوہ بہت سے قدیم وجدید شعراء نے گویا کلام حافظ کا ترجمہ اپنے کلام میں داخل کیا ہے۔ جو جو مثالیں یاد آتی جائیں گی لکھتا جاتا ہوں۔

حافظ کے اس مضمون کا ؎ جان دادش بہ مژدۂ وغلت ہی برم۔ الخ جیسا غالب نے ترجمہ کیا ہے۔ اسی طرح آزردہ نے بھی ترجمہ کیا ہے ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

حافظ:- گر ز مسجد بہ خرابات شدم عیب مکن مجلس وعظ دراز است وزماں خواہد شد

(اگر میں مسجد سے شراب خانہ میں چلا گیا تو عیب جوئی نہ کر۔ وعظ کی مجلس طول کھینچتی ہے اور اس کیلئے وقت درکار ہے)

قائم:- مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی قائم یہ ہے مے خانہ سبھی پی کے چلے جائیں گے

قائم نے معنوی اضافہ کیا ہے۔

حافظ:- دے درمیان زلف بدیدم رخ نگار بر ہیئتے کہ ابر محیط قمر شود

(کل میں نے زلف کے درمیان محبوب کے رخ کو دیکھا۔ اس طرح کہ ابر نے چاند کو گھیر لیا تھا)

داغ:- روئے روشن کے قریں زلف اگر ہوتی ہے ایک جا کیفیت شام و سحر ہوتی ہے

شاد:- رخ روشن پہ بل کھائی ہوئی زلفوں کا جھک پڑنا جو سچ پوچھو تو اس ماہ سحاب آلودہ نما را

داغ کے یہاں تشبیہ کا فرق ہے۔

حافظ:- میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

(عاشق و معشوق کے درمیان کوئی روک نہیں ہے۔ اے حافظ! تو خود ہی اپنا پردہ ہے۔ بس اے حافظ تو درمیان سے اٹھ جا)

آتش:- نا فہمی اپنی پردہ ہے دیدار کے لئے ورنہ کوئی حجاب نہیں یار کے لئے

حکیم مومن کی یہ غزل "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کس قدر مقبول ہوئی اور درحقیقت یہی غزل ان کے پورے دیوان کی جان ہے۔ مگر کلام حافظ کو غور سے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مومن نے تقریباً حافظ کی پوری غزل کا ترجمہ کر دیا ہے۔

حافظ کی غزل نواشارکی ہے اور ہر شعر کے پہلے "یاد باد آنکہ" کا فقرہ ہے، جس کا ترجمہ مومن خان نے "تمہیں یاد ہو کہ زیادہ ہو" کر دیا ہے اور اسی کو ردیف قرار دیا ہے۔ حافظ کہتا ہے ؎

یاد باد آنکہ نہانت نظری با ما بود رقم مہر تو بر چہرۂ ما پیدا بود

(تجھے وہ زمانہ یاد ہوگا کہ در پردہ نظر سے تو مجھ کو دیکھتا تھا۔ اور تیری محبت کی رقم ہمارے چہرے سے ظاہر تھی)

یاد باد آنکہ رخت شمع طرب می افروخت دین دل سوختہ پروانۂ بے پروا بود

(تجھے یاد ہوگا وہ زمانہ کہ تیرا رخ خوشی کی شمع روشن کرتا تھا اور یہ سوختہ دل پروانۂ بے پروا بنتا تھا)

حافظ اور مومن کی غزل میں صرف اتنا فرق ہے کہ حافظ کا محبوب کوئی مرد معلوم ہوتا ہے۔ اور مومن کی محبوبہ عورت ہے۔ حافظ کے اسی شعر سے معلوم ہوتا ہے ؎

یاد باد آنکہ مرا من چو کلہ بشکستے در کلاہش مہ نو پیک جہاں پیما بود

(تجھے یاد ہوگا وہ زمانہ جبکہ میرا ماہ نو جیسی ٹوپی سر پر دھرتا تھا۔ اس کی رکاب میں ماہ نو خادم بن کر دوڑتا تھا)

حافظ:۔ حافظ تو برو بندگیٔ پیر مغاں کن بر دامن او دست زن و از ہمہ بگسل

(اے حافظ جا پیر مغاں کی پیروی کر، اس کا دامن پکڑ اور سب سے علیحدہ ہو)

یگانہ، یاس:۔ کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

کلام انیس پر حافظ کا اثر:۔ یہ تو غزل گو شعراء کا حال ہوا۔ مراثی انیس و شاہ کو غور سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ بعض تضمین انھوں نے حافظ کے اشعار کو استعمال کیا ہے۔ یا بعض جگہ فارسی کے مصرعوں میں حافظ کی ترکیب استعمال کی ہے۔

حافظ:۔ معجز ست این شعر یا سحر حلال

میر انیس:۔ معجزہ گر نہ اسے کہیے تو ہے سحر حلال

حافظ:۔ با خرابات نشینان زکرامات ملاف ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

میر انیس اپنے مشہور مرثیہ ع "نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری" میں کہتے ہیں ؎

داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد ہر سخن نکتہ و ہر چیز مقامے دارد

قوافی بدل دینے سے بھی حافظ کی خو بو باقی رہی۔

حافظ:۔ بریں دو دیدۂ حیران من ہزار افسوس کہ با دو آئینہ رویش عیاں نمی بینم

(مجھے اپنی ان دو حیران آنکھوں پر افسوس ہے۔ کہ دو آئینہ رکھتے ہوئے بھی میں اس کے چہرے کو صاف نہیں دیکھ سکتا ہوں)

تشبیہ وہی ہے مگر مفہوم بدل کے کہا ہے ع حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں۔

مراثی شاد پر حافظ کا اثر:۔ امام حسین علیہ السلام کا خط کربلا سے لیکر قاصد کوفے میں جناب حبیب ابن مظاہر کے پاس پہنچتا ہے۔ اس موقع پر نظم کرتے ہیں ؎

ہاتھ میں پہلا تھا نامہ کہ ہوا دل بیتاب کون ہے تو ہی کہتے ہوئے دوڑے وہ شتاب

قاصد سبط پیمبر ہوں دیا اس نے جواب نہ رہی تاب کیا کھول کے در کو یہ خطاب

اے صبا نکہت گل از تو بمشے می آید
بوئے ہمدردیٔ فریادرسے می آید

بارک اللہ لک احسن کہ مسیح زمنی اے بقربان قدوم تو کہ معجز دہنی

پاس داری اگر از دلبر من حرف زنی تا نہ در ملک دلم شور قیامت فگنی

تاب در خاطرم از دوریٔ دلدار کجاست
اے نسیم سحر آرام گہ یار کجاست

دوسرے بند کی بیت کا آخری مصرعہ حافظ کے مطلع کا پہلا مصرعہ ہے ؎

اے نسیم سحر آرام گہ یار کجاست منزل آں مہ عاشق کش عیار کجاست

(اے نسیم سحری یار کی آرام گاہ کہاں ہے۔ اس عاشق کو قتل کرنے والے شوخ ماہرو کی منزل کہاں ہے)

موجودہ دور میں حافظ کا اثر:۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ۴۴-۱۹۴۳ء میں رسالہ "زمانہ" کانپور میں جناب مقبول احمد صاحب کی خالص اردو میں ایک غزل چھپی تھی۔ جس میں حافظ کی مشہور غزل "اگر آں ترک شیرازی" الخ کا ترجمہ تھا۔

اب کوئی شعر یاد نہیں۔ ہاں "سمرقند و بخارا" کے بدلے مقبول احمد صاحب نے یہ فقرہ نظم کیا: "بنگالہ دیس لٹائیں گے"۔
حال میں جناب نریش کمار شاد نے "دو آتشہ" کے عنوان سے خواجہ حافظ کے چند اشعار کا ترجمہ قطعاتِ اردو میں پیش کیا ہے۔ اس کا پیش لفظ علامہ مسعود لکھنوی نے لکھا ہے۔

راقم کے خیالِ ناقص میں خواہ کیسا ہی بڑے سے بڑا شاعر کیوں نہ ہو جب اصل کلام اپنے سامنے رکھ کر نظم میں ترجمہ کریگا تو بجائے آمد یقیناً آورد پیدا ہوگی۔ چنانچہ یہ مختصر سا مجموعہ "دو آتشہ" بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ مثال ؎

مے خور کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

(ترجمہ۔ شراب پی کہ شیخ اور حافظ اور مفتی اور محتسب کو۔ اگر تو بغور دیکھے تو سب مکر و فریب کر رہے ہیں۔ مطلب: اے مخاطب! تو بھی شراب پی اس لئے کہ مفتی اور محتسب سب کے سب مکر کر رہے ہیں کہ ظاہر میں شراب سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور پردے میں شراب پیتے ہیں۔ پس تو بھی پی کہ مضائقہ نہیں)

اس شعر میں درحقیقت حافظ نے اپنے عہد کے علماء پر طنز کیا ہے۔ جناب نریش کمار شاد نے جو ترجمہ کیا ہے ملاحظہ ہو ؎

جانِ من سرپھروں کی باتوں پر بے تکلف اُٹھا شراب کا جام
محتسب، شیخ، واعظ اور مفتی سب فریبی، زمانہ ساز تمام

پہلے مصرعہ میں "سرپھروں" کا فقرہ نہ صرف مخلِ فصاحت ہے بلکہ غلط ترجمہ ہے۔ بہرکیف نریش کمار شاد کی کاوش بھی قابلِ ستائش ہے۔

میرے خیال میں بہتر ترجمہ وہی ہوتا ہے کہ صرف مفہوم کو ذہن میں رکھ کر حسبِ اقتضائے زبان و بیان، قوافی و ردیف کی پابندی کیساتھ کوئی کسی نظم کہے، ہوئے خیال کو بعنوانِ احسن اپنی زبان میں نظم کر دے۔ مثال ؎

حافظ:- بہ بوئے نافہ کآخر صبا زاں طرہ بکشاید ز تابِ جعدِ مشکینش چہ خونِ افتاد در دلہا

(اس نافہ کی امید میں کہ صبا آخر اس طرہ سے کھولے گی۔ اس مشکیں زلف سے کیا کیا خون ہوئے ہیں)

مطلب:- نافہ کنایہ ہے پیغام حضرت صمدیت سے، جو بذریعہ ملک الموت کے پہنچتا ہے اور اس کے پہنچنے کے وقت ارواحِ مقدسہ زندہ تن سے نکل کر شاداں و فرحاں حضرت ذوالجلال کی طرف رجوع کرتی ہے۔

اس کا ترجمہ جو بغیر کسی قصد کے شاد عظیم آبادی کے شعر میں آیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

کھلا ہے بامِ پر جو اصبا کس جعدِ مشکیں کا کہ مجھ تک بوئے گیسوئے رواں رکاروں پہنچی

غزل کا شعر ہے۔ رکاروں کی فصاحت و بلاغت پر غور کیجئے۔ مطلب یہ کہ اس پیام فدا الجلال کا سلسلہ ازل سے تا بحال جاری رہے گا۔ گزرنے والے پیام سن سن کر گزرتے جا رہے ہیں اور اب یہ پیام مجھ تک پہنچا ہے۔

دوسری مثال ؎

شبِ تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل کجا داند حالِ ما سبک ساران ساحل ہا

(اندھیری رات، لہر کا خوف، ایسا خوفناک بھنور، کنارے کے سبک سر سہارے حال کو کیا جانیں)

مطلب:- شبِ تاریک سے مراد دنیا، موج کنایہ ہے حوادثِ زمانہ کا۔ گرداب کنایہ ہے عمر کا)

شاد عظیم آبادی ؎

کہاں چھوٹا ہے مجھ وحشی کو قاتل نیم جاں تو نے اندھیری رات، سناٹوں کا عالم، بولنا رن کا

بے مصرعہ میں صرف ایک لفظ بدلا دینے سے ترجمہ مکمل ہو جاتا ہے ؎ جانِ من کاریوں کی باتوں پر ارشاد

تیسری مثال ؎

عزم دیدارِ تو دارم، جان بر لب آمدہ　　باز گردد یا برآید، چیست فرمانِ شما

(لب پر آئی ہوئی جان تمہارے دیدار کا ارادہ رکھتی ہے۔ تمہارا حکم کیا ہے؟ لوٹ جائے یا نکل آئے)

شاد عظیم آبادی ؎

تجھے جلدی پڑی ہے نزع میں اور میں پریشاں ہوں　　ٹھہر اے موت دم بھر کہہ گئے ہیں آپ آنے کو

اس سے مراد کوئی مجازی معشوق نہیں ہے بلکہ مشکل کشا حضرت علی مرتضیٰ ہیں۔

اردو والے اگر یہ دعویٰ کریں کہ اُن کی غزلیں فارسی کی غزلوں کی ہمدوش ہیں تو یہ سراسر بھول ہے۔ آپ اردو کے کسی بڑے سے بڑے شاعر کے شعر پر غور کیجئے اور اُس کا ماخذ تلاش کیجئے۔ اگر اسی مضمون کا شعر فارسی میں مل جائے تو ملا کر دیکھئے۔ صرف گنتی کے اردو اشعار فارسی کے ہمدوش ملیں گے۔

اب اسی شعر کو دیکھئے۔ حافظ نے ؎ چوں طفلاں زاہدا۔ الخ میں زاہد پر طنز کیا ہے اور جب مرزا غالب اردو میں شعر کہنے بیٹھے تو نعوذ باللہ ذاتِ باری اور کلام باری پر طنز کر بیٹھے ؎

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن　　دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مطلب یہ ہے کہ بہشت کیا ہے۔ نافہموں کو سبز باغ دکھانا ہے۔ حالانکہ کلامِ باری سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ جنّت دوزخ استعارے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حافظ کا ترجمہ اُس وقت تک کامیاب نہ ہوگا۔ جب تک مترجم اس شعر کے داخلی پہلو کو نہ سمجھے بہت سے حافظ کے ایسے بھی اشعار ہیں جن کا کوئی ترجمہ اُردو اشعار میں نہیں ہو سکتا ہے۔ مثال ؎

اے کبکِ خوش خرام کہ خوش می روی بہ ناز　　غرّہ مشو کہ گرگ بہ عابد نماز کرد

قصہ مشہور ہے۔ ایک عابد شب و روز پہاڑ پر عبادتِ الٰہی کرتا تھا۔ اُس کے پاس ایک بلّی تھی۔ ایک چکور کا اُدھر سے گزر ہوا۔ اُس نے دیکھا کہ بلّی قبلہ رُخ بیٹھی ہوئی ہے۔ چکور نے سمجھا کہ اب اس بلّی نے توبہ کر لی ہے اور عابد کی صحبت کا اُس کو فیض پہنچا ہے۔ یہ سوچ کر وہ بلّی کے پاس آیا۔ بلّی نے جھپٹ کر اُس کو پکڑا اور لقمہ کر گئی۔

اب اس کا اُردو میں ترجمہ کر کے دیکھئے یا اس شعر کا ؎

لبِ تو خضر، دہانِ تو آبِ حیوان است　　قدِ تو سرو، میانِ تو موئے و گردنِ عاج

(تیرا لب خضر ہے، تیرا دہن آبِ حیات ہے۔ تیرا قد سرو ہے، تیری کمر بال ہے اور تیری گردن ہاتھی دانت ہے)

اُردو میں گردن کی تشبیہ ہاتھی دانت سے کیسے دی جا سکتی ہے۔

علی سردار جعفری کی ۱۹۵۴ء سے لیکر ۱۹۶۴ء تک کی سو سے زیادہ نظموں اور غزلوں کا نیا مجموعہ

تغزل و غزل کی اعلیٰ قدروں میں ایک حسین و دلفریب اضافہ

ایک خواب اور

قیمت :- چھ روپے

ملنے کا پتہ :- مکتبۂ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۸ بی سی

نیا سماج

علمی، ادبی اور تہذیبی جریدہ

مالیگاؤں میں جشنِ شاعر

ایک عظیم الشان ادبی و شعری اجتماع

کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی، نثار جعفری، کیفی اعظمی، ہنر ناتھ، زبیر رضوی، ندا فاضلی کی شرکت

مالیگاؤں ناسک مہاراشٹر کا ایک اہم صنعتی شہر ہے اور اسی کے ساتھ اردو زبان کا گہوارہ بھی۔ ایک طرف خوبصورت مساجد کے بلند میناروں کا شہر ہے تو دوسری طرف تعلیمی اداروں، بزموں، انجمنوں اور کلبوں کی بھی کمی نہیں۔

۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ء کو بزم اعجاز مالیگاؤں کے زیر اہتمام لوکمانیہ ہائی اسکول کے وسیع کمپاؤنڈ میں "جشنِ شاعر" کا عظیم الشان اجتماع ہوا۔ اراکین بزم اعجاز اور مالیگاؤں کے دوسرے ہمدردانِ اردو دو ماہ سے اس جشن کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اسے کامیاب بنانے کے لئے بمبئی کے مشاہیر ادبا و شعرا نے اپنا بہترین تعاون دیا اور کاروں کے ذریعہ طویل سفر کی زحمت برداشت کر کے مالیگاؤں پہنچے۔ ہندوستان کے بعض دوسرے شہروں سے بھی شرکت کی۔

شب کے سوا دس بجے سے دو بجے رات تک ادب و شعر کا ایک ملا جلا خوبصورت پروگرام پیش ہوا۔ "جشنِ شاعر" کے کل ہند مشاعرہ کی صدارت جناب الحاج سید شکیل احمد صاحب نے کی اور افتتاح خواجہ احمد عباس صاحب نے فرمایا۔ مہمانِ خصوصی میں کرشن چندر، ہنر ناتھ اور سید قمر الدین (اندور) کے نام خاص ہیں۔ اس میں مالیگاؤں کے بزرگ شعرا کے علاوہ دوسرے بہت سے مہمانِ شہر، سیاسی لیڈر، بڑے تاجر اردو اور مراٹھی پریس کے نمائندے بھی شریک تھے۔ اسٹیج کو سادگی کے ساتھ آراستہ کیا گیا تھا۔ سردی کے باوجود لوکمانیہ ہائی اسکول کے کھلے ہوئے کمپاؤنڈ میں تقریباً دو بجے کے ساتھ کئی ہزار سامعین کی مشاعرہ کو سننے رہے۔

اس مشاعرہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مشہور ادیب کرشن چندر نے یہاں اپنا مشہور افسانہ "بلی اور وزیر" پڑھ کر سنایا۔ سامعین نے اسے بیحد پسند کیا اور خوب خوب داد دی۔ خواجہ احمد عباس کی طویل افتتاحی تقریر کو بھی بڑی توجہ سے سنا گیا۔ صدرِ مشاعرہ جناب شکیل احمد صاحب نے نہایت اختصار کے ساتھ ایک مؤثر تقریر پڑھ کر سنائی جس میں مشاعروں کی طویل غذا کو سراہا۔ مالیگاؤں کے ادبی و شعری حلقوں سے "شاعر" اور مدیر شاعر اعجاز صدیقی کے دیرینہ اور پُرخلوص تعلق پر روشنی ڈالی۔ بیرونی شعرا میں سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، اختر الایمان، کیفی اعظمی، اعجاز صدیقی، عارف عباسی، زبیر رضوی، ندا فاضلی، مجتبیٰ حسین، رئیس رامپوری، ہلال سیوہاروی، نگار سلطانہ اور صہبا لکھنوی نے اور مقامی شعرا میں نظر مالیگانوی، سلم مالیگانوی، عتیق احمد عتیق، نسیم مینا نگری، صادق نظامی اور دانش مالیگانوی نے اپنا کلام سنایا۔ مہمان شعرا کو دو دو بار سنا گیا۔ اسٹیج کے منتظمین کی بعض کوتاہیوں کی وجہ سے مشاعرہ کا ایک حصہ ختم ہو گیا، حالانکہ سامعین اپنے محبوب شعرا کو اور سننا چاہتے تھے۔

اراکین بزم اعجاز نے جشنِ "شاعر" کو کامیاب بنانے کی زبردست کوششیں کیں، اس اجتماع سے اُن کا مقصد "شاعر" کے لئے ایک بڑی مالی اعانت تھا لیکن بالکل خلافِ توقع بعض مقامی حلقوں کا تعاون نہ ملنے اور کچھ انتظامی کمزوریوں کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ خود ادارہ "شاعر" کو بھی مالیگاؤں کی اردو نواز سرزمین سے بہت سی توقعات تھیں۔ ممکن ہے یہ توقعات پھر کبھی آئندہ پوری ہو سکیں۔ بہر حال ادارہ "شاعر" اراکین بزم اعجاز اور مالیگاؤں کے تمام ہمدردانِ اردو کے خلوص و تعاون کا ممنون ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں پہل کی اور ہندوستان کے اُن دوسرے شہروں کے لئے جہاں "شاعر" کے ہمدرد اور اُس سے محبت کرنے والے ہیں ایک مثال قائم کی۔

اردو، ہندی اور دیگر جدید زبانوں کیلئے ۵ کروڑ ۸ لاکھ

نئی دہلی ۲ نومبر۔ چوتھے منصوبے کے دوران جدید ہندوستانی زبانوں کی ترقی پر کل ۵ کروڑ ۸ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔

اس رقم میں مرکز کا حصہ ایک کروڑ اور ریاستوں کا ۴ کروڑ ۸ لاکھ ہوگا یہ بات بھارتیہ بھاشا سمیتی کے اجلاس کو ایک سرکاری دستاویز میں بتائی گئی

اہم تجویز یہ ہے کہ جدید ہندوستانی زبانوں کے لئے جن میں اردو بھی شامل ہے مرکز میں ایک مرکزی انسٹی ٹیوٹ قائم ہوگا اور ریاستوں میں ریاستی انسٹی ٹیوٹ قائم ہوں گے۔

آغا رشید میرزا دہلوی

دلّی کی مراثنیں اور اُن کے گانے

دلّی جو عالم میں انتخاب ہے، اور جہاں منتخب روزگار ہی رہتے چلے آئے ہیں جس کی سرزمین پر بڑے بڑے اولیاء اللہ ہوئے جس نے مسیحا سیر عالم، علماء فضلاء، صاحب فن اور اہلِ کمال کو جنم دیا جس کی آنکھوں نے اَن گنت نامور شہنشاہوں، تاجروں اور رنج کلاہوں کو دیکھا، اُن کے رعب و جلال، شان و شوکت اور اُن کی عظمت کے تماشے دیکھے، انہیں خاک میں ملتے اور مٹتے دیکھا، اُن ہی میں سے کسی نے جو اس کے لیلیٰ پن پر مرمٹا، اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ بنایا سنوارا۔ اور کسی سہرپرغور نے اپنی ذرا سی جنبش سے خون کی ندیاں بہادیں۔ اسے تاخت و تاراج کیا۔ اور یہ سخت جان وقت کے ہاتھوں کتنی مرتبہ لٹی پھری، سنوری، لیکن قدرت نے بخشیہ حکومت کا تاج اسی کو عطا کیا۔ اس کی عظمتِ رفتہ اور عہدِ گزشتہ کے نشانات مٹتے مٹتے بھی باقی رہے۔ اور ہر دور میں تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کے ساتھ کچھ نہ کچھ وابستہ نظر آتے رہے۔ یہ عذر نا اس سے پہلے کی بات نہیں، دوسری جنگِ عظیم کے اختتام بلکہ تقسیم ہند تک بھی یہ اثرات نمایاں تھے۔

اُس وقت شادی کی تقاریب میں طوائف کا مُجرا ایک ضروری تفریح تھا۔ اگر یہ نہ ہو تو ناک کٹ جاتی تھی۔ عورتوں کی محفل میں مراثنوں کے گانے کی بڑی اہمیت تھی۔ مراثن دراصل مراثی کی تانیث ہے۔ طوائفوں کے سازندے مراثی کہلاتے تھے۔ یہ خود بھی موسیقی کے علم اور آداب محفل سے واقف ہوتے تھے، بعض سازندے رقص و موسیقی کے فن میں ماہر ہوتے تھے، وہ صرف طوائفوں کو رقص و موسیقی کی تعلیم دیتے، اور اُستاد کہلاتے تھے۔ عموماً یہی لوگ جن عورتوں سے شادی کرتے انہیں اپنا فن سکھا دیتے تھے، وہی مراثنیں کہلاتی تھیں۔ وہ صرف بڑے بڑے گھرانوں اور صرف عورتوں کی محفل میں گاتی تھیں۔ لیکن یہ ضروری نہ تھا۔ بعض مراثنیں اپنے حلقہ سے باہر بھی شادی کرتی تھیں۔ اور اس پیشہ کو اختیار کرتی تھیں۔ اکثر نوابوں راجاؤں اور رؤسا کی نظر چڑھ جاتیں، اُن کی منظورِ نظر کہلاتیں۔ اور سمجھات اور دانیوں میں داخل ہو جاتیں۔

پرانے زمانے میں کبھی مراثنیں تہذیب کا ایک جزو رہی ہیں خصوصاً تقاریب میں اُن کی خاص اہمیت تھی، اور یہ اہمیت اب سے کچھ عرصہ پہلے تک قائم تھی۔ غالب جیسے شاعر بھی ایک مراثن کے عشق میں مبتلا ہوئے۔ ان کا عشق بھی یقیناً اُس کے ذوقِ سخن، خوش گلوئی اور طرز ادا کی کشش ہی کا مرہون منت ہوگا۔ مراثنیں بڑی صاحب فن ہوتی تھیں۔ اکثر بڑی بڑی طوائفوں کو فن کے لحاظ سے دور بٹھا دیتی تھیں۔ گانے کے علاوہ یہ ناچنے نقلیں اُتارنے اور فی البدیہہ گانے میں بھی کہنے یا بجو کہنے میں اُستاد ہوتی تھیں آواز اتنی بلند ہوتی تھی کہ دور دور محلہ والوں کو خبر ہو جائے اس زمانے میں عام طور پر مکان حسب حیثیت خوب وسیع و عریض ہوتے تھے۔ آجکل ماچس کی ڈبیوں کی طرح اوپر تلے رکھے ہوئے کمرے اور دیوالی کے جوگھڑے کی طرح برابر برابر چھوٹے ہوئے نہ ہوتے تھے۔ جس مکان میں تھا، اُس میں بیسیوں کمرے تھے اوپر نیچے وسیع صحن، دو چھتیاں، دیوان خانہ۔ زنان خانہ وغیرہ اور ہال کمرہ میں تو بیک وقت ڈھائی تین سو مہمان آرام سے آسکتے تھے۔ اُس وقت ہی قسم کی مہمان داریاں بھی ہوتی تھیں حسب توفیق مکان میں اس کا خیال رکھا جاتا تھا اور یہ ایک عام بات تھی۔ بچپن کی

بہت سی ناقابلِ فراموش یادیں میرے ذہن میں اب بھی محفوظ ہیں اور مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اتنے وسیع مکان میں مراثنوں کی آواز جہاں بلند ہوتی ہم گھر کے کسی کونے کھدرے میں بھی ہوتے وہیں پہنچ جاتے اور ہمارے ساتھ ساتھ محلّہ پڑوس کے دوسرے لڑکے اور بچے بھی موجود ہوتے۔ مائیکروفون کی ضرورت ہی نہ تھی مراثنیں بنی سنوری، اڑا پاجامہ، کُرتہ اور رنگین دوپٹے میں ملبوس ہوتیں۔ کانوں میں پھولوں سے بھری بالیاں، منھ میں پان کا بیڑا دبا ہوا، بس کی دھجی کا ایک گال اوپر کو اٹھا ہوتا، عطر اور خوشبو میں بسی ہوئی، وقت اور ماحول کے لحاظ سے جو بھی گانا چھڑتی وہاں بندھ جاتا۔

بڑی بڑی نامور مراثنیں سارنگی، طبلہ اور ہارمونیم کے ساتھ گاتی تھیں، اکثر طبلہ کے بجائے ڈھول اور دائرہ بھی استعمال کرتی تھیں۔ بالکل طوائفوں کے مجرے کی طرح ساز بجانے والی مراثنیں پیچھے بیٹھتیں اور گانے والی ایک یا دو مراثنیں آگے بیٹھ کر عشرت اور طرزادا کیساتھ گاتی تھیں۔ بعض ماہر مراثنیں صرف گایا کرتی تھیں۔ ناچنا، نزاکت کرنا کسر شان سمجھتی تھیں کسی زمانے میں سہرا یا مراثن کا بڑا نام تھا اُس کے بغیر کوئی محفل مکمل نہ سمجھی جاتی تھی۔ وہ صرف رونمائی کے ماں جاتی تھی۔ اس کے بعد عقبری مراثن کے گانے کی شہرت تھی اُس کی آواز میں بڑا کشش تھی اس کے بعد نھنو اور دھنو دو بہنیں تھیں جن کا شہرہ دور دور تک بھر میں ہوا۔ تقسیم ہند سے کچھ عرصہ پہلے میں نے نھنو مراثن کو دیکھا اس وقت بیچاری اللہ کو پیاری ہو چکی تھی، گانا بجانا اور محفلوں میں جانا ترک ہو چکا تھا والدہ محترمہ کی فرمائش پر اُس نے فارسی کے چند شعر سنائے وہ شعر مجھے اس وقت یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ الفاظ صاف اور زبان شستہ تھی۔ آواز میں اگرچہ کسی قدر خشہ تھا لیکن کشش اور بلندی دیکھ کر تعجب ہوتا تھا والدہ صاحبہ نے مجھے بتایا کہ کسی زمانے میں اس کے بڑے ٹھسّے تھے بڑی دولت اُس نے کمائی تھی سر سے پاؤں تک زیور میں لدی محفلوں میں جاتی تو خود بھی بہت بی معلوم ہوتی۔ مراثن کا خطبہ ہوتا تھا۔ روپیہ تو روپیہ کوئی پیسہ بھی نہیں لیتی تھی۔ انعام میں کسی نے کپڑے یا سونے ہی کی کوئی چیز لیتی تھی۔ ورنہ نہیں لیتی تھی۔ چاندی کی کوئی چیز دیتا تو سامنے ہی بہتر الٹی یا دھوبن کے آگے ڈال دیتی۔۔۔ یا اسی طرح پھینک کر چلی جاتی تھی۔ قدردان تھے اور نذر برداری کرتے تھے تو بلا ناز و کرشمہ قبول کرتی۔ یہ واقعہ اور ان میں سے بعض گانے اپنی والدہ ماجدہ سے معلوم کر کے لکھ رہا ہوں، ہر چند کہ وہ تقاریب، وہ محفلیں اور اُس شان و شوکت کی آخری جھلک میں نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھی، لیکن گزرے ہوئے وقت اور بیتے ہوئے دنوں کی دلچسپ باتیں جب بھی سنئے سنتے ہی جائیے۔ گفتنی سنتے ہی جائیے۔ اب تو وہ حقیقت ایک افسانہ اور وہ قصہ الف لیلیٰ کی خوابناک داستان معلوم ہوتے ہیں۔

آج کی نسبت وہ زمانہ سستا ہونے کے علاوہ فرصت، طمانیت اور فارغ البالی کا تھا تقریب کے بہانے ڈھونڈے جاتے تھے اور شادی کا تو خیر ایک طویل ہنگامہ ہوتا تھا۔ آج کل کی طرح چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوتا تو کہا جاتا "اے ہے کسی بیچاری بیوہ یا "دوہاجو"[1] کا نکاح ہو گیا۔ شادی کے انتظامات دو چار برس میں مکمل ہوتے۔ دعوت نامے بھیجنے کا رواج عام نہ تھا دونوں پہلے مہمانوں کی فہرست تیار ہوتی تھی۔ نام کے اندراج کے سامنے اُس کے دستخط لئے جاتے تاکہ اطلاع پہنچنے کا سند رہے۔ جہیز کے سوٹ کیس کا سلمانی میں ایک بڑی اہم سماجی بات تھی۔ ہاتھ کی سلائی اور دستکاری کے بڑے بڑے خوبصورت کام ہوتے تھے اور اس میں بڑا وقت لگتا تھا۔ دستکاری میں اُس زمانے میں کچھ ڈیزائن کے نام ہوا کرتے تھے: مثلاً دیکھت بھولی، کھجور چھڑی، مائی پشت کا جال، کیکری کھٹاؤ وغیرہ۔ زردوزی میں مقیش کو کھرد اور سلمہ ستارے کا کارچوب کام کاریگری کا بہترین نمونے ہوتے تھے۔ یہ سب بڑی دیدہ ریزی اور جانفشانی کے کام ہوتے تھے آجکل وہ سب چیزیں ناپید ہیں۔ اور ان کے بنانے والے ناپید۔ جہیز اور سب انتظامات کی تکمیل کے بعد عموماً نکاح اور رخصتی ایک ساتھ ہونے کا رواج نہ تھا، نکاح کے سال چھ مہینے بعد رخصتی ہوتی تھی۔ غرض کہ تقاریب اور رسوم کا ایک سلسلہ رہتا تھا۔ مایوں۔ ساچق۔ نکاح۔ آرسی مصحف۔ رخصتی اور اس کے بعد چوتھی چالے وغیرہ۔

شادی کا دن ہے۔ دلہنیں دم ہو رہی ہیں، بہاتی حسب [illegible] ڈولیوں اور گاڑیوں میں آرہے ہیں، ڈیوڑھی دروازہ کے قریب [illegible] لگ جاتی ہے۔ کہار آواز لگاتا ہے "فلاں جگہ کی سواری آنے والو۔ قریب ہی دروازہ پر ایک آدمی رومال میں ریزگاری بھر بھر کر بھیجوا کر دیتا جاتا ہے۔ مہمان اتر رہے ہیں، کلدار چوڑی دار پائجامہ، ململ کا کرتہ، کمخواب، زربفت اور سلمے ستارے سے لیس ہوئے صوسات [illegible] یا بجلے۔ فرشی غرارے، آبجلا پلو کے دوپٹے اس پر [illegible] تر چھے جھومر لٹکتے۔ ہاتھوں میں چوڑیاں۔ کرسے [illegible]

[1] دوہاجو۔ دوبارہ شادی کرنے والا مرد

بازو پر روشن۔ نتھنے یا نورتن گلے میں چندن ہار، چمپا کلی، انگوٹھ بند۔ ماتھا۔ ٹیکا، انگلیوں میں لعوت۔ نرد، ادھیرے کی انگوٹھیاں۔

حسب حیثیت سادہ یا زیادہ زیورات سے لدی ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر سنوری سب ہی دلہنیں نظر آرہی ہیں۔ ایک طرف قناتی بیٹھی پان کی گلوریاں بنا رہی ہے سینیوں اور طباقوں میں سجا سجا کر مہمانوں کو بھجوا رہا ہے۔ مراثنیں سہاگ گا رہی ہیں۔

بنو ہریالی گھونگھٹ کھول اپنی اماں کی پیاری گھونگھٹ کھول
سونے کی ڈنڈی۔ روپے کے پلڑے بیٹھی جوبن تول
تیرے گھونگھٹ میں چندا برابر موتی بیگے انمول
اک لکھ دونگا منہ سے بول، دو لکھ دونگا گھونگھٹ کھول
اپنے ابا کی پیاری گھونگھٹ کھول اپنے بھائیوں کی پیاری گھونگھٹ کھول

اتنے میں شور مچا۔ سمدھن آگئیں۔ سمدھن آگئیں۔ مراثنوں نے فوراً تال سُر بدل دیئے اور موقع کے لحاظ سے گانا شروع کیا۔

آئیں سمدھن کر کے بناؤ
جلدی لوگو پان لگاؤ

اس موقع پر مراثنوں کو چھوٹ ہوتی تھی کہ وہ گانے ہی میں سمدھن پر پھبتیاں کسیں۔ اور صلواتیں سنائیں، اس کا اظہار صاحب خانہ کے شانے پر ہو رہا تھا۔ سمدھن نہایت خندہ پیشانی کے بھولا پھیلا دیتی، اور کتنی جوڑا نہ ہے ڈالدو، مراثنیں پھر نئے سُر کے ساتھ آواز اٹھاتیں۔

یہ سمدھن کیسی چترا
دیکھو کیسا گل کترا

اتنے میں پھر شور اٹھا، دلہن سے پوچھنے کے لئے مرد اندر آرہے ہیں۔ پردہ کرنے کا تو کسے ہوش ہوتا۔ کسی ایک آدھ نے چھو سے منہ چھپا لیا چلے، دلہن نے ہنکارا بھرا، مرد چلے گئے۔ باہر سے آواز آئی، نکاح ہو گیا۔ مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ پان اور شربت تقسیم ہو رہا ہے۔ ایک ہنگامہ ہے، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، مراثنوں کا گانا جاری ہے

لال رومالوں شربت ہے
چینی کے پیالوں شربت ہے

ہماری تہذیب میں وداع کی رسم ایک خاص جذباتی اہمیت رکھتی ہے، ماں، باپ، بہن، بھائی، عزیز، رشتہ دار گلے ملتے ہیں۔ شادی کی خوشی اور لڑکی کے جانے کا غم ہوتا ہے نہ معلوم تقدیر کیسی ہو عمر کیسے کٹے۔ غم اور خوشی کے ان ملے جلے جذبات کا دھارا آنکھوں کی راہ بہہ نکلتا ہے۔ دیکھنے والوں کی بھی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اسی موقع پر مراثنیں منڈھا چھیڑتی ہیں اور ایک سماں بندھ جاتا ہے۔

کاہے کو دینی بدیس سُن بابل مورے
سُن بابل مورے، کاہے کو دینی بدیس رے

ہم تورے بابل کھونٹے کی گیّاں جدھر ہانک دو چل جائیں رے
ہم تورے بابل آنگن کی چڑیاں چُگت چُگت اڑ جائیں رے
ہم تورے بابل بیلے کی کلیاں گھر گھر مانگی جائیں رے

بھائیوں کو دینی اونچی اٹریا ہم کو دینا بدیس رے
سن بابل مورے، کاہے کو دینی بدیس رے

پالکی تیار دروازے سے لگی ہے، دولہا منتظر ہے، دلہن آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی ہے، اس وقت مراثنیں دوسرا منڈھا چھیڑتی ہیں۔

پربت بانس کٹا مورے بابل بنی کا منڈھا چھوا مورے بابل
ہرے ہرے بانس کٹا مورے بابل بنی کا منڈھا چھوا رے بابل
اونچے کوٹے گڑیاں چھوڑیں چھوڑا سہیلی کا ساتھ رے
نو جینے گربت میں رکھی اب نہ رکھی جائے رے
ہوتے نہ دینی بابل زہر کی گٹھی اب پچھتائے کیا ہوئے رے
سونا بھی دینا، روپا بھی دینا، دینا بڑا جوڑ رے
ایک نہ دینی سر کٹنی ساس نند کے بول رے
سُن سمدھی ڈولا تھام رے ڈولا تھام رے
میری تو بیٹی ترے محلوں کی لونڈی ہم سب تا بعدار رے
تیری تو بیٹی میرے محلوں کی رانی تم سب سردار رے
پردہ اٹھا کے دیکھ میری لاڈو دور ہوا بابل کا دیس رے
پربت بانس کٹا مورے بابل بنی کا منڈھا چھوا رے

ہمارے ہاں برسات کے موسم کی ایک خاص اہمیت اور خصوصیت ہے۔ سوکھے کھیتوں میں جان پڑ گئی ہے۔ کیاریوں کے منہ پر رونق آگئی ہے۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے جذبات میں ہیجان اور دلوں میں اُمنگ ہے، کالے اور سُرمئی بادل اُمڈے چلے آرہے ہیں، رم جھم بارش کی جھڑی لگی ہے، پکوان تلے جا رہے ہیں۔ عورتیں، مرد، بچے، چھوٹے بڑے امیر غریب گھروں سے پکوان باندھ کر نکل پڑے ہیں، اور میلوں میں نکل جانے کی

ہو نہیں گئے ہیں۔ انھوں نے گھر والوں میں جھگڑے ڈال دیئے ہیں۔ مراٹھنوں کی ٹولیاں بھی اپنے اپنے ٹھکانے پر روسا کے گھرانوں میں چلی گئی ہیں۔ بیگمات سیر کیلئے انہیں بھی اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ یا پھر گھر پر ہی الاپ شروع ہو گئی ہے۔ پورا خاندان اور محلہ والیاں جمع ہو گئی ہیں۔

ساونا میں مہندی میرے سیاں کن لوٹی
بیلا بھی بویا چنبیلی بھی بوئی اور بویا ہے گلاب
ساونا میں مہندی میرے سیاں کن لوٹی

ابھی دو ہی بول ہوئے تھے کہ کسی نے ٹوک دیا۔ اے ہے یہ کیا شروع کیا ہے کوئی اچھی سی چیز سناؤ۔ مراٹھنوں نے ایک ایک پان کی گلوری کلے میں دبائی اور پھر شروع ہو گئیں۔

جھولا جھولت ناگن ڈس گئی
ڈس گئی انگلی کی پور
ساسو جی سے کہیو تورے پیاں لاگوں
نند جی سے کہیو میرا سلام
سیاں جی سے کہیو ناگن ڈس گئی
جھولا جھولت ناگن ڈس گئی

اتنے میں بادل اندھیری لے کے آئے بھیگی ہوا چلنے لگی اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ایسے میں وقت کی چیز چھیڑ کر مراٹھنوں نے محفل پہ رنگ لانے کی کوشش کی۔

سیاں جاگ اندھیری ڈر لاگے
رین اندھیری بدری کاری
سیاں جاگ ——————

لیکن کسی برہا کی ماری نے اپنی ہی فرمائش کر دی۔ اس پر سے کسی دوسری نے حاشیہ چڑھایا۔ اے ہاں بی!! ان ہی کے دل کی سناؤ" ان کے میاں جو پردیس گئے ہوئے ہیں۔ خدا جی ہلکا ہو جائے گا ان کا۔ مراٹھنوں نے دعا دی کہ خدا ساتھ خیر کے جلد واپس لائے اور پھر ڈوں کو لائے۔ اور پھر شروع کیا۔

پیا آون ہی آون کہہ گئے آئے نہ بارہ ماس
سونا لینے پی گئے، سونا کو گئے دیس
چھیر پرانے شام ہو گئے کر کر لمبے سانس
پیا آون ہی آون کہہ گئے آئے نہ بارہ ماس

کسی مہمان پسند نے بیل کے گیت دکھائے۔ مراٹھنوں نے آگے بڑھ کر لئے تو انھوں نے آہستہ سے اپنی کوئی فرمائش بھی کر دی۔ مراٹھنوں نے دوسری مراٹھنوں سے گھسر پھسر کی۔ پھر پان کی گلوریاں دبائیں اور تانہ دم ہو کر گانا شروع کیا۔ اس گانے میں ایک لوری چھوٹی سی کہانی نہایت سادہ اور دلنشیں انداز میں بیان کی ہے۔

ایک مسافر گھوڑے سوار پیاسا کنوئیں پر آ نکلتا ہے۔ اور پانی بھرنے والی ایک گاؤں کی گوری سے کہتا ہے کہ پیاسے کو پانی پلا دو تو مسافر اپنے ساتھ پلا جائے۔ گوری کہتی ہے "ارے چھیلا ذرا اپنے ہوش میں رہ۔ میرا حسن دیکھ کر بھول نہ جا۔ کنواں پڑا ہے۔ اپنے آپ جا ہے جتنے ڈول بھر کر پی لے۔ مسافر جواب دیتا ہے، تجھے کس بات کا گھمنڈ ہے۔ تیری جیسی تو میرے گھر کی گوری کے سامنے پانی بھرتی ہیں۔ تیرا مول ہی کیا ہے۔ میرے ساتھ چل تجھے سونے میں پیلی کر دوں گا۔ گاؤں کی گوری جواب دیتی ہے۔ آگ لگاؤں تیرے سونے کو، تیرے جیسے تو میرے شادی کے ہاں راج اور مزدور ہیں۔ اتنا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ مسافر جب اپنے گھر پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہی گاؤں کی گوری اس کی اپنی بیوی ہے۔ اس پر تو وہ روٹھ کر پلنگ پر پڑ جاتا ہے، گوری کہتی ہے میں اگر تمہیں پہچانتی تو پانی بھی پلا دیتی اور اپنا حسن بھی دکھا دیتی، مجھے کیا معلوم اور میں بھلا کیسے پہچانتی۔ بارہ برس کی عمر میں بیاہ کے گئے اور بارہ برس بعد ہی آئے ہو۔

کمال تو یہ ہے کہ یہ گانا آزاد نظم میں ہے اس کے معنی ہیں کہ آزاد نظم آج سے بہت پہلے وجود میں آ چکی تھی۔

اے جی نیلی سی گھوڑی پاتی
اور پائیلا ہے سوار
اور سانولیا ہے سوار
پیاسے کو پانی پلا میری گوری تو راہ مسافر جائیں

اے جی بھر بھیو چھیلا بھر بھیو۔
بھر بھیو ڈول پچاس
مورت دیکھ نہ بھول
بالا جوبن دیکھ نہ بھول

جس ری گوری کے ہم بالے پیا ہیتیا

تجھ جیسی بھری پانی اور بات
اے جی کاہے کا تیرا گڑوا
اور کاہے کا تیرا ڈھول۔
کاہے کا تیری اینڈوری
اور رتنے ناکھ جوبن کا مول

اے جی سونے کا میرا گڑوا
روپے کا میرا ڈھول
رتن جڑاؤ میری اینڈوری
نولاکھ جوبن کا مول

اے جی مٹی کا تیرا گڑوا
گھاس پھوس کی تیری اینڈوری
اور نو کوڑی تیرا مول
اے جی تم چلو ہمارے سنگ
سونے میں تمہیں گا پیلی
تو موتیوں میں جڑت جڑاؤ

اے جی آگ لگاؤں تیرے سونے کو
لوٹ کا تیرے موتیوں کو
جس رے شامی کی ہم بالی بہوریا
تو تجھ جیسے راج مجور

اے جی بھر گڑوا دے جلیبی
اور چڑھ گئیں چندن چوبارہ
کوٹھے کے اندر پلنگ بچھایا۔
تو منکھ پہ ڈالا رومال
اے جی کیا تمہیں آئی ہے نندیا
کیا تمہیں چڑھا ہے خمار
دل کی گنڈھڑی کھولو میرے رسیا
تو منکھ سے اتارو رومال
اے جی نا ہمیں آئی ہے نندیا
نہ ہمیں چڑھا ہے خمار

وہ دن یاد کرو میری گوری
جو پنگھٹ پر بولے تھے بول
اے جی میں کیا جانوں میرا شامی ہے
یا فنڈیتی یا بالا جوبن دیتی دکھا
بارہ برس کی بیاہ تا چھوڑی
تو بارہ برس پیچھے آئے۔

محفل کا رنگ جم گیا۔ رنگِ محفل سمجھنے کا سلیقہ مراثنوں میں خوب ہوتا تھا۔ انھوں نے ایسا ہی ایک گانا اور شروع کیا اس گانے میں بھی ایک کہانی ہے لیکن یہ ایک سچی کہانی ہے اور حقیقت ہے کسی زمانے میں کلکتہ پر انگریز حاکم تھا۔ اس زمانے میں کسی کی مجال نہ تھی کہ انگریز اور وہ بھی حاکم سے کوئی بازپرس کر سکے۔ وہ سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ اُس حاکم کا نام ذہن میں تھا جو بگڑ کر کرزن ہو گیا تھا۔ یہ گاؤں کی لڑکیوں کا عاشق تھا۔ دورہ پر جس کسی گاؤں یا دیہات سے گذرتا سُنہار۔ لوہار اور غریب کی لڑکیوں کو پکڑوانا اور عیش کرتا۔ ان ہی میں کنگانہ گاؤں سے ایک لڑکی سروں نامی جسے اُس کے چچا نے آگے دے کر پکڑوا دیا۔ گاؤں کے کھیت میں باجرہ کاٹتی پکڑی گئی، اُسی پر گانا بنایا گیا تھا۔ اس گانے اور اس حقیقت کے متعلق "سروں" کے عنوان سے اشرف صبوحی دہلوی نے بھی عرصہ ہوا ایک مضمون لکھا تھا، مجھے یاد نہیں کہ وہ کس رسالہ میں شائع ہوا۔ اُنھوں نے اس ضمن میں سمدھیا مراثن کے بارے میں بھی لکھا تھا جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ مراثنیں اس گانے کو ایسی دلنشیں طرز سے ادا کرتی ہیں کہ نقشہ سا کھنچ جاتا ہے۔

اُدھر کلکتہ سے چلا فرنگن پانچوں پیرہنائے
پانچ مقام دلی کے چھپا گنگا نے مائے
دھولے کنوئیں پہ بیٹھو تھا سائے مجھیں دیل گڑوائے
سگے چچا نے بھیر دیا لے سروں باجرے مائے
باجرہ کاٹتی پکڑی سروں درانتی ڈھونگے ٹائے
چار پولی کاٹی سروں پکڑی پانچویں کاٹی نہ جائے
ہاتھ میں بیلوا۔ بیلوے میں تیلوا۔ سروں نائیوں کے جائے
اولے کولے منیڈھی گوندھے میری سروں پھر نہ آئے
آگے سُنہار کی پیچھے لوہار کی بیچ میں سروں جائے

(بقیہ صفحہ ۲ پر دیکھئے)

شاعر بمبئی
بدیع الزماں خاور

غزل

خود اپنے پاؤں کی اک لغزشِ مسلسل سے
کچھ اور دُور یہ جادے ہوئے ہیں منزل سے
نہ کم ہوں وارِ نظر کے، نہ دل کا دم ٹوٹے
تمام عمر چلے، رسم و راہ قاتل سے
غموں میں کس کو شریکِ سفر کہا جائے
چلے ہیں چند قدم ساتھ لوگ مشکل سے
دُعا یہ ہے کہ چراغوں کی لَو نہ مدّھم ہو
بہت قریب اندھیرے ہیں ورنہ محفل سے
جو دَرس گاہوں سے چھوٹے تو شہر کے لڑکے
اُلجھ پڑے ہیں سرِ راہ ایک جاہل سے
خدا کرے کوئی طوفان راس آجائے
کہ سرگراں نظر آتے ہیں لوگ ساحل سے
نہ جانے بات ہے کیا، آج تیرے دیوانے
تری تلاش میں نکلے ہیں تیری محفل سے
ہزاروں گیت سماعت نواز ہیں خاور
مگر حیات عبارت ہے نغمۂ دل سے

فروغِ تمکنت

کاغذ کا ٹکڑا

سجا کر میں نے اپنے دل کی درشیزۂ اُمنگوں کو
حسیں قرطاس پر بکھرا دیا نغموں کی صورت میں
کہ ان کو آبشاروں کے ترنّم میں کوئی گا لے
سمو دے رس بھرے ہونٹوں کی شادابی سماعت میں

اِسی قرطاس کے دامن سے وہ خوشبو بکھرتی ہے
کہ جس سے حُسن کی شہزادیاں مخمور ہوتی ہیں
جلاتے ہیں یہی الفاظ خلوت گاہ میں شمعیں
لکیریں گیت بننے کے لئے مجبور ہوتی ہیں

مری محبوب تک کاغذ سفیر رنگ بنتا ہے
محبت ہے مجھے فن کی طرح کاغذ کے ٹکڑے سے
یہ میرے بے زباں نغمات کا آہنگ بنتا ہے

اظہر انسر
ڈرامہ

بھول ہی بھول

افراد

اُفق ..... ——— *
شیدا ..... ——— *
کاکل ..... ——— *
فیروز ..... ——— *

(ایک خوبصورت کمرہ ہے، کمرہ میں بائیں جانب وسط میں ایک بڑا سا آئینہ لگا ہے جس کے سامنے چھوٹی سی گول کرسی رکھی ہے، ایک طرف صوفے سلیقے سے سجے رکھے ہیں۔ دائیں جانب باہر اور بائیں جانب اندر جانے کے لئے بند دروازے ہیں، پردہ اٹھتا ہے تو ایک ۲۶، ۲۷ سال کی دبلی پتلی سانولی سی عورت (کاکل) آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے بال درست کر رہی ہے کہ کھٹکا ہوتا ہے)

کاکل:۔ (دائیں جانب دیکھ کر) کون؟

(پھر کھٹکا ہوتا ہے)

(کاکل دائیں جانب جاتی اور دروازہ کھولتی ہے۔ ۲۴، ۲۵ برس کا ایک نوجوان (شیدا) عمدہ سوٹ پہنے رومال سے بار بار پسینہ پونچھتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے)

شیدا:۔ جی میں محترمہ اُفق صاحبہ سے ملنے کیلئے آیا تھا۔

کاکل:۔ وہ تو باہر گئی ہوئی ہیں۔

شیدا:۔ باہر گئی ہوئی ہیں؟

کاکل:۔ لیکن جلد ہی آجائیں گی۔ آپ بیٹھئے۔ آپ شاید ضرور اکیڈیمی سے آئے ہیں۔

شیدا:۔ جی نہیں۔

کاکل:۔ شاید حضرت کج نشین نے آپکو بھیجا ہے، قصیدے آئے آپ؟

شیدا:۔ قصیدہ؟

کاکل:۔ جی ہاں وہ کہہ رہے تھے کہ آج ہی قصیدہ فریم کروا کر بھیج دیں گے۔

شیدا:۔ جی قصیدہ کی تو مجھے خبر نہیں۔ میں۔

کاکل:۔ شاید آپ کسی کپڑے کی دکان سے آئے ہیں، کس نے بھیجا ہے آپکو۔؟

شیدا:۔ جی، مجھے کسی نے نہیں بھیجا، میں خود آیا ہوں۔

کاکل:۔ آپ خود آئے ہیں۔؟

شیدا:۔ جی دراصل میں اُفق، میرا مطلب ہے، میں محترمہ اُفق صاحبہ کے مزاحیہ مضامین ایک عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جو محترمہ نے لکھا ہو، وہ کسی رسالے میں چھپا ہو، اور میں نے نہ پڑھا ہو، صاحب کیا لکھتی ہیں، بس کاغذ پر گلشن زعفران بکھیر دیتی ہیں، ہو سکتا ہے اُن کے سیکڑوں مداح ہوں، مگر سچ پوچھئے تو اگر آپ برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ میں تو اُن کا گرویدہ ہوں، میرا مطلب ہے اُن کے مضامین کا۔

کاکل:۔ آپ کا اسم گرامی؟

شیدا:۔ جی شیدا۔

کاکل:۔ شیدا۔؟

شیدا:۔ شیدا شفق۔

کاکل:۔ آپ شاعر ہیں؟

شیدا:۔ جی نہیں شاعر تو نہیں ہوں مگر بات یہ ہے کہ ویسے میرا نام نعیب خاں ہے لیکن میں نے خوبصورتی کی خاطر۔۔۔

کاکل:۔ خوبصورتی کی خاطر؟

شیدا:۔ میرا مطلب ہے کسی خوبصورت نام کی خاطر میں اپنے آپکو شیدا شفق کہلوانا چاہتا ہوں، کیا میں یہ میں آپ کا اسم گرامی کی پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔

کاکل:۔ جی ہاں؟

شیدا:۔ میں نے آپکا اسم گرامی دریافت کیا تھا لیکن آپ چپ ہیں۔

کاکل:۔ آپ نے تو صرف جرأت کی اجازت چاہی تھی۔

شیدا:۔ (پسینہ پونچھتا ہے) آپ کافی دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔

کاکل:۔ (مسکراتی ہے) میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں، میرا اسم گرامی میرا مطلب ہے کہ کاکل ریشمی کہتے ہیں۔

شیدا:۔ کاکل؟

کاکل:۔ جی کاکل ریشمی۔ ر۔ے، ش۔ی، ا۔ی م اور پھر ی،

شیدا:۔ کس قدر حسین اور خوبصورت نام ہے کاکل ریشمی۔ سچ مچ کاکلوں کی طرح نرم ملائم اور۔۔۔۔ ریشمی۔

شیدا:۔ آپ بھی کچھ لکھتی ہیں؟

کاکل:۔ ہیں؟ جی نہیں، لیکن اب لکھنے کا ارادہ ہو رہا ہے۔

شیدا:۔ بہت خوب، کیا لکھنے کا ارادہ ہے؟

کاکل:۔ جی وہ، یہی افسانے۔

شیدا:۔ افسانے؟ مگر کس قسم کے افسانے، میرا مطلب ہے جاسوسی افسانے، رومانی افسانے تاریخی افسانے یا

کاکل:۔ جی درخشاں افسانے۔

شیدا:۔ اوہ، بڑی مسرت کی بات ہے آپ شاید محترمہ افق کی چھوٹی بہن ہیں؟

کاکل:۔ جی نہیں۔

شیدا:۔ شاید آپ بڑی بہن ہیں؟

کاکل:۔ (سر ہلاتی ہے)

شیدا:۔ کوئی رشتہ دار ہیں آپ؟

کاکل:۔ (مسکراتی ہوئی سر ہلاتی ہے)

شیدا:۔ شاید آپ اُن کی سہیلی ہیں؟

کاکل:۔ میں یہاں ملازم ہوں۔

شیدا:۔ ملازم۔۔؟

کاکل:۔ جی ہاں ایسی ملازم جو بیک وقت چھوٹی بہن، بڑی بہن رشتہ دار، سہیلی بھی کچھ تو ہوتی ہے، آپ پسینہ پونچھ رہے ہیں۔۔؟

شیدا:۔ گویا آپ محترمہ افق کی۔۔۔

کاکل:۔ سیکرٹری ہوں۔

شیدا:۔ پھر تو میرا کام آپ بڑی آسانی سے کرا سکتی ہیں، ایک محترمہ افق سے ملوا دیجئے۔

کاکل:۔ وہ تو آپ مل ہی لینگے اس میں اس قدر مایوسی کی کیا بات ہے۔؟

شیدا:۔ آپ نہیں جانتیں؟

کاکل:۔ کیا آپ اس پہلے بھی اُن سے ملنے کی کوشش کر چکے ہیں۔

شیدا:۔ جی ہاں، کئی بار۔ یہ بڑی سی تصویر جو ہفتے سے میری طرف دیکھ رہی ہے اُنہی کی ہے نا؟

کاکل:۔ (مسکراتی ہے) جی ہاں۔

شیدا:۔ کل شام بالکل یہی گھوڑ تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے یہ تصویر کل ہی کھینچی گئی ہے؟

کاکل:۔ جی نہیں یہ تصویر سات سال پرانی ہے۔

شیدا:۔ سا۔۔۔ سا۔۔۔ سا۔۔۔

کاکل:۔ جی سات سال

شیدا:۔ کل شام وہ حسین ساگر کے کنارے ٹہلنے آئی تھیں۔ اُن کے ساتھ کچھ اور خواتین بھی تھیں۔

کاکل:۔ جی ہاں۔

شیدا:۔ دو تین بار میں نے اُنہیں روک کر اُن سے ملنے اور۔۔۔۔ کچھ کہنے کی کوشش کی۔۔۔ لیکن۔

کاکل:۔ لیکن؟

شیدا:۔ ہر بار وہ معاف کرنا بابا کہہ کر آگے بڑھ گئیں

کاکل:۔ (بے اختیار ہنس پڑتی ہے)

شیدا:۔ ارے آپ تو ہنس رہی ہیں۔

کاکل:۔ نہیں نہیں میں ہنسی تو کسی اور بات پر تھی، شاید اُنھوں نے آپ کی طرف دیکھا ہی نہیں ہوگا۔ میں آپ سے ایک سوال

کر سکتی ہوں۔ آپ اُن سے ملنا کیوں چاہتے ہیں؟

شیدا: یہ کس قدر اہم سوال آپ نے کس آسانی سے پوچھ لیا ہے اب دیکھئے یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کو کیا جواب دوں۔ آپ میرے قلب، میرا مطلب ہے، میرے دل کی حالت نہیں جانتیں کاکل صاحبہ میں آپ سے کوئی ایسی بڑی گزارش بھی تو نہیں کر رہا ہوں صرف ایک ملاقات۔

(دائیں جانب سے سبز ریشمی ساری میں ملبوس اُفق داخل ہوتی ہے، بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس ہے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی بغیر کاکل اور شیدا کو دیکھے بائیں جانب چلی جاتی ہے)

کاکل: لیجئے وہ آگئیں۔

شیدا: (لمبا سانس لیتا ہے) اور چلی بھی گئیں۔

اُفق: (اندر سے) کاکل

کاکل: آ رہی ہوں (شیدا کو ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ کرتی ہوئی چلی جاتی ہے)

اُفق: (اندر ہی سے) یہ کیسے کیسے لوگوں کو تم بٹھائے رکھتی ہو کیا اس نٹ بال پلیئر سے پھر لڑائی ہو گئی۔ کون ہے یہ نیا گرویدہ۔

کاکل: (اندر ہی سے) جی یہ میرا گرویدہ نہیں آپ کا شیدا ہے۔

اُفق: (کسی قدر پست آواز میں) کیا کہہ رہی ہو؟

کاکل: جی ہاں آپ ہی کے انتظار میں بڑی دیر سے بیٹھا ہے۔ مل لیجئے نا۔

اُفق: نہیں نہیں میں کسی سے نہیں ملتی۔

کاکل: پلیز۔

اُفق: تم نہیں جانتیں کاکل مجھے ایک منٹ کی فرصت نہیں ہے، جانتی ہو کل شام میں وہ لوگ خیر مقدمی جلسہ کر رہے ہیں۔ کسی منچلے نے تقریر کے لئے اصرار کیا تو میں کیا کروں گی۔ بڑی تیاری کرنی ہے بھئی جاؤ جاؤ اُسے چلتا کرو بہت دیر میں اُس سے نہیں مل سکتی۔ ٹھہرو ٹھہرو اُس سے تمہیں بات کرنے کی ضرورت نہیں، ذرا وہ کارڈ دینا۔

کاکل: یہ؟

اُفق: ہاں اور پنسل بھی۔

کاکل لیجئے۔

اُفق لو میں نے اسی پر سب کچھ لکھ دیا ہے، اپنے آپ سمجھ جائے گا۔ لو بس یہ اُسے دیدو۔ بات کرنے کی قطعی ضرورت نہیں کیا سمجھیں۔ جاؤ۔ اور فوراً آؤ۔ دروازہ اچھی طرح سے بند کر دینا۔ دنیا دھوکہ کس قدر کام ہے۔ ارے بھئی جاؤ۔

(دائیں جانب سے کاکل ایک کارڈ لئے داخل ہوتی ہے۔ لبوں پر اُنگلی رکھ کر کارڈ شیدا کو دیتی ہے اور ہاتھ کے اشارے سے کہتی ہے، جاؤ۔ جاؤ۔)

(شیدا کارڈ لئے دائیں جانب بڑھتا ہے کہ پردہ گرتا ہے)

(پردہ اُٹھتا ہے تو وسط میں ایک کھمبا گڑا ہے جس پر بس اسٹاپ لکھا ہے۔ شیدا کا دوست فیروز اُسی کھمبے سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا ہے۔

اچانک دائیں جانب دیکھ کر چلاتا ہے۔

فیروز: شیدا ارے بھئی شیدا۔

شیدا: (دائیں جانب سے بغل میں اخباروں کا ایک گٹھا لئے داخل ہوتا ہے) کیا ہو رہا ہے کیا بس کا انتظار ہو رہا ہے۔

فیروز: ہاں صرف دو گھنٹے سے، یہ بغل میں کیا دبا رکھا ہے۔

شیدا: اخبار ہیں اخبار۔

فیروز: کیا ردی کے کاروبار کرنے کا ارادہ ہے؟

شیدا: جناب یہ پرانے نہیں نئے اخبار ہیں۔ آج کے ہیں۔

فیروز: آج کے اخبار ہیں؟ دکھاؤ تو کون سے ہیں؟

شیدا: کون کون سے کیا ایک ہی اخبار ہے۔

فیروز: ایک ہی اخبار اور اتنی کاپیاں، لاؤ ایک اخبار دکھاؤ۔

شیدا: لو (ایک اخبار فیروز کو دیتا ہے)

فیروز: روزنامہ "بے قرار"

شیدا: ذرا اندر دیکھو صفحہ ورق اوّل۔

فیروز: (پڑھتا ہے) "ستارۂ اُفق" کا خیر مقدم۔ اچھا تصویر بھی ہے۔

شیدا: کیسی خوبصورت بھنویں ہیں ایں؟ ستواں ناک، کتابی چہرہ، نازک ٹھوڑی اور پھر چاہِ ذقن۔

فیروز: کہ ہزاروں ڈوب جائیں۔

شیدا:۔ ابھی اُس کے لبوں کی شگفتگی اور رخسار دلہ کی سرخی تو ظاہر ہی نہیں ہو سکی ہے جناب۔

فیروز:۔ بے شک لیکن پیشانی کے خطوط واضح ہیں کسی ماہر علم الخطوط کا کہنا ہے کہ پیشانی کا ہر خط انسانی عمر کے بیس سال کو ظاہر کرتا ہے۔

شیدا:۔ بیس سال کو؟

فیروز:۔ ہاں۔ تین لکیریں تو واضح ہیں۔

شیدا:۔ ہائے تم نے اُسے دیکھا نہیں، وہ جس قدر خوبصورت لکھتی ہے، اس سے کہیں زیادہ حسین ہے۔

فیروز:۔ بھئی کچھ ہو، میں اس فوٹو گرافر کا خرور قائل ہوں جس نے یہ تصویر بنائی ہے۔ اپنی ساری مہارت اس تصویر پر صرف کر دی ہے۔ (پڑھتا ہے) چار بجے الوداعی شام میں چھ بجے ٹلک کی ممتاز ادیبہ ستارہ افق کا طمطراق اکیڈیمی کی جانب سے خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ ایک ادبی محفل ہوگی ادبی محفلوں کے بعد عشائیہ ترتیب دیا جائے گا۔ صرف مدعو حضرات شرکت کر سکیں گے۔ ہوں یہ ہے قابل غور بات۔ کیوں بھئی تم نہیں شرکت کر رہے ہو اس میں؟

شیدا:۔ میں جا رہا ہوں ڈنر میں۔

فیروز:۔ کیسے، کیسے میاں ــــ یہاں تو صاف لکھا ہے صرف مدعو حضرات شرکت کر سکیں گے۔

شیدا:۔ میں بھی تو مدعو ہوں۔

فیروز:۔ کس کی جانب سے طمطراق اکیڈیمی کی جانب سے۔ مگر اس اکیڈیمی کے لوگوں سے آپ کا کیا واسطہ؟

شیدا:۔ (لمبا سانس لیتا ہے) مجھے خود اس ہستی دلنواز نے بلایا ہے جس کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔

فیروز:۔ اُس نے۔ ستارہ افق نے تمہیں بلایا ہے، ضرور تم سے کوئی بھول ہو رہی ہے۔

شیدا:۔ کوئی بھول وول نہیں۔

فیروز:۔ تو پھر اس سے ہوئی ہے۔

شیدا:۔ کسی سے کوئی بھول نہیں ہوئی ہے۔ بیکار شگونی کی باتیں مت کرو۔ لاؤ اخبار (اخبار چھین کر باہر جانب چلا جاتا ہے)

فیروز:۔ سنو، سنو شیدا۔

(پردہ اٹھتا ہے تو باغ کا ایک حصہ نظر آتا ہے۔ سامنے کرسیوں کے بڑے بڑے گملے رکھے ہیں۔ عقب میں وقفہ وقفہ سے مرد و خواتین کے قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ دائیں جانب سے کانی بلاؤز اور نفیس ساڑی پہنے اونچے قد کی ہوئی افق داخل ہوتی ہے۔ ساتھ ہی شیدا بھی۔ شیدا ڈھی سوٹ پہنے ہے جو پہلے منظر میں ہے)

شیدا:۔ سنیئے۔

افق:۔ (ریٹ کو دیکھتی ہے) جی؟

شیدا:۔ کھانے پر بھی آپ چپ چپ ہی تھیں۔

جی؟

(ادھر ادھر سے پسینہ پونچھتا ہے) کھانا بہت مزیدار تھا

(مسکراتی ہے) جی ہاں۔

کل بھی یہاں کوئی محفل ہے؟

افق:۔ کیوں طمطراق اکیڈیمی کے معتمد صاحب نے آپ کو نہیں بتایا۔

شیدا:۔ (گردن نیچی کر لیتا ہے) جی نہیں، میں بھلا طمطراق صاحب کو کیا جانوں؟

افق:۔ (حیرت سے شیدا کو دیکھتی ہے) جی آپ طمطراق صاحب کو نہیں جانتے، پھر آپ نے اس جلسہ میں شرکت کیسے کی؟

شیدا:۔ آپ ہی نے تو اس جلسہ کا کارڈ مجھے بھجوایا تھا۔

افق:۔ میں نے بھجوایا تھا۔ آپ کو کس سے؟

شیدا:۔ ارے آپ بھول گئیں۔ کل دوپہر میں جب میں آپ کے گھر پر حاضر ہوا تھا۔

افق:۔ ویسے تو پرسوں آپ حسین ساگر کے کنارے بھی حاضر ہوئے تھے۔

شیدا:۔ جی میں پرسوں کی نہیں کل دوپہر کی بات کر رہا ہوں۔ کل جب میں آپ کے گھر آیا تھا تو آپ نے اندر سے اپنی سکریٹری کے ہاتھ اس دعوت کا کارڈ بھجوایا تھا۔

افق:۔ میں نے آپ کو اپنی سکریٹری سے کارڈ بھجوایا تھا؟

شیدا:۔ جی ہاں۔ اور وہ کارڈ اس وقت بھی میری جیب میں پڑا ہے۔

افق:۔ دکھایئے تو۔

شیدا:۔ (بائیں جانب سے ایک کارڈ نکال کر اُفق کو دیتا ہے) لیجیے۔

اُفق:۔ (ایک نظر اُلٹ پلٹ کر کارڈ کو دیکھتی ہے اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگتی ہے) اوہ۔ اوہ

شیدا:۔ آپ ہنس رہی ہیں۔ کیا آپ نے یہ کارڈ نہیں بھیجا تھا؟

اُفق:۔ میں نے تو آپ کے لئے اس کارڈ کے پیچھے والی عبارت لکھی تھی، دنا کارڈ پلٹا کر دیکھیے۔

شیدا:۔ کارڈ کے پیچھے کی عبارت؟

اُفق:۔ (کارڈ شیدا کو دیتی ہے) پڑھیے پڑھیے، عبارت پڑھیے، کیا لکھا ہے۔

شیدا:۔ (کارڈ لے کر پڑھتا ہے) میں اجنبیوں سے بلا تقطعاً پسند نہیں کرتی آپ تشریف لے جائیں۔

اُفق:۔ جی۔ اب بتائیے بھول مجھ سے ہوئی ہے یا آپ سے؟ (پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگتی ہے، اور پکارتی ہوئی بائیں جانب چلی جاتی ہے)

مظفر احمد صاحب۔ ذرا سنیے آپ اگلے مہینے میرے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ شائع کر رہے ہیں نا۔ شرائط آپ۔ بھلا ہی بھول سہی مجموعہ کا نام ہوگا۔ بھول ہی بھول۔

(شیدا حیران جاتی ہوئی اُفق کو دیکھ رہا ہے۔ اُفق کے قہقہے سنائی دے رہے ہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

بقیہ صفحہ ۱۹ — "اندھیرا اور اندھیرا" —

ہاں — یہ سویتا ہے، خواب و خیال سے بھری بھری آنکھوں میں اب کچھ بھی نہیں، مرمریں گالوں کی رنگت ختم ہو چکی ہے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی نہیں۔

یہ سویتا ہے۔

"سویتا... میں... میں...!"

میں اس کے قریب سرک آیا لیکن میری نظریں تھیں کہ جھک گئیں۔ زبان تالو سے چپک گئی۔ اور جسم۔ وہاں کوئی جسم نہ تھا بس ایک تصویر تھی۔ خالی خالی سی، بے زبان سی تصویر۔!!

مجھے منموہن کے چلے جانے کا جواب مل گیا تھا!!

اعجاز صدیقی کی طویل شاہکار نظم

خوابوں کا مسیحا

(ایک سے زائد تین زبانوں میں شائع ہو گئی)

خوابوں کا مسیحا ہی مشہور نظم ہے جو منفرد رجحان ساز شاعرہ پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال کے بعد لکھی گئی تھی۔ یہ نظم ریڈیو سے نشر ہونے کے علاوہ مختلف بیرونی ممالک کی حکومت ہند کی کتابوں اور اخبارات و رسائل میں بھی شائع ہو کر مقبول ہوئی تھی۔

نیا روپ

اسی نظم کو اعجاز صدیقی نے ایک بالکل نیا روپ دیا ہے۔ اس میں مزید طویل و مختصر نئے بندوں کا اضافہ اور نظر ثانی کر کے نظم کو شاہکار کا درجہ دیا ہے۔ ایک پورا نیا بند۔ پنڈت نہرو کی "راکھ" پر شامل کیا ہے۔ نظم کے تمام نئے بند غیر مطبوعہ اور ناشنیدہ ہیں۔ اب یہ پہلی نظم سے بالکل مختلف ہے۔

اس طویل ELEGY میں جواہر لال نہرو کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے تصورات و نظریات کا گہرا فنیاتی مطالعہ تمام اصناف، لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس کے ایک ایک مصرعے سے ایشیا کے اس عظیم رہنما کی پوری زندگی جھلکتی اور چمکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ نظم پنڈت نہرو کی عظمت کی ایک خوبصورت علامت بن گئی ہے۔

خوابوں کا مسیحا

امن عالم کے لئے ایک پیغام بھی ہے اور لمحۂ فکریہ بھی۔ یہ پہلا خمسہ مجموعہ ہے جو ایک ساتھ اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں نہایت اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ نظم کا انگریزی ترجمہ مترنم، رواں، خوبصورت، اردو سے قریب اور بجائے خود ایک مکمل نظم ہے۔ ہندی روپ بھی قابل دید ہے۔

دیباچہ ——— کرشن چندر

انگریزی ترجمہ:۔ ناصر کاظمی ہندی روپ:۔ ندا فاضلی

ٹائپ اور لیتھو کی نفیس طباعت۔ اعلیٰ کاغذ۔ خوبصورت جلد اور رنگ گرد پوش پر پنڈت نہرو کا خوبناک اسکیچ

قیمت روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ قصر الادب، پوسٹ باکس ۲۵۲۶ بمبئی ۸ بی سی

افتخار احمد فخر دھولیوی

غزل

چمن کے نکلی جو ضیا پردۂ در سے پہلے
اک اُجالا ہوا تنویرِ سحر سے پہلے

پیش دستی تو ہے توہینِ طلب اے رندو!
کچھ اشارہ بھی ہو ساقی کی نظر سے پہلے

سخت ہے اُس کیلئے جادۂ دشوارِ حیات
جو نہ واقف ہو تری راہگزر سے پہلے

کشتِ غم خود کہیں سیراب ہوا کرتی ہے!
خون برسا ہے بہت دیدۂ تر سے پہلے

چار تنکے بھی نہیں باغ میں اے آتشِ گل!
آشیاں خاک ہوا رقصِ شرر سے پہلے

شوق اک شرط ہے جادوں کی روایت پہ نہ جا
منزلیں زیرِ قدم ہوں گی سفر سے پہلے

اِس زمانہ میں کہیں قدرِ ہنر ہے کہ نہیں!
سوچ لو فخر! یہاں عرضِ ہنر سے پہلے

غزل

خلش بڑودوی

زندگی پر تھکن سی ہے چھائی ہوئی اب ہے ذوقِ سفر بے کہاں دوستو
حوصلہ، عزم، ہمت، ارادہ، یقیں آج کوئی نہیں ہے جواں دوستو

ایک بار اور فرض اپنا انجام دو، اِس جہاں کو محبت کا پیغام دو
میں نے مانا کہ نفرت کے ہیں ور میں ایسی ہر سمت ہے راز داں دوستو

یہ سیاست کا میداں، یہ کرسی یہاں، ہار مانیں گے دشمن بھلا کس طرح
تیغ ہو تم مگر زنگ آلود ہو، تیر ہو تم مگر بے کماں دوستو

ہوگی برسات شاید بھی گھٹا چھائے گی، ظلم ہوگا تو آواز بھی آئے گی
بات کہنے کی ہو تو کہی جائیگی، تم سہی ہم نہیں بے زباں دوستو

آرزوؤں کا رقصِ حسیں اب کہاں، حسرتوں کی جوانی کو نیند آگئی
حوصلوں کے جواں شہر میں ہر طرف، تم نے بانٹی ہیں مایوسیاں دوستو

اُن پہ پھر پھر اہیں، یہ تڑپ یہ تپش، یہ کھنڈر پستیوں کے یہ ویرانیاں
جنت ارتقا کے لئے کہہ کے تم، ہم کو لیجا رہے ہو کہاں دوستو

دُور تک تا بکے آؤ سر جوڑ کر، زندگی کے مسائل پہ سوچیں ذرا
سب کا دُکھ ایک ہے، سب کا سُکھ ایک ہے، سب کی ہے ایک ہی داستاں دوستو

اس کی باتوں میں ہے تلخیوں کی جلن، اِسکے شعروں میں ہے نشتروں کی چبھن
ہے مگر صرف اک شاعرِ فکر و فن، تم خلش سے نہ ہو بدگماں دوستو

کلیم راہی

راجہ مہدی علیخاں

ابھی مولانا نیاز فتحپوری کے غم سے اُردو دُنیا کی آنکھیں خشک بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ ۲۷ جولائی ۱۹۶۶ء کو یہ المناک خبر ملی کہ اُردو کا مشہور خوش فکر شاعر اور طنز و مزاح نگار راجہ مہدی علیخاں اس جہانِ فانی کو سلام آخر کہہ گیا۔ اس اندوہناک خبر کے ساتھ ہی اُردو دُنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی اور سکتے میں کو آ گئے۔

راجہ صاحب ہمارے کازبان کے منفرد اسلوب نگارش رکھنے والے شاعر تھے، اُن کا اپنا ایک خاص لب و لہجہ تھا، اور اُنھوں نے اپنی ایک الگ تھلگ دُنیا بنا رکھی تھی۔

بچوں اور بڑوں کا یہ مقبول شاعر اپنے مخصوص انداز بیان سے اُردو دُنیا کو مسلسل زار رہا ہے اور اب بھی جبکہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہے۔ اُس کی بیشمار نگارشات ہمیں طنز کے نشتروں کے ساتھ برابر ہنساتی رہیں گی۔ یہ وہ کاوشیں ہیں، وہ حرارت ہے جو راجہ صاحب کی یاد کو کبھی سرد نہیں ہونے دیگی۔ بقول خوشتر گرامی "انہیں مرحوم کون کہہ سکتا ہے وہ زندہ ہیں اور جب تک اُردو زبان بولی جاتی رہے گی وہ زندہ رہیں گے۔ میرے بھائی نے اُردو زبان و ادب میں بہت سی لافانی چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔"

یوں تو راجہ صاحب نے شعر کہنا بدیہہ سال کی عمر میں کہا تھا۔ مگر ادبی دُنیا سے اُن کا تعارف "پھول" لاہور سے ہوا۔ جس میں وہ بچوں کے لئے قہقہوں کے جھرنے بہایا کرتے تھے، خوگوش کی قوالی بچو کی قوبہ، چور کی دُعا، مترجمہ میں آلو۔ کدھر گیا میرا بچپن خراب کر کے مجھے۔ وغیرہ وغیرہ اُن کی مشہور نظمیں ہیں۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

چور کی دُعا ——— اے خالقِ ارض و سما یہ وقت دُعا ہے
بندے پہ ترے آج عجب وقت پڑا ہے
سچ تو یہ ہے کتوں کو سُلا رکھتا ہے تو ہی
میرے لئے در وازہ کھلا رکھتا ہے تو ہی
کدھر گیا میرا بچپن خراب کر کے مجھے ———

سب بھائی بہن اور دوست مرے مکتب کو بلا ناغہ جاتے
میں اپنی کتابوں کو جا کر، مذیا میں بہایا کرتا تھا
اپنے گھر پر اس بندے نے کھولا اسکول شرارت کا
چڑیوں سے روز سبق سُنتا، طوطوں کو پڑھایا کرتا تھا
اب بیچ پہاڑوں میں جھاڑو، جھاڑو لے لو جھاڑو لے لو
کل کہتا پھرتا گلیوں میں، آلو لے لو آلو لے لو

راجہ صاحب کی پرورش جس ماحول میں ہوئی وہ اپنی طرح ایک ادبی اور شعری ماحول تھا، اُن کی والدہ محترمہ "ع ب" صاحبہ اُردو کی مشہور ادیبہ اور شاعرہ ہیں، اور اس وقت تاج محل میں اپنے بیٹے کی جدائی کے غم میں آنسو بہا رہی ہیں، اُن کے ماموں مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا شمار اُردو کے نامور اہل قلم حضرات میں ہوتا ہے

راجہ صاحب ۲۲ ستمبر ۱۹۱۵ء کو ضلع حیدرآباد میں پیدا ہوئے، اور وہیں اُنھوں نے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ اُس کے بعد میٹرک سے مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ اور بہت دنوں تک آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ رہے جہاں سے وہ بڑے دلچسپ فیچر اور کہانیاں نشر کیا کرتے تھے۔

راجہ صاحب ۱۹۴۷ء میں فلمی دُنیا میں بڑی شان سے داخل ہوئے اور "دو بھائی" کے گیت لکھے جو بیحد مقبول ہوئے۔ اُس کے بعد اُنھوں نے مسلسل کئی سلور جوبلی فلموں کے گیت لکھے، اور آخری وقت تک فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔

راجہ صاحب اُن گنے چنے شاعروں میں سے ایک تھے جنھوں نے بیک وقت ادبی اور فلمی دنیا میں یکساں مقبول ہو کر قابلِ رشک شہرت حاصل کی۔ اگر راجہ صاحب نے اردو ادب میں کوئی لافانی چیزوں کا اضافہ کیا ہے تو انھوں نے بڑے پیارے فلمی گیت بھی لکھے ہیں۔

فدا بھائی، گاشتہ، عزت، شریمتی جی، شہید، رشمی، دو ماں، جلی نوٹ، بمبئی میں سونا، ان پڑھ وہ کون تھی؟ آپکی پرچھائیاں اور میرا سایہ اُن کی چند مشہور فلمیں ہیں۔

راجہ صاحب کے پاس موضوعات کی بہتات تھی، وہ اپنی پسند اور انداز کے دائرے میں بڑی آسانی سے نئے نئے موضوع تلاش کر لیا کرتے تھے محترمہ طاہرہ سلطانہ مغنی سے اُن کی ادبی نوک جھونک بڑی ہی دلکش، شگفتہ اور جاندار ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے اس نوک جھونک کو مسلسل اپنے شماروں میں چھاپا ہے۔ غالب کی غزلوں کی پیروڈی لکھنے میں بھی انہیں غضب کا ملکہ حاصل تھا۔ ان پیروڈیوں کو پڑھنے کے بعد اُن کی فنی چابکدستی اور اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ فرمایئے ــــ

"اندازِ بیاں اور"

آہ کو کیا خاک اُس گل کی جو گلشن میں نہیں
لاکھ بلواتا ہوں پر تم میرے آنگن میں نہیں،
اے جنونِ عشق مجھ کو اُن پہ غصہ آ نہ جائے
جان بن بن کر وہ رہتیں کیوں ہمارے دل میں نہیں
کھیت میں گیہوں پھٹکنے بھی نہیں آتی وہ کیوں؟
کوئی پوچھے کیا ہے کیوں وہ برق خرمن میں نہیں
آگے پیچھے میں ترے پھرنے لگا، دیوانہ وار
بات جو تجھ میں ہے ظالم، تیری سوکن میں نہیں

چند دنوں پہلے انھوں نے بانو دہلی میں تکیہ کے اشعار کے زیرِ عنوان مختلف مشہور شعراء حضرات اور اُن کی بیگمات کے تکیہ کے اشعار لکھنے شروع کئے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

غالب کے تکیہ اشعار

نان اُس کی ہے کباب اُسکا ہے، رانیں اُسکی ہیں
تیری بھیڑیں جس کے گھر شب کو غزلخواں ہو گئیں
لیٹے ہوئے ہیں ہم فنا بھر لا تو چلم
ہستی ہوئی ہے حقہ جاناں پیے ہوئے

فدوی آگیا ہے گھر میں چرانے کا سب کلام
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

بیگم میر کے تکیہ کے چند اشعار

میر سے ملنے آئے ہو، اے مولویو کیوں، اُس نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا
میر کہے زباں پہ اپنی ناز
ہے زباں اپنی کچھ دراز بہت
گھر میں مہمان اکثر آتے ہیں
بھوکے آتے ہیں بھوکے جاتے ہیں
کتا کتا، بلا بلا حال ہمارا جانے ہے،
جانے نہ جانے میکہ نہ جانے شہر تو سارا جانے ہے

راجہ صاحب کو نظم نگاری کے ساتھ ساتھ، نثر کے میدان میں بھی بلا کی دسترس حاصل تھی۔ پچھلے دنوں وہ "بیسویں صدی" دہلی میں شہسوارِ قلم کے محبوب مشغلے" کے زیرِ عنوان طنز و مزاح کی ارغوانی شراب چھلکا رہے تھے۔ اس حلقہ میں اس سلسلہ کو بڑی پسندیدگی حاصل ہو گئی تھی۔ ایک مثال ملاحظہ فرمایئے ــــ

"ساحر لدھیانوی کے محبوب مشغلے"

دریا میں رہ کر مگرمچھوں سے بیر رکھنا، مگرمچھوں سے ہاتھا پائی کرنا، دریائی گھوڑوں سے الجھنا، ہارمونیم کے سمندری تیندوؤں کو آنکھیں مارنا، چل پریوں کے قریب آکر بھاگ جانا، مقدمے سونپنا، مقدمے لڑنا، مقدمے ہارنا۔ ہار کر وکیلوں کی ہجویں لکھنا، اُن کی ڈگریاں منگوا منگوا کر دیکھنا کہ کہیں وہ جعلی تو نہیں، میز چہرے کے داغ دھبے اور دامن کے داغ دور کرنے کے نسخے ڈھونڈنا، چہرے پر کریم مل کر "ضرورتِ رشتہ" کے اشتہار پڑھنا، بچپن کے لنگوٹیے غریب یاد آنا، گلے ملنا، غریب لنگوٹیے یاروں کی بار بار یاد دہانی پر کہ خدا آپ ہمارے دوست ہیں، تو کہنا ؎

میں نے شاید تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

گھر آئے ہوئے لنگوٹیے دوستوں کا سامان اُن کے سر پر رکھ کر پیچھے سے دھکے دیکر انہیں گھر سے نکالنا، دنیا کھڑکی سے جھانک کر کہنا ؎

شاید پھر اس جنم میں ملاقات ہو نہ ہو

آج سے دس سال پہلے اقبال کا یہ شعر گنگنانا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

آجکل شعر گنگنانا اُن کا محبوب مشغلہ ہے ۔

جاؤ بسری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
"کاخِ غرباء" کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روٹی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

محبوب ترین مشغلہ، کالج کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے لئے شعر کہنا "تاج محل بیچ بیچ کر کھانا" نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ۔

زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات
ایک بے درد سپاہی سے ملاقات کی رات

راجہ صاحب نے کچھ چینی نظموں کے ترجمے بھی کئے، انہیں بھی کچھ نقد و روش کا دوجہ سے جوش ملیح آبادی، فرقت کاکوروی، سید محمد جعفری، وامق جونپوری اور دوسرے مقبول طنز و مزاح نگاروں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے، اور بلاشبہ راجہ صاحب کی موت اردو دُنیا کا ایک نقصانِ عظیم ہے۔ اُن کی موت نے ایک ایسا خلاء پیدا کر دیا ہے جسے شاید اردو دُنیا برسوں کچھ پُر نہ کر سکے گی ۔

بقیہ صفحہ ۱۰ ۔ "ایک نظر پردۂ غفلت پر"

ستیا رام! "احمد میاں! بھان متی کے پٹارے سے سب کچھ نکل آتا ہے"

اور تیسرے ایکٹ تیسرے سین میں جب ستیا رام کو معلوم ہوتا ہے کہ سعیدہ کی شادی جمشید سے نہیں ہو سکتی تو وہ نائش کر دیتا ہے۔ احمد حسین ستیا رام کو آستین کا سانپ کہتا ہے۔ اُس کو گالیاں دیتا ہے "یہ حرام زادہ اگر کہیں مل جائے تو بوٹیاں چبا ڈالوں۔ گھر پر ملنے کے لئے گیا تو منع کر دیا۔ میرے یار غار تھے بچپن کے دوست، ہم مکتب خاندان کے خیر خواہ۔ ہولی۔ دیوالی۔ عید۔ بقر عید تھالی بھیجا کرتے تھے۔ "احمد میاں" "احمد میاں" کہتے کہتے منہ سوکھتا تھا، اب کیسی طوطے کی سی آنکھیں بدل دیں۔

ڈرامے کے عنوان اور اس کے محاسن کو پیش نظر رکھتے ہوئے "پردۂ غفلت" کو ہم اردو کے اچھے ڈراموں میں شمار کر سکتے ہیں۔ ڈرامے کے فن نے سنسکرت ڈرامے کے زوال کے بعد پختگی سے شہرت تک میں زیادہ ترقی نہیں کی اور خصوصیت کیساتھ اردو ڈرامے اور تھیٹر کو وہ تمام آسانیاں اور وسائل نصیب نہ ہو سکے جن پر اس فن کی ترقی کا دار و مدار ہوتا ہے ۔

عبدالرحیم نشتر

ایک ستارہ

(راجہ مہدی علی خاں کی موت پر)

نصف صدی پہلے کا ہے قصّہ
ایک ستارہ
اوجِ فلک سے
ٹوٹ کے اِس دھرتی پر آیا
روتی گاتی اور سسکتی
ہم ننگے بھوکے لوگوں کی
بستی کی ہر ایک گلی میں
نرم روشنی بن کر چھایا
پھیکے چہرے
بھیگی آنکھیں
پژمردہ لب
دیکھ کے جس نے اشک بہائے
خود رویا
اور سب کو ہنسایا
سچ مچ
وہ دل کا راجہ تھا

★

شاعر بمبئی

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

تلاش

وہ اِس شہر کی اک جذباتی لڑکی تھی
پھولوں کی نازک سی شاخ
لچکیلی، گاتی، لہراتی
میرے فن نے جس کے من کو موہ لیا تھا

اپنی صبح جوانی کے جذبات کا رنگ
اپنے سیمیں ہاتھوں کی خوشرنگ حنا
اپنے ہونٹوں کی بھیگی شاموں کی جلتی لالی
اپنی دوشیزہ سانسوں کے پھولوں کی مستانہ خوشبو
اپنی تیکھی نظریں، اپنے دہکے عارض
اپنے کومل جسم کی دیوانہ کرنے والی محجوب لطافت
مجھ پر واری!
کیسے اُس کے جسم و جاں کے وارفتہ اظہار کو بھولوں

سانجھ سویرے
اُمڈے ساگر کے خاموش کنارے
پُررونق چوراہوں
جھلمل جھلمل کرتے باغوں
بہکے بہکے ریستورانوں میں وہ میرے ساتھ رہی

کتنی راتوں کو
میرے ہوٹل کے کمرے میں
اُس نے زرکار کیا
اور فراق کا جب پگھلا دینے والا لمحہ آیا
اُس کی اُٹھتی پلکوں کی گرتی شبنم نے پوچھا
پھر کب آؤ گے پردیسی؟

ہر چوراہا منظرِ محشر، نفسا نفسی، بھاگم بھاگ
کس کو روکوں، کس سے پوچھوں
کس انبوہِ گریزاں میں گم ہے وہ میری راحتِ جاں
جس کی خاطر
صدیوں کے بے برگ شجر، بے پایاں تپتے صحراؤں سے
گزر رہا ہوں میں
شعلہ بہ جسم و شعلہ بہ جاں

رفیعہ شبنم منیجری
کسمانی

شاہکار

شمع کی ٹمٹماتی ہوئی، پیلی پیلی سی بیمار روشنی میں اُس نے دیکھا کہ اس کی بیوی ابھی نیم بے ہوشی کے عالم میں آنکھیں بند کئے لیٹی تھی، کبھی کبھی اُس کے سوکھے اور پتلے پتلے ہونٹوں کے درمیان سے ایک ہلکی سی کراہ نکل کر اُس کے بردبار، چھوٹے سے کمرے کی تعفن زدہ فضا میں گم ہو کر رہ جاتی اور وہ گھبرا کر شمع کی طرف دیکھتا جس کی لَو نہ جانے کیوں کانپ کر ٹھہر جاتی تھی، اور وہ اپنے دو سال پرانے قلم کو جس میں اُس نے آج ہی دو پیسے کی نب خرید کر لگائی تھی، دوات میں ڈبو کر کچھ لکھنے کی کوشش کرتا، لیکن اُس کے بھٹکتے ہوئے خیالات اُس کا ساتھ نہ دیتے اور جب وہ انھیں بڑی مشکل سے مجتمع کر کے قلم اُٹھاتا تو اُس کی روشنائی خشک ہو چکی ہوتی، اور باہر گلی کے کوڑے پر بیٹھے ہوئے اُس خارش زدہ کتے کی بھدی روتی ہوئی آواز اُس کے تسلسلِ خیال کے پرخچے اُڑا کر رکھ دیتی، اور وہ سوچنے لگتا اُس کے خیالات کا ماحصل ان روتی ہوئی آوازوں کے سوا اور ہے ہی کیا؟ ان رونی آوازوں کی بازگشت ہوں، ان رونی آوازوں کے سوا اس سوگوار ماحول کے ہوا اور ہے ہی کیا؟ بتانے اُس کے فن کے بدلے اُسے یہی تو دیا تھا۔

یہ خارش زدہ کتا ایک زمانہ سے یونہی روتا آ رہا تھا اور اُسے ابھی کتے کی روتی ہوئی آواز جانی پہچانی سی لگنے لگی تھی۔ اپنے گھر پر بیٹھنے والو! کو چھیڑیں، اپنے تعفن زدہ کمرے میں رفیعہ کو اس گھٹی گھٹی سی کھانسی کی کہ خستگی کو پہنچنے کا اب وہ عادی ہو چکا تھا، یہی سوگوار ماحول تو اُس کے افسانوں کا محرک تھا، اسی گھٹی گھٹی فضا میں اسی تاریکی میں، اور شمع کی اسی ٹمٹماتی ہوئی بیمار روشنی میں نہ جانے اُس کے ذہن نے کتنے عظیم افسانوں کو جنم دیا تھا، کتنے کرداروں کو بڑے بڑے کلبوں کی میز پر بیٹھ کر وہسکی اور بیئر کے گلاس اُڑاتے ہوئے دیکھا تھا، اپنے دو پیسے کا بیڑی کے کڑوے کسیلے دھوئیں میں اُس نے نہ جانے کتنے نوجوانوں کو قیمتی سوٹ میں ملبوس گورڈنلیک کے سُرمئی مرغولے بناتا ہوا پایا تھا، اپنے اسی چھوٹے سے کمرے کی بے پناہ تاریکی میں ڈوب کر اُس نے کتنے ہی ایسے محلات اور ایوانات تعمیر کئے تھے جو برقی قمقموں کی روشنی میں رات کو کہکشاں کا سماں پیدا دیتے ہیں اور انھیں بے ہنگم بھدی کھانسی کی آواز دور کے دریہاں کی کردہ ایک ایسی بزم نشاط میں پہنچ گیا تھا جہاں آہیں نہیں ہوتیں، سسکیاں نہیں ہوتیں بلکہ کھنکتے ہوئے قہقہے گونجتے ہیں، اور لبوں پر نقرئی شکراہٹیں رقص کرتی ہیں۔ جہاں گردشِ دوراں کے خلاف ایک ہلکی سی شکایت بھی لبوں پر نہیں آتی بلکہ ہوش سے بے نشاط کی سُرخیوں میں ڈوب کر مسرتوں اور رنگینیوں سے بھرپور گیت الاپنے لگتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ زندگی کا صحیح نصب العین صرف عیش و نشاط میں پنہاں ہے۔ جہاں میر کی غزلوں کی بجائے خیام کی رباعیوں سے محفلیں آراستہ کی جاتی ہیں۔ جہاں دو زانہ نہ جانے کتنے بُت بنائے اور توڑے جاتے ہیں، جہاں نہ جانے کتنے خداؤں کو سجدہ کیا جاتا ہے، اور پھر اُن کی عظمت کو یوں سپردِ خاک کر دیا جاتا ہے جیسے وہ مٹی کے کھلونے ہوں، جو ٹوٹ جانے کے بعد پھینک دیئے جاتے ہیں۔ جہاں معصوم دلوں کی تجارت ہوتی ہے۔ جہاں سماج کے سفید پوش گدھ نہ جانے ارمانوں کی کتنی لاشوں کو نوچ نوچ کر استخواں کے ڈھیر میں تبدیل کر دیتے ہیں اور جہاں مجبور نظروں کے ریاکار اشارے پارساؤں کو بھی دعوتِ گناہ دیتے ہیں۔ اور ساری دنیا صرف ایک مرکز کے گرد گھومتی نظر آتی ہے، صرف ایک مرکز ——— چاندی کا ایک گول، چھوٹا سا ٹکڑا، جس کی چمک تاریک دلوں کو تو روشنی نہیں بخشتی بلکہ اُن ایوانوں میں جاتی ہے جہاں ہر ارمان اور ہر

آرزو کو اُس کی روشنی میں پرکھا اور جانچا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہونچ کر اُس کا قلم آگے بڑھنے سے قاصر تھا۔ اور جب وہ ہاتھوں میں ڈ ہوئے اس مقام کو چھوڑ کر اپنی اگلی دنیا میں آتا تو پھر اُسے وہی ماحول کی گھٹن کا احساس ہوتا اور اُسے اپنی سانسیں رُکتی ہوئی سی محسوس ہوتیں اور اُس لمحہ ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل جاتی۔ لیکن رضیہ کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی کراہ اُس کے ہونٹوں کے پھیلے ہوئے دائروں کو پھر اپنی گرفت میں لے آتی اور وہ اپنے دونوں ہونٹ مضبوطی سے بھینچ کر رضیہ کی طرف بے بس نگاہوں سے دیکھنے لگتا۔ اور جیسے ساری سوچیں، سارے خیالات، سارے افکار، یک لخت کسی انجانے دشمن کے ہو جاتے اور وہ رضیہ کے نیم وا رخساروں کو گھورتے ہوئے سوچتا۔ وقت کی بادِ صبا نہ جانے کتنے شگفتہ گلابوں کی تازگی چھین لیتی ہے اور وہ ایسے پژمردہ ہو جاتے ہیں جیسے اُن کی شاخِ زندگی نے کبھی انھیں کھلتے ہوئے دیکھا ہی نہیں ہو۔ اور پھر پانی کی ایک چھوٹی سی گرم گرم بوند اس کی ٹھہری ہوئی آنکھوں سے پھسل کر رضیہ تپتے ہوئے رخساروں پر جا گرتی اور وہ گھبرا کر اپنی کھدری ہتھیلیوں سے اُسے صاف کر دیتا۔ اتنی آہستگی سے کہ نیم غنودہ رضیہ کو اُس کی خبر تک نہ ہو پاتی اور وہ پھر خون ہو کر واپس جاتا۔ اور وہ فوراً اپنے جگر کا یہ بٹا ہوا خون اپنے خیالات کے جام میں بھر لیتا۔ اور پھر ــــ لوگ اُس کے خون کو فانوس کی شراب سمجھ کر محض تفریحاً پیتے۔ اس کے افسانۂ تحریر کے نشہ میں ڈوب کر اُس کے فن کے معتقد دو چار خوبصورت سے جملے اُن کی زبان سے نکل جاتے۔ اور پھر کوئی پبلشر انتہائی خوش ہو کر اُس کے ہاتھوں میں کاغذ کے دو تین نوٹ تھما دیتا۔ اور وہ ان نوٹوں کو اپنی مٹھی میں بھینچ کر یوں مسکراتے ہوئے گھر کی جانب چل دیتا۔ جیسے کسی بچے کو اچانک مل جائے تو وہ دوڑ کر حلوائی کی دکان کی طرف جاتا ہے۔ لیکن ــ ان نوٹوں کی بھائے اُس کے ہاتھوں میں مٹھائی کی تو نہیں ہوتی تھی، بلکہ دوا کی ایک بوتل ہوتی تھی جیسے وہ رضیہ کی زندگی سمجھ بیٹھا تھا۔ جب بھی رضیہ کے مدقوق پھیپھڑوں نے سانس لینے میں سستی دکھائی فوراً ہی اُس کے ہاتھوں میں یہ بوتل آ گئی۔ جیسے اُس نے رضیہ کی زندگی خرید لی ہو۔

اور آج ــ آج بھی رضیہ کے پھیپھڑے لوہار کی دھونکنی کی طرح آہستہ آہستہ سست ہوتے جا رہے تھے۔ اُس کی لہراتی ہوئی پلکوں نے اُس کی بے نور آنکھوں کو چھپا لیا تھا۔ اُس کے سوکھے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ اور وہ بڑی مشکل سے سانس لے پاتی۔ رضیہ کی مدھم سانسوں کی سست رفتاری کے ساتھ ساتھ اُس کے قلم کی رفتار سست پڑتی جا رہی تھی۔ اُس کے کمرے کا سوگوار ماحول ایک انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔ اور باہر آنگن میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ فاختہ غٹر غوں کر رہا تھا اور اُس کے مکان کے پچھلے حصے سے بہنے والی نالی کا گندہ پانی عجیب بے ہنگم سی آواز میں بہتا جا رہا تھا۔ اُس نے تھک کر انگڑائی لی۔ گردن کو جھٹک کر جیسے دماغ کے بوجھل پن کو کم کرنے کی کوشش کی۔ اور شمع کی کانپتی جلتی لَو میں اُس کی نظر ایک بار پھر رضیہ کے چہرے پر جم کر رہ گئی۔

شوخ، شریر، چنچل، ہنستی، مسکراتی ہوئی نوخیز کلی جسے آج بادِ خزاں نے ایک مرجھائے ہوئے پھول کی طرح ڈالی سے پھینک کر غمِ گزراں کی گود میں ڈال دیا تھا۔ وہ رضیہ جس کے رخساروں پر گلابوں کی سی سرخی تھی، جس کے ہونٹوں پر شفق کی چھاپ تھی، جس کی آنکھوں میں ایک مسکراتی ہوئی خاموشی تھی اور جس کی آواز میں ایک نغمگی کا وہ گیت چھپا تھا جو اہلِ دل واہی ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اُس نے جب رضیہ کو پہلی بار اپنی گلی سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا تو یہی سوچا تھا اور نہ جانے کیوں ایک معصوم سی آرزو نے مچلتے ہوئے اُس کے نہاں خانۂ دل سے سر ابھارا تھا۔ کاش! اُس کے خیالوں کا یہ پیکر حقیقی اُس کی سُنسان خاموش زندگی میں آ جائے پھر تو وہ ایسے افسانوں کو جنم دے گا جن کا خمار بعد تک نہ ٹوٹے۔ جو اُس کا شاہکار کہلائیں گے۔ نہ جانے زندگی کا وہ کونسا خوشگوار لمحہ تھا کہ اُس کی یہ آرزو پوری ہو گئی۔ اُس کی زندگی کی یہی تو ایک آرزو تھی جو پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ وہ نہ جانے کتنی ہی آرزوئیں اب تک کسی سکیٹے کے آوارہ خیالوں کی طرح بھٹکتی ہوئی پھر رہی تھیں اور زندگی میں پہلی بار وہ اتنا خوش ہوا تھا جیسے اُسے کائنات کی وہ لازوال شئے مل گئی ہو۔ لیکن فنا ہی ایک شدید احساس اُس کے ذہن کو دبوچ لیتا تھا۔ اُس نے اپنی آرزوؤں اور ارمانوں کے پھولوں کے ڈھیر کو سمیٹنے کی کوشش میں اپنے دامن کی کتاہی اور بے بسیدگی کا بھی خیال نہیں کیا تھا اور جب پھول سمیٹتے سمیٹتے اُس کے پھٹے دامن سے گرنے لگے تو وہ چونک اُٹھا تھا اور لرز کر جب اپنی نظریں اُٹھائی تھیں تو خوشبو میں بسی ہوئی اور پھولوں سے سجی ہوئی رضیہ کو اپنے سامنے پایا تھا۔ اور وہ اس خوشبو میں ڈوب گیا تھا۔ کتنا خوش قسمت تھا وہ ــــ جسے رضیہ جیسی بیوی مل گئی تھی ــــ جیسے تارا ٹوٹ کر اس کی گود میں آ گرا ہو۔ جیسے ویرانے میں پھول کھل اُٹھا ہو لیکن فوراً ہی اُسے اپنی خلعی کا احساس ہوا تھا۔ جب رضیہ کی پاکیزہ مسکراہٹ کو اوراق کہہ کر وہ کتنی راتوں کی نیند چھینتا تھا اس وقت وہ یہ سوچنے لگتا کہ اُس نے رضیہ کے ساتھ شادی کر کے اُس پر ظلم کیا ہے۔ ایک بہت بڑا ظلم۔ لیکن اس میں اُس کا کیا قصور تھا؟ رضیہ خود ہی ایک پُر مسرت زندگی کو چھوڑ کر اُس کی ویران زندگی میں داخل ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی مرضی سے اس عیش و آرام کو خیرباد کہہ دیا تھا جس کا دنیا متلاشی ہے۔ اُس برتی نعمتوں سے جھلملاتے ہوئے فلیٹ اور اس میں رہنے

والے سفید پوشوں سے لڑ جھگڑ کر وہ خود ہی ایک غریب بے روزگار اور لاابالی سے ادیب کو اپنے پاس چلی آئی تھی۔ اور وہ اُسے واپس اُس کی دنیا میں لوٹا نہ سکا تھا۔ اُس نے رضیہ کو کتنا سمجھایا تھا، اُس نے سب کچھ سن کر کہہ دیا تھا رضیہ سے کہ وہ اُسے سکھ نہیں دے سکتا۔ اُسے خوشیاں نہیں پہنچا سکتا۔ وہ اُسے کچھ بھی تو نہیں دے سکتا۔ سوائے ایک دل کے جذباتوں سے بھرا پڑا تھا لیکن رضیہ نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا "محبت زندہ رہنے کے لئے ہوا میں نہیں تلتی، بلکہ دلوں کے پیمانوں سے ناپی جاتی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے دل نے تمہاری محبت کو اپنے لئے ہمیشہ بھرپور پایا ہے، اور زندگی میں ایک محبت بھرا دل پانا ہی سب سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اگر رضیہ کی بات سچ تھی تو وہ یقیناً خوش نصیب تھا۔ کیونکہ رضیہ کی عظیم، پُرخلوص اور بے لوث محبت ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا تھی اُسے سب کچھ رضیہ نے دے دیا۔ لیکن وہ رضیہ کو کچھ بھی نہ دے سکا سوائے آنسوؤں، غموں، مصیبتوں اور تکلیفوں کے۔ وہ ایک تلاش ادیب دے ہی کیا سکتا تھا؟ — اُس نے دو روٹی کھوٹکریں کھائیں، لیکن کہیں بھی ملازمت نہ مل سکی۔ اس مادہ پرست دنیا میں کاکروں کی ضرورت ہے۔ سائنس دانوں کی ضرورت ہے، جراب والوں کی ضرورت ہے، لیکن ادیبوں کی نہیں، بنگلا کا اکاؤنٹنٹ ایک کلرک ہی سنبھال سکتا ہے، ایک ادیب نہیں۔ اور اُس کا خالی جیب اُس کا منہ چڑاتی رہی۔ اُسکے سُوکھے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ اس کی آنکھیں جواب دے گئیں اور رات کی تنہائیوں میں جب اُس نے قلم اُٹھایا اپنے کو بے بس کا سا پایا۔ اُسے نادل لکھ کر پبلشر کے پاس پہنچانا تھا جس کی رضیہ کو وعدہ کر چکی تھی۔ اُس کے قرضداروں کی سُرخی بڑھ چکی تھی۔ اُس کے ہونٹوں کی سے جیسے کسی نے چوس ڈالی تھی، اور جب کاغذ کے چند نوٹ اپنی مٹھی میں چھپائے وہ گھر پہنچا تو اُس کا خیر مقدم کرنے کیلئے رضیہ میں مسکرانے کی طاقت بھی نہ رہی تھی، اور جب اُس نے رضیہ کے کراہنے کی دھیمی دھیمی سسکیاں سنی تھیں تو وہ چونک اُٹھا تھا۔ اور ایک دن صبح ہی صبح رضیہ کو بڑے زور کی کھانسی آئی تھی تو وہ چند منٹ تک اُسے گویا ہی دیکھتا رہا تھا، اور پھر گھٹنے فرش پر سُرخ سُرخ بلغم پھیل گیا تھا۔ اور اُس دن اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ پھر اُسی رات اُس کے ہاتھوں میں قلم آگیا تھا۔ اُسی رات پہلی دفعہ اُس خارش زدہ کتے کے رونے کی آواز آئی تھی۔ اُسی رات پہلی دفعہ اُس کی چھت پر اُلو کی جیسا ایک چیخ سنائی دی تھی۔ اور اُس کا قلم ایک تھرتھراہٹ کے ساتھ رُک گیا تھا۔ اُس کے کمرے کی ٹمٹماتی ہوئی شمع کی لو کانپنے لگی تھی۔

اور اب — آٹھ ماہ ہو چکے تھے لیکن اب بھی وہ دن اُسے یاد تھا۔ اُسی دن سے اُس کے ہاتھوں میں ایک بوتل آگئی تھی جس کے شیشوں کی تاریک دیواروں میں اُس نے رضیہ کی زندگی کو قید کر رکھا تھا۔ آج پھر ویسی ہی بھیانک رات تھی، اور وہ خاموشی کے بے کراں سمندر کی وسعتوں میں مستغرق ایک ناول لکھ رہا تھا۔ یہ ناول اُس نے پندرہ دن پہلے سے شروع کر رکھا تھا، جس دن رضیہ کو ہلکا ہلکا سا بخار آیا تھا، اور روزانہ بڑی تیز رفتاری سے اُسے مکمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ اُسے مکمل ہی نہیں کر پا رہا تھا اُس کے خیالات نہ جانے کونسی گمنام وادی میں کھو چکے تھے۔ آج اُسے ناول مکمل کرنا تھا، ہر حال میں — کیونکہ صبح سے رضیہ غنودگی کے عالم میں پڑی تھی، اُس کا نفس سست ہو چکا تھا، اور اب تک اُس کے ہاتھ خالی تھے۔ اُسے بوتل کی فکر تھی، ——— وہ بوتل جس میں رضیہ کی زندگی قید تھی، وہ لکھتا رہا — لکھتا رہا — تیز، اور تیز — اپنے خیالات کو بار بار مجتمع کرتا، اور بار بار بھٹک جاتے لیکن وہ لکھتا رہا، اُسے اپنے ماحول کی گھٹن کا احساس نہ ہوا۔ رضیہ کی کراہوں کو بھی وہ چپ چاپ سُنتا رہا، اور جب اپنے کو سحر خود ہی تھکا تو وہ مسکرا اُٹھا، وہ ناول مکمل کر چکا تھا، اُس نے فاطمینان کی ایک گہری سانس لی، اُس کا خیال تھا کہ اُس کا یہ ناول شاہکار مانا جائیگا، رضیہ کے بالوں کو پیار سے سہلاتے ہوئے ناول کا مسودہ ہاتھ میں لئے وہ باہر نکل گیا۔

شام کو جب وہ گھر لوٹا تو اُس کے قدم بوجھل تھے۔ رضیہ اب بھی لیٹی تھی — "رضو" — اُس نے پکارا، رضیہ نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولدیں، بے نور آنکھیں — اور وہ کانپ کر رہ گیا — وہ آنکھیں اُس سے زندگی کی بھیک مانگ رہی تھیں، لیکن وہ خود ہی تہی دامن تھا تو اُسے کیا دیتا۔ وہ اُس کے سرہانے بیٹھ کر اُس کا سر سہلانے لگا۔ اور وہ آنکھیں بند کئے لیٹی رہی شام ہو چکی تھی، اور اُس کے کمرے میں اندھیرا چھا رہا تھا، اُس کے نصیب کی طرح۔ اُس نے شمع جلائی اور غیر ارادی طور پر اُس کے قدم میز کی جانب اُٹھ گئے۔ لیکن وہ جھجھک گیا۔ سامنے ہی ناول کا مسودہ پڑا تھا جو اُس کی پندرہ راتوں کی مسلسل جاگوں کا نتیجہ تھا جسے اُس نے اپنے خونِ جگر سے لکھا تھا۔ جو اُس کا شاہکار تھا، اور جسے لیکر وہ بڑی اُمیدوں سے پبلشر کے پاس پہنچا تھا، اور جسے محض پبلشر کے ہاتھوں میں اُس مسودہ کو دیکھ کر وہ سوچ رہا تھا: جیسے اب رضیہ کی زندگی اُسے واپس مل جائے گی، پبلشر ناول پڑھ رہا، اور منہ ڈسیٹ سے آماستہ کئے میں شراب کی بوتل پھینک دی، اور وہ پبلشر کے چہرے پر نظریں جمائے اُس کے تاثرات جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر پبلشر کا چہرہ تو بالکل سپاٹ تھا۔ بالکل بیمار، ہر قسم کے جذبات سے عاری، اور پھر اُس نے منہ بناتے ہوئے کہا "بوگس — بالکل بوگس — نہ جانے آج کل تمہارے ناول اتنے

پولیس کیوں ہو گئے ہیں۔ آئی ایم ویری سوری' آئی کانٹ پبلش اٹ ۔" اُس کے مُنہ سے شراب کا ایک بھپکا نکلا تھا۔ "لیکن میرے خیال میں یہ میرا شاہکار ناول ہے سر۔!" اس نے ڈُوبتے ہُوئے لہجہ میں کہا تھا ۔ "بہت خوب !!۔" "اس میں میرا خونِ جگر شامل ہے۔" اُس کے اس جملے پر پبلشر نے قہقہہ لگایا تھا۔ "پبلک کسی کی زندگی نہیں دیکھتی ۔" "کسی کی آہیں بھی نہیں دیکھتی ؟" "نہیں ۔" "کسی کی کراہیں ؟" "نہیں !" "کسی کی بے ہنگم کھانسی ؟" "ہرگز نہیں ۔" "کسی کے آنسو ۔؟ کسی کے ارمان ؟ کسی کی آرزوئیں ؟" "نہیں ۔ نہیں ۔ نہیں ۔" پبلشر کا لہجہ لڑکھڑایا۔ "پبلک کچھ نہیں دیکھتی مسٹر۔ پبلک کو صرف تفریح چاہیئے' لُطف چاہیئے ۔" "اچھا تو اسے پبلک کی تفریح ہی کی خاطر خرید لیجیئے ۔" اُس کے لہجہ میں عاجزی تھی ۔ "وِد آل سنس ۔" پبلشر جھلا گیا۔ "ہم ایسا کچرا کلاس ناول نہیں لے سکتے۔ اس کے بجائے کسی نئے ادیب کا ناول شائع کر کے اُسے اُبھارا جا سکتا ہے۔" اور وہ مایوس ہو گیا' وہ پبلشر کی کچھڑی کھا کر وہاں سے باہر نکل آیا تھا۔ رضیہ کی کراہیں اب تک اُس کے کانوں میں گُونج رہی تھیں۔ کیا آج وہ تو ل اُس کے قبضے میں نہیں آ سکتی ؟" اور خود بخود اُس کے قدم ڈسپنسری کی جانب اُٹھ گئے تھے۔ جہاں وہی الفاظ تھے' وہی معذرت تھی' وہی بے دردی' وہی بے مُروتی ۔ "آئی ایم ویری سارری مسٹر۔ میں نہ ایسا دوا دے سکتا ہوں' اور نہ گھر چل سکتا ہوں۔ ایک سو پچیس رُوپے کا بل ہو چکا ہے' اور تم نے اب تک اُس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں چکایا ۔"

"ڈاکٹر !۔ آپ لوگ کسی کو زندگی دیتے ہیں یا خریدتے ہیں ؟" وہ چیخ پڑا تھا۔ "شٹ اپ" ڈاکٹر تیز لہجہ میں بولا ۔ "گیٹ آؤٹ فرام ہیئر ۔" اور پھر وہ وہاں سے بھی پاگل جنونی حالت میں گھر چلا آیا تھا' جہاں اُس کی رضیہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔

رات تاریک ہو چکی تھی' اور وہ سوچے جا رہا تھا' "یہ دُنیا ۔ یہ تاجرانہ ذہنیت کی غلام دُنیا' یہاں ہر زندگی رُوپوں میں تولی جاتی ہے۔ یہاں فن بازاروں میں مٹی کے مول بکتا ہے' پھر بھی فنکار کو بھوکا رہنا پڑتا ہے' کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ اُس کے افسانے' اُس کے ناول' لوگ ڈرائنگ رُوموں میں' صوفہ سیٹ کے نرم گدّوں پر بیٹھ کر پڑھا کرتے ہیں ۔ اور وہ ۔ اِن افسانوں کا خالق' آج ایک ایک کوڑی کو ترس رہا تھا۔ ایک اندھیرے کمرے میں سوچے جا رہا تھا۔ اُس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا' پبلشر کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز اب بھی اُس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی ۔ "تم پہلے دُوسرا ناول لکھ کر لاؤ ۔ ہم پھر بات کریں گے ۔" "دوسرا ناول ۔" پھر ۔ پھر ۔ تم کیا بات کرو گے ؟ کیا مجھے میری رضیہ کی زندگی مل جائے گی ۔؟ تم ۔ تم کتنے ظالم ہو ۔ تم میرے فن پر ۔ میرے افسانوں پر ۔ میرے ناولز پر عیش کرتے ہو ۔ اور میں ۔ میں ایک ایک پیسے کے لئے ترستا ہوں' تم اور یہ ڈاکٹر ۔ یہ ظالم' کیا ایسے ہی ظالموں کو مسیحا کہتے ہیں' کیا یہی انسانیت کے خدمتگار ہیں ؟ ۔ میں ۔ میں ۔ تمہیں ختم کر دوں گا ۔ تم دونوں کو' ہاں ۔ تم ۔ ڈاکٹر اور وہ مشرابی ۔ جو میری تخلیق کی آمدنی پر راج کر رہا ہے ۔ آؤ ۔ اور قریب آؤ ۔ آؤ نا ۔ ڈرتے کیوں ہو ڈاکٹر ۔ اور قریب ! اور قریب !! میں تمہیں ختم کر دوں گا ۔ آؤ ۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے بڑے جوش کے ساتھ' اور ۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا' اس کا سر چکرا گیا' اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔ اُس کے بعد سے کُھردرے اور موٹے ہاتھوں میں رضیہ کی صراحی دار گردن پھنسی ہوئی تھی ۔ اُس کی بے نُور آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں تھیں' اچانک شمعی کی لو' تھرتھرا کر بجھ گئی ۔ باہر اُلّو زور سے چیخا' اور خارش زدہ کتا پھر رونے لگا ۔ اور ۔ رات کی بھیانک تاریکی میں کسی پاگل ادیب کے خوفناک قہقہے' ایک تاریک کمرے سے نکل کر فضا کا سینہ چیرتے ہوئے دُور دُور تک پھیل گئے' دُنیا کا سب سے عظیم شاہکار مکمل ہو چکا تھا۔

مدتِ خریداری ختم ہونے کی اطلاع

اس سیاہ حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری اگست کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو گیا ہے' آپ کی خدمت میں ستمبر ۱۹۳۸ء کا شاہجریہ بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا' یا آپ سالانہ چندہ کی رقم مبلغ آٹھ روپے بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیجیے ۔ اگر تجدید خریداری منظور نہ ہو تو واپسی ایک خط سے دفتر کو اطلاع دیجیے' تاکہ وی پی نہ بھیجا جائے (منیجر)

لیف احمد صدیقی

غزل

پھولوں کی طرح حُسن کو رُسوا نہیں کرتے
یہ زخمِ جگر کھِل کے بھی مہکا نہیں کرتے

سُورج کی طرح ڈوب رہا ہوں میں اکیلا
سائے بھی مرا ساتھ گوارا نہیں کرتے

یہ دَرد کا مہتاب، یہ اشکوں کے ستارے
ڈھل کر بھی چمکتے ہیں، اندھیرا نہیں کرتے

اے حشر جنھیں خوابِ محبّت کا ہے نشّہ
وہ صُور کی آواز سے جاگا نہیں کرتے

دل ہے کہ سُلگتی ہوئی موجوں کا سمندر
بادل بھی برس کر جسے ٹھنڈا نہیں کرتے

خوابوں کے فسُوں کار جزیروں کے مسافر
ہر شہرِ طلسمات میں ٹھہرا نہیں کرتے

اے کیفؔ کچھ ایسے بھی ہیں جذبے مرے دل میں
جو شعر کے پیکر میں سمایا نہیں کرتے

اسرار اکبرآبادی

غزل

لرز رہے ہیں ارادے، بھٹک رہے ہیں قدم
ابھی تو گھور اندھیرا ہے روشنی کی قسم

فضا میں کانپتی پرچھائیاں فلک پہ جمود
تصوّرات میں دُھندلے ڈرے ڈرے ہیں قلم

حیات و موت کی خاموش سرحدوں پہ دھُواں
بڑھی ہوئی ہے تپش اور پگھل رہے ہیں نسیم

نظر کے سامنے حالات اس طرح اُبھرے
تعلقات کی راہوں میں جیسے دیر و حرم

غموں میں ڈُوبے سمندر میں بادبان کھُلے
تغیّرات کی موجوں پہ چل رہے ہیں کرم

یہ کائنات کا پھیلاؤ اور میرا وجود
کتابِ زیست پہ اسرار جیسے نوکِ قلم

لیلیٰ اور لیلیٰ کے خطوط

انوار منیر

لیلیٰ کے خطوط کیوں لکھے گئے

بقول قاضی صاحب "یہ خطوط" ایک چھوٹا سا آئینہ ہیں جو ہندوستان کے نام نہاد مصلحین قوم اور مذہبی پیشواؤں کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس میں عورت کے متعلق اپنی غفلت شعاریوں کا کریہہ چہرہ دیکھ سکیں"۔

اور اس مکروہ چہرے کو دیکھ کر دل ہی دل میں شرمائیں اور خیال کریں کہ ہم نے اس طبقے کے ساتھ کیا کیا ظلم کئے ہیں، تاکہ ان ظلموں کی یاد میں ہندوستانی عورت کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے کے لئے مجبور کرے۔ بس یہی ان خطوط کا مقصد ہے کہ سماج کے اس گلے سڑے ناسور کیلئے کوئی مرہم تجویز کیا جائے، انہیں اس تباہی کے غار سے نکالنے کی ترکیب کی جائے۔

یہ خطوط کیا ہیں؟

لیلیٰ کے خطوط، بادی خطوط کا ایک مختصر مجموعہ ہے۔ جن میں حسن فروشی کے بازار میں ہندوستانی عورت کی خوشحال فطرت کا مطالعہ کیا گیا ہے، ان خطوط کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور ہر حصے کا نام کتاب، پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب، رکھا گیا ہے، ان خطوط میں ایک طرح کا تسلسل ملتا ہے جوں جوں ہم خطوط پڑھتے جاتے ہیں لیلیٰ کی ذہنی کیفیتوں سے واقف ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر میں یہ خطوط ہم پر ایک طرح کا مجموعی تاثر چھوڑتے ہیں۔ یہ خطوط لیلیٰ کی زندگی یا خارجی واقعات کی داستان نہیں۔ (اس میں کسی قسم کا کوئی قصہ بیان نہیں کیا گیا ہے جس سے ہمیں لیلیٰ کی زندگی کے حالات، اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہو سکیں)۔ بلکہ یہ داستان ہیں اس کی باطنی زندگی یعنی ذہنی حالت کی۔ ان خطوط میں لیلیٰ کی فطرت کا مطالعہ کیا گیا ہے نہ کہ اس کی زندگی کا۔ اس میں اس کی ذہنی تبدیلیوں کا بوتوید جائزہ لیا گیا ہے نہ کہ اس کی جسمانی شخصیت کا۔

لیلیٰ کو مردوں سے نفرت ہے اور اس نفرت کی وجہ ایک مرد ہے۔ جو اسے دھوکہ دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ تمام مردوں سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ وہ مردوں کو دل کھول کر گالیاں دیتی ہے، لیکن مردوں سے دور نہیں رہ سکتی کیونکہ اس کا پیشہ ہی ایسا ہے پھر اس کے ذہنی رویہ میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اور ایک مرد کی محبت اس کے دل میں گھر کرنے لگتی ہے، لیکن انتقام کا جذبہ پھر حاوی ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس محبت سے دامن چھڑا لیتی ہے۔ ایک بار پھر اس کے ذہنی رویے میں تبدیلی ہوتی ہے۔ وہ خود کو بوڑھا محسوس کرنے لگتی ہے، اور آئندہ زندگی کے لئے خود کو تنہا محسوس کرتی ہے، اسے کسی سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، پھر وہ اپنے ٹھکرائے ہوئے عاشق کو یاد کرتی ہے۔

"تم یاد آئے ہو آؤ"

یہ کیفیت چند گھنٹے طاری رہتی ہے، اب اس کے انتقام کے جذبے کی آگ سرد پڑ چکی ہے لیکن اس میں چنگاریاں اب بھی موجود ہیں۔ وہ اس کو بلاتی ضرور ہے لیکن اگلے جنم کے لئے۔

"ہاں ایک دوسرے جنم میں میرا انتظار کرو"۔

لیلیٰ زندگی بھر اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتی ہے اور اسی ذہنی کشمکش کی داستان یہ خطوط ہیں۔

چھوٹے چھوٹے مضامین کا ذخیرہ

یہ خطوط جہاں مل کر ایک مجموعی تاثر چھوڑتے ہیں، وہاں ان میں سے بیشتر کی اپنی اپنی الگ حیثیت ہے۔ قاضی صاحب نے ان

(قاضی عبدالغفار خاں مرحوم)

خطوط میں کبھی کبھی کسی مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے مثلاً کسی خط میں عشق کے بارے میں لکھا ہے تو کبھی میں اُس زمانے کے کھوکھلے لیڈروں کے بارے میں۔ عیاش مذہبی رہنماؤں کے بارے میں۔ کہیں خوبصورتی کے بارے میں کچھ لکھا ہے تو کہیں اولاد پر تبصرہ فرمایا ہے۔ کہیں تو ازدواجی زندگی کے سلسلے میں بحث کی ہے۔ تو کہیں پردے کے سلسلے میں کچھ کہا ہے۔ کہیں عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ تو کہیں "اسباب و نتائج" جیسی خشک بحث کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ غرضیکہ اس طرح کے بہت سے چھوٹے چھوٹے مضامین ان خطوط میں جواہر ریزوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔

لیلیٰ کا کردار:-

یوں تو اس مجموعے میں کئی کردار ہیں جو لیلیٰ کے وسیلے سے تھوڑی تھوڑی دیر کیلئے آتے ہیں اور پھر ہمیشہ کیلئے غائب ہو جاتے ہیں لیکن لیلیٰ کا کردار پورے مجموعے پر چھایا ہوا ہے۔ جدھر نظر اٹھتی ہے لیلیٰ ہی لیلیٰ نظر آتی ہے۔ لیلیٰ کے بارے میں قاضی صاحب نے بہت کم معلومات ہم تک پہونچائی ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کس گھر کی شمع و چراغ تھی۔ گھر کا ماحول کیسا تھا۔ اُس کی پہلی محبت کس طرح ہوئی۔ اُس کے عاشق نے کس طرح دھوکا دیا۔ پھر وہ طوائف کے اڈے تک کس طرح آئی وغیرہ وغیرہ۔ ہم اُس کے بارے میں صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔ اچھی تعلیم و تربیت پا نہ سکی۔ پھر کسی مرد نے اُس کے ساتھ بے وفائی کی اور وہ کوٹھے تک آ پہونچی اور بس۔

خیر اس سے اتنی بات تو واضح ہو گئی کہ وہ خاندانی طوائف نہ تھی۔ بلکہ سماج کے بے رحم ہاتھوں نے اُسے اس پیشے کیلئے مجبور کیا تھا۔ لیلیٰ کے کردار میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ جذبۂ انتقام ہے۔ یہ جذبۂ انتقام نتیجہ تھا اُس بے وفائی کا جو اُس کی زندگی میں آنے والے پہلے مرد نے اُسکے ساتھ کی۔ تب ہی سے لیلیٰ کو عشق سے نفرت ہو گئی۔ محبت جتانے والے اُن بے وفا مردوں کو دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگتا۔ وہ انتقام کی آگ میں جلنے لگتی۔ اور یہ آگ اتنی بلند ہوتی، اتنی بلند ہوتی کہ آسمانوں سے باتیں کرنے لگتی۔

"مرد کبھی انتقام کا جذبہ ہی ہے کہ تمہاری ہی مرمر سے تلوار کھول کر تمہاری گردنیں کاٹی جائیں۔ تمہارے ہی دانت توڑ کر تمہارے جسم میں پیوست کئے جائیں۔ تمہارے ہی ڈنک کاٹ کر تمہارے خون میں بہر پہنچایا جائے۔"

اُسے مرد پر اتنا غصہ آتا ہے کہ وہ جھنجھلا جاتی ہے اُس کے منہ میں جو کچھ آتا ہے کہہ جاتی ہے، لیکن پھر بھی لیکن نہیں ہوتی تو پھر وہ خواب دیکھتی

"کیا وہ دن کبھی آئے گا کہ جب میں تمہاری ہوس بھری آنکھوں میں سلائی پھیر کر اندھا کر دوں، تمہارے کانوں میں گرم گرم تیل ڈال کر بہرہ کر دوں، تمہارے چہرے کو آگ اور دھوپ میں اس طرح خشک کر دوں کہ تمہاری ہڈیوں میں نم باقی نہ رہے۔"

لیلیٰ جس مرد کو یہ خطوط لکھتی ہے اُسے بے وقوف سمجھتی ہے اور اُس کے ساتھ جو برتاؤ کرتی ہے وہ ناصحانہ اور بزرگانہ ہے وہ اُسے کل کا چھوکرا سمجھتی ہے اور خود کو ایک تجربہ کار عورت، اُس کے ساتھ ہی اُسے فلسفی ہونے کا بھی دعویٰ ہے جس کا اظہار اُس نے بار بار کیا ہے۔

"مگر سب سے اس امر پر اصرار کرو کہ تالاب درحقیقت سمندر ہے تو پھر پانی کا ہر قطرہ تمہارے لئے طوفان خیز ہوگا۔ تم نے بہت سے حکیم فلسفی دیکھے ہوں گے، میں ایک حسن فروش فلسفی ہوں ــــ مجھ سے کچھ حاصل کرو۔"

لیکن کیونکہ یہ فلسفی ہے اس لئے سوچنے کی عادی ہے، وہ کبھی کبھی اپنی شخصیت کے بارے میں بھی غور کرنے لگتی ہے لیکن وہ خود کو سمجھ نہیں پاتی کہ وہ کیا ہے۔ کبھی اُس میں بجلی کی سی چمک اور بادل کی کڑک پیدا ہو جاتی ہے۔ تو کبھی وہ رحمت بن کر برسنے لگتی ہے کبھی وہ ہنستے ہنستے رو دیتی ہے۔ اور کبھی روتے روتے ہنسنے لگتی ہے۔ کبھی وہ نسیم سحری بن جاتی ہے تو کبھی گرمیوں کی لُو۔ اس لئے کہتی ہے۔

"میرا کچھ عجب حال ہے۔ میں کچھ عجیب ہوں۔ کسی نے مجھے ایسا بنا دیا۔ کیسے میں ایسی بن گئی۔"

جہاں لیلیٰ اتنی سنگ دل، بے رحم، کٹھور اور غصہ ور ہے وہیں اُس میں جذبۂ ایثار، خلوص اور محبت کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنے عاشق کی بیماری کے زمانے میں دن رات جاگ کر تیمارداری کرتی ہے اور اس میں بڑا لطف آتا ہے۔ وہ زندگی کے ایک نئے تجربے سے دوچار ہوتی ہے

"میں آج تک کسی کی بہن نہیں، بیٹی نہیں، بیوی نہیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ عورت خدمت میں کیا مزہ پاتی ہے، میں نے ایک نئے مکتب میں کچھ نئے سبق پڑھے۔"

لیلیٰ کو اپنے عاشق کی محبت کا کچھ کچھ یقین ہونے لگتا ہے وہ نکاح کی پیشکش کر دیتا ہے، اب یہاں لیلیٰ ایک زبردست ذہنی کشمکش سے

لڑتی ہے' ایک طرف اُس کا دل کہتا ہے

"لیلیٰ بچنا مشکل ہے۔ تو محبت کے پھندے میں پھنس گئی ہے۔ تیرے دل کی پرانی قبر میں مردہ۔ پھر کروٹیں لے رہا ہے' اب کہاں جائے گی۔ آخر تیرے حسن و عشق کی بارگاہ میں حاضری دینی پڑے گی۔"

دوسری طرف اُس کا ذہن کہتا ہے۔

"لیلیٰ گھبرا نہ تو مُڑتی ہے۔ تو۔ جس نے سیکڑوں مُوذیوں کو چٹکی میں مسل ڈالا۔ محبت ایک دھوکا ہے۔ فریب ہے۔ بھول کر بھی اس کا خیال نہ کیجیو۔ تجھے مردوں سے اُن مظالم کا بدلہ لینا ہے جو تجھ پر کیے گئے ہیں۔"

لیلیٰ اگلا بڑا مقام پھر عود کر آتا ہے جو کچھ لمحوں کیلئے دب گیا تھا' یہی اُس کی زندگی کا بھی مقصد تھا۔

لیلیٰ عشق کی تو قائل ہے لیکن ایسے عشق کی جو آسمانی عشق" کہلاتا ہے' جس میں جنسی جذبے کے لئے کوئی جگہ نہیں' جہاں لیلیٰ نے اپنے بہت سے عاشقوں کا ذکر کیا ہے۔ وہاں ایک ایسے لڑکے کا بھی ذکر کیا ہے جس کا نام ممتاز ہے' اُس کو وہ چاہتا تو ہے لیکن جسمانی لذت حاصل کرنا اُس کا مقصد نہیں۔ "مجھے اصلی عورت چاہیئے مجھے محض جسم کی ضرورت نہیں" یہی وجہ ہے کہ ممتاز سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے خیالوں میں ذکر کرتی ہے۔

"ہماری یہ دوستی عشق و محبت کی سوزش سے پاک ہے وہ (ممتاز) آتا ہے۔ گھنٹوں میرے پاس پڑا رہتا ہے میری زندگی کی داستان کا ایک حصہ اُس نے میری زبان سے سُن لیا ہے تم ایک لفظ بھی آج تک نہ سُن سکے کیونکہ تم محض عاشق زار ہو۔"

مکتوب الیہ کو محبت پر اُس کو اُسی دن یقین آتا ہے وہ قسم کھا لیتا ہے کہ آئینہ تمہارے ساتھ نفسانی تعلقات نہ رکھے گا۔ اور جس طرح محبت کرنی چاہیئے کرے گا' اس بات کا پورا اثر ہوتا ہے' اگرچہ پورے طور سے نہیں جب سے تم نے مجھ جسمانی تعلقات سے خارج کیا ہے میں تمہاری دوستی میں لیکن لطف پاتی ہوں۔" ان دونوں مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عشق کے سلسلے میں اس کا تصور کیا ہے۔

لیلیٰ کو ان مولویوں سے سخت نفرت ہے جو مذہب کی آڑ میں چار

چار بیویوں کو رکھتے ہیں۔ یہ جہاں بھی نظر آ جاتے ہیں لیلیٰ کا پارہ چڑھ جاتا ہے' اور وہ انہیں دل کھول کر بُرا بھلا کہتی ہے' وہ مذہب کی بھی بُرائی کرتی ہے' اور اس سلسلے میں سخت سے سخت کلمات زبان سے نکالتی ہے۔

اُسے کھوکھلے لیڈروں سے شکایت ہے اور ایڈیٹروں کی بھی مخالف ہے' ساتھ ہی اُردو رسالوں کی بھی کیونکہ "یہ اُردو رسالے عشق کی بہت مقوی معجونیں فروخت کرتے ہیں۔"

لیلیٰ مرد کی شخصیت کے ہر پہلو سے واقف ہے۔ وہ مرد کی شخصیت کے ہر پہلو اور اُس کی رگ رگ کو' اپنے جملوں کی تیز دھار سے پھاڑ کر اُس کی اصلیت ظاہر کر دیتی ہے۔

مجموعی طور پر لیلیٰ ایک ایسا کردار ہے' جو سماج کے ہاتھوں کا کھلونا ہے' اپنی اس مجبوری پر وہ کڑھتی ہے' اُس میں اندر ہی اندر جذبۂ انتقام اُبھرتا ہے۔ وہ ہنستی ہے تو اُس کے منہ سے پھول کے بجائے خون کے قطرے گرتے ہیں' وہ چیختی چلاتی ہے' لیکن سر ٹیک کر رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی اُس کا عورت پن جاگ جاتا ہے' تو وہ تم اشیاء و خلوص بن جاتی ہے کبھی بھڑک اٹھتی ہے تو آندھی کی طرح چیختی چلاتی ہے اُس کی زندگی کا مقصد مردوں سے انتقام لینا ہے' انتقام۔

بقول قاضی صاحب "لیلیٰ کی زندگی کا فلسفہ اس قدر نفرت انگیز نہیں جس قدر دردانگیز ہے۔"

بقیہ صفحہ ۲۸ "دہلی کی مرثیں اور اُن کے گانے"

رب جانے رے بیچ میں سردن جائے
اڑے کڑکی بولی چھوڑ میری سردن گھٹ پٹ کی بولی
پیڑھی کا بیٹھنا چھوڑ میری سردن کرسی کا بیٹھنا لے
لہنگے کا پہنا چھوڑ میری سردن سائے کا پہنا لے
چرخے کا کاتنا چھوڑ میری سردن سلائیوں کا بننا لے
تھالی کا کھانا چھوڑ میری سردن کانٹے چمچی کا کھانا لے

لیجئے محفل ختم ہوئی' رنگِ محفل ختم ہوا تہذیب کے پرانے نمونے چراغ گل ہوئے پرانے مے آشام اُٹھ گئے۔ وہ پی بھی گئے۔ اور چھلکا بھی گئے۔ اب نئی محفل ہے نئے آداب محفل نئی شمعیں روشن ہیں۔ اور نئے بادہ خوار جام بجام قہقہوں کا شور مچاتے چلے آ رہے ہیں۔

اس قدر مے اور ہے' جام اور ہے
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

جمیل جمیلی

غزل

چاند بھی ڈوبا ستارے بھی گئے ہیں کب کے
ایک اک کر کے مسافر ہوئے رخصت شب کے

جانے کس حال میں ارباب چمن ہوں یا رو
کچھ خبر موج صبا بھی نہیں لائی اب کے

ذکر کیا چھیڑے ہیں غنچوں نے مرے لیکر
احمریں رنگ میں ڈوبے ترے شیریں لب کے

المیہ شہر میں کیا ایسا ہوا ہے جس سے
غم کے سیلاب میں ڈوبے ہوئے دل ہیں سب کے

دل تمھارے کہیں ہو جائیں نہ ٹکڑے ٹکڑے
ہم سے حالات غم و درد نہ پوچھو شب کے

آپ نے آنے کا جس وقت کیا تھا وعدہ!
ہم تو اس راہ میں بیٹھے ہی ہوئے ہیں جب کے

حق تو پھولوں پہ سبھی کا ہے برابر کا جمیل
پھر چمن میں کوئی کانٹوں سے رہے کیوں دب کے

قمر اقبال

غزل

فضائے کوچۂ لوح و قلم نہیں سمجھے
لہو گنوا کے ملا کیا، یہ ہم نہیں سمجھے

تمھارے شہر میں سب کے ستم سہے لیکن
تمھارے شہر کو شہر ستم نہیں سمجھے

وہ صبح کتنے اندھیرے لئے تھی دامن میں
وہ صبح جس کو کبھی رات ہم نہیں سمجھے

وہ ہم تھے، دل کی جو مشعل جلائے بیٹھے تھے
تبھی تو لوگ اجالا ہے کم، نہیں سمجھے

وہ بات جس کے لئے تم بہت پریشاں ہو
وہ بات لوگ تمھاری قسم نہیں سمجھے

وہ درد جو ہے تبسم کی اداس آنکھوں میں
قمر اسے ابھی اہل قلم نہیں سمجھے

اوم پربھاکر

سوال (ہندی) نئے گیت کا؟

سوال نئے گیت کا اتنا نہیں جتنا نظم کا ہے، اور نظم کا بھی اتنا نہیں جتنا ہندوستانی نظم کا ہے۔ کیونکہ نئے پن کو جن معنی میں ہمارے یہاں کے نئے کوی استعمال کر رہے ہیں اُس کے ہوتے ہندوستانی نظم ایسی سنگین داخلی اور شخصیاتی اندرونی روپ کے کھو جانے کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔

انسانی زندگی میں کتنی تبدیلیاں آئیں، وہ کتنی بھی ترقی کر جائے، لیکن مجھے لگتا ہے کہ جغرافیائی اور تاریخی حالات سے الگ وہ اپنے دائرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتی۔ میں اسی سمندھ کو قومی اور ملکی مزاج یا تاثروں جو دنیا میں ہر جگہ ایک سا نہیں ہے، نہ تھا، نہ ہوگا۔

اسی دائرے سے اس کے باسیوں کے مزاجی اقدار کا تعین ہوتا ہے۔ ادب انسانی کیکر کرے الگ کہاں؟ کیونکہ اپنے اپنے دائروں میں ہر انسانی کو دراصل اپنی انفرادی نوک پلک لئے ہوتا ہے اسلئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر دیس کا ادب اُس کا اپنا ہو اور یہ ہی ہونا بھی چاہیے۔ پہلے بھی کل بھی ہوگا۔

تب بھارت میں لکھی جانے والی نظم سے غیر ملکیوں (FOREIGNERS) کو یہ شکایت کہ ترجمے کے بعد اُس میں "بھارت" نہیں رہتا وہ ہندوستانی نہیں رہتی اور خود اپنے ملکیوں کو یہ گلہ کہ ہندی نظم کی روایات سے کٹی ہوئی ہے..... کیوں ہو؟

وہ ایسی کیوں نہ ہو جس کا خود انفرادی آہنگ بھی ہو اور جو آج کے ساتھ بھی ہو، آج جو اپنے تہذیبی مفہوم کے لحاظ سے ملک بھر ساری دنیا میں یکساں ہے۔

لیکن مجھے لگتا ہے کہ ہندی نئی نظم میں انفرادی آہنگ کی یہ خصوصیت (CHARACTRISTIC) دن بہ دن کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ اُسے ایسا بنائے جانے کی تمام ذمہ داری اُن چند خود ساختہ ——— SOCALLED نئے کویوں پر ہے، جو گاؤں اور قصبوں سے اُکھڑ کے شہروں اور بڑی بڑی بستیوں میں پہونچ گئے ہیں، اور وہاں کی زندگی کی رفتار اور شور و غل کو ہضم نہیں کر سکے ہیں۔ جو وہاں پہونچ کر اچانک ہی نئے پن کے طوفان میں کھو گئے ہیں۔ وہ کچھ اتفاقی مفاد کی وجہ سے اپنی خراب نظروں میں صرف ذہنی بیان کر رہے ہیں جو بیرونی ممالک کی بگڑی ہوئی پرچھائیوں کی صورت میں اُن کے خود ساختہ گھیروں میں پڑ رہا ہیں، وہ زندگی کی حقیقتوں سے یا تو بخوبی واقف نہیں ہیں، یا اُن کا اظہار کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو ناقابل سمجھتے ہیں۔ محدود نظر اور سکڑے ہوئے شعور والے ادیب یہ نہیں جانتے کہ اُن کا دائرہ بہت بڑا اور پھیلا ہوا ہے اور اپنی جس غیر ادبی کوشش کو وہ آج کے جیون کا سائنسیہ ترجمان سمجھتے ہیں وہ اُس کا غلط اور بے ڈھنگا اظہار (PRESENTATION) ہے۔ وہ اپنی شخصی کمزوریوں، ذہنی انتشار اور تنگ نظری کے غیر ادبی اظہار کو آج کا نمائندہ ادب کہہ کر پیش کر رہے ہیں، دراصل وہ ہیں ہی نہیں، بلکہ بے ترتیب لمحاتی تخلیقات سامنے لا رہے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ نئے عصری شعور کی ایک یکساں سطح ہوتے ہوئے بھی اُس پر خاص دائروں کا اثر بھی پڑتا ہے جو فطری و نفسیاتی عمل ہے، جب کہ آج کی ہندی نظم کا یہ روپ ..... نیا گیت..... میری سمجھ میں اُن تمام فیشن زدہ نئے پن سے کتنا ہے نیا گیت جہاں ایک طرف اپنے موضوع اور ہیئت میں شگفتہ اور تازہ ہے وہاں وہ ہندی نظم کی صحت مند روایات سے اندرونی طور پر جڑا ہوا بھی ہے۔ نیا گیت اپنے اظہار کے نئے امکانات میں پوری طرح ملکی روایتی دائرے کا بھرپور تکملہ ہے۔ نئے گیت میں عملی زندگی کی سچائیوں اور ملکی مزاج کا جدید پرانی اور روایتی اسالیب کے مقابلے میں وہ سرتی سے زیادہ قریب ہے، شبدوں میں نئے سنگیتی اصوات کی تلاش، صاف اور

آئندہ شمارہ

(ایک ناتمام جھلک)

سائنٹ۔ (تعارف و تبصرہ) — حنیف کیفی بریلوی۔ ایم اے

ندا فاضلی کے خط کا جواب — پروفیسر اے حمید بہاولپور

افشاں یا نور افشاں (ڈراما) — ابراہیم یوسف

غالبؔ کہ تیرا میری یادوں کے آئینے میں — علیم اختر مظفر نگری

ہوش، بے ہوشی (تاثراتی کہانی) — رفعت نواز

تانیتا ٹوپی (ایک طویل تاریخی نظم) — اعجاز صدیقی

ایک شاعر کی ڈائری (پال ویلری) — ندا فاضلی

سراب (کہانی) — ایس۔ ایم۔ رشاد ہنواں

آزاد نظم کا ارتقاء — عبدالصمد (خانہ بدوش)

ڈاکٹر سلام سندیلوی کی شاعری — انیس احمد ہاشمی ایم اے

باتیں (طنز و مزاح) — رشید الدین

تلاش (کہانی) — کلیم راہی

حسن کی خوشبو (وین آمورس) — منیر احمد

زمانے کا درد (مختصر مصری کہانی) — صہبا اکرام

نئی شاعری کیوں؟ (ایک بحث)
- عمیق حنفی
- شہریار
- ندا فاضلی
- قاضی سلیم
- کمار پاشی

منظومات:۔

منور لکھنوی۔ ساحر لدھیانوی۔ سرشار سلانی۔ کنول پرشاد کنول قیصر طلندر۔ واجی۔ تاجی انصاری۔ ساہر اکبابی۔ ممتاز راشد۔ رحمت امروہوی۔ خالد شفائی۔ رحیم بریلوی۔ تقی حیدر۔ فیض الحسن خیالی۔ نصیر پروانہ مصور سبزواری۔ عروج زیدی۔ سلیمان خمار۔ رحمت الہ آبادی۔ اسمٰعیل رازؔ خالد رحیم۔ جی۔ ایم۔ ساہی فتحپوری۔ شاہد عزیز۔ ضیاء الانجم پرتاپگڈھی۔

ادبی دنیا کے مایہ ناز ادیب و شاعر:۔

جرائد — رد و قبول — مکتوبات — نقد و نظر

علمی و ادبی اور تہذیبی خبریں

فنکاروں کی تصاویر

اکتوبر ۱۹۶۶ء کا یہ اہم شمارہ اپنے مقامی ایجنٹ کے یہاں پہلے سے محفوظ کرا لیجئے

حال احوال بیان' میر ضروری پھیلاؤ کے بجائے موضوعی گہرائی' نظر کی پوری وسعت' نئی موضوعی ترتیب' نکلی وقدری مزاج کی دائمی اقدار کا مناسب اثر روایات سے فنکارانہ اور داخلی رشتہ' عصری شعور کا واضح ترجمان اور انسانیت پر اٹوٹ وشواس وغیرہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں (اس اچھوتے مضمون میں شامل نہیں کرنا تو مشکل ہے) جن کی بنا پر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آج اگر صحیح ہندوستانی نظم ہندی کو بنانے کسی روپ میں ظاہر ہو رہی ہے' تو نئے گیت ہی ہیں شرط صرف یہی ہے کہ اس کے فنکار نئی نظم کی دقتی اہمیت اور پوچھ گچھ سے نڑائش نہ ہو جائیں' اور اس غلط فہمی سے بچے رہیں کہ ہندی نیا گیت' ہندی نئی نظم کے کسی روپ کا مدِ مقابل ہے یا مخالفت میں ہے

(اوم پربھاکر کا نیا گیت)

اب کی ساون.....

اب کی ساون
نہیں گرے سوندھے جل
سوندھے جل نہیں گرے

دھرتی لئے دراریں
مون[1] رہی
ہم پیاسے کے پیاسے
کھڑے رہے
ورکش[2] نہیں جگا سکے ہرے گانے
کھیت: کاٹھ کے ٹکڑے پڑے رہے

اب کی ساون
نہیں ہوئے جوڑواں پل
جوڑواں پل نہیں ہوئے

ہوا منوں جو رگوں[3] انگلیاں
چھوٹی رہیں شریر[4]
چڑیاں پڑی رہیں نیڑوں[5] میں.
جیسے ٹوٹے تیر

اب کی ساون
نہیں گھرے سور[6] بادل
سور بادل نہیں گھرے
سوندھے جل نہیں گرے

---

[1] خاموشی [2] پیڑ [3] ٹوٹا ہوا [4] بدن [5] گھونسلے [6] گونجتے بادل

غزل

شفق تنویر

نازک نازک پیارے پیارے رخساروں کا شہر
آذر ہم نے چھوڑ دیا وہ انگاروں کا شہر

جس کی گلیاں آنکھ مچولی کھیلیں میرے ساتھ
جانے اب کس حال میں ہوگا وہ یاروں کا شہر

اپنی جلتی سوچیں لیکر بھٹکے چاروں اور
لیکن ہم نے ایک نہ پایا دیواروں کا شہر

کس کے گھر میں کیا ہوتا ہے سب اس سے انجان
سچ مانو سب سے اچھا ہے یہ کاروں کا شہر

تنہائی کو ڈس لیتے ہیں ہمدردی کے سانپ
جب بھی یاد آتا ہے مجھ کو غم خواروں کا شہر

آذر جیسے ساری رونق لوٹ گئے ہیں آپ
اجڑا اجڑا سا لگتا ہے مہ پاروں کا شہر

زمین کا مذہب

نہیں ہے کوئی زمیں کا مذہب
جو جی میں آئے
بنا دو اس پر
وہ مسجدیں ہوں کہ ہو مندر
وہ گرجا دوارے ہوں یا کلیسا
نہیں ہے کوئی زمیں کا مذہب
جو چاہو،
مسجد کو توڑ کر تم
مہان مندر کا روپ دے دو
جو چاہو،
مندر کو توڑ کر تم
عظیم مسجد کا رنگ دے دو
کہ ان کو "شکل صلیب" دے دو
ہر ایک صورت
زمیں زمیں ہے
زمیں کا مذہب کوئی نہیں ہے۔

ناسی۔ پھڑکے

ترجمہ: نور سرکار

آگ

(مراٹھی ڈرامہ)

(رائے بہادر سادلے کا دیوان خانہ خوب سجا سجایا۔ اُن کی نظر کسی چیز کی تلاش میں الماریاں اور شیلف دیکھ رہی ہے۔ زیر لب گنگنا رہی ہے۔ آخر کار تھک ہار کر بائیں جانب کے کھلے دروازے سے اپنی بڑی بہن کو آواز دیتی ہے۔ میرا۔)

انجنی: میرا! او میرا۔!

میرا: (کمرے ہی میں سے) کیا ہوا تمھیں؟

انجنی: نہیں مل رہی ہے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اب میں تھک چکی ہوں۔ پہلے ہی سے تم اندھی ہو، نچلے شیلف میں دیکھ لو، مگر ذرا دھیان سے۔

انجنی: میں ساری الماریاں دیکھ چکی ہوں مور کہیں کی

میں مور کہ سہی، اب تم ہی تلاش کر لو، تم بہت سیانی ہو نا؟

{انجنی ٹیبل سے پرے ہٹتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف جانے کے لئے مڑتی ہے}

میرا: میں پہلے ہی سے جانتی تھی، تم مجھے کمرے سے باہر نکال کر ہی دم لوگی۔

(میرا کھوج میں جُٹ جاتی ہے اور انجنی پھر سے گنگنانا شروع کرتی ہے اتنے میں راؤ بہادر کا رکن باپو جی ہانپتے ہوئے داخل ہوتا ہے مگر کسی کا دھیان اُس کی طرف نہیں جاتا، اس لئے وہ ٹیبل کے قریب جا کر اُن کا دھیان تالیوں کے ذریعہ اپنی طرف راغب کرتا ہے)

انجنی: کون باپو جی! میں تو بالکل گھبرا ہی گئی تھی۔

تم بالکل وقت پر آ دھمکے ہو۔ ہم دونوں ناکام ہیں! اب تم ہی ذرا تلاش کر لو۔

باپو جی: کیا؟

میرا: قینچی!

باپو جی: کس لئے؟

میرا: رنگین کاغذ جو کاٹنے ہیں۔ بیڑیاں تیار کرنے والی عورتوں کی بڑی ہڑتال ہے "جاگیرداری ختم کرو" یہ جملہ ہمیں لال نشان لگوانا ہے۔ ذرا سی مدد درکار ہے۔

انجنی: ارے ہو سکے تو یہ الفاظ بھی تم ہی تراش دو۔ بھیا ہمیشہ ہی کہا کرتے ہیں، "ہمارے باپو سب سے ہی خوشخط ہیں"

میرا: ہاں باپو، تم سے بہتر کوئی بھی یہ کام نہیں کر سکے گا۔

باپو جی: یہ کام اور میں..... ناممکن!

میرا: جس طرح تم نے یہ لال کپڑا انتیا کر دیا، اب اُسی طرح یہ جملہ بھی.....!

باپو جی: کیا کہہ رہی ہو...؟ میں نے کب دیا تھا تمھیں یہ لال کپڑا؟

میرا: تمھیں خود پتا نہیں، البتہ ہم دونوں بھی واقف ہیں۔

(دونوں ہنس پڑتی ہیں)

باپو جی: میں نے کب دیا تھا تمھیں اور تم دونوں ہنس کیوں رہی ہو؟

انجنی: وہ تمہاری لال پگڑی..... (دونوں پھر سے ہنسنے لگتی ہیں)

باپو جی: رام رام۔ اب تو میں ہار ہی گیا تم دونوں کے سامنے!

انجنی بھاسی لے، تو ہم کہہ رہی ہیں، جس طرح وہ مشکل تم نے حل کی، اب یہ مشکل بھی آسان کر دو..... کیوں باپو ٹھیک ہے نا؟

میرا: حروف ذرا دھیان سے کاٹ کر لگانا۔

باپو جی: لیکن میں نے اقرار ہی کب کیا تھا؟

میرا: کر دو نا اقرار۔ کون سی بڑی بات ہے!

انجنی:۔ نفی میں جواب سننا ہمیں بالکل پسند نہیں، اور باپو جی تم بھی نفی کے قائل نہیں ہو۔

باپو جی:۔ کیا تم دونوں یہی چاہتی ہو کہ میں وکیل صاحب کو تار دے دیں۔؟

انجنی:۔ لیکن اُن کو اس بات کا بالکل پتہ نہیں چلیگا کہ تم نے ہماری مدد کی ہے

میرا:۔ ان کی بمبئی سے واپسی میں ابھی چار روز باقی ہیں۔

باپو جی:۔ آخر تم دونوں ہو کس دھوکے میں..... وہ تو صبح ہی واپس آچکے ہیں!

میرا:۔ کیا کہہ رہے ہو؟

انجنی:۔ کیا وہ واقعی واپس آگئے ہیں؟

باپو جی:۔ صرف آئے ہی نہیں نہا دھو کر چار سے بھی فراغت حاصل کر چکے ہیں، اب دیوان خانے میں آیا ہی چاہتے ہوں گے گپ بازی کرنے تم دونوں اسی وقت یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ، آج پہلے ہی سے وہ ناراض ہیں

میرا:۔ ناراضگی کی وجہ؟

باپو جی:۔ اُن کی من پسند بیڑیاں ختم ہو چکی ہیں۔ میں نے رامو کو بازار تو بھیج دیا ہے، کہیں ایسا نہ ہو وہ خالی ہاتھ واپس چلا آئے۔

(اتنے میں رامو داخل ہوتا ہے)

رامو:۔ باپو جی!

باپو جی:۔ کیا خبر لائے ہو؟

رامو:۔ ہڑتال خوب رنگ لائی گئی، کارخانے کے صاحب لوگ کہہ رہے ہیں، ہڑتال کرنے والی سبھی عورتیں چار ہی دن میں بیدھی ہو جائینگی۔ کل ان کے جلوس پر پتھر برسائے گئے۔ آج بھی وہی حال ہونے والا ہے۔

باپو جی:۔ میں نے تمہیں خبریں جمع کرنے کے لئے نہیں بھیجا تھا۔ کہو بیڑیاں لائے ہو؟

رامو:۔ فرماس بیڑی کہیں نہیں ملتی، سبھی دوکانیں چھان ڈالیں۔

باپو جی:۔ پھر کیوں اپنا بے سُرکا راگ الاپ رہے ہو، چلتے پھرتے نظر آؤ (رامو چلا جاتا ہے) اب نہ جانے وکیل صاحب میری کیا گت بنائیں گے انجنی، اور میرا ہنس پڑتی ہیں، اس پر طرّہ یہ کہ دونوں اس ہر حال میں ہنستے رہتی ہو۔ خدا کے لئے ایسا نہ کرو۔

میرا:۔ ہمیں نصیحت دینا چھوڑ دیں ہم دونوں ابھی یہاں سے رفو چکر.....!

باپو جی:۔ انجنی ٹیبل پر اخبار کے نیچے سے دیکھو تم دونوں نہ جانے کہاں کہاں تلاش کر رہی ہو۔

انجنی:۔ میرا، (دونوں ایکساتھ) تعجب کی بات ہے۔ بغل میں بچہ... تھینک یو باپو!

(دونوں ہنستی ہوئی کمرے کی جانب چلی جاتی ہیں)

باپو جی:۔ ان کے سامنے پڑی ہوئی نفی نظر نہیں آتی اور چلی ہیں اُن عورتوں کو راستہ دکھانے۔ جو خود کچھ دیکھ نہیں سکتیں، اوروں کو کیا دکھا سکتی ہیں؟

(راؤ بہادر داخل ہوتے ہیں۔ ٹیبل سے کچھ کاغذات اٹھا کر پڑھنا شروع کرتے ہیں، بیڑی سلگاتے ہیں، انھیں پسند نہیں آرہی ہے، ماچس لئے ایک کے بعد دوسری آدھی جلا کر راکھ دان کی نذر کرتے ہیں)

راؤ بہادر:۔ آج کتنے جھگڑے سلجھانے ہیں؟

باپو جی:۔ چار!

راؤ بہادر:۔ کون کون سے؟

باپو جی:۔ پہلا نمبر ۳۲۶ نرسپا بیڑی کارخانے دیر۔ کارخانے میں کام کرنے والی عورت کو اس نے بری طرح پیٹا تھا، مگر ہمیں تو نرسپا کی طرف سے لڑنا ہے۔

راؤ بہادر:۔ بالکل درست! یہ کام کرنے والی عورتیں کچھ کم بدمعاش نہیں ہوتیں۔

باپو جی:۔ فیکٹم تھینک!

راؤ بہادر:۔ اس کے بعد کون سی واردات ہے؟ لیکن باپو آج کی یہ بیڑی بالکل کچے پتے کی مزہ ہے۔

باپو جی:۔ ہو سکتا ہے متواتر سفر کی وجہ سے منہ کا مزہ بگڑ گیا ہو۔

راؤ بہادر:۔ ناممکن! شاید یہ فرماش بیڑی نہیں ہے، فلاں دوسرا برانڈ تو دے دو۔

باپو جی:۔ بیڑیاں ختم ہو چکی ہیں

تو رامو کو بازار بھیجدو اور ایک ہزار بیڑیاں زائد منگوالو، بمبئی کے تاتیا بھاؤ کو یہ بیڑیاں بہت پسند ہیں، آج ہی ان کی بیڑیوں کا پارسل روانہ کرنا ہے۔

باپو جی:۔ جی ہاں! بھیج دیتا ہوں رامو کو۔

راؤ بہادر:۔ میری فرماش بیڑیاں منگوالو، نجانے یہ بالنریاں کم کہاں سے لے آئے ہو، جھونک دو انھیں آگ میں!

باپو جی:۔ آپ کی بیڑیاں آنے تک یہ سگار ہی دیکھ لیجئے، کل ہی پونہ سیٹھ نے آپ کیلئے یہ تحفہ بھیجا ہے۔

راؤ بہادر۔ (اسی طرح) میں یہ سگار اور کسی قسم کے ہوں تب بھی مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں ـــــ میں بیڑی پیتا ہوں سگار نہیں۔ جینو سیٹھ سگار کا تحفہ بھیجنے والا ایسے بیوقوف ہے اور مجھے پیش کرنے والا اگر مجھے صرف فرمائش بیڑی کی ضرورت ہے۔

باپو جی۔ لیکن آپ کو کچھ دن کیلئے انتظار کرنا ہوگا۔

راؤ بہادر۔ تو کیا بازار سے بیڑیاں لانے کے لئے پانچ ٹرک کا عملہ درکار ہے؟

باپو جی۔ ہڑتال!

راؤ بہادر۔ کون سی ہڑتال کس کی ہڑتال؟

باپو جی۔ کارخانے میں بیڑی بنانے والی عورتوں نے کام پر جانا بند کر دیا ہے اس لئے پرانا کوٹہ بازار سے اٹھ گیا ہے۔

راؤ بہادر۔ یعنی یہ وقت بھی قیامت سے کم نہیں۔ اب نچلا طبقہ بیڑی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

باپو جی۔ کل ڈیڑھ ہزار عورتیں ہیں۔

راؤ بہادر۔ چاہے وہ چار ہزار کیوں نہ ہوں۔ آخر وہ عورتیں ہیں اور سرمایہ میں مزدوری سے کم ہیں۔

(اتنے میں راؤ داخل ہوتا ہے)

راؤ۔ آپ سے ملئے بیڑی کارخانے کے مالک نرسپا سیٹھ آئے ہوئے ہیں۔

(راؤ کے پیچھے پیچھے نرسپا سیٹھ داخل ہوتے ہیں)

راؤ بہادر۔ آیئے، آپ بالکل وقت پر تشریف لائے ہیں۔ لیکن ایک بوڑھے کی طرح لکڑی کا سہارا لینے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

نرسپا۔ بھئی اس ہڑتال نے تو کمر توڑ کر رکھ دی ہے پچھلے ۱۰ دن سے کوڑی تک میسر نہیں ہوئی۔ تمباکو اور پتوں کا انبار لگ چکا ہے۔ ابھی تک آٹھ سو روپوں کا نقصان..... خدا جانے اور کتنا ہوگا؟

راؤ بہادر۔ تعجب کی بات ہے تم نے عورتوں کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیئے۔

نرسپا۔ سبھی داؤ آزما چکا۔ اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے، ان کی مانگیں پوری کر دی جائیں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

باپو جی۔ آخر ان کی مانگیں کیا کیا ہیں؟

نرسپا۔ ایک تو بیڑیوں پر سات آنے فی روپیہ مزدوری۔

راؤ بہادر۔ تم اس سے قبل کتنی مزدوری دیا کرتے تھے؟

نرسپا۔ پانچ آنے!

راؤ بہادر۔ قانون کے مطابق ہر ہندوستانی کو نمک روٹی ملنی چاہئے۔ ان کی دوسری مانگ؟

نرسپا۔ کارخانے کی جگہ ہم انھیں بیٹھنے کیلئے دیتے ہیں، فی ہزار ایک ہے صرف چار آنے روپوں کیا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کرایہ بھی معاف کر دیا جائے۔

راؤ بہادر۔ بیٹھنے کیلئے زمین گھر کی مانگ کیوں نہیں کرتیں یہ عورتیں؟

نرسپا۔ تیسری مانگ یہ ہے کہ اگر کسی عورت کے گھر بچہ جنم لے تو کام کرنے کے قابل ہونے تک اسے گھر بیٹھے بھتہ دیا جائے۔

راؤ بہادر۔ اور کیا کہنا ہے ان عورتوں کا؟

نرسپا۔ یہی کہ ان کی مزدوری میں سے جو دان دھرم کا پیسہ لیا جاتا ہے وہ نہ لیا جائے۔ میں ہر سال انھیں دان دھرم کے روپوں میں کسی بڑی یاترا پر بھیجا جاتا ہوں، تاکہ کم از کم بیری اس یاترا سے ان عورتوں کو گھر بیٹھے بٹھائے پن مل جائے۔ لیکن اب انھیں نہ دھرم کی پروا ہے نہ پن کی۔

راؤ بہادر۔ تو کیا اتنا سب کچھ ہونے تک تم بڑی خاموشی سے تماشہ دیکھنے میں جٹے گئے تھے؟

نرسپا۔ ان کا ساتھ دینے والے اور اسی راہ پر گامزن کرنے والے اور بہت سارے لوگ ہیں۔

راؤ بہادر۔ وہ لوگ کون کون ہیں؟

نرسپا۔ بہت دور جانے کی ضرورت نہیں، یہ لوگ آپ ہی کے گھروں میں بستے ہیں، اب کیا چھپانا آپ سے، اس ہڑتال کے کرتا دھرتا آپ ہی کے گھر کے لوگ ہیں۔

راؤ بہادر۔ (تعجب سے) کون ہمارا راؤ یا کارکن باپو جی؟

نرسپا۔ نہ راؤ اور نہ ہی باپو جی، آپ کی دونوں صاحبزادیاں۔ تیرا اور انجنی۔

راؤ بہادر۔ تیرا اور انجنی..... ناممکن ہم پوسیبل ـــ

نرسپا۔ پچھلے ہفتے آپ یہاں نہیں تھے ورنہ "جاگیردار ہائے ہائے" کا نعرہ بلند کرنے والی یہ دونوں صف اول میں دکھائی دیتیں ـــ

راؤ بہادر۔ مجھے بالکل وشواس نہیں۔

نرسپا۔ مجھے بھی کہاں وشواس تھا کہ دس گھنٹے، مقابلہ تمام

کرنے والی عورتیں ایک روز اپنا سب کچھ کھو کر سر راہ چلاتی پھریں گی۔ جاگیرداری ختم کرو، روپیہ جمع کرنا بند کرو۔ ۔ ۔ مانگیں ہماری .... پوری کرو ۔ ۔ ۔

(پوکلے صاحب داخل ہوتے ہیں)

پوکلے۔ تمہاری واپسی کی خبر ملتے ہی ادھمکا ہوں۔ چاروں طرف آگ کے شعلے دکھائی دے رہے ہیں اور تعجب کی بات ہے کہ تمہاری آنکھیں بند ہیں

راؤ بہادر۔ میرے گھر میں آگ! کیسی آگ؟ کس کی لگائی ہوئی؟

پوکلے۔ تم راؤ بہادر میں راؤ صاحب دو ایک جان بہادر بھی کچھ گنے چنے لوگ ہم اس شہر کی آبرو ہیں۔ قانون کے کھمبے اور امن کی سلامتی کے پہرے دار۔ تمہارے اور میرے بچے اگر راستوں پر چلتے پھریں اس نظام کو ختم کرو، مانگیں ہماری پوری کرو۔" تو کیا تمہاری اور میری آبرو سلامت رہ سکے گی؟ یہ آگ نہیں تو اور کیا ہے جس کے شعلے تمہارے گھر کو جلانے کے لئے تیار ہیں۔ بجھاؤ ان شعلوں کو، دبا دو یہ اٹھتی ہوئی چنگاریاں!

راؤ بہادر۔ اب تو خدا ہی بچائے۔ اگر یہ باتیں کلکٹر صاحب کے کانوں تک پہنچ گئیں تو....

پوکلے۔ شاید پہنچ چکی ہوں۔

راؤ بہادر۔ اور میرا... انجنی ....!

میرا۔ (کمرے ہی میں سے) کیوں پتاجی۔ کیا تمہیں قینچی کی ضرورت ہے؟

راؤ بہادر۔ قینچی کا ہے کی۔ تو تو میری گردن پر چھری پھرا رہی ہے۔ پہلے اس طرف ۔ ۔ ۔

میرا۔ (داخل ہوتی ہے) کیوں بلایا گیا مجھے؟

راؤ بہادر۔ کان کھول کر سن لو کیا کہہ رہے ہیں لوگ تمہارے بارے میں!

میرا۔ میں اندر کمرے میں کام میں مصروف تھی۔

راؤ بہادر۔ پوکلے صاحب ہیں۔ اس سال تک میونسپلٹی کے پریسیڈنٹ رہ چکے ہیں۔ ایک کارخانے کے ڈائرکٹر، بنک کے بڑے سکریٹری اور چار پانچ انجمنوں کے صدر..... اور یہ ہیں مرسپا سیٹھ! چھ فاکھ کے مالک، اسکولوں اور اسپتالوں کا کھلے دل کے ساتھ چندہ دینے والے کیا تم ان دونوں سے بخوبی واقف ہو؟

میرا۔ میں ان سے بخوبی واقف ہوں آپ نے ان کا تعارف کراتے وقت یہ کہیں نہیں کہا کہ جب بلوائی حکومت نے زور پکڑا تو عوام نے ان کا انتخاب نہ کیا۔ اسی لئے سرکار کے پچھلے دروازے سے وہ میونسپلٹی میں داخل ہو گئے۔ اور یہ مرسپا سیٹھ ان کے پاس چھ فاکھ کہاں سے آ گئے؟ ان بیچاری غریب عورتوں کا بھوپوں کر، اسی لئے اسکولوں اور اسپتالوں کے لئے خیرات کرتے پھرتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کی آنکھوں میں چاندی کی دھول جھونک سکیں۔ ان کا ایک کھوٹہ اور دیکھ لیجئے! یہ سامنے جو پتھرے کا بنا ہوا جھونپڑا ہے، جو گرمی کے دنوں میں بھٹ جاتا ہے اور بارش کے دنوں میں ٹپ ٹپ روتا رہتا ہے۔ وہاں پر بیٹھی عورتیں کام کرتی رہتی ہیں۔ اس کا بھی ان بیچاری عورتوں سے کرایہ وصول کیا جاتا ہے، گویا وہ عورتیں اپنے ہی گھر کا کوئی کام کر رہی ہوں۔ اس پر طرہ یہ کہ کئی طریقوں سے ان کی مزدوری کی کمی کر دی جاتی ہے، ایک ہزار بیڑی پر پانچ آنے ملتے ہیں، اور ہر بار یہ کہا جاتا ہے کہ ڈھائی سو بیڑیاں سلیقے سے باندھی ہوئی نہیں ہیں۔ اس لئے پانچ آنے میں سے ڈھائی سو بیڑیوں کی مزدوری کاٹ دی جاتی ہے اس پر ان کا دان دھرم الگ۔ کام پورے دس گھنٹے! یہ بیڑی کا کارخانہ ہے یا مذبح خانہ؟

راؤ بہادر۔ کیا تمہاری تعلیم کا یہی منتہا تھا؟ کس نے پڑھایا۔ تمہیں یہ سبق؟

میرا۔ وقت خود بخود پڑھا دیتا ہے۔

راؤ بہادر۔ کہاں وہ بیڑیاں بنانے والی عورتیں اور کہاں تم؟... آوارہ... آگ لگانے والیاں...

میرا۔ کہیئے، پھر کیا کہیئے کتنا سکون ہے اس مجمعے میں بھی جتنی بڑی اور بھیانک آگ لگانا چاہتی ہوں اس میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو پائی ہوں، اس لئے مجھے دکھ بھی ہے، وہ بھوک کی آگ جو پندرہ اور سولہ دس گھنٹے کام کرنے کے باوجود بھی ایک وقت کے لئے مٹ نہیں ہو پاتی، اسی آگ کو میں لوگوں کی نظروں کے سامنے لانا چاہتی ہوں۔ اس سچائی کی آگ کو میں چاروں طرف لگانا چاہتی ہوں۔ تم نے اس آگ کو کہاں دیکھا جو مرسپا سیٹھ نے ان غریبوں کے گھروں کو لگا رکھی ہے، ان اس آگ میں ان ساری عورتوں کو جھلسا کر بھسم کر رہے ہو۔ آج آٹھ دن سے ان غریب عورتوں کی ایک پیسے کی مزدوری نہیں آئی۔ آئندہ مزدوری کی کوئی امید نہیں، کہ بھی ہو تو کم سے

شعلے اپنے پیٹ پر باندھے چلاتی رہتی ہیں۔ یہ تمہارے محلات پر قبضہ نہیں چاہتیں اور نہ ہی انہیں تمہارے سونے چاندی کے برتنوں کی ضرورت ہے، انہیں صرف آزادی چاہیئے اور اپنا حق محنت کا صلہ، ہم سے بھرپور محنت لو اور بھرپور صلہ دو۔ اس کے علاوہ تمہاری کوئی مانگ نہیں۔

نرسپا:۔ ہم سات آنے کی جگہ نو آنے بھی دے دیں تب بھی ان کا دل دُور نہیں ہوگا، ان عورتوں کے شوہر روز نشہ.....!

پوکلے:۔ بالکل بجا کہہ رہے ہو تم! ساہوکاروں کو گالیاں دینے سے دل کا تھوڑا سا دُکھ ہوگا۔ اپنی بُرائیوں کو نکال پھینکنے کی ضرورت ہے۔

راؤ بہادر:۔ میرا اگر تمہیں مزدوروں کی حالت سُدھارنی ہے تو دارو بندی کا پرچار کرتے پھرو۔ مزدوروں کی حالت سدھر جائے گی۔

نرسپا:۔ باپو جی دکھاوے جی کا بھی یہی نعرہ تھا۔

میرا:۔ ہاں جب ہم اپنے حق کی بات کرتے ہیں تو انہیں ہمارے منہ سے شراب کی بو آنے لگتی ہے۔ کیوں پوکلے صاحب! آپ اپنا شام کا وقت کہاں گزارا کرتے ہیں؟ اور نرسپا سیٹھ آپ کے بھائی نے اتنی بڑی جائداد کا ستیاناس کیسے کیا؟

راؤ بہادر:۔ میرا تم پوکلے صاحب کی بے عزتی کر رہی ہو، شرم نہیں آتی تمہیں؟

میرا:۔ ان ڈیڑھ ہزار عورتوں کی جو بے عزتی ہو رہی ہے، اُسے سامنے لانے کیلئے سچائی کا نہر نکال رہی ہوں۔ یہ بڑے لوگ اپنے گناہوں کو بھلانے اور اپنا وقت گذارنے کے لئے کہاں کہاں نہیں جاتے؟ اور مزدور دن بھر کی سخت محنت کی تھکن دُور کرنے کے لئے گذشتہ حالی کے احساس کو دفنانے کیلئے شراب پیتا ہے دو چار کش کی آگ کو اپنے پیٹ میں اتار لیتا ہے تو اس کی ہا ہا کار مچ جاتی ہے۔

("جاگیرداری ختم کرو" کا لال نشان ہاتھ میں تھامے انجنی داخل ہوتی ہے)

راؤ بہادر:۔ کون، انجنی؟

نرسپا:۔ اب تم خود ہی دیکھ لو۔

انجنی:۔ دیکھو کتنی محنت کی ہے میں نے اس نشان کو تیار کرنے کے

شاعر بھیجو

میرا:۔ (جھنڈے کو بغور دیکھتے ہوئے) کالے قانون ختم کرو۔

(اسی وقت سامنے میدان میں جمع ہونے والی عورتوں کی آواز آتی ہیں..... اس نظام کو ختم کرو.....)

انجنی:۔ چلو اب دیر نہ کرو عورتیں جمع ہو چکی ہیں۔

راؤ بہادر:۔ (چیختے ہوئے) یاد رکھنا اگر گھر سے باہر قدم بھی رکھا تو..... یہاں صرف میرا حکم چلیگا، اور اس پر عمل تمہارا فرض ہے، میں راتھو سے کہہ دیتا ہوں کہ ان دونوں کو کمرے میں بند کر دے اور باہر سے تالا لگا دے۔

(راتھو ایک شخص کو دیوان خانے میں داخل ہونے سے روک رہا ہے، اس کے باوجود وہ شخص داخل ہوتا ہے)

راؤ بہادر:۔ کون ہو تم جو بنا اجازت اندر آ گئے ہو؟

..... میری بیوی اس گھر میں چھپائی گئی ہے (میری بیوی کو اس گھر میں چھپایا گیا ہے)

راؤ بہادر:۔ ہمارے گھر میں۔ تمہارا دماغ تو نہیں کھسکا نے ہے نا؟ تمہاری ان بیٹیوں نے.....!

راؤ بہادر:۔ میری لڑکیوں نے تمہاری بیوی کو چھپا رکھا ہے، تعجب کی بات ہے!

..... میرا نام شریف اپا، پوچھ لو اپنی لڑکیوں سے اور کرو وضاحت۔

میرا:۔ یہ شریف اپا مہاراج ہماری ہڑتال ناکامیاب کرنے کا ٹھیکہ لے چکے ہیں، اور مزدوروں کے ہاتھ خوب پیٹے گئے ہیں۔ اُن کی بیوی رنگما، نرسپا سیٹھ کے کارخانے میں کام کرتی ہے، وہ ہڑتال میں حصہ لے رہی ہے، اس لئے اُس نے رنگما کو بڑی بے دردی سے پیٹا ہے، ہم دونوں نے اُسے اپنی شرن لیا ہے۔

راؤ بہادر:۔ پہلے تم نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا، اب کیوں اس کے پیچھے بھاگے پھرتے ہو؟

میرا:۔ بیوی یعنی جب، وقت چاہا اپنے ساتھ رکھ لو اور جب چاہے گھر سے نکال دو، شرم نہیں آتی تمہیں؟

شریف اپا:۔ میری بیوی میرے حوالے کر دی جائے۔

میرا:۔ ناممکن! یہ ہو نہیں سکتا!

راؤ بہادر:۔ کیوں؟

(بقیہ صفحہ

شاعر بمبئی
اختر نظمی

غزل

ہم نے دل پر رکھ لیا پتھر تو کیا
آ گئے اُس بزم سے اُٹھ کر تو کیا
یہ خمارِ تشنگی بھی کم نہیں
ہیں شکستہ شیشہ و ساغر تو کیا
نامکمل ہے جنونِ سر کی بات
ہاتھ اگر آ بھی گئے پتھر تو کیا
پھر بہک جائیں گے، دیوانے تو ہیں
ہوش میں آ بھی گئے پل بھر تو کیا
اپنی راہوں میں ہیں میخانے بہت
بند ہے اک میکدے کا در تو کیا
کل کے خوابوں میں ہزاروں رنگ ہیں
آج ہے بے رنگِ ہر منظر تو کیا
شکر ہے گھر میں ہے نظمی گھر کی بات
خندہ زن ہیں مجھ پہ بام و در تو کیا

جمال مہدوی بڑودوی

غزل

جتنے غم آئیں مری سمت، انھیں آنے دو
زندگی کے لئے اِس دَور میں مر جانے دو
جام چھینو نہ خدا کے لئے ہاتھوں سے مرے
دوستو آج مجھے حد سے گزر جانے دو
راستے زندگیٔ نو کے بنانے والو!
اُن کے در تک بھی کوئی راہ گزر جانے دو
کھڑکیاں کھولو، دماغوں کی کہ ہے وقتِ سحر
گوشے گوشے میں اُجالے کو بکھر جانے دو
چاند تاروں کی حدوں تک ہی نہ رکھو محدود
اور جاتی ہو جہاں تک بھی نظر جانے دو
ہاتھ بربادیٔ گلشن میں رہا ہے کس کا
ہم بتا سکتے ہیں یہ بات، مگر جانے دو
پرچمِ حق و صداقت نہ جھکے تم سے جمال
جوئے خوں سر سے گزر جائے، گزر جانے دو

شاعر
اردو

محمد علی صدیقی

وان گو

فن

زندگی کی روشنی میں

یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج جدید آرٹ کا نام لیتے ہی مانی کے آرٹ کا تصور ابھر آتا ہے۔ آج دنیا بھر میں زبانیں اپنے جاگیردارانہ پیرایہ کو کھو رہی ہیں نتیجے میں جدید اور ہر جدید اصطلاحیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

یہ اصطلاحیں چاہے ادب میں استعمال ہوتی ہوں یا دیگر فنون میں لیکن مانی کی وسعت ہیں ان تصوروں شاعروں اور دوسرے تمام تخلیقی کرب سے گزرنے والوں کی ترقی پذیر کوششیں مبنی اور تجرباتی کاوشوں کو الگ نام دینے پر مجبور کرتی ہے جو صرف ہمارے زمانے میں نہ ہونے کے باعث ماڈرن نہیں کہلا سکتے لہٰذا لکھنے والے زندہ کہنا زیادہ بہتر ہے وان گو جدید بھی ہے اور زندہ بھی۔

سارا عظیم فن جدید ہے شیکسپیئر، کالی داس اور بودھ مت بھی جدید ہیں۔ لیکن اس کا ایک دوسرا سوال اٹھتا ہے کہ وہ فنکار جو وقت اور ذوق کی اوٹ میں آج ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ کیا اسی مفہوم سے "مردہ" ہو چکا ہے اور پھر وہ فنکار جو اپنے سارے فنی سرمائے کو فراڈ بتا دینے کے مذاق کے بعد دنیا کے مصوروں پر سب سے زیادہ اثرات چھوڑنے کا محرک ہوا نیچ عظیم نور لغی کے بعد بھی سب سے بڑا فنکار کہلایا گیا۔ "وان گو" کے ضمن میں یہ سارے سوال خود بخود اٹھتے چلے آتے ہیں۔ کیونکہ ماضی کا قدیم تاریخ دانوں کی طرح اثرات سے کسی شخص یا واقعہ یا کسی کام کا اندازہ لگاتے ہیں۔ وہ ایک تاریخی شخصیت کے نام لیوا اور شیدائیوں کی تعداد سے اس شخصیت کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اور غالباً اسی لئے مصوری کو ایک دکھتی رگ خاندان کے معیار پر جانچا جاتا ہے کہ جو عجائب خانہ کے بہانوں سے زیادہ تعلیمی کمانڈ بنوا سکے وہی سب سے بڑا مصور ٹھہرے۔

"وان گو" اس لحاظ سے بھی انیسویں صدی کا بہت بڑا مصور ہے اس نے تاثریت (IMPRESSIONIST) تحریک کو "زندگی بخشنے" والا اور رعنائی دی ہے کہ ہم اسے تاریخی وقت کے معنوں میں نہیں بلکہ خالصتاً مکانی (SPATIAL) معنوں میں جدید کہہ سکتے ہیں۔ ایسے کہنا نہ ہی کوئی اشتہاری ہتھکنڈہ ہے اور نہ ہی اس کی عظمت کے سوال پر کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے۔ وہ بہت اہم شخصیت ہے اس کو جدید ٹھہرانا اگر یہ کوئی مجرمانہ فعل ہے، ہم حال کی دگرگوں صورت حال سے عاری چشم پوشی بھی کر سکتے ہیں کیونکہ جدید آرٹ عظیم فنی شہ پارے پیش نہیں کر رہا ہے اب تعریف کا آخری لفظ "اچھا" رہ گیا ہے لیکن فنکاروں کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری آرٹ کے عام شیدائیوں پر ہے۔

وان گو نے گو بڑی آسانی سے موت کی بندشوں کو پار کر لیا ہے وقت کے دھارے میں جینے کی آگہی کی حس اور "فوق البشر" کے چکیلے رنگوں کی بیانی نے سب سے بڑا فصیح البیان مصور بنا دیا ہے۔

وہ پیدائش کے لحاظ سے دلندیزی ہے جب ۱۸۵۳ء میں (ZUNDERT) کے ایک پروٹسٹنٹ پادری کے گھر پیدا ہوا تو اسے "فوق البشر" تو بے پناہ رونے ہی نے بنا دیا۔ وہ اپنی نجلی کا سب سے زیادہ رونے والا بچہ تھا جوں جوں بڑا ہوتا گیا وہ بے پناہ خاموش ہوتا گیا۔ چھ سات سال کی عمر میں ہی دنیا کے دکھوں سے اس قدر بے نیاز سا ہو گیا کہ والدین کو خیال گزرا کہ وان گو کو مشتری بننا چاہیئے۔ وہ ناتمام کیلئے ایک درد مند دل لایا تھا اور یہ اس لئے اور بھی معاون ثابت ہوئے کہ بے پناہ طاقت بھی اسے قدرت سے ملی تھی اس کی تعلیم کے زمانے کا ایک مشہور واقعہ جس سے اس کی عظیم طاقت و ہمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ہوا کہ استاد نے اسے بائیس بائیس گھنٹوں تک مسلسل پڑھتے دیکھ کر اسے امتحان کی شرط سے آزاد کر دیا۔ اور محض اس کی محنت اور پیہم شوق کے

اعتراف میں اُسے مشنری کا سرٹیفکیٹ دے دیا' جب وہ پہلی بار آئیورتھ کے گرجا گھر میں عبادت کے لئے کھڑا ہوا تو اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا' اور وہ کچھ سہم سا گیا' اُس کی آواز میں لکنت تھی' لیکن اُسے محسوس ہُوا کہ اُس کی رُوح شکستہ الفاظ اور کھُردرے انداز کی صورت میں پھٹ پڑی ہو۔ یہاں سے ایک دو گرجاؤں میں تبلیغ کرنے کے بعد وہ اسٹرڈم آیا۔ یہاں وہ برسلز میں (EVANGELIST) مبلغ کی حیثیت سے مُلازم ہو گیا' یہاں سے اُس کا شہرہ آفاق دور شروع ہوتا ہے۔ بیوٹی فل کے کہنے کے بموجب' کاملاقات BORINAGE ایک چیلنج تھا۔ اُس نے دیکھا کہ فرد و رجال ہونے کے باوجود اپنے اپنے کاموں میں ہوشیار ہیں' وہ جیالے اور دلیر بھی ہیں لیکن ساتھ ہی میں کانوں کی بھاری مشقت نے انھیں نحیف اور زرد بنا دیا ہے اور اُن کے جسم گھل رہے ہیں' ان کے لئے سُورج اتوار کو طلوع ہوتا ہے اور اس مسلسل تاریک زندگی نے انکی آنکھوں میں شکست اور مُردنی کی پژمُردگی بھر دی ہے۔

اس نے ان مزدوروں کی زندگی کا اپنی حالت سے موازنہ کیا۔ فرق کافی تھا' اُس نے اس فرق کی دیوار کو پھلانگ کر اپنی حالت مزدوروں جیسی بنالی اور اُن کی زندگی کا ہر حالت میں شریک بن کر جو مسرت اُسے حاصل ہوئی' وہ ظاہر سیاہ دھبوں اور سانس کی گھٹن سے زیادہ تھی جب گرجا کے منتظمین کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو انھوں نے مشنری کی زندگی کے آداب و التزامات سے متعلق ہدایات ارسال کیں۔ جو اس جیسے انسان آدمی کیلئے کہاں قابلِ قبول تھیں' نتیجہ یہ ہُوا کہ اُس نے چرچ کی مُلازمت چھوڑ دی' اور سماجی خدمت کا کام جاری رکھا۔

"وان گو" کو مُصوری کا شوق لندن سے تھا لیکن اُس کے شوق نے اُسے ابھی فنکارانہ اظہار پر قائم نہیں کیا تھا' اب اُس نے کوئلے سے جو چند تصویریں بنائیں تو اُس پاس کے مصوروں پر وان گو کے چھپے ہوئے جوہر افشا ہو گئے اور ان کی ہمت افزائی سے وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جو دس سال تک انتہائی زرخیز دور رہا ہے' ان سالوں میں اُس نے کوئی چھ سو تصویریں آئل میں بنائیں' اور آٹھ سو سے زیادہ ڈرائنگ کیں

اس پورے زمانے میں اُس کا زبردست وجدانی جذبہ نہ جانے اُسے کہاں سے کہاں لے گیا اور ایک معصوم بچے کی مانند رنگوں کی لگام پکڑے خیال کا اتھاہ دریاؤں میں کھو گیا۔ اُس نے خود کو رُوح اور اس کی مشیت کے سپرد کر دیا۔ مُصوری صرف اُس کے لئے ذریعۂ اظہار نہ تھی' بلکہ رُوح کی وادی سے گزرنے کا حیلہ و مقصد' لاانتہا بشریت کو تاہموں پر تولا جو کُچھ تھا' اُس کے رنگ اور بھی گاڑھے ہو جاتے' وہ مجنونانہ جذبہ میں برش ہی کیا چاقو اور انگلیوں سب سے کام لیتا' وہ مصوری کو جذبہ تھوپنے کا کام سمجھتا تھا رنگ بھرنے کا نہیں' رنگ اس جنون کی پھیر پر اور برہم ہو جاتے رنگوں کی مادریت میں وان گو خود مادر ہو گیا۔

تقریباً چھ سال سال تک وہ کلاسیکی مکتبۂ خیال کا طالب علم رہا اور زمانۂ وسطیٰ کے ماہرین فن سے متاثر رہا' اس کی مصوری میں اُس کے چھوٹے بھائی تھیو (THEO) کا کردار بڑا مؤثر کن ہے' شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی اور بہم تنگ دستی سے دوچار رہنے پر بھی جس طرح اُس نے وان گو کی اخلاقی اور مادی امداد کی ہے وہ اس جذبۂ ایثار کی ترجمانی کرتی ہے جو انسان پر فرض ہیں۔ تھیو نہ جانے کس طرح سے اپنے اخراجات میں کمی کرتا لیکن اپنے بھائی کو ماہانہ خرچ بھیجتا' تاکہ وہ اپنے شوق کی تکمیل جاری رکھ سکے۔ وان سے یہ سب ممکن تھا کیونکہ وہ مصوری کے دام میں کسی خارجی منطق کی بدولت گرفتار نہ ہُوا تھا' وہ رُوح کا پجاری تھا اور اُس کے ہاں رُوح کا بھی عجیب تصور تھا' وہ جب رنگوں کو دیکھتا تو اُس کی آنکھیں ایک رُوحانی سفر پر روانہ ہو جاتیں اور پوری فضا پر محیط ہو جاتی' وہ جب کسی شے یا منظر کو دیکھتا تو اُسے اس منظر کی اصلیت سے زیادہ اُس میں چھپی ہوئی کیفیت سے زیادہ لگاؤ ہوتا' اُس کی تصویروں میں شروع شروع تو حقیقت پسندی غالب رہی لیکن تھیو کیونکہ خود ایک آرٹ ڈیلر کے ہاں مُلازم تھا اس لئے وان گو کو مصوری میں نئے نئے تجربات اور مکتبوں کے متعلق معلوم ہوتا رہا۔ لیکن تھیو نے اپنے بھائی کو کلاسیکی حقیقت پسندی پر چلنے دیا۔ تاکہ وہ ایک روایت کو توڑنے سے پہلے خود کوئی اپنی تو روایت بنا سکے۔

آج کا المیہ بھی شاید یہی ہے کہ لوگ شاعری اور فنِ مصوری میں پابندیوں سے اس لئے بھی کتراتے ہیں کہ پابندیوں پر عمل کرنا جان جوکھوں کا کھیل ہے' ان لوگوں میں جدیدیت کے لئے عقیدت محبت میں آنجہانی بات ہے' وہ بیچارے ایک نئے بنائے گھر کو توڑ تو سکتے ہیں' لیکن کوئی نئی منزل کھڑی نہیں کر پاتے' وان گو شروع ہی سے ایک روایت توڑنے کے لئے دوسری روایت کی تعمیر میں سرگرداں تھا جب وہ پیرس آیا تو یہاں کی چکا چوند اور نت نئی تحریکوں نے اُس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا اور اپنے بھائی پر چلا اُٹھا کہ آخر مجھے پیرس سے کیوں دور رکھا گیا' اُس کے چھوٹے بھائی نے سمجھایا کہ دراصل اب تم روایت کو توڑ سکتے ہو' اور یہی ہوا کہ وہ چند سالوں ہی میں تاثریت (IMPRESSIONIST) کے

اسکول کا سب سے بڑا دادا بن گیا۔

مصوری اُس کے نزدیک ایک عبادت تھی، وہ عبادت جو رُوح کو تطہیر کرتی ہے۔ اُسے گہرے رنگ بہت پسند تھے۔ پیرس کی اُس وقت کی تصویروں کا سب سے گہرا رنگ بھی اُس کے ہاں سب سے ہلکا رنگ تھا۔ اس پسند کا سبب اُس کی داخلی زندگی کے کرب سے ملتا ہے جو اس شدت کے ساتھ اظہار چاہتا تھا کہ ہلکے رنگ اُس کی نمائندگی نہ کر سکتے تھے۔ وان گوگ زرد رنگ بہت پسند تھا۔ وہ اُسے طاقت اور جذبہ کا نمائندہ سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تصویروں میں زرد رنگ ایک جوالہ مکھی طاقت کا اظہار ہے۔

اپنے پاگل پن کے زمانے جب وہ آرلیز (ARLES) سورج پینٹ کر رہا تھا تو سورج کی تپش میں ننگے سر دیر تک مسلسل کھڑے رہنے کی بدولت اس کا سر پکنے لگا اور اس کی آنکھیں اُبل پڑیں لیکن وہ سہل انگار مصور نہیں تھا، وہ اگر سورج پر مرتا تھا تو اُسے سورج کے دیگر تمام اوصاف سے بے خبری ہوتا تھا اور وہ اپنے فنکارانہ جذبہ میں اس قدر چور رہتا تھا کہ اپنے فن پارہ کو تکمیل کی منزل سے گزارنے تک وہ ہر قسم کی قربانی کا متحمل ہو سکتا تھا لیکن "ہمعصر" زمانہ ہمیشہ ماضی کی سنجیدہ شہرتوں ہی کو سمجھ سکتا ہے۔

جب وان گوگ ۱۸۸۸ء میں پاگل خانے میں داخل ہوا تو اس کے بھائی نے ایسا کردار ادا کیا جو تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے، وہ بڑے بھائی کو دماغی تسکین پہنچانے کیلئے تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد اطلاع دیتا کہ تمہاری فلاں فلاں تصویر بک گئی ہے، فلاں تصویر کے دام اتنے لگ رہے ہیں لیکن اور زیادہ لگیں تو۔ بچیں، تھیو اُسے منی آرڈر روانہ کیا کرتا تو وان گوگ سمجھ کر یہ سب چھوٹے بھائی کی بدولت ہے، اُسے ساری کی ساری رقم واپس کر دیتا لیکن تھیو پھر کمی بیشی کے بعد منی آرڈر کر دیتا، اور اس طرح دونوں بھائی ایک دوسرے کے عزت و احترام میں اضافہ کرتے رہے۔ تھیو کا خیال تھا کہ شاید اس طرح اس کے بھائی کے اندر چھپا ہوا بہتر فنکار نکھر کر سامنے آ جائے اور وہ پاگل پن میں اپنے فن کی قدر و منزلت کے خیال سے اعصابی سکون حاصل کر سکے۔ پاگل پن کے دوران بھی وان گوگ رنگوں سے شغل جاری رکھتا، وان گوگ وہاں کیوں چین سے بیٹھتا، اور جلد ہی صحتیاب ہوئے بغیر پاگل خانہ چھوڑ کر باہر آ گیا۔ یہاں سے وہ طوائفوں کے کوچوں میں بھٹکتا پھرا۔ اور ایک زمانے کے مذہبی مبلغ کو لوگ جب سستی عورتوں کے جلوس دیکھتے تو اپنے کان پکڑ کر رہ جاتے۔

شرکوں پر بچے اُسکا تعاقب کرتے رہتے، یہ وہ زمانہ تھا جب اُسکا پاگل پن اس حد تک بڑھا کہ ایک طوائف کے غیر سنجیدہ اصرار پر اپنا کان کاٹ دیا، اُسکی محبوب طوائف نے اُس کے بڑے بڑے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک کان مجھے دیدو، وان اُس وقت تو شرمندہ ہو کر چلا گیا۔ لیکن ایک دن شیو کرتے ہوئے اُسے خیال آیا کہ کان دینے سے کیا فرق پڑتا ہے، نتیجے میں کاغذ میں لپیٹ کر ایک کان جا حاضر کیا۔

اُس زمانہ میں اسے جب کبھی ہوش کی سوجھتی وہ خوب کڑھتا اور اپنے نادار چھوٹے بھائی کے خیال سے لرز اُٹھتا۔ اسلئے اُس نے اپنی نجات دنیا سے مراجعت حال کرنے ہی میں ٹھانی اور پستول سے خودکشی کر لی۔ مرتے وقت اُس نے کہا کہ "مجھ سے زندگی میں کوئی بھی کام نہ ہو سکا اس لئے سوچتا ہوں کہ مرنا بھی اس میں ہے لیکن یہاں بھی غلطی ہو گئی اور ڈیڑھ دن سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں"۔ اور اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

اُس کی آخری تصویر "گیہوں کے کھیت میں کالی چڑیاں" فنکار کا عجیب شہ پارہ ہے، اس تصویر کے رنگ بہت ہی ہیجانی ہیں، گیہوں کے پودوں کے وسیع و عریض خطوط پر غصیلا آسمان خضناک موڈ میں اتار دیا ہے۔ اس شہ پارے کے بارے میں خود ہی لکھتا ہے "مجھے مغموم اور بے پناہ تنہائی کا ترقع کھینچنے کیلئے اپنی راہ سے دور نہ جانا پڑا۔ شاید اس پینٹنگ میں وہ سب سے زیادہ تاثر آتی ہے۔ اور اس نے کھل کر مصوری نمائندگی کو روا رکھا ہے، اس کی شاہکار تصویر میں "پالنا جھلاتی عورت" "سیڈیا موزائیل روڈلین" "سورج مکھی" "خالی کرسی" اور (SEASCAPES) ہیں جن میں یہ خاصیت مشترک ہے کہ جذبات اس قدر شدت لئے ہوئے ہیں کہ فنکارانہ تصاویر پر کام کرتے وقت خود بے خبر معلوم ہوتا ہے۔ رنگوں کی زبان اس قدر فصیح و بلیغ ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی جنونی چیخ چیخ کر انسان کو اُس کے بنیادی جذبات و محرکات کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اس کے رنگوں میں اُس کے منہ کے بھاگ اور سرخ آنکھیں بھی جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ——

——— یہ فن کی معراج کا دور ہے جو انیسویں صدی میں چند ہی مصوروں کو ملا ہے۔ لیکن وان ان سب میں اس لئے مختلف ہے کہ وہ قدم قدم پر اپنی زبردست فنکارانہ اپج کے مطابق طرز عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ ایک بڑا GENIUS ہے جس نے مصوری کے معیار اتنا تبدیل کر دیئے جس نے غیر قدرتی تصویری فیشن کو رد کیا اور اپنے زمانہ کے ذوق کی تعمیر کی۔ اسکے بھائی نے اس

بقیہ صفحہ ۶۲ پر دیکھئے

شاعر بمبئی

سید سعید احمد

سیماب اکبرآبادی۔ ایک شاعر ایک انجمن

جب کسی بڑے آدمی کا تذکرہ ہوتا ہے تو ایک جملہ بڑی آسانی سے اس کی شان میں کہہ دیا جاتا ہے "فلاں شخصیت اپنی ذات سے ایک انجمن تھی"۔ لیکن بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں جو حقیقی معنوں میں اس صفت سے متصف ہوں۔ میرے خیال میں یہ جملہ جس قدر علامہ سیماب اکبرآبادی پر چسپاں ہوتا ہے کسی اور پر نہیں۔ برصغیر ہند و پاکستان میں ان کی ذات محض اسی وجہ سے منفرد نظر آتی ہے مگر افسوس ہے کہ ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہزارہا حمید تلامذہ اور شاگردوں نے علم و ادب کی اس قندیل کی نور فشانی ہونے دی اور نہ ان کی یاد کو دلوں سے محو ہو جانے دیا اور اعتراف شناسی کی وہ مثال قائم کی کہ جو اہل علم کے لئے باعث استعجاب ہے۔

سیماب کی شاعری اس دور میں، برصغیر جب برصغیر پاک و ہند زبردست سیاسی تحریکوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اقبال کی شاعری فضا میں گونج رہی تھی اور اہل وطن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ تمام چھوٹے بڑے شعراء روایتی غزلگوئی کو چھوڑ کر قومی و ملی شاعری کا چراغ روشن کر رہے تھے، سیماب بھی اپنی غزلگوئی کو ترک کر کے اس طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن غزلگوئی کی طرح اس میں بھی ان کی انفرادیت قائم رہی، اس عہد کے خارجی اثرات کو اس پاکیزگی سے اپنی شاعری میں سمویا کہ ایک انفرادی شان پیدا ہو گئی۔ ان کی بعض نظمیں مثلاً مزدور۔ اے سرمایہ دار۔ اقلیم کمالہ۔ مغربی مزدور کا پیغام مشرقی مزدور کے نام۔ خدا کہاں ہے۔ اور میرا وطن ادب عالیہ کی شان رکھتی ہیں، اور ان کا شمار بھی نقطۂ عروج پر ملتا ہے۔

ان کے تمام تر کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک چیز جو قاری کے ذہن پر مرتسم ہوتی ہے، وہ ان کی حقیقت پسندی ہے۔ یہ حقیقت پسندی غزل میں بھی ملتی ہے اور نظم میں بھی، وہ رومانی و مبالغہ کے قائل نہ تھے اور وہ چاہتے تھے کہ دوسرے شعراء بھی اسی نہج پر سوچیں اور اپنے خیالات کو نظم کریں، اپنی حقیقت پسندی کے متعلق وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"اب ذہنی عشق و محبت جتانے کا وقت باقی نہیں رہا۔ اب مجازی مذہبیات میں صلح و فراق کی نقالی کا موقع نہیں رہا۔ حقیقی موضوعات اس قدر کثیر موجود ہیں کہ ہمیں فرضیات اور ظنیات کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی نہیں ملنی چاہیئے۔ ہم شاعر ہیں ہمیں فطرت کی طرف سے ایک فلک رس ذہن عطا ہوا ہے، ہمیں اپنے خیالات میں ترفع پیدا کرنا چاہیئے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالی اور آزاد کے خیالات سے پوری طرح متفق تھے اور پوری شدت اور خلوص سے محسوس کرتے تھے کہ ہمارے شعراء کو اس غزل سے نکل آنا چاہیئے جس میں وہ محدود ہیں، چنانچہ اسی لئے انھوں نے غزلگوئی کو ترک کیا، حالانکہ غزل کو وہ ایک بنیادی مزاج اور نیا آہنگ دے چکے تھے، ان کی غزل میں بھی ان کی تڑپ موجود تھی غزل میں بھی بلند فکار فلسفہ اور حقائق و معارف کے نکات ملتے ہیں، ملاحظہ ہو:

میں ہو کر خاک اے سیماب جزو گل ہوا آخر — مرے شیرازۂ ہستی کو اس آیا بکھر جانا

یہ ایک سرمایہ تھا ایمان عفو میں اسکے — کہیے نہ کوئی کہ انساں گناہ کر نہ سکا

پہلے وحشت دی مجھے پھر اسکی حجت دیکھیے — عمر بھر کوئے دیا زندانِ آب و گل مجھے

ہر چیز پر بہار تھی ہر شے میں حُسن تھا　　دُنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

وہی اب اشاروں، کنایوں اور استعاروں میں غزل کہہ رہے تھے سیماب نے نظم میں کہنا شروع کر دیا ؎

اُٹھا دو چنگ و رباب اپنی بزمِ عشرت سے　　کہ آ رہا ہوں میں صد حشر چنگ و بربط و نَے

نظامِ بزمِ مسرت کو فرصتِ تعمیر　　اک انقلاب ہے میرے دُرود میں روپوش

یعنی سیماب بھی انقلاب کے پیغامبر ہیں لیکن اُن کے خیالات حقیقت پسندی سے عبارت ہیں۔ وہ جنہیں دھماکا اور شور و شغب کو ہی شاعری نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ جوش کی طرح محض بڑھے جاؤ کا نعرہ نہیں لگاتے بلکہ وہ بار بار فکر کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ اُن کا انقلاب فکر انگیز ہے، اپنے ہموطنوں کو نہ صرف آگے بڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں بلکہ صحیح سمت میں آگے بڑھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ انقلاب پر سیماب کی ایک نظم کے دو شعر ملاحظہ ہوں جن سے سیماب کی شاعرانہ عظمت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ؎

ہے خونِ لالہ زار سے بھیگی ہوئی بہار　　برباد یوں کو مرثیہ خواں دیکھتا ہوں میں

ہے غارتِ چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ　　شاخوں پہ اُنگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

یہ سیماب کی طرزِ ادا ہے وہی ایک تلخ حقیقت کو حسین تشبیہ کے پردہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ اسی قسم کی ترکیبیں، سیماب کو ایسے مقام پر کھڑا کر دیتی ہیں جہاں چند ہی اُن کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

نوجوانوں کو عمل کی ترغیب کس انوکھی شان سے دیتے ہیں، یہ اُنہی کا حق ہے ؎

کیوں سمٹ کر بیٹھے گوشوں میں مرے کمسن سپاہی　　دھوپ بن کر پھیل جانے کا زمانہ آگیا

منظر نگاری میں بھی سیماب نے اپنی حیثیت صاحبانِ نقد و نظر سے منوالی ہے۔ نیاز فتحپوری اپنے سخت تنقیدی رجحانات رکھنے کے باوجود یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ۔ "سیماب کا ادبی و مصاکاتی رنگ زیادہ پختہ ہے"۔ اُن کی جیسی منظر نگاری کی مثالیں اُردو شاعری میں خال خال نظر آتی ہیں۔

عروجِ شب ہائے ماہ کا ہے فضاؤں پہ چھا رہی ہے　　عروسِ شب بے حجاب ہو کر تجلیوں میں نہا رہی ہے

چمک رہا ہے دُھلے ہوئے آسمان پر چاند چودھویں کا　　برس کے بادل ابھی کھلے ہیں، فضا کی خنکی بتا رہی ہے

کسے معلوم تھا کہ اک بوالہوس آبادی کی سرزمین سے نظیر کے بعد اُس کے روشن کئے ہوئے چراغ کی منوّر کرنے کے لئے اُسی کا ایک ہم وطن سیماب اُٹھے گا جس کے پاس علم بھی ہوگا اور نظر بھی۔ جس کے خیالات میں بھی رفعت ہوگی اور الفاظ میں بھی۔ جو نہ اپنے دور کے شاعروں کا امام ہو گا بلکہ خود اپنی ذات میں ایک انجمن ہو گا جس طرح نظیر کو اُس کے دور میں کوئی مقام نہیں دیا گیا اُسی طرح سیماب کو بھی کثرتِ تلامذہ کے باوجود کوئی مقام نہ مل سکا۔ لیکن نظیر کی طرح سیماب کو بھی وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اُس کا صحیح مقام ملے گا، کیونکہ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین۔ "وہ انگریزی شاعری کے پوپ ــــ ڈرائڈن اور جانسن کے کلاسیکی اسکول سے زیادہ ملتے ہیں، اور عشوۂ حقیقی کے پرستار ہونے کی وجہ سے درد سے شاد ہیں۔

(جامِ نو۔ کراچی)

بقیہ "وان گو۔ فن زندگی کی روشنی میں" (صفحہ ۶۰)

کے وجود کو منوانے کیلئے دُنیا اور خود اس سے جو جنگ لڑی ہے وہ اپنی جگہ مستقل دخول کی حامل ہے

وان گو یکایک زیادہ حقیقت پسند بن گیا، اور جونہی اُسے جھوٹے پر زور دینے کا علم ہوا، اُس نے فوراً خودکشی کر ڈالی۔ کیونکہ اُسے خیال تھا کہ جھوٹ کسی طرح ختم ہو سکتا ہے لیکن وقت بھی کیا آنکھ مچولی کھیلا کرتا ہے کہ اس نے وان گو کی سوچ کو پلٹا کر رکھ دیا آج وہ سوتا ہے اور اُس کی تصویریں جاگتی ہیں۔

("نشیمن" کراچی اگست ۱۹۶۶ء)

اخلاق نجیبوری

نیاز فتحپوری

اے ادیبِ نامور، اُردو ادب کے آفتاب
تجھ سے علم و فکر کے روشن ہوئے ہیں کتنے باب

تیری فطرت گو رہی خلوت پسند و گوشہ گیر
اوجِ تابانی پہ چمکی تیری قسمت کی لکیر

تو بظاہر کم سخن تھا اور کم آمیز تھا
قافلہ علم و ادب کا تیرے دم سے تیز تھا

پیکرِ اخلاق تھا، تو، تو تھا تہذیبوں کی جان
تو ہمہ جہتی کا عالم، تو ہمہ گیری کی شان

تو کہ تھا خود اک ادارہ، تو کہ اک تحریر تھا
فکر کا مکتب تھا تو، یا علم کا اک سلسلا

سارے اصنافِ ادب میں تیرے جوہر بے مثال
ہر حقیقت پر ترا بے لاگ اظہارِ خیال

اے مصورِ حسن کا تو محرمِ اسرار تھا
صاحبِ تحقیق تھا، نقاد تھا، نشار تھا

فلسفہ، علمِ فقہ، منطق، حدیث و نفسیات
ہر جگہ، ہر انجمن میں تھی نمایاں تیری ذات

وہ فنِ انشاء ہو موسیقی ہو یا علم الکلام
ہم نے ہر محفل میں پایا ہے ترا افضل مقام

تیرے اسلوبِ نگارش، تیری طرزِ فکر کی
اک انوکھی بات تھی اک اجتہادی شان تھی

اے محافی تجھ پہ تاریخ و نجوم و فن نثار
تو معانی و بیاں کی مملکت کا تاجدار

نثر میں اک "تجزیاتی" طرز کی دے کر بنا
تو نے تعمیرِ ادب کا نام روشن کر دیا

کون اب جذباتِ بھاشا کو سمجھنے آئے گا
کس سے اب انجام اک شاعر کا دیکھا جائے گا

ہوتی جاتی ہے منّ و یزداں کے آگے عقل دنگ
راس کیونکر آئیں گے اب نقش ہائے رنگ رنگ

شبنمستاں کا کوئی اب گوہریں قطرہ نہیں
گم شدہ اوراق تھے تاریخ کے کتنے حسیں

کون ہوگا مسند آرا اب نگارستان میں
کس کی ہستی جان ڈالے گی جمالستان میں

مشکلاتِ خالقِ آخر کریں گی کس پہ ناز
اپنے خالق کے لئے تڑپیں گے مکتوبِ نیاز

سرگزشت اپنی سنے گا کس کے منھ سے اب شہاب
کس کو ڈھونڈے گی تجلی بعد اٹھنے کے نقاب

اب بھلا آئے گا کس کو عرضِ نغمہ کا خیال
حل کریگا کون ترغیباتِ جنسی کے سوال

بابِ استفسار میں خالی جوابوں کے لئے
یدطولیٰ سی کا ہنر ہے اب کتابوں کے لئے

کتنے گھوڑے تدن کے ہیں اب خالی پڑے
وہ سلیقے اب کہاں تفسیر کے، تنقید کے

جم جو ہر ہوں پرانے فلسفے کے اب کہاں
کس طرح شعری نقائص کی اڑیں اب دھجیاں

تھی مذاہب پر زمانے کے تری گہری نظر
تو نے ڈالی روشنی تحقیق پر، تاریخ پر

شرقیہ ہوں مسئلے یا حسن کی عیاریاں
فیض سب پر ہے ترا اے صاحبِ جادو بیاں

ہوں مذاکر تیرے یا مذہب کے پیچیدہ نکات
ہر جگہ افضل رہا ہے تیرا کہنا، تیری بات

تیرے بعد اب اے نیاز، اے نازشِ ہندوستاں
اک خلا ہے وسعتِ علم و ادب کے درمیاں

خون روئے آسماں یا غم سے خوں روئے زمیں
یہ خلا برسوں تو کیا صدیوں میں پُر ہوتی نہیں

زائد عنہ ۱۔ جذباتِ بھاشا ۲۔ ایک شاعر کا انجام ۳۔ منّ و یزداں ۴۔ نقش ہائے رنگا رنگ ۵۔ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں ۶۔ تاریخ کے گم شدہ اوراق ۷۔ فکارستان ۸۔ جمالستان ۹۔ مشکلات ۱۰۔ مکتوباتِ نیاز ۱۱۔ سرگزشت ۱۲۔ نقاب ۱۳۔ ترغیباتِ جنسی ۱۴۔ استفسارات و جوابات ۱۵۔ فراست الید ۱۶۔ گھوارۂ تمدن ۱۷۔ انتقادیات ۱۸۔ فلاسفۂ قدیم کی رموز کا اجتماع ۱۹۔ مالہ و علیہ ۲۰۔ غزالی و ابنِ تیمیہ کا تقابلی مطالعہ ۲۱۔ محمد بن قاسم سے بابر تک ۲۲۔ المسئلۃ الشرقیہ ۲۳۔ حسن کی عیاریاں ۲۴۔ مذاکراتِ نیاز ۲۵۔ غریب

مکتوبات

نامی انصاری ——— ۱۷/۱ پریڈ کانپور۔

شاعر کا تازہ شمارہ (اگست ۶۶ء) ملا۔ یاد فرمائی کیلئے شکر گزار ہوں۔ یہ شمارہ مضامین نثر و نظم کے لحاظ سے نہایت وقیع ہے۔ اردو کے بارے میں آپ کا اداریہ غور و فکر کا مستحق ہے۔ خبر تو ہے کہ کانگریس پریسیڈنٹ شری کامراج اس مسئلہ کو سلجھانے کے لئے کوشاں ہیں، بہار کے وزیر اعلیٰ جناب کے بی سہائے نے خود صدر کانگریس سے درخواست کی ہے کہ بہار میں اردو کو علاقائی زبان قرار دینے کا انتظام کیا جائے۔ وزیر اعلیٰ بہار یقیناً ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ اب سوال صرف یو۔ پی کا ہے۔ اور یہی BURNING QUESTION ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شری کامراج اور شری چندا بھانو گپتا اس مسئلے پر کہاں تک اپنے اثرات استعمال کر سکتے ہیں، عام انتخابات بھی قریب ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ چند مہینوں میں کوئی قطعی صورت سامنے آ سکے میرا ذاتی خیال ہے کہ جب تک اعلیٰ سطح پر اس معاملہ پر غور و خوض ختم نہ ہو جائے۔ اس وقت تک حامیانِ اردو کو کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہیے جس سے بنتی ہوئی بات بگڑ جائے۔ جہاں ہم نے انتیس سال صبر و ضبط سے کام لیا ہے، وہاں چار چھ مہینے اور سہی۔

منظہر امام ——— آل انڈیا ریڈیو گوہاٹی (آسام)

جولائی کے شمارے میں "شاعر" میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں، انہ سے رسالے کی صوری خوبیوں میں نمایاں اضافہ ہوا ہے، لکھنے والے کی تخلیق کے ساتھ، اسی صفحے پر فن کار کی تصویر کا اشاعت کا سلسلہ بہت ہی خوب ہے اور آپ کے ذوقِ سلیم کا غماز۔ ایک عرصہ سے میری خواہش رہی ہے کہ میں اردو کا ایک ایسا رسالہ شائع کروں جو پورے کا پورا ٹائپ پر چھپے، اور ہر تخلیق کے ساتھ صاحبِ تخلیق کی تصویر بھی ہو۔ آپنے میری خواہش کے ایک حصے کو تکمیل کر دکھایا۔ ٹائپ ہمارے یہاں اب تک مقبول نہیں ہو پایا۔ یوں بھی اس کی طباعت کے اخراجات بڑے جان لیوا ہیں۔ لیکن کبھی نہ کبھی ہمیں اس کی طرف آنا ہی ہوگا، اگر ہمیں اپنے ہم خطا کی بقا عزیز ہے۔

اگست کا شمارہ اپنے بعض مگر ان قدر مشمولات کے باعث یقیناً خاص نمبر کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ فراق گورکھپوری کا رباعی غزل لکھنا چھوڑ کر فارسی اور اردو کے مشہور اشعار پر تضمینیں ہی لکھا کریں تو وہ اچھا گلدستہ تیار کریں گے، قارئین کا بھلا تو ہوگا ہی۔ شاذ تمکنت اور اویس احمد دوراں کی نظمیں تاثر سے بھرپور ہیں، اگست نمبر کی مناسبت سے متین سروش کی نظم موزوں ہے اور جذبۂ وطنیت کو مہمیز دیتی ہے، احمد جمال پاشا کا طنزیہ مضمون ان ہم تضمینوں کے لئے خاص طور پر تسکین کا باعث ہوگا جو میری طرح احباب اور کرمفرماؤں کی نوازشوں کا شکار ہوں۔ یوسف ناظم نے جدید علامتی شاعری کی افراط اور تفریط کا مذاق خوبصورتی سے اڑایا ہے۔ مسعود قمر "آباؤں کا مضمون" ایک تعارفی حیثیت رکھتا ہے۔ جو بہت اچھا ہے۔ بہر حال مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ "شاعر" کے صفحات میں اور جدید شاعری کے مسائل پر گفتگو کی جا رہی ہے، کلدیپ سنگھ "محمد علوی" شہریار۔ ندا فاضلی اور اس طرح کے دیگر جدید ترین شاعروں کے افکار کا ہمدردی اور فراخ دلی کے ساتھ تجزیہ کیا، اور انہیں ان کی غلط فہمیوں سے آگاہ کر دیا یقیناً زندہ زبان کے قارئین کیلئے مفید ہوگا۔

فکر تونسوی کی اعلیٰ طنزیہ صلاحیتوں کا میں بڑا قائل ہوں۔ افسوس ہے کہ انہیں ناقدوں کی بارگاہ میں مناسب درجۂ اعتبار نہیں ملا۔ مناظر عاشق ہرگانوی قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے فکر کی خراشت اور طنز کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ ندا فاضلی کے مضمون "بارکر ہوئی" کے اختتام پر لکھا ہوا ہے "ہندی سے ترجمہ"۔

مجھے تو یہ مضمون کہیں سے ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ اگر یہ مضمون پہلے ہندی میں خود ندا فاضلی نے لکھا تھا اور پھر اسے انھوں نے اردو میں

دیا ہے تو اسے ترجمہ کہنا درست نہ ہوگا' بہرحال مضمون بہت خوبصورت ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ آج کا جدید ذہن اپنی اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی تباہی پر کتنا طبع رداشتہ ہے اور وہ اب اُن کہانیوں اور اُن لیلیٰ کے لئے تسکین کا سامان ڈھونڈتا ہے۔ جو تاریخ پارینہ کا حصہ بن چکی ہیں۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی کا مضمون بہت مایوس کن ہے' انھوں نے دو صفحات میں کلیم الدین احمد سے خواہش ملاقات کی بیتابی کا تذکرہ کیا ہے اور نصف صفحے میں اُن سے اپنی ملاقات کے ذکر کو ختم کر دیا ہے۔ انہیں خدا تفصیل سے لکھنا چاہیئے تھا کہ کلیم صاحب سے کیا باتیں ہوئیں' احتشام' سردار' مجنوں' وغیرہ کے بارے میں سرسری طور پر ہی سہی' لیکن انھوں نے کن خیالات کا اظہار کیا۔ اور مجموعی طور پر انھوں نے کیا تاثر چھوڑا۔ کوثر چاندپوری' مہندر ناتھ اور اکرام جاوید کے افسانے پسندیدہ ہیں' اظہر افسر نے نذیر احمد کے ناول کو چابک دستی سے ریڈیو ڈرامہ کی شکل دی ہے' سردار جعفری کی "محبوبہ کا ایک خواب اور" پرتاپ کا تبصرہ تفصیلی اور جامع ہے اسے باضابطہ مقالہ کہنا چاہیئے۔

اپنی غزل کے بارے میں اتنا عرض کرنا ہے کہ اسے آپ کو روانہ کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ آخری شعر کو ترتیب میں دوسرے نمبر پر آنا چاہیئے تھا۔ پھر اس شعر میں "سر بادیا دے" کی جگہ "خاموشیاں دے" کی ضرورت تھی۔ یعنی شعر مندرجہ ذیل صورت میں شاید حسب حال اور زیادہ پُر تاثیر ہوتا۔

میرے حصے میں فقط خاموشیاں' ویرانیاں یہ جہاں' سب کا جہاں' یہ انہیں میرا انہیں

اس کے علاوہ اس غزل کے چھٹے شعر میں لفظ "تازہ" واوین کے اندر ہوتا تو بہتر تھا۔ آج سے کم و بیش ۳۵-۴۰ سال پہلے اقبال نے جس "آفتاب تازہ" کے پیدا ہونے کی بشارت دی تھی' اب "انقلاب" "آزادی" اور "خوشحالی" کا وہی آفتاب ہمارے جسموں کو ہی نہیں' ہماری روحوں کو بھی جھلسا رہا ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی ـــــ موضع ہرگانواں بریگہہ ضلع مونگیر (بہار)

"شاعر" کے اگست ۶۶ء کے شمارہ میں آپ نے "روح اخذ" کے تحت ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا مضمون "اردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈرامہ" شائع کیا ہے۔ نامی صاحب نے ۱۸۵۱ء کے "خورشید" نامی ایک ڈرامہ کو اردو کا سب سے پہلا اور بنیادی ڈرامہ قرار دیا ہے نیز نامی صاحب لکھتے ہیں کہ "واجد علی شاہ" کے دربار میں امانت کو کوئی حیثیت حاصل تھی' اور نہ شاہ عالم نے اُن سے "اندر سبھا" لکھنے کی فرمائش کی اور نہ یہ "رسم" کبھی اسٹیج ہوئی ـــــ اس کے باوجود کہ واجد علی شاہ اور اُن کے اہل دربار یہ نہیں جانتے تھے کہ تھیٹر کیا چیز ہے' پھر بھی لکھنے والوں نے دو دو اس آرائیاں کی ہیں' اور خیالی قلعے تعمیر کئے ہیں کہ اُن کو مہندم کرتے ہوئے بڑے بڑے صاحب طرز انشاء پرداز ادیب اور محقق خوف کھاتے ہیں۔"

نامی صاحب بغیر ثبوت کے اتنی ساری باتیں کہہ گئے ہیں کہ عقل تسلیم نہیں کرتی' جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے' اردو ڈراما پر چھوٹے بڑے جس کسی نے بھی لکھا ہے واجد علی شاہ' امانت' اور "اندر سبھا" کا ذکر ضرور کیا ہے' ساتھ ہی تحقیق بھی کی ہے۔ نامی صاحب عبدالعلیم شرر' شوق قدوائی' عبدالماجد دریابادی' عبدالسلام ندوی وغیرہ کی تحقیق سے واقف ہیں' لیکن اُن کے خیال میں تو ان حضرات نے قیاس آرائیاں کی ہیں اور خیالی قلعے تعمیر کئے ہیں۔"

لیکن میرے خیال میں ایسا سوچنا اور لکھنا بھی قلعے تعمیر کرنے کے برابر ہے کیونکہ بقول علامہ سید سلیمان ندوی امانت کا "اندر سبھا" مدتوں تک اہل شوق کا تماشہ گاہ بنا رہا ہے' اور اب یہ بات پوری تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ یہ صرف شاعرانہ فسانہ نہیں تھا' بلکہ واقعی لکھنؤ میں اندر کا اکھاڑ لگتا تھا اور اس کا تماشہ پردوں کے ساتھ کھیل کر دکھایا جاتا تھا' اور اس طرح اردو میں (نہ) جدید تماشوں اور ناٹکوں کی تمدنی بدعت بھی یہیں پیدا ہوئی (رسم ہندستانی۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء' صفحہ ۳۸)

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نامی صاحب نے "خورشید" کو اردو کا پہلا ڈرامہ کیونکر قرار دیا۔ جبکہ ۱۸۷۱ء سے بہت پہلے نواز نامی شخص

نے شاہ کے حکم سے عید فرخ سیر میں ایک ڈرامہ لکھا تھا جس کا ترجمہ سلیس اردو میں ۱۸۵۱ء میں فورٹ ولیم کالج کے اندر مرزا کاظم علی جوان نے کیا ـــــ پھر اس کے دو سال بعد ہی ۱۸۵۳ء کا وہ زمانہ تھا جب "اندر سبھا" بڑی دھوم دھام سے اودھ کے عوامی اسٹیج پر دکھایا جا رہا تھا۔ (اردو ڈرامہ اور اسٹیج (لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، دوسرا حصہ) مطبوعہ سلیمی پریس الہ آباد ص ۵۱)

اس سے قبل نامی صاحب "خورشید" سے پہلے ایک ڈرامہ صراحت کی ہے جس اور جلنے لگا" کو اردو کا پہلا ڈرامہ قرار دے چکے ہیں جس کا مصنف ڈاکٹر بھاؤ جی لاڈ ایک مرہٹہ تھا اور جو ہندو ڈرامیٹک کور کے مرہٹہ ایکٹروں کے ذریعہ اسٹیج کیا گیا تھا (اردو تھیٹر جلد اوّل، مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان صفحہ ۱۹۱ - ۱۹۲)

لیکن خورشید کو اردو ڈرامہ کہا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ بہرام جی فریدون مجمر زبان بحیثیت مترجم (خورشید) اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "اوّل اس کھیل کو گجراتی میں تصنیف کیا تھا اس پر سے اس کمترین نے تھوڑی آرائش اور تبدیلی کے ساتھ ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا ہے ـــــ یہاں ہر طرح کی قوم بستی ہے، مگر جو تماشہ کیا جاتا ہے، سو فقط پارسی گجراتی زبان میں تو یہ زبان اکثر انجمنوں، مسلمانوں و ہندوؤں کو سمجھنا دشوار ہونا مشکل ہے اس لئے کئی ایک صاحبوں نے اس امر کی کوشش کی کہ اگر کوئی کھیل ہندوستانی زبان میں لکھا جائے تو یہاں کے باشندے ہر قوم کو موافق آوے، کیونکہ ہندی زبان سارے ہند میں مروج ہے ـــــ تو اس کھیل کو اپنے حوصلہ کے موافق سلیس اور مذمرہ کی ہندی میں کہ پارسی و ہندوؤں کو آسان ہووے سمجھ میں آئے ترجمہ کیا ہے ـــــ اس کمترین نے موافق طاقت اپنی زبان ہندی میں اور قواعد میں البتہ خامی اور خطا ہی ہوگی۔"

جبکہ مترجم خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ ڈرامہ ہندی زبان میں ہندوؤں اور پارسیوں کیلئے لکھا گیا ہے تو پھر اسے اردو زبان کا ڈرامہ نہ کیونکر مان لیا جائے۔ کیا اس وجہ سے کہ مترجم نے "خورشید" میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اردو کے مشہور قصوں، مثلاً "زہر عشق" "بہ منیر" "یوسف و زلیخا" اور "گل و صنوبر" وغیرہ میں آئے ہوئے موافق فقرے، نکتے اور شعر کی آمیزش کی ہے۔

قیصر قلندر ـــــ آل انڈیا ریڈیو۔ اندور

اگست کا شمارہ موصول ہوا۔ اداریہ حسب معمول دلچسپ اور فکر انگیز ہے، ہمارے ملک میں اردو کے "معتبر و معتمد" قلم کار مصلحتوں کے شکار ہو گئے ہیں، انہیں اپنی شخصیت، رسوخ اور رکھ رکھاؤ کا زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے، اور جب اردو کے بل بوتے پر وہ "قد آور" بن گئے ہیں، اس کی بقا و اپنی مصلحت کو شیوہ" اور رسوخ" کی قربان گاہ کی نظر کرتے ہیں، چونکہ موجودہ دور میں "وقت نادے" زیادہ ہیں، اور وہ اپنی شخصیت کو زیادہ جاذب" بنانے میں ہر طرح کے نسخے استعمال کرتے ہیں، اس لئے ان سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ میدان عمل میں آئیں، میدان عمل سے میری مراد ذاتی تحریری یا خیر دانش مندانہ کارروائی نہیں ہے اور نہ ہی میں اس بات کے حق میں ہوں کہ خیر چوری طریقوں کو اپنایا جائے۔ بلکہ مجھے آپ سے شدید اتفاق ہے کہ محبت مضبوط ہاتھ، نہ چھوٹنے والا ہاتھ، جب ایک ساتھ اٹھ جاتے ہیں تو دستوری سختیوں کو بھی جھک جانا پڑتا ہے، مگر بروقت بر از وقت نہیں ـــــ مگر بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے، والی بات ہو گئی ہے۔ سب اپنی شخصیتوں کے شیش محل میں گھر گئے ہیں، آپ کی انجمن کرے تو کرے ورنہ مجبوراً "اور دعا تا اللہ کہنا پڑے گا! الیا وقت تو نہیں آنا چاہئے، آپ کے احساسات ایسے کتنے ہی جوشیلے کیوں نہ ہوں، سرد کو گرم کر دینے میں رفتاں نہیں رکھ سکتے، عمل کے ساتھ جوش عمل کی ضرورت ہے، شوق کی گرمی کی ضرورت ہے، جب کہیں بدلاب پگھل کر تیز دھار یا بپھرتے دریا کی صورت اختیار کر سکتے ہیں کسی "مسیحا" کی ضرورت ہے۔ کسی پُرعزم، پُرخلوص اور باہمت رہبر کی سخت ضرورت ہے، ایسا قطعاً اجناس کی طرح بازار سے خریدا نہیں جا سکتا۔ مجھ ہمارے ہی درمیان میں سے کسی کو یہ سرمایہ کرنے کا حوصلہ ہونا چاہئے، آپ خود سوچ سکتے ہیں، میرے دوسرے کرم فرما بھی غور کر سکتے ہیں، ایسے رہبر کی قیادت پر "مانا کہ اللہ اصلاح اردو" کی ترکیب میں آپ نے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ شاید وہ لوگ سمجھ سکیں جن کی طرف "مجوب اشارہ" ہے۔ اور اپنے گریبان میں منہ ڈال سکیں، میرے بس کی بات ہوتی تو میں اپنی حقیر خدمات پیش کرتا۔ آپ خوابوں کا مسیحا" منظر عام پر آیا، مبارک باد قبول کیجئے۔

اظہر افسر ——— آستانۂ مخدوم للہی۔ کڑپہ

اُوپر کا پتہ دیکھ کر آپ کو حیرت ہوگی' میں ۳۱ اگست کو یہاں آیا ہوں۔ ۳ ستمبر کو حیدرآباد واپس ہو جاؤں گا ہر سال آنا پڑتا ہے یہاں حضرت شاہ عارف اللہ مشہدیؒ کا درگاہ ہے' بڑے شاندار پیمانے پر عرس ہوتا ہے' مقامی لوگ تو ہوتے ہی ہیں' آس پاس اور دور دراز سے ہزاروں آدمی شریک ہوتے ہیں۔ ڈراموں کی پیش کش کے ساتھ ساتھ ادبی پروگراموں کی پیش کش بھی میرے ہی ذمے ہے سنہ ۱۹۶۱ء سے ہر سال باقاعدگی کے ساتھ یہ سلسلہ چلا تھا اگست کا شاعر نہیں ملا تھا۔ یہاں پہنچا تو شجاع صاحب اور محترمہ شاعرہ عرس کمیٹی نہال مخدومی صاحب نے ڈرامہ "ایامی" کی تعریف کے پل باندھ دیئے۔ میں حیران ہوا کہ ان حضرات کو اس ڈرامہ کا کیسے علم ہو گیا۔

کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ کڑپہ میں شاعر بڑے اشتیاق سے اور کثرت سے پڑھا جاتا ہے "شاعر" اور آپکے تعلق سے یہاں کے مقررین نے جس آزار کا اظہار کیا ہے میں اُس سے اس قدر متاثر ہوا کہ بے اختیار آپ کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

نئی تبدیلیوں کو یہاں کے لوگ بھی بیحد پسند کر رہے ہیں اگست کا "شاعر" میں نے یہیں دیکھا' خوب ہے' صفحات بھی آپ نے بہت بڑھا دیئے ہیں' مضامین اور نظم و غزل کا انتخاب بھی قابلِ داد ہے۔ افسانے' "چاہیاں" "محبت کے سوا" "خواب ڈھونڈوں کہاں" "مسیحا" وغیرہ بہت پسند آئے ڈرامے کے بارے میں تو کچھ کہنا آئینہ کے آگے کھڑے ہو کر تعریف کرنے کے برابر ہے۔

مقالوں میں نئی شاعری' اُردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈرامہ" ——— طنز و مزاح میں "ایک خط" فکاہ تو نسوی' اور "سروری غزل" خوب ہیں۔

غرض اب کے "شاعر" کچھ اور ہی "شاعر" ہے۔ ہاں آپ کے تازہ کلام کو ہمیں ڈھونڈتی رہیں۔

بدیع الزماں خاور ——— ۱۰۱ اے فیملی مال۔ دالپوری (رتناگری)

اس خبر سے بیحد مسرت ہوئی کہ آپ کی طویل نظم "خوابوں کا مسیحا" نئے اضافوں نیز انجمنیری اور ہندی ترجموں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے مستقبل قریب میں علامہ سیماب" اور آپ کی غزلوں کے مجموعوں کی طباعت کے اعلان نے مجھے اور بھی مسرور کر دیا ہے' خدا کرے "قصاع الادب" کا یہ نیا اشاعتی پروگرام زیادہ سے زیادہ کامیاب ہو۔ میں ہفتے عشرے میں "خوابوں کا مسیحا" کے لئے ایک شترکارڈ یہاں سے بھجواؤں گا۔

اس بار پھر آپ کے حوصلے اور نوازش پر تاپ گڑھی کے مکتوب سے اُردو تحریک کے سلسلے میں بہت سے غور طلب نکتے سامنے آگئے ہیں' میں سمجھتا ہوں اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اگر ہماری بڑی شخصیتیں ذرا دوڑ دھوپ سے کام لیتیں تو اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔!!

"شاعر" کا تازہ شمارہ اگر ایک طرف صفحات کے اعتبار سے قدرے ضخیم ہے تو دوسری جانب' اس کا معنوی حسن بھی' پچھلے عام شماروں کے مقابلے کچھ زیادہ کشش انگیز لگ رہا ہے۔

"شاعر" کے توسط سے اپنے اُن دیدہ اور نادیدہ احباب کا شکریہ ادا کرنے کی اجازت دیجئے' جنھوں نے مجھے ریڈیو کا انعام ملنے پر خطوط اور تاروں کے ذریعے تہنیت کا اظہار کیا ہے ایک تازہ غزل اس مکتوب کے ساتھ "شاعر" کیلئے ملفوف کر رہا ہوں۔

نور سرکار ——— پلاٹ نمبر ۵ تلسی باغ کے سامنے نندیش روڈ بوریولی (ویسٹ) بمبئی ۹۲

اگست کے اس شمارے میں آپ نے ایک ساتھ بہت سارے چوٹی کے فنکار بیٹھ کر لئے ہیں۔ غنیمت ہے مہندر ناتھ کا ذکر نہ آیا ورنہ ذکر کر کے ٹوٹ ہی گیا اور اُنکی زندگی کا احساس ہوا۔ ایک تو یہ عرصے کے بعد اُن کی تخلیقی نظروں سے گزری' مہندر ناتھ' کوثر چاندپوری اور اکرام جاوید کی کہانیاں پسند آئیں طنز و مزاح میں "ایک خط" اور "سروری غزل" دونوں ہی چیزیں معیاری ہیں۔ نئی شاعری نیا زاویہ" اچھا مضمون ہے' البتہ ہر جگہ مضمون کی کمزوری کا احساس ہوتا ہے' بنظرِ غائر دیکھنے میں کوئی ایک بھی ایسی چیز نہیں جو داد کے قابل ہو۔ "ایک خواب اور" پر کیا گیا تبصرہ بہت ہی جاندار ہے کتابوں کے حصے میں اتنا بارہا سارے غلط طار دوستوں کی توجہ کے مستحق ہیں۔

مکتبہ قصر الادب کے اشاعتی پروگرام کا آغاز ہو چکا ہے اُردو والوں کے لئے یہ ایک نیک فال ہے۔

عبدالجبار خان .... خانپور

"شاعر" شمارہ اگست ۱۹۶۶ء کے حصۂ مکتوبات میں حضرت نازش پرتاپ گڑھی کا مکتوب گرامی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے گزشتہ ادارئیے سے موصوف نے "ایک خیال" لیکر اپنے خط میں جو جو باتیں لکھی ہیں یا وہ ہر اس خواندہ فرد کیلئے۔ خواہ وہ گمنام ہو یا نامور۔ قابل قبول و عمل ہیں۔ انھوں نے اردو کی حمایت میں لکھنؤ کے چند گمنام نوجوانوں کی بھوک ہڑتال اور عدالت کے لسانی فیصلے میں خود کو نمایاں پیش کر کے حکومت سے اپنی بات منوانے والے ایسے ہی گمنام لوگوں کی تقلید کی طرف اردو داں حضرات کو متوجہ کیا ہے۔ بتایا ہے کہ وہ پنڈت آنند نرائن ملا اور شری کیات الشا نصاری کے دولت کدوں کے سامنے ستیہ گرہ شروع کردیں۔ اور دیگر مقامات کے ہمدردان اردو کو بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ وہ بھی ایسی ہی تحریکوں کو استعمال کر کے فراق گورکھپوری، پنڈت سندر لال۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، تیرتھ جعفری اور سجاد ظہیر جیسے نامور شعراء و ادباء کو اپنا ساتھی بنائیں حضرت نازش کا یہ مشورہ بڑا معقول اور نتیجہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن تعجب ہے کہ جن نامور حضرات کے نام انھوں نے اپنے خط میں تحریر فرمائے ہیں ان میں خود اپنا نام کیسے بھول گئے یہ فرض خود ان پر بھی عائد ہوتا ہے۔

زیر نظر شمارے میں تصاویر کی جدت اور مضامین کی افادیت قابل قدر ہے آپ کے حسن انتخاب کی داد نہ دینا تنگ دلی اور تنگ نظری ہے۔ منظومات میں شاذ تمکنت کی نظم "خواب زار" بڑے سلیقے کی چیز ہے۔

اس مرتبہ اکبر وارثی نے اپنی نظم کا سانچہ بدل دیا ہے ممکن ہے کہ وہ اس ڈھنگ کو کوئی موثر فن سمجھتے ہوں لیکن ان کی نظم کے ٹکڑے "ادب لطیف" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ ان کی بیشتر نظمیں جو اس سے پہلے "شاعر" میں چھپ چکی ہیں نہایت دلچسپ اور مترنم تھیں۔

وکار صدیقی کی نظم "بادل" کے اس مصرعہ

"جانے خود کتنے جگوں کا ہے پیاسا بادل"

میں لفظ "پیاسا" بمعنی پیاوہ نظم ہوا ہے جو محل نظر ہے۔

اقبال طاہر صاحب کی غزل کے مطلع کے پہلے مصرعے میں:۔

"رات گئے روتا ہے شبنم پھولوں کے سرہانے کیوں"

قافیہ کی صحت قابل توجہ ہے۔ میر تقی میر نے اس لفظ کو مقولن کے وزن پر لکھا ہے۔

"سرہانے میر کے آہستہ بولو"

فضیل جعفری صاحب تحایف شعر:

رفتہ رفتہ شب یادوں کے آسیب ستائیں گے کوئی
شہر میں ان سے خفا ہو کے رہے گا کیسے

علی عباس امید ــــ کمبرج ہائی اسکول، بمبئی

تازہ "شاعر" کا۔ اس کا حیثیت جولائی کے شمارہ سے زیادہ "انقلابی" ہے اس کے متعلق کہنا پرانے تاثرات کو دہرانے سے زیادہ نہ ہوگا۔ مختصراً اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ہر شمارہ ادبی مائل میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے تبدیلیاں بہت زیادہ پسند آئیں کہ سے آئندہ بھی اس کی ترتیب و تدوین میں ترقی ہو۔

نازش صاحب کا طویل خط پڑھا، اس سے قبل بھی نازش صاحب کا اسی مضمون کا ایک خط کسی روزنامہ (غالباً پیغام) میں نظر سے گذرا تھا۔ ان کا یہ کہنا تو درست ہے کہ عوام کو اردو کے سلسلہ میں نہ کیا جائے لیکن یہ مشورہ قطعی غلط ہے کہ "آج اردو کو اس مخدوم کی ضرورت نہیں۔ جو تلنگانہ کے بعد حیدرآباد میں گرم عمل ہوا..... بلکہ آج اردو کو صرف ان ہی گمنام نوجوانوں کی ضرورت ہے جو

ستون دار پہ رکھتے ہوئے سروں کے چراغ
چلے چلیں کہ جہاں تک سیاہ رات چلے

اردو کو فقط اسی مخدوم کی ضرورت ہے۔ اگر وہ خود دلچسپی نہ لے تو اسے متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی "گمنام نوجوانوں کی بھی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔ اس سے قبل آپنے اپنے ادارئیے "میں بڑے شعراء اور ادباء کو متوجہ کرنے کی جو بات لکھی تھی۔ وہ نہ صرف درست بلکہ لازمی ہے "نام بنام" واقعی جرأت ہے!!

اکبر رحیم دت ــــ قلعہ۔ امرتسر

اردو کا علمبردار اور آپکی ادبی و صحافتی صلاحیتوں کا مرہون منت "شاعر" ماہ بماہ موصول ہو کر باعث صد شکر و مسرت بنتا جا رہا ہے۔ تازہ شمارہ کا ہی ہے آپ ہر بار اس میں نیا رنگ بھر کر اپنا نام اردو ادب کی لاانتہا بلندیوں پر پہنچانے میں کامیاب تر نظر آتے ہیں۔

عبدالکریم ثروت ــــ نیا بازار۔ کاپٹی (ناگپور)

تازہ شاعر بھی حسب روایت خاصہ کا پرچہ ہے آج کل آپ کے ادارئیے بہت شاندار جا رہے ہیں یہاں "یوم اردو" کے جلسہ میں کچھ مقررین نے آپ کے مشوروں کو دہرایا "سخن در سخن" کی اشاعت کا اعلان بڑا ہی مسرت بخش ہے۔

نقد و نظر

(تبصرہ کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کیف و کم

انر ——— یوسف ناظم

مکرمی اعجاز مہدی صاحب بی ذات سے

۱۹/ جولائی ۱۹۶۳ء

عموماً طنز و مزاح کی چھلیاں اچھوٹی مچھلیوں کو نگل لیا کرتی ہیں۔ اسی طرح موٹی سوٹی بڑے قد کی کتابوں کی بھیڑ میں چھوٹے سائز کی کتابیں چھپ جایا کرتی ہیں۔ "کیف و کم" کے ساتھ بھی یہی حادثہ ہوا۔ خود مصنف کے مزاح میں رنگے ہوئے ہاتھوں کی پیشکش ایسی ادھجلی ہوئی کہ پورے تین سال گذر گئے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپ کر پڑھنے والوں کو پیدا ہوا۔ میری بار جنم لینے کا امکان پیدا ہو گیا۔ یوسف ناظم نے ان تین سال میں طنز و مزاح کے "ہنڈے" پر سوار ہو کر بے شمار چکر کھائے۔ نیچے سے خوب تالیاں بج گئیں۔ ان کے طنز و مزاح کی "بیل گاڑی" دیکھتے ہی دیکھتے "فرنٹیئر میل" بن گئی۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا نیا مجموعہ کسی پُر مذاق مگر نہایت غریب پبلشر کی تلاش میں ہے۔ اور اب یہ حال کہ تین سال سے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شاعر کے ہر شعر کو دیکھ رہے ہیں، چشمہ اتار کر کبھی، اور لگا کر کبھی، چھوٹے اور بڑے شیشے دیکھ دیکھ کر اندازہ لگا رہے ہیں، مگر پچاسوں ملاقاتوں اور متعدد ساتھ بیٹھنے کے باوجود اللہ کے اس انتہائی نیک اور بردبار شاعر مزاح نگار نے کسی ایک ملاقات میں مزاحاً بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ بہرحال معلوم ہوا کہ وہ "دیر" شاعر پر ایک طنزیہ نظم لکھ رہے ہیں۔ سی۔ آئی۔ ڈی نے بتایا کہ اس بھول کو علامت بنا کر کچھ خامہ فرسائی کر لیا تو ہے میں لیکن "خامہ" اگھڑ ہو جاتا ہے اور "فرسا" لگ۔ بڑے شاعر یا ادیب کہیں آ جائیں تو بعض اوقات وہ جتنا سوچتے ہیں اس سے زیادہ بھول جاتے ہیں۔ بہرحال "مولانا یوسف ناظم" سے معذرت کے ساتھ ذیل کی چند سطور بطور سند پیش کی جا رہی ہیں۔ ان کے لئے بھی بھول کی تجویز ہیں بھولوں کی شکار بھلا۔

یہ مجموعہ اپنے نام کے اعتبار سے کوئی شعری مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ نام کسی بھی طرح سے "اگھڑا" اور "لولنگڑا" نہیں ہے۔ اس نام کا وجہ ہے "چھدا کا دانہ" میں "تنکا" والا محاورہ ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ غالباً اسی لئے انھوں نے اپنے مضمون "مختگو" میں دوسرے محاوروں کے ساتھ اس محاورے کو بھی لیا ہے کہ انکے شاعرانہ ذوق کا اندازہ ہو جائے۔ مگر ہمارے نگار کی رائے عالی یہ ہے کہ اگر یوسف ناظم پہلے اچھے شاعر بنتے تو اپنے مزاح پاروں میں انھے "جو ارشاد" "نوازا" "بیٹھوا" کرشن چندر (تعارف نگار)

"وہ زندگی کی گوناگوں اور بوقلموں کیفیتوں سے مضحکہ پہلو تلاش کر لیتے ہیں وہ شریفانہ مزاح اور ظرافت میں لطافت کے قائل نظر آتے ہیں"

* قواعد اردو کی تشریحات میں بھی انھوں نے فنکارانہ چابکدستی کا ثبوت دیا ہے اور صرف و نحو کی خشک اور سنگلاخ سرزمین سے ایسی شگفتہ اور رنگا رنگ پھلجھڑیاں برآمد کی ہیں کہ پڑھ کو طبیعت بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔"

اپنے اعداد شاعر برادری کی پاسداری ہی نے یوسف ناظم سے "مرزا غالب کی صحت جسمانی" جیسا قطعہ بار مضمون لکھوایا۔ ان کے اس "عالیجناب مزاح پارے" نے انہیں ایک دم بانس پر چڑھا دیا، اور حضرت نے وہیں سے لکھنے لکھنے بیٹھے چھوٹے بڑے مزاحیہ مضامین لکھ ڈالے یہ الگ بات ہے کہ ابھی نیچے نہیں آئے ہیں بلکہ اور اونچے اور اونچے ہوتے چلے گئے۔

"کیف و کم" میں "مرزا غالب کی صحت جسمانی" کے علاوہ قواعد اردو۔ صورت۔ سالانہ رپورٹ۔ گرہست شاستر۔ صحت اور زندگی۔ چوٹی کا نفرنس۔ باتات۔ آیئے کچھ باتیں ہو جائیں۔ گفتگو۔ ادبیات۔ مجرب نسخے۔ نثر میں ایک دفعہ شعر گوئی۔ مواعظ مولانا یوسف ناظم۔ اور شہرتا سوتہ مزاحیہ مضامین ہیں۔

یوسف ناظم کے منع کرنے کے باوجود یہ رائے ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں

کردہ شعرا مزاح کے سلسلے میں "کنوارے" موضوعات کو لیتے ہیں یہ موضوع کے "کنوارپن" اور اُس کے اظہار کے لئے علامتوں "تشبیہوں" استعاروں کنایوں اور گہری مگر مضحک معنویت کی تلاش میں وہ سُوکھ کے کانٹا ہو گئے ہیں۔ لیکن فراحیا دب کر "فربہی" عطا کر رہے ہیں۔ کرشن چندر نے اپنے مادف میں لکھا ہے کہ

"اِنتظار کے فن میں وہ پطرس کے قریب ہیں اور اکبر کے مزاح کے اعتبار سے رشید احمد صدیقی کے طرفدار نظر آتے ہیں۔"

اِسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ وہ مختصر سی مجموعوں کا مجموعہ "معجونِ مزاح کلاں" نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا؟

حجم ۱۵۲ صفحات، قیمت فقط روپیہ۔ ناشر ادارۂ ادبیات اُردو خیریت آباد۔ حیدرآباد (اے پی) (۲۔ص)

نیا عہد نامہ

انٹرویو ——— خلیل الرحمٰن اعظمی

"نیا عہد نامہ" دو متصادم شخصیتوں کا محسوساتی غنائیہ ہے یوں تو اِس میں ۳۰ نظمیں ہیں مختلف موضوعات کی نظمیں اور بحریات شامل ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ شاعر نے ایک طویل نظم کو دو الگ الگ مختلف "فورمس" کے کئی ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے جس کی دو میانی کڑیوں میں سے وقت اپنی پوری رفتار کے ساتھ گزر رہا ہے۔

یہ دو شخصیتیں ایک کہانی ہی کے دو رُخ ہیں مگر ایک چہرہ دوسرے سے اتنا مختلف اور بیگانہ ہو گیا ہے کہ اُن کی شناخت آسمانی سے ہو جاتی ہے۔ پہلا چہرہ معصوم بچے کا ہے جو ذہنی ہوئی شکست و ریخت، فطری شگفتگی اور خوبصورت بھولپن لئے ہوئے نظر آتا ہے اور دوسرا وقت کی دھوپ میں جھلسا ہوا، ابرو باد زمانہ سے جھلسا ہوا۔ کھردری بالغیت کی چھاپ کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری انہیں دو چہروں کی عدم مشابہت کا غم انگیز اظہار ہے۔ یہ دونوں چہرے ایک دوسرے میں گھل مل جانا چاہتے ہیں، مگر اِن کے درمیان وقت کی ایک بہت بڑی جابر چٹان حائل ہے جسے پھلانگنے کیلئے خوابِ ناشعور یا تصوراتی سرشاری لازمی شرط ہیں۔

اعظمی کی ذہنی نشوونما آزاد ہندوستان میں ہوئی ہے فسادات کی تباہ کاری، خوابوں کی شکستگی، آدرشی کھوکھلے پن اور اقتصادی و معاشی انتشار نے انہیں وقت سے پہلے ہی بالغ کر دیا۔ یہی وہ چبھن ہے جو ایک نفسیاتی گرہ کی صورت میں اُن کے شعور میں وقت کے ساتھ کستی گئی ہے۔ اُن کی مخصوص اُس کی سادگی اور کومل رومانیت نے اُن کے یہاں ایک آدرش کا رُوپ دھار لیا ہے۔ جس کو وہ ہر جگہ ڈھونڈتے ہوئے نظر آتے ہیں یہ آدرش "نیا عہد نامہ" میں مختلف علامات نئی نئی تشبیہوں اور خوبصورت تاثراتی نقوش کی فنکارانہ تہوں سے جھانکتا ہوا ملتا۔ جس میں وقت کے ساتھ ساتھ پھیلاؤ پیدا ہوتا گیا ہے کہیں یہ سماجی نا آسودگیوں کا اشاریہ بن جاتا ہے اور کہیں صوفیانہ تاریکیوں میں مدھم سی روشنی کی کرن کی طرح جھلملاتا ہے۔

کوئی تم جیسا تھا، ایسا ہی کوئی چہرہ تھا
یاد آتا ہے کہ ایک خواب کبھی دیکھا تھا

کیا جانے کب یہ دلیں ہے اپنا لمبا ہوا
ایسا نگر کہ جس میں کوئی راستہ نہ جائے

ہاتھ جو مجھ سے چھڑاتی ہے وہی پرچھائیں
لگ کے سو جاتی ہے ماتھا تو مرے سینے سے

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر، ذرا تُو پکار مجھے!

اب دُور کہیں چل کے ذرا اپنے کو ڈھونڈیں
اپنے ہی سے لگتے ہیں سبھی، دیکھئے کیا ہو

خلیل الرحمٰن اعظمی نے پہلے خود کو تلاش کیا ہے۔ اور پھر اپنے بھرپور اظہار کے لئے اپنی انفرادی آواز کی کھوج کی ہے۔ اس تلاش میں انہیں زندگی کرنے کے ساتھ کاسکی پل صراط اور جدیدیت کی کھوکھل بھلیوں، دونوں سے گذرنا پڑا ہے، اُنھوں نے روایات کو پرستش نہیں کی۔ بلکہ اُنھیں شعوری جہان پٹک کے ساتھ اپنایا ہے، جدید رجحانات اُن کے نیا لائف نیشن زندگی سے بچتے ہوئے زندگی کے تجربات کی صورت میں اُبھرتے رہے ہیں۔

اعظمی کے آرٹ میں تنہائی کا احساس بڑا ذہنی اور شعوری نہیں ہے۔ اس میں ہمارے گھروں کی نفسیاتی ٹائمنٹ، گندے نالیوں کا سیدھا سادھا اُبھار، بھوکے بسورتے چہروں کی مٹھاس، بلیوں کا رونا، رشتوں کا تقدس اور زندگیوں کی ساجھیداریاں شامل ہیں۔

دھوپ چھوں سے بھی بھاتا نہیں
کوئی بادل کا ٹکڑا انہیں
کوئی سایہ نہیں۔

کیا ہُوا آنکھ میں اپنے ہی مگر میں گم ہوں
وہی دروازے وہی شیشے وہی آئینے
لیکن اِس درجہ کی وحشت کبھی پہلے تو نہ تھی
اپنے چہرے کو ذرا ہاتھ سے چھو کر دیکھوں
جانے کیوں آج یہ کچھ مجھ کو نیا لگتا ہے
کیونکہ ایسی مری صورت کبھی پہلے تو نہ تھی
کیسے کہہ دوں مجھے جینے کی دُعا دے کوئی
کیسے کہہ دوں کہ لگائے کوئی سینے سے مجھے
آج کی رات کوئی اور بچائے مجھ کو

اعلیٰ کی شاعری ہمارے عہد کی شاعری ہے۔ یہ شاعرانہ حُسن کے ساتھ ORIGINAL ہے۔ اور یہ بہت اچھی بات ہے کیونکہ بہت سے شاعر انفرادیت کی تلاش میں شاعری ہی کو کھو دیتے ہیں۔

ناشر انڈین بک ہاؤس محمد علی روڈ ۔۔۔ علی گڑھ

موجِ صبا

از ۔۔۔ ..... فیضی الحسن خیال

"موجِ صبا" حیدرآباد کے نوجوان شاعر فیضی الحسن خیال کا پہلا مجموعہ کلام ہے جس کا انتساب شاعر نے زندگی کی ناآسودگیوں کے نام کیا ہے

ناآسودگیاں ہر انسان کا مقدر ہیں مگر انکی پرستش اور ان سے نبرد آزمائی دو الگ الگ باتیں ہیں۔ فرق ہے اور شاید یہ فرق ہی تھا اور پرانے ذہن کے دو متضاد ATTITUDES کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خیال صاحب کی آسودگیاں مریضانہ ذہن کی پیداوار ہیں۔ ان میں حقیقتوں سے نبرد آزما ہونے کا ردِ عمل اور انکی چھاپ نظر نہیں آتی۔ موجِ صبا کی نظمیں اور غزلیں سیدھے سادے انداز بیان سے ایک ہلکی پھلکی رومانی فضا کی تخلیق کرتی ہیں جو کہیں کہیں اچھی ہو گئی ہے مگر جب اُن کا عشق سماجی حیثیتوں کے تقلیدی روپ میں سامنے آتا ہے تو کھٹکتا ہے۔

تیری مخمور نگاہوں کی ضیاء ۔۔۔ میری تنہائی میں گھل جاتی ہے
کتنی گہری ہی سہی غم کی کرن ! ۔۔۔ تیری آواز سے دھل جاتی ہے

ہاں اڑا لیں مری غربت کا مذاق ۔۔۔ یہ تو دل یہ امیری کے دیئے
اب سلگتے ہیں مری راہوں میں ۔۔۔ جانے کب آہ انہیں گل کر دے

خیال نوجوان شاعر ہیں۔ شاعری بھی دیگر فنون کی طرح آپ اور ریاضت چاہتا ہے۔ زبان و بیان کی صحت اور اسکا برتاؤ استعمال اچھی شاعری کی علامتی شرط ہے جسکا موجِ صبا کے شاعر کو ادراک خیال کھا جائے۔ قیمت اردو پیسہ۔ ملنے کا پتہ:۔ موتی گلی جوبلی آباد ۔ ۵

(ت۔ ف)

بہترین خوشبو
تازگی اور
خوش ذائقہ

لاکھوں آدمیوں کی پسند

بابا

اس کی میٹھی اور دل کو خوش کرنیوالی خوشبو اور دل پسند ذائقہ کیلئے لاکھوں انسان روز استعمال کرتے ہیں پان کیساتھ کھانے سے اسکی خوشبو ذائقہ کو دوبالا کر دیتا ہے اور دیر تک اسکی تازگی رہتی ہے۔ زہرست مفت حاصل کیجئے

نقل و ملتے جلتے مال سے
ہوشیار دہلی والوں کا
"بابا چھاپ" دیکھ کر خریدیئے

تیار کردہ :- دھرم پال پریم چند ۔۔۔ چاندنی چوک دہلی ۶

محفل اپنی.....!

کچھ "شاعر" کی اختراعات کے بارے میں

"شاعر" کا یہ تازہ شمارہ جولائی اور اگست کے دونوں شماروں سے زیادہ ترقی یافتہ نظر آئے گا۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ مواد، معیار اور ہیئت کی ان تبدیلیوں میں تدریجی ارتقاء ہوگا۔ "شاعر" نے اپنی سنسیتس ۲۵ سالہ زندگی میں بیشمار مخالفتیں کیں۔ اور عام طور پر دوسرے رسائل نے ان کی تقلید کی۔ پندرہ بیس سال پہلے یا تو رسائل میں بتھرے ہوتے ہی نہیں تھے، یا پھر وہ بہت سرسری ہوا کرتے تھے۔ قدامت پسندانہ طرز کے۔ "شاعر" نے تبصرہ نگاری کا ایک توانا، جدید اور گہرا علمی فکری انداز اختیار کیا۔ نظم و نثر کی ادبی تقسیم، لکھنے اور پڑھنے والوں کے خطوط کی اشاعت۔ علمی، ادبی اور تہذیبی خبروں کا سلسلہ سب سے پہلے "شاعر" ہی نے شروع کیا۔ علمی، ادبی اور لسانی مسائل پر الگ سے "اداریہ" لکھنے کا رجحان بھی "شاعر" ہی نے پیدا کیا۔ فدرتہ نگاری اور صاف غیر چند علمی رسائل کے علاوہ عام طور پر اردو ماہناموں کے اداریوں میں انکی بناہی باتیں ہوتی تھیں۔ یہ خصوصیت تو تنہا "شاعر" ہی کی ہے۔ گزشتہ عشرہ ال میں اسکا ہر مہینہ کا اداریہ صرف اردو زبان اور اس کے مسائل سے متعلق ہا گیا ہے۔ یہ اداریے اردو تحریک کی ایک مضبوط تاریخ ہیں ایک طرح کا عمل۔

ہندوستان کے ادبی ماہناموں میں "شاعر" نے خاص بیباک اور سائنٹفک بجرت شائع کئے۔ ادارہ تخلیقات کے ساتھ فنکاروں کی تصاویر کی ت کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے یہ تجربہ چند رسائل کی خاص اشاعتوں ر کیا گیا خصوصاً پاکستانی رسائل میں لیکن یہ بالالتزام نہ ہو سکا اس سلسلہ میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے لیکن یہ سلسلہ ہے گا اور اسے بہتر سے بہتر بنایا جائے گا۔

ان گذارشات کا مقصد کسی قسم کا تفاخر یا خود ستائی نہیں بلکہ "شاعر" روایتوں کا ادبی اہمیت کا احساس دلانا ہے۔

"شاعر" کے سلسلے میں کبھی کوئی ہنگامی تجارتی پہلو" اختیار نہیں کیا ورنہ ہزاروں تقریظ لیٹر ہاتھ اس کی طرف بڑھ سکتے تھے۔ شاعر علمی و ادبی ذہن پیدا کئے ہیں۔ یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے

صالح ذوق کی تعمیر شاعر کا مسلک رہا ہے۔

یہ تازہ شمارہ

اس تازہ شمارہ میں بہت ہی گرانقدر نظم و نثر تخلیقات شامل ہیں۔ ان پر الگ الگ کوئی تبصرہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ موضوع، نگارش، شگفتگی اور فکر و فن کا کارواں ان میں آپ کو ملیگا۔ "شاعر" گھٹی ہوئی نہیں بلکہ کھلی ہوئی ذہنی فضا کی پیدا شدہ تخلیقات اشاعت کیلئے منتخب کرتا ہے۔

اس بار مکتوبات کا حصہ کافی سنبھلا ہوا ہے اور اس میں کام کی باتیں زیادہ ہیں۔ کئی دوسرے اچھے خاصے مضامین گنجائش کی وجہ سے شائع نہ ہو سکے۔ بعض کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

حوصلہ تو بہت کچھ ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ "شاعر" قدیم تر پیمانہ اشاعت کا کم از کم تہائی حصہ کم کر دیں تاکہ شاعر کو اس سے بھی زیادہ حسن و معیار دیا جا سکے۔

(بقیہ: ڈرامہ "آگ" صفحہ ۵۶)

میرا: پرسوں ہی تو ایک بچے کی ماں بن چکی ہے ایسی نازکی حالت میں بیاں سے جانا ٹھیک نہیں ہے کیسے نازک وقت میں پیاسا تھا اس نے اپنی بیوی کو!

اسے دیوان خانے سے اسی وقت نکال دو۔

(پھر سے غرغراہٹ کی آواز بلند ہوتی ہے۔ کالے قانون ختم کرو.....

(انجلی اور میرا دروازے کی طرف چلی جاتی ہیں)

راؤ بہادر: ہو اگر تم دونوں نے باہر قدم رکھا تو سمجھ لو اس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لئے بند ہیں۔

میرا: اس گھر پر صرف آپکا حق نہیں ہمارا بھی حق ہے جس طرح اپنا حق جتا کر شرف اپنا اپنی بیوی کو اپنے گھر نہیں لیجا سکتا اسی طرح اس گھر کے دروازے ہمارے لئے بند کرنیکا کسی کو کوئی حق نہیں عورتیں کوئی روپیہ پیسہ نہیں ہیں کہ جس وقت چاہے بٹور لیا اور جس وقت چاہا اڑا دیا۔

(انجلی اور میرا نشان تھامے چلی جاتی ہیں)

راؤ بہادر: (جیسے کسی گہرے خواب سے بیدار ہوئے) شاید اس نئی روشنی کے دھارے میرے ہی گھر سے پھوٹینگے۔ (تنویر بھی بڑی خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اتنے میں پھر ان آوازوں سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ ہمیں ہماری.. لوٹا دو۔ کالے قانون ختم کرو.. جاگیرداری ختم کرو ہمیں ہماری.. (پردہ گرتا ہے)

رفتار

علمی، ادبی اور تہذیبی خبرنامہ

برطانوی اخبار میں اُردو

انگلستان کے مشہور شہر برمنگھم سے ایک کثیر الاشاعت روزنامہ اخبار برمنگھم پوسٹ نکلتا ہے۔ اُس نے یہ دیکھ کر کہ شہر مذکورہ اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں میں اسّی ہزار کے قریب ہندوستانی و پاکستانی باشندے جن کی زبان اُردو ہے، آباد ہو گئے ہیں۔ ہر ہفتہ کی اشاعت میں ایک کالم اُردو زبان اور رسم خط میں خبروں کی اشاعت کیلئے مخصوص کر دیا ہے۔

کتابوں کا پہلا قومی میلہ بمبئی میں نومبر سے شروع ہوگا

نئی دہلی۔ ۱۲ر اگست۔ بمبئی میں ۱۵ر نومبر سے ۲۰ر نومبر ۱۹۶۶ء تک ہونے والے کتابوں کے پہلے قومی میلے میں داخلہ کے لئے نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نے کتابیں مانگی ہیں۔ نمائش کے لئے کتابیں اور اسٹالوں کے لئے باقاعدہ درخواست دینا ضروری ہے۔ اس نمائش میں ہندوستانی زبانوں اور انگریزی میں تجوری ۱۹۶۴ء کے بعد شائع ہوئی سیدہ چیدہ کتابیں شامل ہوں گی۔ نمائش میں ایک گوشہ آثار قدیمہ کے علم سے متعلق تمام زبانوں کی کتابوں کے لئے مخصوص ہوگا۔ ایک دوسرے گوشہ میں آرٹ کے موضوع پر کتابیں رکھی جائیں گی۔ بچوں کی دلچسپی کی کتابوں کو بھی نمائش میں رکھنے کی تجویز ہے۔ اسٹالوں میں کتابوں کی نمائش اور فروخت دونوں کے حصے رکھا جائیگا۔

میلہ کے آخری روز نمائش میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والوں کو ایک معمولی تقریب میں انعام دینے کی بھی تجویز ہے۔

اسلامی ثقافت میں ڈاکٹریٹ

سینٹ زیویرس کالج بمبئی کے شعبۂ عربی و اسلامی ثقافت کے ریڈر پروفیسر نظام الدین۔ ایس جی ریکر ایم اے نے ایک مقالہ بعنوان "رسی کا اثر ہندوستانی زندگی اور ادب پر" بمبئی یونیورسٹی میں داخل کیا جسے رسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے منظور کیا۔ پروفیسر گوریکر نے اپنے طور پر تیار کیا اور یونیورسٹی میں آپ شخص ہیں جنہوں نے اسلامی

جشنِ غزل

انجمن ترقی اُردو بانگا ڈیرا کے زیر اہتمام ۱۴ر اگست کی شب کو ترقی پسند غزلگو شعراء حضرات کی پیش کردہ شعری تخلیقات پر خواتین حضرات نے کیلئے بابائے سخن حضرت نیئر بانگا نوی کی صدارت اور مہمان شعراء جناب عارف عباسی الہ آباد، جناب مجتبیٰ انصاری لکھنوی، جناب سلیم کنتوری، جناب شعریؔ بھوپالی، جناب اصغر مراد آبادی، جناب انجم رومانی اور جناب قدر بلیاوی کے اعزاز میں نہایت شاندار پیمانے پر "جشنِ غزل" منایا گیا۔ جس میں مقامی اساتذۂ فن اور نوجوان خوش فکر شعراء کے ساتھ ساتھ شہر کے معززین اور معمر حضرات نے بھی شرکت کی۔

ابتدا میں جناب ادیب بانگا نوی نے عتیق وحقیق کے فکر و فن پر ایک مختصر کی حیثیت سے روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ جناب عتیق کے یہاں وہ تمام خصوصیات و محاسن پائی جاتی ہیں، جو ایک اچھے اور قادر الکلام غزل گو شاعر میں ہونی چاہئیں عتیق احمد عتیق نے شعر کہنا بالیدگی سے جدید شاعری کو نکھار رہے ہیں۔

دورانِ مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ مہمان شعراء کے ساتھ ساتھ مقامی شعراء نے بھی اپنا اپنا کلام سنایا۔

کرشن چندر پر لکھنے کیلئے طلبا کو انعامات

تاریخ میں اضافہ

جولائی ۱۹۶۶ء کے "شاعر" میں کرشن چندر کے فن پر خط لکھنے کی طلبا اور طالبات کو دعوت دی گئی تھی۔ پہلا انعام پچاس روپے، دوسرا تیس روپے اور تیسرا بیس روپے ہے۔ ان انعامات کو کرشن چندر نمبر کی ایک کاپی خود کرشن چندر کے دستخطوں کے ساتھ منسلک اس مقابلہ کی تاریخ ۳۰ر ستمبر سے بڑھا کر ۳۰ر اکتوبر ۱۹۶۶ء کر دی گئی ہے۔ خط مختصر اسکیپ سائز پر پنسل سے لکھا جانا چاہیئے۔ جو چودہ نئے پیسے کے ٹکٹ کے ساتھ اسکول یا کالج کے پرنسپل سے تصدیق کرا کے بھیجا جائے۔ خط ہندی، اُردو انگریزی تلگو کسی بھی زبان میں بھیجا جا سکتا ہے۔

۲۵۰ سالہ قدیم تاج اللغات

آگرہ یہاں ایک کتاب "تاج اللغات" دستیاب ہوئی ہے جو عربی اور فارسی کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس کی چھپائی لیتھو کی ہے۔ اور ۲۵۰ سال پرانا ہے۔ اس کے ہر صفحہ پر دو جلدی شاہ کی مہر ثبت ہے یہ پنجاب

... رہا ... ہیں اور ناعاقبت اندیشی ہے۔

پارلیمنٹ کے غیر مسلم اُردو کے حق میں!

دہلی ۲۹ اگست: اُردو کے مسئلے نے پارلیمنٹ میں کافی وسعت اختیار کرلی ہے۔ لسانی کمشنر کی رپورٹ کے بعد اس نے کافی زور پکڑا اور میمورل ..... الگ الگ کئی نشستیں ہوئی جن میں طے کیا گیا کہ اُردو کے مسئلہ پر حکومت کو دھیان لانا چاہیئے کیونکہ لسانی مسئلوں میں اب صرف یہی ایک مسئلہ رہ گیا ہے۔

اتفاق سے اس کے بعد ہی وزارت داخلہ کی کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ جس میں بعض مسلم اور غیر مسلم دونوں ممبروں نے سوال کیا کہ اُردو کے معاملہ میں حکومت لاپروائی کیوں کر رہی ہے۔ وزیر داخلہ شری گلزاری لال نندہ نے وعدہ کیا کہ اس سلسلہ میں وزیر اعلیٰ اتر پردیش سے بات چیت کریں گے اور انھوں نے کچھ گفتگو بھی کی ہے۔

لسانی کمشنر کی رپورٹ پر بحث کے بعد ہی یکم جنوری کونسل کا ایک جلسہ ہوا، وہاں اُردو کے مسئلہ کو نئے رُخ سے پیش کیا گیا۔ کہا گیا کہ اُردو کی مخالفت دراصل ایک ٹیکنیکل فیشنل مقلد نظر کی پیداوار ہے۔ اور ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی یک جہتی کو ترقی دینے کے لئے اس نقطۂ نظر پر بھرپور حملہ کیا جائے۔

لکھنؤ میں "یوم مولانا محمد علی جوہر" منانے کی تیاریاں

لکھنؤ: نیشنل سوشل سوسائٹی" اتر پردیش لکھنؤ کے ممبروں اور ہمدردوں کا ایک جلسہ جناب شاہ محمد فاروق عطا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ اُردو کے مشہور ادیب اور شاعر اور جنگِ آزادی کے مجاہد مولانا محمد علی جوہر کا یوم وفات، ۴ جنوری کا ۶۱ء کو لکھنؤ میں آل انڈیا پیمانے پر "یوم مولانا محمد علی جوہر" منایا جائیگا۔ جس میں مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو تقریروں اور مقالوں کے ذریعہ خراجِ عقیدت پیش کیا جائے گا۔ سوسائٹی کے جنرل سکریٹری سلیم عمر نے کہا اس واقعہ پر حکومت ہند سے درخواست کی جائے گی کہ وہ موصوف کی مناسب یادگار لکھنؤ میں قائم کرے۔ اور ان کے کارناموں کو عوام کے سامنے لائے۔

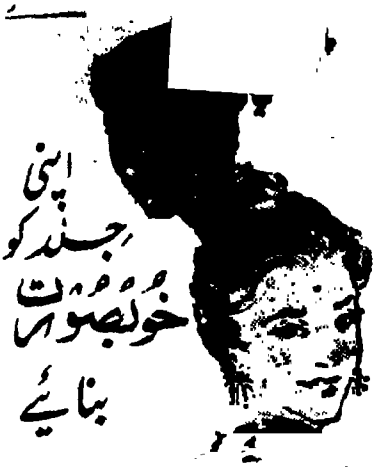

آج ہی فلورون کا استعمال شروع کیجیے چند ہفتوں میں آپ کی جلد خوبصورت سے خوبصورت تر ہو جائیگی۔ فلورون جلد کو خوبصورت بناتا ہے کیل مہاسے اور جھریاں دور کر کے لازوال حسن عطا کرتا ہے۔

فلورون جسم میں جذب ہو کر اپنے کیمیاوی اثرات سے چھپے ہوئے حسن کو ابھارتا ہے۔ خوبصورتی، دلکشی اور جاذبیت پیدا کرتا ہے۔

فلورون لوشن چار روپے پچھتر پیسے فی بوتل

فلورون کنسٹرٹیڈ کریم پانچ روپے ۸۵ پیسے

ہر جگہ دستیاب ہوتا ہے یا براہِ راست اس پتہ سے منگائیے

ہائیجنک لیبوریٹریز انسٹی ٹیوٹ پوسٹ بکس نمبر ۱۹۲ بمبئی ۱

مڑ پبلشر و مالک اعجاز قدیمی نے یونیورسل فائن آرٹ پریس پر نٹر نجی اسٹریٹ ٹھاکر دوار بمبئی نمبر ۲ میں چھپوا کر وہیں سے شائع کیا۔

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۸ء

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا بتیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

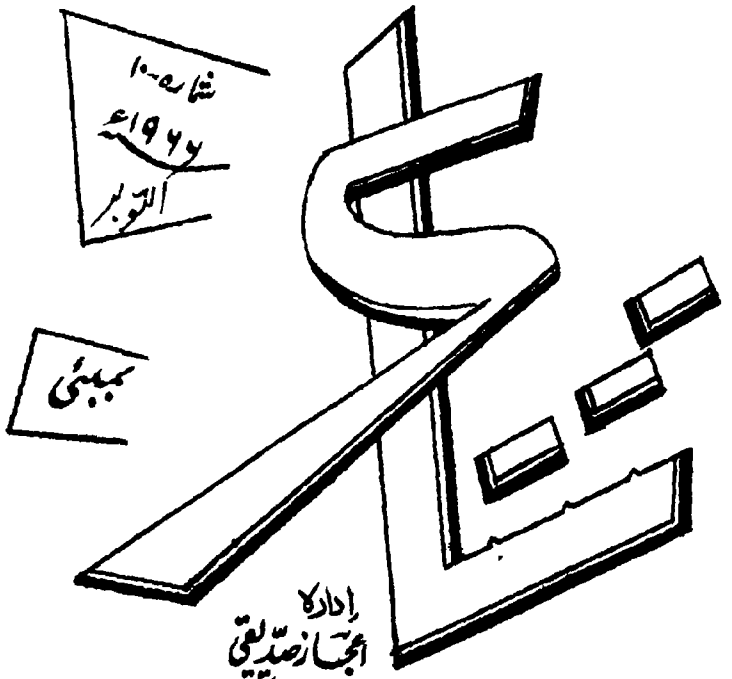

ادارہ
اعجاز صدیقی
مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	معاونین سے	تاعمر خریداری	ممالکِ غیر سے	فی پرچہ
آٹھ روپے	پچیس روپے	۱۲۵ روپے	۲۵ شلنگ	۱۲ آنے (۷۵ پیسے)

نشر و اشاعت کا پتہ

ماہنامہ "شاعر" قصر الادب۔ بمبئی ۸ بی سی

دہلی آفس
۱۲۱۱۔ بلیماران دہلی ۶

خط و کتابت کا پتہ

کلکتہ آفس
۱۵ کانگریس گزیمپشن روڈ۔ کلکتہ ۱۵

مکتبہ قصر الادب

پوسٹ بکس ۲۵۲۳ بمبئی ۸ بی سی

موسمِ سرما کی سبزیاں
اب لگائیے

آپ یہ سبزیاں اپنے کھیت میں، گھر کے پچھواڑے
میں یا چھت پر گملوں میں لگا سکتے ہیں۔

ٹماٹر، پھول گوبھی، بند گوبھی اور گانٹھ گوبھی کی پنیری تیار کرنے کے لیے بیج بونے اور پنیریاں لگانے کا یہی موسم ہے۔
شلجم، مولی، گاجر، چقندر اور پالک جیسی سبزیاں بھی اس مہینے میں بوئی جانی چاہئیں۔

گھر کے آنگن میں
سبزیاں لگائیے

اِس سے اناج کی کمی پوری ہوگی

DA 66/346

ترتیب

اُردو اور سیاسی گٹھ جوڑ!!	(اداریہ)	اعجاز صدیقی	۷
اے شریف انسانو!	(نظم)	ساحر لدھیانوی	۸
آزاد نظم کا ارتقاء	(مقالہ)	ع۔ محمد (خانپوری)	۹
غزل		منور لکھنوی	۱۳
غزل		سرشار سیلانی	۱۳
ہوش ربا بیہوشی	(قاتل کہانی)	مترجمہ۔ رفعت نواز	۱۴
گوکھلے	(نظم)	کنول پرشاد کنول	۲۰
سائنٹ۔ تعارف و تبصرہ	(مقالہ)	حنیف کیفی بریلوی	۲۱
غزل		نامی انصاری	۲۵
غزل		نصیر پرواز	۲۶
افشاں یا نورافشاں	(ڈرامہ)	ابراہیم یوسف	۲۶
ذوقِ فنا کی ناتمامی	(نظم)	تقی حیدر	۳۱
علامہ سیماب بیسویں یادوں کے آئینہ میں (یادداشتیں)		علیم اختر مظفر نگری	۳۲
غزل		مختار راشد	۳۵
غزل		مصور سبزواری	۳۵
سراب	(کہانی)	ایس۔ ایم شاہنواز	۳۶
ہوس کے سائے	(نظم)	قیصر قلندر	۳۸
ندا فاضلی کے خط کا جواب		پروفیسر اے سی بہار	۳۹
غزل		عروج زیدی	۴۲
غزل		راہی بیلونی	۴۲
تلاش	(کہانی)	کلیم راہی	۴۳
آنسو نوشی	(نظم)	وسیم بریلوی	۴۶
خلش احساس	(نظم)	جی۔ ایم آر راہی خانپوری	۴۶
باتیں	(طنز و مزاح)	رشید الدین ہوس	۴۷
آرزو	(نظم)	خالد شفائی	۵۰
گرفت و شکست	(نظم)	ضیاء الانجم پرتاپگڑھی	۵۰
حسن کی خوشبو	(نباتاتی افسانہ)	منیر احمد	۵۰
ترقی	(مزاحیہ نظم)	راہی	۵۳
نئی شاعری کیوں؟	(ایک بحث)	عمیق حنفی	۵۵
		شہریار	
		کمار پاشی	
		ندا فاضلی	
غزل		علی عباس امید	۵۸
غزل		خالد رحیم	۵۸

بیادِ اکبر الہ آبادی

اکبر الہ آبادی اور اردو	(روئے اخذ)	کرشن چندر	۵۹
کیا میں نے خواب دیکھا تھا		خواجہ احمد عباس	۶۱
اکبر الہ آبادی۔ منظر نہ مولانا		یوسف ناظم	۶۳

مکتوبات

رشید الدین بدیع المزاجی خاور ۔ نذیر بکار
جی۔ ایم راہی مناظر عاشق فرکاوی ۔ حسن فرخ
نقد و نظر (تبصرے) مختلف تبصرہ نگار ۶۹
محفل اپنی ۔۔۔۔! ادارہ ۷۲
رفتار (ادبی و تہذیبی خبریں) ادارہ ۷۳

شاعر بمبئی

جلد ۳۷ شمارہ ۱۰

ماہنامہ **شاعر** بمبئی ـــــ فخر و مسرت کے ساتھ

فروری ۱۹۷۶ء میں

اُردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار

کرشن چندر

پر نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر پیش کر رہا ہے

کرشن چندر کی منفرد شخصیت اور اُس کے ہمہ گیر فن پر نہ صرف ہندوستان اور پاکستان کے اُردو ادیبوں بلکہ ہندی، مراٹھی، گجراتی، بنگالی زبانوں کے مشہور قلمکاروں، نیز دنیا کی مختلف زبانوں کے ایک سو سے زیادہ مصنفین و مفکرین کے مضامین و تاثرات

کرشن چندر نمبر

چھ سو صفحات سے زیادہ کی ایک عظیم، منفرد اور حسین خصوصی شاعت

نوٹو آفسٹ کی

۲۴ صفحات پر یادگار تصاویر

قیمت ـــــ دس روپے

کرشن چندر کی ادبی زندگی کا مکمل تاریخ، اُس کی عظمت کی کہانی اُس کے نفسیاتی تجزیہ، اُس کی زندہ اسلوب نگاری اور شاہکار افسانوں، ناولوں اور ڈراموں پر تنقید کی منظر

ایجنٹوں کے آرڈرس پہلے سے نہ چاہئیں بعد میں تعمیل نہ ہو سکے گی

پاکستان کے ایجنٹ اور اہل ذوق حضرات فیل کے پتہ سے کرشن چندر نمبر حاصل کر سکتے ہیں

رائٹرز امپوریم ۔ خورشید بلڈنگ سر فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی ۱

منیجر "شاعر" ـــــ مکتبۂ قصر الادب ۔ پوسٹ بکس ۲۵۲۶ بمبئی ۸ بی سی

کرشن چندر نمبر میں

خود

کرشن چندر

کے اپنے قلم سے

ایک تازہ، غیر مطبوعہ اور شاہکار

نئے

ناول

کے علاوہ

تین تازہ کہانیاں ۔ ایک ڈرامہ

ایک مزاحیہ ۔ میرے ادبی نظریات

میرے تنقید نگار ۔

میری ادبی زندگی کا آغاز و انجام

★

کرشن چندر کے شب و روز (تصاویر کے ذریعہ)

اور

عکس تحریر

کرشن چندر کے اہم

خطوط

خبر ماشے

اُردو اور سیاسی گٹھ جوڑ!!

اِس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اُردو کو نقصان پہنچانے اور اِس عظیم زبان کو ختم کر دینے کے پیچھے سیاسی مصلحتیں اور فرقہ پرستانہ ذہنیتیں رہی ہیں۔ تقسیم ملک کے فوراً بعد سب سے پہلے یو۔پی میں اِس کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا اور اِسے "مضامین اختیاری" کے ذیل میں ڈال دیا گیا۔ اِس کے خلاف پہلی آواز غالباً ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء میں شاعر نے اُٹھائی تھی، جہاں تک یاد آتا ہے اُس وقت مضامین اختیاری میں اُردو کے ساتھ سائنس اور انگریزی زبان کو رکھا گیا تھا۔ یہ پتہ چلا کہ وزارت کا نقطہ تھا، بڑھتے ہوئے یہاں تک ہوا کہ اُردو کی کلاسیں ہی ختم کی جانے لگیں، اور پھر اُردو اسکولوں کا قلع قمع کر دیا گیا۔ یو۔پی۔ کی تقلید بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان وغیرہ نے کی! اسکے ساتھ اُردو زبان کے ساتھ انصاف کرنے کے وعدے، اپنے ہر دزارتی دور میں حکومت یو۔پی کرتی رہی۔ اور مختلف انداز میں اِن وعدوں کی معیاد بڑھاتی رہی، "تا آنکہ اب سے چند سال پہلے" جدید ذہانت کی ایک اصطلاح گڑھ کر اُس کے ذیل میں اُردو کے بجائے "سنسکرت" جیسی قدیم زبان کو لے لیا گیا، یا پھر جنوبی ہند کی بعض زبانوں کی تعلیم کا حیلہ تراش لیا گیا۔ یہ بات کوئی پوچھنے والا نہ تھا کہ "تمل۔ کنڑ وغیرہ زبانیں جدید ہیں یا قدیم؟" سیاسی مصلحت نے ہر قدیم کو جدید بنا دیا، اِس لئے کہ جنوبی ہند کی لسانی تحریکیں "ہندی زبان" کی اجارہ داری اور یلغار کے خلاف تھیں اُردو والے بیچارے منہ دیکھتے رہ گئے، پھر ہر سیاسی اُلٹ پھیر کے ساتھ وعدوں اور وعدہ خلافیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور نئے نئے رُخ اختیار کر رہا ہے۔

جیسا کہ "شاعر" کے پچھلے اداریوں میں عرض کیا جا چکا ہے آنے والے انتخابات سے پہلے اُردو کیلئے جہاں بہت سی اُمیدیں پیدا ہوئی ہیں، ہر طرف اُردو اُردو کا شور ہے، اُسے اُس کی ۱۹ سالہ پامالی کے بعد تھوڑے جانے کی آمادگی کا اظہار کیا جا رہا ہے اُردو زبان کی عظمت و اہمیت کا اعتراف ہو رہا ہے وہیں ایک گوشہ سے یہ آواز بھی آگئی ہے کہ "اُردو کیلئے ایک علیحدہ کمیشن مقرر کر دیا جائے" نکتہ چینی کی بات نکالی ہے ہمارے سیاست دانوں نے وہ سمجھ رہے ہیں کہ اُردو والے خوش ہو جائیں گے!!

خلاصہ یہ کہ اُردو والے اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ وہ ابھی ایسے حسین فریبوں میں آجائیں گے، کیا اٹھارہ سال کے بعد بھی ہنوز یہ تحقیق کرنا باقی ہے کہ اُردو کوئی زبان ہے یا نہیں، اور ہے تو کہاں کہاں؟ برسوں سے لسانی کمشنر اپنی رپورٹوں میں اُردو کی حقیقت، ضرورت اور اہمیت پر اپنی سفارشات پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ لسانی کمشنر کی حالیہ رپورٹ میں بھی بڑی شدومد کے ساتھ اُردو کی حق تلفیوں کو واضح کیا گیا ہے اور اخبارات کی اطلاع کے مطابق حکومت یو۔پی نے اس رپورٹ کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر لسانی کمشنر مقرر ہی کیوں کیا گیا؟ جبکہ اُس کی رپورٹ کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جا رہا ہے!!

رہا اُردو کیلئے علیحدہ کمیشن مقرر کرنے کا سوال، تو ہم سیاسی ناخداؤں سے بڑے ادب کے ساتھ یہ پوچھنے کی جسارت کریں گے کہ اُردو زبان اُن چودہ[۱۴] زبانوں میں سے ایک ہے جنھیں آئین کی رو سے قومی زبان کی حیثیت دی گئی ہے، کیا اِن چودہ زبانوں میں سے کبھی کسی زبان کیلئے اِس طرح کے کمیشن کی ضرورت محسوس کی گئی؟ اگر نہیں، تو پھر اُردو کے لئے کیوں؟ یہ کیا اس لئے کہ اُردو کا مقدمہ کمزور سا اور اُلجھ جائے اور دوسرے سیاسی مسائل کی طرح آہستہ آہستہ اس پر بھی وقت گذرتا رہے، اُردو پڑھنے کے خواہش مند طلباء مجبوراً ہندی میں سب کچھ پڑھتے رہیں اور اُردو تعلیم کا رجحان روز بروز کم ہوتا جائے۔ ایک واضح، صاف اور نہایت صریح بات کے سلسلے میں یہ اُلجھاوے ہمارے جمہوری اصولوں کی کھلی ہوئی نفی ہیں۔

بہرحال ساگر اُردو زبان پر یہ نئی اُفتاد بھی آتی ہے تو اس کی ضرورت ہے کہ اُردو کے چند دانشوروں کو اس ذیل میں ضروری کارروائیاں کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ ہم اُردو والوں نے خود اب تک اُردو تحریک کو سیاسی تحریک بنانے سے گریز کیا ہے اور آئندہ بھی گریز ہی کریں گے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اب کی سیاست اُردو کے مسئلے کو سیاست کے خانہ ازمیں گھسیٹ لائیں، ایسی صورت میں ہمارے لئے بھی سپریم کورٹ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جس سے ہم نے تک کام نہیں لیا۔

۹ر اکتوبر ۱۹۶۶ء

محمد احمد صدیقی

ساحر لدھیانوی

اے شریف انسانو!

ن اپنا ہو یا پرایا ہو
نلِ آدم کا خون ہے آخر
نگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
نِ عالم کا خون ہے آخر

م گھروں پر گریں کہ سرحد پر
رحِ تعمیر زخم کھاتی ہے
بت اپنے جلیں کہ اوروں کے
یت فاقوں سے تلملاتی ہے

نگ آگے بڑھیں کہ پیچھے ہٹیں
کھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
ج کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
ندگی میتوں پہ روتی ہے

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی

اِس لئے اے شریف انسانو
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم، سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر ہے

شاعر بلخی

ع۔ صمد۔ (خانہ پوری)

آزاد نظم کا ارتقاء

ہر سال حال سال گزشتہ بن جاتا ہے، ہر سال گزشتہ اپنی کہنگی کا احساس مٹانے کیلئے سال نو کا لباس زیب تن کئے جب جلوہ گر ہوتا ہے تو اُسکی تمام تر رعنائیاں اور رنگینیاں اور بجائے خود ہی جاذبیت بن جاتی ہیں اور یہی چیزیں ہی حیات کو خوبصورت بنا دیتی ہیں۔ زبان اور ادب کی قدریں بھی ہر دور میں یکساں نہیں ہوتیں۔ زبان و ادب کو بھی ہم نے کارڈیا فاتحہ نہیں پڑھا جسمیں ایک ہی طرح کے خیالات، جذبات، اور احساسات کا اظہار کیا جاتا ہو۔ بلکہ ایک ایسا ربط ہے جس میں ہر دور کے تاثرات مرتعش ہوتے ہیں جیسے ہر شخص کی انگلیاں اپنے جذبات سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ ہر زبان کے پیٹ سے حال اور مستقبل کی کوکھ سے مستقبل جنم لیتا ہے۔ آزاد نظم کا وجود بھی آج نیا اور اچھوتا محسوس ہوتا ہے، مگر حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آزاد نظم کا وجود بہت پرانا ہے یہ اور بات ہے کہ اس دور میں اس نے اپنی کہنگی کا احساس مٹانے کیلئے ایک نئی جدت اور ایک نیا وجود حاصل کر لیا ہے۔ بقول ڈاکٹر عزیز احمد [1]

"آزاد شاعری ہمارے زمانے کی پیداوار نہیں ہے۔ جذبات کی طرح یہ ہمیشہ ہر ملک اور قوم میں تھی۔ صرف کچھ وقت کے تقاضوں نے جس طرح جذبات کی اہمیت کو نمایاں کیا تھا، اُسی طرح آزاد شاعری کو بھلا دیا ہے۔"

شاعری ردیف، قافیہ، اوزان و بحور اور الفاظ کے تکلفات سے متبرا روح کی کیفیت کا ایک لطیف ترین اظہار ہے، اُس میں باطنی اضطراب بھی ہے اور داخلی ہیجانات IMPULSES بھی۔ ذاتی جذبے بھی ہیں اور زندگی کی یکسانیت کا وجدانی جواب بھی۔ شاعری دراصل انسان کا ایک فطری جذبہ ہے۔ ہر عصر اور ہر عہد کے کچھ خاص بانیں محسوس ہوتی ہیں۔ ادوار میں تبدیلیوں کا آغاز حسن مقتضائے فطرت ہے۔ ایک زمانے میں سانہ اور آواز کی قدر اتنی بڑھی کہ شاعر کو موسیقی کے تابع ہونا پڑا۔ اُسے اپنے داخلی احساسات و جذبات اپنے حسی تجربوں PSYCHIC EXPERIENCE کو آہنگ دانہ طور پر بیان کرنے کے بجائے طاؤس و چنگ و رباب کے سُر اور لے کی ہم آہنگی میں سنانا پڑا۔ کلام شاعر بزبان شاعر کے بجائے گویے کا کلام کہلانے لگے۔ یہ تسلط شاعری طور پر کچھ اس طرح ہوا کہ اس کی وجہ سے شاعری کی حسی ہیئت FORM میں تبدیلی آنے لگی۔

آخر کار آزاد شاعری منظر عام پر آئی۔ دور جدید و تعلیم نے آزاد شاعری کو مدلل قافیے اور اوزان کی بندشوں میں جکڑ دیا۔ دور نہ ہر جگہ آزاد شاعری ہی بزبان زد خاص و عام تھی۔ قدیم و جدید عربی زبان کی دو الہامی کتابیں آزاد شاعری ہی میں ہیں۔ اصل وید کا مطالعہ بھی آزاد شاعری کا وجود ثابت کرتا ہے۔ مسلمانوں کی مقدس الہامی کتاب قرآن کریم جو تقریباً طور پر کسی حد بدل سے منزہ ہے۔ اگر ہم غور کرینگے تو یہ محسوس ہوگا کہ آیت کریمہ آزاد تکنیک ہی میں ہے جیسے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ
مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ
وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ
وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ
وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۔

قرآن کریم کو ہمیشہ نثر یا عبارت کہنے کی جگہ کلام اور ہر آیت کو فقرا کہنے کی جگہ مصرعہ کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات

[1] حسب بیاض تنقیدی نادر ہے۔

ادب کہلاتا ہے۔ اور انگریزی اور فرانسیسی شاعری آزاد نظم ہی میں ہے۔ انیسویں صدی میں شہرۂ آفاق امریکی شاعر "والٹ" وٹ من کے تحت آزاد نظم کی تحر

بیسویں صدی میں موضوع، مواد اور ہیئت کی بوقلمونی کا احساس ادب کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی سعی جمیلہ دامن پکڑ چکا تھا۔ آزادی کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ موضوع اور مواد کے اعتبار سے اردو شاعری میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کی جدت پسندی کی کوشش مولانا عبدالحلیم شرر، محمد اسمٰعیل میرٹھی اور علامہ نیاز نے کیں جس کی بہترین مثال محمد اسمٰعیل میرٹھی کی نظم "تاروں بھری رات" ہے گ

پھر بھی ہم اسے آزاد نظم سے مماثلت نہیں دے سکتے کیونکہ بقول احتشام حسین[1]

"جہاں تک صرف تغیر تک کرنے کا سوال ہے اس کی کوشش مولانا شرر، اسمٰعیل میرٹھی اور نظم طباطبائی کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن وہ صرف جدت طرازی تھی۔ اس کا تعلق کسی تحریک اور شاعرانہ شعور سے نہ تھا۔

مولانا شرر کے منظوم ڈرامے "خلود فلسطین" اور اسمٰعیل میرٹھی کی نظم "تاروں بھری رات" موضوع اور فن دونوں لحاظ سے آزاد شاعری سے مماثلت رکھتی ہے، دونوں نے ردیف و قافیے کی بندشوں سے آزادی حاصل کر لی ہے۔ دونوں نے پرانی روایتوں سے بغاوت کی ہے مثلاً اسمٰعیل میرٹھی کی "تاروں بھری رات" کا ایک بند پیش ہے۔

تاروں بھری رات

ارے چھوٹے چھوٹے تارو — کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر سنہ ہو دے — مجھے کس طرح تحیر
کہ تم اڑ رہے آسماں پر — جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے — کہ کسی نے جڑ دیئے ہیں!
نگینے اور لعل گویا

مگر پھر بھی اس نظم کو آزاد نظم نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ بقول احتشام حسین "نظم معرّیٰ اور آزاد نظم میں فرق ہے"۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے انیسویں صدی میں "گلفشانِ بے خزاں" میں شاعری میں قافیے کی بندشوں کے خلاف تحریک شروع کی انھوں نے مسلسل خیال اور اظہار کی روانی (FREE FLOW OF EXPRESSION) کے لئے قافیے کی پابندی کو قید کی مثال دی ہے۔

"اصل وجہ یہ ہے کہ قافیہ وغیرہ کی قید کلام کو محدود اور طبع آزمائی کے میدان کو نہایت ہی تنگ کر دیتی ہے، اگر کوئی ڈرامہ یا مختلف لوگوں کی گفتگو نظم میں بیان کرنی ہو تو مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ہر فقرہ یا خیال جس طرح نے شعر یا مصرع میں ختم کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قید کے ساتھ کلام کا تسلسل قائم نہیں رہ سکتا، اس لئے قافیہ سلسلۂ کلام کو ہمیشہ قطع کر دیا کرتا ہے۔"

اس طرح شرر کی سرپرستی میں قافیے کی بندشوں سے بغاوت اور نظم معرّیٰ نے اپنا وجود حاصل کر لیا۔ شرر کی تحریک نے کافی زور پکڑا، اور ہر کوئی نظم معرّیٰ کی طرف مائل ہوتا گیا۔

اردو کی پابند شاعری میں ایک ایسی صنف بھی ہے جو ظاہری ساخت کے اعتبار سے آزاد نظم سے کچھ حد تک مماثلت رکھتی ہے جسے "مستزاد" کہتے ہیں۔ میر تقی میر نے ۱۷۲۲ء سے ۱۸۱۰ء رباعی کی ہیئت میں ایک "مستزاد" لکھی۔ مثلاً

تا چند غم دل کی حکایت کریئے — ہو ہو کر تنگ
کیوں کس سے شب و روز شکایت کیجئے — آتا ہے تنگ
سنتی کوئی اس غم کی کہاں تک کہیئے — ہے جی ہی کباب

---

[1] پروفیسر احتشام حسین — مضمون "مراد اور ہیئت" کتاب "تنقیدی زاویئے" مضامین شرر "دلگداز" ۱۹۱۰ء بمبئی ۱۹۶۱ء

ہوتا کر ترے دل میں سرایت کر یئے
پر تُو ہے سنگ

قافیے کے معین اصول و ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے میر نے مروجہ صنفِ سخن کے آگے مصرعہ کے خیال کو بڑھانے کے لئے ایک فقرا ایک جدت طرازی کی۔ ٹھیک اسی طرح غالب نے بھی ہیئت یا فارم کے لحاظ سے بہت سے تجربے کئے ہیں۔

انگریزی ادب میں جدید سائیکالوجی PSYCHOLOGY فرائڈ کے نظریۂ لاشعور نے شاعری کے موضوع فارم اور طریقۂ کار پر بہت اثر ڈالا انسان کی وہ تمام آرزوئیں، خواہشات و جذبات جنہیں انسان چند خارجی بندشوں کے خوف سے ترشح نہیں کر سکتا، لاشعور کی دُنیا میں موجود رہتے ہیں، ایک چیز کے ذکر سے ہمارا خیال دوسری چیز کی طرف روانی کی روانی میں مائل ہو جاتا ہے اور پھر یکے بعد دیگرے تسلسل، خیالات کی ایک بلا واسطہ تمام ہو جاتی ہے، شاعری میں فرائیڈ کے اس نظریے کو آزاد تسلسل FREE ASSOCIATION کا نام دیا گیا ہے، اس کے علاوہ IMAGISM رابرٹ گریوز پو اشاریت SYMBOLISM اور فرانسیسی VERS LIBRE نے بھی آزاد نظم کا محرک بنتے ہوئے تقویت پہنچائی۔

اُردو زبان کے شعراء میں انگریزی ادب سے واقفیت، فرائڈ کے لاشعور کی تھیوری، مارکس کے جدلیاتی نظریہ نے تحقیق، تحلیل، تجزیہ، تنقید، تجربہ اور سوجھ بوجھ کا رجحان بڑھا اور اندرونی طور پر اقتصادی، سماجی، سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور نظریاتی کشمکش نے انہیں آزاد نظم کی دہلیز پر کشاں کشاں لا کھڑا کر دیا۔ انگریزی ادب کے رُومانی شاعر ورڈزورتھ شیلے، کولرج کا اثر اُردو ادب پر ہونے لگا۔ انگریزی شاعری کو اُردو میں منتقل کیا جانے لگا۔ ۱۸۸۷ء میں اسمٰعیل میرٹھی نے اپنے طور پر انگریزی شاعری کے ترجمے کئے مثلاً "ایک قانع منش" "حُبِ وطن" "انسان کی خام خیالی" وغیرہ۔ مولانا شرر نے بھی نظم کی تعریف اور انگریزی نظم کی سہولت کے خیالات پیش کئے۔[2]

"اُردو نظم میں جس قدر سختی کی گئی ہے اسی قدر انگریزی میں سہولت سے کام لیا گیا ہے، اُردو شاعری میں صدہا قیدیں اور ہزار ہا قسم کی پابندیاں ہیں اور ترقی کرتی جا رہی ہیں، برخلاف اس کے انگریزی میں بہت کم قیدیں ہیں خیال کیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ باوجود اس ترقی کے اب تک انگریزی میں قافیہ کی ضرورت نہیں اور اُردو میں جب تک قافیے کی پابندی نہ ہو شعر ہی نہیں ہو سکتا۔"

مختصر یہ کہ اُردو نظم تصوراتی اور خیالی دنیا سے نکل کر حقیقی اور وقت کی پکار بننے لگی۔ اردو نظم نوابوں بادشاہوں کے محل کی زینت ہونے کے بجائے جفاکش کسانوں، کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں، دفتر کے کلرکوں کی پیچیدگیوں، مشکلات، رُومان اور مسائل کا آئینہ بننے لگی، سردار جعفری، صدیق حسین خالد ن م راشد، میراجی، ڈاکٹر تاثیر، خلیل الرحمٰن اعظمی، فکر تونسوی، یوسف ظفر، قیوم نظر، ضیاء جالندھری، محمد جالندھری احمد ندیم قاسمی، رضی ترمذی، ظہیر کاشمیری کے علاوہ اسلاف گوہر، کمار پاشی، انجم رومانی، اعجاز صدیقی، ضیاء الاسلام، ملک جاوید زیدی اور کرشن موہن وغیرہ نے آزاد نظم کو اپنایا۔

آزاد نظم کا آغاز سب سے پہلے اُردو میں پنجاب کے شعراء سے ہوا یونی کے شعراء نے بعد میں اپنایا۔ صدیق حسین خالد۔ ن م۔ راشد، میراجی ڈاکٹر تاثیر وغیرہ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ آزاد نظم کے محض انگریزی ادب کی نقل اور جدت طرازی نہ ہوتے ہوئے اس تحریک کے پیچھے جدید احساسات خیالات اور موضوع کے بھرپور اور آزاد اظہار و ابلاغ کا ایک خاص ادبی مقصد کام کرنے لگا۔ ترقی پسند تحریک ۱۹۳۵ء کے بعد اُردو شاعری میں ہیئت کا مسئلہ ایک اہم ترین مسئلہ بن گیا۔ معین اصناف سخن، بحور، ردیف و قافیے کی روایتی پابندی سے بغاوت کے عناصر پیدا ہونے لگے۔ بقول پروفیسر کمل بانی[1]

"اس فارم کی بنیاد اس نظریہ پر رکھی گئی ہے کہ شاعری کا انحصار موضوع پر ہے، نہ کہ ہیئت پر۔ اس نظریے سے شاعری میں آزاد نظم کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جس کے پیش نظر معین اصناف سخن، بحور اور قافیے کی روایتی پابندیوں سے بغاوت کی گئی ہے نظم معرا میں صرف قافیے کی قید سے نجات ملی تھی۔ آزاد نظم میں شاعر نے بحر اور قافیہ، دونوں سے نجات حاصل کر لی ہے

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جزو کل تسلیم کیا جانے لگا۔ سائنس نے انسان کے مشاہدات اور تجربات کیلئے نئے نئے ماستے پیدا کئے۔ ایک طرف انسان چاند تک پھیلی ہوئی فضائی دُنیا کے حدود اربع میں منہمک ہو گیا۔ اسی سائنس نے دوسری طرف فرد کو تنہائی اور بیکاری کے احساس میں مبتلا

---

[1] پروفیسر کمل بانی "تجربے کے ہیئتی تجربے" سالنامہ "شاعر" ۱۹۶۶ء

[2] شرر "دلگداز" ۱۸۹۹ء مضمون "ہمارا لٹریچر"..... پروفیسر کمل بانی بحوں آزاد نظم اُردو شاعری میں رسالہ نگار جولائی ۱۹۵۸ء

یہ دور ہے پرانے اصول اور اصنامی کی طرف حال کی نگاہوں سے تعجب و حیرت کی نظر ڈالنے لگا۔ منزل کا تعین ہی اس کے تحت الشعور میں پنپنے اور کشمکش کا سبب بن گیا۔ ایک طرف اُسے محبوب کی زلف پیچاں، عارض کا رنگ، باہنوں کی مہک نے پکارا تو دوسری طرف مفلسی، بیکاری، دستی، متوسط طبقے کی کشمکش، انجمن، اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالات کے نفسیاتی تجزیے نے مدد دی۔ بقول ڈاکٹر آلِ احمد سرور رضا نہ

"یہ بڑا عجیب و غریب کرب کا دور ہے۔ زندگی کی رفتار یک لخت جتنی تیز ہو گئی ہے اتنا تیز چلنے کے ہم عادی نہیں ہیں۔ اس لئے چلنے کے حوصلے کے باوجود تھکن کا ایک احساس ہے اس لئے آج ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ اس حوصلے اور تھکن کا اظہار کرنے کیلئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ زندگی کی بکھیر بھاڑ اور دھکم پیل نے تنہائی کا جو احساس دلایا ہے اُسے کس طرح ظاہر کیا جائے۔ ہم سناٹے کے ایک بھنور میں ہیں یہی بھنور ہمارا موضوع بھی ہے۔ اب ایک طرف فرد اور اس کی تنہائی ہے تو دوسری طرف چاند تک پھیلی ہوئی یہ دنیا۔ ان دو فوق حقیقتوں کا اظہار بوقلموں کے دور عصر حاضر میں کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا یہ نا آزاد نظم کی طرف توجہ کی جائے اور کیا یہ نا آزاد نظموں میں اپنے فوک گیتوں کی موسیقی کے ارتعاش کو مقید کرنے کی کوشش کی جائے۔"

ہم نے آغاز میں بتلایا ہے کہ شاعری جب موسیقی کی بندشوں سے آزاد ہوئی جب اس نے ہیئت کی بندشوں اور ردیف و قافیہ کی جکڑبندیوں سے فیصلہ تعلق کیا تو آزاد شاعری کا وجود عمل میں آیا۔ یہاں آزاد نظم میں بقول ڈاکٹر آلِ احمد سرور رضا نہ فوک گیتوں کی موسیقی کے ارتعاش کو ضم کرنے کا سوال آگیا دوبارہ پھر سے شاعری کو سانس اور آواز کے جنگل میں پھنسانا ہے۔ اس لئے فوک گیتوں کی موسیقی کے ارتعاش کو مقید کرنا مناسب نہیں۔

علی عباس حسینی نے غالب کی "سنگلاخ غزل" کے احساس کو غزل کی ہیئت اور ردیف قافیے کی بندشوں سے بیزارگی سے تعبیر کیا ہے۔ مجنوں غالب کے "سنگلاخ غزل" کے احساس کو اور دو غزل کی ہیئت سے قبیلہ کو ناغزل کی توہین ہے۔ "سنگلاخ غزل" کا احساس تو غالب کو تجمل حسین خاں کی مدح و ستائش کے واسطے وسیع تر میدان چاہتا ہے۔ نہ کہ ردیف و قافیے کی بندشوں سے آزادگی۔ غالب تو آزاد شاعری کے وجود سے بھی ناآشنا تھے۔ جوزف والا نیاز فتحپوری کہتے ہیں

"غالب نہ تو انقلاب پسند شاعر تھے نہ اشتراک پسند۔ سنگلاخ غزل کی شکایت ایک مخصوص غزل میں صرف اس لئے کی گئی ہے کہ وہ اسے یہ کہہ کر تجمل حسین خاں کی مدح کی طرف تحریر کرتا تھا۔"

آزاد نظم کی جھلکیاں ہمیں ۱۹۳۰ء کے بعد سے نظر آتی ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس میں ندیم صداقت سجاد ظہیر اور پریم چند کے بعد شاعری میں ایک نمود آیا۔ سردار جعفری نے آزاد شاعری کی رہنمائی کی انھوں نے بدلتے ہوئے حالات کا بہت گہرا تجزیہ کیا۔ انسان کے ذہنی انتشار اور احساس تنہائی کیلئے سیدھی سادی براہ راست بیانیہ نظم کیلئے آزاد شاعری کو اپنایا[۵]

"سردار جعفری نے شاعری کو متنوع اور مبہم جنسی اور غیر سماجی مواد کے جال سے نکال کر سماجی مسائل کے لئے استعمال کیا۔ انھوں نے ہیئت پر یا تو زور دینا چھوڑ دیا یا نظم کا خارجی ڈھانچہ چھوڑ کر پھیلنے والوں کی طرح لفظوں، فقروں اور مصرعوں کے کھٹ کھلے ضلع نہیں کھڑے کئے بلکہ اپنے خیالات کو بہترین سانچے میں ڈھالنے کیلئے آزاد نظم کا فارم اختیار کیا۔"

آزاد نظم جدید خیال کے ساتھ سکڑتی اور پھیلتی ہوئی متحرک رہتی ہے۔ ایک نازک انسانی حسیت کی طرح لچکیلی ہے، کہیں کہیں ایک مصرعہ دو سے زیادہ مصرعوں کا وزن برابر ہوتا ہے۔ اس طرح کہیں کہیں قافیہ بھی ایک ہو سکتا ہے لیکن یہ بات آزاد نظم کے لوازم میں شامل نہیں ہے۔ مثلاً کرشن کی پیشکش بیسویں صدی فروری ۱۹۶۶ء۔

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

---

[۱] "اصناف سخن کا مسئلہ" علی گڑھ میگزین۔

[۲] "جدید شاعری میں ہیئت کا مسئلہ" "شاعر" اور دسمبر ۱۹۶۵ء

[۳] خیر بہوری "غالب کے دو شعر" فروغ اردو مئی ۱۹۶۶ء

[۴] تنقید و تنقید، سید احتشام حسین

منوّر لکھنوی

غزل

سرِ کعبہ تجلّی ریز بُت خانے بھی ہوتے ہیں
حقیقت کے عَلم بردار افسانے بھی ہوتے ہیں
گزرنا ہوش سے اِن کے لئے ہے عین دانائی
جنھیں کہتے ہو دیوانے، وہ فرزانے بھی ہوتے ہیں
عبادت کے لئے دَیر و حرم کا دَم یہ کیا بھرنا
پرستش گاہ اک دُنیا کی میخانے بھی ہوتے ہیں
محبّت کا چمن آباد بھی، برباد بھی دیکھا
یہ وہ گلشن ہے جس کے ساتھ ویرانے بھی ہوتے ہیں
اُنھیں منظور ہے اِس آگ میں فی النّار ہو جانا
شریکِ شمع سوزِ غم میں پروانے بھی ہوتے ہیں
نہیں، ہر میکدے میں اُن کی سرشاری نہیں ممکن
بڑے عظمت نشاں رندوں کے پیمانے بھی ہوتے ہیں
اگر برباد ہوتے ہیں گلستاں کچھ تو غم کیا ہے
بہ تبدیلِ فضا آباد ویرانے بھی ہوتے ہیں
منوّر راز کیا اِس میں ہے آخر دیکھ کر تم کو
یگانے شادماں، بیتاب بیگانے بھی ہوتے ہیں

سرشار سیلانی

غزل

صلہ نیازِ محبّت کا پالیا میں نے
دیا جلاتے ہوئے گھر جلا لیا میں نے
کسی کی چشمِ عنایت کا پردہ رکھنے کو
خود اپنے حال پہ پردہ گرا لیا میں نے
خرد کی مصلحت اندیشیوں سے تنگ آکر
جنوں سے اپنا تعلّق بڑھا لیا میں نے
ستم ظریف نے کب سوچنے دیا مجھ کو
کہ اپنا حال یہ کیسا بنا لیا میں نے
بُرا ہو دستِ مروّت کی نارسائی کا
کہ ایک دوست کو دشمن بنا لیا میں نے
بساطِ شوق پہ سب کچھ لُٹا کے یوں خوش ہوں
کہ جیسے گنجِ گراں مایہ پالیا میں نے
جگر میں خون کا قطرہ نہیں رہا نہ سہی
چمن میں رنگ تو اپنا جما لیا میں نے

شاعر بمبئی

تحریر: ارکے شاسوتی

ترجمہ: رفعت نواز

ہوش بے ہوشی

"مقدمے میں کوئی جان نہیں" وکیل نے کہا۔ "یہ بیان حلفی سراسر جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کو جھٹلایا جا سکتا ہے۔ اس کے گواہ بھی جھوٹے ہیں۔ ان کے بیان میں کوئی وزن نہیں۔ ہم اس مقدمے کو بڑی آسانی سے جیت سکتے ہیں۔"

"کیا واقعی ایسا ہے؟" موکل نے پوچھا۔

"بالکل ایسا ہی ہے۔ ہم اس مقدمے کو ضرور جیتیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ مقدمہ دائر کر دیجیے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم مقدمہ دائر کر دیں گے۔ لیکن اس کے لیے ہمیں کچھ رقم درکار ہوگی۔"

"کتنی رقم؟"

"ہمیں کم از کم پانچ ہزار روپے چاہئیں۔"

"پانچ ہزار روپے!" موکل نے حیرت سے دہرایا۔ "اتنی بڑی رقم کا بندوبست میں کیسے کروں گا؟"

"یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ ہمیں تو رقم چاہیے۔"

"لیکن اتنی بڑی رقم کا بندوبست میں کیسے کروں گا؟"

"یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ ہمیں تو رقم چاہیے۔"

"لیکن اتنی بڑی رقم کا بندوبست میں کیسے کروں گا؟"

"یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ ہمیں تو رقم چاہیے۔"

بس یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اب وکیل کے کمرے میں مسٹر ایکا مہاوناٹیک شاستری اپنے وکیل اور مقدمے کی فیس بھی کافی دیکھ چکی تھی۔ اگر وہ مقدمہ جیت جاتا تو بلا جھجک وہ ٹیک شاستری سے کچھ رقم بطور قرض حاصل کر لیتا، لیکن جب کہ وہ مقدمہ ہار چکا ہے کس منہ سے قرض مانگے۔ اگر قرض مل بھی جاتا تو اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی۔ اس کا بال بال تو قرض میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس نے سوچا خاموشی سے کھسک جانا ہی بہتر ہے۔ پتلے پتلے آہستہ آہستہ بلکونی کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا اور سمندر کی طرف چل پڑا۔ سمندر کے کنارے وہ اونچا مخصوص جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ "اب کیا کرنا چاہیے۔" اس نے دھوتی کے پلو سے دو چند سکے نکالے جو صبح کے خرچ کے بعد بچ گئے تھے..... صبح چار آنے خرچ ہوئے تھے.....

بس کا کرایہ ادا کیا گیا تھا اور ایک ناس کی ڈبیا خریدی گئی تھی۔ اب صرف ڈیڑھ آنا بچا تھا۔ اس کا مختصر سامان ایک ہوٹل میں پڑا تھا، مگر ہوٹل سے سامان بھی نہیں لا سکتا تھا۔ کرہ کا کرایہ دیئے بغیر مالک سامان کیوں دینے لگا۔ اس کے مقدمے کا فیصلہ توقع کے خلاف ہوا تھا۔

دو سال پہلے وہ اس مقدمے کے چکر میں پھنسا تھا۔ وہ زمیندار تھا۔ اس کے پاس کوئی ۵۰ ایکڑ زمین تھی۔ مگر اس زمین پر ایک لاکھ روپے کا قرض تھا اور سود دس ایکڑ زمین بیچ کر ۴ ہزار روپے ادا کر دیئے گئے تھے اب ستر ایکڑ زمین بچی تھی اور اٹھارہ ہزار روپے کا قرض تھا۔ قرض خواہ نے اسے مشورہ دیا تھا کہ قرض میں مزید ۱۰ ایکڑ زمین اس کے حوالے کر دی جائے۔ بقیہ ۶۰ ایکڑ زمین پر وہ کاشت کر سکتا ہے۔ اس بات پر پہلے تو ناراض بھی ہو گیا تھا مگر ان ہی دنوں بنجر زمین کا قانون نافذ ہو گیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ اس قانون میں پٹے کا تحفظ ہوتا تھا۔ اب اسے صرف سوا سو روپے ادا کرنے تھے کیونکہ دس ہزار روپے کی قرض کی سال پہلے لیا گیا تھا، اور سودی میں وہ اٹھارہ ہزار چار سو روپے ادا کر چکا تھا۔ قانون کی رو سے واجب الادا رقم وہ دینے کو تیار بھی تھا، مگر قرض خواہ نہ مانا اور عدالت میں مقدمہ دائر ہو گیا۔ سب لوگوں کا یہی خیال تھا کہ ساہوکار نے مقدمہ دائر کر کے بیوقوفی کی ہے۔ فیصلہ اس کے موافق نہیں ہوگا مگر جب ڈسٹرکٹ جج نے فیصلہ سنایا تو سب حیران رہ گئے۔

اس زمانے میں حکومت کی مجلس پالیسی تھی۔ ایسے آئی۔ سی۔ ایس عہدیدار جو انتظامی صلاحیتیں نہ رکھتے تھے، انہیں عدالت کی کرسیوں میں ٹھونس دیا جاتا تھا۔ ڈسٹرکٹ جج بھی ایسا ہی آئی۔ سی۔ ایس تھا۔ وہ ہمیشہ اس بات کی مخالفت کرتا تھا جس میں عوام کا بھلا ہوتا تھا۔ اپنے فیصلے میں اس نے زرعی قانون کی بھی مخالفت کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نہ تو مدراس قانون ساز کونسل اور نہ ہی مرکزی قانون ساز کونسل اس کی مجاز ہے کہ کوئی قانون پاس کرے

کا کہ ہے۔ یہ حق تو صرف شہنشاہ برطانیہ کو ہے اور اس قانون کے مسودے پر چونکہ شہنشاہ برطانیہ کے دستخط نہیں ہوئے تھے اس لئے وہ قانون قابل قبول نہیں ہے۔ اس لئے اس نے فیصلہ دیا کہ مدعی سیوشنکرم نہ صرف اثاثہ جات بلکہ مدعا علیہ کے پورے اخراجات بھی ادا کرے۔ یہ فیصلہ سنتے ہی ایک بجلی سی گری۔ لوگوں کا خیال تھا کہ فیصلہ مہنگا ہے کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا' اور سیوشنکرم کو چاہیئے کہ وہ ہائی کورٹ میں مراجعہ دائر کرے وہاں یقیناً اس کے موافق فیصلہ ہو جائیگا۔ سیوشنکرم نے گھر کے تمام زیورات اور جواہرات بیچ کر ہائی کورٹ میں مراجعہ دائر کر دیا۔ مگر اسے کیا پتہ تھا کہ ہائی کورٹ میں بھی.....

سیوشنکرم ان ہی خیالات میں کھویا' سمندر کے کنارے ریت پر بیٹھا تھا' خیال آیا کہ خودکشی تمام پریشانیوں کا واحد حل ہے' مگر اسی لمحہ بچپن میں سنی ایک روایت یاد آگئی کہ خودکشی کرنے والے کی روح زمین کے اطراف بھٹکتی رہتی ہے' اور اسے کبھی سکون نہیں ملتا۔ یا خدا موت کیسے کریں جو انوں کو آدبوچتی ہے' مجھ جیسے ناکارہ کھوسٹ کو کیوں نہیں آجاتی' پھر بہت سوچ بچار کر کے اس نتیجے پر پہنچا کہ خودکشی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ وہ اٹھا اور تیزی سے سمندر کی طرف بڑھنے لگا' پانی میں اتر کر وہ بڑبڑایا "پورتر جل تو ہی آسرا ہے غم نہ دوں اور نیا رلا کا"

اسی وقت اسے اپنے بچوں کا خیال آگیا' ان سے بے نیاز وہ کیسے مر سکتا ہے۔ کل دیوالی ہے اور اس کے بچے انتظار کر رہے ہونگے کہ باپ ان کے لئے نئے کپڑے لائیگا' مٹھائیاں لائے گا' پٹاخے اور پٹاخے لائیگا' جب وہ سنیں گے کہ ان کا باپ فوت ہو گیا تو کتنا صدمہ ہوگا' اُف کیا دردناک منظر ہوگا وہ۔ اس سے تو بہتر ہے کہ خالی ہاتھ ہی جاؤں۔ اس کی نگاہوں میں بچوں کے معصوم چہرے گھومنے لگے۔

سیوشنکرم اگمور ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگا' اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے ایک آنے کا پلیٹ فارم ٹکٹ خریدا' ٹرین چھوٹنے والی تھی' وہ ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا' ٹرین چل پڑی' ٹرین کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے بیچ اس کے ہونٹوں پر بچپن میں سنا ہوا ایک نغمہ مچل گیا۔

"دولت نہ کے کنارے کا ریت ہے' جو پانی کی ہر موج کے ساتھ بہہ جاتی ہے" واقعی کتنا سچا ہے یہ نغمہ' اس کی ابتدائی زندگی اور آج کی زندگی میں کتنا فرق تھا' ایک زمانہ تھا کہ وہ بڑا زمیندار تھا' اور آج اس کے پاس ہوٹل کا بل ادا کرنے کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔ اس نے میٹرک میں بھی سیکنڈ کلاس میں سفر کیا کرتا تھا' اور آج بغیر ٹکٹ سفر کر رہا ہے' اور ہر لمحہ یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ اب ٹکٹ انسپکٹر آئے گا اور اسے دھکے دیکر ڈبے سے باہر نکال دے گا۔

کوئی نو بجے رات کو ٹکٹ انسپکٹر ڈبے میں داخل ہوا۔ اور مسافروں کو اٹھا اٹھا کر ٹکٹ دیکھنے لگا۔ انسپکٹر اس کے قریب پہنچا تو اسے یوں لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہے' اور چند ہی لمحوں میں اس کا خاتمہ ہو جائیگا' اپنے پورے حواس مجتمع کر کے بھرائی آواز میں سیوشنکرم نے کہا "سر! میں نے کسی نے سوٹ کیس اٹھا لیا' ریلوے ٹکٹ اور نقد پیسے سوٹ میں ہی تھے" ٹکٹ انسپکٹر نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا' وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے بیان میں کہاں تک سچائی ہے۔ اس نے سیوشنکرم سے کہا کہ اگلے اسٹیشن پر اتر جائے۔ اگلے اسٹیشن پر ٹکٹ انسپکٹر نے معاملہ اسٹیشن ماسٹر کے سپرد کر دیا۔ اسٹیشن ماسٹر نیند کے مزے لوٹنا چاہتا تھا' اس نے پوچھ گچھ سے اجتناب کیا اور سیوشنکرم کے لئے حکم دیا کہ وہ اپنا سفر ملتوی کر دے۔ پھر ریلوے اسٹیشن سے باہر آگیا' اسے ریلوے اسٹیشن کا نام بھی نہیں معلوم تھا' دور دور کا روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ اس کے قدم تیزی سے روشنیوں کی طرف بڑھنے لگے وہ کل سے بھوکا تھا' بھوک کا دھبہ سے نیند بھی نہیں آئی تھی۔ وہ تھکن سے چور تھا مگر کچھ دیر بعد وہ گاؤں میں داخل ہو گیا۔ ایک بڑے مکان کے قریب پہنچ کر دم لے گیا۔

جب سیوشنکرم کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک خوبصورت سجے سجائے کمرے میں آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا پایا' کمرہ میں چنبیلی اور گلاب کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی' اس کے پلنگ کے سامنے کی دیوار میں کھڑکا کر کے ایک تصویر لٹکائی گئی تھی' تصویر پر پھولوں کے ہار پڑے تھے' اور قریب ہی تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ وہ تصویر کو غور سے دیکھنے لگا' دیکھتا رہا' دیکھتا رہا' اسے ایک جھٹکا سا لگا' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور تصویر کو پھر غور سے دیکھنے لگا' بلاشبہ وہ اسی کی تصویر تھی۔ یہ تصویر کوئی ۲۰ سال پہلے کھنچوائی گئی تھی' اس لئے کچھ دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی' پھر بھی اس نے بڑے اشتیاق اور مسرت سے اپنی پرانی تصویر کو دیکھا' بڑے بڑے بال جو ٹوپی کے کونوں سے جھانک رہے تھے' کانوں میں نگوں والی بالیاں' پیشانی کے بیچ میں کم کم

سر دست سمیر سے اپنے موجودہ چہرے کا مقابل کیا تو زمین و آسمان کا فرق نظر آیا۔ اب اُس
نشا ہو ق اور بے روق ہو گیا تھا' اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ۲۵ سال پہلے وہ اتنا خوبرو نوجوان رہا ہو گا۔

اُس زمانے میں وہ سینٹ جوزف کالج رنچی ہاؤس میں پیٹ گ بکوشش کر رہا تھا' وہ ایک بڑے زمیندار کا لڑکا تھا' اس لئے ہوسٹل میں نہیں رہتا تھا بلکہ مکان میں رہتا تھا' کھانا پکانے کے لئے ایک باورچی تھا' اور وہ خوب ٹھاٹ باٹ سے رہتا تھا' اُسی سال اُس کی شادی طے ہوئی تھی۔ لڑکی اُو۔ اور مالدار گھرانے کی تھی' اس لئے شادی خوب دُھوم دھام سے ہونیوالی تھی' سیوشنکرم کے والد نے شادی کی تمام تیاریاں کر لی تھیں اور سیوشنکر کو شادی سے تین ہفتے قبل ہی گھاؤں آ جانے کا حکم دیا تھا' اُس کا گاؤں ریلوے اسٹیشن سے کوئی چھ میل دُور تھا۔ اُسے بھی دو میل پانی کا سفر تھا جو کشتی کے ذریعہ طے کرنا پڑتا تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے ندی کے کنارے تک سیوشنکرم بیل گاڑی میں آ گیا تھا' مگر کشتی کوئی تیار نہ تھی' وہ کشتی کا انتظار کرنے لگا۔ ایکا کھٹکتے ہوئے قبضے نے اُسے متوجہ کر لیا۔ درخت کے دوسری طرف ایک لڑکی اور ایک بوڑھی عورت مُرغابیوں کو چاول کھلا رہی تھی۔ لڑکی مٹھی بھر بھر کر چاول مُرغابیوں کی طرف پھینکتی اور پانچ چھ مُرغابیاں چاولوں پر جھپٹ پڑتیں' اور لڑکی خوش ہو کر قہقہہ لگاتی' مُرغابیاں گردن اور چونچیں ہلا ہلا کر اُسے مزید خوفناک دیئے پر اُکساتی رہتیں اور لڑکی اُن کی ادائیں دیکھ کر بے ساختہ قہقہے لگا رہی تھی۔

سیوشنکرم بھی یہ کھیل بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا ایک بار لڑکی نے اُسے مسکراتے ہوئے دیکھ لیا' پھر تو جب بھی وہ چاول پانی میں پھینکتی اُس کی طرف اُچٹتی کا نظر ڈالتی' اور سیوشنکرم خوشی سے سرشار ہو جاتا' ایک بڑی مُرغابی نے جرأت سے لڑکی کے ہاتھ سے چاول اُچک لئے۔ لڑکی گھبرا کر چیخنے لگی۔ سیوشنکرم دوڑ کر پہنچا اور مُرغابی کو بھگا دیا۔ بڑھیا کو مخاطب کر کے لڑکی بولی "مالان صاحب نے مجھے خبیث مُرغابی کے چنگل سے بچا لیا ورنہ وہ تو مجھے کھینچ کر پانی میں لے جا رہی تھی۔" سیوشنکرم اپنی تعریف سُن کر نہال ہو گیا۔

"خبیث مُرغابی" لڑکی پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے۔ سیوشنکرم نے سوچا۔ یہ کون ہے۔ کہاں سے آ رہی ہے۔؟ کہاں جا رہی ہے۔؟ کیوں نہ اس سے بات کروں۔ اپنا تعارف کراؤں۔ اس کا اتہ پتہ پوچھوں۔ مگر وہ یہ سب کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ کشتی آ گئی اور وہ تینوں سوار ہو گئے۔

کشتی پانی کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی' لڑکی جھلنی کا جوڑا باندھے ہوئے تھی۔ وہ اپنے جوڑے سے پھول توڑ کر پانی میں پھینکتی' اور لہروں کے ساتھ پھولوں کے تیرنے کا تماشہ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ کبھی وہ کشتی کے آخری کنارے پر جا کر نظارہ کرتی کبھی کشتی کے اُس کنارے پر جھول کر موجوں سے کھیلتی' ایکبار کشتی جھکولا کھا گئی اور وہ بھی پانی میں گرتے گرتے بچی۔

سیوشنکرم نے اُسے گرنے سے بچایا تھا' لڑکی کی ماں بولی "دھن کوڈی یہ کیا شرارت ہے۔ ابھی تم پانی میں گر جاتیں تو؟"

دھن کوڈی نے ایک قہقہہ لگایا اور سیوشنکرم سے دریافت کیا "آپ کو تیرنا تو آتا ہو گا۔"

"ہاں۔"

"اگر میں پانی میں گر بھی جاتی تو آپ مجھے تیر کر نکال لیتے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

سیوشنکرم کے لئے یہ سب کچھ نیا تھا اُس نے کبھی کسی لڑکی کے ساتھ گفتگو نہیں کی تھی۔ کشتی ندی کے دوسرے کنارے پر آ کر ٹھہر گئی۔ سیوشنکرم کا تانگہ بھی آ چکا تھا۔ اس لڑکی اور بڑھیا کو لینے بھی چار پانچ آدمی آئے تھے' سیوشنکرم اپنے تانگہ میں بیٹھ گیا اور تانگہ چل پڑا۔ اُسے بھی کا خیال آ رہا تھا' یوں لگ رہا تھا جیسے لڑکی ندی کے کنارے کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ کون ہے۔ کہاں کا رہنے والا ہے' کیا کیا اُس سے ملاقات ہو سکے گی۔ "اُف کتنی خوبصورت ہے وہ" وہ رہ رہ کر اُسے لڑکی کا خوبصورت اور پُرکشش چہرہ یاد آ رہا تھا۔ پھر اس کی معصوم نازنخریلی' دُزدیدہ نگاہوں کے تیر' اگر وہ مجھے کچھ دن مل جاتی تو شاید یہ شادی .. یا خدا مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیسے کیسے خیالات آ رہے ہیں۔ سیوشنکرم نے سے ایک سرد آہ نکل گئی۔

سیوشنکرم کی شادی بڑے دُھوم دھام سے ہوئی۔ شادی کے ہفتہ عشرہ میں رہ رہ کر لڑکی کا بھولا بھالا' معصوم خوبصورت چہرہ یاد آتا رہا۔ پھر وہ سب کچھ بھول گیا۔ شادی کے دوسرے دن ناچ گانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سیوشنکرم کو دیدہ اسٹیشن کے ناچ گانوں سے ایک چڑ سی تھی' کیا پرانی اداؤں

فضول بدعت ہے یہ۔ پھر بھی اُسے ناچ دیکھنے بیٹھنا ہی پڑا۔ وہ اُس بیباک رقاصہ کو دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔ وہ دھن کوڈی تھی، دیہاتی لڑکی جو ڈی کے کنارے پلی تھی، وہ ننگ دھڑنگ کوڈی کو دیکھے جا رہا تھا، وہ اس لڑکی کے متعلق بہت کچھ جاننے کا مشتاق تھا، قریب بیٹھے ہوئے دوست سے اُس نے رقاصہ کے متعلق دریافت کیا تو وہ بولا "ارے تم اسے نہیں جانتے، حیرت ہے۔ تم ترچناپلی میں رہتے ہو، اور دھن کوڈی کو نہیں جانتے، یہ تو پہاڑی علاقہ کی مشہور رنگی ہے"

ابتدا میں تو دھن کوڈی نے چھوٹے چھوٹے رقص پیش کئے، پھر اُس نے ایک مشہور "بھجن" کو گانے کے ساتھ پیش کیا۔ سیو شنکرم کو رقص سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا وہ تو بس دھن کوڈی کو دیکھے جا رہا تھا۔ آخر میں دھن کوڈی نے رامائن کا ایک "بھجن" پیش کیا، اور سیو شنکرم کھو کر رہ گیا۔

شادی کے کچھ دن بعد سیو شنکرم اور صوری تعلیم مکمل کرنے ترچناپلی آ گیا، مگر اب پڑھنے لکھنے میں اس کا جی نہیں لگتا تھا، وہ تو دھن کوڈی کے فراق میں تڑپ رہا تھا۔ وہ دھن کوڈی کے رقص کے ہر پروگرام میں شرکت کرتا اور جہاں تک ہوتا زیادہ سے زیادہ دھن کوڈی کے قریب رہا کرے۔ ایک دن، پروگرام کے بعد سیو شنکرم نے دھن کوڈی کی ماں سے پوچھا "آپ کہاں رہتی ہیں۔" اس نے پتہ بتا کر کہا "کبھی ہمارے یہاں آیئے نا!"

سیو شنکرم اکثر دھن کوڈی کے یہاں جانے لگا۔ مگر اُسے ایسا لگتا کہ دھن کوڈی اُس کی آمد سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہے، وہ اُسے دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے مغموم ہو جاتی، مگر اُس کی آنکھیں کہتیں کہ وہ مہربان ہیں، دھن کوڈی اُسے چاہتی ہے، اُس پر کبھی اس کی دھن کوڈی سے رسمی باتیں ہوتی تھیں ایک دن دھن کوڈی نے پوچھا "آپکے پاس اپنی کوئی تصویر تو ہوگی؟"

"ہاں ہے تو۔"

"مہربانی کر کے مجھے اپنی ایک تصویر دیجئے گا" دھن کوڈی کے لہجہ میں التجا تھی۔

دیوالی کو چار دن رہ گئے تھے، اور شادی کے بعد اُس کی یہ پہلی دیوالی تھی، گھر سے بلاوا آ گیا تھا مگر اُس نے طے کر لیا تھا کہ گھر نہیں جائیگا، اُس نے اس فیصلہ سے گھر والوں کو ابھی مطلع نہیں کیا تھا کہ گھر سے کوئی آ جائے گا اور اُسے جانا پڑے گا، دیوالی سے ایک دن پہلے اُس نے گھر والوں کو مطلع کر دیا کہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر وہ دیوالی کیلئے گھر نہ آ سکیگا۔ سب بڑی وجہ امتحان کی تیاری بتلائی گئی تھی۔

سیو شنکرم نے تصویر کھنچوائی اور دیوالی کے دن تصویر لے کر دھن کوڈی کے یہاں پہنچ گیا۔ دھن کوڈی دیوالی کے دن اُسے اپنے یہاں دیکھ کر حیرت میں پڑ گئی۔ سیو شنکرم بولا "محض اپنی تصویر تمہیں دینے کیلئے رُک گیا تھا میں چاہتا تھا کہ دیوالی کے دن ہی تمہیں اپنی تصویر دوں۔"

دھن کوڈی نے شکریہ ادا کیا، مگر اُس کے چہرے پر خوشی کے آثار نہ دیکھ کر سیو شنکرم رنجیدہ ہو گیا۔ وہ غم زدہ سا دھن کوڈی کے مکان سے نکلا، یا اور بے دلی سے اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ مکان کے قریب ہی والد کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

"میں تمہیں لینے کے لئے آیا ہوں۔" والد نے کہا۔

گھر واپس پہنچکر سیو شنکرم کو معلوم ہوا کہ اُس کے والد نے ترچناپلی والا مکان کرایہ پر اُٹھا دیا ہے، جب وجہ دریافت کی گئی تو وہ بولے "بس اب تعلیم ختم ہونی چاہیئے۔ ایسی تعلیم سے کیا فائدہ جو تمہیں اپنے گھر اور اپنی بیوی سے بیگانہ کر دے۔" اب وہ گاؤں میں رہنے لگا تھا مگر دھن کوڈی کی یاد کو بھلا نہ سکا، والد کے رویہ میں جو تبدیلی ہوئی تھی اُس کی وجہ معلوم کرنے کے لئے وہ بیچین تھا۔

آخر ایک دن وجہ معلوم ہو ہی گئی، والد الماری میں کوئی چیز تلاش کر رہا تھا کہ اُسے ایک خط ملا، لفافے پر ترچناپلی کی مہر لگی تھی، خط کی تحریر خوبصورت اور واضح تھی۔

جناب!

آپ کے لڑکے کی شادی کے موقع پر رقص کا بڑا اچھا پروگرام ہوا تھا۔ مگر اُس رقص کا انجام کہیں "کوا چلا ہنس کی چال" کی داستان نہ بن جائے۔ میں اب اور کوئی بات تو کہنا نہیں چاہتا، آپ خود سمجھ دار ہیں، پھر بھی اپنے لڑکے کو پہاڑی قلعہ والے اُس بدنام مکان میں جانے سے روکئے گا ــــــــــــــــ آپ کا ایک بہی خواہ

سیو شنکرم سوچنے لگا یہ خط کس کمینے نے لکھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے دھن کوڈی کا کوئی عاشق ہو، اور جذبۂ رقابت اپنا کام کر گیا ہو گا۔ شاید کالج

کا کوئی ساتھی ہوگا۔ بہر حال کوئی بھی ہو، میں تو اُس سے بدلہ ضرور لوں گا۔" اسیطرح دو سال گذر گئے۔ دھن کوڈی کی محبت کی وہ گرمی بھی نہیں رہی، اور انتقام کی آگ بھی سرد پڑ گئی اور سیو شنکرم اپنی دنیا میں کھو گیا۔ گرم گرم ہستی کی دلچسپیاں، زمینداری کی مصروفیتیں، اور نت نئے منصوبے، اس نے گمنام مکتوب نگار کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اُسے تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ دھن کوڈی کی محبت کتنی مہنگی پڑتی، اُس کے خاندان کی عزت مٹی میں مل جاتی، وہ قلاش ہو جاتا اور تمام زندگی اُسے دھن کوڈی کے در پر ایک گدا کی طرح پڑا رہنا پڑتا۔ اب وہ دھن کوڈی کو بھول سا گیا تھا

سیو شنکرم اس خوبصورت کمرے میں پڑا ہوا تھا، اور یادوں کا ایک کمزور اُس کے ذہن میں موجیں مار رہا تھا۔ "یہ تصویر یہاں کیسے آ گئی شاید وہ عورت، وہ سنیاسیوں والی بڑھیا، دھن کوڈی کا ہی ہو، وہ، دھن کوڈی جس کا میں دیوانہ تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو اگر ایسا ہو تو جیتا پکا ایک جوا ہو جائے گا۔" وہ ان ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ وہ بڑھیا آ گئی۔ سیو شنکرم نے سنبھل کر دریافت کیا۔ "یہ کس کی تصویر ہے۔"

"یہ میرے کارخانے کے مالک کی تصویر ہے۔ اسے میں نے اپنی جوانی میں کھو دیا تھا۔"

"سچ۔ وہ کیسے بھلا۔" سیو شنکرم نے متعجب سے پوچھا۔

"یہ ایک لمبی داستان ہے۔ میں نے اب تک یہ کہانی کسی سے نہیں کہی ہے، مگر نہ جانے کیوں چاہتی ہوں کہ آپ سے سب کچھ کہہ سنا دوں۔" پھر وہ ایک تاریخی تبسم سے بھیگ گئی اور کہنے لگی "ہو سکتا ہے کہانی سن کر آپ مجھ سے نفرت کرنے لگیں..... میں ایک دیوداسی ہوں..... اس کے بعد کی کہانی سیو شنکرم کے لئے کوئی نئی نہیں تھی، اُس کی اپنی آپ بیتی تھی..... اب تو اُسے یقین ہو گیا کہ بوڑھیا دھن کوڈی ہی ہے۔

"پھر بھی میری ملاقات اس شخص سے نہیں ہوئی۔"

"حیرت ہے تم اس شخص کو بھول نہ سکیں۔" بڑھیا نے دریافت کیا

"اس بیچارے کی غلطی کو ان سی تھی۔" چند لمحوں کے لئے دھن کوڈی خیالوں میں کھو سی گئی، اور یادوں بھری آواز میں بولی، "اُس دن آڈیٹوریم میں وہ نہیں آیا تو مجھے دھکا سا لگا تھا، ناچتا گاتا سب فضول معلوم ہونے لگا، اُس کے بعد میں نے نا چنا گانا سب چھوڑ دیا، پہاڑی قلعہ والا مکان بھی میں نے چھوڑ دیا اور یہاں چلی آئی، بس میری ایک ہی آرزو ہے کہ اُسکا ایک بار دیدار ہو جائے، اور میں اُس کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لوں، خدا سے امید ہے کہ وہ میری آرزو پوری کریگا۔"

سیو شنکرم کے خیالات میں تیزی سی اُٹھا پٹک ہو رہی تھی، اگرچہ میں خود کو ظاہر کر دوں تو وہ کتنا خوش ہوگی، یہ مال و دولت سب میرا ہو جائیگا۔ پھر ہائیکورٹ سے میرے خلاف فیصلہ ہو جائے، مجھے پروا نہ ہوگی۔" دوسرے لمحے خیال آتا، مگر دوسرے کی دولت پر قبضہ کرنے کا یہ کتنا ذلیل طریقہ ہے، وہ جس سیو شنکرم سے محبت کرتی تھی وہ اب کہاں، وہ نوجوان، بانکا سجیلا، اب وہ مجھ بڈھے کو دیکھے گی تو کتنا دکھ ہوگا اُسے اس کی محبت نفرت میں بدل جائے گی۔ نہیں نہیں میں خود کو ظاہر نہیں کروں گا۔

گھڑی نے تین کے گھنٹے بجائے۔ گھر کا ہر فرد خواب میں ڈوبا ہوا تھا، سیو شنکرم خاموشی سے سیڑھیاں اتر کر مکان سے باہر آ گیا۔ اب اُسے اپنا جسم کتنا ہلکا پھلکا لگ رہا تھا، دل پر جو ایک بوجھ تھا وہ ہٹ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو شناسائی اور بے فکر محسوس کر رہا تھا۔ مرنے کے بعد ہی آدمی خود کو غموں سے آزاد، بندھنوں میں جکڑا ہوا محسوس نہیں کرتا۔ زندہ جسم تو میں دھن کوڈی کے پلنگ پر چھوڑ آیا ہوں۔ شاید میری روح ابھی بھٹک رہی ہے، اف موت، ظالم، موت...

سڑک پر پٹاخے چھوٹ رہے تھے، اور فضا میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی، معاً اُسے اپنے بچوں کا خیال آ گیا۔ مرنے سے پہلے ایکبار انہیں کو دیکھنے کی خواہش ہونے لگی اور وہ بیقرار ہو اُٹھا... پھر اُس نے خود کو اپنے مکان کی سیڑھیوں پر کھڑا پایا، اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا، کوئی جواب نہیں ملا، اُس نے بچوں کا نام لیکر پکارنے کی کوشش کی..... مگر آواز اُس کی حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی..... موت..... ہاں، موت اسی کو کہتے ہیں۔

"سیو شنکرم مدلیار، سیو شنکرم مدلیار۔" کوئی اُسے پکار رہا تھا، مگر آواز بہت خفیف اور دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ کیا

شاعر بمبئی

بات ہوگئی کٹوایر یہاں کیسے آگیا (وکیل کا منشی کٹوایر ہی اُسے سیوشنکرم مدلیار کہتا تھا) مرنے کے بعد بھی یہ منشی میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا۔ جونک کہیں کا ــــ

"سیوشنکرم مدلیار، سیوشنکرم مدلیار"، بڑی واضح اور گونجیلی آواز تھی۔

"تم کہاں ہو بھائی سامنے آؤ نا" سیوشنکرم آہستہ سے بڑبڑایا، پھر دھیرے دھیرے اُس نے آنکھیں کھولدیں، سامنے کٹوایر بیٹھا ہو "تم نے بزدلوں کی طرح کتنا غلط اقدام کیا تھا مدلیار" کٹوایر کہہ رہا تھا، تھوڑی دیر میں سیوشنکرم کے حواس درست ہوگئے۔ وہ دریا کنارے لیٹا ہوا تھا۔

اندھیرا پھیل چکا تھا، اُس کے اردگرد چار آدمی کھڑے تھے، کٹوایر نے اُسے کافی پلائی تو اُس کے جسم میں کچھ جان آئی۔ کٹوایر کہہ رہا تھا۔

"فیصلہ سُننے کے بعد ہم کمرے میں آئے تو تم موجود نہیں تھے۔ میں نے جب وکیل کو بتایا کہ مذاق سے میں مقدمہ ہار جانے کی بات کہہ چکا ہوں تو وکیل بہت پچھتایا۔" ارے ظالم یہ کیا کیا تُو نے۔ ابھی غریب نے تو اپنا سب کچھ اس مقدمہ میں لگا دیا تھا، تراش ہو کر کہیں خودکشی نہ کرے، میں دوڑا دوڑا مندر کے کنارے آیا اور تمہیں تلاش کرنے لگ گیا۔ وکیل نے سچ کہا تھا اگر مجھے تمہیں بروقت نہ نکال لیتے تو تم کب کے مر گئے ہوتے، ہاں مقدمہ جیت لیا گیا ہے۔

اُس سال سیوشنکرم کے یہاں دیوالی کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ مقدمہ جیتنے کی وجہ سے ستراکیڑ زمین واپس مل گئی تھی۔ مگر سیوشنکرم زیادہ خوش نہیں تھا۔ اُس کے دل میں خلش سی ہو رہی تھی، وہ عالم بیہوشی میں دھن کوڈی سے ملاقات کو نہیں بھول سکا تھا، کیا واقعی دھن کوڈی زندہ ہوگی اور مجھے یاد کرتی ہوگی۔"

اُسی دن ڈاکیئے نے ایک پارسل دیا، پارسل کھولا گیا تو وہ حیران رہ گیا۔ پارسل کے ذریعہ اُس کی وہ تصویر بھیجوائی گئی تھی جو ۳۵ سال پہلے اُس نے دھن کوڈی کو دی تھی، پارسل کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔

"میری آرزو تھی کہ مرنے سے پہلے تمہیں ایک بار دیکھ لیتی، کل وہ آرزو پوری ہوگئی۔ کل شام بیٹھے بیٹھے آنکھ جو لگی تو تمہیں دیکھ لیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ میرے بچنے کا کوئی امید نہیں ہے۔ وقت چار دن کی مہمان ہوں، میں نے اپنی پوری دولت، رفاہِ عام کیلئے وقف کر دی ہے اور تمہیں اس وقف کا خازن مقرر کر چکی ہوں، خدا کے لئے انکار نہ کرنا۔ تمہارا ایک دیوالی پر دیا ہوا تحفہ واپس کر رہی ہوں، اسے سنبھال کر رکھنا، یہ میری یاد دلاتا رہیگا۔

فقط تمہاری۔ دھن کوڈی۔

خط پڑھ کر سیوشنکرم کو یقیناً حیرت ہوئی ہوگی۔ مگر اس سے بھی زیادہ حیرت ناک بات یہ تھی کہ یہ خط بھی اُسی کاتھا جس نے آج سے پچیس ۲۵ سال پہلے سیوشنکرم کے والد کو خط لکھا تھا جس کے بعد ہی سیوشنکرم اور دھن کوڈی کے مفقات ختم ہوگئے تھے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

ایک تاریخ ساز کتاب :۔

اِمکان

مرتبین :۔ سیکندر علی وجد، قاضی سلیم، جوگندر پال اور اثر فاروقی

ذہنِ جدید کے تخلیقی معیار کا پیمانہ

قارئین و ناقدین کیلئے نئے ذہن کا مکمل جائزہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) اورنگ آباد بہت جلد کتاب "اِمکان" شائع کر رہی ہے ایجنٹ حضرات، تاجران کتب اور قدردانوں کے تقاضا ہے مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

(اثر فاروقی) کنوینر۔ اشاعت کمیٹی

کنول پرشاد کنول

گوکھلے

نام جادو ہے، کرشمہ ہے، مسیحائی ہے
ہے بھری بزم، کبھی بزم میں تنہائی ہے
نام اندھیرے میں ہے جلتی ہوئی شمعوں کی قطار
نام ہے زہر کبھی اور کبھی رس کی پھوار
نام تاریخ ہے، تاریخ کی رسوائی بھی
یہ بھی غم ہے، کبھی غم کی پذیرائی بھی
نام قرآں سا مقدس، کبھی گیتا سا عظیم
کبھی جھلسا ہوا جھونکا ہے، کبھی موجِ نسیم
گوکھلے نام درخشاں ہے ستاروں کی طرح
بزمِ گیتی میں مہکتا ہے بہاروں کی طرح
تو اَمر اور ترا کام ابھی زندہ ہے
موت کے بعد ترا نام ابھی زندہ ہے

پیار کے لاکھ سمندر ہیں کہ لہرائے ہیں
ہم تری یاد منانے کے لئے آئے ہیں
سوچتا ہوں کہ تری یاد مناؤں کیسے؟
پھول قدموں میں عقیدت کے چڑھاؤں کیسے؟
تجھ کو لاؤں جو میں اِس بزم میں دکھ پائے گا
ہمیں دیکھے گا جو اِس حال میں شرمائے گا

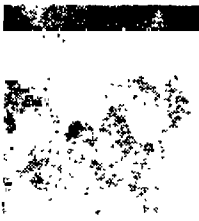

زندگی کا مرے بھارت میں عجب ڈھنگ ہے آج
تیرے گلزار کے پھولوں کا نیا رنگ ہے آج
سرفروشی کے لئے کون نئے افسانے
آگ کے ذکر سے ڈر جاتے ہیں اب پروانے
کیا ہوئے آج وہ پروردہ بیابانوں کے
اب وہ دیوانے ہیں اور خواب ہیں دیوانوں کے
ولولے سو گئے زنجیرِ ستم کٹتے ہی
ہر مسافر نے کمر کھول دی پو پھٹتے ہی
شمعِ دل خونِ تمنا سے جلائی شب بھر
اور پھر سو گئے سب لوگ بہ ہنگامِ سحر
عادۃً اب بھی قدم اُٹھتے ہیں، لیکن ایسے
کارواں نیند ہی میں گرمِ سفر ہو جیسے

ہر طرف راہِ ترقی پہ بڑھے اپنے قدم
دونوں ہاتھوں سے لٹاتے ہوئے سرمایۂ غم
عزم نے دولتِ دُنیا تو بہت پا لی ہے
پیار کی دولتِ بیدار سے دل خالی ہے
کاش یہ یاد تری ہم کو نیا دل دیدے
جو نگاہوں سے نہ اوجھل ہو وہ منزل دیدے
آگ وہ دے کہ جو پتھر کو بھی پگھلا ڈالے
پیار وہ دے کہ چھلکتے رہیں آنکھ کے پیالے

شاعر بمبئی
حنیف کیفی ہویلوی

سانیٹ ــــ تعارف و تبصرہ

سانیٹ انگریزی شاعری کی ایک مشہور صنف ہے۔ اور اگرچہ آج اس کا زمانہ نہیں رہا، لیکن ایک زمانہ میں یہ مقبول ترین صنفِ سخن رہی ہے سولھویں صدی عیسوی یعنی عہدِ الزبتھ میں جو انگریزی ڈرامہ کا عہدِ زریں ہے سانیٹ کا دور کہا جا سکتا ہے جس طرح اردو میں غزل کو اشاعِ "مرثیہ گو" مشہور ہے اسی طرح اس دور کے انگریز شعراء کے متعلق بڑا شاعر سانیٹیر SONETEER کہنا غلط نہ ہوگا۔ تقریباً ہر شاعر مبتدا سے سانیٹ نگار تھا۔

ایک طرف جہاں شیکسپیر جیسا عظیم الشان شاعر اس صنفِ سخن کا دلدادہ نظر آتا ہے اور اپنی شاعرانہ سے اس کو دائمی حسن عطا کرتا ہے وہیں اس کے غم میں ایسے مشہور دیوانے گریباں چاک ملتے ہیں جن کی نہ اس وقت کچھ وقعت تھی اور نہ آج ہی کوئی انکا نام لینے والا ہے مخصوص طرز ادا اور انداز کی چودہ مصرعوں والی اس نظم نے ایک دور کی تاریخ مرتب کی ہے لیکن آج تک اس کی صحیح تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کا علم نہیں ہو سکا ہے البتہ منظرِ عام پر یہ اٹلی میں تیرھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں آئی اور یہیں اسے قبولِ عام کی سند ملی۔ خود لفظ "سانیٹ" جو اطالوی لفظ SONETTO سے بنا ہے اس کی اٹلی سے نسبت ظاہر کرتا ہے SONETTO کے معنی ہیں "چھوٹی آواز" یا "دھن" اسی مناسبت سے سانیٹ جو غنائیہ شاعری (LYRICALPOETRY) کی ایک قسم ہے، اپنی ابتدائی منزل میں سازکی ہم آہنگی کے لئے ایک مختصر نغمہ کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا۔

اطالوی یا پیٹرارک کی سانیٹ

سانیٹ کو شہرتِ دوام بخشنے والا مشہور اطالوی شاعر پیٹرارک PETRAREK ۱۳۰۴ء ــ ۱۳۷۴ء ہے حالانکہ اس سے پہلے مشہور زمانہ اطالوی شاعر دانتے (DANTE) اس صنفِ سخن میں اپنے جوہر دکھا چکا تھا اور اس کی محبوبہ بیٹرس (BEATRICE) کے نام اس کے سانیٹوں کا سلسلہ موجود ہے۔ پیٹرارک نے اس صنفِ سخن کو اتنی خوبصورتی اور چابکدستی سے استعمال کیا کہ اطالوی سانیٹ اس کے نام سے منسوب ہو گیا اور آج تک پیٹرارکی سانیٹ (PETRARCHANSONNET) کے نام سے مشہور ہے۔ پیٹرارک نے سانیٹوں کا سلسلہ اس کی محبوبہ لورا (LAURA) کے نام سے معنون ہے۔ اس اطالوی یا پیٹرارکی سانیٹ کو کلاسیکل سانیٹ بھی کہا جاتا ہے موادو ہیئت دونوں اعتبار سے یہ ایک مخصوص تکنیک کا حامل ہوتا ہے۔ سانیٹ کے چودہ مصرعے دو بندوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ پہلا بند جس میں آٹھ مصرعے ہوتے ہیں (OCTAVE) (مثمن) کہلاتا ہے جو خود چار چار مصرعوں کے دو بندوں (QUATRAINS) میں تقسیم ہوتا ہے OCTAVE میں دو قافیے استعمال ہوتے ہیں فرض کیجئے ایک قافیہ "ا" اور دوسرا "ب" ہے تو قافیوں کی ترتیب اس طرح ہوگی ا ب ب ا ا ب ب ا یعنی پہلے مصرعے میں استعمال کئے جانے والا قافیہ چوتھے پانچویں اور آٹھویں مصرعے میں استعمال ہوگا اور دوسرے مصرعہ کا قافیہ تیسرے چھٹے اور ساتویں مصرعہ میں استعمال ہوگا۔ سانیٹ کا دوسرا بند جو چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے SESTET (سدس) کہلاتا ہے۔ یہ بھی تین تین مصرعوں کے دو بندوں TERCETS (مثلث) میں منقسم ہوتا ہے SESTET میں OCTAVE کے قافیوں کے علاوہ دو یا تین قافیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ترتیبِ قوافی (RHYMESCHEME) عموماً اس طرح ہوتی ہے ج د ج د ج د یا ج د ج ج د ج یعنی دو قافیے استعمال کرنے کی صورت میں نویں مصرعہ کا قافیہ گیارہویں مصرعہ میں اور دسویں مصرعہ کا قافیہ بارہویں اور چودہویں مصرعہ میں استعمال ہوتا ہے تین قافیے استعمال کرنے کی صورت میں نویں مصرعہ کا قافیہ بارہویں، دسویں مصرعہ کا قافیہ تیرہویں اور گیارہویں مصرعہ کا قافیہ چودہویں مصرعہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جذبات یا خیالات کو ایک مخصوص ترتیب یا تکنیک کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے یہ طرز

سانیٹ کسی ایک خیال، جذبہ یا احساس کی ترجمانی کرتا ہے۔ جو انتہائی شدت سے شاعر کے دل و دماغ پر چھایا ہوتا ہے، دھیرے دھیرے خیال سانیٹ کی امتیازی خصوصیت ہے جو اکثر نقطۂ عروج (CLIMAX) تک پہونچ جاتی ہے۔ خیال یا جذبہ کی اسی شدت کو شاعر OCTAVE میں پیش کرتا ہے۔ اس میں وہ کسی ذہنی الجھن کو پیش کرتا ہے۔ کسی بات کی تمہید اٹھاتا ہے، کوئی سوال کرتا ہے، یا کوئی مسئلہ زیر بحث لاتا ہے۔ OCTAVE کے اختتام پر یعنی آٹھویں مصرعے کے بعد ایک وقفہ (PHASE) ہوتا ہے جسے CAESURA کہتے ہیں۔ یہ وقفہ، جو اس بات کی علامت ہے کہ شاعر اپنے ذہن میں پیدا شدہ سوالات پر غور کر رہا ہے، اکثر PUNCTUATION (علامات وقف) سے ظاہر کیا جاتا ہے یا OCTAVE کے بعد کچھ جگہ چھوڑ کر اس کی طرف توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ اس وقفہ کے بعد خیال ایک نیا موڑ لیتا ہے۔ خیال کے اس موڑ کو VOLTA کہتے ہیں۔ VOLTA انگریزی کا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ OCTAVE میں پیش کردہ خیال ختم نہیں ہوا بلکہ اس کو ایک نیا انداز دے دیا گیا ہے۔ یا کسی مناسب طریقہ سے اسی خیال کی تردید کر دی جاتی ہے۔ اس کے باوجود کوئی دوسرا خیال نہیں پیش کیا جاتا۔ اس طرح SESTET میں شاعر اپنی ذہنی الجھن کو سلجھاتا ہے، بات کی تکمیل کرتا ہے، سوال کا جواب دیتا ہے، اور مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے۔ انگریزی میں ملٹن اور ورڈسورتھ نے اس طرز کے سانیٹ بہت کامیابی سے لکھے ہیں، اور میں شیکسپیر کی سانیٹ کی مثال کیلئے ملاحظہ ہو حنیف کیفی کا سانیٹ "معراج" مطبوعہ "شاعر" بابت جون ۱۹۶۶ء[1]

انگریزی یا شیکسپیری سانیٹ:-

اٹلی میں پندرھویں اور سولھویں صدی میں سانیٹ بابر عروج کی منزلیں طے کرتا رہا۔ سولہویں صدی تک اس کے قدم اسپین اور فرانس کی سرزمین پر جم چکے تھے۔ انگلستان میں سانیٹ کی رسائی سولھویں صدی کے نصف اول میں وائیٹ SIR THOMAS WYATT اور سرے HENRY HOWARD, EARL OF SORREY کے توسط سے ہوئی۔ وائیٹ نے پیٹرارکی طرز کو اپنایا، مگر اسمیں یہ معمولی سی تبدیلی کی کہ آخری دو مصرعوں کو ہم قافیہ کر دیا۔ سرے نے سانیٹ کی ایک بالکل نئی شکل وضع کی۔ اسنے سانیٹ میں تین QUATRAINS (مربع) استعمال کئے۔ ہر مربع میں علیحدہ علیحدہ قافیے اس طرح نظم کئے کہ پہلے مصرعہ کا قافیہ تیسرا مصرعہ میں اور دوسرے کا چوتھے میں آئے۔ آخری دو مصرعے (یعنی تیرہواں اور چودھواں مصرعہ) ہم قافیہ رکھے۔ اس طرح سرے کے ایجاد کردہ سانیٹ کی ترتیب قوافی یہ ہوئی a b a b c d c d e f e f g g۔ شیکسپیر نے سانیٹ کی اس شکل کو اپنی حسن کاری اور جمال آفرینی سے نقش دوام کی حیثیت دی۔ اور جس طرح اطالوی سانیٹ پیٹرارک کے نام سے منسوب ہے اسی طرح انگریزی سانیٹ اپنے موجد سرے کے بجائے شیکسپیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے چونکہ شیکسپیر کا سانیٹ SHAKESPEARIAN SONNET چار حصوں (تین مربع اور آخری دو ہم قافیہ مصرعے) میں تقسیم ہوتا ہے، اس لئے پیٹرارکی سانیٹ کی طرح اس میں آٹھویں مصرعہ کے اختتام پر وقفہ CAESURA اور گریز (VOLTA) نہیں ہوتا بلکہ خیال یا جذبہ شروع سے آخر تک ایک ہی انداز میں کارفرما رہتا ہے۔ آخری دو مصرعوں میں یہ خیال اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ شیکسپیر سے پہلے سڈنی (SIR PHILIP SIDNEY) نے اسی تکنیک کے مطابق سانیٹ لکھے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ سڈنی کی بدولت ہی سانیٹ نے جو وائیٹ اور سرے کے بعد ایک مدت تک تعمیر گمنامی میں پڑا رہا، ایک نئی زندگی پائی۔ اس کے اکیاسی سانیٹس کے مجموعہ ASTROPHEL AND STELLA کی اشاعت کے بعد سانیٹ کے سلسلوں SONNET SQUENCES کا ایک سیلاب سا آگیا۔ اچھے برے سیکڑوں سانیٹ لکھے گئے۔ اس صنف کی بے پناہ مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف ۱۵۹۴ء سے ۱۵۹۶ء تک کی مدت میں سانیٹ سلسلوں کے کم و بیش ایک درجن مجموعے منظر عام پر آئے۔ آج تک کسی اور صنف سخن کی اتنی کثرت سے سانیٹ نہیں لکھے گئے۔ سانیٹ نگاروں کی اس بھیڑ میں اسپنسر (SPENSER) اور شیکسپیر نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ اسپنسر نے اٹھائیس اور شیکسپیر نے اکیاون سانیٹ لکھے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، شیکسپیر سرے کی قلم میں بغیر کسی تبدیلی کے سانیٹ لکھے مگر اس سے پہلے اسپنسر نے اس میں ایک اور جدت کی۔ وہ یہ کہ سانیٹ کے ہر مربع کے آخری مصرعہ کا قافیہ اس کے بعد والے مربع کے پہلے مصرعے میں استعمال ہوتا ہے۔ البتہ آخری دو مصرعے شیکسپیر کے سانیٹ ہی کی طرح ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اسپنسر کے سانیٹ کی ترتیب قوافی حسب ذیل ہے

a b a b, b c b c, c d c d, e e

اسپنسر کی ایجاد کردہ یہ طرز مقبول نہ ہو سکی۔

---

[1] میری کمزوری کو خود ستائی نہ سمجھا جائے۔ میری نظر سے کہیں اور ایسا سانیٹ نہیں گزرا جس میں اس طرز کی پوری پابندی کی گئی ہو (حنیف کیفی)

سانیٹ کا میٹر:- یہاں اس بات کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ سانیٹ کا اسپنسر اور شیکسپیئر دونوں طرح کی سانیٹ کا ایک مخصوص میٹر ہوتا ہے (IAMBIC PENTAM ETER) ہر مصرعہ میں پانچ FEET (ارکان) یا فوٹ (SYLLABLE) (اجزا) ہوتے ہیں ہر FOOT (رکن) کا پہلا SYLLABLE (جزو) UNSTRESSED (جس پر لہجہ پسند نہ دیا جائے) اور دوسرا STRESSED (جزو) دے کر ادا کیا جائے، ہوتا ہے۔

سانیٹ کے موضوعات:- موضوعات کے اعتبار سے سانیٹ اور غزل کے ارتقا میں بڑی مطابقت پائی جاتی ہے سولھویں صدی تک سانیٹ حسن و عشق کے موضوع کے لئے مخصوص رہا۔ یہ کسی حقیقی یا خیالی محبوب (محبوبہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا) کی چاہ میں لکھا جاتا تھا، محبت اور اس کا اظہار دونوں ہی روایتی ہوتے تھے۔ سانیٹ نگار کی محبوبہ غزل گو کے محبوب کی طرح بے رحم، بے حس مغرور، جفاکار اور تغافل شعار ہوتی ہے اور اس کا عاشق اس کا وفادار اور پرستار ہوتا ہے۔ وہ اس کے عشق میں دیوانہ ہوتا ہے۔ اس کے غم میں آہیں بھرتا نظر آتا ہے اس کی فرقت میں روز مرہ کے معاملات سے بیگانہ ہے اس کے ستم پر غم و غصہ کا اظہار بھی کرتا ہے اس کی جفاؤں کے شکوے بھی کرتا ہے اور اس کے رحم و التفات اور قرب کی بھیک بھی مانگتا ہے اگر محبوبہ کو شاعر یا عاشق کی محبت کا یقین ہو جاتا ہے تو اسے اس کا قرب بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ پٹرارک کی تقلید میں سولھویں صدی کے تمام سانیٹ نگاروں نے سانیٹ کو انہیں جذبات کے اظہار کے لئے استعمال کیا۔ سب سے پہلے ملٹن نے اس روایت کو توڑا۔ اور اس کے ذریعہ ذاتی حالات اور اپنی معاملات کا ذکر کر کے اس کے دامن کو وسیع کیا۔ ملٹن کے بعد شاعر فطرت ورڈسورتھ نے سانیٹ کو نہ صرف منظر نگاری کے لئے استعمال کیا بلکہ اس میں مذہب، سیاست، سماج اور بہت سی دوسری باتوں کے لئے گنجائش پیدا کی۔ اس نے سانیٹ کو ہر قسم کے مضامین کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ڈی جی روزیٹی نے اس کے ذریعہ اپنے تصوف اور حسن کاری کے ذوق کی تسکین کی اور اس طرح جدید غزل کے مطابق اب سانیٹ محض روایتی محبت کے اظہار کا ذریعہ نہیں رہا۔ اس تنگنائے میں دونوں جہان کی وسعتیں سمائی ہوئی ہیں۔

اردو سانیٹ:- اردو میں سانیٹ کا غیر مانوس ہونے کے برابر ہے اور یہ کسی قدر حیرت کی بات ہے، انگریزی ادب نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے اور ہم نے اس کے بدلتے ہوئے اثرات کو بہت تیزی سے قبول کیا ہے مگر سانیٹ کے استقبال میں ہم نے کسی خاص گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا جبکہ یہ موضوعات، لب و لہجہ اور "قوت قافیہ پیمائی" — کتنے ہی اعتبار سے اردو شاعری کی مقبول ترین صنف غزل سے بہت قریب ہے بلکہ میرے خیال میں فنی اعتبار سے انگریزی شاعری کی کوئی صنف غزل سے اتنی قریب نہیں جتنی سانیٹ — غزل اور سانیٹ میں ہوا اور ہیئت کے اعتبار سے مثالیں فرق یہ ہے کہ سانیٹ میں ایک خیال چند قافیوں کی ایک خاص ترتیب سے نظم کئے گئے مصرعوں میں ادا ہوتا ہے اور اس طرح اسمیں تسلسل لازمی شے ہے جبکہ غزل میں مختلف خیالات ایک ہی قافیہ میں کہے گئے مختلف شعروں میں نظم کئے جاتے ہیں اور اس طرح اس کا ہر شعر فرد ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا دیگر خصوصیات دونوں میں قریب قریب مشترک ہیں۔ غزل گو کا مزاج سانیٹ نگار کے مزاج سے میل کھاتا ہے پھر بھی غزل گو شعراء کا (انہیں وہ شعراء بھی شامل ہیں جو انگریزی ادب سے بخوبی واقف ہیں) سانیٹ پر طبع آزمائی کی کوشش نہ کرنا حیرت کی بات نہیں تو اور کیا ہے! ممکن ہے اس کی وجہ سانیٹ کی تکنیکی دشواریاں ہوں، یا اسے یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہو کہ یہ آج کے زمانے کی چیز نہ رہی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو حقیقت ہے کہ اردو میں سانیٹ بہت کم لکھے گئے ہیں اور جو کچھ لکھے بھی گئے ان میں ایسی نظر سے ایسے سانیٹ نہیں گذرے جن میں سانیٹ کی دونوں مستند قسموں (پٹرارک اور شیکسپیئر) کی پوری طرح پابندی کی گئی ہو — نہ اظہار خیال اور انداز پیشکش میں اور نہ ترتیب قوافی میں — مثال کے طور پر اختر شیرانی کے سانیٹ لے لیجئے۔ ان کے یہاں دو طرح کے سانیٹ ملتے ہیں، ایک تو وہ جنہیں پٹرارک کی سانیٹ کے مطابق دو بند موجود ہیں، ان میں OCTAVE میں تو ترتیب قوافی پٹرارک کی سانیٹ کے مطابق ہے مگر SESTET میں پٹرارک کی سانیٹ کی ترتیب قائم نہیں رکھی گئی۔ CAESURA (وقفہ) اور VOLTA (گریز) بھی موجود نہیں اور خیال شروع سے آخر تک ایک ہی انداز میں پیش ہوتا ہے، آخری دو مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں، دوسری طرح کے سانیٹ شیکسپیئر کی سانیٹ کی طرح تین مربع اور آخری دو ہم قافیہ مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ یہاں بھی ترتیب قوافی شیکسپیئر کی سانیٹ کی ترتیب کے خلاف ہے، یعنی جبکہ شیکسپیئر کی سانیٹ کے ہر بند میں پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے اور دوسرا اور چوتھا، اختر کے یہاں پٹرارک کی سانیٹ کے

---

(۱) اردو میں STRESS کا وجود نہیں اس لئے میری سمجھ میں ان الفاظ کا کوئی اپنا ترجمہ نہیں آتا جسے میں صحیح قرار دے سکوں۔ ان دو لفظوں کا ترجمہ ترتیب غیر ملفوظ اور ملفوظی ہو سکتا ہے جو کسی قدر [illegible] قریب ہے مگر پوری طرح مفہوم کو واضح نہیں کرتا۔ (مرتب کنفی)

QUATRAIN کے مطابق پہلا اور چوتھا مصرعہ اور دوسرا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اُردو میں عام طور پر سانیٹ اختر شیرانی کے دوسرے قسم کے سانیٹ کی طرز پر لکھے گئے ہیں۔ اسیطرح سانیٹ کیلئے کوئی بحر مخصوص کرنے کی طرف دھیان نہیں دیا گیا۔ خیر کسی ایک شاعر کے لئے دوسرے تمام شاعروں کو اپنی مقرر کردہ بحر کا پابند کر دینا تو دشوار ہی نہیں بلکہ قریب قریب ناممکن تھا۔ مگر اتنا تو آسانی کیا جا سکتا تھا کہ ہر شاعر اپنے تمام سانیٹوں کے لئے صرف ایک بحر مقرر کر لیتا۔ اس طرح حفظ اہل کے کافی قریب آجاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام فروگذاشتیں صرف اس وجہ سے ہوئی ہیں کہ سانیٹ لکھنے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی گئی۔ اور اُردو میں سانیٹ لکھنے والوں نے اپنے سامنے انگریزی سانیٹ کے نمونہ نہ رکھنے کے بجائے اپنی ہی زبان کے نمونوں کو اپنایا ہے۔ اس طرح وہ اُردو شاعری کے ایوان میں ایک نئی شکل پیش کرنے میں تو بلاشبہ کامیاب ہو گئے، مگر اُسے جو لباس پہنا کر پیش کیا گیا وہ اُسکے اصل لباس سے کسی قدر مختلف تھا اور شاید اس لئے وہ اس پر جچا نہیں۔ کھلتا اتنا کھلنا چاہیئے۔ میرا خیال ہے (اور اس جہاں کو تجربے نے تو بہت کچھ دی ہے) کہ اُردو میں اتنی وسعت اور گنجائش ہے کہ انگریزی سانیٹ اپنی اصل تکنیک کے مطابق کامیابی سے لکھے جا سکتے ہیں۔ ضرورت ارادہ اور کوشش کی ہے۔ سانیٹ نگاری ایک مشکل فن سہی مگر اتنا مشکل بھی نہیں کہ اس پر قابو نہ پایا جا سکے۔ اگر سانیٹ کی تمام خصوصیات کو ذہن میں رکھ کر اُسے لکھنے اور مقبول بنانے کی صحیح معنی میں کوشش کی گئی تو یہ اُردو شاعری میں ایک گرانقدر اضافہ ہوگا۔

مدتِ خریداری ختم ہونے کی اطلاع

اس سیاہ حلقے میں سُرخ خطوں کے معنی ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری اکتوبر کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو گیا ہے آپکی خدمت میں نومبر ۶۶ء کا شاعر بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا یا آپ سالانہ چندہ کا رقم مبلغ آٹھ روپے بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیجئے اگر تجدید خریداری منظور نہ ہو تو واپسی ایک خط سے دفتر کو اطلاع دیجئے تاکہ وی پی نہ بھیجا جائے۔ (منیجر)

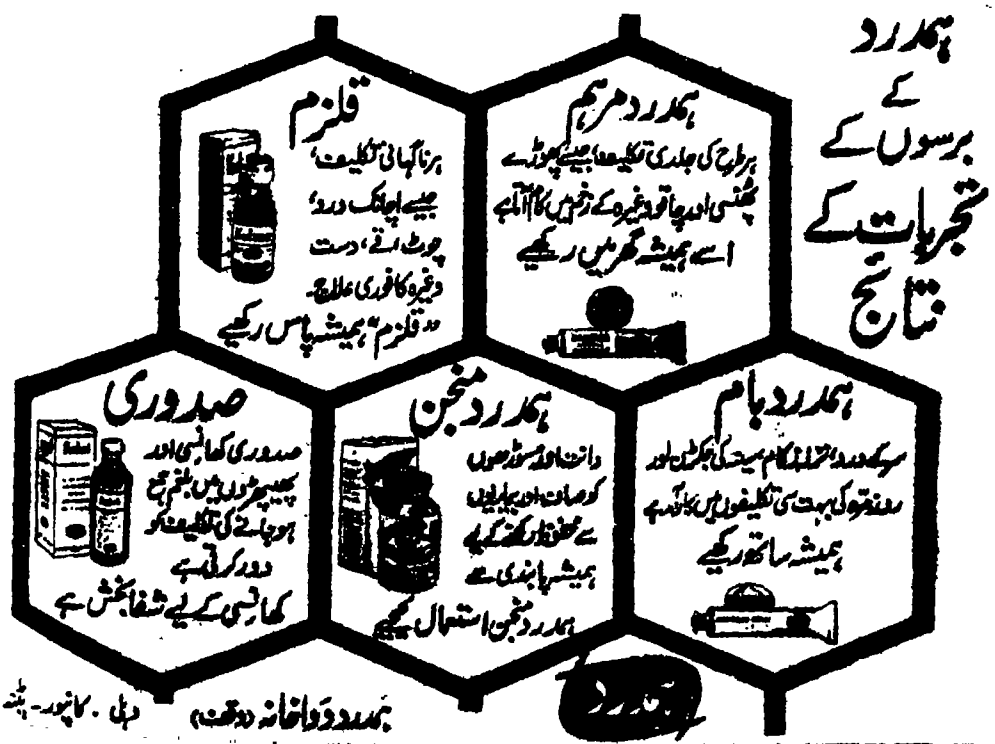

نامی انصاری

غزل

نشاط و رنگ بھی ہے جلوۂ بہار بھی ہے
مگر دلوں کو میسّر کہیں قرار بھی ہے

صبا کی مست خرامی پہ حرف گیر کھئے
خمارِ خواب بھی ہے نشۂ بہار بھی ہے

تم اپنے دامنِ رنگیں سے باخبر رہنا
گلوں کے رنگ میں شعلے بھی ہیں شرار بھی ہے

خمارِ بادۂ شب نے سُلا دیا ورنہ
نسیمِ صبح میں کیفِ جمالِ یار بھی ہے

یہ دُنجوم بھی واماندۂ محبت ہیں
کہ شبنمی نگہ و دل اُفق کے پار بھی ہے

کسے ہے فرصتِ چارہ گری زمانے میں
وگرنہ دردِ محبت تو آشکار بھی ہے

غلط نہیں جو زمانہ فدائے اُردو ہے
کہ یہ زباں ہی نہیں نغمۂ بہار بھی ہے

نصیر پرواز

غزل

یوں تو دُنیا کو بھی خاطر میں نہیں لاتے ہیں ہم
جو مگر اپنا بنائے اُس کے بن جاتے ہیں ہم

ہر نفس اشکوں سے تنویرِ نمو پاتے ہیں ہم
نُور کی مانند ہر جانب بکھر جاتے ہیں ہم

کون سا سنگِ ملامت ہم پہ آکر گر چکا ہے
اپنی اِس دیوانگی پر ناز فرماتے ہیں ہم

خود فریبی جُرم ہے لیکن عقیدوں کے طفیل
اک ادائے خود فریبی دل کو سکھلاتے ہیں ہم

کوئی بھی ہو زندگی کا درد ہے جس کو عزیز
اُس کے دامانِ وفا پر اشک برساتے ہیں ہم

راستے بھر پھول مہکاتا ہے زخموں کا لہو
گرمیِ رفتار سے ہر چند مُرجھاتے ہیں ہم

مرکزِ انوارِ چشم و دل سمجھتے تھے جسے
آج اُس کی گود میں شمعیں جلا آتے ہیں ہم

کوئی سُنتا ہی نہیں پرواز رُودادِ خیال
شام سے اک قصۂ پارینہ دُہراتے ہیں ہم

ابراہیم یوسف

(دوسرا حصہ)

افشاں یا نورافشاں

افراد تمثیل

خالد ..... ایک نوجوان
وحید ..... کاذم
ناظم ..... ایک بوڑھا
نورافشاں ..... ایک نوجوان خاتون

منظر

ایک ریسٹ ہاؤس نما مکان کا کمرہ۔ کمرہ میں معمولی فرنیچر ہے، دو چارپائیاں اور ایک چارپائی جس پر صاف ستھرا بستر بچھا ہے کمرہ معمولی طریقہ سے سجایا گیا ہے، غیر معمولی سردی کی وجہ سے آتشدان میں آگ روشن ہے اور کھڑکیوں اور دروازوں پر پردے پڑے ہیں۔ خالد آتشدان کے پاس کھڑا ہے اور وحید کچھ لکڑیاں آتشدان میں ڈال رہا ہے۔

وحید۔ (آتشدان میں لکڑیاں ڈالتے ہوئے) ایسی سردی برسوں ہی میں پڑتی ہے۔ باہر بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) بادل بھی گھرے ہوئے ہیں۔

خالد۔ بادل گھرے ہوتے ہیں؟

وحید۔ جی ہاں بارش کے آثار ہیں۔

خالد۔ (ایک کھڑکی کے پاس جا کر اسے کھولتا ہے تیز ہوا کا جھونکا اندر داخل ہوتا ہے۔ خالد پھر کھڑکی بند کر دیتا ہے) اندھیرا بھی کافی ہو گیا ہے۔

وحید۔ میں لیمپ روشن کئے دیتا ہوں۔ کھڑکیاں نہ کھولئے۔ آپ سیدانوں میں رہنے والے ان طوفانی ہواؤں کے عادی نہیں ہوتے۔

(وحید لیمپ روشن کرتا ہے اور کمرہ میں روشنی پھیل جاتی ہے۔ خالد آتشدان کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ کر آگ سے ہاتھ سینکنے لگتا ہے وحید چارپائی پر بستر برابر کرتے ہوئے)

خالد۔ دیکھو! کیا نام ہے تمہارا؟

وحید۔ مجھے وحید کہتے ہیں۔

خالد۔ کیا تم اس وقت کافی کا انتظام کر سکتے ہو؟

وحید۔ جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ ابھی انتظام ہو جائیگا۔

خالد۔ یہاں سے قریب ترین گاؤں کتنی دور ہے۔

وحید۔ یہی کوئی دو تین میل۔ مگر راستہ خراب ہے، وہاں تک پہنچنے میں آپ کو تکلیف ہوگی۔ کیا آپ کو کوئی تکلیف ہے؟

خالد۔ نہیں، نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

وحید۔ شکار کے لئے جو لوگ آتے ہیں وہ اسی جگہ قیام کرنا پسند کرتے ہیں۔ سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنا پسند نہیں کرتے۔ آج اتفاق ہی سے موسم خراب ہو گیا ہے۔

خالد۔ کوئی حرج نہیں۔ تم فکر نہ کرو، کافی کا انتظام کرو۔

وحید۔ بہت اچھا ابھی انتظام ہوا جاتا ہے۔ کیا آپ شکار کے لئے آئے ہیں۔ اگر بڑے شکار کا شوق ہے تو دو چار دن انتظار کرنا پڑیگا ویسے پرندے بڑی آسانی سے مل جائیں گے۔

خالد۔ میں تو ویسے ہی سیر و تفریح کے لئے چلا آیا ہوں۔ میرے آنے سے پہلے یہاں اور تو کوئی نہیں آیا تھا۔

وحید۔ دو تین دن سے تو یہاں کوئی نہیں آیا۔ آپ کو کسی کا انتظار ہے؟

خالد۔ ہاں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) گلاب تک اسے آجانا چاہیئے تھا۔

وحید۔ ممکن ہے موسم کی خرابی کی وجہ سے رک گئے ہوں۔

خالد:۔ یہ ناممکن ہے۔ اُسے ضرور آنا ہے۔

وحید:۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے گورنمنٹ ریسٹ ہاؤس میں نہ ٹھہر گئے ہوں۔

خالد:۔ مگر وہ تو یہاں ملنے کا تھا (گھڑی دیکھ کر) سات بج گئے۔ (وحید سے) اچھا تم کافی بنالاؤ۔

وحید:۔ بہت اچھا۔ (جاتے ہوئے) دیکھیے میں پاس والے کمرہ میں سوتا ہوں۔ آپ کسی وقت بھی مجھے بلا سکتے ہیں۔

(وحید کمرہ سے نکل جاتا ہے، خالد سگریٹ جلا کر اُس کے چھلّے بنانے لگتا ہے۔ پھر جیب سے تاش نکالکر انہیں سامنے رکھی ہوئی میز پر پھیلانے لگتا ہے کچھ دیر بعد برآمدہ میں کسی کے چلنے کی آہٹ خالد کان لگا کر سُنتا ہے، اور اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر دروازہ پر آہستہ آہستہ دستک۔ خالد دروازہ کے پاس جا کر اُسے کھولتے ہوئے)

خالد:۔ بہت راہ دکھلائی ــــ (دروازہ کھلتا ہے۔ خالد کے سامنے ایک بوڑھا کھڑا ہے۔ اُس نے سیاہ اوور کوٹ پہن رکھا ہے۔ فلیٹ کیپ ہے۔ لباس اور چہرے سے بھلا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ خالد چند سیکنڈ اُسے خاموشی سے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ سے) "اندر آجائیے باہر سردی بہت زیادہ ہے۔

(بوڑھا آہستہ آہستہ آتا ہے۔ خالد دروازہ بند کر دیتا ہے بوڑھا آتشدان کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے ہاتھ سینکتا ہے۔ خالد بھی اُس کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتے ہیں۔ پھر بوڑھا نظریں اٹھا کر خالد کو غور سے دیکھ کر)

بوڑھا:۔ آپ کسی کا انتظار کر رہے تھے (غمگین سی مسکراہٹ سے) یہاں اکثر لوگ کسی کا انتظار کرنے آتے ہیں۔ اوہ معاف کیجئے گا ــــ آپ تشریف رکھیے۔ میرا نام ناظم ہے۔ ناظم علی۔ میں آپ کی تنہائی میں مخل تو نہیں ہوا۔

خالد:۔ جی نہیں۔ ہرگز نہیں ــــ مجھے خالد کہتے ہیں (کرسی کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھیئے، موسم بہت خراب ہے۔

ناظم:۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) کوئی زیادہ خراب موسم نہیں ہے۔

خالد:۔ (حیرت سے اُس کا چہرہ دیکھ کر) مگر تو کر تو کہہ رہا تھا ایسا موسم کئی سال بعد آیا ہے۔

ناظم:۔ میں نے اس سے ہزار گنا خراب موسم دیکھے ہیں۔ اور نوکر تو یوں بھی مسافروں سے کچھ اینٹھ لینے کے لئے موسم کو خراب کہہ دیتے ہیں شاید اس علاقے میں آپ پہلی بار آئے ہیں۔

خالد:۔ جی نہیں۔ میں اکثر ادھر آیا جایا کرتا ہوں مگر ایسا موسم پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

ناظم:۔ تو پھر یوں سمجھ لیجئے کہ میں اس موسم کا عادی ہو چکا ہوں۔ کم از کم اب سال میں ایکبار ضرور آتا ہوں۔ آج ۲۱ جولائی ہے نا؟

خالد:۔ جی ہاں آج ۲۱ جولائی ہے۔

ناظم:۔ پہلے میں ہر روز آیا کرتا تھا پھر ہفتہ میں ایک بار آنے لگا پھر مہینے میں ایکبار اور اب سال میں ایکبار ۲۱ جولائی کو۔

خالد:۔ (مسکرا کر) اس سلسلہ میں آپ کافی ذمہ دار ہیں۔

ناظم:۔ جی نہیں ذمہ داری تو کچھ نہیں۔ بس یوں ہی سمجھ لیجئے (میز پر تاش دیکھ کر) آپ کو انڈور گیمس سے کافی دلچسپی ہے۔

خالد:۔ جی نہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اس وقت محض وقت گذاری کے لئے لے بیٹھا تھا۔

ناظم:۔ مجھے انڈور گیمس سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہمیشہ آؤٹ ڈور گیمس کھیلتا رہا۔

خالد:۔ اچھا۔ (دلچسپی لیتے ہوئے) آپ کونسا گیم کھیلتے تھے۔

ناظم:۔ ویسے تو میں ہر کھیل میں دلچسپی لیتا تھا مگر میرا پسندیدہ کھیل فٹ بال تھا۔ صحت مند نوجوانوں کا کھیل۔ کالج چھوڑنے کے بعد بھی کھیلتا رہا۔ اور اب (مسکرا کر) آپ کہیں گے میں بھی کس قدر باتونی آدمی ہوں۔

خالد:۔ جی نہیں آپ کافی دلچسپ انسان ہیں۔

ناظم:۔ دلچسپ! اچھا میری عمر آپکے نزدیک کیا ہوگی۔

خالد:۔ یہی کوئی ــــ

ناظم:۔ میں آج پورے ۶۵ سال کا ہو گیا ہوں۔ پورے ۶۵ سال کا ۲۱ جولائی۔

خالد:۔ (حیرت سے) ۶۵ سال۔ لیکن آپ کی صحت ــــ

ناظم:۔ جی ہاں میری صحت کافی اچھی ہے۔ میں اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھ سکتا ہوں۔ دوڑ بھی سکتا ہوں اور کبھی کبھی تو اتنی مجھے حسین تتلیوں کے پیچھے دُور دُور تک دوڑنا پڑتا ہے۔

خالد:۔ (مسکرا کر) تتلیاں؟

ناظم:۔ ہاں۔ آج کل میرا شغل صبح سے شام تک تتلیاں پکڑنا ہے۔

آج بکاؤ میں نے سات آٹھ تتلیاں پکڑی ہیں، بہت خوبصورت بھی ہیں۔

(وحید کافی لیکر آتا ہے اور ناظم کو دیکھ کر حیرت سے)

وحید:۔ تم یہاں آپ ۔۔۔؟

ناظم:۔ آج ۲۱ر جولائی ہے، شاید تم بھول گئے کہ میں اس تاریخ کو یہاں ضرور آتا ہوں۔ آج میری عمر ۶۵ سال کی ہو گئی ہے اور میں چالیس سال سے برابر آرہا ہوں اسی تاریخ کو۔ (مسکراکر) یوں سمجھ لو کہ اپنی سالگرہ منانے۔ (وحید میز پر کشتی رکھتا ہے) شاید تم سمجھ رہے ہو گے کہ میں مر گیا۔

وحید:۔ جی نہیں۔ میں ایسا کیوں سوچنے لگا۔

ناظم:۔ (مسکراکر) میرے اکثر دوست ایسا ہی سوچنے لگتے ہیں اور تب اچانک دو چار سال بعد میں اُن کے سامنے پہنچتا ہوں تو اُن کو بڑی حیرت ہوتی ہے۔

وحید:۔ (دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) میں آپکے لئے پیالی لاتا ہوں۔

(تیزی سے کمرے سے نکل جاتا ہے)

ناظم:۔ بیچارا بڑا پرانا دوست ہے۔ بہادر بھی ہے۔ خالد اب اُسے ایسی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے ناظم کی شخصیت بڑی پُراسرار ہو۔ (ناظم اُس پر دھیان نہ دیکھ ہم دونوں اکثر خطرناک جنگلوں میں خطرناک درندوں کا شکار کھیلتے رہے ہیں (خالد اب بھی خاموش رہتا ہے اور ویسی ہی نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ ناظم خالد کو غور سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے) آپ ایسی نظروں سے مجھے کیوں گھور رہے ہیں۔

خالد:۔ جی کوئی بات نہیں۔

ناظم:۔ (قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے) شاید آپ مجھے ان پہاڑوں کا کوئی بھوت سمجھ رہے ہیں۔ نہیں بھائی میں انسان ہوں کوئی بھوت پریت نہیں ہوں اس دنیا میں پورے ۶۵ سال انسانوں کی طرح رہتا آرہا ہوں۔ یہ بات ضرور ہے کہ میں ابھی کنوارا ہوں۔

خالد:۔ آپ اور کنوارے!

ناظم:۔ جی ہاں بالکل کنوارا۔ فی الحال شادی کا سوال میں نے ملتوی کر رکھا ہے (مسکراکر) میرے دوست مجھے اولڈ بیچلر کہتے ہیں۔ مجھے صرف اولڈ کے لفظ پر اعتراض ہے۔ بیچلر لفظ سُنا کر مجھے خوشی ہوتی ہے (مسکراکر) اب تو آپ مجھے بھوت پریت نہیں سمجھ رہے ہیں

خالد:۔ جی نہیں۔ میں نے پہلے بھی ۔۔۔

شاہ بھی

ناظم:۔ (بات کاٹ کر) پہلے تو آپنے ضرور مجھے ایسی ہی کوئی مخلوق سمجھ لیا تھا۔ (خالد ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتا ہے) (ناظم اُسے غور سے دیکھ کر) آپ کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ کم بخت منحوس جگہ کچھ ایسی ہی ہے کہ جو بھی یہاں آتا ہے اُسے کسی نہ کسی کا انتظار رہتا ہے۔ اور کبھی کبھی کو تو چالیس چالیس سال انتظار کرنا پڑتا ہے (وحید کافی کی پیالی لاکر میز پر رکھ دیتا ہے۔ ناظم اُسے غور سے دیکھ کر) تمہاری پیالی کہاں ہے؟

وحید:۔ تمہاری؟

ناظم:۔ ہاں تمہاری۔ تمہارے لئے۔ کیا تم آج میرے ساتھ کافی نہیں پیو گے؟

وحید:۔ مگر میں تو ۔۔۔

ناظم:۔ تم جھوٹ بول رہے ہو، تم نے ابھی کافی نہیں پی ہے (خالد کی طرف دیکھ کر) آپ کو کوئی اعتراض ہے۔

خالد:۔ جی نہیں۔ مجھے کیا اعتراض ہوگا۔

ناظم:۔ یہ چالیس سال سے میرے ساتھ بیٹھ کر چائے اور کافی پی رہا ہے، جلدی اور ایک پیالی اور لیکر آؤ۔ (وحید کمرہ سے چلا جاتا ہے) ہم نے عجیب عجیب کامپلیکس پیدا کر لئے ہیں۔ یہ چھوٹا ہے یہ بڑا ہے، یہ امیر ہے، وہ غریب (خالد سگریٹ کیس اس کی طرف بڑھاتا ہے) (شکریہ۔ میں پائپ پیتا ہوں (جیب میں سے پائپ نکال کر اسمیں تمباکو بھرتا ہے۔ اُسے جلا کر دو چار کش لیتا ہے) ٹھنڈی راتوں میں آتشدان کے پاس بیٹھ کر اس طرح پائپ پینا مجھے بہت پسند ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر یہ مواقع زندگی میں بہت کم آتے ہیں، یوں سمجھ لیجئے کہ سال میں ایک بار ۲۱ر جولائی کو (خالد کی طرف دیکھ کر) ہاں تو آپ نے بتلایا نہیں آپ کس کا انتظار کر رہے ہیں۔

خالد:۔ جی میں اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔

ناظم:۔ (قہقہہ مار کر) اور وہ یعنی کوئی خاتون دوست ہی ہو گی، نوجوان اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ پائپ جلانے کے لئے جو دیا سلائی جلاتا ہے جس کی روشنی میں اُس کے چہرے کی جھریاں اور گہری نظر آتی ہیں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) کوئی خاتون دوست وقت پر نہیں آتی۔

(دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ ناظم کے چہرے پر سنجیدگی کچھ

(یہ ہو بلقے وحید تیسری پیالی میز پر رکھتے ہوئے)

وحید:۔ آج انتہائی خراب موسم ہے۔ سردی غیر معمولی ہے اور ہوا تو اس قدر تند و تیز ہے کہ ۔

ناظم:۔ (بات کاٹ کر) سب فضول بکواس ہے، موسم ہر سال یونہی آتا ہے اور چلا جاتا ہے (قہقہہ مار کر ہنستا ہے اور وحید کی طرف دیکھ کر) ابھی ایک لچھے دار لطیفہ ہوا (خالد کی طرف اشارہ کر کے) ہمارے نوجوان دوست نے مجھے پہاڑوں کا بھوت سمجھ لیا۔ (پھر قہقہہ مار کر ہنستا ہے) خالد میاں، ۵۰ سال کی عمر میں انسان بھوت نہیں ہوتا۔

خالد:۔ (کسی قدر شرمندہ ہو کر) آپ تو مجھے بلاوجہ شرمندہ کر رہے ہیں۔

ناظم:۔ خیر چھوڑیئے آپ نے مجھے بھوت نہیں سمجھا۔ مگر میرے متعلق کوئی غلط رائے ضرور قائم کی تھی۔ ہو سکتا ہے آپ نے مجھے چور یا ڈاکو سمجھا ہو۔

خالد:۔ جی نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی۔

ناظم:۔ (ہنسکر) ایسی بات تو ضرور تھی۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں یوں اپنی جیب میں ہاتھ ڈالوں گا (جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے) پھر ایک ریوالور نکالوں گا (ریوالور نکالتا ہے) اور اس کا رُخ آپ کی طرف کر کے کہوں گا "ہینڈز اپ"۔ خالد غیر اختیاری طور پر دونوں ہاتھ اوپر کر لیتا ہے۔ (ناظم قہقہہ مار کر ہنستا ہے) اپنے ہاتھ نیچے کر لیجئے۔ یہ ریوالور میں اپنی حفاظت کے لئے رکھتا ہوں دوسروں کو ستانے کے لئے نہیں۔

خالد:۔ (شرمندگی سے مسکرا کر) آپ نے تو مجھے ڈرا دیا۔

ناظم:۔ میرے ساتھ اکثر ایسا ہوا ہے (ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے) کہ میں پہاڑوں پر تتلیاں پکڑ رہا ہوں اور لوگوں نے مجھے جانے کیا سمجھ لیا۔ (ہنسکر) ایک دو مرتبہ تو مجھے پولیس اسٹیشن پر بھی جانا پڑا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر میں مارا مارا کیوں پھرتا ہوں۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے صرف ایک بہن ہے تو اس سے بھی کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے (ہنسکر) اور وہ بھی اس وقت جب وہ سمجھ لیتی ہے کہ میں مر گیا ہوں۔ میرے سامنے آنے پر وہ مجھے ایسی حیرت سے دیکھتی ہے جیسے میں ناظم نہیں، ناظم کا بھوت ہوں۔ آپ میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے ہیں۔

خالد:۔ جی نہیں، آپ کی دلچسپ باتوں سے وقت اچھا گذر رہا ہے موسم کی خرابی کا خیال تو جاتا ہی رہا۔

ناظم:۔ آج جانے کیوں خوب باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔

(ایک دم وحید کی طرف پلٹ کر) تمہاری لڑکی کی شادی میں میں نہ آسکا، مجھے افسوس ہے۔ تم جانتے ہو کہ اب میں سال میں ایک مرتبہ آتا ہوں، ۱۲ر جولائی کو۔ شادی تو بخیر و خوبی ہو گئی۔ بچی تو خوش ہے۔

وحید:۔ (ہاں)۔ بہت خوش ہے، کل ہی اپنی سسرال گئی ہے ایک روز تمہیں پوچھ بھی رہی تھی۔

ناظم:۔ اسے اپنے چاچا کا خیال ہے، (ہنسکر) لڑکیاں یونہی ہمیشہ بیوقوف ہوتی ہیں ۔ کبھی کوئی مجھے پوچھتا ہوا تو نہیں آیا۔

وحید:۔ (غور سے اس کا چہرہ دیکھ کر) تم چالیس سال سے یہی سوال کرتے رہے ہو، اور میں ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا رہا ہوں، مجھے افسوس ہے۔

ناظم:۔ (مسکرا کر) عادت سی ہو گئی ہے۔ کوئی بات نہیں۔

(باہر سے ایک بچہ کی آواز "بابا۔ بابا۔ کوئی موٹر ادھر آرہی ہے)

وحید:۔ اچھا میں آرہا ہوں۔

(خالد بیچینی سے اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

ناظم:۔ (خالد سے) بیٹھ جاؤ تمہیں جس کا انتظار ہے وہ نہیں ہے

خالد:۔ وہ وہ وہی ہے۔

ناظم:۔ وہ ہرگز نہیں ہے موسم خراب ہے اور تم اس موسم کے عادی نہیں ہو (وحید کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ خالد دروازہ کی طرف بڑھتا ہے۔ (ناظم اس کا ہاتھ پکڑ کر) میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ۔

خالد:۔ میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے۔

ناظم:۔ نہیں ۔ بیوقوف نہ بنو، اول تو وہ وہ نہیں ہے اگر وہ وہ ہے تو اسے خود یہاں آنے دو۔

خالد:۔ لیکن آپا ۔

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اپنی خانون دوست کا انتظار کر رہے ہو، اور اس سے ملنے کیلئے بیچین ہو۔

(خالد کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ وحید تیزی سے کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور ٹارچ اٹھا کر جاتے ہوئے۔

وحید:۔ شاید ڈرائیور راستہ بھول گیا ہے غلط راستہ پر جا رہا ہے ۔ اُدھر گہری کھائیاں ہیں۔

(پھر تیزی سے کمرہ سے نکل جاتا ہے، خالد کھڑا ہو جاتا ہے ناظم پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے)

ناظم: میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ۔

خالد: مگر وہ غلط راستہ پر جا رہی ہے۔

ناظم: وہ صحیح راستہ پر آ جائے گی۔ باہر بہت سردی ہے۔

خالد: مجھے اس کی پروا نہیں (جھٹکا دیکر ہاتھ چھڑاتے ہوئے) میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے۔ میں آپ سے اس قدر بے تکلف نہیں ہوا ہوں کہ آپ میرا راستہ روکیں۔

ناظم: بزدل نہ بنو نوجوان ہمت سے کام لو

خالد: آپکی بہادری آپکو مبارک (دروازہ کی طرف جاتا ہے۔ ناظم کھڑے ہو کر دروازے کے سامنے آتا ہے) میرا راستہ نہ روکیے ورنہ —

ناظم: تم طاقت کا استعمال کروگے (بے پروائی سے مسکرا کر) میں طاقت کی دھمکی سے نہیں ڈرتا میں ۶۵ سال کی عمر میں بھی تم جیسے نوجوان کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔

خالد: مگر آپ میرا راستہ کیوں روک رہے ہیں؟

ناظم: اس لئے کہ تم مردوں کی توہین کر رہے ہو۔ یہ شیوہ نہیں ہے (پُروقار لہجہ میں) جاؤ اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اگر وہ وہی ہے تو اُسے خود چل کر تمہارے پاس آنا چاہیئے۔ (خالد بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے موٹر کی آواز قریب تر ہوتی جاتی ہے اور پھر بالکل قریب آ جاتی ہے) کرسی پر پُروقار انداز میں بیٹھ جاؤ (خالد دروازہ کی طرف بڑھتا ہے) میں کہتا ہوں کرسی پر بیٹھ جاؤ (خالد کرسی پر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ مگر اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت بے چین ہے۔ ناظم اپنے پائپ میں تمباکو بھرتا ہے اور اس کو جلاتا ہے۔ باہر موٹر رکنے کی آواز آتی ہے۔ خالد پھر کھڑے ہونے کی کوشش کرتا ہے) بیٹھے رہو۔

(ناظم آتش دان کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور دروازہ کی طرف پیٹھ کر کے اپنا پائپ پینے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلتا ہے اور ایک خوبصورت لڑکی کمرہ میں داخل ہوتی ہے وہ [illegible] ہے۔ خالد کو دیکھ کر)

لڑکی: بہت خراب [illegible]

[illegible]

خالد: [illegible] کے پاس آ جاؤ [illegible] ہے۔

[illegible]

اُٹھتی ہوئی نظر ڈالتی ہے۔ ناظم اُسے حیرت سے دیکھ کر

ناظم: افشاں — آخر چالیس سال بعد تم آ ہی گئیں آج ۲۱ رجولائی

لڑکی: جی — افشاں — آپ نے غلط سمجھا — میں افشاں نہیں ہوں۔

ناظم: تم افشاں نہیں ہو! وہی قد، وہی صورت، وہی آواز، وہی لہجہ، وہی لباس، تم افشاں کیسے نہیں ہو؟

لڑکی: (گھبرا کر) جی نہیں — میرا نام نور افشاں ہے۔ میری ماں کا نام افشاں ہے۔ آپ —؟

خالد: یہ مسٹر ناظم ہیں۔

(ناظم کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور غور سے لڑکی کو دیکھتے دیکھتے پھر آہستہ سے)

ناظم: تم افشاں نہیں ہو، اُس کی لڑکی ہو، کیا افشاں نے شادی کر لی (غور سے لڑکی کو دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور پائپ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑتا ہے۔

—(پردہ)—

بقیہ "اُردو نظم کا اِرتقا" صفحہ ۱۲

کئی بار میں نے
اِنہیں آنسوؤں سے چراغاں کیا ہے
یہی ننھے تارے حزیں ظلمتوں میں چمکتے رہے ہیں
انہیں سے سجایا ہے دل کا شبستاں
انہیں سے غم دل کا درماں کیا ہے
ملاقات رنگیں کا ارماں کیا ہے۔

آزاد نظم بدلتے ہوئے حالات کا تجزیہ ہے یہ نئی نظم ہے یہ نئے آدمی کی نظم ہے جس میں طنز بھی ہے کراہٹ بھی۔ یہ آج کے حساس شاعر کی نظم ہے جو شکستگی کی گھٹن گھبراہٹ راستوں کے بچھڑتے ہوئے جاتی اور غریبوں کی محبت کا عکس پیش کرتی ہے راستے پر پڑا ہوا پتھر (شیر کی تماشی) (محمد علوی) (گھر کے دریچے معصوم رضا) اونچی اونچی عمارتیں (مارا منصوری) کرب خود کلامی (اعجاز صدیقی) شکست انا (عنوان چشتی) سلگتی سگریٹ (زاہدہ اور رشید) دکرشن موہن) ارتجا مکان (میراجی) اسکی بہترین مثالیں ہیں نئی نسل نئے دور کی نظم ہے، ضرورت ہے کہ انہیں اور [illegible] اور وسعت کی جائے نیا طبقہ ابھر رہا ہے اور دیکھیں انیا شروع کرے۔

بحوالہ نقد و نظر مقصد سید احتشام حسین۔

تقی حیدر

ذوقِ فنا کی ناتمامی

آسماں
چاند
ستارے

غمِ دل
رسمِ جنوں
موجِ ہوا
خوفِ بہار

اتنے رنگوں کا کرشمہ ہے محبّت کی دھنک

آسماں گردشِ پیہم کی علامت ہے ازل کے دن سے
اور ازل آج ہے یا کل تھا؟ یہ معلوم نہیں
چاند اک قطرۂ شبنم میں ہے فطرت کی نمود
اور اس قطرۂ شبنم کو فنا کی تعلیم!
وقت کی مانگ میں افشاں ہے ستاروں کا ہجوم۔
وقت کی قید سے آزاد ہے جب عشق تو پھر
کیسے عاشق کے گریباں پہ ہوں افشاں کے نشاں؟
ہے غمِ دل کی جوانی سے تمنّا کا فسوں،
موت سے رسمِ جنوں کا ہے بھرم، پھر بھی مگر
جاودانی ہے محبّت، غمِ دل لافانی،
اب تلک موجِ ہوا ہے وہی پیچاں کہ جو تھی
دل پہ چھایا اُسی انداز سے ہے خوفِ بہار

پھر بھی آخر کو کسی دن تو چھٹے گا یہ غبار!

آسماں حدِّ نظر ہے، نہ رہے گی کوئی حد
چاند ہر قطرۂ شبنم کو بنا دے گا گہر
ہر گریباں پہ کئی لاکھ ستارے ہوں گے
دل رہے گا نہ غمِ دل کا یہ جھگڑا ہوگا
ہاتھ میں ہاتھ دئے عشق کے موت آئے گی۔
اتنی بس رسمِ جنوں ہوگی کہ سب اہلِ جنوں
اپنے پندار کو محمل کی طرح پوجیں گے
کیسی پھر موجِ ہوا اور کیسے خوفِ بہار؟
نہ کلی ہوگی، نہ پت جھڑ کی اُداسی ہوگی
نہ خزاں اور بہاروں کے یہ چکّر ہوں گے
ہوگا اک رات میں طے مرحلۂ ہجر و وصال
اور پلک جھپکی تو بس رات گئی بات گئی

ایک ہی رنگ کی بت ہوگی محبّت کی دھنک
اور وہ رنگ بھی پابندِ "نہیں" کا ہوگا
جب نہ ہوگا تو رہے گا، جو رہے گا تو نہیں

جب تک ایسا نہ ہو تب تک تو بلا چُون و چرا
جن کو دعویٰ ہے محبّت کا وہ سب اہلِ ہوس
دل کے سو رنگ کریں خونِ جگر ہونے تک

نظم کا عنوان غالب کے ایک شعر سے ماخوذ ہے:-

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتا نفس ہر چند آتش بار ہے

اس کے علاوہ پوری نظم میں غالب کے اشعار سے جو استفادہ کیا گیا ہے وہ بہت ہی صاف اور نمایاں ہے اور اس کے علیحدہ اعتراف کی ضرورت غالباً نہیں ہے۔

تقی حیدر

سلیم اختر مظفر نگری

علامہ تمنا

میری یادوں کے آئینے میں

۱۹۲۹ء جب کہ میں گورنمنٹ مڈل اسکول مظفر نگر میں ساتویں کلاس کا طالب علم تھا، مرتبہ علامہ تمنا کو مشاعرۂ نمائش مظفر نگر میں دیکھا اور سنا۔ اس کے بعد قبلۂ مرحوم کو ہر سال مظفر نگر، سہارنپور اور میرٹھ نوچندی کے موقع پر مشاعروں میں سنتا رہا۔ ۱۹۳۶ء میں حضرت مولانا مظفر نگر نمائش کے مشاعرے میں تشریف لائے اور استاذی مولانا الم مظفر نگری کے دولت کدہ پر قیام پذیر ہوئے تو نہ صرف یہ کہ قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا بلکہ دو روز تک چلم برداری کی خدمت اور سعادت بھی نصیب ہوئی مشاعرے والی شب میں کھانا کھانے سے قبل مولانا الم نے از خود میری غزل مولانا کی خدمت میں پیش کی اور فرمایا کہ یہ مجھ سے پڑھتے رہے ہیں ان دن کی غزل دیکھ لیجئے۔ حضرت قبلہ نے غزل سنی، کئی شعر اپنے فرمائے۔ مگر کسی شعر پر اصلاح نہیں فرمائی۔ کھانے سے فارغ ہو کر مشاعرے میں تشریف لے چلے۔ تانگہ میں اگلی سیٹ پر دو تشریف فرما ہوئے۔ پچھلی سیٹ پر میں اور حضرت مولانا الم صاحب بیٹھے۔ تانگہ چلا تو فرمایا۔ علیم میاں ذرا اپنا مقبول شعر سنانا۔ میں نے شعر سنایا تو فرمایا کہ تم نے پہلے مصرع میں "میرا سکوت" کہا ہے اور دوسرے مصرعے میں "اُن کا سکوت" کہا ہے دونوں کی پوزیشن بدل کر شعر پڑھو۔ اب شعر پڑھا تو معافی ہی بدل گئے اور اصلاح کے انداز سے شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا

میرا شعر تھا:— میرا سکوت گرم نگاہی کا راز دار اُن کا سکوت حسن تقاضائے ہوئے۔

اب اصلاح شدہ شعر پڑھئے اور سر دُھنیئے:—

میرا سکوت گرم نگاہی کا راز دار اُن کا سکوت حسن تقاضائے ہوئے

اس کے بعد فرمایا تم نے جو چوتھے شعر میں کہا ہے "پھر طور پر پکار رہا ہے کوئی مجھے" اس مصرعے میں "پر" کے بجائے "سے" کر لو۔ اصل شعر یوں تھا۔

پھر طور سے پکار رہا ہے کوئی مجھے جلوہ بقدر ذوق تماشا لئے ہوئے

صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے معانی میں کس قدر خوبی پیدا ہو گئی ہے آپ بھی سنیئے:—

پھر طور سے پکار رہا ہے کوئی مجھے جلوہ بقدر ذوق تماشا لئے ہوئے

ساتویں شعر کے متعلق فرمایا تم نے "ابتدائے کار" کہا ہے یہاں "ابتدائے عشق" کر لو۔ اصل شعر سنیئے:—

وہ ابتدائے کاروہ غم کی مساعتیں اک انتہائے شوق سراپا لئے ہوئے

اس شعر کو صرف ایک لفظ بدل کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ دیکھئے

وہ ابتدائے عشق، وہ غم کی ساعتیں اک انتہائے شوق سراپا لئے ہوئے

میرا آٹھواں شعر تھا۔

یا جنبش نظر کو تقاضوں سے عار تھی یا چشم مست خود ہے تقاضائے ہوئے

اصلاح فرما کر شعر یوں بنا دیا

یا جنبش نظر کو تقاضوں سے تھا گریز یا چشم ناز خود ہے تقاضائے ہوئے

اصلاح شعر کے سلسلہ میں حضرت قبلہ کو جو ملکہ حاصل تھا۔ اس کے متعلق فقرا میں نہیں ہو سکتیں لیکن خود ان کے حافظے کا کمال بھی تو دیکھئے کہ ایک دفعہ غزل سننے کے بعد ہر شعر اس ترتیب سے مطلع تک یاد رکھا۔

تمنا نے قبلۂ مرحوم کے اس التفات خاص سے بڑا فائدہ اٹھا کر عرض کیا کہ ولیسے تو میں اپنی غزلیں مولانا الم کو دکھاتا ہی نہیں لیکن اگر اجازت ہو تو کبھی کبھی خدمت میں بھی کچھ غزلیں بھیجوا دیا کروں تو فرمایا کہ ضرور

جینے کی ضرورت نہیں، البتہ ملاقات کے وقت حسبِ فرصت غزلیں دکھا لینے کی اجازت ہے۔ میں نے اس اجازت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ ہر سال مظفر نگر، سہارنپور اور میرٹھ کے شاعروں کے موقع پر اپنی مشاعرہ والی غزل مولانا سے ضرور اصلاح کرا لیتا۔

۱۹۲۹ء میں دوسری جنگِ عظیم اپنے شباب پر تھی، یو پی گورنمنٹ نے ضلع مظفر نگر میں فوجی ضرورت کے لئے کمبل بافی کا کارخانہ قائم کیا۔ ہمارے ضلع میں تین سینٹر قائم ہوئے۔ میران پور کٹرہ کمبل بافی کا کارخانہ بھی مجھے سنہ ۱۹۴۲ء میں وہاں منیجر بنا کر بھیجا گیا۔ میں نے ڈائرکٹر صاحب سے تحریری طور پر اجازت حاصل کر کے جانسٹھ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا کہ تحصیل کا مدر مقام ہے اور یہاں ڈاک تار کی سہولتیں بھی میسر ہیں۔ چونکہ میران پور جانسٹھ سے چھ سات میل کے فاصلہ پر ہے اس لئے وہاں کے لئے ایک جونیئر آفیسر مقرر کرا لیا۔ اگرچہ یہ سب کچھ خلافِ قاعدہ تھا لیکن خان بہادر سید عبداللہ خاں صاحب رئیسِ اعظم جانسٹھ کی تحریر پر جناب اے ٹی نقوی صاحب ڈائرکٹر آف انڈسٹریز ان گئے۔ اسی سال بموقع میلہ شاہ ناصر حسبِ دستور جانسٹھ میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا۔ انتظام مشاعرہ میرے اور سید ظہیر عباس صاحب برادر نسبتی سید علی حسن خاں صاحب مرحوم کے سپرد ہوا۔ حضرت قبلہ مولانا سیماب، ثاقب لکھنوی جگر صاحب مرادآبادی اور بہت سے دوسرے اساتذہ تشریف لائے، نہایت کامیاب مشاعرہ ہوا ــــ۔ اگلے دن شعرا رخصت ہونے لگے لیکن خان بہادر صاحب مرحوم نے حضرت علامہ کو اصرار کر کے ایک ہفتہ تک روک لیا۔ یہ ایک ہفتہ میرے لئے غنیمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ میں نے ہر روز ایک تازہ غزل پر حضرت قبلہ سے اصلاح لی اور اسطرح کہ مصرع بھی مولانا مرحوم نے تجویز فرمایا اور قافئے بھی خود ہی تجویز فرمائے۔ ایک پلنگ حضرت قبلہ دوسرے پر خان بہادر صاحب قبلہ نوشتی میں مصروف ہو جاتے۔ درمیان میں ایک چوکی پر عظیم الخیر فکرِ شعر میں کھو جائے۔ ہر دو بزرگ ایک دوسرے کو شاد کرتے اور زیرِ لب مسکراتے۔ شعر ہو جاتا تو میرے لہجے کے انداز سے کہ فرماتے ہاں بھائی سناؤ تو دیکھیں کس طرح کہا ہے یہ قافیہ تم نے۔ شعر اچھا ہوتا تو پسند فرماتے کئی کئی دفعہ خود پڑھواتے۔ خان بہادر صاحب سے فرماتے، دیکھا سید صاحب کیا اچھا شعر ہوا ہے کبھی شعر پر اصلاح فرماتے اور کبھی کبھی میں اپنی ناسمجھی کے باعث اپنے ہی لفظ یا مصرع پر اصرار کرتا تو انتہائی محبت اور شفقت سے توجیہ فرماتے۔ مختلف مثالیں دے کر قائل کر کے چھوڑتے۔ ایک ہفتہ کی اس مشق اور مزاولت نے مجھ میں جو خود اعتمادی پیدا کی وہ شاید برسوں میں بھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

دس گیارہ شعر کی غزل جس ترتیب سے نازل ہوتی تھی اسی طرح ایک فل اسکیپ کے کاغذ پر لکھ کر حضرت قبلہ سے تاریخ وار تحفظ حاصل کر لیتا تھا۔ حضرت قبلہ اپنے پسندیدہ اشعار پر "ح" کا نشان اور کہیں اپنے قلم سے اصلاح فرما کر تحریر فرماتے "مصدقہ سیماب اکبرآبادی"۔

افسوس کہ یہ یادگار دستاویزات اور میری بیاضِ شعر ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہو گئیں۔ حافظہ پر زور ڈالتے سے جو کچھ یاد آ رہا ہے وہی قلم بند کر رہا ہوں۔ اس زمانے کے دو شعر حضرت قبلہ نے بہت پسند فرمائے تھے اور یہ کہہ کر اصلاح دی تھی کہ اسے سن کر یہ سماں کہتے ہیں: "آپکی لاحظہ فرمائیں

میں اٹھ چلا ہوں تری بزم سے مگر سن لے　　عجب نہیں کہ تجھے میرا انتظار رہے

اصلاح کے بعد شعر یوں ہو گیا۔

میں اٹھ چلا ہوں تری بزمِ ناز سے لیکن　　عجب نہیں کہ تجھے میرا انتظار رہے

دوسرا شعر تھا

میرا جرم بے نہایت اور سزائے قید بند　　تم نے اپنی رحمتیں محدود کیں، یہ کیا کیا!

حضرت قبلہ نے اس شعر میں "سزائے قید بند" کا ٹکڑا نکال کر جو الفاظ دیئے ہیں، وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ بادی النظر میں شعر علی حالہٖ ٹھیک ہے اور اپنے پورے مفہوم اور معانی کو احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن ذرا مولانا کے کلام و فنی آفاقیت دیکھئے شعر سن کر کچھ دن کے ایک دفعہ واہ کہا اور خود شعر پڑھا تو اس طرح پڑھا ــــ

میرا جرم بے نہایت اور تجویزِ سزا　　تم نے اپنی رحمتیں محدود کیں، یہ کیا کیا

حضرت قبلہ نے اصلاح فرما کر شعر پڑھا تو خان بہادر صاحب نے بھی ایک لمبی "ہائے" کر کے کہا "آج تو بنگا ہوں اور کہہ اٹھی ہوئی آواز سے شروع ہوا۔ ذکرِ شعر اور اصلاحِ سخن کا یہ سلسلہ دو تین گھنٹہ جاری رہتا، اتنے میں دوپہر کے کھانے پر طلبی ہو جاتی۔ کھانے کے کمرے میں پندرہ آدمی ہوتے کھانا شروع ہوتا۔ خان بہادر صاحب خود کم کھاتے دوسروں کو زیادہ اور مزاحیہ کر کھلاتے۔ لطیفے سناتے اور ہنساتے ہنساتے پاگل بنا دیتے۔ کھانے کے

بعد جمعہ نوشی ہوتی تھی۔ ظہر کی نماز کے بعد حضرت قبلہ اپنی ڈاک دیکھتے۔ میں فکری کام دیکھتا، عصر کے بعد چائے پی کر سید صاحب کے ہمراہ باغ میں جاتے۔ مغرب کی نماز کے بعد واپسی ہوتی، عشاء کی نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر محفلِ شعر و سخن جمتی۔ ایک دن طے پایا کہ آج صرف اپنے پسندیدہ اشعار سنائے جائیں۔ ہر شخص نے اپنی اپنی پسند کے اشعار سنائے بڑا لطف رہا۔ حضرت قبلہ نے جو اشعار سنائے ان میں سے دو شعر مجھے آج تک یاد ہیں۔ غالباً یہ فرمانے کے لئے کہ یہ شعر جناب مضطر خیرآبادی کی والدہ ماجدہ کے ہیں۔

رات کس درجہ یاد آتے ہو تم — بانسری کی صدا تھی دور کہیں؟
بن کہے میں جی گئی کیوں کر — تم کو کیا خود مجھے یقین نہیں

ایک دن بیچ گئی برسات چلی۔ مختلف حضرات کے بھجن سنائے گئے۔ سید صاحب کے کمرے میں ان کے بڑے صاحبزادے سید حسن علی خاں کا بیچ آویزاں تھا۔

"حسن علی کے بڑے ہیں پسر صغیر حسین"

حضرت قبلہ نے فرمایا محنت نہیں کی گئی، ورنہ خدا کی قدرت سے بہت عمدہ بیچ ہو سکتا تھا۔ یہ کہہ کر مجھ سے فرمایا بیچ کہو۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے تو آج تک نہیں کہا تو فرمایا کہ آج کہو، چنانچہ میں نے کچھ دیر فکر کے بعد عرض کیا کہ قبلہ میں نے ایک ہی مصرع میں سید صاحب اور ان کے تینوں صاحبزادگان کے نام ترتیب وار موزوں کر دیئے ہیں۔

"ابن عبداللہ، حسن ممتاز و اعجاز علی"

قبلہ نے پسند فرمایا اور حکم دیا کہ مصرع اولیٰ کہہ کر مطلع بنا دو۔

میں نے عرض کیا۔

بیچ موزوں ہو گیا اختر بعنوانِ جلی
ابن عبداللہ، حسن ممتاز و اعجاز علی

سید صاحب نے اسی وقت ایک خوش نویس کو بلوا کر لکھوایا اور شام تک یہ بیچ بھی کمرے کی زینت بن گیا۔

ہائے افسوس کہ حضرت قبلہ سے میری یہ آخری ملاقات تھی ۱۹۴۱ء میں مجھے D. I. O (کمسریٹ) میں بہت اچھی ملازمت مل گئی اور ایک مہینہ کانپور میں سپروائزر شعبہ مایات کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد ناگپور چلا گیا، وہاں سے تبدیل ہو کر کچھ عرصہ کٹنی اور پھر کچھ عرصہ ناگپور رہ کر ۱۹۴۶ء میں دہلی آ گیا۔ اس عرصہ میں خط و کتابت کے ذریعہ حضرت قبلہ کی خیریت مزاج سے آگاہی ہوتی رہی۔ قدم بوسی کی سعادت نصیب نہ ہو سکی حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ ہوا میں اپنا سب کچھ لٹا کر منٹگمری نگر چلا گیا۔ اور ایک سال تک دہلی آنے کا خواب بھی نہ دیکھ سکا۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں دوبارہ دہلی آیا، عارضی طور پر دفاتر شعبہ میں نوکری کر لی۔ اور اپنی بحالی ملازمت کے لئے کوشش کرتا رہا لیکن پندرہ بیس دن کے بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ سابقہ نوکری پر بحال ہونا مشکل ہے اس لئے مستقل طور پر شعبہ کا پرانا بن کر رہ گیا۔ حضرت قبلہ اس عرصہ میں پاکستان تشریف لے گئے اور جنوری ۱۹۵۱ء میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی میں چلنے والے قافلہ کے اکثر لوگ اپنی زندگی ہی میں منزلِ مقصود پر پہنچ گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے ان کی وفات کے بعد بھی گرتے پڑتے منزل کو جا ہی لیا۔ مجھ جیسے سکیڑوں ادب ہر دو ادب جو قافلہ کے بالکل پیچھے تھے۔ یکہ و تنہا رہ گئے تو انہیں اپنے لئے کسی منزل کا تعین کرنا دشوار ہو گیا۔ اکثر کے پاؤں شل ہو گئے۔ مجھ جیسے سخت جان گھسٹتے ہوئے اگر منزل پر پہنچ بھی گئے اور آج کے شعر و ادب میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لی تو اسے بھی میں ان کلمات فانی تصرف سمجھتا ہوں۔ بیتاب کا جنیا قافلہ سالار اور سودا شاعری کو کم ہی ملا ہے جتنے بڑے قافلہ کی رہنمائی حضرت علامہ (رح) نے فرمائی اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

ممتاز راشد

غزل

ہنس ہنس کر اشکوں کو چھپایا دل کی آگ دبائی بھی
پھیلے پھر بھی درد کے قصّے اور ہوئی رسوائی بھی

پہلے دل کی دیواروں تک موج غم ٹکراتی رہی
دھیرے دھیرے خون میں ڈوبی آنکھوں کی انگنائی بھی

پل دو پل کو سو لیتے تھے کاکل و رخ کے سائے میں
اُس کی محفل اس نے آئی روٹھ گئی تنہائی بھی

ہونٹوں کے جلتے کاسے میں نغموں کے کچھ موتی ہیں
اور بھلا کیا دیتی ہم کو زخموں کی گہرائی بھی

اُس کی نگہ سے جب گزرے تیسب چہرے انجانے تھے
اہلِ جنوں کے کام نہ آئی کچھ اُن کی رسوائی بھی

زلف سیہ، خورشید سا چہرہ، شاخ سا لچکیلا پیکر
کتنے خواب جگا دیتی ہے یادوں کی شہنائی بھی

مرگِ دل کے سوگ میں راشد کس گل کی زلفیں بکھریں
چلتے چلتے رُک سی گئی ہے ساون کی پُروائی بھی

مصوّر سبزواری

غزل

رہِ طلب میں چلا یوں میں عمر بھر تنہا
کہ جیسے کوئی بگولا کرے سفر تنہا

اُداسی رُوح سے گزری ہے اِس طرح جیسے
اُجاڑ دشت میں پت جھڑ کی دوپہر تنہا

بھٹک رہی ہے خلاؤں میں یوں نظر جیسے
ہو رات میں کسی گمراہ کا گزر تنہا

نسیمِ صبح مجھے بھی گلے لگاتی جا
میں وہ دیا ہوں جلا ہے جو تا سحر تنہا

گزر گئے جرسِ گل کے قافلے کب کے
لگا کرو یونہی اب گردِ رہگزر تنہا

اندھیری رات، ہوا سخت، تیز وحشتِ دل
ہم ایسی شب میں بھی پھرتے ہیں دربدر تنہا

مسافروں پہ مصوّر نہ جانے کیا بیتی؟
سفینہ آیا ہے ساحل پہ لوٹ کر تنہا

شاعر بمبئی

ایس ایم شاہنواز
(کہانی)

سزا

اس کے باپ نے اپنی بوڑھی ماں پر طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر کے اُسے بی اے پاس کرایا۔ اور پھر اُسے کسی نہ کسی شہر میں ایک معقول سی ملازمت بھی مل گئی۔

لیکن اس اجنبی شہر میں نوکری سے بھی بڑا سوال رہائش کا تھا۔ یہاں سر چھپانے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کچہری کے لئے کپڑے اُس کے پاس پیسہ نہ تھا، اور لوگوں کے منہ لہو لگا ہوا تھا۔ نہ جان نہ پہچان نہ کوئی دوست نہ عزیز و اقارب۔ کہاں جاتے اور کس سے کہتے؟

اس الجھن اور پریشانی میں محمد قمر نامی ایک آسامی فرشتہ بن کر سامنے آیا اور اُس نے اُسے اپنے ذاتی مکان کا ایک کمرہ کرائے پر دے دیا۔ اسے یہ سوچنے کا موقع بھی نہ ملا کہ اس خود غرض دنیا میں بغیر کسی رشتے کے کوئی یوں بھی کمرہ کیسے دے سکتا ہے۔

محمد قمر نامی پچاس برس سے اوپر کے انسان تھے۔ وہ اور اُن کی بیگم، وقت کی کج ادائیوں میں مگن رہتے۔ اُس کی صورتی سے صورتی تکلیف کا خیال رکھتے، جلد ہی اُسے محسوس ہونے لگا کہ یہ مکان یہ لوگ یہ کمرہ اُس کی اپنی ہے۔ وہ یہاں آج سے نہیں بلکہ برسوں سے رہتا آیا ہے۔ اُس نے اپنے ماحول اور انسان لوگوں میں خود کو کبھی تنہا محسوس نہیں کیا۔ وہ اکثر سوچا کرتا۔ "لوگ اس دنیا میں بے لوث خلوص و محبت کا دعوٰی کرتے ہیں۔ شاید انھوں نے قمر نامی گھرانہ نہیں دیکھا۔

دن بھر کا تھکا ہارا جب وہ گھر لوٹتا تو محمد قمر نامی کے گھر والوں کے مسکراتے چہرے اُس کا استقبال کرتے، وقت پر چائے، وقت پر کھانا — دولت پر مصیبت کی ہر چیرہ دستیوں کے باوجود اس گھرانے کے لوگ سکون پسند بنتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اچانک بیمار ہو گیا... ایسے بھرے پُرے شہر میں جہاں افراتفری مچی ہوئی ہے جہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں، جہاں ہر شخص غم دوراں کا شکار ہے۔ جیسے کچھ نہیں ہوا کسی کسی کو کسی غم میں مبتلا رہنا پڑتا ہے، ماں، باپ، بھائی، بہن اس سے سو میل دور تھے اور وہ بیمار ہو گیا تھا۔ اپنی بیماری سے وہ بہت ڈرتا تھا کیونکہ وہ جب بھی بیمار ہوتا، گھر میں ایک بھونچال سا آجاتا تھا۔ سارا ماحول گھر کی ہر چیز تلپٹ ہو جاتی۔ ڈاکٹر... دوا... تیمار داری...!

لیکن قمر نامی کے گھر میں ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ گھر والوں سے دور، بالکل تنہا ہے... بیگم قمر نامی گھر کی گھریلو اس کا حال پوچھ جاتیں۔ اور اُس کے پاس بیٹھ کر اُسے تسلی دیا کرتیں۔ اُن کی بڑی لڑکی سیدہ قمر نامی شریف لڑکی تھیں پڑھی لکھی، اُس پر بھی بیمار کی تیمار داری کرتی تھی۔ پانچوں وقت نماز کے بعد وہ اُس کے لئے دعا مانگا کرتی اور دن میں کئی کئی بار اُس کی چارپائی کے سرہانے آکر کھڑی ہو جاتی اور اُس سے بیٹھنے کیلئے کہتی، لیکن وہ چپ چاپ اُسے تکا کرتا۔ کبھی کبھی اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوتے جیسے اُن میں سیاہ دھواں گھل گیا ہو۔ اُن آنسوؤں میں اُسے ایک فریاد کی جھلک دکھائی دیتی... ایک سچی ہوئی کہانی، جسے وہ بیمار کے دوران تو ہرگز نہ سمجھ سکا، لیکن صحت یابی کے بعد وہ سب کچھ جان گیا تھا۔ ہر بات واضح ہو چکی تھی... بلکہ جیسے کسی طرح بڑی ہوئی کہانی یہ کہانی بھی محمد قمر نامی اور اُن کی بیگم کی زبانی سے بھی پوشیدہ نہ رہی تھی۔ سبھی تو جاننا چاہتے تھے... مرد میں ہر آدمی تھیں، قمر نامی نے ہر آدمی سے پوچھ کچھ کر اپنی بیگم سے شعورہ کر کے اُسے اپنے گھر کا کرایہ دار بنایا تھا، جو اس بیچارے کا بہت بڑا سہارا تھا اور اُنھوں نے بھی اُس سے کرایہ کی کچھ زیادہ نہیں لی تھی۔ وہ نہ وہ کوئی نادان نوجوان تھا جو اُن کے دامن اخلاق، سماجی قدروں کا خوف کھاتا، وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ اُس کے گلے ڈال کر بچی کی قسم برباد کرنا چاہتے تھے، اب بچھی جال میں اچھی طرح پھنس چکا تھا۔

اُس کے والدین نے اس شادی کا سخت مخالفت کی لیکن زیدہ سے اُس کی شادی ہو گئی۔ وہ ایسی لڑکی تھی جو بھی نہیں کرتی، وہ اُسے چاہتا تھا، اُس سے محبت کرتا تھا۔ وہ خوبصورت تھی، خوش خلق تھی، اور زندگی کی ہمدم بننے کی صلاحیت رکھتی تھی، کیا ہوا جو اُس کا خاندان اُس سے اونچا تھا۔ وہ اونچ نیچ، جہیز، بھائی بھتیجے، اُن کے مدارج

کا سخت مخالف تھا۔ اگر دیکھا جائے تو اس شادی کے ہونے کی وجہ والدین کی خود غرضی تھی۔ ماں نے اُسے بہت لکھا کہ زبیدہ کا خاندان ہمارے خاندان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اُس کیلئے زبیدہ سے زیادہ خوبصورت، پڑھی لکھی اور اونچے خاندان کی لڑکی ڈھونڈی ہے۔ اگر اُس نے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کر لی تو اچھا نہ ہوگا لیکن شادی کے بارے میں اُس نے جو کچھ فیصلہ کر لیا تھا اُسے بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے زبیدہ سے شادی کا وعدہ کیا تھا، وعدہ کا دل کیسے توڑتا۔

اُس کے چند قریبی دوستوں اور قریبی خاندان کے رشتہ داروں کے علاوہ کسی کو کانوں کان اس کی شادی کی خبر نہ ہوئی۔ اُس کی ماں جو بیٹے کا سہرا دیکھنے کیلئے عمر بھر انتظار کرتی رہی تھی، ناراضگی کی وجہ سے شادی میں شریک نہ ہو سکی۔ شادی کی تمام رسومات بڑی سادگی اور خاموشی سے سرانجام پا گئیں۔ وہ خوش تھا کہ جو کچھ اُس نے سوچا اور چاہا تھا اُسے مل گیا۔

جن خوشیوں کا وہ گھونٹ بھر لینا چاہتا تھا، وہ اُس سے دُور رہنے پر آمادہ تھیں..... ابھی وہ چاند سی بیٹی اور بیٹے کی خوشی بھی پوری طرح برداشت نہ کر پایا تھا کہ چودہ سال کے شاندار ریکارڈ کو خراب کر کے اُسے ملازمت سے الگ کر دیا گیا، اور وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ کیونکہ اُس کے پاس کسی وزیر کی سفارش نہ تھی۔ ہیڈ کلرک کی جیب گرم کرنے کے لئے خود اُس کی جیب گرم نہ تھی۔ دوسری طرف سیکشن آفیسر اُس کی جگہ اپنے بھائی کے سالے کا تقرر کرنا چاہتا تھا۔ یہ سوچنے لگا، یہ زمانہ ہی بھانجوں، بھتیجوں، اور سالوں کا ہے۔

ابتدائی معاش نے اُس کے سامنے نئے نئے مسائل کھڑے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ سیکڑوں سوالیہ نشان سنگ میل بن کر اُس کے سامنے آ رہے تھے، والدین کے پاس کیا منہ لیکر جائے، انہیں پہلے ہی ناراض کر بیٹھا تھا۔ سسرال والے کسی قسم کی مدد کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ وہ اپنی بیٹی کی اکیلی جان ہی کا بوجھ سمجھے بیٹھے تھے۔ پھر اتنا چار جانوں کو کیسے برداشت کر لیتے۔ اُس نے کوئی خاص قدم بھی پس انداز نہیں کی تھی کہ کچھ ماہ ڈھکیل دیئے جاتے۔ ملازمت لاکھ جتن کرنے پر کہیں نہیں مل رہی تھی۔ بیکاری میں اخراجات میں بھی قدرتی طور پر غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور ہر قرض خواہوں کے تقاضے برابر شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ کچھ دنوں سے زبیدہ بھی بیمار نظر آ رہی تھی، اور وہ اپنے آپ کو بھی برسوں کا بیمار محسوس کرنے لگا تھا۔ حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے، ہر وقت ذہنی الجھن، ہر لمحہ ایک خلش ——————

اس کی زندگی میں ہر جہت سے محرومیوں کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ اور نس نس میں اندھیرا گھل گیا تھا، اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاریک مستقبل کے اس بھنور میں گھرا مستقبل کی ایک ننھی سی کرن کی آس میں بھٹک رہا تھا، اور جیسے پالینے کی خواہش اُس کے لئے سراب بن چکی تھی۔ کئی بار اُس نے سوچا کہ اس زندگی کو ختم کر دے —— اس مستقل بوجھ کو اُتار پھینکے، لیکن اس طرح صرف اسے ہی چھٹکارہ مل سکے گا، بیوی بچوں کا پھر کیا ہوگا۔ اُن کے مسائل کیسے ختم ہوں گے، وہ ایسے موڑ پر پہونچ چکا تھا، جہاں سے کئی راہیں نکلتی تھیں، اور اُسے کسی ایک راہ کو اپنانا تھا۔

وہ ایک مبہم اور دھندلے ارادے کا بوجھ ذہن میں لئے شہر کی پُر شور شاہراہ کے کنارے کھڑا تھا۔ سڑک پر لمبوں، موٹروں، ٹراموں اور تانگوں کا سیلاب بہہ رہا تھا، اُسے کچھ احساس نہ تھا کہ وہ کہاں اور کیوں کھڑا ہے۔ سامنے سے آتی ہوئی ہر موٹر کی طرف بڑھتا اور پھر ٹھٹک کر رہ جاتا۔ اس کشمکش میں کتنا وقت گزرا، اُسے کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک ایسی ہی تیز رفتار کار اُس کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس میں ایک خوبصورت نوجوان قیمتی سوٹ میں ملبوس بیٹھا تھا۔ شاید کوئی غیر ملکی ہوگا، اس نے سوچا کار بڑھتی آ رہی تھی۔ قریب۔ بہت قریب۔ اُس کے ذہن میں سیٹیوں کا سا شور تھا اور مشینوں کی گھڑ گھڑاہٹ۔ اُسے اپنا سارا وجود ڈولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنی ساری قوتوں کو سمیٹا اور اس لغو خیال پر جما دیا جہاں اس کی چھاؤں تھی، جہاں اطمینان کا سایہ لہرا رہا تھا، اُسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی گہرے کنوئیں میں گرتا جا رہا ہو۔ موٹر کے بریکوں کی چیخ اور لوگوں کی آوازیں کنپٹیوں کی پھڑپھڑاہٹ کی طرح محسوس ہو رہی تھیں۔

کچھ فرشتے سفید لباس پہنے اُس پر جھکے ہوئے تھے۔ ایک بھیانک صورت فرشتہ اُس کی طرف لپکتا ہوا آیا، اور اُس کی طرف اشارہ کر کے دوسرے فرشتوں کے کانوں میں کچھ کہنے لگا۔ کوئی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، اس نے صرف اتنا سُنا کہ سارے فرشتے سر ہلا ہلا کر اُس میں کہہ رہے تھے: ہاں اس گناہگار کیلئے خداوند تعالیٰ کا حکم ہے کہ اس کی زبان کاٹ کر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے۔ ایک چیخ کے ساتھ اُس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ بستر پر پڑا تھا، اور نرس ہاتھ میں تھرمامیٹر لئے اُس کا ٹمپریچر دیکھ رہی تھی۔ اس کا سارا جسم پٹیوں سے بندھا ہوا تھا۔

اُس نے تھکے ہوئے ذہن پر زور دے کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کی... اُس نے کار کے آگے اپنے بیکار وجود کو پھینک دیا تھا، تاکہ وہ اُس کے نیچے دب کر مر جائے۔ اور اُس کی موت کا معقول معاوضہ اُس کے بیوی بچوں کو مل سکے، اور وہ اس کے بعد آرام سے زندگی گزار سکیں۔ مگر وہ مر نہ سکا۔

بقیہ صفحہ (۴۵) پر

قیصر قلندر

ہوس کے سائے

سکوت کے بے نہ سمندر میں آخرش رات کھو گئی ہے
دہکتے دن اور مہکتے لمحوں کی روشنی ختم ہو گئی ہے

اُفق سے تا حدِّ دیدتاروں کی جھلملاہٹ میں آرزو کا
چراغِ کشتہ سسک رہا ہے چراغ میں تیل ہے لہو کا

میں گنگنانے کی سعی کرتا رہا ہوں تنہائیوں کے بن میں
گزرتی گھڑیوں کی آگ سلگی ہے دھیرے دھیرے اداس من میں

چھنکتے لمحوں کی کوئی آہٹ سکوت کے بحرِ بیکراں میں
گرے تو گرداب بن کے یادوں کا حشر پیدا ہو سازِ جاں میں

ہزار دکھ درد کی شعاعیں سلگتی پہنائیوں سے پھوٹیں
جراحتوں کے گلاب دیکھیں تو ساعتوں کی طنابیں ٹوٹیں

گلال کا رنگ ہے نمایاں لباس لمحوں کا لالہ گوں ہے
اُٹھو گراں خوابیوں سے نکلو اُفق پہ دیکھو وہ جوئے خوں ہے

دہکتے لمحوں کی سسکتی یادوں میں خون کا رنگ مل گیا ہے
بہیمیت شعلہ زائیوں میں مگن ہے کیا وقت آ پڑا ہے!

خیال زخمی شعور گھائل قرار گم، بے بسی مسلّط
حروف نظروں سے بھاگتے ہیں عروق پر بے حسی مسلّط

وہ دور دیپک کے سبز زاروں میں پھول سے چہرے جل رہے ہیں
بشر کی صورت ہے اہرمن کی بدن سے شعلے نکل رہے ہیں

ہزار معصومیت کی کلیاں جھلس کے خاشاک ہو گئی ہیں
نفاستوں کی ہزار حوریں بنا کفن ہی کے سو گئی ہیں

تمام ماحول آرزو کے لہو سے گلنار ہو گیا ہے
جوانیوں کے دھڑکتے نغموں کا قصر مسمار ہو گیا ہے

مسرتوں کے شگفتہ پھولوں کو اشک و آہن نے ڈھک لیا ہے
مکان خالی اُداس آہیں فسردہ کھلیان۔ کیا ہوا ہے؟!

ہوس کی دارائیوں نے انساں کو اہرمن کا مقام بخشا
بشر نے اپنے ہی ہمدموں کے لہو کا بھر پور جام کھینچا

اُداسیاں جلوہ گر رہی ہیں تباہیاں فرش سے فلک تک
اُجڑ رہے ہیں بلاد قریے دیار ملکوں کی اک جھپک تک

ہرے بھرے کھیت کے لبوں پر سلامتی کی دعائیں بے کل
جہاز مصروف شعلہ باری ہلاکتوں کی فضا ہے چھاگل

خلا کو تسخیر کرنے والے کے دل پہ چھائے ہوس کے سائے
اگر یہ فہمِ بشر کی معراج ہے تو ہم اس سے باز آئے

اے۔ سی۔ بسمار

ندا فاضلی کے خط کا جواب

اگست کے مکتوبات والے باب میں میرے سابقہ خط سے متعلق جناب ندا فاضلی کا مراسلہ نظر سے گذرا۔ میں نے غزل سے متعلق جو سپند منتشر جملے سپردِ قلم کر کے مدیر "شاعر" کے نام بھیجے تھے، وہ دراصل انچاغزل کے ساتھ ایک قسم کی APOLOGY کے طور پر لکھے گئے تھے۔ کسی بحث طلب موضوع کو کریدنا مقصود نہ تھا، تاہم وہ جملے "شاعر" کے حصے مکتوبات میں شائع ہو جانے پر قلمبند کردہ کے اعتراضات کا جواب دینا اور اپنے نظریے کا وضاحت کرنا ضروری فرض ہو جاتا ہے

جناب ندا فاضلی نے استفسار کیا ہے کہ غزل میں حسن و عشق، ہجر و وصال اور رخ و خال کے علاوہ دیگر مسائل سے نپٹنا کیا مراد ہے، زندگی کے ہزار ہا مسائل کا فہرست پیش کرنا تو ناممکن سی بات ہے۔ میں جواباً فقط میر کے اس شعر کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کروں گا، ؎

ساعتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

انگریزی کے رومانوی شاعر جان کیٹس نے کہا تھا، THE POETRY OF EARTH IS NEVER DEAD مراد شاعری کے موضوعات لامتناہی ہیں۔

فاضل مراسلہ نگار نے تحریر فرمایا ہے کہ غزل کی کینوس شاعر کے ذہن کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، اور اسی نقطہ کا مراحت کرتے ہوئے غالب، ذوق اور مومن کا حوالہ پیش کیا ہے، بیشک غالب کے ذہنی پیمانے نے غزل کو زندگی کی کاوشوں سے متعارف کرایا، مگر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ غزل کے اس مسلم الثبوت استاد نے تمام عمر غزل گوئی کے بعد اس صنف سخن کی LIMITATIONS کا ان الفاظ میں اعتراف کیا تھا ؎

لقدِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غالب پہلے شاعر ہیں جن کو غزل کی تنگ دامانی کا احساس ہوا، آپ کو یاد ہوگا بیسویں صدی کے شہنشاہِ متغزلین حضرت جگر مرادآبادی بھی ایک بار یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کے غزل سے متعلق چٹکلے میں خود اُن کی زبانی سُن چکا ہوں۔

اس امر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ آج کی غزل کے خدوخال ویسے نہیں ہے جو دو ڈھائی سو سال پہلے تھے، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہیئت و صنعت سے لیکر آشفتہ، غالب، مومن اور ذوق تک ہوتے ہوئے آج تک کے اکابرین کی غزلوں میں حسن و عشق، ہجر و وصال اور رخ و خال کے متعلق شاعری نمایاں نظر آئیں گے، غزل کا دائرہ بیشک وسیع ہو گیا، مگر متقدمین، متوسطین اور متاخرین کی غزلوں میں DOMINANT NOTE آپ کو یہی ملیں گے، حسرت، آرزو، یگانہ، فانی، اصغر، جگر اور فراق کی غزلوں کے مطالعہ کے بعد کسی دوسرے نتیجہ پر پہنچنا بیشکل ہے۔ عصرِ حاضر کے ممتاز اور متغزل شاعر حضرت فراق گورکھپوری نے غزل کو بہت کچھ دیا ہے اور آپ کا نظریہ عشق بھی قدماء سے مختلف سہی، مگر انچی غزلوں کے مجموعہ "مشعل" کے حاشیے میں وہ عشقیہ شاعری کرنے کا کھلم کھلا دعویٰ کرتے ہیں۔

میں عشقیہ شاعری کو بُرا نہیں کہتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ وقت کا تقاضہ کیا ہے؟ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری شاعری سماجی کردار کا آئینہ ہو، قومی، ملکی اور عالمی مسائل کی بھرپور ترجمانی کرے، سماج دشمن عناصر کے لئے ضربِ کلیم بنے، فرسودہ روایات، توہمات اور کہنہ نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے، موجودہ سماجی اور معاشی بحران ختم کرنے میں ممد ثابت ہو

تخلیق اور تنقید دونوں کا علم بردار ہو، اور اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ تخلیقی اعتبار سے کسی ایک بنیاد امن اور زرین عہد نے کیلئے زور دے کر اپنایا جائے تو ظاہر ہے کہ ہمیں غزل کی نسبت نظم سے زیادہ کام لینا ہوگا۔ کچھ اسی طرح کے حالات میں مولانا حالی نے غزل خوانی کو بدقت کہا تھا کہ گزشتہ بیچاری غزل پر مجموعہ حالیہ میں کیا تھا۔ اس نازک صنف کے متوالوں کے جذبات مجروح کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ وقت کے تقاضوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

ہمارے ملک کی پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے پچھلے دنوں، ادیبوں کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے ادیبوں کو اپنی تخلیقات میں ادبیت کی طرف کم اور افادیت کی طرف زیادہ دھیان دینا چاہیئے۔ اس نظریئے سے کسی کا اتفاق رائے ضروری نہیں، نہ شاعری محض پرتگنڈہ ہے، ہم اور ہمارا یہ ہمیشہ ایک صالح اور راسخ نظریہ حیات اور اعلیٰ قدروں کا حامل ہوتا ہے غزل کے خلاف سے متعلق تیری تلخ گفتگو اور لمبی لمبی رائے پڑھ کر خدا جانے کیوں خوشگوار ہنسی ہو گئی کہ شاید پچھلے پچاس سال سے اچھے شاعروں کا کیا آج غزلیں میری نظر سے نہیں گذریں۔ میں نہایت انکساری سے صرف اتنا عرض کروں گا کہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے نہ صرف پچھلے پچاس ساٹھ سالوں کی کامیاب اور عمدہ غزلیں میری نظر سے گذر چکی ہیں بلکہ انگریزی نظمیں بھی۔ میں مغرب زدہ تو نہیں، اور مجھے اپنے ملک کے ادبی اثاثہ پر فخر ہے، اور اس کے مستقبل میں لیکن جگر زبان اور ملک کی قیود سے بالاتر ہو کر آفاقی نظریہ اپنانا کوئی جرم بھی نہیں سمجھتا۔

اگر ہم دوسری زبانوں کے شعری ادب کو پیش نظر رکھ کر اردو غزلیات پر مشتمل شعری سرمایہ کا دیکھیں عزیز ترین ہے، جائزہ لیں تو یہ احساس ہوگا کہ ہم وقت کی رفتار سے کتنا پیچھے ہیں، مگر اردو افسانہ، ناول یا نظم پر ایسا احساس ہرگز نہیں ہوگا۔ ہمارے شعری ادب میں نظموں کی بالعموم کمی ہے اور بالخصوص NARRATIVE POETRY اور REFLECTIVE کی طرف تو بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ ہمارے ہاں TINTERN ABBEY PARADISE LOST, ODE TO WEST WIND WHITE LAND یا ANCIENT MARINER, IN MEMORIAM جیسی نظموں کی تعداد زیادہ نہ سہی، تاہم گذشتہ پچاس ساٹھ سال میں ہمارے اردو شاعروں نے ایسی نظمیں کہی ہیں جن پر کسی بھی ملک یا ان کے ادب کو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے۔ وہ اقبال کی مسجد قرطبہ ہو، "بوک پر محروم کی نور جہاں کا مزار" جوش کی "شاعر" یا فراق کی نظم ہم زندہ ہیں" فیض کی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"

یا ساحر لدھیانوی کی نظم "تاج محل" یا "اعجاز مہدی حسن" کی "کرب خود کلامی" یا مخدوم کی "سوار صحرا" یا "دشمن کون ہے" اور ایسی دیگر شاہکار نظمیں آپ انگریزی یا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کر کے پورے اعتماد کے ساتھ دیگر ممالک کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اگر گذشتہ پچاس سال میں کہی گئی اس طرح کی کتنی غزلیں پیش کی جا سکتی ہیں، اچھے شاعروں کا کامیاب غزلوں کا مجموعہ ترجمے میں کھل جائے گا۔ اور معقول نتیجے اس کی مثال ان کاغذی پھولوں کی سی ہے جو آنکھوں کو تو بھلے معلوم ہوتے ہیں مگر خوشبو نہیں دیتے۔ غزل کی AESTHETIC APPEAL سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے مگر گہرائی تھوس بات بھی تو ہو، صرف لطف زبان و بیان ہی تو سب کچھ نہیں، ہمارے اچھے شعرا کی کامیاب ترین غزلوں میں کچھ نہ کچھ پھر تو کے آثار ضرور مل جائیں گے اور حسن و عشق کی باتیں بھی ع

دیکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

جناب ندا فاضلی فرماتے ہیں کہ سماج، زبان اور بیان سے گہری واقفیت اور صحیح مزاج کی شعور کی سوجھ بوجھ کا ہونا نہ کہ ہمارے غزل کے فارم کا۔ گویہ شرط تو ہر صنف سخن کیلئے لازم ہے، چاہے وہ نظم ہو یا غزل، رباعی ہو یا قطعہ۔ میں اس سلسلہ میں مزید یہ بات کہنے کی جسارت کروں گا کہ ایک طرف تو ایک عام غزل گو شاعر چند بندھے ٹکے اور روایتی مضامین کو موضوع سخن بناتا ہے، دوسری طرف ہمارے اکثر و بیشتر غزل گو شعراء کی زبان بھی ڈھائی سو برس کے شعراء کی طرح کتابی اور مصنوعی ہے، میری ناقص رائے میں اردو زبان کو بول چال اور روزمرہ کی عام فہم زبان سے زیادہ دور لے جانا زبان یا ادب کی چنداں خدمت نہیں کرتی جا سکتی۔ بلکہ یہ رجحان موجودہ حالات میں اردو کیلئے نہایت مضر ثابت ہوگا۔ ورڈزورتھ نے، شیکسپیر ہی تو کہا تھا کہ POETS DO NOT WRITE FOR POETS ALONE! اسی نظریئے کو دہراتے ہوئے حضرت فراق نے فرمایا ہے۔ "شاعر کا وہ میعار نہیں جسے سن کر محض دو اڑھائی فن سمجھ لیں، بلکہ شاعری وہ چیز ہے جو انسانیت کے بیشتر افراد کی دسترس میں آئے"۔ انکا یہ الزام سراسر بے بنیاد نہیں کہ "اجکل کی شاعری میں بہت سے لوگ جو کم و بیش نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ان کے ہاں لبا لب اوقات شاعری کی زبان افتاد پر واقعی کی زبان پر کر دی گئی ہے۔۔۔ احساسات زبان کے سانچے میں ڈھلتے ڈھلتے کہیں الفاظ میں اپنا مفہوم نہ چھپا لیں اگر ہم نے ایک خالص ادبی زبان کو معمولی اور قطعی سمجھ لیا اور عام فہم زبان میں شعر کہنے کی بجائے مشکل پسندی کو وصف گردانا تو ظاہر ہے ہم پر کچھ اس قسم کے اعتراضات ہوں گے جو نہرو

آبھائی ریڈیائی ہندی پر کیا کرتے تھے جو مختلف شری گیت کے انداز کی ہندی شاعری پر دوسری زبانوں والے کرتے ہیں۔

اُردو غزل کی زبان اُس کے ظرف اور موضوع سے متعلق کچھ ناخوشگوار باتیں کہہ کر میں غزل کا گلا گھونٹ دینے کا مشورہ نہیں دے رہا۔ گذرے ہوئے ایام والی خوشحالی اور فراغت کبھی دوبارہ نصیب ہو سکی تو ایک بار پھر ہم ساز غزل پر کتنا سے حسن و محبت کے راگنیاں الاپیں گے۔ مگر بقول سائل ؎

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں!

اس وقت جبکہ انسانیت زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ عصر حاضر کے اُردو شاعر کو یہی زیب دیتا ہے کہ غزل میں کہیں کہیں مبہم سے اشاروں اور کنایوں سے کام لینے کی بجائے نظم میں وہ تمام باتیں کھل کر کہے جو آج کی دکھی اور فریاد طلب جنتا اُس سے سننے کے لئے گوش برآواز ہے اور اُس کی گھن گرج اِس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی کرن بن کر انسان کو راستہ دکھائے۔ یہ جو آج ہر آنکھ اُٹھتی ہے یہی تقاضا ہے کہ ع

ہر شاخ پہ اُلو بیٹھا ہے

اِس قابل افسوس صورت حالات کا خاتمہ کرنے کے لئے ایک اُردو شاعر کے لئے آخر اِس سے زیادہ کاری کون سا ہتھیار ہو سکتا ہے۔ میں نے پچھلے مضامین میں غزل کی پابندیوں اور قیود کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا تھا لیکن اگر ہم نظم کے ساتھ غزل سے بھی دبے کام لے سکیں جو مثال کے طور پر جگر نے لیا تھا، اگر غزل کی مزید اصلاح اس پیمانے پر ممکن ہو کہ یہ صنف سخن ماحول کی سچی آئینہ دار بن سکے، قافیہ پیمائی، جھوٹی شاعری، روایتی بندشوں، ترکیبوں، بعید از قیاس تشبیہوں، غیر مانوس الفاظ اور فرسودہ موضوعات سے مکمل طور پر احتراز کیا جائے اور اِس طرح اُردو شاعری کو اچھلنے اور غیر ضروری بجا اور بیجا اچھلوں سے بچانے کی ترکیب پر سنجیدگی سے غور و عمل کر سکیں تو غزل شوق سے کہئے ہم محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کو اُردو زبان اور اُردو ادب کے بڑے محسن تسلیم کرتے ہیں اور انہیں زبانی خراج عقیدت بھی پیش کرتے ہیں مگر افسوس ہم اُن کے دکھائے ہوئے راستے پر ثابت قدمی سے نہیں چل سکے آج سے کئی سال پہلے لکھے گئے مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے آج بھی استفادہ کرنے کی کافی گنجائش ہے اس تاریخی دستاویز سے ایک مختصر اقتباس کے ساتھ میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔

"البتہ ہم کو اپنے نوجوان ہموطنوں سے جو شاعری کا چسکا رکھتے ہیں اور زمانے کے تیور پہچانتے ہیں یہ اُمید ہے کہ وہ شاید اِس مضمون کو پڑھیں، اور کم سے کم اس قدر تسلیم کریں کہ اُردو شاعری کی حالت بلاشبہ اصلاح یا ترمیم کی محتاج ہے، ہم نے اپنی ناچیز رائیں جو اس مضمون میں شاعری کی اصلاح کے متعلق ظاہر کی ہیں، گو اُن میں سے ایک رائے بھی تسلیم نہ کی جائے لیکن اس مضمون سے لوگوں میں یہ خیال پھیل جائے کہ فی الواقع ہماری شاعری اصلاح طلب ہے تو ہم سمجھیں گے کہ ہم کو جو کامیابی حاصل ہوئی ہے کیونکہ ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے تنزل کا یقین ہے ...."

آئندہ شمارہ

ایک ناتمام جھلک

ترقی پسندی	(مقالہ)	علی عباس امید ایم۔اے
عورت اور جام	(کہانی)	ترجمہ۔ انجم آرا انجم
علامہ آجر کا صحافتی زندگی	(مقالہ)	مناظر عاشق ہرگانوی
گرگٹ پور اپریں	(ڈرامہ)	رسول احمد
تانیتا ڈوبی	(دیکھیں انظر)	اعجاز صدیقی
ایک شاعر کی ڈائری	(پال ورلین)	بنا فاضلی
کل کے سپنے	(کہانی)	غلیم اقبال ایم اے
ڈاکٹر سلام سندیلوی کی شاعری	(مقالہ)	انیس احمد ہاشمی ایم اے
آپ کا نظر نے کیا	(رجھوری غازیپوری کے خطوط)	اندر جیت در
تحریک خلاج لسواں الاصلاح	(مقالہ)	عزیز صدیقی
زمانے کا دکھ	(لورکا)	
خونخوار پودے	(معری کہانی)	مہیا کرام
	(روح اخضر رفیعہ منظور الامین)	

منظومات

سردار جعفری، احسان دانش، متین سرویٹی، نثار اٹاوی، شمیم کرہانی، غلام محمد شطہ، وفا ملکاپوری، بقیل ہوشیارپوری، منظر خفی، عارف نظیری، رحمت امروہوی، شاہ صدیقی، مدت الاخیر، رحمان جامی، قیصر الجعفری، ڈاکٹر حمید شاہین، ماہر الکھانی، حبیب الرحمن رائی اور دوسرے ادیب و شاعر

جرائد۔ مکتوبات۔ نقد و نظر۔ ادبی و تہذیبی خبریں اور فنکاروں کی تصاویر

نومبر ۶۶ء کا یہ اہم شمارہ اپنے مقامی ایجنٹ کے یہاں محفوظ کرا لیجئے

عروج زیدی

غزل

دردِ دل عیش دو عالم سے بھی پیارا ہے مجھے
تم نے کس رنگ سے شیشہ میں اُتارا ہے مجھے
حُسن کروٹ نے اِس رُخ سے سنوارا ہے مجھے
اپنے ماحول پہ تنقید گوارا ہے مجھے
"غمِ دُوری" کے تصوّر سے لرز جاتا ہوں
"غمِ دوراں" بسر و چشم گوارا ہے مجھے
کورذوقی ہے کہ آواز پہ آواز نہ دوں
نور و نکہت کی فضاؤں نے پکارا ہے مجھے
اُن کی انگڑائی کا مفہوم کوئی کیا سمجھے
میں نہ اُٹھ کر کہیں جاؤں یہ اشارا ہے مجھے
عقل کو "عقل کے اندازِ سیاست" کو سلام
دل نے اعلانِ بغاوت پہ اُبھارا ہے مجھے
بے نیازِ کرمِ مرگ ہے میری ہستی
التفاتِ نگہِ ناز نے مارا ہے مجھے
عرش کو فرشِ رہِ شوق سمجھتا ہوں عروج
کس بلندی سے محبت نے پکارا ہے مجھے

راہی سیونی

غزل

بغض و حسد کی آگ میں ناحق جلتے ہیں دیوانے لوگ
دل میں جلا کر شمعِ محبت بن جاتے ہیں پروانے لوگ
اپنی غرض کی خاطر اکثر رسمِ وفا کھو دیتے ہیں
پیار جتا کر بھی دیتے ہیں زہر بھرے پیمانے لوگ
کیسے کوئی بھید چھپائے، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے
کس کو اپنا سمجھا جائے، اپنے ہیں بیگانے لوگ
کیسا ہے دستور یہاں کا، کیسی یہ دنیا کی ریت
جان پہ جب بن جاتی ہے تب آتے ہیں سمجھانے لوگ
چونک اُٹھے اربابِ محفل آنکھ میں آنسو جب بھر آئے
دل کا شیشہ چُور ہوا کیوں راز نہ اِس کا جانے لوگ
پل میں ہے ہر پل میں ہے ہرن دو ستا بھی ہیں دشمن بھی یہی
کیسے کیسے رُوپ بھرے ہیں جانے اور پہچانے لوگ
عزم اگر ہے راسخ راہی منزلِ اُلفت دُور رہے
راہ نہ اپنی چھوڑنا ہرگز آئیں گے بہکانے لوگ

نسیم راہی
(کہانی)

تلاش

میں نے ابھی نئے ناول کا ایک ہی باب پڑھا تھا کہ اُکتاہٹ سی محسوس ہونے لگی ذہن منتشر منتشر سا ہو گیا اور دل کی گہرائیوں میں ایک عجیب طرح کی اداسی گھس آئی تھی ——— پتہ نہیں یہ مجھے اچانک کیا ہونے لگتا ہے؟ چاہے کتنی ہی اچھی ناول ہو کتنا ہی مشہور افسانوی یا شعری مجموعہ ہو اب میں ایک نشست میں نہیں پڑھ پاتا ہوں؟ (پہلے تین تین کتابیں پڑھ جاتا تھا) حد ہو گئی' دو باب پڑھ ڈالے پھر ایک طرح کی اُکتاہٹ اور اداسی ذہن پر محیط ہو جاتی ہے۔ اور روح کی عمیق گہرائیوں میں ایسا احساس جاگنے لگتا ہے جیسے میری زندگی ایک بہت بڑا خلا بن کر رہ گئی ہو۔ دل کسی بھی پہلو کسی بھی کام میں نہیں لگتا۔ اور میری بے چین نگاہیں ذہن کے اشاروں پر پتہ نہیں اپنی دنیا سے باہر کس شے کو کھوجنے لگتی ہیں

میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا ——

یونیورسٹی کے مرکزی بلب کی دودھیا روشنی میں بچے بڑی دیر سے کھیل رہے تھے جس پول پر یہ دودھیا مرکری بلب روشن ہے۔ اُس سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر وہ نیا مکان ہے' یہ نیا مکان جس کا ڈیزائن مجھے بیحد پسند آیا' ابھی چند ہی دن پہلے بنا ہے اور اس میں رہنے والے تو آج ہی شام سے کچھ پہلے آئے ہیں۔ میں نے اُن میں سے ابھی کسی کو نہیں دیکھا ہے ہوا ئے اُس ایک آٹھ سالہ لڑکے کے جو شاید مٹی کا تیل خریدنے کی غرض سے کالو فی کی دُوکان کی طرف جا رہا تھا کیونکہ اُس کے ہاتھ میں شربت کا خالی شیشہ تھا' اُن لوگوں کو کیا پتہ تھا کہ آج جب وہ پہلی بار اس نئے مکان میں آئیں گے تو میں لائن بند ہو گی اور نتیجہ میں انہیں قندیل جلانا پڑیگی۔

نئے مکان میں اب قندیل روشن ہو چکی ہے' ابھی ابھی سامنے والے کمرے میں کوئی قندیل جلا گیا ہے اور کسی نے اس کی کھڑکی کے دونوں پٹ بھی کھول دیئے ہیں' جہاں تک میری نگاہوں کی پہونچ ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ کھڑکی کے پٹ کھولنے والے ہاتھ یقیناً خوبصورت تھے کاش اس وقت کمرے میں کوئی تیز روشنی کا بلب جل رہا ہوتا تو میں اُس حسین پیکر کو سر تا پا دیکھ لیتا۔ جانے کیوں دل اُسے دیکھنے کا طالب ہوا جا رہا ہے؟ اس سے پہلے تو میں نے کبھی کسی صنف نازک میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں کی۔ بس دیکھ لیا ۔ اور پھر اپنی دُنیا میں کھو گئے۔ نہ جانے اب کیوں دل بار بار اسی میں دلچسپی محسوس کر رہا ہے پتہ نہیں کیا بات ہے؟ میری عادتیں' میری خواہشیں' اور سکون کے محور رفتہ رفتہ کیوں بدلتے جا رہے ہیں؟ چند دن پہلے تیاجی بلڈنگ کے اسی کمرے میں کس قدر پُرسکون زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسکول سے لوٹتا' پریس چلا جاتا' پریس سے رات بارہ بجے کے آگے پیچھے لوٹتا اور کوئی علمی گیت زیر لب گنگناتے ہوئے سو رہتا ——— پھر جب تعلیم ختم کرنے کے بعد نوکری کر لی۔ تو صبح نو بجے بڑے ہی اطمینان سے اُٹھتا۔ کھڑکی کی نئی جنتا ہوٹل میں کھانا کھاتا اور آفس چلا جاتا۔ آفس سے زندہ دل دوستوں کے ساتھ نکل جاتا اور رات دس گیارہ بجے تک لوٹ آتا۔ خوب خوش گپیاں ہوتیں۔ اور پھر جنتا ہوٹل میں رات کا کھانا کھا کر کمرے پر آ جاتا۔ کبھی کبھی رات گئے تک کہانیاں پڑھتا۔ ناولیں پڑھتا' اور غزلیں گنگناتا۔ کبھی کبھی ذہن کا تخلیقی گوشہ جاگ اُٹھتا تو کہانیاں بھی لکھنے لگتا' اس طرح مجھے بے پناہ سکون حاصل تھا جب کبھی کوئی خلا پیدا بھی ہوتا تو بڑی جلدی میں اُسے پُر کر دیا کرتا تھا۔ اس طرح زندگی کے عمیق اور وسیع سمندر میں اکثر ایک طرح کا ٹھہراؤ ہی رہتا تھا' مگر اب کی بار جانے

کیسا خلا پیدا ہو گیا ہے جسے پُر کرنے کی ہر کوشش میں ناکام ہوں۔ ایک طرح کی اضطرابی کیفیت ہمیشہ دل اور ذہن میں پارے کی طرح تھرکتی رہتی ہے، بار بار ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ذہن کی بنیادوں سے کوئی چیز سرک گئی ہے اور وہاں ایک خلا سا بنتا جا رہا ہے۔ میرا ذہنی سکون منتشر ہو گیا ہے، دوستوں میں دل نہیں لگتا، اپنے پسندیدہ مصنفوں کی کتابوں میں دل نہیں لگتا۔ ہوٹل جاؤں تو ایک طرح کا ذہنی ٹھہراؤ ایک لمحے کیلئے محسوس ہونے لگتا ہے مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ احساس بھاپ کی طرح اڑ جاتا ہے اور میری کیفیت پہلے سے بھی زیادہ بگڑ جاتی ہے۔ پتہ نہیں میرے ذہن کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ؟ اُسے اپنی دُنیا میں سکون کیوں نہیں مل رہا ہے ؟ وہ بار بار اپنی دُنیا سے باہر کیوں جھانک جھانک کر کیا دیکھنے کی سعی کر رہا ہے ؟ اُسے کسی شے کی تلاش ہے ؟ آخر وہ زندگی کے اس وسیع سمندر میں کیا کھوج رہا ہے ؟ کیا تلاش کر رہا ہے ؟

نئے مکان میں روشنی ہو گئی ہے شاید اب مین لائن ٹھیک ہو گئی ہے اُس سامنے والے کمرے میں بھی بڑا ٹیوب لائٹ جل اٹھا ہے مگر قندیل اُس کمرے میں اب بھی بدستور روشن ہے اُسے ابھی تک کسی نے گُل نہیں کیا ہے۔ میونسپلٹی کے مرکزی پلستے اب کوئی بچہ نہیں ہے۔ سب اپنے اپنے گھروں میں جا گھسے ہیں میری نگاہیں سامنے والے کمرے کی کھڑکی پر لگی ہوئی ہیں۔ وہی پیکرِ حسن ابھی ابھی کمرے میں وارد ہوا ہے۔ میں نے کھڑکی کے سرکے ہوئے نیلے پردے میں سے اُسے دیکھ لیا ہے۔ وہ بلا کا حسین ہے۔ متناسب قد، گورا گورا گلابی چہرہ، چکلا اور بڑی بڑی ہرن جیسی آنکھیں، لمبے لمبے بال اور ہونٹوں پر مسکراہٹوں کا نور ——

بہر حال اُن میں وہ ساری باتیں موجود ہیں جو ہمارے تصوّرات میں ایک پیکرِ حسن کی تکمیل کیلئے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ اُس کی آنکھوں کی کشش قابلِ دید ہے۔ میرے سارے وجود کو کھینچ رہی ہے جب کھڑکی کا سرکا ہوا پردہ ٹھیک کرنے کیلئے وہ کھڑکی تک آئی تو میری اور اس کی نگاہوں کا تصادم ہو گیا۔ اور پھر ایک لمحے کیلئے مجھے یوں لگا جیسے اُسکی حسین اور غلافی آنکھوں کی گہرائیوں میں وہ شہ موجود ہے جس کی کھوج میں میرا ذہن مدّت سے سرگرداں تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اُسے دیکھتا ہی رہوں۔ پتہ نہیں کیوں ہے اُسے دیکھنے سے مجھے بڑا سکون محسوس ہو رہا ہے۔

وہ پردہ برابر کر کے واپس چلی گئی ہے۔ اور اُس کے سرکتے ہی وہ

شاعر بمبئی

لمحاتی سکون بھی چلا گیا ہے۔ اب پھر میرے قلب و ذہن کی وہی حالت ہوئی جا رہی ہے۔ ؟ .... وہی بے چینی .... وہی خلا کا احساس .... وہی اُکتاہٹ .... اور بے دلی .... میں اب ٹیبل لیمپ بجھا دوں گا، اور سو رہوں گا .... شاید اس طرح میری یہ حالت بدل جائے۔ اور یہ تاثر جو ذہن پر محیط ہو چکا ہے۔ چھٹ جائے۔

جب میری آنکھ کھلی تو بدن میں بڑی کسلمندی محسوس ہو رہی تھی کل رات کے پچھلے پہر میں میری آنکھ لگی تھی اور صبح ہی جب پڑوسن اپنے بچے کو جس نے دودھ کی بوتل زینہ پر گرا کر توڑ ڈالی تھی، ڈانٹ رہی تھی، کہ میں رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ چڑیوں کی چہچہاہٹ بھی برساتے جا رہی تھی تو میری آنکھ کھل گئی۔ اور پھر میں باوجود لاکھ کوششوں کے دوبارہ نہ سو سکا۔ کوئی ساڑھے نو بجے کے قریب بستر سے اٹھ کر میں نے غسل کیا اور پھر معمولی کے مطابق ٹکرڈ کی جنتا ہوٹل میں بے دلی کیساتھ کھانا کھا کر آفس چلا گیا۔

کبھی کبھی سی یہ کیفیت کوئی مجھ پر سال بھر چھائی رہی تھی اب پھر مجھے سکون مل گیا ہے۔ اور یہ سکون مجھے ترونا کی حسین آنکھوں نے بخشا ہے۔

ترونا — یہی پیکرِ حسن ہے جو نئے مکان میں آئی تھی۔ میں اُس سے پیار کرنے لگا ہوں یا یوں کہیئے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پیار کرنے لگے ہیں۔

میں نے سوچ لیا ہے کہ اب مجھے ترونا سے شادی کر ہی لینی چاہیئے تاکہ یہ سکون اب ہمیشہ کیلئے میرا اپنا ہو جائے اور پھر مجھے زندگی سے اکتاہٹ نہ محسوس ہو۔ وہ خلا جو میرے ذہن میں اکثر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ ہمیشہ کے لئے پُر ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں ترونا کے بعد اب میرے ذہن کی تلاش ختم ہو چکی ہے اور اب یہ محور جس پر میری حیات بڑے ہی پُرسکون انداز میں گھوم رہی ہے کبھی نہیں بدلے گا۔ کبھی تبدیل نہیں ہوگا۔ ترونا بہت حسین ہے، بہت سمجھدار ہے اور بہت سوشل ہے، وہ میرے لئے سب کچھ سہنے کو تیار ہے۔ ہماری بے پناہ چاہت کے آگے اب ترونا کے پتاجی بھی جھکنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ وہ پہلے ہمارے دلوں کے حسین راستے میں ایک آہنی دیوار بن گئے تھے۔ مگر پیار کی حرارت سے اب وہ دیوار بھی پگھل گئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ میرے مقابلے میں وہ بیحد دولت مند واقع ہوئے ہیں، اور ہر دولت مند باپ کی یہ دلی آرزو ہوا کرتی ہے کہ اس کی جیتی بیٹی اُس سے بھی زیادہ دولت مند گھرانے میں بیاہی جائے مگر وہ جیسے ہماری

پابت کے آگے مجبور ہو گئے ہیں اور اب جلد ہی ہم دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔

آج ہماری شادی کی چھٹی سالگرہ ہے ہم ابھی ابھی ترنا ہوٹل سے لوٹے ہیں۔ ترنا اشوک کو سینک سلائی کر بڑے ہی پیار سے سلا رہی ہے۔ اشوک ہمارا پہلا بیٹا ہے اور بے پناہ شرارتی ہے۔

اس سالگرہ کی پارٹی میں جو میں نے بڑے ہی شاندار پیمانے پر اپنے رتبہ کا مانند اور دوستوں کو دی تھی، معمولی بات پر میری اور ترنا کی زبردست بحث ہوگئی۔ شادی کے چند ہی ماہ بعد سے یہ بحثیں اور تکرار میری زندگی میں گھس آئی ہیں۔ خدا جانے اس باتوں میں رونا مجھ سے بُری طرح الجھ پڑتی ہے۔ ناراض ہو جاتی ہے اور دو دو دن تک روٹھی رہتی ہے ایک دن صرف اس وجہ سے ترنا مجھ سے دو دن خفا رہی کہ میں نے اس کی ایک سہیلی کو پارٹی میں چلنے کا وعدہ کیا تھا، اور دفتر کی شدید مصروفیت کی وجہ سے اس دن نہ تو پارٹی میں ترنا کے ساتھ جا سکا تھا اور نہ اسے اس بات کی کوئی اطلاع ہی دے سکا تھا۔ اس دن رات گئے جب میں گھر لوٹا تو وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ اس کے اور معمولی سی بات نے طول پکڑا کہ خدا کی پناہ، دو دن تک گھر کی فضا گھٹی گھٹی سی رہی اور میرا ذہنی سکون بھی بکھر سا گیا۔

کبھی کبھی تو ترنا اس قدر بحث و تکرار پر اتر آتی تھی کہ میں کوچے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ کیا یہ وہی ترنا ہے جو میری زندگی پر سرور کیف کی گھٹا سی بن کر چھا گئی تھی، اور جس کے قریب آ کر میں یہ تصور کیا کرتا تھا کہ اب مجھے کبھی اکتاہٹ اور ذہنی الجھن سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔ مگر میرا یہ احساس ایک سراب ثابت ہوا۔ آج بھی میرے ذہن میں خلا رہتے ہیں۔ اکتاہٹ اور انتشار ذہنی ہے۔ اب بھی مجھے کوئی چیز کام نہیں دیتی ہے۔ ترنا کی وجہ سے آئے دن جو طرح طرح کی الجھنیں میری زندگی میں وارد ہوتی رہتی ہیں، انہیں دیکھ دیکھ کر کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا ذہنی خلا پہلے سے بھی وسیع تر ہو گیا ہے۔ اور ترنا نے میری زندگی میں آ کر میرا سارا سکون بھی لوٹ لیا ہے۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود بھی، مکمل اب پتہ نہیں کیوں؟ میں سکون کی تلاش میں سرگرداں نہیں رہتا۔؟ میری نگاہیں کیوں اب اپنی دنیا سے باہر جھانک جھانک کر نہیں دیکھتیں۔؟ کیوں میں ہمیشہ کی طرح اپنی الجھنوں کا حل تلاش نہیں کرتا؟ کیوں؟.. آخر کس لئے...؟

شاید اس لئے کہ اب یہ حقیقت میرے ذہن پر پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ یہ تلاش کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس کھوج کا کوئی انت نہیں ہے۔ انسانی ذہن کبھی اور کسی حالت میں بھی یکساں نہیں رہ سکتا اس لئے جو کچھ اپنی دنیا میں موجود ہے اسی میں سکون تلاش کرنا چاہیئے اسی میں اپنی خوشیوں اور مسرتوں کا کھوج کرنی چاہیئے۔ اور پھر کسی کے کہنے کے مطابق سکون تو اپنے ہی اندر ہے۔ بہرحال بات جو کچھ بھی رہی ہو۔ اب میں سکون کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہوں۔ ترنا کے بعد میری تلاش ختم نہ ہوتے ہوئے بھی ختم ہو گئی ہے۔

بقیہ افسانہ "سراب" صفحہ ۳۷

اور ہسپتال کے بیڈ پر پڑا تھا۔ اس نے سوچا، انسان جو کچھ چاہتا ہے اسے کبھی نہیں ملتا، حتیٰ کہ موت بھی چاہنے پر نہیں ملتی۔ انسان کتنا بے بس ہے، انگ انگ میں بے حسی دوڑ رہی تھی اور جسم کچھ ہلکا ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بہت کوشش کے بعد گردن اٹھا کر اپنے جسم پر نگاہ ڈالی، اس کی دائیں ٹانگ غائب تھی۔

اس کے سارے جسم میں اندھیرے کی لہر سرایت کرتی چلی گئی نرس اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

آپ کے جانے پہچانے فنکار اور مقبول و محبوب افسانہ نگار
محمود واجد
کے
بیس منتخب افسانوں کا مجموعہ
خزاں کے پھول بہار کے دن
شائع کر دہ
انجمن ترقی اردو ہند - کلکتہ
قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ:- مقبول عالم کیو ۲۲ دیوان کلکتہ ۱۴

آنسو فروش

دیم بریلوی

میں دل کے زخموں کا ایک تاجر، میں ایک آنسو فروش شاعر
میں زندگی کے اُداس چہرے کی جھرّیاں بیچنے چلا ہوں
نظر کی تشنہ لبی کو میں نے مزاجِ فن میں سمو دیا ہے
سیاہ راتوں سے جو ملی ہیں وہ تلخیاں بیچنے چلا ہوں

گنا ہگار آنکھ کے اشارے پہ ٹوٹ کے ڈھلکے ہوئے ستارے
تھمی ہوئی تیرگی کے سائے، مٹے مٹے روشنی کے غازے
لٹے ہوئے کارواں کا ماضی، شکست کھائے ہوئے ارادے
میں حسنِ انسانیت کے داغوں کی جھرّیاں بیچنے چلا ہوں
کوئی خریدو کہ مسکراتی اُداسیاں بیچنے چلا ہوں

خلوص کی زندگی کا رونا، وفا کا خوں، جان کی تباہی
جھکی نگاہوں کی کج ادائی، جواں ہونٹوں کی بیوفائی
نئے زمانے کی تُند خوئی، حسین ماضی کی بے ثباتی
ہزاروں ہونٹوں کی بات کرتی خموشیاں بیچنے چلا ہوں
کوئی خریدو کہ مسکراتی اُداسیاں بیچنے چلا ہوں

کوئی خریدو کہ آج خودداریوں کا ماتھا جھکا ہوا ہے
کوئی خریدو کہ ایک فنکار زندہ رہنا بھی چاہتا ہے
اُداس نظروں سے اپنے فن کو اُداس چہرے کو دیکھتا ہے
یہ لمحہ تاریخ ہی کو دیدو کہ اس کا ماضی سے سلسلہ ہے
ہر ایسے لمحے کو اک امانت بنا کے تاریخ نے رکھا ہے
مگر امانت بنا کے رکھنے کا سلسلہ کب تلک رہے گا
رگوں سے فنکار کی کہاں تک یہ قطرہ قطرہ لہو بہے گا؟

خلشِ احساس

جی ایم راہی فتح پوری

مری حیات کی بستی میں بے شمار کھنڈر
خزاں رسیدہ چمن زار جن کو کہہ لیجے
کھڑے ہیں خلوتِ پنہاں میں ساکت و خاموش
نفس نفس کے نگہدار جن کو کہہ لیجے

وہ چارہ ساز جو چارہ گری کے پردے میں
مرے چمن کو برنگِ بہار لے ڈوبے
بصد خلوص فریبِ خلوص دے دے کر
مرا سکوں، مرے دل کا قرار لے ڈوبے

کرم نمائیِ ساقی کا شکریہ، لیکن
مرے لبوں کی حدِ تشنگی کو پا نہ سکی
ستم طرازیِ یاراں بہ شکلِ چارہ گری
حقیقتوں کی کسوٹی پہ رنگ لا نہ سکی

تغیراتِ زمانہ کی کشمکش میں مجھے
تاثراتِ کے خاکوں میں رنگ بھرنا ہے
حقیقتاً ابھی مجھکو فریب کھا کھا کر
غمِ حیات کے پہلو پہ غور کرنا ہے

کمر خمیدہ مساوات، زخم خوردہ نظام
یہ شاہراہوں پہ دم توڑتی ہوئی تہذیب
تھکے تھکے سے عزائم، بجھے بجھے سے ضمیر
یہ ظلمتوں میں مقدر، یہ تیرگی میں نصیب
یہ دردناک مناظر یہ میرا سوزِ دروں
عجب نہیں کہ جلادوں میں خرمنِ تخریب

یہ کم نہیں ہے کہ روشن ہے میرا جذبِ نہاں
یہ اور بات ہے تنویرِ آفتاب نہ ہو
مرا شعور ہے اک مقصدِ حیات لئے
یہ اور بات ہے مقصد میں کامیاب نہ ہو

رشید الدین

باتیں

بات تو ہر شخص ہی کرتا ہے مگر بات میں بات پیدا ہو کر جو بات بنتی ہے وہ بات کچھ اور ہی ہوتی ہے ادیبوں اور شاعروں سے متعلق چند ایسی ہی دلچسپ اور مزیدار باتیں قارئین "شاعر" کی ضیافتِ طبع کیلئے پیش ہیں۔ رشید

اورنگ آباد (دکن) کی ایک ادبی انجمن "مطلعِ ادب" میں ایک نئے افسانہ نویس صاحب نے ایک افسانہ سنایا۔ اتفاق سے افسانہ کچھ ٹھیک نہیں تھا لیکن ان صاحب کے ایک دوست نے جو کسی وجہ سے جلسہ میں نہ آسکے تھے اس افسانہ کے متعلق ایک لمبی چوڑی توصیفی رائے لکھ بھیجی۔ جب سکریٹری صاحب افسانہ کے بعد وہ رائے پڑھ کر سنائی تو اورنگ آباد کے نوجوان شاعر بشر نواز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افسانہ پر تنقید کی جائے یا تنقید پر تنقید؟"

کل ہند اردو کانفرنس اورنگ آباد (دکن) منعقدہ اکتوبر ۱۹۵۴ء کے مشاعرے میں اردو کے ایک کہنہ مشق شاعر صاحب ٹیک لگائے کچھ قطعات سنا رہے تھے۔ اب وہ قطعات سنا چکے تو ٹیک نکال کر جیب میں رکھ لی اور پھر شیروانی کی جیب سے ایک دوسری ٹیک نکال کر لگائی۔ اس کے بعد انھوں نے کہا "کچھ رباعیات سنئے اور شروع ہو گئے۔ یہ دیکھ کر مجروح سلطان پوری نے جو ڈائس کے قریب ہی بیٹھے تھے آہستہ سے کہا۔

"اچھا تو وہ قطعات کی ٹیک تھی اور یہ رباعیات کی ٹیک ہے۔"

مذکورہ بالا مشاعرے ہی میں چند منچلے طالب علموں نے مجروح سلطان پوری کا آٹو گراف لینے کی ٹھان لی۔ جب وہ اکثر لڑکوں کو ایک شعر لکھ کر آٹو گراف دے چکے تو شوخ سی بچی آگے بڑھی اور کہنے لگی:

"اب تو مجھے کوئی شعر یاد نہیں آرہا ہے، سمجھ میں نہیں آرہا ہے کیا لکھوں؟"

اس پر ایک شریر لڑکے نے پیچھے سے کہا۔

"لکھ دیجئے ؎

کبھی آر کبھی پار لگا تیر نظر
تیاں گھائل کیا رے تو نے مورا جگر"

یہ شعر مجروح کے ایک فلمی گیت کا تھا اور وہ گیت ان دنوں بیحد مقبول تھا۔ مجروح نے پیچھے مڑ کر لڑکے کو دیکھا اور پھر مسکرا کر وہی شعر لکھ کر نیچے اپنے دستخط کر دئے۔

سکندر علی وجد اور عزیز احمد اپنے زمانۂ طالب علمی میں روزانہ شام میں مولوی عبدالحق مرحوم سے ملا کرتے تھے جو اس زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن) میں اردو کے پروفیسر تھے اور اکثر ادبی موضوعات پر بحث کیا کرتے تھے۔ تنقید نگار عزیز احمد بحث کے دوران جا بجا مغربی ادب اور مغربی مفکروں کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ ان کی اس عادت سے تنگ آکر وجد نے ایک دن کہا

"یار عزیز تم تو بقول شخصے ہو کر رہ گئے۔"

اور دوسرے دن سے عزیز احمد نے مغربی مفکروں کے حوالے دینا بند کر دیئے۔

اورنگ آباد (دکن) کی نوجوان خاتون شاعر شفیق فاطمہ شعریٰ

سکندر علی وجد سے اس سلسلہ میں بحث کر رہی تھیں کہ نئی نسل کے شاعروں نے بھی بہت سارے اچھے اشعار کہے ہیں؟ یہ سُن کر وجد نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ارے تم ان کے اچھے اشعار ڈھونڈنے کی بات کر رہی ہو۔ انہوں نے تو اچھے اشعار پڑھے تک نہیں۔"

ایک بار بشیر نواز سے میں نے کہا کہ گورنمنٹ کالج اورنگ آباد کے ایک لائبریرین اور اُردو کے طالب علم نے اورنگ آباد کے نوجوان اور ذہین شاعر وحید اختر کی مشہور نظم "لہو کے چراغ" کی پیروڈی لکھی ہے۔ اس پر بشیر نواز نے جو اُس لڑکے کو اچھی طرح جانتے تھے جواب دیا

وہ صاحب خود انسان کی پیروڈی ہیں اگر وہ ایک اچھی خاصی نظم کی پیروڈی لکھیں تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے۔"

سعادت حسن منٹو مرحوم، اور راشد (جو اُردو شاعری میں آزاد نظم کے بانیوں میں سے ایک ہیں) اپنے چند دوستوں کے ساتھ تقسیم ہند سے قبل لاہور کے ایک بازار سے گزر رہے تھے۔ راستے میں انہیں ایک پان کی دوکان کے سامنے چند سائیکلیں بہت ہی شکستہ حالت میں کھڑی نظر آئیں۔

"تمہاری نظموں کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔"

منٹو نے شرارت سے بغیر مڈگارڈ اور کیریئر کی سائیکلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ن۔م۔ راشد سے کہا۔

ایک بار اُردو کے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد جو اپنی صفائی اور نفاست پسندی کے لئے مشہور ہیں، پہلی بار کنہیا لال کپور سے ملنے اُن کے گھر گئے جب وہ دروازہ کے قریب پہنچ گئے تو اپنے دھول سے اٹے ہوئے جوتوں کو جھک کر صاف کرنے لگے۔ اس پر کنہیا لال کپور نے (جو انھیں آتے دیکھ چکے تھے اندر ہی سے) زور سے کہا۔

"بھئی کیا آئے آپ جس شخص سے ملنے والے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ خلیفہ ہے۔"

سن سنتالیس کے فسادات کے بعد اُردو اور ہندی کے نوجوان افسانہ نگار ست پرکاش سنگر نے کلکتہ سے کنہیا لال کپور کو خط لکھا کہ وہ کلکتہ میں ہیں اور اگر وہ چاہیں تو انھیں خالکیں سکتے ہیں۔ کپور نے جواب میں لکھا۔

"اماں بڑے سخت جان معلوم ہوتے ہو۔ فسادات جیسے فسادات ہوئے اور پھر بھی تم کلکتہ ایسے شہر میں۔ وہ کہ ادب کی خدمت کے لئے باقی رہ گئے؟"

باسوچن نے کرجانسن کی سوانح حیات لکھ کر اُسے انگریزی ادب میں جاودان بنا دیا، جب پہلی مرتبہ اُس سے ملا تو وہ اس کے مطابق اُسے بہت دماغ پایا، باسوچن بہت دیر تک بیٹھا رہا، مگر جانسن نے اُس سے کوئی بات نہیں کی بلکہ اپنے ایک دوست سے باتیں کرتا رہا، وہ اپنے ایک ملاقاتی کا اپنے ایک دوست سے تعارف کرا رہا تھا موقعہ بیچ میں بول پڑا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا ان صاحب نے ایسا کس وجہ سے کیا؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا جرات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی، اس میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔"

جانسن نے روکھے پن سے جواب دیا۔

جانسن کی ایک تقریر کے دوران ایک شخص مسلسل غلط انداز میں ہنس رہا تھا، جانسن بہت دیر تک ٹالتا رہا مگر جب وہ شخص برابر ہنسنے لگا تو جانسن نے رُک کر کہا "جناب! آپ کس سلسلہ میں ہنس رہے ہیں۔ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی جو آپ کی سمجھ میں آسکے۔"

"میرے خلیفے کو اب تک صرف دو ہی لوگ سمجھ سکے ہیں"

مشہور جرمن فلسفی ہیگل نے اپنے ایک ملاقاتی کو بتایا۔

"وہ دو کون ہیں؟" ملاقاتی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ایک میں اور دوسرا خدا ——!" ہیگل نے جواب دیا۔

"اور حق تو یہ ہے کہ میں بھی اسے اچھی طرح نہیں سمجھ سکا ہوں" اس نے منہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

جارج برنارڈ شاہ ایک بار انگلستان کی ایک مخیر لیڈی نے کہا کہ وہ اُن سے شادی کرنا چاہتی ہے تاکہ ایک تیز دماغ اور ایک اچھے جسم کا امتزاج ہو سکے اس طرح اُن کے جو بچے ہوں گے اُن کا دماغ تو شاکا سا ہوگا اور جسم

ایکٹریس کا سا۔ یہ سُن کر شانے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔
"محترمہ! یہ صیح ٹھیک ہے مگر اگر معاملہ اس کے برعکس ہو جائے تب۔۔۔؟"

پنڈت جواہر لال نہرو کسی زمانے میں ہاجرہ نیم سے بہت نالاں تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مذاق ہی مذاق میں اُن کی چھوٹی بہن نے (جو اُن دنوں کرشنا ہتھی سنگھ کے نام سے مشہور تھیں) اُن سے پوچھا
"بھیا آپ آزادی حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلا کام کیا کریں گے؟"

"آزادی ملنے کے بعد میں سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ ہاجرہ نیم کو بھارت سے دیش نکالا کروا دوں گا تاکہ ایسا بے رحم سنگدل رہے اور نہ لوگوں کو درد سر کی شکایت کرنا پڑے۔"
پنڈت جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی سے علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے ازراہ شکایت کہا کہ آلِ احمد سرور صاحب تو کلاس میں ہمیشہ اچھے اچھے اشعار سناتے ہیں جب کہ وہ (یعنی رشید احمد صدیقی) ہمیشہ اشعار کا مطلب ہی بیان کر دیتے ہیں اور اصل اشعار نہیں سناتے۔
یہ سُن کر رشید احمد صدیقی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"مجھ میں اور آلِ احمد سرور میں یہی تو فرق ہے کہ وہ ہمیشہ اشعار رکھتے ہیں، اور میں اُن کا مطلب۔"

ایک طالب علم صاحب جو داڑھیوں کا اکثر مذاق اُڑایا کرتے تھے دفعہ گرما کی طویل تعطیلات کے بعد جب یونیورسٹی آئے تو ساتھ ہی لمبی لمبی داڑھی بھی لائے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے انھیں دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں کہا۔
"لمبی داڑھی بھی قدرت کا ایک عطیہ ہے۔"
"جی آپ کا روئے سخن میری طرف ہے۔"
وہ صاحب بغلیں جھانکتے ہوئے کہنے لگے۔
"جی نہیں آپکی داڑھی کی طرف۔"
رشید احمد صدیقی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

جارج برنارڈ شاہ کے ایک دوست نے ایک نئے ادیب کا اُن سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔
"آپ سے ملیئے! بہت اچھے افسانہ نگار ہیں۔"
"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"
نئے ادیب نے شا سے مصافحہ کرتے ہوئے تپاک سے کہا۔
"لیکن مجھے آپ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔"
شا نے بیباکی سے کہا۔

اعجاز صدیقی کی طویل شاہکار نظم
خوابوں کا مسیحا
(ایک ساتھ تین زبانوں میں شائع ہوگئی)
"خوابوں کا مسیحا" وہی مشہور نظم ہے جو ہندوستان کے نجات دہندہ پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال کے بعد لکھی گئی تھی یہ نظم ریڈیو سے نشر ہونے کے علاوہ مختلف شعری مجموعوں، سکہ متہ ہندی کتابوں، اخبارات اور رسائل میں بھی شائع ہو کر مقبول ہوئی تھی۔
نیا روپ
اسی نظم کو اعجاز صدیقی نے ایک بالکل نیا روپ دیا ہے۔ اس میں مزید بارہ طویل و مختصر نئے بندوں کا اضافہ اور نظر ثانی کر کے نظم کو شاہکار کا درجہ دے دیا ہے ایک پورا نیا بند پنڈت نہرو کی راکھ پر شامل کیا ہے نظم کے تمام نئے بند غیر مطبوعہ اور ناشنیدہ ہیں اب یہ پہلی نظم سے بالکل مختلف ہے اس طویل ۱۴۶۷ میں جواہر لال نہرو کی ہمہ گیر شخصیت اور اُن کے تصورات معتقدات کا گہرا نفسیاتی مطالعہ تمام شاعرانہ مضامین اور نزاکتوں کیساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اس کے ایک ایک مصرعے سے ایشیا کے اس عظیم رہنما کی پوری زندگی جھلکتی اور تھرکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے یہ نظم پنڈت نہرو کی عظمت کی ایک خوبصورت علامت بن گئی ہے۔
"خوابوں کا مسیحا"
● عام عالم کے لئے ایک پیغام بھی ہے اور لمحۂ فکریہ بھی ●
دیدہ زیب گرد پوش پر پنڈت نہرو کا خوبصورت اسکیچ
قیمت دو روپے پچاس پیسے
ملنے کا پتہ: قلم الادب پوسٹ بکس ۲۵۲۶ بمبئی ۴۰۰۰۵۸ بی - سی

خالد شفائی

آرزو

ضیاء الانجم پرتابگڈھی

کبھی کبھی
میرے دل میں لیتی ہے چٹکیاں سی
یہ آرزو
کاش
مَیں بھی خانہ بدوش ہوتا
تمام رسموں، سبھی رواجوں کو چھوڑ دیتا
مَیں توڑ دیتا
خود اپنے پیروں کی بندشوں اور بیڑیوں کو
نکل کے اِس شہرِ علم و تہذیب کی فضا سے
میں گھومتا
قریہ در قریہ، کوچہ در کوچہ، گلیوں گلیوں
میں گھومتا
کوہ در کوہ، دشت در دشت، وادی وادی
ہر ایک قدغن سے
اور پابندیوں سے
پاکر نجات
فطرت کی گود میں مسکراتا رہتا
اور ایک آزاد زندگی کے
حسین نغمات
گاتا رہتا

گرفت و شکست

ظلمت آگیں فضاؤں میں کھویا ہوا
اپنی تخئیل کے کچھ گھروندے لیے
روشنی کھوجتا
خود ہی اپنے خیالوں کے جگنو پکڑتا رہا
جس طرح کوئی معصوم بچّہ
اپنی کٹیا میں
چھت کے جھروکوں سے چھنتی ہوئی روشنی کو
پکڑنے کی ناکام سعیٔ و عمل میں
بہت شاد ہو!

شاعر بمبئی

منیر احمد

منبات قمی کہانی

حسن کی خوشبو

کئی سال تک دُنیا کے مختلف حصّوں کا سفر کرنے کے بعد میں ابھی ابھی واپس آیا تھا۔ میرے سامنے دُور دُور تک ہرے بھرے کھیت ہواؤں کے نرم نرم جھونکوں سے لہلہا رہے تھے۔ وقت بھی پرانے ان مٹ نشانات چھوڑتا ہوا گزرتا چلا جا رہا تھا لیکن میرے چہیتے بھائی کے یہ کھیت ابھی تک جوان تھے۔ وہی ازلی و ابدی حسن کا پرتو لئے زمانے کے کاروان نے یہاں اپنے قدموں کے نشان نہیں چھوڑے تھے۔ ہم دونوں ایک ساتھ دھیرے دھیرے آگے بڑھے اور کھیتوں میں ہری بھری گھاس پر بیٹھ گئے۔ میں اپنے سفر کے تجربات بیان کرتا رہا۔ لندن۔ پیرس۔ روم، نیویارک وغیرہ کے افسانے اور ندیم ایک ہاتھ میں لکڑی تھامے لبوں پر مسکراہٹ لئے نہایت دلچسپی سے سنتا رہا۔

بادِ صبا کے جھونکوں سے سرگوشیاں کرتے پتے فضاؤں میں ایک عجیب سہانا راگ بکھیر رہے تھے۔ قریب ہی کہیں آم کے پیڑ پر کوئل کوک رہی تھی۔ لگتا تھا اس صحرا انگیز کوک سے ہوا میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا ہو اور وہ بیتابی دیوانہ وار اِدھر اُدھر گھوم رہی ہو۔ میرے دل و دماغ سے پیرس، لندن اور نیویارک کے رنگین فسانے محو ہو گئے۔ بیان ہوتے ہوئے واقعات کی کڑیاں کھو گئیں، اور میرے کان پتوں کی سرگوشی اور کوئل کی کوک کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں ایک عجیب حسن کی لذت سے بیقرار سا ہو گیا۔ اور مجھ پر بے خودی کا ویسا ہی پیارا پیارا عالم طاری ہو گیا، جیسا کہ ایک طویل عرصہ پہلے انہیں کھیتوں میں ہوا تھا۔

اس وقت میں پندرہ سال کا تھا۔ اور ندیم کی عمر بیس سال تھی۔ ندیم کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔ وہ رات بھر کام میں لگا رہتا تھا۔ میں نے بھی ایک بیل کو ہانکنا سیکھا تھا، میری دلی تمنا تھی کہ میں بھی اس کا ہاتھ بٹاؤں۔ ہم باری باری گھاس پر لیٹے آرام کرتے۔

ساڑھے گیارہ بجے جب میری آنکھ کھلی تو پونم کا چاند اپنی دودھیا کرنوں سے کائنات میں سحر جگا رہا تھا۔ ندیم کو میں نے پوری توانائی کے ساتھ دوڑانا شروع کر دیا۔ اس کے ہیڈ لائٹس کی روشنی کھیتوں میں دور دور تک پھیل رہی تھی۔ جیسے جیسے میں گھومتا جاتا، ندیم بھی ویسے ہی ہاتھوں میں ایک کتاب تھامے ٹریکٹر کی روشنی میں آگے بڑھتا جاتا۔ وہ والٹ وائٹ مین کی ایک نظم یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"دھرتی

سیبوں سے لدی اور گلابوں سے سنوری

دُلہن جیسی ہے۔

مسکراؤ!

مسرتوں سے لبریز ہو جاؤ!

محبوب کی آمد آمد ہے!"

..... وہ حد سے زیادہ مطالعہ کرتا، لائبریرین کا کہنا تھا کہ اس گاؤں میں سب سے زیادہ کتابیں وہی لیجایا کرتا ہے۔

— پونم کی اس رات مجھے ایسا لگا جیسے ایک پُراسرار روشنی مجھے اپنی باہنوں میں چھپائے لئے جا رہی ہو۔ دور دور تک چاندنی، ہواؤں کی پُرفسوں سرگوشیاں کرتے کھیت، سرگوشیاں کرتے درخت..... میں چپ چاپ کھویا کھویا سا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ فطرت اس قدر سحر انگیز نظر آ رہی تھی کہ میں سانس بھی نہایت آہستگی سے لے رہا تھا، اس خیال سے کہ کہیں

میرے دل و دماغ اس فریب کن سحر سے آزاد نہ ہو جائیں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وقت اپنی پرواز بھول چکا ہو اور ایک ہی مرکز پر اپنی تمام رعنائیوں سے منجمد ہو کر رہ گیا ہو میری اپنی آرزو یہی تھی کہ وقت اپنے حسن کے اس نقطۂ عروج سے کبھی آگے نہ بڑھے اور میں ہمیشہ کیلئے اس میں غلطیدہ ہو جاؤں۔

اور اب..... کئی سالوں کے طویل وقفے کے بعد میں اکیلا ہرے بھرے خطے پر بیٹھا اپنی مسرت بخش دلچسپ لمحات کے نرم و نازک پروں پر اپنے آپ کو اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ہواؤں کے نغمے درختوں کی سرگوشیوں سے مختلف انداز ہوتے ہوئے مناظر کے حسن میں یوں کھو گیا تھا جیسے میں انہی کا اٹوٹ حصہ ہوں۔ ان سے الگ کوئی چیز نہیں۔

میں نے چاہا لمحات کے اس حسن کو ندیم پر بھی آشکار کر دوں لیکن نیرا سا بقایہ دے سکی پونم کی وہ رات میرے دماغ کے پردوں میں سرسرانے لگی۔ بمشکل میں نے کہا "میں اسی دودھیا رات کا ایک انگ بنا ہوا ہوں، چاند اپنی رعنائیوں سے اسی طرح چمک رہا ہے.. اُف! میں حسن کے نقطۂ عروج کو پکار رہی! جاگ کر نے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ افتاد کی گرفت میں کبھی نہیں آئیں گے۔"

ندیم نے دھیرے سے اپنا سر ہلایا، میرے جسم میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ ندیم وقت کے اس جادو سے اچھی طرح واقف تھا۔ لمحات کے اس سحر میں ڈوب کر اس نے اسکا تجزیہ بھی کرنے کی کوشش کی تھی۔

"تم اس کے اسرار سے واقف ہو!" میں چلا اٹھا۔ "بتاؤ... مجھے بتاؤ یہ کیا ہے... یہ تو میری روح کو ابدی مسرتوں سے بھگو بھگو دیتے ہیں" ندیم دھیرے سے مسکرایا۔

"کوئی بھی اس سحر کو افتاد کی گرفت میں نہیں لا سکا.... کوئی نہیں...." اس نے ایک عجیب انداز سے کہا۔

"ہاں کئی کتابوں میں میں نے اس کے متعلق کچھ اشارے پائے ہیں۔ لیکن پہلے میں نے انہیں محسوس کیا ہے بالکل تمہاری طرح۔ اور ان لمحوں پر بھی یہ احساس طاری ہوتے ہیں، جنہوں نے اس کے متعلق کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے وہ تنہا، دنیا کے جھمیلوں سے دور رہ کر، آزاد نقادوں میں ان سے نقطۂ عروج ہوتے ہیں، وہ ہم سے دور رہے ہیں، دور... بہت دور...، اس فاصلے کے درمیان کئی سمندر کئی زمانے حائل ہیں، پھر بھی ان سبھوں نے بالکل ایسے ہی جاوداں لمحات میں ڈوب کر اس کے مسرت بخش حسن کو پہچاننے کی کوشش کی ہے"

"لیکن ان کی حقیقت کیا ہے؟"

"اگر میں انہیں ایک ہی جملے میں پیش کرنے کی کوشش کروں تو؟" ندیم نے بات آگے بڑھائی "یوں کہوں گا مکمل آگہی اپنے جلو میں مسرتوں کو لے آتی ہے۔ اس کا ایک مفروضہ بھی ہے کہ یہ کائنات فطری مسرتوں سے مملو ہے ان کو پانے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے حواس کا مکمل رُخ ادھر موڑ دیا جائے بظاہر ہوتے ہوئے سُر و ح بھر بھر کرتے رہتے۔ بلاتے کھیت، بادلوں کے سیکیاں اسلئے بالکل تکلف بغور دیکھنے اور ان کی آواز کو سننے کی کوشش کرو تو یہ مسرت تمہاری طرف دوڑی چلی آئے گی۔"

مسرتوں کے اس سرچشمے سے فیض یاب ہونے کیلئے ضروری ہے کہ دل و دماغ وقت کے تصور سے آزاد اور یادوں سے دور کر دیا جائے، ماضی اور مستقبل کیا ہے؟ اُسے بھلا کر آج اور صرف اب کے لمحات میں خود کو گم کر دینا چاہیئے۔ جیمس الیٹ نے اپنی ایک نظم میں گردش کائنات کا ایک منجمد لمحہ پیش کیا ہے صرف حال یا موجودہ وقت ہی حقیقت ہے۔ ماضی کو ہم اپنا کیوں میں کھو چکا ہے مستقبل نے حقیقت کا جامہ ابھی نہیں پہنا ہے جانے وہ آئے گا بھی یا نہیں!

"پونم کی وہ رات تمہیں رعنائیوں سے نم آلود لگی۔ کیونکہ اس وقت ماحول کچھ عجیب احساسات سے بھرپور تھا، مخملیں گھاس پر رات کو جب دودھیا چاند فی چھٹکی ہوئی مزاحیہ لہلہاتے کھیتوں میں تمہارا بوں جاگ پڑتا کچھ ایسا اچانک تھا کہ ماحول نے تمہارے احساسات میں ایک عجیب تبدیلی پیدا کر دی آنے یادوں میں کھو دیا مستقبل کے متعلق سوچنا بالکل بند کر دیا تھا تم وہاں حال کے جادو میں جکڑے ہوئے تھے۔"

"بچپن پر ایسے مسرت بخش لمحات اکثر طاری ہوا کرتے ہیں لیکن عمر کے بڑھتے ہوئے دھارے کے ساتھ ہی وہ اس عظیم صلاحیت سے محروم ہوتے جاتے ہیں، بھی کبھی اس خوشیوں بھرے لمحے کی یاد ہمیں تڑپا بھی جاتی ہے، وہ اپنی زندگی کو خوش گوار ماضی کی یادوں یا خوشیوں سے ہم کنار ہونے کی لگن دوڑ میں گزار دیتے ہیں، لیکن یہ اندیشہ بھی سوچتے رہتے ہیں کہ وہ زمانہ بھی کیسا سنہرا تھا جو درد و غم کے تمام نقش مٹا دیا کرتا تھا۔ اکثر وہ یہ حسرت کیا کہتے ہیں کہ

ہاش وہ سحر آگیں لمحات پھر سے ہمارے جیون پر رم جھم برسیں اور رنج و غم کے تمام زخموں کو دل سے دھو کر رکھ دیں یہی سبب ہے کہ اکثر زندگیاں ناکامیوں ناامرادیوں اور خواہشوں کا مرقع ہوتی ہیں۔ یہ لوگ زندگی گذارتے نہیں بلکہ بھگتتے ہیں"۔

شوپن ہار کا کہنا ہے "اکثر انسان انسان نہیں بلکہ فکرمند آدمی ہوتے ہیں۔ وہ حسین وادیوں سے گذرتے بھی ہیں تو یہی سوچتے ہوئے کہ گذشتہ سال کتنا نفع حاصل ہوا تھا اور اسے اور زیادہ کرنے کے لئے کیا ذرائع اختیار کرنے ہیں، وہ ہمیشہ یا تو ماضی میں ڈوبے رہتے ہیں یا مستقبل کے خاکوں میں غلطاں و پریشاں۔ وہ ہمیشہ کچھ بننے یا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں لیکن کبھی کچھ بنتے یا کرتے نہیں"۔

"اور انہی وادیوں میں ایک انسان آتا ہے جو "فکرمند آدمی" نہیں بلکہ ایک فنکار ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے زندگی بھر کسی فن پارے کی تخلیق نہ کی ہو پھر بھی وہ یہاں کے ان فنی رموز میں حسن کو دیکھتا ہے، اور شیدائی بن جاتا ہے فطرت کے حسن کا۔ وہ حسن کی کرامتوں کو دیکھتا ہے کیونکہ وہ مستقبل کے متعلق حیران و پریشان نہیں رہتا، اس لئے کہ کوئی یاد اسے نہیں ستاتی۔ پھر کیا ہے بس وقت کے رواں دواں دھارے رک جاتے ہیں۔ صرف وہ وہاں ہوتا ہے فطرت کی سحر انگیزیوں کا شکار حال کی رعنائیوں میں گم۔ وہ فطرت کی رعنائیوں کو دیکھتا ہے۔ اور سوچتا ہے حسن بھی کیا چیز ہے۔ اور مسرت بنا پکارے دوڑی چلی آتی ہے اور اس کے تمام وجود کو اپنی حیات بخش گود میں چھپا لیتی ہے"۔

"اہم بات یہ نہیں کہ تم اسے کن الفاظ میں پرو تے ہو، بلکہ اہم تر تو یہ بات ہے ان انجانی بیکراں مسرتوں سے لطف اندوز ہونا۔ اس کا احساس کرنا۔ کئی لوگوں کا یقین ہے کہ کائنات کی ہر شے جیسے ہوا کے جھونکوں سے لہلہاتے کھیت، پہاڑوں کے سلسلے، بادلوں کے سرسراتے آنچل، رم جھم برستی برساتیں، سب جاندار اشیاء ہیں۔ ان کے اپنے احساسات ہیں، اپنی روح بھی ہے۔ اگر ہمارا بھی یہی انداز فکر ہو جائے تو شاید اس کائنات سے ہم بھی محبت کرنے لگیں۔ مسرت بخش احساسات کی بنیاد ہی محبت ہے۔ لیکن ہماری یہ محبت مادہ پرستی یا نفع پرستی کی شکل میں نہیں ہونی چاہیئے دیکھو بلیک کا کہنا ہے ہر شے میں موجود یاں دیکھنے والا اپنی حد سے مسرتوں کا انگلا گھونٹ دیتا ہے، لیکن وہ جو آفاقی خوشیوں کو زندگی سے بوسہ دیتا ہے، ہمیشہ آسمانی خوشیوں کے سمندر میں تیرتا رہتا ہے۔

"مارٹن بیوبر کہتا ہے "ہم کائنات سے پرہم کر سکتے ہیں انسان جانور، کھیت، ستارے، ہر شے سے۔ اے عظیم رب! بالکل تیری طرح۔ اگر ہم پر تیرے میں ڈوب کر انہیں آوازیں تو وہ بھی ہمارے ہمنوا بن جائیں گے۔ عظیم مسرت یہی ہے خوشی کا جواب خوشی سے دینا"۔

میرا یقین ہے کہ اکثر انسان خوشیوں کے اس امرت رس سے جب چاہے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، ہمارے اکثر عمل ایسے ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے اپنی مکمل توانائی کے صرف ایک حصے کی ضرورت ہوتی ہے، بقیہ توانائی ہم خواب، تمنا، ماضی اور فکر فردا میں صرف کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ہی جسم کی نشوونما پر غور کریں یا تتلی کی سرسراہٹ اور پھولوں کی مسکراہٹ کے بارے میں سوچیں اور ایک لمحے ہی کے لئے کیوں نہ ہو، انکو ماضی و مستقبل سے اپنے دل و دماغ کو آزاد کر لیں تو یہ خوشی یہ پائیداری مسرت ہمیں نہال کر دے گی"۔

"تمہاری آنکھیں ایک پراسرار روشنی سے چمکنے لگیں گی۔ ایسے میں اگر کوئی تمہاری آنکھوں میں جھانکے تو وہ بھی اس عجیب خوشی سے ہمکنار ہو جائے گا"۔

والچیا پر میں ایک باغ کے قریب رکا۔ یہاں کی خاموش فضاؤں سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی لیکن میرا دماغ مستقبل کے کسی الجھنے رسمو سے میں غلطاں تھا۔ میں نے بہت دھیان سے یہاں کی سرسراہٹوں کو سننا اور حسن کو دیکھنا چاہا، میرا ذہن ماضی کی کسی یاد سے الجھا ہوا تھا۔

یکایک آکاش میں ایک طوفانی گرج سنائی دی، اوپر ایک جیٹ طیارہ اڑ رہا تھا، اس گھن گرج کے بعد فضاؤں پر سناٹا چھا گیا۔ انہیں خاموشیوں کی گہرائیوں سے ایک لے ابھری۔ کوک۔ کوک۔ قریب ہی کہیں کوئل اپنے نغمے الاپ رہی تھی۔ وہ سریلی آواز کانوں میں شہد گھولنے لگی، چند لمحے اور میرے خیالات وقت، سال اور زمانے کی تمام حدبندیوں سے آزاد حسن اور خوشی کے دھارے پر بہہ رہے تھے۔

(مرکز خیال۔ دین آموں کے ایک مضمون سے)

شاعر بمبئی

واپسی

ترقّی

کون کہتا ہے۔ ترقّی کی سنہری اسکیم ایک انجن ہے کہ جس میں نہیں مطلق اسٹیم
کاغذی پھول ہے جس میں نہ کشش ہے نہ شمیم
سُن کے افواہ عبث دل کو نہ مارا کیجے تھوڑی تکلیف تماشہ تو گوارا کیجے
آئیے ساتھ مرے چل کے نظارا کیجے
دیکھئے کتنی ترقّی پہ ہے قومی کردار ہم ہوئے، آپ ہوئے، یار ہوئے یا اغیار
ہیں سبھی غمزۂ محبوبِ "کرپشن" کے شکار
پہنچے اُس در پہ تو سب ہوگئے مجبورِ نیاز "نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
کتنی معراجِ ترقّی پہ ہے کالا بازار رُخ لیلائے گرانی پہ ہے کس درجہ نکھار
غلّہ نایاب ہے یوں، جیسے خزاں، وقتِ بہار
جس طرف دیکھئے قلّت کی فراوانی ہے قحط کی جلوہ گری، بھوک کی ارزانی ہے
کھیتیاں خشک ہیں دریاؤں میں طغیانی ہے
ہے پلاننگ کا یہ زور کہ غلّہ تو ہے کم تیز تر ہے مگر افزائشِ نسلِ آدم
اور ہم لوگ ہیں اب روبکشِ تیرِ اعظم
مُفلسی عام ہے اور بار کی رفتار ہے تیز شل ہے بازوئے عمل، نشۂ گفتار ہے تیز
بات ارزاں ہے، بیانات کا بازار ہے تیز
اشتہارِ غلہ بھرتا ہے ہر دم بے تاب ہے یہ معمول کہ روزانہ ہر اک عالی جناب
اوسطاً چار بیانات کا رکھتے ہیں حساب
ہے سخن ساز کا بر کی قیادت کو فروغ شہر و بستی میں ہے لفظوں کی تجارت کو فروغ
کس قدر آج ہے تقریر کی صنعت کو فروغ
کھیتیاں ہوتی ہیں تحلیل کے میدانوں میں فائلیں پلتی ہیں دفتر کے خیابانوں میں
ڈھیر وعدوں کا ہے اِن کاغذی کھلیانوں میں
کون کہتا ہے ترقّی کی سنہری اسکیم ایک انجن ہے کہ جس میں نہیں مطلق اسٹیم

ایک بحث

نئی شاعری کیوں؟

عمیق حنفی

سوال کیا گیا ہے، نئی شاعری کیوں؟ اس سوال نے ہمارے سامنے سوالات کا سلسلہ پیدا کر دیا ہے، نئی تہذیب کیوں؟ نئی معاشرت کیوں؟ نیا صنعتی نظام کیوں؟ نیا عہد کیوں؟ ان تمام سوالات کو اٹھانے والے اس تشکیک نے جو پرانے کے ذہن میں نئے کی چاہ پیدا کی ہے نئی شاعری ہر عہد میں ہوئی ہے، ہر عہد میں ارباب بست و کشاد اور حاکمانِ وقت کے قصیدہ گویوں اور ثنا خوانوں کے ہجوم سے علیحدہ الگ حقیقت بن، حق شناس اور تنقیدی بصیرت رکھنے والے شاعر پیدا ہوئے ہیں اور ان شاعروں نے دینِ بزرگاں کو خوش کرنے کے بجائے اپنے عہد کے انسان کی ذات کا سفر نامہ اپنے مشاہدہ احساس کے زیرِ بصیرت کیا ہے۔ ہمارے عہد کی نئی شاعری اس نئے ذہن و احساس کا اظہار ہے جو بدلے ہوئے اور بدلتے ہوئے حالات میں پروان چڑھ رہا ہے۔ یہ شاعری دراصل شاعری کی خود مختاری اور آزادی کا اعلان ہے، ایک بغاوت ہے، ہر اس عقیدے اور فرض کے خلاف جو انسان کو اور اس کے شعور و احساس کو اظہار کو محض اک کھلونا اور استعمال کی شے سمجھنے پر مُصر ہے۔ نیا عہد انسان کو فرد ذات اور شخصیت کے روپ میں ابھارتا ہے، نئی شاعری اس عہد کے اور اس کی روح کے ادراک کے پس منظر پر انسان کی ذات اور اس کی کائنات کے براہ راست و ٹھوس فاص انسانی تجربات محسوسات کو پیش کرتا ہے، وہ شاعرانہ شعور و احساس کو غیر انسانی قلابوں اور پابندیوں اور شرائط سے آزاد کر کے انسان کی اپنی ذاتی اور فطری زبان کے امکانات کی جہتوں میں ہمہ وقت مصروف ہے، اس کیلئے نام نہاد بڑے مسائل، بڑے حقائق اور ابدی اقدار کو موضوعِ سخن بنانا لازمی نہیں۔ اس طرح شاعری کا مختلف علوم و فنون میں تکرارِ مناصب (DUPLICTION OF FUNCTIONS) کا خطرہ نہیں رہتا۔ انسان کا چھوٹے سے چھوٹا اور حقیر سے حقیر تجربہ اور زندگی کا معمولی سے معمولی واقعہ شاعرانہ مطالعہ رکھتا ہے، پرانی شاعری روایات، تقلید، مفروضات، اصطلاحات، منشور، مذہب، اخلاق اور سیاست کو انسان اور شاعری پر فوقیت، اولیت اور افضلیت دیتی ہے، اور ان تمام کی تعمیر انسان کاہ پر شاعری اور انسانیت کو بھینٹ چڑھانے سے باز نہیں آتی، اس لئے نئی شاعری کو جنم لینا پڑا۔

نئے شاعروں میں سے PIONEERS کے علاوہ میر نیازی، بلراج کومل، وزیر آغا، خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، باقر مہدی، ظہور نظر، قاضی سلیم، عمیق حنفی، محمد علوی، فتح اقبال، شہزاد احمد، ساقی فاروقی، جمیل ملک، شہاب جعفری، کمار پاشی، شہریار، رحمان فارس، احمد فراز، محمود ایاز، عرش صہبائی، وشنو رائے، بریندر ساہنی، سلیم الرحمٰن، شفیق فاطمہ شعریٰ، الجیدہ ریاض، عادل منصوری، احمد ہمیش، ندا فاضلی، افضل تابش وغیرہ کا مطالعہ اس سوال کا بہتر جواب فراہم کر سکتا ہے کہ نئی شاعری کیسی ہے؟ نیا شاعر ایک جوگی ہے جو اپنی ذات اور شخصیت کو ایک تجربہ گاہ مانتا ہے، ویدانت کا عقیدہ ہے کہ جو کچھ برہمانڈ میں ہے وہی پنڈ میں ہے، برہمانڈ (آفاق، سائنس) کے حصے میں آیا ہے اور پنڈ (انفس، شاعری) کے۔ اگر آج عہد رفتہ میں بھگتی مارگ، تصوف، تسخیر و یدانت کیوں؟ کا جواب دے سکے، میں تو آج نئی شاعری کیوں؟ کا جواب پانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

شہریار

شاعری چاہے نئی ہو یا پرانی، اس کا بنیادی منصب اور مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کے حواس کو متحرک اور دماغ کو بیدار رکھے، انسانیت کی اعلیٰ

اقدار کی حفاظت کرے اور زندگی اور زمانے میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا فریضہ بھی انجام دے۔ اس کے لئے اپنے عہد کا ذہنی و جذباتی کیفیات کا عرفان، فکر کی تہذیبی مسائل کی آگہی، معاشی و معاشرتی ناہمواریوں اور تضادات کے تسلسل کا شعور، توہمات، تعصبات اور تنگ نظری کی آویزش اور کشمکش کا احساس اور سب سے زیادہ ذات اور کائنات اور فرد اور جماعت کے باہم بدلتے ہوئے رشتوں کی بصیرت ضروری ہے۔ وقت کے ساتھ ان کی نوعیتیں اور صورتیں اور اہمیت بدلتی رہتی ہے ہر عہد اپنے POINT OF EMPHASIS سے پہچانا جاتا ہے اور اس کا عرفان روح عصر کہلاتا ہے۔ نئی شاعری وہ ہے جو روح عصر کو پیش کرے پرانی شاعری اس کو کہتے ہیں جو POINT OF EMPHASIS بدلنے کے ساتھ نہیں بدلتی۔ لیکن پرانی شاعری اگر وہ شاعری ہے خراب شاعری نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ بہر حال کسی نہ کسی عہد کی روح کو ضرور پیش کرتی ہے اور نہ نئی شاعری پرانی شاعری سے انکار کرنے سے وجود میں آتی ہے نئی شاعری پر گفتگو کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ کسی چیز سے انکار کا لازمی نتیجہ کسی دوسری چیز کا اثبات نہیں ہوتا۔

نئی شاعری اپنے عہد کی پیداوار ہے اور اگر ہم حقیقتوں سے جی چاہے وہ تلخ ہوں یا شیریں آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو نئی شاعری کا مطالعہ ہمارا فرض ہے۔ ظاہر ہے کہ حقیقتیں چھوٹی بھی ہوتی ہیں اور بڑی بھی ایسی حقیقتیں بھی ہوتی ہیں جن کا تعلق عرف عام کی ایک ذی ہوش انسان سے ہوتا ہے اور کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا تعلق کسی ایک فرد سے ہوتا ہے جماعت تو بڑی کائنات سے ہوتی ہے لیکن چھوٹی بڑی تلخ یا شیریں ہونے کے باوجود وہ حقیقتیں ہی ہوتی ہیں۔ انسان کی ازلی اور ابدی فکر یہ ہے کہ اسے حیات و کائنات کی پوری کل سمجھ آئے جس سے وہ مانوس ہو جو اسکا ہے دشمن جذبہ کی تخلیق ہو۔ نئی شاعری کی مخالفت انسان کی اسی ازلی اور ابدی فکر کی نتیجہ ہے لیکن شعر و ادب اور زندگی سے سنجیدہ اور حقیقی دلچسپی رکھنے والوں کا ایک بڑا گروہ نئی شاعری کو نہ صرف پسند کرتا ہے بلکہ پسند بھی کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نئی شاعری کسی مخصوص پیام، کسی نظام، کسی فلسفے کی تائید اور تبلیغ نہیں کرتی لیکن کیا آج کوئی ایسا پیام، نظام اور فلسفہ ہے جس پر انسان کا کامل ایمان ہو اور جس سے انسان اور انسانیت کی نجات وابستہ کی جا سکے، تو پھر کیا نئی شاعری وہ سچے بولے جسکے کھوٹا ہے ہر انسان واقف ہے۔

مندرجہ ذیل میں چند لیے شعرا کے کلام سے کسی نہ کسی نئی شاعری کے نمائندہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اختر الایمان، مینب الرحمن، قاضی سلیم، خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر، شاذ تمکنت، بلراج کومل، شہاب جعفری، راہی معصوم رضا، حسن نعیم، محمد علوی، شہریار، عمیق حنفی، کمار پاشی، عاطف منصوری، ندا فاضلی، بمل کرشن اشک، احسن کمال، محمود ایاز، شفیق فاطمہ شعری، زبیر رضوی، مظفر حنفی، حبیب تنویر، پکاش فکری، محمود سعیدی، باقی، شمس الرحمن فاروقی، علیم اللہ حالی، مغنی تبسم، شمیم حنفی، صحف اقبال توصیفی، وارث کرمانی وغیرہ۔

کمار پاشی

ان دونوں جس شاعر کے ہاں اداسی، تنہائی، خوف، شہری زندگی کے کرب وغیرہ کا اظہار ملتا ہے اسے جھٹ سے نئے شاعروں کی فہرست میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ نئی شاعری حقیقتاً یہی ہے تو پھر سب نئے اور پرانے شاعروں کی تصویریں اس چھلنی میں بڑی آسانی کے ساتھ فٹ کی جا سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے تو میر صاحب بھی تھے جو عطار کے لونڈے سے شفا فرماتے تھے۔ اور اس سے وصال نہ ہو سکنے کی صورت میں اداس اور تنہا رہ گئے تھے اور اپنے بند مکان میں پڑے پڑے رو دی کی شدت سے چلاتے تھے، شور مچاتے تھے۔ اور پڑوسیوں کی نیند خراب کرتے تھے۔ تو نئے شاعروں کی فہرست میں سب سے پہلے میر صاحب کا نام لکھ لیجئے۔ مگر اس سے پہلے غالب کا بھی، اور پھر غالب اور قدیم، حسرت، فانی، جگر وغیرہ تمام بڑوں کے نام لکھئے۔ یہ بیچارے بھی اپنی زندگی میں بہت اداس تھے، بہت تنہا تھے اور اپنی اپنی نوعیت کا خوف بھی تھا۔ اب رہا شہری زندگی کا کرب، تو مسئلہ ان کے وقت میں نہیں تھا۔

اب میں اس نکتہ کو سامنے رکھ کر نئے شاعروں کی فہرست تیار کروں تو بہت سے (خود ساختہ) نئے لوگ بد کیں گے اور بغیر کسی جھجھک کے میری اس فہرست کو رد کر دیں گے لیکن اب گھبرائیے نہیں میں ایسی کوئی فہرست تیار کرنے والا نہیں ہوں۔ کیونکہ میں دکھنی سے لیکر فراق تک سبھی شاعروں کو پڑھا ہے اور نئی شاعری کو بھی۔ اور بتا سکتا ہوں کہ آخر کیوں وہ ہم سے الگ ہیں اور ہمارے اور ان کے درمیان کا فاصلہ کس نوعیت کا ہے۔

اداس، تنہا اور خوفزدہ تو سبھی تھے۔ پرانے دور میں میر بھی، غالب بھی، حسرت بھی، اصغر بھی، اور اداس، تنہا اور خوفزدہ اس عہد کا شہزاد احمد بھی ہے اور بلراج کومل بھی۔ لیکن پرانے گروہ کا شاعر تو خالی خولی اشتیاق میں گرفتار تھا، محبوب کو یاد کیا تو بیٹھے بیٹھے اداس ہو گیا۔ اور تنہائی میں دو آنسو بہا لیے۔ عاشق صاحب کی طرح بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ لیکن شہزاد احمد اور بلراج کومل نے تو کسی عطار کے لونڈے کو دیکھا تک نہیں، پھر بھی وہ اداس ہے، تنہا ہے

اور خوفزدہ ۔ تو یقیناً ہمارے بزرگوں کا مسئلہ کچھ اور تھا اور ہمارا مسئلہ کچھ اور ہے اور جب ہم اس اور ان مسئلوں کے فرق کو سمجھ لیں گے، نئے پرانے شاعر یا نئی پرانی شاعری کا فرق واضح ہو جائے گا۔ اور ہم بڑی آسانی کے ساتھ کہہ سکیں گے کہ ہمارے بزرگ نکمے تھے اس لئے کہ اس خاص وقت میں شاعری نہیں کرتے تھے بلکہ کچھ اور کرتے تھے لیکن اب ہمیں شعبدوں کی نہیں، شاعری کی ضرورت ہے اور ہم مداری نہیں چاہتے، شاعر چاہتے ہیں۔

اب میرے سامنے سارتر کے ناول LA NAUSEE کا کردار ROQUENTIN ہے جو اس دور کی نمائندگی کرتا ہے، وہ بھی تنہا، خوفزدہ اور اداس ہے لیکن اس کی پرابلم یہ نہیں کہ وہ اکیلا ہے ۔ بلکہ اس کی پرابلم تو یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں ہے ؟ وہ چاہے تو ہجوم میں خود کو کھو سکتا ہے، اور اپنا تنہا پن ختم کر سکتا ہے۔ لیکن خدا کے زوال اور زندگی کی بے مقصدیت کا حل اس کے نزدیک یہ نہیں ہے، زندگی اپنی تمام تر بے معنویت کے ساتھ اس کے سامنے برہنہ آ کھڑی ہوتی ہے سائنس اور مشینی زندگی نے کائنات کے تمام اسرار کا گرہ کھول کر رکھ دی ہیں اور خدا کے وجود کو مکمل طور پر ختم کر دیا ہے اور اب ROQUENTIN اس پھیلے ہوئے آسمان کے نیچے اپنے وجود کو کاندھے پر اٹھائے پاگلوں کی طرح شہر در شہر بھٹک رہا ہے ROQUENTIN اس درد کا نمائندہ کردار ہے جس کی پرابلم سے میرے صاحب دانے گودہ کو کوئی علاقہ نہیں۔ اسلئے میں نے کہا تھا کہ ہمارے بزرگوں کا مسئلہ کچھ اور تھا اور ہمارا مسئلہ کچھ اور ہے اور جب ہم ان اور ان مسئلوں کے فرق کو سمجھ لیں گے نئے پرانے شاعر یا نئی پرانی شاعری کا فرق واضح ہو جائے گا۔

ندا فاضلی

میں آج کا آدمی ہوں، سلگتے اندھیروں اور جھلستی دھوپوں کے جنگل میں سانسیں لیتی ایک اجنبی آواز، آج کی لعنت، ایک خدا آدم آئینہ۔ جو ہر وقت میرے گلے میں طوق کی مانند لٹکا رہتا ہے۔ اس آئینے نے میرے وجود کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے، میں جو آئینے کے باہر ہوں، میں جو آئینے کے اندر نظر آتا ہوں اور اپنے ہی ننگے پن کے نشے سے ہر دم اپنے آپ کو گود تا رہتا ہوں، پرکٹے پنچھی کی طرح جب بھی جست بھرنا چاہتا ہوں، اندھے سنہ گر گرا جاتا ہوں۔

ان دو زندہ گوشت کے ٹکڑوں کے درمیان ایک اور میں ہے جو ایک تماشائی کی مانند اس درمیانی فاصلے کو ناپتا رہتا ہے، اس میرے 'میں' کو کیا نام دوں، کیوں نہ اسے عصری شعور کے نام سے پکارا جائے۔

ہم تینوں ایک دوسرے میں گھل مل جانا چاہتے ہیں، انگریزی نقادوں کا باپ کنسر اسی تکمیلی ارتباط کو موجودہ تہذیب کا ایک بہت بڑا مسئلہ مانتا ہے جس کے ساتھ کاوہ دھرتی کے مستقبل کو بھی جوڑ دینا چاہتا ہے۔ لیکن کوئی 'میں' کتنی گہرائیاں، کتنی دھرتیاں، کتنی تنہائیاں!

کتابی علامات، شاید کبھی کام آتے رہے ہوں، مگر اب تو ان منتروں میں صرف گھسے پٹے الفاظ ہی نظر آتے ہیں، حالانکہ بازاروں میں اب بھی یہ کرنٹ کرنسی کی طرح بھنائے جاتے ہیں، سانسوں کی مضبوط رسی سے بندھا ہوا یہ تین ٹکڑے آدمی ..... کھاتا پیتا سمجھتا ہے ..... ہنستا کھاتا بھی ہے لوگوں سے گھلتا ملتا بھی ہے... استاد عظیم آبادی کا شعر ہے ؎

غضب ہے آدمی کے واسطے محبوب ہو جانا　　زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا نرم ہو جانا

ان ضرورتوں کی جبریہ تکمیل کے لئے جھوٹے چہرے، جھوٹی آوازیں ..... اور جھوٹے آدرش کی نقابوں سے وہ اپنے آپ کو ہر دم چھپائے رہتا ہے، ہم سب اپنے اپنے جھوٹ کو اپنے دائروں میں بناتے سنوارتے رہتے ہیں۔

نئی شاعری پرانی نقابوں اور مندروں کی بکھراؤ کے تضاد کا نفسیاتی ڈرامہ ہے، اردو میں ترقی پسند شاعری صرف اوپری نقابوں کی شاعری تھی جو بھیڑ کا ٹھہری ہوئی تصویر کشی ہی تک محدود رہی، موضوعات چلتی پھرتی زندگی سے نہیں بلکہ سوچی ہوئی زندگیوں سے فارمولوں کی صورت میں لئے جاتے تھے جبکہ پھر بھی زندگی سے بڑی سرکردہ زندگی ہے جو افراد سماج میں عملی طور سے جیتے ہیں۔ جس میں سیدھا پن نہیں..... نتائج پہیلیاں لگتی ہیں اور گتھیاں پڑی ہوئی ہیں، ترقی پسند گروپ کی اوپری کاڑھا نچے دار ہمیشہ سناٹا ہی ہوتا ہے، ہاں کو پورا آدمی سمجھتے رہے، یہ ایک بڑی غلط فہمی تھی، یہی وجہ ہے کہ ۳۶-۳۵ کی بیشتر نظموں میں تصویری نوک پلک اور رنگ و روغن تو ہے مگر سانسوں کی گرمی اور جسمانی حرارت کا احساس نہیں ہوتا۔

نیا ذہن اس مصنوعی نقطۂ نظر کے خلاف ایک گہرا رد عمل ہے۔ نئی شاعری پورا آدمی اپنے فطری روپ میں پیش کرتا ہے، دوڑتے ہانپتوں کے ساتھ بیٹھ کے بل گھسٹتا آدمی، ہنستا کھیلتا آدمی، بند کمرے میں اپنے آپ سے لڑتا جھگڑتا آدمی، بھیڑ میں رہتے ہوئے خود اپنی ہی ذات سے کتراتا آدمی ..... نئی شاعری کے تیور اثباتی نہیں منفی ہیں۔

(ماخوذ)

علی عباس امید

غزل

منزلوں سے دل کو بہلا رہگزاروں کو نہ چھیڑ
زندگی یوں مسکرا کر خاکساروں کو نہ چھیڑ

سرنگوں ہیں آرزوئیں اور تمنائیں اداس
اے خزاں نا آشنا تشنہ بہاروں کو نہ چھیڑ

تھی کبھی اک رسم لیکن اس زمانے میں نہیں
بھول جا مہر و وفا کو ماہ پاروں کو نہ چھیڑ

ہے انھیں کے خون سے یہ تابشِ رنگِ سحر
جل اٹھے گا دامنِ دل سوگواروں کو نہ چھیڑ

اڑتے لمحوں میں ہے خوشبو کتنی یادوں کی نہ پوچھ
ذکرِ مہر و ماہ کر کے دل کے تاروں کو نہ چھیڑ

بجھ چکی شمعِ تمنا، بجھ چکی شمعِ امید
راہ لگ اپنی صبا تو غم کے ماروں کو نہ چھیڑ

خالد رحیم

غزل

(اعجاز صدیقی کی غزل سے متاثر ہو کر)

رسنے لگے ہیں دل میں تری بے رخی کے زخم
گہرے ہوئے کچھ اور غمِ زندگی کے زخم

پھر تجھکو ڈھونڈنے چلے یادوں کے قافلے
پھر تازہ ہو گئے ہیں غمِ عاشقی کے زخم

بس اے نگاہِ یار تجھے ڈسے نہ پھر فریب
اب تک بھرے نہیں ہیں تری دوستی کے زخم

ہم نے ہی چن لئے ہیں چمن سے غموں کے پھول
دنیا نے ورنہ بیش کئے تھے خوشی کے زخم

یہ اتفاق تھا کہ نظر تجھ سے مل گئی
دیکھے ہے ورنہ کون کسی اجنبی کے زخم

قائم ہے اب بھی تیرے خیالوں کا سلسلہ
اب بھی سلگ رہے ہیں تری دوستی کے زخم

ڈرتا ہوں میں رحیم کہ ناسور بن نہ جائیں
انسانیت کے جسم پہ یہ بے بسی کے زخم

شاعر بمبئی

بیادِ اکبر الہ آبادی

کرشن چندر ——— روحِ اَخذ

اکبر الہ آبادی — اور اُردو

● گزشتہ مہینے بزمِ شعرا بمبئی نے اکبر الہ آبادی کی یاد میں ایک خاص اجلاس اجتماع کیا تھا۔ جس کی صدارت کرشن چندر نے کی تھی۔ یہ مقالات اُسی اجتماع کے ہیں۔ ——— (ادارہ)

کچھ ایسا لگتا ہے جیسے اکبر الہ آبادی آج بھی ہم میں زندہ ہیں۔ ہمیں کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں اُن کی برسی نہیں منانی چاہیئے۔ سالگرہ منانی چاہیئے۔ کیونکہ اُن کا کلام آج بھی زندہ و تابندہ ہے، جواں سال زندگی بخش اور قہقہہ زار ہے۔ سیکڑوں محفلوں کی جان ہے۔ لاکھوں گھروں میں بڑے ذوق و شوق سے سُنا اور سُنایا جاتا ہے۔ میر اور غالب کے بعد سب سے زیادہ حوالے اگر کسی اور دیوانِ شاعر کے کام میں دیئے جاتے ہیں تو وہ اکبر الہ آبادی ہی ہیں۔ میں بزمِ شعرا کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے ایسے بلند مرتبت، عظیم زندہ دل شاعر کی یاد کو تازہ رکھنے کیلئے یہ بزم منعقد کرکے اسمیں شرکت کرنے اور اپنے گلہائے عقیدت پیش کرنے کا موقع دیا ہے ۔ بزمِ شعرا نے یوم اکبر منعقد کرکے اکبر کا ثواب حاصل کر لیا ہے۔ نئی نسل کے جدید شعرا کی طرح اکبر الہ آبادی، مارائی اور مابعد الطبیعاتی باتیں نہیں کرتے۔ وہ ہماری آپ کی طرح اسی دنیا کے رہنے والے ہیں، اور اسی دنیا کی باتیں کرتے ہیں۔ اُن کا کلام پڑھ کر یہ گمان نہیں ہوتا کہ آپ کسی جیتاں میں گم ہو گئے یا شمع کے معنے حل کرنے میں لگ گئے۔ جی نہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں صاف اور بے دھڑک کہتے ہیں۔ آپ کے منہ پر کہتے ہیں، اور اکثر بیان میں کہتے ہیں جو سب کی سمجھ میں آتا ہے۔ وہ ایک مقصدی شاعر ہیں، ان معنوں میں کہ وہ اسی دنیا کے مسائل سے اپنی شاعری میں بحث کرتے ہیں اور آفاقی کی دور دراز کی پنہائیوں میں گم نہیں ہو جاتے کہ قاری کے پلے بجز ایک بے معنی گونج کے کچھ نہ پڑے۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری اسی زمین کی شاعری ہے اسی دھرتی کی بو باس اس میں رچی ہوئی ہے۔ اور یہیں کے مسائل کا اس میں بیان ہے، اور اسی لئے وہ زندہ ہیں۔ آفاق کی منزلوں کو پار کر جانے والے شاعر آفاق سے اُدھر ہی کہیں زندہ رہتے ہوں تو ہوں، اِدھر تو ان کا گزر ممکن نہیں۔

ایک فخر کی بات آپ سے کہتا ہوں، یہ دنیا بڑی سنگ دل ہے، یہ زمانہ کو تو زندہ رہنے نہیں دیتی جو جبراً خاکی چھوڑ چکے ہیں، اُن کے حاصل کو یہ نہ کبھی آج تک زندہ و تابندہ مانتی ہے! تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری میں جن مسائل سے بحث کی ہے، وہ آج بھی ہم میں زندہ ہیں اور ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔

آج کل علامتی شاعری کا بہت چرچا ہے، اکبر نے آج سے بہت پہلے ہماری زندگی کے مسائل کو نے کہ چند علامتیں وضع کی تھیں انگریزوں کے لئے صاحب اور میم، مغرب زدہ تہذیب کے لئے انجن اور ریل، غریبوں کے لئے بہ عنوان کلو اور جگن، امیروں کے لئے لالہ اور بنیا، سیاست کے لئے چندہ اور لیڈر وغیرہ وغیرہ..... یہ بہت تکنیکی اور واضح علامتیں ہیں۔ علامتیں کم اور تعینیں زیادہ ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے ان پر کڑے اور بھرپور وار کئے ہیں، زندگی کا کوئی گوشہ اکبر کی تیز نگاہ سے نہیں بچا۔ آج کل کے لیڈروں پر ؎

خدا کی راہ میں پہلے بسر کرتے تھے سختی سے
محل میں لیٹ کر اب عشق قومی میں تڑپتے ہیں!

یہ شعر سُنیئے لگتا ہے، ہندوستان اور پاکستان کا سرد جنگ کے بارے میں کہا گیا ہے اور وہ بھی مارشل لاء سے پہلے ؎

نہ سرکاری پولیس کی ہے نہ جاری مارشل لا ہے
کوئی شورش نہیں ہے، ہر طرح سے خیر صلا ہے
یہ کلکتہ کی شوخی اور یہ ڈھاکے کی سنجی ہے
وہ ایک فرشی کبڈی ہے، یہ نفلی گنبد بلا ہے
یا تاشقند کی لڑائی سے متعلق ؎

خوب لڑوایا ہم دل کھول کھول کر
مار ڈالا راولپنڈی نے قوم کو،
تیغ اپنی رنگ کو کیا کریں، ریشے کو کیا کریں!
مذہب کے جھگڑے چھڑیں تو پیشے کو کیا کریں!

امیری غریبی کے تضاد اور اس کی باہمی چپقلش سے بھی اکبر غافل نہیں

تھے۔ کہتے ہیں۔

دُنیا سے تم کو کم فرصت، یہاں فاقے سے کم خالی
چلو بس ہو چکا فیشن، تم خالی، نہ ہم خالی

شکم سے حضرتِ انساں نجات پا نہ سکے
اب اپنے پیٹ میں ہیں، پہلے ماں کے پیٹ میں تھے

یہ سُنیے کیسا لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔

ہے نورِ خدا بھی طالبِ رزق، درست
داڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

اور یہ شعر بھی ہوشربا گرانی اور مہنگائی اور عوام کی زبوں حالی کا آئینہ دار ہے ؎

پکا لیں بیسیا کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لاتا
ہمارا کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

مگتا ہے بالکل آج ہی کہا گیا ہے۔

اہلِ مغرب کی تقسیم کاریوں سے اکبر بخوبی واقف ہو چکے تھے انہیں جس طرح انھوں نے نکلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کئے، بھائی کو بھائی سے جُدا کیا۔ ہندو، تینام، کھدیا، سندگاپور، ملایا میں خطِ تقسیم کھینچا، وہ اکبر سے بہت بعد کی بات ہے مگر اکبر آنے والے زمانے کو دیکھ رہے تھے چنانچہ کہتے ہیں ؎

پُورب والے جو چاہیں دل میں بھر دیں
جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچے رہے ان کی تیزیوں سے اکبر
تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

اصل میں اکبر تعلیمِ نسواں کے خلاف تھے اور عورتوں کی ترقی کے وہ سخت مخالف تھے جس کے تحت بہت سی خواتینِ مغرب کی نقالی کرتے ہوئے اپنے فرائض بھول گئی ہیں، مثلاً ؎

اُن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کا پاٹھ کی
یہ نہ بتلایا کہاں پر رکھی ہے روٹی رات کی
حسرت بہت ترقیِ دختر کی تھی انہیں
پردہ جو اُٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

اور اس بات کو یوں اور بھی واضح کیا ہے ؎

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں، وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذکرِ شاہی کے لال قلعے سے بھی اکبر بخوبی آگاہ تھے اور یہ دلی اور نبیوں میں جو جملہ باز رہتی ہے، اس پر بھی ان کی نظر تھی۔

بابو نہیں نکل گئے اس عہد میں تو خیر
رہنا پڑا ہے نبیوں کو مچھلی کے پیٹ میں

احساس ہوتا ہے کہ اکبر الہ آبادی نے مندھرا سکندر ٹال کے لب شعر کہا ہوگا، اور اب سُنیے ایک شعر فیلی پلاننگ پر....

حج کو کیونکر جائیں کارِ خانگی کو چھوڑ کر
اتنی کثرت ہو جو چوہوں کی تو بلی کیا کرے

اور یہ گھر کا کاٹ والا طنزیہ شعر شاید کارل مارکس کو پڑھ کر کہا ہو

کافی ہیں امیروں کو قوانینِ گورنمنٹ
مذہب کی ضرورت تو غریبوں کیلئے ہے

آخر میں میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اکبر الہ آبادی کی عظمت محض اس بات میں نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل پر نظر رکھی۔ محض اس بات میں بھی نہیں کہ انھوں نے اپنے سے آگے آنے والے عہد کے مسائل کو بھانپ لیا، اور اس لئے وہ آج بھی ہمیں اپنے پیش رو ہی نہیں، اپنے ہم عصر بھی معلوم ہوتے ہیں۔ محض اس بات میں بھی نہیں کہ انھوں نے اعلیٰ ظرفی و فراست سے کام لے کر ہمیں ہنسایا، اعلیٰ ادب میں مزاح و ہجو کے ایک دیرینہ روایت کی روح بھی جھلکنی چاہیئے اور وہ بھی اکبر کے پاس موجود ہے، خلوص کا گداز، افسوس کی نمی اور زیرکِ ظرافت آہوں کی ایک ہلکی ہلکی مسلسل رَو.... اپنے چمن کی پامالی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی۔

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے
صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہے باقی جنابِ قبلہ میں
کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے!

نبوت کا زمانہ اور تھا اب اور جھگڑا ہے
وہاں بسنے میں قرآں تھا یہاں بسنے میں لیگ ہے

ایسا قاتل زہر خند جس کے پاس ہے اس کا نام ہے اکبر الہ آبادی۔ وہ جس زبان کا وہ شاعر ہے اس کا نام ہے اردو، دونوں زندہ رہیں گے۔

ماہنامہ "الفاروق" بمبئی
ستمبر ۱۹۶۶ء

شاعر بمبئی
خواجہ احمد عباس

کیا میں نے خواب دیکھا تھا؟

بمبئی کے صابو صدیق اسکول ہال میں پچھلے ہفتے اکبر الہ آبادی مرحوم کی پینتالیسویں برسی منائی گئی۔ وہاں جانے کے ارادے سے میں گھر سے نکلا تھا کہ بس میں ایک بزرگ سے ملاقات ہو گئی۔ بمبئی میں نو وارد لگتے تھے جیسے بہت دور سے آئے ہوں۔

ساٹھ سے زیادہ عمر ہو گی لیکن آنکھوں میں جوانی کی چمک تھی۔ اور ایک عجیب سی معصومانہ شرارت آواز بھی نوجوانوں کی طرح کھنکھارتی تھی۔ چہرے سے ایسا لگتا تھا جیسے زیرِ لب دنیا اور دنیا والوں پر خاموشی سے ہنس رہے ہوں۔

بس میں میرے برابر بیٹھے تھے، فرمایا "کیوں صاحبزادے کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا "اکبر الہ آبادی کی برسی منائی جا رہی ہے، وہاں جا رہا ہوں۔"

"وہاں کیا ہو گا؟" بڑے میاں نے بڑی دلچسپی سے سوال کیا۔

"تقریریں ہوں گی، اکبر کی زندگی، اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی جائے گی۔"

"روشنی ڈالی جائے گی؟" انھوں نے سوال کیا۔ "کیا اب تک وہ اندھیرے میں تھے؟"

"روشنی ڈالی جائیگی کا مطلب ہے کہ ان کے بارے میں تقریریں ہوں گی۔ ہمارے ہاں روشنی ڈالنا محاورہ ہے، ہر چیز پر روشنی ڈالی جاتی ہے، یہاں تک کہ چاند اور سورج اور ستاروں پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔"

شاعر کا کلام فلمسٹار کی زبانی

"خوب تو روشنی ڈالی جائے گی، اور کیا ہو گا؟"

"کسی فلم اسٹار کی زبانی اکبر الہ آبادی کا کلام سنایا جائے گا۔"

"یہ فلم اسٹار کون ہوتا ہے؟"

"ہوتا کبھی ہے اور ہوتی کبھی ہے۔ کسی خوبصورت نئے چہرے کو دعوت دیا جائے گا کہ اکبر کا کلام سنائے۔"

"کیا اکبر کا کلام اتنا بدصورت ہے کہ اس کو سنانے کے لئے خوبصورت چہرے کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ آپ کو نہیں معلوم کہ یہ ساری دنیا خوبصورت چہروں کی مدد سے چلتی ہے، خوبصورت چہرے صابن بیچتے ہیں، بناسپتی گھی بیچتے ہیں، کپڑا بیچتے ہیں، خوبصورت چہروں کی مدد سے سیاست داں الیکشن جیتتے ہیں، اور مُردہ شاعر زندہ کئے جاتے ہیں۔

— آج بھی ایسا ہی ہونے والا ہے۔"

وہ جس کو بلانا بھول گئے

"پروگرام بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے، مجھے بھی وہاں لے چلو۔"

"وے حضرت آپ کیسے جا سکتے ہیں، آپ کے پاس دعوتی کارڈ ہے؟"

"وہ تو نہیں ہے۔ شاید وہ لوگ مجھے بلانا بھول گئے ہیں۔"

"تو پھر آپ وہاں نہیں جا سکتے، وہاں بڑی بھیڑ ہو گی، جن کے پاس کارڈ نہیں ہوں گے، اُن کو دروازے پر روک دیا جائے گا۔"

"تو ایک کام کرو، میری آواز وہاں تک پہنچا دو۔"

"وہ میں کر سکتا ہوں، میں ایک جرنلسٹ ہوں، اور رپورٹر کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں آپ کی آواز عوام تک پہنچا دوں، آپ چاہیں تو میں آپ کا انٹرویو کر سکتا ہوں۔"

"یہ انٹرویو کیا ہوتا ہے؟"

"بس سوال جواب سمجھیے۔ میں آپ سے سوال کرتا جاتا ہوں آپ جواب دیتے جائیے۔"

"بہت خوب۔ آپ شوق سے سوال کیجیے۔

سوال: پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال کے بعد ملک کی جو حالت ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: نہ پالیسی رہی نہ وہ پالیسی کہ آنجناب رہے
نئے طریق فقط جان پر عذاب رہے

سوال: وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ اُس کی بیٹی نے اُٹھا رکھی ہے دُنیا سر پر
خیریت گذری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا

سوال:۔ پارلیمنٹ کا الکشن ہونے والا ہے، اُس میں اُمیدواروں کو آپ کیا مشورہ دیتے ہیں۔

جواب:۔ سوچ تجھ کو ہے اگر آئندہ کی
لے تاریخ سے مدد اور شہری سے فال دیکھ

سوال:۔ بنگال میں صورت حال نازک ہوتی جارہی ہے۔ وہاں کے حالات کو بہتر بنانے کیلئے کیا کیا جاسکتا ہے؟

جواب:۔ شوق قول و عمل میں اس کی فطرت کو ہے اگر
بات بنگلا کی سُن، بنگالوں کے بال دیکھ

دل اور عقل

سوال:۔ مسلمانوں کو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلا جانا چاہیئے؟

جواب:۔ دل یہ کہتا ہے کہ ہجرت ہند سے لازم ہے اب
عقل کہتی ہے کہ اکثر اور ذرا کر سال دیکھ

سوال:۔ اور کمیونسٹوں کے کارپوریشن کے ممبروں کو آپ کیا صلاح دیتے ہیں؟

جواب:۔ لبا لب حلقۂ میونسپل دیکھ
تجھے کیا کام ہے جا پان دجیں سے

سوال:۔ ہمارے ملک میں مذہب کے نام پر جھگڑے فساد ہوتے رہتے ہیں مذہب کی بنیاد پر جو تفریق کی جاتی ہے، اُس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندو مسلمان الگ الگ قومیں ہیں؟

جواب:۔ وہی انساں وہی آنکھیں وہی جینا وہی مرنا،
کہیں اللہ اکبر ہے، کہیں الحاد کا غلغلہ ہے

"ہر ایک مذہب میں کافر ہیں"

سوال:۔ تو پھر اصولاً مذہب کی اہمیت کے بارے میں آپکا کیا عقیدہ ہے؟

جواب:۔ کیا ہے مذہب ایک کلی اور سوشل نظام
یہ نہیں پہچان ہر گز کافر و دیندار کی
صورت و اشکال کا اکثر نہیں ہے اعتبار
ہیں فقط یہ عادتیں رفتار کی گفتار کی

سوال:۔ شراب بندی کے قانون کے بارے میں کچھ فرمایئے؟

جواب:۔ ذوقِ عرفاں جو نہ ہو باندہ پرستی اچھی
ہوش اگر دیں سے غافل ہو تو مستی اچھی

سوال:۔ آپ شراب بندی کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ ڈراری بھائی جیسے سماج سدھارک اور رفیاہ مرکے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب:۔ گردن رفیاہ مرکی ہر اک سمت تن گئی
بگڑی جو ملک و قوم کی اُن کی تو بن گئی

دشمنوں سے دوستی کرنے والے

سوال:۔ ان ہندوستانی سیاست دانوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے، جو کہتے ہیں کہ ہندوستان کو اپنی غیر جانبداری کی پالیسی کو چھوڑ کر امریکی جنگی کیمپ میں شامل ہو جانا چاہیئے"؟

جواب:۔ مُرید دہر ہوتے وضع مغربی کر لی
نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی
نگاہ نازِ بتاں پر ستیاہ دل کو کیا
زمانہ دیکھ کے دشمن سے دوستی کر لی

سوال:۔ مگر ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی بہتری کے لئے امریکہ سے دوستی کرنا کا مشورہ دیتے ہیں۔

جواب:۔ انہیں کی مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری بات اُنکی
انہیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی

سوال:۔ پردے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی نامرد ہو گئے

سوال:۔ ہمارے ملک میں بڑے بڑے عالم، فاضل، قابل سائنس داں اور ہنرمند پڑے ہوئے ہیں پھر کیا ہم ترقی کیوں نہیں کر پاتے؟

جواب:۔ ہُنر سے بھی فوائد ہم کو حاصل ہو نہیں سکتے
سبب یہ ہے کہ ہم آپس میں یکدل ہو نہیں سکتے

جس بس اسٹاپ پر مجھے اُترنا تھا، وہ قریب آرہا تھا۔ میں نے کہا۔ مولانا اب ایک آخری سوال اور پھر انٹرویو ختم۔

سوال:۔ اگلے الکشن کا زمانہ قریب ہے، کانگریس پارٹی کے لیڈر پھر ووٹ مانگیں گے۔ کیا یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ایک بار پھر ان کو حکومت سونپی جائے۔

برابر کی سیٹ خالی تھی

جواب:۔ معین ہما نہیں جن کے عقول و ماخذ اے اکبر
قیامت تک وہ سرداری کے قابل ہو نہیں سکتے

میں نے چونک کر کہا "اکبر؟ کیا آپ بھی اکبر تخلص کرتے ہیں؟"
لیکن میرے برابر کی سیٹ خالی تھی۔ میں نے کنڈکٹر سے پوچھا
"ارے بھئی وہ داڑھی والے بزرگ کیا ہوئے جو میرے
پاس بیٹھے تھے؟"
اور کنڈکٹر نے کہا۔
"نشے میں ہو یا خواب دیکھ رہے ہو۔؟"

(ڈھنڈورچی۔ بمبئی)

اکبر الہ آبادی

نہ مسٹر نہ مولانا۔!

یوسف ناظم

ہندوستان میں دو اکبر بڑے شاندار گزرے ہیں، ایک مہابلی شہنشاہ اکبر اور دوسرے اکبر الہ آبادی۔ بہت سے شاعر، شاعر اعظم ہوتے ہیں لیکن اکبر شاعری میں اکبر اعظم تھے۔

آنند نرائن ملا اور سکندر علی وجد یہ نہ سمجھیں کہ صرف اُن ہی نے عدالتی کام کرتے ہوئے شاعری کی ہے۔ ہندوستان کے عدالتی لوگوں میں شاعری کا رواج پہلے بھی تھا۔ سید اکبر حسین اکبر کو عدالتی شاعروں کا امام سمجھنا چاہیئے۔ سید اکبر حسین اکبر کو ہم اب اکبر الہ آبادی کے نام سے جانتے ہیں۔ الہ آباد کے امرود دلی کے بعد اگر الہ آباد کی کوئی اور چیز مشہور ہوئی ہے تو وہ اکبر الہ آبادی کی شاعری ہے۔ اکبر الہ آبادی سے میں کبھی نہیں ملا کیونکہ جب میں پیدا ہو رہا تھا، اُس وقت اکبر الہ آبادی انتقال کر رہے تھے۔ اُن سے ملاقات نہ ہو سکنے کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے گہرے دوست تھے۔ وہ تھے ہی گھر کے آدمی۔ عدالت کے فیصلے وہ کیسے لکھتے تھے یہ تو معلوم نہیں لیکن شاعری میں وہ بڑی گہری گہری باتیں کرتے تھے۔ شہنشاہ اکبر کو جس طرح ہندوستان پر پورا پورا تسلط حاصل تھا، ویسا ہی تسلط اکبر الہ آبادی کو شاعری کی تمام اصناف پر حاصل تھا۔ اکبر نے شاعری کے ہر "صوبے" میں اپنی برتری منوا کر چھوڑی۔ اکبر دل میں شاید کچھ قدرتی بڑائی ہوا کرتی ہے۔

اُس زمانہ کے شاعروں کے عام دستور کے مطابق اکبر الہ آبادی بھی داڑھی رکھتے تھے اور بڑے کروفر سے شاعری کرتے تھے۔ سنا گیا ہے کہ وہ گیارہ سال کی عمر سے شاعری کرتے تھے۔ اُن کو تحصیل دار بنایا گیا تب بھی وہ شاعری سے باز نہ آئے۔ تحصیل دار سے وہ منصف ہوئے پھر بھی وہ شاعری کرتے ہی رہے۔ تحصیل دار کا منصف ہونا بھی ممکن ہے، منصف سے وہ جج ہوئے تب بھی وہ شاعری سے نہ چوکے۔ سشن جج سے وہ ریٹائر ہوئے لیکن شاعری سے وہ ریٹائر نہ ہوئے۔ اس لئے یہ کہنا چاہیئے کہ شاعری اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، اصلی گھی اور خشک میوے کا اثر ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

اپنے ہم عصروں، حالی اور شبلی کی طرح اکبر نے بھی قومی شاعری کی۔ وہ شمس العلماء اور علامہ تو نہیں بنے لیکن زمانہ نے اُنہیں "لسان العصر" تسلیم کر لیا۔ جس طرح ایڈیسن نے سترہویں صدی کے انگلستان کی سوسائٹی کی خامیوں پر تنقید کی تھی، اسی طرح اکبر الہ آبادی نے ہندوستانی سوسائٹی کے نقائص کو بے نقاب کیا ہے۔ اُن کی ظریفانہ شاعری لطیفہ گوئی نہیں کہ آدمی لطیفہ سُنے اور اپنی باچھیں کھول دے۔ ہندوستان میں مغربی تہذیب کی مدّاحی کے بعد اکبر سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اُس نظام تعلیم پر گہری نظر ڈالی ہے اور اڈیسن کی تحریروں سے اکبر کی شاعری کا مشن بہت زیادہ ہم رنگ ہے۔ اڈیسن کے عہد میں انگریز اور بالخصوص انگریز عورتیں (صدیوں ہمیشہ مردوں سے آگے رہی ہیں) فرانس کی فیشن پرستی پر بے طرح لٹو ہو رہی تھیں اور اس طرح فرانس کی تقلید میں اُن کی قومی دولت اور دولت پر پانی پھر رہا تھا۔ اکبر کے عہد میں بھی ہندوستان کا حال "الیف" تھا۔ اکبر شاعر ہونے کی حیثیت سے زیادہ شوخ اور زندہ دل معلوم ہوتے ہیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ آدمی جس رگ پر بھی انگلی

رسالے، وہ وہی رنگ ہوتی۔

یوں قتل سے لڑکوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی
بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا
ملک میں مضمون نہ پھیلا، اور جوتا چل گیا
پھیر سکتی نہیں تقدیر سے مجھے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

اللہ میاں سے اپنی رعایت مانگنے تو بندہ کو حق ملنا ہی چاہیئے۔

اکبر الہ آبادی غالباً بہت نازک بھی تھے، گرمی کے نام سے انہیں پسینے چھوٹ جاتے تھے

پڑ جائیں ابھی آبلے اکبر کے بدن پر
پڑھ کر جو کوئی پھونک دے اپریل مئی جون

قانون کی کتابوں کی جو زبان ہوتی ہے، وہ سبھی کو معلوم ہے، اتنی ثقیل اور مشکل زبان شاید ہی کسی اور جگہ استعمال ہوتی ہو۔ قانون پڑھ پڑھ کر اکبر الہ آبادی کو بھی بگڑ جانا چاہیئے تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے اکبر الہ آبادی نے گھر پر خاص اردو کا بوڑھ نگار کھا تھا اور بامحاورہ اردو کے سوا کسی اور قسم کی زبان داخل نہیں ہو سکتی تھی۔

مجنوں کی پیاس کو بجھاتی
لیلیٰ کچھ بار نہ تھی!

اے قبلہ مجھ پر آپ چڑھے آ رہے ہیں کیوں
ممبر اس انجمن کا ہوں، ممبر نہیں ہوں میں۔

دنیا ہی اب درست ہے قائم نہ دین ہے
زر کی طلب میں شیخ بھی کوڑی کا تین ہے

(یہ شیخ اور شیخ سے بالکل الگ ہے جو کویت یا عربستان میں رہتا ہے)

ہوتا ہے نفع یورپین نالہ پاؤ سے
سب خوشیاں ہیں الشیا کے خیالی پلاؤ سے
حسرت بہت تڑپتی دختر فلک نہیں
پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی
پوچھے کون نکل گئی حسرت یا دختر

ڈاڑھی اور مونچھ کا کوئی ہیئت گرجب فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں

خود اکبر کے داماد بھی داڑھی نہیں رکھتے تھے۔ مغرب کی کورانہ تقلید کے بارے میں اکبر الہ آبادی بہت سخت رویہ اختیار کرتے ہیں، بالکل ویسا ہی جیسا علامہ شبلی نے نور الدین اور مہر النساء کے معاملہ میں اختیار کیا تھا

وہ فقط وضع کے گشتہ ہیں، نہیں ہیں کچھ اور
بھینس کو گون پہنا دیجئے عاشق ہو جائیں

سیاست کاروں کے تو اکبر دشمن تھے اور انہیں ایسی پھٹکنار دیتے تھے کہ کیا محمد علی کلے بھی دے سکے گا۔

وہ اٹھنے دیتے ہیں خود فتنہ ہائے بے حقیقت کو
کہ تا حاصل کریں ان کے فرو کرنے کی لذت کو

... اس شعر میں اب بھی "تازگی" ہے

اپنے بھائی کے مقابل کبر سے تن جایئے
غیر کا جب سامنا ہو لیمن گلی بن جایئے!

اس نصیحت پر ہم آج بھی عمل کرتے ہیں ـــــ اللہ جزائے خیر دے

کمیٹی میں چندے دیا کیجئے۔
ترقی کی ہے کیا کیجئے

اکبر شاعر بڑے خاص تھے لیکن شوہر کی حیثیت میں بالکل عام شوہروں کی طرح تھے۔

اکبر دبے نہیں کسی سلطان کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی فوج سے

اکبر نے جہاں مغربی تہذیب و تمدن کی بے جا تقلید کی مخالفت کی ہے وہیں مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کی بھی خوب خبر لی ہے صرف انگریز ہی کی نہیں انھوں نے مولویت اور سنگ نظری کی بھی شدید مخالفت کی ہے اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ انہیں قدامت پسند کہیں یا مولوی دشمن ان کا کلام مجموعی حیثیت سے بہر حال ناصحانہ و مصلحانہ ہے مولویانہ نہیں۔ اکبر حسن نے کہا ہے کہ ہر دور خود اپنا قومی ادب پیدا کرنا چاہیئے، اکبر کی شاعری بالخصوص ظریفانہ شاعری ان کے عہد کی حقیقی تصویر پیش کرتی ہے۔

اکبر اپنے مزاج کو شاعری میں مفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ سودا ہجو گو شاعر تھے، انشا ہجو گو بھی تھے اور ظریف بھی، نظیر اکبر آبادی خوش مزاج اور واقعہ نگار تھے لیکن اکبر طنز گو شاعر اور زندگی کے نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور شیخ پر تو بس ان کی حملہ آوری ہمیشہ جاری رہتی ہے

خدا شرع بھی شیخ کو سمجھا نہیں
مگر اندھیرے اجالے یہ چوکتا بھی نہیں

یہ سمجھ لیجئے کہ اکبر نہ مسٹر تھے نہ مولانا

(دور زناٹا فقرات)

مکتوب

رشید الدین ـــــ محکمۂ ترجمہ، تالاب ماں صاحبہ، حیدر آباد ۲۸

ستمبر ۱۹۶۶ء کا "شاعر" ملا۔ بحیثیت مجموعی صاف ستھرا اور خوبصورت ہے۔ "شاعر" میں تین چار ماہ سے جو تبدیلیاں کی جا رہی ہیں، یہ شمارہ اُن کا بہتر مظہر ہے۔ اُمید ہے کہ "شاعر" کی مرصع و خوب سے خوب تر بننے کی یہ دوڑ یوں ہی جاری رہے گی اور ہر "نقش ثانی" "نقش اوّل" سے بہتر رہیگا۔

ظاہری خوبصورتی کے علاوہ باطنی حسن یعنی مواد کے لحاظ سے بھی زیر نظر شمارہ بیحد قابل لحاظ اور پڑھنے کی چیز ہے۔ صرف ۴۰ صفحات میں آپ نے بیشمار دلچسپیاں اکٹھی کر دی ہیں۔ مستقل عنوانات میں ایک اور مستقل عنوان "روح حاضر" کا اضافہ خوب ہے آپ نے آئندہ بھی جاری رکھیے۔ اس شمارے میں اس عنوان کے تحت دیئے گئے دونوں مضامین مختصر ہونے کے باوجود اپنے اندر بھرپور افادیت لیے ہوئے ہیں۔ "دل کی بات" قسم کے مضامین "شاعر" میں ادبی کے علاوہ دیگر دلچسپیاں تلاش کرنے والوں کی تشفی کا باعث بن سکتے ہیں۔ علامہ نیاب اکبر آبادی اور دیگر مدیروں (خصوصاً پاکستانی) میں شائع شدہ مضامین آپ کسی کہنہ مشق عنوان کے تحت دیتے رہیے، تاکہ "شاعر" پڑھنے والوں کو معلوم ہو سکے کہ ؎

"کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا"

اس شمارہ کا دوسرا مستقل عنوان "نقد و نظر" بھی اس بار توجہ کا طالب ہے۔ آپ نے محترم یوسف ناظم کے مزاحیہ مضامین کے مجموعہ "کیف و کم" پر ویسا ہی تبصرہ کیا ہے، جیسے تبصرہ کا وہ متقاضی تھا۔ اس دلچسپ تبصرہ نے بڑی حد تک اُس تاخیر کی تلافی کر دی ہے جو اس مجموعہ پر تبصرہ کے سلسلے میں ہو گئی۔ دوسرا قابل توجہ تبصرہ مدّاح فاضلی کا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے تازہ شعری مجموعہ "نیا عہد نامہ" پر کیا ہے۔ مجھے یہ تبصرہ پسند آیا۔ اور میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے مجموعۂ کلام پر "شاعر" میں ایسا ہی تبصرہ ہونا چاہیئے تھا، تبصرہ کے علاوہ زیر بحث "شاعر" میں مدّاح فاضلی کی نظم "شہرِ مرگ" بھی بیحد متاثر کن ہے۔

آجکل علامتی اور ابہام زدہ شاعری کی بیحد مخالفت کی جا رہی ہے مگر میرا خیال ہے ایسا ابہام جو مذکورہ بالا نظم میں موجود ہے، نظم کی خوبصورتی اور تاثر کے لئے بیحد ضروری ہے۔ کسی بات کے صاف طور پر کہہ دینے میں وہ بات نہیں پیدا ہوتی جو اشاروں اور کنایوں اور ابہام سے پیدا ہوتی ہے۔ اس شمارہ میں ظرفر قریشی کی غزل بھی خوب ہے۔

حصۂ مضامین میں مرزا غلام رشید مرزا دہلوی کا مضمون "حالی کی مراثیں اور اُن کے گانے" اچھا مضمون ہے۔ ایسے موضوعات پر اور بھی چیزیں لکھی جانی چاہئیں۔ لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ خاصاحب نے دہلوی ہونے کے باوجود اپنے اس مضمون میں دیگیں کو "دیگیں" اور یاقوت کو "یعقوت" لکھا ہے۔ مزید تعجب اس بات پر ہے کہ آپ کی نظر سے یہ اغلاط کیسے چوک گئے۔

بدیع الزماں خاور ـــــ ۴۰، اے ضیغم مال، دالپولی، ضلع سنگاریڈی ـــــ

مجھے جناب تاجی انصاری کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ جب تک اعلیٰ سطح پر غور و خوض ختم نہ ہو جائے اُس وقت تک عامیانِ اُردو کو کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہیئے جس سے بنتی ہوئی بات بگڑ جائے۔ مگر ہمارے سربراہوں کو ہر حال یہ طے کر لینا چاہیئے کہ اگر حکومت کو فرقہ پرستوں کے دباؤ میں آ کر اُردو کو بعض علاقوں میں سرکاری زبان بنانے کا منصوبہ تبدیل کرنا پڑا تو ان حالات میں اُردو والوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ جہاں تک ہو سکے مخالفین اُردو کی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہمارا فرض ہے، اور اس سلسلہ میں آپسی بحث کو مشفقانہ ہونی چاہیئے، لیکن اگر ہماری کوششوں کے باوجود (جیسا کہ اندیشہ ہے) نتیجہ برعکس نکلے تو ہمارے لئے ایک واضح اور منظم پروگرام کے تحت اُردو کے آئینی حقوق "حاصل الینا" ناگزیر ہو جائے گا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم آنے والے کل کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں پر انتہائی سنجیدگی سے سوچیں اور ایسی فیصلہ کریں کہ مخالفانہ انتخابات سے پہلے اُردو کو دی گئی مراعات عملی طور پر دی جائیں، جن کے لئے حالات اب تک کسی حد تک

سازگار دکھائی دینے لگے ہیں، تو اردو والوں کا اپنی منزل تک پہنچنے کیلئے کون سا راستہ چلنا ہوگا، یہ فیصلہ کرنا اور تمام اردو والوں تک اپنا پروگرام وقت سے پہلے پہنچا دینا ہماری ادبی شخصیتوں کا کام ہے۔ "شاعر" کے اداریوں سے فیصلہ کرنے میں ہمیں بھرپور روشنی مل سکتی ہے "ہماری زبان" میں بھی اس تعلق سے لکھا گیا ہے۔

"شاعر" کے گزشتہ چند شماروں میں قلمکار سیماب کی شخصیت اور ان کے فن پر پابندی کے ساتھ مضامین شائع ہوئے ہیں اگر یہ سلسلہ مستقل باب کی صورت اختیار کرے تو بہت بڑا کام ہو سکتا ہے اردو کے سب سے بڑے مجتہد شاعر پر جتنا بھی کام ہونا چاہیئے ہنوز اس کا دسواں حصہ بھی پورا نہیں ہوا ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ علامہ سیماب پر نکلے ہوئے تمام مضامین کو کتابی صورت میں اکٹھا کیا جانا چاہیئے۔ اگر "شاعر" کے پچھلے اٹھارہ برس کے اداریے بھی کتابی صورت پیش کئے جائیں تو اردو تحریک کی تاریخ محفوظ ہو جائے گی۔

نورِ پرکار ——— پلاٹ نمبر ۵، تلسی باغ کے پیچھے، منڈ بیشور روڈ۔
بریلی (یوپی) ۲۴۳۰۰۱

"شاعر" موصول ہوتے ہی میں "برعات" محفل اپنی" تبصرے اور خطوط پہلے پڑھ لیتا ہوں چونکہ "برعات" اردو کے حق میں آپ کی بیباک آواز ہوتے ہیں۔ "محفل اپنی" میں تخلیقات سے متعلق آپ کی گرانقدر رائیں محفوظ ہوتی ہیں۔ تبصرے جو تنقیدی جائزے ہوتے ہیں اور کتابوں میں قارئین اور اہل قلم حضرات کے نظریات پائے جاتے ہیں، یہ چاروں چیزیں جہاں مقبول ہیں، وہیں بیحد اہم بھی اور تعجب کی بات ہے ان میں ابھی تک کسی قسم کا کوئی تعطل پیدا نہیں ہوا۔ اس بار کیف و کم پر کیا گیا تبصرہ خود طنز و مزاح سے کم نہیں۔

مقالات کے باب میں "حافظ کا اثر شعرائے اردو پر" "پردہ خفت پر ایک نظر" "راجہ مہدی علیخان" "لیلیٰ اور لیلیٰ کے خطوط" اچھے مضامین ہیں اردو پر بچا کر کا مضمون صرف سرسری جائزے کی حیثیت رکھتا ہے، نظمیں سبھی اچھی ہیں، البتہ غزلیات دو تین غزلیں پسند نہیں آئیں، افسانوں اور ڈرامہ کا انتخاب خوب ہے۔

جی، ایم۔ راہی ——— ۱۵۶ خیلدار۔ فتحپور ——— (یو۔پی)

ستمبر ۱۹۷۱ء کا شمارہ پیش نظر ہے۔ اسے مجموعہ شعر و ادب کہوں یا مکمل سوانح و تفسیر حیات! آپ کی دیرینہ صلاحیتوں کے گواہ پائے رنگا رنگ جا بجا قرطاس پر بکھرے ہوئے ہیں، یہ شمارہ ایک نئی آن بان کیساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ سرسید، سید احمد، چند دیپ کے مقالے، فیضا شاہ کا افسانہ، مکیش اکبرآبادی کی بیباکانہ خاکہ نگاری، غزلیں اور کسی حد تک نظم بھی خاص طور پر پسندیدہ ہیں۔ اخلاق فتحپوری کی نظم بیاد فتحپوری بھی بہت متاثر کن ہے۔ شاعر میں مرحوم کے متعلق سلسلہ وار مضامین مقالوں اور نظموں کی اشاعت آپ کے حسن خلوص کی آئینہ دار ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی ——— ہرگانواں۔ ڈاکخانہ برہیہ ضلع مونگیر (بہار)

ستمبر کا شاعر مل گیا ہے، شکریہ! ڈاکٹر عبدالعلیم نامی صاحب کے مضمون "اردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈراما" (مطبوعہ "شاعر" اگست ۱۹۶۹ء) اور تازہ "شاعر" میں مطبوعہ راقم الحروف کے مراسلے کے بعض جملوں کے سلسلے میں مجھے کرم فرما ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب (الہ آباد یونیورسٹی) کے خط سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں جن کا یہاں ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب لکھتے ہیں "یہ بات تو بالکل صحیح ہے کہ امانت نے اندر سبھا واجد علی شاہ کے اشارے سے ہرگز نہیں لکھا تھا۔ انھوں نے "شرح اندر سبھا" میں خود سبب تصنیف بیان کیا ہے کہ اپنے شاگرد عبادت کے کہنے سے یہ "رہس" لکھا ہے، یہ بھی درست ہے کہ واجد علی شاہ نے کہیں امانت کا نام نہیں لیا۔ کیونکہ اندر سبھا سے پہلے خود واجد علی شاہ کئی "رہس" لکھ چکے تھے، جو اُن کے تصور کئے ہوئے "رہس خانوں" میں کھیلے بھی جا چکے تھے! امانت نے تو اندر سبھا، واجد علی شاہ کے رہس غزالہ ماہرو کے انداز پر خود ہی لکھی، اندر سبھا غزالہ ماہرو اور فسانہ عشق کے اسٹیج کئے جانے کے ڈیڑھ سال بعد لکھی گئی تھی۔ (راقم کے نام لکھے گئے ۱۲ ستمبر ۶۹ء کے خط سے اقتباس)

ایک دوسرے خط میں ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب لکھتے ہیں "یہ تو طے ہے کہ واجد علی شاہ نے پہلا "رہس" ۱۸۴۳ء میں جب وہ شاہزادے تھے "رادھا کنہیا" کے نام سے تحریر کیا تھا۔ انھوں نے اسے ڈرامے یا تھیٹر کا نام البتہ نہیں دیا تھا کیونکہ اس وقت یہ نام اردو والوں تک پہنچا بھی نہ تھا اپنی روایات کے مطابق انھوں نے اسے جلسہ اندر سبھ کے نام سے یاد کیا" اور یہ ڈراما اور بعد کے بھی ڈرامے جن میں غزالہ ماہرو، ماہ پیکر، پری اور ماہ پردیں اور پھر پردہ خفا تھے۔ رہس خانوں میں کھیلے گئے۔ بجھیر رہس نہیں کہتے تھے کوئی چاہے تو انہیں (تھیٹر پلیس) کا نام دے سکتا ہے۔ اور واجد علی شاہ

بہترین خوشبو
تازگی اور
خوش رائحہ

لاکھوں آدمیوں کی پسند

بابا

اس کی بھینی اور دل کو خوش کرنیوالی خوشبو صدیوں سے پسند کی جاتی رہی ہے
انسان نے ہمیشہ استعمال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسے بہترین خوشبو تیار کرنے
والے بھی اسکی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ فہرست مفت حاصل کیجئے

تیار کردہ:- وشرم پال پریم چند۔ چاندنی چوک دہلی

نقل سے ہوشیار، دہلی والوں کا
"بابا" بھی ہے کہ نہیں دیکھ لیجئے

نقــــد و نظر

[illegible] ضروری ہیں!

دیوانِ ناشاد

[illegible] آغا مہدی [illegible]

ناشاد [illegible] مسخروں کی
بھی قسمیں ہوا کرتی ہیں جیسے آموں کی ہوتی ہیں۔ شوکت تھانوی مرحوم
راجہ مہدی علی خاں مرحوم، سید محمد جعفری، غلام احمد فرقت، واہی، دلاور
فگار اور کتنے ہی مزاحیہ شاعر اُردو میں ہوئے ہیں۔ مزاحیہ شاعری کے لئے
اشاروں، کنایوں، مترادف الفاظ کے ہیر پھیر اور مضبوط گرفت
کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح [illegible] کی خاصیت ہوتی
ہے کہ ماچس دکھلاؤ اور [illegible] بھڑک اٹھے۔ بعض مزاح نگار
شعرا زبردستی ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض ایک بے اختیار
[illegible] صاحب [illegible] ہنسانے کی کوشش
کر[illegible]

ناشاد صاحب [illegible] کی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی
ہیں۔ ان میں پہلا [illegible] کلام [illegible] شائع ہوا تھا اس
میں طنز و مزاح سے بھرپور [illegible] نظمیں [illegible] دوسرا مجموعہ
”دیوان ناشاد“ کی بیشتر نظمیں یہی مزاحیہ شاعری کے زمرے میں
تو نہیں آتیں لیکن کسی حد تک دلچسپ ضرور ہیں جن میں شاعرانہ کوتاہیاں
اور کہیں کہیں [illegible] کے پہلو بھی پائے جاتے ہیں مگر مذاق کی سطح میں
[illegible]

(و۔ص)

لگیں تو اس کے سامنے فکر و فن کے نئے دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ [illegible]
سے اپنا رشتہ منقطع کر کے جب اظہر افسر آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہوئے
تو یہاں بھی انھوں نے چند ہی سال میں ہوا کی لہروں پر اپنا نام اچھال دیا۔
ان کے ڈرامے، خاکے اور مزاحیہ فیچر آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن
کے سبھی اسٹیشنوں سے نشر ہوتے رہتے ہیں اور عام طور پر پسند کئے جاتے ہیں
پسند اور ناپسند کی دو مختلف سمتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے بعض قلم کاروں کی تخلیقات
یا تو صرف خواص کیلئے ہو کر رہ جاتی ہیں یا پھر بالکل عوام کیلئے۔ آج شاعری
کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن بعض قلم کار اپنی تحریروں میں ایسے عناصر [illegible]
عوام و خواص دونوں میں قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اظہر افسر بھی [illegible]
کے ایسے ہی قلم کار ہیں۔

”سانولی“ اظہر افسر کا ایک مقبول اور خوبصورت [illegible]
[illegible] شاہ کے معاشقے سے [illegible] انھوں نے [illegible]
ڈراما کی تمام تر الجھنیں اور لطافتیں بھر دی ہیں۔ اس مجموعہ میں [illegible]
علاوہ تیرہ ڈرامے اور بھی ہیں۔ صاحب جی، مومن کی حیات معاشقہ کا نقش
دلپذیر ہے۔ غالب۔ ذوق اِن دونوں باکمال شعرا کی زندگی کے بعض
دلچسپ پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ تمام ڈرامے اور ادبی لوازمات کے ساتھ
اظہر افسر نے اردو کی بعض مقبول تصانیف سے بھی استفادہ کیا ہے
اور انہیں ڈراما کا روپ دیا ہے۔ امراؤ جان ادا، اور ”مرأۃ العروس“
[illegible]
[illegible]
[illegible] ڈرامے کا شوق اور تعمیر [illegible] بھی اس مجموعے کے [illegible]

سانولی

[illegible] یہ نہیں کہ اظہر افسر کے ڈرامے ریڈیو سننے والے پسند کرتے ہیں
[illegible] کے مشہور [illegible]
[illegible]
[illegible] اور [illegible] سے ہو [illegible]
[illegible] کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اظہر افسر نے کمال [illegible]

ادارئیے

محفلِ اپنی ....!

یہ تازہ شمارہ

"شاعر" کا یہ تازہ شمارہ کئی قابلِ قدر نظم و نثر تخلیقات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اس کے علمی و فنی مضامین، افسانوں اور ڈرامے کے علاوہ اس میں کچھ یادیں ہیں، کچھ باتیں ہیں۔ نباتاتی سائنس پر ایک افسانوی نمونہ ہے، غزل کی تنگ دامانی و وسعت کے سلسلے میں ایک بحث ہے اور "نئی شاعری کیوں؟" کے عنوان سے چند نئے شعراء کا نئی شاعری پر اظہارِ خیال ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ آخر وقت تک قاضی سلیم کا بیان نہ آ سکا۔ ہماری رائے میں یہ اظہارِ خیال ابھی نامکمل ہے۔ چند دوسرے نئے معروف شعراء مثلاً شہاب جعفری، منیب الرحمن، خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر وغیرہ کو بھی لکھنا چاہیئے۔ نئے شاعروں کا فرض ہے کہ اس کی وہ نمائندگی نہیں ہوئی جو ہونی چاہیئے تھی۔ امید کہ یہ شعراء نئی شاعری کے صحیح خد و خال کو پیش کرنے کی کوشش کریں گے اور کمار پاشی کی طرح محض میر صاحب کو گالیاں نہیں دیں گے۔ ادبی عدالت میں گالیاں دے کر تو کوئی مقدمہ نہیں جیتا جا سکتا۔ نئے شعراء کے اظہارِ خیال کے بعد ہم ان سے پہلے کی نسل کے ذمہ دار شعراء اور نقادوں کو اظہارِ خیال کی دعوت دیں گے۔ ادارے کی رائے محفوظ ہے اور اس کا اظہار سب سے آخر میں کیا جائیگا۔ موضوع کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کا تقاضا یہی ہے کہ اس پر ذمہ داری کے ساتھ لکھا جائے۔

"روحِ اخذ" کا باب اس بار اکبر الہ آبادی کی یاد میں ان کیلئے وقف کر دیا گیا ہے اور کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور یوسف ناظم جیسے مشاہیر اربابِ قلم کے مضامین اس میں رکھے گئے ہیں۔

ہمیں بڑا افسوس ہے کہ کئی اعلان شدہ مضامین نظم و نثر اگرچہ کہ اس شمارہ میں شامل نہیں ہیں۔ ایک شاعر کی [illegible] شاعری "زمانے کا درد" اور وہ نظمیں غزلیں جو جگہ کی کمی کی وجہ سے رہ گئی ہیں قارئین آئندہ شمارے میں یہ سب کچھ پڑھ سکیں گے۔ "شاعر" اپنے حجم کے اعتبار سے اتنا زیادہ مواد پیش کرتا ہے کہ کوئی اور پیش نہیں کر سکتا، پھر بھی ہم کو تنگ دامانی کا احساس ہو رہا ہے [illegible] بھری کیا دو دو تین تین ماہ بعد آتی ہے۔

معذرت

ہر چند پچھلے شمارہ کی کئی تصاویر بہت اچھی چھپی تھیں، لیکن خرابی کی وجہ سے ایک دو دیگر بھی [illegible] کی طرح سرورق ایک مشین میں کا تجربہ مشق بن کر رہ گیا اور اس کا علم اس وقت ہوا جب دفتری کے یہاں سے بالکل تیار ہو کر آیا۔ اس کے لئے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

"شاعر" میں کتابت کی غلطیاں کم ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی ایسی ہوتی ہیں کہ دو دو بار دیکھنے میں نظر چوک جاتی ہے اور بعض فحش غلطیاں جوں کی توں رہ جاتی ہیں مثلاً "ایک خواب اور" کے تبصرہ میں "ابہام انتقا" کا ارتقاء چھپ گیا تھا۔ پچھلے شمارے میں یاقوت کا [illegible] کی غزل کا مصرع اوٹی۔ قارئین مصرع کو اس طرح صحیح کر لیں۔

"غمِ جہاں کے میرے سینے میں اتر جانے دو"

بقیہ "نقد و نظر" صفحہ (۷۱)

میں شاعر ہیں۔

پھر کیا تیرا [illegible] کے ساتھ الاپتا ہوں

دھرتی کا [illegible] کومل اور دھیما ہے جو طبیعت کے گداز کا اشاریہ ہے

اس مجموعہ کی پہلی نظم جو اپنے موضوع کے لحاظ سے پورے مجموعے میں اکیلی ہے نثر میں ایک متوازن شعری کاوش کہی جا سکتی ہے۔ حجم ۵۰ صفحات قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ آل انڈیا میر اکاڈمی — لکھنؤ
(ن ۔ ف)

بقیہ "نئی شاعری کیوں؟" صفحہ (۵۸)

[illegible] سوالیاتی ہے [illegible] جیسے کہ الطاف [illegible] کر کے احساس [illegible] قاضی سلیم کے الفاظ میں ہمارے چہروں کی طرح مختلف اور الگ الگ، ہر فرد اپنے اندر ایک مکمل دنیا ہوتا ہے، نئی شاعری کسی ایک خیال کے بجائے کئی دنیاؤں کا [illegible] [illegible] شاعری کا محور [illegible]

رفتار

علمی ادبی ۔ اور تہذیبی خبریں

۱۵ اکتوبر تک اُردو کو ثانوی سرکاری زبان بنایا جائے

اُردو کا حق مؤثر کرنے کیلئے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا جائیگا

دہلی ۲۹ ستمبر۔ پنڈت سُندر لال کے بیان پر اُردو کے بہی خواہوں کا ایک اجتماع ۲۵ ستمبر ۶۶ء کو جناب پی بی مورید ممبر پارلیمنٹ کی قیام گاہ پر منعقد ہوا۔ اس میں دہلی لکھنؤ پٹنہ الہ آباد وغیرہ کے نمائندوں نے شرکت کی۔ صدارت پارلیمنٹ کے ممبر جناب اختر حسین صاحب نے کی۔

جلسہ سے قبل ۲۳ اور ۲۴ ستمبر کو بھی کمیٹی کی نشستیں منعقد ہوئی تھیں۔

پنڈت سُندر لال نے کہا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ بجائے اُردو میدان میں آئیں۔ انھوں نے کہا میں ذاتی طور پر اُردو کی خاطر جیل خانے اور گولی کھانے کیلئے بھی تیار ہوں۔

مختلف تقریروں اور بحث و مباحثہ کے بعد حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ اُردو کو یو۔ پی، بہار، مدھیہ پردیش، دہلی، ہماچل، پنجاب اور راجستھان کی ثانوی زبان قرار دے۔ ساتھ ہی یہ بھی تجویز کیا گیا کہ اگر ۱۵ اکتوبر تک حکومت نے اس مطالبہ کو عملی شکل نہ دی تو حکومت کے خلاف ہر ممکن طریقہ کار اختیار کیا جائیگا، جس کی دستور ہند اجازت دیتا ہے۔

اُردو کا رسم الخط نہیں بدلا جائے گا

مشہور ادیب و نقاد پروفیسر احتشام حسین کا اعلان!

پروفیسر احتشام حسین نے حیدرآباد میں اپنی ایک حالیہ تقریر میں کہا تھا کہ اردو زبان اور رسم الخط کے ایک دوسرے سے تعلق کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ ان کا خیال تھا کہ اُردو کیلئے دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن اب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ضروری کے بعض بدگمان ادیب اُردو کے ادبی سرمایہ کو ہڑپ کرنے اور اس کی افادیت ختم کرنے کیلئے دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کی رائے دیتے ہیں۔

احتشام حسین صاحب نے کہا اب ان کا خیال ہے کہ اپنے رسم الخط میں اردو زبان کی اہمیت کو برقرار رکھنا چاہئے۔ اُردو صرف فارسی رسم الخط

ہی میں پہچانی جا سکتی ہے، ہمیں کوئی اختیار نہیں کہ رسم الخط تبدیل کریں۔

اُردو ہندوستان کی ترقی یافتہ زبان ہے اسکو جائز مقام دیا جائے

دو سو دن سے جاری حلفہ طور پر بنگلور کا تعطل کیا مگر اُردو کسی نے نہ دیکھا

بنگلور کے اخبار انڈین ایکسپریس نے "اُردو کا مستقبل" کے عنوان سے ایک اداریہ سپرد قلم کیا ہے جس میں نہایت صاف اور کھری کھری باتیں لکھی ہیں۔

اخبار مذکور نے لکھا ہے کہ یہ تجویز بظاہر معقول نظر آتی ہے کہ حکومت یو۔ پی ایک ایسی کمیٹی مقرر کرے گی جو دستاویز فوراً مدعا اس میں اُردو کی تعلیم پر نظر رکھے گی، مگر جب اس تجویز کا گہرے طور پر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بالکل غلط اقدام ہے۔ کیونکہ اس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوگا کسی ایسی بات کے لئے جو صاف، واضح اور مدلل ہے تحقیق کرنے کے لئے کمیٹی مقرر کرنا، زیادتی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اُردو کو اس کا جائز مقام دینے کا سوال کسی صورت میں یو۔ پی کا سوال نہیں ہے یہ سارے ملک کا سوال ہے۔ اُردو بیحد زرخیز زبان ہے۔ مگر آج یہ زبان کسمپرسی کی حالت اور خطرے میں ہے۔

شکیل بدایونی صحت یاب ہوگئے

اُردو کے مشہور شاعر اور فلمی نغمہ نگار شکیل بدایونی جو دو سال سے سخت علیل تھے اور ایک سال سے پونہ کے قریب پانچ گنی میں بغرض علاج مقیم تھے، اب مکمل طور پر شفایاب ہو کر بمبئی واپس آگئے ہیں۔

پہلا "نہرو انعام" سکریٹری جنرل او تھانٹ کو ملے گا

دہلی، ۱ ستمبر: بین الاقوامی مفاہمت کے لئے پہلا "نہرو انعام" سکریٹری جنرل اقوام متحدہ او تھانٹ کو دیا جائے گا۔

یہ انعام ایک لاکھ روپے کا ہے جسے بیرونی زرمبادلہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ آنجہانی پنڈت نہرو کی سالگرہ کے موقع پر ۱۴ نومبر کو دہلی میں ایک خاص تقریب کے دوران صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن "نہرو انعام" سکریٹری جنرل او تھانٹ کو پیش کریں گے۔ اس کا اعلان آج یہاں نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا۔

ریڈیو کے اردو پروگرام عالمگیر اپیل کے حامل ہوں

آل انڈیا ریڈیو کی جانب سے شروع کی گئی خصوصی اردو سروس کو مختلف حلقوں پر پروگرام کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ عالمگیر اپیل کا حامل بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ مشورہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو مشاورتی کمیٹی کی طرف سے جس کا اجلاس یہاں ۱۴ مارچ کو وزیر اطلاعات و نشریات شری راج بہادر کی صدارت میں ہوا کی گئی۔

کمیٹی نے یہ بھی مشورہ دیا کہ پروگرام پیش کرنے والوں اور موضوعات کے اعتبار سے مزید تنوع درکار ہے۔ کمیٹی نے یہ بھی کہا کہ اردو پروگراموں کی زبان ایسی ہونی چاہیئے کہ سننے والے اسے بآسانی سمجھ سکیں۔ کمیٹی نے آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے پیش کئے جانے والے اردو پروگراموں کو بحیثیت مجموعی تسلی بخش قرار دیا۔

میر انیس کے پڑپوتے میر حزیں کا انتقال

لکھنؤ ۱۴ مارچ۔ سید محمد ہاشم حزیں لکھنوی کا ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ اُن کی عمر تقریباً پچاسی سال تھی۔

حزیں لکھنوی مشہور و معروف مرثیہ گو میر انیس کے پڑپوتے اور اُن کی اولاد مذکور میں آخری تھے۔ اب میر صاحب کے خاندان میں دختری اولاد رہ گئی ہے۔

حزیں لکھنوی کافی عرصے سے نقرس میں مبتلا تھے۔ اُن کی شادی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اپنے خانوادے کی فن مرثیہ گوئی سے شغف رکھتے تھے اور بعض نایاب مرثیے انھوں نے کہے ہیں۔

راجہ مہدی علیخاں کی غیر مطبوعہ تحریریں محفوظ کیجائینگی

نئی دہلی ۱۴ مارچ۔ اردو مجلس نئی دہلی کا ایک خصوصی نشست میں اردو کے مقبول فراخ نگار راجہ مہدی علیخاں کے انتقال پر اظہار تعزیت کیا گیا۔ یہ قرارداد پیش کی گئی کہ مرحوم کی غیر مطبوعہ تحریرات کی اشاعت کا جلد سے جلد انتظام کریں گے تاکہ یہ گرانقدر سرمایہ ضائع ہونے والی نسلوں کے لئے محفوظ رہے۔ اجلاس کی صدارت جناب مالک رام نے فرمائی۔

جلسہ کی کارروائی کے بعد مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے شرکت فرمائی۔

پنجاب کی طرف سے پونہ میں آل انڈیا

احمد آباد ۱۴ مارچ۔ پنجاب کی طرف سے پونہ میں آل انڈیا مشاعرہ ترتیب دینے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ مشاعرہ میں ملک کے دیگر حصوں کے شعراء کی شرکت متوقع ہے۔ علامہ عجمی، شاہ ہری، نشور واحدی، نگین اختر اور دیگر پروفیسر [illegible] مشاعرہ کی صدارت کریں گے۔ مشاعرہ کا اہتمام [illegible] کے زیر اہتمام ہوگا۔ [illegible] رضا نقوی واہی، پروفیسر قوس قزح، ناظم مرکزی مجلس علمی، شاہ بھائی، شاہ بھائی، بانو نزاکت آغا، قتیل سالک لکھنوی اور دوسرے شعراء سے مراسلت جاری ہے۔ ٹکٹ سے ہوگا۔ تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

فخر پور میں یوم مولانا آزاد کا افتتاح

۱۴ دسمبر ۱۹۵۸ء کو یہاں انجمن کے مکان پر ایک ادبی نشست ہوا جس میں فخر پور کے ادیبوں اور شاعروں نے بزم یاد کا افتتاح کیا۔ ساتھ ہی مسرت اللہ صاحب [illegible] فخر پوری صدر منتخب فخر اقبال سکریٹری جاوید اقبال کاظمی نائب سکریٹری اور جمال فخر پوری خزانچی مقرر ہوئے۔

اس نشست میں شعراء نے اپنی غزلیں سنائیں۔ مشتاق فخر پوری نے اپنی نظم یاد فخر پوری نے اپنا مضمون نیاز فخر پوری نے اپنی چند یادیں پڑھا۔ سعید مظہر جاوید اقبال اصلاحی نے اپنی کہانیاں سنائیں۔

خلیل الرحمن اعظمی کے مضامین کا نیا مجموعہ

"زاویہ نگاہ" شائع ہو گیا

یہ خبر ادبی حلقوں میں مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے نمایاں شاعر اور نقاد خلیل الرحمن اعظمی کے تنقیدی مضامین کا نیا مجموعہ "زاویہ نگاہ" شائع ہو گیا ہے۔ اس مجموعہ کے آدھے حصہ پر [illegible] گیا ہے۔ بہاں نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے [illegible] صفحات اور قیمت چھ روپے ہے۔

گنجینۂ گوہر پر انعام

مجلس ترقی ادب لاہور نے جناب شاہد احمد دہلوی، مدیر ساقی کی کتاب "گنجینۂ گوہر" پر [illegible] روپے کا انعام دیا ہے [illegible]

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء
بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
اُردو کا سینتیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

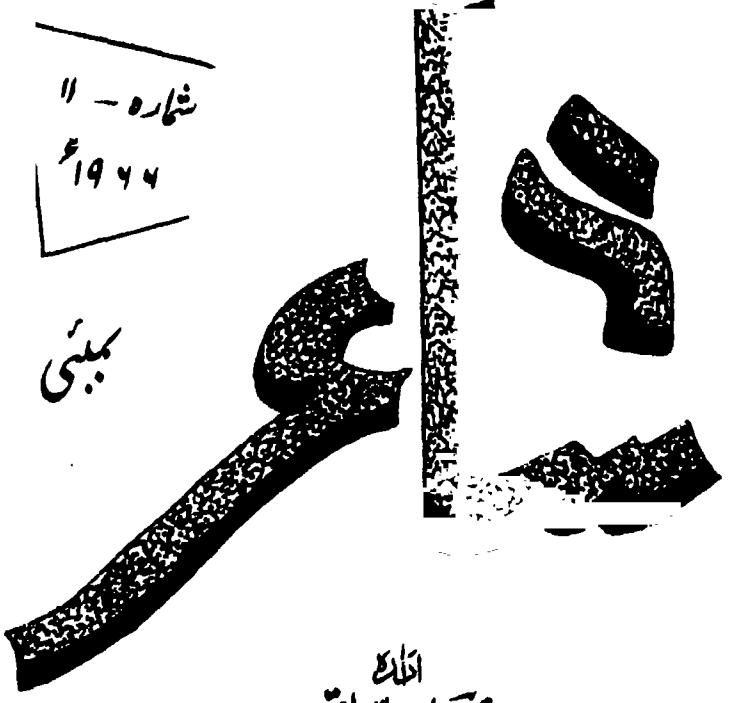

ادارہ
اعجاز صدیقی
مہندر ناتھ

زرِ سالانہ	معاونین سے	تاعمر خریداری	ممالک غیر سے	فی پرچہ
آٹھ روپے	پچیس روپے	۱۲۵- روپے	۲۵- شلنگ	۱۲ آنے (۷۵ پیسے)

ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ "شاعر" قصر الادب بمبئی ۸- بی سی

دہلی آفس
۱۲۱۱- بلیماران دہلی ۶

کلکتہ آفس
۱۲ کانگریس اگزیبیشن روڈ- کلکتہ ۱۶

خط و کتابت کا پتہ
مکتبۂ قصر الادب
پوسٹ بکس نمبر ۲۵۲۶ بمبئی ۸ بی سی

(بعد افتخار پیش کرتا ہے)

اُردو کے ممتاز اور جواں سال افسانہ نگار ـــــــ **نور بیدار**

کے پندرہ منتخب اور دلچسپ افسانوں کا پہلا مجموعہ

روپے کی موت ـــــ ایڈیشن ڈی لکس

قیمت ۳ روپے

پتہ:۔ دلنواز پبلیکیشنز ـــ مرزا علی اسٹریٹ ـــــ بمبئی نمبر ۹

دیوالی

خوشی اور خوش حالی کی علامت

اور

مسرتیں اور

خوش حالی ہمارے منصوبے کے مقاصد ہیں

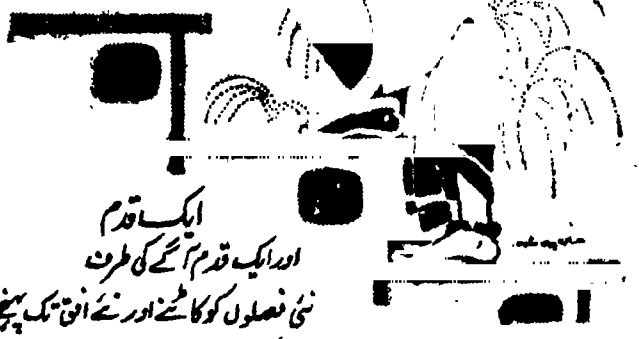

ایک قدم

اور ایک قدم آگے کی طرف

نئی فصلوں کو کاٹنے اور نئے افق تک پہنچنے کے لئے

جیسا کہ

مہاراشٹر اپنے چوتھے پنچالہ منصوبہ کی ابتدا کرتا ہے

(ڈائرکٹر آف پبلسٹی۔ گورنمنٹ آف مہاراشٹر)

شاعر کے سالنامے اور خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۵۱ء
دو روپیہ

افسانہ نمبر ۱۹۵۶ء
دو روپیہ

خاص نمبر ۱۹۵۹ء
ڈیڑھ روپیہ

جمہوریت نمبر ۱۹۶۲ء
ڈیڑھ روپیہ

افسانہ نمبر ۱۹۶۲ء
ایک روپیہ دس آنے

سالنامہ ۱۹۶۳ء
ڈیڑھ روپیہ

خاص نمبر ۱۹۶۳ء
ایک روپیہ چار آنے

سالنامہ ۱۹۶۴ء
ایک روپیہ

سالنامہ ۱۹۶۵ء
ایک روپیہ

"شاعر" پوسٹ بکس ۱۵۲۶
بمبئی ۵۰۰ ۴۰۰

اُردو تحریک کی بے مائگی	(اداریہ)	اعجاز صدیقی	۷
غزل		احسان انش	۸
نرگسیت پسندی	(مقالہ)	علی عباس اُمید ایم اے	۹
لُب کا پیڑ	(نظم)	وفا ملک پوری	۱۵
ورت اور جام	(کہانی)	انجمن آرا انجم	۱۶
زل		میتن سروش	۲۰
اکٹر سلام سندیلوی کی شاعری	(مقالہ)	انیس احمد خانجی ایم اے	۲۱
نتیا ٹوپی	(نظم)	اعجاز صدیقی	۲۴
ا شاعری کے فلسفہ طراز	(بحث)	سرار جعفری	۲۶
زل		نثار اٹاوی	۳۰
زل		مظفر حنفی	۳۰
ک کے سپنے	(کہانی)	عظیم اقبال ایم اے	۳۱
گی	(نظم)	عطا محمد شعلہ	۳۵
زل		شفیق کوٹی	۳۵
تی دیوار	(ڈراما)	رسول احمد	۳۶
رے خواب	(نظم)	ماہر کبانی	۴۲
ساحر لدھیانوی اور تحریک ناکام نسواں	(مقالہ)	عزیز صدیقی	۴۳
تبسگاہ	(نظم)	قیصر الجعفری	۴۶
غزل		فضیل ہوشیارپوری	۴۶
آپ کی نظروں نے سمجھا...	(خطوط اصلاح یادداشت)	اندرجیت دت	۴۷
دو غزلیں		رحمت امروہوی	۵۱
زمانے کا درد	(مصری کہانی)	ضیاء اکرام	۵۲
مسافر	(نظم)	فیض الحسن خیال	۵۴
بہار کے خط کا جواب	(بحث)	ندا فاضلی	۵۵
غزل		مدحت الاختر	۵۹
غزل		شاہد صدیقی (لکھنؤ)	۵۹
خوں خوار پرند سے	(روح اخذ)	رفیعہ منظور الامین	۶۰

مکتوبات

قیصر جہاں	ادریس احمد قطاں	ناصر انصاری
مسعود تمر تاباں	علی عباس اُمید	عبداللطیف اعظمی
خلیل تنویر	بدرالزماں خاور	نور بریکاسی

محفل اپنی.....!		ادارہ ۷۰
تقد و نظر	(تبصرے)	ادارہ ۷۱
رفتار	(ادبی و تہذیبی خبریں)	ادارہ ۷۴

ماہنامہ **شاعر** بمبئی — فخر و مسرت کے ساتھ

فروری ۱۹۶۷ء میں

اُردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار

کرشن چندر

پر نہایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر پیش کر رہا ہے

کرشن چندر کی منفرد شخصیت اور اُسکے ہمہ گیر فن پر دنیائے ہندوستان اور پاکستان کے اُردو اور ہندی بلکہ ہندی، مراٹھی، گجراتی، بنگالی زبانوں کے مشہور قلمکاروں، نیز دنیا کی مختلف زبانوں کے ایک سو سے زیادہ مستند مفکرین کے مضامین و تاثرات

کرشن چندر نمبر

چھ سو صفحات سے زیادہ کی ایک عظیم منفرد اور حسین خصوصی اشاعت

فوٹو آفسٹ کی

۲۴ صفحات پر بیادگار تصاویر

قیمت

دس روپیہ

کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ، اُن کی عظمت کی کہانی اُن کی تصانیف کا جائزہ، اُن کے زرین اسلوبِ فکر اور شاہکار افسانوں، ناولوں اور ڈراموں پر تنقیدی نظر

کرشن چندر نمبر میں خود

کرشن چندر

کے اپنے قلم سے

ایک تازہ، غیر مطبوعہ اور شاہکار

بیتے

ناول

کے علاوہ

تین کہانیاں - ایک ڈرامہ

ایک مزاحیہ - میرے ادبی نظریات

میرے تنقید نگار

میری ادبی زندگی کا آغاز و انجام

★

کرشن چندر کے شب و روز

(تصاویر کے ذریعہ)

اور

عکسِ تحریر

کرشن چندر

کے اہم

خطوط

ایجنٹوں کے آرڈر سے پہلے سے آنے چاہئیں بعد میں تعمیل نہ ہو سکے گی

پاکستان کے ایجنٹ اور اہلِ ذوق حضرات فیل کے پتہ سے "کرشن چندر نمبر" حاصل کر سکتے ہیں

راٹلز امپوریم - خورشید بلڈنگ بی فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی ۱

منیجر "شاعر" ——— مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس ۲۵۲۶ بمبئی ۸ بی سی

خیر عاشے

اُردو تحریک کی بے مائگی

اُردو تحریک کی اہمیت، اس سلسلے کی تعلیم جدّ جہد اور اُس سے پیدا شدہ نتائج سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ہماری تنظیم کتنی ہی کمزور کیوں نہ رہی ہو، ہم سے کتنی ہی غلطیاں اور کوتاہیاں کیوں نہ ہوئی ہوں، لیکن ہماری تحریک بہر حال جاری رہی ہے۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اُردو کو اُس کے کچھ نہ کچھ حقوق مل جانے کی اُمید پیدا ہو چلی ہے۔ ملک میں اُردو رسائل و اخبارات کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ ان کے پڑھنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ سرکاری تعاون کے بغیر عوامی قوتِ خرید کے سہارے اُردو کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ہر سال بڑی تعداد میں نئی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ہر چند اُن کے ایڈیشن ہزار دو ہزار نہیں چھپتے ہیں، لیکن دو تین سال میں فروخت ضرور ہو جاتی ہیں، جبکہ ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں کی کتابیں بڑی تعداد میں سرکاری لائبریریوں کے لئے خریدی جاتی ہیں۔ اور اس سلسلے میں اکثر و بیشتر ان زبانوں کے پبلشروں سے یہ سُننے میں آتا ہے کہ اگر سرکار ہی خریدار نہ ہو تو اُن کی کتابیں بوں کی توں رکھی رہ جائیں۔ بعض دوسری زبانوں کے مصنفوں اور پبلشروں کو اپنی کا احساس ہے کہ اُن کی کتابوں کا عوامی مارکیٹ شاذ و نادر ہی ہے ــــ کم از کم معلوم اُردو زبان تو اپنے عوام و خواص کے ذوقِ خریداری ہی کی بنا پر زندہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اُردو والوں کا ذوقِ مطالعہ زیادہ بیدار نہیں ہے۔ ہمارے یہاں زیادہ تر اخبارات و رسائل اور کتب مانگ کر پڑھنے کی عادت ہے، اُردو جاننے اور بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے ہمارے اچھے ادبی رسائل اور معیاری اُردو مطبوعات کی تعدادِ اشاعت بہت ہی کم ہوتی ہے، اور ہم نے کبھی اس اہم نکتے پر غور کر کے اس کا کوئی سائنٹفک حل نہیں سوچا۔ اس سلسلے کا کوئی باقاعدہ پروپیگنڈہ نہیں کیا۔

اُردو تحریک یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہے کہ بعض علاقوں میں اُس کے لئے تعلیمی سہولتیں مل جائیں یا بعض سرکاری دفتروں میں اس سے کام لیا جانے لگے۔ ہندوستان کی اس لسانی دوڑ میں ابھی برسوں ہمیں اپنی تحریک کو مختلف پہلوؤں سے چلانا پڑے گا اور ہماری تحریک اپنی مختلف ضرورتوں کو اُسی وقت پورا کر سکے گی، جب ہمارے پاس کثیر سرمایہ ہوگا ــــ دو چار لاکھ یا دس پانچ لاکھ نہیں بلکہ دو چار کروڑ۔ جس سے ہم اُردو کی تعمیر و ترقی کیلئے کوئی منصوبہ بنا سکیں۔ ملک میں بڑے بڑے اشاعتی ادارے قائم کر سکیں، نصابِ تعلیم چھاپ سکیں، اچھے رسائل و اخبارات کی مدد کر سکیں۔ اُردو کے اسکولوں کا جال بچھا سکیں۔ تحقیقی کاموں پر روپیہ صرف کر سکیں اور اپنی تنظیموں کو مضبوط بنا سکیں۔

اگر ہم چاہیں تو اُردو کی یہ بے مائگی ختم ہو سکتی ہے۔ جب ہم نجی اداروں کیلئے سرمایہ فراہم کر لیتے ہیں تو کیا اُردو تحریک کے بنیادی مقصد کے لئے چار پانچ کروڑ روپیہ جمع نہیں کر سکتے!!؟ شہروں شہروں اجتماعات اور دلچسپ پروگرام کر کے اربابِ ثروت سے مطالبات کر کے اور دوسرے بہت سے طریقوں سے ــــ اُردو زبان کے سربراہوں کو پوری سنجیدگی سے جلد اس مسئلہ پر غور کر کے عملی اقدامات کرنے چاہئیں ــــ راقم الحروف اس سلسلے میں ہر تعاون کے لئے تیار ہے۔ ہم اس کے لئے صوبائی کمیٹیاں بنا کر منضبط طریقہ پر کام شروع کر سکتے ہیں، اور بہتر نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

۲ر نومبر ۱۹۶۶ء

ابراہیم ضیائی

احسان دانش

غزل

ہزار بار ہوا اُن کا سامنا مجھ سے
مگر ادا نہ ہوا حرفِ مدّعا مجھ سے

ترے سوا میں کہاں جاؤں کس کا کہلاؤں
نہ چھین اپنے تعلّق کا آسرا مجھ سے

ہزار راہ میں تھیں فاصلوں کی دیواریں
رہا ہے پھر بھی ترے غم کا واسطہ مجھ سے

مرا قلم ہے گریبانِ کربلا کا شگاف
کھُلا ہے شہرِ شہادت کا راستا مجھ سے

مری نظر میں وہ گھر ہیں جہاں چراغ نہیں
نہ ہوگی جشنِ چراغاں کی ابتدا مجھ سے

مری نگاہ غلط، میرا انتخاب غلط
اگر یہ سچ ہے تو اچھا نظر ملا مجھ سے

میں سوچتا ہوں کہ ہیں کتنے کم سواد یہ لوگ
جو پوچھتے ہیں مراحاصلِ وفا مجھ سے

مرے نقوشِ قدم پہ ہے کارواں کی نظر
بڑھے ہے اہلِ تجسّس کا دائرہ مجھ سے

سبب تو کچھ نہیں کھلتا مگر یہ سنتا ہوں
ہوئی ہے بزمِ دو عالم کی ابتدا مجھ سے

میں اپنی ذات کو کیا اور خاک پہچانوں
کہ داغدار ہے دامانِ ارتقا مجھ سے

مرے جنوں نے بہر گام رہنمائی کی
ہزار بار کٹا میرا قافلہ مجھ سے

تصوّر اس میں مرا کیا جو بعض لوگوں نے
لیا ہے تیرے تغافل کا جائزہ مجھ سے

میں متّفق نہ ہوا انتشارِ نکہت پر
ہزار بار اُلجھ کر گئی صبا مجھ سے

میں اک ذریعۂ تشہیر کے سوا کیا ہوں
جو تو نے کہہ دیا دُنیا نے سُن لیا مجھ سے

مری طلب نے تماشا بنا دیا مجھ کو
گھرا ہوا ہے ترے گھر کا راستا مجھ سے

کسی جگہ مرا کیوں ہاتھ پھیلتا دانش
بہت قریب رہا ہے مرا خدا مجھ سے

○

علی عباس اُمید

ترقی پسندی

کوئی چوتھائی صدی سے ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کا قضیہ چلا آرہا ہے۔ کچھ لوگ بالکل ہی دقیانوس ہیں اور کسی قسم کی تبدیلی برداشت نہیں کرتے۔ کچھ اس قدر ترقی پسند (PROGRESSIVE) ہیں کہ ہر پرانی بات کو بغیر نفع اور نقصان پر غور کئے رد (REJECT) کر دیتے ہیں۔ ایک گروہ اُن لوگوں کا ہے جو "میا دلیس دلیا بھیس" کے قائل ہیں اور ان دونوں کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے تعلقات بنائے ہوئے ہیں۔ میں اور میرے طرح کے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ہر سے سے اسی قسم کے جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں۔ آپ شاید سوچیں کہ یہ جو تھا گروہ سر پھروں کا ہے، جو روز روشن کی طرح واضح ایک حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا لیکن بات ایسی نہیں ہے، اس جھگڑے میں پڑنے سے پہلے "ترقی پسند" کی اصطلاح پر غور کرنا چاہیئے۔ اور اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنا چاہیئے۔ ترقی - ORI - لاطینی، ترفس سے ہے جس کے معنی ہیں بلندی، ڈھونڈو اس لئے ترقی کے معنی ہوئے بلند ہونا یا اوپر چڑھنا۔ اسی طرح 'پسند' خوشی

رسیدہ یا چاہنے کے لئے استعمال ہوتا ہے دونوں کو ملانے سے 'ترقی پسند' کی تشکیل ہوئی۔ اس طرح 'ترقی پسند' کے لغوی معنی ہوئے 'بلندی چاہنا'۔ اب اگر دیکھا جائے تو ہر وہ عمل جو بلند ہونے کے لئے کیا جائے ترقی کہلائے گا

انسان فطری طور پر ترقی پسند واقع ہوا ہے چونکہ وہ بلندی چاہتا ہے اس لئے ہر عمل میں جدت اختیار کرتا ہے اور زندگی کے ہر ہر شعبہ میں نئی چیزوں کا دخل پسند کرتا ہے ہمارا موجودہ تہذیب یافتہ سماج اسی فطرت کا نتیجہ ہے اگر انسان میں یہ جذبہ کارفرما نہ ہوتا تو آج ہم بھی سنگی دور (PASTORAL STAGE) کے چرواہے والے جانوروں کی ایک قسم ہوتے۔ جدت ہی وہ جذبہ ہے جس نے انسان کو جانوروں سے الگ کیا اور اشرف المخلوقات کا درجہ دیا۔ زندگی کے لئے ماحول سے وابستگی ضروری ہے اور چونکہ ماحول بدلتا رہتا ہے اس لئے اس بدلتے ماحول کے ساتھ زندہ رہنے کے طریقے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ [illegible] نے منزل سے آگے کا سراغ لگانے اور پرانی ڈگر سے الگ ہٹ کر چلنے کی کوشش کی [illegible] ہمارا سماج، ہمارا معاشرہ اور ہماری تہذیب ہے یوں بھی نئے تجربات خواہ وہ کسی قسم کے ہوں زندگی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

نئے تجربات، نئے راستوں کی دریافت اور منزل کے از سر نو تعین ہی کو جدت کہتے ہیں اور اسی جدت کا دوسرا نام ترقی ہے یہ تبدیلی اور ہر ترقی تعمیری اور تخریبی دونوں قسم کی ہوتی ہے کچھ لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر عمل بنی نوع انسان کے لئے سود مند ثابت ہو اور کچھ ہمیشہ ترقی کرتے ہوئے فنا کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ پہلے گروہ کا عمل اگر مسرت، انبساط، فلاح اور مرہم لاتا ہے تو دوسرا دکھ، درد، گناہ اور ظلم۔ ایک گروہ اگر پینسلین کی تخلیق کرتا ہے تو دوسرا ایٹم بم کی۔ ویسے دونوں کا عمل ترقی ہی کہلاتا ہے، چونکہ دونوں ہی نے کسی نئی چیزوں کی دریافت کی ہے، اور بزرگوں کی متعین کی ہوئی منزل سے آگے بڑھے ہیں۔

ہر حساس اور باشعور فنکار ترقی پسند ہوتا ہے، وہ کبھی بنے بنائے اصولوں پر قناعت نہیں کرتا، زندگی کو نت نئی مسرتوں سے ہمکنار کرنے کے لئے فکر، فن اور غرض و عمل کا ساز نئے انداز سے چھیڑتا ہے ایک خنک چاندنی کا خواب دیکھتا ہے جس کی چھاؤں میں روح کو سکون میسر آسکے، اپنے ماحول بیگانہ ہو کر صرف تخیل کے سہارے زندہ رہنے کے بجائے اجتماعی طور پر ہو سانس لیں ایک [illegible] ضرورت محسوس کرانے کی کوشش کرتا ہے اور ہمیشہ غرم و عمل کا پیغام دیتا ہے۔ لوگ غم و عذاب کے

کاروان کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ وہ قطعی طور پر بے شعور اور انسانیت دشمن ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کے اندر خود آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اس لئے وہ دوسروں کو بھی روکتے ہیں۔ انہیں خدشہ ہوتا ہے کہ اگر کچھ لوگ آگے بڑھ گئے تو وہ تنہا رہ جائیں گے اور ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں رہے گا چونکہ اکثریت ہمیشہ آگے بڑھنے والے کے ساتھ ہوتی ہے اس لئے ان کا تعلق اقلیت میں ڈھل جانے والی ہے ایسے لوگوں کا تذکرہ تو کجا ان کے متعلق سوچنا بھی انسانیت کی توہین ہے ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کا جھگڑا بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ پرانے خیالات کے لوگ کبھی نئی بات سوچ نہیں سکتے۔ ان میں بدلتے ہوئے وقت کے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے ان کے اندر نہ تو جستجوئے صبح نو کا عزم ہے نہ حوصلہ اس لئے یہ ظلمت کہنہ ہی کو خلعت جانتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جو انسانیت کے بڑھتے ہوئے کاروان کی راہ میں حائل ہوں خارج از انسانیت ہیں اور چونکہ ان کا شمار آدمیوں کی برادری میں نہیں ہوتا اس لئے یہ جھگڑا بھی ختم ہو گیا۔ اب باقی رہے انسان اور انسان فطری طور پر ترقی پسند ہوتا ہے خواہ ترقی تعمیری ہو یا تخریبی۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان کا وجود بھاشا اور فارسی کی آمیزش سے ہوا۔ ابتداء کی تمام تخلیقات میں دونوں زبانوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں!
گوری سوے سیج پر مکھ ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس!

نظم کے علاوہ اس دور کی نثر دیکھنے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ زبان کی موجودہ شکل بولنے والوں کی بے پایاں ترقی پسندی کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ جس طرح استعمال کی جاتی ہے کہ وجود میں آئی تھی آج بھی وہی فارسی آمیز بھاشا ساتھ چودھویں موجودہ اردو نے امیر خسرو کے دور سے مغلیہ سلطنت، فورٹ ولیم کالج، لکھنؤ، دہلی اور موجودہ ہندو پاک تک پہنچنے کیلئے ترقی کی ایک طویل رہگزر طے کی ہے۔ آج جو اس کا نکھرا ہوا روپ ہمارے سامنے ہے وہ اسی ترقی پسند ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

محمد حسین نے کہا ہے "ذہن انسانی کی تمام سرگرمیوں میں شاعری سب سے بلند درجہ رکھتا ہے"۔ زندگی کے دوسرے شعبوں سے قطع نظر اگر ادب اور بالخصوص شاعری کو لیا جائے تو یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ ہر دور میں ہر نئی نسل نے ترقی پسند ہونے کا ثبوت اپنے سر لیا ہے دلچسپ بات تو یہ ہے کہ وہی لوگ اپنے وقت میں بدرجہ اتم ترقی پسند رہ چکے ہوتے ہیں نئی نسلوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کو بے راہ روی کا مجرم قرار دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہر زمانے میں سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات الگ الگ رہے ہیں اسی لئے سوچنے، دیکھنے اور کہنے کے انداز میں بھی اختلاف رہا ہے۔

یہ بات سے ہوتا رہا ہے کہ جب بھی کسی نے کوئی نئی بات کہی ہے ہر طرف سے اس پر سخت نکتہ چینی ہوتی ہے، ذہنوں میں وسعت نہ ہونے کے سبب شروع میں ہر نئی بات اور فکر دونوں ہی کا دائرہ تقریباً محدود رہا ہے، انفرادی کاوشوں سے پیچ و خم پیدا کرنے والے میر، غالب، آتش یا انیس غالباً ہی نظر آتے ہیں۔ اگر نیا انداز اپنانے والے کو اپنی بات پر استقلال ہو تو ٹھیک ہے ورنہ اس کا خاموش ہو جانا فطری بات ہے۔ غالب نے جرأت کا اظہار کیا۔ کثرت چونکہ ہمتوں کی تھی اس لئے ان کو آگے بڑھنے سے روکنے کی ہر شعوری اور غیر شعوری، مہذب اور غیر مہذب حرکت کی گئی لیکن چونکہ وہ حوصلہ اور FIRM DETERMINATION میں یقین رکھتے تھے اس لئے انھوں نے اپنا راستہ نہیں بدلا اور ناکہ کر سب کا منہ بند کر دیا۔

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پروا،
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آج چونکہ ہمارے معاشرہ کا بڑا حصہ جہت پرستی کی لعنت سے آزاد ہو چکا ہے، اس لئے اتنا کہنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ غالب کے علاوہ آزاد اور اقبال وغیرہ بھی ان حالات سے دوچار ہوئے لیکن کسی نے اپنی سمت نہیں تبدیل کی اور آگے ہی بڑھتے رہے۔

اختلافات نے ایک طرف تو ادب کا مقصد متعین کرنے میں متفقہ فیصلہ نہ ہونے دیا اور دوسری طرف "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کے دو گروہ بنا دیئے۔ "ادب برائے ادب" والوں نے ادب کو فرد کی شخصیت اور انفرادی جذبات و احساسات کا ترجمان بتایا۔ اس کے برعکس "ادب برائے [illegible]

ں ترقی پسند تحریک کے بھی دو عناصر ہیں، انقلابی تحریک، اور حقیقت نگاری۔ گو کہ یہ دو الگ الگ دھارے ہیں پھر بھی ملکر بہتے ہیں یہاں اس بات کا اعادہ بیجا ہگا قاضین اور خانہ بدوش، نہ ہیئت رکھنے والے رجعت پرست ہیں اور نہ فلاح انسانیت کا عزم رکھنے والے ترقی پسند جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں، یہ قاضین نے وقت میں خود بھی ترقی پسند رہ چکے ہیں، اس لئے اُن سے گھبرا کر اپنے نظریہ کو تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے ذاتی طور پر تو میں اس میں یقین رکھتا ہوں کہ ہان خود زمانے کی تشکیل کرتا ہے۔

فنکار کو صرف زندگی کا ترجمان ہی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ زندگی کی تخلیق بھی کرنی چاہیئے۔ حالات کے بیان اور ماحول کی عکاسی کے ساتھ ہی ساتھ عزم عمل اور ہان کے سرچشموں کا سراغ بھی دینا چاہیئے جن میں زندگی کا امرت بھرا ہوا ہے، انفرادی زندگی کے مقابلہ میں اجتماعی زندگی کو زیادہ اہمیت دینی چاہیئے۔ ذاتی مفاد کی جگہ جماعتی فائدے کو فروغ دینا چاہیئے۔ اس کا مطمح نظر سماج میں ان داشتی کی بنیادوں کو تقویت پہنچانا ہو۔ عزیز احمد کے لفظوں میں "ترقی پسند شاعر یا ادیب اس وقت تک ترقی پسند قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ وہ ادب کو انسانیت کی خدمت کا آلہ نہ بنائے۔" عزیز احمد نے جو شرط ترقی پسند فنکار کیلئے لگائی ہے میں وہی باشعور اور مہذب انسان کے لئے لگاتا ہوں جس کے اندر یہ جذبہ نہیں ہے اور جو تو محسوس اور خود غرضی کا قائل ہو، وہ قطعی انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے، اپنا پیٹ بھر کر مطمئن ہو جانا جانوروں کا شیوہ ہے وقت کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے عالم انسانیت کی بقا اور فلاح کے لئے آواز اُٹھانا انسان کا فرض ہے، ادب میں یہی چیز ترقی پسند کہلاتی ہے۔

شعری اکتشافات کے ذریعہ فنکاروں نے جو وقت کے تقاضوں کو پورا کیا ہے اس کا بیان بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اس مختصر سے مضمون میں مکمل طور پر احاطہ کرنا تو ناممکن ہے پھر بھی ۱۹۳۶ء سے شروع ہونے والی تحریک (ترقی پسند) پر مختصر روشنی ڈالی جا سکتی ہے، کبھی کبھی اندھیرے کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے اور آدمی بے تحاشہ روشنی کی تلاش شروع کر دیتا ہے اس دور میں سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل نے کچھ ایسی ہی صورت پیدا کر دی تھی، نت نئے حادثات اور تبدیلیوں نے عوام کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، چنانچہ مختلف واقعات، اور نظریات کے ٹکرانے سے جو دھندلکا پیدا ہو گیا تھا اس میں حقیقت کی جستجو کی گئی، پرانی قدروں پر چلنے والے ادب کو زندگی کے نئے تقاضوں سے روشناس کرانے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ فنکار سے منفی عمل سے متاثر ہوئے بغیر سیاست اور صنعت کو فن کا اہم جزو قرار دیا گیا۔ سیاسی شعور کے ساتھ ہی سماجی شعور کو بھی اُجاگر کرنے کی سعی شروع ہوئی۔ سامراج، فاشیت، سرمایہ دار، مزدور اور کسان وغیرہ موضوع کے طور پر اپنائے گئے۔ روایات ماضی سے انحراف کیا گیا اور ساکت فن میں حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے جلدی کا کام شیطان کا، اس تحریک میں حصہ لینے والوں کی تعداد بڑی تھی اور تو راستوں کا صحیح تعین ہی نہ کر سکی، کچھ لوگ بھٹک گئے، کچھ آگے بڑھے لیکن ہمسفر نہ ملنے کی وجہ سے اپنے پرانے مجلس دیرینہ کی رنگینیوں ہی کو خلوت سمجھے لیکن چند ایسے حوصلہ مند بھی تھے جو ہمت نہ ہارے اور بڑے استقلال سے منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ ہر تحریک کے شروع میں یہی ہوتا ہے کوئی مستقبل کے حلوے مانڈے کے مقابلہ میں حال کی روکھی سوکھی کو بہتر سمجھتا ہے، کوئی ڈوب کر آہستہ آہستہ گفتگو کرتا ہے، کوئی بہت زیادہ جوشیلا ہوتا ہے اور مرنے مارنے پر تل جاتا ہے اور کچھ لوگ صلح اور جوش کے حسین امتزاج کو پسند کرتے ہیں، اس تحریک کے لاتعداد حامیوں میں بھی ایسی سبھی قسموں کے لوگ موجود تھے۔ اکثریت جذبہ ہمیشہ پہلے طبقہ (نام نہاد لوگوں) کی ہوتی ہے اس لئے غیر تربیت یافتہ اور بے سُرا راگ الاپنے والوں نے ترقی پسندی کی تحریک کو اس قدر مسخ کر دیا کہ عرصہ تک اُس کے متعلق کوئی خوشگوار تصور ہی نہیں ابھرتا تھا۔ ترقی پسندی کے نام پر جس قدر بدعتیں ہوئیں ممکن نہیں کہ ان کا بیان چند صفحات پر کیا جا سکے پھر بھی یہ ایک واقعہ ترقی پسندی کے نام پر کی جانے والی سطحی، عامیانہ، بچکانہ، بلکہ خلاف تہذیب حرکتوں کو سمجھنے میں بڑی مدد دے گا۔ پاکستان بننے کے بعد "ترقی پسندوں" نے بہت واویلا مچائی اور اپنے سے جدا نظریہ رکھنے والوں کو رجعت پسند ٹھہرایا۔ لاہور کے ایک جلسہ میں ماہنامہ "ساقی" کے خلاف قرارداد پاس کی۔ ساقی اور ادارہ ساقی کو رجعت پسند قرار دیا اور پرچہ کا بائیکاٹ کر دیا۔ ساقی کا قصور صرف اتنا تھا کہ "جدلیاتی" میں کھری کھری باتیں لکھتا تھا اور عوام کو انتشار اور ابتر ادب و فضا کو چیر کر صاف اور واضح فکر تک پہنچنے میں مدد دیتا تھا، چنانچہ سکی ہی پالیسی کی بدولت ترقی پسندوں کے محدود نظریات ادب میں سطحی سیاست، غلط پالیسی اور پروپیگنڈے بھی آجاتے تھے۔ اس بائیکاٹ سے عوام نے محسوس کیا کہ ترقی پسند انتہائی مزاحمتی رویہ رکھتے ہیں۔ بنتیجہ ساقی کی اشاعت اور مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا، بعد کو انھیں ترقی پسندوں نے کراچی میں جلسہ کیا اور اس میں اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اپنے گناہوں سے توبہ کی۔ اس دور کی سب سے بڑی لعنت بھی کہ ہر جدا و بیباک (حرکت) کو ترقی پسندی کا نام دیا گیا۔ بیشتر فنکاروں نے ترقی پسندی کے نام پر سیاسی اور

جاتی ہے کہ اس نے کیا کیا۔ اس زمانہ کی تخلیقات میں کہیں کہیں تو گہرا شعور کا دخل ملتا ہے ورنہ عام طور سے یہ رنگ سطحی انفعالیت کا بھرا ہے۔ جعلی انداز اور لفوبازی کر اپنا کھوٹا سرے آدمی نے شکم ادب کا شہزادہ بننے کی کوشش کی لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے اب یہ بھیڑ چھٹ چکی ہے اور خوش گوار نغمے سنائی دینے لگے ہیں۔

آج کی شاعری پر اگر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ وہ انفرادی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ مختلف رجحانات سے پیدا شدہ انداز پھر اچھا شروع ہو گیا ہے اور امید کی تابناک کرنیں نظر آنے لگی ہیں۔ شعراء کے لہجے میں کسی حد تک یکسانیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ناموں کی فہرست دی جا سکتی ہے لیکن ڈر ہے کہ انتخاب کہیں ردّ سواد کر دے۔ چونکہ بغیر ثبوت کے کام نہیں چلتا۔ اس لئے طوالت کے خوف سے زیادہ تو نہیں لکھ سکتا پھر بھی کچھ مثالیں دیتا ہوں کہ شاید کسی کی نظر سے گزر جائے۔ چونکہ زیادہ جگہ چاہیئے اس لئے غزل ہی کے اشعار نقل کرتا ہوں۔ اس انتخاب سے اس نظریہ کی بھی تردید ہو جائے گی کہ یہ دور صرف نظموں کا ہے اور یہ کہ غزل "نانوی حیثیت رکھتی ہے۔

نسرو دخت ہوتی ہے انسانیت سی جنس گراں — جہاں کو پھونک نہ دے گی یہ گرمیٔ بازار
رات بہت تاریک ہے شاید دشمن شبخوں مارینگے — شرمِ جاں جھنجھوت دنیا روشن رکھنا شمعِ خیال
کرنا ہے ابھی خونِ جگر صرفِ بہاراں — کچھ دیر اٹھانا ہے ابھی ناز خزاں اور

(علی سردار جعفری)

ہر دلیس کی اپنی اپنی بولی — صحرا کا سکوت بھی صدا ہے
مسافروں سے کہو ران سے شکست نہ کھائیں — میں لا رہا ہوں خود اپنے لہو سے گھر کے چراغ
جنہیں کسی دور میں ڈبویا طلاطمِ بحرِ زندگی نے — طلاطمِ بحرِ زندگی سے وہی سفینے اچھل رہے ہیں

(احمد ندیم قاسمی)

میں دوپہر سے دھوپ میں کھڑا ہوں — سایہ سایہ پکارتا ہوں!
ہر سمت آوازِ ہائے صداؤں کے سلسلے — ہم خود کو ڈھونڈتے ہیں اسی ازدحام میں
بارہا دستِ ستمگر کو قلم — ہم نے کیا — بارہا چاک اندھیرے کی قبا ہم سے ہوئی

(خلیل الرحمن اعظمی)

نہر قطرہ قطرہ پیتے پیتے مرتے رہے روز جیتے رہے — زندگی بھی ہمیں آزماتی رہی اور ہم بھی اسے آزماتے رہے
ہم تو دل کی ویرانی بھی دکھلاتے شرماتے ہیں — ہم کو دکھلانے آئے ہیں ذہنوں کے ویرانے لوگ
فصلِ جنوں ہے خوں میں تر بخیۂ بہار کم کرو — اٹھو اور اٹھ کے قصۂ دار و رسن رقم کرو

(راہی معصوم رضا)

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا — یارو — میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو
زندگی میں خوشیاں بھی ہیں رعنائی بھی — زندگی سے ابھی دامن نہ چھڑاؤ ابھی جیو
لاکھ خورشید سرِ بام اگر ہیں تو رہیں — ہم کوئی موم نہیں ہیں کہ پگھل جائینگے

(شہریار)

چند مرہوم امیدیں تھیں سو وہ بھی نہ رہیں — اے خدا اور کہاں تک کوئی اب زہر پیئے
مشعلیں ہیں نہ رخِ صبح پہ زلفِ شبِ غم — کیا خبر قافلہ دل کہاں ہے اب کے
عزمِ جواں کو دو صدا، خونِ جگر بہم کرو — سادہ ہے زیست کا ورق فتحِ جنوں رقم کرو

(علی عباس امید)

ہر دور میں ہر دل کے دھڑکنے کی صدا ہوں — اک عمر ہے تاریخ کی چوکھٹ پہ کھڑا ہوں

بانہوں میں لے چلا ہے زمانے سمیٹ کر — جلتے ہوئے شعور کا یہ ایک ایک پل
یادوں کے سنگ میل نہ خوابوں کا راستہ — کس دشتِ بیکراں میں نہ جانے بھٹک گئے

(خورشید احمد جامی)

حدیثِ غم بھی نہیں، حرفِ مدعا بھی نہیں — پہلی بات سنا را عتنا بھی نہیں
آوارگی میں جادۂ منزل کی قید کیا — اپنا سفر بھی ہے سفرِ باد کی طرح

(غلام ربانی تاباں)

جام ہیں اُن کے ہاتھوں میں بھی جن میں ظرفِ باد نہیں — اہلِ نیاز ساقیٔ کم نظر کو کیا کہیئے
خوشبو کے رسول بن گئے ہیں — وہ زخم جو پھول بن گئے ہیں

(اعجاز صدیقی)

میں تو ایک نئی دنیا کی دھن میں بھٹکتا پھرتا ہوں — میری تجھ سے کیسے نبھے گی ایک ہیں تیرے ہر کردار
دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا — یاد نے کنکر پھینکا ہوگا

(ناصر کاظمی)

کئی صدیوں سے ساحل پہ کھڑا ہوں — میں آنکھوں سے سمندر ناپتا ہوں
اک نئی دھوپ میں پھر اپنا سفر جاری ہے — وہ گھنا سایہ فقط طولِ تمنا نکلا

(کمار پاشی)

رستہ، مکان، راہ کے پتھر بدل گئے — جھپکی جو آنکھ شہر کے منظر بدل گئے
اٹھتی نہیں ہے ہم پہ کوئی مہربان نگاہ — کہنے کو شہر محفلِ اغیار بھی نہیں

(فضیل جعفری)

سورج کے اُجالے میں چراغاں نہیں ممکن — سورج کو بجھا دو کہ زمیں جشن منائے

آئینہ خانے میں ہے درکار کیا — چاہیئے اک سنگ اگر چاہیئے (حمایت علی شاعر)
سینۂ بربط سے جو شعلہ اُٹھا، ہم دردوں کے دل کا نغمہ ہو گیا (سلام مچھلی شہری)
فغانِ دل سے کس کا دامن تر ہوا — یہ ہے سودائے خام آہستہ بولو (شان الحق حقی)
کھڑکیاں کھولو کہ درماندۂ موسم ہوا، راکھ کا ڈھیر ہیں کچھ لوگ طرب خانوں میں (زبیر رضوی)
اتنے پتھر دل تو نہیں تھے، دیوانوں کو کیا سوجھی — زلیخا اب بھاگ کب سے حیرت دروازہ کھٹکھٹائے ہے۔ (طراح حیرت)
درِ گلشن پہ "سہم اے بادو" — "راستہ بند ہے" لکھوا دو (شاد عارفی)
وہی تاریک جبینی، وہی تاریک شبی — زندگی کو صلۂ شعلہ بجانی نہ ملا (سید حرمت الاکرام)
رات تاریک ہے مشکل ہے سفر ایسے میں — ایک کرن پیار کی لے آؤ کہ کچھ رات کٹے (امیر احمد خسرو)
منّی کی بھولی باتوں سی چنچل تاروں کی کلیاں — پتّو کی رنجیو شرارت سا چھپ چھپ کر بھرا چاند (مدا فاضلی)
خود بخود شاخ لچک جائے گی — پھل سے بھر پور تو ہو لینے دو (علقمہ شبلی)
حسرتوں کے صحرا میں سرنگوں اُمیدیں ہیں، صبح کا تصور کیا شام کا سویرا ہے (زہرہ غازی پوری)
برف کی اُجلی پوشاک پہنے ہوئے پیڑ جیسے دعاؤں میں مصروف ہوں — وادیاں پاک مریم کا آنچل ہوں جن پر سجدہ کریں سر جھکائیں کہیں

(بشیر بدر)

اہلِ ہمت کے حسیں خوابوں کی نکلی تعبیر ابنِ آدم کو ستاروں کا سلام آتا ہے۔ (حبیب احمد صدیقی)

جن شعراء کے اشعار یہاں نقل کئے گئے ہیں یہ بھی مختلف عمروں اور مختلف جگہوں سے تعلق رکھتے ہیں، ناموں کی ترتیب اور اشعار کی تعداد پر ممکن ہے کہ کسی کو اعتراض ہو لیکن یہ قطعی بیجا ہوگا کیونکہ یہ انتخاب میں نے فنیات اور ادبی مقامات کی قید سے آزاد ہو کر صرف اس بات کو واضح کرنے کے لئے کیا ہے کہ ہمارے فنکاروں کے لہجہ میں کافی یک رنگی آگئی ہے، سب کا محور ایک ہے، بات کہنے کا انداز (جو کہ عام بول چال میں بھی اکثر گل مل ہوتا ہے۔ جدا ہو سکتا ہے لیکن مقصد میں قطعی اختلاف نہیں ہے۔ تخلیق کا مقصد ہونا ضروری ہے، آج کی اس چاند تک پھیلی ہوئی دنیا اور بھاگتی ہوئی زندگی میں بے مقصد اور بے مہل باتوں کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ بہت لوگ اب بھی فرسودہ خیالوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اُن کا ذہنی اُفق روشن نہیں۔ میری اس بات سے یہ نتیجہ قطعی نہیں نکالنا چاہیئے کہ ماضی کی ہر چیز بُری ہے، اور اُسے بھول جانا چاہیئے۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں، ماضی تو بہت ہی پیاری چیز ہے۔ بغیر ماضی کے مطالعہ (واقفیت) کے ہم حال میں مستقبل کی تابناک کرنوں کا خواب ہی نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ ماضی گذر چکا، اس میں اُلجھ کر کہی ہوئی باتوں کو دہرانے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے بلکہ صرف تجربات کو پیشِ نظر رکھ کر وقت اور زمانے کے مزاج کے مطابق نئے سرے سے سفر کا آغاز کرنا چاہیئے۔

چونکہ نئی نظم کی اکثریت ہم آواز ہے اس لئے اب مقصد کا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ اب جس بات پر اختلاف ہے اور جو چیز ہمیں طے کرنی ہے وہ ہے ہیئت۔ غزلیں تو کما بیش سے لکھی جا رہی ہیں لیکن نظموں کا کیا فارم ہو؟ یہ چیز اب بھی زیرِ بحث ہے۔ کوئی پابندی کے حق میں ہے تو کوئی مکمل آزادی چاہتا ہے، کچھ لوگ موزونیٔ خیال اور وقت کے لحاظ سے پابندی اور آزادی دونوں ہی کو اپنانے کی رائے دیتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں بھی امتزاج ہی کو پسند کرتا ہوں۔ آزادی سے میرا مقصد اس آزادی سے نہیں ہے جس میں ہر مصرعہ سے الگ الگ سُر پھوٹتے ہیں۔ اور پوری نظم کا نتیجہ صفر ہوتا ہے، بلکہ اُس سے ہے جس میں قافیہ کی پابندی بھلے ہی نہ ہو لیکن نظم میں (معین ارکان کے ساتھ آزادی برتنے کے باوجود) تسلسل اور مقصد ہو۔ مصرعوں میں رکنوں کی تعداد تو حسبِ ضرورت بڑھائی یا گھٹائی جائے لیکن مصرعوں میں خیال مکمل ہو دو سرے سے ہم آہنگ ضرور ہوں۔ ایک بار فلابیرؔ نے مپاساں سے کہا تھا "بات کہنے کے لئے درمیل ایک ہی لفظ ہوتا ہے صفت ظاہر کرنے کے لئے ایک ہی اسم صفت اور فعل کو ظاہر کرنے کے لئے بس ایک ہی فعل۔" اچھی تخلیق کے لئے اس مقولے کو ذہن میں رکھنا مناسب ہوگا، اگر شاعر اس پر پابندی سے عمل کرے تو مہل اور نامانوس تخلیقات کے ساتھ ہی گنجلک اسلوبِ بیان سے بھی ادب کو دور رکھنا ہوگا۔ انداز بیان میں موضوع اور اسلوب کی ہم آہنگی کے علاوہ بیان ہونے والی ہر چیز کا اُس کے اپنے رنگ و روپ میں ہونا ضروری ہے۔ شعراء کو اس طرف بھی دھیان دینا چاہیئے۔

قبل اس کے کہ میں مضمون ختم کروں اتنا اور کہنا چاہوں گا کہ جو بھی جدت یا ترقی ہوتی ہے وہ وقت اور حالات سے مجبور ہو کر، اگر ہم اپنے حالات سے مطمئن گذر رہے ہوں اور نئی اُلجھنوں اور پریشانیوں سے دوچار نہ ہوں تو کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت نہیں محسوس کریں گے۔ یہ صحیح ہے کہ یک رنگی سے بھی لوگ گھبرا جاتے ہیں لیکن گھر خوش و خرم بسر ہوتی ہو تو کون تجربات کا RISK لیگا، مگر چونکہ انسان موجودہ انتشار کا نتیجہ ہے اس لئے "مکمل آسودگی" تو صرف تصور کی چیز ہے، تبدیلیوں کو زندگی کی علامت کہا گیا ہے۔ جیسے حالات ہوتے ہیں اُسی طرح کے اقدامات بھی کئے جاتے ہیں۔ ادب میں بھی حالات ہی کے سبب تجربے جنم لیتی رہتی ہیں۔ ہماری موجودہ تحریک جسے ہم نے "ترقی پسند تحریک" کا نام دیا ہے غدر برائے نام مغل بادشاہ، انگریز جنگِ آزادی اور آزادی کی دین ہے، بُلبل کی جگہ رسن و دار کو لانے والے حادثات ہی ہیں ورنہ

غمِ حیات کے سائے نہیں ہیں ورنہ کیسے پسند نہیں ہے، خیالِ یار کی دھوپ

آخر میں ترقی پسندی کے متعلق صرف اتنا کہوں گا کہ وقت کی آواز کو تخلیق میں سمونا ہی ترقی پسندی ہے جو اس سے انحراف کرتا ہے وہ قطعی اس دور کیلئے مناسب نہیں ہے اور چونکہ اسکی آواز صرف گذرے زمانوں کی بازگشت ہے اسلئے اُس کی اہمیت بھی ماضی کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ ایک نسل دوسری نسل سے جن اعتبارات سے مختلف ہوتی ہے اور پرانی نسلوں کے مقابلہ میں نئی نسل جو امتیازی خصوصیات رکھتی ہے اچھے فنکار (ترقی پسند) کو اس سے واقفیت ہونی چاہیئے۔ اسے انسان کی عظمت کا شدید احساس ہونا چاہیئے، جو اُسے کچھ کر گذرنے کا محرک ایسا بنا دے کہ جس کی نوعیت انسانی خلوص ہو۔ (انسانی ارتقاء کیلئے انتہا پسندی (جذباتی) ضروری ہے) کیونکہ یہ "انگ" ہی اور طاقت کی تخلیق کرتی ہے اور یہی چیز "کچھ" کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس ایٹمی دور میں دوسری پہلے کا انداز اپنانے کے بجائے لہجہ میں بلند آہنگی کو جگہ دینا چاہیئے ذات کائنات سے ہم آہنگ کرنا بلندی کی دلیل ہے۔ زندگی اور زندگی کے مسائل پر پھر لوٹ چوٹ کا بیان تخلیق کے لئے لازم ہیں۔

وفا ملک پوری

گلاب کا پیڑ

کسی نے اپنے خوں سے سینچکر اسے بڑا کیا
یہ بڑھ کے جب جواں ہوا وقارِ گلستاں ہوا
یہ شاہزادۂ چمن
چمن کی اک روِش پہ ہے کھڑا ہوا
غرور و فخر و ناز سے
خودی کی ہر ادا لئے، لطافتِ صبا لئے
نجوم و مہر و ماہ کی ضیائے دلربا لئے
ہر ایک شاخ و برگ و گل میں نکہتِ وفا لئے

یہ موسمِ بہار کا ہے اک حسین ترجماں
نقیبِ فصلِ گل ہے یہ، حریفِ جامِ مل ہے یہ
نسیم کی دعا ہے یہ، ریاضتِ صبا ہے یہ
کسی کے دل کی آرزو، کسی کی آنکھ کا لہو
کسی کا دلربا، کسی کے اعتماد کا نشاں

یہ شاہزادۂ چمن!
چمن کی اک روِش پہ ہے کھڑا ہوا
پلا رہا ہے خار و گل کو اپنے جسم کا لہو
بڑھا رہا ہے ہر نفس یہ گلستاں کی آبرو
کھلے ہوئے جو اس کی شاخ شاخ میں گلاب ہیں
کہیں یہ آفتاب ہیں، کہیں یہ ماہتاب ہیں

غرض اس ایک پیڑ کے وجود سے
"چمن چمن کھلے ہیں گل قدم قدم بہار ہے"
اور اس کے ارد گرد اک ہجوم کاروبار ہے
جہاں جنوں نواز بھی ہیں اور اہلِ ہوش بھی
نگاہِ لطف باغباں بھی اور گلفروش بھی

مگر وہ جس نے اس کو اپنے خونِ دل سے سینچ کر
بڑا کیا، جواں کیا
وقارِ گلستاں کیا، بہارِ گلستاں کیا
اسی کے واسطے نہیں یہ شاہکارِ رنگ و بو
یہ تو بہارِ رنگ و بو
نہیں جو اس کے واسطے یہ شاہکارِ رنگ و بو
تو کیا ہوا کہ آج بھی ہے اسکے لب پہ یہ دعا
"یہ شاہکارِ رنگ و بو، یہ شاہزادۂ چمن"
"یونہی رہے ہرا بھرا"
"یونہی رہے ہرا بھرا"

(انگریزی سے ترجمہ)

عورت اور جام

یہ مشہور مصور ہمیش نندا کی کہانی ہے۔ گزشتہ سال جب دہلی میں نمائش لگی تھی، اُس وقت میں نے اُسے لکھا مجھے آرٹ کے بارے میں بہت کم معلومات ہے میں مصوری سے اتنا ہی اثر لیتا ہوں جتنا کوئی بارش سے نہائے ہوئے پتوں یا شام کے وقت کے آسمان سے لے۔ ایک ہفتہ تک اخبار نمائش کی خبروں سے بھرے رہے، میں خاموشی سے تصویروں کو سراہتا ہوا ایک طرف سے دوسری طرف گیا۔ میری نگاہیں ان میں سے دو تصویروں پر رک گئیں۔ ایک کا عنوان تھا "برگ گلی" اور دوسری تصویر بغیر کسی عنوان کے تھی۔

ان میں سے پہلی تصویر چائے کے باغ میں چائے کی پتیاں توڑتی ہوئی عورتوں کے ایک گروہ کی تھی۔ ایک عورت سامنے کھڑی تھی سر پر ایک ٹوکری تھی۔ اس تصویر کا ایک رُخ نظر آرہا تھا۔ میں اس تصویر کو گھورتا رہا۔ اس کے عنوان کے متعلق سوچتا رہا۔ مجھے چائے کے بارے میں کچھ معلومات تھی، کیونکہ ایک بار میں اپنے دوست کے ساتھ دارجلنگ چائے کا باغ دیکھنے گیا تھا..... اس کا چپراسی ذمہ دار تھا۔ چائے کے پودے کے سب سے اُوپری حصہ میں ایک پتی اور ایک کلی ہوتی ہے، اس کے نیچے سخت اور موٹی پتیوں کا ایک خوشہ ہوتا ہے، میں اُوپر کے حصہ میں صرف ایک پتی ہوتی ہے اور ایک کلی۔ اور جو چائے اس سے تیار ہوتی ہے، بہت عمدہ ہوتی ہے جو عام طور سے معمولی آدمی استعمال کرتے ہیں، وہ موٹی پتیوں کا بنا ہوتا ہے۔

میں تصویر کو غور سے دیکھتا رہا۔ عورتوں کا گروہ پتیوں کے خوشہ کی مانند معلوم ہوتا تھا اور جو عورت کھڑی تھی وہ کلی کی طرح۔

دوسری تصویر ایک پہاڑی عورت کی تھی۔ جو بے پناہ خوبصورتی کا مظاہرہ کر رہی تھی، وہ چست سبز رنگ کا اور کالی پٹی دار قمیص، بڑی بڑی نقرئی بالیاں اور ناک میں لونگ پہنے تھی۔ اس کے جسم کی ساخت میں موسیقی کا بڑھاؤ تھا۔ اس کا سینہ اور رانیں گداز تھیں، روشنائی جیسی اس کی سیاہ آنکھیں آمادۂ پیکار نظر آتی تھیں، رائے زنی کی۔ "کیتنی خوبصورت تصویر ہے"، "ایک حسین عورت" شراب کے بہزیر جام کی طرح۔ اس کی جوانی کی پینے کے لئے پوری زندگی بھی ناکافی ہوگی۔

مجھے یہ احساس بھی نہ ہوا کہ مصور میرے پیچھے تھا اور اس نے میرا ریمارک سن لیا تھا۔

اس نے مجھ سے پوچھا — "آپ نے کیا کہا؟"

میں نے بھوری داڑھی والے اس آدمی کو دیکھا

وہ پرانے گھسے ہوئے کوٹ اور کارچوب کی مخملی ٹوپی میں ایک جادوگر معلوم ہو رہا تھا اس کے رخسار پچکے ہوئے تھے، پیشانی بھرپور سچ تھی اور عجیب سی مضحکہ خیز ناک جو اس کے چہرہ کا خاص حصہ تھی، جب وہ کسی شدید جذبہ کا اظہار کرتا تو اپنی ناک کو بھڑکاتا تھا۔ جیسے وہ ناک کے ذریعہ چیزوں کو دیکھتا۔ اس کی تصاویر میں بھی یہی چیز موجود تھی۔

اس نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "آپ نے کیا کہا"

کیا آپ نے سن لیا۔ میں نے پوچھا۔

"جی ہاں، جو کچھ میں سننا چاہتا تھا وہی آپ نے دہرا دیا۔ ایک دم اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی، جن میں اچانک ہوائی کی امنگیں، اُمنگیں لینے لگیں۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی میں نے اس تصویر کے بارے میں کچھ ایسا ہی سوچا تھا، کسی نے بھی اس خیال کا اظہار نہیں کیا، میرے دوست ایسی عورت کے خیال پر ہنسے۔ مگر مجھے اس جذبہ کا یقین ہے جو چنگلی بارش کی طرح اچانک اور شدید ہوتا ہے۔ تم نے

سیر کا عنوان بتا دیا ہے "عورت اور جام" میں اس کا یہی عنوان رکھوں گا۔
میری معمولی سی رائے ناقد کی رائے کا درجہ نہ رکھتی تھی لیکن اس نے مصور کا دماغ کچھ پریشان کر دیا۔ نمائش ایک ہفتہ تک رہی۔ میں کئی دفعہ وہاں گیا۔ ایک دن میں نے جرأت کر کے مصور سے پوچھا "آپ کو یہ عورت کہاں ملی؟" کیا اس کا تعلق حقیقی زندگی سے ہے یا آپ کے تصور کی پیداوار ہے۔

آخری دن جب میں گیا تو اس نے مجھ کو یہ کہانی بتائی۔
تیس سال کی بات ہے میں اٹھارہ برس کی عمر کے حوالی آرٹ اور مصوری کو دیکھنے کانگرا پہاڑیوں میں گھوم رہا تھا۔ وہاں میں نے ٹونی کو چائے کے ایک باغ میں کھڑا دیکھا جو میرے خوابوں میں بسنے والی عورت کی مکمل تصویر تھی۔
"ٹونی کون تھی؟
میں نے اس کا نام جاننے کی کبھی کوشش نہ کی۔ میں اس کو ٹونی کہتا تھا۔ میں اس کو اکثر اپنی کمر پر ایک ٹوکری لٹکائے، اپنی سہیلیوں کے ہمراہ چائے کی پتیاں توڑتے وقت گیت گاتا سنتا تھا جس میں پُر مسرت غم کا تاثر ہوتا تھا۔
اس نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔ میں نے اپنا ایزل اور رنگ لئے اور اس کی تصویر بنانا شروع کی۔ کانگرا عورت ہمیشہ اپنی کمر پر ایک ٹوکری لیجاتی ہے یا تو چائے پتیاں توڑنے کے لئے یا اس میں بچہ رکھ کر۔ وہ زندگی بھر ٹوکری کے اس بوجھ کو اٹھائے رہتی ہے۔ ایک دفعہ جب میں اس کا خاکہ کھینچ رہا تھا، میں نے اس سے یہ بات مذاق میں کہہ دی تھی۔ وہ بولی ایک تیسری ٹوکری بھی ہے اور وہ ہے غم کی۔ یہ کہہ کر وہ خوب ہنسی اور اپنا راستہ لیا۔
ایک دو تصاویر بنا کر اپنا کام ختم کر کے میں نے اپنے میزبان سے جانے کی اجازت چاہی اور وادی کو چھوڑ کر واپس جانے کا خیال کیا۔ کئی دن سے میں نے ٹونی کو نہیں دیکھا تھا۔
ان دنوں بارش تیزی سے ہو رہی تھی۔ گہرے گہرے بادل اٹھتے اور برس ہو جاتی۔ آنے جانے کے راستے بند ہو گئے تھے جو سڑک گاؤں سے باہر تھی، وہ پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مجھے واپس جانے کے لئے کئی دن انتظار کرنا پڑا۔ ایک ہفتہ بعد آسمان صاف تھا۔ طوفان کم ہو گیا تھا۔ اور سرسبز نظر آنے لگی تھی۔ موسم کافی خوش گوار اور دلکیف انگیز تھا۔ ہوا کے جھونکے اپنے ساتھ جنگل کی سوندھی بھینی خوشبو لا رہے تھے۔ میں گاؤں سے جا رہا تھا کہ مری نظر ٹونی پر پڑی جو پہاڑی راستہ پر آ رہی تھی۔
اس نے میرا خیر مقدم کیا اور کہنے لگی "کیا تم گاؤں چھوڑ رہے ہو؟"
"ہاں" میں نے جواب دیا۔ "کام ختم ہو گیا ہے اب مجھے چلا جانا چاہیئے۔ اس بارش کو تو دیکھو۔ میں تو سمجھا تھا کہ طوفان کبھی ختم نہ ہوگا۔ لیکن وہ آخر کم ہو ہی گیا۔"
"یہ آسمان کے آنسو ہیں، یہ ایک بیوقوف عورت کی طرح رحمدل ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد وہ آنسو بہانا ختم کر دیتا ہے اور خوشی سے مسکرا اٹھتا ہے انسان کے آنسو اتنی جلد کبھی خشک نہیں ہوتے، وہ بہتے ہی رہتے ہیں۔"
میں خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایسی بات کہہ سکتی ہے۔ مجھے بنگالی ناولوں میں لکھے ہوئے ایسے کچھ جملے یاد تھے، لیکن ٹونی نے بھلا ان کو کہاں سنا تھا، پھر بھی اس نے ایسی باتیں کہیں، شاید تمام انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک ہی سی باتیں محسوس کرتے ہیں۔
"تم ایسی باتیں کیوں کیا کرتی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔
"کیوں! ہر عورت ایسی ہی باتیں محسوس کرتی ہے چاہے وہ کہہ نہ سکے۔"
"کون سی باتیں؟"
"زندہ رہنے اور نہ رہنے کی باتیں۔"
وہ میرے کینوس کی طرف مڑی اور کہنے لگی "کیا تم اس کو فروخت کرو گے؟"
"ہاں۔"

— سن لو لسر درخت کرو نے ۔ ؟"

"کسی کو بھی، جو قیمت ادا کرے گا۔"

اُس نے خاموشی سے میری طرف دیکھا اور کچھ دیر بعد سوچ کر بولی، "کیا ہمارے یہاں کی عورتوں کی طرح جو قیمت ادا کرتا ہے اُسی کے ہاتھوں بک

"کیا عورتیں بکتی ہیں؟"

"بیشک! اور بہت سستی۔ تمہاری تصویر سے بھی کم قیمت پر۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"ہاجن ان کو خرید لیتے ہیں، کچھ دینے ہوئے میرے والد نے زیادہ شرح سود پر اس سے کچھ روپیہ لیا تھا، جتنا میں بڑی ہوتی گئی رقم بھی بڑھتی گئی وہ چھ سو روپے سے ضم کر چکا ہے۔ میں کاشت کرتی ہوں اور میرا باپ کچھ کام کر کے اُس کی رقم چکاتا ہے، اتنی رقم کا ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ اسے برسوں کیا تمام عورتیں اس قرضہ سے مجبور ہو کر کاشت کرتی ہیں؟"

سب نہیں لیکن زیادہ تر کرتی ہیں۔ زمیندار اچھی چاہے اپنے استقلال یا ہمارا جہ کو تندرست کرنے کے لئے تو لیتا ہے اور ایسا ہی وہ کام کرنے والیوں کے ساتھ کرتا ہے وہ چاہے کی طرح اُن کو بھی چن لیتا ہے وہ خوفناک آدمی ہے۔ ٹیڑھی ٹانگ والا بدمعاش ہے۔ بوڑھے بیل کی طرح چلتا ہے۔ لڑکیو نے ایک گیت بنایا ہے ایک ٹیڑھی ٹانگ والے آدمی کا گیت۔ گذشتہ سال اُس نے قرضے کے بدلے میں میرے باپ سے مجھ سے اپنی شادی کے بارے میں کہا تھا، مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔

"تم اُس سے شادی کیوں کرتی ہو؟"

"کیسے نہ کروں۔ میرا باپ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کیسے کر سکتا ہے۔ اور میں باپ کی مرضی سے مجبور ہوں۔ قرضہ چکانے کے بدلے میں مجھے شادی کرنی پڑے گی۔

میں نے تصویر کو دیکھا پھر اُس کو۔ تصویر ایک زندہ حقیقت تھی جو کینوس پر کھینچ گئی تھی۔ ایک فریم میں چڑھی گئی تھی کسی امیر کے گھر کے لئے۔ بالکل اُس جیسی ہی ——

"اگر میں تم کو قرضہ سے نجات دلا دوں، میں نے اتفاقاً پوچھا۔

"تم کیسے دلا سکتے ہو؟"

"اُس کو ادا کر کے۔"

"تم کیسے ادا کر سکتے ہو؟"

"میں رقم ادا کر دوں گا، اور تمہارے والد سے منگنی توڑنے کیلئے کہوں گا۔"

پھر میں نے واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

دوسرے دن میں اُس کے گھر گیا اُس کے والد سے شادی ختم کرنے کو کہا، بوڑھے کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا، اُس نے کہا "تم کیوں یہ رقم ادا کر رہے ہو۔ کیا تم لڑکی کو خریدنا چاہتے ہو؟"

خرید و فروخت، لڑکی سے پیار کرنے کا صرف یہی راستہ تھا، خواہشات۔ اور خوابوں کو حقیقت بنانے کا ذریعہ۔

"میں کچھ نہیں خرید رہا ہوں ——" یہ کہہ کر میں چلا گیا۔

شام کو لڑکی مجھ سے ملی۔ صاحب تم مجھے کیوں خریدنا نہیں چاہتے۔ کیا میں اپنی تصویر سے خراب ہوں۔ شاید..... ہوں۔ اور پھر اُس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔

اس نے جانور کی طرح خوفزدہ ہو کر دیکھا، وہ ایک انجانے خیال سے خوفزدہ تھی، ایسے خطرہ سے سہمی ہوئی تھی جو اُس کی زندگی کے راستہ میں رکاوٹ

بن گیا تھا۔

میری زندگی میں کئی عورتیں آئیں اور چلی گئیں۔ زیادہ عرصہ تک میں اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی اپنی زندگی کے راستہ پر چل سکا۔ شاید میں اپنی پوری زندگی ایک ساتھی کے ساتھ گذارنے کا اہل نہ تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہی وہ عورت ہے جس کے ساتھ اپنی زندگی کی تاریک راہوں پر چل سکتا ہوں۔

وہ مجھے پُرشوق نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں میں ایک پوشیدہ غم کی ہلکی شامل تھی۔ میں نے اُس سے کہا "ہر وہ عورت جو میری زندگی میں آئی، شراب کا ایک جام تھی جس کو میں پی ڈالتا تھا اور پھر دوسرا پیالہ بھرتا تھا۔

"کیوں صاحب کیا آپ کی تشنگی کبھی نہیں بجھی ۔۔؟"

اُس کے جسم سے شرارے پھوٹ نکلے جو مجھے دعوتِ نظارہ دینے لگے۔ دُور بھیڑوں کے گلے سے خوشبو آئی۔ بند کلیاں کنگناتی عورتوں کے ہاتھوں سے ٹوٹنے لگیں۔ میرے جسم میں خوشی کی لہریں جاگ اُٹھیں۔ میں نے کہا۔

"تم تو چائے کے پودے کی سب سے زیادہ پیاری کلی ہو۔ کوئی جو تم کو پیے گا وہ خوش قسمت ہوگا۔"

میں نے اس کو بوسہ دیا۔ جنگل، بھیڑ کے گلے اور برگ و صنوبر کی تمام خوشبو ایک دوسرے میں گھل گئی۔ سارے رنگ ایک دوسرے میں سمٹ آئے۔ ساری آوازیں ایک ہی آواز میں ڈوب گئیں۔

"مجھ سے وعدہ کرو تمہارے لب کسی دوسرے جام کو نہ چھوئیں گے۔" سوائے میرے لبوں کے، وہ التجا کرنے لگی۔

اُس کا فیصلہ اٹل تھا۔ اُس کے والدین کچھ خائف ہو گئے، اور میں رقم کا انتظام کرنے شہر چلا گیا۔

کچھ دیر کے لئے مصوّر خاموش ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں ویران تھیں اور اُس کی ناک بار بار پھڑک رہی تھی۔

"اُس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔ "تم خاموش کیوں ہو گئے؟"

اُس نے تصویر کو دیکھا اور کہنے لگا۔ "تقدیر نے میرے ہاتھوں سے میرا جام چھین لیا۔"

"کیا وہ جاجن سے شادی کرنے کو اپنے والدین کی طرف سے مجبور کر دی گئی تھی۔"

"ہاں ۔" وہ مجھ سے رقم کے بارے میں پوچھنے آیا تھا۔ شام کو جاجن وہ دستاویز لے کر جس پر اُس کے باپ کا نشانِ انگوٹھا تھا، گاؤں کے مُکھیا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ اُس کے یہاں پہونچا۔ اُس نے ٹونی کو شادی کرنے کے لئے مجبور کیا۔ اُس رات ٹونی نے زہر پی کر خود کو ہلاک کر لیا۔ باغ میں زہر ہلاہل کی طرح ایک پودا تھا، وہ باغ سے اُسے لائی اور پینے کے قابل بنایا۔ جب برات پہونچی، ٹونی نے اُس کو پی لیا۔

میں دوسرے دن روپیہ لے کر واپس آ گیا۔ میں نے ٹونی کو مُردہ پایا۔ وہ میری تھی، صرف میری۔ میں اُس کے اوپر جھک گیا اور اُس کے بے جان اور سرد ہونٹوں کو بوسہ دیا۔

بیس سال گذر چکے ہیں۔ میں نے اپنی قسم توڑی کہ۔ اس کے ہونٹ لرز گئے جیسے ہی آنسو اُس کے رخساروں پر بہے۔

جب اُس نے اپنی کہانی شروع کی تھی تو آٹھ بجے کا وقت تھا۔ ناظرین چلے گئے تھے۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ چوکیدار دروازہ بند کرنے آ گیا تھا۔

مجھے اس کہانی کو سُنتے ہوئے ایک سال گزر گیا ہے۔ اس ہفتہ میں نے تبدیلی کے ساتھ کہانی لکھ ڈالی، مگر مصوّر نے اُس کی اشاعت کی اجازت نہیں دی۔ وہ کہنے لگا اس جام کی شراب مجھے تم زندگی کے آخری لمحہ تک پینے دو۔ میری موت کے بعد تم میرا نام بغیر تبدیلی کے شائع کرا سکتے ہو۔

گذشتہ ہفتہ اخبار میں مشہور مصوّر کے انتقال کے بارے میں آپ نے پڑھا ہوگا۔ اخبار اُس کے فن کی تعریف سے پُر تھے۔ نقادوں نے اُس کے فن کے پس منظر کے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا جس کمرہ میں مصوّر نے آخری سانس لیا تھا، دیوار پر ایک تصویر ٹنگی تھی "عورت اور جام" اُس کی خواہش کے مطابق میں نے کہانی میں کچھ تبدیلی نہیں کی۔ ■

غزل

(حضرت فراق گورکھپوری کے نام)

یہ رُت بہار کی یہ موسم جواں صیّاد
ترے کرم سے مرا دل ہے خونچکاں صیّاد

مری فغاں سے تو برہم ہے گلستاں صیّاد
تری جفا کا بھی ہوتا ہے امتحاں صیّاد

ادا شناسِ محبت نہ تھا کوئی ورنہ
روش روش پہ تھی اک فوجِ گلرخاں صیّاد

نئے لباس ستم ہر نفس بدلتی ہے
نئی حیات ہے اک نازِ دلبراں صیّاد

دلوں کے زخم کا رشتہ نظر سے محکم ہے
یہ موجِ گل بھی ہے اک تیغِ خونچکاں صیّاد

مذاقِ جشنِ بہاراں کی یہ سزا تو نہیں
نوائے عیش بھی بلبل کی ہے فغاں صیّاد

تڑپ رہا ہے فضاؤں میں خونِ دل میرا
مری نگاہ سے کر سیرِ گلستاں صیاد

کہیں ہے صوتِ عنادل کہیں ہے زخمِ جگر
نمودِ تابشِ گل ہے کہاں کہاں صیّاد

جلا کے خاکِ نشیمن بھی تو اڑاتا ہے
رُکے نہ پھر یہیں پھولوں کا کارواں صیّاد

نسونِ دبدبۂ غم نہ ٹوٹ جائے کہیں
بدل نہ جائیں کہیں اہلِ گلستاں صیّاد

قفس میں میں نے کیا رقصِ آرزو تازہ
نسیمِ صبح ہوئی جب بھی گلفشاں صیّاد

جسے نہ برق کا کھٹکا، نہ خطرۂ گل چیں
ہے میرے خواب میں وہ رنگِ گلستاں صیّاد

جو زیرِ تیغ بھی شعرِ وفا سنائی ہے
ہے اس حیات کا ہر لمحہ بے کراں صیّاد

وہ دن قریب ہیں سوز وفا کے صدقے میں
ہر ایک پھول بنے برق بے اماں صیاد

کفن بنے گا جو اہلِ ستم کی شوکت کا
سلگتے سینوں سے اٹھتا ہے وہ دھواں صیّاد

چلا ہے سوئے قمر آدمی کمند بدوش
زمیں کا حال نہ ہو حال آسماں صیّاد

مرا بیاں ہے کہ سحرِ حلال ہے ظالم
ہے مدّعائے محبت مری زباں صیّاد

لہو لہان ہے گرچہ سروش زخموں سے
بدل سکی نہ مگر طبعِ نوجواں صیّاد

انیس احمد ہاشمی۔ ایم۔اے

ڈاکٹر سلام سندیلوی کی شاعری

بات کہی ہوئی کہنی پڑتی ہے کہ اردو شاعری نے اپنا چراغ فارسی سے روشن کیا ہے اسلیئے اپنے ملک و معاشرت سے نہ مواد لیا نہ اسالیب۔ خیالی اور موہوم زندگی کو اپنا ماخذ رکھا اور اسی کو اپنا موضوع بنایا۔ حقیقتاً اردو شاعری نے تمام اکتسابات اور کمالات کے باوجود ہندوستانی زندگی کی پوری نمائندگی نہیں کی، نہیں کی جو اسے کرنا چاہیئے تھی۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اس نے غیر ملکی تصورات و مفروضات، اسالیب اور روایات کو اپنایا کیونکہ حکومت کی زبان فارسی تھی اور درباروں میں فارسی ہی کی قدر و منزلت تھی، دوسری وجہ زندگی سے بے تعلقی و بیگانہ ہو جانے کی یہ ہے کہ اس کی جو صنف بادشاہوں اور درباریوں کی سرپرستی اور ماحول میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی وہ غزل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل بھی انسانی زندگی کی ایک ضرورت ہے لیکن ہر ضرورت پر حاوی نہیں ہو سکتی یا انسانی زندگی میں سوز و گداز، درد و کسک اور جیسی پیدا ہوتی جا رہی ہے اس لئے ہمیں اپنی شاعری میں ایسے اصناف کی ضرورت ہے جو ہماری خارجی اور باطنی زندگی کا پورا پورا حق ادا کر سکیں۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی کے کلام کو پڑھنے کے بعد ہم مکمل اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے بلا شرکت غیرے جو کچھ کہا ہے پورے شعور و احساس کے ساتھ کہا ہے ——— وہ شاعری کی بنیادی کوتاہیوں سے بخوبی واقف ہیں، انھوں نے بحیثیت ہندوستانی اپنے ملک کے جغرافیہ، تاریخ، روایات اور اساطیر کو صرف قائم ہی نہیں رکھا ہے بلکہ اس کی عظمت اور تقدس کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور شاعری میں نئے تجربات اور خیالات کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے یہاں گل و بلبل کی فرسودہ شاعری نہیں ملتی، بلکہ حقیقی شاعری کے تمام اوصاف و عناصر پائے جاتے ہیں، ان کی شاعری حزنیہ ہو یا نشاطیہ اپنے اندر رجائیت رکھتی ہے یا منوطیت، انشاء فریبی پیدا کئے بغیر نہیں رہتی۔ ان کی نظموں میں غم نگاری، منظر نگاری اور محاکات کی حسین تصویریں ملتی ہیں، کلام میں روانی، سلاست، دلکشی، شگفتگی اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ "بلبل کو تسے" "پانی پر چھایاں" "تاریک موجیں" "ایک پناہ گزیں دوست سے" "بھکارن کی لڑکی" حزنیہ شاعری کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں انگریزی کے مقولہ SHELLY کے الفاظ میں صرف اس حقیقت کا اعتراف کرنا کہ OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE THAT TELL OF SADDEST THOUGHTS میرے خیال میں کافی نہیں ہے۔ شاعر کی اپنی غمگین زندگی اور پرانے غم ماحول نے اسے منوطیت میں غرق کر دیا ہے اور نہ اسے زندگی سے فرار سکھائی ہے بلکہ اسے وہ بصیرت بخشی ہے جس کے باعث اس کی شاعری "آہ" اور "واہ" کی وادی سے آگے بڑھ کر نئے آئینے نصب کرتی ہے۔ جس میں قدریں، شاعر کے محسوسات اور اس کی نجی زندگی کے حالات کا عکس لطیف دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اگر ان نظموں یا اس ضمن کی دیگر نظموں کے پڑھنے کے بعد ڈاکٹر سلام سندیلوی کے متعلق بزبان میر کہا جائے کہ ؎

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
رنج و غم گتے کے جمع تو دیوان کیا

تو زیادتی ہوگی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سلام سندیلوی کے کلام میں جو منوطی رنگ ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ جا بجا عناصر ملتے ہیں جو SHELLY کی مشہور نظم ODE TO THE WEST WIND میں پائے جاتے ہیں، SHELLY نے بڑے یقین کے ساتھ کہا ہے کہ "IF WINTER COMES CAN SPRING BE FAR BEHIND" اسی یقین سلام سندیلوی کے یہاں موجود ہے اور اسی لئے ان کی نظموں کا بیشتر اختتامی شعر رجائیت پر ہوتا ہے اور ہم اس کی عالمگیر حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے، ملاحظہ ہو۔

ہر خوشۂ جو میں یہاں دانہ نہیں ملتا
ہر پھول میں خوشبو کا خزانہ نہیں ملتا
ہر قطرۂ نیساں میں دمکتا نہیں موتی
ہر چیز چمکتی ہوئی سونا نہیں ہوتی

شاعر کی نگاہ وسیع ہے، اُس کے احساسات بلیغ ہیں، وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے اپنے مشاہدات اور تجربۂ زندگی کے باعث غیر ذاتی یا سطحی بات نہیں کہتا، اس کے شعور اُس کے احساسات اور خیالات میں گیرائی اور گہرائی ہے۔ سلام سندیلوی کے یہاں فلسفیانہ خیالات کچھ ملے جلے کر وہ ایسے خیالات نہیں ہیں جن کے بارے میں کہا جائے کہ ؎ "دُر کو سُلجھا رہا ہے پر سرا نہیں ملتا" بلکہ اپنے دلکش انداز میں فلسفیانہ خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً بیڑ میں اُلجھے ہوئے پتنگ کو دیکھ کر کہتے ہیں ؎

پیلو میں اے سلام یہ اُلجھا ہوا پتنگ — سمجھا رہا ہے زیست کی گہرائیوں کا راز
ٹوٹے گا ایک دن یوں ہی ٹکرا کے موت سے — انسان کی حیات کا چلتا ہوا جہاز

اس سلسلہ میں اُن کی نظمیں "آنکھ مچولی" "مردہ خانہ" "سونے کے جزیرے" قابلِ ذکر ہیں۔ جن میں شاعر نے فلسفیانہ خیالات کو پُر اثر دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ اگر آپ اُن کا تجزیہ کریں تو شاعر کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ندرتِ خیال کے ساتھ ساتھ سلام سندیلوی کی نظموں میں الفاظ کا جو التزام قائم ہے، وہ بیشتر خالص ہندی نژاد ہے، وہ ہماری الفاظ کی کوزہ گری تقلید نہیں کرتے اور نہ بدیسی کرداروں سے کام لیتے ہیں، اُنھوں نے گنگا جمنا کی جگہ جمنوں دجلوں کو لا کر نہیں کھڑا کیا، ہمالہ کے بجائے کوہ الوند کا ذکر نہیں فرمایا، بیر، راجمحل، سسی پنوں کو شیریں فرہاد، قیس و لیلیٰ سے معزول نہیں کرایا، اسی سے اُن کی وطنی کردار سے انسیت کا پتہ چلتا ہے، اُردو شاعری میں نئے میلانات کی طرف ایک خوش گوار پیش قدمی ہے۔

ڈاکٹر سلام کی نظریں صرف حسن و عشق کی وادی میں یا فلسفہ کی الجھنوں میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتیں، وہ غم دوراں سے تھک کر ہار تسلیم نہیں کرتے بلکہ ایک ذی شعور صاحبِ فکر انسان اور ایک باکمال شاعر کی طرح شاعر کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے خبر آنکھیں بند کئے اپنے حال میں مست نہیں دکھائی دیتے بلکہ زندگی کی مشکلات اور بدلتے ہوئے حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں، حصول آزادی سے قبل وطنِ عزیز کو غلام دیکھ کر کڑھتے ہیں اور جوانانِ ہند کو جھنجھوڑتے ہیں، للکارتے ہیں اور بڑے خوبصورت انداز میں کہتے ہیں ؎

اب مٹ رہے ہیں سطحِ پہ تہذیب کے حباب — اب ڈوب رہی ہے ناؤ سمندر کی غرق آب
اب چھپ رہا ہے قوم کی عزت کا آفتاب — اب لٹ رہی ہے چرخ پہ عظمت کی کہکشاں

اے ہند کے جواں.....

اور پھر وہ جوانانِ ہند کو عزم و عمل کی قوت کا راز بتاتے ہیں ؎

گر مستقل ہوں آج ارادوں کی تو میں — قدموں پہ جھک پڑیں تری دنیا کی عظمتیں
دینے لگیں خراج مخالف جبا عتیں — نعروں سے تیرے لرزہ براندام ہو جہاں

اے ہند کے جواں...

مستقل سندیلوی نے زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور اُن کو جھیل کر یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اُن کو اپنے احساس کی نیرنگیوں میں ڈھال کر اپنی شاعری کے صنم خانہ میں بٹھا دیا ہے، اُن کے تلخ و شیریں تجربات کا کچھ حصہ ہمیں اُن کی نظموں "تنہائی" "محرومی" "افسردگی" "شہابِ ثاقب" وغیرہ میں نظر آتا ہے۔

سلام سندیلوی نے نظموں کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی کہی ہیں، لیکن وہ فرسودہ عشق و محبت، ہجر و وصال کے گورکھ دھندوں میں اُلجھے نظر نہیں آتے ہیں۔ اپنی تمام تر محرومی اور غمناک زندگی کی سنگینیوں کے باوجود انھوں نے اپنی غزلوں میں ایک صحت مند ماحول برقرار رکھا ہے، غالب کی

طرح غم و آلام سے گھبرا کر وہ یہ نہیں کہتے نظر آتے ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

بلکہ ناکامیوں اور نامرادیوں کے ہجوم میں بھی عزم و امید کی شمع جلاتے نظر آتے ہیں، فرماتے ہیں ؎

جھک پڑے مرے آنسو کہ جلی اٹھیں شمعیں میرے قفس سے کبھی روشنی نہیں جاتی

ڈاکٹر سلام کا عشق سطحی نہیں ہے، انھوں نے عشق کا ایک خاص معیار قائم کر رکھا ہے، وہ غالبؔ کی طرح محبوب سے دعوں دھتے کی حد تک نہیں پہونچتے، اور نہ داغؔ کی طرح حد درجہ شوخ ہو جاتے ہیں، ان کا عشق گنگا جل کی طرح پاک ہے، جہاں ہوس کا گندہ تک نہیں، وہ عشق کا نام تقدس برقرار رکھتے ہیں اور اس طرح وہ شاعر کے بہت قریب پہونچ جاتے ہیں۔ شادؔ عظیم آبادی کا ایک شعر ہے ؎

وہ سنگِ آستاں ہل نہ سکا ہزار حیف آگے قدم نہ بڑھ سکا ہمتِ سر فراز کا

اسی طرح سے سلام سندیلوی بھی شرابِ دید کے لئے بے چین نظر آتے ہیں مگر وہ جب وہ سامنے آتے ہیں تو آنکھیں پھاڑ کر نہیں دیکھتے بلکہ عشق سے نظریں جھک جاتی ہیں ؎

سلامؔ جھک گئیں نظریں وہ آئے بھی تو کیا شراب سامنے ہے اور پی نہیں جاتی

ڈاکٹر سلام سندیلوی اپنے غم کو غم کہتے ہوئے بھی شرماتے ہیں، ان کا یقین ہے کہ اگر غم چہرے سے آشکار ہو جائے تو عشق پر آنچ آتی ہے چنانچہ انھوں نے آئینہ کے ٹوٹنے سے اس کی جھنجھلاہٹ پر بڑا خوبصورت طنز کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ شاید اسے ضبط کی لذت نہیں معلوم ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک شعر ہے ؎

معلوم نہیں ضبط کی لذت اُسے ورنہ جب ٹوٹتا آئینہ تو آواز نہ آتی

بعض فنکار جب اپنے دل کی پیاس بجھانے میں ناکام رہتے ہیں تو وہ شراب کی تلخیوں سے غم دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ڈاکٹر سلام سندیلوی زندگی کی تمام تر تلخیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کے باوجود اپنے درد کا درماں شراب یا چاک دامنی میں تلاش نہیں کرتے وہ ایک اور شے لطیف کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

فرسودہ ہے شراب بھی دریا بھی آگ بھی وہ اور شے ہے پیاس جو دل کی بجھا سکے

ڈاکٹر سلام اپنے غم میں اپنے آپ کو تنہا نہیں لیتے بلکہ مردانہ وار اس کا مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں، ان کا غم ذاتی غم نہیں ہے بلکہ آفاقی ہے، وہ فانیؔ کی طرح یہ نہیں سوچتے کہ "زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا" وہ اپنی محرومیوں میں ایک کیف پاتے ہیں ان کا ایک شعر ہے ؎

مجھے تشنہ لبی میں آ رہا ہے کیف سرمستی پلا مجھ کو نہ اے ساقی شرابِ ارغواں پہلے

ان کی غزلوں میں ایک تنوع ملتا ہے ایک ہم آہنگی ہے جو دلوں پر ایک خاص تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ ان کے کلام میں انفرادیت بھی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا دامن جدید و قدیم شاعری کی بحث سے بڑی کامیابی کے ساتھ بچایا ہے اور بیچ کی راہ اختیار کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ راہ اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے، وہ جدید شاعری کی تمام روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اور جدید اردو شاعری کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی اس کوشش میں کامیاب ہیں، دونوں کے امتزاج سے انھوں نے ایک نئی روش نکالی ہے جو ان کی غزلوں اور نظموں میں پائی جاتی ہے اسطرح جہاں انھوں نے قدیم شاعری کے تقاضوں کو پورا کیا ہے، وہاں جدید شاعری کی بے اعتدالیوں سے بھی گریز کیا ہے، جو نئی لب و لہجہ خیالی الجھاتی ہے، اور فکر کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔

سلام اپنے غم میں آنکھیں بند کئے ہوئے زندگی کا سفر طے نہیں کر رہے ہیں، وہ حیرؔ اور فانیؔ کی طرح قنوطیت کی انتہائی منزلوں میں گم نہیں، اپنے گرد و پیش پر بھی نظر رکھتے ہیں، اور یہ نظر ایک بیدار شاعر کی نظر ہوتی ہے، آزادی کے بعد سے بدلے ہوئے حالات اور اذہان کے رجحانات کو دیکھتے ہوئے سلام صاحب کے اس شعر کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

نہ ہم بدلے نہ تم بدلے نہ حالِ گلستاں بدلا بس اتنی بات ہے رنگِ مذاقِ باغباں بدلا

اعجاز صدیقی

تانتیا ٹوپی

(ایک بیانیہ نظم)

(یہ موضوع آل انڈیا ریڈیو دہلی نے دیا تھا۔ معتبر تاریخی کتابوں سے جنگ آزادی کے اس حریت رہنما کی مکمل سیاسی اور انقلابی زندگی کی کڑیاں ملا کر یہ کہانی مرتب کی گئی ہے۔ نظم میں تاریخی تسلسل کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے)

اک ایسا وقت بھی آیا تھا تاریخ غلامی میں
کہ ہر گوشے سے ظلم و جبر و استبداد کی آندھی
اٹھی تھی خرمنِ امن و سکون تاراج کرنے کو
بڑھی تھی، چیختی، چنگھاڑتی، جبڑوں کو پھیلاتی!
فرنگی سورما اپنے جنونِ حکمرانی میں
جھپٹتے پھر رہے تھے ہندیوں کا خون پینے کو
جلایا جا رہا تھا آگ میں معصوم بچوں کو
چڑھایا جا رہا تھا قوم کو پھانسی کے تختوں پر
سزائیں گولیوں کی مل رہی تھیں دیش بھگتوں کو
لتھڑ کر خاک و خوں میں رہ گئی تھی صبحِ آزادی
اذیت دی گئی اُن بے بسوں کو حبسِ بے جا کی
جو صف آرا تھے، سینوں میں لئے جذباتِ آزادی
ظفر کے لاڈلوں کے سر سجا کر "خوان" میں لائے
زمیں پر تشتریاں بہنے لگیں خونِ شہیداں کی
فلک پر تھا پیا کہرام مظلوموں کی آہوں سے

بغاوت پھوٹ نکلی سینہ چاکانِ حوادث میں
چلا دہلی سے کوئی، کوئی پنجاب اور میرٹھ سے
الٰہ باد، آگرہ، پٹنہ، بنارس، لکھنؤ، بریلی
سہارنپور، علیگڑھ، فرخ آباد، پانسی ورجڑ کی
وطن کے چپے چپے سے اٹھی تحریکِ آزادی
مجاہد آ گئے رن میں کفن باندھے ہوئے سر سے

بنا اک کاروانِ انقلاب ایسا ہوا پیدا
کہ جس نے دشمنانِ ملک و ملت کو نچا ڈالا

عظیم اللہ اپنی عظمتِ کردار کو لے کر
اٹھے نوابؔ باندہ آہنی تلوار کو لے کر
اُدھر حضرت محل تھیں اور اِدھر جھانسی کی رانی تھیں
یہ عورت ہو کے بھی جانبازیوں کی اک کہانی تھیں!
اگر واں آر ادؔ صاحب، بالاؔ صاحب، تاناؔ صاحب تھے
تو یاں، شہزادہ فیروزؔ، تیجاؔ سنگھ، حمید اللہ
دلوں میں انتقامِ قوم کی چنگاریاں لے کر
اُمڈتے آ رہے تھے عزم کی سرشاریاں لے کر

انھیں میں ایک مردِ حریت تھا تانتیا ٹوپی
کلاہِ فخر میں جس کے ٹکے تھے قیمتی ہیرے
قلم کو چھوڑ کر تلوار جس نے ہاتھ میں لے لی
گھرانا جس کا خود تیوار جس نے ہاتھ میں لے لی
حرارت تھی مرتہٹہ خون کی اُس کی رگ و پے میں

کیا پھر گرم آ کر کارزارِ کان پور اُس نے
بپک جنبش بجھا ڈالا، فرنگی کا غرور اُس نے
کبھی شیورا ج پور آیا پئے تدبیرِ آزادی
گوالیار پہنچا معرکہ آرائی کی دُھن میں
کیا دشمن کو پسپا پانڈوی کی رہگذاروں میں
بچھائی ارض تھانسی میں بساطِ جنگ یوں اُس نے
کہ اب تک بیتوانڈی کو یاد اُس کے فسانے ہیں!
عطا کی لکشمی بائی کو ایسی جرأت و ہمت
صفِ دشمن میں جس نے ڈال دی تلوار سے ہلچل

الٰہ آباد

تعلق ہے شکست و فتح کا تقدیر سے، لیکن
مجاہد بھول کر بھی غم نہیں کرتے شکستوں کا
زمین کالپی پر ہو گئے پھر جمع پروانے
ہوئی افرنگیوں سے کوچ میں پھر رزم آرائی
رفیقِ رزم تھے نوّاب بانده، نکشمی بائی
نئی تنظیم کے خاکے لئے گویا کہ پُور آیا
قیامت کا پڑا اک ان گوالیار و جھانسی میں
جہاں رانی نے اپنی جان بھی نذرِ وطن کردی
شجاعت کی مگر اک داستانِ نَو رقم کردی

یہ مردِ حُریت لیکن نہ ہاتھ آیا فرنگی کے
بغاوت کا نیا اک صُور پھونکا ہر طرف اُس نے
نکل آئے گھروں سے لیکے سب جانیں ہتھیلی پر
"گوریلا جنگ" میں ہمراہ تھے لاکھوں عوام اُس کے
نصیر آباد، نیمچ، ٹونک، بُوندی، جھالاوہ، پاٹن
سرسنج، اندور، جے پور، مالوہ، اجمیر، آگرہ
کوئی خطّہ نہ تھا ایسا، جہاں وہ آہنی انساں
نہ پہنچا ہو دلوں میں حُریت کی آگ بھڑکانے
فرنگی مورچوں کو توڑ کر اپنے تدبّر سے
حصارِ دشمناں سے بارہا بچ کر نکل آیا
نوابِ بانده، راؤ صاحب اور فیروز شہزادہ
شریکِ کارزارِ خونچکاں تھے، ہر قدم اُس کے
ہوئی کرگن میں اک مڈبھیڑ افرنگی درندوں سے
بہ ارباب ثلاثہ، جمع ڈوسہ میں ہوئے آکر
نیا نقشہ بنانے کیلئے تحریکِ قومی کا،
معاً خیمے پر اُن کے حملہ آور ہو گئے دشمن
مگر "انقلابی رہنما" بچ کر نکل آئے
اور اسکے بعد سیکر ایک جولانگاہ تھا اُن کی
زمین و آسماں ہیبت سے جنکی کانپ جاتے تھے
فرنگی جن کو پالینے کے منصوبے بناتے تھے

۱۔ پُور۔

وہاں سے پھر گوالیار آیا تانتیا ٹوپی
جہاں تانتا بندھا حُریت کے پاسبانوں کا
ہوا جا کر ریاست کے "وزیرِ خاص" کا مہماں
سمجھتا تھا کہ ہے ہمدرد بھی اور دوست بھی اُس کا
اُسی نے دی خبر افرنگیو ں کو اُس کی آمد کی
اور آدھی رات کو جب خامشی کا رنگ گہرا تھا
اسیرِ دامِ افرنگی بنا وہ شیر دل انساں
بھلا سکتی نہیں جس کو کبھی تاریخِ آزادی!

فسانہ آتے آتے آگیا انجام تک اپنے،
عدالت نے بہت پوچھا، حریفوں نے بہت چاہا
کہ وہ رازِ آشنائے انقلابِ وقت کچھ بولے

مگر یاں اک "نہیں" تھی سو سوالوں کے جوابوں میں
سزائے موت پر بھی مُسکراہٹ ہونٹوں پہ رقصاں تھا!
جبکہ باندھے جلّاد اُسکے دست و بازو کو
تو یہ کہہ کر "نہیں کوئی ضرورت ایسی رسموں کی"
گلے میں خود ہی اُس نے پھانسی کی پھندے کو
ہزاروں لوگ تھے اِس سرفروشی کے تماشائی
اُسی پھندے میں جب ڈوبنے تک سانس اٹکی تھی
کہ جسکو اُس مجاہد نے لبوں سے اپنے چوما تھا
وہ اُسکے بال، جو ہیرے کی ٹوپی کی امانت تھے
پڑے تھے اُسکے چہرے پر کھُلے تھے اُسکے شانوں پر
نشانی تھے جو اُسکی عظمتِ جہدِ مسلسل کے
بطور یادگار اُن میں سے کچھ بالوں کو افرنگی
جھپٹ کر لے گئے اپنا جُنونِ سر بڑھانے کو
وہ تھا سردارِ آزادی، وہ تھا سرشارِ آزادی!
اُسے رکھے گا برسوں یاد، ہر نیخوارِ آزادی!

سید دلدار جعفری

نئی شاعری کے فلسفہ طراز

میرا مقصد نئی شاعری پر اظہار خیال کرنا نہیں ہے۔ ضمناً اس کا ذکر آجائے تو الگ بات ہے۔ اس وقت میں عمیق حنفی کے ایک بیان کو سمجھنے کی کوشش پر یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

انہوں نے اکتوبر ۶۶ء کے "شاعر" میں لکھا ہے کہ "ویدانت کا عقیدہ ہے کہ جو کچھ برہمانڈ میں ہے وہی پنڈ میں ہے۔ برہمانڈ (آفاق) سائنس کے حلقے میں آیا ہے اور پنڈ (نفس) شاعری کے۔ اگر آپ عہد رفتہ میں بھگتی مارگ، تصوف، تنتر، ویدانت کیوں کا جواب دے سکتے ہیں تو آج نئی شاعری کیوں کا جواب پانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔" یہ فقرے انہوں نے اپنے اس عقیدے کے جواب میں لکھے ہیں کہ نئے شاعر کو اپنی ذات میں کھو جانا چاہیئے۔ باقی سب باتیں بے کار ہیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ نئی شاعری کے سلسلے میں میرا ذہن بھی ویدانت اور اپنی نشد کی طرف گیا۔ چنانچہ شہریار کے مجموعۂ کلام "اسم اعظم" کو پڑھ کر میں نے اس کتاب پر یہ عبارت لکھ دی تھی۔

"اپنی شناخت ویدانت کی تخلیق کرنے والے مفکروں نے انسان کی توجہ دیوتاؤں سے ہٹا کر انسان پر مرکوز کر دی تھی۔ انسان کے وجود میں ساری کائنات ہے۔ خدا انسان کے اندر ہے اور اس طرح انسان کو اس قیامت سے آشنا کر دیا تھا جس پر فرشتے بھی رشک کریں۔ جدید عہد کے شاعر پر وہی عظیم الشان ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو اپنی نشد اور ویدانت کے رشیوں نے اپنے اوپر عائد کی تھی۔ ان کا کام انسان کے روحانی کرب کو دریافت کرنا ہے، اس سچ کو سننا ہے جو انسان کے دل کے اندر ہوتی ہے اور انسان کو عہد جدید کے "دیوتاؤں" سے آزاد کر کے انسان تک پہونچانا ہے۔"

میرے اور عمیق حنفی کے رد و قبول میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ میں نے انفس و آفاق کو الگ الگ نہیں کیا ہے۔ کائنات اور زمانے کے رشتے کو توڑا نہیں ہے۔ لیکن عمیق حنفی انسان کی ذات کو کائنات سے الگ کر لینا چاہتے ہیں۔ یہ ناممکن کوشش ہے۔

خود ویدانت کے اعتبار سے جس عقیدے کو انہوں نے تسلیم کیا ہے اور اپنے حق میں پیش کیا ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ جو برہمانڈ میں ہے وہی پنڈ میں تو برہمانڈ اور پنڈ ایک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ پنڈ برہمانڈ میں ہے اور برہمانڈ پنڈ میں۔ ایک دوسرے انداز سے اسی بات کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے کہ مذہب اور فلسفے کی طرح شاعری پر بھی انسان اور کائنات کے باہمی رشتے کو دریافت کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور اسی رشتے کی جستجو میں اقبال یہاں تک گئے کہ انسان بھی ایک چھوٹے سے پیمانے پر خالق ہے جو تخلیق کے تسلسل کو آگے بڑھاتا ہے اور ہر وہ نظام قابل مذمت ہے جو انسان کی قوت تخلیق کو نقصان پہونچاتا ہے۔

لیکن عمیق حنفی انسان کو کائنات سے الگ کر کے ایک ایسی دنیا بنانا چاہتے ہیں جو گرد و پیش سے بے نیاز اپنی ذات کے اندر کائنات کو تلاش کر رہا ہے۔ یہ کوشش کتنی ناکام ہے اس کا اندازہ اس فقرے سے ہوتا ہے کہ "نئے شاعروں نے اپنے ذہن کے اپنے شعور اور احساس کے ذریعے مرتب کیا ہے۔" اس میں انہوں نے [illegible] کو ایک عہد میں اسیر کیا ہے جو انسان اور کائنات کے ناقابل شکست رشتے کا پہلا ثبوت ہے۔ پھر شعور اور احساس [illegible] انسان اور کائنات کے رشتے کے ادراک کے بغیر پیدا ہو نہیں ہو سکتا۔

اب اگر انسان عہد میں اسیر بھی ہے اور شعور و احساس بھی رکھتا ہے تو وہ سماجی ذمہ داریوں سے گریز کیسے کر سکتا ہے اور شاعرانہ ذمہ داریوں سے بے نیاز کیسے ہو سکتا ہے۔

لیکن عمیق حنفی کو اس پر اصرار ہے کہ "پرانی شاعری روایات، عقائد، مفروضات، اصطلاحات، منشور، مذہب، اخلاق اور سیاست کو انسان اور شاعری پر فوقیت، اولیت اور افضلیت دیتی ہے اور ان تمام کی قربان گاہ پر شاعری اور انسانیت کو بھینٹ چڑھانے سے باز نہیں آتی"۔ اس طرح وہ ایک خالص انسان اور خالص شاعری کی بات کر رہے ہیں (اسے دوسرے الفاظ میں مجرم انسان اور مجرم شاعری کہتے ہیں) اور ناممکنات کو ممکنات کی سرحد میں لانا چاہتے ہیں۔

لیکن وہ خود ان میں سے کسی ایک چیز سے بھی بے نیاز نہیں ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ ان کے عقائد مختلف ہیں۔ اگر ایک شخص ویدانت، بھگتی تصوف ٹی ایس ایلیٹ کے عقائد کی "قربان گاہ" پر شاعری کو بھینٹ چڑھا رہا ہے اور دوسرا مارکسزم اور اشتراکیت، جمہوریت، امن اور آزادی کی "قربان گاہ" پر تو دونوں میں فرق صرف عقائد کے اختلاف کا رہ گیا۔ عقائد سے بے نیازی تو نہیں ثابت ہوئی۔ ٹی ایس ایلیٹ میں اتنی ہمت تھی کہ اس نے کھل کر جمہوریت، اشتراکیت اور آزادی کی مخالفت کی اور شہنشاہیت کی حمایت عمیق حنفی ابھی صرف پرتول رہے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ پرانی شاعری نے کسی روایت کو قبول کیا ہو اور نئی شاعری بالکل عدم سے وجود میں آئی ہو۔ اس کے پاس بھی ایک روایت ہے۔ ممکن ہے کہ وہ میراجی اور حلقۂ اربابِ ذوق کی روایت ہو یا فرانس اور انگلستان کی کوئی روایت ہو۔ لیکن ہے تو روایت۔ کیا عمیق حنفی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اپنی نظم "سندباد" ٹی ایس ایلیٹ کی نظم "ویسٹ لینڈ" کی روایت کو اپنانے سے باز رہی ہے۔ یوں تو کسی بڑی شاعری سے متاثر ہونا کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے۔ لیکن آج کے ہندستان اور پہلی جنگ عظیم کے بعد کے انگلستان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک خون آشام سامراج کے زوال کا سماج ہے اور دوسرا اُس سامراج کے جھنجوڑے ہوئے زخم خوردہ انسانوں کا سماج جو زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ اس پر انحطاط پذیر سامراج کی روایت کو مسلط کرنا اور پھر یہ کہنا کہ پرانی شاعری روایت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ رہی ہے ایک ایسی دیدہ دلیری ہے جس کا جواب نہیں۔ اس کے علاوہ عمیق حنفی کے یہاں جن محروں کا استعمال ہو رہا ہے جس زبان کی گرامر کی پابندی کی جا رہی ہے وہ بھی روایت ہے۔

مفروضات کے بغیر تشبیہ، استعارہ اور علامت بن ہی نہیں سکتی۔ حد یہ ہے کہ "میں" جب شاعر کے نام اور ذات سے الگ ہو کر وہ "تیسرا" بنتا ہے جس میں سب شریک ہو سکیں تو وہ بھی مفروضے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

یہی حال اصطلاحات کا ہے۔ ممکن ہے کہ پرانی شاعری کی اصطلاحات دوسری ہوں اور نئی شاعری کی دوسری، لیکن وہ پھر بھی اصطلاحات ہیں نام بدل جانے سے کچھ نہیں ہوتا۔

منشور، عقائد اور تصورات کے اعلان کا نام ہے۔ اس سے بھی عمیق حنفی اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔ اب تو وہ ہر رسالے میں اپنے عقائد کا اعلان کرتے ہیں۔ گریز کا یہ راستہ کہ اب تک نئے شاعروں نے مل کر کوئی منشور یا اعلان نامہ تیار نہیں کیا، زیادہ دور نہیں لے جا سکتا۔ مجھے ذاتی طور سے بعض اعلان ناموں کا علم ہے جو نئے شاعروں کی طرف سے پیش کئے گئے ہیں۔ خود بمبئی میں ایک جلسہ کر کے ایک منشور پیش کیا تھا۔ لیکن اہلِ جلسہ نے اُسے قبول نہیں کیا اور وہ معاملہ ٹھنڈے پر ختم ہوا۔

مذہب کا طعنہ بھی بے معنی ہے۔ عمیق حنفی نہ سہی لیکن ان کے معنوی استاد ٹی ایس ایلیٹ نے مذہب کی "قربان گاہ" پر شاعری کو بھینٹ چڑھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ویدانت جس کی قسم خود عمیق حنفی کھا رہے ہیں اگر مذہب نہیں تو مذہبی لبادہ ضرور پہنے ہوئے ہے۔ جن شاعروں نے مذہب کی "قربان گاہ" پر شاعری کو بھینٹ نہیں چڑھایا وہ صرف ترقی پسند شاعر ہیں جن کا نام عمیق حنفی کے سامنے لینا گناہ ہے۔

اخلاق اضافی ہے اور اس کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ آج قدیم اخلاق کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اگر عمیق حنفی شاعر میں کسی اخلاقی قدر کے قائل نہیں ہیں تو یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ نئے شاعروں میں سے ہر شاعر ان کا ہم خیال نہیں ہو سکتا اور وہ ان کے نام پر بیان دینے کے مجاز نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر وحید اختر، قاضی سلیم، نجیب الرحمٰن اعظمی اور دوسرے بہت سے شعرا کے یہاں اخلاقی قدریں موجود ہیں۔

سیاست کی "قربان گاہ" بہت عجیب و غریب ہے۔ ایک سیاست سے گریز کی کوشش دوسری سیاست کے فریب میں مبتلا کرتی ہے جمود

تھا۔ لیکن آج طاقتور سیاسی پارٹیوں کے دور میں جہاں زبانوں کی زندگی بھی سیاسی مصلحت کی پابند بنا دی جاتی ہے۔ سیاست سے گریز کا نعرہ ایک فریب سے زیادہ نہیں۔ چونکہ عمیق حنفی سرکاری ملازم ہیں اس لئے میں اس مسئلے پر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اپنی معذوری کو نظریہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش صرف مضحکہ خیز ہے۔ اگر ان کی جہات تلاش کرنے والے شاعر ان کی ذات کی عظمت کے منکر، ان لوگوں کو کچلنے والے اداروں کو نظر انداز کر کے اپنی ہمدردیات میں گم ہو جانا چاہتے ہیں تو وہ دراصل ان غیر منصفانہ اداروں کی غیر شعوری حمایت کر رہے ہیں۔ بھگتی اور تصوف نے مذہبی اور سرکاری بیوروکریسی کو کبھی معاف نہیں کیا، متصدی نے ان اہل کاروں کو شمر اور یزید کے نام سے یاد کیا ہے۔ زاہد، ملا، محتسب، قاضی، کوتوال، واعظ، شیخ، برہمن اور پانڈے کا مذاق صرف تفریح طبع کے لئے نہیں اڑایا گیا ہے۔ اسکی شہادت اردو اور فارسی کے شعرا کے علاوہ خود کبیر داس کی شاعری بھی دے سکتی ہے اور ہمارے بہت سے صوفیائے کرام کی زندگی میں بھی مل جائے گی۔

مجھے معلوم نہیں کہ اپنی یا انسان کی ذات کا سوگنامہ لکھنے والے شاعر ہندوستان کے عوام کی بھوک، جہالت اور افلاس سے آنکھیں بند کر کے اپنے ضمیر کو کیسے مطمئن کر سکتے ہیں۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ بھوکے کے سامنے خدا بھی روٹی کے سوا کوئی دوسرا روپ نہیں دھار سکتا۔ اس کو پروپیگنڈا، اخلاقیات اور سیاست کہہ کر ٹالا ضرور جا سکتا ہے، لیکن ضمیر کی تسکین کا سامان نہیں کیا جا سکتا۔ میں ویت نام میں امریکی بمباری کا ذکر نہیں کروں گا۔ حالانکہ مجھے اس کا علم ہے کہ ہر نیا شاعر اس بربریت کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر رہا ہے۔

غرض روایات، عقائد، معلومات، اصطلاحات، منشور، مذہب، اخلاق، سیاست ان میں سے کسی بھی "قربان گاہ" سے نئی شاعری بے نیاز نہیں ہے۔ بے نیازی کا اعلان صرف ایک قسم کا اسٹیکچول پوز ہے کبھی کبھی یہ پوز اچھا لگتا ہے جیسے یہ کسی معشوقہ کا تجاہل عارفانہ ہو۔ لیکن جب یہ انانیت سے گریز کر کے بھیت کا بہانہ اور سہارا بننے لگے تو اس پوز کا بھرم کھولنا ضروری ہو جاتا ہے۔

بے نیازی کا یہ اسٹیکچول پوز کسی ایک شاعر کی ادا تو ہو سکتا ہے لیکن تمام نئے شاعر اس میں مبتلا نہیں ہیں۔ نئی شاعری ایک دھنک کی طرح ہے جس میں بہت سے رنگ ہیں۔ اس کے ایک سرے پر عمیق حنفی ہیں جو اپنے خیال میں ہر "قربان گاہ" سے گریزاں ہیں اور دوسرے سرے پر محسن کمال ہیں جو سیاست اور جانبداری سب کے قائل ہیں۔ ان کے درمیان وحید اختر، شہریار اور خلیل الرحمٰن کی طرح کے خوش گفتار شاعروں کے رنگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جدید و قدیم کے رشتے ٹوٹتے نہیں ہیں ؎

زمانہ ایک، جہاں ایک، کائنات بھی ایک — دلیلِ کم نظری، قصۂ جدید و قدیم!!

مثال کے طور پر میں صرف ایک نمونے پر اکتفا کروں گا۔ شہریار کی کتاب "اسم اعظم" میں ایک چھوٹی سی خوبصورت نظم ہے جس کا عنوان "پیغام" ہے ؎

کشمکش سے مرکب ہوا ہے جو مہ
جنبشِ چشمِ ساقی کو پہچان لو
دل کے ہنستے لہو کی دعائیں سنو
گردشِ چرخ کو مے کے اک جام میں دیکھ لو
زیست
تشنگی
زندگی علامت ہے
پیتے رہو

اس نظم کو پڑھ کر مجھے بیاختہ نیاز حیدر کی ۱۹۴۸ء کی ایک نظم کے مصرعے یاد آ گئے ؎

تشنگی نام ہے جینے کا مجھے جینے دو
تشنگی مرد و زنِ ازل سے ہے رفیقِ دل و جاں

تشنگی دمِ طلب، ذوقِ طلب، حسنِ طلب
تشنگی پرورِ زمانے کا مدار

اور تشنگی کا یہ سمبل غالبؔ تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے ؎

رشکِ برتشنہ تہا رَوِ وادی دارم زہر آسودہ دلانِ حرم و زمزم شاں

اس سے بھی آگے تلاش کریں تو عرفی کے یہاں بھی یہ سمبل ملتا ہے ؎

زلفِ تشنہ رَوی واں بعقل خویش منازِ دلت فریب گراز چشمۂ سراب نہ خورد

نئے شاعروں کے یہاں سے ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن میں ماضی اور روایت کا تسلسل استعاروں کے خوبصورت لباس بدل بدل کر سامنے آتا ہے۔

میں نئی شاعری سے ہرگز مایوس نہیں ہوں صرف یہ محسوس کرتا ہوں کہ فلسفہ طرازوں کی فلسفہ طرازی نئی شاعری کے مستقبل کے لئے خطرناک ہے۔

یہ سوال میرے نزدیک غیر ضروری ہے کہ نئی شاعری کیوں۔ نئی شاعری اس لئے کہ زندگی نئی ہے۔ مسائل نئے ہیں۔ شاعر نئے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ نئی شاعری ایسی کیوں ہے جیسی کی جا رہی ہے۔ اس میں اچھے اور بُرے بہت سے رنگ ملیں گے جو ہر زمانے کی شاعری میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ ہم ان رنگوں کو اپنے زمانے کی شاعری میں کیوں نہ تلاش کریں۔

اعجاز صدیقی کی طویل شاہکار نظم
خوابوں کا مسیحا
(ایک ساتھ تین زبانوں میں شائع ہوگئی)
• ایک خوبصورت ترین کتاب •

اس طویل ELEGY میں جواہر لال نہرو کی ہمہ گیر شخصیت اور اُنکے تصوّرات و معتقدات کا گہرا نفسیاتی مطالعہ تمام شاعرانہ لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ امنِ عالم کیلئے ایک پیغام ہے
دیباچہ ــــ کرشن چندر قیمت مجلّد روپیہ پچاس پیسے
مکتبۂ نصر الادب۔ پوسٹ بکس ۴۵۲۶ بمبئی ۸ بی سی

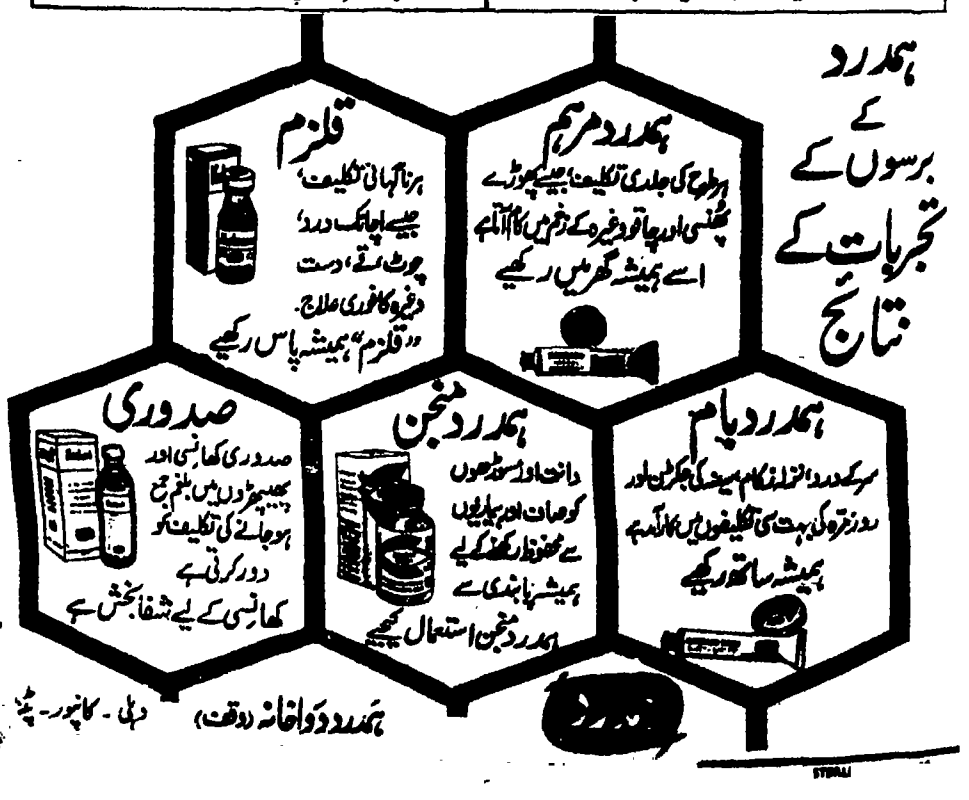
ہمدرد
کے
برسوں کے
تجربات کے
نتائج
ہمدرد مرہم
ہر طرح کی جلدی تکلیف، جیسے پھوڑے پھنسی اور چاقو وغیرہ کے زخم میں کام آتا ہے
اسے ہمیشہ گھر میں رکھیے
قلزم
ہر نوع کی تکلیف، جیسے اچانک درد، چوٹ لگنے، دست وغیرہ کا فوری علاج۔
"قلزم" ہمیشہ پاس رکھیے
ہمدرد پام
سر کے درد، نزلہ زکام میں فوری طور پر اور روزمرہ کی بہت سی تکلیفوں میں کام آتا ہے
ہمیشہ ساتھ رکھیے
ہمدرد منجن
دانت اور مسوڑھوں کو صحت اور بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہمیشہ پابندی سے
ہمدرد منجن استعمال کیجیے
صدوری
صدوری کھانسی اور پھیپھڑوں میں بلغم جمع ہو جانے کی تکلیف کو دور کرتی ہے
کھانسی کے لیے شفا بخش ہے
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی۔ کانپور۔ پٹنہ

نثار اناوی

غزل

دل کا تو یہ کہنا ہے کوئی کام کئے جا
اب تیری یہ ہمت ہے مرے یا کہ جئے جا

پائے نگہِ ناز کی ٹھوکر ہی دئے جا
بنتا ہوں بہت میں، مری توہین کئے جا

"یہ میں ہوں، وہ ساقی ہے، یہ میخانہ وہ مسجد"
جب تک یہ ترا ہوش سلامت ہے پئے جا

یا کھینچ نہ سینے سے خدنگِ نگہِ ناز
یا نوکِ مژہ سے دلِ صد چاک سئے جا

ذلت ہے سرِ بزمِ طلب ہاتھ بڑھانا
جب تک وہ نگاہوں سے پلاتے ہیں پئے جا

اعمال یہ کہتے ہیں اِسے منہ نہ لگانا
انسان یہ کہتا ہے مجھے پیار کئے جا

یہ کہہ کے نثار اُس کے تغافل نے دیئے داغ
لے اپنی محبت کا یہ انعام لئے جا

مظفر حنفی

غزل

طویل رات، زمیں سخت، آسماں چُپ چاپ
مگر ہے قافلۂ زندگی رواں چُپ چاپ

ہمیں بتائیں کہ منزل کے نام ہی پر اب
جناب! آہ بھی کیا چل دئے کہاں چُپ چاپ

وہیں وہیں سے صداؤں کے بانڈھ ٹوٹتے ہیں
چلی ہے بات ہماری جہاں جہاں چُپ چاپ

طلوعِ صبح کے دھوکے میں صبحِ کاذب سے
لُٹا کئے ہیں ستاروں کے کارواں چُپ چاپ

وُفورِ خوف سے آنکھیں گلوں کی پتلی ہیں
نشیمنوں کو جلاتا ہے باغباں چُپ چاپ

"زباں پہ مُہر تھی، لوح و قلم پہ بندش تھی"
نظر سُنا ہی گئی غم کی داستاں چُپ چاپ

سفینہ موجِ حوادث کی زد میں ہے پھر بھی
کھڑے ہوئے ہیں کنارے پہ مہرباں چُپ چاپ

کسی کو یاد نہ کرنے کا عہد کرتا ہوں
مگر یہ رات سیہ رات، بے کراں چُپ چاپ

غزل سُناؤ مظفر دُھواں دُھواں ہے فضا
سُلگ رہا ہے کوئی قلبِ ناتواں چُپ چاپ

عظیم اقبال۔ ایم۔ اے

(کہانی)

کل کے سپنے

"سو گئیں کیا؟"

میں نے سلمیٰ کو آواز دی ہے، لیکن وہ دم سادھے لیٹی ہی رہی۔ گھپ اندھیرے کو نصف چاند کی روپہلی روشنی اب ہولے ہولے نگلنے لگی ہے اور میرے تنگ و تاریک کمرے میں خاموشی کی سہما پڑی گائیاں ٹکرانی ہیں اور چوڑیوں کی مدھم مدھم کھنک اپنی دلنواز موسیقی سے ماحول کی جاذبیت کو جلا بخش رہی ہے۔

آج سلمیٰ بھی مجھے غلط سمجھ بیٹھی۔ میری سوچ مجھے کہاں لے آئی؟ عجیب مگر زندہ عالم ہے، عرف میں جاگ رہا ہوں، ساری دنیا سو گئی ہے، شعور و احساس میرے ہم نوا ہیں، اکثر راتیں اسی پس و پیش میں گذار دیتا ہوں، نیند آ گئی ہے تو دلآزار خواب ستاتے ہیں، آنکھ کھلتی ہے تو یاس و نومیدی کی تلخیاں رگ و پے میں سرایت کرنے لگتی ہیں۔ بے چین ہو کر کروٹیں بدلتا ہوں، دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو جاتی ہیں، سکون چھن جاتا ہے اور پھر دفعتاً لحاف پانہیں سرکا دیتا ہوں، یہ ہنگامہ جو میرے اندر ہے، کیا کسی اور کا ہے؟ لیکن یہ "دوسرے" یہ "کوئی اور" جانے کس طرح میرے ذہن پر چھا گئے ہیں۔ سلمیٰ کی آنکھوں میں لرزاں آنسو کے قطرے بھی دیکھ سکتا ہوں، لیکن دوسروں کی زبان پر میری شکایت ہو، یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا، کتنا بے بس ہوں میں، میرا وجود اس دوراہے پر کھڑا ہے، ایک راہ دوسروں کے آگے سر نگوں ہے۔

وہ تیز ہے، میرے جسم کو متحرک کرتی ہے میں دیکھتے مناظر کو تھام لیتا ہوں، میرے لبوں پر سرخ انگارے جم جاتے ہیں، میرے ہونٹوں پر شبنمی طراوٹ بکھر جاتی ہے، میری روح کیف و سرشاری کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتی ہے۔

کاش یہ لمحے جاوداں ہوتے!

میں ان ساعتوں میں سب کچھ بھول جاتا ہوں — سہانا خواب — اور ڈراؤنی تعبیریں، روتی بسورتی شباہتیں اور چیختی چلاتی آوازیں، غم و اندوہ کی آندھیاں اور مصائب کی یلغار۔

میری بغل میں محو خواب سلمیٰ میری شریک حیات ہے، میں اسی کے سہارے زندگی کی مشکل راہوں پر چل پایا ہوں، وہ اگر میرے دوش بدوش نہ ہوتی تو میرے قدم لڑکھڑا کے رہ جاتے۔ گرتے ہوئے مجھے کون سنبھالتا۔ کون میرے بازو تھامتا سہلا؟ میری حیات سلمیٰ کی ممنون ہے، سلمیٰ کا قرض میں کبھی نہیں چکا سکتا۔ اندھیرے کی روشنی ویرانوں کی بہار، تپتے صحراؤں کی نسیم۔ سلمیٰ میرے لئے ان سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، لیکن میں نے سلمیٰ کو کبھی خوشی نہیں دی، سدا رلا دیا ہے کبھی جو وہ مسکرائی، تو یہ مسکراہٹ بھی میں نے چھین لی، دم بھر کے لئے جو وہ شگفتہ ہوئی تو اس سے پہلے کہ اس کی خوشبو سارے میں پھیل جائے میں نے اسے مسل ڈالا، میں اتنا ظالم ہوں کیا؟! ہاں! یہ ظلم ہے، سفاکی ہے، لیکن سلمیٰ کیا جانے، میں کتنا مجبور ہوں۔ میں نے اسے نہیں اپنے آپ کو ستایا ہے، مجھے کیا معلوم تھا، گردشیں جب تھکتی ہیں تو جھکتی چلی جاتی ہیں۔ انسان اپنی نظروں سے بھی گرنے لگتا ہے، کتنا حقیر، کتنا کم تر وہ خود کو محسوس کرتا ہے!! روح بلکتی ہے۔ ضمیر چیختا ہے، لیکن آدمی کی بے بسی و بیچارگی کی کوئی حد ہے نہ کوئی انتہا۔ بہت دلدوز ہے میری داستان۔ کیسے سناؤں اپنی کہانی کون دیکھے گا میرے رستے ہوئے ناسوروں کو — سلمیٰ؟ عورت میں اتنا صبر کہاں؟ وہ تو موم کے مانند ہوتی ہے، رنج کی ذرا سی حدت سے پگھلنے والی۔ میرے درد سے وہ بے چین ہو اٹھے گی، اپنے جذبات میں گھٹ کر رہ جانے کے سوا میرے لئے دوسرا کیا چارہ ہے اور وہ سمجھتی ہے مجھے اس سے محبت نہیں۔ یہی سوچ کر اداس ہو جاتی ہے دوسروں کے لئے میں جو کچھ بھی کرتا ہوں، شاید مجھے نہ کرنا چاہئے۔ مجھ پر میرے خواہشات پر میرے اقدام پر پہلے سلمیٰ کا حق ہے، اختیار ہے، پھر کسی اور کا۔ لیکن یہ "دوسرے" یہ "کوئی اور" جانے کس طرح میرے ذہن پر چھا گئے ہیں۔ سلمیٰ کی آنکھوں میں لرزاں آنسو کے قطرے بھی دیکھ سکتا ہوں، لیکن دوسروں کی زبان پر میری شکایت ہو، یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا، کتنا بے بس ہوں میں، میرا وجود اس دوراہے پر کھڑا ہے، ایک راہ دوسروں کے آگے سر نگوں ہے۔

اس قصہ کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے؟

ذرا ٹھہریئے! مجھے سوچنے دیجئے۔ دھندلی دھندلی یادوں کے سائے میں میرے حافظہ کی دیواروں سے کچھ پرے ہٹ کر۔ میری نانی بیٹھی ہیں۔ ابا جی کے بعد میں تھا اور میرے بعد نسرین دلشاد، ہم سب میں بیحد محبت تھی۔ ابا جی سنجیدہ تھیں، ہماری کھلنڈری طبیعت انہیں ذرا نہ بھاتی۔ نسرین ہمیں اونچا دن بھر چھت پر چوکڑیاں بھرتے، رات کو قصے کہانیاں ہوتیں، گیت گائے جاتے۔ دھول دھپا ہوتا۔ ابا جی کمرے میں بند ہو کر چشمہ کی اوٹ سے کتابیں پڑھتی تھیں۔ انشوری کی بات پر ان کی ذہنی ورزش شروع ہو جاتی۔ رگیں، موچیں، غیر معمولی بالوں پر پہلو بدلنا پڑتا۔ کبھی کبھی حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھیل جاتیں، امی حجاب اور حیرانی کو سامنے بٹھائے پانداں سنبھال سنبھال کر کھولتیں، بند کرتیں، پان کی گلوریوں پر اڑوس پڑوس کی خبروں کا رنگ ہونٹوں پر اور زیادہ نکھر آتا۔

اے مالکن! حمید بابو کی بیگم اتنی کالی کلوٹی نہ ہوتیں، تو کیا ہوتا اے ہے ذرا فیشن تو دیکھو، عمر ڈھلنے کو آئی، آدھی درجن بچے جنے، چھیں اور پاؤڈر لگاتی ہیں، ہستی پوتتی ہیں، مہترانی کہتی۔

"مالکن جی! انجینئر صاحب کی لاڈلی اونٹ کی طرح لمبی ہو گئی، لیکن ذرا بھی شرم نہیں، کیسن بے حیائی ہے، دن دہاڑے دروازہ پر آ کھڑی ہوتی ہے ابو کے سامنے پردہ کرتی ہیں، نانی جی اور ابا کے بیٹھتے ہی شہر، بازار کی عورت سے بھی زیادہ بے شرمی، چھی چھی، کیسا زمانہ آ گیا ہے!" امی من کان پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں گھما گھما کر یہ سب کہے جاتی، امی صرف ہوں، ہاں کرتیں اور پان کا بیڑا آگے بڑھا دیتیں۔ محلہ جمع ہوتا، ہلکے پھلکے سے گھر میں ہر ایک شاداں تھا، مشترکہ خاندانوں کبھی جنت کا نمونہ ہوتا ہے اور یہاں تو اس میں اتنی محبت تھی کہ اس کی مثال محال تھی، بچا کھچا جو بچتیں، ان کے دل کے ٹکڑے ہوتے، ہم جمل تھے، ماحول بیحد پرسکون تھا، ابا بزنس کے سلسلے میں ہمیشہ سرگرداں رہتے، کبھی اس شہر میں کبھی اس شہر میں، ہفتہ دس روز میں گھر لوٹتے تو ہمارے لئے کھلونے، تحفے، مٹھائیاں سب کچھ لاتے، ہم سب انہیں گھیر لیتے، امی پیار سے ڈانٹتیں۔

"چلو ہٹو، چند منٹ آرام کرنے دو، دیکھو، دیکھو، قمیص پر ناک لگ گئی۔"

"چھوڑو بچے ہی تو ہیں، معصوم!" ابا شفقت سے ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرتے، پیار سے ہمیں بھینچ لیتے۔

باپ کے پیار اور ماں کی محبت کا کیا شکرانہ، ان کی بے غرض بے لوث چاہتوں کا ثواب کہاں؟ ان کی شفقتوں کے زیر سایہ ہم نے بہت سے خواب دیکھے، زیادہ سے زیادہ سکون، چین، آرام و آسائش کی تمنا کی۔ نئے نئے منصوبے بنے، سپنوں کے منار تعمیر ہوئے، آرزو کا محل وجود میں آیا لیکن خواب بکھرتے دیر ہی کتنی لگتی ہے، ایک جھٹکا ہوتا ہے، ایک چیخ ابھرتی ہے فضا گونجتی ہے اور خوابوں کے سجے سجائے ایوان منہدم ہوتے ہیں۔ ایک ہنستی گاتی رات کی صبح ہمارے لئے اتنی کربناک بن گئی، اتنی اخلاق سلب کر لینے والی تھی، کبھی ایسی صبح نہ آئی تھی، ہماری آہ و بکا کی تیز آواز بھی انہیں بیدار نہ کر سکی۔ زندگی میں پہلی بار ہمیں پتہ چلا کہ مسرت و ماتم کے درمیان کتنا فاصلہ ہوتا ہے، اس حادثہ نے ہمیں ایک نئے موڑ پر آشنا کیا، ہم شرارتیں بھول گئے، کھیل کود ہمارے لئے اجنبی بن گئے، ابا جی کی ساری سنجیدگی جانے کہاں روپوش ہو گئی۔ اب وہ ہمارے سامنے ہنستیں، مسکراتیں، تاکہ ہمارے چہرے پر اٹے ہوئے غموں کی گرد دھل جائے۔ اتنے بے بات وہ کھلکھلا پڑتیں، ایسا کرنے سے ان کی آنکھوں میں نمی آ جاتی لیکن وہ ہنستے جاتیں، زور زور سے قہقہے لگاتیں، ایسا معلوم ہوتا دیوانی ہو گئی ہو، پھر یکایک خاموش ہو جاتیں۔ اس وقت ایسے لگتا کہ غم و الم میں ہونٹ زیادہ ہونے سے اس کے نیچے اڑ گئے ہوں، ہمیں چمٹا چمٹا کر پیار کرتیں، امی کی جگہ ابا جی نے لے لی، زخم مندمل ہونے لگے۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ نئے تجربوں، نئے مشاہدوں کے ساتھ پھر ایک دن ایسا آیا کہ ہماری زندگی میں جو خلیج پیدا ہو گئی تھی، وہ کریہہ ہوتی گئی۔ ریشہ تر! ہم کئی بھول بھلیوں سے دوچار ہوئے، نئے مسائل سامنے آئے، نئی راہیں ملیں، نئے لوگوں سے تعلقات استوار ہوئے۔ حیات کی قدریں یکسر بدل گئیں، اس طرح کہ جس کا تصور بھی ہم نے نہیں کیا تھا، ابا نے بزنس انٹرپرائز ہانگ کانگ میں شفٹ (SHIFT) کر لیا، وہاں ان کے کئی دوست پہلے سے موجود تھے، ہم سے جدا ہوتے وقت ان کا گلا رندھ گیا تھا۔ پیار کے چند بول بھی اچھی طرح نہ کہہ سکے۔

"گھبرانا مت، میرے بچو! میں نہیں تو کیا ہوا، تمہارے چاچا جو ہیں، بچے ہیں۔ تم سب بھی سمجھو، تمہارے چاچا کے بچے ہیں سب لوگ ہیں، خدا کو منظور ہوا اور میں برابر آتا رہوں گا۔ پھر تمہیں بھی ساتھ لے چلوں گا۔"

ساتھ جانے کی بات ۔ اس کے لئے تو ہم ساری عمر ترستے رہے ہیں ۔ اب تک ہمیں ابّا کا انتظار ہے ۔ کبھی تو وہ لوٹ کر اپنے وطن آئیں گے، کبھی تو ہمیں ہماری کھوئی ہوئی محبت مل جائے گی صرف اتنا معلوم ہے کہ ہانگ کانگ میں پہلے ان کا کاروبار کافی چمکا، امید سے زیادہ منافع ہوئے۔ کچھ اور پلان بنائے گئے افریقہ کے سیاہ براعظم میں بھی ابّا نے قدم جمانا شروع کر دیا۔ ترقی ہوتی گئی تجارت بڑھیں تجارت کو اور فروغ ملا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا سب کچھ ختم ہو گیا، دیکھتے دیکھتے سب بزنس تباہ ہو گیا ——— جانے افریقہ کا سرزمین اُن کو نگل گئی یا اُن کی ہو گئی ۔ انہیں مار ڈالا۔ ہمارے سارے خطوط ڈیڈ لیٹر آفس کی مُہریں لئے ہوئے لوٹ آئے ۔

ہماری تمام خواہشات سکتہ ہو گئیں، دو سروں کی نظرِ کرم کے سہارے کوئی کب تک ستاروں تک بلند ہو سکتا ہے ۔ چچا اور چچی کی شفقتیں ہمارے لئے بڑی نعمت تھیں لیکن جب اپنے لختِ جگر سامنے ہوں تو دوسروں کے بچوں کی وقعت کم ہو ہی جاتی ہے، کہنے کو ہم سب بچے اُن کے اپنے بچوں کی مانند تھے لیکن ہر جگہ امتیاز، ہر قدم پر فرق کیسے چھپایا جا سکتا ہے بھلا ۔ ہم سب کچھ دیکھتے، سنتے، محسوس کرتے اور خاموش رہ جاتے، اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔

بہاریں آئیں، خزاں آئی، سردی آئی، گرمی آئی، وقت بھاگتا گیا۔ ہم ناسمجھی کی اور صغر کی حدود سے نکل کر فہم و شعور کی حدیں پہونچ چکے تھے باجی تو پہلے ہی سے سنجیدہ تھیں زمانہ کی رفتار نے ہم سب کو سنجیدہ بنا دیا۔ ہم کر رہنا۔ تلخ سے تلخ بات برداشت کر جانا، تھپڑ کھا کر رونا بھی نہیں صرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہنا، ہم نے سیکھ لیا تھا، ہمیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا جیسے بچے ازل ہی سے فلسفی پیدا ہوتے چلے آئے ہوں۔ ماں باپ کے بعد چچا چچی نے ہمارے سرپرستی کی لیکن اُن کی محبت میں خلوص کی تابانی نہ تھی، ایسا معلوم ہوتا وہ لوگ جو کچھ ہمارے لئے کر رہے ہیں، وہ اگر نہ کریں تو ہم مر مٹ جائیں گے۔ میں اپنے احساسات بتاتا ہوں۔ چچا نے جب کبھی مسکرا کر میری طرف دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اُن کی خندہ زن آنکھوں کے پیچھے تیر تن رہے ہوں۔ اُن کی میٹھی میٹھی باتوں کو سُن کر مجھے اکثر کپکپی آجاتی، ایک انجانا خوف سا محسوس ہوتا اور ڈر لگتا۔ وجہ ؟ جانے کیا تھی ؟ کبھی کسی نتیجہ پر میں نہ پہنچ سکا۔ اُن کی شفقتوں کے لمس پر مجھے ہمیشہ گھٹن سی محسوس ہوتی ۔

عورت کا دل تو معبد کا در رکھتا ہے۔ اُس کے تقدس کے آگے ہمارے سر ہمیشہ خود بخود جھک جاتے ہیں، چچی نے نہیں چاہا دیا، لیکن وہ احساس ۔ اس پیار، اس محبت، پر ہمارا پیدائشی حق ہے، کبھی نہ پیدا ہو سکا، ہم تڑپتے رہے، سسکتے رہے، ہمارے جذبات پامال ہوئے، چچا کے سب بچے خالد، ماجد اور سائرہ ہمارے اپنے بھائی بہنوں سے چھوٹے تھے لیکن ہمیں اُن سے بھی خوف معلوم ہوتا، ہم محسوس کرتے وہ ہمارے بزرگ ہیں، ہمیں ان کا احترام کرنا چاہیئے ہم سے کسی نے محبت نہیں کی کسی نے خلوص نہیں دیا، سب نے صرف مہربانی کی جو کچھ کسی نے کہا، وہ ہماری بے بسی پر ترس کھا کر!

جیسی بھی ہو، ہماری زندگی چلتا رہا، چچی کے رحم و کرم پر آگے بڑھی، باجی بیاہی گئیں، نسرین اور نشاط بھی ماموں کے گھر میں بندھ گئیں۔ کامرس میں گریجویٹ ہونے کے بعد اسٹیٹ بینک میں میری تقرری ہو گئی، پھر سلمیٰ میری ویران سی دنیا کو لالہ زار بنانے چلی آئی، سانولی سلونی سی، کتابی چہرہ والی معصوم سی لڑکی سلمیٰ، اُسے دیکھ کر اپنے سارے درد بھول جانے کو جی چاہتا ہے لیکن اپنی ذہنی روش کو کیا کروں، سلمیٰ کے سامنے بھی پوری طرح نہیں کھل پاتا ہوں۔ اُس سے بھی بہانے بناتا ہوں، خالد اور ماجد بڑے ہو گئے ہیں سائرہ کی شادی بھی پچھلے برس ہو گئی لیکن اُن کی فرمائشوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، چچا اور چچی بھی آئے دن کسی نہ کسی چیز کی خواہش کا اظہار کر دیتے ہیں، مجھے سب کا دل رکھنا پڑتا ہے ۔

"میرے لئے لپ اسٹک لاد یجئے گا" اور ہاں لیکو کلامائن کی ایک شیشی بھی!" سائرہ کہتی ۔

"میرے لئے فاؤنٹین پین خرید دیجئے۔" ماجد فرماتے ۔

"بھائی جان! مجھے کچھ نہیں چاہیئے بس انگلینڈ کا ایک کیمرہ لے دیجئے، قیمت صرف چھ پونڈ۔" یہ فرمائش خالد میاں کی ہے ۔

"بیٹے" چچا نے اپنے خط میں لکھا ہے میرے لئے تین گز ٹویلین خرید کر بھیج دو، اور تمہاری چچی کے لئے ایک شال بھی چاہیئے، اپنی پسند سے لیکر بھیج دینا۔"

اور سلمیٰ گم سم رہتی ہے، اُس کی کوئی خواہش نہیں، کوئی فرمائش نہیں، میں ہزار بار پوچھتا ہوں ۔

"کچھ تم بھی کہو، تمہارے لئے اس پہلی تاریخ کو کیا لاؤں۔ ؟ کوئی نئی چیز ؟" وہ ہنستی ہے ——— "مجھے کچھ نہیں چاہیئے، اپنے لئے

میں چاہتا ہوں سلمٰی کیلئے کوئی تحفہ خریدوں، مگر دو سو روپوں کی فرمائشوں کا تانتا لگ جاتا ہے سارے پیسے ختم اوپر سے کتنے لوگوں کا قرض!

کبھی کبھار میرے بیجا اخراجات سے گھبرا کر وہ کہہ اٹھتی ہے "روٹھ بھی جاتی ہے" آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے، سائرہ نے تنخواہ سے دو روز پہلے ایک ریسٹ واچ کی فرمائش کر دی، کسی سہیلی کی سالگرہ پر دینا تھی۔ میں اس کی بات نہ ٹال سکا، کپڑے والے کے پیسے ادھار ہی رہے۔ سلمٰی خوب لڑی۔ ناراض ہو گئی، اب مجھے منا رہی ہے اس خاموشی سے اکتا گیا ہوں۔ تنہائی کے احساس سے میرے دل میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں میں سلمٰی کو پکارتا ہوں اسے جھنجھوڑ دیتا ہوں۔

"مجھے ساری دنیا سے نفرت ہے! سلمٰی مجھے تم سے محبت ہے، صرف تم سے! دل کی گہرائیوں سے پیار کرتا ہوں تم مت روٹھو میری جان! ورنہ میں کہاں جاؤں گا، ہم لٹ گئے تو کیا ہوا، آؤ اپنی آئندہ نسل کے لئے ایک خواب دیکھیں، انہیں پابند تم ہونے سے بچا لیں، آؤ ہم دیکھتے رہیں دوسروں کے رحم و کرم کی آنچ، ہمیں جھلسنے نہ پائے"۔

میرے ہاتھ رینگ رہے ہیں۔

"اوں نہ۔ ہوں۔۔۔۔ ہوں۔" چند سسکیاں ابھرتی ہیں۔

ایک شعلہ میری باہوں میں ہے، میرے رخساروں پر گرم گرم جھرنے بہہ رہے ہیں، میری روح روشنی میں نہا گئی ہے، اس روشنی میں بہت سے ناگ بہت خوش ہیں، دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا ہے جیسے ابھی اچھل کر سینے سے باہر آ جائے گا۔

ہر طرف سناٹا ہے، خاموشی ہے!
ہر طرف بہار ہے شگفتگی ہے!!
کاش یہ لمحے جاوداں ہوتے!!!

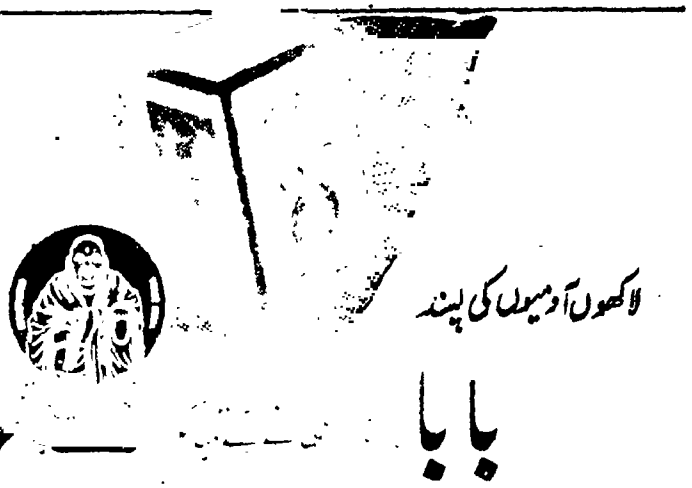

اس کی میٹھی اور دل کو خوش کرنیوالی خوشبو اور دل پسند ذائقہ کے لئے لاکھوں انسان اسے دراز استعمال کرتے ہیں۔ پان کیساتھ کھانے سے اس کی خوشبو ذائقہ کو بڑھا دیتی ہے اور عرصہ تک اسکی تازگی بھی رہتی ہے۔ فہرست مفت حاصل کیجئے۔

نقل و ملتے جلتے نام سے
ہوشیار، دہلی والوں کا
"بابا چھاپ" دیکھکر خریدیئے

تیار کردہ:- دھرم پال پریم چند۔ چاندنی چوک دہلی ۶

شفیق کوٹی

غزل

جس در پہ بہشت کا گماں ہے
اُس در کی زمین آسماں ہے
خطرہ نہیں قافلے کو کوئی
اب خضر امیرِ کارواں ہے
افسانہ بنے تو کوئی کیسے
تقدیسِ حیات درمیاں ہے
ہو جائے چراغ گُل تو ہو جائے
چلنا تو ہَوا کے درمیاں ہے
وہ میرا ترنگ کا زمانہ
وہ میرا شباب اب کہاں ہے
اُس تیر کی خیر مانگتا ہوں
جو تیر جگر کے درمیاں ہے
کیا جانے میں اُس سے کہہ گیا کیا
وہ پھول سا رُخ دُھواں دُھواں ہے
مُدّت سے ہے راہ و رسم میں فرق
مُدّت سے وہ مجھ سے بدگماں ہے
جو بات شروعِ عشق میں تھی
وہ بات شفیق اب کہاں ہے

عطا محمد شعلہ

زندگی

(ایک تری اولے، TRIOLET)[1]

آگے سوچیں تو مہ و مہر کی عمروں سے طویل
پیچھے دیکھیں تو ہو اک پل کا تماشہ جیسے!
ہے کھڑی بیچ میں اک عمرِ گریزاں کی فصیل
آگے سوچیں تو مہ و مہر کی عمروں سے طویل
پیار کرنے کو تڑپ اُٹھیں، کبھی اتنی جمیل
ماہرِ فن نے کوئی بُت ہو تراشا جیسے
آگے سوچیں تو مہ و مہر کی عمروں سے طویل
پیچھے دیکھیں تو ہو اک پل کا تماشہ جیسے

---

[1] TREOLET تریولے فرانسیسی شاعری کا ایک سانچہ ہے جس میں پانچ مصرعوں کے اُلٹ پھیر سے آٹھ مصرعے بنائے جاتے ہیں۔ گویا ایک طرح کا قطعہ ہے۔ اِس میں کوئی ایک خیال یا ایک تجربہ لطیف و رنگین شعری سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُردو شاعروں میں اِس صنفِ سخن میں مَیں نے ہی پہلی بار طبع آزمائی اب سے ۲۰ سال قبل کی تھی۔ اور میرا ایک تری اولے "نیا دور" (بنگلور) میں چھپا تھا۔ آج پھر اُسی کو یاد تازہ کر رہا ہوں۔
عطا محمد شعلہ

گرتی دیوار

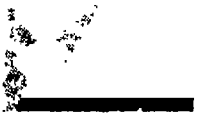

پردہ کھلتا ہے۔ سامنے ایک شکستہ دیوار نظر آتی ہے جسے گرنے سے بچانے کے لئے کہیں بانس سے تو کہیں بلیوں سے سہارا دیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسے مکان کی دیوار ہے جس میں کئی خاندان آباد ہیں۔ اس دیوار کے دونوں جانب ایک ایک گلی ہے۔ اسٹیج کی دائیں جانب ایک بڑے مکان کا عقبی حصہ نظر آتا ہے جس کا دروازہ اور دروازے کی چوکھٹ پر مٹی کی سیاہی جمی ہوئی نظر آتی ہیں۔ صبح کا وقت ہے۔ سامنے کی دیوار کے سائے میں اشرف چارپائی پر سویا ہوا ہے۔ کوئی کبیر کا دوہا گنگناتے ہوئے اس محلہ سے گذر جاتا ہے۔ دیوار کے پاس والی گلی سے ایک نوجوان سوٹ کیس اٹھائے آتا ہے۔ بار بار اس کی نظر گھڑی پر جاتی ہے پھر وہ گلی میں جا کر اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے گویا وہ اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ بائیں جانب سے ایک لڑکی داخل ہوتی ہے اور گھبراہٹ بھری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی ہے۔ نوجوان لڑکی کو دیکھ کر تیزی سے اس کے پاس آجاتا ہے۔

نوجوان: بہت دیر کر دی تم نے۔

لڑکی: میرا دل دھڑک رہا ہے اور.... اور...

نوجوان: اگر آج ہم نہ جا سکے تو پھر شاید کبھی نہ نکل سکیں گے۔ اتنی ہمت کی ہے تو کچھ اور ہمت کرلو۔

لڑکی: اچھا تم کچھ دیر انتظار کرو، میں ابھی آتی ہوں۔

نوجوان: یہاں؟

لڑکی: تو پھر کہاں ٹھہرتے ہو؟

نوجوان: میں اس گلی کے سامنے والے بس اسٹینڈ پر تمہارا انتظار کروں گا۔ لیکن جلدی آنا۔

(نوجوان سامنے والی گلی میں چلا جاتا ہے۔ لڑکی دائیں جانب مکان کے پاس والے راستے سے چلی جاتی ہے۔ اب دھوپ اشرف کی چارپائی تک آگئی ہے۔ وہ اٹھتا ہے اور اپنا بستر لے کر چلا جاتا ہے گلی میں سے کسی کا [illegible] سنائی دیتا ہے)

ایک عورت: کسی کا سامان جا رہا ہے؟

دوسری عورت: حسنی کا۔

پہلی عورت: بڑی قسمت والا ہے جسے مکان مل گیا۔

دوسری عورت: وہ تو جا رہی ہے اپنے سسرے۔ کس کی جیب میں اتنے ہزار پڑے ہیں جو مکان کرایے پر لے گا۔ دونوں عورتیں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتی ہیں اور حسنی ان کے پاس سے گزر جاتی ہے۔

ایک عورت: دیکھا بہن، مکان ملتے ہی کیسا بدل گئیں۔

دوسری عورت: چلو بہن وہ ہی زندہ رہے۔ دیوار گرنے لگی تو مر جائیں گے اچھا ہوگا۔ ہمارا کوئی ہے جس کے گھر جا کر ہم رہیں۔

(دونوں عورتیں چلی جاتی ہیں۔ محلہ میں کوئی نظر نہیں آتا۔ نواب صاحب کے مکان کا دروازہ کھلتا ہے اور ان کی لڑکی کوثر اس لڑکی کو لئے باہر آتی ہے جو کچھ دیر پہلے نوجوان سے باتیں کر رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ کوثر اپنے مکان میں چلی جاتی ہے اور وہ لڑکی تیزی سے گلی کے راستے چلی جاتی ہے۔ ایک عمر رسیدہ عورت جھاڑو پر کوڑا کرکٹ اٹھائے گلی سے آتی ہے اور دیوار کے پاس پھینک دیتی ہے۔ اس کی نگاہ سامنے سے آتے ہوئے کو دیکھ کر وہ عورت رک جاتی ہے۔

عورت: [illegible] بھائی، یا اللہ غریبوں کی ہائے کبھی خالی نہیں جاتی، لیا کہتے ہو۔

دوسری عورت: (جو جاتے ہوئے رک گئی ہے) اُن سے کہنا فضول ہے
چاچی، یہ لوگ اپنے پیسے میں مست ہیں انہیں کیا۔
ہم لوگ اپنی مکان میں دب کر مر جائیں
فالی ہی عورتوں کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتا اور چلے جاتے ہیں۔
عورت سیدھ مست بڑبڑاتے ہوئے چلی جاتی ہے۔

(شاکر صاحب داہنی جانب کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں وہ کسی اوارے کے سکریٹری ہیں اور نواب صاحب کے مکان کی طرف بڑھتے ہیں نواب صاحب اپنے مکان سے نکلتے ہیں)

نواب:۔ اخاہ۔ آیئے شاکر صاحب، آیئے بھئی آیئے (دونوں ایک دوسرے کو آداب کرتے ہیں مصافحہ کرتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔
۔ کہیئے شاکر صاحب بھئی آج ہمارا یاد کیسے آگئی۔

شاکر:۔ آپ خواہ مخواہ شرمندہ کر رہے ہیں۔

ارے عبید۔۔۔ (ملازم داخل ہوتا ہے) بھئی چائے لاؤ
ملازم ہمارے شاکر صاحب کے لئے، بہت دنوں بعد تشریف
لائے ہیں (دونوں ہنستے ہیں) ملازم چلا جاتا ہے، سامنے
دیوار کے نیچے بچے کھیل رہے ہیں ایک عورت انہیں ڈانٹ
کر بھگاتی ہے۔ اور ایک بچے کو پکڑ کر ایک طمانچہ رسید کر دیتی ہے
بچہ روتا ہوا چلا جاتا ہے)

نواب:۔ بھئی پندرہ بیس روز ہوئے ایک صاحب آئے تھے میرے
پاس۔۔ (سوچتے ہوئے) کیا نام تھا اُن کا۔۔۔

شاکر:۔ محسن صاحب

نواب:۔ جی ہاں۔ جی ہاں۔ بھئی بڑے معقول آدمی معلوم ہوئے۔

شاکر:۔ جی ہاں ہمارے ادارے کے جائنٹ سکریٹری ہیں چندے
کے سلسلے میں مجھے بھی جانا پڑا اسلئے وہ میرے پاس آئے تھے۔

نواب:۔ جی شاکر صاحب! ہم آپ کی اسکیم سے خوش ہوئے۔

شاکر:۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا نواب صاحب۔ اب آپ ہی
سوچئے شہر میں ایک ہی اردو کا اسکول ہے اور وہ بھی بند
ہو جائے تو یہ قوم سماج کے لئے کتنا بڑا المیہ ہوگا پہلے تو
سکے ہزار ہزار روپے کا گھاٹا تھا اب ڈیڑھ ہزار کا گھاٹا ہے یہ پیسہ آئے کہاں سے؟

نواب:۔ دو ہزار؟۔۔۔ (نوکر چائے لیکر آتا ہے اور تپائی پر رکھ دیتا ہے
دونوں چائے پیتے ہیں) پھر یہ چندہ جمع کرنے کی اسکیم کا نکالا
ٹھیک ہے لیکن۔۔۔ کچھ بات بنے ہے۔۔۔

شاکر:۔ محسن صاحب نے مجھ سے کہا تھا پہلے میرا خیال تھا کہ
شاید پکار ہم ہو لیکن دوسرے ہی دن اسکول میں ہنگامہ
ہو گیا لڑکوں نے ہڑتال کر دی، پھر بازی ہوئی کانچ پھاڑ
توڑ دیئے۔۔۔

نواب:۔ بھئی چھوڑیئے یہ حرکت بچوں کی نہیں ہوتی اکثر بڑوں کی سازش ہوتی ہے

شاکر:۔ ہمارے یہاں بھی بالکل یہی ہوا۔ میں نے پورا معاملہ پولیس
کے سپرد کیا تو وہی بات نکلی جو آپ نے محسن صاحب سے کہی تھی۔
یہ سب اشرف کی شرارت تھی (نواب صاحب کا ہاتھ فوراً اپنی
مونچھوں پر رکھ لیتا ہے) میں نے اُسی وقت نوکری سے بر
طرف کر دیا اب اُس کا جی چاہے تو مقدمہ کرے ہم پر۔

نواب:۔ کیا کرے گا وہ۔

شاکر:۔ (گھڑی دیکھتے ہوئے) میرا خیال ہے نواب صاحب، میں
نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ اب آپ جب حکم دیں حاضر
ہو جاؤں۔

نواب:۔ ارے بھئی ایسے جب آپ کا جی چاہے چلے آیئے لیکن چندے
کی رقم میں کل ہی بھجوا دوں گا۔

شاکر:۔ بہت بہت شکریہ نواب صاحب۔۔۔۔ (ہاتھ ملا کر
چلے جاتے ہیں)

نواب:۔ (مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے) میں بھیک مانگوں گا کسی
تمہارے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا۔ (ہونہہ (مکان میں
چلے جاتے ہیں۔ نوکر برتن اٹھاتا ہے)

(ایک عورت اپنے بچے کا بازو کھینچتے ہوئے آتی ہے)

ایک عورت:۔ کس کے ہاتھ ٹوٹ گئے تھے اتنے سے بچے کو مارتے ہوئے
شرم نہ آئی۔

دوسری عورت:۔ (پہلی عورت کی آواز سن کر تیزی سے آتی ہے) اُئی لو
میں نے اُسے دھکا یا تھا بس۔ کب سے کھیل رہا تھا
اس دیوار کے نیچے۔

ایک عورت:۔ کھیل رہا تھا تو کس کے باپ کی جگہ ہے۔

دوسری عورت:۔ لے لو۔ یہ دیوار دیکھی ہے ذرا۔

ایک عورت:۔ دیکھی۔ دیکھی۔ تمہارے کوئی اولاد ہوتی تو قدر ہوتی۔۔۔
(اور بچے کو لیکر چلی جاتی ہے)

تیسری عورت:۔ (جمع ہونے والوں میں سے) کیا معلوم ہیں۔ یہ دیوار کس
کس کے گھر میں آگ لگائے گی۔ (چلی جاتی ہے) دوسرے

(لوگ ہی جانے لگتے ہیں)

لوثر: منو! منو! (لوثر کی آواز سن کر اشرف اُس کی طرف دیکھتا ہے، لوثر اُسے اشارے سے بُلاتا ہے۔ اشرف آتا ہے)
کیا آپ مجھ سے اس قدر نفرت کرتے ہیں کہ بات کرنا بھی نہیں چاہتے؟ میں کب سے آپکو بُلا رہی ہوں۔

اشرف: تم تو منو کو بُلا رہی تھیں، کیا معلوم تھا تم مجھے آواز دینے کی ہمت کروگی۔

لوثر: آپ نے میری ہمت دیکھی کہاں ہے (اشرف خاموش ہے) میں نے ہمیشہ آپکو اپنا سمجھا ہے اشرف، اور آپ کے بغیر میں طرح زندہ ہوں، میرا دل جانتا ہے.... آپ نے مجھ سے جھوٹی محبت ہی جتائی ہوتی۔ میرے بچوں کے سر پر پیار سے ہاتھ ہی پھیرا ہوتا، تو آج یہ دن کیوں آتے... (لوثر رونے لگتا ہے)

اشرف: لوثر یہ رونے کی جگہ ہے؟ لوگ کیا کہیں گے۔

لوثر: آپنے ہمیشہ لوگوں کی پروا کی ہے، جانتے ہوا سطرح پورے آٹھ دس سال گذر گئے ہیں، کچھ تو سوچو، میرا بھی آپ پر کچھ حق ہے۔

اشرف: میں اپنے حق کو اچھی طرح جانتا ہوں لوثر، دُنیا میں کوئی باپ ایسا نہیں ہے جو اپنے بچوں سے پیار نہ کرتا ہو۔ میں بھی دُنیا کے ہر شخص کی طرح اپنی دُنیا سے محبت کرتا ہوں۔ لیکن بھیک مانگنے والوں کو، لوثر کہ تمہارے خوابوں کو اپنی دُنیا سے کچھ نہ دے سکا۔ یہ سچ ہے کہ تم نے غربت نہیں دیکھی، لیکن میری عزت بھی کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ شادی سے پہلے تم بھی جانتی تھیں، تمہارے والد بھی جانتے تھے۔ پھر آج غربت میرا قصور کیوں ہے؟ میری دُنیا میں گھٹن ہے، تمہاری دُنیا دیواروں سے بھری ہوئی ہے، یہ کشمکش ایک دیوار ہے جو ہم دونوں کے درمیان کھڑی ہے میں اس دیوار کے پیچھے اپنے بازو پھیلائے کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ (جانے لگتا ہے)

لوثر: میری ایک بات سنتے جائیے، آپ اس دیوار کے نیچے سونا چھوڑ دیجئے۔

اشرف: کیوں۔؟

لوثر: دیکھتے نہیں، دیوار کی جو حالت ہے

اشرف: تو اور کہاں سوؤں گا، کمرے میں سونے سے بھی کیا فرق پڑتا ہے اگر یہ دیوار گر بھی تو نہ کرہ سلامت رہیگا نہ میں (لوثر اشرف کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ اُسی وقت نواب صاحب اُچٹکرے سے نکلتے ہیں اُن کے چہرے سے ناراضگی ظاہر ہوتی ہے)

نواب: کوثر.... (دونوں دور ہو جاتے ہیں)

کوثر: (اشرف سے) آپ چلے جائیے.. (اشرف چلا جاتا ہے اور کوثر بھی اپنے مکان میں چلی جاتی ہے)

نواب: ٹھہرو! آج اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیئے، اگر تمہیں اُس بدچلن سے ہمدردی ہے تو چلی جاؤ یہاں سے۔ اور پھر دیکھو تمہارے بچے کس طرح یتیموں کی زندگی بسر کرتے ہیں، اور کس طرح تم ایسی اجلی زندگی گذارتی ہو۔ اس طرح چوری چھپے مل کر مجھے رسوا کرنا چاہتی ہو، محلہ والوں کو بتانا چاہتی ہو کہ میں تمہارا راستہ روکے کھڑا ہوں (کوثر خاموش ہے) بیٹھو... (کوثر بیٹھ جاتی ہے) کل روز سے میں تم میں ایک تبدیلی دیکھ رہا ہوں (لال جی آتے ہیں۔ اور نواب صاحب کو آواز دیتے ہیں)

نواب: (لال جی سے) آیئے.. (کوثر اٹھ کر چلی جاتی ہے، لال جی آکر بیٹھتے ہیں اور چند کاغذات نواب صاحب کی طرف بڑھا دیتے ہیں) کیا ہے یہ؟ (کاغذات کھول کر دیکھتے ہیں) اچھا تو نوٹس ہے کارپوریشن کا۔

لال جی: ایک بنتے میں اس دیوار کی مرمت کیلئے لکھا ہے۔

نواب: بتاؤ کے ہاکر اکمل کو.... میں یہ کرلوں گا، میں وہ کرلوں گا کیا جھک ماری ہے اُس نے۔

لال جی: اب کیا ہو سکتا ہے نواب صاحب

نواب: بہت کچھ ہو سکتا ہے

لال جی: لیکن میرا تو خیال ہے نواب صاحب کہ.... یہ.... دیوار منوا کے مصیبت سے چھوٹ جاؤں۔

نواب: تو منوا دیجئے، تبدیل امکان ہے (خاموشی) اور دیوار منوا کر بھی کیا مل جائے گا تمہیں..... (خاموشی).... اور اگر تم یہاں دوکان نہ منوا سکے تو میرے جیسا کوئی بھی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔

لال جی: میں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا۔ صرف آپ۔

نواب: (کڑے ہو کر) نا... نا... نا میں اس کام کے لئے ایک پائی بھی نہیں دے سکتا۔ تمہاری جو سمجھ میں آئے کرلو چلے جاتے ہیں۔ لال جی کاغذات لے جاتے ہیں)

لال جی: منیجر۔ اشرف کہاں ہے؟

شیخو:۔ اشرف کا کیا کام ہے لال جی، وہ اب تمہارے جال میں پھنسنے والا نہیں، ہاں۔۔۔

لال جی:۔ (آگے بڑھتے ہوئے) کیسے لوگ ہیں، سیدھی بات کرو تو الٹا جواب دیتے ہیں۔

بھیا جی:۔ (جاتے ہوئے رک کر) ارے لال جی سیدھی انگلی سے کبھی نکلا ہے گھی۔ (سامنے سے اشرف آتا ہے)

لال جی:۔ اشرف

اشرف:۔ کیا ہے چاچا جی

لال جی:۔ اشرف تم جانتے ہو بیٹا، میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ اس دیوار کی مرمت کرا سکوں

بھیا جی:۔ ان کے جھانسے میں مت آیو اشرف، یہ ہم سب سے مکان خالی کرانے کے بہانے ہیں۔

شیخو:۔ ہمارے کوئی مائی کا پوت آئے تو سہی۔

اشرف:۔ چاچا جی تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں لیکن ایسے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں لوگوں کا اپنے بال بچوں کے ساتھ رہنا کتنا خطرناک ہے اس دیوار کو بنوائے بغیر کوئی چارہ نہیں، وہ تم بناؤ یا ہم، اگر تمہاری نیت صاف ہے چاچا جی تو ہمارے ساتھ آ کر کھڑے ہو جاؤ، اور دیکھو، ہم غریب سہی لیکن کس طرح تمہارا دکھ بانٹتے ہیں۔ ہم آپس میں پیسے جمع کریں گے اور ۔۔۔

لال جی:۔ (جذبات میں آ کر) میں تم سب کی ایک ایک پائی چکا دوں گا۔ کرایے میں وصول کر لوں گا لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے جس کا اظہار لوگ طرح طرح سے کرتے ہیں۔ نواب صاحب آتے ہیں لیکن اس منظر کو دیکھ کر فوراً ہی مکان میں چلے جاتے ہیں اور دروازہ بند کر لیتے ہیں، لوگ آہستہ آہستہ چلے جاتے ہیں، اکمل گھبرائے ہوئے داخل ہوتے ہیں، اور نواب صاحب کے دھانے پر جا کر انہیں پکارتے ہیں اور دروازہ پر زور زور سے دستک دیتے ہیں۔

نواب:۔ (باہر آتے ہیں) ارے تم! اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟

اکمل:۔ نواب صاحب میں آپ سے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔

نواب:۔ ہوا کیا ہے؟ بیٹھو بھی بیٹھو۔

اکمل:۔ نواب صاحب آج صبح سے۔۔۔ آج صبح سے میری رضیہ کہیں چلی گئی ہے۔

نواب:۔ اُسی بدچلن کے ساتھ؟۔۔۔ (اکمل خاموش ہیں) ہم اسی سے جانتے تھے اکمل کہ یہ سب ہو کر رہیگا۔ اور تم نے میونسپل کارپوریشر ہوتے ہوئے جھک ماری۔۔۔ میں اگر تم جگہ ہوتا تو نہ یہ مکان ہوتا نہ ایک بھی کرایہ دار، اور نہ یہ دیکھنا پڑتا، اب کیا ہو سکتا ہے۔

اکمل:۔ آپ چاہیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے نواب صاحب، ابھی رضیہ اسی شہر میں ہوگی اور۔۔۔ اشرف اچھی طرح جانتا ہوگا کہ احمد کہاں ہے۔ اگر آپ اشرف کو بلا کر۔۔۔

نواب:۔ (غصہ میں کھڑے ہو جاتے ہیں) یہ نہیں ہو سکتا۔

اکمل:۔ (ہاتھ جوڑتے ہوئے) میری خاطر نواب صاحب۔۔۔

نواب:۔ کبھی نہیں ہو سکتا اکمل۔ تم اس بدتمیز کا نام میرے سامنے نہ لو۔ جو شخص میرے دروازے پر بھیک مانگنے کے قابل ہے، میں اس کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں۔ اگر میں اس کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتا تو اپنی بیٹی کا سکھ نہ مانگتا؟

اکمل:۔ (نواب صاحب کے قدموں میں گر جاتے ہیں) خدا کے لئے مجھ پر اتنا احسان کیجیے نواب صاحب میں زندگی بھر آپ کا غلام بنا رہوں گا۔

نواب:۔ (اکمل کو سہارا دیکر اٹھاتے ہیں)۔۔۔ ایک بات ہو سکتی ہے اچھا یہ بتاؤ رضیہ گھر سے کیا لیکر گئی ہے؟

اکمل:۔ کچھ نہیں لے گئی۔۔۔ (کوٹر دروازے کی آڑ میں کھڑی ہے اور دونوں کی باتیں سن رہی ہے۔

نواب:۔ (سر چھپتے ہوئے) ایک صورت ہے اکمل۔ اگر مقدمہ کیا جائے؟

اکمل:۔ مقدمہ؟

نواب:۔ جانتا ہوں تم اپنی بدنامی سے ڈرتے ہو، لیکن رضیہ کے بھاگنے سے پہلے ہی لوگ تمہیں بدنام کر چکے ہوں گے اور اب تک سارا شہر جان چکا ہوگا کہ تمہاری بیٹی بھاگ گئی ہے۔ اگر تم اس کی زندگی بچانا چاہو تو یہی ایک راستہ ہے، آگے تمہاری مرضی۔

اکمل:۔ لیکن مقدمے سے کیا ہوگا؟

نواب:۔ وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو، میں ابھی تیلی فون کر کے منشی شرما کو بلاتا ہوں۔ تم یہ بیان دینا کہ لڑکی دے

مال لیکر فرار ہوئی ہے' اور وہ لوگ اس وقت کہاں ہونگے اس کا علم اشرف کو ہے' پھر دیکھو... چلو آؤ میرے ساتھ' رونے سے کچھ نہ ہوگا (دونوں مکان میں چلے جاتے ہیں' کوثر باہر آتی ہے اور سامنے سے اشرف کو آتا دیکھ کر اس سے ملنے چلی جاتی ہے)

کوثر:۔ اشرف

اشرف:۔ (کوثر کے پاس آکر) اب کیا باقی رہ گیا ہے کوثر؟

کوثر:۔ میں شرمندہ ہوں اشرف' میری وجہ سے آپ نے بہت کچھ برداشت کیا ہے صرف ایک بات اور مان لیجئے۔

اشرف:۔ کیا اس مکان کو چھوڑ دوں' اس قصے کو چھوڑ کر چلا جاؤں'

کوثر:۔ ہاں اشرف۔ دو چار دن کے لئے آپ یہاں سے کہیں چلے جائیے

اشرف:۔ کیوں؟ دو چار دن میں۔ زندگی بدل جائے گی حالات۔ پھر میرے جانے سے کیا ہوگا۔

کوثر:۔ اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ امجد کی وجہ سے آپ پر کوئی بھی مصیبت آسکتی ہے۔

اشرف:۔ امجد کی وجہ سے؟

کوثر:۔ اب مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کیجئے۔ امجد آپ کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا' آج وہ رضیہ کے ساتھ چلا گیا ہے۔

اشرف:۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایسی ذلیل حرکت کبھی نہیں کریگا۔

کوثر:۔ آپ جلد سے چلے جائیے' ورنہ پولیس آجائے گی۔

اشرف:۔ پولیس؟

کوثر:۔ ہاں' چچا اکمل مقدمہ دائر کرنا چاہتے ہیں ان کا خیال ہے دونوں کی مدد آپ نے کی ہے؟ دیکھئے وہ پولیس آرہی ہے خدا کے لئے چلے جائیے۔

(اشرف گلی میں چلا جاتا ہے اور کوثر اپنے مکان میں چلی جاتی ہے۔ پولیس انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ بائیں جانب سے داخل ہوتا ہے' اس وقت نواب صاحب اور اکمل باہر آتے ہیں)

نواب:۔ آیئے انسپکٹر صاحب۔

انسپکٹر:۔ آداب عرض ہے حضور۔

نواب:۔ آداب عرض ہے۔ کہئے آپ کو بڑی زحمت دی' آیئے بیٹھئے۔

انسپکٹر:۔ کہئے کیا حکم ہے؟

نواب:۔ ارے بھئی اب تو اس محلہ میں رہنا عذاب ہو گیا ہے' دنیا بھر کے لچے لفنگے یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ اب دیکھئے یہی ہمارے دوست اکمل صاحب' میونسپل کارپوریٹر ہیں۔ آج صبح سے ان کی لڑکی غائب ہے۔

انسپکٹر:۔ کیا EGE ہے لڑکی کی

اکمل:۔ یہی پندرہ سولہ سال کی ہوگی انسپکٹر صاحب (ایک کانسٹبل نے کچھ لکھنا شروع کر دیا ہے)

انسپکٹر:۔ اچھا یہ بتایئے' لڑکی آپ کے گھر سے کوئی چیز و MEAN روپے پیسے لے گئی ہے؟

اکمل:۔ جی' جی ہاں پانچ ہزار روپے نقد لے گئی ہے' اور چار پانچ ہزار کے زیورات ہیں۔

انسپکٹر:۔ SEE لڑکے کو آپ جانتے ہیں۔

نواب:۔ ارے بھئی اسی سامنے والے مکان میں رہتا ہے۔

انسپکٹر:۔ لڑکے کے ماں باپ وغیرہ بھی یہیں رہتے ہیں

اکمل:۔ یہاں اس کا کوئی نہیں ہے انسپکٹر صاحب' صرف اس کا ایک دوست سامنے مکان میں رہتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہوگا کہ یہ لوگ اس وقت کہاں ہوں گے۔

انسپکٹر:۔ کیا نام ہے اس کا؟

اکمل:۔ اشرف۔

انسپکٹر:۔ گو بند جاؤ دیکھو اشرف ہو تو اسے پکڑ لاؤ۔

(کانسٹبل جاتا ہے)

نواب:۔ بھئی آپ بیٹھئے انسپکٹر صاحب۔ میں ابھی حاضر ہوا۔

(کچھ لوگ دور کھڑے ہوئے تماشہ دیکھ رہے ہیں اور کانسٹبل اشرف کو لیکر آتا ہے۔ انسپکٹر اور اکمل وغیرہ سے نیچے آجاتے ہیں)

انسپکٹر:۔ تمہارا نام ہے اشرف؟

اشرف:۔ جی ہاں۔

انسپکٹر:۔ تم جانتے ہو تمہارا دوست ایک لڑکی کو لیکر بھاگ گیا ہے؟

اکمل:۔ یہ اچھی طرح جانتا ہے انسپکٹر صاحب!

اشرف:۔

اکمل :۔ اس نے مجھ سے انتقام لیا ہے۔ میں نے میونسپلٹی میں اس دیوار کو گرانے کی حمایت کی تھی۔ لیکن یاد رکھو اشرف ——

انسپکٹر :۔ آپ چپ رہیئے (اشرف سے) آپکا دوست پانچ ہزار کمشن اور پانچ ہزار کے زیورات بیکر بھاگا ہے۔

اشرف :۔ لیکن میں ——

انسپکٹر :۔ بچو میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔

اشرف :۔ چلیئے۔ (سب جانے لگتے ہیں)

کوثر :۔ (مکان کے پاس والی گلی سے باہر آتی ہے) اشرف (سب رکتے ہیں) ٹھہریئے میں آپکو بتاتی ہوں (انسپکٹر کے پاس جاتی ہے) انسپکٹر آپ مجھے گرفتار کیجیے اور انہیں چھوڑ دیجیے اشرف بے قصور ہیں۔

انسپکٹر :۔ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟

کوثر :۔ میں جانتی ہوں انسپکٹر صاحب یہ سب ذاتی بغض و عداوت کی وجہ سے ہوا ہے مجھے معلوم ہے رضیہ اس وقت کہاں ہے وہ مجھ سے مل کر گئی ہے۔

اکمل :۔ کوثر! تو تم نے مجھ سے چھپایا کیوں؟ تم نے کس جرم کا بدلہ لیا ہے؟

انسپکٹر :۔ آپ EXACT پتہ بتا سکتی ہیں وہ اس وقت کہاں ہوں گے۔

کوثر :۔ جی ہاں لیجئے! (ایک خط دیتے ہوئے) پڑھ لیجیے اس میں پتہ درج ہے اور رضیہ نے امجد سے اپنی محبت کا اقرار بھی کیا ہے اور وہ کہانی بھی لکھی ہے جس میں ایک باپ کس طرح دولت کی لالچ میں اندھا ہو جاتا ہے۔

اکمل :۔ کوثر!

کوثر :۔ رضیہ ایک صلوح شخص کے ساتھ زندگی نہیں بتا سکتی تھی، چاچا جی۔

اکمل :۔ تو مر گیوں نہ گئی

کوثر :۔ وہ بزدل نہ تھی جو ایک باپ کی جھوٹی محبت اور ٹھیکیداری پر اپنے آپکو قربان کر دیتی۔ وہ دولت، ذات پات اور جھوٹی عزت کے اس حصار کو توڑ کر نکل گئی ہے جو ایک باپ اپنی بیٹی کے ارد گرد باندھ لیتا ہے۔ اور جس میں مجھ جیسی ہزاروں لڑکیاں زندہ درگور ہو جاتی ہیں، اس نے اپنا راستہ خود تلاش کر لیا ہے چاچا جی اسے جا کر دیکھ

انسپکٹر :۔ I AM SORRY MR ASHRAF

کوثر :۔ چلو اشرف۔ میں نے بھی اس سلسلہ کو توڑ دیا ہے۔

اشرف :۔ کوثر (اور دونوں دیوار کے پاس والی گلی کی طرف جاتے ہیں اور پردہ گر جاتا ہے)

آئندہ شمارہ
ایک ناتمام جھلک

مضامین

تقلیدی اور تخلیقی شاعری	بشر نواز
خدیجہ مستور اور "آنگن"	علی حیدر ملک
مقاؔ کی شاعری کا ایک پہلو	قمر اعظم ہاشمی
علامہ تاجور کی صحافتی زندگی	مناظر عاشق ہرگانوی
عنوان چشتی کی شاعری	انوار صدیقی

ملاقات

کرشن چندر سے ملاقاتیں — آغا رشید مرزا

خطوط

نیاز فتحپوری۔ خطوط کے آئینے میں — ضیا حسنی

ڈراما

چارہ گر — جمیل الدین

افسانہ

سہیل ہو گئیں منزلیں — فیض الحسن

نئی شاعری کیوں؟

نئے فن کار

(دوسری زبانوں کے کئی افسانے)

نظمیں

رفعت سروش۔ اویس احمد دوراں۔ رؤف خلش۔ رونق دکنی۔ حسن فرخ۔ یوسف اقبال۔

غزلیں

ماہر القادری۔ پروین شاکر۔ عبدالرحیم نشتر۔ ضیا فتح آبادی۔ کرشن موہن۔ محسن زیدی۔ بدیع الزماں خاور۔ علقمہ شبلی۔ مہدی پرتاپگڑھی۔ جرمؔ۔

مکتوبات۔ نقد و نظر۔ اور فنی تہذیبی مسائل پر فنکاروں کی نقادانہ

دسمبر ۱۹۶۶ء کا یہ اہم شمارہ اپنے مقامی ایجنٹ کے یہاں محفوظ کرا لیجئے

ماہر کابانی

ہمارے خواب

مٹی تھی وقت کے ہاتھ سے ظلمتوں کی شکن
بنی تھی نُور کا مخزن زمین گنگ و جمن
کئے تھے چاند ستارے نے پے بہ پے سجدے
سوادِ شوق سے پھوٹی تھی ایک شوخ کرن

ہر ایک سمت تھے نغمے لبِ عنادل پر
ہر ایک گوشے میں رقصِ بہارِ تازہ تھا
صبا کی چال میں مستی تھی خوش جمالوں کی
رُخِ سحر پہ جوانی کا سُرخ غازہ تھا

یہ عزم تھا کہ مٹائیں گے نفرتوں کا وجود
یہ تھا خیال، جلائیں گے آشتی کے چراغ
یہ سوچتے تھے کہ روشن کریں گے از سرِ نو
خرد کے، فکر و نظر کے، خود آگہی کے چراغ

مگر وہ خواب جو ہم سب نے مل کے دیکھے تھے
ہنوز تشنہ ہیں، دُھندلے ہیں، نامکمل ہیں
نہ جانے کب سے سفر میں ہے کاروانِ اُمید
ہماری منزلیں پھر بھی نظر سے اوجھل ہیں

سکوں کے نام سے ناآشنا ہیں اہلِ چمن
قدم قدم پہ ستم کے نقوش ملتے ہیں
رُوسِ وقت نے پہنا ہے تاج کانٹوں کا
دلوں میں آج بھی زخموں کے پھول کھلتے ہیں

زباں تشنہ ہے، لب تشنہ، ذہن تشنہ ہے
بھری ہیں تشنگیاں دل کے آبگینوں میں
ٹھہر سکا نہ ابھی تک چمن اُمیدوں کا
اُبلتے رہے خونِ جگر پسینوں میں

یہ خواب کہ ہیں آدمی کا سرمایہ
ہم اپنے خوابوں کو تعبیرِ زندگی دیں گے
ہم اُس عہد کی جس نے یہ خواب بخشے ہیں
ہر ایک گوشۂ تیرہ کو روشنی دیں گے

ہمارے خواب اُدھورے سہی، ہمارے ہیں
ہمارے خواب، ہمیں زندگی سے پیارے ہیں

عزیز صدیقی

ساحر لدھیانوی ۔ اور تحریک فلاحِ نسواں

عورت ایک مقدس ہستی ہے۔ سماج اور سوسائٹی، کلچر اور تہذیب اس کا دین ناقابلِ فراموش ہے۔ تہذیب و تمدن، معاشرت اور ثقافت کے سنوارنے میں اس کے نازک اور نرم بازوؤں نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کے حصہ لیا ہے۔ صدیوں کی تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں کہ عورت نے مردوں کے دوش بدوش، قوم، ملک کی حفاظت کی ہے۔ وہ (عورت) فرانس کی جان آف آرک ہو یا ہندوستان کی لکشمی بائی، الجیریا کی جمیلہ ہو یا عرب کی فاطمہ بنت عبدالقادر، احمد نگر کی چاند بی بی ہو یا کشمیر کی حبہ خاتون، ان کی خدمات وطن کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے لائق ہیں۔ عورت ہماری نسلوں کی ماں ہے، اسی کی آغوش میں پل کر قومی تاریخ کے صفحے بدلے ہیں۔ اس کے قدموں پر تاریخ نے خراج عقیدت کے طور پر تاج و تخت جھکائے ہیں اور اسی کی گود میں پرورش پاکر قومیں جوان ہوئی ہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب اور تہذیبوں نے عورت کے مقدس مقام اور اس کے حقوق کا اصولی طور پر اعتراف کیا ہے۔ بائبل، پاژند، کنفیوشس کی تصانیف، برہمنوں کی قدیم مذہبی کتب، سبھوں نے اس معصوم ہستی کو اعلیٰ مقام عطا کرنا چاہا ہے۔ وید میں آیا ہے "عورتیں پوجنے (قدر) کے لائق ہیں" دوسری جگہ لکھا ہے "جہاں عورتوں کی پوجا (عزت و احترام) ہوتی ہے وہاں دیوتا نرتیا کرتے ہیں"۔

اسلام نے عورتوں کے تقدس کو گرم جوشی سے گلے لگایا، اسلام کے قبل ساری قوموں کے افراد عورتوں سے برا سلوک کرتے تھے۔ کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہونا باعث ننگ سمجھا جاتا تھا، اس معصوم ذات کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، اسلام نے بنت حوا کو نہ صرف معاشرت میں بلکہ زندگی کے سارے شعبوں میں جائز مقام عطا کیا، اسے معاشی، اقتصادی، سیاسی اور تمدنی حکومت پہنائے گئے، یہاں تک کہ لونڈی کا مقام بھی ماں، بیوی اور بہن کے قریب تر بن کر دیا گیا۔

پھر بھی صدیوں سے صنفِ نازک غلامی، بے بسی اور بے چارگی کی زنجیروں میں جکڑی کراہ رہی ہے۔ مہذب ممالک نے اسے آزادی تو عطا کر دی لیکن اس آزادی کے نام پر اس مظلوم مخلوق سے ناگفتہ بہ کھیل کھیلے جاتے رہے ہیں، مردوں نے اسے لوٹا، سرمایہ داروں نے اس کی عصمت کی سودے بازی کی، سامراج اور جاگیردارانہ سوسائٹی نے اسے اپنی عیش پرستی کے لئے استعمال کیا، کبھی تو یہ محفلِ عیش و عشرت میں "رقاصہ" کے فرائض انجام دینے پر مجبور کی جاتی رہی اور کبھی عیش پرستوں کے پہلو گرم کرنے کے لئے جس کی شاخِ پر اس معصوم پرندے نے آشیانہ بنانا چاہا ہے بجلی کو گرنا پڑی، جس کسی گھر میں اس نے پناہ ڈھونڈنا چاہی، ہر جگہ سے بڑی بڑی خونخوار آنکھیں نگل جانے کو تیار ملیں، غرض آج بھی سوسائٹی اور سماج میں عورت کو وہ برابر کے حقوق حاصل نہیں جو ہونے چاہئیں۔

ادب اور زندگی کا رشتہ بہت ہی گہرا ہے، زندگی کی متحرک تصویریں ادب کے پردے پر ہمیشہ نمایاں ہوتی رہی ہیں، اردو ادب بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ عورتوں کے کھوئے ہوئے مقام، وقار اور حق کے لئے اردو ادیب، سوسائٹی، حکومت اور قوم سے برسرِ پیکار رہا ہے، اردو کے عہدِ وسطیٰ میں کبھی یہ ادیب نذیر احمد

अहो सर्वेषामेतेषां पुरुषाणां कुतो वृत्तम् । (योगवासिष्ठ)
लोकवत् सुखं सम्यक् भर्तृ • यासु प्रतिष्ठितम् (३रा भाग
२३वां श्लोक)

دلہن کے پیکر میں جلوہ گر "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" سے اس کی فلاح کی راہ ہموار کرتا رہا۔ کبھی ابن وقت، راشد الخیری جیسے مصلحِ قوم کو جنم دیتے "صبح زندگی" "شام زندگی" اور شب زندگی سے اصلاح نسواں کی کوشش کی۔

بیسویں صدی کا آغاز ہی تاریخ عالم پر انقلاب سے ہوتا ہے۔ بعض گتی سے نیا آفتاب چمکا، نئی قدریں ابھرنے لگیں اور پرانی فرسودہ قدریں ایک ایک دم ٹوٹنے لگیں۔ نئے جام چھلکنے لگے اور پرانے شیشے کا تقدس ٹوٹنے لگا۔ سامراج پستا رہا اور جاگیردارانہ نظام کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ ماضی پرستی کا اور روایات کا جو دھندلا اب سائی کھنچا ہوا تھا اور سیانہ کبھی ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔ فرد اور سماج دونوں نے بھی کروٹ لی۔ اور محلوں کی چہار دیواری سے نکل کر اب عوام میں مکیت ہو گئی۔ یہ عام گھروں میں بھی بہو، بیٹی کے فرائض انجام دینے لگی۔ زندگی کے تمام شعبے اس تبدیلی سے متاثر ہوئے۔ عورتوں کی فلاح کی طرف بھی توجہ کی گیا۔ اب ایک نئی تحریک چل پڑی اور اس نے بھی تعلقات دیا۔ اسی وقت اردو افسانہ نگاری کی دنیا میں پریم چند آتے ہیں۔ انھوں نے متوسط طبقے کی کھوکھلی زندگی اور سماجی کھوکھلے پن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ عورتوں کی بہلی بار انھوں نے "بہن" "بیوی" اور "ماں" کی مقدس صورت میں پیش کیا۔ "بیوہ" "نرملا" اور بازار حسن جیسے ناولوں میں ان کی اچھائی کو کوشش کی جا سکتی ہیں۔

مارکسزم کی کرتی ہوئی مقبولیت نے ہمیں یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیا کہ عورتوں کی معاشی اور سماجی آزادی کے بغیر ترقی کی راہیں نہیں کھل سکتیں۔ ترقی پسند شعراء نے بہ بانگ بلند اس تحریک کی حمایت کی۔ سیماب کی نظم "رنگین تتری" کے پردے میں جو حسن چھلک رہا ہے وہ عورت کی طرف دنیا کو کھینچتا ہے۔ اختر شیرانی، فیض احمد فیض اور مجاز کی نورا اختر تاوری کی جیل، جمیل مظہری کی "مذرا" اور سردار جعفری کی "نئی دنیا" کو سلام کی مریم ہماری شاعری کے مختلف روپ جن کر سامنے آئے۔

ساحر لدھیانوی بھی اسی قبیل کے فنکار ہیں۔ انھوں نے بھی اس درد کو محسوس کیا، وہ بھی علم بغاوت لیکر آگے بڑھے۔ ان کی متعدد نظموں اور نظمانگا نظموں سے کان آشنا ہوئے۔

ایک طرف افلاس کی گھٹا چھا رہی ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ مفلسوں کی عصمت کی سودے بازاں ہو رہی ہیں۔ ان کی عزت عصمت اور غیرت سے سرمایہ دار کھیل رہے ہیں۔

گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے!
حسین آنکھوں میں افسردگی سی چھائی ہوئی!

یہ وہی سرمایہ دار ہیں جو غریبوں کا خون چوس کر ان کی قبروں پر بلند عمارتیں کھڑی کرتے ہیں، یہ مدہوش اور متوالے سانپ عصمت کے نام سے بھی کھیلنے میں عار نہیں سمجھتے۔

وہ پھر بکی کسی مجبور کی جواں بیٹی

وہ دیکھ سامنے کے پر شکوہ ایوان سے
کسی کرایے کی لڑکی کا پیسنج ٹکرائی — !

کسان دن بھر محنت کرتا ہے، خود بھوکا رہ کر دنیا کے لئے غلہ فراہم کرتا ہے لیکن اس کی محنت کو قدر نہیں ہوتی۔ اس کی جواں بیٹیوں کے پاس ستر پوشی کے لئے ڈھنگ کا کپڑا تک نہیں۔

نکل ہے جھگے کے در سے
ایک مفلس دہقان کی بیٹی!
افسردہ مرجھائی ہوئی سی!
جسم کے دکھتے جوڑ دباتی
آنچل سے سینے کو چھپاتی

عصمت کی عظمت کے گیت گانے والے مشرقی سرزمین کو تقدس کا گہوارہ بتانے والے عاملوں سے عورتوں کی نیلامی کا تماشہ دیکھ

ہیں۔ عصمت نسواں کا کس طرح جنازہ اٹھایا جارہا ہے' کیا وہ چکلے کے نیلام خانے کی طرف دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے۔

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے'
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے'

ع۔ یہ عصمت کے سودے یہ سودوں پہ تکرار

اے ساوات کا نعرہ بلند کرنے والو' کیا اسی کا نام آزادی ہے کہ ناموس نسواں کے جلوس نکالے جائیں' کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس جنس مجبور کے ساتھ کیسے کیسے سلوک کئے جارہے ہیں۔

یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں!
یہ بجھتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں!

ہماری اونچی ناک والی اس سوسائٹی نے عام طور پر اب تک عورت کو اتنا حق نہیں دیا کہ وہ اپنے شریک زندگی کا اپنی مرضی سے انتخاب کر سکے۔ بس ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لیتی ہے' کتنا دردناک ہے یہ منظر' شاعر ہمیں صنف لطیف کہتے ہوئے کرتا ہے۔ بعض جگہ تو وہ عورتوں کو بھی بغاوت کا پیغام دیتا ہے۔

مدوحیا ہتی ہے یہ حوا کی بیٹی!
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت زلیخا کی بیٹی —!

ساحر کے ان تیز شاعرانہ محسسات کے باوجود اس موضوع میں ایک تشنگی کی بات رہتی ہے جس سے ہمارے حوصلے زیادہ نہیں بڑھتے' قاری کے سامنے کوئی واضح بات نہیں آتی کہ اس مظلوم قوم کی ترقی کی راہیں کیسے ہموار کی جائیں؟ شاعر تصویر کی صحیح عکاسی تو کر دیتا ہے لیکن اتنی کاوش کے لئے کوئی نظریہ اور عملی تجویز پیش نہیں کرتا یہ بہت ہی نزاعی مسئلہ ہے' اس مقام پر اقبال جیسے مفکر بھی دامن بچا کر خاموشی سے گذر جاتے ہیں ؎

میں بھی منظور نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ساحر لدھیانوی نے فلاح نسواں کے سلسلے میں شعوری کوشش کی ہے اس موضوع پر انھوں نے مختلف انداز سے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

ہماری "ترقی پسند تحریک" نے عورتوں کو کافی متاثر کیا۔ نئی نسل کے تمام ادبا اس مشن میں ساتھ دے رہے ہیں وہ دن دور نہیں جب عورت اس کی خورد و نخیر کو توڑنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ ہمیں یقین ہے:۔

ہزار برق گرے لاکھ آندھیاں اٹھیں!
وہ پھول کھل کے رہیں گے' جو کھلنے والے ہیں

مدت خریداری ختم ہونے کی اطلاع

اس سیاہ ملفے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سال خریداری نومبر کے اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ آپکی خدمت میں دسمبر ۴۱ء کا شاعر بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا' یا آپ سالانہ چندہ کا رقم مبلغ آٹھ روپے مع کمیشن چندہ بنر کی رعایتی قیمت چار روپیہ بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیجئے۔ اگر تجدید خریداری منظور نہ ہو تو لفافہ واپسی ایک خط سے دفتر کو اطلاع دیجئے تاکہ وی پی نہ بھیجا جائے یاد دہانی صرف سالانہ چندے کا بھیجا جائے۔ — منیجر

قیصر الجعفری

قبرگاہ

ترے مزار کی جانب مجھے بہا لائی
یہ شامِ درد جو آئی ہے زخمِ جاں بن کر
یہ چاندنی جو بچھی ہے ترے کفن کی طرح
میں تیری قبر پہ برسوں کے بعد آیا ہوں
نشانِ قبر کا پہچاننا بھی مشکل ہے
یہ ایک گوشۂ ویراں جو اجنبی سا ہے
پکارتا ہے مجھے، جیسے جانتا ہے مجھے
اسی زمین میں گم ہیں مری تمنائیں
اسی ہوا میں مری خاکِ دل بھی شامل ہے
یہیں کہیں تری آرام گاہ ہے شاید
مہک رہی ہے یہ مٹی ترے بدن کی طرح

میں تیری قبر پہ ہر روز آ نہیں سکتا
کہ میرے گھر ہی میں اک اور قبرگاہ بھی ہے
وہ قبرگاہ جہاں کوئی لوحِ نصب نہیں
جہاں نہ پھول، نہ خوشبو، نہ روشنی، نہ چراغ
وہ قبرگاہ جہاں اپنے دل کی بھٹی میں
جلا رہا ہوں میں نوبانِ آرزوؤں کا
وہ قبرگاہ جہاں کھو گیا مرا ماضی
وہ قبرگاہ جہاں میرا حال سوتا ہے
وہ قبرگاہ جہاں دفن ہے مرا فردا
وہ قبرگاہ جہاں چند پھول سے بچے
مجاوروں کی طرح سوگوار پھرتے ہیں

وہ دور ہے کہ بہت کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں
رات مجھ کو نہ جانے کہاں ڈبوئے گی
جو روشنی کا سمندر بھی ہے سیاہ بھی ہے

طفیل ہوشیارپوری

غزل

رقصِ جذبات کی لے، شعلۂ آواز کا رنگ
اب تک آنکھوں میں ہے اُس جلوہ گہِ ناز کا رنگ
میں نے سیکھا تری آنکھوں سے غزلخواں ہونا
تو نے بخشا مرے نغمات کو اعجاز کا رنگ
میں نے کھائے ہیں تری چشمِ نوازش کے فریب
میں نے دیکھا ہے ترے حسنِ فسوں ساز کا رنگ
تیرے عارض پہ جھلکتا ہے شفق کی صورت
حسنِ معصوم، تری شوخیِ انداز کا رنگ
جب قفس میں کبھی آتا ہے نشیمن کا خیال
خوں رُلاتا ہے مجھے حسرتِ پرواز کا رنگ
کوئی آئینۂ حالات میں دیکھے تو سہی
میرے انجام کی صورت، مرے آغاز کا رنگ
میری فریاد بھی ہے وجہِ نشاطِ محفل
بھر دیا تو نے مرے نوں میں بھی ساز کا رنگ
کون سا حادثہ گذرا ہے ترے ساتھ طفیلؔ
کیوں بجھا سا ہے دلِ زمزمہ پرداز کا رنگ

آپ کی نظروں نے سمجھا...!

اِس دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ ہر بقا کو ایک دن فنا سے دوچار ہونا ہے۔ اِس حقیقت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے لیکن اِس جہانِ فانی میں چند ایسی شخصیتیں بھی جنم لیتی ہیں، جن کے کارناموں سے ملک و قوم کے بے شمار افراد متاثر ہوتے ہیں اور اُن کے اُٹھ جانے پر اپنے اندر کوئی ویسا ہی خلا محسوس کرتے ہیں۔ اُن کے دل غم سے بھر آتے ہیں ۔۔۔ شاید ایسی ہی ایک شخصیت تھے ۔۔۔ راجہ مہدی علیخاں ۔۔۔ محبت و خلوص کے پیکر، اِس عہد کے طنز و مزاح کی دُنیا کے شہنشاہ اور برصغیر ہند و پاک کے عظیم ادیب و شاعر ۔۔۔ جو اِن دونوں ممالک کے کونے کونے میں صفِ ماتم بچھا کر ایک ایسے پردے کی اوٹ میں چلے گئے جس کے پیچھے جانا کسی دیکھنے والا آج تک اِس دُنیا میں پیدا نہیں ہوا۔

لیکن مدتوں تک میں ایک عظیم مزاحیہ شاعر اور فلمی دنیا کے ہر دلعزیز گیت کار کی حیثیت سے اُن کے کلام سے لطف اندوز و فیضیاب ہوتا رہا۔ جب اُن کے طنزیہ مضامین مشہور اہلِ قلم حضرات کے محبوب مشغلے کی پہلی قسط نظر نواز ہوئی تو مجھے اُن کی ادبی اور صحافتی صلاحیتوں سے رُوشناس ہونے کا موقع ملا۔ مجھے اُن کا طرزِ نگارش کچھ اتنا پسند آیا کہ اُن کی خدمت میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ایک تعریفی خط لکھنے پر مجبور سا ہو گیا، یہ سمجھی خط سے اور اُن کے درمیان دوستانہ تعلقات کا سنگِ بنیاد رکھ دے گا، اُس وقت یہ خیال میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

ایک اچھے فنکار کیلئے اپنے فن کی داد حاصل کرنا اور پرستار پیدا کرنا ایک قدرتی بات ہے لیکن اپنے پرستاروں کی عقیدت برقرار رکھنے اور اُن کے دلوں میں ہم عصری کے جذبات پیدا کرنے کی غرض سے اُن کے خطوں کے جواب لکھنے پر اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہوئے خوشی محسوس کرنا، کچھ ایسی صفت ہے، جو بیشتر بڑے لوگوں میں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے، راجہ صاحب میں یہ اوصاف کس حد تک موجود تھے، جواب میں ملاحظہ اُس کا ناقابلِ تردید ثبوت آپ کے ہاتھوں نے سمجھا پہنچا کے قابل مجھے

میری انٹ شنٹ بکواس آپ کو ذرا پسند آئی۔ یہ میری انتہائی بدقسمتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ عجیب انسان ہے، تعریف پہ سیخ پا ہو رہا ہے۔ بھئی اِس میں خوشی کی بات ہی کیا ہے، ایک گھٹیا تحریر کی اتنی تعریف کس سر پھرے کو مکمل دیوانہ بننے پر آمادہ نہ کر دے گی، نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ اور پاگل پن کا مظاہرہ کر کے کسی دن چلتے کے ہاتھوں اپنی ہڈی پسلی ایک کروانے کا سامان خود فراہم کرے گا ۔۔۔ ایک ادیب کے لئے اُس کی بُری بھلی سطروں کا بہتر حیثیت انعام آپ جیسے ذی ہوش قارئین کے بلند و ثوق خطوط سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔ امید ہے آپ اپنی دلچسپی برقرار رکھ کر آئندہ بھی اپنی کا ناقدانہ رائے کا اظہار فرماتے رہیں گے۔ مخلص ۔۔۔ "راجہ مہدی علیخاں"

اُن کے محبت نامے سے تحریک پا کر دوسری اور تیسری قسط شائع ہونے پر اور خطوط لکھے، لیکن جواب ..... ندارد، تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ اچانک ان کا گرامی نامہ موصول ہوا۔

"شرمندہ ہوں کہ آپ کے دو گرامی ناموں کے جواب نہ لکھ سکا، عرصہ دو ماہ سے سخت علیل ہوں۔ دل کُڑے قدم ہیں۔ پھیپھڑے ہتھنی ہی پتیال سے لوٹا ہوں۔ ڈاکٹروں کی طرف سے پڑھنے لکھنے پر سخت حکم امتناعی جاری کئے جانے کے باوجود آپ جیسے چند قرض خواہوں کا قرض چکانے کی ادا کر رہا ہوں، اُمید ہے اب آپ کا دل صاف ہو گیا ہو گا۔"

اب ناظرین اندازہ لگائیں کہ ایک عظیم فنکار کی اس ذرہ نوازی پر کون پتھر دل انسان ہو گا جو دل و جان سے قربان ہونے میں رتی بھر ہچکچاہٹ محسوس کرے گا۔ مزاج پرسی کے خط کے جواب میں موصول ہوئے مراسلے سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

یاد رہنے سے بہرحال سے مسعد ہوں' حالت میں لوٹی کہ ایاں ہوئیں ہوئی' البتہ اٹھ بیٹھ لیتا ہوں' ڈاکٹروں نے سندی نمک کے بدلے لاہوری نمک استعمال کرنے کی فہائش کی ہے' یہاں چاروں اطراف میں گھوڑے دوڑائے گئے لیکن سوچ کر کہ قاف کی پریوں سے ہمکنار ہونے چلا گیا ہے۔ والی والوں نے بھجوانے کیلئے لکھا لیکن سلوم ہوا کہ وہاں سونے چاندی کے بھاؤ بکتا ہے۔ آپ بازار پر ہیں۔ آپ یا آپ کے احباب اکثر لاہور جاتے ہوں گے۔ ممکن ہو تو تھوڑی سی نمک بھجوانے کی زحمت اٹھائیں گے۔ کار ثواب ہوگا۔"

اتفاقاً میں انہی دنوں لاہور سے ہو کر آیا تھا۔ اور اپنی اہلیہ محترمہ کی فرمائش پر ۳/۴ سیر لاہوری نمک ساتھ لایا تھا۔ تھوڑی مقدار بذریعہ یار روانہ کر کے اپنے کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان تصور کر رہا تھا۔ راجہ صاحب نے اس حقیر خدمت کو تشکر کی کن بلندیوں پر اچھالا' اس کا اندازہ ذیل کے اس خط سے لگایا جا سکتا ہے۔

"آپ کا بھیجا ہوا پارسل آج ہی موصول ہوا ہے' اس پر لگے ٹکٹوں کو دیکھ کر میرے ہوش گم ہونے لگے' اس تکلف کیلئے آپ نے کس قدر زحمت اٹھائی۔ اپنے نوکر جنسی لال کو بلا کر اپنے سامنے پارسل کھلوایا ہے' اس سے برآمد شدہ' آپ کی انسانیت پرستی' کا درخشاں' شفاف اور بلوریں ثبوت' دلنواز مسکراہٹیں بکھیرتا ہوا میرے دل و دماغ کو روشن کر رہا ہے۔ اور اس میں سے جھانکتا ہوا آپ کا تبسم آمیز چہرہ بار بار پوچھ رہا ہے۔ کیوں میاں! اب تو ہمارے نمک خوار ہمیں میں آ گئے ہو۔ کبھی نمک حرامی تو نہ کرو گے؟ آپ کی اس عنایت کا حق تو شاید ہر دو عالم میں ادا نہ کر سکوں لیکن کبھی اس پر آئی فلاکت سے مطلع فرما کر شکریہ ادا کرنے کی توفیق بخش دیں تو تاعمر بے دام غلام رہوں گا۔"

جواب میں فلاکت جانے کے الفاظ پر اظہار ناراضگی اور ایک بھائی کے دوسرے بھائی کے کام آنے پر دلی مسرت حاصل ہونے کے جذبہ کو مجروح کرنے کی شکایت کرنا ایک فلاسفی امر تھا' اور ان کی جانب سے ایک اور پرخلوص انعام۔ ——————

"او مائی ڈیئر — ڈیئر — ڈیئر

یو آر کنگ' ویری نیئر۔ نیئر۔ نیئر

بھئی گستاخی پر سخت ناراض ہو۔ تمہیں ہونا بھی چاہیئے۔ میں انتہائی بے ہودہ قسم کا دقیانوسی بڈھا ہوں اگر انسان ہوتا تو کیا ایسی حرکت کرتا — اور آپ کے برادرانہ سلوک کی یوں دھجیاں بکھیرتا — اچھا اب غصہ تھوک دو میرے یار۔

اب باقاعدہ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا' اور میں ان کی پرخلوص مراسلات سے فیضیاب ہو کر اپنے دل و دماغ کو روشن کرنے لگا۔ اپنے ایک خط میں اپنا تعارف دیتے ہوئے' ملاقات کی سبیل نکالنے کا ذکر کرتے ہیں۔

"میں پچھلے اٹھارہ سال سے بمبئی میں مقیم ہوں۔ میری والدہ' بہنیں — اور دیگر رشتے دار لاہور میں ہیں — چند روز میں معروفیات نے آج تک ان سے ملاقات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا — پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مفصل پروگرام آپ کو لکھوں گا' اگر بحری راستے سے نہ جا کر ٹرین سے گیا تو راستے میں آپ سے ضرور ملاقات ہوگی۔"

ملاقات کا شوق روز بروز بڑھ کر حسرت دیدار کو کسی غریب لڑکی کی طرح لمحہ بہ لمحہ جوان کرنے لگا۔ مزید ایک ماہ کے انتظار کے بعد تشریف آوری کے بارے میں استفسار کیا کیا تو جواب ملا۔

"آپ سے بڑھ کر یہ نابکار ادھر آنے کے لئے پیچ و تاب کھا رہا ہے لیکن صحت ہے کہ سدھرنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اکثر یوں محسوس ہوتا ہے کہ فرشتۂ اجل باہر کھڑا دستک دے رہا ہے۔ مرنا تو آخر سب کو ہے' پھر مجھے اس کا کیا غم! لیکن اس سے پہلے کہ وہ اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جائے' اسے جل دیکر میں آپ سے ملنے اور اپنی والدہ محترمہ کی قدمبوسی کی حسرت پوری کر لینا چاہتا ہوں۔ ملک الموت کو چکمہ دینے میں تو اب تک کامیاب رہا ہوں لیکن ان سرخ خط والوں سے الجھنا بس شیطان کا کام ہے — پاسپورٹ حاصل کرنے میں سخت دقتیں ہو رہی ہیں' وہ کہتے ہیں کہ تم پاکستان میں کیوں پیدا ہوئے؟ جب کہتا ہوں کہ خدا سے پوچھو اس نے مجھے وہاں کیوں پیدا کیا تو یہ جواب ملتا ہے کہ ہمیں مطمئن نہیں کرتا۔ ایک مرتبہ مجھے انٹرنیشنل پاسپورٹ دیکر ثابت کر چکے ہیں کہ

[illegible] ہے جو وہ راہ اختیار کر چکا ہے اس لئے ہم ہرا ہے کہ پھر ثابت کرے۔ شاید اب باقی عمر یہی ثابت کرتے گزر جائے گی۔"

خدا خدا کر کے انہیں پاسپورٹ ملا تو چرخ کج رفتار نے ایک نئی مصیبت درمیان میں کھڑی کر دی۔ امیدوں پر پانی پھیر دیا یعنی ــــ دونوں ملک میں جنگ چھڑ گئی۔ اب حالات سازگار ہونے تک صبر کے کڑوے گھونٹ پینے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ اسی دوران میں انہوں نے ایک نو مشق ادیب و شاعر دوست کے اصرار پر اُن سے حلقہ شاگردی میں لینے اور رسالوں میں کلام چھپوانے کے لئے منظور کر لیا تو انہوں نے حال حاضر کی کی سے کام لیتے ہوئے لکھ بھیجا۔

"میں بے انتہا مصروف آدمی ہوں، مزاجی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی، اس لئے میں نے آج تک کسی کو شاگرد نہیں بنایا، ہزاروں نو آموز شاعروں نے میرے دروازے پیٹ ڈالے لیکن میں نے ہمیشہ معذرت کر دی اور کہدیا کہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا ــــ مجھے معلوم نہیں کہ لیڈیز لوگ نظمیں اور مضمون بھی سفارش سے شائع کرتے ہیں، اس کا تجربہ نہ کبھی بچپن میں ہوا اور اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن آپ کے دوست ایسا سمجھتے ہیں تو ان کا خیال کسی حد تک ٹھیک بھی ہوگا ــ میں اُن کے بارے میں نہیں کہتا ہوں کہ اُن کی کوئی تحریر میں نے نہیں دیکھی۔ دوسروں کے بارے میں کہتا ہوں کہ ہر نوآموز ادیب و شاعر اپنے آپ کو غالب، اقبال، کرشن چندر یا منشی پریم چند سمجھتا ہے اور ہر نوآموز لڑکی اپنے آپ کو عصمت چغتائی ــــ بہر حال جو خدمت مجھ سے ہو سکے گی ضرور کروں گا۔ آپ کی تحریر سے ایک اچھا فنکار بننے کی بو آتی ہے ــ کیوں استاد! کہیں دوسروں کے کندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ سادھنے کی سازش تو نہیں ہو رہی ہے ــ تم کیوں نہیں لکھتے ــ! اس مرض کو پالنے میں کیا مضائقہ ہے؟"

کہہ نہیں سکتا کہ میرے دوست پر اس تحریر کا کیا ردِ عمل ہوا لیکن میرے بارے میں اُن کی رائے نے میرے خیالات کا دھارا ہی بدل کر رکھ دیا۔ عادت میں صرف اپنے پسندیدہ اہلِ قلم حضرات کی خدمت میں خط لکھ کر اُن کے جوابات ہی سے تسکینِ قلب حاصل کرنے کی سعی کرتا رہتا تھا۔ اب ان کی نئی تحریک کے زیرِ اثر شب و روز افسانوں کے پلاٹ ذہن میں چکر کاٹنے لگے۔ آخر ایک افسانہ مکمل کر کے بھیجتے ہوئے ایک جریدے روانہ کر دیا۔ جب قابلِ اشاعت ہونے کی اطلاع ملی تو میری حیرت و مسرت کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ راجہ جی سے کوئی ذکر نہ کیا تھا لیکن افسانہ شائع ہوتے ہی اُن کے اس خط سے تمام تلخی گھل جانے کا علم ہوا۔

"کیوں استاد! پکڑے گئے نا! یہ چھپی چھپی دل پر تیر چلانے کی ادا کس سے سیکھی (افسانہ کا عنوان دل اور تیر تھا) آج سے تم سے قطع تعلق کا اعلان کرتا ہوں، کبھی تجھ سے بھی کسی سے یہ مت کہنا کہ کبھی تمہارے اور میرے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات قائم تھے۔ میں نہ تو چور ہوں اور نہ ہی چور کا بھائی ــــ ورنہ تمہارے نام پر اتنا کیچڑ اچھالوں گا کہ بے موت مارے جاؤ گے۔"

صفائی میں اُن کے خط سے تحریک ملنے اور سب کچھ اُن کی ذرہ نوازی کا کرشمہ ہونے کی دہائی دی گئی اور وہ بمشکل یقین کر پائے۔ پہلی داد دیتے ہوئے تخلیق کا کام جاری رکھنے کی تاکید بھی کی۔ ایک مرتبہ اُن سے جواب دینے میں ازحد تاخیر سے کام لینے کی شکایت کی گئی تو اپنی مجبوریوں کو طنز و مزاح کی لطیف چاشنی میں ڈبوتے ہوئے یوں معذرت خواہ ہوئے۔

"جواب میں کسی قدر تاخیر ہو گئی۔ آج کل کبھی کبھی کھانا کھانے کے لئے بھی فرصت نہیں ملتی۔ بعض نہایت ضروری خطوں کے جواب بھی لکھنے پڑتے ہیں، اتنے خط آتے ہیں کہ مجبوراً دو فیصدی تلف کرنے پڑتے ہیں۔ کیوں کہ بیشتر خطوط بیکار قسم کے ہوتے ہیں، عموماً لوگ چھ پیسے کا کارڈ لکھ کر تصویر مانگتے ہیں ایسے خطوط بڑی بے دردی سے تلف کر دیئے جاتے ہیں، ابھی پرسوں ہی ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ قابلِ جواب خطوط غلطی سے پرزہ پرزہ کر دیئے اور بے کار مکتوبات جواب دینے کو باقی بچ گئے۔"

اُن کے محبوب مشغلے کچھ اس طرح متعارف عام ہوئے کہ ہر چھوٹا بڑا ادیب و شاعر اُن سے اپنی کتب بنوانے کی حسرت دل میں لئے ماہیِ بے آب نظر آنے لگا۔ ایک مشہور ناول نگار سے ملاقات ہوئی تو وہ بھی یہی رونا لے بیٹھے۔ "راجہ جی نے مجھے اچھی طرح جانتے ہوئے بھی نظر انداز کر دیا۔" ہما نے اگلے خط میں اس واقعہ کا سرسری ذکر کر دیا۔ جواب آیا۔

• بات یہ ہے کہ ... صاحب نے محبوب مشغلوں سے میں واقف نہیں۔ بہتر ہوگا اگر آپ یا وہ خود اپنے محبوب مشغلوں سے اور دلچسپی اس لئے کہ میں ان مشغلوں کو بند کر رہا ہوں۔

تاخیر کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔

میں نے اپنی دانست کے مطابق صاحب موصوف کے مشغلے لکھ کر انہیں روانہ کر دیئے، کیا دیکھتا ہوں کہ اگلی قسط میں وہ مشغلے ــــ قدرے ردّوبدل کے ساتھ شامل اشاعت تھے۔

عجیب لغو اتفاق تھا کہ اسی جریدے (جریدیں صدی کے تمبر کے شمارے میں راجہ صاحب کے محبوب مشغلوں سے متعلق محترمہ شفیقہ صاحبہ کا مضمون (جو شاید راجہ صاحب کی موت سے مہینوں پہلے لکھا گیا تھا) شائع ہوا اور اسی پرچے میں ان کی موت پر اٹھ آنے والے قطعات و تعزیت نامے شائع کرنا پڑے۔ ازراہِ مذاق لکھا گیا مضمون کا آخری جملہ "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" تختۂ مشق حرفِ آخر ثابت ہوا۔ راقمہ میرے استفسار نامے کے جواب میں اس حادثے پر اظہارِ تاسف کی مجسم تصویر بنی ہوئی لکھتی ہیں۔

"مذاق اس درجہ سنجیدگی اختیار کرے گا۔ اس کی خدا کی ذات سے توقع نہ تھی۔ اب تک آس پاس والوں کی رائے تھی کہ میری زبان کاٹی ہے ــــ لیجئے! زبان قلم نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ راجہ صاحب میرے بھی بہت اچھے دوست تھے ان کی موت کا مجھے بھی انتہائی رنج ہے، اور ندامت بھی ــــ میں خود کو قتل کے مجرم سے کم نہیں سمجھ رہی۔ ــــ ع

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد"

ہندو پاک کے لاکھوں ادب نواز اشخاص کے دلوں میں مسرت کی آفرش بازی چھوڑنے والا یہ عظیم انسان اور علمی، ادبی و صحافتی سلطنت کا بے تاج بادشاہ دنیائے طنز و مزاح میں ایک نئے دور کا اضافہ کر کے برسوں ادبی محفلوں کو زعفران زار بنائے رکھنے کے بعد عروسِ نصف النہار پر پہنچ کر اپنے دل میں اپنی والدۂ محترمہ سے ملنے کی حسرت دیدار لئے اس دارِ فانی کو خیرباد کہہ گیا ــــ شاید دہشت کا یہ جانکاہ سایہ میری حسرتِ دیدار بجھانے کی وحدہ خلافی پر مُصر تھا خواہ مخواہ ؎

دیکھ تو تصویر میں آنکھیں ہیں وقفِ انتظار
دیکھتے ہی دیکھتے کم بخت آخر رہ گئیں!

اور حق بات یہ ہے کہ ؎

خبرِ مرگِ راجہ مہدی علی — کتنی غمناک ہے خدا کی پناہ!
اُن کے ماتم کی آہ و زاری سے — حق ادا ہو سکا نہ خاطر خواہ!

(بسمل سعیدی)

(بقیہ صفحہ ۱۳۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کی شاعری)

ڈاکٹر سلام سندیلوی کے کلام میں ہمیں ان کی شخصیت کے گوناگوں پہلو نظر آتے ہیں، کہیں وہ فلسفی نظر آتے ہیں، کہیں مدبر، کہیں مشفق، تو کہیں مبلغ، لیکن ہر حال پر حقیقت ہے کہ وہ شاعر ہیں اور ان کی تمام خصوصیات کے باوجود ان کی شاعرانہ شخصیت جس میں انسان کا دل دھڑکتا ہوا ملتا ہے، ہر جگہ حاوی ہے۔ ڈاکٹر سلام کا دم اس پرآشوب زمانہ میں اردو ادب کے لئے بڑا غنیمت ہے۔ میں کالم تھوڑے سے تصرف کے ساتھ پیش کر کے اپنی بات ختم کرتا ہوں ؎

مت سہل انہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

حشمت امروہوی

دو غزلیں

(۱)

درد کی دُھوپ گذر جانے دو
بار یہ سر سے اُتر جانے دو
میکدے ہی میں سکوں مِل جائے!
اک ذرا دیر ٹھہر جانے دو
اب نہ کھائیں گے نگاہوں کا فریب
اب یہ اندازِ نظر جانے دو
ٹھوکریں کھا کے سنبھل جائے گا
دل جدھر جائے اُدھر جانے دو
خود سمجھ جائیں گے اک دن یہ لوگ
سر سے پانی تو گذر جانے دو
چُپ ہی رہنے دو نہ کھولو اُو زباں
کون ہے تنگ نظر، جانے دو

(۲)

خار بن جاتا ہے بستر رات میں
نیند اُچٹ جاتی ہے اکثر، رات میں
جیسے تیسے، کاٹ ہی لیتے ہیں دن
زندگی ہوتی ہے دوبھر، رات میں
موج لے لیتی ہے طوفانوں کا رُوپ
قطرے بنتے ہیں سمندر، رات میں
اب بھی لُٹ جاتے ہیں اہلِ کارواں
اب بھی چل جاتے ہیں خنجر، رات میں
تنگ ہو جاتی ہے کتنوں پر زمیں
کتنے "فٹ پاتھوں" پہ ہیں گھر رات میں
سر پہ ہوتا ہے فلک کا سائباں
خاک کا ہوتا ہے بستر رات میں
اب نہیں پھرتا کوئی اہلِ کرم
بھیس در ویشوں کا بھر کر، رات میں

صبا کرام

مختصر مصوری کہانی

زمانے کا درد

سورج ابھی غروب بھی نہ ہوا تھا کہ پوری بستی پر سناٹا چھا گیا۔ بچوں نے کھیل بند کر دیا۔ کسانوں نے کھیت میں کام کرتے کرتے اپنے ہاتھ روک لئے اور کوّوں نے کان کھڑے کر دیئے۔ چکی ایک بیک چلتے چلتے رک گئی۔ اس کی آواز فضا میں گم ہو چکی تھی۔

ایک عجیب سے خوف نے لوگوں کے دلوں میں جنم لیا اور سبھی سانس روک کر چکی کی آواز کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن تاڑ کے درختوں سے ٹکراتی ہوئی ہواؤں کی آواز کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہ دی۔

ایک شخص نے یہ کہہ کر خاموشی کا سلسلہ توڑا کہ "سلیم اتنا پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ سلیم چکی کو ضرور ٹھیک کر دیگا۔" اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ بات پوری بستی میں پھیل گئی اور سب لوگ اپنے اپنے دلوں میں لئے سو گئے۔

لیکن دوسرے دن۔ اور مسلسل بارہ دن۔ وہ خاموشی اسی طرح بستی پر مسلط رہی۔ لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ چکی کے مزدور سلیم اور چکی کے مالک متالی میں ان بن ہو گئی ہے۔ سلیم نے قسم کھالی تھی کہ اب وہ چکی میں کام نہیں کریگا۔ بستی والوں نے کوشش بھی کی سلیم اور متالی میں پھر ملاپ ہو جائے لیکن سلیم اپنی اس ضد پر قائم رہا کہ متالی سے مہینے کے وعدہ کے مطابق تین کے بجائے پانچ روپے مزدوری ملنی چاہیئے، مگر جب متالی اپنا وعدہ پورا کرنے پر آمادہ نظر نہ آیا تو سلیم نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ قاہرہ سے کسی کاریگر کو لاکر چکی کی مرمت کرالے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ زمانہ جنگ کا ہے اور ایسے وقت میں کوئی بھی قاہرہ سے آنے والی ریل گاڑی کو تیار نہ ہوگا۔

وقت گزرتا گیا۔ اب بستی والے اپنی میٹھی پر گیہوں کی بوری لاد کر شہر تک بیچنے کے لیئے لیجانے کے عادی ہو چکے تھے۔ سلیم اور متالی کے بستی والوں کے دل میں نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ اور وہ آہستہ آہستہ گاؤں کی چکی کو بھول چکے تھے۔ عموماً عورتیں ہی گیہوں کو پیسنے کے لئے شہر لیجایا کرتی تھیں

بچے بھی اب چکی کے قریب جانے سے کتراتے تھے۔ کیونکہ ان کی ماؤں نے گھر سے قریب رکھنے کے لیئے یہ جھوٹی کہانی سنائی تھی کہ چکی میں ایک ڈائن رہتی ہے جو بچوں کو پکڑ کر چکی میں ڈال دیتی ہے۔

ایک روز کہ جب دھوپ ڈھل رہی تھی ایک چیخ بستی میں گونج اٹھی۔ سلیم جب دالوں کے ساتھ آواز کی سمت دوڑا تو چند عورتیں ایک بیہوش عورت کو گھیرے کھڑی تھیں۔ سلیم نے جب سنا کہ بیہوش ہونے والی کا نام نوبیہ ہے تو اس کے جسم میں دوڑتا ہوا خون جم گیا۔ نوبیہ اس کی پڑوسن تھی اور اسی دن وہ حاملہ تھی۔ چند ہی دن قبل اس نے سلیم سے کہا تھا کہ اب اس نے گیہوں کی بوری اٹھانا نہیں چاہتی۔ اور آج وہ بے حس و حرکت راستے کے بیچ پڑی تھی۔ سلیم کی ہمت نہ ہوسکی کہ وہ اس کے قریب جائے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ عورتیں اسے کملی چادر میں لپیٹ کر اٹھا رہی ہیں۔ اسی وقت اس نے کسی کو اپنا نام لیتے ہوئے سنا۔ کوئی عورت اسے بد دعائیں دے رہی تھی اور اس کو نوبیہ کی موت کا ذمہ دار ٹھہرا رہی تھیں۔ سلیم سکتہ کے عالم میں اسی جگہ کھڑا رہا۔ اور بستی والوں کا جلوس آہ و بکا کرتا ہوا اپنے ساتھ لئے بستی کی جانب بڑھ گیا۔ اسی وقت کوئی بچہ بلک اٹھا۔ جس کی آواز سن کر ایک عورت نے دوسری عورت سے کہا۔

"بچے کو گود میں اٹھا لو..... بیچارہ روتا ہوا ماں کی لاش کے پیچھے چلا آرہا ہے۔" دو ہمدرد ہاتھ بڑھے اور بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ سلیم اپنے ہاتھوں میں منہ چھپائے گم سم بیٹھا تھا۔ عورت کی بد دعا تب تک اس کے کانوں میں [illegible] تمام دن وہ بستی سے دور کھیت میں بیٹھا نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ نوبیہ کو تصور میں لاکر جس میں چھلکتی ہوئی ہنسی تھی، سلیم کی ہنسی یاد آتی تھی اس کے مذاق یاد آرہے تھے۔ وہ ہمیشہ سلیم سے [illegible] کرتی رہتی تھی۔ سگریٹ بہت پیتے ہو کہتی تھی کہ [illegible] اور اس کی شادی کے [illegible]

کل ہی اُس نے نوبیہ سے بات کی تھی، اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اتنی جلدی مر جائے گی، اُس نے سوچا تعزیت کیلئے نوبیہ کے گھر ضرور جائے گا۔ بار بار یہی جملہ دہراتا رہا کہ "میں نوبیہ کے گھر ضرور جاؤں گا" مگر اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ نوبیہ کے گھر جاتے۔

رات نے اپنی چادر پھیلا دی اور سلیم نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود کو بدل دیگا، وہ کچھ بستی والوں میں مل جائے گا، ایک بیک اُس کے قدم چلتے چلتے کسی چیز سے ٹکرائے، اُس نے جھک کر دیکھا تو نوبیہ کا بیٹا تھا جو بخار کی وجہ سے گھر سے باہر نہ گیا تھا، سلیم نے پیار سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"گھر جاؤ بیٹا"

لیکن بچے نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے، اور خوفزدہ نظروں سے سلیم کو دیکھنے لگا۔ ایک عجیب سے خوف کے احساس نے سلیم کے دل میں جنم لیا اور وہ سوچنے لگا۔ "کیا یہ بھی مجھے اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار سمجھتا ہے؟"

تھکے ہوئے قدموں سے وہ اپنے گھر میں داخل ہوا اور بستر پر گر کر سسکنے لگا، وہ سوچ رہا تھا۔ "کیا بستی والے یہی چاہتے ہیں کہ میں صرف تین روپے کیلئے دوبارہ طوقِ غلامی اپنے گلے میں ڈال لوں۔ آخر وہ متقی لوگ کیوں نہیں سمجھتے، وہ میرے ہی پیچھے کیوں پڑے ہیں؟"

دوسرے دن سورج طلوع ہوتے ہی بستی والوں نے وہ آواز سنی جس کو سننے کیلئے مدتوں سے اُن کے کان ترس گئے تھے۔ چکی پھر چل رہی تھی، بستی والوں میں خوشی کی لہریں دوڑ گئیں، وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ "چکی ٹھیک ہو گئی... چکی چل رہی ہے۔" اور پھر بستی کی عورتوں کی لمبی قطار اپنے سروں پر گیہوں کی گٹھری لئے ہوئے چکی کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دی۔

وہاں سلیم سر جھکائے کھڑا تھا، اُس کا سارا جسم پسینے سے بھیگ چکا تھا اور آنکھیں زیادہ جاگنے کی وجہ سے سرخ ہو گئیں تھیں، اُس نے تمام رات جاگ کر چکی کی مرمت کی تھی، اب چکی پھر اسی طرح چل رہی تھی اور بستی کی عورتوں کا ایک ہجوم لگا ہوا تھا۔ اُس رات گیہوں کی آخری بوری ختم کرنے وہ بستر پر گر گیا اور نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا رہا۔

نیند آ چکا تھا، کچھ ہی دیر بعد بستی کی عورتوں کی آوازیں اُس کے کانوں سے ٹکرائیں۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے سلیم؟"

سلیم نے عورتوں کی طرف دیکھا جو سر جھکائے [illegible] کی چار پائی کے قریب کھڑی تھیں۔ ان میں سلیم کو وہ عورت بھی نظر آئی جس نے اُسے بد دعائیں دی تھیں اور اُسے نوبیہ کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش بستر پر پڑا رہا، پھر یک بیک چیخ پڑا۔

"مجھے تنہا چھوڑ دو..... چلی جاؤ... میرے پاس سے تم سب..... میں بیشک بیمار ہوں، لیکن یہ میرا نجی معاملہ ہے اس سے کسی کو کیا۔ بستی والے صرف یہی چاہتے تھے نا، کہ میں چکی کو ٹھیک کر دوں۔ تو میں نے وہ بھی کر دیا۔"

اور یہ کہہ وہ اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح سسکنے لگا

(انگریزی سے ترجمہ)

عنوان چشتی کی غزلوں کا مجموعہ

"مجھے عنوان صاحب کے اشعار غزل کو اُن زبان سے سنکر اور خود پڑھ کر اکثر یہ احساس ہوا ہے کہ وہ ایک اچھے غزل گو ہیں۔ اور انھوں نے غزل کی روایتوں کو جو شاعرانہ نہاتیوں کا ایک سلسلہ ہے بڑی خوش فکری اور خوش اسلوبی سے ساتھ برتا ہے۔ وہ غزل کی نشتریت ہی کے قائل نہیں، اُس حسن نزاکت کے بھی قائل ہیں جو پھول کی پتی کی طرح ہیرے کا جگر کاٹ دیتی ہے، اور اپنی غزل میں یہ حسن انھوں نے مترنم بحروں، شگفتہ قافیوں اور ہلکی پھلکی زبان کے ذریعہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔"

(ڈاکٹر نصیر احمد خاں)

ذوقِ جمال

کتابت و طباعت معیاری، کاغذ بہترین، مجلد رنگین

گرد پوش، قیمت صرف ۳ روپے

ملنے کا پتہ

سیدہ اختر، اُردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

فیض الحسن خیال

مسافر

تیرے گیسوئے پریشاں کی قسم
جادۂ شوق کا ایک ایک قدم
آس کے پیار کے شعلوں کو ہوا دیتا رہا
موم کی طرح پگھلتا ہوں میں
شمع خاموش کی مانند سلگتا ہوں میں
زندگانی کے ہر اک موڑ پہ صوفے کی دکاں
کوئی ہمدم نہیں مونس نہیں غمخوار نہیں
اور میں ہائے اکیلا
کسی مجنوں کی طرح
دشتِ غم، وادیٔ ظلمات کی
بے نور گذرگا ہوں میں
تیری یادوں کو لئے
صرف بھٹکا ہی کیا
کوئی مجنوں، کوئی دیوانہ سمجھتا ہے مجھے
ورنہ، لے دے کے مرا مشغلہ شام و سحر
صرف تھا،
کوچۂ جاناں کا طواف!
آخرِ شب یہ ستاروں نے کہا
جاگ!
اے صبحِ شعور

لوگ ہر بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں
اچھے اچھوں کو بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں
پیار؟
اس شہر میں سودے کے سوا کچھ بھی نہیں
دل؟
بہت قیمتی شئے ہے لیکن
حسن والوں کے کھلونے کے سوا کچھ بھی نہیں
اور اخلاص؟
صرف جیبوں کی تراش کے سوا کچھ بھی نہیں
لوٹ جا اپنے ہی ویران سیہ خانے میں
دیکھ خوابوں کے جزیرے سے کوئی آیا ہے
اس کے گیسو کو سنوار
تو بھی اک شاہ جہاں
وہ بھی ممتاز محل
اپنے ویراں کدۂ دل کو سمجھ "تاج محل"

ندا فاضلی

بہار کے خط کا جواب

"شاعر" کے پچھلے شمارے میں میرے ایک مختصر سے خط کے جواب میں ایک طویل خط آپ نے شائع کیا ہے۔ اس مضمون نما جواب کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید بہار صاحب نے میرے چند لائنوں کے خط کو توجہ سے نہیں پڑھا، اور اگر پڑھا بھی ہے تو جو میں کہنا چاہتا تھا اس سے بالکل مختلف مفہوم انھوں نے نکالا ہے۔

میں نے غزل کی وسعت اور اس کے اظہاری امکانات کی طرف اشارہ کیا تھا، اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا کہ میں غزل کو دوسری اصناف سخن سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ میرے ذہن میں فارمس کو لیکر کوئی ادبی تعصب نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ نظم اور غزل کی جو بحث انھوں نے اٹھائی ہے، وہ میرے اعتراضات کا جواب نہیں بلکہ خود ان کی ذہنی کشمکش کی غمازی کر رہی ہے۔

غزل اور نظم دونوں میں اچھی بری شاعری ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اچھائی برائی کی کسوٹی اصناف سخن کے بجائے ان ادبی اقدار سے مرتب ہوتی ہے جو فنی تخلیقات کو ہر صورت میں فن کی طرح ناپتی تولتی ہیں۔ صرف اس لئے کہ کوئی بات کسی خاص فارم میں کہی گئی ہے ادبی نقطۂ نظر سے اس کے اچھے ہونے کی دلیل نہیں۔ "بات کس میں کہی گئی ہے" سے زیادہ "بات کیسے کہی گئی ہے" کی اہمیت ہے۔

لباس روپ کو سج دھج ضرور بخشتے ہیں، مگر بنا روپ لباس کی کیا اہمیت! شرط جامہ زیب ہونے کی ہے جس پر بقول داغ "جو رنگ نکھرنا تھا نکھر کر کھیل گیا"۔ نہ اچھی غزل کا معیار مشاعروں کی عوامی غزلیں ہو سکتی ہیں، اور نہ اچھی نظموں کا معیار اسٹیج کی خطابت ٹھہرائی جا سکتی ہے۔ کامیابی اور ناکامیابی کا انحصار فارمس پر نہیں بلکہ ان کو برتنے والوں کی صلاحیتوں اور شعور مندی پر ہوتا ہے۔

اپنے خط کے شروع میں بہار صاحب نے تحریر کیا ہے، میں نے غزل سے متعلق جو چند متفرق جملے سپرد قلم کر کے بھیجے تھے، وہ دراصل اپنی غزل کے ساتھ ایک قسم کی APOLOGY کے طور پر لکھے گئے تھے۔

غلط فہمی یہیں سے پیدا ہوتی ہے، وہ چند جملے جو بہار صاحب نے اپنی غزل کے ساتھ APOLOGY کے طور پر لکھے تھے، ان کو کسوٹی بنا کر اردو غزل پر کوئی فیصلہ صادر کرنا کہاں تک درست ہے، انھوں نے اپنی غزل کے فیتے سے پوری غزل کا تاریخ کر ناپ دیا۔ جو تنقیدی نقطۂ نظر سے غلط ہی نہیں ادبی ناانصافی بھی مترادف ہے۔

کہنے کو تو نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین نے بھی غزلیں کہی ہیں، لیکن غزل سے متعلق ان کی رائیں نہایت سلجھی ہوئی اور مکمل ادبی تاریخ کا بھرپور تبصرہ ہوتی ہیں۔ ان میں اپنی اپنی غزلوں کی حمایتیوں سے باہر غزل کی GENERAL VALUES اور اس کی فارمی کجک کو بچانے کی کوشش نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

کسی ادبی مسئلہ پر رائے زنی کیلئے OBJECTIVITY ایک لازمی شرط ہے۔

بہ زیادہ اعتراضات بھی ملاحظہ فرمائیے جو بہار صاحب نے بیچارے غزل کے سر تھوپے ہیں: "قافیہ پیمائی، گھڑی شاعری، روایتی ترکیبیں، لعبد از قیاس تشبیہیں، غیر مانوس الفاظ اور فرسودہ موضوعات، ٹھوس بات کا فقدان۔۔۔۔"

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اعتراضات کن غزلوں پر ہیں، میر، درد، آتش، غالب، حالی کی غزلوں پر ہیں یا پچھلے پچاس سال کی اچھی غزلوں پر۔

حسن کی طرف میں نے اپنے پہلے خط میں اشارہ کیا تھا جہاں تک پچھلے پچاس سال کا سوال ہے مجھے تو کوئی ایسا قابلِ ذکر شاعر نظر نہیں آتا جس کی غزلوں پر اس فہرست کا اطلاق ہوتا ہو۔ تعجب آپ کو ہے بہار صاحب کو اتنی بھی چوڑی اعتراضات کی فہرست مرتب کرنے میں جو غزل کو پٹخنا پڑا ہوگا، اس ذہنی مشقت کو وہ کیسے برداشت کر گئے۔ میں نے تو ایک بار "امجد نوح" (نوحہ ندوی کا متیسر ادبی نام) کی درد انگیز غزلوں کی تھی، دو چار غزلوں نے ہی سیر کر دیا۔ ایک شعر اب تک یاد ہے، آپ بھی سن لیجئے۔

وہ کہتے ہیں آؤ میری انجمن میں مگر میں وہاں اب نہیں جانے والا
کہ اکثر بلایا، بلا کر بٹھایا، بٹھا کر اٹھایا، اٹھا کر نکالا!

بہار صاحب نے غزل کی اکثری کے ثبوت میں غالب کا ایک مشہور شعر پیش کیا ہے۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

یہاں بھی بہار صاحب سے بھول ہو گئی ہے۔ یہ شعر غالب کی ایک قطعہ بند غزل کے دو مصرعے ہیں جو انھوں نے نواب تجمل حسین خاں والیٔ رفرخ آباد کی مدح میں لکھی تھی۔ دراصل یہ مصرعے غزل کے بارے میں غالب کی رائے کا اظہار نہیں بلکہ ایک مداح کی اپنے ممدوح کے سامنے تواضع انکساری کا بیان ہے۔ جو اس زمانے کی عام روش تھی۔

جگر صاحب کا بھی ایک مصرع اسی REFERENCE میں درج ہے "شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل" والی غزل جگر صاحب نے ۱۹۴۲ء کی ایک ترقی پسند کانفرنس (جو شاید لکھنؤ میں ہوئی تھی) کیلئے کہی تھی اور وہیں پہلی بار پڑھی تھی۔ ۱۹۴۷ء ملکی تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات کا منحوس سال تھا، انسانوں کی بستی میں ہزاروں سال پہلے کے جنگل اور خونخوار درندے گھس آئے تھے، یہ غزل جانوروں کے شور و غل میں ایک ایسے حساس انسان کی دردناک آواز ہے جس کی فکر جمیل کو بھی ماحول نے خواب پریشاں بنا دیا تھا۔ اس مصرع میں غزل خوان کے معنی "غزل گو" نہیں ہیں جو بہار صاحب اس لفظ کو پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جگر صاحب کا یہ سارا جی مرثیہ بھی غزل ہے، اور تمام عمر وہ غزل ہی کہتے رہے شاعری

لہ اداہ

جگر مرادآبادی مرحوم کے جس شعر کا حوالہ بہار صاحب نے دیا ہے، وہ غزل کی نفی یا اس کی تنگ دامانی کے سلسلے میں نہیں ہے اور ندا فاضلی نے اپنے جواب میں ترقی پسند کانفرنس کا جو حوالہ دیا ہے وہ بھی درست نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ۱۹۴۲ء میں جبکہ دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی اور نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں زبردست خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ ۲۸ نومبر ۴۲ء کو بنگلور (میسور) میں سیدہ اختر ماجد حیدرآبادی نے "وار فنڈ" کے سلسلے میں ایک دو روزہ کانفرنس کی تھی اور اس میں کل ہند طرحی مشاعرہ بھی رکھا تھا، اس کانفرنس اور مشاعرہ میں آبجناب اکبر آبادی۔ جوش ملیح۔ جگر مرادآبادی، ساغر نظامی اور دوسرے بہت سے مشاہیر شعراء شریک ہوئے تھے، راقم الحروف بھی شریک تھا، تمام شعراء نے طرح میں غزلیں پڑھی تھیں، طرحی مصرع تو یاد نہیں، ہاں لیکن زمین وہی تھی جس کا مصرع بہار صاحب اور ندا فاضلی نے درج کیا ہے جگر صاحب نے جو غزل پڑھی تھی اس میں یہ شعر موجود تھا۔

فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آج کل

جگر جو خاص غصیلہ شاعری کرتے تھے، وہ بھی ان دنوں کے عالمی بحران سے بے حد درجہ متاثر ہوئے اور یہ کہنے پر مجبور ہو گئے "ان دنوں جو محض غزلخوانی کرے وہ شاعر نہیں ہے"۔ جگر کی غزل کے اس شعر کے علاوہ جناب اکبر آبادی کی پوری طویل غزل اس ماحول اور تاثر کی آئینہ دار تھی، چند اشعار یہاں درج کر رہا ہوں، دوسرے شعراء کی غزلوں میں دوسری جنگ عظیم سے پیدا شدہ حالات کے تاثرات موجود تھے بشرطیکہ موقع ہے کہ مجلور کے اس مشاعرہ ۱۹۴۲ء کا انتخاب تلاش کیا جائے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۲ء کی کہی ہوئی وہ غزل جس کا ایک شعر

میں الفاظ اپنی علامتی اور اشاراتی تہہ داریوں کے مفہوم میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ ڈکشنری کے الفاظ اور شاعری کے الفاظ میں وہی فرق ہوتا ہے جو ایک مُردہ لاش اور زندہ انسان میں ہوتا ہے۔ "غزل خواں" میں چھپا ہوا ملنزد راصل غزل کہنے والے شاعروں پر نہیں بلکہ اُن روایتوں پر ہے جو ہمیشہ سے گرد و پیش کے حالات سے جوجھنے کے بجائے زمی الفاظ سازی کو بہتر آرٹ سمجھتے آئے ہیں۔

غزل ہر عہد میں ماحول کے مطابق اپنا مزاج بناتی رہی ہے۔ درباروں میں یہ قالینوں پر چلی، خانقاہوں میں ننگی دھرتی پر سوئی، آوارہ گرد و کے ساتھ وادیوں میں بھٹکتی، تماشبینوں کے ساتھ کوٹھوں پر ناچی، سنجیدہ مزاجوں کو اُداسی کی مجبوریوں کا احساس بھی دلاتی رہی ہے اور سیاسی و سماجی کشمکش کے دور اہے پر بھی کھڑی رہی ہے۔ غزل اپنے صحیح معنوں میں اُردو کا فطری مزاج اور ہمارے تہذیبی ارتقاء کا مکمل تبصرہ ہے۔ اس کا بناتی و ہماپن، اشاراتی و رمزیاتی انداز بیان اپنے اندر لامحدود معنوں کو سمیٹے ہوتا ہے۔ آدمی اپنے مواسب سے جھوٹ بول سکتا ہے، غزل میں آدمی خود اپنے سے بات کرتا ہے۔ غزل ضمیر کی تقدس بہ ہنگی کا نام ہے، جو ہر عہد کی بڑی سچائی اور بڑے آرٹ کی خصوصیت رہی ہے۔

بہار صاحب حسن و عشق اور ہجر و وصال تک غزل کو محدود سمجھے ہوئے ہیں، یہ اُن کی اپنی رائے ہے، لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہر اچھے شعر کے کئی چہرے ہوتے ہیں، صرف ایک لوبری چہرے کے خدوخال دیکھ کر اُس کے روپ کے بارے میں کوئی رائے دینا مناسب نہیں۔ اچھی نظم کی طرح اچھی غزل کو بھی آنکھوں سے، احساسات سے، جذبات سے، حالات سے کئی کئی آنکھوں سے پڑھا جاتا ہے، تب جا کر بات بنتی ہے، بادہ و ساغر گل و بلبل، حسن و عشق تو محض بُن کی مانند ہیں جن پر حسیاتی اور ذہنی داد ڈالنے ہی سے ہزار ہا بجلیاں کوندنے لگتی ہیں، کامیاب غزل اپنی علامتی و رمزیاتی اُنجلیوں سے اُن تخیلی حدود کو چھوتی ہوئی لگتی ہے جسے اب تک دنیا کی ایک زبان چھو پائی ہے۔ اور وہ ہے سنگیت۔ غزل ٹھہرے ہوئے الفاظ میں باحرکت جادو جگا دینے کا فن ہے۔

سید باقر حسین کے الفاظ میں

"غزل کے اشعار میں تفصیل و تشریح کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کہانی کا نتیجہ ہوتا ہے کہانی نہیں ہوتی، تجربہ کا نچوڑ ہوتا ہے خود تجربہ نہیں ہوتا، تاریخ کا ماحصل ہوتا ہے تاریخ نہیں ہوتی، آہ ہوتی ہے داستانِ غم نہیں ہوتی۔"

غزل اپنی دو صدی کی پیہم رفتار کے باوجود عہدِ موجودہ کے تقاضوں اور نئے شعور اور مزاج سے ہم آہنگ نظر آتی ہے، اب میں پچھلے پچاس برس کی کہی گئی غزلوں کے کچھ شعر جو اس وقت مجھے یاد آرہے ہیں، لکھ رہا ہوں۔

یہاں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں، — یادش بخیر ہم بھی تھے کل آشیانے میں
دیکھا انہیں قریب سے ہم نے تو رو دئے — جن بستیوں کو آگ لگانے چلے تھے ہم
نئی صدا کہ ہے صدیوں سے انتظار مجھے — مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

---

۴۴ بحث میں آیا ہے، جگر مرادآبادی نے ۱۹۴۷ء میں کسی ترقی پسند کانفرنس میں پڑھی ہو۔

برہم مزاجِ عالمِ امکاں ہے آج کل — جو مطمئن ہے وہ بھی پریشاں ہے آجکل
یہ انتہائے گردشِ دوراں ہے آج کل — انساں کا خونِ خاک سرِ راز داں ہے آجکل
مطرب سے کہہ دو نغمہ و نے کو کرے وداع — دورِ نشید سازِ رگِ جاں ہے آجکل
آسودگی کے جس میں نظر آرہے تھے خواب — وہ نیند خود ہی خواب پریشاں ہے آجکل
تاراجِ انقلاب ہوئی دولتِ بہار — کانٹوں پہ کاروبارِ گلستاں ہے آجکل
لب بستگیِ غنچہ پہ کیا غور کیجئے — سارا چمن ہی سرگریباں ہے آجکل
شاید کہ بزمِ حشر ابھی منعقد نہ ہو — عالم خود ایک حشر خراماں ہے آجکل
تاریخِ عصر یاد کرے گی تمام عمر — سیمابؔ جس ادا سے غزلخواں ہے آجکل

صدیوں کی مسافت بھی طے کر کے نہ پایا کچھ
کتنے قدموں کی خراشوں سے لہو رستا ہے
اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
یہ انا کیسے درمیاں آئی
بے نتیجہ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں!
مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
ہم خود اپنی صورت سے بدگماں ہو بیٹھے
ایک پل کے رُکنے سے دُور ہو گئی منزل
دیوانہ ہر اک گام پہ اب سوچ رہا ہے

کمروں سے غنیمت تھے یہ بیڑوں کے گھنے سایہ
کہیے معلوم ہے یہ راہگذاروں کے سوا
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں
ہو گئی بزمِ دوستاں خالی
ہر تپش پا بلند ہے دیوار کی طرح
آہ اب مجھ سے تری رنجش بیجا بھی نہیں
اتنی مختلف نکلیں آدمی کی تصویریں
صرف ہم نہیں چلتے راستے بھی چلتے ہیں
اس شہر میں آنے کا سبب یاد نہیں ہے

ان اشعار میں بندھے ٹکے روایتی مضامین نہیں ہیں، نہ کتابی مصنوعی زبان، یہ زندہ دستوں کی پیداوار ہیں، ان میں ملکی و بین الاقوامی مسائل بھی ہیں اور سماجی تبدیلیوں کی پرچھائیاں بھی، جن کی طرف بہار صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ لیکن غزل کے اشعار میں، جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، ان کو پڑھنے کے لئے غزل کے اپنے آداب اور تاریخی تسلسل سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔

بہار صاحب "سازِ غزل" کو چھیڑنے کے لئے گذرے ہوئے ایام والی خوشحالی اور فراغت کو لازمی شرط مان رہے ہیں۔ خدا جانے ان کے ذہن میں غزل کا کیا تصور ہے، مجھے تو نئی غزل اس سماجی و معاشی بحران اور سیاسی انتشار کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

وقت کی ضرورت

زیادہ سے زیادہ پیداوار
قوم کے لئے ایک چیلنج

ہندوستانی ریلیں ملک کی سب سے بڑی وسیلہ ہوئی انڈر لیکنگ نے ملک کی اقتصادی ترقی کی اہم لوآگے بڑھنے میں ترقیاتی طور پر اپنی فروغ یافتہ ناگزیری برقرار رکھی ہے وہ ماضی کی کارکردگی سے کے بڑھنے کی عزم و جہد آئندہ بھی برابر جاری رکھیں گی تاکہ کھیتوں اور کارخانوں میں پیداوار بڑھانے کی تو ہم میں ہاتھ کو زور دار دا کریں۔

آیئے! اس دیوالی کے دوران ہم اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے عزم راسخ کی تجدید کریں تاکہ ہم خود کفالتی اور اقتصادی آزادی کی منزل کی طرف اپنی پیشقدمی جاری رکھ سکیں۔ دیوالی مبارک کہتے ہوئے ہمیں یہ بھی کہنا چاہئے۔ "خوشحالی حاصل کرنے کے لئے پیداوار بڑھائیے"

شائع کردہ ویسٹرن اینڈ سینٹرل ریلوے

مدحت الاختر

غزل

راہِ وفا میں جب بھی جوانی آتی ہے
چاندی کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے

مست ہیں اپنی اپنی دُھن میں دیوانے
جادۂ غم میں کون کسی کا ساتھی[1] ہے

بزم میں ہے جو مہِ تبسم آنکھوں میں
خلوت میں آنسو بن کر بہہ جاتی ہے

کیفِ تبسم، سوزِ فغاں، اندازِ نظر
دُنیا میں ہر جنسِ گراں بِک جاتی ہے

فرزانے بھی آن ملے دیوانوں میں
دیکھیں اب کیا رنگ یہ صحبت لاتی ہے

دل کا رونا کون سُنے اُس محفل میں
پائل کی جھنکار پہ دُنیا گاتی ہے

لینے کو میں چھوٹا سا اِک پھول سہی
آنگن آنگن میری خوشبو جاتی ہے

شاہد صدیقی

غزل

جُرمِ خاطر شکنی ہم کبھی کرتے ہی نہیں
موجِ غم بن کے کسی دل سے گُذرتے ہی نہیں

اتنے شائستۂ آدابِ محبت ہیں کہ ہم
کسی ماتھے پہ شکن بن کے اُبھرتے ہی نہیں

میرے ہاتھوں سے بہت دُور مرے دل کے قریب
ایسے برہم ہیں وہ گیسو کہ سنورتے ہی نہیں

صورتِ بادِ صبا وضعِ سفر ہے اپنی
دیر تک ہم کسی منزل پہ ٹھہرتے ہی نہیں

زندگی تیری رفاقت کا صلہ یہ ہے کہ آج
اپنی میراث ہیں وہ زخم جو بھرتے ہی نہیں

جن کو سُننے تھے کہ آتی ہی نہیں وضعِ قیام
تم نہیں ہو تو وہ لمحات گُذرتے ہی نہیں

عصرِ حاضر کے وہ منصور ہیں شاہد ہم لوگ
جو کسی وقت صلیبوں سے اُترتے ہی نہیں

[1] نکتہ داں حضرات سے معذرت کے ساتھ۔

رفیعہ منظور الامین

(روحِ اخذ)

خوں خوار پودے

نباتاتی دنیا ہم انسانوں کی دنیا سے کہیں وسیع تر ہے۔ اس کے خاموش اور گم سم باسی نہ منہ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں، پھر بھی ان کی بھائی چارگی اور اپس کا میل جول ہزاروں سال سے چلا آرہا ہے۔ پاؤں کے نیچے روندی جانے والی گھاس اور کائی کے برابر برابر ویدار اور اشوک کے سربلند قد آور درخت بھی نظر آتے ہیں، مگر انکی دنیا میں آج تک نہ خانہ جنگی ہوئی نہ کسی بغاوت نے سر اٹھایا، اور نہ اٹھوانے کبھی ملک گیری کے لئے کوئی قدم اٹھایا۔ لیکن اس پرامن زندگی گذارنے اور بقائے باہم کے اصول پر عمل کرنے کے باوجود ایک نباتات ان کا دشمن ہے جس میں بیشتر بیشتر ہم انسان ہی ہیں۔ مجموعہ اضداد، سدا کے فتنہ پرداز قتل و غارت کے شیدائی! اگر ہم نے سبزہ اگایا اور درخت لگائے تو ہمارے گھوڑوں نے سبزہ کو روندا بھی اور جنگل کے جنگل کبھی ہم نے صاف کر دیئے۔

شاید انسان کے اسی ظلم و ستم کے خلاف نباتاتی دنیا کے ایک خاص طبقے نے (جسے انسان نے خونخوار پودے کا لقب دیا ہے) آواز اٹھائی، چنانچہ پودوں کی چند قسمیں ایسی بھی ہیں جو دوسرے جانداروں کو کھا کر اپنی زندگی گذارتی ہیں۔ لیکن ان پودوں کی خونخواری "آدم خوری" تک نہیں پہنچ پائی ہے چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے، مکھیاں، تتلیاں اور بعض مرتبہ چڑیاں اور چوہے تک ان کا نوالہ بن جاتے ہیں۔ مگر انسان ان کا شکار نہیں ہونے پاتے۔

ایسے غیر معمولی پودے کہیں کہیں ہندوستان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن بہت کم۔ اپنی رہائش کے لئے انھوں نے آسٹریلیا، امریکہ، برطانیہ اور افریقہ کو زیادہ پسند کیا ہے۔

اس طرح کے پودوں کو "کرم خور" پودے (INSECTIVOROUS PLANTS) یا پھر "خونخوار پودے" (CARNIVOROUS PLANTS) بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر پودوں کا سبز مادہ، یعنی کلوروفل (CHLOROPHYLL) موجود ہوتا ہے جس کی مدد سے عام پودوں کی طرح سورج کی روشنی میں اپنی غذا تیار کرنے کے قابل ہیں۔ لیکن جن جگہوں پر یہ اگتے ہیں، وہاں ان کی بعض اہم غذائی مزید مثلاً نائٹروجن اور پروٹین میسر نہیں آتیں۔ لہٰذا اپنے ناسازگار ماحول کا مقابلہ کرنے کیلئے ان پودوں میں خونخوار ایسے "سبھاؤ" یا "عادتیں" پیدا ہوگئی ہیں جن کے بل بوتے پر وہ "خوں خواری" پر اتر آتے ہیں۔

تمام علاقوں میں کرم خور پودوں کی چند خاص نسلیں ملتی ہیں جو زمین حاصل ہونے والی غذا مثلاً معدنی نمکیات، پانی وغیرہ کے علاوہ بعض زائد ضرورتوں کے لئے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتی ہیں۔ اس کے لئے ایسے کیڑے مکوڑوں کے جسموں میں بیکٹیریا (BACTERIA) موجود ہوتے ہیں جن سے خاص قسم کے ہاضمی مائع یعنی خامرے (ENZYMES) رستے ہیں اور بعض صورتوں میں جسموں کی اندرونی دیواروں کے خلیے (CELLS) خود اپنے خامرے تیار کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں غذا جس میں پروٹین موجود نہ ہو ان پودوں کے لئے قابلِ قبول ہی نہیں ہوتی۔

آیئے چند ایسے خاص پودوں کا مشاہدہ کریں۔

سن ڈیو (SUNDEW)

اس چھوٹے سے معصوم اور خوبصورت پودے کے ارادے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اس کے گلابی پتے چھوٹے چھوٹے مگدر کی شکل کے حساس ساختوں میں چھپے ہوتے ہیں جنہیں TENTACLES (ٹینٹکل) کہا جاتا ہے۔ یہ ٹینٹکل (TENTACLES) درمیان میں چھوٹے اور کناروں پر بڑے ہوتے ہیں۔ ان کے بیرونی سروں پر شیرہ نما گوند یلا مادہ چوتا ہے، جو روشنی میں بڑی آبداری سے چمکتا ہے اسی وجہ

ن پودے کا نام (SUNDEW) سورج کی شبنم رکھا گیا ہے۔ یہی
مراہوا حسین مادہ بھولے بھالے کیڑوں، پتنگوں کی موت کا باعث
ا ہے۔ جونہی کوئی کیڑا اپنی پیاس بجھانے کے لئے اس پر آبیٹھتا ہے
وہ نما مادے میں پھنس جاتا ہے، جیسے جیسے وہ خود کو اس ناگہانی قید
چھڑانے کی کوشش کرتا ہے، اور بھی زیادہ اس میں پھنستا جاتا ہے۔

سن ڈیو ——— (SUN DEW)

اس دوران میں (TENT ACLES) کا عمل شروع ہو جاتا ہے، وہ
کیڑے کی زندگی تنگ سے تنگ تر کرنے لگتے ہیں حتیٰ کہ کیڑے سے دور
جو (TENTACLES) (چھنگل) ہوتے ہیں وہ بھی مڑنے لگتے ہیں۔
جب کیڑا اس شکنجے میں بری طرح پھنس جاتا ہے تو (TEN TACLES)
سے ایک خاص قسم کا مائع خارج ہوتا ہے جس میں خامرے۔ (ENZY
MES) ہوتے ہیں، اس مائع میں کیڑا ڈوب جاتا ہے اور اس کی فنا کی
راہیں مکمل مسدود ہو جاتی ہیں، وہ وہیں دم توڑ دیتا ہے۔ جب دلدلوں
کے (TENTACLES) چھوٹے چھوٹے کیڑے کھا جاتے ہیں اور کیڑے
کا سوکھا ڈھانچہ باہر ڈھکیل دیا جاتا ہے اور "سن ڈیو" کا "شیش محل" نئے
شکار کی تلاش میں پھر جگمگانے لگتا ہے۔

۲۔ بٹر ورٹس (BUTTER WORTS)

یہ پودا "سن ڈیو" سے جسامت میں کچھ ہی بڑا ہوتا ہے اور کوہ ہمالیہ
کی بلندیوں پر پایا جاتا ہے۔
اس میں (TENTACLES) (چھنگل) نہیں ہوتے بلکہ تقریباً

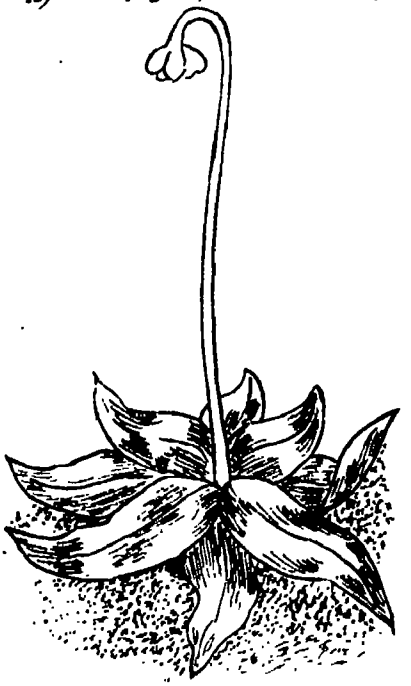

کشتی نما پتے ہوتے ہیں، جن کی ترتیب گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح ہوتی
ہے، بیرونی پتے زمین کو چھوتے ہیں اور اندرونی پتوں کے سرے اوپر
کو مڑے ہوئے ہوتے ہیں، یہ عموماً اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ بھٹکتی
ہوئی نظر ان پر سے یوں ہی گزر جاتی ہے، لیکن ان پتوں کو اکھیڑ کر اگر غور سے
بین سے مشاہدہ کیا جائے تو نظروں میں یکایک ایک چھوٹی سی دنیا ابھر
آتی ہے۔ ہر پتے پر ہزاروں باریک باریک بال ہوتے ہیں، جن کے
سروں پر لیس دار مادہ خارج کرنے والے غدود ہوتے ہیں، اور کبھی
ان میں ننھے ننھے کیڑے بھی پھنسے ہوتے ہیں۔ جونہی یہ پتے اندر مڑتے
ہیں غدودوں سے لیس دار مادہ نکل آتا ہے، کیڑے اس مادے سے
چپک کر رہ جاتے ہیں۔ اور پتے اندر مڑنے لگتے ہیں، دوسرے الفاظ
میں یہ عمل بدنصیب کیڑے کے لئے موت کا پروانہ ہوتا ہے۔
BUTTER WORTS میں ہاضمے کی فنا کافی سست ہوتی

ہے لیکن بہر حال کیڑے کے نرم حصّے ہضم کر لئے جاتے ہیں اور بھوسی خارج کر دی جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لیپ لینڈ کے لوگ بٹر وٹس کے پتّوں کے رس کو دودھ میں ملاتے ہیں اور جب دودھ پھٹ جاتا ہے تو اس کے پانی سے ایک خاص قسم کی شراب بناتے ہیں۔

بعض جگہوں پر اس پودے کے پتّوں کو کیڑے مار کاغذ کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔

۳- بلیڈر ورٹ BLADDER WORT

اس کا پودا سن ڈیو اور بٹر وٹس سے کافی مختلف ہوتا ہے ان دونوں کی طرح یہ زمین پر نہیں بلکہ تالابوں اور کنڈوں میں پیدا ہوتا ہے۔ بعض دوسرے پانی والے پودوں کی طرح اس کے پتّے

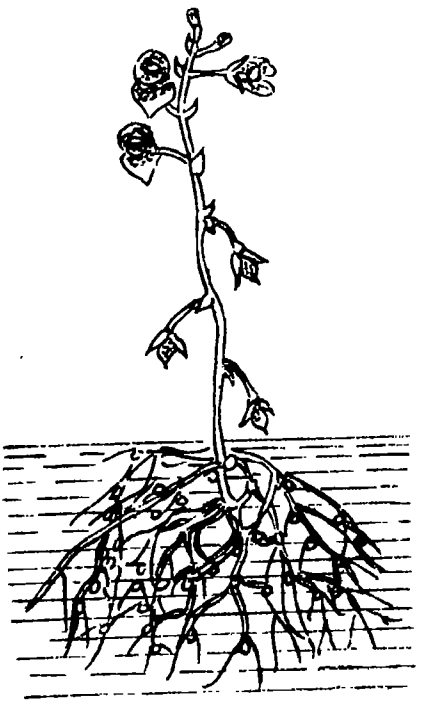

بلیڈر ورٹ (BLADDERWORT)

بھی دھاگے نما ہوتے ہیں۔ کچھ پتّے فٹ بال کے اندر کی ربر کی تھیلی کی طرح چھوٹے چھوٹے بلیڈر (BLADDER)، ہوتے ہیں، ان کی لمبائی تقریباً ½ انچ ہوتی ہے۔ یہ تھیلیاں ایک قاتل مائع سے بھری رہتی ہیں، اور خاص بات یہ ہوتی ہے کہ ان کا راستہ صرف اندر ہی کو کھلتا ہے جیسے پرانے فیشن کے چوہے دانی کا دروازہ۔ پانی میں تیرتے ہوئے ننھے سے کیڑے جب اس پودے کی والی ساخت میں آ پھنستے ہیں تو تھیلی کے منہ پر پائے جانے والے ننھے ننھے بال اندر ہی اندر کو ڈھکیلنے لگتے ہیں حتیٰ کہ یہ اندر زبردستی پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے دروازہ بند ہو جاتا ہے، اور بیچارے وہاں موجود خاصے میں تیرتے تیرتے مر جاتے ہیں۔ اس کے بعد بیکٹیریا کے اثر سے جب یہ سڑ گل جاتے ہیں تو اس کی خلوی دیواریں جذب کر لیتی ہیں۔

۴- پچر پلانٹ (PITCHER PLANT)

گرم خطّہ کے پودوں کی یہ قسم ہندوستان اور ملایا میں پائی جاتی ہے اور امریکہ میں بھی، ہندوستان میں پائے جانے والے پودے کو نیپینتھیز (NEPENTHES) کہتے ہیں۔ یہ جھاڑیوں پر بیل کی طرح سہارہ لیکر اوپر چڑھتے ہیں اور چابک نما مضبوط دھاگے سے جنھیں ٹنڈرل (TENDRIL) کہا جاتا ہے بڑے اور چوڑے پتّے لٹکتے رہتے ہیں۔ اس دھاگے نما ساخت کو جب سہارا ملتا ہے تو پھول کر لمبوترے کوزے (PITCHER) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور یہی ساخت اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ یہ کوزہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس میں دو پیالے پانی آ جائے۔ اور کبھی انگشتانے جتنا چھوٹا سا کے دہانے پر ایک ڈھکن بھی ہوتا ہے جو بارش کو کوزے میں جانے سے حتی الامکان روکتا ہے۔ کوزے کی اندرونی دیواریں بھی سیدھی سادی نہیں ہوتیں بلکہ ساری دیوار ایسے غدودی خلیوں سے بنی ہوتی ہیں جن سے خاصے رستے رہتے ہیں، اور کوزہ ہمیشہ تقریباً آدھا بھرا رہتا ہے۔ قدرے تنگ دہانے کے پاس نیکٹر (NECTOR) غدود ہوتے ہیں جن کی خوشبو سے شکار خود بخود کھنچا چلا آتا ہے جونہی وہ منہ پر پہنچتا ہے پھسل کر اندر گر پڑتا ہے کیونکہ اندر کی سطح اتنی بال دار اور ڈھالو ہوتی ہے کہ کیڑے کے قدم جمنے نہیں پاتے اور وہ مائع میں تیرنے لگتا ہے، لیکن پچر پلانٹ کی خصوصیت یہ ہے کہ مائع میں موجود بیکٹیریا کو ہلاک کر ڈالتے ہیں کیونکہ یہی مائع ہاضم زہر بھی ہوتا ہے اور خاصوں کی موجودگی کی وجہ سے ہاضم بھی۔ لہٰذا غذا کا عرصہ تک تازہ رہتی ہے اور پودا دھیرے دھیرے کیڑے کو کھاتا رہتا ہے۔

یہ پودا کیڑوں، پتنگوں کے علاوہ بعض اوقات نسبتاً بڑے
ہانداروں کا بھی شکار کر لیتا ہے۔ چنانچہ بعض مرتبہ پچر پلانٹ میں
پڑیاں اور چوہے تک پائے گئے ہیں۔

۵۔ وینس فلائی ٹریپ (VENUS FLY TRAP)

کم خود پودوں میں سب سے انوکھا پودا یہی ہے۔ عمل کے
تو بالکل ہمارے رگ اور پٹھوں کا عمل دہرایا جاتا ہے جیسے ہی شکار پھنس
جائے پتوں میں موجود غدودوں سے خامرے نچوڑے جاتے ہیں، جو
اتنی زیادہ مقدار میں ہوتے ہیں کہ دندانے دار ساخت سے باہر ٹپکنے لگتے
ہیں، اب ہاضمے اور غذا کو جذب کرنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر
بعد دونوں پتے اپنے آپ کھل جاتے ہیں، اور زمانہ اپنی رفتار سے چلتا رہتا ہے
کلکتہ کے اس پاس بھی ایسا انوکھے پودے کی ایک قسم ملتی ہے جسے

وینس فلائی ٹریپ — انڈین پچر پلانٹ — امریکن پچر پلانٹ

اعتبار سے اسے سن ڈیو کا رشتہ دار مانا جاسکتا ہے۔ یہ صرف امریکہ
میں ملتا ہے، اس کے پتے جبامت میں ایک انچ سے کچھ زیادہ لمبے
ہوتے ہیں۔ وسیع پتیوں کی مانند ایک ڈنٹھل پر لگے ہوتے ہیں۔ ان میں
خارے پیدا کرنے والے غدود ہوتے ہیں۔ ہر پتے کی سرخ اوپری
سطح پر تین تین سنہالیاں کانٹے اور کنارے کی ساخت بھی کانٹوں سنما ہوتی
ہے۔ اگر کوئی بدنصیب کیڑا ان کانٹوں سے ذرا سا بھی چھو جائے تو یہ
دونوں پتے آدھے سیکنڈ کے خالی سی بجا دیتے ہیں، کناروں کی کانٹوں
دار بناوٹ کے دونوں سرے چوہے دان کی طرح ایک دوسرے سے
مل جاتے ہیں، اور شکار گرفتار ہو جاتا ہے۔ دونوں پتے جب ملتے ہیں

ملکا جانجی (ALDROVANDA VESICULOSA) کہتے ہیں لیکن وینس فلائی ٹریپ (VENUS FLYTRAP) NDA
میں فرق یہ ہے کہ دریبانی کانٹے دار ساخت اس میں چھوٹی بجائے لمبائی
ہوتی ہے اور یہ پودا پانی میں تیرتا رہتا ہے۔ اس میں پتے نچلی سطح پر
نہیں ہوتے بلکہ گھیر دار شکل میں پورے پودے پر پائے جاتے ہیں
ہولناک اور رونگٹے کھڑے کرنے والی داستانیں اکثر افریقہ سے
منسوب کر دی جاتی ہیں، چنانچہ افریقہ کے آدم خور وحشیوں کے دل ہلا
دینے والے قصے کافی مشہور ہیں کہ کس طرح وہاں کے بعض درخت بے خبر مسافروں
کو اپنی باہنوں میں جکڑ لیتے ہیں اور خون پی جاتے ہیں۔ یہ حکایتیں بے

تو ہیں ہی لیکن وسطی افریقہ میں ایک ایسا کرم خوردہ ARAUCIA ALBENS ضرور پایا جاتا ہے جس کی دلپسند غذا تتلیاں ہیں۔ اس

کے پھول سفید کافی بڑے شہد آگیں خوشبو والے ہوتے ہیں۔ جو تتلیوں کو کھینچ لیتے ہیں۔ لیکن یہ رنگ اور یہ خوشبو تو دنیا کے چھوٹے چھوٹے فریب ہیں جونہی تتلی پتیوں کے درمیان مچلتی ہے کھٹ سے اسے دو سخت سیاہ دندانے نما کنپٹیوں کے درمیان دبوچ لیا جاتا ہے یہ بظاہر آہنی دانت اتنے سخت اور تیز ہوتے ہیں کہ انسانی انگلی کو بھی زخمی کر سکتے ہیں۔

اس دنیا میں جہاں نرم و نازک پھول تک ہتھیار بند ہوتے ہیں تو تعجب کی کیا بات ہے جو پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔ مصرع کیسا ہی ہو مگر سچ کہا ہے کسی نے ؎

بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی (نیا دور لکھنؤ)

خریداران خواتین

خط لکھتے وقت اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کریں

منیجر

شاعر بمبئی

اپنی جلد کو خوبصورت بنائیے

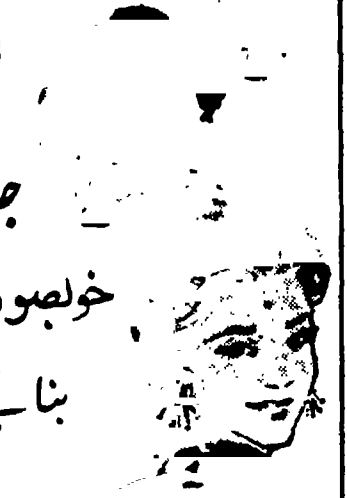

آج ہی فلورزون کا استعمال شروع کیجئے چند ہفتوں میں آپکی جلد خوبصورت سے خوبصورت تر ہو جائیگی فلورزون جلد کو خوبصورت بناتا ہے۔ کیل مہاسے اور جھریاں دور کر کے لازوال حسن عطا کرتا ہے

فلورزون جسم میں جذب ہو کر اپنے کیمیاوی اثرات سے چھپے ہوئے حسن کو ابھارتا ہے۔ خوبصورتی، دلکشی اور جاذبیت پیدا کرتا ہے۔

فلورزون لوشن چار روپے پچھتر پیسے فی بوتل

فلورزون کنسنٹریٹڈ کریم پانچ روپے ۵۰ پیسے

ہر جگہ دستیاب ہوتا ہے

یا

براہ راست اس پتہ سے منگائیے

ہائیجینک بیسرچ انسٹی ٹیوٹ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲ بمبئی ۱

مکتوبات

شمارۂ ستمبر ۶۶ء کے سلسلے میں:۔

قیصر جہاں ـــــ شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

ادم پربھاکر کا مضمون "سوال ہندی نئے گیت کا" نظر سے گذرا۔ ان کا خیال درست ہے کہ نئے گیت میں ردعمل اور جذباتیت سے بغاوت کی آواز اُبھری ہے۔ اور وہ اپنے روایتی انداز سے کنارہ کشی اختیار کر رہا ہے۔ پرانا گیت حقیقتوں سے دُور تصورات کی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔ لیکن نیا گیت اُس کے برعکس ہے۔ اس نئی تبدیلی کے باوجود نیا گیت روایتی حُسن پرستی سے دامن نہیں بچا سکا ہے۔

ہندی کے نئے گیت کار جس قدر دعوے کرتے ہیں، اس قدر کامیابی اُنہیں حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن یہ دیکھ کر اُمید بندھتی ہے کہ ان کی کوششیں برابر جاری ہیں۔

اویس احمد دوراں ـــ ڈی۔ ایم۔ جی بلڈنگ آئی۔ کے۔ پی۔ ڈی۔ کلکتہ ۲۲

ستمبر کا "شاعر" ملا۔ آپ کا اداریہ ملک کے سیاسی ہاؤ کا پتہ دیتا ہے۔ افسوس کہ اُردو زبان کو نہ تو فرقہ پرستوں کی زد سے بچانے کی ہم لوگوں میں اہلیت ہے اور نہ حکومت سے اردو کے حق میں بہتر فائدہ رساں فیصلہ ہی کرا سکتے ہیں۔

ملک کے عام حالات اب وہ رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں کہ اچانک کوئی بات رُونما ہو سکتی ہے۔ وقت کوئی نہ کوئی کروٹ ضرور بدلے گا۔ اور یہ خطرات و انتشار جو ہندوستان کے عام باشندوں کو بری طرح گھیرے ہوئے ہیں ایک نہ ایک دن ضرور ختم ہو کر رہیں گے۔ ملک کے ہر حصّے میں انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ اُردو کا مسئلہ بھی دیگر مسائل کی طرح خالص قومی مسئلہ ہے۔ آج نہیں تو کل اس کا حل دریافت کرنا ہی ہوگا۔

اس بار کے "شاعر" میں ایک مضمون سید تقی احمد صاحب رشاد کا بعنوان "حافظ کا اثر شعرائے اُردو" پر شائع ہوا ہے۔ صاحب مضمون نے بیشک بڑے سلیقہ سے اُردو شاعری پر فارسی کے اثرات کا تجزیہ کیا ہے اور اشعار کے ذریعہ مثالیں دے کر اُردو شاعری پر فارسی شاعری کے احسانات گنوائے ہیں۔ لیکن دانستہ یا نادانستہ طور پر غالب جیسے باعظمت شاعر کو زبردست چیلنج بھی کیا ہے۔ ارشاد کے خیال کے مطابق غالب کی شاعری حافظ و عرفی و بیدل کے کلام کا ترجمہ ہے۔ غالب جو اب تک اپنے زبردست originality کی وجہ سے اُردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا گیا ہے اور جس کے متعلق دعوے اور ثبوت سے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ کم و بیش سر سید حالی، شبلی اور اقبال سے لے کر زمانۂ حال تک کے شعراء اور اُردو زبان میں ہونے والے مفکرین غالب ہی کے اٹھائے ہوئے طوفان کی عظیم و جلیل لہریں ہیں۔ اُس پر یہ الزام لگایا جائے کہ اس کے خیالات اور تخیل نہیں تھے بلکہ مستعار تھے؟ جہاں تک خیالات کے اور تخیل اور اچھوتے ہونے کا تعلق ہے۔ کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ حافظ کے خیالات یا شیکسپیئر اور ملٹن نے جو تخیلیں اپنے ہمہ گیر ادب میں پیش کیں، وہ بالکل نئی تھیں اور ان سے پہلے دنیا کے کسی شاعر و فنکار کے ذہن میں ان کا ظہور نہیں ہوا تھا۔ جب کہ یہ بات ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ خود انگریزی ادب جیسا لافانی ادب یونانی، لاطینی، فرانسیسی اور جرمنی ادب سے متاثر ہوا ہے۔ کیا فارسی ادب پر کسی دوسرے ادب کی پرچھائیں نہیں پڑی؟ حافظ۔ عرفی۔ اور بیدل نے جو مضامین اپنے بیش قیمت اشعار میں باندھے ہیں کیا وہ سب کے سب اچھوتے اور نو وارد ہیں۔ شیکسپیئر اور ملٹن نے جو کچھ سوچا، کیا ان کے پیش روؤں کے دماغوں نے وہ سب کچھ نہ سوچا ہوگا۔ کیا حُسن و عشق کے لازوال جذبے، خیر و شر کے

فلسفے اور ہجر و وصال کے قصے صرف حافظ شیرازی کی میراث تھے۔؟ کائنات میں جتنی چیزیں ہیں، سب کی سب پرانی ہیں۔ سورج چاند، ستارے اور زمین کی ساری مادی اشیاء۔ ان کا حسن۔ ان کی بدصورتی۔ پہاڑوں کی پراسرار ہیبت۔ سمندر کی موجوں کا قہار شور۔ انسان کے دل کی نرمی، اس کا جذبۂ محبت۔ اس کی وجدانی کیفیت۔ آرزوئے وصال۔ تصادم غیر و شر۔ حسن کے غمزے۔ عشوے۔ غرض وہ کون سی شے ہے جو حافظ شیرازی سے پہلے اپنا وجود نہیں رکھتی تھی۔؟ خود حافظ کے حسن اشعار کا حوالہ جناب ارشاد نے دیا ہے، ان کے مضامین حافظ کے عہد میں بھی مروج تھے، ان کے قبل بھی ان کے بعد بھی۔ اب رہا خیالات و مضامین کو پیش کرنے کا انداز، سو وہ ہر شاعر کا الگ الگ رہا ہے۔ یہ انداز ہی ہے جس نے حافظ کو حافظ۔ شیکسپیئر کو شیکسپیئر اور غالب کو غالب بنا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ غالب کے مضمون کو اقبال نے اپنے شعر میں باندھا ہو۔ مگر اقبال کا انداز غالب سے الگ ہوگا۔ غالب کے نام کے ساتھ لفظ ترجمہ کو چپکانا غالب کے ہمہ گیر اور لافانی ادب کو چیلنج کرنا ہے۔

عبدالجبار تاج نے میری نظم "حسرتِ بسترِ گل" کو ادبِ لطیف کا ایک ٹکڑا کہا ہے۔ جبکہ منظر عام نے اسے پسند کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس رائے کو صحیح مانوں؟ سردار جعفری۔ فیض۔ مخدوم۔ پروین۔ اور ساحر سے لے کر جدید نسل کے نامی گرامی شعراء بھی آزاد نظم کے سانچے کے حامی ہیں اور بیشتر خیالات اسی سانچے میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ آزاد نظم کو جو بامعنی ہو۔ مربوط و مسلسل ہو۔ واضح، خوبصورت اور موثر ہو۔ اس کو ادبِ لطیف سے زیادہ اہمیت نہ دی جائے؟ شعر کے لئے معنی اثر اور وزن کا ہونا ضروری ہے۔ میری نظم "حسرتِ بسترِ گل" میں بھی یہ سب کچھ موجود ہے۔ شاعری میں Form کا تعین خیالات کرتے ہیں۔ شاعر نہیں کرتا۔ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ فکر و فن کی نئی لہروں کو زیادہ سے زیادہ پھیلنے دیا جائے۔

شمارۂ اکتوبر ۶۶ء:۔ **نائی انصاری** ـــــ ۱۷/۹۷ پریڈ کانپور

"شاعر" کا تازہ شمارہ اکتوبر ۶۶ء موصول ہوا۔ ساحر کی نظم "اے شریف انسانو" نظم کیا ہے سحر ہے نہ ابہام نہ چیستان، پرائے بیان سادہ و دل نشیں، موضوعِ سخن آفاقی۔ نئی شاعری کے مبلغ اس نظم کو دیکھیں پرکھیں اور بتائیں کہ وہ اس نظم کو کس خانے میں رکھیں گے۔ نئی شاعری میں شمار کریں گے یا پرانی "نقاب دار" شاعری میں گنیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاعری نہ نئی ہوتی ہے نہ پرانی (موضوعِ سخن کے اعتبار سے) زمانے کے اعتبار سے فرد نئی اور پرانی کی تفریق کی بات کہی جا سکتی ہے۔ مگر ماضی گذر چکا ہے۔ مستقبل پردۂ غیب میں ہے۔ حال کسے کہا جائے۔ جس لمحے کو ہم حال کہتے ہیں وہ ماضی کی آغوش میں جا گرتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی نئی اور پرانی کی تفریق چنداں قابلِ اعتبار نہیں۔

کمار پاشی جیسے لوگ جو سخن کی زبان میں نظمیں کہتے ہیں "اے شریف انسانو" جیسی نرم۔ سبک۔ رواں، خوبصورت اور صحت مند قدروں کی حامل نظم کو قبول کریں گے یا رد۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ انہیں اس نظم کے آئینے میں اپنا عکس ضرور دیکھنا چاہئے۔

میر و غالب اردو شاعری کے چاند اور سورج ہیں۔ جن کی روشنی آج بھی صحت بخش ہے اور کل بھی روح و دل کے لئے سرمایہ کیف و کم ہوگی۔ ان کی عظمت پر خاک ڈالنے کی کوشش نہ تو مستحسن کہی جا سکتی ہے۔ نہ سود مند۔ ہاں اگر کوئی اپنی کم مائیگی کا اظہار اسی طرح کرنا چاہے تو دوسری بات ہے۔

ترقی پسند تحریک کے اوائل میں بھی بعض ناعاقبت اندیش لوگوں نے اسی قسم کے ڈھونگ رچائے تھے مگر ان کی گرفت بھی جلد ہی ہو گئی اور ماضی کے ورثے سے روگردانی کی دباغتم ہو گئی۔

میں تو صرف (ذرا سی ترمیم کے ساتھ) اتنا ہی عرض کروں گا۔

ذہر کہ ملکِ کج نہاد و تند نشست ـــــ کلاہ داری و آئین شاعری داند

مسعود قمر تاباں ـــــ مرکز ادب۔ بدھوارہ۔ بھوپال

تازہ "شاعر" میں نئی شاعری کیوں، بڑی دلچسپ بحث ہے۔ اس بحث کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ بحث میں حصہ لینے والے چاروں نئے شاعروں کی رائیں ایک دوسرے سے ذرا بھی ہم آہنگ نہیں ہیں۔ یہی وہ انتشار ہے جس کی طرف میں نے اپنے

مضمون "نئی شاعری" نیا زاویہ، میں اشارہ کیا تھا۔

عمیق حنفی کی رائے میں "نئی شاعری اس نئے ذہن و احساس کا اظہار ہے جو بدلے ہوئے اور بدلتے ہوئے حالات میں پروان چڑھا ہے" دیکھا رہاشی کی رائے تو اُن ہی کی ایک نظم معلوم ہوتی ہے۔ ان کی رائے میں ابھی تک ہم اپنے بزرگوں کے اور اپنے مسائل کے فرق ہی کو نہیں سمجھ سکے ہیں اور جب ہم یہ فرق سمجھ لینگے تو نئی اور پرانی شاعری کا فرق بھی بقول خود ان کے "واضح ہو جائیگا۔ . . . کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" ابدا فاضلی کی رائے میں نئی شاعری "اوپری تقابلوں اور اندرونی ٹکراؤ کے تضاد کا نفسیاتی ڈرامہ ہے" پتہ نہیں یہ نفسیاتی ڈرامہ ہے کیا؟ اور کب سے ہو رہا ہے؟

شہریار نے البتہ واضح طور سے نہایت نپے تلے انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ نئی شاعری کے بارے میں شہریار کی آواز تمام باشعور انسانوں کی دل کی آواز معلوم ہوتی ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شہریار نے نئی شاعری کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اگر اس کی عملی شکل دیکھنا ہو تو ان کی شاعری اٹھا کر دیکھی جا سکتی ہے اس کے برخلاف عمیق حنفی اور رہاشی کے ذہنوں میں انتشار اور تضاد پایا جاتا ہے۔

عمیق صاحب ایک طرف تو یہ کہتے ہوئے کہ "ہر عہد میں ارباب بست و کشاد اور حاکمان وقت کے قصیدہ گویوں اور ثنا خوانوں کے ہجوم سے دور اور ان حقیقت میں حق شناس اور تنقیدی بصیرت رکھنے والے شاعر پیدا ہوئے اور ان شاعروں نے دین بزرگان کو خوش کرنے کے بجائے اپنے عہد کے انسان کی ذات کا سفر اور اپنے شعور و احساس کے ذریعہ مرتب کیا ہے" پرانی شاعری کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ان کی نظر میں پرانی شاعری "روایات، عقائد، عادات، اصطلاحات، منشور، مذہب اخلاق اور سیاست وغیرہ وغیرہ کی قربان گاہ پر شاعری اور انسانیت کو بھینٹ بھی چڑھا دیتی ہے اور پھر نئی شاعری کو جنم لینا پڑتا ہے۔۔ کبھی کچھ کبھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ موصوف کہنا کیا چاہتے ہیں۔ نئے شاعروں کی فہرست دیتے ہوئے عمیق صاحب ایک ہی سانس میں "نئی نسل" کے چھوٹے بڑے اچھے برے نہ جانے کتنے نام یاد کر گئے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ "فہرست روایتی" استادوں کو کیسا معلوم پڑتا ہے

رہاشی کچھ زیادہ ہی احساس کمتری کا شکار معلوم ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان پر ایک قسم کی جھنجلاہٹ سوار ہو گئی ہے اور اسی جھنجلاہٹ میں وہ دلی سے دلی تک تمام اردو شعراء کو "نکمے" "مداری اور شعبدہ باز" قرار دے گئے ہیں۔ "نئے شاعروں" کا ایک ذہین اور حساس طبقہ اس جھنجلاہٹ کا شکار ہے جس کی نمائندگی کمار صاحب نے فرمائی ہے۔ قصور اس طبقے کا نہیں بلکہ اس کے نہ ہونے پن کا ہے۔ یہ طبقہ [illegible] آج شخصیت کی جامعیت اور اکائی کو دیکھتے ہیں تو ان کے اپنے ہونے پن کا احساس کمتری شدت اختیار کر لیتا ہے۔ اور جس کا نتیجہ جھنجلاہٹ میں نمودار ہوتا ہے۔

ندا فاضلی کا انداز بیان دیکھ کر بے انتہا تعجب ہوا۔ حالانکہ ندا فاضلی کا شمار نئی نسل کے ان شعراء میں کیا جا سکتا ہے جو لہجہ واضح اور سلجھے ہوئے انداز میں شاعری کر رہے ہیں۔ اور ان کا شعور بھی زیادہ پختہ ہے۔ لیکن یہاں پر ندا فاضلی کے عام تاثراتی انداز بیان میں ایک طرح کی مصنوعیت آ گئی ہے۔

علی عباس امید ——— انیس منزل۔ نور محل بھوپال

تازہ شاعر دیکھا۔ سرورق سے لے کر تخلیقات تک خوبصورت اور متاثر کن ہے "حرمات" کا حاصل یہ جملہ ہے۔

"ہمارے لئے بھی پرسیم کورٹ کا دروازہ کھلا چاہئے"

خدا کرے اوروں کے ذہن میں بھی یہ بات سما جائے۔ ساحر، لقمہ حیدر، حیدر قلندر اور وسیم کی نظمیں اچھی لگیں۔

ع محمد (ندا فاضلی) کا مقالہ "آزاد نظم کا ارتقا" کچھ عجیب طرح کا ہے۔ اس میں بقول "تو ہے رہا وہ ہے" لیکن ان کی اپنی رائے بہت ہی کم۔ جو رائے ہے بھی اس میں کوئی [illegible] نہیں ہے۔ اس سے قبل اکثر لوگ یہ سب کچھ کہہ چکے ہیں

انہوں نے میرے مضمون "جدید شاعری میں ہیئت کا مسئلہ" کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اس وقت تاثر کا وہ شعور میرے پاس نہیں ہے۔ پھر بھی مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میں نے اُس میں لکھا تھا۔

"اس دور میں شاعر نے غزل کی تنگی کا بھی شدید احساس ہوا اور ردیف و قوافی کی پابندی ناقابل برداشت ہو گئی۔ . . . . . بیسویں صدی کے دوسرے اوائل میں یہ خوش فہمیوں کی حد تک پہنچ گیا۔ ہیئت اور فارم کے سلسلے میں بے شمار تجربات کئے گئے۔

ان جملوں سے میرا مقصد نہ تو غزل کی توہین کرنا تھا، نہ ہی غالب پر الزام تراشی۔ راہی اور میرے دونوں ہی کے مضامین ترقی پسند تحریک کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ یہ تحریک ۱۹۳۶ء میں چلی تھی۔ اور غالب اس سے ۶۷ سال پہلے ہی یعنی ۱۸۶۹ء میں اس فانی دنیا کو الوداع کہہ چکے تھے۔ اب رہی بات غزل کی توہین کی۔ تو بغیر غزل ہم اردو ادب کا تصور نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں اگر انہیں میرے خیالات معلوم کرنا ہوں تو میرا تازہ مضمون ترقی پسندی دیکھ لیں۔ فاضل مقالہ نگار نے راہی کا مضمون دیکھا ہی نہیں، ورنہ میری بات سمجھنے میں اتنی عظیم غلطی نہ کرتے۔ ویسے وہ میرا ہی خیال نہیں ہے بلکہ اردو ادب کی تاریخ کا اہم جزو ہے۔ اور روز روشن کی طرح واضح ایک حقیقت ہے۔ کیوں کہ اگر "تنگنائے غزل" کا احساس نہ ہوتا تو پرانی روش سے انحراف کی ضرورت ہی کیا تھی۔

نئی شاعری کیوں؟ اچھا سلسلہ ہو سکتا ہے، اگر کچھ لوگ واقعی دھیان دیں۔ اس شمارہ میں جن لوگوں نے لکھا ہے اگر ان سب پر اظہار رائے کیا جائے تو خط بہت طویل ہو جائے گا۔ پھر بھی کارپاٹی کی رائے کے متعلق اتنا ضرور کہوں گا کہ اس قسم کی تحریروں اور تقریروں نے عوام کو شاعری اور ادب دونوں سے متنفر کر دیا ہے۔ اُن کا لہجہ ہی ان کی جدت اور ترقی پسندی کا غماز ہے۔ اظہار خیال کرتے وقت اگر اپنا نہیں تو پڑھنے والوں کے معیار کا لحاظ تو ضرور کرنا چاہیئے۔

علامہ سیماب پر مولانا علیم اختر کا مضمون بہت پسند آیا۔ "روح انظر" بھی اچھی چیز ہے۔ نامی، منصور، سبزواری۔ راہی سیوانی اور خالد رحیم کی غزلیں اچھی ہیں۔ راہی کا نام ہی کافی ہے۔ اس لئے "ترقی" کی ناپسندیدگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ افسانوں میں صرف رفعت نواز کا ترجمہ پسند آیا۔ فنکاروں کی تصاویر کا سلسلہ بھی بہت خوب ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، آپ کی اس جدت کو لوگوں نے بہت سراہا ہے اور ہر تخلیق کے ساتھ۔ خالق کا مکس تلاش کرتے ہیں۔

میرے دو مصرعوں کو ایک ایک دو دو لفظوں کی تبدیلی سے آپ نے جس قدر خوبصورت بنا دیا ہے، اُسے دیکھ کر مولانا علیم اختر کے مضمون علامہ سیماب پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔

عبدالطیف اعظمی۔ مدیر "صبح" ــــ جامع نگر، نئی دہلی ۲۵

"شاعر" کے پیش نظر شمارہ میں "یوم اکبر" کے مضامین دیکھے۔ اراکین بزم شعور بمبئی قابل مبارکباد ہیں کہ اُنہوں نے ایک جلسہ منعقد کر کے اکبر کی یاد کو تازہ کیا اور آپ نے اس جلسے کے مضامین کو شائع کر کے اُن لوگوں کو بھی مستفید ہونے کا موقع دیا۔ جو اس موقع پر موجود نہ تھے۔ یا شائع ہونے کے بعد ان کو پڑھ نہیں سکے تھے۔ ان مضامین کو دیکھ کر مجھے ایک کمی کی بری طرح محسوس ہوئی۔ ان میں کوئی ایک مضمون بھی ایسا نہیں ہے۔ جس میں اکبر مرحوم کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ آپ نے تو کبھی مضامین شائع کئے ہوں گے۔ شاید یوم اکبر کے منتظمین ہی نے اس طرف توجہ نہیں کی، ایسی صورت میں آپ نے دو یا تین سطر کا جو نوٹ لکھا ہے، اس میں اگر تاریخ وفات ہی لکھ دی جاتی تو کم از کم ستمبر میں یوم اکبر منانے کی وجہ معلوم ہو جاتی۔ نوٹ میں اگر جلسے کی تاریخ کا بھی ذکر ہوتا تو اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا کہ آیا اکبر نے جس تاریخ کو وفات پائی تھی، اسی کو منایا گیا تھا یا کسی اور تاریخ کو۔

میری توجہ ان جزئیات کی طرف اس لئے ہوئی کہ بہت مشہور اور ممتاز ادیبوں کی وفات اور ولادت کی تاریخوں کا ذکر کرتے وقت اچھے اچھے ادیب اور نقاد پوری احتیاط اور تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اکثر صرف سنہ درج کر دیا جاتا ہے۔ مہینہ اور تاریخ کی اہمیت کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اکتوبر سے "صبح" میں ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ وہ یہ کہ جس ماہ میں مختلف ادیبوں کا انتقال ہوا ہے۔ اُس ماہ کے منتخب ادیبوں اور شاعروں کے مختصر حالات زندگی شائع کئے جائیں۔ زیر اشاعت شمارہ میں ستمبر کے متوفی ادیبوں کا ذکر کیا ہے۔ جس میں اکبر مرحوم بھی شامل ہیں۔ مہینے کی بنیاد پر انتخاب کرنے کی وجہ سے یہ دلچسپ اتفاق سامنے آیا کہ ۹ ستمبر کو کئی ممتاز ادیبوں کا انتقال ہوا ہے۔ مثلاً اکبر۔ جگر۔ چودھری محمد علی ردولوی۔ اختر شیرانی اور حیرت شملوی۔

آپ کے نوٹ میں ایک لفظ استعمال ہوا ہے۔ مجھے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ غلط ہے۔ مگر اس کے بارے میں میری ایک ذاتی رائے ہے، جسے یہاں بحث و گفتگو کے لئے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ بہت سے لوگ "مقالے" کو مضمون کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ آپ نے بھی اس نوٹ میں یہی کیا ہے۔ میرے خیال میں ان دونوں میں فرق کرنا چاہیئے۔ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ "مقالے" کو انگریزی کے لفظ "تھیسس" کے معنی

محفل اپنی.....!

گیارہواں شمارہ

"شاعر" کا گیارہواں شمارہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اب صرف دسمبر کا آخری شمارہ اور شائع ہونا ہے، جو دسمبر کے وسط تک شائع ہو جائیگا۔ ہمیں اس بات کی واقعی مسرت ہے کہ اس سال جنوری سے لیکر دسمبر تک "شاعر" کے پورے بارہ شمارے خریدار کو ملیں گے۔ بڑھی ہوئی ضخامت اور حسن و معیار کو اپنے دامن میں لیتے ہوئے یہ شمارے نکلے ہیں۔ بارہ شماروں کے مجموعی صفحات آٹھ سو سے زیادہ ہوتے ہیں اور یہ صرف آٹھ روپے سالانہ چندہ میں پیش کئے گئے۔ اس سال قیمتوں کے بڑھ جانے کی وجہ سے کافی نقصان ہوا ہے، لیکن ہمیں امید ہے کہ ہمدردانِ "شاعر" اشاعت کی اس باقاعدگی اور معیار کی بلندی کو سراہتے ہوئے "شاعر" کا حلقۂ اشاعت بڑھا کر اس نقصان کی کچھ نہ کچھ تلافی ضرور کر دیں گے۔

کرشن چندر نمبر

کرشن چندر نمبر کی تیاریاں زور شور سے جاری ہیں۔ اس کے لئے بعض خاص موضوعات سے اخباری کاغذ کی گانٹھیں آچکی ہیں، کتابت و طباعت کے بہتر انتظامات کئے جا رہے ہیں۔

امید ہے کہ فروری ۱۹۶۷ء میں یہ خوبصورت، ضخیم اور معیاری اشاعت پیش کی جا سکے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کرشن چندر نمبر کی ضخامت سات سو صفحات سے زائد ہو جائے۔ بہرحال جنوری ۱۹۶۷ء کے شمارے میں اس کی مزید تفصیلات پیش کر دی جائیں گی۔

اس نمبر کو کامیاب بنانا تمام ہمدردانِ "شاعر" کا ادبی و لسانی فریضہ ہے۔ ہندوستان کے ادبی رسائل میں یہ پہلی عظیم پیشکش ہوگی۔ "سا پر تقریباً پندرہ ہزار روپے خرچ آئے گا۔ لیکن تاریخ ادب اردو اس نمبر کو ضرور یاد رکھے گی۔

شمارۂ نومبر

"شاعر" کے گذشتہ شماروں کی طرح نومبر ۱۹۶۶ء کا یہ تازہ شمارہ بھی بہترین نظم و نثر تخلیقات کا حامل ہے۔ "مدیر شاعر" وسط اکتوبر سے شمارۂ نومبر کی تکمیل تک مختلف علیل رہیں۔ اس لئے اکتوبر اور نومبر کے شماروں میں کچھ کمیاں رہ گئی ہوں تو انہیں نظر انداز کر دیا جائے۔

ارباب قلم کی تخلیقات کی اشاعت اور عدم اشاعت کے متعلق اطلاعات اور "مدیر شاعر" کی ذاتی ڈاک کے جواب میں اکثر تاخیر ہوتی ہے۔

خریدِ اردو سے

۱۔ کرشن چندر نمبر کی قیمت دس روپے مقرر کی گئی ہے، چونکہ آٹھ روپے سالانہ چندے میں گیارہ عام شماروں کے علاوہ اتنی ضخیم اور قیمتی اشاعت مفت نہیں دی جا سکتی، اس لئے "شاعر" کے مستقل خریداروں سے اس کی قیمت صرف چار روپے لی جائے گی اور اس کیلئے چھ روپے عنایت ہوگی۔

۲۔ کسی خریدار کو کرشن چندر نمبر کا وی۔ پی نہیں بھیجا جائے گا۔ یہ ضخیم نمبر تمام خریداروں کو رجسٹری کے ذریعہ ارسال کیا جائے گا۔

۳۔ ہر خریدار کو چار روپے پچاس پیسے (Rs 4-50) منی آرڈر سے بھیجنے ہوں گے۔

۴۔ جن خریداروں کے چندے نومبر اور دسمبر ۱۹۶۶ء کے ساتھ ختم ہو رہے ہیں، وہ سالانہ چندہ آٹھ روپے اور کرشن چندر نمبر کی رعایتی قیمت علاوہ کل بارہ روپے پچاس پیسے (Rs. 12-50) کا منی آرڈر بھیجیں۔

۵۔ جو خریدار کرشن چندر نمبر کی رعایتی قیمت اور رجسٹری خرچ نہیں بھیجیں گے تو کہ یہ نمبر نہیں بھیجا جائے گا۔

۶۔ جن خریداروں کی طرف سالانہ چندہ باقی ہے ان کو بھی کرشن چندر نمبر نہیں بھیجا جائیگا۔ تاوقتیکہ وہ بقیہ نہ بھیج دیں۔

ایجنٹوں سے

۱۔ تمام پرانے اور نئے ایجنٹوں کو کرشن چندر نمبر کی مطلوبہ کاپیاں، سواری گاڑی سے بھیجی جائیں گی اور ریلوے رسید وی۔ پی کے ذریعہ۔

۲۔ تمام ایجنٹوں کو کرشن چندر نمبر کی مطلوبہ کاپیوں کی مجموعی رقم کا ۱/۴ حصہ پیشگی بھیجنا لازمی اور ضروری ہے۔

۳۔ کسی ایجنٹ کو زائد قیمت پر کرشن چندر نمبر فروخت کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

۴۔ ۵ جنوری ۱۹۶۷ء کے بعد کسی ایجنٹ کا کوئی آرڈر قبول نہیں کیا جائیگا۔

شاعر

علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

"خوابوں کا مسیحا" کی رسم اجراء

بمبئی ۱۴ نومبر ۱۹۶۶ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کی ۷۷ ویں جنم دن کے موقع پر شام کو چھ بجے انڈو عرب سوسائٹی ہال چرچ گیٹ میں اعجاز صدیقی کی طویل نظم "خوابوں کا مسیحا" (جو تین زبانوں میں حسن و اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے) کی رسم اجراء عمل میں آئی۔ جلسہ کی صدارت جناب ڈاکٹر رفیق زکریا (وزیر حکومت مہاراشٹر) نے فرمائی۔ جلسہ میں بڑی تعداد میں ادیبوں، شاعروں اور عمائدین شہر نے شرکت کی۔

سردار جعفری، سکندر علی وجد، ظ انصاری۔ مولانا حامد الانصاری غازی، سید شہاب الدین دسنوی اور ندا فاضلی نے تقریری پروگرام میں حصہ لیا۔ ڈاکٹر ایس۔ ایس نشاط ٹریڈ ایجنٹ حکومت جموں و کشمیر (صدر انجمن ترقی اردو) نے افتتاحی تقریر کی۔ مصور ماہر اکہانی نے اپنے انگریزی ترجمے کے چند بند سنائے جو بے حد پسند کیے گئے۔

جلسہ کے آخر میں شرکاء نے کتاب کی جلدیں گرم جوشی سے خریدیں۔

تیر تقی میر پر ایک ایکٹ کا ڈرامہ انعامی مقابلہ

"یو پیا" نے اس سال میر تقی میر پر ایک ایکٹ کے ڈرامہ کا انعامی مقابلہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے، ہندوستان کے تمام ادیبوں اور فن کاروں سے گذارش ہے کہ وہ میر تقی میر کی حیات، شخصیت اور شاعری کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ایکٹ کا دلچسپ ڈرامہ جو ۴۵ منٹ کا ہو ۔ اس انعامی مقابلے کیلئے ۳۰ دسمبر ۱۹۶۶ء تک مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں۔ جانچ کے بعد نتیجہ کا اعلان اخبارات کے ذریعہ کر دیا جائیگا۔ حصہ لینے والے اپنا نام اور پتہ صاف لکھیں تاکہ نتیجہ کے بعد انعام پانے والوں کے پاس نقد روپیہ روانہ کر دیا جائے۔

انعامات دو ہوں گے، پہلا انعام ۱۵۰ (دو سو پچاس) روپیہ اور دوسرا انعام ۱۵۰ (ایک سو پچاس) روپیہ کا۔ پہلا انعام پانے والا ڈرامہ یو پیا کے سالانہ جلسہ ۲۸ فروری کے موقع پر اسٹیج کیا جائے گا۔

پتہ:۔ جناب حامد اللہ ندوی، یو پیا اسٹوڈنس سرکل۔ انجمن الاسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲، ڈی، اداراڈ بمبئی ۱

کرشن چندر کو آٹھ ہزار روپیہ کا انعام

نئی دہلی ۱۴ نومبر کو سوویت لینڈ نہرو انعام کمیٹی نے ۱۹۶۶ء کے انعامات کا اعلان کر دیا۔

اردو کے مشہور و ممتاز افسانہ نگار کرشن چندر کو سوویت زندگی کے بارے میں مختصر کہانیوں، انسان دوستی اور امن عالم کے موضوعات پر لکھنے کے سلسلے میں آٹھ ہزار روپیہ کا انعام دیا گیا۔

آہ استاد انوار حسین خاں خمار

بمبئی۔ ۱۶ نومبر کی شب کو بمبئی اسپتال میں ماہر موسیقی استاد انوار حسین خاں خمار (اترولوی) کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم آگرہ گھرانے کے مشہور و ممتاز موسیقار تھے۔ آل انڈیا ریڈیو سے اکثر ان کے پروگرام نشر ہوتے تھے۔ وہ ایک اچھے اور رچے ہوئے مشق شاعر بھی تھے اور علامہ نیساب مرحوم کے شاگرد تھے۔ وہ عرصہ دراز سے دمہ کے مرض میں مبتلا تھے۔ لیکن پتہ کا ایک بڑا آپریشن ان کی موت کا سبب ہوا۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور چار معصوم بچے چھوڑے ہیں۔

راجستھان ساہتیہ اکیڈمی کے ادبی انعامات

راجستھان ساہتیہ اکیڈمی اودے پور کی جانب سے حسب ذیل ادیبوں کو ۱۹۶۵-۶۶ء کی انعامی اسکیم کے تحت ان کی مندرجہ ذیل تصانیف پر پانچ پانچ سو روپے کے انعامات سے نوازا گیا ہے، ہر سال اکیڈمی راجستھان کے منہدی راجستھانی، سنسکرت اور اردو کے ادیبوں کو ان کی بہترین تصانیف پر انعامات دینے کا اعلان کرتی ہے۔

۱۔ ڈاکٹر گوردھن لال شرما کو ہندی تنقید کے تحت ان کی مطبوعہ کتاب "ڈنگل ساہتیہ" پر۔

۲۔ شری نرسنگھ راج پروہت کو راجستھانی افسانوں کے تحت ان کی غیر مطبوعہ کتاب "رویالی راجاں" پر۔

۳۔ شری پدم شاستری کو سنسکرت شاعری کے تحت ان کی غیر مطبوعہ کتاب "سورا بھیم" پر۔

۴۔ شری مہیندر اللہ خاں کو اردو انعام کے تحت ان کی غیر مطبوعہ کتاب "جیتیں گے ہم تنہ والے" پر۔

پبلشر ایڈیٹر مالک: عبدالصمد قریشی نے یونیورسل فائن آرٹ پریس ۲۳ ڈی اسٹریچن روڈ بمبئی ۱ میں چھپوا کر شائع کیا۔

پتے میں شہر کے بعد
زون نمبر
ضرور لکھیں

تیزی کے ساتھ خط وغیرہ چھانٹنے اور پہنچانے
کی غرض سے بڑے قصبوں کو عام طور پر زونوں
میں بانٹ دیا جاتا ہے۔
براہِ مہربانی پتے میں شہر کے بعد زون نمبر
ضرور لکھیں۔
نیز اپنے پتے میں زون نمبر کا خانہ بھر لیں

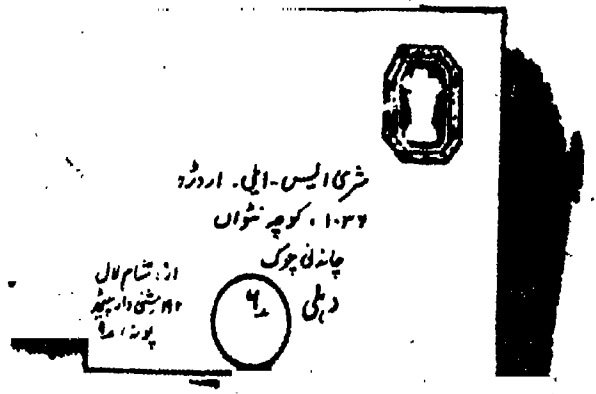

زون نمبر
سے پتہ پورا ہوتا ہے
ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے

بھارتی محکمۂ ڈاک و تار

بہت بہت سستا یہ
عزیز قارئین کا

ہندرُوس دوستی کے باتصویر پندرہ روزہ رسالہ

سوویت لینڈ

کی گرم جوشی کے ساتھ خریداری پر

"سوویت لینڈ"
اپنے چندے کی شرح میں (ایک محدود مدّت کے لئے) رعایت کا اعلان کرتا ہے

انگریزی ایڈیشن		دیگر زبانیں
۶ رُوپے	سالانہ	۵ رُوپے
۱۲ رُوپے	۳ سال کے لئے	۱۰ رُوپے

خریداری کی تجدید کرانے والوں کو خصوصی رعایت

۵ رُوپے	سالانہ	۴ رُوپے
۱۱ رُوپے	۳ سال کے لئے	۹ رُوپے

(تجدید صرف اُس وقت کی جائے گی جب آپ وہ ریپر بھیجیں گے جس میں لپیٹ کر آپ کو سوویت لینڈ بھیجا جاتا ہے)

نئے خریداروں کیلئے سوویت لینڈ کے تحفے

- تمام خریداروں کے لئے ۱۹۶۷ء کا ۱۳ صفحات کا خوبصورت کئی رنگوں والا کیلنڈر
- تین سال کے لئے خریدار بننے والوں کو کیلنڈر کے علاوہ ۱۹۶۷ء کی سوویت لینڈ ڈائری

(انجنٹ حضرات جن تحفوں کی پیشکش کرتے ہیں اُن کے لئے سوویت لینڈ ذمہ دار نہ ہوگا)

- سوویت لینڈ کی درخواست ہے کہ آپ ایجنٹ سے اتھارٹی لیٹر طلب کریں۔
- مہربانی کر کے صرف اصلی رسیدیں لے کر ہی چندہ ادا کیجئے۔
- براہِ کرم صرف مہاراشٹر اور گجرات کے ایجنٹوں ہی کو چندہ دیجئے۔
- اطمینان کر لیجئے کہ نقلی ایجنٹوں اور دلالوں میں آپ نہ پھنس جائیں۔

آپ اپنا چندہ ہمارے مسلّمہ ایجنٹوں کو دے سکتے ہیں یا براہِ راست ہمارے دفتر کو بھیج سکتے ہیں

"پیراڈائز"

۵۱۔ ایل۔ بھولا بھائی دیسائی روڈ۔ بمبئی ۲۶

ماہنامہ ۔ شاعر بمبئی ـــــ فخر و مسرت کے ساتھ

فروری ۱۹۶۷ء میں

اُردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار

کرشن چندر پر

کرشن چندر نمبر میں خود
کرشن چندر
کے اپنے قلم سے
ایک تازہ، غیر مطبوعہ اور شاہکار نئے
ناول
کے علاوہ
تین تازہ کہانیاں ۔ ایک ڈرامہ
ایک مزاحیہ ۔ میرے ادبی نظریات
میرے تنقید نگار
میری ادبی زندگی کا آغاز و انجام
کرشن چندر
کے شب و روز
(تصاویر کے ذریعہ)
اور عکس تحریر
کرشن چندر کے اہم
خطوط

ہنایت ضخیم، شاندار اور مثالی نمبر پیش کر رہا ہے
کرشن چندر کی منفرد شخصیت اور اُسکے ہمہ گیر فن پر نہ صرف ہندوستان
اور پاکستان کے اُردو ادیبوں بلکہ مراٹھی، گجراتی، بنگالی زبانوں کے
مشہور قلمکاروں، نیز دنیا کی مختلف زبانوں کے ایک تہائی سے زیادہ
مصنفین و مفکرین کے مضامین و تاثرات

کرشن چندر نمبر

چھ سو صفحات سے زیادہ کی ایک عظیم، منفرد اور حسین، خصوصی شاعت
فوٹو آفسٹ کی ۲۴ صفحات پر یادگار تصاویر
قیمت ـــــ دس روپے

کرشن چندر کی ادبی زندگی کی لافانی تاریخ، اُن کی عظمت کی کہانی، اُن کی تصانیف کا جائزہ، اُن کے زندہ اسلوب فکر
اور شاہکار افسانوں، ناولوں اور ڈراموں پر تنقیدی نظریے

ایجنٹوں کے آرڈرس پہلے سے آنے چاہئیں۔ بعد میں تعمیل نہ ہو گی
پاکستان کے ایجنٹ اور اہل ذوق حضرات ذیل کے پتہ سے کرشن چندر نمبر حاصل کر سکتے ہیں
مانٹرز امپوریم۔ خورشید بلڈنگ سر فیروز شاہ مہتہ روڈ۔ بمبئی ۱
منیجر شاعر ـــــ مکتبہ قمر الادب پوسٹ بکس ۵۲۶ بمبئی ۱ بی آر

"کرشن چندر نمبر" کے سلسلے میں

"شاعر" کے خریداروں اور ایجنٹوں سے ضروری گذارشات

خریداروں سے

۱۔ کرشن چندر نمبر کی قیمت دس روپے مقرر کی گئی ہے۔ چونکہ آٹھ روپے سالانہ چندے میں گیارہ عام شماروں کے علاوہ اتنی ضخیم اور قیمتی اشاعت مفت نہیں دی جا سکتی اور نہ یہ مناسب ہے کہ "شاعر" کے مستقل خریداروں سے اس شمارہ خاص نمبر کی پوری قیمت لی جائے۔ اس لئے تمام خریداروں کو صرف چار روپے میں یہ بیش قیمت خاص اشاعت پیش کی جائے گی اور اس کے لئے چھ روپے کی بھاری رعایت ہوگی۔

۲۔ کسی خریدار کو "کرشن چندر نمبر" کا وی۔پی نہیں بھیجا جائے گا۔ یہ ضخیم نمبر تمام نئے اور پرانے خریداروں کو رجسٹری کے ذریعہ بھیجا جائے گا۔

۳۔ ہر خریدار کے لئے "کرشن چندر نمبر" کی رعایتی قیمت چار روپے اور رجسٹری خرچ پچپن پیسے (۵۵-۱۲) منی آرڈر سے بھیجنے ضروری ہیں۔ خریداروں کی آسانی کے لئے اس اعلان کے ساتھ "منی آرڈر فارم" بھیجا جا رہا ہے۔ منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر اپنا پتا صاف صاف لکھ دیجئے۔

۴۔ جن خریداروں کے چندہ دسمبر ۱۹۶۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہے ہیں یا جنوری ۱۹۶۷ء کے شمارہ کے ساتھ ختم ہوں گے۔ وہ سالانہ چندہ آٹھ روپے اور "کرشن چندر نمبر" کی رعایتی قیمت چار روپے (مع رجسٹری خرچ) کل بارہ روپے پچپن پیسے (۵۵-۱۲) کا منی آرڈر بھیجیں۔

۵۔ جو خریدار کرشن چندر نمبر کی رعایتی قیمت اور رجسٹری خرچ نہیں بھیجیں گے انھیں یہ نمبر نہیں بھیجا جائے گا

۶۔ جن خریداروں کی طرف ایک سال یا اس سے زیادہ کا چندہ باقی ہے انکو بھی کرشن چندر نمبر نہیں بھیجا جائے گا۔ تاوقتیکہ وہ بقایا نہ بھیجدیں۔

ایجنٹوں سے

۱۔ تمام پرانے اور نئے ایجنٹوں کو "کرشن چندر نمبر" کی مطلوبہ کاپیاں سواری گاڑی سے بھیجی جائیں گی اور ریلوے رسید وی پی کے ذریعہ۔

۲۔ تمام ایجنٹوں کے لئے "کرشن چندر نمبر" کی مطلوبہ کاپیوں کی مجموعی رقم کا پہلا حصہ پیشگی بھیجنا لازمی اور ضروری ہے۔

۳۔ کسی ایجنٹ کو ۲۵ فی صد کمیشن سے زیادہ کمیشن نہیں دی جائے گی۔

۴۔ کسی ایجنٹ کو زائد قیمت پر کرشن چندر نمبر فروخت کرنے کی اجازت نہ ہوگی

۵۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۷ء کے بعد کسی ایجنٹ کا کوئی آرڈر قبول نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ ہر ایجنٹ اپنے آرڈر کے ساتھ یہ اطلاع بھی دے کہ اُسے "کرشن چندر نمبر" کے کتنے پوسٹر بھیجے جائیں۔

مدتِ خریداری ختم ہونے کی اطلاع

اس سیاہ حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سال خریداری دسمبر ۱۹۶۶ء کے اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ آپ کی خدمت میں جنوری ۱۹۶۷ء کا "شاعر" نئے سال کے لئے روانہ کیا جائے گا۔ وی پی بھیجا جائے گا۔ یا آپ سالانہ چندے کی رقم مبلغ آٹھ روپے، مع کرشن چندر نمبر کی رعایتی قیمت چار روپے اور رجسٹری خرچ پچپن پیسے، ذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیجئے۔ اگر تجدید خریداری منظور نہ ہو تو اس ایک خط سے دفتر کو اطلاع دے دیجئے تاکہ [illegible] جا سکے۔ یاد رہے سالانہ چندہ کا بھیجا جانا

اردو کا بیسویں سال علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

نشیب

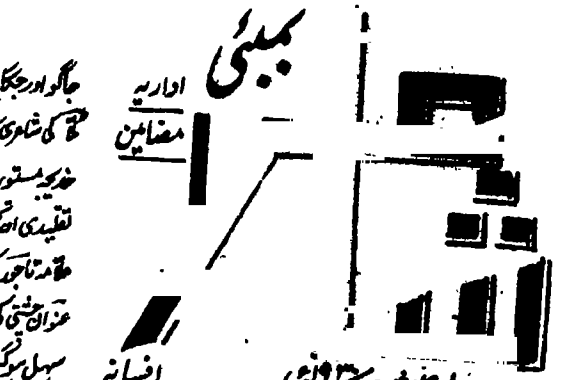

بمبئی

(جاری شدہ ۱۹۳۰ء)

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

شمارہ - ۱۲

دسمبر ۱۹۶۶ء

جلد ——— ۳۷

ادارہ

اعجاز صدیقی

مہندر ناتھ

سرپرستانہ - آٹھ روپے
معاونین کے - پچیس روپے
تاعمر خریداری - ۱۲۵ روپے
ممالک غیر کے - ۲۰ شلنگ

فی پرچہ آنے ۱۲

دہلی آفس
۱۱۰ - بلیماران - دہلی ۶

کلکتہ آفس
۲ کالگریس گارڈن روڈ - کلکتہ ۱۷

ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ شاعر، قصر الادب بمبئی ۸ بی سی
خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ قصر الادب
پوسٹ بکس ۲۵۲۱ بمبئی ۸ بی سی

اداریہ — جاگو اور جگاؤ —! — ۸ — اعجاز صدیقی
مضامین — غالب کی شاعری کا ایک پہلو — ۱۰ — قمر اعظم ہاشمی
خدیجہ مستور اور آنگن — ۲۱ — علی حیدر ملک
تنقیدی اور تحلیقی شاعری — ۲۴ — بشر نواز
علامہ ناجور کی صحافتی زندگی — ۴۲ — مناظر عاشق ہرگانوی
عنوان چشتی کی شاعری — ۴۷ — انور صدیقی
افسانہ — سہل ہو گئیں منزلیں — ۱۷ — فیض الحسن
نظمیں — ہم قلم کے پاسبان — ۱۵ — رفعت سروش
بہارے لمحے — ۲۳ — یوسف اقبال
سوگ — ۴۶ — رؤف خلش
پگھلتی ساعتیں — ۵۶ — حسن فرخ
جائزے — ۵۶ — رونق دکنی
ملاقات — گرد نمبر ۲۳۴ — ۳۷ — آغا رشید زادہلوی
بحث — نئی شاعری کے ذمہ دار — ۶۲ — عتیق حسنی
ڈرامہ — چارہ گر — ۵۷ — جمیل الدین
خطوط — نیاز فتحپوری خطوط کے آئینے میں — ۵۱ — ضیا حسن
غزلیں — ماہر القادری — ۹ — ۱۶ — ضیا فتح آبادی
پروین شاکر — ۲۰ — ۳۶ — عبدالکریم ثمر
کرشن موہن — ۴۱ — حرمت الاکرام
محسن زیدی — ۵۰ — ہنسکی پرتاب گڈھی
عبدالقرب صدا — ۶۳ — علقمہ شبلی

مکتوبات — عنوان چشتی ... بدیع الزماں خاور — عظیم اقبال
عروج احمد عروج ... وہاب دانش ... شمیم ہاشمی
ڈاکٹر عبدالعلیم انصاری ... آلام جاوید

تبصرے — محفل اپنی — ۷۰ — ادارہ
نقد و نظر — ۷۱ — ادارہ
رفتار — ۷۳ — ادارہ

خبرنامہ

جاگو اور جگاؤ ــــ!

پچھلے دو تین سال سے ہر لمحہ یہ توقع پیدا ہوتی رہی ہے کہ اب مظلوم اردو کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ کبھی یہ فیصلہ پنڈت جواہر لال نہرو کی موت کے سبب رکا۔ کبھی چین کی جنگ حیلہ بن گئی اور کبھی پاکستان سے ٹکراؤ اور ملک کا دفاعی پروگرام حاوی آگیا۔ اب الیکشن سے چند ماہ پہلے پھر ایک شوشا اٹھا تھا۔ مرکز میں بھی، بہار اور اتر پردیش کی ریاستوں میں بھی۔ بھوک ہڑتالیں ہوئیں، پارلیمنٹ کے ممبروں نے احتجاج کیا۔ وفود وزراء سے ملے۔ صدر کانگریس فری کامراج کے سامنے جاکر دہائی دی۔ اس سے بھی آگے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن کی خدمت میں پھر سب کچھ عرض کیا اور پچھلے دنوں یہ خبریں گرم رہیں کہ چند ریاستوں میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لئے اب صدر جمہوریہ اپنا فرمان جاری کرنے ہی والے ہیں۔

کہاں ہے صدر جمہوریہ کا فرمان؟

اب کوئی یہ سوچنے اور پوچھنے والا نہیں ہے کہ صدر محترم جو فرمان جاری کرنے والے تھے۔ وہ کہاں گیا؟ "اردو رکشا" کے لئے کی گئی ہڑتال اور بھوک ہڑتال اور بعض دوسرے مطالبات کے سلسلے میں کی گئی بھوک ہڑتالوں اور احتجاجی اقدامات نے حکمراں طبقے کو کہاں تک متوجہ کیا۔ اور مطالبات پر متوجہ ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اردو ہندوستان کی عظیم قومی زبان جس میں ملک کی بے شمار مذہبی کتابیں بھی تصنیف و تالیف ہیں۔ جس میں قومی لیڈروں کے مرثیے ہیں، جس نے آزادی کی جنگ جتوائی۔ جس نے ہندو اور پاکستان کی جنگ میں زبردست قومی رول ادا کیا۔ جو ایک عظیم ادب رکھتی ہے وہ زبان جو تقسیم سے پہلے پورے ملک کی زبان تھی۔ گاندھی جی کی زبان، ہندو کی زبان، ڈاکٹر راجندر پرشاد کی زبان، مگر ہمارے سیاست دانوں اور حکمرانوں کی نظر میں اس کا درجہ جانوروں کے برابر بھی نہیں۔ اس روشنی، آگہی اور ترقی پسند زمانے میں یہ اندھیر اور ظلم زبانوں کے لئے قوانین بنانے والے خود قانون شکنی پر آمادہ ہیں؟!

کوئی وجہ نہیں کہ اردو والے اب یہ یقین نہ کریں کہ حکمران جماعتوں کی نیت صاف نہیں ہے اور چاہتے کہ اردو کے حقوق کیلئے اردو کے شیدائی کتنا ہی احتجاج کیوں نہ کریں، نہ ریاستی حکومتیں کچھ کریں گی اور نہ مرکز اپنے اختیارات سے کام لے گا۔ وعدوں اور دعوہ خلافیوں کی کوئی حد بھی تو ہو۔ حکومت اتر پردیش نے اردو تعلیم کے لئے ایک اعلان کیا ہے۔ لیکن اس سے اردو کی سرکاری اور ثانوی حیثیت تو متعین نہیں ہوتی۔

ہم نے کئی مہینے پہلے عرض کیا تھا کہ اردو والوں کو اس ہونے والے عام چناؤ (الیکشن) میں سخت تر رویہ اختیار کرنا چاہئے، اردو کے پلیٹ فارم سے آزاد امیدواروں کو پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں بھیجنا چاہئے۔ مگر سے اب تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ سب اردو جماعتیں اپنی ڈفلیاں الگ الگ بجا کر رہ گئیں۔ نتیجہ میں یہ الگ الگ بکھری ہوئی کمزور آوازیں کوئی اثر پیدا نہ کر سکیں۔

اب بھی وقت ہے کہ اردو والے جاگ جائیں۔ الیکشن میں کم و بیش دو مہینے باقی رہ گئے ہیں۔ اگر ہم اردو والوں میں اردو کا ذرا سا درد، غیرت اور حمیت ہے تو اب مقاطعہ کی پالیسی اپنائیں۔ ہندوستان بھر سے الیکشن کے لئے کھڑے ہونے والے امیدواروں میں سے کسی امیدوار کو بھی ووٹ نہ دیں۔ اردو جاننے والوں کے ووٹ کسی طرح آٹھ کروڑ سے کم نہیں ہیں۔ ہر شہر میں پوسٹروں کے ذریعہ الیکشن کی آخری گھڑی تک اور تمام اردو اخبارات کے ذریعہ بھی حروف میں یہ اعلان کرتے رہنا چاہئے کہ آٹھ کروڑ اردو جاننے والے، الیکشن میں کسی کو اپنا ووٹ نہیں دیں گے۔ تاوقتیکہ اردو کو سرکاری درجہ نہ دیا جائے۔

اردو کے "ووٹرز" بہت بڑی طاقت ہیں۔ کاش انہیں اس کا احساس ہو۔ اور کاش اردو کے بڑے اخبارات۔ پرتاپ۔ ملاپ۔ قومی آواز۔ الجمعیۃ۔ انقلاب۔ دعوت۔ اردو ٹائمز۔ بلٹز اردو۔ سیاست۔ ساتھی۔ ہمارا زبان۔ ہمدرد جدید۔ افکار وغیرہ اس طرف متوجہ ہوں۔ پریس بھی کسی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے بہت بڑی طاقت ہوتا ہے۔ ۱۳ دسمبر ۶۶ء

عزیز قیسی

ماہر القادری

غزل

کچھ دن سے دل میں اب ہوسِ خام بھی نہیں
اس بُت کدے کو حاجتِ اصنام بھی نہیں

ایمان اور کشمکشِ جبر و اختیار
آزاد بھی نہیں ہے، تہِ دام بھی نہیں

اے دل ادب، کہ پُرسشِ غم کو وہ آئے ہیں
شکوے شکایتوں کا یہ ہنگام بھی نہیں

اے دوست! احتیاطِ محبّت کی داد دے
فریاد کر رہا ہوں، ترا نام بھی نہیں

اے اہلِ تاج و تخت! یہ طغیانِ کبر و ناز
تم کو خیالِ گردشِ ایّام بھی نہیں

منزل ہے دُور اور مسافر کا ہے یہ حال
طاقت بقدرِ زحمتِ یک گام بھی نہیں

رندی و تشنگی کا یہ اللہ رے غرور
ساقی سے اب معاملۂ جام بھی نہیں

ماہر میں اپنی ذات سے جو کچھ ہوں ٹھیک ہوں
غالب نہیں ہوں، حافظ و خیام بھی نہیں

محمد اظہر ہاشمی

مُلّا کی شاعری کا ایک پہلو

فن کار اور فطرت کا تعلق بہت مضبوط اور مربوط ہے۔ فنکار فطرت کے مناظر سے مشاہدہ یا تجربہ کے ذریعہ جو معلومات فراہم کرتا ہے انہیں اظہار و انتخاب کے بعد بہ طرز احسن اظہار و بیان کا جامہ بخشتا ہے۔ فن کار مرحلۂ تخلیق احساس سے شروع ہوتا ہے اور جذبہ و فکر اور تخیل و وجدان اور شعور کی خندقوں سے گذرتا ہوا اظہار و ابلاغ پر ختم ہوتا ہے۔ حقیقت سے تخیل فن کے ان تمام مرحلوں کے درمیان فنکار کئی دنیاؤں سے گذرتا ہے۔ ایک ایک پل میں صدیاں سمٹ آتی ہیں۔ کبھی وہ ماضی کی شاہراہوں پر دوڑتا ہے کبھی نامعلوم مستقبل کی سیر و تماشا کے دریچوں سے جھانکتا ہے اور کبھی زمان و مکان کی حدود سے آزاد ہو کر تخلیق کی وادیوں میں پرواز کرتا ہے اور وہاں تک پہنچتا ہے جہاں فرشتوں کے پر بھی جلتے ہیں اور جانے کا اشارہ ہوتا ہے اور کبھی اس عالم آب و گل کی وہ تاریک وادیاں اس کی نگاہ ڈھونڈتی ہیں جہاں ظلمت و شر کا راج ہوتا ہے۔ جب تک فن جلوہ گہہ عام پر نہیں آجاتا، فن کار کا وجود ایک شدید اضطراب و اور ہنگامۂ و شر سے دوچار ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ فنکاری چاند پر گھر بنانے سے بھی زیادہ مشکل ہے، فنکارانہ کامیابی کی منزلوں سے گذرنے کیلئے ادیب صلاحیت و شخصیت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ایک کامیاب اور عظیم فنکار ایک عظیم اور مکمل انسان ہوتو بڑی بات ہے، ایسا انسان جس میں کسی طرح کی کمی نہ ہو، جو انسانیت اور روحانیت کے رموز سے آگاہ ہو اور سماجی مسلکوں سے بھی، فکری، جذباتی اور نفسیاتی لحاظ سے اسکے اندر کوئی خلا نہ ہو، ہر حیثیت سے مکمل اور صحت مند انسان، فنکارانہ کردار تعمیر بہت بلند ہوگا، اور اسی لئے ایسا فنکار جو کسی نظریہ کا علمبردار کسی نظام حیات کا مبلغ کسی تحریک کا مقلد کسی رجحان فکر کا ستائشگر یا مصلح نہیں ہوتا۔ وہ کلاسیکی، غیر کلاسیکی، رومانی، حقیقت پسندی، اشتراکی، نفسیاتی، روحانی، تعمیری، اصلاحی اور جمالیاتی نیز دوسرے تمام نظریاتی گروہ بندیوں سے محفوظ و مامون ہوتا ہے وہ ایک سچا۔ صالح اور باشعور ادیب کے فرائض سے آگاہ ہوتا ہے اور ان سے عہدہ برا ہونے کی مخلصانہ کوشش کرتا ہے، بے شبہ ایسے فنکار کم ہیں اور ہر زمانے میں کم رہا کئے ہیں۔

گذشتہ چند برس کے اندر خاص طور پر اردو شاعری کو نظریات اور ان کے تصادم نے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ زیادہ تر شعراء فنکار کی حیثیت سے کم کسی نہ کسی نظریہ کے تبلیغ کی حیثیت سے زیادہ سامنے آئے ہیں، جذبات بین و بکا، خود پرستی، نفس، انا، اپنی اور کسی دوسرے شخص یا طبقہ کی فراوانی ہوگئی ہے، فنکار کے کیا کہنے ہیں؟ اور اسے کہیں کون ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا ہے، اس کا احساس کم ہوگیا ہے۔ افسانہ، نظم، غزل، مضمون میں فن کی عظمت اور عظمت کے گیت گائے جاتے ہیں، اور خود انہیں فنکاروں کے دامن صنف سماج برائیوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ ہم اتنے سیدھے سادے اور بھولے بھالے ہیں کہ لمبا لمبا قوقات خود کو غلط تسلیاں دے کر بڑے خلوص سے چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ ایک مٹتے ہوئے کلچر کا نشان ہو، مگر بہرحال میں بعض شخصیتیں ایسی ہیں جن کے فکر و فن سے ہمارا خلوص اور اعتماد وابستہ ہے، جنہیں ہم مخلص فنکار کہتے ہیں اور جن کا فن ہمیں زندگی پر گندگی نہیں، سکون و مسرت دیتا ہے۔ ایسی ہی شخصیتوں میں ایک شخصیت پنڈت آنند نرائن ملا کی ہے۔ موجودہ قدر کے ایسے شعراء میں جو مکمل انسان بھی ہیں اور پورے فنکار بھی، ان میں ایک جناب ملا بھی ہیں۔ پنڈت آنند نرائن ملا ہندوستان کی اس زبان کے شاعر ہیں، جو قومی اتحاد جذبات کی ہم آہنگی کی واحد ضامن ہے اور خود وہ ایک ایسا فنکار ہیں جس کے نام پنڈت بھی ہے اور ملا بھی، میں ذیل کی سطور میں میری حیثیت عرفی پر نہیں ان کی مذہبی حیثیت میں ان کی شاعری کے ایک

پہلو کی رعنائی سے لطف اندوز ہوگا۔

فن کار کی مختلف شخصیت کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اُسے مکمل انسان ہونا چاہیے۔ ایسا فنکار ہمیشہ رنگ، نسل، مذہب اور فرقہ کے تعصبات سے بلند ہو کر انسانیت کی فلاح و بہبود کی فکر کرے گا۔ بشریت کے قدروں پر نظر رکھے گا۔ اُن قدروں کا محافظ ہوگا جو سارے انسانی آرام کیلئے تسکین و نشاط کا سبب ہوتی ہیں۔ خوبصورت جن موصوف کہتے ہیں "میں تو اُس فنکار کو عظیم فنکار سمجھتا ہوں جو نوعِ انسانی کی اس کرب انسان درد و غم سے اور اُس کے مکمل علم اور احساس ہونے کے باوجود اُس کی ذات میں اتنا توازن اور اُس کے فن میں اتنی سکت ہو کہ وہ اس زہر کو امرت بنا کر پی جائے، اپنے دل و دماغ کی معصومیت، تازگی اور حسن کو برقرار رکھے اور پھر دانائی کی چوٹیوں سے کل نوعِ انساں کو جسمیں گمراہ انسان شامل ہوں ایک نئے معصوم کے میٹھے اور سریلے بولوں میں پکارے اور منزلِ انسانیت کی طرف قدم بڑھانے کا پیغام دے۔ اجتماعی مسئلوں کے اسی احساس کی ترجمانی شعرا نے کی ہے۔

اپنا ہی غم فقط ہو تو ممکن ہے جھیل لیں ۔۔۔ ہم ایک جہاں کے درد پہ تڑپے جاتے ہیں
خیر کے دھوپ کی اشک جدا ماں ہونا ! ۔۔۔ یہی معراجِ بشر ہے یہی انساں ہونا

تاریخِ بشر کی کہانی فانی صاحب کی زبانی سنیئے ؎

تاریخِ بشر بس اتنے ہے ہر دور میں کچھ ہے اس نے صنم ۔۔۔ جب آئے نئے بت پیش نظر اصنام پرانے توڑ دیئے

جدید سادگی، متانت اور خلوص کے ساتھ ایک صدی پرانی حقیقت کا اظہار ہے۔ مذہبوں کے اصنام ہوں یا نظریوں کے پتھروں کے احکام ہوں یا حیاتی جاگتی شخصیتوں کے انسان نے ہمیشہ پتھر توڑے ہیں، بت توڑے ہیں۔ تازہ تراشیدہ مورتوں، رائج الوقت سکوں، نئی تحریکوں اور برسرِ اقتدار افراد کی پوجا کی ہے۔ شاعر موجودہ حالات سے نامطمئن ہے، وہ ایک ایسے سماجی نظام کی تعمیر کا خواہاں ہے جس میں انسان انسان کے حقوق کی نگہبانی کرے اور ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی کی ذمہ داری کی اہمیت کو سمجھے، ہر ایک کا دل ایک دوسرے کی محبت کے احساسات سے سرشار ہو، انسان کو کسی انسان سے شکوہ و شکایت کا موقع نہ ملے۔ فانی صاحب نے اپنے جذبہ کی شدت کو اس طرح واضح کیا ہے۔

بشر کو سانس لینا بھی کہیں مشکل نہ ہو جائے ۔۔۔ کچھ اتنی آج زہریلی فضائیں ہو رہی ہیں

اُن کو شکوہ ہے کہ ؎

ہر سو وہ ہراس و دہشت ہے انہوں کو بھی انساں بھول گئے ۔۔۔ دل رسمِ محبت بھول گئے شاعرِ غمِ جاناں بھول گئے
وہ قہقہۂ سموم و برق آیا تہذیبِ گلستاں بھول گئے ۔۔۔ وہ خندۂ لبِ گل و کیفِ نسیمِ شبنم بھی
یہ چاکِ گریباں پر افلاں، چاکِ دلِ انساں بھول گئے ۔۔۔ زخمی کی جاں کی فکر نہیں اور جامہ دری پر شور بپا

اُن کی دلی خواہش ہے کہ ؎

ہر قوم سے لیکن ہے اس کا ایک تو سنِ عالمگیر بنا ۔۔۔ اس رنگین قوس کو محرابِ دانش گہہ مستقبل کر دے

لیکن شاعر اپنے اس قیمتی خیال کو خواب کی سطحوں سے آگے نہیں جانے دیتا، کیونکہ ابھی وہ ایک ایسی دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہے جس میں انسانی قدریں پائی جاتی ہوں، دہشت و بربریت اور ظلم و استبداد کا بازار گرم نہ ہو۔ جہاں افراد مطمئن اور مسرور ہوں اور سماج اُسے یہ دنیا نظر نہیں آئی۔ فانی صاحب کی ایک نظم بعنوان "میری دنیا" پیشِ نظر ہے۔ اس میں کل ۲۹ اشعار ہیں۔ نظم کے دو حصے ہیں پہلے میں ۱۶ اشعار ہیں جن میں انسان کے کردار کی خامیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، شدتِ احساس ملاحظہ فرمائیے ؎

جانا ہے خوف مجھ کو اُن کی عمارتوں سے ۔۔۔ جانا ہے کہ پتا ہے میرا، انساں کی طاقتوں سے
چونے کی جا لہو ہے اینٹیں ہیں ہڈیوں کی ۔۔۔ داغوں پہ ہے بنائے ایوان کا سیاہی
تعمیرِ قصر دولت پر سرمایہ داریاں ہیں ! ۔۔۔ سینچی لہو سے سب تیری کیاریاں حسیں
زیرِ قدم جو آیا کچلے سے کچل ہی ڈالا ! ۔۔۔ پہنچی جہاں بھی گیا تو، اس کو مسل ہی ڈالا

انساں اُتر رہا ہے رسم و زندگی پر تہذیب آگئی ہے حدِ برہنگی پر ....

ان اشعار میں ایک شعور حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے بروجہ دنیا میں جہاں حصولِ اقتدار کی رسہ کشی، جنگ زرگری، غرض پرستی، خود پرستی، اور جذبۂ برتری کا رجحان عام ہے جہاں ہر شعبہ زندگی کو ٹھہر کر جانے کی فکر میں ہے اور تہذیب و تمدن کے نام پر انسانیت کا قتل عام کیا جا رہا ہے اس دلخراش منظر کو دیکھ کر حساس دل انسان کا ذہن بے چین ہو اٹھتا ہے جس کی قوت ارادی کمزور ہوتی ہے۔ یا تو حالات کے آگے سپر ڈال کر زمانہ سازی کو اپنا اصول بنا لیتے ہیں۔ یا زندگی کی بھاگ دوڑ سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشیں ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جن کے فکر و عمل کی توانائی منفرد تر ہوتی ہے ایسی سماجی بدنظمی پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، وہ حالات کے آگے سپر نہیں ڈالتے بلکہ اس کے بالمقابل سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے نظام کے قیام کی خواہش کا اعلان کرتے ہیں جس کی بنیاد انسانیت کے اصول پر رکھی گئی ہو۔ پنڈت آنند زاں تلا کو شکستگی کا احساس تو ہے اور وہ مضطرب بھی ہیں مگر ان کے اندر شکست خوردگی نہیں ملتی۔ وہ ان تمام ناسور یوں کے باوجود ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر کی امید کرتے ہیں

ایک بار دو بگڑ دوں ایسا نظام بھی ہو جس میں ہر ایک میکش صہبا بہ جام بھی ہو
مظلوم کا کلیجہ ستم نہ ڈھونڈ لے ایوانِ شادمانی بنیادِ غم نہ ڈھونڈ لے
انسان خاصیانہ راہوں سے ہٹ چکا ہو پیشانیِ بشر کا تیور پلٹ چکا ہو!
انسانیت کا پودا پھلے پھولے نہ جس ہوا میں دل کا کبھی سانس لینا ممکن ہو جس فضا میں

پنڈت آنند زاں تلا انسانیت کے آلام و مصائب سے پوری طرح آگاہ ہیں، واقعہ یہ ہے کہ فنکار جس سماج اور ماحول میں اپنی زندگی گذارتا ہے وہ خیر و شر سے دامن کش نہیں رہ سکتا، اس مخصوص ماحول کے نیک و بد حالات اُسے بقینی اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ عظیم فنکار فوق البشر ہوتے ہیں جو خیر و شر سے دامن کش نہیں رہ سکتے، وہ انسانیت کی تباہ کن مایوسی کے احساس کو سینے میں چھپائے رکھنے کے باوجود مستقبل پر نظر رکھتے ہیں، ان کا وہ انداز فکر ہے جو ادب کو زندگی بخشتا ہے۔ آفاقی رجحان کو خلق کرتا ہے، لہٰذا ان کا فن خواہ غالب کی غزل کا لہجہ اس کی شکستگی ہو، میکش اور دوسری کی نازِ ہجر و خاص گیت، ان سب کی بے پناہ مقبولیت و شہرت کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان فنکاروں نے زندگی سے جو تجربت حاصل کی، انسان کے اجتماعی الم و فشار کو جو شعوری قوت کے ساتھ محسوس اور اپنی دنیا کے خیر و شر کے درمیان خط تقسیم قائم کر کے انسانیت کی صحت مند قدروں کی وضاحت کی، ان کی ہمہ گیر شہرت و اہمیت کا راز حیات کے تمام سوز و ساز، اور نور و نار کو دستِ عشق کر دینے میں ہے اور کسی نظریہ کی علمبرداری میں۔ اس کی وجہ ان کی وہ عظیم فنکاری جو انسانیت کے سماجی اور فطری تقاضوں کے پیشِ نظر سامنے آئی، عظیم ادیب سارے معاشرے کو کائنات کی حیثیت دیتا ہے، اور وہ انسان برادری کے مسئلوں کو ہر اصول اور نظریہ پر فوقیت دیتا ہے، وہ صحت مند سماج کی تشکیل اور جہانِ تازہ کی تعمیر کا خواہاں تو ہوتا ہے لیکن خود صرف فنکار ہی ہوتا ہے، معمار یا مصلح نہیں بنتا۔ آنند زاں تلا کی ایک نظم "جہاں میں ہوں" کے چند متفرق اشعار ملاحظہ کیجیے۔

وہی حسرت، وہی بوسوں کا تنگ امکاں ہی جہاں میں ہوں وہی انساں وہی دنیائے انساں ہے جہاں میں ہوں
تمنا تیز ہمت پا بجولاں ہے جہاں میں ہوں! مجھے جکڑے ہے زنجیرِ امکاں ہے جہاں میں ہوں
کبھی شاید فرشتہ آدمِ خاکی بھی بن جائے ابھی تو بھیس میں انساں کے شیطانی ہے جہاں میں ہوں
کسی قیمت پہ بھی انسانیت ڈھونڈے نہیں ملتی مگر جنسِ خدائی اب بھی ارزاں ہے جہاں میں ہوں
غرض مندی کی لو جاگم ہے یوں ہر شوالے میں محبت اپنی فطرت پر پشیماں ہے جہاں میں ہوں
ابھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ امیاں! ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے جہاں میں ہوں
مجھے بھی شوقِ آزادی ہے، لیکن کیا کروں اس کو مرے چاروں طرف زنداں ہی زنداں ہے جہاں میں ہوں

انسانیت کے زخم جگر کا یہی وہ شدید احساس ہے جس نے تلا کی شاعری کو امتیازی مقام عطا کیا ہے، قریب قریب ہر شعر میں یہی تلاش و جستجو، بے اعتباری اور اضطراب و ہیجان موجود ہے، اور ایک ایسا جذبۂ تجسس جیسے ایک صالح اور نئی دنیا کی تلاش ہے، بدقسمتی سے ہماری

وہ ایک فکر بنا تنگ ہے۔ چند مخصوص احساسات و جذبات اور کچھ اپنے گنے چنے خیالات و افکار ہیں جو بار بار دہرائے جاتے رہے ہیں، چاہے نسانیت پر بڑی سے بڑی قیامت گذر جائے، دنیا آگ اور خون کے سمندر میں چھلانگ لگا دے یا بشریت معراج کی منزلوں کو طے کر جائے۔ ہمارے یہ شعرا جان تمام انگارہ یا خوش گوار حالات کی موجودگی میں بھی اپنی اشتعال انگیز روش برقرار رکھنے کا گویا تہیہ کر چکے ہیں۔ ۱۵ سال کی عمر کا اور ۶۰ سال کی عمر کا، ہر ایک عمر کا، ایک عام جوان سال حسین محبوب سے اس کا سروکار ضرور ہوگا۔ اردو کے اصلاحیت شعرا کی شخصیتوں کا صحت مند ارتقا بھی ہمیں اسی منزل پر رکتا سا جاتا ہے جس کی وجہ سے شاعری حسن فکر و نظر کی بنیادی توانائیوں سے ایک حد تک محروم ہو جاتی ہے۔ ملا کے یہاں عشق کا تصور بھی ہے اور عشقیہ خیالات و احساسات بھی لیکن وہ غیر صحت مند رجحانات سے اپنا دامن صاف بچا لیجاتے ہیں کیونکہ عشق کو وہ منزل نہیں سمجھتے منزل تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، ایک ایسی شاہراہ جو کچھ دور تک مسافروں کا ساتھ دیتی ہے اور پھر ان کے نزدیک اصل منزل انسانیت کے ارتقا کا آخری زینہ ہے۔ یہی وہ زینہ ہے جہاں کائنات کی تمام لہروں کو مرکز ملتا ہے اور اس منزل تک پہنچنے کیلئے ترقی پسند شاعر کو جن [illegible] ہیں، انسان اس زہر کو شہد سمجھ کر پیتا تھا نہیں ہوتا بلکہ فریب بھی ہوتا ہے۔ ملا صاحب کا خیال ہے کہ انسان ابھی جادہ گمراہی پر ہے، یہ بات اور حقیقت سے قطعی انکار کبھی نہیں کیا جا سکتا ؎

دنیا کے اندھیرے زندانوں سے انساں نے بہت چاہا نکلا — اس غم کی بھول بھلیاں سے باہر کا کوئی رستہ نہ ملا
اہل طاقت بڑھ رہے ہیں بھاری بھاری تیشے لیکر — دیوار پہ دیوار، دیوار پہ دیوار، راہ نہ ملی
پھر کے دیں پڑتا ہے انساں کو باطل پہ ابھی — صدیاں گذریں چلتے چلتے لیکن ہے وہیں کا وہیں

آنند نرائن ملا نے اپنی نظم "جادۂ امن" میں کسی قدر تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، گیارہ بندوں پر مشتمل اس نظم کا ہر بند انسانیت کا قدر و قیمت کا احساس اور موجودہ معاشرے کے زوال آمادہ نظام پر اظہار تاسف ہے۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ عصر حاضر ایک انتہائی جاں گسل تہذیبی، اخلاقی اور سماجی بحران سے گذر رہا ہے، فتنہ و فساد کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ اور خود انسان اپنے [illegible] اپنی روایتی اور ملکی عظمت کی تعمیر کر رہا ہے" جادۂ امن" کے دوسرے بند میں شاعر کہتا ہے ؎

ابھی تو تتلیوں سے ہے قفس کی ساز آشنائی — ابھی تو اس جہاں پہ ہے خدائے جبر حکمراں
بشر کے واسطے نہیں کوئی بھی گوشۂ اماں — ہر اک طرف ہیں ظلمتیں، ہر ایک سمت ہے دھواں
دھوئیں میں لے کے اس کی شمع ضو فشاں بڑھے چلو
علم کئے شہید قوم کا نشاں بڑھے چلو

انسان کی مفاد پرستی، غرض مندی اور بوالہوسی نے دنیا کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور ہر ایک دوسرے سے برسر جنگ ہے اسکی جنگجویانہ فطرت نے سماجی نظام کو درہم برہم کر کے اس کے سکون و امن پر ضرب کاری لگائی ہے جس کے نتیجہ میں۔

لہو سے ہیں عبیث زندگی کی سرخیاں ابھی — پڑا ہوا ہے جنگجو صفوں میں، یہ جہاں ابھی
زمیں کی فوج ہے ابھی سیاہ آسماں ابھی — حسیں افق حیات کا نظر میں ہے نہاں ابھی
ہمیں تو خاک سے لگا آسماں بڑھے چلو
علم کئے شہید قوم کا نشاں بڑھے چلو

ہر طرف غارت گری اور بربادی کا بازار گرم ہے، حد یہ ہے کہ انسان نے فنون لطیفہ میں سے ادب و شعر کا دامن بھی محفوظ نہیں رہنے دیا۔

بدل بدل کے رنگ ابھر رہا ہے فتنہ جہاں — فن و ادب کو بھی ہیں ہیجانی حربے ہیں صدیاں
تحریر ہو رہی ہیں بدلیاں کروٹ رہی ہیں بجلیاں — اور ہر سیاہ اندھیاری میں ہیں سحر کی اندھیاں
ان اندھیروں کے درمیاں ہی نہ سماں بڑھے چلو
علم کئے شہید قوم کا نشاں بڑھے چلو

کہیں مذہب کے نام پر انسانوں کی گردنیں کاٹی جا رہی ہیں کہیں نسل پرستی کے نعرے لگائے جا رہے ہیں کہیں کمیونزم کے رنگ کا مُیلہ پرچم لہرا رہا ہے۔ انسانیت ہر لمحہ حالات کے جانکاہ دباؤ میں پستی چلی جا رہی ہے۔ نظریات کے اختلاف، سیاسیات کے تصادم اور فکر و عمل کے تضادات بڑھتے جاتے ہیں۔ شاعر ان کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

بشر کی اسیر دام دین و نسل و رنگ ہے ۔۔۔ ابھی تو حاصلِ اک نزاعِ زندگی کا جنگ ہے
قدیم حیات پر ابھی بتائے امن تنگ ہے ۔۔۔ ابھی صدائے دوستی پہ ہر طرف سے تنگ ہے

ابھی خصومتیں دلوں میں ہیں جواں بڑھے چلو
علم کئے شہیدِ قوم کا نشاں، بڑھے چلو

ابھی مذاقِ جبر کا وہی ہیں چیرہ دستیاں، ۔۔۔ وہی غرض کے طاق ہیں، وہی ہوس پرستیاں
وہی نشہ غرور کا، وہی سیاہ مستیاں! ۔۔۔ ابھی تو گرد و پیش میں وہی ہیں پستیاں ہی پستیاں

نہاں انہیں میں قوم کی ہیں چوٹیاں بڑھے چلو
علم کئے شہیدِ قوم کا نشاں، بڑھے چلو

انسانیت پر جو جبر و ظلم ڈھائے جا رہے ہیں، ملّا کی شاعری میں اُس کے خلاف ایک طاقت ور صدائے احتجاج صاف طور پر سُنائی دیتی ہے۔ شاعر نئی نوع کی خیر سگالی اور بہتری کے سلسلہ میں نہایت صالح جذبات و احساسات رکھتا ہے وہ چاہتا ہے کہ معاشرے کا موجودہ ڈھانچہ بدل جائے، اُس کی جگہ ایک ایسا نظام وجود میں آئے جس میں اجتماعی بیداریاں ہوں، کوئی شخص دوسرے کے غم سے غیر متعلق نہ ہو، تہذیبِ تمدن کے ایسے نقوش سامنے آئیں جن میں انسانیت کے مزاج اور فطرت کی چھاپ ہو۔ "جادۂ امن" کے علاوہ بیشتر نظمیں اور غزلیں اسی قسم کے مضامین میں انسانیت کے یہی بنیادی مطالبات اور تقاضے ملتے ہیں۔

پختہ آئندہ ترانِ ملّا کی شاعری میں مطالعہ و مشاہدہ کی فراوانی، تجربات کی کثرت، گہری بصیرت اور احساس و جذبہ کی ایک وسیع دنیا ملتی ہے انھوں نے فن کو لاشعور کا ترجمان نہیں بنایا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ لاشعور خواب و خیال کی تاریک وادیوں کی سیر تو کرا سکتا ہے مگر زندگی کی اہم سچائیوں اور توانائیوں کے جوہر سے نقاب نہیں اٹھا سکتا۔ فن سے یہی وقت سابقہ رہتا ہے ملّا کی شاعری میں یہ لاشعور فکر کی جلوہ گری ہے وہ بھرپور علم و اطلاع کے بغیر محض، قیاس کی بنیاد پر لاشعور کی پکار کے سہارے اپنے فن کا کوئی موضوع منتخب نہیں کرتے، ملّا کی شاعری داخلی اور خارجی عناصر کا ایک اشارتی امتزاج پیش کرتی ہے۔ بہتر سے بہتر فن کی پیشکش کیلئے ایک طرف وہ آپ بیتی سے استفادہ کرتے ہیں تو دوسری طرف جگ بیتی پر بھی پوری توجہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو وہ اپنی ذات کے محبس میں اسیر ہیں اور نہ ہیرونی تحریکات کا اثر پذیر ہے۔ ان کے فن کے موضوعات کا دائرہ محض محدود نہیں ہے اُن کی شاعری میں انسانیت کی فلاح و بہبود کا احساس بھی ہے اور اتحاد و بقائے باہم کا رجحان کی ترجمانی بھی۔ وہ وطن پرستی کے جذبات سے بھی سرشار ہیں اور حُسن و عشق کے مسائل سے بھی انہیں دلچسپی ہے اور بقا و فنا کا راز بھی ان پر منکشف ہے مجموعی طور پر بغیر تکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملّا کی شاعری میں شعورِ فن کی صحت مند رووں کی ضیا پاشی ہے۔ اُن کے فن کی فضا میں یاس و حسرت کم، بیم و رجا زیادہ ہے ۔۔۔ فنکارانہ صناعی کے لحاظ سے بھی ملّا ایک اہم مقام رکھتے ہیں فن کو جلوہ گر ہونے کیلئے ذریعہ اظہار منتخب کرنے اور فکر و جذبہ کو الفاظ میں منتقل کرنا کا مرحلہ بڑا آزمائش ہے۔ جب کوئی تجربہ تخلیق کی تمام داخلی منزلوں کو طے کر کے تکمیل کی منزل میں پہونچتا ہے تو فنکار کی ساری خلّاقانہ قوت ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے، وہ اپنے تخلیقی جوہر کی تمام توانائیوں کو سمیٹ کر تخلیقِ فن کے اس آخری مرحلے کو طے کرتا ہے۔ ملّا کی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تخلیق کے ہر مرحلے سے کچھ خوبی گزرنے کی ہر پُر خلوص کوشش کی ہے۔ اُن کے یہاں موضوعات کی کثرت اور تجربہ و فکر کی ندرت ہی نہیں ہے، بہترین فنکاری، صناعی اور حسن کاری بھی موجود ہے مناسب و مؤثر الفاظ کے انتخاب کے ساتھ نئی نئی ترکیبوں کے اختراع، الفاظ کا مناسب اور برجستہ نشست و برخواست، تازہ اور نادر تشبیہ و علامت کے استعمال سے وہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ملّا صاحبِ بیان و زبان پر بھی کافی دسترس رکھتے ہیں اور یہ اُن کے یہاں مجز بیان سبب کم ہے۔ غزل کی دنیا ہو یا نظم کی،

بقیہ صفحہ ( ) پر

پرنسس سروش

"ہم قلم کفن پا سباں ہیں"

مبارک قافلے والو! کہ منزل مسکراتی ہے
کہ روحِ ارتقا اک نغمۂ دلکش سناتی ہے

مبارک تھی وہ ساعت جب چلے تھے سوئے منزل ہم
اندھیری رات میں اک مشعلِ عزم و یقیں لے کر
ہمارے نقشِ پا ہیں سنگِ میلِ ان تیرہ راہوں میں
جہاں سے قافلے مستقبلِ تاباں کے گزریں گے
ہمارا نغمۂ جہد و عمل پرواز کرتا ہے فضاؤں میں
ہمارے شوق کی وسعت
زمین سے آسمان تک ہے
مکاں سے لامکاں تک ہے

عجب تھا دورِ محکومی
غلامی نے ہمیں ذلت کے کانٹوں پر سلایا تھا
کہ ہم تشنہ لبوں کو زہرِ نفرت کا پلایا تھا
بھیانک رات تھی ہر سو اندھیرا تھا جہالت کا
غریبی کا، قدامت کا، تعصب کا، رعونت کا
اندھیرا جس کا ذہنوں پر تسلط تھا
دلوں پر حکمرانی تھی،
اندھیرا جس نے مغرب کو کیا تھا شرق پر حاوی

مگر مشرق کا دل ہے مطلعِ تنویر بیداری
مگر مشرق کا دل ہے شعلۂ احساسِ آزادی
یہ شعلہ رقص میں آیا
قدامت کی لکیروں کا ہوں سے نکلے چھوڑ کر بستر
نئے سورج کے دیوانے

نئی دنیا کے متوالے
غلامی کی اندھیری رات میں برسائے انگارے
وہ انگارے کہ جن سے مشعلوں کی کونپلیں پھوٹیں
ہر اک مشعل بنی پرچم
ہوا پیدا نیا عالم
بغاوت کے "نئے پودے" اُگے انگڑائیاں لیکر
"ترقی" جن کا مسلک تھا
وہ فرزانے اُٹھے سیف و قلم لے کر
بڑھے تیغ و کفن باندھے
کہ دیکھیں زور کتنا بازوئے قاتل میں باقی ہے
نئی کرنیں بڑھیں انگڑائیاں لیکر
کہ دیکھیں رات کب تک ساتھ دیتی ہے مظالم کا

مگر بازوئے قاتل شل ہوئے،
شفق ہو گیا سینہ غلامی کا،
کھنچی تصویرِ آزادی،
ملی تعبیرِ آزادی،
مجسم ہو گئی تنویرِ آزادی،

نیا سورج ہتھیلی پر لئے سیج بہار آئی

اٹھا ہے وقت کے لب پر جو نغمہ شادمانی کا
نحوست کے نشاں باقی تھے کتنے ہی گلشن میں
گلوں کے زرد چہرے تھے لبِ خنداں پہ پہرے تھے
خبر اُن کو نہ تھی ہے کون اپنا، کون بیگانہ
ہزاروں سانپ تھے جو پل رہے تھے آستینوں میں

ضیا فتح آبادی

غزل

ہر اہلِ علم تھا لیکن
وطن کا اپنے پروانہ
لہو کی رُوشنائی سے لکھا عہدِ وفا ہم نے
فنا ہو جا چکے لیکن نشاں اُس کے مٹا نے ہیں
قلم کو آج لڑنا ہے
غریبی سے،
جہالت سے،
تعصب سے،
رعونت سے
قلم ہے برسرِ پیکار دولت کے تسلط سے
قلم انسانیت کے قاتلوں سے برسرِ پیکار ہے اب بھی
وطن کے دشمنوں کے واسطے تلوار ہے اب بھی

رفیقو! ہم قلم کے پاسباں ہیں
اس کے وارث ہیں
امانت ہے ہمارے پاس یہ تہذیبِ عالم کی
اسے لے جائیں گے ہم فکرِ شاعر کی بلندی تک،
زمیں کی جنتِ گل پوش کے ہر ایک گوشے میں،
ہر اک دل کے شوالے اور کعبہ میں

ہمارے شوق کی وسعت
زمیں سے آسماں تک ہے
مکاں سے لامکاں تک ہے

جاتی ہے آسماں سے بھی آگے نظر کہاں
اُن کی خبر ملی تو پھر اپنی خبر کہاں
اُٹھتے ہیں گو منزلِ مقصود خود ہی پاؤں
ڈھونڈے جنوں کدے میں کوئی راہبر کہاں
سیلابِ گریہ، رقصِ شرر، نالۂ سکوت
ہوتی ہے اس طرح شبِ غم مختصر کہاں
یہ پردہ دارِ حُسن وہ غمّازِ رازِ عشق
آنچل ترا کہاں، مرا دامانِ تر کہاں
سجدہ طلب ابھی ہے ترا سنگِ در مگر
تھا شوقِ سجدہ جس کو وہ شوریدہ سر کہاں
گلہائے نو شگفتہ کی رنگینیاں لئے
زنداں میں آگئی ہے نسیمِ سحر کہاں
دن رات بھی وہی، مہ و خورشید بھی وہی
بدلا نظامِ زیست مری موت پر کہاں
طاری دماغِ دل پہ ہے مستی و بے خودی
رندوں کو فکرِ گردشِ شام و سحر کہاں
اب یہ نہ پوچھ میرا دلِ غمزدہ ضیاؔ
زخموں میں ڈھونڈتا ہے دوا کا اثر کہاں

فیض الحسن

سہل ہو گئیں منزلیں

"ڈاکٹر...؟"

"یس کیپٹن؟"

"کیا نسرین کو خبر کر دی گئی تھی۔"

"ہاں... مگر...."

"ہاں، ہاں! کہو ڈاکٹر۔"

"اُن کی شادی ہو گئی اور وہ ہنی مون منانے باہر چلی گئی ہیں۔"

"اوہ...." کیپٹن شہاب کا ہونٹوں سے بھرا سہم لرز اُٹھا۔

"کیپٹن...؟"

"کہو ڈاکٹر۔" کیپٹن شہاب کرایا۔

"کل آپ کی پٹیاں کھول جائیں گی۔"

"اوہ.... تو پھر....؟"

"اس کے بعد آپ ہسپتال سے ڈسچارج کر دیئے جائیں گے۔"

ڈاکٹر نے کیپٹن شہاب کے ہونٹوں پھیرے جسم کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ ہمدردی جذبے کے تحت تھرتھرا رہے تھے۔ "کیا سچ مچ آپ کا اس دنیا میں کوئی رشتہ دار نہیں ہے؟"

"نہیں.... میں بالکل اکیلا ہوں۔"

پھر اچانک ہی کیپٹن شہاب کی یادوں کے دریچے پر کسی کی دستک کی آواز آئی۔ پھر ایک دھندلا سا چہرہ اُبھرا۔ یہ زینت تھی۔

کیپٹن شہاب چیخ پڑا۔ اس کا سر پہلی طرح چکرانے لگا۔ ڈاکٹر بلایا گیا مگر کیپٹن شہاب بے ہوشی کے اندھیروں میں ڈال گیا۔ خدشے پورے ہو چکے تھے۔

آخر کب تک بند ہی اندھیرے ہم بچتا رہتا۔ اُسے ایک دن ٹوٹنا ہی تھا۔ اس ایک ذرا سے شگاف کھلا اور غم کے منبع خود بخود کھل گئے۔ ایک جنگ چھڑ گئی۔ آنسو تھے کہ زینت کی آنکھوں سے برساتی جھرنے کی طرح بہے جا رہے تھے۔ مگر شہاب کو زینت کے ان آنسوؤں کی کب پرواہ تھی۔ وہ تو ان آنسوؤں کو معاً بیچ نگاہوں سے میٹھا دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظروں میں آج اُس کی زندگی کا ایک اہم فیصلہ ہو چکا تھا۔

یعنی شہاب اور زینت کی علیحدگی۔

شہاب کی زندگی میں اور بھی زندگی کی خوشیاں اسی وقت شامل ہو چکی تھیں جب پہلی بار اُس نے اپنے دل میں زوفی کیفیت لئے محلہ سروری میں زینت کا گھونگھٹ اُٹھایا تھا۔ مگر فوراً ہی اُس کے جذبات جلتے ہوئے محسوس ہوتے اور اُسے لگتا جیسے کسی میٹھی چیز کا تصور لئے کوئی کڑوی کسیلی چیز کھا گیا ہو اور وہ کسیلا پن مستقل طور پر اس کے احساس میں رچ سا گیا ہے۔ جب سے شہاب میاں فوج میں بھرتی ہوئے تھے اماں بی کو یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ کسی طرح اس گھر میں ایک چاند سی بہو لے آئیں۔ بہو بغیر گھر کتنا سونا سونا لگتا ہے اور جس گھر میں ہنستے روتے ننھے ننھے معصوم بچے نہ ہوں وہ گھر جہنم سے بھلا کیا کم ہوتا ہوگا۔ وہ اکثر تنہائی میں سوچا کرتیں مگر شہاب میاں اپنی ناک پر مکھی بیٹھنے دیں تب نا؟ ادھر جیسے ہی اماں بی نے اپنی زبان پر شادی کا نام لیا اُدھر شہاب میاں نے جھٹ اپنے کان پر ہاتھ رکھ لیا۔

"ابھی میری شادی کرنے کی عمر ہی کہاں ہوئی ہے امی؟" شہاب میاں اماں بی کے چہرہ پر جواب دیتے۔

"اے لو! تمہیں کی عمر ہوئی۔ اب شادی نہ کرو گے تو کس عمر میں کرو گے۔"

"ارے! آپ بھی تو کہتی ہیں کہ میں آپ کے سامنے ابھی بچہ ہوں، بھلا بچے بھی شادی کرتے ہیں۔؟" اور شہاب میاں بہانے کی طرح گھر سے نکل جایا کرتے اور اماں بی آنسو بھری نگاہوں سے اُن کو دیکھتے رہ جاتیں۔

کی طرف کھینچتی چلی گئی۔ شہاب کی کمی کا احساس اسے پھر گہرائی تک مضمحل کر گیا۔ مگر آج اماں بی کے بھی سوچ لیا تھا کہ وہ شہاب میاں کا ذکر کبھی نہ چھیڑیں گی لیکن اس کی نوبت نہ آنے دیں گی

"بٹیا میں سوچتی ہوں اب تمہاری شادی کر ہی دوں۔"

"کیوں... کیوں!!... میرا قصور؟" شہاب میاں شوخی سے مسکرائے۔

"میں سنجیدہ ہوں۔"

"ہوں..." اماں بی کی سنجیدگی دیکھتے ہوئے شہاب میاں بھی سنجیدہ ہو گئے۔

"میں اب جیند ہی دنوں کی مہمان ہوں۔ اس لئے چاہتی ہوں کہ جلد ہی اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں... زندگی کا کیا ٹھکانہ ہے۔"

اماں بی کی سنجیدگی بدستور قائم رہی۔ اس کے اس جملے پر شہاب میاں ایک انجانے خوف سے لرز اٹھے۔ اور اس نے اس کی بوڑھی آنکھوں میں جھانکا اسے ایسا محسوس ہوا [illegible] کی آنکھیں بھی وہی جملہ دہرا رہی ہیں۔

"بٹیا تم جلد ہی شادی کر لو تاکہ میرے مرنے کے بعد مجھے خلش نہ رہ جائے کہ میں تمہیں کیا چھوڑ آئی ---"

اور شہاب میاں بچل سے گئے۔

"امی میں راضی ہوں... کہیں لڑکی بھی دیکھی ہے۔"

"ہے ..... کہیں لڑکیوں کا کال ہے جو نہیں ملیگی۔"

اماں بی کھل اٹھیں۔

اور ان کے بھریوں سے بھرے چہرے پر ایک انجانی مسرت کا نور سا پھیل گیا۔

"مگر امی... مذا میری پسند کا بھی..." شہاب میاں انتہا کچھاتے ہوئے مسکرائے۔

"اں رے! تیری پسند کا مجھے پورا خیال ہے۔" اماں بی نے آخر ماتا کے جوش میں آکر کہتے ہوئے شہاب کے سر پر ایک دھول جڑ دی بس شہاب کی شریک زندگی کے لئے اتنا ہی کافی تھا، جھٹ اس نے اماں بی کو اپنی بانہوں پر اٹھا لیا اور --- "سوئیٹ ممی... سوئیٹ ممی"..... کہتا ہوا انہیں چکر دینے لگا، مگر جب اماں بی کی پیار بھری دھپا چپت اسے اور نصیب ہو گئیں تو وہ انہیں زمین پر ڈال کر شور مچاتا ہوا رفو چکر ہو گیا۔

"شریر کہیں کے۔" اماں بی زیر لب مسکرائیں اور پھر اونچا چاند سی بہو کے تصور میں کھو گئیں۔

شہاب میاں کی رضامندی سے اماں بی کی بوڑھی رگوں میں جیسے طاقت دوڑ گئی۔ اور ان کی خفیہ کمیسہ گھی ہو کر رہ گئی اور وہ اپنے چہیتے بھانجے مرزا وارث حسین کے یہاں جا پہنچیں، ان کی لڑکی زینت بہت دنوں سے ان کی نظروں میں تھی، سیکنڈ ڈویژن میں ایک ایم اے پاس کر کے کب سے کنواری بیٹھی تھی۔ یہ بھی اماں بی کی خوش قسمتی تھی کہ ابتک زینت کے لئے کوئی لائق لڑکا نہیں مل سکا تھا۔ ورنہ کب کے اس کے ہاتھ پیلے کر دئے گئے ہوتے۔ اور پھر جب اماں بی خود چل کر اپنے بیٹے شہاب کے لئے پیغام لیکر آ گئیں تو مرزا کیونکر انکار کر سکتے تھے اور پھر اگلے دن زینت اماں بی کے گھر دلہن بنکر چلی آئی۔ [illegible] شہنائی گونج اٹھیں، اماں بی کی ذکاوت بھی [illegible] شوخ و شنگ لڑکیاں، اماں بی کی ذکاوت بھی [illegible] شوخ کی تلاش پر لگی لیک کر زینت کے گیت گانے لگیں اور شہاب [illegible] ہوتا ہوا اندر [illegible]

پہنچا۔ دیوں سے مجلس خوبی میں داخل ہوا۔ اور نہ جانے کیوں اماں بی پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر رہ گیا، دلہن کے نقاب رکھ گئے گھر میں کہرام مچ گیا۔ "شہاب کو زینت پسند نہیں ہے۔"

جب اماں بی نے سنا تو ان کا خوشیوں سے تمتماتا ہوا چہرہ یک لخت مرجھا گیا، اور وہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئیں، جہاں شہاب میاں تکیہ سے سر ٹکائے کسی سوچ میں گم تھے چہرے پر کچھ ایسے تھکن کے آثار نمایاں تھے جیسے کوئی جواری اپنا سب کچھ ہار کر بیٹھ گیا ہو یا کوئی تھکا ماندہ مسافر منزل کے قریب پہنچ کر بھی منزل سے دور

"شہاب! میں یہ کیا سن رہی ہوں؟"

"ٹھیک ہی تو سن رہی ہیں آپ...."

"آخر اس میں کونسی خرابی ہے۔؟"

"آپنے اچھی آنکھوں سے دیکھا تھا... میری آنکھوں سے نہیں..... آپ نے اس میں صرف سیرت دیکھی تھی... کیا ہی اچھا ہوتا آپ میری پسند کا خیال رکھتے ہوئے صورت بھی دیکھ لیتیں۔" شہاب میاں کے اس جملہ پر اماں بی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا اور بے اختیار ان کی آنکھیں چھلک اٹھیں، آج پہلی بار شہاب نے انہیں ایسا دو ٹوک سا جواب دیا تھا، پھر اچانک ہی انہیں کچھ خیال آیا، اور وہ دلہن کے کمرے کی طرف لپکیں۔

جب لڑکیاں اپنے بابل کا گھر چھوڑتی ہیں تو نہ جانے کتنے ارمان کو سینے سے لگائے سسرال کی دہلیز پر قدم رکھتی ہیں۔ زینت کا

انہیں اپنا نے دیش کے خوابوں کو اپنے دل میں سجائے مسرت کا لطیف سا احساس لئے مجھ عروسی کی سیج پر گھونگھٹ نکالے شہاب کی منتظر تھی۔ شہاب آیا بھی مگر فوراً ہی زینت کا سینہ جل اٹھا۔ اس کا روم روم سلگ اٹھا۔ اور گھونگھٹ کے اندر سے سسکیاں ابھرنے لگیں۔ جب اماں جی نے نئی نویلی بہو کی یہ حالت دیکھی تو بلبلا گئیں۔ اور چپ چاپ تو جم ہی بھیگی آنکھوں سے زینت کی سسکیاں سنتی رہیں۔

اب تو گھر میں شہاب میاں کے قہقہوں کی جگہ اذیت ناک خاموشیوں نے لے لی۔ جیسے اس گھر کے مکینوں نے بولنا ہی نہ سیکھا ہو۔ اماں جی گھنٹوں سکتے کے عالم میں بیٹھی ایک ٹک خلاؤں میں گھورتی ہوئی نہ جانے کیا کیا سوچا کرتیں۔ انھوں نے کئی بار شہاب میاں کو سمجھانا بھی چاہا مگر شہاب نے تو جیسے زینت سے نہ ملنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ ایک دم سٹپٹا کر اٹھتا اور اماں جی انہیں سامنے کرکے رہ جاتیں۔ اور جب وہ زینت کے چہرے پر نظر ڈالتیں تو اٹھتیں۔ زرد چہرہ، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ جیسے برسوں کی بیمار نظر آرہی ہو۔ کتنے ارمانوں سے وہ زینت کو اپنے گھر میں بہو بنا کر لائی تھیں۔ ابھی تو ہاتھوں کی مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی تھی اور یہ بیوگی کا لباس؟ اماں جی سوچ سوچ کر رو دیتیں مگر شہاب زینت کی طرف سے بالکل انجان بن گیا تھا۔

اور پھر ایک دن اماں جی گھر کی اس خاموش تلخیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کسی انجانے دیش میں ابدی سکون کی تلاش میں چلی گئیں۔ گھر گھر کے وہ تنہا وہی رہے۔

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں....." آخر زینت نے ایک دن شہاب کا راستہ روک ہی لیا، کیونکہ اس نے سن لیا تھا کہ شہاب دوسری شادی کی فکر میں ہے۔

"ہوں.... کہو....." شہاب غرایا۔

"آپ پر میرا بھی حق ہے... کیا میں یونہی....." زینت کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"تم چاہو تو مجھ سے الگ رہ سکتی ہو.... مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"کیا میں نے اسی طرح گھٹ گھٹ کر مرنے کے لئے اس گھر میں قدم رکھا تھا؟"

زینت چیخ پڑی۔ آخر کب تک پرسکون سمندر کے سینے میں طوفان چھپا رہے۔ اسے ایک دن تو حشر برپا کرنا ہی تھا۔

"ہاں! ہاں!! تم..... میری تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" شہاب میاں بھی چیخ پڑے تھے۔

شہاب میاں کچھ دیر زینت کی آنکھوں سے ابلتے ہوئے آنسوؤں کو مطمئن نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ اور پھر اس گھر میں کبھی نہ قدم رکھنے کا مصمم ارادہ کرتے ہوئے کرنل شفیق کے گھر کی طرف چل پڑے جہاں ان کی لڑکی نسرین سے شہاب میاں کی نسبت کی باتیں چل رہی تھیں۔ اور نسرین سے آج ملنے کا وعدہ بھی تھا۔ زندگی سے فرار حاصل کرنے کی خواہش ہمیشہ انسان کو کسی دوسری راہ پر ڈال دیتی ہے۔

زینت نے بھی گویا اپنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا اور اسنے معاشی گرلز کالج میں لکچرر شپ جوائن کر لی۔

ابھی شہاب کی دوسری شادی میں دو ہفتے ہی دن باقی تھے کہ وطن پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے اور ایک بار پھر وہ اپنے احساس میں تلخیاں لئے ہوئے محاذ جنگ پر چلے گئے۔ اور آج کئی ہفتوں سے فوجی ہسپتال میں پٹیوں سے بندھے کسی بیڈ پر کراہ رہے تھے۔

جب ماضی کی چبھتی ہوئی یادوں نے کیپٹن شہاب کے درد کو اور تیز کر دیا تو وہ چیخ پڑا۔

"نرس۔"

"یس کیپٹن۔"

"میری طبیعت گھبرا رہی ہے.... مجھے نیند کی گولی کھلا دو۔"

کیپٹن شہاب ہلکے سے کراہا۔

نرس نے گلاس میں کوئی سیال "دوا" اور اس کے لبوں سے لگا دیا — اور کیپٹن شہاب سسکیاں لیتا ہوا نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اور ایک دن کیپٹن شہاب کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ اس کا چہرہ جھلس چکا تھا۔ ایک آنکھ بھی ناکام ہو گئی تھی۔ وہ بیساکھی کے سہارے لنگڑاتا ہوا اپنے وارڈ سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ اچانک کسی کی آواز پر پیچھے مڑا۔ دیکھا تو نرس کھڑی تھی۔

"نرس تم نے مجھے آواز دی ہے؟"

"ہاں کیپٹن..... میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

نرس مسکرائی۔

"ہاں کہو۔"

"میں آپکو ایک عظیم شخصیت سے ملانا چاہتی ہوں.....

بقیہ صفحہ ۵ پر

پرویز شاہدی

غزل

مخلصانہ شان سے ہم کو بُرا کہتے ہیں آپ
کون ڈھونڈے اِس کا پس منظر بجا کہتے ہیں آپ

نبھ رہی ہے دوستی کس حُسنِ فن کاری کے ساتھ
بے وفائی کو بھی اک طرزِ وفا کہتے ہیں آپ

ریاست کی بلاغت ہے کہ وسعت قلب کی
جو بھی چُپ بیٹھا ہو اُس کو ہم نوا کہتے ہیں آپ

اپنی طرزِ رہبری کا جائزہ لیتے نہیں
کارواں کی بے دلی کو ضعفِ پا کہتے ہیں آپ

اللہ اللہ اپنی اِس صدرنگ گُل چینی کو بھی
سادہ لوحانِ چمن کا مُدّعا کہتے ہیں آپ

چارہ سازِ اختلاجِ قلبِ گلشن کون ہو؟
اِس کو بھی تو شوخیٔ نشو و نما کہتے ہیں آپ

تیز اندیشی کو ٹھہراتے ہیں آشوبِ دماغ
سُست فکری ہی کو جانِ ارتقا کہتے ہیں آپ

کشتیٔ طوفاں کی آویزش سے لاحاصل ہے بحث
ہم ہیں واقف کیوں خدا کو ناخدا کہتے ہیں آپ

پی کے پھولوں کا لہو شاید بہت سرشار ہیں
اپنی ہی سانسوں کو بادِ صبا کہتے ہیں آپ

علی حیدر ملک

خدیجہ مستور اور "آنگن"

خدیجہ مستور، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کی ہم عمر ہیں اور عصمت اور منٹو کے ساتھ مستور کا نام بھی صفِ اوّل کی افسانہ نگاروں میں لیا جاتا ہے۔ افسانوں کے علاوہ عصمت اور منٹو نے ناول بھی لکھے ہیں اور ان ناولوں میں دونوں کا نقطۂ اور ایک دوسرے سے بالکل مختلف انداز ہے پھر بھی دونوں کو اپنے ناولوں کی بیش کش پر خاصی شہرت ملی۔ خصوصاً عصمت کو "ٹیڑھی لکیر" اور منٹو کو "آگ کا دریا" کے بعد۔ اپنی ان معرکہ آرا کے بعد خدیجہ مستور نے اپنا ناول "آنگن" پیش کیا ہے۔

خدیجہ کا یہ ناول "آنگن" دو حصوں میں منقسم ہے۔ ماضی اور حال۔ ماضی کا حصہ مختصر یعنی پورے ناول کے ایک چوتھائی کے برابر ہے جسے انگلش بیک (Flash Back) میں بیان کیا گیا ہے۔ حال کا حصہ تین چوتھائی سے کچھ زیادہ پر مشتمل ہے۔ لیکن کہانی دونوں حصوں میں بیشتر عالیہ کی زبانی یا اس کے نقطۂ نظر سے پیش کی گئی ہے۔ صرف کہیں کہیں مصنفہ نے عالیہ کے انداز نظر سے پرہیز کرکے بیانیہ انداز اختیار کیا ہے۔ "آنگن" کے منظرِ عام پر آتے ہی کسی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ناول دو حصوں یعنی ماضی اور حال میں منقسم ہے حالانکہ اسے تین حصوں یعنی ماضی، حال اور مستقبل میں بٹا ہوا ہونا چاہئے تھا۔ بظاہر یہ رائے صائب معلوم ہوتی ہے لیکن ناول کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تبصرہ نگار نے یہ رائے دیتے وقت صرف تین زمانوں ماضی، حال اور مستقبل کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اور ناول کے پلاٹ پر اُس کی نظر گہری نہیں ہے جہاں مستقبل کا گذرنا ممکن تھا۔ ناول کا قصہ دوسری جنگِ عظیم کے کچھ پہلے سے لے کر آزادیٔ ہند اور قیامِ پاکستان کے کچھ برسوں بعد تک کے زمانے پر محیط ہے۔ کہانی کا پسِ منظر سیاسی اور تاریخی ضرور ہے لیکن سیاسی جماعتوں اور تحریکوں پر بحث اور سن و تاریخ کے اندراج سے پرہیز کرکے ناول نگار نے اسے سیاسی یا تاریخی ناول ہونے سے بچالیا ہے۔ مصنفہ نے سیاسی نظریات کے بارے میں غیر جانبداری اختیار کرکے خود کو سیاسی مبلغ اور ناول کو پروپیگنڈہ بننے سے بھی بچایا ہے۔ وہ شروع سے آخر تک ہمیشہ فنکار کے روپ میں ہی نظر آتی ہیں جسے تاریخی اور سیاسی حالات سے تعلق تو ہوتا ہے لیکن بلا واسطہ نہیں بالواسطہ۔

پلاٹ کی تعمیر کامیاب ہے اس لئے کہ تمام واقعات و حادثات انداز میں اُبھرتے اور ایک دوسرے سے گہرے طور پر مربوط نظر آتے ہیں ان پر گڑھے ہوئے یا بناوٹی ہونے کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کرداروں کے سلسلے میں سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسا کردار نہیں برتا گیا جسے فاضل گردانا جاسکے اور یہ بلاشبہ بڑی بات ہے۔ تمام چھوٹے اور بڑے کرداروں کا "دل کے پلاٹ سے گہرا اور اٹوٹ تعلق ہے اور یہ اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

عالیہ جس کی حیثیت ہیروئن کی ہے داخلیت پسند ہے اسی لئے اس کی حرکات و سکنات سے زیادہ اُس کے من کی موجوں اور خیالات کی لہروں کو پیش کیا گیا ہے اور اس طرح اس کے خیال اور دل کی دنیا سامنے آجاتی ہے۔ ویسے شروع میں اپنی اس خصوصیت کی بنا پر وہ ایک مجہول کردار معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے مقابلے میں بھی کا کردار زیادہ متاثر کن معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ عالیہ کے برعکس خصوصیات کی حامل ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ بھی نما کردار دبنے لگتا ہے اور عالیہ پوری کہانی پر حاوی ہوجاتی ہے۔ زنانہ کرداروں میں ایک کردار کہن بوا کا ہے جو ماضی اور حال کے درمیان ایک پُل کا کام انجام دیتی ہے۔ وہ پرانے زمانے کے خادموں اور خادماؤں

کا ایک یادگار اور ہمارے ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے ماضی کی ایک علامت ہے۔ اور اسی لئے اس کا کردار اس کی ساری کمزوریوں اور استواریوں کے ساتھ قاری کو عزیز ہے۔

مرکزی کرداروں میں بڑے چچا اور جمیل بھائی کے کردار سب سے زیادہ اہم ہیں ــــ خدیجہ مستور کے بڑے چچا اور جمیل بھائی سے پریم چند کے ہوری کا اور گئودان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ــــ گئودان " اور " آنگن " کے درمیان ایک طویل وقفہ حائل ہے اور دونوں میں طبقے اور حول کے اعتبار سے بھی فرق ہے پھر بھی ہوری اور بڑے چچا ــــ گئودان اور جمیل بھائی کی روحیں یکساں معلوم ہوتی ہیں۔ گئودان " کے باپ بیٹوں میں جو اختلاف تھا وہ ذرا مختلف نوعیت اختیار کر کے مگر اور زیادہ شدید اور واضح ہو کر " آنگن " تک پہونچا ہے۔

" آنگن " کے کرداروں کے سلسلے میں اسرار آپا کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اسرار آپا کا کردار اردو ناول کے کرداروں میں ایک نیا کردار ہے اور اس کی تخلیق ناول نگار کا امتیازی وصف ــ یہ کردار بظاہر بڑا معمولی اور چھوٹا معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے اندر غیر معمولیت اور عظمت کے سارے عناصر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے ادھورے اور نامکمل جملے ــ کریں ہوا اگر سب لوگ چائے پی چکے ہوں تو ــ اور اگر سب لوگ کھانا کھا چکے ہوں تو ــ ناول کے ایوان میں بار بار گونجتے اور قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ جاتے ہیں۔ ہماری " تہذیب " کا المیہ اسرار آپا کا مقدر بن گیا ہے اور وہ اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے ــــ اسرار آپا اردو ناول کے تمام کرداروں میں سے عظیم اور بھرپور کردار ہے ــــ مصنفہ نے اسے جس چابکدستی اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے وہ اس کا کمال ہے۔

جزئیات اور تفصیلات کا بیان بڑا صاف اور حقیقی ہے۔ صرف کہیں کہیں مصنفہ سے چوک ہو گئی ہے جیسے چھمی جب اپنی نئی بچی کے ساتھ سسرال سے کے آتی ہے تو مصنفہ نے لکھا ہے کہ " آنگن میں برابر سے بچھے ہوئے پلنگوں میں آج ایک نئے سے کھٹولے کا اضافہ ہو گیا تھا اور اس کھٹولے پر پڑی ہوئی ایک ننھی سی بچی کی خوں خاں رات کو اور بھی خوبصورت بنا رہی تھی " حالانکہ مشرقی ماحول میں چھوٹے بچے یعنی اس عمر کے بچے جو ابھی گائی بتائی گئی ہے ماں سے علیحدہ نہیں سلائے جاتے خصوصاً چھمی کے طبقے اور حول کی عورت یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی اولاد کو اپنے پہلو سے علیحدہ رکھے۔ اسی طرح لاہور میں شکیل سے عالیہ کی ملاقات کا منظر بھی حقیقی کم اور سنیمائی رنگ لئے ہوئے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ گو بعد میں اسے حقیقی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔

پچھلے چند برسوں میں لکھے جانے والے ناولوں میں " آنگن " سب سے زیادہ دلچسپ ہے اور اگر اس لحاظ سے اس کا ہم پلہ کوئی دوسرا ناول کہا جا سکتا ہے تو وہ ہے شوکت صدیقی کا " خدا کی بستی "۔

" آنگن " کی دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ یہ ایک آنگن کی کہانی نہیں بلکہ برصغیر کے ہر آنگن کی کہانی ہے۔ اس کا تعلق ہمارے ماضی قریب سے ہے جس کے اثرات اب تک ہماری زندگیوں اور ہمارے معاشرے پر موجود ہیں ــــ ناول نگار کے نظریۂ حیات کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے یہ کہنا ہوگا کہ خدیجہ مستور اس معاملے میں اپنے ہم عصر دوسرے مصنفوں سے علیحدہ ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے خیالات و افکار پر بڑے دبیز پردے ڈال رکھے ہیں۔ اگر کہیں کہیں کوئی نظریہ ظاہر بھی ہوا ہے تو اس کی حیثیت ثانوی ہے۔

ناول کا فن جس زبان کا تقاضا کرتا ہے اس سے اس دور کے اکثر بڑے ناول نگار بھی ناواقف نظر آتے ہیں۔ خدیجہ مستور کی زبان افراط و تفریط سے پاک نظر آتی اور ناول کی زبان کے لئے معیار کا درجہ رکھتی ہے۔

" آنگن " دراصل ہماری ایک فنی اور تاریخی امانت تھی جسے خدیجہ مستور نے بڑی خوش اسلوبی اور دیانت داری کے ساتھ پورا کیا

بقیہ " فانی کی شاعری کا ایک پہلو " ــــ صفحہ ۱۴

فانی صاحب کی فنکارانہ قوت کے جوہر ہر جگہ نظر آئیں گے۔ مختصر یہ کہ پنڈت آنند نرائن ملا مرحوم کے ان چند برگزیدہ اور ناقابل فراموش شعراء میں ایک ہیں جن کے دم سے اردو شاعری کا چراغ روشن ہے، جنہوں نے اپنے خونِ جگر سے اردو شاعری کا دیوی کے رنگ روپ کو نکھارا ہے اور جن کی شخصیت آئندہ نسلوں کے لئے چراغِ راہ ثابت ہوگی۔

یوسف اقبال

ہمارے نغمے

(۱)

سناٹا ہے خاموش
یوں کہ۔ جیسے اِسے کوئی سانپ ڈس گیا ہو
ہَوا پر سکتہ سا چھا گیا ہے
تمام اشجار دم بخود ہیں
نہ جنبشِ برگ ہے، نہ آہٹ
نہ دل دھڑکنے کی کوئی آواز آ رہی ہے
گھٹن کی شدّت نے تشنگی کو بڑھا دیا ہے
جگر میں سوزشِ زباں پہ کانٹے
بھڑک رہے ہیں نظر میں شعلے
تڑپ رہا ہوں، جھلس رہا ہوں
کہاں ہے پانی؟
کہاں ہے پانی؟

(۲)

یہ جھیل، ساحل پہ جس کے اب میں کھڑا ہوا ہوں
بڑے تجسّس کے بعد پہنچا ہوں اِس جگہ تک
اِس آرزو میں
کہ۔ اِس کے پانی سے میری تشنہ لبی مٹے گی
مجھے نئی زندگی ملے گی
مگر یہ پانی۔ اُداس۔ خاموش اور ساکت
نہ کوئی ہلچل نہ کوئی حرکت
اک آئینہ بن کے میری صورت کو تک رہا ہے
بس اک طلسمِ جمود ہر شے پہ چھا گیا ہے
میں اِس طلسمِ جمود کو توڑ کر رہوں گا
اُٹھا کے دھرتی سے ایک پتھر
جو میں نے پانی کے منھ پہ مارا
تو آنکھ ملتی ہوئی اُٹھیں رُوئے آب پر سیکڑوں لہریں
جمال و نکہت
بہارِ گلشن
نگارِ فطرت
شرابِ الفت
صدائے نغمہ
نوائے سرمد
شعورِ حکمت
کمالِ صنعت
بلندیِ فن
نگاہ میں مدّتوں کے تپنے
لبوں پہ فردوس کے ترانے
یہ لہر روحِ رواں ہستی
حیات کے دائرے بناتی
اُبھر کے آئی
نگاہ اِس لہر پر جمی تھی
کہ۔ دوسری لہر تلملائی
ستم کے پیکاں
جفا کے خنجر
شرر فشاں آتشیں بگولے
سروں پہ لٹکی ہوئی صلیبیں
بلی چڑھی ہولناک چیخیں
سسکتی لاشیں
تڑپتے ارماں
لہو کہاں گلشنِ تمنّا
تصوّرِ حسن و عشقِ لرزاں
تباہیِ فکر و فن کے ساماں
یہ لہر پیغامِ مرگِ انساں
نقوشِ تعمیر کو مٹاتی
بپھر کے آئی

(۳)

حیات اور موت کی یہ لہریں
ازل سے اب تک اُلجھ رہی ہیں
قدیم قدم کاروانِ ہستی ابد کی راہوں میں بڑھ رہا ہے
نفس نفس مات کھا رہی ہے حیات سے مرگِ ناگہاں بھی
ہمارے نغمے میں ایسے نغمے کہ۔ بزمِ ہستی میں جن کی لے سے
جمودِ ارضِ کہن بھی ٹوٹا، طلسمِ اسرارِ آسماں بھی

(باجازت اُردو مجلس آل انڈیا ریڈیو)

بشر نواز

تقلیدی اور تخلیقی شاعری

کوئی پسند کرے یا ناپسند کرے یا نہ مانے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر فن پارے پر زندگی کسی نہ کسی روپ میں اور کسی نہ کسی حد تک اپنا عکس ڈال ہی دیتی ہے۔ کبھی یہ عکس راست اور واضح انداز میں پڑتا ہے اور کبھی بالواسطہ اور مبہم انداز میں۔ ادب برائے ادب کے بڑے سے بڑے علمبردار بھی اپنے فن کو مقصود بالذات بنانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ زندگی کے مسائل اور اس کے حقائق سے اپنے فن کو محفوظ رکھنے اور بچائے رکھنے کی کوشش خود اس بات کی دلیل ہے کہ زندگی کو فن سے اور فن کو زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد پیدا ہونے والے خلفشار، روحانی کم مائگی، بے رحمی اور بدصورتی کا اظہار یورپی ممالک (جہاں یہ خون کی ہولی کھیلی گئی) کے ادب میں نمایاں ہونے لگا۔ اس ذہنی اور روحانی کرب سے بچنے کے لئے جن لوگوں نے سرے سے زندگی ہی کی نفی کرنی شروع کر دی وہ بھی اپنے فن کا مواد زندگی ہی سے لینے پر مجبور ہیں۔ اسی ذہنی اور روحانی دیوالیہ پن کا تحفہ مغربی دنیا کو ایٹمی ینگ مین Angry young man اور بیٹنکس نشوار کی شکل میں ملا۔ یہ حضرات ہزار مغربی رجحانات اور بیمار ذہنیتوں کے مالک سہی لیکن اپنی ذاتی سوچ اور مسائل رکھتے ہیں۔ مسائل کے حل کے سلسلے میں ان پر اعتراضات کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مسائل انہوں نے اپنے اوپر خود طاری کر لیئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے یہاں کئی قسم کی گمراہیوں کے باوجود وہ خلوص مل جاتا ہے جو فن کی جان ہے۔

اس بیسویں صدی میں دنیا ذہنی اور جذباتی طور پر تو مختلف کیمپوں، ملکوں اور قوموں میں بدستور بٹی ہوئی ہے۔ لیکن بظاہر رسل و رسائل اور اطلاعات کی حد تک یقیناً ایک ہو گئی ہے۔ اور یہی سب سے بڑا عذاب ہے۔ چنانچہ جب یورپ، امریکہ اور فرانس کی ان جدید تحریکات کی اطلاعات برصغیر ہند و پاک میں پہنچیں تو یہاں کے نیم مہذب اور ادھوری تعلیم پائے ہوئے، علمی شہرت کی بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس خوانِ یغما پر ٹوٹ پڑے نتیجتاً۔ جدید ادب جدید شعر، جدید ذہن، جدید آدمی کا وہ شور و غوغا بلند ہوا کہ کان پڑی آواز کا سننا بھی مشکل ہو گیا۔ ان نو آزاد ملکوں کے حقیقی فنکار جو واقعی اس علاقے کے مسائل سے دوچار تھے عجیب کشمکش میں گرفتار ہو گئے۔ ایک طرف نا شاعروں اور شاعروں کا غول ہے جو محض اطلاعات کی بنا پر کچھ موضوعہ مسائل اور خیالی پریشانیوں کے پرچار میں اپنا حلق خشک کئے جا رہا ہے اور دوسری طرف وہ حقیقی فنکار ہیں جو اپنی زندگی، کچھ اور ادب کے تعلق سے پیدا شدہ نئے مگر زندہ مسئلوں سے دوچار ہیں۔ چنانچہ نیا ادب یا نیا ذہن ان دو متضاد قوتوں کے زیر اثر پروان چڑھنے لگا۔ آج کا ادب آج کی زندگی اور ادب کے آج کے مسائل سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں زندگی اور فن کو الگ الگ خانوں میں بانٹنے کا قائل نہیں اور چونکہ ہماری زندگی نے یقیناً کچھ نئے رخ اختیار کئے ہیں۔ اس لئے نئے فن سے انکار نہیں کرتا میں تو صرف حقیقی اور موضوعہ نئے ادب کے درمیان حد فاصل قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

آیئے اب ہم یہ دیکھیں کہ وہ موضوعہ مسائل کیا ہیں۔ جنکی وجہ سے بے روح شاعری اور ادب کا ایک سیلاب امڈ آیا ہے اس قسم کا ایک اہم مسئلہ تو مشینی شہروں کی زندگی اور مشینیں ہیں۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان تو کیا پورے مشرق کو ابھی مشینی بننے کے لئے کم از کم پچاس ساٹھ سال درکار ہیں۔ اور پھر مشینوں کا زندگی کا جزو بننا اور عام آدمی کا زندگی پر اثر انداز ہونا تو بہت بعد کے مسائل ہیں۔ لیکن ہمارے فرقہ ائی ادب پسندوں کو اسکی کوئی فکر نہیں۔ وہ تو آج اعلان کر چکے ہیں کہ ہم مشینی عہد میں جی رہے ہیں۔ اور محض اطلاعات کی بنا پر ان کے گرگوں کو

بھی روحانیت شروع کر دیا گیا ہے جو اس قسم کی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ امریکہ، انگلینڈ اور فرانس کے ادیب یہی کر رہے ہیں۔ دوسرا خود ساختہ [illegible] روحانی انحطاط اور اُس سے پیدا شدہ تنہائی کا ہے۔ یہ ذرا نازک مسئلہ ہے کہ یہ بڑی حد تک لیکن مغرب سے قطعاً مختلف شکل میں ہمارے زندگی سے متعلق ہے۔ مغرب میں کبھی بھی روحانیت عام زندگی کی سطح پر ایک فلسفۂ حیات نہ بن سکی تھی[1] اس وجہ سے سائنس نے ایک ہی جھٹکے نے اسکو بنیاد سے اکھاڑ پھینکا۔ پھر وہاں کی مادی ترقیوں کی چکا چوند بھی روحانیت کی رو جو زندگی بن جانیکی راہ میں حائل رہی۔ روحانیت اور ماورائیت کے جو تھوڑے بہت اثرات تھے ان کا زوال عام زندگی میں اٹھارویں صدی ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ اس زوال کا احساس بیسویں صدی میں ہوا۔ ایلیٹ کو ہوا چنانچہ اُس نے دوبارہ روحانیت کی تلقین شروع کی) برخلاف اس کے مشرقی ممالک اور خصوصاً ہندوستان روحانیت کا گہوارہ ہے ہزاروں سال سے روحانی اور ماورائی طرزِ فکر ہمارے عام آدمی کی زندگی کا جزو بنی ہوئی ہے۔ سائنس کی مسلسل ترقی نے یقیناً اسکے اثرات کو کسی قدر کم کر دیا ہے اور کچھ سوچنے والے ذہنوں کو تشکیک میں مبتلا کر دیا ہے۔ لیکن آج بھی ان کی سوچ کا انداز بالکلیہ مادی نہیں ہو پاتا۔ اور یہ مقام شکر ہے (میں جانتا ہوں کہ کچھ فیشن ایبل حضرات اس پر ناک بھوں چڑھائینگے اور اس میں مشرقی ذہن کا کمزور پہلو ڈھونڈ نکالینگے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ حقیقت بھی ہے اور مشرق کے لئے وجہ سربلندی بھی) سیاست میں اس کی تازہ ترین مثال گاندھی جی اور ادب میں ٹیگور، اقبال۔ اور پریم چند ہیں۔ اور پھر ہماری مادی زندگی کے کمزور پہلو معاشی بدحالی اور مادی آسائشوں کا فقدان خود بخود ہمیں روحانیت اور آنے والی خوش حال دنیا کا سہارا لینے پر مجبور کر دیتا ہے اور موجودہ عمر دیسوں کی تلافی دوسری دنیا میں ہو جانے کی آس زندگی کو زہر کا جام بن جانے سے بچائے رکھتی ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ فلسفہ بذاتِ خود صحت مند ہے یا مریضانہ اور افیون کی گولی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کرم کے اسی فلسفہ کی وجہ سے ہمارے یہاں خودکشی، زنا، بے ہوشی کی حد تک شراب نوشی کے واقعات اتنے عام نہیں جتنے مغربی مہذب ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ ان حقائق کے باوجود اگر کچھ حضرات نے فقدانِ روحانیت کو اپنی زندگی کا ایک مسئلہ بنا لیا ہے تو اس کی) صاف وجہ یہ ہے کہ اُن بیماروں کے سامنے اپنی روایات، تہذیبی سرمائے اور آس پاس کی زندگی کے بجائے بیرونی مستعار غیر ملکی اور عریاں نیم عریاں تصاویر والے امریکی رسالے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ حقیقی ادب اور شاعری رسالوں سے نہیں بلکہ جیتی جاگتی زندگی کے بطن سے جنم لیتی ہے۔

اسی طرح کئی اور مفروضہ مسائل ہیں، جن میں تنہائی اور جنسی گھٹن سرِفہرست ہیں۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ روحانی اقدار کا تنزل اور اسکے زیرِ اثر پیدا شدہ تنہائی وغیرہ ہمارے معاشرے کے بھی مسائل ہیں لیکن جس انداز سے آج کے کچھ حضرات (میں انہیں شاعر قطعاً نہیں کہوں گا) اس کا اظہار کر رہے ہیں وہ قطعاً عائد کردہ اور تقلیدی ہے۔ ویسے بھی غلامانہ دور کے طرزِ تعلیم کا منطقی نتیجہ یہی تھا کہ تیسرے درجہ کی ذہانتیں پیدا ہوں اور انگریزی کی خواہش بھی یہی تھی کہ ہندوستانی اتنی انگریزی سیکھ لیں کہ بہتر کلرک بن سکیں۔ سو یہ "کلرک" اب ادب کے میدان میں بھی اُتر آئے ہیں۔ پھر یہ کلرک اگر "صاحب" کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم نہ کریں تو جائیں کہاں۔ اور اگر یہ ادبی کلرک اپنے تہذیبی، ادبی اور سماجی ورثہ سے نابلد ہیں تو اس کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے؟ اُن عزیزوں پر یا غلامانہ دور کے طرزِ تعلیم پر جس کا مقصد ہی کلرک طبقہ کو پیدا کرنا تھا تاکہ کمپنی بہادر کے کام کاج میں آسانی ہو۔ چنانچہ اپنے ماضی سے قطعی کٹ ہوا اور مغربی روشنی سے چندھیائی آنکھوں والا یہ طبقہ جب مختلف شعبوں کی طرح ادب کے شعبوں میں بھی داخل ہوا تو اس کے منطقی نتیجہ کے طور پر جہالت اور اندھی تقلید کا گٹھ جوڑ مظاہرہ ہونے لگا۔ چنانچہ تجربے کے نام پر نثر کے تماشے اور لفظی بازی گری کے علاوہ سنخ شدہ نحل میں رمزیت اور ابہام پسندی کا رواج عام ہو گیا۔ آج سے پانچ چھ برس پہلے غزل میں جذبات کے نام پر انتشار دین اور انیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے درجہ کے اردو شعراء کے تتبع میں "عسل کی مکھی" "مکھی کچھڑی" "سرپہ طرّہ

نوٹ: [1] مذہب کی ظاہری رسومات کی تکمیل الگ چیز ہے اور مذہب اور روحانیت کو زندگی کا جزو بنانا بالکل الگ ہے۔ اگر عیسائیت کے پیرو اپنے مذہب کا حقیقی روح کو جذب کر لیتے تو مغرب میں مادیت اسقدر فروغ نہ پا سکتی اور دنیاوی آسائشوں کیلئے بھرپور قوت سے لیکر نوآبادیاتی نظام اور مسلسل عالمگیر جنگوں کا سلسلہ جاری نہ رہتا کہ عیسائیت تو خدا کی مملکت کا تصور پیش کرتی ہے، جو دوسری دنیا کی بات ہے (ب۔ ن)

[1] اس سلسلے میں محمود ہاشمی اپنے مضمون "ایک خطرناک رجحان" مطبوعہ "اوراق" میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

گئے میں مظہر کی خزاں کو سا نغمہ کہ "جہاز پہاڑ" "دروازے کو کھولیں" جیسے بے معنی اور لایعنی ردیفوں والی غزلیں کہی جانے لگیں جس کے بات آپ بھی پاتے ہیں۔

سورج جاگے تو ہم بھی بہنہ سر گھر سے کھوجنے نکلیں — اشک وہی گرنگ کھڑکیاں اور وہی نیلے دروازے
پاؤں کے تلوؤں سے بالوں تک کیسی چیونٹیاں — آج پھر جاگیں بدن میں لال پیلی چیونٹیاں (البلاغ کراچی)

الفاظ کو نئے مفاہیم اور معنی عطا کرنے کا دعویٰ بھی آج کل عام ہے۔ لیکن یہ "عطائی" صرف لفظوں کا بیج لفظوں بو کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ نئے مفاہیم عنی اگا دیا گیا۔ نظموں کے سلسلہ میں اس پر گفتگو پھر ہوگی فی الحال غزل کے شعر سنئے۔

کہاں گیا ظفر اس کے تازہ ترجم کے جال سے نکل کر — سفید بیڈ شیٹ پر پڑا یہ بوسیدہ بدحواس کا ہے (ظفر اقبال)
ہمیں چھلانگیں مار کے آنکھیں کھولوں پھر بھی تمہیں — ایک سنہرا ایک سانولا ایک سیہ دریا

شاید الفاظ کے نئے مفہوم سے مراد ان لوگوں کی بے معنویت اور بے موزونیت ہو (پہلے شعر کا وزن؟)
پھر اردو شاعری کی بدترین اور انحطاطی ذہنوں کی پیداوار رنگینی کے انداز کی غزلوں کا زور ہوا۔

سخت بیگم کو شکایت ہے جہانِ نو سے — ریل چلتی نہیں گر جاتا ہے پہلے سگنل
دھرا کیا ہے بھلا الفت کے ان جھوٹے فسانوں میں — بھرم کھوٹے کرے کا خود ہی کھل جائے گا کانوں میں (سلیم احمد)

اس کے بعد سہل ممتنع کی بگڑی ہوئی اور سخن شکستہ شکل چھوٹی بحریں، تو بیا بے معنی اشعار کی صورت میں نمودار ہوئی۔

تے کے اوپر دو نقطے — بے کے نیچے اک نقطہ (عادل منصور کا)
مچھلی باہر گئی ہوئی تھی — دریا کا مکان بے صدا تھا (ظفر اقبال)

اس قسم کی مزید مثالوں سے قصداً گریز کر رہا ہوں۔ صرف اشارتاً ایک ایک دو دو شعر دیدیئے ہیں ورنہ اس قسم کی خرافات کی کمی نہیں۔ اگر یہ اپنے بچے ادب کی گذشتہ تاریخ سے پوری طرح واقف رہتے تو شاید انہیں اندازہ ہو جاتا کہ یہ کام گذشتہ صدی میں گنتی کے چند لوگ کر چکے ہیں اور ان کا انجام عبرتناک ہو چکا ہے۔ اگر گنتی نہ سطح پر بیرونی زبانوں سے واقف یہ حضرات واقعی بیرونی ادب سے واقف ہوتے تو علامت اور مہمل گوئی کے فرق کو پوری طرح محسوس کر لیتے اور یہ بھی جان لیتے کہ اگر فرانس میں اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں بودلیر نے رمزیت کی تحریک فروغ دی جس کی پیروی بعد میں میلارمے، پال ورلین، ژاں بودیغرہ نے کی تو اس سے پہلے (Romanticism) پارناسی اسکول وجود میں آچکا تھا جس کے لئے "سات سیاروں" Pléiade نے رونسار (Ronsard) کی سرکردگی میں سولہویں صدی میں میدان ہموار کر دیا تھا یہ تحریک مختلف ارتقائی منازل سے گذر کر بودلیر۔ ورلین اور رمبو جیسے ذہین فنکاروں کے ہاتھوں پروان چڑھی تھی۔ تو یہ بیچارے رمزیت کے نام پر مہمل گوئی کے دلدل میں نہ پھنستے اور میراجی کے "سمندر کا بلاوا" جیسا بے بنیاد نظمیں کہنے کے بجائے اس قسم کی نہ بالغانہ کیفیت مبتلا نہ ہوتے۔ فرانس میں رمزیت کی تحریک فطرت پسندی، اصلاحی ادبی تحریک، رومانوی تحریک اور پارناسی تحریک کے بعد کی چیز ہے۔ یہ تمام تحریکیں یکے بعد دیگرے زنجیر کے ایک سلسلے کی طرح وجود میں آئیں۔ جو ایک دوسرے کی کمزوریوں اور خامیوں کو رد کرتے ہوئے اور ان سے صحت مند رجحانات کو خود میں جذب کرتے ہوئے مختلف شکلیں اختیار کرتی رہیں۔ اس طرح وہاں کے ادب میں مسلسل ارتقائی کیفیات کا احساس ہوتا ہے۔ اور ہر تحریک اپنی پیش رو تحریک کا منطقی نتیجہ بن جاتی ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے ہاں کے شاعروں نے اپنی روایات ادب اور اپنی قومی کو نظر انداز کرتے ہوئے بیرونوں کے آگے ہوئے نوالوں کو نگلنا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر عام بدہضمی کی وبا گھس آئی اور اس قسم کی نظمیں عام ہونے لگیں۔

---

[1] سنہ ۱۸۵۰ء فرانس میں انیسویں صدی میں کلاسیکی ادب کے رد عمل کے طور پر رومانیت کی تحریک شروع ہوئی جس نے اپنا دفاع پیش کرتے ہوئے شکست خوردہ اور رجعت پسند ہونا ثابت کیا۔

گرم خیلے جسم سے
گوشت کے ان لوتھڑوں کو نوچ لوں
رچ گئی ہے جن میں اجدادوں کی بو
نوچ لوں اور نوچ کر، بوڑھے قبرستان کی، ٹوٹی ہوئی قبروں سے باہر
جا گتی سب ہڈیوں پر تھوپ دوں۔ اک شکستہ کھوپڑی میں تھوک بھر بھر کر ہنسوں۔ (عادل منصوری)

شاعر کو شاید کسی طرح یہ اطلاع مل گئی تھی کہ لارڈ بائرن اپنے بچپن میں انسانی کھوپڑی کے سر میں شراب پیتا تھا۔ اب ہاسے "منشی" کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا ہے کہ وہ اس خواہش کا اظہار نہ کرے۔

تجرید بذاتِ خود کوئی چیز نہیں۔ وہ حقیقت تک پہنچنے، اُسے پہچاننے اور سمجھنے کا ایک ذریعہ ہے یا حقیقت کی سمت ایک اشارہ ..... اسی حقیقت کی طرف جو یا تو موجود تھی یا کبھی رہی ہوگی۔ اپنی ظاہر اور واضح شکل میں نظر کے سامنے ہے یا حواس خمسہ کی زد سے پرے کہیں ہے، جسے صرف چھٹی حس دریافت کر سکتی ہے۔ فن میں اس چھٹی حس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ اس طرح تجرید کا بذاتِ خود کوئی وجود نہیں بلکہ وہ جانی اور انجانی حقیقتوں کی علامت ہے۔ الفاظ یقیناً مجرّد ہیں اور حقائق کے مدوّن علایم کے طور پر جنم لیتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف قاری کے ذہن کو حقیقتوں کی طرف موڑ دینا ہے مگر یہ عمل کامیابی کے ساتھ اسی وقت وجود میں آتا ہے جب لفظ کے استعمال کرنے والے کو خود حقیقت کا اور اس کا احساس ہو ورنہ لفظ تجرید سے حقیقت کی طرف سفر کرنے سے قاصر رہے گا۔ اس طرح اپنے مفہوم سے کٹ کر بے معنی ہو جائے گا جس کے نتیجہ کے طور پر خطاب کرنے والے اور مخاطب کے درمیان کا وہ رشتہ منقطع ہو جائے گا جو ایک کو دوسرے سے قریب کرتا ہے اور یہیں فن میں ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جو نے غالب کو

؎ مجھے رنگِ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا ۔۔۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

تک کا سفر کروایا اور ایک عمر گنوا جانے اور عالمگیر شہرت حاصل کر لینے کے بعد بھی پکاسو سے اعلان کروا دیا کہ اب تک وہ بے معنی تصویریں بناتا رہا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر ہم کو روایت کے تسلسل اور ارتقار کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ رسوم و علایم کو ان کے اپنے سلسلے سے کاٹ کر جو شکل میں استعمال کرنے کا انجام کتنا دردناک اور عبرت انگیز ہوتا ہے جب یہ لنڈورا پن جاہل اور کم وقعت ذہنوں کے ساتھ میل کھاتا ہے تو اس کی بھیانک ترین شکل افتخار جالب، عباس اطہر، افتخار حسن، احمد ہمیش اور اسی قماش کے دوسرے حضرات کی صورت اختیار کر جاتی ہے اور اس قسم کی دیوانگی کا مظاہرہ ہونے لگتا ہے۔ ؎

قدیم بحر سیاہ خانوں میں بٹ گئی
شہر کی خرابہ گرد گلیوں، سانحہ تاپتے جنی دیواروں کی دھول قومی معاونت کا عذاب،
شکنوں میں گرو، بجتے ہوئے جہنم کی راکھ سینے پہ منتشر، سب شبیہیں انجام
ریزہ، ریزہ، مجال کی مشتبہ ضرورت، بدن دکھن تر مرے دھاگے۔ تضاد راہوں میں گرتی بہتی لاوارثیں، میرے پاؤں بالکل ہوا ہٹ گئے ہیں۔ (قدیم بحر۔ افتخار جالب)

اگر آپ اسے شاعری سمجھنے پر آمادہ ہیں تو اس الفاظ کے انبار کو ایک مصرع مانئے کہ شاعر نے اسے مصرع ہی کہا ہے۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے تجربہ اردو میں انشاء اللہ خاں انشاؔ جب بحر طویل کے استعمال پر آئے تو انہوں نے تین تین اور چار چار صفحات کا ایک ایک مصرعہ کہہ دیا لیکن وہ ذرا با معنی تھا۔ بیچارے افتخار جالبؔ صاحب باوجود اپنی انگریزی دانی کے اس کرتب میں بھی اولیت کا درجہ حاصل نہ کر سکے اسے بس اگر ردی کہ خاکستر شدہ۔ الفاظ کو بچوں کا کھلونا سمجھ کر کھیلنے کے بعد کچھ دردناک نتائج ملاحظہ کیجئے۔

اسیم کے درمیان، جا بجا لڑھکتے گرتے
لہریلے گیروؤں کو اشتہار بازوں میں پھٹے، بہہ رہے تھے۔
سراٹ، جہاں بھی تھے ..... نہ جانے کیا تھے وہ!

(ایک نظم ۔ احمد ہمیش)

وہ گھر میں نہیں آئے گا سڑکوں پہ سہی
اُن سے ملاقات جہاں پر بھی ہوئی، ماتھے پر چومینگے اُسے
اور سنائینگے کہ گھر بیٹھے رہے، مدتوں خستہ دیکھا، صبر کا پھل نہ ملا
اور کنواں پیاس کے ہونٹوں پہ نظر آیا، سو ہم گھر سے نکل آئے کہ سڑکوں پہ سہی
("میں خبر بناؤں گا مگر اپنے لئے" ——— (عباس اطہر)

یہ اور اس قسم کی کئی ایک مثالیں نتیجہ ہیں، الفاظ کے محض رسمی استعمال اور تقلیدی تجریدیت کا۔ جس طرح زندہ جسم کا کوئی حصہ اس سے کٹ کر بے معنی اور غیر ضروری ہو جاتا ہے اور اگر مناسب وقت پر اس کے کفن دفن کا انتظام نہ کر دیا جائے تو وبائیں پھیلانے والی سڑاند کا باعث بنتا ہے، بالکل اسی طرح "لفظ" اپنے سلسلے اور زندہ زبان سے جدا ہو کر بیماری کا جرثومہ بن جاتا ہے۔ جس سے ہر مخلص فنکار کا فکر مند ہونا اور ضروری ہے۔ لیکن یہاں رونا تو خلوص کا ہے کہ خلوص کا فقدان اور وقتی شہرت طلبی ان تمام کرتب بازیوں کی اصل فرق ہے۔ ورنہ زبان اور اس میں تجربے کس زبان میں نہیں ہوئے؟ کونسا تخلیقی فنکار صرف اپنے انگلوں کی ڈگر پر قانع رہا ہے۔ میر۔ سودا، غالب، آتش، اقبال۔ فراق جو بھی سب ہی اپنے اپنے دور کے مجتہد اور نئی زبان کے خالق ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان لوگوں نے سلیقہ سے تبدیلیاں کیں۔ پرانی روایات کے صحت مند رجحانات کو قبول کیا اور لفظوں کے ہاتھوں خود استعمال ہونے کے بجائے اپنے مرضی کے مطابق لفظوں کو استعمال کیا۔

ان فنکاروں نے نہ اپنے تجربوں کے ڈنکے بجائے مناسب سمجھے اور نہ اس مجبوری پن پر اُتر آئے کہ انفرادیت کے شوق میں سر کے بل کھڑے ہو جائیں یا کپڑے پھاڑ کر دنگل میں کود پڑیں۔ اور باتوں کو جانے دیجئے صرف یہ دیکھ لیجئے کہ خود عشق کا تصور جو اردو غزل کی جان رہا ہے میر کے زمانے سے ہمارے زمانے میں فراق تک آتے آتے کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ میر کے نزدیک عشق ہی ازل ہے اور عشق ہی ابد۔ یہی ایک جذبہ ہر لامکاں تک چھایا ہوا ہے اور پوری زندگی اسی ایک جذبہ کی اسیر ہے ؎

جب نام ترا لیجے تب آنکھ بھر آوے — اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

لیکن غالب کی زندگی میں اور بھی کچھ مسائل ہیں۔ جو عشق اور محبوب ہی کی طرح زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ عشق میں وہ وقت بھی آتا ہے جب اس کی "وفا" بھی "تلافی" نہیں کر سکتی ؎

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

اور فراق تو صاف کہہ دیتے ہیں ؎

کچھ آدمی کو بھی مجبوریاں ہیں دہر میں — ارے وہ درد محبت سہی تو کیا مر جائیں

اردو میں میر آجی کی بھی تجریدیت محض تجریدیت نہ تھی بلکہ وہ معلوم اور عموماً معلوم حقیقتوں تک پہنچنے اور ان کے ادراک کا ایک ذریعہ یا وسیلہ تھی۔ اُن کا ابہام صرف اس حد تک تھا کہ قاری ان کے اشاروں اور علامتوں پر فتح پانے میں کامیاب ہو جائے اس کے بعد اس کے سامنے معنی اور حقایق کا ایک وسیع میدان کھل جاتا تھا۔

"سمندر کا بلاوا" "مجھے گھر یاد آتا ہے" اور اسی قبیل کی دوسری نظمیں اس کی تابندہ مثالیں ہیں۔ برخلاف اس کے متذکرہ بالا نظموں اور آنکے ساتھیوں کو چونکہ حقیقت کا شعور نہیں ہو پایا ہے۔ اور انکی علامتیں اور الفاظ اپنے سلسلے سے کٹ چکے ہیں، اس لئے اُن کی تجریدیت محض تجریدیت کہہ رہ گئی ہے اور اس وجہ سے ان کے استعمال شدہ الفاظ اپنے مفہوم و معنی سے بے نیاز ہیں۔ اسی وجہ سے اس قبیل کی نظموں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایسی چیزیں ہیں جنہیں اوپر سے نیچے کی طرف پڑھیں یا نیچے سے اوپر کی طرف۔ دائیں سے بائیں پڑھیں یا بائیں سے دائیں مطلب ایک ہی رہتا ہے یعنی بے معنویت ..... میں اس بات کو مانتا ہوں کہ لفظ ایٹم یا جوہر کی طرح رکھتا ہے جسے توڑ کر یا اس کی ترتیب بدل کر ہم اس کی نئی اور بے پناہ توانائیوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن جس طرح ایٹم کو توڑنے اور اس سے موصولہ قوت کے صحیح استعمال کے لئے ماہر سائنسدان کی ضرورت پڑتی ہے ٹھیک اسی طرح لفظ کو توڑنے اور اس کی ترتیب بدل کر نئے مفاہیم حاصل کرنے کے لئے ایسی ذہانتیں ناگزیر ہیں جو اس کی اصل اور پوشیدہ قوتوں سے پوری طرح واقف ہوں

اور یہ واقفیت اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک ہم روایت اور اس کے صحت مند پہلوؤں سے پوری طرح استفادہ نہیں کرتے۔ بغاوت یا دیگر الفاظ کی شکست جھاکہ تو کر دیگی لیکن کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرنے سے قاصر رہے گی۔ آج کے ادب میں اسی قسم کے تجربی دھماکے اور پٹاخے بازی عام ہے۔ جسے چونکانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ادب کا مقصد صرف لمحاتی طور پر چونکانا ہی ہے تو بات الگ ہے، ورنہ اگر فن اور ادب کا مقصد مسلسل چونکاتے رہنا ہے تو ہمیں اس قسم کی "پٹاخے بازی" سے گریز کر کے کوئی اور طریقۂ عمل سوچنا پڑے گا۔ مصیبت یہ ہے کہ اس تمام ہنگامے، ادبی بدتمیزی اور بے راہ روی کے جواز میں بیرونی ادیبوں، شاعروں، مصوروں اور تحریکوں کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ فلاں شاعر نے یوں کیا تھا یا فلاں تحریک یوں چلی تھی اس لئے یہ سب جائز ہے لیکن شاید ان اندھی تقلید کرنے والوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ ہر ادبی تحریک اپنے ملک و قوم اور معاشرے کی پیداوار ہوتی ہے اور اُس میں جب تک اپنی زبان، قوم اور ملک کے رسوم و رواج جذب نہ ہو چکے ہوں مقبول نہیں ہو سکتی۔ مستعار لی ہوئی اور تقلیدی تحریکیں اور نظریئے ادب پیدا نہیں کر سکتے۔ ۱۸۵۰ء میں (Théophile Gautier) ایمل فرانسیس نے اچھے ادب کے لئے یہ شرط لگائی تھی کہ اس میں وہ اپنے ملک و قوم کے تاریخی حالات کے ساتھ ساتھ رسم و رواج اور معاشری کیفیات بھی شامل ہوں وہ کہتا ہے "ایک ہی زمانے میں مختلف قوموں کے ادب میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ ان کے مزاج اور معاشری احوال کے فرق پر مبنی ہوتا ہے" ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے بھی اپنے تنقیدی مضامین میں اس فرق پر بہت زور دیا ہے۔ ویسے بھی کوئی جدت طراز اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے ملک و قوم کے مزاج اور خود اپنی زبان کے حسن و نزاکت کے ساتھ ساتھ اپنے کلاسیکی سرمائے سے پوری طرح واقف نہ ہو۔ لیکن یہاں تو ایسے ایسے جاہل جدت کے دعویدار بن بیٹھے کہ جن سے پوچھا جائے کہ بھائی یہ میر و سودا کو تھے تو بڑی بے نیازی سے کہہ اُٹھیں "معاف کیجئے ان لوگوں سے اب تک ملا نہیں سکا ہوں" اصل فتنہ یہ ہے کہ ایسے لوگ اوّل تو اپنے ادب سے واقفیت نہیں رکھتے۔ ان کی نظر میں اس کی اچھائیاں برائیاں نہیں ہوتیں دوسرے صرف باہر کی ادبی تحریکوں سے متاثر ہو کر خود کام کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی ہر کوشش و کاوش معلق ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس کا نہ کوئی سر ہوتا ہے اور نہ پیر۔ کیونکہ جب تک کسی فن پارے کی جڑیں زندگی اور اس کے اپنے معاشرے میں دور تک پھیلی ہوئی نہ ہوں کسی اہمیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اس قسم کے لوگوں کی تخلیقات کا مواد سُنی سنائی باتوں یا پڑھی پڑھائی کتابوں سے حاصل کیا جاتا ہے اور انکا خالق ان میں "خلوص" اور زندگی و معاشرے کے اثرات شامل نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ تخلیقات انتہائی زیادہ ترقی یافتہ شکل میں بھی الفاظ کا اُلٹ پھیر بن کر رہ جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے جب کوئی تخلیقی فنکار کسی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ اس کے اپنے معاشرے اور زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ اور فنکار کا خلوص اس میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ یہاں میں ایک بار پھر یہ بات دہرا دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد نئی شاعری کے وجود سے انکار نہیں ہے۔ میں صرف حقیقی یا تخلیقی نئی شاعری اور تقلیدی دیا کے فرق کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ دیکھیئے کہ ان لوگوں میں جنکا ذکر گذشتہ اوراق میں ہو چکا ہے اور جن کا ذکر آئندہ صفحوں پر ہوگا کچھ موضوعات بظاہر مشترک نظر آئینگے لیکن تخلیقی شاعروں کے ہاں اُن کے بیان میں ایک توازن کا احساس ملے گا۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی تخلیقات ہماری اپنی زندگی سے قریب نظر آئینگی۔ مثال کے طور پر معاشرے کے کھوکھلے پن کو لیجئے۔ تقلیدی شاعر اس کھوکھلے پن کے اظہار میں وہ کرب، بے چینی اور درد شامل نہیں کر پائینگے۔ جس سے کسی تخلیقی شاعر کی نظم عبارت ہوگی۔

ہمارے لئے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس گئے گذرے دور میں بھی اردو شاعری پر ایسا بُرا وقت نہیں آیا کہ ہم اُس سے نا اُمید ہو جائیں۔ آج بھی ہمیں ایسے شاعر مل جاتے ہیں جن کے پاس کہنے اور سمجھنے سمجھانے کا بہت کچھ مواد موجود ہے ان کے ہاں ہمیں روایت کا احترام بھی ملتا ہے اور جدت کا رنگ بھی، صحت مند پیرو ادب کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ اپنا معاشری رنگ بھی اور انکشافِ ذات کی کیفیات بھی۔ اس قسم کے سنجیدہ فنکاروں نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے نٹ کا تماشہ دکھانے کے بجائے موجودہ معاشرے اور زندگی کی کڑوی حقیقتوں کو اپنایا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جدید شاعری کے حقیقی علمبرداروں کے ہاں ہمیں آج کی زندگی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اُن کی تخلیقات میں معاشرے کی بدصورتی اور کمزوریوں کا اظہار محض اطلاع دینے کی حد تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس ذکر کے وقت وہ اپنے روحانی کرب کو شامل کر کے اسے ایک فنی سطح عطا کر دیتے ہیں۔

کبھی جب سوچتا ہوں اپنے بارے میں تو کہتا ہوں
کہ تو اک آبلہ ہے جس کو آخر پھوٹ جانا ہے۔
فرض گرداں ہوں بادِ صبحگاہی کا کیا لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایماں تم ہی ہو (ایک لڑکا۔ اخترالایمان)

ان تخلیقی نئے شاعروں کی فکر میں ایک وقار اور لہجہ میں ایسی تازگی ملتی ہے جس کی مثال اس سے پہلے کے دور میں ذرا مشکل سے ملے گی جب پڑھنے والا۔

راہ نوردِ شوق کو رہ میں کیسے کیسے پار ملے
ابر بہاراں، روئے نگاراں، خالِ رخِ دلدار ملے
کچھ بالکل مٹی کے بادھو کچھ خنجر کے دھار ملے
کچھ منجدھار میں کچھ ساحل پر کچھ دریا کے پار ملے
ہم سب سے ہر حال میں لیکن ہنس کر ہاتھ پسار ملے
صرف اُن کی خوبی پہ نظر کی اس آباد خرابے میں (یادیں۔ اخترالایمان)

قسم کے مصرعوں اور نظموں سے دوچار ہوتا ہے تو اردو جدید شاعری کے تعلق سے اس کی نا امیدی مسرت میں بدل جاتی ہے یا جب ادب کا کوئی شیدائی زندگی کی ناکامیوں سے گھبرا کر ادب میں پناہ ڈھونڈتا ہے اور اسی نظر سے اس قسم کے ٹکڑے گذرتے ہیں۔

عجب خامشی ہے
وہ آنسو جو پلکوں کی دہلیز تک آ کے
سفاک جھونکوں کے چابک سے گھبرا کے واپس گیا تھا
سیہ آنکھ کے سال خوردہ سے اندھے کنویں میں
کسی سنگ ریزے کی صورت زمیں پر پڑا ہے۔
اندھیرے کا دیوار
چاروں طرف سے اُمڈ کر
سیہ آنکھ میں گر چکی ہے
چلو ــــ اور نیچے چلیں
اُس چمکتے ہوئے سنگ ریزے کے نیچے
تم آنسو دھرتی تو موجود ہوگی
وہیں چل کے ٹھہریں۔ وہیں رُک کے دیکھیں (اندھا کنواں۔ وزیر آغا)

تو اس کے اندر زندہ رہنے اور زندگی کے اس پاتال کے اتھ تک پہنچنے کی ایک مسرت آمیز خواہش پیدا ہو جاتی ہے جدید ادب و شعر پر قنوطیت کا الزام لگانے والوں کے لئے اس قسم کی نظمیں لمحۂ فکریہ پیدا کرتی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قصر الفاظ میں نئے ذہن کے تعلق سے کچھ باتیں کر لی جائیں۔ تاکہ آج کے اور آج سے پہلے کے ذہن کا فرق صاف ہو جائے۔ اور زیر بحث موضوع سے پورا پورا انصاف ہو سکے۔ احساس فنکار ذہن اول ہی سے انسان کے لئے ایک بڑا مسئلہ اور المیہ رہا ہے۔ اس احساس نے ہر دور کے سوچنے والوں کو متاثر کیا ہے اور اس کی المناکیوں کو کم کرنے یا مٹانے کی کوششیں شروع ہی سے

ہوتی رہی ہیں۔ کسی نے حیاتِ بعد الموت کو عقیدہ بنا کے ذہنی سکون حاصل کیا ہے، تو کسی نے اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ کر زندگی کے ہر لمحے سے اُس کا رس اور حُسن نچوڑ لینا چاہا۔ کسی نے اس احساس اور خوفِ مرگ کا مداوا افیون لطیفہ میں تلاش کر لیا اور جسمانی حیثیت سے نہ سہی اپنے نام اور اپنے فن کے بل بوتے پر دوام حاصل کرنے کی کوشش کی۔ گذشتہ دنوں میں موت اپنی بے پناہ قوت کا احساس انفرادی شکل میں کراتی رہی کبھی کبھار جنگوں وغیرہ میں اس کی نوعیت اجتماعی ہو جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی مرنے والا یا موت کی اطلاع سُننے والے اس کے لئے کسی حد تک تیار رہتے تھے۔ لیکن آج سائنس کی تخریبی سمت میں بے پناہ ترقی نے موت کو اتنا اچانک اور بھیانک بنا دیا ہے کہ اس کے تصور ہی سے انسانی اعصاب جواب دینے لگ جاتے ہیں۔ پہلے بڑی سے بڑی جنگ بھی چند علاقوں، شہروں یا زیادہ سے زیادہ ملکوں تک محدود ہوتی تھی لیکن آج کی جنگ بیک وقت پورے عالم انسانیت پر تباہی لا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس قدر سے پہلے موت نازل کرنے کی اتنی زبردست قوت کبھی چند ہاتھوں میں مرکوز نہ ہو سکی تھی۔ لیکن آج ہر شخص یہ جانتا ہے کہ "چند دیوانے" اپنے وقتی جنونوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر چند بٹنوں کے ذرا سے اشارے سے عالمگیر تباہی لا سکتے ہیں۔ انسانی ذہن کی اس شیطانی قوت نے ہر انسان کو بری طرح سہما دیا ہے اور وہ ایک دوسرے سے خوف محسوس کرنے لگا ہے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر ہر شخص کو تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ اسی خوف نے ایک انسان کا دوسرے انسان پر سے اعتماد اور بھروسہ اٹھا دیا ہے۔ یہ بداعتمادی ہے آج کے ادب میں عالمگیر پیمانے پر تنہائی اور "بے بھروسگی" کی فضا پیدا ہو گئی اور انسان اپنے ہی سائے اور ہم جنسوں کو بھی پریت اور آسیب سمجھنے لگا جو کے شیطانی منصوبوں کا رد اُس کے پاس کوئی نہیں۔ اسے اپنے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔

ایک آسیب صدیوں سے منڈلا رہا ہے یہاں
یہ مکاں ـــــ مردہ روحوں سے آباد ہے
اور پرچھائیاں رات بھر چیختی، روتی، چلاتی، لڑتی جھگڑتی پھرا کرتی ہیں ہر طرف
ایک پرچھائیں کے ہاتھ میں بان ہے اور ترشول ہے .....
اس کی خونخوار بپھری ہوئی
اس کے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے اُن گنت سر بدن سے جدا ..... (رات کا مہمان۔ وحید اختر)

اس جنگل میں دیکھی میں نے لہو میں لتھڑی اک شہزادی
اس کے پاس ہی نیلے جسموں والے سادھو جھوم رہے تھے
پیلے پیلے دانت نکالے نعش کی گردن چوم رہے تھے (منیر نیازی)

انسانی تاریخ کے اس سب سے بڑے المیہ نے پرانے تمام اعتقادات پر ضرب لگائی۔ کہیں تو اعتقادات جڑ ہی سے ہل گئے اور کہیں ان کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور ایک شک و شبہ کی فضا پیدا ہوئی۔ اور آنے والے "سہانے کل" (جو آخرت بھی ہو سکتا ہے) پر سے اعتقاد اٹھ گیا۔

بتاؤں کس سے کہ میں منتظر ہوں جس دن کا
وہ شاید اب نہ کبھی آئے گا زمانے میں
وہ میرا "گوڈو" نہ جانے کہاں رہ گیا
اسے میں ڈھونڈ چکا روم اور لندن میں
نہ پا سکوں میں ملا اور نہ سارے پیرس میں
بھلا ملے گا کہاں بمبئی کی گلیوں میں
یہ انتظار مسلسل یہ جاں کنی یہ عذاب

ہر ایک لمحہ جہنم ہر اک خواب سراب (گودڑ۔ باقر مہدی)

جنگ اور موت کے خوف نے ذہنوں کو موجودہ تہذیب کی کمزوریوں کی طرف متوجہ کر دیا اور جب غور سے جائزہ لیا گیا تو اس کے کئی کھوکھلے اور قبیح پہلو سامنے آئے پھر عام زندگی کی سطحیت اور اکتاہٹ بھی مرکزِ نظر بن گئی۔

میں نے لوگوں سے بھلا کیا سیکھا
یہی الفاظ میں جھوٹی سچی بات سے بات ملانا، دل کی بے یقینی کو چھپانا ــــ
ــ سر کو ہر اجنبی گندہ ذہن شخص کی خدمت میں جھکانا، ہنسنا،
مسکراتے ہوئے کہنا صاحب
زندگی کرنے کا فن آپ سے بہتر تو یہاں کوئی نہیں جانتا ہے (اپنے آپ سے ۔ زاہد ڈار)

موجودہ تہذیب کی ان خامیوں اور کمزوریوں نے بعض ذہنوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اس "روشن حال" سے "تاریک ماضی" ہی زیادہ پرسکون اور محفوظ تھا۔ اس طرح ان کے دلوں میں اپنے ماضی کی روایات کا تقدس جاگ اٹھا لیکن انہوں نے صرف ماضی کا مجذوب بن جانا نہیں چاہا بلکہ اس کی اچھائیوں سے حال کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ "خواب" ایک ایسے دور اور زندگی کی علامت بن کر ان کے فن میں جگہ پانے لگے جس میں ماضی کی معصومیت، سادگی اور بے ریائی بھی ہو۔ اور حال کا شعور بھی اور وہ ایسے خوابوں یا سچائیوں کو جنم دینے پر اصرار کرنے لگے۔ ویسے بھی ماضی کے تسلسل سے انہوں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ انسان نے دورِ جہالت سے یہاں تک پہنچنے کے سفر میں ہر منزل پر پہلے خواب ہی دیکھے تھے اور خواب دیکھنا اس کی فطرت ہے.....

تو ایسا کیوں نہیں کہتے کہ میں خوابوں کے بے معنی ارتنگ کو
حقائق کی دہکتی بھٹیوں میں پھینک دوں سب کچھ جلا ڈالوں۔ تو یوں کیوں نا کیا تم نے
وہ جو کچھ میرا حصہ میرا ورثہ تھا، اگلے تم چھین لیتے اور مجھے صرا کے بے حس پیڑ کی طرح اگا دیتے
جو ہر موسم کے ہمرہ اپنا پیراہن بدلتا ہے
مگر تم یہ نہ کر پائے
مرا ورثہ نہ مجھ سے چھین پائے اور وہ پہلا شخص جس نے سب سے پہلا خواب دیکھا تھا ابھی تک مجھ میں زندہ ہے
تو ایسا کیوں نہیں کرتے ۔ انہیں خوابوں انہیں پرچھائیوں کو جسم دے ڈالو (بشر نواز)

موجودہ دور کی تیز رفتاری نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر شئے، ہر خیال اور شاید ہر فلسفہ اس قدر تیزی سے بدلتا جا رہا ہے کہ نظر کہیں ٹھہر نہیں پاتی۔ کچھ اسی قسم کی تیز رفتاری کا احساس اس دور کے نظموں میں بھی ملتا ہے۔ ایک لمحہ حرف ایک لمحہ گرفت میں آنے تک دوسرا لمحہ اجنبی بن جاتا ہے۔

رنگ کی وادیوں سے گزرتے ہوئے
میں ترے ساتھ تھا
دل کو تھامے ہوئے
اس سفر میں کہاں سے کہاں تک گئی
راہ کے موڑ پر
رک گئے جب مگر
میرے بڑھتے قدم ــ تو بھی موجود تھی ــ میں بھی موجود تھا
ایک لمحہ میں تو اجنبی ہو گئی (دوسرا لمحہ ۔ بلراج کومل)

اسی احساس نے ایک اور خیال کو جنم دیا..... جب ہر لمحہ اپنے ساتھ ایک نئی کیفیت لاتا ہے اور ہر آنیوالا لمحہ غیر یقینی کے اندھیرے میں لپٹا ہوا ہے تو کیوں نہ موجودہ لمحہ سے اسکا پورا حسن اور پورا رنگ بٹور کر زندگی کو رنگین بنا لیا جائے۔

ہم اور تم سب خمیازہ ہیں وقت کی تیرہ بختی کا
اپنے اپنے تاروں کو کیوں برا کہیں الزام دھریں
قرض چکا لیں، آؤ سہہ لیں زیست کی یہ بیگار بھریں
اس کے بعد تو دل اپنا ہے دل کے سپنے اپنے ہیں
باقی جو بچ جاتے ہیں وہ سارے لمحے اپنے ہیں
ان لمحوں کی بات کرو تم ان لمحوں کو کیا دو گے ؟ (اختیار۔ قاضی سلیم)

آج کے روز جبیں کل کو خدا پر چھوڑ دیں
اک لمحہ کے لئے وقت کا بندھن توڑ دیں
اپنے اسلاف کے فرسودہ خیالات کا بوجھ
کتنی صدیوں سے
اٹھائے ہوئے ہم پھرتے ہیں
اپنی ناکردہ گناہی کے طفیل
کس قدر زیست سے مایوس ہیں ہم
دیکھ یہ لمحۂ تابندہ جو سورج کی طرح ابھرا ہے
شب کی ڈائن ایسے دم بھر میں نگل جائے گی (غلام جیلانی اصغر)

موجودہ لمحے کے حسن سے دامن زندگی بھر لینے کا یہ رجحان انفرادی سوچ کی حیثیت سے اردو میں پہلے بھی پایا جاتا تھا۔ لیکن اس رجحان کو ایک مستقل فلسفۂ حیات کی حیثیت دینے اور اس کا جواز دریافت کرنے کا کام نئے ذہن نے انجام دیا ہے۔ ویسے بھی نئے ادب اور شعر میں اخبار اور احساسات کے یک سطحی ذکر کے بجائے ان کی اصل حیات و کائنات کے اندرونی رشتوں کی تلاش مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی بندھا ٹکا اصولِ حیات، سیاسی نظام یا رہنمائی آج کے شاعر کو مطمئن نہیں کر سکتی وہ حقیقت کی تلاش میں جو بھی سفر کرتا ہے وہ اس کا انفرادی عمل ہوتا ہے۔ اور اپنے ذہن و احساس کی رہنمائی میں وہ منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے آج کے ادب میں ہمہ رنگی پائی جاتی ہے آج کی تخلیقات پڑھنے والے کو قدم قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بندھے ٹکے نعروں یا فلسفۂ حیات کو ادب کے نام سے نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ کچھ نئی سمتوں میں جانے والے راستوں پر گامزن ہے اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ادب کی وسعت اس نہج اور رویے کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں گھڑی گھڑی نئی آواز۔ نئے لہجے اور الفاظ کے نئے مفاہیم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ نئے شاعروں نے موجودہ تیز رفتار زندگی کا ساتھ دینے کی بھی پوری پوری کوشش کی ہے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر آج کی تخلیقات میں ٹھہراؤ کے بجائے مسلسل رو کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ الفاظ اپنے مفاہیم بدلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خیالات منیا کی تصاویر کی طرح ہر دم نئے روپ دکھا جاتے ہیں اور پڑھنے والے کو اس کرشمگی اور بدصورتی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جس سے ہماری زندگی دوچار ہے۔

چکنے گول مٹول لڑھکتے پتھر
تازہ مٹی ان سے چپکے تو کیسے ؟ (عمیق حنفی)
ان پر کوئی تازہ انکھوا پھوٹے تو کیسے ؟

آج ہماری پوری زندگی اور ہمارا مستقبل ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن گیا ہے اور یہ سوالیہ نشان ہر سوچنے والے کی سوچ کا احاطہ کئے ہوئے ہے

دن کے چہروں میں بھی رات کا سا سناٹا
رات کی خموشی میں جیسے دن کے ہنگامے
جاگتی ہوئی آنکھیں نیند کے دھندلکوں میں
خواب کے تصور میں اک عذاب بے داری
روز و شب گذرتے ہیں قافلے خیالوں کے
صبح شام کرتے ہیں آپ اپنا غم خواری
ہم کہاں ہیں ہم کیا ہیں، کون ہیں مگر کیوں ہیں۔
ختم ہی نہیں ہوتے سلسلے سوالوں کے (خلیل الرحمٰن اعظمی۔ سلسلے سوالوں کے)

نوید کرے دل کو نہ منزل کا پتہ دے
اے رہگذرِ عشق تو کیا ہی ارادے؟ (فضیل جعفری)

یہ درد جو زندگی صورت صدیوں سے یونہی رواں دواں ہے
صدیوں سے جو روشنی کی صورت دھرتی پہ جہاں رائیگاں ہے۔
اس درد کی انتہا کہاں ہے؟؟ (تیاگ کے بعد۔ شہاب جعفری)

ریت کے ذرّوں کی طرح اڑتے ہوئے لمحوں کے اس ماحول میں ..... زندگی کے اس جلتے جھلستے ریگ زار میں سیکڑوں کی خاطر کچھ اہل فن نے اپنے خیالات و جذبات کے خوشنما سایے جگہ جگہ نصب کر دیئے ہیں ۔ وقت کی تیز رفتاری کے احساس نے انہیں افتقار کی طرف راغب کیا اور زندگی کی سنگینی کے ردِ عمل کے طور پر اُن کے لطیف احساسات اور زیادہ بیدار ہو گئے۔ چنانچہ وہ زندگی کے ہر حسین لمحے اور حادثے کو اُس کی تمام تجربیات اور بار یکیوں کے ساتھ فن میں سمونے لگے۔

وہ نیاز و ناز کے مرحلے نگہ و سخن سے چلے گئے — ترے رنگ و بو کے وہ قافلے ترے پیرہن سے چلے گئے
سخی سنا کی یہ سنت جاوداں قریب تو آ — سزاوار ہے کہ محبت ہے بے حجاب تک (قمار تمکنت)

زندگی میں حسن کی کمی نے ہر حسین لمحہ کو اتنا اہم اور عزیز تر بنا دیا ہے کہ ان ان گنت ایک لمحہ کے گذر جانے کے بعد بھی اس سے پیدا شدہ کیفیات کو اپنے سینے سے لگائے رکھنے پر مجبور ہے اور اسی سے اپنی تسکین کے سامان کر لیتا ہے۔

وہ گذری پگڈنڈی جاگی
ہر دل میں چنگاری جاگی
ہم سب اٹھ کر بیٹھ گئے ہیں ...
ٹھنڈی گیلی ریت پہ کوئی
تنکے سے کچھ کاڑھ رہا ہے
ایک پرانا لاغر کوئی
دھیمے دھیمے بھاڑ رہا ہے
شوخ ہوا کا قاصد دن بھر
پلکٹ پر آواز میں دیگا
لیکن ان بے نام خطوں کا
پڑھنے والا کون ملے گا (ہمدانی فاضلی)

زندگی کے بے پناہ تجربے احساس نے بعض شاعروں کے ذہنوں کو "ابدیت" کی طرف موڑ دیا اور انھوں نے مرنے کے بعد بھی زندہ رہنے کے باطل نور کے لئے ہندوستان کے قدیم فلسفہ "آواگون" کا سہارا لیا اور اپنے آپ کو گوشت پوست کے جسم میں محدود سمجھنے کی بجائے ہر زندہ اور موہوم چیز کو اپنا مظہر جانا۔ اسطرح زندگی اجسام یا اشیاء میں محدود ہونے کی بجائے اپنے مکمل مظاہر کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اور وقت یا زمان و مکان فاصلے اور حدیں خود بخود پگھل گئیں۔

مر بھی جاؤں تو مت رونا
اپنا سایہ نہ چھوڑے گا
میں بادل کا بھیس بدل کر
تجھ سے ملنے آؤں گا

(منیر نیازی)

تو کیا میرے بارے میں تم بھی یہی سوچتی ہو؟
ہزاروں برس کی رفاقت غلط
میں نے مانا ــــ کہ لمحوں کے جادو کا سنگیت میں نے سنا ہے۔
مگر اُس سمندر سے پوچھو ــ جسے ایک ہی گھونٹ میں پی گیا تھا

(آکاش میں شبد۔ کمار پاشی)

یہ بات بھی بڑے وثوق اور دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ آج کی شاعری اور ادب نے زندگی کے بدلتے ہوئے ہر رخ کا ساتھ دیا ہے راپنے آپ کو زندگی کے ہر نئے دریافت ہونے والے پہلو سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ زندگی کی ڈرامائیت نے نظموں غزلوں افسانوں کے ہیرو کو ڈرامائی بنانے میں مدد دی اور نئی نئی دریافتوں نے ہر چیز کو ایک نئے پہلو سے دیکھنا سکھایا۔

چاند بے نور ہے بدصورت ہے
بات دیوانے کی سچ ہی نکلی
راستوں پر کوئی نقشِ پا نہیں
کوئی نشان باقی نہیں
نقش گر لمحوں کی ہر تصویر ــــ بہت بے نشان ہے لمس قاتل کا کاف نہ بن گئی

(فضیل جعفری)

(احمد شمیم)

عزیز احمد مدنی ادیب سہیل، شاد امرتسری، عرش صدیقی، عزیز قیسی، انور معظم کی نظموں کی "ڈرامائیت" بھی انہیں احساسات کی آئینہ دار ہے۔ بالکل نئے شعراء ندیم ناجی، شمس الرحمٰن فاروقی، قمر اقبال، ممتاز راشد، پرکاش فکری، حسن کمال، مظفر حنفی، رحمت الاخر کے ہاں بھی یہ رویہ ملتا ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ نئی اردو شاعری نے محدود معنوں کے برخلاف اپنے وسیع تر مفہوم زندگی سے قربت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا ہر جھٹکا زندگی کی پشت پہلو یت کا آئینہ ہے۔ آج کا تخلیقی فنکار زندگی کو اپنے طور پر سمجھنے برتنے کا قائل ہے۔ وہ اپنے مسائل کا حل کسی سیاسی پارٹی کے منشو یا کسی رہنما کے بتائے ہوئے راستے پر اندھی آنکھوں سے چل کر ڈھونڈنا نہیں چاہتا۔ بلکہ وہ ہر مسئلہ کو اپنے طور سے حل کرنا چاہتا ہے۔ اپنے خیالات، جذبات، و احساسات کو اپنی زبان اور اپنے انداز میں ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے آج کے ادب کے بارے میں کوئی ایک فارمولا وضع نہیں کیا جا سکتا۔ ہم صرف آسانی کے لئے یہ کہہ سکتے ہیں آج پہلی بار اردو کے ادیب اور شاعر غم جاناں اور غم دوراں کے الگ الگ اور محدود خانوں کو توڑ کر زندگی کو اسکے بے اور محدود روپ میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اشیاء، کائنات واقعات و حالات کے ظاہری روپ کے بجائے انکے اندرونی رشتوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ آج کے ذہن کو سمجھنے کے لئے نظم، غزل، آزاد نظم، یا مجرد نظم، ناول، ناولٹ، افسانہ، ریڈیو تاثر اور اسی قسم کی دوسری ظاہری حد بندیوں کو توڑ کر ان کے اندر چھپی ہوئی بے تاب اور مچلتی ہوئی روح تک پہنچنے کی ضرورت ہے کہ تمام FORMS اور ہیئتیں اجسام ہیں اور اجسام فانی ہوتے ہیں۔ زندہ و پائندہ صرف روح ہے۔

عبدالکریم ثمر

غزل

اہلِ دل زمانہ سے سرگراں نہیں ہوتے
ہم کلام ہوتے ہیں ہم زباں نہیں ہوتے

اہلِ قافلہ سوچیں منزلوں پہ کیوں اکثر
راہزن ہی ملتے ہیں راہ داں نہیں ہوتے

ہوتی ہے مشیّت بھی برق و باد میں شامل
حادثے گلستاں میں ناگہاں نہیں ہوتے

آنسوؤں کے طوفاں سے بہرہ یاب ہوتے ہیں
ورنہ خود سمندر بھی بیکراں نہیں ہوتے

طور پر کوئی مچلا، دار پر کوئی کھیلا!
کیا کہا محبّت میں امتحاں نہیں ہوتے؟

نزہتیں بھی کرتی ہیں سرو و گل کی رکھوالی
خار ہی گلستاں کے پاسباں نہیں ہوتے

برق و باد کے لرزاں کیوں ہیں آشیاں والے
بجلیوں کی زد میں کیا آشیاں نہیں ہوتے؟

خارزار بھی اُن کے ہمصفیر ہوتے ہیں
پھول ہی بہاروں کے ترجماں نہیں ہوتے

بوئے گل خیاباں میں نرم رَو ہی رہتی ہے
ہمرہی ہیں گو اُسکی گلرُخاں نہیں ہوتے

شاخِ آرزو اُن کی بے ثمر نہیں رہتی
جو شجر بہاروں میں گلفشاں نہیں ہوتے

آغا رشید مرزا دہلوی

کمرہ نمبر ۲۳۴

عنوان پُراسرار ہے اور کہانی ایک جاسوس کی ہے۔ جس کا بلند تخیل، ذہن رسا اور تیز نگاہیں ہر دم موجودہ نظام، سماج اور سوسائٹی کے جرموں کے نقاب میں لگی رہتی ہیں۔ اُن کی بدعنوانیوں اور بے انصافیوں کی گرفت کرتی ہیں اور انہیں منظرِ عام پر لاتی ہیں۔ اس جاسوس سے میری ملاقاتیں ہوئیں گرانڈ ہوٹل کے کمرہ نمبر ۲۳۴ میں اور اپنے گھر پر۔ گھنٹے بیٹھے۔ کھاتے پیتے اور راستہ چلتے ہوئے گھنٹوں باتیں بھی ہوئیں۔ سیدھی سادی باتیں۔ سچی باتیں۔ چٹ پٹی باتیں۔ کڑوی کسیلی باتیں۔ خدا لگتی اور دل میں گھر کرنے والی باتیں۔ اُس کی باتیں۔ اُس کا تجسس۔ اُس کی تلاش اور اس کی گرفت ایک عام جاسوس سے بالکل علیحدہ ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کے اندھیروں کے پیچھے سائے کی طرح لگا رہتا ہے۔

وہ ایک ادبی جاسوس ہے۔ اور اس کا نام ہے کرشن چندر! ۲۸ ستمبر کو مجھے آنجہانی صاحب کا محبت نامہ ملا اور اس کے ساتھ ہی کرشن چندر کا عنایت نامہ بھی کہ وہ ۲۸ ستمبر کو کلکتہ پہنچ رہے ہیں۔ اُسی روز شام کو انہوں نے ٹیلیفون پر مجھے اپنے آنے کا مژدہ سُنایا۔ اور دوسرے روز شام کو پانچ بجے گرانڈ ہوٹل کمرہ نمبر ۲۳۴ میں ملاقات طے پائی۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ آہستہ سے دروازہ کھلا اور میرے سامنے ایک سیدھا سادا بے تکلف سا انسان کھڑا تھا۔ اس کی سادگی اس کی صاف گوئی اور سچائی، زندگی کے متعلق اُس کا تجربہ اور تجزیہ بتا رہا تھا کہ اس کے اندر جو انسان ہے وہ کتنا عظیم اور حساس ہے۔

کچھ پینے کا انتظام کروں؟

جی نہیں! میں معذور ہوں۔ آپ تکلف فرمائیں۔ میں ساتھ دے دوں گا۔

تو پھر چائے یا کافی ہی رہے۔

چائے ٹھیک ہے۔

چائے کے دور کے بعد باتوں کا دور چلا اور ساڑھے پانچ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک معلوم نہیں وقت کب اور کس طرح گذر گیا اور کے بعد ان سے میری متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور ان میں علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، فلمی، اور پھر جنگ بیتی، آپ بیتی، اپنا ادب، دوسروں کا ادب نئے لکھنے والے، پرانے لکھنے والے، ادبی رسائل اور ان کو چلانے والے۔ مثلاً "شاعر" اور آنجہانی صدیقی، "بیسویں صدی" اور خوشتر گرامی، "خونِ خون" اور ڈاکٹر اعجاز حسین۔ غرض یہ کہ کوئی موضوع ایسا نہ تھا جو زیرِ بحث نہ آیا ہو۔ اس کی تفصیل لکھوں تو "شاعر" کو ایک "ملاقات نمبر" نکالنے کی ضرورت پڑ جائے۔ اس لئے مختصراً ادبی باتیں لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ جو قارئین "شاعر" کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں۔ یا ادبی حیثیت سے کچھ اہمیت رکھتی ہوں یا اُن سے ادیب کی شخصیت اور اس کی زندگی کے کسی رُخ پر کچھ روشنی پڑ سکتی ہو۔

پرانی یادوں کو کریدتے ہوئے کرشن چندر نے کہا۔ میری افسانہ نگاری کی ابتدا ۱۹۳۸ء میں ہوئی اور میری شہرت میرے پہلے افسانوں سے ہوئی "رسالہ" ہمایوں" نے میرے پہلے ہی افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک خوش آئند پیشگوئی کی تھی۔ اُن ہی دنوں ایک ادبی جلسہ میں مجھے شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا۔ ایک مقرر نے اپنی تقریر میں میرا ذکر کرتے ہوئے میرے افسانے کی توہین کی۔ اس کے بعد تو پھر سلسلہ ہی شروع ہو گیا۔

میں نے آل انڈیا ریڈیو بمبئی میں ملازمت کی لیکن وہاں میرے خلاف شکایت ہوئی کہ میں کانگریس کے [illegible] بات کرتا ہوں۔ اس کے بعد میں وہاں سے علیحدہ ہو گیا۔ اور لکھنؤ چلا آیا۔ میں نے بہت سوچ بچار کر اردو کو اپنا پیشہ بنایا اور اس میں کامیاب ہوا۔ میرے سو سے زیادہ افسانے مقبول ہیں۔ آج بھی وہ لوگ میرے یہاں سے کہتے ہیں۔ یہ تیرا بٹیا کیا لکھتا ہے اور اس سے کیا کماتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ایک افسانہ لکھ کر اور اس میں زندگی سمو کر جو خوشی مجھے حاصل ہوتی ہے، شاید یہ ایک لاکھ روپیہ مفت ملنے پر بھی حاصل نہ ہو۔ میں نے ادب سے کوئی دولت نہیں کمائی ہے۔ میرا اپنا کوئی ذاتی مکان نہیں ہے۔ کرایہ کے مکان میں رہتا ہوں۔ میرے پاس گاڑی موٹر بھی نہیں ہے، اور میرا کوئی بھاری بینک بیلنس بھی نہیں ہے۔ لیکن ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں کسی کا مرہون منت نہیں کسی کا احسان مند نہیں۔ یوں میں اگر اب بھی چاہوں تو تعلقات سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ اتنا کما کر بھر سکتا ہوں کہ لاکھوں پیدا کر لوں۔ لیکن جس روحانی اذیت میں مبتلا ہوں گا۔ میرے اندر جو شے مجھ سے لکھواتی ہے۔ وہ ضمیر۔ وہ احساس۔ وہ درد۔ اور ان سب سے طاقتور بنا ہوا افسانہ نگار جس کا نام کرشن چندر ہے مر جائے گا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ کوئی چیز ہے جو آپ ہی آپ اندر سے مجھے لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ خیالات ابلے پڑتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایک ذہنی اذیت مجھ پر بھی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ فرصت یہ اخلاص دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ کہیں دور بھاگ جاؤں جہاں یہ سب میری نظروں سے اوجھل ہو جائے اور میں کچھ دیکھ نہ پاؤں۔

اس پر بھی آپ پر الزام ہے کہ آپ کمرشیل رائٹر ہیں۔ اور یہ کہ آپ کا فن زوال پذیر ہے؟

مجھے احساس ہوا کہ میرے اس سوال سے ان کے چہرے پر افسردگی سی طاری ہو گئی۔ بات ہی افسوسناک ہونے کی ہے۔ کسی کی محنت اور قربانی کو یوں چند لفظوں میں ختم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو بلندی پر دیکھ نہیں سکتے۔ یا تھوڑا بہت جو کچھ بھی کسی نے ہمارے ادب کو دیا ہے۔ ہم اس کی قدر کرنے یا پہچاننے سے قاصر ہیں یا پھر ہم مردہ پرست ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا جواب دیتے میں نے خود ہی کہا۔ اس الزام کا ایک مختصر سا جواب "کرشن چندر۔ کمرشیل ازم اور انحطاط" کے عنوان سے میں نے لکھا ہے جو "شاعر" کے کرشن چندر نمبر میں شائع ہونے والا ہے

اس وقت مسرت کی ایک لہر ان کے چہرے پر تھی اور کیوں نہ ہوا اپنے فن اور محنت کی قدردانی سے کسے خوشی نہیں ہوتی۔

مضمون کا نام سن کر انہوں نے جواب دیا ہاں میرا خیال ہے شاید ممتاز صاحب نے بھی اس کے بارے میں مجھ سے ذکر کیا تھا کہ بہت اچھا جواب لکھا ہے۔ لیکن کیا آپ اسے مکمل کر چکے ہیں۔؟ میں اس سلسلہ میں آپ کو کچھ اور بھی پوائنٹ دینا چاہتا ہوں۔ آپ انہیں ضرور لکھیں۔

میں نے جواب دیا۔ جی ہاں میں وہ مضمون مکمل کر چکا ہوں اور اسے بھیج بھی چکا ہوں۔ لیکن وہ پوائنٹ آپ مجھے ضرور بتائیں۔ میں ان کا ذکر تفصیل سے دوسرے مضمون میں کروں گا۔ جو آپ سے ملاقات کے سلسلہ میں ہوگا اور اس کا عنوان ہوگا کہ ۲۳۴

پھر اس سلسلہ میں جو باتیں انہوں نے مجھے بتائیں۔ اگرچہ میں ان کا ذکر اشارتاً "کرشن چندر کمرشیل ازم اور انحطاط" میں کر چکا ہوں۔ لیکن ان کی زبانی جو باتیں سنیں۔ ان کو تفصیل سے دہرا دینے سے بات کچھ زیادہ صاف ہو جاتی ہے۔

کرشن چندر نے کہا۔ یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں نے ادب سے کوئی دولت حاصل نہیں کی۔ اور نہ ادب سے کوئی کما سکتا ہے مجھے ایک افسانے کے سو روپے سے لے کر پونے دو سو تک ملتے ہیں۔ اور میں ایک مہینے میں دو افسانے اور ایک سال میں صرف دو ناول لکھ پاتا ہوں۔ یوں لکھنے والے ہفتہ میں ایک ناول بھی لکھتے ہیں۔ لیکن میں اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ اب آپ اندازہ لگائیے کہ اس سے کتنا کما سکتا ہے۔ میری ضرورتوں کا دسواں حصہ بھی اس سے پورا نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود میں اردو ادب کے لئے لکھتا ہوں۔ اس وقت تک میری ساٹھ سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن میری گذر اوقات اور میری ضرورتیں تو بے فیصدی فلم سے پوری ہوتی ہیں۔ میں مکالمہ اور اسکرین پلے [illegible] لکھتا ہوں۔ دوسرے پیشوں کی طرح یہ بھی ایک پیشہ ہے اور اس کے لئے میں کسی کے دروازہ پر نہیں جاتا۔ کسی کی خوشامد نہیں کرتا۔ ضرورت مند خود ہی میرے پاس آتے ہیں۔ میں فلمی کہانی نہیں لکھتا کیونکہ گھٹیا قسم کی کمرشیل کہانی کوشش کے باوجود میں اگر چاہوں بھی تو نہیں لکھ سکتا۔ اور جو کہانی میں لکھ سکتا ہوں وہ فلم میں چل نہیں سکتی۔

دوسری بات جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ افسانہ کسی دوست کے تقاضہ پر اُسے مفت دینے کے لئے لکھا جائے یا صاحب [illegible] کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے لکھا جائے۔ لیکن کہانی لکھتے وقت کسی بھی ادیب کے سامنے اس کا دوست یا صاحب

کا خیال یا کوئی اور تجارتی یا غیر تجارتی مقصد نہیں ہوتا۔ اُس وقت جو چیز سامنے ہوتی ہے وہ صرف کہانی ہوتی ہے۔ اُس کا پلاٹ ہوتا ہے۔ اُس کے کردار ہوتے ہیں اور اُس کے دوسرے تمام لوازم ہوتے ہیں اور ان ہی میں ڈوب کر وہ لکھتا ہے۔ یہ بات تو کہانی لکھنے کے بعد کی ہے کہ لکھنے والا اسے کسی دوست کو دیتا ہے یا اسے فروخت کر کے اپنے مکان کا کرایہ دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے شیکسپیئر نے رومیو جولیٹ اپنی محبوبہ کی کسی فرمائش کو پورا کرنے کے لئے لکھا ہو یا اپنے مکان کا کرایہ ادا کرنے کے لئے۔ لیکن لکھتے وقت اس کے سامنے نہ محبوبہ ہوگی نہ مکان کا کرایہ۔ اُس وقت اُس کے سامنے صرف رومیو جولیٹ ہی ہوگا۔ پھر اگر ہم شیکسپیئر کو یا کسی بھی ادیب یا شاعر کو جو اپنے قلم کے زور پر تھوڑا بہت کما لیتا ہو، کمرشیل رائٹر یا شاعر کہیں تو حماقت ہے۔ ہر فنکار چاہتا ہے کہ اپنے فن کو اپنا پیشہ بنائے اس کے فن کی زیادہ سے زیادہ قدر و قیمت ہو۔ اُسے اُس کی محنت کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ ملے اور یہ کوئی گناہ نہیں اور تجارت بھی نہیں۔

جہاں تک میرے فن کے زوال پذیر ہونے کا سوال ہے۔ میرا فن ہی اس کا جواب ہے۔ میں کسی کے اعتراض کا جواب نہیں دیتا۔ اس کے جواب میں صرف ایک کہانی لکھ دیتا ہوں۔ اور یہ ہی میرا جواب ہوتا ہے۔

اُردو افسانہ نگاری اور شعر و ادب کے بارے میں انہوں نے کہا:

"میرا خیال ہے کہ اُردو شعر و ادب اور افسانہ نگاری کا عروج ۱۹۳۰ء میں ہوا اور ۱۹۴۴ء میں اپنی انتہا کو پہنچا ــــ اور یہ ۱۹۴۷ء کے ادائل تک رہا۔"

"آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا۔ یہ وہ دور تھا جب منٹو۔ بیدی۔ عباس۔ عصمت۔ اشک اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ سب جمع تھے۔ تقسیم کے ہنگامے کے بعد جمود اور زوال کا دور دورہ کافی مدت رہا۔ اس وقت اُردو کسی دور میں بھی ہو، جمود یا زوال ترقی یا مجبوری، لیکن عروج کا وہ دور ابھی تک اردو کو پھر دوبارہ نصیب نہیں ہوا۔"

"دراصل تقسیم کی وجہ سے اردو اور اردو ادب کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا، حالانکہ میں تقسیم کی موافقت میں لکھنے والوں میں سے تھا۔"

"آپ نے کب اور کس عنوان کے تحت لکھا تھا۔ میری نظر سے آپ کی کوئی ایسی تحریر نہیں گذری۔"

"مجھے یاد نہیں، لیکن میں نے لکھا ضرور تھا۔ دو بھائی۔ جب ایک ساتھ رہنا نہیں چاہتے تو انہیں علیحدہ ہی کر دینا چاہئے لیکن یہ ایک بھول تھی اور بہت ہی غلط خیال تھا۔ سب اکٹھے رہتے تو اردو زبان و ادب کہاں پہنچا ہوتا اور کیا شان ہوتی۔ لیکن اب کہنے سے کیا حاصل ہے۔ جو ہونا تھا سو ہوا۔ اللہ کو یہ ہی منظور تھا۔"

"موجودہ دور کی افسانہ نگاری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔"

"اس وقت کی افسانہ نگاری میں [illegible] نہیں ہے۔ زیادہ تر افسانہ نگاری مبہم ہے۔ مثال کے طور پر "شب خون" کی اکتوبر کی اشاعت میں دو افسانے شائع ہوئے ہیں۔ دونوں کے دونوں مبہم ہیں۔ معلوم نہیں لکھنے والا کیا کہنا چاہتا ہے۔"

"میں وہ افسانے پڑھ چکا ہوں ہوسکتا ہے کہ تجریدی آرٹ کی طرح افسانہ نگاری میں بھی یہ لوگ کچھ نئے تجربے کرنا چاہتے ہوں! یا ماڈرن آرٹ کی طرح کوئی نئی چیز پیش کرنا چاہتے ہوں۔"

تجریدی آرٹ کی مثال پر ہنستے ہوئے کرشن چندر نے جواب دیا۔

"یہ بات آپ نے خوب کہی لیکن وہ کسی خاص طبقے کے لئے تو ہے۔ بات یہ نہیں۔ دراصل یہ افسانہ نگاری میں ناکامی کا ردِ عمل ہے۔ نئے لکھنے والوں میں آپ کے خیال میں کون سے کامیاب اور اچھے لکھنے والے ہیں۔"

میرے خیال میں بہت سے اچھے افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ سب کا نام لینا طوالت کا باعث ہوگا۔

۱۹ اکتوبر کی صبح میں نے ٹیلیفون کیا۔ کرشن چندر نے کہا اگر آپ چلے آئیں تو گپ رہے۔ اس وقت مجھے فرصت ہے۔ میں آدھے گھنٹے میں پہنچ گیا۔ چائے کا ایک دور ہوا اس کے بعد مارکیٹ کا چکر ہوا۔ کرشن چندر نے صرف پھل ہی پھل خریدے۔ شریفے اور دوسرے کے سیب کے

لیکھے۔ طنز نگاری میں وہ دوسروں کے دانت کھٹے کرتا ہے لیکن پھل کھانے میں خود اپنے دانت کھٹے کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ پھلوں کا شوقین ہے۔ اگر اسے کسی باغ میں چھوڑ دیا جائے تو وہ درخت پر چڑھ جائے گا اور وہیں سارا پھل توڑ کر کھا جائے گا اور اف تک نہ کہے گا۔ کرشن چندر کو پھل اس لئے مرغوب ہیں کہ ان کے خیال میں یہ ہی ایک چیز ہے جو ابھی تک خالص ہے اور اس کی اصلیت برقرار ہے۔ اس میں ملاوٹ کرنے یا اس کو جعلی پیمانہ پر بنانے کا طریقہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا

ہوٹل میں واپس آنے کے بعد پھل پلیٹ میں سجا کر رکھ دیئے۔ کچھ دیر ان کو دیکھا۔ پھر کہا۔ بھئی مجھ سے ضبط نہیں ہو سکتا۔ ایک ایک شریفہ ہو جائے اور دو منٹ میں شریفے صفاچٹ تھے۔

میں نے دریافت کیا۔ لکھنے کے لئے کیا ضروری ہے کہ شراب یا سگریٹ یا کسی ایسے ہی نشہ کا سہارا لیا جائے۔ "نہیں بالکل نہیں۔ میں خود سگریٹ قطعی چھوڑ چکا ہوں۔ شراب چھوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بہت کم کر دیا ہے۔ اب اس عادت کو ہفتہ میں صرف ایک دو مرتبہ۔ وہ بھی دو پیگ سے زیادہ نہیں۔ اس سے زیادہ تو میں [illegible] ہی نہیں کر سکتا۔ آؤٹ ہو جاتا ہوں۔

بذاتِ خود نشہ ہونے کے باوجود آخر اس میں کیا لذت ہے۔ کیا سرور جیسی واقعی کوئی چیز آپ کو محسوس ہوتی ہے۔ میں نے دریافت کیا۔ اس پر وہ مسکرائے اور کہا۔ ہاں سرور تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن آل احمد سرور نہیں۔ ابھی دوران میں انہوں نے مجھے بتایا اور گذشتہ ملاقاتوں میں یہ میں نے محسوس کیا تھا کہ کرشن چندر کو کھانسی کا تماشا ہے۔ لیکن اس مرتبہ برائے نام تھی۔ انہوں نے بتایا کہ مجھے کھانسی نے پریشان کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر سے ابھی وقت مشورہ کیا۔ ایکس رے بھی لیا گیا۔ خدا کا شکر ہے کچھ نہیں نکلا۔ ایکس رے بالکل صاف ہے۔ تکلیف گلے کی خرابی کی وجہ سے تھی۔ دوا کھا رہا ہوں اور اب اچھا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اٹھے الماری کھول کر رپورٹ اور ایکس رے فلم مجھے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ بھئی دیکھ لو کرشن چندر اندر سے کیسا ہے۔

میں نے ایکس رے اور رپورٹ کلیر [illegible] دیکھتے ہوئے کہا۔ کیوں نہ ہو۔ کرشن چندر جیسا باہر سے صاف ستھرا ہے۔ ویسا ہی اندر سے بھی صاف ستھرا ہے۔

۱۴ اکتوبر کو کرشن چندر میرے ہاں مدعو تھے۔ کھانے سے زیادہ ان کی باتیں مزیدار تھیں۔ گذشتہ شام وہ ایک مشہور فلم اسٹار کے ساتھ تھے جس کا نام لکھنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ ان ہی دنوں کلکتہ میں سنیما اور دوسری ہڑتالوں کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اس پر اعتراض کرتے ہوئے فلم اسٹار نے کہا۔ یہ دو دو کوڑی کے آدمی اتنے چڑھ گئے ہیں کہ ہڑتالیں کرتے ہیں اور ملک و قوم کی انڈسٹری کو نقصان پہنچاتے ہیں اور میرے ڈرائیور نے مجھ سے یونین میں شریک ہونے کی اجازت مانگی۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ جس دن تم یونین میں جاؤ گے اسی روز تمہیں نوکری سے الگ کر دوں گا۔

کرشن چندر نے بتایا۔ اس وقت میرے دل میں آیا کہہ دوں کہ تم بھی کبھی دو کوڑی کے آدمی تھے۔ لیکن کیا کرتا۔ اس وقت تو وسکی اسی کے پیسے کی چل رہی تھی۔ اور چاروں طرف اس کے چمچے بھی موجود تھے۔ پھر بھی میں چوکا نہیں۔ مناسب الفاظ میں کہہ ہی دیا۔ کتنے ڈرائیوروں کو نکالو گے۔ یہ سلسلہ اب رکنے والا نہیں۔

ایک مارواڑی کے یہاں کھانے کا دلچسپ قصہ سنایا۔ غالباً ۱۹۵۵ء میں کلکتہ میں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی آل انڈیا کانفرنس تھی۔ اس کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ ایک مارواڑی سیٹھ نے کہا اگر کرشن چندر اور پرتھوی راج (فلم ایکٹر) دونوں میرے ہاں کھانا کھائیں تو میں پانچ ہزار روپے کا چندہ دیدوں گا۔ میں نے سوچا بھئی اگر چندہ لینا ہے تو کھانا ہی پڑے گا۔ کھانا نیچے زمین پر بیٹھ کر کھلایا گیا۔ پیٹھانی سب کو کھانا باندھتی۔ لیکن جب سیٹھ کے لئے لاتی تو خاص چیز چھپا کر لاتی اور جلدی سے تھال میں ڈال دیتی کہ کوئی دیکھے نہیں۔ ہم لوگ یہ خفیہ انداز دیکھتے رہے۔

۱۶ اکتوبر کی شام کو میرے ہاں ایک ادبی نشست کا انتظام تھا۔ احمد صاحب اکبر آبادی۔ پرویز شاہدی۔ اور کلکتہ کے دوسرے شاعر مدعو تھے۔ لیکن کرشن چندر کی ہمہ وقت مصروفیات کی مجبوریوں کی وجہ سے یہ نشست نہ ہو سکی۔

۱۷ اکتوبر کو صبح ناشتہ کے قریب کرشن چندر نے مجھ سے فون پر کہا کہ اس وقت گیارہ بجے تک مجھے فرصت ہے اگر آپ آئیں

کرشن موہن

غزل

"پیو پیالۂ خوشبوئے عنبریں بدناں"
جیو میانِ گروہِ نفیس سرد ہناں
شعورِ عشق کو چمکاؤ حسنِ رنگیں سے
اٹھاؤ لذتِ انداز و نازِ سیم تناں
فریبِ دنیا و فا کارہِ محبت میں
طریقِ راہبراں ہے کہ طرزِ راہزناں
یہی ہے رسمِ زمانہ شکستہ دل مت ہو
کہ تحفہ عشق کا ہے طعن و طنزِ ہم سخناں
سلوکِ تلخ نہ کر اپنے کرشن موہن
نہیں یہ رنگ ہم آہنگِ انگبیں دہناں

سید حرمت الاکرام

غزل

عجیب ہے مری محرومیوں کا افسانہ
حضورِ دوست بھی جاتا ہوں بے نیازانہ
نہ ہو وہ میرے ہی جامِ تہی میں چہرہ پوش
جبینِ آفتاب کی جو یا ہے صبحِ مے خانہ
مئے نشاط سے لبریز اس قدر بھی نہ کر
چھلک نہ جائے کہیں زندگی کا پیمانہ!
بھڑک اٹھے تو نہیں خیر شمعِ محفل کی
وہ آگ، دل میں جو رکھتا ہے اپنے، پروانہ
جنوں بھی ہوش میں اپنے نہیں رہا شاید
تمھیں کو بھول گیا ہے تمھارا دیوانہ
ہے اعتراف مجھے اپنی کم نگاہی کا
مرا شعار نہیں جرأتِ کلیمانہ
یہ احتیاطِ خرد ہے کہ امتحانِ جنوں
ہمیں سے کہتی ہے دنیا ہما افسانہ
سجائے جاتے ہیں کانٹوں سے گلستاں حرمت
مگر ہے لالہ و گل پر نظر حریفانہ

مناظر عاشق ہرگانوی

علامہ تاجور کی صحافتی زندگی

شمس العلماء علامہ حسرت اللہ خاں تاجور نجیب آبادی کی علمی ادبی اور صحافتی زندگی سے بعد کون ناواقف ہو سکتا ہے۔ اردو ادب میں علامہ ایک آفتاب درخشاں کی طرح ہیں۔ انھوں نے سرزمین پنجاب پر علم و ادب کی مشعل اس طرح روشن کی کہ اردو شعر و ادب کا ذوق سلیم بے شمار شہد سکہ نوجوانوں میں بھی پیدا ہو گیا صرف تنہا یہی نہیں ایک شاعر، ادیب اور صحافی کی حیثیت سے بھی علامہ کا مقام بہت بلند ہے۔ انھوں نے نثر و نظم کی ہر صنف پر لکھا ہے اور جب لکھا ہے اور اپنی صحافت نگاری کے ذریعہ قابل فراموش خدمات انجام دی ہیں

علامہ تاجور کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۱۱ء سے ہوتا ہے "آلۂ بسمل" لدھیانہ۔ "آفتاب احمد" اور "تاج الکلام" نجیب آباد کی ادارت یا الترتیب ۱۹۱۱ء ۱۹۱۳ء ۱۹۱۴ء جب آپ نے کلکتہ کی رسائل کے ذریعہ آپ نے اردو کی کوئی بہت نمایاں خدمت انجام نہیں دی اور نہ انہیں کوئی شہرت حاصل ہوئی لیکن ۱۹۱۵ء میں جبکہ "مخزن" علامہ میں تھا اور اس کے بورڈ سے ایڈیٹر سر شار علی شہرت دہلوی کا کانٹا ہو "مخزن" کا بار جو اٹھانے کے قابل نہ تھا تو انھوں نے عنان ادارت تاجور کو دیدی تاجور اس سے پہلے تین رسائل کی ایڈیٹری کر کے اچھا خاصا تجربہ حاصل کر چکے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کی ادارت میں آتے ہی "مخزن" دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا اور پانچ سال تک ترقی کرتا رہا۔ اس عرصے میں تاجور نے اپنی ایک الگ دنیا قائم کر لی اور شہرت میں بھی ایک اچھا خاصا نام کما چکے تھے مگر "مخزن" کی ادارت کر کے خود ان کا اپنا پالنا مشکل ہو رہا تھا کیونکہ مخزن کے ایڈیٹر کی تنخواہ پانچ روپے اور خورد و نوش بھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ "مخزن" سے کنارہ کش ہو گئے۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں جب میاں بشیر احمد ہارڈ ایٹ لا نے "ہمایوں" جاری کیا تو اس کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داریاں تاجور کو حاصل ہو گئیں۔ رسالہ کے ٹائیٹل کی پیشانی پر ایک عرصہ تک تاجور کا یہ شعر بھی چھپتا رہا۔

لبِ تاجور درشکر سخناں ادر جنبد آمد!
مقالِ اللہ ہمایوں دلگیرو دلربند آمد!

لیکن بعد میں میاں بشیر احمد کے والد میاں شاہ دین کا یہ شعر چھپنے لگا۔

اٹھو دگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی!
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!

تاجور پانچ سال تک "ہمایوں" کی ادارت کرتے رہے۔ اس دوران میں انہیں اردو زبان و ادب کی مزید خدمت کے لئے اور گرانقدر نایاب مطبوعہ اردو کتابوں کی ترتیب تہذیب اور ہر قسم کی علمی و ادبی اردو تصنیفات و تالیف کی اشاعت کے لئے ایک ادارہ کی ضرورت محسوس ہوتی رہی۔ جیسے قائم کرنے اور طریق انتخاب و طریق کار کے متعلق عبدالحلیم شرر، علامہ سید عبدالماجد دریابادی، اعجاز حسین دہلوی، سید غلام بھیک نیرنگ، رشید احمد صدیقی، کشوری موہن سرا، سید جالب دہلوی ایڈیٹر "ہمدم" لکھنؤ، میاں بشیر احمد خان بہادر ڈاکٹر میاں محمد شفیع بار ایٹ لا، مولانا راشد الخیری دہلوی ایڈیٹر "عصمت" چودھری فتح دین، سید ناصر نذیر فراق دہلوی، چودھری غلام رسول شوق، خواجہ ولی محمد، وحید الدین سلیم، مولانا ساک ایڈیٹر "انقلاب"، مولانا خلیفی دہلوی، ہوش بگرامی ایڈیٹر "زخیرہ" اور دوسرے حضرات سے انھوں نے مشورہ طلب کیا اور اگست ۱۹۲۵ء میں عطر چند کپور اینڈ سنز تاجران کتب لاہور اور خان بہادر شیخ الٰہی انسپکٹر مدارس لاہور ڈویژن کے اشتراک عمل سے اردو مرکز قائم کر دیا جس کے اشتاف میں علامہ سیماب اکبر آبادی، حضرت گویا

اکبر الہ آبادی، گویا جہان آبادی، سرور بارہ بنکوی، سنگور شاہجہانپوری، نظیر لدھیانوی، شیر علی افسر خوشابی، فاخر ہریانوی، پنڈت میلا رام وفا، مفتی سہسوانی، افسر بدایونی، عابد علی عابد، قصدق حسین خالد، شیخ عبداللطیف طیش، شیخ محمد ہادی حسن قریشی، یوسف سلیم چشتی، شیخ محمد ضیاء الدین شمسی اور مولانا حامد علی خاں جیسے ملک کے منتخب اہل قلم اور انشا پرداز تھے۔ اراکین مجلس شادت میں سر شیخ عبدالقادر، برج موہن دتاتریہ کیفی اور خان بہادر نواب بھی شامل تھے۔ اسی ادارے کی طرف سے تاجور نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایک غیر سیاسی ہفت روزہ "اتحاد" اور بچوں کے لئے ہفت روزہ "پریم" جاری کیا۔

"مخزن" "ہمایوں" اور "اتحاد" وغیرہ کی ادارت کے بعد علامہ کی ادبی شہرت ہندوستان گیر بن چکی تھی اور اسی شہرت اور تجربہ سے فائدہ اٹھا کر سالنامے السوشیٹڈ پبلیکیشنز کے سائز پر یادگار علمی و فنی اور مشہور زمانہ معتبر رسالہ "ادبی دنیا" جاری کیا جس کے طویل سائز، رنگین تصاویر اور گوناگوں مضامین نظم و نثر سے دنیائے ادب میں تہلکہ مچ گیا، اور بقول علامہ تاجور "رسالہ "ادبی دنیا"

"اس سطوت و جلال کے ساتھ افق ادب پر طلوع ہوا کہ آسمان ادب کے پرستاروں کے چراغ گل ہو گئے، اس بیان میں شاعری ہے یا خود فراموشی عام طور نے اسے صحافت کیلئے نشان راہ تسلیم کیا۔ اس کی مانگ دنیا کے ہر اس منطقے میں تھی جہاں ہندوستانی پہنچ چکے تھے۔ اگلی غیر ملکی ڈاک ہی پتہ چلتی تھی کہ دنیا میں اردو داں ہنوز کتنے ہیں۔ مجموعی ڈاک کبھی اس مقدار کو نہیں پہنچی ہوگی۔

ادبی دنیا کے بعد جتنے دو رسالے جاری ہوئے ان میں سے اکثر کے نام "ادبی ..." کا لفظ ضرور شامل ہوتا تھا۔ یہ علم و ادب کا صحافتی طوفان پانچ سال تک بگولے اور بگولے بگولے دس سال تک باد صبا اکثر معاصرین اپنے اپنے ظرف و حوصلہ کے مطابق اس سیلاب کو روکنا چاہا مگر ناکام رہے۔ تیز گھوڑا کیسے یا خت جانی انہیں ہر طوفان سکھا دیتے گئے مگر نہ پانی تو ان کے مرے گندہ کر چکا تھا۔ اس دور میں لپٹ فطرت معاصرین کی ماہنامہ بدھوں کے لئے ایسے افق کے تماشے دیکھنے میں آئے کہ افسر نگاہ تماشا حیرت زدہ ہو کر ڈوب گئی۔

ہماری ادبی و صحافتی لائنوں میں یہ نسلی و نسلی وبائے عام کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ "ادبی دنیا" کے عہد عروج میں مجھے اس وبائے عام کو عریاں صورت میں دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ بعض معاصرین "ادبی دنیا" کے ہر تازہ نمبر کو دیکھ کر میرے اور "ادبی دنیا" کے خلاف ایک مجلس تبری منعقد کر کے اپنے حسد پیشہ ساتھیوں کے ساتھ ہر سہ[1] گانے میں زندگی کا سکون محسوس کرتے تھے ——— بہرحال "ادبی دنیا" کے جاہ و جلال نے ہر صحافتی لپٹی میں جان ڈال دی تھی۔ لیکن میری انتظامی قابلیت اور عملہ انتظام پر زور اعتمادی کے سبب یہ پرچہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔"

چند احباب کی باطنوں کی سازش کی وجہ سے مارچ ۱۹۳۴ء میں "ادبی دنیا" تاجور کے ہاتھ سے نکل گیا مگر مئی ۱۹۳۵ء میں اسی بڑے سائز پر "شاہکار" نامی معتبر رسالہ جاری کر دیا۔ جس کی ظاہری اور معنوی خوبیاں ادبی دنیا سے بھی زیادہ تھیں۔ مولانا یہ رسالہ قریب پانچ سال تک چلاتے رہے، لیکن "شاہکار" کے کارکن دیانت دار اور محنتی نہیں تھے، یہی وجہ تھی کہ مولانا قریب کھاتے رہے اور فائدہ کی بجائے نقصان اٹھاتے رہے۔ کیونکہ ہر سال ہزارہا روپے انہیں اپنی آمدنی میں سے "شاہکار" پر خرچ کرنے پڑ رہے تھے اس لئے پانچ سال بعد "شاہکار" بھی ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن "شاہکار" کی حیثیت اردو صحافت کی تاریخ میں ایک ممتاز نشان کی ہے۔ اس کی جامعیت، رفعت اور شان کا اندازہ پرانے فائلوں سے لگایا جا سکتا ہے یا پھر ان خطوط سے جو "شاہکار" کے مختلف شماروں میں چھپے پڑے ہیں۔ دسمبر ۱۹۳۵ء کے شمارہ سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے خط کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

اس قسم کے دیدہ زیب رسالے کی اردو کو بہت سخت ضرورت تھی، اگرچہ پنجاب سے اس طرح کے اور بھی رسالے نکلتے ہیں لیکن شاہکار اپنے گوناگوں خصوصیات کی بنا پر سب پر سبقت لے گیا ہے، خاص کر تنقیدی اور تنقیدی مقالات و مضامین کی وجہ سے اردو کے سنجیدہ اور علمی رسائل میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔ اس پایہ کا اعلیٰ علمی مقالات کے ساتھ ساتھ ظاہر بینوں اور عام دلچسپی

---

[1] ہرسیہ بروزن فریضہ۔ نظم کی اس مخصوص صنف کا نام ہے جو سہ تراکی حضرت عمرؓ، ابوبکرؓ، عثمانؓ کی شان میں کہا کرتے ہیں یہ صنف شیر گلشن کی ایجاد ہے۔ علیہ ما علیہ۔

رکھنے والے اصحاب کے مذاق کا بھی خیال رکھنا نہایت مشکل امر ہے اور بڑی خوشی ہوتی ہے جب "شاہکار" میں یہ دونوں خوبیاں ہم پہلو نظر آتی ہیں۔"

علامہ تاجور دور بیں نگاہ رکھتے تھے اور اردو کے ہونہار بردا کی تلاش میں اور ان کی حوصلہ افزائی میں ذرا بھی کوتاہی روا نہ رکھتے تھے۔ فروری ۱۹۳۶ء "شاہکار" میں عبدالحمید عدم کے مجموعۂ کلام "نقش دوام" پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں "۳۰ء یا ۳۱ء کا ذکر ہے کہ رسالہ "ادبی دنیا" کی ڈاک میں ایک نظم آئی۔ نظم کے نیچے لکھا تھا "سید عبدالحمید اختر"۔ نظم کے کچھ اشعار غلط کچھ صحیح تھے۔ نظموں کی ترتیب نپٹ میلا رام وفا کر رہے تھے۔ انھوں نے اس نظم کو ترتیب کے لئے انتخاب نہ کیا۔ میں نے خود سے دیکھا تو صحیح اشعار میں بھی زندگی کی جھلک پائی، وفا سے کہا "یہ نہ جا سکے گی؟" وہ بولے "نہیں غلطیاں بہت ہیں۔" میں نے کہا "درست کر دو۔" انھوں نے جواب دیا کہ اس کی رعایت منظور ہے تو اس کے نام سے ایک نظم کہے دیتا ہوں، یہ میرے لئے آسان ہوگا۔" اچھا مجھے دیدو میں درست کرتا ہوں۔" نظم طویل تھی، میں نے کچھ وقت لگا کر غلط اشعار کی اصلاح کی اور زیر ترتیب نمبر میں شائع کر دی۔

پرچہ شائع ہوا تو ایک طالب علم دفتر میں آیا اور رسم سلام کے بعد بولا "میرے نام کا پرچہ میری نظم چھپی ہے۔" پھر ذرا شرمندہ ہو کر پوچھا "آپ نے میرے شعر میں تبدیلی کیوں کر دی؟" اتفاق سے وفا صاحب بھی میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا "کون سی نظم، اور آپ کا نام؟" میرا نام سید عبدالحمید اختر ہے۔" مجھے اور وفا کو اس دن کا واقعہ یاد آ گیا، وفا نے کہا "ادھر دماغ سوزی کرو، دیکھو کیا معاملہ رہا ہے۔" میں نے فرضی انداز میں تلخ نوائی شروع کر دی اور کہا "دفتر گھنٹے ضائع کر کے نظم درست کی گئی، اس کا صلہ یہ دے رہے ہو۔" نوجوان شاعر نے کچھ محسوس کر کے شکریہ ادا کیا اور پھر اس کی نظمیں مسلسل آنے لگیں۔ اور آج اس کی نظموں کا مجموعہ میرے سامنے ہے۔ اس مجموعے کو دیکھتا ہوں اور اختر کو جو اختر سے آفتاب بن کر عدم کہلانا پسند کرتا ہے۔"

آج کل ہندو پاک میں جتنے بھی رسائل نکل رہے ہیں، ان میں تبصرہ کا کالم ضرور ہوتا ہے۔ کسی کتاب پر تبصرہ کرتے وقت جن امور کو پیش نظر رکھنا چاہیئے، اس کی تفصیل فروری ۱۹۳۶ء کے "شاہکار" میں علامہ تاجور نے "اصول تبصرہ" کے عنوان سے بیان کی ہے جس کا پڑھنا ہر نامور ہستی کے لئے ضروری ہوگا۔ علامہ لکھتے ہیں۔

کسی کتاب پر تبصرہ کرتے وقت حسب ذیل امور کو پیش نظر رکھنا چاہیئے (۱) کتاب کا ناشر کون ہے (۲) کتابت کی قطع اور ضخامت کتنی ہے؟ اور اس کی طباعت و کتابت کیسی ہے؟ کتاب کی قیمت حسب حیثیت ہے یا کم و بیش؟ (۳) کتاب کا نام اس کے موضوع کے مطابق ہے یا نہیں؟ قاری یا خریدار کو اس نام سے دھوکہ تو نہیں ہو سکتا؟ (۴) کتاب کا موضوع کیا ہے؟ اور وہ کن لوگوں کے لئے مفید ہے۔ (۵) کتاب کی خصوصیت کیا ہے؟ بیان یا خیالات یا جذبات؟ اور یہ خصوصیت موضوع سے مطابقت کرتی ہے یا نہیں؟ قصہ سفرنامے میں احوال و کوائف کو خصوصیت حاصل ہونی چاہیئے۔ نظم میں خیالات کو اور شاعری میں جذبات کو اس کے ساتھ بھی دیکھنا چاہیئے کہ خصوصیت کتاب الفشان سے تجاوز تو نہیں کر گئی ہے مثلاً سفرنامے میں بیان کو اس قدر طویل تو نہیں کر دیا گیا ہے کہ غور و فکر کی گنجائش بھی باقی نہ ہو؟ یا نظم کی کتاب میں اتنے شعور خیالات تو نہیں ہیں کہ ان میں بیانات و جذبات کا مطلق دخل نہ ہو۔ (۶) بیان کے بارے میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جو قصے بیان کئے گئے ہیں آیا وہ صحیح اور واضح ہیں؟ وہ تجربات کا نتیجہ ہیں یا خیالات کا؟ اگر طبعزاد ہیں تو ممکن ہیں یا ناممکن؟ کیا ان قصوں کے لئے مصنف نے ناظرین کو پہلے سے تیار کر دیا ہے؟ یعنی کتاب میں ایسی بات تو نہیں ہے جس کے لئے پڑھنے والا پہلے سے تیار نہ ہو؟ کیا بیانات میں کچھ دلچسپی ہے؟ کیا ان میں کچھ مزاح کی آمیزش ہے؟ اگر ہے تو موزوں ہے ——— یا نامناسب؟ کیا بیانات میں باہم تناسب قطع و برید ہے؟ کیا ان میں کوئی ربط ہے؟ اور ہے تو سمجھ میں آتا ہے یا نہیں؟ (۷) خیالات کی نسبت یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ قدیم ہیں یا جدید؟ مصنف کے مرتع رائے کیا ہے؟ دوسری رائیں اس سے مطابقت کرتی ہیں یا نہیں؟ مصنف اپنے خیالات کے اظہار میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ (۸) جذبات کے بارے میں یہ جاننا چاہیئے کہ وہ فطری ہیں یا غیر فطری، جذبہ کا خاص کیا ہے اور جذبہ سے

جذبات اُس کی مطابقت کرتے ہیں یا نہیں؟ (۹) مُصنّف اپنے بیان میں خیالات، وجذبات کے اظہار میں فریب تو نہیں دے رہا ہے۔ اُسنے جو کچھ لکھا ہے اس پر اُسے خود اعتماد و اعتبار ہے یا نہیں۔؟ اگر مُصنّف کا کوئی مقصد ہے تو کیا ہے۔ (۱۰) تصنیف میں مصنف کی شخصیت کا کتنا اثر ہے؟ وہ اپنی سرگذشت لکھتا ہے یا دُنیا کی داستان؟ کتاب میں موجودہ سوسائٹی کا کیا عکس ہے؟ (۱۱) زبان اور طرزِ تحریر کے بارے میں یہ جاننا چاہیئے کہ کیا مُصنّف نے موقعہ زبان استعمال کی ہے کیا زبان میں اسکا دلنشیں رنگ موجود ہے؟ زبان میں قواعد یا گرامر کی پابندی کی گئی ہے یا نہیں؟ زبان غیر واضح تو نہیں ہے کہ ایک جُملہ کے دو معنی لئے جا سکیں؟ کیا الفاظ کی کثرت تو نہیں ہے؟ کیا خیالات و جذبات کا توازن درست ہے؟ (۱۲) کتاب کا مجموعی پر کیا اثر پڑیگا؟ لوگ اسے سمجھ سکیں گے یا نہیں؟ کیا اس سے علم و عقل میں کچھ اضافہ ہوگا؟ اس سے تعلیم و دلچسپی دونوں چیزیں حاصل ہوتی ہیں یا ایک؟ یا ایک بھی نہیں؟ کتاب اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکی ہے یا نہیں؟ خود تبصرہ نگار پر اس کتاب کا کیا اثر ہوا؟"

علامہ تاجور کی زیرِ سرپرستی امرتسر سے ماہنامہ "چمن" بھی نکل چکا ہے جس کا ذکر آج تک کسی نے بھی نہیں کیا۔ حتیٰ کہ تاجور نے "نقوش لاہور کیلئے میری صحافتی زندگی" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا اس میں بھی "چمن" کا ذکر نہیں ہے۔ نظر زیدی، عبدالشکور بشیر، عبدالصمد صارم، موہن سنگھ دیوانہ، عبدالوحید خاں حکیم احمد شجاع، عبدالسلام خورشید اور خالد بزمی وغیرہ بھی خاموش رہے۔

میرے پیشِ نظر "چمن" امرتسر کا ۱۹۳۲ء کا سالنامہ (جلد ۵ نمبر ۳) جس کے پہلے صفحہ کی پیشانی پر "زیرِ سرپرستی علامہ تاجور نجیب آبادی" لکھا ہوا ہے اس کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر پورن سنگھ مہر الوری اور ایڈیٹر چمن وال سیوک ہیں۔ "چمن" کا سالانہ چندہ لکھا تھا۔ ۲۰ صفحات کا یہ خوبصورت سالنامہ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ ہے اس میں درجنوں رنگین تصاویر کے ساتھ مندرجہ ذیل معروف حضرات کی تخلیقات نثر و نظم شامل ہیں، جنہیں دیکھ کر "چمن" کی مقبولیت اور اس کے معیار کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس شمارہ میں تاجور نجیب آبادی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، بیخود موہانی، تاجور کمپنی، آنند نرائن ملا، مجروح، برق، وحید، جوش ملیانی، بیخود موہانی، آذر جالندھری، منور سہسوانی، آذر اور ایم اسلم، اودھ پرشاد گنشہ جگر بریلوی، شوکت تھانوی، علی عباس حسینی، تاطق لکھنوی، اعظم کریوی، منظر صدیقی، امین سلونوی، ارجا چاندپوری، سید عابد علی، جعفر علی خاں اثر، ملا رموزی، نوح ناروی کے علاوہ دیگر دوسرے حضرات کی تخلیقات شامل ہیں۔

مولانا اپنی عمر کے آخری دنوں میں حکومت پنجاب کے ہفتہ وار مقتدر رسالہ "ہمارا پنجاب" کو بھی ترتیب دیتے رہے تھے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تاجور کی ساری عمر اردو ادب کی خدمت کرتے گزری اور بقول کوپال متل "اپنے دور میں اردو نثر و نظم میں ان کا حصہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے بعد غالباً سب سے زیادہ ہے۔"

بقیہ کمرہ نمبر ۲۲۴ صفحہ ۴۰ —

نو بات چیت ہے اور یہ کہ میں کل ۲۲ اکتوبر کو واپس جا رہا ہوں۔ بعض مصروفیات کی وجہ سے میں اسوقت تو نہ جا سکا لیکن دوسرے روز صبح کو ملاقات طے پائی۔

۲۲ اکتوبر کی صبح کو ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ اعجاز صاحب کا خط بھی آیا ہے۔ وہ بیمار ہیں۔ اور کرشن چندر نمبر کی مشکلات کی وجہ سے پریشان ہیں اور زیادہ ہیں۔ اس خاص نمبر کے لئے بہت سے رسائل والے مصر ہوئے۔ "نقوش" والوں نے لکھا۔ "سیپ" والوں نے بھی لکھا۔ میں نے سب کو منع کر دیا۔ لیکن اعجاز صاحب نے کہا کہ میں نکال کر ہی رہوں گا۔ اب ان کے آگے میں کیا کہتا۔

اس روز صبح ہی صبح کرشن چندر نے مٹھائی بھی کھلائی اور چائے کا دور بھی چلا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے ادبی نشست کے نہ ہونے کا افسوس تھا۔ کرشن چندر نے اپنی مجبوریاں بتائیں اور وعدہ کیا کہ دسمبر یا جنوری میں جب وہ دوبارہ آئیں گے تو اس کی تلافی ضرور کریں گے۔ اس کے بعد ہم دونوں بغل گیر ہوئے۔ کرشن چندر الوداع کہنے کے لئے باہر دروازہ تک آئے اور پھر ہم دونوں رخصت ہو گئے۔

——— یار زندہ صحبت باقی

رؤف خلش

سوگ

ہائے ارمان بھرے خوابوں کی اُجڑی بستی
دشتِ تنہائی کی مانند اندھیرا ہے جہاں
ایسے ویرانے میں شہنائی کی آواز کہاں
ہر طرف کرب میں ڈوبی ہوئی آہوں کا دھواں
زندگی ہے کہ گلا پھاڑ کے چلاتی ہے
اب تو ہر گوشے سے ماتم کی صدا آتی ہے
درد کے نوحے سناؤں تو خیالوں کے ہجوم
نوچ لیتے ہیں مرے دُکھ بھرے گیتوں کی زباں
فکر و احساس کی خوشبو سے مہکتے نغمے!
شورِ بیداد جو اُٹھتا ہے تو گھٹ جاتے ہیں
میری آواز تو بن جاتی ہے ہچکی لیکن
کتنے دل میرے لب و لہجہ پر بھر آتے ہیں

اِسی ارمان بھرے خوابوں کے ویرانے میں
اُونگھنے لگتے ہیں پلکوں پہ تصوّر کتنے!
چور بیٹھا ہے مرے مَن میں سجائے میلے
چپکے چپکے مرے جذبات سے ہولی کھیلے

کون جانے کسی گوپی کا گوالا ہوگا
یا مدھوبن میں سیا پریم شوالا ہوگا

آگ ہی آگ ہے، سبزہ ہے نہ پُروائی ہے
گرم سانسوں کی طرح جھونکے ہوا کے گزرے
خون کے گھونٹ ہی پینے کو یہاں ملتے رہے
پیاس بجھتی نہیں، میں ہوں کہ پیے جاتا ہوں
یاد کی لہر اُٹھے، مجھ کو دِوانہ کر دے
رت جگوں میں کوئی غم دھیرے سے چٹکی بھر دے
کیسے اِن خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کروں
ٹمٹماتے بھی نہیں اب تو اُمیدوں کے دیے
حوصلے ٹوٹ گئے، ٹوٹ گیا ساغرِ دل
سوگ میں ڈوب گئی خوابوں کی اُجڑی بستی
کیوں نہ اِس غم میں ہر اک غم کو بنالوں اپنا
ابھی زندہ ہوں مگر سوگ منالوں اپنا!

انور صدیقی

عنوان چشتی کی شاعری

بدحال کچھ فرانسیسی نقاد ساں بیو جیسا ہے۔ اسے جب بھی کسی نوجوان کی کوئی نئی کتاب ملتی تو اس کا جی چاہتا کہ کوئی پرانی کتاب اٹھالے۔ پھر اردو شوار نے مجموعوں کی جو بھرمار کر رکھی ہے، اس سے اور بھی دل برداشتہ ہوں۔ میں زندگی اور شاعری دونوں میں ضبطِ تولید کا قائل ہوں۔ اس لئے جلوۂ کثرتِ اولاد سے گھبرا جاتا ہوں۔ اور جی چاہتا ہے کہ بقیہ عمر جدید اردو شاعری کے مطالعے میں نہیں توبہ استغفار میں گزار دوں۔ یا پھر قدیم اساتذہ کے کرم خوردہ کلیات میں پناہ لوں۔ وہاں شاید کوئی کام کی بات مل جائے۔ اور موجودہ شاعری کی ہسپتالی اور حیات شکن فضا سے کچھ نجات حاصل ہو۔ مجھے حیرت ہے کہ عنوان چشتی کی شاعری کا مجموعہ پڑھ کر یہ ردِ عمل نہیں ہوا۔ اس لیے محسوس ہوا جیسے میں ایک ایسے شخص کی شاعری اور شعری تجربوں سے دوچار ہوں جس کی نظر میں انسانی مقدر تاریک نہیں روشن ہے۔ جسے روشنی کے سفر اور اتمام سفر سے دلچسپی ہے۔ جسے اس زمین اور زندگی کے تمام مظاہر سے محبت ہے جس کے لیے ہر ذرہ اپنی آغوش میں صد ہا حسین پیکر چھپائے ہوئے ہے۔ جس کے لئے ہر لمحہ کی محراب میں شمعیں جل رہی ہیں۔ اور وہ شمعیں زندگی اور تہذیب کی آخر شب کی شمعیں نہیں بلکہ نیم شب کی شمعیں ہیں جن کی جوان لو میں زندگی کا سارا سوز و ساز جگمگاتا ہے عنوان چشتی کی شعری کائنات کی فضا مسموم نہیں ہے اس میں حبس کی سی کیفیت نہیں ہے بلکہ یوں کہیئے کہ اس کی شعری دنیا پر دیرانیوں کے سائے نہیں، حسین چاندنی راتوں کا پرتو ہے۔ اس میں کشادگی ہے۔ وہ سراسر جمال کے شاعر ہیں۔ جمالِ زندگی کے۔ جمالِ کائنات کے اور جمالِ فن کے۔ جو عورت کے جسم ہی میں نہیں بلکہ فنونِ لطیفہ اور زندگی کے مختلف مظاہر میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان کی شعری دنیا کی اسی جمالیاتی شادابی نے مجھے متوجہ کیا۔ مجھے ان کے یہاں وہ حیات شکن اور ہسپتالی فضا نہیں ملی جس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اور جس سے ان دنوں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جو ہم سے زندہ رہنے کا حوصلہ چھین رہی ہے۔ اور ہمیں بالاقساط خودکشی پر آمادہ کر رہی ہے۔ غموں کی مجلسی ہوئی شاعری کی اپنی جگہ اہمیت سہی مگر جمالیاتی رجائی شاعری کی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ بعض لوگ اب بھی ایسے پائے جاتے ہیں جنہیں ترقی پسند تحریک کی باقیات الصالحات سمجھتا ہوں۔ جو آج بھی ادب کو علاجِ غربا قسم کی چیز سمجھتے ہیں۔ شاعری کی اپنی قوتِ شفا ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اسے وہی پروگرام بنا کر رکھ دینا، یا اس میں اس دنیا کو تاریک سیارہ سمجھنا اور سمجھانا ادب و زندگی دونوں کے منصب و مقام سے بُرا مذاقِ عدم واقفیت کا ثبوت ہے۔ انگریزی شاعری میں ورڈزورتھ اور شیلی سہی مگر کیٹس کی جمالیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کیٹس کی کف دستِ وہاں شاعری کی جو بھی اہمیت ہو مگر اختر شیرانی کی شاعری سے انکار بدمذاقی اور بدتوفیقی ہے۔

عنوان چشتی حسن و جمال کے شاعر ہیں۔ ان کا اپنا ایک انداز نظر ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ بھی خمار کے ہجوم ماتم گساراں میں نظر آئیں۔ شاعر اور شاعری سے کسی قسم کی عسکری یک نیت کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر شاعر زندگی کو ایک ہی زاویے سے دیکھے۔ زندگی کے تو بہت سے رنگ ہیں۔ وہ ہمہ رنگ اور بوقلموں ہے۔ ہمیں اپنے فنکاروں کو اس کی اجازت دینی چاہئے کہ وہ جس رنگ کو پسند کریں اسی کے گیت گائیں۔ اور پھر فنکار کا ذہنی وجود ساکن و جامد نہیں ہوتا۔ ممکن ہے اس کا احساس آئندہ دوسرے رنگوں کا بھی احاطہ کر لے۔ عنوان چشتی نے اپنے مجموعے کے لیے جو لیڈی غزل انتخاب کیا ہے۔ جسے ہم ان کی شاعری کا اسم اعظم کہہ سکتے ہیں وہ ان کے جمالیاتی نقطۂ نظر کا اظہار کرتا ہے۔ اسی ذوقِ جمال اور احساسِ جمال کی کرشمہ سازی ہے کہ انہیں زندگی کے مظاہر میں غزل کا سا کیف محسوس ہوتا ہے ؎

تیری نسبت سے ملا ہے مجھے یہ ذوقِ جمال
مسکراتی ہوئی ہر چیز غزل ہو جیسے

تجھ کو کیا علم بڑی چیز ہے احساسِ جمال میرے ناصح یونہی رہنے دے گنہگار مجھے

عموماً بڑا جمالیاتی احساس تصوف اور مابعد طبیعیاتی حقائق سے کسی نہ کسی طرح ہم رشتہ ہوتا ہے۔ لوگوں کو مادی مظاہرِ جمال میں الوہی جمال کا پرتو نظر آنے لگتا ہے۔ اور اس طرح کے شعر وجود میں آتے ہیں۔ ؎

خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو درود کیوں نہ پڑھوں دیکھ کر حسینوں کو (انیس)

جلوۂ حق نما کو دیکھا تجھ کو دیکھا خدا کو دیکھا (فراق)

عنوان چشتی تصوف کے مطالعہ اور اس سے غائبانہ وابستگی کے باوجود نہ تو خود اس طرح کے فریبوں میں مبتلا ہوئے ہیں یا دوسروں کو مبتلا کرنے کی کوشش کی۔ ان کا جمالیاتی احساس سراسر ارضی ہے۔ اور یہی ارضیت انہیں اس قبیل کے شعراء سے الگ کرتی ہے۔ عموماً ارضی جمالیاتی احساس لمس و لذت سے آگے نہیں بڑھتا۔ اور انسان جو الفت کی طرح بے روح عیاشی کی شاعری کرتا ہے۔ جمالیاتی احساس رکھنے والوں کے لئے گناہ اور بے گناہی کے درمیان توازن قائم رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اور جتنا ضروری ہوتا ہے، اتنا ہی مشکل۔ گناہ کو بے گناہی کا جمال عطا کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ کو عنوان چشتی کی شاعری میں "بوئے پیرہن" "بدن کی خوشبو" "گرمیٔ آغوشِ حبیب" جیسی تراکیب ملتی ہیں۔ جو ان کے مزاج کی حسیت (sensibility) کی طرف اشارے کرتی ہیں مگر اس کے باوجود اس کا خطاب نہیں ہے جو بے ضمیروں کے یہاں پیدا ہوتا ہے

اس اعتبار سے وہ مزاجاً اختر شیرانی سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ جو حسن کی شاعری کرتے ہیں۔ اس کو موجِ نکہت و نور سمجھتے ہیں۔ اس کی ایک ایک ادا پر جان دیتے ہیں۔ مگر نہ جانے کیوں گنہگار نہیں ہوتے۔ اور بالآخر ان کی شاعری میں وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے میں اخلاقی ٹھنڈک کہتا ہوں۔ یہ بات اور ہے کہ یہ ٹھنڈک رات بھر شبنم میں بھیگے ہوئے تاج محل کی مرمریں سطح کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ عنوان چشتی کے یہاں ایسی اخلاقی شاعری گناہ اور بے گناہی کے تصادم اور تضاد سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کا مزاج شبنمی اور کردار شعلہ ساماں ہے۔

'عورت' اور 'تاج محل' عنوان چشتی کے یہاں جمالیاتی کیفیت کو نمایاں کرنے کے لئے (Symbol) علامت کے روپ میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ؎

ان کے جلووں سے ملی ہے مجھے وہ رعنائی زندگی خوابوں کا اک تاج محل ہو جیسے

کہکشاں کا ہے مرمریں پیکر مسکراتا ہے چاندنی کا کنول

جاگتا ہے نہ حسن سوتا ہے عالمِ خواب ہے کہ تاج محل

جہاں تک عورت کا تعلق ہے وہ بقول شخصے خدا کی طرح ہر طرح موجود ہے۔ اس سے دنیا کی اسّی فیصدی شاعری متاثر ہے۔ عنوان چشتی لطیف جذبات کے نوجوان شاعر ہیں۔ ان کا اس وطن کائنات جسے عورت کہتے ہیں متاثر ہونا لازمی تھا۔ متاثر نہ ہوتے تو ان کی شاعری اور جوانی مشکوک ہو جاتی۔ لیکن 'عورت' ان کے یہاں ایک ہشت پہلو نگینہ کی طرح نہیں قرینے سے کر رنگ بکھیرتی اور زندگی کو رنگین اور بامعنی بناتی ہے۔ صرف لمس و لذت کا ذریعہ نہیں ہے۔ تاج محل سے وہ دوسرے شعراء کی طرح رسماً متاثر نہیں ہیں۔ وہ تاج کے شہر میں برسوں رہے ہیں۔ اور اسے انہوں نے برسوں تک مختلف رنگوں میں اور مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ تاج محل ان کے لئے صرف مغلانہ تعمیر کا نمونہ ہی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔ ان کے مختلف اظہار میں جس طرح مختلف انداز سے اس کا ذکر آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاج محل ان کے لئے اپنی محبت کی کامرانیوں اور ناکامیوں کا ایک استعارہ ہے۔ وہ ان کے احساس کی لطافت اور ان کے محبوب کے جسم کی چاندنی ہے۔ تاج سے یہ شخصی اور کیفیاتی ربط عنوان چشتی کی شاعری کی جان ہے۔ جس کی وجہ سے تاج محل زمین سے پیوست جڑ متحرک عمارت نہیں بلکہ ایک زندہ اور رواں دواں کیفیت ہے۔ میرے اس قول کی تصدیق ان کی طویل اور مشہور نظم 'تاج محل' اور مختلف قطعات و اشعار سے ہوتی ہے۔ جن میں تاج کو ایک موڈ یا ایک احساس کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے۔ اگر میں یا کوئی اور یا خود عنوان اس بات کا ذکر نہ کرتے کہ ان کا تاج کے شہر سے کوئی تعلق ہے تو بھی آپ ان کے مجموعۂ کلام کو پڑھ کر یہ بات معلوم کر سکتے

دوسری بات جو عنوان کی شاعری میں نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ وہ غزلیں، نظمیں، اور قطعات وغیرہ بڑی چستی کا سیاق سے کہہ سکتے

[illegible] ہے۔ بات در اصل جب اور حیرت کی ہے۔ ایک دریا اور طباع انسان یا قوت احدہ اور قوت اخیرہ کو [illegible] ہے۔ وہ متوسط درجہ کے ذہن رکھنے والوں کے مقابلے میں فن ہی کیا زندگی کے نکتوں کو بڑی آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ فن چستی نے فن کے موروف عیب سے اجتناب کی کوشش کی ہے۔ مگر وہ فن کی معنوی لطافت کو فن کی جامد پابندیوں پر ترجیح دینے کے قائل ہیں۔ دراصل یہی صحت مند فنی نقطۂ نظر ہے۔ ان کے یہاں عام نوجوان شعراء کی سی فنی بے راہ روی نہ ملے گی۔ وہ اردو کی بہترین شعری روایات سے واقف ہیں۔ اور اسی روایت کے آئینے میں اپنی شاعری کی شاخلی کرتے ہیں۔ انہیں الفاظ کی خصوصیت کو پہچان کر برتنا آتا ہے۔ اس کام میں وہ صرف ذوق سلیم کو رہنما بناتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے ان کے یہاں ابہام اور پیچیدگی نہیں ہر خیال کا چہرہ روشن ہے اور جذبے کے رنگ نمایاں ہیں۔

یہ کون مسکرا کے پس پردہ چھپ گیا — اب تک خزاں پکار رہی ہے بہار کو
محفل ناز میں یوں پھول لے آیا ہوں — آج اظہار محبت کا محل ہو جیسے
بجھا چکا ہوں ترے انتظار کی شمعیں — کھلا ہوا ہے مگر شام ہی سے دروازہ
کچھ اس ادا سے وقت پہ رنگ آیا ہے — رخ حیات پہ جیسے شعور کا غازہ
نگار کا سا ہے عنوان رد خشی کا سفر — غلط نہیں ہے یہ اہل نظر کا اندازہ
یوں مطمئن سی ہو گئی شاطۂ نظر! — گویا وہیں وقت کے گیسو سنور گئے
بات کہاں ان آنکھوں کی بھول بہت ہیں جام بہت — اوروں کو سرشار بنائیں خود ہیں تشنہ کام بہت
اس کے تقدس کے افسانے سبھی زباں پر جاری ہیں — اس کی گلی کے رہنے والے پھر بھی ہیں بدنام بہت
جنہیں نگاہوں سے ما ورا کہیئے — وہ حادثے بھی سر کوئے دلبراں کہیئے
یوں چرا تا ہوں گلوں سے نظریں — چھپ کے وہ دیکھ رہا ہو جیسے
میں معاً سودۂ جلوہ ہوں کہ تیری خاطر — ہر کوئی مجھ سے مری خوش نظری مانگے ہے
حد نگاہ تک ہے چمن سا کھلا ہوا — یہ کون آ بسا مری پلکوں کی چھاؤں میں
وہ مسکرائے ہونٹوں پہ جلوے بکھر گئے — اک نقش آرزو میں کئی رنگ بھر گئے
ٹھکراتی ہیں کس در پہ ترے شہر کی گلیاں — ہر شخص خود اپنا ہی پتہ پوچھ رہا ہے
دل کی جراحتوں کے کھلا کرتے گلاب — بیٹھا ہوں زندگی کو گلستاں کئے ہوئے
تیرے نثار مجھے یوں سکوں میسر ہے — کہ جیسے ترک تعلق کا کچھ ملال نہیں

عنوان چشتی کی شاعری میں زبان کی سلاست اور ابلاغ کی آسانی نظر آتی ہے۔ چونکہ وہ رومانی شاعری کر رہے ہیں۔ اس لئے وہ معصوم اور صاف جذبوں کے شاعر ہیں۔ رومانیت ایام طفلی کی طرف واپسی کا نام ہے۔ بچپن میں سادگی اور معصومی ہوتی ہے پیچیدگی نہیں۔ عنوان چشتی کا شعری ارتقا بتاتا ہے کہ وہ ایک جگہ پہنچ کر قیام نہ کریں گے۔ انہیں راحت منزل سے کہیں زیادہ نشاط سفر عزیز ہے۔ وہ نئے طور اور نئے برق تجلی کے منتظر رہتے ہیں۔ اور ہر حسین چہرے کی طرح ہر نئی حقیقت کی طرف بے تابی کے ساتھ بڑھتے ہیں۔ یہ بڑا اچھا شگون ہے انہوں نے حال میں جو غزلیں کہی ہیں ان میں زندگی کی تلخ حقیقتوں، اور زہرناکیوں کا اثر انگیز عکس نظر آتا ہے۔ ؎

اف یہ ویرانیٔ شام احساس — زندگی ایک خلا ہو جیسے

میں اسی ویرانیٔ شام احساس کو تجربے اور موجودہ تہذیب کی شاعری کہتا ہوں زندگی کے خلا کی بیکرانی کا احساس اور پھر اس کا اظہار جرأت مندانہ اظہار معمولی بات نہیں ہے۔ اس طرح کے بہت سے اشعار عنوان چشتی کہہ رہے ہیں۔ جس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ رومانیت کی پرسرار دلکیف دھند سے نکلنے کے لئے مضطرب ہیں اور ان کا احساس اس دور کی صدہا پریشان کن تمناؤں کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے بے تاب ہے۔ اردو شاعری [illegible] صدیوں کے خواب لئے ان کی طرف دیکھ رہی ہے۔

محسن زیدی

غزل

کہتے ہیں جو کہ سُن نہیں سکتے کسی کا غم
کس طرح دیکھتے ہیں وہ لوگ آدمی کا غم

وہ اک خوشی جسے نہ رہا لمحہ بھر ثبات
دل کو تمام عمر رہا اُس خوشی کا غم

کچھ دشمنوں سے دادِ خلوص و وفا ملی
کچھ دوستوں سے ہم کو ملا دوستی کا غم

مجھ کو بھلا دیا جو کسی نے تو کیا گلہ؟
رکھتا ہے کون دل میں کسی اجنبی کا غم

کٹتا غمِ حیات نہ تنہا کسی سے بھی
مِل جُل کے ہم نے بانٹ لیا زندگی کا غم

انجامِ آرزوئے طرب دل میں سوچ کر
ہر غنچۂ چمن کو ہے اپنی ہنسی کا غم

دنیا کی بے وفائی کا ہو رنج کیا ہمیں
آبِ رواں سے اور بھلا بے رخی کا غم

پھیلا ہوا ہے رشتۂ غم دُور دُور تک
غم ایک سا ہے اپنا ہو چاہے کسی کا غم

جب گرد گرد ہو گئی ہر منزلِ حیات
تنہائی کا نہ رنج نہ تنہا روی کا غم

ہنگامِ فکرِ شعر ہے گو محشرِ خیال
محسن بیان کو ہے تہی دامنی کا غم

مہدی پرتابگڈھی

غزل

بادِ صبا سُنا ہے اُدھر ہو کے آئی ہے
شہرِ مجنوں سے کون سا پیغام لائی ہے

ٹپکے ہے کس کا خون ابھی تک صلیب سے
شاید کسی مسیح نے پھر جاں گنوائی ہے

کس سے کریں جراحتِ قلب و نظر کی بات
اُس بے وفا کے ساتھ تو ساری خدائی ہے

یہ ناقدینِ عظمتِ غم کیا سمجھ سکیں
کن منزلوں سے ہو کے مری زیست آئی ہے

جب بھی بصد خلوص ملے مجھ سے میرے دوست
میں نے ضرور کوئی نئی چوٹ کھائی ہے

اُٹھی تو تھی نگاہ تری آرزو لئے
زخمِ فریب کھا کے مگر لوٹ آئی ہے

مہدی جہاں قدم نہ فرشتوں کے پر سکیں
جوشِ جنوں کی میرے وہاں تک رسائی ہے

ضیا حسنی

نیاز فتحپوری

مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مکتوبات کے آئینے میں

چمنِ ادب کی کوئی ایسی روش نہیں جس میں نیاز کے لگائے ہوئے گلہائے رنگارنگ نہ دکھائی دیتے ہوں جب کوئی صاحبِ ذوق بساطِ روشنائی کے درمیان سے گذرتا ہے تو یہ لکھتے مہکتے پھول اُس کا دامن تھام لیتے ہیں۔ اُن کی خوبصورتی و رنگینی سے اُس کی آنکھوں کو فرحت ملتی ہے۔ اور خوشبو سے مشامِ جاں کو تازگی۔ الغرض شگفتہ پھولوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ان پر کبھی خزاں نہ آئے گی، اور یہ ہمیشہ مسکراتے ہی رہیں گے۔

علامہ نیاز فتحپوری نے اپنی جنبشِ قلم سے ہر صنفِ ادب کو نکھارا سنوارا ہے نقد ہو یا تبصرہ، شعر ہو یا افسانہ، اداریہ ہو یا مقالہ، مکتوب ہو یا ڈائری، سیاسیات ہوں یا مذہبیات، جس موضوع کو چھیڑا اُسے حسین و رنگین بنا دیا، کسی بے جان اور پامال مضمون کو بھی شروع کیا تو اُس میں جان ڈالدی، قاری نے جب پڑھا تو محوِ حیرت بن گیا۔ علامہ نیاز کی جادوگری عمر کی آخری منزل تک قائم رہی۔ تھکنا اور ہار جانا تو انھوں نے سیکھا ہی نہیں تھا، جمود اور انحطاط کے نشانات اُن کی زندگی میں ملتے ہی نہیں۔ وہ صحیح معنوں میں ہمیشہ رواں دواں رہے، یہاں تک کہ جب اشغال ہی گئے۔ مرض بیان موت کا پیغام آپہونچا۔ اُس وقت بھی ہار نہیں مانی، بستر مرگ پر لیٹے لیٹے بھی کام کرتے رہے۔ یہ تھے حضرت نیاز، جنہیں صحیح طور پر ادبی دنیا کا مردِ آہن کہا جاسکتا ہے۔

مُتنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ نیاز نے آنکھیں بند کرلیں تو وہ خصوصیات بھی فنا ہوگئیں جو انسان سے متعلق تھیں۔ جناب آل احمد سرور نے صحیح لکھا ہے۔

"نیاز کی موت ایک فرد کی موت نہیں، ایک روایت، ایک اسلوب، ایک نسل، ایک رجحان، ایک وضع، ایک انداز کی موت ہے۔ علم و فضل، فکر و نظر، انفرادیت و بصیرت، ادب، انشا، عزم و استقلال کی کتنی ہی حکایتیں اُن کے ساتھ ختم ہوگئیں۔

بلاشبہ تم کو موت نے نیاز کو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھین لیا ہے۔ اب ہم انہیں کبھی نہ دیکھ سکیں گے اور نہ اُن کی دلکش اور تازگی بخش تحریریں پڑھ سکیں گے۔ یہ خیال ہمیں ضرور دل شکستہ کردیتا ہے لیکن کیا کیا جائے جو عالم وجود میں آیا ہے اُسے ایک دن آغوشِ لحد میں جانا ہی پڑیگا۔ اُس کی جگہ کبھی خالی نہیں رہتی، کوئی دوسرا اُس کی جگہ پر کام کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح یہ دنیا چلتی رہتی ہے اور چلتی رہے گی۔ کچھ بھی نیاز دوسرے مرنے والوں کی طرح بھلائے نہیں جاسکتے۔ وہ ایک عظیم سرمایہ ہمیں دے گئے ہیں، جو بار بار ہمیں اُن کی یاد دلاتا رہیگا۔ ہم جب بھی انہیں دیکھنا چاہیں گے، اُن کی ہمہ جہت شخصیت اُن کے مکاتیب کے مطالعہ کے درمیان اُبھرتی ہوئی دکھائی دیگی۔ ان کے نظریات، عقائد، غیر معمولی ذہانت و فطانت اور شوخیٔ طبع غرض ہر چیز ان مکتوبات سے نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان کی دلکشی و رنگینی کو بیان کرتے ہوئے ارسٹاکراسی کا انہیں (BELLES LETTERS) کہنا صحیح ہے۔

لیکن یہ صرف مکتوباتِ مورت رالفت... [illegible]

BELLES LETTERS فرانسیسی ادب میں [illegible] جملیے اہم موضوعات سے متعلق ہوتے ہوئے بھی ہلکے پھلکے سادہ شگفتہ، نازک اور شاعرانہ انداز بیان کے [illegible]

ہوں (سالنامہ نگار ۱۹۶۳ء)

ہیں۔ میں نے انہیں بار بار پڑھا۔ ان کا سے مشتہر خط۔ نیاز صاحب کی حقیقی تصویر دکھاتے ہیں۔ کبھی وہ ناقد و مبصر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں کبھی ایک بلند پایہ ادیب و شاعر سے ہم کلامی کا لطف حاصل ہوتا ہے کبھی خط کے خادم میں کوئی دلکش بھابیت مجسم ہوں سے گذر جاتی اور وہ کبھی کسی مولوی کی چٹکی اچھالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غرض کہ ان کی زندگی کا عکس ہمیں ان کے بیشتر خطوط کے آئینے میں دکھائی دیتا ہے اس لئے میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی اس بات سے پوری طرح متفق نہیں ہوں۔ "نیاز فتحپوری نے جو خط لکھے ہیں وہ ایک خاص قسم کی انشا کی بہترین مثال ہیں۔ لیکن خطوں کی تعریف ان کے جسم پر چسپت نہیں آتی۔ اصل خط تو وہ ہیں جن میں جذبہ بے اختیار شوق اور پیام کی زبان میں کوئی نامہ ہم "پرندہ ہو۔"

نیاز صاحب معترضین اور نکتہ چینوں کو جواب دینے کے عادی نہیں تھے بلکہ یہ بات ان کے اصول زندگی میں داخل نہ تھی۔ ایک بار حضرت چاندپوری نے علامہ نیاز سے پوچھا "آپ کے فلاں صاحب نے جو اعتراض کیا ہے آپ اس کا کیا جواب دیں گے

نیاز صاحب نے فرمایا "کوثر صاحب! جواب دینا حماقت ہے۔"

اس خصوصیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے نیاز صاحب کا درج ذیل مکتوب پڑھیئے۔ "جہاں کہ می نامم ہم" والی بات صاف دکھائی دے گی اور غصہ بے اختیار بھی آئے گا۔

"یہیں لکھنؤ سے ایک رسالہ حال ہی میں شائع ہوا تھا اس کے موجد و مخترع کو آپ بھی جانتے ہیں۔ وہی سیماب فی جو دیہی کی اشاعت کا مقصد صرف مجھ کو ذلیل کرنا تھا چنانچہ پہلے پرچہ میں ایک مضمون میرے متعلق تھا۔ اسمیں تھا تو وہی میرے کفر و الحاد کا رونا لیکن تھوڑی سی جدت کے ساتھ یعنی یہ کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اس سے مقصود صرف کاروبار کی رونق ہے۔ یا خدا یہ انحراف کرنا بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے فلاح انسانی متعلق ہو سکتی ہے۔ بعض احباب نے اصرار کیا کہ میں جواب دوں لیکن چونکہ "خزف ریزہ" کی اوقات اتنی ہی ہے کہ انسان ٹھوکر لگا ہوا گذر جائے، اس لئے میں نے کوئی توجہ نہیں کی، میں جواب دیتا تو اس کی ہمت بڑھ جاتی۔ اور ہزاروں آدمیوں کے کانوں تک اس کا نام پہنچ جاتا۔ وہ مجھے چھیڑ کر کاروباری فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پس اس صورت میں آداب و محسنین کا اقتضا یہی تھا کہ میں خاموش رہوں۔ چنانچہ میں خاموش رہا۔" اور وہ تین نمبروں سے زیادہ چل نہ سکا۔"

نیاز صاحب کی انانیت، افتاد مزاج اور انداز فکر بھی کچھ اس مکتوب سے صاف دکھائی دے رہے ہیں اسے کیوں خط نہیں کہا جا سکتا؟ نیاز صاحب اس خط میں ابھر کر بالکل سامنے آگئے ہیں۔ جس نے انہیں قریب سے دیکھا یا سمجھا ہے، وہ اس خط کے حقیقی ہونے میں کس طرح شبہ کر سکتا ہے۔ اب کچھ اور مکتوبات ملاحظہ فرمائیے۔

(۱)

"مولویت و ادبیت معقول۔ ان دونوں کا اجتماع آج تک کبھی ہوا ہے کہ اب ہو گا۔ بندہ سجادہ بدوش تو بن سکتا ہے لیکن ناہید خرابات نشیں کا میسر آنا دشوار۔"

(۲)

"آپ نے بھی کس طبقہ کا ذکر کیا۔ آپ اتنا وقت کسی گناہ میں صرف کرتے تو بہتر تھا۔ یہ محراب دعا" سے حلقۂ عام تیار کرنے والے باوجود کوتاہ آستینی کے انتہائی دراز دستی سے کبھی نہ چوکنے والے اور دوسب کر گذرنے والے ہیں جو دوسروں کے لئے ممنوع ہے، ہماری قوم کے وہ افراد ہیں جنہیں پاؤں کا چھالا کہنا چاہیئے کہ جب تک آپ انہیں چھوڑ نہ ڈالیں راستہ چلنا ممکن نہیں۔ انھوں نے سلطنتوں تک کو کھا لیا، قوموں کو ہضم کر لیا۔"

یہ دونوں مکتوب نیاز صاحب کے دل جذبات کے آئینہ دار ہیں، مولویوں سے ان کی نفرت یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ وہ علماء حق کو بھی نہیں چھوڑتے تھے جب بھی علماء اور زہاد پر قلم اٹھاتے تھے تو یہی انداز اختیار کر لیتے تھے اور ایسے موقع پر ان کا قلم دل کی بھڑاس نکالتا تھا۔ ڈاکٹر مسعود حسین ادیب شادانی فرماتے ہیں "پرائیویٹ خطوط میں مصلحتوں کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں اور قلم

کی زبان صحیح معنی میں دلکش نگارخانہ بن جاتی ہے۔ اور آپ یہ دونوں باتیں مولویت کے خلاف لکھے ہوئے ان مکتوبات میں پائیں گے۔

نیاز صاحب نے خواتین کے نام کافی دلچسپ اور دلکش خطوط لکھے ہیں، قاری انہیں پڑھتے پڑھتے رومان اور رنگینیوں کے ماحول میں پہنچ جاتا ہے ـــــ وہ لطف اندوز ہوتا ہے لیکن اجنبیت کا احساس لئے ہوئے۔ یہ خطوط اس دور کی یادگار ہیں کہ جب "عورت اور شباب" حضرت نیاز کا محبوب موضوع تھا اور یہ مصرع ان کے اس دلکش دور کی بہترین تعبیر بنا ہوا تھا۔

"الغراق اے ہوش و تقوی الوداع اے عقل و دین!"

اس سلسلہ میں ان کا دلچسپ، شوخ و رنگین اور پر لطف مکاتیب کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"محترمہ" یاد فرمائی کا شکریہ اور گرسندیوں پر بے نیازی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے خلوص نے تاویل متعذر کے بھی دروازے بند کر دیئے ہیں ورنہ میں آپ کو یقین دلاتا کہ میری خاموشی کا مقصد سوا اس کے کچھ نہ تھا کہ آپ کو کیوں زحمت تحریر میں مبتلا کروں۔ رہا سوال میرے قلب کے اطمینان کا سو آپ جانتی ہیں کہ "جائی" انسان ہوں اور حشر کی ملاقات کا قائل ہوں یا نہ ہوں لیکن

"مے گل تو افی بکشید آواز بلبل را!"

کا ضرور قائل ہوں۔ آپ نہیں جانتیں کہ "تصور" کے برکات کیا کیا ہیں اور اس نے گرتے گھر سنبھال لئے ہیں لیکن اگر آپ اس خاطر شکن "پرسش" کو پسند نہیں فرماتیں تو مجھے بھی گلہ گل کر جان دینا زیادہ پسند نہیں۔

"نظارہ کن ز چاک گریبان ماہتاب را"

"ارے آپ نے یاد تو کیا، میں تو سمجھتا تھا کہ آپ برہم ہو گئیں اور اب کبھی نہ بولیں گی، مگر یہ بھی ہوتی کوئی بات بھلا آج تک صحیح نکلی ہے جو یہ صحیح نکلتی۔ اور سچ پوچھئے تو اسی امید پر جی رہا تھا، ڈرتا ہوں اس وقت سے جب مجھے آپ کی محبت کا یقین آ جائے کہ پھر تو آپ کی عداوت مسلم ہے۔

آپ نے سیاحت کشمیر کا ارادہ کیوں کیا، وہاں شاید آپ کے جذبۂ خود نمائی کی وہ پوری طرح نہ مل سکے بدخشاں سے لال آتے ہیں، وہاں بھیجے نہیں جاتے، اور پھر قیامت یہ ہے کہ آپ تنہا نہیں جا رہی ہیں۔ بے پر و بال جا رہی ہیں بالکل ہیم من کرا اور بیاں

یہ حال ہے کہ ـــــــ باسایہ ترا کمی نیندم

وہ سایہ نہیں جو آپ بنتی ہیں، بلکہ آپ کی ظل مراد ہے، اب فرمائیے آپ کیا کہتی ہیں"

ان خطوط کے مطالعہ کے بعد ہم ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی رائے سے متفق ہو جاتے ہیں۔

"ان میں نہ مکتوب الیہ کا نام درج ہے نہ تاریخ، نہ وقت نہ مقام، حالانکہ ان چیزوں کی موجودگی سے ایک خاص قسم کی فضا تیار ہوتی ہے اور جب پڑھنے والا اس "خلوت کدہ" میں داخل ہوتا ہے تو اس کی حیرت و مسرت کی انتہا نہیں رہتی"

یہ صحیح ہے کہ ان تمام باتوں کی موجودگی سے ان مکتوبات کے حسن و دلکشی میں نہ صرف اضافہ ہو جاتا بلکہ قاری اس فضا میں پہنچ جاتا اور اس ماحول میں سانس لینے لگتا۔ جس میں زیر نظر مکتوب مکتوبٌ الیہا تھا لیکن ایسی ضروری باتوں کے فقدان سے جو لذت ایک خط کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے اس سے قاری یکسر محروم رہتا ہے، دوسرے علامہ نیاز کی مخاطب خواتین علمیت و فضیلت میں انہیں کی ہم پلہ دکھائی دیتی ہیں بلاشبہ اس وقت عطیہ فیضی جیسی عالم و فاضل خواتین بھی موجود تھیں لیکن خال خال۔ کاش نیاز صاحب اپنی مخاطب خواتین کے چہروں سے نقاب ہٹا دیتے تو ادبی دنیا انہیں پہچان لیتی، انہوں نے ایسا نہیں کیا، اس لئے آل احمد سرور کی یہ بات کہ "آپ بالکل صحیح معلوم ہوتے ہیں" یہ خط لکھے گئے بھیجے نہیں گئے اور جو خط بھیجنے کیلئے نہیں لکھا جاتا، وہ خط نہیں انشائیہ ہوتا ہے

یہ بات سبھی خطوط کے متعلق نہیں کہی جا سکتی، یہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ کافی خطوط تحقیقی ہیں اور وہ بھیجے بھی گئے تھے۔

اب میں حضرت نیاز کے ایسے خطوط قارئین کے مطالعہ کے لئے پیش کرتے جا رہا ہوں جو مکتوب الیہ تک پہنچ گئے اور جنہیں انہوں نے خود حاصل کیا ہے۔ یہ سب غیر مطبوعہ ہیں اور پرنسپل ریاض الدین احمد صاحب اور حضرت برق فتحپوری کے نام لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط کے متعلق حضرت نیاز کو شبہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ وہ کبھی شائع ہوں گے ورنہ جملات کی ایسی سادگی و بیساختگی کو نہ ملتی۔

لکھنؤ

۱۰ر اکتوبر ——————

ایک کارڈ لکھ چکا ہوں، میں صبح آٹھ بج کر بیس منٹ پر (منگل کے دن) روانہ ہوں گا یہ گاڑی غالباً دس بجے کا پہنچے گی اور شام کو ۴ بجے کی گاڑی سے واپس آؤں گا، آپ سنگل سے مل کر معلوم کر لیجئے کہ یہ تاریخ مناسب ہوگی یا نہیں، اور مجھے اطلاع دیجئے تاکہ اطمینان ہو جائے، آپ کا جواب نہ آیا تو میں نہ آؤں گا۔ سنگل سے ضرور مل لیجئے ورنہ ممکن ہے وہ اس دن معروف ہوں یا کسی وجہ سے وقت نہ دے سکیں۔ اور آنا بیکار ہو۔ یہ خط آپ کو ۱۱ کو کسی وقت مل جائے گا اور آپ ۱۲ کو اس کا جواب دیجئے۔ جو زیادہ سے زیادہ ۱۴ تک مل جائے گا، بلکہ زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ آپ مجھے ۱۲ کو تار دے دیں کہ میں ۱۵ کو آخری ٹرین سے آجاؤں۔

نیاز

حضرت نیاز وقت کے اتنے پابند تھے کہ ایک لمحہ کو بھی ضائع کرنا انہیں پسند نہیں تھا۔ اگرچہ یہ خط معمولی نوعیت کا ہے لیکن نیاز کی ایک اچھی عادت (پابندی وقت) کا پتہ اس مکتوب سے چلتا ہے۔

لکھنؤ

۱۹ر اکتوبر ۴ بجے شام ——————

ابھی ابھی میں نے ٹرنک کال کی تو معلوم ہوا آپ نہیں ہیں، ورنہ بات کر لیتا آپ بذریعہ تار اطلاع دیجئے کہ انت آپکو مل گئی یا نہیں، تار میں جو صرف ہوگا وہ میں دے دوں گا یہاں ورنہ روزِ قیامت۔ ٹیلی سے کام لینے کی ضرورت نہیں تار کا پتہ "بجگار" آفس لکھنؤ کافی ہے۔"

نیاز

اگر ظفر نمبر کی جلد آگئی ہے تو کسی کے ذریعہ سے بھجوا دیجئے یا بک پوسٹ ذریعہ رجسٹری بھیج دیجئے، ذریعہ رجسٹری کتاب کی طرح پیک کر کے بھیج دیجئے۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو روپیہ صرف ہوگا۔ کسی آدمی کے ذریعہ سے بھیجیں گے تو زیادہ صرف ہو جائے گا۔

نیاز

عابد منزل۔ ناظم آباد نمبر ۲۔ کراچی (۱۸)

کرمی، خط مل گیا، وہ کون سی روح ہے اور کس کی جس سے آپ حالات معلوم کرتے رہتے ہیں، بندہ نواز! یہ سب توہمات ہیں جنہیں مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، آپ کیوں ان لغویات میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ مرسلہ غزل کا کوئی شعر انتخاب میں نہیں آسکا۔ ——————— دعاگو۔

نیاز

یہ خط حضرت برق فتح پوری کے نام ہے۔ یہ کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر ہونے کے باوجود فتحپور میں کافی خاموش زندگی گذار رہے ہیں حضرت اعجاز صدیقی "مدیر شاعر" کے ذریعہ سے میں نے انہیں جانا پہچانا، یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں اور پہلے شاعر موصوف سے نہیں ملا ورنہ مجھے نیاز صاحب کے کافی خطوط مل جاتے، اس خط کو پڑھنے کے بعد میں نے برق صاحب سے پوچھا "حضرت نیاز کے انتخاب کے

کیا خیال ہے۔ آپ کا۔

برق صاحب نے جواب دیا "بہت اچھا لیکن سخت انتخاب فرماتے تھے"۔

اس خط کے جواب میں حضرت برق نے علامہ نیاز کو لکھا تھا۔

"جب آپ دعا کے قائل نہیں تو دعا کیوں دیتے ہیں"۔

نیاز صاحب نے اس بات کا جواب نہیں دیا، لیکن پھر دعا کو، کبھی نہیں لکھا۔

برق صاحب کے نام لکھے گئے اور خطوط ملاحظہ فرمائیے۔

کراچی ۱۴؟ ۔ عابد منزل ناظم آباد نمبر ۲

کرمی، ۲۰ اگست کا خط ملا، آپ ضرور روٹ کے ذریعے میرے گھر کے اندرونی حالات معلوم کرکے اطلاع دیجئے، میرے مکان کا نام "عابد منزل" ہے اور پتہ ناظم آباد نمبر ۲ کراچی ہے۔ میں روح کو اجازت دیتا ہوں کہ میرے مکان میں داخل ہو کر حالات معلوم کرے۔ آپ کی نظمیں مل گئی ہیں، اس سے پہلے بھی ایک خط آپ کو بھیج چکا ہوں۔ تازہ غزلیں بھی مل گئیں۔ نیاز

کراچی ۲۴ اپریل

تسلیم جو فارسی کا لفظ 'ن' پر ختم ہوتے ہیں، ان میں ہمیشہ "ن" کا اعلان ہوگا لیکن بہ حالتِ اضافت ن غنہ ہو جائے گا۔ امید ہے اب آپ سمجھ گئے ہوں گے جس غزل کا ذکر آپ نے کیا ہے اس میں مزید اشعار کے اضافہ کا خیال مناسب نہیں۔ نیاز

لے دونوں شعر لغو اور مہمل ہیں۔ اشرف المخلوق بھی غلط اور رسم الخط فطرت بھی غلط۔ نیاز

حضرت نیاز خط کا جواب پابندی سے دیتے تھے خواہ ایک جملہ ہی لکھیں۔

لے لیکن اے انساں نہیں مایوس ہونے کا مقام — اشرف المخلوق سے مخلوق کہا سکتی ہے مات

آشنائے علم رسم الخط فطرت ہو کے پڑھ! — وقت کے ہاتھوں میں ہے دفترِ کون و نفاذ

یہ برق صاحب کی نظم "جبر و اختیار" کے وہ اشعار ہیں جنہیں نیاز صاحب نے پسند نہیں کیا تھا۔

بہترین خوشبو
تازگی اور
خوش ذائقہ

لاکھوں آدمیوں کی پسند

بابا

نقل و ملتے جلتے نام سے ہوشیار۔ دہلی والوں کا "بابا چھاپ" دیکھکر خریدیئے

اس کی بھینی اور دلکش خوشبو اور دل پسند ذائقہ کے لئے لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ پان کے ساتھ کھانے سے اس کی خوشبو ذائقہ کو بڑھا دیتی ہے اور عرصہ تک اس کی تازگی بھی برقرار رہتی ہے۔ فہرست مفت حاصل کیجئے

تاجر ... مال پرسم چند۔ چاندنی چوک دہلی ۶

حسن فرخ

پگھلتی ساعتیں

مہکتی شب کے لئے، جاگتی سحر کے لئے
بھٹک رہے ہیں رہِ جستجو میں اہلِ نظر
اور اہتمام ہے یہ زندگی کی راہوں میں
کہ گام گام پہ رہزن بھی ہوں شریکِ سفر

کرن کرن سے ٹپکتا ہے سرد سرد لہو
روش روش پہ نگاہوں کو ہے تلاشِ گہر
سُبو سُبو سے چھلکتی ہے سُرخ سُرخ شراب
یہ اور بات ہے پیاسے ہیں میکدے کے در
چمن چمن میں بہاروں کا رقص ہوتا ہے
یہ اور بات کہ دل کے کنول نہیں کھلتے
ہر ایک موڑ پہ رانگ ہے رسمِ سنجیدگی
یہ اور بات کہ زخموں کے لب نہیں سلتے!
سُنا ہے سب کو خلوص و وفا ملتا ہے
مجھے تو پیار کے دو لفظ بھی نہیں ملتے

میں کوہکن ہوں مرے پاس دل کا شیشہ ہے
بصد خلوص کوئی اس کو کاش توڑ ہی دے
کہ نقشِ عہدِ محبت بہت ہی گہرا ہے
کوئی ستارہ سرِ راہ جھلملاتا نہیں
قدم قدم پہ یہاں کس قدر اندھیرا ہے

بس ایک پل کو شعاعِ اُمید پھوٹتی ہے
وہ ایک پل ہی ہے اب زیرگی کا سرمایہ
بس ایک پل کو یقیں جاگتا ہے فردا کا
وہ ایک پل ہی ہے اس زندگی کا سرمایہ

رونق دکنی سیمابی

جائزے

کس قدر تھی غلط اندازہ، قیاس آرائی
خارزاروں پہ پڑا ہاتھ، چمن کے بدلے
دُرِ خوش آب ملے، اور سمیٹے کنکر
سنگ ریزوں کے عوض دُرِ عدن کے بدلے

جب عزائم کو کوئی دیتا ہے ملبوسِ عمل
طعنے دیتے ہیں اُسے لوگ ستائش کی جگہ
بدلیاں اُٹھتی ہیں دامن میں لئے آبِ حیات
دھوپ چھا جاتی ہے یکبارگی بارش کی جگہ

ہوں عفونت سے اگر پُر یہ دل و ذہن و دماغ
کس طرح موجۂ انفاس سے خوشبو پھوٹے
بے نمو ہوگی جو مٹی تو نہ ہوگی زرخیز
خارزاروں میں کھلیں گے نہ کہیں گل بوٹے

کھا گیا دل کو جگر، چاٹ گیا خون کو خون،
ہیں نہیں اس دور میں یوسفؑ کے برادر کی کمی
دشمنِ جاں دوست نما، ظاہر و باطن میں تضاد
جس کے دل میں ہوں کنول، آنکھ میں شبنم کی نمی

حاملِ سوز دروں اصل میں ہے سازِ حیات
گل تازہ کو ہے شبنم میں حرارت کی تلاش
عقل کو کذب و خرافات کی گہری صوب میں بھی
ہوتی ہے سایۂ گیسوئے صداقت کی تلاش

"جائزے فطرتِ انساں کے ہیں گردش بکنار
سائے عقدے، ہو سلیقہ تو سنور جائیں گے
پائے ادراک کی لغزش بھی سنبھل جائے گی
دل کی محفل میں ستارے بھی نظر آئیں گے

چارہ گر

پہلی کرسمس

(خوبصورت سامکان ہے۔ کشادہ بالکونی کے وسط میں مکان کے داہنے بازو سے اوٹ لگا کر اس کو دو بڑے حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ ڈرامہ ان ہی دو حصّوں میں گھومتا ہے۔ مکان کا ایک حصّہ دو کمروں پر مشتمل ہے۔ ایک زیادہ کشادہ کمرہ ہے اور اس سے ملحق دوسرا کمرہ ہے جو باغ کی طرف کھلتا ہے۔ بڑے کمرے کے دروازہ پر اجاز لاحمد کے نام کی تختی لگی ہوئی ہے)

(پھاٹک سے دو جوان جن کی عمریں ۲۵، ۲۶ سال کی ہونگی داخل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک دروازہ کا تالا کھولتا ہے۔ یہ خوبصورت، وجیہ اور اچھی صحت کا مالک ہے دروازہ کھلتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کمرے کی آخری دیوار سے لگا ہوا پلنگ پڑا ہے۔ ایک کونے میں میز اور کرسی ہے اور دوسرے کونے میں کھانے پکانے کا سامان بنانے کی پراسٹور رکھا ہوا ہے۔ وہ دونوں اس کمرے سے چھوٹے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں بید کی کرسیاں ہیں۔ پہلا جوان کھڑکیاں کھول دیتا ہے۔ کھڑکیوں سے باغ نظر آتا ہے۔ چھوٹا، خوبصورت، سلیقہ سے سجایا ہوا)

پہلا جوان: ۔ دیکھا یار، یہی میری دنیا ہے۔ یہاں میرا کس سکون ہے۔ بستی سے دور، اور تم اگر کچھ سن سکو گے تو صرف پرندوں کا خود جو بسیرے کے لئے یہاں باغ میں آتے ہیں۔

دوسرا جوان: ۔ لیکن اجاز! تمہارا دل اس تنہائی میں کس طرح لگتا ہوگا یہاں تو کوئی بات کرنے والا تک نہیں۔

اجاز: ۔ دل لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بندھا بندھایا سا معمول ہے صبح اٹھنا، گولنگ، پھر آفس۔ اور جب شام کو آفس سے گھر آتا ہوں تو کچھ وقت گولنگ میں صرف ہو جاتا ہے اور پھر رات میں مطالعہ یا کبھی کوئی اچھی سی پکچر۔

دوسرا جوان: ۔ یار میں تو اس معمول سے مر جاؤں۔

اجاز: ۔ شوکت میاں! تمہاری بات الگ ہے۔ تمہاری پرورش ایک درجن بھائی بہنوں کے درمیان ہوئی اور میں صرف ایک تھا۔ تنہا۔ اس لئے مجھے تنہائی سے محبت ہے۔ اور جب بھی لوگوں میں ہوتا ہوں تو وحشت ہونے لگتی ہے۔

شوکت: ۔ تم نے اپنے ہمسایوں کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔

اجاز: ۔ میں خود نہیں جانتا کہ لوگ کون ہیں۔ ابھی تو مجھے یہاں آئے پندرہ دن ہی ہوئے ہیں۔ ویسے اس گھر کے ساتھ ایک عجیب بات ہے۔ لگتا ہے یہاں مہذب نہیں معلوم ہوتے۔ ہر روز رات گئے یہاں بیوی کا جھگڑا ہوتا ہے اور تقریباً ہر روز بیوی کی پٹائی ہوتی ہے اور رات کے ایک دو بجے تک بچاری کے سسکنے کی آوازیں آتی ہیں۔

شوکت: ۔ آفر مرد ہے کون؟ کہاں کام کرتا ہے؟

اجاز: ۔ (نیچے سے کتاب اٹھاتے ہوئے) میں نہیں جانتا مرد کون ہے۔ کیوں کہ آج تک میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔ ہاں آواز آشنا ضرور ہوں جو رات کو گالیوں کی شکل میں مجھ تک آتی ہے۔

شوکت: ۔ پھر بھی پڑوسی کے ناطے تمہیں معلوم تو ہونا ہی چاہئے کہ لوگ کون ہیں۔

اجاز: ۔ (اٹھتے ہوئے) صرف ان لوگوں کی ملازمہ ادھر ادھر جاتے ہوئے نظر آجاتی ہے۔ اس کی گود میں سال دو سال کا خوبصورت سا بچہ ہے جو بلا شبہ ان لوگوں ہی کا بچہ ہو سکتا ہے۔ عورت کی شکل میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اگر چہ صرف اوٹ بیچ میں پڑتا ہے۔ وہاں کا آپ ہوا ایک

شوکت :۔ تو جھگڑا ہوتا کس لیے ہے۔

اعجاز :۔ کبھی کھانے پر کبھی صفائی پر۔ بہرحال اس کے کئی عنوانات ہیں۔ پھر بات یہ بھی ہے کہ قبلہ شوق فرماتے ہیں۔ اور ایسے میں خود پر کنٹرول کرنا ظفیہ خواروں ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ورنہ نوشق اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

شوکت :۔ نوشق؟ تم تو یہاں تک جانتے ہو کہ قبلہ نوشق ہیں۔

اعجاز :۔ (اسٹولاتے ہوئے) ۔ ہاں شوکت ۔ ان کی گفتگو سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے۔ عورت ہی کہتی ہے اور ہمیشہ شکایت کرتی ہے کہ سال ڈیڑھ سال سے اس بری عادت نے گھر کا نقشہ ہی الٹ دیا ہے۔

شوکت :۔ واقعی پینا بری عادت ہے۔ خدا اس روگ سے بچائے

اعجاز :۔ (کیتلی اسٹو پر رکھتا ہے اور ٹرے اٹھالاتا ہے) تم نے سچ کہا ہے خدا اس لعنت سے بچائے۔

شوکت :۔ اعجاز۔ آج پکچر چلو گے۔ تیولی میں اچھی پکچر لگی ہے۔

اعجاز :۔ نہیں یار! آج پروگرام کینسل سمجھو۔ طبیعت بوجھل سی ہو گئی ہے۔ کل ضرور چلیں گے۔

شوکت :۔ کل کی بات خدا جانے۔ آج چلتے ہو تو چلو ورنہ بندہ دفتر کے ساتھ جائے گا۔

اعجاز :۔ (چائے کی پیالی دیتا ہے) ایسا ہے تو دیکھ آؤ کل مجھے دنیا پکچر دیکھنے کے لائق ہے یا کوفت ہوتی ہے۔

چائے پینے کے بعد شوکت چلا جاتا ہے۔ اعجاز پلنگ کی چادر کی سلوٹیں درست کرتا ہے اور دراز ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر تک خاموش لیٹا رہتا ہے۔ اس طرح اس کی طبیعت کا بوجھل پن دور ہو رہا ہے۔ وہ پلنگ کے نیچے سے اونیل (O'Neill) کا ڈرامہ اٹھاتا ہے۔ پاس کے گھر سے عورت کی آواز سنائی دیتا ہے کتاب رکھ دیتا ہے۔

عورت :۔ دیکھو آیا۔ بچہ رو رہا ہے۔ اور تم وہاں کھڑی ہو۔ دودھ کو وقت ہو گیا ہے۔ دودھ ذرا گرم کر لو۔

نرس :۔ اچھا بی بی۔

عورت :۔ ابھی کپڑوں کی صفائی نہیں ہوئی اور ان کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ پھر ایک ہنگامہ ہوگا۔

(کچھ دیر تک جھاڑو کی آوازیں آتی ہیں۔ پھر دروازے پر

کس قسم کا آدمی ہے۔ دروازے پر ایک جوان آدمی کوئی ۳۰۔۳۲ سال کا ہوگا کھڑا ہے۔ آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں۔ وہ دروازہ زور زور سے کھٹکھٹاتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور اندر داخل ہوتا ہے۔ اعجاز پلنگ سے پردراز ہو جاتا ہے۔)

مرد :۔ (عورت سے) ۔ ایک گھنٹے سے برابر دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں کوئی سنتا تک نہیں۔

عورت :۔ ایسی بات نہیں میں تو تمہاری بنا رہی تھی اور آیا کی گود میں بچہ تھا۔

مرد :۔ پھر دروازہ کون کھولے چاہے کوئی زندہ رہے یا مر جائے۔

عورت :۔ دروازہ کھولنے میں ایسی کونسی دیر لگ گئی مشکل سے دو منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے۔

مرد :۔ (پیتے ہوئے) اری حرامزادی، دو گھنٹے سے دروازہ پیٹ رہا ہوں کبھی۔

ملازمہ :۔ بی بی جا رہی ہوں۔

عورت :۔ (ملازمہ سے) اچھا جاؤ (ملازمہ دروازہ سے نکل جاتی ہے) اب تو آپ نوکروں کے سامنے بھی گالیاں دینے لگے۔

مرد :۔ تو کیا اپنی زبان بند کر لوں۔ مجھے ستایا جاتا ہے اور یہ سب کچھ منصوبے بنا بنا کر کیا جاتا ہے۔

عورت :۔ آپ کو کون سمجھائے۔ آدمی ہوش میں ہو تو ایک اور بات ہے۔

مرد :۔ تو میں بے ہوش ہوں۔

عورت :۔ اب بس بھی کیجئے۔

مرد :۔ نہیں جواب دو۔ کیا میں بد ہوش ہوں ــــ بولو میں بے ہوش ہوں (بے تحاشہ مارنے کی آواز آتی ہے اور پھر رونے کی اعجاز لیٹا سسکنے کی آوازیں رات دیر گئے تک سنتا ہے)

دوسری کڑی ــــ

دوسرا دن۔ صبح کے ۱۱ بج رہے ہیں۔ اعجاز کھانے سے فارغ ہو کر اخبار پڑھ رہا ہے۔ خاموشی کا دور دورہ ہے۔ اتنے میں بچے کے رونے کی آوازیں آتی ہیں جو تدریج بڑھ رہی ہیں۔ اعجاز سے بچے کی بے تابی دیکھی نہیں جا رہی ہے وہ ٹہلتا ہے۔ ہچکیوں کی آوازیں آ رہی ہیں جب یہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں تو وہ باہر نکل جاتا ہے

اور دروازہ پر ہلکے سے کھٹکھٹاتا ہے۔

عورت:۔ (اندر سے) کون ہے۔

اعجاز:۔ دیکھئے! میں آپ کا پڑوسی ہوں۔ بچہ شدت سے رو رہا ہے اس لئے پوچھنے چلا آیا۔ کیا طبیعت خراب ہے۔

عورت:۔ طبیعت ٹھیک ہی ہے البتہ تھوڑا ہو گیا ہے۔

اعجاز:۔ (پلٹتے ہوئے) دودھ میرے پاس ہے میں ابھی لے آتا ہوں

عورت:۔ جی نہیں۔ تکلیف مت کیجئے۔ دودھ موجود ہے۔

اعجاز:۔ پھر آپ دیتی کیوں نہیں؟

عورت:۔ بات دراصل یہ ہے۔ میں نہا رہی ہوں۔ ملازمہ آج چھٹی پر ہے

اعجاز:۔ اس طرح چیخنے سے بچے کا گلا رندھ جائیگا کیا میں اندر آ کر بچے کو اٹھا سکتا ہوں۔

عورت:۔ دروازہ کھلا ہے۔ آیئے۔ اسٹانڈ پر دودھ کی بوتل ہے مگر آپ زحمت کیوں کرتے ہیں۔

اعجاز:۔ کوئی بات نہیں۔ (وہ اندر داخل ہوتا ہے۔ کمرہ بہت صاف ہے۔ ہر چیز سلیقہ سے رکھی ہوئی ہے۔ وہ بچہ کو اٹھا لیتا ہے۔ اسٹانڈ کے اوپر بچے کو گود میں لئے ہوئے عورت کی تصویر ہے۔ تصویر میں عورت کے تیکھے خدوخال نمایاں ہیں۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ ستواں ناک۔ پتلے ہونٹ۔ مجموعی طور پر بھوری صورت اور متناسب اعضاء بتاتے ہیں کہ عورت خوبصورت ہے۔ وہ دودھ کی بوتل لئے باہر آجاتا ہے۔ بچہ خاموش ہوتا جا رہا ہے (اور تھوڑی دیر کے بعد دروازہ سے عورت کی آواز آتی ہے)

عورت:۔ دیکھئے۔ میں نہا چکی۔

اعجاز:۔ میں ابھی لے آتا ہوں (وہ بچے کو گود میں لئے آتا ہے۔ دروازہ کے پردے کے پیچھے عورت ہے)

عورت:۔ جاوید نے آپ کو تنگ کیا ہوگا بڑا تکلیف دہ ہے آپ کو۔

اعجاز:۔ جی ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا وقت اچھی طرح سے کٹ گیا۔ اتنا بھولا بچہ ہو تو تکلیف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جاوید بالکل آپ جیسا ہے۔

عورت:۔ (گھبرائے ہوئے انداز میں) مجھے کب دیکھا آپ نے؟

اعجاز:۔ گھبرایئے نہیں۔ آپ کا عکس دیکھا ہے وہ جو اسٹانڈ کے اوپر ہے۔

عورت:۔ اوہو۔ تو تصویر سے آپ شاید یہ کہہ رہے ہیں۔

اعجاز:۔ جی ہاں۔ ہوتا بھی بھلا ہے امرود بچہ عموماً اپنی ماں پر جاتا ہے لوگ کہتے ہیں میں بھی اپنی ماں سے ملتا جلتا ہوں۔

عورت:۔ آپ کی والدہ کہاں رہتی ہیں۔

اعجاز:۔ میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ والد صاحب بھی مرحوم ہو چکے ہیں۔

عورت:۔ (تاسف سے) بھائی بہن تو ہوں گے۔؟

اعجاز:۔ جی نہیں۔ میں تنہا ہوں۔

عورت:۔ آپ ملازم کہاں ہیں۔

اعجاز:۔ ریڈیو اسٹیشن پر۔

عورت:۔ آپ کو کیا تنخواہ ملتی ہے۔

اعجاز:۔ ساڑھے تین سو روپے۔

عورت:۔ آپ کے لئے تو یہ تنخواہ کافی ہے۔ ملازم کیوں نہیں رکھ لیتے اسے

اعجاز:۔ ملازم رکھ لوں تو بیکاری بڑھ جائے گی اور بے کاری سے میری طبیعت گھبرانے لگتی ہے۔

عورت:۔ میری تو رائے یہ ہے کہ آپ شادی کر لیں۔ شادی سے ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اور ذمہ داریوں کے بڑھ جانے سے بیکاری خود بخود دور ہو جاتی ہے۔ ماشاء اللہ آپ کی تنخواہ بھی معقول ہے۔

اعجاز:۔ معاف کیجئے۔ سوال بالکل نجی ہو جاتا ہے۔ پھر بھی آپ کو اعتراض نہ ہو تو پوچھوں ..... کیا آپ اپنی شادی سے مطمئن ہیں؟

عورت:۔ (ہچکچاتے ہوئے) میری بات چھوڑیئے۔ ایسا ہر ایک کے ساتھ ہونا ضروری نہیں۔

اعجاز:۔ کچھ بھی ہو۔ سوال اپنی جگہ برقرار ہے۔

عورت:۔ ہاں میں شادی کے دو تین سال مطمئن رہی اور پھر دو سال سے ان کو یہ خراب لت پڑ گئی ہے اور بہکنے لگے ہیں۔

اعجاز:۔ رات گئے آپ کی سسکیاں سنتا ہوں تو بے اختیار مجھے اپنی ماں یاد آنے لگتی ہیں۔ میری ماں کی زندگی اور آپ کی زندگی کی بہت سی باتیں ملتی جلتی رکھتی ہیں۔ میرے والد بھی پیتے تھے اور ماں کو ہر رات مار کھانے کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا۔ میں اس وقت چھوٹا سا تھا۔ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ ماں کی بے بسی خجل سے دیکھی نہ جاتی تھی آج بھی ماں کے ہاتھوں کے وہ نیلے نشان ذہن میں ابھرتے ہیں تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

عورت:۔ یہی حال میرا بھی ہے۔ ہر روز شام کے خیال سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے۔ یہ دیکھئے کس بری طرح مجھے پیٹا جاتا ہے۔ (وہ اپنے

ہاتھ کو ہونٹوں تک پہنچنے سے باز رکھتی ہے۔ گورے ہاتھوں پر نیلے
نظر آتے ہیں کوئی دوسری عورت ہوتی تو گھر سے بھاگ جاتی میرے
مجبوریاں ہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔

اجاز:۔ آپ اپنے والدین کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں۔ ہو سکتا
بھی ہار بے جا چڑھ جائے۔ پھر آپ کے سامنے جاوید کا مستقبل بھی
جائے گا۔

برت:۔ آپ کی طرح میں بھی تنہا ہوں۔ صرف ایک بہن ہے وہ بھی
ان میں رہتی ہے۔ خط تک نہیں آتے۔ اب آپ بتائیے میں جاؤں
ہاں جاؤں۔ مجھے معلوم ہے کہ موجودہ حالات سے جاوید ضرور متاثر
۔ اس پر ان جھگڑوں کا اثر ضرور پڑے گا۔ مگر میں مجبور ہوں۔

ازمہ:۔ آپ کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ پڑھی
ہیں۔ پھر کیوں آپ ملازمت نہیں کر لیتیں۔؟

برت:۔ میرے پاس ڈگری نہیں۔ میں نے اپنے طور پر کوشش کی
پڑھ لیتی ہوں۔ لکھ لیتی ہوں۔ ملازمت کے لئے سند چاہئے۔ اور
پاس کوئی سند نہیں ہے۔

ازمہ:۔ تب تو مشکل ہے۔ آپ کوئی امتحان کیوں نہیں دے دیتیں۔

برت:۔ دیکھئے۔ میری عمر ۲۶ سال کے قریب ہے۔ اب اس عمر میں
ن کا خیال شرمندہ کرتا ہے۔

ازمہ:۔ عمر کو بیچ میں مت ڈالیئے۔ میں نے آپ سے بڑی عمر کی عورتوں
تحان دیتے دیکھا ہے۔

برت:۔ پھر بھی۔ اسٹڈی کے لئے سکون چاہئے۔ میرے لئے
ن مفقا ہے۔ جاوید پیدا نہ ہوتا تو سچ مانیئے خودکشی کر لیتی۔ یہ بھی
زندگی ہے۔ کھانے پینے کی جہاں افراط ہے وہاں ذہنی سکون
اور چین کا نام و نشان نہیں۔

ازمہ:۔ پست ہمتی انسان میں مایوسی پیدا کرتی ہے۔ امید سے
لیجئے۔ ہو سکتا ہے حالات یکسر بدل جائیں اور آپ خوشیوں۔
ثمار ہوں۔

برت:۔ اب خوشیاں بھی میرے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔
سے میں نے تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ اور اب اتنی عمر نکلنے کے بعد
ت ملی تو کیا۔ نہیں ملی تو کیا۔

زمہ:۔ پھر بھی جاوید کے لئے آپ کو زندہ رہنا ہے اور جب زندہ
ہے تو کیوں نہ یہ دن ہنسی خوشی سے گزار دیئے جائیں۔

عورت:۔ ہاں آپ نے ٹھیک کہا ہے۔

اجاز:۔ (گڑی دیکھتے ہوئے) اچھا اجازت دیجئے۔ جاوید رونے لگے
تو بہلا دیجئے گا۔ میں آج کل رخصت پر ہوں۔ میرا دل بھی بہل جائے گا

عورت:۔ اچھا۔ خدا حافظ۔

تیسری کڑی

دو تین ماہ بعد۔ اعجاز کا کمرہ۔ دن اتوار کا ہے شوکت اور
اعجاز بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

شوکت:۔ ارے بھائی۔ آج اتوار کا دن ہے۔ کیوں نہ پکچر دیکھی جائے
تمہارے ساتھ آج تک میں نے کوئی پکچر نہیں دیکھی۔

اعجاز:۔ ہاں شوکت آج ضرور چلیں گے۔ دھرا رہا۔ (ملازمہ باہر سے
جاوید کو لیئے گزرتی ہے۔ اعجاز پکارتا ہے) ارے بھائی جاوید کو دیتی جاؤ
(شوکت سے) بڑا بھولا بچہ ہے۔ (ملازمہ جاوید کو لاتی ہے)

شوکت:۔ (بیزاری سے) ارے یار تم نے یہ کیا روگ پال رکھا ہے
کہیں تمہیں (Father complex) تو نہیں ہو گیا۔

اعجاز:۔ (Mother complex) نہیں شوکت میاں۔ اس بچہ پر مجھے بڑا رحم
آتا ہے۔ اس کی ماں بیچاری.....

شوکت:۔ (ٹوکتا ہے) بس بھئی اعجاز بس۔ میں تو بیذکر سنتے سنتے عاجز
آ گیا ہوں۔ آج کل تمہاری ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ زیادہ ہیں۔ کیا
میں پوچھ سکتا ہوں آخر بات کیا ہے۔

اعجاز:۔ مظلوموں کا ہمدرد کون نہیں بنتا۔

شوکت:۔ (ہنستے ہوئے) پھر بھی تمہاری ہمدردیوں سے اندازہ لگایا
ہے کہ لڑکی خوبصورت ہوگی۔

اعجاز:۔ تم غلط سمجھے۔

شوکت:۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

اعجاز:۔ شوکت میاں۔ اس خاتون اور میری ماں میں کوئی باتیں ملتی
ہیں اور جب بھی اس کا مجھے خیال آتا ہے تو میری ساری ہمدردیاں
جاگ اٹھتی ہیں۔ تم عورت کی بے چارگی نہیں سمجھ سکتے۔ ایک دن کا واقعہ
سناتا ہوں۔ وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ گرمی کی دوپہر تھی۔ دوپہر
کے لئے ماں کھانا پکا رہی تھیں۔ اتنے میں والد صاحب آ گئے۔ پیئے
ہوئے تھے۔ ماں سے کھانا طلب کیا۔ ماں نے کہا سالن تیار ہے روٹی
کے لئے کچھ دیر لگے گی۔ بس اتنی سی بات پر دماغ پا ہو گئے۔ گرم گرم
سالن کا بھگونا سر پر انڈیل دیا۔ ساری گردن، سر جھلس گیا۔ ہاتھوں پر

آ گئے۔ تکلیف دہ حالات کراہتی رہیں۔ میں چھوٹا سا تھا۔ یہ تو ایک واقعہ تھا۔ ایسے کئی حادثے میں نے دیکھے۔ شام کے ساتھ ہی میری ماں کی آنکھوں میں ایک قسم کا خوف آ جاتا اور مجھے یوں لگتا جیسے وہ آنکھیں کہہ رہی ہوں "مجھے خدا کے لئے ان ماروں سے بچا لو جن سے سارا جسم چور چور ہو رہا ہے" خوفناک میاں۔ تقریباً یہی حال جاوید کی ماں کا ہے۔ میں کئی ماہ سے یہاں ہوں اور برابر دیکھ رہا ہوں۔ روز نہ سہی تو ہر دوسرے تیسرے دن بیچاری کی پٹائی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے اپنے حالات کہہ دیتی تھی ایک دن اس بدمعاش نے دیکھ لیا۔ تمام رات بیچاری کو پیٹتا رہا۔ پھر مجھے ملنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پرسوں چٹھی آئی تھی۔ (اعجاز چٹھی خوفناک کر دیتا ہے۔ شوکت چٹھی پڑھتا ہے)

اعجاز صاحب۔ تسلیم۔ آپ سے بات کرتے ہوئے انہوں نے دیکھ لیا۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر جو سزا مجھے دی گئی ہے وہ میں۔ بیان نہیں کر سکتی۔ شاید میرا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔ سوجن اترتی نہیں ہے اور رہ رہ کر اس میں ٹیسیں ہونے لگتی ہیں۔ [illegible] کہا جا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا میں نے کئی بار آپ سے بات چیت کی اس کے باوجود کبھی آپ کے سامنے نہیں آئی۔ خدا گواہ ہے میں نے آپ کو اپنے بھائی کی نظر سے دیکھا۔ وہ دوسرا مکان دیکھ رہے ہیں۔ تاکہ یہاں سے جلد از جلد منتقل ہو جائیں۔ دوسرا مکان مل گیا تو ہم لوگ چلے جائیں گے۔ اس لئے آپ سے گزارش کرتی ہوں کہ جاوید کو آپ اپنے پاس رکھیں۔ اسے اپنا بچہ سمجھ کر تعلیم دلائیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کی پرورش اس انداز سے ہو۔ میں بیحد احسان مند رہوں گی، آپ مجھے اپنے ارادہ سے مطلع کریں۔ ہیں یکسوئی کے بعد مجھے موت کا بھی ڈر نہیں رہے گا۔ نہ جانے زندگی کب ختم ہو جائے۔ اور نہ جانے کون سی مار فیصلہ کر دے آپ کے فیصلہ کی منتظر۔ عطیہ۔ پھر تم نے کیا جواب دیا؟

اعجاز۔ سوچ رہا ہوں۔ اسی لئے تو میں نے تبادلہ کی کوشش کی تھی اور خیر سے میرا تبادلہ بھی ہو رہا ہے۔ جاوید کو میں ضرور اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

شوکت۔ ملازمہ آ رہی ہے شاید جاوید کو لینے۔ اچھا میں جا رہا ہوں

(وہ جاتا ہے)

اعجاز۔ خدا حافظ

چرخی کرڈی۔

شام کا وقت ہے۔ چراغ جل چکے ہیں۔ اعجاز لیٹا اخبار پڑھ

مرد کی آواز آتی ہے۔

مرد۔ تو کھانا اب تک نہیں پکا۔

عطیہ۔ پک گیا ہے۔ لگانا باقی ہے۔ صرف دو منٹ لگیں گے۔ آپ منہ ہاتھ دھو لیجئے۔ جب تک دسترخوان بچھ جائے گا۔

مرد۔ جب تک جوتے نہ پڑیں کام نہ ہوگا۔

عطیہ۔ آج رحم کیجئے۔ میرے ہاتھ میں شدید درد ہے۔ میں آپ کے پیر چھوتی ہوں۔

مرد۔ (زور سے) ہٹ۔ (اس کے ساتھ ہی عطیہ کی چیخ سنائی دیتی ہے)

عطیہ۔ (چیختے ہوئے) بچاؤ۔ بچاؤ۔ میرا ہاتھ۔ اللہ۔ (اعجاز دوڑتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے)

اعجاز۔ (مٹھیاں بھینچتے ہوئے) ٹھہرو!

مرد۔ (پلٹتا ہے ہاتھ میں بلٹ ہے۔ عطیہ ہاتھ تھامے نیچے گری ہوئی ہے) اعجاز کی نظریں عطیہ کی طرف ہیں۔ آج پہلی بار اس نے عطیہ کو دیکھا ہے۔ صورت پر خوف طاری ہے۔ پیشانی سے خون رس رہا ہے وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو تھامے اٹھنے کی کوشش کر رہی ہے) اچھا تو تم میں اتنی ہمت ہو گئی کہ تم گھر میں گھس آئے اس کے لئے تم جیل بھی جا سکتے ہو۔

اعجاز۔ (قابو پاتے ہوئے) کیوں نہیں۔ جیل اسی صورت میں جا سکتا ہوں جب تم یہاں سے نکل کر پولیس کو اطلاع دو۔

مرد۔ میں ضرور دوں گا۔

اعجاز۔ تم اس گھر سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکال سکتے۔ آج میں تمہیں بتاؤں گا کہ ایک کمزور عورت پر روز روز بہادری جتانے کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔ میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔

مرد۔ (بلٹ لئے آگے بڑھتا ہے) او خونخوار ہٹ جا۔ دفن کر دوں گا (وہ کرسی سے ٹکراتا ہے اور فرش پر گرتا ہے سر پر گہری چوٹ لگتی ہے)

عطیہ۔ اعجاز۔ یہ کیا کیا تم نے۔

اعجاز۔ تم چپ رہو عطیہ میں آج اسے قتل کر دوں گا (وہ بے ہوش مرد کی طرف بڑھتا ہے)

عطیہ۔ (پریشانی سے)۔ اعجاز۔ اعجاز۔ خدا کے لئے تم ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے (اعجاز رک جاتا ہے وہ پلٹ کر عطیہ کی طرف آتا ہے۔ اور عطیہ کو شانے پکڑ کر اٹھاتا ہے۔)

اعجاز۔ عطیہ۔ یہ تمہارا کلیجہ تھا جو اتنا ظلم برداشت کرتی رہی ہو۔

عطیہ:۔ (روتی ہے) تم نے مجھے کیا اعجاز۔

اعجاز:۔ ان تین مہینوں میں میں نے کس طرح خود پر قابو پایا یہ میرا دل جانتا ہے۔ رات رات بھر جاگ کر تمہاری سسکیاں سنتا تھا۔ اور ہمیشہ دل نے یہی چاہا کہ تمہارے زخموں کے لئے مرہم بن جاؤں۔۔۔۔ عطیہ ۔۔۔ عطیہ۔۔۔۔ میں تمہیں اپنی شریک زندگی بنالوں گا۔

عطیہ:۔ (حیرت سے دیکھتے ہوئے) ۔۔۔ اعجاز

اعجاز:۔ ہاں عطیہ۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میرے دل میں تمہارے لئے جو محبت ہے اس کا اندازہ شاید تم نہ کرسکو۔ میری محبت میں تمہیں ماں کا پیار، باپ کی محبت، بہن بھائیوں کا خلوص سب کچھ ملے گا اور تم اس کی شریک حیات میرے مالک ہوگی۔ بولو عطیہ بولو۔۔۔۔ کیا تم۔۔۔۔

عطیہ:۔ (روتے ہوئے) نہیں اعجاز۔۔۔۔ نہیں۔

اعجاز:۔ یہ تمہارا دیوانہ پن ہے۔ کسی دن یہ تمہاری جان لے لے گا۔ جاوید کا کیا بنے گا۔ جاوید ماں کے پیار کے لئے ترسے گا۔ اپنے لئے نہیں تو جاوید کے لئے مان جاؤ عطیہ۔

عطیہ:۔ تم بھی بدل گئے تو۔۔۔ نہیں اب کسی بھی تجربے سے جی ڈرنے لگا ہے۔

اعجاز:۔ مجھے یقین ہے میں بدل نہیں سکتا۔ تم خود دیکھ لوگی، میں ساری عمر تمہاری خدمت کروں گا۔ اپنی ماں کی روح کو تسکین پہنچانے کے لئے۔ اٹھو عطیہ۔ چلو اب ہم چلیں۔ (وہ عطیہ کو اٹھاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو تھامے آگے بڑھتے ہیں۔ اعجاز جاوید کو اٹھا لیتا ہے اور تینوں دروازہ کی طرف بڑھتے ہیں)۔

عطیہ:۔ میں چپل تو پہن لوں۔

اعجاز:۔ نہیں عطیہ نہیں۔ میرا بس چلے تو تمہارے پیر بھی نہیں چھونے جاؤں۔ (دروازہ کھلتا ہے اور تینوں آہستہ آہستہ دروازہ سے باہر نکلتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے۔۔۔)

بقیہ افسانہ صفحہ 19۔ "سہیل ہوگئیں منزلیں"

جس نے آپ کا کافی خدمت کی ہے۔

پھر اچانک اس نے دیکھا کہ سامنے سے زینت اپنی ننھی بچی کو گود میں لئے چلی آرہی ہے۔ اس کا وجود لرز اٹھا کہ پیچھے ہٹنا چاہتا تھا کہ زینت نے بڑھ کر اسکی بیساکھی پکڑلی۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور تب اس نے دیکھا کہ شہاب کی بیساکھی دیوار سے لگی ہوئی ہے اور وہ زینت کے کاندھے کے سہارے لنگڑاتا ہوا اپنے [illegible]

سب سے زیادہ قابل اعتماد
بالوں کو سیاہ کرنے وا

وسمول

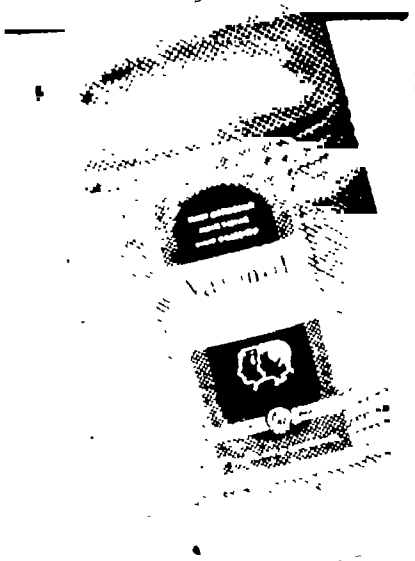

سفید بالوں کو سیاہ کرتا ہے
بالوں کو سنوارنے کا بہترین ذریعہ ہے
ایمنسی فائڈ ہیر آئل اور پومیڈ
کی شکل میں ہر اسٹور سے
دستیاب ہوسکتا ہے
دنیا بھر میں لاکھوں استعمال کرتے ہیں

ہائیجنک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پوسٹ بکس ۱۹۲ بمبئی ۱

عبدالرب صدا سنبھلی

غزل

ڈوب کر رہ گئے موجِ مئے پندار میں لوگ
کیسے بے مثل بنے عظمتِ کردار میں لوگ

کشتیِ فکر نہ ہے ساحلِ حاصل کوئی
تیرتے پھرتے ہیں گفتار کی منجدھار میں لوگ

ایک اک حرف نکل جاتا ہے لمحوں کی طرح
اور کھو دیتے ہیں صدیاں یونہی گفتار میں لوگ

خود ہی یہ عظمتِ الفت کی قسم کھاتے ہیں
خود ہی نیلام وفا کرتے ہیں بازار میں لوگ

کون سمجھائے صدا ان کو محبت کے اصول
راحتیں ڈھونڈتے ہیں عشق کے آزار میں لوگ

علامہ شبلی

غزل

شعورِ باغبانی کو اگر ہم کُل فشاں کرتے
نمایاں چہرۂ صحرا کی بھی شادابیاں کرتے

بہم رکھا دلِ بیتاب کا سعیِ تبسّم نے
وقارِ غم کہاں رہتا جو ہم آہ و فغاں کرتے

یقیں آنے لگا ہے دشمنوں کی دوستداری کا
ہم اس سے بڑھ کے اب کیا اعتبارِ دوستاں کرتے

اگر تیرا سہارا اے نگاہِ ناز مل جاتا
دلِ ویراں میں ہم آباد کتنی بستیاں کرتے

تعاون حسنِ خود آرا اگر کرتا تو اے شبلی
زمینِ فکر و فن کو ہم بھی رشکِ آسماں کرتے

عمیق حنفی

نئی شاعری کے ذرّہ نواز

میں نئی شاعری کا علم بردار ہوں، نہ سردار جعفری ہوں۔ نئی شاعری کا کوئی مخصوص فلسفہ ہے اور نہ کسی ایسے فلسفے کی اسے ضرورت ہے۔ جو نئی شاعری کے بارے میں وقتاً فوقتاً جا بجا میں لکھتا رہا ہوں وہ میرے اپنے خیالات کا آزادانہ اظہار رہے اور انھیں فلسفہ طرازی کے بجائے بولتی ہوئی سوچ کہنا مناسب اور برمحل ہوگا۔ میں انھیں باتوں کی تکرار تعارفی انداز میں کرتا رہا ہوں جو مختلف الخیال نئے شاعروں نے اپنے مقدموں، تعارفی نوٹوں اور نظموں غزلوں میں کی ہیں۔ میری اس کوشش کو اظہارِ عقائد کہنا ٹھیک نہیں۔

پرانی شاعری سے بری الذمہ شاعری ہر گز نہیں جو قدماء، متوسطین اور میرے قریبی پیش رو شعراء نے اپنے خونِ جگر سے کی تھی۔ میں اس روایت کا مخالف بھی نہیں جو خون میں شامل ہے، زندہ اور تابندہ ہے اور انسان کے ارتقار کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ پرانی شاعری وہ ہے جس کا شعور (نظام) طرزِ احساس آج بے وقت اور بے محل ہے اور جو بندھے ٹکے جذبات، بندھی ٹکی رعایات، بندھے ٹکے صنائع و بدائع، مرکبہ اور فرسودہ تصورات، نامعقول معروضات اور Mood ہی سے نہ تو پیچھا چھڑا سکی ہے اور نہ چھڑانا چاہتی ہے۔ الفاظ کی بازی گری کو فکر و فن کا کمال سمجھتی ہے۔ کاسکی اور رومانی جذبات و خیالات کو (جو آج کی زندگی اور طرزِ فکر و احساس سے میل نہیں کھاتے) آزاد یا موزوں فارم میں نظم کر دینے کو نئی شاعری نہیں مانتا۔

جہاں تک میرا اپنا معاملہ ہے میں غیر محض Non Aesthetic رہنا پسند کرتا ہوں۔ چونکہ نئی شاعری میں "نئی" ایک اضافی اور محض امتیازی صفت ہے اور آزادیٔ عقیدہ و فکر و احساس کے مترادف ہے اس لئے "نیا شاعر" کہلانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آج جبکہ اقبال، جوش، فراق، انیس ناگی، محمد سلیم الرحمٰن عادل منصوری ایسے جدید تر شاعر سامنے آگئے ہیں، شاید میں اتنا نیا بھی نہیں رہا۔ لیکن میں نے نئی شاعری کو جدید ترین موضوعات استعمال کیا ہے اور اس کے محیط میں جدید، جدید تر اور جدید ترین شعراء کو گھیر لیا ہے اس لئے پرانے شاعروں کی کوئی بات نہیں۔ نئی شاعری کے دائرے میں علامت پسند، امیجسٹ، شعور کی رو کے قائل، اشیاء سے نظم کرنے والے، آواں گارڈ کے پیرو، وہ بھی جو داخل اور خارج کے انضمام اور وحدت کے قائل ہیں اور وہ بھی جو انفس و آفاق کی ثنویت کے حامی ہیں، وہ بھی جو اپنی شاعری کو ٹھیٹ ہندوستانی رکھنا چاہتے ہیں اور وہ بھی جو اسے آفاقی رنگ و آہنگ اور احساس و اظہار سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی جو وسیلۂ ذات سے حیات و کائنات کے رشتے اور مسائل کا اظہار کرتے ہیں اور وہ بھی جو محض نفسیاتی اور رومانی علائم و تمثیالات کو نظم کرتے ہیں۔ غرضیکہ مختلف الخیال اور مختلف العقائد لوگ آجاتے ہیں۔ انگریزی، بنگالی، ہندی، بہت سی دوسری زبانوں کے ادیبوں کی طرح اردو میں ادیبوں کی مختلف تحریکیں یا شاعری کے مختلف مکاتب نہیں ہیں۔ عام طور سے پرانے، ترقی پسند اور نئے ادیبوں کے گروہوں میں اردو کے تمام ادیب بانٹے اور پہچانے جا سکتے ہیں۔

سردار جعفری نے شہریار کے مجموعے "اسم اعظم" پر جو عبارت لکھی تھی اور جسے انہوں نے اپنے زیرِ بحث مضمون میں نقل بھی کیا ہے اس سے مجھے کوئی اختلاف نہیں۔ عہد بہ عہد دیوتاؤں سے انسان کو آزاد کرانے کی کوشش میں بہت سے نئے شاعر سرگرداں ہیں اور اس سلسلے میں بھی ہوں۔ خواہ یہ روسی اور امریکی دیوتا ہوں، خواہ جنوبی افریقہ اور کمیونسٹ چین کے سفید اور لال دیو۔ جس بات کو سردار جعفری نے اقبال کے حوالے سے کہا ہے وہ بھی اختلاف کی گنجائش نہیں رکھتی۔ میں بھی ہر اس نظام اور ہر اس نظریے اور عقیدے

Burnt Books

قابلِ مذمت بلکہ گردن زدنی سمجھتا ہوں جو انسان کی قوتِ تخلیق کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یا انسان کے جسم، دل، دماغ اور روح کی توہین و تذلیل کرتا، میں انسان اور کائنات کو ایک روحانی وحدت اور بدھی ثنویت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے اور سمجھنے میں سہولیت پاتا ہوں۔ بالفرض اگر وہ دونوں ہر اعتبار سے ایک ہیں تو پھر داخل اور خارج کا جھگڑا ہی فضول ہے اور انفس و آفاق یا پنڈ اور برہانڈ کی تفریق ہی غلط نظر ہے۔ اگر سردار جعفری اس وحدت الوجود کو مانتے ہیں تو دونوں میں رشتے کا تلاش کرنے کا یہ معنی ہیں؟ میں نے بھی انسان اور کائنات کے رشتے کو از سرِ نو دریافت کرنے کی بات ہی تو کہی تھی۔ اور اس رشتے کو تلاش کرنے کے دو راستے قرار دیئے تھے ایک خارج (آفاق یا برہانڈ) کا اور دوسرا داخل (انفس یا پنڈ) کا۔ شاعری کے لئے دوسرا راستہ کھلا ہے کیونکہ پہلے کا سوغلافی جہازوں سے ہو سکتا ہے جو شاعری کو میسر نہیں۔ اب پھر انسان کے نفس یا ذات یا پنڈ میں اگر خارجی کائنات کا کوئی (عناصر یا ۔۔۔) موجود ہے اور اس کی اندر کی دنیا باہر کی دنیا کا عکس ہی ہے تو پھر ذات کے اندر کائنات کی تلاش ناممکن کیوں قرار پائی؟ پھر صورت سائنس یا ویدانت کا حوالہ میں نے کسی فلسفیانہ بحث کو شروع کرنے کی غرض سے نہیں دیا تھا بلکہ اس لئے کہ ذات کے سفر اور نئی شاعری کی داخلیت کی بات واضح ہو جائے۔ بے شک شعور و احساس انسان اور کائنات کے باہمی رشتے کے ادراک کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ مجھے تو اپنے اور سردار جعفری کے نقطۂ نگاہ میں یہاں کوئی اختلاف نظر نہیں آیا۔ "اپنے" عہد سے ظاہر ہے کہ میں وقت کے اس نقطے کی طرف اشارہ کر رہا تھا جہاں ہم آج کھڑے ہیں۔ رہ گئی سماجی اور شاعرانہ ذمہ داری کی بات تو میں کسی ذمہ داری سے منہ چرانے کی تلقین نہ تبلیغ نہیں کرتا۔ میں نے ایک شہری اور ایک انسان کی حیثیت سے کبھی کسی ذمہ داری سے فرار اختیار نہیں کیا۔ لیکن ایک سوال ہمیشہ میرے ذہن کو کریدتا رہا کہ انسان سماج کے لئے ہے یا سماج انسان کے لئے؟ ذمہ داری کا تعین کون کرے؟ سماج یا انسان؟ اور یہ کہ کیا ہمارا آج کا سماج ایک ذمہ دار سماج ہے؟ اگر نہیں تو ایک غیر ذمہ دار سماج کی ذمہ داری قبول کرنا صحیح ہے یا غلط؟ کیا ہمارے سماج کی بنیاد انسانیت اور فطرت پر قائم ہے؟

میں انسان کو اوّل و افضل مانتا ہوں [redacted] مذہب، اخلاق، صحافیات، سیاست اور معاشرت کا جنم داتا ہے اور یہ سب اس کے لئے ہیں نہ کہ وہ ان کے لئے۔ بھگتی، تصوف، ویدانت، جمہوریت، آزادی، کمیونزم اور امن کے نعرے اور نظریے جہاں تک انسان اور انسانیت کے وجود، سالمیت اور وحدت کو برقرار رکھنے اور انسانیت کی شخصیت کو ابھرنے، نکھرنے، بننے، سنورنے کا موقعہ دیتے ہیں میں ان کے ساتھ ہوں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کو میرا استادِ معنوی اور پیرو مرشد ثابت کرنے میں سردار جعفری آخر لطف کیوں لے رہے ہیں میں نہیں جانتا۔ میں ایلیٹ کو بیسویں صدی کا ایک اہم اور عظیم شاعر مانتا ہوں اور بس۔ مجھے اس کے عقائد اور نظریات سے بحیثیت شاعر کوئی غرض نہیں۔

جو ابھی پر تول رہے ہیں اور کون جانے وہ کب چہچہانا شروع کر دیں۔ علوم نہیں پَر تولنے والوں سے ایسے لوگ کیوں چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں جن کے پر و بال یا تو شل ہو چکے ہیں، یا کتر چکے ہیں یا ٹوٹ چکے ہیں یا نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر پر تولنے والے ان پر جھپٹ پڑے تو انہیں بچاؤ کے لئے اڑنے کا موقعہ بھی نہ مل سکے گا۔

میری طویل نظم "سندباد" میں فضیل جعفری اور سردار جعفری کو ایلیٹ کے ویسٹ لینڈ کی روایت نظر آئی، اختر سعید کو ایلیٹ کی "ٹو کورسس فرام ڈراک" کی پرچھائیں دکھی، محمد ہاشمی کو اس نظم نے ہارٹ کرین (Hart Crane) کی طویل نظم "دی برج" (The Bridge) کی یاد دلائی اور براج کول نے اسے ایک "وجودیہ ایلیٹ بک" قرار دیا۔ ان تمام کرم فرماؤں کے ردِ عمل کو داد کھنوں یا بیداد کہی میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاؤں کہ میں ایلیٹ، ہارٹ کرین، یا آژاں پال سارتر سے کچھ ہی پیچھے ہوں۔ یا اس غلط فہمی کی وجہ سے خواہ مخواہ سرتے یا استفادے کے احساسِ جرم کو پروان چڑھاؤں؟ لیکن میں خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا ہونے کے بجائے صرف یہ صفائی دینا چاہتا ہوں کہ ایلیٹ یا کسی اور سے سندباد کا کارشتہ تلاش کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ حق بجانب۔ ان لوگوں کے عقائد، نظریات اور مسائل ہی اور دوسرے تھے۔ میں نے سندباد کے ذریعہ آج کے انسان کے کرب، بحران، ہیجان اور مسئلے کو ملفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میکانکی اور انتہی تہذیب کے ان منفی اور تاریک پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جن کی لپیٹ میں مشرق اور مغرب یکساں طور پر آ رہے ہیں۔ اقدار، یقین، شناخت اور بے توقیری کے بحرانوں پر غور کیا ہے۔ نرائڈین لغویات اور طریق علاج کا بھرم کھولا ہے جمہوریت، آزادی، اشتراکیت، مذہب کے موجودوں کے نہ آنے کا سبب معلوم کرنا چاہا ہے۔ سبز باغوں، جھوٹے اعدادوں اور کھوکھلے نعروں کا المیاتی انجام دیکھا اور دکھایا ہے۔ تخلیقی صلاحیتوں [redacted] کی تنگی اور شعاریوں کو اعلامیوں کے سہارے ابھارا ہے۔ کیا سندباد کے ان مصرعوں میں خطابت یا زیرِ اسراج کی روایت ہے

تخت و کرسی، منبر و مسند پہ جو میں جلوہ گر

تیرے ماتھوں اور ہاتھ، مشرقوں کے رنگ پر
شرق کا مخصوص ان کی! اور میں مجرم فقط!

یہ تو احتیاط پذیر سماج کی روایت جیسی دشنام آزادیوں سے کتراتا یا ڈرتا نہیں ہوں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ یہ گالی ہر اس شخص کو دی جاتی ہے جو اس گالی کی تہہ میں لعنت ملامت کا جو جذبہ ہوتا ہے اس کو کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے یا دورِ جدید کی مصلحت آمیز کایا کلپ کا۔ بہرحال منتقد میں کوئی نامعقول، غیر صحت مند یا غیر انسانی عنصر نہیں ہے۔

منشور اگر حقائق اور تصورات کے اظہار کا نام ہے تو نئے شاعروں کو اول ہی سے کوئی منشور ضرور تیار کرنا چاہئے تاکہ نئی شاعری کی صحیح تفہیم ہو جائے اور اس کی کوئی ایسی توجیہ بن جائے جس سے تفہیم اور تنقید میں لوگوں کو آسانی ہو۔ لیکن اگر منشور شاعری میں جذبات و احساسات کی تخصیص کا نام ہے، شاعر کے احساس و اظہار کو حدود و خصوص اور پابندیوں کے نام ہے تو ہم جیسے ہیں ویسے ہی بھلے۔

ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادیبوں کی بغاوت، جدت و ندرت اور تجربات کی تاریخی اہمیت سے انکار کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ فیض، ندیم، سردار جعفری، جاں نثار اختر، مخدوم وغیرہ کی بیشتر نظمیں اور غزلیں نئی شاعری کے ضمن میں آتی ہیں اور انہیں پڑھ کر آنکھوں میں لو اور دل میں سرور آجاتا ہے۔ لیکن جہاں کمیونسٹ منحنی خیز نعروں، پامالیوں اور فارمولا بازی کا اتباع اور اطاعت آجاتی ہے اور سیاست کے اشارۂ ابرو پر شاعر اپنے خیالات، جذبات اور قید بدلتا ہے، وہاں شاعر چاہے جو کچھ ہو شاعری نہیں ہوتی۔ سردار جعفری نے مجھ پر ویدانت، تصوف، بھگتی، ملٹن، ایلیٹ اور مذہب کے ساتھ مختص کرکے مجھ پر جو تنقید فرمائی ہے سراسر بے بنیاد اور لغو ہے۔ ویدانت، تنتر، بھگتی، تصوف، مذہب، مائیتھولوجی، داستانیں میرے اور مجھ ایسے نئے شاعروں کے لئے معاشرتی، نفسیاتی فرائڈین مفہوم میں نہیں اور انسانی ذہن کے مطالعہ اور تحقیق کے شعبے ہیں اور ان سے علائم، تلمیحات اور اشارات مل جاتے ہیں۔

میں بھی اخلاق کو اضافی مانتا ہوں اور اخلاقی قدروں کو تغیر و تبدل سے ماورا نہیں سمجھتا۔ موجودہ نظام اخلاق کی فرسودگی اور نئی صداقتوں اور نئے حقائق کا ساتھ نہ دینے کا، ان کی مجبوری اور معذوری کا اور رسوم و رواج کے اس پر تسلط کی شکایت کرنا اس بات کا ثبوت ہرگز نہیں کہ میں کسی نظام اخلاق کا قائل ہی نہیں ہوں، ہری شاعری میں پرانے اقتدار کی شکست و ریخت کا مرثیہ بھی ہے اور نئے اقدار کے رونما ہونے کا مژدہ بھی۔ اسی کے ساتھ سرمائی ہوئی بدبودار قدروں کو ٹھکرانے کی خواہش کا اظہار بھی میں کرتا رہتا ہوں۔

میں اولاد آدم بالخصوص شاعر۔ ادیب، فنکار، ہنرمند۔ اور محنت کش انسانوں پر جبر و ظلم کو برداشت نہیں کرتا۔ خواہ وہ روس میں ہو یا امریکہ میں، ہندوستان میں ہو یا پاکستان میں۔ مجھے صرف ہو کا عالمی جنگ ہے، اور موت موت ہوتی ہے، وہ مذہب کے نام پر ہو یا کمیونزم یا جمہوریت کے نام پر۔ میں انسانیت کے نام پر بھی انسان کشی کو جائز نہیں سمجھتا۔ میں سرکاری ملازم فرد ہوں لیکن بیوروکریٹ، محتسب، قاضی، کوتوال یا فقیہہ شہر ہرگز نہیں۔ اب اس کا کیا علاج کہ مجھے کے حصے میں سرکار کی ملازمت آئی ہے تو کسی کے حصے میں سرمایہ دار فلم سازوں کے معاہدات۔ غیر میں تو جو کچھ اپنے تئیں سوچتا یا محسوس کرتا ہوں لکھ دیتا ہوں نہ تو کسی افسر کی صریح اور نہ کسی جمہوری فرمائش سے نحو لکھوا کر شاعری کرتا ہوں۔ کبھی آئینے کا ٹوٹنا مجھے نظم کہنے پر مجبور کر دیتا ہے اور کبھی اپنے حقیقی یا ادبی پروردگار کی وفات بھی مجھے نوحہ یا مرثیہ لکھنے کی ترغیب نہیں دیتی۔ سردار جعفری ایک طرف تو مجھ سے نالاں ہیں اور دوسری طرف شاعروں سے موضوعات کے اختیار پر آمادہ۔

روایت کے تسلسل اور روایت شکنی کے کسی ہمہ گیر ضابطہ کا مجھے علم نہیں۔ ترقی پسندوں نے اپنے عقائد، نظریات اور شعور کے مطابق روایت پر جو قدغنیں عمل جاری رکھا اور نئے شاعروں میں سے ہر ایک اپنے اپنے نظریۂ فکر و فن، شعور اور تجربہ کی بنا پر روایت شکنی اور تجدد پسندی کے ہر دور، زبان اور گرامر کی پابندی کو روایت پرستی قرار دے کر ہائی سکول کے انشائی مباحثوں کے طرز استدلال کی یاد تازہ کر دی۔ بہرحال ہر دو فرض اور گرامر کی روایت شکنی کا لطف لینا ہو تو یہ بھی نئے شاعروں میں سے بعض کے یہاں مل سکتا ہے۔ افتخار جالب کی نظمیں پڑھئے یا ظفر اقبال کے مکتوبات کی فرمائش۔ مجھ میں اس قسم کی بغاوت کی صلاحیت ہے نہ ہمت۔

اپنے مضمون کے اختتام تک آتے آتے سردار جعفری نئی زندگی، نئی شاعری، نیا زمانہ کی بات کرنے لگے ہیں "نے اپنے مضمون کی ابتدا کی تو انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں نے انسان کو ہیرو کا اسیر کر دیا اور خود" اپنے زمانے کی شاعری میں" اچھے برے دیوتاؤں کی تلاش کرنے لگے ہیں تو وہ اس شعر پر سر دھن رہے تھے۔

ادبی محاذ، ایک کائنات بھی ایک دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

[illegible] میں تضاد ہے؟ یا میری باتوں میں تضاد تھا؟ جی نہیں تضاد نہ اُن میں ہے نہ مجھ میں۔ دراصل وہ مباحثے کے موڈ میں تھے اور مباحثے میں حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا اور اُلجھانا جائز حربہ ہے لیکن میں اُن سے مباحثہ نہیں کرنا چاہتا کیونکہ وہ فیرجانبداری کا چاہے قصداً مظاہرہ نہ بھی کریں اپنے مخصوص نظریات اور اپنی پسند ناپسند کی دیواروں سے اُوپر نہیں اُٹھ سکتے اور پھر اِس مضمون میں میں اسطور یہ معلوم ہو کہ میں کوئی نظریاتی بحث کر رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ تقریق و تقسیم کر کے اُنہیں منظم ہونے سے روکنا چاہتا ہوں۔

بہرحال میں نہ شاعری کا فلسفہ طراز ہوں۔ نہ اُن امراض میں سے کوئی مرض مجھ میں ہے جس کی تشخیص سردار جعفری نے کی ہے۔ میں نہ شاعری کا وکیل یا مجاہد بھی نہیں۔ نہ شاعروں کو بچھڑنے کا اپنے طور پر کوشش کر رہا ہوں اور اس کوشش میں ادب دوستوں کو فریق کر لیتا ہوں۔ چونکہ سردار جعفری نے میرے بیان کو سمجھنے کی کوشش میں چند سطریں لکھی تھیں، اس لئے میں نے حقِ صفائی و جواب کا استعمال کرتے ہوئے اپنے معروضات قارئین "شاعر" کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ جہاں تک میرے اپنے "معروضات" کا سوال ہے انہیں میں نے اپنے زیرِ ترتیب مجموعۂ کلام "شعلے کی شناخت" کے پیش لفظ میں رقم کر دیا ہے۔ اور یہ پیش لفظ کتاب (لکھنؤ) میں چھپ رہا ہے۔

اعجاز صدیقی کی طویل شاہکار نظم

خوابوں کا مسیحا

(ایک ساتھ تین زبانوں میں شائع ہوئی)

• ایک خوبصورت ترین کتاب •

اِس طویل نظم ELAY میں جواہر لال نہرو کی ہمہ گیر شخصیت اور اُن کے تصوّرات و معتقدات کا گہرا نفسیاتی مطالعہ تمام شاعرانہ لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ امنِ عالم کے لئے ایک پیغام ہے۔

ریباچہ — کرشن چندر قیمت مجلد روپے پچاس پیسے

مکتبہ فکر الادب پوسٹ بکس ۲۶۴۵ بمبئی ۸ بی سی

خشک سالی زدہ آئے

اپنے ہموطنوں

کی امداد کیجئے

عطیات، نقدی یا سامان

پردھان منتری خشک سالی امدادی فنڈ

کیبنٹ سکریٹریٹ راشٹرپتی بھون نئی دہلی ۱

کو بھیجئے۔

آج کا ادب

ایک کتاب — ایک تحریک

اُن مہتم بالشان تخلیقات کا مجموعہ جن کی عظمت اور گرانمایہ ادبی حیثیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ایک عہد آفرین کتاب — جس کا ہر لفظ اِس دَور کے تقاضوں — ہم آہنگ ہوگا۔

زیرِ طبع

مترتب وسیم فاضلی

ناصر بغدادی

۶۔ حجاز ہوٹل۔ گرانٹ روڈ۔ کراچی

مدو

عنوان چشتی ——— لیکچرار اردو دیال سنگھ اسلامیہ نئی دہلی ص ۲۵

"شاعر" کا تازہ شمارہ ملا، آپ کی نظم اور مظفر صاحب شعلہ کا "ترنگا دے" پسند آیا۔ علیحدہ سے صاحب امید کا مضمون نئی غذا رکھتا ہے، دیگر مضامین بھی اچھے ہیں۔

جناب عبداللطیف اعظمی کے خط اور آپ کے ادارتی نوٹ سے وہ بات سامنے آگئی جو مدت سے میرے دل میں کھٹک رہی تھی۔ صرف مضمون اور مقالہ ہی کی بات نہیں، نثر میں بہت سی اصناف کا از سر نو تعین، تعبیر اور تشریح کی ضرورت ہے۔ جس سے ان کے حدود اور امکانات کا تعین کیا جا سکے۔ اردو میں مقالہ بہت وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسکول پر پڑھا جانے والا سادہ تحریر ہو یا بھرپور تحریر۔ تبصرہ نما تحریر ہو یا بھرپور تنقیدی مضمون، علمی و ادبی موضوعات پر سرسری تحریریں ہوں یا مدلل اور مفصل ہمہ گیر تحریریں، ایم اے کے نصاب میں ایک پیپر کا مکمل حال ہونے والا طویل مضمون (DISSERTATION) ہو یا پی ایچ ڈی تھیسس سب کو مقالہ کہتے ہیں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم تبصرہ، مضمون، مقالہ، تنقید، انشائیہ، تحقیق و مقالہ اور خاکہ وغیرہ کے حدود امکانات کا تعین کریں۔ اس بحث کے لئے آپ براہ راست سب کو دعوت دیجئے۔

آج کل کئی رسالوں میں نئی شاعری پر مضامین شائع ہو رہے ہیں آپ نے بھی چند نئے لکھنے والوں کو اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی دعوت دی ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے بہت اچھی ہے کہ نئی شاعری کی طرف سے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جائے گا۔ مگر بعض لوگ نئی شاعری کے بارے میں، اس طرح اظہار خیال کر رہے ہیں جس سے ایک طرف وہ اپنی رسوائی کا سامان کر رہے ہیں اور دوسری طرف نئی شاعری کی حقیقت پر سکہ بند غلط بیانیوں کے پردے بھی ڈال رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس نہ ماضی کا سرمایہ ہے نہ مستقبل کا تصور، بلکہ گروہی مصلحت ہے اور وہ بزعم خود نئی شاعری کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔

دراصل نئی شاعری پر اظہار خیال کرنے سے پہلے ماضی حال اور مستقبل کے ناقابل تقسیم امکانات کو ذہن میں رکھنا ہوگا، نئی تہذیبی روایات، نئے سماجی نفسیاتی اور نئی زندگی کی بدلتی ہوئی علامات کو سمجھنا ہوگا، خواہ مخواہ اپنے گذشتہ روایات سے جوڑنا، اور ذات میں بتدریج انحطاط پذیری سے آنکھیں بند کر لینا، یونہی بزرگوں اور بزرگوں میں بیٹھ کر تنہائی کا Complex پیدا کرنا پھر خود کو یکہ و تنہا سمجھنا یہ طرز فکر و احساس نہیں ہے۔ ڈکشن کی بات لیجئے تو اور بھی بہت سے سامنے آتے ہیں۔ اپنی بہترین خوبی روایات سے انحراف کرنا، اور ماضی کے تمام سرمائے کو حرف غلط سمجھنا کونسی دانشمندی ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ انفرادیت اپنے مخصوص لہجہ اور انداز بیان کے بانکپن سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر کوئی انفرادیت اپنی زندہ و تابندہ قدروں سے علیحدہ ہو کر کبھی زندہ نہیں رہتی کوہ وقتی چمک تو ہو سکتا ہے اس میں چونکا دینے کی صلاحیت تو ہو سکتی ہے مگر دیرپا اثرات کی حامل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے نئے شاعروں میں وہی لوگ کامیاب ہیں جو اپنی بہترین خوبی روایات سے واقف ہیں۔ فکر و احساس کے اچھوتے تجربوں کو اچھی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی نظموں غزلوں میں عصر حاضر کی پیچیدگی، ہنگامہ آرائی، کرب، تضادات، خلش اور تہذیبی و معاشی، سیاسی، اور اخلاقی نیرنگیاں نمایاں ہیں۔ اور وہ اپنے اندر جمالیاتی کیف و کم بھی رکھتی ہیں۔

بدیع الزماں خاور ——— نیشنل ہائی اسکول۔ دالپلی ضلع رتناگیری)

"شاعر" کے تازہ شمارے میں آپ کا اداریہ "اردو تحریک کا المیہ" بڑا اہم اور توجہ طلب ہے۔ اس سلسلے میں دوسرے رسائل نے بھی آواز اٹھائی ہے مگر عملی اقدامات کے بغیر کسی نتیجے کی توقع ہم کر ہی نہیں سکتے۔ اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ اردو والے اس جذبہ عمل سے محروم ہوتے جا رہے ہیں جو ہماری تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ سرکاری طور پر اردو کو جن مراعات کے ملنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا اُن کی طرف سے بھی اب تک مایوسی ہی ہے۔ آپ کا یہ اندیشہ (جس کا اظہار آپ نے اکثر بر میں خوشتر گرامی مہندر ناتھ اور رضا فتح آبادی کی ایک صحبت میں کیا تھا) بالکل صحیح ہے کہ اگر اردو والے اپنے حقوق حاصل نہ کر سکے تو ہندی میں بہت دشواری ہوگی۔ عام اشتہارات میں جب مشکل سے دو چھوٹے رسالے

انہیں سال میں ہر ہندوستانی [illegible] کا حساب ان دو مہینوں کے اندر بہر صورت نوالینا ہے۔ اس لئے ہمارے کام کی رفتار تیز تر ہونی چاہئے۔ اگر یہ کام سے نکل گیا تو پھر خدا جانے کتنا عرصہ ایسا وقت نہ آئے گا جب اردو کے حقوق آئینی طور پر تسلیم ہونے کی امید کی جاسکے۔ ہمیں ایک طرف اردو کے لئے رعایات حاصل کرنی ہیں اور دوسری طرف اس کی بقا و ترقی کے لئے عوامی سطح پر وہ کام کرنا ہے جو اب تک کیا نہیں گیا ہے اور جس کے سلسلے میں صحیح تجاویز آپ نے اپنے زیر نظر اداریے میں پیش کی ہیں۔

عظیم اقبال ——— مجمع عرائض (بہار)

جن گوں ناگفتنیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ شاعر نظر نواز ہوا۔ آپ کی ہمت اور لگن کی داد دینی پڑتی ہے۔ "شاعر" کو سنوارے چلے جا رہے ہیں۔ اردو تحریک کی بے آئینی اس زبان کے سرپرست ہی کر رہے ہیں۔ اردو زبان شاعری کی خدمتوں کو کبھی فراموش نہ کر پائیگی۔

اردو کی بقا و ترقی کے لئے آپ نے جس منصوبہ کا ذکر کیا ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ زبان کا درجہ ایمان اور مذہب سے بھی اونچا ہوتا ہے۔ لیکن اردو والوں کی سوچ ہی کچھ میں نہیں آتی۔ سنجیدہ ادب کو وہ سراہ سکتے۔ اردو کا کوئی اخبار یا رسالہ نہیں خریدتے۔ اگر کبھی کبھار خریدتے بھی ہیں تو ایسے رسالے جن میں سستی سنسنی خیزی، رومانی اور فحش باتیں ہوتی ہیں۔

مراسلہ کے آخری حصہ کی جانب جو ہلکا سا اشارہ آپ نے کیا ہے، وہ ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسروں کی مدد کے بھروسہ پر آپ کب تک بیٹھے رہیں گے۔ یہ سہارا بھی کسی کے سر کیوں نہ ہو۔ دوسرے آپ کے نقش قدم پر چلنے کے لئے خود بخود تیار ہو جائیں گے۔

زیر نظر شمارہ میں اچھے مضامین ہیں خصوصاً علی عباس امید کا مضمون ترقی پسندی کا دلچسپ ہے۔ احسان دانش، وفا ملک پوری، ماہر القادری اور متین سرحدی کی تخلیقات روح پرور ہیں۔ آپ کی نظم "تاتیا ٹوپی" انداز بیان، تسلسل خیال اور لطافت احساس کی رنگ آمیزی کا بہترین نمونہ ہے۔ میرے افسانہ "کل کے بچے" میں کتابت کی غلطیوں نے بہت سے خوبصورت اور پر معنی الفاظ اور جملوں کا تاثر ختم کر دیا۔

عروج احمد عروج ——— نمونہ مکرم ٹرانسپورٹ۔ جالنہ

تازہ "شاعر" میں آپ کی نظم "تاتیا ٹوپی" بہت پسند آئی۔ آپ نے بڑے موثر انداز میں واقعات غدر کا خلاصہ اتنے فنکارانہ انداز میں کیا ہے کہ بے ساختہ منہ سے داد نکل جاتی ہے۔ بڑی پیاری نظم ہے۔ احسان دانش، متین سرحدی کی غزلیں اور ماہر القادری، قمیر الجعفری، عطا عارفی شعلہ کی نظمیں بھی اچھی ہیں۔

مرزا جعفری کا مضمون "نئی شاعری کے فلسفہ از" خاصہ کی چیز ہے۔ لیکن ایک بات کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ جعفری صاحب نے مضمون کی ابتدا میں لکھا ہے کہ میرا مقصد نئی شاعری پر اظہار خیال کرنا نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے نئی شاعری پر بحث سے بچنے کی کوشش کیوں کی ہے۔ جعفری صاحب کو تو کھل کر نئی شاعری پر اظہار خیال کرنا چاہئے۔

رابعہ مہدی خانخاں اور ساگر لدھیانوی پر لکھے گئے مضامین اچھے ہیں۔ عظیم اقبال کا افسانہ پسند آیا۔

وہاب دانش ——— لوئر بازار، ناظم علی لین، رانچی

ماہ رواں کا "شاعر" نظر سے گذرا۔ بیحد پسند آیا۔ اداریہ میں اردو کی بقا کے سلسلے میں آپ نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی اہمیت اور عملی قدروں سے ناچیز بھی حد تک متفق ہے۔ کسی بھی تحریک کے لئے خلوص اور نیک نیتی اگر روح ہے تو زر، خون۔ جو رگوں میں موج بن کر جذبہ عمل کو تازہ رکھتا ہے۔ آپ نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے، انہیں فروغ دینے اور ذہین طبقہ تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ آئندہ شماروں میں بھی دانشوران اور اردو پسند ہندوؤں کی رائیں عملی اقدامات سے متعلق تحریروں اور افادی تفہیمات کا سلسلہ جاری رہے۔ تاکہ قدم ملا کر چلنے والوں کا اشتراک بھی طریقے سے مل سکے۔

سرمایہ کے سلسلے میں عملی اقدام کا پروگرام فوراً ہی بن جانا چاہئے۔ اور سارے اردو پسند فرقوں کو مختلف حلقوں میں بانٹ کر کام شروع کر دینا چاہئے۔ اس کام کا سہرا شاعر کے سر بندھا جائے گا۔ کیوں کہ ہندوستان بھر میں جتنے بھی رسالے نکل رہے ہیں ان میں سے ایک نے بھی ابھی تک اتنی مضبوط اور مستحکم قدم کی طرف توجہ مبذول نہیں کرائی ہے۔

[illegible] ایسا بار سردار جعفری نے جس اچھوتے انداز میں نئی شاعری کی حمایت کی ہے اور نئی شاعری کے چہرے پر پڑے ہوئے، انہوں کے اٹھے ہوئے نقاب

[illegible] محبت پیدا ہو [illegible] کو نئے ڈھب سے تانی عطا کریں۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ نئی شاعری کے سلسلے میں "شاعر" کے اوراق کا ایک خاص حصہ وقف کر دیا ہے۔ وہ لوگ جو پہلے "شاعر" کو پرانی قدروں کا حامی اور ترجمان کہہ کر پڑھتے نہ تھے، اب پرچے کا شدت سے انتظار کرنے لگے ہیں۔ نئے لکھنے والوں کا حلقہ بڑھ گیا ہے اور ادب کو کچھ سے کچھ نام بھی "شاعر" میں نظر آنے لگے ہیں اور ساتھ ہی کچھ ایسے نام بھی نظر آنے لگے ہیں جو اس سے پہلے غیر معروف تھے۔ جن کا انداز الگ ہے جیسے اس دفعہ رحمت امروہوی کی دو غزلیں۔ سیدھے سادے الفاظ میں انہوں نے کتنی پیاری غزلیں کہی ہیں۔ اور قیصر الجعفری کی نظم "قربانگاہ" اور انجم آرا انجم کا تجزیہ۔ آپ کی نظم میں وہ جادو ہے کہ اگر آپ غور نہ کریں تو لگتا ہے کہ ہر جملہ کہہ کر ہو گیا ہے۔ اپنے وطن کا پیار۔ (ایثار اور جان نثاری سے سرشار اس نظم کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

نعیم ہاشمی ———— اے۔ ٹی۔ مرتہاس ہائی اسکول۔ پوسٹ مرتہاس ضلع شاہ آباد (آرہ)

محترم حنیف کیفی کا سانیٹ "مزاج" مطبوعہ "شاعر" ماہ جون نظر سے گزرا۔ اس کے بعد ہی ماہ اکتوبر کے "شاعر" میں موصوف کا ایک پُر مغز تحقیقی مضمون "سانیٹ۔ تعارف و تبصرہ" پڑھنے کو ملا۔ اسے اتفاق کہیے کہ حنیف صاحب کا سانیٹ "تنہائی" مطبوعہ "بیسویں" نومبر ۶۶ء پر بھی میری نظر پڑی۔ "مزاج" نے تو میرا دل اپنی طرف کھینچ ہی لیا تھا۔ "تنہائی" نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں بھی سانیٹ پر طبع آزمائی کروں۔ اپنی پہلی کوشش "شاعر" کے لئے "ہیلن" کی شکل میں ارسال کر رہا ہوں۔

ماہ نومبر کا "شاعر" مل گیا ہے۔ "اردو تحریک کا بیانیہ" میں قابلِ قدر اور قابلِ عمل بات کہی گئی ہے۔ اس ماہ کی تمام تخلیقات پسند آئیں۔ وفا ملک پوری کی نظم "محبوب کا پیرہن" حسین نظم ہے۔ آپ کی نظم "تانتیا ٹوپی" آپ کی دھرتی اور اپنے وطن کے ساتھ گہری اور بے لوث محبت کا بیّن ثبوت ہے۔ زکا فاضلی نے تو بہار صاحب کے خط کا خوب جواب دیا۔ بہار صاحب کو پھر کچھ لکھنا چاہیے۔ لیکن ٹھنڈے دل سے۔ "نئی شاعری کیوں؟" میں اس بار بھی "شاعر" میں تلاش کر رہا تھا۔ لیکن مایوسی ہوئی۔ یہ تو بہت اچھی اور بہت کام کی چیز ہے۔ اسے جاری رکھیے۔ اس سلسلے میں کمار پاشی کی رائے سے زیادہ لوگ اُن کے طرزِ بیان پر کُپی پڑے۔ صرف نور پیکار ہی نے اُن کے خیالات کی قدر کی ہے۔ چلئے کوئی تو ملا!!۔

ڈاکٹر عبدالعلیم ناقی ———— اورینٹل کالج، بمبئی ۳

"اردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈراما" کے تحت جو اعتراضات کئے گئے ہیں اُن کے جوابات ارسالِ خدمت ہیں۔

(۱) "ڈراما" انگریزی زبان کا لفظ ہے اور انگریزی زبان کی مقبولیت کے ساتھ ہی اس نے بھی مقبولیتِ عام حاصل کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب لفظ ڈراما کو زبان میں استعمال ہوتا ہے تو انگریزی ڈرامے کی جملہ خصوصیات آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔

انگریزی زبان میں ڈرامے کی بہت سی صورتیں ہیں مثلاً Comedy، [illegible]، Melo، Miracle، Pastoral، Tragedy، Operatic وغیرہ۔ اور ہر صنف ایک خاص معانی و مطالب کی حامل اور دوسری اصناف سے مختلف ہے۔ میلو ڈراما نہ اوپرا بن سکتا ہے اور نہ ٹریجڈی۔ پاسٹورل کہلایا جا سکتا ہے۔

اردو زبان میں بھی بہت سے الفاظ مستعمل ہیں مثلاً (۱) اوتر رام چرتر۔ (۲) بیاونی۔ (۳) پالا۔ (۴) بھرت لیلا۔ (۵) بھگت تماشا۔ (۶) جھنک (۷) راس لیلا (۸) رام لیلا۔ (۹) رہس۔ (۱۰) سوانگ۔ (۱۱) کالیا دمن۔ (۱۲) کرشن جاترا۔ (۱۳) کرشن لیلا۔ (۱۴) کھیل۔ (۱۵) گیت گوبندا (۱۶) نوٹنکی وغیرہ وغیرہ جو ایک ہی چیز کی مختلف صورتیں ہیں اور ہر ایک اپنی معنوی خصوصیت کے اعتبار سے پہچانی جاتی ہے۔

اردو چونکہ ایک عالمگیر زبان ہے اور ہر صوبہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس لئے اس کے ڈرامے کے لئے مختلف الفاظ مستعمل ہیں۔ اوتر چرتر نہ سوانگ کے معنی میں استعمال ہو سکتا ہے اور نہ نقل، نوٹنکی کے۔ ہر لفظ کے جو معنی ہیں وہ اُسی کی ادائیگی ہی سے پورے ہو سکتے ہیں۔ رہس کا تعارف رہس ہی پورا کر سکتا ہے ڈراما نہیں۔

میں اردو کو چینی زبان کے بعد مشرق و دنیا کی سب سے بڑی اور موثر زبان سمجھتا ہوں اور یہ ضروری خیال کرتا ہوں کہ جس لفظ سے جو مقصد ظاہر ہوتا ہو وہی لفظ استعمال کیا جائے۔

محفل اپنی .....!

یہ گوشہ آخری شمارہ

۱۹۳۶ء سے شاعر بڑی باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس عرصہ میں اس کو بڑی زبردست پریشانیوں کا شکار رہنا پڑا ہے۔ اب وہ صحت کے لحاظ سے بھی ثابت نہیں ہوا۔ مالی حالات کی ابتری نے بڑی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔

بہر حال ثابت قدمی ہی اس دور کا تقاضا ہے۔ "شاعر" نے بھی اس کا ثبوت دیا۔ مشکلات کے باوجود ہر اگلا قدم آگے ہی کی طرف بڑھا ہے۔ "شاعر" کی فضائیں معنوی و صوری تبدیلیاں آئی ہیں اور سب سے زیادہ مسرت کی بات تو یہ ہے کہ اس سال پورے بارہ شمارے پیش کئے گئے۔ پوہ مہینہ کے آخر ہی میں سہی لیکن "شاعر" ہر مہینے نکلتا ضرور رہا ہے۔ آٹھ روپے کے تخلیقی سالانہ چندہ میں فی شمارہ سے زیادہ صفحات پیش کئے گئے۔ اس پر بھی حسابِ سال میں بعض کرم فرماؤں نے "شاعر" کے دفتر پر واپسی کے لئے حضرات کو اشتہار یا بھی خواہ مخواہ ہر گز نہیں کہا جا سکتا ایک روپیہ کی واپسی سے "شاعر" پر تقریباً بارہ آنے کا بار پڑتا ہے۔

دسمبر ۱۹۴۱ء کا یہ تازہ شمارہ، پچھلے شماروں ہی کی طرح متنوع ہے اس بار علمی ادبی اور تنقیدی مضامین کی تعداد زیادہ ہے۔ ہمیں اس کا افسوس ہے کہ اس شمارہ میں افسانے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایک بہت ہی طویل مگر کام کے مضمون "تعلیمی اور تخلیقی شاعری" نے دو تین افسانوں کا حق چھین لیا۔ پہلے ہی کچھ اعلان شدہ نظمیں اور غزلیں رکی ہوئی تھیں۔ اس بار بعض کتابت شدہ مضامون کو بھی روکنا پڑا ہے۔ "روحِ اخذ" اور نقد و نظر کے دونوں اہم ابواب کے لئے بھی جگہ نہ نکل سکی۔

کئی بار عرض کیا جا چکا ہے کہ "شاعر" کے لئے بے اندازہ نظم و نثر تخلیقات آتی ہیں۔ ۱۹۳۸ء کی تو پچھلی سو تخلیقات واپس کرنا پڑی تھیں ۱۹۴۱ء میں اس سے بھی زیادہ واپس کرنا پڑا ہے۔ زیادہ تر یہ مواد کچا ہونے کی وجہ سے آئی ہوئی تخلیقات کا دو سواں حصہ بھی شائع نہیں ہو پاتا۔ قلم کار بڑا ناقد ہوتا ہے کاش وہ "شاعر" کی تنگ دامانی کا احساس کریں۔ ہو سکتا ہے کہ جنوری ۱۹۴۲ء کے "شاعر" کے صفحات بڑھانے پڑیں۔ اس لئے کہ اس کے لئے جو نظم و نثر تخلیقات منتخب کی گئی ہیں وہ بہت زیادہ ہیں سوال کاغذ کی

[illegible] خبر
[illegible] سے بھی کم میں پیش کیا جائے گا۔
صرف بارہ روپے
"شاعر" کے ہر دور، دوست خیر خواہ اور قارئین جتنے بھی بڑھتے جائیں گے ہمیں یہ اندیشہ نہیں کہ ہر نئے سال تخلیقات کے کسی حصہ یا فنڈ سے بارہ روپے وصول نہیں کر سکتا۔ ایک یا دو بار بقایا جات کا مسئلہ بھی ایسا مشکل نہیں ہے۔

آئندہ شمارہ

مضامین	اُردو میں تحقیق	مالک رام
	تشبیہ کی غزل پسندی	ڈاکٹر جعفر رضا
	مضمون۔ مقالہ۔ انشائیہ	عبدالطیف اعظمی
	ہندی نئی نظم کا موضوعاتی پھیلاؤ	شیام کنول
کہانی	دل اور دیوار	عمر عاطف ہری
	میری دنیا میرے لوگ	کلدیپ رضا
ریویو تارٹ	"جشنِ شاعر"	ندا فاضلی
بحث	نئی شاعری کیوں؟	مقابلہ پر دیسی
		رشید الدین
		حسین عباسی

ندا فاضلی کے خط کا جواب، پروفیسر سی۔ سی۔ بہل

اور کئی دوسری اہم نثری تخلیقات

منظومات: ثاقب کانپوری۔ یقین سروشی۔ علیم اختر مظفر نگری۔ مظفر حنفی۔ ابن احمد دہلوی۔ مظہر اقبال۔ اسرار الحق بادری۔ شاہد الرحمٰن خاں عشا۔ بدیع الزماں خاور۔ کیفی اور صدیقی۔ جلیل عارفی۔ عمار راشد۔ شبیر حسین خاور۔ تاج فاروقی۔ ذکاء الدین شایاں۔ حنیف کیفی۔ امیر حمزہ ثاقب۔ طاہر دہلوی۔ بہم ناتھ درد قاسمی۔ ناہید قریشی۔ اعزاز افضل۔ مروج احمد مروج۔ اختر شیرانی۔ بھاگلپوری۔ فاروق شفق۔ ظفر غوری۔ حباب دانش۔ منان صدیقی۔ علیم اللہ حالی۔ فروغ فکنت۔ مستانہ شکیب۔ شمیم ہاشمی وغیرہ۔

جرعات۔ نقد و نظر۔ ادبی و تہذیبی خبریں اور فنکاروں کی تصاویر

بڑی قوت ہے جس کے بل بوتے پر سینکڑوں اہم سے اہم کام بہ سہولت تمام انجام پاجاتے ہیں۔ عقیدت یا عقیدہ جس کا نام ہے وہ اسی قوتِ خیال کی فروعات میں سے ہے۔ نذر، نیاز، گنڈا، تعویذ، بھوت، پلید اور دُنیا بھر کے جھگڑے بکھیڑے سب اسی قوتِ خیال پر مبنی ہیں۔ سب کی بُنیاد بھی قوتِ خیال ہے۔ قوتِ خیال سے جو کام نکلتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں نکل سکتا۔ قوتِ خیال بلا امتیاز مذہب و قوم ہندو مسلمان، گبر و مجوس وغیرہ سب میں موجود ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جو فائدہ اہلِ اسلام وظائف سے اٹھاتے ہیں وہ ہا فائدہ ایک ہندو اشلوک پڑھ کر حاصل کرلیتا ہے کہ جو فائدہ مشرکات ایک مسلمان مخلص مزاروں اور معبدوں پر جانے سے لے آتا ہے وہ ہی برکتیں ایک ہندو مندروں سے لوٹ لاتا ہے۔ خواجہ صاحبؒ کی نیاز و فاتحہ سے اگر عقیدی کی پچاس مُرادیں پوری ہوتی ہیں تو شیخ سدّو کا کہرا کرنے سے بھی عقیدی بیس ضرور پوری ہوجاتی ہیں ——— ..... آتش پرست آگ کو معبود سمجھ کر اُس سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں اور ملتی ہیں۔ آفتاب پرست سورج کو بزرگ ترین خلائق سمجھ کر اُس سے عرض حال کی تقویت معدوم چیزوں کی بھی خاطر خواہ پوری ہوتی ہیں۔ یہ سب قوتِ خیال کے ادنیٰ ترین شعبے ہیں۔ خیال کی تقویت معدوم چیزوں کو موجود کرکے دکھا سکتی ہے۔ اندھیری رات میں جبکہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہو اور دور دور تک کوئی آواز نہ سنائی دیتی ہو، کسی لق و دق میدان یا کسی دشوار گذار گھاٹی کے دامنوں پر نظر کیجئے، معلوم ہوگا کہ کوئی ڈراؤنی چیز یہاں موجود ہے۔ اب اپنے خیالات کو یوں جمایئے کہ یہ کوئی بلا ہے۔ جمتے جمتے وہی خیال دو حقیقتاً محض بے اصل ہے مگر رفتہ رفتہ تقویت حاصل کرتا جارہا ہے) اُس ہیولہ کو مجسم بنکر آپ کے سامنے کھڑا کردے گا۔ اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ واقعی کوئی بھوت بلا ہے۔ اُس کی آنکھیں، کان، ناک، دانت، بال اور دیگر ڈراؤنے اعضاء آپ کی قوتِ خیال پر موقوف ہیں۔ سب ظاہر ہوجائیں گے اور آپ پر خوف طاری ہوجائے گا۔ غرض قوتِ خیال ایک عجیب مظہر العجائب قوت ہے اور مسمریزم کو بھی اسی قوت سے ہر قسم کی طاقت حاصل ہے۔ بعض عامل جو مسمریزم کے طریقوں سے کسی قدر واقف ہیں اپنے معمولی اصحاب سے فرمایا کرتے ہیں کہ ہمارے تابع ہمزاد ہے۔ یہ بات بالکل لغو ہے۔ ہمزاد کا تابع کرنا بڑی بڑھی کھیر ہے .....

..... نئے ہمزاد کے معنی ہیں۔ ساتھ جنا ہوا یعنی ہمزاد ہر انسان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور جب تک اُس کی عمر ۱۲ سال کی نہیں ہوجاتی ہر وقت اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اُس کے ساتھ رہتا ہے اور پھر چونکہ پردہ ہر مذہب و قوم میں ایک ضروری رسم ہے، کنارہ کش ہوجاتا ہے۔ ہمزاد شکل و شمائل، عادات و خصائل میں اپنے ہمزاد انسان سے بالکل مشابہ ہوتا ہے اور علم و کمال میں ہر طرح بہرہ مند۔ اگر انسان جاہل ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اُس کا ہمزاد بھی جاہل ہو۔ مگر جو انسان فاضل ہے تو ہمزاد عالم ہوگا۔ ہمزادوں میں قومیں بنی نوعِ انسان کی طرح قائم ہیں۔ جو ہم مسلمان ہیں وہ شیخ، سید، مغل، پٹھان کی قیود سے آزاد نہیں۔ جو ہندو ہیں وہ برہمن، چھتری، شودر و بیش وغیرہ اقوام نام سے نامزد ہیں۔ عیسائیوں کے ہمزاد عیسائی، مجوسیوں کے مجوسی، نصرانیوں کے نصرانی، ہندوؤں کے ہندو، مسلمانوں کے مسلمان، غرضکہ جس قوم اور مذہب میں جو انسان مبعوث ہے اُسی مذہب اور ملت میں اُس کا ہمزاد بھی مخلوق ہے۔ آپ نے سنا ہے کہ فلاں عورت اور فلاں مرد کے سر فلانی کو لن اور فلاں چمٹ آتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ وہی ہمزاد۔ ورنہ کوئی بلا ہے، نہ چڑیل ..... مگر ہاں اس بات کے ماننے میں کسی قسم کا تامل نہیں ہوسکتا کہ مسمریزم اور قوتِ خیال لازم و ملزوم ہیں۔ قوتِ خیال سے متعلق اکثر حاذق حکما اور لائق ڈاکٹر بھی بہت کچھ تحریر کرچکے ہیں اور اسلئے کہا جاتا ہے کہ قوتِ خیال از روئے سائنس یا باعتبار حکمت بھی ثابت کی گئی ہے ..... حکیم فیثا غورث نے قوتِ خیال پر ایک بسیط اور مدلل بحث کی ہے، جس کا مجمل خلاصہ یہ ہے کہ "قوتِ خیال اور قوتِ دماغ دونوں قوتیں جسم انسان میں بادشاہ ہیں اور باقی تمام طاقتیں اُن کی محتاج" اگر یہ دونوں طاقتیں انسان کو ودیعت نہ ہوتیں تو انسان انسان نہ کہلاتا کیونکہ حیوان اس سے محروم ہیں اور سنئے لیلیٰ کی فصد لی گئی تو مجنوں کے ہاتھ سے خون جاری ہوگیا۔ اگر یہ سچ ہے تو وہی قوتِ خیال کا کرشمہ ہے۔ کوہکن نے مرگ شیریں کی جھوٹی خبر سنکر سر پر کلہاڑی ماری شیریں مرگ کی سچی سرگذشت سے مؤثر ہوکر اسی قبر پر جان نثار کرگئی۔ اگر یہ دونوں حادثے تاریخی دُنیا میں جھوٹے نہیں ہیں تو یہ بھی قوتِ خیال کے ادنیٰ نمونے ہیں ۹ھ

انشاء اللہ تعالیٰ سیماب کی دوسری کڑی "حیاتِ داغ" ہوگا۔ علامہ سیماب مرحوم کی کتاب "حیاتِ داغ" کا نام حضرتِ اعجاز صدیقی نہ معلوم کس بنا پر "چراغِ داغ" لکھا ہے۔

---

۹ صدق ۲۲ تا ۲۵ ۔ م ۔ ج ۔ ۵

۱۰ ملاحظہ ہو ماہنامہ "شاعر" نومبر ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۷ ۔ م ۔ ش ۔ ۵

اب کوئی شعر یاد نہیں۔ ہاں "سمرقند و بخارا" کے بدلے مقبول احمد صاحب نے یہ فقرہ نظم کیا۔ "بنگالہ دیس لٹائیں گے"۔
حال میں جناب نریش کمار شاد نے "دو آتشہ" کے عنوان سے خواجہ حافظ کے چند اشعار کا ترجمہ قطعات اردو میں پیش کیا ہے۔ اس کا پیش لفظ علامہ منور لکھنوی نے لکھا ہے۔

راقم کے خیال ناقص میں خواہ کیسا ہی بڑے سے بڑا شاعر کیوں نہ ہو جب اصل کلام اپنے سامنے رکھ کر نظم میں ترجمہ کرے بجائے آمد یقیناً آورد پیدا ہوگی۔ چنانچہ یہ مختصر سا مجموعہ "دو آتشہ" بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ مثال ؎

مے خور کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب — چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

(ترجمہ۔ شراب پی کہ شیخ اور حافظ اور مفتی اور محتسب کو۔ اگر تو بغور دیکھے تو سب مکر و فریب کر رہے ہیں۔ مطلب :۔ اے مخاطب! تو بھی شراب پی اس لئے کہ مفتی اور محتسب سب کے سب مکر کر رہے ہیں کہ ظاہر میں شراب سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور پردے میں شراب پیتے ہیں۔ پس تو بھی پی کہ مضائقہ نہیں)

اس شعر میں درحقیقت حافظ نے اپنے عہد کے علماء پر طنز کیا ہے۔ جناب نریش کمار شاد نے جو ترجمہ کیا ہے ملاحظہ ہو ؎

جانِ ان سرپھروں کی باتوں پر — بے تکلف اُٹھا شراب کا جام
محتسب، شیخ، واعظ اور مفتی — سب فریبی، زمانہ ساز تمام

پہلے مصرعہ میں "سرپھروں" کا فقرہ نہ صرف مخل فصاحت ہے بلکہ غلط ترجمہ ہے۔ بہرکیف نریش کمار شاد کی کاوش بھی قابل ستائش ہے۔

میرے خیال میں بہتر ترجمہ وہی ہوتا ہے کہ صرف مفہوم کو ذہن میں رکھ کر حسب اقتضائے زبان و بیان، قوافی و ردیف کی پابندی کیساتھ کوئی کسی نظم کہے، ہوئے خیال کو بعنوان احسن اپنی زبان میں نظم کر دے۔ مثال ؎

حافظ :۔ — بہ بوئے نافۂ کآخر صبا زاں طرّہ بکشاید — زتابِ جعدِ مشکینش چہ خونِ افتاد در دلہا

(اس نافہ کی امید میں کہ صبا آخر اس طرہ سے کھولے گی۔ اس مشکیں زلف سے کیا کیا خون ہوئے ہیں)

مطلب :۔ نافہ کنایہ ہے پیام حضرت صمدیت سے، جو بذریعہ ملک الموت کے پہنچتا ہے اور اس کے پہنچنے کے وقت ارواح مقدسہ زندہ تن سے نکل کر شاداں و فرحاں حضرت ذوالجلال کی طرف رجوع کرتی ہے۔

اس کا ترجمہ جو بغیر کسی قصد کے شاد عظیم آبادی کے شعر میں آیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

کھلا ہے باغ پر جو طرّۂ صبا کس جعدِ مشکیں کا — کہ مجھ تک بوئے گیسو کارواں در کارواں پہنچی

غزل کا شعر ہے۔ کارواں در کارواں کی فصاحت و بلاغت پر غور کیجئے۔ مطلب یہ کہ اس پیام ذوالجلال کا سلسلہ ازل سے ابد تک جاری رہے گا۔ گزرنے والے پیام سن سن کر گزرتے جا رہے ہیں اور اب یہ پیام مجھ تک پہنچا ہے۔

دوسری مثال ؎

شبِ تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل — کجا دانند حال ما سبک ساران ساحل ہا

(اندھیری رات، لہر کا خوف، ایسا خوفناک بھنور، کنارے کے سبک سر ہمارے حال کو کیا جانیں)

مطلب :۔ شبِ تاریک سے مراد دنیا، موج کنایہ ہے حوادثِ زمانہ کا۔ گرداب کنایہ ہے عمر کا)

شاد عظیم آبادی ؎

کہاں چھوڑا ہے مجھ وحشی کو قاتل نیم جاں تو نے — اندھیری رات، سناٹوں کا عالم، بولنا رن کا

؎ پہلے مصرعہ میں صرف ایک لفظ بدلا دینے سے ترجمہ مکمل ہو جاتا ہے ؎ جانِ من کاریوں کی باتوں پر — ارشاد

"یہ درد جو زندگی کی صورت
صدیوں سے یونہی رواں دواں ہے
صدیوں سے جو روشنی کی صورت
دھرتی پہ جمال رائگاں ہے
اِس درد کی انتہا کہاں ہے؟
یہ درد جو زندگی سزا ہے!"

شہاب جعفری

تیاگ کے بعد

بے کار سا یہ سوال — لیکن
اک فکر میں کائنات ڈوبی
ہر شے نے ہر ایک شے سے پوچھا
ہر اک کا جواب تھا خموشی
ہر جسم نے رُوح کو پکارا
ہر رُوح پکار سُن کے چُپ تھی
دریاؤں کے شورِ جانگسل کو
ساحل کی سماعتیں ہی کم تھیں
پتھر کے سکوتِ مضمحل کو
صحراؤں کی وُسعتیں ہی کم تھیں
اک دل کی صدائے منفعل کو
افلاک کی رفعتیں ہی کم تھیں
البتہ صدا و سمت و آفاق
سب درد ہی درد ہو گئے تھے
ہر درد میں ایک "میں" چھپا تھا
"میں"، جس کی کچھ انتہا نہیں ہے